جانباز

1

ایم اے راحت

دیباچہ

زیرِ نظر ''جانباز'' نامی داستان دلچسپ حقائق سے مزین ایک دل آویز دستان ہے۔ایسی ہی تخلیقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں خونِ جگر صرف کیا گیا ہے۔اس کہانی کا محور بھی حق و باطل، نیکی و بدی اور خیر وشر جیسے ازلی موضوعات ہیں لیکن واقعات کی ترتیب نے اس میں ایک ایسا انوکھا حُسن بھر دیا ہے کہ آنکھ اور کتاب کا رشتہ کہانی کے اختتام تک ختم نہیں ہوتا۔

تاریخ، سائنس، روحانیت، پراسراریت اور محبت اس شہ پارے کے اجزائے ترکیبی ہیں۔عظیم سائنسدان و روحانی عالم ''رازل جریری'' تمام دنیا کے لئے امن کا پیغام لے کر اٹھتا ہے تو تشدد پسند طاقتیں اور ناعاقبت اندیش حکومتیں اُس کی جان کے درپے ہو جاتی ہیں۔ پلاسکو کی مطلق العنان حکومت ''رازل جریری'' کو ختم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہے اور ایسے ایسے معرکے جنم لیتے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اور پھر کہانی کا وہ ڈرامائی موڑ جہاں ''رازل جریری'' اپنی روح سے بچھڑ کر جسمانی طور پر برفانی وادیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے تو شہباز نامی ایک عجائب زمانہ نوجوان اُس سے ٹکراتا ہے جو اُس کی روح اور جسم کو پھر سے ملا دیتا ہے اور یہی شہباز اس داستان کا ہیرو ہے۔

محترم قارئین کرام! ذہنی اُڑان کے حوالے سے ہم نے اب تک ٹیلی پیتھی کے بارے میں پڑھا ہے۔مگر ذہن کو کسی دوسرے چلتے پھرتے آدمی کے ذہن میں داخل کر دینا یا جسم کو بغیر روح کے مدتوں محفوظ رکھنا یقیناً ہمارے لئے ایک سرپرائز سے کم نہیں۔تاریخی حوالے سے انقلابِ ایران کے پس منظر سے مصنف نے لاتعداد اندرونی حقائق کو صفحات کی زینت بنایا ہے۔دورانِ انقلاب خون کی ہولی کھیلنے سے لے کر معزول شاہ کے خفیہ خزانے کے حصول کی جدوجہد میں انقلابیوں اور زیرِ زمین دنیا سے متعلق افراد میں جو تصادم اور ٹکراؤ

ہوئے ہیں، تاریخ ان سے پناہ مانگتی ہے۔

کہانی کا دوسرا اہم کردار نریمان فرازی ہے جسے ایک دہشت ناک جیل سے حاصل کیا گیا۔ یہ ایک ایرانی نوجوان ہے جسے شاہ کے خفیہ خزانے تک رسائی کے لئے بنیادی کردار بنایا گیا۔ رازل جریری، شہباز اور نریمان فرازی کی تکون جب خفیہ خزانے کے حصول کے لئے سرگرداں ہوتی ہے تو ہر ہر قدم پر ایک دلچسپ کہانی وجود میں آتی چلی جاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ شہباز ایک مہم جو نوجوان ہے لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ وہ کسی کے حسنِ جہاں سوز سے متاثر ہی نہ ہو۔ نوشابہ شہباز کے حوالے سے ایک اہم کردار ہے جس کے جمالِ رنگین و سنگین سے کہانی میں ایک دلبرانا سا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

ادارہ

رحیم شاہ کبھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ اپنے کتے، بکرے اور ریچھ سے زیادہ پیار کرتا ہے یا فیض شاہ سے جو کتے، بکرے اور ریچھ کی طرح اس کا کوئی نہیں تھا۔ بس یہ اس دور کی بات ہے جب کنٹری میں باڑھ آئی تھی اور آدھی کنٹری کی آبادی سیلابی ریلے کے ساتھ بہتی ہوئی دریائے سونجنا میں جا گری تھی۔ اس کے بعد دریا میں جا گرنے والے دریا کی ملکیت تھے۔ کچھ کی لاشیں ملی تھیں اور کچھ کا پتہ ہی نہیں چل سکا تھا۔ انہی گم ہو جانے والوں میں فیض شاہ کی ماں اور رحیم شاہ کا باپ بھی تھے۔ فیض شاہ کا باپ اور رحیم شاہ کی ماں اس سیلابی حادثے سے پہلے مر چکے تھے۔ لیکن ان دونوں کی گمشدگی یا موت رحیم شاہ اور فیض شاہ کی لازوال دوستی کی بنیاد نہیں بنی تھی بلکہ سیلاب میں جب کہ بستی نو فٹ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور کچے گھروں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں اور قرب و جوار کے ہر درخت کی موٹی شاخوں پر کنٹری کے زندہ بچ جانے والے چپکے ہوئے تھے۔ اور کوئی درخت خالی نہیں تھا، رحیم شاہ کے بہتے ہوئے جسم کو کنٹری کے سب سے نٹ کھٹ اور منہ زور لڑکے فیض شاہ عرف عام میں فیجے نے روکا تھا جو ایک درخت کی شاخ سے لپٹا ہوا تھا اور اس نے اس شاخ پر الٹا لٹک کر رحیم شاہ کو پانی سے اٹھایا تھا۔

معمولی بات نہیں تھی۔ رحیم شاہ بھی خوب تندرست اور وزنی تھا لیکن فیض شاہ طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ پاگل بھی تھا۔ مشکل سے مشکل درخت پر چڑھ جانا، اونچی سے اونچی جگہ پہنچ جانا اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ بلند ترین جگہوں سے چھلانگیں لگا دینا معمولی بات تھی۔ دو تین جھولے دینے کے بعد اس نے رحیم شاہ کو شاخ پر کھینچ لیا۔ دیر تک رحیم شاہ کو یقین نہیں آیا کہ وہ بچ گیا ہے۔ پانی اس کے بدن کو آسانی سے بہا کر لے جا رہا تھا۔

''تیری مہربانی فیجے!'' رحیم شاہ نے کہا تھا۔

رات کو فیجے نے کہا۔ ''بھوک لگی ہے......؟''

"ہاں......"

"چنے مونگ پھلی کھائے گا......؟"

"مذاق کررہا ہے؟" رحیم شاہ بولا۔

"سنبھل کر بیٹھ۔ ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر فیض شاہ نے ایک نگاہ درخت کی شاخوں سے چپکے ہوئے دوسرے لوگوں کو دیکھا اور پھر اپنے سر کے قریب ایک شاخ پکڑی اور دوسرے لمحے غائب ہوگیا۔ بہت ہی معمولی جنبشیں بتاتی تھیں کہ وہ کچھ کررہا ہے۔ بہت ہی مختصر وقت میں وہ واپس آگیا پھر اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی رحیم شاہ کی طرف بڑھائی اور بولا۔

"چلو......شروع ہوجاؤ۔"

سچ مچ چنے اور مونگ پھلیاں تھیں۔

"کہاں سے آئیں......؟" رحیم شاہ حیرت سے بولا۔

"خانو خلیل کے بھاڑ سے۔" فیجے نے مزے سے پوٹلی سے چنے نکال کر ایک پھنکی مارتے ہوئے کہا۔

"کیا......؟ تم وہاں کیسے پہنچ گئے؟ اور پھر اتنی جلدی۔"

"آج تھوڑی پہنچا تھا یار...... بہت دن سے اس پوٹلی کی تاک میں تھا جس میں خانو خلیل بھڑ بھونجہ گرم گرم چنے، مونگ پھلی بھر کر رکھتا ہے۔ کئی دن سے بارش ہورہی تھی اور بھنے ہوئے چنوں کی خوشبو پاگل کیے دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے دُکان میں گھسا تھا اور پوٹلی قبضے میں کی تھی کہ پانی اندر آگیا۔ مولا کا شکر ہے کہ پوٹلی ہاتھ سے نہیں چھوٹی اور پانی کا ریلا اس پیڑ تک لے آیا۔"

"اتنی چھوٹی سی پوٹلی......"

"اونہیں یار! پوٹلی کافی بڑی ہے۔ یہ تو اس سے نکال کر لایا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"درخت کی پھننگی سے باندھ رکھی ہے۔"

"کسی نے اتار لی تو؟"

"کس کی شامت آئی ہے کہ اس تک جانے کی کوشش کرے۔ ایسی جگہ لٹکی ہوئی ہے۔"

چار دن تک اسی درخت پر بسیرا رہا تھا۔ چنے پیٹ بھرتے رہے تھے۔ پانی کی تو کمی ہی نہیں تھی۔ باڑ اتر رہی تھی۔ چوتھے دن پانی اتر گیا۔ چاروں طرف ہاہا کار مچ گئی۔ رونے پیٹنے کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ پتہ نہیں کس کس کا کون بچھڑ گیا تھا۔ امدادی ٹیموں نے بہت سی لاشیں نکال لی تھیں لیکن نہ فیض شاہ کی ماں زبیدہ بی بی ملی نہ رحیم شاہ کا باپ غلام شاہ۔

بستی کے حالات معمول پر آگئے۔ فیض شاہ کی جھونپڑی کا تو نام ونشان نہیں ملا تھا، لیکن رحیم شاہ کے باپ نے اینٹوں کا احاطہ بنالیا تھا جو قائم تھا۔ چنانچہ فیض شاہ رحیم شاہ کے ساتھ رہنے لگا۔ رحیم شاہ کا باپ غلام شاہ بندر نچاتا تھا لیکن رحیم شاہ نے کافی ترقی کر لی۔ ایک کتا، ایک بکرا اور پھر ایک ریچھ...... تینوں کی موجودگی میں آمدنی ڈبل سے بھی زیادہ ہوگئی۔ البتہ فیض شاہ ہمیشہ کا لاابالی تھا۔

"تو کماتا تو ہے۔ کافی نہیں ہے کیا دونوں بھائیوں کے لئے؟" فیض شاہ ہنس کر کہتا۔

"اوہ......تو میں کب کہتا ہوں تجھ سے کہ تو کما کر لا۔ جان حاضر ہے تیرے لئے۔ آرام سے کھا پی، زندگی گزار۔"

"پر بستی والے تو سرے کہتے ہیں کہ فیجا رحیم شاہ کی کمائی کھائے جارہا ہے۔"

"جس کے منہ سے سنے مجھے بتادے۔ دوبارہ کہنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔" رحیم شاہ غصیلے لہجے میں کہتا۔ البتہ جب بستی سے باہر کھیل تماشہ دکھانے کی ضرورت ہوتی تو عام طور سے فیض شاہ، رحیم شاہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور بکرا، کتا اور ریچھ ایسا لگتا تھا جیسے فیض شاہ سے زیادہ مانوس ہوں۔ ویسے بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔ اور فرصت کے وقت میں فیجا ان جانوروں سے گھنٹوں بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے مشاغل بھی مختلف تھے۔ ایک دن ایسے ہی کسی بستی سے واپسی ہورہی تھی۔ درختوں اور کھیتوں کے درمیان رحیم شاہ تھوڑی دیر آرام کرنے رُک گیا تو فیض شاہ کو مستی سوجھی۔ کتے کو دوڑانے لگا۔ رحیم شاہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا مسکرارہا تھا۔ کتا فیجے سے کھیل رہا تھا۔ اچانک ہی فیض شاہ اچھلا اور ایک درخت سے الٹا لٹک گیا۔ اچھل کر پیروں سے درخت کی شاخ کو پکڑنا اور پھر الٹا لٹک جانا بڑی مہارت کی بات تھی۔ لیکن بات یہی نہ رہی۔ کتا اچھل اچھل کر اسے پکڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ فیض شاہ درخت سے ٹپکا اور اچھل کر دوسرے درخت کی شاخ سے لٹک گیا اور

پھر اس طرح شاخ کو پکڑ کر گول گول گھومنے لگا کہ رحیم شاہ کو چکر آ گیا۔ فیض شاہ کو اس وقت نجانے کیا سوجھی تھی۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ ناقابلِ فہم بات تھی۔ درخت سے زمین پر آنا۔ زمین سے ایک دم دونوں ہاتھ پھیلا کر درخت سے لٹک جانا۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک، دوسرے سے تیسرے تک۔ کتا اس کے ساتھ کھیل رہا تھا اور فیض شاہ باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ پھر وہ ہنستا ہوا رحیم شاہ کے پاس آ گیا۔

''یار! یہ تیرا ڈولی بہت شریر ہو گیا ہے۔ لیکن پکڑ نہیں سکا مجھے۔'' رحیم شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے فیض شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ فیض شاہ چونک کر بولا۔

''ارے ارے...... کیا ہو گیا؟ کیا ہو گیا تجھے؟''

''فیض شاہ! یہ سب کچھ تو نے کہاں سے سیکھ لیا؟ یہ کیسے ہو گیا......؟''

''کیا رے......؟'' فیض شاہ چونک کر بولا۔

''یہ جو ابھی کر رہا تھا تو کیا تجھے اُڑنا آ گیا ہے؟''

فیض شاہ ہنس پڑا پھر بولا۔ ''یہ تو مجھے بہت دن سے آتا ہے۔ اور کرتا کیا رہا ہوں میں۔ یہی سب کچھ تو کرتا رہا ہوں۔ جنگلوں میں گھوم پھر کر جانوروں کی حرکتیں دیکھنا، کس طرح وہ پروں کو پھیلا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ میں ان سے سیکھتا رہا ہوں۔ ہمارے بازوؤں میں اس طرح بجلی نہیں پیدا ہوتی جس طرح ان کے پروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم بازوؤں کی جنبش صحیح انداز میں استعمال کر کے کم از کم اپنے جسم کے وزن کو کم کر سکتے ہیں۔ تم نے بندروں کو دیکھا ہے، بے شک ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور ان کے جسم میں بے پناہ پھرتی ہوتی ہے لیکن میں نے جو دوسری بات کہی یعنی ان کے بدن کی پھرتی وہ ایک الگ چیز ہے اور ان کی مہارت الگ چیز۔ دیکھو...... میں تمہیں دکھاتا ہوں۔'' فیض شاہ نے اپنی جگہ سے دوڑ لگائی اور اس کے بعد وہ اچھل کر درخت کی ایک شاخ سے لٹک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے شاخ پکڑی اور پھر بدن کو پوری قوت سے جھکولہ دے کر آگے بڑھ آیا اور اس شاخ کو چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے دوسری شاخ پکڑ لی جو ایک پتلی اور کمزور شاخ تھی۔ اور پھر وہاں سے دوسری اور اس جگہ سے تیسری اس طرح وہ درختوں پر چکر لگاتا رہا اور پھر اس درخت پر آ کر نیچے کود گیا جہاں رحیم شاہ موجود تھا۔ رحیم شاہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''بس رُک جا فیض شاہ! بیٹھ جا میرے پاس۔''

''ہاں بول۔''

''یار! تو اپنے لئے تو کچھ نہیں کرے گا یہ بات تو میں جانتا ہوں۔ میرے لئے بھی کچھ نہیں کرے گا؟''

''تیرے لئے تو میں دنیا کا ہر کام کر سکتا ہوں۔''

''فیض شاہ! تو میرے ساتھ چلا کر۔ ہم بستیوں میں کھیل تماشے دکھا کر کافی رقم کما سکتے ہیں۔ دیکھ انکار مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔ رقم تو کما۔ میں تجھے تیری مرضی کے مطابق کر کے دکھا دوں گا جیسا تو کہے گا۔''

اور اس کے بعد تھوڑے ہی دن گزرے کہ نگن پور میں میلہ لگا۔ نگن پور کا میلہ بہت بڑا ہوا کرتا تھا اور نگن پور کے میلے میں فیض شاہ اور رحیم شاہ پہنچ گئے۔ رحیم شاہ کا کتا، بکرا اور ریچھ اپنے کام دکھا رہے تھے اور فیض شاہ اپنا کمال۔ ایک چھوٹا سا کتا بھلا ایک انسانی جسم کا وزن کہاں سنبھال سکتا ہے؟ لیکن ہو یوں رہا تھا کہ کتا ایک دائرے میں دوڑ رہا تھا اور فیض شاہ دوڑ کر اس کی پیٹھ پر چڑھ جاتا تھا۔ کتا اسے اپنی پشت پر سنبھال کر کافی قدم آگے دوڑتا۔ فیض اس کی پیٹھ سے کودتا، تین چار قدم خود دوڑتا اس کے بعد خود کتے کی پیٹھ پر چڑھ جاتا۔ پھر ریچھ نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فیض شاہ اس کے ہاتھوں پر کھڑا ہوا نظر آیا۔ ریچھ خود اپنے وجود کو نہیں سنبھال پا رہا تھا لیکن فیض شاہ آرام سے اس کے دونوں ہاتھوں پر کھڑا رہتا اور اس کے بعد لمبی چھلانگ لگا کر وہ بکرے کے اوپر جا چڑھتا۔ یہ ایک ایسا انوکھا کمال تھا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اور ان کے گرد زیادہ تر انسانوں کی بھیڑ رہتی۔

فیض شاہ نے اپنی اسی مہارت سے کام لیا تھا۔ یعنی وہ اپنے بدن کو بے وزن کرنے کا گُر سیکھ گیا تھا اور اس طرح وہ ہر چیز پر کھڑا ہو جاتا تھا جو کمزور سے کمزور ہوتی لیکن اس کے بعد وہ اپنے جسم کو زمین پر لے جاتا۔ یہ انوکھے کمالات تھے۔ اس کے علاوہ فیض شاہ اور بھی بہت سے کام کرتا تھا۔ وہ اندھے کنوؤں سے کبوتر پکڑ لاتا، درخت پر بندروں کی طرح چھلانگیں لگاتا پھرتا لیکن من موجی آدمی تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی کی بھی نہیں سنتا تھا اور نکل جاتا تھا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ لیکن اس بار وہ خاصے دن کے لئے چلا گیا تھا اور حیران کن بات

یہ تھی کہ رحیم شاہ کنٹری سے باہر نہیں نکلا تھا۔ نجانے کیوں وہ نظر بند ہو گیا تھا۔

پھر پتہ چلا کہ رحیم شاہ بابا رحمت خان کی بیٹی سانولی سے شادی کر رہا ہے۔ بس اسے فیض شاہ کا انتظار تھا۔ فیض شاہ آیا تو رحیم شاہ نے کہا۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" فیض شاہ کے منہ سے وہ چیز نکل گئی جو اس وقت اس کے منہ میں تھی۔ رحیم شاہ کے کپڑے خراب ہو گئے۔ اس نے اپنے کپڑے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تیرا انتظار تھا۔ بابا رحمت خان سے میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس وقت شادی کروں گا جب فیض شاہ آجائے گا۔ اب تو آ گیا ہے تو میں ان سے بات کئے لیتا ہوں۔"

"ارے مگر تجھے سوجھی کیا ہے؟"

"ابے کیا کتے بلیوں کے ساتھ ہی ساری عمر گزار دوں گا؟"

"کتا تو خیر تیرے پاس ہے۔ بلی تو نے کسے کہا؟" فیض شاہ مسخرے پن سے بولا۔

بہر حال رحیم شاہ نے سانولی سے شادی کر لی۔ فیض شاہ کا تو کام ہی محبت تھا۔ بھابی کو جان کی طرح عزیز رکھنے لگا۔ سانولی بھی اسے اپنے سگے بھائیوں کی مانند چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ سانولی ایک بیٹے کی ماں بن گئی اور سب سے زیادہ خوشی فیض شاہ نے منائی۔ طارق شاہ نام رکھا گیا بچے کا۔ اولاد تو وہ بے شک رحیم شاہ کی تھی لیکن فیض شاہ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ پھر بھلا طارق شاہ کو فیض شاہ سے کون چھین سکتا تھا۔

بہر حال یوں وقت گزرتا رہا اور پھر اچانک ہی رحیم شاہ نے اعلان کیا کہ وہ ایک سرکس بنا رہا ہے۔ رحیم شاہ کی اس بات پر فیض شاہ خوب ہنسا تھا۔

"پتہ ہے بیٹا! کتنے پیسے چاہئے ہوتے ہیں اس کے لئے۔ ڈیرے، تمبو، جھولے اور نجانے کیا کیا۔ پیارے بھائی! میلے ٹھیلوں میں جو کھیل تماشے دکھالیا کرتے ہیں، بس وہی کافی ہوتے ہیں۔ ہماری اپنی شناخت بھی رہتی ہے۔"

"نہیں یار! سرکس بنانا ہے مجھے۔ میرے دل کو لگی ہوئی ہے۔"

"میں جانتا ہوں، ایک دن میں نے تم سے کہا تھا کہ کیا یار! ہم میلے ٹھیلوں میں کھیل تماشے دکھاتے رہتے ہیں۔ تمبو، ڈیرے ہوں تو کھیل کا مزہ بھی آئے۔"

"ہاں تو ٹھیک کہتا ہے فیض شاہ! یہ بات میرے دل کو لگ گئی تھی اور مجھے یہ کام کرنا

ہے۔"

"مگر اتنے پیسے کہاں سے لائے گا؟" اور یہ بات حقیقتاً رحیم شاہ نے فیض شاہ کو بھی نہیں بتائی تھی کہ اس کے پاس اتنے سارے پیسے کہاں سے آ گئے۔ کمال کر رہا تھا وہ۔ بڑے بڑے تمبو، ڈیرے، بانس، جھولے اتنی بڑی رقم کا کام تھا کہ کم از کم فیض شاہ کی سمجھ میں تو نہیں آتا تھا کہ یہ کام اس نے کہاں سے کیا۔ لیکن کام ہو گیا تھا اور اس کے بعد ان کا سرکس خوب چلنے لگا۔ لوگ اس سرکس میں آ آ کر جمع ہوتے رہے۔ سب کی تقدیر سے سرکس چل رہا تھا۔ جانور بھی خریدے گئے اور سچی بات یہ ہے کہ سرکس کا روح رواں فیض شاہ ہی تھا جو اپنے حیرت انگیز کمالات سے لوگوں کو دم بخود کر دیا کرتا تھا۔

سرکس بڑھتا چلا گیا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ رحیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔ سانولی بھی اس کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی۔ فیض شاہ رہ گیا جس نے اس سرکس کو بھی سنبھال رکھا تھا اور طارق شاہ کو بھی۔ جو اب جوان ہو گیا تھا اور اپنے آپ کو سرکس کا مالک کہلا کر خوش ہوا کرتا تھا۔

فیض شاہ اب صرف نگران کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ سرکس اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ جہاں جاتا دھوم مچ جاتی۔ لوگ سارے کے سارے کام چھوڑ کر سرکس دیکھنے آجاتے اور پھر اس دوران سرکس میں کچھ اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور وہاں شبیلہ آگئی۔ شبیلہ پیکر حسن و جمال تھی۔ ایک غریب آدمی کی بیٹی تھی اور سرکس کے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ملازم رکھ لی گئی تھی۔ ملازمت کا یہ اختیار سرکس کے منیجر کو تھا۔

لیکن جب طارق شاہ نے پہلی بار اس خوبصورت لڑکی کو اپنے سرکس میں دیکھا تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ شبیلہ پرواز کرتی ہوئی اس کی آنکھوں کے راستے دل تک پہنچ گئی تھی۔ طارق شاہ اس کے خواب دیکھنے لگا۔ لیکن فطرتاً شرمیلا آدمی تھا۔ بہت عرصہ گزر گیا۔ شبیلہ سے وہ اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکا لیکن اس کا ہر انداز پکار پکار کر کہتا تھا کہ وہ شبیلہ کو حد سے زیادہ چاہنے لگا ہے۔ البتہ اس دن اس کے دل پر بجلی گر پڑی جب اس نے شبیلہ کو گل باز کے ساتھ محبت کی باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔

طارق شاہ کے دل میں آگ لگ گئی تھی اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ گل باز خان ایک نوجوان اور خوبصورت فنکار تھا جو سرکس میں نوے فٹ کی بلندی پر جھولے پر کرتب دکھایا

کرتا تھا۔ شبیلہ بے شک کوئی کرتب نہیں جانتی تھی لیکن گل باز خان اس سے بہت زیادہ متاثر تھا اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ طارق شاہ بے چین ہو گیا۔ یہ تو غلط ہو گیا۔ گل باز خان تو ایک معمولی سا ملازم ہے۔ جبکہ طارق شاہ خود سرکس کا مالک ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ تب اس نے فیض شاہ کا سہارا لینا مناسب سمجھا۔ فیض شاہ خود ذہانت بھری نگاہوں سے طارق شاہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب طارق شاہ اس کے پاس پہنچا تو فیض شاہ نے کہا۔

”ویسے تو خیر بیٹے! تم اکثر میرے پاس آتے رہتے ہو۔ لیکن آج میں سمجھتا ہوں کہ تم جس مقصد کے لئے آئے ہو تمہیں بہت پہلے میرے پاس آجانا چاہئے تھا۔“

”چچا جان! اگر آپ میری مجبوری کو سمجھ گئے ہیں تو آپ کے پاس میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے اس کا حل بتا دیجئے۔“

”حل...... بیٹے! ایک بہترین حل ہے اگر تم قبول کرو تو۔“

”جی بتائیے......؟“

”تم اس سرکس کے مالک ہو نا؟“

”جی۔“

”تو فراخ دل مالک کی حیثیت سے اپنے دونوں ملازموں کو ایک کر دو۔“

”جی......؟“

”ہاں...... اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کی شادی کر دو۔ کیونکہ اگر تم نے اتنی گہری نگاہوں سے ان کی محبت کو نہیں دیکھا ہے تو میں تمہیں بتا دوں کہ وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ اپنے آپ کو کوئی سخت کہانی بتانے کی بجائے فراخ دلی سے ان کی اس چاہت کو پورا کر دو۔“

طارق شاہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا۔ آج پہلی بار اسے فیض شاہ پر غصہ آیا تھا۔ چچا وہ اس کا تھا اور بات کر رہا تھا گل باز کی۔ فیض شاہ اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

”بری لگی ہے میری بات؟ لیکن بیٹا! یہ سب کچھ تمہیں کرنا ہو گا۔“

”آپ کمال کرتے ہیں۔ میں آپ کے پاس گیا تھا اپنے دل کا سہارا حاصل کرنے کے لئے اور آپ نے چھرا گھونپ دیا میرے سینے میں۔“

”نہیں بیٹا! تجربے کی آنکھ سے دیکھا اور تمہیں ہوشیار کر دیا۔ میری مانو مت پڑو اس چکر میں۔ جو میں نے کہا ہے وہی کرو۔“

لیکن طارق شاہ نے فیصلہ کیا کہ دنیا کا ہر کام خود ہی کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی مجھے ہی کرنا ہو گا۔ وہ شبیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ شبیلہ نے پُر احترام انداز میں اس کا استقبال کیا۔

”شبیلہ! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی مالک! حکم کیجئے۔“

”مالک نہیں، اس وقت تم مجھے بھکاری سمجھو۔“

”میں سمجھی نہیں مالک!“

”شبیلہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ تم گل باز خان سے متاثر ہو اور اس کی طرف راغب ہو۔ یہ بات تو تم جانتی ہو شبیلہ! کہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد تم اس سرکس کی مالک ہو گی۔ یہ سرکس تمہارے نام سے چلا کرے گا۔ ”شبیلہ سرکس“ لیکن اس کے لئے تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہو گی۔“

شبیلہ نے نہایت صاف ستھرے لہجے میں کہا۔

”مالک! میں نہیں جانتی کہ اگر گلباز سے پہلے آپ مجھ سے یہ الفاظ کہتے تو میں آپ کو کیا جواب دیتی۔ مالک! سرکس آپ ہی کے نام سے چلے گا۔ آپ ہمارے ان داتا ہیں۔ مالک ہیں ہماری سرکس کے۔ آپ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے مالک! سوائے اس کے کہ میں آپ کا یہ حکم مان لوں۔ یہ ممکن نہیں ہے مالک! یہ تو کسی طور ممکن نہیں ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی میں گلباز کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ میں اسی سے شادی کروں گی۔ معافی چاہتی ہوں، آپ میری بات کا برا نہ مانئے۔ بہت اچھے، بہت مہربان مالک ہیں آپ ہمارے۔ برا نہ مانئے میری بات کا۔ آپ کا احسان ہو گا مجھ پر۔“

طارق شاہ اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔ اور اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ لیکن وہ اس قدر فراخدل نہیں تھا کہ فیض شاہ کی بات پر عمل کرتا اور خود ان دونوں کو یکجا کر دیتا۔ بس دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ پھر ایک دن سرکس والوں نے خوب خوشیاں منائیں کیونکہ گلباز نے شبیلہ کے ساتھ شادی کر لی تھی۔

سادگی سے نکاح ہوا تھا اور دلہن رخصت ہو کر ایک خیمے سے دوسرے خیمے میں پہنچ گئی

تھی۔ طارق شاہ اس دن کسی کام سے کہیں چلا گیا تھا۔ پہلے سے اس کے جانے کا علم کسی کو نہیں تھا۔ بہرحال واپس آیا تو اس نے بھی بے دلی سے گلباز کو مبارکباد دی اور کہا۔

''ہم نہیں تھے گلباز! تم نے ہمارے پیچھے ہی شادی کر لی۔''

''یقین کریں مالک! مجھے تو اس وقت پتہ چلا جب قاضی صاحب نکاح پڑھا رہے تھے۔ اور میں نے کہا تھا کہ مالک نہیں آئے ابھی تک۔ مالک کہاں ہیں۔''

''تم نے تو ہمیں بتایا بھی نہیں تھا گلباز! کہ تم شادی کر رہے ہو۔''

''مالک! بس ہو گیا تھا یہ سب کچھ۔''

''چلو...... کوئی بات نہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو اور یہ تحفہ بھی۔'' طارق شاہ نے سونے کا ایک خوبصورت زیور شبیلہ کے تحفے کے طور پر دیا۔ اس کے بعد یوں لگا جیسے طارق شاہ نے اپنے ذہن سے شبیلہ کو نکال دیا ہو۔ گلباز بھی اپنا کام کرتا رہا اور وقت اسی طرح برق رفتاری سے سفر کرنے لگا جس طرح اپنا سفر کرتا ہے۔ گلباز بھی ایک بیٹے کا باپ بن گیا اور اس نے اپنے بیٹے کا نام شہباز رکھا۔

شہباز دونوں کی محبت کا پھل تھا لیکن قدرت کا ایک اعلیٰ شاہکار بھی۔ نہایت خوبصورت، بہت ہی دلکش اور اتنا پیارا کہ دیکھنے والے کو بے اختیار اس پر پیار آئے۔ سرکس اب بہت بڑی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ طارق شاہ کی کنپٹیاں سفید ہو گئی تھیں۔ اس نے شادی نہیں کی تھی جبکہ بہت سی بار فیض شاہ نے بھی اس سے کہا تھا۔

''طارق شاہ! تم شادی نہیں کرو گے؟''

''شادی بھی کوئی کرنے کی چیز ہے چچا جان؟''

''بیٹا! زندگی کے مرحلے ہوتے ہیں یہ۔ اور انسانوں کو ان میں الجھنا پڑتا ہے۔''

''تب پھر میری ایک شرط ہے چچا جان!'' طارق شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''پہلے آپ شادی کریں گے۔ زندگی کے اس مرحلے کو آپ نے کیوں نہیں قبول کیا، یہ بتائیے۔'' اور فیض شاہ لاجواب ہو گیا۔ بس ایک آدھ بار اس نے کہا تھا۔

''تجھے کیا معلوم کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔''

بہرحال طارق شاہ کے اندر کی کیفیت کسی کو نہیں معلوم تھی۔ کبھی کبھی اس کے چہرے

سے ایک عجیب سا احساس جھلکنے لگتا تھا۔ جب کہیں تنہائیوں میں کھڑا وہ دور سے شبیلہ کو دیکھ رہا ہوتا۔ ایک بچے کی ماں بن گئی تھی لیکن حسن و شباب کا وہ عالم تھا کہ دیکھنے والی آنکھ دیکھتی رہ جائے۔ حالانکہ اب اس پر بھی عمر کی بہت سی منزلیں گزر چکی تھیں۔ بچہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ گلباز نے ایک کام ذرا مختلف انداز کا کیا۔ وہ یہ کہ اسے شہر بھجوا دیا۔ تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکے۔ سرکس ملک ہی میں کام کرتا تھا۔ ملک کے کسی بھی شہر میں وہ ہوتا، شہباز خان سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ شہباز ہوسٹل میں رہتا تھا اور اپنی تعلیم حاصل کرتا تھا۔

بہرحال شہباز تعلیم کی منزلیں طے کرتا رہا۔ گلباز سرکس میں اپنے کمالات دکھاتا رہا۔ وہ سب سے بڑا جھولے پر کام کرنے والا تھا۔ شہباز نے میٹرک کیا۔ اس کے بعد فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر پاس کر لیا۔ اب اسے بی۔ اے میں داخلہ مل گیا تھا۔ اکثر فیض شاہ اس سے کہتا تھا۔

''یار گلباز! ایک بات بتا۔ بیٹے کو پڑھا لکھا کر کیا بنانا چاہتا ہے؟''

''کچھ بھی بن جائے گا شاہ جی! کم از کم سرکس میں کام نہیں کرے گا۔''

''نہ گل باز! نہ...... جو چیز تیرے خون کا حصہ ہے اور جس روزی سے وہ پلا بڑھا ہے اس سے اسے اتنا دور نہیں رکھنا چاہئے۔ اچھی بات نہیں ہوتی یہ۔ اپنے پیشے سے، اپنے فن سے محبت کرنی چاہئے۔''

جواب میں گلباز ہنس پڑتا۔

''تو اپنے فن، اپنے پیشے سے انکار کون کر رہا ہے؟ مگر یہ اولاد جو ہوتی ہے نا بڑی بری چیز ہوتی ہے بھائی! خود چاہے کچھ بھی کر لیا جائے مگر اولاد کو کسی خطرے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اتنے اونچے جھولے پر میں تو اسے لٹکے دیکھ کر ہی مر جاؤں۔ دل کی حرکت بند ہو جائے میری۔''

''ہاں۔ ہمیں تو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ مولا نے کرم ہی کیا ہمارے اوپر۔'' فیض شاہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتا۔

غرض یہ کہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ سرکس کسی بھی شہر میں ہوتا، شہباز سے گلباز اور شبیلہ کا رابطہ رہتا۔ اور جب بھی شہباز کی چھٹیاں ہوتیں وہ فاصلے طے کر کے ماں باپ کے پاس سرکس پہنچ جاتا۔ یہی ان کی دنیا تھی۔ مگر شہباز کے لئے بھی دلکش۔ اسے سرکس بہت پسند

تھا۔ بھانت بھانت کے جانور، بھانت بھانت کے انسان۔ چھوٹے قد والے جو اچھل کود کر کے لوگوں کا دل بہلاتے تھے۔ اپنی مشکلات اور اپنے مسائل کے لئے سنجیدہ، دوسروں کے لئے دیوارِ قہقہہ۔ خیر یہ تضاد تو زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ ایک سرکس ہی پر کیا منحصر۔

بہر حال یہ تھے نسلوں کے مسائل۔ بات شروع ہوئی تھی رحیم شاہ اور فیض شاہ کی دوستی سے۔ دونوں سیلاب کے ایک ریلے میں اپنے سرپرستوں سے محروم ہو گئے تھے اور پھر زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ان کی دوستیاں آگے بڑھیں۔ جوان ہوئے، عمر کا ڈھلان شروع ہوا۔ رحیم شاہ نے شادی کی۔ بیٹے کا باپ بنا۔ طارق شاہ کے لئے اس نے ایک عظیم الشان سرکس ترتیب دیا اور آخر کار زندگی سے دور چلا گیا۔ فیض شاہ تنہا رہ گیا لیکن اب اس پر طارق شاہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عائد ہو گئی۔

طارق شاہ خود کفیل تھا۔ خود پرست تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے فیض شاہ کو باپ جیسا ہی مقام دیا تھا لیکن ضدی فطرت کا مالک تھا اور فیض شاہ جانتا تھا کہ ہمیشہ ہی سے رحیم شاہ کا یہ بیٹا سرکش ہے۔ اور صرف اپنی من مانی کرتا ہے۔ طارق شاہ اپنے سرکس میں کام کرنے والی لڑکی شبیلہ سے متاثر ہوا۔ لیکن شبیلہ نے سرکس کے ایک فنکار کو اس پر ترجیح دی اور کہانی کے مختلف حصے، مختلف روپ دھارتے چلے گئے۔

اب کہانی طارق شاہ، گلباز خان اور گلباز کے بیٹے شہباز پر مرکوز تھی۔

☆......☆

ڈاکٹر طاہر فریدوں جرمنی سے پلاسٹک سرجری کا سب سے بڑا اعزاز لے کر آیا تھا اور ملک کے ان واحد پلاسٹک سرجری کے ماہرین میں شمار ہوتا تھا جو اپنے فن میں یکتا ہوتے ہیں۔ بڑا جدید اور انوکھا کام تھا۔ لیکن بہر حال ہر طرح کے شوقین اپنے ملک میں بھی موجود ہیں۔ ہر طرح کے کام ہوا کرتے تھے۔ اس کی مہارت دیکھ کر سرکاری طور پر بڑے بڑے ہسپتالوں نے اسے اپنے ہاں ملازمت کی پیشکش کی تھی۔ لیکن ڈاکٹر فریدوں مالی طور پر بہت مضبوط تھا۔ اس کو ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں اس نے اپنی طرف سے یہ پیشکش ضرور کر دی تھی کہ کسی بھی ہسپتال کو کسی حادثے کے مریض کے لئے اگر پلاسٹک سرجری کی ضرورت پیش آئے تو ڈاکٹر فریدوں اس سے کبھی گریز نہیں کرے گا اور ایسا ہی

ہوتا تھا۔ اعلیٰ درجے کے ہسپتالوں میں بعض اوقات ایسے حادثات کے کیس آجاتے تھے کہ بگڑے ہوئے چہروں کو سنوارنا پڑ جاتا تھا۔ اور اس وقت ڈاکٹر فریدوں اپنی خدمات پیش کر دیتا تھا۔ کسی معاوضے یا لالچ کے بغیر۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے بہترین معاوضے ادا کئے جاتے تھے۔ ایک بیٹا تھا احتشام فریدوں۔ اسے شام کہا جاتا تھا۔ لیکن بعض اوقات نام بھی شخصیت سے چپک جاتے ہیں اور وہ ہو جاتا ہے جو سوچا بھی نہیں جاتا۔ احتشام فریدوں بہت سرکش تھا اور اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ باپ کے پاس بے پناہ دولت تھی۔

جب بیٹے نے پہلی بار اپنے لئے کنوینس کی فرمائش کی تو باپ نے ایک اعلیٰ درجے کی کار خرید کر اسے دے دی۔

''کار نہیں، مجھے بائیک چاہئے۔''

''بیٹا! دو پہیوں کی یہ سواری بہتر نہیں ہوتی۔''

''کمال کرتے ہیں آپ۔ اور وہ جنہوں نے پوری زندگی ان دو پہیوں پر گزار دی ہوتی ہے ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''بیٹا! ویسے تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن بس نجانے کیوں میرا دل ڈرتا ہے۔''

''آپ کا دل ڈرتا ہے ڈیڈی! میرا تو نہیں ڈرتا۔''

''تمہارا باپ ہوں بیٹے!''

''اسی لئے میں آپ سے ضد بھی کر رہا ہوں۔ مجھے بائیک چاہئے۔'' طاہر فریدوں جانتا تھا کہ اگر اس نے سختی سے انکار کر دیا تو اس کے بعد حالات کیا ہوں گے۔ اکلوتا بیٹا شروع ہی سے بگڑا ہوا تھا۔ اس وقت کوئی سولہ سترہ سال کی عمر تھی۔ لیکن جنون کا وہی عالم تھا۔ طاہر فریدوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! مگر وعدہ کرو کہ احتیاط سے چلاؤ گے۔''

''آپ خود دیکھ لیجئے گا۔ میں پوری پوری احتیاط برتوں گا۔'' احتشام فریدوں نے کہا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر چھپی مسکراہٹ کو باپ نہیں دیکھ سکا تھا۔

''مگر بائیک چلانا کس سے سیکھو گے؟''

''وہ میری ذمے داری پر ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

بے چارے طاہر فریدوں کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ بیٹا دوستوں کی موٹر سائیکلوں پر ہواؤں میں اُڑتا پھرتا ہے۔ موٹر سائیکلنگ کے تین مقابلے جیت چکا ہے۔ دونوں پہیوں پر موٹر سائیکل چلانے کو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی جب باپ نے کہا تھا کہ بیٹا دو پہیوں کی سواری ہے۔ ٹھیک نہیں ہوتی۔ اس نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے کہا تھا کہ ڈیڈی صاحب! میں تو اسے دو پہیوں کی سواری گردانتا ہی نہیں ہوں۔ موٹر سائیکل اگر ایک ویل پر نہ چلے تو لعنت ہے اس پر اور لعنت ہے ان لوگوں پر جنہوں نے ابھی تک ایک وہیل کی موٹر سائیکل نہیں بنائی۔ بھلا دو پہیوں پر موٹر سائیکل چلانا بھی کوئی موٹر سائیکل چلانے کے مترادف ہے؟

موٹر بائیک خرید کر دے دی گئی۔ نئی موٹر بائیک جس کا سائلنسر نکلوا دیا گیا تھا اور وہ جدھر سے بھی گزر جاتی تھی لوگ دل اور کانوں پر ہاتھ رکھے رہ جاتے تھے۔ دل پر ہاتھ اس لئے رکھتے تھے کہ ایک وہیل پر موٹر سائیکل تیز رفتار دوڑتی نظر آتی اس سے اس پر بیٹھے ہوئے خوبصورت اور دلکش جوان کی زندگی کو کتنا خطرہ ہوتا تھا۔ اور کانوں پر ہاتھ اس لئے رکھتے تھے کہ سائلنسر نکلنے کی وجہ سے موٹر سائیکل کی آواز بے پناہ ہو جاتی تھی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا طاہر فریدوں کو خدشہ تھا۔

جنرل ہسپتال سے اسے ٹیلی فون موصول ہوا تھا کہ فوراً ہسپتال پہنچ جائے۔ اس کے بیٹے کا حادثہ ہو گیا ہے۔ طاہر فریدوں ہسپتال پہنچا تو ڈاکٹر نے انتہائی غمناک انداز میں اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

''آہ، کاش! ہم آپ کے لئے کچھ کر سکتے ڈاکٹر فریدوں!'' یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند طاہر فریدوں کے کانوں میں اترے تھے اور وہ ڈاکٹر کی صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔

''ایک وہیل پر موٹر سائیکل چلاتے ہوئے احتشام فریدوں کا حادثہ ہو گیا۔ اور وہ......''

اس کے بعد تقریباً سولہ گھنٹے تک ڈاکٹر طاہر فریدوں کو اسی ہسپتال کے ایک بیڈ پر رہنا پڑا تھا۔ اس دوران گھر پر یہ اطلاع دے دی گئی تھی۔ لیکن وہاں اس سے زیادہ بدترین حالات ہو گئے تھے۔ راحیلہ فریدوں بیٹے کی خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اسے فوراً ہی دوسرے ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ ایک ہنستا بستا گھر ایسے اچانک حادثے کا شکار ہوا تھا کہ دنیا غم کرتی تھی۔ جوان بیٹے کی تدفین بھی دوسرے ہی لوگوں نے کی۔ ڈاکٹر طاہر فریدوں تو

اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہیں تھا۔ بیوی الگ ہسپتال میں تھی۔ اور جب دنیا لٹ چکی، کھیل ختم ہو گیا تو ڈاکٹر طاہر فریدوں نے بیوی کی آواز سنی۔

''احتشام، اٹھ جاؤ بیٹے! چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ کتنی بری بات ہے کہ گندے منہ سے چائے پیتے ہو۔ سارے جراثیم معدے میں اتر جاتے ہوں گے۔'' یہ روزانہ کا مخصوص جملہ تھا۔ اور اس کے بعد ہر ممکن کوشش کر لی گئی لیکن راحیلہ فریدوں ہوش و حواس میں نہیں آ سکی۔ بے شمار علاج کئے گئے لیکن راحیلہ اپنے بیٹے کو مُردہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھی۔ ایک بہت بڑی سی تصویر بنائی گئی تھی اور اسے راحیلہ کی خوابگاہ میں سجا دیا گیا تھا۔

راحیلہ اسی سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ جب بھی فرصت ہوتی تھی وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی مصروفیات کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔

''بائیک مل گئی ہے نا تمہیں۔ اب تو خوش ہو۔ ویسے بہت ضدی ہو تم۔ دیکھو، سنبھل کر بائیک چلایا کرو۔ اچھا یہ بتاؤ دوپہر کو لنچ میں کیا کھاؤ گے؟'' اس نے اپنی دنیا الگ ہی بنا رکھی تھی۔

ڈاکٹر طاہر فریدوں کے لئے یہ سارا ماحول اب ایک مستقل غم بن گیا تھا۔ بیوی کی کیفیت نے اسے گھریلو زندگی سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اپنا کام بے شک کرتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کا فن تھا۔ ضرورت مند آتے تھے تو انہیں منع کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن کام نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا اس نے۔

بہرحال یوں زندگی گزر رہی تھی کہ ایک دن اسے ایک اور حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ حادثہ اس کی شہباز سے ملاقات تھی۔ شہر کے ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں وہ خریداری کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ دوسری جانب اٹھ گئی۔ ایک نوعمر لڑکا کچھ خریداری کر رہا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ڈاکٹر طاہر فریدوں پتھرا گیا۔ یہ احتشام فریدوں تھا۔ اس کا اپنا بیٹا۔ ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔ وہی رنگ و روپ، وہی آنکھوں کی نیلاہٹ، وہی بالوں کی سیاہی، وہی پیشانی کی چمک، وہی ہونٹوں سے چپکی مسکراہٹ، وہی سرکش جیسے بدن میں بجلیاں تڑپ رہی ہوں۔ قد و قامت، رنگ و روپ۔ ڈاکٹر فریدوں کا بدن لرزنے لگا۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔ دماغ میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے نوجوان لڑکے کے قریب پہنچا۔

''ہیلو!''

لڑکے نے شانِ بے نیازی سے اسے دیکھا۔ ڈاکٹر فریدوں کی اپنی شخصیت بھی بے حد خوشگوار تھی۔ لڑکے کی آنکھوں میں نرمی کے تاثرات نظر آئے۔ پھر اس نے کہا۔

''ہیلو سر!''

''بیٹے! آپ اکیلے ہیں یا آپ کے ساتھ کوئی ہے؟''

''دنیا میں......؟'' بہت تیکھا سوال کیا گیا۔

''نن نہیں۔ میرا مطلب ہے یہاں ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں۔''

''اکیلا ہوں۔ فرمایئے۔''

''کچھ لمحے دے سکو گے مجھے؟''

''لمحے......؟''

''میرا مطلب ہے کچھ وقت۔ اوپر ریستوران ہے۔ اگر میرے ساتھ بیٹھ کر کافی یا چائے پی لو۔''

''کوئی خاص کام ہے آپ کو مجھ سے؟''

''ہاں بیٹے! دیکھو، دور ذرا عجیب ہے۔ طرح طرح کے لوگ مختلف طریقوں سے بچوں اور دوسروں سے ملتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ صحیح ہی نہیں ہوتے۔ مختلف طریقوں سے دھوکا دہی کر کے اپنی مطلب براری کر لیتے ہیں۔ بیٹا! آپ یقین کر لیجئے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ سے صرف چند لمحے چاہتا ہوں۔''

نوجوان ہنس پڑا، پھر بولا۔

''کاش! ایسی بات ہوتی تو میں اپنی زندگی کے ایک دلچسپ تجربے سے دوچار ہوتا۔ چلئے آیئے......آپ کافی پلا رہے ہیں تو میں آپ کا پیشگی شکریہ ادا کئے دیتا ہوں۔ ویسے بھی کافی مجھے بے حد پسند ہے۔''

''آیئے بیٹے! آیئے......'' ڈاکٹر فریدوں لڑکے کی تیزی طراری سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے اوپری حصے پر ریستوران بنا ہوا تھا۔ وہ ریستوران میں جا بیٹھے۔

ڈاکٹر فریدوں قربان ہو جانے والی نگاہوں سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے لڑکے کی پسند سے کافی منگوائی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے کچھ لوازمات بھی۔ وہ پلکیں جھپکائے

بغیر لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''میرا نام طاہر فریدوں ہے۔ آپ اپنا نام بتائیں گے مجھے؟''

''شہباز۔ آگے پیچھے کچھ نہیں۔ کیونکہ میرے باپ کا نام گلباز ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ شہباز گلباز تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس لئے مجھے شہباز ہی رہنے دیجئے۔''

''بیٹا! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔''

''بڑی اچھی بات ہے۔ ویسے میں اس خوشی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔''

''کافی پیو......میں تمہیں وجہ بھی سمجھاؤں گا۔''

''ٹھیک......'' لڑکے کے لہجے میں ایک عجیب سی شوخی تھی۔ ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔

''بیٹا! کہاں رہتے ہو؟''

''ہوسٹل میں۔''

''پڑھتے ہو؟''

''جی، تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا ہے۔''

''کسی دوسرے شہر......میرا مطلب ہے والدین کسی دوسرے شہر میں ہیں؟''

''ہاں......تیسرے، چوتھے اور پانچویں شہر میں بھی ہیں۔'' لڑکے نے سامنے رکھے ہوئے سینڈوچ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''سمجھا نہیں۔''

''خانہ بدوش ہیں ہم لوگ۔''

''کیا مطلب؟''

''خانہ بدوش......یعنی وہ جو اپنے کندھے پر اپنا گھر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ خانہ کا معنی گھر اور بدوش کا معنی کندھے پر۔ یعنی گھر کندھے پر۔''

''اب بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔''

''آپ نے کبھی خانہ بدوش نہیں دیکھے؟''

''دیکھے ہیں۔ لیکن ان کے حلیے اور ان کے رنگ وروپ تمہارے جیسے نہیں ہوتے۔''

''تھوڑا سا فرق ہے۔ اصل میں محترم! کیا نام بتایا آپ نے؟''

''طاہر فریدوں۔''

’’جی بزرگ محترم! انسانی زندگی پر اس کے ماحول کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔غریبوں کے بچے عام طور سے...... عام طور سے میں کہہ رہا ہوں خاص طور سے نہیں۔عام طور سے کالے پیلے رنگوں کے ہوتے ہیں۔بنیادی وجہ ان کی غربت ہے۔ جبکہ امیروں کے بچے خود بخود خوبصورت ہو جاتے ہیں۔اب یہ اللہ جانتا ہے کہ ان باقی چیزوں میں کیا مصلحت ہے۔‘‘

’’ویری گڈ...... تمہاری سوچ تمہاری عمر سے بہت آگے ہے۔‘‘

’’اب میں کیا کہوں آپ سے، اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہو جائے گی۔لوگوں کا یہی خیال ہے کہ میں کچھ دیر سے پیدا ہوا ہوں جبکہ میری عمر مجھ سے آگے چل پڑی تھی۔‘‘

طاہر فریدوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔اس نے کہا۔

’’ایسا ہی مجھے بھی لگتا ہے۔لیکن یقین کرو، خانہ بدوش والی بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’حضورِ من! میرے والد صاحب قبلہ ایک سرکس میں جمناسٹر ہیں۔شہر شہر یہ سرکس گھومتا ہے اور وہاں اپنے کھیل تماشے اور کرتب دکھاتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ مجھے سرکس میں کام نہیں کرنے دیں گے۔اپنے فن کے استاد ہیں وہ لیکن میرے لئے انہوں نے زندگی کے کسی اور شعبے کا انتخاب کیا ہوا ہے۔بہرحال ماں باپ کی خواہش ہے۔میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔اور ایک بات وہ نہیں جانتے کہ میں انہیں سرپرائز دوں گا۔مجھے خود بھی جسمانی کرتبوں سے دلچسپی ہے۔‘‘

ڈاکٹر طاہر فریدوں خوش دلی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔کتنے روشن وجود کا مالک ہے۔کس قدر دلکش اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا بیٹا ان کے پاس ہے۔ڈاکٹر فریدوں کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے نمی اتر آئی۔لڑکا سنجیدہ ہو گیا۔

’’ڈاکٹر صاحب! براہِ کرم اب آپ میرا ذہن بھی صاف کر دیجئے۔دیکھئے، وقت بڑا عجیب ہے۔لوگ واقعی طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔میں معافی چاہتا ہوں، ابتداء میں، میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ پتہ نہیں آپ کس قماش کے آدمی ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔لیکن تھوڑی سی آبزرویشن میری بھی ہے۔اس دنیا میں رہ کر ڈاکٹر صاحب! انسان اگر احمقوں کی طرح زندگی گزارے تو زندگی آسانی سے نہیں گزرتی۔دنیا سے واقفیت بڑی ضروری

ہوتی ہے۔میں بھی ایسی ہی کوششوں میں مصروف ہوں کہ دنیا کو وقت سے پہلے سمجھ لوں۔ کیا کہتے ہیں اس بارے میں۔انسان کو یہ سب کچھ کرنا چاہئے یا نہیں؟‘‘

’’بالکل کرنا چاہئے بیٹا! کامیاب لوگ وہی ہوتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، میں ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔تب آپ یہ خود بتائیے کہ کیا میرے ذہن میں تجسس نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ آپ نے مجھ پر اتنی عنایت کیوں کی ہے۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ، عمل کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟‘‘

’’بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ہر عمل کا ایک پس منظر ہوتا ہے بیٹے! اور میں بھی تم سے بے مقصد نہیں ملا ہوں۔‘‘

’’کوئی کام ہے مجھ سے؟‘‘

’’ہاں، ایک ایسا کام جو زندگی کی ایک حسرت بن کر رہ گیا۔‘‘

’’واہ، بتائیے ذرا۔مجھے بھی خوشی ہو کہ میں بھی کام کا آدمی ہوں۔‘‘

’’بیٹا! ایک منٹ رک جائیے۔‘‘ ڈاکٹر فریدوں نے کہا اور پھر جیب سے اپنا پرس نکالا۔ اس پرس میں احتشام فریدوں کی ایک خوبصورت سی تصویر لگی ہوئی تھی۔یہ تصویر ڈاکٹر فریدوں نے شہباز کے سامنے پیش کر دی۔اور شہباز حیرت اور دلچسپی سے تصویر دیکھنے لگا۔

’’میری تصویر آپ کے پاس...... لگتا ہے کسی پراسرار کہانی کا آغاز ہو رہا ہے۔‘‘

’’پراسرار نہیں بیٹے! ایک غمناک کہانی کہو۔یہ میرا بیٹا احتشام فریدوں ہے۔‘‘

’’ارے کیا واقعی؟ دکھائیے ذرا۔‘‘ شہباز نے اس بار پرس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔

’’ہو بہو میری تصویر ہے۔لیکن یہ لباس میرا نہیں ہے جو آپ کے یہ صاحبزادے پہنے ہوئے ہیں۔میں ان سے ضرور ملنا چاہوں گا۔واقعی اپنے ہم شکل کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔‘‘

’’مجھے بھی ہو رہی ہے۔‘‘ ڈاکٹر فریدوں نے گردن جھکا لی۔دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے جو سامنے بیٹھے ہوئے شہباز نے دیکھے اور اچانک اس کی آواز ابھری۔

’’اوہو...... اوہو...... کیا...... کیا......‘‘

’’ہاں بیٹے! یہ اس دنیا میں نہیں ہے۔‘‘

"کیا ہوا؟ کیا ہو گیا تھا......؟" شہباز نے کہا۔ ڈاکٹر فریدوں کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"سرکش تھا بہت زیادہ۔ بات نہیں مانتا تھا میری۔ موٹر سائیکل ایک وہیل پر چلاتا تھا۔ بس۔"

"بہت دُکھ ہوا مجھے...... بہت دُکھ ہوا۔"

"بیٹے! میں کوئی فراڈ نہیں ہوں۔ بس تمہاری شکل میں اپنا بیٹا دیکھ کر میرا دل تمہاری طرف مائل ہو گیا تھا۔ ایک اور مشکل کا شکار ہوں۔ تم سوچو گے تو سہی کہ بڑے میاں ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ مجبوری ہے۔ سوچتے ہو تو ضرور سوچو، کسی کی ہمدردیاں خریدی نہیں جاتیں۔ یہ تو تقدیر کا مسئلہ ہوتا ہے بیٹے! میری بیوی اور اس لڑکے کی ماں اس دن سے پاگل ہو گئی ہے۔ اپنے بیٹے کی ایک تصویر کو اس نے اپنا مرکز بنا لیا ہے اور اسی سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ جس طرح اس وقت میرے دل کو قرار ملا ہے اگر تم ہم پر تھوڑی سے مہربانی کرو، اور اس سے مل لو تو ہمیں بڑی خوشی ہو گی۔"

"نہیں سر! میں ان سے ضرور ملوں گا۔ بلکہ آپ میری ذمے داری لگائیے کہ میں ان غمزدہ خاتون کو بہتر حالات میں لا سکوں۔"

"بیٹے! میں ڈاکٹر ہوں۔ ایم بی بی ایس بھی کیا ہے میں نے۔ لیکن میری اسپیشلٹی سرجری ہے۔ جس کی تربیت میں نے بون میں رہ کر ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کے ادارے سے لی ہے اور یہاں میں پلاسٹک سرجری کا کام کرتا ہوں۔ ایک بات میں جانتا ہوں کہ کسی غمزدہ شخصیت کو عارضی طور پر تو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی پیارا واپس آ گیا ہے لیکن وہ چیز بعد میں پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس کے بیٹے کی حیثیت سے اس سے ملو۔ لیکن تم اس سے ملاقات کرو۔ اسے دلی سکون حاصل ہو گا۔ تم اس سے شہباز کی حیثیت سے ہی ملو۔ تاکہ تمہارے اوپر بھی کوئی بوجھ نہ پڑے اور تم اس کے کام بھی آ سکو۔"

"آپ جب چاہیں میں آپ کے پاس حاضر ہو سکتا ہوں۔" شہباز نے ہمدردی سے کہا۔

فطرتاً وہ بہت اچھا نوجوان تھا۔ گلباز نے سرکس کی زندگی سے الگ کر کے تعلیم حاصل

کرنے کے لئے بھیجا تھا اور اس نے باپ کی خواہش کی تکمیل بڑی خوش اسلوبی سے کی تھی۔ لیکن اسے روزِ اول سے ہی اس بات سے اختلاف تھا کہ گلباز اپنے فن کو برا سمجھتا ہے۔ اس نے کئی بار گلباز سے یہ بات کہی بھی تھی۔

"بابا صاحب! آپ کی اور میری سوچ میں فرق ہے۔ ٹھیک ہے آپ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ آپ مجھے اپنی زندگی گزارنے پر مجبور کریں۔ میں مجبور نہیں ہوں۔ تعلیم تو بہت ہی اعلیٰ چیز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں میری دلی خواہش کیا ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں سرکس کا ایک اعلیٰ فنکار بنوں۔ کوئی بہترین کارنامہ سرانجام دینے پر لوگوں کی نگاہوں میں میرے لئے خراجِ تحسین ہو۔ میری شاندار کارکردگی پر چاروں طرف تالیاں بج رہی ہوں۔ بابا صاحب! جب آپ جھولے پر اپنا کھیل دکھاتے ہیں اور لوگ سانس روکے ہوئے آپ کے کارنامے دیکھتے ہیں تو میرا سینہ خوشی سے پھول جاتا ہے۔ میں بڑی مسرت سے سوچتا ہوں کہ یہ میرا باپ ہے جو اس وقت اتنے سارے افراد کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بڑا اچھا لگتا ہے مجھے بابا صاحب! اور بڑی حسرت سے میں یہ سوچتا ہوں کہ پتہ نہیں میرے باپ نے مجھے اس زندگی سے کیوں محروم رکھا ہے۔"

"بیٹا! معافی چاہتا ہوں کہ تمہاری خواہش کی تکمیل نہیں کر سکا۔ لیکن میری جان! ایک دن بابا فیض شاہ نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا کہ شاہ صاحب! میں اپنے بیٹے کو زندگی اور موت کا کھیل کھیلتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ بیٹا! اسے میری کمزوری سمجھ لو۔ محسوس مت کرنا۔"

"نہیں نہیں بابا صاحب! میرا یہ مقصد بالکل نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ ٹھیک ہے آپ نے میرے لئے یہ زندگی پسند نہیں کی۔ یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ لیکن میں سچے دل سے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ زندگی بے حد پسند ہے۔ شہر شہر کی سیاحت، ہر شہر کے لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے محبت۔ بڑا اچھا لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔"

"ہاں...... یہ تو ٹھیک ہے۔"

شہباز نے باپ کی خواہش کی تکمیل کی تھی۔ لیکن اپنے طور پر بھی وہ اپنے آپ کو بڑا فٹ رکھے ہوئے تھا۔ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ایک جم میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ بہترین ورزشی جسم کا

مالک۔ اس کے شناسا اسے قرمری کہا کرتے تھے۔ سیماب جیسی تڑپ ہی تھی اس کے اندر۔ بجلی جیسی پھرتی۔ آن کی آن میں وہ سب کچھ کر ڈالنے کا حوصلہ جس پر دوسرے گھنٹوں سوچیں اور ہمت نہ کر پائیں۔ یہ سب کچھ اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھا۔ لوگ اسے نجانے کیسے کیسے ناموں سے مخاطب کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں میں انتہائی پسندیدہ شخصیت کا مالک تھا اور اس کی ہر دل عزیزی بے مثال تھی۔ بڑا شاندار کسرتی بدن رکھتا تھا۔ جس کا عضو عضو سیماب جیسی تڑپ رکھتا تھا۔ دل میں انسانیت اور ہمدردی بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر فریدوں جیسی اچھی شخصیت کے مالک نے جب اسے اپنی مشکل بتائی تو وہ خلوصِ دل سے ان کے تعاون پر آمادہ ہو گیا۔

"آپ چاہیں تو میرا ہوسٹل دیکھ سکتے ہیں۔ جس طرح بھی آپ پسند کریں، مجھے اپنے کام کی تکمیل کے لئے بلا سکتے ہیں۔ میں حاضر ہوں۔"

"بیٹے! میں تمہارے ہوسٹل آؤں گا۔ ایسا کرتے ہیں کل گیارہ بجے میں تمہارے پاس پہنچوں گا۔ مل سکو گے یا کوئی مصروفیت ہو گی؟"

"نہیں...... میں ملوں گا آپ کو سر!"

"سر نہیں، انکل کہہ دو۔ مجھے خوشی ہو گی۔"

"تھینک یو انکل! کل گیارہ بجے میں اپنے ہوسٹل میں آپ کا انتظار کروں گا۔" شہباز نے کہا۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے ڈاکٹر فریدوں شہباز کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور بولا۔

"بعد میں مجھے بڑا افسوس ہوا، میں نے تمہیں بڑا غلط وقت دے دیا تھا۔ اس وقت تو تمہیں اپنی کلاس میں ہونا چاہئے تھا۔"

"آپ نے گیارہ بجے کا وقت دیا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ ہو سکتا ہے یہی وقت آپ کے لئے موزوں ہو۔ تھوڑا سا وقت نکال کر میں اپنے دوستوں سے اپنے مہمان سے ملاقات کا تذکرہ کر کے یہاں آ گیا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔"

"آنٹی؟"

"ویسے تو وہ ٹھیک ہیں۔ بس جو بات ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تصویر ہے اس کی، میرا مطلب ہے احتشام کی۔ جس سے باتیں کرتی رہتی ہے اور اسے اپنا مرکز نگاہ بنا رکھا ہے۔ وہ اسی میں اپنے بیٹے کو زندہ سمجھتی ہے۔ لیکن میں کوئی دھوکہ دہی نہیں چاہتا۔ اگر تمہیں فرصت ہے تو تھوڑی دیر کے بعد ہم گھر چلیں گے اور تم اپنی آنٹی سے ملو گے۔ باقی کیا کرنا ہے یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ بولو، کر سکو گے؟"

"جی...... آپ نے اپنا مقصد مجھے بتا دیا ہے۔ باقی آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"

"بیٹے! یہ ایک چھوٹا سا تحفہ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر فریدوں نے ایک اعلیٰ درجے کا موبائل فون نکال کر شہباز کو دیتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ گیارہ بجے کا وقت تم سے ملاقات کے لئے موزوں رہے گا یا نہیں۔ مگر ٹیلی فون نہیں تھا تمہارے پاس۔ میری طرف سے یہ قبول کرو۔"

"اوہ...... انکل! بہت شکریہ۔ موبائل فون اس دور کی بہت بڑی ضرورت بن چکا ہے۔ مگر یہ کہتے ہوئے میں کوئی شرمندگی نہیں محسوس کرتا کہ میرے والد ایک سیدھے سادھے آدمی ہیں۔ سرکس کے ایک فنکار۔ ہم لوگ قیمتی چیزیں افورڈ نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں نے کبھی ان سے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ ویسے ہی وہ میرا جو خرچ برداشت کر رہے ہیں مجھے اس پر شرمندگی ہے۔"

"بیٹے! ہم بہت سی باتیں بعد میں کریں گے۔ فوراً ہی بہت ساری پیشکشیں کر دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"بہرحال اس موبائل فون کا شکریہ۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے...... ہمارے گھر لنچ کرو گے؟"

"ہاں۔ میں کہہ چکا ہوں اپنے دوستوں سے کہ بعد کا وقت مجھے آپ کے ساتھ ہی گزارنا ہے۔"

"بے حد شکریہ۔ آؤ پھر چلتے ہیں۔"

"میں لباس تبدیل کر کے باہر آتا ہوں۔ آپ......"

"ہاں، نیلے رنگ کی فورزک باہر کھڑی ہے۔ میں اسی میں تمہیں ملوں گا۔" ڈاکٹر

فریدوں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''بس میں چند منٹ میں پہنچتا ہوں۔'' شہباز نے کہا اور ڈاکٹر فریدوں باہر نکل گیا۔ شہباز نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور پھر لباس تبدیل کرنے لگا۔

☆......☆

ڈاکٹر فریدوں کی خوبصورت کوٹھی میں گاڑی رک گئی۔ ڈاکٹر فریدوں پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ شہباز نے دلچسپی سے چاروں طرف دیکھا۔ بڑی عالیشان کوٹھی تھی۔ دیکھ کر ہی احساس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر طاہر فریدوں کتنی بڑی حیثیت کا مالک ہے۔ راستے میں دونوں باتیں کرتے آئے تھے اور ڈاکٹر فریدوں نے اسے ایک باقاعدہ لائحہ عمل بتایا تھا جو شہباز نے ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔

''کیوں شہباز! تم مسکرا کیوں رہے ہو؟''

''نہیں جناب! اصل میں ایک بات سوچ رہا تھا میں۔ ویسے تو چلتے پھرتے میں نے شہر کی بہت سی رہائش گاہیں دیکھی ہیں۔ ذاتی طور پر میں نے کبھی اس طرح کی ذاتی عمارت اندر سے نہیں دیکھی۔ میں ہنستا ہوں اس بات پر کہ ایک عمارت بنانے کے بعد انسان اس میں قید ہو جاتا ہے۔ وہ دیواریں اس کے لئے قید خانہ بن جاتی ہیں اور یہ قید خانہ انسان خود اپنے ہاتھوں تعمیر کرتا ہے۔ جب کہ سرکس کی دنیا اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یعنی میں اور میرے ماں باپ جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہم، میرا مطلب ہے وہ جہاں بھی جاتے ہیں، پہلے اپنا گھر بناتے ہیں اور اس کے بعد اس میں رہتے ہیں۔ پھر وہ اپنا گھر اپنے ہاتھوں سے اکھیڑ لیتے ہیں اور وہاں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔''

''ہاں شہباز! زندگی کے مختلف روپ ہیں اور لوگ بھی مختلف۔ کوئی کسی انداز میں جینا پسند کرتا ہے اور کوئی کسی انداز میں۔ ویسے تم نے بڑی دلچسپ بات کہی۔ اپنا گھر واقعی اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا قید خانہ ہوتا ہے۔ انسان نجانے کیسی کیسی محبتوں میں پھنس جاتا ہے۔ اور پھر اسے انہی محبتوں کے درمیان زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ یہ دیواریں بھی اس کی محبت ہی بن جاتی ہیں اور وہ ان سے فرار نہیں حاصل کر سکتا۔''

''بالکل جناب! میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔'' شہباز نے جواب دیا۔

''اب تم سنبھالو۔ ہم اندر داخل ہو رہے ہیں۔'' فریدوں نے کہا اور شہباز نے آنکھیں

بند کر کے گردن ہلا دی۔ ایک خوبصورت خوابگاہ کے دروازے پر رک کر فریدوں نے ہلکی سی دستک دی اور اس کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ فریدوں نے اندر داخل ہو کر دیکھا کہ اس کی بیوی اپنے بیٹے کی تصویر کے سامنے بیٹھی ہوئی حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فریدوں کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا تھا۔

''ہیلو راحیلہ!''

راحیلہ نے ویران آنکھیں فریدوں کے چہرے پر گاڑ دیں۔ فریدوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے راحیلہ! اور ہمیشہ کی طرح آج بھی میں اپنی بات دوہراؤں گا۔ یقین کرو، میں تمہیں عام انسانوں سے بہت مختلف سمجھتا رہا ہوں۔ آج تک نہ صرف سمجھتا رہا ہوں بلکہ کہتا رہا ہوں لوگوں سے کہ میری بیوی ایک آئیڈیل ہے۔ بہت ہی ذہین اور سمجھدار، زندگی کو قریب سے دیکھ کر اس کی حقیقتوں کو جاننے والی۔ لیکن ایک تصویر کو مرکز نگاہ بنا کر تم نے میرے اس احساس کو تھوڑا سا دکھ پہنچایا ہے۔''

راحیلہ کے چہرے پر تبدیلی نمایاں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فریدوں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں شرمندگی کے آثار ہیں۔ وہ محبت بھرے انداز میں آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''نہیں، شرمندہ نہ ہو راحیلہ! دیکھو، ہم جس صورتحال سے دوچار ہوئے ہیں اس میں ہماری بہت سی مجبوریاں بھی شامل تھیں۔ والدین بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کبھی کبھی بہت الجھ جاتے ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ہمیں دکھی چھوڑ گیا۔ لیکن ہمیں بھی جینا ہے۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا ہے۔ دیکھو نا، اس کی ذات تو اب ہمارے درمیان نہیں رہی۔ تمہیں میرے لئے اور مجھے تمہارے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ اب میں تمہیں ایک عجیب وغریب بات بتاؤں۔ ایک دن پہلے کی بات ہے کہ ایک جنرل اسٹور پر مجھے ایک لڑکا ملا۔ سو فیصدی ہمارے احتشام کا ہم شکل۔ اتنا ہم شکل کہ میرا دل تو سینے سے نکل ہی پڑا تھا۔ معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ اس کا نام شہباز ہے۔ اس کے والدین دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور وہ یہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پہلے میں نے دل میں سوچا کہ تمہیں اس بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ تم ایک مضبوط اعصاب کی مالک ایک ذہین خاتون ہو۔ تمہیں دھوکا تو نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقتیں بتا کر تم سے پوچھا جائے کہ کیا

تم احتشام کے ہم شکل شہباز سے ملنا پسند کرو گی؟"

راحیلہ بے اختیار کھڑی ہوگئی۔

"ہاں...... ہاں......" اس نے بہت دن کے بعد اپنے منہ سے آواز نکالی۔ ورنہ وہ مکمل طور پر خاموش ہی رہا کرتی تھی۔

"اپنے آپ پر قابو پا سکو گی؟"

"ہاں، ہاں...... کہاں ہے وہ؟"

ڈاکٹر فریدوں کو اپنے اس فیصلے پر خوشی ہوئی تھی۔ اس نے بہت عمدگی کے ساتھ اس مسئلے کو حل کیا تھا۔ کہنے لگا۔

"بس یہ سمجھو راحیلہ! یہ میری طرف سے تمہارے لئے انعام ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مکمل طور پر خود پر قابو پاؤ گی۔ اور کوئی ایسا عمل نہیں کرو گی۔"

"نہیں کروں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔ کب لاؤ گے اسے؟"

"جب تم کہو۔"

"آج پلیز۔" راحیلہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ بھئی شہباز! اندر آجاؤ۔" فریدوں نے کہا اور شہباز جو یہ گفتگو سن رہا تھا، اندر داخل ہوگیا۔

راحیلہ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چکرائی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے لیکن شہباز نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

"نہیں آنٹی! آپ گر جائیں گی۔" راحیلہ نے دونوں ہاتھ شہباز کی گردن میں ڈالے اور اسے اپنے سینے سے بھینچ دیا۔ وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ شہباز نے مکمل طور پر تعاون کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کا انسانی فرض کیا ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ راحیلہ سے لپٹا رہا اور اس کے بعد اس نے بڑے پیار سے اسے سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"آنٹی! میں آپ کا احتشام تو نہیں ہوں۔ لیکن آپ کا شہباز ضرور ہوں۔ روزانہ آپ کی خدمت میں حاضری دیا کروں گا۔ آپ کی ہر بات مانا کروں گا۔ آپ اپنے آپ کو سنبھال لیجئے۔"

راحیلہ پھر زار و قطار رونے لگی۔ بہرحال کچھ دیر کے بعد یہ بادل چھٹ گئے تو راحیلہ

نے نہایت ہوش مندی سے پوچھا۔

"بیٹے! تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

"انکل کو بتا چکا ہوں۔ وہ دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور بس میں یہاں پڑھتا ہوں اور ہوسٹل میں رہتا ہوں۔"

"بیٹے! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم ہمارے پاس رہو؟"

"آنٹی! ویسے تو یہ ممکن ہے۔ لیکن......"

"اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ چلو بھئی راحیلہ! اپنے شہباز کو کچھ کھلانے پلانے کا بندوبست کرو۔"

دوپہر کا کھانا شہباز نے ڈاکٹر طاہر فریدوں کے گھر پر ہی کھایا۔ کوئی تین بجے تک وہ ان کے ساتھ رہا۔ دوسرے دن اس نے شام کو پانچ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے خود بھی یہ ماحول بڑا عجیب سا لگا تھا۔ وعدے کے مطابق دوسرے دن وہ کوٹھی پہنچ گیا۔ رات کو دس بجے تک ڈاکٹر فریدوں کے ساتھ رہا۔ اصل میں آغاز حقیقتوں سے کیا گیا تھا اور ذہن یہی بنایا گیا تھا کہ سچ کے ساتھ سفر کیا جائے۔ چنانچہ الجھنیں ختم ہوگئی تھیں۔ سچ ہمیشہ ہی ایک بہترین عمل ثابت ہوا ہے۔ لیکن کبھی کبھی سچائیوں سے اتنے بڑے فائدے ہو جاتے ہیں کہ انسان سوچ بھی نہ سکے۔

چنانچہ یہ گاڑی سچ کے سہارے چلنے لگی۔ راحیلہ کو ایک سکون، ایک سہارا مل گیا تھا لیکن کبھی کبھی یہ احساس، اس کے دل کو سخت کچوکے دیتا تھا کہ شہباز صرف احتشام کا ہم شکل ہے، احتشام نہیں ہے۔ البتہ ایسے موقعوں پر وہ اپنے احساسات کو چھپا لیتی تھی۔ ادھر ڈاکٹر فریدوں نے بھی شہباز سے کہنا شروع کر دیا تھا۔

"دیکھو...... اب کی بار جب تم اپنے والدین سے ملنے جاؤ تو ان سے ہمارا تذکرہ کر دینا اور اجازت لے لینا کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ تمہارے اخراجات بھی بچیں گے۔"

شہباز لاابالی نوجوان تھا، باپ سے بھی خود ہی رابطہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی اس بات کو قبول کر لیا۔ کہنے لگا۔

"انکل! بات اصل میں یہ ہے کہ جب آپ لوگوں نے مجھے اتنا بڑا درجہ دے دیا ہے اور ویسے بھی مجھے اپنی اولاد کی طرح رکھنے لگے ہیں، یہ تحفے تحائف، یہ شاہانہ اخراجات نہ

میرے بس کی بات تھی نہ میرے باپ کے بس کی بات۔ لہٰذا آپ کے ساتھ رہنے میں بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میں اپنا پتہ یہاں کا دیئے دیتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی رابطہ قائم کرنا ہو تو یہاں کر لیا جائے۔''

''بڑا اچھا فیصلہ ہے تمہارا۔''

''اس طرح میرے باپ کے اخراجات بھی بچیں گے۔ بلکہ ان کے بھیجے ہوئے پیسے میں پس انداز کر لوں گا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔''

اور اس کے بعد شہباز کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ یہ عالیشان کوٹھی اس کے تصورات سے بھی باہر کی چیز تھی۔ بڑا شاندار کمرہ دیا گیا تھا اسے۔ بظاہر بات حقیقتوں کے درمیان چل رہی تھی۔ لیکن انسانی جذبات کو بھلا کون کنٹرول کر سکتا ہے۔ یہاں آنے کے بعد سے تو خاص طور سے راحیلہ، شہباز کی دیوانی ہو گئی تھی۔ فرصت کے سارے لمحات اسی کے ساتھ گزرتے تھے۔ ڈاکٹر فریدوں نے شہباز سے کہا۔

''شہباز! اگر تم چاہو تو میرا کام سیکھ سکتے ہو۔ انسانی چہروں کو تبدیل کر دینا میرا فن ہے۔ اور دیکھو بیٹے! فن کوئی بھی ہو، ہمیشہ کام آتا ہے۔''

''کیوں نہیں انکل! میں نے اکثر آپ کو اپنی لیبارٹری میں کام کرتے دیکھا ہے۔ لیکن صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ آپ کس طرح کام کرتے ہیں۔''

''میرے پاس ایک کلائنٹ آیا ہے۔ وہ جلے ہوئے چہرے کا مریض ہے۔ آؤ...... وہیں سے ابتدا کرتے ہیں۔''

اور شہباز کو ایک اور دلچسپ مشغلہ مل گیا۔ جلے ہوئے چہرے والی ایک عورت تھی۔ جو ایک لیبارٹری میں کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسڈ پڑ گیا تھا اور چہرہ بالکل جھلس چکا تھا۔ عورت کی فرمائش تھی کہ اسے ایک مخصوص شکل دے دی جائے اور یہ شکل ایک تصویر کی تھی۔

''یہ میری بڑی بہن تھی۔ جس سے مجھے بے حد پیار تھا۔ ایئر ہوسٹس تھی۔ ایک ہوائی حادثے میں زندگی کھو بیٹھی۔ اور اب جب مجھے اپنی پسند کا چہرہ اپنانے کا موقع ملا ہے تو میں چاہتی ہوں کہ مجھے میری بہن کی شکل دے دی جائے۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے انکل؟''

''ہاں بیٹے! میں تمہیں یہ کر کے دکھاؤں گا۔''

اور جب ایک مہینے کی کاوش کے بعد اس لڑکی کے چہرے کے نقوش نمایاں ہوئے تو یہ چہرہ اسی تصویر کا چہرہ تھا۔ اکثر طاہر فریدوں شہباز کو بتانے لگا کہ کس طرح پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرے مستقل اور عارضی طور پر تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔

''عارضی طور پر بھی ایسا ہو سکتا ہے انکل؟''

''زمانہ جدید نے اس طرح کی ایجادات کر لی ہیں کہ ہم اپنے چہروں کو عارضی طور پر تبدیل کر سکتے ہیں اور ایسی شکلیں دے سکتے ہیں جو ہماری ضرورت کے مطابق ہوں۔''

''انکل! میں آپ کا فن سیکھنا چاہتا ہوں۔''

''شروع کر دو آج ہی سے۔'' ڈاکٹر فریدوں نے کہا اور یہاں بھی شہباز نے اپنی انتہائی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر طاہر فریدوں اسے ایک بار بتاتا تھا اور شہباز اس میں تین نقطے نکال لیا کرتا تھا۔ اور جب وہ ان نقطوں پر ڈاکٹر طاہر فریدوں سے سوال کرتا تو طاہر فریدوں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔

''مجھے تو تم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق لگتے ہو۔ اس قدر ذہانت کسی زمینی انسان میں نہیں دیکھی میں نے۔''

''انکل! آپ کی محبت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے جس طرح مجھے سہارا دیا ہے وہ بڑی حیثیت کا حامل ہے۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ مجھے ایک انوکھا فن حاصل ہو گیا ہے۔''

''میں تمہیں اس کے ہر پہلو سے آگاہ کروں گا۔''

''انکل! دو تین دن کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے رابطہ کیا ہے۔ اس وقت ہمارا سرکس یہاں سے کوئی دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر حسین پور نامی شہر میں لگا ہوا ہے۔ لیکن وہ لوگ اسی ہفتے وہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آنٹی کو بتا دینا۔''

اور شہباز تین دن کے لئے چلا گیا۔ راحیلہ پر جو گزری تھی اسے ڈاکٹر فریدوں نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’بے شک انسانی جذبات بڑے عجیب ہوتے ہیں راحیلہ! لیکن تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس کے ماں باپ بھی ہیں۔ وہ بہر حال ایک اجنبی وجود ہے۔‘‘

’’میں جانتی ہوں طاہر! کیا ہم ایک کام نہیں کر سکتے؟‘‘ راحیلہ نے حسرت بھری آواز میں کہا۔

’’کیا؟‘‘

’’ہم اس کے والدین کو بھی یہاں نہیں بلا سکتے؟ ہمارے پاس اللہ کا دیا اتنا کچھ ہے۔ ہم ان کی کفالت کر سکتے ہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟‘‘

’’نہیں، وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے والدین کیوں تیار ہوں گے ہمارے پاس رہنے کے لئے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔‘‘

تین دن کے بعد شہباز واپس پہنچ گیا تھا اور راحیلہ نے اسے خوشی سے لپٹا لیا تھا۔

’’تمہارے جانے کے بعد یہ بہت اداس ہو گئی تھیں۔ میں تو بس پریشان تھا کہ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ سناؤ، سب خیریت ہے؟‘‘

’’ہاں انکل!‘‘

’’آؤ۔ میری لیبارٹری میں ایک نیا کیس آیا ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ راحیلہ! اب یہ جو تمہارا شہباز ہے نا، یہ میرا بہترین معاون بن چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھے پلاسٹک سرجری کے گر سکھا رہا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ میرا استاد ہے یا میں اس کا استاد ہوں۔‘‘ ڈاکٹر طاہر فریدوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شہباز سرجری کے فن میں ماہر ہو گیا تھا۔ کسی بھی چہرے کو نئی شکل دے دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

لیبارٹری میں ایک شخص موجود تھا لیکن اس کا چہرہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ ایک کرخت چہرے والا آدمی تھا۔ ڈاکٹر فریدوں نے ایک تصویر شہباز کو دکھاتے ہوئے کہا۔

’’اسے دیکھو۔‘‘

شہباز نے تصویر لے لی۔ اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

’’یہ تصویر ان کی تو نہیں ہے۔‘‘

’’غور سے دیکھو۔‘‘ فریدوں بولا اور شہباز نے ایک بار پھر تصویر سامنے کر لی۔ پھر

گردن موڑتے ہوئے بولا۔

’’نہیں...... یہ تصویر ان کی نہیں ہے۔‘‘

’’تم نے غور سے دیکھا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’کیا فرق ہے دونوں میں؟‘‘

’’تصویر کے چہرے میں ناک تھوڑی سی موٹی ہے۔‘‘

’’اور......؟‘‘

’’آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہیں۔‘‘

’’اس کے علاوہ؟‘‘

’’ٹھوڑی میں لکیر کا فرق ہے۔‘‘

’’اور کچھ......؟‘‘

’’بس یہی ہے۔‘‘

’’چہرے کی بناوٹ......؟‘‘

’’ایک جیسی ہے۔‘‘

’’فریم......؟‘‘

’’ایک ہے۔‘‘

’’کیا یہ ان صاحب کی تصویر ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ اپنا چہرہ اس تصویر کے مطابق کرانا چاہتے ہیں۔ دوسرا آدمی ایک کروڑ پتی تاجر ہے جو ایک حادثے میں مر چکا ہے۔ یہ اس کی جگہ لینا چاہتے ہیں تاکہ اس کی دولت ان کے قبضے میں آجائے۔ اس کے لئے یہ ہمیں پچیس لاکھ روپے دینا چاہتے ہیں۔‘‘

’’مگر...... یہ تو جرم ہے۔‘‘ شہباز بولا۔

’’ناک تھوڑی سی بھاری آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ آنکھوں کے پپوٹوں پر سیلکن لگانے سے کام بن جائے گا۔ ٹھوڑی کی لکیر آسانی سے بھری جا سکتی ہے۔ اتنا سا کام،

معاوضہ پچیس لاکھ۔ کیا کہتے ہو؟"

"نہیں ...... یہ جرم ہے۔"

"صرف ان کا۔"

"نہیں انکل! ہمارا بھی۔"

ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اس شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "سنا آپ نے؟"

"سن لیا...... فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔" وہ آدمی بولا۔

"آپ جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔

"ناکام زندگی گزاریں گے آپ لوگ۔"

"جی......" ڈاکٹر پُرسکون لہجے میں بولا۔

اس شخص کے جانے کے بعد ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔ "مجھے تم پر فخر ہے شہباز! خدا کرے کوئی ایسی بات نہ ہو جو تمہارے مستقبل میں رکاوٹ بن جائے۔ میری نگاہیں تمہیں دور تک دیکھ رہی ہیں۔"

"سچ انکل......؟" شہباز مسکرا کر بولا۔

"ہاں۔"

"میں کیا نظر آ رہا ہوں آپ کو......؟"

"ایک بہت بڑا آدمی۔" ڈاکٹر نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

✿......✿

ننھی ننھی بوندیں آسمان سے زمین کا سفر کر رہی تھیں۔ کئی دن سے گرمی پڑ رہی تھی اور موسم بے حد خراب تھا۔ لیکن آج صبح ہی صبح بادل چھا گئے تھے اور اس وقت سے ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے موسم بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔

طارق شاہ شیر کے پنجرے کا جائزہ لے کر واپس آ رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر شبیلہ سرکس کی ایک لڑکی گالہ سے باتیں کر رہی تھی۔ طارق شاہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے دل کو ایک دُکھن کا احساس ہو رہا تھا۔ شبیلہ بے حد خوش لباس تھی۔ اس وقت بھی وہ کھلتے پیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کی نیلی خوبصورت آنکھیں چمک رہی تھیں اور اخروٹی رنگت کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ طارق شاہ ماضی میں چلا گیا۔ جوان بیٹے کی ماں تھی لیکن بدن کی موزونیت اور چہرے کی کوشش جوں کی توں تھی۔ طارق شاہ اسے دیکھتا چلا گیا۔ شبیلہ کی دلکش آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

بچپن سے گالہ! بچپن سے مجھے اس موسم سے عشق ہے۔ ایسے موسم میں نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ تم یقین کرو، گلباز نے ایسے ہی موسم میں مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

"کیا مطلب......؟" گالہ نے کہا۔

"ہاں، میں بے خود تھی۔ ایک عجیب سا سرور طاری تھا۔ اور شاید......"

"ہاں بولو...... رُک کیوں گئیں؟"

"میں نے اسی بے خودی کے عالم میں اس کی محبت کو قبول کر لیا۔"

"واقعی......؟"

"ہاں...... تم یقین کرو، اگر میں موسم کا شکار نہ ہوتی تو شاید مجھے گلباز کی وہ بات پسند نہ آتی۔ میں اس قسم کی ہوں ہی نہیں۔"

”یہ تو بڑے مزے کی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ گلباز کی جگہ کوئی بھی تم سے اس وقت اظہار عشق کر دیتا تو تم اس کی محبت قبول کر لیتیں۔ کیوں، ایسا ہوتا؟“ گالہ نے سوال کیا اور طارق شاہ کے دل میں آگ سلگ اٹھی۔ وہ اس سوال کا جواب سننے کے لئے بے چین تھا۔ شبیلہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔

”پتہ نہیں۔ ویسے تم اگر میری بات پر یقین نہیں کر رہیں تو یقین کر لو، میں سچ بول رہی ہوں۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ ورنہ شاید......“ شبیلہ خاموش ہوگئی۔ طارق شاہ بری طرح دُکھن محسوس کر رہا تھا...... آہ، یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اگر گلباز کی جگہ اس وقت میں ہوتا تو...... وہ اسی سوچ میں تھا کہ گالہ نے کہا۔

”اس موسم میں تمہارا دل عجیب عجیب طلب کرتا ہوگا۔“

”ہاں، ایسی ہی بات ہے۔“

”فرض کرو کوئی اس وقت تمہاری طلب پوچھے تو تم کیا مانگو گی؟“ گالہ نے کہا اور شبیلہ ہنس پڑی۔

”میں چاہوں گی کہ کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ بس سب لوگ ہنسی خوشی گپیں لگاتے رہیں۔ خوب کھانے پینے کی چیزیں، کڑاہیاں چڑھ جائیں، پکوان پکیں، کیا مزہ آئے۔ یوں لگے جیسے ہم بھی اسی دنیا کے لوگ ہوں۔ ورنہ سچ جانو، ہم اب تو صرف بازیگر ہیں۔ کھیل تماشہ دکھانے والے۔ ہماری اپنی زندگی ہماری اپنی ہے ہی نہیں۔“

”گویا سرکس میں چھٹی ہو جائے؟“

”ہاں...... کیا ہی مزہ آئے۔ آج کوئی شور نہ ہو اور سب مزے سے موسم کا لطف اٹھائیں۔“

طارق شاہ کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا اور پھر اس نے اپنے آفس میں جا کر منیجر کو طلب کیا۔

”منیجر! باہر بورڈ لگا دو، آج کوئی شو نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے ایڈوانس بکنگ کرا لی ہے، وہ یہ شو کل دیکھ سکتے ہیں۔ ونڈو کھول دو۔ جو اپنے ٹکٹ واپس کرنا چاہیں، انہیں معذرت کے ساتھ ان کی رقم واپس کر دو۔“

”سر لیکن......“ منیجر نے کہا اور طارق شاہ نے گھور کر اسے دیکھا تو منیجر جلدی سے بولا۔

”یس سر...... یس سر......“ اور اس کے بعد وہ منیجر کے پاس سے ہٹ آیا۔ یہ نئی بات ہوئی تھی۔ سرکس میں شو اس وقت نہیں ہوتا تھا جب کوئی اہم بات ہو جاتی تھی۔ یا پھر سرکس کوچ کر کے کہیں اور جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے معلومات حاصل کرنے لگے۔ پتہ نہیں طارق شاہ نے یہ چھٹی کیوں کرا دی تھی۔ منیجر سے سوال کیا گیا تو منیجر نے ڈانٹ کر ان لوگوں کو خاموش کر دیا جو یہ سوال کر رہے تھے۔ اسے یاد آ گیا کہ طارق شاہ نے اس سوال پر اسے بری طرح گھور کر دیکھا تھا گویا اس سوال کا جواب دینا طارق شاہ کی شان کے خلاف تھا اور بہر حال وہ بھی منیجر تھا۔ لیکن سرکس کے کارکنوں نے بہت خوشیاں منائیں۔ طارق شاہ کا دوسرا حکم سامنے آیا اور وہ لوگ حیران رہ گئے۔

دوسرا حکم تھا کہ کڑاہیاں چڑھائی جائیں اور ہر جگہ پکوان پکوائے جائیں۔ سرکس میں واقعی زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص خوش اور قہقہے لگاتا نظر آ رہا تھا۔ ادھر موسم نے بھی اس خوشی کا ساتھ دیا تھا۔ بوندیں کچھ اور گہری ہوگئی تھیں لیکن چھما چھم بارش نہیں برسی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بھی وقت اس کے برسنے کے امکانات تھے۔ طارق شاہ پر آج نجانے کیا کیفیت سوار ہوگئی تھی۔ ایک بار پھر وہ شبیلہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق تھا کہ شبیلہ اس وقت بھی ایک گوشے میں کھڑی گالہ ہی سے باتیں کر رہی تھی۔ طارق شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ چھپتا چھپاتا آگے بڑھا، ایک خیمے کے پیچھے بڑے بڑے تختے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ان میں سے ایک تختے پر چڑھ گیا اور گالہ اور شبیلہ کی باتیں سننے لگا۔ موضوع وہی تھا۔

”یوں لگتا ہے جیسے شاہ جی نے میری بات سن لی ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ کاش آج چھٹی ہو۔ پکوان چڑھ جائیں۔ دیکھو نا، کیسا مزہ آ رہا ہے۔“

”واقعی، مجھے خود حیرانی ہوئی تھی، ایسا کیسے ہو گیا۔ ویسے ایک بات ہے شبیلہ! شاہ جی تم پر بہت مہربان رہتے ہیں۔“

”وہ ہیں ہی اچھے آدمی۔ وہ اس سرکس کے مالک ہیں مگر تم دیکھو، کبھی کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کرتے۔“

”پتہ نہیں انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔“ گالہ نے کہا۔ گالہ بہت جونیئر تھی، جگہ جگہ

سے لڑکیاں اور لڑکے سرکس میں کام کرنے آجایا کرتے تھے۔ انٹرویو ہوا کرتے تھے اور اگر وہ سرکس کے قابل ہوتے تو انہیں ملازمت دے دی جاتی تھی۔ گالہ کو بھی اس سرکس میں آئے ہوئے تین چار سال ہی ہوئے تھے۔ اچھی لڑکی تھی، شبیلہ سے خوب دوستی تھی اس کی۔ لیکن شبیلہ نے بہرحال اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جبکہ طارق شاہ منتظر رہا کہ شبیلہ اپنے طور پر تبصرہ آرائی کرے۔ شبیلہ بولی۔

''اوہو، دیکھو......وہ نیاز خان تمہیں بلا رہا ہے۔''

نیاز خان بہت دور گلگلے تل رہا تھا۔ گالہ ہنستی ہوئی اس کی طرف چل پڑی۔ چلتے ہوئے اس نے کہا۔

''تم بھی آؤ......''

''نہ بابا نہ۔ میں گلگلے نہیں کھاتی۔ تم کھاؤ۔''

گالہ ہنستی ہوئی چلی گئی اور شبیلہ نے پیچھے کھڑے ہوئے تختے سے پشت لگالی جیسے وہ یہیں رکنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اچانک ہی اس کی نگاہ طارق شاہ پر پڑی اور وہ اچھل پڑی۔ طارق شاہ بدستور تختے پر کھڑا ہوا تھا اور شبیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شبیلہ جھینپے ہوئے سے انداز میں مسکرائی۔ پھر دو قدم آگے بڑھ آئی اور بولی۔

''شاہ جی! یہاں کیسے کھڑے ہیں؟''

طارق شاہ کی برف پاش نگاہیں شبیلہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''تمہیں معلوم ہے شبیلہ! کہ پیلا لباس میری بہت بڑی کمزوری ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا شاہ جی! میں تو صبح ہی سے یہ کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔''

''بارش کے موسم میں اچھے لگتے ہیں۔''

''اچھے نہیں، بہت اچھے۔ اور تم پر تو یہ اتنے سج رہے ہیں کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔''

''شکریہ شاہ جی۔''

''شبیلہ! گالہ تم سے سوال کر رہی تھی کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''آپ سن رہے تھے شاہ جی؟''

''ہاں، اتفاق سے یہاں آکھڑا ہوا تھا۔''

''ہاں، یہ سوال کر رہی تھی وہ۔''

''تم نے اسے بتایا کیوں نہیں؟''

''کیا بتاتی شاہ جی؟''

''یہی کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔''

''شاہ جی وہ......''

''ہاں بولو۔''

''شاہ جی! مجھے کیا معلوم؟''

''نہیں معلوم؟'' طارق شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''جی شاہ جی! وہ......''

''میرے شادی نہ کرنے کی وجہ تم ہو شبیلہ! میں نہیں جانتا میرا خاندان کیا ہے۔ میرا باپ معمولی سا آدمی تھا۔ بے شک اس نے محنت کر کے سرکس بنایا اور یہ بنا بنایا سرکس میرے حوالے کیا گیا۔ لیکن والدین کے ترکے ہی اولاد کو منتقل ہوتے ہیں۔ اور مجھے بھی ترکہ ہی ملا۔ لیکن شبیلہ! میری فطرت میں ایک ضد ہے، ایک جنون ہے۔ میرے اندر گو یہ جنون کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی شبیلہ! میں اس جنون کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ تم اسے بتادو کہ میرے شادی نہ کرنے کی وجہ تم ہو۔ میں نے جب تمہیں دیکھا تھا، جب مجھے تم سے محبت کا احساس ہوا تھا تو میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شادی اگر کی تو صرف تم سے کروں گا۔ تم نے میری محبت کو قبول نہیں کیا اور میرے ہی سرکس کے ایک ملازم کو تم نے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا۔ تب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میری بہت بڑی بے عزتی کی گئی ہے۔ ایک جھولے پر کرتب دکھانے والے کو سرکس کے مالک سے بڑا بنا دیا گیا ہے۔ شبیلہ! بہت سی باتیں دل میں آئی تھیں لیکن میں نے دل کی بات نہیں مانی اور راستہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ شبیلہ! میں نے صبح کو تمہاری خواہش سنی۔ اس وقت بھی اتفاق سے میں تمہارے پاس سے گزر رہا تھا۔ تم گالہ سے کہہ رہی تھیں کہ کاش آج سرکس کی چھٹی ہوجائے۔ کاش ہر جگہ پکوان چڑھ جائیں۔ صرف تمہاری اس خواہش کی خوشی میں، میں نے ہزاروں روپے کا نقصان کرڈالا۔ شبیلہ! مجھے اس کا بالکل افسوس نہیں ہے۔ تمہارے لئے تو میں نجانے کیا کیا کرسکتا تھا۔ کاش تم مجھے اس کا موقع دیتیں۔''

شبیلہ خاموشی سے سر جھکائے یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے طارق شاہ کی بات کا

کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ طارق شاہ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

''ایک بات کہوں شبیلہ! مکیش ایک گلوکار ہے۔ میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ میں گانے بھی نہیں سنتا۔ لیکن کسی دن کوئی ٹیپ ریکارڈر بجا رہا تھا اور مکیش کی آواز میں ایک گانا اُبھر رہا تھا۔ گانا یہ تھا کہ

کوئی جب تمہارا ردے توڑ دے
تڑپتا سکتا تمہیں چھوڑ دے
تب تم میرے پاس آنا پریے
میرا در کھلا ہے کھلا ہی رہے گا
تمہارے لئے.........

مجھے یوں لگا کہ نجانے کیسے مکیش میرے دل میں اتر گیا ہو۔ نجانے کس طرح اس نے میرے دل کی آواز سن لی ہو۔ شبیلہ! میرا در ہمیشہ تمہارے لئے کھلا تھا اور کھلا رہے گا۔ میری دعا ہے کہ تم زندگی کا ہر سکھ پاؤ۔ صدیاں بیت گئیں، عرصہ بیت گیا جب تم نے مجھے ٹھکرا کر گلباز کو چن لیا۔ خدا نے تمہیں ایک جوان بیٹے کی ماں بنایا ہوا ہے۔ لیکن شبیلہ! مجھے تمہارے حسن و جمال، تمہاری دلکشی سے زیادہ تم سے پیار ہے۔ اور ''کوئی جب تمہارا ردے توڑ دے'' تو میرے دروازے تمہیں ہمیشہ کھلے ملیں گے۔ یہ میری محبت کی انتہا ہے۔ دل چاہا کہ آج میں تم سے یہ ساری باتیں کروں۔ پر اس دن کو کوستا ہوں جب ایسا ہی موسم تھا اور مجھ سے پہلے گلباز نے تم سے اظہارِ عشق کر دیا تھا۔ آہ کاش! وہ میں ہوتا جو تمہاری اس بے خودی سے فائدہ اٹھاتا۔''

شبیلہ زبان بند کئے خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ یہ باتیں اسے عجیب سی لگ رہی تھیں۔ کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی جگہ سے ہٹی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے دور چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر طارق شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔

طارق شاہ جلتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس وقت چونکا جب اسے اس تختے کے نیچے کلبلاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے تختہ چھوڑ دیا اور جائزہ لینے لگا کہ آخر ایسی کون سی چیز ہے جو کلبلا رہی ہے۔ تب جگو تختے کے نیچے سے نکل آیا۔ جگجیت عرف جگو سرکس کا بونا تھا۔ قد ساڑھے تین فٹ تھا۔ بدن انتہائی مضبوط۔ وہ سرکس میں ایک خاص

آئیٹم پیش کرتا تھا اور وہ آئیٹم عجیب و غریب تھا۔ وزیر خان کا قد چھ فٹ دو انچ کا تھا اور وہ ایک باقاعدہ پہلوان تھا۔ اس کی اور جگو کی کشتی رنگ میں کرائی جاتی تھی۔ اور فن کشتی کے ماہرین کو دعوت دے دی جاتی تھی کہ وہ آئیں اور یہ دیکھیں کہ یہ کشتی محض دکھاوے کی نہیں ہے۔ جگو بڑے آرام سے اپنے حریف کو پٹخ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہت سارا وزن اٹھایا کرتا تھا۔ طاقت کے بہت کام کیا کرتا تھا اور اس کے جسم کی طاقت کا سب کو احساس تھا۔ اتنی دیر سے طارق شاہ جگو کے اوپر ہی کھڑا ہوا تھا۔

جب جگو تختے کے نیچے سے نکلا تو طارق شاہ کی آنکھیں اسے دیکھ کر پھیل گئیں۔

''کیا کر رہے تھے تم یہاں؟''

''ورزش کر رہا تھا مالک! پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور تختہ اپنے اوپر رکھ لیا تھا۔ تختے کا وزن چالیس کے جی ہے۔ یہ میری ورزش کا ایک حصہ ہے۔ پھر آپ اس پر آ کھڑے ہوئے۔''

''میرا وزن پچھتر کے جی ہے۔ گویا تم اس وقت پچھتر اور چالیس ایک سو پندرہ کلوگرام کا وزن اٹھائے ہوئے تھے۔''

''معمولی وزن ہے مالک! میں تو چار سو کلوگرام تک اپنے بدن پر اٹھا لیتا ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے۔''

''مگر مر کیوں رہے تھے یہاں؟'' طارق شاہ سنبھل کر غرایا۔

''مالک! ورزش کر رہا تھا۔''

''تو پھر جب میں تمہارے اوپر چڑھا تو تم نے مجھے منع کیوں نہیں کیا۔ آواز کیوں نہیں نکالی؟''

''مالک کا وزن محبت کرنے والے غلام کو برا تھوڑی لگتا ہے۔''

''تم نے میری باتیں بھی سنی ہوں گی۔''

''ہاں مالک! کان بند نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں ہاتھ پیٹ کے نیچے پھنسے ہوئے تھے۔''

''کھڑے ہو جاؤ۔''

''کھڑا ہی ہوا ہوں مالک۔''

"تم نے میری ساری باتیں سنیں؟"

"ہاں۔"

"اور اب یہ باتیں پورے سرکس میں مشہور ہو جائیں گی۔"

"مالک کو اختیار ہے کہ غلاموں کو جتنی مرضی گالیاں دے لیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"میں نے تمہیں کون سی گالی دی ہے؟" طارق شاہ نے سوال کیا۔

"مالک! وفادار غلام مالک کی کسی بات کی تشہیر نہیں کرتے۔ بلکہ اسے اپنے سینے میں اتار لیتے ہیں اور پھر کبھی باہر نہیں نکلنے دیتے۔"

طارق شاہ گہری نگاہوں سے جگو کا جائزہ لینے لگا۔ جگو کے لہجے میں سچ تھا۔ طارق شاہ نے کہا۔

"ہاں جگو! کسی سے کچھ کہنا نہیں۔ بات زبان سے باہر نکل جاتی ہے تو پتہ نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے اور لوگ پتہ نہیں کس کس انداز میں اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ اب جب تم نے سن ہی لیا ہے تو حقیقت تو یہ ہے جگو! کہ مجھے زندگی میں بدترین شکست اٹھانی پڑی ہے۔ میں نے...... میں نے زندگی میں صرف اسے چاہا ہے۔ اس کے علاوہ میری چاہت کا محور اور کوئی نہیں ہے۔ لاکھ سمجھایا خود کو، لاکھ بار اپنے اوپر لعنت بھیجی اور سوچا کہ کہاں میں اور کہاں وہ میری ایک ادنیٰ سی ملازم، میرے ایک ملازم کی بیوی جسے میں جب چاہوں کان سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہوں، جسے میں جب چاہوں مار پیٹ کر شبیلہ کو اس سے چھین سکتا ہوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن جگو! میرا دل آج بھی اس کے لئے تڑپتا ہے۔ وہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے۔ بس نجانے کیوں ایسے ہی دل تڑپ اٹھتا ہے۔ لعنت ہے مجھ پر۔"

"نہیں مالک! آپ پر لعنت نہیں ہے۔ ہم تو آپ کے غلام ہیں۔ نجانے کب سے آپ کا نمک کھا رہے ہیں مالک! ظاہر ہے ہم ناواقف تھے انؐ ساری باتوں سے۔ اب واقفیت ہوگئی ہے مالک۔ مالک! بات سنیں، شبیلہ پر ہر حالت میں آپ کا حق ہے۔ جتنا وقت آپ نے گلباز خان کو دے دیا بس کافی ہے۔ اگر اب بھی آپ دل کے دروازے کھولے بیٹھے ہیں تو ان دروازوں سے شبیلہ کو اندر لانا ہمارا کام ہے مالک! آپ کا نہیں۔"

طارق شاہ نے چونک کر جگو کو دیکھا اور بولا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"گلباز کو آپ کے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ وہ آپ کے راستے میں نہیں آئے گا مالک!"

"کیا بکواس کر رہے ہو جگو! کیسے ہٹا دو گے؟"

"یہ کام آپ ہم پر چھوڑ دیجئے۔"

"مطلب...... کیا گلباز کو کوئی جسمانی نقصان پہنچایا جائے گا؟"

"جسمانی نہیں، روحانی نقصان مالک!" جگو نے سفاک لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بس اس کی روح اس سرکس میں منڈلاتی رہے گی۔ جسم منوں مٹی کے نیچے چلا جائے گا۔ بات ختم ہو جائے گی۔"

"گویا تم اسے قتل کر دو گے؟"

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ آپ براہِ کرم اس وقت تک یہ الفاظ منہ سے نہ نکالیں جب تک کہ کام نہ ہو جائے۔ ویسے مالک! بے فکر رہیں۔ اگر اس قتل کا راز کھل بھی گیا تو جگو سرِ عام کہے گا کہ جگو گلباز کا قاتل ہے اور ایسا جگو صرف اپنے مالک کے لئے کرے گا۔ ایک جذبے کے تحت کرے گا۔"

"بیوقوف! احمق! تیرا کیا خیال ہے یہ کام صرف تو کر سکتا ہے؟ میں اگر چاہتا تو کبھی کا یہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن احمق آدمی! ضمیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کیا گلباز کو قتل کر کے شبیلہ کی محبت حاصل کی جا سکتی تھی؟ خبردار۔ تو نے میری محبت اور میری وفاداری میں یہ الفاظ ادا کئے ہیں جن کے لئے میں تجھے معاف کئے دیتا ہوں۔ لیکن آئندہ بھول کر بھی یہ بات نہ سوچنا۔ اور ایک بات اور ذہن نشین کر لے، گلباز کو اگر کوئی نقصان پہنچا تو اس کی ذمے داری میں صرف اور صرف تجھ پر عائد کروں گا۔ بات سمجھ میں آ گئی؟" طارق شاہ کی آواز آخر میں غراہٹ میں تبدیل ہو گئی تو جگو لرزتی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے مالک! ہم نے جو باتیں سنیں اور جس انداز میں سنیں بس اس سے ہمارا دل بھر آیا اور ہم نے چاہا کہ مالک کو اس کی محبت دلوا دیں۔"

"بالکل نہیں...... میں جرم کر کے شبیلہ کو حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اگر اپنی زبان سے مجھ سے کہے کہ طارق شاہ مجھے اپنا لو، تمہاری محبت ٹھکرا کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے

تو شاید میں تیار ہو جاؤں۔ لیکن اس کے برعکس کچھ بھی نہیں۔ میری بات سمجھ لی ہے تم نے؟ گلباز کے انگوٹھے تک کو کوئی نقصان پہنچا تو اس کی سو فیصدی ذمے داری میں تجھ پر عائد کروں گا۔'' طارق شاہ نے کہا اور غصیلے انداز میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ بونا جگو اسے دیکھتا رہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''محبت بھی کیا بیوقوفی کی چیز ہے۔ یہ اچھا ہے کہ ہم چھوٹے لوگ ایسے جنجال میں نہیں پھنستے۔'' پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر ایک طرف چلا گیا۔ رات کے پہلے پہر بادلوں نے گڑگڑانا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد دھواں دھار بارش شروع ہو گئی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اگر سرکس میں چھٹی نہ ہوتی تو بڑی افراتفری مچ جاتی۔ شائقین بری طرح بھگدڑ مچاتے اور نقصانات اٹھانے پڑتے۔

رات کے آخری پہر میں بارش بند ہو گئی تھی اور موسم بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ پھر صبح ہوئی اور سورج نے سر نکال کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔ رات کی بارش سے جو جل تھل ہو گیا تھا، وہ خشک ہونے لگا۔ سرکس کے کام اپنے معمولات پر چلتے رہے۔ فیض شاہ نے طارق شاہ کو دیکھا جس کے چہرے پر ہمیشہ افسردگی رہتی تھی۔ طارق شاہ اس کے دوست رحیم شاہ کا بیٹا تھا۔ عزت و احترام سے فیض شاہ سے پیش آتا تھا۔ فیض شاہ کو بھی اس سے اپنی اولاد ہی کی طرح محبت تھی۔ طارق شاہ کی ناکام محبت کا اسے پوری طرح اندازہ تھا۔ اور کوئی مسئلہ ہوتا تو شاید وہ اسے طارق شاہ کے لئے ہموار کر دیتا۔ لیکن کسی کی محبت زبردستی کسی کے دل میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ بہر حال وہ اپنی ذمے داری تو پوری کیا ہی کرتا تھا۔

دوپہر ہو گئی۔ دوپہر کو سرکس کے تمام کارکن کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گلباز نے شبیلہ سے کہا۔

''کھانا شاید زیادہ کھا لیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''

''ہاں، کیوں؟ تم کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''ایک عجیب سی گرانی طبیعت پر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''تھوڑی دیر سو جاؤ۔ ہو سکتا ہے پھر طبیعت ٹھیک ہو جائے۔''

''ہاں، یہی میں سوچ رہا ہوں۔'' گلباز نے کہا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ شام پانچ

بجے تک وہ بستر میں رہا پھر جاگ گیا۔ شبیلہ نے اسے چائے بنا کر دی۔ چائے پینے کے بعد وہ بولا۔

''ذرا جاتا ہوں، جھولے وغیرہ ٹھیک کرا آؤں۔ کل کا شو کرنا ہے۔ آج نئے ٹکٹ بھی بہت زیادہ فروخت ہو رہے ہیں۔ صبح سے ایڈوانس بکنگ چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے پنڈال میں اب جگہ نہیں ہو گی۔'' اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو شبیلہ نے پوچھا۔

''طبیعت کیسی ہے؟''

''بس نجانے کیوں بدن کچھ بے جان بے جان سا ہو رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے۔''

''کیا؟'' شبیلہ چونک کر بولی۔

''بس۔ چونکہ رات کو چھما چھم ہوتی رہی ہے۔ صبح کی ورزش نہیں کی۔ اور تم جانتی ہو شبیلہ! کہ اگر صبح کی ورزش نہ ہو تو پورا دن سست گزرتا ہے۔''

''یقیناً یہی وجہ ہے۔''

''جا رہا ہوں۔ ذرا جھولے پر پریکٹس کروں گا۔'' گلباز نے کہا اور اس کے بعد وہ پنڈال میں داخل ہو گیا۔ ہر طرف مشقیں ہو رہی تھیں۔ بونے اپنا آئیٹم دوہرا رہے تھے اور اس کی ریہرسل کی جا رہی تھی۔ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گلباز جھولے پر چل پڑا۔ اس کا پارٹنر رفیق شاہ اسے دیکھ کر دوسری طرف سے جھولے پر پہنچ گیا اور گلباز پریکٹس کرنے لگا۔ فضا میں تین چھلانگیں لگا کر قلابازیاں کھا کر جھولے کو پکڑنا ہوتا تھا۔ نیچے جال بھی نہیں لگایا جاتا تھا۔

بہر حال گلباز اپنا کام کرنے لگا اور پریکٹس بڑی خوش اسلوبی سے ہونے لگی۔ لیکن گلباز کو نجانے کیوں اپنا بدن کمزور کمزور سا ہی لگ رہا تھا۔ وہ اس عجیب سی کیفیت کو ابھی تک دور نہیں کر پایا تھا۔ تقریباً پچیس منٹ تک وہ اپنے پارٹنر کے ساتھ مشق کرتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اسی کے ذریعے نیچے اتر آیا۔ اس کے پارٹنر کو کسی قسم کی سستی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ بعد میں گلباز کافی دیر تک پریکٹس کرتا رہا۔ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر اس پر کرتب کئے۔ چھلانگیں لگا کر زمین پر اور زمین سے دوسرے گھوڑے پر۔ دوسرے گھوڑے سے زمین اور پھر تیسرے گھوڑے پر۔ یہ سارے کام اس نے خوش اسلوبی کر لئے اور بدن میں چستی آ

گئی۔ پھر جب وہ واپس اپنے خیمے میں آیا تو شبیلہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

’’اب کیسی طبیعت ہے؟‘‘

’’اب بہتر ہو گئی ہے۔ خاصی بھاگ دوڑ کر کے آیا ہوں۔‘‘

’’بس وہی بات ہے۔ صبح کی ورزش اپنا مقام ہی الگ رکھتی ہے۔‘‘

سرکس کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں اور وقت پر مہمان اندر آنے لگے۔ شو شروع ہو گیا۔ سب فنکار اپنا اپنا فن دکھانے لگے۔ پنڈال پر تالیاں گونجتی رہیں۔ یہاں تک کہ گلباز کی باری بھی آ گئی۔ پہلے گھوڑوں کا کھیل دکھانا تھا۔ وہ گھوڑوں کی سواریاں بدلتا رہا اور پبلک داد و تحسین سے اسے نوازتی رہی۔ ایک گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگا کر دوسرے گھوڑے کی پشت پر پہنچنا، پھر وہاں سے زمین پر قدم جما کر مخالف سمت سے دوڑ کر آنے والے گھوڑے کی پشت پر پہنچ جانا بڑے کمال کا کرتب تھا اور گلباز اپنا یہ کام بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔ آئیٹم ختم ہوا اور پھر دوسرا آئیٹم ہونے لگا۔

گلباز ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ لیکن پتہ نہیں طبیعت پر کچھ بوجھ بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کر تو لیا ہے لیکن کوئی گڑبڑ رہ گئی ہے۔ کچھ ہے۔

دوسرا آئیٹم کوئی پینتیس منٹ کے بعد تھا۔ یہ پینتیس منٹ اس نے ڈریسنگ روم میں ہی گزارے تھے۔ سب اپنے اپنے آئیٹم کر رہے تھے۔

پھر گلباز کی باری آ گئی۔ اس کا پارٹنر جھولے پر پہنچ گیا۔ نوے فٹ بلند جھولا اس کا منتظر تھا۔ وہ ایک رسی کے ذریعے اوپر پہنچ کر کھولے پر آ گیا اور اس کے بعد کھیل شروع ہو گیا۔ گلباز برق رفتاری سے اپنے کرتب دکھانے لگا۔ کسی کو تصور ہی نہیں تھا کہ اچانک ہی کیا ہو جائے گا۔ اس بار جب گلباز اپنے جھولے پر چلا اور منڈوے کے درمیان پہنچا تو اس کے پارٹنر نے پوری مہارت سے جھولا اس کے پاس پھینکا۔ عین درمیان میں گلباز نے قلابازی کھائی۔ اسے قلابازی کھا کر جھولا پکڑنا تھا لیکن نجانے کیا ہوا، وہ ایک دم الٹا ہو گیا۔ ہاتھ جن سے جھولا پکڑنا تھا، نیچے آ گئے اور پاؤں اوپر اٹھ گئے۔ اس کے بعد جھولا اس کے اوپر سے گزر گیا اور وہ نیچے گرنے لگا...... بے شمار آوازیں بلند ہوئیں۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ اور گلباز سیدھا سر کے بل نیچے آ رہا...... گردن شانوں میں گھس گئی تھی۔ سر کی ہڈی پاش پاش ہو گئی تھی اور بھیجہ باہر نکل آیا تھا۔ خون ابل رہا تھا۔ چاروں

طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ اب اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس طرح گرنے والے میں زندگی کی کوئی رمق تلاش کی جائے۔ بس چورا بن کر رہ گیا تھا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ بے شمار افراد دوڑ پڑے اور انہوں نے گلباز کی لاش کو کپڑے میں رکھا اور اسے اندر لے گئے۔ باہر ساری پبلک کھڑی ہو گئی تھی۔ ہر شخص گرنے والے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

طارق شاہ کو اس کا علم ہوا اور وہ دوڑ کر گلباز کی لاش کے پاس پہنچ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا اور کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔ کسی قسم کی بھاگ دوڑ تو اس وقت کی جاتی ہے جب کوئی ایک فیصد بھی زندگی کی امید ہو۔ وہاں جہاں سر پکے ہوئے خربوزے کی طرح پھٹ چکا ہو اور سفید سفید بھیجہ نکل کر دور تک بکھر گیا ہو، وہاں جہاں گردن شانوں کے اندر چلی گئی ہو، بھلا بھاگ دوڑ کے لئے کیا رہ جاتا ہے۔

بے شمار کراہیں، آہیں، رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سرکس کے منیجر ریاض شاہ نے طارق شاہ سے کہا۔

’’سر! شو کا کیا، کیا جائے؟‘‘

طارق شاہ نے ویران نگاہوں سے منیجر کو دیکھا، کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا۔ منیجر اس کی کیفیت کو سمجھ گیا تھا۔ سمجھدار آدمی تھا۔ باہر نکلا اور اس نے مائیک اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

’’خواتین و حضرات!

آپ کے لئے آپ کی تفریح طبع کے لئے زندگی کی بازی لگانے والوں میں سے ایک آپ کو خوش کرنے کی کوشش میں زندگی کی بازی ہار گیا ہے۔ ہو جاتا ہے ایسا۔ شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں گرتے ہیں۔ ہمارا ہر دلعزیز فنکار جو چند لمحات پہلے آپ کے سامنے اپنے کرتب دکھا رہا تھا اچانک ہی ہم سے روٹھ گیا ہے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کی تفریح طبع ہماری ذمے داری ہے۔ حکم فرمائیے کہ شو کو جاری رکھا جائے یا ہم اپنے ساتھی فنکار کی موت پر آنسو بہائیں؟ ہم شو پورا کریں گے۔ لیکن ہمارے دل رو رہے ہوں گے۔ ہمیں آپ کا حکم چاہئے۔ شو جاری رکھا جائے یا بند کر دیا جائے؟‘‘

بھلا کون ایسا تھا جو یہ کہتا کہ شو پورا کیا جائے۔ لوگوں نے چیخ چیخ کر کہا۔

"اب شو نہ کیا جائے۔"

اور اس کے بعد تماشبین سرکس سے باہر نکلنے لگے۔ بہت سوں نے تعزیتی الفاظ بھی کہے تھے۔ اس طرح پنڈال خالی ہو گیا۔ گلباز کی لاش ڈریسنگ روم میں رکھی ہوئی تھی۔ لاش کیا تھی، بس ایک عجیب وغریب چیز تھی۔ نچلا بدن اسی طرح ورزشی اور کسرتی اور باقی شانوں کے پاس سے سب کچھ ختم۔ لوگوں سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ سرکس میں یہ پہلا ایسا حادثہ ہوا تھا۔ چھوٹے موٹے حادثے تو چلتے ہی رہتے تھے لیکن یہ جو کچھ ہوا تھا وہ بہت ہی دکھ بھرا پہلو تھا۔ ایک گوشے میں شبیلہ خاموش کھڑی ہوئی اس سفید چادر کو دیکھ رہی تھی جس کے نیچے اس کا مستقبل سو گیا تھا۔ پھر کسی نے کہا۔

"فوراً کسی کو شہر روانہ کیا جائے۔ تاکہ گلباز کا بیٹا فوراً آ جائے۔ یہ کام ابھی کر لیا جائے۔"

ایک نوجوان نے اپنی پیشکش کر دی۔ وہ ہوسٹل کے بارے میں جانتا تھا۔ چنانچہ تیاریاں کر کے وہ روانہ ہو گیا۔

ہر طرف خاموشی اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ شبیلہ رو بھی نہیں رہی تھی۔ بس ساکت نگاہوں سے شوہر کی لاش کو دیکھے جا رہی تھی۔ طارق شاہ نے کئی بار نگاہیں اٹھا کر شبیلہ کی طرف دیکھا۔ نجانے کیا احساس تھا اس کے ذہن میں۔ وہ ہمدردی ظاہر کرنا چاہتا تھا لیکن اپنا صحیح مفہوم واضح نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر باقی تمام لوگ بھی غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ شہباز کو بلانے کے لئے جو نوجوان گیا تھا اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے، شہباز کو لے کر آ جائے۔ سرکس کی زندگی میں ایک ایسا بدترین حادثہ ہوا تھا کہ ہر شخص لرزہ بر اندام تھا۔

بہر حال جانے والے چلے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ دکھ کا باعث تھا۔ اور اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ تشویش فیض شاہ کے چہرے پر تھی۔ وہ مستقبل کی آنکھ سے دور تک دیکھ رہا تھا۔

✿......✿

طاہر فریدوں جانتا تھا کہ شہباز اس کا بیٹا نہیں ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان اپنے آپ

کو دھوکا دیتا ہے کہ پھر بچت کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں ہوتا۔ راحیلہ اب اچھی طرح صحیح الدماغ تھی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ شہباز، احتشام نہیں ہے۔ بس شکل وصورت احتشام کی ہے۔ فطرت میں بھی تھوڑی سی تبدیلی تھی لیکن اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی۔ اپنا غم بھلا رہی تھی۔ شہباز ویسے بری فطرت کا انسان نہیں تھا۔ آج تک اس نے اپنے لئے کوئی چیز نہیں مانگی تھی۔ وہ موبائل بھی اس سے کہیں گم ہو گیا تھا جو طاہر فریدوں نے اس کو خرید کر دیا تھا۔ ویسے اب اس کی وہ ضرورت نہیں رہی تھی جس کے تحت طاہر فریدوں نے اسے وہ موبائل لے کر دیا تھا۔ کیونکہ اب تو وہ ہوتا ہی طاہر فریدوں کی کوٹھی میں تھا۔ رقم بھی وہیں پس انداز کرتا تھا جو گلباز اسے بھیجتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ طاہر فریدوں خود اس کی ہر چیز کا خیال رکھتا تھا۔ لیکن اب زیادہ تر وقت شہباز کا طاہر فریدوں کی لیبارٹری میں ہی گزرتا تھا جہاں طاہر فریدوں کبھی کبھی اپنے پرائیویٹ مریضوں پر پلاسٹک سرجری کرتا تھا اور اس سلسلے میں نت نئے تجربات کرتا رہتا تھا۔ شہباز کو ان تمام چیزوں کے نام یاد ہو گئے تھے جو پلاسٹک سرجری میں استعمال ہوتی تھیں بلکہ شہباز اپنے طور پر اس میں بڑی جدتیں کرتا جا رہا تھا اور فریدوں اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھتا تھا۔ اتنا ذہین اور ہونہار شاگرد تو اسے کوشش کے باوجود نہیں مل سکتا تھا۔ کبھی کبھی جب کسی بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر طاہر فریدوں کے لئے کال آ جاتی تو وہ اسسٹنٹ کے طور پر شہباز کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس طرح شہباز کی شناسائیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ بہت نئے نئے لوگ دوست بن گئے تھے۔ لیکن وہ شہباز کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ شہباز اب زیادہ تر لیبارٹری میں مختلف قسم کے تجربات کرتا نظر آتا۔ اس وقت بھی وہ لیبارٹری میں تھا اور طاہر فریدوں کو حیران کئے ہوئے تھا۔ طاہر فریدوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"شہباز! تم انتہائی خطرناک انسان بن سکتے ہو۔ اگر تم جرم کی دنیا میں نکل جاؤ تو اتنے بڑے بڑے فراڈ کر سکتے ہو کہ دنیا دنگ رہ جائے۔"

"وہ کیسے انکل؟" شہباز نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"چہرے کی تبدیلی معمولی بات نہیں ہوتی۔ تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"انکل! ایک بات میں آپ کو بتا دوں، میں جس باپ کا بیٹا ہوں، اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی وجہ سے میں مجرم نہیں بلکہ جرم شکن بن سکتا ہوں۔ اس لئے آپ

میری طرف سے بے فکر رہیں۔"

"ہاں، تم اچھے انسان ہو شہباز! کبھی ہمیں بھی تو اپنے والدین سے ملاؤ۔"

"بتا چکا ہوں آپ کو، میرا باپ سرکس میں جھولے پر قلابازیاں کھاتا ہے اور میری ماں ایک سیدھی سادھی گھریلو عورت ہے جو سرکس ہی کے خیمے میں رہتی ہے۔"

"تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! کیا وہ آپ کے معیار کے مطابق ہیں؟"

"بیٹا! کیا اتنا ہی برا انسان پایا ہے تم نے مجھے؟ جس باپ کی اولاد تم ہو، ظاہر ہے وہ باپ بذاتِ خود کیا نہیں ہوگا۔ میں اس بات کو دل سے تسلیم کرتا ہوں اور میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ بڑے باپ کی اولاد بڑی ہی ہوتی ہے۔ یقیناً تمہارا باپ بھی معمولی انسان نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر کبھی ایسا کریں گے کہ اگر سرکس قریب ہی ہوا تو میں آپ کو اپنے ماں باپ سے ملانے لے جاؤں گا۔"

یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ملازم لیبارٹری میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر فریدوں لیبارٹری میں فون نہیں رکھتا تھا تاکہ اس کے کام میں مداخلت نہ ہو۔ ملازم نے ادب سے کہا۔

"سر! ایک شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"کون ہے؟"

"وہ شاید بابا صاحب کے پاس آیا ہے۔" ملازم نے شہباز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میرے پاس؟" شہباز حیرت سے بولا۔

"جی۔ ہوسٹل سے آپ کا پتہ لے کر آیا ہے۔"

"کون ہے...... کیا میں جا کر دیکھوں؟"

"ہاں ضرور جاؤ۔"

آنے والا سرکس کا وہی نوجوان تھا جو گلباز کی موت کی خبر لے کر آیا تھا۔ لیکن اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ شہباز کو اصل بات نہ بتائی جائے بلکہ اسے اپنے ساتھ لے کر آیا جائے۔ آنے کے بعد اسے تفصیلات معلوم ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ پتہ نہیں اتنی دور رہ کر باپ کی موت کی خبر سن کر اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے۔ شہباز نے اس شخص کو پہچان لیا اور بولا۔

"ارے خیریت، تم......؟"

"ہاں شہباز! طارق شاہ نے آپ کو فوراً بلایا ہے اور مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں۔"

"کیوں، خیریت...... میرے ماں باپ تو ٹھیک ہیں ناں؟"

"ہاں، وہ ٹھیک ہیں۔ کوئی ایسا اہم کام آ پڑا ہے شاہ جی کو آپ سے کہ انہوں نے کہا ہے کہ میں آپ کو ساتھ ہی لے کر آؤں۔ ہر قیمت پر......"

"آخر ایسا کیا کام ہو سکتا ہے۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں اس بارے میں؟"

"نہیں شہباز! ہم نوکر ہیں۔ مالک کیا ہمیں اپنی بات بتاتے ہیں؟ بابا فیض شاہ نے بھی یہی کہا ہے کہ آپ کو فوراً ہی ساتھ لے آیا جائے۔"

"ایسا کبھی ہوا نہیں ہے۔ ضرور کوئی اتنی ہی اہم بات ہوگی۔"

"تمہیں جانا چاہئے اور فوراً جانا چاہئے۔ ظاہر ہے وہاں تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔ تمہیں بلانے کی کوئی اہم وجہ ہی ہو سکتی ہے۔ بلاوجہ تو اس شخص کو تمہیں بلانے کے لئے نہیں بھیج دیا گیا ہوگا۔ جاؤ، تیاریاں کرو۔" پیچھے سے طاہر فریدوں کی آواز سنائی دی جو جانے کیوں تجسس میں ڈوبا ہوا ادھر آ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"ایسے ہی اٹھ کر نہ چلے جاؤ۔ دو تین جوڑے کپڑے بھی لے جاؤ۔ اب جا رہے ہو تو تھوڑا وقت ماں باپ کے ساتھ گزار آنا۔" طاہر فریدوں نے کہا اور شہباز نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ تیاریوں کے ساتھ راحیلہ سے ملاقات کر کے یہاں سے چل پڑا۔ راحیلہ نے چلتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! بہت زیادہ وقت مت لگانا۔ تمہارے بغیر اب زندگی کچھ ناممکن سی ہو گئی ہے۔"

شہباز اسے تسلیاں دیتا ہوا چل پڑا۔ لیکن اس کا ذہن شدید بے چینی کا شکار تھا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔

"سرکس اس وقت کہاں ہے؟"

"مان پوری میں جناب! کوئی چھ سات گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ ہم یہاں سے کھیڑہ چلیں گے۔ کھیڑہ سے ہمیں دوسری بس مان پوری کے لئے ملے گی۔ قصبہ ہے۔ سرکس آج کل

وہیں لگا ہوا ہے۔"

"ہاں...... میں نے نام سنا ہے۔ ویسے سب خیریت تو ہے ناوہاں؟"

"جی......"

"مگر میں تمہارے چہرے پر کچھ تشویش دیکھ رہا ہوں۔"

"نہیں شہباز بھائی! ہماری تو شکل ہی ایسی ہے۔"

"نہیں استاد! کچھ چکر ہے ضرور۔ بتاؤ گے نہیں؟ کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے؟"

"بالکل نہیں۔ اور اگر ہوا بھی ہے تو ہمارے علم میں نہیں ہے۔" شہباز خاموش ہو گیا۔ لیکن نجانے کیوں ذہن پر ایک کرید سوار ہو چکی تھی۔ کھیڑہ نامی بستی پہنچے وہاں سے مان پوری کا سفر چار گھنٹے کا تھا۔

آخر کار یہ چار گھنٹے بھی طے ہوئے اور اس کے بعد وہ مان پوری پہنچ گئے۔ ایک تانگہ کر کے انہوں نے سرکس کا پتہ بتایا اور تانگہ انہیں لے کر چل پڑا۔ پھر اسے سرکس کے اونچے اونچے تمبو نظر آ گئے تو شہباز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔ کیسا چل رہا ہے سرکس یہاں؟"

"ٹھیک چل رہا ہے شہباز بھائی!" وہ افسردگی سے بولا۔ اور شہباز پھر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"بتاؤ گے نہیں کیا بات ہے...... خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں، خیریت ہے۔"

"یار! یقین کرو، میرا دل چاہتا ہے کہ میں سرکس کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں۔ مگر پتہ نہیں کیوں مجھے یہاں سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک حسین زندگی ہے۔ بہت ہی خوبصورت۔"

تانگہ سرکس پہنچ گیا۔ ایک عجیب سی سوگوار فضا چاروں طرف طاری تھی۔ لوگ خاموش خاموش سے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ شہباز تانگے سے اُترا تو بہت سے لوگ ساکت ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ شہباز کا دل ڈولنے لگا۔ بات معمولی نہیں ہے۔ سب کی توجہ میری جانب کیوں ہے؟ لیکن اب اس نے کسی سے کچھ پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے والا بابو خان تھا۔ بابو خان نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور آنسو بہانے لگا۔ شہباز نے کرخت نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو بات ہے مجھے نہیں معلوم۔ آپ کیوں رو رہے ہیں بابو چاچا؟"

"بیٹا! تیرا باپ دنیا سے چلا گیا۔" بابو خان نے انکشاف کیا اور شہباز پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بابو خان کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر گردن گھما کر اس شخص کو تلاش کیا جو اسے لے کر یہاں تک آیا تھا۔ اگر وہ اسے مل جاتا تو یقیناً شہباز اسے نقصان پہنچا دیتا۔

"کیا ہوا میرے باپ کو؟" شہباز نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"حادثہ ہو گیا بیٹا! گلباز جھولے سے گر کر مالک حقیقی سے جا ملا۔ اپنا فرض پورا کرتے ہوئے گر کر مر گیا۔"

شہباز کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔ دیر تک خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"ماں کہاں ہے؟"

"کیفیت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ گلباز کے غم سے نڈھال ہے۔ آؤ......" پھر بابو خان اسے اس خیمے میں لے گیا جہاں گلباز کی لاش رکھی ہوئی تھی۔

فیض شاہ، گلباز کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ رونے پیٹنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ شہباز نے اپنے باپ کو دیکھا اور بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے چونک کر کہا۔

"ماں کہاں ہے؟"

"اپنے خیمے میں ہے۔ بری حالت ہو رہی ہے اس کی۔"

شہباز وہاں سے ہٹ کر شبیلہ کے پاس پہنچا۔ شبیلہ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے غم آلود نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور شہباز اس کے قریب پہنچ گیا۔ ماں کا سر اپنی آغوش میں رکھ کر اس نے کہا۔

"میں ہوں...... ماں! میں ہوں۔"

اور ان الفاظ پر جیسے شبیلہ کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ جس طرح وہ روئی اس نے سب کے جگر پانی کر دیئے۔ شہباز خاموشی سے ماں کے سر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اس کے بعد اور کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ بس ذہن میں ماضی گھوم رہا تھا۔ گلباز کی محبت خاموش خاموش سی تھی۔ وہ الفاظ اسے یاد تھے۔

"یار! میں تجھے اتنے اونچے جھولے پر قلابازیاں کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔ باپ ہوں نا، خود چاہے کچھ بھی کرلوں، تیرے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اور پھر بیٹا! زندگی کی ڈگر بدلنی بھی چاہئے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ تو یہی سب کچھ کرے۔ وقت کی کہانی تو بدل بھی جاتی ہے۔"

باپ کے سامنے کھڑے ہوکر کیا کہتا۔ لاش ہی مسخ ہوگئی تھی۔ کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

"بہر حال بیٹا آ گیا تھا۔ اس کے بعد گلباز کی تدفین میں کوئی بیچ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ طارق شاہ نے کہا۔

"کیا کہتے ہو شہباز! تدفین کردی جائے؟"

"آپ بڑے ہیں شاہ جی! جیسا آپ پسند کریں۔ میں کیا بول سکتا ہوں ان معاملات میں۔ جو کرنا ہے وہ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیر کرنے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی۔" شہباز نے جواب دیا اور طارق شاہ نے ہدایت کی کہ گلباز کی تدفین کی تیاری کی جائے۔

سرکس تین دن کے لئے بند کردیا تھا۔ سرکس تین دن کے لئے، تین ہفتوں کیلئے یا تین مہینوں کے لئے بند کیا جاتا، اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ ایک شخص اپنی زندگی کا فرض پورا کر کے دنیا سے چلا گیا تھا۔ سرکس آج یہاں، کل وہاں، پھر کہیں اور۔ لیکن جو یہاں رہ گیا تھا وہ اب سرکس کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ شہباز پر باپ کی موت کا گہرا اثر تھا۔ شبیلہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھتی رہتی تھی۔ ظاہر ہے زندگی بھر کا ساتھ لمحوں میں ختم نہیں ہو جاتا۔ لمحہ لمحہ کی رفاقت یاد آتی ہے۔ اور شبیلہ بیٹھے بیٹھے اکثر جملے بول پڑتی تھی۔ ادھر شہباز اپنے سب سے برے وقت کو گزار رہا تھا۔ دوہری کیفیت تھی اس کی۔ پہلے بھی درجنوں بار اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ سرکس ہی میں رہے۔ اپنے ماں باپ سے دور نہ جائے۔ یہ زندگی اسے پسند تھی۔ بس یہ گلباز کی ضد تھی کہ اس نے اسے اس زندگی سے دور کردیا تھا۔ بے شک ایف ایس سی اس نے بڑی عمدگی کے ساتھ پاس کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس وقت تک تعلیم حاصل کرتا رہتا جب تک کہ باپ کی خواہش ہوتی۔ اپنے دل کی بات اس نے ایک آدھ بار گلباز سے کہی تھی لیکن گلباز نے اس کا جو جواب دیا تھا، اس جواب نے اسے خاموش کردیا تھا اور اس نے باپ کی ہی خواہش پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن اب گلباز سر پر نہیں تھا۔ وہ مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ کیوں نہ سرکس ہی میں

زندگی گزاری جائے۔ یہیں رہ کر اپنا کام کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اسے ڈاکٹر فریدوں اور راحیلہ بھی یاد آتے تھے۔ بڑا پیار دیا تھا انہوں نے اسے۔ اتنی محبت دی تھی کہ کبھی کبھی وہ ان کے پیار پر شرمندہ ہو جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بات سچائیوں کی بنیاد پر چل رہی تھی۔ راحیلہ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ اسے بتا دیا گیا تھا کہ یہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ اپنے آپ کو بہلاووں میں رکھنا چاہتے تھے اور اسے احتشام جیسا ہی مقام دیا گیا تھا۔ لیکن اب پھر سے فرض کا آغاز ہو گیا تھا۔ فیض شاہ نے اس سے کہا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو بیٹا! کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"اُلجھن میں ہوں بابا صاحب! میرا ذہن فیصلہ نہیں کر پاتا۔"

"بیٹے! شبیلہ کو اب تمہاری اشد ضرورت ہے۔ شبیلہ تنہا نہیں رہ سکتی۔ یا تو اسے بھی اپنے ساتھ شہر لے جاؤ یا پھر تم بھی یہیں رہو۔"

"نہیں بابا! شہر کی زندگی اب نہ ماں کو راس آئے گی اور نہ مجھے۔ میں معافی چاہتا ہوں بابا! پہلے بھی میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں اپنے باپ ہی کی طرح سرکس میں رہ کر زندگی گزاروں اور یہیں پر جو کچھ کرنا ہے کروں۔ لیکن میرے باپ کی خواہش تھی کہ میں تعلیم حاصل کروں۔ شہر کی زندگی میں رہ کر میں نے بہت کچھ دیکھا۔ بے شک تعلیم انسان کے ذہن کو روشن کر دیتی ہے۔ لیکن دور کچھ ایسا آ گیا ہے کہ صرف تھوڑا سا پڑھ لکھ کر مستقبل نہیں بنایا جا سکتا۔ شہر میں کلرکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بلکہ اب تو کلرکی بھی نہیں ملتی۔ میں کبھی بھی کلرک نہیں بننا چاہتا تھا۔ بابا صاحب! کچھ بھی نہیں ہے شہر میں۔ کیا کروں گا ماں کو وہاں لے جاکر۔ غربت کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ میں دیکھ چکا ہوں وہاں کی دنیا کو۔ آپ یقین کریں وہاں ہنگامہ آرائی تو ہے، ایک خوشگوار زندگی نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹے! ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میں تمہاری بات سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سرکس میں......"

"جی بابا صاحب! کہئے۔"

"نہیں، میرا مطلب تھا کہ یہاں تم کیا کرو گے؟ گلباز تو اپنے فن کا فنکار تھا۔ تمہاری ماں بھی ایک سیدھی سادھی عورت ہے اور صرف اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ تم

تو سرکس کا کوئی کھیل بھی نہیں جانتے۔"

"جی بابا صاحب! لیکن یہاں لکھنے پڑھنے کے بھی تو بہت سے کام ہوتے ہیں۔ کاغذات رکھے جاتے ہیں، حسابات رکھے جاتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ مستحق اس بات کا اور کون ہو سکتا ہے کہ مجھے یہاں لکھنے پڑھنے کی ملازمت دے دی جائے۔ میرے باپ نے اپنی پوری زندگی سرکس کو دی ہے۔ یہاں تک کہ موت بھی سرکس کے کھیل میں ہی اپنائی ہے۔ میرا حق بنتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ طارق شاہ سے بات کروں گا۔" فیض شاہ نے کہا۔ پھر ایک دن شبیلہ بلک بلک کر رو پڑی۔ اس نے بیٹے کے سر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کہیں مت جانا شہباز! اب کہیں مت جانا۔ تو ہوتا تو شاید گلباز نہ مرتا۔ کبھی مت جانا۔"

شہباز نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "نہیں ماں! بھلا تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟ اب تیرے علاوہ میرے پاس ہے کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں تعلیم حاصل کروں۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ کسی طور ممکن نہیں ہو سکا۔ میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟ ہماری زندگی کا آغاز یہیں سے ہوا تھا ماں! اور یہیں میرے باپ کی طرح میری زندگی کا بھی اختتام ہوگا۔ ماں! ہم لوگ تو پیدا ہی یہاں کے لئے ہوئے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہتا؟"

شبیلہ آنسوؤں کے درمیان گردن ہلانے لگی تھی۔

سرکس کے کام شروع ہو گئے۔ زندگی کہاں رکتی ہے۔ زندگی تو ہے ہی روانی کا نام۔ بے شک اتنی جلدی لوگ گلباز کو بھول نہیں سکتے تھے۔ جھولے پر دوسرے آدمی نے کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن سرکس والوں کی نگاہیں خاص طور سے جھولے پر گلباز کو ہی تلاش کرتی تھیں۔ اس جیسا فنکار بہت عرصے کے بعد بنتا ہے۔ اتنا ماہر تھا وہ کہ دیکھنے والے اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن وہی کہا جاتا ہے نا کہ، تیراک ہی سمندر میں ڈوبتا ہے۔ جو تیرنا نہیں جانتا وہ بھلا سمندر کو کیا جانے۔ اسی طرح گلباز نے بھی اتنی بلندی سے گر کر جان دے دی تھی۔

پھر ایک دن جب سرکس کسی اور شہر میں منتقل ہو چکا تھا اور گلباز کی کہانی پیچھے رہ گئی۔ پھر موسم بھر آیا اور بادلوں کی رم جھم شروع ہو گئی۔ ماحول بہت دلکش تھا۔ جس جگہ سرکس لگا ہوا

تھا وہاں چاروں طرف پہاڑیاں تھیں اور ان پر سبزہ لدا ہوا تھا۔ بارش نے ان پہاڑیوں کو اور حسین رنگ بخش دیئے تھے۔ کسی کام سے طارق شاہ باہر نکلا اور اِدھر اُدھر گھومتا ہوا ایک مخصوص جگہ پہنچا تو اس نے تھوڑے فاصلے پر شبیلہ کو دیکھا۔ وہ ایک رسیوں کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی تھی اور ویران نگاہوں سے دور خلا میں تک رہی تھی۔ طارق شاہ کے دل میں ایک بار پھر محبت کا طوفان اُمڈ آیا۔ بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا لیکن اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ابھی تھوڑے ہی عرصے پہلے کی بات تھی کہ اس نے ایک دن شبیلہ کو پیلے رنگ کے جوڑے میں ملبوس بارش کی پھوار سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ کس قدر حسین لگ رہی تھی۔ حسین تو وہ اس وقت بھی لگ رہی تھی لیکن انداز ذرا سا بدلا ہوا تھا۔ اس وقت بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ لباس بھی میلا کچیلا سا تھا لیکن یا تو اپنی نظر کا حسنِ نظر ہوتا ہے یا پھر شبیلہ تھی ہی دلکش۔ اس کا یہ روپ بھی بڑا ہی بھلا لگ رہا تھا۔

طارق شاہ کے دل میں طوفان اُمڈتے رہے۔ پھر کسی خیال کے تحت وہ واپس پلٹا۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر آیا تو پلاسٹک کی کور میں اس کے پاس پیلے رنگ کا ایک انتہائی خوبصورت جوڑا تھا۔ وہ اس جوڑے کو لے کر آہستہ آہستہ شبیلہ کی جانب چل پڑا۔ اس وقت اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔

شبیلہ اپنی جگہ موجود تھی اور بدستور خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ طارق شاہ نے آگے بڑھ کر پیلا جوڑا اس کے سامنے کیا تو شبیلہ چونک پڑی۔ اس نے حیرت سے اس جوڑے کو دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی رہی...... پھر اس نے طارق شاہ کو دیکھا اور بولی۔

"یہ کیا ہے شاہ جی؟"

"پیلا جوڑا۔ موسم کا رنگ ہے۔" طارق شاہ نے کہا۔

"تو پھر......؟"

"پہن لو۔"

"میں......؟"

"ہاں...... تمہارے ہی لئے لایا ہوں۔"

"کیوں؟"

"تمہیں پسند ہے نا یہ رنگ۔"

''نہیں شاہ جی!''

''مگر میں نے تمہیں دیکھا ہے یہ رنگ پہنے ہوئے۔ خاص طور سے اس موسم میں۔''

''ہاں، پہنتی تھی۔ مگر......''

''ہاں...... بولو شبیلہ!''

''مجھے یہ رنگ پسند نہیں تھا۔ بلکہ...... بلکہ گلباز کو پسند تھا۔ اس نے ہی پیلا جوڑا میرے لئے خریدا تھا۔ میں اسی کے لئے وہ جوڑا پہنتی تھی۔

''اسے پہن لو شبیلہ!''

''اب کس کے لئے پہنوں شاہ جی؟'' شبیلہ نے غم آلود لہجے میں کہا۔

''میرے لئے شبیلہ! میرے لئے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا، میرے دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے رہیں گے۔ تم ان دروازوں سے گزر کر اندر تو آؤ۔''

شبیلہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے شدید نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''کاش آپ ہمارے مالک نہ ہوتے شاہ جی! کاش آپ کا نمک نہ کھایا ہوتا میں نے۔ پھر میں آپ کو بتاتی...... پھر جواب دیتی میں آپ کو......''

اس نے پوری قوت سے جوڑے کا پیکٹ طارق شاہ کے منہ پر مارا اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

☆......☆

طارق شاہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کا لایا ہوا جوڑا اس کے پیروں میں پڑا ہوا تھا۔ اچانک پیچھے سے جگو نمودار ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر زمین پر پڑا ہوا جوڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں مالک! مگر میں کیا کروں۔ دیکھو، اس وقت بھی میں ٹوٹی ہوئی رسیوں کے سرے تلاش کر رہا تھا۔''

''کیا تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے؟ تو ہر اس جگہ موجود ہوتا ہے جہاں میری توہین ہو رہی ہو۔''

''تم خاموشی سے مجھے قتل کر دو۔ اُف تک نہیں کروں گا۔ لیکن ایک بات تم سے ضرور کہنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں ہے۔''

''بکو......'' طارق شاہ بولا۔

''یہ عورت......!''

''کون......؟''

''صرف شبیلہ کی بات کر رہا ہوں۔''

''ہوں۔ آگے بولو۔''

''بہت مغرور ہے مالک! اگر یہ گلباز کو اپنا غرور سمجھتی تھی تو وہ غرور اب ٹوٹ چکا ہے مالک! آپ ہمارے آقا ہیں۔ ہم آپ کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ آخر یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ اسے کس بات کا غرور ہے، بس مجھے یہ بتا دو۔''

''میں کیا بتاؤں۔''

''تب مجھے اجازت دو۔''

''کیسی اجازت؟''

"اس سے پوچھوں آقا کہ کیا ملا اسے گلباز سے شادی کر کے؟ اس نے میرے آقا کو ٹھکرا کر اس سے شادی کی تھی۔ اب کیا کرے گی۔"

"جگو...... ایک بات بتائے گا؟"

"پوچھو مالک!"

"تو نے ایک بار پہلے بھی اس بات پر نفرت کا اظہار کیا تھا۔

"تمہارے سامنے صرف ایک بار کیا تھا۔"

"کیوں؟"

"اس بات پر تو میں برسوں سے نفرت کرتا آیا ہوں مالک! سچ مانو تو یہ دونوں کبھی تمہارے وفادار تھے ہی نہیں۔"

"دونوں...... کیا گلباز بھی؟"

"ہاں دونوں۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک بات بتاؤ مالک! یہ سرکس تمہارے پُرکھوں نے بنایا تھا۔"

"ہوں۔"

"اور یہی تمہاری روزی ہے۔ ہماری بھی روزی یہی ہے۔ ہمارے لئے اس سے بڑی چیز اور کوئی ہو سکتی ہے؟"

"ہونی تو نہیں چاہئے۔"

"بالکل نہیں ہونی چاہئے مالک! مگر گلباز سرکس کی نوکری کو گھٹیا سمجھتا تھا۔"

"کیا......؟"

"ٹھیک کہتا ہوں مالک!"

"اس نے تم سے کہا تھا؟"

"نہیں۔"

"پھر تمہیں کیسے معلوم؟"

"اس نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لئے شہر بھیج دیا تھا۔ کہتا تھا کہ اسے سرکس کے جھولوں پر کام کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اسے سرکاری افسر بنائے گا وہ۔"

طارق شاہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہاں، تمہاری بات میں وزن ہے۔"

"پورا وزن ہے مالک! وہ ہمارا ساتھی تھا۔ ہمیں اس سے کوئی پرخاش نہیں تھی مالک! ساتھیوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ آپ سے محبت ہے۔ بے شک وہ اپنا فرض پورا کر کے چلا گیا لیکن یہ عورت...... آخر یہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے مالک! آپ کچھ بھی کہو، جگو کو اس کی باتوں کی سزا دے دو۔ پر ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ ایک بار پہلے بھی اس نے آپ کی توہین کی تھی۔ ہم دل مسوس کر رہ گئے تھے۔ بلکہ غصہ تو آیا تھا کہ اس کا غرور اچھی طرح نکال دیں۔ سمجھا دیں اسے کہ مالک کی توہین کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اور بس دل مسوس کر رہ گئے تھے۔"

"جگو! ایک بات بتاؤ گے؟"

"جی مالک!"

"میرے ذہن میں بار بار یہ سوال آ رہا ہے کہ گلباز تو ایک تندرست آدمی تھا۔ اپنے کام کا ماہر بھی تھا۔ کیا ہوا جو وہ جھولے سے گر گیا؟"

"نہیں مالک! ٹھیک ہے یہ بات۔ بہت ساری خرابی کی تھی۔ پر قاتل نہیں ہیں ہم۔ بننا بھی نہیں چاہتے۔ اور پھر اس بے چارے کو کوئی نقصان پہنچانے سے ہمیں کیا فائدہ؟ ہاں، اگر حکم دو تو اسے ٹھیک کر دیں ہم۔" بونے جگو نے زیادہ اونچی باتیں کرتے ہوئے کہا۔

لیکن طارق شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"نہیں جگو...... نہیں، میں تمہیں سچ بتاؤں، بہت چاہتا ہوں میں اسے۔ بڑی غلطی کی اس نے میری محبت کو ٹھکرا کر۔ مگر محبت ایسی ہی سرپھری چیز ہوتی ہے۔ اگر وہ میری بن جاتی تو اس سرکس کی مالک ہوتی اور بڑے عیش کر رہی ہوتی۔ مگر ٹھیک ہے......"

"مالک! ہم سے آپ کی توہین نہیں برداشت ہوتی۔"

"میں سوچوں گا اس بارے میں اور فیصلہ کروں گا۔" طارق شاہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔

پھر فیض شاہ شہباز کو لے کر طارق شاہ کے پاس آیا۔ طارق شاہ نے گہری نگاہوں سے شبیلہ کے بیٹے کو دیکھا۔ خوبصورت، تندرست و توانا۔ چہرے پر ایک ایسی بے باکی جسے دیکھ کر مدمقابل کو خود بخود احساسِ کمتری پیدا ہو جائے۔ آنکھوں میں بجلیوں جیسی تڑپ۔ بڑا

دلکش نوجوان تھا یہ۔ لیکن پھر ایک دم سے اس کے دماغ پر ایک دھند سی چھا گئی۔ یہ گلباز اور شبیلہ کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ اس سے اس نوجوان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا چہرہ خشک ہو گیا۔ فیض شاہ نے کہا۔

''مالک! یہ شہباز ہے۔ آپ کے گلباز کا بیٹا۔''

''کیا بات ہے فیض شاہ! تم اس کا تعارف کیوں کرا رہے ہو؟ کیا میں اسے نہیں جانتا؟''

''ہاں مالک! جانتے ہیں۔ گلباز نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ سرکس کو دیا ہے۔ اب یہ اپنی خدمات سرکس کو پیش کرنا چاہتا ہے۔''

''یہ......؟'' طارق شاہ نے کمال بے نیازی سے کہا۔

''جی مالک......''

''تو کیا گلباز نے اسے جھولے کا کام سکھا دیا تھا؟''

''نہیں مالک! آپ کے علم میں ہے یہ بات۔ اس نے تو سرکس کا کوئی کام نہیں سیکھا۔''

''ہاں، ہمارے علم میں ہے یہ بات۔ اور ہم ہمیشہ اس بات پر دکھی رہے ہیں کہ گلباز نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ کیا سرکس اس کے لئے اتنا ہی بے حقیقت تھا یا پھر...... خیر چھوڑو فیض شاہ! بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''مالک! اس نے تعلیم حاصل کی ہے۔ سرکس میں لکھنے پڑھنے کے کاموں پر اسے لگا دیا جائے۔ اس سے زیادہ وفادار اور کون ہو سکتا ہے؟ اسے کیش پر لگا دیا جائے۔ اس کی تو ہر طرح سے ضمانت ہے۔''

''فیض شاہ! تمہارے علم میں یہ بات ہے کہ ہم کسی کو اس کے کام سے ہٹاتے نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں کیش پر بھی آدمی لگا ہوا ہے۔ باقی لکھنے پڑھنے کے کام بھی جو لوگ کرتے ہیں ان کے بارے میں تم جانتے ہو۔ مزید گنجائش کہاں ہے۔''

''پھر بھی شاہ جی! کرنا تو ہے نا کچھ نہ کچھ۔''

''میں خود بہت دن سے یہ بات سوچ رہا تھا۔ بات اصل میں یہ ہے فیض شاہ صاحب! یا چچا جان! کہ میرا ایک اصول رہا ہے۔ کام کے لوگوں کو ساتھ رکھا جائے اور جن کا کوئی کام

نہ ہو انہیں رکھنا بالکل بے مقصد ہوتا ہے۔ اور میں بے مقصد کام نہیں کرتا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔''

''کیا مطلب......؟'' فیض شاہ نے حیرت سے کہا۔

''اب یہ ماں بیٹا میرے لئے بالکل بے مقصد اور فالتو چیز ہیں۔ اور پھر گلباز نے تو ویسے بھی یہی سوچا تھا کہ اپنے بیٹے کو سرکس میں کام نہیں کرنے دے گا۔ ٹھیک ہے، گلباز چلا گیا لیکن اسے اس قابل بنا گیا ہے کہ باہر کی دنیا میں اپنا مقام تلاش کرے اور اپنی ماں کو کہیں مناسب جگہ لے جا کر رکھے۔ سرکس میں تو اب اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شہباز! تم نے میری بات سن لی۔ اب یہاں دو چار دن کے لئے تم مہمان کی حیثیت سے رہ سکتے ہو۔ باقی تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

شہباز نے فیض شاہ کو دیکھا، پھر طارق شاہ کو۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں شاہ جی! واقعی ہمیں بے مقصد یہاں نہیں رہنا چاہئے۔''

''گلباز نے ہمارے لئے کافی عرصہ کام کیا۔ تھوڑے بہت پیسے ہم تمہیں دے سکتے ہیں۔ اپنی ماں کو لے کر جس قدر جلد ممکن ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔ کہاں جاؤ گے یہ بات ہم نہیں جانتے۔ اولاد جب جوان ہو جاتی ہے تو اپنے مستقبل خود تلاش کرتی ہے۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں بہت جلد ماں کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

فیض شاہ حیرت سے منہ کھولے یہ تمام باتیں سن رہا تھا۔ وہ رحیم شاہ کا دوست تھا۔ طارق شاہ کے باپ کا دوست۔ طارق شاہ ویسے بھی اسے بڑی عزت اور احترام دیتا تھا۔ لیکن اس وقت جو طارق شاہ بول رہا تھا، یہ تو بالکل ہی ایک حیرت ناک کردار تھا۔

شہباز باہر نکل گیا لیکن فیض شاہ وہیں بیٹھا رہا۔ فیض شاہ نے کہا۔

''یہ تم نے کیا، کیا طارق شاہ؟''

''کیوں...... کیا میں نے ٹھیک نہیں کیا ہے؟''

''تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ سفارش میں نے تم سے کی تھی۔''

''سوچا کیا، سنا بھی تھا چچا جان! لیکن ہر سفارش مانی تو نہیں جا سکتی۔''

''کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔''

''جی کہئے۔''

’’کیا یہ شبیلہ کی محبت میں ناکام ہونے کا نتیجہ ہے؟‘‘

’’جی چچا جان! ایسی ہی بات ہے۔‘‘ طارق شاہ بھی بولڈ آدمی تھا۔ فیض شاہ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ پھر بھی کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

’’تو تم اس سے انتقام لے رہے ہو۔‘‘

’’نہیں...... آپ اسے انتقام تو نہیں کہہ سکتے۔ اپنی انا، اپنی سوچ کہہ سکتے ہیں۔ گلباز ہمارے سرکس کا ایک اہم رکن تھا۔ اس کا آئیٹم بہت پسند کیا جاتا تھا۔ میں گلباز کو بھی نکال سکتا تھا اس کی زندگی میں۔ لیکن میں نے سرکس کا نقصان کرنا پسند نہیں کیا۔ ہاں، اب جبکہ گلباز ہمارے درمیان نہیں ہے تو میں ایک ایسی لڑکی کو برداشت کیوں کروں جس نے میری محبت کو ٹھکرا کر میرے ہی سرکس کے ایک معمولی سے آدمی سے شادی کر لی تھی۔‘‘

’’وہ اس سے محبت کرتی تھی۔‘‘ فیض شاہ نے کہا۔

’’میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔‘‘

’’تم بہت عجیب باتیں کر رہے ہو طارق شاہ! مجھے تم سے اس کی امید نہیں تھی۔ اب بیٹا! میں ایک بات کہوں۔‘‘

’’جی چچا جان! فرمائیے؟‘‘

’’شہباز کو اپنے ہاں ملازم رکھ لو۔ شبیلہ کو یہاں سے نہ نکالو۔‘‘

’’نہیں چچا جان! میں تو اپنا فیصلہ دے چکا ہوں اور شاید میرے اور آپ کے درمیان کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب میں کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہوں تو اس سے منحرف نہیں ہوتا۔‘‘

’’بیٹا! ابھی وہ بچہ ہے۔ دنیا نہیں دیکھی ہے اس نے۔ کہاں نوکری کرے گا۔ کیا کرے گا؟‘‘

’’وہ جوان ہے۔ اسے اپنا مستقبل تلاش کرنا ہوگا۔‘‘

’’کیا تم نے اپنا مستقبل تلاش کیا تھا؟‘‘ فیض شاہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’تمہارے باپ نے یہ سرکس تمہیں بنا کر دیا تھا۔‘‘

’’تو پھر؟‘‘

’’اس کے لئے ایسا کوئی اچھا مستقبل ابھی ممکن نہیں ہے۔‘‘

’’میں اس کا ذمے دار نہیں ہوں۔ میرا اس سے کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔‘‘

’’طارق شاہ! دیوانے ہو گئے ہو تم؟‘‘

’’ہاں چچا جان! دیوانہ ہو گیا ہوں میں۔‘‘

’’میرا بھی خیال نہیں کرو گے؟ میں اس سرکس کے بانیوں میں سے ہوں۔‘‘

’’آپ سر آنکھوں پر، میرے سینے میں رہیں آپ۔ بڑی عزت، بڑا احترام کرتا ہوں میں آپ کا۔ لیکن چچا جان! محبت اور جنگ کے معاملات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اچھا ایک کام کیجئے، آپ جو حکم دیں گے وہ مان لوں گا میں۔‘‘

’’کیا کام......؟‘‘ فیض شاہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

’’شبیلہ بیوہ ہو چکی ہے۔ اس کی عدت کے دن پورے ہو جانے چاہئیں۔ اور اس کے بعد اس سے کہیں کہ مجھ سے شادی کر لے۔ کتنے دن باقی رہ گئے اس کی عدت کے، میرا خیال ہے دس بارہ، پندرہ دن۔ کئی مہینے تو ہو چکے ہیں گلباز کے انتقال کو۔‘‘

فیض شاہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے طارق شاہ کو دیکھا، پھر بولا۔

’’یعنی ایک جوان بیٹے کی ماں سے تم شادی کرو گے...... یعنی ایسی عمر رسیدہ عورت سے جو اب لڑکی نہیں ہے؟‘‘

’’بے شک لڑکی نہیں ہے۔ لیکن میری محبت ہے۔ بولئے کریں گے آپ ایسا؟ یہ بھی بتا دیجئے اسے کہ اگر وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے تو میں شہباز کو اس سرکس کا مینجر بنا دوں گا اور میری موت کے بعد شہباز اسی طرح اس سرکس کا حصے دار ہوگا جس طرح اگر شبیلہ کے بطن سے میری کوئی اولاد پیدا ہوئی تو وہ ہوگی۔ میں اسے بیٹے ہی کا درجہ دوں گا۔ جائیے مجھ سے تو آپ ایثار کی بات کر رہے ہیں لیکن شبیلہ سے بھی تو کیجئے۔‘‘

فیض شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ طارق شاہ کو گھورتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ عجیب و غریب صورتحال سامنے آ گئی تھی۔ یہ طارق شاہ اتنا سخت گیر نکلے گا یہ بات فیض شاہ نے نہیں سوچی تھی۔

بہرحال وہ واپس آیا اور اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔ طارق شاہ کی باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں اور اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اسے شہباز کا خیال آیا اور وہ

اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا کرنا چاہئے؟ کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ سامنے ہی اسے طارق شاہ جاتا ہوا نظر آیا۔ ایک بار پھر اس کے دل میں امید کی ایک کرن نمودار ہوگئی۔ اس نے زور سے آواز دی۔

''شاہ جی! میری بات سنیں۔''

طارق شاہ رک گیا۔ فیض شاہ اس کے پاس پہنچ گیا۔

''وہ شاہ جی! کافی دیر ہوگئی ہے میری آپ سے بات ہوئے۔ یقیناً آپ کے دماغ میں بھی وہ الفاظ چکراتے رہے ہوں گے جو میں آپ سے کہہ کر آیا تھا۔''

''نہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں ذرا مختلف قسم کا آدمی ہوں۔ میں کہنے سے پہلے سوچتا ہوں اور جب کہہ دیتا ہوں تو سوچتا نہیں ہوں۔''

''حرام کے پلّے! ٹیوں ٹیوں کرتا تھا۔ اور میرے کندھے سے ناک صاف کرتا رہتا تھا۔ پھر کندھے ہی سے لگا لگا سو جاتا تھا۔ اور آج میرے سامنے کہہ رہا ہے حرامی! کہ مختلف قسم کا انسان ہے۔ ابے کہاں سے ہو گیا تو مختلف؟'' فیض شاہ اپنی اصل پر اتر آیا اور طارق شاہ ہنس پڑا۔

''مجھے آپ کے یہ الفاظ اچھے لگتے ہیں۔ کیونکہ بابا صاحب کے انتقال کے بعد صرف آپ کی شخصیت ایسی ہے چچا جان! جو مجھ سے یہ جملے کہتی ہے۔ ورنہ باقی سب تو مالک مالک کہتے ہوئے نہیں تھکتے۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور آپ کے ان الفاظ کا مجھے برا نہیں لگا۔ لیکن آپ کے کندھے سے لگ کر سو جانے والا بچہ مجھے نظر نہیں آتا۔ دکھایئے مجھے ذرا۔ کہاں ہے وہ؟ اور جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر میرے بارے میں کہتے ہیں تو میں آپ کو یہ عرض کروں گا کہ مجھے وہ سب یاد نہیں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، کچھ بھی کہیے، تعمیل حکم کروں گا۔ لیکن میں شبیلہ سے محبت کرتا تھا، کرتا ہوں۔ اس نے میری توہین کی تھی اور کرتی رہی ہے اور کر رہی ہے۔ آپ نے مجھ سے تو بات کر لی، اس سے کیوں نہیں کہا آپ نے کہ میری محبت قبول کر لے۔ بتایئے چچا جان! کتنی اچھی آفر کر چکا ہوں۔ آپ کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ صرف شہباز کی ملازمت کیا معنی رکھتی ہے۔''

''دیکھ بیٹا! چل ٹھیک ہے انہیں کچھ نہ دے۔ میرا تو حق ہے نا اس سرکس پر۔ کیا میں اپنی مرضی سے کسی ایک آدمی کو ملازمت نہیں دے سکتا؟''

''دس کو ملازمت دے سکتے ہیں آپ لیکن شبیلہ کو نہیں۔ گلباز نہیں بلکہ شبیلہ کے بیٹے کو نہیں۔ وہ اگر صرف گلباز کا بیٹا ہوتا تو آپ کی سفارش کی ضرورت نہیں پیش آتی۔''

''ہوں...... اچھا تو ٹھیک ہے بیٹا! اب جب ہماری اتنی عزت رہ گئی ہے تو پھر چلتے ہیں ہم یہاں سے۔ ہمارا بھی یہاں رہنے سے کیا فائدہ؟''

''آپ کی مرضی ہے فیض شاہ صاحب یا چچا جان! کیا سمجھے آپ۔ آپ کی مرضی ہے۔ اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے میں آپ کو نہیں روک سکتا۔ اپنا فیصلہ میں آپ کو سنا چکا ہوں۔''

''ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں تجھ سے۔ اس سرکس کو بنانے میں میرا ہاتھ ہے اور آج مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تو نے مجھ سے میرا حق چھین لیا ہو۔ کیا یہ بات مناسب ہے؟''

''آپ سوچتے ہیں تو سوچتے رہیں۔ مجھے آپ کی سوچ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''کل کا دن اگر تیرے حق میں نقصان دہ ہو تو سوچ لینا وہ سب کچھ تو نے کیا ہے۔''

''جی ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ سوچ لوں گا میں۔'' طارق شاہ بھی دیوانہ ہی تھا۔ کسی بات کی پرواہ کئے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

تب فیض شاہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان لوگوں کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ شہباز اور شبیلہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شہباز نے مسکرا کر فیض شاہ کو دیکھا اور بولا۔

''آیئے۔ آپ ہمارے محسن اور ہمارے بزرگ ہیں۔ میں آپ کو آج تک شاہ جی کہتا رہا ہوں۔ مجھے بتایئے میں آپ کو کیا کہوں؟''

''بیٹا! میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے احترام کا کوئی درجہ دیا جائے۔''

''ارے ارے، کیوں...... خیریت؟ کیا ہو گیا آپ کو؟''

''طارق شاہ نے میری توہین کی ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔ سرکس کا مالک ہے۔ ہر بات کہہ سکتا ہے۔ آپ نے میری سفارش کی اور اس نے سفارش نہیں مانی۔''

''بیٹا! اس کا باپ ایک کتا، ایک بکرا اور ایک ریچھ بس یہ تھی اس کی کل کائنات یا پھر میں تھا۔ جو اسے سہارا دیئے ہوئے تھا۔ اور پھر اس سرکس کی داغ بیل میں نے ہی ڈالی۔ بہت محنت کی تھی اس کے ساتھ۔ بے شک اس نے پیسہ لگایا۔ کہاں سے لگایا؟ یہ اس نے

مجھے نہیں بتایا۔ پھر اس طرح آہستہ آہستہ سرکس تعمیر ہوا۔ طارق شاہ تو بے چارہ صرف اس کا قصور وار تھا کہ وہ رحیم شاہ کا بیٹا تھا۔ اسے تو سب کچھ بنا بنایا ملا ہے۔ چلو چھوڑو...... جن لوگوں کو سب کچھ بنا بنایا مل جاتا ہے نا وہ ایسے ہی بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم کیوں دل کا بخار نکالیں۔ اور پھر وہ بھی میرے دوست کا بیٹا ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ وہ الگ بات ہے۔ دیکھا جائے گا۔ چلتے ہیں یہاں سے۔ اپنے لئے کوئی اور دنیا تلاش کریں گے۔ ویسے بھی بہت عرصہ گزر گیا ہے۔"

شہباز نے چونک کر فیض شاہ کو دیکھا اور بولا۔ "مگر آپ......"

"ہاں بول۔ آگے کیا کہنا چاہتا ہے؟ ایک بات سن۔ بوڑھا ہو گیا ہوں بے شک۔ لیکن تو یقین کر، اب بھی ہزاروں جوانوں پر بھاری ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں تیرے اوپر بوجھ نہیں بنوں گا۔ تو بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دے گا؟"

"نہیں شاہ جی! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ یہ تو آپ نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ ابھی ماں سے یہی کہہ رہا تھا کہ ماں! کیسی عجیب بات ہے۔ میں اس دنیا سے واقف تو ہو گیا ہوں اچھا خاصا لیکن ماں! اگر کوئی سرپرست ہوتا ہے تو ہر قسم کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ کاش! ہمارے سر پر کوئی بزرگ ہوتا۔ اور فیض شاہ صاحب! اگر آپ ہمارے سرپرستی کریں گے تو اس سے بڑا اعزاز ہمارے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"بھیا میں اب یہاں کیسے رہ سکتا ہوں، اور کس حیثیت سے رہ سکتا ہوں؟ تم لوگ یقین کرو، میں تو اپنے آپ کو سرکس کا مالک سمجھتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کبھی بھی نہیں کیا تھا جس سے میری آنکھیں کھل جاتیں۔ مگر اب جب کہ میرا یہ اعزاز چھن چکا ہے تو بھلا میرے یہاں رہنے کی کیا گنجائش ہے۔"

"جی شاہ جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میرا تو سینہ بڑھ گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم اتنے بے سہارا نہیں ہیں۔ باہر ہمارا سہارا موجود ہے۔"

"تو پھر تیار ہو چلو، نکلتے ہیں یہاں سے۔ زندگی کہاں گزرتی ہے اور کہاں گزرے گی یہ بات مولا جانتا ہے۔ وہی ہمارے راستے بھی متعین کرے گا۔"

"جی۔"

اور اس کے بعد تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ مختصر سا سامان سنبھال کر وہ تینوں باہر نکل آئے۔

طارق شاہ سامنے موجود نہیں تھا لیکن فیض شاہ ان دونوں کو لے کر منیجر کے کمرے میں پہنچا تھا۔ منیجر کسی کام میں مصروف تھا۔ فیض شاہ کی یہاں ذرا مختلف قسم کی عزت تھی۔ اسے مالکان میں ہی تصور کیا جاتا تھا۔ منیجر نے پُر احترام نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

"میرے لئے کوئی حکم ہے شاہ جی؟"

"ہاں......" فیض شاہ نے کہا۔

"فرمائیے؟"

"اپنے آدمیوں سے کہو ہماری تلاشی لیں۔ یہ ان دونوں بچوں کا سامان اور یہ چھوٹا سا تھیلا میرا ہے۔ اسے دیکھو کہ ہم یہاں سے کیا کیا لے جا رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں شاہ جی؟"

"جا رہے ہیں ہم لوگ۔ طارق شاہ نے ہمیں سرکس سے نکال دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بیکار لوگوں کو وہ زیادہ عرصہ نہیں پال سکتا۔"

"مگر شاہ جی! آپ...... مم...... مم...... میرا مطلب ہے آپ تینوں جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ یہ میرے بچے ہیں۔ یہ گلباز کی بیوی ہے اور یہ اس کا بیٹا۔ اور گلباز میرا بچہ تھا۔ بیٹوں ہی کی طرح چاہتا تھا میں اسے۔ وہ خود بھی میری اتنی ہی عزت اور احترام کرتا تھا۔ میں نے طارق شاہ سے کہا کہ گلباز کے بیٹے کو دفتری کام کے لئے رکھ لے۔ اس نے انکار کر دیا۔ جس جگہ میری اتنی سی بات نہ مانی جائے وہاں میرا رہنا بے مقصد ہے۔"

"شاہ جی! اگر آپ پسند کریں تو کچھ دیر رکیں۔ میں طارق شاہ صاحب سے بات کر لوں۔"

"سفارش کرو گے میری...... میری؟ میں جو اس کے باپ کا دوست ہوں۔ میں جس نے اپنے ہاتھوں سے اس سرکس کے تنبو سیئے ہیں۔ اس کے فرنیچر میں کیلیں ٹھونکی ہیں۔ کیونکہ دوسرا فرنیچر نہیں لیا جا سکتا تھا۔ میری سفارش کرو گے تم؟ بابا! اپنا کام کرو۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ تا کہ کل طارق شاہ یہ نہ کہہ دے کہ میں فیض شاہ سرکس سے اس کے ہاتھی اور شیر چرا کر لے گیا۔"

"شاہ جی! یہ کام میں نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی جواب بھی تم ہی دو گے اگر ایسا کوئی الزام لگا مجھ پر تو۔

چلو......“ فیض شاہ نے شہباز اور شبیلہ سے کہا۔

اور اس کے بعد وہ تینوں سرکس سے باہر نکل آئے۔ مینجر افسردہ نگاہوں سے اس شخص کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جسے اس نے سرکس میں اپنے پہلے دن سے دیکھا تھا۔ طارق شاہ کا البتہ کہیں پتہ نہیں تھا۔ تینوں قدم بہ قدم چلتے ہوئے سرکس سے کافی دور نکل آئے۔ تب فیض شاہ نے کہا۔

”ہمیں یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ جب سرکس کے لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ ہم اس طرح سرکس سے نکل آئے ہیں تو وہ ہنگامہ کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے ہماری تلاش میں بھی دوڑ پڑیں۔ اب جب ایک جگہ چھوڑ دی ہے تو وہاں واپسی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میری طبیعت میں بھی یہ بات ہے کہ تھوکا ہوا نہیں چاٹتا۔ سرکس اب ہمارے لئے ختم ہو گیا نا، ہمیں اس کے مفادات کے لئے کچھ سوچنا ہے اور نہ وہاں واپس جانے کے بارے میں۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن چلو۔ وہاں جا کر سوچیں گے کہ اب کہاں جانا چاہئے۔“

انہوں نے ایک تانگہ روکا اور تانگے میں بیٹھ کر وہ ریلوے اسٹیشن چل پڑے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ریلوے پلیٹ فارم پر ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہباز کے ذہن میں لاتعداد خیالات چکرا رہے تھے۔ دنیا اتنی مختصر نہیں ہے کہ تین افراد اس میں نہ سما سکیں۔ اس وسیع دنیا میں کہیں بھی گزارہ ہو جائے گا۔

دفعتہً ہی شہباز کو فریدوں کا خیال آیا۔ اس دوران وہ ان لوگوں کو مسلسل یاد کرتا رہا تھا۔ یہاں کے حالات کچھ اس طرح پیش آئے تھے کہ طاہر فریدوں سے کوئی رابطہ ہی قائم نہیں ہو سکا تھا۔ تھوڑی سی ناتجربہ کاری، تھوڑی سی لاپرواہی۔ ان چیزوں نے مل جل کر ایک طرح کی دوری رکھی تھی۔ اور اب تو کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اب یہاں ریلوے اسٹیشن پر آنے کے بعد اچانک ہی اسے بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ شہر جایا جا سکتا تھا۔ طاہر فریدوں اور راحیلہ نے کئی بار یہ بات کہی تھی کہ اگر شہباز کے والدین بھی یہاں آ جائیں تب تو بہت ہی اچھا ہو جائے۔ سب مل کر ساتھ رہیں۔ اس وقت تو اس نے یہ بات نہیں سوچی تھی اور یہ بھی جانتا تھا کہ ساری زندگی سرکس کے جھولوں پر گزارنے والا گلباز کبھی اس طرح معطل ہو کر کسی دوسرے کے شانوں پر آ بیٹھے گا۔ چنانچہ وہ بات ممکن نہیں تھی۔ لیکن اب جبکہ گلباز

اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور ان لوگوں کے لئے دنیا ذرا مشکل ہو گئی تھی تو ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ٹھکانہ انہیں ملے۔ طاہر فریدوں کا خیال آتے ہی شہباز کے چہرے پر ایک شگفتگی پیدا ہو گئی۔

کم از کم ایک ٹھکانہ ایسا تھا جہاں وہ پناہ لے سکتا تھا۔ شرمندگی بس اس بات کی تھی کہ اتنے مہینے گزر گئے تھے، اس نے ان لوگوں کی خبر نہیں لی تھی۔ یہ ایک دکھ بھرا پہلو تھا۔ جبکہ راحیلہ اسے اپنی آنکھوں کا تارا بنا بیٹھی تھی۔ اور وہ ہر لمحے اس کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہاں آ کر باپ کی موت کے بعد ماں کو سہارا دیتے ہوئے شہباز بہت کچھ بھول گیا تھا اصولی طور پر اسے ڈاکٹر طاہر فریدوں سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا۔ تھوڑا سا وقت نکال کر ان کے پاس پہنچ جانا چاہئے تھا۔ لیکن نجانے کیوں اس قدر لاپرواہی برت گیا۔ بعض اوقات بہت سے کام غیر اختیاری طور پر ہو جاتے ہیں اور انسان کو جب احساس ہوتا ہے تو وہ خود حیران ہو جاتا ہے کہ اس نے اتنا بڑا اخلاقی جرم کیوں کیا۔

بہرحال اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے کر وہ سفر کرتا رہا۔ فیض شاہ شبیلہ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ شبیلہ بہرحال عورت تھی اور اس کے ذہن میں سینکڑوں وسوسے تھے۔ فیض شاہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہے بیٹا! ہم لوگوں نے سرکس کے تمبو کو اپنی کائنات سمجھ لیا تھا۔ ٹھیک ہے اپنی چیزوں سے محبت اور ان پر اعتماد ایک اچھی بات ہے۔ انسان کو ایسا کرنا چاہئے۔ لیکن کائنات کی وسعتوں کے بارے میں معلوم ہونا تو بڑا ضروری ہے۔ شہر بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت صرف ان خیموں میں گزارا ہے۔ لیکن ہوتا ہے بیٹا! بہت سے لوگ ہزاروں چیزوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اب اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ان چیزوں کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ شہری آبادی میں ہم ضرور اپنی جگہ بنا سکیں گے۔“

”وہاں ہماری جگہ موجود ہے شاہ جی!“ شہباز نے کہا۔

”کہاں بیٹا؟“

”شہر میں...... ہم اس شہر جا رہے ہیں جہاں میں پڑھتا تھا۔ وہاں میرے دوست احباب بھی ہیں اور ایک ایسی شخصیت بھی جس کے بارے میں ابھی تک آپ لوگوں کو کچھ

بھی نہیں معلوم۔"

"اچھا......کون ہے وہ؟"

"ڈاکٹر طاہر فریدوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"بس شاہ جی! ایک عجیب واقعہ ہوا تھا جس کے بارے میں بتانا ہی بھول گیا۔ بابا کو بتایا تھا مگر اتنی تفصیل سے نہیں۔ کیونکہ بابا ہر چیز میں وسوسوں کا شکار رہتے تھے۔ سرکس کی زندگی تو محدود ہوتی ہے۔ اپنے کھیل تماشے، جگہ جگہ کی سیر و سیاحت۔ اس میں کوئی شک نہیں فیض بابا! کہ سرکس کی زندگی بے مثال ہوتی ہے۔ مجھے تو روزِ اول سے ہی پسند تھی۔ مگر کیا کروں، میرے باپ کا حکم کچھ اور تھا۔ میں نے اس سے تعاون کیا۔ تو بات ہو رہی تھی ڈاکٹر طاہر فریدوں کی۔ اتفاق سے میں ان کے مرحوم بیٹے کا ہمشکل تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور بے اختیار ہو گئے۔ یہی کیفیت ان کی بیگم کی تھی۔ بس مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ہم نے تمام تر سچائیوں کے ساتھ راحیلہ بیگم کو یہ بات بتا دی کہ میں ان کا مرحوم بیٹا نہیں ہوں بلکہ اس کا ہم شکل ہوں۔ بڑی محبت کا سلوک کیا انہوں نے میرے ساتھ۔ اور مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ ہوسٹل کی بجائے میں ان کے گھر میں ہی رہنے لگا۔ اس طرح میرے وہ اخراجات بھی بچ گئے جو بابا مجھے بھیجا کرتے تھے۔ اس وقت وہاں کے بینک میں میرے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے اور یقیناً وہ اس وقت ہمارے کام آئے گی۔"

فیض شاہ گردن جھکا کر خاموش بیٹھا رہا۔

سفر طے ہوتا رہا۔ شبیلہ سہمی سہمی نظر آتی تھی کہ نجانے باہر کا ماحول کیسا ثابت ہو۔

آخر کار وہ شہر پہنچ گئے اور پھر ایک ٹیکسی نے انہیں ڈاکٹر طاہر فریدوں کی کوٹھی پر پہنچا دیا۔ سب سے پہلا جھٹکا جو شہباز کے ذہن کو لگا تھا، وہ کوٹھی پر بدلی ہوئی نیم پلیٹ تھی جس پر "احسن شیرازی" لکھا ہوا تھا۔ اس کوٹھی کو بھولنے کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایک آدمی ایک عورت کے ساتھ چہل قدمی کرنے والے انداز میں باہر نکلا تھا۔ یہ اجنبی چہرہ تھا، عورت بھی اجنبی تھی۔ لیکن ہو سکتا ہے کچھ مہمان آئے ہوں۔ البتہ یہ بدلی ہوئی پلیٹ کیا معنی رکھتی ہے۔

ان لوگوں نے جو ٹیکسی سے اترنے والوں کو دیکھا تو دونوں شہباز، فیض اور شبیلہ کی

طرف متوجہ ہو گئے۔ مرد آگے بڑھا اور بولا۔

"جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"وہ ڈاکٹر طاہر فریدوں......؟"

"طاہر فریدوں؟ نہیں۔ اب وہ یہاں کہاں ہیں۔ یہاں میں رہتا ہوں۔ میرا نام احسن شیرازی ہے۔ اور یہ میری مسز ہیں۔"

"ڈ......ڈاکٹر فریدوں کہاں چلے گئے؟"

"سنا ہے وہ پیرا گوئے چلے گئے۔ اپنی مسز کے انتقال کے بعد وہ تقریباً بیس بائیس دن یہاں رہے۔ پھر اس طرح وحشت زدہ ہوئے کہ انہوں نے ایک پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے یہ کوٹھی ہی فروخت کر دی اور پیرا گوئے چلے گئے جہاں ان کا ایک کزن رہتا ہے۔"

شہباز پر جیسے بجلی سی گر پڑی تھی۔

فیض شاہ اور شبیلہ بھی ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ شہباز نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

"نہیں۔ ہم لوگ ہیں۔ میری فیملی ہے۔"

"آپ کے دروازے پر چوکیدار ہوا کرتا تھا ایک۔"

"مضان خان؟"

"جی جی......مضان خان۔ کیا وہ موجود ہے؟"

"ہاں، وہ موجود ہے۔"

اسی وقت چوکیدار دروازہ بند کرنے کے لئے باہر نکلا تو شہباز نے اسے پہچان لیا۔ یہ ڈاکٹر طاہر فریدوں کے ہی دور کا چوکیدار تھا۔ اس نے بھی شہباز کو پہچان لیا اور پھر جھجکتا ہوا باہر آ گیا۔

"سلام صاحب!"

"وعلیکم السلام مضان خان! کیا ہوا، ڈاکٹر صاحب نے یہ کوٹھی بیچ دی۔"

"جی صاحب! آپ تو ایسا گیا صاحب! کہ آپ نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لیا۔ آپ کے جانے کے بعد چھ سات دن تو راحیلہ بیگم صاحب خیریت سے رہا اور اس کے بعد وہ بیمار پڑ گیا۔ وہ یہی بولتا تھا کہ اب آپ نہیں آئے گا۔ صاحب! وہ یہ بولتا تھا کہ غیر تو غیر ہی ہوتا

ہے۔آپ ان کا بیٹا تو نہیں تھا۔اگر ان کا بیٹا ہوتا تو اپنی ماں کو چھوڑ کر ایسے نہیں جاتا۔تڑ
تڑپ کر مرا ہے وہ صاحب، آپ کی یاد میں۔ڈاکٹر طاہر فریدوں نے آپ کو جگہ جگہ تلا
کیا۔پر آپ نہیں ملا صاحب! اور پھر ایک رات راحیلہ بیگم صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور
مر گیا۔ڈاکٹر صاحب نیم پاگل ہو گیا تھا۔ان کا بھائی باہر کا ملک سے آیا اور آنے کے بعد
ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ لے گیا۔یہ کوٹھی ہمارے نئے مالک مکان نے خرید لیا صاحب
ہمیں ادھر ہی رکھا۔دوسرے ملازم لوگ بھی پہلے کی طرح یہیں کام کرتا ہے۔''

''آپ کا کیا قصہ ہے؟ آپ کون ہیں؟'' احسن شیرازی نے شہباز سے سوال کیا
شہباز کا چہرہ افسردگی سے لٹک گیا تھا۔دوہری دوہری پریشانی تھی۔فوری طور پر کوئی ٹھکا
بھی نہیں تھا شہر میں۔اس نے افسردگی سے کہا۔

''نہیں جناب! کوئی بات نہیں ہے۔چوکیدار کی زبانی آپ نے سن ہی لیا ہوگا۔یہ
وفائی کی کہانی ہے۔بس کیا بتایا جائے آپ کو۔''

عورت ہمدردی سے بولی۔

''آپ لوگ کہیں باہر سے آ رہے ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو کوئی حرج نہیں ہے۔آئیے...... پتہ نہیں کتنا سفر کیا ہو آپ نے۔لگ رہا ہے آ
کے چہرے اور لباس سے کہ خاصا لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں۔آئیں، کوئی حرج نہ
ہے۔جانا تو ہے آپ کو۔تھوڑے وقت کے بعد چلے جائیے۔''

''نہیں بیگم صاحب جی! آپ لوگ پتہ نہیں کس کام سے جا رہے تھے۔ہم نے آپ
راستہ خراب کیا۔'' فیض شاہ نے کہا۔

''نہیں بابا جی! کوئی ایسی بات نہیں ہے۔چلو رمضان خان! اندر لے چلو ان کو۔''

مہمان خانے کے ایک کمرے میں انہیں پہنچا دیا گیا۔شہباز جو یہاں ایک حکمران
حیثیت سے آیا جایا کرتا تھا، پہلی بار مہمان خانے کے اس کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ا
شیرازی نے ہمدردی سے کہا۔

''بھئی عظمی! پہلے ان کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔آپ لوگ غسل وغیرہ
لیجئے۔کوئی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔تھوڑا وقت یہاں گزار لیں۔اور اس کے بعد جو

آپ کا دل چاہے چلے جائیں۔ظاہر ہے آپ یہاں کوئی مستقل رہنے کے لئے تو
نہیں آئے۔''

بمشکل تمام شہباز نے ان لوگوں کی مہمان داری قبول کی تھی۔تقدیر نے یہاں بھی دھوکا
دیا تھا۔یعنی یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ تقدیر کی دوسری ضرب تھی۔حالات سے سمجھوتہ
کرنا ہی پڑا تھا۔

احسان شیرازی ایک نیک، نفیس انسان تھا جس نے ان لوگوں کی اچھی خاصی مدارت
کی اور یہ پیشکش کی کہ اگر وہ چاہیں تو ہفتہ پندرہ دن یہاں رہ سکتے ہیں۔کوئی حرج نہیں
ہے۔ہفتہ پندرہ دن تو خیر رہنا ممکن نہیں تھا لیکن عارضی طور پر ایک دو دن گزارے جا سکتے
تھے۔شہباز نے شکریہ کے ساتھ یہ پیشکش قبول کر لی۔ویسے حقیقتاً وہ غم زدہ تھا۔باپ کی
موت کا جتنا رنج ہوا تھا اتنا ہی دُکھ اسے راحیلہ کی موت کا بھی ہوا تھا۔وہ اپنے آپ کو
راحیلہ کا مجرم سمجھ رہا تھا۔اس عورت نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔بڑے نفیس لوگ
تھے۔اگر شہباز اس طرح لاپرواہی سے کام نہ لیتا تو شاید اس طرح جلدی حالات خراب نہ
ہو جاتے۔بڑی غلطی ہوئی تھی۔

شہباز نے بابا فیض شاہ اور اپنی ماں کو ان لوگوں کے حالات سنائے۔دوستوں سے ملنا
بڑی بے معنی چیز تھی۔وہ جانتا تھا کہ اس دور میں دوستیاں مفادات کے ترازو میں تولی جاتی
ہیں اور بس اتنی ہی دوستی نبھائی جاتی ہے کہ سلام دعا قائم رہے۔جب دوستوں کو اس بات
کا علم ہوگا کہ حالات اس قدر بگڑے ہوئے ہیں تو گریز کرنے لگیں گے۔فیض شاہ نے بھی
یہی سمجھایا تھا۔کہنے لگا۔

''بیٹے! تقدیر اسی طرح کے کھیل کھیلتی ہے۔اب تم یہ بتاؤ آگے کا منصوبہ کیا ہے؟''

''بابا صاحب! میں اپنے باپ کو زندگی بھر برا نہیں کہوں گا کہ اس نے مجھے تعلیم کی روشنی
سے روشناس کرایا۔بات اصل میں یہ ہے کہ میں بذاتِ خود سرکس کی زندگی کو بے حد پسند
کیا کرتا تھا۔اور جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا میں سرکس میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔
میرے والد نے مجھے سرکس سے دور کر دیا اور تعلیم کے لئے یہاں بھیج دیا۔آپ یقین کریں
میں خوش نہیں تھا۔میں تو انہی آزاد فضاؤں کا پنچھی تھا جن میں میرے بابا نے زندگی گزاری
تھی۔انہی کا تو خون تھا میں۔بہرحال میری تعلیم اتنی مکمل نہیں ہوئی ہے کہ میں بابا صاحب

کی کسی خواہش کی تکمیل کر سکوں۔ وہ مرحوم میرے لئے نجانے کیا چاہتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ مجھے سرکس میں ہی رہنے دیتے اور اپنا فن سکھا دیتے تو میرا ایک مقام ہوتا۔ آمدنی کا ذریعہ ہوتا۔ مگر اب تو آمدنی کے ذرائع تلاش کرنا پڑیں گے۔''

فیض نیم خوابیدہ آنکھوں سے شہباز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نجانے کیا اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ پھر جب شہباز اپنی آرزوؤں کا اظہار کر کے خاموش ہو گیا تو فیض شاہ نے اس سے کہا۔

''بینک میں تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟''

''کافی پیسے ہیں شاہ جی! کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟''

''کافی پیسے؟''

''ہاں۔ میں نے کہا نا، بابا جو مجھے خرچ بھیجتے تھے وہ میں بینک میں جمع کراتا رہا۔ کچھ اور ایسے تحفے تحائف مجھے دیئے گئے۔ کئی بار اس نیک دل خاتون نے مجھے رقم دی جس کا نام راحیلہ تھا۔ میں لالچی بالکل نہیں ہوں۔ لیکن بہرحال جس محبت سے وہ رقم مجھے دی گئی اس کی وجہ سے وہ رقم مجھے قبول کرنی پڑی۔ وہ سب بھی بینکوں میں پڑی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اسے نکال لوں۔ ظاہر ہے ہمیں یہاں اپنے لئے کوئی مقام تو تلاش کرنا ہوگا۔''

''بیٹا! میں ایک بار پھر ماضی کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔''

''ماضی کی طرف؟''

''ہاں۔''

''سمجھا دیجئے شاہ جی!''

''یہ بات میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم دونوں نے ایک چھوٹی سی بستی سے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ دونوں سے میری مراد رحیم شاہ یعنی طارق شاہ کے باپ اور اپنے آپ سے ہے۔ طارق شاہ کا باپ رحیم شاہ اور میں ایک ہی بستی کے باسی تھے اور ہم لوگ وہیں زندگی گزار رہے تھے۔ ویسے تو ظاہر ہے ایک آبادی کے لوگ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے تھوڑی شناسائی تھی۔ لیکن ایک سیلاب نے ہمیں یکجا کر دیا تھا۔'' فیض شاہ نے ماضی کی پوری کہانی سنائی اور شہباز دلچسپی سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔

''رحیم شاہ کھیل تماشے دکھاتا تھا۔ اس کا باپ بھی یہی کچھ کرتا تھا۔ لیکن پھر ہم لوگوں

نے ایک سرکس بنانے کا فیصلہ کیا۔ خیر داستان خاصی لمبی ہوگئی۔ میرا خیال ہے میں بستی جانا چاہتا ہوں۔''

''بڑی تاریخی جگہ ہوگی وہ شاہ جی!''

''ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہاں ایک بھی شخص ایسا نہ ملے جو فیض شاہ یا رحیم شاہ سے واقف ہو۔ ہمارا اپنا تو کوئی خاندان ہی نہیں تھا۔ لیکن نجانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بار پھر ماضی کی کہانی دوہرائی جائے۔''

''آپ ضرور ایسا کریں۔ مجھے بھی ان تمام چیزوں سے بہت دلچسپی ہے۔'' شہباز نے کہا۔

اپنے میزبان سے انہوں نے بہت ہی عاجزی اور انکساری کے ساتھ کہا۔

''احسن شیرازی صاحب! ہم آئے کسی اور طرح سے تھے۔ یہاں کے حالات جاننے کے بعد ہم نے جس ذہنی بوجھ کا احساس کیا تھا، آپ نے ایک لمحے کے اندر وہ ختم کر دیا۔ ہم آپ کی اس محبت کا جواب صرف الفاظ سے ہی دے سکتے ہیں۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ ہمیں اجازت دیجئے۔''

''ارے ارے...... ابھی تو میری آپ لوگوں سے صحیح طور سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ اصل میں بزنس کرتا ہوں میں۔ اور اگر ایک بزنس مین اپنے بیوی بچوں کو ہی وقت دے لے تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ ایک کامیاب بزنس مین نہیں ہے یا پھر ضرورت سے زیادہ کامیاب ہے۔ بہرحال ابھی آپ یہاں سے جانے کی نہ سوچیں۔ آپ کے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا۔ مجھے تو آپ کے بارے میں پوری تفصیل بھی نہیں معلوم۔ صرف ملازموں نے بتایا ہے کہ آپ اس کوٹھی میں شہزادوں کی طرح رہتے تھے۔''

''جی۔ اب بھی آپ نے ہمیں بڑا اعزاز بخشا ہے۔ لیکن بہرحال ہمیں یہاں سے جانا ہے۔''

بمشکل تمام احسن شیرازی نے انہیں جانے کی اجازت دی تھی۔ اس دوران شہباز نے بینک سے اپنی رقم نکال لی تھی۔ بہرحال غریب کی پونجی تھی۔ اس کے لئے تو یہی بہت کچھ تھا۔ پھر بابا فیض شاہ نے تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں اور ایک بار پھر انہوں نے ریل کا سفر کیا اور اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی جب وہ بستی کے اسٹیشن پر اترے۔

وہاں سے بھی انہیں ایک لمبا سفر کرنا تھا۔ یہ سفر بس کے ذریعے کیا گیا۔ بس نے جب انہیں بستی پر اتارا تو صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ ماضی کا ہر نقش فیض شاہ کے ذہن میں ابھر آیا۔ اپنی بستی میں آکر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زمین کا بھی ایک رشتہ ہوتا ہے۔ درودیوار سے بھی پیار ہوتا ہے۔ فیض شاہ کو ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے پوری بستی اسے دیکھ کر خوش ہو رہی ہو۔ اس کا استقبال کر رہی ہو۔ وہ درخت، وہ چوپال، وہ پن چکی، وہ کھیت کھلیان ساری چیزیں جوں کی توں تھیں۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہ بستی کو بھول گیا تھا۔ بستی اسے نہیں بھولی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بستی کے مکانات اور جھونپڑیاں بھی جوں کے توں تھے۔

شہباز بھی حیرت و دلچسپی سے اس زمین کو دیکھ رہا تھا جو اس کی تو نہیں تھی لیکن بہرحال فیض شاہ کی تھی۔ اور فیض شاہ اسے اس زمین سے متعلق بہت سی باتیں سنا چکا تھا۔ آخر کار فیض شاہ پیپل کے ایک درخت کے نیچے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔

"یہ جگہ اکثر ہماری ہوا کرتی تھی۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر وہ دیکھو، اس جگہ وہ ہندو آبادی ہے۔ ہندو لوگ پیپل کی پوجا کرتے ہیں۔ اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو اس چبوترے کے نیچے گوبردھن کا مجسمہ ہوگا۔ گوبردھن ان کا ایک دیوتا ہے اور یہ لوگ اسے گائے کے گوبر سے بناتے ہیں۔ چونا کرتے ہیں اس پر۔ آدمی جیسی شکل دیتے ہیں اسے اور پھر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اپنے رسم و رواج ہیں، اپنی اپنی رِیت۔ ہم ایک کام کیا کرتے تھے۔ جب ہندو عورتیں اور مرد گوبردھن کی پوجا کرنے کے لئے یہاں آتے تھے تو پیپل کے اس درخت کے نیچے وہ مٹھائی کے دونے رکھ جاتے تھے اور ہم اس تاک میں رہتے تھے کہ جیسے ہی وہ پوجا کر کے واپس جائیں ہم لپک کر اس مٹھائی تک جائیں۔ اور ایسا ہی کیا کرتے تھے ہم دونوں۔ یعنی میں اور رحیم شاہ۔ ارے دیکھو...... وہ کیا رکھا ہوا ہے۔ ذرا دیکھنا بھائی!" فیض شاہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور شہباز اٹھ کر اس طرف چل پڑا۔ پھر یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وہاں ڈھاک کے پتوں میں تازہ تازہ مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔ شہباز کا قہقہہ سن کر شبیلہ اور فیض شاہ چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟"

"یہاں مٹھائی پڑی ہے۔"

"تو لے آؤ یار! یہ بڑی پاک صاف ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ پوجا کی مٹھائی ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بستی جوں کی توں آباد رہے۔"

شہباز مٹھائی کا دونہ لے آیا۔ شبیلہ بہت عرصے کے بعد ہنسی تھی۔

"واہ شاہ جی! تم نے تو اپنی بستی میں داخل ہوتے ہی مٹھائی سے ہماری تواضع کی ہے۔"

"ارے ہم نے کہاں کی ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ان کا جو ہمارے لئے یہ مٹھائی لا کر رکھ گئے ہمارے آنے سے پہلے ہی۔"

"ایک بات بتایئے بابا صاحب! مٹھائی میں کوئی ایسی غلاظت تو نہیں شامل ہوتی جس کی وجہ سے یہ ہمارے لئے......"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ ہم جہاں سے یہ چلتی ہے وہاں سے یہاں تک کی تحقیقات کر چکے تھے۔ بڑی پاک صاف اور ان کی زبان میں پوتر ہوتی ہے یہ۔ کیونکہ دیوتاؤں کو چڑھائی جاتی ہے۔ چلو بھئی...... شروع ہو جاؤ۔"

بہرحال بستی کی پہلی ضیافت رات کے اندھیرے میں ہوئی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ صبح کا اُجالا پھوٹنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض شاہ اور رحیم شاہ کو یہ بستی چھوڑے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا تھا لیکن بستی کے آثار جوں کے توں تھے۔ دن کی روشنی میں بستی کے سیدھے سادھے لوگوں نے تین مہمانوں کو دیکھا تو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان کی جانب دوڑ پڑے۔ اور پھر انہیں بے شمار پیشکشیں کی گئیں۔ لوگ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر اپنا مہمان بنانا چاہتے تھے۔ حالانکہ ان میں ایک بھی فیض شاہ کا شناسا نہیں تھا۔ لیکن سیدھے سادھے دیہاتی لوگوں کے لئے کسی شناسائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مہمان نوازی تو ان کی فطرت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ فیض شاہ نے بڑی نیازمندی سے ان میں سے ایک بزرگ شخص کی میزبانی قبول کر لی۔ یہ شخص بھی کوئی قدیم آدمی نہیں تھا۔ بس بستی کا ایک مکین تھا۔ اس کا نام نیاز علی تھا۔ نیاز علی اسے اپنے چھوٹے سے کچے گھر میں لے گیا۔ شہباز اور فیض شاہ کے لئے ڈیوڑھی میں بندوبست کیا گیا۔

شبیلہ کو عزت و احترام کے ساتھ اندر گھر کی عورتوں کے درمیان پہنچا دیا گیا۔ اور پھر نیاز علی حسب استطاعت ان لوگوں کی خاطر کرنے لگا۔ بستی کے دوسرے لوگوں نے بھی اس سلسلے میں اپنی اعانت پیش کر دی تھی۔ بہرحال یہ انسانوں کی بستی تھی اور انسان انسانوں

کے ساتھ اسی طرح پیش آتے ہیں۔ ہاں ان شہری آبادیوں کی بات نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ جہاں شاید انسان کی شکل کے لوگ ضرور رہتے ہیں، انسان نہیں رہتے۔ بہت ہی اچھا استقبال کیا گیا تھا اس بستی میں ان لوگوں کا۔

شہباز نے دلچسپی سے کہا۔

''حقیقت یہ ہے کہ میرا خمیر ایسے ہی کسی دیہات کی مٹی سے اٹھا ہے۔ مجھے اس طرح کا ماحول بے حد پسند ہے۔ شہری زندگی کو بھی میں برا نہیں سمجھتا۔ وہاں ایک تیز رفتار ماحول ہوتا ہے اور بڑی برق رفتاری ہوتی ہے اس ماحول میں۔ لیکن دیہاتی زندگی میں ایک سادگی ہوتی ہے جس کا مزہ ہی الگ ہے۔''

''ہاں بیٹا! میں انہیں تلاش کروں گا جو مجھے جانتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ مل ہی جائیں۔ ویسے وقت بہت گزر چکا ہے۔ بستی کی شکل وصورت بالکل پہلے جیسی ہی ہے۔ لیکن انسان مجھے وہ نظر نہیں آرہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس وقت یہ سارے کے سارے یا تو بچے ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ وہ بوڑھے نظر نہیں آرہے جو ہمارے وقت میں یہاں ہوا کرتے تھے۔''

بہرحال کچھ بھی تھا، یہاں کے لوگوں نے جس طرح پذیرائی کی تھی، وہ قابل تحسین تھی۔ اور پھر کچھ لوگ ایسے مل ہی گئے جو اس دور کے لوگ تھے۔ اور جب انہوں نے فیض شاہ کو پہچانا تو ایک ہنگامہ ہوگیا۔ فیض شاہ کو سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ شبیلہ اور شہباز کو ہر شخص اپنا سمجھ رہا تھا۔ شہباز کو بھی یہ ماحول بڑا راس آیا تھا اور وہ اسے بے حد پسند کررہا تھا۔

پھر ایک دن فیض شاہ نے انہیں اپنی رہائش گاہ دکھائی۔ رحیم شاہ کا وہ کچا مکان اب کافی اچھا اور بڑا بن گیا تھا۔ لوگوں نے پیشکش کی کہ فیض شاہ اگر یہاں مستقل بود و باش اختیار کرنا چاہے تو اس کے لئے جھونپڑی کی جگہ مخصوص کردی جائے گی۔ یہ فراخ دل لوگ ہر طرح کی دولت سے مالا مال تھے۔ لیکن فیض شاہ یہاں منصوبے کے تحت ہی آیا تھا۔

آخر کار ایک دن وہ شبیلہ اور شہباز کو لے کر بستی کے نواحی علاقے میں پہنچ گیا جہاں جنگل اور درخت بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے شہباز سے کہا۔

''تم یہ درخت دیکھ رہے ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں صحیح معنوں میں میری اور رحیم شاہ کی دوستی کا آغاز ہوا۔ سیلاب نے پوری بستی کو نو نو فٹ گہرے پانی میں ڈبو دیا تھا۔ یہ درخت تھا

جس پر ہم نے پناہ لی تھی۔ آس پاس کے یہ بے شمار درخت اور ان کی شاخیں بستی والوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس وقت ان درختوں کے سوا ان کے پاس اور کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ ہمارے خاندان اس سیلابی ریلے میں بہہ گئے تھے۔ کسی کے پاس کوئی گھر نہیں تھا۔ کئی دن کے بعد پانی اترا تھا۔ رحیم شاہ کو اس وقت میں نے اس سیلابی ریلے سے نکال لیا تھا ورنہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح بہتا ہوا دریا کی جانب جارہا تھا۔ خیر...... اس کے بعد ہم نے ایک اور زندگی کا آغاز کیا۔ اور میں یہ چاہتا ہوں شہباز! کہ تم تھوڑی سی مشقت میرے ساتھ کرو۔''

''میں آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا شاہ جی! کہ وہ مشقت کیا ہوگی۔'' شہباز نے کہا۔

شبیلہ کو جو رہائش گاہ ملی تھی، وہاں اسے ایسی کچھ خواتین مل گئی تھیں جو اس کا دل بہلائے ہوئے تھیں۔ فیض شاہ پہلی بار شہباز کو لے کر نواحی جنگل میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

''شہباز! میں نے زندگی میں کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا کوئی کام کرنے کے لئے۔ بس میرا ایک مشغلہ تھا۔ جنگل میں نکل آتا تھا اور جنگلی جانوروں کو دیکھا کرتا تھا کیسے ہیں وہ؟ کیا کرتے ہیں؟ کیسے زندگی گزارتے ہیں؟ میں نے ان پر بڑے تجربات کئے ہیں۔ دیکھو...... یہ پرندے۔ ان پرندوں کو دیکھو، ان کے پروں میں قدرت نے برقی طاقت رکھی ہے۔ لیکن فضا میں بلند ہونے کے لئے یہ پہلے اپنے پیروں پر دباؤ ڈالتے ہیں، اس کے بعد اپنے بدن کو اچھالتے ہیں اور پھر اپنے پروں کی طاقت لے کر چل پڑتے ہیں۔ انسانوں نے ان کی اس قوت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اس کے بعد فضا میں پرواز کرنے کے لئے ایسی مشینیں ایجاد کرلی ہیں۔ ایک جہاز ٹیک آف کرنے سے پہلے رن وے کا ایک چکر لگاتا ہے اور اس کے بعد تیز رفتاری سے دوڑتا ہے اور جب پائلٹ اسے فضا میں بلند کرتا ہے تو اس کی مشین زمین پر اسی طرح دباؤ ڈالتی ہے جس طرح ایک پرندہ فضا میں اُڑنے کے لئے پہلے اپنے پیروں پر دباؤ ڈالتا ہے اور اس کے بعد اپنی برقی قوت کو استعمال کرتا ہوا فضا میں بلند ہوجاتا ہے۔ ایک انسان بے شک وہ برقی قوت اپنے بازوؤں میں نہیں رکھتا کیونکہ اس کے پاس قدرت کی وہ دین نہیں ہے۔ لیکن اپنے پیروں پر ایک مخصوص قسم کا دباؤ ڈال کر اگر وہ اپنے بدن کو بے وزنی کا شکار کرکے فضا میں آگے بڑھائے تو لانگ جمپ کا ماہر ہوسکتا ہے۔ اتنی لمبی چھلانگ لگا سکتا ہے وہ اپنی اس

مشق کے بعد کہ دوسرے لوگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے چاہے یہ ہائی جمپ ہو یا لانگ جمپ۔ کیا تم اس کی مشق کرنا پسند کرو گے؟ ٹھہرو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ حالانکہ میں طویل عرصے سے ان جسمانی مشقتوں سے دور ہوں۔ لیکن جو مشق میں نے اپنی نوجوانی کے عالم میں کی ہے وہ آج بھی مجھے تھوڑی بہت مدد دے گی۔ دیکھو...... میں تمہیں پہلا عمل کر کے دکھاتا ہوں۔''

شہباز کے ذہن میں پھلجھڑیاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ یہ شوق تو اس کی زندگی کا حصہ تھا۔ اپنے کالج میں وہ ہر طرح کے کھیلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور چیمپئن مانا جاتا تھا۔ اسی طرح اس نے اپنے سیکھنے کے شوق کو برقرار رکھا تھا۔ اور ڈاکٹر طاہر فریدوں سے پلاسٹک سرجری اس نے سیکھ لی تھی اور اس طرح سیکھی تھی کہ ڈاکٹر فریدوں خود اس کی مہارت پر دانت تلے انگلی دبا کر رہ جاتا تھا۔

بہرحال اپنی عمر کو نظر انداز کر کے فیض شاہ نے ایک لمبی دوڑ لگائی اور اس کے بعد ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے اپنے پیروں پر دباؤ ڈالا اور فضا میں اُچھل گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے شہباز کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ کسی پرندے کی طرح فضا میں پرواز کر گیا ہو۔ یہ پرواز زیادہ اونچی نہیں تھی۔ لیکن حیران کن تھی۔ کیونکہ فیض شاہ یہ دباؤ ڈال کر زمین پر نہیں آیا تھا بلکہ ایک درخت کی تقریباً سولہ فٹ اونچی لمبی شاخ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

بوڑھے فیض شاہ کا یہ کمال دیکھ کر شہباز دنگ رہ گیا۔ فیض شاہ چند لمحے وہاں رکا، اس کے بعد اس نے شہباز کو مخاطب کیا۔

''اب میں بلندی سے پستی کی طرف آ رہا ہوں۔ ذرا غور کرو، کس طرح۔'' اور ایک بار پھر بوڑھے فیض شاہ کی مہارت نے شہباز کو حیران کر دیا۔ اچھے خاصے بھاری بدن کا مالک تھا وہ۔ لیکن شاخ کی بلندی سے اس نے چھلانگ لگائی اور کافی دور آ کر زمین پر اس طرح پاؤں ٹکائے کہ جہاں اس نے قدم رکھے تھے، وہیں ساکت رہ گیا۔

''کیا تم نے پرندوں کو، میں کوے کی مثال دیتا ہوں، فضا سے آ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے؟ وہ اپنے پیروں کے بل پر نیچے آتا ہے۔ پیروں کو ایک خاص انداز میں...... او ہو...... او ہو...... وہ دیکھ ...... وہ دیکھو!'' فیض شاہ نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ایک بڑا

ہریل بلندی سے آ کر نیچے زمین پر بیٹھا تھا۔

''تم نے اس کے زمین پر قدم رکھنے کے انداز کو دیکھا شہباز! تمہیں دس بارہ دن تک ان پرندوں پر نگاہ رکھنی ہے۔ کس طرح یہ ٹیک آف کرتے ہیں، کس طرح بلندی سے زمین پر آتے ہیں۔ دیکھو، میں نے جو کچھ دکھایا ہے تمہیں وہ اتفاق نہیں ہے۔ میں نے اس پر عمل کیا ہے۔ یہ دوبارہ دیکھو۔'' اور اس کے بعد بوڑھا فیض شاہ اسے یہ سب کچھ دکھاتا رہا۔ پھر اس نے شہباز سے کہا کہ وہ ایسا کر کے دکھائے۔

بہرحال صرف دیکھنے سے سب کچھ نہیں ہو جاتا اور اتنی جلدی ہوتا بھی نہیں ہے۔ شہباز نے کوشش بے شک کی تھی لیکن ابھی اس میں اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس نے یہ بات دل سے تسلیم کر لی تھی کہ فیض شاہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔

''جو کچھ میں تمہیں سکھانا چاہتا ہوں وہ تمہارے مزاج کے خلاف تو نہیں ہے؟'' گھر کی طرف واپس لوٹتے ہوئے فیض شاہ نے پوچھا۔

''نہیں...... بلکہ میں نے آپ کا یہ انوکھا روپ دیکھا ہے۔ سرکس میں آپ کا کوئی شاگرد ہے...... کیا گلباز کی تربیت بھی آپ نے کی تھی؟'' شہباز نے پوچھا۔

''میں نے بے شک کسی کے بارے میں اس انداز میں سوچا بھی نہیں۔ نہ میں کسی کو شاگرد بنانے کے قابل ہوں۔ کیونکہ میں خود کو استاد نہیں سمجھتا اور نہ ہی کوئی میرا استاد ہے۔'' فیض شاہ نے کہا اور شہباز اس کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔

۞......۞

یہ سب کچھ شہباز کے مزاج کے مطابق تھا۔ دوسرے دن اس نے خود فیض شاہ سے تقاضا کر دیا اور بولا۔

"آج جنگل نہیں چلیں گے بابا صاحب؟"

"بابا صاحب...... یہ آج تم نے مجھے نئے نام سے پکارا ہے۔ کیوں؟"

"اس لئے کہ میں دل سے آپ کا احترام کرنے لگا ہوں۔"

"دل سے......؟"

"ہاں بابا صاحب! اپنی ایک کمزوری کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ میں ہمیشہ بزرگوں کا احترام کرتا ہوں۔ ان کا بھی جو کسی حوالے سے میرے لئے قابل احترام ہوں۔ لیکن ذاتی طور پر کسی سے متاثر ہو جاؤں تو پھر وہ میرے سینے میں اتر جاتے ہیں۔ جیسے آپ......"

"میں......؟" فیض شاہ کی آواز میں خوشی تھی۔

"ہاں بابا صاحب!"

"مگر میرے اندر ایسی کون سی خوبی ہے؟"

"آپ بہت بڑے انسان ہیں۔"

"ارے ارے...... میں نے ایسا کون سا کام کیا ہے؟"

"رحیم شاہ کی زندگی بچائی تھی آپ نے۔"

"ہاں بچائی تھی۔ وہ درخت کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ پانی کی لہر اسے دریا کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا، میں اپنا فرض پورا کرتا۔"

"اس کے بعد آپ نے رحیم شاہ سے دوستی کر لی اور یہ دوستی اس حد تک نبھائی کہ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے تک کو اپنا سایہ دیتے رہے۔"

"بس مجھے اس سرکس سے محبت تھی جو میرے ایماء پر میرے دوست نے بنایا تھا۔"

"بات یہیں تک محدود نہیں ہے شاہ جی! آپ صاحب فن ہیں۔ لیکن آپ نے اپنا یہ فن فروخت نہیں کیا۔"

"ہاں بیٹے! بس یہ بات کہہ سکتے ہو تم۔ دنیا کا کوئی بھی شخص میرا فن خرید نہیں سکتا تھا۔ یہ ضرور میرا عزم تھا۔ ایسی کوئی کوشش کی بھی نہیں گئی۔ میرا دوست مجھے جانتا تھا کہ میں سرکس کے فنکاروں کو گائیڈ تو کر سکتا ہوں خود سرکس میں کام کبھی نہیں کروں گا۔ چنانچہ اس نے کبھی مجھے سرکس میں کچھ کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ وہ بھی تو بڑا آدمی تھا۔ ہمیشہ اس نے میری خدمت کی۔ چلو چھوڑو، تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ کام شروع کرو اپنا۔"

پورے پندرہ دن تک یہ مشق ہوتی رہی۔ اور سولہویں دن جب شہباز نے دوڑ لگا کر دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے اور سامنے ایک درخت کی شاخ پر جا کھڑا ہوا تو فیض شاہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کل سے دن میں دو منٹ تمہیں اس مشق کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ تین دفع اپنی یہ مشق دوہراؤ۔ اس کے بعد دوسرے کھیل کا آغاز کرو۔ دوسرے کھیل کے بارے میں، میں تمہیں تھوڑی سی تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اپنے جسم کو بے وزن کیسے کیا جا سکتا ہے۔"

"بے وزن؟"

"ہاں۔ کشش ثقل کا راز جانتے ہو۔ ہر چیز اوپر سے نیچے کی جانب آتی ہے۔ زمین کی کشش اسے کھینچ لیتی ہے۔ لیکن یہ ننھے ننھے بھنگے جن کی کوئی جسامت، کوئی قوت نہیں ہوتی جو تمہارے پھونک مارے سے لوٹ پوٹ ہو کر دور جا گرتے ہیں، اپنے آپ کو کشش ثقل سے معاف کر لیتے ہیں اور زمین انہیں اپنی جانب کھینچ نہیں سکتی۔ اس کا بھی ایک خاص طریقہ کار ہے۔ تم جس طرح اپنی زبان کو چند لمحوں کے لئے ذائقے سے محروم کر سکتے ہو۔ تم جس طرح اپنی سماعت کو بے جان کر سکتے ہو، اس طرح کہ شدید دھماکہ بھی تمہارے اعصابی نظام کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ تمہاری سماعت اس دھماکے کو اگر پہلے سے محسوس کر لے تو تم اپنی قوت ارادی سے کام لے کر اپنے آپ کو اس دھماکے سے انجان کر سکتے ہو۔

اسی طرح تمہاری نگاہوں کے سامنے کوئی چیز آئے اور تم اسے نہ دیکھنا چاہو تو اپنے ذہن کو کہیں اور منتقل کر دو۔ وہ چیز تمہارے ذہن تک نہیں پہنچ پائے گی۔ مقصد صرف اتنا سا ہے کہ حواسِ خمسہ کو بے جان کر دیا جائے تو وہ ساری حسیات بے اثر ہو جاتی ہیں اور یہ بھی ایک مشق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے وجود کو کچھ دیر کے لئے کشش ثقل سے آزاد کر دو اور یہ کام تم ایک مشق کے ذریعے کر سکتے ہو۔ اس طرح تم بڑی سے بڑی پرواز کر سکتے ہو۔ تم نے نواب واجد علی شاہ کا نام سنا ہے؟“

”نہیں شاہ جی! کون تھے یہ؟“

”روایت میں نوابینِ ابد میں سے تھے۔ فنونِ لطیفہ کے شوقین۔ سنا ہے تلوار کی نوکیں ان کے پیروں پر بے اثر تھیں۔ تلواروں کو کھڑا کر کے زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا اور واجد علی شاہ ان پر رقص کرتے تھے۔ زمین پر بتاشے بچھا دیئے جاتے تھے اور وہ ان پر رقص کرتے تھے۔ نہ ہی بتاشے ان کے پیروں تلے آ کر ٹوٹتے نہ تلوار کی نوکیں ان کے تلوؤں کو زخمی کرتیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ انہوں نے کشش ثقل کو اپنے اوپر بے اثر کر دیا تھا۔ میں نے اسی سے اس فن کو اخذ کیا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ اور پھر فیض شاہ نے ایک اور ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا۔ لمبے لمبے کانٹے زمین پر کھڑے کر دیئے اور ایک بڑے علاقے میں انہیں بچھا دیا گیا۔ فیض شاہ نے ان کانٹوں پر رقص کر کے اسے دکھایا اور شہباز سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”آپ جادوگر ہیں شاہ جی! آپ جادوگر ہیں۔“

”یہ نہ کہو۔ بڑی مہربانی ہوگی تمہاری۔ تم دیکھو کہ تم بھی تو جادوگر بن گئے ہو۔ اب تم فضا میں لمبی لمبی چھلانگیں لگا کر بلندیوں پر اس طرح جا کھڑے ہوتے ہو کہ دوسرا سوچ بھی نہ سکے۔ تمہارا بدن اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا اور کوئی بھی اس سلسلے میں تمہاری طرح مشق کئے بغیر تھوڑی بہت کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ تمہارے بارے میں ایک بات میں خاص طور سے کہوں۔ تم عام لوگوں سے بالکل مختلف ہو اور سچ یہ ہے کہ اس وقت میں نہیں جانتا کہ میں ایک اتنے حیرت انگیز آدمی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر رہا ہوں۔ بات صرف میرے فن سکھانے کی نہیں ہے، بلکہ تمہارے فن سیکھنے کی بھی ہے۔ اس کے علاوہ بات ذرا بھی غیر فطری نہیں ہے۔ قدرت نے جو ذی روح اس کائنات میں پیدا کیا ہے، اسے ہر

چیز سکھائی ہے۔ وہ آفات سے مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ جنگ و جدل سے بھی بچ سکتا ہے اور جنگ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے مقابل کو نقصان پہنچانے کے لئے اسے ان تمام کوششوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ بلی بلندی سے گرتی ہے تو سر کے بل نہیں، پیروں کے بل زمین پر آتی ہے۔ وہ فضا میں اپنے بدن کو جنبش دینے کی ماہر ہے۔ عقاب اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ وہ فضا میں نیچے آنے کے بعد فضا ہی میں اپنے آپ کو بلند کر سکتا ہے۔ بیٹے! مجھے کسی نے یہ سب کچھ سکھایا نہیں...... ہاں! یہ حقیقت ہے کہ عرفِ عام میں مجھے حرام خور اور ناکارہ انسان کہا جاتا تھا اور لوگ میرے بارے میں یہ پیش گوئیاں کرتے تھے کہ یہ شخص کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ بس یہ الزام تھا میرے اوپر۔ لیکن میں تو ان چیزوں کا رسیا ہو گیا تھا۔ بلندیوں سے گرنے والے جھرنے وزنی سے وزنی چیز کو گہرائیوں میں لے آتے ہیں۔ میں پانی کی دھار پکڑ کر اوپر چڑھ سکتا ہوں۔ گویا بہت عرصے سے یہ مشق نہیں کی ہے لیکن بیٹے! اب میں تمہیں سکھاؤں گا۔ اور بھی بہت سے فنون ہیں۔ چیونٹی تک اپنے مدمقابل پر کس طرح قابو پا سکتی ہے۔ بس اپنے آپ کو میرے سپرد کر دو۔ میں تمہیں یہ ساری چیزیں سکھاؤں گا۔“

”ایک سوال کروں شاہ جی؟“

”ہاں ضرور۔“

”اس سے مجھے فائدہ کیا ہوگا؟“

”ناقابل تسخیر بن جاؤ گے تم۔ اور میں...... میں اس بے ایمان کو سبق دوں گا تمہارے حوالے سے جس نے اپنے باپ جیسے آدمی کو ایک معمولی سی بات کے لئے انکار کر کے اپنے سرکس سے نکال دیا، سمجھے۔ میں اسے ایک سبق دینا چاہتا ہوں۔ اور یہی میرا معاوضہ ہوگا۔“

”میں آپ کا ایک ہونہار شاگرد ثابت ہوں گا فیض شاہ صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔“ شہباز نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

اور جو کچھ اس نے کہا، ثابت کر کے دکھا دیا۔ فیض شاہ ایک بار پھر جوان ہو گیا تھا۔ وہ خود اسے ہر چیز سکھاتا تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ صرف حملہ کرنا اور دشمن کو ختم کر دینا ہی دلیری نہیں ہے، اپنا دفاع بھی ضروری ہے۔ عقاب شکار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ شکار اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کیسے کرتا ہے۔ بہت سی بار عقاب کو ناکامی بھی ہوتی ہے۔ شیر ہرن

پر حملہ کرتا ہے اور ہرن لمبی قلانچیں بھرتا ہے۔ ہر جانور اپنے دفاع کے لئے کوششیں کرتا ہے اور دونوں عمل سیکھنے چاہئیں، حملہ کرنا بھی اور دفاع کرنا بھی۔ اور نجانے کتنے عرصے کی محنت سے شہباز کو درحقیقت شہباز بنا دیا۔ وہ ویسے ہی ایک شاندار نوجوان تھا۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اب اس قدر مشقت اور عرق ریزی نے اسے بہت کچھ دیا تھا اور وہ ایک شاندار شخصیت کا مالک بن گیا تھا۔ تب فیض شاہ نے کنٹری بستی چھوڑ دی، ماں بیٹے کو ساتھ لے کر وہ شہری آبادیوں میں آ گیا۔ ایک جگہ قیام کیا اور اس کے بعد وہ کچھ اور تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

شہباز اپنی مشقیں جاری رکھے ہوئے تھا اور بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر فیض شاہ نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ شہباز کے لئے بھی ناقابل یقین تھا۔

''بابا صاحب! آپ کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟''

''یقین کرو شہباز بیٹے! کسی ناجائز طریقے سے نہیں آئی۔ بس میں نے کچھ ایسے کام کئے جن کی بناء پر کچھ لوگوں نے مجھے یہ رقم فراہم کی۔ تفصیل نہ پوچھنا۔ بتاؤں گا نہیں۔'' فیض شاہ نے کہا۔

''نہیں نہیں بابا صاحب! مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے کہ آپ نے کسی کی گردن نہیں دبائی ہو گی۔ ویسے بابا صاحب! دنیا کے جو رنگ نظر آ رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ یہاں تو ہر شخص ایک دوسرے کی گردن دبا رہا ہے اور جو ایسا نہیں کر رہا وہ اس دنیا کو گزار نہیں پا رہا۔''

''ابھی تم اس بارے میں نہ سوچو۔ دیکھو، زندگی ہمیں آگے چل کر کیا موقع دیتی ہے۔''

فیض شاہ نے ایک ٹرک کا انتظام کیا تھا۔ لمبے لمبے بانس، رسیاں، آنکڑے اور نجانے کیسی کیسی چیزیں۔ بہرحال ان تیاریوں کے بعد وہ وہاں سے چل پڑے تھے۔ یہ ٹرک ان کی چلتی پھرتی رہائش گاہ تھا اور فیض شاہ اور شہباز اسے حاصل کر کے بہت خوش تھے۔ کھانے پینے کی تمام اشیاء، دو خیمے اور باقی یہ تمام چیزیں۔ زمین کی وسعتیں تو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہیں۔ ایک ایسی سنسان جگہ جہاں عام انسانی گزر نہیں تھا، فیض شاہ نے شہباز کو بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اور اس کی مشق کی گئی۔

بہرحال شہباز کی ابتدائی خواہش ہی یہ تھی کہ سرکس میں شامل رہ کر جگہ جگہ زندگی گزاری

جائے۔ یہ جگہ اسے بے حد پسند آئی تھی۔ آخر کار وہ وہاں سے بھی چل پڑے اور پھر ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچ کر فیض شاہ نے کچھ معلومات حاصل کیں۔ قصبے کے ابتدائی سرے پر اس نے اپنا خیمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ اخبار لئے ہوئے شہباز کے پاس پہنچ گیا۔

''شہباز! یہ دیکھو۔ یہ اشتہار دیکھو......''

شہباز نے بھی وہ اشتہار دیکھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اشتہار میں سرکس کے بارے میں لکھا تھا جو ایک بڑے شہر اعظم پور میں اپنا کھیل دکھا رہا تھا۔ اعظم پور کے اس علاقے میں بڑا زبردست میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ اشتہار اسی میلے میں لگے ہوئے سرکس کا تھا۔

''طارق شاہ کا سرکس ہے۔''

''ہاں۔ اور ہمیں اعظم پور چلنا ہے۔'' فیض شاہ اپنا منصوبہ اسے بتانے لگا۔ شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بابا صاحب! ایک بات بتایئے، کیا ہم براہِ راست اس کے سامنے چلے جائیں گے؟ مطلب میرا یہ ہے کہ پہلی نگاہ میں اگر اس نے ہمیں پہچان لیا تو مزہ نہیں آئے گا۔ اب تھوڑا سا کام آپ مجھے بھی کرنے دیجئے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ سب کچھ تو تمہارے ہمارے تعاون سے ہی چلے گا۔''

آخر کار وہ اعظم پور پہنچ گئے۔ اعظم پور کے بازاروں میں گھوم پھر کر شہباز اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے لگا۔ اور پھر اس نے کافی مہنگی خریداری کی۔ پھر بولا۔

''جی بابا صاحب! اب میں آپ کو اپنا کمال دکھاتا ہوں۔''

''کیا کرو گے؟ میں نہیں جانتا۔''

''یہ میں آپ کو کچھ وقت کے بعد بتاؤں گا۔''

شہباز اپنا خریدا ہوا سامان لے کر شبیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ فیض شاہ دوسرے خیمے میں تھا اور کچھ تیاریاں کر رہا تھا۔ میلے میں اسے طارق شاہ کے مدمقابل جانا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ الجھ کر باہر نکل آیا اور اس نے شہباز کے خیمے پر پہنچ کر آواز دی۔

"کیا تم اندر جا کر سو گئے؟"

"بس ایک منٹ بابا صاحب!"

اور چند لمحوں کے بعد شہباز ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ باہر نکلا۔ لڑکی کافی دلکش تھی۔ فیض شاہ نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔

"یہ کون ہیں...... اور یہاں خیمے میں؟ شبیلہ...... شبیلہ! کیا تم اندر موجود ہو؟"

لڑکی ہنس پڑی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"یہ میں ہی ہوں۔ ثمن بابا!"

شبیلہ کی آواز سن کر فیض شاہ نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ایک لمحے کے اندر اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ آواز اسی لڑکی کے منہ سے نکلی ہے۔"

"تم...... تم...... یہ...... یہ کیا بکواس ہے؟"

"جی بابا صاحب! یہی فن میں آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔"

"مگر یہ...... یہ کیا ہوا؟" فیض شاہ آگے بڑھا اور شبیلہ کا چہرہ ٹٹولنے لگا۔ خوبصورت کسا ہوا چہرہ، حسین و جمیل بال۔ جو لباس شہباز نے اسے پہنایا تھا وہ لڑکیوں جیسا ہی تھا۔ شبیلہ شرما کر بولی۔

"اس کمینے نے نجانے کیا کر ڈالا ہے میرے چہرے کو۔ آپ دیکھ رہے ہیں مجھے تو یہ آئینہ بھی نہیں دیکھنے دے رہا۔"

لیکن فیض شاہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہباز کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی شہباز کا مقصد اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ لیکن اس نے حیرانی سے کہا۔

"کیا تم نے اس کے چہرے پر کوئی خول چڑھایا ہے؟"

"نہیں بابا صاحب! ہم اسے پلاسٹک میک اپ کہتے ہیں۔"

"مگر یہ تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"جو سامان میں نے بازار سے خریدا تھا اس کی مدد سے میں نے ماں کا چہرہ بدلا ہے اور یہ فن مجھے جس شخص نے سکھایا ہے اسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ میں نے آپ کو ڈاکٹر طاہر فریدوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ڈاکٹر طاہر فریدوں ایک انتہائی ماہر پلاسٹک سرجری کے ڈاکٹر تھے۔" شہباز نے اپنا پورا مفہوم سمجھایا اور بولا۔ "اور یہ میک اپ اب میں

آپ کے چہرے پر بھی کروں گا اور اپنے چہرے پر بھی۔ جب دشمن سے لطف لینا ہے تو پھر مزے سے ہی لیا جائے۔"

اچانک ہی فیض شاہ کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ پھر وہ خوب ہنسا اور بولا۔

"واہ...... یہ تو بڑی پُر لطف بات ہے۔ واقعی مزہ آ جائے گا۔ واقعی...... واقعی...... واہ...... واہ......"

اس کے بعد شہباز نے فیض شاہ پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو فیض شاہ مسکرا کر بولا۔

"مجھے بوڑھا ہی رہنے دینا بیٹے! اپنی ماں کی طرح جوان مت کر دینا۔ شبیلہ تو ویسے بھی جوان اور دلکش ہے۔ مگر میں بوڑھا آدمی ہوں اور اپنے بڑھاپے کو تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔"

شہباز نے اس بات کا خیال رکھا تھا۔ فیض شاہ کے سامنے جب آئینہ آیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"یہاں تو تم نے مجھے بھی مات دے دی ہے۔ میں نے تمہیں صرف اچھل کود سکھائی تھی لیکن ڈاکٹر طاہر فریدوں تمہیں وہ فن دے گیا ہے جس سے تم ساری دنیا میں تہلکہ مچا سکتے ہو۔"

شہباز مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

بہرحال آخری میک اپ اس نے اپنے چہرے پر کیا تھا اور اس کام سے فراغت حاصل کر کے وہ لوگ میلہ گاہ پہنچ گئے۔ ابھی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سرکس شروع ہو چکا تھا۔ میلے میں بہت سے اسٹال لگ چکے تھے۔ بہت سے اسٹال لگائے جا رہے تھے۔ منتظمین سے بات کر کے ایک مخصوص جگہ حاصل کر لی گئی جو سرکس سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہاں ابھی مداری پن کا کھیل کھیلا جانا تھا۔ کیونکہ نہ باقاعدہ تمبو ڈیرے تھے اور نہ ہی کوئی باقاعدہ اجازت نامہ۔ جبکہ سرکس کا علاقہ تو انتہائی وسیع تھا۔ اس جانے پہچانے سرکس کے سامنے پہنچ کر فیض شاہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔

بہرحال تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ چوبیس بانس جن کے اوپری سرے باریک تھے، کوئی آٹھ فٹ کے فاصلے پر زمین میں نصب کر دیئے گئے۔ ایک بڑا بانس درمیان میں اور اس کے ساتھ ہی دوسری تمام ذمے داریاں۔ سامنے ہی ایک بہت اونچے کھجور کا درخت تھا۔ اس سے بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ تماشبین جمع ہو گئے تھے اور کسی کو

نہیں معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ سرکس کا شو رات کو آٹھ بجے شروع ہونے والا تھا۔ کوئی چھ ساڑھے چھ بجے ایک ڈھولچی کو جو وہیں سے حاصل کیا گیا تھا، ڈھول بجانے کے لئے کھڑا کر دیا گیا۔ پھر انتہائی خوبصورت لباس میں فیض شاہ، شبیلہ اور شہباز اپنے بنائے ہوئے مچان پر چڑھ گئے اور فیض شاہ اعلان کرنے لگا۔

''دوستو...... بھائیو......

آپ نے بازیگروں کے بہت سے کمالات دیکھے ہوں گے۔ بہت کچھ دیکھا ہوگا آپ نے۔ آئیے...... ہم آپ کو ایک نوجوان بازیگر کے کمالات دکھاتے ہیں۔ دوستو...... یہ ہماری روزی ہے۔ اگر آپ کو اس شخص کے کمالات پسند آئیں تو زندگی کی بازی لگانے والے اس نوجوان کے لئے اور ہمارے لئے آپ کچھ کیجئے۔ آپ کی نوازش ہوگی۔ ہم آپ سے بھیک نہیں مانگیں گے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ہمیں زندہ رکھنے کے لئے ہماری کیا مدد کرتے ہیں۔''

اور اس کے بعد شہباز نے اپنے کمالات کا آغاز کر دیا۔ لمبے اور سیدھے بانس پر جو تقریباً نوے فٹ اونچا تھا اور جسے مخصوص طریقے سے کئی حصوں میں تقسیم کر کے یکجا کیا گیا تھا، شہباز بغیر کسی سہارے کے سیدھا چڑھتا چلا گیا۔ بانس کے آخری سرے پر پہنچنے کے بعد وہ ایک پاؤں سے بانس کی نوک پر کھڑا ہو گیا اور پھر وہاں سے اچانک ہی پھسل پڑا۔ دیکھنے والوں کے حلق سے دہشت بھری آوازیں نکل گئی تھیں۔ لیکن کوئی تیس فٹ نیچے آنے کے بعد شہباز نے اپنے جسم کو گھما کر بانس پکڑا اور اس کے بعد بجلی کی سی تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی انسان یہ کارنامہ سرانجام دے رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے بجلی کی کوئی مشین ہو اور برقی رو سے اپنا یہ سفر طے کر رہی ہو۔ تیس فٹ کے بعد چالیس فٹ نیچے پھر ساٹھ اور پھر ستر فٹ۔ زمین سے بیس فٹ اونچا رہ کر وہ پھر سیدھا اوپر چلا جاتا اور اس زبردست طریقے سے جاتا جیسے کمان سے تیر نکلا ہو۔ پھر اچانک ہی اس نے بانس کی نوک کو لچکایا اور پھر بل کھا کر کھجور کے درخت پر پہنچ گیا۔ کھجور کے درخت سے نیچے اترا تو وہ بانس جو گاڑھے تھے، ان کی نوکوں پر چھلانگیں لگانے لگا۔

انسان نہیں تھا وہ، چھلاوا تھا۔ کوئی انسان یہ سب کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ دیکھنے والے سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی آوازیں اس کے بدن کی حرکت کے ساتھ ساتھ

بلند ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کوئی انسان ہی ہے۔ کوئی آدھا گھنٹہ شہباز یہ کمالات دکھاتا رہا اور اس کے بعد سلام کر کے نیچے اتر آیا۔ لوگوں نے دوڑ کر اس کے گرد حلقہ بنا لیا تھا اور اس پر تعریفی ڈونگرے برسا رہے تھے۔ اتنے نوٹ برسائے گئے اس پر کہ فیض شاہ کو بھی یقین نہ آیا۔ بہرحال فیض شاہ اور شبیلہ نے یہ نوٹ اٹھائے اور اس کے بعد لوگوں کی داد و تحسین وصول کرتے رہے۔ یہ پہلا عمل تھا۔ شہباز نے لوگوں کے منتشر ہونے کے بعد ہنستے ہوئے کہا۔

''تو اب ہم مداریوں کی طرح کھیل تماشے دکھا کر پیسے جمع کریں گے۔''

فیض شاہ نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

''نہیں۔ یہ تعارف تھا طارق شاہ سے ہمارا کام بالکل مختلف ہوگا۔ ہم تو اسے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ آخری انسان نہیں ہے، اس کے علاوہ بھی دنیا میں لوگ رہتے ہیں۔ اسے تو باپ کا بنا بنایا مل گیا لیکن وہ جو اپنی محنت کر کے کھاتے ہیں وہ بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ سمجھا کیا تھا اس کتے نے۔ میں نے اس کے باپ کو بنایا تھا، میں اسے بگاڑ بھی سکتا ہوں۔''

فیض شاہ کی آواز میں غراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

۞......۞

راجہ سرکار ایک پارسی آدمی تھا۔ اسی وطن کا باشندہ۔ مالی حیثیت سے بہت مضبوط تھا وہ۔ اس نے یہ سرکس ایران میں بنایا تھا اور راجہ سرکس کے نام سے اس نے یہاں منتقل کر لیا تھا۔ لیکن ہر جگہ کاروباری مقابلے ہوتے ہیں۔ طارق شاہ کے سرکس سے راجہ سرکس کا مقابلہ ہوا لیکن طارق شاہ بہت مستحکم تھا۔ اس کے فنکار بہت مہارت رکھتے تھے اور بڑی حیثیت کے مالک تھے۔ راجہ سرکار بذاتِ خود ایک اچھا آدمی تھا۔ کافی عرصے تک اس کے سرکس کا مقابلہ طارق شاہ سے رہا تھا اور طارق شاہ نے بڑے غرور کے ساتھ اس سے کہا۔

''راجہ سرکار! پہلے مجھ سے معلوم کر لیا کرو۔ جہاں میں سرکس لگاؤں، تم وہاں تک نہ پہنچا کرو۔ بلکہ کہیں اور اتنے فاصلے پر نکل جایا کرو کہ میرے سرکس کی آواز تماش بینوں تک نہ پہنچ سکے ورنہ تمہارے سرکس میں کوئی نہیں آئے گا۔''

یہ بات عملی طور پر بھی سامنے آ چکی تھی اور یہ پتہ چل گیا تھا کہ واقعی طارق شاہ جو کچھ کہتا ہے وہی ٹھیک ہوتا ہے۔ چنانچہ راجہ سرکار نے انتہائی افسردگی کے عالم میں طارق شاہ سے

یہ معاہدہ کرلیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی دلبر سرکار اس کا معاون تھا۔ دونوں بھائی اکثر گفتگو کیا کرتے تھے کہ آخر ایسا کون سا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے طارق شاہ کے سرکس کا مقابلہ کیا جاسکے۔ بات بہت مشکل تھی۔ کتنی ہی بار کوششیں کی گئی تھیں کہ طارق شاہ کے سرکس کے آدمیوں کو توڑا جائے لیکن ان تک رسائی نہیں حاصل ہوسکی تھی۔ خاصا مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ پارسی ہونے کی حیثیت سے راجہ سرکار امن پسند آدمی تھا اور کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس میلے میں جب اس کا سرکس تمام ساز وسامان کے ساتھ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ طارق شاہ کا سرکس تو یہاں اپنے شو شروع بھی کرچکا ہے۔ راجہ سرکار کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ پہلے ہی اس سلسلے میں طارق شاہ سے بات چیت کرچکا تھا اور طارق شاہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس میلے میں سرکس لگانے سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ راجہ سرکار اگر چاہے تو وہاں سرکس لگالے۔ پھر پتہ نہیں کیوں پہلی بار راجہ سرکار نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرڈالی تھی۔ راجہ سرکار کا سرکس ایک جگہ اپنے شو کررہا تھا لیکن چونکہ یہ میلہ تھا۔ ایسی جگہوں پر رش زیادہ ہوجاتا ہے اور کمائی اچھی ہوجاتی ہے۔ اور چونکہ طارق شاہ وہاں سرکس لگانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا اس لئے راجہ سرکار نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہا اور اپنا سرکس وہاں سے اکھاڑ کر اس جگہ چل پڑا۔ اگر یہاں اس کے شو نہیں ہوئے تو اسے شدید نقصان پہنچ جائے گا۔ دلبر شاہ ذرا تیز مزاج آدمی تھا۔ وہ خود بھی بھرا ہوا تھا۔

''اصل میں طارق شاہ بے حد مغرور ہے اور اس پر دیوانگی سوار ہوچکی ہے۔ جینا تو ہمیں بھی ہے بھایا! چلتے ہیں اس کے پاس۔ بات کرتے ہیں۔''

''میں جاتا ہوں۔ تم ابھی یہاں کام شروع نہ کراؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ چلے جاؤ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی ساتھ جانا چاہئے۔ آپ اگر مجھے نہیں لے جانا چاہتے تو یہ دوسری بات ہے لیکن میں......''

''نہیں نہیں...... نہ لے جانے کی بات نہیں ہے۔ اچھا چلو ٹھیک ہے۔ چلو تم میرے ساتھ......'' راجہ سرکار نے کہا اور دلبر شاہ تیاریاں کرنے لگا۔

✿......✿

طارق شاہ کو بے شمار کارکنوں نے ان تین حیرت انگیز افراد کے بارے میں بتایا جنہوں

نے میلہ لوٹ لیا تھا۔

''کیا انہوں نے کوئی سرکس لگایا ہے؟''

''نہیں شاہ جی! آپ یقین کرو، ہمیں تو وہ خلائی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ایک بندہ کام کرنے والا ہے۔ ساتھ میں ایک لڑکی ہے، ایک بزرگ ہیں۔ مگر شاہ جی! وہ بندہ جو ہے ناخدا کی پناہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ بندروں سے زیادہ پھرتیلا اور اس قدر تیز طرار ہے کہ چھلاوا لگتا ہے۔''

دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں آدمی نے بھی طارق شاہ کو جب یہی کہانی سنائی تو طارق شاہ نے کہا۔

''کمال ہے۔ ہوسکتا ہے کہیں کسی دور دراز کی بستی سے آئے ہوں۔ اب ٹیلنٹ کہاں ہوتا ہے اس کی کوئی بنیاد تو نہیں ہے۔ کل ذرا میں بھی دیکھوں گا انہیں۔''

اور دوسرے دن طارق شاہ نے بھی یہ حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ لوگ تو اس طرح ٹوٹے پڑرہے تھے کہ واقعی کوئی خلائی مخلوق آگئی ہے۔ اور وہ نوجوان تھا بھی چھلاوا ہی ایک لمحے میں کہیں سے کہیں۔ اتنی برق رفتاری کسی انسانی جسم میں کم ہی دیکھی گئی ہوگی۔ طارق شاہ خود بھی فن شناس تھا۔ وہ نوجوان کی بدن کی لچک، اس کی پھرتی اور دلیری دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ بعد میں اس نے اپنے منیجر سے کہا۔

''نہیں...... اس نوجوان کو ہمارے سرکس سے باہر نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ہمارے لئے خطرناک ہوسکتا ہے۔ مجھے تو تعجب ہے کہ تم نے فوراً ہی اس سے رجوع کیوں نہیں کیا۔ انہیں ہر قیمت پر خریدلو۔ منہ مانگے دام ادا کردو ان کے۔ ہر شرط قبول کرلو۔ کہاں قیام ہے ان کا، یہ پتہ چلا؟''

''وہیں شاہ جی! ان کے پاس ٹرک ہے۔ ٹرک کے پاس ہی انہوں نے خیمے لگا رکھے ہیں۔ انہی خیموں میں رہتے ہیں وہ۔''

''تو لے کر آؤ نا انہیں۔''

''لے آئیں گے شاہ جی!'' منیجر نے کہا اور پھر وہ اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر اس ٹرک کے پاس پہنچ گیا جہاں خیمے لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ تینوں باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے کھانے پینے میں لگے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ انہیں دور سے دیکھ رہے تھے۔ اصل

میں جس کارکردگی کا مظاہرہ انہوں نے کیا تھا اس نے میلے میں موجود لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اکثر لوگ اس کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ منیجر اپنے آدمیوں کے ساتھ سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ بزرگ آدمی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

''جی بہت مہربانی جی آپ کی۔ اب ہم کل آپ کو نئے آئیٹم دکھائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے آئیٹم ہیں کہ آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''یقیناً ہوں گے۔ میں سامنے والے سرکس سے آیا ہوں۔ ہمارے سرکس کے مالک طارق شاہ صاحب آپ لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جائیں تو براہِ کرم ہمارے ساتھ چلیں۔''

بزرگ کے چہرے پر ناخوشگواری کے تاثرات پیدا ہو گئے۔ اس نے کہا۔

''تمہارا مالک طارق شاہ کیا کمشنر لگا ہوا ہے۔ جس نے حکم دے دیا کہ جاؤ اور جا کر انہیں بلا لاؤ۔ اور ہم چلیں جائیں گے اس کے پاس۔''

''نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے۔ انہوں نے تو بڑی عزت و احترام کے ساتھ آپ کو بلایا ہے۔''

''اس سے کہو کہ ذرا بے عزتی سے ہمیں بلا کر دیکھ لے۔ اس کا سرکس باقی رہ جائے تو ہمارا بھی نام بدل دینا۔''

''نہیں جناب! آپ ہماری بات سمجھے نہیں۔''

''ابے کیا سمجھائے گا تو۔ جا دفع ہو جا۔ جس انداز میں تو نے ہمیں دعوت دی ہے اس سے تیرا غرور ٹپکتا ہے۔ کیا سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو؟''

''جناب عالی! آپ کو غلط فہمی ہو گئی۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ مالک آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں کوئی بھی وقت دے دیجئے۔''

''ٹھیک ہے۔ کل شام کی چائے کا بندوبست کر لینا۔ پانچ بجے چائے پیتے ہیں۔ پانچ بجے آ جائیں گے تیرے پاس۔ چونکہ شام کو سات بجے ہمیں اپنے آئیٹم کرنا ہوتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جناب! پانچ بجے ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ بلکہ ہمارے آدمی آپ کو آ کر لے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ دفع ہو جاؤ۔ کھاتے پیتے میں کبھی نہ گھسا کرو۔ شیر جب اپنا شکار کھا رہا

ہوتا ہے نا تو جنگل کے سارے جانور اس سے بہت دور رہتے ہیں۔ اور جب وہ شکار کھانے کے بعد اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو وہ سب کتوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دفع ہو جاؤ، کھڑے ہوا بھی تک۔'' فیض شاہ نے کہا اور منیجر جھینپے ہوئے انداز میں اپنے آدمیوں کو دیکھ کر وہاں سے چل پڑا۔ بڑی عزت تھی اس کی۔ لیکن اس وقت اس بوڑھے آدمی نے اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔

''جاہل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال فن کسی کی میراث نہیں ہوتا۔ اور یہ جاہل قسم کے لوگ تو کچھ زیادہ ہی فنکار ہوتے ہیں۔''

''تعجب کی بات ہے سر جی! پتہ نہیں کون لوگ ہیں۔ بس تین بندے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جھنڈے گاڑ کر رکھ دیئے ہیں۔''

''میں تو ان کے جھنڈے ایسے اتارتا کہ دیکھنے والے دیکھتے۔ مگر بات شاہ جی تک پہنچ چکی ہے اس لئے ان کی بدتمیزی برداشت ہی کرنا ہو گی۔''

طارق شاہ کو البتہ اس طرزِ تخاطب کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ بس یہ کہہ دیا تھا کہ کل پانچ بجے وہ چائے پر پہنچ جائیں گے۔ منیجر اپنی ذمے داری جانتا تھا۔ طارق شاہ کو حقیقت نہ بتا کر اس نے سارا بوجھ اپنے شانوں پر لے لیا تھا۔ ان سر پھرے لوگوں کو جنہوں نے اس کی عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی تھی ان کی مرضی کے مطابق ہی طارق شاہ تک پہنچانا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن وہ بڑا دست بستہ ان کے سامنے پہنچا تھا۔

''کیسی بدنصیبی ہے میری کہ مجھے آپ کا نام بھی نہیں معلوم۔''

''تمہارے نصیب خراب ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' بزرگ آدمی نے کہا۔

''سر! اب آپ مجھے اپنا نام بتا دیجئے۔''

''میرا نام دیوان ہے۔ اس لڑکی کا نام دونیہ اور یہ مانک ہے۔''

''دیوان...... دونیہ...... مانک۔'' منیجر نام دوہرانے لگا اور پھر اس نے کہا۔ ''آپ نے ہمارے ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ چائے کے ساتھ کیا کھلا رہے ہو یہ بتاؤ؟''

''جو آپ پسند کریں۔'' منیجر نے کہا۔

بہرحال دیوان اور اس کے دونوں ساتھی اس کے ساتھ چل پڑے۔ سرکس میں ان کا

بہترین استقبال کیا گیا تھا۔ سرکس میں ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے ان کے دونوں دن کے کارنامے دیکھے تھے اور صحیح معنوں میں عش عش کر اٹھے تھے۔ مانک چاروں طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا جبکہ دونیہ جس کا نام بتایا گیا تھا اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی افسردگی رچی ہوئی تھی اور بوڑھا آدمی دیوان اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سہارا دیئے ہوئے تھا۔ طارق شاہ نے اپنے خیمے میں ان کا استقبال کیا اور انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی گئی۔

''تو ہے رے اس سرکس کا مالک؟'' دیوان نے کہا۔

''جی۔''

''شاہ جی! ان بزرگ کا نام دیوان ہے۔ یہ لڑکی دونیہ ہے اور یہ ہے وہ چھلاوا جس نے دو دن سے انسانوں کے دماغ ہلا کر رکھ دیئے ہیں۔ اس کا نام مانک ہے۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔ میرے آدمی تو آپ کی تعریفوں کے اس طرح پل باندھ رہے ہیں جیسے آپ ہی ان کے سب کچھ ہوں، میں کچھ بھی نہ ہوں۔''

''ابے تو ہے کیا، اپنی اوقات تو بتا۔ کسی نے ہمیں تیرے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔''

''میں اس سرکس کا مالک ہوں۔ طارق شاہ ہے میرا نام۔''

''سرکس کا مالک ہے دنیا کا مالک تو نہیں ہے۔ تمیز سے بیٹھنا سیکھ۔'' دیوان نے کہا اور طارق شاہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں منیجر سے کہا۔

''چائے کا بندوبست کرو۔''

''خالی چائے تو تُو دس بار دن میں آ جا ہمارے پاس ہم پلا دیا کریں گے۔ کوئی ڈھنگ کی چیز کھلا اس کے ساتھ۔'' دیوان بڑا ہی اکھڑ نظر آتا تھا۔ اوروں نے تو شاید محسوس نہ کیا ہو لیکن دونیہ نے ضرور محسوس کیا تھا کہ مانک نے کتنی ہی بار اپنی ہنسی روکی تھی۔

بہر حال منیجر باہر نکل گیا۔ طارق شاہ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ طارق شاہ نے کہا۔

''دیوان صاحب! آپ لوگوں کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''اپنے گھر سے۔'' دیوان نے جواب دیا۔

''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''تھا کہیں کسی جگہ۔ اب تو ٹرک میں ہے۔''

''آپ اس سے پہلے کہیں اپنے کمالات دکھا چکے ہیں؟''

''ہاں دکھا چکے ہیں۔''

''کہاں؟''

''اب ساری باتیں تجھے کیوں بتائیں؟ پولیس والا ہے کیا تو؟ کیوں پوچھ رہا ہے یہ ساری باتیں۔ جتنا بتانا تھا تجھے بتا دیا۔ فالتو باتیں مت کر۔ چائے پلا۔ دل چاہ رہا ہے۔ نہیں تو اٹھ کر آ جا ہمارے ساتھ۔ ہم تجھے چائے پلا دیتے ہیں۔''

''نہیں نہیں دیوان صاحب! آپ بہت جلد ناراض ہو جاتے ہیں۔''

''تو تیرے خیال میں کتنی دیر میں ناراض ہونا چاہئے؟ ابے ڈھنگ کی باتیں کر تو ہم بھی تجھ سے ڈھنگ کی باتیں کریں گے۔''

''بات اصل میں یہ ہے کہ میں آپ کو اپنے سرکس میں آنے کی پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔'' ابھی طارق شاہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر دو آدمی اندر داخل ہو گئے۔ یہ راجہ سرکار اور دلبر سرکار تھے۔ طارق شاہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''یہ آپ لوگ بغیر اجازت اندر کیسے آ گئے؟''

''ہمیں پہچانتے ہو طارق شاہ! ہم کون ہیں؟''

''پہچانتا تو ہوں۔ لیکن یہ بدتمیزی کیا ہے آخر؟''

''سنو طارق شاہ! ہمارے ساتھ کوئی سختی مت کرو۔ ہم نے ہمیشہ امن پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ کبھی تمہارے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا ہو۔ لیکن اس بار تم مجھے نقصان پہنچانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟''

''آپ معزز لوگ ہیں راجہ سرکار! لیکن اس طرح کسی کے پاس گھس آنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے مہمانوں سے بات کر رہے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے بعد آیئے۔''

''ہم بیٹھ جاتے ہیں۔ تم بات کر لو۔ ہمارے لئے بھی بڑا پریشانی کا معاملہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بیٹھا رہنے دو بے چاروں کو۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے کہ ہم

تمہارے سرکس میں شمولیت اختیار کرلیں۔ کرلیں گے بھائی! ایک کام کرو۔ معاہدہ کرلو ہمارے ساتھ۔ سرکس کی آدھی آمدنی ہماری ہوگی، آدھی تمہاری۔ اس طرح پارٹنرشپ پر کام چل سکتا ہے، اس کے بغیر نہیں۔ ہمارا یہ بچہ مانک تمہارے سرکس میں چار چاند لگا دے گا۔ تم نے اس کے کارنامے دیکھ ہی لئے ہیں۔ اور نہیں دیکھے تو آج شام کو پھر دیکھ لینا۔ دو گھنٹے کے بعد ہم اپنا کام شروع کریں گے۔ ہماری آمدنی بھی دیکھ لو۔ نوٹ برساتے ہیں لوگ نوٹ۔ یہ نوٹ تمہارے سرکس پر برسیں گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

”آپ براہِ کرم تھوڑی دیر بیٹھئے، میں ان لوگوں کو فارغ کردوں۔“

”کردو...... کردو۔ ہمیں اعتراض نہیں ہے۔“ دیوان نے کہا۔

”ہاں تو راجہ سرکار! مشکل کیا پیش آئی ہے آپ کو؟“

”شاہ جی! آپ نے کہا تھا کہ یہاں میلے میں آپ اپنا سرکس نہیں لگا رہے۔ آپ نے ہمیں اجازت دی تھی کہ ہم اپنا سرکس لگالیں۔ ہم باقاعدہ شو کررہے تھے لیکن میلے کی کمائی کرنے کے لئے ہم نے اپنے تمبو ڈیرے اکھاڑ لئے اور ادھر آگئے۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ آپ کا سرکس تو کام بھی شروع کرچکا ہے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں یہاں سرکس نہیں لگاؤں گا؟“

”ہاں شاہ جی! تبھی تو ہم نے یہ ہمت کی۔ ورنہ ہم آپ کے مقابلے پر کب آتے ہیں۔“

”ارے بابا! اب میں بیٹھا ہوا تمہیں ہی یاد کرتا رہا کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔ یاد نہیں رہا ہوگا۔ تم ایسا کرو اپنے تمبو ڈیرے لے کر کہیں اور لے جاؤ۔ دنیا بہت وسیع ہے۔ ملک بہت بڑا ہے ہمارا۔ جاؤ، کہیں اور کماؤ کھاؤ۔ اور کوئی کام ہے مجھ سے؟“

”شاہ جی! آپ......“

”ارے تو لگا لو پھر ہمارے مقابلے پر۔ ہم کب منع کررہے ہیں۔ اپنی اوقات دیکھ لینا۔ خرچہ بھی نہیں نکل سکے گا۔ چار بندے نہیں آئیں گے تمہارے سرکس میں ہمارے سرکس کے سامنے۔“

”شاہ جی! بس آپ ظلم کررہے ہیں۔“

”اور کوئی خدمت ہے ہمارے لئے؟“

”نہیں، بہت بہت شکریہ۔ کوئی گنجائش ہے؟“

”ہاں ہے۔ سرکس لگالو۔ اپنا کھیل شروع کردو۔ ہم میں سے کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔“

”روک تو خیر آپ ویسے بھی نہیں سکتے طارق شاہ صاحب! میرے بھائی نے مجھے خاموش رہنے کے لئے کہا تھا لیکن آپ جیسے کم ظرف آدمی کے سامنے کون اور کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔“ دلبر سرکار نے غصیلی آواز میں کہا۔

”دلبر! ہم شاہ جی سے لڑیں گے نہیں۔ ٹھیک ہے شاہ جی! ہم دیکھ لیں گے۔ سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ بہت بڑا نقصان ہوا ہے ہمارا۔“

”جاؤ بابا جاؤ۔ میرے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ طارق شاہ نے مغرور لہجے میں کہا اور راجہ سرکار دلبر دونوں خاموشی سے باہر نکل گئے۔

منیجر چائے کے لوازمات ملازموں کے ساتھ لے کر اندر آرہا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ کھانے پینے والے لوگ ہیں چنانچہ اس نے بڑے زبردست انتظامات کئے تھے۔ دیوان نے خوشی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ ہوئی نا بات۔ اب ذرا مزے کی باتیں ہوں گی۔ ہاں تو تم یہ چاہ رہے ہو کہ...... ارے او مانک...... کیا بیٹھا شکل دیکھ رہا ہے۔ کھا بھائی! مفت کا مال ہے، جی بھر کر کھاؤ...... چلو شروع ہوجاؤ۔“

”جی......“

”اوہ دونیہ! تو کیوں الگ بیٹھی ہے ری...... وہ ذرا ادھر سرکا، میرے پاس۔“ دیوان نے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دونیہ نے ایک بڑی پلیٹ اس کے سامنے سرکادی۔

”ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ ہم تمہارے سرکس میں شامل ہوجائیں۔ ہوجائیں گے بھائی! لیکن پارٹنرشپ کرلو۔ ہم اپنے کھیل دکھائیں گے اور تم ہمارے نیچے آکر کام کرنا۔ چارگنا آمدنی کردیں گے ہم۔“

”چائے پیو۔“ طارق شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

”پی رہے ہیں، پی رہے ہیں۔ چلو بھئی......“ دیوان نے ہنس کر کہا اور دونیہ اور مانک اس طرح سامنے رکھی چیزوں پر ٹوٹ پڑے جیسے کوئی اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ طارق شاہ انہیں ناخوشگوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

✿......✿

وان کیسرو کا علاقہ جنوبی آرتھیو ولیسکو کا سب سے مشکل علاقہ تھا۔ ویسے تو آرتھیو ولیسکو کے بیشتر علاقے غیر آباد اور دشوار گزار تھے اور وہاں زندگی کا تصور بھی مشکل تھا لیکن حکومت پلاسکو نے ان میں سے کچھ علاقوں کو خصوصی استعمال کے قابل بنا لیا تھا۔ یہاں خاص قسم کے سائنسی تجربے ہوئے تھے اور برف کی لاکھوں ٹن وزنی چھت کے نیچے شاندار لیبارٹریاں بنا دی گئی تھیں۔ ان لیبارٹریوں میں دنیا کے خطرناک ترین تجربے ہوتے تھے۔ حکومت پلاکو نے ان لیبارٹریوں میں کام کرنے والے سائنسدانوں کو بہترین مراعات دی تھیں اور برف کی اس مشکل ترین زندگی کو بے حد آسان بنا دیا تھا۔ یہاں کام کرنے والے سائنسدانوں کے اہل خاندان کو ساری دنیا میں کسی بھی جگہ زندگی گزارنے کی سہولت دی گئی تھی۔ وہ ان سائنسدانوں کی وساطت سے اعلیٰ ترین زندگی گزارنے کے اہل قرار دیئے گئے تھے۔

دنیا کے کئی ممالک کو اس بات کا شبہ تھا کہ پلاسکو کے خفیہ ایجنٹوں نے ان ذہین ترین ایجنٹوں کو اغواء کر کے وان کیسرو پہنچایا ہے جو انوکھے تجربات کر رہے تھے۔ لیکن بے شمار مشن آرتھو ویسکو بھیجے تھے جنہیں ان سائنسدانوں کا سراغ لگانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اور یہ بھی ایک پُر درد المیہ تھا کہ ایسے کسی بھی مشن کا کوئی ایک فرد زندہ واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود اکثر ایسی کوششیں ہوتی رہتی تھیں۔ پھر اس وقت پہلی بار گورنمنٹ آف پلاسکو کو بدترین پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جب ایسی ہی ایک برفانی لیبارٹری کے پرخچے اُڑ گئے۔ انتہائی خوفناک دھماکوں نے اربوں ڈالر سے تیار شدہ اس لیبارٹری کو برف بوس کر دیا اور وہ زمین کی گہرائیوں میں اتنی نیچے چلی گئی جہاں تک جا کر اس کا سراغ لگانے کا تصور تک مٹ جائے۔ ستائیس افراد وہاں کام کر رہے تھے جن میں چودہ سائنسدان تھے باقی دوسرے لوگ جن میں سکیورٹی گارڈز وغیرہ اور ریڈیو آپریٹر اور دوسرے معاملات کو کنٹرول کرنے والے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی زندگی کا سراغ نہیں مل سکا۔ زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر انہیں تلاش کرنا ناممکن عمل تھا۔ ماہرین تلملا کر رہ گئے۔ وہ یہ سراغ تک نہیں لگا سکے تھے کہ آخر اس لیبارٹری کی تباہی کی وجہ کیا تھی۔ بات ابھی الجھن میں ہی چل رہی تھی کہ ایک اور لیبارٹری اسی انداز میں تباہ ہو گئی اور حکومت دہل کر رہ گئی۔ کیونکہ بالکل نہیں پتہ چل سکا تھا کہ حکومت پلاسکو کے اس بدترین نقصان میں کس کا ہاتھ ہے۔

بہر حال خصوصی طور پر ایک منصوبہ بنایا گیا۔ برفانی علاقے سے تھوڑا سا ہٹ کر جو ایک بندرگاہ تھی، وہاں ہیڈ کوارٹر بنایا گیا اور ان برف زاروں میں دوسرے انتظامات کئے جانے لگے۔ ایک دہشت بیٹھ گئی تھی۔ اول تو ویسے ہی اس جگہ کام کرنا ایک انتہائی ناممکن عمل تھا۔ اس کے لئے کچھ لوگوں کو تو مجبور کیا جاتا تھا اور کچھ ایسے محب وطن لوگ کام کر رہے تھے جو حکومت پلاسکو کے منصوبے سے زبردست اتفاق رکھتے تھے۔ ورنہ عام طور سے یہاں کام کرنے والے اس طرح کے مظاہرے کرتے کہ حکومت ان کے لئے مجبور ہو جاتی۔ وان کیسرو تو ویسے ہی ایک خوف کی جگہ تھی جہاں کے بارے میں اگر حفاظتی عملے کو بھی منتخب کیا جاتا تو اس وعدے کے ساتھ کہ چھ ماہ تک ڈیوٹی دینے کے بعد اسے ریٹائر کر دیا جائے گا اور ساری عمر پنشن دی جائے گی۔ یہ منصوبہ بن چکا تھا لیکن دو لیبارٹریوں کی تباہی نے ایسا خوفناک کام کیا تھا کہ حکومت پلاسکو کے ذمے دار ارکان سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے ذہن میں صرف ایک نام ہی آتا تھا اور وہ نام تھا رازل جریری...... رازل جریری جس کے خلاف کام کر کے یہ لوگ نجانے کس عذاب میں گرفتار ہو گئے تھے۔

لیبارٹری نمبر تین میں اس وقت دہشت کی لہر دوڑ گئی جب وہاں موجود سائنس دانوں میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ یہاں وہ کچھ تبدیلیاں دیکھ رہا ہے۔ مشہور سائنسدان ہیلسن نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جو دو حادثے ہو چکے ہیں ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں ہلیکیو بلینکر پر جو تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں وہ مجھے ایک انوکھے خیال سے دوچار کر رہی ہیں۔"

"ہلیکیو بلینکر؟"

"ہاں...... ہلیکیو بلینکر۔"

"یہ تبدیلیاں کیا ہیں؟ اور ہلیکیو بلینکر تو آپ کی اپنی ایجاد ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں ابھی تک کوئی تفصیلی بات معلوم نہیں ہے۔"

"اصل میں ہلیکیو بلینکر میں نے ایک آبزربیٹری کے طور پر بنایا ہے۔ ایک ایسا اسپیس سکرین جس پر میں سیاروں کے درمیان ان نادیدہ اجسام کی تحقیق کر سکوں جو خلاء میں تیرتے پھرتے ہیں لیکن کچھ خاص شعاعوں کے زیر اثر بلینک ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ان اجسام کی ماہیت اس قدر اہم ہوتی ہے کہ اگر وہ ہمیں دستیاب ہو جائیں تو ہماری معلومات

میں بیش قیمت اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہلیکیو بلینکر میری ایک ایسی ہی ایجاد ہے جس پر میں
مسلسل کام کر رہا تھا۔ وہ اجسام جو خلاء میں نظر نہیں آتے، ہلیکیو بلینکر پر ہمیں ایک چمکدار
شعلے کی شکل میں نظر آ جاتے ہیں۔ ہم نے ان اجسام کو زندہ روحوں کا نام دیا ہے۔ زندہ
روحیں جن کے جسم نہیں ہوتے لیکن وہ خلاء میں آزاد پھرتی ہیں۔ لیکن پچھلے کچھ وقت سے
ہمارے ہلیکیو بلینکر پر ایک عجیب و غریب چیز نظر آتی ہے۔ اس لیبارٹری کے مختلف حصوں
میں کوئی ایسی نادیدہ کارروائی ہو رہی ہے جو ناقابل فہم ہے۔ میں تمہیں اپنے مکمل تجربات
کے بارے میں بتا رہا ہوں اور یہ ضروری ہے۔ حکومت پلاسکو نے بیرونی طور پر ہماری ہر
طرح کی سکیورٹی کا بندوبست کر دیا ہے لیکن دو لیبارٹریاں تباہ ہو چکی ہیں۔ آخر کیسے......؟
سمندر یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے اور شہری آبادیاں یہاں سے بے پناہ دور۔ اس کے
باوجود ہر طرح کے آسمانی اور زمینی اور سمندری معاملات کا خیال رکھا گیا ہے یعنی تینوں
طرف سے اگر کوئی پیش قدمی ان لیبارٹریز کی طرف ہوتی ہے تو حکومت پلاسکو کے متعین
کردہ محافظ ہمارا بچاؤ کر سکتے ہیں۔ ہمارا بلو اسٹیشن بہترین ساز و سامان کے ساتھ موجود
ہے۔ میں ہلیکیو بلینکر کی بات کر رہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے جو تبدیلی مجھے محسوس ہوئی ہے وہ
یہ ہے کہ کوئی ایک چمکدار جسم یا پھر جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ کوئی زندہ روح ہمارا سارا
نظام واچ کر رہی ہے۔ ہلیکیو بلینکر پر لیبارٹری کے مختلف گوشوں میں کسی ایسے چمکدار وجود
کی موجودگی نمایاں ہو رہی ہے جو کوئی باقاعدہ جسم نہیں رکھتا۔ یعنی ایک روح۔ آپ لوگ
کہیں گے کہ زمانہ جدید کا یہ سائنسدان جو اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہے ایسی
توہمات کی باتیں کر رہا ہے۔ لیکن میری یہ ایجاد ہلیکیو بلینکر یہ سمجھ لو کہ میرے لئے ایک اعزاز
ہے۔ میں اس پر خلائی اجسام تلاش کر رہا تھا اور یونہی خلاء سے اتر کر میں زمین پر آیا اور اپنی
لیبارٹری میں داخل ہوا، میرا مطلب ہے اپنے ہلیکیو بلینکر کے ذریعے تو مجھے ایک زندہ روح
کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا یہ زندہ روح خلاء سے زمین پر
اتر آئی ہے؟ اور جب میں نے اس کی تلاش میں چاروں طرف اپنی جاسوسی لہریں دوڑائیں
تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کہیں اور نہیں، برف کے ویرانے میں نہیں بلکہ اس لیبارٹری میں
موجود ہیں تو دہشت زدہ ہو گیا۔ لیکن اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے میں نے سوچا کہ میں
آپ لوگوں کو تفصیل بتانے سے پہلے کچھ اور تحقیقات کروں۔ چنانچہ میرے دوستو! میں

نے مختلف اوقات میں اس زندہ روح کو مختلف جگہوں پر دیکھا ہے۔ یعنی اپنی لیبارٹری کے
ان گوشوں میں جہاں ہم نے کوئی اہم کارروائی کی ہوتی ہے یعنی اپنے تحقیقاتی مراکز پر۔
مثلاً میں تم سے ایٹی نائن کی بات کرتا ہوں۔ اب اگر تم میں سے کوئی ایٹی نائن کے
فارمولے کے بارے میں مکمل تفصیل جاننا ہے تو یہ دیکھ لے کہ اس فارمولے میں کیا کیا
تبدیلی کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ میں ایکس، او فائیو کی بات کرتا ہوں۔ ایکس او فائیو کو
بھی دیکھ لیجئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی نیریکلین۔ یہ تین پوائنٹ اس وقت اپنے مرکز سے
ہٹے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں اس طرح جانتا ہوں میں کہ میں نے خود بھی ان پر
کام کیا ہے۔ آپ یوں کریں کہ میرے بیان کی تصدیق کرنے سے پہلے خود ان جگہوں کا
جائزہ لے لیں۔ مسٹر ڈائیکر، مسٹر جیری! آپ میرے ساتھ ان دونوں بلکہ تینوں پروجیکٹس
پر کام کرتے رہے ہیں اور آپ کے پاس بھی ان کی تفصیلی رپورٹ موجود ہے۔ براہِ کرم
پہلے ان کا جائزہ لے لیجئے۔"

اور جب ان تمام سائنسدانوں نے ان جگہوں کا جائزہ لیا جس کی نشاندہی مسٹر بینسن
نے کی تھی تو ان سب کے سانس اوپر کے اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ جو تبدیلیاں وہاں
کی گئی تھیں وہ مزید کچھ کارروائی کے بعد ایک خطرناک تباہی کا ذریعہ بن سکتی تھیں۔ خوف و
دہشت کی ایک خوفناک لہر لیبارٹری میں دوڑ گئی۔ جو دو لیبارٹریاں تباہ ہوئی تھیں وہ اس
طرح تباہ ہوئی تھیں کہ نشانِ عبرت بن گئی تھیں اور اب یہی کارروائی اس تیسری لیبارٹری
میں ہونے جا رہی تھی۔ لیکن بینسن کا یہ انکشاف جو اس نے ہلیکیو بلینکر کے ذریعے کیا تھا ان
سب کے لئے انتہائی ہولناک تھا۔ مسٹر بینسن نے ان تمام چیزوں کی نشاندہی کرنے کے
بعد کہا۔

"اور میرے دوستو! شروع ہی سے ایک ایسا تصور میرے ذہن کو پراگندہ کئے ہوئے
ہے جس کا تذکرہ آپ لوگوں سے کروں گا تو آپ سب اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھیں گے یعنی
راز لجریدی، جس کے بارے میں یہ بات طے پا چکی ہے کہ وہ وان کیسرو یا پھر یوں کہو کہ
آرتھیو ولیسکو کے ان روایتی غاروں میں پڑا ہے جہاں انسانی یا مشینی گزر ممکن نہیں ہے۔
لیکن اس کی روح زندہ ہے۔ وہ ایک ایسا زندہ جسم تلاش کرتا پھر رہا ہے جو روح سے محروم
ہو۔ لیکن روح کی پہنچ سے بھی باہر ہو۔"

وہاں موجود ہر شخص کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔
جانے رازل جریری کی کہانی کیا تھی......؟

✿......✿

وہ تینوں بڑی لاپرواہی اور بڑی بدتمیزی سے چائے پیتے رہے۔ طارق شاہ نے کئی بار نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ تینوں کے چہرے پر اتنی لاپرواہی نظر آ رہی تھی جیسے وہ کسی بہت ہی گھٹیا سے آدمی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں۔ سامنے رکھی ہوئی تمام چیزیں صاف کرنے کے بعد دیوان نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بڑی مہربانی بھائی جی آپ کی۔ بڑا اچھا کھلایا پلایا۔ ہاں تو پھر اب یہ بتاؤ کہ ارادہ کیا ہے؟"

"چائے پی لی تم نے؟"

"ہاں بھیا! اور ہے نہیں برتنوں میں۔ ورنہ چائے کے تو ہم بڑے رسیا ہیں۔ کیوں ری دونیہ؟" دیوان نے دونیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دونیہ بڑے عجیب انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر اس نے طارق شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ہمیں کب سے سرکس میں آنا ہوگا صاب جی؟"

"ہاں ہاں مانک! کیا کہتے ہو، تم بولو۔"

"وہی بات ٹھیک ہے۔ سرکس میں پارٹنر شپ کر لو۔ آدھا آدھا۔"

"چائے پی لی تم نے؟" طارق شاہ کی غراہٹ بڑی عجیب تھی۔

"ارے بھیا! تم نے پلائی تو پی لی۔ کوئی زبردستی تو نہیں پی ہم نے۔ بول کیسے رہے ہو؟"

"اٹھو......" طارق شاہ کی آواز اور زیادہ خوفناک ہو گئی اور تینوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں بولو بھائی جان! بولو......"

"نکل جاؤ...... چلو نکل جاؤ یہاں سے۔"

"کک...... کیا مطلب؟ بے عزتی کر رہے ہو ہماری؟"

"نکل جاؤ...... یا کچھ اور بے عزتی کروں۔"

"ہیں...... کھلا پلا کر بے عزتی کر رہے ہو۔ کیسے آدمی ہو بھائی۔"

"منیجر! جاؤ گارڈ کو بلاؤ۔ ان سے کہو انہیں دھکے دے کر باہر نکال دے۔"

"مر گئے دھکے دینے والے۔" مانک غرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے نہ نہ نہ...... بھیا! کھا پی لیا ہے تمہارا۔ تم نے ہی بلایا تھا، تبھی بھگا رہے ہو۔ ارے رکو منیجر! ارے بھائی، کیا اسی لئے لایا تھا یہاں؟"

"منیجر! انہیں ایک سیکنڈ کے اندر اندر نکال دو۔ ورنہ تمہیں بھی ان کے ساتھ ہی جانا ہوگا۔" طارق شاہ بدستور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"چلئے بھائی صاحب! چلئے...... آیئے...... آیئے، میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آیئے......آیئے......"

"ارے بھائی! ایک سیکنڈ۔ میں تو اپنی ٹوپی تک سیدھی نہیں کر سکتا۔ چلو یار مانک! چل ری دونیہ! عجیب پاگل لوگ ہیں۔ بلاتے ہیں، کھلاتے پلاتے ہیں، پھر بے عزتی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پر ہم تمہیں ایک بات بتا دیں بھائی! دھکے دو، گالیاں دو، جوتے مار لو پر بے عزتی بالکل مت کرنا۔ ورنہ ہمیں غصہ آ جائے گا۔ چل مانک! چل۔" دیوان نے مانک اور دونیہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اس کے بعد وہ لوگ وہاں سے باہر نکل گئے۔

طارق شاہ کا چہرہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ اس نے خونی نگاہوں سے منیجر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"منیجر! یہ بدتمیزی تم نے کی ہے۔ یہ بتاؤ تمہارے ساتھ میں کیا سلوک کروں؟"

"سر! جو آپ کا دل چاہے۔ آپ مالک ہیں اور میں ملازم۔ ظاہر ہے جو آپ کہیں گے وہی ہوگا۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتا دوں، آپ ایسا کیجئے اگر یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور اپنا کھیل جاری رکھتے ہیں تو آپ بھی ایک نگاہ ان کے کھیل پر ڈال لیجئے۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جناب عالی! میں نے بہت عرصے سے اس سرکس کا نمک کھایا ہے۔ اس کی ہر بہتری اور ہر بھلائی میری ذمے داری ہے۔ یہی میرے نمک حلال ہونے کی نشانی ہے۔ صرف اس لئے ان لوگوں کو یہاں لایا تھا کہ معمولی سے لوگ ہیں، سڑکوں پر کام کرتے ہیں، انہیں بھی عزت اور اوقات مل جائے گی اور سرکس کو بہت اچھے فنکار...... یہ بات تو میں اب بھی کہوں گا سر! کہ ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہے ان کے مقابلے پر ہماری سرکس میں جو ان کی

طرح کام کر سکے۔ یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے۔"

"ٹھیک ہے...... تمہارا مطلب یہ ہے کہ سرکس کی پارٹنر شپ ان سے کر لی جائے۔ ان تین سڑک چھاپ لوگوں سے جن کے پاس صحیح طور سے پہننے کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟"

"سر! گولی ماریں آپ انہیں۔ اتنی فضول بات پر تو مجھے بھی بہت غصہ اور افسوس ہے۔ لیکن جاہل آدمی ہیں، جہالت کی بات کر گئے۔ جہاں تک میرے معاملے کا تعلق ہے میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر کل وہ پھر اپنا پروگرام کرتے ہیں تو آپ ذرا ایک بار ان کا جائزہ لے لیجئے۔ میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔"

"ضرور جائزہ لوں گا ان کا میں۔" طارق شاہ غصیلے لہجے میں بولا۔ بڑا غصہ آ رہا تھا اسے ان کی باتوں پر۔ خیر تھے تو جاہل ہی۔ لیکن جاہل ہونے کے باوجود انہوں نے جس انداز میں بات کی وہ خالی جہالت نہیں تھی۔ حرام زادوں کے دل میں پارٹنر شپ کی بات آئی ہی کیسے...... دو ہی وجوہات تھیں۔ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ فنکار سمجھتے تھے۔ دیکھوں گا ضرور کیسے فنکار ہیں۔ اور نجانے طارق شاہ کب تک کھولتا رہا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔ آج کے شو میں اسے زیادہ لطف نہیں آیا۔ آخری فیصلہ اس نے یہی کیا تھا کہ منیجر کی بات کی تصدیق ضرور کرے گا۔ ان کا کھیل دیکھے گا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے گا کہ منیجر قابل معافی ہے یا نہیں۔ ایسے جاہل لوگوں کو یہاں تک لایا ہی کیوں۔ منیجر کو شاید اس بات کا احساس تھا کہ دوسرے دن تک طارق شاہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ لیکن طارق شاہ کو شاید زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔ شام کو پانچ بجے اس نے کہا۔

"کیا ہو رہا ہے میلے میں...... معلومات حاصل کیں؟"

"جی سر! اچھا خاصا رش لے رہا ہے۔"

"میں رش کی بات نہیں کر رہا۔ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ یہاں موجود ہیں، اپنا شو کر رہے ہیں یا بھاگ گئے؟"

"نہیں مالک! آج تو انہوں نے بڑے جھولے شو لے لگائے ہیں۔ ہمارے سرکس سے اونچا بانس باندھا ہے انہوں نے۔ بانس میں بانس باندھتے ہیں اور اسے رسہ باندھ کر لچکا رہے ہیں۔"

"میں بھی دیکھوں گا ان کے کھیل کو۔" طارق شاہ نے کہا اور پھر اس کے بعد وہ اِدھر سے اُدھر گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ شام کے ساڑھے چھ بج گئے۔ جو لوگ پہلے ان کا شو دیکھ کر جا چکے تھے وہ سارے کے سارے جمع ہو گئے۔ اتنا رش ہو گیا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ تبھی طارق شاہ نے دیکھا کہ مانک ایک چست لباس میں ملبوس خیمے سے باہر آیا۔ دونیہ اور دیوان بھی آ گئے تھے۔ مانک نے بانس پکڑا اور جس برق رفتاری سے وہ بانس کے سرے تک پہنچا وہ ناقابل یقین تھا۔ جبکہ بانس میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جو کسی طرح مانک کے اوپر جانے میں معاون ثابت ہوتی۔ لچک دار بانس کے سرے پر پہنچنے کے بعد مانک نے اسے اپنے انگوٹھوں کی گرفت میں لیا اور پھر وہ کھیل شروع ہوا جس کی توقع کسی انسان سے تو کی نہیں جا سکتی تھی۔ بانس کا سرا لچکا اور بانس کمان کی طرح دوہرا ہو گیا۔ مانک سینکڑوں انسانوں کے اوپر سے گزرتا ہوا نیچے تک آیا، پھر وہیں سے پلٹ کر دوسری طرف۔ اب تقریباً نوے فٹ اونچے بانس کے سرے سے ایک انسان کمان کی شکل بنا رہا تھا اور صرف پیروں سے اس بانس کو پکڑ رکھا تھا۔ خود طارق شاہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ذرا سی لغزش یا پھر پیروں کی گرفت میں ہلکی سی کمی ایک انسان کو زندگی سے محروم کر سکتی تھی اور انسان بھی وہ جو چست اور خوبصورت لباس میں اس قدر حسین نظر آ رہا تھا کہ دیکھنے والی آنکھیں اسے دیکھ کر اس پر سے ہٹنے کو نہ چاہیں۔

"خدا اس پر رحم کرے۔" طارق شاہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

اس وقت پورے میلے کی کارروائیاں رک گئی تھیں۔ سارے کھیل تماشے بند ہو گئے تھے۔ بلندی اتنی تھی کہ ہر جگہ سے مانک کے اس کھیل کو دیکھا جا سکتا تھا۔ طارق شاہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آخر کار ایک بار مانک بانس کے سرے کو لچکا کر انسانوں کے ہجوم پر پہنچا اور آہستگی سے اس نے زمین پر پاؤں رکھ دیئے۔ بانس ایک زوردار زناٹے سے سیدھا ہو گیا تھا۔ جس جگہ مانک زمین پر اترا تھا وہاں کے لوگوں نے اسے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ طارق شاہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجمع والہانہ انداز میں مانک کو چوم رہا تھا۔

اسی وقت طارق شاہ کی نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔ راجہ سرکار اور دلبر سرکار بھی مجمع میں موجود تھے۔ طارق شاہ انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

"یہ برا ہو گیا...... یہ واقعی برا ہو گیا۔"

"کیا سر! میں سمجھا نہیں۔"

"آؤ مینجر......"

"سر! یہ ابھی اور نا قابل یقین کھیل دکھائے گا۔"

"جو کچھ اس نے دکھایا ہے اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ آگے یہ اور نیا کرے گا! میرے ذہن کو بس ایک خدشہ ہے۔"

"کیا سر؟"

"کہیں راجہ سرکار اسے اپنے ساتھ شامل نہ کر لے۔" طارق شاہ نے جواب دیا۔

✿......✿

لیبارٹری نمبر تین کی رپورٹ پر حکومت پلاسکو کے اعلیٰ ارکان میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ فوراً ہی ایک تحقیقاتی ٹیم برف کی پراسرار سرزمین پر پہنچ گئی۔ اس میں بڑے بڑے اعلیٰ دماغ تھے۔ وہ دو لیبارٹریوں کی تباہی نے حکومت پلاسکو کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ ابھی یہ خوفناک اور ہولناک کارروائی منظر عام پر نہیں لائی گئی تھی اور اس کے بارے میں صرف تحقیقات ہی ہو رہی تھیں۔ لیکن ایک طرح سے نہ ہونے کے برابر۔ بھلا ایسے گڑھوں میں کیا تلاش کیا جا سکتا تھا جن کی وسعتیں بے پناہ ہوں اور آس پاس کی برفانی زمین اس قدر ناپائیدار ہو گئی ہو کہ کوئی بھی وزنی چیز اس گڑھے کے قطر کو اور بڑھانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ کر سکے۔ ہر طرح کی کوششیں کر لی گئی تھیں۔ کچھ انتہائی دلیر ہوابازوں نے ہیلی کاپٹر کو اس گڑھے میں اتارنے کی کوشش کی تھی اور خاصے نیچے تک چلے گئے تھے لیکن جس جگہ کی انتہا کا بھی کوئی اندازہ نہ ہو وہاں کتنی گہرائیوں میں جایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اطلاع یہ تھی کہ وہاں سے ایسی گیسوں کا اخراج ہو رہا ہے کہ اگر کوئی ذی روح وہاں دس منٹ تک رک جائے تو پھر دوبارہ کبھی سانس نہ لے سکے۔ چنانچہ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ ان لیبارٹریوں کے بارے میں دنیا کے کچھ اور دوست ممالک بھی جانتے تھے۔ تھوڑی بہت بھنک ان کے کانوں تک ضرور پہنچائی گئی تھی کیونکہ ان کے بھی کچھ مفادات یہاں سے وابستہ تھے۔ لیکن پلاسکو گورنمنٹ نے مکمل تفصیل آج تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔ اور جب تیسری لیبارٹری سے بھی مسٹر بینسن کی ہلکیو رپورٹ سائنسی اداروں کو پہنچی اور وہاں سے اعلیٰ درجے کے حکام کو تو اعلیٰ حکام دہشت زدہ ہو گئے۔ یہاں تو برف کی اس پراسرار زمین پر بہت کچھ ہو رہا تھا۔ ایسی ایسی خوفناک سازشیں ہوئی تھیں وہاں کہ اگر دنیا کے علم میں آ جاتیں تو شاید تیسری جنگ عظیم کے امکانات بڑھ جاتے۔

کئی ملکوں کے سائنسدانوں کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا اور انہیں مجبور کیا گیا تھا کہ وہ

یہاں پلاسکو کے لئے کام کریں۔ پلاسکو حکومت نے اپنا ایک نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا
جو سراسر فریب پر مبنی تھا۔

بہر حال مسٹر بینسن کی رپورٹ پر پہلے لیبارٹری کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ پھر
زبردست کارروائیاں کرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ زندہ روح وہاں موجود نہیں ہے۔ مگر
ہے عارضی طور پر اس نے یہ جگہ چھوڑ دی ہو۔ جو تبدیلیاں کی گئی تھیں انہیں درست کیا گیا
لیکن وہاں موجود اعلیٰ درجے کے کارکن بددل ہو چکے تھے۔ بمشکل تمام انہیں یہاں کام
جاری رکھنے پر آمادہ کیا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک بلو اسٹیشن قائم کیا جارہا
ہے۔ یعنی اس جگہ سے صرف تیس میل کے فاصلے پر۔ اس کے علاوہ ڈینی مور نامی ایک
طیارہ بردار جہاز فوری طور پر آرتھینولیسکو کے پاس سمندر میں بھیجا جارہا ہے۔

ڈینی مور پر ہر طرح کے دفاعی انتظام موجود ہیں اور وہاں سے نہ صرف بلو اسٹیشن بلکہ
لیبارٹری تک فوری طور پر مدد بھیجی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کو پوری طرح یقین دلا دیا گیا تھا۔
خود بلو اسٹیشن پر چھ ہیلی کاپٹر پہنچا دیئے گئے تھے جو ذرا سی دیر میں ہر قسم کی کارروائیوں کے
لئے فضا میں بلند ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایمرجنسی لینڈ بنایا گیا تھا۔

اصل میں حکومت پلاسکو یہاں جو کچھ کر رہی تھی اس کے پس منظر میں اتنا کچھ تھا کہ د
سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان دو لیبارٹریوں کی تباہی نے گویا ایک طرح سے حکومت پلاسکو کو
مفلوج کر دیا تھا۔ وہ تو اس سلسلے کے اہم ترین معاملات تھے جس کی وجہ سے باہر کی دنیا
اس کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں ورنہ نجانے کیا کچھ ہو جاتا۔

بہر حال بات صرف اتنی سی نہیں تھی، عارضی طور پر کچھ رن وے بنائے گئے تھے
سمندر کے آس پاس ہی تھے اور یہاں خاص قسم کے طیارے رکھے جاتے تھے۔ ایسے
ایک طیارے کے دو افراد اس وقت خراب موسم کے باوجود یہاں چھوٹے سے ایئرپورٹ پر
مستعد تھے۔ ان میں ایک سٹین تھا، دوسرا فلیچر۔ اور دونوں ہی اعلیٰ درجے کی کارکردگی کے
مالک تھے۔

میجر فلیچر بہت نامور پائلٹ تھا اور کو پائلٹ اسٹین بھی اپنے طور پر بڑی اعلیٰ درجے کی
شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ بڑے اعلیٰ درجے کے کارنامے منسلک تھے
چنانچہ جب ریڈیو ٹرانسمیٹر پر میجر فلیچر کو ایک پیغام ملا تو اس کی سیاہ آنکھوں میں الجھن نظر

گئی۔ پیشانی پر فکر و تشویش کی لکیریں اُبھر آئیں۔ اس نے اس طرح ہیڈ فون کو چھوا جیسے
سماعت سے ٹکرانے والے الفاظ سمجھ میں نہ آئے ہوں۔ وہ اس وقت معمول کے گشت پر
تھے اور بلو اسٹیشن سے خاصے فاصلے پر اپنے طیارے کو فضا میں گردش دے رہے تھے۔ طیارے
کے انجنوں کے شور میں میجر فلیچر نے دوبارہ وہی الفاظ سنے۔ مفہوم وہی تھا جو وہ پہلے سن چکا
تھا۔ لیکن نجانے کیوں ان الفاظ پر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

طیارہ اس وقت بلو اسٹیشن سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کا پورا
والیم کھلا ہونے کے باعث آواز کی شدت سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جانے
چاہئے تھے لیکن آپریٹر کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی اور کچھ لمحوں بعد
یہ مدھم آواز بھی خاموشی میں ڈوب گئی۔ شاید آپریٹر شدید زخمی ہو چکا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے
اس نے کو پائلٹ اسٹین کی طرف دیکھا۔ اسٹین نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ فلیچر نے اسے
جھنجھوڑ دیا۔ اسٹین چونک کر اٹھا اور فلیچر کو دیکھنے لگا۔

”خیریت...... کیا بات ہے؟“

”ابھی ابھی بلو اسٹیشن کے کنٹرول ٹاور سے پیغام ملا ہے کہ کسی نامعلوم طیارے نے ان
پر حملہ کیا ہے۔“ فلیچر نے بتایا۔

”حملہ...... کسی نامعلوم طیارے نے...... بلو اسٹیشن پر؟...... کیا یہ رات کی بوریت کا
مذاق نہیں ہے؟“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ پیغام دینے والے آپریٹر کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے
وہ شدید زخمی ہو۔“ فلیچر کی نگاہیں تقریباً پانچ ہزار فٹ نیچے پھیلے ہوئے سمندر کی لہروں کا
جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بولا۔

”اوہو دیکھو...... تمہارے پاس دوربین ہے اسٹین! براہِ کرم مشرقی سمت انتہائی علاقے
کی طرف دیکھو...... کیا وہ جگہ بلو اسٹیشن نہیں ہے؟“

اسٹین نے آنکھیں بند کر کے زور سے گردن جھٹکی جیسے اپنے آپ کو اس غنودگی کے جال
سے نکالنا چاہتا ہو جو اب بھی اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ خراب موسم میں طیارے کو فضا میں
قائم رکھنا بھی ایک مشکل کام ہوتا ہے اور وہ کافی دیر تک یہ مشکل کام انجام دیتا رہا تھا اور
اس کے بعد اس کی جگہ فلیچر نے سنبھال لی تھی۔ اس نے دوربین سے اس طرف کا جائزہ

لیا۔

اس طرف واقعی کچھ ہو رہا تھا۔ دھوئیں کا سیاہ بادل ان کی نگاہوں سے محفوظ نہیں تھا۔ فلیچر نے اس دوران طیارے کا رخ اسی جانب کر دیا تھا۔ فاصلہ کچھ کم ہوا تو نارنجی رنگ کے شعلے بھی دکھائی دینے لگے۔ فلیچر نے ریڈیو کا بٹن دبایا اور ہیڈ فون درست کرتے ہوئے پیغام نشر کرنے لگا۔

''ایم ایکس کنٹرول...... ایم ایکس کنٹرول...... فلیچر کالنگ...... ہیلو...... بلو اسٹیشن...... ایم ایکس کنٹرول...... ہیلو ہیلو......'' اس نے کئی بار یہ الفاظ دوہرائے لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو اس کی تشویش بڑھ گئی۔ اسٹین نے تشویش آمیز نگاہوں سے فلیچر کو دیکھا۔

''تم نے کہا تھا مسٹر فلیچر! کہ بلو اسٹیشن پر کسی نامعلوم طیارے نے حملہ کیا ہے۔ نامعلوم طیارے کا مطلب ہے ایک طیارہ۔''

''ہاں...... آپریٹر کے یہ الفاظ میرے کانوں تک پہنچے تھے۔''

''کیا بات کچھ سمجھ میں آتی ہے، صرف ایک طیارہ جس نے بلو اسٹیشن پر حملہ کیا ہو۔ بلو اسٹیشن پر تو خود بھی خاصے مناسب انتظامات ہیں۔ کیا وہاں سے ہمارے ہیلی کاپٹر اس طیارے پر حملہ کرنے کے لئے بلند نہیں ہوئے جبکہ یہ ہیلی کاپٹر یوسیون ہیں۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ موسم بھی کتنا خراب ہے۔ اور پھر......'' فلیچر نے جملہ ادھورا چھوڑ کر طیارے کا رخ بدل کر تھروٹل کھینچ لیا۔ طیارہ اوپر اٹھ گیا۔ برف کے ان پہاڑوں پر ایک طویل چکر کاٹ کر اس طرف بڑھنے لگا جہاں سے دھوئیں کے بادل امڈ رہے تھے۔ اور پھر ہیڈ فون پر ابھرنے والی تیز آواز فلیچر کے کانوں سے ٹکرائی اور اس نے گھبرا کر جلدی سے والیم کم کر دیا۔

''بلو اسٹیشن کنٹرول فیلڈ کالنگ...... بلو اسٹیشن کنٹرول فیلڈ کالنگ...... ہم پر حملہ کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی ہمارا پیغام سن رہا ہو تو ہمارے لئے مدد پہنچائی جائے۔ ہیلو ہیلو ہیلو...... ہماری مدد کرو...... ہم پر حملہ کر دیا گیا ہے۔'' آواز خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی فلیچر نے کہا۔

''ہم فضا میں موجود ہیں اور بہت جلد تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں...... ہیلو...... آپریٹر...... ہیلو ہیلو......'' لیکن پھر ایک کراہ کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند

لمحات کے بعد اس آواز کا جواب پھر ملا۔

''ہیلو، ہاں میں میجر فلیچر...... اس وقت فضا میں ہوں۔ ہم چھ ہزار فٹ کی بلندی پر تم سے تقریباً دس میل مغرب کی طرف ہیں۔ ہمیں سچویشن بتاؤ۔ کیا سچویشن ہے؟''

''ہمارے پاس اس وقت کوئی تحفظ نہیں ہے۔ ہمارے ہیلی کاپٹرز زمین پر ہی تباہ کر دیئے گئے ہیں اور اس وقت کوئی ہماری مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیا آپ ہماری مدد کریں گے میجر فلیچر......'' آپریٹر کی کرب میں ڈوبی ہوئی آواز نے پوچھا۔

''ہم جس قدر جلد ممکن ہو سکتا ہے پہنچ رہے ہیں۔ کیا تم اس طیارے کی ساخت بتا سکتے ہو؟''

''قدیم طرز کا جہاز ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی اصل کیفیت کیا ہے۔ لیکن ہوا باز نے ہمیں مفلوج کر دیا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں کر پا رہے۔''

''ہم تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں۔'' فلیچر نے کہا اور اس کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اسٹین سے بولا۔

''فوراً مقابلے کی تیاری کرو۔''

''تعجب کی بات ہے۔ میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔ یعنی کمال کی بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کوئی قدیم طرز کا طیارہ ہے اور قدیم طرز کے طیارے کی بلو اسٹیشن پر پہنچنے کی اطلاع اس جدید ترین اسٹیشن کو نہیں ہوئی جسے یہاں خاص طور سے تعینات کیا گیا ہے، ایک ایسے مشن پر جو آسان نہیں ہے۔''

''ہاں۔ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔ لیکن اس وقت حقیقت کو سمجھنے کی بجائے ہمیں بلو اسٹیشن پہنچ کر ان کی مدد کرنی ہے۔ تم اپنی ریڈ شاٹ سنبھال لو۔ کیا سمجھے؟''

''ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔'' یہ کہہ کر اسٹین نے طیارے کے پچھلے حصے سے تیس کیلبر کی آٹو میٹک نکالی اور اس میں میگزین فٹ کرنے لگا۔ اور پھر اس نے طیارے کے پہلو میں بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں کھول لیں۔ کھڑکیوں کے کھلنے سے سرد ہواؤں کے جھونکے اندر آئے لیکن اس وقت ہواؤں کی سردی کا اثر نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اسٹین نے رائفل سنبھال لی اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا ذہن پوری طرح ہوشیار ہو چکا تھا اور وہ آنے والے ہر لمحے کے لئے اپنے آپ کو مستعد پاتا تھا۔ ویسے اسٹین، فلیچر

کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فلیچر اس وقت بہت زیادہ سنسنی کا شکار نظر آتا تھا حالانکہ وہ ایک مختلف شخصیت کا مالک تھا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ دوہری شخصیت کا مالک تھا اور اس بات کو اسٹین سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کی دوہری شخصیت میں ایک شخصیت وہ تھی جو اپنی خوش اخلاقی کے باعث فوراً ہی دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی اور دوسرا روپ تنہائی پسند تھا۔ جو بعض اوقات گہرے دوستوں کی مداخلت کو بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

ویسے اسٹین اس کے بچپن کا دوست ہونے کے باوجود اس کی شخصیت کے ان دونوں روپ کو نہیں جانتا تھا۔ اور وہ ان دونوں شخصیتوں کے درمیان کسی گمشدہ کڑی کی تلاش میں تھا لیکن اسے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں...... بس ایک تصور اس کے ذہن میں تھا۔ اسے یاد تھا کہ فلیچر کی محبوبہ سارڈی اسے دھوکا دے کر کہیں چلی گئی تھی اور اس وقت سے فلیچر کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کی تہہ کچھ اور بھی دبیز ہوگئی تھی۔

ویسے شکل وصورت ایسی نہیں تھی اس کی کہ عورتیں اس کی طرف کھنچ کر آتیں لیکن کوئی ایسی کشش اس میں ضرور موجود تھی جس کی وجہ سے ہر مقام پر وہ ہر دلعزیز ہو جاتا تھا۔ اس وقت فلیچر کی صورت دیکھ کر یہ تمام احساسات اسٹین کے ذہن سے گزر گئے۔ اچانک ہی فلیچر نے طیارے کا کنٹرول کالم آہستگی سے آگے کی طرف دبایا اور طیارہ جھکتا ہوا بلوفیلڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ رخ سیدھا کرتے ہی اس نے تھروٹل کھینچ لیا اور ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ طیارے کی رفتار بڑھ گئی۔ فلیچر کو جب اس کی رفتار صحیح معنوں میں کنٹرول کرنے کا موقع مل گیا تو اس نے طیارے کو سنبھال لیا۔ ویسے یہ دو انجن والا طیارہ اس کی درخواست پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس طیارے میں نہ صرف سامان اور مسافروں کو لے جانے کی گنجائش تھی بلکہ یہ پانی کی سطح پر بھی کشتی کی طرح تیر سکتا تھا۔ اس جہاز کو زمین پر اترنے یا زمین سے اُڑنے کے لئے بہت بڑے رن وے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔

دفعتہً ہی فلیچر کی نظریں زرد رنگ کے ایک طیارے پر پڑیں جو دھوئیں کے بادل کی دوسری طرف بلواسٹیشن پر حملے کر رہا تھا۔ فلیچر کو اندازہ ہوگیا کہ یہی وہ طیارہ ہے جس نے بلو اسٹیشن پر تباہی مچا رکھی ہے۔ اس نے اپنے طیارے کی رفتار سست کر دی تا کہ حملہ آور طیارے کی زد میں نہ آسکے۔ لیکن وہ طیارہ...... اسے دیکھ کر فلیچر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ واقعی ایک پرانا جرمن طیارہ تھا اور اس وقت اس کا استعمال اور وہ بھی اس کامیابی کے ساتھ ناقابل یقین تھا۔

فلیچر نے کمال ہوشیاری سے کام لے کر طیارے کو ایک ایسے رخ پر ڈال لیا کہ وہ سورج کی شعاعوں میں چھپ جائے۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دوسرا جہاز اسے نہیں دیکھ سکا ہے۔ ایک خوفناک فضائی جنگ کے تصور سے فلیچر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ جیسے ہی اس کا طیارہ گرجتا ہوا اس دوسرے میرینو طیارے پر پہنچا، اسٹین نے فائر کھول دیا۔

دوسرے طیارے کا پٹ کھلا ہوا تھا اور ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہوگیا کہ اس کا پائلٹ اس اچانک افتاد سے بوکھلا گیا ہے۔ لیکن پھر اس نے سنبھل کر تیزی سے ایک طرف جھکا دیا۔ اگلے چند لمحات بہت ہی خوفناک تھے۔ بلواسٹیشن کی فضا میں پہلی بار فلائنگ بوٹ میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ فلیچر کا طیارہ گو تیز رفتار تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے طیارے کا ہواباز کمال کی مہارت رکھتا تھا۔ اس میں دو مشین گنیں نصب تھیں اور یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی کہ اس کی جنگی صلاحیت بے پناہ تھی۔ جرمن ایئر فورس میں اس طیاروں نے بڑی زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنے سامنے کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا تھا۔

اچانک ہی دوسرا طیارہ تیزی سے پلٹ کر فلیچر کے طیارے پر تیزی سے جھپٹا۔ فلیچر نے پوری قوت سے کنٹرول پیچھے کھینچ لیا۔ طیارہ بائیں پہلو پر قلابازیاں کھاتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ دوسری طرف سے مشین گن چلائی گئی تھی۔ گولیاں فلیچر کے طیارے کے عین قریب سے گزر گئیں اور دوسرا طیارہ بائیں طرف کا چکر کاٹ کر دوبارہ اس کی طرف لپکا۔ گولیوں کی باڑ چلی لیکن فلیچر ایک بار پھر طیارے کو صاف بچا لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے طیارے کو گھما کر دوسرے طیارے کے اوپر لے گیا۔ موقع پاتے ہی اسٹین نے بھی فائر کھول دیا لیکن دوسرے طیارے کے ہواباز کی مہارت کا وہ پہلے ہی اعتراف کر چکے تھے۔ وہ اس فائر سے بھی بچا اور تیزی سے نیچے جھکتا چلا گیا۔ البتہ چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ اس قدر تیزی سے اٹھا کہ فلیچر حیران رہ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھلے، اس طیارے سے زبردست فائرنگ شروع ہوئی اور وہ ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس بار مشین گن کی گولیوں نے فلیچر کے

طیارے کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن فلیچر نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ہوائی اڈے پر کھڑے ہوئے لوگ جو اس فضائی جنگ کو دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے بڑے خوف کا شکار ہوگئے۔ یہ ڈاگ فائٹ ان کے لئے شاید بالکل نئی چیز تھی اور انہوں نے پہلی بار اپنے سروں پر دو جہازوں کی جنگ ہوتے ہوئے دیکھی تھی۔ فلیچر کا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا اور چہرے پر جمع ہونے والا پسینہ لکیریں بناتا ہوا نیچے بہنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مدمقابل بہت ہی چالاک تھا۔

لیکن فلیچر خود بھی حکمت عملی سے کام لے رہا تھا اور اس پر کاری ضرب لگانے کے لئے مناسب لمحوں کا انتظار کررہا تھا۔ آخر کار اسے موقع مل گیا۔ اس مرتبہ وہ جہاز اوپر سے آرہا تھا۔ فلیچر کو اس کی پوزیشن کا اندازہ ہوگیا۔ دوسرے طیارے کا پائلٹ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ کامیابی کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن فلیچر نے اچانک ہی تھروٹل پیچھے کھینچ کر اپنے طیارے کی رفتار ایک دم کم کردی اور دوسرے طیارے پر گولیاں برساتا ہوا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ فلیچر کا طیارہ محفوظ رہا لیکن اسٹین کی رائفل نے اس بار دوسرے طیارے کا انجن چھلنی کردیا اور وہ دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا تیزی سے مغرب کی طرف نکل گیا۔ فلیچر نے ایک طویل چکر کاٹا اور پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا۔ لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ طیارہ اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوگیا۔

اب اس کا کہیں نام ونشان تک نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ فلیچر نے ایک گہری سانس لی۔ اسٹین اور وہ ونڈ شیلڈ سے باہر دیکھنے لگے۔ انہیں ڈینی مور کے پاس سمندر میں اترنا تھا جو ساحل کے قریب گہرے سمندر میں لنگر انداز تھا۔ لیکن فلیچر سوچ رہا تھا کہ بہتر یہ ہے کہ اب وہ وہاں نہ اترے۔ کیونکہ طیارے میں گولیاں لگ چکی تھیں اور خوف تھا کہ یہ نقصان زیادہ خطرناک ثابت نہ ہو۔ اسٹین نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

''نہیں...... سمندر میں اترنے کی بجائے اس وقت ہمیں بلو اسٹیشن پر اترنا چاہئے تاکہ وہاں کی خبر گیری بھی کی جاسکے۔''

فلیچر نے فوراً ہی اپنا ارادہ تبدیل کرلیا اور کچھ لمحوں کے بعد طیارہ نیچے جھکنے لگا۔ آخر کار جب طیارہ رن وے کے آخری سرے پر پہنچ گیا تو فلیچر نے انجن بند کردیئے اور چند سیکنڈ تک دونوں بے حس وحرکت بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک طویل پرواز کے بعد

طیارہ زمین پر اترا تھا۔ نیچے بڑی تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے شعلے اٹھ رہے تھے اور بلو اسٹیشن کے عملے کے لوگ آگ بجھانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ انہوں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ کیونکہ جو کچھ نظر آرہا تھا اس سے احساس ہوتا تھا کہ نیچے خاصا جانی نقصان بھی ہوا ہوگا۔

جن لوگوں نے لیبارٹری تباہ کی تھی انہوں نے بلو اسٹیشن کو بھی کافی نقصان پہنچا دیا تھا۔ بہرحال یہ ساری چیزیں بڑے دکھ کا باعث تھیں۔ وہ دیکھتے رہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان لوگوں کی اور کس طرح مدد کریں۔ سب سے بڑی الجھن یہی تھی کہ آخر وہ کون تھا جس نے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت پلاسکو نے بڑی زبردست تیاریاں کی تھیں اور اس علاقے کو محفوظ ترین قرار دے دیا تھا۔ لیکن یہاں وہ سب کچھ ہورہا تھا جو توقع کے بالکل برعکس تھا۔ آخر وہ کون ہوسکتا ہے۔ اسٹین نے فلیچر کی طرف دیکھا اور ایک دم ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

''یہی سوال میرے ذہن میں بھی ہے۔''

✿......✿

راجہ سرکار اور دلبر سرکار حیرت سے منہ کھولے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحے میں انہوں نے پہچان لیا تھا کہ یہ تینوں وہی ہیں جنہیں انہوں نے طارق شاہ کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت مانک نامی نوجوان جو کارنامہ دکھا رہا تھا وہ دنیا کے کسی خطے میں کسی فنکار نے نہ دکھایا ہوگا۔ لگتا تھا کہ وہ انسان ہی نہیں ہے وہ تو ایک چھلاوا تھا جو اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر لوگوں کو بیوقوف بنا رہا تھا۔ بمشکل تمام دونوں کے ہوش و حواس درست ہوئے۔ دلبر سرکار نے کہا۔

''بھیا جی! اُدھر دیکھو ذرا اُدھر۔ وہ اس طرف بائیں طرف۔ ارے...... اُدھر نہیں، اُدھر......'' راجہ سرکار کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئیں۔ اس نے بھی طارق شاہ کو دیکھ لیا جو پتھر کا بت بنا ہوا اسی طرح اس نوجوان کے کارنامے دیکھ رہا تھا جس طرح دوسرے لوگ۔

''ہاں، یہ یہاں موجود ہیں۔''

''لو...... وہ واپس چل پڑا۔'' دلبر سرکار نے کہا۔ راجہ سرکار نے طارق شاہ اور اس کے

سرکس کے منیجر کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر راجہ سرکار، دلبر سرکار سے بولا۔

"تمہیں یاد ہے نا...... ان لوگوں کو ہم نے طارق شاہ کے پاس دیکھا تھا۔"

"ہاں۔ پہلے تو میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب غور کر رہا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ طارق شاہ کے آدمی نہیں ہیں بلکہ وہاں ان کا انداز کچھ اجنبی اجنبی سا تھا۔"

"میں نے تو اتنا بھی غور نہیں کیا تھا۔" راجہ سرکار بولا۔

"ساری باتیں اپنی جگہ۔ لیکن آپ یہ دیکھو بھیا جی! کیا یہ سب انسانی کارنامے ہیں؟"

"انسان تو وہ ہے لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"بھیا جی! ایک بات کہوں جو فوراً میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"ہاں بولو۔"

"پیچھا نہیں چھوڑنا ہے ان کا۔ اگر یہ ہمارے سرکس میں آجائیں تو اولاد کی قسم! سمجھ لو کہ پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔"

"تیری ایسی تیسی۔ تیری اولاد ہے ہی کہاں جو اس کی قسم کھا رہا ہے۔"

"کہنے میں کیا حرج ہے بھیا جی!"

"بات تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن تیرا کیا خیال ہے، کیا طارق شاہ نے انہیں چھوڑ دیا ہوگا؟"

"بھیا جی! چاہے کپڑے بیچنے پڑیں، انہیں لانا ہے سرکس میں۔ مال دکھاؤ انہیں مال۔ دنیا کا ہر کام ہو جاتا ہے۔"

"ہوں...... ہو تو جاتا ہے۔ بتا کیا کریں؟"

"کرو گے کیا بھیا جی! وہ جس خیمے سے نکلے ہیں لازمی بات ہے انہی کا ہے۔ نٹ معلوم ہوتے ہیں۔ نٹ قبیلہ ہوتا ہے نا، ایسے ہی کھیل تماشے دکھاتا ہے۔ بعض اوقات ان قبیلوں میں بڑے بڑے فنکار نکل آتے ہیں۔"

"ہاں، بالکل بالکل...... ایسا ہی لگتا ہے۔ چلو آؤ دیکھتے ہیں۔"

بانس وغیرہ اسی طرح گڑھا رہنے دیا گیا تھا اور اس وقت صرف دیوان باہر موجود تھا۔ دونیہ اور مانک اندر ہی تھے۔ راجہ سرکار دیوان کے سامنے پہنچ گیا اور دیوان اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

"ہمیں پہچان گئے بھائی جی؟" راجہ سرکار نے کہا۔

"ہاں جی ہاں...... پہچان گئے۔ آپ طارق شاہ کے سرکس میں اس کے پاس......"

"ہاں، بالکل بالکل...... ہمیں آپ سے کچھ بات کرنی ہے بھائی جی! پہلی بات تو یہ بتائیے کہ آپ کو کس نام سے پکاریں؟"

"دیوان۔"

"دیوان جی! تھوڑا سا وقت دیں گے؟"

"آجاؤ، آجاؤ۔" دیوان نے نرمی سے کہا اور ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔

"بیٹھو بھائی جی! بیٹھو۔ غریبوں کا ڈیرہ ہے۔ خانہ بدوش ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی اور اچھی جگہ نہیں دے سکتے بیٹھنے کے لئے۔"

"ہم زمین پر بھی خوشی سے بیٹھ جائیں گے۔" راجہ سرکار نے کہا اور پھر مانک کی طرف دیکھ کر بولا۔

"جوان! حقیقت یہ ہے کہ تم سرکس کی دنیا کے صفحہ اول کے نوجوان ہو۔"

"اچھا......" مانک مسخرے انداز میں بولا۔ اس نے دونیہ کو دیکھا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"کیوں...... لڑکی کیا کہتی ہے؟"

دونیہ نے پاس رکھی چپل اٹھائی اور بولی۔ "ماں سے بدتمیزی کرتا ہے۔ شرم نہیں آتی؟"

راجہ سرکار اور دلبر چونک کر دونوں کو دیکھنے لگے۔ دونیہ نے جلدی سے چپل نیچے ڈال دی تھی۔ پتہ نہیں کس ترنگ میں وہ یہ جملہ کہہ گئی تھی۔ لیکن اب لگ رہا تھا جیسے اس کا چہرہ شرمندگی کا شکار ہو۔ ادھر راجہ سرکار اور دلبر سرکار بھی چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ پھر دلبر نے حیرانی سے کہا۔

"یہ تمہاری ماں ہے؟"

"کہنے میں کیا حرج ہے۔" مانک بولا اور دلبر چونک پڑا۔

"ارے تم بھی یہی کہتے ہو۔ میرا بھی یہی تکیہ کلام ہے۔"

"کہئے بھائی جی! ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟" دیوان نے اس بیکار گفتگو کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کے پاس ایک اہم کام سے آئے ہیں دیوان جی!''

''ہاں ہاں بھیا! بولو۔ اگر ہم تمہاری خدمت کرنے کے قابل ہوئے تو ضرور کریں گے۔''

''کچھ سوالات کر سکتے ہیں ہم آپ سے؟''

''وہ بھی کرلو۔'' دیوان نے فراخ دلی سے کہا۔

''آپ اپنے پورے قبیلے کے ساتھ یہاں آئے ہیں یا تنہا ہیں؟''

''نہیں بھائی جی! پورے قبیلے کے ساتھ آئے ہیں۔''

''ہاں ہاں، یہی میرا مطلب تھا۔ کہاں ٹھہرا ہوا ہے آپ کا قبیلہ؟''

''یہیں۔''

''میرا مطلب یہی ہے کہ یہاں آپ کے خیمے کے آس پاس؟''

''نہیں بھائی جی! اسی بستی کے اندر۔''

''کیا......؟'' راجہ سرکار کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

''ہاں جی...... یہیں ٹھہرا ہوا ہے ہمارا قبیلہ۔'' دیوان پھر بولا۔

''میرا مطلب ہے کتنے افراد ہیں اس قبیلے میں؟''

''تین......'' دیوان نے سادگی سے کہا اور راجہ سرکار نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ ایک دم ہنس پڑا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ صرف تین افراد ہیں؟''

''ہاں بھیا جی! یہی ہمارا قبیلہ ہے۔ یہ مانک ہے سسرا، یہ دونیہ ہے اور ہم ہیں۔ بس یہی ہمارا پورا قبیلہ ہے اور کوئی نہیں ہے۔''

''واہ بابا جی! بڑا خوبصورت قبیلہ ہے۔ خیر بابا جی! بات اصل میں یہ ہے کہ ہم بھی ایک مشکل میں گرفتار ہیں۔ ہمارا بھی ایک سرکس ہے اور خاصا بڑا سرکس ہے لیکن طارق شاہ کے سرکس میں زیادہ افراد ہیں اور وہ خاصا مشہور سرکس ہے۔ کئی جگہ ہم لوگوں نے آپس میں مقابلہ کیا لیکن طارق شاہ کا سرکس زیادہ مقبول رہا۔ یہ بات میں صاف گوئی سے کہتا ہوں، ہمارے سرکس میں اتنے اچھے فنکار نہیں ہیں۔ اور پھر ہمارا سرکس اتنا پرانا بھی نہیں۔ جب ہمیں کئی جگہ نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تو پھر ہم نے طارق شاہ سے بات کی کہ ہمیں

بھی پیٹ بھرنے دیا جائے اور اس کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ جہاں طارق شاہ سرکس لگائے، ہمیں بتا دے۔ ہم وہاں اپنا سرکس نہیں لگا سکتے۔ طارق شاہ نے بڑی محبت سے ہماری بات مان لی۔ اس طرح جیسے بہت بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے اور انہیں رعایت دے دیتے ہیں۔ ہم نے سوچا ٹھیک ہے۔ لیکن طارق شاہ کا رویہ کبھی ہمارے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ یہاں اس میلے میں ہماری بات ہوگئی تھی طارق شاہ سے کہ وہ یہاں سرکس نہیں لگائے گا بلکہ کہیں اور لگائے گا وہ سرکس کسی شہر میں۔ اس کا سرکس تو بہت مقبول ہے۔ جب ہم یہاں پہنچے اپنے ساز و سامان کے ساتھ تو پتہ چلا کہ طارق شاہ تو اپنے شو کر رہا ہے۔ ہمارا سامان بند پڑا ہوا ہے۔ یہ زیادتی ہے طارق شاہ کی ہمارے ساتھ۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ ہم آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔''

''بولو بھیا جی! بولو۔'' دیوان کا لہجہ نرم ہوگیا۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ ہم آپ کا شو دیکھ چکے ہیں۔ آپ کا کوئی باقاعدہ سرکس نہیں ہے۔ لیکن ایک بات ہم جانتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے سرکس میں شامل ہو جائیں تو ہماری عزت بڑھ جائے گی۔ جتنے لوگ محبت اور دلچسپی سے آپ کو دیکھتے ہیں اور واقعی آپ کے کارنامے اتنے ہی شاندار ہیں۔ اگر لوگوں کو یہ پتہ چل جائے کہ ہمارے سرکس میں آپ کام کررہے ہیں تو ہمارے سرکس کی عزت بڑھ جائے گی۔ دیکھئے، ہم آپ کی ہمیشہ عزت کریں گے اور معاوضے کے طور پر......''

''بس بھیا جی! بس...... وہ جو سیانے کہتے ہیں نا کہ زیادہ بات کرنے سے نقصان ہوتا ہے فائدہ نہیں۔ دیکھو بھیا جی! فنکار کی قیمت کبھی مت لگانا۔ مجبور ہوگا تو تمہارے قدموں میں آکر لیٹ جائے گا، مجبور نہیں ہوگا تو کسی قیمت پر تمہارے لئے کچھ نہیں کرے گا۔ ہاں اگر اس کے فن کی عزت کرو گے، اس کی قدر کرو گے تو سمجھ لو کہ فنکار کے لئے اس سے بڑا معاوضہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ بات سمجھ میں آئی؟''

''ہاں...... لیکن کیا آپ کے پاس ہمارے لئے کوئی خوشخبری ہے؟ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ ہم طارق شاہ کی خوشامد کرنے گئے تھے۔ اس سے پوچھنے گئے تھے کہ اس نے ہمارے پیٹ پر یہ لات کیوں ماری۔ پر اس نے بڑے غرور سے کہہ دیا کہ اسے یاد نہیں تھا

کہ اسے یہاں آنا ہے یا نہیں۔ میلے میں تو آنا ہی تھا۔ تو مطلب ہے دیوان جی! ا
آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ......"

"ہمیں بھی اس نے اسی لئے بلایا تھا کہ ہماری فنکاری کو خریدے۔ ہم نے اس
کہہ دیا کہ بھائی آدھا حصہ کرلو۔ آدھا سرکس تمہارا آدھا ہمارا۔ باؤلا ہو گیا سرا
بڑے باپ کا بیٹا ہے وہ اتنے بڑے باپ کا کہ ہم تمہیں کیا بتائیں۔" دیوان کی آنکھوں
آنسو آگئے۔ راجہ سرکار اسے غور سے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"طارق شاہ کے باپ کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"ارے تو اور کیا تمہارے باپ کی بات کر رہے ہیں؟" دیوان جھلا کر بولا۔

"نہیں نہیں......سوری۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

"دوست تھا ہمارا بچپن کا۔ جان بچائی تھی ہم نے سسرے کی۔ محبت کرنا جانتا تھ
عزت کرنا جانتا تھا۔ یہ نئی نسل کے چھوکرے، انہیں نہ بزرگی کا کوئی خیال ہے نہ ہی کسی
چیز کا۔ ٹھیک ہے راجہ جی! منڈوا تان دو، اپنا تمبو لگوا دو۔ ہم تمہارے سرکس میں کام کر
گے۔ اور سنو، یہ بھی اعلان کرا دو کہ وہ جو باہر کرتب دکھا رہے تھے وہ تمہارے سرکس
آدمی تھے اور پبلسٹی کر رہے تھے تمہارے سرکس کی۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

راجہ سرکار خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ دوڑ کر دیوان سے لپٹ گیا۔ مانک کی آواز ابھری۔

"کہنے میں کیا حرج ہے۔"

دلبر سرکار مانک کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

"زندگی بن جائے گی ہماری۔ ہم ہمیشہ تمہارے قدموں میں رہیں گے۔"

"نہیں، انسان کی جگہ قدموں میں نہیں سینے کے پاس ہوتی ہے۔"

راجہ سرکار بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔

"ابھی اسی وقت اپنا خیمہ اکھاڑ لو، ہمارا تمبو لگواؤ۔ خدا کرے تمہارے ذریعے ہمیں
عزت اور شہرت ملے۔ یہاں میلے میں دیکھ لیا ہے ہم نے۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو بھئی مانک! چلو دونیہ!"

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟" دلبر سرکار بہرحال نوجوان لڑکا تھا اور تجسس کا اظہار کر
تھا۔

"ہاں ہاں پوچھو......"

"یہ دونوں بہن بھائی ہیں؟" اس نے دونیہ اور مانک کی طرف اشارہ کر کے کہا اور
دونوں ہنس پڑے۔

"ارے بھیا! سنو گے تو پگلے ہو جاؤ گے۔"

"وہی تو سننا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں میرے دماغ میں مسلسل کرید ہے ان کے
بارے میں۔"

"ماں بیٹا ہیں دونوں۔ یہ منکوا جو ہے نا، بیٹا ہے اس دونیہ کا۔ چلو تمبو اکھڑوانے میں مدد
کرو ہماری۔ ہم بتائیں گے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔"

راجہ سرکار بھی حیران رہ گیا۔ پھر وہ بولا۔

"پتہ نہیں یہ کیا مذاق ہے۔"

"اب اٹھو۔ چل کے کچھ کھلاؤ پلاؤ ہمیں۔ سامان اٹھا کر لے چلو ہمارا، اٹھاؤ گے نا؟"

"اٹھائیں گے۔ فنکار کے تو جوتے اٹھانے کا بھی الگ ہی لطف ہے۔" راجہ سرکار کا
پورا اسٹاف تھا لیکن دیوان کے مزاج کو وہ سمجھ چکا تھا چنانچہ خیمہ اکھڑوانے میں، ساز و
سامان سنبھالنے میں دونوں بھائیوں نے پورا کردار ادا کیا اور اس کے بعد خیمے کا گٹھر دلبر
سرکار نے اٹھایا۔ راجہ سرکار نے بہت سے بانس اور باقی سامان ان تینوں نے۔ اس طرح
یہ قافلہ اس طرف پہنچا جہاں راجہ سرکار کے سامان کے ٹرک وغیرہ کھڑے ہوئے تھے۔
راجہ سرکار کے سرکس میں کام کرنے والے ملازموں نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا اور اس
طرف دوڑ پڑے۔ سارا سامان انہوں نے ان لوگوں سے لے لیا۔ دیوان مانک سے کہہ رہا
تھا۔

"دیکھنا چاہتا تھا میں کہ یہ لوگ عزت کے شیدائی ہیں یا شان و شوکت کے۔ ایسے لوگوں
کے ساتھ ہمارا گزارہ ہو سکتا ہے۔"

مانک اور دونیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خیمے لگا دیئے گئے تھے۔ سامان جوں کا توں
پڑا ہوا تھا۔ راجہ سرکار نے پُرمسرت لہجے میں اپنے مینجر اور سپروائزر سے کہا۔

"سامان اتروالو۔ تمبو کھڑا کرو۔ ہم طارق شاہ کے سرکس سے مقابلہ کریں گے۔"

ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملازم دوڑ دوڑ کر کام کرنے لگے۔ دیوان، مانک اور دونیہ،

راجہ سرکار اور دلبر سرکار کے ساتھ کھڑے ہوئے ان لوگوں کو کام کرتے دیکھ رہے تھے دونیہ کہنے لگی۔

''شاہ جی! کیا خیال ہے، کوئی وقت ایسا آئے گا جب ہمارا اپنا بھی ایسا ہی ایک سرکس ہوگا۔ کیوں مانک! تم کیا کہتے ہو؟''

مانک کے چہرے کے نقوش کچھ اور ہی تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں ماں! یہ میری منزل نہیں ہے۔ میں تو آسمان کی بلندیوں کو چھونا چاہتا ہوں۔ میں جھولے اور بانسوں پر کام نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرا باپ یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں ان لوگوں کو بالکل بے حقیقت کر دوں گا جنہوں نے ہماری زندگی بھر کی محنت کو نہیں سراہا اور میرے باپ کی موت کی قیمت بھی نہیں ادا کی۔''

یہ باتیں سرگوشی میں ہو رہی تھیں لیکن راجہ سرکار اور دلبر سرکار ماں بیٹے کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ راجہ سرکار پریشان لہجے میں کہنے لگا۔

''یار! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ماں بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں۔''

سرکس کا کام جاری ہو گیا۔ سب سے پہلے راجہ سرکار نے ان کے لئے خیمہ منتخب کیا۔ اس نے پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کے لئے تین الگ الگ خیمے لگوا دیئے جائیں یا ایک؟''

''نہیں ...... ہم اپنی ایکتا کو ختم نہیں کرنا چاہتے۔'' دیوان نے جواب دیا۔ ملازمین اپنا کام بڑی خوشی سے کر رہے تھے۔ یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہو جایا کرتے۔ جانوروں کے کٹہرے محفوظ کئے جا رہے تھے۔ شیر، چیتے، ہاتھی سنبھالے جا رہے تھے۔ انہیں خوراکیں دی جا رہی تھیں۔ ملازموں کے کھانے پینے کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔ معمولی کام نہیں ہوتا۔

بہر حال رات کے کھانے کے بعد راجہ سرکار نے کہا۔

''دیوان جی! آپ نے کہا تھا کہ آپ ہمیں کچھ بتائیں گے۔''

''کہنے میں کیا حرج ہے۔'' مانک کی شرارت بھری آواز ابھری اور راجہ سرکار چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''تم ناقابل یقین شخصیت کے مالک ہو۔ یقین کرو میں تمہاری بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ بڑی عقیدت ہے مجھے تم سے۔ بہر حال اگر تمہاری ذات سے کوئی اور کہانی منسلک

ہے تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا کہ میرے دل میں کتنی خواہش ہے کہ اس کہانی کے بارے میں جان سکوں۔''

دیوان کہنے لگا۔ ''وہی کہانی میں تمہیں سنانے جا رہا ہوں راجہ سرکار! یہ جو طارق شاہ ہے نا یہ میرے جگری یار کا بیٹا ہے۔ اس جگری یار کا جو بستی کنٹری میں بندر نچاتا تھا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر یہ سرکس بنایا۔ پیسہ اس کا تھا، محنت اس کی تھی، دماغ میرا تھا۔ اور بھی بہت کچھ کیا تھا میں نے اس کے لئے۔ یہ سسرا تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ میری مراد طارق شاہ سے ہے۔ یہ بچہ جو تمہارے سامنے ایک بازی گر کی حیثیت سے آیا ہے اس سرکس کے ایک بہت بڑے فنکار کا بیٹا ہے۔ وہ فنکار جھولے سے گر کر مر گیا۔ میں نے طارق شاہ سے کہا کہ اس بچے کو نوکری دے دو جس کے باپ نے اسے شہر میں تعلیم دلائی ہے۔ طارق شاہ نے میری بات نہیں مانی۔ اس کی بات نہیں مانی جو اس کے باپ کا دوست اور سرکس کا بانی تھا۔ میں، دونیہ اور مانک یا پھر ہمارے اصل نام فیض، شبیلہ اور شہباز ہیں جسے تم مانک کے نام سے جانتے ہو اس کا نام شہباز ہے۔ دونیہ کا اصل نام شبیلہ ہے۔ شہباز کی ماں ہے یہ۔ گلباز کی بیوی۔ شہباز صرف سرکس کا فنکار نہیں ہے بلکہ یہ چہرے بدلنے کا ماہر بھی ہے۔ تمہارے یہ سوال کرنے سے پہلے کہ طارق شاہ نے ہم تینوں کو پہچانا کیوں نہیں، میں تمہیں بتا دوں کہ یہ ہماری اصلی شکلیں نہیں ہیں۔ شہباز نے اس سارے کھیل کا آغاز ہم سب کے چہرے بدل کر کیا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو ایک نوجوان لڑکی بنا دیا ہے اور طارق شاہ کے فرشتے بھی نہیں پہچان سکے کہ یہ ہم تینوں ہیں۔''

''تو آپ نے وہ سرکس چھوڑ دیا تھا؟''

''ارے اس حرام کے پلے نے ہمیں منع کر دیا تھا کہ وہ میرے کہنے سے شہباز کو اس سرکس میں نہیں رکھے گا۔ وہ کتے کی اولاد میرے دوست کا بیٹا تھا۔ ٹیاؤں ٹیاؤں کر کے ہمارے سامنے پلا بڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم کون ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ہماری بات نہیں مانی۔ بس ہم اسے تباہ کرنے پر تل گئے اور تباہ کر کے چھوڑیں گے ہم اسے۔ تباہ کر کے چھوڑیں گے۔ کیا سمجھتا ہے سسرا خود کو۔ بھیا جی! جو کسی کو بنانے کے لئے محنت کر سکتا ہے وہ اسے ڈبونے کے لئے بھی اتنی ہی محنت کر سکتا ہے۔ کبھی کسی کے دل پر ٹھوکر مت لگاؤ۔ دل پر لگنے والی ٹھوکر دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ خود برباد ہو جاؤ یا دوسرے کو

برباد کردو۔ سمجھ رہے ہو نا؟“

راجہ سرکار کو فیض شاہ کے لہجے میں ایک ایسی غراہٹ محسوس ہوئی کہ اس کا بدن لرز کر رہ گیا۔ بہت دیر تک وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھا ان لوگوں کی صورتیں دیکھتا رہا۔ دلبر سرکار بھی اتنا ہی حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔ دفعتہً اس نے چونک کر کہا۔

”مگر آپ کی اصل صورتیں......“

”بس سچ بولا ہے ہم نے تم سے۔ اس لئے کہ تم ہمارے مقصد کے شریک ہو۔ اس سے زیادہ کوئی لالچ نہیں ہے ہمیں تم سے۔ تم دیکھ لو، میلے میں کھڑے ہو کر ہم اتنا کما سکتے ہیں کہ تم اتنا بڑا منڈوا بنا کر نہیں کما سکتے۔ اس لئے یہ مت سمجھنا کہ ہم پیسوں کے لالچی ہیں۔ بس ایک مقصد ہے ہمارا۔ ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ اپنے بارے میں بتا دیا ہے۔ اس سے آگے بات مت کرو۔ ہم اپنی صورتیں اس وقت نمایاں کریں گے جب طارق شاہ اپنی بے بسی کو محسوس کر کے رو رہا ہوگا۔“

راجہ سرکار نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر دلبر سرکار کی طرف دیکھا اور دونوں بھائی گردن ہلانے لگے۔

✿......✿

میجر فلیچر کے ذہن میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ بلو اسٹیشن پر جو کچھ ہو چکا تھا وہ ان کے منہ پر جوتے کے مترادف تھا جبکہ میجر فلیچر کو اس جگہ کی ذمے داری سونپتے ہوئے خصوصی طور پر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ بلو اسٹیشن کے تحفظ کے لئے اس کی خدمات بلاوجہ نہیں حاصل کی گئیں بلکہ اسے خصوصی طور پر اس کا اہل سمجھا گیا ہے اور درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی اہلیت کو قائم رکھے اور اس بات کی تصدیق کر دے کہ اس پر بھروسہ کر کے غلطی نہیں کی گئی۔ لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ انتہائی دکھ کی بات تھی۔ سب سے بڑی صورتحال یہ تھی کہ وہ اس دلیر کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا تھا جس نے ڈینی مور نامی سمندری جہاز اور آس پاس بکھرے ہوئے محافظوں کو چکمہ دے کر بلو اسٹیشن کو ایک طرح سے تباہ کر ڈالا تھا۔ گویا اس نے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا۔ حالانکہ میجر کے رینک پر ہونے کے باوجود اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس ایریا کی اتنی بڑی حفاظت کی ذمے داری کیا چیز ہے۔

رات کافی گزر چکی تھی لیکن فلیچر کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اس نے اندھیرے میں

ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا۔ گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیاں چار بج کر نو منٹ بتا رہی تھیں۔ اس نے قریب رکھے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ اس میں سے سگریٹ نکالی اور اٹھ کر ننگے پاؤں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

گزشتہ روز جو کچھ ہوا تھا وہ بڑے دکھ کا باعث تھا اور جن نگاہوں سے اسے دیکھا گیا تھا ان میں حیرت کے نقوش چسپاں تھے کہ میجر اتنا قریب ہونے کے باوجود بلو اسٹیشن کو نہیں بچا سکا۔ باہر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ کھڑکی سے سرد ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ میجر دیر تک سوچتا رہا پھر باہر نکل آیا۔ چند لمحوں تک وہ آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتا رہا پھر مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ رن وے کی بہت سی سگنل لائٹیں گزشتہ روز اس طیارے کی وحشیانہ فائرنگ سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور اس وقت چند روشنیاں جل رہی تھیں۔ ان روشنیوں کے پس منظر میں اسے اپنے طیارے کا ہیولا دکھائی دیا۔ فائرنگ سے اس کے جہاز کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا اور بلو فیلڈ کے انجینئروں نے وعدہ کیا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ اس کے طیارے کی مرمت شروع کر دیں گے جس میں کم از کم تین دن ضرور لگ جائیں گے۔ اس دوران میں بیس کمانڈر نے انہیں اپنی میزبانی کی خدمات پیش کر دی تھیں جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔

بہر حال، ڈینی مور بھی ساحل کے قریب ہی لنگر انداز تھا اور وہ لوگ کشتیوں کے ذریعے اس تک آمد و رفت رکھے ہوئے تھے۔ فلیچر تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ محافظ کی آواز سنائی دی۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ مین گیٹ پر پہنچ گیا ہے۔ محافظ کے ہولسٹر اعشاریہ چار، پانچ کا کولٹ جھانک رہا تھا۔ اس نے باہر جانے کے لئے پاس طلب کیا تو فلیچر نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”سر! پاس کے بغیر کسی کو بھی گیٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اندر آنے کی۔“ اس نے کہا۔

”مجھے نہیں پہچانتے گارڈ؟“ فلیچر نے کہا اور گارڈ غور سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر دفعتہً ہی اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں سر! سوری...... آپ چاہیں تو باہر جا سکتے ہیں۔ ویسے آپ بروقت پہنچ گئے تھے۔ لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ جو کام ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔“

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا فرار ہو جانے والے طیارے کی تلاش کی گئی؟''

''جی سر! اس زخمی طیارے کی تلاش میں پہاڑیوں کے دوسری طرف بھی دور دور تک کا علاقہ چھان مارا گیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں غائب ہو گیا۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو کہیں بہت دور نکل گیا یا پھر کہیں سمندر میں گر کر غرق ہو گیا۔ لیکن اب یہ طے ہے کہ اس علاقے میں اس کا وجود نہیں ہے۔''

''ہاں...... یہ بات تو طے ہے۔ اچھا تو کیا میں باہر جا سکتا ہوں؟''

''جی سر! آپ بے شک چلے جائیے، آپ ہمارے لئے ایک معزز مہمان ہیں۔ لیکن براہِ کرم دوبارہ جانے کے لئے آپ پاس ضرور حاصل کر لیجئے۔''

''یقیناً، یقیناً......'' فلیچر نے کہا۔

مین گیٹ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر چٹانوں کی دوسری طرف ساحل کی نرم ریت بکھری ہوئی تھی۔ ہوا رک گئی تھی لیکن فضا میں ٹھنڈک تھی۔ چاندنی پانی کی لہروں پر مچل رہی تھی۔ بہت دور اُفق پر آسمان اور سمندر ایک دوسرے سے گلے ملے ہوئے تھے۔ فلیچر چاندنی میں مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھتا رہا۔ پھر نجانے اسے کیا سوجھی کہ اس ٹھنڈک کے باوجود وہ پانی میں اتر گیا۔ پانی اتنا سرد نہیں تھا کہ اس پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت وہ اپنے جلتے ہوئے وجود کو پانی کی ٹھنڈک میں بجھا رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ اس نے پانی میں گزارا اور پھر وہ پانی سے نکل کر نرم گیلی ریت پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ ستاروں کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ صبح ہونے کو تھی۔ اس کا ذہن غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

دفعتہً ہی اس کی چھٹی حس نے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس کیا اور اسے چونکا دیا۔ اس نے حیران نگاہوں سے دیکھا، یہ ایک انسانی سایہ تھا جو اس کے بالکل اوپر جھکا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ چونک پڑا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہیلو......'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ عورت کے حلق سے ایک گھبرائی ہوئی سی آواز نکلی اور اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لئے جیسے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکنا چاہتی ہو۔ فلیچر نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔ میرا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں تھا۔'' فلیچر عورت کے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ابھی روشنی اتنی تیز نہیں ہوئی تھی کہ اس کے نقوش واضح ہو جاتے۔ عورت کی آواز ابھری۔

''مم...... میں سمجھی تھی کہ شاید...... شاید...... کوئی...... کوئی لاش ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں...... میں اسے تمہارا قصور نہیں سمجھتا۔ کیونکہ جس انداز میں، میں یہاں پڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسانی لاش ہی ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ...... میری کیفیت اب بھی بہت خراب ہے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' فلیچر نے کہا۔ ''ویسے میرا نام ریمن فلیچر ہے۔''

''میں نیروس ہوں...... نیروس آرگو۔'' وہ بولی۔

''ویری گڈ...... ویسے میں آپ کو مس آرگو کہہ سکتا ہوں۔''

''ہاں...... لوگ مجھے یہی کہتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ نجانے کیوں یہ نام آپ پر سوٹ کرتا ہے۔''

''کیا واقعی؟''

''ہاں۔''

''تمہارے جسم اور تمہارے لباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس ٹھنڈک کے باوجود تم سمندر میں نہائے ہو۔''

''ہاں...... پانی میں تو یہ ٹھنڈک کچھ اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔'' فلیچر نے جواب دیا۔

''واقعی۔ میں بھی اس وقت اسی لئے آئی تھی۔ اصل میں یہ وقت سمندر میں نہانے کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ کیا تم دوبارہ سمندر میں جانا پسند کرو گے؟''

اور دونوں پانی میں ہی تھے جب سورج کا گولہ بحر اوقیانوس سے ابھرا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ باہر نکل آئے۔

فلیچر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ ہے۔ اس نے بہت خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا جو کھال کی طرح جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ نمایاں تھی۔ فلیچر گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ دفعتہً نیروس کہنے لگی۔

''تم طلوعِ آفتاب کا نظارہ نہیں کر رہے؟''

"سورج تو میں نے بہت سی بار نکلتے دیکھا ہے۔ لیکن یونانی دیوی افیرڈائیڈ کو آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"افیرڈائیڈ؟"

"تم......"

"افیرڈائیڈ تو حسن ومحبت کی دیوی تھی جبکہ میں آدھی یونانی ہوں۔"

"اوہو، کیا واقعی...... میں تمہارے نقوش پر غور کر رہا تھا کہ کیا تم یونانی ہو۔ ویسے باقی آدھی؟"

"میری ماں کا تعلق پلاسکو سے تھا۔"

"اور باپ؟"

"باپ یونانی تھا۔"

"میرا خیال ہے تم اپنی ماں کی بجائے باپ پر گئی ہو۔"

"ہاں، لوگ یہی کہتے ہیں۔ ویسے تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں کہاں سے آ گئی۔"

"نہیں، مجھے معلوم ہے کہ بائیں سمت برفانی علاقے سے ہٹ کر آبادی ہے۔"

"ہاں...... میرا تعلق وہیں سے ہے۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہو...... کیا واقعی؟" فلیچر نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں، بس وہ کار کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور اس کی موت کے بعد میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔"

فلیچر نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اپنی زندگی کی تنہائی کا ذکر کرنے والی یقینی طور پر فلیچر کے ذریعے اپنی تنہائی کو دور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن برا ہو سٹین کا، بچپن کی دوستی کیا تھی اس نے نقصانات پہنچانے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا اور اس سے بڑا نقصان اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت نازل ہو گیا اور دونوں کو سنبھلنا پڑا۔ اس نے اطلاع دی کہ ونگ کمانڈر آیا ہے اور اسے طلب کر رہا ہے۔ واپس جاتے ہوئے عورت نے عجیب سی نگاہوں سے فلیچر کو دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ کیا غلط آدمی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی؟

بہرحال ایسا تو ہو جاتا ہے۔ نفع نقصان زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ البتہ وہاں سے چلتے ہوئے فلیچر نے اسٹین سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم ونگ کمانڈر کو کچھ وقت کے لئے ٹال نہیں سکتے تھے؟"

"اعلیٰ افسران اتنی آسانی سے تو نہیں ٹل جاتے۔" اسٹین نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا، پھر بولا۔ "لیکن مسئلہ کیا تھا؟ تمہیں ہر جگہ کوئی نہ کوئی عورت مل جاتی ہے۔"

"آہ...... میں اس کی دلجوئی کر رہا تھا۔ بے چاری غمزدہ عورت شوہر سے محروم، زندگی سے بھرپور۔" فلیچر نے اس وقت اسٹین کا چہرہ نہیں دیکھا تھا البتہ بلو اسٹیشن پہنچنے کے بعد اس نے ونگ کمانڈر کو تلاش کیا تو اسٹین نے بدستور اسی انداز میں کہا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے دور سے تمہیں ان حالات میں دیکھ لیا تھا اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ جب بھی کوئی خوبصورت عورت تمہارے قرب میں ہوتی ہے مجھے اس سے رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ......" فلیچر نے اسٹین کی طرف دیکھا اور اسٹین پھرتی سے وہاں سے غائب ہو گیا۔

✡......✡
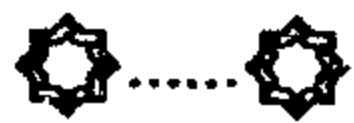
بلو اسٹیشن پر جو ہولناک واردات ہوئی تھی وہ بھی معمولی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ڈینی مور سے کچھ بھی نہیں کیا جا سکا تھا۔ البتہ خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ اس کی اطلاع لیبارٹری نمبر تین کو نہیں ہونی چاہئے جہاں کام جاری رکھنے کے لئے وہاں کے کارکنوں کو باقاعدہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ان علاقوں کا معائنہ کرایا گیا تھا اور ان کی بے چینی کو اس طرح دور کیا گیا تھا کہ انہیں ایک باقاعدہ لیکچر کے ذریعے بریفنگ دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اب یہ علاقہ بالکل محفوظ ہے اور یہاں کوئی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمام سائنسدانوں کو پورے علاقے کا سروے کرایا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ جگہ جگہ چھوٹی ایئر فیلڈز بنائی گئی ہیں تا کہ وہاں طیارے موجود رہیں اور کسی بھی مشکل کو ٹالنے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جا سکے۔ ڈینی مور کے بارے میں سائنسدانوں کو بتایا گیا تھا کہ وہاں ہر طرح کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ سائنسدان مطمئن تو خیر کیا ہوئے ہوں گے، ہینسن کا جو نظریہ تھا وہ تو بالکل ہی الگ سا تھا۔ لیکن بہرحال انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ وان کیسرو کے اس علاقے میں اب کوئی غلط کارروائی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہاں بھرپور سکیورٹی کے انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا

تھا وہ حیران کن تھا اور اس سلسلے میں ایک بار پھر حکومت پلاسکو کے ذمے دار ارکان سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

''جو مصیبت مول لی گئی ہے اس کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب برائی آنا ہوتی ہے تو عقل ضبط ہو جاتی ہے۔ میں تو سفارش کرتا ہوں کہ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ کو پھر ان ارکان کو یا کسی ایک شخص کو جس کے ذہن میں یہ منصوبہ آیا باقاعدہ مجرم قرار دیا جائے اور اسے سزا دی جائے کہ اس نے ایسی ناقص پلاننگ کی۔ ہم بے شک اپنی برتری کے لئے کوشاں ہیں اور نہیں چاہتے کہ دنیا کا کوئی ملک اس سلسلے میں اپنی قوت کو آگے بڑھائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ناقص پلاننگ بھی جس قدر نقصان پہنچاتی ہے اس کا اندازہ سب کو ہے۔ دنیا کے چار پانچ ملکوں میں ہم نے جو کچھ کیا ہے اور اس کے جو نتائج بھگتنا پڑے ہیں، ہم جانتے ہیں۔ میں ان ممالک کے نام لے کر کیا کروں گا۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ کیا صورتحال رہی ہے۔ ہماری جنگی پالیسیوں نے ہمیں کتنے فائدے اور نقصانات پہنچائے ہیں۔ ہم نے جن ممالک کے ساتھ دوستانہ سلوک کیا ہے ان سے ہمیں کیا کیا فائدے حاصل ہوئے ہیں، میں ان پر تبصرے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور نہ ہی میں ان پر تبصرہ کر کے اپنے آپ کو کوئی مجرم کہلوا سکتا ہوں۔ لیکن یہ سلسلہ چونکہ براہ راست میری ذمے داریوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اور کہا تھا کہ ایک خاموش سائنسدان کو جس کی کوئی تخریب یا طاقت ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی، نہ چھیڑا جائے۔ رازل جریری اپنے ملک کے لئے بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی ایک لیبارٹری بنائے کاموں میں مصروف تھا۔ اگر اس کی طاقت منظر عام پر آتی اور وہ کچھ کر کے دکھاتا تب ہم پر لازم تھا کہ ہم اس کے خلاف عمل پیرا ہو جاتے اور اسے ختم کرنے کی کارروائیاں شروع کر دیتے۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ کچھ منظر عام پر نہ آنے سے پہلے اس کے لئے اتنی خوفناک کارروائی کی گئی کہ درندگی کی اعلیٰ ترین مثال قائم ہو جائے۔ اور اس کے بعد اگر وہ اپنی سائنسی قوتوں سے کام لے کر ہمارے خلاف صف آراء ہو گیا ہے تو یہ تو اسے کرنا تھا۔ کسی کی ذراسی کاوش یا صرف ایک شخص کے بارے میں اتنی زبردست کارروائی نے ہمیں اربوں ڈالر کی لیبارٹریوں اور انتہائی قیمتی زندگیوں سے محروم کر دیا۔ تو میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایسی ناقص پلاننگ کرنے

والوں کو قومی مجرم قرار دیا جائے اور ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مسٹر ٹیڈ! لیکن اس وقت آپ کے یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ ہم اس کا تدارک کرنا چاہتے ہیں اور کوئی ایسا منصوبہ زیر عمل لانا چاہتے ہیں جو ہمیں فوری طور پر اس مشکل سے نجات دلا دے۔ جہاں تک بات رہی ایک سلسلے کے ناکام ہونے کی تو ہم میں سے ہر شخص آپ سے متفق ہے۔''

''افسوس، ہماری ترقی کے راستے رک گئے۔ آرتھیو ویسکو کا محفوظ ترین علاقہ جسے ہم سائنسی تجربات کے لئے اپنی جنت کہتے تھے اس طرح تباہ و برباد ہو کر رہ گیا کہ ہم تو صحیح معنوں میں اپنے دکھ کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ آپ مجھے بتائیے، کتنی بددلی پھیل گئی ہمارے سائنسدانوں میں۔ کیا اب وہ دلجمعی سے ہمارے لئے قیمتی ایجادات کر سکتے ہیں؟ انہیں تو اپنی ہی زندگی کا خوف ہوگا۔ اور جب یہ خوف ان کے ذہنوں میں بیٹھ چکا ہے تو پھر کام کیا خاک ہوگا۔ آپ چاہیں تو ان سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی غیر محفوظ زندگی کی حفاظت سب سے پہلے چاہتے ہیں اور اصولی بات بھی یہی ہے۔ کسی مقصد کے لئے زندگی قربان کرنا الگ بات ہے اور کسی کے گناہ کی پاداش میں یا کسی کے غلط عمل کے نتیجے میں کتے کی موت مر جانا دوسری بات ہے۔ وہ لیبارٹریاں جو برف کی گہرائیوں میں دفن ہو چکی ہیں عبرت کا نمونہ ہیں۔ برفانی سرزمین میں پیدا ہو جانے والے وہ گڑھے...... خدا کی پناہ آپ انہیں دیکھ تک نہیں سکتے۔ تو ذرا غور کیجئے کہ جو لوگ وہاں کام کر رہے ہوں گے ان پر کیا بیتی ہوگی۔ کیا ہم اور آپ اس المیے کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟''

''بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ ہمیں سب سے پہلے اس مشکل سے بچنے کا طریقہ تلاش کرنا ہوگا۔ پہلے ہم اس پر گفتگو کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے نظریات پیش کریں۔ یہاں جتنے افراد اس وقت موجود ہیں انہیں دعوت دی گئی تھی کہ وہ ہمیں اپنے قیمتی منصوبوں سے آگاہ کریں۔ اس سلسلے میں براہ کرم پروفیسر نیکلسن سب سے پہلے اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔''

''رازل جریری! اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک خوفناک سائنسدان تھا۔ وہ ہر اس قوت کے خلاف کارروائی کرنا چاہتا تھا جو دنیا میں تخریب کاری پھیلا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ارادے نیک تھے اور اس کے منصوبے انسانیت کے لئے قابل قدر۔ لیکن

اس نے ہماری پالیسی سے انحراف کیا۔ اسے تین بار یہ پیشکش کی گئی کہ وہ اپنی سائنسی توا
کو حکومت پلاسکو کے تعاون سے آگے بڑھائے اور اپنی ایجادات کو وہی درجہ دے
انسانیت کے حق میں بہتر ہے۔ لیکن اس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنائی ا
نہایت نخوت سے انکار کر دیا کہ وہ کسی کے ساتھ شمولیت نہیں چاہتا بلکہ اس نے ا
گورنمنٹ کو بھی اپنے تعاون سے محروم رکھا۔ ورنہ ہم سرکاری پیمانے پر بھی اس گورنمن
کے تعاون سے اس کی مدد حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ بہر حال اس کے ب
اس کے خلاف کارروائی عمل میں لائی گئی۔''

''ہاں...... تو اب کیا، کیا جا سکتا ہے؟''

''میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے اور اس کے سلسلے میں، میں آپ لوگوں کی را
لینا چاہتا ہوں۔''

سب لوگ خاموشی سے اس متحمل اور بردبار چہرے کو دیکھنے لگے جو اپنی رائے پیش
کرنے والا تھا۔ بلند و بالا قد و قامت کا مالک یہ شخص حکومت پلاسکو کے لئے بڑی ا
حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی بھنچی بھنچی جھیل جیسی گہری آنکھوں سے وہاں بیٹھے ہوئے
شخص کا جائزہ لیا، پھر بھاری لہجے میں بولا۔

''ہمیں آرتھو ویسکو کے ان خوفناک برفانی غاروں سے رازل جریری کا جسم نکالنا ہوگا
اس بدن کو لے کر ہم کسی محفوظ جگہ آئیں گے اور اس کے بعد رازل جریری کو دعوت دیں
کہ اگر وہ اپنے جسم کا حصول چاہتا ہے تو ہم سے تعاون کرے۔ اور اس میں کچھ اور
کہانیاں بھی جوڑی جا سکتی ہیں۔ رازل جریری اگر ہم سے تعاون پر آمادہ ہو جائے تو
اسے اس کی پسند کی مراعات بھی دے سکتے ہیں ورنہ دوسری شکل میں ہم اس سے کہیں
کہ ہم اس کے جسم کو تہس نہس کر دیں گے اور لازمی طور پر اس کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔''

''کیا یہ اتنا ہی آسان ہو گا سر؟'' ایک پستہ قامت شخص نے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہا
پھیرتے ہوئے سوال کیا اور بردبار شخص نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہر ناممکن کو ممکن بنانا ہی کام ہوتا ہے مسٹر آرتھر! دنیا کا کوئی بھی کام خود بخود نہیں
جاتا۔ میں اس کے لئے بھی ایک منصوبہ پیش کر سکتا ہوں۔ ہم ایک مشن ترتیب دیں
بہترین کمانڈوز پر مشتمل آرتھو ویسکو کے اس ناقابل یقین برفاب میں ایک کیمپ لگایا جا

گا اور وہاں سے اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ اس جگہ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ ان
برفانی غاروں میں کیسے اترا جا سکتا ہے اور کس طرح رازل جریری کے جسم کو وہاں سے لایا جا
سکتا ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ اس سلسلے میں؟''

''مجھے تو یہ ایک دلچسپ کہانی معلوم ہوتی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔'' ایک شخص نے
کہا۔

''اور یہ کہانی حقیقت بننے کے لئے بے چین ہے۔ بشرطیکہ اس کہانی کی ترتیب کرنے
والوں کی دل شکنی نہ کی جائے۔''

یہ بحث ہوتی رہی۔ کچھ لوگ مخالفت میں بول رہے تھے۔ لیکن زیادہ تعداد ان لوگوں کی
تھی جو اس کی موافقت کر رہے تھے۔ پھر اسی میٹنگ کو جس کو حکومت پلاسکو بڑی اہمیت کی
نگاہ سے دیکھتی تھی، کانفرنس ہال میں ہی ایک نئی اطلاع سے دوچار ہونا پڑا۔ چونکہ بلو اسٹیشن
پر ہونے والی تباہی کے بارے میں مکمل تحقیقات ہو رہی تھیں اور ڈینی مور سے بھی اس سلسلے
میں بہت سے انکشافات ہو رہے تھے۔

چنانچہ ایک نیا انکشاف یہ ہوا کہ وہ زرد طیارہ نیو ایئر فیلڈ سے حاصل کیا گیا تھا اور نیو ایئر
فیلڈ سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ ناقابل یقین تھیں۔ یہ طیارہ جنگ عظیم میں بڑی
شاندار اور نمایاں کارکردگی دکھا چکا تھا اور اسے ایک یادگار کے طور پر نیو ایئر فیلڈ پر رکھا گیا
تھا لیکن اس میں ایندھن اور اسلحے کا انتظام نہیں تھا۔ پتہ یہ چلا کہ رات کی تاریکیوں میں کسی
نامعلوم وجود نے طیارے میں ایندھن بھرا اور اس کے بعد اسلحے وغیرہ کی چوری کی گئی۔
لیکن جن جگہوں سے یہ سب کچھ حاصل کیا گیا تھا وہ اس قدر محفوظ تھیں کہ کوئی انہیں صحیح
انداز میں دیکھ بھی نہ سکے۔ پھر نجانے وہ کون سا انسانی وجود تھا جس نے یہ ساری کارروائی
کی۔ یہاں میٹنگ میں اس خبر کو سن کر شدید سنسنی دوڑ گئی۔ سوال کیا گیا کہ بعد میں وہ طیارہ
کہاں گیا؟ تو پتہ چلا کہ اسے سمندر میں غرق ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

''آہ...... اس کا مطلب ہے کہ اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ رازل جریری کی
روح سمندر بوس ہو گئی ہو۔''

''بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ہم اپنے مشن خلائی سیاروں پر بھیج رہے ہیں اور
ان میں ہمیں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل ہو رہی ہیں لیکن آج بھی ہم ایک ایسی انسانی

روح کو اپنے آپ کو نقصان پہنچانے سے نہیں روک پا رہے جس کا پہلے صرف تصور ہی کیا جا
سکتا تھا، یقین نہیں۔ اور اب بھی ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ ایک روح ہمارے لئے
نقصانات کا باعث ہے۔"

"ایک اور سوال، کیا رازل جریری کوئی ہواباز بھی تھا...... ایک ماہر ہواباز؟"

"ہاں...... اس کے ریکارڈ میں یہ بات تھی کہ وہ لاتعداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔"

"بہر حال افسوس ہے کہ ہم اتنی ساری گفتگو کے بعد بھی کسی معتبر نتیجے پر نہیں پہنچ سکے
سوائے اس کے کہ اس کے جسم کو آرتھینو ویسکو کے برفانی غاروں سے نکالا جائے اور اس
کے بعد اس طرح اسے محفوظ کیا جائے کہ کوئی روح بھی اس میں داخل نہ ہو سکے یعنی
جگہ جہاں وہ جسم رکھا گیا ہو۔"

"ایک اور ترکیب بھی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم اس جسم کے حصول میں کامیاب
جائیں تو اسے اس طرح محفوظ نہ کریں کہ وہ اس جسم میں داخل نہ ہو سکے۔ اگر وہ ایسا
ہے تو جسم متحرک ہوگا اور اس کے بعد ہم اسے با آسانی ختم کر سکتے ہیں۔ یہاں تو صورت
ذرا مختلف ہو گئی تھی نا۔ اس لئے اس کی روح ایک بہتر پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب
ہو گئی۔ سب لوگ جس طرح کی باتیں کر رہے ہیں ان پر انہیں خود یقین نہیں تھا۔ لیکن بعض
اوقات سچائیوں کو نہ ماننے کے باوجود قبول کرنا ہوتا ہے۔ رازل جریری کے بارے
رپورٹ ان کے پاس موجود تھی اور ہر ذہن اس کے بارے میں سوچ سوچ کر عجیب
غریب احساس کا شکار ہو جاتا تھا۔

بہر طور یہی طے پایا کہ ایک مشن ترتیب دیا جائے جو آرتھینو ویسکو کے برفانی غار
میں اترے اور وہاں سے رازل جریری کا جسم حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس
میں با قاعدہ کمیشن قائم کیا جائے جو اس بارے میں تفصیلی رپورٹ تیار کرے۔

✿......✿

سرکس کے ایک رکن نے طارق شاہ کے منیجر کو اطلاع دی کہ راجہ سرکار کے سرکس کے
تمبو کھڑے ہو رہے ہیں۔

منیجر چونک پڑا۔ پھر اس نے یہی اطلاع طارق شاہ کو دی۔ طارق شاہ نے غرور بھری
نگاہیں اٹھائیں اور بولا۔

"پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ تم لوگ پریشان کیوں ہو؟ اول تو اس بار ویسے ہی ان
بدبختوں نے ہمارے سرکس کا رش بھی توڑ دیا ہے۔ ہمارا سرکس یہاں اس میلے میں اس
طرح خالی جا رہا ہے، اس سے پہلے ہمارے پاس کسی معمولی سے معمولی جگہ کی ایسی
رپورٹ نہیں تھی، اس کے ہاں کون جائے گا۔ ایک شو دیکھنے کے بعد ہی لوگ ادھر کا رخ
کرنا چھوڑ دیں گے۔ اور اسے اس جرأت کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑے گا۔"

لیکن دوسری اطلاع طارق شاہ کے لئے بڑی تشویش ناک تھی۔ یہ اطلاع بھی منیجر ہی
نے اسے دی تھی۔

"جناب عالی! سرکس کے ڈھولچی اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ مانک نامی نوجوان جو
کھلے عام بازیگری کے کرتب دکھا رہا تھا درحقیقت اس کا تعلق راجہ سرکار کے سرکس ہی سے
ہے اور آج رات اس کا شو راجہ سرکار کے سرکس میں دیکھا جا سکے گا۔ وہ تینوں راجہ سرکار ہی
کے آدمی ہیں۔"

طارق شاہ یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش کی۔ راجہ سرکار کی
اتنی جرأت ہو گئی کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی گیم کھیلے۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ ہم
اس کو روٹیوں کے لئے ترسا دیں گے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں جناب! کہ یہ تو ایک طرح سے ہمارا مذاق اُڑانے کی کوشش

کی گئی۔"

"بہر حال اگر وہ اس کے آدمی ہیں تو...... اوہو...... اوہو، اب میں سمجھا کہ ان لوگوں نے یہ مطالبہ کیوں کیا۔ یعنی ہماری سرکس میں پارٹنر شپ کا۔ سو فیصدی یہ کوشش راجہ سرکار کی جانب سے کی گئی ہوگی۔ اس کا خیال ہوگا کہ اگر ہم بہت زیادہ متاثر ہو کر اس پارٹنر شپ پر آمادہ ہو گئے تو راجہ سرکار بعد میں اپنے آپ کو ظاہر کر کے اپنا سرکس ہمارے سرکس میں ضم کر دے گا۔ تو یہ سازش تھی ان کمینوں کی۔ گویا اب کے راجہ سرکار نے بڑی زبردست پلاننگ کی تھی ہمارے خلاف۔ لیکن وہ لوگ انتہائی بیوقوف ہوتے ہیں جو اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے لیا۔ گویا دوسرا ان کی نگاہوں میں بیوقوف ہی ہوتا ہے۔ میں راجہ سرکار کو ایسی سزا دوں گا کہ یاد کرے گا وہ۔"

بہر حال یہ ساری باتیں ابھی تک مفروضہ تھیں۔ رات کو جب طارق شاہ کو رپورٹ ملی کہ راجہ سرکار کا سرکس اس طرح پیک ہے کہ لوگوں کو ٹکٹ بھی نہیں مل رہی تو اس کا دل خون ہو گیا۔ اس کے اپنے سرکس میں وہ لوگ آئے تھے جنہیں راجہ سرکار کے سرکس میں ٹکٹ نہیں ملا تھا۔ یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ طارق شاہ نے کہا۔

"مینجر! ہم بھی دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔" اور مینجر نے گردن ہلا دی۔ طارق شاہ نے اپنے لئے باقاعدہ ٹکٹ حاصل کئے اور خاموشی سے سرکس میں جا بیٹھا۔ اس نے سب سے پیچھے جگہ حاصل کی تھی اور ٹکٹ اس نے چار گنا زیادہ قیمت ادا کر کے ایک ایسے شخص سے خریدے تھے جو خود بھی سرکس دیکھنا چاہتا تھا لیکن جب اسے ٹکٹ کی چار گنا قیمت پیش کی گئی تو اس نے اپنے ٹکٹ طارق شاہ کے ہاتھوں بیچ دیئے۔ طارق شاہ سب سے پیچھے ایک گوشے میں بیٹھ گیا تھا۔

اور پھر راجہ سرکار کے سرکس کے فنکار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ تیسرا آئٹم گھوڑوں کا تھا اور یہ آئٹم صرف طارق شاہ کے سرکس میں پیش کیا جاتا تھا اور گلباز ہی آئٹم پیش کرتا تھا۔ اس کے بعد کوئی فنکار ایسا نہیں نکلا تھا جس نے یہ آئٹم کیا ہو۔ چھ گھوڑے ارینا میں دوڑا دیئے گئے۔ ایک ماسٹر انہیں چابک مار مار کر کنٹرول کر رہا تھا۔ ان کی رفتار بڑھا رہا تھا۔ یہ گھوڑے منتشر بھی تھے اور منظم بھی۔ تبھی مانک دوڑتا ہوا آیا اور ایک

گھوڑے کی پشت پر پہنچ گیا۔ گھوڑا الف ہوا تو وہ اس طرح پھسلا جیسے گھوڑے سے گر کر اس کے قدموں تلے روندا جائے گا۔ لیکن تماش بینوں نے اسے دوسرے گھوڑے کی پشت پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ درحقیقت گلباز جب یہ آئٹم پیش کرتا تھا تو گھوڑے ایک ترتیب سے دائرے میں گھومتے تھے اور وہ گھوڑوں کی پشت بدلتا رہتا تھا۔ لیکن اس میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی تھی۔ اب گھوڑا ایک نئے اور اجنبی وجود کو اپنی پیٹھ پر برداشت نہیں کرتا تھا اور بدک کر کھڑا ہو جاتا تھا لیکن مانک اس طرح اس کی پیٹھ سے پھسلتا کہ لوگ یہ سمجھتے کہ اب دوسرے گھوڑے اسے روند ڈالیں گے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ کسی دوسرے گھوڑے کی پشت پر ہوتا۔ پھر بات یہ بھی نہیں تھی کہ گھوڑوں کی پشت اس طرح بدلتے ہوئے وہ اور بھی بہت سے کرتب دکھائے جا رہا تھا۔ اور اس وقت تو لوگ ششدر رہ گئے جب اوپر سے رسہ پھینکا گیا اور مانک گھوڑے کی پشت سے اس رسے پر چڑھ گیا اور اس کے بعد انتہائی بلندیوں پر جھولے پر۔ اس وقت جھولے پر اور کوئی موجود نہیں تھا بلکہ پہلے جھولوں کے تختوں پر بہت سے لوگ کھڑے ہوا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سپورٹ دیتے تھے۔ لیکن مانک اس ہلتے ہوئے رسے کے ذریعے ایک جھولے پر پہنچا اور اس طرح اس نے اپنے قدم ڈگمگائے جیسے گرنے والا ہو۔ لیکن بلندی سے جھولے سے نیچے گر کر وہ بالکل نیچے آ گیا۔ جس رسے کے ذریعے وہ اوپر پہنچا تھا وہ ہل رہا تھا۔ اس نے ہلتے ہوئے رسے کو پکڑا، دو جھکولے لئے اور پھر مخالف سمت کے جھولے پر پہنچ گیا۔ تماشہ بنا کر رکھ دیا تھا اس نے ان بلندیوں کو۔ لگ رہا تھا فضا میں اُڑنے والا کوئی انسان ہے جو بغیر کسی مشین کے فلائنگ کر رہا ہے۔ پورے سرکس کا اس طرح چکر لگا رہا تھا وہ کہ خود راجہ سرکار نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے اور ہر لمحہ اس بات کا متوقع تھا کہ اب مانک اپنی زندگی کا آخری سفر طے کرے گا۔ ادھر طارق شاہ پاگلوں کی طرح منہ کھولے اس کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ ساری زندگی سرکس میں گزاری تھی۔ ہر فن کی حیثیت جانتا تھا اور جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اس نے اسے دیوانہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ داد دے، تالیاں بجائے یا دعا کرے کہ یہ نوجوان ہوش میں آئے اور اپنی زندگی کا یہ تماشہ کرنا چھوڑ دے۔ وہ اس قدر حیرت انگیز کمالات دکھا رہا تھا کہ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ صحیح معنوں میں اس نے پورے منڈوے کو اپنا گھر بنا رکھا تھا اور ان تمام اصولوں کو نظر انداز کر دیا تھا جو سرکس کے

اصول ہوا کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود سرکس کے فنکار بھی حیرت سے منہ کھولے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ تماشائی تو دیوانے ہوگئے اس وقت جب وہ نیچے آکر ارینا کے درمیان میں کھڑا ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اندر چھلانگیں لگائیں۔ وہ اسے چومنا چاہتے تھے، اس کی دلیری اور پھرتی کو خراج ادا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بھاگ کر اندر چلا گیا اور سرکس کے منتظمین سے درخواست کی کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں تاکہ شو جاری رہے۔

بہر حال وہ کچھ دکھا دیا گیا تھا جو کسی انسان سے ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ تماشائی داد کے ڈونگرے برساتے ہوئے گئے اور ایک ہی رات میں سرکس کو وہ شہرت اور عزت ملی جو طارق شاہ برسوں میں بھی نہیں کما سکا تھا۔ جب تمام تماشائی نکل گئے تو منیجر نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے طارق شاہ کو دیکھا اور بولا۔

”سر! چلئے، منڈوا خالی ہوگیا ہے اور لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔“

پھر شاید راجہ سرکار کو بھی اطلاع ملی کہ طارق شاہ اس کے سرکس میں موجود ہے۔ بہر حال اخلاق والا آدمی تھا چنانچہ اپنے بھائی کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور پُر احترام لہجے میں بولا۔

”شاہ جی! آپ یہاں...... ہمارے لئے تو بڑی شرمندگی کی بات تھی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آپ کی یہاں آمد کا پتہ ہی نہیں تھا ورنہ ہم خود عزت واحترام کے ساتھ آپ کو سب سے آگے لاتے اور اپنے یہ شو دکھاتے۔ شاہ جی! آیئے، وقت ابھی اتنا زیادہ بھی نہیں ہوا ہے کہ...... آیئے، ہمارے ساتھ ایک پیالہ چائے پی کر ہماری عزت بڑھایئے۔ ہم مہمانوں کا استقبال اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہمارے وطن کی ریت رواج ہے۔“

طارق شاہ نے منیجر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور راجہ سرکار عزت واحترام کے ساتھ طارق شاہ کو اندر لے گیا۔ طارق شاہ بیٹھ گیا تو راجہ سرکار نے اپنے ملازموں کو چائے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے کہہ دیا۔

”نہیں راجہ سرکار! میں دوست کی حیثیت سے نہیں، دشمن کی حیثیت سے یہاں ہوں۔ صاف اور کھلی طبیعت کا مالک ہوں۔ مکاری کے الفاظ نہیں ادا کرسکتا۔ کیا تم دشمن کا بھی اسی طرح استقبال کرو گے جس طرح تم کر رہے ہو؟“

دلبر سرکار نوجوان تھا اور نوجوانی ذرا مشکل ہی سے کنٹرول ہوتی ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ”ہاں...... ہم دشمن کا احترام تو اسی انداز میں کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ ہمارے سامنے سے واپس جاتا ہے تو اپنے پیروں پر چل کر نہیں جاتا۔“

”گڈ...... گڈ...... میں یہی سننا چاہتا تھا۔ دو افراد پورے گروہ میں اگر معذور ہوکر جائیں تو تعجب کی بات نہیں ہوتی۔“

راجہ سرکار نے بھائی کو ڈانٹا اور بولا۔

”طارق شاہ صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کل ہم آئیں گے آپ کے تمبو میں اور ہم یہ نہیں کہیں گے کہ دو دشمن آئے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ہم دشمنوں کے ڈیرے پر آئے ہیں۔ کسی سے ہمارا کچھ بگاڑا جائے تو بگاڑے۔ بزدل نہ سمجھیں آپ ہمیں۔ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی، آخر آپ اس طرح کی دھمکیاں دے کر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں، ملک کے سربراہ لگے ہوئے ہیں آپ؟ کون سی بڑی شخصیت ہے آپ کی۔ آپ بھی کھیل تماشے دکھاتے ہیں اور روزی کماتے ہیں۔ ہم بھی یہی کرتے ہیں۔ پھر آپ کی یہ اکڑ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب کن بنیادوں پر یہ دھمکیاں دیتے ہیں۔ آپ یقین کریں ہم اس پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے۔ آپ یہاں آئے ہیں، آپ نے ہمارا شو دیکھا۔ ہم تو آپ کی فراخ دلی سے اس بات کی توقع کرتے تھے کہ آپ ہمارے اس شو کی تعریف کریں گے اور ہمیں داد دیں گے۔ خاص طور سے انہیں...... میرا مطلب ہے مانک کو جس نے حیرت ناک کرتب دکھائے ہیں۔“

”میں یقیناً داد دینا چاہتا ہوں، مگر آپ کے گھٹیا پن کی۔ آپ نے چلئے عوام کو تو دھوکے میں رکھا ہی تھا، وہ تو کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے آپ جیسے لوگوں کے لئے۔ لیکن آپ نے انہیں میرے پاس جس مقصد سے بھیجا تھا وہ بڑا گھٹیا تھا۔ کہیں میں بھی جذباتی ہوکر واقعی ان سے یہ وعدہ کرلیتا کہ میں انہیں اپنے سرکس میں پارٹنر بنانے کے لئے تیار ہوں تو اس کا مطلب تھا کہ ان کا سہارا لے کر آپ اپنے اس گھٹیا سے سرکس کو میرے عالیشان سرکس میں ضم کرنے کی کوشش کرتے۔“

راجہ سرکار نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دلبر سرکار کو دیکھا۔ اسے خوف ہوا کہ دلبر سرکار کہیں زیادہ مشتعل نہ ہوجائے۔ پھر وہ بولا۔

"یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہم آپ جیسے نامعقول لوگوں میں شمولیت اختیار کر کے اپنے آپ کو بدنام نہیں کرنا چاہتے۔ اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہم نے آپ کے پاس بھیجا تھا؟"

"سو فیصدی۔ اور سچ بھی یہی ہے۔"

"سچ تو میں بتاتا ہوں تمہیں طارق شاہ! سچ مجھ سے سنو۔ اور اگر سنا سکتے ہو تو اپنے سرکس کے لوگوں کو بھی سنا دو۔ نہیں تو میں کسی وقت تمہارے سرکس میں آ کر انہیں یہ سناؤں گا۔" یہ آواز دیوان یا فیض شاہ کی تھی۔ جو باہر سے آئی تھی اور وہ سب چونک کر ادھر دیکھنے لگے تھے۔

"ہاں..... سچ کے اگر اتنے ہی شیدائی ہو تو سچ میری زبان سے سنو۔ میں دیوان نہیں فیض شاہ ہوں۔ تمہارے باپ کا دوست۔ اس وقت کا دوست جب وہ کنٹری بستی میں رہتا تھا اور تمہارے دادا کے پاس ایک بندر، ایک ڈگڈگی، ایک بانسری اور ایک جھولی تھی۔ جوتے تک نہیں تھے تمہارے دادا کے پاس۔ اور یہی ورثہ اس نے تمہارے باپ کو منتقل کیا۔ پھر سیلاب کا ایک ریلا تمہارے باپ کو بہا کر لے جا رہا تھا کہ میں نے اسے درخت پر الٹا لٹک کر پکڑا اور اس کی جان بچائی۔ پھر اس کے بعد جب وہ ایک ریچھ، ایک بکرا اور ایک کتا حاصل کر کے اسی کو زندگی کا حاصل بنا چکا تھا، میں نے ہی اس کی مدد کی اور اس سرکس کی بنیاد ڈالی جس کے آج تم مالک کہلاتے ہو۔ جبکہ اس سرکس کے لئے تم نے صرف اتنا کیا کہ اپنی ماں کے پیٹ سے جنم لیا سمجھے۔ یہ منیجر ہے نا تمہارا..... منیجر! میری ان باتوں کو یہ شخص جھٹلا نہیں سکتا۔ کیونکہ ان کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ میں نے اس کے باپ کو ہر طرح کی مدد دے کر اس سرکس کی ترتیب کرائی۔ اسے بتایا کہ سرکس کیا ہوتا ہے، کس طرح اسے چلایا جاتا ہے۔ اور پھر میں نے اس سرکس کے فنکار ترتیب دیئے۔ سمجھے اس سرکس کے جتنے سینئر فنکار تھے، میں نے انہیں سرکس کے کھیل سکھائے اور سرکس ترقی کرتا چلا گیا۔ پھر یہ سرکس، سرکس بنا اور طارق شاہ اس سرکس کا مالک بنا۔ یہ ہے اس سرکس کی کہانی۔ یہ ہے طارق شاہ کی کہانی۔ اور اس کے بعد طارق شاہ کا باپ مر گیا اور طارق شاہ نے اس سرکس کی تمام تر ذمے داریاں سنبھال لیں۔ سمجھ رہے ہو نا۔ پھر گلباز کا دور آیا۔ گلباز نے سرکس پر زندگی قربان کر دی۔ مر گیا وہ۔ اپنے بیٹے کو وہ پڑھا لکھا کر کچھ اور بنانا

چاہتا تھا۔ ایک باپ کو اس کا حق پہنچتا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ اس کا حقدار تھا۔

بہرحال گلباز کے مرنے کے بعد میں نے طارق شاہ سے درخواست کی کہ وہ گلباز کے بیٹے کو اپنا ساتھی بنا لے۔ اسے سرکس میں لکھنے پڑھنے کا کام دے دے۔ مگر طارق شاہ نے میری بات ٹھکرا دی۔ اس شخص کی بات نہیں مانی اس نے جو اس کے باپ کی جگہ تھا۔ میں تو کان دبائے زندگی گزار رہا تھا۔ میں تھا ہی کیا۔ میں اپنے آپ کو اس کے باپ کی جگہ سمجھتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس کا باپ اتنا اچھا انسان ہے تو اس کی اولاد بری ہو ہی نہیں سکتی۔ پر تجربہ غلط ہو گیا رے..... تجربہ غلط ہو گیا۔ اس نے میری درخواست نہیں مانی۔ میں شبیلہ اور شہباز کو لے کر سرکس سے باہر آ گیا۔ پھر ایک بار اس نے مجھے دوبارہ جوان کر دیا۔ ہاں رے طارق! تیرے سرکس کے جتنے سینئر فنکار ہیں پوچھ ان سے، میں نے سکھایا تھا انہیں۔ سمجھ رہا ہے تو۔ میرا شوق تھا یہ۔ میں نے بنوایا ہے تیرا یہ سرکس۔ اور کیا کہتا ہے تو ان لوگوں سے، ہم گئے تھے تیرے پاس ان کا سندیس لے کر؟ تیرا یہ منیجر سو خوشامدیں کر کے لے گیا تھا ہمیں تیرے پاس۔ غیرت تو نہیں آتی تجھے بے غیرت۔ دیکھ ہماری شکلیں۔ دیکھ اور پہچان ہمیں۔"

یہ کہہ کر فیض شاہ نے مانک اور دونیہ کو اندر بلا لیا اور پھر مانک نے فیض شاہ کے چہرے سے میک اپ اتار دیا۔ پھر اپنا اور شبیلہ کا چہرہ بھی نمایاں کر دیا۔

طارق شاہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ فیض شاہ نے کہا۔

"تو ایک سرکس کا مالک ہے..... بس اتنی ہی اوقات ہے تیری، دیکھا کیسے چہرے بدلے؟ اور کیسے ہم نے کھیل کھیلا۔ اور سن..... ہم صرف دو روٹی لیں گے راجہ سرکار سے۔ کوئی چیز نہیں مانگیں گے اس سے۔ پر اسی کے سرکس میں کام کریں گے اور جہاں تو سرکس لگائے گا وہاں ہمارا سرکس لگے گا۔ ڈبونا ہے تیرے سرکس کو ہمیں، سمجھا۔ جب انسان کے دل میں غرور پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ڈوبنا بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ ڈوب گیا رے تو..... ڈوب گیا۔"

طارق شاہ خاموشی سے فیض شاہ کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھا اور گردن جھکائے خیمے سے باہر نکل آیا۔ منیجر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ پیچھے سے فیض شاہ کی ہنسی سنائی دی تھی۔

طارق شاہ باہر آیا اور اپنے سرکس کی جانب چل پڑا۔ پھر اس نے صرف ایک لفظ کہا۔
''سرکس اُکھاڑ لو...... یہاں سے واپس جانے کے بعد تمام لوگوں سے کہو کہ سرکس کے
بانس اکھاڑنا شروع کر دیں۔ ہو سکے تو راتوں رات اسے یہاں سے ختم کر کے ٹرکوں پر لا
دو اور صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل چلو۔ سمجھے؟''
''لیکن سر! اب ایسا......'' مینجر نے کہا۔
''مینجر! صرف ایک لفظ معاف کر دیتا ہوں تمہارا۔ دوسرا لفظ کہا تو سب سے پہلے تمہیں
نوکری سے نکالوں گا۔''
''جی سر! ٹھیک ہے سر!'' مینجر نے جواب دیا۔

۞......۞

بہت بڑا ہال تھا۔ اس وقت روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ہال میں چودہ افراد موجود تھے۔ ان
میں سے بیشتر کے جسموں پر ایئر فورس کی وردی تھی اور ان کے شانوں پر لگے ہوئے تمغے
اور نشانات انہیں ایئر فورس کے اعلیٰ افسران ظاہر کرتے تھے۔ اس وقت وہ سب کرسیوں پر
بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً کسی کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد بغلی دروازے سے چار افراد
اندر داخل ہوئے۔ ان کے جسموں پر بھی ہوابازوں کی وردی تھی۔ یہ پائلٹ معلوم ہوتے
تھے۔ چاروں کے چاروں تندرستی کی اعلیٰ مثال تھے۔ ان کی پیشانی کی لکیروں اور آنکھوں
کی بناوٹ سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ چہرے انگاروں کی طرح سرخ اور توانائی سے بھرپور
تھے۔ بدن بھی بہت ہی متناسب تھے۔ چال سے پتہ لگتا تھا کہ چاروں زبردست مشقت
کے عادی ہیں اور ایئر کمانڈو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اندر داخل ہو گئے۔ لوگوں نے
مدھم سی بڑبڑاہٹوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ انہیں سب سے آگے جگہ دی گئی اور
چاروں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تبھی سامنے لگا ہوا وسیع و عریض اسکرین روشن ہو گیا۔ پیچھے سے
اس پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ پھر ایک آواز ابھری۔
''مشن ون، زیرو، سیون۔ آپ چاروں اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے مستعد ہیں؟''
''یس سر......'' چاروں آوازیں اُبھریں۔ لیکن جملے یکسانیت کے ساتھ ادا کئے گئے تھے۔
''کیا آپ اپنے پچھلے سات دنوں کی ریہرسل سے مطمئن ہیں؟''
''یس سر......'' ایئر کمانڈر کی آواز کے جواب میں کہا گیا۔

''او کے...... آن......'' آواز پھر اُبھری اور اسکرین پر ایک منظر اُبھرنے لگا۔
یہ ایک انتہائی خوفناک برفانی علاقہ تھا۔ کیمرہ اس کے اطراف کی تصویریں پیش کرنے
لگا۔ بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر ساری کارروائی ہو رہی تھی۔
''پہاڑی نمبر ایک......'' آواز ابھری اور ایک پہاڑی پر ایک کا ہندسہ روشن ہو گیا۔
''تین......'' آواز پھر ابھری اور ایک اور برفانی ٹیلے پر دائرے کے اندر تین نمبر نمودار
ہو گیا۔
''چار، چھ، پانچ، دو......'' نمبر بے ترتیبی سے دوہرائے جاتے رہے اور پائلٹ انہیں
بغور دیکھتے رہے۔ پھر ایک پہاڑی پورے اسکرین پر پھیل گئی۔
''سات...... مسٹر تھامس......''
''یس سر!'' ایک شخص کھڑا ہو کر بولا۔
''مسٹر جون......''
''یس سر!''
آپ ڈیبی تھرٹی کو فورٹی سیون اینگل پر لے جائیں گے۔ وہاں آپ تین چکر لگائیں
گے اور چوتھے چکر میں آپ سات کے پاس سے گزریں گے۔ یہاں چاروں ہواباز پیرا
شوٹ سے چھلانگیں لگا دیں گے اور آپ لوگ مشن ون، زیرو، سیون یہاں پہنچ جائیں گے۔
ایک ایرو جو سرخ رنگ کا تھا، یہاں اسپارک کرنے لگا۔ پھر وہی آواز ابھری۔
''اس وقت ڈیبی تھرٹی سے آپ کے لئے ضروری سامان کے بیگ پیراشوٹ کے
ذریعے اتار دیئے جائیں گے۔ آپ لوگ صبح ساڑھے پانچ بجے یہ کام کریں گے۔ چھ بجے
تک سورج ابھر آتا ہے۔ اجالا پھیلنا شروع ہو جائے گا۔ آپ اپنا سامان کھول کر سات بجے
تک اپنے آپ کو تیار کر لیں گے اور پھر منصوبے کے مطابق کام کریں گے۔ سمجھ رہے ہیں نا
آپ۔ کسی بات کو سمجھنے میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو سوال کیا جا سکتا ہے۔''
ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ جیسے ہواباز ایک دوسرے کا انتظار کر رہے ہوں کہ شاید کوئی
بولنا چاہے۔ لیکن اس کے بعد ان چاروں کی مخصوص آواز اُبھری۔
''نو سر!''
''کیا ایک بار آپ کو پھر یہ تمام منظر دکھایا جائے؟ کیونکہ ہمارے پاس وقت ہے۔''

''نہیں سر! ہم سب کچھ سمجھ چکے ہیں۔'' پائلٹوں نے جواب دیا۔

''ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ اس مشن کی کامیابی کے بعد حکومت پلاسکو آپ کو اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازے گی۔''

ایئر کمانڈر ان لوگوں کو مزید تفصیل بتاتا رہا اور اس کے بعد یہ میٹنگ ڈسمس ہو گئی۔

لوگ ان چاروں پائلٹوں سے ہاتھ ملا ملا کر باہر نکلنے لگے۔ صرف چند افراد رہ گئے تھے۔ فضا میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹِک کی آواز کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں اور وقت کی رفتار بڑی سست محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ باہر ایک گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور چاروں پائلٹ جو خاموشی سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہوئے تھے، مشینی انداز میں کھڑے ہو گئے۔ پھر اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اس ہال سے باہر نکل آئے۔ ہال کے باہر ماحول سرد اور کہریلا تھا۔ سامنے ہی رن وے نظر آ رہا تھا جس پر ایک ڈیسی ٹین کھڑا ہوا تھا۔ اس کے انجن اسٹارٹ تھے اور پائلٹ اور کو پائلٹ اس کی اچھی طرح چیکنگ کر چکے تھے۔ ڈیسی ٹین نے رن وے کے تین چکر لگا لئے تھے اور اب اسٹارٹنگ پوائنٹ پر تیار کھڑا ہوا تھا۔

چاروں ہواباز مستعدی اور پھرتی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔ ڈیسی ٹین میں سیڑھی باہر نکل آئی اور وہ چاروں پوری طرح چاق و چوبند اس سیڑھی سے اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو گئے۔ وقت ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں آرتھینو ویسکو پہنچنا تھا اور وہاں سے وان کیسرو کے علاقے میں۔ اور اس کے بعد ڈیسی ٹین آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے انجنوں کی آواز تیز ہوتی چلی گئی۔ اور پھر اس نے تیز دوڑنا شروع کر دیا اور پھر زمین سے اوپر اٹھنے لگا اور چند لمحوں کے بعد بڑی چابک دستی کے ساتھ فضا میں بلند ہو گیا۔ فضا میں اس نے ایک چکر لگایا اور اس آخری چیکنگ کے بعد پائلٹ اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔

ایک عجیب سی ہولناک خاموشی فضا پر مسلط تھی۔ ڈیسی ٹین کا سفر جاری تھا۔

چاروں ہواباز پتہ نہیں کن سوچوں میں گم تھے۔ پائلٹ کیبن سے موسم اور رفتار وغیرہ کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ تھوڑے سے سفر کے بعد یہ بتایا گیا کہ اب ہم آرتھینو ویسکو کے علاقے میں داخل ہو رہے ہیں۔ پھر بتایا گیا کہ اب جہاز وان کیسرو کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک اسکرین روشن ہو گیا اور چھوٹے اسکرین پر وان کیسرو کا منظر دکھایا

جانے لگا۔

یہاں بھی انہیں پہاڑیوں کے بارے میں گائیڈ کیا جا رہا تھا اور ان کے نمبر اُبھر رہے تھے۔ چاروں ہوابازوں کے بدن کسمسانے لگے اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ بے چین اور مضطرب ہوں۔ پھر اس کے بعد آخری اناؤنسمنٹ کیا گیا اور وہ چاروں اس دروازے کی جانب چل پڑے جہاں سے انہیں فضا میں چھلانگ لگانی تھی۔

مشن اپنی آخری منزل میں تھا۔ وہ لوگ پتھروں سے سپاٹ چہرے لئے ہوئے تا حد نظر پھیلی ہوئی برف کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے لگ رہا تھا جیسے وہ سوئے ہوئے ہوں۔ موت کی سی ویرانی ان میں سے ہر ایک کی شکل پر برس رہی تھی اور طیارہ اپنے مخصوص طریقہ کار کے مطابق چکر لگا رہا تھا۔ پھر طیارے نے ایک غوطہ لیا اور تھوڑا سا نیچے اتر آیا۔ اس کے بعد وہ پھر سیدھا ہوا اور پائلٹ کیبن سے کوئی آواز ابھری۔ یہ کاشن تھا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے تیز ہواؤں کی زد میں آ کر درختوں پر پکے ہوئے آم ٹوٹ کر فضا میں منتقل ہو گئے ہوں۔ وہ طیارے سے نیچے کود گئے تھے۔ ایک ایک کر کے خلاء میں اترے اور خلاء میں معلق ہو گئے۔ اور پھر ان کے جسم لڑھکتے ہوئے زمین کی جانب چل پڑے۔

برف کا وسیع و عریض سمندر ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہوابازوں کو پوری احتیاط کے ساتھ اس برف پر اترنا تھا۔ وہ اپنی تمام تر تربیتی مہارت کے ساتھ نیچے جا رہے تھے۔ وہ اس برفانی گڑھے میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہتے تھے جو ان کی منزل تھی بات وہی ہوتی ہے جس مشن کے لئے انہیں تربیت دی گئی تھی، بس اس کی تکمیل انہوں نے اپنا ایمان بنا لی تھی اور اس کے لئے ہر طرح کا خطرہ ذہن سے نکال دیا تھا۔

بہرحال پیراشوٹ انہیں کچھ ہی لمحات کے بعد برف کی سطح تک لے گئے اور ان کے قدموں نے برف کی سرزمین چھوئی۔ انتہائی پھرتی سے انہوں نے اپنے جسموں سے پیرا شوٹ کی ڈوریاں کھولیں اور اپنے آپ کو چاق و چوبند کر دیا۔ برف کی زردی اور جمی ہوئی برف کی پھسلن کو کنٹرول کرنا تھا۔ پیروں میں جو جوتے پہنے ہوئے تھے ان میں کیلیں لگی ہوئی تھیں تا کہ برف پر قدم جمائے جا سکیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے فاصلے کم کئے اور جو جہاں گرا تھا وہاں سے ایک جگہ منتخب کر کے چل پڑا اور کچھ لمحوں کے بعد وہ سب

یکجا ہو گئے۔ انہوں نے اپنی کامیابی کے اظہار کے طور پر انگوٹھے ایک دوسرے کی جانب بلند کئے اور اس کے بعد وہ ایک ایسی جگہ منتخب کرنے لگے جہاں رک کر وہ ہیلی کاپٹر سے پھینکے ہوئے سامان کا انتظار کر سکیں۔ برف کی اس سرزمین پر بھلا کسی قسم کی پناہ گاہ کا کیا تصور کیا جا سکتا تھا۔ بس ہر جگہ ایک جیسی ہی تھی۔ کہیں بھی قدم جما لئے جائیں۔ وہ خاص قسم کے سوٹ پہنے ہوئے تھے جن میں ان کے چہرے بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ آکسیجن سلنڈر ان کی پشت سے بندھے ہوئے تھے اور اس طرح کے دوسرے ضروری آلات جو کسی بھی طرح کے ہنگامی حالات میں ان کی مدد کر سکتے تھے۔

بہرحال اپنے طور پر حکومت پلاسکو نے ان کے لئے بہترین انتظامات کئے ہوئے تھے۔ وہ انتظار کرنے لگے۔ تقریباً پندرہ منٹ اسی طرح خاموشی کے ساتھ گزارنے پڑے اور اس کے بعد فضا میں ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ تین ہیلی کاپٹر اس طرف آ رہے تھے۔ ان کا پہلا کام تو اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ فضا سے زمین کی طرف جانے والے، چاروں ہوا باز صحیح ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔ برف کی اس ہولناک سرزمین پر ہر قسم کے حادثے متوقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کا جائزہ بھی لینا چاہتے تھے کہ ان کے قیمتی ہوا باز محفوظ ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی پیراشوٹ انہیں سیدھا برفانی گڑھے میں لے گیا ہو۔ اس بات کے امکانات تھے۔ اور یہ ہوا بازوں کی مہارت پر منحصر تھا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ جائیں۔

بہرحال کچھ دیر کے بعد ہیلی کاپٹر سروں پر پہنچ گئے۔ چاروں ہوا بازوں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق سبز روشنیوں سے اپنی سلامتی کا پیغام دیا اور اس کے بعد ہیلی کاپٹر اتنے نیچے جھک آئے جتنے نیچے آ کر وہ اپنا کام کر سکتے تھے۔ پھر ضروری سامان کے تھیلے جن میں اعلیٰ درجے کے ہلکے ہتھیار، ایک بڑے خیمے کا پیکٹ، کھانے پینے کی اشیاء جو انتہائی محفوظ طریقے سے پیک کی گئی تھیں اور ایسی جنہیں کچھ دنوں تک استعمال کیا جا سکے۔ طے شدہ ضرورت کا سارا سامان زمین تک پہنچ گیا اور ہوا باز اس کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے ایک بار پھر سبز روشنیوں سے ہیلی کاپٹروں کو پیغام دیا اور ٹرانسمیٹر کے ذریعے بات کر کے انہیں بتایا کہ اب تک سب ٹھیک ہے اور وہ مطمئن ہیں۔

پھر ہیلی کاپٹر واپس چلے گئے۔ ہوا بازوں نے سب سے پہلا کام خیمہ نصب کرنے کا

کیا اور برف کی اس سرزمین پر انسان نے اپنی برتری کے نقوش نصب کر دیئے۔ نیلے رنگ کا خیمہ برف پر لگا دیا گیا۔ برفانی طوفان اور دوسری آفات سے خاص طور سے محفوظ اس خیمے کے نصب ہونے کے بعد چاروں ہوا باز اندر داخل ہو گئے۔ خیمے کا دروازہ اس پر لگی ہوئی زپ کے ذریعے بند کر لیا اور وہ چھوٹی مشین چلا دی گئی جو خیمے کو گرم کر سکتی تھی۔ لمحوں میں اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ برف کو اور اس پر چلنے والی ہواؤں کو شکست دے دی گئی تھی۔ خیمہ اس طرح کا تھا کہ اس کے نیچے کی زمین بھی کسی خاص چیز سے بنی ہوئی تھی اور اس طرح وہ تمام برفانی تصور ختم کر دیا گیا جس میں بدن کو گلا دینے والی کہانیاں چھپی ہوتی ہیں۔ اب یہ بالکل مناسب اور معتدل فضا والی جگہ تھی جہاں ہوا باز باہر کی آفتوں سے اسی فیصد محفوظ تھے۔ بیس فیصد گنجائش صرف اس بات کی تھی کہ اگر کوئی بہت ہی خوفناک برفانی طوفان آ جائے اور برف کی چٹانیں اپنی جگہ چھوڑ کر اس خیمے پر حملہ آور ہوں تو انہیں نقصان پہنچ جائے۔ ورنہ باقی سب خیریت تھی۔

انہوں نے کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو اس خاص قسم کے لباس سے آزاد کر کے وقت گزارنے کا فیصلہ کیا اور کھانے پینے کی اشیاء کے پیکٹ کھول لئے گئے۔ ہر چیز جدید ضروریات سے آراستہ اور اس کے مطابق تھی۔ اعلیٰ درجے کی کافی جو لمحوں میں تیار ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرا سامان۔ برف کے اس ویرانے میں جہاں انسانی زندگی کا تصور ہی مشکل تھا، وہ ایک ایسے گروپ کی حیثیت سے یہ لمحے گزار رہے تھے جو پکنک منانے آیا ہو۔ چاروں ہوا بازوں کے چہرے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

''ٹھیک دو گھنٹے تک آرام کرنے کے بعد ہم پہلی ریکی کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک مسٹر ٹو! ہم لوگ چار سمتیں اختیار کریں گے اور پھر اپنی اپنی رپورٹ ایک دوسرے کو پیش کریں گے۔''

''او کے۔'' تیسرے آدمی نے کہا۔ چوتھا خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

بہرحال اس کے بعد وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ حالانکہ ان کے جسم بالکل ٹھیک تھے اور کسی بھی طرح اپنے آپ کو آرام کا ضرورت مند نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کے بعد کا جو منصوبہ تھا وہ یہی تھا کہ وقت کا تعین کئے بغیر کام کیا جائے گا۔ اور جب انہوں نے آرام مکمل ہونے کے بعد جانے کی تیاریاں کیں تو اس طرح کیں جیسے اب دن اور رات

ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ ان کے سروں پر خاص قسم کی لائٹیں تھیں جو ان طاقتور ایٹمی بیٹریوں سے منسلک تھیں جو ان کی کمر کی بیک پر بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ مزید اس طرح کے انتظامات جن سے وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔

آخر کار وہ برف کے ویران سمندر پر باہر نکل آئے اور اپنے قدموں کو مضبوطی سے جما جما کر اپنی اپنی سمتوں کو چلنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ موسم بہتر ہی تھا حالانکہ یہاں کی فضا میں ہمیشہ کہر چھائی رہتی تھی۔ ہوائیں بھی چلتی تھیں۔ اور اگر برف باری ہو جائے تو پھر تو بات ہی مختلف ہو جاتی ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو کہر گاڑھی تھی اور نہ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان خاصی حد تک شفاف تھا۔

چنانچہ وہ اپنے کام کو آسانی سے کر رہے تھے۔ آخر کار ان کے قدم اس برفانی گڑھے تک پہنچ گئے جو کافی لمبا چوڑا تھا اور اس کی تہہ کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ نمبر تین نے اپنی سمت ایک جگہ رک کر اپنے تجربات کا آغاز کر دیا۔ جس جگہ وہ رکا تھا وہ برفانی گڑھے سے تقریباً چھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ سب سے پہلے اس نے برف کی مضبوطی چیک کرنے والی مشین کو اس جگہ لگایا اور اس کا بٹن آن کر دیا۔ مشین کے نچلے حصے سے ایک ڈرل راڈ نیچے کی سمت چلی اور برف کی تہہ میں سوراخ کرتی ہوئی نیچے جانے لگی۔

ساڑھے پانچ فٹ گہرائی میں اتر کر وہ رکی اور اس کی ناٹ ٹھوس زمین پر جا ٹکی جس میں آہستہ آہستہ سوراخ ہونے لگا تھا۔ اوپر لگے ہوئے ڈائل یہ بتا رہے تھے کہ ساڑھے پانچ فٹ کے بعد ٹھوس زمین موجود ہے۔ نمبر تین نے مشین کا دوسرا بٹن دبایا اور اس کے بعد راڈ واپس آنے لگی۔ وہ اپنے مراحل طے کرتی ہوئی فولڈ ہو گئی۔ یہ اس بات کا اندازہ لگانا تھا کہ جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے وہاں برف کی تہہ کے نیچے کوئی ایسا برفانی گڑھا تو نہیں ہے جو اس کے وزن کو نہ سنبھال پائے اور وہ اس برفانی گڑھے میں غرق ہو جائے۔

گویا یہاں رک کر آگے کے تجربات کئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے اپنے دوسرے عمل کا آغاز کر دیا۔ پہلے تو اپنی زندگی کا تحفظ ضروری ہوتا ہے اس کے بعد باقی سارے کام۔ بقیہ لوگوں کو بھی اسی طرح کے تجربات کرنے تھے اور اپنا کام آگے بڑھانا تھا۔ پھر اس نے دوسری مشینیں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ ایک خاص قسم کی مشین اس نے اسٹینڈ پر لگائی اور پھر مشین سے ایک راڈ گڑھے کی طرف جانے لگی۔ اس کے آخری

سرے پر ایک ننھا سا کیمرہ لٹکا ہوا تھا جو ایک خاص قسم کی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ کیمرہ آہستہ آہستہ برفانی گڑھے کی جانب چل پڑا اور آخر کار برفانی گڑھے کے درمیان میں پہنچ گیا۔

پھر نمبر تین نے ایک بٹن آن کیا اور اس کے سامنے ایک دس انچ کا اسکرین روشن ہو گیا۔ کیمرہ برفانی گڑھے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ خوفناک گڑھے کی دیواریں روشن تھیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان دیواروں سے مدھم مدھم ایک چمکدار روشنی نمودار ہو رہی تھی۔

یہاں کسی ایسی چیز کا تصور تو مشکل تھا جو کوئی دھات یا اسی طرح کی کوئی چیز ہو بلکہ شبہ ہوتا تھا کہ برف کی گہرائیوں کے بعد جیسم کی سرزمین ہے۔ لیکن اس کا کوئی تجزیہ کرنا مشکل تھا۔ پھر یہ روشنی کیسے پھوٹ رہی ہے؟ آخر کار کیمرہ نیچے اترنے لگا۔ دس فٹ، بیس فٹ، پچاس فٹ، اسی فٹ تک یہ دیواریں روشن تھیں اور اس کے بعد تاریکیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ جو خاص قسم کی ڈوری کیمرہ کو نیچے لے جا سکتی تھی وہ ایک سو بیس فٹ تھی اور ایک سو بیس فٹ گہرائیوں میں اترنے کے بعد کیمرے کا سفر رک گیا۔ وہ اب صرف تاریکیوں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ناقابل یقین تاریکیاں...... ہوا باز کا دل کانپ کر رہ گیا۔ ایک سو بیس فٹ کی گہرائیوں کے بعد بھی یہ گہرائیاں اس قدر نظر آ رہی تھیں کہ ان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ایسا کون سا عمل ہو سکتا ہے جو انہیں نیچے تک لے جائے۔

بہر حال اس کے بعد اس نے کیمرہ واپس کر لیا۔ یہ بہت ہی خوفناک تجربہ تھا جس سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ پھر اس کے بعد کافی دیر تک وہ بیٹھا رہا اور پھر دوسری کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد وہ پھر اسی خیمے میں جمع ہوئے۔ باہر کا موسم ان کے لئے ختم کر دیا گیا تھا۔ جو لباس اور جس طرح کی آسانیاں انہیں فراہم کی گئی تھیں انہوں نے ابھی تک انہیں مکمل طور پر محفوظ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خیمے میں واپس پہنچ گئے۔ چاروں نے ایک بار پھر خیمے کی فضا کو اپنی ضرورت کے مطابق کیا اور اس کے بعد اپنا لباس اتار کر بیٹھ گئے۔ آٹھ گھنٹے کی شدید مشقت نے انہیں تھکا دیا تھا لیکن اب انہیں یہ کام برق رفتاری سے کرنا تھا۔

"ہاں...... کیا رپورٹ ہے؟"

"وہی جو تمہاری ہے۔ ایک سو بیس فٹ کے بعد ہم ان گہرائیوں کا کوئی تجزیہ نہیں کر

سکتے۔''

''نمبر ایک! تم نے کیا اندازہ لگایا؟''

''برفانی گڑھے کی لمبائی چوڑائی یعنی اس کا قطر چودہ بائی بیس ہے۔ ہم اگر اس کے چودہ فٹ کے قطر کو چوڑائی کہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کم سے کم پچیس فٹ کی راڈ تیار کرنی ہوگی۔ ہمارے پاس گہرائیوں میں اترنے کے لئے تقریباً ایک ہزار فٹ کا بندوبست ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہزار فٹ کی لمبائی ہمارے لئے کافی ہوگی۔ کیونکہ ایک سو بیس فٹ تک کیمرے کے نیچے جانے کے بعد گڑھے کی تہہ کا اندازہ ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔''

''اگر ہمارا کام ایک ہزار فٹ کی گہرائیوں میں ہو جاتا ہے تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس کے بعد ظاہر ہے ہم موت کی آغوش میں چھلانگ لگانا پسند کریں گے۔ بات ہماری سوچ کے خلاف ہو جائے گی۔''

''ٹھیک...... کل دن کی روشنی میں ہم اپنے کام کا آغاز کر دیں گے۔''

جس کام کا آغاز وہ کرنے جا رہے تھے وہ بہرحال خوفناک تھا۔ لیکن چاروں افراد کا انتخاب اسی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ وہ انتہائی بے جگر اور ہر طرح کے حالات میں ثابت قدم رہنے والوں میں سے تھے۔ خوف کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہیں تھی اور وہ کسی بھی خوف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

چنانچہ دوسرے دن ایک خوفناک کھیل کا آغاز ہو گیا۔ انہوں نے اپنی ضرورت کا اظہار کیا اور ٹرانسمیٹر کے ذریعے وہ طلب کر لیا جو ان کی ضرورت تھی۔ پچیس فٹ لمبی لوہے کی ایک انتہائی مضبوط راڈ ہیلی کاپٹر کے ذریعے انہیں فراہم کی گئی اور انہوں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ راڈ کو برفانی گڑھے کی چودہ فٹ کی لمبائی میں زمین میں نصب کر دیا گیا۔ چودہ کے بعد گیارہ فٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ساڑھے پانچ پانچ فٹ زمین پر رکھا گیا اور یہ بھرپور اندازہ کر لیا گیا کہ وہ ایک مضبوط چیز ہے اور اس کے بعد اس میں خاص قسم کے کڑے پھنسائے گئے اور وہ مشینیں تیار کر دی گئیں جو انہیں نیچے اتارنے کا باعث بنی تھیں۔ نمبر چار کو ان مشینوں پر کنٹرول کے لئے چھوڑ دیا گیا اور پھر تینوں ہوا باز اس راڈ پر قدم جما کر چلتے ہوئے خوفناک برفانی گڑھے کے درمیان میں پہنچ گئے۔ وہ بازیگروں کی

طرح ایک ہولناک فاصلہ طے کر کے گڑھے کے درمیان میں آئے تھے۔ پھر وہ راڈ پر بیٹھے اور اس کے بعد ان کی زنجیریں کھل گئیں۔ یہ زنجیریں کڑ کڑ کی آواز کے ساتھ انہیں برفانی گڑھے میں اتار رہی تھیں اور وہ جائزہ لے رہے تھے کہ وہ نیچے کیسے پہنچ سکتے ہیں اور ان چمکدار دیواروں کا کیا راز ہے۔ یہ ہولناک اور انوکھا سفر ان کے لئے ناقابل یقین تھا۔ بہت سی مہمات میں حصہ لے چکے تھے لیکن یہ پہلی انوکھی مہم تھی۔ اب صرف اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ہزار فٹ کی گہرائی کے بعد بھی مزید گہرائیاں نہ شروع ہو جائیں۔ وہ نیچے اترتے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے میٹر انہیں گہرائیوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ سو فٹ، دو سو فٹ، تین سو فٹ، ساڑھے تین سو فٹ اور پھر ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ کیونکہ انہیں نیچے ایک مدھم مدھم روشنی نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو مسرت کا پیغام دیا اور اس کے بعد وہ اوپر موجود کنٹرولر کو اپنی ان گہرائیوں کے بارے میں بتانا ہی چاہتے تھے کہ دفعتہً ہی کچھ ہو گیا۔

انہیں یوں لگا جیسے دیواروں سے ایک عجیب سا اندھیرا پھوٹنے لگا ہو۔ ان زنجیروں کو زوردار جھٹکے لگے جن کے ذریعے وہ نیچے آ رہے تھے اور اس کے بعد اچانک ہی زنجیروں کے کڑے ٹوٹ گئے...... البتہ وہ زیادہ نیچے نہیں گرے تھے۔ کوئی آٹھ یا نو فٹ نیچے زمین موجود تھی اور وہ اس زمین تک گئے تھے۔ ان کے دل خوف سے بند ہونے لگے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس جھٹکے کی گرفت سے آزاد کیا جو زمین پر گرنے سے انہیں لگا تھا۔ لیکن یہ اندازہ تینوں کو بیک وقت ہو گیا کہ اب زنجیروں سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے اور اوپر موجود مشین نے تیزی سے زنجیروں کو اوپر کھینچ لیا ہوگا۔

''آہ...... یہ کیا ہوا؟'' نمبر دو کے منہ سے آواز نکلی۔ یہ آواز وہ اپنے خلائی سوٹ میں بآسانی سن سکتے تھے۔ تینوں دہشت بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ یہاں کی وسعتیں اتنی ہی تھیں جتنی اوپر تھیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد انہیں اس گڑھے میں مدھم مدھم روشنی کا احساس ہونے لگا۔ بالکل ویسی روشنی جیسی اوپر کی دیواروں سے پھوٹ رہی تھی۔ یقیناً برف کی گہرائیوں میں کوئی ایسی دھات موجود تھی جو ماحول کو روشن کئے ہوئے تھی۔ ان کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ تب انہوں نے اس انسانی جسم کو دیکھا جو ایک طرف ایک خاص قسم کی کوچ پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن یہ کوچ نہیں تھی بلکہ برف کی ایک سل

تھی اور یہ انسانی جسم اس سل میں پیوست تھا۔ شفاف برف غور کرنے پر ہی نظر آتی تھی اس قدر شفاف جیسے منرل واٹر ہو۔ اِدھر سے اُدھر ہر چیز نظر آنے والی۔ اور یہ انسانی جسم اس طرح برف کی اس سل میں محفوظ تھا جیسے کسی ماہر انسانی ہاتھوں نے برف کی اس سل میں جما دیا ہو۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ماحول روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا ہو۔ اب اس گڑھے کی ہر چیز انہیں نظر آ رہی تھی اور وہ ہر سمت دیکھ سکتے تھے۔ بس اوپر نگاہ ڈالتے تو ان کا خوف حد سے زیادہ بڑھ جاتا۔ وہ اس گہرے کنوئیں میں اترے ہوئے تھے اور اب اوپر کی دنیا سے ان کا سارا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ ہاں اگر اوپر موجود نمبر تین ذہانت کے ساتھ اس طرح کی تیاریاں کرے کہ ان زنجیروں کو احتیاط سے زمین تک اتارے اور ان میں ایسا بندوبست کر کے بھیجے کہ یہ اوپر سے منسلک ہو جائیں تب کچھ ہو سکتا ہے۔

لیکن تجسس اور حیرت نے ان پر حملہ کیا تھا اور وہ اس سارے ماحول کو خوف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ ٹرانسمیٹر ان کے پاس موجود تھے لیکن کچھ لمحوں کے لئے وہ اس طرح ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے تھے کہ ٹرانسمیٹر کے استعمال کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ ویسے اوپر باقاعدہ ہر طرح کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ ایک ہیلی کاپٹر وقفے وقفے سے وہاں چکر لگا لیتا تھا اور جانبازوں کی طرف سے کی جانے والی کارروائیوں کا جائزہ لے لیتا تھا۔ نیچے جو شخص مشین آپریٹ کر رہا تھا اس سے بھی رابطہ رہتا تھا۔

بہر حال کافی دیر کے بعد جب ان کے حواس کسی حد تک درست ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے اس سلسلے میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ نمبر دو کہنے لگا۔

”جو ہوا ہے وہ تو واقعی حواس چھین لینے والا عمل ہے۔ لیکن خوف اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ ہوا کیسے ہے اور اس کا ذریعہ کیا ہے...... وجہ کیا ہے؟“

”ہماری یہ زنجیریں حیران کن ہیں۔ دیکھو، ان کی مضبوطی پر بھلا کوئی شبہ کر سکتا ہے؟ یہ تو ہم جیسے دس افراد کا وزن اٹھا سکتی ہیں۔ ان کی کڑیاں تو ایسے کھلی ہیں جیسے کسی خاص عمل سے انہیں کھول دیا گیا ہو۔“

”اوہو...... میرا خیال ہے نمبر ایک کو اس کی اطلاع دینی چاہئے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”ہاں...... نہ صرف اطلاع بلکہ اسے تفصیل بھی بتا دینی چاہئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آنے والے لمحات کیا ہوں۔ ہم کچھ کر سکیں یا نہ کر سکیں۔“

نمبر تین نے جلدی سے ٹرانسمیٹر نکالا اور اس پر نمبر ایک سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر اس پر ایک ہولناک انکشاف ہوا...... ٹرانسمیٹر کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اوپر کچھ فاصلے پر کچھ ایسی ٹھوس فضا قائم ہو گئی ہو جو ٹرانسمیٹر کی لہروں کو اوپر جانے سے روک رہی ہو۔ فوراً ہی انہوں نے تجزیاتی مشین نکالی اور اس کا اندازہ کرنے لگے۔ اور پھر تین نمبر کے منہ سے خوفزدہ آواز نکلی۔

”بالکل یوں لگ رہا ہے جیسے ہمارے نیچے آنے کے بعد اس کنوئیں پر چھت پاٹ دی گئی ہو اوپر یا کہیں درمیان میں۔ اور چھت بھی کسی ایسی دھات کی جسے ٹرانسمیٹر کی لہریں کراس نہ کر پا رہی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا ٹرانسمیٹر خراب ہو ڈیئر تھری! میں کوشش کرتا ہوں۔“ نمبر دو نے کہا۔

لیکن تینوں اپنی ان کوششوں میں ناکام رہے۔ مکمل طور پر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ٹرانسمیٹر کی لہریں ایک خاص جگہ جا کر رک جاتی ہیں اور اسے عبور نہیں کر پاتیں۔ اچانک ہی ان میں سے ایک نے ایک بھیانک انکشاف کیا۔

”آہ...... تم نے ایک بات اور نہیں محسوس کی؟“

”کیا......؟“

”جب ہم نیچے یہاں تک پہنچے تھے تو فضا میں ذرہ برابر گھٹن نہیں تھی۔ لیکن اب محسوس کرو، ہمارے سانس کتنے بوجھل ہو رہے ہیں۔“

اور باقی دونوں بھی بول پڑے۔

”ہاں...... اوپر کچھ نظر نہیں آ رہا۔ جو گہرائیاں نیچے سے تاریک تھیں اب بلندیاں بھی تاریک ہو چکی ہیں۔ کم از کم ہمیں آسمان کسی روشن نقطے کی شکل میں تو نظر آ سکتا تھا۔“

”بالکل...... میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں۔“

”آہ...... یہ تو بڑی خوفناک بات ہے۔ اب کیا کریں؟“

لیکن کسی کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکل سکا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اس چھوٹے سے

مرکز کو دیکھ رہے تھے جہاں برف کی سل میں جمے ہوئے اس انسانی وجود کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ یہ پروفیسر رازل جریری تھا جو برف کی سل کے اندر آرام کی گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ لیکن تندرست بوڑھا جس کے سر کے بال سفید اور لمبے تھے اور ایک انتہائی خوبصورت سفید داڑھی اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا بدن نہایت توانا اور زندگی سے بھرپور تھا۔ پتہ نہیں کتنا عرصہ اسے اس برفانی گڑھے میں ہوا تھا لیکن برف کی سل میں جمے ہونے کی وجہ سے اس کے جسم میں خرابی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ بالکل تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے دیکھتے رہے۔ دفعتہً نمبر چار نے اپنی گردن پکڑ لی اور تڑپنے لگا۔ اس پر شدید گھٹن کا حملہ ہوا تھا۔ باقی دونوں افراد اس کی جانب دوڑے اور انہوں نے فوراً اس کا آکسیجن سلنڈر آن کر دیا اور اس کی نلکیاں گیس ماسک سے جوڑ دیں۔ اسے زمین پر لٹا دیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت اعتدال پر آنے لگی۔ جب اس کی کیفیت سنبھل گئی تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ ہم موت کی گود میں پہنچ چکے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن اتنا اندازہ ہمیں ضرور ہو چکا ہے کہ اب ہم زندگی سے زیادہ موت کے قریب ہیں۔"

"حالانکہ مجھے تمہاری موت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں تو خود ان نقصان پہنچانے والوں کے خلاف ہوں جو اللہ کی بنائی ہوئی اس خوش نما زمین کو ایک ویران کھنڈر بنا دینا چاہتے ہیں، اس برفانی صحرا کی مانند جہاں زندگی ختم ہو جاتی ہے۔"

یہ آواز بڑی پُر وقار تھی۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے برف کی سل میں جما ہوا انسانی وجود بول رہا ہو۔ لیکن وہ وجود اسی طرح ساکت تھا۔

بڑی ہمت کر کے ان میں سے ایک نے سوال کیا۔ "کون ہو تم؟"

"رازل جریری...... یہی میرا نام ہے۔ اور یقیناً تم لوگوں کو میرے بارے میں پوری طرح بریف کیا گیا ہوگا۔ میں ایک سائنس دان ہوں۔ کیونکہ تھا کا صیغہ ابھی نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ تمہارے بدقماش سربراہ چاہتے تو یہی تھے کہ مجھے تھا کے صیغے پر پہنچا دیں لیکن ایسا نہیں کر سکے۔ دنیا کو برائیوں کی جانب تیز رفتاری سے لے جایا جا رہا تھا۔ بلکہ لے جایا

جا رہا ہے۔ زمین پر بسنے والے انسان جن کی آبادی کا صرف پانچ فیصد آرام کی زندگی گزار رہا ہے بلکہ اب اس کا آرام بھی چھن چکا ہے۔ چونکہ خود انسانی کوششوں نے فضا کو اس قدر غلیظ کر دیا ہے کہ ان کی دولت، ان کی آسائشیں انہیں زندگی فراہم نہیں کر پاتیں۔ وہ ایک خوشحال زندگی گزارنے سے محروم ہیں۔ ہر ذی روح چاہے وہ جانور ہو یا انسان، لاتعداد مسائل میں گرفتار ہو چکا ہے اور اسے ان مسائل میں گرفتار کرنے والا وہ ہے جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ دوستو...... میں اپنی بے اوقات ہستی کو صرف اس بات کے لئے وقف کر چکا تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے میں تخریب کا بیج اکھاڑ کر پھینک دوں۔ میں کیا، میری اوقات کیا۔ لیکن بہرحال اگر ہر شخص یہی سوچ کر گوشہ نشین ہو جائے کہ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے تو پھر نیکیوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ میں اپنی کوشش کر کے ہر اس تخریبی عمل کو فنا کرنا چاہتا تھا جو انسانوں کو نقصان پہنچائے۔ میں اس طرح کی تحقیقات کرنا چاہتا تھا جس سے انسانیت کو کچھ بھلائی اور بقاء حاصل ہو سکے۔ تم دیکھو...... بھیانک ایجادات ہو رہی ہیں۔ وہ وحشی درندے جو کیمیاوی ہتھیار، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، پولسٹر بم، میزائل اور نجانے کیسی بھیانک ایجادیں کر رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ زمین اور اقتدار کے حصول کے لئے انسانی خون بہایا جاتا تھا۔ جسمانی طاقت آزمائش ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ لوہے اور پتھر کے ہتھیار استعمال کر لئے جاتے تھے۔ ایک فریق دوسرے فریق کا خون بہا دیتا تھا لیکن کم از کم اس میں اس کی گنجائش تھی کہ باقی لوگ سنبھل جائیں۔ وہ بے گناہ جو میدانِ جنگ میں نہیں ہوتے، ایک بم کے دھماکے سے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ ماؤں کے معصوم بچے، بیویوں کے شوہر، بیٹے، بھائی، بہن سارے کے سارے جو بے گناہ ہوتے ہیں اور جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا، کسی ایسے غیر انسانی عمل کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں جو نقصان پہنچانے کے لئے ہو۔ جنگیں ہوتی ہیں اور بے گناہ ان میں پس جاتے ہیں۔ بھوک، افلاس، غربت دنیا کی تین چوتھائی آبادی کو نگل جانے کے لئے تیار ہے۔ لیکن وہ افراد جو قوت رکھتے ہیں، طاقت رکھتے ہیں، ان کی بھوک، افلاس، غربت اور بیماریوں کو قابو کرنے کی بجائے ان کے خاتمے کے لئے کوشاں ہیں۔ وہ سب کچھ تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا عمل انہی کے خلاف تھا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ یہ دنیا ایک ہنستا بستا گھرانا ہو۔ سب ایک دوسرے سے منسلک، سب ایک دوسرے

کے دکھ درد کے ساتھی، ایک حصہ خشکی اور تین حصہ پانی۔ کائنات کی وسعتوں میں پھیلا ہوا یہ سمندر جس کی تہہ میں نظر آنے والی یہ جڑی بوٹیاں اور بے شمار چیزیں انسانی بقاء کے لئے منتظر ہیں کہ کب انسان ان پر ریسرچ کرے اور انہیں سمندر سے نکال کر انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کرے اور دنیا کا مسئلہ ہزاروں سال کے لئے حل ہو جائے۔ جس طرح اس ایک چوتھائی زمین پر انسان ہزاروں سال سے آباد ہے اور جی رہا ہے اسی طرح قدرت نے اس کے لئے سمندر کا دل بھی کشادہ کر دیا ہے۔ وہ جب بھی اس طرف راغب ہو، اپنی بقاء اور بہتری کے راستے تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن نہیں...... ایسا نہیں کیا جا رہا۔ کیا نہیں ہے اس تین چوتھائی پانی کی زمین میں۔ میرے یہی نظریات ان انسانیت دشمنوں کو پسند نہیں آئے۔ انہوں نے اپنی قوت کے ذریعے مجھے خریدنا چاہا اور جب میں نے ان کے ہاتھوں بکنے سے انکار کر دیا تو وہ مجھے سزا دینے پر تل گئے۔ میں نے کسی کی برتری قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ اپنے وطن کے لوگوں سے بھی میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ جب بھی انہوں نے اپنی کسی خدمت کے لئے مجھے آواز دی تو میں سر جھکا کر ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے غلامی کی زنجیریں نہ پہنائیں۔ وطن والے تو مان گئے لیکن تمہاری حکومت پلاسکو جو ساری دنیا پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے نہ مانی اور مجھے سزا دے کر اس غار میں پھینک دیا گیا۔ لیکن میں اپنے آپ کو ان کی اس سزا سے تو نہ بچا سکا البتہ میں نے اپنی روح کو جسم کی قید سے آزاد کر لیا۔ اور اس کے بعد میں روح کی شکل میں آج تک بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ جو چیزیں قدرت کے زیر اثر ہیں، ان پر انسان نہ کبھی دسترس حاصل کر سکا ہے اور نہ ہی قیامت تک کر سکے گا۔ میں اپنی روح کو اپنے جسم میں داخل نہیں کر سکتا کیونکہ میرا جسم برف کی اس سل میں دفن ہے۔ لیکن میں اپنے روحانی وجود سے اور بہت کچھ کر سکتا ہوں اور میں نے کیا۔ تمہارے اس خوفناک علاقے میں جہاں یہ برفانی قبرستان ہے، تمہاری حکومت نے لیبارٹریاں بنائی ہوئی ہیں۔ میں نے ان لیبارٹریوں کو ناکارہ کر دیا ہے اور انہیں بدترین نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ انہیں کسی مرحلے پر کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ہر جگہ کامیابی حاصل کر سکتا ہوں۔ میری تو خواہش ہے کہ دنیا میں جتنے لوگ برے کام کر رہے ہیں، ان کے خلاف عمل کروں۔ میری لڑائی صرف حکومت پلاسکو سے ہی نہیں بلکہ دنیا

کے ہر تخریب کار سے ہے جو کسی ایک انسان کو بھی نقصان پہنچانے کا خواہش مند ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم لوگ...... یہ ہے میرا نظریہ حیات اور میں تلاش میں ہوں ان لوگوں کی جو مجھے میرا بدن واپس کر دیں اور میں ایک بار پھر رازل جریری کی حیثیت سے اپنے کام کا آغاز کر دوں۔ یہ کام انسانیت کی بھلائی کے لئے ہے اور بھلائی کے لئے میں ہر اس شخص کو آواز دوں گا جو میرا ہمنوا ہو اور اس وقت تک ان لوگوں کے خلاف کام کرتا رہوں گا جب تک کر سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے ان لوگوں کے خلاف جو دنیا کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ تم لوگ میرے جسم کی تلاش میں یہاں تک آئے ہو اور مجھے علم ہے کہ حکومت پلاسکو اب یہ بات سمجھ چکی ہے کہ ان کے خوفناک اور ہولناک ایجنڈوں کو نقصان پہنچانے والا میں ہوں اور آئندہ بھی میں انہیں نقصان پہنچاتا رہوں گا، جہاں اور جیسے بھی ممکن ہو سکا۔ وہ میرے جسم کو حاصل کر کے مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بیوقوف ہیں۔ بھلا میں اپنی روح کو اپنے جسم میں کیوں داخل کروں گا کہ وہ اسے نقصان پہنچا سکیں۔ جب تک کہ میں مطمئن نہ ہو جاؤں کہ میرے مقصد کی تکمیل ذہن میں رکھی جا رہی ہے۔ سن لیا تم نے۔ تم لوگ یہاں پہنچے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ، تمہارے پیچھے پیچھے تھا۔ مجھ میں قوت پرواز ہے۔ میں یہاں تک آ گیا ہوں اور اب میں تم سے بھی ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس غار کی گہرائیوں کے ایک مخصوص حصے کو ایک نادیدہ گیس کے دباؤ سے ڈھک دیا ہے اور اب اوپر اور نیچے کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ ہر کوشش کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم اوپر نہیں جا سکتے۔ البتہ ایک عمل کیا جا سکتا ہے۔ میرے جسم کو برف کی اس سل سے نکالو اور اسے خشک کر لو۔ اس کے بعد میں تمہیں اوپر جانے کے راستے بتاؤں گا۔ یہ سودا اگر منظور ہے تو زندگی کی طرف تمہارے سفر کا آغاز ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔“

آواز بند ہو گئی۔ وہ تینوں پتھرائے ہوئے کھڑے تھے۔ بے شک وہ فولاد دل و دماغ والے انسان تھے جنہیں ان کی حکومت نے خاص طور سے منتخب کیا تھا لیکن خرابی بس یہ تھی کہ وہ انسان تھے، روبوٹ نہیں تھے۔ اگر وہ مشینی انسان ہوتے تو خوف و دہشت سے آزاد ہوتے اور اپنی بقاء تلاش کرتے۔ لیکن وہ انسان تھے۔ جذبات اور احساسات کے مالک۔ خوف ان کے وجود کا بھی حصہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ اپنے مقاصد کے لئے مخلص تھے۔

چنانچہ تینوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نمبر تین نے سرگوشی کی۔

"نہیں ...... یہ ممکن نہیں ہے۔ ہماری حکومت نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اسے اسی حالت میں لائیں جس حالت میں وہ یہاں ملے۔ اپنے طور پر ہمیں کسی عمل کو کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ اور ہم اپنے مشن کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو آواز ہم نے سنی ہے وہ فریب کی آواز ہو۔ اپنا وجود حاصل کرنے کے بعد رازل جریری سب سے پہلے ہمیں فنا کر دے اور اس کے بعد تنہا باہر نکل جائے۔ یہ ہمارے مشن کا حصہ نہیں ہے۔" چنانچہ نمبر تین نے کہا۔

"ہم وہ نہیں کر سکتے جو تم کہہ رہے ہو۔"

کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ خاموشی ہی خاموشی۔ وہ کئی بار اپنے الفاظ دوہرانے کے بعد خاموش ہو گئے تھے لیکن فضا میں وہ گھٹن اب بھی قائم تھی۔ آکسیجن آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سلنڈر چلا رکھے تھے لیکن انہیں یہ اندازہ تھا کہ بہر حال ایک وقت گزرنے کے بعد ان سلنڈروں میں آکسیجن ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد انہیں موت کی گھٹن کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ادھر اوپر جو شخص آپریشن مشین پر بیٹھا ہوا تھا اسے کچھ ہی لمحوں کے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ اچانک ہی ان زنجیروں کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے جو تنی ہوئی تھیں اور نیچے جانے والوں کے وزن کا احساس دلا رہی تھیں۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو نیچے جانے والوں کے قدم زمین پر جم چکے ہیں اور زنجیریں خود بخود ڈھیلی پڑ گئی تھیں یا پھر کچھ اور ہوا ہے۔ اور پھر اس نے ٹرانسمیٹر پر نیچے جانے والوں سے رابطہ قائم کیا لیکن انتہائی کوششیں اسے اس میں کامیاب نہیں کر سکیں۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے آپریشن مشین کی طرف دیکھا اور یہ آپریشن مشین جس کے دو نیلے بلب اسپارک کر رہے تھے، ایک خوفناک حقیقت کا انکشاف کرنے لگی اور وہ حقیقت یہ تھی کہ نیچے جانے والوں کا اب اس مشین سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔

چنانچہ آپریٹر نے فوراً ہی زنجیروں کے ریورس بٹن دبائے اور زنجیریں وزن سے بے نیاز اوپر لپٹنے لگیں۔ آپریٹر کے بدن کی جان نکل گئی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ نیچے اترنے والے مشین کی گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں اور زنجیروں سے علیحدہ

ہو کر غار کی گہرائیوں میں گر گئے ہیں۔ وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔ اس کے تینوں جانباز ساتھی زندگی سے محروم ہو چکے تھے۔ اور یہ تصور اس کے لئے انتہائی دردناک تھا۔ لیکن ظاہر ہے وہ خود بھی بے بس تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس کے بعد وہ کئی گھنٹے تک مسلسل کوششیں کرتا رہا اور اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے تینوں ساتھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ سامنے سے اسے ہیلی کاپٹر آتا ہوا نظر آیا۔ ان لوگوں کی مسلسل خبر گیری کی جا رہی تھی اور ان سے پوچھا جا رہا تھا کہ ان کی موجودہ کیفیت کیا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی ہیلی کاپٹر سے رابطہ قائم ہوا، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہیلو...... ہیلو...... ہیلو......"

اور پھر اس کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔

ہیلی کاپٹر سے ان سسکیوں کو سنا گیا اور آواز آئی۔

"ہیلو...... ہیلو...... کیا تم رو رہے ہو؟ کیا کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے...... ہیلو...... تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟"

"کوئی نہیں......" وہ روتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب...... کیا کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟"

"ہاں...... شاید میرا اندازہ ہے کہ ہم اپنے تین ساتھیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔"

دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

✿......✿

راجہ سرکار اور دلبر سرکار خوشیوں کے جھولے جھول رہے تھے۔ زندگی اور تقدیر ہر شخص کو موقع دیتی ہے۔ جو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ ذہین اور سمجھدار لوگ ہوتے ہیں اور جو ایسے مواقع کھو دیتے ہیں وہ زندگی بھر ناکامیوں کی آغوش میں بسر کرتے ہیں۔ راجہ سرکار اور اس کا بھائی خوشیوں کی آغوش میں جھولا جھول رہے تھے۔ ان کے سرکس کو جو عزت اور شہرت ملی تھی وہ ان کے تصور سے کہیں دور کی چیز تھی۔ وہ بے پناہ خوشیاں محسوس کرتے تھے۔ اور اسی طرح وہ شبیلہ، فیض شاہ اور شہباز کی عزت کرتے تھے۔ شہباز بے پناہ خوبیوں کا مالک تھا۔ پلاسٹک سرجری سے چہرے تبدیل کرنے کا فن تو خیر اسے آتا ہی تھا لیکن سرکس کی دنیا میں اس نے جس کمال کا اظہار کیا تھا اس کا عام لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دونوں یعنی راجہ سرکار اور دلبر سرکار سرکس ہی سے متعلق تھے لیکن خود انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ یہ لڑکا انتہائی غیر معمولی ہے اور کبھی کبھی اس کا عمل انسانی عمل نہیں معلوم ہوتا۔

بہر حال ساری باتیں اپنی جگہ تھیں...... لیکن جو ہزیمت طارق شاہ کو اٹھانی پڑی تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ طارق شاہ جب بھی کہیں سرکس لگاتا، پہلے معلوم کر لیتا کہ راجہ سرکار کا سرکس تو وہاں نہیں لگ رہا۔ ایک بار اس کے کچھ ہمدردوں نے اس سے کہا۔

''شاہ جی! آپ نے اس بات کو اپنے اوپر زیادہ طاری کر لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم کچھ ایسے فنکار تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو شہباز سے بھی زیادہ باصلاحیت ہوں۔''

تب طارق شاہ نے ایک دن اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بیوقوفو! میں اس کے فن سے خوفزدہ نہیں ہوں، اس بات سے نہیں ڈرتا میں کہ اس کے سرکس کے سامنے ہمارا سرکس بے وقعت ہو جاتا ہے۔ بس تم سمجھ لو میں اپنے آپ کو

ایک چور، ایک مجرم تصور کرتا ہوں۔ بات اصل میں یہ تھی کہ میں شبیلہ سے محبت کرتا تھا۔ کسی کی توجہ زبردستی نہیں حاصل کی جاتی بلکہ محبت تو ایک قدرتی عمل ہے اور کسی کسی کو ہی اس محبت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ سب کی تقدیر میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے غم اس بات کا ہے کہ میں اس قدر خودغرض ہو گیا تھا کہ میں نے گلباز کی وفاداریوں کو بھی بھلا دیا اور اپنی شخصیت کو بھی بھول گیا۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے اتنا برا انسان نہیں ہوں کہ انسانیت سے اس طرح گر جاؤں کہ خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں۔ بس ایک خود غرضی میرے وجود پر سوار ہو گئی تھی۔ شبیلہ کا حصول بھی شاید میرے لئے اتنا ضروری نہ ہوتا جتنا ضروری یہ خیال تھا کہ اس نے سرکس کے مالک کو ٹھکرا کر سرکس کے ایک ملازم سے شادی کر لی اور اسے ترجیح دی۔ بس اس احساس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا اور میری دیوانگی اس حد تک اوپر پہنچ گئی کہ میں نے فیض شاہ صاحب کی بھی بات نہ سنی۔ حالانکہ یہ بات میرے باپ نے مجھے بتائی تھی کہ اس سرکس کا وجود فیض شاہ کے دم سے ہوا۔ صحیح معنوں میں فیض شاہ نے تو میرے والد کی زندگی بچائی تھی اور یہ احسان کم نہیں تھا۔ لیکن میں نے فیض شاہ کی درخواست کو بھی ٹھکرا دیا اور شہباز کو اور شبیلہ کو اپنے سرکس سے نکال دیا۔ میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اب جب بھی یہ سرکس میرے سامنے ہوتا ہے تو میں ایک عجیب مجرمانہ احساس کا شکار ہو جاتا ہوں۔ بلکہ پچھلے کچھ عرصے سے تو میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ اب مجھے اس سرکس سے دستبردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لینی چاہئے۔ بہت بددل ہو گیا ہوں میں۔''

''ایسا خواب میں بھی نہ سوچیں۔ بے شمار انسان اور جانور لاوارث ہو جائیں گے۔''

''نہیں منیجر! اس دنیا کے کام کبھی بند نہیں ہوتے۔ جو کام میں کر رہا ہوں وہ کوئی دوسرا کرے گا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر اتنا زیادہ غور کیا جائے۔''

بہر حال یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

دوسری طرف راجہ سرکار کے سرکس نے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اخبارات وغیرہ اس شہرۂ زمانہ چھلاوے کے بارے میں نجانے کس کس طرح لکھا کرتے تھے۔ اس کی تصویریں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ اخبار کہتے تھے کہ وہ اس دنیا کا انسان ہے ہی نہیں، کوئی خلائی مخلوق ہے جو زمین پر آ گئی ہے۔ سرکس ان دنوں ایک شہر میں لگا ہوا تھا۔ آباد اور بھرپور

شہر۔ راجہ سرکار نے یہاں کے ایک مخصوص مقام پر سرکس لگانے کی ہمت کی تھی اور یہ ہمت افزائی اسی شکل میں ہوئی تھی کہ اخبارات شہباز کے دیوانے ہو گئے تھے اور بات واقعی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ شہر میں سرکس کھچا کھچ بھرنے لگا۔ ہر شعبۂ فکر کے لوگ اس چھلاوے کو دیکھنے آنے لگے جس کی پبلسٹی بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہو چکی تھی۔

اسی سرکس میں ایک دن تانیہ اپنے والد کے ساتھ آئی۔ ایرانی نژاد تھی اور اس کے والد منوچہر تبریزی یہاں بہت بڑا کاروبار کرتے تھے چنانچہ باپ بیٹی ایسے ہی سیر و سیاحت کرتے ہوئے سرکس کی طرف آ نکلے تھے اور تانیہ ایک دم بول پڑی تھی۔

''پاپا! میں سرکس دیکھوں گی۔''

''ارے یہ کیا بیوقوفی کا شوق پیدا ہوا تمہیں؟''

''نہیں پاپا! میں تو ان لوگوں سے بہت متاثر ہوں جو زندگی کی بازی لگا کر پیٹ پوجا کرتے ہیں۔ میں تو انہیں بڑے محنت کشوں میں تصور کرتی ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن......''

''پاپا! میں سرکس دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے کیوں منع کر رہے ہیں؟''

''تب پھر یوں کرتا ہوں کہ میں تمہیں ٹکٹ دے کر یہاں چھوڑے جاتا ہوں۔ میں اپنے ضروری کام کر لوں۔''

''پاپا...... آپ اتنے خود غرض کب سے ہو گئے؟ آپ مجھے یہاں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟''

''او بیوقوف...... میں......''

''آیئے میرے ساتھ۔ سرکس دیکھیں گے آپ، سمجھے۔''

''ٹھیک ہے بابا! ٹھیک ہے۔ تیری ضد کے آگے چلتی ہے کسی کی جو میری چلے گی۔''

''میں کبھی بے جا ضد نہیں کرتی ہوں پاپا! بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں سرکس دیکھوں۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔ بات ختم ہو جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے بابا! ختم ہو گئی نا بات۔ اب تم کیوں بڑھائے جا رہی ہو اس بات کو۔'' منوچہر تبریزی نے کہا اور تانیہ ہنسنے لگی۔

''ڈر گئے پاپا؟''

''ہاں بھئی، تجھ جیسی بیوقوف لڑکی سے ڈرنا ہی پڑتا ہے۔'' منوچہر نے کہا اور تانیہ ہنسنے لگی۔

باپ بیٹی سرکس میں جا بیٹھے اور تانیہ حیرت اور دلچسپی سے کمالات دیکھنے لگی۔ منوچہر تبریزی کی اکیلی بیٹی تھی۔ بیوی مر چکی تھی۔ زندگی میں تانیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ باپ کی آرزوؤں کا واحد مرکز تانیہ جوکروں کی شرارتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی جا رہی تھی۔ بہت سے کرتب بھی دکھائے جا رہے تھے اور تانیہ بچوں کی طرح تالیاں پیٹ رہی تھی۔ سرکس کے کمالات نے منوچہر کو بھی متاثر کیا تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے خوش ہو رہا تھا۔

پھر اچانک سرکس کے ایرینا میں خاص قسم کے جال تانے جانے لگے۔ تماشہ دیکھنے والوں اور کرتب دکھانے والوں کے درمیان خاص قسم کے لوہے کے جال تان دیئے گئے۔ غالباً شیر اندر لائے جا رہے تھے اور کوئی ایسا کمال دکھایا جانے والا تھا جو خطرناک ہو۔ اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ سرکس کے ایرینا میں تین خونخوار شیر چھوڑ دیئے گئے۔ دیکھنے ہی سے بھیانک معلوم ہوتے تھے۔ سب لوگ حیرت اور دلچسپی اور کسی قدر خوف کے عالم میں غراتے ہوئے شیروں کو دیکھنے لگے۔ پھر بلندی سے کوئی نیچے اترا۔ چست لباس میں ملبوس ایک حسین ترین جسم والا نوجوان تھا۔ جس کے چہرے کی دلکشی قابل دید تھی۔ ایسا عجیب و غریب اور پُر سحر چہرہ کہ دیکھ کر آنکھیں نہ ہٹیں۔ شیر اسے دیکھ کر غرانے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس نوجوان کو پسند نہ کرتے ہوں۔ نوجوان خالی ہاتھ تھا۔ دفعتاً اس نے ایک شیر کے عقب میں جا کر اس کے پچھلے حصے میں ایک زوردار لات ماری اور شیر کئی قدم آگے بڑھ کر جنگلے سے ٹکرایا اور خوفناک دھاڑ کے ساتھ پلٹا اور اس نوجوان پر حملہ آور ہو گیا۔ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ شیر نے اس نوجوان پر چھلانگ لگائی تو نوجوان اس کے نیچے سے نکل گیا اور اچھل کر ایک دوسرے شیر کو دولتی مار دی۔ وہ شیر الٹی قلابازی کھا گیا اور پھر وہ بھی مشتعل ہو گیا۔ یہ منظر جعلی نہیں، حقیقی تھا۔ لوگ کھڑے ہو گئے اور منتظمین ان سے بیٹھنے کی درخواست کرنے لگے۔ اناؤنسر نے کہا۔

''نہیں...... آپ لوگ بے فکری سے بیٹھ کر زندگی اور موت کے اس کھیل کو دیکھئے۔ اس کھیل کا کھلاڑی ہے شہباز۔ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے والا شہباز! یہ شیر حقیقی طور

پر مشتعل ہوئے ہیں۔ وہ اس نوجوان سے نفرت کرتے ہیں۔ اور یہ جب ان کے سامنے آتا ہے تو وہ اسے چیرنے پھاڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ لیکن دیکھئے، شیروں کو شکست دینے والا، ان کی پھرتی سے خوفزدہ نہ ہونے والا یہ دلیر ان سے زیادہ طاقتور اور بہادر ہے۔ دیکھئے اس نوجوان کی کارروائیاں۔ دیکھئے اس کے کمالات۔“

اور واقعی بڑا خوفناک منظر تھا۔ مشتعل شیر پینترے بدل بدل کر اس پر حملے کر رہے تھے لیکن وہ انسان تھا ہی کہاں۔ وہ تو ایک ہیولا تھا، ایک برق تھی جو کوندتی اور تینوں شیروں سے بچنے کی کوشش کرتی۔ کبھی زمین پر لیٹ کر، کبھی فضا میں اچھل کر۔ کبھی اس کے پاؤں کسی شیر کی پشت پر پڑتے اور کبھی کسی کے سر پر۔ یہ خونی کھیل کوئی دس منٹ جاری رہا۔ ایک بھی شیر اس نوجوان کے بدن کو نہیں چھو سکا تھا۔ پھر اچانک ہی نوجوان اچھلا اور اس کٹہرے کے اوپر لٹکے ہوئے ایک رسے تک پہنچ گیا۔ اس نے رسہ پکڑا اور مشینی عمل کے ذریعے رسہ اوپر کھینچ لیا گیا۔ شیر اچھل اچھل کر اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ شیروں کو اندر لے جایا گیا۔ مشتعل شیروں کو اس طرح قابو میں کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن نکاسی کے راستے پر ان کے لئے پنجرے لگے ہوئے تھے اور ان شیروں کو براہِ راست ان پنجروں میں منتقل کیا گیا اور شاید پھر کھانے پینے کو دیا گیا۔ کیونکہ کچھ دیر ان کی غراہٹیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ جنگلہ ہٹا دیا گیا۔ دوسرے کام شروع ہو گئے۔

یہ خوفناک کھیل تانیہ نے بھی دیکھا۔ لیکن کھیل اپنی جگہ، کھلاڑی اس کے دل میں کسی خفیہ راستے سے داخل ہو گیا۔ وہ ایک عجیب سی کسک محسوس کرنے لگی۔ وہ حسین مردانہ چہرہ اسے اپنے وجود پر مسلط ہوتا محسوس ہوا اور وہ کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔ اس کے بعد کئی کرتب ہوئے اور پھر شہباز کا نام دوہرایا گیا تو وہ چونکی۔ اس بار جھولے کا خطرناک کھیل اس کے سامنے آیا اور کئی بار اس کے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے بچی۔ وہ جس طرح کا کرتب دکھا رہا تھا وہ بھی غیر انسانی ہی تھا۔ کئی بار تانیہ کے حلق سے آوازیں نکلیں۔ کئی بار وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ کئی بار اس نے سینے پر ہاتھ رکھا اور دل کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ کئی بار وہ بے اختیار ہوئی۔ وقفے وقفے سے شہباز کے خوفناک کمالات ان کے سامنے آتے رہے۔ اس کے نام کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا اور اکثر لوگوں کے منہ سے شہباز شہباز کی آوازیں نکلی تھیں۔ دو تین بار تو منوچہر نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”خدا اسے محفوظ رکھے۔ یہ انسان ہے یا چھلاوا...... پتہ نہیں کس ماں کی اولاد ہے اور اس نے اسے یہ خوفناک کرتب کرنے کے لئے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ارے یہ تو مجھے کوئی انتہائی سرکش اور پاگل لڑکا لگتا ہے۔ کیا کروں، اس کے لئے دعائیں کروں یا...... اوہو...... توبہ توبہ......توبہ توبہ......“ منوچہر کے یہ الفاظ تانیہ بھی سن رہی تھی۔ پھر سرکس کا شو ختم ہوا تو تانیہ نے کہا۔

”بابا! میں شہباز سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”کیوں بیٹا! وہ سرکس کا ایک فنکار ہے۔ روزانہ اس طرح کے کھیل تماشہ دکھانے والا۔“

”نہیں نہیں...... حرج نہیں ہے۔ آؤ دیکھیں۔ چلو......“ پھر کئی لوگوں کی منت سماجت کر کے تانیہ، شہباز تک پہنچ سکی تھی۔ شہباز نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے اور اس وقت وہ ایک انتہائی خوش روح اور عام آدمی کی حیثیت سے نظر آ رہا تھا۔ منوچہر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”مسٹر شہباز! بڑی مشکل سے آپ تک رسائی حاصل ہوئی۔ آپ تو خیر ہیں ہی ایک اعلیٰ شخصیت کے مالک۔ لیکن آپ کے پرستار کبھی کبھی آپ سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔“

”ضرور جناب! میں آپ سے مل کر خوشی محسوس کروں گا۔“ شہباز نے نرم لہجے میں کہا۔

”یہ میری بیٹی تانیہ ہے۔ آپ کی تازہ تازہ پرستار۔ ہم لوگ پہلی بار آپ کا یہ سرکس دیکھنے آئے ہیں۔ آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آپ باکمال شخصیت کے مالک ہیں۔“

”بے حد شکریہ...... آپ کا بھی شکریہ مس تانیہ!“

”شہباز! آپ سے کچھ سوالات کروں؟“

”کریجئے۔ کیا حرج ہے؟“

”آپ کو اس سارے کھیل سے ڈر نہیں لگتا؟“

”نہیں۔“

”کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ شیر آپ کو چیر پھاڑ کر پھینک دیں گے؟“

”نہیں۔“

”کیوں...... کیا آپ انسان نہیں ہیں؟“

"انسان ہوں۔ لیکن اس یقین کے ساتھ کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں ان
سے زیادہ طاقتور، ان سے زیادہ دلیر اور ان سے زیادہ پھرتیلا ہوں۔ میں ان سے اپنا بچ
کر سکتا ہوں۔ مجھے اس بات کا پورا پورا یقین ہے۔"

"خیر، یہ تو اچھی بات ہے۔ انسان کو اپنے اوپر اعتماد ہونا چاہئے۔" تانیہ نے گردن ہ
کر کہا۔ پھر بولی۔ "اگر میں آپ سے دوبارہ ملاقات کرنا چاہوں تو؟"

"سرکس تو ابھی کافی دن تک یہاں لگا رہے گا مس تانیہ! آپ جب چاہیں سرک
دیکھنے آ سکتی ہیں۔"

"آپ کا بے حد شکریہ۔" تانیہ نے واپس پلٹتے ہوئے کہا اور اپنے باپ کے ساتھ اس
خیمے کے دروازے تک آ گئی۔ پھر پلٹ کر بولی۔

"میں آپ سے ملاقات کرنے کے لئے آؤں گی مسٹر شہباز! صرف آپ سے ملاقات
کرنے کے لئے۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شہباز پر اس کے کیا اثرات
مرتب ہوں گے۔ پھر جب دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے اپنے باپ کو اطلاع دیے بغیر
وہ اپنی کار میں بیٹھ کر سرکس پہنچی تو اس نے سرکس کے ملازموں کو ادھر سے اُدھر آتے جاتے
دیکھا۔ ایک ملازم سے اس نے شہباز کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"وہ اپنے خیمے میں ہیں۔ ابھی ابھی پریکٹس کر کے اندر گئے ہیں۔"

"ملنا چاہتی ہوں میں ان سے۔"

شہباز اسی وقت کسی کام سے اپنے خیمے سے باہر نکلا۔ اندر شبیلہ اور فیض شاہ کسی بحث
میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ایک تیسرا سرکس کا آدمی بھی وہاں موجود تھا۔ شہباز انہیں بحث میں
الجھا ہوا چھوڑ کر باہر نکلا تو اسے تانیہ نظر آ گئی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے
کے اندر اندر تانیہ کو پہچان لیا اور ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔

"پہچان گئے آپ مجھے؟"

"ہاں مس تانیہ! میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔ پھر سب سے حیرت انگیز بات
ہے کہ آپ میری ایک کالج فیلو سے بہت ملتی ہیں۔"

"کالج فیلو......؟" تانیہ بولی۔

"ہاں......اس کا نام سونیا تھا۔"

"آپ کالج میں پڑھتے رہے ہیں؟"

"ہاں......کچھ عرصہ پہلے تک۔"

"شہباز! آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکیں گے؟"

"میں نہیں جانتا کہ مجھے یہ وقت آپ کو کیسے دینا ہوگا۔"

"ایک ریستوران میں میرے ساتھ چائے پی کر۔"

"کب؟"

"ابھی۔"

"ارے اچانک، بغیر کسی پروگرام کے؟"

"ہاں......کچھ جملے کہہ رہی ہوں۔ آپ چاہیں تو اس پر ہنس سکتے ہیں۔"

"نہیں......ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ بتائیے۔"

تانیہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر گردن جھٹک کر بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا کام رات کو شروع ہوتا ہے۔ دن میں ایک آدھ
گھنٹے پریکٹس کرنے کے بعد ہم فارغ ہو جاتے ہیں۔ البتہ اگر آپ مجھے لباس تبدیل کرنے
کی اجازت دیں تو۔"

"ہاں بالکل۔" تانیہ نے کہا اور شہباز ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ اس لڑکی کو اگر شبیلہ اور
فیض شاہ سے ملایا جائے تو بات ذرا آگے کی ہو جائے گی۔ پتہ نہیں کون کیا سوچے۔ بہتر یہ
ہے کہ اسے سرکس کے باہر جانے کی ہدایت کر دی جائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ شہباز کے کہنے
پر تانیہ باہر چلی گئی اور شہباز لباس تبدیل کرنے اندر۔ بہرحال اس کے بعد تانیہ اسے ایک
خوبصورت کار میں لے کر چل پڑی۔ راستے میں اس نے کہا۔

"آپ تو جگہ جگہ جاتے ہوں گے۔"

"ہاں، جہاں بھی سرکس جاتا ہے۔"

"اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ آپ کو پسند کرنے والے بھی بہت سے ہوں گے۔"

"ظاہر ہے......جو لوگ کھیل تماشے سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جسے سرکس میں میرا کھیل

پسند آتا ہے وہ مجھے پسند بھی کرتا ہے۔"

"میں ان کی بات نہیں کر رہی۔"

"تو پھر......؟" شہباز نے سوال کیا۔

"مجھ جیسی لڑکیاں جو آپ کو میری طرح غور سے دیکھتی ہوں گی۔"

"مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی لڑکی نے آ کر مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

"اور میں یہ الفاظ بالکل نہیں کہوں گی کہ مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آ رہا۔ کیونکہ اس سے آپ کی توہین ہوگی۔ لیکن میرے دل میں یہ بات ضرور ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔" تانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے بہت خوبصورت انداز میں بات کی ہے۔ لیکن صرف ایک جملہ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ضرور۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا اور کوشش کرتا ہوں جھوٹ نہ بولوں۔"

"ویری گڈ...... اس سے آپ نے اپنے مؤقف کا اظہار کر دیا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ بہر حال میں آپ کو پسند کرتی ہوں مسٹر شہباز!"

"شکریہ...... بے حد شکریہ۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے کارناموں کو تو پسند کرتی ہی ہوں لیکن اس سے ہٹ کر میرے دل میں آپ کے لئے پسندیدگی کے جذبات ہیں۔"

شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تانیہ اسے لے کر جس ریستوران میں داخل ہوئی بالکل اتفاقیہ طور پر منوچہر بھی موجود تھا جسے تانیہ نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن شہباز نے اپنی میز پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"آپ اپنے ڈیڈی کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھیں؟"

"ڈیڈی؟"

"ہاں...... وہ سامنے موجود ہیں۔"

تانیہ نے منوچہر کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ منوچہر کو اس کی

یہاں آمد کے بارے میں بالکل نہیں معلوم تھا۔ لیکن پھر دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"سوری۔ مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ میرے پاپا بھی یہاں موجود ہوں گے۔ آپ کا سرکس ابھی کتنے دن یہاں ہے؟"

"ابھی تو بہت دن تک لگا ہوا ہے۔"

"تو پھر...... آپ سے تنہائی میں ملاقات ہوگی؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ مگر میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ آئیے۔ ابھی ہم پاپا کے پاس بیٹھیں گے۔"

منوچہر نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور گردن ہلا کر بولا۔

"مجھے بڑی حیرت ہے۔ نہ تانیہ نے مجھے بتایا کہ وہ تمہارے پاس جا رہی ہے نہ میں یہ جانتا ہوں کہ تمہارے درمیان یہ شناسائی کیسے ہوئی۔ کیا پہلے سے یا پھر پچھلے دن سے؟"

"آپ کیسے ہیں سر؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ لیکن جو سوال میں نے کیا ہے وہ تو ادھورا ہی رہ گیا۔"

"نہیں، مس تانیہ سے میری پہلے شناسائی نہیں ہے۔"

"پاپا! میں انہی کے پاس گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ان کے کارنامے حیرت انگیز تھے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں پاپا! کہ مجھے ناقابل یقین کام کرنے والے لوگوں سے ہمیشہ سے دلچسپی ہے۔"

"ہاں...... جانتا ہوں۔ لیکن اپنے پسندیدہ فنکار سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کا ایک مختصر سا ذریعہ یہ ہے کہ آٹو گراف بک پر اس کے دستخط لے لئے جائیں اور بعض اوقات ایسا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ کام تو کرنا جانتے ہیں لیکن پڑھے لکھے نہیں ہوتے جیسے یہ سرکس وغیرہ میں کام کرنے والے لوگ۔ ان بے چاروں کا تعلیمی زندگی سے کیا واسطہ۔" منوچہر کے لہجے میں جو حقارت تھی وہ اس کی بیٹی سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ تاہم تانیہ نے جلدی سے کہا۔

"نہیں پاپا! مزیدار بات تو یہی ہے کہ مسٹر شہباز تعلیم یافتہ ہیں اور کالج میں تعلیم حاصل

کر چکے ہیں۔"

"انہوں نے تم سے یہی کہا ہوگا۔" منوچہر نے پھر ایک حقارت آمیز تیر پھینکا۔

"ظاہر ہے پاپا! جھوٹ تو نہیں کہا ہوگا مجھ سے۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں۔ خیر چھوڑیئے، مسٹر شہباز! آپ یہ بتایئے کہ کب سے اس سرکس میں تماشا دکھا رہے ہیں آپ؟"

"ہمیشہ سے۔ میرا مطلب ہے میرے فادر گلباز اسی سرکس میں کام کرتے تھے اور اسی میں ایک جھولے سے گر کر ان کا انتقال ہوگیا۔"

"ہاں ہاں...... ظاہر ہے۔ تم لوگوں کی زندگی دوسروں کو تماشے دکھاتے گزرتی ہے اور اس کے بعد کسی دن تم یہیں حادثے کا شکار ہو جاتے ہو۔"

"پاپا! ہمارے لئے کچھ منگوایئے۔" تانیہ نے گھبرا کر کہا۔ باپ کی باتوں کو وہ اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں ضرور۔ ویٹر! دیکھو، یہ لوگ جو کچھ بھی طلب کریں انہیں فراہم کرو۔ میرے حساب میں ڈال دو۔ اوکے تانیہ! تم میرا اسٹیٹس جانتی ہو۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہر کے متمول لوگ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی مجھے سرکس کے ایک آدمی کے ساتھ بیٹھے دیکھ لے تو یہی سوچ سکتا ہے کہ شاید میں کوئی سرکس کھولنا چاہتا ہوں۔"

منوچہر نے اپنے مذاق پر خود ہی ہنسنے کی کوشش کی اور اس کے بعد باہر نکل گیا۔ تانیہ نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے شہباز کو دیکھا۔ شہباز مسکرا رہا تھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر تانیہ کو ذرا سا اطمینان ہوا اور وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"پاپا کو کہیں مصروفیت ہوگی۔ وہ بہت بڑے کاروباری ہیں اور عام طور سے کاروباری مصروفیات میں رہتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی موجودگی بالکل اتفاقیہ تھی۔ لیکن اتنا میں جانتی ہوں کہ وہ کسی کام سے یہاں آئے ہوں گے اور کسی کے وقت پر نہ آنے سے بددل ہو کر چلے گئے۔ کافی پیتے ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کل تم ہمارے گھر آؤ گے۔ وقت کا تعین خود کر لو۔"

"ارے نہیں...... یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس اتنا کافی ہے۔ میں آپ کی فرمائش

یہاں تک آیا، میرا مطلب ہے ہم لوگ تو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ اس طرح کی ملاقاتیں بعض اوقات دل و دماغ کو پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہیں اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ...... کہ......" شہباز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"شہباز! کل آپ ضرور ہمارے لئے وقت نکالیں گے۔"

"تانیہ! کیوں ضد کر رہی ہیں آپ۔ آپ یقین کریں کہ جب تک سرکس یہاں ہے، ہم لوگ مل سکتے ہیں ایک دوسرے سے۔ لیکن اس کے بعد......"

"بعد میں جو کچھ ہوگا وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پلیز!" تانیہ کے لہجے میں ایک رونے جیسی کیفیت پیدا ہوگئی تو شہباز نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"جیسا آپ پسند کریں۔ میں آپ کے گھر بھی چلوں گا۔"

اور دوسرے دن تانیہ مقررہ وقت پر اسے لینے آگئی۔

"دوپہر کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر پر ہی کھائیں گے۔"

"کیا آپ نے اپنے ڈیڈی سے اس کا تذکرہ کر دیا ہے؟"

"ڈیڈی کے بارے میں، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ وہ کسی کاروباری اُلجھن کا شکار ہوں گے اور اسی کاروباری اُلجھن میں وہ نجانے کیا باتیں کہہ گئے۔ اصل میں یہ ان کی کمزوری ہے۔ جب کوئی ان سے وعدہ خلافی کرتا ہے اور انہیں کسی قسم کی مایوسی ہوتی ہے تو انہیں اپنے الفاظ پر کنٹرول نہیں رہتا۔ آیئے چلئے......"

راستے میں تانیہ نے اسے بتایا کہ اس کی ماں نہیں ہے۔ وہ لوگ ایرانی ہیں اور ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ گھر میں ملازم ہیں، تانیہ کی پھوپھو ہے اور اس کا باپ ہے۔ منوچہر کی طرف سے اسے ہر طرح کی آزادی ہے۔

بہرحال جس حسین کوٹھی میں شہباز، تانیہ کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر شہباز کو اپنا ماضی یاد آگیا۔ اپنے آپ سے محبت کرنے والے یاد آگئے۔ یہ گھر جہاں اس نے پہلی بار گھریلو زندگی دیکھی تھی۔ اسے اپنی اولاد سمجھنے والی عورت دنیا سے جا چکی تھی۔ شہباز بہت دیر تک ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اس نے تانیہ کی کوٹھی کی تعریف کی اور ہنس کر بولا۔

"ہم تو خانہ بدوش ہیں۔ کبھی کبھی ایسے گھر میں داخلے کا موقع مل جاتا ہے تو بڑا اچھا لگتا ہے ہمیں۔ ویسے ایک بات بتاؤں آپ کو تانیہ؟"

تانیہ نے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ضرور بتایئے۔ مجھے بھی آپ سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔''

''تانیہ! میرے والد بہت اچھے فنکار تھے۔ سرکس میں سب سے خطرناک کام وہی دکھایا کرتے تھے۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں سرکس میں کام نہ کروں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کام وہ سرکس میں دکھاتے ہیں وہ اس طرح زندگی اور موت کا کھیل ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو یہ کھیل کھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کہتے تھے کہ میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں تمہیں اس طرح جھولے پر چھلانگیں لگاتے ہوئے دیکھوں۔ بہرحال ان کی موت اسی کھیل میں واقع ہوئی۔ انہوں نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر بھیج دیا۔ سرکس جگہ جگہ جاتا تھا اور جب کبھی مجھے ان سے ملنا ہوتا تھا تو مجھے اطلاع مل جاتی تھی کہ سرکس آج کل کہاں لگا ہوا ہے۔ اگر فاصلے بہت دور کے ہوتے تو مجبوری ہوتی لیکن سرکس کبھی آس پاس لگتا تو پھر میں اپنے ماں باپ کے پاس وقت گزارنے چلا جاتا۔ بہرحال ان کی موت کے بعد میں نے سرکس کی زندگی اختیار کی۔''

''بڑی دلچسپ اور عجیب زندگی ہوتی ہوگی یہ۔''

''اسی بارے میں بتا رہا تھا میں کہ جب مجھے شہر بھیج دیا گیا تو تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ہوسٹل میں رہنا پڑا لیکن مجھے سرکس کی زندگی پسند تھی۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ڈیرے، تمبو، بانس، کھیل تماشے، لوگوں کی پسندیدگی یہ ساری چیزیں مجھے یاد آتی تھیں تو میں سوچتا تھا کہ میرے والد نے مجھے اس ماحول سے دور کر دیا ہے۔ حالانکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسی ماحول میں رہوں۔''

''ہاں...... ایسا ہوتا ہے۔ جسے جو کچھ نہیں ملتا، وہ اس کے لئے تڑپتا ہے۔ حالانکہ جو اسے ملا ہوا ہوتا ہے وہ بہت اچھا ہوتا ہے۔''

''ہاں...... ایسا ہی ہے۔''

بہرحال اس طرح وقت گزرتا رہا۔ وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور پھر اچانک ہی منوچہر ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔

''ارے گڈ گڈ گڈ...... بھئی بہت تیز رفتار ہو تم شہباز! حرکتیں تمہاری شہباز جیسی ہی ہیں۔ یعنی تیز رفتار پرندہ جو برق رفتاری سے اُڑتا ہے اور اپنے شکار پر جھپٹ پڑتا ہے۔ مگر

دوست! میری بیٹی کو تم شکار نہیں بنا سکو گے۔''

''کیا مطلب......؟'' شہباز حیرت سے بولا۔

''نہیں نہیں...... برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں۔ سیدھی سی بات ہے۔ میری بیٹی ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہے اور تم سرکس میں کام کرنے والے ایک معمولی سے مداری۔ ایک مداری اور شہزادی کا بھلا کیا گٹھ جوڑ؟''

''پاپا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' تانیہ چیخ کر بولی۔

''نہیں نہیں...... میں کوئی بری بات نہیں کہہ رہا۔ کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں تانیہ! جو انسان عارضی طور پر فراموش کر دیتا ہے۔ یہ تو ایک اچھا کام ہے کہ اسے یاد دلا دو کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ بیٹے! آپ سرکس میں کام کرنے والے ایک مداری ہیں۔ جھولے پر قلابازیاں کھاتے ہیں آپ بندروں کی طرح۔ اور لوگ انسانوں کو بندروں کی حرکتیں کرتا دیکھ کر ہنستے ہیں۔ انہیں داد دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس طرح باعزت ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ ایک تعلیم یافتہ ملازم چاہے وہ گورنمنٹ کا ہو یا پرائیویٹ، بہت عزت اور وقعت رکھتا ہے بجائے سرکس میں کام کرنے والے ایک مداری کے۔''

''ہاں...... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ خیر جناب! یہ تو اپنا اپنا ذوق ہے، اپنی اپنی پسند ہے۔ مس تانیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کا تعلق ایک شریف خاندان سے ہے۔ وہ اعلیٰ خون رکھتی ہیں۔ اصل میں اعلیٰ خون جو ہوتا ہے نا جناب! میری ناقص سی معلومات کے مطابق اعلیٰ ظرف بھی ہوتا ہے۔ اپنے گھر کے دروازوں کے اندر کسی کو ذلیل و خوار نہیں کیا جاتا اور خاص طور سے اس شکل میں جبکہ وہ کوئی حاجت مند نہ ہو اور آپ سے بھیک مانگنے نہ آیا ہو۔ مس تانیہ معصوم فطرت کی مالک ہیں۔ آپ یقین کیجئے، میں نے بہت منع کیا تھا انہیں۔ بہت سمجھایا تھا۔ لیکن یہ نہیں مانیں اور مجبور کر کے مجھے یہاں لے آئیں۔ میں جانتا ہوں جناب! کہ کسی دولت مند آدمی کے گھر کھانا وغیرہ کھانا بڑی بات ہوتی ہے۔ یہ لوگ چھوٹے دل کے مالک ہوتے ہیں اور ان میں ظرف بالکل نہیں ہوتا۔ آپ انہی میں سے ایک ہیں۔ لیکن بہرحال غلطی میری بھی ہے۔ میں اس غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے آپ سے

معذرت خواہ ہوں اور واپسی کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"ارے نہیں نہیں...... تانیہ نے تمہارے لئے کھانا پکوالیا ہوگا۔ کھانا کھاتے جاؤ۔ ورنہ کہو گے کہ میں نے تمہارے رزق پر ڈاکہ ڈال دیا۔ بھائی! سرکس کی کچی پکی کھاتے رہ رہتے ہوگے۔ آج کچھ ڈھنگ کا کھا پی لو۔ یاد رہے گا اور وقت پر کام آئے گا۔"

تانیہ پتھرا کر رہ گئی۔ منوچہر ہنستا ہوا باہر نکل گیا اور تانیہ سہمی ہوئی نگاہوں سے شہباز کو دیکھنے لگی۔ شہباز ہنستا ہوا بولا۔

"کوئی بات نہیں ہے مس تانیہ! آپ کو ذرہ برابر افسوس نہیں ہونا چاہئے۔ لوگوں کے خیالات کچھ اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہم کسی کی سوچ کو بدل تو نہیں سکتے نا۔ آپ یقین کریں، میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے۔ اصل میں پہلے میں نے کبھی کسی کی ایسی دعوت قبول بھی نہیں کی۔ اب انسان کو اپنے کئے ہوئے کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے نا۔ آپ یقین کیجئے مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ کے فادر کا اندازِ فکر یہ ہے۔ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ ممکن ہے وہ اس طرح سوچتے ہوں۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ مگر اجازت دیجئے۔ گھر کے مالک کی مرضی کے بغیر کسی کے گھر میں بیٹھے رہنا، کھانے پینے کی کوشش کرنا بالکل مناسب بات نہیں ہے۔ میں......"

"شہباز......"

"مس تانیہ! میں بہت خر دماغ ہوں۔ کسی پر الٹ جاتا ہوں تو پھر اسے قبر کی گہرائیوں میں بھی پناہ نہیں لینے دیتا۔ یہ شخص خوش نصیب ہے کہ آپ جیسی اچھی لڑکی کا باپ ہے جایئے، آپ کے صدقے میں، میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ورنہ اس قسم کی بکواس کرنے والے کو میں کم از کم اس قابل ضرور کر دیتا ہوں کہ دوبارہ وہ ایسی کوئی بکواس نہ کر سکے۔ اور اگر ایسی کسی بکواس کے لئے کبھی سوچے تو اسے اپنا ماضی یاد آ جائے۔"

شہباز پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا اور تانیہ کے گھر کے دروازے سے نکل کر اس نے زور سے اس کی کوٹھی کی طرف رخ کر کے تھوکا اور وہاں سے واپس اپنے سرکس میں لوٹ آیا۔ اس رات اس نے جس دیوانگی کے انداز میں اپنے کرتب اور اپنے کمال دکھائے، انہیں دیکھ کر فیض شاہ اور شبیلہ بری طرح سہم گئے۔ وہ اس قدر بے جگری اور خوفی سے اپنا ہر کھیل دکھا رہا تھا کہ دیکھنے والے دہشت سے سکتہ کر رہ جائیں۔ ایسا خونی

کھیل بھلا کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔ لوگ عش عش کر رہے تھے۔ ہر طرف تالیاں بج رہی تھیں۔ لیکن شہباز ان تمام چیزوں سے بے نیاز اپنے جنون میں مبتلا نظر آتا تھا۔

راجہ سرکار اور دلبر سرکار بھی اسے دیکھ کر سہمے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کر رہے تھے۔ ادھر شبیلہ پتھرائی ہوئی سی بیٹھی تھی اور بیٹے کے تیور دیکھ رہی تھی۔ فیض شاہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور شبیلہ چونک پڑی۔

"کیا بات ہے شبیلہ؟ یہ تمہارا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے؟"

"آپ...... آپ اسے دیکھ رہے ہیں...... اسے دیکھ رہے ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے اسے؟"

"زخمی ہو گیا ہے۔ کوئی زخم لگ گیا ہے۔ میرا تجربہ اس کے جنون کے بارے میں یہی کہتا ہے۔ کہیں سے چوٹ لگ گئی ہے اسے۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں...... اس چوٹ نے اسے مشتعل ضرور کر دیا ہے لیکن اس کے ہوش و حواس قائم ہیں۔ میں اپنے تجربے کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

"ماضی یاد آ رہا ہے مجھے۔ اس کا باپ بھی اسی طرح......"

"تمہیں خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔" فیض شاہ بھاری آواز میں بولا اور شہباز کے کرتب دیکھنے لگا۔ شہباز عالمِ جنون میں اتنی بے جگری سے اپنا ہر کھیل دکھا رہا تھا کہ تماشائی چیخ چیخ پڑتے تھے۔ اور سب کے سب دم روکے ہوئے یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ انہی میں وہ دو افراد بھی تھے۔ جن میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ مرد ایک شاندار صحت کا مالک غیر ملکی تھا۔ پتہ نہیں اس کا تعلق کون سے ملک سے تھا۔ اور عورت اس کی عمر سے مطابقت رکھتی تھی۔ غالباً یہ اس کی بیوی ہوگی۔

"تم دیکھ رہی ہو نیلسینا!" مرد نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔

"مائی گاڈ! یہ کوئی خلائی مخلوق ہے۔ مجھے تو یہ انسان نہیں معلوم ہوتا۔"

"وہ نہیں سوچ رہیں تم جو میں سوچ رہا ہوں۔" مرد نے کہا۔

"کیا جیفرے! میرا ذہن تو اس کی اس کیفیت میں الجھا ہوا ہے۔ وہ...... اُف میرے خدا...... میرے خدا...... ذرا دیکھو۔" جیفرے کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ نیلسینا

نے اسے دیکھا اور بولی۔

’’ارے...... یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’نیلسینا! میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اور جو سوچ رہا ہوں...... آہ...... کیا واقعی...... کیا واقعی......؟‘‘ یہ کہہ کر جیفرے خاموش ہو گیا۔ نیلسینا سر جھکائے ہوئے تھی اور جیفرے کی آنکھیں غالباً ماضی کے کسی جزیرے پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ برفباری کے اس موسم کو دیکھ رہا تھا جب نہ رکنے والی برفباری ہر طرف جاری تھی اور زمین پر برف کی سفید چادر بچھ گئی تھی۔ وہ اسی دور کی بات ہے۔ ہر طرف برفباری کے موسم میں کیفیتیں عجیب سی ہو جاتی ہیں۔ وہ شخص غالباً مقامی محافظ تھا۔ حکومت پلاسکو کا ایک سکیورٹی آفیسر جو اس علاقے میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ برفباری کے اس موسم میں بدن کچھ سستی کا شکار ہو گیا تھا لیکن وہ ان حالات میں بھی مطمئن تھا۔ اس وقت وہ کنٹرول روم میں بیٹھا اندر کی گرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن ذمے داریوں کے احساس نے اسے مستعدی بخش دی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے کنٹرول روم سے باہر آیا۔ باہر شدید سردی تھی جس نے اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دی۔ لیکن ذمے داری، ذمے داری ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ بدن تھرتھری کا شکار تھا لیکن وہ اس سردی کو اپنے وجود پر مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تب اس کی نگاہیں بہت دور پہاڑی کی جانب اٹھ گئیں جہاں اسے چند سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ اسے اپنا واہمہ سمجھنے لگا۔ لیکن ڈیوٹی اسی کو کہتے ہیں۔ ہر وہم کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنے کا ہی نام مستعدی ہے۔ وہ پھرتی سے واپس کنٹرول روم میں داخل ہو گیا اور اس نے اندھیرے میں لگانے والی عینک اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں پر لگا کر جلدی سے باہر آ گیا۔ ساتھ ہی اس نے دوربین بھی اٹھالی تھی اور اس کے بعد ان دونوں چیزوں کی مدد سے اس نے ایک بار پھر اس پہاڑی کی جانب دیکھا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ سائے اب صاف نظر آنے لگے تھے۔

بہت دور ساحل پر لمبی لمبی کشتیاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔ دوربین کے زاویے تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اصل میں صورتحال کچھ ایسی تھی۔ اس وقت مستعدی اور چستی ہی دشمن کے خلاف ایک بہترین عمل ثابت ہو سکتی تھی۔ جہاں بھی مار کھائی، سمجھو نقصان ہی نقصان۔

تھوڑے فاصلے پر چند کشتیاں گہرے پانی کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنی سماعت پر غور کرنے لگا۔ پتہ نہیں ان کشتیوں سے کوئی آواز کیوں نہیں پیدا ہو رہی۔ پھر چند لمحے سکوت کے عالم میں گزر گئے۔ اور اچانک ہی اس کی نگاہوں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے پانی میں ہلچل مچتے ہوئے دیکھی تھی اور پھر اس نے ایک دیو قامت آبدوز کو پانی میں ابھرتے ہوئے دیکھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی طلسمی رات ہو اور طلسمی مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے نمایاں ہوتے جا رہے ہوں۔ بڑے سنسنی خیز حالات میں زندگی گزر رہی تھی۔ اس وقت حکومت پلاسکو اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہی تھی۔ ڈیولینڈ حیرت انگیز طور پر ان پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور حالات کچھ اس طرح کے نظر آ رہے تھے کہ اگر ذرا بھی کہیں لغزش ہوئی تو ڈیولینڈ، پلاسکو کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دے گا۔

جنگ صرف ڈیولینڈ اور پلاسکو کے درمیان ہی محدود نہیں رہی تھی بلکہ اب اس کے شعلے ہلیسونا اور لائیٹن تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے علاوہ میلیکو بھی لپیٹ میں آ گیا تھا اور ڈیولینڈ کی فوجیں میلیکو کے علاقے پیریسکی کو روندتی ہوئی آگے تک پہنچ گئی تھیں۔ لائیٹن کا ساحلی علاقہ اپنی فولاد اور ابرک کی کانوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور تھا۔ چنانچہ ڈیولینڈ کے قبضے کے بعد یہاں کی کانوں سے خام مال نکال کر فوراً ہی اسلحہ سازی کے کارخانوں میں پہنچایا جانے لگا تھا تاکہ ڈیولینڈ کے اسلحے کی سپلائی میں کمی نہ آئے۔

جنگ کا آغاز پلاسکو سے ہوا تھا لیکن فطری طور پر یہ جنگ ہیلسونا، لائیٹن اور میلیکو تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ جنگ کی بڑھتی ہوئی آگ کو روکنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا گیا تھا اور یہ طے کیا گیا تھا کہ میلیکو کی ان کانوں کو تباہ کر دیا جائے تاکہ ڈیولینڈ کے اسلحے کی سپلائی میں خلل واقع ہو اور وہ دوسرے ممالک تک طوفانی پیش قدمی جاری نہ رکھ سکے۔ اس وقت ڈیولینڈ کے خلاف یہ مشترکہ محاذ ایک بڑی حیثیت رکھتا تھا۔

چنانچہ اس آپریشن کو انتہائی خفیہ طور پر منصوبہ بندی کے بعد شروع کر دیا۔ میلیکو میں خاص علاقہ جیسے پیریسکی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا بڑی مشہور حیثیت کا حامل تھا اور میلیکو کے اس خصوصی علاقے میں پیریسکی کا یہ علاقہ دقرتی پہاڑی کا علاقہ تھا اور سمندر کے کنارے واقع تھا۔ اس کی زیادہ تر آبادی مچھیروں یا پھر کانوں میں کام کرنے والوں پر

مشتمل تھی۔ ان کئی ممالک کی منصوبہ بندی کے اوقات میں ان کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا تھا اور یہ طے کیا گیا تھا کہ فوراً آپریشن میلیکو شروع کر دیا جائے تاکہ ڈیولینڈ کی قوت کو توڑا جا سکے۔

پیریسکی کا واحد پورٹ جسے کسی سمندری اڈے کی بجائے ایک گھاٹ کہنا مناسب ہوگا، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان کٹی پھٹی خلیج کی شکل میں تھا۔ یہ پہاڑیاں دور تک سمندر میں چلی گئی تھیں اور ان پہاڑیوں کے درمیان بڑا سا گھاٹ بڑا خوبصورت نظر آتا تھا۔ ڈیولینڈ کے فوجیوں نے ان پہاڑیوں کے اوپر ایسے حساس آلات لگا دیئے تھے جن سے وہ دشمن کی ہر فضائی کارروائی سے آگاہ ہو جائے۔ ان کے کنٹرول روم پر ہر وقت مسلح پہرہ لگا رہتا تھا۔ یہاں ایک ٹیلی فون بھی تھا جس کا رابطہ قصبے کے کمانڈر سے تھا۔ کسی بھی خطرے کے پیش نظر فوجیوں کو ہوشیار کرنا ضروری ہوتا تھا۔ ڈیولینڈ کے اس علاقے پر قبضے سے پہلے پیریسکی کا یہ انتہائی حسین علاقہ رومان پسند جوڑوں کے لئے جنت کی حیثیت رکھتا تھا۔ سمندر میں دور تک چلی جانے والی پہاڑیاں سبزے سے لدی ہوئی تھیں اور اس کے درمیان ایسے قدرتی خوبصورت پھولوں کا جھمگٹا تھا جو دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائے جاتے تھے۔

جو نوجوان آفیسر یہاں تعینات کیا گیا تھا وہ انتہائی ذمے دار اور مستعد آدمی تھا۔ ابتدائی چاند کی ان تاریخوں میں وہ یہاں اس سرد ترین ماحول میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ یہ اس کی خوبی تھی کہ اپنی ڈیوٹی کے درمیان وہ کبھی کنٹرول روم کے آلات کے پاس سے نہیں ہٹتا تھا۔ لیکن نجانے آج کیوں بے چینی اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی اور موسم بھی انتہائی سرد اور خوفناک تھا۔ نزلے کی شدت نے اس کے گلے اور سینے میں سخت تکلیف پیدا کر دی تھی۔ ناک مسلسل پانی بہنے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھی اور اس کے سر میں بھی شدید تکلیف تھی۔ اپنے طور پر اس نے اپنے آپ کو بہتر رکھنے کے لئے کارروائیاں کی تھیں اور کچھ ادویات استعمال کی تھیں لیکن تکلیف میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا درد نا قابل برداشت تھا اور وہ بار بار اندر سے باہر آ جاتا تھا اور اپنے آپ کو بہلانے کی مسلسل کوششوں میں مصروف تھا۔

کنٹرول روم پر پہرے کے بارے میں اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ کیونکہ مستعدی ہی زندگی

کی ضمانت ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنے فرض سے غافل ہو جاتے ہیں صحیح معنوں میں نقصان کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور ایسی کسی جگہ پر جس شخص کی تعیناتی کی جاتی ہے وہ کوئی غیر مستعد آدمی نہیں ہوتا۔ حالانکہ پیریسکی پر قبضے کے بعد یہاں ایسی کوئی کارروائی اب تک نہیں ہوئی تھی جو حکومت ڈیولینڈ کی نگاہوں میں پریشان کن ہوتی۔ لیکن اس وقت بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ابھی تک تو اس قصبے پر کوئی فضائی یا بحری حملہ نہیں کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پلاسکو ہی نہیں، ہیلسونا، لائیٹن اور میلیکو چار ملکوں کے اس اشتراک میں اس جگہ کو کوئی اہمیت نہ دی گئی ہو۔ لیکن آج جو کچھ اس نے وہاں دیکھا تھا اسے دیکھ کر وہ الجھ گیا تھا۔ نجانے کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے کچھ لمحوں کے بعد اسے اپنے نزلے کی تکلیف کا بھی احساس نہیں رہا اور وہ گھبرا کر دوبارہ کنٹرول روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ریسیونگ آپریٹ کا والیم کھولا۔ ادھر ہونے والی ہر آواز اس کے علم میں آنی چاہئے تھی لیکن نجانے کیا ہو گیا تھا۔ چٹانوں سے سمندری لہروں کے ٹکرانے کی آواز تو بے شک آ رہی تھی لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پتہ چل رہا تھا۔ اس نے والیم کم کیا اور بوکھلا کر اپنی گدی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے حیرت تھی کہ آلات نے کشتیوں اور آبدوزوں کی آواز نوٹ کیوں نہیں کی۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ اور اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ ڈیولینڈ کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ان چار ملکوں کی قیادت نے کوئی خوفناک منصوبہ بنایا ہے اور اس وقت اس آبدوز کی اس سمندر میں اچانک آمد یقینی طور پر کوئی بڑے خطرے کا اعلان کرنے والی ہے۔

اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں کے بعد الارم بجنے لگا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ کنٹرول روم میں تعینات ڈیولینڈ کے آفیسر ہیلس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس وقت تین کشتیاں گھاٹ پر آ چکی تھیں اور گہرے پانی میں آبدوز مکمل طور پر سطح آب پر ابھر آئی تھی۔ اس کے علاوہ چار کشتیاں مزید برق رفتاری سے کھاڑی کی طرف آ رہی تھیں اور ہر کشتی میں دس دس افراد سوار تھے جبکہ پانچ پانچ افراد انہیں چپوؤں سے چلا رہے تھے اور باقی کسی حکم کے منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔

ساحل سے تین میل دور گہرے سمندر میں دو جنگی جہاز کھڑے ہوئے تھے جو پلاسکو کی ملکیت تھے اور یہ کشتیاں انہی جہازوں سے اتاری گئی تھیں۔ آبدوز ان کشتیوں کی حفاظت

کر رہی تھی۔ پچھلی دو کشتیوں میں سرنگیں بچھانے والے جوانوں کا ایک دستہ تھا۔ اس دستے میں تین سپاہی اور ان کا افسر تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح یہ نوجوان بھی ٹامی گن ریوالور اور چاقوؤں اور دستی بموں سے لیس تھے۔ لیکن دوسرے ساتھیوں کی طرح ان کے پاس اسلحے کی بھرمار نہیں تھی۔ البتہ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھیلوں میں ڈائنامائیٹ اور ڈیٹونیٹر بھرے ہوئے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ ڈیولینڈ خاصے عرصے سے پلاسکو کے خلاف جنگی منصوبہ بندیاں کر رہا تھا۔ ایک مخصوص علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے اس نے بہت عرصے سے بین الاقوامی پیمانے پر چکر چلا رکھا تھا اور ان کوششوں میں مصروف تھا کہ جس طرح ممکن ہو سکے، سیاسی اُکھاڑ پچھاڑ کے ذریعے پلاسکو سے منسلک اس علاقے پر اپنا قبضہ جمائے۔ اس علاقے میں یورینیم کی کانیں بکھری ہوئی تھیں جن کا کچھ تھوڑا سا حصہ ڈیولینڈ کے قبضے میں آتا تھا۔ لیکن وہاں سے بات نہیں بنتی تھی۔ چونکہ سرحدی پیمانے پر دونوں ملکوں کے درمیان شدید جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں اور ان کانوں پر کام کرنے کا موقع نہ حکومت ڈیولینڈ کو مل سکا تھا اور نہ ہی پلاسکو کو۔ چنانچہ یہ چپقلش اب فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔ ڈیولینڈ نے زبردست جنگی تیاریاں کیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ حکومت پلاسکو کو ٹریپ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن حکومت پلاسکو نے اپنی جغرافیائی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر ذہانت کے ساتھ اس جنگ کو صرف اپنے اور ڈیولینڈ کے درمیان ہی محدود نہ رہنے دیا بلکہ اس نے ہیلسونا، لائیٹن اور میلیکو کو بھی اس میں ملوث کر لیا اور اس کے بعد ڈیولینڈ کو اچانک ہی ان تمام ملکوں سے نبرد آزمائی کرنی پڑی۔ لیکن چونکہ اس کی جنگی قوتیں بے پناہ تھیں اور اس کی منصوبہ بندیوں میں یہ بات شامل تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکا، حکومت پلاسکو کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ جمائے گا۔ لیکن اب اسے دانتوں پسینہ آ رہا تھا۔

کچھ وقفے کے بعد کشتیاں قصبے کی کھاڑی میں داخل ہو گئیں۔ لیکن دشمن بھی غیر مستعد نہیں تھا۔ اس علاقہ پر قبضہ کا مطلب یہ تھا کہ جگہ جگہ مستعدی سے ڈیوٹیاں سرانجام دی جا رہی تھیں ابھی یہ کشتیاں گھاٹ سے کچھ فاصلے پر تھیں کہ اچانک پورا گھاٹ روشنی میں نہا گیا۔ گھاٹ کے کنارے پر ایک بلند جگہ لگی ہوئی سرچ لائٹ اچانک روشن ہوئی تھی اور اب اسے گھما کر کھاڑی کے اس حصے کی طرف کیا جا رہا تھا جو سمندر سے جا ملتا تھا۔ سرچ لائٹ کا

وسیع و عریض روشن دائرہ حرکت کرتا ہوا آنے والی کشتیوں پر مرکوز ہو گیا۔ فوراً ہی کشتیوں کی طرف سے کئی شعلے سرچ لائٹ کی طرف لپکے اور جواب میں دوسری طرف سے بھی فائر ہوا۔ سب سے اگلی کشتی میں سے ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر ایک زوردار چھناکے کے ساتھ گھاٹ پر مکمل تاریکی کا راج ہو گیا۔ کشتی کی طرف سے سرچ لائٹ کو نشانہ بنا لیا گیا تھا اور وہ روشنی ختم کر دی گئی تھی جس نے کشتی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک بار پھر ماحول گہری تاریکی میں ڈوب گیا اور اس گہری تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگلی تین کشتیاں گھاٹ پر جا لگیں۔

اس دوران آبدوز دوبارہ پانی کے اندر بیٹھ چکی تھی۔ لکڑی کی گھاٹ پر رکنے والی کشتیوں میں سوار جوانوں نے برق رفتاری سے کود کر پوزیشن لی اور گھاٹ کے چاروں طرف پھیل گئے۔ پہاڑی کے اوپر سے کسی ڈیولینڈ کی چوکی نے مارٹر کا فائر کھول دیا اور اگلے ہی لمحے ایک خالی کشتی دھماکے سے فضا میں اُڑ گئی۔ اور پھر اس کے تختے ٹکڑوں کی شکل میں پانی پر گرنے لگے۔ لیکن پیچھے والی چاروں کشتیوں سے مارٹر کا جواب مارٹر سے دیا گیا اور بزوکہ رائفل سے فائر ہونے لگے۔ پہاڑی پر بنی ہوئی چوکی جس کے چاروں طرف ریت کی بوریاں جمع تھیں، ایک دھماکے سے اُڑ گئیں۔ رات کا گہرا سناٹا مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ اور دوسرے اسلحے کی آوازوں سے بری طرح زخمی ہو گیا اور ماحول میں ایک عجیب طرح کی دہشت چھا گئی۔ تیز رفتار فائر جب ذرا ہلکا ہوا تو پیچھے کھڑی ہوئی کشتیوں میں حرکت ہوئی اور وہ گھاٹ کی جانب چل پڑیں۔

تقریباً دس منٹ کے بعد ایک چھاپہ مار پانی میں اترا اور تیرتا ہوا گھاٹ کے شمالی سرے پر موجود کشتیوں کے پاس جا پہنچا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''ہیلو...... ہیلو...... کیپٹن سولڈر کہاں ہے؟...... کیپٹن سولڈر! میجر نے پوچھا ہے کہ کیا آپ اور آپ کے ساتھی قصبے کے شمالی حصے میں داخل ہو کر منصوبے کے متعلق کارروائی کرنے کے لئے تیار ہیں؟''

''ہاں...... ہم تیار ہیں۔'' لائیٹن کے ایک قابل فخر آفیسر نے مستعدی سے اپنے منصب کی تکمیل کرنے کے لئے آمادگی کا اظہار کیا اور پھر گھوم کر ایک طرف رخ کرتا ہوا بولا۔

''میجر جیفرے! آپ اس سلسلے میں کوئی اور تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں؟ حالات آپ

دیکھ رہے ہیں۔ آپ اور آپ کے دونوں ساتھی گورڈن اور شیفر! آپ لوگوں نے یہ پیغام سن لیا ہے نا؟ ہمیں اپنی حفاظت اب خود کرنی پڑے گی۔ کیونکہ آبدوز اوپر آ کر ہمیں سپورٹ نہیں دے سکے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میجر جیفرے نے جواب دیا جو پلاسکو کا قد آور باشندہ تھا اور اپنے ساتھ اتنے بیش بہا کارناموں کی فہرست رکھتا تھا کہ ہر فوجی اس کی عزت کرنے پر مجبور تھا۔

”ٹھیک ہے...... تو پھر پلیز آیئے۔“ لائیٹن کے باشندے سولڈر نے جو اس وقت اس مشن میں ایک نمایاں کردار ادا کر رہا تھا کہا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ ایک بار پھر سرگوشی کے انداز میں اس کی آواز ابھری۔

”آپ کو احتیاط سے ایک دوسرے کو فالو کرنا ہے۔ یہ خیال رہے کہ کسی کو اگر دشمن کی گولی لگ جائے تو دوسرا رُکے گا نہیں۔ اس منصوبے کی کامیابی کے لئے ہمیں سخت دل ہونا پڑے گا۔“

”او کے......“ جیفرے کی جھٹکے دار آواز ابھری اور اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ چاروں پانی میں تیرتے ہوئے پہاڑی کے سرے پر پہنچ گئے اور پھر انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنے اس مرحلے کی تکمیل کرتے ہوئے خشکی پر آ کر شمال کی طرف سے قصبے کی جانب چل پڑے۔

انہوں نے اپنے انداز کو انتہائی محتاط رکھا تھا اور پانی سے نکلتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کسی بھی لمحے تاریکی میں چلائی ہوئی گولی ان کا کام تمام کر سکتی ہے۔ غالباً ان کی یہ شاندار احتیاط ان کی معاون ثابت ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ قصبے میں داخل ہو گئے۔ قصبہ مکمل گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن یہ صرف ان کا خیال تھا۔ گھبرائے ہوئے ڈیولینڈی فوجیوں کی آوازیں اور ان کے بوٹوں کی تسلسل سے دوڑنے کی آوازیں مسلسل رہی تھیں۔ وہ گھاٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس وقت قصبے کی تمام سڑکیں اور گلیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور ڈیولینڈی فوجیوں کے بھاگنے سے برف ان کے قدموں تلے آ کر چرمراہٹ کی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ کیپٹن سولڈر اپنے ساتھیوں کے ساتھ قصبے کی گلیوں میں کسی سانپ کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی انتہائی مستعد تھے اور چوکنے چیتوں کی طرح ہر طرف کی آہٹیں لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کیونکہ یہ علاقہ

خاص طور سے ابرک کی کانوں کی وجہ سے اہمیت کا حامل تھا۔

چنانچہ اس کے بارے میں ان لوگوں کو معلومات حاصل تھیں اور بریفنگ کرتے ہوئے اس قصبے کے گلی کوچوں کی واضح تصویریں انہیں دکھائی گئی تھیں۔ ان تصویروں کی مدد سے قصبے کا ایک ماڈل بھی تیار کیا گیا تھا اور پھر اس ماڈل کے ذریعے قصبے کی ایک ایک گلی اور عمارت سے چھاپہ ماروں کو روشناس کرایا گیا تھا۔ چنانچہ اپنا کام کرتے ہوئے انہیں ذرا بھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد چاروں کمانڈوز ابرک کی کان کے وائینڈنگ گیئر کے پاس پہنچ گئے۔ کان کے قرب و جوار میں بنی ہوئی عمارتیں مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں البتہ کبھی کبھی گھاٹ کی طرف سے فائرنگ کی ہلکی آواز ضرور آ رہی تھی۔ کان میں مسلسل کام ہو رہا تھا لیکن اس وقت یہ کام بند ہو چکا تھا۔ وہ کان کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے ذمے الگ الگ کام تھے۔ میجر جیفرے کے ذمے بوائلر ہاؤس تباہ کرنے کا کام تھا۔ وہ مستعدی سے اپنے کام کے لئے آگے بڑھا۔ پہرے دار غالباً اس وقت بوائلر ہاؤس میں موجود تھا لیکن باہر پڑنے والی سردی اتنی شدید تھی کہ وہ ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔

میجر جیفرے نے بوائلر ہاؤس کے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ اندر سے بوائلر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہینڈل آہستہ آہستہ گھوم گیا۔ جیفرے نے بڑی مہارت کے ساتھ دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ وہ پھرتی سے اندر داخل ہوا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لئے اس کی ٹامی گن تیار تھی۔ اور پھر فوراً ہی اس کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو دائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑا تولیے سے اپنا منہ اور گردن صاف کر رہا تھا۔ لیکن جیفرے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ نہ وہ پہرے دار تھا اور نہ کان کن۔ اس شخص نے بہت عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ گلے میں قیمتی ٹائی نظر آ رہی تھی۔ بہرحال صورتحال ایسی تھی کہ اس کے سامنے جائے بغیر کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ چنانچہ میجر جیفرے آگے بڑھا اور سخت لہجے میں بولا۔

”چلو...... اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لو۔“

اس شخص کی جو حالت ہونی چاہئے تھی، وہی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے

سامنے سیاہ ہیلمٹ اور پلاسکو کی فوجی وردی پہنے کھڑا ہے۔ اس نے اچانک ہی اپنا انداز بدل لیا اور مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔

"ہیلو...... اگر تم مجھے دشمن سمجھتے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ میں اس کان کا چیف سپروائزر ہوں اور شاید تمہیں اس کے بارے میں بتا دیا گیا ہو کہ میں وہ واحد شخصیت ہوں جو یہاں رہ کر میلیکو سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہوں۔ اور یہ مشورہ میں نے ہی حکومت پلاسکو کو دیا تھا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے اس کان کو تباہ کر دے۔ مائی ڈیئر! مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا کوئی افسر اعلیٰ یہاں موجود ہے یا پھر...... تم خود اس بات کو جانتے ہو کہ اٹیلٹ نامی کسی شخص سے تمہیں رابطہ کرنا ہے۔"

میجر جیفرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس بے چارے نے اپنی زندگی بچانے کے لئے ایک فوری عمل کا آغاز کیا تھا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے میجر جیفرے کو دیکھ رہا تھا۔

میجر جیفرے ہنستا ہوا بولا۔

"تمہاری کہانی بڑی کچی ہے دوست۔"

"نہیں...... میں نے تم سے اسی لئے سوال کیا کہ کیا تمہارا کوئی افسر اعلیٰ یہاں موجود ہے؟ اگر ہے تو تم میری بات کی تصدیق اس سے کر سکتے ہو۔ یا اگر اس کے علم میں بھی نہیں ہے تو میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں اسے اپنے بارے میں ضرور مطمئن کر دوں گا۔"

"کیا تمہارے پاس تمہارا شناختی کارڈ ہے؟"

"ہاں ہے...... لیکن ڈیولینڈ کی جانب سے پلاسکو، ہیلسونا، لائیٹن یا میلیکو کی طرف سے ایسا کوئی کارڈ میرے پاس موجود نہیں ہے۔"

"ہوں...... چلو ٹھیک ہے۔ اگر تم سچ بھی کہہ رہے ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ہمارے ساتھ وائینڈنگ گیئر اور انجن ہاؤس میں مصروف ہیں۔ تم اگر میرے ساتھ اس کام میں تعاون کرو گے تو ہم تمہارے بارے میں ضرور سوچیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"میری جان! میں اگر کوئی کام کر سکتا ہوں تو تمہارے لئے حاضر ہوں۔ لیکن یہاں آخر کام کیا کرنا ہے؟"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ فی الحال میں یہ کام کئے دیتا ہوں کہ تمہیں باندھ دوں۔ دیکھو اگر تم واقعی حکومت میلیکو سے رابطہ قائم کر چکے ہو اور پلاسکو کو یہ منصوبہ دے چکے ہو تب بھی

مجھے یا میرے کسی ساتھی افسر کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا کہ یہاں میری ملاقات تم سے ہو سکتی ہے اور تم ہمارے مددگار ہو سکتے ہو۔ اس لئے تم میری اس کوشش کا برا مت ماننا۔ کیا کہتے ہو۔"

"نہیں...... بالکل ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کرتا۔" اٹیلٹ نے سعادت مندی سے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

"ایسے نہیں۔ یوں کرو تم گھوم جاؤ۔ تاکہ میں تمہارے ہاتھ پشت پر باندھ سکوں۔" چالاک جیفرے نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوکے، اوکے...... ویسے تم یہاں کیسے پہنچے؟"

جیفرے ہنس کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ایک ڈوری کی مدد سے اس کے دونوں ہاتھ باندھے۔ وہ پھر بولا۔

"غالباً تم پیراشوٹ کے ذریعے قصبے میں پہنچے ہو۔" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"تم نے سنا نہیں کہ اب تک کیا ہو رہا ہے...... آدھے گھنٹے قبل ہم گھاٹ پر اترے تو زبردست فائرنگ ہوئی تھی۔"

جیفرے نے دیکھا اس شخص کا چہرہ مدھم پڑ گیا ہے۔ وہ افسوس بھرے انداز میں بولا۔

"آہ...... بوائلر ہاؤس کا دروازہ بند تھا اور اندر چار بوائلر چل رہے ہیں۔ ان کے شور میں باہر کی آواز سننا تقریباً ناممکن ہی ہے۔"

"ہوں......" جیفرے نے اسے باندھ لیا۔ پھر دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا تو چھوٹے اسلحے سے پیدا ہونے والی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد تھوڑا سا اور آگے بڑھ کر اس نے گھاٹ کی طرف دیکھا تو وہاں تاریک فضا میں سرخ لکیریں اِدھر سے اُدھر آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گردن ہلائی۔ گویا ابھی تک زبردست فائرنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ اچانک ہی وہ پلٹ کر اٹیلٹ سے بولا۔

"اگر تم واقعی ہمارے لئے کام کر رہے ہو اور تمہیں ہمارا ہی انتظار تھا تو خاموشی سے یہاں کھڑے رہو۔ کوئی حرکت کی تو نقصان اٹھانے والے بھی تم ہی ہو گے۔" یہ کہہ کر جیفرے دوبارہ بوائلر ہاؤس میں داخل ہو گیا۔ اس نے نچلی بھٹیوں کے دروازے کھول دیئے۔ ہوا لگنے سے شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے اور پورے بوائلر ہاؤس میں تیز اور چمکدار

روشنی ہوگئی۔ جیفرے برق رفتاری سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ حالانکہ اس وقت سردی اچھی خاصی تھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب وہ پہلے بوائلر کے سیفٹی وائینڈنگ پر طاقتور ڈائنا مائیٹ ڈال رہا تھا تو اس کا بدن پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے ایک سے دوسرے اور پھر تیسرے سے چوتھے بوائلر پر ڈائنا مائیٹ باندھ کر اس کام سے فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ پہلے بوائلر کے قریب پہنچا اور اس نے چاروں ڈائنا مائیٹوں کے فیوز روشن کر دیئے۔ یہ تمام ڈائنا مائیٹ اسٹاک واچ سے منسلک تھے تاکہ چاروں ہی ایک ساتھ خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹ جائیں۔ اس سب سے مشکل کام کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے بوائلر کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں کوئلے کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ یہ کوئلہ بوائلروں کو روشن کرنے کے کام آتا تھا۔ آخر کار وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کا ساتھی گورڈن اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔

”جلدی کرو......“ اس نے جیفرے کو دیکھتے ہی کہا۔

”کیوں خیریت؟“

”آوازیں نہیں سن رہے۔ وہ لوگ اس طرف بھی آ رہے ہیں۔“

”ابھی انتظار کرنا ہے۔ کیونکہ کسی بھی لمحے بوائلر بھک سے اڑنے والا ہے۔ فکر مت کرو۔ اگر وہ لوگ یہاں پہنچے تو ان کا بھی برا ہی حشر ہوگا۔“

”اور ہمارا......؟“ گورڈن نے کہا۔ ابھی جیفرے نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ اچانک رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی جس کی آواز سنتے ہی جیفرے پھرتی کے ساتھ بوائلر ہاؤس میں داخل ہوگیا۔ اسی وقت ایک فائر ہوا اور دروازے کے قریب ہی دیوار کا پلاسٹر اکھڑ گیا۔

جیفرے غیر ارادی طور پر اندر داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اچانک اسے بوائلر ہاؤس کے اوپر لگے ہوئے ڈائنا مائیٹس کا خیال آیا۔ اگر کہیں یہ ڈائنا مائیٹ پھٹ نہ سکے تو کیا ہوگا؟ دفعتہً ہی ایک آٹومیٹک مشین گن دھاڑی اور اس کے خیالات ادھر سے منتشر ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈیولینڈ کے گارڈز اندھا دھند دروازے پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ جیفرے اس فائرنگ کی زد میں آ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سر ٹانگوں میں چھپا لیا۔ لیکن خوش قسمتی سے گولیاں چند ہی لمحوں کے بعد چلنے بند ہو گئیں۔

جیفرے پھرتی سے کھڑا ہوا اور چاروں طرف دیکھنے کے بعد بوائلروں کی طرف دوڑا۔ پھر اس نے اپنے پیروں کی مدد سے اس کے دروازے بند کر دیئے۔ آخری دروازہ بند ہوتے ہی بوائلر ہاؤس میں تاریکی چھا گئی۔ البتہ ایک معمولی سا بلب روشنی کر رہا تھا۔ جیفرے کی گھڑی میں جو وقت ہو رہا تھا اسے دیکھ کر اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ منصوبے کے مطابق ڈائنا مائیٹ کے دھماکے میں صرف دو منٹ کا وقفہ تھا۔ اس نے ایک طرف چھلانگ لگائی اور کوئلے کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ کوئلے کے ڈھیر کے دوسری طرف ایک دروازہ تھا۔ یہ دروازہ کھل گیا تو آسانی سے باہر نکلا جا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے لکڑی کے دروازے کو کھولنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ باہر سے اسٹین گن چلنے کی دوبارہ آواز آئی اور پھر لگاتار فائرنگ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کہیں دو دستی بم پھٹنے کے دھماکے ہوئے اور جیفرے کو یہ اندازہ ہو گیا کہ باہر کا معرکہ خونریز ہوتا جا رہا ہے۔ ڈائنا مائیٹ کے دھماکوں میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ جیفرے پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ دروازہ ابھی تک کھلا نہیں تھا۔ وہ زور سے چیخا۔

”دروازہ کھولو......ڈائنا مائیٹ پھٹنے والے ہیں۔ توڑ دو اسے۔ توڑ دو۔“ لیکن ایسا کوئی عمل نہ ہوا۔ بلکہ کوئی مشین گن مسلسل چلتی رہی۔ اور پھر مختلف اسلحوں کے چلنے کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ جیسے جیفرے کے اندازے کے مطابق ڈیولینڈ کے کمانڈروں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس وقت جو مشترکہ جدوجہد ہوئی ہے وہ کس لئے ہے اور چاروں ملکوں کے مشترکہ کمانڈر کو اس قصبے میں کس چیز کی اہمیت کا احساس ہوا ہے۔ بس اسی خطرے کے پیش نظر ڈیولینڈ کے کمانڈر نے ایک فوجی دستہ بوائلر ہاؤس کی طرف بھیج دیا تھا لیکن اسے دیر ہو گئی تھی۔

دوسری طرف جیفرے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ جب بھی دروازہ کھولنے کے لئے طاقت صرف کرتا، کوئلے کا ڈھیر اس کے پیروں کے نیچے سے کھسکنے لگتا اور وہ دروازے کے پاس سے ہٹ جاتا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا فیوز جل چکے تھے اور شعلے تیزی سے ڈائنا مائیٹ سے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ڈائنا مائیٹ کا خیال آتے ہی جیفرے کے جسم میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح دروازے سے الجھ پڑا۔ اسی وقت ایک اعصاب شکن دھماکہ ہوا۔ دھماکے کی چمک

نے قصبے کے گوشے گوشے کو روشن کر دیا۔ جیفرے نے آنکھیں بند کر لیں اور چہرے کو اپنے سینے میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ تباہ شدہ بوائلر کی بھاپ ایک لمحے کے اندر اندر اسے کوئلے کی طرح جھلسا دے گی۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ بھاپ کی بجائے اسے اپنے قریب ہی ایک غراہٹ سنائی دی۔

''جیفرے! کہاں ہو تم؟ جیفرے! کہاں ہو تم؟'' اچانک بولنے والا چونک پڑا اس کی نظر جیفرے پر پڑ چکی تھی۔

''اوہ......شٹ۔ آؤ......ادھر آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔''

جیفرے نے چہرہ اٹھا کر دیکھا، ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا باہر آیا۔ باہر آ کر اس نے دیکھا جہاں وائینڈنگ گیئر تھا وہاں اب دھواں اور شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ جس دھماکے نے جیفرے کا خون خشک کر دیا وہ وائینڈنگ گیئر کے پھٹنے کی آواز تھی۔ گویا بوائلر ہاؤس ابھی تک محفوظ تھا لیکن کسی بھی لمحے پھٹنے والا تھا۔ اور وہی ہوا۔ اچانک ہی وہ خوفناک دھماکہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ اور بھی ہوا۔ کسی نے میجر جیفرے کا ہاتھ پکڑا اور ایک جانب دوڑنے لگا۔ جیفرے نے بمشکل تمام حواس سنبھال کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ کیپٹن سولڈر تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اس وقت کیپٹن سولڈر ہی اس کی جان بچانے کا باعث بنا تھا۔ فلک شگاف دھماکے کے فوراً بعد تین اور دھماکے ہوئے۔ کیپٹن سولڈر، میجر جیفرے کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ جیسے کسی انجانی طاقت نے انہیں فضا میں اُچھال دیا ہو۔

بوائلر ہاؤس کا ملبہ اُڑ اُڑ کر زمین پر بکھرتا رہا۔ اینٹیں، چھت کے ٹکڑے۔ بوائلر کی فولادی چادریں اُڑتی ہوئی نجانے کتنی کتنی دور جا کر گری تھیں۔ چاروں طرف سفید بھاپ کی چادر تن گئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا اور ملبے کے ٹکڑے فضا میں اس طرح پرواز کر رہے تھے جیسے پرندے ہوں۔ گھاٹ پر ابھی تک زور دار شور سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ساحل کے ساتھ بنے ہوئے چند مکانوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ پھر اچانک ہی فضا میں سرد روشنی کے گولے پھٹنے لگے اور ان کے ٹکڑے اپنی روشنی بکھیرتے ہوئے آہستہ آہستہ معدوم ہو گئے۔ انجن ہاؤس کے قریب ایک شکستہ

دیوار کی آڑ میں گورڈن اور شیفرڈ چھپے ہوئے تھے۔ پھر روشنی معدوم ہوتے ہی گورڈن نے شیفرڈ کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

''یہ واپسی کا سگنل ہے۔ آدھے گھنٹے تک ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کریں گے اور اگر اس دوران ہم کشتیوں تک نہ پہنچے تو وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

''ہاں......'' شیفرڈ نے اپنے لوہے کے ہیلمٹ کو تھوڑا سا اوپر اٹھاتے ہوئے سر کو کھجاتے ہوئے کہا، پھر متفکر لہجے میں بولا۔ ''لیکن جیفرے اور سولڈر کی خیریت کیسے معلوم ہو؟''

''ہمارے پاس ابھی کچھ وقت ہے۔ کیوں نہ ہم انہیں تلاش کریں۔'' گورڈن نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی سے برف کریدتے ہوئے کہا۔ دھوئیں اور گرد کی سفید چادر نے ماحول کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ دور دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ کہیں کشتیاں چل نہ پڑیں۔ منصوبہ یہی تھا کہ اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر ان میں سے کچھ لوگ ساحل پر نہ پہنچ سکے تو کشتیاں ساحل چھوڑ دیں گی۔

بہر حال یہ لوگ برق رفتاری سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہیں کیپٹن سولڈر اور جیفرے کا شدید احساس تھا۔ دونوں شاندار شخصیتوں کے مالک تھے۔ آخر کار یہ دونوں گھاٹ کی جانب جانے لگے۔ گھاٹ پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی اور مسلسل دھماکے ہوتے جا رہے تھے۔ اگلے چند منٹوں میں وہ لوگ پوزیشنیں بدلتے ہوئے کشتی میں پہنچ گئے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ کیپٹن سولڈر اور جیفرے لاپتہ ہیں لیکن مشن کامیاب ہو گیا ہے۔ چنانچہ فوجیوں کو پسپائی کا حکم دے دیا گیا اور سمندر کے سینے پر چھ کشتیاں تیزی کے ساتھ ساحل سے چل پڑیں۔ یہ آپریشن مکمل طور پر کامیاب ہو چکا تھا اور ڈیولینڈ کے لئے ابرک اور لوہے کی کانیں ناکارہ ہو چکی تھیں اور مشترکہ محاذ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

ادھر کیپٹن سولڈر اور میجر جیفرے اپنی زندگیوں کو بچانے کے مشن میں مصروف ہو گئے تھے۔ لیکن دھوئیں اور برف کی سفید چادر نے انہیں صحیح سمت کی طرف رخ نہیں کرنے دیا تھا۔ سبز گولوں کے بارے میں انہیں بھی علم تھا اور انہیں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کشتیاں اگر روانہ نہیں ہوئیں تو چند لمحوں میں روانہ ہونے والی ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ گھاٹ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ ایک شکستہ سی جھونپڑی انہیں نظر آئی۔

اس خوفناک جدوجہد کے بعد بدن اس طرح بے جان ہو رہے تھے کہ دل چاہتا تھا کہ جہاں اور جس حال میں بھی ہیں زمین بوس ہو جائیں۔ پہلے کیپٹن سولڈر زمین پر گرا اور پھر جیفرے اس کے اوپر۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوئی تھی اس وقت تک جب تک کہ سپیدۂ سحر نمودار نہ ہو گیا۔ گھاٹ پر رات میں قیامت ٹوٹنے کے آثار بخوبی نظر آ رہے تھے۔ اس خوفناک حملے سے ڈیولینڈیوں کو زبردست نقصان ہوا تھا۔ ساحل پر واقع اکثر مکانوں سے ابھی تک دھواں بلند ہو رہا تھا۔ ڈیولینڈ کے فوجی اپنے مُردہ اور زخمی سپاہیوں کو اٹھا رہے تھے جو رات کے خونریز معرکے میں کام آئے تھے۔

ادھر قصبے میں جہاں ابرک اور لوہے کی کانیں تھیں، وہاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رات بھر طیاروں نے خوفناک بمباری کی ہو۔ بوائلز ہاؤس، انجن روم اور وائنڈنگ گیئر کی عمارتوں کا ملبہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بوائلر ہاؤس کی شکستہ عمارت سے تقریباً دو سو فرلانگ دور ایک شکستہ جھونپڑی میں دو ایسے فوجی چھپے ہوئے ہیں جن کا اس مشن سے گہرا تعلق ہے اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ کیپٹن سولڈر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آہ...... کتنی قیامت خیز رات تھی۔'' میجر جیفرے نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دباتے ہوئے کہا۔

''یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے...... جیسے ہمارے جسم ہمارا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔''

''لیکن یہ کون سی جگہ ہے؟'' جیفرے نے دماغ پر چھائی ہوئی دُھند کو جھٹکا اور حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی کھوپڑی کو ٹٹولا، سر پر ایک چھوٹا سا اُبھار اُبھر آیا تھا اور اس کی اونی ٹوپی چپک کر رہ گئی تھی۔ فولادی ہیلمٹ قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ ہیلمٹ کے قریب ہی اس کی ٹامی گن اور دو دستی بم پڑے ہوئے تھے۔ کچھ اور فالتو اسلحہ بھی تھا۔ اس کے سر میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن بہرحال اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رینگتا ہوا جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس جھونپڑی نے واقعی رات کو زندگی بخش عمل کیا تھا۔ ورنہ شاید بے ہوشی کے عالم میں وہ برف ہی بن کر رہ جاتے۔ باہر آ کر اس نے برف کا گولا بنایا اور اسے چوسنے لگا۔ برف چوسنے سے زبان پر پیدا ہونے والی خشکی دور ہو گئی اور ایک فرحت بخش لطافت کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی چوٹ اور کنپٹی کے گرد بھی برف ملنا شروع کر دی۔ ایسا کرنے سے تکلیف کی شدت میں کمی واقع ہونے لگی تھی۔ اور پھر اس نے برف

کے گولے کیپٹن سولڈر کے قریب بڑھا دیئے۔ رات کے واقعات یاد آ رہے تھے۔ بوائلر ہاؤس کے حادثے اور بھاگنے کے تمام واقعات اسے یاد آتے رہے اور پھر یہ زندگی بخش جھونپڑی۔

پھر کچھ دیر کے بعد جب وہ دوبارہ باہر نکلا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بوائلر ہاؤس کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری لیکن یہ مسکراہٹ جلد ہی غائب ہو گئی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ڈیولینڈ کی فوجیں نقصان کا اندازہ لگانے کے لئے جائے وقوع پر پہنچ چکی ہیں اور وہ لوگ ملبے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یہ صرف اتفاق تھا کہ کسی نے بھی اس شکستہ جھونپڑی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ لوگ جھونپڑی میں چھپے بیٹھے رہے۔ باہر نکلنے کا تصور بھی موت کا دوسرا نام تھا۔

آخر تیسرے پہر ڈیولینڈیوں نے اپنا کام ختم کیا اور آہستہ آہستہ وہ لوگ وہاں سے جانے لگے۔ جھونپڑی نے اس وقت بھی ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ کیونکہ شاید کوئی اس طرف کا تصور بھی نہیں کر سکا تھا۔

اچانک ہی انہیں احساس ہوا کہ کوئی ادھر آ رہا ہے۔ چنانچہ دونوں سنبھل کر کھسکتے ہوئے جھونپڑی کی پچھلی دیوار سے جا لگے۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ کوئی آواز بلند نہ ہونے پائے۔ جھونپڑی کی لمبائی اور چوڑائی یکساں تھی اور اس کا دروازہ نجانے کب سے قبضے کے سہارے جھول رہا تھا۔

''پتہ نہیں کون ہے؟''

''شاید کوئی آوارہ کتا۔'' جیفرے نے اپنی ٹامی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''رُکو...... رُک جاؤ۔''

کچھ دیر کے بعد ایک مریل سا کتے کا پلّہ شکستہ جھونپڑی کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ دفعتہً اسے نجانے کیا ہو گیا کہ وہ جھونپڑی کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنے لگا۔ شاید اسے یہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ جیفرے اسے چمکارنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے کتا اس کے پچکارنے پر جھونپڑی کے اندر آ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ چوکھٹ پر آ کر ٹھہر گیا اور بھونکنے لگا۔ اچانک ہی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے جھونپڑی میں جھری تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ پتہ چلا سکیں کہ سیٹی بجانے والا کون ہے۔ انہیں جھری تلاش

کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی البتہ دروازے کے قریب ایک سایہ ضرور نظر آیا تھا۔ شاید یہ کتے کا مالک تھا۔ بمشکل تمام انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کوئی لڑکا ہے۔ اس کی پشت جھونپڑی کی طرف تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں تھے اور وہ کتے کے پلّے سے باتیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ پلّے نے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ بے حس و حرکت پڑے لڑکے کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ اگر لڑکا پلٹ کر جھونپڑی میں نگاہ ڈال لیتا تو با آسانی ان دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ جھکا۔ اس کی پشت جھونپڑی کے بالکل سامنے تھی۔ وہ اس وقت بھی کتے سے کھیل رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں سے باہر آ چکے تھے۔ اس نے ایک چھوٹا سا پیکٹ جھونپڑی میں اچھال دیا اور شائستہ زبان میں بولا۔

"میرے والد کو علم ہے کہ تم دونوں یہاں موجود ہو۔ انہوں نے یہ کھانا بھجوایا ہے۔ گو کھانا زیادہ نہیں ہے۔ جب اندھیرا پھیل جائے گا تو میں مزید کھانا لانے کی کوشش کروں گا۔" دونوں شدتِ حیرت سے منہ کھول کر رہ گئے تھے۔ یہ کون ہے؟ کس نے ان کے ساتھ یہ احسان کیا ہے؟ بہرحال اس بات کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ لڑکا اور کتا ان کی یہاں موجودگی سے واقف ہیں۔ بمشکل تمام کیپٹن سولڈر نے کہا۔

"کون ہو تم؟"

"سوری سر! میرا نام ایمرسن ہے اور میرے باپ کا نام اٹیلٹ۔ وہ ان کانوں کا جنرل سپروائزر ہے۔"

"اوہو...... پیارے بیٹے! ذرا مجھ سے بات کرو۔" میجر جیفرے کو اٹیلٹ یاد آ گیا تھا جس کے ساتھ اس نے بہت برا سلوک کیا تھا اور ایک طرح سے اسے موت کے حوالے ہی کر دیا تھا۔ لیکن اٹیلٹ نے درحقیقت بہت زبردست احسان کیا تھا۔ یہ بڑی بات تھی۔ کیپٹن سولڈر نے جیفرے سے کہا۔

"یہ اٹیلٹ کون ہے؟"

"وہ کانوں کا چیف سپروائزر ہے۔" پھر جیفرے نے لڑکے کی طرف رخ کر کے کہا۔ "رات کے حملے کے بارے میں تمہیں کچھ معلومات حاصل ہیں بیٹے! کیا ڈیولینڈ کے فوجی کافی تعداد میں ہلاک ہوئے ہیں؟"

"پتہ نہیں...... میں چل رہا ہوں۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد دوبارہ آؤں گا۔"

جیفرے نے وہ پیکٹ اٹھا لیا جو لڑکے نے اندر پھینکا تھا اور پھر اسے کھول کر دیکھا تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اس میں اُبلی ہوئی مچھلی کے دو قتلے، دو بسکٹ، دو ڈبل روٹی کے پیس اور دو اُبلے ہوئے انڈے تھے۔

"واہ...... اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس پیکٹ میں کیا ہے تو میں جواب دوں گا کیپٹن! کہ زندگی۔"

"ہاں...... لیکن اس کے ساتھ تمہیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ مقبوضہ علاقے کے لوگ کن مصائب کا شکار ہیں۔ اس لڑکے کی ماں نے ہمیں اپنی طرف سے شاندار کھانا بھجوایا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آج ان میں سے کوئی ضرور بھوکا رہ گیا ہوگا۔"

میجر جیفرے نے غمزدہ انداز میں گردن ہلائی اور پھر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ بہرحال اس کے بعد انہوں نے بقیہ دن وہیں گزارا تھا۔ سرچ لائٹ کے بجھنے کے بیس منٹ کے بعد وہ لڑکا دوبارہ واپس آیا۔ اس وقت وہ کتا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر اس نے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی اور قریب آ کر بولا۔

"میں سیٹی اس لئے بجاتا ہوں کہ کہیں آپ لوگ دھوکے میں مجھ پر گولی نہ چلا دیں۔"

"آہ...... پیارے بچے! تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کیا لائے ہو ہمارے لئے؟ غالباً یہ کافی ہے۔"

"ہاں...... یہ کافی میری ماں نے اس روز سے بچا رکھی تھی جس دن ڈیولینڈیوں نے یہاں قبضہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ کافی وہ اس دن بنائے گی جب ڈیولینڈ کے سپاہی اس سرزمین سے نکل جائیں گے۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ اب تم اس کافی کے حقدار ہو۔"

"خدا اسے خوش رکھے۔" کیپٹن سولڈر نے ڈھکن کھولتے ہوئے کہا۔

"بے حد خوشبودار کافی ہے۔ ہم تمہارے والدین کے شکر گزار ہیں۔ انہوں نے واقعی ان سنگین حالات میں ہم پر بہت احسان کیا ہے۔ کیوں جیفرے!"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں جناب!"

کافی پینے کے بعد انہیں تازگی اور چستی کا احساس ہونے لگا۔ اور پھر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کو گرم رکھنے کے لئے اسے کمبل کی کئی تہوں میں لپیٹ کر بھیجا گیا تھا۔ کھانے کے بعد کیپٹن سولڈر نے کہا۔

"ہاں پیارے بیٹے! یہ بتاؤ کہ تمہارے والد نے یہاں سے نکلنے کے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں...... آج ہمارے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔"

"کیا......؟"

"میرے پاپا کو ڈیولینڈیوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ جو سپاہی کل رات کان کی حفاظت کے لئے آئے تھے ان میں سے ایک زندہ بچ گیا تھا۔ ہوش میں آ کر اس نے بوائلر ہاؤس کے تباہ ہونے کی داستان سنائی۔ اس نے اپنے افسروں کو بتایا کہ دھماکے کے وقت میرے پاپا وہیں موجود تھے۔"

سولڈر اور جیفرے کے چہرے سخت پڑ گئے۔

"لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کانوں پر حملہ مشترکہ محاذ نے کیا ہے۔ ایک عام شہری کا اس میں کیا قصور۔"

"میرے پاپا کو مجرم قرار دیا جا چکا ہے۔ ڈیولینڈیوں کا کہنا ہے کہ کوئی چھاپہ مار کانوں تک نہیں پہنچ سکا۔ ان کو گھاٹ پر سے ہی پسپا کر دیا گیا تھا اور چونکہ بوائلر ہاؤس میں میرے پاپا موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بوائلر ہاؤس کو تباہ کرنے میں میرے پاپا کا ہاتھ ہے اس لئے ان کو پھانسی دی جائے۔ وہ انہیں سزائے موت دینے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"اوہ...... میرے خدا، یہ اتنے بڑے محاذ کا انتقام ایک نہتے شہری سے لے رہے ہیں۔"

"اس سپاہی نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ میرے پاپا نے ڈیولینڈ کے فوجیوں پر گولیاں چلائی تھیں۔" لڑکا باقاعدہ رونے لگا تھا۔

یہ الزام کیسے لگایا گیا ہے؟"

"اس سپاہی کا کہنا ہے کہ اس نے خود پاپا کو فوجیوں کا نشانہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔"

کیپٹن سولڈر بے چینی سے جھونپڑی کے اندر ٹہلنے لگا۔ جھونپڑی میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ لڑکے کی سسکیاں اُبھر جاتی تھیں۔ پھر لڑکے نے اچانک کہا۔

"آپ دونوں ہی انہیں یقین دلا سکتے ہیں کہ میرے پاپا بے گناہ ہیں۔ آپ فوجی

ہیں۔ وہ آپ کو سزائے موت نہیں دے سکتے۔ البتہ وہ آپ کو جنگی قیدی بنا لیں گے اور پھر جنگ ختم ہونے کے بعد آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن میرے باپ کو......" بچے نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ جھونپڑی میں کچھ اعصاب شکن خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ پھر کیپٹن سولڈر نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم کچھ دیر کے لئے جھونپڑی سے باہر چلے جاؤ۔"

لڑکا خاموشی سے اٹھا اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ سولڈر خاصا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہمارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو ہم خود کو ڈیولینڈ کے حوالے کر دیں یا پھر کوئی کشتی چرا کر رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کریں۔"

"مجھے آپ کے دوسرے خیال سے اتفاق ہے جناب! میں جنگی قیدی بننا پسند نہیں کروں گا۔"

"سوچ لو۔ ویسے بھی ہم چاروں طرف سے ڈیولینڈ کے فوجیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... میں جانتا ہوں کہ یہاں سے فرار میں بہت خطرہ ہے۔ لیکن ہم کوشش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔"

کیپٹن سولڈر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے جیفرے کی طرف دیکھا اور جیفرے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو دیکھ کر بولا۔

"کیا تم میرا امتحان لے رہے ہو جیفرے!"

"نہیں سر! میری یہ مجال نہیں۔"

"ہم ایک ایسے شخص کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے جس کی زندگی ہماری وجہ سے خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"اوکے سر!" اور اس کے بعد ایک گھنٹے تک وہ لڑکے سے مختلف انداز کے سوالات کرتے رہے کہ ڈیولینڈ کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟ وہاں پہرے داروں کی کیا پوزیشن ہے؟ ان کی ڈیوٹیاں کب تبدیل ہوتی ہیں؟ اور اٹیلٹ کو کہاں بند کیا گیا ہے؟ اور اس کے بعد لڑکا چلا گیا۔ اسے کچھ ہدایتیں کر دی گئی تھیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ واپس آیا اور اس نے بتایا

کہ اس کی ماں اپنے شوہر کی سلامتی کے لئے فرار پر آمادہ ہے۔ وہ دونوں لڑکے کے ساتھ قصبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ قصبے کی گلیاں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا کیونکہ رات کو بلیک آؤٹ رہتا تھا۔ جلدی وہ ایک ایسی گلی کے موڑ پر پہنچ گئے جو قصبے کی شاہراہ سے جا ملتی تھی۔ وہ دونوں چھاپہ مار وہاں رک گئے اور لڑکے کو انہوں نے کچھ ہدایات دے کر ایک جگہ چھوڑ دیا۔ ان کے تھیلوں میں اب بھی اسلحہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ انہوں نے اپنی ٹامی گن ایک دیوار کے ساتھ لگا دی۔

قصبے پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہولناک سناٹا تھا اور ہدایت کر دی گئی تھی کہ مغرب کے بعد کوئی بھی باہر نظر نہ آئے۔ بہرحال کسی آہٹ اور آمد کے بغیر کافی وقت گزر گیا۔ آخر وہ آواز سنائی دینے لگی جس کا وہ بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ سڑک پر جمی ہوئی برف بھاری بوٹوں سے چرمرانے لگی۔ آوازیں آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ جیفرے کسی چیتے کی طرح ہوشیار تھا۔ رات کے سناٹے میں برف چٹخنے کی آواز خاصی تیز تھی اور جیسے ہی وہ دونوں سپاہی گلی کی نکڑ پر پہنچے تو جیفرے اور سولڈر بجلی کی طرح کوندتے ہوئے ان پر لپکے اور چند ہی لمحوں کے بعد وہ دونوں سپاہی سولڈر اور جیفرے کے ہاتھوں میں مُردہ چھپکلی کی طرح جھول گئے۔ انہیں کھینچ کر گلی میں ڈال دیا گیا۔ پھر ان کے ہیلمٹ اور اسلحہ اتار کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر انہیں دو مختلف درزوں میں دھکیل دیا گیا۔

پانچ منٹ کے بعد وہ دونوں ان سپاہیوں کے لباس میں باہر نکلے۔ ان کے شانوں پر ٹامی گن لٹک رہی تھی۔ قصبے کی بڑی شاہراہ پر واقع ایک مکان جس میں چوبیس گھنٹے سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا، یہ مکان اٹیلٹ کا قید خانہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے قریب پہنچ گئے۔ دروازے پر متعین گارڈ سپاہیوں کو دیکھ کر اٹینشن ہو گیا۔ آنے والے سپاہی جونہی گارڈ کے قریب پہنچے، دفعتہً ہی سنتری کے ہیلمٹ نے اس کے سر سے پھسل کر اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ یہ ایک مخصوص داؤ تھا جو سولڈر اور جیفرے ہمیشہ استعمال کرتے تھے۔ اس طرح مقابل کے منہ سے آواز تک نہیں نکل پاتی تھی اور وہ قبضے میں آ جاتا تھا۔ چھاپہ ماروں کا مخصوص خنجر اب اس سنتری کی شہ رگ پر موجود تھا۔

''ہمیں اپنے کمانڈر کے پاس لے چلو۔'' سولڈر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور خنجر کو

ذرا سا دبایا۔ اس کی آواز سانپ کی پھنکار کی طرح تھی۔ گارڈ فوراً تیار ہو گیا۔

''اس کی رائفل لیتے آؤ۔'' جیفرے نے لڑکے سے کہا اور لڑکا رائفل سنبھال کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ سولڈر نے گارڈ کو ہلکا سا ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

''کمانڈر کے کمرے کی طرف چلو۔ وہ اندر موجود ہے نا؟'' اس کی سرگوشی میں بلا کی کاٹ تھی۔

''ہاں......'' سنتری نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ہال میں ایک زینہ اوپر کی طرف چلا گیا تھا جس پر ایک بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ خوفزدہ گارڈ نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی کی غراہٹ سنائی دی اور پھر اندر آنے کا حکم دے دیا گیا۔ خنجر کا دباؤ گارڈ کی کمر پر مسلسل بڑھ رہا تھا۔ گارڈ نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ جیفرے اور سولڈر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی جیفرے نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ کمرہ کافی روشن تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ موٹے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کا فرنیچر اگرچہ پرانی طرز کا تھا لیکن بہتر حالت میں ہونے کی وجہ سے خوشنما محسوس ہو رہا تھا۔

کمرے کی ایک جانب میز پڑی ہوئی تھی جس پر بچا کھچا کھانا پڑا ہوا تھا اور ڈیولینڈ کا کمانڈر کرسی پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ قدموں کی چاپ پر وہ کرسی گھما کر آنے والوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک ہی اس کی نظر سولڈر اور جیفرے پر پڑی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی کیپٹن سولڈر کی آواز ابھری۔

''نہیں مائی ڈیئر کمانڈر! اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے بہت سی لاشیں دیکھی ہیں اور نہیں چاہتے کہ ہمیں تمہاری بھی لاش دیکھنی پڑے۔''

کمانڈر کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''ل......لیکن میں تو...... میں تو......''

''ہاں، ہم تمہارے پاس ایک اہم ضرورت سے آئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ تم تمہاری ضرورت ضرور پوری کر دو گے۔'' کیپٹن سولڈر سفاک لہجے میں بولا اور کمانڈر سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''بات شفٹ انچارج اٹیلٹ کی ہے جسے تم سزائے موت دینا چاہتے ہو۔ ہمیں

تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں مجبوراً یہاں آنا پڑا۔ سب سے پہلی اطلاع تمہارے لئے یہ ہے کہ بوائکر ہاؤس کی تباہی میں اس کا ہاتھ نہیں بلکہ ہم نے اسے تباہ کیا ہے۔"

"ہاں لیکن...... ہاں لیکن......" کمانڈر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکا۔

"سنو، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اتھلیٹ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ پلاسکو میں زیادہ پُرسکون زندگی گزارے گا۔ چنانچہ تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ تم اسے فوراً یہاں بلالو۔"

"یہاں......؟" کمانڈر حیرت سے بولا۔

"ہاں یہاں۔ تمہیں اس کے لئے ٹیلی فون پر حکم دینا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔ نیچے کی منزل میں ہے۔" کمانڈر نے کہا۔ جیفرے نے اسے ٹامی گن کی زد پر لے لیا۔ اس کے پیچھے گارڈ تھا لیکن اس کی پشت پر سولڈر نے گن لگا رکھی تھی۔ نچلی منزل کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ جیسے ہی گارڈ نے روشنی کرنے کے لئے دیوار کی طرف ہاتھ بڑھایا، سولڈر نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

"پہلے کھڑکیوں کے پردے گراؤ۔" اس نے غرا کر حکم دیا۔ کھڑکیوں کے پردے گرا کر روشنی کر دی گئی۔ کمرے میں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی جس پر ایک ٹرے اور دو ٹیلی فون رکھے ہوئے تھے۔

"چلو، فون پر اپنے گارڈ کو اس کو یہاں لانے کا حکم دو۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ قیدی کو ٹرک میں لائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" کمانڈر خشک لہجے میں بولا۔ اسے ان دونوں آدمیوں کے چہروں سے ان کی خطرناک شخصیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بہرحال دوسری جانب آپریٹر نے ڈیوٹی آفیسر کو جگایا تھا اور اسے اطلاع دی تھی کہ کمانڈر اس سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ کمانڈر نے اسے حکم دیا کہ وہ قیدی کو ٹرک پر لے آئے۔ بہرحال یہ سب کچھ بڑی برق رفتاری سے ہو رہا تھا۔ پھر انہوں نے آگے کا پروگرام سائمن کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اسے احتیاط کرنی ہوگی اور یہاں اس کمانڈر کو کور کئے کھڑا رہنا ہوگا۔ باہر وہ ٹرک سے آنے والوں سے نمٹیں گے۔ حالانکہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں پندرہ سالہ لڑکا کوئی غلطی نہ کر بیٹھے لیکن بہرحال یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل کر ہال میں آ گئے۔ انہوں نے ڈیولینڈی ہیلمٹ سروں پر رکھ لئے تھے۔ اور پھر وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ٹرک کا انتظار کرنے لگے۔ کیپٹن سولڈر نے گارڈ کی جگہ سنبھال لی تھی۔ سڑک پر ٹاؤن ہال کی سمت ایک گاڑی کا دھندلا دھندلا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ گاڑی میں مکمل اندھیرا تھا لیکن اس کا انجن بیدار تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور تین فوجی باہر نکل گئے۔ بہرحال یہ سارے مرحلے نمٹنے کے لئے ہی تھے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرک آ گیا اور اس سے چند افراد نیچے اترے۔

"یہ اس وقت کیا ہنگامہ ہوا ہے؟ قیدی کو کیوں طلب کیا گیا ہے؟" اترنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"غالباً کوئی ایسا کام ہوا ہے جو ناقابل فہم ہے۔" جیفرے بولا۔ اسی وقت سولڈر نے اپنی ٹامی گن کی نال آنے والے افسر کی گردن پر رکھ دی اور جیفرے سے بولا۔

"اسے نیچے والے کمرے میں لے جاؤ۔"

افسر کا منہ حیرت سے کھلا، پھر جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور چال میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ جیفرے اسے لئے ہوئے اندر آ گیا۔ اس دوران اتھلیٹ کو سوچنے کا موقع مل گیا تھا اور وہ ان لوگوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

بہرحال اس کے بعد یہ لوگ باقی معاملات سے نکل کر وہاں سے چل پڑے۔ جس گھر پر سائمن انہیں لے گیا تھا وہاں مکمل تاریکی تھی لیکن سائمن نے اپنی ماں کو بلایا اور ماں بیٹی بیٹے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ وہ لوگ کمانڈر کو اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے تاکہ کسی بھی خطرناک صورتحال سے نمٹا جا سکے۔ بیس منٹ کے بعد ان کا ٹرک اس ڈھلان پر پہنچ گیا جس کے سرے پر حفاظتی چوکی تھی۔ اور پھر بعد کی کارروائیاں بڑی سنسنی خیز تھیں۔ لیکن بہرحال وہ ان دونوں کو لے کر نکل آئے تھے اور اس طرح انہیں میلیکو تک پہنچانے کے سلسلے میں جو مہم سرانجام دی گئی تھی وہ خاصی سنسنی خیز تھی۔ لیکن خوش نصیبی ان کے ہم رکاب تھی۔

بعد میں حکومت پلاسکو نے ڈیولینڈ کے خطرے کو ختم کرنے میں بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ لیکن بہرحال وہ اس خوفناک وبا کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو ہیلسونا، لائیٹن اور میلیکو کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھی۔ دفعتہً ہی نیلسینا نے جیفرے کے شانے کو جھنجھوڑتے

ہوئے کہا۔

''کیاتم سوگئے ڈیئر جیفرے! یعنی ان شاندار کمالات کے باوجود تمہیں نیند آ گئی جن پر یقین نہیں آتا کہ یہ کسی انسان کا کارنامہ ہے۔''

جیفرے ایک دم خواب سے چونک پڑا۔ وہ اپنی زندگی کے اس قابل فخر کارنامے میں کھو گیا تھا اور ایسی باتیں اسی وقت یاد آتی ہیں جب کوئی اپنے جیسا نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ اپنی فوجی زندگی میں اس نے بڑے بڑے بیش بہا کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اور جب حکومت پلاسکو اپنے تینوں حلیفوں کی مدد کر کے ڈیولینڈ کی خوفناک کارروائیوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئی تو ان تمام لوگوں کو زبردست اعزازات سے نوازا گیا جنہوں نے اس سلسلے میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں خود حکومت پلاسکو نے ہیلسونا، لائیٹن، میلیکو پر لشکرکشی کر کے ان پر قبضہ جما لیا تھا اور انہیں پلاسکو میں ضم کر لیا تھا لیکن نقصان انہیں پہنچا جو قبضے میں آ گئے تھے۔ مسٹر جیفرے تو تھے ہی پلاسکو کے باشندے۔ ان اعزازات کے ساتھ بہت سے اور بھی کام ہوئے۔ یعنی ریٹائر ہونے کے بعد مسٹر جیفرے کو پلاسکو کونسلیٹ میں ایک اہم عہدہ دے کر اس ایشیائی ملک روانہ کر دیا گیا اور یہاں وہ ایک بھرپور اور مطمئن زندگی گزارنے لگے۔ نیلسینا ان کی شریک حیات تھی اور ان کی زندگی کی ایک اہم ساتھی۔ خاص طور سے عمر کے اس حصے میں جب انسان کسی اچھے ہمدرد کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ دونوں کا ذوق یکجا تھا۔ حالانکہ مسٹر جیفرے پلاسکو کونسلیٹ میں ایک اہم عہدیدار تھے لیکن اپنے شوق کی تکمیل انسان کو کسی منصب کے جال میں نہیں جکڑ سکتی۔ اس قسم کے جسمانی اور ایڈونچر کارنامے انہیں زندگی کی طرح عزیز تھے۔ گو اب ان کا جسم بوڑھا ہو چکا تھا لیکن نوجوانی کی یادگاریں کبھی کبھی ایسے ہی تازہ ہو جاتی ہیں جیسے اس وقت وہ شہباز کو دیکھ کر اپنے ماضی میں کھو گئے تھے۔ پھر انہوں نے سر جھکا کر نیلسینا سے کہا۔

''میں حکومت پلاسکو کا ایک وفادار اور ذمے دار فوجی رہا ہوں اور آج تک ذہنی طور پر فوجی ہی ہوں نیلسینا! تم وہ نہیں سوچ سکتیں جو میں سوچ رہا ہوں۔''

نیلسینا ہنس کر بولی۔ ''میں تو اس وقت ان حیرت انگیز لوگوں کے کارنامے دیکھ رہی ہوں جو صرف پیٹ بھرنے کے لئے زندگی کو اس طرح ہر روز داؤ پر لگا دیتے ہیں۔''

مسٹر جیفرے ہنسنے لگے، پھر بولے۔

''یہ لوگ تو سرکس میں کام کرنے والے جانباز ہیں نیلسینا! تم کیا سمجھتی ہو۔ سڑکوں پر رواں دواں زندگی ہر لمحے ایسے ہی خطرات سے دوچار رہتی ہے۔ بہرحال میں اس وقت اس نوجوان میں کھو گیا ہوں اور نجانے مجھے کیا نظر آنے لگا ہے۔''

نیلسینا نے جیفرے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

✡......✡

شبیلہ نے فیض شاہ کو دیکھا۔فیض شاہ گردن جھکائے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔اس کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار تھے۔شبیلہ کئی دن سے فیض شاہ کے چہرے کی یہ پریشانی دیکھ رہی تھی۔اس وقت وہ فیض شاہ کے پاس پہنچ ہی گئی۔

''شاہ جی! مجھے نہیں بتائیں گے کیا بات ہے؟''

فیض شاہ نے چونک کر شبیلہ کو دیکھا اور پھر کسی قدر حیرانی سے بولا۔

''کیوں......خیریت، کیا ہوا؟''

''نہیں شاہ جی! آپ اس طرح اجنبی لہجے میں مجھ سے بات نہ کریں۔ ہم تینوں ایک جان تین قالب بن چکے ہیں۔ ہمارے چہروں پر نمودار ہونے والی ہر نئی لکیر دوسرے کی نگاہوں میں آجاتی ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس لکیر سے ہماری شناسائی کیوں نہیں ہے۔''

''ارے واہ! تم تو واقعی سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو۔بس ایسے ہی بعض اوقات کچھ خیالات دل کو پریشان کر دیتے ہیں۔''

''اس وقت کون سا خیال آپ کو پریشان کر رہا ہے۔ مجھے بتائیے۔''

''شبیلہ! تم بہت معصوم ہو۔ظاہر ہے زمانے کی تجربے کاری تمہاری آنکھوں میں نہیں آئی ہے ابھی۔لیکن میں شہباز کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ جھولوں پر جا کر بے قابو ہو جاتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی جنون ابھر آتا ہو۔شیروں کو مشتعل کر کے انہیں اپنے آپ پر حملہ آور کروا کر ان سے بچنا ایک انتہائی خوفناک کھیل ہے۔ میں پہلے بھی دل سے اس کھیل کی مخالفت کر چکا ہوں لیکن پبلک اسے بہت پسند کر رہی ہے۔ البتہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح وہ شیروں کو مشتعل کر کے خود کو ان کے درمیان چھوڑ دیتا ہے، کسی بھی لمحے اس سے چوک ہو سکتی ہے۔ان دنوں اس کے اندر ایک ہیجانی کیفیت نظر آتی ہے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا شاہ بابا! واقعی میں اس کے اندر ایک افسردگی محسوس کر رہی ہوں۔''

''وجہ......وجہ......وجہ......'' فیض شاہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''سیدھی سیدھی سی بات ہے۔ کیوں نہ ہم اس سے براہِ راست یہ سوال کر ڈالیں۔''

''برا نہ مان جائے کہیں۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بھلا میری اور آپ کی بات کا برا مانے گا وہ؟ ہم تینوں کا ایک دوسرے کے علاوہ ہے ہی کون۔''

فیض شاہ سوچ میں ڈوب گیا اور پھر انہوں نے شہباز کو جا لیا۔شہباز اس وقت خیمے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔انہیں دیکھ کر چونکا، مسکرایا اور بولا۔

''کہاں سے آرہے ہیں آپ دونوں؟''

''باہر موجود تھے اور تمہارے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔''

''میرے بارے میں؟''

''ہاں......''

''میرے بارے میں کیا بات چیت کر رہے تھے آپ؟''

''تمہاری ان دنوں کی کیفیت کے بارے میں۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں......کیا بات چیت کر رہے تھے آپ؟''

''شہباز! تم پچھلے کچھ دنوں سے بہت اُلجھے اُلجھے سے نظر آرہے ہو۔''

''ہاں......آپ کا خیال بالکل درست ہے۔'' خلافِ توقع شہباز نے اعتراف کرتے ہوئے کہا اور دونوں چونک پڑے۔

''کیا واقعی؟''

''ہاں۔''

''بیٹے! ابھی ہم یہ بات بھی کر رہے تھے کہ ہم تینوں ایک جان تین قالب ہیں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے ہمارا اس دنیا میں۔ اور ہم ایک دوسرے سے اپنا دُکھ درد نہیں کہیں گے، ایک دوسرے سے اپنی اُلجھنوں کا مشورہ نہیں کریں گے تو پھر اور کون آئے گا ہمیں سمجھانے کے لئے۔''

"بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ۔"

"ارے بابا! سارے اعترافات کر رہے ہو تو یہ بتاؤ کہ بتاتے کیوں نہیں ہو کہ کیا پریشانی ہے، کیا الجھن ہے تمہیں؟"

"آپ پوچھتے تو میں بتاتا۔"

"لیجئے۔ ہماری غلطی ہوگئی۔"

"غلطی تو ہے شاہ بابا!" شبیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو بابا! اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔ معافی بھی مانگ لیتے ہیں اس غلطی کی۔ لیکن اب حضور والا! بتا تو دیجئے کہ مشکل کیا ہے۔"

"اصل میں شاہ بابا! میں سوچ رہا تھا کہ جو الفاظ میں اپنی زبان سے ادا کروں گا بہت عجیب ہوں گے۔ مجھے اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرنے چاہئیں یا نہیں۔"

"ارے خیریت بیٹا! تم نے تو واقعی ہمیں پریشان کر دیا اور وہ بھی اچانک۔"

"شاہ بابا! میں سرکس میں کام نہیں کروں گا۔" شہباز نے جواب دیا اور فیض شاہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر گردن ہلا کر بولا۔

"ٹھیک ہے...... نہیں کرو گے تو بالکل نہیں کرو گے۔ ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے اس سلسلے میں۔ اکیلے اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"شاہ بابا! آپ لوگ اس بات سے ناراض تو نہیں ہوں گے؟ خاص طور سے میں آپ کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں...... تم سرکس میں کام نہیں کرنا چاہتے اور ہم تم سے کہیں گے کہ نہیں سرکس میں کام کرو۔ بیٹا! میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔ میں دوہری کیفیت کا شکار رہا ہوں۔ کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ جب ہم نے سرکس چھوڑا تھا اور تم مجھے شہر لے کر گئے تھے کہ وہاں تم کسی سے متعلق ہو اور اس کے ساتھ ہم ایک اچھی اور بہتر زندگی گزار سکتے ہیں تو میں نے بالکل انکار نہیں کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس بات کے لئے آمادہ کر کے گیا تھا کہ جیسے تم آگے کی زندگی گزارنا پسند کرو گے، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن وہ لوگ وہاں نہیں ملے اور اس کے بعد خود تم نے اس رجحان کا اظہار کیا تھا تو میں نے تمہیں طارق شاہ کے مقابل لا کھڑا کیا۔ اور دیکھو لو اب کیا کیفیت ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو بیٹا! ہم تو تمہارے کچھ وقت کے

ساتھی ہیں۔ زندگی کو آگے کی جانب بڑھانا تو تمہارا اپنا ہی کام ہوگا۔ کیا ہم تمہیں سرکس میں کام کرنے کے لئے مجبور کر کے اپنا پیٹ بھریں گے؟"

شہباز حیرت سے شبیلہ اور فیض شاہ کو دیکھنے لگا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے یہ الفاظ سن کر وہ دونوں چونک پڑیں گے۔ پھر فیض شاہ اس کے اس فیصلے کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ اس نے اس پر یہ محنت بلاوجہ کی۔ ماں بھی کہے گی کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ سرکس میں کام نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا وغیرہ۔ لیکن یہاں تو صورتحال ہی مختلف تھی۔ شبیلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"مجھے گلباز کی بات سے بالکل اختلاف نہیں تھا۔ میں تو خود زندگی بھر سولی پر لٹکی رہی۔ گلباز جھولے پر چھلانگیں لگایا کرتے تھے اور میں زمین پر سینہ پکڑے بیٹھی رہتی تھی۔ دعائیں مانگتے مانگتے میری عمر گزر گئی۔ اور اب دوبارہ میرے لئے وہی لمحات شروع ہوگئے۔ میں یہ جانتی تھی کہ گلباز کس جذبے کے تحت یہ بات کہتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں یہی سوچتے ہوں گے کہ خدانہ کرے کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ مگر بیٹے! ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا دل بہت چاہتا ہے کہ میں بھی اسی طرح سرکس کی زندگی اپناؤں۔ جگہ جگہ کی سیر کروں۔ اور میں نے دل میں سوچا تھا کہ یہ تو زیادتی ہے کہ شہباز جو کچھ چاہتا ہے وہ اسے نہیں مل رہا۔ میرے بیٹے! ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ ہمارے دن رات کیسے گزریں گے۔ رزق اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور وہ ہمیں ہر قیمت پر رزق دے گا۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں کہ تم سرکس چھوڑ دو گے۔"

شہباز ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر بے اختیار ہنس پڑا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ ہر انسان تھوڑا سا بیوقوف ہوتا ہے اور آج بابا صاحب! آپ کے سامنے میں یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ میں تھوڑا سا نہیں بلکہ بہت زیادہ بیوقوف ہوں۔ بلاوجہ سوچتا رہا کہ آپ لوگ میرے اس فیصلے کی مخالفت کریں گے۔ بس اسی لئے میں نے آپ سے نہیں کہا۔"

فیض شاہ نے آنسو بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اور اس بات کو ذہن سے نکال دینا اور آئندہ کبھی مت سوچنا۔ ہم تمہارے کسی فیصلے کی مخالفت نہیں کریں گے بلکہ کبھی یہ بھی نہیں پوچھیں گے کہ اس فیصلے کی وجہ کیا ہے۔ اور یہ اس لئے نہیں پوچھیں گے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو

کہ اس میں ہماری کوئی غرض پوشیدہ ہے۔"

بہر حال شہباز کو ان لوگوں کی ان باتوں سے بہت خوشی ہوئی تھی۔اس نے کہا۔

"اصل میں بابا صاحب! جتنی تعلیم مجھے مل چکی ہے اس نے میرے ذہن کو خاصا کشادہ کیا ہے۔سرکس کی زندگی میرے باپ نے بھی اپنائی تھی اور اب میں بھی اس کے بارے میں بہت سے تجربات کر چکا ہوں۔ بالکل برا نہیں ہے یہ سب کچھ۔اور جو میرے باپ نے کیا ہے میں اسے کیسے برا کہہ سکتا ہوں۔لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس کی کوئی بڑی حیثیت نہیں ہے۔ہم معاشرتی حیوان ہیں۔ ہمارے اپنے کچھ افکار و اقدار ہوتے ہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں بن پاتا۔اصل میں بابا فیض شاہ! میں چاہتا ہوں کہ معاشرے میں میرا کوئی مقام ہو۔اِک زندگی ہو میری اپنی۔کیا کہتے ہیں لوگ ہم لوگوں کے بارے میں۔ یہی کہ سرکس میں کام کرنے والا مداری ہے۔ کھیل تماشے دکھا کر پیٹ بھرتا ہے۔بس بابا! یہ میں نہیں چاہتا۔ میں معاشرے میں اپنا ایک مقام چاہتا ہوں۔ میں ایسے کام کرنا چاہتا ہوں جو میری فطرت کے عین مطابق ہوں۔میں نے واقعی ماں سے کتنی ہی بار یہ بات کہی تھی کہ مجھے سرکس کی زندگی پسند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکس کی زندگی بری نہیں ہوتی۔اس میں ایڈونچر ہے،اس میں سیاحت ہیں،زندگی اور موت کا کھیل ہے۔اور یہ کھیل بہت دلکش ہوتا ہے۔اس کھیل کے کھلاڑی الگ ہی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ کچھ بیوقوف لوگ مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے،میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ان کے اپنے سوچنے کا انداز بھی ٹھیک ہے۔اگر وہ مجھے صرف برائی کے پیش نگاہ اس طرح سے کہتے تو میں گھونسا مار کر ان کے دانت توڑ دیتا۔لیکن ایک بات ایک طرح سے صحیح ہے۔ مسئلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ خیر سوچیں گے اس بارے میں۔آگے سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"بیٹے! دیکھو،اس کے بعد بھی اگر تم نے ہم سے اپنے کسی ذاتی معاملے میں گریز کیا تو ہم تم سے کچھ نہیں کہیں گے مگر دل گرفتہ ہو جائیں گے کہ تم نے ہمیں اپنی رازداری کے قابل نہیں سمجھا۔ بیٹے! ہم بالکل برے لوگ نہیں ہیں۔ہم تمہیں اپنا ذریعہ آمدنی نہیں سمجھتے۔ پیار کرتے ہیں ہم تم سے۔محبت کرتے ہیں اور بس۔تم ہمارے بارے میں کبھی برے انداز میں نہیں سوچو گے۔سمجھ، ہے ہو نا؟"

"جی بالکل۔" شہباز نے مسرور لہجے میں کہا۔حقیقتاً یہ خیال بارہا اس کے دل میں آیا تھا کہ فیض شاہ نے جس طرح اس پر محنت کی ہے اس کے بعد جب وہ سرکس چھوڑنے کی بات کرے گا تو فیض شاہ کا موڈ خراب ہو جائے گا۔وہ سوچے گا کہ یہ لڑکا شاید انہیں بیوقوف سمجھتا ہے۔منوچہر نے اچانک ہی شہباز کی پوری سوچ تبدیل کر دی تھی اور شہباز اب اپنے آپ پر غور کرنے لگا تھا۔ان لوگوں نے اسے این او سی دے دیا تھا۔یہ این او سی اس کے لئے بڑی حیثیت رکھتا تھا۔

بہر حال اس کے ذہن میں آئندہ کے لئے منصوبے بننے لگے۔ ماں تھی۔ باپ جیسا شفیق فیض شاہ تھا اور وہ خود تھا۔ان تین انسانوں پر مشتمل یہ چھوٹا سا خاندان مالی طور پر بھی اس قدر غیر مستحکم نہیں تھا۔ساری زندگی کی کمائی گلباز بیوی کو دیتا رہا تھا اور شبیلہ نے اسے کسی حد تک محفوظ بھی رکھا تھا۔ چنانچہ وہ اس قدر کمزور بھی نہیں تھے کہ چار دن ان کا گزارہ نہ ہوتا۔اگر کوئی مشکل تھی تو راجہ سرکار کی۔راجہ سرکار کا تو سرکس ہی انہی کی بنیاد پر چل رہا تھا اور راجہ سرکار اور دلبر سرکار خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ زیادہ عرصے پہلے کی بات نہیں ہے،طارق شاہ انہیں سڑک کا پتھر سمجھتا تھا۔انسان سمجھتا ہی نہیں تھا وہ انہیں۔ جو دل چاہتا تھا وہ کرتا تھا اور یہ لوگ سوچتے رہتے تھے بلکہ ایک شعبہ یہ بھی بنا لیا گیا تھا کہ طارق شاہ کے سرکس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہیں کہ کہاں لگا ہے، کہاں نہیں لگا ہے۔اس جگہ سے بھاگیں جہاں طارق شاہ آ جائے۔لیکن وقت نے ایک دم کایا پلٹ کر دی تھی۔اور یہی کام طارق شاہ کو کرنا پڑ رہا تھا۔ ہر اس جگہ سے بھاگ جاتا جہاں یہ لوگ موجود ہوتے یا بعد میں پہنچ جاتے۔البتہ اس نے اس ظرف کا مظاہرہ ضرور کیا کہ کبھی آ کر ان سے شکایت نہیں کی تھی۔لیکن دو تین بار فیض شاہ کو راتوں کو جاگتے اور ایک طرح سے پہرہ دیتے ہوئے دیکھ کر خود شبیلہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے بابا صاحب! آپ ان دنوں کچھ بے خوابی کا شکار نظر آتے ہیں؟"

جواب میں فیض شاہ مسکرا دیتا۔"ہاں...... میرے پاس ایک ایسا نایاب ہیرا ہے جس کے چوری ہو جانے کا خطرہ مجھے سونے نہیں دیتا۔"

"ہیرا......؟"

"ہاں......"

"مجھے نہیں معلوم اس کے بارے میں۔ آپ نے پہلے کبھی مجھ سے بھی تذکرہ نہیں کیا۔"

"ہیرے کی اصل مالک تو تم ہی ہو۔ تم سے کیا تذکرہ کرتا میں۔"

"سمجھی نہیں ہوں بالکل۔"

"شہباز کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ہیرا شہباز ہی ہے۔ اصل میں کھل کر کہوں، تم سے چھپانے کو دل نہیں چاہتا۔ شہباز کو جو عزت اور جو شہرت ملی ہے اور جس طرح اس نے طارق شاہ کو نڈھال کر کے رکھ دیا ہے وہ یہ سمجھ لو کہ میرے لئے بڑے خوف کا باعث ہے۔ آدمی کا دل و دماغ خراب ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ کئی بار یہ خطرہ میرے ذہن کو چھو چکا ہے کہ کہیں طارق شاہ میرے بچے کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ بس اس لئے جاگتا رہتا ہوں۔"

شبیلہ خاموش ہو گئی۔ اس بات کی تردید بھی نہیں کر سکتی تھی اور خود بھی خوفزدہ رہتی تھی۔ اس لئے جب شہباز نے سرکس میں کام نہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو بجائے فکرمند ہونے کے وہ دونوں بھی خوش ہی ہو گئے تھے۔ شہباز کے جانے کے بعد شبیلہ نے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ شہباز کے اس فیصلے سے گلباز کی روح بھی خوش ہو جائے گی۔ وہ تو کبھی نہیں چاہتے تھے کہ شہباز اسی طرح جھولے پر کام کرے۔ یہ ان کی دلی آرزو تھی۔ لیکن اولاد جب جوان ہو جاتی ہے اور اپنی خواہشوں کا اظہار کرتی ہے تو ماں باپ کو سوچنا پڑتا ہے۔ شہباز چونکہ خود سرکس کی زندگی سے متاثر تھا اور اس کا اظہار اس نے اس وقت مجھ سے کیا تھا جب ہم نے اسے شہر بھیج دیا تھا تو تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے کئی بار مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ جب آسمان پر بادل گرجتے ہیں اور جب بجلیوں کی چمک آنکھوں کو بند کر دیتی ہے تو وہ سرکس کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے اسے کس طرح اس حسین زندگی سے دور کر دیا ہے۔ اس وقت بھی میں نے کئی بار اسے سمجھایا تھا کہ بیٹے! سرکس کی زندگی اتنی دلکش نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھ رہے ہو۔ اس میں بڑی مشکلات ہیں۔ لیکن وہ اس طرح خاموش رہتا تھا کہ جیسے سوچ رہا ہو کہ ماں! تم مجھے کیوں بہلا رہی ہو؟ اب تو اتنی تمیز مجھے بھی ہے کہ کون سی زندگی کتنی خوبصورت ہے، اس کا تجزیہ کر سکوں۔ آج خود یہ بات وہ کہہ رہا ہے تو میرے احساس کی آنکھیں گلباز کو مسرور دیکھ رہی ہیں۔"

فیض شاہ آنکھوں کے آنسو خشک کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

شہباز واقعی اس طرح شہرت حاصل کر چکا تھا کہ فیض شاہ نے کئی بار یہ بات سنی تھی کہ طارق شاہ سرکس بند کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ لیکن بہرحال اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ اب اس طرح سے کم از کم یہ فائدہ بھی ہو جائے گا کہ طارق شاہ اس خیال کو دل سے نکال دے گا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ شہباز کے راجہ سرکار کے سرکس سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ راجہ سرکار کے سرکس کی چھٹی ہو جائے۔ کیونکہ وہ صرف شہباز کے نام پر چلتا تھا۔

ادھر تو یہ تمام سوچیں کارفرما تھیں اور ادھر شہباز کا عضو عضو مسرت سے جھوم رہا تھا اور اس کی سوچیں صرف یہی تھیں کہ کوئی اور بہتر ذریعہ دریافت کر لینا چاہئے۔ تاکہ سب سے پہلے سرکس کی زندگی سے نجات حاصل ہو جائے۔

پھر ایک دن اس نے دور سے تانیہ کو آتے ہوئے دیکھا اور جلدی سے مشق کرنے کے لئے سرکس کے ایرینا میں داخل ہو گیا۔ تانیہ کو سرکس کے لوگ بھی پہچان چکے تھے کہ وہ شہباز کی دوست ہے اور اس کے پاس اس سے ملنے آیا کرتی ہے۔ لیکن تانیہ کا براہ راست یہاں سے کوئی گہرا تعلق نہیں تھا۔ اس وقت بھی اسے ایرینا تک پہنچا دیا گیا۔ تانیہ شہباز کو مشق کرتے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ لیکن جب ایک شخص نے شہباز کے پاس جا کر اسے تانیہ کی طرف متوجہ کیا تو شہباز نے اس سے کہا کہ تانیہ سے کہہ دو وہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں مل سکتا۔ وہ چلی جائے۔ تانیہ کو شہباز سے اس روکھے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی تو اس شخص نے کہا کہ جب پریکٹس کی جاتی ہے تو اس میں وقفے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسی شام وہ پھر آ گئی۔ پھر دوسرے دن تین دفعہ چکر لگائے اس نے۔ تیسرا، چوتھا، پانچواں دن بھی اسی طرح گزرا۔ شہباز مختلف مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا اور تانیہ سے نہیں ملتا تھا۔

تانیہ پر بہت برے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ وہ بخار سے تپنے لگی تھی۔ منوچہر کو اس کی بیماری کا علم ہو گیا۔ اس نے خود دیکھا کہ تانیہ کو شدید بخار ہے۔ لیکن تانیہ نے اس سے اس بارے میں رجوع نہیں کیا تھا۔ منوچہر پریشان ہو گیا۔ بیٹی کا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ بات تو اس کے علم میں تھی کہ تانیہ سرکس کے اس نوجوان سے محبت کرنے لگی ہے

جسے اس نے ذلیل وخوار کر دیا تھا۔ لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ تانیہ اس کی وجہ سے بیمار بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس دن جب تیز بخار کے باوجود تانیہ، شہباز کی تلاش میں سرکس پہنچی تو منوچہر نے باقاعدہ اس کا پیچھا کیا اور سرکس تک پہنچ گیا۔

لیکن شہباز معمول کے مطابق اس سے نہیں ملا تھا اور تانیہ اس دن بھی مایوس واپس آئی تھی۔ اور جس طرح کا تاثر تانیہ کے چہرے پر تھا اس سے منوچہر کا دل دہل گیا۔ بیٹی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ شہباز کے بارے میں اس نے جو قدم اٹھا لیا تھا اسے برا نہیں سمجھتا تھا۔ باپ کا حق تھا، جو اس نے وصول کیا۔ لیکن بیٹی پر اس طرح کے اثرات مرتب ہوں گے یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تانیہ کے پاس پہنچ گیا اور افسردہ سا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تانیہ نے تیکھی نگاہوں سے باپ کو دیکھا تو منوچہر کہنے لگا۔

''تانیہ! کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں تم سے۔''

تانیہ کے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ تاہم بولی۔

''جی، کیجئے۔''

''بیٹا! ناراض ہو مجھ سے؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ آپ نے ضرورت سے زیادہ ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے پاپا! ضرورت سے بہت زیادہ۔ آپ نے اس طرح اس کی پذیرائی کی جیسے آپ اسے عزت دینا چاہتے ہوں اور جو عزت آپ نے اسے دی پاپا! میرا سر بڑے شرم سے جھک گیا۔ آپ بہت بڑے بزنس مین ہیں، بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ میں جانتی ہوں پاپا! لیکن میں کیا کروں؟ میرا دل اسے قبول کرتا ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اور پاپا! یہ بھی سوچتی ہوں کہ آپ نے اپنی محبت میں ایک انسان کو انسان نہ سمجھ کر اس کی بے عزتی کر ڈالی۔ لیکن پاپا! میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں اسے چاہتی ہوں پاپا! بہت زیادہ چاہتی ہوں اسے۔ انسان کبھی کبھی بڑی انوکھی بے بسی کا شکار ہو جاتا ہے پاپا! میں بھی اسی بے بسی کا شکار ہوں اور یہ سوچتی رہی ہوں کہ مجھے اپنے پاپا سے تعاون کرنا چاہئے۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ میں اس کے پاس جاتی ہوں تو وہ مجھ سے ملتا نہیں ہے۔ اور اس دن سے نہیں

ملا۔ جس دن سے آپ نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ پاپا! بہت برا کیا ہے آپ نے۔ ساری باتیں اپنی جگہ، ہر بات کا ایک طریقہ، ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ آپ اسے اس کا اسٹیٹس بتانا چاہتے تھے تو ان الفاظ میں تو اس سے نہ کہتے جن الفاظ میں آپ نے اس سے کہا۔ پاپا! ہر انسان اپنے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ اسے بھی معلوم تھا۔ آپ نے اسے بتا کر کوئی نا کام نہیں کیا۔''

''مگر تانیہ......''

''کچھ نہیں پاپا! شکایت نہیں کر رہی میں آپ سے۔ آپ نے پوچھا ہے اس لئے بتا رہی ہوں۔ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے آپ وہی کچھ سوچیں گے جس میں آپ کا اپنا مفاد وابستہ ہو۔''

''بس کر تانیہ! بس کر......وہ آجائے گا تیرے پاس۔ ملے گا وہ تجھ سے۔ تانیہ! ہم اس سے سرکس چھڑا دیں گے۔ ہم اس سے کہیں گے کہ وہ بزنس کرے۔ میں اس کی بھرپور مدد کروں گا۔ ہم اس کا اسٹیٹس بنا لیں گے۔ بنا لیں گے ہم اس کا اسٹیٹس۔ تو بالکل فکر مت کر۔'' تانیہ باپ کی صورت دیکھنے لگی تھی۔

بہرحال منوچہر سرکس پہنچ گیا۔ اور پھر جب اس نے اس سے ملاقات کی کوشش کی تو شہباز نے اسے بڑے احترام سے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے منوچہر کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ منوچہر کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ ظاہر ہے مجبور ہو کر آیا تھا۔ اب سوائے مفاہمت کی باتوں کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کہنے لگا۔

''شہباز! میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔''

''آپ کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا ہے سر؟''

''ہاں۔''

''مگر میں نے کچھ اور ہی سنا ہے۔''

''کیا......؟'' منوچہر نے چونک کر کہا۔

''آپ جیسے دولت مند لوگ کبھی اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ اس روایت کو توڑ رہے ہیں۔''

''غلطی تو نہیں کی ہے میں نے بیٹے! بات اصل میں یہ ہے کہ انسان مختلف طرح کی

مجبوریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے میری بیٹی کو کیوں منتخب کیا ہے۔ ظاہر ہے تم صرف سرکس میں کام کرتے ہو۔ کیا مستقبل ہے تمہارا۔ جھولوں پر لٹک کر بازیگری دکھانا، مداری پن کی حرکتیں اور بس۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہیں اس زندگی سے چھٹکارہ نہیں مل سکتا۔ تم زندگی بھر یہی کرو گے۔ اس کے بعد اگر تم ایک سیدھی سادھی لڑکی کو اپنے جال میں پھانس کر اسے مجبور کر دیتے ہو کہ وہ تم سے شادی کرے تو تمہارے لئے اس سے گولڈن چانس اور کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے معاف کرنا، اصولی طور پر میں تم سے مفاہمت کرنے آیا ہوں۔ مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ لیکن میں اپنی فطرت کو کیا کروں، جس میں سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور مصلحت کے تقاضوں کے باوجود میں سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔"

"اصل میں بڑی عجیب بات ہے سر! کہ کچھ لوگ جیسے آپ یک طرفہ فیصلے کر لیتے ہیں۔ آپ یہ سوچتے ہیں کہ جو نظریہ آپ نے قائم کر لیا، وہی سچ ہے۔ آپ کو یہ سن کر دلی مسرت ہوگی کہ آج تک نہ تو میں نے تانیہ سے اظہارِ محبت کیا اور نہ ہی میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور میں جس سے محبت نہیں کرتا اس سے شادی کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجئے کہ میں تانیہ سے ایسا کوئی رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بار بار یہاں آتی ہے۔ میں اس سے نہیں ملتا اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جب ہمیں کوئی فین ملتا ہے ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا شو دیکھتا ہے۔ ہم سے پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ ہم انہی کے لئے تو زندگی کی بازی لگاتے ہیں۔ تانیہ کو اگر میرا کھیل پسند آیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خود ہی مجھ سے ملنے آئی تھیں اور اس کے بعد انہوں نے اسی رشتے سے مجھے اپنے ساتھ ایک کپ چائے پینے کی پیشکش کی۔ پھر آپ نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں تو یہ تمام کام اخلاقی طور پر کرتا رہا ہوں۔ آپ اور آپ کی بیٹی غلط فہمی کا شکار ہو گئے سر! ہم آج یہاں ہیں۔ کل ہمارا یہ سرکس اٹھ جائے گا، کہیں اور چلے جائیں گے۔ ہم عشق و محبت کے جال میں نہیں پھنستے سر! یہ چیزیں ہمیں سوٹ نہیں کرتیں۔"

"تو کیا تم تانیہ سے محبت نہیں کرتے؟"

"... اتنی جتنی میں آپ سے کرتا ہوں یا جتنی ایک انسان ایک انسان سے کر سکتا

ہے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔"

"دوبارہ اگر آپ نے یہ الفاظ کہے تو میں سرکس کے کسی ملازم کو بلا کر آپ کو یہاں سے باہر نکلوا دوں گا۔ آپ کو مجھے جھوٹا کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے تم...... تمہارا مطلب ہے تم......"

"جی ہاں...... میرا مطلب ہے میں۔ جا سکتے ہیں آپ۔ اور سنئے، اپنی بیٹی سے کہہ دیجئے کہ آئندہ ادھر کا رخ نہ کریں۔ اپنے آپ کو اگر ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی سمجھتی ہے تو یہ غلط فہمی دل سے نکال دے۔ ہر شخص اپنی ذات میں ایک حکمراں ہوتا ہے۔"

منوچہر شدتِ حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ وہ سن رہا تھا جس کا کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ صرف ایک ہی احساس کے ساتھ اب تک زندگی گزاری تھی۔ وہ یہ کہ ماحول صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ جب اور جہاں چاہے تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ جب کسی کی تقدیر بدلنے پر آ جائے تو تقدیر بدل سکتا ہے۔ دولت کا شکار تھا بیچارہ۔ دولت میں کھیلتا رہا تھا اور وہی اس کا ہتھیار تھی۔ وہی اس کی فوج تھی۔ لیکن اس وقت ایک عجیب سر پھرے کا سامنا کرنا پڑا تھا جس نے اس کی حیثیت کے بخیے ادھیڑ دیئے تھے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا؟ بیٹی کی دیوانگی سے متاثر ہو کر سوچا تھا کہ چلو سرکس میں کام کرنے والے اس خوبصورت نوجوان کو عزت اور حیثیت بخش دی جائے۔ لیکن یہاں اس نے خود اس کی عزت دو کوڑی کی کر دی تھی۔ منوچہر کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا لباس اتار لیا گیا ہو اور وہ دنیا کے سامنے بے لباس ہو گیا ہو۔ ایسی بے غیرتی بھلا کبھی کسی نے کاہے کو کی ہوگی۔ لیکن اب ایک اور سوال منہ پھاڑ کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ تانیہ کا کیا ہوگا؟ وہ تو بہت ہی جذباتی قسم کی لڑکی ہے۔ اسے جب اس بات کا علم ہوگا کہ شہباز اس طرح اس سے منحرف ہے تو کیا وہ زندگی کی بازی نہیں لگا بیٹھے گی؟ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ تھوڑا سا سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے شہباز سے کہا۔

"سنو...... تم ایک جذباتی نوجوان ہو، مجھے اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔ لیکن میں ایک بزرگ کی حیثیت سے تمہاری کچھ رہنمائی کرنا چاہتا ہوں۔ بزرگوں کا، مفکروں کا ایک کہنا ہے وہ یہ کہ زندگی ایک بار ہر انسان کو موقع دیتی ہے۔ قسمت کی دیوی ایک بار ہر انسان پر

مہربان ہوتی ہے اور پھر موقع دیتی ہے کہ وہ صورتحال سے فائدہ اٹھائے۔ جو لوگ اس وقت قسمت کی دیوی کی آواز کو سن لیتے ہیں اور اس کے ساتھ چلتے ہیں وہ کامیاب رہتے ہیں اور انہیں زندگی کی بہت سی خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس وقت قسمت کی دیوی سے انحراف کر رہے ہو۔ جب میں تمہیں خوش دلی کے ساتھ اپنے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنانے کو تیار ہوں تو تم اس طرح پیچھے نہ ہٹو۔"

"آپ کی اس نصیحت کا شکریہ۔ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے دوسرے بہت سے کام بھی ہیں۔ ان دیوی جی سے آپ کی ملاقات ہو تو میرا اتنا پیغام آپ انہیں دے دیجئے کہ کچھ سرپھرے ان کی عبادت سے گریز کرتے ہیں اور انہیں کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ اور ان میں سے ایک سرپھرے کا نام شہباز ہے۔"

یہ کہہ کر شہباز منوچہر کے سامنے سے اٹھ گیا۔

......

پلاسکو کی ایک سرکاری عمارت میں پرچم سرنگوں کر دیا گیا تھا اور اس وقت عمارت کے اندر بڑے سے ہال میں بہت سے افراد سر جھکائے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک تعزیتی اجلاس ہو رہا تھا جس میں ان چاروں جانبازوں میں سے تین کی ہلاکت کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ چوتھا آدمی، خود اس سوگوار اجلاس میں موجود تھا اور ابھی چند منٹ قبل اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سنائے تھے۔ یہ نہیں بتایا تھا اس نے کہ خود وہ کس طرح وہاں جانے سے محروم رہا اور یہ بھی نہیں بتا سکا تھا وہ کہ گہرائیوں میں ان تینوں کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے۔

لیکن بہرحال ان ہولناک گہرائیوں کی کہانی منظر عام پر نہیں آ سکی۔ تعزیتی اجلاس ختم ہوا۔ دو منٹ کی خاموشی ٹوٹ گئی اور اس کے بعد حکومت پلاسکو کے ایک ذمے دار رکن نے کہا۔

"ہم اس شخص کو ابھی تک کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں رہے ہیں جبکہ اس نے ہمارے بخیے ادھیڑ دیئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہم نے اس کی شخصیت، اس کی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور اس کے لئے ساری بات ان ذمے داروں پر جاتی ہے جن کے سپرد یہ ڈیوٹی کی گئی تھی۔ اس ناکام مشن کو بھی ہم انہی سے منسوب کرتے ہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں

کہ اس کے لئے ان پر مقدمہ قائم کیا جائے۔ ہم جس قدر شدید نقصانات اٹھا چکے ہیں اس کے بعد ہمیں اس طرح کے نقصانات اٹھانے کی گنجائش نہیں ملتی۔ لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اس شخص نے ہمارے انتہائی کام کے علاقے کو بری طرح ناکامیوں سے دوچار کیا ہے۔ آرتھینو ویسکو اور وان کیسرو ہمارے لئے ایک ایسی شاندار جگہ تھی جہاں قائم کی جانے والی لیبارٹریوں پر کھربوں ڈالر خرچ کر کے ہم نے دنیا بھر کے لئے تحقیقی پروگرام شروع کئے تھے اور جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ بہت ہی شاندار علاقہ ہے اور یہاں دشمن کے پہنچنے کی توقع نہیں ہے۔ ہم نے جو نقصان یہاں اٹھایا ہے میرا خیال ہے صدیوں تک پلاسکو کی تاریخ اسے معاف نہیں کر سکے گی۔ بڑے بڑے قیمتی سائنسدان کھو دیئے ہیں ہم نے اور جتنی بڑی رقم ہم نے وہاں خرچ کر دی تھی اس سے ایک شہر نہیں ایک ملک بسایا جا سکتا تھا۔ دنیا کی بہت بڑی آبادی کو اپنی مٹھی میں جکڑا جا سکتا تھا۔ اس لئے یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ رازل جریری کے ساتھ آپریشن کا پروگرام شروع ہی سے غلط تھا اور غلط منصوبہ بندی کرنے والوں کو بہر طور سزا ملنی چاہئے۔"

"جناب عالی! اس وقت ہر ادارے کو یہ حق دیا گیا تھا۔ یعنی انہیں جو پلاسکو کی حفاظت کے ذمے دار ہیں، ان سے کہا گیا تھا کہ ایک ایسے خوفناک سائنسدان کو اپنی گرفت میں رکھنا بہت ضروری ہے اور اس کے لئے ہمیں مؤثر پلاننگ چاہئے۔ سات اداروں نے یہ پلاننگ نوک پلک سے سنوار کر حکومت پلاسکو کو پیش کی تھی اور اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ رازل جریری کے ساتھ جو کچھ بھی کیا گیا وہ کسی ایک فرد یا ایک ادارے نے نہیں کیا۔ وہ ایک مشترکہ مشن تھا۔"

"مانتا ہوں اس بات کو۔ لیکن اس کو فائنل ٹچ تو آپ ہی نے دیا تھا مسٹر ڈینی مور۔"

"بالکل جناب! ان تمام لوگوں کی مشترکہ رپورٹوں کے بعد یہ پروگرام میں نے فائنل کیا تھا۔"

"خیر...... میں نے ایک سفارش کی ہے۔ ہائی کمان اس کی منظوری یا نامنظوری کا فیصلہ دے گی۔ اور ہمیں بہت جلد اس فیصلے کو سامنے رکھ کر عمل کرنا ہے۔"

ان آخری الفاظ کے ساتھ یہ اجلاس ملتوی ہو گیا تھا۔

......
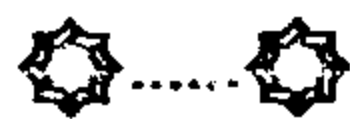
نیلسینا اور مسٹر جیفرے جن کا تعلق پلاسکو سے تھا اور جو کونسلر کی حیثیت سے یہاں اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا، ایک طرح سے ہپناٹائز ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی جب مسٹر جیفرے سرکس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، نیلسینا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جیفرے! ہم لوگوں پر کیا ایک عجیب سی کیفیت طاری نہیں ہو گئی؟"

"عجیب سی کیفیت؟" جیفرے نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یوں لگتا ہے جیسے اس نوجوان سے ہمارا کوئی قلبی تعلق قائم ہو گیا ہو۔ ہر شام ہم اسے دیکھنے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ اور یقین کرو، میں تمہاری کیفیت تو نہیں بتا سکتی، میری اپنی کیفیت یہ ہے کہ میں تو شام ہونے کا انتظار کرتی ہوں تاکہ سرکس پہنچ جاؤں اور اسے قریب سے دیکھوں۔"

جیفرے ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "عورتیں اتنی ہی کمزور ہوتی ہیں۔"

"ارے واہ...... تمہارا مطلب ہے کہ میں عورت ہونے کے ناطے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس حوالے سے سرِشام ہی تیار ہونا شروع ہو جاتے ہو؟"

جواب میں جیفرے ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "ہم لوگ جن کا تعلق ملک کی بقاء سے رہا ہو، اپنے عہدوں سے کتنے ہی دور ہو جائیں، ریٹائر ہو جائیں، سسپینڈ کر دیئے جائیں یا نکال دیئے جائیں۔ لیکن وطن کی محبت اور وطن پرستی ہمارے ضمیر میں رچی ہوتی ہے اور ہم کسی بھی جگہ اس سے گریز نہیں کرتے۔ میرے ذہن میں جو کچھ آ رہا ہے نیلسینا! ابھی میں اس کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن میں دیکھ لیتا ہوں کہ میری کاوشوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔"

"او کے...... او کے۔ تمہارے ذہن میں کچھ بھی ہو ڈیئر جیفرے! لیکن تم یقین کرو، وہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بالکل اپنا اپنا۔"

دونوں تیار ہو کر سرکس پہنچ گئے۔ جیفرے کے پاس اس وقت بہت ہی جدید ساخت کا موبائل فون تھا اور اس کی خوبی یہ تھی کہ یہ ایک متحرک فلم بنا سکتا تھا۔

چنانچہ سرکس میں اس وقت جب شہباز نمودار ہوا اور اس نے اپنی ناقابل یقین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا، جیفرے کا مووی کیمرہ چل پڑا اور کسی کے علم میں لائے بغیر وہ شہباز کی فلم بنانے لگا۔ شہباز اپنا وہ تمام کرتب دکھا رہا تھا جو ناقابل یقین تصور

کئے جا سکتے تھے۔ اس کے ہر کرتب پر تماشائی شدتِ جوش سے تالیاں بجا رہے تھے اور یہ حقیقت تھی کہ راجہ سرکار کے اس سرکس میں جس کی کبھی کوئی خاص شہرت نہیں رہی تھی اس وقت تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ راجہ سرکار دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔

بہرحال جیفرے بڑی احتیاط کے ساتھ شہباز کے ایک ایک ایکشن کی فلم بناتا رہا۔ اور پھر جب سرکس ختم ہوا تو وہ نیلسینا کے ساتھ واپس چل پڑا۔ پھر اس کے بعد وہ اس فلم کو پلاسکو منتقل کرنے کے انتظامات کرنے لگا۔ تونصلیٹ جنرل سے رابطہ ہونے کی بناء پر اس کے وسائل محدود نہیں تھے۔ چنانچہ یہ کام اس نے باآسانی کر لیا۔

✿......✿

حکومت پلاسکو کے ایک خفیہ ڈیپارٹمنٹ میں اس وقت پلاسکو حکومت کے بڑے بڑے اعلیٰ عہدیدار موجود تھے۔ بہت بڑے اسکرین پر وہ فلم چل رہی تھی جو جیفرے نے اپنے وطن کو بھیجی تھی اور اس فلم میں شہباز کے ناقابل یقین کارنامے دکھائے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کے چہرے حیرت سے سُتے ہوئے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہباز کی کارکردگی دیکھ رہے تھے۔ تقریباً چار بار یہ فلم چلائی جا چکی تھی اور اس کے بعد پروجیکٹر بند کر دیا گیا۔ اس فلم کو انٹرنیٹ سے سول لائیٹ پر منتقل کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں ایک باقاعدہ طریقہ کار سے گزارا گیا تھا۔ کچھ دیر تک ماحول پر خاموشی مسلط رہی پھر منسٹری آف ڈیفنس کے ایک اعلیٰ رکن کی آواز ابھری۔

"میں نہیں مانتا...... میں بالکل نہیں مانتا۔ کیا آپ لوگ اسے انسانی کارنامہ کہہ سکتے ہیں؟ ناممکن ہے جناب! ناممکن ہے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ روبوٹ ہے۔ اور اگر اسے گرفتار کر کے اس پر تحقیق کی جائے تو یہ مشین نکلے گا۔"

"اس سلسلے میں مسٹر جیفرے کی رپورٹ پر آپ نے غور نہیں کیا سر!" ایک اور آدمی نے کھڑے ہو کر اعتراض کیا۔

"کیا رپورٹ ہے...... دوہرایئے۔"

جیفرے کی رپورٹ پڑھی جانے لگی۔

"میں سرزمین وطن کا ایک محبت کرنے والا سپاہی رہا ہوں جس کے

دل ودماغ میں اپنے وطن کی اعلیٰ حیثیت اور کارکردگی کی خواہشوں کا بسیرا ہے۔ایک تھوڑی سی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔ہم لوگوں نے یہاں ایک سرکس دیکھا جس میں ایک نوجوان کے ناقابل یقین کارنامے دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ جس طرح ہم آرتھینو ویسکو کے علاقے میں اپنے شدید نقصانات کر چکے ہیں اور جس طرح ہم نے رازل جریری کے جسم کو برفانی گہرائیوں میں چھوڑ کر اپنے لئے عذاب خریدا ہے اس کے سدباب کے لئے ایک اور تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔اگر ہم اس نوجوان کو اپنے قابو میں کرلیں اور کسی طرح اسے اس بات پر مجبور کیا جا سکے کہ یہ ان گہرائیوں میں داخل ہو کر رازل جریری کے بدن کو ہمارے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرے تو یہ ہمارے حق میں بہت ہی بہتر ہوگا اور نجانے کیوں مجھے یقین ہے کہ یہ حیرت انگیز نوجوان یہ کام کر سکے گا۔آپ لوگ اس پر غور کر لیجئے اور اگر اس کام کو مناسب سمجھا جائے تو مجھے اس سلسلے میں پروگرام دیجئے۔''

یہ رپورٹ تھی اور بڑی اہمیت کی حامل تھی۔وہ لوگ سوچ میں ڈوب گئے۔اور اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

''اور ہم مسٹر جیفرے کی اس تجویز کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔کہا جا رہا ہے کہ یہ روبوٹ ہے۔لیکن مسٹر جیفرے کی رپورٹ کے مطابق یہ گوشت پوست کا انسان ہی ہے اور ہمیں اس سلسلے میں مسٹر جیفرے پر اعتماد کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے...... ایک اچھی تجویز ہے۔اور جس طرح ہم آج تک اپنی اس حماقت کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو ہم نے رازل جریری کو اتنی بھیانک سزا دے کر کی، ہم ایک اور تجربہ کر سکتے ہیں۔ہوسکتا ہے یہ انسان ہی ہو۔حالانکہ کسی انسان سے اس قدر پھرتی اور بے جگری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔لیکن فرض کیجئے اگر ایسا ہے بھی تو کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ہمیں اسے حاصل کرنا ہوگا۔ویسے جتنے مشن اب تک اس سلسلے میں ترتیب دیئے گئے ہیں ان میں ہمیں ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔''

اور یہ حقیقت تھی۔ان چار افراد کے مشن کے بعد مزید کوششیں کی گئی تھیں اور ہر طرح کی کوششیں کر لی گئی تھیں مثلاً مشینی انسان بنائے گئے تھے جن کے سپرد یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ گہرائیوں میں جائیں اور وہاں کے بارے میں رپورٹ دیں۔یہ روبوٹ ان غاروں میں پھینک دیئے گئے تھے۔لیکن اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی سگنل نہیں ملا تھا۔

حکومت پلاسکو اپنے عظیم الشان اداروں کے تحت خلاؤں میں مشن بھیج رہی تھی اور اس نے سیاروں کی تسخیر کے سلسلے میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں لیکن زمین کی برفانی گہرائیوں میں موجود اس غار میں جو کچھ تھا اس کے بارے میں آج تک وہ کوئی معلومات نہیں حاصل کر سکے تھے۔اپنے ہاتھوں سے انہوں نے رازل جریری کو زمین کی گہرائیوں میں پہنچایا تھا اور اب اس کے جسم کو حاصل کرنے کی ہر کوشش میں ناکام رہے تھے۔بہت سے سیانوں نے یہ بھی کہا تھا کہ رازل جریری کی روح ہر مشین کو ناکارہ بنا دیتی ہے اور کسی کو اپنے بدن تک نہیں آنے دیتی یہ ایک خوفناک خیال تھا جو رازل جریری کے سلسلے میں کوشش کرنے والے ہر فرد کے ذہن میں تھا۔لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔رازل جریری کو اگر کسی اور ذریعے سے ٹریپ کیا جاتا تو شاید وہ ان کے لئے اس قدر ہولناک نہ بنتا۔لیکن اب کام بگڑ چکا تھا اور وہ ایسے ایسے نقصانات سے دوچار ہو چکے تھے رازل جریری کے ہاتھوں کہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔اور اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔البتہ وہ یہ بات ضرور جانتے تھے کہ رازل جریری خود حکومت پلاسکو کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہی حکومت پلاسکو کے وہ حواری جن کے نام تو بے شک الگ الگ تھے لیکن اصولی طور پر وہ پلاسکو ہی کے زیر تحت چل رہے تھے وہ بھی خوفزدہ تھے کہ اگر رازل جریری کو اس کا جسم حاصل ہو گیا تو وہ دنیا کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائے گا۔وہ ہر اس ملک کو مٹانے کی کوشش کرے گا جو خوفناک کارروائیوں میں ملوث ہے۔خصوصی طور پر حکومت پلاسکو۔

چنانچہ وہ اس کے بدن کو اپنے قبضے میں کر کے رازل جریری کی آوارہ روح پر قابو پانا چاہتے تھے۔لیکن اونٹ کسی کل نہیں بیٹھ رہا تھا۔ہال میں موجود لوگ بڑے بڑے مفکر بھی تھے اور ان کے ذہن برق رفتاری سے چل رہے تھے۔آخر کار ان میں سے ایک نے کہا۔

''میں اپنی رائے کا اعلان کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا۔سب سے پہلے تو ہم مسٹر جیفرے کی محبت الوطنی کو سلام کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے منصب سے ہٹ کر

اپنے وطن کے لئے عمدہ جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ایک اعلیٰ تجویز پیش کی۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص غار کی گہرائیوں میں جا سکتا ہے اگر ہم اسے اپنے مقصد کے لئے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ میں آپ سب کی منظوری چاہتا ہوں کہ جیفرے کی خواہش کے مطابق اس مشن کا آغاز کر دیا جائے۔ براہِ کرم مجھے گائیڈ کیجئے۔''

اور بے شمار آوازوں نے تائیدی انداز میں گفتگو کی اور اس بات پر آمادگی کا اظہار کیا گیا کہ وہ مسٹر جیفرے کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نوجوان کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''

''یہی سوال ہے اب کہ اس نوجوان کو کیسے حاصل کیا جائے۔''

''مسٹر جیفرے کی دوسری رپورٹوں میں اس کے بارے میں جو تفصیل لکھی ہے اس میں اس کے دو بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں ایک اس کی ماں ہے اور ایک کوئی اور عزیز۔ اور وہ ان پر انحصار کرتا ہے۔ اگر ہم ان دونوں کو حاصل کر لیں تو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

''تو اس کے لئے مسٹر جیفرے ہی کو اس مشن کا چیف بنایا جائے اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایسے ممبر مہیا کئے جائیں جو وہاں جا کر اپنا کام کریں۔''

اور پھر بحث و مباحثے کے بعد یہ تجویز مکمل طور پر طے پا گئی اور اس سلسلے میں بارہ گھنٹے کے اندر اندر سارا پیپر ورک مکمل کر لینے کے بعد حکم دیا گیا اور جنہیں یہ کام کرنا تھا وہ مستعدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

✡......✡

مسٹر جیفرے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ پانچ افراد ان تک خصوصی طور پر پہنچے تھے اور انہوں نے مسٹر جیفرے کو حکومت پلاسکو کے انتہائی اہم عہدیداروں کی مبارکباد پہنچائی تھی اور اس کے بعد وہ تفصیلی ہدایت جو تحریری شکل میں مسٹر جیفرے کو دی گئی اس ہدایت کے ابتدائی الفاظ یہ تھے۔

''مائی ڈیئر مسٹر جیفرے! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

حکومت پلاسکو آپ جیسے انسانوں پر فخر کرتی ہے جو پیدا وطن کی حفاظت

کے لئے ہوتے ہیں اور وطن کی حفاظت کرتے ہوئے ہی اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں۔ ہمارا وہ مشن جو وان کیسرو کے سلسلے میں مسلسل جاری ہے ابھی تک ناکامیوں سے دوچار ہے۔ حالانکہ وہ آپ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہر شخص کی ذمے داریاں الگ ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے محبِ وطن جو صرف اپنی ذمے داریاں یا صرف سرکاری فرائض پورے نہیں کرتے بلکہ اپنے وطن سے پیار کرتے ہیں اور وطن کی بہتری اور بقاء کے لئے ہر وقت سینہ تانے کھڑے رہتے ہیں اور وطن کے کسی مفاد کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اور آپ انہی میں سے ایک ہیں۔ آپ کی فوجی خدمات بھی بے مثال رہیں اور اس کے بعد آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بھی ہمارے لئے قابلِ فخر ہے۔ لیکن آپ نے اپنے جذبوں سے کام لے کر جس بات کا انکشاف کیا ہے وہ بھی ہمارے لئے بہت زیادہ قابلِ قدر اور قابلِ توجہ ہے۔ مسٹر جیفرے! آپ کو اس مہم کا انچارج بنایا جاتا ہے۔ یہ پانچ افراد جو آپ کے پاس آ رہے ہیں، آپ کی ماتحتی میں کام کریں گے اور آپ کے ہر حکم کی تکمیل کی جائے گی جس کی انہیں ہدایت کر دی گئی ہے۔ ہم اس نوجوان کا حصول چاہتے ہیں۔ آپ جس طرح بھی اسے اپنے قبضے میں کر سکتے ہیں کیجئے۔ اس پر دولت کے دہانے کھول دیجئے یا کسی اور ذریعے سے اسے مجبور کر سکتے ہیں تو کیجئے۔ ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔ آسمانی باپ آپ کی حفاظت کرے۔''

یہ تحریر ایک سند تھی مسٹر جیفرے کے لئے اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر پلاننگ کی اور آنے والے لوگوں میں سے جن کا انتظام خصوصی طور پر کیا گیا تھا، کہا۔

''اصل میں یہاں کے لوگ حد درجہ جذباتی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہم نے اس نوجوان کو اپنے کام آنے کے لئے دولت کی پیشکش کی تو اس بات کے بیس فیصد امکانات ہیں کہ وہ انکار کر دے۔ چونکہ اس کی شخصیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے بیل کی مانند ہے جس کے جسم پر کوئی رسی نہ ہو۔ جس عمر سے اس کا تعلق ہے اس عمر میں دولت

وغیرہ کی کوئی عزت، کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ہاں اس کے بزرگ جن میں ایک عورت اور ایک مرد ہے اگر قبضے میں لے لئے جائیں تو ہم اسے ہر کام کے لئے مجبور کر سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی چیز یہی ہے کہ ان دونوں پر کامیابی سے ہاتھ ڈالا جائے۔''

''سر! ہم آپ کی ہر ہدایت کے لئے حاضر ہیں اور ہمیں اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ اس سلسلے میں مقامی لوگوں کی مدد لینے کی فکر نہ کریں۔ ہم یہ کام سرانجام دیں گے۔''

مسٹر جیفرے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ میں بہت جلد تمہیں اپنے اگلے منصوبے سے آگاہ کروں گا۔'' اور پھر انہوں نے دو آدمیوں کو اپنا ساتھی بنایا اور ایک بار پھر سرکس جا پہنچے جہاں شہباز کا شو ہو رہا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کو بھی انہوں نے ساتھ لے لیا تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے اس چھلاوے کو دیکھ رہے تھے جو واقعی غیر انسانی کارنامے سرانجام دے رہا تھا۔ لیکن اسے روبوٹ بالکل نہیں کیا جا سکتا تھا چونکہ مشینی انسان اپنے طور پر فیصلے نہیں کر سکتے جبکہ وہ سرکس کے اس بڑے پنڈال میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دے رہا تھا کہ لوگوں کے سانس رُک جاتے تھے۔ پھر شو کے دوران ہی مسٹر جیفرے کی ہدایت کے مطابق وہ دونوں آدمی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور باہر نکل کر سرکس کا جائزہ لینے لگے۔ یہ اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ سرکس میں اس علاقے میں داخلے میں کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں جہاں سرکس کے کارکنوں کے رہائشی خیمے تھے۔ دونوں بھرپور طریقے سے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ کئی جگہ کے انہوں نے فوٹو گراف بھی بنائے جن کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکا کیونکہ آج کل ہر چیز کے لئے اعلیٰ ترین ایجادات ہو چکی ہیں۔ موبائل فون، بہترین کیمرے بن چکے ہیں اور ان سے کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی جگہ کی فوٹو گرافی کی جا رہی تھی۔ اسی رات ان تمام تصویروں کے پرنٹ تیار کر کے سب لوگ میٹنگ کرنے بیٹھ گئے۔ جو لوگ اس مقصد کے تحت پلاسکو سے آئے تھے وہ انتہائی تربیت یافتہ افراد تھے۔ انہوں نے رپورٹ دیکھ کر بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''جناب! یہ تو بہت ہی آسان کام ہے۔ ویسے بھی سرکس میں اس قسم کی واردات پہلے کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔ چنانچہ ان لوگوں کے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہو سکتا ہے۔ اب صرف اس بات کی نشاندہی ہونی ہے کہ وہ دونوں بزرگ کون سے ہیں۔''

''وہ میں کر دوں گا اور ان کی صحیح رہائش گاہ کی مارکنگ بھی ہو جائے گی۔ اس کے لئے وقت کا تعین بھی کر لیا جائے گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس جگہ کا انتخاب کرنا ہے جہاں ان دونوں کو رکھا جائے گا۔''

''یہ انتظام دو گھنٹے کے اندر اندر ہو جائے گا۔ اس کی بالکل فکر نہ کی جائے۔''

چنانچہ تمام تر تیاریاں کر لی گئیں اور مسٹر جیفرے کے زیر ہدایت ایک انتہائی اعلیٰ پروگرام تیار کر لیا گیا جس کے نتیجے میں شبیلہ اور فیض شاہ کو ان کے خیمے میں بے ہوش کیا گیا اور اس کے بعد خاموشی سے انہیں وہاں سے اٹھا کر باہر لایا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب سرکس کا شو جاری تھا اور سرکس کے تمام کارکنان ادھر مصروف تھے۔ اسی وقت کو سب سے مناسب سمجھا گیا تھا۔ البتہ بندروں کے کٹہرے میں ایک دم بڑی زبردست ہلچل مچ گئی تھی۔ چونکہ انہوں نے دو بے ہوش جسموں کو سرکس کے ایریا سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن بیچارے نہ تو اس سلسلے میں مدافعت کر سکتے تھے اور نہ ہی کسی سے اظہار۔

✿......✿

ہلچل مچ گئی تھی۔ سرکس کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جو اس طرح ہوا تھا۔ شو کے خاتمے کے بعد معمول کے مطابق شہباز واپس آیا تھا اور انہیں نہ پا کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ اکثر فیض شاہ اور شبیلہ پنڈال میں جا بیٹھتے تھے اور شو دیکھا کرتے تھے۔ یہ روزانہ کا معمول نہیں تھا البتہ شو کے وقت وہ سیر و سیاحت کے لئے کہیں باہر نہیں نکلتے تھے۔ ورنہ عام حالات میں بابا فیض شاہ، شبیلہ کو لے کر باہر بھی نکل جایا کرتا تھا۔ نئی نئی جگہیں ہوا کرتی تھیں۔ دونوں اپنے طور پر اپنا دل بہلا لیا کرتے تھے۔ بات ایسی بھی نہیں تھی جس پر حیرت ہو۔ چنانچہ ہر بات کو مدنگاہ رکھا گیا۔

لیکن جب رات آگے بڑھتی گئی اور وہ واپس نہ آئے تو شہباز کو حیرت ہوئی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ پھر جب رات کا ایک بج گیا تو وہ دیوانگی کے انداز میں باہر نکل آیا اور سیدھا دلبر شاہ تک پہنچ گیا۔ دلبر شاہ آرام کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر راجہ سرکار کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ دلبر سرکار نے اس بری طرح شہباز کو کبھی بے چین نہیں دیکھا تھا۔ چونک کر بولا۔

''کیا بات ہے شہباز! خیریت تو ہے؟''

"خیریت نہیں ہے دلبر سرکار! میری ماں اور میرا چاچا سرکس میں موجود نہیں ہیں اور ایسا کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ اس وقت اپنی مرضی سے کہیں باہر گئے ہوں۔"

"ارے کیا مطلب ہے تمہارا؟ گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟"

"ہاں......" شہباز نے حتمی لہجے میں کہا اور دلبر سرکار فوراً خیمے سے باہر نکل آیا۔ شہباز سرکس کی ناک کا بال تھا اور اس کی ہر طرح سے پذیرائی ہی سرکس کی کامیابی کا باعث تھی۔ چنانچہ پورے سرکس میں ہلچل مچ گئی۔ راجہ سرکار بھی باہر نکل آیا اور صورتحال معلوم کرنے لگا۔ پھر اس کے بعد سرکس کے بے شمار افراد اس کام کے لئے باہر نکل گئے کہ فیض شاہ اور شبیلہ کو تلاش کریں۔ ہر طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ دلبر سرکار نے پریشان لہجے میں کہا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کو اغواء کر لیا گیا ہو۔ حالات اور شواہد یہی بتاتے ہیں۔ ان کے جوتے اور ان کے لباس اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے باہر نہیں نکلے۔ یعنی ان کے جوتے خیمے میں موجود ہیں اور لباس وہ گھریلو استعمال کے پہنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں...... اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے اغواء کا کیا تصور ہے؟ ان دو بزرگوں سے کسی کو کیا حاصل ہو سکتا ہے؟" راجہ سرکار نے دلبر سرکار کے کان میں سرگوشی کی۔

"طارق شاہ...... طارق شاہ یہ کارروائی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو کچھ اس پر بیت رہی ہے اس کے تحت وہ ہر قدم اٹھا سکتا ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔"

"اوہ...... اگر اس نے ایسا کیا ہے تو یہ تو بڑا مجرمانہ قدم ہے۔ شہباز انتقامی مزاج کا نوجوان ہے۔ وہ یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد خون خرابہ کر ڈالے گا۔"

"نہیں ہونا چاہئے یہ...... بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ چونکہ شہباز کا پُرسکون رہنا ہماری کامیابی کی ضمانت ہے۔ ورنہ سرکس کو جو اعزاز ملا ہے وہ سب ختم ہو جائے گا۔"

"یہ تو بڑی سنگین صورتحال ہے۔ ہمیں اس کے لئے ہنگامی اقدامات کرنا ہوں گے۔"

شہباز کے اپنے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا اور اس کے سارے وجود میں چنگاریاں

دوڑنے لگی تھیں۔ لیکن ایک اور خیال نے اسے الجھن کا شکار کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ کہیں یہ حرکت منوچہر کی تو نہیں ہے جس نے اپنی بیٹی کی خوشیاں حاصل کرنے کے لئے یہ مجرمانہ قدم اٹھایا ہو۔

چنانچہ اس سلسلے میں کوئی مؤثر منصوبہ بندی کرنا ضروری تھی اور اس نے اس کا آغاز کر دیا۔ کسی کو بتائے بغیر وہ منوچہر کے بنگلے پر جا پہنچا۔ پہلی ملاقات منوچہر سے ہی ہوئی۔ اسے دیکھ کر منوچہر عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہیلو سر......"

"آؤ......" منوچہر نے سرد لہجے میں کہا اور اسے لے کر اپنے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

"تم نے شاید اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے۔"

"ہاں...... ایک دلچسپ تبدیلی جو آپ کو پسند آئے گی مسٹر منوچہر!" شہباز کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ منوچہر نے چونک کر اسے دیکھا، پھر بولا۔

"مطلب سمجھاؤ۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟ حالانکہ میں اس طرح کے لہجے کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن تم موقع شناس ہو، وقت کے ساتھ چلنا جانتے ہو اور تمہیں اس بات کا علم ہے کہ میں اس وقت تمہارے ہاتھوں میں کھیل رہا ہوں اور کچھ مجبوریوں کا شکار ہوں۔"

اور اپنی مجبوریوں سے نمٹنے کے لئے آپ نے یہ گھٹیا کھیل کھیلا ہے مسٹر منوچہر۔"

"لڑکے! بہت اچھے فنکار ہو تم۔ کمال کی کاریگری دکھاتے ہو سرکس کے رسوں اور جھولوں پر۔ لیکن جو الفاظ میں نے پہلے تمہارے بارے میں کہے تھے آج بھی مکمل طور سے انہی پر کاربند ہوں۔ تمہاری فطرت میں کوئی بڑا پن کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو الفاظ تم میرے لئے استعمال کر رہے ہو وہ کبھی میرے دل میں تمہاری عزت نہیں پیدا ہونے دیں گے اور تم کبھی اور کسی قیمت پر ایک بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔"

"بڑے آدمی! میں تم سے صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ میری ماں اور بابا فیض شاہ کہاں ہیں۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں تم سے کہ تمہاری بیٹی کسی بھی قیمت پر میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ میں جوابی کارروائی کے طور پر اسے اٹھا کر لے جاؤں گا اور وہ کروں گا اس کے ساتھ جو میں نے آج تک کبھی نہیں کیا۔ میں عزت کرنا جانتا ہوں اور عزت کا مفہوم بھی جانتا ہوں لیکن تم نے جو قدم اٹھایا ہے اس کے جواب میں میری بات سن لو، ان دونوں کو

واپس سرکس میں پہنچا دو۔ اس کے لئے میں تمہیں صرف دو گھنٹے کا وقت دیتا ہوں۔ دو گھنٹے کا یہ وقت گزر گیا منوچہر! تو اس کے بعد تم اپنی بیٹی کو پاتال کی گہرائیوں میں بھی رکھو گے تو میں اسے اٹھا لے جاؤں گا۔ اور تم جانتے ہو کہ پاتال میرے لئے ایک آسان سی چیز ہے اور مجھے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ پہلے وضاحت کرو۔ بعض اوقات غلط فہمیاں بڑے بڑے المیے جنم دیتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی المیہ نہ ہو۔ براہِ کرم مجھے صاف صاف بتاؤ قصہ کیا ہے۔ اب مجھے یہ لگ رہا ہے جیسے تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچے ہو۔"

شہباز بغور منوچہر کو دیکھنے لگا۔ منوچہر کے چہرے پر کہیں بھی چالاکی کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"میری ماں اور میرے چچا کو سرکس سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں تم آئے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کام تم نے کیا ہو۔"

منوچہر کے چہرے پر ملامت کے آثار پھیل گئے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "صرف اتنا کہوں گا کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو تم جو کہہ رہے ہو وہیں تک محدود نہ رہنا بلکہ اس سے آگے کا عمل کرنا۔ میں ایسی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتا اور مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا ہوا۔ مجھے بہت افسوس ہے اور میں تمہیں خود اپنے تعاون کی پیشکش کرتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں ان کی تلاش میں تمہاری مدد کروں۔ میں ایسا بھول کر بھی نہیں سوچ سکتا...... بے شک مجھے اپنی بیٹی سے محبت بھی ہے اور تم ان جذبوں کو نہیں جانتے جو باپ کے دل میں ہوتے ہیں۔ بس جاؤ، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اگر اس قسم کا کوئی شبہ بھی ہو جائے مجھ پر تو تم اپنے ہر عمل میں آزاد ہو گے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

منوچہر کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ شہباز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں وہ واقعی غلط فہمی کا شکار ہے۔ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں ہے۔

بہر حال وہ وہاں سے اٹھ گیا اور اس نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ واپس سرکس میں آ گیا۔ راجہ سرکار اور دلبر سرکار پولیس سے مدد لے چکے تھے۔ اور ہر طرح کی کارروائیوں

میں تعاون کر رہے تھے۔ ابھی تک کوئی ڈھنگ کی بات نہیں معلوم ہو سکی تھی۔ شہباز بہت پریشان تھا۔ ادھر یہ معلومات حاصل کی جا رہی تھیں کہ طارق شاہ کا سرکس اس وقت کہاں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طارق شاہ نے شہباز کو مجبور کرنے کے لئے یہ کارروائی کی ہو۔ راجہ سرکار نے شہباز سے ملاقات کر کے کہا۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم صرف کاروباری طور پر تمہارے لئے یہ بھاگ دوڑ کر رہے ہیں بلکہ یوں سمجھ لو وہ ہمارے بھی بزرگ ہیں۔ البتہ تم سے ایک درخواست میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اگر طارق شاہ کی طرف سے تم سے کوئی رابطہ ہو اور وہ تمہیں یہ بتانا چاہے کہ فیض شاہ اور شبیلہ بیگم اس کی تحویل میں ہیں اور تم فوراً اس کے پاس پہنچ جاؤ اور یہ بھی کہا جائے تم سے کہ خبردار پولیس کو آگاہ کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے تو تم جذباتی مت ہونا۔ فوراً ہمیں اس بات کی اطلاع دینا۔ ہم اس طرح کی خفیہ کارروائیاں کریں گے کہ طارق شاہ ہمیشہ کے لئے دلدل میں غرق ہو جائے اور ہم فیض شاہ اور شبیلہ کو آسانی کے ساتھ لے آئیں۔ خود شہباز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب دوسرا قدم کیا اٹھائے۔ ان لوگوں کو حاصل کرنے کے لئے کیا کارروائی کرے۔ منوچہر کے بارے میں تو اسے یقین ہو گیا کہ اس نے ایسی کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔ اب طارق شاہ کے علاوہ بھلا کون رہ جاتا ہے۔ لیکن کوئی اور تھا جو مسلسل اپنی کارروائیوں میں مصروف تھا اور اس طرح تھا کہ اس تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ حکومت پلاسکو نے ایسے خفیہ ایجنٹ وہاں بھیجے تھے جو اپنی کارکردگی میں بے مثال تھے۔

چنانچہ اس رات جب شہباز اپنے خیمے میں بستر پر لیٹا خیمے کی چھت کو گھور رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ بھلا شبیلہ اور فیض شاہ میں کسے اتنی دلچسپی ہو سکتی ہے تو اچانک اسے خیمے میں ایک ہلکی سی بو کا احساس ہوا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔ خیمے کی دیوار سے ایک عجیب سی سوئی باہر نکلی ہوئی نظر آ رہی تھی اور خیمے کی دیوار کے پیچھے کوئی موجود تھا۔ سوئی کے خول سے سفید دھوئیں کی ایک دھاری سی نکل رہی تھی۔ شہباز برق رفتاری سے اس کی طرف جھپٹا لیکن اچانک ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اس کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ اس نے پریشانی کے عالم میں اپنے ہاتھ پیروں کو جنبش دینے کی کوشش کی لیکن سر کو زور کا چکر آیا اور اس کے بعد وہ زمین پر بیٹھتا

چلا گیا اور کچھ ہی لمحوں کے بعد ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گیا۔ حواس کی واپسی بھی بدن پر لگنے والے ہچکولوں سے ہوئی تھی اور وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک خوبصورت سی جگہ تھی۔ لیکن کون سی، اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

ہچکولے بدستور لگ رہے تھے۔ لیکن بات ناقابل فہم تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ دفعتہً ہی سامنے ایک دروازہ کھلا اور اس سے دو آدمی اندر داخل ہو گئے۔ شہباز نے ایک دم آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ابھی تک صورتحال کا اسے صحیح طور پر اندازہ تو نہیں ہو سکا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی بہت ہی غیر متوقع بات ہوئی ہے۔ اس کے کانوں میں آواز آئی۔

''ابھی تک ہوش نہیں آیا۔''

''حالانکہ آ جانا چاہئے۔ میں دیکھتا ہوں۔''

''کیا یہ انگریزی زبان جانتا ہے؟''

''مشکل ہے...... سرکس میں کام کرنے والا ایک بازیگر پڑھا لکھا تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن فکر کی بات نہیں ہے۔ ہمارے پاس ترجمان موجود ہے جو اس کی زبان کا انگریزی میں ترجمہ کر سکتا ہے اور اس سے اس کی زبان میں بات کر سکتا ہے۔''

''مسٹر ڈوڈسن کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''ہاں...... ڈوڈسن سولہ سال ایشیاء میں رہا ہے اور ایشیاء کی کئی زبانوں سے بخوبی واقف ہے۔''

''دیکھو ذرا اسے، ہوش میں کیوں نہیں آیا۔''

یہ تمام باتیں شہباز سن رہا تھا اور ان لوگوں نے اسے ایک لمحے کے لئے یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ آگے کے بارے میں اپنا لائحہ عمل تیار کر سکے۔ مگر حیرانی کی بات تھی کہ آخر کون لوگ ہیں؟ کیا غیر ملکی...... انگریزی بولنے والے؟ البتہ یہ فیصلہ اس نے ایک لمحے کے اندر اندر کر لیا تھا کہ ان کی اس غلط فہمی کو قائم رکھنے کا یعنی ان پر اظہار نہیں ہونے دے گا کہ یہ انگریزی جانتا ہے۔ آنے والے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک شخص نے اس کے کان کے نیچے کوئی خاص رگ سہلائی اور اس کے بعد کندھے تک سہلاتا چلا گیا۔ شہباز نے ہلکی سی جنبش کی اور وہ شخص بولا۔

''بس چند لمحوں کے اندر یہ ہوش میں آ جائے گا۔ اصل میں ہم نے جتنا ڈوز اسے دیا تھا، وہ یہ سوچ کر دیا تھا کہ یہ خصوصی قوتوں کا مالک ہے۔ چنانچہ ہم نے ڈوز ہائی کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک بے ہوشی چل رہی ہے۔ حالانکہ ساڑھے پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

شہباز کو حیرت ہوئی وہ ساڑھے پانچ گھنٹے سے بے ہوش ہے۔ بہر حال اب ہوش میں آ جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک شخص اس کے بالکل قریب موجود تھا۔ دوسرا تھوڑے فاصلے پر تھا لیکن فاصلے پر کھڑے ہوئے آدمی نے ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ شہباز کی جانب کر دیا۔ شہباز خالی خالی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پاس بیٹھا ہوا شخص ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم بالکل محفوظ جگہ ہو اور تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ یہ ریوالور تم پر صرف اس لئے تانا گیا ہے کہ کہیں تم غلط فہمی کا شکار ہو کر کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھو۔ تم دوستوں کے درمیان ہو۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔''

یہ تمام گفتگو شہباز نے سمجھی تھی لیکن چونکہ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب بالکل ہی بے تعلقی کا اظہار کرے گا چنانچہ وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ تبھی دوسرے نے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے۔ یہ انگریزی نہیں سمجھتا۔ اب ایسا کرو تم جاؤ اور ڈوڈسن کو بلا لاؤ۔''

''میں یہیں سے ڈوڈسن کو کال کر دیتا ہوں۔'' اس شخص نے کہا اور جیب سے ایک آلہ نکالا اور اس کا ایک بٹن دبا دیا۔

''ہاں...... ہم بلو کیبن میں ہیں۔ مسٹر ڈوڈسن کو فوراً بھیج دو۔ اوکے۔'' اس نے آلہ جیب میں ڈال لیا۔ غالباً یہ آلہ اس جگہ بات کرنے کا محدود آلہ تھا لیکن یہ ہچکولے سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ جگہ کون سی ہے اس کا کوئی تجزیہ نہیں ہو سکا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد دبلے پتلے بدن کا ایک اسمارٹ سا آدمی اندر داخل ہوا اور اس نے اندر کا منظر دیکھا، پھر سوالیہ نگاہوں سے اس شخص کو جو شہباز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

''ہاں...... یہ ہوش میں آ چکا ہے اور ہم تمہارے ذریعے اس سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ یہ انگریزی نہیں سمجھتا۔''

"او کے......" پھر ڈوڈسن نامی شخص شہباز کے قریب آ گیا اور آہستہ سے بولا۔

"مسٹر شہباز! ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارا تعلق ایک مغربی ملک سے ہے اور صحیح معنوں میں ہم آپ کے قدر دان ہیں۔ ہم وہ ہیں جو آپ کے فن کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں معاف کیجئے گا مسٹر شہباز! ہم آپ کو اپنے درمیان لانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہم آپ کو اس طرح بے ہوش کر کے یہاں لے آئیں۔"

شہباز نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔ "یہ جگہ کون سی ہے؟"

"ایک آبدوز ہے جو سمندر کی گہرائیوں میں سفر کر رہی ہے۔ ہم آپ کو اپنے وطن لے جا رہے ہیں۔ یقیناً آپ نے پلاسکو کا نام سنا ہوگا۔ ہم پلاسکو کے باشندے ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے شہباز کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ پلاسکو تو بہت بڑی حیثیت کا مالک تھا۔ بہت بڑا ملک تھا یہ جس نے دنیا بھر میں اپنے پنجے گاڑھ رکھے تھے۔ شہباز ایک لمحے تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"لیکن تم مجھے وہاں کیوں لے جا رہے ہو؟"

"کہا نا مسٹر شہباز! کہ آپ کی صحیح قدر ہمارے دل میں ہے۔ ہم آپ کا مقام جانتے ہیں۔ یہ چھوٹے موٹے سرکسوں میں کام کر کے آپ جیسی شخصیت کی توہین ہو رہی تھی۔ ہم آپ کو بلند مقام دیں گے جس کے آپ اہل ہیں۔ شہنشاہوں کی طرح رکھا جائے گا آپ کو۔"

"مگر اس طرح؟"

"ہاں...... میں نے کہا نا، یہ بہت ضروری تھا۔ اس طرح آپ کو حاصل کر کے اور اس طرح آپ کو لے جا کر ہم خود شرمندہ ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ وقت آ جائے گا جب آپ ہماری اس جرأت کو معاف کر دیں گے اور ہمارے اس مؤقف کو تسلیم کر لیں گے کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"دلچسپ بات ہے...... تم لوگ میری بھلائی چاہتے ہو لیکن اس طرح کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں۔"

"آپ ہمارے قبضے میں نہیں ہیں، ایک معزز مہمان ہیں آپ ہمارے اور اس کا یقین

آپ کو تھوڑے وقفے کے بعد ہو جائے گا۔ البتہ ہم آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی جذباتی قدم اٹھا کر اپنی زندگی کا خطرہ مول نہ لیں۔ کیونکہ ہم گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں اور ذرا سی جذباتی لغزش ہم سب کو موت کے دہانے پر پہنچا دے گی۔"

"ایک اور سوال کا جواب۔"

"اگر وہ سوال آپ کے والدین کے بارے میں ہے تو ہم اس سلسلے میں آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" شہباز اچھل پڑا۔

"وہ پلاسکو پہنچ چکے ہیں اور انہیں جس انداز میں رکھا جا رہا ہے آپ خود دیکھ لیجئے گا۔" ڈوڈسن نے کہا۔ وہ بھی غالباً اس طرح سفر کرنے والوں میں ایک بڑی حیثیت کا مالک تھا اور تمام صورتحال سے آگاہ تھا۔ اس نے دوسرے آدمی کو اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ ریوالور والا بدستور کونے میں ساکت کھڑا ہوا تھا۔ غالباً اسے ابتدائی طور پر شہباز کو کنٹرول کرنے کی ذمے داری دی گئی تھی اور یہ ریوالور شہباز پر صرف اس لئے تنا ہوا تھا کہ وہ جذبات کا شکار ہو کر کوئی دیوانگی کا قدم نہ اٹھا بیٹھے۔

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑا سا چوکور بکس لایا گیا جس میں سفید اسکرین لگا ہوا تھا۔ یہ ٹیلی ویژن نہیں تھا بلکہ کمپیوٹر ٹائپ کا ایک آلہ تھا جس کے کچھ بٹن آن کئے گئے اور کچھ تار آپس میں جوڑ دیئے گئے۔ اس پر سفید نقطے تڑپنے لگے اور کچھ لمحوں کے بعد یہ نقطے نمایاں ہو گئے۔ فوراً ہی ایک اور بٹن آن کیا گیا اور ایک چھوٹے سے خانے سے روشنی کی شعاعیں نکل کر شہباز کا احاطہ کرنے لگیں۔ پھر شہباز کی نگاہوں نے جو منظر دیکھا اس نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ ایک انتہائی شاندار کمرہ تھا جس میں دو زبردست مسہریاں پڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک میز تھی جس کے گرد شبیلہ اور فیض شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے چائے کے برتن لگے ہوئے تھے اور بالکل سامنے ایک ویسا ہی چوکور بکس رکھا ہوا تھا۔ تبھی ڈوڈسن نے کہا۔

"فیض شاہ صاحب اور مادام شبیلہ! کیا آپ اسکرین پر شہباز کو دیکھ رہے ہیں؟"

فیض شاہ کی آواز ابھری۔ "ہاں...... مگر یہ کون سی جگہ ہے جہاں شہباز موجود ہے اور

کونے میں جو آدمی ریوالور سنبھالے کھڑا ہے وہ کون ہے؟ ہمیں اس جگہ کا ایک ایک منظر نظر آرہا ہے۔"

"آپ براہِ کرم شہباز کو اپنے بارے میں بتایئے۔ آپ کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے، جس طرح آپ وقت گزار رہے ہیں اور جو گفتگو آپ سے کی جارہی ہے کیا آپ شہباز کو بتانا پسند کریں گے تاکہ یہ پُرسکون رہیں؟"

"ایک بات کا جواب دو پہلے مجھے۔" فیض شاہ نے کہا۔

"جی فرمایئے۔" ڈوڈسن اُردو میں بولا۔

"کیا شہباز کو کوئی نقصان پہنچایا گیا ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"کیا تم لوگ شہباز کو بھی یہاں لا رہے ہو؟"

"ہاں بالکل۔"

"کب تک پہنچ جاؤ گے تم؟"

"تھوڑا سا وقت لگے گا۔"

"شہباز کو کوئی تکلیف تو نہیں دی گئی ہے؟"

"بالکل نہیں جناب! آپ پوچھ سکتے ہیں۔"

"شہباز! کیا ہم تمہاری آواز سن سکتے ہیں؟" فیض شاہ نے کہا اور شہباز چونک پڑا۔

"ہاں شاہ بابا! میں تو آپ کی آواز سن رہا ہوں۔"

"ہوں...... شہباز! یہ غیر ملکی لوگ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ہمیں سرکس سے اغواء کیا تھا اور ہم بے ہوشی کے عالم میں ان تک پہنچے تھے۔ اس کے بعد یہ لوگ ہمیں اپنے وطن لے آئے۔ ابھی ہم باہر کی دنیا سے واقف نہیں ہوئے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ ہمیں پلاسکو لے آئے ہیں اور ہم پلاسکو کے ایک بڑے شہر میں موجود ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ہمارا زبردست احترام کیا ہے۔ ہم نے ان کے ساتھ سخت سلوک بھی روا رکھا۔ میں نے ان کے دو آدمیوں کو مارا پیٹا بھی لیکن انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی بلکہ ہم سے عاجزی سے کہا کہ ان کی ایک مجبوری تھی کہ وہ ہمیں اس طرح لے کر آئے۔ ہم ان کے لئے ایک معزز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے

کہ اب ہم پلاسکو ہی میں رہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو مقام وہ ہمیں دے سکتے ہیں، ایک گھٹیا سا سرکس ہمیں وہ مقام کبھی نہیں دے سکتا۔ یہ تمام باتیں انہوں نے کی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا احترام اور عزت کی ہے۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ بہت جلد تمہیں بھی یہاں لے آیا جائے گا۔ بات اصل میں یہ ہے شہباز! کہ تم بھی سرکس چھوڑنا چاہتے تھے۔ پلاسکو کو تم بھی جانتے ہو، ہم بھی جانتے ہیں کہ اس وقت دنیا پر اس کا سکہ جما ہوا ہے۔ اگر ہم حکومت پلاسکو کے لئے کسی کام کے ثابت ہو سکتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اپنے وطن کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاتے ہوئے اگر ہم کچھ کر لیتے ہیں تو بہت بہتر رہے گا۔ ہاں، اگر یہ لوگ ہمیں ہمارے وطن کے خلاف کچھ کرنے کو کہتے ہیں تو انہیں کم از کم اتنا معلوم ہے کہ جس ملک اور جس مذہب سے ہمارا تعلق ہے اس میں جامِ شہادت پیا جاتا ہے، غداری نہیں کی جاتی۔ وطن یا مذہب سے انحراف نہیں کیا جاتا۔ زندگی کو ہم دو نمبر کی چیز سمجھتے ہیں۔ پہلے نمبر پر ہمارا مذہب اور دوسرے نمبر پر ہمارا وطن ہے۔ اور اس کے بعد باقی سب کچھ ہے۔ سمجھ رہے ہو نا؟ اس وقت تک ہمیں ان سے تعاون کرنا ہے جب تک کہ ہم پر یہ نہ ظاہر ہو جائے کہ ہمیں کوئی غلط قدم اٹھانے کے لئے مجبور نہیں کیا جارہا۔ تم امن و سکون کے ساتھ ہم تک پہنچو۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

فیض شاہ خاموش ہو گیا۔ شہباز حیرت سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے شاہ بابا! مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔"

ڈوڈسن نے مسکراتی نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور بولا۔

"اگر آپ کچھ اور بات چیت کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجئے۔ ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"نہیں...... اب تم مجھے اپنے درمیان بالکل پُرسکون سمجھو۔" شہباز نے جواب دیا۔ اس نے اب بھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ انگریزی جانتا ہے

✿.....✿

پلاسکو کا دارالحکومت ایک ایسی خوابوں کی دنیا تھی جسے دیکھ کر شہباز دنگ رہ گیا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ دنیا کے بارے میں بہت سی معلومات اسے کتابی ذرائع سے حاصل ہوئی تھیں یا پھر اس نے ملکوں کے بارے میں کچھ فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ لیکن اس توجہ سے نہیں۔ کیونکہ ایسی فلمیں دیکھنے کا کوئی خاص مقصد ذہن میں نہیں تھا۔ لیکن اب پلاسکو کے دارالحکومت کی سیر کر کے وہ دنگ رہ گیا تھا۔ دنیا اتنی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے یہ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ سنی سنائی باتیں اپنی جگہ ہوتی ہیں۔ وہ تو اسی بات سے خوش تھا اور اس کی حسرت کرتا تھا کہ سرکس جگہ جگہ جاتا ہے، نئے نئے شہر، نئے نئے لوگ، زندگی میں بہت سی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے کی دنیا بالکل ہی مختلف ہے۔ یہ بات اس نے پہلے کبھی نہیں سوچی تھی۔

بہر حال نوجوان تھا، ناتجربہ کار تھا۔ بے شک ایسے کردار اسے ملے تھے جنہوں نے اسے اس کی دنیا سے ہٹ کر بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ پلاسٹک سرجری میں وہ اس قدر ماہر تھا کہ دنیا کے بڑے سے بڑے ملک میں کسی بھی جگہ اپنے اس فن کے ذریعے وہ اپنا ایک مقام بنا سکتا تھا لیکن خود اسے اپنے اس مقام کا کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس طرح چہرے بدلنے کا کام بھی بہت بڑی فنکارانہ حیثیت کا حامل ہے اور اگر اس کی یہ مہارت منظر عام پر آ جائے تو اسے بہت کچھ دے سکتی ہے۔

بہر حال دنیا سے ناواقف یہ شخص پلاسکو آنے کے بعد بہت ہی خوش ہو گیا تھا اور اسے اس پذیرائی سے بڑی خوشی ملی تھی جو یہاں ان لوگوں نے کی تھی۔ پلاسکو کے وہ ماہرین جنہیں اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اس کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے بارے میں انہوں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ باصلاحیت نوجوان ایک سرکش گھوڑے کی مانند ہے۔ جسے پیار سے رام کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ انہی کوششوں میں مصروف تھے۔

شبیلہ اور فیض بابا کے ساتھ ہی اسے بھی ٹھہرایا گیا تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس کی ماں کی خدمت کے لئے چار چار خواتین مصروف رکھی جاتی تھیں۔ شبیلہ کو بہترین لباس پہنائے جاتے تھے۔ فیض شاہ کو اس کی پسند کا ہر ماحول مہیا کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کو خوب سیر و سیاحت کرائی گئی تھی جس کی وجہ سے یہ بڑے اچھے الفاظ میں ان لوگوں کا ذکر کرتے تھے۔ فیض شاہ نے کہا۔

"یہ تو دنیا کا دستور ہے بیٹے! کہ کوئی بھی بلاوجہ کسی پر عنایتوں کی بارش نہیں کرتا۔ ان لوگوں کے ذہن میں بھی ضرور کوئی ایسا کام ہے جو وہ تم سے یا ہم سے لینا چاہتے ہیں اور میں تو تمہیں سچ بتاؤں، اپنے آپ کو تو میں نے ہر طرح سے دیکھ لیا۔ میرے اندر تو کوئی ایسی صلاحیت نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ لوگ اس طرح ہم پر مہربان ہو جائیں۔ صرف تم ہو جس کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انہیں ضرور تم سے ہی کوئی کام ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے ساتھ ان کا جو رویہ ہے وہ بہت اچھا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ انہوں نے ہم لوگوں کے ساتھ کتنا اچھا انداز اختیار کیا ہے۔"

"میں سوچ تو بے شک نہیں سکتا شاہ بابا! لیکن دیکھ تو سکتا ہوں۔ خود مجھے بھی انہوں نے ایسی حیرت انگیز دنیا دکھائی ہے کہ میں دنگ رہ گیا ہوں لیکن آپ کی اس بات سے اتفاق میں بھی کرتا ہوں کہ ضرور انہیں کوئی ایسا ہی اہم کام ہے ہم سے۔ میرا تو خیال ہے ان کا تعلق کسی بہت بڑے سرکس سے ہے اور یہ مجھے اپنے سرکس میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو حالانکہ میں خود سرکس کی زندگی کو ناپسند کرتا ہوں لیکن ان کا یہ احسان اتارنے کے لئے انہیں تھوڑا سا وقت ضرور دوں گا۔"

"دیکھو، کیا مسئلہ ہے۔"

"نہیں...... مسئلے کی بات نہیں ہے۔ میں خود ان سے اس سلسلے میں بات کئے لیتا ہوں۔ اس طرح ہم اپنی شرافت کا ثبوت بھی دیں گے۔"

"اگر تم یہ مناسب سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

ان لوگوں کو ہینڈل کرنے کے لئے مسٹر جیفرے ہی کو مخصوص کیا گیا تھا جنہیں ان کے مقصد سے اور ان کی مصروفیات سے ہٹا کر یہاں بلا لیا گیا تھا کیونکہ شہباز انہی کی دریافت تھا۔ نیلسینا وغیرہ اس سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ ویسے بھی نیلسینا، شہباز سے بڑی

رغبت رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک لاولد عورت تھی اور نجانے کیوں اسے شہباز سے ایک اُلفت سی محسوس ہوتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ اس بات سے پریشان ہو جاتی تھی کہ جس مقصد کے لئے انہوں نے شہباز کو حاصل کیا ہے وہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ کیا شہباز اس معیار پر پورا اتر سکے گا؟ کیا وہ ان کی خواہشیں پوری کر سکے گا؟ یا پھر دوسرے بہت سے افراد کی طرح وہ بھی آخر کار اس کوشش میں موت کا شکار ہو جائے گا؟ یہ دُکھ بھرا تصور بہت سی بار نیلسینا کے دل میں آ چکا تھا۔ لیکن بہر حال اپنے وطن سے دلچسپی اور اپنے وطن کے معاملات سے اسے بھی اسی طرح دلچسپی تھی جس طرح پلاسکو کے رہنے والے دوسرے افراد کو تھی اور جس کے لئے ایک زبردست جدوجہد نجانے کب سے کی جا رہی تھی۔

دوسرا کردار مسٹر ڈوڈسن کا تھا جو ان لوگوں کے درمیان مترجم تھے۔ شہباز نے ہر طرح ان لوگوں کے ساتھ خلوص کا برتاؤ کیا تھا لیکن ابھی تک اس نے یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ انگریزی زبان سے واقف ہے۔ اس طرح وہ ان لوگوں کی فطرت سے واقفیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ ابھی تک کوئی ایسی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی جو اس کے اپنے خلاف ہو۔ چنانچہ خود شہباز کا رویہ بھی خود ان کے ساتھ دوستانہ ہو گیا تھا۔ پھر اسی شام جب مسٹر ڈوڈسن، مسٹر جیفرے اور نیلسینا اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اس نے کہا۔

''میڈم نیلسینا اور مسٹر جیفرے! میں مسٹر ڈوڈسن کی معرفت آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ضرور......'' جیفرے نے کہا۔

''دیکھئے مسٹر جیفرے! میری عمر بہت زیادہ نہیں ہے اور نہ ہی میں دنیا کے بارے میں بہت زیادہ تجربے کار ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں لیکن ایک بات میں جانتا ہوں کہ دنیا کا سارا کام ایک دوسرے کی مدد سے چلتا ہے اور کوئی بھی بے مقصد کسی کے لئے مخلص نہیں ہوتا جیسے آپ لوگوں کا رویہ میرے اور میرے ان ماں باپ کے ساتھ ہے۔ میری مراد میری ماں اور میرے چچا فیض شاہ سے ہے۔ آپ ہمیں اتنی دور سے لے کر اپنے وطن آئے ہیں اور آپ نے یہاں ہم پر محبتوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہے۔ اس کے پس منظر میں میری کوئی ایسی ضرورت ضرور ہے جو آپ کے لئے ہو۔ میرا مطلب ہے میں آپ کے کسی کام کا ہوں۔ کیا مخلصانہ طور پر آپ

مجھے اس کے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟''

مسٹر ڈوڈسن نے مسٹر جیفرے کی طرف دیکھا اور مسٹر جیفرے بولے۔

''مسٹر ڈوڈسن! میرا خیال ہے مسٹر شہباز کو تھوڑی سی تفصیل اس بارے میں ضرور بتا دیں۔ ویسے بھی ہم کام چونکہ بہت جلد شروع کرنا چاہتے ہیں اس لئے اگر اس وقت خود مسٹر شہباز نے ہمیں اس کا موقع دیا ہے تو بات ہمیں ان کے کانوں میں ڈال دینی چاہئے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص کی ذمے داری ہے کہ اصل کام کا آغاز جتنی جلدی کر دیا جائے بہتر ہے۔ آپ پلیز انہیں بتا دیجئے۔ باقی تمام ذمے داری میں قبول کرتا ہوں۔''

مسٹر ڈوڈسن نے گردن ہلائی اور بولا۔ ''مسٹر جیفرے کہتے ہیں مسٹر شہباز! کہ دنیا میں کوئی بھی کام واقعی بے غرضی سے نہیں ہوتا۔ دنیا کے رہنے والے ایک دوسرے کے ضرورت مند ہیں۔ ہم آپ کی ان فنکارانہ صلاحیتوں سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں۔ آپ کے بدن کی پھرتی، آپ کی بے جگری اور دلیری ہمارے لئے ایک انتہائی اور ضروری کام کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اگر آپ اسے پسند کریں۔''

''میں اس بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''کیا آپ خلوصِ دل سے ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہوں گے؟''

''ہاں...... بالکل...... میں بھی انسان دوست ہوں اور احسان کے جواب میں اپنے دوستوں کی پذیرائی کرنا پسند کرتا ہوں۔''

''بے شک آپ جیسے دلیر، ذہین اور پھرتیلے آدمی کے اندر یہ خوبیاں تو لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔ ہم آپ کی اجازت سے آپ کو اپنے ان سربراہوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جو آپ کو صحیح معنوں میں آپ کے سپرد کی جانے والی ذمے داریوں کی تفصیل بتائیں گے۔''

''میں چاہتا ہوں فوری طور پر ایسا کریں۔''

''بہتر ہے۔''

اور پھر اسی شام یہ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ایک بڑے سے ہال میں انتظام کیا گیا۔ فیض شاہ یا شبیلہ کو اس میٹنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی تھی بلکہ یہ کام صرف شہباز ہی

کے سپرد کیا جانا تھا اس لئے اسے ہی اس ہال میں طلب کیا گیا تھا۔

بہرحال شہباز یہاں پہنچ کر کچھ نروس سا ہو گیا تھا کیونکہ یہاں اس وقت پلاسکو کے بڑے بڑے آفیسر موجود تھے جن میں زیادہ تر فوجی افسران تھے اور جیفرے اور مسٹر ڈوڈسن بھی موجود تھے۔ ترجمانی کے فرائض مسٹر ڈوڈسن ہی کو دیئے گئے تھے۔ اجازت ملنے پر مسٹر ڈوڈسن نے کہا۔

''چونکہ یہ پیشکش آپ نے خود ہمیں کی کہ اگر ہم آپ سے کوئی کام لینا چاہیں تو آپ کو بتایا جائے۔ اس لئے ہم اپنے اعلیٰ حکام کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں مسٹر شہباز! بلاشبہ جو لوگ احسان کی ادائیگی کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں وہ بڑے لوگ ہوتے ہیں ورنہ اس دور میں ہر شخص اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ صرف دوسرا اس کے لئے ایثار اور جذبوں سے کام لیتا رہے اور وہ عیش کرے۔ یہ آپ کی بڑائی کی دلیل ہے کہ آپ نے ان تمام باتوں کو محسوس کیا اور خود ہمیں اس کی پیشکش کی۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے مسٹر شہباز! کہ آپ پر بلاوجہ وقت نہیں صرف کیا گیا ہے بلکہ حکومت پلاسکو ہمیشہ ایسے عظیم لوگوں کی پذیرائی کرتی رہی ہے جو اپنے فن کے بادشاہ ہوتے ہیں اور صحیح معنوں میں انہیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ ہمیں معاف کیجئے گا۔ اگر کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو آپ ہم سے تعرض نہ کریں اور نہ برا مانیں۔ سرکس میں آپ ایک معمولی زندگی گزار رہے تھے۔ جھولوں پر کام کرنے والے ایک فنکار کی زندگی جس کا ہر لمحہ خطرے میں ہوتا ہے۔ لیکن اسے زندگی کی بازی لگانے کا کوئی صلہ نہیں ملتا۔ جبکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق ہوتا ہے۔ مسٹر جیفرے آپ کے ملک میں ہمارے ایک عہدے دار کی حیثیت سے تعینات تھے۔ انہوں نے اور ان کی مسز نیلسینا نے آپ کے کارنامے دیکھے اور اس طرح آپ کے گرویدہ ہوئے کہ روزانہ یہ کارنامے دیکھتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی چونکہ مسٹر جیفرے ہمارے ایک اعلیٰ اور اہم ترین کارکن رہے ہیں، ان کے ذہن میں ایک خاص خیال آیا جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے کچھ دشمنوں نے ہمارے خلاف سازش کی اور ہمارے ایک ایسے اعلیٰ انسان کو زمین کی گہرائیوں میں اتار دیا جو ہمارے سائنسی امور کے لئے ہماری ریڑھ کی ہڈی تھا۔ ہم نے اسے ایک اور ملک سے حاصل کیا تھا اور وہ ہمارے لئے سائنسی تجربات کر رہا تھا۔ لیکن ہمارے دشمنوں نے اسے اغواء کیا اور جب اس نے ان

کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیا تو یہیں ایک علاقے میں جسے ہم آرتھینو ویسکو کا نام دیتے ہیں اور جو برفانی غاروں پر مشتمل ایک خطرناک علاقہ ہے وہاں اسے ایک غار میں پھینک دیا اور اس کا جسم اسی غار میں بے گور و کفن پڑا ہوا ہے۔ غار کی گہرائیاں بہت زیادہ ہیں اور ایک عام آدمی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن آپ کی فنکاری دیکھ کر ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ واحد انسان ہیں جو برف کی ان گہرائیوں میں اتر کر اس شخص کے جسم کو باہر لا سکتے ہیں۔ اصل میں اس کے دماغ میں ہمارے ایسے فارمولے پوشیدہ ہیں جنہیں ہم کھو کر صدیوں پیچھے چلے گئے ہیں۔ ہم ان فارمولوں کا حصول چاہتے ہیں اور آپ کے ذریعے یہ کام سرانجام دینا چاہتے ہیں۔''

شہباز حیرت سے یہ انوکھی کہانی سن رہا تھا۔ پھر اس نے بے اختیار لہجے میں کہا۔

''لیکن کیا اسے ان غاروں کی گہرائیوں میں پہنچایا گیا ہے یا پھینکا گیا ہے؟''

''نہیں...... پھینکا گیا ہے۔''

''تو پھر وہ زندہ تو نہیں ہوگا۔ اور پھر اتنے عرصے سے ایسے برفانی غاروں میں......''

''نہیں...... وہ زندہ نہیں ہوگا۔ یہ بات ہم بھی جانتے ہیں۔''

''تو پھر آپ ایک مُردہ وجود کا کیا کریں گے؟''

''اس کے دماغ سے ہم وہ فارمولا حاصل کریں گے۔ ہمیں اس کا جسم چاہیئے۔''

''اوہ...... کیا وہ غار نا قابل عبور ہیں؟''

''ہاں...... آپ کو بے خبر نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ ہمیں آپ کی زندگی بھی اسی طرح عزیز ہے جیسے اپنے کسی انتہائی قریبی دوست کی۔ ہم آپ کو اپنے مکمل دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔''

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی انسان کی پہنچ سے باہر ہیں تو پھر آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ میں وہاں تک جا سکوں گا؟''

''مسٹر جیفرے کا کہنا ہے کہ جس طرح آپ بے جگری سے اپنا سرکس کا کھیل کرتے ہیں اگر آپ اس میں ذرا تھوڑی سی احتیاطی تدابیر کے ساتھ کوشش کریں تو آپ وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''اگر یہ بات ہے اور اس کے کچھ فیصد بھی امکانات ہیں تو میں اپنے دوستوں کے

ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' شہباز نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ان لوگوں نے اب تک اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے وہ بہت خوش تھا۔ انہوں نے تو اسے ایک بالکل ہی نئی دنیا دکھائی تھی اور نوجوانی کی عمر اسی طرح کے جذبات سے آراستہ ہوتی ہے۔ ڈوڈسن نے ان لوگوں کو شہباز کی آمادگی کے بارے میں بتایا تو فوج کے افسر اعلیٰ نے کہا۔

''مسٹر شہباز! آپ ہمارا یہ کام کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم آپ کو پلاسکو کی شہریت دیں گے۔ آپ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے رہیں گے۔ آپ کو اس جگہ ایک فوجی عہدے دار کی حیثیت حاصل ہوگی اور آپ کے والدین کو ہر طرح کی طبی امداد مہیا کی جائے گی۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ آپ مجھے اس جگہ کے بارے میں بتایئے۔''

''ہماری دوسری نشست اسی سلسلے میں ہوگی۔''

بعد میں شہباز نے فیض شاہ اور شبیلہ کو جب یہ تفصیل بتائی تو دونوں کے چہرے فکر مندی سے سکڑ گئے۔

''وہ جگہ اتنی آسان تو نہیں ہوگی کہ اتنے بڑے ملک کے وسائل وہاں تک پہنچنے میں ناکام رہے ہوں گے۔ انہوں نے تم سے یہ توقع کر لی ہے۔ یہ بڑی پریشانی کی بات ہے۔''

''کچھ بھی ہے، میں ان لوگوں کے لئے یہ کارروائی ضرور کروں گا۔'' شہباز نے جواب دیا۔

دوسری میٹنگ میں شہباز کو ان علاقوں کے بارے میں تفصیلات بتائی گئیں۔ بہت بڑے اسکرین پر مناظر ابھرنے لگے اور وہ تمام جگہیں شہباز کے سامنے لائی جانے لگیں جہاں اسے یہ کارروائی سرانجام دینی تھی۔ آرتھینو ویسکو کا علاقہ، پھر وان کیسرو اور اس کے بعد وہاں کے برفانی غار جس حد تک نمایاں کئے جا سکتے تھے، کئے گئے اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان گہرائیوں میں اترنا تو ایک انتہائی دلچسپ کام ہوگا۔ وہ لوگ اس کے چہرے پر تاثرات تلاش کر رہے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ شہباز ان علاقوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے یا پھر وہاں اترنے کے لئے آمادگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ اور جب یہ فلم ختم ہوئی تو شہباز نے کہا۔

''میں یہ کام سرانجام دینے کے لئے تیار ہوں۔''

ان کے چہرے خوشیوں سے کھل اٹھے تھے۔

***
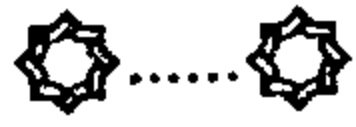
شہباز مکمل طور پر اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے تیار تھا۔ نئی دنیا، نئے لوگ، سرکس کی زندگی سے نجات۔ اب تانیہ جیسی لڑکیوں کے باپ یہ طعنہ نہیں دے سکیں گے کہ سرکس میں کام کرنے والا ایک معمولی سا آدمی کسی باعزت گھرانے کا فرد بننے کے قابل نہیں ہوتا۔ بے شک شہباز کو تانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی لاکھوں پرستار اسی طرح اس کے گرد مکھیوں کی طرح منڈلاتی رہتی تھیں۔ تانیہ نے بس اتنا کام کیا تھا کہ اس کے بالکل قریب آنے کی جرأت کر ڈالی تھی۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ لیکن اب شہباز کو اس کی پسند کی زندگی ملنے والی تھی۔ اپنے دل میں وہ ہمیشہ ایک ایسی خلش پاتا تھا جس کا کوئی مفہوم اس تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ خلش اب بھی قائم تھی۔ لیکن اس نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ نئی زندگی اپنانے کے بعد یہ خلش اس کا پیچھا چھوڑ دے۔

ادھر آرتھینو ویسکو میں ایک بار پھر ایک نئے مشن کی تیاریوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ برف کے ویرانوں میں کیمپ لگا دیئے گئے تھے اور ان کیمپوں میں نئے پیمانے پر کارروائی ہو رہی تھی۔ اور اس کے بعد آخر کار شہباز کو آرتھینو ویسکو لے جایا گیا۔ ابھی وہ علاقہ یہاں سے دور تھا جو اصل کام کا مرکز تھا اور جہاں پہلے ان لوگوں نے اپنے کمانڈوز اتارے تھے۔ یعنی وان کیسرو۔ برف کی وہ بلندیاں جہاں اس بھیانک برفانی غار کا وجود تھا جو دنیا کی ہولناک ترین چیز تھی۔ لیکن اس علاقے کو دیکھ کر ہی شہباز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اتنی برف...... کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''وہ علاقہ جو دور نظر آ رہا ہے، وہ وان کیسرو کا علاقہ ہے اور برف کے ان ڈھلانوں کو پیدل کے ذریعے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ ان میں کہاں کہاں غار چھپے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر میں اوپر کیسے پہنچوں گا؟''

''ہیلی کاپٹر کے ذریعے۔ ہیلی کاپٹر تمہیں وان کیسرو پر اتارے گا اور وہاں سے تم اس غار کے سفر کا آغاز کرو گے۔ لیکن تم بے فکر رہو۔ ہماری پوری ٹیم وہاں تمہارے ساتھ ہوگی۔ بیکمپ وہاں لگائے جائیں گے اور تم اس غار میں اترو گے۔ ہم پہلے تمہیں اس کا سروے

کراتے ہیں۔''

تھوڑی سی تیاریوں کے بعد ایک ہیلی کاپٹر چند افراد کے ساتھ وان کیسرو کے علاقے پر پرواز کرنے لگا۔ نیچی پرواز کر کے وہ لوگ اس غار کا جائزہ لینے لگے۔ اور پھر اس کے بعد وہاں کی فلم بنائی گئی اور ایک بار پھر کیمپ میں واپس آ کر وہ فلم چلائی گئی اور اس کے بعد شہباز سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... کیا کہتے ہو اب؟''

''کچھ نہیں...... میں ان برفانی غاروں میں اتروں گا۔ مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت ہو گی۔''

''ہاں بالکل...... بولو۔''

''ایسی مضبوط اور بڑی کیلیں جنہیں میں برف میں گاڑھ سکوں یعنی وہ غار کی دیواروں میں پیوست ہو سکیں۔''

''تمہیں ایک ایسی مشین دی جائے گی جس کے ذریعے وہ کیلیں دس سے بارہ انچ تک با آسانی دیوار میں پیوست ہو جائیں گی۔ بالکل مضبوط اور طاقتور۔ تمہیں ہتھوڑے کا استعمال نہیں کرنا پڑے گا۔ مشین کا بٹن دباؤ گے اور کام ہو جائے گا۔''

''لیکن اتنی ساری کیلیں نیچے تک کیسے لے جائی جا سکیں گی؟''

''ہاں...... ان کے ساتھ ایک بہت بڑا پیکٹ تمہارے ساتھ رسوں کے ذریعے نیچے اترے گا۔ جہاں تک یہ پیکٹ تمہارے ساتھ جا سکے گا، جائے گا۔ اور جب یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تو تم اسے نئی کیلوں سے باندھ سکو گے۔ تمہارے جسم پر ایک ایسا سوٹ ہو گا جو تمہیں برف کی ٹھنڈک سے بچائے رہے گا۔ ہو سکتا ہے ان غاروں کی گہرائیاں بے پناہ ہوں۔ لیکن باقی ذمے داری تمہاری ہے کہ کس طرح تم اپنا کام کرتے ہو۔ اسی میں تمہاری فنکاری ہے۔''

''ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔'' شہباز نے بے خوفی سے کہا، پھر بولا۔ ''مگر مجھے بہت سی چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''ہاں، ہاں...... بالکل۔''

''رسّی جو نائلون کی مضبوط ترین رسّی ہو، بھی مجھے درکار ہے جسے مجھ سے پہلے اس غار

میں پھینک دیا جائے گا تا کہ نیچے پہنچنے کے بعد اگر مجھے کوئی مشکل پیش آئے تو میں ان رسیوں کے ذریعے اپنا کام کر سکوں۔ مضبوط ہتھوڑے جن کا ایک سرا دھاری دار ہو۔ یہ میری اپنی ضرورت ہے جسے میں محسوس کر رہا ہوں۔ وہ ہتھوڑے بھی میرے کام آ سکتے ہیں۔''

''ان کی تعداد کتنی ہو؟''

''بس دو تین کافی ہیں۔ پہلے ان میں سے کسی کو نیچے پھینک دیا جائے اور اس کے بعد ایک مجھے دے دیا جائے۔''

''ٹھیک......''

اس کے بعد شہباز اپنی عقل کے مطابق اپنی ضرورتیں بتاتا رہا اور وہ لوگ اسے نوٹ کرتے رہے۔ نجانے کیوں شہباز کو ایک عجیب سی مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وان کیسرو کی یہ مہم اس کے لئے ایک دلچسپ کھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن ہو سکتا ہے اس کی ناتجربے کاری اسے نہ سمجھنے دے رہی ہو کہ وہ کس خطرناک مہم پر جا رہا ہے اور نیچے کیسے کیسے بھیانک معاملات اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے عمر نے ابھی اتنے تجربات نہیں دیئے تھے۔ زندگی کو ایک کھیل سمجھتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے بھی غیر مخلص نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے اب تک اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ نہ صرف اس کے ساتھ بلکہ شبیلہ اور فیض شاہ کو بھی انہوں نے پھول کی طرح رکھا ہوا تھا اور وہ دونوں بھی وہاں بہت خوش تھے۔ پھر اس سے زیادہ اور کیا چاہئے تھا۔ البتہ وہ احمق بالکل نہیں تھا اور یہ جانتا تھا کہ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی غرض کے لئے کام کرتا ہے۔ وہ جسم جس کے بارے میں انہوں نے اسے تفصیلات بتائی تھیں نجانے کس کا ہے اور ان برفانی غاروں تک کیسے پہنچا۔

بہرحال یہ ایک عجیب و غریب کھیل تھا۔ وہ مکمل تیاریاں کرنے کے بعد آخر کار اس پوائنٹ پر پہنچ گیا جہاں سے اسے اس برفانی غار میں اترنا تھا۔ اس کے ساتھ پورا عملہ موجود تھا۔ اس بار ان لوگوں نے بھی ہر طرح کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس طوفانی جگہ جہاں زندگی کا بچاؤ ہی ایک مشکل کام تھا، ایک کیمپ لگا دیا گیا اور یہ لوگ اسپیس سوٹ میں ملبوس ہو کر وہاں کارروائیاں سرانجام دینے لگے۔ تمام چیزیں مختلف ذرائع سے وہاں پہنچا دی گئیں اور اس کے بعد شہباز اپنی زندگی کے سب سے خطرناک کھیل میں مصروف ہو گیا۔

سرکس کے 90 فٹ اونچے پنڈال اور بعد میں ایک سو بیس فٹ اونچے پنڈال کے جھولوں سے زمین تک کا سفر یا چھوڑوں کی پشت دوڑ لگانا اب شہباز کے لئے ایک معمولی سا شغل تھا۔لیکن یہ وہ سب کچھ نہیں تھا۔ یہاں اسے ایک ایک لمحہ بڑی مہارت سے صرف کرنا تھا۔اس مشین کا استعمال بھی اسے بتا دیا گیا جو ٹھوس دیواروں میں لمبی لمبی کیلیں پلک جھپکتے گاڑھ دیتی تھی اور وہ بھی اتنی مضبوط تھی کہ انسان سوچ بھی نہ سکے۔ نائیلون کی رسیوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے غار میں گرا دیئے گئے تھے۔غرض یہ کہ ناقابل یقین کارروائیاں کی گئی تھیں اور آخر کار شہباز اپنے اس بھیانک سفر پر چل پڑا تھا۔

اس نے ایک لمبی راڈ سے لٹک کر سب سے پہلے مختلف جگہوں پر کیلیں گاڑھیں۔ یہ کیلیں نائیلون کے ایک جال میں ڈھیر تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اوپر سے نیچے اتر رہی تھیں۔وہ اپنے اندازے کے مطابق یہ کیلیں لگاتا چلا گیا جو خاص قسم کی کیلیں تھیں اور تقریباً تین سو فٹ کی گہرائی میں اترنے کے بعد اس کا رابطہ اوپر سے منقطع ہو گیا۔اب اسے ہر قدم اپنے طور پر اٹھانا تھا۔ وہ اس برفانی کنوئیں کی گہرائیوں پر غور کر رہا تھا۔ نیچے دیکھتا تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔کیلیں اس قدر مضبوط تھیں کہ ان پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا تھا اور شہباز اپنی مہارت کے مطابق ان میں لٹک لٹک کر ان کی مضبوطی کا جائزہ بھی لے چکا تھا۔ دو تین جگہ اس نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے رسے کے ہک کو ان کیلوں سے منسلک کیا۔ یہ ہک ایک مخصوص ساخت کے تھے اور ضرورت کے وقت انہیں اپنے ذرائع سے ہی کھولا جا سکتا تھا۔ پاتال کی گہرائیوں کا یہ انوکھا سفر شہباز کے لئے زندگی کا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ ہر طرح کی کوششیں کر لی گئی تھیں۔ آکسیجن ماسک وغیرہ فراہم کر دیئے گئے تھے۔لیکن اس نے نیچے اترتے ہوئے آکسیجن ماسک وغیرہ نہیں لگایا تھا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس وقت تک اپنے قدرتی سانسوں کو بحال رکھے گا جب تک کہ شدید گھٹن کا احساس نہ ہو اور یہ حیرت انگیز اور دلچسپ بات تھی کہ زمین کی اتنی گہرائیوں میں اترنے کے باوجود گھٹن کا نام و نشان نہیں تھا۔ گہرے......اور گہرے......اور گہرے کنوئیں میں اترتے ہوئے اسے طویل ترین وقت ہو گیا۔ اب اعصاب کچھ کھچاؤ محسوس کرنے لگے تھے۔لیکن یہی اس کی خوبی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر وہ اپنی ہر کیفیت کو قابو کر لیتا تھا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کئی دن اسے نیچے اترتے ہوئے ہو گئے ہوں۔ اور وہ اس دلچسپ تجربے کو دوہراتا رہا۔ پھر اس

اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب پیروں کے نیچے سخت اور کھردری زمین آ گئی۔ وہ اس کنوئیں کی تہہ میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن یہ تہہ صرف کنوئیں کے قطر کے دائرے میں نہیں بلکہ نیچے پہنچ کر وہ ایک وسیع و عریض ہال کی شکل میں پھیل گئی تھی۔ اور حیران کن بات تھی کہ اس ہال میں قدرتی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو یقیناً اوپر سے نہیں آ رہی تھی۔ اس نے پاؤں زمین پر جمائے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تبھی اس کی نگاہ ان تین انسانی جسموں پر پڑی جو شاید سو رہے تھے۔ وہ حیرت سے چونک پڑا۔ اسے تو ایک انسانی جسم کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ یہ تین انسانی جسم یہاں کہاں سے آ گئے؟ اس کے علاوہ اس کے لئے پھینکے گئے رسوں کے ڈھیر اور وہ ہتھوڑے جو اس نے مانگے تھے، یہ ساری چیزیں یہاں موجود تھیں۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان تمام چیزوں کو دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ان لوگوں کی جانب چل پڑا جو موسم اور حالات سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔ اچانک ہی قریب پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ ان لوگوں کے جسموں پر ہلکی ہلکی برف جمی ہوئی ہے۔ لیکن ان کے چہرے پُرسکون تھے جیسے برف کی یہ سردی انہیں متاثر نہ کر رہی ہو۔ جبکہ یہاں اس غار میں بھی شدید سردی موجود تھی۔ وہ ان لوگوں کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے ان میں سے ایک کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا اور ان کے جسموں سے ایک عجیب سی ہلکی ہلکی بو اٹھتی محسوس ہوئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ یہ تینوں زندہ نہیں ہیں۔ شدید سردی اور برف نے ان کے جسموں کو بگڑنے نہیں دیا تھا۔ لیکن یہ ایک لمحے میں ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ زندگی سے دور ہو چکے ہیں۔ تینوں کی یہی کیفیت تھی اور شہباز حیران تھا کہ ان تین انسانوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا اور ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہو جائے۔

وہ دوسری چیزوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اور ایک بار پھر اسے ایک عجیب و غریب چیز نظر آئی۔ یہ برف کی ایک چوڑی سل تھی۔ بالکل یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اس غار میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ انتہائی صاف شفاف ہو۔ لیکن اس سل کے اندر ایک انسان نظر آ رہا تھا۔ اور یہ منظر بڑا حیران کن منظر تھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اس کی جانب اٹھ گئے اور اب پہنچ کر سل میں جمے ہوئے اس شخص کو دیکھنے لگا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے برف میں کوئی شخص سو رہا ہو۔ سفید لمبی داڑھی، سفید بکھرے ہوئے بال، انتہائی جاندار چہرہ

اور انتہائی جاندار بدن۔ نا قابل یقین بات تھی۔ بہت ہی حیران کن۔ لیکن اسے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ اسے اس شخص کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

پھر یہ تین افراد کون تھے؟ چند لمحات وہ سوچتا رہا اور اس کے بعد ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ جلد بازی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ ان تین انسانوں کی لاشوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا انہیں بھی اوپر لے جانے کی کوشش کی جائے؟ اس کے پاس بہترین مشینی ذرائع موجود تھے جن کے ذریعے وہ ان کیلوں کا سہارا لے کر ان سب کو اوپر پہنچا سکتا تھا اپنی شاندار مہارت کے ساتھ جو بے شک ایک آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اسے صرف ایک انسانی جسم کے بارے میں کہا گیا تھا اور لازمی بات تھی کہ وہ انسانی جسم بھی سفید داڑھی والا تھا۔ دیر تک وہ بیٹھا سوچتا رہا، پھر اچانک ہی اسے ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے اس غار میں اس کے سوا بھی کوئی موجود ہے۔ وہ چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔ تبھی اس کے کانوں میں ایک آواز ابھری۔

"ہاں...... تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ اس غار میں تمہارے علاوہ بھی ایک انسانی وجود موجود ہے اور وہ میں ہوں۔ میرا نام رازل جریری ہے۔"

شہباز پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑنے لگا۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کون بول رہا ہے۔ لیکن وہ تینوں انسانی لاشیں اور برف میں جما ہوا شخص ساکت تھا۔ ان کے اندر کوئی جنبش نہیں تھی۔ اسے حیرت ہونے لگی کہ جو کوئی بھی بول رہا ہے کہاں ہے اور اس کے ذہن کی باتیں کیسے سمجھ رہا ہے؟ آواز پھر سنائی دی۔

"ہاں...... نہ تو یہ تینوں بول رہے ہیں نہ یہ برف میں جما ہوا انسانی وجود۔ یہ میں ہوں...... ایک ہوا، ایک خیال، ایک تصور یا پھر رازل جریری۔ دیکھو نوجوان! میں تمہاری کوششوں اور کاوشوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے۔ اس بار انہوں نے جس شخص کا انتخاب کیا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ لیکن انسان انسان ہی ہوتا ہے کیونکہ مالک دو جہاں نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ وہ بہت طاقتور ہے ذہنی اور جسمانی طور پر۔ اور جب کوئی طاقتور آ جائے تو سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ رب العزت نے اسے ہر مقام دے دیا ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب کا پرتو ہے۔ اس نے اپنے محبوب کے لئے یہ دنیا بنائی اور جب اس نے اس جیسے بنائے تو انہیں وہ تمام قوتیں عطا کر دیں جو

کائنات میں بکھری ہوئی کسی بھی مخلوق کو حاصل نہیں ہیں۔ تم جو کچھ کر کے یہاں تک پہنچے ہو واقعی انسانی عمل نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جب ہم اللہ کی دین کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر بخشش اسی کی ہے۔ میرے دوست! میرا نام رازل جریری ہے۔ تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

نجانے کیوں شہباز کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی قوتِ ارادی سلب ہو گئی ہو اور اب اس کے اندر جو شخص بول رہا ہو وہ شہباز نہیں بلکہ شہباز کا ہمزاد ہو۔ اور یہ ہمزاد صرف سچ بول سکتا ہے۔ اس کی آواز کے جواب میں اس نے کہا۔

"میرا نام شہباز ہے۔"

"آہ...... واقعی، جس نے بھی تمہارا یہ نام رکھا ہے صاحب علم ہوگا۔ کیونکہ شہباز ہی اس قدر دلیر، بے جگر اور پھرتیلا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ لیکن میرے عزیز ساتھی! تم پلاسکو کے باشندے تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"ہاں...... میرا تعلق پلاسکو سے نہیں ہے۔"

"پھر کون ہو؟"

"ایک مشرقی ملک کا باشندہ جسے یہ لوگ اغوا کر کے یہاں تک لائے ہیں۔ اس کے پس منظر میں ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔"

شہباز کے ان الفاظ کے جواب میں ایک ہلکی سی ہنسی سنائی دی اور اس کے بعد رازل جریری نے کہا۔

"بچپن میں نانی اماں کی سنائی ہوئی کہانیوں سے کچھ ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ انسان زندگی کے آخری لمحے تک کہانیوں کی دلچسپی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسے کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے اور اگر کوئی کہانی سنانے والا مل جائے تو پھر مزہ ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔ میرے دوست! اگر تم چاہو تو مجھے اپنی کہانی سنا سکتے ہو۔ پھر میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا۔ نجانے کتنے طویل عرصے کے بعد دل چاہا ہے کہ کسی سے اپنی کہانی کا تبادلہ کیا جائے۔ کیا تم میرے ساتھ یہ کھیل کھیلو گے؟"

"ہاں...... واقعی۔ کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی کہانی سنانے کو دل چاہتا ہے۔ میری کہانی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایک سرکس میں پیدا ہوا، باپ جھولے پر کام کرتا تھا

لیکن ایک باپ کی حیثیت سے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں بھی وہی خطرناک کھیل کھیلوں جس میں زندگی ہر لمحہ موت سے پنجہ کش رہتی ہے۔ اس نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا جہاں میں پڑھتا رہا۔ لیکن پھر اس کی زندگی وفا نہ کر سکی۔ وہی حادثہ ہوا جس کے سب متوقع تھے۔ وہ جھولے سے گر کر مرگیا اور میں سرکس واپس آگیا۔ اور پھر میں نے بھی سرکس ہی کی زندگی اپنائی۔ بابا فیض شاہ جسے میں چچا کہتا اور سمجھتا ہوں اور میری ماں شبلیہ دونوں میرے ساتھ تھے۔ میں سرکس میں کھیل دکھاتا رہا۔ مسٹر جیفرے نے میرا یہ کھیل دیکھا اور شاید مجھے اپنے کام کے لئے منتخب کرلیا۔ وہ میرے ماں باپ یعنی چچا فیض شاہ اور میری ماں کو اغواء کر کے لے آئے اور اس کے مجھے۔ اور پھر انہوں نے مجھے یہ تمام تفصیلات سمجھائیں اور مجھ سے کہا کہ میں ان غار سے ایک انسانی جسم کو نکال کر لاؤں۔ چنانچہ میں یہاں تک پہنچ گیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے میری۔ ہاں، اس میں اتنا اضافہ میں ضرور کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ سرکس کی زندگی میں کبھی کبھی میرے دل میں ایک ہلکا سا ملال آ جاتا تھا اور میں یہ سوچتا تھا کہ میں جس قدر ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں رکھتا ہوں وہ صرف جھولے پر زندگی اور موت کا کھیل دکھانے کے لئے نہیں ہے۔ مجھے کچھ اور آگے جانا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے دورانِ تعلیم ایک محترم کرم فرما سے پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرے بدلنے کا بھی علم سیکھا۔ یہ ہے میری داستان اور میرا خیال ہے اس میں منوچہر اور تانیہ کا ذکر کردوں تاکہ کوئی بات نامکمل نہ رہ جائے۔ تانیہ نے میرے دل میں یہ لگن جگائی کہ سرکس کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ گویا اس نے بلکہ اس نے کیا اس کے باپ نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ تانیہ میری محبت نہیں تھی لیکن اتنا میں مانتا ہوں کہ اس کی وجہ سے یہ خیال میرے دل میں آیا تھا۔ اور اگر یہ لوگ مجھے اغوا نہ کر لیتے تو یقینی طور پر میں کسی دوسرے کام کا آغاز کرتا۔“ یہ ساری تفصیل بتا کر شہباز خاموش ہوگیا۔

دیر تک کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ پھر اس کے بعد رازل جریری کی آواز سنائی دی۔

”بہت ہی سچے اور بہت ہی پیارے نوجوان ہو تم۔ جو کچھ تم نے بتایا ہے میں سمجھتا ہوں تمہاری ذات کی اتنی حسین کہانی ہے کہ ایسی کہانیاں کم ہی سننے کو ملتی ہیں۔ پھر تم جس قدر ذہنی اور جسمانی قوتوں سے آراستہ ہو، بلاشبہ تمہارا مقام بے حد بلند ہے۔ لیکن ایک بات میں بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ جس طرح تم نے میرے سامنے ایک ایک لفظ سچ بولا ہے

اسی طرح میں بھی تمہیں اپنی تمام تر سچائیاں دے دینا چاہتا ہوں۔ بولو، کیا تم ان سچائیوں کی قدر کرو گے؟“

”سچائی بذاتِ خود قابلِ قدر ہوتی ہے۔“

”ہاں...... بڑے لوگوں کا یہی قول ہے۔ اور بڑے لوگ یہی بات مانتے ہیں۔“

”مگر ایک بات بتایئے، آپ ہیں کہاں؟ کہاں سے آپ کی آواز آرہی ہے؟ برف کی اس سل میں لیٹے ہوئے انسان کے بدن میں اور ہونٹوں پر تو کوئی جنبش نہیں ہے۔“

”وہ جسم میرا ہی ہے۔ لیکن میری روح اس سے دور ہے۔ یہ بات تمہیں بے شک حیرت ناک محسوس ہوگی۔ لیکن اس وقت جب میری کہانی مکمل ہو جائے گی تم کسی بات پر حیرت نہیں کرو گے میرے نوجوان دوست!“

”ہاں واقعی...... یہ میرے لئے ایک دلچسپ اور انوکھا تجربہ ہے۔“

”تمہارے پاس کھانے پینے کا سامان موجود ہے؟“

”کافی مقدار میں۔“

”اور کیا تمہاری واپسی کے لئے کسی وقت کا تعین کیا گیا ہے؟“

”نہیں...... یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔“ شہباز نے جواب دیا۔

”تو پھر میں تمہیں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں اور وہ پیشکش یہ ہے کہ تم ایک مناسب وقت میرے ساتھ گزارو۔ ممکن ہے میں صحیح راستوں کی جانب تمہاری رہنمائی کرسکوں۔ ممکن ہے میں تمہیں کوئی ایسا مشورہ دے سکوں جو تمہارے حق میں بہتر ہو اور میرے حق میں بھی۔ تم ان تین انسانی جسموں کو دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں...... میں تم سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کون ہیں؟ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔“

”اسی سے اندازہ لگا لو کہ وہ کس قدر غیر مخلص لوگ ہیں۔ اور پہلی بات میں تمہیں یہ بتاؤں، پلاسکو میں رہنے والے، وہاں کے حکمراں اور وہاں کے تمام سربراہ لوگ سب سے بڑے دشمن کس کے ہیں، مسلمانوں کے۔ صرف مسلمانوں کے۔ میرا نام رازل جریری ہے تمہارا نام شہباز۔ اس سے یہ اندازہ تو پہلی کوشش میں ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں کا تعلق ایک ہی مذہب سے ہے۔ حکومت پلاسکو دنیا کے ہر اس ملک میں اپنی ریشہ دوانیاں کر رہی

ہے جس کا تعلق اسلام سے ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری ذات سے مخلص ہیں تو میرے دوست! یہ خیال دل سے نکال دو اور اس کے چند ثبوت میں تمہیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے میں یہ بہتر اور ضروری سمجھتا ہوں کہ تم یہاں آرام و اطمینان سے بیٹھو۔ اپنے لئے سکون کا ایک ماحول پیدا کرو۔ کھاؤ پیو۔ تاکہ میرے اور تمہارے درمیان ایک طویل گفتگو شروع ہو سکے۔"

"ہاں۔ میں اس شدید جدوجہد سے تھوڑا سا تھکا ضرور ہوں۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں تھوڑی سی کافی اور اس کے ساتھ دو سینڈوچ لینا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے اس اطمینان پر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ تم نے میرے اوپرا د کر لیا ہے۔ شکریہ میرے دوست! اس اعتماد کا شکریہ۔"

"اور ایک سوال جو میرے ذہن میں ابھرا ہے۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ تم صرف ایک روح ہو، جسم سے الگ۔ تو کیا میں تمہاری ضیافت نہیں کر سکتا؟"

رازل جریری کی ہنسی ایک بار پھر سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "نہیں...... روح کو کسی مادی شے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور میرا جسم اس سے الگ ہے۔"

"کیا برف کی سل میں وہ جسم تمہارا ہی ہے؟"

"ہاں...... وہ جسم میرا ہی ہے۔ ابھی اسے اسی طرح رہنے دو اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کرو۔"

شہباز ویسے بھی ایک لاابالی فطرت کا مالک تھا۔ مشکل اور خطرناک ترین حالات اس کے لئے کبھی کبھی بے مقصد ہو جایا کرتے تھے۔ وہ انتہائی لاپرواہی کے ساتھ سامان کی کٹ میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکالنے لگا۔ پھر اس نے کافی اور سینڈوچ تیار کئے اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں...... تمہاری گفتگو درمیان میں رک گئی تھی۔"

"ہاں...... پلاسکو کے رہنے والوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ لوگ صدیوں سے ہمارے مذہب کے دشمن چلے آئے ہیں۔ کیونکہ انہیں سب سے زیادہ نقصان ہمارے ہی ہاتھوں سے پہنچا ہے۔ چنانچہ اپنے کسی مقصد کے لئے کسی کو حاصل کر لینا ایک الگ بات ہے اور اس سے مخلص ہو جانا دوسری بات ہے۔ تم یہ دیکھو کہ انہوں نے تمہیں اپنے کام کے

لئے بہتر پایا تو تم سے مذاکرات یا تم کو پیشکش کرنے کی بجائے انہوں نے پہلے تمہارے ماں باپ کو اغوا کیا اور اس طرح انہوں نے تمہیں اس بات کے لئے حتمی طور پر تیار کرنے کے لئے مجبور کر لیا کہ تم ان کے مقصد کی تکمیل کرو۔ اگر وہ تم سے مخلص ہوتے تو پہلے تم سے بات کرتے اور تمہاری آمادگی کے بعد ہی اس بات کا فیصلہ کرتے کہ تمہیں ان کے ساتھ کام کرنا ہے یا نہیں۔ یہ ان کی بددیانتی کا پہلا ثبوت ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے تمہیں اغواء کر کے وہاں تک پہنچایا۔ تمہارے والدین کے ساتھ یہ بہتر سلوک تو انہیں کرنا ہی تھا کیونکہ تمہیں جو آمادہ کرنا تھا۔ میں تمہیں پہلا ثبوت یہی دیتا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے تمہیں ان تینوں افراد کے بارے میں نہیں بتایا جو یہاں زندگی کی بازی ہار بیٹھے تھے۔ یہ اس طویل عرصے کے بعد پہلے لوگ تھے جو یہاں تک پہنچے لیکن یہ اسی قوم کے فرد تھے اور جارحانہ عزائم لے کر آئے تھے۔ جبکہ میرے دوست! مقصد تمہارا بھی یہی ہے۔ لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کچھ رشتے نکل آئے ہیں۔ میں تمہیں کچھ پیشکشیں کروں گا جن پر تم غور کرو گے۔ اور اس کے بعد فیصلہ ہو گا۔ کیا تم اس بارے میں مجھ سے تعاون کرو گے؟" رازل جریری نے کہا۔

"ہاں...... میں آپ سے تعاون کروں گا رازل جریری!" شہباز نے جواب دیا۔ وہ مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھا اور ہر بات سوچ سمجھ کر کر رہا تھا۔ جو ثبوت رازل جریری نے اسے پیش کئے تھے وہ بالکل سمجھ میں آتے تھے اور واقعی شہباز کو ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہوا تھا کہ اگر وہ لوگ اس طرح شبیلہ اور فیض شاہ کو اغوا نہ کرتے تو پتہ نہیں صورتحال کیا ہوتی۔ وہ اس کام پر آمادگی کا اظہار کرتا یا نہ کرتا۔ لیکن انہوں نے شروع ہی سے جارحانہ رویہ رکھا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک چالاک قوم کے چالاک افراد تھے جنہوں نے اسے دھمکی تو دی تھی لیکن شکر میں لپیٹ کر۔ یہ تو واقعی مجبور کرنے والی بات تھی۔ اگر وہ اس بات سے انکار کرتا تو ظاہر ہے ان کا رویہ یہ نہ رہتا۔

کافی اور سینڈوچ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ خلائی سوٹ میں اسے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی البتہ اس نے اپنا چہرہ مکمل طور پر کھول کر رکھا تھا۔ پھر اس نے رازل جریری سے کہا۔

"اپنے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں محترم بزرگ! اور آپ کی تمام باتوں

سے اتفاق بھی کرتا ہوں۔آپ مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟''

''ہاں...... میرا نام رازل جریری ہے۔ایک سائنٹسٹ ہوں۔سائنس کی دنیا میں ایک عجیب وغریب زندگی گزار چکا ہوں۔اپنے بارے میں تفصیل بتاؤں تو تم حیران رہ جاؤ گے۔بس یوں سمجھ لو، زندگی ایک انوکھے رنگ میں گزری ہے۔بہت ہی انوکھے رنگ میں۔ اوراس کے بارے میں تمہیں ساری تفصیل بتانے کو دل چاہتا ہے۔''

''میں ضرور جاننا چاہوں گا۔ایک سائنس دان کی زندگی میرے لئے ایک دلکش تجربہ ہو گی۔''شہباز نے کہا۔کچھ دیر خاموشی رہی اوراس کے بعد رازل جریری کی آواز ابھری۔

''بچپن ہی سے میں نے دنیا کا گہری نگاہوں سے تجزیہ کیا تھا۔مجھے یہ دنیا بہت عجیب محسوس ہوتی تھی۔میں کسی حد تک مذہبی انسان بھی ہوں اور میں نے کتابِ مقدس قرآن حکیم کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ذاتِ باری نے اپنے کلام میں اس دنیا کو جنت کا نام دیا ہے اوراپنی تخلیق کو یہی حکم دیا ہے کہ اس کائنات کو جنت بنانے میں قرآن حکیم کی تعلیمات سے استفادہ کرے۔نیکیاں، بھلائیاں، محبتیں اس زمین کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہیں۔اس نے تو ہمیں زمین پر بھی جنت ہی دی اور آسمانوں میں بھی ہمارے لئے جنت ہی تخلیق کی۔بھلا وہ اپنی تخلیق کی بھلائی کے لئے، اپنی مخلوق کی بہتری کے لئے اچھی باتیں اوراچھے کام کیوں نہ کرتا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اس نے اپنی مخلوق کو بھی حکم دیا کہ اس کے احکامات پر عمل کرے اور کہیں بھی اس سے روگردانی نہ کرے۔تبھی اسے زمین و آسمان کی جنت مل سکتی ہے۔لیکن شیطان بھی موجود ہے اوراس نے اپنے عمل کے مطابق ہر کام شروع کر دیا ہے۔وہ اس زمین کو جہنم بنانے میں مصروف ہے اوراسی طرح اللہ کی اس مخلوق کو آسمانوں پر بھی جہنم میں پہنچانے کی تمام تر تیاریاں کرتا رہا ہے۔انسانوں نے انسانیت چھوڑ دی اور حیوان بن گئے۔شیطان کے پجاری شیطنت کرتے رہے اور زمین پر جگہ جگہ جہنم نمودار ہو گئے۔انہی تعلیمات نے مجھے ان راستوں کی طرف گامزن کر دیا۔میں نے دل میں سوچا کہ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے؟ لیکن پھر میرے اندر سے آواز ابھری کہ تم اپنی اس مختصر زندگی میں جو کچھ بھی کر سکتے ہو ضرور کرو۔انسانیت کی بھلائی کے لئے تخریب کاروں کو دنیا ہی میں جہنم رسید کرنے کے لئے کم از کم تم اپنی ذات کا فرض تو پورا کرو۔اور میرے دوست! میں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔میں دن رات مصروف ہو گیا۔میں نے

سب سے خاموشی اختیار کر لی اور سب سے چھپ کر اپنے کام کرنے لگا۔میری زندگی کا مقصد یہی تھا کہ جہاں کہیں تخریب کاری کے منصوبے پرورش پا رہے ہوں میں اپنی ٹانگ وہاں پھنسا دوں اور جو میری اوقات ہے اس کے مطابق کام کروں۔میرے دوست! میں نے اس کے لئے اپنا شریک کار کسی کو نہیں بنایا۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہزار دوست، ہزار دشمن۔انسان کے اندر لالچ اور بدفطرتی ایک ایسا عمل ہے جس سے وہ بچ جائے تو بڑی بات ہوتی ہے۔میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسے لوگ سامنے آجائیں جو میری اس جدوجہد کو ختم کرنے کا باعث بن جائیں۔میرے دوست! میں اپنی کاوشوں میں مصروف رہا لیکن نجانے کہاں سے کچھ کم بختوں کو میرے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں اور یہ معلومات اس عفریت تک پہنچ گئیں جو دنیا میں کسی کو بھی اپنا مدمقابل نہیں چاہتا۔جو ساری دنیا پر اپنی برتری کا خواہش مند ہے۔نہ صرف زمین بلکہ خلاء اور آسمانوں تک پہنچے کی جنونی خواہش رکھنے والا پلاسکو جسے میرے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔اور آخر کار اس نے سازش کر کے میری لیبارٹری تک رسائی حاصل کر لی۔میری لیبارٹری کو اپنی تحویل میں لے لیا گیا اور مجھے اغواء کر کے پلاسکو لے آیا گیا۔وہاں انہوں نے مجھے آخری حد تک کوشش کر کے اس بات کے لئے مجبور کرنا چاہا کہ میں ان کے لئے کام کروں۔لیکن رازل جریری خدا کے فضل وکرم سے ایک کٹر مسلمان ہے اور زندگی کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ جو لمحات اللہ تعالیٰ نے زندگی کے لئے عطا کر دیئے ہیں وہ کسی کے بس میں نہیں ہیں۔انسان اپنی کاوشیں کر کے کسی کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کر سکتا ہے لیکن فیصلہ مالک حقیقی کی ذات کا ہی ہوتا ہے۔انہوں نے بھرپور کوششیں کر لیں لیکن مجھے اس پر آمادہ نہیں کر سکے یہاں تک کہ چڑ گئے اور انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یا تو میں ان کے لئے ہر طرح سے آمادہ ہو جاؤں ورنہ پھر وہ مجھے ختم کر دیں۔وہ مجھے دھمکی دینے کے لئے اس جگہ تک لائے تھے اور اس منصوبے کے تحت کہ اگر آخری وقت تک میں ان کے لئے کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دوں تو میری زندگی بخش دی جائے ورنہ پھر مجھے ان غاروں میں پھینک دیا جائے۔اور انہوں نے وان کیسرو کے اس علاقے میں لا کر مجھے یہی دھمکی دی لیکن میرے دل میں خدا کا نور تھا۔میں نے ان سے ہنس کر کہا کہ بیوقوفو! تم مجھے زندگی کا خوف دلا کر ایک غلط کام پر آمادہ کرنا چاہتے ہو۔زندگی تو میری ہے ہی نہیں۔جاتی ہے جائے۔کیا فرق پڑتا

ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اس غار کی بلندی سے نیچے پھینک دیا۔ البتہ میرے پاس ایک فن تھا۔ ایک سائنسی عمل۔ میں نے ایک لمحے کے اندر اندر اپنے جسم کو روح سے خالی کرلیا اور اسے روح کے ہاتھوں میں سنبھال کر نیچے تک لے آیا جس کی وجہ سے وہ ٹوٹنے پھوٹنے سے محفوظ رہا۔ لیکن روح میں اتنی قوت نہیں ہوتی یا اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی وزنی چیز کو اٹھا کر اوپر تک لے جائے۔ میں اس کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ انہوں نے اپنی دانست میں مجھے ختم کردیا لیکن میری روح ختم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے قدرتی موت نہیں ملی تھی۔ میرا یہ بدن بھی زندہ ہے۔ بس روح سے محروم ہے۔ یہاں اس پر برف پڑتی رہی ہے اور برف نے اسے اپنے اندر محفوظ کرلیا ہے۔ میں اسے بھی قدرت کا ہی عمل سمجھتا ہوں۔ جب بھی کبھی یہ جسم اس برف سے باہر نکلے گا میں اپنی روح کو اس میں داخل کرسکتا ہوں۔ اور رازل جریری ایک بار پھر معرض الوجود میں آجائے گا۔ اس کے بعد مجھے بھی یہ حق حاصل ہوگیا تھا کہ میں ان لوگوں کو نقصان پہنچاؤں۔ یہاں آرتھینو ویسکو میں انہوں نے برف کی گہرائیوں میں اپنی تجربہ گاہیں بنائیں اور یہاں تخریبی عمل کو فروغ دیا جانے لگا۔ دنیا بھر کے خلاف ایٹمی قوتوں کو استعمال کرکے عمل کیا جانے لگا اور یہ لوگ ترقی کا سفر کرنے لگے دنیا کے کئی ملکوں کا تعاون انہیں حاصل ہے اور یہ اپنا کام یہاں کررہے ہیں۔ لیکن مجھے ایک موقع فراہم ہوگیا۔ میں نے اپنی نادیدہ روح کو استعمال کرتے ہوئے ان کی کئی لیبارٹریاں تباہ کردیں اور وہ اس طرح زمین کی پاتال میں چلی گئیں کہ ان کا وجود بھی مٹ گیا۔ اس میں موجود عظیم ترین سائنسدان جو ان کی صلاحیتوں کی تخلیق تھے، زیر زمین پہنچ گئے اور سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا۔ وہ بوکھلا گئے تو میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بتایا کہ میں رازل جریری ہوں، ان کا دشمن۔ اور میں انہیں اس وقت تک نقصان پہنچاتا رہوں گا جب تک کہ میری روح کی زندگی باقی ہے۔ پلاسکو میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ لوگ شدید ترین جدوجہد کرنے لگے لیکن اس میں انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور میں انہیں نقصانات پہنچاتا رہا۔ تب انہوں نے ایک پروگرام بنایا۔ انہوں نے سوچا کہ میرے اس جسم کو غار کی گہرائیوں سے حاصل کیا جائے اور اسے اپنے قبضے میں لے کر اس پر تجربات کئے جائیں۔ وہ بھی سائنسی تجربات میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ بات میں نے انہیں خود بتادی تھی کہ میرا جسم صحیح حالت میں اس غار میں موجود ہے اور اگر وہ مجھے میرا جسم

واپس کردیں تو میں انہیں معاف کرسکتا ہوں۔ انہوں نے فیصلہ دوسرا ہی کیا۔ انہوں نے سوچا کہ میرا جسم حاصل کرکے وہ اسے سائنسی تجربات کی نذر کردیں گے اور کوشش کریں گے کہ میری روح اس میں واپس آسکے۔ یہ ذرائع ان کے پاس ہیں جس کا میں اعتراف کرتا ہوں۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک وہ ان کوششوں میں مصروف رہے ہیں کہ میرا بدن ان غاروں سے نکال لیں۔ لیکن اپنے ہی کئے کا کوئی علاج ابھی تک انہیں دستیاب نہیں ہوسکا اور میرا جسم یہاں سے ابھی تک نہیں نکالا جاسکا۔ یہ ہے رازل جریری کی کہانی۔“

شہباز اس انوکھی کہانی کو سن کر پتھرا سا گیا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔

✡......✡

بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر اچانک ہی شہباز کے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور وہ چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔ پھر بولا۔

”محترم رازل جریری! اس انوکھی داستان نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اور واقعی میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ میں اپنی سادگی کی بناء پر ان لوگوں سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ لیکن ایک لحاظ سے یہ بہتر ہوا کہ اس طرح مجھے آپ تک پہنچنے کا موقع ملا۔ دیکھئے میں آپ کو اپنی فطرت کے بارے میں بتاؤں۔ اپنی مختصر سی کہانی میں یہ بتا چکا ہوں میں آپ کو کہ ابھی تک میری زندگی کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ ان لوگوں سے تعاون کرتے ہوئے میں نے یہ سوچا تھا کہ میں کسی ایک مرکز پر آجاؤں گا۔ میرے ساتھ میری ماں شبیلہ یا باپ یا چچا فیض شاہ ہے۔ اس کے علاوہ میری کائنات میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ان لوگوں کی زندگی چاہتا ہوں اور بہتری بھی چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی جو تفصیلات میرے علم میں آئی ہیں انہوں نے مجھے ان سے برگشتہ کردیا ہے اور میں بھی آپ ہی کی طرح اس بات پر بھرپور یقین رکھتا ہوں کہ اگر زندگی ہے تو اسے ختم کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ پہلا اعلان تو میں یہ کرتا ہوں کہ اس وقت سے میں ان کا منحرف ہوں اور ان کے مقاصد کے لئے کام کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ دوسرا سوال میں آپ سے یہ کرتا ہوں کہ کیا کوئی اس طرح کا عمل ہوسکتا ہے کہ میں آپ کے ہاتھ پاؤں بن سکوں؟“

رازل جریری کی روح کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں میرے بچے! ایسا ہوسکتا ہے۔ اور میں

تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے دستِ راست بنو اور میرے ساتھ مل کر کام کرو۔ میری وہ آرزو آج بھی جوان ہے کہ ہر اس شخص کو مدد دو جو مظلوم ہو اور جس کے ساتھ زندگی نے مذاق کیا ہو، جو انسانوں کے ظلم کا شکار ہوا ہو۔ ہر اس تخریب کاری کو ختم کرو جو دنیا کو جہنم بنا دے۔ میرے پاس اس کے لئے بڑے بڑے منصوبے ہیں۔ بے شک اب میں اپنی وہ زبردست لیبارٹری قائم نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ان کی تحویل میں جاچکی ہے اور وہ میری زندگی بھر کی کاوشوں کا نچوڑ تھی۔ لیکن اب بھی میں ایسے ذرائع اکٹھے کرسکتا ہوں جس سے اس دنیا میں تخریب کاری کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اگر تم میرے دستِ راست بن جاؤ کیونکہ تمہارے اندر ماحول کو تسخیر کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ کیا تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گے؟''

''پسند کیا کرو گے؟ میں دل و جان سے آپ کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو چکا ہوں مسٹر رازل جریری!''

''میں سمجھتا ہوں بڑی جذباتی سی بات ہے۔ لیکن ایک سچائی کہ میری عمر سینکڑوں سال بڑھ گئی ہے۔ مجھے تمہاری عمر حاصل ہو گئی ہے۔ ایک ایسے نوجوان کی عمر جو زبردست صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تائید غیبی ہے میرے لئے۔ میں ایک بار پھر اپنے ان منصوبوں کو زیرِ عمل لاسکتا ہوں جو تشنہ رہ گئے ہیں۔ تم یقین کرو شہباز! میرا یہ عمل کسی ایک ایسے انسان کے خلاف نہیں ہے جو تھوڑی بہت بھی شرافت رکھتا ہو۔ میں تو صرف ان لوگوں کے خلاف کام کرنا چاہتا ہوں جو دنیا کو مہلک امراض میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ جو جراثیمی ہتھیار بنا رہے ہیں۔ جو ایسے ایسے فارمولے ایجاد کر رہے جن سے یہ دنیا کاغذ کی طرح جل کر راکھ ہو جائے۔ بھلا سوچو، یہ اللہ کی بنائی ہوئی اس کائنات کو کس طرح تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا سارا عمل ان کے خلاف ہے۔ ہم دنیا کے ہر اس ملک اور اس علاقے میں کام کرنا چاہتے ہیں جہاں تخریبی عمل کیا جارہا ہو اور تم اس سلسلے میں میرے بہترین معاون ثابت ہو سکتے ہو۔''

''میں خلوصِ دل سے آپ کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... تو اب تم مجھے ان کی خواہش کے مطابق یہاں سے نکال کر لے جانے کی کوشش کرو۔''

''میں سمجھا نہیں رازل جریری! ان کی خواہش کے مطابق؟''

''ہاں......''

''براہِ کرم مجھے سمجھائیے۔''

''ہاں...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھے برف کی اس سل سے نکال لو اور میں اپنی روح اس جسم میں داخل کر دوں اور اس کے بعد ہم دونوں اس گہرے غار کی بلندی طے کر کے اوپر تک پہنچ جائیں۔ لیکن باہر وہ لوگ ہمارے منتظر ہوں گے اور اس کے علاوہ تمہارے والدین بھی ان کے قبضے میں ہیں۔ چنانچہ ایک نئی جنگ کا آغاز یہیں سے ہو جائے گا اور بہرحال ہم ان کے علاقے میں ہیں۔ ہمیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک طویل کھیل کھیلنا ہوگا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس طرح ہم فوری طور پر مصروف ہو جائیں گے۔ اور ہمیں جم کر کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ لیکن دوسری شکل کیا ہو سکتی ہے؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''بالکل...... میں تمہیں وہی بتانے جارہا ہوں۔''

''جی، میں منتظر ہوں۔''

''برف کی اس سل کو تم اپنے ذرائع سے اوپر لے جانے میں کامیاب ہو سکتے ہو؟''

''ہاں...... میرے پاس مکمل طور پر ایک وزنی چٹان کو اوپر لے جانے کے انتظامات ہیں۔''

''تب تم وہی طریقہ کار اختیار کرو گے اور آخر کار میرا جسم ان کے حوالے کر دو گے۔ اس طرح تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ تمہیں دینا چاہتے ہیں یا تم جس کے خواہش مند ہو۔ لیکن درپردہ ہم دونوں ساتھ مل کر کام کریں گے۔ میں تمہیں مکمل طور سے گائیڈ کروں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے وہ میرے جسم کو اس برف سے آزاد کرا لیں گے اور اس کے بعد میرے اندر صلاحیت ہو گی کہ میں اپنے اس جسم میں روح ڈال کر اسے متحرک کرسکوں۔ پھر ہم جو کچھ بھی کریں گے وہ ہماری ضرورت کے مطابق ہوگا۔ تمہیں بھی وہ لوگ عزت و احترام دیں گے چونکہ تم نے ان کے مقصد کی تکمیل کی ہو گی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ میرا تم سے اس طرح رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ میں لمحہ لمحہ تمہارے ساتھ رہوں گا اور تمہیں ہدایات دیتا رہوں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ کیسا رہے گا یہ کھیل؟''

''انتہائی دلچسپ اور پُر لطف۔'' شہباز نے خوش ہو کر کہا۔ ''واقعی ایک بہت ہی پُر کشش کھیل شروع ہو جائے گا جو ہزاروں دلچسپیوں کا باعث ہو گا۔''

''تو پھر ہمارے درمیان یہ سب کچھ طے ہے؟''

''بالکل طے۔''

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم برف کی اس سل کو کس طرح بلندی تک لے جاؤ گے؟'' رازل جریری نے کہا اور شہباز اسے اپنا منصوبہ بتانے لگا۔ رازل جریری بولا۔

''ٹھیک ہے...... میں تمہارے اس منصوبے سے متفق ہوں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد ہم یہ کام شروع کر دیں گے۔''

شہباز مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور پھر اس کے بعد اس نے کہا۔ ''میری زندگی کے لئے انتہائی انوکھا تجربہ ہے جناب! میں آپ کو دیکھ نہیں سکتا لیکن میں آپ کو محسوس کر رہا ہوں۔''

''نہیں میرے پیارے دوست! نگاہیں اٹھا کر برف کی سل کے اندر دیکھو اور مجھے جھانک لو۔ میں وہی تو ہوں۔''

''ارے ہاں...... مگر کیا ہی دلچسپ بات ہے۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میری زندگی کے ایک انتہائی انوکھے اور دلچسپ مرحلے کا آغاز ہو رہا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' رازل جریری نے جواب دیا۔

شہباز جس فطرت کا مالک تھا اس میں سوچنے اور غور کرنے کا کوئی مرحلہ شامل نہیں تھا۔ جب فیصلہ کر لیا تو پھر کر ہی لیا۔ دیر کرنا بے معنی۔ یہ فیصلہ اس نے ان لوگوں کے درمیان بھی کیا تھا اور زندگی اور موت کا یہ کھیل کھیل ڈالا تھا جو بہرحال زندگی کا کھیل ہی ثابت ہوا تھا۔ اور اب یہ ساری کوششیں۔ انہوں نے اسے واقعی یہ بہترین ذرائع مہیا کئے تھے اور شہباز ان ذرائع کو صحیح استعمال کرنے کا ذریعہ بنا تھا۔

چنانچہ سب سے پہلے اس نے ان ہتھوڑوں سے برفانی سِل چوکور شکل میں کاٹی اور جب یہ سِل بالکل الگ تیار ہو گئی تو وہ اپنے وہ تمام ذرائع استعمال کرنے لگا۔ رازل جریری کی ہدایات اس کے ساتھ شامل تھیں اور برف کی سِل ان مضبوط رسیوں سے منسلک کر دی گئی۔ رازل جریری نے سوال کیا۔

''یہ سِل کتنی دیر میں اوپر تک پہنچ جائے گی؟ ویسے تو اس برف کو پگھلانے کے لئے بہت وقت درکار ہو گا۔ لیکن پھر بھی میں اس خوف سے آزاد ہونا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ برف اوپر جانے کے راستے میں ہی نہ پگھل جائے۔''

''نہیں جناب! یہ بہت جلد اوپر پہنچ جائے گی۔''

''چلو پھر کوشش کرو۔''

اور پھر اس کے بعد ایک بھیانک جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ سِل کو مضبوطی سے رسوں سے باندھا گیا۔ نائیلون کے انتہائی موٹے رسے ایک خاص عمل کے ذریعے اوپر لگی ہوئی کیلوں سے منسلک کر دیئے گئے اور انتہائی پھرتیلے جسم کا مالک اور بے حد شاندار ذہنی صلاحیتیں رکھنے والا بہر طور ہر ممکن طریقے سے حفاظت کے ساتھ اس سِل کو باہر لانے لگا۔ اوپر ہیلی کاپٹر گردش کر رہے تھے اور ایک عجیب سنسنی خیز فضا اور ماحول قائم تھا۔ وہ لوگ امید و بیم کی کیفیت کا شکار تھے۔ پھر جب تقریباً ان گہرائیوں کا آدھا سفر طے ہو گیا تو شہباز نے ٹرانسمیٹر پر ان سے رابطہ قائم کیا جو ایک لمحے میں قائم ہو گیا تھا۔

''ہیلو شہباز...... ہیلو ہیلو...... شہباز......'' شہباز کی آواز سن کر اوپر ہلچل مچ گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں پلاسکو کے متعلقہ حکام کو اس بات کی امید تھی کہ یہ شاندار صلاحیتوں کا مالک نوجوان اس مشن کی تکمیل کر ہی ڈالے گا۔ چنانچہ جب شہباز کی آواز سنائی دی تو ہر طرف سنسنی پھیل گئی اور اسے جواب دیا جانے لگا۔

''میں رازل جریری کے جسم کو اوپر تک لا رہا ہوں...... ہمارا آدھا سفر طے ہو گیا۔ باقی سفر بھی مخصوص ذرائع سے طے ہو جائے گا۔''

''تم فوراً کیمرہ آن کر دو شہباز! ہم ڈائریکشن دیکھیں گے اور اس کے بعد تم سے رابطہ قائم کریں گے۔ ٹرانسمیٹر بھی آن رکھو۔ کیا تم ہماری آواز بخوبی سن رہے ہو؟''

''ہاں......''

''اور ہم بھی تمہاری آواز پوری بہتری کے ساتھ سن رہے ہیں۔'' اور اس کے بعد اوپر کے رابطے جاری ہو گئے۔ شہباز نے وہ کیمرہ آن کر دیا جو اس کی کارروائی کو اوپر پیش کرتا لیکن اوپر سے جواب ملا۔

''نہیں شہباز! ٹرانسمیٹر بے شک کام کر رہا ہے لیکن کیمرے نے ابھی تک کام نہیں کیا۔

اس کی رینج ابھی کم ہے۔ لیکن تم اسے آن رکھو۔ بے فکر رہو، وہ خراب نہیں ہوگا۔ جیسے ہی ہمیں اس کی پہلی تصویر ملی ہم تمہیں اس سے آگاہ کریں گے۔"

پھر مزید فاصلے طے ہوتے رہے اور کافی اوپر پہنچنے کے بعد اچانک ہی اوپر سے کہا گیا۔

"زندہ باد شہباز! زندہ باد۔ اب ہم تمہیں تمہاری کارروائیوں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اپنی حفاظت بھی کرو۔ تم اپنے آپ سے بے خبر ہو رہے ہو۔"

"میری فکر نہ کریں جناب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شہباز جو بندروں کی طرح بغیر کسی سہارے کے پھدک پھدک کر ان کیلوں کو پکڑ رہا تھا اور اعتماد کے ساتھ اوپر چڑھ رہا تھا، بولا۔ جو لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے انہیں پسینے آ رہے تھے۔ کسی انسان کے سینے میں دل کی جگہ اتنا سخت پتھر بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہر طرح کے خوف کو نظر انداز کر دے۔ یہ ان کے لئے ناقابل یقین سی بات تھی۔ لیکن مسٹر جیفرے نے کسی معمولی نگاہ کا کام نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس بے جگر نوجوان کو بخوبی دیکھا تھا۔ اور تبھی یہ عجیب و غریب فیصلہ کیا تھا اور ان کا یہ فیصلہ کتنا درست نکلا یہ بات اب سامنے آ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اتنی بلندی تک آ گئے کہ اس کے بعد ہیلی کاپٹر سے مدد حاصل کی جا سکے۔ اوپر لمحے لمحے کے رابطے تھے اور ہر ٹیکنیکل کوشش کی جا رہی تھی۔

چنانچہ ایسے جال خاص طریقے سے نیچے پھینکے گئے جن میں برف کی اس سل کو سنبھال لیا جائے اور شہباز کو ہدایات دی جانے لگیں۔ ہیلی کاپٹروں نے زندگی کی بازی لگا کر اس غار کے دہانے کے عین اوپر آ کر برف کی اس سل کو جال میں سمیٹ لیا اور پھر اسے لے کر چل پڑے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد شہباز بھی اوپر پہنچ گیا۔ اور جب اس نے برف کے ٹھوس راستے پر پہلا قدم رکھا تو بے شمار افراد نے دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔

......

پلاسکو کے ایک انتہائی خفیہ ہیڈ کوارٹر میں ایک اہم میٹنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ لیبارٹری میں وہ برف کی سل پہنچا دی گئی تھی جس کے حصول کے لئے نجانے کتنے سال کتنی رقم اور کتنی انسانی زندگیاں ضائع کی گئی تھیں۔ لیبارٹری کے اس مخصوص حصے میں یہ برف کی سل محفوظ کر دی گئی تھی اور بے شمار افراد نے اس شخص کا جائزہ لیا تھا جس نے ایک نادیدہ روح کی حیثیت سے حکومت پلاسکو کے اتنے شدید نقصانات کئے تھے کہ پلاسکو حکومت ہل کر رہ

گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسے دیکھ کر شدید نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ادھر خفیہ ہیڈ کوارٹر میں جو میٹنگ ہو رہی تھی اس میں حکومت پلاسکو کی ذہنیت کا صحیح مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ وہ لوگ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نوجوان بے مثال شخصیت کا مالک ہے اور اس نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ ہمارے لئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہماری ان کاوشوں کا ایک رازدار موجود ہے۔ ہمیں بلاوجہ ایک شخص کی حفاظت کے لئے سرگرم ہونا پڑے گا۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ اگر کبھی رازل جریری کا راز منظر عام پر آئے اور دنیا میں کوئی اسے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو اسے ایک ایسا شخص دستیاب ہو سکے جو اس کے بارے میں مکمل تفصیلات بتا دے۔ یہ ایک سنگین صورتحال ہوگی۔ اور ہمیں بلاوجہ اس کے لئے سرگرم ہونا پڑے گا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں ڈاکٹر بینسن!"

"ہم نے اس طرح کے خطرے کبھی اپنے لئے نہیں رکھے بلکہ جب بھی کبھی ہمیں ایسے کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑا ہم نے اس سے نمٹنے کی کوشش کی اور ہمارا یہی طریقہ کار سب سے بہتر رہا کہ ہم اسے ختم کر دیں۔"

"تو پھر اس نوجوان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"نہیں، تھوڑی سی زندگی تو اسے دی جائے گی۔ جو کام اس نے ہمارے لئے سرانجام دیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اسے دارالحکومت میں ایک شاندار رہائش گاہ مہیا کرتے ہیں جہاں اس کے والدین بھی اس کے ساتھ ہی رہیں گے۔ انہیں ہر آسائش دی جائے گی اور پھر ایک دن اس رہائش گاہ میں آگ لگ جائے گی اور وہ تینوں بے چارے اس آگ میں جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔ انعام کے طور پر یہ تھوڑی سی زندگی انہیں دی جا سکتی ہے۔ میں اس کی پُرزور سفارش کرتا ہوں۔"

کئی افراد کی ہنسی اُبھری۔ اور پھر اس سفارش کو قبول کر لیا گیا۔ میٹنگ کے شرکاء میں جیفرے بھی تھا اور نجانے کیوں جیفرے کے دل کو ایک دُکھ کا سا احساس ہوا تھا۔ نیلسینا تو اس نوجوان سے بہت ہی متاثر تھی۔ لیکن بہرحال ملکی مفادات ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتے تھے۔ چنانچہ جیفرے ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ گویا رازل جریری کی پیش گوئی سو فیصدی درست ثابت ہوئی تھی اور پلاسکو کے سربرآوردہ لوگوں نے شہباز کے اس

دلچسپ کارنامے پر انعام کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن ان میں سے کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس جال میں ایک پراسرار وجود موجود ہے۔ ہلکی ہلکی خاص طرح کی سرسراہٹیں اُبھری تھیں لیکن کسی کی توجہ اس طرف نہیں گئی تھی۔ بڑی سی میز کے نیچے جس کے چاروں طرف میٹنگ کے ارکان بیٹھے ہوئے تھے ایک ٹیپ ریکارڈر لگا ہوا تھا اور وہ یہاں کی ساری آوازیں ریکارڈ کر رہا تھا۔

میٹنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جب وہاں کوئی بھی باقی نہ رہا تو ایک نادیدہ ہاتھ نے وہ ٹیپ ریکارڈر نکال کر سنبھال لیا۔ اور اگر کوئی دیکھنے والا ہوتا تو بس اتنا ہی دیکھتا کہ ٹیپ ریکارڈر فضا میں تیرتا ہوا دروازوں میں سے باہر نکل گیا ہے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ نظارہ ہوتا دیکھنے والوں کے لئے۔ اس طرح خاصی ہنگامی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک طرف تو لیبارٹری میں برف کی اس سل کا بڑے بڑے سائنسدان تجزیہ کر رہے تھے جس میں رازل جریری کا جسم قید تھا۔ یہ برف چونکہ بہت عرصے سے اپنی یہی ہیئت رکھے ہوئے تھی اس لئے انتہائی سخت ہو گئی تھی۔ دوسری طرف ایک شاندار رہائش گاہ میں شہباز شبیلہ اور فیض شاہ کے ساتھ موجود تھا اور یہ لوگ بھی بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ فیض شاہ نے مسکراتے ہوئے شبیلہ سے کہا۔

''زندگی کا آغاز کنٹری بستی سے کیا تھا جہاں پکی زمین کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ بارش ہوتی تو پوری بستی دلدل بن جاتی تھی۔ لیکن ایک بات کہوں شبیلہ! اس دلدل میں ننگے پاؤں چلنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ گاڑھی گاڑھی کیچڑ ٹخنوں کے اوپر تک پیروں میں لگ جاتی تھی اور کبھی کبھی اس کے چھینٹے اُڑ کر چہرے پر بھی پہنچ جاتے تھے۔ پھر جب وہ چکنی مٹی چہروں پر سوکھ جاتی تھی تو جو مزہ آتا تھا میں تجھے اس کے بارے میں بتا نہیں سکتا۔ نفرت ہے مجھے طارق شاہ سے جس نے مجھ جیسے مخلص آدمی کو کھو دیا۔ اور ایک بات میں تجھے بتاؤں، اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو، تو یقین کر کہ وہ سرکس کو مٹا کر پھینک دیتا، مجھے نہ چھوڑتا۔ ہم انہی خوابوں میں جیتے ہیں شبیلہ! کہ ایسا ہوتا تو ویسا ہوتا اور ویسا ہوتا تو ایسا ہوتا۔ اور ہوتا کیا، یہ تو وہی جانتا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے۔ سسرے نے وہ مٹا کر برباد کر دیا جو میں نے اس کے باپ کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ اگر مان لیتا، ہماری بات کو تسلیم کر لیتا، ہماری اس برتری کو کہ ہم اس کے اپنے ہیں، اس کے بڑے ہیں تو فائدے میں رہتا۔

سسرے کو ملا کچھ بھی نہیں۔ بہرحال اب سرکس سے تو رشتہ ٹوٹ ہی گیا مگر بھیا! تیرے بیٹے کا سرکس سب سے بڑا ہے۔ سب سے اچھا ہے۔ کیونکہ اس نے ہمیں یہ زندگی دی۔ مگر ایک شکایت ہے شہباز سے۔''

شہباز نے مسکرا کر فیض شاہ کو دیکھا اور بولا۔ ''نہیں شاہ بابا! ابھی آپ نے وہ شکایت مجھے بتائی نہیں ہے۔ آپ کو اور بھلا میں شکایت میں رہنے دوں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ کی انگلی کا سہارا لے کر تو میں نے دنیا کی ہر چیز سیکھی ہے۔ آپ مجھے بتائیے، آپ کو کیا شکایت ہے شاہ بابا؟''

''بھیا! تو نے ہمیں اپنے اس سرکس کے بارے میں نہیں بتایا جسے کر کے تو ہمیں یہاں تک لے آیا۔ ویسے تیری اس بڑائی کو تو ہم مان گئے ہیں کہ تو نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ زندگی کے اُلٹ پھیر یہی تو ہوتے ہیں۔ کہاں سے شروع ہوئے تھے، کہاں پہنچ گئے۔ اور اب اس کے بعد زندگی بھر عیش ہی عیش۔ یہ بتاؤ، ان لوگوں نے تم سے جو کام لیا ہے کیا اس کے بعد یہ دوبارہ بھی اسی طرح کام لیں گے تم سے؟''

شہباز سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور اس کے بعد مدھم لہجے میں بولا۔ ''شاہ بابا! یہ لوگ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف اپنی مطلب براری کے لئے ہمیں استعمال کیا تھا۔ جو داستان میں آپ کو سناؤں گا وہ بہت ہی عجیب ہے۔ ہمیں ان کے چنگل سے نکلنا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ مکمل طور پر ناقابل اعتبار ہیں۔ رازل جریری یہی کہتے ہیں۔''

فیض شاہ اور شبیلہ نہ سمجھنے والی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے تو شہباز نے کہا۔

''آپ لوگوں سے زیادہ میرے لئے کوئی بھی محترم نہیں ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ دنیا کی کوئی بات آپ سے چھپانا بھی میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ شاہ بابا! اب ان کی پوری کہانی سنئے۔''

یہ کہہ کر شہباز وہ پوری تفصیل بتانے لگا جس کا آغاز شبیلہ اور فیض شاہ کے اغواء سے ہوا تھا۔ اس میں رازل جریری کے بارے میں بھی تفصیل موجود تھی۔ فیض شاہ غور سے یہ سب کچھ سن رہا تھا جبکہ شبیلہ کا منہ تو حیرت سے کھلا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس نے شہباز کے خاموش ہونے کے بعد کہا۔

''کالج میں پڑھایا تھا نا تجھے۔ شہر میں تعلیم دلوائی تھی۔ کہانیاں گھڑنا سیکھ گیا۔ کیسی

خوفناک کہانی سنائی ہے تو نے مجھے۔ روح الگ اور جسم الگ ہو ہی نہیں سکتا شریر کہیں کے اب سچ بات بتا۔"

"یہ جو کچھ کہہ رہا ہے مہربان بہن! ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ایک اجنبی آواز ان دونوں نے سنی لیکن یہ آواز شبیلہ اور فیض شاہ کے لئے اجنبی تھی۔ شہباز نے اسے فوراً پہچان لیا۔ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں...... آپ نے شہباز کی بات پر شک کیا تھا نا۔ ایک روح جسم سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ فیض شاہ صاحب! آپ دنیا دار انسان ہیں۔ بہت عمر ہے آپ کی۔ اور آپ نے بہت اچھی طرح دنیا دیکھی ہے۔ آپ کے سامنے اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے یہ بات میں جانتا ہوں۔ لیکن اس طرح شہباز کی بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ میں ہی رازل جریری ہوں۔ جس روح کا تذکرہ شہباز نے کیا ہے اور اس کا یہ خدشہ بھی بالکل ٹھیک ہے کہ پلاسکو کے حکمران بہت ہی بدنیت اور برے لوگ ہیں۔ انسانیت انہیں چھو کر نہیں گئی ہے۔ یہ اپنی پالیسیاں بناتے ہیں اور کبھی اس میں اپنے لوگوں کو جھونک دیتے ہیں اور کبھی ساری دنیا کو۔ شہباز! میں نے ہی تمہیں ہوشیار کیا تھا ان لوگوں کی طرف سے اور دیکھو، یہ میرے شک کی تصدیق ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک ٹیپ ریکارڈر فضا میں نمودار ہوا جیسے کسی نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہو اور پھر وہ ان کے سامنے میز پر آ ٹکا۔ ایک نادیدہ ہاتھ نے اسے ریوائنڈ کیا کیا اور اس کے بعد اس سے اس میٹنگ میں ہونے والی گفتگو کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس میں شہباز کے مستقبل کا منصوبہ بھی تھا۔ یعنی ان تینوں افراد کی موت۔ فیض شاہ اور شبیلہ تھوڑا بہت سمجھ پا رہے تھے لیکن شہباز بہت اچھی طرح اس تمام گفتگو کو سمجھ رہا تھا اور انہیں بھی سمجھا رہا تھا۔ یہ منصوبہ سن کر سب کے سب دنگ رہ گئے۔ شہباز کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"واقعی کمینے لوگ ہیں۔ انسانیت سے بہت دور کے لوگ۔ بہت ہی گرے ہوئے۔"

شہباز شدتِ غصہ سے خاموش ہو گیا۔

"تم لوگوں کی حیثیت اب میرے لئے ایک خاندان جیسی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دنیا کا ہر شخص لالچی ہوتا ہے۔ میں بھی لالچی ہوں۔ شہباز سے میرے مستقبل کے بہت سے معاملات وابستہ ہیں۔ میں اسے اپنے مقصد کے لئے آئندہ استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں اس کی ہر بہتری کا خواہش مند بھی ہوں اور آپ لوگوں کے ساتھ مل کر میرا ایک چھوٹا سا خاندان بن چکا ہے۔ اور بے فکر رہیں۔ آپ یا شہباز کسی بھی طرح ان کے چنگل میں نہیں پھنسیں گے۔ بہت جلد آپ لوگوں کو ایک محفوظ ٹھکانہ مل جائے گا۔ میں آپ کو یہاں سے دور لے چلوں گا۔ شہباز کی دنیا وہی ہے جو شہباز کو پسند ہے۔ لیکن بس تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ جانتے ہو شہباز! اس کے ساتھ ساتھ اور کیا کیا منصوبے بنائے گئے ہیں؟"

"آہ...... مسٹر رازل جریری! افسوس، اگر آپ انسانی شکل میں ہوتے تو ہم......"

"نہیں...... انسانی شکل میرے لئے کافی خطرناک ہے۔ لیکن میں اپنے جسم کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ مجھے بہرحال جگہ جگہ اس کی ضرورت پیش آئے گی آگے کی منصوبہ بندی میں۔ لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں ان لوگوں کا اگلا منصوبہ کیا ہے۔ ٹیپ بند کر دو۔ وہ لوگ ایک سرد جہنم بنا رہے ہیں۔ میں نے عجب سے الفاظ کہے ہیں، سرد جہنم...... انتہائی سخت سرد خانہ جسے مشینی ذریعوں سے نقطہ انجماد سے نجانے کتنا نیچے لے جایا جائے گا۔ اور میرے بدن کو اس سرد جہنم میں رکھا جائے گا۔ وہ لوگ اس طرح جگہ کو ترتیب دے رہے ہیں کہ کوئی انسان ایک سیکنڈ سے زیادہ وہاں زندہ نہ رہ سکے۔ میرا جسم وہاں جما دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے مجھے برف کی سِل سے نکالنے کا فیصلہ ترک کر دیا ہے اور اب اس سرد جہنم میں رکھ کر اپنی دانست میں وہ میرے خطرے کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی نیت کیا ہے۔ شہباز! یہ ایک غیر متوقع اور خطرناک کام ہے۔ اگر وہ لوگ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں نہیں جانتا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ ایک بار پھر تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔"

شہباز شدید بے چینی محسوس کرنے لگا۔ پھر بولا۔ "میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟"

"وہ میں نے سوچ لیا ہے۔" رازل جریری کی آواز ابھری۔

"تب ٹھیک ہے...... بالکل بے فکر رہو۔ میں تمہارے لئے ہر طرح سے زندگی کی بازی لگانے کے لئے تیار ہوں۔"

''ٹھیک ہے فیض بابا اور شبیلہ بہن! کیا آپ مجھے اس قابل فخر انسان کو کچھ وقت کے لئے مزید دے سکیں گے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ رازل جریری جیسی شخصیت کی ہر طرح سے مدد کرنا چاہئے۔ اور ویسے بھی تم نے اپنا مستقبل منتخب کر لیا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' فیض شاہ نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

''اول تو وہ لوگ ہمیں مکمل آزادی دے چکے ہیں کہ ہم جو چاہیں کریں لیکن اگر میرے بارے میں پوچھا جائے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوجوان لڑکا ہے۔ سیر و سیاحت کے لئے نکل گیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے...... تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ یہاں کے معاملات ہم سنبھالے رکھیں گے۔'' فیض شاہ نے مطمئن لہجے میں کہا اور پھر وہ حیران نگاہوں سے شہباز کو اس طرح جاتے دیکھتے رہے جیسے وہ کسی کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہو۔ لیکن انہیں دوسرا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

✿......✿

ہوٹل الاسکا میں ایک شاندار کمرہ حاصل کر لیا گیا۔ بظاہر ایک ہی آدمی نے یہ کمرہ حاصل کیا تھا اور وہ تھا شہباز۔ لیکن وہ دو تھے یعنی رازل جریری بھی ساتھ ہی تھا اور اسی نے یہ مشورہ بھی دیا تھا۔ ابتدائی مرحلوں سے فارغ ہونے کے بعد رازل جریری نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''ابھی تک جو صورتحال ہے شہباز! وہ یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی دانست میں مجھ پر قابو پا چکے ہیں کیونکہ میرا بدن ان کے قبضے میں ہے اور تھوڑے ہی وقت کے بعد وہ مجھے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں گے۔ انہوں نے کچھ اور انتظامات بھی کئے ہیں جو ان کے خیالات کے مطابق کسی روح کا راستہ روکنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ میں وہاں تک آسانی سے آ جا سکتا ہوں۔ میں اگر چاہوں تو لمحوں کے اندر اندر ان کی وہ لیبارٹری بھی تباہ کر دوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے تو دنیا کی بقاء کے لئے کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن ان لوگوں کے لئے میں کیا کروں جو مجھے میرے راستوں سے ہٹا کر برائی کے راستوں کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ وہ میری سائنسی صلاحیتوں کو اپنے قبضے میں کر کے مجھ سے میرے مزاج کے الٹ کام کرانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو مستقبل میں لاکھوں افراد کی موت کا سبب بننے والے ہوں، مٹا دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے میں کوئی دکھ نہیں محسوس کرتا اور نہ ہی اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔ میرے دوست شہباز! اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں آئندہ کے لئے اپنا لائحہ عمل مرتب کر لوں۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ ہم کچھ وقت یہاں گزارنے کے بعد، میرا مطلب ہے تیاریاں کرنے کے بعد یہاں سے ایک اور ملک روانہ ہو جائیں گے۔ اور اس ملک کا نام ہے میلیکو...... میلیکو میں، میں نے اپنے مقصد کے لئے بہت سے بہتر مقامات پائے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میلیکو حکومت پلاسکو کی حرکتوں سے نالاں ہے اور وہاں

اگر ہمارا انکشاف بھی ہو گیا تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اگر ہم ان لوگوں کو مطمئن کر دیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب ہم یہاں سے مکمل کارروائی کے بعد باہر نکل جائیں۔ میں نے جو لائحہ عمل مرتب کیا ہے اس میں صورتحال یہی ہے کہ اب چونکہ مجھے ایک طریقہ کار حاصل ہو گیا ہے، میں ایک لمحے کے اندر اندر اپنا بدن چھوڑ سکتا ہوں اور ایک لمحے کے اندر اندر اپنے وطن واپس جا سکتا ہوں۔ یہ ایک خوبصورت راستہ ہے۔ لیکن اس کے لئے میرا بدن میری تحویل میں ہونا چاہئے۔ اگر کہیں بہت ہی مجبوری ہو تو پھر تو صورتحال مختلف ہے ورنہ عموماً میں اپنے جسم میں ہی رہوں گا۔ میں وہیں اس غار میں ہی تم سے یہ درخواست کرتا کہ میرے بدن کے گرد بنا ہوا برف کا حصار توڑ دو تا کہ میرا جسم نمایاں ہو جائے۔ میں سارے کام کر لیتا ہوں۔ بس یہی ایک کام میرے لئے مشکل ہوتا اور اس کے لئے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اب میں تمہیں وہ تمام تفصیلات بتاتا ہوں جن کے تحت ہم اپنا دوسرا کام سرانجام دیں گے۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں چہرے بدلنے میں مہارت حاصل ہے۔''

''ہاں...... میں یہ کر سکتا ہوں۔'' شہباز نے ایک دم حیرت سے کہا کیونکہ اسے اس وقت یاد نہیں رہا تھا کہ وہ یہ بات رازل جریری کو بتا چکا ہے۔

''اب تم بازار سے وہ سامان خریدو گے جو چہرے بدلنے میں معاون ہوتا ہے اور اس کے بعد میری دی ہوئی ایک تصویر کے مطابق اپنے چہرے میں تبدیلیاں پیدا کرو گے۔''

''گویا مجھے کسی اور شخص کا روپ اختیار کرنا ہو گا؟''

''ہاں...... وہ پروفیسر بیراٹ ہے۔ اور پروفیسر بیراٹ اس وقت اس سرد جہنم کی تشکیل کر رہا ہے۔ وہ دن میں تین شفٹوں میں کام کرتا ہے۔ صبح سات بجے سے دو بجے تک۔ دو بجے وہ اپنے گھر واپس آتا ہے، لنچ کرتا ہے اس کے بعد چار بجے واپس پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ رات کو دو بجے تک وہاں رہتا ہے۔ پھر واپس آ جاتا ہے اور دوبارہ پھر وہاں جاتا ہے اور چھ بجے تک کام کرتا رہتا ہے۔ یہ اس کا طریقہ کار ہے۔ ہمارے لئے دن کا وقت ہی مناسب ہے۔ یعنی وہ وقت جب ہم وہاں کام کریں گے۔ تمہیں پروفیسر بیراٹ کی جگہ لینی ہے اور پروفیسر بیراٹ، بہر حال وہ ایک ایسا خطرہ ہے جس کا ختم ہو جانا ضروری ہے۔ ہم اسے اس وقت اغوا کریں گے جب وہ اپنی سات بجے والی شفٹ ختم کر کے اپنے

گھر آ رہا ہو گا۔ اس سے پہلے تم اس کا چہرہ اختیار کر کے اس بات کے لئے تیار رہو گے کہ تم اس کی جگہ جاؤ۔''

شہباز کو یہ سب کچھ بہت دلکش محسوس ہوا تھا۔ صرف ایک ہلکا سا خیال اس کے ذہن کو اُلجھا رہا تھا، پروفیسر بیراٹ کی موت۔ اور رازل جریری نے غالباً اس کے اس احساس کو سمجھ لیا۔

''میرے عزیز دوست! زندگی جب مشکل لمحات سے نبرد آزما ہوتی ہے تو انسان کو بہت سے کام اپنی مرضی کے خلاف کرنا ہوتے ہیں۔ میں خود بھی انسانوں سے محبت کرنے والوں میں سے ہوں۔ کسی ایک ننھی سی چڑیا کی موت بھی میرے لئے دُکھ کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن ہم بڑے مفاد کے لئے چھوٹے چھوٹے پودے کاٹ دیا کرتے ہیں۔ وہ جو تناور درخت بن کر ماحول کو چوس جائیں، ان کا ختم ہو جانا بہت ضروری ہوا کرتا ہے۔ اس لئے تم یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔''

''ٹھیک ہے...... تو اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''تیار ہو جاؤ...... ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہم باہر نکلیں گے اور تیاریاں کریں گے۔''

ایک دلچسپ دور شہباز کی زندگی میں آ گیا تھا۔ زندگی کے لاکھوں اُلٹ پھیر ہوئے تھے اور نجانے کیسے کیسے مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ لیکن ان لمحات کو وہ بالکل خواب کی سی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ کہیں جاتا تو تنہا نہیں ہوتا تھا لیکن دیکھنے والوں کی نگاہوں میں بالکل تنہا۔ اس وقت بھی رازل جریری اس کے ساتھ تھا اور اب ان ہلکی ہلکی سرسراہٹوں سے شہباز اس کی قربت کو محسوس کر سکتا تھا جو صرف اسے ہی سنائی دیتی تھیں۔ ایک بہت بڑے اسٹور سے شہباز نے اپنی معلومات کے مطابق مطلوبہ اشیاء خریدیں۔ رازل جریری کا پُراسرار وجود ایک طرح سے ہر کام کر سکتا تھا۔ ادائیگی کرنے کے بعد وہ واپس پلٹے اور جب اپنے کمرے میں داخل ہو کر شہباز نے تمام سامان رکھا تو رازل جریری نے ایک بہت ہی نمایاں تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ رنگین تصویر تھی اور اس میں پروفیسر بیراٹ کا ایک ایک نقش نمایاں تھا۔ اس کا رنگ، اس کی آنکھیں، اس کے بال، اس کے کانوں کا اسٹائل اور بے شک یہ چہرہ اپنانے میں بڑی مہارت کا ثبوت دینا تھا۔

چنانچہ بہت عرصے کے بعد شہباز کو اپنی فنکارانہ صلاحیتیں یاد کرنا پڑیں۔ رازل جریری

نے کہا۔

"اب تم شروع ہو جاؤ اور میں کچھ وقت کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ کیونکہ تنہائی میں انسان پوری یکسوئی کے ساتھ وہ کام سرانجام دیتا ہے جو اس کے فن کا آئینہ ہوتا ہے۔ کسی کی موجودگی بہرحال ذہن کو تھوڑا سا متاثر ضرور کرتی ہے لیکن میں تم سے زیادہ دور نہیں رہوں گا۔ اور بے فکر رہو، تمہاری ہر مشکل کی ڈھال کے طور پر میں موجود ہوں۔"

شہباز نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی اور پھر وہ گردن جھٹک کر واش روم کی جانب بڑھ گیا تاکہ اپنے چہرے کو واش کر کے اپنے کام کا آغاز کر دے۔ اور اس وقت اسے اپنے وہ محبت کرنے والے یاد آ رہے تھے جنہوں نے اسے یہ فن بخشا تھا۔ اور اس کے بعد بے چارے ایک المیئے کا شکار ہو گئے تھے۔

نجانے کیوں شہباز کو یہ احساس ہوا کہ فریدوں اس وقت اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اسے ہدایات دے رہا ہے۔ اس کا محسن، اس کا رہنما جس کا تصور اس کے سامنے آ بیٹھا تھا اور شہباز نے اپنی زندگی کا یہ پہلا نقش ترتیب دیا تھا۔ لیکن اس طرح کہ اگر خود ڈاکٹر بیراٹ بھی اسے دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ وہ دو حصوں میں کس طرح تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک ایک نقش سے فارغ ہونے کے بعد جب شہباز نے خود اپنا چہرہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہ اس تصویر کا مکمل عکس بن چکا تھا۔ اور پھر اس نے تمام سامان سمیٹا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے کا مطلب یہ تھا کہ رازل جریری کو اطلاع دے کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا ہے۔ تبھی ایک سرسراہٹ کے ساتھ ایک حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

"آہ...... واقعی۔ جو لوگ زندگی میں کوئی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ایسی ہی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ تو تم مکمل طور پر پروفیسر بیراٹ بن گئے۔ ناقابل یقین، حیرت انگیز...... اوہ میرے خدا! کیا انسانی ہاتھوں کو یہ فن بھی بخشا گیا ہے؟ نوجوان لڑکے! میں تمہاری جس قدر بھی تعریف کروں کم ہے۔ اور میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں اس شخص کو جس کا نام غالباً تم نے فریدوں بتایا تھا۔ جب اس کا شاگرد اتنا بڑا فنکار ہو گا، کمال ہے بھئی کمال ہے...... اتنا مطمئن ہوں میں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور ایک پیش گوئی میں تمہارے بارے میں کر دوں، جس شخص کو قدرت نے اتنی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہو، وہ بلاوجہ اس دنیا میں نہیں آتا۔ دنیا میں اس کی آمد کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اور

میں......" رازل جریری خاموش ہو گیا۔ بہت زیادہ تعریف کر دی تھی اس نے اور شہباز کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

"اب چونکہ ہمیں ایک اہم مشن کا آغاز کرنا ہے، ایک ٹیلی فون کر کے اپنے والدین کو مطمئن کر دو۔ اور ان سے کہو کہ تمہاری غیر موجودگی کی وہ فکر نہ کریں۔ کچھ دوستوں کے ساتھ نکل گئے ہو اور تفریحات میں مشغول ہو۔ ہو سکتا ہے واپسی میں ایک دو دن لگ جائیں۔ احتیاطاً یہ الفاظ تم ان سے کہہ دو۔"

"میں بھی یہ ضروری سمجھتا ہوں۔"

اور اس طرح واقعی شہباز نے بروقت فیض شاہ اور شبیلہ کو یہ اطلاع دی تھی۔ کیونکہ اس ٹیلی فون کے سلسلے منقطع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد چند افراد اس فلیٹ پر پہنچے تھے اور انہوں نے شہباز کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ فیض شاہ نے مسکراتے ہوئے آنے والے سے کہا۔

"باہر گیا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نکلا تھا۔ اصل میں نوجوان اولاد بوڑھے والدین کے ساتھ صرف اخلاقاً وقت گزار لیتی ہے۔ ورنہ ان بوڑھوں کے درمیان اس کا دل کہاں لگے۔ غالباً کسی لڑکی کا فون آیا تھا۔ ہم نہیں جانتے یہاں پلاسکو میں اس کی شناسا کون بن گئی۔ لیکن ایسا ہوا۔ بڑی سج دھج کے ساتھ گیا ہے۔ لڑکی غالباً اسے شہر سے کہیں باہر لے جانا چاہتی تھی۔"

آنے والوں میں سے ایک نے دوسرے کی شکل دیکھی۔ کل دو افراد تھے۔ اور پھر بولا۔ "لیکن اس کے باوجود سر! ہم آپ کو ایک نمبر دیئے دیتے ہیں۔ جب بھی اسے کہیں جانا ہو آپ اس نمبر پر ہمیں اطلاع دے دیا کریں۔ ہمارے لئے وہ اتنا اہم کردار ہے کہ ہم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے۔ سو دوست، سو دشمن۔ کہیں وہ کسی مشکل کا شکار نہ ہو جائیں۔ آپ نے یہ نہیں دیکھا، یہاں سے باہر نکل کر وہ کسی کار میں بیٹھا یا......"

"نہیں...... اصل میں وہ خود بھی بے حد سمجھدار ہے اور ہم اس پر پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے غور نہیں کیا۔ بہرحال چونکہ بات بہت زیادہ تشویش کی نہیں تھی اس لئے وہ دونوں خاموشی سے واپس چلے گئے۔ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ نہ شبیلہ اور نہ ہی فیض شاہ کے ذہن میں کوئی تشویش تھی کیونکہ بہرحال انہیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک

زیرک اور ذہین انسان نادیدہ شکل میں شہباز کے ساتھ موجود ہے۔ اور شہباز خود اس کی اہم ضرورت ہے۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ شہباز واقعی رازل جریری کی اہم ترین ضرورت تھا۔ کیونکہ اگر وہ لوگ رازل جریری کا بدن اس سرد جہنم تک پہنچا دیتے تو رازل جریری ایک طرح سے ان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہی بن جاتا۔

اور رازل جریری بھی اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ہر عمل کر رہا تھا۔ ہوٹل الاسکا کے سپرویژن ونگ کو فون کر کے اس نے کہا۔

''میں روم نمبر پانچ سو اٹھارہ سے بول رہا ہوں۔ ہمیں ایک کرائے کی کار درکار ہے۔ کیا آپ اسے مہیا کر سکیں گے؟''

''جی سر! آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہاں، اگر کسی خاص کار کی فرمائش ہو تو بتا دیجئے گا۔''

''ایک عمدہ اور کشادہ کار۔''

''ہمارے پاس ہر طرح کی گاڑیاں موجود ہیں۔ آپ کو ایک بلو کراؤن الاٹ کی جا رہی ہے۔ بالکل بہترین حالت میں۔ نمبر نوٹ کر لیجئے گا۔ یہ آپ کے نام پر بک کر کے باہر پارکنگ تک پہنچا دی جاتی ہے۔ کیا ڈرائیور بھی درکار ہے؟''

''نہیں۔ ڈرائیونگ خود کر لی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے آپ براہ کرم پارکنگ لاٹ سے چابی وصول کر لیجئے گا۔ ڈرائیور گاڑی کے پاس موجود ہے۔'' تھوڑی دیر کے بعد رازل جریری اور شہباز باہر نکل گئے۔ شہباز اس وقت پروفیسر بیراٹ کی شکل میں تھا۔ رازل جریری اسے ساتھ لئے ہوئے پارکنگ لاٹ تک پہنچ گیا اور یہاں کار کا نمبر دیکھ کر شہباز نے قریب کھڑے ہوئے ڈرائیور سے چابی مانگ لی۔ اس نے اپنے روم نمبر کا حوالہ دے دیا تھا ائینڈن نے جھک کر چابی اس کے حوالے کر دی۔

''ڈرائیونگ میں کروں گا تم میرے برابر بیٹھو۔'' رازل جریری بولا۔ کار کے شیشے چڑھا دیئے گئے تھے اور اگر شیشے کالے نہ ہوتے تو یقیناً شہر میں ہنگامہ مچ جاتا کہ ایک گاڑی بغیر ڈرائیور کے چل رہی ہے لیکن بلیک شیشوں کی وجہ سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور اس کے بعد رازل جریری شہر کی سڑکیں ناپنے لگا یہاں تک کہ مقررہ وقت پر اس نے گاڑی ایک جگہ لے جا کر کھڑی کر دی۔ اس دوران وہ اپنی معلومات کے مطابق ایسی سڑکیں ناپتا رہا تھا

جہاں سے پروفیسر بیراٹ کا اپنے گھر واپسی پر گزر ہو سکتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں لیبارٹری واقع تھی تو اس نے ایک سیاہ سیٹی لاک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ پروفیسر بیراٹ کی گاڑی ہے ڈرائیور اسے ڈرائیو کرتا ہے۔ ہمیں دو افراد کو سنبھالنا ہوگا۔ کیا سمجھے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' شہباز نے کسی قدر بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ بہر حال یہ مرحلہ اس کے لئے سنسنی خیز تھا۔ سارا منصوبہ رازل جریری کے ذہن میں تھا چنانچہ وہ لوگ انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مقررہ وقت پر شہباز نے پروفیسر بیراٹ کو لیبارٹری سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ ڈرائیور نے پُر ادب انداز میں دروازہ کھول دیا تھا۔ پروفیسر بیراٹ جیسے ہی اپنی گاڑی میں بیٹھا، رازل جریری نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور پورے اعتماد کے ساتھ اسے برق رفتاری سے چلاتا ہوا پروفیسر بیراٹ سے بہت آگے چل پڑا۔ بس اب بعد کے واقعات حالات کے رحم و کرم پر تھے۔ کوئی بھی اتفاق اس منصوبے کو ناکام بنا سکتا تھا لیکن کبھی کبھی تقدیریں بھی یاور ہوا کرتی ہیں اور جو ہونا ہوتا ہے بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ رازل جریری نے کار اس سنسان سڑک پر اس طرح ترچھی کر کے کھڑی کی کہ دوسری کار کو آگے نکلنے کے لئے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑے۔ کراؤن سڑک پر ترچھی کھڑی ہو گئی تھی اور جب پروفیسر بیراٹ کی کار وہاں پہنچی تو ڈرائیور نے بہت فاصلے پر ہی بریک لگا دیئے۔ پروفیسر بیراٹ نے چونک کر پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''لگتا ہے سر! کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ یا پھر کسی نے نشے کے عالم میں گاڑی اس طرح کھڑی کر دی ہے۔''

''ذرا فاصلہ رکھو۔ گاڑی آگے مت بڑھانا۔'' پروفیسر بیراٹ خاصا تیز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ادھر منصوبے کے مطابق شہباز سڑک کے نشیب میں اتر گیا تھا۔ رازل جریری بھی مستعد تھا۔ پروفیسر بیراٹ کا ڈرائیور چند لمحے انتظار کرتا رہا، پھر نیچے اتر کر بولا۔

''سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو آگے جا کر دیکھوں؟''

"ہاں، دیکھو تو سہی، قصہ کیا ہے؟ آس پاس کوئی موجود بھی ہے یا نہیں؟"

ڈرائیور آہستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا اور پروفیسر بیراٹ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن اس کام کے لئے شہباز موجود تھا۔ پروفیسر بیراٹ بس ایک لمحے کے لئے چونکا تھا کہ شہباز نے اس پر ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد اس نے ایک ہاتھ سے پروفیسر بیراٹ کا منہ دبایا، دوسرے ہاتھ سے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔ پھر اسی لمحے اسے رازل جریری کے وجود کا احساس ہوا اور رازل جریری کی آواز ہلکی سرگوشی کے انداز میں سنائی دی۔

"بس...... اسے میرے حوالے کر دو اور تم گاڑی میں جا بیٹھو۔ ریوالور اپنے لباس میں رکھ لو۔ لباس بے شک ذرا مختلف ہے لیکن چل جائے گا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

شہباز نے محسوس کیا کہ کسی طاقتور وجود نے بڑے آرام سے پروفیسر بیراٹ کو زمین سے اونچا اٹھایا ہے اور نشیب میں لے گیا ہے۔ وہ جلدی سے گاڑی کے اندر جا بیٹھا۔ ڈرائیور غالباً کراؤن کے پاس جا کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر وہاں کسی کو موجود نہ پا کر اس نے خود ایک عمل کیا۔ کار کے اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کار کو اسٹارٹ کیا، پھر اسے وہاں سے ریورس کر کے سڑک کی سائیڈ میں لگا دیا اور نیچے اتر کر شانے ہلاتا ہوا واپس پلٹ پڑا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اپنی کار کے قریب موجود تھا۔ اس نے کہا۔

"سر! دور دور تک کوئی نہیں ہے۔ گاڑی بھی بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں ہے۔ پتہ نہیں کیا چکر ہے۔ چلیں یا رکیں؟"

"چلو......" شہباز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اور اس کے بعد کراؤن کے قریب سے گزرتا ہوا سڑک پر چل پڑا۔

شہباز کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن بہرحال اب تک منصوبے پر بڑی کامیابی کے ساتھ عمل ہوا تھا۔ کافی دور جانے کے بعد اس نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا، کراؤن کافی فاصلے سے پروفیسر بیراٹ کی کار کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ شہباز کو تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ رازل جریری بدستور اس کے ساتھ ہے۔ پتہ نہیں پروفیسر بیراٹ بیچارے کا کیا حال ہوا۔ لیکن بہرحال رازل جریری کے اپنے معاملات تھے۔ ظاہر ہے ان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سفر ایک خوبصورت رہائش گاہ پر ختم ہوا۔ کار اندر داخل ہو کر رک گئی اور

ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ شہباز پروفیسر بیراٹ کے میک اپ میں باہر نکل آیا۔ ایک بار پھر اس کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں۔ لیکن اسی وقت اسے اپنے کانوں کے قریب رازل جریری کی سرگوشی سنائی دی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ فکرمند نہ ہونا۔"

ایک بار پھر شہباز کو دلی تقویت کا احساس ہوا تھا۔ وہ کوٹھی کے صدر گیٹ کی جانب بڑھ گیا صرف اس کے کان اپنے قریب رازل جریری کے وجود کی سرسراہٹیں سن رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک شوخ و شنگ سی لڑکی نے ایک دم سے ایک ستون کی آڑ سے نکل کر منہ سے زوردار آواز نکالی اور شہباز نے چونک کر اسے دیکھا۔

بڑی دلکش اور گداز سی لڑکی تھی۔

"اور اب آپ یہ کہیں گے انکل! کہ بے بی ڈونٹ ڈسٹرب می۔ میں بہت مصروف ہوں۔ یہی کہیں گے نا؟"

"ہیلو......" شہباز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"او کے انکل...... او کے۔ بس تھوڑے دن کی کسر اور ہے۔ آپ سے مستقل خاموشی اختیار کر لی جائے گی۔ گھر کے سب لوگ آپ کی مصروفیت سے تنگ آ چکے ہیں۔"

شہباز نے ایک بار پھر نگاہیں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ رازل جریری نے فوراً ہی کہا۔

"ادھر اس طرف۔ یہ بائیں سمت کی راہداری میں۔"

شہباز اس طرف مڑ گیا۔ پھر شاید وہ دروازہ بھی رازل جریری نے ہی کھولا تھا۔ شہباز نے صرف ان کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ ایک پرُسکون آرام گاہ تھی۔ دروازہ رازل جریری ہی نے بند کیا تھا۔

"وہ لباس تبدیل کرنا ہے اور اس کے بعد لنچ اپنے کمرے میں منگوا لینا ہے۔ اس کی بیوی اٹالیا گئی ہوئی ہے۔ یہ لڑکی اس کی بھانجی ہے جو اسی عمارت میں رہتی ہے۔ ابھی ایک ملازم آئے گا۔ اس کا نام رابٹ ہے۔ تم اسے کھانے کے لئے کہو گے۔ جاؤ واش روم میں جا کر وہ لباس تبدیل کر لو۔"

شہباز نے رازل جریری کے حکم پر عمل کیا تھا۔ پہلے وہ بے حد خوفزدہ تھا لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ رازل جریری جیسا ذہین آدمی اس کی رہنمائی کر رہا ہے، پریشانی کی کوئی

بات نہیں ہے۔ چنانچہ اسے ڈھارس ہوگئی تھی۔ تمام کام رازل جریری کی ہدایت کے مطابق کئے گئے۔ کھانا اس نے اپنی آرام گاہ میں ہی کھایا، پھر اٹالیانوں سے اس کی بیوی کا فون آ گیا۔

''ہیلو...... تم ٹھیک ہو بیراٹ؟''

''ہاں ہنی! تم کیسی ہو؟''

''ہنی......؟'' عورت حیرت سے بولی۔

''کیوں...... کیا میں تمہیں ہنی نہیں کہہ سکتا؟''

''لگ رہا ہے آج کل ضرورت سے زیادہ مصروفیت چل رہی ہے۔ اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگے ہو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ آواز بھی کچھ بھاری بھاری سی ہو رہی ہے۔''

''ہاں...... مجھے فلو ہے۔''

''میڈیسن لے لو بیراٹ! اور اپنے کام سے فراغت حاصل کر کے فوراً اٹالیانو پہنچو۔ میں تمہیں بری طرح مِس کر رہی ہوں۔ نہ صرف میں بلکہ باقی لوگ بھی۔ اور سنو! کم از کم دو ہفتے کی چھٹی کرنی ہے تمہیں۔ اس سے پہلے میں تمہیں واپس آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ او کے؟''

''او کے ڈارلنگ!'' شہباز نے کہا۔

''ڈارلنگ! تم ضرور کوئی غلط چیز کھا گئے ہو۔ رابٹ کو بلاؤ۔ کیا دیا ہے اس نے تمہیں کھانے میں؟''

''او کے بائے......''

''بائے......'' دوسری طرف سے کہا گیا اور فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شہباز گہری گہری سانسیں لینے لگا تو رازل جریری نے سوال کیا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟''

''پہلے میں نے لفظ ہنی کہا تو وہ چونک پڑی اور اس نے حیرت کے الفاظ کہے۔ پھر ڈارلنگ کہا تب بھی اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ میرا خیال ہے جناب! یہ دو نام تو شوہر اپنی بیوی کو ضرور دیا کرتے ہیں۔''

رازل جریری خوب ہنسا، پھر بولا۔ ''یار! نہ مجھے شوہر ہونے کا تجربہ ہے نہ تمہیں۔ ویسے

ہنی اور ڈارلنگ جو ہے نا پرانے لفظ ہو چکے ہیں۔ اب پتہ نہیں آج کل کے لوگ بیویوں کو کیا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اب اتنی تفصیل تو نہیں معلوم۔ ورنہ اگر وہ یہاں ہوتی اور میں بیراٹ اور اس کے درمیان کے معاملات سے واقف ہو سکتا تو ضرور تمہیں ان الفاظ سے بھی آگاہ کر دیتا جو یہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کہا کرتے ہیں۔''

شہباز نے باقی ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو رازل جریری نے کسی قدر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہاں...... ہو جاتا ہے ایسا، ہو جاتا ہے۔ ویسے مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان دونوں کا درمیانی رابطہ ختم کرا دیا۔''

''میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا رازل جریری!''

''کیا......؟''

''یہ کہ پروفیسر بیراٹ کا کیا ہوا؟''

''وہ لوگ جو آگے کے منصوبے میں رُکاوٹ بن سکتے ہیں، بحالت مجبوری راستے سے ہٹا دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ سوری، پروفیسر بیراٹ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

شہباز کو ایک دُکھ کا سا احساس ہوا تھا۔ جس طرح پروفیسر بیراٹ کی بیوی نے اپنے شوہر کو پندرہ دن کی چھٹیوں کے لئے طلب کیا تھا اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ بیراٹ بہرحال ایک اچھا شوہر ہے۔ لیکن افسوس وہ اس منصوبے کے گھاٹ اتر گیا۔

بہرحال جتنا وقت یہاں گزرا، سولی پر گزرا تھا۔ ہر لمحے یہ خوف دامن گیر رہا کہ کہیں سے پہچان نہ لیا جائے کیونکہ گھر کے لوگ بہرحال ضرورت سے زیادہ متعلق رہتے ہیں اور ...نا پہچان سکے یا نہ پہچان سکے، لیکن گھر کے لوگوں سے بچنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد آخر کار وقت مقررہ پر وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ اب اسے اپنی ڈیوٹی نبھانا تھا۔ چنانچہ وہ کار میں بیٹھ کر چل پڑا اور تھوڑے ہی فاصلے پر اس نے ایک بار پھر اس ...راؤن کو دیکھا جسے رازل جریری ڈرائیو کر رہا تھا۔ یہ احساس بھی تھا کہ رازل جریری کتنا ہی ذہین سہی لیکن آخر کار انسان ہے۔ پتہ نہیں اس نے بیراٹ کی لاش کو کہاں ٹھکانے لگایا ...کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت سے پہلے وہ نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور فکر یہ تھا کہ بیراٹ کو لیبارٹری پہنچنے کے بعد اپنا کام سنبھالنا تھا۔ وہاں کون کون ہے اور کس کس سے واسطہ پڑے گا، یہ ایک انتہائی پریشان کن کام تھا اور شہباز چونکی پہلی بار یہ

سب کچھ کر رہا تھا اس لئے اسے محتاط رہنا تھا۔

آخر کار وہ لیبارٹری پہنچ گئے۔ اور جب وہ کار سے اتر کر اندر داخل ہو رہا تھا تو ایک بار پھر رازل جریری کی آواز نے اس کی وحشت کو تقریباً ختم کر دیا۔ رازل جریری کی سرگوشی سنائی دی۔

"میں ہر لمحے تمہارے ساتھ ہوں۔ بے فکر رہنا اور کسی قسم کا خوف مت کرنا۔ ہم کامیابی کے ساتھ اپنا کام سرانجام دیں گے۔"

اور یہی ہوا۔ پانچ اسسٹنٹ تھے جو پروفیسر بیراٹ کے ساتھ کام کرتے تھے۔ پروفیسر بیراٹ کی حیثیت سے شہباز لیبارٹری میں اپنی میز پر جا بیٹھا اور اسسٹنٹ اسے کارروائی کی رپورٹ دینے لگے۔ اس کے بعد ایک اسسٹنٹ نے کہا۔

"سر! سرد خانے میں جو یونٹ لگائے گئے ہیں ان میں سے ایک یونٹ کے تین پلگ کام نہیں کر رہے۔ ذرا ان کا جائزہ لے لیجئے۔"

رازل جریری نے اس کے کان میں کہا۔

"سرد خانے میں جانے کے لئے پہلے ایک لیونگ روم آئے گا۔ وہاں ایک سوٹ لٹکا ہوا ہے۔ یعنی پروفیسر بیراٹ کا۔ تمہیں وہ سوٹ پہن کر اس سرد خانے میں داخل ہونا ہے کیونکہ وہاں کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے ایک ہزار سینٹی گریڈ کم ہے۔ سمجھ لو، وہاں کیا صورتحال ہوگی۔"

شہباز کو ان تمام چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ پانچوں اسسٹنٹ بھی لیونگ روم میں اس کے ساتھ ہی داخل ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے اپنا اپنا لباس پہننا شروع کر دیا۔ انتہائی موٹا اور وزنی لباس تھا جس میں کسی خاص قسم کی گیس بھری ہوئی تھی۔ اس لباس کے اندر ہی اندر آکسیجن ماسک بھی تھا اور لباس کے اندر آکسیجن بھری ہوئی تھی جس کا ایک لیور آن کرنے کے بعد لباس کے اندر سانس لینے کے ذرائع پیدا ہو جاتے تھے۔ آنکھوں کی جگہ خاص قسم کے گلاس لگائے گئے تھے جو برف کی دھند سے پاک رہتے تھے اور ان پر بہت ہی باریک قسم کے وائپر پنکھے کی شکل میں چلتے رہتے تھے اور ان کی اسپیڈ اتنی تیز ہوتی تھی کہ سامنے کے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ اس موٹے لباس میں ملبوس ہو کر وہ ان پانچوں ماتحتوں کی رہنمائی میں آگے بڑھا۔ رازل جریری کی سرگوشی سنائی دی۔

"سرد خانے میں تمہارے ساتھ میں نہیں داخل ہو سکوں گا کیونکہ میں اپنی روح پر کوئی تجربہ نہیں کرنا چاہتا۔ وہ جگہ ایسی ہی خطرناک اور مشکل ہوگی۔ وہاں تمہیں اپنی ذہانت سے کام لینا ہوگا۔"

جس جگہ وہ پہنچے وہاں ایک بڑا سا گول دروازہ تھا جو کسی میکنزم کے ذریعے کھلتا تھا۔ ایک اسسٹنٹ نے یہ دروازہ کھولا۔ باہر ایک چوڑا پلیٹ فارم نظر آ رہا تھا اور اس کے بعد خلاء ہی خلاء تھی۔ یہ پلیٹ فارم ایک کھلی ہوئی لفٹ کی شکل میں تھا جس میں صرف ایک کٹہرہ بنا ہوا تھا۔ یہ لفٹ ایک جھٹکے سے نیچے اترنے لگی اور تقریباً سو فٹ کی گہرائی تک پہنچی۔ اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ شہباز اس وقت اپنی بہترین ذہانت سے کام لے رہا تھا اور ہر چیز کے استعمال کو ذہن میں رکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ لفٹ ایک جگہ جا کر رک گئی اور پھر وہ اسی طرح آگے بڑھنے لگی۔ ایک وسیع و عریض ہال تھا جسے تیز ترین روشنیوں میں نمایاں طریقے سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس ہال کے اندر سفید سفید دھواں بھرا ہوا تھا اور یہ جگہ جہاں یہ لفٹ نما پلیٹ فارم چل رہا تھا ایک شیشے کی سرنگ کی مانند تھی۔ یعنی یہ اس سرنگ میں محفوظ تھی۔ اس کے باوجود انہیں یہ سردی سے بچنے کا لباس پہننا پڑا تھا۔ باہر کی کیفیت نجانے کیا ہوگی۔

آخر کار وہ ایک میکنزم مشین کے پاس رک گئے اور اسسٹنٹ اسے بتانے لگے کہ یہ وول کام نہیں کر رہے۔ شہباز نے یہ وول دیکھے اور ماہرانہ انداز میں اس کا جائزہ لیتا رہا جیسے وہ واقعی ان کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔ اس نے ایک آدھ وول کو چھیڑ کر بھی دیکھا تھا اور خوش قسمتی سے یہ سب کچھ اتنی مہارت سے ہوا تھا کہ کسی کو شبہ نہیں ہو سکا۔ تب اس نے گردن ہلا کر واپسی کے لئے رخ بدل دیا۔ ماتحت اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے تھے۔ شہباز ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔

آخر کار وہ اس خوفناک جگہ سے باہر نکل آئے۔ صحیح معنوں میں شہباز اس سرد جہنم کی سیر کر چکا تھا۔ جب وہ باہر آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو سب سے پہلے رازل جریری کی سرگوشی کانوں میں اُبھری۔

"تم خیریت سے ہو شہباز؟"

"ہاں بالکل......"

فولاد کا بنا ہوا تھا اور اس کا بھیجہ باہر نکل پڑا تھا۔ خون کی دھاریں دور دور تک پھیل گئیں اور وہ اپنی جگہ سے نیچے آ رہا۔ یہ انتہائی خوفناک منظر شہباز کے لئے انتہائی دلدوز تھا۔ پروفیسر بیراٹ کی حیثیت سے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔

''آپ یہاں موجود ہیں رازل جریری!''

''ہاں...... آؤ...... فوکس آن چلتے ہیں۔''

فوکس آن اندر سے کافی بڑی جگہ تھی اور اس کے درمیان ایک بڑے سے آئس کنٹینر میں برف کی وہ سل رکھی ہوئی تھی جس کے اندر پروفیسر رازل جریری کا جسم منجمد تھا۔ رازل کی آواز ابھری۔

''توڑو اسے۔ یہ آلہ استعمال کرو۔ میرے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ یہ برف بہت سخت ہے۔ اسے توڑنا آسان نہیں ہوگا۔''

اور اس وقت شہباز کو اپنی زبردست مہارت سے کام لینا پڑا تھا۔ پہلے اس نے زبردست ضربیں لگا کر اپنے بدن کی پوری قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برف کی سل کے کنارے توڑے اور اس کے بعد وہ اسی مہارت کے ساتھ آہستہ آہستہ برف توڑتا رہا۔ یہ بھی جسمانی قوت کا کرشمہ تھا۔ عام لوگ اتنی طاقت کے ساتھ یہ کاریگری نہیں دکھا سکتے تھے۔ یہاں تک کہ برف کی سل ٹوٹتی چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد رازل جریری کا جسم برف کی تہہ سے آزاد ہو گیا۔ ایک سرد اور بے جان جسم جسے شہباز اپنے بازو میں اٹھا کر ایک مخصوص جگہ لے کر آیا۔ یہاں اسے گرمی دے کر نرم کرنا تھا۔ اس کام میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہو گیا اور اس وقت بارہ بجے تھے جب اس کام سے فراغت حاصل ہو گئی۔ شہباز باقاعدہ اس بدن کی فزیو تھراپی کر رہا تھا۔ اور جب اس کے جوڑ کھل گئے اور وہ نرم ہو گیا تو رازل جریری نے ایک بار پھر سرگوشی کی اور لرزتی آواز میں بولا۔

''بہت عرصے کے بعد میں اپنے بدن کی قید میں جا رہا ہوں۔ میرے لئے دعا کرنا۔''

یہ اندازہ شہباز کو نہیں ہو سکا تھا کہ جسم میں جانے کا ذریعہ کیا رہا ہے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد رازل جریری نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ پھیل گئی اس نے محبت بھری نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور بولا۔

''مجھے سہارا دو شہباز! مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔''

شہباز نے اسے سہارے سے اٹھا کر بٹھا دیا۔ رازل جریری کے چہرے پر آہستہ آہستہ خوشی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اپنے بدن میں واپس آنے کے بعد وہ رفتہ رفتہ یہ بات محسوس کر رہا ہو کہ اب وہ ایک نارمل شخصیت ہے۔ بہت بڑی بات ہوتی ہے کچھ محرومیوں کے بعد کچھ پا لینا۔ اور غالباً اس طرح گزرے ہوئے لمحات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ شخصیت کوئی بھی ہو، حالات اس کے کیسے بھی ہوں، بات وہی ہوتی ہے کہ انسان جو کچھ پا لیتا ہے وہ اس کی نگاہوں میں اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن جب کھو دیتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ جانے والی چیز کیا تھی۔ اور تب اس کے ذہن میں وہ سچائیاں اُبھرتی ہیں جو اگر صحیح معنوں میں سچائیوں کی شکل میں رہیں تو شخصیتیں بنتی ہیں ورنہ انسان کی سب سے بڑی برائی یہی ہے کہ وقت گزرتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے۔

شہباز اس وقت رازل جریری کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے بھی ایک خوشی کا احساس تھا۔ غالباً اس لئے کہ رازل جریری کو اپنا کھویا ہوا جسم اس کی وجہ سے واپس ملا تھا۔ ویسے انسانی نقطہ نگاہ سے حکومت پلاسکو کے عہدیداروں نے اس سے جو فائدہ اٹھایا تھا اور اس نے جس طرح زندگی کی بازی لگا کر بڑے خلوص کے ساتھ یہ کام کیا تھا اور اس کے بعد جب اسے اس میٹنگ روم میں ہونے والے فیصلوں کا ثبوتوں کے ساتھ علم ہوا تھا تو شہباز کے دل میں بھی انتقامی جذبے جاگ اٹھے تھے۔ یہی انسانی صفات ہوتی ہیں اور وہ جو برائیوں کا جواب بھی نیکیوں سے دینے پر تل جاتے ہیں، حقیقی معنوں میں کچھ اور ہی کردار ہوتے ہیں اور ایسے کردار یا تو درویش ہوتے ہیں یا ولی۔ انسان تو بہرطور انسان ہی ہوتا ہے۔ اور شہباز نے کبھی درویش یا ولی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ انسان تھا۔ تمام تر انسانی صفات سے آراستہ۔ چنانچہ اب اس کے دل میں اپنے ان تمام کرم فرماؤں کے لئے کوئی بہتر جذبہ نہیں تھا بلکہ رازل جریری نے جس طرح اپنے کام کا آغاز کیا تھا وہ اس سے غیر متفق نہیں تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن تو پستا ہی ہے اور یہاں تو صورتحال بالکل الگ ہی تھی۔ یہ گھن بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا جو رازل جریری کے بعد اپنے اوپر احسان کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے تھے۔ اور بہرحال شہباز اس قدر فراخ دل نہیں تھا کہ ایسے لوگوں کو معاف کر دیتا۔

رازل جریری اپنے بدن کو جنبش دے رہا تھا اور رفتہ رفتہ اس کی جسمانی کیفیتیں بحال

ہوتی جارہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے جسم کو ورزش کے انداز میں جنبشیں دیں اور شہباز کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''کیا چیز ہوتا ہے یہ انسان بھی۔ قدرت نے اسے ہر طرح کی طاقتیں بخشنے کے بعد کچھ ایسی کیفیتیں بھی بخش دیں کہ وہ اپنی بے بسی کا احساس کرے اور اس کے بعد خدا سے مدد کا طالب ہو۔ میرے دوست! میں نے پہلے بھی تم سے کہا ہے کہ میں کوئی خالص مذہبی شخصیت نہیں ہوں لیکن بہت ساری سائنسی قوتیں رکھنے کے باوجود میں اس بات کا خلوص دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ بعض اوقات میں نے شدید بے بسی محسوس کی اور اس وقت میں نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے لئے دعائیں مانگیں۔ میں نے کہا کہ......

''مالک دو جہاں! تو نے مجھے جن سائنسی قوتوں سے نوازا ہے وہ بھی تیری ہی عنایات کا ایک حصہ ہیں۔ میں اپنی بے اوقاتی کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہوں۔ مجھے ایک بار پھر انہی قوتوں سے نواز تاکہ میں اپنا عمل جاری رکھ سکوں اور ایسا تو ہی کر سکتا ہے اور کوئی نہیں۔''

اور بہر حال میرا ایمان ہے کہ مجھے وہیں سے مدد ملی۔ اس کے علاوہ میرے دوست! میں درگزر کی قوت بھی رکھتا ہوں اور ان لوگوں کو معاف بھی کر سکتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس کے تم گواہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مستقبل میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ اور اگر میں نے آغاز اس قدر کمزور کیا تو پھر انجام زیادہ بہتر نہیں ہو سکے گا۔ تم یہاں سے کچھ دور چلے جاؤ اور اس کے بعد میں تم سے آملوں گا۔ یا بہتر ہے کہ اب تم اپنی رہائش گاہ ہی کا رخ کرو۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی تم سے رجوع کرنے کی کوشش کرے۔ میں کچھ کام کر کے تم سے ملاقات کروں گا۔ اور سنو، ایک بات تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں۔ میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں اپنے جسم اور روح کو الگ الگ استعمال کروں۔ اب جبکہ انہوں نے مجھے یہ راستہ بھی دکھا دیا تو کیوں نہ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔ میرا مطلب ہے کہ کبھی کبھی میری روح بھی تم سے مخاطب ہو گی اور میرا جسم فاصلے پر رہے گا۔ میں ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش کرتا ہوں جہاں اگر مجھے اپنے جسم سے الگ ہونا پڑے تو میرا جسم وہاں محفوظ رہے اور میں اپنا کام کر سکوں۔ ٹھیک ہے...... آؤ اب ہم باہر چلتے ہیں۔''

رازل جریری انتہائی احتیاط کے ساتھ شہباز کے ہمراہ باہر آیا اور اس کے بعد اس نے شہباز کو روانہ کر دیا اور شہباز دل میں لاکھوں سوچیں لئے ہوئے اپنی آرام گاہ کی جانب چل پڑا۔ جبکہ رازل جریری دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ ایک بار پھر وہ لیبارٹری میں واپس آیا اور اس نے وہاں کارروائی شروع کر دی۔ غالباً غیر جسمانیت کے عالم میں بھی اس نے وہاں کچھ کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اسسٹنٹ کی لاش لیبارٹری میں پڑی ہوئی تھی۔ باہر ہلکی پھلکی پہرے داری بھی تھی۔

رازل جریری وہ بیگ اٹھا کر لے آیا جس میں انتہائی طاقتور ریڈیو کنٹرول ڈائنا مائیٹ تھے۔ اس نے یہ ڈائنا مائیٹ لیبارٹری کے مختلف حصوں میں نصب کر دیئے اور مطمئن انداز میں لیبارٹری کا ایک چکر لگا کر باہر نکل آیا۔ یہاں سے کافی دور پہنچنے کے بعد اس نے ریڈیو کنٹرول ریموٹ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اس کے بعد پہلا دھماکہ ہوا۔ لیبارٹری کا ایک حصہ تباہ ہو گیا۔ وہاں رکھے ہوئے آلات اور قیمتی چیزیں دھماکے کے ساتھ فضا میں اُڑنے لگیں۔ تین منٹ کے بعد دوسرا، پھر مزید تین منٹ کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا دھماکہ ہوا۔ قرب و جوار میں طوفان آ گیا تھا۔ آس پاس جتنے دفاتر اور رہائش گاہیں تھیں، وہاں کھڑکیوں دروازوں کے شیشے چھناکوں کے ساتھ ٹوٹنے لگے اور ہر طرف غل غپاڑہ مچ گیا۔

''گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ میں افسردہ ہوں اے بے گناہ انسانو! کہ تمہیں بڑی وجہ سے پریشانی ہوئی۔ لیکن ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ غاصب اور دنیا کو نگلنے کی کوشش میں مصروف تمہارے اپنے لئے بھی اتنے ہی خونخوار درندے ہیں جتنا دنیا کے دوسرے لوگوں کے لئے۔ مجبوری ہے میرے دوستو! مجبوری ہے۔''

رازل جریری وہاں سے چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی تلاش کے لئے وہ لوگ زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ وہ لیبارٹری میں اس کے جسم کے ٹکڑے تلاش کریں کیونکہ بہر حال حقیقتوں سے فوراً ہی تو واقف نہیں ہوا جا سکتا، کوئی ایسی جگہ جہاں وہ اپنے بدن کو محفوظ کر سکے۔ اور شاید اس کی بے پناہ ذہانت تھی کہ اس نے ایسی جگہ کا انتخاب بھی کر لیا۔ سرکاری ہسپتال کا سرد خانہ تھا۔ زیر زمین تہہ خانے میں وہ اجسام رکھے ہوئے تھے جنہیں یا تو کسی تجربے کے لئے استعمال کیا جانا تھا یا پھر ان کے ورثاء کی

تلاش تھی۔ یا سرکاری کاغذات میں ان کی تدفین کی میعاد پوری نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال ایسے اجسام سردخانے میں موجود تھے اور رازل جریری نے انہی میں سے ایک جسم حاصل کیا۔ وہ اس سردخانے تک بمشکل تمام پہنچا تھا۔ سردخانے کے ایک حصے سے اس نے وہ انسانی جسم نکال کر باہر رکھا اور اس کے بعد اس کا وہ ہسپتال کا لباس جو سفید کپڑے کی شکل میں تھا، اپنے جسم پر ڈالا اور اپنے جسم کو اس ریک میں پہنچا دیا۔ ریک کا نمبر آٹھ تھا۔ اس نے اس تمام کارروائی سے مکمل استفادہ کرنے کے بعد اپنی روح کو اپنے جسم سے نکالا اور اس کے بعد سردخانے کے ریک سے نکالے ہوئے جسم میں اپنے آپ کو داخل کرنے لگا۔

جسم بدلنے کا یہ عمل انتہائی ہولناک اور ناقابل یقین تھا۔ لیکن رازل جریری کی شخصیت کے بارے میں جتنے افراد جانتے تھے انہیں یہ بات معلوم تھی کہ دنیا کا عظیم ترین سائنسدان نجانے کیسے کیسے پراسرار علوم سے واقف ہے اور نجانے کیا کیا کر سکتا ہے۔ رازل جریری اس وقت اپنے ذہن و جسم سے کام لیتے ہوئے ہر شاندار عمل کر رہا تھا۔ چنانچہ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ مُردہ جسم متحرک ہو گیا اور رازل جریری انتہائی احتیاط کے ساتھ تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ باہر آنے کے بعد اس نے ایک سمت کا رخ کیا۔ کسی ایسے جسم کو مکمل طور سے تکلیف دینا ایک غیر انسانی عمل تھا جس کی روح بہت پہلے دنیا چھوڑ گئی ہو۔

چنانچہ یہ سفر ایک تیز بہاؤ والے دریا پر جا کر ختم ہوا اور دریا کے پل پر کھڑے ہو کر رازل جریری نے اپنی روح کو اس جسم سے آزاد کیا اور اس کے بعد اس جسم کو زور سے دریا میں دھکیل دیا اور شوریدہ سر لہریں اسے اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے اس طرح دوڑنے لگیں جیسے کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہی ہوں۔

رازل جریری روح کی شکل میں پل پر کھڑا دنیا کی بے ثباتی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہت بے بس اور بے کس ہے یہ انسان جو اپنے آپ کو کائنات کا مالک سمجھ لیتا ہے۔ مالک کائنات کے عمل کو بھول کر یہ اپنے عمل جاری کر دیتا ہے۔ لیکن کس قدر ناپاس اور کمزور ہے۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا اور سب کچھ کرنے کے دعوے کرتا ہے۔ بیوقوف۔''

رازل جریری وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ اب اس کے اندر سو فیصدی ایک انسان

پل رہا تھا۔ انتقامی مزاج کا مالک۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے والا۔ یہ کمزوری انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے اور اگر یہ نہ ہو تو انسان دیوتا ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک پبلک کال بوتھ میں داخل ہو کر اس نے ریسیور اتارا اور اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ یہ وزارتِ دفاع کے فرسٹ سیکرٹری کا نمبر تھا۔ رابطے مختلف ذرائع سے قائم ہوئے اور فرسٹ سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔

''ہاں...... کون ہے اس وقت...... کیا بات ہے؟''

''جناب عالی! کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ وہ لیبارٹری ہولناک دھماکوں کے ساتھ تباہ ہو گئی ہے جہاں رازل جریری کے جسم کو رکھا گیا تھا۔ وہاں اب خوفناک دھماکے اور گہرے غار کے سوا کچھ نہیں رہا ہے۔ کیا ابھی تک آپ کو اطلاع نہیں پہنچی؟''

''اوہ...... میرے دوسرے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو یا یہ کوئی مذاق ہے؟ تم جانتے ہو اس خوفناک مذاق کا نتیجہ کیا نکلے گا۔''

''نہیں جناب! میں آپ سے غلط بیانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔''

''اپنے بارے میں بتاؤ...... تم کون ہو؟''

''رازل جریری۔'' رازل جریری نے جواب دیا اور ریسیور کریڈل پر ٹانگ کر کال بوتھ سے باہر نکل آیا۔

✡......✡

شہباز خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ اور دور بیٹھا ہوا فیض شاہ اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شبیلہ بھی فیض شاہ کے قریب تھی۔ دفعتہً ہی شبیلہ کی ہنسی کی آواز ابھری اور فیض شاہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر خود مسکرا دیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''یہ کتنا بدل گیا ہے...... کیسا عجیب لگنے لگا ہے۔ دیکھ رہے ہو نا، ہمارا بیٹا ہے یہ بابا فیض شاہ! لیکن کیسا اجنبی اجنبی سا محسوس ہونے لگا ہے۔''

''نہیں...... یہ مجھے اجنبی نہیں لگتا۔ تم نے کبھی اسے غور سے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی یہ اپنے

باپ کا عکس محسوس ہوتا ہے۔"

"میں نے کتنی ہی بار غور کیا ہے بابا صاحب! واقعی کبھی کبھی تو بالکل ہی......" شبیلہ کی آواز میں آنسوؤں کی جھلک آ گئی۔

"نہیں شبیلہ! جانے والے تو چلے ہی جاتے ہیں، یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان میں یہی تو ایک خوبی لکھی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ وہ آخر کار اپنے ماحول سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ نہ کرے تو کر بھی کیا سکتا ہے۔ یہ مالک کا حکم ہے اور مالک بہر حال قادر ہوتا ہے۔ میں شہباز کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ گلباز نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ اس کا بیٹا ایک دن کیا حیثیت اور کیا شخصیت اختیار کرے گا۔ اب دیکھو نا، کنٹری ایک ایسی بستی تھی جہاں بے شک سادگی کا دور دورہ تھا، معصوم معصوم فرشتہ صفت لوگ۔ ایک دوسرے کے لئے قطعی بے ضرر۔ پھر کنٹری میں ایک خوفناک سیلاب آیا اور وہاں سے کنٹری کی کہانی تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ میں اپنے آپ پر مرکوز ہو گیا۔ بندر نچانے والے میرے دوست نے سرکس بنایا۔ سرکس میں مجھے تم لوگ ملے اور میری کہانی تم سے منسلک ہو گئی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں صدیوں سے جی رہا ہوں۔ صدیوں کی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہوں۔ کیا کہتی ہو تم؟"

"میں آپ کی طرح نہیں بھول سکتی بابا صاحب! لیکن واقعی کتنے الٹ پھیر ہوتے ہیں انسانوں کی زندگی میں۔ ہم کبھی آگے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ کیا سوچ رہا ہے؟ کچھ پریشان سا نہیں لگ رہا آپ کو؟"

"اب یہ ہم سے بڑا ہو گیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ واقعی بڑا ہے۔ نجانے کیسے کیسے جتن کر کے اس نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ہر ایک کو تو یہ سب کچھ نہیں مل جاتا۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کی بڑائی کو تسلیم کرنا چاہئے۔" فیض شاہ نے کہا اور شبیلہ ہنسنے لگی۔ ایک فخر، ایک غرور تھا اس ہنسی میں کہ شہباز بہر حال اس کی اولاد ہے۔

شہباز اس وقت واقعی بڑی سنجیدگی سے بیٹھا اپنے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ زندگی میں بہت کچھ پایا تھا اس نے۔ باپ نے اس کے لئے جو مقام تلاش کرنا چاہا تھا وہ تو اسے نہیں مل سکا لیکن اس سے کہیں بڑا مقام مل گیا تھا اسے۔ گلباز یہی تو چاہتا تھا کہ وہ جھولوں

پر لٹکا ہوا نظر نہ آئے اور گلباز یہ نہ دیکھے کہ اس کا بیٹا خلا سے زمین کی طرف آ رہا ہے۔ کوئی سہارا مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ موت ہاتھ تھام لیتی ہے۔ اور اب جب یہ سب کچھ مل گیا تو گلباز دیکھنے والا نہیں تھا۔ لیکن بہر حال جس زندگی کو اس نے اپنایا تھا وہ بے شک اس کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ تو نہیں تھی۔ بس تقدیر اس کے راستے منتخب کرتی رہی تھی اور اب وہ اس منزل میں تھا۔

رات کو لیبارٹری میں ہونے والے دھماکوں کی تفصیل اسے دن میں معلوم ہو چکی تھی اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ کارروائی رازل جریری کے علاوہ اور کسی نے نہیں کی ہے۔ اخبارات اس بھیانک حادثے کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے جس میں تقریباً 70 افراد ہلاک اور دو تین سو زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک وہ لوگ ہوئے تھے جن کی رہائش گاہیں لیبارٹری کے آس پاس تھیں اور جہاں چار خوفناک دھماکوں نے شدید زلزلہ پیدا کر دیا تھا اور وزنی وزنی چیزیں فضا میں اُڑ کر لوگوں کے گھروں پر جا گری تھیں۔ نتیجے میں ان کے گھر کی چھتیں تباہ ہوئی تھیں اور سونے والے دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ رازل جریری انتہائی بے رحمی سے پلاسکو کی حکومت سے انتقام لے رہا تھا۔ اور پھر مزید دہشت اس وقت پھیلی جب مختلف اخبارات کو رازل جریری کے پیغامات موصول ہوئے۔ ان پیغامات میں اس نے کہا تھا کہ حکومت پلاسکو کے جنگجو لوگو! جنگجو حکمرانو! یہ نہ سوچو کہ تمہاری قوت سب سے زیادہ ہے۔ ساری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ کر تم ان خوابوں کی تعبیر بھی پا لو گے۔ کچھ ایسی طاقتیں خدا کی طرف سے اٹھیں گی جو تمہارا نام ونشان مٹا دیں گی اور یہی صدیوں کی تاریخ ہے۔ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ ہر فرعون اپنے ناپاک ارادوں کے ساتھ پوری قوت سے سر ابھارتا ہے۔ تھوڑی درندگی کا مظاہرہ کرتا ہے تاکہ اس پر مہر لگ جائے کہ وہ بد باطن درندہ ہے اور آخر کار قدرت کا ہاتھ اس کی گردن دبوچ لیتا ہے اور ساری فرعونیت کے ساتھ زمین بوس ہو جاتا ہے۔

چنانچہ پلاسکو کے رہنے والو! میں اپنا جسم بھی حاصل کر چکا ہوں اور اب ایک بار پھر میں تمہارے خلاف متحرک ہو رہا ہوں۔ ہوشیار...... ہوشیار......!"

ہر طرف ایک ہی ہنگامہ آرائی ہو گئی تھی۔ اخبارات بہت کچھ لکھ رہے تھے۔ پلاسکو کے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کی مذمت کر رہے تھے۔ حکومت سے مستعفی ہونے کے لئے کہا جا

رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ یہ حکومت بالکل ناکارہ ہے۔ یہ سارا نظام درہم برہم کر دے گی۔ اسے ختم کیا جائے۔ اسے معطل کیا جائے۔ بس یہی تمام باتیں ہر طرف ہو رہی تھیں اور شہباز سوچ رہا تھا کہ رازل جریری نے اس کے بارے میں جو انکشافات کئے ہیں ان کی تکمیل اب کب ہوگی؟ لیکن کسی حماقت کا ثبوت نہیں دینا چاہتا تھا وہ۔ اپنے طور پر اپنے آپ کو محفوظ کرنا بھی ضروری تھا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ وہ پلاسکو حکومت کی گڈ بک پر تھا اور اسے جو مراعات دی گئی تھیں وہ بہت زیادہ تھیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ بدباطن لوگ کھلا کھلا کر مارنے والوں میں سے تھے اور یہ بات اب شہباز کو اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ بابا فیض شاہ اور ماں کو لے کسی طرح پلاسکو سے نکل جائے۔

لیکن رازل جریری ناسپاس نہیں تھا۔ چنانچہ ان ہنگامہ آرائیوں کے چوتھے دن رازل جریری نادیدہ شکل میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں شہباز کا بسیرا تھا۔ فیض شاہ اور شبیلہ بے چارے معصوم صفت لوگ بیٹے کی الجھنوں کو نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن شہباز ان دنوں خاصی الجھنوں میں مبتلا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ حکومت پلاسکو کے یہ سربرآوردہ لوگ جوان سازشوں کا مرکز تھے، رازل جریری کے پیدا کئے ہوئے ہولناک بحران میں الجھ گئے تھے۔ ورنہ شاید شہباز کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا جاتا۔ وہ بیگ شہباز کے لئے بالکل اجنبی تھا جو سامنے ایک میز پر رکھا ہوا نظر آیا تھا۔ اس کمرے میں جو شہباز کی رہائش گاہ تھا۔ شہباز حیران حیران سا اس بیگ کے پاس پہنچ گیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ بیگ میں میک اپ کا بہترین سامان موجود تھا۔ پلاسٹک سرجری کے تمام آلات اور اس کے لوازمات بیگ میں موجود تھے۔ شہباز حیرت بھری نگاہوں سے ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی رازل جریری کی آواز ابھری۔

''میں تمہارے سامنے اس صوفے پر بیٹھا ہوا ہوں شہباز! اسے محسوس کرو۔''

اور شہباز نے ادھر دیکھا۔ صوفے پر ہلکا سا دباؤ اس بات کا اظہار کر رہا تھا کہ کوئی اس پر بیٹھا ہوا ہے۔

''اوہ...... مسٹر رازل جریری! میں تو بڑی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔''

''میرے عظیم دوست! میں کوئی احسان نہیں کر رہا تمہارے سامنے یہ الفاظ ادا کر کے کہ حقیقت یہ ہے کہ اب تم میرے وجود کا نصف ہو۔ میرا آدھا وجود ہو تم۔ کیونکہ تمہارے

راستے سے میں نے اپنا بدن پایا ہے۔ بہرحال میں مصروف تھا اور مجھے وہ انتظامات کرنے تھے جو تمہارے لئے بہتر اور تمہارے حق میں ہوں۔ مجھے اور تمہیں ابھی زندگی کے متعین کردہ راستے پر بہت دور تک سفر کرنا ہے۔ بھلا تمہارے بغیر میں زندگی گزارنے کا تصور اب کیسے کر سکتا ہوں؟ تو میرے پیارے دوست! میں نے میک اپ کا یہ سامان تمہیں لا کر دیا ہے۔ بیگ میں ایک البم بھی موجود ہے جس میں تین تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک نوجوان لڑکے کی تصویر اور دو بزرگوں کی۔ مسٹر اُولسن، ان کی بیٹی لائفیل اور نواسا جیمس۔ تم تینوں یہاں سیر و سیاحت کے لئے آئے تھے اور اب تمہیں یہاں سے واپس میلیکو جانا ہے جس کے لئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور دوسرے کاغذات بھی بیگ ہی میں موجود ہیں۔ پورا سامان الٹ کر دیکھو گے تو یہ تمام چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔ اب سے کچھ دیر کے بعد تم اپنی والدہ اور اپنے چچا کے ساتھ باہر نکلو گے۔ ہوٹل میلوڈی میں کمرہ نمبر تین سو آٹھ تمہارے لئے بک ہے۔ وہاں جا کر مقیم ہو جاؤ اور وہاں یہ میک اپ اپنے چہرے پر کر لو۔ میں تم سے یہ کہتا کہ تم یہاں سے ہی میک اپ کر کے نکلو۔ لیکن یہ جگہ جہاں تم اس وقت موجود ہو، وہ سرکاری رہائش گاہ ہے جو ان لوگوں نے تمہارے لئے منتخب کی ہے۔ اور یہاں کون کون تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اس کا مجھے واقعی علم نہیں ہو سکا ہے۔ تین سو آٹھ میں اپنا میک اپ کر کے تم تین سو سولہ میں چلے جاؤ گے جو تمہارے لئے مخصوص ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ اگر بدلے ہوئے چہرے میں کوئی تمہیں دیکھے گا تو پہچان نہیں سکے گا اور یہ نہیں سوچے گا کہ تین سو آٹھ میں تو کچھ اور لوگ آئے ہیں، ان کے چہرے کیسے بدل گئے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ تین سو سولہ میں تمہیں تمہارا مختصر سامان ملے گا اور پھر تم ہوائی جہاز کے ذریعے میلیکو پہنچ جاؤ گے۔ میلیکو میں عارضی طور پر ہوٹل گیلیلو میں تمہارے لئے ایک کمرہ بک ہے۔ میلیکو میں ہم لوگ آزاد ہوں گے اور ہمارے اوپر یہ پابندی نہیں ہوگا۔ جبکہ پلاسکو ہمارے لئے ہر لمحہ موت کا گھر ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟''

شہباز کو چکر آ رہے تھے۔ رازل جریری اس کے لئے کیا کیا کر رہا ہے۔ بہرحال وہ اس کا ممنونِ احسان بھی تھا اور اسے خوشی بھی تھی کہ اس نے ایک مناسب شخص کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگائی تھی اور جس کے لئے اس نے زندگی داؤ پر لگائی تھی وہ ناسپاس نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

''مسٹر جریری! میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں۔''

''ہاں...... مختصر وقت میں یہ سوالات کرلو۔''

''لیبارٹری آپ نے ہی تباہ کی تھی؟''

''سو فیصدی۔''

''آپ کا جسم کہاں ہے...... کیا وہ محفوظ ہے؟''

''ہاں میرے بچے! ایک بار ان لوگوں کے ہاتھوں دھوکا کھانے کے بعد اب بار بار میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ میں نے اپنے بدن کی حفاظت کا اتنا اعلیٰ بندوبست کیا ہے کہ اس وقت پلاسکو میں جتنی سکیورٹی ہے اس کا ایک تہائی حصہ میری تلاش میں لگا ہوا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے تلاش نہیں کرسکیں گے۔ میں نے اپنے جسم کو سرکاری ہسپتال کے سرد خانے میں محفوظ کر دیا ہے ایک ایسے حادثہ کے شکار شخص کی حیثیت سے جس کا کوئی وارث اس دنیا میں موجود نہیں ہے اور جس کے بارے میں ہسپتال کی انتظامیہ یہ فیصلہ نہیں کر پائی ہے کہ کب اس کی تدفین کی جائے کاغذات سست روی سے تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں اپنے جسم کو وہاں سے لے آؤں گا اور پھر ایک ایسے حادثہ کے شکار شخص کی حیثیت سے جو میلیکو کا ایک تاجر ہے، میرا جسم میلیکو کے لئے بک کر دیا جائے گا اور وہاں پہنچ کر میں اپنی اصل جسمانی حیثیت میں آجاؤں گا۔''

شہباز نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ اس نے کہا۔

''مسٹر رازل جریری! آپ صرف ایک سائنٹسٹ ہی نہیں ہیں بلکہ مجھے معاف کیجئے، ایک انتہائی اعلیٰ درجے کی مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔''

''میں تمہاری تھوڑی سی تصحیح کرنا چاہتا ہوں بیٹے! تم اس ذہنیت کو مجرمانہ نہ کہو۔ میں کائنات کے بسنے والوں کی بقاء کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہوں۔ اور دیکھو، جو لوگ برائیوں کا مرکز ہوتے ہیں وہ بھی اپنی تمام تر ذہانت اور خباثت کے ساتھ منظر عام پر آتے ہیں۔ وہ معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ اور کرلیا کرتے ہیں۔ ان سے محفوظ رہنے کے لئے اگر ذہانت سے کام لیا جائے تو غلط بات تو نہیں ہے۔ میں نے بڑی جاں فشانی کے بعد تم لوگوں کا میک اپ منتخب کیا ہے۔ یہ تینوں افراد کافی عرصے تک گم رہیں گے.. کیونکہ میں نے انہیں ایشیاء بھیج دیا ہے اور انہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بس یوں

سمجھ لو یہ اپنا کام مکمل نہیں کر پائیں گے۔ بعد میں غور کریں گے کہ ان سے کیا غلطی ہوگئی تھی۔ جبکہ اس دوران تم میلیکو نکل چکے ہوگے۔ اپنے جسم کے لئے میں نے یہ کیا ہے کہ ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو میلیکو کا ایک بہت بڑا تاجر ہے۔ یہ شخص یہاں اچانک شدید بیمار ہوگیا اور ہوٹل کے ایک کمرے میں اس نے دم توڑ دیا۔ میں نے فوراً ہی اس کا جسم منتخب کیا۔ اب ایسا ہوگا کہ میرے بدن کو اس کی حیثیت سے میلیکو پہنچا دیا جائے گا اور وہاں میں مسٹر جونس ہاکر کی حیثیت سے اس کے سارے مفادات سنبھال لوں گا۔ لیکن ہوگا یہ کہ میں جونس ہاکر نہیں بلکہ رازل جریری ہوں گا۔ یہ بڑی اہم شخصیت ہے اور میں نے بڑا سوچ سمجھ کر اس کا انتخاب کیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

''ہاں۔''

''تو اب تم سے میلیکو کے دارالحکومت یوکاس میں ملاقات ہوگی۔ سمجھے؟''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا رہوں گا مسٹر رازل جریری!''

''تو میں چلتا ہوں۔''

اسی وقت باہر سے دروازے پر دستک سنائی دی۔ فیض شاہ اور شبیلہ دروازے پر موجود تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئے۔ ظاہر ہے وہ رازل جریری کو تو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ رازل جریری نے کچھ اور قریب ہو کر شہباز کے کان میں کہا۔

''تو میں چل رہا ہوں اور تمہیں میں نے جو بتایا ہے تمہیں اسی کے مطابق کرنا ہے۔''

شہباز نے صرف گردن ہلا دی تھی۔ تبھی اچانک فیض شاہ چونک پڑا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شہباز ہوش میں آگیا تھا۔ رازل جریری کی ہدایت کو وہ ذہن نشین کر رہا تھا۔ یہ لوگ ذرا غلط وقت پر آگئے تھے۔ بہرحال اس نے مسکراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔ لیکن فیض شاہ کا حیرت کو خود اس نے حیرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

''آیئے بابا صاحب! کیا ہوگیا..... آپ اِدھر اُدھر بے چینی سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''پتہ نہیں کیا بات ہے؟ پتہ نہیں کیا ہوا۔''

''کیوں، کیا ہوا..... خیریت؟''

''ہاں، خیریت تو ہے۔ مجھے یوں لگا شہباز! جیسے کوئی یہاں موجود ہو اور میرے برابر سے نکل کر گیا ہو۔ کیا تمہیں کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا؟''

شہباز نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہنس کر بولا۔ ''آپ زیادہ تر آرام کیا کریں بابا فیض شاہ! اب اس طرح کی باتیں آپ کو محسوس ہوتی رہیں گی۔''

''شریر کہیں کا، میرے بڑھاپے پر طنز کر رہا ہے بیٹے! ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوں۔ اور اس بات کا اطمینان رکھو، تم لوگوں سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ کیا سمجھے؟ ابھی بھول جاؤ۔ ابھی تو میں بہت عرصے تک تمہاری جان پر لاگو رہوں گا۔''

''سر آنکھوں پر بابا صاحب! سر آنکھوں پر۔ بڑا اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔ میں خود آپ سے ملاقات کرنے والا تھا۔''

''کیوں خیریت...... کیا بات ہے؟''

''بابا صاحب! بس کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔ اصل میں مجھے کچھ معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ سو دوست سو دشمن ہوا کرتے ہیں۔ یہاں میں نے ان لوگوں کے لئے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ ان کی نگاہوں میں بڑی وقعت رکھتے ہیں اور انہوں نے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے ہیں مجھے۔ میرے مستقبل کے لئے کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ لیکن وقت یہ کہتا ہے کہ عقل مند آدمی وہی ہے جو حالات سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ حالات کے بدلتے ہوئے رخ پر بھی نگاہ رکھے۔''

''دیکھا شبیلہ! گلباز نے کچھ غلط تو نہیں کیا تھا۔ اگر وہ اسے تعلیم سے روشناس نہ کراتا تو اس کے دماغ کی رفتار اتنی تیز ہوتی؟''

''ہاں......'' شبیلہ نے معصومیت سے کہا۔

فیض شاہ بولا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''ہم یہ ملک، یہ شہر چھوڑ رہے ہیں بابا صاحب!''

''وجہ؟''

''میں ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں رہنا چاہتا جو صرف اپنی مطلب براری کے لئے مجھے استعمال کرتے رہیں۔ کل وہ اس سے زیادہ خطرناک مہم میرے سپرد کر سکتے ہیں اور ظاہر ہے وہ ہم پر احسان کریں گے۔ اس لئے مجھے ان کی ہر ہدایت قبول کرنا ہوگی۔ یہ کوئی بہتر بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو...... واقعی سوچنے کی بات ہے۔''

''لیکن اگر میں جانا چاہوں تو وہ آزادی سے مجھے چھوڑیں گے بھی نہیں۔ اس لئے میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔''

''بھلا کیا؟''

''ہم اپنے چہرے تبدیل کر کے سفر کریں گے۔''

''جائیں گے کہاں؟''

''ایک دوسرے ملک جس کا نام میلیکو ہے۔''

''کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟ یہ لوگ ہمیں اتنی آسانی سے چھوڑ دیں گے؟''

''نہیں...... مگر اس کے لئے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ آپ لوگ تیار ہو جایئے۔''

''ہماری تیاریوں کا کیا ہے بیٹا! ہم تو تمہاری ہر جنبش کے ساتھی ہیں۔''

''تو بس چلتے ہیں۔ آیئے۔''

''سامان وغیرہ؟'' فیض شاہ نے کہا۔

''چھوڑیئے، سامان کی پرواہ نہ کیجئے۔ سب کچھ ہے ہمارے پاس۔'' شہباز نے اپنا بیگ اٹھایا اور پھر احتیاط کے ساتھ وہ اپنی رہائش گاہ سے نکل آئے۔ شہباز خود بھی ان معاملات میں کافی تیز اور چالاک تھا چنانچہ بہت زیادہ گہرائیوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ وہ باہر آیا اور احتیاط کے ساتھ اپنی رہائش گاہ سے دور نکل آیا۔ شبیلہ اور فیض شاہ اس کے ساتھ تھے۔ شہباز کا انداز بھی ایسا ہی تھا جیسے وہ بس چہل قدمی کے لئے نکلا ہو۔ صرف یہ ایک بیگ تھا جو اس نے اپنے ہاتھ میں لٹکا لیا تھا اور یہ بیگ ہی اہمیت کا حامل تھا۔ ویسے رازل جریری انسان ہی تھا۔ جب اس نے اس کے لئے ہوٹل میں کمرہ بک کر دیا تھا تو یہ سامان اُسے اس کمرے میں ہی ملنا چاہئے تھا۔ پتہ نہیں کیوں رازل جریری نے یہ رسک نہیں لیا تھا۔

بہرحال جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہے تو اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اپنے مطلوبہ ہوٹل چل پڑا۔ ہوٹل میں رازل جریری کے کہنے کے مطابق ان کے لئے ایک بڑا سوئیٹ بک تھا۔ اس سوئیٹ میں پہنچنے کے بعد انہوں نے کچھ وقت وہاں قیام کیا اور پھر کھانے پینے سے فراغت حاصل کر کے شہباز نے تصویروں کے مطابق میک اپ شروع کر دیا۔ اس فن میں فریدوں اسے ماہر کر گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی

خواب میں بھی نہیں سوچا گیا تھا کہ یہ فن اس کے اس قدر کام آئے گا۔ فیض شاہ اور شبیلہ بھی اس کے اس فن کے معترف تھے۔ انہیں اپنی بدلی ہوئی شکلوں پر ہنسی بھی آ رہی تھی اور حیرت بھی ہو رہی تھی۔ کس طرح چہرے کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں۔ آخر میں اس نے اپنے چہرے پر نوجوان لڑکے کی تصویر کے مطابق میک اپ کیا اور تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس کمرے سے باہر نکل آئے۔ تالا لگایا اور چھ سات کمرے چھوڑ کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ فیض شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھ رہی ہے شبیلہ! یہ لڑکا کیا چیز بن گیا ہے۔ ارے اتنے بڑے ملک کے اتنے بڑے شہر میں تو عقل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہم اکیلے ہوتے تو سچی بات ہے پتہ نہیں کہاں پڑے ہوتے۔ کتنا چالاک ہو گیا ہے تیرا بیٹا۔ کاش گلباز زندہ ہوتا۔''

ان معصوم لوگوں کی سوچ اس سے آگے بھلا کیسے بڑھ سکتی تھی؟ وہ تو بس اتنی چھوٹی سی کارروائی کو ہی آفاقی حیثیت دیتے تھے۔ جبکہ شہباز کی زندگی کے سامنے ایک اتنا بڑا مقصد آ چکا تھا جو اسے نجانے کون کون سے جہانوں میں لے جا سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ تین سو سولہ میں منتقل ہو کر انہوں نے آگے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رازل جریری نے ان کے لئے ہر طرح کے انتظامات کر دیئے تھے۔ چنانچہ سامان کے دو سوٹ کیس جن میں لباس وغیرہ موجود تھا اور تمام چیزیں اسی مطابقت سے تھیں۔ اس بیگ کو ضائع کر دیا گیا تھا اور کاغذات نکال لئے گئے تھے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں ساتھ رکھنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ دن اور یہ رات یہاں گزاری گئی اور اس کے بعد دوسرے دن وہ لوگ ایئر پورٹ چل پڑے۔

❁......❁

یوکاس پھولوں کا شہر جہاں ہر گھر کی بالکونی سے سرخ پھولوں کے گچھے جھانک رہے ہوتے۔ ایک خاص طرز کی زندگی یہاں نظر آئی تھی جو ان تینوں ہی کے لئے دلکشی کا باعث تھی۔ ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے شبیلہ نے کہا۔

''بابا صاحب! ہمیں دنیا کی سیر اپنے بچے کے ذریعے کرنا نصیب ہو رہی ہے۔ اب تو واقعی مجھے بھی حسرت ہوتی ہے کہ کاش! گلباز زندہ ہوتے اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل اس شکل میں دیکھتے۔ کیا یہی سب سوچا ہو گا انہوں نے شہباز کے مستقبل کے بارے میں؟''

سرخ پھولوں کا شہر یوکاس جو سمندر کے کنارے لامحدود وسعتوں میں پھیلا ہوا تھا اور جس میں زندگی اور خوشحالی کی ہر جھلک بھرپور نظر آتی تھی، شہباز کو یہاں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ رازل جریری نے اس سے رابطہ بھی قائم کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ ابھی وہ اس سے نہیں مل سکتا کیونکہ وہ یہاں بہت سے تعمیری کاموں میں مصروف ہے۔ البتہ کچھ عرصے کے بعد دریائے سون کے ایک خوبصورت کنارے پر جہاں چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانات سرسبز گھاس پر کھلونوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، ایک کھلونے میں انہیں منتقل کر دیا گیا۔ قابل دید مناظر تھے۔ پھول تو اس شہر کی شناخت تھے۔ لیکن دریا کے کنارے جس قدر خوشگوار مناظر میں ان لوگوں کو رہائش گاہ دی گئی تھی وہ بس یوں لگتا تھا جیسے جنت زمین پر اتر آئی ہو۔ دو فلپائنی ملازمائیں، ایک ڈرائیور، ایک قیمتی کار، کل چار ملازم یہاں ان کی خدمت کے لئے دیئے گئے تھے جن میں سے چوتھا ایک ایشیائی نادر شاہ نامی آدمی تھا جو انتہائی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ کہتا تھا۔

''بچپن میں مجھے بلیوں کو مارنے کا شوق تھا۔ آپ لوگ یقین کرو جی! پتہ نہیں بلیوں سے میری کیا ازلی دشمنی تھی۔ ایک دفعہ چھری سے چھ بلیاں قتل کر ڈالیں تو پڑوس کے رہنے والے مولوی عبدالقیوم نے میرا نام نادر شاہ کر دیا۔ ورنہ ماں باپ نے تو غلام علی رکھا تھا۔ پر

جی نادر شاہ کا نام مجھے بھی بہت پسند تھا۔ اب بھی میرا دل چاہتا ہے کہ دلی لوٹ لوں۔ پر بس نوکری کرنے کے لئے ایک ایجنٹ نے ادھر بھجوا دیا۔ غیر قانونی طور پر آیا تھا جی، قانونی ہو گیا۔ بس اب آپ لوگوں کی خدمت کرنی ہے مجھے۔''

یہ تمام آسائشیں رازل جریری نے انہیں فراہم کی تھیں اور آخر کار تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد ایک دن اس وقت جب شہباز اپنی اس خوبصورت رہائش گاہ کے بیرونی حصے میں کرسی ڈالے شبیلہ اور فیض شاہ سے باتیں کر رہا تھا، سامنے دریا میں چھوٹی چھوٹی رنگین کشتیاں مٹر گشت کر رہی تھیں اور تین خوبصورت فاختائیں تھوڑے فاصلے پر گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھی ہوئی دلچسپ حرکتیں کر رہی تھیں کہ ایک لمبی کار آ کر سامنے رکی اور اس سے ایک دراز قامت آدمی اتر کر ان کے قریب آ گیا۔

''معافی چاہتا ہوں، آپ لوگوں کے درمیان مداخلت کی۔ شہباز صاحب کے لئے ایک پیغام ہے۔''

''ہاں...... کیا بات ہے؟'' شہباز نے کہا۔

''براہِ کرم ذرا ادھر تک آ جایئے۔''

کچھ فاصلے پر لے جا کر اس شخص نے کہا۔

''رازل جریری صاحب نے آپ کو طلب کیا ہے۔ یہ موبائل فون ہے۔ آپ اس پر بات کر لیجئے۔'' اس نے ایک موبائل جیب سے نکال کر شہباز کو دیا۔ خود ہی اس نے ایک نمبر بھی ڈائل کر دیا تھا۔ تبھی دوسری طرف سے رازل جریری کی آواز سنائی دی۔

''شہباز! کیسا لگا یہ شہر تمہیں؟''

''بہت خوبصورت ہے۔''

''بس اب ہمیں باعمل ہو جانا چاہئے۔ اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو میرے پاس آ جاؤ اس شخص کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے...... میں پہنچ رہا ہوں۔'' شہباز نے رازل جریری کی آواز پہچان کر کہا۔

فیض شاہ اور شبیلہ کو تسلی دے کر وہ کار میں بیٹھ کر چل پڑا اور کار یوکاس کے گلی کوچوں اور بازاروں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ تبھی شہباز نے ڈرائیور سے کہا۔

''کیا آپ مجھے ایک بات بتائیں گے مسٹر؟''

''جی سر!''

''یہ یہاں یوکاس میں ہر گھر میں سرخ پھول کیوں نظر آتے ہیں؟''

''یوکاس کی ایک قدیم روایت ہے جناب! جس نے اسے پھولوں کا شہر بنا دیا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہاں کے لوگ سرخ پھولوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تحفے میں ایک دوسرے کو سرخ پھول دیئے جاتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ جب تک یوکاس ان سرخ پھولوں سے مہکتا رہے گا اس پر کبھی تباہی نہیں آئے گی۔ یہ دیوی دیوتاؤں کا چکر ہے جو صدیوں پہلے چلا تھا۔''

''کمال ہے، باہر کی دنیا میں بھی اس قدر توہمات پل رہے ہیں۔''

ڈرائیور خاموش ہو گیا تھا۔

رازل جریری اس وقت بہت شاندار نظر آ رہا تھا۔ اپنی رہائش گاہ کے اس حصے میں اس نے شہباز کا استقبال کیا۔

''حیرت انگیز آدمی! میں تمہیں کسی بھی طرح رازل جریری سے کم مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ تم بے مثال شخصیت کے مالک ہو۔ آؤ...... میں تمہیں اپنی لیبارٹری دکھاؤں۔ مختصر وقت میں، میں نے بہت کام کیا ہے اور میلیکو میں مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ وہاں کی کچھ خبریں بھی تمہیں سناؤں۔ وہ لوگ رازل جریری سے سمجھوتے پر آمادہ ہیں اور وہاں کے اخبارات نے اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ جس نوجوان نے رازل جریری کا جسم ان ہولناک غاروں سے نکالا تھا وہی اس کی رہائی کا باعث بھی بنا ہے۔ بہر حال ان کے اپنے وسائل ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو ابھی تک اس بات کا شبہ نہیں ہے کہ ہم پلاسکو چھوڑ چکے ہیں۔ وہ پلاسکو کے گوشے گوشے میں اپنے وسائل سے کام لیتے ہوئے ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ خیر...... یہ تو وہاں کی باتیں تھیں۔ آؤ...... اب میں تمہیں اپنی لیبارٹری دکھاتا ہوں۔ میرے لئے یہ کام مشکل نہیں ہے کہ کسی بھی لمحے اپنا جسم چھوڑ دوں اور اپنی روح کو متحرک کر لوں۔ بہر حال یہ ایک انتہائی مشکل سائنسی عمل ہے اور میں ایسا خود بھی نہ کرتا اگر یہ لوگ غاصبانہ طور پر مجھے اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش نہ کرتے کیونکہ بہر حال یہ اتنا مشکل کام تھا کہ کوئی بھی لمحہ مجھے ناکامیوں سے دوچار کر سکتا تھا اور اس وقت نہ میری روح باقی رہتی نہ جسم۔ خیر یہاں میں نے اپنا مقام اس تاجر کی حیثیت سے بنایا ہے جس کی شکل اختیار کر

کے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس تاجر کا ایک خاندان ہے لیکن کچھ ایسے کوائف اور مسائل ہیں جن کی بناء پر وہ اپنے خاندان سے مستقل طور پر الگ ہو چکا ہے اس لئے مجھے کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ میں نے اس کے اثاثوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنے وہ اختیارات جمع کئے جو میرے اپنے وسائل کے تحت مجھے حاصل ہوئے تھے۔

بہر طور یہ مختصر سی تفصیل میں نے تمہیں اس لئے بتائی ہے کہ اب ہم اپنے اسی مقصد کے لئے باعمل ہونا چاہتے ہیں جس کے لئے اتنی ساری کاوشیں کی گئی تھیں۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ ایک بار پھر مختصر الفاظ میں اپنا موقف دوہراؤں گا۔ دنیا بھر میں انسانیت کے خلاف جو کارروائیاں ہو رہی ہیں ہم ان کارروائیوں میں مداخلت کریں گے اور جہاں تک ممکن ہوا ایسے تخریب کاروں اور غلط لوگوں کو ختم کریں گے جو انسانیت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ ہم ان ملکوں سے خراج وصول کریں گے اور انہیں ان کی غلط کاریوں پر بلیک میل کریں گے۔ یہی ہمارا اپنا ذریعہ عمل ہوگا۔''

''جی۔''

''اور تم اس سلسلے میں میرے معاونِ کار رہو گے۔ ویسے تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہر ملک میں اپنے نمائندے اکٹھے کروں تاکہ وہ ضرورت پڑنے پر میرے لئے کام کریں۔ اکیلے میں یا تم ساری دنیا پر نگاہ نہیں رکھ سکتے۔ میں ایک ایسا ڈیپارٹمنٹ تخلیق کر رہا ہوں جہاں موجود اسٹاف دنیا بھر سے دن رات رپورٹیں وصول کرے گا۔ یہ معلومات حاصل کرے گا کہ کہاں کس ملک میں کیا ہو رہا ہے اور جہاں بھی ہم محسوس کریں گے کہ برائیاں فروغ پا رہی ہیں وہاں ہم اپنا عمل اختیار کریں گے۔ یہی میرا موقف پہلے بھی تھا جس کے راستے میں روڑے اٹکائے گئے اور خصوصاً حکومت پلاسکو نے جو ساری دنیا پر اپنا اقتدار چاہتی ہے اور اس کے لئے مصروفِ عمل ہے۔ آخری بار تم سے یہ سوال کر رہا ہوں شہباز! کہ بتاؤ کیا تم خلوصِ دل سے میرا دست راست بننا پسند کرو گے؟''

''ہاں...... پورے خلوصِ دل سے۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ کہ یہ کام میری پسند کے مطابق ہے۔''

''ٹھیک ہے... اب ہمیں اپنے کام جاری کرنا ہوں گے۔ میں تمہیں خصوصی طور پر ایک شخصیت کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نام علی اصغر جراوی ہے، سمجھے۔ علی اصغر جراوی۔''

⚝...... ⚝
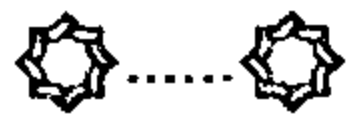
وہ نسلاً ایرانی معلوم ہوتا تھا۔ بلند و بالا قد، گٹھا ہوا بدن، تپش کے باعث گورے چہرے پر تانبے کی رنگت جیسے اثرات، سنہرے بال، کنپٹیوں پر سفید بال، جسم پر جیل کی یونیفارم، کھلا گریبان، چہرے پر پسینہ اور پیٹھ پر پسینے کے گہرے دھبے۔ وہ جیل کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھا فضا میں گھور رہا تھا۔ نیلی آنکھیں بے چینی سے کوٹھڑی کے در و دیوار اور فرش پر بھٹک رہی تھیں۔ چھت پر لوہے کی جالی سے محفوظ کیا ہوا تیز بلب روشن تھا اور اس روشن بلب کی روشنی میں جیل کا وارڈر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا اور تھکا تھکا انسان جس نے نجانے زندگی کس طرح گزاری تھی۔

''مجھے جانتے ہو...... میرا نام علی اصغر جراوی ہے۔'' اچانک ہی قیدی کی آواز ابھری اور وارڈر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔'' وارڈر نے ٹھنڈی سانس لی۔

''تمہیں میری نگرانی کے لئے بھیجا گیا ہے یہاں۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے اور اس کے بعد یہ روشن دنیا تاریک ہو جائے گی۔ کیا تم بتا سکتے ہو میرے معزز بزرگ! کہ موت کے بعد کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ میں نے واعظوں کی تقریریں سنی تو تھیں لیکن کبھی ان پر توجہ نہیں دی۔ وہ بہت کچھ بتاتے تھے مگر اس وقت یہ گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی اس طرح......'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا، پھر ہنس کر بولا۔ ''اور صبح کو مجھے سزائے موت دی جا رہی ہے نا۔''

وارڈر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''بس...... انسان کے بہت سے عمل ایسے ہوتے ہیں جو اسے حسرت اور بے کسی کا شکار کر دیتے ہیں۔ لیکن موت تو ہر زندگی کا مقدر ہے۔ اس سے تم کیسے فرار حاصل کر سکتے ہو؟''

''ہاں...... یہ ساری داستانیں میں نے اجنبیوں کی طرح سنی تھیں۔ بات بس وہی تھی نا کہ مجھے خود اپنے ان داستانوں میں ملوث ہونے کی امید نہیں تھی۔ ہوتا ہے، ہوتا ہے...... سب کچھ ہوتا ہے۔''

''کیا تم مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بتانا پسند کرو گے؟ دیکھو، دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ آخری دنیا کے سفر کے وقت تمہارے کندھوں پر گناہوں کا ناقابل برداشت بوجھ تو ہوگا

لیکن دل ہلکا کرلو تو بہتر ہے۔''

علی اصغر نے نفرت اور حقارت سے ہونٹ سکوڑے اور بولا۔

''بے کار...... سب کچھ بے کار۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو سونے کی کوشش ضرور کرتا۔ ایسے موقعوں پر نیند کم ہی آتی ہے۔ لیکن کوشش کرنے سے تھوڑا سا سکون ضرور مل جاتا ہے۔''

قیدی اپنی جگہ سے اٹھا اور کال کوٹھڑی کی سلاخوں والی چھوٹی سی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سلاخیں پکڑ لیں اور باہر کی سمت دیکھنے لگا۔ ویران راہداری کے آگے حد نظر پتھریلی اور خاردار تاروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ چند کوٹھڑیوں میں روشنی تھی جن میں کچھ قیدی آپس میں باتیں کررہے تھے۔ شام کی خنک ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی اور دور کہیں جیل کے کسی حصے میں جھینگر اپنا راگ اس طرح الاپ رہے تھے گویا مرثیہ خوانی کررہے ہوں۔ قیدی کئی منٹ تک خاموش کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ چار دنوں میں...... صرف چار دنوں میں اس نے تئیس افراد کو قتل کیا تھا۔ چار دنوں کے اندر اندر۔ وہ ایک خونخوار اور ہولناک قاتل تھا۔ وکیل نے عدالت سے کہا۔

''جنابِ عالی! اس کے انتقام کا جذبہ اسی وقت سرد ہوسکتا ہے اور مقتولین کے لواحقین کو صرف اسی صورت میں صبر آسکتا ہے جب اسے موت کی سزا دی جائے۔ اسے صرف اور صرف موت کی سزا دی جائے اور میں درخواست کرتا ہوں جناب والا! میں سفارش کرتا ہوں کہ مقدمے کی کارروائی کے دوران اس پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔''

''کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' جج کی آواز ابھری۔

''نہیں...... کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عدالت کا فیصلہ میرے حق میں نہیں ہوگا۔ سمجھ رہے ہیں نا جناب والا۔ آپ میرے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ یہ بات آپ سے زیادہ میں بہتر طور پر جان سکتا ہوں۔''

اور آخر کار عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔ یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔

''میں جانتا ہوں...... اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے وارڈن کی طرف رخ کرکے کہا۔ ''کہ یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ میں صبح کا سورج نہیں دیکھ پاؤں گا۔

کیونکہ سورج نکلنے سے قبل میری زندگی کا چراغ گل کردیا جائے گا۔ لیکن میں تمہیں وہ سب کچھ بتانا چاہتا ہوں جو مجھ سے نہیں سنا گیا۔ سمجھ رہے ہو نا۔ جب میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑی تھی اس وقت میں نے یہ سب کچھ نہیں سوچا تھا۔ اس بات کو ایک سال سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ مگر تم یقین کرو، میرے لئے کل ہی کی بات ہے۔ پانچ دن کے بعد میری شادی ہونے والی تھی اور میں نے طے کیا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر باقی کی زندگی آرام سکون اور بیوی کی محبت کے ساتھ اپنی آبائی زمینوں پر گزاروں گا۔ آہ...... میرے پیارے دوست! میری زمینیں مختصر ضرور تھیں لیکن اس قدر حسین کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ زمینیں ایک حسین شہر کے دامنِ کوہ میں واقع تھیں اور ان پر سونا اُگتا تھا۔ برسات کا موسم شروع ہوچکا تھا، جن دنوں کی میں بات کررہا ہوں۔ لیکن بارش نہیں ہوئی تھی۔ صبح کی دھوپ ہمیشہ کی طرح گرم تھی۔ میں اس وقت دمادم جنگل کے کنارے واقع پولیس اسٹیشن پر چارج دے کر اپنے کتے کے ساتھ باہر آرہا تھا کہ میرا ایک دوست جس کا نام ثاقب سلامی تھا، مجھے دور سے نظر آیا اور اس نے مجھے ہاتھ اٹھا کر رکنے کے لئے کہا۔ میرا یہ دوست مجھ سے ڈیڑھ دو سال سے بڑا نہیں تھا۔ لیکن انتہائی تندرست و توانا تھا اور اس کے ٹھوس گوشت اور ہڈی سے بنے ہوئے بدن کا وزن دو سو چالیس تھا۔ انتہائی بدصورت تصور کیا جاتا تھا اسے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ عورتوں کے لئے انتہائی پُرکشش تھا اور ہوسکتا ہے اس کی وجہ اس کی خوش مزاجی ہو۔ لمحوں کے اندر وہ سب سے گھل مل جاتا تھا اور سب سے خلوص سے پیش آتا تھا۔ ثاقب سلامی بھی پولیس ہی میں ملازمت کرتا تھا بلکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی پولیس میں بھرتی ہوئے تھے اور ہم ایک دوسرے کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔ سلامی میرے قریب پہنچ کر بولا۔

''میں تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ وہ مکروہ شخص جس کا نام ہشمان ہے تمہیں یاد کررہا ہے۔''

''کیوں؟ ہشمان مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ یہ بات تو سب کے علم میں آچکی ہے کہ اب میں اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے چکا ہوں۔''

''شاید وہ تمہارے جاتے جاتے اس پراسرار روح کے بارے میں کچھ اور سننا چاہتا ہو جسے تم نے دریافت کیا اور اس کے بارے میں اتنی سنسنی پھیلا دی کہ اب ہر شخص اس کے

بارے میں جاننے کے لئے بے چین رہتا ہے۔‘‘

’’بیوقوف ہیں سارے کے سارے۔ لیکن تمہیں ایسے لوگوں کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے سلامی! اور ایک بات میں اور بتا دوں، تم لوگ جس انداز میں اس بات کا مذاق اُڑاتے ہو اس کے بارے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ صرف تمہیں ہی نہیں بلکہ بہت سوں کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ جو رپورٹ میں نے پیش کی ہے وہ غلط نہیں تھی۔ سمجھ رہے ہو نا؟‘‘

’’یہ بات ہشمان کو بھی تو بتاؤ نا۔ ویسے میں تمہیں صرف اس کا پیغام دے رہا ہوں اور اس کے لئے میری نیت پر شبہ نہ کرو۔‘‘ وہ بولا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ میرا کتا میرے پیروں میں اپنا منہ رگڑ رہا تھا۔ ہشمان ہمارا انچارج تھا۔ اور تھوڑے فاصلے پر اس کا دفتر بھی تھا۔ میں نے دیکھا کہ ثاقب سلامی یہاں سے زیادہ دور نہیں گیا ہے۔ وہ خود بھی میری اس رپورٹ میں کافی دلچسپی لیتا رہا تھا۔

بہر حال بے شک میں استعفیٰ دے چکا تھا لیکن ہشمان ہمارا انچارج تھا۔ میں اس کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ پھر میری دستک کے جواب میں اندر سے ہشمان کی غرائی ہوئی آواز آئی۔

’’آؤ......‘‘

ہشمان کے اس مختصر سے آفس کو میں نے کئی بار دیکھا تھا جس کے ایک کونے میں فائلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک بڑی سی الماری تھی اور الماری کے سامنے والی میز پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں میز پر پاؤں دراز کئے ہوئے ہشمان اپنی کرسی پر نیم دراز تھا۔ چھوٹے قد اور سرخ چہرے والا یہ عمر رسیدہ آدمی اس میں کوئی شک نہیں کہ محکمہ پولیس کا سب سے تجربہ کار افسر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے بال اب اس وقت بالکل سفید ہو چکے تھے۔ لیکن جب اس نے بیس سال قبل پولیس کے محکمے میں شمولیت اختیار کی تھی تو اس وقت اس کا بدن اب سے کہیں زیادہ تندرست و توانا اور بال گہرے سیاہ تھے۔ وہ یہی کہتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور محکمہ پولیس اس کی دلہن ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اپنی اس بیس سالہ زندگی میں اس نے یہی ثابت کر کے دکھایا تھا۔ فطرتاً بہت ہی سخت مزاج اور چہرے سے بھی کرخت ہی لگنے والی شخصیت تھی یہ۔ آواز میں خاص غراہٹ تھی اور اس وقت اسی غراہٹ کے ساتھ اس نے اپنے پاؤں سمیٹے اور مجھے

سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

’’سن رہے ہو نا تم! خبردار، سونے کی کوشش مت کرنا۔ یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ میں خود بھی پوری رات جاگنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ جاگتے رہو تا کہ رات کے کسی حصے میں میری نیت خراب نہ ہو جائے اور میں تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کروں تا کہ باہر نکل سکوں۔ اور یقین کرو، میرے ذہن میں ایسے ایسے منصوبے ہیں کہ میں اگر چاہوں تو اب بھی تم پر قابو پا کر تمہارے لباس سے چابی نکال سکتا ہوں۔ اس کے بعد فرار کی کوشش کر سکتا ہوں۔ دیکھو، میں ایک بات تمہیں بتاؤں، میری زندگی کا اختتام تو ہے ہی۔ تختہ دار پر چڑھایا جائے یا بندوق کی گولی سے ہلاکت ہو جائے، کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن تم بہت اچھے آدمی ہو۔ اگر تم جاگتے ہوئے میری داستان سننا پسند کرو گے تو تم سمجھ لو کہ اپنی زندگی بچا لو گے۔ میں تم سے جو کہہ رہا ہوں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ہاں، تو میں بتا رہا تھا کہ ہشمان نے مجھے دیکھا اور اس کے بعد غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

’’یہ تمہارے آخری گشت کی رپورٹ ہے۔ تم کہتے ہو کہ ریس کے میدان کے آس پاس رہنے والے پریشان ہیں اور کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اپنی پریشانی کا اظہار کر سکے۔ کیونکہ وہ پراسرار روح ان کے اردگرد چکراتی رہتی ہے۔‘‘

’’ہاں...... میں نے اپنی رپورٹ میں یہی درج کیا ہے۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

’’اور یہ تفصیلات تمہیں وہاں کے کونسلر نے بتائی ہیں؟‘‘

’’جی نہیں۔‘‘

’’تو پھر وہاں کے کسی باشندے سے پتہ چلا ہے؟‘‘

’’میں نے کہا نا، نہیں۔‘‘

’’اوہو...... تو پھر کسی نہ کسی نے تو تمہیں بتایا ہوگا۔‘‘ ہشمان کے لہجے میں پھر وہی غراہٹ ابھر آئی جو اس کی گفتگو کا ایک حصہ تھی۔

’’کسی نے بھی نہیں بتایا۔‘‘

’’تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا؟‘‘

’’بس یوں سمجھ لیجئے انچارج صاحب! کہ مجھے وہاں کی فضا سے ایسا ہی معلوم ہوا تھا۔

لوگ اسی انداز میں خوفزدہ تھے اور پراسرار روح کی کہانی انہیں دہشت زدہ کئے ہوئے تھی۔"

ہشمان نے ناگواری سے منہ بنایا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر غصے کی سرخی نظر آئی اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم مسلمان ہو۔ مسلمان ہونے کے باوجود تمہیں طرح روحوں کی پبلسٹی نہیں کرنی چاہئے۔ یہ ہمارے مذہب کے خلاف اور تم جو کچھ کر رہے ہو وہ غلط کر رہے ہو۔ اس طرح تو ان قبیلوں میں بغاوت ابھر سکتی ہے اور تمہاری افواہیں حکومت کے لئے کس قدر نقصان دہ ہو سکتی ہیں، تمہیں اس کا اندازہ ہے؟ شہنشاہ کبھی اس قسم کی کوئی بغاوت پسند نہیں کریں گے اور نتیجے میں ہم لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوگا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے۔"

"نہیں...... میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن آج تو میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں۔ کل آپ دیکھ لیجئے، مختلف لوگ یہی سب کچھ کہیں گے۔ اور ہو سکتا ہے اس طرح قبیلے کے شہنشاہ کے خلاف بھڑک اٹھیں۔"

"سنو...... علی اصغر جراوی! تم ایک ایسا بیج بو کر جا رہے ہو جو ہمارے لئے مستقبل میں نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے تمہیں حقائق معلوم کرنے کے لئے گشت پر بھیجا تھا، جنگل کی بے ہودہ ہواؤں اور فضاؤں کو سونگھنے کے لئے نہیں۔"

اب اس کے بعد میرے غصے کی باری تھی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم انچارج ہونا...... ظاہر ہے تمہارے نزدیک ہر کام آسان ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت جب تم اس منزل سے گزر چکے ہوتے ہو۔"

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم خود ان جنگلوں میں جاؤ۔ وہاں سے گزرو گے تو کسی کے بتائے بغیر یہ محسوس کرو گے کہ وہاں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کے خوف کا احساس ہوگا تمہیں۔ ہر طرف پھیلی ہوئی گھٹن کا اندازہ ہوگا۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں، تم اس گھٹن کو چھو نہیں سکو گے۔"

"بیٹھو، بیٹھو...... بیٹھ جاؤ۔" ہشمان کا لہجہ ایک دم نرم ہو گیا۔ پھر وہ بولا۔

"دیکھو...... تم نے ایک ایسی انوکھی فضا پیدا کر دی ہے جس کے بارے میں ہر شخص الجھ کر رہ گیا ہے۔ میرا مطلب ہے محکمہ پولیس میں روحوں کی بات بڑی عجیب ہوتی ہے۔ براہِ کرم تم مجھے ذرا ایک بار پھر تفصیل بتاؤ۔"

"میں اپنی رپورٹ میں ہر بات تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔"

"مگر میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"ہوں...... وہ رات بڑی سرد اور منحوس رات تھی جب وہ پاگل عورت میرے پاس پہنچی۔ تم جانتے ہو ہشمان! کہ میں نے ان دنوں تمہاری ہدایت کے مطابق جنگل میں کیمپ لگایا ہوا تھا۔ وہ عورت جو میلے کچیلے اور چیتھڑے لٹکے ہوئے لباس میں تھی، نوجوان تھی اور جوانی کی دلکشی اس کے پھٹے ہوئے لباس سے جھلک رہی تھی۔ لیکن اس کے انداز میں دیوانگی تھی۔ اس نے بڑے کرخت اور دانت پیستے ہوئے لہجے میں مجھے بتایا کہ بس شاہ کی کہانی ختم ہو چکی ہے اور ایک ایسی روح جنگل میں داخل ہو چکی ہے جو شاہ کی باقیات کو جلا کر فنا کر دے گی۔ اور تم اس روح کو دل آرام کی روح کہہ سکتے ہو۔ سمجھے مائی ڈیئر ہشمان! یہ الفاظ اس نے مجھ سے کہے۔"

"اور خود تمہارے الفاظ ہیں کہ وہ ایک نیم دیوانی عورت تھی۔"

"نیم دیوانی نہیں...... بلکہ ایک طرح سے بالکل ہی دیوانی۔"

"اور تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا۔ آخر کیوں؟"

"فضا ایسی تھی کہ مجھے یقین کرنا پڑا۔"

"کمال کرتے ہو۔ فضا، فضا، فضا۔ کیا ایک ذمے دار شخص کو اس قسم کی حماقتوں کو اپنانا چاہئے؟ مجھے خود اپنی اس حماقت پر افسوس ہے کہ میں نے تمہاری رپورٹ پر ضابطے کی کارروائی کے طور پر تفتیش کرائی تھی۔ جانتے ہو مجھے اس کا کیا صلہ ملا؟ اسپیشل برانچ والوں نے کہا کہ ہشمان کا دماغ چل گیا ہے۔ میرے افسرِ اعلیٰ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں چند روز کی چھٹی لے کر آرام کروں اور ایسی غذاؤں کا استعمال کروں کہ میری دماغی کیفیت درست ہو جائے۔ مجھے دیوانگی کا سرٹیفکیٹ تک دینے کی تیاری ہو گئی۔ ان سب کا خیال ہے کہ میرا ذہن ناکارہ ہو گیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری رپورٹ نے میرا دماغ الٹ دیا ہے۔"

"اور میں تم سے ایک بات کہوں۔ تم لوگ جو نقصان اٹھانے والے ہو اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے سمجھے۔ اگر تم نے اس بارے میں تفتیش نہ کی۔ تم کوئی احتیاطی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔"

"اوہ۔ جنہیں تم باغی کہتے ہو نا، وہ اتنے کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے حق قبائل کا تم ذکر کر رہے ہو۔ وہ بہت ہی سیدھے سادھے لوگ ہیں اور آج تک کبھی ہمارے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اچانک کوئی دوسری دنیا سے کوئی بدروح آئے اور شاہ کے آمیوں کو ٹھکانے لگانا شروع کر دے۔"

"صرف شاہ کے آدمیوں کو نہیں بلکہ اس نے تو بہت سے لوگوں کو ٹھکانے لگایا جو سب شاہ کے آدمی نہیں تھے۔"

"اور یہ صرف تمہارے محسوسات ہیں۔"

"مسٹر ہشمان! اس پاگل عورت نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ بہت سی عورتیں، بہت سے بچے مارے جا چکے ہیں اور میرا دل کہتا ہے کہ بہت جلد قتل و غارت گری کا بازار گرم ہونے والا ہے۔ میری رپوٹ کو نظر انداز کر دینے یا پھاڑ کر پھینک دینے سے صورتحال تو نہیں بدل جائے گی۔ میں نے خطرات کی نشاندہی کر دی ہے اور اب میں یہاں زیادہ رکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ خاص طور سے ایسی جگہ جہاں تم جیسے غلط انچارج موجود ہوں جو اپنی حیثیت سے بے مقصد فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے بارے میں میری رائے یہی رہی ہے کہ تم پولیس کی نوکری کے قابل ہی نہیں تھے۔ او کے، او کے اگر تم استعفیٰ نہ دے دیتے تو میں تمہارے خلاف جو کچھ کرتا اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

"میں جانتا ہوں مسٹر ہشمان! اچھی طرح جانتا ہوں او کے خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔ میں نے دیکھا کہ جس درخت کے نیچے ثاقب سلامی میرا انتظار کر رہا تھا وہیں اس کے پاس جیودش بھی موجود تھا یہ بھی مقامی ہی باشندہ تھا جب میں ملازمت کی تلاش میں دو سال پہلے پہلی بار پولیس اسٹیشن آیا تھا تو اس نے نہ صرف میری

پرزور سفارش کی تھی جبکہ میری اس سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ لیکن اس نے میری نیک چلنی کی ضمانت بھی دی تھی اور اس طرح اس نے میری دوستی جیت لی تھی۔ وہ ہمیشہ میرا ادب کرتا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ پر ادب انداز میں اس وقت بھی کھڑا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انسان کی شکل میں ایک دیو تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ گھٹنوں کے نیچے تک پہنچتے تھے۔ بال گھنگھریالے اور گہرے سیاہ تھے۔ دہانے کی بناوٹ ایسی عجیب تھی کہ مسکراتا تو پوری بتیسی ظاہر ہو جاتی تھی۔

"ہشمان کی دیوانگی کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ تم سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی اس نے؟" جیودش بولا۔

"نہیں" میں نے بتا دیا ہے کہ اب پولیس کی نوکری میں نہیں بلکہ جیودش کا ملازم ہوں صرف جیودش کا۔" میں نے جواب دیا۔

اپنے بارے میں میرے آخری رات کے ساتھی! تمہیں یہ بتا دوں کہ میں نے اپنے بچپن کا زمانہ نہران کے رہائشی اسکولوں میں گزارا ہے۔ والدین شروع ہی سے ملک سے باہر رہے۔ خاص طور سے میرے والد جو بس یوں کہو کہ میرے لئے ایک عجیب وغریب کردار تھا۔ کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہو گی میرے عظیم دوست! کہ میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ میری والدہ بھی انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہیں بھی کبھی اتنا وقت نہیں ملا کہ میرے پاس آتیں۔ لیکن ایک بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ والد کے مقابلے میں والدہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی تھیں اور مہینے میں کم از کم چار بار محبت بھرے خطوط اور چھوٹے موٹے تحائف بھیجتی تھیں۔ بہرحال اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی جب والدہ کا انتقال ہو گیا۔ خطوط کی شکل میں پیار کا جو نازک دھاگا بندھا تھا ان کی موت کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ میں پہلے بھی تنہا تھا اور تنہائی کے شدید احساس کا شکار بھی تھا۔ اب جبکہ والدہ سے رابطہ ختم ہوا تو میری تنہائی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ کبھی کبھی میں اپنی تنہائی اور محبت سے محرومی کی بناء پر رونے لگتا تھا۔ والد صاحب سے بس میرا اتنا رشتہ تھا کہ مہینے کا جیب خرچ آتا رہتا۔ لیکن وہ کبھی مجھے اپنے بارے میں اور کچھ نہ بتاتے۔ میں محبت کا متلاشی، محبت کا پیاسا اجنبی چہروں میں محبت تلاش کرنے کی کوشش کرتا اور پھر ناکام ہو کر یہ سوچ لیتا کہ وہ چیز جسے محبت کہا جاتا ہے صرف ایک کتابی بات ہے۔

ایک لفظ جسے لغت میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ انسان کی زندگی میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

بہر حال ان کیفیتوں نے مجھ پر جو اثرات مرتب کئے وہ بہت مختلف تھے۔ نجانے کیوں مجھے انسان برے لگنے لگے تھے۔ میں اپنے خول میں قید ہو گیا تھا اور مجھے انسانوں سے وحشت ہونے لگی۔ ایسی شکل میں تنہائیاں مجھ جیسی شخصیت کی بہترین ساتھی ہوتی ہیں اور میں ان تنہائیوں میں وقت گزارنے لگا۔ تقدیر مجھ پر مسلسل وار کر رہی تھی۔ جو کچھ مجھ سے چھن گیا تھا اس کا ماتم میرے سینے کی گہرائیوں میں ہوتا رہتا تھا۔ اسکول سے نکلنے کے بعد کالج کی زندگی کا آغاز ہوا۔ لیکن اس آغاز کے کچھ ہی عرصے کے بعد میری پیشانی پر تاریکی کا ایک اور برش پھر گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ میرے والد نے دوسری شادی کر لی ہے اور پتہ ایسے چلا کہ مجھے میرا الاؤنس ملنا بند ہو گیا۔ وہ جیب خرچ اور کالج کی وہ فیس وغیرہ جو والد صاحب سے مجھے حاصل ہوتی تھی، وہ بند ہو گئیں۔ اور جب میں نے اس کی وجوہات معلوم کیں تو بتانے والوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے والد کا خیال ہے کہ اب تم اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہو چکے ہو۔

بہر حال یہ تازیانہ میرے لئے کم نہیں تھا۔ مگر مجھے خوشی بھی ہوئی تھی کہ اس طرح اس شخص سے رابطہ بالکل ختم ہو گیا تھا جس نے زندگی میں کبھی مجھے اپنی صورت تک نہیں دکھائی تھی اور میں ترستا ہی رہا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں نے ملازمت تلاش کی اور آخر کار مجھے پولیس میں ملازمت مل گئی۔ پھر ایک چھوٹے سے پولیس اسٹیشن پر میری ڈیوٹی لگا دی گئی۔ میری تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ یہ پہلا شخص تھا جس کا نام جیودش تھا کہ اس نے مجھ سے اپنائیت کا برتاؤ کیا تھا اور کسی طرح کی معلومات میرے بارے میں نہ ہونے کے باوجود اس نے میری سفارش کی اور نیک چلنی کی ضمانت دی۔ وہ خود پولیس اسٹیشن پر اردلی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ چھوٹا سا پولیس اسٹیشن میرے لئے انتہائی موزوں ثابت ہوا تھا۔ تارکول کی سب سے قریبی سڑک وہاں سے ایک سو چوبیس گز کے فاصلے پر تھی۔ کسی سے ملنا جلنا چاہتا تھا تو اس کے لئے سلامی موجود تھا۔ اس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ میرے ساتھ ہی وہ بھی بھرتی ہوا تھا۔ اگر کبھی تنہائی درکار ہوتی تو اس کے لئے وسیع وعریض جنگل موجود تھا۔ جہاں اکثر مجھے گشت کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

یوں زندگی کی گاڑی گزر رہی تھی کہ اب اس میں کچھ رنگین واقعات بھی شروع ہوئے

اور ان رنگینیوں کا محرک لاشیلہ تھی۔ لاشیلہ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے وجود میں وہ ساری مٹھاس موجود تھی جو کسی حسین تصور میں ہو سکتی ہے۔ میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ میرے دل و دماغ پر پوری طرح چھا گئی۔ میں اسے شروع شروع میں نظر انداز کرتا رہا۔ اور پھر جب اس سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ ہم دونوں کی زندگی کے واقعات تقریباً یکساں ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میری پرورش رہائشی اسکولوں میں ہوئی تھی اور اس کی پرورش اس کے دادا نے کی تھی۔ اس یکسانیت کے باوجود فطری طور پر ہم ایک دوسرے کی ضد تھے۔ وہ جتنی سادہ لوح تھی، میں اتنا ہی قنوطی واقع ہوا تھا۔ وہ جتنی جذباتی تھی، میں اتنا ہی سرد مزاج تھا۔ کیونکہ میری زندگی کی داستان ایسی ہی سرد مزاجی سے منسلک تھی۔ لاشیلہ نے مجھے بتایا کہ تیسری ہی ملاقات میں وہ مجھ سے شادی کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ لیکن میں اتنا بے حس ثابت ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے اظہارِ محبت کرنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ اس نے کہا کہ جب بھی کبھی وہ اس قسم کا ارادہ کرتی تو مجھے اس طرح اپنے خول میں گم پاتی کہ سوچتی کہ کہیں میں اس کی بات سن بھی پاؤں گا یا نہیں۔

بہر حال یہ حقیقت تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں مجھے لاشیلہ سے اتنی انسیت ہو گئی کہ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اس کی مداخلت کو ناگوار نہیں محسوس کرتا تھا اور ادھر وہ تھی کہ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ میری انا کے حصار کو توڑ کر دم لے گی۔ ایک دن میں نے غصے سے نہیں، صرف خوف کے عالم میں اس سے کہا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ دے۔ وہ حیرت سے میری صورت دیکھتی رہی۔ میں نے اس سے کہا کہ کیا اسے میرے بغیر سکون نہیں مل سکتا؟ کیا وہ دل و دماغ کے بعد اب میری روح پر بھی قابض ہو جانا چاہتی ہے؟ میں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ میرے طرزِ تخاطب سے اسے شدید تکلیف پہنچی ہے۔ مگر میں غم و غصے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ اتفاق سے انہی دنوں مجھے ہشمان نے دو ہفتوں کے لئے جنگل کی ڈیوٹی پر بھیج دیا اور میں جنگل روانہ ہو گیا۔ جنگل میں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ لاشیلہ کو تکلیف پہنچا کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ یہ کوئی شریفانہ قدم نہیں تھا۔ میں نے اپنے اس احساس کو دبانے اور کچلنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ لیکن اس میں کمی ہونے کی بجائے شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔

آخر کار میں نادم ہو کر اس کے پاس پہنچا لیکن اس دوران بازی پلٹ گئی تھی۔ پہلے وہ

مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھی اور میں بے اعتنائی برتتا تھا۔ لیکن اب...... اب وہ مجھ سے بے اعتنائی کا اظہار کر رہی تھی اور میں اس کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن وہ میری جانب راغب ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر ایک دن ڈر اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں، میں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

''لاشیلہ! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لاشیلہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر اور بہت غور کر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور اس کے بازو پر میرے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس پر انگلیوں کے نشانات بن گئے تھے۔ میری حیثیت اس وقت ایک بھکاری کی سی تھی جو رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ اپنے بازو کی تکلیف کو نظر انداز کر کے میری اس کیفیت پر مسکرائی اور پھر اس نے اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔ نجانے کیوں اسے اس بات پر اعتماد تھا کہ آخر کار میں اس کے سامنے جھک جاؤں گا۔ وہ بہت طاقتور ثابت ہوئی۔ خوبصورت سی قد و قامت کی مالک یہ دُبلی پتلی لڑکی اتنی طاقتور ثابت ہوئی کہ اس نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا اور اس کے بعد میں لاشیلہ کو دل و جان سے چاہنے لگا۔ میں نے اپنا سارا پیار، سارا اعتماد اسے دے دیا۔ میں اس کے بغیر نامکمل تھا اور میرے لئے ہر وہ لمحہ بیش قیمت تھا جو میں نے لاشیلہ کے ساتھ گزارا۔ اس کے دادا شروع شروع میں ہماری محبت کے خلاف تھے لیکن بعد میں وہ بھی مجھے پسند کرنے لگے۔ ہماری منگنی ہو گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ ایک ماہ کے اندر اندر ہماری شادی ہو جائے گی۔ لاشیلہ اور میں بس یوں لگتا تھا جیسے ایک جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔ اس دن جب میں نے اپنی کار اس چٹان کے نیچے روکی جسے انسانی ہاتھوں کی تراش نے بے حد خوبصورت بنا دیا تھا۔ پتھر کی بل کھاتی ہوئی سیڑھیوں پر میں چڑھ رہا تھا اور یہ سیڑھیاں اس فارم ہاؤس تک جاتی تھیں جو چوکی پر قلعے کی مانند بنا ہوا تھا۔ ابھی میں نے آدھا راستہ طے کیا تھا کہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی اور میں ایک دم رک گیا۔ مجھے لاشیلہ کا انتظار تھا۔ اور کچھ لمحوں کے بعد اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ دُبلے پتلے بدن والی لاشیلہ میرے کندھوں تک آتی تھی۔ اس کے سرخی مائل سنہرے بال لاپرواہی سے پشت پر بکھرے رہتے تھے۔ چہرہ سنگ مرمر کی یونانی مورتی سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن اتنا احساس تھا کہ خوشی یا غم، ڈر یا تعجب یا تھکن کے

موقعوں پر اس پر مختلف رنگ دوڑنے لگتے تھے۔ ہونٹ نہ پتلے تھے نہ موٹے۔ ان میں گلابی رنگ کا رس بھرا ہوا تھا اور سب سے زیادہ حسین اس کی یہ بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں تھیں جو اس کی خاموشی کے ساتھ ساتھ بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ قریب پہنچ کر اس نے پھلوں سے بھری ٹوکری میرے ہاتھ میں تھمائی اور اپنے گداز ہاتھوں سے میرے بالوں کو جو میری پیشانی پر آ گئے تھے، درست کیا۔ پھر ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اوپر چڑھنے لگے۔ لیکن جب ہم اوپر پہنچے تو جیوڈش وہاں ہمارا منتظر تھا۔ اچانک ہی لاشیلہ نے مدھم لہجے میں کہا۔

''جیوڈش کو یہیں چھوڑ دینا۔''

نجانے کیوں اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ لیکن میں اس پر سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ جیوڈش آگے بڑھا اور اس نے کہا۔

''ہیلو لاشا! تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تمہارے بچوں کا کیا حال ہے؟''

''عیش کر رہے ہیں سب۔ خوب ڈٹ کر کھا رہے ہیں۔ ویسے اگر جلدی ان کی شادی نہیں ہوئی تو میں مفلس ہو جاؤں گا۔''

''ابھی پچھلے دنوں ہی تو تم نے اپنی ایک بیٹی کی شادی کی تھی۔ کیا تمہیں اس کا بھاری معاوضہ نہیں ملا؟'' لاشیلہ نے عجیب سا سوال کیا۔

''نہیں کہاں؟ یہ زمانہ نیکی کا نہیں ہے۔ میں اپنے داماد کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ شادی کے بعد ساری ادائیگی کر دے گا۔ اب کبھی کہتا ہے فصل اچھی نہیں ہوئی، کبھی کہتا ہے مویشی بیمار پڑ گئے۔ ابھی تک ایک کھوٹا سکہ نہیں دیا ہے۔ مفت میں میری بیٹی کو اپنی بیوی بنا رکھا ہے۔''

''ہو سکتا ہے وہ فصل اور مویشیوں کے بارے میں سچ کہہ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی نیت خراب نہ ہو۔'' لاشیلہ نے کہا۔

''آہ...... یہی تو بدقسمتی ہے لاشا! اس کی نیت بہت خراب ہے۔ وہ مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے۔''

وہ ایک لمحے کو رکا، پھر بولا۔ ''لیکن اگر اگلے مہینے تک اس نے ادائیگی نہیں کی تو میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔'' اس نے ہاتھ سے گردن اُڑانے کا اشارہ کیا۔

"اوہو...... تمہاری بیٹی بیوہ ہو جائے گی۔ اور پھر تم اس کی دوسری شادی بھی نہیں کر سکو گے۔ بھلا کون ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جس کا باپ ذرا سی رقم کی خاطر داماد کی گردن اُڑا دینے کا قائل ہو۔"

"ذرا سی رقم نہیں ہے لاشا! کافی بڑی رقم پر سودا ہوا ہے۔"

لاشیلہ اور اس کے درمیان باتیں ہوتی رہی تھیں۔ میں نے اس گفتگو میں دخل دینا مناسب سمجھا اور کہا۔

"جیودش! میں اور لاشیلہ زمینوں پر جا رہے ہیں۔ تم کمپاؤنڈ کا ایک چکر لگا آنا اور مزدوروں سے کہہ دینا کہ صبح ہوتے ہی پہنچ جائیں۔"

"کیا مطلب...... کیا تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے چلو گے؟" جیودش نے کہا۔

"تمہیں لے جاؤں گا تو یہاں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

جیودش جیسے سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے فارم سے زیادہ تمہیں اور لاشا کو دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔"

"ہمارے لئے پریشان نہ ہو۔ ہم بچے نہیں ہیں۔"

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ "غروبِ آفتاب کے بعد یہیں ملنا۔ گھر مت چلے جانا۔"

اس نے اس بار ہاتھ ہلایا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگوں کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ تم اس کے ملازم ہو یا وہ تمہارا ملازم ہے؟ سنا تو میں نے یہی تھا کہ تم جیودش کے ساتھ کام کرتے ہو اور وہ تمہارا محسن ہے۔ لیکن جس طرح تم اس پر حکومت کرتے ہو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہارا ملازم ہے۔ ویسے ایک بات میں تمہیں بتاؤں، ایک ایسا شخص قابل اعتماد نہیں ہوتا جو ہر وقت خون خرابے کی باتیں کرتا رہتا ہے۔"

"ایسا شخص قابل اعتماد ہوتا ہے لاشیلہ! مزدور اس سے ڈرتے ہیں اور محنت سے کام کرتے ہیں۔"

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ جیودش ایک سخت فطرت کا مالک تھا اور دوران ملازمت اس کا زیادہ تر عرصہ یا تو حوالات کی کوٹھڑی میں گزرا تھا یا پھر محکمے کی جانب سے دی جانے والی دوسری سزائیں بھگت کر۔ اکثر الزامات معمولی نوعیت کے ہوتے تھے جن کا

تعلق ڈسپلن سے ہی تھا۔ جیودش جس شخص کو چاہے، جس کا عہدہ یا رینک کچھ کیوں نہ ہو، خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا جرم شراب نوشی تھا۔ بلانوشی کے باعث کسی سے اس کا جھگڑا ضرور ہوتا تھا اور نشہ اترنے تک اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ سزا صرف سزا نہیں تھی بلکہ احتیاطی تدابیر بھی تھیں کہ کہیں اس کے ہاتھوں کوئی قتل نہ ہو جائے۔ وہ حوالات میں بند ہوتا اور اس لڑنے والے کو اپنی چوٹوں اور زخموں کے علاج کے لئے کلینک جانا پڑتا۔

ان دنوں کی بات ہے جب میں پولیس کا ملازم تھا بلکہ مجھے پولیس اسٹیشن میں کام کرتے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن مجھے اطلاع موصول ہوئی کہ جنگل میں واقع ایک بستی میں بڑے پیمانے پر نشہ آور محلول تیار کیا جا رہا ہے۔ ایسی اطلاع پر پولیس فوری کارروائی کرتی تھی۔ کیونکہ جس قسم کا محلول تیار ہوتا تھا اس سے یا تو دو چار لوگ اندھے ہو جاتے تھے یا ان کا دماغ الٹ جاتا تھا۔ میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ میں بستی میں جاؤں اور ان لوگوں کو محلول بنانے سے باز رکھوں۔ جیودش میرے ساتھ تھا۔

ہم دونوں رات کے آغاز میں بستی پہنچے۔ اطلاع دینے والوں نے بہت دیر میں اطلاع دی تھی۔ محلول نہ صرف تیار کیا جا چکا تھا بلکہ پچھلے تین روز سے بستی کے افراد اپنے کسی نہ کسی عزیز کی موت کا غم غلط کرنے کے لئے مسلسل اسے استعمال کر رہے تھے۔ کوئی مرد، کوئی عورت، کوئی بچہ ایسا نہیں تھا جو ہوش میں ہو۔ بستیوں میں جاتے وقت پولیس اپنے سارے ہتھیار نہیں رکھتی۔ ہتھیار پاس ہوں تب بھی چار پانچ پاگلوں اور مدہوش باشندوں کے مقابلے میں ان ہتھیاروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ محلول سے بھرے ہوئے ان بے شمار مٹکوں کو جن کے استعمال کی ابھی باری نہیں آئی تھی، توڑ دیا۔ مدہوش باشندوں کو مٹکے ٹوٹنے اور محلول بہہ جانے کا علم اس وقت ہوا جب ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ سب سے زیادہ پریشان کن مرحلہ یہی تھا۔ محلول کے نشے میں چور دیہاتیوں نے چاروں طرف سے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ غصے کے باعث ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ کچی زمین پر وہ محلول جس میں ذائقہ بڑھانے اور خوشبو پیدا کرنے کے لئے چوہوں، چھپکلیوں اور سانپوں کو ڈالا جاتا تھا، بہہ رہا تھا۔ انہیں محلول کے ضائع ہونے پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ ان کے غصے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ان کی وہ پارٹی

جسے کئی دنوں تک غم غلط کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا، مٹکے پھوٹ جانے کے باعث اچانک ضائع ہوگئی تھی۔

یہ ایک سنگین صورتحال تھی۔ اس وقت ایران کے ان قبائلی علاقوں کی کیفیت بہت ہی مختلف تھی۔ بے چارے غیر تعلیم یافتہ ایرانی دیہاتی اس صورتحال سے بڑے سنجیدہ ہوگئے تھے۔ خون کو منجمد کر دینے والی ایک عجیب قسم کی ناقابل برداشت خاموشی طاری تھی۔ میں ان لوگوں کے گھیرے میں تھا اور وہ مجھے گھور رہے تھے اور میں انہیں گھور رہا تھا۔ اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ انہیں کچھ کہوں۔ لیکن اچانک ایک شخص بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا لیکن جسامت کسی ویٹ لفٹر کی طرح تھی۔ اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ مجمع اس کے پیچھے مجھے چیرنے پھاڑنے کے ارادے سے آگے آیا۔ وہاں ایک ہلکی سی کسی بھیڑیئے کی غراہٹ سے ملتی جلتی آواز آئی اور جو شخص جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ جیودش کے ہاتھ پتہ نہیں کہاں سے ایک لاٹھی لگ گئی تھی جسے وہ بڑی مہارت سے اپنے سر پر لٹو کی طرح گھماتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنے منہ سے بھیڑیئے کی آواز خاص طور سے نکالی تھی۔ لاٹھی کو گھماتا اور منہ سے خوفناک آوازیں نکالتا وہ جس طرف بڑھ جاتا، لوگوں کے پرے کے پرے پیچھے ہٹ جاتے۔ سب کچھ ایک لمحے کے اندر اندر ہو جاتا۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا میرے سینے پر آ گرا اور میرے سنبھلتے سنبھلتے اب اس نے میرے منہ پر اتنا زوردار مکا رسید کیا کہ میرا توازن برقرار نہ رہ سکا۔ میں پیٹھ کے بل زمین پر گرا۔ اگر قلابازی کھا کر دوسری طرف نہ چلا جاتا تو پلک جھپکتے اس کی ٹھوکر میری کئی پسلیوں کو توڑ دیتی۔ اس وقت مجھے اپنی حیثیت اور اپنے مرتبے کے ختم ہونے کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچانا چاہتا تھا۔ میں پھرتی سے اٹھا اور خود کو مقابلے کے لئے تیار کر لیا۔ وہ دیوانگی کی حد تک خوفناک ہو رہا تھا۔

آخر کار جنگ شروع ہوئی۔ لیکن آغاز سے ہی وہ جنگ برابر کی جنگ نہیں تھی۔ نشے نے اسے اتنا مدہوش اور بے خود کر رکھا تھا کہ میرے گھونسوں، مکوں اور ٹھوکروں سے اسے کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر میں اپنے ناخنوں سے اس کے چہرے کی کھال بھی اتار ڈالتا تب بھی اسے کوئی احساس نہ ہوتا۔ محلول نے اسے ایسی قوت و توانائی بخش دی تھی جو کم

ہونے کی بجائے لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں زیادہ دیر اس کے سامنے نہیں ٹک سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے محلول سے پیدا ہو جانے والی کیچڑ میں جا گرا۔ اگلے ہی لمحے وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنی فولادی انگلیوں سے میرا گلا پکڑ لیا تھا اور اتنی شدید گرفت قائم کی تھی اس پر کہ مجھے اپنی آنکھیں باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اور پھر باقی جو کچھ ہوا، وہ دیوانگی کے عالم میں یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ سیلف ڈیفنس اور وہ بھی قوتِ ارادی کے بغیر۔ بس اتنا یاد ہے مجھے کہ میں نے اس کے بال پکڑ رکھے تھے اور اس کے سر کو زور زور سے ایک پتھر پر ٹکرا رہا تھا۔ میں اس وقت تک اس کے سر کو پتھر سے ٹکراتا رہا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہو گیا۔ اور آخر کار بمشکل تمام میں اٹھ کر کھڑا ہو سکا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آس پاس کون ہے۔ کوئی خیال ہی دل میں نہیں تھا۔ نجانے کس طرح میں لڑکھڑاتا ہوا بستی سے باہر نکلا اور گھنے جنگل میں پہنچ کر زمین پر گر گیا اور یہ بھی نہیں یاد تھا کہ کتنا وقت گزرا تھا جب جیودش نے مجھے اٹھایا۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا وہاں تک آیا تھا۔ وہی مجھے کندھے پر ڈال کر ایک سرنگ تک لے گیا جس کے گنگنے پانی سے اس نے میری چوٹوں اور کیچڑ آلود جسم کو اچھی طرح دھویا۔ میں نے اسے دیکھا، اس وقت میرے ہوش و حواس کسی حد تک بحال ہو گئے تھے۔ بہت سی باتیں دماغ سے محو ہو گئی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے جیودش! اتنے نازک لمحات میں تم نے میری کوئی مدد نہیں کی۔''

''کیا بات کرتے ہو؟ میں مدد نہ کرتا تو اس وقت تمہاری بوٹی بھی نہ ملتی۔ چار سو سے زیادہ بپھرے ہوئے لوگوں کو میں نے وہاں سے بھگایا ہے۔ تمہیں تو صرف ایک ہی شخص کا مقابلہ کرنا پڑا اور مجھے...... ویسے ایک بات میں تمہیں بتا دوں، بہت شاندار آدمی ہو تم۔ بڑی بے جگری اور بڑی بہادری سے لڑے اس سے۔'' جیودش نجانے مجھے کیا کیا بتاتا رہا لیکن بہرحال میری اس کی دوستی اس واقعے کے بعد سے بہت گہری ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد جب بھی میں کبھی گشت پر گیا، جیودش کے بغیر نہیں گیا۔

ویسے ہم دونوں کی بہت سی عادتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ میں جیودش کی بات کر رہا ہوں۔ اور یہی وجہ تھی شاید کہ جب میں نے استعفیٰ دیا تو اس نے بھی اپنا استعفیٰ پیش کر کے اعلان کر دیا کہ اب ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔ اچانک ہی لاشیلہ کی آواز نے

مجھے چونکا دیا۔

"کیا تم کوئی خواب دیکھ رہے ہو کھلی آنکھوں کے ساتھ؟"

میں ایک دم چونک پڑا۔ خیالات کی رو میں بہہ کر میں اس وقت لاشیلہ کو بھی بھول گیا تھا۔ اس نے کندھا ہلایا تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اوہو...... نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ہے...... میں بہت سی بار محسوس کر چکی ہوں کہ کبھی کبھی تم میری قربت کو بھی بھول جاتے ہو۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی سنگین ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیار، اپنی محبت سے اپنے محبوب کو اپنی جانب صحیح طور پر متوجہ نہ کر سکے اور اس کا محبوب نجانے کیسے کیسے خیالات میں کھو جائے۔"

"اوہو...... ایسی کوئی بات نہیں ہے لاشیلہ! میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ چلو اگر یہ بات تمہیں ناگوار گزری ہے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو، کیا فائدہ؟ تم پریشان ہو جاؤ گی۔"

"نہیں ہوں گی...... بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کا نام کیا رکھوں گا۔ اور اگر میری توقع کے خلاف بیٹی پیدا ہو گئی تو......؟"

"بے کار باتیں...... بے کار باتیں کرتے ہو۔ ابھی کوئی مسئلہ نہیں ہے اور تم بچوں کے چکر میں پڑ گئے۔"

ہم لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد لاشیلہ اپنے گھوڑے کے پاس پہنچ گئی جو گھاس چر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، جیودش کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ میرا گھوڑا لے کر قریب آ گیا۔

ویسے تو ہم عام طور سے کار استعمال کیا کرتے تھے لیکن جنگل میں گھوڑوں پر جاتے تھے۔ کار کے لئے ہموار راستے ضروری ہوتے ہیں جبکہ گھوڑے کے لئے ہر جگہ راستہ بنایا جا سکتا ہے۔ جیودش نے پہلے ہی زین کس کر میرا گھوڑا تیار کر رکھا تھا۔ وہ اسے لگام سے پکڑے میرے پاس لے آیا۔

"یہ گوشت کی سواری حاضر ہے۔"

میں گھوڑے پر سوار ہو گیا اور سست رفتاری سے احاطے سے باہر نکل آیا اور پھر گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ کوئی آدھے میل تک کا سفر میں نے اسے اس کی مرضی سے کرنے دیا۔ پھر لگام کھینچ کر رفتار ہلکی کی۔ لاشیلہ کا گھوڑا بھی میرے ساتھ ساتھ ہی آ رہا تھا اور تھوڑا ہی پیچھے تھا۔ گھوڑے کی سواری پر تیز ہوا کی وجہ سے اس کے حسین بال اسکارف کی قید سے آزاد ہو گئے تھے اور ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک مقام پر لاشیلہ نے اپنا گھوڑا تیزی سے آگے بڑھایا اور اسے سرپٹ دوڑا دیا۔ میں نے بھی ایڑ لگائی۔ لیکن نظر نہ آنے والے ایک گڑھے میں پاؤں پڑ جانے کے باعث میرا گھوڑا لڑکھڑا گیا۔ توازن بگڑنے سے میں نیچے گرا۔ لیکن کچھ دلچسپ واقعات میرے منتظر تھے۔ مثلاً جس جگہ میں گرا، وہاں قریب ہی ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ میری آہٹوں سے وہ تڑپ کر بہت اونچا کھڑا ہو گیا۔

اس قسم کے واقعات جنگلوں میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے اعصاب خصوصی طور پر تیار رہا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کئی قلابازیاں کھائیں اور سانپ کی پہنچ سے دور چلا گیا جس نے اس جگہ پھن مارا تھا جہاں میں گھوڑے سے گرا تھا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گھوڑے کی جانب دوڑا۔ پھر میں چھلانگ لگا کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا۔ لاشیلہ کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ میں ایک لمحے کے لئے پریشان سا ہو گیا۔ خاصی دور نکل آیا تھا لیکن لاشیلہ کا گھوڑا یا لاشیلہ نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کئی بار اسے آواز دی اور میری گونجتی ہوئی آواز پتھروں سے ٹکراتی ہوئی دُور دُور تک پھیل گئی۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اپنے گھوڑے کو روکا، اس سے نیچے اتر آیا۔ زمین پر گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشانات تلاش کرنے لگا اور چند ہی لمحوں کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس وسیع و عریض میدان کی جانب گئی ہے جو ایک روایتی میدان ہے اور روشنان کا میدان کہلاتا ہے۔ میں نے اس کا نام ہی سنا تھا اور اس سے متعلق داستانیں۔ لیکن کبھی وہاں گیا نہیں تھا۔

پہلی بار میں نے اس طرف کا رخ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ میدان میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس میں گھاس انتہائی بلند تھی۔ اتنی بلند کہ اس نے مجھے اور میرے

گھوڑے کو چھپا لیا۔ اس کے باوجود میں اندازے سے آگے بڑھتا رہا۔ میرے حلق سے لاشیلہ، لاشیلہ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس میدان کی لمبائی چوڑائی کم از کم ایک سے ڈیڑھ میل کے قریب تھی۔ میں نے وہ میدان عبور کرلیا اور ایک ایسے ریتلے علاقے میں پہنچ گیا جہاں گھاس کی ایک جڑ تک نہیں تھی۔ ایک بار پھر میں نے گھوڑے کو روکا اور نیچے اتر گیا۔

اب سچی بات یہ ہے کہ مجھے شدید تشویش ہونے لگی اور میں یہ سوچنے لگا کہ پتہ نہیں کیا قصہ ہے۔ مجھے اس پاگل عورت کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے ایسے ہی کسی ریتلے علاقے کا تذکرہ کیا تھا جہاں وہ پراسرار روح پائی جاتی ہے۔ گھوڑے کی رسّی کو ایک ابھرے ہوئے پتھر سے باندھ کر ایک بار پھر میں واپس پلٹا اور قدِ آدم گھاس میں گھس گیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اسے چیرتا ہوا اندھوں کی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اور ایک بار پھر میں نے یہ طویل میدان طے کیا اور دوسرے کھلے حصے میں پہنچ گیا۔ تبھی میری آنکھیں شدتِ حیرت سے پھیل گئیں۔ سامنے ایک چٹان پر لاشیلہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کا ایک دلچسپ مذاق ہو۔ حالانکہ میں بہت پریشان ہو گیا تھا اور اسی پریشانی کے عالم میں، میں نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

''کمال ہے...... تم یہاں سکون سے بیٹھی ہوئی ہو اور میں نجانے کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''بس میرا شوق ہے۔''

''شوق؟''

''ہاں...... کیوں؟''

''یہ بھی کوئی مشغلہ ہے تمہارا؟''

''بالکل۔''

''اس کی وجہ؟''

''تمہاری محبت کا امتحان۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ تم ضرور مجھے تلاش کرلو گے۔ آؤ میں تمہیں ایک بڑی اچھی چیز دکھاؤں۔''

''کیا چیز؟''

''آؤ تو......'' وہ بولی اور مجھے کھینچتی ہوئی گھاس میں لے گئی۔ راستہ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود ایسا لگتا تھا جیسے لاشیلہ وہاں کے چپے چپے سے واقف ہو۔ اس مرتبہ ہم دونوں گھاس کے درمیان واقع ایک ایسی چٹان کے قریب پہنچے جو بڑی حد تک انسانی چہرے سے مشابہ تھی۔

''وہ دیکھو......'' اس نے گھاس ہٹا کر ایک جانب اشارہ کیا۔ تب میری نگاہیں اس سرنگ کے دہانے کی جانب اٹھیں جو چٹان کے نیچے دوسرے حصے کی طرف جاتی تھی۔ لاشیلہ نے کہا۔

''آؤ...... ہمیں اس سرنگ میں چلنا ہے۔''

''مم...... مگر کیوں؟''

''آؤ تو...... تم آگے آجاؤ۔ اور خیال رکھنا، یہاں سانپ بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ اگر ایسا ہو تو تم انہیں مار دینا۔''

میں نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلائی۔ عورت کی حماقتوں میں تو بڑے بڑے نجانے کیا کیا کچھ کر چکے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چلو ٹھیک ہے، مجھ پر بھی حماقتوں کا موسم گزر رہا ہے۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے اس سرنگ میں۔ لاشیلہ مجھے کیوں وہاں لے جا رہی ہے۔ میں آگے بڑھ کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔

سرنگ کی اونچائی اتنی نہیں تھی کہ اس میں کھڑا ہونا ممکن ہو۔ چنانچہ ہمیں جھکنا پڑا۔ لاشیلہ پیچھے سے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ سرنگ ویسے صاف ستھری تھی۔ سانپ تو سانپ، اس میں مکڑی کا جالا تک نہیں تھا۔ طوالت بھی بہت زیادہ نہیں ہو گی۔ کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد ہم دوسری جانب پہنچ گئے۔ تب میں نے دائرے کی شکل کا ایک بڑا میدان دیکھا جس کے اطراف میں ٹھوس پتھر کی تیس فٹ اونچی دیوار بنائی گئی تھی۔ یقیناً یہ انسانی ہاتھوں کا ہی کارنامہ تھا۔ ہم اسے قدرتی دیوار نہیں کہہ سکتے تھے۔ درمیان میں ایک ایسا بڑا پتھر موجود تھا جسے خاص طور پر تراشا گیا تھا۔ اگر یہ پتھر یہاں نہ ہوتا تو اسے کرکٹ کے ایک وسیع میدان سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ میں نے حیرت سے لاشیلہ کی جانب دیکھا اور کہا۔

"لاشیلہ! کیا تم نے پہلے بھی اس جگہ کو دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے۔"

"کیسے؟"

"میرے دادا کا ایک ملازم تھا۔ وہ مجھے کئی بار یہاں لایا تھا۔ اس وقت جب میں چھوٹی سی تھی۔ میں یہاں اکثر کھیلنے آتی رہی ہوں۔ یہ اس علاقے کی سب سے خوبصورت جگہ ہے۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں کسی زمانے میں یہ جادوگری کا مسکن رہی ہے اور جادوئی کارناموں کے شوقین یہاں آجایا کرتے تھے اور چلّے وغیرہ کیا کرتے تھے۔ لیکن اب ادھر کا کوئی رُخ نہیں کرتا۔ خاص طور سے یہ قد آدم گھاس جس نے سرنگ کو انسانوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا ہے۔"

"ہوں...... کیا یہاں داخلے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

"نہیں۔ صرف یہ ایک سرنگ۔" اس نے جواب دیا۔ نجانے کیوں مجھے اپنی گردن کی پشت میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن جو کچھ لگ رہا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ...... کہ......" میں جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ ایک بار پھر مجھے ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا ذہن خلاؤں میں کھو سا گیا ہو...... ایسی کیفیت کچھ لمحے رہی اور ماحول میری نگاہوں سے اوجھل ہوتا گیا......!

☆......☆

ہوش اور بے ہوشی کا یہ درمیانی لمحہ نجانے کتنا طویل رہا تھا، مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ لیکن جب ہوش آیا تو لاشیلہ گردن اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لاپرواہی کے آثار تھے۔ بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہوا جیسے اسے میری اس بے ہوشی کا اندازہ ہی نہ ہوا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھ کو ہلا کر دیکھا تو وہ ہل گیا تھا۔ میں نے لاشیلہ کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"چلیں......؟"

"ہاں...... آؤ یہاں سے واپس چلتے ہیں۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور آخر کار ہم اسی راستے سے واپس نکل آئے۔ میرا گھوڑا میری آواز پر میرے قریب آ گیا تھا۔ ہم وہاں سے واپس چل پڑے اور اس کے بعد پورا فاصلہ طے کر کے ہم اپنے جھونپڑی نما چھوٹے سے مکان میں پہنچے۔ یہ مکان میں نے خاص طور سے جیوڈش کی مدد سے تیار کرایا تھا اور بہت ہی اچھے ڈیزائن کا بنایا تھا جیسا ان علاقوں میں مکان بنایا جا سکتا ہے۔ لکڑی کے شہتیروں پر چھت ڈالی گئی تھی اور چھت پر خوب اچھی طرح گھاس جمائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مکان کے سامنے والے حصے میں پھولوں کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ دیواروں کے قریب انگور کی بیلیں لگائی گئی تھیں اور ہمارا متفقہ فیصلہ تھا کہ جب یہ بیلیں بڑی ہونا شروع ہوں گی تو ہم انہیں دیواروں پر پھیلا دیں گے اور اس طرح ہمارا یہ مکان اور حسین ہو جائے گا۔ گھوڑے سے اتر کر لاشیلہ نے دروازہ کھولا اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ باقاعدہ گھر بنا لیا گیا تھا اور جیوڈش اس کی تعمیر میں میرا دست راست رہا تھا۔

بہرحال لاشیلہ کو زندگی میں شامل کرنے کا تصور میرا حسین ترین تصور تھا۔ میں نے اپنے طور پر یہ مکان بنایا تھا اور جیوڈش نے جس طرح میری مدد کی تھی بس ان میں جذبات کا بہترین دخل تھا اور یہ جذبات ہی اس طرح کے مکانات تعمیر کراتے ہیں۔ میری زندگی میں

جیوڈش میرا بہترین دوست تھا اور میں اس کی دوستی کی دل سے قدر کرتا تھا۔

وقت جس طرح دل و دماغ پر اپنا تسلط جما لیتا ہے اس سے انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زندگی بس اسی انداز میں گزرتی رہے گی۔ لیکن زندگی نام ہی ایک کروٹ کا ہے۔ زندگی کروٹیں بدلتی رہتی ہے اور اس کی ہر جنبش میں مناظر کی تبدیلی ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کوئی ایسا ساتھی جدا نہ ہو جو زندگی کا مرکز بن جائے۔ وہ جو کسی کا ایک مصرعہ ہے یا ایک شعر ہے کہ۔

یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی کسی کے لئے
خدا کسی کو کسی سے کبھی جدا نہ کرے

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ لاشیلہ کے ساتھ میری زندگی کا آغاز ہی انجام بن گیا۔ وہ ایک منحوس دن تھا۔ انتہائی منحوس دن جب سلامتی گھوڑا دوڑاتا ہوا میرے پاس پہنچا اور بدحواسی میں گھوڑے سے نیچے کود پڑا اور زمین پر گرتے گرتے بولا۔

''جلدی کرو علی اصغر! کسی نے تمہارے گھر میں آگ لگا دی ہے۔ جلدی کرو، لاشیلہ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔''

اصولی طور پر پوچھنا تو یہ تھا کہ آگ کیسے لگی۔ خود بخود لگی یا کسی نے لگائی ہے؟ لیکن سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور سلامی کے ساتھ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا مکان کی طرف چل پڑا۔ دل کی ایک ہی خواہش تھی کہ مکان اور کھیت چاہے جل کر خاک ہو چکے ہوں مگر لاشیلہ کا بال بیکا نہ ہو۔ میرے پیچھے کچھ اور لوگ بھی چل پڑے تھے۔ لیکن جب میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو میں نے گہرا دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کو دیکھا۔ دور ہی سے کھیتوں میں کام کرنے والے ہاریوں کی لاشیں نظر آئیں جو اس حصے میں پڑی ہوئی تھیں جس کا چند گھنٹے قبل مکان کے احاطے میں شمار ہوتا تھا۔ یہ لاشیں انہی لوگوں کی تھیں۔ وہ آگ کا شکار نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں باقاعدہ دھاردار ہتھیاروں سے قتل کیا گیا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ گھٹنے ٹوٹ چکے تھے۔ پھر میں نے اپنے جسم میں کچھ اور طاقت پیدا کی اور دوڑتا ہوا باغیچے کی طرف بھاگا۔ آہ...... میں نے لاشیلہ کو دیکھا جو منہ کے بل ایک کیاری میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا جسم سیدھا کیا اور خون

میں نہائے ہوئے سر کو گھٹنوں پر رکھ کر اسے آواز دی۔

''لاشا...... لاشیلہ...... لاشیلہ......'' لیکن لاشیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے مرے ہوئے دیر گزر چکی تھی۔ میں نے اس کے سر کو زمین پر رکھا۔ جسم پر جگہ جگہ خنجروں کے نشانات تھے۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور زخموں سے بہنے والا خون جسم اور فرش پر جم گیا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں لیکن دیکھنے سے قاصر تھیں۔ مجھے اپنی پشت پر قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں نے چیخ کر کہا۔

''ادھر مت آنا۔ لاشیلہ بے لباس ہے۔'' یہ جملے ادا کرتے ہوئے میری ہچکی بندھ گئی۔

پھر میں نے اپنا اوپری لباس اتار کر لاشیلہ کے بدن پر ڈال دیا اور اس کی مُردہ آنکھوں کو پیار کیا اور پھر انہیں بند کر دیا۔ نجانے کون کون میرے قریب آ گیا تھا اور میں کسی کو دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ دفعتہً مجھے لاشیلہ کی بند مٹھی کا احساس ہوا اور میں نے اسے کھول کر سیدھا کر دیا۔ پھر میری نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ تب میں نے لاشیلہ کے گھوڑے کو دیکھا جس کے پیروں کو گھٹنوں کے پاس سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے رائفل اٹھائی اور گھوڑے نے اس طرح میری جانب منہ بڑھایا جیسے مجھے پیار کرنا چاہتا ہو۔ میں نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

''میں جانتا ہوں تمہاری تکلیف کو۔ بس ایک لمحے کی بات ہے، پھر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

پھر میں نے کھڑے ہو کر رائفل کی نال اس کے سر پر رکھی، دانتوں کو بھینچا اور گولی چلا دی۔ گھوڑے نے قلابازی کھائی اور اس کی موت کو یقینی بنانے کے لئے میں نے دوسرا فائر کیا اور گھوڑا اب قلابازی نہیں کھا سکا۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''ایک شریف آدمی ہوں میں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا قاتل کون ہے اور میری لاشیلہ کو کس نے قتل کیا ہے۔ شاہ پسندوں اور انقلابیوں کے درمیان چپقلش چل رہی ہے۔ مجھے جو کچھ سمجھا گیا ہے وہ ان کی سمجھ کا پھیر ہے۔ لیکن انہوں نے میرے سینے میں خنجر بھونکا ہے۔ اور اب یہی خنجر نجانے کس کس سے زندگی چھین لے گا۔''

میں نے جھک کر لاشیلہ کے کان میں کہا۔ ''لاشیلہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ تمہی سے محبت کرتا رہوں گا۔ میں ان لوگوں کا ذاتی دشمن نہیں تھا جنہوں نے تمہارے ساتھ

یہ سلوک کیا ہے۔ لیکن اب میری اور ان کی ذاتی دشمنی ہوگئی ہے۔''

اچانک ہی میرے کانوں میں جیودش کی آواز ابھری۔ ''علی اصغر...... علی اصغر! ادھر آؤ۔ دیکھو، یہ زندہ ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ جیودش ایک ایسے شخص کو سنبھالے ہوئے بیٹھا تھا جس کی گردن کاٹ دی گئی تھی لیکن اس کا ڈوبتا ہوا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ علی اصغر نے اس کے حلق میں پانی ٹپکایا اور اس نے یہ پانی جلدی جلدی پی لیا۔ اور اس کے بعد اس کی کراہیں شروع ہوگئیں۔ جیودش نے اس کے منہ پر جھک کر کہا۔

''جلدی بتاؤ، وہ کون لوگ تھے جنہوں نے یہ سب کچھ کیا؟''

''میں...... میں مر رہا ہوں۔ مجھے مرنے دو۔''

''یہ قتل و غارت گری کرنے والے کون تھے...... جلدی بتاؤ۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔''

''وہ بہت سے لوگ تھے...... وہ...... وہ انقلابی تھے۔ انقلابی...... ان...... ان......''

''کدھر گئے وہ لوگ؟'' جیودش نے کہا۔

''میدان روشان...... میدان......'' یہ کہہ کر اس نے دم توڑ دیا۔ میں نے جیودش کی آنکھوں میں دیکھا، اس شخص کی گردن سے بہا ہوا خون اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

''شاہ کا اور انقلابیوں کا معاملہ ہمارا ذاتی مسئلہ تو نہیں ہے۔ انہیں وہ نہیں کرنا چاہئے تھا جو انہوں نے کیا۔ اور اب انہوں نے جو نئے دشمن پیدا کئے ہیں ان سے نمٹنا ان کے لئے بہت مشکل کام ہوگا۔ یقین کرو علی اصغر! وہ تمہاری بیوی اور یہ گھر تمہارا تھا۔ لیکن پتہ نہیں اس میں تمہارا کیا ہے اور میرا کیا ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں خاموش ہوگیا۔

بہر حال لاشیلہ کی خوشبو میرے وجود میں رچی ہوئی تھی۔ لیکن وہ خود چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ایک اونچی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا اور بے خیالی میں آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ مجھے پتہ نہیں چلا کہ سلامی کب میرے پاس آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ قدرت ہمارے غم کی شریک تھی۔ سلامی کو دیکھ کر میں نے کہا۔

''سلامی! میں رونا چاہتا ہوں۔ لیکن میں رونا بھول گیا ہوں۔''

''نیچے چلو۔ بارش ہونے والی ہے۔'' سلامی نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

اور مجھے لے کر نیچے آگیا۔ میری نگاہیں مکان کی جانب اٹھیں۔ اس ایک ایک چیز کو میں نے کتنی محبت، کتنی محنت سے بنایا تھا لیکن وہ جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ بیڈ روم سیاہ ہو چکا تھا۔ نرسری کی تیز ہوا اندر آ رہی تھی۔ جس ڈرائنگ روم میں لاشیلہ کاغذ کا ایک ٹکڑا یا ڈھول کا ایک ذرہ دیکھنے کی روادار نہیں تھی، وہ مٹی کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ اس کی چھت اور ایک دیوار غائب ہو چکی تھی اور فرنیچر کوئلے میں بدل گیا تھا۔ میں ایک ایک چیز سے اس کی یادوں کو محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بس...... اب کیا کرنا ہے؟''

''آؤ، میں تمہیں شہر لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

پھر وہ مجھے لے کر چل پڑا۔ راستے میں بارش شروع ہوگئی اور ہم دونوں پتہ نہیں کیوں اس بارش سے ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگے۔ سلامی کے بارے میں تو مجھے اندازہ نہیں تھا۔''

دفعتہً ہی علی اصغر ذرا دیر رکا اور گارڈ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''سنو...... وہ لوگ مجھے پھانسی گھر لے جانے کے لئے کب آئیں گے؟''

''سزائے موت کے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے۔''

''ہوں، ٹھیک ہے...... بہر حال کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سونے کے بعد اٹھا تو میں نے تھوڑے فاصلے پر ایک عورت کو دیکھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھی مٹی کے گارے سے کچھ بنا رہی تھی۔ جب ہم اس کے سامنے پہنچے تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ سلامی نے فرش پر پڑا ہوا ڈنڈا اٹھایا اور غرا کر بولا۔

''خاموش ہو جاؤ...... ورنہ تمہارا بھیجہ نکال دوں گا۔''

عورت کی خوفزدہ نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں اور وہ دیوار سے چمٹ گئی۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم ایک بار جنگل میں میرے پاس آئی تھیں اور تم نے کچھ بدمعاشوں کا ذکر کیا تھا جو انقلابی تھے۔ یاد ہے نا تمہیں؟ میں تمہیں بتاؤں، ان بدمعاشوں نے میری بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ صرف اتنا بتا دو وہ کہاں ہیں؟''

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا تو سلامی چیخ کر بولا۔ ''دیکھو جو کچھ تم سے پوچھا جا رہا

ہے اس کا جواب دو۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔''

سلامی ویسا نہیں تھا جیسا جیودش تھا۔ جیودش کے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ میرے پاس پہنچنے والا ہوگا۔

بہر حال سلامی اس سے معلومات حاصل کرتا رہا اور عورت آہستہ آہستہ رام ہونے لگی۔ پھر جو الٹے سیدھے الفاظ اس نے ادا کئے ان کا مفہوم یہ تھا کہ اسے بدمعاشوں کے ٹھکانے کا کوئی علم نہیں ہے۔ لیکن آج رات وہ چٹانوں میں جشن منائیں گے اور بستی کے بہت سے جوان اس جشن میں شرکت کریں گے۔''

''کون سی چٹانوں میں؟''

''وہاں...... جہاں بہت سی چٹانیں ہیں اور بیچ میں ایک بڑا سا پتھر لگا ہوا ہے۔''

اور اس وقت مجھے روشان کا وہ میدان یاد آ گیا جس کے بارے میں، میں نے سوچا تھا کہ اگر یہ پتھر درمیان میں نہ ہوتا تو یقیناً یہ ایک کرکٹ اسٹیڈیم ہوتا۔ پھر ہم نے اپنے جوش کو فرو کرنے کا بندوبست کیا۔ جیودش اس سلسلے میں میرا دست راست تھا۔ اس نے کہا۔

''ہم بھی ان کے ساتھ جشن منائیں گے۔ لیکن موت کا جشن۔ کیا سمجھے؟ اس کے لئے ہمیں اسلحے کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''بندوبست ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں اس کی ترکیب ہے۔''

''کیا مطلب؟ کہاں سے بندوبست کرو گے؟''

جیودش مسکرایا اور بولا۔ ''وہاں سے جہاں ہم نے اپنی زندگی کا بہت بڑا عرصہ گزارا ہے اور جہاں سے اب ہم کنارہ کش ہو گئے ہیں۔''

''اوہو...... تمہارا مطلب ہے پولیس تھانہ؟''

''ہاں......''

اور پھر جیودش نے اس کارروائی کا آغاز کر دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔ ہم لوگ اپنے طے کئے ہوئے وقت کے مطابق تھانے میں داخل ہو گئے۔ ہمیں یہاں کی ایک ایک جگہ کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ مجھے پتہ تھا کہ اصطبل کو اسلحہ کے اسٹور روم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس علاقے کو ابھی تک اصطبل ہی کہا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اصطبل کی تیسری کھڑکی چٹخنی نہ ہونے کے باعث کھلی رہتی ہے۔ یہی جگہ

ہمارے لئے کام کی جگہ تھی۔ حسب معمول اصطبل کا بڑا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اسلحے کی عام سپلائی کے لئے عام طور پر اس دروازے کو دن میں کھلا رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں شاہ پسندوں اور انقلابیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ چل رہی تھی۔

اندر پہنچ کر میں نے الماری کی آڑ سے دیکھا، اسٹور کیپر کرسی پر بیٹھا ہوا محو خواب تھا اور اتنی گہری نیند تھی کہ میں نے مطلوبہ اشیاء نکالنے کے لئے کئی الماریاں کھولیں۔ جیودش نے بھی کئی جگہ آوازیں پیدا کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ساری چیزوں کو اکٹھا کر کے زین کے ایک بڑے تھیلے میں بند کیا گیا اور اس کے بعد میں کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اس پر چڑھ بھی گیا لیکن جب دوسری جانب نظر ڈالی تو خون خشک ہو گیا۔ آتے وقت اونچائی کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ جاتے وقت پتہ چلا کہ چھلانگ لگائے بغیر نیچے پہنچنا مشکل تھا۔ اور بھاری بھرکم تھیلے کے ساتھ چھلانگ لگانا اس سے بھی زیادہ مشکل۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ پہلے تھیلا نیچے پھینکوں اور بعد میں خود کود جاؤں۔ تھیلے میں کئی چیزیں ایسی تھیں جو ذرا سی رگڑ سے پھٹ سکتی تھیں اور ان کے پھٹنے سے گولہ بارود سے بھرا ہوا پورا اصطبل اُڑ سکتا تھا۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ میں نے جیودش کو پہلے جانے کے لئے کیوں کہہ دیا؟ اور یہ کیوں کہہ دیا کہ وہ باہر جا کر ذرا صورتحال کا جائزہ لے۔

بہر حال بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ جیودش غالباً دوسری طرف موجود تھا۔ اور پھر میں نے تھیلا اسے دے دیا اور طاقتور جیودش نے اسے سنبھال لیا۔ ہم لوگ کامیابی سے اپنی پہلی مہم سر انجام دے چکے اور وہاں سے چل پڑے۔

کچھ فاصلے پر جا کر ہم نے اپنے ساز و سامان کا جائزہ لیا اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ہم اپنے مقصد میں یقینی کامیابی حاصل کریں گے۔ ہم اس جشن کو جشن خونی میں تبدیل کر دیں گے۔ اور آخر کار ہم اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ روشان کے میدان میں داخل ہونے سے قبل ہم نے گھنی جھاڑیوں میں لباس تبدیل کئے۔ جسم سے اتارے ہوئے کپڑوں کو گڑھا کھود کر وہیں پر دفن کر دیا۔ اپنے چہرے وغیرہ کو تبدیل کیا اور کمر میں بڑا شکاری چاقو لٹکایا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ہماری جیپ ایک چٹان کی آڑ میں محفوظ ہو گئی تھی۔ اس وقت میرے ہاتھ کی گھڑی دس بجا رہی تھی اور میں اتنی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ گیارہ بجے تک ان چٹانوں میں پہنچ جاؤں جن کی نشاندہی اس پاگل عورت نے کی تھی۔

ابھی وہ چٹانیں تقریباً چھ سات میل کے فاصلے پر تھیں۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی اور تقریباً بھاگنے لگے۔ گھٹنوں تک گھاس، کانٹوں اور چھوٹے دلدلی گڑھوں سے تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے اچانک احساس ہوا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ اس راستے کی نشاندہی کی ذمے داری میں نے اپنے سپرد لی تھی۔ جبکہ جیودش اور سلامی میری تقلید کر رہے تھے۔ میں اندر ہی اندر شدید پریشان ہو گیا چونکہ میں راستہ بھٹک چکا تھا اور اس وقت میرے ہوش و حواس جواب دینے والے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میری مہم ناکام ہو گئی کہ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ایک مدھم سی ہنسی کی آواز سنائی دی اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ آواز لاشیلہ کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ تب میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، وہ مدھم سا ہیولا کوئی اسے پہچانے یا نہ پہچانے، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ لاشیلہ ہی تھی۔ بے اختیار ہونے سے پہلے میں نے اسے سنبھال لیا۔ لاشیلہ کی لاش اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ چکا ہوتا تو یقینی طور پر میں بھٹک جاتا۔ لیکن اس کی تدفین تو میں نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔

اس کی سرگوشی سنائی دی۔ ''وہ سامنے والا ٹیلہ دیکھ رہے ہو۔ اس کے پیچھے جاتے ہی تمہیں وہ سرنگ نظر آجائے گی۔''

اور میں نے اسی راستے کو اپنایا اور سرنگ کے قریب پہنچ گیا۔ اب میں ان میں سے کسی کو کیا بتاتا کہ اس وقت لاشیلہ نے میری رہنمائی کی ہے اور لاشیلہ کی روح یہاں موجود ہے۔ بہرحال ہم اس سرنگ کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن اس وقت ہمیں حیرت ہوئی جب ہم نے وہاں ایک پہرے دار کو دیکھا۔ وہ سرنگ کے دہانے کی حفاظت کر رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ اجنبی اور نئی بات اس لئے ہوئی ہے کہ انہیں کسی کے اس طرف آجانے کا خدشہ ہو گا۔'' جیودش نے کہا۔ ''اسے ٹھکانے لگائے بغیر سرنگ میں داخل ہونا مشکل ہے۔''

سلامی بولا۔ ''اس وقت کا انتظار ضروری ہے جب بادل کا کوئی ٹکڑا چاند پر آجائے اور ہم تاریکی سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں آجائیں۔''

بہرحال انہوں نے دو طرف سے پتھر کی جانب بڑھنے کا منصوبہ بنایا اور طے یہ ہوا کہ میں پہرے دار کے سامنے جاؤں گا۔ جیودش اس کی پیٹھ کی طرف سے جائے گا اور پتھر کے قریب بیٹھ کر آہٹ کرے گا۔ اور پھر پہرے دار تیزی سے پلٹ کر رائفل تان لے گا۔ اور

اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر میں پتھر پر چڑھ جاؤں گا اور اس کا کام تمام کر دوں گا۔

کچھ دیر کے بعد ہمیں یہ پوزیشن مل گئی۔ جب بادل کے ایک بڑے ٹکڑے نے چاند کو چھپا لیا اور تاریکی پھیل گئی تو ہم نے اپنے منصوبے پر کام کیا اور میں گھاس میں دبکتے ہوئے پتھر تک پہنچ گیا۔ لیکن اچانک ہمارا منصوبہ الٹ ہو گیا۔ آہٹ جیودش کو کرنا تھی لیکن کندھے پر پڑی رائفل کی نال پتھر سے جا ٹکرائی۔ بدحواسی میں اسے ہٹایا تو گھاس کی تیز سرسراہٹ ہوئی۔ پہرے دار کو جیودش کی طرف جھکنا تھا لیکن وہ میری طرف جھک گیا۔ اور پھر بادل کو بھی اسی وقت چاند پر سے ہٹنا تھا۔ پھر ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور اس نے پھرتی سے رائفل سنبھال لی۔ میں نے اتنی ہی پھرتی سے پتھر پر چڑھ کر اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ وہ منہ کے بل گرا اور دوسرے لمحے میرا شکاری چاقو اس کی پیٹھ میں اتر گیا۔ پھر میں نے پیٹھ میں پیوست چاقو کو پوری قوت سے کئی چکر دیئے تاکہ دوسرے اندرونی اعضاء اچھی طرح کٹ جائیں۔

اس دوران جیودش بھی اوپر آ گیا۔ اس نے آتے ہی پہرے دار کی رائفل گھاس پر پھینکی اور اپنا چاقو نکال کر اس کی طرف بڑھا۔ پہرے دار شاید میری ہی کوششوں سے ختم ہو چکا تھا۔ لیکن جیودش نے جھک کر اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیا تاکہ نہ مرض رہے نہ مریض۔ اس نے کٹے ہوئے سر کو ٹھوکر سے نیچے پھینک کر کہا۔

''بدنصیب انقلابی! میں شاہ پسند نہیں ہوں۔ لیکن تم نے ہمیں اپنا دشمن بنا لیا ہے۔''

بہرحال کچھ وقت کے بعد ہم نے سرنگ کو پار کیا اور اس کے بعد دوسری طرف پہنچ کر جب میں نے سامنے کا منظر دیکھا تو بے اختیار مجھے اس پاگل عورت کو داد دینے کو جی چاہا۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ گیس کی لالٹینیں روشن تھیں اور اس درمیانی پتھر کے درمیان کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں ان کے نظریات کیا تھے لیکن انہوں نے ایک باقاعدہ جشن منانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ لوگ وہاں قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک آدمی کے کندھے پر سب مشین گن لٹکی ہوئی تھی اور سفید لباس والا ایک شخص اور وہاں پر موجود تھا۔ تیز روشنی میں اس کا لباس جھلملا رہا تھا۔ وہ ایک عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا۔ دفعتہً ہی اس نے فضا میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نیچے گرے تو ایک سفید سا دھواں فضا میں بلند ہونے لگا اور اس کے بعد ایک سفید لبادے والی شخصیت ان

کے درمیان نظر آئی۔ اچانک ہی ثاقب سلامی کے منہ سے آواز نکلی۔

''آہ...... یہی وہ پراسرار روح ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی رہنمائی کرتی ہے۔ ہم نے اس وقت اس کے چکر میں نہیں پڑنا۔ بلکہ اپنا کام کرنا ہے۔''

پھر ہم لوگ تیار ہو گئے اور اس کے بعد ہماری رائفلیں تیار ہو گئیں۔ میں گولی چلانے ہی والا تھا کہ دوسری جانب سے ایک فائر ہوا اور وہ شخص جس نے بھڑکتا ہوا لباس پہنا ہوا تھا، اپنے کندھے کو پکڑ کر تیزی سے گھوما۔ اسی لمحے دوسرا فائر ہوا۔ گولی اس کے پیٹ میں پیوست ہو گئی۔ وہ بڑا سخت جان تھا۔ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا چھپنے کے لئے بھاگا۔ تیسرے فائر کی گولی اس کے گردوں میں لگی اور وہ چیخ مار کر گھٹنوں پر جھک گیا۔ اس کے ہاتھوں نے خون روکنے کے لئے پیٹ کو دبا رکھا تھا۔ ایک سیکنڈ تک وہ گھٹنوں پر جھکا رہا اور پھر اس کی طاقت ختم ہو گئی۔ وہ زمین پر گرا اور لوٹ لگاتا ہوا ختم ہو گیا۔

بہرحال یہ فائرنگ جیودش نے کی تھی جو اپنا جوش برداشت نہیں کر سکا تھا اور اب اس کے بعد اس نے اندھادھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ گھوم گھوم کر، اچھل اچھل کر گولیاں برسا رہا تھا۔ ہماری طرف سے بھاگ کر دوسری طرف جانے والوں کا استقبال سلامی کر رہا تھا۔ ہم نے بہترین مورچے سنبھالے تھے اور انتہائی کامیاب نشانے لگا رہے تھے۔ ہم نے صحیح معنوں میں زبردست کامیابی حاصل کی تھی اور ان میں سے بیشتر افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چنانچہ ہمیں اپنی انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں جتنے افراد تھے ہماری گولیاں انہیں چاٹ چکی تھیں اور ایک دم ایک بھرپور خاموشی اور سناٹا پھیل گیا تھا۔ بس ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ کامیابی نے ہمارے قدم چوم لئے ہیں۔ لیکن وقت کے فیصلے کچھ اور ہوتے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے بے خبر تھے جن کی تعداد بے پناہ تھی اور جو آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھ رہے تھے بالکل ایسے کہ ہمیں ان کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ اور جب ہم ہوش میں آئے تو ہم ان کی گرفت میں آ چکے تھے۔

تم بتاؤ، جو کچھ میں نے اور میرے دوستوں نے کیا، کیا وہ ایسا تھا کہ نہ کیا جاتا؟ وہ تو اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہمارا اس جنگ سے کیا تعلق تھا۔ ہم تو صرف ملازمت پیشہ تھے۔ اور میں نے تو نوکری چھوڑ بھی دی تھی۔ لیکن گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے اور میری ساری خوشیاں اس گھن میں پس گئی تھیں۔ لیکن اس وقت میرے دکھوں میں بہت

زیادہ اضافہ ہو گیا جب مجھے یہ علم ہوا کہ ہمارے خلاف کارروائیاں ہو رہی ہیں اور ان کارروائیوں میں وہ بھی شریک ہیں جن کے لئے ہم نے زندگی کی بازی لگائی اور بدترین نقصانات اٹھائے۔ یعنی شاہ پسند یا پھر وہ نام نہاد قانون کے محافظ جو صرف شاہ کے لئے کام کرتے تھے، قانون سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ شاہ کا قانون ہی اس ملک کا قانون تھا جس کا تعلق عدالتوں سے نہیں تھا۔ یہاں ہم زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے اور وہاں ہم تینوں کے خلاف زبردست کارروائیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ لیکن ہم یہ جانتے تھے کہ ہمارے خلاف شدید کارروائیاں ہو رہی ہوں گی۔

بہرحال یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم تینوں افراد کو حکومت کا باغی قرار دے دیا گیا ہے اور اس بنیاد پر کہ ہم سرکاری ہدایت کے بغیر انقلابیوں کے خلاف کارروائی کرتے پھر رہے ہیں اور ہم نے خون ریز جنگ میں انہیں ہلاک کیا ہے۔ اگر شاہ کی فوجیں انقلابیوں کو چن چن کر قتل کر دیں تو وہ شاہ کا قانون اور اگر ہم نے اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر اپنا قانون بنا لیا تو ہم بھی باغیوں کے تیسرے گروپ کی شکل اختیار کر گئے۔ ظلم تھا یہ۔ زیادتی تھی جسے ہم نے قبول نہیں کیا اور آخرکار ہمیں دونوں سمت سے بچنے کے لئے جنگلوں ہی میں پناہ لینا پڑی۔ لیکن ابھی میری آتش انتقام سرد نہیں ہوئی تھی۔ جیودش اور سلامی بھی میرے ہمراہ باغی قرار دے دیئے گئے تھے اس لئے ان کی بقاء بھی اسی میں تھی کہ میرے ہمراہ زندگی بچانے کی جدوجہد ہی نہیں بلکہ لاشیلہ کی موت کا انتقام لینے کے لئے مزید خونریزی کریں۔

جیودش پتہ نہیں کس قسم کا انسان تھا۔ یہ دیو قامت شخص اپنے سینے میں بڑا محبت بھرا دل رکھتا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ لاشیلہ کا انتقام لینے کی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ ابھی ہم نے ان لوگوں کے خلاف کوئی عمل نہیں کیا تھا جو ہمارے دشمن تھے۔ یعنی شاہ پسند جنہوں نے ہم سے نئی نئی دشمنی کا آغاز کیا تھا۔ بہرحال ہم لوگ چھپے پھر رہے تھے۔ اور پھر اس وقت بھی قد آدم جھاڑیوں کے درمیان ہی ہمارا بسیرا تھا کہ جیودش نے کہا۔

''اٹھو...... ہمیں کسی ایک جگہ نہیں چھپے رہنا چاہئے۔ جگہ تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔

اب چونکہ ہم باقاعدہ گوریلے بن گئے تھے اس لئے ہمیں گوریلوں جیسی ہی زندگی گزارنی پڑ

رہی تھی۔ اٹھنے کے بعد ہم نے جلدی جلدی کھانے کی چیزوں کو جھاڑیوں میں چھپایا۔ چاقو کمر کی بیلٹ میں لٹکائے۔ میں نے رائفل اور جیودش نے شاٹ گن سنبھال لی۔ پھر ہم جھاڑیوں سے نکل کر دبے قدموں چٹان کی طرف بڑھے اور احتیاط کے ساتھ اس چٹان پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی ہم جس علاقے میں تھے اس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ یہاں انقلابیوں کا بہت بڑا گڑھ ہے اور ہمارا اندازہ بالکل درست نکلا۔ چٹان کے دوسری جانب ہم نے ایک انقلابی محافظ کو دیکھا جو سگریٹ پی رہا تھا اور دھوئیں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں جیودش کے پیچھے اس کا ہاتھ پکڑ کر چڑھ رہا تھا اور اس بات پر حیرت بھی کرتا جا رہا تھا کہ جیودش جیسا بھاری بھرکم آدمی کتنی پھرتی اور بے نیازی سے اوپر جا رہا ہے۔ اصل میں اس کے وسیع تجربے نے سکھا دیا تھا کہ کون سا پتھر اس کا بوجھ سنبھال سکتا ہے اور کون سا پتھر اس کا وزن نہ سنبھالتے ہوئے لڑھک جائے گا۔

اوپر پہنچنے سے قبل ہم چند لمحوں کے لئے رکے۔ ضروری تھا کہ اگلے قدم سے پہلے سانس لے لیا جائے۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا، سرخ گولہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا اور اندازہ یہ تھا کہ بہت جلد رات ہو جائے گی۔ اور پھر چاند کی روشنی اس علاقے کو ہمارے مقصد کے لئے خراب کر دے گی۔ کچھ لمحوں کے بعد رک کر جیودش نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''ہوں، ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔''

''اسے دیکھ رہے ہو؟''

''بالکل۔''

''تم سنبھالو گے یا میں۔''

''فکر مت کرو اسے میں سنبھالوں گا'' میں نے کہا

''او کے وہ دیکھو۔ چٹان کے نیچے باقاعدہ خیمہ لگا ہوا ہے اوہو شاید وہ آگ روشن کر رہے ہیں۔ جیوتش کی آواز سناٹے میں ابھری۔ جس مقام پر ہم لوگ کھڑے تھے وہاں سے ان لوگوں کا خیمہ نظر آنے لگا۔ آگ بھی انہوں نے تازہ تازہ روشن کی تھی اور اس کی دھندلائیوں میں ان کے سائے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ محافظ جو یہاں چٹان کے

پاس موجود تھا اب بھی ہم سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہم سے دائیں جانب نظر آ رہا تھا۔ میں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ پیروں کے نیچے آنے والے پتھروں کا خیال کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ جیوتش نے مجھ سے تھوڑا سا فاصلہ اختیار کیے رکھا تھا پھر جب محافظ بیس گز دور رہ گیا تو میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور میں نے کمر کی بیلٹ سے چاقو نکال لیا پھر میں نے اپنی قمیض اتار دی سارے بٹن لگا کر سر سے اس طرح اوڑھا کہ چہرا ڈھک جائے اور آنکھیں کھلی رہیں۔ ایک بار پھر آسمان پر نگاہیں دوڑائیں اب چاند نکلنے میں بہت تھوڑی سی دیر باقی رہ گئی تھی۔ میں بیلٹ کے بل بیٹھ کر محافظ کی جانب بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ بارہ فٹ کا فاصلہ طے کر لیا۔ میرے اور محافظ کے درمیان صرف آٹھ فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔ بیچ میں کوئی ابھار یا پتھر نہ رہا جو آڑ کا کام دے سکے اور وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا اچانک میرے بوٹ سے ایک پتھر لڑھکتا ہوا اور آواز پیدا کرتا ہوا میرے قریب سے گزر کر محافظ کے جسم سے جا ٹکرایا۔ وہ رائفل سنبھال کر تیزی سے گھوما میری کھلی پیٹھ پر سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے پتھریلی زمین سے چہرہ لگا لیا اور آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے سانس لے کر سوچنے لگا کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے۔ محافظ کھڑا ہوا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ میں ایک لمحے کے لئے سوچنے لگا کہ اب مجھے اپنی جان بچانے کی فکر کرنی چاہئے۔ لیکن میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ اسی لمحے ایک اور پتھر لڑھکتا ہوا آیا اور محافظ کے پیر سے ٹکرا کر رک گیا۔ محافظ نے جھک کر پتھر اٹھایا اور اس طرح پھینکا کہ وہ دور جا کر گرا۔ اسی وقت آواز آئی۔

''کیا ہے......کون ہے......؟'' یہ غالباً کوئی دوسرا محافظ تھا۔

''شاید کوئی جنگلی جانور۔'' محافظ نے سکون سے جواب دیا اور میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ محافظ نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ اس وقت میرا زمین سے چپکے رہنا میرے کام آ گیا تھا۔ محافظ دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھا۔ یہ عمل میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ بہر حال اب اس کے بعد مجھے اپنا کام کرنا تھا۔ چنانچہ میں خاموشی سے اس کے پیچھے پہنچ گیا اور پھر میں نے بجلی جیسی تیزی سے اس کی گردن میں بایاں ہاتھ ڈالا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک چوتھائی سیکنڈ کے لئے اس کی آنکھیں خوف سے پھیلیں اور اسی لمحے میرا شکاری چاقو اس کے حلق میں اتر گیا۔ میرا پورا ہاتھ اور اس کا پورا سینہ خون کے فوارے

سے لت پت ہو گیا۔ لیکن میں پوری قوت سے اسے اپنی گرفت میں سنبھالے ہوئے تھا۔ اور جب اس کا جسم لرزنا بند ہو گیا تو میں نے آہستہ آہستہ اسے وہیں لٹا دیا۔ جیودش میرے پاس پہنچ گیا تھا لیکن اسی وقت اچانک محافظ کے ہاتھ میں دبی ہوئی کوئی چیز نکل کر چٹان پر پھسلنے لگی۔ میں اس کو پکڑنے کے لئے لپکا اور اسی وقت جیودش کے حلق سے آواز نکل گئی۔

''اوہو...... اوہو...... نہیں ...... نہیں ...... یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ دستی بم ہے۔'' جملہ مکمل کرتے کرتے وہ مجھے دبوچ کر وہیں گر گیا۔ اگر اسے ایک سیکنڈ کی دیر بھی ہو جاتی تو میرے پرخچے اُڑ گئے ہوتے۔ ہم دونوں کے گرتے ہی بم زوردار دھماکے سے پھٹا اور ہمارے جسموں پر چھوٹے چھوٹے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ شکر ہے کہ بم کافی نیچے چلا گیا۔ اوپر پھٹتا تو ہمیں ختم کرنے کے لئے چٹان کا ایک ہی ٹکڑا کافی ہوتا۔ بہت دیر تک دھماکے کی بازگشت فضا میں گونجتی رہی۔ پتھر لڑھکنا بند ہوئے اور خاموشی پھیل گئی۔ میں نے سانس درست کرتے ہوئے جیودش کو آواز دی۔

''خیریت سے ہو......؟''

''ہاں......'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور بولا۔ ''چلو جلدی۔ اب دیر نہ کرو۔ وہ لوگ بہرے نہیں ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بم کا دھماکہ سننے کے بعد وہ خاموشی سے بیٹھے رہیں۔''

اچانک نیچے سے مشین گن سے فائر ہونے لگے۔ پھر جیودش بولا۔ ''دیکھا تم نے۔ وہ تو شکر ہے کہ انہیں ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔'' پھر اس نے شاٹ گن والا ہاتھ پتھر کی آڑ سے نکالا اور ہنس کر بولا۔ ''میرے خیال میں وقت آ گیا ہے کہ باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔''

اور اس کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے فائر جھونک دیا۔ میں تیزی سے دوسرے پتھر کی جانب رینگ گیا اور جس مقام پر ان لوگوں نے آگ روشن کر رکھی تھی، اس طرف میں نے ایک سائے پر فائر کیا۔ اسی وقت چاند نکل آیا تھا اور ہمیں چٹان پر ہونے کا فائدہ حاصل تھا۔ دوسری مرتبہ نیچے سے مشین گنوں کی مزید اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں صحیح جگہ کا تعین نہیں کر پا رہے ہیں۔ پھر فائرنگ رک گئی اور جیودش رینگتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

''وہ لوگ فرار ہو رہے ہیں۔''

''تو پھر کیا ان کا پیچھا کیا جائے؟''

''مناسب نہیں ہو گا۔''

''کیوں؟''

''چاندنی سے فائدہ اٹھا کر وہ ہمیں گھیر سکتے ہیں۔ ہمارے لئے سب سے اچھا وقت وہ ہو گا جب چاند غروب ہو جائے۔'' جیودش نے ماہرانہ انداز میں کہا۔ میں نے اس کی بات سے انحراف نہیں کیا۔ ہم وہیں بیٹھے رہے اور چاندنی کے اچھی طرح پھیل جانے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر احتیاط اور سکون کے ساتھ نیچے اترے۔ جیودش کے مطابق وہ پانچ افراد تھے جن میں ایک زخمی تھا، ایک کو ہم نے چٹان کے اوپر ذبح کر دیا تھا اور چونکہ وہ زخمی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے اس لئے اب بھاگنے والوں کی تعداد کل تین تھی۔ اور زخمی لازمی طور پر وہیں موجود تھا۔ نیچے اترتے ہی مجھے خیمے کے نزدیک ایک انسانی سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے فوراً ہی اس پر فائر کر دیا لیکن چیخنے والا انسان نہیں بلکہ بندر تھا اور انسانوں کی طرح اپنا ایک بازو پکڑ کر تیزی سے چٹان پر چڑھ رہا تھا۔ جیودش خیمے میں چلا گیا۔ میں اس خیمے کے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ میری نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ دفعتہً ہی مجھے خیمے کے اندر سے کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں اور میں تیزی سے خیمے میں داخل ہو گیا۔ سامنے اسٹریچر پر ایک بہت ہی قد آور آدمی پڑا ہوا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے جیودش کو گردن سے پکڑ کر اپنے اوپر گرا رکھا تھا جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ جس میں چاقو تھا، جیودش کی گردن کے قریب بازو میں پیوست تھا۔ حالانکہ جیودش بھی قد و قامت میں کسی سے کم نہیں تھا لیکن اس وقت وہ بہت بے بس سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا چاقو نکال کر سامنے کی طرف چھلانگ لگائی اور اسی وقت جیودش نے پھرتی سے اپنی گردن آزاد کرا لی اور اچانک ہی چیخ کر بولا۔

''نہیں...... سر نہیں۔ اسے ختم نہیں کرنا۔ یہ کام کا آدمی ہے۔''

میں وار کرتے کرتے رک گیا۔ اسٹریچر پر پڑا ہوا شخص جیودش سے کشمکش کے دوران نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کے پیٹ سے قمیض ہٹ گئی تھی اور قمیض ہٹ جانے کی وجہ سے رُوئی کے بڑے سے ڈھیر پر پٹیاں کسی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ

اس کے پیٹ پر گہرے زخم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جیودش کے بازو پر بھرپور وار کیا تھا اور اس کے بازو سے خون جاری تھا۔ اسے روکنے کے لئے میں نے رومال باندھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

بہرحال جیودش نے کہا۔ ”رومال کو زخم کے اندر رکھ کر اس چادر کی پٹیاں بناؤ اور ایک یا دو پٹیاں خوب کس کر زخم پر باندھ دو۔“

اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جب میں بازو کے زخم پر پٹی باندھ رہا تھا تو مجھے جیودش کا سینہ لہولہان نظر آیا۔ سینے پر بھی زخموں کے نشانات تھے۔

”ارے یہ......؟“

”نہیں......ان کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ یہ گہرے زخم نہیں ہیں۔ انہیں یونہی چھوڑ دو۔ یہ رِستا ہوا خون کچھ دیر میں جم جائے گا اور مزید خون کو رِسنے سے روک دے گا۔“ پھر وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ”میں سمجھا یہ مر چکا ہے۔ میں جونہی اس کے دل کی دھڑکن سننے کے لئے جھکا، اس نے مجھے دبوچ لیا۔“

”مگر تمہارے بازو کا زخم؟“

”اوہو...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آ جاؤ...... اب اس شخص سے ضروری معلومات حاصل کریں۔“

ہم دونوں زخمی کے پاس پہنچے۔ میری آنکھوں میں اسے دیکھ کر خون اتر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کتے کے بچے! غور سے میری بات سنو۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے میری بیوی ہی نہیں بلکہ میری زندگی کو شدید تکلیفیں پہنچائی ہیں اور اسے ختم کر دیا ہے۔ میرے گھر کو جلا دیا ہے تم نے۔ خوب قتل و غارت گری کی وہاں۔ چنانچہ اس بات کا تو تصور بھی ذہن میں مت لانا کہ میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت برت سکتا ہوں۔ لیکن بس یہ سمجھ لو کہ اتنا ہو سکتا ہے کہ اگر تم مجھے اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو اور تم تکلیف اٹھا کر مر جاؤ اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تب بھی میں تمہیں آسانی سے نہیں مرنے دوں گا۔ تمہارے جسم کے ہر حصے کو چاقو سے چھیل ڈالوں گا اور اتنی اذیت پہنچاؤں گا کہ تم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔“

میری اس گفتگو کے جواب میں اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن میں نے اسے جھنجھوڑ کر

کہا۔ ”ہاں، پتہ بتاؤ۔“

اچانک ہی وہ درد سے چیخنے لگا۔ میں نے اس کا سر پکڑا اور اسے دبا دیا اور پھر اس کے بال پکڑ کر اس کے سر کو اسٹریچر پر مارنے لگا۔

”اور چیخو......اور چیخو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ کیونکہ اسی طرح لاشیلہ بھی چیخی ہو گی۔ لیکن تمہیں اس پر رحم نہیں آیا ہو گا۔ تم اسے جانتے تک نہیں تھے لیکن پھر بھی تم نے اسے تکلیفیں پہنچا پہنچا کر مار دیا۔ اب تمہاری باری ہے۔ میں تمہارے سر کو ریزہ ریزہ کر ڈالوں گا۔“

اچانک ہی جیودش نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

”نہیں علی اصغر! اس طرح تو یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ تمہیں سسکا سسکا کر مارنا نہیں آتا۔ یہ کام مجھے کرنے دو۔“

”مجھے بتاؤ، اس نے لاشیلہ کو کیوں مارا......کیا بگاڑا تھا اس نے ان کا؟“

”تم فکر مت کرو۔ اس کی ایک ایک چیخ کا حساب لیا جائے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں جنگلی اور حبشی ہوں۔ میرے لئے شراب، عورت اور لڑائی کے علاوہ اور کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر میں سمجھتا ہوں یہ شخص مجھ سے زیادہ برا ہے...... مجھ سے زیادہ برا۔“ جیودش کے لہجے میں ایک عجیب سی غراہٹ آ گئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھا اور خیمے کی ایک رسّی لے کر اسے سر سے پاؤں تک خوب اچھی طرح باندھا۔ پھر بڑی بے دردی سے اس نے اس کے جسم پر بندھی ہوئی خون آلود پٹیوں کو نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔

”میرا نام جیودش ہے۔ میں وہ ہوں جو پتھروں تک کو بولنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔ ابھی دو منٹ کے اندر تم مجھے یہ بات بتا دو گے۔“

اس نے اس کے پیٹ کے زخم میں انگلیاں گاڑھ کر دونوں ہاتھوں سے کھال کھینچ دی۔ زخمی کے منہ سے فلک شگاف چیخیں نکلنے لگیں۔

”سوکھی گھاس کی چلتی ہوئی گولیاں تمہارے پیٹ میں جا کر آنتوں سے اٹکھیلیاں کریں گی سمجھے۔ سوکھی گھاس کی چلتی ہوئی گولیاں۔“

”نہیں......نہیں......“ وہ بلبلا کر بولا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں......شاید تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ میں غصے کے عالم میں

انسانی خون تک پی سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ نیچے جھکا اور اس نے گھاس اکھاڑنا شروع کر دی۔ پھر اس کے گولے بناتا ہوا بولا۔

”تھوڑی سی تکلیف تو ہوگی علی اصغر! کونے میں پڑی لالٹین اٹھا کر مجھے دو۔ مجھے تھوڑے سے مٹی کے تیل کی ضرورت ہے۔“

”آہ، نہیں...... آہ، نہیں......“ وہ دوبارہ چلایا اور اتنی زور سے ہلا کہ وہ رسی جس نے اسے جکڑ رکھا تھا، محسوس ہوا ٹوٹ جائے گی۔ لیکن جیودش نے اس کی چیخوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور گھاس سے بنی ہوئی گولیوں پر تیل ٹپکانے لگا۔

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ کرلو جو تمہارا دل چاہے۔ جو تمہارا دل چاہے کرلو میرے ساتھ۔ تم انسان نہیں، جانور ہو۔“

”ارے تمہیں انسان اور جانور کا فرق معلوم ہے؟ کیا تم نے میری مالکہ کے ساتھ انسانوں جیسا ہی سلوک کیا تھا؟“ یہ کہہ کر جیودش نے ماچس کی تیلی رگڑی اور اس کے شعلے سے گھاس کی ایک گولی جلائی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے زخمی کے پیٹ کا زخم چیرا اور اس میں جلتی ہوئی گولی رکھ دی۔ ”اب بتاؤ کتے......“

اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ اس نے دانت بھینچ لئے تاکہ منہ سے آواز نہ نکلے۔

”کیا سمجھے...... کیا سمجھے...... مزہ آرہا ہے نا؟“ جیودش نے دوسری گولی جلانے کی کوشش کی اور زخم چیر کر اس کے پیٹ پر ڈال دی۔ ”وہ لوگ کہاں ہوتے ہیں...... تمہارے ساتھی بھاگ کر کہاں گئے ہیں؟“

زخمی پر زلزلے جیسی کیفیت طاری تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”رحم کرو...... رحم کرو۔“

”اس وقت جب تم نے میرے دوست کا گھر جلایا تھا اور اس کی بیوی کو قتل کیا تھا اس وقت میری بہت سی چیزیں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تھیں۔ ان ضائع ہونے والی چیزوں میں رحم بھی تھا۔“ اس نے تیسری گولی جلا کر زخم پر رکھ دی۔

”بس کرو...... بس کرو۔“

”ہوں...... آنکھیں کھولو اور مجھے اس جگہ کا پتہ بتاؤ جہاں تمہارے دوست گئے ہیں ورنہ تمہارے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر آنتیں باہر نکال لوں گا اور ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر

آگ لگاؤں گا۔ ذرا لالٹین مجھے دو۔“ یہ الفاظ اس نے میری طرف رخ کر کے کہے تھے۔ وہ جلدی سے بولا۔

”یہاں سے سیدھے مشرق کی طرف پندرہ میل۔ پھر خشک دریا پڑے گا۔ اس کے شمال میں جاؤ گے تو ایک اونچی چٹان نظر آئے گی۔ چٹان میں غار ہے۔ وہی انقلابیوں کا صدر مقام ہے۔ اور میرے ساتھی وہیں گئے ہیں۔“

”ویری گڈ...... ٹھیک۔ سنا تم نے علی اصغر؟“

”مجھے مار ڈالو...... مار ڈالو۔ تکلیف نا قابل برداشت ہوگئی ہے۔“

”صدر مقام پر کتنے افراد ہیں؟“

”بس ہمارا سربراہ اور اسپیشل لیڈ اور کیپٹن بچے ہیں۔ میں ان کا ریڈیو آپریٹر تھا۔ اب پلیز مجھے مار ڈالو“

جیودش نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جیودش چاقو سنبھال کر اس کے جسم پر جھکا اور اس کے گلے پر چاقو پھیر دیا۔ بکرے کٹتے ہوئے دیکھے گئے ہوں گے۔ لیکن انسان اس طرح کٹتے ہیں یہ منظر آج پہلی بار نظر آرہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لئے رحم نہیں تھا اور میں لاشیلہ کو یاد کر رہا تھا۔ لاشیلہ میری زندگی...... میری روح!

✿......✿

زندگی خون کا سفر بن گئی تھی۔ جو اس سے پہلے نہیں تھی۔ ہم شاہ کے آدمی تھے لیکن حقیقت ہے کہ ہم میں سے بے شمار افراد جن میں خود میں بھی شامل تھا، شاہ کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس میں ایک ڈکٹیٹر کی کیفیت ہمیشہ قائم رہتی تھی اور وہ لوگ جو انقلاب پر آمادہ ہوئے تھے، ہماری نگاہ میں غلط نہیں تھے۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ بے شمار بار ہمارے درمیان بہت سی میٹنگیں ہوئی تھیں اور اس میں ہم نے منصوبہ بندیاں کی تھیں۔ لیکن ہماری بدنصیبی یہ تھی کہ ہم تو خود شاہ کے ملازم تھے۔ نہ صرف ہم بلکہ ہمارا پورا خاندان۔ اور اگر ہم بغاوت کا تصور کرتے تو بات صرف ہماری ذات تک ہی محدود نہ رہتی بلکہ ہمارا پورا خاندان ختم کر دیا جاتا۔ اس چیز سے سبھی واقف تھے اور یہی چیز خوف کا باعث بنتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ایسا مرحلہ بھی ہماری زندگی میں آ چکا تھا جو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی داستان صیغۂ راز ہی میں رہنا ضروری ہے۔ میں اس وقت تین دوسرے افراد کے ساتھ اس مرحلے میں شامل تھا اور جیسا کہ میں نے کہا کہ اسے صیغۂ راز ہی میں رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ ہاں اگر کوئی مرحلہ ایسا آیا اور زندگی کو کچھ دن مل گئے تو اس مرحلے کے بارے میں بھی تفصیل بتاؤں گا۔

بہرحال یہ الگ بات ہے کہ انقلابیوں نے شاہ کے آدمی سمجھ کر ہمیں وہ اذیت دی تھی جو انہیں نہیں دینی چاہئے تھی اور اس اذیت کے بعد میری ان سے ہمدردیاں ختم ہو گئی تھیں اب جیودش میرا ساتھی تھا جبکہ ثاقب سلامی ہماری اس مہم میں گم ہو چکا تھا۔

بہرحال ہم نے چاندنی رات میں کئی میل کا فاصلہ طے کیا۔ چلتے چلتے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور غنودگی طاری ہونے لگی تو جیودش نے کچھ دیر آرام کرنے کی رائے دی۔ اس کا کہنا تھا کہ دشمن کے مقابلے کے لئے تازہ دم ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم نے

آرام نہیں کیا تو چالاک دشمن مہلک وار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور ہم انتقام کی آرزو لئے اس دنیا سے نامراد اور ناکام ہی چلے جائیں گے۔

دل تو یہی کہتا تھا کہ آرام نہ کیا جائے لیکن حالت ایسی تھی کہ دل کے کہنے پر عمل نہ کر کے جیودش کی بات ماننے پر راضی ہو گیا۔ جنگلی جھاڑیوں کے درمیان ہم نے ایک محفوظ مقام پر جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کیا اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔ آنکھ اس وقت کھلی جب جیودش نے میرے کندھے ہلائے۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' میں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔

''سورج طلوع ہو چکا ہے۔''

میں کچھ دیر تک خاموش پڑا رہا۔ اتنا زیادہ تھک گیا تھا کہ اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن لیٹنے اور آرام کرنے سے زیادہ اہم کام سرانجام دینا تھا۔ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ جیودش آگ جلا کر کھانے کی اشیاء گرم کر رہا تھا۔

''بارش کے آثار ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''موسلا دھار بارش ہو گی۔ تم ہوا میں اس کی خوشبو محسوس کر سکتے ہو۔''

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادلوں کے اِکا دُکا ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

''شاید سورج کی حرارت بادلوں کو ادھر نہ آنے دے۔'' میں نے پُر امید لہجے میں کہا۔ بارش ہماری مہم میں سدِ راہ ثابت ہو سکتی تھی۔ جیودش نے ہاں کے انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''بارش تو ضرور ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ دوپہر تک یا اس کے فوراً بعد۔ آؤ خوب ڈٹ کر گرم گرم ناشتہ کر لو۔ ہم نے آخری بار آگ جلائی ہے۔ ہم سے آگے نکل جانے والے لوگ جانتے ہیں کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ جلد ہی ہماری نقل و حرکت پر توجہ دینا شروع کر دیں گے کیونکہ وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ہم ان کے صدر مقام تک پہنچیں۔''

اس نے کھانے کا ایک ڈبہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''تین افراد ہیں۔ ان کے بھاگنے کا طریقہ یہ ہو گا کہ ایک شخص سب سے پیچھے رہے گا، دوسرا درمیان میں ہو گا تاکہ ضرورت کے وقت پیچھے رہ جانے والے کی مدد کے لئے آ سکے۔ تیسرا آگے ہو گا۔ وہ اسی

ترتیب سے بڑھیں گے اور ایک کے بعد دوسرے کی جگہ لیتے رہیں گے۔ رات میں بھی یہی ترتیب برقرار رہے گی اور تینوں علیحدہ علیحدہ آرام کریں گے تاکہ بیک وقت تینوں پر شب خون نہ مارا جاسکے۔ اگر ہم نے کسی پر حملہ کیا تو باقی دونوں فوراً اس کی مدد کو آموجود ہوں گے۔''

اس نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ پریشان کن تھا۔ میں نے کہا۔

''ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''میرے ذہن میں بہت ہی شاندار منصوبہ آیا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے بائیں ہاتھ سے اپنی کمر کا چاقو نکالا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دایاں ہاتھ ہلانے سے قاصر ہے۔ چاقو کی مدد سے اس نے زمین پر ایک سیدھی لکیر کھینچی۔ ''وہ لوگ یہاں ہیں۔'' پھر اس نے لکیر کے گرد گول دائرہ بنالیا۔ ''ہم ادھر سے چلتے ہوئے ان سے آگے نکل جائیں گے۔ ہر بدمعاش اپنے پیچھے والے بدمعاش کی حفاظت کر رہا ہوگا۔ آگے والے کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔ پھر جیسے جیسے وہ آگے آئیں گے، ہم ان کا صفایا کرتے رہیں گے۔ کیوں، کیسا منصوبہ ہے؟''

''بہت ہی اچھا منصوبہ ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر اس کی قمیض پکڑ کر ہنستا ہوا بولا۔ ''ذرا اپنا بازو تو دکھاؤ۔''

''چھوڑو۔ گرم گرم کھانا کھاؤ۔'' وہ کہنے لگا۔ ''معمولی سی تکلیف ہے۔ چلنے پھرنے سے جسم میں حرارت دوڑے گی تو ساری تکلیف دور ہوجائے گی۔''

اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے اس کے کندھے اور بازو کو کھولا۔ دونوں پر ورم آگیا تھا اور زخم سے پیپ کی بدبو پھوٹ رہی تھی۔ سینے کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔

''جیوڈش!'' میں نے کہا۔ ''تمہارے زخم خراب ہوگئے ہیں۔''

''اس بدمعاش نے مجھ پر حملہ کرتے وقت گندا چاقو استعمال کیا ہوگا۔''

''ہوسکتا ہے زہر آلود چاقو ہو۔''

''نہیں...... زہر آلود چاقو ہوتا تو میں اب تک لاشیلہ کے قدموں میں پہنچ چکا ہوتا۔''

''زخم اور بگڑے تو جلد ہی اس کے پاس پہنچ جاؤ گے۔'' میں نے تنبیہ کی۔ ''دیکھو، ابھی وقت ہے۔ واپس چلے جاؤ۔ ایک ڈاکٹر ہی تمہارے زخموں کا علاج کرسکتا ہے۔''

''ڈاکٹر سے اچھا علاج مجھے آتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''پہلے ہم کھانے سے فارغ ہوجائیں، اس کے بعد زخموں کا علاج کیا جائے گا اور تم حیرت زدہ ہوجاؤ گے۔''

''میں حیرت زدہ ہونا نہیں چاہتا۔''

''اور میں تمہیں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' اس نے کہا۔ ''ان بدمعاشوں کے نزدیک تمہاری حیثیت ایک ننھے سے بچے سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں چٹکی بجاتے میں ختم کر دیں گے۔''

''صرف تین آدمی ہیں۔ میں تمہارے منصوبے پر عمل کر کے ان سے آگے نکل جاؤں گا اور یکے بعد دیگرے تینوں کو دوسری دنیا میں بھیج دوں گا۔ جس شخص کے دل میں نفرت اور انتقام کی اتنی تیز آگ جل رہی ہو، جتنی میرے دل میں جل رہی ہے وہ آسانی سے نہیں مرسکتا۔''

مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔ واپس جانے پر تیار نہیں ہوا۔ کھانے کے بعد جنگلی بوٹیوں کی تلاش میں نکل گیا۔ آدھے گھنٹے بعد درخت کی چھال اور بیر سے چھوٹے زرد آلو جیسے پھل لے کر آیا۔ ان چیزوں میں نمک ملا کر لئی جیسی چیز تیار کی۔ لئی تیار ہوگئی تو اس نے کہا۔ ''اب اسے میرے زخموں پر اچھی طرح تھوپ کر پٹیاں باندھ دو۔''

''ٹھنڈی ہونے میں کم از کم دس منٹ لگیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھنڈی ہوگئی تو اس کا سارا اثر ختم ہوجائے گا۔ اسے اسی طرح لگاؤ۔''

''کچھ تو ٹھنڈی ہونے دو۔ اس سے ابھی تک بھاپ اٹھ رہی ہے۔''

''پرواہ مت کرو۔''

''مجبوراً میں نے ایک بڑے پتھر کی مدد سے کھولتی ہوئی لئی کو اس کے بازو، کندھے اور سینے پر تھوپ دیا۔ اس کی حدت اتنی تھی کہ پتے پر رکھنے کے باوجود میرا ہاتھ جل رہا تھا۔ جیوڈش نے دانت بھینچ لئے تھے اور تکلیف کے باعث اس کا سیاہ چہرہ پسینے سے نہا گیا تھا۔ آنکھوں اور ناک سے پانی جاری تھا۔

لئی اچھی طرح تھپ گئی اور اس پر پٹیاں بندھ گئیں تو وہ لمبا لمبا لیٹ گیا۔

''تکلیف ہورہی ہے؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔

''مستقل آرام کے لئے تھوڑی سی تکلیف برداشت کی جاسکتی ہے۔''

''تھوڑی سی تکلیف؟ میں سمجھتا ہوں، اتنی تکلیف تو اس بدمعاش کو بھی نہیں ہوئی ہوگی جس کے پیٹ میں گھاس کی گولیاں ڈالی گئی تھیں۔''

اسی وقت ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی اور مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگی کہ ہماری تلاش میں ناکام ہو کر انچارج نے شہر سے فضائی پولیس کی مدد حاصل کر لی ہے۔

''جیوڈش!'' میں اسے آواز دیتا ہوا کھڑا ہوا اور جلدی جلدی آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ آگ بجھنے کی بجائے اور پھیل گئی۔ کیونکہ میں نے دہشت میں ان پتھروں کو ہٹایا تھا جن کے درمیان آگ جل رہی تھی۔

''جیوڈش......'' میں دوبارہ چیخا۔ ''ہیلی کاپٹر۔''

اُسے بے حس پڑا دیکھ کر پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ جیوڈش گرم لُو کی تاب نہ لا کر چل بسا ہے۔ پھیلتی ہوئی آگ کو فراموش کر کے اس کی طرف دوڑا۔ وہ بہت سخت جان تھا، مرا نہیں تھا، صرف بے ہوش ہوا تھا۔

ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر آ پہنچا تھا۔ میں نے جیوڈش کے پاؤں پکڑے اور کنکروں، پتھروں اور کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر اسے کھینچتا ہوا اس وقت تک بھاگتا رہا جب تک ایک معقول سی چٹان نظر نہیں آ گئی۔ میں وہاں دبک کر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ ہیلی کاپٹر والے آگ کو نہ دیکھنے پائیں۔ اور اگر اسے دیکھ لیں تو اسے جنگل کے کسی باسی کی جلائی ہوئی آگ سمجھیں۔

ہیلی کاپٹر کئی منٹ تک آگ کے اوپر رُکا ہوا منڈلاتا رہا۔ پھر شاید جھاڑیوں اور چٹانوں میں نیچے اترنے کی مناسب جگہ نہ پا کر مڑا اور دوسری طرف چلا گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لے کر جیوڈش کے چہرے کو تھپتھپایا۔ وہ بے ہوش نہ ہوتا تو اب تک ہم دونوں کہیں کے کہیں جا چکے ہوتے۔

اچانک ہوا میں تیرتی ہوئی ایک تیز آواز آئی۔ ''علی اصغر! سامنے آؤ۔ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم چٹان کے پیچھے چھپے ہوئے ہو۔''

میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ آواز انچارج کی تھی۔

''علی اصغر!'' وہی آواز دوبارہ آئی۔ ''پولیس کے جوان سارے علاقے میں پھیل چکے

ہیں۔ اس سے پہلے کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے، اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ چٹان کے پیچھے سے سامنے نکل کر آ جاؤ۔''

جیوڈش نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے دور منڈلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے سائے کی طرف اشارہ کیا۔ تعجب سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہیلی کاپٹر یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''ہمیں گرفتار کرنے آیا ہے۔''

ہیلی کاپٹر پلٹ کر ہماری طرف آ گیا۔ اس سے بار بار وہی اعلان ہو رہا تھا۔ ''سامنے آ جاؤ علی اصغر! چھپنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پولیس کے جوان تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

''جیوڈش!'' میں نے اس کے جسم پر جھک کر کہا۔ ''چلنے پھرنے کی طاقت ہے؟ ہمیں یہاں سے کھسک لینا چاہیے۔ انچارج جانتا ہے کہ ہم چٹان میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ اس وقت تک ہمیں تلاش کرتا رہے گا جب تک ہمارے سر پر نہیں پہنچ جائے گا۔''

وہ میرا سہارا لے کر اٹھا۔ اس کا دایاں ہاتھ بالکل بیکار ہو چکا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے ہیلی کاپٹر کو دیکھتے رہے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ انچارج کو دھوکا دیا جا سکتا تھا۔

ہم نے ہیلی کاپٹر کے مُڑنے کا انتظار کیا۔ وہ جونہی مُڑا میں بھاگتا ہوا آگ تک گیا۔ جلدی جلدی سامان سمیٹا، اپنی رائفل اور جیوڈش کی شاٹ گن سنبھالی۔ کھانے کی چیزوں کو وہیں رہنے دیا۔ پھر ساری چیزیں جیوڈش کے پاس لے جا کر رکھ دیں۔ دوبارہ آگ کی طرف گیا۔ اس کے دہکتے ہوئے انگاروں کو دور دور تک پھیلایا۔ ان پر گھاس اور جھاڑیوں کی پتیاں اور ٹہنیاں ڈالیں۔ جب وہ سلگنے لگیں تو انہیں مزید انگاروں سے ہٹا کر آگے ڈال دیا اور انگاروں پر مزید پتیاں اور ٹہنیاں بچھا دیں۔ کچھ دیر میں دور دور تک دھوئیں کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس دھوئیں میں اپنے اور ہیلی کاپٹر کے درمیان پردہ بنا کر میں نے سامان لادا، جیوڈش کا ہاتھ پکڑا اور جس طرف سر اٹھا، ادھر ہی روانہ ہو گیا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ گھنے درختوں کا علاقہ شروع ہو گیا اور ہیلی کاپٹر

کی آواز آنا بند ہوگئی۔ پولیس کے جوان اول تو وہاں تھے ہی نہیں۔ محض انچارج کی دماغی اختراع تھی۔ اور اگر تھے تو ہمیں کہیں نظر نہ آئے۔ شاید وہ چٹانوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تھے۔

وہ پولیس کا جوان یا کوئی بھی رہا ہو، پیڑ کے تنے کی آڑ میں کھڑا اپنی رائفل سے میرے یا جیودش کے سر کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم لوگ آڑے میں تھے، نشانہ کسی طور ٹھیک نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ایک بار ہمیں غافل سمجھ کر اس نے جونہی اپنا آدھا دھڑ پیڑ کی آڑ سے نکالا، میں نے گولی چلا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہوگیا۔

میں اور جیودش کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے کہ شاید اس کی صورت دوبارہ نظر آئے۔ جیودش کا ہاتھ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ درد کی شدت میں البتہ تھوڑی سی کمی آگئی تھی۔

اچانک وہ کھڑا ہوگیا۔ ''چلو۔''

''کہاں؟''

''بدمعاشوں کے صدر مقام۔'' اس نے کہا۔ ''سوکھے ہوئے دریا کی طرف جانے سے قبل ایک چیز اور بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔''

''ان بدمعاشوں سے بے پرواہ ہو جانا بھی مناسب نہیں ہے۔''

ہم دونوں آگے بڑھے۔ اس درخت تک پہنچے جہاں سے ایک شخص ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ تنے کی دوسری جانب زمین پر خون کے قطرے پڑے تھے جو جم کر سیاہ ہوگئے تھے۔ جیودش نے جھک کر خون کا سوکھا ہوا ایک قطرہ اٹھایا، انگلیوں سے مل کر اس کا سفید سفوف بنایا۔ ایک لمحے تک معائنہ کیا، سونگھا اور اس کے بعد پھینک دیا۔

''کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے۔'' اس نے انگلیوں کو اپنی کمر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تازہ خون ہو تو اس کے رنگ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زخم کس نوعیت کا ہے۔ چمکتا ہوا سرخ خون ہو تو سمجھ لو زخمی مر رہا ہے۔ کیونکہ ایسا خون براہِ راست دل سے آتا ہے۔ مٹیالا رنگ ہو تو زخم خطرناک نہیں ہے۔ خون اپنا کام سرانجام دے چکا ہے۔ لیکن یہ خون......'' وہ زمین کے قطروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سوکھ کر بیکار ہو چکا ہے۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ تمہاری گولی بیکار نہیں ہوئی ہے۔ وہ شخص مر رہا ہے۔

خون کے قطروں کے نشانات پر چل کر ہمیں جلد ہی حقیقت کا علم ہو جائے گا۔''

تقریباً ایک چوتھائی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم نے اس شخص کو دیکھ لیا۔ وہ جھاڑیوں میں پیٹ کے بل اس طرح پڑا تھا کہ اس کا آدھے سے زیادہ جسم ہمیں بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

''دیکھا تم نے؟'' جیودش نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ طاقتور اور بہادر تھا جو گولی کھا کر اتنی دور چلا آیا۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ دوسرے نشانات بھی نظر آ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کئی لوگ تھے جو اسے چھوڑ کر آگے چلے گئے۔''

''ہاں......'' جیودش نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے اس کے پاس سے چند اہم کاغذات مل جائیں۔'' میں نے جھاڑیوں میں پڑے ہوئے شخص کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جیودش نے بائیں ہاتھ سے میرے کندھے کو پکڑ لیا۔ ''کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ اسے اس طرح جھاڑیوں میں ڈالا گیا ہے کہ دور سے نظر آ جائے۔ اس کے علاوہ پیٹ کے بل گر کر مرنے کا انداز بھی قابل غور ہے۔ جو شخص گولی کا نشانہ بن کر یہاں تک آ سکتا ہے وہ اس طرح نہیں مر سکتا۔ مرنے سے پہلے وہ اپنے جسم کو ضرور سیدھا کر لیتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کے لئے جال ڈالا گیا ہے؟''

''شاید۔'' جیودش نے کہا۔ ''دشمن جتنے کمینے ہیں اتنے ہی ذہین بھی ہیں۔''

ہم دونوں نے لاشوں کے اردگرد کی زمین اور جھاڑیوں کو بغور دیکھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک معلوم ہو رہا تھا لیکن جیودش مطمئن نہیں تھا۔ اسے مطمئن کرنے کے لئے میں لاش کے قریب لیٹ گیا اور اس کے پیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور تب مجھے ایک دستی بم کی موجودگی محسوس ہوئی۔ اس کے ٹریگر کو لاش کے وزن سے دبا دیا گیا تھا۔ لاش کے ہٹاتے ہی ڈیگر اوپر اٹھ جاتا اور اس کے ساتھ ہی دستی بم دھماکے سے پھٹ جاتا۔ ویسا ہی دوسرا دستی بم مجھے اس کی رانوں میں دبا ہوا نظر آ گیا۔

''کچھ ہے......؟'' جیودش نے میرے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''صرف دو بم ہیں۔''

''آجاؤ'' اس نے کہا۔ ''اس لاش کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمیں کاغذات کی نہیں، دشمنوں کے سروں کی ضرورت ہے۔''

میں اٹھ کر جیودش کے پاس پہنچ گیا۔ چٹانوں میں کئی گدھ جمع ہو گئے تھے جو لاش تک جانے کے لئے پر تول رہے تھے۔

''جیودش!'' میں نے کہا۔ ''یہ شخص میری اور تمہاری توقع سے زیادہ طاقتور اور باہمت تھا۔ انقلابیوں کو اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کے گلے کو کاٹنا پڑا ہے۔''

جیودش فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''جنگل کا قانون یہی ہے۔ جب کوئی شخص کسی کا پیچھا کر رہا ہو یا خود اسی کا پیچھا کیا جا رہا ہو، اسے انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر درندہ بن جانا چاہئے۔ جتنا بڑا درندہ بنے گا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ یہ انقلابیوں کا دوست اور ساتھی تھا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس کے جسم سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے ہم لوگوں کی رہنمائی کریں گے تو مناسب یہی سمجھا کہ اسے ختم کر دیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم ان کا پیچھا کر رہے ہیں اس لئے انہوں نے لاش سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے نیچے دستی بم چھپا دیا۔ وہ ہم سے خوفزدہ ہیں لیکن اتنا یاد رکھنا کہ ان کی ذہانت اور طاقت معمولی درجے کی نہیں ہے۔ ہمیں اپنا ہر قدم پھونک کر اٹھانا چاہئے۔''

''یاد رکھوں گا......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''یاد رکھو گے تو ہم شاید انقلابیوں کو ٹھکانے لگانے تک زندہ رہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اب صرف دو بدمعاش باقی رہ گئے ہیں۔ ہم نے حواس نہیں کھوئے تو بہت جلد ان تک پہنچ جائیں گے۔''

ہم نے بمشکل ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک دو زوردار دھماکے ہوئے۔ پھر کئی گِدھ چیختے ہوئے اُڑے۔ ہم سمجھ گئے کہ لاش کے نیچے دبے ہوئے بم گِدھوں کی بے احتیاطی کے باعث پھٹے ہوں گے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ہمارا اطمینان خاک میں مل گیا۔ دھماکوں کے فوراً بعد تیز سیٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بے شمار لوگ نجانے کہاں کہاں سے نکل کر جھاڑیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ جیودش کو ایک چھوٹی چٹان کی آڑ میں کھڑا کر کے میں اوپر چڑھ گیا۔ کئی فوجی تھے جو جھاڑیوں کے گرد کھڑے تھے اور دھماکے سے مرنے والے گِدھوں اور لاش کے

ٹکڑوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ دیکھ لئے جانے کا خطرہ محسوس کر کے میں نے لیٹ کر اپنے آپ کو چٹان کی چوٹی کا ایک حصہ بنا لیا اور تھوڑا سا سر اٹھا کر نئی صورتحال کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

مشرق کی جانب سے تقریباً پچاس فوجی نصف دائرے کی صورت میں جھاڑیوں کی جانب آ رہے تھے۔ مغرب میں بھی کم و بیش اتنے ہی فوجیوں نے نصف دائرہ بنا کر جھاڑیوں کی سمت مارچ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مشرق و مغرب کے فوجیوں نے نصف نصف دائرے بنانے کی جو حکمت عملی اختیار کی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں طرف سے گھرنے والے تھے۔ وقت ضائع کئے بغیر میں نے چٹان سے نیچے لڑھکنا شروع کیا۔ نیچے پہنچا اور جیودش کو آ کر ساری بات بتائی۔

''انقلابیوں کے بجائے فوجی ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے کہا۔

''مگر کیوں؟''

اسی اثناء میں ہمارے سروں کے اوپر سے ایک ہیلی کاپٹر گزرا۔ تقریباً ایک میل دور جا کر پلٹا اور جھاڑیوں کی طرف آتے ہوئے فوجیوں کے آگے اور پیچھے پہرہ دینے لگا۔

''علی اصغر!'' جیودش نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ ''جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔ کسی ایسی جگہ چلو جہاں بہت سی چٹانیں ہوں۔''

ہم نے بھاگنا شروع کر دیا۔ تقریباً سو گز تک بھاگنے کے بعد میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بازو سے خون ٹپک رہا ہے۔ انہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم کدھر گئے ہیں۔''

''جلدی سے اسے کسی جگہ سے باندھ دو'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

میں نے اپنی قمیض اتار کر پھاڑی اور اسے مضبوطی سے بازو پر باندھ دیا۔ اس سے خون کا بہنا تو بند نہیں ہو سکتا تھا تاہم اتنا اطمینان تھا کہ قمیض بہتے ہوئے خون کو کئی منٹ تک جذب کرتی رہے گی۔ پھر میں نے اس کی شاٹ گن، پانی کی بوتل اور دوسری چیزیں

لے کر اپنے کندھے پر لادلیں۔

آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔اس نے ایک نظر اوپر ڈالی اور مسکرا کر بولا۔''بارش کیوں نہیں ہو رہی ہے؟''

ہم ایک بار پھر دوڑنے لگے۔اصل خطرہ ہیلی کاپٹر سے تھا۔وہ ہمیں دیکھ کر فوجیوں کو آگاہ کرسکتا تھا۔ہم مسلسل ایسی چٹانوں کی تلاش میں دوڑ رہے تھے جو آپس میں گتھی ہوئی ہوں۔یہاں اس قسم کی چٹانوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری چٹانیں غائب ہو چکی ہوں۔دوڑ کے دوران ہماری نظریں بار بار آسمان کی طرف ہی اٹھ جاتی تھیں۔بادلوں پر غصہ آرہا تھا۔ساری امیدیں بارش سے وابستہ تھیں اور بادل تھے کہ کسی طرح چھلکنے پر تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔

بارش تو نہیں ہوئی البتہ آندھی چلنا شروع ہو گئی۔ہوا کے تیز جھکڑوں کے باعث دوڑنے میں دقت پیش آنے لگی۔

''جیودش!'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔''چٹانوں کے سلسلے کو چھوڑو اور اب جو پہلی چٹان آئے اس پر چڑھ جاؤ۔''

ہم نے ایسا ہی کیا۔اگلی چٹان پر ہواؤں سے لڑتے ہوئے چڑھے۔مشرق و مغرب کے فوجی لحہ بہ لحہ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ہیلی کاپٹر بدستور انہیں تحفظ فراہم کئے ہوئے تھا۔

''بارش......'' میں نے چلا کر اس طرح کہا جیسے بادلوں کو ڈانٹ رہا ہوں۔''بارش نہیں ہوئی تو ہم مارے جائیں گے۔''

شاید بادلوں تک میری آواز پہنچ گئی۔بجلی چمکی،بادل کڑکے اور آلو جتنی بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔میں خوش ہو کر جیوتش کی طرف گھوما۔ہیلی کاپٹر فوجیوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔فوجیوں کی رفتار سست پڑ جائے گی اور وہ نشانات جو اس چٹان تک ان کی رہنمائی کرتے،معدوم ہو جائیں گے۔

جیودش ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے نیم مردہ سا پڑا تھا۔بازو سے بندھی قمیض میں مزید خون جذب کرنے کی قوت نہیں رہی تھی۔پورا بازو سرخ ہو چکا تھا اور خون کے قطرے ٹپ ٹپ کر کے نیچے گر رہے تھے۔میں نے اس کے دوسرے بازو کو پکڑ کر اپنی

گردن میں ڈالا اور لڑکھڑاتا ہوا آگے کی جانب نکلتے ہوئے ایک پتھر کی جانب بڑھا۔

''یہیں بیٹھو۔'' میں نے اسے پتھر کے نیچے بٹھاتے ہوئے کہا۔''میں ابھی کسی دوسری زیادہ محفوظ اور زیادہ اچھی جگہ کو تلاش کر کے آتا ہوں۔''

اس کی آنکھیں بند تھیں۔آنکھوں کو کھول کر اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا پھر مسکرانے لگا۔پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جس طرح کوئی نئی نویلی دلہن شوہر کا دل خوش کرنے کے لئے اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے ویسا ہی مظاہرہ اس وقت تم کر رہے ہو۔''

اس کی ہنسی سے میرے دل کو بڑی تقویت ملی۔

''درد کا کیا حال ہے؟''

''بالکل معمولی سا ہے۔'' وہ بولا۔''اوپر پھسل کر گر گیا تھا اس لئے تکلیف میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔اب یہاں کچھ دیر آرام کروں گا تو ساری تکلیف رفع ہو جائے گی۔''

''جیودش ایک دیو ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر جھک کر کچھ اس طرح کہا جیسے کسی معصوم بچے کو خطاب کر رہا ہوں۔''وہ اپنے ایک ہاتھ سے ہی آدھی دنیا کو زیر وزبر کر سکتا ہے۔''

''اس سے پہلے کہ دیو کی قوت واپس آئے اور وہ اپنے ہاتھ سے تمہیں زیر وزبر کر ڈالے،یہاں سے بھاگ جاؤ اور اچھی طرح پناہ گاہ تلاش کرو۔''

میں ہنسنے لگا۔وہ بے انتہا قوتِ برداشت کا مالک تھا۔مجھے اس پر بے ساختہ پیار آرہا تھا۔

بارش اتنی تیز تھی کہ پتھر کے نیچے ہونے کے باوجود جیودش پانی سے تربتر ہو گیا تھا۔میں نے اس کے پاس واپس جا کر کہا۔''چٹان میں چھوٹے چھوٹے کئی غار ہیں لیکن ان کا بڑی آسانی سے پتہ چلایا جا سکتا ہے۔تاہم چٹان کے نیچے سو گز کے فاصلے پر بانسوں اور سرکنڈوں سے گھرا ہوا ایک بڑا سا گڑھا ہے جو پانی سے لبالب بھر چکا ہے۔اگر ہم سانس لینے کے لئے بانسوں کے ٹکڑوں کو استعمال کریں تو کئی گھنٹوں تک پانی کے نیچے چھپ سکتے ہیں۔''

''انچارج نے ہمیں گرفتار کرنے کے لئے فوج کی مدد لی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ فوج کے بہترین دستے بھیجے گئے ہیں۔''

''پھر تو ہماری ترکیب نہیں چلے گی۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ اس قسم کے سارے سرکنڈوں سے واقف ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''بارش کے بارے میں کیا کہتے ہو...... کب تک ہوتی رہے گی؟''

''بیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ اور ہوگی۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''اور جب رکے گی تو بالکل ہی رک جائے گی۔ ایک قطرہ بھی نہیں گرے گا۔''

''گویا ہمارے پاس بیس پچیس منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اسی عرصے میں کرنا ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بارش کے بعد اگر ہم ان لوگوں کی نظروں میں نہیں آئے تب بھی ہمارا یہاں رکنا مشکل ہو جائے گا اور نیچے جائیں گے تو ہر ممکن احتیاط کے باوجود ایسے نشانات چھوڑ دیں گے کہ وہ ہمیں پالیں گے۔ اور پھر خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کی مدد اور رہنمائی کے لئے ہیلی کاپٹر بھی موجود ہیں۔''

وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم ابھی نیچے اتریں اور سیدھے بھیڑیوں کے جبڑوں تک پہنچ جائیں؟ پاگل ہی ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔ وہ میرے اور تمہارے جیسے پولیس والے نہیں ہیں، فوجی ہیں۔ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر یہ بھی تو سوچو، وہ انسان ہیں۔ اور جس طرح ہمیں سردی محسوس ہو رہی ہے، انہیں بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔ جس طرح ہم بھیگ رہے ہیں، اسی طرح وہ بھی بھیگ رہے ہوں گے۔ جن مصائب کا ہم شکار ہیں، کم و بیش ایسے ہی مصائب کا وہ بھی شکار ہوں گے۔ دو آدمیوں کی خاطر جن سے ان کی کوئی دشمنی نہیں ہے، ان کی پوری فوج موسلا دھار بارش میں صف بندی کر کے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ انہی چٹانوں میں وہ بھی دبکے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔''

''تم یقیناً پاگل ہو گئے ہو۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''مگر پاگل ہوئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ مجھے سہارا دو۔''

چٹان سے نیچے اترنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص بھیڑیوں کی وادی میں چلا جائے۔ فوجی چٹانوں میں اور درختوں کے نیچے دبکے تو بے شک بیٹھے تھے لیکن غافل نہیں تھے۔

رائفلیں تنی تھیں، کان کھڑے تھے اور کچھ تو باقاعدہ دوربین استعمال کر رہے تھے۔

ہم زمین پر لیٹ گئے اور زمین سے چمٹے ہوئے پانی کے اس ریلے کی طرف بڑھے جو درختوں اور چٹانوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا تیزی سے نشیب کی جانب رواں تھا۔ ہم نے خود کو اس ریلے کے حوالے کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ فوجی ہمیں لکڑی کا گٹھا یا اسی قسم کی چیزیں سمجھیں گے۔ اور اگر کسی نے پہچان بھی لیا تو جب تک وہ گولی چلائے گا، ہم کئی گز دور جا چکے ہوں گے۔

کافی دور جانے کے بعد جیوڈش ایک گرے ہوئے درخت میں پھنس گیا۔ میں اسے نکالنے کے لئے پلٹا اور ظاہر ہے کہ تیز پانی کی رو کے خلاف لیٹ کر جانا بالکل ناممکن تھا۔ اسلئے مجھے اس کو بچانے کے لئے کھڑا ہونا پڑا۔

جونہی کھڑا ہوا، چٹان کے دامن سے چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ''یہ مت سمجھو کہ میں اندھا ہوں۔ تم یہاں نہانے اور تیراکی کے مقابلے میں شرکت کے لئے نہیں آئے ہو۔ اپنی صف میں جاؤ اور قمیض پہنو۔''

میں نے جلدی سے سلیوٹ کیا۔ ''یس سر......'' پھر سنبھل کر کہا۔ ''ان لوگوں کو بھی منع کیجئے جو چٹان کے پیچھے نہا رہے ہیں۔''

وہ جو کوئی بھی تھا، تھا افسر۔ گالیاں بکتا ہوا چٹان کے عقب میں چلا گیا۔ میں نے اطمینان سے جیوڈش کو نکالا اور ایک بار پھر ہم دونوں پانی کے ریلے میں بہنے لگے۔ لیکن پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ ریلے کی تیزی ختم ہو گئی۔ سامنے چٹانوں کا طویل سلسلہ تھا جس نے پانی کو روک لیا تھا اور رکا ہوا پانی ایک بڑے تالاب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

جیوڈش کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ شاید کچھ پانی ناک اور پیٹ کے ذریعے اس کے پیٹ میں بھی اتر گیا تھا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ایسی ہی کوشش تھی جیسے کوئی شخص کسی پہاڑ کو اٹھانے کی کوشش کرے۔ ناکام ہو کر اس سے کہا کہ وہ اپنا بایاں ہاتھ میری گردن میں ڈال لے۔ پھر پوری طاقت لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کیچڑ اور پانی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ہم چٹان کی طرف بڑھے۔

چٹان کے قریب ایک فوجی کیچڑ میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے گرج کر پوچھا۔

''اوپر ڈیوٹی دے رہا تھا، پھسل گیا۔'' وہ بولا۔ ''شاید گھٹنا اتر گیا ہے۔ تم کیا کرتے پھر رہے ہو...... یہ دوسرا کون ہے؟''

''یہ ڈیکن ہے۔ پانی کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔ بیچارے کا سر پھٹ گیا ہے۔ فرسٹ ایڈ کے لئے جا رہا ہوں۔ اٹھ سکتے ہو تو تم بھی میرا سہارا لے لو۔''

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''میرے لئے اسٹریچر بھجوا دینا۔ میں پاؤں کو جنبش نہیں دے سکتا۔''

جیوڈش نے پانی کی دوسری سمت پہنچ کر کہا۔ ''تم نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟ وہ دوسرے فوجیوں کو ہمارے متعلق ضرور بتائے گا۔''

''تمہاری خواہش ہے کہ اسے قتل کر دوں؟''

''ہاں...... قتل کر کے یہیں کیچڑ میں دبا دو۔ پانی اترنے میں دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

''ہمیں صرف لاشیلہ کے قاتلوں کو ختم کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فوجی ملک کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ جب تک میری اور تمہاری زندگی کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا میں ان پر وار نہیں کر سکتا۔''

''کیوں نہیں کر سکتے۔ وہ بندوقیں لے کر ہمارا شکار کرنے آئے ہیں۔ اصل دشمن کو چھوڑ کر وہ ان لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں جنہوں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ان پر مہربان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یاد ہے میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ جنگل کے قانون کے مطابق جو جتنا بڑا درندہ ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہے۔''

میں نے موضوع بدل دیا۔ ''راستہ بتاؤ...... کس طرف چلوں؟''

''جب تک بارش ہو رہی ہے اسی طرف چلتے رہو۔'' وہ بولا۔ ''تاکہ پیروں کے سارے نشانات بہہ جائیں۔ بارش کے بعد صحیح راستہ اختیار کریں گے۔''

''بازو کی تکلیف کیسی ہے؟''

''پانی کے تھپیڑوں نے ساری دوا دھو ڈالی ہے اور زخموں کو ہرا کر دیا ہے۔ لیکن فکر کی بات نہیں، ان زخموں کا علاج ممکن ہے۔ اصل زخم تو وہ ہے جو دل میں ہے اور لاعلاج

ہے۔''

میں نے سر ہلا دیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف کو بڑھتا چلا گیا۔

خشک دریا تک پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ کئی چٹانوں کو پار کر کے میں نے رات کے قیام کے لئے ایک اونچی چٹان کو منتخب کیا۔ جیوڈش کی جانب سے فکر بڑھ گئی تھی۔ اسے بخار ہو گیا تھا اور تیز ہوتا جا رہا تھا۔

ہم نے جس غار میں پناہ لی تھی وہ سرد اور تاریک تھا۔ آسمان پر بادل نہیں تھے۔ چاند دیر میں نکلا اور جب نکلا تو آدھا تھا۔ غار کے وہ پتھر جن میں ہمارے جسم تھے، جسموں کی حرارت سے قدرے گرم ہو گئے تھے۔ ٹمپریچر تیزی سے گر رہا تھا، سردی بڑھ رہی تھی۔ ہمارے پاس جسم کو ڈھکنے کے لئے جو لباس تھا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے غار میں ایک طویل سرد رات گزارنا تھی۔

پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دُھلی دُھلائی صاف ستھری چٹانوں کے پتھریلے گڑھوں میں اتنا پانی تھا کہ دو سے تین دن تک استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی اور ہمیں بھی کھانے کی پرواہ نہیں تھی۔

میں نے جیوڈش سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کتنے کارتوس باقی رہ گئے ہیں؟''

جیوڈش نے نقاہت کے ساتھ اپنی شاٹ گن پر بایاں ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''پانچ اس میں ہیں اور تین کینوس کے تھیلے میں۔''

''میرے پاس کل بارہ راؤنڈ باقی بچے ہیں جو مشین گن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔''

جیوڈش نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''ہمارے مقابلے میں ان کا سامان زیادہ تیزی سے ختم ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے رہے ہیں۔ مت بھولو کہ ہمارے پاس شکاری چاقو بھی ہیں۔ ایک ایسے شخص کے خلاف جس سے نفرت کی جا رہی ہو، چاقو استعمال کرتے وقت بڑا لطف آتا ہے۔ اس کی آنکھوں کو پھیلتے اور منہ کو بگڑتے اور گرم گرم خون کو بہتے اور روح کو نکلتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے اور اس طرح اسے تھوڑا سا سکون بھی مل جاتا ہے۔''

جیوڈش کی کمزور آواز میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم کہو تو میں

تمہارے زخموں کو صاف کر کے دوبارہ باندھ دوں؟"

"نہیں...... یونہی رہنے دو۔ دوا کے بغیر زخموں کو چھیڑنا مناسب نہیں۔"

"درد ہو رہا ہے؟"

"ہو تو رہا ہے مگر اب میں اس کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کو ٹانگوں میں دبا لیا تاکہ سردی کم سے کم محسوس ہو۔ پھر جیوڈش کو مخاطب کیا۔ "کیا تمہیں تنہائی کا احساس ہوا ہے؟ مجھے ہوتا ہے۔ میں درد اور غصے سے زیادہ اسے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے لاشیلہ بہت یاد آتی ہے۔ اس کی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی ایک ایک ادا میرے ذہن میں گھومتی ہے۔ کیسے مسکراتی تھی، کیسے ہنستی تھی، ہوا میں اس کے بال کس طرح لہراتے تھے۔ نجانے کون کون سی باتیں تھیں جو میں اسے بتانا چاہتا تھا۔ رات کو میں اپنے ہاتھ بڑھاتا ہوں تاکہ اسے چھوؤں، اسے محسوس کروں، اس کے قرب سے سکون حاصل کروں۔ لیکن آنکھ کھل جاتی ہے۔ تاریکی اور موت کی خوشبو کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر میں تاریکی میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور سوچتا ہوں اب میری واپسی ناممکن ہے کیونکہ میری دنیا تو لٹ چکی ہے۔ میں واپس نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی کوئی دنیا نہیں ہے جسے میری ضرورت ہو۔ اور تب تنہائی کا احساس مجھ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں دماغ کی تاریکیوں میں لاشیلہ کو آوازیں دیتا ہوں۔ اس سے التجا کرتا ہوں کہ میری مدد کرو۔ میں ڈوب رہا ہوں۔ مجھے ڈوبنے سے بچا لو۔ لیکن جیوڈش! وہ نہیں آتی۔ کوئی مدد نہیں کرتی۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "میرے نزدیک عورت ایک بھینس کی طرح ہے اور بہت سی عورتیں بہت سی عورتوں کی طرح۔ میرے نزدیک ان کی حیثیت جائیداد جیسی ہے، محبت والی نہیں۔ میں جائیداد کی حفاظت کرتا ہوں، ضروریات پوری کرتا ہوں صرف اس لئے کہ میں اس کا مالک ہوں۔ تم نے صرف ایک عورت سے محبت کی اور آخری دم تک اسی سے محبت کرتے رہو گے۔ معاف کرنا، مجھے تو کبھی کبھی تمہاری حماقت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ افسوس بھی ہوتا ہے۔ تم نے اپنا سب کچھ لاشیلہ کے سپرد کر دیا اور جب وہ مریں تو اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ بہت سی عورتوں سے تھوڑی تھوڑی محبت کرنا زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک عورت سے

بہت سی محبت کی جائے۔ یہ میرا نظریہ ہے۔"

"محبت کو ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ یہ تو خود بخود ہو جاتی ہے۔ بہت سوں سے نہیں، صرف ایک سے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اگرچہ میں لٹ چکا ہوں۔ البتہ میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ میں نے کسی کو اور کسی نے مجھے نہیں چاہا۔ چاہنے اور چاہے جانے کا تصور ایسا ہے جو مجھے اب بھی بے خود اور مدہوش کر دیتا ہے۔"

غار میں کچھ دیر کے لئے گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر اچانک اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"فوجی ہمیں کیوں تلاش کر رہے ہیں علی اصغر؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"کیونکہ لاشیلہ کے قاتلوں کو قتل کر کے ہم قانون شکنی کر رہے ہیں۔"

"انہیں نہیں معلوم کہ قاتلوں نے لاشیلہ کو قتل کیا ہے اور تمہارا گھر جلایا ہے۔ کیا وہ نہیں چاہتے کہ قاتلوں کو سزا دی جائے؟"

"صرف قانون ہی انہیں سزا دے سکتا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر ہم پولیس کی ملازمت نہ چھوڑتے اور قاتلوں نے کسی دوسری عورت کو قتل کیا ہوتا اور ہم انہیں قتل کر دیتے تو کیا قانون نہیں ٹوٹتا؟"

"پہلے ہم انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیتے اور اگر وہ ہتھیار نہ ڈالتے تو انہیں قتل کرنے سے قانون شکنی نہیں ہوتی۔"

"اور اگر وہ ہتھیار ڈال دیتے تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا اور جیل میں انہیں ایک عورت کے قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا۔"

"ہاں...... پھانسی ہو جاتی۔"

"پھانسی ایک قسم کے قتل ہی کا نام ہے۔" وہ بولا۔ "چاہے ہم مارتے یا انہیں جیل میں مارا جاتا، قاتلوں کو دونوں طرح قتل ہونا پڑتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن جب ہم ان قاتلوں کو قتل کرتے ہیں جنہوں نے ہماری لاشیلہ کو قتل کیا ہے اور

گھر کو جلایا ہے اور جنہیں ایک نہ ایک دن قتل ہو جانا ہے، پولیس یا فوجی قتل کریں یا جیل میں پھانسی دے کر قتل کیا جائے تو ہمیں قاتل اور مجرم سمجھ کر فوج اور پولیس کو ہماری گرفتاری کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔"

"ہاں...... قانون یہی ہے۔"

"اوہ......" اس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم لوگ بہت ہی عجیب وغریب قسم کے لوگ ہو۔ تمہارے پاس قانون تو ڈھیر سارے ہیں لیکن انصاف بہت ہی تھوڑا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے جیودش!" میں نے کہا۔ "میں پوری طرح وضاحت نہیں کر سکتا۔ قانون کی باریکیاں ایسی ہیں جو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ قانون اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ خوب سوچ سمجھ کر بناتے ہیں۔ ان سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔"

"فوجیوں نے ہمیں پکڑ لیا تو کیا ہوگا؟"

"ہم پر مقدمہ چلے گا، مجھے پھانسی ہو جائے گی اور تمہیں عمر قید۔"

"مطلب یہ کہ تمہارے اپنے آدمی اس شخص کو قتل کرنے کی وجہ سے جس نے تمہاری بیوی کو اذیتیں پہنچا پہنچا کر قتل کیا، تمہیں پھانسی پر چڑھا دیں گے؟"

"نہیں......" میں نے کہا۔ "اگر مجھے پھانسی پر چڑھایا گیا تو اس کی اصل وجہ یہ ہوگی کہ میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عوام کی عبرت کے لئے مجھے پھانسی کی سزا دی جائے تاکہ وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی جسارت نہ کر سکیں۔"

"کچھ بھی ہو، قانون بہت بچگانہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے بنایا ہے، کسی ایسے بچے نے نہیں بنایا جو چت بھی میری اور پٹ بھی میری کا قائل تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "افسوس مت کرو، قانون کسی نے بھی بنایا ہو، اب تو بن ہی گیا۔ کس کو فرصت ہے کہ دوبارہ اس پر توجہ دے۔ یہ بتاؤ کیا تم مرنے سے ڈرتے ہو؟"

"یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لاشیلہ کے قاتلوں کو مارنے کے بعد مجھے موت اچھی لگنے لگے گی۔ کیونکہ وہ مسلسل تنہائی سے بہتر ہوگی۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ کبھی کبھی تنہائی کا احساس مجھے بھی پریشان کر دیتا ہے تو ہنسنا نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں بوڑھا ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ اور وہ دنیا جس سے مجھے محبت

ہے، روز بروز بدل رہی ہے۔ میری حالت ایک ایسے آدمی جیسی ہے جو دوسروں سے ایک قدم پیچھے رہ گیا ہے۔ آہستہ آہستہ میری قوت میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ مجھے اس وقت سے ڈر لگتا ہے جب میرے سامنے طرح طرح کے کھانے رکھے ہوں گے اور میں انہیں بغیر دانتوں والے مسوڑھوں سے کھانے کی کوشش کر رہا ہوں گا۔ نہیں......" اس نے عزم کے ساتھ سر ہلایا۔ "میں نے ساری زندگی مرد کی حیثیت سے گزاری ہے۔ میں مرد کی حیثیت سے مرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ جب میری موت آئے اس وقت بھی میری رگوں میں زندگی کی آگ سے بھرپور خون دوڑ رہا ہو۔ کیا تمہاری حالت ایسی ہی ہے؟"

میں نے "ہاں" میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"ٹھیک ہے...... جب تم قاتلوں کے قتل سے فارغ ہو جاؤ گے تو ہم دونوں مل کر اپنا پیچھا کرنے والے فوجیوں سے لڑیں گے اور اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ہمیں موت نہیں آ جائے گی۔ پھر ہم ایک ساتھ ایک نئے سفر پر روانہ ہوں گے۔ ایک نئی دنیا ہماری منتظر ہوگی۔"

"شاید......"

"شاید سے تمہاری کیا مراد ہے؟ یہ سوچ رہے ہو کہ خدا ہمارے اور فوجیوں کے درمیان ہونے والی لڑائی کو پسند نہیں کرے گا؟"

"ہاں...... تقریباً یہی سوچ رہا ہوں۔"

"گھبراتے کیوں ہو؟ میں خدا کو منا لوں گا۔" وہ بولا۔ "ایک بار ہماری بستی میں پادری آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک زمانے میں خدا بیٹا بن کر دنیا میں عام انسانوں جیسی زندگی گزار چکا ہے۔ وہ یقیناً ہماری مجبوریوں کو سمجھ جائے گا۔"

"کافی رات گزر گئی ہے۔ اب سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اس موضوع پر باقی گفتگو بعد میں ہوگی۔"

رات کے آخری پہر میں سردی اتنی شدت اختیار کر گئی کہ میری رگوں کا خون جمنے لگا۔ ساتھ ہی جیودش کی تکلیف میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ سیاہ چہرہ نیلا پڑ گیا۔ بہتے ہوئے پسینے نے پورے بدن کو تر بتر کر دیا۔ بخار کی تیزی اسے نگل رہی تھی اور وہ بے قابو ہو کر

تھرتھر کانپ رہا تھا۔ مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی گئی۔ میں نے احتیاط کو فراموش کر کے غار کے دروازے پر آگ روشن کر دی کہ اس کی گرمی سے شاید جیوڈش کی کپکپی کم ہو جائے۔ جانتا تھا کہ آگ کو کئی میل دور تک دیکھا جا سکے گا مگر جیوڈش کو بچانے کی خاطر خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ اندر ہی اندر ڈر سا لگ رہا تھا کہ جیوڈش مر نہ جائے۔

میں نے اسے آگ کے قریب کر دیا اور گود میں اس کا سر رکھ لیا۔ وہ لفظ توڑ توڑ کر بڑبڑا رہا تھا اور اس کے بائیں ہاتھ نے میری کلائی کو پکڑ رکھا تھا۔ میں اس کی بڑبڑاہٹ کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ گود میں سر رکھے بیٹھا رہا اور جیوڈش کی ہر سانس کو اس کی آخری سانس تصور کرتا رہا۔

سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر قبل اس کا بخار ہلکا ہوا اور اس پر نیم غنودگی طاری ہو گئی۔ میں نے اٹھ کر غار کے باہر گھاس کی موٹی تہہ بنائی، پھر اس گھاس پر آگ لگا دی۔ گھاس کا کچھ حصہ ہرا اور گیلا تھا۔ اس سے سیاہ دھوئیں کے مرغولے فضا میں بلند ہونے لگے۔

مجھے یقین تھا کہ قریب موجود فوج کے دستوں کو وہاں سے اٹھتا ہوا دھواں با آسانی نظر آ جائے گا۔ وہ آئیں گے اور جیوڈش کو بخار کی حالت میں پکڑ لے جائیں گے۔ ہسپتال میں اس کا علاج کرایا جائے گا اور مقدمے کے دوران اس کا وکیل دلائل دیتے ہوئے کہے گا کہ جیوڈش سے بس اتنی غلطی ہوئی کہ اپنی سادگی اور جہالت کے باعث اس نے علی اصغر کا ساتھ دیا تھا۔ جج رحم دل ہوتا یا سنگدل دونوں صورتوں میں جیوڈش کو چند سال سے زیادہ کی سزا نہ دیتا۔ اس کے لئے جیل کی کوٹھڑی خشک چٹان میں بخار سے مرنے سے زیادہ بہتر ثابت ہوتی۔

میں نے احتیاط کے طور پر کہ کہیں وہ درد اور بخار کی تکلیف سے نجات پانے کے لئے خودکشی نہ کر لے، پتھر پر مار مار کر اس کی شاٹ گن توڑ دی۔ دھوپ پھیلتے پھیلتے میں وہاں سے رخصت ہونے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

جانے سے قبل اس کے قریب گیا اور سیلوٹ کے طور پر اپنی رائفل کو بلند کیا۔

''شکریہ جیوڈش! بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا اور آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے چٹان سے نیچے اترنے لگا۔

چٹان کے جس حصے کو میں نے نیچے اترنے کے لئے منتخب کیا تھا وہ گیلا اور چکنا تھا۔ قدم جمانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ رائفل کو سر کے اوپر اٹھا رکھا تھا تاکہ پھسلوں تو اس سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔ نیچے وسیع و عریض میدان تھا جن میں ایک طرف چند چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔

میں ہوشیاری سے قدم جماتا ہوا اتر رہا تھا کہ ایک جانب سے مشین گن چلی اور مجھے اپنے بازو میں کئی انگارے اترتے محسوس ہوئے۔ توازن برقرار نہ رکھ سکا، پھسلا اور گر کر دور تک پھسلتا چلا گیا۔ مشین گن کی آواز دوبارہ گونجی اور متعدد گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر کر چٹان میں پیوست ہو گئیں۔

میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گرا اور چند لمحوں تک سراسیمہ سا زمین پر پڑا رہا۔ اوپر سے گرتے ہوئے پتھروں کی میرے جسم پر بارش ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک برسٹ اور چلا اور ضائع ہو گیا۔

کہیں دور سے ہیلی کاپٹر کی آواز آ رہی تھی۔ اس پر دھیان دیئے بغیر اٹھ کر کھلے میدان میں کئی گز تک بھاگا اور خود کو ایک پتھر کے پیچھے گرا دیا۔ ایک لمحے کے لئے وہاں خاموشی رہی، پھر میں نے اپنے دونوں اطراف سے قدموں کی آوازیں سنیں۔ وہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے بازو پر ہاتھ پھیرا، گولیاں جلد کو چھوتی ہوئی گزری تھیں۔ خون ٹپک رہا تھا اور کچھ ایسی تکلیف ہو رہی تھی جیسے پورا بازو آگ کے شعلوں پر بھن رہا ہو۔

میں نے بھاگ کر ایک اور پتھر کی آڑ لے لی۔ بھاگنے کی آواز پر انہوں نے ایک اور برسٹ مارا مگر میں محفوظ ہو چکا تھا۔ پتھر کے اوپر رائفل رکھ کر میں نے بھی گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ پیشانی پر آیا ہوا پسینہ میری آنکھوں میں داخل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میں صحیح طور پر نشانہ لینے سے قاصر تھا۔ آنکھیں صاف کیں۔ سامنے والے پتھر سے سر کا ابھرتا ہوا سایہ نظر آیا۔ میں نے گولی چلائی، نشانہ ایک بار پھر خطا ہو گیا۔ وہ میرے راؤنڈ کی آخری گولی تھی۔ رائفل خالی کر کے میں نے ایک ہاتھ سے اسے دوبارہ لوڈ کرنے کی کوشش کی اور ان کے اگلے برسٹ کا انتظار کرنے لگا۔

اسی اثناء میں ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر آ گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ

اس کی توجہ مبذول کرنے کے لئے ہاتھ ہلاؤں۔ پھر پتھر سے چمٹ گیا۔ وہ میری جنگ تھی۔ اس جنگ میں کسی دوسرے کو شریک کرنا مناسب نہیں تھا۔

ہیلی کاپٹر اس دھوئیں کی طرف بڑھ رہا تھا جو جیوڈش کی غار کے پاس سے اٹھ رہا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک نے یہ سمجھ کر کہ ہیلی کاپٹر میری مدد کے لئے آیا ہے، اس پر مشین گن سے فائر کرنا شروع کر دیئے۔ ہیلی کاپٹر خوفزدہ چوہے کی طرح تیزی سے چٹان کی دوسری طرف نکل گیا۔

اس عرصے میں ان لوگوں کو ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ پا کر میں نے اپنی جگہ تبدیل کر لی اور نسبتاً اونچی اور زیادہ بہتر آڑ میں چلا گیا اور پتھر پر رائفل کی نال رکھ کر ان کے سامنے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحوں کے لئے وہاں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ پھر اچانک اس پتھر پر جس کے پیچھے تھوڑی دیر قبل میں نے اپنے آپ کو چھپایا تھا، دائیں اور بائیں جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پتھر کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔

ایک بار پھر وہی گہرا سکوت اور سناٹا چھا گیا۔ پھر فاتحانہ انداز میں ایک شخص آڑ سے نکل کر پتھروں کی طرف بڑھا۔ گولیوں سے پیدا ہونے والے غبار کے باعث جب تک وہ پتھر تک نہیں پہنچ گیا اسے میری غیر موجودگی کا پتہ نہیں چل سکا۔ پھر جونہی معلوم ہوا کہ میں غائب ہو چکا ہوں اور وہ کھلے میدان میں کھڑا ہے اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پناہ کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور تب اس کی نظریں میری رائفل کی نال پر پڑیں۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نال کا رخ چند فٹ کے فاصلے پر اس کے پیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی مشین گن بے احتیاطی سے لٹکی ہوئی تھی۔

میں نے ٹریگر کھینچا۔ ہلکی سی کلک کی آواز ہوئی۔ رائفل کو ایک ہاتھ سے بھرتے وقت ڈھنگ سے کارتوس نہیں لگ سکے تھے اور ایک کارتوس تو پھنس کر جام ہو گیا تھا۔ ایک سیکنڈ تک ہم بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ پھر اچانک اس کے چہرے کا خوف ہوا ہو گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے مشین گن سنبھال لی۔

''ایک منٹ رکو۔'' کسی کی آواز آئی۔ ''میں اس کی موت سے پہلے اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

سب مشین گن والا مسکراتا اور اتراتا ہوا میرے قریب پہنچا اور سب مشین گن کا بٹ میرے منہ پر زور سے مار کر مجھے نیچے گرا دیا۔ میں پوری طرح سنبھل نہیں سکا تھا کہ اس کی ٹھوکر میرے پیٹ کے نیچے پڑی۔ میں درد سے دوہرا ہو گیا۔ اس نے جھک کر میری رائفل چھینی، کمر کا چاقو کھینچا اور بڑی مہارت سے میرے جسم کی تلاشی لے کر ایک طرف سکون سے کھڑا ہو گیا۔

وہی تحکمانہ آواز دوبارہ آئی۔ ''اسے کھلے ہوئے میدان میں کھینچ لاؤ۔''

تب میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سفید لبادے میں ملبوس وہ ایک عجیب و غریب مخلوق تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہی وہ پراسرار روح ہے جس کی کہانیاں زبان زد عام تھیں۔ اس وقت وہ ایک زندہ جسم کے طور پر عمل کر رہی تھی۔

مجھے پیروں کی جانب سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے روح تک لے جایا گیا، پھر پیٹ پر گھونسا رسید کر کے بٹھا دیا گیا۔

روح نے پیٹ کی جانب میرے ہاتھ موڑ کر اچھی طرح جکڑ دیئے، پھر ایک پھندا بنا کر میری گردن میں ڈالا اور اس کے سرے کو میرے جکڑے ہوئے ہاتھوں پر باندھ دیا۔ میں ہاتھوں کو آزاد کرانے کی کوشش کرتا تو وہ گردن کا پھندا کس کر مجھے پھانسی لگا سکتا تھا۔

روح نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ ہونا۔ میرے ساتھ مشین گن لئے کھڑے رہو اور یہ اگر ذرا بھی حرکت کرے......'' جملہ نامکمل چھوڑ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اگر تم نے بے ہودگی کی تو میں تمہارے بازو اور ٹانگوں کو کاٹ کر تمہیں لولا بنا دوں گا۔ میرا ارادہ تھا کہ تم پر قابو پاتے ہی لولا بنانے کا فرض انجام دوں گا۔ لیکن اب میں نے اپنے ارادے کو موخر کر دیا ہے۔ بازو اور ٹانگیں کٹنے کی تکلیف تمہیں بے ہوش کر دے گی اور میں تم سے گفتگو کرنے سے محروم رہ جاؤں گا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہارا ساتھی کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''شاید مر چکا ہے۔''

''ہاں......'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تم نے چٹان پر آگ جلانے کی حماقت کر کے اپنی موت کو آواز دی ہے۔'' وہ بولا۔

''ہمارا خیال تھا کہ بارش نے ہمارے قدموں کے نشانات کو مٹا دیا ہوگا اور تم ہم تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ لیکن آگ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارا ریڈیو آپریٹر تمہیں سب کچھ بتا چکا ہے۔ زندہ ہے یا مارا گیا؟''

''مارا گیا۔''

''تم نے زبان کھلوانے کے لئے اسے شدید قسم کی اذیت دی ہوگی۔''

''بے شک۔''

''وہ ہمارا انتہائی وفادار ساتھی تھا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے تمہیں بھی اذیت دی جائے گی۔ اتنی اذیت کہ تم اس وقت کو روؤ گے جب تمہیں تمہاری ماں نے پیدا کیا تھا۔''

میں خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہا۔

''تم ہو کون؟'' وہ گرج کر بولا۔ ''ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟ اتنی بات تو میں بھی جانتا ہوں کہ تمہارا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

''بتاؤ......'' اس نے میرے گلے پر اپنے چاقو کی نوک رکھ دی۔ ''کون ہو؟''

میں نے کہا۔ ''جیودش نے ایک بار تمہاری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارا چہرہ ایک ایسے مُردے کا چہرہ ہے جسے مرے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے ہیں لیکن کسی نے ابھی تک اسے دفن نہیں کیا ہے۔''

میرا خیال تھا کہ وہ توہین برداشت نہیں کر سکے گا اور گلے سے چاقو اتار کر مجھے مسلسل کرب واذیت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دے گا۔

''نہیں......'' اس نے میرے ارادے کو بھانپ کر گردن سے چاقو کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنی آسانی سے نہیں مر سکتے۔ تم نے مجھے بے پناہ تکلیف پہنچائی ہے۔ میرے وفادار ساتھیوں کو اذیتیں دے دے کر ختم کیا ہے۔ رہا میرا چہرہ تو اسے میں اپنے لئے ایک نعمت سمجھتا ہوں۔ اسے دیکھ کر لوگ ڈر جاتے ہیں۔'' اس کی انگاروں جیسی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ ''مگر تم مجھ سے خوفزدہ نہیں ہو۔ خوف کی بجائے تمہاری آنکھوں میں نفرت ہے۔ شاید اُس لڑکی کی وجہ سے۔'' وہ مسکرایا۔ ''اچھی حسین لڑکی تھی۔ تمہارا اور اس کا رشتہ کیا تھا...... محبوبہ تھی یا بیوی؟''

کوئی جواب نہیں ملا تو وہ پھر بولا۔ ''جو بھی رہی ہو، مگر تھی خوبصورت۔ ملک میں شاید ہی کوئی اس جیسی خوبصورت لڑکی ہو۔ ایک بات بتاؤں، میرے چہرے نے اسے بھی ڈرا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوف سے چیخنے لگی تھی۔ پھر چیختی ہوئی بھاگی تھی۔ مگر میرے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور اس سے کہا۔ ''بھاگ کر کہاں جاؤ گی میری جان! ہمارے خنجروں کی پیاس کون بجھائے گا؟''

میرے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگانے کے لئے وہ خاموش ہو گیا، پھر ہنس کر کہنے لگا۔ ''اس لڑکی کی جلد نرم، ملائم اور چکنی تھی۔ میں نے اسے اپنے آدمیوں سے وصول کیا تو ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ لیکن جب میں نے چاقو نکالا تو وہ چیخنے لگی۔ خوب چیخی۔ کاش تم نے اس کی چیخیں سنی ہوتیں۔ جتنی حسین خود تھی، اتنی ہی حسین اس کی چیخیں تھیں۔''

اس نے درست کہا تھا۔ وہ مجھے واقعی اتنی شدید اذیت پہنچا رہا تھا جس کا میں نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ میری بوٹیاں کاٹ کر میری نظروں کے سامنے کتوں کو کھلائی جاتیں تب بھی مجھے اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی اس کی باتوں سے ہو رہی تھی۔

''تمہارا نام علی اصغر ہے اور اس لڑکی کا نام......''

ابھی میں جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ اچانک جیودش نے پہاڑ کے پیچھے سے چھلانگ لگائی اور سب حیرت زدہ رہ گئے۔

جیودش شاید بینائی کھو بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے زخموں سے چور بدن کو سنبھالا اور اس شخص پر حملہ کر دیا جس کے پاس مشین گن تھی اور دوسرے لمحے مشین گن اس کے ہاتھ آ گئی۔ لیکن اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''علی! تم زمین پر لیٹ جاؤ...... جلدی کرو......'' ان الفاظ کے ساتھ اس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن دوسرے لوگوں نے بھی اس کی وارننگ سے فائدہ اٹھایا اور خود کو محفوظ مورچوں میں چھپا لیا۔ پھر ان میں سے ایک نے رائفل سے لگاتار فائر کئے اور جیودش کے سر کے چیتھڑے اُڑ گئے...... اس کے بدن میں سینکڑوں سوراخ ہو گئے تھے اور یہاں کھیل ختم ہو گیا۔ میں ان کے چنگل سے نکل نہیں سکا تھا۔ اور اس کے بعد موت...... موت ہی موت۔ سمجھے ڈیئر شہباز! یہ ہے علی اصغر جرادی۔''

''ہے...... یا تھا......؟'' شہباز نے چونک کر پوچھا۔
''مجھے یہ آدمی چاہئے......'' رازل جریری کی آواز اُبھری......

٭......٭

شہباز کی یہ ایڈونچرس داستان ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کریں۔

جانباز

2

ایم اے راحت

شہباز نے اس طرح اسے دیکھا جیسے رازل جریری نے اس سے مذاق کیا ہو۔اس سے پہلے کہ وہ رازل جریری سے کہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رازل جریری کی آواز دوبارہ ابھری۔

''مجھے یہ آدمی چاہئے۔''

''کون......؟'' بمشکل تمام حواس مجتمع کر کے شہباز نے پوچھا۔

''علی......اصغر......جراوی۔'' رازل جریری نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''کیا......؟'' شہباز حیرت سے بولا۔

''ہاں...... مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''کیا یہ زندہ ہے؟''

''ہاں زندہ ہے۔''

''اسے سزائے موت نہیں ہوئی ؟''

''ابھی نہیں۔''

''مطلب......؟''

''صبح ہونے میں کچھ دیر باقی ہے۔''

''آہ......تو کیا اس کی کہانی......مگر یہ کیسے ممکن ہے؟''

''ناممکنات ہی سے تو ممکن کا لفظ نکلتا ہے۔ یہ زندہ ہے اور تمہیں ایک کردار بنا کر اپنی داستان سنا رہا ہے۔'' رازل کی بات بالکل بھی سمجھ میں نہیں آئی۔شہباز پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔تب رازل جریری نے کہا۔

''ہاں شہباز! میں کبھی تم سے کوئی غلط بات نہیں کہوں گا۔حقیقتاً اس وقت اس نے جو تمہیں کہانی سنائی ہے اس میں تمہیں ایک وارڈر کی حیثیت اختیار کرنا پڑی ہے۔لیکن کہانی

تمہارے گوش گزار کردی گئی ہے۔"

"ایک بات میرے ذہن میں بار بار آتی ہے رازل جریری!"

"بولو، کیا؟"

"کیا تم جادوگر ہو...... جادو جانتے ہو؟"

رازل جریری کچھ لمحے خاموش رہا، پھر مدھم لہجے میں بولا "حقیقت یہ ہے کہ میں جادو اور جادوگری پر ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کروں، مصروفیتوں نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان بدبختوں نے مجھے اپنے چنگل میں پھانس لیا۔ میرے عزیز! اگر مجھے زندگی میں آزادانہ طور پر کام کرنے کے مواقع حاصل ہوتے تو تم یقین کرو دنیا کو اتنا کچھ دیتا کہ دنیا سرشار ہو جاتی۔ لیکن بس اجارہ داری کا تصور انسانی ذہن میں ابتدا ہی سے رہا ہے۔ ساری برتری اپنے آپ میں سمیٹ لینے کی خواہشوں نے انسان کا پیچھا کہاں چھوڑا ہے۔ اور وہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے۔ پلاسکو ساری دنیا پر اپنی حکمرانی کا خواہش مند ہے۔ وہ کسی کو اپنے آپ سے بڑا نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر کوئی فنکار اپنے فن کو ظاہر کردے، اسے اسی صورت میں پناہ مل سکتی ہے جب وہ پلاسکو کی غلامی قبول کرے۔ یہ ایک عجیب وغریب سلسلہ چل رہا ہے۔ مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم انہیں ختم نہیں کرسکتے۔ وہ چند ہی افراد ہوتے ہیں جو اس طرح کی سوچ رکھ کر ملکوں کی باگ ڈور چلاتے ہیں۔ وہاں رہنے والے تو وہی سیدھے سچے انسان ہوتے ہیں جو سچائی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہوں۔ میں پلاسکو کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہوئے بہت کچھ کرسکتا ہوں لیکن بات وہی آجاتی ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسنا پڑتا ہے اور ایسی کسی کاوش میں تو سچی بات ہے کہ گیہوں کے تو چند دانے ہی ہوتے ہیں، باقی گھن ہی گھن ہوتا ہے۔ بے ضرر، معصوم، بے گناہ۔ انہیں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ امریکہ نے جنگی حوالے سے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم مار دیئے۔ یہ وحشت ناکی تھی کیونکہ نقصان صرف چند دانوں ہی کو پہنچا تھا باقی تو گھن ہی گھن تھا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، میں تمہیں علی اصغر جراوی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مجھے اس شخص کی ضرورت ہے اور بات اسی تک محدود نہیں ہے۔ اصل میں یہ شخص ایک ایسے مقصد کا رازدار ہے جو شروع سے میرے موقف میں شامل رہا ہے۔ میرے عزیز ساتھی! ایک بات تو تم جانتے ہو کہ اس دور میں کسی بھی مقصد، کسی بھی مشن کی کامیابی کے لئے

دولت درکار ہوتی ہے۔ اتنا سرمایہ، اتنی رقم چاہئے ہوتی ہے کہ ہمارے مالی وسائل ہمیں دھوکا نہ دیں۔ اب یہ مالی وسائل ڈاکہ زنی یا لوٹ مار سے تو حاصل نہیں ہوسکتے۔ اس طرح تو دنیا کو اپنے پیچھے لگا لینے کا ایک اور عمل جاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی یہی سب کچھ درکار تھا۔ اور جہاں میں دوسرے سائنسی امور کے لئے کام کررہا تھا وہیں مجھے دولت کی ضرورت بھی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی۔ اور پھر تحقیقات نے مجھے ایک ایسے نقطے کی طرف متوجہ کیا جو پُرکشش اور قابل حصول تھا۔ ایک ایسا عظیم الشان خزانہ جو نجانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا کہاں تک پہنچا۔ اس کی تفصیل میرے علم میں بھی آئی۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس میں ایک بہت بڑا حصہ شاہ کی کارروائیوں کا بھی ہے۔ شاہ نے جب اپنے اس ناقابل یقین خزانے کو ایران سے کہیں اور منتقل کیا تو اس کی منتقلی میں انتظامیہ کے افراد بھی شریک تھے اور اسے بحفاظت ایک مخصوص جگہ تک لے جانا تھا۔ انہی لوگوں میں علی اصغر جراوی بھی تھا۔ اور علی اصغر جراوی زیادہ تو نہیں لیکن شاہ کے منصوبوں کے مطابق ایسی جگہ تک نشاندہی کرسکتا ہے جہاں سے اس خزانے کی جانب رخ کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ خزانہ ہماری تحویل میں آجائے تو تم یوں سمجھ لو کہ ایک عرصۂ دراز کے لئے میری تحقیقی کاوشیں جلا پاسکتی ہیں۔ میرے دوست! صرف علی اصغر جراوی ہی نہیں ہے، اس کے علاوہ بھی کچھ کردار ہیں جنہیں ہمیں اکٹھا کرنا ہوگا۔ یوں سمجھ لو کہ میں زندہ انسانوں کا ایک میوزیم بنانا چاہتا ہوں اور اس میوزیم میں عجیب وغریب لوگ ہوں گے جو بظاہر تو کچھ بھی نہیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات چھوٹی سے چھوٹی شخصیت کسی عظیم کام کے لئے ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ یہی کیفیت علی اصغر جراوی کی بھی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن رازل جریری! میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا کہ کیا آپ جادوگر ہیں؟"

"ہاں...... بات ذرا مختلف راستوں پر نکل گئی تھی۔ اصل میں بات کہیں سے کہیں آجاتی ہے۔ ہمیں کائنات تسخیر کرکے دی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے ہماری پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ لیکن اسے تلاش کرنے کے لئے ہمیں جدوجہد کرنا ہوگی۔ اور یہی جدوجہد ہماری منزل ہے۔ وہیں سے ہم آگے کے راستے پا سکتے ہیں۔ میرے پیارے دوست! میں نے تمہیں اپنے وجود کا نصف بنا لیا ہے اور جو مقام اب

میرے مقاصد میں تمہارا ہے کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ ہم رواں دواں زندگی کے مالک ہیں اور زندگی کی یہ روانی ہی ہماری کامیابی کی ضمانت ہوگی۔ تو بات تسخیر کائنات ہی کی ہو رہی تھی۔۔ زمانہ قدیم میں اسے جادو کہہ لو، زمانہ جدید میں سائنس۔ ذرا جادوگری کی کارروائیوں پر غور کرو اور اس کے بعد زمانہ جدید کی سائنس پر غور کرو۔ یہ سائنس تمہیں جادوگری سے کہیں زیادہ آگے نظر آئے گی۔ بس طریقہ کار ہوتے ہیں، ہر چیز کی ایک لاجک ہے۔ اگر لاجک نہ ہو تو وہ چیز ہی نہ ہو۔ سمجھ رہے ہو؟ میرا عمل بھی ایسا ہی ہے۔ تمہیں یہ جادو محسوس ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سائنس ہے جو مادی چیزوں سے بھی تعلق رکھتی ہے اور روحانی چیزوں سے بھی۔ لیکن ہر چیز کو ہم اپنے نقطہ نگاہ سے دیکھیں گے اور اسی طرح اسے سمجھا بھی جا سکتا ہے۔ اس شخص کی کہانی تم یہ سمجھ لو کہ براہِ راست ہے۔ صبح اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اس تک پہنچ کر اس کی زندگی بچانی ہے اور اس میں تم پیش پیش ہو گے۔“

رازل جریری کے الفاظ نے شہباز کو سنسنا کر رکھ دیا تھا۔ یہ شخص کہتا تھا کہ یہ جادوگر نہیں ہے۔ لیکن جو بات عقل سے اتنے فاصلے پر ہو کہ اس کے بارے میں صحیح فیصلہ ہی نہ کیا جا سکے اسے پھر اور کیا کہا جائے۔

بہرحال رازل جریری شہباز کے لئے اس قدر اچھا انسان ثابت ہو رہا تھا کہ بعض باتیں سمجھ میں نہ آنے کے باوجود شہباز اپنی فطرت کے خلاف اس سے تعاون کر رہا تھا اور اس کی بات کو اہمیت دے رہا تھا۔ چنانچہ اس نے یہاں بھی خاموشی ہی اختیار کر لی اور کچھ لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے رازل جریری! کہ آپ نے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں حیران ہوں کہ وہ شخص اپنی داستان کسی کو سنا رہا تھا اور آپ کہتے ہیں کہ داستان سننے والا میں تھا۔ بہرحال کیونکہ آپ کی لاتعداد باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں اور جیسا کہ میں نے آپ کو ایک عجیب و غریب جگہ سے نکالا، ان میں سے لاتعداد باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ چنانچہ یہ سب کچھ بھی۔ مجھے یہ بتائیے کہ میری ذمے داری کیا ہے؟“

”دیکھو، میں ایک لمحے کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ تم ذہنی طور پر کسی الجھن کے شکار رہو۔

بعض باتیں ذرا دیر سے سمجھ میں آتی ہیں لیکن آ جاتی ہیں۔ میری کچھ باتیں تمہارے لئے بے شک الجھن کا باعث ہوں گی لیکن بعد میں وہ تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی۔ اس لئے فی الحال اس وقت تک کا توقف اختیار کر لو جب تک ان باتوں کی مکمل تفصیل تمہارے علم میں آنا نہ شروع ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے...... مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے۔“ شہباز نے کہا۔ پھر اس کے بعد بات ختم ہو گئی۔ رازل جریری نے کہا۔

”ہم بس کچھ لمحوں کے بعد روانہ ہونے کے لئے تیار ہیں۔ تمہیں اور کوئی کام تو نہیں ہے؟“

”اگر میں یہ چاہوں کہ میں بابا فیض شاہ اور اپنی ماں سے مل لوں تو وقت تو ضائع نہیں ہو جائے گا؟“

”بالکل نہیں۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ جیسا کہ میں نے تم سے کہا۔“

شہباز کا دل تو چاہ رہا تھا کہ بابا فیض شاہ کو تفصیل بتا دے لیکن ایک بات وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ حد درجہ معصوم ہیں اور انہیں کسی سلسلے میں راز دار بنانا بالکل ہی بے مقصد ہوگا۔ چونکہ یہ بیچارے ذرا مختلف قسم کی زندگی گزار چکے ہیں اور انہیں نہیں معلوم کہ زندگی کے پراسرار مسائل کیا ہوتے ہیں۔ لیکن احتیاطاً اس نے کہا۔

”میں رازل جریری کے ساتھ ایک اہم مقصد کے لئے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے زیادہ وقت لگ جائے۔ آپ لوگ محسوس نہ کریں۔“

فیض شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”بیٹے! ہمارے لئے تم نے جو ماحول مہیا کر دیا ہے ہم اس سے مطمئن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے سفر میں مختلف منزلیں آتی ہیں۔ ایک منزل وہ ہوتی ہے جب انسان مکمل طور پر سکون اور اطمینان کا طلب گار ہوتا ہے۔ ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ چنانچہ بس ہمیں سکون کے ساتھ وقت گزارنے کے علاوہ کام ہی کیا ہے۔ تمہارے لئے دعا کریں گے کہ تم دنیا کی ہر مشکل سے دور رہو۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟“

”جی...... آپ کی دعائیں ہی میرے لئے سب کچھ ہوں گی۔ میں حقیقتاً اس منزل کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں جس کے بارے میں، میں نے سوچا تھا۔“

"یہی بڑی بات ہے کہ تمہیں تمہاری پسند کے مطابق موقع مل رہا ہے۔"

یہ دونوں کردار شہباز کی زندگی میں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اور یہاں میلیکو میں ان کے لئے جو بندوبست کر دیا گیا تھا وہ بلاشبہ شہباز کے لئے نہایت اطمینان بخش تھا۔ دنیا کی ہر آسائش انہیں حاصل تھی اور اس کے بعد بھلا اس بات کی کیا گنجائش رہ جاتی تھی کہ وہ کسی اور چیز کی تلاش کریں۔

بہر حال ان تمام امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جب شہباز رازل جریری کے پاس پہنچا تو رازل جریری ایک آرام چیئر پر نیم دراز تھا۔

"میں آ گیا ہوں۔" شہباز نے کہا۔ لیکن رازل جریری کا جسم متحرک نہ ہوا۔ ایک لمحے کے لئے شہباز کو حیرت ہوئی لیکن دوسرے لمحے رازل جریری کی آواز عقب سے سنائی دی۔

"ٹھیک ہے شہباز! چلو آؤ، چلتے ہیں۔"

شہباز نے ایک گہری سانس لی۔ رازل جریری اس وقت اپنے بدن میں موجود نہیں تھا۔ کیا عمدہ اور انوکھی بات تھی۔ وہ سفر کے لئے تیار تھا لیکن اس کا بدن اس سفر میں بالکل غیر متحرک تھا۔

☼......☼

صبح کا آخری ستارہ اپنی منزل کا اختتام کر رہا تھا۔ بہت دُور سے اُجالے کی ہلکی ہلکی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ جیل کی فضا میں ایک گہری خاموشی طاری تھی۔ سنتری اپنی ڈیوٹیوں پر مستعد تھے لیکن رات کی جگار نے انہیں بالکل ست کر رکھا تھا۔ ان میں سے ہر جاگنے والا اس بات کا متمنی ہوگا کہ کاش اسے آرام دہ بستر پر لیٹنے کا موقع مل جائے۔ لیکن انسانی ذمے داریاں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔ ہر شخص اپنی مرضی کے خلاف جیتا ہے اور یہی دنیا گزاری ہے۔ شہباز اپنی بہترین مہارتوں سے کام لے کر جیل کی چار دیواری میں داخل ہوا تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین بات تھی کیونکہ جیل کی تعمیر میں کسی حماقت سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اندر کے قیدی باہر جانے کے لئے کیا جدوجہد نہیں کرتے۔ انہی تمام کاوشوں کو ناکام بنانے میں صلاحیتیں صرف کی جاتی تھیں۔ لیکن صرف ایک چھلاوا جو صرف ایک پتلی سی رسّی کے ذریعے جیل کی بلند و بالا دیواریں طے کر کے اندر داخل ہو گیا تھا ان لوگوں کے لئے ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔

بہر حال وہ جیل میں داخل ہونے کے بعد جائزہ لے چکے تھے۔ رازل جریری نے تو اپنے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کر لی تھیں اور وہ یقینی طور پر شہباز سے اس قدر متاثر تھا کہ اگر اس کے لئے اس طرح کی سہولتیں مہیا کر سکتا تو اس سے کبھی گریز نہ کرتا اور یہ بالکل نہ سوچتا کہ ان قوتوں کے حصول کے بعد کہیں شہباز اس سے منحرف نہ ہو جائے۔ آخر کار وہ ایک جگہ پہنچا اور اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پھانسی گھاٹ ہے۔ یہاں اسے پھانسی دی جائے گی اور ہم یہیں سے آغاز کریں گے۔"

"ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم کہ ہمارے پاس اسے بچانے کا ذریعہ کیا ہے۔"

"ہاں...... وہ میں بتاتا ہوں تمہیں۔ بات یہ ہے کہ پلاسکو میں ہم نے بہت سے لوگوں کو زندگی سے محروم کیا۔ تمہاری میرے ساتھ شمولیت سے بہت پہلے میں نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ میں نے ان کی کئی لیبارٹریاں تباہ کیں اور اس تباہی میں بہت سے انسان زندگی سے محروم ہوئے۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں، ان کی زندگی چھین کر بھی مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان میں سے بعض بالکل بے گناہ تھے اور ان کا اس معاملے سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ بس یوں سمجھ لو کہ انسان اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کے سلسلے میں نجانے کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہوتا۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ ہر جگہ ہم انسانی زندگی سے کھیلیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اب یہ شخص مجھے جس مقصد کے لئے درکار ہے اس بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ اسے یہاں سے لے جانے کے سلسلے میں قتل و غارت گری کی کوششیں کرنا پڑیں۔"

"تو یہی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم یہاں اتنی جدوجہد کر کے جس مقصد کے تحت آئے ہیں اس کی نوعیت کیا ہوگی؟"

"وہی میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔ یہ پھانسی گھاٹ ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

شہباز سیڑھیاں چڑھ کر پھانسی گھاٹ کے قریب پہنچ گیا۔ یہ ایک زبردست خطرہ تھا۔ اگر اسے یہاں دیکھ لیا جاتا تو یقینی طور پر جیل کے محافظ یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ کوئی مفرور قیدی ہے یا پھر کوئی ایسی پراسرار شخصیت جو ان کی اجازت کے بغیر یہاں تک پہنچی ہے۔ رازل جریری نے کہا۔

"ہر طرف سے بے فکر رہو۔ میں تمہارے تحفظ کا انتظام کیے ہوئے ہوں۔ اس طرح سے مجرم کو تختۂ دار پر پہنچایا جاتا ہے۔ یہاں اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا جاتا ہے اور پھر یہ تختہ اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے اور دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مجرم کچھ دیر رسّی کے پھندے میں لٹکا رہتا ہے اور اس کے بعد نیچے جا گرتا ہے جہاں سے ڈاکٹر اس کی موت کی تصدیق کرتے ہیں اور پھر اسے یا تو اس کے ورثاء کے حوالے کر دیا جاتا ہے یا پھر کچھ وقت کے لئے ہسپتال میں اس جگہ پہنچا دیا جاتا ہے جہاں مُردے رکھے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک...... ہمارا عمل کیا ہوگا؟" شہباز نے سوال کیا۔

"جب اسے سولی پر کھینچا جائے گا اور تختہ ہٹا دیا جائے گا اس وقت میں اس خلاء میں موجود ہوں گا۔ میرا مطلب ہے نادیدہ شکل میں۔ اور میں اس کا وزن اپنے کاندھوں پر سمیٹوں گا تاکہ اسے نقصان نہ پہنچے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میں ایک انجکشن اس کے جسم میں لگا دوں گا۔ اس انجکشن کی خوبی یہ ہے کہ یہ کم از کم آٹھ گھنٹے کے لئے انسانی زندگی کو موت کا مزہ چکھا دیتا ہے۔ اور جب ڈاکٹر اس کا معائنہ کریں گے تو پورے اعتماد کے ساتھ یہ تصدیق کریں گے کہ اس کی موت واقع ہوگئی ہے لیکن درحقیقت یہ مُردہ نہیں ہوگا کیونکہ لاوارث ہے اور اس کے وارثوں میں کوئی نہیں ہے جو اس کی لاش کو وصول کرے اور اس کی تصدیق کرے اور اس کی تدفین کرے۔ چنانچہ یہی ہوگا کہ اسے کچھ وقت کے لئے وہاں چھوڑ دیا جائے گا اور یہیں سے میں اسے باہر لے آؤں گا۔ کیا سمجھے۔"

"ٹھیک ہے اگر تم یہ کام باآسانی کر سکتے ہو تو بے شک اسی انداز میں کرو ورنہ دوسری صورت میں پھر میری ذمے داری لگاؤ کہ میں اسے ہسپتال کے مُردہ گھر سے باہر لا سکوں۔"

"جہاں ہم جو عمل کر سکتے ہیں وہ کیا جائے گا اور باقی اگر کہیں ضرورت محسوس کی جائے گی کہ ہم خطرات مول لیں تو ہم اس سے بھی گریز تو نہیں کریں گے۔"

چنانچہ وہ انتظار کرنے لگے۔

قیدی جیل کی کوٹھڑی میں اپنا دل ہلکا کر کے اپنے آپ کو سکون دے رہا تھا۔ جوں جوں روشنی ہوتی جارہی تھی اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہوتی جارہی تھی۔ اس میں خوف نہیں تھا، بس ایک تصور تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آہ...... اگر انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو بچھڑ چکے ہیں، موت کے بعد ان سے

دوسری دنیا میں مل جائیں گے تو موت سے خوف کا تصور ہی ختم ہو جائے۔ ہر انسان خوشی خوشی یہ سوچ کر دنیا سے واپسی کے لئے تیاریاں کرے کہ اتنا وقت اس نے اس دنیا میں گزارا، اب باقی وقت ان سے بچھڑنے والوں کے ساتھ اس دنیا میں گزارے گا جو اس سے دور ہو چکے ہیں۔ اور قیدی کے ذہن میں لاشیلہ تھی۔ اس کی محبت، اس کی حیات کے ایک ایک لمحے کی رازدار۔ جس کے لئے وہ تڑپتا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر کے فیصلے انسانی فیصلوں سے بالکل مختلف ہوا کرتے ہیں اور تقدیر اس کے سلسلے میں الگ ہی فیصلے کر چکی ہے۔

بہرحال وہ انتظار کر رہا تھا۔ اور پھر وقت مقررہ پر کچھ خاموش افراد بے آواز چلتے ہوئے اس تک پہنچ گئے۔ قیدی نے وارڈر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی داستان سننے کے بعد وارڈر نے اپنے ذہن میں اسے کیا قرار دیا، مجرم یا بے گناہ؟ لیکن اب وارڈر اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا۔

جیل کا ڈاکٹر، جلاد اور وہ حکام جو اس کی پھانسی کی آخری رسم ادا کرنا چاہتے تھے، پھانسی گھاٹ پہنچ چکے تھے اور دور سے قیدی کو دیکھ رہے تھے جو صبر وضبط کے ساتھ اپنے قدموں سے چلتا ہوا پھانسی گھاٹ کی سمت آرہا تھا۔ ایک افسر نے دوسرے سے کہا۔

"حوصلہ مند آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ موت کا خوف تو موت سے پہلے تمام قوتیں جسم سے کھینچ لیتا ہے۔ اور پاؤں بے جان ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں......" دوسرے افسر نے افسردگی سے کہا۔

کوئی بھی انسانی مصائب پر خوش نہیں ہوتا۔ وہ لوگ آنے والے کو دیکھتے رہے جس کی نگاہیں آسمان کی جانب تھیں اور پاؤں سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔ کیسی انوکھی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنی موت کا وقت نہیں جانتا، یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ کب اور کس وقت موت آجائے۔ لیکن پھانسی کی سزا پانے والا سوچ رہا تھا کہ اس کی موت کا وقت کیا ہے اور وہ اپنی موت کے وقت کو جانتا تھا۔ اگر اسے وقت ملتا تو دنیا والوں سے یہ سوال ضرور کرتا کہ بتاؤ یہ تصور تو یہاں ختم ہو جاتا ہے کہ کسی کو اپنی موت کے لمحات نہیں معلوم ہوتے لیکن جو کچھ ہونے والا تھا وہ اس خیال کی تصدیق کرتا تھا کہ موت کا وقت واقعی کسی کو نہیں معلوم۔ اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا گیا اور پھر اس سے پوچھا گیا کہ کوئی آخری

خواہش اس کے دل میں ہے؟اس نے پھیکے سے انداز میں مسکرا کر نفی میں گردن ہلا دی۔

زندگی کی بہت سی حسرتیں اس سے سوال کر رہی تھیں۔ وہ کون ہوتے ہیں جو ایک سو پانچ، ایک سو دس اور ایک سو بیس سال کی عمریں گزار کر سینکڑوں لوگوں کو اس دنیا میں چھوڑ کر جاتے ہیں اور ہر شخص ایک ہی بات کہتا ہے کہ بہرحال انہوں نے اپنی زندگی انتہائی بہتر طریقے سے گزاری۔ بہتر طور پر زندگی گزارنے کے کیا گر ہوتے ہیں؟ یہ آخری سوچیں اس کے ذہن میں تھیں۔ بھلا اس کی آخری خواہش کیا ہو سکتی تھی۔ کوئی بات ہی دل میں نہیں تھی۔ تھوڑے عرصے اور زندہ رہ لیتا تب بھی کوئی ہرج نہیں تھا۔ دکھ تو زندگی کے ساتھی تھے۔ لاشیلہ اتنے آرام سے بھولنے والی چیز تو نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کا ہر لمحہ ایک دلکشی رکھتا تھا۔ بے دلی سی طاری تھی اس پر۔ بعد کے واقعات اس نے اس طرح محسوس کئے جیسے خود اس کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہو رہا ہو۔ بس ایک تماشائی تھا وہ۔ ایک تماشائی کے سوا کچھ نہیں۔ ساری باتیں اپنی جگہ، موت کا خوف اس کے دل میں اس وقت ذرہ برابر نہیں تھا۔

پھر جب اس کی دنیا تاریک کی گئی، اس کے چہرے پر کنٹوپ چڑھا دیا گیا تب بھی اس نے کچھ غور نہ کیا۔ اس کے بعد اس نے پھانسی کا پھندہ اپنی گردن پر فٹ ہوتا ہوا محسوس کیا۔ لیکن اس وقت اسے کوئی خیال نہ آیا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ یہاں تک کہ جلاد نے لیور کھینچ دیا۔

✿......✿

رازل جریری نے ایک لمحے کے اندر اندر اس کے پاؤں اپنے کاندھوں پر جما دیئے۔ ہلکا سا جھٹکا اسے ضرور لگا تھا لیکن اس سے پہلے کہ حلق پر دباؤ پڑے، رازل جریری کے نادیدہ بدن نے اس کا سارا وزن اپنے کندھوں پر لے لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک ہاتھ میں دبی ہوئی سرنج کو اس کی پنڈلی میں پیوست کر دیا۔ ایسا لگا جیسے اسے اس بات کا بھی احساس نہ ہوا ہو کہ پنڈلی میں کیا چبھا ہے۔ دیکھنے والی نگاہیں بس یہی منظر دیکھ رہی تھیں کہ اس کا انسانی جسم تڑپ تک نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھانسی کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر، پھانسی دینے والے جلاد اور پھانسی کے منظر کو دیکھنے والے اعلیٰ افسران اس سے پہلے بھی یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے۔ بہت سے انسانی جسم تو اس طرح تڑپتے ہیں کہ پورا پھانسی گھر ہل جاتا ہے اور بہت سے بڑی خاموشی سے مر جاتے ہیں۔

دونوں طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ جو اپنے آپ کو موت کے لئے پُرسکون کر لیتے ہیں، سکون ہی سے زندگی دے دیتے ہیں۔ ہاں جو موت کو قبول نہ کرتے ہوں ان کی بات الگ ہوتی ہے۔

بہرحال دکھ کا یہ منظر کسی کو پسند نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ حقیقتیں ہوتی ہیں۔ اپنی پسند یا ناپسند سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جیل کا ڈاکٹر گھڑی دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے گردن ہلا دی۔ اس کے اپنے تجربے کے مطابق پھانسی پانے والا مجرم اب ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ دوسرے لوگ حرکت میں آ گئے۔ لاش پھندے سے نکالی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی نبضیں دیکھیں۔ وہ خاموش تھا زندگی اپنا سفر طے کر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے خاموشی سے گردن ہلائی اور واپسی کے لیے اٹھ گیا۔ اس کے بعد انتظامی عملے کا کام تھا اس کے جسم کو سنبھال کر اسٹریچر پر ڈالا گیا تھا لیکن حقیقتیں کچھ اور ہی تھیں۔ ایک طریقہ کار ایک طرزِ عمل اس میں کوئی تبدیلی ممکن ہی نہیں تھی۔ اسے اس ریک میں رکھ دیا گیا جہاں اس وقت اس کے علاوہ کوئی لاش موجود نہیں تھی۔ یہ تھی ایک کہانی جو بہرحال بڑی پراسرار اور سنسنی خیز تھی اور اس کے بعد کہانی کا دوسرا باب شروع ہونے والا تھا۔

لاش سرد خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ خود شہباز جیل کے ایک ایسے حصے میں موجود تھا جو محفوظ تھا۔ محافظ قیدیوں سے بے شک محتاط رہا کرتے تھے۔ اور ان کی نگاہیں قیدیوں کا بھرپور جائزہ لیتی رہتی تھیں کہ کہیں کوئی قیدی فرار ہونے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ لیکن باقی عملے کے افراد تھے جن میں مختلف سویلین بھی ہوا کرتے تھے جو الگ الگ کاموں سے جیل میں آیا کرتے تھے۔ جب اس شخص کا جسم سرد خانے میں پہنچا دیا گیا تو رازل جریری شہباز کے پاس پہنچ گیا۔

''شہباز! میں اب تک کی کوششوں میں تو بہت عمدگی کے ساتھ کامیاب رہا ہوں لیکن اس کے بعد جو کچھ کرنا ہے تمہیں کرنا ہے۔ البتہ اس دوران میں ایک اور کارروائی کر سکتا ہوں جس کی اطلاع ابھی تک میں نے نہیں دی۔ اور یہ ایک دل خوش کن انکشاف ہے۔''

شہباز سوالیہ نگاہوں سے رازل جریری کو دیکھنے کے لئے آنکھیں پھاڑنے لگا جس کا وجود صرف ایک احساس کی حیثیت رکھتا تھا البتہ اس کے بدن کی سرسراہٹیں شہباز کو یہ احساس دلا دیتی تھیں کہ وہ کہاں اور کتنے فاصلے پر موجود ہے۔ اور یہ بھی کافی عرصے کی

رفاقت کے بعد ہوا تھا۔ ورنہ عام آدمی اسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ رازل جریری نے کہا۔
''وہ میرے ایک اہم مقصد کے لئے اہم ترین کارکن ہے۔ دنیا سے محبت بھی کرتا ہوں میں۔ کسی دکھی انسان سے متاثر ہو کر اس کے لئے رو بھی سکتا ہوں۔ لیکن ایک بات جانتا ہوں، اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے غیر جذباتی ہونا ضروری ہے۔ یہ ساری عمر کا تجربہ ہے میرا۔ ورنہ کچھ نہیں ہوتا۔ ایک مزے کی بات تم نے کبھی محسوس نہیں کی اور میں اس کی وجہ بھی سمجھتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ تم ابھی اس قدر نوعمر ہو کہ بہت سی باتیں تمہارے ذہن سے گزرتی ہی نہیں ہیں۔ یہ بھی انسانی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔ عمر کی ابتدائی منزلیں، بچپن کے دور سے نکل کر جوانی کا دور کسی بھی طرح بچپن کے دور سے کم نہیں ہوتا اور انسان بہت سی باتیں جاننے کے باوجود یہ سوچتا ہے کہ ان باتوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب یہ عمر تجربہ دیتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی کی وہ ساری تبدیلیاں ہر ذی روح کے ساتھ ہیں جو کبھی کبھی المیوں کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ خیر...... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ لیکن یقین کرو میرے محسوسات یہ ہیں کہ ساری دنیا میری ہے۔ اس میں بسنے والے ہر انسان کا دکھ میرا دکھ ہے۔ میں اپنی زندگی کے ہر شعبے کو بدل سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ہم اپنا اندازِ فکر تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن میری بنیاد یہ ہے کہ پلاسکو جیسے ممالک جو ساری دنیا پر اپنی برتری قائم کر کے صرف اپنے مفاد کی تکمیل چاہتے ہیں، اس قدر آزاد نہ رہیں کہ دنیا کا ہر شخص اس سے خوف کھاتا رہے۔ یہ غلط ہے۔ انسان تو سبھی یکساں ہوتے ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب، جینے کے حقوق تو ہر ایک کو حاصل ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ تم طاقت حاصل کر کے یہ سوچ لو کہ باقی سب غیر انسان ہیں۔ انہیں تمہاری مرضی کے مطابق ہی جینا چاہئے۔ ورنہ تم ان کے خلاف سازشیں کرتے ہو اور ان کے لئے موت تجویز کرتے ہو۔ بس حکومت پلاسکو سے یہی اختلاف ہے مجھے اور اس وقت بھی میں نے یہی سوچا تھا کہ زیادہ کچھ نہیں کروں گا۔ لیکن انہیں یہ احساس دلا دوں گا کہ ان کی سوچ غلط ہے۔ وہ نہیں کرنے دوں گا انہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے میرے اس موقف کو جان کر میرے خلاف عمل کیا۔ لیکن تقدیر مجھے زندہ رکھنے پر آمادہ تھی۔ میں نے ابتدا میں اپنی بچت کی اور بعد میں تم نے میری مدد کی۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔ میں اس انسان کو بھی ایک ایسے مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتا

ہوں جو آگے چل کر میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بن جائے گا اور ابھی یہی مقصد ہے میرا۔''
''میں سمجھتا ہوں رازل جریری!''
''تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ یہ بات میرے ذہن میں ایک مشکل سوچ کی حیثیت رکھتی تھی کہ میں اسے یہاں سے کیسے نکال کر لے جاؤں گا؟ بات یہ ہے کہ یہ جیل ہے۔ یہاں اس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں اور جیل کے محافظ ہر شخص کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔ میں تمہاری زندگی کے لئے بھی کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کسی ایسے زندہ انسان کو جس کی روح اپنے جسم میں موجود ہو، میں اپنے قبضے میں نہیں کر سکتا۔ یعنی میں اس کے جسم میں نہیں داخل ہو سکتا۔ ہاں...... اگر مجھے کوئی خالی بدن مل جائے تو بات الگ ہو جاتی ہے۔ پھر میں اس بدن کو کچھ عرصے کے لئے استعمال کر سکتا ہوں۔ خالی بدن سے میری مراد کہ ایک ایسا انسان جس کی روح اس کے بدن کو چھوڑ چکی ہو۔ میرے ذہن میں یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کرنا چاہی۔ ہسپتال وہ سرخ عمارت ہے جس کے اوپر سفید پٹی لگائی گئی ہے۔ اس کے عقب میں ایک بڑی کھڑکی ہے جس میں کوئی سلاخ وغیرہ نہیں ہے اور یہ اتنی بڑی ہے کہ ایک انسانی جسم اس سے اندر آ جا سکتا ہے۔ اس کھڑکی کے قریب یعنی دوسری جانب ایک گٹر ہے جس کا ڈھکن واں فکس تھا لیکن وہ ڈھکن میں نے ہٹا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ پہلے وہ اس طرح زمین میں جڑا ہوا تھا کہ کوئی اسے پوری جدوجہد کے بعد ہی ہٹا سکتا تھا لیکن اب وہ بالکل الگ ہے اور ایک کنڈے کو پکڑ کر اسے اٹھایا جا سکتا ہے۔ کھڑکی سے...... مگر چھوڑو، میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ صرف تھوڑا سا مسئلہ بتا دیا تھا میں نے تمہیں تاکہ میرا موقف سمجھ سکو۔ تو تمہیں اس کھڑکی کے راستے جراوی کے بدن کو باہر لانا ہے۔ اور جب تم کھڑکی سے دوسری طرف اترو گے تو میں گٹر کا ڈھکن ہٹا دوں گا۔ تم بے دھڑک اس گٹر میں اتر جانا۔ گٹر سات فٹ کی گہرائی میں ہے اور اس کے بعد ایک سرنگ کی شکل میں آگے چلا گیا ہے اور جیل سے کافی دور کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک جگہ ویسا ہی اس کا ڈھکن ہے۔ گٹر تو بہت دور چلا گیا ہے۔ اس میں بہنے والا پانی بہت معمولی سا ہے یعنی صرف وہ پانی جو قیدی استعمال کرتے ہیں۔ وہ ذرا مشکل مرحلہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اسے آسانی سے

طے کرلو گے۔ بس وہاں ہم اسے نکال لیں گے۔ میں نے وہاں ایک گاڑی کا بندوبست کیا ہے جو خالی کھڑی ہو گی۔ بس اتنا کام ہے۔ اور اس کے بعد اس شخص کے سلسلے میں ہمارا کام ختم۔ کیا تم یہ ساری باتیں تفصیل سے سمجھ گئے؟"

"ہاں مسٹر جریری! اس میں نہ سمجھنے والی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ہسپتال تک پہنچنے کے لئے تمہیں ظاہر ہے یہ سفر کرنا پڑے گا۔ وہ دیکھو، ہسپتال سے دس گز کے فاصلے پر وہ سفید درخت ہے جس کی کچھ شاخیں ہسپتال کی چھت تک گئی ہیں۔ کیا تم اس جگہ کو اپنے لئے آسان سمجھتے ہو؟"

"بہت آسان۔" شہباز نے کہا اور جریری ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں۔ تو کیا خیال ہے، ہمیں زیادہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ ہسپتال کے عملے کے لئے ایک پھانسی پانے والے قیدی کا بدن معمولی نوعیت کا حامل ہے۔ اسے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ اس پر کسی کی کوئی اہم توجہ بھی نہیں ہے۔ آؤ...... اب تمہیں اس درخت تک پہنچنا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے عملے کی نگاہوں سے بچنا تمہارا کام ہوگا۔ یہی تمہاری مہارت ہے۔"

شہباز نے اس جگہ کا جائزہ لیا اور اس کے بعد ہنس کر بولا۔

"وہ تو بہت آسان راستہ ہے۔"

اور اس کے بعد اس نے عمل شروع کر دیا۔ ہسپتال کے ساتھ ساتھ درختوں کی ایک قطار تھی۔ گو ان کے درمیان خاصے فاصلے تھے لیکن رازل جریری کے نادیدہ بدن نے وہ دلچسپ اور حیرت انگیز منظر دیکھا جو ایک لمحے کے لئے تو حیران کرتا تھا لیکن جب شہباز کا نام ذہن میں آجاتا تو سارے کام ختم ہو جاتے۔ بندروں کو درختوں پر چڑھتے دیکھا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی سچائی تھی کہ بندر بھی شاید شہباز کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ درخت کے تنے پر اس طرح چڑھ گیا کہ کوئی سیڑھیوں پر بھی نہ چڑھ سکے۔ بس یوں لگا جیسے کوئی لفٹ مشینی عمل سے اوپر اٹھ گئی ہو۔ پھر وہ درخت کی ایک شاخ کے بعد دوسری شاخ اور وہاں سے دوسرے درخت پر، پھر وہاں سے تیسرے اور چوتھے درخت پر پہنچ گیا۔ ٹارزن کی کہانی ذہن میں آجاتی تھی۔

یہاں تک کہ رازل جریری کی آنکھ نے اسے ہسپتال کی چھت پر اور پھر وہاں سے نیچے

اترتے دیکھا۔ رازل جریری کو بری طرح دوڑ لگانی پڑی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنا لمبا راستہ پلک جھپکتے طے ہو جائے گا۔ اب اسے کھڑکی کے پاس ہونا چاہئے تھا۔ بہر حال وہ وہاں پہنچ گیا۔ شہباز کھڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ رازل جریری نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم، تم واقعی میری زندگی کا دوسرا حصہ ہو۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر تم مجھے نہ ملے ہوتے تو شاید میری سوچ کا یہ سفر اتنا آسان نہ ہوتا۔ آؤ، کھڑکی سے دوسری طرف اترو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

رازل جریری نے کھڑکی کی دوسری طرف دیکھا، کچھ مریضوں کے بستر لگے ہوئے تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے، کچھ سو گئے تھے۔ یہ سب جیل کے قیدی تھے۔ ان بے چاروں کی کوئی خاص خبر گیری نہیں ہوتی تھی۔ ہسپتال کا عملہ لیونگ روم میں عیاشیاں کر رہا تھا اور وہیں پر سارا جماؤ تھا۔ چنانچہ شہباز کو بھی آسانی ہو گئی۔ ہسپتال بدبو دار تھا۔ جگہ جگہ کوڑا کرکٹ نظر آ رہا تھا۔ پھلوں کے چھلکے اور دوسری چیزیں۔ مُردہ خانے تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ وہاں اصغر جراوی کا جسم ایک سفید کپڑے سے ڈھکا رکھا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر شہباز نے اسے اپنے کندھے پر لادا۔ اس وقت صورتحال بہتر تھی۔ عملے کے افراد اپنے معمول کے مطابق چائے نوشی کر رہے تھے۔ کھڑکی کے راستے جراوی کے جسم کو باہر لانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور پھر کھڑکی کے دوسری طرف نظر آنے والا گٹر ان کی رہائی کا ضامن بن گیا جس کا ڈھکن شہباز کو کھلا ہوا ملا تھا۔ البتہ بدبودار سرنگ میں سفر ایک نیا تجربہ تھا اور اس میں اسے خاصی دقت ہوئی تھی۔ سانس پھول گیا تھا۔ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے وہ کھلی جگہ نظر آئی اور اس نے پہلے علی اصغر جراوی کے جسم کو اوپر پہنچایا اور اس کے بعد خود اوپر آ گیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

بہر حال اسے اس کا اندازہ تھا کہ رازل جریری وہاں موجود ہے۔ ہلکی ہلکی سانسوں کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔

"یقیناً وہ ایک بری جگہ تھی۔ تم سانس لے سکتے ہو۔"

"خدا کی پناہ...... اس سے زیادہ وقت اگر وہاں گزارنا پڑ جاتا تو شاید وہاں ایک کی بجائے دو مُردہ جسم موجود ہوتے۔"

"میں جانتا ہوں۔ حقیقت یہی ہے۔" رازل جریری نے کہا۔

''کیا آپ بھی وہاں موجود تھے؟''

''ایک شرم ناک اعتراف ہے یہ کہ ایک انسانی جسم ہر کیفیت برداشت کرسکتا ہے لیکن روح میں جو لطافتیں ہوتی ہیں وہ ایسی کسی چیز کو برداشت نہیں کرسکتیں۔ میں وہاں ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ دیکھو، وہ وین کھڑی ہے۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔'' رازل جریری نے کہا اور شہباز نے آنکھیں بھینچ کر گردن جھٹکی اور اس کے بعد اس انسانی جسم کو ایک بار پھر کندھے پر اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔

بے شک جو کام کیا گیا وہ انتہائی مشکل کام تھا لیکن کرنے والے جو افراد تھے وہ دنیا کی پراسرار ترین شخصیتیں یقین سے کہے جاسکتے تھے۔

......

علی اصغر جراوی نے آنکھیں کھول کر ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا اور رفتہ رفتہ اس پر حقیقتیں منکشف ہوتی جارہی تھیں۔ اس نے واعظوں کی تقریروں کے بارے میں سوچا۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ جس قدر معلومات اسے حاصل تھیں ان پر غور کیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ بڑا سا کمرہ تھا۔ حسین پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں۔ فرش پر انتہائی قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی بے مثال تھا۔ جس بستر پر وہ لیٹا ہوا تھا وہ بھی انتہائی قیمتی تھا۔ وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے ماضی کے بارے میں سوچا۔ میری زندگی میں ایسا تو کوئی عمل نہیں تھا جس کے نتیجے میں مجھے جنت ملی ہوتی۔ پھر یہ کیا ہوا؟ کیا کوئی ایسی نیکی کام آگئی جس کا مجھے خود بھی علم نہیں؟ وہ اپنے ماضی پر نگاہ دوڑانے لگا۔ یاد کرنے لگا کہ اس نے کب کسی غریب، یتیم، مظلوم یا کسی اور شخصیت کے ساتھ اور کوئی نیکی کی ہو۔ شاہ کے وفاداروں میں زندگی گزاری تھی اور یہ زندگی جو کچھ تھی اس کا خود بھی اسے اندازہ تھا۔ گو فطرتاً وہ برا نہیں تھا لیکن نجانے کیا کیا کرنا پڑا تھا اسے۔ البتہ وہ بات اسے یاد نہ آئی جس کے نتیجے میں موت کے بعد اسے جنت مل جاتی۔ پھانسی کا پورا منظر اسے یاد تھا لیکن اس کے بعد یہ جگہ......''

پھر اس نے حیرت سے سوچا کہ جنت کا ڈیزائن بھی دنیا کی طرح سے ہے۔ یہ چھت پہ فانوس، یہ بجلی کی روشنی۔ کمال کی جنت ہے۔ واعظوں کو اس بارے میں اتنی معلومات نہیں

تھیں جتنی ہونی چاہئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اچانک ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سرے سے جنت ہی نہ ہو۔ کیا گڑبڑ ہے یار! اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ نکلی۔ تب ہی اس نے دروازے سے دو افراد کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک بھاری بدن کا ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کا چہرہ انتہائی پُروقار، آنکھیں روشن اور زیرک، لباس بے انتہا قیمتی اور ڈھیلا ڈھالا۔ دوسرا ایک دلکش اور خوش رو نوجوان۔ دونوں ہی شکل وصورت سے ایشیائی لگتے تھے۔ ان لوگوں سے یقیناً اس جنت کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائے گی۔ علی اصغر جراوی تھوڑا سا کھسکا۔ بدن بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ کہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اس نے ایک ہلکی سی استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کو دیکھا اور وہ اس کے قریب پہنچ گئے۔ علی اصغر ان کے چہروں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ کس طرح کے لوگ ہیں۔ اس کے دوست ہیں یا دشمن۔ اس نے دونوں ہی کے چہروں پر ایک دوستانہ مسکراہٹ دیکھی اور اسے اطمینان ہوگیا۔ وہ دونوں کرسیاں کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

''میں نے تمہیں تین انجکشن دیئے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ جسم کی تمام تر توانائیاں بحال کردیتے ہیں اور انسان خود کو پہلے سے زیادہ بہتر محسوس کرتا ہے۔ تمہاری کیا کیفیت ہے علی اصغر جراوی؟''

''واقعی...... آپ کے کہنے پر میں نے غور کیا جناب! میں تو واقعی خاصی بہتر کیفیت محسوس کررہا ہوں۔ لیکن ذہن ذرا خراب ہے۔ کیونکہ جن واقعات سے میں گزرا ہوں اس کے بعد میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میں زندہ ہوں یا نہیں۔''

''ہم تمہیں کسی ڈرامائی کیفیت کا شکار نہیں کریں گے۔ تم یوں سمجھ لو کہ جب تمہیں پھانسی دی گئی، ہم نے اپنی فراستوں سے کام لے کر تمہیں زندہ بچالیا اور تمہارے جسم کو جیل سے نکال لائے۔''

''حالانکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے باقاعدہ پھانسی دی گئی تھی۔''

''ہاں...... وہ لوگ تاحیات یہ معمہ حل نہیں کرسکیں گے کہ پھانسی شدہ شخص اور ایک مُردہ جسم جیل کے ہسپتال سے کیسے نکل گیا۔ لیکن ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ کھیل اب ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے علی اصغر جراوی! اگر تم آئینہ دیکھو

گے تو تمہیں اپنا چہرہ بالکل بدلا ہوا نظر آئے گا۔ یہ پلاسٹک سرجری کا کمال ہے جو ہم نے تمہارے چہرے پر کی ہے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ دوبارہ تم کسی کی نگاہوں میں آؤ اور لوگ تمہیں پریشان کریں۔''

''آہ.....کیا واقعی، میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہوں؟''

بھاری بدن والے معمر آدمی نے دوسرے شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔''شہباز! علی اصغر جراوی کو ان کا چہرہ دکھاؤ۔''

شہباز ایک آئینہ اٹھا لایا۔ جب علی اصغر جراوی نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو ششدر رہ گیا، پھر بولا۔''یہ آپ کا دوسرا کمال ہے۔ پہلا کمال تو یہ کہ آپ نے مجھے پھانسی سے بچایا اور ہسپتال سے نکال لائے۔ اور دوسرا میرے چہرے کی یہ تبدیلی۔ جناب! معاف کیجئے گا، اپنے بارے میں آپ کو بتانے سے پہلے میں خاص طور سے ایک بات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ علی اصغر جراوی کی شکل تبدیل کر کے آپ نے اس کی شخصیت بھی تبدیل کر دی۔ بڑی گھٹن تھی مجھے اپنے وجود کے اندر کہ میں اپنے ماضی کو نہیں بھلا سکتا تھا۔ لیکن اس نئے چہرے نے نجانے کیوں میرے اندر ایک حوصلہ پیدا کر دیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ نئی اور بدلی ہوئی زندگی میرے لئے واقعی کسی نئی زندگی کا پیغام ہے؟''

''ہاں ہے۔ بات یہ ہے علی اصغر جراوی! کہ تم جو وقت اور زندگی گزار چکے ہو وہ اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتی تھی۔ بے شک لاشیلہ کا عشق انسانی فطرت کا ایک مستحکم مقام تھا۔ لیکن انسان کے لئے یہ حکم نہیں ہے کہ کسی ایک شخصیت کی یاد میں وہ اپنی بقیہ زندگی تباہ و برباد کر لے۔ یہ مناسب نہیں تھا۔ اور ایک دوستانہ مشورہ تمہارے لئے یہی ہے کہ اس بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی زندگی بھی بدل ڈالو۔ اپنی سوچ، اپنے خیالات، اپنا ماضی۔ حالانکہ یہ سب کچھ تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ وجود کا ایک حصہ رہتے ہیں۔ لیکن جس چیز سے کوئی فائدہ نہ ہو اس سے لپٹے رہنا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ ہم اس زندگی میں تمہارا ساتھ دیں گے۔''

''مگر آپ لوگ ہیں کون؟ مجھے ابھی تک یہ بات نہیں معلوم۔''

''میرا نام رازل جریری ہے اور یہ میرا بیٹا شہباز۔ میرا اصل بیٹا نہیں ہے لیکن مجھے بیٹوں ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں ایک سائنسٹ ہوں اور یہ میری لیبارٹری ہے۔ اور یہی

میری رہائش۔ ہم تمہارے ماضی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ لاشیلہ، جیودش اور دوسرے وہ کردار جو تمہاری زندگی سے متعلق رہے ہیں ہمارے علم میں ہیں۔ ہم بے غرض تمہیں بچا کر نہیں لائے بلکہ تم سے ہماری زندگی کی ایک اہم ضرورت وابستہ ہے جس کے لئے ہم تمہیں یہاں تک لائے اور تمہاری زندگی بچائی۔ تمہیں اس بات کے مکمل اختیارات حاصل ہیں کہ جب تک چاہو آرام کرو اور جب آرام کرتے کرتے تھک جاؤ تو ہمیں اس بات کا موقع دو کہ ہم تمہیں اپنی ضرورت اور موقف سے آگاہ کریں۔''

علی اصغر جراوی نے یہ صاف ستھری باتیں سنیں۔ نجانے کیوں اسے ایک دم سے ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ زندگی یکسانیت کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس وقت بھی جب وہ ایران کی پولیس سے تعلق رکھتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے زمانہ نوکری میں بہت سے ایسے کارنامے سرانجام دے چکا تھا جو بے شک کارنامے تھے۔ لیکن ان کا اسے کوئی صلہ نہیں ملا تھا بلکہ ایک بار تو اس کے انچارج نے اس سے کہا تھا کہ علی اصغر جراوی! تم لوگ یعنی وہ پورا گروپ انتہائی خوش نصیب ہے کہ شاہ کے ایک اہم راز سے واقف ہونے کے باوجود تم زندگی پانے میں کامیاب ہو گئے اور زندہ ہو۔ ورنہ ایسے اہم راز جسے معلوم ہوتے ہیں وہ زندہ نہیں رہتا۔ یہی شاہ کا اصول ہے۔

تو میں آپ کو بتا رہا تھا جناب! کہ میں نے ساری زندگی.....لیکن ایک منٹ، آپ نے لاشیلہ کا نام لیا اور میرے ماضی کے کچھ ایسے اشارے مجھے بتائے کہ میں حیران رہ گیا ہوں۔ ایسا کیسے ہے۔ آپ میرے بارے میں اتنا کیسے جانتے ہیں؟''

''تجسس بھی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ہماری تحقیق تھی تمہارے بارے میں اور اس تحقیق کے تحت میں نے موقع ملتے ہی تمہاری نئی کھوج کی اور مجھے پتہ چل گیا کہ وہ لوگ تمہاری زندگی کا اختتام کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہماری کاوشیں تمہیں یہاں تک لے آئیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ دو عظیم سائنسدانوں کو مجھ جیسے آدمی کی ضرورت کیسے پیش آ گئی؟''

''کیا تم بالکل ٹھیک ہو؟''

''ہاں.....اور حقیقتاً میری بیماری میرا تجسس ہو گی۔ میں اپنے آپ کو ایک تبدیل شدہ شخصیت کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے.....''

''ہوں......علی اصغر جراوی! تم نے ابھی ایک گروپ کا تذکرہ کیا اور یہ بتایا کہ کسی نے تم سے کہا تھا کہ شاہ کے اتنے اہم راز سے واقف ہونے کے باوجود تم زندہ ہو۔ اصل میں ہم اسی راستے تک آنا چاہتے ہیں۔ شاہ کا اہم راز میں تمہیں بتاتا ہوں۔ جب شاہ کو اس بات کا خوف ہو گیا کہ اس کی حکومت کو زوال درپیش ہے تو انہوں نے اپنا ایک عظیم الشان خزانہ جو اس قدر تھا کہ اس سے ایک نیا ملک آباد کیا جا سکے، دور دراز مقام پر کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جہاں کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔ اور یہ خزانے لے کر جانے والوں میں تم بھی شامل تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہ صرف میں بلکہ میرے ساتھ چار افراد اور تھے جو مجھ سے زیادہ بہتر طریقے سے ان جگہوں اور ان راستوں کے بارے میں جانتے تھے۔''

''ہاں......وہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ لیکن ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کون کہاں ہے؟ یہ پتہ لگانا میرے لئے ناممکن نہیں ہوگا۔'' رازل جریری نے کہا اور اس بات کا علم شہباز کو بھی نہیں تھا کہ رازل جریری کے پاس ایسے کون سے ذرائع ہیں جن سے وہ اس طرح کی معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ خود علی اصغر جراوی کے بارے میں رازل جریری کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا۔ خصوصاً اس کی مکمل کہانی۔ لیکن رازل جریری ایک سائنسدان تھا۔ ایسی ہی پراسرار اور انوکھی قوتوں کا مالک جنہوں نے خود شہباز کو ششدر کر دیا تھا۔ شہباز نے سرسری انداز میں فیض شاہ سے بھی اس کی ان پراسرار قوتوں کا تذکرہ کیا تھا اور فیض شاہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا! یہ تیری دنیا ہے۔ اور ہم اس دنیا سے دور کے لوگ۔ زندگی کی تھوڑی بہت حقیقتوں کا علم ہے ہمیں۔ اس سے آگے زندگی کیا ہے وہ ہم نہیں بتا سکتے اور نہ ہی اپنے تجربے کو تجھ پر مسلط کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ ہماری عقل سے کہیں آگے کی چیز ہے۔''

علی اصغر جراوی، رازل جریری کو دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''محترم دوست! زندگی بہرحال ایک قیمتی چیز ہوتی ہے۔ تم نے کسی بھی طرح میری زندگی کو بچایا، میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں اور اگر اب اس نئی زندگی میں، میں تمہارے لئے کچھ کروں تو یہ میری خوش بختی ہوگی۔ اور میں اس خوش بختی کے لئے تیار

ہوں۔ اگر تم اس خزانے کی طرف اپنی رسائی چاہتے ہو تو میرے ذہن میں اب بھی اس کے مٹے مٹے نقوش ہیں۔ لیکن کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو اس خزانے تک تمہاری رسائی میں تمہارے بہترین معاون ثابت ہوں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہیں اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔ بہرحال میں تمہارے لئے حاضر ہوں۔''

''تم سے پوری تفصیل معلوم کرنے کے بعد ہم اس سلسلے میں اپنی کارروائیوں کا آغاز کریں گے۔'' رازل جریری نے جواب دیا۔

✿......✿

فیض شاہ کی عمر تو کافی تھی۔ لیکن صحت بے مثال۔ خود جب وہ کبھی اپنے بارے میں سوچتا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ صدیوں سے زندہ ہو۔ کتنی نسلیں گزر چکی ہوں اس کے سامنے سے۔ کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھے بیٹھے وہ انہی سوچوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اب جو زندگی اسے ملی تھی وہ اس کے تصور سے بھی دور کی زندگی تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت رہائش گاہ، ہر کام کے لئے ملازم...... بہت سے خدمت گار اس کے آگے پیچھے رہا کرتے تھے۔ بہت شاندار گاڑی ملی ہوئی تھی۔ ڈرائیور ان دونوں کو روزانہ سیر و سیاحت کے لئے مختلف مقامات پر لے جایا کرتا تھا۔ ایک طرح سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور فیض شاہ اکثر شبیلہ سے کہا کرتا تھا۔

''شبیلہ! قسمت کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کبھی کہ ہم اس طرح کی زندگی بھی گزاریں گے۔ کون کن حالات سے گزر سکتا ہے، پتہ نہیں ہوتا اسے۔ بے چارہ گلباز جھولے پر زندگی گزار کر مر گیا۔ بیٹے کے لئے اس نے جو کچھ سوچا تھا اس کی تعبیر البتہ ہو گئی۔ تم دیکھو شہباز کو، کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے وہ۔ اسی کی وجہ سے ہمیں یہ شاندار زندگی ملی ہے۔''

''بابا صاحب! آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو خوش کرنے کے لئے یہ الفاظ کہہ رہی ہوں۔ اسے زندگی کا یہ مقام دلانے میں آپ ہی کا تو ہاتھ ہے۔''

''ارے ان باتوں کو چھوڑو۔ بس کس کے لئے کس نے کیا، کیا ہے؟ کوئی سمجھے تو بات ہے۔ نہ سمجھنے والوں کے لئے کوئی کیا کر سکتا ہے۔''

اس دن بھی بابا فیض شاہ بیٹھا ہوا اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک

اسے بدن میں تیز کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ پھر یہ کپکپاہٹ بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور اس کی آنکھیں تاریک ہونے لگیں۔ بمشکل تمام اس نے شبیلہ کو آواز دی اور شبیلہ آئی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ شبیلہ اب بہت سمجھدار ہو چکی تھی۔ شہباز کو اطلاع دی جا سکتی تھی لیکن اس سے پہلے ڈاکٹر کو بلانا ضروری تھا۔ ڈرائیور کو اس نے دوڑا دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''انہیں ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔ آپ براہِ کرم جلدی کیجئے۔''

ایمبولینس بلائی گئی اور فیض شاہ کو ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اور پھر شہباز کو اس کے بارے میں اطلاع دی گئی۔

شہباز اور رازل جریری ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ اس دوران ڈاکٹر، فیض شاہ کی کیفیت پر قابو پا چکے تھے اور فیض شاہ کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ فیض شاہ کے معالج ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ ایک عجیب وغریب اٹیک تھا جناب! ہمارے لئے بھی حیران کن۔ لیکن ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ البتہ انہیں کافی دن تک یہاں رکھنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ اپنا کام جس طرح مناسب سمجھیں۔'' رازل جریری نے کہا۔

شبیلہ تو فیض شاہ سے جڑی ہی ہوئی تھی۔ اب رہ کیا گیا تھا زندگی میں شہباز اور فیض شاہ کے علاوہ۔ فیض شاہ اس کے لئے باپ کی حیثیت رکھتا تھا اور شہباز اس کی زندگی کی تاروں سے منسلک تھا۔ ہسپتال میں وہ فیض شاہ کے ساتھ ہی کمرے میں رہنے لگی۔ فیض شاہ اس حملے کے بعد بہتر کیفیت میں آ گیا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ ابھی اسے خاصا عرصہ ہسپتال ہی میں گزارنا پڑے گا۔ اصل میں بات وہی ہوتی ہے کہ کوئی بھی واقعہ پیچ در پیچ مراحل سے گزرنے کے بعد واقعہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ چھوٹا سا واقعہ بھی کہانی سے مربوط ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس میں کچھ نہ کچھ جدتیں تو ضروری تھیں اور ان جدتوں کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔

✡......✡

حکومت پلاسکو ساری دنیا میں اپنی برتری کے حصول کے لئے بہت کاوشیں کر رہی تھی۔ سینکڑوں جگہ اسے ناکامی اور سینکڑوں جگہ کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ بے پناہ دولت تھی ان کے پاس۔ اور اس وقت اس کائنات میں دولت نے جو مظالم ڈھا رکھے ہیں وہ انسانوں کی

آنکھوں سے دور نہیں ہیں۔ حکومت پلاسکو دولت کے بل پر ہی زندگیاں چھین رہی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس کے منہ پر ایسے طمانچے پڑ جاتے تھے کہ پلاسکو کے اہم ذمے دار گال بھی نہیں سہلا سکتے تھے۔

رازل جریری، شہباز اور اس کے ماں باپ یہ سب حکومت پلاسکو کی انتظامیہ کے لئے ایک بدترین چیلنج ثابت ہوئے تھے اور درپردہ ساری دنیا کو ہوشیار کر دیا گیا تھا کہ رازل جریری کسی بھی شکل میں نظر آئے، اس کے وجود کا شائبہ تک ہو سکے تو فوری طور پر تمام طاقت اس کے حصول پر صرف کر دی جائے اور یہ کوششیں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔ بے شمار ایجنٹ اس کام کے لئے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔

مارکر بھی ایک ایجنٹ ہی تھا اور ان لوگوں میں شامل تھا جو رازل جریری کے معاملے میں بھرپور طریقے سے حصہ لیتے رہے تھے۔ ان دنوں وہ میلیکو میں ایک اہم مشن پر کام کر رہا تھا اور اپنے ادارے کے ایک خاص رکن ڈریک کے ساتھ اس کے فلیٹ پر قیام پذیر تھا۔

ڈریک میلیکو ہی میں رہتا تھا۔ حکومت پلاسکو کا ایجنٹ تھا اور میلیکو میں حکومت کے مفادات کے لئے کام کر رہا تھا۔ میلیکو میں ایک بہت بڑا پراجیکٹ خفیہ طریقے سے زیر عمل تھا لیکن اس کے پس منظر میں پلاسکو تھا اور حکومت میلیکو پلاسکو کی ان کارروائیوں سے بالکل ناواقف تھی۔ ڈریک جیسے لوگ ان کارروائیوں کو خفیہ رکھنے میں بھرپور کام کر رہے تھے۔ ڈریک یہاں کا قدیم باشندہ تھا اور اپنے خاندان کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ بظاہر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لوگ حکومت پلاسکو کے خفیہ ایجنٹ ہوں گے۔

ڈریک کی نانی بیمار ہو گئی اور اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ نانی کی صحت تو ٹھیک ہونے لگی لیکن ڈریک کے ذریعے مارکر کو ایک عجیب صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ اس دن وہ ہسپتال کی راہداری میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ اچانک اس نے ایک شخص کو دیکھا جسے دو وارڈ بوائے سنبھالے ہوئے تھے اور اسے چہل قدمی کرا رہے تھے۔ یہ شخص عمر رسیدہ تھا لیکن مارکر ایک نگاہ میں اسے پہچان گیا۔ کیونکہ وہ خود ان تمام تر معاملات میں ملوث رہا تھا۔ یہ شخص حکومت پلاسکو کا مفرور تھا۔ وہ خطرناک نوجوان جس کا نام شہباز تھا، ایشیاء کے ایک ملک سے حاصل کیا گیا تھا اور اس نے حکومت پلاسکو کے لئے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا تھا جس کا پلاسکو کے ایجنٹ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے بعد حکومت

پلاسکو نے فیصلہ کیا کہ کچھ عرصہ اسے زندگی کی مراعات دینے کے بعد اس کے اہل خاندان جن میں صرف دو افراد تھے سمیت ختم کر دیا جائے گا۔ چونکہ ایسے لوگوں کو راز دار نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ البتہ زندگی کے کچھ صبح و شام اسے انعام کے طور پر دیئے گئے تھے۔ لیکن کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

رازل جریری کا جسم، شہباز اور اس کے ماں باپ غائب ہو گئے تھے اور وہ قیمتی تجربہ گاہ فنا کر دی گئی تھی جو حکومت پلاسکو کے سائنسی مقاصد کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتی تھی۔ ایک اور بڑا نقصان ہوا تھا حکومت پلاسکو کو۔ اور صحیح معنوں میں وہ گال سہلاتی رہ گئی تھی۔

مارکر ان لوگوں میں شامل تھا جو اس سلسلے میں براہِ راست ملوث تھے اور اس کہانی کے ایک ایک کردار سے واقف تھے۔ چنانچہ اس نے ایک لمحے کے اندر اندر اس شخص کو پہچان لیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس کا نام فیض شاہ ہے۔ وہ ایک دم ساکت رہ گیا۔ وہ بوڑھے کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے چہل قدمی کرانے والے راہداری کے دو تین چکر لگانے کے بعد فیض شاہ کو لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ مارکر ہر چیز کی نگرانی کر رہا تھا۔ پہلے وہ یہ جائزہ لیتا رہا کہ بوڑھا اسی کمرے کا مریض ہے۔ اور پھر جب اسے اس بات کا اطمینان ہو گیا تو اس نے ریسپشنسٹ لڑکی سے لگاوٹ کا اظہار کر کے اس بارے میں تفصیلات حاصل کر لیں اور اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ اس شخص کا نام فیض شاہ ہی ہے۔ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ یہ لوگ پلاسکو سے فرار ہو کر یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن کیسے؟ یہ ایک بہت ہی پراسرار اور حیرت ناک بات تھی لیکن معمولی نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت پلاسکو ان تینوں افراد کو ختم کرانا چاہتی ہے اور پھر پچھلے چند دنوں کی میٹنگوں میں یہ بات بھی زیر بحث آئی تھی کہ رازل جریری کا جسم غائب ہونے میں اور لیبارٹری کی تباہی میں شہباز کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس حادثے کے فوراً بعد ہی یہ سب لوگ غائب ہو گئے تھے۔

یہ ایک ہولناک بات تھی۔ مارکر سخت ہیجان کا شکار ہو گیا۔ سب سے پہلے یہ اطلاع اس نے ڈریک کو دی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ڈریک اپنی محبوبہ سوئیٹا کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھا۔ مارکر کا پُرتجسس چہرہ دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یقیناً کوئی سنسنی خیز خبر لے کر آئے ہو تم۔ تمہارا چہرہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔''

''ہاں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنا یہ محبوب مشغلہ ترک کر کے تھوڑا سا وقت مجھے دو گے۔''

''سوئیٹا میں ایک خوبی ہے کہ جب وہ مجھے مصروف محسوس کرتی ہے تو خود مجھے تنہائی بخش دیتی ہے۔''

نوجوان لڑکی مسکراتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی اور مارکر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ ڈریک نے کہا۔

''کیا میں تمہارے لئے پیگ بناؤں؟''

''ہاں...... میں جس کیفیت کا شکار ہوں اس میں مجھے فوری طور پر ڈرنک کی ضرورت ہے۔'' مارکر نے جواب دیا۔

''قصہ کیا ہے؟'' ڈریک نے اس کے لئے پیگ بناتے ہوئے پوچھا۔ مارکر اس وقت تک خاموش رہا جب تک ڈریک نے اسے جام نہیں دے دیا۔ دو تین چھوٹے سپ لینے کے بعد مارکر نے ہونٹ خشک کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں میلیکو میں ایک ایسی شخصیت نظر آئی ہے جو پلاسکو سے مفرور ہے۔'' اور پھر اس نے ساری تفصیل ڈریک کو بتائی اور ڈریک بھی ششدر رہ گیا۔

''تو پھر تم کیا سمجھتے ہو، کیا وہ یہاں اکیلا ہو گا؟ اگر وہ پلاسکو سے فرار ہو کر میلیکو تک پہنچا ہے تو یقینی طور پر اس کے ساتھ شہباز، وہ عورت بھی ہو گی۔ اور کیا یہ بات قابل قیاس نہیں ہے کہ خود رازل جریری بھی ہو گا اور ہو سکتا ہے وہ اپنے جسم کے ساتھ ہو۔''

''رازل جریری کے ذریعے جو نقصانات پلاسکو کو پہنچے ہیں وہ پلاسکو کی تاریخ میں کبھی نہیں بھولے جا سکیں گے۔ یہ سب بے حد خطرناک ہیں۔ ابھی بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''آہ...... کاش! ہم حقیقت حال کی تہہ تک پہنچ جائیں اور اور ہمیں اس بات کا پتہ چل جائے کہ شہباز یا رازل جریری کہاں ہیں تو یوں سمجھ لو یہ ہماری زندگی کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہو گا۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ واقعی یہ سب بہت عظیم ہے اور ہمیں اس عظیم کارنامے کو انجام دینے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دینی چاہئیں۔''

''مگر کیا، کیا جائے؟''

"فی الحال ہسپتال کی نگرانی اور یہ جائزہ لیا جائے کہ کیا یہاں دوسرے لوگ موجود ہیں مثلاً شہباز۔"

"ٹھیک ہے ڈریک! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں حاضر ہوں میرے دوست۔"

اور اس کے بعد دونوں اس سلسلے میں منصوبہ بندی کرنے لگے اور دونوں ہی ہسپتال پہنچ گئے۔ پلاسکو کا ایک خاص ایجنٹ ڈریک اپنے اس پروجیکٹ کے سلسلے میں یہاں میلیکو کے دارالحکومت میں حکومت پلاسکو کی اہم ترین خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ کئی اور بھی افراد تھے جو اس کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔

بہرحال وہ دونوں ہسپتال میں مقیم ہو گئے۔ انہوں نے منصوبہ بندی کی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو، شہباز کا پتہ لگانا چاہئے کیونکہ یہ شخص بھی کافی خطرناک تھا۔ اور سب سے زیادہ خطرے کی گھنٹی رازل جریری کی شکل میں موجود تھی جو یقیناً حکومت پلاسکو کے خلاف بہت سے منصوبے رکھتا تھا اپنے ذہن میں۔ اور حکومت پلاسکو میں ایک خاص قسم کی میٹنگ ہوئی تھی جس میں ان خدشات کا اظہار کیا گیا تھا۔ پلاسکو کے ایک بڑے سائنسدان نے کہا تھا۔

"رازل جریری سائنسی طور پر بہت آگے کا انسان ہے اور ہمیں اس بات کا خطرہ ہے کہ آگے چل کر وہ ہمارے عظیم تر مقاصد کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم نے اسی لئے اسے اپنے راستوں سے ہٹانا چاہا تھا۔ لیکن کم بخت انتہائی سخت جان نکلا۔ ہر طرح کی مشکلوں سے بچ گیا۔ اور اب تو اس بات کا شبہ دل میں پیدا ہو گیا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ ایشیائی جوان، بازی گر کسی طرح رازل جریری سے تعاون پر آمادہ ہو گیا ہو۔ سب سے بڑی اور مشکل بات یہ ہے کہ وہ لوگ ہم مذہب ہیں اور یہ لوگ بعض اوقات مذہب کے معاملے میں اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ عمر بھر کے مفادات ٹھکرا دیتے ہیں اور فقیری اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمیں پندرہ سو سال سے اس خطرے سے نمٹنا پڑ رہا ہے۔ رازل جریری کے جسم کا غائب ہو جانا اور لیبارٹری کی تباہی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ رازل جریری کو بھی اس کا بدن حاصل ہو گیا ہے۔" یہ میٹنگ جب ہوئی تھی تو مارکر بھی وہاں سکیورٹی پر موجود تھا اور اس نے تمام گفتگو اپنے کانوں سے سنی تھی۔

چنانچہ ڈریک سے باتیں کرتے ہوئے اس نے یہی کہا کہ ہو سکتا ہے رازل جریری نے

میلیکو میں پناہ لی ہو۔ ہسپتال میں انتہائی محتاط طریقے سے وہ لوگ اس کمرے کی نگرانی کر رہے تھے جہاں بابا فیض شاہ بیماری کے عالم میں تھا۔ پھر انہوں نے شبیلہ کو بھی دیکھ لیا۔ مارکر نے ڈریک سے کہا۔

"یہ اس بوڑھے کی ساتھی عورت ہے اور شہباز کی ماں ہے۔ آہ...... مجھے تو لگ رہا ہے مائی ڈیئر ڈریک! جیسے یہ شاندار کارنامہ میری تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اور ہم بہت جلد ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنے والے ہیں۔"

ڈریک نے پُرخیال انداز میں گردن ہلا دی تھی۔

✿......✿

شہباز ایک لاابالی نوجوان تھا۔ دنیا سے بہت زیادہ واقفیت نہیں تھی اس کی۔ فریب اور پراسرار چالیں اس کے لئے ناقابل فہم تھیں۔ لیکن رازل جریری کو بڑا طویل تجربہ تھا اور خاص طور سے حکومت پلاسکو کے ہتھکنڈوں سے۔ اس نے بڑی زبردست معلومات حاصل کی تھیں اور یہ جانتا تھا کہ پلاسکو کے ایجنٹ اس کی تلاش میں دنیا بھر میں پھیل گئے ہوں گے اور انہیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ رازل جریری کے جسم کا غائب ہو جانا بے مقصد نہیں ہے اور اس کے پس پردہ کچھ ہے۔ یعنی یہ کہ رازل جریری اب انسانی شکل میں موجود ہے اور ممکن ہے اس نے اپنی کارروائی کا آغاز بھی کر دیا ہو۔

چنانچہ شہباز تو بہت زیادہ احتیاط تو نہیں برتتا تھا لیکن رازل جریری ہر لمحہ محتاط رہتا تھا۔ اور یہ اس کا مشغلہ تھا کہ وہ اپنا بدن چھوڑ کر اکثر باہر نکل جایا کرتا تھا اور شہباز کی بھی نگرانی کرتا تھا۔ کیونکہ شہباز کی الہڑ فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ شہباز اس قدر محتاط نہیں رہ سکتا تھا اور یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ لیکن اب یہ نوجوان اس کی زندگی کا محور بن چکا تھا اور اس کے بغیر ایک قدم آگے چلنے کا تصور تک رازل جریری کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اکثر شہباز کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوتا کہ جب کہیں وہ باہر گھوم پھر رہا ہوتا ہے تو رازل جریری اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شہباز ہسپتال میں بابا فیض شاہ سے ملنے آیا تھا۔ ماں بھی یہیں موجود تھی۔ فیض شاہ اب بہت بہتر حالت میں تھا اور ڈاکٹر اسے چھٹی دینے والے تھے۔ جو پُرسکون زندگی اب انہیں حاصل ہوئی تھی، شہباز اسے قائم رکھنا چاہتا تھا۔ ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی ایسا کردار شامل نہیں ہوا تھا جو اس

کے لئے نسوانی دلکشی کا حامل ہوتا۔ بس وقت نے اور فطرت نے اتنے مواقع ابھی تک نہیں دیئے تھے اور اسے اس مقام تک نہیں لے گیا تھا جہاں یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

تانیہ بے شک اس کی طرف بڑھی تھی اور اگر منوچہر اس طرح کی گفتگو نہ کرتا تو ممکن تھا کہ آہستہ آہستہ تانیہ اسے متاثر کر لیتی۔ لیکن بس ایک ضد اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ منوچہر کو ذلیل کرنا چاہتا تھا اور یہ بتانا چاہتا تھا کہ تانیہ جیسی لڑکیاں اس کی منزل نہیں ہیں۔ وہ تو بہت ہی بلند مقام کی طرف سفر کر رہا ہے۔ ماں کے پاس آ کر وہ بہت خوش ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کمرے میں موجود تھا اور شبیلہ اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ فیض شاہ نے مسکرا کر کہا۔

”تم میری وجہ سے پریشان ہو؟“

”ہاں بابا صاحب! ہمارے پاس اس کی گنجائش کہاں ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک کسی الجھن، کسی مشکل میں گرفتار ہو۔“

”بیٹا! یہ تو زندگی کے راستے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے؟“

”پھر بھی میں یہی سوچتا ہوں کہ ہم تینوں کو خوش و خرم زندگی گزارنی چاہئے۔“

”میں ٹھیک ہوں...... اب میرے لئے فکر مند نہ ہوا کرو۔ اپنا کام جاری رکھو۔ وہ کام جس کی وجہ سے تمہیں، مجھے اور شبیلہ کو یہ مقام حاصل ہوا۔“

”میں رازل جریری کے لئے ان کی خواہش کے مطابق کام کر رہا ہوں۔“ شہباز نے جواب دیا۔ بہت دیر تک وہ باہر نہیں نکلا اور ان دونوں سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ان سے رخصت لی اور باہر چل پڑا۔

رازل جریری بے جسمی کے عالم میں اس وقت بھی کمرے میں ان کے ساتھ موجود تھا اور جب شہباز باہر نکلا تب بھی وہ شہباز کے پاس ہی رہا لیکن اس کی زیرک نگاہوں نے سفید رنگ کی اس خوبصورت کار کو دیکھ لیا تھا جو شہباز کا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ ایک دم محتاط ہو گیا۔ ایسے لمحات کے لئے تو وہ اپنے آپ کو ہمیشہ چاق و چوبند رکھتا تھا۔ سفید کار ان کے تعاقب میں آتی رہی۔ رازل جریری نے کچھ دیر تک کچھ سوچا اور پھر اس نے شہباز کو مخاطب کیا۔

”شہباز! میں تمہارے ساتھ موجود ہوں۔“

شہباز کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکتے بہکتے بچا تھا۔

”مجھے معاف کرنا، میں تمہاری نگرانی نہیں کر رہا بلکہ ایک شبہ مجھے تم تک لے آیا ہے۔“

”کیسا شبہ مسٹر جریری؟“

”کچھ لوگ تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔“

”اوہ...... کون؟“

”بیک مرر میں دیکھو۔ سفید رنگ کی یہ کار ہسپتال سے تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔“

”اوہ واقعی...... ہاں، ہے تو سہی۔“

”ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ان میں ہمیں کسی بھی پراسرار عمل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں مسٹر جریری! اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اس وقت سے ہی ہمارے پیچھے ہے۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔“

”یہ جو کوئی بھی ہیں انہیں ہماری رہائش گاہ کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ تم یوں کرو کہ سینٹرلائن کی طرف چلو۔ سینٹرلائن کے بیچ پر ہم ان کے بارے میں اندازہ لگائیں گے کہ یہ کون ہیں۔“

سینٹرلائن سمندر کا علاقہ تھا۔ ایک لمبی سڑک گھوم کر وہ میلیکو کے اس حسین ساحل کی طرف چل پڑے جہاں زندگی کا تمام تر حسن بکھرا ہوتا تھا۔ اگر کبھی ذہنی تکدر ہو طبیعت پر کوئی بوجھ سوار ہو تو سینٹرلائن کے ساحل کا رخ کر لیا جائے، آنکھیں تر و تازہ ہو جاتی ہیں اور ذہن معطر۔ اس وقت بھی یہی مناظر یہاں بکھرے پڑے تھے۔ شہباز نے پارکنگ لاٹ پر اپنی کار پارک کی اور اس کے بعد نیچے اتر آیا۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے اور اس کے ساتھ کوئی ایسی پراسرار قوت موجود ہے جو تاریخ کا رخ موڑنے والی ہے۔“

رازل جریری اسے ہدایات دیتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”تم اس ساحلی ہوٹل میں بیٹھو۔ اب میں ذرا ان لوگوں کا جائزہ لے لوں۔“

”ٹھیک ہے...... میں اپنے لئے کافی طلب کر لیتا ہوں۔ آپ کا انتظار کروں گا۔“ شہباز نے کہا اور اس اوپن ایئر ہوٹل کی طرف چل پڑا جہاں اس وقت اچھی خاصی رونق تھی۔ شہباز پہلے بھی کافی تیز طرار نوجوان تھا۔ عام نوجوانوں سے کہیں زیادہ۔ لیکن اب

حالات کی بھٹی اسے کندن بنا رہی تھی۔ گلباز اسے سرکس سے الگ کوئی شخصیت بنانا چاہتا تھا لیکن اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا۔ اس بے چارے کی سوچ ہی مختصر تھی۔ بھلا کسی بڑے کام کا تصور اس کے ذہن میں کیسے آ سکتا تھا جبکہ اس نے سرکس کے علاوہ زندگی میں کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔

بہر حال وقت نے بڑے انوکھے تجربے کئے تھے اور سرکس میں کام کرنے والے معمولی سے شخص کے بیٹے کو ایک ایسے عظیم منصب پر لا کھڑا کیا تھا جس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک بے شمار معاملات میں شہباز کو رازل جریری کے عمل کا مرہون منت رہنا پڑتا تھا۔

تعاقب کرنے والی کار سے جو دو افراد نیچے اترے تھے وہ بھی شہباز کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے اور اوپن ایئر ساحلی ہوٹل کے ایک گوشے میں وہ دونوں بھی جا بیٹھے۔ شہباز نے اپنے لئے کچھ اشیاء طلب کر لی تھیں۔ وہ ان سے شغل کرتا رہا۔ گوشے کی میز پر اس نے ان دونوں کے سامنے بھی ویٹر کو برتن لگاتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔

پھر اچانک ہی شہباز کے قریب کی کرسی ہلکی سی کھسکی اور شہباز نے سمجھ لیا کہ رازل جریری اس کے پاس آ بیٹھا ہے۔

''ہاں......اس سے پہلے میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔'' رازل جریری نے کہا۔ ''وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ جس شخصیت سے انہوں نے ٹکر لی ہے وہ کیسی انوکھی قوتوں کے مالک ہیں۔ بیوقوف کہیں کے۔ اپنے نقصانات پر نقصانات کئے جا رہے ہیں اور ابھی تک عقل سے فاصلے پر ہیں۔'' رازل جریری کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی پھر اس نے کہا۔

''دونوں کا تعلق پلاسکو انتظامیہ سے ہی ہے۔ اور دونوں پلاسکو کے سیکرٹ ایجنٹ ہیں۔ ایک کا نام مارکر ہے اور دوسرے کا ڈریک۔ پال ڈریک اور ایس مارکر۔ پال ڈریک یہیں شہر میں رہتا ہے اور کسی ایسے شخص کا اسسٹنٹ ہے جو میلیکو کے کسی دور دراز علاقے میں کچھ کر رہا ہے۔ اس بارے میں ابھی بالکل کوئی تفصیل نہیں معلوم ہو سکتی اور مارکر اس سے معاونت کے لئے پلاسکو سے یہاں پہنچا ہے۔ کوئی اہم پروجیکٹ ہے جس پر یہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ اس کی کوئی تفصیل ابھی نہیں معلوم ہو سکی۔ لیکن بڑے بدنصیب ہیں

دونوں کہ براہِ راست مجھ تک آ پہنچے۔ ورنہ شاید ہمیں اس بارے میں اتنی تفصیل سے کچھ معلوم نہ ہو سکتا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ انہیں اپنے آپ سے بہت فاصلے پر رکھا جائے اور انہیں ہماری رہائش گاہ کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوں۔ لیکن پال ڈریک نے میرے تجسس کو اس قدر بھڑکا دیا ہے کہ اب پال ڈریک کو ایک لمحے کے لئے نگاہوں سے اوجھل کرنا میرے لئے ممکن نہیں رہا ہے کیونکہ میں میلیکو میں پلاسکو کے اس پراجیکٹ کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہوں جو یقینی طور پر پلاسکو کی کوئی پراسرار کارروائی ہو گی۔ میں بالکل نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور نہ ہی کوئی تفصیلی حقیقت میرے علم میں آ سکی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ ایک پراسرار انکشاف ہے میرے لئے۔''

''تو پھر اب کیا منصوبہ ہے رازل جریری؟''

''یہاں سے فراغت حاصل کر کے اٹھو۔ وہ تمہارا پیچھا کریں گے۔ کوٹھی چلتے ہیں۔ یہ دونوں وہاں تک جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ان کی کارروائی کا جائزہ لیں گے اور یہ جائزہ لینے کے بعد انہیں اندر لے جائیں گے۔ کیونکہ یہ ہماری ضرورت ہیں۔''

شہباز نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ رازل جریری کی شخصیت اسے بہت دلچسپ لگی تھی۔ یہ شخص ماحول پر قابو پانے کی کس قدر زبردست صلاحیت رکھتا ہے، شہباز اس بات سے بخوبی واقف تھا۔ رازل جریری نے کہا۔

''چنانچہ اب تھوڑی دیر کے بعد تم یہاں سے اٹھو گے اور سیدھے اپنی رہائش گاہ کا رخ کرو گے۔ بے فکر رہنا، اب میں تمہارے ساتھ نہیں، ان کے ساتھ سفر کروں گا تا کہ صورتحال سے زیادہ بہتر طریقے سے آگاہ رہوں۔''

شہباز نے ایک دلچسپ سنسنی محسوس کی تھی۔ گویا رازل جریری اب ان کی کار میں ہو گا۔

کافی دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ ماحول دلچسپ تھا۔ دلکش اور رومانوی۔ سمندر کی طرف سے چلنے والی نمی سے بوجھل ہوائیں ذہن پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑ رہی تھیں۔ لیکن مقصد کی تکمیل بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ رازل جریری نے اسے جو ہدایت دی تھی اس کے مطابق اس نے ویٹر کو بلا کر بل طلب کیا اور بل ادا کر کے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی کار میں جا بیٹھا۔ اور جب اس کی کار پارکنگ لاٹ سے نکل

رہی تھی تو اس نے ان دونوں کو بھی اپنی کار میں گھستے ہوئے دیکھا اور ایک بار پھر تعاقب شروع ہو گیا۔ وہ بدستور پیچھے چلے آ رہے تھے۔ احمق، بیوقوف کہیں کے۔ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان کی کار کی پچھلی سیٹ پر ان کی شامت بیٹھی ہوئی ہے۔ شہباز اطمینان سے لمبے راستے طے کر کے آخر کار اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ اس نے پورٹیکو میں کار روکی اور نیچے اتر آیا۔ اب اسے رازل جریری کی ہدایت کا انتظار تھا اور رازل جریری اپنا کام بخیر و خوبی کر رہا تھا۔ ساحل ہی سے وہ ان کی کار کے عقب میں جا بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دونوں افراد اگلی سیٹوں پر ہی بیٹھ کر سفر کریں گے اور یہی ہوا۔

شہباز اپنی کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اور جب اس کی کار پارکنگ لاٹ سے باہر نکلی تو مارکر نے بھی اپنی کار اسٹارٹ کر کے باہر نکال لی۔ رازل جریری اب ان دونوں کے ناموں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ لوگ باتیں کرتے جا رہے تھے۔

''یہ ایک شاندار کام ہوا ہے ڈریک! میں تو تمہارے ساتھ تعاون کے لئے آیا تھا لیکن اب جب ساری تفصیل بتا کر میں حکومت پلاسکو کو ان چوروں کے بارے میں بتاؤں گا تو یقین کرو ہم دونوں کی پوزیشن بہت بڑھ جائے گی۔''

''ظاہر ہے، میں رازل جریری کے بارے میں جانتا ہوں۔ ہمارے ملک کو اس شخص نے جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا غالباً دوسری جنگ عظیم میں بھی ہماری حکومت کو نہیں پہنچا تھا۔''

''بالکل ٹھیک کہتے ہو۔''

''تو پھر پروگرام کیا ہے؟''

''پروگرام تو یہی ہے کہ پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ یہاں میلیکو میں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ عارضی طور پر یہاں رکے ہوئے ہیں یا انہوں نے مستقل اسے اپنا ٹھکانہ بنایا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ فرار ہونے کے بعد رازل جریری پلاسکو نہیں رکا بلکہ اس نے پلاسکو چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے، پلاسکو حکومت سے خوفزدہ تھا۔ بے شک اس نے وہاں زبردست تباہی مچائی اور اپنی دانست میں پلاسکو سے زبردست انتقام لیا۔ ممکن ہے اس نے آگے پلاسکو کے راستے میں آنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ لیکن پلاسکو تو کبھی ایسے انسان کو نہیں چھوڑ سکتا جس نے پلاسکو کی سرزمین پر ایک کتا بھی مار دیا ہو، وہ کتا جو پلاکو کی ملکیت ہو یا وہاں کے کسی شہری کی ملکیت۔''

''ہم عظیم ہیں اور ساری دنیا کے رہنے والے ہمارے نزدیک حقیر چیونٹیوں کی مانند ہیں۔ یہی ہمارا پہلا سبق ہے۔''

دونوں اپنی اپنی بکواس کرتے رہے لیکن اس بکواس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد شہباز کا مستقل قیام میلیکو میں ہی ہے اور یہ پتہ چلانے کے بعد کہ رازل جریری اپنے جسم کے حصول کے بعد اپنی اصل شکل میں کہاں ہے۔ کیا یہیں میلیکو میں شہباز کے ساتھ یا پھر یہ خیال غلط ہے ان کا کہ رازل جریری اور شہباز ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مارکر بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ جذباتی انداز میں نہیں دوڑ پڑا تھا۔ اور اس بات کی گنجائش رکھی تھی کہ ذرا سا خیال رکھے اور صحیح اطلاع اپنے ملک کو دے۔ بس اسی چکر میں وہ شہباز کا تعاقب کر رہا تھا۔ گویا وہ ابھی کوئی بڑا عمل نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اوپن ایئر ہوٹل میں بیٹھ کر جو گفتگو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی اور رازل جریری نے سنی تھی اس میں کسی اور ایسے پراجیکٹ کا تذکرہ تھا جو پلاسکو کے سائنسدان کر رہے تھے یا پھر کوئی ایسی بات جس کی ابھی تک کوئی وضاحت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کوئی پراسرار عمل زیر عمل تھا۔ یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔

چنانچہ اس وقت یہی صورتحال تھی۔ شہباز جب اپنی رہائش گاہ میں داخل ہوا تو مارکر نے کار روک دی۔ وہ دونوں متجسس نگاہوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

''تو پھر اب کیا، کیا جائے؟ کار جس انداز سے اس عمارت میں داخل ہوئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شہباز یہیں رہتا ہے۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کہاں تک کارروائی کرنی چاہئے۔ کیا اس عمارت میں داخل ہو کر مزید معلومات حاصل کریں یا پھر......''

''مائی ڈیئر! میری رائے ہے کہ ہم یہیں رک کر صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں۔ کم از کم دو دن تک اس عمارت کی نگرانی کرنا ہو گی اور یہاں کے اِن اور آؤٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔''

''اوکے...... ٹھیک کہتے ہو۔ جلد بازی میں اٹھایا جانے والا کوئی بھی قدم خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔''

لیکن رازل جریری کی منطق کچھ اور تھی۔ جب اسے یہ معلوم ہو گیا کہ اس کے بعد یہ

لوگ صرف اس عمارت کی نگرانی کریں گے تو اس نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں دوستو! تمہارے پاس ضائع کرنے کے لئے کافی وقت ہے۔ لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں۔''

رازل جریری کے یہ الفاظ دونوں نے سنے۔ دونوں کے حلق سے خوفزدہ آوازیں نکل گئیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ یہ آواز ان سے اس قدر قریب ہے۔ سروں کی پشت پر پڑنے والی ضربیں اتنی ہی شدید تھیں کہ وہ دونوں بری طرح چیخے۔ لیکن بس ان دو ضربوں نے ان کی آواز گم کر دی اور وہ اندھوں کی طرح خلاء میں ہاتھ مارتے ہوئے گاڑی کے اگلے حصے سے جا ٹکرائے۔ مارکر کی پیشانی سے گاڑی کا ہارن دبا اور ایک لمبی کوک فضا میں پھیل گئی۔ لیکن رازل جریری نے ایک لمحے کے اندر اندر اس کا سر اسٹیئرنگ کے ہارن سے ہٹا دیا اور یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ دونوں بے ہوش ہو چکے ہیں، پُر اطمینان انداز میں ان کی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اب آگے کی کارروائی شہباز کو کرنا تھی۔

......

حالانکہ اس لیبارٹری کو قائم ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا اور رازل جریری نے بہت تھوڑے وقت میں جو انتظامات کئے تھے ان میں ابھی بیشتر خامیاں اور کمی تھی۔ لیکن بہرحال اس کے باوجود اس نے اپنی بے پناہ محنت سے بہت کچھ کر لیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں افراد کو جب ہوش آیا تو وہ اسی عظیم الشان لیبارٹری میں موجود تھے اور خاص قسم کی دو کرسیوں پر نیم دراز تھے۔ یہ کرسیاں اس انداز کی تھیں جیسی ڈینٹل سرجن استعمال کرتے ہیں۔ ان میں بے شمار جدتیں تھیں۔ لاتعداد تار اور ڈائل لگے ہوئے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان دونوں کے ہاتھ اور پاؤں خاص قسم کے کلیم میں پھنسے ہوئے تھے۔ سر پر بھی ایک چوڑی پٹی خاص انداز میں بنی ہوئی تھی۔ ابھی انہیں ہوش نہیں آیا تھا لیکن رازل جریری جو اس وقت اپنے پورے بدن میں موجود تھا اور ایک گوشے میں بیٹھا شہباز کے ساتھ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا، شہباز کو یہ بتا چکا تھا کہ اب سے چھ منٹ کے اندر اندر یہ لوگ مکمل طور سے ہوش میں آ جائیں گے۔ شہباز ہی انہیں اٹھا کر اندر لایا تھا اور ایک دوسرے ملازم کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس کار کو لے جائے اور اتنے فاصلے پر چھوڑ دے کہ کوئی شبہ بھی نہ کر سکے کہ یہ کار اس عمارت تک آئی ہوگی۔ ملازم کار لے کر چلا گیا اور رازل جریری کافی کا ایک سپ لیتے ہوئے اپنے سامنے رکھے ایک چارٹ پر نشانات لگاتا جا رہا تھا۔ اس نے شہباز سے کہا۔

''ہمارے پاس مالی وسائل کی بے پناہ کمی ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس وقت دنیا کے دولت مند ترین ملکوں کو مختلف طریقے سے بلیک میل کر کے دولت کے انبار لگا لوں۔ لیکن یہ عمل میرے شایانِ شان نہیں ہوگا کیونکہ میں جب انسانیت کے ہمدرد کی حیثیت سے منظر عام پر آؤں گا تو وہ لوگ میرے بارے میں عوام کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں تو ایک بلیک میلر تھا اور میں نے انہیں بلیک میل کر کے ان سے بڑی بڑی رقمیں

حاصل کی ہیں۔ اس طرح میرا امیج دنیا میں رہنے والوں کی نگاہوں میں خراب ہو جائے گا اور یہ بات بہرحال میں کسی طور پسند نہیں کروں گا۔ اصل میں یہ تذکرہ اس طرح سے نکلا کہ میں دنیا کے اور بے شمار ملکوں میں اپنے ایجنٹ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس طرح کے افراد جو دنیا کے کسی بھی ملک سے مجھے معلومات فراہم کریں۔ اس طرح کے لوگوں کو میں بہت سے ملکوں میں تعینات کر چکا ہوں۔ لیکن شہباز! ہمیں ان کے پورے اخراجات کی ادائیگی کرنا ہوتی ہے اور ان تمام معاملات کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی اور ملک میں میرا ایک ایجنٹ یا چند ایجنٹ ہیں تو وہ اکیلا ہی میرے لئے کام نہیں کر سکتا۔ اس کے اپنے بھی وسائل ہوتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں مقامی باشندوں کو ہی ترجیح دیتا ہوں۔ ایسے لوگوں کی تلاش بھی ایک اہم کام ہے۔ اس وقت بھی میں تقریباً چودہ نمائندے مقرر کر چکا ہوں جو دنیا کے مختلف گوشوں میں اور ضرورت کی ایسی جگہوں پر میرے مفادات کی دیکھ بھال کر رہے ہیں جہاں میں ایسی ضرورت محسوس کر سکتا ہوں۔ یعنی بعض ایسے ممالک جو ترقی حاصل کرنے کے بعد اپنے ہاتھ پاؤں مزید پھیلانے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ ایسے بہت سے ملک ہیں اور وہاں پر جو کوئی بھی ہمارے لئے کام شروع کرتا ہے اسے ہر طرح کی مراعات اور وسائل دینا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسے دوسروں سے بھی رابطے کرنا ہوتے ہیں۔

لیکن بہرحال میں نے اب تک جن لوگوں کو مقرر کیا ہوا ہے وہ بڑے کام کے لوگ ہیں اور میرے لئے بہترین معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اوہو دیکھو...... وہ ہوش میں آ رہے ہیں۔'' رازل جریری نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا جو شہباز کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اور آخر کار رازل جریری کے چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔

کافی کی پیالی سے دونوں نے آخری گھونٹ لئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرسیوں پر بندھے ہوئے لوگ ہوش میں آ گئے تھے اور کسی قدر بے خیالی کے انداز میں اپنے سامنے لگے ہوئے اس ایئر پائپ کو دیکھ رہے تھے جو بہت موٹا تھا۔ وہ غالباً سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ لیکن پھر ان کی نگاہوں نے رازل جریری کو دیکھا۔ اس وقت وہ اپنے مکمل حواس میں واپس آ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے چہروں پر ایک دم حیرت اور پھر خوف نمودار ہو گیا۔ انہوں نے رازل جریری کو پہچان لیا تھا۔ ساتھ میں شہباز تو موجود تھا ہی۔ رازل جریری نے نرم اور خلیق لہجے میں کہا۔

''آپ لوگوں کا خیال بالکل درست ہے۔ میں آپ لوگوں کے چہرے کے تاثرات پڑھ رہا ہوں۔ آپ مجھے دیکھ کر چونکے ہیں۔ بہرحال آپ کو مختصر الفاظ میں اتنا بتا دوں کہ جہاں آپ پہنچے ہیں وہ میری رہائش گاہ ہے۔ آپ لوگ اسے میری لیبارٹری کہتے ہیں۔ شہباز کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہی ہیں۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے تو آپ پھنسے ہیں۔ اب آپ یہ دیکھ لیجئے کہ برسوں سے مجھے آپ کے ملک پر برتری حاصل ہے۔ اپنی انتہائی کوششیں کرنے کے باوجود اور برسوں سے میرے چکر میں اربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود اور اربوں ڈالر کا نقصان اٹھانے کے باوجود حکومت پلاسکو مجھ پر قابو نہیں پا سکی۔ آپ لوگ اپنے وطن کے وفادار ہیں۔ بے شک آپ کو وہی کرنا چاہئے تھا جو آپ نے کیا۔ لیکن مجھے بھی اپنی بقاء کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اب ایسا تو ممکن نہیں ہے کہ میں آپ کو اپنے اس عمل پر معافی کا حقدار سمجھوں۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ لوگ؟ آپ لوگ میرے قبضے میں ہیں اور میں پوری دیانت داری کے ساتھ آپ سے عرض کر دوں کہ آپ سے میں بہت سی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو آپ کے نام......''

''ہمیں کھول دو...... ہمیں کھول دو...... تم نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ تم ہمیں اپنے قابو میں رکھ سکو گے۔ اور جو باتیں تم کر رہے ہو وہ فضول باتیں ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ ہم تو یہیں میلیکو کے رہنے والے ہیں اور تم نجانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔''

''خیر، اصل میں بات یہ ہے کہ میں ذرا مختلف سوچ کا حامل ہوں اور میرا اندازِ فکر ذرا مختلف ہے۔ میں فضول باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ اب یہ کہ میں آپ لوگوں کے بدن سگریٹوں سے جلاؤں، آپ کے ہاتھ پاؤں کے ناخن اکھاڑ دوں، آپ کی پلکیں اور بھنوئیں ادھیڑ لوں، آپ کے سر کے بال نوچوں، یہ احمقانہ کوششیں اب بہت پرانی ہو گئی ہیں۔ یہ مشین آپ سامنے دیکھ رہے ہیں، یہ متحرک ہو گی اور اس کے بعد آپ بڑے خلوص کے ساتھ میرے ہر سوال کا جواب دیں گے۔ اس مشین کا رابطہ براہِ راست دماغ سے ہوتا ہے۔ یہ کلیمپ جو آپ کے سر پر چڑھے ہوئے ہیں، اس مشین کا ریسیور ہیں۔ یہ آپ کے دماغ کو متحرک کریں گے۔ دماغ آپ کے ساؤنڈ بکس کو ہدایات دے گا اور یہ خلیہ مصروف عمل ہو جائے گا جس میں میرے سوال کا جواب پوشیدہ ہو گا اور میں آپ کو صرف اس لئے

یہ بتانے والا ہوں کہ میں ایسا کرنے جارہا ہوں اور آپ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار رہئے۔ یہ بھی ایک طریقہ کار ہے کہ پہلے میں آپ کے ذہن میں ڈال دوں کہ میں آپ سے کیا سوال کرنے والا ہوں۔ آپ اسی بارے میں سوچیں گے اور آپ کے دماغ کے وہ خلیے متحرک ہوجائیں گے جن میں میرے سوالات کے جوابات چھپے ہوں۔ اب ذرا تجربے کے طور پر آپ یہ دیکھ لیجئے، آپ مسٹر......" رازل جریری نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد تھوڑے فاصلے پر جا کر ایک بٹن دبا دیا اور بولا۔

"ہاں......آپ کا نام؟"

"البرٹ مارکر۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"اور آپ؟"

"پال ڈریک۔" ان دونوں کے منہ سے نکلنے والی آوازیں کچھ مشینی سا انداز اختیار کئے ہوئے تھیں۔

"دیکھا آپ نے۔ یہ ہے طریقہ کار۔ اب ہم باقاعدہ اس طریقہ کار پر عمل کرتے ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کے بغیر آپ مجھے ایک بھی لفظ صحیح نہیں بتائیں گے۔ اس کا اندازہ بھی مجھے آپ کے پنجر سے ہوا ہے۔ اس وقت آپ جن کرسیوں پر لیٹے ہوئے ہیں وہ آپ کا مکمل تجزیہ کر کے مجھے آپ کے بارے میں رپورٹ دے رہی ہیں مسٹر مارکر...... آپ کے پنجر کی تفصیلی رپورٹ میرے پاس موجود ہے۔ میں آپ کے ماضی کی ایک ایک بات بتا سکتا ہوں۔"

رازل جریری نے وہ مشین اپنے سامنے سرکالی جس پر آپریشن بٹن لگے ہوئے تھے۔ پھر اس نے شہباز کو بھی بیٹھنے کے لئے کہا۔

شہباز سکتے کے سے عالم میں تھا۔ رازل جریری کی اس لیبارٹری میں وہ جب بھی آتا، اس پر گہرا سکوت طاری ہوجاتا۔ وہ سوچتا کہ سرکس کے جھولوں پر کام کرنا تو دنیا کا سب سے چھوٹا کام ہے۔ یہ جادوگری جو اس کے سامنے آرہی ہے کیا اس کا کوئی جواب ہے؟

رازل جریری کی آواز ابھری۔ "مسٹر مارکر! آپ کا وزن ایک سو چالیس پونڈ، آپ کا قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ، آپ ایک تندرست نوجوان ہیں۔ اب سے چوبیس دن پہلے آپ کو ہلکا سا فلو ہوا تھا لیکن آپ کی مضبوط قوتِ مدافعت نے اسے ختم کردیا، اور آپ بالکل

ٹھیک ٹھاک ہیں۔ یہ آپ کی جسمانی کیفیت ہے اور یہی مسٹر پال ڈریک! مجھے آپ کے بارے میں معلومات ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ میرا پہلا سوال۔"

یہ کہہ کر رازل جریری نے ایک بٹن آن کیا اور ان دونوں کی سانسوں کی آوازیں ایک بڑے مائیک پر سنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی نیچے ریکارڈر چل پڑا تھا۔ رازل جریری نے ایک لمحے کی خاموشی اختیار کرنے کے بعد سوال کیا۔

"شہباز کے بارے میں آپ کو کیسے پتہ چلا اور آپ میں سے کسے پتہ چلا؟"

"مجھے......" مارکر کے ہونٹ ہلے۔ آواز اس اسپیکر سے آئی تھی۔

"یعنی مسٹر مارکر کو؟"

"ہاں۔"

"کیسے......؟"

"ہسپتال میں، میں نے ان دونوں کو دیکھا تھا جو پلاسکو میں ہماری تحویل میں تھے اور ان میں سے ایک کا نام فیض شاہ تھا۔ عورت کا نام مجھے نہیں معلوم۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ یہ شہباز کے ماں باپ ہیں اور شہباز رازل جریری کے جسم کے ساتھ غائب ہوگیا تھا جس سے حکومت پلاسکو کو یہ شبہ ہوا تھا کہ ممکن ہے شہباز نے بعد میں اپنا منصوبہ بدل دیا ہو اور رازل جریری کی مدد پر آمادہ ہوگیا ہو یا رازل جریری نے اسے کسی پراسرار ذریعے سے اپنی مدد پر آمادہ کرلیا ہو۔ حکومت پلاسکو نے ہم لوگوں کو شہباز، فیض شاہ اور شہباز کی ماں کی تصویریں فراہم کی تھیں اور ہدایت کی تھی کہ ہر کام کے ساتھ ساتھ اس مسئلے پر بھی نگاہ رکھی جائے کہ یہ لوگ کہاں ہیں۔"

"ٹھیک......تو آپ نے ہسپتال میں فیض شاہ کو دیکھا؟"

"ہاں......اور اس کے بعد میں نے پال ڈریک کو اپنے ساتھ شامل کرلیا۔"

"پال ڈریک یہاں میلیکو میں کیا کر رہے تھے؟"

"یہ یہیں ہوتا ہے اور یہاں پلاسکو کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ ڈان بیورس کے خاص آدمیوں میں شامل ہے۔"

"ڈان بیورس؟"

''ہاں۔''

''یہ بات مسٹر پال ڈریک! آپ بتائیں گے۔ڈان بیورس کون ہے؟ پلاسکو سے اس کا کیا تعلق ہے اور آپ اس کے مفادات کیلئے کیا کرتے ہیں؟'' رازل جریری نے دلچسپی سے کہا۔شہباز پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔یہ سچ بولنے والی مشین تو بڑی لاجواب چیز تھی۔پتہ نہیں اس لیبارٹری میں اور کیسے کیسے پراسرار آلات بکھرے ہوئے ہیں۔

پال ڈریک نے البتہ ڈان بیورس کے بارے میں جو انکشافات کئے وہ دل ہلا دینے والے تھے۔اس نے کہا۔

''ڈان بیورس میلیکو میں پیدا ہوا۔اس نے میلیکو اور اس کے بعد پلاسکو میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔اور جب وہ پلاسکو میں سائنسی تعلیم کے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کر رہا تھا اس وقت حکومت پلاسکو کی نگاہ اس پر پڑی اور اس نے مستقبل کے ذہین ترین سائنسدان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔یہ پلاسکو کا اپنا طریقہ کار ہے کہ دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو وہ اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے اور اپنے مفادات کے لئے اس نے انہیں دنیا بھر میں پھیلا رکھا ہے۔اور اگر کوئی محب وطن جذباتی ہو کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ اعلیٰ ترین تعلیم اور تجربات حاصل کر کے اپنے وطن کے لئے کام کرے گا تو پھر حکومت پلاسکو اسے ختم کر دیتی ہے کیونکہ وہ لوگ نہیں چاہتے کہ دنیا میں کوئی ان کا مدمقابل ہو۔

بہرحال بیورس، میرا مطلب ہے ڈان بیورس بھی حکومت میلیکو کے ہتھے چڑھ گیا۔اس وقت تک میلیکو، پلاسکو کے تعلقات اس قدر خراب نہیں ہوئے تھے لیکن بعد میں یہ بھی ہو گیا۔پلاسکو اور میلیکو کے درمیان جنگ بھی ہوئی۔بہت کچھ ہوا۔پھر ڈان بیورس کی تعلیم مکمل ہو گئی اور وہ میلیکو واپس آ گیا۔حکومت میلیکو نے اسے بہت بڑے بڑے اعزازات دیئے اور اس پر فخر کا اظہار کیا۔اس کے ساتھ ہی اس کی خواہش پر میلیکو کے ایک دور دراز علاقے میں ڈان بیورس کے لئے ایک شاندار تجربہ گاہ قائم کر دی گئی جو اس کی خواہش کے مطابق تھی۔لیکن درحقیقت یہ اس کی خواہش نہیں بلکہ حکومت پلاسکو کی خواہش تھی اور حکومت پلاسکو نے اسے وہ تمام وسائل مہیا کئے جو اس کے مقاصد کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔چنانچہ ڈان بیورس کو دوہری حیثیت حاصل ہو گئی۔ایک طرف تو حکومت میلیکو اسے اپنا قابل فخر سائنسدان سمجھتی تھی لیکن درپردہ وہ پلاسکو کے لئے کام کر رہا تھا۔میلیکو کے

لئے اس نے بہترین ایجادات کیں اور انہیں حکومت میلیکو کے حوالے کیا۔لیکن جب سے میلیکو اور پلاسکو کے حالات خراب ہوئے اور ان کے تعلقات میں زبردست خرابی پیدا ہو گئی تو حکومت پلاسکو نے اپنے اصل حربے کو آزمایا یعنی اس نے میلیکو کی اس لیبارٹری میں ایسے ہتھیار بنانا شروع کر دیئے جو انتہائی تباہ کن ایٹمی ہتھیار تھے۔ان ہتھیاروں کی تیاری کا علم حکومت میلیکو کو نہیں ہے۔وہ ڈان بیورس کو اپنا سائنسدان سمجھتی ہے اور ڈان بیورس ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ایک طرف تو وہ میلیکو کے مفادات کی نگرانی کے لئے کام کر رہا ہے لیکن درپردہ اس کا ایک شعبہ حکومت پلاسکو کے لئے بھی متحرک ہے اور وہ اس کے لئے تباہ کن ہتھیار بنا رہا ہے۔پلاسکو حکومت کے اعلیٰ عہدیدار انتہائی چالاکی سے اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے میں مصروف ہیں۔یہ میلیکن آدمی یعنی ڈان بیورس جب پلاسکو کی طرف سے حکم ملے گا تو اپنے ہی ہتھیار اپنے ہی ملک میں استعمال کر ڈالے گا یعنی میلیکو میں۔اور حکومت پلاسکو دنیا سے یہی کہے گی کہ میلیکو حکومت خود اپنی سازشوں کے جال میں جکڑی گئی۔اور اس نے ایک ایٹمی سائنسدان کو برگشتہ کر کے اپنے اوپر ایٹوں کی بارش کرالی۔اور اس کے بعد حکومت پلاسکو ساری دنیا کی تحقیق کے دروازے کھول دے گی اور دعوت دے گی کہ آؤ اور اس بات کا تجزیہ کر لو کہ پلاسکو کی طرف سے ایک بھی میزائل نہیں داغا گیا۔جو کچھ ہوا ہے میلیکو کے اندر ہی ہوا ہے۔اور اس طرح ایٹم بموں کے استعمال میں اس کا دخل نہیں ہے۔حکومت پلاسکو یہ ثبوت پیش کر کے صاف بچ جائے گی اور دنیا یہ سوچتی رہ جائے گی کہ میلیکو نے جو کچھ کیا اس کا شکار ہو گیا۔یہ میلیکو کے خلاف ایک بھیانک منصوبہ ہے اور اس منصوبے کا آغاز اس جنگ کے بعد ہی ہو گیا تھا جو میلیکو اور پلاسکو کے درمیان ہوئی تھی اور پلاسکو کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ چار ممالک اگر یکجا ہو جائیں تو پلاسکو کو بدترین نقصانات پہنچا سکتے ہیں۔یہ بہت ہی خوفناک صورتحال تھی۔ڈیولینڈ، ہیلسونا، واسکوڈا، بیرات یہ سب آج بھی پلاسکو کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔چنانچہ میلیکو اس سلسلے میں پہلا شکار ہے۔''

شہباز نے سچ بولنے والی مشین کے زیرعمل یہ داستان سنی اور دنگ رہ گیا۔اس کی نگاہیں رازل جریری کی جانب اٹھیں۔رازل جریری کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔اس نے آخری سوال کیا۔

"اور ڈان بیورس کی لیبارٹری کہاں واقع ہے؟"

"ریبون میں، ہلیکیون کے ساحل کے قریب۔" پال ڈریک کے آخری الفاظ ابھرے۔ آخری الفاظ انہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے لمحے رازل جریری نے اپنے لباس سے ایک ریوالور نکالا اور اس کا رخ پال ڈریک کی جانب کر کے لگاتار تین فائر کر دیئے۔ شہباز بری طرح چونک پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ منہ کھولے، ریوالور کے تین مزید فائر ہوئے اور مارکر خون میں نہا گیا۔ یہ فوری ردعمل اور اس کے بعد کا عمل شہباز کے لئے بے حد سنسنی خیز تھا۔ رازل جریری نے ریوالور ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک اچھی ایجاد ہے۔ ایک لمحے کے اندر اندر مشکل کا حل پیش کر دیتی ہے۔ آؤ....." اور اس کے بعد وہ مڑ کر ایک طرف چل پڑا۔

✿.....✿

رازل جریری کا موقف تھا کہ یہ لوگ اس قدر گھناؤنے اور بدکار ہیں کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ دنیا کو خطرے میں مبتلا کر دینے کے مترادف ہے۔ بعد میں اس نے اصغر جراری کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھو شہباز! میلیکو میں کروڑوں افراد ہیں۔ پلاسکو کی سازش نہ تو میلیکو کے حکمرانوں کے خلاف ہے اور نہ ہی اس کی عوام کے خلاف۔ وہ تو بس ایک ملک کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی طاقت پر ایک بدنما نشان کے طور پر موجود ہے۔ وہ اپنی ان پراسرار قوتوں کو داغدار نہیں کرنا چاہتا اور اس کے لئے کروڑوں انسانوں کی زندگی سے کھیلنے پر آمادہ ہے اور اس گھناؤنی سازش میں شریک ڈان بیورس اس قابل نہیں ہے کہ دنیا میں زیادہ وقت گزارے۔ کیا سمجھے؟"

"جی..... مسٹر رازل جریری۔"

"یہ آغاز ہے اس ہولناک خطرے کے خلاف جو خود میلیکو میں ڈان بیورس کی شکل میں موجود ہے۔ اور اب اس خزانے کے حصول کے لئے اصغر جراری کے ساتھ ایک مہم سرانجام دینے سے پہلے تمہارے سپرد یہ ذمے داری کی جاتی ہے کہ تم ہیلیکون کے ساحل پر ریبون کے علاقے میں واقع ڈان بیورس کی اس تجربہ گاہ کو تباہ کرو اور میلیکو کے ناعاقبت اندیش حکمرانوں کی مدد کرو۔ بلکہ میلیکو کے کروڑوں افراد کی زندگی بچاؤ۔ یہ تمہاری زندگی کا ایک

مشن ہے جو میری طرف سے تمہیں سونپا جا رہا ہے اور میں تمہیں اس کے مکمل کوائف مہیا کر دوں گا کہ کہاں تمہیں کیا کرنا ہے اور تمہارا امدادگار اس سلسلے میں کون ہوگا۔ میرے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہے۔ لیکن جس شخص کا میں نے اپنے دست راست کی حیثیت سے انتخاب کیا ہے وہ میرے لئے ون مین آرمی ہے اور میں اس پر مکمل بھروسہ کرتا ہوں۔ تمہیں خصوصی ہتھیاروں سے لیس کیا جائے گا۔ یہ ہتھیار میری لیبارٹری میں مشینی انسان تیار کر رہے ہیں اور بہت جلد تمہیں مہیا کر دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ میں بتاؤں گا کہ اس علاقے میں کون تمہاری معاونت کرے گا کیونکہ بہرحال تم اس سے ناواقف ہو گے۔"

پھر شہباز پر ایک اور انوکھا انکشاف ہوا وہ یہ کہ رازل جریری کی اس لیبارٹری میں زیر زمین تہہ خانوں میں روبوٹ، رازل جریری کے لئے ضروری کام کیا کرتے ہیں اور انہی روبوٹس کی تیار کی ہوئی کچھ خاص چیزیں اسے فراہم کی گئیں۔ یہ انتہائی عجیب وغریب مائیکرو ہتھیار تھے جن کی حقیقت جب شہباز کو بتائی گئی تو وہ دنگ رہ گیا اور ایک بار پھر اسے ہنسی آنے لگی۔

شبیلہ اور فیض شاہ سے ملاقات کر کے اس نے انہیں مختصر الفاظ میں اپنے اس مشن کے بارے میں بتایا۔ شبیلہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ فیض شاہ بھی خاموشی سے بیٹھا شہباز کی صورت دیکھتا رہا۔ شبیلہ نے کہا۔

"اب آپ ہی بتایئے شاہ بابا! کیا یہ سب ٹھیک ہے؟ ہم لوگ کیا صرف ایک ہی مقصد کے لئے رہ گئے ہیں کہ انتہائی خطرناک حالات میں گھرے ہوئے اپنے بچے کی زندگی کی دعائیں کرتے رہے ہیں۔ آپ بتایئے مجھے، کیا یہ اکیلا اتنا بڑا کام کر سکتا ہے جو ٹھیک سے ہماری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔"

اچانک ہی فیض شاہ چونک پڑا اور اس نے مسکرا کر محبت بھری نگاہوں سے شہباز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم یہ کیوں نہیں سوچتیں شبیلہ! کہ گلباز کا بیٹا کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا محافظ بن گیا ہے۔ یہ اعزاز کیا سب کو مل جاتا ہے؟ ذرا سوچو، غور کرو، کتنا بڑا اعزاز ہے یہ۔ ہمیں خود بھی کتنا بڑا اعزاز حاصل ہے کہ ہم صرف خدا کے حضور بیٹھے دعائیں کرتے رہیں اور اپنے بڑھاپے کا صحیح مصرف اختیار کریں۔"

شبیلہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی تھی۔

ریبون ایک ساحلی شہر تھا اور یہاں کی ہنگامہ خیز زندگی عام میلیکو کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ ہر طرف ہنگامہ آرائی۔ مچھلیوں کا کاروبار یہاں بنیادی حیثیت رکھتا تھا اور اسی بنیاد پر یہ شہر مچھلیوں کا شہر بن گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل چاروں طرف بکھرے ہوا کرتے تھے جہاں مچھلی کی بو اور سیلن کی بو سے مہکتا ہوا ماحول ہوا کرتا تھا۔ اچھے ہوٹل بھی تھے۔ شہباز کو یہ ہنگامہ آرائی بڑی عجیب سی لگی تھی لیکن زندگی کی ندرتیں تو ویسے بھی بڑی دلکش ہوا کرتی ہیں اور اسے یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ فریدوں کے ساتھ پہلی شہری زندگی دیکھی تھی۔ ورنہ بچپن کا بیشتر حصہ تو میلوں ٹھیلوں ہی میں گزرا تھا۔ فریدوں نے اسے اپنا دست راست بنا کر بہت کچھ دکھایا تھا اور اس واقفیت نے شہباز کو بہت سی معلومات فراہم کی تھیں۔

بہر حال وہ اس وقت ایک ساحلی ریستوران میں بیٹھا ہوا تھا اور کچھ لمحوں کے بعد اس نے ایک شخص کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھا اور سنبھل گیا۔ اس شخص نے قریب آ کر اسے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ لیشک سے تمہیں اچھی طرح روشناس کرا دیا گیا ہے۔ تمہارے حلیے اور تمہاری شخصیت کے بارے میں مجھے بھی تفصیل بتا دی گئی ہے مائی ڈیئر! ہم رازل جریری کے معترفین میں سے ہیں۔'' اتنا تعارف کافی تھا۔ شہباز نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرا کر بولا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر لیشک! کیا آپ اس جگہ کو مناسب سمجھتے ہیں..... میرا مطلب ہے کہ یہاں ہماری گفتگو مناسب رہے گی؟''

''بالکل نہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے ہوٹل تک چلو۔ وہ کافی پُرسکون جگہ ہے۔ اور پھر تمہیں وہاں جا کر ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملے گی۔ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ زندگی کے ہر مسئلے سے دوچار۔ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ علاقہ میلیکو کے پسماندہ ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے اور ریبون شہر کی حیثیت صرف ایک مچھلی مارکیٹ کی سی ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں تمہیں کروڑ پتی افراد مل سکتے ہیں۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی بہت ہی

کسمپرسی سے بسر ہو رہی ہے لیکن ان میں سے بیشتر نوٹوں کے ڈھیر پر سوتے ہیں۔ لیکن نوٹوں کے ڈھیر جھونپڑیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ البتہ میں نے اپنے آپ کو ان لوگوں میں ضم کرنے کے لئے خود بھی ایک مکان پر گتے کے ڈبوں کی جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ اگر تم فطری طور پر نفاست پسند ہو تو دوسری بات ہے اور اگر زندگی کو اس کی دلچسپیوں کے ساتھ دیکھنے کے قائل ہو تو میری یہ جھونپڑی اور یہ علاقہ تمہیں بہت پسند آئے گا۔''

''میں یقیناً تمہاری جھونپڑی دیکھوں گا۔'' شہباز نے کہا اور اس کے بعد وہ لیشک کے ساتھ ریستوران سے باہر نکل آیا۔

ریبون کے علاقے میں واقعی زندگی کا انداز بڑا مختلف تھا۔ وہ کسی سواری سے اس علاقے میں نہیں پہنچے جہاں لیشک کا قیام تھا بلکہ پیدل ہی ٹہلتے ہوئے اچھا خاصا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس علاقے میں پہنچے تھے۔ زندگی واقعی بہت نئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دیکھنے والی نگاہیں وہاں غربت کی ایسی ایسی اعلیٰ مثالیں دیکھتی ہیں کہ ششدر رہ جائیں۔ لیکن لیشک نے ذرا الگ ہی بات بتائی ان لوگوں کے بارے میں۔ جس مکان کے سامنے وہ رکے، اس کا زینہ الگ تھلگ اور بہت پتلا سا تھا۔ اس زینے کو وہ عبور کر کے چھت پر بنی ہوئی جھونپڑی پر پہنچے تو لیشک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یقین کرو گے میری بات پر، تم اس جھونپڑی کو دیکھ رہے ہو؟ یہ اس علاقے کی اعلیٰ درجے کی عیش گاہ ہے اور یہاں کی بیشتر آبادی ایسی عیش گاہوں کے لئے ترستی ہے۔ ریبون کی مشہور ترین جگہ بی بے ہے۔ بی بے یعنی بی فاربسٹ اور بے کھاڑی۔ اسے بی بے کہا جاتا ہے اور بی بے میں کشتیوں کا شہر آباد ہے بالکل ہانگ کانگ کے انداز میں۔ بی بے کا یہ علاقہ دوسرا ہانگ کانگ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں بھی آدھی آبادی پانی پر رہتی ہے۔''

''پانی پر.....؟'' شہباز نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''ہاں..... تم نے کبھی ہانگ کانگ دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

''بس سمجھ لو وہاں بھی آدھی زندگی پانی پر بسر ہوتی ہے۔ یہاں بی بے کے رہنے والے بھی بعض اوقات ساری زندگی کشتی پر گزار دیتے ہیں۔ ان کا سونا جاگنا، کھانا پینا، شادی بیاہ وغیرہ سب کچھ کشتیوں میں ہوتا ہے۔''

"واہ...... کیا دلچسپ زندگی گزرتی ہوگی۔"

"میں اسی اعتبار سے اپنی اس گتے کی بنی جھونپڑی کو اعلیٰ درجے کی عیش گاہ کہتا ہوں، کیونکہ ایک پوری جھونپڑی میں تنہا رہنا بہت بڑی عیاشی ہے۔ ویسے یہاں اس طرح کی اور بھی لاتعداد جھونپڑیاں ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک جھونپڑی میں چھ چھ، سات سات اور آٹھ آٹھ افراد رہتے ہیں۔"

"ویری گڈ...... میرے لئے یہ ایک تجربہ ہے۔" جھونپڑی کے اندر داخل ہو کر شہباز نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا زیادہ تر حصہ اسٹور اور الماری نے گھیر رکھا تھا۔ الماری کے ایک شیلف اور سوٹ کیس میں میلے کپڑے بھرے ہوئے تھے اور اس کا دروازہ غائب تھا۔ لیشک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہر طرح کے شک وشبہات سے بالاتر رہنے کے لئے یہ انداز اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ یہاں کے رہنے والے ہمیں اپنوں ہی میں تصور کریں۔ کیا سمجھے؟"

"ہاں...... بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ایک عمدہ انداز ہے۔" شہباز ایک کسی قدر صاف ستھری جگہ تلاش کر کے بیٹھ گیا۔ لیشک کہنے لگا۔

"ہاں، تو اب میں تمہیں ذرا ڈان بیورس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیلات بتادوں۔ اس شخص کی بڑی وقعت اور بڑا احترام ہے یہاں۔ اگر تم ایک ثبوت بھی پیش کردو کہ درحقیقت وہ پلاسکو کے لئے کام کر رہا ہے اور پلاسکو کا وفادار ہے تو مقامی لوگوں میں سے کوئی نہیں مانے گا۔ اسے یہاں ہر طرح کی مراعات دی گئی ہیں اور جو علاقہ اس نے اپنے لئے منتخب کیا ہے یوں سمجھ لو اس طرح سے وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ ہے اور اپنی ایجادات اور اعمال کے سلسلے میں کسی کا جوابدہ نہیں ہے۔ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی مرضی سے کر رہا ہے۔ اس مخصوص علاقے میں، میرا مطلب ہے ہیلیکون کے ساحل پر اس کی اپنی فوج ہے جو اس کی تنصیبات کی حفاظت کرتی ہے۔ اس نے انتہائی خوفناک ہتھیار تیار کئے ہوئے ہیں اور بظاہر میلیکو کے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ میلیکو کے تحفظ کے لئے کام کر رہا ہے۔ لیکن بہرحال رازل جریری کی اطلاعات کچھ اور ہی ہیں۔ ویسے تمہارے بارے میں بتایا گیا ہے کہ تم انتہائی برق رفتار اور باعمل ہو اور اس جگہ کو تباہ کرنے میں تم کامیابی حاصل کرلو گے۔ ظاہری بات ہے کہ تم پر یہ اعتبار بلاوجہ ہی نہیں کیا ہوگا۔ لیکن مائی ڈیئر! اگر برا نہ مانو تو ایک بات

کہوں؟ وہ یہ کہ ہر شخص کو تھوڑی سی گنجائش ضرور رکھنی چاہئے۔ تم لوگ اگر اسے بالکل چوہا سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ کیونکہ وہ چوہا نہیں ہے بلکہ ایک انتہائی چالاک آدمی ہے جو ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔"

"ہاں...... یہ ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟"

"یہی کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ تم ان خوفناک ہتھیاروں کو کس طرح استعمال کرو گے۔"

"رازل جریری میرا آئیڈیل ہے۔ بہت مختصر سے وقت میں اس نے جو کچھ کرلیا ہے وہ بے مثال ہے۔ مجھے کچھ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ مہلک ایجادات ہوں گی۔ لیکن حقیقت ہے کہ رازل جریری کے کہنے کے مطابق وہ انتہائی تباہ کن چیزیں ہیں اور شاید ڈان بیورس کے اس مضبوط قلعے کو تباہ کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے پاس زبردست قسم کے ایٹم بم موجود ہیں جنہیں وہ میلیکو ہی کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یعنی در پردہ۔"

"بہرحال اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنی وہ ایجادات میرا مطلب ہے رازل جریری کی ایجادات دکھانا پسند کروں گا۔ یہ ایجادات بقول رازل جریری کے ڈان بیورس کے بنائے ہوئے اس پورے طلسم خانے کو تباہ کرسکتی ہیں۔"

"آہ کاش! میں ایک نگاہ انہیں دیکھ سکوں۔ وہ تم نے کہاں محفوظ کی ہیں؟"

"میرے مختصر سے سامان میں جو میرے ہوٹل کے کمرے میں موجود ہے۔" شہباز نے جواب دیا۔ یہاں اس علاقے میں آنے سے پہلے اس نے اپنے لئے ایک بہتر ہوٹل میں کمرہ منتخب کرلیا تھا اور اس کے بعد وہ اس علاقے میں آیا تھا جہاں اس نے لیشک سے پہلی ملاقات کی تھی۔

بہرحال لیشک کی اس جھونپڑی سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے بعد شہباز اسے لے کر اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ لیشک ایک ذہین نوجوان تھا۔ اس نے شہباز کے کان میں سرگوشی کی۔

"ویسے تو اور کوئی کردار ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابھی کوئی ہماری طرف متوجہ ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ڈان بیورس کے

سلسلے میں ساری معلومات صرف ہمیں ہی حاصل نہیں ہیں۔ دنیا کے اور بہت سے لوگ ڈان بیورس کو اس حیثیت سے نہیں لیکن کم از کم اس حیثیت سے ضرور جانتے ہوں گے کہ وہ میلیکو میں ایک آزاد سائنسدان کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ ہو مائی ڈیئر مسٹر شہباز! کہ ڈان بیورس کے بارے میں دنیا کے اور ممالک میں بھی تشویش پائی جاتی ہے اور اس سلسلے میں چند عرصہ پہلے مجھے کچھ شواہد ملے تھے۔ لیکن چونکہ میں اس سلسلے میں کسی کے لئے خاص طور سے مخلص نہیں تھا اس لئے وہ شواہد میری ذات تک ہی محدود رہے۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ اور ایسے خفیہ لوگ ڈان بیورس کے چکر میں ہیں جن کی قومیت اور شہریت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ نہ ہی میں نے اس کے لئے کوئی خاص جدوجہد کی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ان لوگوں سے بھی ہوشیار رہنا پڑے گا۔ پہلے میں یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ کہیں یہاں، میرا مطلب ہے اس کمرے میں کوئی ایسا آلہ تو نہیں پوشیدہ کر دیا گیا جس سے ہماری مصروفیات کے بارے میں پتہ چل سکے۔''

شہباز محتاط ہو گیا۔ اس شبے میں وہ اس قدر تیز نہیں تھا جبکہ باقی معاملات میں اب وہ کھل گیا تھا۔ پہلے اسے کسی انسان کی زندگی کو نقصان پہنچتے دیکھ کر شدید ذہنی گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن جب رازل جریری نے پال ڈریک اور مارکر کو بے دردی سے قتل کیا تھا تو شہباز نے یہ سوچا تھا کہ رازل جریری کا موقف ہی ٹھیک ہے۔ ایک بڑی تباہی کو روکنے کے لئے اگر کچھ افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں تو اتنی بری بات نہیں ہے۔ اور یہ سبق اسے رازل جریری نے اپنی بریفنگ کے دوران دیا تھا۔

بہر حال کمرے میں کسی ایسی چیز کا جائزہ لیا گیا اور لیشک نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن اس کے بعد دونوں مطمئن ہو گئے تھے۔ لیشک اس بات پر حیران تھا جو مختصر سا سامان شہباز کے ساتھ موجود ہے اس میں بھلا ایسی کون سی چیز ہے جو ایک اتنے بڑے عالیشان پراجیکٹ کو تباہ کر دے۔ شہباز نے سادگی سے کہا۔

''اور یقین کرو میرے دوست! میں نہیں جانتا کہ رازل جریری نے جو کہا ہے وہ کوئی سچائی ہے۔ لیکن اب میں تمہیں بتاؤں کہ اصل چیز کیا ہے جس کے بارے میں رازل جریری کا کہنا ہے کہ یہ دنیا کی بہترین ایجادات ہیں۔ اس کی زبردست محنتوں کا نچوڑ۔''

''آہ...... تب تو میں ایک بات جانتا ہوں کہ وہ کوئی بے مثال ہی چیز ہو گی۔ ذرا مجھے

بتاؤ کہ وہ کیا ہے؟''

تب شہباز نے وہ انتہائی خوبصورت بریف کیس کھول لیا جس میں ایک مرد کے استعمال کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ریزر مشین، فام سیلنڈر، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش۔ یہ تمام چیزیں موجود تھیں۔ اس نے فام ٹیوب اٹھایا اور اس کا نچلا حصہ کسی اسکیو کی طرح گھما کر کھول ڈالا۔ نچلے حصے سے ایک گول سی پلیٹ نکل آئی۔ اور پھر مزید گھمانے سے ویسی ہی اور پلیٹیں نکل آئیں۔ لیشک تعجب اور دلچسپی سے یہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے چونک کر کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

''بس یہ سمجھ لو کہ یہ مائیکرو انجینئرنگ کے شاہکار ہیں۔ اس کے ایک طرف پرنٹڈ سرکٹس کا جال بچھا ہوا ہے جبکہ دوسری جانب اس میں ایٹمی آلات تباہ کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ انہیں خاص طریقے سے چارج کیا جاتا ہے اور یہ طویل ترین قطر میں تمام چیزوں کو تباہ کر سکتی ہے۔ اور یہ بھی ضرورت نہیں ہے کہ لانچ پیڈ پر لگایا جائے۔ انہیں زمین پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور یہ زمین پر سے سگنل پھینک سکتی ہے۔ یہ چارج ہونے کے بعد لانچ پیڈ میزائل اور راکٹ کو تباہ کر کے رکھ دیں گی۔''

''اوہ...... مگر انہیں کیا کسی ریموٹ سے متحرک کیا جاتا ہے؟''

''نہیں۔ رازل جریری کے کہنے کے مطابق دو مخصوص الفاظ ہیں جو ایک خاص آواز میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اور جب یہ دو الفاظ ادا ہوں گے تو یہ متحرک ہو جائیں گی۔

''مائی گاڈ...... ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ جادوگری نہیں ہے؟''

''دوسری بات میں کہوں گا، وہ یہ کہ اگر تم رازل جریری کو جانتے ہو تو تم یہ سمجھ لو کہ وہ کسی جادوگر سے کم نہیں ہے۔'' شہباز یہ کہتے کہتے رک گیا کہ رازل جریری اپنے جسم کو روح سے الگ کر سکتا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

لیشک نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔ ''ذرا مجھے اس کے بارے میں اور تفصیل سمجھاؤ۔''

''سنو...... آواز کا جو زیر و بم اور جو الفاظ انہیں متحرک کرنے کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں وہ آواز کے اشارے کو بجلی کے سگنل میں تبدیل کر دیتے ہیں اور پھر یہ سگنل ڈیٹونیٹر تک منتقل ہو جاتے ہیں۔ کیا سمجھے؟''

”بڑی بات ہے۔ گویا ان الفاظ میں...... اوہ میرے خدا...... واقعی یہ سائنس کی جادوگری ہے۔ زبردست...... ویری گڈ...... ویری گڈ۔ اب میں خاصا مطمئن ہو گیا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب تمہیں......“

”بات یہیں تک نہیں ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی بے شمار چیزیں چھوٹے سے بریف کیس میں موجود ہیں جو دشمن کے خلاف ایک موثر ہتھیار ثابت ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ ٹوتھ برش، یہ ٹوتھ پیسٹ اور یہ لوشن آفٹر شیو۔ ان میں سے ہر چیز ایک ہتھیار ہے۔ لیکن اس وقت جب اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔“

”کمال ہے...... واقعی کمال ہے۔ کیا تم اس ہوٹل میں مطمئن ہو؟“

”ہاں...... ریبون میں یہ ایک خوبصورت ہوٹل ہے۔“

”ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ واقعی زبردست چیز ہے یہ۔ میرا مطلب ہے یہ ہوٹل۔ اب یہ بتاؤ اس کے بعد کیا کرنا ہے۔“

”ہم آسانی سے ہیلیکون کے ساحلی علاقے میں نہیں داخل ہو سکتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس علاقے کو مکمل طور پر ڈان بیورس نے اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے اور وہاں رسائی آسان چیز نہیں ہے۔ لیکن بہرحال ہم اس جگہ کے بارے میں تگ و دو کریں گے جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ڈان بیورس کی خوفناک تجربہ گاہ ہے۔“

”او کے...... اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ شہباز نے کہا اور لیشک خوش دلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شہباز ازراہِ اخلاق لیشک کو چھوڑنے کے لئے ہوٹل کی لفٹ تک آیا تھا۔ راستے میں دونوں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اور پھر شہباز اپنے کمرے کی جانب واپس چل پڑا۔ رات ہو چکی تھی۔ ایک ہلکی سی کھولت اس پر سوار تھی چنانچہ اس نے رات کا کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوالیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ دور دور تک روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی شہباز کو اپنی تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ یہ کمی نجانے کس شکل میں پوری ہو سکتی ہے، یہ فیصلہ وہ کبھی نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ بہت دیر تک وہ کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ باہر کی ہنگامہ آرائیوں میں بتدریج کمی آتی جا رہی تھی اور ماحول پر خاموشی سی طاری ہونے لگی۔ چنانچہ وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

رات کا نجانے کون سا وقت تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہے۔ لیکن آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ نہ کچھ ضرور تھی اور یہ اس کی فطری جبلت تھی کہ ایک لمحے میں اسے احساس ہوا کہ کوئی خطرہ قریب ترین ہے۔ اس کے اعضاء اس کے شعور کے تابع تھے اور اسی شعور نے اسے سوتے ہوئے بھی یہ احساس دلا دیا تھا کہ خطرہ اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور اس خطرے سے نمٹنے کے لئے راستہ بھی اس کے شعور نے ہی منتخب کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے نہ تو جنبش کی اور نہ آنکھیں کھولیں۔ لازمی امر تھا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں ہے، وہاں کوئی اور بھی ہے۔ شہباز کا ریوالور تھوڑے فاصلے پر ذرا نیچی ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ اسے اٹھاتے ہوئے لازمی بات تھی کہ اسے اپنے بدن کو جنبش دینا پڑتی۔ وہ پہلے یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اگر کمرے میں کوئی ہے تو کون ہے؟ اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں درز پیدا کی اور غور کیا تو اسے کمرے میں ایک شخص چلتا پھرتا نظر آیا۔

شہباز اس کا بھرپور جائزہ لیتا رہا۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا اور کسی قدر پستہ قامت تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک فلش لائٹ تھی جسے وہ اِدھر اُدھر گھما رہا تھا۔ اور پھر وہ اس سوٹ کیس کی جانب متوجہ ہو گیا جو شہباز کی ملکیت تھا۔ شہباز نے سوچا کہ اس سے نمٹنے کا بہترین موقع ہے۔ جمناسٹک کا تو وہ ماہر تھا۔ لیٹے ہی لیٹے اس طرح جست لگانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور تلاشی لینے والا پھرتی سے پلٹا۔ مگر اسے مہلت نہیں مل سکی۔ شہباز اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا اور اس نے اسے دیوار سے لگا دیا۔ وہ شخص چند لمحوں تک تو کچھ نہ کر سکا لیکن اس کے بعد اس نے بھی پھرتی سے عمل کیا اور فلش لائٹ جو اس کے ہاتھ میں دبی تھی اس نے پوری قوت سے شہباز کے اوپر دے ماری۔ اتنی قوت سے یہ فلش لائٹ اس کے کندھے پر ماری گئی تھی کہ شہباز کو لگا جیسے اس کا کندھا ٹوٹ گیا ہو۔ اس شخص نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور شہباز کو دھکا دے کر دروازے کی طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن شہباز نے فوراً ہی اپنا پاؤں اس کے پاؤں میں اڑایا اور وہ اس طرح فرش پر گرا جیسے کوئی الماری گر پڑتی ہے۔ شہباز نے اس کے بدن کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ درحقیقت گینڈا تھا اور اس کی تقدیر بھی یاور تھی کہ جس جگہ وہ گرا تھا وہاں سے تھوڑے فاصلے پر پتھر کا ایک خوبصورت لیمپ جو ماربل سے بنا ہوا تھا، رکھا ہوا

تھا اور وہ با آسانی اس کی مٹھی کی گرفت میں بھی آ گیا۔ اس نے فوراً ہی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ لیمپ پکڑ کر اس نے پوری قوت سے گھمایا اور ایک چوٹ شہباز کو کھانی پڑی۔

شہباز ایک طرف لڑھک گیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پستہ قامت کھڑکی کی طرف دوڑا۔ لیکن شہباز نے لوٹ لگا کر ایک بار پھر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے دوبارہ کمرے میں گھسیٹ لیا۔ اس شخص نے ہاتھ پیر مارے اور کسی چکنی مچھلی کی طرح شہباز کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ شہباز نے کھڑے ہو کر اس کے سینے پر فلائنگ کک ماری لیکن اندازہ یہ نہیں تھا کہ اس کے نتیجے میں کیا ہو جائے گا۔ وہ سیدھا کھڑکی پر جا کر گرا اور کھڑکی کا شیشہ چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی سے باہر نکل گیا تھا اور اس کی آخری چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔

یہ ہنگامہ آرائی اس قدر خاموش نہ رہ سکی تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد شہباز کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ وہ شخص جو بلندی سے نیچے گرا تھا، نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ آنے والوں میں ہوٹل کا منیجر اور سکیورٹی پولیس کے علاوہ ملیکین پولیس کے افراد بھی تھے۔ کمرے میں روشنی کر دی گئی اور وہ لوگ کمرے کا جائزہ لینے لگے۔

''وہ کون تھا جو کھڑکی کے شیشے سے نیچے جا گرا؟''

''یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں...... یہ سوال تو میں آپ سے کرتا ہوں کہ وہ کون تھا؟ میں سو رہا تھا۔ کمرے میں آہٹیں سن کر میری آنکھ کھلی۔ میں نے کسی کی یہاں موجودگی محسوس کر کے اپنا ریوالور نکالا اور ریوالور دیکھ کر وہ بری طرح بھاگا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور وہ باہر جا گرا۔'' بڑی سادگی سے شہباز نے یہ بیان دیا تھا۔ پولیس آفیسر نے پھر بھی اس کے کاغذات وغیرہ چیک کئے اور منیجر نے اس بات پر احتجاج کیا۔

''یقیناً وہ کوئی چور تھا۔ آپ اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ ہم اپنے معزز مہمانوں کو اس طرح کی تکلیف دینا برداشت نہیں کریں گے۔''

''اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ کوئی معمولی سا چور تھا اور چوری کی نیت سے آیا تھا۔'' پولیس آفیسر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''یقیناً...... ظاہر ہے، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔'' شہباز نے کہا۔ اور جب وہ

لوگ چلے گئے تو شہباز نے سوچا کہ وہ کوئی معمولی چور نہیں ہو سکتا۔ کون ہے، کیا ہے؟ دل تو چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

بہر حال ہوٹل کے دو ملازمین آئے اور انہوں نے کھڑکی کے اندر کی جانب پڑا ہوا شیشہ صاف کیا، کھڑکی پر پردہ برابر کیا گیا۔ ان میں سے ایک نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''کل صبح سب سے پہلا کام یہی کیا جائے گا جناب! کہ کھڑکی میں نیا شیشہ لگوا دیا جائے گا۔ ویسے چونکہ کھڑکی سڑک کی طرف ہے اور نیچے سے اوپر آنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اس لئے آپ کا کمرہ غیر محفوظ نہیں ہے۔ پھر بھی آپ ہمیں تھوڑا سا وقت ضرور دیں گے۔ کیونکہ اس وقت رات ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔'' شہباز نے کہا اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اس کی سوچوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔

دوسری صبح لیشک اس کے ہوٹل پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

''میں نے اس سلسلے میں کافی ہوم ورک کیا ہے۔ میری تھوڑی سی معلومات اور اس سلسلے میں تمام تر کارروائی۔ اور پھر معاف کرنا میرے دوست! تمہاری پسندیدگی یہ ساری چیزیں مل کر ایک اہم حیثیت اختیار کر گئیں۔''

شہباز نے اسے رات کے واقعہ کے بارے میں بتایا اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔

''اوہ مائی گاڈ۔ کون ہو سکتا تھا وہ۔ آہ، اگر مجھے رات ہی کو پتہ چل جاتا تو میں لازمی طور پر پولیس ہسپتال جا کر اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہو سکیں گی۔ پتہ نہیں کون تھا اور یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔ آہ...... کیا یہ ممکن ہے کہ کسی کو تمہارے بارے میں کوئی شبہ ہو گیا ہو؟ حالانکہ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں ہر مسئلے کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔''

بہت دیر تک لیشک اس سلسلے میں قیاس آرائیاں کرتا رہا، پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''خیر، ٹھیک ہے۔ حقیقت کسی نہ کسی شکل میں منظر عام پر آ ہی جائے گی۔ لیکن اب میرے دوست! تم مجھے یہ بتاؤ کہ آگے کا منصوبہ کیا ہے؟''

''ابھی تم نے اپنے ہوم ورک کے سلسلے میں بتایا تھا۔ یہ ہوم ورک کیا ہوسکتا ہے؟''

''دیکھو، میں ہر اس جگہ تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کرنے کو تیار ہوں جہاں تم میری ضرورت محسوس کرو۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ فیصلے تم ہی کرو۔ میں اپنے کسی غلط فیصلے کے لئے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ کیا سمجھے؟''

''ہاں...... میں سمجھ رہا ہوں۔ میرے علم میں جو تفصیلات لائی گئی ہیں ان کے مطابق ہیلیکون کا یہ علاقہ ایک طرح سے ریبون سے کٹ ہی جاتا ہے اور اس تک جانے کے لئے بہت سی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''بے شک...... لیکن ہیلیکون کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے تم کیا طریقہ کار اختیار کرو گے؟ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں اور یقینی طور پر جب تمہیں اس بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہوں گی تو بتایا گیا ہوگا کہ ڈان بیورس اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ حکومت میلیکو اس پر بے پناہ بھروسہ کرتی ہے اور تم ایک بات ذہن نشین کرلو، اگر کبھی حکومت میلیکو کے کسی نمائندے کو یہ بتاؤ گے کہ ڈان بیورس اصل میں ان کا نہیں بلکہ پلاسکو کا وفادار ہے تو پہلے تو وہ تمہیں حیرت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اگر کوئی خوش مزاج شخص ہوا تو ہنس کر تمہارا مذاق اڑائے گا۔ اور بدمزاج ہوا تو فوراً تمہارے خلاف کچھ کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ میرا مطلب کہنے کا یہ ہے کہ اس کی گڈ وِل ایسی ہی ہے۔ اور وہ لوگ اسے اپنا ہیرو مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ ان کے لئے ایک بیش بہا نعمت ہے جو اپنی سائنسی ایجادات سے میلیکو کو دوام بخش رہا ہے۔ اس لئے کبھی یہ مت سوچنا کہ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے تمہیں میلیکو سکیورٹی کی مدد مل سکتی ہے۔''

''بھول جاؤ اس بات کو لیشک! رازل جریری نے جو ذمے داری میرے سپرد کی ہے وہ مجھے ہی پوری کرنی ہے۔ مائنڈ مت کرنا میرے دوست! اگر تم بھی اس قدر شاندار طریقے سے میری مدد نہ کرتے تب بھی مجھے یہ کام اپنی ذہنی پہنچ کے مطابق کرنا ہی تھا۔''

''بے شک...... بے شک۔ تو تمہارے پاس اس سلسلے میں کیا منصوبہ ہے۔''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ایک بہت بڑا علاقہ اس کے قبضے میں ہے۔ سمندر میں اس نے بہترین انتظامات کر رکھے ہیں اور سنا ہے کہ بہت سی گن بوٹیں اس کے مفادات کے لئے وہاں مستعد ہیں۔ حکومت میلیکو اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کرتی ہے

کیونکہ وہ ان کا ایٹمی سائنسدان ہے۔ اسے بھرپور تحفظ حاصل ہے میلیکن نیوی کا۔ چنانچہ فرض کرو اگر تمہیں کشتی کے ذریعے ہیلیکون کی حدود میں داخل کیا جائے تو بہرحال یہ ایک مشکل عمل ہوگا۔ اور اگر ریلوے کے ذریعے تم یہ سفر کرو گے تو یقینی امر ہے کہ کہیں نہ کہیں ان کی نگاہوں میں آجاؤ گے۔''

''وہ ایریا کتنا بڑا ہے جہاں ڈان بیورس کے لئے فوجیں پھیلی ہوئی ہیں...... میرا مطلب ہے سمندری محافظ؟''

''تقریباً سو میل کا علاقہ ہے۔''

''اگر ہم کشتی کے ذریعے سفر کرتے ہیں تو کیا یہ ایک مشکل کام نہیں ہوگا؟''

''یقیناً ہوگا۔ لیکن تھوڑی سی عقل سے کام لیا جائے تو یہ اتنا مشکل نہیں رہے گا۔'' لیشک نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''مچھلیاں پکڑنے والے دنیا کے کون سے ملک میں نہیں ہوتے۔ ہم ایک اعلیٰ درجے کی کشتی کی بجائے اگر کسی ماہی گیری کشتی میں یہ سفر کریں تو ہمارے لئے زیادہ محفوظ ہوگا اور تم خود بھی دیکھ چکے ہو کہ ریبون کے ساحل پر کس انداز میں ماہی گیری ہوتی ہے اور وہ لوگ جو کشتیوں میں زندگی گزار دیتے ہیں ہر علاقے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اصل میں وہ میلیکن آرمی اور میلیکن پولیس کے لئے قابل ہمدردی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں کوئی بھی برا انداز اختیار نہیں کرتا اور ان کی غربت پر ترس کھا کر ان سے چھوٹا موٹا تعاون بھی کرلیتا ہے۔''

''ویری گڈ...... پھر تو یہ اچھی بات ہے۔ ہمیں کشتی ہی سے یہ سفر کرنا چاہئے۔ لیکن ایک بات بتاؤ، کیا ایسی کسی کشتی کا بندوبست ہوسکتا ہے؟''

''لیشک انہی امراض کی دوا ہے۔'' لیشک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا۔

''ہم نیرو برج تک جائیں گے۔ پھر وہاں سے کیٹلان اور اس کے بعد ہمیں ریلوے لائن مل جائے گی جس کے سہارے ہم آگے بڑھتے رہیں گے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ڈان بیورس کا وہ شیش محل کیٹلان کے شمال میں واقع ہے اور یہ بات بالکل طے

ہے کہ وہ ہیلیکون کے اس ساحل سے اپنی تمام ضروریات پوری نہیں کرتا ہوگا بلکہ سو فیصد
اس کی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں ٹرین کے راستے سے آتی جاتی ہوں گی اور اس نے اس
قسم کے انتظامات کر رکھے ہوں گے کہ ٹرین کیٹلان کے علاقے میں رک جائے اور اس
منگوایا ہوا مال آن لوڈ کر دے۔ آہا...... ایک شخص مجھے یاد آیا۔ واہ...... واہ...... وہ تو ہمارے
لئے بہت ہی عمدہ ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘

’’کون؟‘‘ شہباز نے سوال کیا۔

’’اس کا نام گارشیہ ہے۔ وہ سمندر کا کیڑا ہے۔ حالانکہ وہ کیٹلان کے علاقے میں ایک
کسان کی حیثیت سے رہتا ہے لیکن وہ کشتی کی مدد سے مختلف علاقوں میں گھومتا پھرتا ہے۔
یہ اس کا شوق بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی۔‘‘

’’تو پھر تم اس سلسلے میں انتظامات کرو۔‘‘ شہباز نے کہا اور لیشک نے گردن ہلا دی۔
پھر بولا۔

’’میرے لائق اور کوئی کام ہو تو مجھے بتاؤ۔‘‘

’’نہیں، اور بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔ اور پھر تم جو کچھ کر رہے ہو وہ معمولی کام تو نہیں
ہے۔ مسٹر رازل جریری نے میرے سپرد ذمے داریاں تو بے شک کی ہیں لیکن تم جیسے لوگوں
کو میرا مددگار بنا کر انہوں نے میرے لئے بے حد آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور میں اس کے
لئے ان کا شکر گزار ہوں۔‘‘

’’تھینک یو سر!‘‘ لیشک نے مسکرا کر گردن خم کی اور اس کے بعد لفٹ کے ذریعے نیچے
کی طرف چل پڑا۔ شہباز یونہی بالکونی میں جا کھڑا ہوا تھا۔ یہاں سے نیچے کا منظر صاف
نظر آتا تھا۔ لیکن یہ اتفاق بس اتفاق ہی تھا کہ اس وقت وہ بالکونی میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اس
نے لیشک کو دیکھا جو نیچے اتر کر سڑک پر نکلا ہی تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک کار اس
کے پاس آ کر رکی۔ یہ غالباً پولیس کار تھی لیکن پرائیویٹ۔ اس پر پولیس کا مونوگرام نہیں
تھا۔ یا تو یہ لوگ سادہ لباس میں پولیس والے تھے۔ اصل میں ان پر پولیس کا شبہ اس لئے
کیا گیا کہ لیشک کے سامنے آ کر انہوں نے اپنا کارڈ نکالا اور اس کے سامنے کیا اور اس
کے بعد اس سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اب اس وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا
کہ شہباز برق رفتاری کا مظاہرہ کرے۔ لفٹ نیچے گئی ہوئی تھی اور سیڑھیوں سے اترنے

مطلب یہ تھا کہ لیشک کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے۔ وہ لوگ شہباز کو شکل سے
اچھے نہیں معلوم ہوئے تھے۔ یقیناً لیشک اس وقت خطرے میں ہے اور یہاں شہباز نے
اپنی اسی فنکاری سے کام لیا جس فنکاری نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔ نیچے کی بالکونی
زیادہ نیچی تو نہیں تھی لیکن ایک چھوٹے سے پائپ کا سہارا لے کر اس بالکونی تک اور اس
کے بعد اسی جیسے دوسرے پائپ سے دوسری بالکونی تک اور پھر سڑک تک پہنچنے میں اس
نے جس برق رفتاری کا مظاہرہ کیا وہ کسی بندر کے بس کی بات بھی نہیں تھی اور اگر اتفاقیہ طور
پر دیکھنے والوں نے اسے دیکھا ہوگا تو وہ دنگ رہ گئے ہوں گے۔ وہ تو یہی سمجھے ہوں گے کہ
کوئی شخص بالکونی سے نیچے گر رہا ہے۔

بہرحال لیشک کچھ ہی لمحوں میں سڑک پر پہنچ گیا تھا اور اس وقت شہباز نے دیکھا کہ
ان میں سے ایک شخص لیشک کا بازو پکڑ کر اس کار کی جانب بڑھ رہا ہے جو کچھ فاصلے پر رکی
ہوئی تھی۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ہی لیشک نے اپنا بازو
موڑا اور اپنی کہنی پوری قوت سے اس شخص کی گردن پر ماری جس نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا
وہ اپنی گردن پکڑ کر کراہا اور زمین پر گر گیا۔ لیشک اس کی قید سے آزاد ہو گیا تھا اس سے
پہلے کہ دوسرا اس کی طرف بڑھتا لیشک نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے سینے پر وار کیا اور وہ
اچھل کر چاروں شانے چت گرا۔ ایک لمحے تک وہ اٹھ نہیں سکا تھا اس دوران شہباز اس
کے قریب پہنچ گیا۔ لیشک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر اس طرح اوپر کی
طرف جیسے اسے اس بات کا خیال ہو کہ شہباز اوپر سے نیچے کود پڑا ہے ورنہ اتنی جلدی میں
پلک جھپکنے کی دیر کے اندر اندر کوئی اوپر سے کس طرح نیچے اتر سکتا ہے۔ لیشک نے پھٹی پھٹی
آواز میں کہا۔

’’مسٹر شہباز! کیا آپ اوپر سے کود پڑے ہیں؟‘‘

’’یہی سمجھ لو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ان لوگوں کے چکر میں پڑو کیا یہ پولیس والے
ہیں۔‘‘

’’لگتا نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ پی ڈبلیو کا روپ دھارے ہوئے
ہیں۔ پی ڈبلیو یہاں کی وہ پولیس ہوتی ہے جو پولیس کی وردی میں نہیں ہوتی لیکن ان کے
پاس پولیس کے شناختی کارڈ ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ وہ بھی نہیں لگتے۔ مگر ان کا کیا کریں؟‘‘

''اب یہ جو کوئی بھی ہیں اور ہم ان کے ساتھ جو سلوک کر چکے ہیں اس کے بعد ان
کھڑے ہونا مناسب نہیں ہے۔ دیکھو لوگ ہماری طرف متوجہ ہو رہے ہیں کہیں ایسا نہ
کہ ہمارے گرد مجمع جمع ہو جائے۔''

وہ دونوں اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیشک نے شہباز کو اشارہ کیا اور شہباز نے ا
کے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک کو ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اصل
کام کچھ اور ہی تھا۔ گرے ہوئے شخص نے اٹھنے کے لئے ہاتھ کا سہارا لیا۔ لیکن شہباز ک
ٹھوکر اس برق رفتاری سے اس کے سر پر پڑی کہ دیکھنے والوں کو بھی اندازہ نہیں ہو سکا
لیشک نے بھی یہی عمل کیا تھا اور اس کے بعد وہ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ وہ دونوں زمی
پر ہاتھ ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہباز اور لیشک کافی آگے بڑھ کر ایک ایسی ا
میں ہو گئے جہاں سے وہ ان لوگوں کا جائزہ لے سکتے تھے۔ کئی راہ گیر ان کے پاس پہنچ گ
تھے اور جھک کر ان سے صورتحال پوچھنے لگے تھے۔ لیکن اس وقت ان کی جو حالت تھی
ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی کسی خاص کیفیت کا اظہار کرتے۔ گرتے پڑتے وہ اپنی کار میں پہ
تھے اور اس کے بعد کار سست رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔ لیشک نے آہستہ سے کہا۔

''یہ ہوٹل اب مشکوک ہو چکا ہے۔''

''ہاں...... لیکن کوئی بات نہیں ہے، میں محتاط رہوں گا۔''

''او کے...... میں چلتا ہوں۔ مجھے انتظامات کرنے ہیں۔''

اس کے بعد لیشک چلا گیا اور شہباز ٹہلنے کے انداز میں اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑا۔
اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ کوئی اس ک
جانب متوجہ نہیں ہے۔ وہ راہ گیر جو ان دونوں کے گرد جمع ہو گئے تھے، کوئی صحیح صورتحال نہ
کر منتشر ہو گئے تھے اور اب وہاں کی زندگی معمول پر تھی۔

***

ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچ کر شہباز نے اس طرح کے انتظامات کئے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اگر کچھ لوگ لیشک کو اس طرح روک کر اس سے سوالات کر سکتے تھے یا پھر اس کو لے جانے کی کوشش کر سکتے تھے تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شہباز کا پتہ لگاتے ہوئے اس کے ہوٹل تک پہنچ جائیں۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ البتہ کافی دیر کے بعد شہباز کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور شہباز چونک پڑا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر بھاری لہجے میں کہا۔

''کون ہے...... آجاؤ......''

لیکن آنے والا اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ ایک نوجوان اور خوش شکل لڑکی جو اس طرح اندر داخل ہوئی تھی جیسے جھجک رہی ہو۔ شہباز اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں...... کہو، کیا بات ہے؟''

''سر! آپ نے مجھے طلب کیا تھا؟''

''نہیں...... کون ہو تم؟''

''نیشن میرا نام نیشن گراہم ہے۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ روم نمبر چار سو ستائیس میں مسٹر گواسکر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''نہ تو یہ روم نمبر چار سو ستائیس ہے اور نہ میرا نام گواسکر ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم نے دروازے پر میرے کمرے کا نمبر نہیں دیکھا۔''

''اوہ...... سو...... سوری۔ سوری سر! میرا مطلب ہے کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

شہباز نے ایک نگاہ اسے غور سے دیکھا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

''آپ کو مسٹر گواسکر سے نہیں ملنا؟''

"آپ سے مل لوں گی۔ بات ایک ہی ہے۔"

"اوہو، اچھا...... ذرا آیئے میرے ساتھ۔" شہباز اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آ گئی تھی۔ وہ کسی قدر حیران تھی۔ شہباز اسے لے کر راہداری میں آ گیا۔

"وہ روم نمبر چار سو ستائیس ہے۔ اور مسٹر گواسکر آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جایئے پلیز۔" یہ کہہ کر شہباز اسے راہداری میں چھوڑ کر دروازے سے اندر داخل ہوا اور اندر سے کمرہ بند کر لیا۔ پھر اسے خود ہی اپنے اس اقدام پر ہنسی آ گئی۔ اب اس قدر نا تجربے کار بھی نہیں رہا تھا کہ لڑکی کا مقصد نہ جان سکتا۔ چہرے سے بھی وہ ذرا کال گرل ٹائپ ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ انداز ہوتے ہیں ان لوگوں کے بھی۔ تجربہ تو بے شک نہیں تھا لیکن اب رفتہ رفتہ اس طرح کے تجربات بھی ہوتے جا رہے تھے۔ یہ بھی سوچا تھا اس نے ایک لمحے کے لئے کہ ممکن ہے لڑکی اس کی ٹوہ لینے آئی ہو۔

بہر حال ان سارے معاملات پر غور کرنا بڑا ضروری تھا۔ اس کے بعد لڑکی دوبارہ اس طرف نہیں آئی تھی۔ شہباز کو ایک افسوس ہونے لگا۔ وہ یہ کہ باہر نکالنے کے بعد اسے کسی نہ کسی شکل میں لڑکی کا جائزہ لینا چاہئے تھا، وہ مطلوبہ کمرے تک گئی یا وہیں سے کہیں اور چلی گئی۔ بہر حال اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد وقت گزرتا رہا۔ پھر اسے لیشک کا پیغام ملا۔ لیشک نے اسے ریبون کے ایک مخصوص حصے میں ساحلی علاقے میں پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ اس نے تھوڑی سی تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

"یلو ڈریگن نامی کشتی ہمارے کام کے لئے تیار ہو گئی ہے اور میں نے اپنے مخصوص ذرائع سے کام لے کر وہ انتظامات کر لئے ہیں جو ہمیں ہماری منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔"

انسانوں سے بھرے ہوئے اس ساحل پر شہباز کو یہ دونوں چیزیں تلاش کرنی تھیں یعنی یلو ڈریگن اور لیشک۔ لیکن یلو ڈریگن سے پہلے لیشک مل گیا۔ اس نے بے تکلفی سے ہاتھ ہلایا اور شہباز اس کے قریب پہنچ گیا۔ لیشک نے کہا۔

"بڑی اچھی کشتی کا انتظام ہو گیا ہے اور ہم نے انہیں میرا مطلب ہے میں نے اس کی ادائیگی کر دی ہے۔ رازل جریری کے اکاؤنٹ میں۔"

"گڈ...... لیکن وہ ہے کہاں؟"

"آؤ...... کشتیوں کے اس ہجوم میں وہ بھی کہیں نہ کہیں ہو گی۔" اور پھر انہوں نے اس کشتی کو تلاش کر لیا جو یلو ڈریگن کے نام سے منسوب تھی۔ سفید رنگ کے پینٹ پر پیلے رنگ کا ایک ڈریگن نظر آ رہا تھا۔ وہ کافی بڑی کشتی تھی۔ اوپر سے بند۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں نہیں ہو گا کہ یہ سطح آب پر وہ تیرتا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا نچلا حصہ کئی رنگوں سے بنا ہوا تھا۔ باقی باڈی سفید اور اس پر یلو ڈریگن کا نشان۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے تو انہوں نے ایک آدمی کو اس کے کھلے حصے میں بیٹھے جال کی مرمت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے علاوہ وہاں ایک عورت اور دو بچے بھی تھے۔ عورت مٹی کے چولہے پر کچھ پکا رہی تھی۔ وہ دونوں کنارے پر پہنچے تو جال مرمت کرنے والے شخص نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا۔

"ہاں...... کیا بات ہے؟ کوئی کام ہے؟"

"بہت ضروری کام ہے۔ صبح کا ستارہ ڈوبنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔"

"آ جاؤ...... آ جاؤ" ایک لمحے کے لئے تو شہباز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت صبح کا ستارہ کہاں سے نکل آیا۔ لیکن فوراً ہی لیشک نے اس کی تفصیل بتا دی۔

"یہ کوڈ ورڈ ہے جو اسے بتا دیا گیا ہے۔"

وہ شخص جو پہلے کرخت لہجے میں بولا تھا اب ایک دم نرم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"آ جایئے...... آ جایئے۔ ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

لیشک اور شہباز کشتی پر اتر گئے اور اس مکان نما کشتی کا جائزہ لینے لگے۔ لیشک تو تنقیدی نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن شہباز کے انداز میں حیرت تھی۔ پانی پر تیرتا ہوا کوئی مکان اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اور جب بھی وہ کسی ایسی نئی چیز کو دیکھتا تھا اس کے ذہن میں ماضی کے تصورات آ جاتے تھے۔ سرکس کی زندگی بھی بہر حال بھولنے والی چیز نہیں تھی۔ جب سرکس کسی دوسرے شہر، بستی یا علاقے میں منتقل ہوتا تو شہباز کے دل میں یہی خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ یہاں کے رہن سہن، یہاں کی زندگی کا جائزہ لے یہاں کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں، کیسے ان کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں شہباز کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتی تھیں اور جب اس کے باپ نے اسے شہر میں تعلیم حاصل

کرنے کے لئے بھیج دیا تھا تو وہ ہمیشہ اسی بات کی حسرت کرتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔
بھی سرکس کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ جاتا اور نئی نئی زندگی کو دیکھتا۔ لیکن اب صورت حال
بالکل مختلف ہوگئی تھی۔ وہ دنیا کے دوسرے خطوں کو دیکھ رہا تھا اور انتہائی ہوش مندی کے
عالم میں دیکھ رہا تھا۔ وہاں تو صرف بچپن اور معصومیت ہوا کرتی تھی لیکن یہاں مکمل تحقیق
بہرحال وہ اس ماحول سے کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے قرب و جوار میں تیر
کشتیوں کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس دوران لیشک نے جال مرمت کرنے والے شخص سے
پوچھا۔

"کیا تمہارا یہ خاندان ہمارے ساتھ ہی سفر کرے گا؟"

"تو پھر؟" اس نے سوال کے جواب میں خود سوال کر ڈالا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے......"

"ہم لوگ ہمیشہ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم اور کہاں جائیں گے۔ ہمیں جو کام بھی کرنا ہوتا ہے اسی پر کرلیا کرتے ہیں۔ ہم تمہیں تمہاری مطلوبہ منزل پر اتاریں گے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ جائیں گے۔"

"گڈ...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے تو صرف معلومات کے لئے تم سے یہ سوال کیا تھا۔ ویسے تم کیا کرتے ہو؟"

"ہم یہاں چٹائیاں بناتے ہیں اور انہیں فروخت کرکے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ دیکھو، یہ چٹائیوں کا ڈھیر یہاں موجود ہے۔ یہ بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ اگر کبھی کوئی خطرہ پیش آئے تو ان کے درمیان چھپ کر پناہ لی جاسکتی ہے۔"

"خطرہ......؟" لیشک نے سوال کیا۔

"تمہارے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ ظاہر ہے جس انداز میں تم سفر کرنا چاہتے ہو وہ......" یہ کہہ کر وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ عورت ہانڈی میں سے مچھلی کا شوربہ نکال کر بچوں کو دے رہی تھی اور دونوں بچے شور مچا رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"تم رات کو سفر کرو گے؟"

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے۔ حالانکہ کشتیاں زیادہ تر دن میں ہی سفر کرتی ہیں۔ کیونکہ رات کے وقت

سمت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ اگر ہم ساحل کی پٹی سے لگ کر چلتے رہیں گے تو بھٹکنے کا امکان کم ہوگا۔"

"شام کو روانگی کیسی رہے گی؟"

"یہ تمہاری مرضی پر ہے۔ ہم نے تو اپنے آپ کو تیار کرہی لیا ہے۔"

بہرحال یہاں سارا معاملہ پکا کرنے کے بعد لیشک نے کہا۔

"اب اور کوئی خاص کام تو رہا نہیں ہے۔ آؤ...... واپس چلیں۔ میرا خیال ہے تم ہوٹل جانا ہی پسند کرو گے۔"

شہباز نے شانے ہلا دیئے اور اس کے بعد وہ ہوٹل چل پڑا۔ لیکن ہوٹل میں جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو شہباز بری طرح چونک پڑا۔

کمرے میں زبردست ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کی ہر چیز الٹ پلٹ کرکے پھینک دی گئی تھی۔ شہباز کے سوٹ کیس کو اچھی طرح ادھیڑا گیا تھا۔ کرسیوں کے غلاف پھاڑ ڈالے گئے تھے۔ غسل خانے میں اسے وہ اشیاء صحیح سلامت نظر آئیں جو اصل میں ایٹم بم تھیں۔ شہباز نے انہیں بریف کیس میں محفوظ کرکے حماقت کا ثبوت نہیں دیا تھا بلکہ انہیں غسل خانے ہی میں سجا دیا گیا تھا تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان میں کوئی اہم بات ہے بلکہ وہ انہیں عام قسم کی چیز نظر آئیں۔ شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم مسکرا رہے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ ہوٹل تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ شکر ہے کہ انہوں نے صرف تلاشی پر ہی دھیان دیا۔ اگر وہ تمہیں خود تلاش کرنے کے بجائے لے جاتے تو بھلا ہم کیا کرسکتے تھے۔ ڈان بیورس کے اختیارات بہت وسیع ہیں اور میلیکو والے اس کے احسان مند۔ بیوقوف، احمق۔ جو لوگ حقیقتوں کو نہیں سمجھ پاتے انہیں بیوقوف کہنا ہی زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال یہ بات طے ہے کہ ہم ان کی نگاہوں میں آچکے ہیں اور اس کے ثبوت یہ دونوں موجود ہیں۔ یعنی تمہارے کمرے کی تلاشی۔ وہ تمہارے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے ہیں اور مجھے اغواء کرکے لے جانے کی کوشش۔ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ وہ لوگ جن کے پاس ایجنسی کے شناختی کارڈ تھے درحقیقت ایجنسی کے لوگ نہیں تھے۔ اگر تھے بھی تو ڈان بیورس کے کارکن اور اس کے آلۂ کار۔"

"وری گڈ...... مزہ آرہا ہے لیشک!" شہباز نے ایک پھریری سی لیتے ہوئے کہا۔

"مزہ؟"

"ہاں۔"

"اب میں نہیں جانتا کہ مزے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"زندگی اگر خطرات سے دوچار رہے تو زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ سادہ سادہ سی زن
گزارنا بھی کوئی زندگی ہے؟ دشمن چاروں طرف تاک میں لگے ہوں، پورا وجود گو
کے نشانے پر ہو اور اپنے آپ کو بچانے کا تصور ہر لمحے دل و دماغ میں رہے تو خو
تحریک زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ورنہ سادہ سی زندگی بھی کیا معنی رکھتی ہے۔"

لیشک نے گہری نگاہوں سے شہباز کا جائزہ لیا اور بولا۔ "بدقسمتی تو یہ ہے کہ تمہار
بارے میں مجھے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ میں تو اس وقت سے حیران ہوں جب
اوپر کی منزلوں سے پلک جھپکتے میں نیچے پہنچ گئے تھے اور صحیح معنوں میں تم نے میری بہ
مدد کی تھی۔ یقیناً تمہارا ماضی اتنا ہی جاندار ہوگا کہ تم رازل جریری کے منظور نظر بن گ
اچھا اب ایسا کرو کہ یہاں سے اپنا سامان سمیٹو۔ اب یہاں رکنا خطرناک ہے۔ ہوسکتا
وہ لوگ مزید کوئی کوشش کریں کیونکہ انہیں تم پر شبہ ہوگیا ہے۔"

شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ انہوں نے سامان سمیٹ لیا اور پھر اس کے بعد ش
سے کہنے لگا۔

"آؤ...... میں تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملاؤں جسے دیکھ کر تمہیں حیرت ہوگی۔"

جس جگہ وہ شہباز کو لے کر گیا وہ ایک چھوٹا سا اوپن ایئر پب تھا۔ کرسیاں لگی
تھیں۔ ایک طرف کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ علاقہ پُرفضا اور حسین تھا۔ لیکن جس شخص کو شہباز
وہاں دیکھا، اسے دیکھ کر وہ شدید حیران ہوا۔ کیونکہ وہ لیشک کا دوسرا روپ تھا
جسامت، وہی نقوش، ویسے ہی بال، ویسی ہی آنکھیں۔ شہباز نے حیرانی سے لیشک
دیکھا تو وہ بولا۔

"یہ چاؤ ہے، ایئرک چاؤ۔ میرا جڑواں بھائی۔ میں نے تمہیں اپنا پورا نام نہیں بتایا
میرا نام ایئرک لیشک ہے۔ چاؤ یہاں یہ چھوٹا سا ریستوران چلاتا ہے۔ اور دلچسپی کی
یہ ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ اس مشن میں شریک ہوگا۔"

"یہ...... کیوں اس شریف آدمی کو......"

"نہیں، یہ شریف آدمی بھی رازل جریری کا دست راست ہے۔ میرا مطلب ہے اس کا
مقامی کارکن۔"

"یہ تو تم نے بڑی انوکھی اور حیران کن بات بتائی۔ میں واقعی حیران ہوا ہوں۔ اور بڑی
دلچسپ شخصیت ہے یہ۔ ہیلو ڈیئر چاؤ! تم نے مل کر حیرت ہوئی۔" شہباز نے اس سے ہاتھ
ملاتے ہوئے کہا۔ چاؤ نے بھی خوش اخلاقی سے اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"تم ایک خوبصورت اور دلچسپ انسان ہو۔"

"ہاں......تو اب کیا ارادہ ہے؟" شہباز نے سوال کیا۔

"ہم تھوڑی دیر یہاں رکیں گے اور پھر یہاں سے ساحل پر چلیں گے۔" لیشک نے کہا
اور پھر اپنے بھائی سے بولا۔

"تمہیں کوئی ایسی مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"نہیں، میں مکمل تیاریاں کر چکا ہوں۔"

بعد میں پتہ چلا کہ لیشک مقامی طور پر جو تیاریاں کرتا ہے اس کی تمام ذمے داریاں
چاؤ پر ہوتی ہیں۔ چاؤ تو لیشک سے بھی زیادہ پھرتیلا اور باعمل آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس
وقت سورج غروب ہو چکا تھا جب وہ ساحل پر پہنچے۔ کشتی کا مالک جس کا نام بعد میں ڈیکن
پتہ چلا تھا اس وقت کشتی پر موجود تھا۔ پھر اچانک ہی لیشک کو کوئی احساس ہوا اور وہ رک
گیا۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ایک منٹ چاؤ! تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟"

شہباز حیران رہ گیا۔ پتہ نہیں لیشک کس کی بات کر رہا تھا۔ چاؤ نے مسکرا کر گردن ہلا کر
کہا۔

"میں جانتا ہوں لیشک! تمہاری چھٹی حس بہت تیز ہے۔ مجھے بھی اچانک ہی یہ خیال
آیا۔ سوری ڈیئر شہباز! تم آؤ ذرا۔ ہم اب براہِ راست اس کشتی تک نہیں جائیں گے بلکہ
ہمیں گھوم کر جانا ہوگا۔ نجانے کیوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا ہے۔ کیا کہتے ہو اس
شخص کے بارے میں جو پتھرایا ہوا سا بیٹھا ہے؟" لیشک نے ڈیکن کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ ڈیکن ان کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور وہ ہل جل بھی نہیں
رہا تھا۔ شہباز کو بھی ایک دم احساس ہوا کہ کوئی غیر معمولی صورتحال ضرور ہے۔ چنانچہ ان

لوگوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان ایک جگہ محفوظ کیا، جوتے اتار کر وہیں رکھے اور ا
چیزیں جو بھیگ کر خراب ہو سکتی تھیں، وہیں محفوظ کر دیں اور اس کے بعد پانی میں اتر گ
تینوں بہترین تیراک تھے چنانچہ پانی کے نیچے ہی نیچے چلتے ہوئے وہ اس کشتی تک پہ
جہاں ڈیکن اب بھی اسی انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور پھر ان کا اندازہ درست ثابت ہوا
مدھم روشنیوں میں انہوں نے ان تینوں افراد کو دیکھ لیا تھا جو ریوالور لئے وہاں موجود تھے
ان میں سے دو نے ڈیکن کی بیوی اور اس کے دونوں بچوں کو کور کر رکھا تھا اور ایک کچ
فاصلے پر ڈیکن کو ٹارگٹ بنائے انتظار کر رہا تھا کہ وہ لوگ آئیں۔ لازمی امر تھا کہ یہ شہبا
اور اس کے دونوں ساتھیوں کی تاک میں تھے۔ یہ لوگ اس طرح کشتی پر چڑھے کہ انہو
نے کشتی کو ہلنے بھی نہ دیا۔ اس کے بڑا اور وزنی ہونے سے یہی فائدہ ہوا تھا۔ لیکن جیسے ہ
وہ چونکے یہ تینوں ان پر ٹوٹ پڑے اور کشتی میں زلزلہ سا آ گیا۔ ان تینوں کو گمان بھی نہی
تھا کہ اچانک ان پر اس طرح حملہ ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں بے اختیا
بھاگے۔ ضربیں تو ان پر شدید پڑی تھیں لیکن جاندار لوگ تھے۔ ریوالور سمیت پانی میں کو
گئے اور اپنی جان بچائی۔ پھر پانی کے نیچے ہی نیچے وہ غائب ہو گئے تھے ورنہ شاید ان م
سے ایک آدھ ان لوگوں کے کام کا ثابت ہوتا۔ ڈیکن ایک دم سنبھل گیا تھا۔ اس ن
آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ تینوں اچانک ہی ہماری کشتی پر آ گئے تھے اور مجھ سے تمہارے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔''

''کیا......؟'' لیشک نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''وہ پوچھ رہے تھے کہ دن میں جو دو افراد مجھ سے ملے تھے اور جنہوں نے میری کشتی کرائے پر حاصل کیا ہے وہ کون تھے اور کہاں جانا چاہتے تھے۔''

''اوہ میرے خدا...... اس کا مطلب ہے کہ ڈان بیورس اب پوری طرح ہماری جانب متوجہ ہے اور یقیناً اسے اپنے پراسرار ذرائع سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کوئی اس کے خلاف کچھ کرنے پر آمادہ ہے۔ پھر تم نے کیا بتایا انہیں مسٹر ڈیکن؟''

''مجبوری تھی ماسٹر! وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آپ لوگ کہاں جائیں گے اور کہاں اتریں گے۔ میں انہیں بتانے پر مجبور تھا اس لئے کہ میری کھوپڑی کی تین طرف ریوالور د

کی نالیں اٹھی ہوئی تھیں۔''

''اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ اب یہ سفر ہمارے لئے ممکن نہیں رہا۔ واقعی اب ان کے علم میں آ گیا ہے کہ ہم ڈان بیورس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ آؤ چلیں...... اب اس کشتی پر سفر کسی بھی طور ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔''

وہ کشتی سے باہر نکل آئے۔ چاؤ بھی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''تو اب کیا ارادہ ہے...... کیا، کیا جائے؟''

''ظاہر ہے نئی کشتی کی تلاش۔ اور اس بار یہ کشتی کرائے پر نہیں حاصل کی جائے گی۔ کرایہ تو ہم ادا کر چکے ہیں اور ظاہر ہے اسے ڈیکن سے واپس مانگنا ممکن نہیں ہوگا۔''

''تو پھر......؟''

''چوری کی کشتی۔ سیدھی سیدھی سی بات ہے۔ اس سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہمارے بارے میں کسی کو علم نہیں رہے گا۔'' لیشک مسکرا دیا اور پھر اس نے ایک آنکھ دبا کر شہباز سے کہا۔

''یہ میرا بھائی جو ہے نا، یہ پیدائشی چور ہے۔ بچپن میں گھر میں چوریاں کرتا تھا۔ اس کے بعد پڑوس میں۔ اس نے سب کچھ خود ہی بنایا ہے اور اچھی خاصی حیثیت کا مالک ہے۔'' شہباز بھی لیشک کے انداز پر مسکرا دیا تھا۔ چاؤ اس طرح گردن ہلا رہا تھا جیسے اس کے کارنامے بیان کئے جا رہے ہوں۔ اور اس کے بعد یہ لوگ اس طرح کشتیوں کے اس شہر کا جائزہ لینے لگے جیسے اپنی مملکت میں گھوم رہے ہوں۔ چاؤ کی نگاہیں کسی بہتر کشتی کا جائزہ لے رہی تھیں اور پھر اس نے ایک دور کھڑی کشتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''دیکھو، وہ کشتی کیسی ہے؟ وہ جو تاریکی میں کھڑی ہوئی ہے۔ اور مجھے لگ رہا ہے جیسے وہ خالی بھی ہے۔ اور اس پر کوئی خاندان نہیں۔''

''آؤ ذرا دیکھتے ہیں۔''

اور اس کے بعد وہ تاریکی میں سانسیں روکے آہستہ آہستہ پانی کی جانب چل پڑے۔ باہر کے راستے سے کشتی تک پہنچنا خطرناک بھی تھا اور ناممکن بھی کہ وہ کسی کی نگاہوں میں نہ آ سکیں۔ پانی میں اتر کر وہ اس کشتی کی طرف تیرنے لگے جو انہیں اپنے لئے مناسب معلوم ہوئی تھی۔ نزدیک پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ وہاں صرف ایک آدمی ہے۔ وہ آدمی اچھے خاصے تن

وتوش کا مالک تھا اور کرسی پر بیٹھا لمبی چلم سے سلفاء پی رہا تھا۔ چہرے سے خاصا خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ شہباز نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور پانی سے سر ابھار کر کشتی کے قریب گیا۔ پھر اس نے اپنے سدھے ہوئے بدن کو سنبھالا اور کشتی میں داخل ہو گیا۔ رات کا تھا۔ اور ہر طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ اس شخص نے شاید سانسوں کی آواز سے کس موجودگی محسوس کر لی اور ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے بھاری تن وتوش کے باوجود نے جس قدر پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ اچانک ہی وہ سانپ کی طرح کھا کر جھکا۔ سلفے والی چلم اس نے نیچے رکھ دی اور وہیں سے پھرتی سے دائیں جانب ر ہوئی کلہاڑی اٹھا لی۔ کلہاڑی کا پھل مدھم روشنی میں چمکا اور اس نے دونوں ہاتھوں دستہ سنبھال کر شہباز کے سر پر وار کیا۔ شہباز تیار تھا اور اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ رہا تھا۔ وہ پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا اور کلہاڑی کا پھل زناٹے سے اس کے سر پر سے گ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ وار کرتا، اچانک ہی چاؤ نے دائیں جانب سے اس چھلانگ لگائی اور اسے لئے ہوئے نیچے گرا۔ اس کا ایک ہاتھ اس شخص کے گریبان اور د کلہاڑی کے دستے پر تھا۔ چاؤ بلاشبہ جسامت میں اس شخص سے بہت ہلکا لیکن انتہائی پھر اور طاقتور تھا۔ اس نے پھرتی سے اس کے ہاتھ سے کلہاڑا چھین لیا اور پھر اچھل کر دونو پیروں کی ٹھوکر اس کے سر کے پچھلے حصے پر ماری۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز اور اس نے دونوں ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسی وقت لیشک آگے بڑ اور اس نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔ چاؤ نے اس کا مطلب سمجھا اور اس سے پ کہ شہباز ان سے ایک لفظ بھی کہتا انہوں نے اسے پانی میں دھکیل دیا اور اس کے بعد کشتی کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا کہ کشتی میں اس کے علاوہ اور کوئی نہ ہے۔ چاؤ نے گردن ہلائی اور اس کے بعد کشتی کے پتوار سنبھال لئے۔

''ہمیں ساحل پر جانا ہوگا۔'' لیشک بولا۔

چاؤ نے کشتی آگے بڑھا دی اور تھوڑی دور پہنچ کر کشتی ساحل سے جا لگی۔ انہیں اس اپنا سامان لادنا تھا۔ یہ سامان بھی انتہائی پھرتی سے رکھا گیا۔ شہباز خود بھی مستعد تھا۔ ان لوگ پوری مہارت کے ساتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ رات کی ہولناک تاریکیوں میں کے سینے پر یہ زبردست کام کیا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی کشتی کیٹلان کے سا

سے ہیلیکون کی جانب چل پڑی۔ ہیلیکون کو جزیرہ نما بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن خشکی کے راستے وہاں تک آنے کے امکانات بہت کم تھے کیونکہ یہاں ڈان بیوس کے آدمی موجود ہوتے تھے۔

کشتی کا یہ سفر آگے چل کر انتہائی پُرسکون رہا۔ راستے میں وہ لوگ کافی وغیرہ سے شغل کرتے تھے جس کا انتظام چاؤ نے اپنے چھوٹے سے اوپن ایئر پب سے کر لیا تھا اور سامان کے تھیلوں میں کافی کے تھرمس اور اعلیٰ درجے کے سینڈوچ موجود تھے۔ یہ سفر جاری رہا اور رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ صبح کے تقریباً چار بجے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں نیند تیر رہی تھی لیکن سب نے اپنے آپ کو مستعد رکھا تھا اور نیند بھگانے والی گولیاں کھا رکھی تھیں۔ رات کا سفر تو پُرسکون رہا تھا لیکن صبح کے چار بجے کے قریب انہیں ایک پیٹرول بوٹ کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی وہ انتہائی طاقتور فلش لائٹ نظر آئی جس پر سورج کا گمان ہوتا تھا۔ پیٹرول بوٹ کی یہ فلش لائٹ وقفے وقفے سے آن ہوتی تھی اور جب اس نے اس کشتی کو محسوس کیا تو آن ہو گئی اور اس کی روشنی نے ان کی چھوٹی سی کشتی کو دائرے میں لے لیا۔ ان کی آنکھیں اس تیز روشنی سے بند ہو گئیں۔ پیٹرولنگ بوٹ ان کی کشتی کی چاروں طرف گھومی اور اس کے بعد اس کی لائٹ بجھا دی گئی۔

''کیا خیال ہے...... وہ لوگ کشتی کی چیکنگ کریں گے؟''

''ہو سکتا ہے۔''

''خطرناک تو نہیں ہو گا؟''

''یقیناً ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے بھی امکانات ہیں کہ......''

''اوہو...... دیکھو، شاید ان کا رخ اسی جانب ہے۔''

''خاموش ہو جاؤ۔''

ایک لمحے تک کی خاموشی کی بعد چاؤ کی سرگوشی سنائی دی۔ ''بہر حال وہ ہم سے ہوشیار ہیں۔ یہ بات تو انہیں معلوم ہے کہ ہم ڈان بیوس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ابھی تک ہمارا ان سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا۔''

''کیوں...... تمہیں یاد نہیں ہیں، وہ دونوں افراد جو تمہیں لے جانا چاہتے تھے؟''

''ہاں......''

"دیکھو......رخ تبدیل کرلیا ہے انہوں نے۔ غالباً ہماری طرف سے مطمئن ہو گئے ہیں۔"

"پتہ نہیں ہوئے ہیں یا پھر ہمارے بارے میں رپورٹ دینے جا رہے ہیں۔" یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک ہی لیشک نے کہا۔

"میری چھٹی حس بعض اوقات میرا بہت ساتھ دیتی ہے۔ نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ لوگ ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکے ہیں۔ جس طرح وہ ہمارے قریب آرہے تھے اور اس کے بعد ہمارا جائزہ لے کر دور ہٹ گئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"شاید اس میں کوئی شک نہیں ہے مسٹر شہباز! کہ لیشک کی چھٹی حس نے بڑے بڑے پراسرار کارنامے دکھائے ہیں۔"

"تو اب پھر کیا کیا جائے؟"

"کیوں نہ ہم اس کشتی سے چھٹکارہ حاصل کرلیں۔" لیشک نے تجویز پیش کی۔

"کیا مطلب؟"

"کشتی کے نچلے حصے میں، میں نے پچاس پچاس گیلن کے پٹرول کے دو ڈرم دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر ہم انہیں استعمال کریں تو پھر ہماری موجودگی کا پتہ نہیں چل سکے گا۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا اور اس کے بعد اس بات کے امکانات ہیں کہ ہم بانسوں کے بیڑے پر سفر کریں۔"

"پٹرول استعمال کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" شہباز نے سوال کیا۔ لیکن ابھی اس سوال کا اسے کوئی جواب بھی نہیں ملا تھا کہ ایک بار پھر موٹر بوٹ کا رخ تبدیل ہوا اور وہ ان کی جانب بڑھنے لگی۔

"میں سمجھ گیا......" چاؤ بولا۔

"کیا؟" لیشک نے سرسراتی آواز میں کہا۔ شہباز کو اپنے پورے بدن میں ایک سنسنی کا سا احساس ہو رہا تھا۔ یہ پراسرار اور سسپنس فل ماحول اسے بڑا عجیب لگ رہا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس سے کہیں زیادہ یہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ لیشک نے کہا۔

"شاید وہ ہمارے لئے کوئی احکامات لینے گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ تین افراد مرے نہیں تھے جو پانی میں کود گئے تھے۔"

"اب کیا کریں؟"

"انہیں ہم تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ جائے گا کیونکہ وہ محتاط ہو کر اس طرف آئیں گے۔ اور فوراً ہی وہ ہماری کشتی میں قدم بھی نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ انہیں یہ بھی خطرہ ہوگا کہ ہم ان پر کہیں کوئی ہتھیار نہ استعمال کر ڈالیں۔ بیوقوف تو وہ بھی نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا، کیا جائے؟"

"کچھ وقت ہے ہمارے پاس۔"

"اگر تم لوگ چاہو کہ ان کے خلاف کوئی صحیح کام کیا جائے تو میرے پاس اس کا انتظام ہے۔"

"ہاں......تمہارا وہ بریف کیس جو ایک خوفناک اسلحہ خانہ ہے۔"

"ایک منٹ۔" شہباز نے کہا اور اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک فیوز بکس اور دھماکے سے پھٹنے والا پاؤڈر نکالا۔ وہ پاؤڈر ان پٹرول بموں پر چھڑکنے کے بعد اس نے فیوز باندھ دیا اور کہنے لگا۔

"تو پھر کیا کہتے ہو؟"

"ہاں، لکڑی کا یہ تختہ میرا خیال ہے کارآمد رہے گا۔ ہم اسے اپنے آگے کے سفر کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔"

کشتی کے ایک بہت بڑے حصے پر ایک بڑا لکڑی کا تختہ جس میں کچھ بانس بندھے ہوئے تھے اسے یقینی طور پر شام کو یا دوپہر کو کشتی کی چھت پر ڈال دیا جاتا ہوگا۔ بمعہ چپوؤں کے اٹھا کر انہیں پانی میں ڈالا اور اسے دھکیلتے ہوئے وہاں سے دور لے گئے اور جب فیوز کے چلنے کا وقت آیا تو شہباز نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ سب اوندھے لیٹ جائیں اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ یہ ایک سنگین صورتحال تھی۔ انہیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ سرچ لائٹ والی کشتی میں جو لوگ موجود ہیں انہیں لازمی طور پر یہ ہدایت مل چکی ہے کہ یا تو انہیں گرفتار کرلیں یا ختم کر دیں اور اس وقت یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ سمندر کی سطح پر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر نہ تو ستارے تھے نہ چاند۔ اتنی گہری اور گھور تاریکی تھی

کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آئے۔ لیکن اس کے بعد فضا میں ایک ہولناک دھماکہ ہوا اور ان لوگوں
نے پٹرول کا ایک ڈرم فضا میں اچھلتے ہوئے دیکھا۔ ڈرم شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور آگ
برسا رہا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد دوسرا دھماکہ ہوا اور پھر بے شمار انسانی چیخیں سنائی دیں۔
شاید پٹرولنگ بوٹ کے گارڈز اس دھماکے کا نشانہ بن گئے تھے۔ سطح آب پر شعلے ہی شعلے
بکھرے ہوئے تھے اور پوری کشتی ان شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ لکڑی کا یہ بڑا تختہ جو ان
لوگوں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا اس وقت ان کے بہت کام کا تھا۔ لیشک اور چاؤ چپوؤں کی مدد
سے اسے آگے بڑھا رہے تھے۔ وہ اس انوکھے بیڑے کو چلاتے ہوئے دور نکل آئے۔ چاؤ
اور لیشک کی مستعدی قابل داد تھی اور شہباز یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اکیلے اسے یہ سب کچھ کرنا
پڑتا تو غالباً وہ اس انداز میں نہ کرسکتا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ اس نے اپنے تمام مسائل
لیشک پر چھوڑ دیئے تھے اور لیشک ہی ہر مسئلے میں رہنمائی کر رہا تھا۔ اگر وہ خود یہ کارروائی کر
رہا ہوتا تو طریقہ کار شاید کچھ اور ہی ہوتا۔ لیکن بہرحال تینوں جوان مرد تھے اور ہر مشکل پر
قابو پانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی چیز ان کی حوصلہ مندی تھی اور حوصلہ
مندی کے نتائج جہاں بھی کہیں سامنے آئے ہیں، شاندار ہی رہے ہیں۔

چنانچہ اس وقت جب صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پھوٹنے لگا تو انہیں وہ ساحل نظر آنے لگا
جو یقیناً ہیلیکون کا ساحل تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں انہیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ
ناقابل یقین تھی کیونکہ جس انداز میں انہوں نے بعد میں سفر کیا تھا وہ انسانی انداز نہیں تھا
بلکہ ایک ناہوشی کا سفر تھا جس میں سب سے قریب جو چیز ہوتی ہے وہ موت ہوتی ہے
دوسرا کوئی حفاظتی دستہ انہیں اسی لئے نہیں ملا تھا کہ اس انداز میں سفر کرنے کا تصور بھی کوئی
نہیں کرسکتا تھا۔ ساحل پر ریت کے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس تختے کو پا
سے باہر کھینچا اور پھر ان درختوں کی جانب بڑھ گئے جو ریت کے ٹیلوں سے کچھ فاصلے
یقینی طور پر کچھ ہاتھوں نے لگائے تھے اور بہت قدیم تھے۔ چونکہ ان کے تنے بہت چوڑے
چوڑے تھے۔ یہاں بھی ان درختوں سے فائدہ اٹھایا گیا اور تختے کو ایک ایسے درخت سے
باندھ دیا گیا جس کا تنا بہت چوڑا تھا۔ پتوار بھی انہوں نے اسی درخت کی اوپری شاخوں
چھپا دیئے تھے۔ اس طرح انہوں نے واپسی کے سفر کی گنجائش رکھی تھی اور اس کے بعد
سے پہلے انہیں یہ طے کرنا تھا کہ ہیلیکون کے اس ساحل پر خفیہ طریقے سے پہنچنے کے بعد

اب انہیں آگے کیا کرنا ہے۔“

”میری رائے ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے بدن میں پٹرول بھرنا چاہئے یعنی
خوراک۔ جس کے بعد ہم لوگ آگے کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔“

چاؤ نے اس بات سے اتفاق کیا تھا اور فوراً ہی کھانے پینے کی اشیاء نکال کر ایک عمدہ
ناشتہ کیا گیا۔ لیشک نے چاؤ کے انتظامات کی تعریف کی تھی اور کہا تھا۔

”کسی بھی خطرناک مہم کو اگر پکنک کا درجہ دے لیا جائے تو یہ ایک اچھی بات ہوتی ہے۔“

”ہاں...... اس میں کیا شک ہے۔ اچھا تو اب یہ طے ہوا کہ ہم ہیلیکون کے ساحل تک
تو پہنچ گئے ہیں، اب یہاں سے ہمیں اس ریلوے لائن تک جانا ہے جو جنوبی سمت میں
ہے۔ وہیں سے ہمارا آگے کا کام شروع ہوگا۔ یہ ریلوے لائن ہمیں آخر کار ڈان بیورس
کے خطرناک علاقے میں پہنچا سکتی ہے جہاں سے وہ اپنے لئے ضرورت کی اشیاء حاصل
کرتا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس شخص نے کمال کا کام کیا ہے اور اس میں
بھی کوئی شک نہیں ہے کہ میلیکو کے کسی ایک شخص کو بھی اس بات کا احساس نہیں ہوگا کہ ایک
غدار اتنی بڑی حیثیت اختیار کئے ہوئے ان کے درمیان چھپا بیٹھا ہے۔ کتنے افسوس اور دکھ
کی بات ہے کہ میلیکو کے کسی بھی ذہن نے یہ اندازہ نہیں لگایا کہ پلاسکو نے کتنی بڑی
سازش ان کے دل میں بیٹھ کر کر ڈالی ہے۔ میلیکو اپنے ہی ہاتھوں اپنی موت کی تکمیل کر رہا
ہے۔ آہ...... میں ایک میلیکن ہوں اور اپنے وطن کی سرزمین سے بے انتہا پیار کرتا ہوں
چاہے مجھے اس کے لئے اپنی جان کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ ڈان بیورس کے اس منصوبے کو
میں خاک میں ملا کر رہوں گا۔ اور میں شکر گزار ہوں رازل جریری کا جس نے ایک اہم
ذمے داری اپنے شانوں پر لی ہوئی ہے اور وہ کچھ کر رہا ہے جو کوئی اپنا نہیں کرسکا۔ اس
طرح سے جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ رازل جریری کا کام نہیں بلکہ ہمارا اپنا کام ہے جس کے
لئے وہ عظیم شخص کام کر رہا ہے۔“ لیشک کے لہجے میں بڑی عقیدت تھی جسے بخوبی محسوس کیا
جاسکتا تھا۔ تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے آگے کے سفر کا آغاز کیا۔
ریتلا ٹیلا عبور کرنے کے بعد انہیں ایک پہاڑی سلسلہ دکھائی دیا اور وہ اس کے بارے میں
قیاس آرائیاں کرنے لگے۔

آخر کار انہوں نے اس پہاڑی سلسلے تک سفر کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں سے چل

پڑے۔ آگے ناہموار پہاڑی راستے کے علاوہ انہیں خشک جھاڑیوں اور کانٹے دار درختوں کی وجہ سے اپنا سفر جاری رکھنے میں بہت مشکل پیش آئی۔ اس دوران انہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں آس پاس کوئی آبادی تھی یا نہیں لیکن یہ خیال اس لڑکے کی وجہ سے ختم ہو گیا جو انہیں تھوڑے فاصلے پر نظر آیا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن انہیں دیکھتے ہی وہ ایک دم سے سنبھل گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش ابھرے اور منہ کھل گیا۔ اور اس کے بعد اس نے کسی خرگوش کی طرح ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ایک سمت دوڑنے لگا۔ لیشک کے منہ سے آواز نکلی۔

''اوہ مائی گاڈ...... یہ...... یہ ضرور ہمارے بارے میں......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہباز نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ فضا میں پرواز کرتا ہوا وہاں تک پہنچا ہو۔ لیکن لڑکا بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ شہباز اس تک پہنچے، لڑکا ایک ٹیلے کے پیچھے جا کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ شہباز برق رفتاری سے ٹیلے پر چڑھ گیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں مگر لڑکا اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ اس دوران لیشک اور چاؤ بھی دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اچانک ہی شہباز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اُدھر......اوپر آجاؤ۔''

لیشک اور چاؤ ٹیلے پر چڑھنے لگے اور کچھ لمحوں کے بعد وہ شہباز کے قریب پہنچ گئے۔ شہباز کا اشارہ ایک چھوٹے سے فارم ہاؤس کی طرف تھا جو کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ فارم ہاؤس میں خاص قسم کے درختوں اور بھیڑوں کی خاصی تعداد نظر آ رہی تھی۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی خاص طرز کی جھونپڑی سی بنی ہوئی تھی۔ لیشک نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''لڑکا بہت تیز تھا۔ اس نے ہمیں خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ ویسے وہ یقیناً اسی جھونپڑی کی طرف گیا ہو گا مگر نظر نہیں آیا۔''

''ہاں واقعی۔ وہ کوئی مشینی مخلوق ہی معلوم ہوتی تھی۔ اتنی تیزی سے وہ گیا کہ ہم حیران ہو گئے۔ کیا خیال ہے، جھونپڑی کی طرف چلیں؟''

''میں تمہیں ڈان بیورس کے بارے میں مختلف اوقات میں بتاتا رہا ہوں۔ وہ بے حد

چالاک آدمی ہے اور مجھے یقین ہے وہ لڑکا اس کا مخبر ہو گا اور انہیں اطلاع دینے کے لئے گیا ہو گا۔''

''پھر اب کیا، کیا جائے؟''

''جانا تو اُدھر ہی ہے۔ اور اگر تقدیر نے کچھ دھائیں دھوئیں لکھ دی ہے تو وہ بھی کرنی پڑے گی۔''

''آؤ......'' اور وہ ٹیلے سے اترنے کے بعد اس فارم ہاؤس کی جانب چل پڑے۔ چاؤ اور لیشک پوری طرح محتاط تھے۔ آخر کار وہ جھونپڑی کے قریب پہنچ گئے۔ جھونپڑی اندر سے کافی کشادہ تھی جبکہ دور سے وہ چھوٹی سی نظر آتی تھی۔ یہاں ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ بستر، میز، کرسی۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا لیکن انہیں جس چیز نے متوجہ کیا وہ جھونپڑی کے درمیان میں کھڑی ہوئی ایک عورت تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ بے جان اور سپاٹ سا چہرہ۔

''تم یہاں رکو، میں آگے کا جائزہ لیتا ہوں۔'' شہباز نے کہا اور دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ دروازے سے بھی باہر نکل آیا تو اس نے لکڑی کا چھوٹا سا شیڈ دیکھا اور پھر وہ لڑکا اسی شیڈ میں نظر آ گیا تھا۔ بچہ شہباز کو دیکھ کر اپنے آپ میں سمٹ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے گہرے نقوش تھے۔ شہباز آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے پوچھا۔

''یہاں اور کون رہتا ہے؟'' شہباز کو خطرہ تھا کہ لڑکا کہیں کوئی اور زبان نہ بولتا ہو۔ لیکن اسے فوراً اس کا جواب ملا۔

''کوئی نہیں۔'' ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی لڑکے کے چہرے سے خوف کے آثار اس طرح مٹ گئے جیسے کوئی نقاب سی سرک گئی ہو اور پھر اس نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ شہباز عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ نجانے کیوں لڑکے کے چہرے کو دیکھ کر اس کے اندر غصے کی ایک لہر بیدار ہو گئی۔ اب لڑکا بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھور رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور زمین پر تھوک دیا۔ اسی لمحے شہباز کا بھرپور تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا اور لڑکے کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا اور اس نے ایک دیوار کا سہارا

لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی لکیر بہتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی خوف کے آثار دوبارہ نمودار نہیں ہوئے تھے۔ اسی وقت شہباز کو عورت کی نسوانی آواز سنائی دی۔

''نہیں...... پلیز نہیں...... نہیں، یہ بیوقوف ہے۔ اسے مت مارو پلیز۔'' شہباز نے گھوم کر اس عورت کو دیکھا اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہاں اور کون رہتا ہے؟''

''بس میرا شوہر، میں اور یہ۔''

''کہاں ہے تمہارا شوہر؟''

اچانک ہی لڑکا غرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نہیں...... اسے مت بتانا۔''

شہباز نے جھپٹ کر لڑکے کے بال پکڑ لئے۔ لڑکے کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ اسی وقت عورت بولی۔

''وہ اس وقت آبادی کی طرف گیا ہوا ہے۔''

''کب؟''

''بس ابھی تھوڑی دیر پہلے۔''

''ہوں...... کتنی دیر پہلے؟ اس وقت جب اس لڑکے نے تمہیں آ کر بتایا کہ اس نے ہم لوگوں کو دیکھا ہے؟''

''ہاں، ہاں۔''

''گویا وہ پولیس کو ہمارے بارے میں بتانے گیا ہے۔''

''وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن یہ بیوقوف لڑکا گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا ہے اور وہاں دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اگر کوئی غیر معمولی چیز دیکھے تو اس کی اطلاع دے۔ آپ یقین کریں جناب! ہم لوگ تو مجبور ہیں میرے شوہر کو مجبوراً اطلاع دینے کے لئے جانا پڑا ہے۔ ورنہ اگر یہ لڑکا اسکول میں بتاتا کہ ایسا ہوا ہے اور ہم لوگوں نے اس کا نوٹس نہیں لیا تو حکومت میرے شوہر کو سزا دیتی۔''

''اصل بات کیوں چھپا رہی ہو؟ وہ ہمارے بارے میں اطلاع دے کر...... خیر چھوڑو...... قصبہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''فاصلہ دو میل سے زیادہ ہی ہے۔ یہاں سے سڑک قصبے تک جاتی ہے۔''

لیشک اور چاؤ اس گفتگو کو خاموشی سے کھڑے سن رہے تھے۔ شہباز نے گردن ہلا کر کہا۔

''ٹھیک ہے...... ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ اور یہ لڑکا، میرا خیال ہے ہمیں اس کے باپ کا پیچھا کرنا چاہئے ورنہ وہ ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم یہاں رکو، میں اسے دیکھتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ لیشک اور چاؤ کچھ کہتے، شہباز وہاں سے باہر نکل آیا۔ وہ دوڑ میں بے مثال تھا اور کسی ہرن، کتے اور گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اور پھر اسے وہ شکستہ سڑک نظر آئی۔ سڑک کیا تھی بس سڑک کا ہلکا سا نشان تھا۔ شہباز نے سوچا کہ جتنی برق رفتاری سے وہ دوڑ رہا ہے، وہ شخص اتنا فاصلہ طے نہیں کر پائے گا۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ ابھی بہت زیادہ دور نہیں گیا تھا وہ کہ اسے ایک شخص سڑک پر بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ جہاں وہ دوڑ رہا تھا وہاں سڑک بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اس آدمی کے جسم پر کسانوں کا لباس تھا اور ہاتھ میں ایک درانتی دبی ہوئی تھی جس کا پھل غیر معمولی طور پر لمبا اور تیز دھار والا تھا۔ شہباز یہ فاصلہ بھی طے کر کے اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس شخص نے درانتی اس طرح ہاتھ میں سنبھال لی جیسے اس سے مقابلہ کرنا چاہتا ہو۔ شہباز نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''نہیں دوست! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔''

لیکن اس آدمی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں پیدا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خون جھلکنے لگا تھا۔ وہ درانتی کو اس طرح تول رہا تھا جیسے مناسب طریقے سے حملہ کرنا چاہتا ہو۔ اور اچانک ہی اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور درانتی لہرا کر شہباز پر حملہ آور ہوا۔ شہباز ایک دم سے زمین پر جھک گیا اور درانتی اس کے شانے کے اس سے نکلتی چلی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درانتی کا استعمال زبردست طریقے سے کیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے چوک جاتا تو درانتی یقیناً اس کے شانے پر کاری زخم لگا دیتی۔ اس نے اچانک ہی دوسرا وار کیا تو شہباز لڑھک کر دوسری طرف آ گیا اور پھر اس نے تھوڑا سا فاصلہ اختیار کیا اور جست لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اگر چاہتا تو بہت آرام سے اس شخص کو ریوالور کا نشانہ بنا

سکتا تھا۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اس آدمی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ فائر کی آواز دور دور تک سنی جاتی اور پتہ نہیں اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ اس آدمی نے ایک بار درانتی گھمائی اور اس کا پھل شائیں کی سی آواز کے ساتھ شہباز کے چہرے کے قریب سے گزرا تو شہباز سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”دیکھو...... میں اگر چاہوں تو ایک لمحے کے اندر تمہیں......“

مگر کسان نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی اور درانتی کو مسلسل دائیں بائیں گھمانے جیسے فضا میں لگی گھاس کاٹ رہا ہو۔ شہباز اچھل اچھل کر پیچھے ہٹتا رہا۔ لیکن اب صورتحال ذرا گڑبڑ ہو گئی تھی کیونکہ آگے چل کر سڑک ختم ہو جاتی تھی اور وہ نیچے بھی گر سکتا تھا۔ وہاں درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ اگر وہ اس جھنڈ میں جا گرتا تو صورتحال سنگین ہو جاتی تھی۔ مگر اس مشتعل کسان کو روکنے کا کوئی طریقہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دفعتہً اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے گھٹنے کو موڑا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مٹھی میں بہت سی مٹی اٹھائی اور اسے اچانک اس کسان کی آنکھوں کی طرف اچھال دیا۔ کسان کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بس شہباز کے لئے یہ لمحہ کافی تھا۔ اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر غوطہ لگایا اور اپنے مدمقابل کی ٹانگیں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ حلق سے ایک آواز نکال کر کسی شہتیر کی طرح زمین پر گر پڑا۔ درانتی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ لیکن بڑا جنگلی آدمی تھا۔ گرتے ہی وہ شہباز کی طرف لپکا مگر شہباز نے اب اسے موقع نہیں دیا۔ اس نے چیتے کی طرح شہباز پر چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ لیکن کمال کا طاقتور تھا وہ شخص۔ شہباز کو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ لوہے کا بنا ہوا ہو۔ شہباز نے اس کے جبڑے پر ایک گھونسہ رسید کیا اور وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر لڑکھڑانے لگا۔ لیکن ایک لمحے کے اندر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا البتہ درانتی اب اس کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے درانتی کی طرف ہاتھ بڑھائے اور مجبوراً شہباز کو بھی اس پر چھلانگ لگانی پڑی۔

وہ درانتی کے استعمال سے بہترین طریقے سے واقف تھا۔ کسان کا ہاتھ درانتی کے دستے پر پڑا اور شہباز کا پاؤں اس کے جسم پر۔ وزن سے درانتی کا پھل اٹھ گیا۔ اور جب شہباز نے جھٹکا مارا تو وہ تیزی سے نیچے آیا۔ ٹھیک اس کے نیچے کسان کی گردن تھی۔ درانتی اس پر پڑی اور ایک خون کا فوارہ اس کی گردن سے بلند ہو گیا۔ وہ تڑپنے لگا اور درانتی اس

اٹھ کر اس پر گرتی رہی۔ وہ خون میں نہاتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی بکرے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ شہباز نے آخری حد تک کوشش کی تھی کہ اس کی زندگی ختم نہ ہونے پائے لیکن شاید تقدیر اس کے لئے موت کا فیصلہ کر چکی تھی۔

بہر حال ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا اور پھر اس نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے گھسیٹنا شروع کیا اور اس کے بعد اسے سڑک کے نیچے درختوں کے جھنڈ میں اچھال دیا۔ اگر کوئی اتفاقیہ طور پر یہاں سے گزرتا تو وہ اسے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ پھر اس نے خون پر مٹی ڈالی اور اس کے بعد تیزی سے واپس جھونپڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ جبکہ اس دوران لیشک اور چاؤ لڑکے اور عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ چکے تھے۔ عورت سسکیاں لے رہی تھی۔ لیشک کو شہباز کی واپسی کا انتظار تھا۔ چند لمحوں کے بعد شہباز وہاں پہنچ گیا۔ لیشک نے کہا۔

”شہباز! ہم انہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ ہمارے یہاں سے نکلتے ہی یہ دوسروں کو خبر کر دیں گے۔“

شہباز نے لیشک کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ شہباز کو انتہائی افسوس ہونے لگا، یہ لوگ بلاوجہ موت سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا اور اس نے لیشک کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہم انہیں جذباتی طریقے سے مجبور کر سکتے ہیں۔ تم ایسا کرو، عورت کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔“

”ٹھیک ہے......“ لیشک بولا اور پھر وہ عورت کو گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

شہباز نے لڑکے کو بالوں سے پکڑ کر اسے زمین سے اٹھایا اور پھر اسے زور سے زمین پر پٹخ دیا اور کہا۔ ”تمہاری خاموشی پر وہ تمہاری ماں کو ہلاک کر دیں گے۔ اگر تم نے اب بھی زبان نہیں کھولی تو تم دونوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ بولو، کیا تم ہمیں ساری حقیقت بتانے کے لئے تیار ہو؟“

لڑکے نے وحشت زدہ انداز میں ہاں میں گردن ہلا دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر بے پناہ خوف ابھر آیا تھا۔

”صرف تمہارا سچ تمہاری جان بچا سکتا ہے۔“

''آپ......آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''قصبے سے تمہارے ہاں کون آتا ہے؟''

''ایک آدمی۔ جو بازار کے قریب رہتا ہے۔''

''وہ یہاں کب آئے گا؟''

''اب سے تین دن کے بعد۔''

''اور اس سے پہلے کوئی اور آئے گا، تمہارا کوئی دوست وغیرہ؟''

''نہیں......میرا کوئی دوست سنیچر سے پہلے نہیں آئے گا۔''

''اور تمہارے باپ کا کوئی دوست؟''

''وہ اتوار کو آتے ہیں۔''

''ہوں......'' شہباز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے زیادہ اور کیا سوال کرے۔ اس نے گردن ہلائی۔ اسی وقت لیشک، چاؤ کو عورت کے پاس چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ اس نے کہا۔

''عورت کا کہنا ہے کہ قصبے سے صرف ایک آدمی یہاں آتا ہے جو مارکیٹ کے قریب ہی رہتا ہے۔'' باقی باتیں بھی وہی تھیں جو لڑکے نے بتائی تھیں۔

''ٹھیک ہے......انہیں کوٹھے پر بند کر دو۔ تین دن کے بعد جب وہ آدمی یہاں آئے گا تو انہیں کھول دے گا اور اس دوران......'' شہباز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

پھر انہوں نے وہی کیا تھا۔ عورت اور لڑکے کو قتل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''آؤ......چلیں یہاں سے۔'' شہباز نے ست لہجے میں کہا اور وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

لیشک اور چاؤ خاصے متجس تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ لیشک نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے چاؤ! کہ رازل جریری ہمیں بھاری معاوضہ دیتا ہے اور ہم نے اپنے کام کی ابتدا اسی معاوضے کے تحت کی تھی۔ لیکن اب جب ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ڈان بیورس میلیکو کا غدار ہے اور اس نے اپنا ایٹمی پلانٹ پلاسکو کے ایما پر شروع کر رکھا ہے اور اس کے بنائے ہوئے ایٹم بم اور میزائل کسی اور ملک کے لئے نہیں بلکہ خود میلیکو کی تباہی کے لئے ہیں تو نجانے کیوں دل لرزتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ

وطن پرستی بھی کوئی چیز ہے۔ اور بات صرف رازل جریری کے ادا کئے ہوئے معاوضے کی نہیں بلکہ اپنے وطن کی بقاء کی بھی ہے۔ ایسی شکل میں ہماری ذمے داریاں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔''

چاؤ نے کچھ اور آگے کی بات کی۔ پھر ہنسنے لگا۔ ''تم یہ بات کہہ رہے ہو لیشک! اور میں جو سوچ رہا ہوں، وہ بے حد بھیانک ہے۔''

لیشک سوالیہ نگاہوں سے چاؤ کو دیکھنے لگا تو چاؤ نے کہا۔

''جس طرح جگہ جگہ ہمارے راستے روکے جا رہے ہیں اس سے یہ بات تو بالکل واضح ہو گئی ہے کہ ڈان بیورس ہماری اور خاص طور سے شہباز کی طرف سے متفکر ہو گیا ہے اور اسے ہر قیمت پر ختم کرنے کی کارروائی میں مصروف ہے۔ اس سے ایک بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اس بات کا شبہ ہو گیا ہے کہ شہباز، رازل جریری کا دست راست ہے اور ضرور کسی اہم مقصد کے لئے یہاں آیا ہے۔ اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ حکومت پلاسکو نے اپنے اس غدار نمائندے کو یہ اطلاع دے دی ہو کہ اس کی حقیقت منظر عام پر آ گئی ہے اور وہ خطرے میں ہے۔ ایسی صورت میں ڈان بیورس جیسا کتا یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت سے پہلے میلیکو کی تباہی کا آغاز کر دے۔ اسے خوف بھی ہو سکتا ہے کہ اگر یہ بات کھل گئی ہے تو آنے والا وقت بے حد خطرناک ہوگا۔'' دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ کچی سڑک بل کھاتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی تھی۔

قصبے کی جانب جانے کی بجائے وہ اس کی مخالف سمت چلے گئے اور تقریباً ایک ڈیڑھ میل چلنے کے بعد انہیں ایک نیچی چھت کی عمارت دکھائی دی۔ اچانک ہی انہیں ایک ہلکی سی گھر گھراہٹ کی آواز سنائی دی اور انہوں نے فوراً ہی اپنے قدم روک دیئے۔ گھنے درختوں کی آڑ اپنا لی گئی تھی اور وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ گھر گھراہٹ کی آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دس ٹرکوں کا قافلہ دائیں جانب سے نکل کر سڑک پر آیا اور پھر اس عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس میں خاص قسم کی وردی والے لوگ سوار تھے۔ لیکن یہ وردی میلیکن فوج کی نہیں تھی۔ لیشک نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''بیورس فورس۔ یہ ڈان بیورس کی فورس ہے۔''

''کمال ہے، حکومت میلیکو نے اسے اس قدر آزادی دے رکھی ہے کہ وہ اپنی فورس

تک بنا کر رہ سکے۔ جبکہ حکومت میلیکو جانتی ہے کہ یہ ایک سائنس دان ہے اور کسی بھی لمحے کوئی غلط قدم اٹھا سکتا ہے۔"

"یہی تو افسوس کی بات ہے کہ حکومت میلیکو اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتی ہے اور اس اعتماد نے اسے ہر قسم کی مراعات دے رکھی ہیں۔ جبکہ شاید حکومت میلیکو تو اسے اپنا واحد محافظ سمجھتی ہے۔ کم بخت ڈان بیورس نے اسی طرح میلیکو کی کئی حکومتوں کو ہپناٹائز کیا ہوا ہے۔"

"پتہ نہیں یہ ٹرک کیوں اندر داخل ہوئے ہیں۔"

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد ٹرک ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک ٹرک گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اچانک ہی لیشک نے کہا۔

"دس ٹرک...... دس ٹرک مسٹر شہباز! نو ٹرک جا چکے ہیں اور ایک باقی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا اس عمارت کا جائزہ لیا جائے؟ یہ ٹرک پتہ نہیں یہاں کیوں کھڑا ہوا ہے۔"

"اس پر زیادہ لوگ بھی معلوم نہیں ہوتے۔"

"میری رائے ہے کہ ہم اس عمارت کا جائزہ لیں۔"

اور اس کے بعد وہ لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ عمارت کے بارے میں بظاہر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خالی ہی ہے۔ ٹرک والے جس مقصد کے تحت یہاں آئے تھے غالباً وہ مقصد پورا کر کے جا چکے تھے۔ وہ لوگ چھپکلیوں کی طرح زمین پر ہاتھ پیروں کے بل چلتے ہوئے عمارت تک پہنچے اور پھر انہیں اس عمارت میں داخل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ عمارت میں داخل ہو گئے۔ عمارت واقعی خالی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ عمارت کس مقصد کے تحت استعمال کی جاتی ہے۔ یہ فوجیوں کا اسلحہ خانہ تھا۔ ڈان بیورس کے فوجیوں کے پاس یہاں اسلحے کے ذخیرے تھے اور اسلحے کے اس ذخیرے میں سے بہترین قسم کے کچھ ہتھیار انہوں نے اپنے قبضے میں کیے۔ باہر ٹرک میں صرف چار افراد تھے اور انہیں اس بات کا شبہ ہوا کہ اندر کوئی آہٹ ہو رہی ہے۔ وہ اپنے ہتھیار لئے عمارت میں آئے اور ایک ایک گوشے کا جائزہ لینے لگے۔ لیکن شہباز، لیشک اور چاؤ نے ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا اور پھر انہوں نے چوکنے چیتوں کی طرح ان پر خونخوار حملے کئے اور تھوڑی سی دوبدو کے بعد ان لوگوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد وہ انہیں بے

ہوش کر کے باندھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شہباز نے کہا۔

"آؤ...... کیوں نہ اب ہم اس ٹرک کے ذریعے وہاں سے آگے بڑھیں۔ ہمیں آسانی ہو جائے گی۔"

"بہت ہی عمدہ موقع ملا ہے ہمیں چلنا چاہئے۔" بے ہوش آدمیوں کو عمارت میں قید کیا گیا اور اس کے بعد تینوں اس ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ لیشک نے سنبھال لی تھی اس نے ٹرک کا رخ اسی جانب کر دیا جہاں دوسرے ٹرک گئے تھے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد انہیں نو ٹرکوں کا وہ قافلہ مل گیا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔

سہ پہر کا وقت تھا درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ جنگل میں انہیں ایک بورڈ پر ڈان بیورس لکھا ہوا دکھائی دیا اسی وقت چاؤ کی آواز سنائی دی۔

"ریلوے لائن اب یہاں سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے" باقی لوگوں نے خاموشی ہی اختیار کیے رکھی تھی۔ قافلہ شمال کی جانب جا رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد شہباز نے کہا۔

"میری رائے ہے کہ اب اس سڑک سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔"

"او کے چیف" لیشک میں یہی خوبی تھی کہ یا تو وہ اپنی کوئی تجویز پیش کر دیتا تھا اور اگر اس پر شہباز کی کوئی تجویز آ جائے تو آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دیتا تھا۔ اس نے کہا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آگے ہمیں جھیل ڈمیکین ملنی چاہیے۔ یہ ایک مشہور جھیل ہے ڈمیکین ہم وہاں اس ٹرک سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔"

اور اس کے بعد انہوں نے رفتار کسی قدر سست کر دی۔ باقی نو ٹرکوں کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ دسویں ٹرک میں کون ہے اور کیوں اس سست رفتاری سے آ رہا ہے۔ فاصلہ بڑھتا چلا گیا پھر وہ لوگ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ پہاڑی جھیل نظر آنے لگی۔ وہ بہت ہی لمبی چوڑی تھی وہ ٹرک سے نیچے کود گئے پھر اچانک ہی چاؤ نے ایک اور فیصلہ کیا۔ وہ یہ کہ ٹرک کو جھیل میں ڈبو دیا جائے۔ چنانچہ ٹرک کی رفتار مناسب کی گئی۔ ایکسیلیٹر پر ایک وزنی پتھر رکھا گیا اور تینوں نے ٹرک کو چھوڑ دیا۔ ٹرک تیزی سے ڈھلوانی فاصلہ طے کر کے آگے بڑھا اور پُر شور آواز کے ساتھ جھیل میں جا گرا۔ لیکن یہ آواز قافلے والوں نے سن لی تھی اور جنگل کی طرف جانے والا قافلہ رک گیا تھا۔

پھر اس میں سے کچھ فوجی نیچے اترے اور صورتحال معلوم کرنے کے لئے پیچھے آنے لگے۔ لیکن یہ لوگ ان سے فاصلہ طے کر کے دوڑ پڑے تھے اور جنگل کی جانب چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس جگہ سے کافی دور ہو گئے۔ ایک جگہ پہنچ کر لیشک رکا اور اس نے کہا۔

''ہم اپنی مطلوبہ جگہ آ گئے ہیں۔ اب ہمیں اپنے پوشیدہ رہنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ ریلوے لائن اس پہاڑی کے دوسری جانب سے گزرتی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ میں اس کی ہلکی سی جھلک دیکھ چکا ہوں۔ ویسے میرا جہاں تک خیال ہے یہ ٹرک ٹرین سے مال اٹھانے کے لئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ڈان بیورس کے آدمی یقینی طور پر اسی علاقے میں ٹرین روک کر سامان حاصل کرتے ہوں گے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیں یہاں کتنا انتظار کرنا ہوگا۔ کیونکہ بہرحال ٹرین کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور اگر ہے تو ہمیں اس کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔''

وہ لوگ کافی دیر تک یہاں آرام کرتے رہے اور اس کے بعد لیشک کے بیان کے مطابق ریلوے لائن کی تلاش میں چل پڑے۔

پہاڑی کے دوسری طرف پہنچنے پر انہیں ریلوے لائن نظر آ گئی۔ لیکن خوش قسمتی یہ تھی کہ سورج غروب ہوتے ہی وہ ٹرین بھی دکھائی دی جو وہاں ضروریاتِ زندگی کا سامان سپلائی کرتی تھی۔ اس ٹرین کو ایک بوسیدہ سا انجن کھینچ رہا تھا۔ ان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یہ ٹرک ٹرین سے سامان اتارنے کے لئے ہی متحرک ہوئے تھے۔

بہرحال ٹرین اس پہاڑی کے قریب رک گئی اور اس میں سے کریٹ اتارے جانے لگے۔ کریٹ کے علاوہ بورے اور کارٹن بھی تھے۔ ان میں شاید چاول، آٹا اور سبزیوں کے ذخائر تھے۔ سبزیوں کا اندازہ تو خاص طور سے ہو جاتا تھا لیکن بوریوں پر چاول اور آٹے کے نشانات لگے ہوئے تھے اور شاید ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت بھی تھا۔ جنگل کی طرف سے آنے والی سڑک پر تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹرک کی روشنیاں چمکیں اور پھر تیزی سے قریب آنے لگا۔ وہ ٹرک اس ٹرین کے قریب آ کر رکا اور اس میں سامان لادا جانے لگا۔ اس ٹرک کے ساتھ تین موٹر سائیکل تھے جن پر تین اسی وردی میں ملبوس گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بات صاف ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ ڈان بیورس کے آدمی ہیں۔ کافی دیر

تک یہ سامان اتارا جاتا رہا اور اس کے بعد ٹرین آگے بڑھ گئی۔ ٹرک لوڈ ہو چکے تھے چنانچہ وہ جنگل کی جانب واپس مڑ گئے جبکہ تینوں موٹر سائیکل سوار ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

یہ لوگ بڑی شاندار کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ ابھی تک انہیں کوئی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا تھا جو جان لیوا ہوتا اور وہ نہایت کامیابی سے ڈان بیورس کی تمام کارروائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ طے یہ کیا گیا کہ جس جانب ٹرک اور موٹر سائیکل سوار گئے ہیں سفر اسی جانب کیا جانا ہے۔ اور یہ آسانی انہیں ٹائروں کے نشانات سے ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ سب ان نشانات کی رہنمائی میں دوڑنے لگے اور صبح چار بجے تک انہوں نے ایک طویل سفر طے کر لیا۔ لیکن اب ان کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ لیشک اور چاؤ کی حالت تو بہت ہی خراب تھی۔ لیکن شہباز جن خصوصیتوں کا حامل تھا ان کے بارے میں ابھی تک یہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک مشینی انسان تھا اور اس نے اپنی زندگی میں ایسے ایسے بیش بہا کارنامے سرانجام دیئے تھے کہ یہ لوگ ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ شہباز نے لیشک کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''میرا خیال ہے تم آخری حد تک تھک گئے ہو لیشک!''

''اور میں بھی۔'' چاؤ نے فوراً ہی جواب دیا۔

''مجھے اندازہ ہے۔''

''ہماری ٹانگیں جواب دے گئی ہیں۔''

''اچھا ایسا کرو، تم دونوں یہاں آرام کرو۔ میں ذرا تھوڑا سا آگے جاؤں گا۔''

''ارے نہیں۔ یہ تو مناسب نہیں ہے۔ ہم تمہیں تنہا خطرے میں نہیں جھونک سکتے۔''

''بے فکر رہو۔ میں خطرات سے دور رہوں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی تو واپس تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ لیکن پلیز! کم از کم اپنا خیال ضرور رکھنا۔ ایک درخت کے پیچھے ہو جاؤ۔ میں زیادہ فاصلہ اختیار نہیں کروں گا۔''

اور پھر شہباز وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ یہ لوگ بے شک اس کے بہترین ساتھی تھے اور بھرپور طریقے سے اس کا ساتھ دے رہے تھے لیکن اب چونکہ ڈان بیورس کی رہائش گاہ بہت قریب آ گئی تھی اس لئے شہباز تھوڑی سی آزادی بھی چاہتا تھا تاکہ اپنے جوہر دکھا سکے اور اپنی شخصیت کو صحیح انداز میں استعمال کر سکے۔

بہر حال ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا ہوا یہ سفر کرتا رہا۔ لیکن اسے بہت طویل سفر نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے ڈان بیورس کی وہ خوفناک رہائش گاہ نظر آ گئی جس کے بارے میں اب تک اس نے صرف پراسرار کہانیاں سنی تھیں۔ ڈان بیورس کی یہ شاندار رہائش گاہ ہر طرح سے محفوظ تھی۔ اندر داخلے کے لئے صرف ایک گیٹ تھا۔ باقی احاطے کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ گیٹ کے ستون پر لگی ایک فلش لائٹ چاروں طرف گھوم رہی تھی اور یہ فلش لائٹ انتہائی خوفناک تھی۔ کیونکہ اس کے ساتھ ٹیلی ویژن منسلک تھے اور اس فلش لائٹ کی روشنی کی زد میں آنے والی ہر چیز ٹیلی ویژن سیٹ کی اسکرین پر دیکھی جاتی ہو گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس باقاعدہ نظام کو اور زیادہ محفوظ بنا لیا گیا ہو۔

بہر حال اب ان تمام چیزوں سے واقفیت شہباز کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ پوری طرح محتاط رہنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لیشک اور چاؤ بے شک تھک گئے ہیں اور آرام کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی طرف سے وہ پریشان ہی ہوں گے۔ اور شہباز بہر حال ان لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ دونوں بہترین ساتھی تھے۔

چنانچہ ان تمام چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد وہ واپسی کے لئے پلٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ دونوں واقعی اس کے لئے پریشان نظر آ رہے تھے۔ اور جب وہ قریب پہنچا تو ان دونوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ لیشک کہنے لگا۔

”میں لعنت بھیج رہا تھا اپنی اس تھکن پر جس نے تمہیں تنہا جانے دیا مائی ڈیئر! بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میں بڑی شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تمہاری بات کو تسلیم کیوں کر لیا۔“

”شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب ہم لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں تو میں تم لوگوں کو ایک بات خاص طور سے بتا دوں کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت کہیں کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ ہمارا مقصد جو ہے ہمیں اسے مدنگاہ رکھنا ہے۔ باقی ساری باتیں بعد کی باتیں ہیں۔ کیا خیال ہے؟“

”کیا تمہیں کچھ معلومات حاصل ہو گئیں؟“

”ہاں...... بہت ہی کارآمد۔“ شہباز نے کہا اور ان لوگوں کو تفصیل بتانے لگا۔ پھر بولا۔ ”اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ ہم یہاں سے آگے کب بڑھیں گے۔“

”کب کا کیا سوال ہے، بس اتنا وقت کافی تھا آرام کرنے کے لئے۔ اس طویل ترین فاصلے کو طے کرتے ہوئے تھوڑی سی تھکن ہو گئی تھی۔ لیکن تم ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو یہ تھکن خود بخود اتر گئی۔ کیونکہ ہم تمہارے لئے خوفزدہ ہو گئے تھے۔“

”بہت اچھے دوست ہو تم لوگ۔ اگر تم تیار ہو تو آؤ، ہم لوگ چلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ وہاں سے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ان کا رخ اسی پہاڑی کی سمت تھا جو مغربی سمت میں سر اٹھائے کھڑی ہوئی تھی۔ انہیں اس پہاڑی کی بلندی تک پہنچنا تھا۔ اور رات کی تاریکی میں پہاڑی کی بلندی کا یہ سفر کیا جانے لگا۔

آخر کار وہ اوپر پہنچ گئے۔ لیکن اس طرح کہ تھک کر چور ہو گئے تھے۔ ایک بار پھر لیشک اور چاؤ ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر ستانے لگے جبکہ شہباز کی نگاہیں اس جگہ کا جائزہ لینے لگیں جہاں ڈان بیورس نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور یہ جگہ لاکھوں انسانوں کی قتل گاہ بنتی جا رہی تھی۔ اس قتل گاہ کو چند انسانوں سمیت دفن کرنا تھا۔ یہی رازل جریری کا مشن تھا اور شہباز اس مشن کا شریک کار۔

دور سے وہ میزائل نظر آ رہے تھے جو کسی بھی وقت دنیا کا نقشہ بدل دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ تمام میزائل اور راکٹ کنکریٹ کے شیڈ میں بند تھے اور ان کا اگلا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ ان کی تعداد چھ سات کے قریب تھی۔ شہباز اپنے منصوبے کو اپنے ذہن میں دوہرانے لگا۔

لیشک اور چاؤ بے شک بہترین آدمی ثابت ہوئے لیکن جو کام خود شہباز کو کرنا تھا اس میں بھلا کسی دوسرے پر انحصار کرنا کیا معنی رکھتا تھا؟ وہ اندازہ لگانے لگا کہ جو کچھ اسے دیا گیا ہے اور جس انداز میں رازل جریری نے اس کے بارے میں بتایا ہے اگر پوری مہارت اور ذمے داری کے ساتھ وہ ان ڈیٹونیٹروں کو ان شیڈوں کے قریب نصب کر دے تو میزائل یہیں کے یہیں تباہ کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ تمام شیڈ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں۔ اور ان سب جگہوں پر کامیابی کے ساتھ ڈیٹونیٹر نصب کرنا آسان کام نہیں ہو گا۔ ہر شیڈ کے قریب تین تین چار چار گارڈز پہرہ دے رہے

تھے اور ان سے نمٹنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ کیونکہ وہ ایک وسیع و عریض میدان تھا اور وہاں ا
کی تمام نقل و حرکت دیکھی جا سکتی تھی۔

پھر اس نے پہاڑی کے نیچے واقع پچھلے گیٹ پر متعین گارڈ کو دیکھا۔ وہ اکیلا تھا
اسے قابو میں کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس پروجیکٹ کے مخالف سمت میں لکڑی
کنکریٹ کی عمارت تھی جس کی تعمیر فوجی بیرکوں کے انداز میں کی گئی تھی اور اس بیرک
عمارت میں بہت سے انٹینا اور ریڈار اسکرین اور موسم کی کیفیت بتانے والے آلات
ایسی چیزیں نصب تھیں۔ گویا وہ آپریشن ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے دوسری جانب ایک
مخصوص ساخت کی عمارت تھی جس پر سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ اس عمارت کے سامنے کا حص
شیشے کا تھا اور یقینی طور پر یہاں سے پوری عمارت کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔

شہباز اب انتہائی ذہانت اور مہارت کے ساتھ اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا اور تمام باتوں
اپنے ذہن میں رکھنے لگا، کتنے گارڈز کہاں کھڑے ہوئے ہیں اور اندر داخل ہونے کے لی
کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ خاردار تاروں سے دیوار کا کتنا فاصلہ ہے۔ وہاں کا جائزہ لینے کے
بعد اسے خاصے فاصلے پر دھات کی پلیٹیں نصب دکھائی دیں۔ ان پلیٹوں کا مقصد سمجھ میں
نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس نے یہ غور کیا کہ گارڈز ان پلیٹوں سے بچ کر چل رہے ہیں اور ان
کی کوشش ہوتی ہے کہ پلیٹوں پر پاؤں نہ پڑنے پائے۔ اس سے اندازہ لگایا گیا کہ وہ ان
الارم سسٹم ہے۔ ممکن ہے ان پلیٹوں پر پاؤں پڑنے سے الارم بج اُٹھتا ہو۔ لیکن یہ
شاید دن کے لئے تھا۔ رات کو سرچ لائٹ اپنا کام کرتی تھی اور دن میں سورج کی روشنی میں
ان کے دیکھ لئے جانے کا احتمال تھا۔

بہرحال یہ تمام جائزہ لینے کے بعد جب شہباز وہاں سے پلٹا تو لیشک ایک دلچسپ کا
کر چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"آہ...... ہمارا شاندار بیڈروم۔"

"بیڈروم؟"

"ہاں......"

"وہ کیسے بنالیا تم نے بھائی؟" شہباز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آؤ دیکھو، کیا عمدہ جگہ ہے۔"

اور واقعی وہ عمدہ جگہ تھی۔ ایک انتہائی صاف ستھرا غار جو اس پہاڑی کے ایک کونے میں
واقع تھا۔ اندر سے اتنا ہموار جیسے انسانی ہاتھوں نے اس کی صفائی کی ہو۔ کشادہ اور سونے
کے لئے نہایت آرام دہ جگہ۔ شہباز کے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"واقعی عمدہ جگہ ہے۔ اور جب ایسی جگہ سامنے آجائے تو پھر بھلا کس کا دل آرام کرنے
کو نہ چاہے۔"

نیند اس طرح ان کی آنکھوں میں در آئی تھی جیسے بس ان کے زمین پر دراز ہونے کا
انتظار کر رہی ہو۔

خوب گہری نیند آئی تھی۔ شہباز جب وقت جاگا تو باہر خوب چمکدار دن پھیل چکا تھا۔
سورج کی تیز روشنی غار میں مختلف سوراخوں سے اندر آ رہی تھی جس نے غار کو پوری طر
روشن کر دیا تھا۔ چند لمحات وہ ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے بعد غار سے باہر نکل آیا
دور دور تک کا ماحول اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ پہاڑی سے تھوڑے فاصلے پر ایک چش
نظر آ رہا تھا۔ شہباز وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تاحد نظر کوئی موجود نہیں تھا ان پہاڑیوں پر۔
ہاں، ادھر ڈان بیورس کی تجربہ گاہ میں زندگی پوری طرح رواں دواں تھی۔ شہباز
مطمئن ہو کر لباس اتارا اور اچھی طرح غسل کیا اور اس کے بعد لباس پہن کر واپس آ گیا
لیشک اور چاؤ اب بھی گہری نیند سو رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد شہباز نے انہیں بھی
دیا۔ لیشک نے شہباز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ...... تم تو اس طرح تروتازہ نظر آ رہے ہو جیسے......''

''ہاں...... تھوڑے فاصلے پر قدرت نے ہمارے لئے غسل کا بندوبست کیا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''چشمہ...... جس کا پانی انتہائی شفاف ہے۔''

''تو کیا تم غسل کر چکے ہو؟''

''ہاں۔''

''پانی زیادہ ٹھنڈا تو نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں۔ بلکہ اتنا خوشگوار ہے کہ نہا کر اب تک کی تمام جدوجہد کی تھکن دور
جائے گی۔''

''تب ہم چلتے ہیں۔''

پھر وہ لوگ چشمے پر پہنچ گئے اور شہباز نے چٹان کی آڑ لے کر ایک بار پھر اس

جائزہ لینے کا کام شروع کر دیا۔ وہ اندازہ لگانے لگا کہ وہاں کس طرح داخل ہوا جا سکتا ہے؟
بظاہر کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ کوئی ایسی کارروائی کی جائے
جس سے ان سب کی توجہ کسی اور جانب مبذول ہو جائے۔ اور پھر وہ اپنا بریف کیس کھول
کر بیٹھ گیا جس میں رازل جریری نے اپنی تمام تر کاوشیں بھر دی تھیں اور کچھ ایسی ایسی
ایجادات کر کے اسے دی تھیں جنہیں مائیکرو بم کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور پھر اس نے کچھ
مرحلے طے کئے اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ دونوں واپس آ گئے تو وہ انہیں اس کے
بارے میں بتانے لگا۔

''یہ ننھا سا پوائنٹ جو تمہیں نظر آ رہا ہے اس میں ایک زبردست دستی بم کی طاقت ہے
اور یہ اپنے آس پاس کی کسی بھی چیز کے پرخچے اُڑا سکتی ہے۔ استعمال کے وقت اس پر لگی
ہوئی یہ ننھی سی گولی ہٹانا پڑتی ہے۔ تم اسے اس ٹپ کا فیوز کہہ سکتے ہو۔ میں نے اپنے ذہن
میں ایک منصوبہ ترتیب دیا ہے، وہ یہ ہے کہ تم ان بموں سے دھماکے کرتے ہوئے اس
علاقے میں داخل ہو جاؤ گے اور گارڈز کی توجہ اس طرف ہو جائے گی۔''

''مگر داخل ہونے کی کیا صورت ہوگی؟'' چاؤ نے پوچھا۔

''پیچھے کے گیٹ پر متعین گارڈ کو راستے سے ہٹانے کے بعد ہم اندر داخل ہو سکیں گے۔
اس کے لئے ہمیں نیچے چلنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن کس وقت؟''

''دن کی روشنی ہمارے کام کے لئے بالکل بے مقصد ثابت ہوگی۔ رات کی تاریکیاں
ہی ایسے کاموں کے لئے نہایت موزوں ہوتی ہیں۔''

رات کا انتظار کیا جانے لگا۔ اور جب تاریکی نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہ غار
سے نکل کر جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے عقبی گیٹ کی جانب چل پڑے۔ گیٹ پر متعین گارڈ
کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی اور وہ گیٹ کے سامنے ٹہل رہا تھا لیکن شہباز کا منصوبہ
تھا کہ اس پر اس انداز میں قابو پایا جائے کہ اس کی سانس کی آواز تک کسی اور کو نہ سنائی
دے۔ اگر اس کی رائفل وغیرہ زمین پر گری تو دوسرے گارڈز ہوشیار ہو جائیں گے اور ان کا
منصوبہ پہلے ہی مرحلے میں ضائع ہو جائے گا۔

وہ تینوں سانپ کی طرح رینگتے ہوئے بے آواز اس گارڈ کے قریب پہنچنے کی کوشش کر

رہے تھے۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اس کے قریب پہنچ گئے۔ لکڑی کے گیٹ کی طرف سے وہ سامنے آیا تو شہباز اپنے دونوں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹکائے ایک عجیب وغریب چھلانگ کے لئے تیار تھا اور جیسے ہی وہ سامنے آیا تو شہباز نے سب سے پہلے ایک مخصوص انداز میں اپنے لمبے چاقو کو اس کی طرف پھینکا۔ چاقو اس کے حلق میں پیوست ہو گیا اور گارڈ کے حلق سے ایک خرخراہٹ بلند ہوئی۔ وہ لہرا کر آگے گرنے لگا۔ لیکن شہباز نے ایک لمحے کے اندر چھلانگ لگا کر اسے سنبھال لیا اور زمین پر نہیں گرنے دیا۔ چاؤ بھی اس کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس نے اس کی رائفل تھام لی اور پھر اسے آہستہ سے زمین پر لٹا دیا گیا۔ شہباز نے سرگوشی کی۔

''اس کی جیکٹ اتار لو۔ جب تم اس کا لباس پہن کر رائفل تان کر کھڑے ہو گے تو دور سے بالکل گارڈ نظر آؤ گے۔ لیکن خیال رہے کہ ان دھاتی پلیٹوں سے دور رہنا ہے۔''

چاؤ نے گردن ہلائی اور تیزی سے اس گارڈ کا لباس اتار کر پہن لیا۔ اور پھر رائفل اٹھا کر گارڈ ہی کے انداز میں وہاں گشت کرنے لگا۔

یہ کام انہوں نے انتہائی پھرتی سے کر ڈالا تھا اور کسی کو اس کا ذرہ برابر علم نہیں ہو سکا تھا۔ ادھر شہباز نے اپنے بیگ میں سے ڈیٹونیٹر سیٹ نکالا اور انہیں علیحدہ علیحدہ کرنے لگا۔ ان میں سے تین ڈیٹونیٹر اس نے لیشک کو تھمائے، باقی اپنی مٹھی میں دبا لئے اور اب انہیں تیزی سے ان میزائلوں کے قریب دفن کرنا تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

''یہاں کی مٹی نرم ہے اور ہمیں ان ڈیٹونیٹروں کو زمین میں دفن کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی۔ لیکن بس ہوشیار رہنا شرط ہے۔''

''کیا میں چلوں؟'' لیشک نے کہا۔

''ہاں ...... لیکن انداز وہی ہو گا کہ پہلے تم دھماکے کرو گے تاکہ گارڈز تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں۔ پھر میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔''

لیشک نے گردن ہلا دی۔ وہ بے شک ایک بہترین ساتھی ثابت ہوا تھا۔ عمارت میں جابجا دھماکے ہونے لگے۔ گارڈز پہلے تو ان ناگہانی دھماکوں سے خوفزدہ ہوئے اور پھر انہوں نے اپنی رائفلوں سے فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ تاریکی میں چنگاریوں کی گردش شروع ہو گئی۔ اور اس موقع سے شہباز نے فائدہ اٹھایا۔ وہ کنکریٹ کے ان شیڈوں کی

طرف دوڑنے لگا جہاں وہ میزائل کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔ اس کی جسمانی پھرتی جس نے ایک خوفناک علاقے میں زمین کی گہرائیوں کو ناپا تھا اس وقت بھی اپنی پوری قوت سے زیر عمل تھی۔ وہ دوڑ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ڈیٹونیٹر دبے ہوئے تھے جبکہ دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ ایک لمحے کے لئے غفلت نہیں برت رہا تھا اور کسی بھی خطرناک صورتحال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

پہلے شیڈ کے قریب پہنچ کر اس نے ریوالور کے دستے سے مٹی ہٹائی اور ایک ڈیٹونیٹر دبا دیا۔ گارڈز بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور ان کی تمام تر توجہ اسی سمت تھی جہاں لیشک نے اپنا کام شروع کر رکھا تھا۔ شہباز کو دوسرا اور پھر تیسرا ڈیٹونیٹر زمین میں دبانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ خود بھی اس بات کی توقع نہیں رکھتا تھا کہ اس کا مشن اتنی آسانی سے مکمل ہو جائے گا۔ گارڈز بیرک سے نکل رہے تھے اور ان سمتوں میں فائرنگ کر رہے تھے جہاں دھماکے ہوئے تھے۔ انہیں یہی گمان تھا کہ شاید پورا گروپ حملہ آور ہو گیا ہے۔ لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد شہباز کو کنکریٹ کی شیڈ کے قریب دیکھ لیا گیا۔ وہ دو افراد تھے جو اس طرف دوڑے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کی ہوئی تھیں مگر انہیں فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کیونکہ شہباز کے ریوالور سے ٹھیک دو فائر ہوئے اور وہ اپنا سینہ تھامتے ہوئے چیخ مار کر نیچے گر گئے۔ شہباز نے چوتھے شیڈ کی جانب رخ کیا۔ ٹھیک اسی وقت عمارت میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں سے اعلان ہونے لگا کہ تمام گارڈز اپنے گیس ماسک پہن لیں۔

شہباز نے بھی یہ اعلان سنا لیکن سمجھ نہیں سکا کہ یہ ہدایت کیوں دی گئی ہے۔ پھر اس نے چوتھا ڈیٹونیٹر لگایا تھا اور گیٹ کی طرف مڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت میدان میں لگی ہوئی دھاتی پلیٹیں اپنی جگہ سے اٹھیں اور تیزی سے گھومنے لگیں۔ ان کے چاروں طرف سوراخوں سے کثیف قسم کی گیسیں خارج ہونے لگیں اور آنِ واحد میں اس گیس کے بادل پورے کمپلیکس پر پھیلتے چلے گئے۔ یہ ایک خوفناک صورتحال تھی جس کا ذرہ برابر گمان نہیں تھا۔ شہباز نے جیب سے رومال نکال کر اپنی ناک پر رکھا اور گیٹ کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کی رفتار پہلے سے تیز تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کا سانس بری طرح پھولنے لگا اور اسے

رومال ناک پر سے ہٹا کر سانس لینا پڑا۔ نتیجہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ گیس اس کے پھیپھڑوں میں
داخل ہوگئی۔ اس گیس کا اثر دماغ پر بھی اسی طرح ہوا اور شہباز نے بڑے دکھ بھرے انداز
میں سوچا کہ گڑبڑ ہوگئی۔ کاش اس سلسلے میں بھی یہی کچھ کیا جا سکتا...... لیکن ذہن میں
خیال نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل و دماغ گیس کی بو میں لپٹتا چلا گیا اور تھوڑی دیر کے
بعد وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

✿......✿

آنکھیں کھلنے پر اس نے خود کو ایک اسٹریچر سے بندھے ہوئے پایا۔ اور پھر جب سر گھما
کر اِدھر اُدھر دیکھا تو لیشک اور چاؤ بھی دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ پاؤں بھی بندھے
ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ شہباز نے انہیں دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس
کا مطلب ہے کہ کھیل ختم ہوگیا اور وہ آخر کار ڈان بیورس کا شکار ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک وہ
آنکھیں بند کئے رہا اور اس کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور قرب و جوار کا جائزہ لینے
لگا۔ ایک لمحے کے اندر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی لیبارٹری میں ہے۔ وہاں مشینیں اور
ٹیکنیشن بھی دکھائی دے رہے تھے۔ نجانے کیسی کیسی مشینیں یہاں موجود تھیں۔ ابھی
چاروں طرف سر گھما کر جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک ایک دراز قامت شخص اندر داخل
ہوا۔ اس کے جسم پر لمبا سفید کوٹ تھا اور چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھیں کسی سانپ جیسی لگتی تھیں
اور حقیقت تھی کہ ان میں سفیدی نظر نہیں آ رہی تھی۔ گہرے گہرے ڈیلے اور ان سے کہیں
ڈارک کلر کی پتلی جسے غور سے دیکھنے پر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں کسی زندہ انسان کی
آنکھیں ہیں۔ ایسی آنکھیں زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ شخص اس کے
سامنے آ کھڑا ہوا اور غور سے شہباز کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے ایک حیران کن آواز
نکلی۔

"ایسٹرن......"

شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

"تم مجھے ایشیائی معلوم ہوتے ہو۔ کون سے ملک سے تعلق ہے تمہارا۔ بتاؤ گے؟"

شہباز اس طرح اسے دیکھتا رہا جیسے اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ سکے ہوں۔

"انگریزی نہیں جانتے؟" وہ پھر اسی انداز میں بولا۔ شہباز اب بھی خاموشی سے اسے

دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔

"تمہارے چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ تم میرے ایک ایک لفظ کو سمجھ رہے ہو
لیکن اپنے آپ کو انجان ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے مجھے
کتنا نقصان پہنچا دیا؟"

شہباز نے سوچا کہ اب ٹھیک ٹھاک ہو جانا چاہئے۔ صورتحال اتنی آسان نہیں جتنی سمجھی
جا رہی ہے۔ یہ شخص سانپ کا دوسرا روپ ہے۔ ممکن ہے اس کی بدلی ہوئی کوئی شکل ہی ہو۔
اس نے آہستہ سے کہا۔

"نقصان؟"

"گڈ...... صحیح فیصلہ کیا تم نے۔ تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہئے۔ ایک ذہین انسان ایسا
ہی کر سکتا ہے۔ اگر تم یہ اداکاری جاری رکھتے تو ظاہر ہے تمہیں اس سے نہ کوئی فائدہ ہوتا نہ
مجھے۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں یہاں تک آیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میرا تعلق
ایشیا کے ایک ملک سے ہے۔"

اسی وقت دو افراد آئے۔ ان کے پاس ایکسرے تھے۔ انہوں نے یہ ایکسرے اس شخص
کو پیش کئے اور وہ شخص ان کا بغور جائزہ لینے لگا۔ پھر ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

"آپ یہ ایکسرے دیکھئے مسٹر ڈان بیورس! یہ دونوں ایکسرے کلیئر ہیں اور اس کے جسم
میں کوئی چیز نہیں ہے۔"

"ہوں...... میں نے یہ ایکسرے اسی لئے کرائے تھے۔ میں تمہیں کس نام سے مخاطب
کروں؟"

"ایکس۔ وائی۔ زیڈ۔" شہباز نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"تمہاری یہ بے خوفی مجھے پسند آ رہی ہے۔ ایسے لڑکے مجھے اچھے لگتے ہیں جو موت کو
بالکل قریب دیکھنے کے بعد اسے پھونک مار کر اڑا دیں اور یہ سوچیں کہ وہ زندہ رہیں گے۔
خیر زندہ تو تم رہو گے، لیکن زبان کھولنے کے بعد۔ دیکھو، میرے لئے دو چار آدمی ایسی
حیثیت نہیں رکھتے کہ میں ان کی موت پر ہی غور کرنے لگوں۔ کام کے لوگوں کو میں اپنے
ساتھ شامل بھی کر لیتا ہوں۔ اب جبکہ تم اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے ہو تو تمہارے

پاس ایک بہترین ذریعہ یہ ہے کہ مجھے اپنے بارے میں ساری تفصیلات بتا کر اور یہ بتا کر جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا مقصد اور مفہوم کیا تھا، تم اپنے لئے زندگی حاصل کر لو۔ ممکن ہے میں تمہیں معاف کر دوں۔ کیا سمجھے؟''

''جی۔''

''تمہارے دوستوں نے بھی اپنی زبان نہ کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجبوراً مجھے ان پر تشدد کرنا پڑے گا۔ وہ دیکھو، میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔''

شہباز کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ لیشک اور چاؤ کے پیر نہ صرف بندھے ہوئے ہیں بلکہ ان پر الیکٹروڈ بھی لگے ہوئے ہیں تا کہ انہیں الیکٹرک شاک دیئے جا سکیں۔ وہ کمبخت چہروں کے تاثرات پڑھنے کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ شہباز نے ابھی اتنا ہی سوچا تھا کہ وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں...... یہ تو ایک معمولی سی کوشش ہے۔ میرے پاس بڑے بڑے دلچسپ طریقہ کار ہیں۔ اگر تم لوگ اپنی زبان کھول دو تو مجھے یہ تجربات نہیں کرنے پڑیں گے۔ ورنہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ مجھے اذیت دینے کے دو ہزار طریقے معلوم ہیں اور میں نے دنیا کے قدیم ترین لوگوں سے یہ سیکھا ہے کہ انسانوں کو کون کون سے طریقوں سے زبان کھولنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ دیکھو، میری پہلی کوشش یہی ہے کہ تم لوگ زبان کھول دو...... جاؤ ذرا ان دونوں کو ذرا سا گرم کر دو۔'' ڈان بیورس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور ایک شخص نے آگے بڑھ کر سوئچ آن کر دیا۔

لیشک اور چاؤ کے جسموں کو زبردست جھٹکے لگے۔ اگر وہ اسٹریچر سے بندھے نہ ہوتے تو شاید اچھل کر نیچے گر پڑتے۔ ان کے جسم بری طرح اینٹھنے لگے اور حلق سے کرب ناک چیخیں نکلنے لگیں۔ شہباز سرد نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ ڈان بیورس واقعی ایک بوڑھا سانپ ہے۔ ایک بے رحم اور جلاد قسم کا آدمی جو رحم کرنا نہیں جانتا۔ بے شک انسان یہی کوشش کرتا ہے کہ کسی دوسرے کے سامنے اسے شکست نہ ہو۔ لیکن شکست بھی اپنا ایک مزہ ہے۔ اور پہلی بار شہباز کو یہ اندازہ ہوا کہ اس کے وجود میں بھی اذیت طلبی ہے۔ یعنی وہ اپنے جسم پر اذیت ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈان بیورس کہنے لگا۔

''یہ ابھی ابتدا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان سے کہو کہ یہ زبان کھول دیں۔ اس باران جھٹکوں میں جو شدت ہوگی وہ ان کے سانس بھی روک سکتی ہے اور دل کی حرکت بھی۔''

''ٹھیک ہے...... بہتر یہ ہوگا مسٹر ڈان بیورس! کہ آپ ان کی بجائے مجھ سے بات کریں۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان پر تشدد ختم کر دیا جائے۔''

''ہاں، یہ بے چارے تو صرف مہرے ہیں۔ اصل کردار میں ہوں۔''

''واہ...... یہاں بھی میرے اندازے کی تصدیق ہوئی ہے۔ اسی لئے میں تمہارے پاس کھڑا ہوں اور تمہیں ابھی تک میں نے کوئی تکلیف نہیں دی ہے۔'' ڈان بیورس نے اشارہ کیا اور ٹیکنیشن نے سوئچ آف کر دیا۔ ڈان بیورس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا۔

''ہاں...... اب یہ بتاؤ کہ بات اسی طرح ہو جائے یا پھر...... مگر نہیں، یہی شکل مناسب ہے۔ اچھا تو تم مجھے کیا بتانے والے تھے؟''

''ہمارا تعلق نہ کسی ملک سے ہے اور نہ کسی سیاسی گروپ سے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم نے نیل ڈل کا نام سنا ہے؟''

''نیل ڈل؟''

''ہاں......''

''نہیں، یہ نام میرے لئے اجنبی ہے۔''

''کچھ عرصے کے بعد یہ نام دنیا کے لئے اجنبی نہیں رہے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''نیل ڈل ہمارا چیف ہے۔ اور وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا تعلق برمودہ ٹرینگل سے ہے۔ اب تم یہ کہو گے کہ تم برمودہ ٹرینگل کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔'' شہباز نے ایک ایسی کہانی کا آغاز کر دیا جو پہلے سے اس کے ذہن میں نہیں تھی بلکہ اس نے زمانہ طالب علمی میں ہی برمودہ ٹرینگل کے بارے میں پڑھا تھا۔ وہ پراسرار علاقہ جس کی ہر کہانی ایک نئی کہانی ہوتی تھی۔

ڈان بیورس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''برمودہ ٹرینگل کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ لیکن تم جو بکواس کر رہے ہو وہ میری سمجھ میں نہیں

آئی۔"

"میں اپنے چیف بیل ڈل کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ بیل ڈل نے اپنے گروپ کا نام بھی بیل ڈل ہی رکھا ہے۔ بظاہر یہ ایک دہشت گرد گروپ ہے لیکن بیل ڈل کا کہنا ہے کہ بہت جلد وہ ساری دنیا کو بلیک میل کر کے اسے اپنی مٹھی میں جکڑ لے گا۔ اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر برمودہ ٹرینگل میں ہی بنایا ہے۔"

اچانک ہی شہباز نے محسوس کیا کہ ڈان بیورس کے چہرے پر دلچسپی کے آثار پھیل گئے ہیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو کیا تمہارا تعلق بھی برموداٹرینگل سے ہی ہے؟"

"نہیں...... بالکل نہیں۔ ہم مختلف ملکوں کے لوگ ہیں۔ مثلاً میرے یہ دونوں ساتھی۔ ان کا تعلق میلیکو سے ہی ہے۔ جبکہ میں ایشیاء کے ایک چھوٹے سے ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔ بیل ڈل نے ہر جگہ اپنے نمائندے منتخب کئے ہیں۔"

"لیکن یہاں تم کیا کرنا چاہتے تھے؟" ڈان بیورس نے سوال کیا۔

"مسٹر ڈان بیورس! یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ ہم صرف تین آدمی اس علاقے میں آئے تھے۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ تین افراد آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہاں مسٹر بیل ڈل یہ ضرور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی اجازت دی تھی کہ اگر ہم آپ کی گرفت میں آجائیں تو آپ کو ان کی طرف سے ایک پیشکش بھی کر دیں۔"

"پیشکش؟"

"ہاں...... یہ پیشکش کہ مسٹر بیل ڈل آپ کا تعاون چاہتے ہیں اور برمودہ ٹرینگل کے خفیہ خزانے منہ کھولے آپ کا انتظار کر رہے ہیں جو آپ کو اتنی مالیت میں دیئے جا سکتے ہیں کہ آپ ایک پورا ملک تعمیر کر سکیں۔ اگر آپ ان سے تعاون کریں گے تو آپ کو دولت مل سکتی ہے۔"

"گڈ...... لیکن اگر تم میرے قبضے میں نہ آتے تو کیا کرتے؟"

"صرف یہ معلومات حاصل کرتے کہ آپ یہاں کیا واقعی ایٹمی تیاریاں کر رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہے...... تم جو کچھ بھی یہاں کرنا چاہتے تھے اب اسے کرنے میں ناکام رہے

ہو۔ چنانچہ موت کا مزہ چکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"یہ آپ کی مرضی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم آپ کے لئے بے ضرر ہیں۔ ہم اگر یہ معلومات لے کر مسٹر بیل ڈل کے پاس پہنچ بھی جاتے تو صرف اتنا ہوتا کہ مسٹر بیل ڈل آپ سے رابطہ کرنے کے لئے کوشش کرتے اور اس کے بعد آپ سے براہِ راست سودے بازی کرتے۔ ہمیں تو صرف اس بات کی تصدیق کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے کہ کیا واقعی آپ ایٹمی سائنس دان ہیں؟"

"میں تمہیں اس کی بھرپور تصدیق کراؤں گا۔ بے فکر رہو۔" اچانک ہی ڈان بیورس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اسٹریچر کی بندشیں کھول کر شہباز کو آزاد کر دیا اور اسے سر کے بالوں سے اٹھاتا ہوا بولا۔

"طاقت...... طاقت...... مائی ڈیئر! طاقت۔ اور میں تمہیں بتاؤں گا کہ طاقت کیا چیز ہوتی ہے۔ اور تم اب بیل ڈل کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے بیل ڈل کے خلاف کام کرو گے۔ کیونکہ ایسے کسی شخص کو آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا جو سوچتا ہو کہ دنیا میں جینے کا حق اسے ہی حاصل ہے جو طاقتور ہو۔ اور میں یہ طاقت جس طرح اپنے پاس جمع کرنا چاہتا ہوں اسی کے طریقہ کار پر چل رہا ہوں۔ دنیا کا ایک بہت بڑا ملک مجھے سپورٹ کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے اپنے افکار و خیالات کچھ اور ہی ہیں۔"

اس نے بال پکڑ کر شہباز کو دھکا دیا تو وہ ایک گارڈ پر جا گرا۔ گارڈ نے اسے اسٹین گن کی نال پر روکا اور پھر اس کے پیٹ میں پوری قوت سے مُکا مارا۔ شہباز پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ شاید ڈان بیورس نے گارڈز کو اس پر تشدد کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ دوسرے گارڈ نے اس کے سر پر ٹھوکر لگائی۔

شہباز نے اس طرح کا مظاہرہ کیا جیسے وہ صرف اپنی بچت کرنا چاہتا ہو۔ اچانک ہی اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں نہیں جانتا مسٹر ڈان بیورس! کہ آپ کو مجھ پر تشدد کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ میں ایک بار پھر آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں بے ضرر انسان ہوں۔"

"تمہاری بہت سی باتوں پر یقین کرنے کو دل بھی چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی میں نے ایک معقول بندوبست کر رکھا ہے۔ تمہارا سچ اور جھوٹ جو کچھ بھی ہوگا آسانی سے

سامنے آجائے گا۔ چلو، اسے سی آر میں بند کر دو۔"

یہ سی آر کیا چیز تھی اس کے بارے میں شہباز کو بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس وقت شہباز نے ایک انوکھا کردار تخلیق کر کے اپنی بہترین ذہانت کا ثبوت دے دیا تھا۔

بہر حال اس کے بعد یہ سی آر کا منصوبہ زیر عمل آ گیا۔ انہیں وہاں سے نکالا گیا اور ایک ٹرک میں بٹھا کر کہیں روانہ کر دیا گیا۔ شہباز ابھی تک اس قسم کا مظاہرہ کر رہا تھا جیسے واقعی ایک بے ضرر چوہا ہو اور ان لوگوں سے بری طرح مرعوب ہو گیا ہو۔ ٹرک پہلے کچے اور ناہموار راستے پر چلتا رہا، پھر ایک کنکریٹ کی سڑک پر دوڑنے لگا۔ وسیع وعریض علاقہ تھا اور اندرونی نقل وحرکت کے لئے شہباز نے وہاں کئی ایسے ٹرک دوڑتے دیکھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس عمارت کے سامنے جا کھڑے ہوئے جو سرخ رنگ کی تھی اور اس کے سامنے کے حصے میں سیاہ رنگ کے ستون بنے ہوئے تھے۔ اس کی آرائش لکڑی اور بانسوں سے کی گئی تھی۔ لیشک اور چاؤ کو بھی اتار لیا گیا۔ پتہ نہیں ان لوگوں کے ساتھ انہوں نے کیا، کیا تھا کہ وہ بڑے مضمحل نظر آ رہے تھے۔

بہر حال ان تینوں کو اس عمارت کے اندر داخل کر دیا گیا۔ عمارت اندر سے بہت وسیع اور کشادہ تھی۔ اس کی آرائش شاندار کی گئی تھی۔ ہال سے ایک بل کھاتا ہوا زینہ دوسری منزل تک چلا گیا تھا۔ وہ لوگ انہیں دھکیلتے ہوئے دوسرے زینے تک لے گئے جو نیچے جا رہا تھا۔ نیچے تہہ خانہ تھا جو اوپر کی نسبت تاریک تھا اور وہاں بہت ہی مدہم روشنی تھی۔ ایک گارڈ نے پوری قوت سے شہباز کی کمر پر رائفل کا دستہ مارا اور وہ ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ گارڈ نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ لیشک اور چاؤ کے ساتھ کیا، کیا گیا۔ پھر اس نے نزدیک ہی کوئی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی اور یہ اندازہ لگایا کہ شاید لیشک اور چاؤ کو کسی دوسری کوٹھڑی میں بند کیا جا رہا ہے۔ راہداری میں قدموں کی نپی تلی چاپ اُبھر رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی گارڈ وہاں پہرہ دے رہا ہے۔ جس کوٹھڑی میں اسے قید کیا گیا تھا اس کے دروازے میں شیشے کی چھوٹی سی آنکھ بنی ہوئی تھی۔ شہباز کو یقین تھا کہ گارڈ اس آنکھ سے اندر کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔

شہباز کو اس صورتحال کی کوئی امید نہیں تھی۔ اب وہ یہ جائزہ لے رہا تھا کہ یہاں سے فرار ہوا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی، روشن دان یا گرل وغیرہ نہیں تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا جس سے اسے اندر لایا گیا تھا اور ایک بلب لگا ہوا تھا جس سے روشنی ہو رہی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا اور ڈان بیورس اندر داخل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں وہی سانپوں جیسی کیفیت اور چمک۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"مائی ڈیئر! میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ اور دیکھ لو میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔ ورنہ جس طرح تمہارے ساتھیوں کے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں اور ان زنجیروں کے سرے فرش میں گڑے ہوئے ہیں اسی طرح تمہارے ساتھ بھی یہ سلوک کیا جاتا۔ میں نے ان زنجیروں کی چابیاں اپنے پاس رکھی ہیں اور تمہاری چابی......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"مگر آپ نے میرے ساتھ یہ رعایت کیوں برتی؟"

"بس دل چاہا کہ تمہارے بدن کو داغدار نہ کیا جائے۔ اس کے لئے تو بہت سے مواقع آئیں گے۔ ویسے تھوڑی دیر ہمارے مہمان رہو تاکہ ہم فیصلہ کر سکیں کہ تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔ بیل ڈل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے میں انتظامات کر رہا ہوں۔ تمہاری بات کی تصدیق ہو گئی تو ہم یہ بھی سوچیں گے کہ کیا بیل ڈل کسی موقع پر ہمارے لئے کام کا ثابت ہو سکتا ہے؟ تم اس بات کا پورا پورا اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس وقت تمہاری زندگی کی وجہ یہی ہے کہ ہم بیل ڈل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے تم میرے اور اس کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکو بشرطیکہ اس کا کوئی وجود اس دنیا میں ہو۔ او کے؟" اس نے کہا اور واپس پلٹ گیا۔

شہباز کی نگاہ پھر ان سپاٹ اور بے رحم دیواروں کا جائزہ لینے لگی۔ نجانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا بہت مشکل کام ہے۔ اور پھر رات کے وقت تو یہ بہت ہی مشکل ہو گا۔ ہو سکتا ہے صبح کو اس کا موقع مل جائے اور ہو سکتا ہے جب ڈان بیورس کے گارڈز انہیں یہاں سے لینے کے لئے آئیں۔

بہر حال شہباز ہلکی سی ورزش کرنے لگا اور اس کے بعد سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ اسے کوئی

موثر منصوبہ درکار تھا اور اس کا ذہن کسی تدبیر پر غور کر رہا تھا۔

☼......☼

لیشک اور ایرک چاؤ شہباز کے بہترین معاون رہے تھے۔ اس ساری ہنگامہ آرائی میں انہوں نے جس طرح شہباز کا ساتھ دیا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے طور پر شہباز نے اپنی فراست سے کام لے کر یہاں وہ سارا بندوبست تو کر دیا تھا جو ڈان بیورس کے خوفناک منصوبے کو خاک میں ملا سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ لیشک اور چاؤ کی زندگی کا خواہش مند تھا اور اتنے بڑے نقصان سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

بہرحال دوسری صبح اسے اسٹین گن کی نال سے کور کر کے دھکیلتے ہوئے اس کشادہ اور ہال نما کمرے میں لایا گیا جس کی ایک دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی اور یہاں سے اس سارے نظام حیات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ ویسے تہہ خانے سے آتے وقت شہباز نے دیکھا تھا کہ یہاں بہت زیادہ گارڈز موجود نہیں ہیں، بس نچلی منزل پر تین یا چار گارڈ تھے اور زینے کے قریب صرف دو افراد وہ جو اسے وہاں تک لایا تھا بدستور وہیں کھڑا ہوا تھا اور ڈان بیورس اس وقت دیوار کے ساتھ کھڑا نجانے کیا جائزے لے رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد ڈان بیورس اس کی جانب مڑا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو انسان کو ذہنی طور پر مشتعل کر دے۔ شہباز نے دیکھا کہ اس دیوار کے نزدیک ایک کنٹرول پینل ہے جس پر بہت سے سوئچ لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دیوار کے پار وہ خوفناک میزائل نصب تھے جن کی پرواز تباہی کا دوسرا نام کہلا سکتی تھی۔

ڈان بیورس نے گہری سانس لی اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''ہیلو...... بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں میری نگاہوں میں کوئی اہمیت، کوئی وقعت حاصل ہوئی۔ بہت کم۔ بلکہ یہ کہو کہ نہ ہونے کے برابر۔ اور تم انتہائی خوش قسمت ہو لڑکے! تم نے بہت تھوڑے سے وقت میں ایک عجیب حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مختصر الفاظ میں، میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں۔ میرا تعلق تو کہیں اور سے ہی ہے۔ نہ میں میلیکو کا باشندہ ہوں اور نہ ہی میرا تعلق پلاسکو سے ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ لو کہ حکومت پلاسکو نے مجھے پالا ہے۔ تمہارے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتا۔ پلاسکو حکومت ابتداء ہی سے میری ہر طرح سے مدد کرتی رہی ہے اور اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ میرا اس قدر عظیم

سائنسدان بن جانا پلاسکو ہی کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میرے وسائل اتنے نہیں تھے کہ میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کر سکتا۔ میلیکو کے سربراہانِ مملکت اور یہاں کے بڑے بڑے لوگ مجھے دیوتا کی طرح پوجتے ہیں۔ حکومت میلیکو کا خیال ہے کہ میں اس کے لئے جو جوہری ہتھیار بنا رہا ہوں وہ اسے اقوام عالم میں بہت ممتاز بنا دیں گے اور میلیکو ایک قابل فخر ایٹمی ملک بن جائے گا۔ لیکن پلاسکو کو درحقیقت اس دنیا کو کمان کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ وہاں جو پلاننگ ہوتی ہے اس پر پہلی بات تو یہ کہ اس قدر زبردست اخراجات کئے جاتے ہیں کہ دوسرے ملک سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ وہاں اپنے لوگوں کی جو پذیرائی کی جاتی ہے اور جس طرح ان کی عزت افزائی کی جاتی ہے وہ بھی ایک قابل فخر بات ہے۔ وہ لوگ ہر ذہانت کو خرید لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی پلاننگ بھی زبردست ہوتی ہے۔ تو میرے دوست! تمہیں اب یہ بات بتانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہے کہ میں حکومت پلاسکو کا ہی پروردہ ہوں۔ لیکن کیا ہی دلچسپ بات ہے کہ حکومت پلاسکو نے مجھے اپنے دشمن ملک کا عظیم ترین سائنسدان بنا دیا ہے۔ میلکو والے سمجھتے ہیں کہ میں ان کے مفادات کے لئے کام کر رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں پلاسکو کے مفادات کے لئے کام کر رہا ہوں تاکہ میلیکو اگر کبھی پلاسکو کے لئے کوئی مشکل چیز بن جائے تو اندر ہی اندر اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور کیا ہی بدنصیبی کی بات ہے کہ اس وقت میلیکو کو ایک بدترین نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بدترین نقصان سے۔''

شہباز چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ڈان بیورس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''اور تم نے رازل جریری کا نام میرے سامنے پیش کیا۔ حکومت پلاسکو بہت عرصے سے اس سائنسدان سے نقصانات اٹھا رہی ہے اور اس کے سلسلے میں جو مفصل رپورٹ بھیجی گئی ہے وہ یہ ہے کہ رازل جریری نے پلاسکو کا کھربوں ڈالر کا نقصان کر دیا ہے۔ اس کی عظیم ترین لیبارٹریاں جو اس نے بڑی تحقیق اور ترتیب کے بعد آرتھیو ویسکو اور وان کیسرو کے علاقے میں بنائی تھیں رازل جریری نے تباہ کر دی ہیں۔ ایک لمبی کشمکش کے بعد رازل جریری اپنی قوتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور حکومت پلاسکو کے پاس نئی رپورٹ یہ موجود ہے کہ اس کے میلیکو کے اس شہر میں، میرا مطلب ہے یوکاس میں کہیں

اپنی لیبارٹری بنائی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ یوکا
کی آبادی تقریباً پچھتر لاکھ ہے۔ ان پچھتر لاکھ افراد میں سے تقریباً ساٹھ لاکھ افراد کو مرنا ہو
گا۔ دس پندرہ لاکھ افراد میں سے کچھ تو وہ ہوں گے جو کسی کام سے یوکاس سے باہر گئے
ہوں گے اور کچھ وہ خوش نصیب ہوں گے جو اتفاقیہ طور پر زندہ بچ جائیں گے۔ اور ایسا کس
لئے ہوگا؟ صرف رازل جریری کی وجہ سے۔ حکومت پلاسکو کو یہ اطلاع ملی ہے کہ یوکاس
میں رازل جریری نے اپنے لئے کوئی جگہ منتخب کر کے وہاں اپنی لیبارٹری بنائی ہے اور وہاں
وہ کام کر رہا ہے۔ اور اس کی تصدیق تم سے ہو جاتی ہے۔ غالباً تم نے پلاسکو کے کچھ ایسے
نمائندہ کو ختم کر دیا ہے جنہیں یہاں تمہاری آمد کا علم ہو گیا تھا۔ حکومت پلاسکو کو ایک بار پھر تم
نے نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن میرے عزیز..... میرے دوست..... پلاسکو کی حکومت بہت
طاقتور ہے اور بڑے جدید ذرائع رکھتی ہے۔ تم نے شاید غلط ہی کیا ہے۔ چنانچہ اب مجھے
ہدایت ملی ہے کہ بحالت مجبوری یوکاس شہر کو نیست و نابود کر دوں۔ وہ میزائل جو میں نے
نصب کئے ہوئے ہیں، زبردست ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ اگر کبھی میلیکو، پلاسکو کے
مقابلے میں آتا تو اندرونی طور پر یہ سارے میزائل خود میلیکو کو ہی نقصان پہنچاتے کیونکہ
میں درپردہ پلاسکو کا نمائندہ ہوں۔ تم پلاننگ دیکھو اور اس کی تعریف کرو۔ کیا اتنی زبردست
پلاننگ کرنے والا پلاسکو ساری دنیا پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے؟ خیر یہ میزائل اب
سے تھوڑی دیر کے بعد اپنی جگہ سے پرواز کریں گے اور اس کے بعد یوکاس کو نیست و نابود
کر دیں گے۔ بہت ہی کم لوگ زندہ بچیں گے یہاں۔ باقی شہروں سے ہمیں کوئی دلچسپی
نہیں ہے۔ ہم صرف رازل جریری کی تجربہ گاہ تباہ کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ
رازل جریری فنا ہو جائے۔ اس ایک شخص کی وجہ سے ساٹھ لاکھ انسان یا ہو سکتا ہے اس سے
زیادہ موت کا نوالہ بننے جا رہے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈان بیورس پھر
حکومت میلیکو کی گڈ بک پر رہے گا۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ ایک چھوٹی سی غلطی سے
میزائل چل گئے۔ بلکہ شبہ ہے اس سلسلے میں کہ کسی غیر ملکی ایجنٹ نے یعنی تم نے یہاں
کارروائی کی ہے۔ اخبارات کو یہی بیان جاری ہوگا۔ اور اس وقت جب پورا میلیکو یوکاس
کے سوگ میں ڈوبا ہوا ہوگا اور میرے عزیز! وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔ کیا سمجھے۔ میں
ہوں اور میں نے سوچا ہے کہ تمہاری موجودگی ہی میں یہ سارا کام سرانجام پائے گا۔ آہ

میلیکو اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزرنے والا ہے۔ بس کچھ لمحوں کے بعد ضروری
کارروائی مکمل ہو جائے گی جس کا حکم میں دے چکا ہوں۔ اور پھر یہ میزائل پرواز کے لئے
تیار ہوں گے۔"

شہباز کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے تھے۔ وہ جو کچھ کر چکا تھا، وہ بھی بہت بڑی چیز
تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ایکٹی ویٹر صرف ایک سیکنڈ میں الیکٹرونک اشارہ دے گا
اور ڈیٹونیٹر اپنا کام شروع کر دیں گے اور چند سیکنڈ میں وہ سب کچھ ہو جائے گا جو ڈان
بیورس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ رازل جریری کے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔
اسے اس تمام کارروائی کے لئے اور ڈان بیورس کی اس ہولناک تجربہ گاہ کی تباہی کے لئے
صرف چودہ سیکنڈ درکار تھے۔ اس نے ایک نگاہ ادھر اُدھر دیکھا، وہ گارڈ جو چوکس کھڑا ہوا تھا
اس کے لئے اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔

اچانک ہی شہباز نے اس طرح کی کیفیت کا مظاہرہ کیا کہ اس کے پیروں کی جان نکلتی
جا رہی ہو۔ اس نے اپنے گھٹنے پکڑ لئے اور کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آہ..... آہ..... میں..... میں اپنے سینے میں شدید درد محسوس کر رہا ہوں..... آہ.....
میں..... میں....." وہ گرنے لگا تو گارڈ نے جلدی سے اسے سنبھالا دیا۔ لیکن بس یہی شہباز
چاہتا تھا۔ گارڈ کی کنپٹی پر پوری قوت سے اس نے وار کیا اور گارڈ کے حلق سے ایک بے معنی
آواز نکلی اور وہ دھڑام سے گر گیا۔

یہ تمام کیفیت ڈان بیورس نے بھی دیکھ لی تھی۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے
ہوئے کہا۔ "کیا ہوا تمہیں..... اور کیا ہوا اسے؟ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔ آہ..... شاید تم نے
چالاکی سے کام لیا ہے۔ لیکن تمہارا کیا خیال ہے کیا تمہاری یہ چالاکی یوکاس کو بچا لے گی؟
رازل جریری کو بچا لے گی؟ کیا ہی بیوقوفی کی بات ہے۔"

"نہیں میری جان ڈان بیورس۔ یہ بیوقوفی کی بات نہیں ہے۔ تم رازل جریری کے
مقابلے پر آئے ہو نا۔ رازل جریری نے پلاسکو کو کس طرح ناکوں چنے چبوائے ہیں، کیا
تمہارا خیال ہے کہ تم جیسا ایک بیوقوف سائنسدان اسے نقصان پہنچا سکتا ہے؟ سنو.....
جاؤ، کوشش کرو۔ تمہارے یہ میزائل اپنی جگہ سے پرواز نہیں کر سکتے۔ کیا سمجھے؟"

ڈان بیورس ایک لمحہ کے لئے چونکا اور پھر مسکرا کر بولا۔ "کوئی دوسری ترکیب۔ یا پھر

تمہارا دماغ ہی الٹ گیا ہے۔"

"نمبر ایک......" شہباز نے گونجدار آواز میں کہا۔ یہ رازل جریری کی عظیم الشان ایجا[د] تھی اور نمبر ایک خفیہ اشارہ تھا۔ آواز کے سگنل کے ذریعے ایکٹیویٹر پہلے ڈیٹونیٹر کو متحرک کرنے والا تھا۔ چنانچہ اسی لئے اس نے مخصوص ردھم میں نمبر ایک کہا تھا۔ وہ پھر بولا۔

"نمبر ایک۔" اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایکٹیویٹر نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس نے وقفہ دے کر گہرا سانس لیا اور بولا۔

"ہاں...... کیا کہتے ہو؟"

"کچھ نہیں...... دیکھ رہا ہوں کہ ایک انسان کا دماغ جب کام کرنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ کس طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔"

لیکن ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ڈیٹونیٹر دھماکے کے ساتھ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی ایک میزائل کے پرخچے اُڑ گئے۔ دھماکہ اتنا لرزہ خیز تھا کہ پیروں سے نیچے کی زمین ہل گئی تھی۔ میزائل ایک جھٹکے سے فضا میں بلند ہوا اور اس کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ وہ جس شیڈ میں رکھا ہوا تھا وہ تباہی سے دوچار ہو گیا اور پورے علاقے میں کنکریٹ، فولاد اور لکڑیوں کے ٹکڑے بکھر گئے۔ اس کے آس پاس جتنے افراد موجود تھے وہ موت سے ہمکنار ہو گئے۔

ڈان بیورس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ سراسیمہ انداز میں دوڑتا ہوا کنٹرول پینل کی طرف گیا اور پھر ایک سوئچ کو دبا کر بولا۔

"یہ کیا ہوا آپریٹر...... آپریٹر! میں ڈان بیورس بول رہا ہوں۔ یہ کیا ہوا ہے...... فوراً مجھے بتاؤ...... فوراً۔"

"تم نے میری پوری بات تو سنی ہی نہیں میرے دوست!" شہباز نے اپنے پہلے عمل کا ردِعمل دیکھتے ہوئے کہا۔

"نمبر دو...... ظلم اور جبر انسانیت کو کبھی فنا نہیں کر سکتا۔ سمجھے نمبر دو......" اس کا جملہ ختم ہی تھا کہ دوسرا خوفناک دھماکہ ہوا اور دوسرا میزائل بھی اچھل کر تباہ ہو گیا۔ اس کے ٹکڑے پورے علاقے میں پھیل گئے تھے۔

ڈان بیورس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اسپیکر کے قریب

پہنچ کر سوئچ آن کیا اور بولا۔

"معلوم کرو...... کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ کیا ہو رہا ہے؟"

"نمبر تین......" شہباز کی بلند آواز ابھری۔ اور جب تیسرا دھماکہ ہوا تو اس ہال کے در و دیوار تک ہل کر رہ گئے۔ ڈان بیورس نے اس طرح شہباز کو دیکھا جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی خوفناک مخلوق ہو۔

ایک بار پھر وہ پینل پورٹ کے پاس جا کر چیخ چیخ کر اپنے لوگوں کو ہدایت دینے لگا۔ اس کی آواز سے بدحواسی ٹپک رہی تھی اور جسم کانپ رہا تھا۔

"تم نے مجھے داد نہیں دی ڈان بیورس! جو کچھ میں نے کہا تھا اس پر تم نے غور نہیں کیا...... نمبر چار...... محبت نفرت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور طاقت کو سچائی سے مغلوب کیا جا سکتا ہے۔"

چوتھا میزائل فضا میں اچھل کر پھٹا اور اس کے ساتھ ہی ڈان بیورس فرش پر گر پڑا۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئی تھیں۔ وہ زمین پر پڑا دیوانوں کی طرح چیخ چلا رہا تھا۔ اور اس کے بعد چاروں طرف دھوئیں کے کثیف مرغولے پھیل گئے۔

دھماکے ہوتے رہے۔ تمام شیڈ ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں اور زندہ بچ جانے والے بدحواسی میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے لیکن انہیں کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ تب شہباز آگے بڑھا اور اس نے ڈان بیورس کا گریبان پکڑا اور اسے شیشے کی دیوار کی طرف گھماتے ہوئے بولا۔

"اس تباہی کا مکمل جائزہ لو کتے! سمجھ رہے ہو نا کیا ہو رہا ہے یہ۔ ساٹھ لاکھ انسانوں کو ختم کرنے چلے تھے تم...... ساٹھ لاکھ انسانوں کو۔ لیکن وہ زندہ بچ گئے اور تم اس وقت موت کے قریب ہو۔"

ڈان بیورس میں جیسے زندگی آ گئی۔ اس نے پوری قوت سے شہباز پر حملہ کیا لیکن یہ بھی اس کی بڑی بیوقوفی تھی۔ شہباز نے اسے گریبان سے پکڑ کر اس طرح فضا میں گھما دیا جیسے وہ کوئی معمولی سی چیز ہو اور اس کے بعد اسے زمین پر دے مارا۔ ڈان بیورس کے جسم میں کافی چوٹ لگی تھی۔

لیکن پھر اچانک ہی اس نے دوسرا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک دم باہر کی طرف چھلانگ لگا

دی اور ہال سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شہباز اس کے پیچھے لپکا تھا۔ جب وہ ہال سے باہر نکلا تو ڈان بیورس راہداری کے اختتامی سرے پر غائب ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے آگے دوڑا لیکن اچانک ہی چار گارڈ اس کے سامنے آگئے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کیں اور ایک دم فائر کر دیئے۔ شہباز اچھل کر نیچے گرا تھا۔ حالانکہ اس میں اس کی کسی چالاکی کا دخل نہیں تھا۔ لیکن وہ چاروں اس طرح اس کی طرف بھاگے جیسے اسے فوراً ہی سنبھال لینا چاہتے ہوں۔ شہباز نے اچانک ہی ایک لات پہلے والے گارڈ کے سینے پر جمائی اور وہ اتنا اونچا اچھل کر دیوار سے ٹکرایا کہ خود شہباز کو ہی حیرت ہوئی۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر کھل گیا تھا۔ اس کی رائفل شہباز کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ شہباز نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ان باقی کی طرف رخ کیا اور فائر کر دیئے۔ وہ خاک و خون میں لوٹنے لگے تھے۔ شہباز نے ان کی لاشوں پر سے چھلانگ لگائی اور آگے کی طرف دوڑنے لگا۔ دو گارڈ پھر اس کے سامنے آئے اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل گرجی اور وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ اسے ڈان بیورس کی تلاش تھی۔ وہ دوڑتا ہوا تہہ خانے کی طرف چل پڑا۔ اچانک اسے کچھ چیخیں سنائی دیں اور اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ پھر جب وہ کوٹھی کے دروازے پر پہنچا تو اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔

ڈان بیورس کے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کی تلوار تھی اور وہ اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے لیشک کے سامنے اس طرح کھڑا تھا جیسے ایک لمحے میں اس کا سر قلم کر دینا چاہتا ہو۔ صرف ایک لمحہ...... صرف ایک لمحہ۔ صورتحال بڑی سنگین تھی۔ اس وقت شہباز بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اس وقت ڈان بیورس پر فائر کرے گا تو تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اور لیشک کی گردن میں پڑے گی۔ اس نے اپنی رائفل ایک طرف پھینکی اور دائیں پہلو سے ڈان بیورس پر چھلانگ لگائی اور اسے سمیٹتا ہوا دور جا گرا۔

ڈان بیورس نے گرتے ہی شہباز پر وار کیا۔ اگر شہباز اچھل کر پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو اس وحشیانہ وار میں اس کا بازو کٹ کر گر پڑتا۔ تلوار اس کے بازو کے بالکل قریب سے نکلی تھی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا تاکہ ڈان بیورس کے دوسرے وار سے بچ سکے۔ چونکہ ڈان بیورس اس وقت پوری طرح شہباز کی طرف متوجہ تھا، اس نے پھر اس پر حملہ کیا لیکن شہباز

نے اس کی وہ کلائی پکڑ لی جس میں تلوار دبی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ تلوار سمیت دور جا گرا۔ لیکن بدنصیبی یہ تھی کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تلوار سیدھی ہو گئی اور وہ اس پھل پر گرا۔ تیز دھار کی تلوار اس کے سینے میں گھستی چلی گئی۔

ڈان بیورس کی کربناک چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں مار کر تلوار کو اپنے سینے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور فرش اس کے خون سے آلودہ ہوا جا رہا تھا۔ پھر اس کا کانپتا ہوا بدن ساکت ہو گیا۔

شہباز نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے چابی نکالی اور لیشک اور چاؤ کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ دونوں کے اعصاب کشیدہ تھے اور وہ شاید اس وقت کسی بھی قسم کی مدافعت کرنے کی کیفیت میں نہیں تھے۔ لیشک کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

”دھماکے...... یہ دھماکے......“

”ہاں...... آؤ۔“

اور اس کے بعد انہیں یہاں سے نکلنے میں خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر طرف آگ، خون اور تباہی ان کی منتظر تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائیں، کیا کریں۔ چنانچہ وہ جدھر منہ اٹھا، ادھر چل نکلے۔ لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک شکستہ دیوار کے عقب سے انہیں فوجی وردی میں ملبوس افراد دوڑتے ہوئے نظر آئے۔

”اوہ مائی گاڈ۔ وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا“ لیشک کے منہ سے پریشانی کی آواز نکلی۔

”یہ لوگ کچھ تبدیل لگ رہے ہیں۔“

”جی ہاں...... یہ میلیکو کی ریگولر آرمی ہے۔ اس کمینے انسان نے میلیکو میں جو مقام حاصل کر رکھا تھا اس کے تحت میلیکن آرمی اس کی مدد کو آئی ہے۔ وہ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ دشمن کے ایجنٹوں نے ڈان بیورس کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہمیں جنگل کی طرف بھاگنا ہوگا۔ یہ لوگ لازمی طور پر ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گے۔ بس ایک اندازہ ہے کہ یہ لوگ یہاں تک پیدل نہیں آئے ہوں گے۔ یقیناً ان کے ٹرک کہیں آس پاس ہوں گے۔ اگر ہمیں ان میں سے ایک ٹرک مل جائے تو بڑا اچھا ہو۔“

”چلو...... چلتے ہیں۔“ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ آنے والے فوجی ایجنٹوں کی تلاش

میں ہیں۔ لیکن شہباز، چاؤ اور لیشک کو ٹرک حاصل ہو گیا۔ گیٹ پر انہیں آٹھ دس ٹرک کھڑے نظر آئے تھے۔ چنانچہ پہلے والے ٹرک کو قبضے میں کیا گیا۔

شہباز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور دونوں بھائیوں کو ہدایت کی کہ وہ پچھلے حصے میں بیٹھیں تاکہ اگر ٹرک کا تعاقب کیا جائے تو وہ اس سے نمٹ سکیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جونہی ٹرک اسٹارٹ ہوا، آٹھ دس فوجی بھاگتے ہوئے نکلے۔ ابھی انہوں نے فائر کرنے کے لئے رائفلیں سیدھی ہی کی تھیں کہ لیشک اور چاؤ نے ان پر رائفلیں تانیں اور شعلے اگلنا شروع کر دیئے۔ متعدد چیخیں گونجیں اور کئی ایک زمین پر گرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جو باقی بچے تھے انہوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ مگر شہباز دیوانوں کی طرح ٹرک کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ اور چند لمحوں کے اندر وہ فائرنگ کی رینج سے باہر نکل گئے۔

بڑی اندھی صورتحال تھی۔ اور یہ ایک دکھ تھا کہ جس ملک کو بچانے کے لئے یا جس شہر کو بچانے کے لئے یہ تمام کارروائی کی جا رہی تھی اسی کی آبادی ان لوگوں کی زندگی کی دشمن ہو گئی تھی اور وہ حکومت سمجھتی تھی کہ ڈان بیورس کو جو نقصان پہنچا ہے وہ میلیکو کا نقصان ہے۔ لیکن بہرحال اب جو کچھ بھی ہے وہ بعد کی بات تھی۔ کوئی پندرہ منٹ کے سفر کے بعد شہباز نے مڑ کر دیکھا تو لیشک اور چاؤ کو پوری طرح مستعد پایا۔ لیکن ابھی بہت زیادہ سفر نہیں طے کیا گیا تھا کہ فضا میں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ شہباز نے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا تو ہیلی کاپٹر پر میلیکو کا فوجی نشان نظر آ رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر برق رفتاری سے اسی طرف آ رہا تھا۔ دفعتہً اس نے غوطہ لگایا اور اس کے پہلو میں لگی ہوئی مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور ٹرک کا کینوس چھلنی ہو گیا۔ لیشک اور چاؤ اپنے آپ کو بچانے کے لئے چھپ گئے تھے۔ ہیلی کاپٹر بار بار غوطے لگا کر گولیاں برساتا رہا۔ شہباز کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ بظاہر کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ لیکن آگے جا کر درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور ان درختوں کے گھنے جنگل میں لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ٹرک سے نیچے اتر جائیں۔ شہباز نے چیخ کر اپنا منصوبہ لیشک اور چاؤ کو بتایا اور پھر ایک جگہ ٹرک نے بریک لگا دیئے۔

پھر وہ گھنی گھاس میں گھستے چلے گئے تھے۔ ہیلی کاپٹر مسلسل جنگلوں کے اوپر چکرا رہا تھا

اور اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ پھر شاید ان کے پاس ایمونیشن ہی ختم ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہیلی کاپٹر واپس جاتا ہوا دکھائی دیا۔

زندگی کا یہ انوکھا سفر بڑا عجیب تھا۔ بے شمار دقتیں، بے شمار پریشانیاں اٹھا کر تیسرے دن وہ ایسی جگہ پہنچے تھے جہاں سے آبادی کا رخ کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار اس مہم کا اختتام ہوا اور شہباز ایک بار پھر کامیابی کے ساتھ رازل جریری کی تجربہ گاہ پہنچ گیا۔ رازل جریری تو تھا ہی بے مثال قوتوں کا مالک۔ اس کی حیثیت صرف ایک سائنسدان کی ہی نہیں تھی بلکہ شہباز نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ وہ پُراسرار قوتیں بھی رکھتا تھا۔ رازل جریری نے اپنی جسمانی حیثیت میں شہباز کو گلے سے لگایا تھا اور دیر تک اسے سینے سے چمٹائے رہا تھا۔ پھر اس نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"میں کم از کم اس سلسلے میں پلاسکو والوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے تم جیسی شخصیت سے روشناس کرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری شکل میں، میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے مجھے پھر سے جوانی مل گئی ہے اور میں مصروفِ عمل ہوں۔"

"شکریہ رازل جریری! آپ کا بے حد شکریہ۔"

"اب تم اپنے والدین کے پاس جاؤ اور مکمل طور پر آرام کرو۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد میری تم سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔"

"علی اصغر کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے میں اسے اپنی تجربہ گاہ میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور میں نے ذہنی طور پر اسے مطمئن کر دیا ہے۔ اس وقت اس کا قیام ایک ہوٹل میں ہے۔ تم اگر اس سے ملنا چاہو تو......"

"پہلے تو میں اپنے ماں باپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ بڑے عرصے کی جدائی رہی ہے۔ والدین ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں چاہے کسی بھی حیثیت کے مالک ہوں۔ چاہے عمر کی کسی بھی منزل سے گزر رہے ہوں۔"

⁂......⁂

شبیلہ نے شہباز کو گلے سے لگا لیا تھا اور دیر تک اسے اپنے کمزور بازوؤں میں دبائے بیٹھی رہی تھی۔ بابا صاحب بھی خاصے جذباتی ہو گئے تھے۔

"مجھے اپنی صحتوں کے بارے میں بتایئے۔"

"بیٹے! تم دیکھ رہے ہو ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ اس طرح خبر گیری کی جا رہی ہے جیسے ہم کہیں کے شہنشاہ ہوں۔ بے شک تم نے ہمیں شہنشاہوں جیسی زندگی دے دی ہے لیکن شہباز! زندگی میں ابھی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری یہ تشنگی تم ہی سکتے ہو۔"

"کیسی تشنگی؟"

"بیٹے! جس ماحول اور جس زندگی سے ہمارا تعلق ہے اس میں زندگی کی ایک چ ہے، ایک انداز ہے وقت گزارنے کا۔ ہماری بھی یہ آرزو ہے کہ اسی طرح وقت گزار والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں، گھر میں اولاد ہوتی ہے۔ اس اولاد سے متعلق کچھ اور افر زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً بہو، بچے، پوتے، پوتیاں۔ بڑھاپے کی یہی آرزو ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔"

شہباز مسکرانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "ساٹھ لاکھ انسانوں کی زندگی بچائی ہے میر ذریعے اللہ تعالیٰ نے۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ ایک گھر میں محدود ہو کر ایک عام انسان زندگی گزارنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ دنیا کی فلاح کے لئے کام کیا جائے؟ میرے با گلباز نے مجھے تعلیم دلانے کے لئے بھیجا تھا حالانکہ اس وقت مجھے ان سے شدید اختلا تھا۔ میں سرکس ہی کی زندگی چاہتا تھا لیکن ان کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا۔ مجھے وقت دیجئے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے اس حد تک نہ سوچا ہو۔ لیکن آج جو کچھ میں کر رہا ہوں اگر آپ رازل جریری کے بارے میں جان لیں تو خود حیران رہ جائیں۔ اس شخص نے پوری حیات انسانیت کی بہتری کے لئے وقف کر دی ہے۔ میں اس کا ادنیٰ سا کار ہوں۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں ایک اتنے بڑے شخص کے کام کر رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی میری مدد کیجئے۔"

"نہیں بیٹے! وہ تو ایک بات کہی تھی ہم نے۔ ویسے میں تم سے کہتا ہوں ہمارے پا ایک درمیانی حل بھی موجود ہے۔"

"درمیانی حل؟"

"ہاں...... ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیں۔ بہو ہمارے پاس رہے گی

تمہاری مہمات میں مداخلت نہیں کریں گے۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی مجھے تھوڑا سا موقع دیجئے۔ کسی وقت آپ کی اس خواہش کی تکمیل کر دوں گا۔ لیکن ایک بات تو ضروری ہوتی ہے۔ ہر انسان کو اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کرنے کا حق ہوتا ہے۔ یہ حق اگر آپ میرے پاس ہی رہنے دیں تو مجھے خوشی ہوگی اور میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔"

دونوں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے تھے۔

علی اصغر جراری یہاں بہت خوش تھا رازل جریری نے انتہائی نفسیاتی طریقوں سے اس
کا برین واش کیا اور اب وہ ماضی کو تقریباً بھولتا جا رہا تھا۔ میلیکو کے دارالحکومت یوکاس میں
اس نے اپنے لیے بہت سی تفریحات تلاش کر لی تھیں۔ مالی طور پر رازل جریری نے اسے
بالکل مطمئن کر دیا تھا۔ چنانچہ دل بہلانے کے لئے وہ یوکاس کے شاندار ہوٹلوں میں
جایا کرتا تھا لیکن ناسپاس نہیں تھا اور مکمل طور سے اس بات کی حقیقت کو تسلیم کرتا تھا کہ یہ اس
کا نیا جنم ہے اور اس کا جنم داتا رازل جریری ہے۔ رازل جریری نے اس سے کھل کر
تھا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ میرا تم سے کوئی رشتہ کوئی ناطہ نہیں تھا ہر انسان غرض کا بندہ
ہوتا ہے اور اپنی غرض کے لئے وہ مختلف کام کیا کرتا ہے میں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ
ایران کے ان لوگوں میں تمہارا شمار ہے جو شاہ کے خزانے کی منتقلی میں منظر عام پر رہے تھے
اور انہوں نے اس جگہ تک رسائی حاصل کر لی تھی جہاں شاہ نے اپنا خزانہ منتقل کر دیا تھا۔
چنانچہ دو افراد کا نام میرے علم میں تھا تم یعنی علی اصغر جراری اور سعدی حشمی! کیا تم اس
بارے میں انکار کرو گے۔"

"ہاں۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے تو درمیان میں سے ہی واپس کر دیا گیا تھا لیکن حشمی شاید کسی
خزانے تک پہنچ گیا تھا۔ بنیادی بات یہ تھی کہ سعدی حشمی نے وہاں سے اپنے راستے بدل
لئے تھے۔ بہت عرصے کے بعد ایک بار وہ مجھے ملا تھا اس وقت وہ کسی جدوجہد میں مصروف
تھا۔ شاہ ایران سے رابطہ ختم ہونے کے بعد نجانے کب تک وہ بھٹکتا رہا تھا اور اس کے بعد
اس نے راہ فرار اختیار کر لی تھی پھر جب وہ مجھے ملا تو اس نے بتایا کہ اس نے ایک لانچ
خرید لی ہے اور سمندر میں وہ لانچ چلاتا ہے۔ مختلف لوگ اس کے گاہک ہوا کرتے ہیں جن
میں اسمگلر بھی ہوتے ہیں۔ انسانوں کو مختلف ممالک میں بھجوانے والے بھی۔ اس وقت

سعدی حشمی کا یہ کاروبار اچھا خاصا چل رہا تھا۔ بس اتنی ہی معلومات حاصل تھیں مجھے لیکن
پھر اس کے بعد ایک بار وہ تہران آیا تھا اور اس وقت اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا لیکن یہ بات
بھی بہت عرصے بعد کی ہے۔ وہ ایک امیر و کبیر آدمی کی حیثیت سے اپنی بیوی کے ہمراہ آیا
تھا اور اس کی بیوی انتہائی حسین تھی۔ اس نے بتایا کہ طرابلس میں اس کا ایک شاندار ہوٹل
ہے اور اب وہ وہیں رہتا ہے کیونکہ اس کی بیوی نظمہ شاید طرابلس ہی کی رہنے والی ہے۔
اس بارے میں مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم۔ اب وہ وہیں ہے البتہ وہ خزانہ جس کا ایک چھوٹا
سا حصہ اسے حاصل ہو چکا تھا اپنی جگہ محفوظ ہے سعدی حشمی نے سرسرے انداز میں اس کا
تذکرہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اتنا
عظیم الشان خزانہ ہے اور اس قدر پراسرار حالات میں ہے کہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

رازل جریری نے اس سے کہا تھا۔

"شہباز! اس وقت اپنی زندگی کے ایک اہم مشن پر گیا ہوا ہے اس کی واپسی کے بعد
ہمیں طرابلس چلنا ہوگا۔"

بہر حال رازل جریری کے اپنے ذرائع بھی تھے۔ علی اصغر جراری اب اس قدر مطمئن
زندگی گزار رہا تھا کہ ان لوگوں کو اس بات کی امید ہو گئی تھی کہ وہ ذہنی طور پر مطمئن ہو گیا
ہے اور نازی کا غم اس کے دل سے نکل گیا ہے۔

پھر شہباز کا کام ختم ہو گیا اور وہ فیض شاہ اور شبیلہ کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کے بعد
اور انہیں مطمئن پا کر دوبارہ رازل جریری کے پاس پہنچ گیا۔ رازل جریری ابھی تک اس
کے کارناموں پر عش عش کرتا رہا تھا اور اس نے شہباز کو ساٹھ لاکھ انسانوں کی زندگی کا
محافظ قرار دیا تھا۔ علی اصغر جراری کے سامنے اس نے کہا تھا۔

"اور یوکاس کے رہنے والے یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک فرشتہ کس طرح ان کی
زندگی کے لئے سینہ سپر ہو گیا تھا۔ اگر انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ اس فرشتے نے کس
طرح اپنی زندگی کی بازی لگا کر انہیں زندگی بخشی ہے تو وہ اس کی پوجا کرنے لگیں۔ لیکن یہ
بھی ایک دلچسپ امر ہے کچھ لوگ پس پردہ رہ کر احسانات کرتے رہتے ہیں اور جس پر وہ
احسان کرتے ہیں اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے ان کے لئے کیا کیا
ہے۔ یوکاس میں آج بھی ڈان بیورس کی موت کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ حکومت میلیکو اس

سلسلے میں جو بیانات جاری کر رہی ہے وہ انتہائی غصہ دلانے والے تھے لیکن کون انہیں بتائے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ صحیح معنوں میں اصل سوگ تو پلاسکو میں منایا جا رہا ہے۔ جو کے میلیکو پر برتری حاصل کرنے کے خواب ادھورے رہ گئے ہیں۔ علی اصغر جراری نے کہا

”لیکن رازل جریری! اس جدوجہد سے آپ کو کیا حاصل؟“

رازل جریری جو اس وقت جسمانی شکل میں موجود تھا۔ ایک عجیب نشہ آلود انداز میں مسکرا دیا پھر بولا۔ ”میرے عزیز دوست! اتفاق سے اس وقت ہم تینوں ایک ہی مذہب کے پیروکار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات سے پوری طرح متفق ہیں۔ کہا تو یہی گیا ہے کہ اللہ کا مجرم معاف کر دیا جائے۔ انسانیت کے مجرم کو اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔ ہم انسانیت کے دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا رہے ہیں وہ جو دنیا کی تباہی کے خواب دیکھتے ہیں اور اس کے لئے مصروف عمل ہیں اور جدوجہد کر رہے ہیں انہیں فنا کرنا ایک فرض ہے اور یہی نشہ مجھے ہے اس نشے کی تکمیل کے لئے میں نے ایک طویل عرصہ برف کی شکل میں دفن ہو کر گزارا ہے اور اس کے لئے میں ہر طرح کی تکلیفیں اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں میلیکو میں جب تک میں منظر عام پر نہیں آتا، کام کر رہا ہوں جب یہاں تباہ کر دیا جاؤں گا اور زندہ رہوں گا تو کہیں اپنا مسکن تلاش کروں گا۔ شہباز میرا ساتھی ہے۔ علی اصغر! ویسے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ شہباز میری ایسی دریافت ہے کہ جس نے میرے عزم کو جلا بخشی ہے۔ تم مجھے اپنی زندگی کا محافظ اور نئی زندگی عطا کرنے والا کہتے ہو اور میں یہ درجہ شہباز کو دے رہا ہوں۔ اس نوجوان کو قدرت نے اسی لئے شاید برق آساں جسم عطا کیا تھا کہ وہ لاکھوں انسانوں کی زندگی کا ضامن بن سکے۔ میں تو صرف اس کا ایک اوزار ہوں۔ جو اسے روشن راستے دکھاتا ہے۔ دیکھ لو ساٹھ لاکھ انسانوں کی زندگی محفوظ کر دی اس نے۔ ثبوت کے طور پر وہ علاقہ موجود ہے جہاں اب زمین میں گہرے گہرے غاروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے یہ غار پورے یوکاس کو ختم کر دیتے اور اس وقت ساری دنیا یوکاس کا سوگ منا رہی ہوتی جہاں ساٹھ لاکھ انسانوں کی زندگی موت سے ہمکنار ہوئی ہوتی۔ علی اصغر! ہم اسی نشے سے سرشار ہیں۔ شہباز کی سوچ کا انداز بالکل میرے جیسا ہے۔ بے غرض، بے لوث۔ وہ میرے لئے زندگی کی بازی لگا دیتا ہے حالانکہ میرے اور بھی مددگار ہیں جو جگہ جگہ دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن شہباز ان میں نہیں ہے۔ وہ میرا اسوہ

ہاتھ ہے۔ میرا آدھا دماغ ہے وہ۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا وہ اپنے لئے آسانیاں اور آسائشیں حاصل کرتا جائے گا۔ یعنی دنیا کی بقاء کے لئے سرگرم عمل ایک انسان۔“

علی اصغر جراری ان الفاظ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ رازل جریری نے کہا۔

”بہرحال اور کچھ نہیں تو ہمیں سعدی حشمی سے اس خزانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوں گی اور اس کے لئے ہمارا طرابلس جانا ضروری ہے۔ کیا طرابلس پہنچ کر تم سعدی حشمی کو تلاش کر سکتے ہو۔“

”کیوں نہیں۔ مجھے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہیں اور وہ یقیناً اس بار تمہاری بہترین مدد کر سکے گا۔“

”بس تو تیاریاں کروں۔ ویسے میں ذرا سی غلط فہمی کا شکار تھا میں سمجھتا تھا کہ شاہ کا وہ خزانہ کسی خاص منزل تک پہنچ گیا ہے لیکن تم کہتے ہو کہ سعدی حشمی خود بھی اس سے دور ہو گیا تھا لیکن اس نے کوئی خزانہ حاصل کیا۔ اب مجھے اپنے ذرائع سے کام لے کر اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل معلوم کرنا ہے اور اس کے لئے میں تم سے سات دن کا وقت لیتا ہوں۔ ان سات دنوں میں تم اپنے طور پر زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہو اور اپنا کام کر سکتے ہو۔ ٹھیک سات دن کے بعد میری تم سے ملاقات ہو گی۔

اور یہ سات دن شہباز کی زندگی کے بہترین دنوں میں سے تھے بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ علی اصغر جراری تو انتہائی خوش مزاج اور نفیس انسان ہے زندگی کے پہلے دور کو کھونے کے بعد جب اسے دوبارہ زندگی ملی تو اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی ان محرومیوں کو دور کر دیا جو اس کے دل میں تھیں۔

بہرحال یہ سات دن ہوٹل گردی اور دوسری تفریحات میں گزارے۔ تب پتہ چلا کہ یوکاس دنیا کے جدید ترین شہروں میں سے ایک ہے اور اس میں اتنا کچھ ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ساتویں رات کو رازل جریری نے ان دونوں کو اپنے سامنے طلب کر لیا۔ اس کے چہرے پر ایک کامیابی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”تو پیارے دوستو! ساتواں دن پورا ہو چکا ہے۔ میں نے یہی مہلت مانگی تھی تم سے۔ اور اب میں اس خزانے کا راز لے آیا ہوں جس کا شناور یقینی طور پر سعدی حشمی ہے اور یہ

سعدی حشمی بلاشبہ ایک ذہین آدمی ہے۔ بہر حال میں تمہیں فرقہ باطنیہ کے بارے میں
رہا ہوں۔ میری باتوں کو ذرا غور سے سننا حسن بن صباح نے دس سو بہتر عیسوی میں ا
فرقے کی بنیاد رکھی تھی۔ حسن بن صباح بے حد زیرک، قابل اور اقتدار پسند شخص تھا
سلطان ملک شاہ کے دربار میں جب اسے اس کی مرضی کے مطابق جگہ نہ مل سکی تو اس نے
ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی اور اپنی ذہانت سے اس نے کچھ اس طرح چکر چلایا کہ بہ
جلد اس کے مریدوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور دس سو بانوے میں اس نے قلعے پر قبضہ
کرلیا جو فارس میں دریائے خضر اور شہر قزرین کے درمیان پیچیدہ کھائیوں میں ایک بلا
پہاڑ پر واقع تھا۔ یہ قلعہ جس پہاڑ پر واقع تھا وہ اس قدر بلند تھا کہ کسی تیر انداز کا تیر وہا
تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

حسن بن صباح نے قلعے کا نام آلہ الموت رکھا جس کا مطلب تھا "عقابوں کا نشیمن"
لیکن اسے الموت کے نام سے مشہور ہونے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ قلعہ ایک انتہا
پراسرار وادی میں تھا اور اس میں حسن بن صباح نے جو جنت بنائی تھی اس میں نشہ آ
ادویات کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا اور یہ خاص چیز ایک جڑی بوٹی سے حاصل کی جا
تھی۔ جسے عرف عام میں بھنگ کہتے ہیں۔

بہر حال حسن بن صباح کے مریدوں کو فرقہ باطنیہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور ا
کے مرید فدائن بھی کہلانے لگے۔ چونکہ وہ اپنے مرشد کے اشارے پر جان دے دینا اور ق
و غارت گری کرنا ایک کھیل سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حسن بن صباح کے حکم پر مر
والے جنت میں جاتے ہیں۔ لیکن ہر کمال کو زوال ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے پوتے ہلا
خاں نے حملہ کر کے اس کے قلعے کو نیست و نابود کر دیا اور فدائن کو اس قدر قتل کیا جس
مثال نہیں ملتی۔ عرب میں بسنے والے فرقہ باطنیہ کے فدائن خلیفہ مصر کے زیر سایہ چلے
اور وہاں انہیں تحفظ ملا یہاں تک کہ سلطان ببرس اور سلطان صلاح الدین ایوبی
باطنیوں کا قصہ تمام کیا۔ پھر بھی حسن بن صباح کے مریدوں کا وجود باقی رہا اور وہ مخ
علاقوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔"

یہ کہہ کر رازل جریری نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسے ان دنوں کے سا
پھیلاتے ہوئے کہا۔

"یہ نقشہ میں نے جن ذرائع سے ترتیب دیا ہے وہ ذرائع پہلی بات تو یہ کہ تمہاری سمجھ
میں نہیں آسکیں گے اور پھر ان کا سمجھنا بھی تمہارے لئے ضروری نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو
کہ یہ پراسرار نشانات قدیم مصری اہراموں سے دستیاب ہوئے۔ یہ دیکھو یہ نیچے جو ابتدائی
نشان ہے وہ کسی پہاڑی یا اس کی ڈھلوان کا ہے۔ اس کے سامنے دیوتا راء کی عائق بنی ہوئی
ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ دیوتا راء اس مقام کی نگرانی کر رہا ہے۔ اور آخر میں بنا ہوا
علامتی نشان اس جگہ کی سمت اشارہ کرتا ہے جو کسی پہاڑی کے اندر بنی ہوئی اس نقشے پر جو
تحریریں ہیں، میں انہیں تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا۔

پہاڑی کے اندر بنی ہوئی جگہ کے دو دہانے یا راستے ہیں لیکن ان کی تفصیل نہیں معلوم
ہوسکی۔

میں تمہیں یہ بتاؤں کہ یہ نقشہ میں نے ایک قدیم مصری میوزیم سے حاصل کیا ہے لیکن
حقیقت یہ ہے کہ اس میوزیم میں بھی اس کی تفصیل کہیں درج نہیں ہے۔ قلعہ الموت کے
مالک نے اپنے دور کے تمام بڑے حکمرانوں سے کثیر دولت جمع کی تھی۔ مارکوپولو نے اپنے
سفرنامے میں تحریر کیا ہے کہ حسن بن صباح نے قلعہ الموت میں جو جنت بنائی تھی اس میں وہ
سب کچھ تھا جس کا جنت میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ سرسبز و شاداب باغ، دودھ کی نہریں اور
فردوس کی حوریں اور غلمان۔ جو لوگ بھنگ کے نشے میں مست ہو کر وہاں پہنچائے جاتے وہ
اسے فردوس بریں تصور کر کے دادعیش دیتے اور پھر وہاں دوبارہ جانے کے لئے اپنی جان
تک قربان کرنے کے لئے تیار ہوجاتے۔ اس جنت کے لالچ میں حسن بن صباح کے
فدائن نے ہر اس شخص کو قتل کر دیا جو حسن بن صباح کے حکم کی تکمیل سے انکار کرتا۔ اس بناء
پر فدائن کا خوف دور دور تک بیٹھ گیا تھا۔

یہاں تک کہ فرانس کے شاہ لوئس جیسے حکمران نے بھی موت کے خوف سے حسن بن
صباح کو منہ مانگی دولت دینے میں پس و پیش نہ کیا۔ اس طرح قلعہ الموت میں دنیا کا ایک
بیش بہا خزانہ جمع ہو گیا۔ جس میں انمول ہیرے اور جواہرات بھی شامل تھے اور جب ہلاکو
خاں نے حسن بن صباح کے قلعہ الموت کو تاراج کیا تو حسن بن صباح کے فدائن اس
خزانے کو وہاں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہ پتہ آج تک نہیں چل سکا
کہ انہوں نے یہ انمول خزانہ کہاں چھپایا۔ یہ ہے وہ تفصیل جو بہر حال تمہیں معلوم ہوئی اور

اب میں تمہیں ان عجیب وغریب زبان کی تحریروں کی تفصیل سناتا ہوں۔ جن کا ترجمہ
نے کرلیا ہے۔"

"یہ دیکھو...... یہ پہلی لکیر جو تمہیں الٹے سیدھے نشانات سے مرساں نظر آئے گی اس کا مفہوم ہے کہ جس نے جنت کا راستہ نہیں دیکھا وہ آقا امام الجبل تک پہنچنے کا راستہ تلاش نہیں کرسکتا۔ وہ راستہ صرف ایک ہے لیکن امام کے حضور پہنچنے کے دروازے دو ہیں دونوں انتہائی بلندی پر اور نہایت دشوار گزار ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسرے سے بہ[تر] ہے۔ جنت کے متعلق معلومات رکھنے والا فدائی چھ دن تک سیدھے راستے پر سفر کرسکتا ہے لیکن جو امام پر ایمان نہیں رکھتا اس پر ریگستان کی مصری دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے۔ سمجھ رہے ہونا میری بات۔ اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ریگستان کا انتہائی دشوار گزار سفر امام الجبل تک پہنچنے کے لئے کرنا ہوگا۔

اس کے بعد یہ دوسری سطر ہے کہ دوسرا امتحان وہ تاریک پردہ ہے جو صرف اس وقت ہٹتا ہے جب سورج کی مصری دیوی نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ لائن مفہوم ادا کرتی ہے کہ تیسرا امتحان آتش میں پوشیدہ ہے جو ایمان نہیں رکھتے خاکستر ہوجاتے ہیں۔ ایمان والے جنت کا راستہ جانتے ہیں اس لئے بلاخوف وخطر اس راہ سے گزر جاتے ہیں جو آگ کے درمیان سے گزرتی ہے۔

چوتھی تحریر ہے کہ اس سے گزرنے کے بعد آسمان کی دیوی خود اشارہ کرتی ہے۔ ایمان والوں کا راستہ اس مخبر کے درمیان سے گزرتا ہے اور اس کے بعد راستہ نشیب کو جاتا ہے۔
پانچویں لکیر کہتی ہے کہ سبز دیوار کے نیچے تلاش کرنے والے کو پہلے ستارے کے نمودار ہونے کا انتظار کرنا چاہئے اور یہ چھٹی ہے کہ پانی کا دیوتا تیری رہنمائی کرے اسے تلاش کرنے والے یہاں سیراب ہوکر تازہ دم ہوکر رات کے نمودار ہونے والے کا انتظار کر[ے] اور یہ ساتویں لکیر اس آخری راستے کی نشاندہی کرتی ہے جو ہواؤں کے غار کو جاتا ہے اس کے اندر نمک اپنے نیچے ریگستانوں کے مقبروں کی محافظ سانپوں کی دیوی کے نزدیک سے گزرتے ہیں۔

سمجھ رہے ہونا ان سات لائنوں میں اس خزانے کی نشاندہی کی گئی ہے جو اپنی نوعیت عظیم تر خزانہ ہے اور تم یوں سمجھ لو کہ میرا مرکز۔ کیونکہ اس کے حصول کے بعد میں دنیا

میں ہر طرح کی کاروائی کرسکتا ہوں اور میرے پاس اس کاروائی کے لئے بہتر وسائل ہوں گے۔"

علی اصغر جراری اور شہباز اس تفصیل کو سن کر دنگ رہ گئے تھے شہباز کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا وجود کسی طلسمی وادی میں پرواز کر رہا ہو اور وہ وہاں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا ہو۔ بہت دیر تک سکتہ سا طاری رہا اس کے بعد شہباز نے کہا۔

"لیکن آپ کو یہ نقشہ اور یہ تحریریں آپ کو کہاں سے حاصل ہوئیں؟"

"میں نے بتایا نا تمہیں کہ مصر کے ایک ایسے میوزیم سے جہاں احرامین سے برآمد ہونے والی لاتعداد اشیاء جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین نوادرات میں ہوتا ہے۔ موجود ہیں۔ بس میری تحقیق نے مجھے وہاں پہنچایا لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ سعدی حشمی کی نظر سے بھی یہ نقشہ گزر چکا ہے اور یقینی طور پر وہ انہیں راستوں سے گزر کر منزل مقصود تک پہنچا ہوگا۔ اب یہ تو وہی بتا سکے گا کہ یہ ساری کاروائی اس نے کیسے کی۔"

"آہ...... تب تو ہمارا سعدی حشمی تک پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ میرے عزیز دوست شہباز! سعدی حشمی بہت اچھا انسان ہے چونکہ جب وہ مجھے ملا تھا تو اپنی بیوی نظمہ کے ساتھ تھا اور نظمہ حسن وشباب میں یکتا اور اس کی محبت کا نشان تھی دونوں بڑے مطمئن اور مسرور تھے جبکہ میں ان دنوں اپنی زندگی کے بدترین کرب سے گزر رہا تھا مگر میں نے انہیں اپنے راز میں شریک نہیں کیا تھا۔

"گویا تمہارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم کسی طرح سعدی حشمی تک پہنچ جائیں تو وہ ہماری پذیرائی کرے گا اور ہمیں معلومات فراہم کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔"

"میرا تو یہی اندازہ ہے لیکن انسان بڑی عجیب وغریب فطرت کا مالک ہے اگر وہ بدل گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

"پھر بھی تمہیں کوشش تو کرنی چاہئے۔ اس کی سنائی ہوئی تفصیل ہمیں خزانے کے ان راستوں کے بارے میں بتا سکتی ہے جو وہاں تک جانے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔"

"کوشش کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"بس تو پھر تیاریاں کرو۔ ہم لوگوں کو طرابلس روانہ ہونا ہے۔" رازل جریری جیسی عظیم

شخصیت جس نے سات دن کے اندر اندر مصر کے ان محفوظ ترین میوزیم سے وہ نقشہ حاصل کر لیا تھا اور ظاہر ہے اس کے ذرائع ان دونوں میں سے کسی کو نہیں معلوم تھے لیکن یہ بات شہباز بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ رازل جریری بوقت ضرورت اپنی روح کو اپنے جسم سے علیحدہ کر سکتا ہے اور نادیدہ شکل میں وہ سارے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ جو اس کا دل چاہے۔ لیکن انسانی پہنچ کے دائرے کے اندر اندر روح کی حیثیت سے وہ اپنے جسم کو غار سے باہر نہیں لا سکتا تھا کیونکہ بہر حال ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور آخر کار انہوں نے لیبیا کا رخ اختیار کیا۔

شہباز نے بابا فیض شاہ اور شبیلہ سے ملاقات کر کے کہا۔

”ہوسکتا ہے ایک طویل عرصے کے لئے میں آپ سے دور رہوں لیکن آپ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ آپ کی دعاؤں کے سہارے میں زندگی کی ہر مشکل سے گزر سکتا ہوں اس بات پر میرا تو سو فیصد یقین ہے۔ آپ بھی اس بات پر یقین رکھیے گا۔“

فیض شاہ نے غمزدہ آواز میں کہا تھا۔

”ہاں ہمیں یقین ہے کہ قدرت تمہاری رہنما اور محافظ ہے دکھ ہوتا ہے کبھی تو صرف اس بات کا کہ کاش! گلباز بھی زندہ ہوتا اور ہمارے ساتھ ہوتا اور ہم تینوں یہاں عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہوتے تمہارے راج میں گلباز اپنے بیٹے کو ایک منفرد شخصیت دینا چاہتا تھا جو قدرت نے اسے عطا کر دی۔ کاش اس کی روح ان تمام چیزوں سے بہرہ ور ہو رہی ہو اور سکون محسوس کرتی ہو۔“

”آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔“

”نہیں بیٹے زندگی اس قدر سکون سے گزرے گی کنٹری کے پر بہار علاقے میں کبھی اس کا سوچا بھی نہیں تھا اور حقیقت یہی ہے کہ رازل جریری کی مدد سے شہباز نے اپنی ماں اور اپنے اس سرپرست کے لئے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ وہ شہنشاہوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ گھر بار ملازم ہر طرح کی آسائشیں ان کے لیے موجود تھی اور واقعی ایسے عالم میں گلباز کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

رازل جریری سفر کی تیاریاں کرنے میں مصروف تھا اور آخر کار ایک دن وہ طرابلس ایئر پورٹ پر اتر گئے۔ یہاں انہوں نے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کیا اور اس کے بعد

علی اصغر جراری کی رہنمائی میں وہ سعدی حشمی کی تلاش میں چل پڑے حقیقت یہ ہے کہ سعدی حشمی ایک بے مثال شخصیت کا جوان تھا۔ لمبا تڑنگا، دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھنے والا پہلی ہی نگاہ میں وہ اس کی شخصیت کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔ علی اصغر جراری سے وہ اس طرح لپٹ گیا جیسے کوئی بہت ہی قدیم اور پرانا دوست ایک دوسرے سے طویل عرصے سے بعد مل جانے کے بعد بغل گیر ہو جاتا ہے۔ تمہارے پھانسی پانے اور اس وقت زندہ نظر آنے کا خوشگوار معاملہ کیا ہے علی اصغر!“

”یہ میرے ان دونوں مہربانوں کی مہربانی ہے۔“ علی اصغر جراوی نے کہا۔ پھر اس نے نہایت احترام کے ساتھ ان دونوں سے بھی ملاقات کی تھی۔ شہباز کو دیکھ کر اس نے تعریفی انداز میں گردن ہلائی تھی اور وہ دونوں بھی اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔

”آپ لوگوں کی آمد میرے لئے جس قدر فرحت بخش ہے۔ بیان نہیں کر سکتا زندگی میں ہزاروں دوست بنتے ہیں اور ان میں بہت اچھے اچھے ساتھی بھی ہوتے ہیں لیکن قدیم دوستوں کا جو مزہ ہے وہ اسی صاحب دل سے پوچھیے جس کے اتنے قدیم دوست اسے حاصل ہو جائیں۔ سعدی حشمی اور علی اصغر جراری نے وہ لمحات گزارے ہیں کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا پھر وقت نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کر دیا۔ جب میں پچھلی بار ان سے ملا تھا تو نہ تو ان کی صحت اچھی تھی اور نہ ہی یہ مجھے ذہنی طور پر مطمئن نظر آ رہے تھے لیکن افسوس اس وقت نظمہ ایک ایسے کام میں مصروف ہیں کہ میں زیادہ وقت ان کے ساتھ نہ گزار سکا۔ جس کے لئے میں آج بھی تم سے علی اصغر معافی چاہتا ہوں لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم نہایت بہتر حالت میں ہو۔“

”ہاں اور بلا شک وشبہ ہم تم سے یہ الفاظ کہہ دینے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اس وقت ایک مطلب ایک ضرورت ہمیں تمہارے پاس لائی ہے۔“

”آہ......اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں ایک قدیم دوست کی کسی ضرورت کو پورا کر سکوں اور وہ مجھے اس قابل سمجھے کہ میں اس کے کسی کام آؤں۔“

سعدی حشمی! ایک سوال جو بنیادی حیثیت رکھتا ہے تم سے کیا جائے اور تم اس کا صحیح جواب دے دو تو بات آگے کی جائے ورنہ مناسب نہیں ہوگا۔“

”سوال کرو۔ میں سوال کی نوعیت نہیں پوچھوں گا۔“

"کیا تمہارا یہ جاہ وحشم کیا تمہاری یہ موجودہ صورتحال اس خزانے کے حصول کی وجہ نہیں ہے جس کا تعلق حسن بن صباح سے بتایا جاتا ہے۔"

"ہاں ہے۔ مگر میں اس میں سے ایک بہت ہی معمولی حصہ حاصل کر سکا ہوں۔ بہر حال یہاں ایک بہت بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں ہے۔" راز جریری نے تعریفی نگاہوں سے سعدی حشمی کو دیکھا اور پھر علی اصغر جراری کو اور کہا۔

"میں تم دونوں کی اس بے مثال دوستی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ جس طرح سعدی نے یہ اعتراف کیا ہے۔ وہ اس کی عظمت کی بلندی کا پتہ دیتا ہے ویسے سعدی ہم تمہارے اس تجربے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

"کہانی طویل ہے میرے ساتھ قیام کر کے سننا پسند کریں گے۔"

"ہماری یہاں آمد کا مقصد ہی یہی ہے کیونکہ اس کے بعد ہمیں اس خزانے کے حصول کے لئے سرگرداں ہونا ہے۔"

"آہ...... بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں ہیں۔ بہت سے نئے کردار درمیان میں آ گئے ہیں لیکن بہر حال میرے دوست نے مجھ سے اس کی فرمائش کی ہے اس لئے میں تفصیل بیان کیے بغیر رہ نہ سکوں گا۔"

رات کا کھانا سعدی حشمی کی بیوی نظمہ نے اپنی نگرانی میں تیار کرایا تھا اور بلاشبہ وہ طرز کے کھانوں میں وہ کمال رکھتی تھی۔ ویسے بھی با کمال شخصیت تھی۔ ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاص کمرہ نشست میں بیٹھ کر سعدی حشمی نے اپنے ماضی کے دروازے کھول دیئے۔

اس کی آنکھیں خلاء میں اس طرح منجمد ہوگئیں جیسے بکھری داستانوں کو سمیٹ رہی ہوں۔ یہ داستانیں جن کا دروازہ پرانا نہیں تھا لیکن لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ تہران میں شاہ کے زوال کے آثار نمودار ہو چکے تھے اور بہت سے ایسے مرحلے پیش آ گئے تھے جن کی بناء پر لوگ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سعدی حشمی نے بھی اپنے لئے الگ راستہ منتخب کیا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنے مستقبل کا جو فیصلہ کیا تھا وہ انوکھا تھا۔ اس نے ایک لانچ خریدی تھی اور ایک ملاح کی حیثیت سے اسے کرائے پر چلانے لگا۔

اس دن بھی وہ سمندر میں اپنی ذمے داری پوری کرنے کے لئے نکلا تھا۔ اس کے ہونٹ اس طرح ہلنے لگے جیسے کسی مشین سے متحرک ہوئے ہوں۔

✡......✡
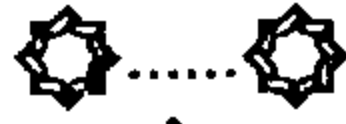
وہ ایک روشن اور چمکدار دن تھا۔ سعدی حشمی نے لانچ کا انجن بند کر دیا۔ تعاقب کرتی ہوئی شارک مچھلیاں لانچ کے گرد چکر کاٹنے لگیں۔ اس نے صاف شفاف پانی کی تہہ میں نظر آنے والی نوکیلی چٹانوں کے درمیان لنگر ڈال دیا۔ سورج نکلے ابھی مشکل سے ایک گھنٹہ ہوا تھا۔ لیکن تمازت اتنی تھی کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں تھیں۔ وہ گورا چٹا، مضبوط اور گھٹے ہوئے جسم کا ایک کرد نوجوان تھا۔ خلیج فارس کے اس موسم میں مسلسل سفر کرنے سے اس کا رنگ تانبے کی طرح سانولا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پسینہ صاف کیا اور دوربین اٹھا کر اس شخص کو دیکھنے لگا جو اس کی زندگی کے ایک خطرناک باب کی ابتداء کرنے والا تھا۔

اس کی نگاہ اچانک اس نوکیلی چٹان پر جا کر ٹھہر گئی تھی جو ایران کے اس خطرناک پتھریلے اور ویران ساحل پر کسی مٹی کی طرح باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس پر پڑی ہوئی تین لاشیں غالباً کسی ایرانی مالبوت کشتی کے مسافروں کی تھیں جو اس طوفان میں پتھریلے ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی تھی۔ تباہ شدہ دخانی کشتی کا ملبہ پانی میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ لاشیں غالباً پانی کی لہروں پر بہتی ہوئی دس فٹ بلند چٹان پر جا کر رک گئی تھیں جو اس وقت یقیناً زیر آب رہی ہوگی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ ایک لاش کو حرکت ہوئی ہے۔ سعدی نے دوربین کو دوبارہ ایڈجسٹ کر کے آنکھوں سے لگایا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ درمیان والی لاش حرکت کر رہی تھی۔ ایک ہاتھ بلند ہو کر آنکھوں کے اوپر آ گیا تھا۔ شاید وہ سورج کی چمک سے آنکھوں کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے کوشش کر کے کروٹ لی اور پیٹ کے بل الٹا ہو کر لیٹ لیا۔ بقیہ دو لاشیں ساکت پڑی تھی۔ عام حالات میں شاید سعدی توجہ نہ دیتا کہ خلیج فارس کے اس ویران اور خطرناک ساحل پر کسی کو بغیر امداد کے چھوڑ دینا بڑی غیر انسانی حرکت ہوتی۔ ممکن تھا اگلی مرتبہ اس کو یہی حادثہ پیش آتا لیکن مشکل یہ تھی کہ پانی کی سطح گہری نہ تھی اور تہہ میں ابھری ہوئی نوکیلی چٹانوں میں اپنی ساٹھ فٹ لمبی اور قیمتی لانچ کو

آگے لے جا کر وہ تباہی کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ پانی میں ہر سمت شارک مچھلیاں
رہی تھیں۔ اس لئے تیر کر ساحل تک جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے دوسرا لنگر بھی پانی میں
دیا تھا تاکہ لانچ محفوظ کھڑی رہے اور پھر ربڑ کی ڈونگی کو عرشے سے پانی میں ڈالا اور
میں اتر گیا۔ خطرناک اور تیز پر والی شارک مچھلیاں اس کی ڈونگی کے گرد منڈلانے لگیں۔
اتنا قریب تھیں کہ ان کی للچاتی ہوئی بھوکی آنکھیں سعدی کو نظر آ رہی تھی۔ سعدی حشمی کو خط
تو صرف یہ تھا کہ کوئی بڑی لہر اس کی ہلکی پھلکی ڈونگی کو الٹ نہ دے لیکن خلیج فارس کی زند
میں وہ ہمیشہ خطرات سے کھیلتا رہا تھا۔

شارک مچھلیوں نے چٹانی ساحل تک اس کا تعاقب کیا۔ سعدی نے پانی کی بوتل
کاندھے پر لٹکائی اور کود کر اس چٹان پر آ گیا جہاں وہ تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈونگی کی
رسی ایک پتھر سے باندھ کر وہ آگے بڑھا۔ دو آدمی واقعی مر چکے تھے۔ تیسرا جس کو سعدی
نے حرکت کرتے دیکھا تھا بظاہر دس بارہ سال کا لڑکا معلوم دیتا تھا لیکن سعدی نے قریب
پہنچ کر اسے سیدھا کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ خاص عمر کا ایک پستہ قد کبڑا تھا۔ شانے
اور سر کا حصہ بقیہ جسم کے مقابلے میں اتنا بھاری اور موٹا تھا کہ کبڑے کا جسم بڑا بدہیئت
معلوم دیتا تھا۔ اس کا لباس دوسروں کی طرح عام ملاحوں جیسا معمولی اور بوسیدہ تھا۔ لیکن
پیر میں جوتے بڑے قیمتی تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سعدی حشمی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے
بولنے کی کوشش کی لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ سعدی نے اپنی پلاسٹک کی بوتل کبڑے
کے لبوں سے لگا دی۔ پانی کی آدھی بوتل حلق میں اترنے کے بعد کبڑا بولنے کے قابل ہو
سکا۔

’’میرے پیر...... میرے دونوں پیر ٹوٹ گئے...... ہیں۔‘‘ اس نے کرب آمیز لہجے میں
کہا سعدی نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس کی پنڈلی کی ہڈیاں صرف ٹوٹی ہی نہیں بلکہ چکنا چور
ہو چکی ہیں۔ فارسی لب و لہجہ سے واضح تھا کہ وہ ایرانی ہے۔

’’تمہاری ٹانگیں اتنی زخمی ہیں کہ فوراً کسی ہسپتال جانا ضروری ہے۔ میں بصرہ جا رہا
ہوں وہاں......‘‘

’’نہیں......‘‘ کبڑا خوف زدہ لہجے میں بولا اور پھر درد سے کراہ اٹھا۔ میں عراق ہرگز
نہیں جا سکتا...... تم مجھے کسی ایرانی علاقے میں پہنچا دو۔‘‘

لباس کی بوسیدگی کے باوجود کبڑا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ سعدی کے لئے پھر ایران
جانا مشکل تھا کیونکہ بصرہ میں اس نے ایک گاہک کو وقت دے رکھا تھا لیکن کبڑا عراق کے
نام سے خائف تھا اور اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ سعدی انکار کر دے۔

’’ٹھیک ہے تم گھبراؤ نہیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں تم کو نئے بغداد کی بندرگاہ تک پہنچا
دوں گا آؤ۔‘‘ اس نے کبڑے کو دونوں بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

نئے بغداد پر سعدی نے بے ہوش کبڑے کو ہسپتال سے آنے والی ایمبولینس پر سوار کرا
دیا۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا تھا۔ اس لئے سعدی نہ تو اس کا نام معلوم کر سکا تھا اور نہ
اس حادثے کی تفصیلات۔ بندرگاہ کی پولیس اور ساوک کے آدمیوں نے اسے بمشکل جانے
کی اجازت دی۔ سعدی بصرہ کے لئے واپس روانہ ہوا تو اسے یقین تھا کہ اس کے گاہک
نے دوسری لانچ کا بندوبست کر لیا ہوگا لیکن اسے پرواہ نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ کبڑے
نے اسے کچھ نہ بتایا تھا لیکن سعدی کا خیال تھا کہ یا تو وہ کوئی جاسوس تھا یا شاہ کے خلاف
سرگرم خفیہ تنظیم کا آدمی۔ ورنہ اتنا خوفزدہ نہ ہوتا لیکن سعدی کو اب اس سے کوئی سروکار نہیں
تھا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ کبڑے سے جان چھڑانا اب اس کے لیے دشوار ہوگا۔

سعدی کو بصرہ پہنچنے کی جلدی تھی تاکہ اس کا گاہک اگر منتظر ہو تو یہ ٹرپ بے کار نہ جائے
شط العرب سے گزرتے ہوئے اس نے لانچ کی رفتار تیز کر دی۔ دریائے ٹگرس اور فرات
کے سنگم سے پیدا ہونے والے اس دریا کی لمبائی ایک سو بیس میل ہے لیکن اس کا پانی کیچڑ
اور تیل کی آمیزش کی وجہ سے اتنا گدلا رہتا ہے کہ سعدی کو اس سے گزرتے ہوئے ہمیشہ
کوفت ہوتی تھی۔ اس کے دونوں جانب پھیلے ہوئے ریگستان کی گرد اور دونوں کناروں پر
واقع تیل کی ریفائنریوں کا دھواں فضا کو اتنا آلودہ کر دیتا ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لئے
وہ جلد از جلد بصرہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔

❁......❁

سعدی اس وقت ہوٹل العشر کی چھت پر واقع ریسٹوران میں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ بصرہ
کے قیام کے دوران ہمیشہ اسی ہوٹل میں قیام کرتا تھا کیونکہ یہ نسبتاً صاف ستھرا اور عشر گھاٹ
سے قریب واقع تھا۔ جہاں اس کی لانچ لنگر انداز تھی۔ شہر کی قدیم آبادی کے کنارے واقع

اس ہوٹل کا ریسٹورنٹ کھلی چھت پر واقع تھا جہاں سے سند باد جہازی کے اس شہر کی تنگ
گلیاں اور جال کی طرح پھیلی ہوئی نہروں کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ سعدی نے وارتھن
اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو چونک پڑا۔

وارتھن کا تعلق چیکوسلواکیہ سے تھا۔ وہ بہت بدنام قسم کا شخص تھا جس کا شمار خطرناک
اسمگلروں میں ہوتا تھا۔ وہ اسلحہ کا سمگلر تھا اور شکل سے ہی خونخوار قسم کا قاتل نظر آتا تھا۔ وارتھن
بے تکلفی سے کرسی گھسیٹ کر سعدی کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں تمہاری لانچ کرائے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' وارتھن نے بلا کسی تمہید کے کہا۔

''تم نے دیر کر دی۔'' سعدی نے جواب دیا۔ ''میری لانچ بک ہو چکی ہے۔''

وارتھن کو یقین نہیں آیا۔ اس نے ناگواری کے ساتھ سعدی کو دیکھا۔ ''سہ پہر تک تم
گاہک کی تلاش میں تھے؟'' اس نے کہا۔

''تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن اب لانچ بک ہو چکی ہے۔''

''میں تم کو اتنا کرایہ دوں گا جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔''

سعدی نے اسے ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''میں نے تو سنا تھا کہ آجکل تم بالکل
دیوالیہ ہو۔'' اس نے کہا۔

وارتھن نے آگے جھک کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اومان کے انقلابی قبائل کے لئے
جانے والے اسلحہ کی ایک لانچ خلیج میں ڈوب گئی ہے۔ مجھے وہ جگہ معلوم ہے جہاں لانچ
ڈوبی تھی۔ اسلحہ کی بھاری قیمت ایک پارٹی ادا کرنے کو تیار ہے۔ تمہاری لانچ پر غوطہ خوری
کا تمام سامان موجود ہے اس لئے میں تم سے منافع میں ففٹی ففٹی کرنے کو تیار ہوں۔''

سعدی کو یقین تھا کہ وارتھن سچ کہہ رہا ہے لیکن وہ ایسے بدنام آدمی کے ساتھ کوئی کام
کرنے کو تیار نہ تھا۔ ''مجھے افسوس ہے لیکن تم کسی اور کو تلاش کیوں نہیں کر لیتے۔''

''تم کو کیوں انکار ہے۔'' وارتھن غرایا۔

''اس لئے کہ میں عراقی سیکرٹ پولیس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔'' سعدی نے
صاف گوئی سے کام لیا۔

سعدی کو تیل کی ڈرلنگ کا وسیع تجربہ تھا اس نے ابتداء میں ایک آئل کمپنی میں ملازمت
کر کے کافی رقم جمع کی اور اس سے یہ لانچ خرید کر نوکری چھوڑ دی تھی۔ کرد ہونے کی وجہ

عراقی حکام اسے بھی شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے اسمگلروں کے ساتھ بھی کام کیا تھا
لیکن وارتھن جیسے چالاک اور دغاباز کے ساتھ وہ کوئی کام کرنے کو تیار نہ تھا۔

''تم بھی اتنے نیک نام تو نہیں ہو۔'' وارتھن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''حکام کو تمہارے
متعلق بھی معلومات ہیں۔''

''کچھ بھی ہو میں تمہاری اس پیش کش کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوں۔'' سعدی نے
ترش لہجے میں کہا۔ ''اپنا وقت ضائع مت کرو۔''

وارتھن غراتا ہوا چلا گیا۔ سعدی جب اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے یاد آیا کہ برینڈل
نو بجے لانچ پر آئے گا۔ آئل کمپنی کا یہ جرمن انجینئر پہلے بھی مچھلی کے شکار کے لئے اس
کی لانچ کرائے پر لے چکا تھا اور آج بھی اسی نے لانچ بک کرائی تھی۔

نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ سعدی لباس تبدیل کر کے ہوٹل سے نکلا۔ تنگ اور
بدبودار گلیوں سے گزرتا ہوا بصرہ کے عشر گھاٹ کی سمت روانہ ہو گیا۔ فرات کے کنارے اس
کی لانچ بغداد کے ایک بڑے بادبانی سفینے کے پاس لنگر انداز تھی۔ جرمن انجینئر برینڈل بھی
نہیں آیا تھا۔ سعدی اس کا انتظار کرنے کے لئے لانچ کے واحد کیبن میں داخل ہوا۔ لائٹ
جلانے کے بعد اسے یہ احساس ہو کہ وہ کیبن میں تنہا نہیں ہے۔

سترہ اٹھارہ برس کا چھریرے بدن والا ایک عرب لڑکا۔ اس برتھ کے برابر کھڑا ہوا تھا۔
جس پر سعدی نے زخمی کبڑے کو لٹا کر ایرانی بندرگاہ تک پہنچایا تھا۔ لڑکے کے جسم پر عربی عبا
تھی لیکن سر پر بندھا ہوا کفیہ سرخ رنگ کا تھا۔ برتھ کے نیچے والی دراز کھلی ہوئی تھی اور
نوجوان لڑکا اچانک گھوما تو اس کے دبلے پتلے ہاتھ میں سیاہ ریوالور تھا جس کی نالی کا رخ
سعدی کی طرف تھا۔

سعدی دم بخود کھڑا اس لڑکے کو گھور رہا تھا۔ لڑکے نے نظریں ہٹائے بغیر دراز میں ہاتھ
ڈال کر ایک پیکٹ نکالا اور جلدی سے اپنی عبا کے اندر چھپا لیا۔ سعدی کو اچھی طرح یاد تھا
کہ ایرانی کبڑے کو لانچ پر لانے سے پہلے یہ دراز بالکل خالی تھی۔ لڑکے نے برابر رکھی ہوئی
میز کی سمت پر ہاتھ بڑھایا اس پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل میز پر الٹ دی اور پھر ایک عجیب
حرکت کی۔ پانی سے تر میز کی سطح پر اس نے انگلی سے ایک نشان بنایا۔ اس دوران اس کی
نظر ایک لمحے کے لئے بھی سعدی کی شکل پر سے نہیں ہٹی تھی۔

سعدی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ خاموش اور منتظر کھڑا رہا۔ لڑکے کی آنکھیں جنونی انداز میں چمک رہی تھیں۔ جیسے وہ نشے میں ہو۔ سعدی حیرت کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔ عرشے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ سعدی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اسی لمحے لڑکا جیسے سکتے سے چونک پڑا۔ اس نے ریوالور بائیں ہاتھ میں پکڑا اور داہنے ہاتھ کو عبا کے اندر ڈال کر ایک تیز دھار کا چمکتا ہوا خنجر نکالا اور سعدی کو قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھنے لگا۔ پستول کی زد میں لے کر اس نے سعدی کو بالکل بے حس بنا دیا تھا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑا رہا پھر میز کے گرد آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا۔ چھوٹے سے کیبن میں زیادہ جگہ نہ تھی لیکن اس طرح لڑکا گھوم کر دوسری جانب آ گیا تھا اور اب اس کی پشت کیبن کے دروازے کی سمت تھی۔

برنیل نے دروازے سے اچانک جست لگائی تھی اس نے پوری قوت سے عرب لڑکے کے بازوؤں پر گھونسے مارے۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سامنے گرا۔ لیکن لڑکے نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گھوم کر برنیل پر خنجر سے وار کیا۔ برنیل تھرل نے دونوں بازو آگے کر کے خود کو بچایا لیکن خنجر کی نوک اس کی بائیں ہتھیلی کو چیرتی چلی گئی۔ سعدی نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا اور اس سے پہلے کہ لڑکا دوبارہ وار کر سکتا اس نے گرج کر کہا۔

"خبردار! حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔"

لیکن لڑکے پر کوئی اثر نہیں ہوا اور سعدی کی سمت گھوما اور ریوالور کی فکر کیے بغیر خنجر تان کر آگے بڑھا۔ سعدی کے لئے اب کوئی چارہ نہ تھا اس نے فائر کر دیا۔ گولی لڑکے کے پیٹ میں لگی۔ اس نے کراہ کر ایک ہاتھ سے میز کا سہارا لیا۔ اذیت سے اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا لیکن اس کی پرواہ کیے بغیر اس نے خنجر بلند کیا اور سعدی پر جست لگائی۔ سعدی نے اس بار اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کیا اور پھرتی کے ساتھ ایک سمت ہٹا۔ گولی لڑکے کے سر سے پار ہو چکی تھی۔ وہ پلٹ کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ سعدی کا جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اس نے اتنا جنونی قاتل پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ سکتے کے عالم میں کھڑا لڑکے کی لاش کو گھور رہا تھا برنیل تھرل ایک ہاتھ کے سہارے سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پتہ نہیں...... میرے ہاتھ کو کیا...... ہو گیا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا اور پھر فرش پر گر پڑا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔

سعدی نے ریوالور میز پر پھینکا اور بھاگتا ہوا کیبن سے باہر نکلا اور چند لمحے بعد ہی وہ گھاٹ کے سامنے والے کافی ہاؤس سے ہسپتال کو ایمبولینس کے لئے فون کر رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ ایمبولینس پولیس کے بغیر نہیں آئے گی۔ عراق میں اگر کوئی مر بھی رہا ہو تو پولیس کی کارروائی سے پہلے ہسپتال نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن برنیل کے لئے سعدی کی یہ فکر بیکار ثابت ہوئی۔ کیونکہ جب وہ لانچ پر واپس پہنچا تو برنیل مر چکا تھا۔ سعدی نے حیرت سے برنیل تھرل کی ہتھیلی کو دیکھا۔ زخم بالکل معمولی تھا۔ اس نے گھوم کر قاتل لڑکے کے ہاتھ میں اب تک دبے ہوئے خنجر کو دیکھا۔ خنجر کی نوک سیاہ ہو رہی تھی۔ اس پر کوئی مہلک زہر لگا ہوا تھا۔

چند لمحے وہ غصے اور افسوس کے عالم میں دونوں لاشوں کو دیکھتا رہا۔ سب کچھ اس طرح چشم زدن میں ہو گیا تھا کہ سعدی کو یقین نہ آ رہا تھا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ اس نے لڑکے کی عبا میں ہاتھ ڈال کر جیب کے اندر دیکھا اور وہ پیکٹ نکال لیا جو لڑکے نے دراز سے نکال کر اپنی جیب میں چھپایا تھا۔ پلاسٹک کے اندر لپٹا ہوا یہ ایک دبیز کاغذ تھا۔ اس نے پلاسٹک کھول کر اسے باہر نکالا اور روشنی کے قریب جا کر دیکھنے لگا۔ لیکن کاغذ پر سوائے چند انجانے نشانات کے کوئی تحریر نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدیم طرز کا کوئی نقشہ ہے یا کوئی بہت قدیم دور کی کوئی تحریر...... سعدی کے لئے اس کو سمجھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن ایک بات بڑی واضح تھی۔ یہی وہ قیمتی تحریر یا نقشہ تھا جس کی تلاش میں وہ لڑکا یہاں آیا تھا اور جس کو حاصل کرنے کے لئے اس نے برنیل تھرل کو قتل کیا تھا اور خود بھی مر گیا تھا۔

پولیس کی آمد سے پہلے سعدی نے ایک تختہ اکھیڑ کر نقشہ اس کے نیچے چھپا دیا۔

✿......✿

سعدی کو مجرموں کی طرح پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا لیکن عراقی سیکرٹ پولیس کے ایک افسر عازم شفیقی کے آنے کے بعد اسے رہائی مل گئی۔

عازم نے نائیلون کے چیک کا ایک خوبصورت اور قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ چھریرے جسم کا اور دلکش شخصیت کا ایک تیز طرار افسر تھا۔ اس کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ میں بھی سفاکی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ لیکن سعدی کے ساتھ عازم کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی سعدی کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔

”بڑا عجیب کیس ہے۔“ عازم شفقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ لڑکا چوری کی نیت سے لانچ میں داخل ہوا تھا۔ وہ کیا چوری کرنے آیا تھا؟“

”لانچ میں بہت سی قیمتی چیزیں ہیں...... اس نے ابھی تلاش شروع ہی کی تھی کہ اچانک میں پہنچ گیا۔“ سعدی نے کہا۔

”اس کا یوں قاتلانہ حملہ کر دینا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“ عازم نے کہا۔ ”پھر ریوالور کے ساتھ زہر آلود خنجر کا معاملہ بھی پراسرار ہے۔ تم کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو؟“

”میں نے کچھ نہیں چھپایا...... واقعہ جس طرح پیش آیا میں نے من وعن بتلا دیا...... اور پھر آپ سے جھوٹ بولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”تمہارے حق میں بہتر بھی یہی ہوگا۔“ عازم شفقی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آؤ...... میرے ساتھ۔“

وہ سعدی کو لے کر برابر والے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں اس عراقی لڑکے کی لاش ایک لمبی میز پر برہنہ پڑی تھی۔ سعدی نے دیکھا کہ لڑکے کے سینے میں سرخ رنگ ملا ایک عجیب سے نشان کی کھدائی کی گئی تھی۔ عازم بڑے غور سے سعدی کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

”اس نشان کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں...... کیا آپ نے کچھ اندازہ کیا ہے؟“

”نہیں.... اب تک تو کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔“ شفقی نے جواب دیا۔ ”سعدی...... اس واردات کا تعلق کہیں اس معاملے سے تو نہیں جس کے سلسلے میں وارتھن تم سے ملنے آیا تھا؟“

سعدی حیران رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ عازم کی معلومات اتنی وسیع ہیں۔

”اگر ہو بھی تو میں نہیں جانتا۔“ اس نے کہا۔

”یا پھر کرد باغیوں سے کچھ تعلق ہو؟“ عازم نے کہا۔

سعدی خاموش رہا۔ لیکن کرد قبائل کا ذکر اس کے لئے نہایت پریشان کن تھا۔ کرد قبائل خود کو عراق کا اصل حقدار تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عربوں نے ان کی سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ عراق میں کردوں اور حکومت کے درمیان پرانی کشمکش جاری تھی، شمالی حصے کے پہاڑی علاقوں پر کرد گوریلوں کا قبضہ تھا جہاں سے ان کی چھاپہ مار سرگرمیوں

کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ پہاڑوں کی پناہ گاہوں سے نکل کر عراق کے فوجی یونٹوں پر حملے کرتے اور پھر انہی پہاڑی دروں میں غائب ہو جاتے۔ ان کی چھاپہ مار سرگرمیاں دن بدن تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ سعدی کے متعلق یہ شبہ تھا کہ وہ بھی ان کرد گوریلوں کی مدد کرتا رہا تھا اور ان کو عراق سے ایران کی سرحدوں تک فرار کرانے میں اپنی لانچ کو استعمال کرتا رہا تھا۔ لیکن اس کے خلاف اب تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ عازم شفقی کبھی کبھی اس کی لانچ پر دوستانہ انداز میں جا کر چائے پیتا تھا۔ لیکن سعدی کے خلاف کوئی سراغ نہ حاصل کر سکا تھا...... خود عازم کی حیثیت بھی حکومت کی نظروں میں مشکوک تھی۔ عراقی سیکرٹ پولیس کے سربراہ کو حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام سازش کے سلسلے میں جب گرفتار کر کے گولی ماری گئی تو عازم واحد شخص تھا جس کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا اس لئے وہ بچ گیا۔ لیکن اس پر پہلے جیسا اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ اسے نئے سربراہ کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ لیکن عازم شفقی کو معلوم تھا کہ اس کی باقاعدہ نگرانی ہوتی ہے۔

اس کے باوجود سعدی جانتا تھا کہ اگر حکومت کے دشمنوں کے ساتھ ملوث ہونے کا کوئی ثبوت مل گیا تو عازم شفقی اسے گرفتار کرنے یا گولی مارنے میں پس و پیش نہ کرے گا۔ لیکن اس عرب لڑکے کے قاتلانہ حملے کے سلسلے میں عازم شفقی کو سعدی حشمی کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا۔ اس لئے اس نے سعدی کو جانے کی اجازت دے دی۔

”ٹھیک ہے سعدی حشمی...... تم جا سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن فی الحال اپنی لانچ لے کر کہیں نہ جانا۔“

سعدی کے جاتے ہی ایک سارجنٹ نے آ کر عازم شفقی کو بتایا۔ آپ کے دفتر سے فون آیا تھا۔ سعدی کی لانچ اور ہوٹل کے کمرے میں گفتگو سننے کے خفیہ آلات لگا دیئے گئے ہیں اور نگرانی شروع کر دی گئی ہے۔“

”کیا سفیان آ گیا؟“ عازم شفقی نے پوچھا۔

”جی ہاں...... اس نے باہر نکلتے ہی سعدی کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔“

۞......۞

سارجنٹ علی سفیان نے فون پر عازم کو مطلع کیا کہ سعدی حشمی اپنی لانچ پر پہنچ کر انجن کی مرمت میں مصروف تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد یہ رپورٹ ملی کہ وارتھن اس وقت ہوٹل شط

العرب میں شراب نوشی میں مصروف تھا۔

عازم مطمئن ہوگیا۔ اس نے پولیس کو پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ اگر سعدی اپنی لانچ کے ذریعے فرار کی کوشش کرے تو اسے روک کر گرفتار کرلیا جائے۔ وارتھن کا ہوٹل شط العرب میں قیام اس کے لئے حیرت کا باعث ہوا تھا۔ یہ بہت مہنگا ہوٹل تھا اور وارتھن کے متعلق یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ وہ ان دنوں مالی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جس کام کے لئے سعدی کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا اس میں بھاری رقم ملی تھی...... لیکن یہ بات کسی کو نہ معلوم تھی کہ خود عازم شفیقی ان دنوں کہیں سے بھاری رقم حاصل کرنے کے لئے کتنا بے چین تھا۔

جب سے سیکرٹ پولیس کے سابق سربراہ کو ناکام بغاوت کے الزام میں گولی ماری گئی تھی عازم کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ سابق سربراہ نے اپنی حماقت میں اتنی عجلت سے کام لیا تھا کہ حکومت پر قبضہ کرنے کی بجائے خود مارا گیا اور سیکرٹ پولیس کے بائیس افراد بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ عازم خوش قسمت تھا کہ سازش کے الزام سے بری ہوگیا۔ لیکن سیکرٹ سروس کا سربراہ بننے کی اس کی تمام امیدیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھیں اس لئے اب وہ عراق سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اسی خیال سے وہ ہوٹل شط العرب پہنچا اور وارتھن کو چہل قدمی کے بہانے باہر لے آیا تا کہ ان کی گفتگو کوئی نہ سن سکے۔ اس نے سعدی حشمی پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی تفصیل وارتھن کو بتائی۔

"لیکن آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتلا رہے ہیں؟" وارتھن نے حیران ہوکر پوچھا۔ "اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ قاتلانہ حملہ میں نے کرایا تھا تو اس شبے کو ذہن سے نکال دیجئے۔"

"تم کو کسی لانچ کی اشد اور فوری ضرورت تھی جس میں تم اب تک کامیاب نہیں ہو سکے۔" عازم نے کہا۔

"صرف آپ کی وجہ سے۔" وارتھن نے غصے میں جواب دیا۔ "آپ نے مجھے اتنا بدنام کر دیا ہے کہ کوئی میرے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔"

"میری حکومت اسلحہ کی ناجائز اسمگلنگ کے سخت خلاف ہے۔"

"اوہ...... لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کام میں اسلحہ کی اسمگلنگ کا کوئی

سلسلہ نہیں...... میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ کام دوسری نوعیت کا ہے۔"

عازم جانتا تھا کہ وارتھن کتنا جھوٹا ہے۔

"کچھ بھی ہو، کام یقیناً ناجائز ہے۔ کیونکہ اطلاع کے مطابق تم لانچ حاصل کرنے کے لئے بھاری رقم ادا کرنے کو تیار ہو۔"

وارتھن نے چونک کر عازم کو دیکھا۔ "اگر آپ مدد کریں تو میں چار ہزار انگلش پونڈ ادا کرسکتا ہوں۔" اس نے پُر امید لہجے میں کہا۔

"یہ رقم بہت معمولی ہے۔" عازم شفیقی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی تھی۔ اتنی معمولی رقم اس کے کام نہ آسکتی تھی۔

"اوہ...... تو آپ صرف مجھ سے یہ راز معلوم کرنے کے لئے کہہ رہے تھے۔" وارتھن غصے میں بولا۔

"یہی سمجھ لو......" عازم شفیقی نے سرد لہجے میں کہا اور اسے چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔

دفتر پہنچ کر اسے ایک دوسری مایوس کن خبر ملی...... سعدی بڑی چالاکی کے ساتھ سارجنٹ علی سفیان کو جل دے کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔

اس نے فوراً حکم دیا کہ سعدی حشمی کی لانچ کی نگرانی اور سخت کردی جائے۔ ویسے اسے یقین تھا کہ سعدی حشمی فرار نہیں ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ عراق میں اپنا بزنس ختم نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دفتر سے اٹھ کر آرام کرنے گھر چلا گیا۔

لیکن دوسری صبح جب وہ دفتر پہنچا تو ایک چونکا دینے والی خبر اس کی منتظر تھی۔

کرد چھاپہ ماروں کے گروہ کی ایک خوبصورت گوریلا کارکن نظمہ بصرہ آئی ہوئی تھی اور سعدی کو تلاش کررہی تھی۔

۞......۞

سعدی حشمی جب بغداد پہنچا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ تمام رات ٹرین میں سفر کرنے کی وجہ سے وہ سو بھی نہ سکا تھا اس لئے وہ پہلے نارتھ اسٹیشن ہوٹل پہنچا اور ایک کمرہ کرائے پر لے کر چند گھنٹے آرام سے سوتا رہا۔ لنچ کے بعد وہ سیدھا عراقی نیشنل میوزیم پہنچا۔ توقع کے مطابق اسے پروفیسر حارث سلیمی لائبریری میں تنہا بیٹھے ہوئے مل گئے۔ ان کے سامنے کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سعدی حشمی جانتا تھا کہ قدیم زبانوں کا ان سے بڑا ماہر اس خطے

میں کوئی نہیں ہے۔ پروفیسر حارث اس کے والد کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ حشمی
دیکھ کر وہ حیرت سے مسکرائے۔

''ارے سعدی! یہ اتنے دنوں بعد تم کو میری یاد کیسے آ گئی...... خیریت سے تو ہو؟''

''آپ کی دعاؤں کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں۔'' سعدی حشمی نے مسکراتے ہو
جواب دیا۔ ''ایک غرض سے آیا ہوں۔''

''بولو، کیا بات ہے؟''

''فرقہ باطنیہ کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔'' سعدی نے کہا۔

''کیوں...... خیریت تو ہے؟'' سلیمی نے حیران ہو کر کہا۔

سعدی نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر پروفیسر کے سامنے رکھا جس پر اس نے عرب
لڑکے کے سینے پر گدے ہوئے نشان کو نقل کیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''آپ اس نشان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟''

پروفیسر حارث نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ حسن بن صباح کے فدائیوں کا شناختی نشان
ہے۔''

''مجھے یہی شبہ تھا۔'' سعدی نے کہا۔ ''اور اس نشان کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
اس نے کاغذ پر نشان بناتے ہوئے کہا۔

پروفیسر نے بلا جھجک جواب دیا۔ ''جب کوئی فدائی کسی کے قتل کی مہم پر بھیجا جاتا ت
وہ مقتول کے سینے یا اس کی کسی چیز پر یہ نشان بنا دیتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت ہوتا تھا
اس کو فرقہ باطنیہ نے سزا دی ہے۔''

''اور قاتل عموماً زہر آلود خنجر استعمال کرتا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... عام طور پر۔'' پروفیسر نے کہا۔

اب سعدی نے جیب سے وہ نقشہ نکال کر میز پر رکھا جو اس عرب لڑکے کے لباس
برآمد ہوا تھا۔

''یہ نقشہ مجھے ایک ایسے عرب نوجوان کے پاس سے ملا ہے جو مجھے قتل کرنے آیا تھا۔
بلاشبہ فدائی تھا۔ اس کا مطلب کیا ہے؟''

پروفیسر حارث سلیمی غور سے نقشے کو دیکھتے رہے، پھر سعدی کی سمت دیکھ کر بو

''میں نے ایسا عجیب نقشہ کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اس دور کی بابلی اور ویلمی زبان کے مختلف
الفاظ کے درمیان مختلف علامتی نشانوں پر مشتمل ہے۔ یہ پراسرار نشانات کچھ بھی ہو سکتے
ہیں۔ لیکن نقشے میں دیئے ہوئے راستے کی ابتداء اور آخر کے دو نشانات قدیم مصری زبان
میں ہیں۔ یہ نیچے جو ابتداء میں نشان ہے وہ کسی پہاڑی یا اس کی ڈھلوان کا ہے۔ اس کے
سامنے دیوتا راء کی آنکھ بنی ہوئی ہے جس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ دیوتا راء اس مقام کی
نگہبانی کر رہا ہے۔ اور یہ آخر میں بنا ہوا علامتی نشان اس جگہ کی سمت اشارہ کرتا ہے جو کسی
پہاڑی کے اندر بنی ہوئی ہے جس کے دو دہانے یا راستے ہیں۔'' وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے
بولا۔ ''لیکن یہ مفہوم یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ تم کچھ وقت دو تو میں اطمینان سے اس پورے
نقشے کا مطالعہ کر کے بتا سکوں گا۔ کیوں نہ تم دو تین گھنٹے کے بعد پھر آ جاؤ۔''

''آپ نے تو کمال کر دیا پروفیسر!'' سعدی کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا تھا۔ ''ٹھیک
ہے...... میں تین گھنٹے بعد واپس آ جاؤں گا۔''

✡......✡

سعدی جب دوبارہ میوزیم پہنچا تو پروفیسر حارث سلیمی نے اسے فرقہ باطنیہ اور حسن
صباح کے متعلق تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ ہے اس نقشے کا پورا ترجمہ۔'' اور سعدی اسے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''لیکن اس سے کسی مقام کے بارے میں تو اشارہ نہیں ملتا۔'' سعدی نے کہا۔ ''آخر
اس راستے کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟''

''بے شک یہ بڑا مبہم ہے اور یوں لگتا ہے جیسے استعمال کئے جانے والے الفاظ میں
کوئی خفیہ اشارہ پوشیدہ ہے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''کچھ بھی ہو، یہ نقشہ بہت اہم ہے۔ ورنہ اس کی خاطر دو افراد کی جان نہ جاتی۔''
سعدی نے کہا۔ ''وہ عرب جوان اسی کی تلاش میں آیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو وہ
مقام ضرور معلوم ہے جس کا اشارہ نقشے میں کیا گیا ہے۔''

''ہوں......'' پروفیسر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مشکل یہ ہے کہ حسن بن صباح اور فرقہ
باطنیہ سے متعلق تمام اہم مواد ایران میں ہے۔ اگر تم وہاں جاؤ تو ابراہیم بلادی سے ضرور
ملاقات کرنا وہ اس موضوع پر سب سے بڑی اتھارٹی ہیں۔ تم کو وہ تہران کے آثارِ قدیمہ

کے میوزیم میں آسانی سے مل جائیں گے۔"

"شکریہ پروفیسر...... یہ ابراہیم بلادی کیا ایرانی ہیں؟"

"ہاں...... وہ قدیم زبانوں اور آثار قدیمہ کے عظیم ماہر ہیں...... اور جسمانی عیب کے باوجود انہوں نے اس موضوع پر قابل قدر تحقیق کی ہے۔"

"جسمانی عیب؟"

"ہاں...... وہ کبڑے ہیں۔" پروفیسر حارث سلیمی نے کہا۔

سعدی جانتا تھا کہ اگر بغداد سے سیدھا تہران چلا گیا تو عازم اس پر عراق کے دروازے بند کر دے گا اور لانچ بھی ضبط ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے نقشے کو ایک لفافے میں رکھ کر تہران میں اپنے ایک دوست کے پتے پر روانہ کر دیا جو ایک سکول میں ٹیچر تھا اور اسے لکھ دیا کہ اس کے تہران پہنچنے تک اسے اپنے پاس حفاظت سے رکھے۔ اس کے بعد پہلی فلائٹ سے بصرہ روانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ عازم سے اپنی غیر حاضری کا کوئی معقول عذر پیش کر کے بصرہ سے روانگی کی اجازت لے لے گا اور پھر لانچ کو لے کر سیدھا اباوان جائے گا جہاں سے باآسانی بذریعہ طیارہ تہران جا سکتا تھا۔

لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ بصرہ میں نظمہ اس کی منتظر تھی۔

✡......✡

درمیانہ قد، چھریرہ بدن جو مشقت اور محنت سے فولاد کی طرح سڈول ہو گیا تھا۔ سورج کی تمازت سے سنولا ہوا رنگ، ستواں ناک، بھرے ہوئے لب، سیاہ بال اور چیتے کی طرح چمکدار اور چوکنی آنکھیں۔ یہ تھا حسین نظمہ کا سراپا۔ اس کے حسن میں ایک عجیب کشش تھی جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کرد جوان بھی گٹھے ہوئے مضبوط اور پھرتیلے جسم کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی جھلک رہی تھی۔ چوڑے شانے اور بھرے ہوئے بازو ہر خطرے سے نمٹنے کے لئے مضطرب نظر آ رہے تھے۔

عازم اس نوجوان کو نہیں جانتا تھا لیکن اس نے نظمہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ سعدی کے ہوٹل کے سامنے بہنے والی نہر کے کنارے بنے ہوئے ٹین کے شیڈ کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ دوربین اس کی آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔ جیسے ہی یہ خبر ملی کہ نظمہ اور ایک کرد نوجوان سعدی کی لانچ پر پہنچ گئے ہیں، عازم شفیقی فوراً وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں ایسے شکاری کی طرح

چمک رہی تھیں جسے یقین ہو کہ شکار جال میں پھنس چکا ہے۔ سارجنٹ علی سفیان نے اسے فون کیا تھا کہ کرد لڑکی اور جوان، سعدی کی لانچ پر چڑھ کر کیبن میں جا کے بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن جب وہ اس جگہ پہنچا تو علی سفیان نے بتایا کہ ذرا دیر پہلے وہ دونوں بڑے غصے میں کسی بات پر بحث کرتے ہوئے کیبن سے باہر نکلے تھے اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ پھر لانچ سے اتر کر پوچھتے ہوئے سعدی کے ہوٹل میں گئے تھے۔ اس کے بعد باہر نکل کر نہر کے سامنے ایک میز کے گرد بیٹھے مشروب پی رہے تھے۔

دونوں نے مغربی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ لڑکی نے سمر کا ہلکا پتلون، سفید شرٹ اور اس پر جیکٹ پہنا ہوا تھا۔ کیونکہ عراق میں مسلمان عورتوں کا اس طرح بے پردہ بیٹھنا معیوب تھا اور اس طرح اس کے مذہب کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مغربی لباس میں وہ اسپینی یا یونانی سیاح لگ رہے تھے۔ عازم شفیقی نے دیکھا کہ سارجنٹ علی سفیان کا ایک ساتھی ان کے برابر والی میز کے گرد جا کے بیٹھ گیا تا کہ ان کی باتیں سن سکے۔ لیکن اس کے وہاں پہنچتے ہی نظمہ اور اس کا ساتھی خاموش ہو گئے تھے۔ عازم نے علی سفیان کو اس جوڑے کی کڑی نگرانی کی ہدایت کی اور پبلک سیکورٹی ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ گیا۔ وہ گوریلا چھاپہ ماروں کی تصاویر کے ریکارڈ میں اس کرد جوان کی تصویر تلاش کرنے آیا تھا تا کہ اگر ممکن ہو تو اسے شناخت کر سکے۔

عازم کا اندازہ غلط نہیں نکلا...... لڑکی کو اس نے فوراً شناخت کر لیا لیکن نوجوان کی تصویر زیادہ صاف نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اسے پہچاننا اتنا دشوار نہ تھا۔ یہ تصاویر کرد باغیوں کے ریکارڈ میں محفوظ تھیں اور تہران میں واقع ان کے خفیہ ہیڈ کوارٹر کی بلڈنگ کے سامنے عراق کے ایک سیکرٹ ایجنٹ نے اتاری تھیں۔ تصاویر کے نیچے کوئی نام نہ تھا لیکن چہرے کی باآسانی شناخت ہو گئی تھی۔ عازم کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اب تک اسے شک تھا لیکن ان دونوں کرد باغیوں کی آمد سے ثابت ہو گیا تھا کہ سعدی بھی باغیوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اب وہ ایک تیر سے دو شکار کرے گا اور ان کی گرفتاری اس کے لئے ترقی کا دروازہ کھول دے گی۔ ان تینوں سے حقیقت کا اعتراف کرانے کے لئے اس کے دفتر کے تہ خانے میں ایذا رسانی کا جدید ترین سامان موجود تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور اس کا چیف میجر منور حسین

غصے میں بھرا ہوا اندر داخل ہوا۔

"تم نے اب تک ان دونوں کرد باغیوں کو گرفتار کیوں نہیں کیا ہے؟" اس نے غرا
ہوئے پوچھا۔

عازم کو منور حسین کے لہجے کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے صدمہ اس بات سے پہنچا تھا کہ یہ
میجر کو معلوم کیسے ہوا؟ اس نے اپنے شبہ کا اظہار صرف سارجنٹ علی سفیان سے کیا تھا۔ مگر
ہے اس نے کسی اور کو بتلا دیا ہو یا خود میجر کو مطلع کیا ہو...... لیکن یہ بات یقینی تھی کہ محکمے
ماتحتوں کو بھی اب اس پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ یا پھر وہ اسے اپنا افسر تسلیم نہیں کرتے تھے اور ا
کی ہر بات میجر منور حسین تک پہنچا کر خوشنودی حاصل کر رہے تھے۔

"میجر......" عازم نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "ان کو گرفتار کرنا تو اب کوئی مسئلہ نہ
رہ گیا...... لیکن میں ان کے ذریعے چھاپہ ماروں کے اس سرغنہ تک پہنچنا چاہتا ہوں جو ا
تک سامنے نہیں آیا ہے۔"

"بے شک...... یہ ممکن ہے۔" عازم نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے گر
کے افراد بھی ان دونوں کی نگرانی کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں اگر ہم نے ان کو ا
گرفتار کیا تو گروہ کے بقیہ افراد اور ان کا سرغنہ سب خبردار ہو جائیں گے اور یقیناً فرار ہو
ہماری دسترس سے دور نکل جائیں گے۔ میں اس لئے انتظار کر رہا ہوں۔"

منور حسین پس و پیش میں پڑ گیا۔ "ٹھیک ہے...... تم ایسا ہی کرو۔ لیکن اگر یہ دو بھی ہا
سے نکل گئے تو نتائج کی ذمے داری تم پر...... صرف تم پر ہوگی۔"

عازم شفیقی کی تمام تر خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب ا
گرفتاریوں کا سہرا میجر منور حسین اپنے سر باندھے گا۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام تصا
فائل میں واپس رکھ دیں سوائے نظمہ کی تصویر کے جسے وہ بغور دیکھ رہا تھا کہ فون کی گ
بجی...... سارجنٹ علی سفیان نے فون پر بتلایا کہ سعدی حشمی واپس آ گیا ہے۔

⁂......⁂

عازم کا خیال صحیح تھا۔ نظمہ اور عبدالغفور دونوں کرد گوریلے تھے۔ نظمہ کا باپ کردستان
کے شہر رواندیز کا باشندہ تھا اور ایک لڑائی میں عراقی فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد
سے نظمہ نے چھاپہ ماروں میں شامل ہو کر باقاعدہ تربیت حاصل کی اور اب اس کا شمار
کردوں کے بہترین گوریلوں میں ہوتا تھا۔ تجربہ نے اس میں بلا کا صبر و تحمل اور برداشت
پیدا کر دی تھی۔ عبدالغفور کی طبیعت میں اس کے برخلاف بڑا اضطراب تھا۔ بے مثال
جرأت کا مظاہرہ کرتا تھا لیکن اس میں نظمہ جیسا صبر و تحمل نہ تھا۔ وہ بے چوک نشانے باز تھا
اور اسی لئے نظمہ کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ وہ نظمہ سے محبت کرتا تھا اور باوجود اس کے اس نے
کبھی اظہار نہ کیا تھا، نظمہ اس بات سے واقف تھی۔

"ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں...... میں پھر کہتا ہوں کہ نقشہ سعدی کو مل گیا ہے اور وہ
اس کی مدد سے اپنی مہم پر روانہ ہو گیا ہے۔ اب ابراہیم کو چاہئے کہ وہ جگہ کی نشاندہی کر دے
تاکہ ہم سعدی کو راستے ہی میں پکڑ سکیں۔"

نظمہ نے سر ہلایا۔ "نہیں...... ابراہیم بلادی نے پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ صرف نقشے کی مدد
سے کوئی اس جگہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اصل جائے وقوع کا راز صرف ابراہیم کو معلوم ہے۔"

"ممکن ہے اس نے سعدی کو یہ راز بتا دیا ہو۔" عبدالغفور نے کہا۔ "وہ شدید زخمی تھا۔
بے ہوشی کے عالم میں اس نے ساری باتیں اگل دی ہوں جس سے سعدی کو سب کچھ معلوم
ہو گیا ہو۔"

لیکن نظمہ کی نگاہیں اس وقت نہر کے پل پر مرکوز تھیں۔ اس نے سعدی کو اپنی سمت
آتے دیکھ لیا تھا۔ سعدی جیسے ہی ہوٹل کی جانب مڑا، اس کی نگاہ نظمہ پر پڑی۔ ایک لمحے کو
وہ دم بخود کھڑا رہ گیا۔ اس نے ایک نظر عبدالغفور پر ڈالی اور پھر تیزی سے آگے بڑھا۔

"خدا کی پناہ نظمہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس کی آواز میں خوف کے ساتھ ساتھ

مسرت بھی نمایاں تھی۔

"السلام علیکم سعدی حشمی!" نظمہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں عبدالغفور حاسدانہ نگاہوں سے سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

"تم دیوانی تو نہیں ہو گئیں نظمہ......؟ یہ شہر تمہارے دشمنوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر ... کے ہاتھ لگ گئیں تو......؟" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

عبدالغفور نے ان کی نگاہوں میں پوشیدہ راز پڑھ لیا تھا۔ اسے یہ بھی ناگوار گزرا دونوں نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

"اس سے پہلے کہ کسی کا ہاتھ نظمہ تک پہنچے، وہ دوسری دنیا میں ہوگا...... میں اس یہاں موجود ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

سعدی نے اسے غصے میں دیکھا۔ "اسی لئے تم نے اسے یہاں کھلی جگہ بٹھا رکھا جہاں ہر گزرنے والے کی نگاہ اس پر پڑ رہی ہے...... تمہاری عقل کہاں چلی گئی ہے؟"

عبدالغفور نے کرسی کو ٹھوکر ماری اور غصے میں کھڑا ہو گیا۔ "نقشہ کہاں ہے؟" اس غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تم نے اسے ہتھیا لیا ہے۔"

"ذرا عقل سے کام لو۔" سعدی نے نرم لہجے میں کہا اور نظمہ کا بازو تھام کر آگے بڑھ "یہ باتیں ہوٹل چل کر بھی ہو سکتی ہیں۔ یہاں ٹھہرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

سعدی کا کمرہ دوسری منزل پر تھا جس کی کھڑکی عقب کی گلی میں کھلتی تھی۔ سعدی کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا، عقبی گلی کے برابر مکانوں کے پیچھے ایک اور گلی تھی۔ نے دیکھا کہ اس میں کھڑے دو آدمی کسی بحث میں مصروف تھے۔ بظاہر وہ مشتبہ نظر آتے تھے لیکن وہ کوئی خطرہ لینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے لائٹ جلا دی اور نظمہ کی طرف مڑا۔ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ اس ہو کہ اس نے نظمہ کو بہت مدت بعد دیکھا تھا۔ اس کی پچھلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی اس نے نظمہ کے شوہر ملا کو زخمی حالت میں ایران فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ اس کے سعدی نے باغی کردوں کے معاملات میں دخل دینا ترک کر دیا تھا۔ ان دنوں بھی سعدی نظمہ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور سعدی کو خطرہ تھا کہ اگر وہ جلد ہی سے چلا نہیں گیا تو یا تو وہ ملا کو قتل کر دے گا یا ملا اسے جان سے مار دے گا۔ اس لئے

بصرہ چلا آیا اور واپس نہیں گیا۔

"کتنے طویل عرصے بعد ہم ملے ہیں؟" نظمہ نے آہستہ سے کہا۔

دونوں کی نگاہیں ملیں۔ "ہاں...... بہت عرصہ بعد۔" سعدی نے کہا۔ "تمہارے شوہر کا کیا حال ہے؟"

نظمہ کی آنکھوں میں کرب جھلک اٹھا۔ "وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تقریباً ایک سال پہلے وہ بھی عراقی فوجیوں سے ایک جھڑپ میں مارا گیا۔"

"مجھے افسوس ہے نظمہ!" سعدی نے کہا۔ "وہ ایک اچھا آدمی تھا۔"

عبدالغفور سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ وہ آگے بڑھا۔ "ہم نقشہ لینے آئے ہیں۔" اس نے نظمہ کو یاد دلایا۔ "تم کو اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ تم اس آدمی کو جانتی ہو اور تم نے یقین دلایا تھا کہ یہ تم سے تعاون کرے گا۔ پھر اب کام کی بات کرو نا۔"

سعدی نے عبدالغفور کی آنکھوں میں رقابت کے شعلے دیکھے لیکن پھر بھی خود پر قابو رکھا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

عبدالغفور نے اپنا داہنا ہاتھ آگے کیا تو اس میں خنجر چمک رہا تھا۔ "یہ صرف اس صورت میں استعمال ہوگا جب تم تعاون نہ کرو گے۔" اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

سعدی دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "میں خنجر بازوں سے عاجز آ چکا ہوں۔" اس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

نظمہ پھرتی سے دونوں کے درمیان آ گئی۔ "خنجر کو جیب میں رکھ لو عبدالغفور!" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہ نہ بھولو کہ تم میرے ماتحت ہو۔"

اس کے لہجے کی سختی موثر ثابت ہوئی۔ عبدالغفور نے خنجر رکھ لیا اور دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ نظمہ نے مڑ کر سعدی کی سمت دیکھا اور کہا۔

"نقشہ تمہارے پاس ہے؟"

سعدی میز کے کونے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ نقشہ ہے کیسا؟"

"دو ہفتے قبل......" نظمہ نے کہا۔ "تم نے خلیج فارس میں ایک شخص کی جان بچائی تھی؟"

"ہاں...... تم شاید ابراہیم بلادی کی بات کر رہی ہو؟"

عبدالغفور نے چونک کر نظمہ کو دیکھا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ اس شخص کو سب کچھ معلوم ہو چکا

ہے؟''

''تم کس حد تک جانتے ہو سعدی!'' نظمہ نے عبدالغفور کی بات کو نظر انداز کر
ہوئے پوچھا۔

''مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ ایران کا ایک مشہور ماہر آثارِ قدیمہ ہے جسے حسن بن ص
کے فرقہ باطنیہ کے بارے میں خاص حقائق کا علم ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جا
بہتر ہے کہ باقی تم بتادو۔''

عازم شفیقی اس وقت برابر والے کمرے میں بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ سکیورٹی ڈیپارٹ
کا ایک ٹیکنیشن ٹیپ ریکارڈر پر ساری گفتگو محفوظ کر رہا تھا۔

✡......✡

ابراہیم بلادی خود بھی کرد تھے۔ کردوں کی جدوجہد آزادی سے ان کی گہری ہم
قدرتی بات تھی۔ فرقہ باطنیہ کے آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے دوران ان کو ایک ایسی دستا
ہاتھ لگی جس سے ظاہر ہوتا تھا قلعہ الموت کی تباہی سے قبل فدائین نے انمول ہیرواں
جواہرات کا ایک بیش بہا خزانہ کہیں چھپا دیا تھا۔ پروفیسر ابراہیم بلادی نے اس کے
سے فرقہ باطنیہ سے متعلق مسلسل چھان بین اور تحقیق شروع کردی تاکہ اگر یہ خفیہ خزانہ
جائے تو وہ کرد مجاہدین کی جدوجہد کامیاب بنانے کے لئے اسے وقف کرسکیں اور اسی
کے دوران قدیم دستاویزات کے درمیان ان کو ایک خزانے کا سراغ مل گیا جس
مطابق ریگزارِ عرب کے جنوبی علاقہ ربع الخالی میں ایک جگہ وہ نقش موجود تھا جس میں
خزانے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ابراہیم بلادی نے یہ لانچ کرائے پر لی اور چند کرد ساتھی
کے ہمراہ نقشہ کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ ریگستانی راستے میں اس کے دو ساتھی مر گئے
ابراہیم بالآخر اس مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جہاں ایک چٹان پر خزانے کا نقشہ
تھا۔ لیکن یہ نقشہ بیکار ثابت ہوا کیونکہ اس کو سمجھنے کے لئے بعض اہم علامات کی
ضروری تھی۔ اور تہران کے شمال میں واقع حسن بن صباح کے قلعہ الموت جانے کے بعد
ان علامات کو معنی دینا ممکن تھا۔ اس لئے ابراہیم نے ایک کاغذ پر نقشہ اتار لیا اور
روانہ ہوگیا۔ لیکن خلیج فارس میں سفر کے دوران شدید طوفان آیا جس میں کشتی تباہ ہوگئی
ابراہیم بلادی کے علاوہ کوئی زندہ نہ بچ سکا۔

''آہ......تو شاید اسی لئے ابراہیم بلادی نے وہ نقشہ میری لانچ کے کیبن میں چھپا دیا
تھا۔'' سعدی نے کہا۔ ''ظاہر ہے وہ مجھ جیسے اجنبی پر کیسے اعتبار کرسکتا تھا۔ اور چونکہ اس کے
بعد بے ہوش ہوگیا اس لئے نقشہ نہیں نکال سکا۔''

''ہاں......اسے کئی دن بعد ہسپتال میں ہوش آیا تو احساس ہوا کہ نقشہ تمہاری لانچ پر ہی
رہ گیا۔ اس نے فوراً ہمارے ہیڈ کوارٹر کو صورتحال سے مطلع کیا اور اس طرح ہمیں یہ ہدایت
ملی کہ تم سے فوراً رابطہ کریں۔''

''لیکن تم سے پہلے انہوں نے ایک قاتل کو روانہ کرنا ضروری سمجھا تاکہ مجھے ہلاک کر
کے نقشہ حاصل کرلیا جائے۔'' سعدی نے کہا۔ ''جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تب تم کو
استعمال کیا گیا۔''

''تم کس قاتل کا ذکر کررہے ہو؟ ہم سے پہلے کسی کو تمہارے پاس نہیں بھیجا گیا؟''
نظمہ نے حیران ہوکر پوچھا۔

سعدی چند لمحے نظمہ کو گھورتا رہا، پھر سوچتے ہوئے بولا۔ ''تب پھر تمہاری تنظیم میں کوئی
جاسوس موجود ہے۔'' اس نے عرب لڑکے کے قاتلانہ حملے کی ساری تفصیل نظمہ کو سنائی۔
''اس لڑکے کو یہ بھی علم تھا کہ نقشہ میری لانچ میں کس جگہ پوشیدہ ہے۔ اور وہ اسے نکالنے
میں کامیاب بھی ہوگیا تھا......اس کے علاوہ وہ یہاں تم سے پہلے پہنچ گیا۔''

عبدالغفور نے حیرت زدہ ہوکر نظمہ کو دیکھا۔ ''تب یقیناً سعدی کی بات صحیح معلوم دیتی
ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ راز کسی نے ابراہیم بلادی سے معلوم کرلیا ہو۔''

''کچھ بھی ہے......شکر ہے، نقشہ چوری ہونے سے بچ گیا۔'' نظمہ نے کہا۔ ''اسے
ہمیں دے دو سعدی! کیونکہ تمہارے لئے وہ بیکار ہے۔ ہم اگر خزانہ حاصل کرنے میں
کامیاب ہوگئے تو اس سے اسلحہ خرید کر اپنا ملک آزاد کرالیں گے۔''

''مجھے تو یہ سب کچھ ایک سہانا خواب لگتا ہے۔'' سعدی نے ہنس کر کہا۔

''ابراہیم بلادی خواب دیکھنے کا عادی نہیں ہے۔'' نظمہ نے کہا۔

''ہم وقت ضائع کررہے ہیں......'' عبدالغفور نے غراتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب
تفصیلات اس کو بتانے کی ضرورت نہیں......نقشہ ہمارے حوالے کردو۔'' اس نے سعدی
سے کہا۔

"تم بار بار دھمکی دے کر وقت خود ضائع کر رہے ہو۔" سعدی نے جواب دیا۔ "نقشہ یہاں نہیں ہے۔"

"تو پھر جہاں ہے ہمیں وہیں لے چلو۔"

"اتنی آسانی سے نہیں برادر!" سعدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر واقعی خزانہ مل جاتا ہے تو اس کا نصف حصہ میرا ہوگا۔" عبدالغفور کا ہاتھ پھرتی سے جیب کی طرف گیا۔ "اگر تم نے اس بار خنجر نکالا تو نقشہ کبھی نہ مل سکے گا۔"

نظمہ نے غصے سے عبدالغفور کو دیکھا۔ "میں تم کو آخری بار خبردار کر رہی ہوں عبدالغفور...... باز آ جاؤ، ورنہ پچھتاؤ گے۔" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ "سنو سعدی! پروفیسر ابراہیم نے پہلے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا۔ اگر تم اصرار کرو تو میں تم سے مناسب حصے کا وعدہ کر لوں...... لیکن تم کو نقشہ لے کر ابراہیم کے پاس تہران آنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے نظمہ...... حصے کا فیصلہ بھی ابراہیم بلادی سے ہی کر لیا جائے گا۔" سعدی نے کہا۔ "جہاں تک نقشے کا تعلق ہے وہ پہلے ہی تہران روانہ کیا جا چکا ہے۔"

دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے عازم شفیقی نے ایئر فون اتار کر رکھ دیئے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ برسوں کی آرزو بر آنے کی امیدیں پھر اس کے دل میں روشن ہو گئی تھیں۔ اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگائی۔ کیونکہ اس سے بہتر موقع زندگی میں پھر کبھی نہ آ سکتا تھا۔

چند منٹ کے بعد سعدی کے کمرے میں فون کی گھنٹی اچانک بجی۔ سعدی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"کچھ بولنا نہیں......" ایک گھٹی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "تمہارے کمرے میں خفیہ آلات نصب ہیں جس کے ذریعے تمہاری ساری گفتگو پولیس ریکارڈ کر رہی ہے۔ تم پولیس کے جال میں پھنس چکے ہو...... ہوٹل کا ہر سمت سے محاصرہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن تم عقبی گلی سے فرار ہو سکتے ہو بشرطیکہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ باہر نہ نکلنا اور اپنی لانچ کا رخ نہ کرنا۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سعدی چند لمحے فون کو گھورتا رہا۔ نظمہ اور عبدالغفور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پہلے ہی چوکنا ہو گئے تھے۔

"ایک دوست کا فون تھا...... آج رات ڈنر کی دعوت کی یاد دہانی کرا رہا تھا۔" سعدی نے مطمئن لہجے میں کہا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کھڑکی کے پاس جا کر اس کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ گلی بالکل تاریک تھی۔ کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی باریک روشنی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور گلی میں وہ دونوں آدمی بھی نظر نہیں آ رہے تھے جنہیں سعدی نے پہلے دیکھا تھا۔ سعدی نے اشارے سے نظمہ اور عبدالغفور کو پاس بلایا، کھڑکی سے نکل کر بالکونی میں پہنچا اور گلی میں جانے والے پائپ کو پکڑ کر آزمایا اور پھر پھسلتا ہوا نیچے اترتا چلا گیا۔

زمین پر پہنچتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا...... لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ذرا دیر میں نظمہ اور عبدالغفور بھی اسی راستے سے نیچے پہنچ گئے۔ سعدی پھرتی کے ساتھ آگے بڑھا لیکن کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے جھک کر دیکھا، زمین پر پڑا ہوا آدمی بے حس و حرکت تھا۔ قریب ہی ایک دوسرا آدمی بھی پڑا سو رہا تھا۔ دونوں مر چکے تھے۔ ان کی گردنیں بڑی مہارت سے کسی نے کاٹ دی تھیں۔ سعدی حیران تھا کہ یہ نامعلوم ہمدرد کون ہے جس نے ان کی فرار کی راہ ہموار کر دی۔ لیکن یہ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ وہ تاریکی میں آگے بڑھنے لگے۔

ان کے جاتے ہی عازم شفیقی مسکراتا ہوا تاریکی سے باہر نکلا اور ہوٹل کی سمت بڑھا۔ اب اسے ان کی گرفتاری کا ڈرامہ رچانا تھا۔

ذرا دیر بعد ہی ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا...... لیکن عازم کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ اس نے سعدی اور دونوں کرد چھاپہ ماروں کی گرفتاری کے سلسلے میں تمام احکامات صادر کر دیئے تھے لیکن اسے معلوم تھا کہ چالاک میجر منور حسین جلد ہی یہ اندازہ کرے گا کہ سعدی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری میں کس نے غفلت برتی اور سیکرٹ پولیس کے دو جوانوں کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔

لیکن اب عازم شفیقی کو اس بات کی پرواہ نہ تھی...... کیونکہ اس سے پہلے وہ عراق کی سرحد پار کر چکا ہوگا۔

سعدی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لئے جال بچھانے کے بعد عازم شفیقی اپنے دفتر سے نکلا اور وارتھن کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

اسے یقین تھا کہ وارثن واحد شخص تھا جو اسے عراق سے فرار ہونے میں فوری مدد د
سکتا تھا۔ اس نے دانستہ سعدی کے فرار کی اطلاع دینے اور گرفتاری کے احکامات صا
کرنے میں اتنی دیر کی تھی اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس مدت میں سعدی فر
ہونے میں کامیاب ہو چکا ہو۔

☆......☆

تقریباً نصف میل کے فاصلے پر سرکنڈوں کا وہ گھنا جنگل تھا جس کی بلندی آسمان کو
چھوتی لگ رہی تھی۔ بصرہ سے تقریباً 70 میل دور دلدلی پانی کا جو سلسلہ شروع ہوتا تھا وہ
ایران کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ اس دلدلی پانی میں اُگنے والے سرکنڈوں کی ایک دیوار سی
تھی جو حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ سرکنڈوں کی لمبائی اس علاقے میں چھ سے پندرہ فٹ
تک بلند تھی اور یہ اتنے گھنے تھے کہ ان کے درمیان کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ سعدی نے
آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو کوسنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اس کی روشنی میں دور تک صاف نظر آ
رہا تھا۔ اس کی کار پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

انہوں نے بصرہ کے مضافات سے بڑی عجلت میں یہ تقریباً نئی بیوک حاصل کی تھی۔
لیکن بیوک شہر کی سڑکوں پر سواری کے لئے بنائی گئی تھی اور وہ جس سڑک پر سفر کر رہے تھے
وہ ناہموار تھی جس میں جگہ جگہ گڑھے تھے۔ سعدی نے تین میل پہلے تگرس روڈ سے کار کو اس
کچی سڑک پر گھما لیا تھا اور بیوک اس طرح اچھل رہی تھی کہ انجر پنجر ڈھیلے ہوئے جا رہے
تھے۔ پھر بھی اس نے پورا ایکسیلیٹر دبا رکھا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عراقی آرمی کی جیپ
نے تعاقب نہیں چھوڑا تھا اور اسی سڑک پر جیپ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اسے یہ
بھی معلوم تھا کہ قریب آتے ہی جیپ سے اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا
اس لئے سعدی نے دھچکوں کے باوجود پورا ایکسیلیٹر دبائے رکھا۔

سرکنڈوں کا سلسلہ بمشکل سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ اچانک بیوک پوری رفتار سے
بائیں جانب ایک ڈھلوان پر پھسلنے لگی جسے سعدی دیکھ نہ سکا تھا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود
وہ کار کو سنبھالنے میں ناکام رہا اور دوسرے ہی لمحے وہ کھائی نما ڈھلوان کی دیوار سے جا
ٹکرائی۔ کار کا انجن ایک دو مرتبہ کھانس کر بند ہو گیا۔ سعدی نے پھرتی کے ساتھ لائٹ
بجھائی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ سعدی نے دروازہ کھولا

اور کود کر باہر نکلا اور پوری رفتار سے سرکنڈوں کی طرف دوڑنے لگا۔ نظمہ اور عبدالغفور نے بلا
تامل اس کی تقلید کی۔ ان کے پاس عبدالغفور کے خنجر کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہ تھا جبکہ
تعاقب میں آنے والے سات عراقی فوجیوں کے پاس آٹومیٹک ہتھیار تھے۔ ان کو اب
دلدلی پانی میں پھیلے ہوئے سرکنڈوں کے جنگل کی آڑ میں سلامتی کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

لیکن ابھی وہ گھنے سرکنڈوں کی بلند دیوار کے قریب پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے فائرنگ کی
آواز سے فضا گونج اٹھی۔ سعدی نے نظمہ کا بازو پکڑا اور دلدلی پانی میں چھلانگ لگا دی اور
دونوں ہاتھوں سے سرکنڈوں کی تیز پتیوں سے اپنا چہرہ بچاتے ہوئے آگے بڑھے۔ گھٹنے
گھٹنے پانی کے نیچے کیچڑ ان کے پیر پکڑ رہی تھی۔ عبدالغفور ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ سرکنڈے
اتنے گھنے تھے کہ ان کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن جان بچانے
کے لئے تیزی سے آگے بڑھنا ضروری تھا۔ وہ ابھی سرکنڈوں کے درمیان سے گزرتے
ہوئے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ سعدی نے اور زیادہ تیزی
سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ نظمہ اور عبدالغفور اس کے پیچھے تھے۔ گولیاں پانی میں گر کر
چھپاکے کی آواز پیدا کر رہی تھیں لیکن وہ سر جھکائے تاریکی میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔
گہرائی میں پہنچنے کے بعد کیچڑ آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے پانی میں چلنا
قدرے آسان ہو گیا تھا اور پھر اچانک پیچھے سے ہونے والی فائرنگ بند ہو گئی۔ اب فوجی
گولیاں ضائع کئے بغیر ان کے تعاقب میں آگے بڑھ رہے تھے۔

سعدی نے رخ تبدیل کر دیا۔ جلد ہی وہ ایک کھلے ہوئے حصے میں پہنچ گئے جہاں پانی
چاند کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ سعدی نے ستاروں کی طرف دیکھ کر سمت کا اندازہ کیا اور
پھر دوسری جانب بلند سرکنڈوں کے سلسلے میں گھس گیا۔ انہوں نے جوتے اور موزے اتار
کر تسموں کے ذریعے کمر سے باندھ لئے جس کی بناء پر ان کی رفتار کچھ تیز ہو گئی۔ سعدی کو
معلوم تھا کہ خطرہ صرف تعاقب میں آنے والے سات فوجیوں سے نہیں تھا۔ اب تک
وائرلیس کے ذریعے سرحد کی تمام چوکیوں کو خبردار کیا جا چکا ہو گا جہاں متعین پولیس اور فوج
کے پاس جدید ترین ہتھیار اور موٹر بوٹس تھیں۔ اس لئے اس نے نظمہ اور عبدالعغفور کو
ہدایت کی کہ وہ عقب کی سمت بھی نگاہ رکھیں۔ وہ تاریکی میں نگاہ گاڑھ کر دیکھتا ہوا احتیاط
سے آگے بڑھتا رہا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ کم از کم گھٹنے سے اوپر پانی میں چلے تاکہ دلدلی

کیچڑ میں پیر نہ پھنس سکیں۔ لیکن اب پانی میں جزیروں کی طرح دلدلی ٹیلے بھی ملنے لگے تھے۔ ان ٹیلوں پر خطرناک قسم کے جنگلی سور پائے جاتے تھے جو اتنی سرعت سے حملہ کرتے تھے کہ بچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ سعدی اس نئے خطرے سے بھی چوکنا ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ ایسے ہی ایک ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کے آگے بڑھ رہے تھے کہ سعدی نے سرکنڈوں کے جھنڈ سے ایک فوجی کو باہر نکلتے دیکھا جس نے پھرتی کے ساتھ روسی ساخت کی آٹومیٹک رائفل بلند کی...... سعدی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو جائے۔ ان کے درمیان بمشکل دس فٹ کا فاصلہ تھا اور رائفل کی نال کا رخ سعدی کے سینے کی طرف تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ تطمہ اور عبدالغفور اب تک آڑ میں تھے۔ فوجی اسے زد میں لئے ہوئے پانی سے اندر آگے بڑھنے لگا۔ اور پھر جب صرف دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے شاید اپنے ساتھیوں کو آواز دینے کے لئے گردن گھمائی تھی لیکن اسی لمحے عبدالغفور نے آڑ سے نکل کر فوجی پر جست لگائی۔ اس نے پھرتی کے ساتھ رائفل گھما کر فائر کیا لیکن اس سے پہلے عبدالغفور کا تیز دھار خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔ ایک دلخراش چیخ کے ساتھ رائفل فوجی کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گری۔ سعدی نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور نال الٹی کر کے جھٹکا دیا تاکہ پانی نکل سکے۔ عبدالغفور نے خنجر فوجی کے سینے سے نکالا اور آگے بڑھا۔

اسی لمحے دائیں جانب کے گھنے جھنڈ سے آٹومیٹک رائفل کی باڑھ آئی۔ ایک گولی عبدالغفور کے بائیں کولہے پر لگی اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ سعدی نے پھرتی کے ساتھ رائفل بلند کی اور نیم دائرے میں گولیوں کی باڑھ ماری۔ گھنے سرکنڈوں سے ایک سپاہی نکل کر پانی میں گرا۔ تطمہ نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کی رائفل جھپٹ لی اور سعدی کی سمت واپس لوٹتے ہوئے اس طرف کئی برسٹ فائر کئے جہاں سے ان پر گولی چلائی گئی تھی...... لیکن اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ عبدالغفور نے دانت بھینچ رکھے تھے لیکن اس کے دائیں ہاتھ میں خنجر اور بائیں ہاتھ میں فوجی سے چھینی ہوئی رائفل اسی طرح موجود تھی۔

"آگے بڑھتے رہو......" عبدالغفور نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اگر میں ساتھ نہ دے سکا تو کہیں چھپ جاؤں گا...... اور بعد میں تم سے آملوں گا۔"

گولیوں کی آواز ان کی موجودگی کا راز افشا کر چکی تھی...... انہیں احساس تھا کہ تعاقب

کرنے والوں کا دائرہ ہر لمحے تنگ ہوتا جائے گا۔ اس لئے انہوں نے عبدالغفور کے مشورے پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔

۞......۞

آدھ گھنٹے بعد سعدی کو یقین ہو گیا کہ کم از کم جیپ میں آنے والے فوجیوں نے تعاقب ختم کر دیا ہے۔ ان میں سے دو تو ختم ہو چکے تھے، بقیہ پانچ شاید واپس ہو گئے تھے۔ لیکن سرحدی چوکیوں سے اب بھی خطرہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سرحد کو مکمل طور پر بند کیا جا چکا ہوگا۔ لیکن اگر قسمت نے ساتھ دیا تو وہ سرکنڈوں کے اس گھنے دلدلی جنگل کی آڑ لے کر اب بھی ایران کی سرحد میں داخل ہو سکتے تھے۔ سعدی اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ پیشہ ور اسمگلر کا یہ ایک عام راستہ تھا اور ان میں سے بعض کے ساتھ سعدی پہلے بھی ان راستوں سے سفر کر چکا تھا۔ ان اسمگلروں کا تعلق اس علاقے میں رہنے والی ایک قدیم مہدان قوم سے تھا جو شہری آبادی سے الگ اس دلدلی علاقے میں جگہ جگہ واقع خشک جزیروں پر آباد تھی۔ ان کا پیشہ ہی اسمگلنگ اور شکار تھا۔ یہ بڑے لالچی لوگ تھے۔ ان میں سے ایک ایسا تھا جس پر سعدی کسی قدر بھروسہ کر سکتا تھا۔

حمزہ ایک دراز قد اور مضبوط جسم کا ادھیڑ عمر اسمگلر تھا جس کا تعلق مہدان قبیلے سے تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے مکان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ حمزہ کا مکان سرکنڈوں کے جنگل کے درمیان ایک خشک جزیرے پر واقع چھوٹی سی آبادی کے کنارے تھا۔ مٹی اور سرکنڈوں کا بنا ہوا یہ مکان اس وقت انہیں بڑا غنیمت محسوس ہوا۔ گوبر کے کنڈوں آگ سے انہوں نے اپنے کپڑے خشک کئے۔ حمزہ نے اپنی تجربہ کار انگلیوں سے ٹٹول کر عبدالغفور کا زخم صاف کیا اور اس سے گولی نکال کر مرہم پٹی کر دی۔ اس کی بیوی نے گرم گرم دودھ اور کھانے سے ان کی تواضع کی۔ وہ آگ کی حدت میں بیٹھے ہوئے قہوہ پی رہے تھے۔ حمزہ کے تین جوان لڑکے قریب ہی بیٹھے سعدی اور اس کے ساتھیوں کو گھور رہے تھے کہ عبدالغفور کو ہوش آ گیا۔ اس نے حیرت سے سب کو دیکھا۔

"اوہ...... تو ہم واقعی بچ گئے۔" اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "لیکن تم نے مجھے بچانے کی کوشش کر کے احمقانہ غلطی کی تھی...... اس طرح تم دونوں بھی فوجیوں کا نشانہ بن سکتے

"ہم تم کو بے ہوشی کے عالم میں کیسے چھوڑ دیتے؟" سعدی نے جواب دیا۔

"ہمدردی کا شکریہ...... لیکن وہ نقشہ میری جان سے زیادہ قیمتی ہے...... تمہارے بغیر وہ ہمیں کبھی نہ مل سکتا۔" عبدالغفور نے کہا۔ "ویسے تم نے میری جان بچا کر احسان کیا ہے۔"

"تم نے بھی میری جان بچانے میں ہی زخم کھایا تھا۔" سعدی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "بس اب باتیں نہ کرو۔ تم کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"چلو...... حساب برابر ہوگیا......" عبدالغفور نے نحیف آواز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس پر ایک بار پھر غفلت طاری ہوگئی تھی۔

حمزہ جو اب تک خاموش بیٹھا تھا فکر مند لہجے میں بولا۔ "اس کا خون بہت بہہ گیا ہے۔ اور اسے ہسپتال جلد از جلد لے جانا چاہئے۔ لیکن میں اس خطرناک علاقے میں رات کو سفر کرنے سے ڈرتا ہوں۔"

"میرے پاس بیس عراقی دینار نقد موجود ہیں جو پچاس ڈالر کے برابر ہوتے ہیں۔" سعدی نے کہا۔ "یہ تمہیں ابھی دے دوں گا اور ایران کی سرحد میں پہنچ کر میں بنک سے رقم لے کر مزید پچاس ڈالر تم کو ادا کر دوں گا۔"

یہ خاصی بڑی رقم تھی لیکن حمزہ پس و پیش میں نظر آتا تھا۔ اس کی للچائی ہوئی نظریں بار بار سعدی کی آٹومیٹک رائفل پر پڑ رہی تھیں۔

"سرحد پار کرنے کے بعد میری اور نظمہ کی رائفل تم کو بونس کے طور پر مل جائے گی۔" سعدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے...... مجھے پیشکش منظور ہے۔" حمزہ نے مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

✿......✿

پٹرول بوٹ میں عراقی فوج کے بارہ مسلح جوان سوار تھے۔ ان میں سے دو نے بوٹ پر لگی ہوئی ایک بھاری مشین گن سنبھال رکھی تھی اور دوسری جانب ایک فوجی وہ طاقتور سرچ لائٹ سنبھالے ہوئے تھا جو بار بار ہر سمت تیز روشنی پھینک کر جائزہ لے رہی تھی۔ پٹرول بوٹ بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور اس وقت ایک ایسی تنگ گلی سے گزر رہی تھی جس کے دونوں جانب بلند سرکنڈوں کی ایک دیوار کھڑی ہوئی تھی۔ اس گلی نما راستے میں

پانی کی گہرائی بوٹ کے لئے کافی تھی۔ لیکن وہ کھلے ہوئے راستے کو چھوڑ کر سرکنڈوں کے درمیان نہیں گھس سکتے تھے کیونکہ یہ اتنے گھنے تھے کہ بوٹ کے پھنس جانے کا خطرہ تھا۔

سرچ لائٹ میں انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ اس لئے وہ آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ یہ تنگ راستہ کھلے پانی میں پہنچ گیا جو جھیل کی طرح دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پانی کے بیچ میں پہنچ کر بوٹ کی سرچ لائٹ نے ہر سمت روشنی پھینک کر دیر تک جائزہ لیا لیکن حد نگاہ تک پھیلے ہوئے سرکنڈوں کے جنگل میں انہیں کچھ نظر نہ آسکا۔ مایوس ہو کر بوٹ آگے بڑھی اور جنوب کی سمت چلی گئی۔

جب بوٹ کے انجن کی آواز آنی بند ہوگئی تو سرکنڈوں کے درمیان سے ایک پتلی سی لانبی کشتی کی نوک باہر نکلی۔ اب تک یہ کشتی مٹی کے دو ٹیلوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔ یہ کشتی اسمگلنگ کے لئے خاص طور پر بنائی گئی تھی اور حمزہ کو ایسے مواقع پر چھپنے کی مخصوص پناہ گاہوں کا بخوبی علم تھا۔ کشتی اتنی نیچی تھی کہ اس کی دیواریں پانی کی سطح سے صرف چند انچ اونچی تھی۔ اور اس وقت کشتی میں آٹھ افراد سوار تھے۔ حمزہ کشتی کے اگلے حصے میں دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ اور تاریکی میں دیکھ کر سرگوشیوں میں یہ ہدایات دے رہا تھا۔ سعدی اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا اور اس نے اپنی رائفل سنبھال رکھی تھی۔ اس کے بعد حمزہ کے دو جوان بیٹے تھے جو لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے کشتی کو کھیتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہے تھے۔ پانی کی سطح بمشکل دو فٹ گہری تھی اور اس کے نیچے صرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ ان کے پیچھے حمزہ کے دو اور بیٹے پتوار لئے بیٹھے تھے تاکہ جیسے ہی گہرا پانی آئے، وہ کشتی کو تیزی سے کھینا شروع کر دیں۔ آخر میں نظمہ اپنی آٹومیٹک رائفل سنبھالے بالکل تیار بیٹھی تھی اور اس کے پیروں کے پاس کشتی کی تہہ میں عبدالغفور لیٹا ہوا تھا۔

سرکنڈوں سے نکلتے ہی پانی گہرا ہوگیا اور انہوں نے تیزی سے کشتی کو آگے بڑھایا۔ وہ اتنی احتیاط سے کشتی چلا رہے تھے کہ سناٹے کے باوجود ذرا بھی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کھلے ہوئے پانی کو پار کیا اور ایک بار پھر گھنے سرکنڈوں میں داخل ہوگئے۔ دو گھنٹے کے طویل سفر کے بعد پہلی بار حمزہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سعدی کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"ہم نے سرحد پار کر لی۔" اس نے کہا۔ "اب تم ایران کی سرزمین پر سفر کر رہے ہو۔"

سعدی نے جواب دینے کی بجائے اطمینان کی گہری سانس لی اور رائفل کی نال
قدرے نیچی کر لی۔ عراق سے اس طرح بچ کر نکل آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیکن اب
اسے معلوم تھا وہ کبھی بصرہ نہیں جا سکے گا اور اس کی زندگی کا تمام سرمایہ...... اس کی
خوبصورت لانچ اب اسے کبھی نہ مل سکے گی۔ اور اگر یہ نقشہ جھوٹا ثابت ہوا تو اسے زندگی
بسر کرنے کے لئے نئے سرے سے محنت کرنا ہو گی۔

۞......۞

سونے کی زنجیر میں لگا ہوا زمرد ابراہیم بلادی کی ننھی انگلیوں کے درمیان لٹک رہا تھا
اس کے بچوں جتنے پیروں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور وہ مریضوں کی وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا غور
سے سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

''تم کو ہیروں کی کچھ پہچان ہے سعدی؟'' اس نے زنجیر میں لگا ہوا زمرد سعدی کی
طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی جوہری اس کے کم از کم دو ہزار امریکن ڈالر تم کو
آسانی سے دے دے گا۔ ممکن ہے کچھ زیادہ بھی دے دے۔ یہ میرے مرحوم باپ کی
یادگار ہے اور مجھے بے حد عزیز ہے۔ لیکن...... تمہیں میں یہ تحفتاً دے رہا ہوں۔ اسے لے لو
اور نقشہ مجھے دے دو۔''

وہ ابراہیم بلادی کے خوبصورت مضافاتی مکان کے ٹیرس پر تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ سعدی
نے کچھ فاصلے پر اخروٹ کے درخت کی سمت دیکھا۔ ایک ڈھلکتے ہوئے رنگ کا جسیم اور
مضبوط شخص درخت کے تنے سے لگا ہوا اب تک اسی انداز میں کھڑا تھا۔ نیچے ایک دلفریب
منظر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں بہتے ہوئے دریائے ہجرود اور کارج کا پانی چمک رہا
تھا۔ شمال میں کوہ دماوند کا سلسلہ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا جس کی آتش فشاں چوٹیاں برف
سے ڈھکی ہوئی تھیں لیکن اخروٹ کے تنے کے سہارے کھڑا ہوا شخص ہر چیز سے بے پروا
مستعد کھڑا تھا۔

سعدی نے ابراہیم بلادی کی سمت دیکھا۔ ''یہ ناکافی ہے...... اتنی رقم میں تو میں نئی لانچ
بھی نہ خرید سکوں گا۔'' سعدی نے کہا۔ ''میں یہاں تم سے یہ معمولی رقم لینے کے لئے نہیں
خزانے میں اپنا حصہ طے کرنے آیا ہوں۔''

''پلیز......'' ابراہیم بلادی نے نرم لہجے میں زور دیا۔ ''اسے لے لو...... ضد کا انجام

تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ میں نے دانستہ نظمہ کی عدم موجودگی میں تم کو بلایا ہے۔ میں نہیں
چاہتا کہ وہ ہماری گفتگو سنے۔ کیونکہ میرا خیال ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تم کو یہاں
لانے والے دونوں کرد جوان بے حد جذباتی ہیں۔ ضرورت نے ان کو بڑا بے رحم بنا دیا ہے
اور تم کو نقصان پہنچانے میں وہ پس و پیش نہ کریں گے۔''

''کیا تم اس کی اجازت دو گے؟'' سعدی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہم اپنی سرزمین کو عراق کی حکومت سے آزاد کرانے کے لئے لڑ رہے ہیں۔'' ابراہیم
نے جواب دیا۔ ''ہمیں اسلحہ کے لئے دولت چاہئے۔ اس لئے ہم نے رحم کھانا چھوڑ دیا
ہے۔''

''اگر میں تمہیں اس چٹان سے اٹھا کر نہ لاتا تو اس وقت تم کہاں ہوتے؟''

''اگر میری حیات باقی نہ ہوتی تو تم میری مدد کرتے۔'' ابراہیم نے کہا۔ ''تم بہت سخت
جان اور بہادر ہو سعدی! لیکن اذیت تم سے زیادہ مضبوط لوگوں کی زبان بھی کھلوا دیتی
ہے۔''

''کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اذیت برداشت کرتے کرتے مر جاتے ہیں لیکن زبان
نہیں کھولتے۔'' سعدی نے کہا۔ ''اور اگر میں مر گیا تو تم کو وہ نقشہ کبھی نہ مل سکے گا۔''

ابراہیم چند لمحے خاموش رہا۔

''نہیں...... میں یہ خطرہ مول نہیں لوں گا۔ کیونکہ نقشے کی تلاش میں دوبارہ جانے کی
ہمت اب مجھ میں نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ یہ زمرد لے
لو...... ممکن ہے نقشہ بے سود ثابت ہو اور ہم جس خزانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں وہ ہمیں نہ
ملے۔''

''تم جیسا آدمی اتنے غلط اندازے نہیں لگاتا پروفیسر...... بہتر ہے کہ یہ بحث چھوڑ
دو...... میں ایک تہائی سے کم حصے پر راضی نہیں ہو سکتا۔''

ابراہیم نے زمرد کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا جیسے اسے واپس پا کر بہت خوش ہوا اور بولا۔
''میرا اندازہ ٹھیک تھا کہ تم کبھی راضی نہ ہو گے۔ لیکن اب بھی موقع ہے کہ نقد کی بات
کر لو...... ممکن ہے یہ خزانہ صرف ایک کہانی ثابت ہو۔''

''پروفیسر...... میں بچہ نہیں ہوں۔ اس لئے اس سلسلے میں مزید گفتگو بیکار ہو گی۔''

سعدی نے کہا۔ ''لیکن تم اگر مناسب سمجھو تو یہ ضرور بتا دو کہ خزانے کی اصل حقیقت کیا ہے۔''

ابراہیم چند لمحے سوچتا رہا۔ ''تم نے یقیناً پروفیسر حارث سلیمی سے حسن بن صباح کی داستان سن لی ہو گی۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''قدیم دستاویزات کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس وقت ہلاکو خان نے قلعہ الموت کا محاصرہ کیا تو وہاں سے کوئی زندہ بچ کر نہ نکل سکا تھا۔ لیکن چند فدائین ایک خفیہ راستے سے حسن بن صباح کا تابوت نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس وقت تابوت میں صرف حسن بن صباح کے جسد خاکی کی ہڈیاں ہی نہ تھیں بلکہ بیش قیمت اور نایاب ہیرے اور جواہرات بھی بھرے ہوئے تھے۔ اس وقت شام اور مصر میں بھی فدائین کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ تابوت لے جانے والے فدائین ایک بادبانی کشتی کے ذریعے روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ تابوت لے کر مصر جائیں گے۔ وہ دریائے گلرس سے گزر کر خلیج فارس تک تو پہنچ گئے لیکن عرب کے جنوبی علاقے کے پاس ایک طوفان میں کشتی تباہ ہو گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح تابوت کو کنارے تک لانے میں کامیاب ہو گئے اور یہاں سے پیدل روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح بحر احمر تک پہنچ جائیں۔ لیکن درمیان میں اب الخالی کا وسیع اور ہلاکت خیز ریگستان پڑتا ہے۔ راستے میں وہ ایک ایک کر کے ہلاک ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تابوت کو اٹھا کر لے جانے کے لئے ان کی مناسب تعداد باقی نہ رہی۔ اس لئے ایک قریبی پہاڑ میں انہوں نے محفوظ جگہ تلاش کرنا شروع کی۔ اتفاق سے پہاڑ کے اندر انہیں کوئی قدرتی درہ مل گیا۔ انہوں نے تابوت کو اس میں چھپا دیا اور پہاڑ کے باہر ایک چٹان پر اس مقام کی نشاندہی کے لئے ایک نقشہ کندہ کر دیا تا کہ اگر وہ سب ہلاک ہو جائیں تو کبھی کوئی فدائی اس کی مدد سے تابوت تک پہنچ جائے۔ نقشے میں خفیہ علامات کے ذریعے اس مقام کی نشاندہی کی گئی تھی اور یہ خفیہ علامات ایسی ہیں جن کو صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو قلعہ الموت کے سربستہ رازوں سے بخوبی واقف ہو۔''

ابراہیم کا چہرہ درد سے زرد پڑ رہا تھا۔ اس نے قریب رکھی شیشی سے ایک زرد رنگ کی گولی نکال کر کھائی۔

سعدی نے سگریٹ جلا کر گہرا کش لیا اور انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد ابراہیم کی حالت

بحال ہوگئی۔

''ان میں سے صرف ایک فدائی ساحلی علاقے تک پہنچ سکا تھا اور جب دوسرے فدائین اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو وہ قریب المرگ ہو چکا تھا لیکن اس نے تمام تفصیلات ان لوگوں کو بتا دیں۔ اس کے بعد متعدد بار فدائین کی ٹولیاں مقبرے کی تلاش میں روانہ ہوئیں لیکن اس جہنمی ریگستان میں کھو گئیں یا اس جگہ کو تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔ یہاں تک کہ صدیاں گزر گئیں اور لوگ فرقہ باطنیہ اور اس خزانے کو بھول گئے۔ میں اس موضوع پر عرصہ سے ریسرچ کر رہا تھا۔ اچانک مجھے کچھ قدیم اور خستہ حال دستاویزات ہاتھ لگیں۔ یہ مختلف خطوط اور یادداشتوں پر مشتمل تھیں اور ان سے مجھے اس گمشدہ تابوت کا سراغ ملا۔ لیکن یہ زیادہ واضح نہیں تھا۔ پھر بھی میں اس کی مدد سے اب الخالی کی اس پہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اس نقشے کو کاغذ پر اتارنے کے بعد چٹان پر کندہ نشانات مٹا دیئے...... اس لئے اب صرف ایک نقشہ موجود ہے...... جو تمہارے قبضے میں ہے۔''

''لیکن تم نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہوگا۔'' سعدی نے کہا۔ ''تم یادداشت کی مدد سے اسے دوبارہ بنا سکتے ہو۔''

''افسوس کہ یہ ممکن نہیں۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت بے حد خستہ حال تھا۔ اور پھر واپسی کے جان لیوا سفر اور طوفان میں کشتی کی تباہی کے بعد جو تھوڑا بہت یاد تھا وہ بھی بھول گیا۔'' ابراہیم بلادی نے مایوس لہجے میں کہا۔ ''اس کے علاوہ نقشہ اس وقت تک بالکل بے معنی ہے جب تک اس میں دی ہوئی علامات کی تشریح قلعہ الموت جا کر نہ کر لی جائے۔ اس میں جو نشانات اور جو ہدایات دی گئی ہیں وہ بے حد خفیہ ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے قلعہ الموت میں واقع حسن بن صباح کی جنت کے کھنڈرات میں جانا ضروری ہے جو اب بھی موجود ہیں اور وہاں کے پتھروں پر کچھ ایسے نشانات کندہ ہیں جو رہنمائی کریں گے۔ پروفیسر حارث سلیمی نے نقشے کی جو تشریح کی تھی، وہ تم جانتے ہو لیکن قلعہ الموت جائے بغیر وہ نامکمل ہے۔ پھر بھی میں تم کو سمجھاتا ہوں۔''

اس نے بعض نشانات کی تشریح کی جو پروفیسر حارث کی تشریح کے عین مطابق تھی لیکن اس سے زیادہ ابراہیم کو یاد نہ تھا۔

"سنو ابراہیم بلادی! میں نہیں چاہتا کہ تم یہ باتیں میرے علاوہ اور کسی کو بتاؤ۔" سعدی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تمہارے درمیان کوئی جاسوس موجود ہے...... ورنہ نظمہ سے پہلے وہ عرب جوان نقشے کی تلاش میں میری لانچ پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"تم شاید اتفاق نہ کرو...... لیکن اس کے علاوہ اب کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ نقشہ میں اپنی تحویل میں ہی رکھوں گا۔" سعدی نے کہا۔ "چار دن بعد چودھویں کا چاند ہوگا۔ میں اس وقت تنہا قلعہ الموت جا کر اس نقشے کی تشریح کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر کامیاب ہو گیا تو بھی اس کو کسی پر ظاہر نہ کروں گا۔ تم پر بھی نہیں...... میری سلامتی کی یہی ضمانت ہو سکتی ہے۔"

ابراہیم نے پس و پیش کے عالم میں چند منٹ غور کیا، پھر آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے...... لیکن مجھے بھی اپنی سلامتی کی ضمانت چاہئے۔ نظمہ تمہارے ساتھ اب الخالی جائے گی۔ میرا خیال ہے کم از کم اس کو ساتھ لے جانے پر تم کو اعتراض نہ ہوگا اور تم اس کو ریگستان میں چھوڑ کر خزانہ لے کر فرار نہیں ہو گے۔"

سعدی نے انکار کرنا چاہا لیکن ابراہیم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "اس کے بغیر مجھے تمہاری تجویز ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ اس لئے بحث بے کار ہے۔ اگر تم نقشے کی تشریح کرنے میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو میری مدد کے بغیر ریگستان کی اس پہاڑی تک کبھی نہ پہنچ سکو گے۔ چٹان پر جہاں وہ نقشہ کندہ تھا اور راستے کی نشانیاں ہیں صرف نظمہ کو بتاؤں گا۔ یا پھر کرد مجاہدین میں اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کو۔"

سعدی چند لمحے سوچتا رہا...... "نہیں ابراہیم...... تم نظمہ کے علاوہ کسی کو یہ راز نہیں بتاؤ گے۔ اور اگر کسی کو ساتھ بھیجنا ضروری ہے تو پھر صرف عبدالغفور ہمارے ساتھ جائے گا بشرطیکہ وہ اب سفر کے قابل ہو چکا ہو۔"

"چلو...... مجھے یہ بھی منظور ہے۔" ابراہیم نے جواب دیا۔ "لیکن صرف تین افراد کا اس ریگستانی علاقے میں سفر کرنا مناسب نہیں نظر آتا۔ صرف راستے کی ہلاکت خیز صعوبتیں ہی خطرہ نہیں ہیں، بدو قبائل کی لوٹ مار اور غارت گری کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ ہم پر دو مرتبہ حملہ ہوا اور ہمارا ایک آدمی ان کے ہاتھوں ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے اگر تم چند منتخب اور

قابل اعتماد افراد کو بھی ساتھ لے جاؤ تو بہتر ہوگا۔"

"میں یقیناً چند ایسے افراد بھی ساتھ لے جاؤں گا۔" سعدی نے کہا۔ "لیکن میں ان کو یہاں نہیں...... عمان پہنچ کر خود منتخب کروں گا۔ میں وہاں کے بہت سے با اعتماد افراد سے واقف ہوں۔"

☆......☆

سعدی نے دریچے کے پٹ کھولے تو بازار کا شور و غل کانوں سے ٹکرایا۔ نیچے ایک تنگ سڑک تھی جس پر آدمیوں اور ٹریفک کا ایک ہجوم تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا نظمہ اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ ابراہیم کے مشورے پر اس نے نظمہ کے اس مختصر سے فلیٹ میں قیام کیا تھا جو سیاہ بازار کے گنجان علاقے میں تھا۔ سعدی نے فکرمند نظروں سے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھا۔ آج سے تین دن بعد چاند کی چودہ تاریخ تھی۔ اگر مطلع ابر آلود رہا تو قلعہ الموت جانے کا مقصد تشنہ تکمیل رہ جائے گا۔ وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا کھڑا تھا...... ایک نامعلوم قاتل نے اس کی لانچ پر پہنچ کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی...... بس اس کے بعد ایک نامعلوم آواز نے فون پر خبردار کر کے عراقی پولیس کے جال سے بچایا تھا۔ کیا یہ دونوں پراسرار واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑی تھے؟ تہران میں نظمہ کے گھر آتے ہوئے اس نے بڑی احتیاط برتی تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ نظمہ کے فلیٹ میں آ کر اس نے چپے چپے کی تلاشی لی تھی لیکن گفتگو سننے کے خفیہ آلات کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا...... اسے محسوس ہو رہا تھا کہ انجانی آنکھیں ان کی نگرانی کر رہی ہیں۔

قدموں کی چاپ سن کر وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ مڑا۔ اس کا ہاتھ پھرتی سے ریوالور کی طرف گھوم گیا۔ لیکن پھر رُک گیا۔

"تم اس قدر چوکنا ہو؟" نظمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سعدی! کاش ہم ان ذمے داریوں سے آزاد ہوتے...... تم شاید یقین نہ کرو، اس تمام عرصے میں ایک لمحے کے لئے بھی میں تم کو نہیں بھلا سکی تھی۔"

سعدی نے اسے کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "کاش میں بھی یہی کہہ سکتا نظمہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں سعدی!“ نظمہ نے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ”تم کو میرے شوہر کی موت کی خبر نہیں تھی۔“

اسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی اور سعدی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو عبدالغفور سامنے کھڑا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے جن نگاہوں سے سعدی کو دیکھا وہ بڑی خونخوار تھیں۔ سعدی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ عبدالغفور رقابت کی آگ میں جل رہا ہے۔ لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔

”تم کو اس طرح نقشے پر قبضہ جمانے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ عبدالغفور نے غراتے ہوئے کہا۔ وہ چلتے ہوئے اب بھی لنگڑا رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ عبدالغفور!“ سعدی نے کہا۔ ”مجھ سے یوں جھگڑنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ لیکن اگر تم ایک ہفتے کے اندر ٹھیک نہ ہو سکے تو......“

”تم میری فکر نہ کرو۔ میں کسی حال میں تم کو تنہا نہیں جانے دوں گا۔“ عبدالغفور نے غصے میں کہا۔

”اور تم بھی یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو عبدالغفور! کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔“ سعدی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”آج سے تین دن بعد میں قلعہ الموت میں ہوں گا اور جب تک میں قلعہ الموت کے کھنڈرات میں مصروف رہوں، اس وقت تک اگر کسی نے وہاں پہنچنے کی کوشش کی تو میں نقشہ کو آگ لگا دوں گا۔ پھر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔“

دوسری جانب عازم شفقی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کے کانوں سے ہیڈ فون لگا ہوا تھا اور وہ اطمینان سے لیٹا ہوا سعدی کی تمام گفتگو سن رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ نظمہ کی رہائش گاہ سے کئی عمارتوں کے فاصلے پر ایک فلیٹ میں قیام پذیر تھا کیونکہ اسے نظمہ کے کمرے میں ہونے والی گفتگو سننے کی جدید ترین مشین حاصل ہو گئی تھی...... یہ لیزر شعاع کا ایک دور بین نما آلہ تھا جس کا رخ نظمہ کے کمرے کی کھڑکی کی طرف تھا۔ اس کے ذریعے ایک مخصوص فاصلے کی تمام باتیں دور بیٹھ کر بھی سنی جا سکتی تھیں...... وارتھن اپنے بستر پر بے خبر سو رہا تھا اور عراق سے فرار اور اس جدید سائنٹیفک آلے کی دستیابی اسی کا کارنامہ تھا۔ عازم شفقی نے گھڑی دیکھی، آدھ گھنٹے بعد وارتھن کی باری آئے گی۔ اس وقت تک یہ ڈیوٹی

اسے انجام دینی تھی۔

❁......❁

سعدی منہ اندھیرے تہران سے روانہ ہوا تھا اور الموت کے کھنڈرات تک پہنچتے پہنچتے شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ ویران پہاڑی کی بلندیوں پر سرد ہوا کے جھونکے بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ دور تک پھیلے ہوئے کھنڈرات میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ باوجود اس کے کہ تہران سے صرف اسی میل کا فاصلہ تھا لیکن وادی تک پہنچنے کا راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔ یہ پچاس میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ایک پہاڑی سلسلے کے درمیان واقع تھی جہاں پہنچنے کے لئے خطرناک پہاڑی راستوں اور گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا تھا اور چونکہ اس ویرانے میں دور دور تک نہ کوئی آبادی تھی نہ ہی کوئی اور اہم چیز...... اس لئے کسی کو سڑک بنوانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی تھی۔ اسی لئے سعدی نے سفر کے لئے ایک جیپ منتخب کی تھی جو اس پہاڑی راستے پر بڑی کارآمد ثابت ہوئی تھی۔

لیکن قلعہ الموت تک جیپ لے جانے کا راستہ بھی نہیں تھا۔ سعدی نے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ کر ایک جگہ جیپ کو چھوڑ دیا۔ چونکہ وہاں صرف پیدل جانے کا تنگ راستہ تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسلسل چڑھائی کے بعد چھ فٹ کی بلندی پر اسے بھوری چٹانوں کا ایک ناقابل عبور سلسلہ نظر آیا۔ یہی قلعہ الموت تھا جس کی شکستہ فصیلیں اتنے فاصلے سے بھی نظر آ رہی تھیں۔ ابراہیم بلادی نے اسے جو نقشہ بنا کر دیا تھا اس کی مدد سے ایک تنگ اور خطرناک راستے پر چڑھتے ہوئے سعدی جب اوپر پہنچا تو سردی کے باوجود اس کا وجود پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ قلعہ الموت کے ناقابل تسخیر ہونے کا سبب کیا تھا۔ لیکن اسے جلد از جلد اپنا کام مکمل کرنا تھا اس لئے فوراً ہی قلعہ کے کھنڈرات کے تاریک گوشوں میں درجنوں آدمی بھی چھپے ہوں تو پتہ چلانا ممکن نہ تھا۔ لیکن سعدی کو کسی کا خوف نہ تھا۔ اس نے احتیاطاً پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔

ابراہیم بلادی نے جو نقشہ دیا تھا اس کی رہنمائی میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں درمیان میں ایک پتلی سی گہری کھائی تھی۔ اس پر اینٹوں کا ایک مختصر سا پل بنا ہوا تھا۔ اس نے پل پر قدم رکھا تو کئی اینٹیں اکھڑی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن گہرائی کی سمت دیکھے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ دوسری جانب ایک قدرتی بلند چٹان پر

سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان پر چڑھنے کے بعد دس فٹ چوڑی فصیل تھی جو تقریباً پچاس
فٹ بلند تھی جو آگے جا کر ٹوٹ گئی تھی۔ فصیل کے نیچے پہاڑ کی سپاٹ دیوار تھی جو نیچے
سینکڑوں فٹ گہری وادی تک چلی گئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے چھ فدائین نے حسن بن
صباح کے اشارے پر نیچے چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔

سعدی سیڑھیوں سے اتر کر اندرونی حصے میں داخل ہوا اور فصیل کے ساتھ ساتھ آگے
بڑھنے لگا۔ فصیل میں اسے ایک شگاف نظر آیا۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ ایسے ہی تیسرے شگاف
کے پاس پہنچ کر وہ اس کے اندر داخل ہو گیا۔ فصیل کے اندر ایک راستہ بنا ہوا تھا۔ سعدی
نے ٹارچ جلائی اور اس اندرونی راستے میں آگے بڑھنے لگا جو غلام گردش کی طرح فصیل
کے اندرونی حصے میں چلا گیا تھا۔ اس دوران اُسے کئی جگہ سیڑھیاں نظر آئیں جو بلندی پر
قلعے کے پشتے تک چلی گئی تھیں۔ تقریباً 70 فٹ جانے کے بعد اسے وہ زینہ نظر آیا جو فرش
کے نیچے تاریک گہرائی میں چلا گیا تھا۔ سعدی نے ٹارچ کی روشنی کی مدد سے نیچے اترنا
شروع کر دیا۔ سیڑھیوں پر صدیوں کی جمی ہوئی ریت پر اس کے پیر پھسل رہے تھے اس لئے
وہ بڑی احتیاط سے اتر رہا تھا۔

سیڑھیاں خاصی گہرائی تک چلی گئی تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد وہ ایک سرنگ میں
داخل ہو گیا جو چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ سرنگ سے گزرتے ہوئے اسے چٹانوں کو
کاٹ کر بنائے ہوئے کمرے اور خوبصورت حوض ملے جن میں بنی ہوئی چوڑی نالیاں
زمین کی گہرائیوں میں جا کر غائب ہو گئی تھیں۔ شاید انہی خفیہ حوضوں کے ذریعے حسن بن
صباح کی جنت میں بہنے والی نہروں کو دودھ اور شہد سپلائی کیا جاتا رہا ہو گا۔ کچھ دور جا کر
اسے دیوار میں بنی ہوئی سیڑھیاں نظر آئیں۔ ان سے اتر کر وہ ایک بار پھر کھلے ہوئے
آسمان کے نیچے آ گیا۔ وہ جس جگہ کھڑا ہوا تھا اس کے بالکل سامنے بلندی پر ایک بہت بڑا
کمرہ نظر آ رہا تھا جس کے اوپر بنا ہوا گنبد اور دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے
تاتاریوں نے حملے کے بعد قلعے کی ہر چیز کو تاراج و برباد کر دیا تھا۔

ٹارچ بجھا کر سعدی نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کسی نے
اچانک حملہ کیا بھی تو اسے جان سے نہ مارے گا کیونکہ اس کے بغیر نقشے کا ملنا ممکن نہ تھا اور
وہ اتنا بے وقوف نہ تھا کہ نقشہ اپنے ساتھ لے کر یہاں آتا۔ اس لئے سعدی کی زندگی

صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اس کے دشمنوں کے لئے بھی قیمتی تھی۔ لیکن کسی نے اس پر حملہ
نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ چلتا ہوا ایک محراب دار دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے
میں داخل ہو کر وہ ایک بہت بڑے ہال میں پہنچا جو تقریباً پچاس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا
تھا۔ اس کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا اور ہر سمت گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اسے پار
کر کے وہ ایک برآمدے میں نکلا جس کے آخر میں ایک ایسا ہی محراب دار دروازہ تھا۔
سعدی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اس کی محراب کے درمیان ایک عجیب سا نشان
بنا ہوا تھا۔

سعدی اس نشان کے نیچے سے گزر کر باہر نکلا تو خود کو بہت بڑے اور کشادہ باغ کے
اندر پایا۔ یہی اجڑا ہوا باغ حسن بن صباح کی جنت تھا۔

شیخ الجبل حسن بن صباح کے دور میں اس جگہ ہرا بھرا سرسبز باغ تھا جس میں کھلے
ہوئے جاذب نظر پھولوں سے فضا معطر رہتی تھی۔ رنگ برنگی روشنیوں کے درمیان فوارے
مہکتا ہوا پانی بکھیرتے تھے۔ دودھ اور شہد کی نہریں پیاسے لبوں کو سیراب کرتی تھیں۔ حسن
وجمال کا مرقع حوریں اور دلفریبی اور دلکشی کا شاہکار نوعمر غلمان ہر سمت اٹکھیلیاں کرتے تھے
اور یہی سب تھا کہ جس نے ایک مرتبہ اس جنت کی سیر کر لی وہ ہمیشہ کے لئے حسن کا غلام
ہو جاتا تھا اور جنت کی آرزو میں یا سیدنا کا نعرہ لگا کر اپنے سینے میں خنجر پیوست کرنے میں
بھی پس وپیش نہ کرتا تھا۔

لیکن اب نہ وہ حسن بن صباح تھا، نہ اس کی جنت ارضی اور نہ وہ حور و غلمان۔ ہر سمت
انسان کی بے ثباتی کا منظر تھا۔ تاتاریوں نے حسن کی جنت کو مکمل طور پر تاراج کر دیا تھا۔
ابراہیم نے اس جگہ کے گوشے گوشے کو دیکھا تھا۔ اس نے ماہر آثار قدیمہ کی حیثیت سے
یہاں کی ہر چیز کا معائنہ کیا تھا۔ قلعہ الموت کے متعلق اس کی یہی وسیع معلومات تھیں جن کی
مدد سے اس نے نقشے کی کئی علامات کی تشریح آسانی سے کر لی تھی۔

سعدی سیڑھیاں اتر کر ایک بڑے چبوترے کے اوپر پہنچا جس کے درمیان ایک کنواں
بنا ہوا تھا۔ ابراہیم کو یقین تھا کہ نقشے میں جو ایک نشان اس قسم کا تھا وہ اسی کنوئیں کی سمت
اشارہ تھا۔

نقشے میں ایک سمت کنوئیں کا نشان تھا لیکن اس کے دوسری جانب والے نشانات

عمارت کے پتھروں پر ہونے چاہئے تھے۔ ابراہیم نے بتایا تھا کہ ان میں سے دو مٹ چکے تھے لیکن تیسرا موجود تھا۔ باغ کے چبوترے کے ایک جانب ایک بہت بلند سی چٹان ابھری ہوئی تھی اور اس کے برابر ایک بڑا ستون اب تک کھڑا تھا اور ستون کے پاس پہنچتے ہی اسے ایک اور نشان نظر آ گیا۔ پتھر پر اب تک یہ نشان واضح طور پر کندہ تھا۔ سعدی نے کاغذ پر ایک اور جگہ نکتہ لگا کر یادداشت محفوظ کر لی۔ وہ ان نکتوں کی مدد سے تمام مقامات کی سمتوں کا تعین کرتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کاغذ کو زمین پر اس طرح رکھا کہ ستون کے نشان والا نکتہ ایک جانب تھا اور کنوئیں کا نشان بالکل اس کے سامنے تھا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر کاغذ پر رکھ دیئے تاکہ وہ اُڑنے نہ پائے۔ اس کے بعد جیب سے ایک کمپاس اور پنسل نکالی اور کمپاس کو اس طرح گھمایا کہ سوئی کا رخ شمال کی جانب ہو گیا۔ اب نقشے کے مطابق سمتوں کا صحیح تعین ہو گیا تھا اور پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی آخری کرنیں گردوپیش کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔ اب اسے صرف انتظار کرنا تھا۔

اس انتظار کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا؟ یہ بات نہ اسے معلوم تھی اور نہ ابراہیم بلادی کو۔

رات بہت سرد تھی۔ حسن بن صباح کی اجڑی ہوئی جنت پہ موت کا سناٹا طاری تھا۔ اس سنسان اور ویران جگہ پر سعدی کے علاوہ اور کسی جاندار چیز کا وجود نہ تھا لیکن سعدی کو یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر سمت پھیلی ہوئی دودھیا چاندنی میں حوروں کے کھنکتے ہوئے قہقہے بکھر رہے ہوں۔ جیسے سینکڑوں حسن و جمال کے پیکر ہر سمت اٹکھیلیاں کر رہے ہوں۔ مسلسل انتظار اور مکمل تنہائی نے اس پر ایک خوابیدہ سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ فرش پر رکھے ہوئے کاغذ پر ڈھلتے ہوئے چاند کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا اور پھر ستون کے پاس ابھری ہوئی چٹان پر چڑھ کر قلعہ الموت کے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ پوری وادی چاند کی روپہلی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ بڑا روح پرور منظر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ چٹان سے اترا اور کاغذ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہ کاغذ پر جمی ہوئی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اگلے لمحات میں کیا ہونے والا ہے۔

اور پھر رات کو تین بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے کہ معمہ حل ہو گیا۔ چاند اب ڈھلنے لگا تھا۔ اب تک ستون کے برابر والی اونچی چٹان کا سایہ اس کے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر

پڑ رہا تھا اور چاند کے ساتھ ساتھ یہ سایہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتا رہا تھا لیکن اب یہ سایہ کاغذ کے بالکل نچلے حصے تک پہنچ گیا تھا اور پھر چاند کے ڈوبنے سے چند لمحے قبل سایہ اتنا بڑھ گیا کہ کاغذ کا صرف ایک چوتھائی نچلا حصہ روشن رہ گیا۔ سعدی نے پنسل سے وہاں نشان لگایا تھا۔ دوسرے ہی لمحے چاند کی روشنی غائب ہو گئی۔ سعدی نے اس نقشے کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔

وہ دوسرے دن شام کے قریب تہران واپس پہنچا۔ جیپ کو کرائے کے گیراج میں چھوڑ کر وہ پیدل روانہ ہو گیا۔ شاہ رضا ایونیو کے شمال میں پہنچ کر وہ پھرتی کے ساتھ ایک تاریک گلی میں داخل ہو گیا۔ تیز تیز چلتا ہوا وہ گلی سے باہر نکل کر ایک دوسری شاہراہ پر پہنچا اور ایک بڑے ہوٹل میں داخل ہو کر اس کے عقبی دروازے سے باہر نکلا اور ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ کسی نے اس کا تعاقب نہ کیا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے ایک ٹیکسی لی اور اسے مسجد شاہ چلنے کو کہا۔ وہاں پہنچ کر اس نے مسجد کا چکر پیدل لگایا اور پھر ٹیکسی لے کر سٹی پارک پہنچا۔ پارک سے گزرتے ہوئے اس نے کئی بار رک کر اطمینان کر لیا کہ کسی نے تعاقب تو نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ پارک سے گزر کر اس کے عقب میں واقع ایک عمارت کے دروازے میں داخل ہو گیا جہاں اس کا ایک ایرانی دوست رہتا تھا جسے سعدی نے بغداد سے وہ نقشہ روانہ کیا تھا۔ اس کا دوست اسکول ٹیچر تھا۔ سعدی کو دیکھ کر اس نے پُرجوش خیر مقدم کیا۔ کچھ دیر بعد سعدی نے اپنے دوست سے وہ لفافہ لیا جس میں اس نے نقشہ روانہ کیا تھا۔ نقشے کو میز پر پھیلا کر اس نے وہ کاغذ جیب سے نکالا جو قلعہ الموت سے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کاغذ پر لگائے ہوئے نشانات سے اس نے نقشے کا موازنہ کیا اور مسکرانے لگا۔ اب اسے تمام سمتوں کا اندازہ ہو گیا اور ساتھ ہی وہ راز بھی افشا ہو گیا۔ جو اب تک معمہ بنا ہوا تھا۔ ڈوبتے ہوئے چاند کا سایہ آخری بار جہاں تک پڑا تھا اس سے نقشے کے تین نشانات چھپ گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ نشان دانستہ عام آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے بنائے گئے تھے اور اس راستے پر جانے والا مقبرے کے اصل مقام سے بھٹک جائے گا لیکن فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھنے والا جو حسن بن صباح کا معتقد تھا اور اس کے ساتھ ہی الموت کے سربستہ رازوں سے واقف تھا۔ وہ اس راستے سے آگے بڑھے گا جو اس نشان سے جاتا تھا۔

سعدی نے تمام تفصیلات کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا۔ اس کے بعد پروفیسر

بلادی کا نقشہ جلا کر راکھ کر دیا۔ اب چوری کرنے کے لئے کچھ باقی نہ رہا تھا ماسوائے اس نقشے کے جو سعدی کے ذہن میں محفوظ تھا۔

......

ابراہیم کو اپنے تعلقات کے باوجود سعدی، عبدالغفور اور قطمہ کیلئے عمان کا ویزا حاصل کرنے میں چار دن لگ گئے تھے۔ اس چھوٹی سی خلیجی ریاست میں مسقط کے بعد اب مترا کا شہر بھی تیزی سے ترقی پذیر تھا۔ بندرگاہ کے کنارے تیل نکالنے والی بھاری مشینیں نصب تھیں۔ انہوں نے شہر کے ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل الفلاح میں قیام کیا۔ سعدی نے عبدالغفور اور قطمہ کو ہوٹل میں چھوڑا اور خود ٹیکسی لے کر اپنے دوست کے پاس روانہ ہو گیا جو صرف ایک میل دور واقع مسقط شہر میں رہتا تھا۔

شہر کے بڑے دروازے باب الکبیر میں داخل ہو کر ٹیکسی بڑے اور پُر ہجوم بازاروں سے گزرتی ہوئی اس پہاڑ پر چڑھنے لگی جو بندرگاہ کے سامنے واقع تھا۔

سعدی کا دوست بڑی گرم جوشی سے ملا۔ سعدی نے تہران سے فون کے ذریعے اسے جو کچھ بتایا تھا اس کے بعد سے وہ بڑی بے چینی کے ساتھ اپنے دوست کا منتظر تھا۔ سعدی پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس نے اسے ٹھنڈے مشروب کا گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تم مسقط کی گرمی کے عادی نہیں ہو اس لئے یہ مشروب پیو۔ بڑا فرحت انگیز ہے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر سعدی کے برابر بیٹھ گیا۔ "اور بتاؤ...... یہ چکر کیا ہے؟"

سعدی کچھ دیر خاموشی سے شربت پیتا رہا۔ ایئر کنڈیشنر کی سرد ہوا سے جب حواس بجا ہوئے تو اس نے ساری تفصیلات اپنے دوست کو سنا دیں۔ وہ ابو طاہر کو اپنا شریک راز بلا مقصد نہیں بنا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابو طاہر کی مدد کے بغیر صحرائے اب الخالی تک پہنچنا دشوار ہو گا۔ ابو طاہر عمان کا با اثر شخص تھا اور سب سے بڑی امریکن آئل کمپنی پٹرولیم ڈویلپمنٹ کارپوریشن میں تیل تلاش کرنے والے شعبے کا انچارج تھا اور تجربہ کار جیولوجسٹ تھا۔ سعدی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ نہ صرف سرحد پار کرنا آسان ہو گا بلکہ ریگستان میں سفر کے دوران بھی آسانی ہو گی جہاں جگہ جگہ سلطان کی آرمڈ فورس کی چیک پوسٹیں قائم تھیں۔ ابو طاہر بڑی خاموشی سے سعدی کی گفتگو سنتا رہا۔

"خوب...... بڑی دلچسپ داستان ہے۔" ابو طاہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم

کو جانا کس مقام پر ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم ساتھ چلنے پر تیار ہو؟"

"ہاں...... بشرطیکہ تم اپنے حصے میں نصف کا شراکت دار بنا لو۔"

"منظور ہے۔" سعدی نے فوراً کہا۔ "اب علاقے کا نقشہ لے آؤ۔"

وہ نقشے کی مدد سے دیر تک اس جگہ کا تعین کرتے رہے جہاں ان کو پہنچنا تھا۔ ابو طاہر نے نقشے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت خطرناک علاقہ ہے۔ ریگستانی خطرات کے علاوہ یہاں فرقہ قبائل کے حملے کا ہر لحظہ خطرہ رہتا ہے۔ جنوبی یمن نے ان کو جدید ترین اسلحہ فراہم کر دیا ہے اور یہ سلطان کی ملٹری پولیس کے سوا اس علاقے میں نظر آنے والے ہر شخص پر بلا تامل حملہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر آگے بڑھتے ہی بدوی قبائل سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ تمہیں صرف جوتے کی خاطر قتل کر سکتے ہیں اس لئے ہمیں کافی اسلحہ اور آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔"

"تم سفر کے لئے ٹرانسپورٹ اور کھانے پینے کی اشیاء کا بندوبست کرو۔" سعدی نے کہا۔ "اسلحہ اور آدمیوں کا بندوبست میں کر لوں گا۔"

ابو طاہر کے پاس سے اٹھ کر سعدی جب ہوٹل پہنچا تو تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ اس نے ایک معتبر تاجر سے اسلحہ کا انتظام کر لیا تھا۔ اب صرف ایسے قابل اعتماد آدمیوں کی تلاش باقی رہ گئی تھی جو اس سفر میں ساتھ لے جائے جا سکیں۔ لیکن سعدی جانتا تھا کہ وہ رات ہی کو مل سکیں گے۔ اس لئے ہوٹل واپس آ گیا تا کہ قطمہ اور عبدالغفور کو انتظامات کے بارے میں بتا کر ڈنر کھا سکے۔ اس نے دروازہ کھولا تو عبدالغفور اور قطمہ بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سعدی کو عجیب انداز میں دیکھا۔ سعدی حیران نگاہوں سے ان کو دیکھتا ہوا جیسے ہی اندر داخل ہوا اس کا سبب معلوم ہو گیا۔

ایک سمت کرسی پر وارتھن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک پستول تھا جس نے سب کو زد میں لے رکھا تھا اور سنگھار میز سے ٹیک لگائے عازم کھڑا تھا۔ اس کے ریوالور کا رخ بھی ابھی ان کی سمت تھا۔

"اوہ...... تو بصرہ میں وہ پراسرار فون تم نے کیا تھا؟" سعدی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اور سکیورٹی کے ان دو آدمیوں کو ختم کرنے والے بھی تم ہی تھے۔"

"تم نے صحیح اندازہ کیا۔" عازم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو
تم تینوں وہاں سے زندہ بچ کر نہ نکل سکتے۔"

"اپنے ہتھیار جیب میں رکھ لو۔" سعدی نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ "اگر تم واقعی
سب کچھ جانتے ہو تو مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔"

"تم کو ہم یقیناً زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔" عازم نے کہا۔ "لیکن یہ شخص قابل اعتماد نہیں
ہے۔" اس نے عبدالغفور کی سمت اشارہ کیا۔ "یہ کچھ کرنے کے لئے پہلو بدل رہا ہے۔"

"عبدالغفور۔" سعدی نے ترش لہجے میں کہا۔ "ہم یہاں جھگڑا کریں گے تو سارا کھیل
بگڑ جائے گا اور پولیس کو شبہ ہو گیا تو پھر ہم آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

نظمہ نے آہستہ سے عبدالغفور کا ہاتھ دبایا۔ عبدالغفور نے شکایت آمیز نگاہوں سے نظمہ
کو دیکھا۔ "ان لوگوں کو ہمارا راز کیسے معلوم ہو گیا؟" اس نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

سعدی نے اسے بتایا کہ عازم کون تھا اور کس طرح اس نے بصرہ میں ان کی تمام گفتگو
سن لی تھی۔

"لیکن ہماری یہاں آمد کی اطلاع تم کو کیسے ملی عازم؟" اس نے پوچھا۔

"یہ ہمارے دوست وارتھن کا کارنامہ ہے۔" عازم نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ایک
جدید ترین آلے کی مدد سے ہم نے دور بیٹھ کر بھی تمہاری اور نظمہ کی تمام گفتگو سن لی تھی۔"

"تم نے ہمیشہ مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔" وارتھن نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"آئندہ نہیں کروں گا...... اطمینان رکھو۔" سعدی نے جواب دیا۔

"بیکار بحث چھوڑو...... تم لوگ اب یہ جان چکے ہو کہ ہمیں تمہارے منصوبے کا ہر
معلوم ہے۔" عازم نے کہا۔ "اگر تم ہمیں بھی ساتھ لے جاؤ گے تو ہم عمان کی پولیس کو سب
کچھ بتا دیں گے۔ اور کہہ دیں گے کہ تمہارا تعلق یمنی باغیوں سے ہے۔ ظاہر ہے اس کے
بعد تم کہیں نہ جا سکو گے۔"

"اس سے کیا حاصل ہو گا؟"

"ہماری طرح تم بھی کچھ حاصل نہ کر سکو گے۔" عازم نے کہا۔ "دوسری صورت یہ ہے
کہ ہمیں ایک تہائی کا حصہ دار بنا لو۔"

"کیا......؟" عبدالغفور اپنی جگہ سے اچھلا۔ لیکن اس سے پہلے وارتھن کے پستول کی

نال بلند ہو چکی تھی۔ وہ غصے میں تلملا کر پھر بیٹھ گیا۔

نظمہ کی نگاہیں سعدی سے ملیں۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر نظمہ
نے آہستہ سے کہا۔ "میرے خیال میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

سعدی دیر تک خاموش رہا، پھر بولا۔ "ہاں...... مجبوری ہے۔" اس نے نظمہ کی طرف
دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ عبدالغفور نے کچھ کہنا چاہا لیکن نظمہ نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

"شکریہ۔" عازم نے کہا۔ "یہ معاہدہ کارآمد ثابت ہو گا۔ مثلاً وارتھن ایک ذریعہ سے
ہمیں باآسانی ہتھیار دلوا سکتا ہے۔"

"ہم نے یہ انتظام پہلے ہی کر لیا ہے۔" سعدی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے...... لیکن ہم سب کے علاوہ اور کوئی اس مہم پر نہ جائے گا۔" وارتھن نے
کہا۔

"میں ایک آدمی سے پہلے ہی ساتھ چلنے کی بات کر چکا ہوں۔" سعدی نے کہا اور پھر
ابوطاہر کے بارے میں بتایا۔ "اس کو ساتھ لے چلنا بہت ضروری ہے۔"

کسی نے اعتراض نہ کیا۔

✿......✿

وہ اب کوہِ قرا کی بلندی سر کر کے دوسری جانب کے نشیب میں اتر رہے تھے۔ سڑک اتنی تنگ اور خطرناک تھی کہ نیچے کی سمت دیکھ کر خوف آتا تھا۔ پہاڑ کے جس حصے کو طے کر کے وہ آئے تھے ادھر ہر سمت سبزہ زار تھا لیکن اب جو حصہ سامنے تھا وہ حد نگاہ تک پتھریلا اور ریگستانی علاقہ تھا جس میں نام کو بھی کہیں سبزہ نظر نہ آتا تھا۔ یہاں سے اب الخالی کے جہنمی ریگزار کی ابتدا ہوئی تھی۔ عازم، وارتھن اور سعدی آگے چلنے والے ٹرک کے اگلے حصے میں بیٹھے تھے اور لینڈ روور اسٹیشن ویگن ابو طاہر نے آئل ڈویلپمنٹ کارپوریشن سے حاصل کی تھی جس میں اس کے ساتھ تظمہ اور عبدالغفور تھے۔ سب نے ریگستانی سفر کے لئے خاکی ڈرل کا لباس پہن رکھا تھا اور ہر ایک کے گلے میں بدوی قبائل جیسا چیک کا بڑا رومال تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے سر اور منہ کو ڈھانپ سکیں۔ وہ سب پوری طرح مسلح تھے۔ ہر ایک کے پاس براؤننگ کے ہائی پاور آٹومیٹک رائفل اور ایم سولہ اور دیگر قسم کی رائفلیں بھی موجود تھیں۔ انہوں نے اپنا اسلحہ چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ ابو طاہر کی وجہ سے اب تک ہر چیک پوسٹ پر انہیں آگے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

بنجر اور پتھریلی وادی کے بعد ایک تنگ درے کو پار کر کے ان کو آخری چیک پوسٹ پر رکنا پڑا۔ کیونکہ سڑک پر لگا ہوا پھاٹک بند تھا۔ پہاڑی کے دونوں جانب بلندی پر دو مشین گنیں نصب تھیں جن کو سنبھالے ہوئے دو عمانی سپاہی مستعد بیٹھے تھے۔ یہاں پوسٹ کے انچارج افسر نے گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔

''کہاں کے ارادے ہیں ابو طاہر؟'' اس نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں ان صحافیوں کو وہ مقامات دکھانے لے جا رہا ہوں جہاں ہمیں تیل کے بڑے ذخائر ملنے کی امید ہے۔'' ابو طاہر نے بتایا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن مغرب کی سمت زیادہ دور نہ جانا، ادھر کی پہاڑیوں میں آج کل

بھی گوریلے بہت سرگرم ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک بلوچی قافلہ اونٹوں پر کھجوریں لے کر آ رہا تھا۔ اس میں صرف ایک اونٹ سوار بچ سکا، اٹھارہ اونٹوں کا مال اور آدمی انہوں نے ٹھکانے لگا دیئے۔''

ابو طاہر اور سعدی کی نگاہیں ملیں...... ان کو مغرب کی سمت میں ہی سفر کرنا تھا۔

درے سے ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں حد نگاہ تک سنسان اور ویران میدانی علاقہ تھا۔ سعدی نے اپنی طاقتور دوربین اٹھا کر ہر سمت کا جائزہ لیا۔ تظمہ نے اسے کافی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

''کسی نے تعاقب تو نہیں کیا؟''

''نہیں......'' سعدی نے جواب دیا۔ ''مجھے حیرت ہے۔''

''ممکن ہے ہمارے علاوہ اور کسی کو اس خفیہ مشن کا علم نہ ہو سکا ہو۔''

''یا ممکن ہے وہ کہیں آرام دہ جگہ چھپ کر ہماری واپسی کا انتظار کریں۔'' عبدالغفور نے کہا۔ ''تاکہ بلا محنت کئے مال غنیمت ہتھیانے میں آسانی ہو۔''

سعدی نے ابو طاہر سے حاصل کیا ہوا علاقے کا نقشہ اسٹیشن ویگن کے بونٹ پر پھیلا دیا اور قریب کھڑی ہوئی تظمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہم اس جگہ کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔'' عبدالغفور بھی قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ تظمہ نے ایک جگہ انگلی رکھ کر بتایا۔ ''ابراہیم کو اس جگہ نقشہ ملا تھا۔''

''اور یہیں سے ہماری تلاش کا سفر شروع ہو گا۔'' عازم نے آہستہ سے کہا۔

سعدی نے جیب سے کمپاس نکال کر نقشے پر رکھا اور پھر سمتوں کے نشانات لگائے۔ اب اس کے اصل سفر کا آغاز جس جگہ سے ہونا تھا وہ شمال میں واقع تھی۔ نقشہ لپیٹ کر گاڑی میں رکھنے کے بعد وہ روانہ ہو گئے۔ اب وہ پہاڑوں کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ آہستہ آہستہ سخت زمین کی جگہ نرم اور ریتلی زمین آ رہی تھی۔ اب وہ کھلے ریگستان میں سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ رک کر کچھ دیر پھر آرام کیا اور گاڑیوں پر ریگستان میں سفر کے لئے خصوصی ٹائر چڑھائے۔ ایک مرتبہ پھر سعدی نے دوربین سے دیکھ کر یہ اطمینان کیا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ جلد ہی وہ پھر روانہ ہو گئے۔

سہ پہر تک وہ ریگستان کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں ہر سمت ریت کے علاوہ

کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اب الخالی کا ریگستان اپنی تمام تر ہولناک ویرانی کیساتھ ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ زمین کی سطح بتدریج نرم ہوتی جا رہی تھی۔ گرمی اور گرد سے دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی فکر میں وہ بڑھے چلے جا رہے تھے۔ گرم ریت سے بچنے کے لئے وہ ریت کے ان بلند اور طویل ٹیلوں کے درمیان سے چل رہے تھے جو کسی پہاڑی سلسلے کی طرح ریگستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اس طرح اُڑنے والی ریت ڈھلوان پر رک جاتی تھی اور درمیان کا راستہ نسبتاً بہتر تھا۔ تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے۔ سورج اب ڈھلنے لگا تھا۔ سعدی نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دونوں جانب بلند ٹیلوں کا سلسلہ جاری تھا۔

"کیا ہم اس جگہ پہنچ گئے ہیں؟" عازم نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہم بہت قریب ہیں۔" سعدی نے جواب دیا۔ "کچھ دور اور چل کر ہم رکیں گے اور اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں گے کہ کتنا سفر اور باقی ہے۔"

وہ جن ٹیلوں کے درمیان سفر کر رہے تھے ان کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ لیکن سامنے ریت کا ایک بہت بلند پہاڑ ان کا راستہ روکے کھڑا تھا جس سے ظاہر تھا کہ دوسری جانب کوئی بڑی چٹان یا پہاڑی ہے جس کی رکاوٹ کی وجہ سے ریت کا یہ بلند ٹیلہ بن گیا ہے۔ یہاں ڈھلوان پر رکنے والی ریت کے جمع ہونے سے راستہ بھی بڑا نرم تھا۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار ان کی تقلید میں تیز کی۔ اب وہ ریت کے اس پہاڑ کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ انجن کا شور اتنا تھا کہ گفتگو کرنا ممکن نہ تھا۔ سعدی کا ٹرک اب اس ڈھلوان پر آ گیا تھا جو ریت کے ٹیلے کے برابر سے شروع ہوتا تھا۔ سعدی نے بریک پر پاؤں رکھ کر ٹرک کو ڈھلوان پر چھوڑ دیا۔

نشیب میں پہنچ کر اس کی نگاہ اس بلند چٹان پر پڑی جس کی نوک آسمان کی سمت اٹھی ہوئی تھی۔ برسوں میں جمع ہونے والی ریت سے یہ پہاڑی نما ٹھوس چٹان پتھر کی طرح سخت ہو چکی تھی اور اس کی وجہ سے سامنے سے آنے والی ریت کا وہ بلند ٹیلہ بن گیا تھا جس کو عبور کر کے وہ اس جگہ پہنچے تھے۔ عازم اور وارتھن ٹرک سے اتر کر باہر آ گئے۔ چند لمحے بعد تظمہ، ابو طاہر اور عبدالغفور بھی وہیں پہنچ گئے۔ سعدی اس پہاڑی چٹان کے ایک حصے کو دیکھ رہا تھا جہاں کسی نے چھینی اور ہتھوڑے کے ذریعے پتھر کو کھود کر بنے ہوئے نشان کو

تھا۔سعدی جانتا تھا کہ یہ ابراہیم کا کارنامہ تھا..... نظمہ نے اس کی سمت دیکھا،سعدی نے گردن ہلائی۔

"ہم صحیح مقام پر پہنچے ہیں۔" اس نے نقشے کو زمین پر پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر کمپاس نکال کر اس طرح دیکھا کہ سوئی شمال کی سمت اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی یادداشت کے ذریعے سمت کا اندازہ لگایا۔سب لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔سعدی نے مطمئن ہو کر گردن ہلائی۔

"سعدی..... کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم ہمیں بھی شریک راز کرلو۔" ابو طاہر نے کہا۔

"نہیں....." سعدی نے جواب دیا۔"معاف کرنا ابو طاہر! لیکن یہ مناسب نہیں ہے۔"

عبدالغفور نے حقارت سے قہقہہ لگایا۔"جب تک تمام راز اس کے سینے میں دفن ہے یہ بالکل محفوظ رہے گا۔ہم سب باڈی گارڈ کی طرح اس کی حفاظت کرنے پر مجبور ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو عبدالغفور!" سعدی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" وارتھن غصے میں آگے بڑھا۔"اگر یہ اب بھی ہمیں نہیں بتائے گا تو میں اس کی زبان کھلوانا بھی جانتا ہوں۔" اس کا ہاتھ پستول کی سمت بڑھا لیکن اس سے پہلے نظمہ نے اپنی رائفل کی نال اس کے سینے کی سمت بلند کر دی تھی۔ اس نے لیور گھمایا تو اس کی آواز پر وارتھن نے چونک کر نگاہیں اٹھائیں۔نظمہ کی انگلی ٹریگر پر جا چکی تھی۔وارتھن ساکت رہ گیا۔

"اگر تم نے دوبارہ ایسی حرکت کی۔" سعدی نے کہا۔"تو تم کو تنہا اور پیدل واپس جانا پڑے گا۔"

وارتھن نے احتجاج بھری نظروں سے عازم کی سمت دیکھا۔

"آئندہ تم نے ایسی حماقت کی تو میں بلا تامل گولی مار دوں گا۔" عازم نے غصے میں کہا۔

وارتھن کا چہرہ شرم اور مایوسی سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ ہر ایک کی نظروں میں اپنے لئے نفرت کی جھلک دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"غصہ تھوک دو اور ابو طاہر کے ساتھ جا کر گاڑیوں میں تیل ڈالو۔" سعدی نے کہا۔"آج رات ہم یہیں مقام کریں گے۔"

وارتھن نے بلا تامل تعمیل کی اور پھر طاہر کی مدد سے پٹرول کا ایک ڈرم ٹرک سے نیچے

اتار کر گاڑیوں میں پٹرول بھرنے لگا۔ دوسرے لوگ رات گزارنے کے لئے سامان
اتارنے لگے۔ سعدی نے ان کے پاس پہنچ کر کہا۔

''سورج غروب ہونے سے پہلے کھانا کھا لو۔ رات کو ان دونوں ٹیلوں پر دو آدمی باری
باری پہرہ دیں گے۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔ ''پہلی باری ابو طاہر اور وارتھن کی ہو
گی۔ اس کے بعد میری اور نظمہ کی اور آخر میں عبدالغفور اور عازم پہرہ دیں گے۔''

''اوکے باس۔ اب آپ ہی کا حکم چلے گا۔'' عازم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اسی میں سب کی بہتری ہے۔'' سعدی نے جواب دیا۔

✿......✿

نظمہ چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کا دل انجانے خطرے کے احساس سے زور زور سے
اچھل رہا تھا۔ پھرتی کے ساتھ اپنی رائفل اٹھا کر وہ تاریکی میں جھانکنے لگی۔ وہ پہاڑوں میں
رہنے کی عادی تھی۔ ایسا کئی مرتبہ ہو چکا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے خطرہ قریب آنے سے
پہلے اسے بیدار کر دیا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ سعدی بھی بیدار ہو چکا تھا
اور تاریکی میں گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کوئی چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہے۔'' نظمہ نے سرگوشی کی۔ ''میں اسے دیکھ نہیں سکی
لیکن محسوس کر رہی ہوں۔''

سعدی نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر نظمہ کی سمت بڑھا دی۔ ''ممکن ہے تمہاری چھٹی
حس صحیح کہہ رہی ہو۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔''

نظمہ کو بھی گرد و پیش میں کوئی مشتبہ چیز نظر نہ آ سکی۔ لیکن اس کو شدت سے یہ محسوس ہو
رہا تھا کہ کوئی ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ صبح ہونے والی تھی اس لئے وہ پھر نہیں سوئے۔ سعدی
سوچ رہا تھا۔ نقشے کی تحریر کے جملے اسے یاد آ رہے تھے۔ ''اصلی راستہ ایسی جگہ سے شروع
ہوتا ہے جہاں کچھ نہیں......'' وہ اس جگہ بیٹھے تھے جہاں ریت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ دوسرا
جملہ تھا۔ ''چھ دن تک صرف جنت کا علم رکھنے والے کی صحیح راستے پر رہنمائی کرتا ہے۔ جو
ایمان نہیں رکھتا اس پر ریگستان کی مصری دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے۔'' وہ فرقہ باطنیہ کے
عقیدے پر ایمان تو نہیں رکھتا تھا لیکن قلعہ الموت کے رازوں سے باخبر ہو چکا تھا۔ اس
وقت ساحل سے یہاں تک کا سفر انہوں نے چھ دن میں طے کیا ہوگا۔ وہ نقشے کے

اشاروں کو اب بخوبی سمجھ چکا تھا۔

وہ جلد ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سہ پہر تک نقشے میں دی ہوئی دوسری علامات تک
پہنچ گئے۔ لیکن سعدی کو اندازہ تھا کہ مصری دیوی کا قہر نازل ہو چکا ہے۔ ان کو ہر سمت سے
گھیرا جا رہا ہے۔

✿......✿

مصیبت بلا وارننگ کے اچانک آئی تھی۔

وہ ریت کے ایک ٹیلے کے ڈھلوان کی سمت بڑھ رہے تھے کہ ٹرک اچانک نرم ریت
میں پھنس گیا۔ اس وقت عازم شفیقی ڈرائیو کر رہا تھا۔ تمام تر کوشش ٹرک کے دھنسے ہوئے
پہیوں کو ریت سے نکالنے میں ناکام رہی۔ پہیے دلدلی ریت میں گھوم کر رہ جاتے تھے۔
سعدی نے کینوس کے دستانے پہنے اور نیچے اتر آیا۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ اگر اس نے سر اور
منہ پر رومال نہ باندھ لیا ہوتا تو گرمی کی تپش سے چکرا کر گر پڑتا۔ سعدی نے ٹرک کے پیچھے
سے کدالیں اور پھاوڑے نکالے، عازم اور وارتھن بھی اس کی مدد کو آ گئے۔ ابھی انہوں نے
ٹرک کے ٹائروں کے نیچے سے دلدلی ریت صاف کرنا شروع کی تھی کہ نظمہ اپنی اسٹیشن
ویگن ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہ بائیں جانب سے چکر کاٹ کر احتیاط کے ساتھ اپنی
ویگن کو ٹرک کے سامنے لے آئی۔ ابو طاہر اور عبدالغفور تیروں سے زمین کے سخت ہونے کا
اندازہ لگاتے اس جانب بڑھنے لگے جہاں ٹرک پھنسا ہوا تھا دلدلی ریت کی سطح سے پہلے
رک کر انہوں نے نظمہ کو اشارہ کیا۔ وہ ویگن کو بیک کر کے قریب لے آئی۔ سعدی نے لوہے
کی زنجیر ٹرک کے بمپر سے باندھ کر اس کا ہک اسٹیشن ویگن کے عقبی حصے سے باندھ دیا۔
ذرا دیر بعد ٹرک اس دلدلی ریت سے نکل آیا۔ نظمہ اتر کر نیچے آئی تو سعدی نے اس سے کہا
کہ ٹیلے کی بلندی پر جا کر دوسری جانب کا جائزہ لے۔

وہ ٹرک کی برساتی باندھ کر سفر کی تیاری میں مصروف تھے کہ اچانک نظمہ کی سیٹی سنائی
دی وہ ٹیلے کی بلندی پر پیٹ کے بل لیٹی ہوئی سامنے دیکھ رہی تھی۔ سعدی بھاگتا ہوا ٹیلے پر
چڑھنے لگا اور پھر نظمہ کے پاس پہنچ کر خود بھی پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ پہلے تو دھوپ کی چمک
میں اسے کچھ نظر نہ آیا لیکن جب اس نے کچھ دیر بعد دوربین لگا کر دیکھا تو چونک اٹھا۔
تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ریت کے ٹیلوں کے درمیان ایک وادی تھی جس میں اونٹوں کا

ایک قافلہ کھڑا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دم لینے کے لئے رک گئے ہوں۔ لیکن وہاں
سایہ تھا نہ پانی اور نہ یہ کارواں کا کوئی راستہ تھا۔ اب الخالی کے اس خطرناک علاقے
کسی کارواں کے گزرنے کا تصور بھی غلط تھا۔

سعدی نے زیادہ غور سے جائزہ لینا شروع کیا اس نے سوچا ممکن ہے یہ اسمگلر
کارواں ہو وہ کل چالیس اونٹ تھے جو ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے ان پر لدا
سامان کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا لیکن پندرہ اونٹ بندھے ہوئے نہیں تھے یہ ریگستان
دوڑنے والے تیز اونٹ نظر آتے تھے اور ان پر کوئی سامان نہ لدا ہوا تھا۔ ہر اونٹ کے
ایک بدوی کھڑا ہوا تھا ان کی کمر سے لگے ہوئے خنجر اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی آٹو
رائفل کے دستے دھوپ میں چمک رہے تھے سعدی نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور
کی سمت بڑھا۔

"وہ سب وہاں کسی بات کے منتظر کھڑے ہیں۔" اس نے کہا۔

وہ ہماری گاڑیوں کی گرد دیکھ کر تعاقب کر رہے ہوں گے۔" نظمہ نے کہا۔ "اور
ہماری روانگی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

نظمہ کا اندازہ ٹھیک تھا۔ یہ بدوی ڈاکوؤں کا قافلہ تھا جو اچانک حملے کے لئے ان
تعاقب میں آرہے تھے اور گاڑیوں سے اڑنے والی گرد تعاقب کرنے میں ان کی رہنمائی
رہی تھی۔

حقیقت معلوم کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا۔ سعدی نے اشارے سے ٹرک کو آ
لے جانے کی ہدایت کی ٹرک اب اس جگہ روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے پہیوں سے اڑنے
گرداب فضاء میں بلند ہو رہی تھی۔ لینڈ رور کے سامنے کھڑا ابو طاہر سعدی کا انتظار کر
تھا۔ سعدی نے دوربین اٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ فضاء میں بلند ہونے والی گرد جیسے ہی
سے اوپر نظر آئی۔ پندرہ افراد پر مشتمل بدوی قافلہ حرکت میں آگیا۔ وہ بلاشبہ ان کا تعا
کر رہے تھے۔ ٹرک سے اڑنے والی گرد ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔

سعدی ٹیلے سے نیچے اترا تو ابو طاہر اور نظمہ ویگن میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ نظمہ کے
بیٹھ گیا اور ابو طاہر نے ویگن آگے بڑھا دی۔ ٹرک ان سے کافی آگے نکل چکا تھا
خاموش بیٹھے رہے۔ ہر ایک کو خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔

"ایک بات یقینی ہے۔" ابو طاہر نے کہا۔ "وہ کتنی ہی تیز کیوں نہ چلیں ہماری گاڑی کا
مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس نے پر امید لہجے میں کہا۔"

"ہاں......" سعدی نے مشکوک انداز میں جواب دیا۔ "بشرطیکہ راستہ دشوار گزار نہ
ہو۔"

اس کا خدشہ درست ثابت ہوا آدھ گھنٹے بعد ہی ریت کے ٹیلوں میں ایسا سلسلہ شروع
ہوا جن کے درمیان سے گزرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مجبوراً ان کو ٹیلوں پر چڑھ کر پار کرنا پڑ
گیا۔ دو جگہ ٹرک اور ایک جگہ ویگن ریت میں پھنس گئی اور اس طرح ان کا خاصا وقت
گاڑیوں کو نکالنے میں ضائع ہو گیا۔ ہر ٹیلے کو پار کرتے ہوئے سعدی اپنی دوربین سے
عقب کا جائزہ لے رہا تھا اور ہر اونٹ سوار سے قریب تر ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس نے فاصلہ بتلانے والی سوئی دیکھی۔ اس کے اندازے کے مطابق
اب وہ نقشہ کی دوسری نشانی کے قریب پہنچ چکے تھے اور پھر تین بجے کے ذرا دیر بعد اس نے
دوسرا نشانہ دیکھ لیا۔

"دوسرا امتحان یہ سیاہ پردہ ہے جو صرف سورج کی دیوی کے...... نمودار ہونے کے بعد
کھلے گا۔" سعدی کو یہ جملہ یاد تھا اس لئے جیسے ہی وہ ایک اونچے ٹیلے پر پہنچے اس نے رکنے
کا اشارہ کیا اور دوربین نکال کر دیکھنے لگا۔ دور مغربی افق تک ایک سیاہ چٹان کی دیوار کا
سلسلہ پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ بلاشبہ یہی سیاہ پردہ تھا اور صبح کے ابھرتے ہوئے سورج سے
اس دیوار میں یقیناً کوئی نشان نظر آئے گا۔ انہیں ہر صورت سیاہ پتھروں کی اس پہاڑی کے
سامنے انتظار کرنا ہوگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ بدوی رہزنوں کے اونٹ بدستور تعاقب کر
رہے تھے۔ ان سے جنگ کرنا اب ناگزیر ہو گئی تھی۔ سوال صرف یہ تھا کہ کہاں اور کیسے؟

وہ آگے بڑھتے رہے، تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک ایسی لانبی سی وادی میں پہنچ گئے
جہاں دونوں سمت ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ نظر نہ آسکے۔ باہر نکل کر اس نے ابو طاہر کو اشارہ
کیا کہ وہ آگے بڑھتا رہے ٹرک میں اب صرف ابو طاہر رہ گیا تھا کیونکہ باقی سب نیچے اتر
گئے تھے۔ پندرہ بدوی ڈاکوؤں کے مقابلے میں وہ صرف پانچ افراد تھے۔ سعدی جانتا تھا
کہ ان میں صرف نظمہ اور عبدالغفور کو گوریلا جنگ کا تجربہ تھا۔ وارتھن پر تمام تر لاف زنی
کے باوجود زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ادھر ابو طاہر ٹرک پر تنہا تھا اور اسے چھاپہ مار

جنگ کا بالکل تجربہ نہ تھا۔ وہ سعدی کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ سعدی نے اپنی گاڑیوں کے ٹائروں سے بنے ہوئے راستے پر مخالف سمت کے ٹیلے کی ڈھلوان پر چڑھنا شروع کر دیا۔ نظمہ، عازم، وارثھن اور عبدالغفور اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بدوی ڈاکو اسی راستے پر تعاقب کرتے ہوئے اس ٹیلے کو پار کریں گے۔

۞......۞

اونٹ سواروں کے لئے خاموشی سے کہیں پہنچنا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ اونٹ کے نرم پنجے تو بے آواز ہوتے لیکن بھاگتے ہوئے بھی ان کے منہ سے بلبلانے کی آواز ضرور نکلتی رہتی ہے اس لئے ان کی آمد پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور ان بدوی ڈاکوؤں کے اونٹ تو جھلستے ہوئے ریگستان میں طویل سفر کر رہے تھے۔ اس لئے جیسے ہی وہ ریت کے ٹیلوں پر پہنچے سعدی کو خبر ہو گئی۔

سعدی دو ٹیلوں کے درمیان میں چھپا ہوا تھا۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور دوربین لگی ہوئی تھی اسپرنگ فیلڈ رائفل اس کے کاندھے سے لگی فائر کے لئے تیار تھی۔ رائفل اس کے ہاتھ کے برابر بھری رکھی تھی۔ اس کے پیچھے نظمہ گھٹنے کے بل ایک رائفل سے نشانہ لئے تیار بیٹھی تھی۔ عازم، ابو طاہر اور وارثھن دوسری جانب اپنی رائفلیں سنبھالے تیار بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں ٹیلوں کی بلندی پر اس جگہ لگی ہوئی تھیں جہاں سے بدوی قزاقوں کی آمد متوقع تھی۔

لیکن وہ ایک ساتھ نہیں آئے، وہ ریگستان کے تجربہ کار جنگجو تھے۔ صرف ایک ٹیلے کی بلندی پر پہنچا اور وہیں رک گیا۔ وہ نیچے وادی میں غور سے دیکھ رہا تھا اور کافی دیر بعد اس نے اپنے اونٹ کو نیچے کی جانب حرکت دی۔ وہ ٹائر کے نشانوں کے درمیان چلتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ وہ پستہ قد اور مضبوط جسم کا بدو تھا۔ روسی ساخت کی رائفل اس کے دونوں ہاتھوں میں فائر کے لئے بالکل تیار تھی۔ اس کی عقابی نگاہیں تیزی کے ساتھ ہر سمت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سعدی نے سانس روک لی۔ اس کا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ اس کے برابر نظمہ بھی ساکت بیٹھی تھی۔ بقیہ دو بدوی کچھ دیر بعد ٹیلے پر نمودار ہوئے اور ٹائروں کے نشان کے دونوں جانب فاصلہ رکھ کر نیچے اترنے لگے۔ صورتحال خراب ہوتی جا رہی تھی۔ حملہ آور علیحدہ علیحدہ اور مختلف سمتوں سے آ رہے تھے۔ اور پھر دو بدو اچانک نمودار

ہوئے۔ وہ مخالف سمت سے آ کر ٹیلوں کی چوٹی پر رک گئے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ جب وہ نیچے پہنچ گئے تب مزید دو بدو اوپر نظر آئے اور نیچے اترنے لگے۔ اس کے بعد مخالف سمتوں سے دو اور حملہ آور ٹیلوں کے اوپر پہنچے لیکن وہ وہیں رک کر نشیب کا جائزہ لینے لگے۔

اب ان کی تعداد نو ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی چار اور باقی تھے اور سب سے پہلے آنے والا سوار نیچے وادی میں اتر کر ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ سعدی نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ٹیلے پر کھڑے دونوں سواروں کو نشانہ بنانا چاہئے۔ ورنہ گولی کی آواز سنتے ہی وہ آڑ میں ہو جائیں گے۔ اس نے رائفل میں لگی ہوئی دوربین سے ایک نشانہ لیا اور دعا کرنے لگا کہ دوسرے کو عبدالغفور ٹھکانے لگا دے۔ آگے آنے والا سوار اب اس کی سمت دو تہائی فاصلہ طے کر چکا تھا۔ بقیہ چار سواروں کا اب تک کوئی پتہ نہ تھا۔ سعدی کی انگلی ٹریگر پر پہنچ گئی۔ اسے بار بار یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ بقیہ چار عقب سے ان کا گھیراؤ کریں گے اور اب وقت بالکل نہیں رہا تھا۔ آگے آنے والا سوار اب خطرناک حد تک قریب آ چکا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دونوں بدو مختلف سمتوں سے قریب آ رہے تھے اور کسی بھی لمحے ان کی نظر چھپے ہوئے سعدی ہاشمی اور ان کے ساتھیوں پر پڑ سکتی تھی۔

سعدی نے دوربین سے نشانہ لیا، سانس روکی اور فائر کر دیا۔ دھماکے کی آواز سے وادی گونج اٹھی۔ اونٹ سوار بدو کوہان سے اچھل کر ریت پر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا اور اسی لمحے عبدالغفور کی رائفل نے فائر کیا۔ ٹیلے پر کھڑا دوسرا اونٹ سوار منہ کے بل نیچے گرا اور پھر لڑھکا اور دوسرے ہی لمحے نظمہ کی رائفل سے مسلسل تین فائر ہوئے۔ سب سے آگے آنے والے اونٹ سوار کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس کے پیچھے آنے والے دونوں بدو پھرتی کے ساتھ اپنے اونٹ گھما ہی رہے تھے کہ عازم اور وارثھن کی آٹومیٹک رائفل نے دو برسٹ مارے اور ان کو ڈھیر کر دیا۔ بقیہ دو بدو واپس بھاگنے کے لئے تیزی سے مڑے لیکن ایک کو عبدالغفور نے ڈھیر کر دیا اور دوسرے پر سعدی نے فائر کیا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور وہ اچھل کر اپنے اونٹ کی گردن سے جھول گیا۔ کوہان کی آڑ کی وجہ سے وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن عبدالغفور نے پھرتی سے اس کے اونٹ پر فائر کیا۔ اونٹ، سوار دونوں گرے۔ بدو نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن عبدالغفور کی دوسری گولی اسے چاٹ گئی۔ سب

کچھ چشم زدن میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ہوا تھا۔ نو میں سے آٹھ سواروں اور اونٹوں کی لاشیں وادی میں بکھری پڑی تھیں۔ صرف ایک بدو مُردہ اونٹوں کی آڑ میں زخمی پڑا تھا اور اس کو نشانہ بنانے کے لئے اب چکر کاٹ کر عقب میں پہنچنا ضروری تھا اور اس کے لئے وقت درکار تھا جو سعدی اور اس کے ساتھیوں کے پاس اب باقی نہیں رہا تھا۔ چار اونٹ سوار بدو جواب تک نظر نہیں آئے تھے، عقب سے کسی وقت بھی حملہ کر سکتے تھے اور یہاں رکنا خود کو ان کی زد میں لا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ سعدی کو ویگن کی بھی فکر سوار تھی جو اب غیر محفوظ ہو چکی تھی۔ سعدی نے دونوں رائفلیں اٹھائیں اور جھکے ہوئے ان ٹیلوں کی سمت بھاگا جن کے درمیان اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ بھاگتے ہوئے اس نے دوسروں کو بھی تقلید کرنے کی ہدایت کی۔

وہ جہاں تک ممکن تھا، ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا دوڑتا رہا تھا۔ اور پھر وادی پار کر کے وہ ایک ٹیلے کی آڑ سے نکلا اور کھلی ہوئی جگہ پار کر کے ویگن تک پہنچنے کے لئے تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس لمحے داہنے سمت سے اچانک گولیوں کا ایک برسٹ آیا...... سعدی کے چاروں جانب گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بچ سکتا، ایک گولی اس کی پنڈلی میں لگی۔ وہ اچھل کر منہ کے بل گرا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے اُڑنے والی ریت اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی لیکن پھر بھی وہ پھرتی کے ساتھ پلٹا اور کروٹیں لیتا ہوا بیٹھ گیا۔ رائفل چھوڑ کر اس نے ایک ہاتھ سے آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کی اور آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ داہنے جانب ٹیلے پر اسے ایک اونٹ سوار کا دھندلا ہیولا نظر آیا۔ بدو کی رائفل سعدی کا خاتمہ کرنے کے لئے اٹھ چکی تھی۔ سعدی نے بدحواسی کے عالم میں اپنی رائفل اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اسی لمحے سعدی کے عقب کے ٹیلے سے نظمہ پھر سے باہر نکلی۔ اس کی رائفل سے دو برسٹ فائر ہوئے۔ ٹیلے پر کھڑے ہوئے حملہ آور کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے چلا آیا۔ سعدی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے ٹٹول کر رائفل اٹھائی اور تیزی سے کھڑا ہوا۔ پنڈلی میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ اور اگر وہ دونوں رائفلوں کا سہارا نہ لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ گولی ہڈی کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لیکن زخم سے خون بہت نکل رہا تھا۔ سعدی ہمت کر کے لنگڑاتا ہوا

اسٹیشن ویگن کی سمت لپکا۔ عبدالغفور جانے کہاں سے نکل کر آ گیا اور اسے ایک بازو کا سہارا دے کر آگے لے چلا۔ نظمہ اپنی رائفل سے ان کو کور کئے ہوئے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں بلندی پر دشمن کو تلاش کر رہی تھیں۔ اسی لمحے وارتھن اور عازم شفیقی بھی بھاگتے ہوئے آگے بڑھے۔

درد کی شدت سے سعدی نے دانت بھینچ رکھے تھے۔ حالانکہ اس کا زیادہ بوجھ عبدالغفور نے سنبھال رکھا تھا۔ نظمہ نے جس بدو کو ہلاک کیا اس کے بعد بھی ابھی تین حملہ آور باقی تھے اور ابھی ایک زخمی، مُردہ اونٹوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دو بدو اونٹوں کے قافلے کے پاس رہ گئے تھے۔ اس طرح بھی چھ دشمن مقابلہ کے لئے موجود تھے۔ بچنے کی امید اب ویگن کے سہارے باقی تھی۔ وارتھن سب سے پہلے ویگن تک پہنچا۔ دروازہ کھول کر وہ پھرتی کے ساتھ اندر داخل ہوا اور اسٹیئرنگ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ دوسرے دروازے سے عازم اچھل کر اس کے برابر بیٹھا اور دروازہ بند کر کے کھڑکی کا شیشہ ہٹایا تاکہ فائر کرنے میں دشواری نہ ہو۔ نظمہ نے پھرتی کے ساتھ پچھلا دروازہ کھولا اور عبدالغفور نے سعدی حشمی کو اندر دھکا دیا اور خود بھی اچھل کر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کر کے اس نے برابر والی کھڑکی کھولی اور پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ وارتھن نے گاڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا دی۔

اور جیسے ہی گاڑی کھلی جگہ پہنچی اس پر ہر سمت سے گولیاں برسنے لگیں۔ نظمہ، عازم اور عبدالغفور نے پھرتی کے ساتھ اپنے ہتھیار سنبھالے لیکن چونکہ حملہ آور نظر نہیں آ رہے تھے اس لئے فائر نہیں کیا۔ حملہ آور اب اونٹوں سے اتر کر ٹیلوں کی آڑ میں چھپے ہوئے فائر کر رہے تھے۔ گولیاں اسٹیشن ویگن کی باڈی سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھیں۔ اور اچانک ایک گولی عبدالغفور کی کان کی لو اڑاتی گزر گئی۔ کان سے نکلنے والا خون اس کی گردن پر بہنے لگا۔ درد اور غصے سے تلملا کر وہ حملہ آور کو تلاش کرنے لگا۔ سعدی نے اپنے سر کے رومال کو کس کر زخم پر باندھ لیا تھا لیکن ابھی تک تکلیف سے بے حال تھا۔ اس کے برابر دبکی ہوئی نظمہ کی نگاہیں ہر سمت حملہ آوروں کو تلاش کر رہی تھیں۔ وارتھن ٹرک کے چھوڑے ہوئے نشانات پر گاڑی کو پوری رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ نظمہ نے گھوم کر غصے میں کہا۔

"کسی ٹیلے کی آڑ میں پہنچنے کی کوشش کرو۔"

وارتھن نے پھرتی کے ساتھ گاڑی گھما کر بائیں جانب کے ٹیلے کی سمت رخ کیا۔ صرف تین حملہ آور فائرنگ کر رہے تھے اور اب چونکہ گاڑی کا رخ بدل گیا تھا اس لئے صرف پچھلا حصہ ان کی زد میں تھا۔ وہ ان کی زد سے تقریباً نکل چکے تھے کہ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور تظمہ کے رخساروں کے پاس سے گزرتی ہوئی وارتھن کی پشت میں پیوست ہوگئی۔ وارتھن کے لبوں سے ایک کراہ نکلی اور وہ اسٹیئرنگ پر لڑھک گیا۔ گاڑی بے قابو ہو کر چکرائی اور ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے میں گھستی چلی گئی اور اس کا انجن بند ہوگیا۔ عازم نے رائفل رکھی اور پوری قوت سے وارتھن کو ایک سمت گھسیٹنے لگا تاکہ اسٹیئرنگ سنبھال سکے۔ اب تک وہ حملہ آوروں کی براہِ راست زد میں تھے۔ عبدالغفور کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا لیکن اس نے غصے میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن تظمہ تاک تاک کر اطمینان سے ہر حملہ آور کی پوزیشن پر گولی چلا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے ان پر ہونے والی فائرنگ رک گئی۔ حملہ آور پھرتی کے ساتھ آڑ میں ہو گئے تھے۔ عازم شفیقی بالآخر وارتھن کو ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹائی۔ چند لمحے تک پہیے ریت میں پھنسے گھومتے رہے، لیکن پھر حرکت میں آئے اور گاڑی پیچھے ہٹی۔ لیکن اسی لمحے ایک گولی ونڈ شیلڈ کا شیشہ توڑتی ہوئی گزر گئی۔ یہ فائر وادی کے نیچے سے ہوا تھا اور اونٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے زخمی بدو نے کیا تھا۔

شیشے کے ٹکڑے لگنے سے عازم کا چہرہ زخمی ہو گیا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ غصے میں گالی بکتے ہوئے اس نے گاڑی کو گھمایا۔ اسی لمحے بلندی سے ایک پورا برسٹ گاڑی کے ریڈی ایٹر پر پڑا اور وہ چھلنی ہو گیا۔ گرم کھولتا ہوا پانی اچھل کر بہنے لگا۔ گاڑی اب ہچکولے لیتی ہوئی ڈھلوان کی سمت بڑھی اور حملہ آوروں نے ایک بار پھر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

''آگے چلتے رہو......'' سعدی نے چلا کر ہدایت کی۔ اسٹیشن ویگن پانی کا فوارہ اڑاتی آگے بڑھتی ہوئی ڈھلوان پر چڑھتی رہی۔ چاروں حملہ آور اب بھی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ گاڑی ٹیلے کی بلندی سے چند قدم دور اچانک کئی مرتبہ کھانسی اور بند ہو گئی۔ عازم شفیقی نے پھرتی کے ساتھ اپنی آٹومیٹک رائفل اٹھائی اور دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگا دی اور

جھک کر بھاگتا ہوا ٹیلے کی نوک کی آڑ میں آ گیا۔ عبدالغفور نے دونوں رائفلوں کے علاوہ جس قدر کارتوس ممکن تھے اٹھائے اور بھاگتا ہوا عازم شفیقی کے پاس پہنچ گیا۔ سعدی نے اپنی رائفل کاندھے پر ڈالی، کار سے فرسٹ ایڈ کا بکس اور پانی کی بوتل دوسرے ہاتھ میں لی اور لنگڑاتا ہوا ٹیلے کی آڑ میں پہنچ گیا اور ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ لے کر پوزیشن سنبھال لی۔ اس سے بہتر پناہ گاہ ان کو اس وقت نہیں مل سکتی تھی۔ بدوی یہاں پر ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی فائرنگ بند ہو چکی تھی البتہ کبھی کبھی ایک آدھ گولی ویگن کو نشانہ بنا لیتی تھی۔

تظمہ بھاگتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتلیں اور گولیوں کا ذخیرہ تھا۔ اس کی دونوں رائفلیں کندھوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ تظمہ نے سامان ریت پر رکھا اور رائفلیں اور کارتوس لے کر مخالف سمت کا مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئی۔ عازم شفیقی نے نبرے کونے پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ حملہ آور چھپے بیٹھے رہے۔ وہ شاید رات کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ دن کی روشنی میں سعدی اور اس کے ساتھی کہیں نہ جا سکتے تھے۔ وہ اب اس ٹیلے پر محصور ہو گئے تھے اور نیچے اترتے ہوئے حملہ آوروں کی گولیوں سے نہیں بچ سکتے تھے۔ سعدی کے زخموں سے خون بند ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دوا لگا کر اس پر دردکش دوا چھڑکی اور پلاسٹک اسپرے کر کے زخم بند کر دیا۔ اس کے بعد اس پر مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔ اس نے پہلی بار اطمینان کے ساتھ سانس لے کر سامنے دیکھا۔

وارتھن نیچے اترنے کی کوشش میں گاڑی سے گر کر ریت پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا لیکن زیادہ دیر کا مہمان نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس نے اذیت بھری نظروں سے سعدی کو دیکھا اور پھر کروٹیں لیتا ہوا اس کی سمت بڑھنے لگا۔ اس کی خون سے تر پشت پر ریت جمتی جا رہی تھی۔ عازم شفیقی بھاگ کر سعدی کے پاس آ گیا تھا اور حیرت اور استعجاب کے عالم میں وارتھن کو دیکھ رہا تھا جو سعدی کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ ریت کے ٹیلے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا اور ان کو مایوس اور غمزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے لب آہستہ سے ہلے۔

''پلیز...... مجھے...... بچا لو''

''اب کچھ نہیں ہو سکتا وارتھن!'' عازم شفیقی نے بڑی سفاکی سے بولا۔ ''تم ذرا دیر

کے مہمان ہو۔"

وارتھن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ کراہنے لگا تھا۔ اور پھر واقعی ذرا دیر بعد اس کی آواز اچانک رک گئی۔ سعدی نے نظریں اٹھا کر دیکھا، وارتھن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن حرکت بند ہو گئی تھی۔

تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ گہرا اندھیرا چھانے کے بعد اور چاند نکلنے سے پہلے کا وقت ان کے لئے یہاں سے نکلنے کے لئے بہترین ہوگا۔ یہ بات یقیناً بدوی حملہ آوروں کو بھی معلوم ہوگی اور وہ اس وقت کے لئے پوری طرح تیار ہوں گے۔ سعدی نے اپنی رائفل اٹھا کر اس میں دوبارہ کارتوس بھرے، اس کے بعد بوتل اٹھا کر پانی پیا اور پھر ریت سے ٹیک کر لیٹ گیا۔

✿......✿

ریگزار اب الخالی کی ایک تاریک رات بڑی بھیانک تھی۔ ہر سمت ہولناک سناٹا طاری تھا لیکن سعدی کو معلوم تھا کہ اس تاریکی میں اس کے دشمن کہیں گھات لگائے بیٹھے ہیں اور ذرا سی بھی آہٹ ملتے ہی اس پر حملہ کر دیں گے۔ لیکن اس نے دشمن کو حیرت زدہ کر کے شکست دینے کی ترکیب سوچ لی تھی...... دشمن کو یقین ہوگا کہ وہ بڑی احتیاط اور آہستگی سے نیچے اتریں گے اور گہری تاریکی کی سمت بڑھنے کی کوشش کریں گے کیونکہ ان کی اسٹیشن ویگن بالکل بے کار ہو چکی تھی۔

سعدی بھی جانتا تھا کہ اب ویگن سفر کے قابل نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ ڈھلوان پر ضرور چل سکتی ہے۔ عبدالغفور کے سہارے وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیر میں ٹیس اٹھی لیکن اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اسٹیئرنگ سنبھالا اور بریک ہٹا لیا۔ عبدالغفور، عازم اور نظمہ نے ویگن کو سائیڈ سے دھکیلنا شروع کیا۔ انہوں نے دروازے کھلے رہنے دیے تھے۔ ویگن آگے بڑھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ نیچے چھپے ہوئے حملہ آور جلد ہی ویگن کو حرکت کرتا دیکھ لیں گے لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی ہوگی۔ ڈھلوان ایسا سپاٹ تھا کہ جلد ہی ویگن کی رفتار تیز ہو گئی۔ نظمہ اچھل کر اگلی سیٹ پر آ گئی۔ عازم اور عبدالغفور نے پچھلی سیٹ پر چھلانگ لگائی۔ ویگن اب تیز رفتاری سے نیچے جا رہی تھی۔ سعدی نے اسٹیئرنگ مضبوطی سے سنبھال رکھا تھا۔ حملہ آ[illegible] نکل کر حملے کے لئے تیار ہو چکے

ہوں گے۔ گاڑی برق رفتاری سے لڑھکتی ہوئی جا رہی تھی۔

وادی کی ریت میں پہنچ کر اسٹیشن ویگن کی رفتار کم ہو گئی۔ اور پھر ریت کے ایک ڈھیر سے ٹکرا کر وہ رک گئی۔ نظمہ، عازم اور عبدالغفور کود کر باہر نکلے اور رائفلیں سنبھالے مختلف سمتوں میں پوزیشن لینے کے لئے لپکے۔ کسی بھی لمحے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو سکتی تھی۔ سعدی نے رائفل سنبھالی اور نرم ریت پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے دایاں پیر بچانے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن درد کی شدید ٹیس اٹھی اور وہ کراہ دباتا بڑی پھرتی سے رینگتا ہوا ویگن سے دور ہٹ گیا...... لیکن اب تک ایک بھی فائر نہیں ہوا تھا۔ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ کئی منٹ گزر گئے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ سعدی حیران تھا۔ تاریکی میں اس کی نگاہیں ہر سمت گھور رہی تھیں۔ دشمن کی یہ خاموشی بڑی وحشت ناک تھی۔

تقریباً بیس منٹ گزر چکے تھے۔ خاموشی سے سعدی کا دم گھٹنے لگا تھا کہ اچانک ویگن کے دائیں جانب ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ سعدی نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ رائفل کی نال بلند کی۔ اس کی بے چین انگلی ٹریگر دبانے کو تیار تھی۔ اچانک نظمہ کی آواز نے سناٹا توڑا۔

"گولی نہ چلانا...... سب ٹھیک ہے۔" اس نے چلا کر کہا۔

اور پھر جب وہ تاریکی سے برآمد ہوئی تو تنہا نہ تھی۔ اس نے چار اونٹوں کی مہاریں پکڑ رکھی تھیں۔ سعدی حیرت زدہ نگاہوں سے نظمہ کو گھور رہا تھا۔

"وہ سب مرے پڑے ہیں۔" نظمہ نے کہا۔ "سب کی موت خنجر سے واقع ہوئی ہے۔ ان کے اونٹ بندھے ہوئے کھڑے تھے۔ سعدی! تمہارا خیال صحیح تھا، ابراہیم بلادی کے قریبی حلقے میں کوئی غدار ضرور ہے۔"

سعدی چند لمحے خاموش رہا۔ "اسی لئے انہوں نے شروع سے ہمارا تعاقب نہیں کیا۔ انہیں وہ جگہ معلوم تھی جہاں چٹان پر نقش کندہ تھا۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ کر چھپ گئے تھے۔ اور اس کے بعد اطمینان سے ہمارے تعاقب میں چلے آئے۔ ہم کو وہم و گمان بھی نہ ہونے دیا۔"

"لیکن اب تو ہمیں معلوم ہو گیا۔" نظمہ نے کہا۔

"ہاں...... وہ میری حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ مجھے بچانے کے لئے انہوں نے اپنی موجودگی کا راز افشا ہونے کی بھی پرواہ نہ کی اور ان بدوؤں کو قتل کر دیا۔ انہیں اندازہ تھا کہ

اگر میں مر گیا تو وہ شیخ الجبل کا خزانہ کبھی نہ پا سکیں گے۔

سعدی نے اونٹ کی مہار پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ بیٹھ گیا۔ سعدی سوار ہو گیا۔ نظمہ بیٹھنے کے لئے آگے بڑھی۔ اسی لمحے عازم اور عبدالغفور بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعداد میں پانچ یا چھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ نظمہ نے ان کی سمت دیکھا۔

''بدوؤں کا انجام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اتنے بھی کافی ہیں۔''

''جلدی کرو...... ابو طاہر ہمارے انتظار میں پریشان ہوگا۔'' سعدی نے کہا۔

......

چاند کی روشنی میں ان کو ٹرک دور سے نظر آ گیا۔ ابو طاہر نے سعدی کو جو راستہ بتایا تھا، اسی پر چلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ سامنے ایک نیچا اور بڑا سا ریت کا ٹیلہ تھا۔ مغرب میں دور ایک سیاہ پہاڑ کا سلسلہ صاف نظر آ رہا تھا۔ سعدی حشمی نے دور سے ابو طاہر کو آواز دی۔ اسے خدشہ تھا کہ اونٹ دیکھ کر ابو طاہر فائرنگ نہ شروع کر دے۔ لیکن ٹرک سے نہ جواب ملا اور نہ ہی ابو طاہر باہر نکلا۔ سعدی نے دوبارہ چلا کر آواز دی۔ لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ ملا...... اور پھر اسے ٹیلے کے نیچے کوئی سفید سی چیز نظر آئی۔ قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا، وہ ایک دبلے پتلے نوجوان کی لاش تھی۔ اس کی سفید عبا خون سے تر تھی۔ عازم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر لاش کے سینے سے کپڑا ہٹایا۔ دل کے اوپر اس کے سینے پر شناختی نشان گدا ہوا تھا۔ سینے میں گولیوں کے تین سوراخ تھے۔ ابو طاہر نے مقابلے کی کوشش کی تھی۔

عبدالغفور اس ٹیلے سے آگے نکل گیا۔ وہ اونٹوں کے چھوڑے ہوئے نقش پا کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ سعدی وغیرہ بھی اسی سمت چلنے لگے۔ لیکن انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا...... ابو طاہر کی لاش ٹیلے کے دوسری جانب پڑی تھی۔ اسے لاش کہنا غلط تھا، اونٹوں کے ذریعے اس کے جسم کو روند کر بھرتہ بنا دیا گیا تھا۔ سعدی نے آنکھیں بند کر لیں اور چکرا کر زمین پر بیٹھ گیا...... جب طبیعت سنبھلی تو وہ لاش کی سمت دیکھے بغیر ٹرک کی جانب روانہ ہو گیا...... اس کا خدشہ ٹھیک نکلا، ٹرک کے انجن کو قطعی ناکارہ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن پانی اور کھانے کا ذخیرہ موجود تھا۔ فدائین نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اب سعدی اور اس کے ساتھی فدائین کو چھوڑ کر تیز رفتاری سے آگے نہیں جا سکتے تھے اور اب وہ آسانی سے ان کو نگاہ میں رکھ کر تعاقب کر سکیں گے۔ اس نے ہدایت کی کہ ابو طاہر کی لاش کو دفن کر دیا جائے...... جب

لاش دفن کر کے واپس آئے تو سعدی ریت پر نڈھال پڑا تھا۔

سعدی نے ان سے کہا کہ اب آرام سے ٹرک کے برابر سو جائیں اور صبح اس وقت روانہ ہوں جب تھکان دور ہو جائے۔ پے در پے واقعات اور دو ساتھیوں کی موت نے سب کو آزردہ اور نڈھال کر دیا تھا۔ انہوں نے اونٹ باندھ دیئے اور جلد ہی بے خبر سو گئے۔

لیکن سورج نکلنے سے قبل سعدی بیدار ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کروٹ لے کر اپنا رخ سیاہ پہاڑی کی سمت کر لیا تھا اور نیم خوابیدہ آنکھوں سے سامنے گھور رہا تھا۔ اور پھر جیسے ہی سورج پہاڑی کے عقب سے نمودار ہوا، اس کی سنہری کرنیں پہاڑی کے اندر بنے ہوئے ایک شگاف میں داخل ہوئیں۔ سعدی نے پہاڑی کے اندر پوشیدہ ایک دہانے کو دیکھ لیا جو سورج کی روشنی میں ایک دہکتا ہوا دائرہ سا معلوم ہو رہا تھا۔

سورج کی دیوی کے نمودار ہوتے ہی تاریک پردے کے درمیان خفیہ دروازہ کھل گیا تھا۔

نقشے کا اہم ترین راز سعدی نے معلوم کر لیا تھا...... اس نے کروٹ بدلی اور بے اختیار سو گیا۔

چار دن تک سعدی نے اسی جگہ قیام کیا اور اپنے زخم کے مندمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ چوتھے روز عازم شفیقی سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بالآخر پوچھ لیا۔

''تمہارا پیر اب ٹھیک ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں کب تک روانہ ہونا ہے؟''

''جب میں یہ محسوس کروں گا کہ سفر کے لئے تیار ہوں'' سعدی نے کہا۔ ''اتنی بے تابی کی ضرورت نہیں۔''

''کم از کم یہ تو بتا دو کہ اب کدھر جانا ہے؟'' عبدالغفور نے جھنجلا کر کہا۔

جواب دینے کی بجائے سعدی چہل قدمی کے لئے چل دیا تا کہ پیر کی سختی دور ہو جائے۔ اس پورے عرصے میں انہیں فدائین کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس سے ظاہر تھا کہ وہ دور چھپ کر دوربین سے نگرانی کر رہے ہیں۔ پانچویں صبح کو سعدی نے وہ آثار دیکھے جن کا وہ اب تک منتظر تھا۔

شام سے ہی ہوا کچھ کم ہو گئی تھی۔ آدھی رات کو اچانک بالکل بند ہو گئی اور آخری پہر سے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ صبح ہوئی تو افق پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اور جلد ہی طوفان

شروع ہو گیا۔ ہوا تیز ہوتے ہی ریت کے شیطانی بگولے رقص کرنے لگے۔ سعدی کے
لبوں پر مسکراہٹ تھی لیکن وہ انتظار کرتا رہا۔ دو تین گھنٹوں بعد طوفان نے اتنی شدت اختیار
کر لی کہ ان کو کھانے کے لئے ٹرک کے اندر پناہ لینی پڑی۔ پھر اس نے کہا۔

''اب روانگی کی تیاری کرو۔''

''اس طوفان میں؟'' عازم نے حیران ہو کر پوچھا۔

سعدی نے جواب دینے کی بجائے اونٹ پر زین باندھنا شروع کر دی۔ انہوں نے
ضروری سامان لادا، پانی کی وافر مقدار رکھنے کے باوجود ٹرک میں پانی کا ذخیرہ باقی رہا
جو انہوں نے واپسی کے لئے چھوڑ دیا۔ وہ جب روانہ ہوئے تو طوفان اپنے شباب پر تھا۔
سعدی نے جنوب کا رخ کیا۔ اڑتی ہوئی گرد میں پچاس قدم دیکھنا بھی ممکن نہ تھا لیکن
آگے بڑھتے رہے۔ عبدالغفور سب سے پیچھے تھا۔ سعدی رہنمائی کر رہا تھا۔ وقت اور فاصلے
کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ سعدی نے کمپاس دیکھ کر رخ مشرق کی سمت کر دیا۔ ریت کے بگولوں
سے اونٹ بے قابو ہونے لگے تو سعدی نیچے اتر آیا اور اونٹ کی مہار پکڑ کر چلنے لگا۔ دوسروں
نے بھی تقلید کی۔ طوفانی ہوا اتنی تیز تھی کہ ریت کے ٹیلے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اور
ہوا ان کی پشت کی جانب سے آ رہی تھی اس لئے کچھ آرام مل گیا تھا۔ اس طوفان میں سعدی
اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنا ممکن نہ تھا اور ان کے قدموں کے نشانات بھی پلک جھپکتے
مٹ جاتے۔ اس لئے ان کے ذریعے یہ بھی سراغ نہیں مل سکتا تھا کہ وہ کدھر گئے ہیں۔
وہ ایک لمحہ رکے بغیر چلتے رہے۔

طوفان میں چلتے چلتے سعدی کے پیر میں پھر تکلیف ہونے لگی تھی لیکن وہ پرواہ کئے بغیر
چلتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ موقع نکل گیا تو مقصد میں کامیابی ممکن نہ رہے گی۔ اور
جب اچانک پہاڑی کا سیاہ ہیولا نظر آنے لگا تو سعدی نے محسوس کیا کہ ہوا دھیمی پڑنے لگی
ہے۔ زمین بھی اب سخت ہوتی جا رہی تھی۔ گرد کے گہرے بادل اب بھی فضا میں اس طرح
چھائے ہوئے تھے کہ ان کے دیکھے جانے کا کوئی امکان باقی نہ تھا۔ اور پھر تقریباً ایک میل
کی لمبائی میں پھیلی ہوئی پہاڑی کا سلسلہ بالکل سامنے آ گیا۔ سعدی ہر صبح سورج طلوع
ہوتے وقت اس سیاہ پتھر کی پہاڑی کو دیکھتا رہا تھا۔ بلندی پر پوشیدہ راستہ اب اس کو
ذہن نشین ہو چکا تھا۔

وہ داہنے جانب والی چوٹی کی سمت بڑھنے لگا۔ اب وہ ڈھلوان پر چڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد طوفان تھم گیا لیکن فضا میں اتنی گہری گرد چھائی ہوئی تھی کہ ان کے دیکھے جانے کا خدشہ بالکل نہ تھا۔ پہاڑی میں جگہ جگہ شگاف تھے۔ وہ چڑھتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک تنگ راستہ درے کی طرح نظر آرہا تھا۔ سعدی اونٹ کو لے کر اس میں داخل ہو گیا۔ کچھ دور چل کر وہ ایک طویل گھاٹی میں پہنچ گئے جس کے دونوں سمت پہاڑ کی بلند دیوار تھی۔ پیچ وخم کھاتی ہوئی اس گھاٹی کا راستہ باہر سے نظر آنا ممکن نہ تھا۔ وہ یہاں دشمن کی نگاہ سے محفوظ تھے۔ ایک چٹان کے پاس پہنچ کر سعدی بیٹھ گیا۔ اب اس میں چلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر گھاٹی کافی کشادہ ہو گئی تھی۔ پہاڑی کے اوپر جانے والی ڈھلوان میں چھجے کی سی سیڑھیوں کی طرح جگہ جگہ پتلی چٹانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سعدی نے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھائی بڑی دشوار گزار تھی اور اونٹ ساتھ ساتھ۔ اس لئے ان کو چکر کاٹ کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ ابھی چوٹی دور تھی کہ روشنی اچانک غائب ہو گئی۔ ڈھلوان پر ایک ہموار جگہ پر انہوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور اونٹوں کو اچھی طرح سیراب کرنے کے بعد باندھ دیا۔ یہ رات ان کو اسی جگہ گزارنا تھی۔

صبح کا اجالا پھیلنے سے کافی پہلے سعدی چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ”کوئی بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے؟“ قریب لیٹی ہوئی نظمہ نے پوچھا۔ سعدی نے گردن ہلائی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ نظمہ کب سے جاگ رہی تھی اور اس نے کیا خواب دیکھا تھا۔ سعدی نے دوربین اٹھائی اور چٹانوں کو پھلانگتا ہوا گھاٹی کی دیوار پر اس جانب چڑھنے لگا جدھر سے وہ اندر داخل ہوئے تھے۔ جب وہ بلندی پر پہنچا تو خاصا اجالا ہو چکا تھا۔ ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور نیچے دیکھنے لگا۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

گھاٹی کے اندر چار اونٹ داخل ہو رہے تھے...... ان کے سواروں کی سفید عبا صاف نظر آرہی تھی۔

لیکن یہ ناممکن تھا...... کسی کے لئے اس طوفان میں ان کا تعاقب کرنا ممکن نہ تھا...... اور پھر کسی کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ اس گھاٹی میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ

لوگ یہاں پہنچ گئے تھے۔ سعدی کی عقل حیران تھی۔ کیا واقعی کوئی روحانی قوت فدائین کی رہنمائی کررہی تھی...... یا معاملہ کچھ اور تھا؟"

"ہمیں حملہ کر کے انہیں ختم کر دینا چاہیے۔" عازم شفقی نے غصے میں کہا۔

ان سب کو اس بات کا غصہ تھا کہ شدید طوفان میں اتنا تکلیف دہ سفر کرنے کے باوجود ان لوگوں نے ان کا سراغ لگا لیا تھا۔ مسلسل سفر، ساتھیوں کی موت اور خطرے کے ہر لمحہ احساس نے نظمہ کے علاوہ سب کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ سعدی نے کہا۔ کہ مناسب وقت اور موقع آنے پر حملہ کرنا درست ہوگا۔ انہوں نے اپنے اونٹ کھولے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

دوپہر تک وہ اوپر پہنچ گئے پہلے انہوں نے عقب میں دیکھا فدائین کی جھلک کہیں نظر نہ آئی۔ اس کے بعد انہوں نے سامنے اور نیچے دیکھا...... وہ تقریباً بیس میل دور واقع ایک بڑے سے آتش فشاں پہاڑ کے کنارے تھے جو صدیوں پہلے اس علاقے میں پھٹا تھا۔ لاوے کی سبز اور جلے ہوئے پتھر کی سیاہ چٹانوں کا سلسلہ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا اور اب بھی آتش فشاں مردہ نہیں ہوا تھا دھوئیں کے ہلکے بادل کہیں کہیں سے اٹھ رہے تھے۔ وہ جس سیاہ پہاڑی پر کھڑے تھے اس پر جمے ہوئے لاوے کی بعض چٹانیں چمکتے ہوئے میناروں کی طرح لانبی نوکیلی اور چکنی تھیں اور یہ بھی آتش فشاں سلسلے کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ سعدی نے نیچے دیکھا تو تقریباً نصف میل کے فاصلے پر نیچے ایک چھوٹی چوٹی تھی غور سے دیکھنے پر اس کے اندر بنی ہوئی دراڑوں سے رہ رہ کر فوارے کی طرح بھاپ نکلتی نظر آ رہی تھی۔ سعدی نے اسی جانب اترنا شروع کر دیا۔ اسے نقشے کی تحریر کا تیسرا جملہ یاد آ رہا تھا۔

"تیسرا امتحان آگ کے اندر واقع ہے...... جو ایمان نہیں رکھتے جل کر خاکستر ہو جائیں گے...... ایمان والوں کو جنت کا راستہ یاد ہے۔ وہ بے خطر آگ کے دریاؤں سے گزر کر راستہ تلاش کرلیں گے۔"

ڈھلوان کے اختتام پر وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں دور تک کھولتے ہوئے لاوے کی دراڑیں تھیں لیکن یہیں کہیں بلندی پر وہ خفیہ راستہ تھا جس کے ذریعے وہ محفوظ طریقے منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ سعدی نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے خبردار کر کے وہیں رکنے کو کہا اور ہر سمت غور سے دیکھنا شروع کی۔ آتش فشاں کے درمیانی حصے

بالکل مخالف سمت میں پہاڑی کے کگر پہ کچھ دھندلے سے نشانات تھے۔ اس نے دوربین لگا کر دیکھنا شروع کیا۔ چٹان پہ ایک عجیب سا نشان کھدرا ہوا تھا۔ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس سے کچھ دور اندرونی چھجے پر ایک اور نشان تھا۔ وہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکا اور اندر بائیں جانب کے نشان پر اس کی نگاہ جم کر رہ گئی۔ اس پر نشان بنا ہوا تھا اور بالکل یہی نشان سعدی نے قلعہ الموت میں اس محراب دار دروازے پر بنا ہوا دیکھا تھا جس سے گزر کر وہ جنت کے اندرونی حصے میں پہنچا تھا۔

"ایمان والوں کو جنت کا راستہ یاد ہے...... وہ آگ کے دریاؤں سے بے خبر گزر کر راستے تلاش کرلیں گے۔" اب اس جملے کا مطلب اس پر واضح ہو گیا تھا۔

سعدی آگے بڑھتا ہوا اس نشان کے عین سامنے پہنچ گیا اور یہاں کھولتے ہوئے لاوے کے درمیان ایک ٹیلا سا راستہ بنا ہوا تھا جس کی سطح سخت نظر آ رہی تھی۔ سعدی نے سب کو احتیاط سے اپنے پیچھے چلنے کی ہدایت کی اور اس راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ وہ راستے کے بالکل درمیان چل رہا تھا اور اونٹ کی مہار مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور ایک سیدھی قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کہیں کہیں سطح نرم تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اندر دھنس جائیں گے لیکن وہ بخیریت گزر جاتے ان کے دونوں جانب رہ رہ کر تیز گندھکی بھاپ کے فوارے اچانک ابل پڑے۔ کئی جگہ ان کی آواز سے بھڑک کر اونٹ بے قابو ہوئے لیکن انہوں نے سنبھال لیا۔ خوف زدہ اونٹ زور زور سے بلبلا رہے تھے۔ درمیان میں رک کر سعدی نے دوربین سے عقب میں دیکھ کر سمت کا تعین کیا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔ وہ پہاڑی کے دوسرے سرے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے اچانک ان کے راستے کے عین درمیان ایک دراڑ پیدا ہونے لگی۔ سعدی کے گزرنے کے بعد وہ کچھ چوڑی ہوتی نظر آئی۔ نظمہ نے بھی پھرتی سے اسے پار کر لیا اور پھر عازم اور عبدالغفور بھی بخیریت گزر گئے۔ چند منٹ بعد ہی وہ اس ڈھلوان پر پہنچ گئے جس کی مضبوط سطح کے اوپر والے چھجے پر وہ نشان بنا ہوا تھا۔ جس کی سیدھ میں انہوں نے آگ کے دریا کو پار کیا تھا۔

سعدی نے مڑ کر دیکھا اور دوربین سے جائزہ لیا۔ فدائین کا کہیں پتہ نہ تھا وہ اتنی جلدی اوپر پہنچ نہیں سکتے تھے اور اگر انہوں نے راستے کا اصل راز جانے بغیر اس حصے کو پار کرنے کی کوشش کی تو دہکتے ہوئے لاوے میں گر کر بھسم ہو جائیں گے۔ لیکن سعدی کو نجانے کیوں

یقین تھا کہ ایسا نہ ہوگا۔

آتش فشاں کے خاتمے کے بعد جس ہموار جگہ پر وہ کھڑے تھے اس کے ہر سمت لاوے کی چٹانوں کی بھول بھلیاں سی پھیلی ہوئی تھیں۔ سعدی نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور ہر سمت نظر دوڑا کر اگلی نشانی تلاش کرنے لگا نقشے کے الفاظ اسے یاد تھے۔

''اس کے بعد آسمانی دیوی اشارہ کرتی ہے......'' سعدی نے نگاہیں اٹھائیں اور بلند چوٹیوں کو دیکھنے لگا۔ جو دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ''ایمان والوں کے لئے دیوی کے خنجروں کے درمیان راستہ موجود ہے۔'' سعدی کی نگاہیں ان دو بلند چوٹیوں پر مرکوز تھیں جن کی نوکیں خنجر کی طرح آسمان کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے اچھل رہا تھا...... اس نے حسن بن صباح کے مقبرے کا راستہ دریافت کر لیا تھا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہر سمت پھیلی ہوئی نوکیلی چٹانوں کے درمیان سے اوپر چڑھنے لگا لیکن جلد ہی راستہ اتنا ڈھلوان ہو گیا کہ پیر پھسلنے لگے اور اونٹوں کے لئے اس پر چڑھنا ممکن نہ رہا۔ انہوں نے ایک سایہ دار جگہ پر اونٹ باندھ دیئے اور روانہ ہونے سے پہلے کافی اسلحہ اور کھانے پینے کا ذخیرہ ساتھ لے لیا۔ راستہ اتنا دشوار گزار تھا کہ انہیں ہر قدم سنبھال کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی ان کو لمبا چکر کاٹ کر اوپر چڑھنے کا راستہ تلاش کرنا پڑتا تھا۔ لاوے کی چکنی چٹانوں کی بنا پر قدم جمانا بہت دشوار ہوتا تھا۔ مسلسل چڑھائی نے ان کو تھکا دیا۔ اس لئے جب وہ ایک چوڑی اور ہموار چٹان کے چھجے پر پہنچ گئے تو سعدی حشمی کچھ دیر آرام کے لئے رک گیا۔ اس نے دُوربین اٹھا کر نیچے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ وہ پانچ فدائین بھی اسی راستے پر چلتے ہوئے آ رہے تھے جس کو سعدی حشمی اور اس کے ساتھیوں نے پار کیا تھا۔

سعدی حشمی مسکرا دیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ فدائیوں سے جان چھڑانا ممکن نہیں ہوگا۔ انہوں نے پھر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھائی ہر لمحے دشوار تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور بالآخر وہ اس جگہ پہنچ گئے۔ نیچے سے نظر آنے والی خنجر نما نوکیلی چوٹیاں دو اچھی خاصی پہاڑیاں ثابت ہوئی تھیں جو کئی فرلانگ کی چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نقشے کی آخری سطر کے مطابق ''اب راستہ نیچے اترتا'' تھا۔ سعدی حشمی نے پہاڑی کی دوسری جانب نشیب میں جھانکا، ڈھلوان کے خاتمے پر ایک چھوٹی سی ٹیلہ نما چوٹی تھی جس کا سبز پتھر دھوپ میں

چمک رہا تھا۔ نقشے کی اگلی سطر کے مطابق اشارہ تھا کہ سبز دیوار کے نیچے پہلے ستارے کے طلوع ہونے کا انتظار کرو۔ لیکن قلعہ الموت میں یہ سطر کاغذ کے اس حصے میں چھپ گئی تھی جس پر سایہ پڑ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ جھوٹا اشارہ تھا جو گمراہ کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ جس شخص کو حسن بن صباح کی جنت کا راز نہیں معلوم تھا وہ دھوکا کھا کر نشیب میں اتر جائے گا۔ سعدی حشمی نے پہاڑی کے کنارے بائیں سمت چلنا شروع کر دیا۔ عبدالغفور اس کے ساتھ تھا۔ وہ چٹانوں اور پتھروں کے درمیان چکر کاٹتے ہوئے جب اپنی جگہ پر واپس آئے تو سورج ڈھل چکا تھا۔ سعدی حشمی نے دوسری پہاڑی کے گرد چلنا شروع کر دیا اور دوسری جانب بھی انہوں نے کوئی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ سعدی حشمی کو ایک سرنگ نما غار کا دہانہ نظر آیا جو پہاڑی کی بالکل تہہ میں تھا۔ سعدی حشمی کو یاد آیا کہ جڑواں چوٹیوں کے دامن تک پہنچنے سے ذرا دیر قبل بھی اس نے ایک باہر نکلی ہوئی چٹان کے نیچے بالکل ایسا ہی دہانہ دیکھا تھا۔ اس وقت اس پر توجہ دیئے بغیر وہ اوپر آ گئے تھے۔ لیکن اب اسے نقشے پر بنا ہوا وہ نشان یاد آ گیا۔ حارث سلیمی اور ابراہیم بلادی دونوں نے اس نشان کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ پہاڑ کے اندر کوئی مقام یا مقبرے کے دو راستے ہیں اور نقشے کی تحریر کی آخری سطر بھی یہ تھی کہ امام کے حضور پہنچنے کے لئے دو راستے ہیں، دونوں بلندی پر اور دشوار گزار ہیں لیکن دوسرے کے مقابلے میں ایک آسان اور بہتر ہے...... وہ نیچے والے دہانے کو پہلے دیکھ چکے تھے اور یہ بلندی پر واقع دوسرا دہانہ تھا۔

''یہی وہ جگہ ہے۔'' بالآخر سعدی حشمی نے ان کو بتا دیا۔ سب حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ اور پھر سب کی نگاہیں غار کے تاریک دہانے پر مرکوز ہو گئیں۔

سعدی حشمی نے اپنے تھیلے سے دو ٹارچیں نکالیں۔ عازم شفقی نے ایک ٹارچ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر دہانے کی سمت قدم بڑھایا۔ نظمہ نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''ٹھہرو! ہم میں سے کسی ایک کو باہر رک کر نگرانی کرنی چاہیئے۔'' نظمہ نے کہا۔ ''اگر ہم سب کے اندر چلے جانے کے بعد وہ یہاں پہنچ گئے تو ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔''

عازم شفقی نے غصے سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''کچھ بھی ہو، میں پہرہ دینے کے لئے نہیں رکوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اندر جا رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے اس کام کے لئے عبدالغفور مناسب ترین شخص ہے۔'' سعدی حشمی نے

عبدالغفور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

عبدالغفور نے پھرتی کے ساتھ اپنی رائفل دونوں ہاتھوں میں سنبھال لی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ان کو دیکھتے ہی فائرنگ شروع کردوں گا۔'' اس نے کہا۔

''شاباش......'' سعدی حشمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم فائرنگ کی آواز سنتے ہی تمہاری مدد کو پہنچ جائیں گے۔''

✡......✡

عازم شفیقی آگے چل رہا تھا۔ نظمہ اس کے پیچھے تھی۔ آخر میں سعدی حشمی تھا۔ سرنگ کا راستہ ڈھلوان تھا اور پہاڑی کے اندر چلا گیا تھا۔ سطح چکنی تھی جس پر پیر پھسل رہے تھے۔ وہ مسلسل نشیب کی سمت جا رہے تھے۔ لیکن آگے جا کر سرنگ تنگ ہوگئی۔ بعض جگہ تو ان کو گھٹنوں کے بل چل کر اس چکردار سرنگ سے گزرنا پڑا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، فضا میں نمی اور خنکی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ آنتوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اس راستے پر گزرتے ہوئے ان کی آواز گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ زمین کی تہہ میں چلے جا رہے ہیں۔ اور پھر اچانک وہ ایک کشادہ جگہ پہنچ کر رک گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں ان کو ایک تاریک کنوئیں کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ عازم شفیقی نے ٹارچ کی روشنی دہانے کے اندر پھینکی لیکن وہ اتنا گہرا تھا کہ روشنی تہہ تک نہیں پہنچ سکی۔ سب پریشانی کے عالم میں رک گئے۔

لیکن سعدی حشمی نے کنوئیں کے دہانے کے اوپر چٹان میں ایک پتلا سا شگاف تلاش کر لیا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے اس جگہ پہنچے تو ایک تنگ راستہ نظر آیا کہ آدمی بھی بمشکل اس سے گزر سکتا تھا۔ ان کے لئے اس میں داخل ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ راستہ دائیں جانب گھوم کر نیچے چلا گیا تھا۔ وہ اس پر چلتے ہوئے نیچے جا رہے تھے۔ سعدی حشمی کو اب یقین ہوگیا تھا کہ فدائین اپنے شیخ کا تابوت اس دوسرے دہانے سے اندر لائے ہوں گے جو پہاڑی کے نیچے نظر آیا تھا کیونکہ اس راستے سے تابوت لے جانا ناممکن تھا۔ یہ پتلا راستہ نم تھا اور اندر کی ہوا ٹھنڈی تھی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں...... اور پھر اچانک ان کا سفر تمام ہوگیا۔

وہ ایک بہت بڑے گول سے غار میں کھڑے تھے جس کی چھت میں گنبد نما سوراخ اوپر تک چلا گیا تھا۔ نیلے اور چمکیلے پتھر کا یہ غار قدرت کا ایک کارنامہ تھا اور آتش فشاں کے

دھماکے کے نتیجے میں خود بخود وجود میں آیا تھا۔ کنوئیں کی تہہ میں ایک چبوترہ تھا جو تقریباً دو فٹ اونچا تھا۔ اسے انسانی ہاتھوں نے کاٹ کر ہموار کیا تھا اور اس کے بالکل درمیان ایک سیاہ رنگ کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ آبنوس کے اس تابوت پر ہاتھی دانت کا خوبصورت کام تھا۔

عازم شفیقی کے لبوں سے مسرت کی گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی۔ وہ دیوانہ وار لپکا۔ اس نے تابوت کے کنڈے میں لگے ہوئے تالے کو ہاتھ لگایا۔ تالا اس کے ہاتھ میں آ کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔

صدیوں پرانا تالا گل چکا تھا۔ سعدی حشمی نے آہستہ سے ڈھکنا کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ عازم شفیقی کے بے تاب ہاتھوں نے زور لگایا۔ ڈھکنا اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ اب ان کے سامنے تابوت کھلا ہوا تھا......

ڈرتے ڈرتے انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں اندر جھانکا...... شیخ الجبل کے جسم کا ڈھانچہ آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

خوف سے کانپ کر وہ پیچھے ہٹے۔ لیکن حرص و طمع نے پھر مجبور کیا۔ ڈرتے ڈرتے انہوں نے پھر تابوت کے اندر جھانکا...... اور تب انہوں نے دیکھا کہ وہ جسے آنکھیں سمجھ رہے تھے، وہ دو سرخ رنگ کے یاقوت تھے جو آنکھوں کے حلقوں میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن تابوت میں ڈھانچے کے علاوہ کچھ نہ تھا...... نہ ہیرے نہ جواہرات اور نہ وہ خزانہ جس کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے۔

نظمہ نے سوالیہ نگاہوں سے سعدی حشمی کو دیکھا...... سعدی حشمی نے سر ہلایا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ فدائین تابوت یہاں رکھ گئے اور ہیرے جواہرات سب خود لے کر چلے گئے۔''

چند لمحے وہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہے جیسے ان کو یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ حقیقت ہے۔ پھر اچانک عازم شفیقی غصے میں دھاڑا۔

''خدا غارت کرے ان کو۔'' اس نے کہا اور غضب ناک انداز میں اس نے تابوت میں ہاتھ ڈال کر دونوں زمرد آنکھوں سے نکال لئے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''یہ زمرد بھی لاکھوں سے کم نہیں ہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

سعدی حشمی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ عازم شفیقی اچھل کر پیچھے ہٹا۔ اس کا ہاتھ پھرتی

کے ساتھ اپنے پستول پر گیا۔ سعدی حشمی کا ایک ہاتھ آگے پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے سے اس نے ایک ٹارچ پکڑ رکھی تھی جس کی روشنی عازم شفقی پر پڑ رہی تھی۔ لیکن عازم شفقی نے پستول نہیں نکالا کیونکہ نظمہ کی رائفل اسے پہلے ہی زد میں لے چکی تھی۔

"تم مجھے نہیں مار سکتے۔" عازم شفقی نے جنونی انداز میں قہقہہ لگایا۔ "یہ نہ بھولو کہ تمہیں ابھی ضرورت ہے...... باہر فدائین تمہارے منتظر ہیں......"

"اسی لئے بہتر ہے کہ عقل سے کام لو...... زمرد نظمہ کو دے دو۔" سعدی حشمی نے سرد لہجے میں کہا۔

عازم شفقی چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے ایک زمرد نظمہ کو دے دیا۔ "ٹھیک ہے...... لیکن ایک زمرد میرے پاس رہے گا تاکہ تم موقع پا کر میرا کام نہ تمام کر سکو۔"

وہ واپسی کے لئے بڑھے...... سعدی حشمی نے فوراً کہا۔ "ٹھہرو...... واپسی کے لئے ہم دوسرا راستہ اختیار کریں گے...... یہ سامنے والی سرنگ پہاڑی کے نیچے نکلتی ہے۔" اس نے اشارے سے بتایا۔

عازم شفقی اور نظمہ اس راستے کی سمت بڑھے۔ سعدی حشمی ان کے پیچھے چند قدم بڑھا، پھر رک کر بولا۔ "تم چلو...... میں تابوت کو ڈھانپ دوں۔ لاش کھلی چھوڑنا بری بات ہے۔"

چند منٹ بعد سعدی حشمی ان سے آن ملا۔ یہ راستہ کشادہ بھی تھا اور صاف بھی۔ ذرا دیر بعد وہ غار کے دہانے سے باہر پہنچ گئے۔ سعدی حشمی نے ان کو رکنے کا اشارہ کیا اور رائفل سنبھال کر اس نے چوٹی کی سمت دیکھا۔ پھر دوربین لگا کر جائزہ لیتا رہا۔

"وہ ابھی اوپر ہی ہیں۔" سعدی حشمی نے کہا۔ "ان کو تابوت تک پہنچنے میں کم از کم آدھ گھنٹہ لگے گا۔ اسی لئے ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہئے۔"

"لیکن عبدالغفور......؟" نظمہ نے چونک کر پوچھا۔

"عبدالغفور کی فکر نہ کرو۔" سعدی حشمی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہے۔"

"کیا...... کیا مطلب؟" نظمہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "کیا وہ...... اوہ میرے

خدا...... تو کیا ابراہیم بلادی کی جاسوسی وہی کرتا رہا ہے؟"

"ہاں...... عبدالغفور بلاشبہ فدائین میں سے ہے۔" سعدی حشمی نے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو گھاٹی تک ہمارا تعاقب ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ عبدالغفور دانستہ سب سے پیچھے چلتا رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کے لئے یقیناً کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جو ہم نہیں دیکھ سکے۔ لیکن اس کی مدد کے بغیر وہ یہاں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس طوفان میں کسی کے لئے ہمارا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔"

نظمہ نے پریشانی کے عالم میں اسے دیکھا۔ "لیکن اگر تمہارا شبہ غلط ہوا تو......؟"

"میرا شبہ غلط نہیں ہے نظمہ! تم عبدالغفور کو جانتی ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ فدائین بلا کسی مقابلے کے اس پر قابو پا سکیں؟ لیکن ہم نے ایک گولی بھی چلنے کی آواز نہیں سنی۔"

عازم شفقی نے جنونی انداز میں قہقہہ لگایا۔ "چلو اچھا ہوا...... ایک حصہ اور کم ہو گیا۔"

نظمہ کو اس انکشاف سے صدمہ پہنچا تھا۔ سعدی حشمی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور پھر خاموشی سے نیچے اترنے لگی۔ ان کے اونٹ یہیں بندھے ہوئے تھے۔ سعدی حشمی نے روانہ ہوتے وقت چوتھا اونٹ بھی ساتھ لے لیا تاکہ فدائین کو عبدالغفور کے لئے سواری کی دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔

ہر سمت چٹکی ہوئی چاندنی میں ان کو سفید عبائیں صاف نظر آ رہی تھیں...... اور ان کی تعداد اب پانچ کی بجائے چھ تھی...... سعدی حشمی کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

وہ اس وقت پہاڑی کی ڈھلوان پر چٹانوں کی آڑ میں مورچہ سنبھالے بیٹھے تھے۔ یہ وہی پہاڑی تھی جہاں مقبرے کی سمت تنگ راستہ جاتا تھا جس کے دونوں جانب کھولتا ہوا لاوا تھا۔ فدائین اسی راستے سے واپس آ رہے تھے۔ سعدی حشمی نے نظمہ کی سمت دیکھا، اس نے گردن ہلا کر اشارہ کیا۔ عازم شفقی نے فدائین کو زد میں لے رکھا تھا۔ ان کو یہاں پہنچے ہوئے بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے اونٹ گھاٹی کی جانب والی ڈھلان پر چھپا دیئے تھے۔ سعدی حشمی کی دوربین آنے والوں پر مرکوز تھی۔ اس نے اپنی اسپرنگ فیلڈ رائفل اٹھائی اور تیار ہو کے بیٹھ گیا۔ اب فدائین نے دو تہائی راستہ طے کر لیا تھا۔ سعدی حشمی نے آسمان پر پھیلے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کو فکرمند نظروں سے دیکھا لیکن وہ ابھی چاند سے دور تھے۔

''اب وہ میری زد میں ہیں۔'' عازم شفقی نے سرگوشی کی۔ لیکن سعدی حشمی نے اشارے سے اسے روک دیا...... وہ ابھی چند لمحے اور انتظار کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر اس نے درمیان والے پستہ قد کا نشانہ لے کر پہلا برسٹ فائر کیا...... پستہ قد ابھی گرنے بھی نہ پایا تھا کہ نظمہ اور عازم شفقی نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اونٹ اور فدائین گولیوں کی زد میں کٹ کر گرے۔ جو اونٹ زندہ بچ گئے وہ دہشت زدہ ہو کر بھاگے اور بدحواسی میں راستہ چھوڑ کر اس دراڑ میں گرے جس میں لاوا بھرا ہوا تھا۔ وہ اندر دھنستے چلے گئے۔ ان کی چیخوں کے ساتھ فضا میں گوشت جلنے کی تیز بو پھیلنے لگی۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ لیکن فدائین میں سے تین اب بھی باقی رہ گئے تھے۔ ایک تو مرے ہوئے اونٹ کی آڑ میں چھپ گیا اور وہاں سے گولیاں برسانے لگا۔

دوسرا بے تحاشہ مقبرے والی پہاڑی کی سمت بھاگا...... لیکن سعدی حشمی کے تیسرے فائر نے اسے ڈھیر کر دیا۔ تیسرا حیرت انگیز طور پر اس پہاڑی کی سمت بھاگا جس پہ سعدی حشمی اور اس کے ساتھی چھپے ہوئے تھے...... وہ مسلسل فائر کر رہا تھا۔

عازم شفقی اور نظمہ نے بار بار فائر کیا لیکن وہ جھکا ہوا چھلاوے کی طرح لہراتا ہوا بھاگ رہا تھا اس لئے پھر بھی بچتا چلا آ رہا تھا۔ سعدی حشمی نے پھرتی کے ساتھ رائفل کی نال اس کی سمت گھمائی اور قریب تھا کہ فائر کرتا لیکن اچانک اندھیرا چھا گیا...... چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا۔

عازم شفقی نے جھلا کر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن تاریکی میں اس کی گولیاں صرف ضائع ہوتی رہیں اور جب ذرا دیر بعد چاند پھر طلوع ہوا تو دونوں فدائین غائب ہو چکے تھے۔

''کمبخت دونوں بچ نکلے۔'' عازم شفقی نے غصے میں کہا۔

''ہاں...... اب یہاں ٹھہرنا خطرناک ہوگا۔'' سعدی حشمی نے کہا۔ ''اب ہمیں جلد از جلد گھاٹی سے نکل جانا چاہیے......'' اس نے رائفل اٹھائی اور چل پڑا۔

لیکن نظمہ اب تک اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ وہ پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ سعدی حشمی جھکا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

''نظمہ......'' اس نے آہستہ سے کہا اور اس کا شانہ ہلایا۔ لیکن نظمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سعدی حشمی نے اسے گھمایا تو دیکھا کہ خون سے نظمہ کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔

وہ چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا...... پھر جلدی سے جھک کر نظمہ کی نبض ٹٹولی۔ نظمہ زندہ تھی...... گولی کی ضرب سے پتھر کے اُڑنے والے ٹکڑوں میں سے ایک نظمہ کی آنکھ کے اوپر پیشانی میں لگا تھا جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ لیکن زخم گہرا نہیں تھا اور خون اب بند ہو گیا تھا۔ سعدی حشمی نے اس کی دونوں رائفلیں کندھوں پر لٹکائیں۔ اپنی رائفل دائیں ہاتھ میں پکڑی اور پھر نظمہ کو دونوں ہاتھوں پہ اٹھا کر جھکا ہوا آگے بڑھا...... اس کا رخ اب پہاڑی کی دوسری جانب والے ڈھلوان کی سمت تھا۔

چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا وہ تیزی سے بڑھتا رہا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں ان کے اونٹ چھپے ہوئے تھے۔ عازم شفقی اس سے پہلے وہاں پہنچ کر اونٹ کی مہار کھول رہا تھا۔

"جلدی سے اونٹ ان چٹانوں کی آڑ میں لے آؤ۔" سعدی حشمی نے کہا۔ "میں نظمہ کو......"

عازم شفیقی نے اس کی سمت اطمینان کے ساتھ گھورا۔ اس کی رائفل کی نال سعدی حشمی کے سینے کا نشانہ لئے ہوئے تھی۔ سعدی حشمی اس وقت دونوں ہاتھوں پہ نظمہ کو اٹھائے کھڑا تھا۔ سعدی حشمی نے جلدی سے کہا۔ "پہلے ذرا غور سے دیکھ لو۔"

عازم شفیقی نے غور سے دیکھا۔ سعدی حشمی کا دایاں ہاتھ نظمہ کی پشت کے نیچے تھا لیکن اس میں پکڑی ہوئی رائفل کی نال عازم شفیقی کو زد میں لئے ہوئے تھی اور سعدی حشمی کی انگلی ٹرائیگر پر تھی۔

"ٹھیک ہے سعدی حشمی...... ہم دونوں سیز فائر کرتے ہیں۔" عازم شفیقی نے پشیمانی کے عالم میں کہا۔ "تم مجھے ایک زمرد لے کر جانے دو۔ دوسرا نظمہ کے پاس ہے...... بولو، منظور ہے؟"

"تم حماقت کر رہے ہو۔" سعدی حشمی نے سرد لہجے میں کہا۔ "ابھی وہ دونوں زندہ موجود ہیں۔ ہم ایک ساتھ رہ کر زیادہ محفوظ رہیں گے۔"

عازم شفیقی طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری نہیں اس کی فکر ہے۔" اس نے نظمہ کی سمت اشارہ کیا۔ "نہیں سعدی حشمی...... میں اس کے لئے مزید نہیں رک سکتا۔ تم زندہ بچ گئے تو بیروت میں مجھ سے ضرور ملنا۔"

سعدی حشمی کو اسی طرح زد میں لئے وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس نے دو اونٹ اپنے ساتھ لے لئے تھے۔ سعدی حشمی خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ عازم شفیقی بیروت بھی نہ پہنچ سکے گا۔ اگر دونوں فدائین ذرا سی بھی عقل رکھتے تھے تو وہ اب تک کھائی سے نکلنے کے لئے بھاگ رہے ہوں گے کیونکہ گھاٹی سے پہلے باہر نکل کر وہ آسانی سے ان کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں عازم شفیقی قربانی کا بکرا بنے گا۔

عازم شفیقی کے جانے کے بعد اس نے بقیہ دونوں اونٹ کھولے اور بے ہوش نظمہ کو اٹھا کر تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ جیسے ہی دو بڑی چٹانیں نظر آئیں اس نے نظمہ کو ان کی آڑ میں لٹایا اور اونٹوں کو آڑ میں چھپا کر باندھ دیا۔ ان کو اور فدائین دونوں کو اس تنگ گھاٹی سے گزر کر باہر نکلنا تھا۔ اس لئے کہ باہر جانے کا دوسرا کوئی راستہ

نہیں تھا۔ اور عازم شفیقی کی مڈبھیڑ فدائین سے ہونا یقینی تھی...... وہ اس کا انجام دیکھنے کے بعد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے نظمہ کے زخم کی مرہم پٹی کی اور انتظار کرنے لگا۔ لیکن جب آدھ گھنٹہ گزر گیا اور فائرنگ کی آواز نہیں سنائی دی تو اسے یقین ہو گیا کہ دونوں فدائین عازم شفیقی سے پہلے جا چکے تھے۔ اور وہ گھاٹی سے باہر اس کے منتظر رہیں گے۔ اس نے ایک اونٹ پر بے ہوش نظمہ کو لٹا کر اسے مضبوطی سے باندھا اور ان کی مہاریں پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔

رات کے دو بج چکے تھے...... سعدی حشمی اب گھاٹی کے اندر اس کی بلند دیوار کے سائے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں سامنے جمی ہوئی تھیں اور رائفل فائر کے لئے ہاتھ میں تنی ہوئی تھی۔ جب وہ گھاٹی کے دہانے پر پہنچا تو صبح ہونے والی تھی۔ گھاٹی کے دہانے پر موڑ تھا اور فلک نما چٹانیں آڑ بنی ہوئی تھیں۔ گھاٹی سے نکلتے ہی ریت کی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن دہانے سے نکل کر ریت کی پہاڑی تک پہنچنے کے درمیان ہی اصل خطرہ تھا...... اس لئے اس نے دہانے سے کچھ پہلے بلند چٹانوں کی آڑ میں رک کر اونٹ باندھ دیئے۔ نظمہ کو نیچے اتار کر پانی پلایا اور اسے تمام صورتِ حال بتا کر وہیں انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ نظمہ نے ساتھ چلنے کی ضد کی لیکن سعدی حشمی نے سختی سے اسے روک دیا۔

اُجالا پھیلنے لگا تھا کہ اچانک کھائی کے اوپر سے فائرنگ کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ سعدی حشمی نے پھرتی کے ساتھ دونوں رائفلیں سنبھالیں اور گھاٹی کے دہانے کی سمت بھاگنے لگا۔ لیکن وہ باہر نہیں نکلا۔ دہانے سے پہلے اس نے چٹانوں کے درمیان اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا بے آواز چڑھ رہا تھا......

تقریباً آدھ گھنٹے کی چڑھائی کے بعد وہ گھاٹی کی بلندی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران دوبارہ گولی چلنے کی آواز نہیں آئی تھی۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ حملے کا انجام کیا ہوا...... ایک بھاری چٹان کی آڑ میں رک کر اس نے آہٹ لینے کی کوشش کی لیکن مکمل سناٹا طاری تھا۔ وہ چٹانوں کے درمیان جھکا ہوا باہر کی سمت نشیب میں اترنے لگا۔ اسے ہر لمحے یہ خطرہ تھا کہ دشمن کی گولی کسی سمت سے آ سکتی تھی۔ لیکن حقیقت معلوم کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ وہ بالآخر کسی ایسی جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے

گھاٹی کا دہانہ اور اس کے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ چٹان کی آڑ سے گردن نکال کر
اس نے دیکھا...... دہانے کے بالکل اندر ریت پر دو اونٹ مُردہ پڑے تھے اور عازم شفقی کا
کہیں پتہ نہ تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ عبدالغفور اور اس کا ساتھی فدائی گھاٹی سے نکل کر سامنے والی ریت کی
پہاڑی پر پہلے پہنچ گئے تھے اور جیسے ہی عازم شفقی نے گھاٹی کے دہانے میں قدم رکھا انہوں
نے فائرنگ شروع کر دی۔ عازم شفقی یا تو کہیں چھپا ہوا تھا یا ختم ہو چکا تھا۔ ایسی صورت
میں سعدی حشمی اور نظمہ کا باہر نکلنا موت کو دعوت دینا تھا...... وہ چند لمحے ہر سمت کا جائزہ لیتا
رہا لیکن کچھ بھی نظر نہ آسکا۔ سعدی حشمی نے دوربین گردن سے اتاری اور اسے چٹان کے
اوپر اس طرح رکھ دیا کہ اس کا رخ ریت کے ٹیلے کی سمت رہے۔ اس کے بعد وہ تیزی
سے نیچے اترنے لگا اور گھاٹی کے دہانے سے تھوڑی اوپر ایک ہموار جگہ پر کھڑی ہوئی ایک
چٹان کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اسی لمحے سورج نمودار ہوا۔ ریت کی پہاڑی پر روشنی پڑتے ہی سعدی حشمی کو عازم شفقی
کا سر نظر آیا۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ سعدی حشمی نے دہشت زدہ
نظروں سے عازم شفقی کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا جو ٹیلے کے اوپر اس طرح رکھا ہوا تھا کہ
گھاٹی کے دہانے سے اس کا چہرہ صاف نظر آسکے...... اس کا مطلب یہ تھا کہ عبدالغفور اور
اس کا ساتھی فدائی گھاٹی سے نکل کر ریت کی پہاڑی پر پہنچ چکے تھے اور اب سعدی حشمی کے
منتظر تھے...... لیکن کوشش کے باوجود سعدی حشمی یہ اندازہ نہ کر سکا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے
تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس جگہ ہرگز نہیں تھے جہاں عازم شفقی کا کٹا ہوا سر رکھا تھا۔ وہ
انتظار کرنے لگا۔

سعدی حشمی اگر جلد بازی سے کام لیتا تو اس کا انجام بھی عازم شفقی کی طرح ہوتا
کیونکہ جیسے ہی سورج اور بلند ہوا، اس کی روشنی چٹان پہ رکھی ہوئی دوربین کے شیشے پر پڑی
اور شیشہ چمکتے ہی فائر ہوا۔ گولی دوربین کو اُڑا لے گئی۔ لیکن یہ فائر ریت کی پہاڑی سے
نہیں، سعدی حشمی کے بالکل سامنے گھاٹی کی دوسری دیوار سے ہوا تھا۔ عبدالغفور اور اس
کے ساتھی نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ عازم شفقی کی گردن پہاڑی پر رکھ کر وہ گھاٹی
کے اوپر آ کر چھپ گئے تھے۔ سعدی حشمی نے پھرتی کے ساتھ اپنی اسپرنگ فیلڈ کی دوربین

اس سمت مرکوز کی جدھر سے فائر ہوا تھا۔ پہلے تو اسے کچھ نظر نہ آیا لیکن پھر وہ اسے ایک
چٹان کی آڑ میں دکھائی دے گیا۔ سفید عبا میں لیٹا ہوا وہ اسی سمت دیکھ رہا تھا جہاں ذرا دیر
پہلے دوربین رکھی تھی۔ سعدی حشمی نے فائر کیا اور دوسرے ہی لمحے فدائی لڑھکتا ہوا نیچے جا
گرا۔ سعدی حشمی بڑی پھرتی کے ساتھ بائیں سمت ہٹتا ہوا نیچے اترا۔

اچانک فضا میں کئی فائر گونجے۔ نشانہ وہی چٹان تھی جہاں چند لمحے پہلے سعدی حشمی چھپا
ہوا تھا۔ لیکن سعدی حشمی اب وہاں سے کافی نیچے اُتر چکا تھا۔ پھر دیر تک خاموشی طاری
رہی۔ سعدی حشمی کو یقین تھا کہ عبدالغفور کی سپرنگ فیلڈ میں لگی دوربین اسے تلاش کر رہی
ہوگی۔ وہ آہستہ آہستہ اب گھاٹی کی دوسری دیوار پر چڑھ رہا تھا کہ اچانک فائر ہوا۔ رائفل
سعدی حشمی کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اس کے دائیں بازو سے خون کی دھار
پھوٹ نکلی۔ سعدی حشمی نے گھبرا کر اوپر دیکھا...... عبدالغفور چٹان پر کھڑا تھا اور وہ دوسرا فائر
کرنے ہی والا تھا کہ فائر ہوا اور عبدالغفور لڑھکتا ہوا نیچے کی سمت آیا۔ چند لمحے سعدی حشمی
سکتے کے عالم میں پڑا رہا...... پھر اس نے گھوم کر دیکھا...... کچھ فاصلے پر کھڑی نظمہ مسکرا رہی
تھی۔

✡......✡

وہ ابراہیم بلادی کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سفر کی تمام تفصیلات پروفیسر کو نظمہ سنا
چکی تھی۔ ابراہیم بلادی بار بار اس زمرد کو دیکھ رہا تھا جو نظمہ نے اسے ذرا دیر پہلے دیا تھا۔
سعدی حشمی سامنے کرسی پہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بریف کیس تھا۔
ابراہیم بلادی نے اچانک اپنی وہیل چیئر سعدی حشمی کی سمت گھمائی۔

"اس زمرد کی رقم سے ہم روسی اسلحہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تو کچھ نہیں خرید سکتے......
پھر بھی کچھ نہ کچھ کام چل ہی جائے گا۔" اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

"پروفیسر! کیا واقعی تم کو کردوں کی جنگ آزادی کے لئے یہ خزانہ چاہئے تھا؟" سعدی
حشمی نے پوچھا۔

"تم کو اس میں شک کیوں ہے؟" ابراہیم بلادی نے چونک کر پوچھا۔ "میں نے یہ
لڑائیاں اسی مقصد کے لئے لڑائی ہیں۔ لیکن افسوس......" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"افسوس کی ضرورت نہیں ابراہیم بلادی......" سعدی حشمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم اسلحہ ضرور خریدیں گے۔" اس نے گود میں رکھا ہوا بریف کیس آہستہ سے کھولا۔

ابراہیم اور نظمہ حیرت سے اچھل پڑے...... بریف کیس سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں...... اس میں ہیروں اور جواہرات کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھرا ہوا تھا۔ اچانک نظمہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"سعدی حشمی...... مجھے تم سے اس دغابازی کی امید نہ تھی۔"

"میں نے تم سے دغابازی نہیں کی ہے نظمہ!" سعدی حشمی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "عازم شفیقی اور تم دونوں کی نظر ڈھانچے کے سرہانے نہیں پڑ سکی تھی کیونکہ وہاں گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن میں نے سرہانے وہ ابھری ہوئی جگہ دیکھ لی تھی۔ شیخ الجبل کا سر ایک چوکور بکس پر رکھا ہوا تھا۔ تم اور عازم شفیقی جب واپسی کے لئے بڑھے تو میں چند منٹ کے لئے یہ کہہ کر واپس ہوا تھا کہ تابوت کا ڈھکن بند کر دوں۔ اور اسی وقت میں نے اسے اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ اگر میں یہ راز اس وقت بتا دیتا تو ہم شاید کبھی اسے یہاں تک لانے میں کامیاب نہ ہو پاتے...... اور یہ تمہاری امانت ہے۔" اس نے بریف کیس نظمہ کی سمت بڑھایا۔

"نہیں...... اسے مجھے دے دو نظمہ!" ابراہیم بلادی کا لہجہ اچانک کرخت ہو گیا تھا۔ نظمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ ہم سب کی امانت ہے پروفیسر!" اس نے کہا۔

"نہیں...... اسے مجھے دے دو...... یہ صرف میری امانت ہے۔" ابراہیم بلادی کے ہاتھ میں اچانک پستول چمکنے لگا تھا۔ "شیخ الجبل کی امانت کا وارث میں ہوں۔"

"تم...... تم بھی......؟" نظمہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

"ہاں...... مجھے یقین نہ تھا کہ سعدی حشمی میرے اتنے فدائین کو ہلاک کر کے زندہ واپس آ جائے گا۔ میں خود وہاں جانے سے معذور تھا ورنہ اس کی خدمات کبھی نہ حاصل کرتا...... لاؤ......" اس نے گرج کر اپنا پستول بلند کیا۔

نظمہ کا چہرہ غصے اور صدمے سے تاریک ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے بریف کیس ابراہیم بلادی کی سمت بڑھایا...... لیکن اسی لمحے سعدی حشمی نے اپنی جگہ سے جست لگائی۔ بریف کیس اس کی ٹھوکر سے دور جا گرا اور ابراہیم بلادی کی کرسی گھوم گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ

گھومتا، نظمہ کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور ابراہیم بلادی کی کھوپڑی سے خون کا فوارہ ابلنے لگا۔

گولی کی آواز سنتے ہی ابراہیم بلادی کا باڈی گارڈ بھاگتا ہوا ان کی سمت بڑھا لیکن اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملا۔ نظمہ نے سفاکی کے ساتھ اسے بھی ڈھیر کر دیا۔"

سعدی حشمی کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ رازل جریری اور شہباز سحر زدہ انداز میں سعدی کی داستان سن رہے تھے۔

اس وقت نظمہ کسی کام سے سامنے آئی تو شہباز اسے دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو پیارے بچے؟" نظمہ مسکرا کر بولی اور شہباز سنبھل گیا۔ نظمہ ایک خوبصورت عورت تھی، عمر بھی زیادہ نہیں تھی لیکن یہ اندازِ تخاطب بہت عجیب لگا تھا۔ بہر حال شہباز بھی اب بہت تیز ہو گیا تھا، سنبھل کر بولا۔

"کچھ نہیں آنٹی! میں دیکھ رہا ہوں کہ کوئی خاتون بھی اتنی تیز ہو سکتی ہیں۔ ویسے آپ نے جس خزانے کا ذکر کیا ہے اس نے تو آپ کو ارب پتی بنا دیا ہوگا۔"

"کیا ہم تمہیں ارب پتی نظر آتے ہیں؟" نظمہ کی بجائے سعدی حشمی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر وہ خزانہ......؟" رازل جریری بے اختیار بول پڑا۔

"فیصلہ نظمہ نے ہی کیا تھا۔ نظمہ! تم بتاؤ۔"

"خزانے کا ایک حصہ ہمارے قبضے میں آ چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہمارے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ ہم خوفزدہ ہو گئے۔"

"کیسے واقعات؟" رازل جریری اور شہباز نے بیک وقت پوچھا۔

"انتہائی پراسرار واقعات...... کوئی نادیدہ قوت ہمارے گرد منڈلانے لگی۔ حسن بن صباح کی یہ دولت متحرک ہو جاتی تھی۔"

"متحرک......؟"

"ہاں...... کیا آپ یقین کریں گے جناب! کہ ہم نے ہیروں کو گردش کرتے دیکھا ہے۔ سونے کی زنجیریں سانپوں کی طرح بل کھاتے ہوئے دیکھی ہیں۔ خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ چھوٹے چھوٹے گول ہیرے انسانی کھوپڑیوں کی شکل

اختیار کر جاتے تھے اور......اور......"

"کیا وہ آپ کا وہم نہیں تھا تطمہ......؟" رازل جریری نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ سعدی اس کے گواہ ہیں۔"

"کیا آپ نے بھی سعدی حشمی......؟"

"ہاں......ہم اس منحوس خزانے سے خوفزدہ ہو گئے اور......"

"اور کیا؟"

"آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اسے اس کرد تنظیم کے حوالے کر دیں جو اس کی اصل حقدار ہے۔ اور اس طرح اس سنہری عذاب سے چھٹکارا حاصل کریں۔ ہم نے ایک درمیانی زندگی گزارنے کے لئے اس خزانے سے اپنا حصہ حاصل کیا اور باقی خزانہ کرد تنظیم کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک انوکھا کام تھا۔ کرد تنظیم کا سربراہ احمد دانش داؤدی شک کی نگاہوں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ غالباً وہ دو احساسات کا شکار تھا۔ نمبر ایک کہ ہم دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ نمبر دو، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم انہیں کسی سازش کا شکار کر رہے ہیں۔ بمشکل تمام اسے یقین آیا تھا اور اس کے بعد وہ ہمارے گہرے دوست بن گئے تھے۔ اب میں یہ تو نہیں کہتا جناب رازل جریری! کہ آپ عراق اور ایران کے موقف سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن آپ یقین کریں اگر آپ کردوں کی حالت زار کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اپنی بقاء کے لئے ان کا موقف غلط نہیں ہے۔"

"بات اصل میں یہ ہے سعدی حشمی! کہ ہمیں بھی خزانہ درکار ہے۔ پلاسکو ساری دنیا میں اپنے پنجے گاڑ رہا ہے اور اس کے خلاف کوئی مؤثر مدافعت نہیں ہو رہی۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے سارے حریفوں کو پچھاڑ لیا ہے۔"

"میں اپنی معلومات کے مطابق ایک نام تمہارے سامنے لینا چاہتا ہوں میرے معزز دوست! اور اس نام کے بارے میں مجھے تازہ ترین معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ایک شخص ہے جس نے حکومت پلاسکو کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں اور اس کا نام ہے رازل جریری۔"

شہباز نے چونک کر سعدی حشمی کو دیکھا تھا۔ تطمہ اس وقت اتفاق سے غور سے یہ چہرہ ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ نوجوان لڑکا بے حد پسند آیا تھا اور اس کے دل میں شہباز کے لئے برادرانہ جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ رازل جریری مسکراتی نگاہوں سے سعدی حشمی کو دیکھ رہا

تھا۔ تطمہ نے درمیان میں مداخلت کی۔

"شہباز ہے نا تمہارا نام؟ شہباز! رازل جریری کے نام پر تم بری طرح چونکے تھے، وجہ بتانا پسند کرو گے؟"

شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے رازل جریری کو دیکھا اور اس نے رازل جریری کے انداز میں کوئی ایسی تبدیلی نہ پائی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ شہباز کو یہ بتانے سے انکار کر رہا ہو کہ اس کا راز نہ کھولا جائے۔ تطمہ کی سوالیہ نگاہیں بدستور شہباز پر جمی ہوئی تھیں۔ تب شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک دلچسپ اتفاق ہے محترمہ! ابھی سعدی حشمی نے رازل جریری کا نام لیا ہے۔ آپ لوگ رازل جریری سے ہی مخاطب ہیں۔"

اس انکشاف کا بھرپور ردِعمل ہوا تھا۔ دونوں ششدر نگاہوں سے رازل جریری کو دیکھتے رہ گئے۔ پھر اچانک سعدی حشمی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔

"تب میں آپ کے قدم چومتا ہوں رازل جریری! علی اصغر جراری کا نام بھی میرے لئے بڑی حیثیت رکھتا ہے چونکہ وہ میرا جگری دوست ہے اور آپ میرے ہیرو۔ آپ یقین کریں ہم دونوں میاں بیوی انقلاب پسند ہیں اور ہمیشہ یہ سوچتے رہے ہیں کہ جو ایڈونچرس زندگی ہم نے گزاری ہے کیا اب ہم اسے گھریلو زندگی میں تبدیل کر دیں؟ قدرت نے ہمیں اولاد سے بھی نہیں نوازا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت ہماری زندگی میں وہ کھیل برقرار رکھنا چاہتی ہے یعنی ایک ایڈونچرس زندگی کا کھیل۔ جناب رازل جریری! پلاسکو کے خلاف آپ نے حکومت میلیکو کی جس قدر مدد کی ہے اور جس طرح آپ نے ایک زبردست محاذ قائم کر کے حکومت پلاسکو کے گھٹنے ٹکوا دیئے ہیں اس کی بہت سی رپورٹیں ہم دونوں کو بھی حاصل ہیں۔ کچھ اخباری ذرائع سے اور دنیا بھر کے اخباروں کے تبصروں سے اور کچھ ہمارے اپنے ذرائع سے چونکہ ہم انقلابی دنیا سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہر حال کیا ہی خوشی کی بات ہے کہ اتنی عظیم شخصیت ہمارے درمیان اس طرح موجود ہے۔"

"اور یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ تم میرے موقف سے اتفاق کرتے ہو سعدی حشمی! میں نے حکومت پلاسکو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ایسے تخریبی عمل کو اپنی اوقات بھر ختم کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ جس سے انسانیت ہر روز نجانے کیسی کیسی اذیتوں کا شکار ہو جاتی

ہے۔ بڑی عجیب پالیسی ہے، اس دنیا کی۔ لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ دنیا کی تقدیر کا فیصلہ ایک طاقت کے ہاتھوں میں آتا جا رہا ہے اور جب بھی کبھی ایسا ہوا ہے دنیا تباہی کے دہانے پر جا کھڑی ہوئی ہے۔ بنیادی تصور اس طاقت کا خاتمہ ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی دہشت ناک کارروائیوں کا خاتمہ۔ لیکن بات اس تک محدود نہیں ہے۔ سرپھرے انسان کائنات کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور ان کی دہشت ناکیاں انسانی زندگیاں ختم کرتی رہی ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں بہت سے ایسے نام ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ یہ ایک قدرتی عمل ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اب جس طرح زخمی انسانیت سسک رہی ہے اس میں اپنا فرض پورا کئے بغیر چارہ کار بھی نہیں ہے۔ ابھی میں نے کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں بنائی لیکن میرے دل میں ہے کہ میں ایسا کروں۔ اور اس کے لئے مجھے دولت کی ضرورت ہے۔ ایک کامیاب جنگ کے لئے ہتھیار درکار ہوتے ہیں جیسا کہ کرد تنظیم کو اپنے لئے درکار تھے۔ علی اصغر جراری نے اپنے گروپ میں تمہیں بھی شامل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور ہمارے علم میں تمہاری یہ داستان بھی تھی جو اب تفصیل سے سامنے آ گئی ہے۔ بولو ہمارے گروپ میں شامل ہو کر کیا تم دنیا بھر میں انسانیت کے لئے کام کرنے پر آمادہ ہو؟''

اس سے پہلے کہ سعدی حشمی کچھ بولتا، نظمہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''سب سے پہلے میں اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی خدمات پیش کرتی ہوں۔ یہ چیز میرے خمیر میں شامل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی ایسا پُرجوش ردِعمل ظاہر ہوتا ہے تو میرا رواں رواں اس میں شمولیت کے لئے تڑپنے لگتا ہے۔ مجھے معاف کرنا سعدی حشمی کہ میں نے تمہارا ابھی بھرپور ساتھ دیا ہے۔''

''دیا ہی نہیں ہے۔ بلکہ دیتی رہوگی۔ جناب رازل جریری! میں اور نظمہ آپ کے اس مشن کے لئے اپنی پُرخلوص خدمات پیش کرتے ہیں۔''

''شکریہ۔ یہ شہباز ہے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں تفصیل بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ وہ ہے جس نے رازل جریری کو قبر سے نکال کر ایک بار پھر دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا اور اس کی مدد سے پلاسکو کے نقوش بگڑ گئے۔'' رازل جریری نے مختصر الفاظ میں شہباز کے بارے میں کہا تو نظمہ مسکرا کر بولی۔

''آہ...... نجانے کیوں یہ مسکراتا ہوا بچہ مجھے پہلی ہی نگاہ میں اچھا لگا تھا۔''

''تھینک یو آنٹی! حالانکہ میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے ایک آدھ سال چھوٹی ہی ہوں گی لیکن میں آپ کے اس اندازِ تخاطب کو قبول کرتا ہوں۔''

''میں چھوٹی نہیں ہوں تم سے۔ غلط فہمی کا شکار ہو تم۔'' نظمہ بولی۔

سعدی حشمی کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ہم اگر کوشش کریں تو دوبارہ اب التالی کے ان مقبروں تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلا دوں کہ اب وہاں کچھ موجود نہیں ہے۔ اصل میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ محقق یا مہم جو صرف ہم ہی تو نہیں ہیں۔ ممکن ہے ہم سے پہلے کوئی اور شیخ صباح کے مقبرے تک پہنچ چکا ہو۔ اور وہ جو ہمیں ملنے والا تھا، اس کے ذہن سے دور رہا ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے ہماری کہانی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن میں ہر طرح کے تعاون کے لئے تیار ہوں اور اس دوران ہم نے بے شک خزانوں کی تلاش نہیں کی۔ لیکن نظمہ نے مجھے کچھ واقعات سنائے ہیں۔ میں وہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے آنے والے وقت میں وہی واقعات ہماری مہم کا ایک حصہ بن جائیں۔''

سعدی حشمی کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات گزرنے لگے جنہوں نے ایک بار پھر اسے پُرجوش کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں دور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ پھر وہ چونک کر نظمہ کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''تمہیں یاد ہے......؟''

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' نظمہ سحر زدہ لہجے میں بولی۔ ''بھیڑیوں کی وادی کی وہ پُرسحر داستان۔ اُس دن......''

۞......۞

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ممنوعہ علاقہ تاریک اور ویران تھا۔ تھوڑی دوری پر سیاہ سمندر تاحدِ نگاہ لہروں کی سفید جھاگ۔ سے چمک رہا تھا۔ یہ سمندر کے اٹھان کا زمانہ تھا۔ اس لئے طوفانی موجیں پُرشور آواز میں ساحل کی جانب لپک رہی تھیں۔ لیکن سیاہ اور لمبی ابروز پر چند افراد خاموش کھڑے ہوئے سامنے سے آنے والے راستے پر کسی کے انتظار میں نظریں جمائے کھڑے تھے۔ پُروقار انداز میں کھڑے ہوئے لوگوں کی تعداد چھ تھی۔ یہ سب بحریہ کی وردی میں تھے اور بارش سے بچنے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔

''بارش تیز ہو گئی ہے ایڈمرل! کیا ایسی بارش میں ظفر شاہ کی آمد ممکن ہے؟''

""اگر وہ نہ آتے تو اب تک اطلاع آ چکی ہوتی۔ لیکن ابھی آدھے گھنٹے قبل ہی ان کا فون ملا تھا کہ وہ پہنچ رہے ہیں۔""

""لیکن آدھا گھنٹہ قبل بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔""

""انتظار کئے لیتے ہیں۔ اگر نہ آئے تو دیکھا جائے گا۔"" ایڈمرل نے جواب دیا۔ لیکن اسی وقت دور سے نظر آنے والے ناہموار راستے پر جو خاردار تاروں کے درمیان سے گزرتا تھا، کسی گاڑی کی تیز روشنیاں نظر آئیں اور ایڈمرل نے گہری سانس لی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

""فوجی زندگی میں یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بے حقیقت ہوتی ہیں۔"" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سب کی نگاہیں سامنے ہی تھیں۔ روشنیاں آخری چیک پوسٹ پر رک گئیں۔ وہ وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ دور تھی اور اس جگہ سے صاف نظر آ رہی تھی۔ یہاں سے گزرنے کے لئے چار چیک پوسٹ سے گزرنا ہوتا تھا اور یہ آخری چیک پوسٹ تھی۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں چند متحرک سائے نظر آئے۔ یہ غالباً چیک پوسٹ کے سپاہی تھے جو کاغذات وغیرہ چیک کر رہے ہوں گے۔ اس کے بعد چیک پوسٹ کی رکاوٹ بند ہو گئی۔ وہ سب مستعد ہو گئے۔

ایک مخصوص فوجی ٹھکانہ تھا جہاں آبدوز کو ساحل تک لانے کا انتظام تھا۔ یہ ایک زیر زمین عمارت تھی اور آبدوزوں کو ایندھن مہیا کرتی تھی۔ تیل کا بہت بڑا ذخیرہ آبدوزوں کے لئے مخصوص تھا اور یہاں بیس آدمیوں پر مشتمل بحری سٹاف ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا ورکشاپ بھی تھا جہاں چھوٹی موٹی مرمت کا بہترین بندوبست تھا۔ لیکن یہ ورکشاپ صرف مخصوص حالات میں مصروف عمل رہتا تھا۔ عام طور سے یہاں کام نہیں ہوتا تھا۔

تیل کے ڈپو اور ورکشاپ میں کام کرنے والوں کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے وہ سب اپنی جگہوں پر تھے اور شاید باہر ہونے والی بارش کا ابھی انہیں علم نہیں ہوا تھا۔

لینڈ روور بالآخر کنارے پر پہنچ گئی اور اس کی روشنیاں بند ہو گئیں۔ لمبی لمبی نفیس برساتیاں اوڑھے ہوئے سات افراد نیچے اترے اور آبدوز کے راستے پل پر پہنچ گئے جو ایک

سکیم کے تحت آبدوز سے کنارے تک آیا تھا اور اس کے بعد اسے واپس اپنی جگہ لوٹ جانا تھا۔

آبدوز پر کھڑے ہوئے لوگوں نے روشنیاں لہرا کر خوش آمدید کے سگنل دیئے اور لینڈ روور سے اترنے والے پل طے کر کے ان کے قریب پہنچ گئے۔ ایڈمرل نے آگے بڑھ کر ایک طویل القامت شخص سے مصافحہ کیا۔ سفید دستانے میں لپٹے ہوئے طویل القامت آدمی کے چوڑے اور مضبوط ہاتھ میں ایڈمرل کا ملائم ہاتھ کسی ننھے سے بچے کی مانند تھا۔ گو طویل القامت شخص نے نہایت نرمی سے مصافحہ کیا تھا لیکن ایڈمرل کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ذرا سا بھی دباؤ اس ہاتھ کا اس کے ہاتھ پر پڑ جائے تو اس کے ہاتھ کی ہڈیاں اوپر نیچے ہو جائیں گی۔

اس کے بعد بارش کو نظر انداز کرتے ہوئے ایڈمرل نے آبدوز کے مختصر سے اسٹاف کا تعارف کرا کر فوجی اسپرٹ کا مظاہرہ کیا۔ طویل القامت شخص نے بھی اپنے ساتھیوں کا تعارف کرا دیا جن میں دو لڑکیاں تھیں۔ ایک خوبصورت لڑکی میجر نوشین تھی اور دوسری جنرل کی ذاتی سیکرٹری فرح۔ اس کے بعد وہ لوگ آبدوز کی سیڑھیاں جو چمکدار دھات سے بنی ہوئی تھیں اور جن پر کھردری ربڑ کے پائیدان پیوست تھے، طے کرتے ہوئے نیچے کیبن میں آ گئے جہاں دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

آبدوز کے عملے کے دو افراد نے جو کیپٹن کا عہدہ رکھتے تھے، معزز مہمانوں سے برساتیاں طلب کیں اور انہیں اتارنے کے لئے مردوں کی مدد کی۔ میجر نوشین اور فرح نے اپنی برساتیاں اتار کر خود ان لوگوں کے حوالے کر دی تھیں۔

چمکدار آنکھوں والے اور کھڑے نقوش کے وجیہہ چہرے والے جنرل ظفر شاہ نے مسکراتے ہوئے ایڈمرل کی طرف دیکھا اور بولا۔

""اس ناخوشگوار موسم میں ہماری آمد آپ کے لئے خوش گوار تو نہیں ہو گی ایڈمرل!""

""ہرگز نہیں جنرل! ہمارے فرائض موسم سے بے نیاز ہوتے ہیں۔"" ایڈمرل نے خوش اخلاقی سے کہا اور ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہوا ایک کیبن تک آ گیا۔

آنے والوں نے برساتیوں کے نیچے حسب مراتب ہی وردیاں زیب تن کر رکھی تھیں جن سے ان کے عہدوں کا پتہ چلتا تھا۔ وردیاں نہایت نفاست سے استعمال کی گئی تھیں اور

ان کے نشانات بالکل نئے اور چمکدار تھے جسے ایڈمرل نے نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

''ضروری گفتگو کرنے سے قبل میں نے آپ حضرات کے لئے کافی کا بندوبست کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہم بے تکلفی کے ماحول میں پہلے کافی سے شغل کریں اور اس کے بعد جنرل! میں آپ کو تکلیف دوں۔''

''کیوں نہ اس میں تھوڑی سی ترمیم کر لی جائے۔'' جنرل نے کہا۔

''ضرور، فرمایئے۔'' ایڈمرل بولا۔

''ہمارے اور آپ کے درمیان گفتگو میں کتنے افراد شامل ہوں گے؟'' جنرل نے پوچھا۔

''میں اور میرے نائب مسٹر سرفراز اس گفتگو میں شامل ہوں گے۔ آپ اپنی طرف سے جسے پسند کریں۔'' ایڈمرل نے جواب دیا۔

''ترمیم یہ ہے کہ میں اور میری ذاتی سیکرٹری فرح کیبن میں چل کر گفتگو کا آغاز کریں۔ باقی لوگ باہر کی سیر کریں اور اس گفتگو کے دوران کافی کا دور چلتا رہے۔'' جنرل ظفر شاہ نے کہا۔

''اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔'' ایڈمرل نے شانے ہلائے اور پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''معزز مہمانوں کو سب میرین کی سیر کے ساتھ کافی پلائی جائے۔ ہم لوگ کیبن میں جا رہے ہیں۔'' پھر اس نے اپنے نائب کو اشارہ کیا اور جنرل ظفر شاہ، فرح کو لے کر اس کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گیا۔

آبدوز کے خوبصورت کیبن میں آرام دہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن کے درمیان سینٹر ٹیبل نصب تھی۔ وہ سب اس جگہ بیٹھ گئے۔ ایڈمرل نے اپنے نائب کو اشارہ کیا اور وہ ایک آہنی سیف کی طرف بڑھ گیا۔ اس سیف کو کھول کر اس نے چند فائل نکالے اور ابھی انہیں سنبھال ہی رہا تھا کہ دفعتہً ایک دیوار میں نصب سرخ بلب ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اسپارک کرنے لگا۔

''سرخ پیغام۔'' ایڈمرل حیرت سے بولا اور اس نے نائب کو اشارہ کیا۔ نائب نے جلدی سے فائل میز پر رکھے اور ایک کونے کی طرف بڑھ گیا جس کی دیوار میں وائرلیس مشین نصب تھی۔ اس نے ایک بٹن دبایا اور بولا۔

''یس...... ایڈمرل اسٹاف۔''

''خصوصی پیغام ایڈمرل تک پہنچایا جائے۔ جنرل ظفر شاہ کو ہیڈ سنٹر کی طرف جاتے ہوئے شدید زخمی کر دیا گیا ہے۔ ان کے چار ساتھی قتل ہو چکے ہیں۔ اگر ان کے میک اپ میں کوئی شخص یا کچھ لوگ ہیڈ سنٹر پہنچیں تو انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ ہم لوگ بہت جلد ہیڈ سنٹر پہنچ رہے ہیں۔ کیا پیغام نوٹ کر لیا گیا؟''

نائب بجلی کی سی تیزی سے پلٹا لیکن اسی وقت نقلی جنرل کی ذاتی سیکرٹری کے ہاتھ میں دبے ہوئے چھوٹے سے پستول سے خفیف سی آوازیں نکلیں اور دو گولیاں نائب کے سینے میں اتر گئیں۔ تیسری گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ ایڈمرل نے خود بھی یہ پیغام سنا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا اور پستول کی گول نال کا سوراخ اپنی پیشانی کی جانب اٹھا ہوا پایا۔ اس کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اسی وقت طویل القامت شخص اٹھا اور اس نے ایڈمرل کے ہولسٹر سے پستول نکال کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔

''سوری ایڈمرل!'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''تم باہر جاؤ ڈیئر! اور ہاں، ہمیں فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی ہے۔'' جنرل کی وردی میں ملبوس شخص نے جس کے بارے میں اب یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ جنرل نہیں ہے اپنی سیکرٹری کو حکم دیا اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

باہر کا ماحول بے حد خوشگوار تھا۔ آبدوز کے مخصوص لوگ مہمانوں سے خوش گپیاں کر رہے تھے اور کافی کا دور چل رہا تھا۔

''افسوس ساتھیو! وقت نے ہمیں اس خوشگوار ماحول سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔'' وہ بولی۔ اور دوسرے لمحے اس کے ساتھیوں نے کافی کے کپ رکھ دیئے۔

ایڈمرل کے ساتھی اس اچانک تبدیلی پر حیران رہ گئے کہ معزز مہمانوں کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اس وقت وہ اچھل پڑے جب مہمانوں نے مخصوص ساخت کے سائلنسر لگے ہوئے پستول نکال لئے اور اطمینان کے ساتھ ان لوگوں کو گولی مار دی گئی۔

''جدوجہد کرنے والوں کی نگرانی میں کر رہی ہوں۔ تم لوگ فوراً آبدوز کا کنٹرول سنبھالو اور تیز رفتاری سے اسے گہرے پانی میں لے چلو۔'' سیکرٹری نے حکم دیا اور وہ سب منتشر ہو گئے۔

چند ساعت کے اندر اندر آبدوز کے انجن اسٹارٹ ہو گئے اور اس نے اپنا ہینگر چھوڑ دیا۔ دوسرے لمحے وہ گہرے پانی میں جا رہی تھی۔

اندر موجود طویل القامت شخص نے جیب سے تانت کی مضبوط ڈوری نکال کر اس سے ایڈمرل کے ہاتھ اس کی پشت پر کس دیئے تھے۔ وہ بے حد پرسکون تھا اور اس نے باہر نکل کر حالات دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آبدوز جب چل پڑی تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

''بہت خاموش ہو ایڈمرل! کچھ باتیں کرو۔'' اس نے پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور ایڈمرل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''کون ہو تم؟'' چند ساعت کے بعد اس نے پوچھا۔

''خادم کو مارتھر کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ نام کبھی آپ نے سنا ہو۔''

''مارتھر؟'' ایڈمرل نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔''

''ہاں۔ تمہارا نام اجنبی نہیں ہے۔ تم ایک بین الاقوامی مجرم ہو۔ شاید آدھی دنیا میں اس وقت تمہاری تلاش جاری ہے۔'' ایڈمرل نے کہا۔

''محبت ہے ان لوگوں کی۔ ورنہ میں کس قابل کہاں ہوں۔'' مارتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ بالکل ذاتی۔ اس سے تمہارا کیا تعلق؟ یہ پروگرام تو شاید کسی ملک کے لئے بھی قابل توجہ نہیں ہے۔''

''کون سے پروگرام کی بات کر رہے ہو ڈیئر ایڈمرل؟'' طویل القامت بھیڑیئے نے پوچھا۔

''جس پر گفتگو کے لئے اس وقت جنرل ظفر شاہ میرے پاس آنے والے تھے۔''

''اوہ...... نہیں، ہرگز نہیں...... تمہارا خیال غلط ہے۔ اس وقت مجھے ایک ذاتی ضرورت یہاں لے آئی ہے۔ تمہارے کسی پروگرام سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اوہ، میں سمجھا۔ شاید تمہارا نائب یہ فائل اسی لئے نکال رہا تھا۔''

''ہاں...... جنرل ظفر شاہ کو اسی موضوع پر گفتگو کرنی تھی۔ اور تم یقین کرو کہ یہ کوئی ایسا

بات نہیں تھی جس سے کسی دوسرے ملک کو دلچسپی ہو۔ ہم اپنی فوجی بندرگاہ میں توسیع کے لئے نقشے بنا رہے تھے۔ جنرل ظفر شاہ اس بارے میں گفتگو کرنے کے لئے میرے پاس آ رہے تھے۔ میں نے خود انہیں سب میرین پر دعوت دی تھی۔ بس تھوڑی سی تفریح مقصود تھی۔ ورنہ یہ بات کہیں اور بھی ہو سکتی تھی۔''

''میں عرض کر چکا ہوں میرے عزیز دوست! میری اس وقت آمد تمہارے کسی پروگرام میں رخنہ اندازی کی غرض سے نہیں تھی۔ بلکہ مجھے یہ آبدوز درکار تھی۔ چونکہ میں تمہارے ملک میں تھا اور اپنے پروگرام کے آغاز کے لئے کوئی طویل راستہ نہیں اختیار کرنا چاہتا تھا اس لئے یہ مختصر طریقہ کار اختیار کرنا پڑا۔ تم محسوس نہ کرو۔'' مارتھر نے بدستور نرم اور پرسکون لہجے میں کہا اور اپنی وردی کے بٹن کھولنے لگا۔

''لیکن اس کے لئے تم نے کئی بے گناہوں کو ہلاک کر دیا۔ کیا باہر میرے ساتھی محفوظ ہوں گے؟ مجھے یقین ہے کہ ان کے قتل کے بغیر یہ آبدوز یہاں سے نہیں ہلی ہو گی۔ زندگی کا خوف بھی انہیں ایسی کسی حرکت کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔'' ایڈمرل نے غمناک لہجے میں کہا تھا اور مارتھر نے وردی کا کوٹ اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات ابھر آئے تھے۔

''اپنے ساتھیوں پر یہ اعتماد قابل تحسین ہے۔ تمہارا خیال درست ہے۔ وہ سب قتل کئے جا چکے ہوں گے۔ میں نے اپنے لوگوں کو یہی ہدایت کی تھی۔''

''افسوس...... افسوس تم نے اپنے ناپاک مقصد کے لئے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا ہے۔ کیا تم یہ کوشش کسی اور طریقے سے نہیں کر سکتے تھے؟'' ایڈمرل نے کہا۔ اس کے چہرے پر شدید غم کے تاثرات تھے۔

''بہتے ہوئے خون سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے ایڈمرل!'' دفعتہ مارتھر کی آواز کرخت ہو گئی۔ ''یہ خون، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کا منصب ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بہتے ہوئے خون کی پرواہ نہ کرے۔ تمہیں علم ہونا چاہئے ایڈمرل! کہ میرا پورا خاندان ایسے ہی ایک مقصد کے لئے خاک و خون میں ڈوب گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی ماں کی لاش کے ٹکڑے چنے اور انہیں دفن کیا۔ ان اعضاء کو تلاش کیا جنہوں نے میری پرورش کی تھی۔ میں نے اپنے باپ کی خون اگلتی ہوئی لاش کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا

تو میری چھاتی خون سے سرخ ہوگئی۔ میں نے اپنی چھوٹی سی بہن کے رونڈے ہوئے جسم کو دیکھا تو اس کا ننھا سا دل اس میں موجود نہیں تھا۔ بہت تلاش کیا نہ مل سکا۔ میں نے اس معصوم وجود کو بھی دفن کر دیا۔ اور اس کے بعد ایڈمرل! جب میں اپنے گھر کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکلا تو دروازے کے نیچے کوئی چیز دب کر ٹوٹ گئی۔ خون کی سیاہ چھینٹیں میرے پیروں پر پڑیں تو میں نے دروازہ ہٹا کر دیکھا، ننھا سا چھوٹا سا دل تھا۔ میں نے اس پچکے ہوئے دل کو دروازے کے نیچے سے نکال لیا اور اسے اپنے حلق کے راستے سینے میں اتار لیا۔ ہنسو اس بات پر ایڈمرل! کہ میرے سینے میں اب دو دل دھڑکتے ہیں۔ ہے نا ہنسنے کی بات؟" وہ ہنس پڑا۔

ایڈمرل تھوک نگل رہا تھا۔ پھر اس نے بے اختیار پوچھا۔ "یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟"

"بیکار باتیں ہیں۔ تم میرے کون ہو جو میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں۔ بس جتنا کہا وہ کافی ہے۔ اس سے تمہاری تسلی ہو جانی چاہئے۔"

"مجھے بتاؤ مارتھر! میں جاننا چاہتا ہوں۔ مارتھر کے خوفناک کارنامے لوگوں نے سنے ہیں لیکن کوئی اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں تمہارے بارے میں جانوں۔ اور پھر یوں بھی دل کا غبار نکال دینے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ۔"

"بڑا منحوس مشورہ دے رہے ہو ایڈمرل! دل کا غبار ہی نکل گیا تو پھر کیا رہ جائے گا۔ دل جب ہلکا ہو جائے تو انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ سینے میں جلتی ہوئی مشعل ہی تو زندہ رکھتی ہے۔ جو سینے آگ سے خالی ہوتے ہیں وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ بس اس موضوع کو ختم کر دو۔"

"ہوں......" ایڈمرل نے گہری سانس لی اور پھر اپنے نائب کی لاش کو دیکھنے لگا۔ جو سرد ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر غم کے تاثرات ابھر آئے۔

"تم نے مجھے کیوں زندہ رکھا ہے؟"

"کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ بس تفریحاً۔ یہ سارے لوگ تو مصروف رہیں گے۔ تم مجھے کمپنی دو گے۔ اور پھر تمہارا خطرہ پیش نگاہ رہے گا، اس سے تھوڑی مستعدی بھی رہے گی۔ ورنہ ماحول سست ہو جائے گا۔ تھوڑی دور نکل جانے کے بعد میں تمہیں آزاد کر دوں گا

اور تم اپنی سازشوں کے لئے آزاد ہو گے۔ یہ میرا دلچسپ مشغلہ ہے۔ میرے دشمنوں کی تعداد جتنی بڑھتی جا رہی ہے، میری زندگی اتنی ہی خوشگوار ہوتی جا رہی ہے۔ جو مزہ دشمنوں کے درمیان آتا ہے دوستوں میں نہیں آتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" مارتھر نے پوچھا۔

"میں تم سے متفق نہیں ہوں۔" ایڈمرل نے کہا۔

"سینے میں آگ جو نہیں ہے ایڈمرل! بہر حال مجھے چند منٹ کی اجازت دو۔ ذرا باہر دیکھ آؤں، لوگ کیا کر رہے ہیں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔" مارتھر نے ایڈمرل کا پستول جیب میں رکھا اور پھر مردہ نائب کا پستول بھی نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔

ایڈمرل نے ایک گھٹی گھٹی سانس لی۔ وہ جس خطرے سے دوچار ہو گیا تھا اس کا اسے پورا پورا احساس تھا۔ یہ بات اس نے غلط نہیں کہی تھی کہ جنرل ظفر شاہ سے ملاقات سو فیصدی ذاتی نوعیت کی تھی۔ کوئی ایسا راز اس گفتگو میں نہیں تھا جو کسی غیر ملکی ایجنٹ کے لئے باعث کشش ہو۔ نہ ہی آبدوز میں کوئی ایسی دوسری چیز تھی جس سے کسی اور ملک یا فرد کو فائدہ حاصل ہو سکے۔ لیکن اب اسے ہونی ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطرناک آدمی اس وقت اس آبدوز کی تاک میں تھا اور صرف وقت اور تقدیر نے ان لوگوں کو اس حادثے سے دوچار کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد مارتھر واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر وہی پُرسکون لہریں نظر آ رہی تھیں جو اس کی شخصیت کا جزو تھیں۔

"سارے کام ٹھیک ٹھاک ہیں۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھی......" ایڈمرل نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"ان میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"کیا تمہیں میری ذہنی کیفیت کا اندازہ ہے۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہو گی؟"

"میں دوسروں کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا۔" وہ پتھریلے لہجے میں بولا۔

"کیا یہ اچھی بات ہے؟"

"میں دنیا کا سب سے برا انسان ہوں۔" وہ یک بیک مسکرا دیا۔

"اخلاقی قدریں بھی کوئی چیز ہوتی ہیں۔ کم از کم اس لاش کو تو میرے سامنے سے ہٹا
دو۔" ایڈمرل نے کرب سے کہا۔

"اس کے لئے تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا ایڈمرل! ہم تمہاری سمندری حدود سے نکل
جائیں، اس کے بعد آبدوز کو سطح پر لا کر ان لاشوں کو سمندر میں پھینک دیں گے۔ میں جانتا
ہوں کہ اس وقت اس ساحل پر اور یہاں سے دور دور کوئی آبدوز موجود نہیں ہے جو ہمارا
تعاقب کر سکے لیکن بحری جہازوں کی موجودگی خطرناک ہے۔ ممکن ہے کوئی جہاز تعاقب
کرے۔ اس لئے ہماری کوشش ہے کہ ہم یہاں سے دور پُرسکون علاقے میں پہنچ جائیں۔
اس کے بعد باقی کاموں کے بارے میں سوچیں گے۔"

"ایک بات بتاؤ مارتھر!" ایڈمرل نے پوچھا۔

"ضرور......ضرور...... پوچھو۔"

"کیا تمہارے ساتھیوں میں ایسے لوگ شامل ہیں جو آبدوز کو بہتر طور پر آپریٹ کر
سکیں؟" ایڈمرل نے پوچھا اور مارتھر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں...... بلاشبہ میرے تمام ساتھی اس قسم کی آبدوز کے لئے بہترین تربیت یافتہ
ہیں۔ میں خود ٹیکنیشن ہوں اور ہر قسم کی خرابی دور کر سکتا ہوں۔ دراصل مسٹر ایڈمرل! مارتھر
ایک پورے گروہ کا نام ہے۔ یہ گروہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلا ہوا ہے اور ہر جگہ
میرے آدمی موجود ہیں جو میرے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں اور میرے لئے کام کرتے
ہیں۔ کام کی جو بھی نوعیت ہو، میں ایسے لوگوں کا انتخاب کر لیتا ہوں اور بس مجھے کوئی دقت
نہیں ہوتی۔ اس وقت بھی میرے ساتھیوں میں ایسے ماہرین موجود ہیں جو سب میرین کی
زندگی کے سارے رموز سے واقف ہیں۔ چنانچہ ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔" مارتھر نے
جواب دیا اور ایڈمرل ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلانے لگا۔

"ویسے مارتھر! تمہاری زندگی کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟" ایڈمرل نے سوال کیا۔

"ان کا تعین تو میں خود بھی نہ کر سکا آج تک۔ بس سینے میں سلگتی ہوئی مشعل کبھی کبھی
بھڑکتی ہے اور میں کوئی ایسا پروگرام بنانے لگتا ہوں جو زندگی کو خطرات سے دوچار کر دے۔
میری زندگی بھی بڑی عجیب ہے ایڈمرل! آپ یقین کریں کہ میں ہر جگہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر
جاتا ہوں اور ہر مہم جوئی کے وقت میرے ذہن میں یہی خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ میری

زندگی کی شام کا پیغام ہو۔ لیکن زندگی ہے کہ طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی
ہے۔ موت بھی شاید مجھ سے خفا ہوگئی ہے۔ مرنے کی کسی بھی کوشش کو میں نے نظرانداز نہیں
کیا لیکن اب اس بات کا کیا کروں کہ یہ زندگی اتنی طویل ہوگئی ہے۔"

"جب تم نے مجھے گفتگو کے لئے منتخب ہی کیا ہے مارتھر! تو میرا دل چاہتا ہے تم سے
بہت سے سوالات کروں۔" ایڈمرل نے کہا اور مارتھر گردن ہلانے لگا۔

"میری طرف سے اجازت ہے ایڈمرل! جو خیال ذہن میں آئے اور جس سلسلے میں تم
مجھ سے کچھ پوچھنا چاہو، ضرور پوچھو۔" مارتھر نے کہا۔

"تم نے اس آبدوز کا تعین کس طرح کیا تھا؟"

"بس میری معلومات۔ جس سلسلے میں کام کرتا ہوں اس کے لئے میں بہت ہی
سائنٹفک طریقے سے کام کرتا ہوں اور ساری معلومات مہیا ہونے کے بعد آپریشن شروع
کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آبدوز کے ٹینک پٹرول سے بھرے ہوئے ہیں اور یہ مناسب
سفر کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خوراک کی خاصی مقدار موجود ہے۔ اس آبدوز کی
مشینری بالکل درست ہے۔ کیونکہ یہ آبدوز تم نے بہت ہی تھوڑا عرصہ ہوا فرانس سے خریدی
ہے۔"

"خوب...... تمہاری معلومات قابل تحسین ہیں۔"

"اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے مسٹر ایڈمرل! میں موت کا خواہاں ضرور ہوں لیکن
اپنے ساتھیوں کو بے کسی کی موت کا شکار نہیں بنانا چاہتا۔ اس لئے اندھے اقدامات سے
گریز کرتا ہوں۔" مارتھر نے کہا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس آبدوز کو اغواء کر کے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، ہاں ضرور۔ تم تو اب اپنوں ہی میں سے ایک ہو۔ کم از کم اس وقت تک جب
تک میرے مشن کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔ اگر تمہارا بہتر رویہ تمہاری تقدیر کی روشنی کا باعث نہ
بن سکا تو ممکن ہے میں تمہاری زندگی لینے کی کوشش نہ کروں۔ ہاں تمہاری کوئی ایسی حرکت
میرے لئے ناقابل برداشت ہو، مجھے ضرور مشتعل کر سکتی ہے اور تم اس بات کو بہتر طور
پر جانتے ہو کہ زندگیاں لینے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اب تمہارے سوال کا
جواب رہا کہ اب میں کیا کرنا چاہتا ہوں تو ایک دلچسپ کہانی کسی طور تمہاری نگاہوں سے

بھی گزری ہوگی۔ میری مراد اٹھارہویں صدی میں یونان کے ایک چھوٹے سے جزیرے ہاپٹون کی کھدائی سے برآمد ہونے والے پلاٹوس کے سونے کے بت سے ہے۔ یونان کی تاریخ میں پلاٹوس نحوست کا دیوتا سمجھا جاتا ہے اور قدیم یونانی اس سے خائف رہتے ہیں۔ اسی خوف کی بنیاد پر انہوں نے پلاٹوس کو خوش کرنے کے لئے چالیس من سونے کا ایک بت بنایا تھا جس کی آنکھوں میں دو قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے اور یہ ہیرے دنیا کے قیمتی ترین ہیرے شمار ہوتے تھے۔ جس وقت یہ بت برآمد ہوا تھا ہاپٹون کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ نحوست کے اس دیوتا کے بارے میں بہت سی کہانیاں یونانی دیو مالاؤں میں موجود ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نحوست کا یہ دیوتا اپنی موت کے بعد یونان سے ساری نحوستیں سمیٹ لے گیا تھا اور اس کے بعد یونانی قوم کو ترقی نصیب ہوئی۔

بہر صورت نحوست کی اس کہانی کو جدید یونانی مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ لیکن یونان کے قدامت پسند سونے کے بت کی اس برآمد سے خوش نہ تھے اور انہوں نے احتجاج کیا تھا کہ دیوتا کے اس بت کو مہذب آبادیوں میں نہ لایا جائے۔ اب اسے تم ایک مضحکہ خیز عقیدہ ہی کہہ لو کہ پلاٹوس کے برآمد ہونے کے ٹھیک چوتھے دن ہاپٹون پر شدید زلزلہ آیا اور وہاں کی آبادی ختم ہوگئی۔ اس عجیب وغریب واقعہ سے یونان کے متعدد شہروں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی اور قدامت پسندوں کا احتجاج شدید تر ہوگیا۔ حکومت یونان نے اس بت کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ اسے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے فروخت کیا جائے۔ بت کو ہاپٹون سے واپس نہیں لایا گیا تھا کہ دہشت پسندوں کے ایک گروہ نے چالیس من سونے کے لالچ میں اسے وہاں سے اغوا کرلیا اور ایڈروتھ نامی جہاز پر سوار کر کے اسے لے چلے۔ یونانی جہازوں نے اس کا تعاقب کیا تو وہ انہی سمندروں کی جانب جا نکلے جو ممنوعہ علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تب جہاز ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ وہ سمندر میں ابھری ہوئی چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہوگیا تھا اور نحوست کا دیوتا بھی اس کے ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں پہنچ گیا۔ یہ کہانی طویل عرصے سے عام ہے۔ لاتعداد مہم جو سونے کے اس بت کی تلاش میں سمندروں کو نجانے کہاں سے کہاں تک کھنگال چکے ہیں لیکن وہ صحیح جگہ نہ پا سکے۔

جہاز کی غرقابی کو عام کرنے والے چند افراد تھے جو نجانے کس طرح وہاں سے بچ آئے

تھے۔ انہوں نے اس کہانی کو عام کیا اور اس جگہ کی نشاندہی بھی کردی جہاں یہ جہاز غرق ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بچ آنے والوں میں وہی تنہا نہیں تھے بلکہ جہاز جس جگہ غرق ہوا تھا وہاں ایک چھوٹے سے جزیرے پر چند اور افراد بھی زندگی بچانے میں کامیاب ہوگئے جو وہاں سے نہیں نکل سکے اور نہ ہی ان کے نکلنے کی کوئی امید ہے۔ بچ کر آنے والوں میں بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر کئی جہاز اس جانب بڑھے جہاں ان لوگوں کی موجودگی متوقع ہوسکتی تھی لیکن وہ انہیں نہ پا سکے۔ اور یہ کہانی اٹھارہویں صدی سے مسلسل آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ موجودہ صدی میں پہنچ گئی۔

اور پھر ایک ہندوستانی شخص جس کا نام پرتھوی سنگھ تھا اور جو ایک خطرناک مجرم گردانا جاتا تھا کسی طور فرار ہوکر اس سمندری علاقے کی جانب جا نکلا جہاں وہ جہاز غرق ہوا تھا۔ پرتھوی سنگھ نے اپنی اس خوفناک مہم کی داستان لکھی۔ اسے اپنی زندگی کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن بالآخر ایک بار اسے فرار کا موقع مل گیا اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ یہ کہانی عام ہوگئی۔ پرتھوی سنگھ گرفتار کرلیا گیا اور اسے سزا ہوگئی۔ لیکن جب یہ کہانی میرے کانوں تک پہنچی تو میں بھی خود کو اس عظیم الشان نحوست کے بت کے حصول سے باز نہ رکھ سکا اور میں نے فرانس کے جزیرے سے پرتھوی سنگھ کو اغواء کیا۔ میں نے اسے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جو عام نگاہوں میں نہیں ہے اور پھر خود پلاٹوس کی تلاش کے لئے تیاریاں کرنے لگا۔ یہ تیاریاں مجھے تمہارے وطن تک لے آئیں اور یہاں سے میں نے اپنی اس مہم کا آغاز کیا ہے۔ پہلے میں اس آبدوز کے ذریعے اس جگہ جاؤں گا جہاں پرتھوی سنگھ موجود ہے۔ اور میرے ساتھی اس کی حفاظت اور نگرانی کررہے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس پراسرار جزیرے کی تلاش میں نکلیں گے جہاں جہاز غرق ہوا تھا۔ اور پھر میں اس سونے کے بت کو حاصل کرکے اپنے اس نوادر خانے میں جمع کروں گا جسے میں نے بڑی محنت سے بنایا ہے۔ یہ ہے اس آبدوز کے اغوا کی تفصیل اور یہ ہے میری مختصر کہانی۔“

ایڈمرل کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”کیا تم مجھے بھی اس مہم میں شریک رکھو گے؟“

”ہاں ایڈمرل! کیا حرج ہے؟ زندگی بہر صورت رواں دواں رہتی ہے۔ بعض اوقات تم ایسے کام کرتے ہو جو تمہاری پسند کے ہوتے ہیں اور بعض اوقات تمہیں ایسے کام بھی کرنے

پڑتے ہیں جن میں تمہاری زندگی کو لاتعداد خطرات لاحق رہتے ہیں لیکن تم انہیں کرنے کیلئے مجبور ہوتے ہو۔ تو تم بھی اس مجبوری کا شکار ہو گئے ہو ایڈمرل! چنانچہ وقت سے تعاون کرو۔"

"لیکن میرے دوست! تم نے اس کام کے لئے کسی آبدوز کا ہی انتخاب کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ میں الجھنوں سے بچنا چاہتا تھا۔ سمندری جہاز دیکھ لئے جاتے ہیں جبکہ آبدوز ہمیں ان ہنگاموں سے دور رکھنے میں معاون ثابت ہوگی۔"

"لیکن وہاں خطرات ہی خطرات ہیں۔"

"میں جانتا ہوں ایڈمرل! البتہ تم میرے لئے ایک بات بھول گئے کہ میں موت کی تلاش میں سرگرداں ایک شخص ہوں۔ مجھے موت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

"کیا وہ سمندری چٹانیں آبدوز کو پاش پاش نہیں کرسکتیں؟" ایڈمرل نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، ہم ان سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ تم یہ بھی سوچو کہ یہ آبدوز ہمیں اس جہاز کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی جہاز ہی سے سفر کرتے تو ہمیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ غوطہ خوروں کو سمندر میں اتارنا پڑتا اور ایسی ہی دوسری بہت سی باتیں۔ میں نے ان سے بچنے کے لئے آبدوز کا انتخاب کیا۔"

"ہوں......" ایڈمرل نے گہری سانس لی اور پھر بولا۔ "تمہارے ساتھ اس مہم میں شامل ہونے کے بعد مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ اور نقصان تقدیر کی باتیں ہیں۔ ان باتوں کو جانے دو ایڈمرل!"

"ٹھیک ہے...... مجھے اپنی مجبوریوں کا احساس ہے۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اول تو میں آبدوز پر رہ کر ایسے کوئی کام نہیں کرسکتا جو تمہارے لئے نقصان دہ ہوں۔ دوئم کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میری فطرت ہے کہ میں وہ جدوجہد پسند کرتا ہوں جو کامیابی سے قریب ہو۔ جذباتی اور ناکام قدم اٹھانا مجھے پسند نہیں ہے۔" ایڈمرل نے کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے ایڈمرل! اگر ایسا ہوا تو مجھے تم ایک اچھا ساتھی پاؤ گے۔ میری درخواست ہے کہ اچھے لوگوں کی طرح ہمارے درمیان رہو اور ان معمولات میں حصہ لیتے رہو۔" مارتھر نے کہا اور ایڈمرل نے گردن ہلا دی۔ پھر اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن میری ایک درخواست ہے مارتھر! کہ ان لاشوں کو میرے سامنے سے ہٹا دو"

میں بھی جذباتی انسان ہوں۔ ان لوگوں سے میرا جذباتی رابطہ ہے اور میں ان کی موت کو با آسانی فراموش نہیں کرسکتا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ پہلا موقع ملتے ہی ان لاشوں کو آبدوز سے نکال دیا جائے گا۔ یوں بھی یہ ہمارے لئے مضر ثابت ہو سکتی ہیں۔" مارتھر نے جواب دیا اور ایڈمرل نے گردن ہلا دی۔ وہ خاموش اور مغموم تھا۔ مارتھر پھر باہر چلا گیا اور ایڈمرل سوچنے لگا کہ زندگی میں پیش آنے والا یہ واقعہ کتنا اذیت ناک اور روح فرسا ہے۔ اس کے اہل خاندان کو اور اس کے دوسرے لواحقین کو پتہ بھی نہ ہوگا کہ اس پر کیا گزری۔ اس کے ہم وطن ممکن ہے اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں لیکن یہ شیطان نما آدمی ان کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دے گا۔ ایڈمرل مارتھر کے نام سے بھی واقف تھا اور اس وقت اس نے اس کی درندہ صفت فطرت کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اس مصیبت سے نجات حاصل کرے گا۔ مارتھر نے اسے صرف اس لئے زندگی دی ہے کہ تھوڑی سی کمپنی رہے ورنہ وہ اسے بھی دوسرے لوگوں کی طرح ختم کر کے سمندر میں پھینک دیتا۔ زندگی وقتی طور پر بچ گئی ہے لیکن اس درندہ صفت شخص کے مزاج کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی وقت ایڈمرل کو ٹھکانے لگا دیتا۔

ایڈمرل پریشانی سے سر جھکائے سوچتا رہا۔ یہ حادثہ اس کی زندگی میں سب سے انوکھا تھا۔ یوں تو ایک فوجی کی زندگی ہمیشہ مہم جوئی سے پُر ہوتی ہے لیکن ملک وملت کے لئے خطرات مول لینے میں جو مزہ ہے وہ اس کام میں کہاں تھا۔ اس وقت تو وہ ایک مجرم کے جنون کا شکار تھا۔ اس سلسلے میں کیا کرے۔ یہاں صرف اپنی جان بچانے کا سلسلہ تھا اور اس کے لئے ابھی تک کوئی جدوجہد نہیں کی جاسکتی تھی۔ آبدوز کے رفیق مر چکے تھے اور ان کے بغیر آبدوز کو کنٹرول کرنا تنہا ایڈمرل کے بس کی بات نہیں تھی۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ ایڈمرل خود بھی جانتا تھا کہ اس کی حکومت کسی ایسے واقعہ کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کے لئے کوئی جامع کارروائی کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو لوگ اسے اطلاع دے کر ہیڈ کوارٹر کی طرف آئے ہوں گے وہ بے چارے بھی صورتحال پوری طرح نہ سمجھ سکے ہوں گے۔ کوئی دوسری آبدوز بھی قریب موجود نہیں تھی جو کم از کم تعاقب ہی کرتی۔

بہرحال ابھی کسی بہتری کی امید نہیں تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وقت کوئی حل پیش کر

دے۔ چند لمحات کے لئے ایڈمرل کے دل میں اپنے اہل خاندان کا خیال آیا۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے پیچھے اس کے خاندان کو سنبھالنے والے موجود تھے۔ بے شک وہ لوگ اس کی جدائی کو بھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ لیکن کسی ایسی تکلیف کا شکار نہ ہوں گے جو تشویش ناک ہوتی ہے۔

اس بار مارتھر کافی دیر کے بعد آیا۔ اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایڈمرل کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''میرے ذہین ساتھیوں نے آبدوز کے سارے نظام کو سمجھ لیا ہے اور انہوں نے ساخت کا تعین بھی کر لیا ہے۔ یہ آبدوز فرانسیسی ساخت کی ہے نا؟''

''ہاں۔'' ایڈمرل نے جواب دیا۔

''اس سے قبل بھی ہم ایک فرانسیسی آبدوز پر سفر کر چکے ہیں۔''

''مارتھر! تم نے جرائم کی دنیا میں بڑی محنت سے اپنا مقام بنایا ہے۔ لیکن کیا اس کے پس پشت کوئی مقصد کارفرما ہے؟ تمہاری کوئی منزل بھی ہے؟ یہ سب کچھ تم کس لئے کر رہے ہو؟''

''ہاں میرے دوست! میری منزل موت ہے۔ دنیا کا چلن یہی ہے۔ بڑے بڑے سائنسدانوں نے اپنی دنیا تج دی ہے۔ بڑے بڑے سائنسدان مصروف عمل ہیں۔ ملکوں کی توسیع کی جا رہی ہے۔ کمزور لوگوں اور ملکوں کو پیسا جا رہا ہے۔ تسخیر کائنات کے ارادے ہیں۔ آخر کس لئے انسان اس کائنات پر محیط ہونے میں کوشاں ہے؟ آخر کیوں؟ میں نے بہت غور کیا، بہت سوچا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اور پھر یہی فیصلہ کیا کہ جب تک زندگی ہے، دوڑتے رہو۔ جس راستے کا انتخاب کیا ہے اس پر چلتے رہو۔ میں نے بے اندازہ دولت جمع کی ہے۔ جمع کرتا رہوں گا اور پھر مر جاؤں گا۔ میرے بعد میری دولت میرے نام سے منسوب رہے گی۔ لیکن اس طرح جیسے ہٹلر مر گیا لیکن لوگ آج بھی اس کا نام لیتے ہیں۔ اس کے کارناموں کے حوالے سے کوئی اسے اچھا کہتا ہے کوئی برا کہتا ہے۔ یہ کاروبار ہستی ہیں۔ یونہی چلتا رہا ہے، یونہی چلتا رہے گا۔''

''انوکھا فلسفہ ہے۔'' ایڈمرل نے گردن ہلاتے ہوئے گہری سانس لی پھر بولا۔ ''تم میری حیثیت سے واقف ہو مارتھر؟''

''کیا مطلب؟''

''میرا عہدہ جانتے ہو؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔ تمہارا عہدہ اس وقت بھی تمہارے لباس پر سجا ہوا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس عہدے کے لئے ایک طویل تجربہ درکار ہے۔''

''بے شک۔''

''میں اب اس آبدوز پر تنہا ہوں اور پوری طرح تمہارے قبضے میں ہوں۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ میں اب تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے میرے ہاتھوں کو باندھے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں کھول دو۔ میں تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔''

مارتھر چند ساعت کچھ سوچتا رہا۔ پھر مسکراتا ہوا اٹھا اور اس نے جیب سے ایک لمبا چاقو نکال کر ایڈمرل کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی پتلی ڈور کاٹ دی۔

''تم نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''ہاں میں حالات سے سمجھوتے کا قائل ہوں مارتھر۔ بات اگر میری ڈیوٹی اور فرض کی ادائیگی کی ہوتی تو شاید تمہارے ساتھ کوئی تعاون نہ کرتا۔ ملکی معاملات میں کسی کا آلۂ کار بننے پر ہم موت کو ترجیح دیتے ہیں لیکن یہ صورتحال دوسری ہے اور میں تمہارے ساتھ تعاون کر کے زندگی بچانا چاہتا ہوں۔'' ایڈمرل نے جواب دیا۔

''مجھے صاف گوئی پسند ہے لیکن صاف گوئی کے ساتھ اگر صاف دل بھی ہو تب وہ صفت مکمل ہوتی ہے۔ اگر تم ایک اچھے انسان کی حیثیت سے مجھ سے تعاون کرتے رہے تو تمہاری زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے۔''

''شکریہ۔''

''تو اٹھو اور یہ وردی اتار کر ایک عام انسان کی حیثیت اختیار کرو۔ اس کے بعد یہ لاش اٹھا کر باہر لے جاؤ اور اسے دوسری لاشوں کے ساتھ رکھ دو تاکہ ہم انہیں ایک ساتھ سمندر برد کر سکیں۔''

ایڈمرل نے بلاچون وچرا اس کے احکامات کی تعمیل کی۔ وہ جانتا تھا کہ حالات اس کے موافق نہیں اور اس وقت نجات اسی میں ہے کہ اس درندہ فطرت شخص سے تعاون کیا

جائے۔ وہ لڑائی بھڑائی کا انسان نہیں تھا اور پھر عمر کی اس منزل میں تھا جہاں تجربہ تو بہت ہوتا ہے لیکن عمل محدود ہو جاتا ہے تاہم اپنی قوت کے مطابق وہ کام کرتے رہنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے رفیق کی لاش اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کا نائب ایک توانا جوان تھا۔ جس کے دل میں نجانے کیا کیا عزائم ہوں گے جس کا ذہن نجانے کیا کیا سوچتا ہوگا لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

طویل وقت کے بعد وہ کیبن سے نکلا۔ اس نے خود کو تیار کر لیا کہ اپنے دوسرے رفیقوں کی لاشیں بھی دیکھے۔ اگر دوران جنگ یہ لوگ دشمن کے ہاتھوں شہید ہوتے تو بات ہی دوسری تھی لیکن......

آبدوز میں مارتھر کے دوسرے ساتھی مصروف عمل تھے ساری مشینیں معمول کے مطابق کام کر رہی تھیں اور نہ ان لوگوں کو کوئی دقت پیش آ رہی تھی۔ لاشوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا اور وہ اس کام سے فارغ ہو گیا اس کے ہاتھ اور لباس پر جگہ جگہ خون کے دھبے لگ گئے تھے جنہیں اس نے باتھ روم جا کر صاف کیا اور لباس بھی جگہ جگہ سے دھویا پھر باہر نکل آیا۔

مارتھر کی ساتھی لڑکی نے جس کا اصل نام نجانے کیا ہوگا اسے کافی کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر ایڈمرل۔ مارتھر آپ کو کیبن میں طلب کرتا ہے کافی تیار ہے۔“

”شکریہ۔“ ایڈمرل نے ستے ہوئے انداز میں کہا اور کیبن کی طرف بڑھ گیا مارتھر حسب عادت مسکرا رہا تھا۔

بیٹھو ایڈمرل۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کروں۔ تمہارا عہدہ تمہاری شخصیت سے چپک کر رہ گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے۔“

”میرا نام فرید احمد ہے۔ تم مجھے احمد کہہ سکتے ہو۔“ ایڈمرل نے جواب دیا۔

”شکریہ۔ کافی لو۔“ اس نے کافی کی پیالی ایڈمرل کی طرف کھسکا دی جسے ایڈمرل نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

”اگر تقدیر نے ساتھ دیا اور ہم سونے کے اس عظیم الشان بت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں واپسی میں تمہیں اپنے جزیرے پر چند روز مہمان رکھوں گا۔“

”اپنے جزیرے پر۔“

”ہاں۔ جہاں میری حکومت ہے۔“

”ہاں۔ یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ کسی جزیرے پر تمہاری حکومت ہے۔“

”تم کیا سمجھے ہو ایڈمرل۔ مارتھر کا مشن کوئی معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ ایک حیثیت ہے میری۔ دنیا کے مختلف ممالک میں۔ میں مختلف حیثیت رکھتا ہوں لوگ مجھے طرح طرح کے ناموں سے جانتے ہیں۔ وہاں میری شخصیت کے عجیب عجیب بت ہیں۔ میں نے بہت کچھ کھونے کے بعد بہت کچھ پایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے بھی ایک دنیا بنائی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ میرے سینے میں کیا ہے اور ابھی اس دنیا کو میرے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہئے۔“

”تمہارا کوئی مشن بھی ہے مارتھر۔“ ایڈمرل نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ انسان کی زندگی میں اگر کوئی مشن نہ ہو تو پھر اس میں تحریک نہیں رہتی۔ مجھے دیکھو اتنی دولت ہے میرے پاس کہ ایک علیحدہ ملک بنا سکتا ہوں۔ ایک ویرانے کو دنیا کے جدید ترین ملک میں بدل سکتا ہوں لیکن میں ابھی خود کو نامکمل سمجھتا ہوں ابھی میری تکمیل میں دیر ہے۔ میں تمہیں دکھاؤں گا ایڈمرل کہ میں کیا ہوں۔“

”تمہاری باتیں متضاد ہوتی ہیں۔“ ایڈمرل احمد نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”وہ کیوں نشاندہی کرو۔“ مارتھر مسکرا کر بولا۔

”ایک طرف تم کہتے ہو کہ تم موت کے متلاشی ہو اور دوسری طرف اتنے بڑے بڑے عزائم رکھتے ہو۔“

”یہی تو دلچسپ بات ہے مسٹر احمد۔ آہ کاش تم میرے ذہن کی گہرائیوں میں جھانک سکو یہاں انسان کی بے ثباتی کا گہرا غم ملے گا تمہیں۔ دیکھو میں کیا کچھ کر رہا ہوں۔ کیسی شدید جدوجہد کر رہا ہوں لیکن میں موت کو نہیں بھولتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر کسی بھی لمحے موت کی آغوش میں جا سوؤں گا۔ اس کے باوجود میں متحرک ہوں۔ یہ انسان ہے مسٹر احمد۔ ساری دنیا یہی کر رہی ہے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی انتہا کچھ اور ہے۔“

”عجیب فلسفہ ہے تمہارا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ احمد نے جلدی جلدی کافی کے کئی گھونٹ لے لئے۔

"آ جائے گا۔ ضرور آ جائے گا۔ ہر بات کو سمجھنے کے لئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ کچھ وقت لگے گا اس میں۔"

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہت وقت گزر چکا تھا اور اب وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے درخواست کی۔ "کیا مجھے کچھ دیر آرام کی اجازت ہوگی۔"

"ہاں ضرور تم اپنی تمام تر ضروریات پوری کر سکتے ہو۔ کسی بھی سلسلے میں تکلف کی ضرورت نہیں ہے میں چلتا ہوں تم آرام کرو۔" وہ اپنی کافی ختم کر کے باہر نکل گیا۔

ایڈمرل احمد آرام کرنے لیٹ گیا لیکن سکون ملتے ہی لاتعداد خیالات نے اس کے ذہن میں یلغار کر دی۔ اسے اپنا وجود بہت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سب اس طرح ہوا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا انسانی زندگی کو خطرات لاحق ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ہونی اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کے اہل خاندان بہر حال اس بات سے تو واقف ہو ہی جائیں گے کہ وہ ایک سازش کا شکار ہو گیا ہے لیکن یہ سازش کیا ہے اور اس کا اختتام کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔

اسے عزیز و اقارب یاد آتے رہے اور اس کے بعد اسے نیند آ گئی۔ نیند بھی کافی طویل تھی نجانے کتنی بار جاگا اور اس کے بعد دوبارہ سو گیا پھر اس نے اپنے بستر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

مارتھر کی سیکریٹری اس کے نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ "اٹھیں گے نہیں مسٹر احمد۔" اس کی نرم آواز ابھری اور احمد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا وقت ہو گیا۔"

"رات کے نو بجے ہیں۔"

"اوہ۔ بہت دیر ہو گئی۔"

"کیا حرج ہے یہاں کون سی مصروفیات ہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں۔ یہ بھی درست ہے۔ کیا آپ لوگوں نے کھانا کھا لیا۔"

"ہاں۔ آپ کے لئے منگواؤں۔"

"نہیں۔ بھوک نہیں محسوس ہو رہی۔" احمد نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کوئی اور چیز؟ اتفاقات ہیں زمانے کے۔ آپ کی آبدوز پر ہم آپ کے میزبان بن گئے ہیں۔"

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"روز۔"

"کہاں کی باشندہ ہو۔"

"سوئس ہوں۔"

"مارتھر کے ساتھ کب سے کام کر رہی ہو۔"

"پانچ سال سے لیکن کسی مہم میں ساتھ دینے کا یہ پہلا موقع ہے؟" روز نے جواب دیا۔

"کیا مطلب۔"

"مجھے سوئیزرلینڈ سے یہاں بلایا گیا تھا۔ بڑا اشتیاق تھا مجھے مارتھر سے ملنے کا، کیسی انوکھی شخصیت کا مالک ہے۔"

"اس سے قبل اسے نہیں دیکھا تھا۔"

اس کے گروہ کے بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔ جس نے اسے دیکھا ہے وہ خود کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہے۔ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔"

"ہوں۔ تم لوگوں کو اس سے بڑی عقیدت ہے؟"

"وہ جادوگر ہے۔ ایسے ایسے کام کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ زندگی میں سب کچھ دولت ہی نہیں ہوتی۔ گو اس کے ساتھی عیش کرتے ہیں اور وہ ایک مہربان آقا ہے۔ وہ ہر ایک کو زندگی کی ان ساری خوشیوں سے دوچار کرنا پسند کرتا ہے جو انسانی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہمارے دل میں اس کا ایک نمایاں مقام بھی ہے۔ وہ اتنا پر کشش ہے کہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم سب اسے دیکھنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ میں اب تک گروہ کے جتنے افراد سے ملی ان سب میں ایک آقا کی حیثیت کے علاوہ میں نے ایک اور مقام بھی پایا جو ایک پسندیدہ شخص کے لئے ہوتا ہے۔" روز نے جواب دیا اور ایڈمرل گردن ہلانے لگا۔

پھر وہ روز کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے کافی کا ایک کپ چند سینڈوچز کے ساتھ لیا اور پھر آبدوز کے مختلف حصوں میں چکرانے لگا۔ شاید اس دوران مارتھر کو لاشیں ٹھکانے لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ کیونکہ وہ لاشیں اپنی جگہ پر نہیں تھیں جہاں ایڈمرل احمد

نے انہیں دیکھا تھا۔

مارتھر اسے آبدوز کے ایک مخصوص حصے میں مل گیا جہاں وہ کاغذات سامنے رکھے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر احمد کو دیکھا اور کسی قدر سرد لہجے میں بولا۔

''افسوس میں اس وقت تم سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ میں اپنے چند ضروری کاموں میں مصروف ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔'' ایڈمرل احمد نے جواب دیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وقت گزارنے کے لئے کوئی مشغلہ نہیں تھا بس خواہ مخواہ اِدھر سے اُدھر پھر رہا۔ چنانچہ وہ جب تک برداشت کر سکا گھومتا رہا اور اس کے بعد دوبارہ کیبن میں آ گیا۔

کیبن میں آ کر وہ سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ حالانکہ وہ دیر تک سویا تھا اس کے باوجود اسے نیند آ گئی۔ اور پھر اس کی آنکھ اسی وقت کھلی تھی جب اسے آبدوز میں ہلکے سے شور کا احساس ہوا تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔

آبدوز ساکت تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ سطح سمندر پر آ گئی ہے۔ ایڈمرل نے باہر نکل کر صورتحال کا جائزہ لیا۔ آبدوز میں چند نئے لوگ نظر آ رہے تھے اور اس کے علاوہ اوپر سے لوگ آ جا رہے تھے۔ اس نے روز کو دیکھا جو ایک طرف کھڑی کوئی فہرست بنا رہی تھی۔ وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''کیا آبدوز سطح پر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... ہم لوگ جزیرہ گوڈین پر ہیں جہاں سے آبدوز میں ایندھن لیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی خوراک وغیرہ کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو گے۔'' روز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بڑے بڑے کارٹن اندر لائے گئے تھے اور انہیں لانے والے قوی ہیکل اور خوش لباس لوگ تھے۔ اب آبدوز میں افراد کی تعداد بیس کے قریب ہو گئی تھی۔ یہ سب مارتھر کے ساتھی تھے۔ خطرناک، قوی ہیکل اور چاق و چوبند۔ انہی میں ایک دُبلا پتلا دراز قامت آدمی بھی تھا جو پرانے فرانسیسی طرز کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اس کے چہرے پر گل مچھے تھے اور آنکھوں میں تیزی تھی حالانکہ اس کے سارے بال

سفید تھے لیکن اس کے باوجود صحت مند نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے احترام سے آبدوز کے اندر کیبن میں پہنچایا۔

ایڈمرل نے اوپر جانے کی کوشش کی تو مارتھر کی دوسری ساتھی نے اسے روک دیا۔ ''اوپر کا کام مکمل ہو چکا ہے جناب! اور آبدوز کو پانی کی گہرائیوں میں جانے کی ہدایت مل گئی ہے۔ اس لئے اب اوپر جانا بے کار ہے۔''

''اوہ...... اچھا۔'' احمد واپس نیچے آ گیا۔ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی اس لئے اب [illegible] بھی بڑھ گئی تھی۔ احمد آبدوز پر بار کئے جانے والے سامان کو دیکھنے لگا۔ اس میں خوراک کے ڈبوں کے علاوہ اسلحہ وغیرہ بھی بھاری تعداد میں تھا۔ مارتھر نے زبردست انتظامات کئے تھے۔ ایڈمرل بے چارہ خواہ مخواہ ہی اس مشن کا شریک بن گیا تھا۔ اس کا تو کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

آبدوز واپس پانی کی گہرائیوں میں جانے لگی اور ایڈمرل ایک کونے میں کھڑا ہو کر زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھنے لگا۔ چند ہی روز قبل اس کی کیا پوزیشن تھی۔ وہ سب سے بڑی شخصیت سمجھا جاتا تھا اور اسی آبدوز میں اس کے احترام میں لوگ زیادہ زور سے بول بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن اس وقت وہ ایک معمولی سے انسان کی حیثیت سے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ دور سے مارتھر نے اسے غور سے دیکھا اور مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھ آیا۔

''ہیلو ایڈمرل!''

''ہیلو مارتھر!''

''ہم اپنی منزل کی طرف چل پڑے ہیں ایڈمرل''

''ہاں...... مجھے علم ہے۔''

''تم نے جس ضروری سامان کا بندوبست کیا ہے، تم نے اسے دیکھا؟''

''ہاں۔''

''کیا خیال ہے...... مکمل ہے؟''

''اس بارے میں تم زیادہ بہتر جانتے ہو گے۔''

''ہاں۔ جس قدر مجھے اس سلسلے میں معلومات مل سکیں ان کے مطابق تو یہ سامان ہماری

ضرورت پوری کرتا ہے۔ باقی حالات جیسے بھی ہوں۔ آؤ اب پرتھوی سنگھ سے گفتگو کریں۔ میں خود بھی پہلی بار اس شخص سے ملاقات کر رہا ہوں۔ آؤ......'' مارتھر نے دوستانہ انداز میں احمد کا ہاتھ پکڑا اور کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

کیبن میں طویل القامت دبلا پتلا شخص گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک ہی روز موجود تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

''مسٹر پرتھوی! مارتھر سے ملو۔''

اور بوڑھا آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس نے چہرے پر کوئی تاثر پیدا کئے بغیر پہلے مارتھر اور پھر احمد سے ہاتھ ملایا۔ ''اپنے ہم پیشہ پرتھوی سنگھ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔'' مارتھر نے کہا۔

''مارتھر بھی میرے لئے اجنبی نہیں۔ لیکن میں اب اس زندگی سے بہت دور نکل آیا ہوں۔'' پرتھوی سنگھ نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' مارتھر نے بیٹھتے ہوئے احمد کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایڈمرل فریداللہ بھی بیٹھ گیا۔

''مطلب یہی ہے کہ میں مجرمانہ زندگی کے بدترین لمحات سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحات بڑے روح فرسا ہوتے ہیں۔ مسٹر مارتھر! ایک چالاک مجرم جوانی کے عالم میں اپنی تمام تر ذہنی اور جسمانی قوتوں کے ساتھ مصروف عمل رہتا ہے اور اگر جوانی گزر جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو پھر ایسی حیثیت سے کہ لوگ اس کی جوانی فراموش کر چکے ہیں۔ اور ایک مضمحل قویٰ کے ساتھ اس کے لئے کوئی پناہ گاہ نہ ہو اور آخری پناہ گاہ جیل ہو تو اسے زندگی کا بدترین دور بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔'' پرتھوی سنگھ نے کہا۔

''تمہارے تجربات میرے لئے مشعل راہ ہوں گے۔'' مارتھر نے کہا۔

''ہاں...... ممکن ہے۔'' وہ بےزاری سے بولا۔

''لیکن تمہیں خوش ہونا چاہئے پرتھوی! کہ اب تم جیل میں نہیں ہو۔''

''خوش......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں مارتھر کو دیکھا۔

''ہاں۔''

''کیا تم ان حالات میں خوش رہ سکتے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''میں اپنی ذات میں کچھ نہیں رہا۔ ایک زمانے میں میرا طوطی بولتا تھا۔ لوگ میرے نام سے خوفزدہ رہتے تھے اور میرا وجود نمبر ایک ہوتا تھا۔''

''بدلے ہوئے وقت سے تعاون ضروری ہے مسٹر پرتھوی۔''

''کیا فطرت کا بدلنا بھی اتنا ہی آسان ہے؟'' پرتھوی نے پوچھا۔

''ہاں، فطرت کا بدلنا آسان نہیں ہے۔ لیکن انسان کو حالات کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ تم اپنی زندگی کی تمام تر کوششوں کے باوجود ناکام ہو کر جیل چلے گئے تھے اور اس کے بعد تمہارے قویٰ اس قابل نہیں تھے کہ تم جیل کی چار دیواری سے باہر نکل سکتے۔ اب اگر تقدیر نے تمہیں جیل سے باہر نکلنے کا موقع فراہم کر دیا ہے تو تم اس پر بھرپور تعاون کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

''ہاں...... میرے حق میں جو بہتر تھا میں نے اس سے گریز نہیں کیا۔'' پرتھوی سنگھ نے جواب دیا۔

''بحالت مجبوری یہ سب کچھ کرنا مناسب نہیں ہے مسٹر پرتھوی سنگھ! میں نے تمہیں ایک باعزت مقام دے کر اپنے درمیان بلایا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم ایک باعزت انسان کی حیثیت سے میری رہنمائی کرتے رہو۔ اگر میری ساری زندگی مجبوری کے عالم میں رہی تو میرا خیال ہے کہ نہ تم خوش رہ سکو گے نہ میں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک کارکن کی حیثیت سے میرے ساتھ اس کام میں حصہ لو اور قدم قدم پر میری رہنمائی کرو۔''

''میں نے اس سے انکار نہیں کیا مسٹر مارتھر! میں تو صرف آپ کو اپنے تاثرات بتا رہا تھا۔''

''تمہیں یہ تاثرات بدل دینے چاہئیں مسٹر مارتھر! تم سوچو کہ تم اپنی زندگی کی جدوجہد میں ناکام ہو کر جیل پہنچ چکے تھے، اب اگر تمہیں رہائی کا موقع اور ایک آزاد زندگی مل گئی ہے تو پھر تم اسے خوش آمدید کیوں نہیں کہتے۔''

''میں نے اسے خوش آمدید کہا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں جس حد تک بھی ممکن ہو سکا تمہاری مدد کروں گا۔'' پرتھوی سنگھ نے کہا۔

''شکریہ۔ اس کے عوض تمہیں تمہاری پسند کے مقام پر بقیہ زندگی گزارنے کے بہترین

لوازمات مہیا کر دیئے جائیں گے۔ یہ مارتھر کا وعدہ ہے۔'' مارتھر نے کہا اور پرتھوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جوانی اسی قدر خود اعتماد ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے جوان پرتھوی سنگھ یاد آ رہا ہے جو بالکل تمہاری ہی مانند دنیا کو ہیچ سمجھتا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' مارتھر نے پوچھا۔

''ایک عمر اسی قدر خود اعتماد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تجربات آہستہ آہستہ یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہماری خود اعتمادی ہمارے تابع نہیں ہوتی۔ کچھ حالات ہم سے باغی ہوتے ہیں اور کسی طور ہمارے قبضے میں نہیں آتے۔''

''میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا پرتھوی۔''

''تسلیم کر لو۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''ممکن ہے۔ بہرحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مجھے بتاؤ جیل سے رہا کرا کر میرے ساتھیوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

''نہایت عزت سے انہوں نے مجھے اپنے درمیان رکھا۔ تمہارے ایک ساتھی نے مجھے تمہارے مقاصد سے آگاہ کیا اور میں نے اس بھیانک علاقے میں جانے کی شدید مخالفت کی۔''

''کیوں......؟''

''اس لئے کہ وہ موت کا علاقہ ہے۔ تم اسے موت کا مسکن کہہ سکتے ہو۔ موت وہاں رہتی ہے اور وہیں سے دنیا کے گشت پر نکلتی ہے۔ وہ جزیرہ بے حد خوفناک ہے۔ وہاں آباد لوگ اب مہذب دنیا کو پسند نہیں کرتے اور مہذب دنیا میں بسنے والوں کے دشمن ہیں۔ تم یقین کرو اگر وہ لوگ وہاں سے نکلنا چاہیں تو نکل سکتے ہیں۔ لیکن اب انہیں آبادیاں پسند نہیں ہیں۔''

''ان لوگوں کا طرزِ زندگی کیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں یہاں ایسے خوفناک حالات میں گھر گیا کہ مجھے کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ بس میں وہاں سے فرار کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر وہاں سے نکل آیا۔''

''تمہاری ملاقات کسی سے تو ہوئی ہوگی۔''

''ہاں...... چند لوگوں سے۔ لیکن وہ افریقہ کے انتہائی غیر مہذب قبائل سے زیادہ وحشی ہیں اور ان سے انسانیت کی کوئی توقع محض حماقت ہے۔''

''خوب، ان کی آبادی کی تعداد بھی نہیں معلوم؟''

''نہیں...... میں ان کی آبادی تک پہنچ ہی نہیں سکا۔''

''کیا وہ سیاہ فام ہیں؟''

''نہیں۔ اس کے برعکس کھلی آب و ہوا میں رہنے والے خوبصورت ترین باشندے۔ جزیرہ غالباً آٹھ ماہ تک برف اور کہر میں ڈھکا رہتا ہے۔ سرسبز درختوں کی بہتات ہے لیکن سب کے سب بے ترتیب۔ وہ لوگ ان چار ماہ میں جب دھوپ نکلتی ہے اپنے لئے خوراک کے ذخائر اکٹھے کر لیتے ہیں۔ یہ ذخائر سمندری مچھلیاں اور وہ جانور ہوتے ہیں جو پیدا ہو جاتے ہیں۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ وہ کسی جاندار کو نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کو بھی کھا لیتے ہیں۔ جزیرہ کیڑے مکوڑوں سے بالکل صاف ہے۔ جتنے بھی حشرات الارض وہاں نظر آتے ہیں ان سب کو پکڑ لیا جاتا ہے اور ان کی ایک ذخیرہ گاہ بنا لی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ اجناس اور پھل بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی مقدار بہت کم ہوتی ہے کیونکہ شدید سردی اور برف درختوں کے پھلوں کو تازہ نہیں رہنے دیتی۔ اس وجہ سے اجناس کی کمی ہے۔''

''خوب پراسرار جگہ ہوگی۔'' مارتھر نے مسکرا کر ایڈمرل احمد کی طرف دیکھا۔ احمد بیچارہ بھی خاموشی سے پرتھوی سنگھ کی باتیں سن رہا تھا۔

''ٹھیک ہے مسٹر پرتھوی سنگھ! اچھا اب یہ بتاؤ کہ سونے کے اس بت کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''یہ ایک حقیقت ہے جس کی نشاندہی ان لوگوں کی زبانی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن غالباً ان لوگوں نے خود بھی کبھی اس بت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' پرتھوی سنگھ نے جواب دیا۔

''کیا وہ ان کے درمیان کوئی خاص حیثیت رکھتا ہے؟''

''میرا خیال ہے نہیں۔ وہ اس بارے میں سوچتے بھی نہیں ہیں۔'' پرتھوی سنگھ نے کہا۔

''تمہارا اپنا اس سلسلے میں کیا خیال ہے پرتھوی سنگھ؟ میں ایک بزرگ کی حیثیت سے

تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" مارتھر نے کہا اور پرتھوی سنگھ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"دنیا محیر العقول واقعات سے بھری پڑی ہے۔ تواریخ میں انوکھی انوکھی باتیں درج ہیں۔ ہم ان باتوں کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ پلاٹوس کے اس پراسرار مجسمے کے بارے میں جو کہانیاں مشہور ہیں ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو ضرور ہوگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ لوگوں کے اوہام تھے یا درحقیقت کوئی ایسی ہی بات۔ لیکن بہر صورت ان تمام باتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"کیا تم نے اس بت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔ میں نے یہ حماقت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فائدہ بھی کیا تھا؟ اور زندگی سے بیزار تھا۔ چنانچہ میں اس حماقت میں نہیں پھنس سکتا تھا۔"

"کیا زیادہ افراد ان لوگوں پر قابو پانے کا کوئی ذریعہ رکھتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

"اس کی وجہ؟" مارتھر نے پوچھا۔

"وجہ صرف یہی ہے کہ ان لوگوں کا طرزِ زندگی بڑا خطرناک ہے۔ وہ کوئی جتھا بنا کر نہیں رہتے بلکہ چیدہ چیدہ بکھرے ہوئے ہیں اور جہاں ہیں وہیں سے اپنی کارروائیوں کا آغاز کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کسی جتھے پر حملہ کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"ان کی ذخیرہ گاہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بس وہ اتفاقیہ طور پر میں نے دیکھ لی تھی۔ میرا خیال ہے وہاں کوئی نہ کوئی حکمران ضرور ہے۔"

"کیا اس حکمران سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔"

"اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکیں؟"

"نہیں، میں بتا چکا ہوں کہ اس کے مواقع ہی نہیں ملے۔"

"گویا جزیرے کی زندگی کے بارے میں تم کوئی خاص نشاندہی نہیں کر سکتے۔"

"ہاں...... میں اس سے معذور ہوں۔"

"کیا ان لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں؟"

"ہاں...... وہ آتشیں ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ بندوقوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے لیکن کارکردگی میں لاجواب۔"

"اوہ...... یہ ہتھیار ان کے پاس کہاں سے آئے؟"

"ان کی شکل و صورت دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہتھیار انہوں نے خود بنائے ہیں۔" پرتھوی سنگھ نے جواب دیا اور مارتھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے ایڈمرل کی طرف دیکھا۔

"آپ بھی ان حالات کو ذہن میں رکھیں ایڈمرل!"

"ہاں۔" ایڈمرل چونک پڑا۔

"کیا سوچ رہے تھے آپ؟"

"اسی انوکھی آبادی کے بارے میں۔ ان لوگوں کی صحیح نشاندہی نہیں ہو سکی۔" ایڈمرل نے کہا۔

"ابھی تک ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ تباہ شدہ ایلڈوس کے بچ جانے والے باشندے ہیں جو اب وہیں آباد ہو گئے ہیں۔"

"خوب۔ لیکن مارتھر! تم اس جزیرے پر اترنے کے بارے میں کیوں سوچ رہے ہو؟"

"اوہ...... اچھا سوال کیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" مارتھر نے دلچسپی سے کہا۔

"کیا تم نے آبدوز کا انتخاب اس لئے نہیں کیا کہ پانی کی گہرائی میں ہی رہ کر اس بت کو تلاش کرو؟"

"اس میں بہت سی مشکلات ہیں ایڈمرل! ہم آبدوز کو خطرناک جگہوں پر نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے بے حد اہم ہے۔"

"کیا تم نے غوطہ خوری کے لباسوں کا بندوبست کیا ہے؟"

"ہاں...... میں نے انتظامات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ میں جزیرے پر قیام کروں گا۔ اب ہمیں صرف ان حالات پر قابو پانا ہے جو ہمیں جزیرے پر پیش آ سکتے ہیں۔"

"ہوں۔" ایڈمرل نے گہری سانس لی اور کچھ سوچنے لگا۔

"بہرحال مسٹر پرتھوی سنگھ! آپ اس جزیرے تک ہماری رہنمائی تو کر سکتے ہیں؟" مارتھر نے پوچھا۔

"یقیناً۔ میں نے وہاں سے واپسی کا خطرناک سفر کیا ہے۔ تمہارے پاس اس کے لئے معلومات تو ہوں گی۔"

"بے شک۔"

"کوئی نقشہ ترتیب دیا ہے تم نے؟"

"ہاں......"

"مجھے دکھاؤ۔ تاکہ میں اس کے بارے میں رائے دے سکوں۔" پرتھوی سنگھ نے کہا اور مارتھر مسکرانے لگا۔

"ابھی تو تم سے تعارف ہوا ہے۔ آرام کرو۔ اس کے بعد ہم اپنی کارروائی کا آغاز کریں گے۔" اس نے کہا اور پرتھوی سنگھ گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آبدوز کا رخ کس طرف ہے؟"

"مائیک کے جنوب کی جانب۔ کیا اس میں کوئی ترمیم ہے؟"

"نہیں......میرا خیال ہے تم نے بہترین معلومات حاصل کی ہیں۔" پرتھوی سنگھ نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

آبدوز کا سفر جاری رہا۔ راستے میں کوئی حادثہ نہیں پیش آیا جس سے سفر کرنے والوں کو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان سب کے ذہنوں میں جزیرے کی پراسرار آبادی کے تصورات رقصاں رہتے تھے۔ ایڈمرل احمد اب آبدوز میں سفر کرنے والوں سے بے تکلف ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس نے تقدیر کے اس موڑ کو قبول کر لیا ہو۔ وہ عجیب و غریب لوگوں کے درمیان تھا جو سب کے سب مجرمانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ ان کی کہانیاں اور ان کی سوچ عجیب تھی۔ احمد ان میں سے بہت سوں کی زندگی کے حالات سن چکا تھا۔ اسے یہ سب کچھ ہی عجیب اور بڑا اجنبی اجنبی لگتا تھا۔ لیکن اب وہ خود کو ان اجنبی لوگوں کے درمیان رہنے کا عادی بنا چکا تھا۔

پرتھوی سنگھ اور مارتھر کے درمیان نقشے پر گفتگو ہوئی تھی اور پرتھوی نے تسلیم کیا تھا کہ

مارتھر ایک ذہین آدمی ہے۔ اس نے اس نقشے کے بالکل صحیح ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔ جس رفتار سے آبدوز سفر کر رہی تھی، اس کو مد نگاہ رکھتے ہوئے پرتھوی سنگھ کا خیال تھا کہ یہ سفر بیس روز میں ختم ہو جائے گا۔ اکثر پرتھوی سنگھ اور مارتھر پیرسکوپ پر اور کبھی سطح سمندر پر آ کر اوپر کا جائزہ لیتے تھے۔ پرتھوی سنگھ سفر سے پوری طرح مطمئن تھا۔ ویسے زیر آب سفر ان لوگوں کے لئے اُکتا دینے والا تھا جو آبدوز پر سفر کر رہے تھے۔ ان کے لئے تفریح کا کوئی سامان نہیں تھا۔ آبدوز پر ان دو عورتوں کے سوا اور کوئی عورت نہیں تھی جو مارتھر کے ساتھ تھیں لیکن مارتھر کا کنٹرول اتنا سخت تھا کہ لوگ ان عورتوں کے حصول کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

بالآخر خدا خدا کر کے یہ دن گزرے۔ پرتھوی سنگھ نے مارتھر سے درخواست کی کہ اب سفر اگر سطح سمندر پر کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ آبدوز سطح پر آ گئی۔ تازہ ہوا کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔ لوگوں کو اس کا موقع دیا گیا کہ وہ آبدوز کے اوپری حصے میں آ کر تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ خوشگوار دنوں کا آغاز ہو گیا۔ سپاٹ عرشہ پر اب ہر وقت رونق رہتی تھی۔

اور پھر اس شام جب سورج غروب ہو چکا تھا، پرتھوی سنگھ نے ایک سنسنی خیز اعلان کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ لوگ اب ان پہاڑوں کے قریب پہنچ رہے ہیں جن سے ٹکرا کر ایلڈوس غرق ہوا تھا۔

"یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا مسٹر پرتھوی سنگھ؟" مارتھر نے پوچھا۔

"دھند کے بادل جو اس جزیرے پر سایہ فگن رہتے ہیں، نظر آ رہے ہیں۔ میری آنکھیں انہیں پہچان گئی ہیں۔" پرتھوی نے جواب دیا۔

"گویا آپ کو یقین ہے کہ ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے ہیں؟" مارتھر کی آواز میں مسرت جھلک رہی تھی۔

"ہاں.....میں پورے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔" پرتھوی نے جواب دیا اور مارتھر نیچے چلا گیا۔ چلتے وقت اس نے ایڈمرل کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ راستے میں اس نے کہا۔

"کیونکہ رات ہو رہی ہے مسٹر احمد! اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ ہم یہیں رکیں اور صبح کا انتظار کریں۔ میں تاریکی میں ان پہاڑوں کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

''یہی مناسب ہے۔'' احمد نے جواب دیا۔

نیچے آ کر مارتھر نے اپنے عملے کو ہدایات جاری کیں اور آبدوز کی رفتار ختم کر دی گئی۔ اب وہ سطح سمندر پر رینگ رہی تھی۔

مارتھر ایک ماہر ملاح کی طرح اپنے ساتھیوں کو ہدایات جاری کرتا رہا اور پھر مطمئن ہو گیا۔ بے چارے احمد کی حیثیت تو اب ایک بیرے کی سی تھی۔ وہ صرف تماشبین تھا۔ اس سارے ہنگامے میں اس کی شمولیت ایک مجبور انسان کی سی تھی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن اسے ان ساری باتوں میں اس طرح شریک ہونا پڑتا تھا جیسے یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو۔

دوسری صبح خوب چمکدار تھی۔ سورج اٹھان پر تھا کہ مارتھر نے آبدوز کو اس طرف بڑھانا شروع کر دیا جہاں اس چمکدار سورج کے باوجود ایک مخصوص دھند نظر آ رہی تھی۔ جوں جوں آبدوز اس دھند کی طرف بڑھ رہی تھی سیاہ رنگ کی پہاڑیوں کے آثار نمودار ہوتے جا رہے تھے۔''

''میری رائے ہے کہ اب آبدوز کو گہرائیوں میں لے جایا جائے۔'' احمد نے مارتھر سے کہا۔

''اوہ، لیکن یہاں اس کے دیکھے جانے کا امکان نہیں ہے۔''

''بات اس کے دیکھے جانے کی نہیں ہے۔ ہم روٹر ویژن پر ان پہاڑوں کی ساخت دیکھ لیں تو بہتر ہے۔ میری رائے ہے کہ دھند میں داخل ہونے سے پہلے آبدوز کو گہرائیوں میں لے جایا جائے اور پورے جزیرے کے قریب چکر لگا کر مناسب جگہ کا انتخاب کر لیا جائے تاکہ ہنگامی صورتحال میں محفوظ ٹھکانے ہمارے علم میں ہوں۔''

''عمدہ رائے ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ یہ ایک ایڈمرل کی رائے ہے۔'' مارتھر نے تعریفی لہجے میں کہا اور پھر اس نے ایڈمرل کی ہدایت کے مطابق عمل شروع کر دیا۔ آبدوز گہرے پانی میں اتر گئی تھی۔ سمندر کی خاموش زندگی روٹر ویژن پر نمایاں تھی۔ اس وقت کنٹرول پوری طرح ایڈمرل احمد کی گرفت میں تھا۔ چنانچہ آدھی رات تک جزیرے کے گرد احاطہ کیے ہوئے پہاڑوں کے درمیان سفر جاری رہا۔ خطرناک چٹانیں خطرناک موڑ رکھتی تھیں اور مارتھر کے آدمی پوری توجہ اور مہارت سے آبدوز کو ان چٹانوں سے بچاتے ہوئے اپنا

چکر پورا کر رہے تھے۔

اس وقت پرتھوی سنگھ اور مارتھر بھی نزدیک ہی موجود تھے اور گہری نگاہوں سے سمندر کے اندر کا جائزہ لے رہے تھے۔

''کیا خیال ہے مسٹر احمد! کیوں نہ ہم بقیہ رات بھی اسی طرح سمندر کا جائزہ لیتے ہوئے گزاریں؟''

''اوہ، کیوں؟''

''ممکن ہے ہمیں ڈوبا ہوا جہاز نظر آ جائے۔''

''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔'' احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''اس طرح ہمیں زیادہ نیچے جانا پڑے گا۔ لیکن رات کے وقت سمندر کی تہہ میں اترنا خطرناک ہے۔ کائی کے دل، جگہ کو چھپائے ہوتے ہیں۔ آبدوز کو خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ اس کے برعکس دن کی روشنی میں پانی کی گہرائیاں کسی قدر واضح ہو جاتی ہیں اور ہم کائی کے دل کو تہہ نہیں سمجھ سکتے۔''

''عمدہ اور تجربے کی بات ہے، مجھے پسند آئی۔ تو پھر اب کیا خیال ہے؟ جزیرے کا چکر پورا ہو چکا ہے۔''

''ہاں...... آپ نے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کیا؟''

''یہاں میرا تجربہ محدود ہے۔'' مارتھر نے اعتراف کیا۔

''تب براہِ کرم آبدوز کو آگے بڑھائیں۔ میں نے ایک جگہ منتخب کر لی ہے۔ وہاں نوکیلی چٹانیں ہیں جو ایک دروازے کی شکل میں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔ ہمارا ابتدائی قیام وہاں ممکن ہے۔''

''بہتر۔'' مارتھر نے کہا اور پھر اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دے دیں۔ آبدوز نہایت مہارت سے اس مخصوص جگہ لے جائی گئی اور پھر اس کے انجن بند کر دیئے گئے۔ پانی کا دباؤ بھی یہاں بہت کم تھا اور آبدوز اتنی بلند کر لی گئی تھی کہ غوطہ خوروں کو بھی اوپر جانے میں دقت نہ ہو۔

ساری رات وہ ضروری کارروائیوں میں مصروف رہے تھے۔ آبدوز کے انجن بند کرنے

کے بعد عملے کے لوگ بھی فارغ تھے۔ بالکل دفتر کی شکل بن گئی تھی اور آئندہ پروگرام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

طے یہ ہوا کہ کل دن کی روشنی میں پانچ غوطہ خور جن میں مارتھر، احمد اور پرتھوی سنگھ کے علاوہ دو اور دوسرے آدمی بھی ہوں گے، اوپر جائیں گے۔ احمد اس موقع پر انکار نہیں کر سکا کیونکہ اب اس کے دل میں بھی اس جزیرے کو دیکھنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔

گو یہ لوگ رات بھر کے تھکے ہوئے تھے لیکن جزیرے کو دیکھنے کا شوق اس قدر حاوی تھا کہ گھڑیوں کے مطابق صبح ہوتے ہی انہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ غوطہ خوری کے لباس پہنے گئے، واٹر پروف تھیلوں میں اسٹین گنیں اور میگزین بھر لئے گئے۔ کافی کے تھرماس اور کھانے پینے کی چیزوں کے پیکٹ کمر پر لادے گئے اور گیس سلنڈر پشت پر کسنے کے بعد وہ تیار ہو گئے۔

اور پھر آبدوز کے مخصوص حصے سے وہ باہر نکل آئے اور بلبلے چھوڑتے ہوئے پانی کی سطح کی طرف بلند ہونے لگے۔ پہاڑوں میں سیاہ غاروں کے دہانے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ غاروں میں مچھلیوں کے غول بھی نظر آ رہے تھے جو انہیں دیکھ کر منتشر ہو جاتے تھے۔

وہ دھڑکتے دلوں کے ساتھ اوپر بلند ہوتے رہے اور پھر پانی کی سطح پر نکل آئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر بھوری زمین نظر آ رہی تھی۔ فضا پر دھند چھائی ہوئی تھی لیکن یہ دھند اتنی گہری نہیں تھی کہ وہ دیکھ نہ سکتے۔ عجیب پُرسحر ماحول تھا جو بے حد خوشگوار لگ رہا تھا۔ تاحد نگاہ پہاڑ پھیلے ہوئے تھے جن کی چوٹیوں پر برف نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں کے دامن میں سبزہ زار نظر آ رہے تھے۔

"شکر ہے برف باری کا موسم نہیں ہے۔" پرتھوی سنگھ نے اپنا خود اتارتے ہوئے کہا۔ ایڈمرل سحر زدہ نگاہوں سے اس روایتی جزیرے کو دیکھ رہا تھا جس کے متعلق ابھی تک اس نے ایسی ایسی خوفناک داستانیں سنی تھیں جو رونگٹے کھڑے کر دیتی تھیں۔ آج وہ جزیرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

سبزہ زار ویران تھے۔ کسی انسانی وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ تینوں اپنی جگہ خاموش کھڑے اس ماحول کو دیکھتے رہے۔

"یہ جزیرے کی کون سی سمت ہے پرتھوی سنگھ؟" تھوڑی دیر کے بعد مارتھر نے گہری سانس لے کر پوچھا اور پرتھوی سنگھ چونک پڑا۔

"جزیرہ وہی ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ لیکن یہ سمت میرے لئے اجنبی ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے جزیرے کو غور سے نہیں دیکھا۔ یہاں سکون کے لمحات ہی میسر نہیں ہوئے۔ بس زندگی کی جدوجہد میں مصروف رہا اور اسی جدوجہد نے مجھے جزیرے کے ماحول سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔ تاہم جس جگہ میں تھا وہاں تھوڑی سی بھوری ریت کے بعد سبزہ زار شروع ہو جاتا تھا۔ اس سبزہ زار پر اونچے درخت اگے ہوئے تھے جو خاصی لمبی قطار تک پھیلے ہوئے تھے اور خاصے قریب تھے۔" پرتھوی سنگھ نے جواب دیا۔

"کیا خیال ہے مسٹر مارتھر! ہم اپنے کام سے کام رکھیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہم یہاں کے رہنے والوں کو چھیڑنے کی کوشش کریں؟ ظاہر ہے ہمیں ان لوگوں سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو کچھ اور ہے۔ اگر ہم سمندر کی گہرائی سے سونے کے اس عظیم الشان مجسمے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے اٹھا کر آبدوز میں لے آئیں گے۔ یہ لوگ اگر ہماری آمد سے لاعلم ہی رہیں تو بہتر ہے۔" ایڈمرل احمد نے تجویز پیش کی اور مارتھر مسکرانے لگا۔

"ظاہر ہے مسٹر احمد! آپ نے بڑے بڑے بحری کارنامے انجام دیئے ہوں گے۔ لیکن یہ مرحلہ آپ کے لئے بالکل نیا ہے۔ یہ آپ کی کسی مہم جوئی سے بالکل الگ قسم کی چیز ہے۔ آپ ذرا غور تو فرمائیے، اس مجسمے کا وزن چالیس من ہے اور چالیس من وزن سمندر کی گہرائی سے اٹھا کر آبدوز تک لے آنا خاصا مشکل کام ہے۔ کیا یہ کام ممکن ہے؟"

"ہوں..." احمد ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ "واقعی اتنا وزنی مجسمہ کسی طور نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن تمہارے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی اور پروگرام ہے؟"

"ہاں۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے پوری تیاریاں کی ہیں۔ دراصل مارتھر انہی معاملات کے لئے مشہور ہے۔ میرے تمام کام سائنٹفک ہی ہوتے ہیں اور میں نے اس سلسلے میں جو ریسرچ کی ہے اس

کے مطابق کچھ ایسی چیزیں میرے پاس موجود ہیں جو اس کام میں معاون ثابت ہو سکیں گی۔"

"کیا آپ ان کے نام بتائیں گے مسٹر مارتھر؟" احمد نے کہا۔

"ہاں ضرور۔ اس مجسمے کو اٹھانے کے لئے میرے پاس ایک مخصوص ساخت کی کرین کا بندوبست ہے۔ گو یہ کرین الیکٹرک ذرائع سے نہیں چل سکتی اور اس کے لئے انسانوں کی ہی ضرورت ہوگی اور ہمارے پاس اتنے انسان موجود نہیں ہیں۔ میں اپنے لوگوں میں سے کسی کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تقدیر ان کا ساتھ نہ دے۔ اس کے لئے مجھے اسی جزیرے کی آبادی سے کام لینا ہوگا۔" مارتھر نے جواب دیا اور ان دونوں کے جسموں میں سنسنی دوڑ گئی۔ پرتھوی سنگھ نے بھی متحیرانہ نگاہوں سے مارتھر کو دیکھا اور ایڈمرل نے بھی۔

"گویا... گویا تم ان پر کنٹرول حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" پرتھوی سنگھ نے پوچھا۔

"بالکل، سو فیصدی۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہونا ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اس جزیرے پر آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لئے ماحول درکار ہوگا اور اس کے لئے ظاہر ہے ہمیں ان لوگوں کو قابو میں کرنا پڑے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔" پرتھوی سنگھ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور مارتھر نے اسے سرد نگاہوں سے دیکھا۔

"مسٹر پرتھوی! یہاں پر میرے اور تمہارے درمیان فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ مارتھر جس کام کے لئے سوچ لیتا ہے پھر اس کے بارے میں اسے خیال ہوتا ہے کہ وہ اس پر قادر ہے میں ماحول پر قدرت حاصل کرنے پر قادر ہوں اور تم دیکھو گے کہ میں کس طرح جزیرے کے ماحول کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیتا ہوں۔" مارتھر نے ہاتھ بڑھا کر اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی جکڑ لی۔ اس کے چہرے پر انتہائی خطرناک تاثرات تھے۔ لیکن پرتھوی سنگھ ان تاثرات سے خوفزدہ نہ ہوا۔ وہ گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔ پھر وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"بہرصورت میں اپنی زندگی کے بیشتر ایام ختم کر چکا ہوں۔ مجھے بہت زیادہ زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہے۔ یونہی میں قید خانے میں تھا اور جتنی طویل قید مجھے ملی تھی اس کے بعد میں نے یہی سوچا تھا کہ اب اس قید خانے سے میری لاش ہی جائے گی۔ لیکن اگر زندگی

میں آزادی کے چند لمحات مہیا ہو ہی گئے ہیں تو میں ان سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہتا ہوں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ خود اپنا مذاق بن جاؤں۔ میں تمہارے ساتھ ہر تعاون کے لئے تیار ہوں، جب تم پسند کرو۔ البتہ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جزیرے کی جس آبادی کو تم کنٹرول کرنے کے خواب دیکھ رہے ہو وہ اتنا نرم چارہ نہیں ثابت ہوگا تمہارے لئے۔"

"میں اس چارے کو نرم بنانے کی کوشش کروں گا۔" مارتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر تک مارتھر کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تاہم میں اس بات کے لئے خلوصِ دل سے تیار ہوں کہ جب تک ہم مجسمہ تلاش نہیں کر لیتے ان لوگوں کو چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس دوران وہ خود ہی ہماری طرف متوجہ ہو جائیں تو دوسری بات ہے۔"

دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مارتھر تھوڑی دیر پھر خاموش رہا اور پھر اس نے کہا۔

"یہ جگہ مجھے بہت موزوں نظر آئی ہے۔ اگر آپ لوگ بھی مناسب خیال کریں تو آبدوز سے باہر ہم اس جگہ کو اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنا لیں"

"یہ پہاڑیاں پھسلواں ہیں اور ان سے نیچے اترنا مشکل ہوگا۔"

"کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔" مارتھر نے کہا اور پھر وہ غوطہ خوری کا لباس اتارنے لگا۔ دونوں خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ طویل القامت خطرناک آدمی نے لباس اتار کر چاروں طرف دیکھا اور پھر انہوں نے اسے نیچے اترتے دیکھا۔ وہ لنگوروں کی سی پھرتی رکھتا تھا اور نیچے اترنے میں اس کی یہ مہارت قابل دید تھی۔ وہ دونوں سانس روکے اسے نیچے جاتے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نیچے کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"یہ شخص ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہے۔ بے شک جرائم کی دنیا میں یہ اجنبی نہیں ہے اور ایک خطرناک انسان کی حیثیت سے خود کو منوا چکا ہے۔ لیکن میرے دوست! میری زندگی کا تجربہ کہتا ہے کہ اگر انسان سو فیصد ہو تو خود کو صرف ساٹھ فیصد استعمال کرے اور اسی پر قناعت کرے۔ جہاں وہ اس سے آگے بڑھا، کسی خطرناک حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔"

ایڈمرل نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے بعد دونوں خاموش ہی رہے۔ یہاں تک کہ مارتھر واپس آ گیا۔ اس نے غوطہ خوری کا لباس دوبارہ پہنا اور پھر ان دونوں کی طرف دیکھ کر دوبارہ بولا۔

"مجھے اس خطرات سے پُر جزیرے کی آبادی پر قدم رکھ کر بہت مسرت ہوئی ہے۔ ایسی جگہیں میرے لئے بڑی دلکش ہوتی ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم اس وقت تک جزیرے کی آبادی کو نہیں چھیڑو گے جب تک سونے کا بت تلاش نہیں کر لو گے۔" پرتھوی سنگھ نے کہا۔

"ہاں...... ابھی تک تو یہی ارادہ ہے۔"

"میری مانو مارتھر! اس بات پر عمل کرو۔ اگر وہ لوگ ہمیں دیکھ لینے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اتنی آسانیاں نہ رہیں گی ہمارے لئے۔"

"سمندر کے نیچے بھی۔"

"اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ظاہر ہے وہ لوگ یہاں طویل عرصہ سے آباد ہیں اور ذہین لوگ ہیں۔ نجانے انہوں نے کیا کیا انتظامات کئے ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ پرتھوی!"

"کیا؟"

"اس جزیرے پر ان کی کتنی پشتیں گزر چکی ہیں؟"

"میرا خیال ہے دوسری نسل تیار ہو رہی ہے۔"

"اوہ...... گویا وہ جدید ماحول سے واقف ہوں گے۔ تاہم مجھے پرواہ نہیں ہے۔ حالات جو کچھ بھی ہوں گے میں ان سے نمٹ لوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اس بارے میں زیادہ زحمت نہ کرنا ہوگی۔ میں خود ہی سارا کام کروں گا۔ آپ دونوں تو اب میرے مشورہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"تم یقین کرو مارتھر! کم از کم میرے ذہن میں اپنے لئے خطرات کا احساس نہیں ہے۔ اگر میں کوئی بات تم سے کہتا ہوں تو اس کے پس پردہ ایک خیال ہے کہ جب تم میری سرکردگی میں یہاں آئے ہو تو اپنی مہم سے کامیاب ہی لوٹو۔"

"تمہاری اس نیک خواہش کے لئے میں دل سے شکر گزار ہوں۔ آؤ اب واپس چلیں۔ ہمارے ساتھی آرام کر لیں تو پھر میں ان کے ساتھ غوطہ خوری کی مہم پر چلوں۔" مارتھر نے کہا اور وہ تینوں سمندر میں اتر گئے۔ سمندر کی تہہ سے گزر کر وہ آبدوز تک پہنچے اور پھر اس کے بغلی سرے سے اندر داخل ہو گئے۔

آبدوز کا ماحول خوشگوار تھا۔ زندہ دل لوگ زندگی کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہلکی موسیقی کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور دونوں لڑکیاں سُروں کے درمیان رقص کر ہی تھیں۔

ارتھر بھی مسکراتا ہوا ان کے درمیان پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر وہ ان کی خوش فعلیوں سے اندوز ہوتا رہا، پھر پیچھے ہٹ آیا۔

"یہ بھی میرا ایک اصول ہے۔ فرصت کے لمحات ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہوتے اس وقت مارتھر ان پر حکمران نہیں ہوتا۔ اب اگر اس جزیرے پر انہیں لڑکیاں مل گئیں ان پر ٹوٹ پڑے تو مارتھر ان کے درمیان مداخلت نہیں کر سکتا۔"

ایڈمرل احمد تو کچھ بھی نہیں بولا لیکن پرتھوی سنگھ نے گردن ہلائی تھی۔ گویا وہ یقین کر چکا کہ اس خود اعتماد شخص کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہی اس کی تباہی کا باعث بن گی۔ لیکن وہ اس سلسلے میں بولنے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا۔ پرتھوی سنگھ نے تنہائی میں ے کہا۔

"مسٹر فرید احمد! مارتھر آپ کو ایڈمرل کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔"

"ہاں۔"

"میں آپ کے بارے میں تفصیلات نہیں جانتا۔ لیکن اگر آپ کو زندگی عزیز ہے تو محتاط جزیرے کے لوگ اس قدر نرم چارہ نہیں ہیں کہ اس آسانی سے قابو میں آ جائیں طرح سوچا جا رہا ہے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں مسٹر پرتھوی۔"

"میں ان لوگوں کو قریب سے دیکھ چکا ہوں۔"

"بے شک آپ کا تجربہ ہوگا۔" فرید احمد نے مختصراً کہا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

کے بعد کئی گھنٹے پُرسکون گزرے۔ پھر مارتھر نے دس غوطہ خوروں کا انتخاب کیا اور جدید سامان سے آراستہ ہو کر سمندر کی گہرائیاں کھنگالنے چل پڑا۔ اس نے ان دونوں کو اس شریک نہیں کیا تھا البتہ روانگی کے بعد اس نے کہا۔

"عزیز دوستو! کیا تم اس مجسمے کی تلاش میں حصہ نہ لو گے؟"

"شکریہ۔ میں نے ایک پروگرام کے تحت چار چار آدمیوں کو آرام دینے کا فیصلہ کیا

ہے۔ چار آدمی واپس آ جائیں گے۔ لیکن اس وقت آپ لوگ زحمت نہ کریں۔ میں اس
وقت آپ کی ضرورت محسوس کروں گا جب خود نا کام ہو جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پھر آبدوز کے مخصوص حصے میں سمندر میں اتر گیا۔ ایڈمرل سوچ رہا
تھا کہ اس چالاک آدمی نے ان لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھی ان کی
حیثیت سے واقف ہوں گے اور مستعد بھی۔ مارتھر جیسے لوگ اپنے اردگرد کے ماحول سے
ہمیشہ باخبر رہتے ہیں۔"

❂......❂

ایڈمرل احمد نے کافی وقت خاموشی سے گزارا اور پھر کسی خیال کے تحت وہ اپنی جگہ
ے اٹھ گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر وہ ایک گہری سانس لے کر خود
ے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے ہوئے پرتھوی سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔

"آیئے مسٹر پرتھوی سنگھ! کچھ کریں۔ اس طرح بیٹھے بیٹھے بوریت ہو رہی ہے۔"

"کیا کریں مسٹر احمد؟"

"آیئے" فرید احمد نے کہا اور اسے لئے ہوئے آبدوز کے ایک مخصوص حصے میں پہنچ
گیا۔ روز آپریشن بکس پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں سے اس کا رابطہ غوطہ خوروں سے تھا اور وہ
کا پیغام کے انتظار میں تھی۔ دوسرے لوگ بھی آبدوز کے سسٹم کو چیک کر رہے تھے اور
ب اپنی جگہ مستعد تھے۔

ایڈمرل نے روز کے قریب پہنچ کر کہا۔

"مس روز! کیا میں اس آبدوز کے ایک مخصوص سسٹم کو استعمال کر سکتا ہوں؟"

"کس سلسلے میں ایڈمرل؟"

"میں ان غوطہ خوروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" ایڈمرل نے جواب دیا اور روز چونک
پڑی۔

"اوہ...... اوہ، کیا یہ ممکن ہے...... کیا یہ ممکن ہے مسٹر ایڈمرل؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو پھر براہِ کرم آپ عمل کریں۔ تعجب ہے اب تک آپ نے ہمیں اس بارے میں
نہیں بتایا۔"

"آپ لوگوں نے پوچھا ہی نہیں۔ آپ نے تو آبدوز کا انتظام اس طرح سنبھال لیا
برسوں سے اسے استعمال کرتی آ رہی ہوں۔" ایڈمرل نے کہا۔

"آپ کا خیال درست ہے مسٹر ایڈمرل! لیکن ظاہر ہے جو کچھ آپ اس بارے میں جانتے ہوں گے، ہم نہیں جانتے۔" روز نے کہا اور ایڈمرل ایک بورڈ پر مصروف ہو گیا۔ اس نے کئی بٹن دبائے اور پھر انہیں مخصوص انداز میں اوپر نیچے کرنے لگا۔ چند ہی ساعت کے بعد سامنے کی سمت ایک چوڑا تختہ گھوم گیا۔ وہ گھوم کر سامنے آیا تو اس پر ایک ویژن اسکرین نظر آیا اور ایڈمرل احمد سنٹرل بورڈ پر اسکرین کو صاف کرنے لگا۔ چند ہی ساعت کے بعد اسکرین پر دھندلے دھندلے دھبے نمایاں ہونے لگے اور پھر اس پر پانی نظر آنے لگا۔ یہ سمندر کی گہرائیوں کے مناظر تھے۔ وہ پہاڑ صاف نظر آرہے تھے جو وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ روز اور اس کے ساتھ پرتھوی سنگھ بھی متعجبانہ نگاہوں سے اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ ایڈمرل احمد ایک اسٹیئرنگ کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا اور اسکرین پر مناظر بدلنے لگے۔

سمندری گھاس، مچھلیاں اور چند ساعت کے بعد انہوں نے ایک غوطہ خور کو دیکھا۔ یہ مارتھر کا ہی آدمی تھا۔ ہاتھ میں پانی میں استعمال ہونے والی گن لئے وہ روشنی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ روز کے ہونٹوں پر دلچسپ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے پرتھوی سنگھ کی طرف دیکھا، پھر ایڈمرل احمد کی طرف اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"واہ...... آپ نے تو ہمیں اب تک اس سلسلے سے محروم رکھا تھا مسٹر احمد! کیا یہ بہت دور تک دیکھ سکتا ہے؟"

"تقریباً ایک فرلانگ کے دائرے میں۔" ایڈمرل احمد نے جواب دیا اور پھر وہ منظر تبدیل کرنے لگا۔ بہت سے غوطہ خور نظر آئے اور وہ سب کے سب تلاش میں مصروف تھے۔ سمندر میں تہہ کی چیزیں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ تب روز نے ایڈمرل احمد سے کہا۔

"اس طرح تو مسٹر احمد! یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس اسکرین پر اس بت کو تلاش کریں۔"

"ہاں...... کوشش کی جاسکتی ہے۔" اور روز اسے تعجب سے دیکھنے لگی۔ یہ شخص خاموش خاموش سا کافی پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اب تک اس نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی مارتھر کے کسی معاملے میں عدم تعاون کیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب ہے کہ ابھی کچھ چیزیں اس کے ذہن میں موجود ہیں اور اس نے انہیں اپنی ذات تک رکھا ہے؟

ایڈمرل احمد اسکرین کو حرکت دیتا رہا اور اس پر مختلف مناظر ابھرتے رہے۔ پہاڑ کے اندر گہرائیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ پہاڑوں کے اندر سوراخ بھی نظر آرہے تھے۔ دفعتہً انہوں نے انسانی وجود کو دیکھا اور وہ سب حیران رہ گئے۔ روز کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل گئیں۔

"ارے، ارے...... یہ تو ہم میں سے نہیں ہیں۔" اس نے کہا اور ایڈمرل اس منظر کو صاف کرنے لگا۔ بلاشبہ یہ ان میں سے نہیں تھا۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے سمندر کی گہرائیوں میں تیر رہی تھی۔ غالباً وہ کسی شے کی تلاش میں تھی۔ ایڈمرل فرید احمد اسے فوکس کرنے لگا۔ وہ جس طرف جاتی، اسکرین پر اس کی شبیہہ نمایاں ہو جاتی۔

"میرے خدا...... میرے خدا......" پرتھوی سنگھ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پرتھوی! یہ کون ہے؟"

"مقامی باشندہ۔ اسی جزیرے کی رہنے والی۔" پرتھوی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا اور ایڈمرل احمد اسے دیکھنے لگا۔

کسے ہوئے مضبوط بدن کی مالک لڑکی سمندر میں کسی حفاظتی انتظام کے بغیر اس طرح تیر رہی تھی جیسے وہ مچھلی ہو۔ اس کی رفتار بے حد تیز تھی۔ بدن میں گویا بجلیاں تڑپ رہی تھیں اور وہ اِدھر سے اُدھر قلانچیں بھر رہی تھی۔

دور، بہت دور انہوں نے ایک غوطہ خور کی ہلکی سی جھلک دیکھی لیکن وہ ایک دھندلے سے نقطے کی شکل میں نظر آیا۔ نوجوان لڑکی کا عضو عضو تڑپ رہا تھا۔ اور پھر شاید غوطہ خوروں نے بھی اسے دیکھ لیا۔

یہ انوکھا منظر یہاں موجود لوگوں کے لئے سخت تعجب خیز اور سنسنی سے بھرپور تھا۔ وہ سب ساکت و جامد انہیں دیکھ رہے تھے۔ غوطہ خور اور لڑکی اب ایک دوسرے کے قریب پہنچتے جارہے تھے۔ لڑکی کے چہرے کے تاثرات بھی اس اسکرین پر نمایاں تھے۔ وہ بھوکی بلی کی طرح اس غوطہ خور کو دیکھ رہی تھی۔ اور اب اس کی رفتار کچھ سست ہوتی جارہی تھی۔

یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے۔ غوطہ خور شاید اس لڑکی کی بے باکی سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی لیکن اس کے دانت نکلے ہوئے تھے۔ وہ اس برہنہ لڑکی کو دیکھ کر بہت خوش تھا جواب کسی مچھلی کی طرح اس کے گرد

چکرا رہی تھی۔ اسکرین پر اس کے بدن کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔

روز نے ہیجان خیز انداز میں چند بٹن دبائے اور جلدی جلدی بولنے لگی۔

''مسٹر مارتھر...... مسٹر مارتھر...... براہِ کرم اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیں۔ ایک مقامی لڑکی بڑی شد و مد سے ہمارے ایک آدمی پر حملہ آور ہوئی ہے۔ دونوں میں جنگ ہو رہی ہے مسٹر مارتھر...... مسٹر مارتھر......''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' مارتھر کی غراہٹ سنائی دی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں جناب! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اوہ، ہمارا ساتھی نڈھال ہو رہا ہے۔ جلدی کرو۔ آہ...... وہ اب اس کے قبضے میں ہے۔''

''روز! تم پاگل ہو گئی ہے۔ وہ لڑکی کہاں ہے...... کیا آبدوز میں؟'' مارتھر پھر غرایا۔

''نیچے جناب! سمندر کے نیچے پانی میں۔ آہ...... وہ اسے کسی مردہ مچھلی کی طرح گھسیٹتی لے جا رہی ہے۔ وہ اسے لے جا رہی ہے۔'' روز کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اسکرین اب اس منظر سے خالی ہو گیا تھا اور سیاہ سناٹا چھا گیا تھا۔

''تو ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ اب دلچسپ حادثات کا انتظار کرو۔'' پرتھوی نے کہا۔ اس کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر باہر سے چند قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند ساعت کے بعد مارتھر بپھرا ہوا اندر داخل ہوا۔

''تم کیا بکواس کر رہی تھیں؟'' وہ روز کو گھورتا ہوا بولا اور روز نے کوئی جواب دیئے بغیر اسکرین کی طرف اشارہ کر دیا۔ مارتھر کسی قدر حیران ہو گیا تھا۔

''یہ کہاں سے آیا؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''آبدوز ہی کا ایک حصہ ہے مسٹر مارتھر!'' فرید احمد نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

مارتھر نے باقی سوال و جواب خود ہی اپنے ذہن میں کر لئے ہوں گے۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں بولا اور پھر اس نے اس سلسلے میں تفصیل پوچھی اور روز پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اسے سب کچھ بتانے لگی۔

''دوسرے لوگوں کو واپسی کی ہدایت کرو۔'' مارتھر نے کہا اور روز جلدی جلدی پیغامات نشر کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی کے سوا سب واپس آ گئے اور روز کے بیان کی

تصدیق ہو گئی۔

''کیا اس نے اسے ختم کر دیا تھا؟'' مارتھر نے پوچھا۔

''انداز ایسا ہی تھا۔ کیونکہ وہ اسے گھسیٹتی ہوئی لے گئی تھی۔''

''کمال ہے۔ ایک عورت اتنی طاقتور۔ کیوں مسٹر پرتھوی؟''

''مقامی لڑکی تھی۔ ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ اور اب ہمیں ان کی طرف سے کسی کارروائی کا منتظر رہنا چاہئے۔''

''ہوں....'' مارتھر کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''مسٹر احمد! آپ اس اسکرین کو استعمال کریں۔ جہاں تک ہم دیکھ سکتے ہیں، سمندر کی گہرائیوں کا جائزہ لیں۔ کیا خیال ہے۔''

''یہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ ہمیں جگہ بدلتے رہنا ہوگا۔''

''مناسب بات ہے۔ تو یہ کارروائی شروع کی جائے۔'' مارتھر کی آواز صاف ہو گئی جیسے اس نے اپنے ایک آدمی کا غم برداشت کر لیا ہو۔ اور پھر تمام لوگ مستعد ہو گئے۔ آبدوز کو اس جگہ سے ہٹا لیا گیا اور اسے مزید گہرائیوں میں لے جایا گیا۔

فرید احمد کے لئے اب ایک ڈیوٹی متعین ہو گئی تھی۔ آبدوز کے سگنل نشر ہو رہے تھے اور وہ کسی بڑی وہیل مچھلی کی مانند سمندر کی گہرائیوں میں جھانکتی پھر رہی تھی۔ کئی گھنٹے اس کام میں گزر گئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے رک رک کر اسکرین پر قرب و جوار کو اچھی طرح دیکھ لیا جاتا تھا۔ خوفناک سمندری غار، ان میں چھپے ہوئے سمندری جانور، سب کے سب نمایاں ہو رہے تھے اور یہ کوشش کئی گھنٹے تک جاری رہی۔

پھر مارتھر نے ہاتھ اٹھایا اور حکم دیا۔

''بس آج کا کام ختم۔''

''آبدوز کو واپس اس کی جگہ لے جایا جائے؟'' آبدوز آپریٹر نے پوچھا۔

''کیوں مسٹر احمد! کیا رائے ہے؟''

''وہ محفوظ جگہ تھی۔'' فرید احمد نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... آبدوز کو یہاں سے لے جایا جائے۔'' مارتھر نے حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ شخص اب کسی کے ذہن میں نہ رہا ہو جو ان لوگوں کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن تنہائی ملنے پر پرتھوی سنگھ نے احمد سے کہا۔

"وہ واقعہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ اس پر گفتگو بھی نہ کی جائے۔ اس کے نتیجے میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"

اور کچھ نہ کچھ آٹھ گھنٹے کے بعد ہوا۔ سب لوگ آرام کر رہے تھے۔ آبدوز کے سگنل بند تھے اور سمندر پُرسکون تھا۔ لیکن دفعتہً سمندر میں تلاطم پیدا ہو گیا۔ ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کے بعد آبدوز لرز گئی اور سوتے ہوئے لوگ بستروں سے لڑھک گئے۔

آبدوز میں چھناکے اُبھر آئے۔ شیشے کے آلات، برتن اور دوسری چیزیں چھن چھن کر کے ٹوٹنے لگیں۔ لیکن بات ایک دھماکے کی نہیں تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو اور دھماکے ہوئے اور آبدوز دہل کر رہ گئی۔ پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا اور انہیں آبدوز کا اوپری حصہ نیچے بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اب بات خوفناک حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ سب بے تحاشہ دوڑنے لگے۔ مارتھر نے حکم دیا کہ آبدوز کے انجن اسٹارٹ کر کے فوراً اسے یہاں سے آگے بڑھایا جائے۔ اور لوگ مصروف ہو گئے۔

ایڈمرل احمد نے دوسرے لوگوں کی طرف توجہ دیئے بغیر جلدی سے روٹر ویژن کنٹرول سنبھالا اور چند لمحات کے لئے باہر کے مناظر ابھر آئے۔ مارتھر خود بھی دوڑتا ہوا اس طرف آ گیا۔ سیاہ پہاڑیوں کے غار میں سے گول گول ڈبے باہر نکلتے اور نکلتے ہی پھٹ جاتے۔ ان سے دھماکہ ہوتا اور پانی میں آگ ابھر آتی۔

یہاں چٹانوں کے پرخچے اُڑ رہے تھے اور یہ وزنی چٹانیں آبدوز پر گر رہی تھیں۔ اس وقت بچت کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ کسی طور آبدوز کو یہاں سے دور لے جایا جائے۔ دفعتہً اسکرین تاریک ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کے سسٹم میں آگ لگ گئی تھی۔ آبدوز کے انجن ابھی تک اسٹارٹ نہیں ہوئے تھے۔ مارتھر وہاں سے بھاگا اور چند ہی منٹ میں یہ خبر عام ہو گئی کہ دھماکوں سے آبدوز کے انجن جام ہو گئے ہیں اور ان میں سخت ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے جس کی وجہ سے آبدوز ناکارہ ہو گئی ہے۔

دھماکے برابر ہو رہے تھے اور مارتھر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن ایڈمرل نے اس وقت بھی اس کے چہرے پر دہشت یا بے سکونی نہیں دیکھی۔ وہ پُراطمینان نظر آ رہا تھا۔

"غوطہ خوری کے لباس پہن لو۔ آکسیجن سلنڈر پشت پر باندھ لو۔ یہ عمل فوراً کیا جائے۔" اس نے حکم دیا اور اس کے احکامات کی تعمیل ہونے لگی۔ دھماکے برابر ہو رہے تھے اور ہر دھماکے سے آبدوز لرز اٹھتی تھی۔

"اگر آبدوز میں موجود بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی تو پھر صورتحال خراب ہو جائے گی۔" مارتھر نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔

کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سب اس ہولناک گرج سے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شکر تھا کہ ابھی تک آبدوز کا آکسیجن نظام متاثر نہیں ہوا تھا ورنہ قیامت ہی آ جاتی۔ اس کے بعد انہیں باہر نکلنا پڑتا اور باہر جو طوفان تھا اس سے بھی زندگی بچانا محال تھا۔

وہ خاموشی سے صورتحال کا جائزہ لیتے رہے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اب دھماکوں میں کمی ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ سکون چھا گیا تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

"ایڈمرل! کسی طور تمہارے اس ویژن اسکرین کا نظام درست ہو سکتا ہے؟" مارتھر نے پوچھا۔

"سوری مسٹر مارتھر! پوری مشینری ناکارہ ہو گئی ہے۔ اس کی درستگی اب ممکن نہیں ہے۔" ایڈمرل نے جواب دیا۔

"ہوں...... تعجب ہے ان غیر مہذب لوگوں کے پاس بارود کے اتنے بڑے ذخیرے کہاں سے آ گئے۔ کیا یہ طاقتور ڈرم انہوں نے خود تیار کئے تھے یا کہیں سے ان کے ہاتھ لگے؟ بہرحال وہ آبدوز کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب باہر نکلنے کی تیاریاں کی جائیں۔ اس وقت صرف اسلحہ محفوظ کر کے اوپر لے جانے کا سوال ہے۔ آپ لوگ اس کی تیاریاں کریں۔ ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ موت ہماری شہ رگ سے قریب ہوتی ہے۔ اس سے کہیں مفر نہیں ہے۔"

اور اس کے جانثاروں نے خوش دلی سے اس کا یہ حکم بھی قبول کر لیا۔ مارتھر سب سے پہلے آبدوز سے باہر نکلا تھا اور اس کے بعد دوسرے لوگ وزنی اسلحہ اٹھائے ہوئے باہر نکل آئے۔ سمندر اب پُرسکون تھا۔ ہزاروں مچھلیاں، کیکڑے اور دوسرے سمندری جانور مردہ

نظر آ رہے تھے۔ پہاڑیاں ادھڑ کر رہ گئی تھیں۔ بڑی بڑی مچھلیاں بھی مر گئی تھیں۔ وہ مارتھر کی رہنمائی میں ان مردہ جانوروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اوپر جانے لگے۔ آبدوز میں اب کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سطح پر پہنچ گئے۔ مارتھر نے گردن نکال کر دیکھا۔ وہ پہاڑی سلسلے کے پاس ہی نکلے تھے۔ اس نے یہ جگہ پسند کی اور اپنے آدمیوں کو لے کر ایک بلند و بالا پہاڑی پر مورچہ بنا دیا جس کے دوسری سمت کٹاؤ دار ڈھلوان تھے اور سامنے ہی درختوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔

''بہترین اور محفوظ جگہ ہے۔ اسلحہ کھول لو۔'' مارتھر نے حکم دیا اور اس کے ساتھی مصروف ہو گئے۔ ہلکی مشین گنیں نصب کر لی گئیں۔ ان کے علاوہ اسٹین گنیں اور دستی بموں کا ذخیرہ بھی تھا جسے بڑی حفاظت سے محفوظ جگہوں پر منتقل کر لیا گیا اور اس کے بعد وہ اس کام سے فارغ ہو گئے۔

مارتھر نے پرتھوی سنگھ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ''معزز ساتھی! کیا تم میری غیر موجودگی میں میرے نائب کا کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ گے؟''

''حکم دو مارتھر!'' پرتھوی سنگھ نے کہا۔

''یہ سب لوگ تمہارے احکامات کی تعمیل کریں گے۔ اگر کوئی خطرناک صورتحال پیش آئے تو تم ان لوگوں کی کمان کرو گے۔ میں آبدوز سے دوسری چیزیں جیسے خوراک اور ایسا ہی ضرورت کا دوسرا سامان لے آؤں۔ یہ کام میں اپنی نگرانی میں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... تم یہاں کے حالات سے مطمئن ہو کر جاؤ۔'' پرتھوی سنگھ نے کہا اور مارتھر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کا انتخاب کیا اور غوطہ خوری کے لباس میں سمندر میں اتر گیا۔ یکے بعد دیگرے اس کے ساتھی بھی پانی میں داخل ہو گئے تھے۔ ایڈمرل شاید اس کے لئے ناقابل بھروسہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ مارتھر کے دل کا چور ہو۔ اس نے ایڈمرل کے ساتھ کوئی اچھا سلوک تو نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس پرتھوی کو اس نے دائمی قید سے نکالا تھا۔ ایڈمرل کو اس بات کا احساس تھا لیکن اس کا تجربہ یہ کہتا تھا کہ اس وقت مارتھر کا ساتھ دینا ہی زندگی کی ضمانت تھی۔ ورنہ وحشیوں کی اس بستی میں کسی اجنبی انسان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

وہ لوگ مستعدی سے ماحول پر نگاہیں جمائے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ قرب و جوار

میں کوئی تحریک نہیں تھی۔ خاموشی طویل ہو گئی تو پرتھوی سنگھ بھی اکتا کر ایڈمرل کے پاس پہنچ گیا۔

''ان لوگوں کے اس حملے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ وہ بارود کے بہترین استعمال سے واقف ہیں اور انہوں نے آبدوز کو ناکارہ کرنے کے پورے انتظامات کر لئے تھے۔'' ایڈمرل احمد نے جواب دیا۔

''وہ لوگ ہماری آمد سے باخبر ہیں اور میرے خیال میں یہ پہاڑیاں محفوظ نہیں ہیں۔ وہ ان کے پوشیدہ راستوں سے بھی......'' ابھی پرتھوی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ اچانک ہی پہاڑیوں میں گڑگڑاہٹ ہوئی تھی۔ تین خوفناک دھماکے ہوئے اور بڑے بڑے پہاڑی پتھر فضا میں اُڑنے لگے۔ ان پر بجری اور پتھروں کی بارش ہو گئی تھی۔ اس ناگہانی افتاد سے وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ گولیاں چلنے لگیں۔ پہلی ہی کوشش میں مارتھر کے چار ساتھی ہلاک ہو گئے تھے۔ گولیاں چلانے والے کسی ایسی جگہ پوشیدہ تھے کہ ان کا نشانہ لینا بھی ممکن نہیں تھا۔ مشین گنوں کا استعمال بے سود تھا۔ البتہ چند لوگوں نے سنبھل کر دستی بموں کا استعمال شروع کر دیا اور تاک تاک کر ان جگہوں پر بم پھینکے گئے جہاں کسی کے چھپے ہونے کے امکانات تھے۔ افراتفری مچ گئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ ایک بڑا پتھر ایڈمرل کے سر میں لگا اور اس کی آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔ خوفناک ہنگامے دیر تک جاری رہے تھے لیکن ایڈمرل اب ان ہنگاموں سے بے نیاز تھا۔

اسے ہوش آیا تو وہ گھاس کے ایک ڈھیر پر پڑا تھا۔ چاروں طرف سنگلاخ دیواریں تھیں۔ دیوار کے ایک گڑھے میں مشعل گڑھی ہوئی تھی جس کی روشنی غار کو منور کر رہی تھی۔ چند ساعت تو وہ اسی طرح ماحول کا جائزہ لیتا رہا پھر اچھل کر بیٹھ گیا۔

لیکن غار میں وہ تنہا نہیں تھا۔ دو لڑکیاں ایک کونے میں بیٹھیں اس کی نگرانی کر رہی تھیں۔ نوخیز لڑکیاں تھیں۔ بدن پر لباس کا تار بھی نہیں تھا۔ ٹھوس بدن نوخیزیت سے بھرپور، رعنائیوں سے لبریز تھے۔ لمبے لمبے سیاہ بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر صحت مندی کی علامات تھیں اور ایک وحشیانہ چمک ان کی آنکھوں میں لرز رہی تھی۔

ایڈمرل کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ دونوں کھڑی ہوگئیں اور ایڈمرل کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس وحشیانہ برہنگی کو اس کی فطرت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن ایک تیز سیٹی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ یہ سیٹی ایک لڑکی نے منہ سے بجائی تھی اور ردعمل کے طور پر تین چار جوان اندر گھس آئے۔ یہ بھی بے لباس تھے اور ان کے ورزشی بدن فولاد کی مانند نظر آرہے تھے۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے پہلے لڑکی کو دیکھا اور پھر ایڈمرل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اسے ہوش میں دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہیلو......" ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا اور ایڈمرل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیا تم انگلش بول سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں...... تمہارے خیال میں ہمیں اس کے علاوہ اور کوئی زبان بولنی چاہیے؟" اس نے نوجوان سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے۔ لیکن شکل وصورت سے تو تم بالکل وحشی نظر آتے ہو۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ تمہاری کیا کیفیت ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"تب آؤ...... پادری تمہارا منتظر ہے۔" اس نے کہا اور ایڈمرل اٹھ گیا۔ دونوں لڑکیاں بھی ان کے ساتھ ہی غار کے دہانے سے باہر نکل آئی تھیں۔ غار کے باہر کھلا آسمان تھا۔ اوپر سورج چمک رہا تھا لیکن غار کی ساخت ایسی تھی کہ وہاں گھپ اندھیرا رہتا تھا۔

وہ پتلی دراڑوں سے گزرتے رہے جو قد آدم تھیں۔ اور پھر وہ ایک انتہائی کشادہ غار کے دہانے میں داخل ہوگئے۔ یہاں بہت سے ننگ دھڑنگ مرد، عورتیں اور بچے نظر آرہے تھے۔ لباس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ شکل وصورت، قد وقامت بہترین تھے۔ اگر مہذب دنیا میں یہ لوگ ہوتے تو ایک خوبصورت قبیلہ یا خاندان کہلا سکتے تھے۔

غار میں ایک معمر شخص موجود تھا جس کے سر کے بال لمبے تھے اور داڑھی پیٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔ چہرے پر بڑی بردباری اور جلال نظر آرہا تھا لیکن باقی سب خیریت تھی۔

بھی لباس کا یہاں بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے ایڈمرل کو دیکھا۔

"تم جواب دو گے۔ تمہیں جواب دینا ہوگا کہ تم کون ہو اور ہماری اس پرسکون دنیا میں کیوں آئے ہو؟"

"میں ایک خطرناک شخص کا قیدی ہوں۔ جس چیز میں ہم آئے تھے......"

"آبدوز ہے۔" بوڑھے نے حقارت سے کہا۔

"خوب...... تم جدید دنیا سے اچھی طرح واقف ہو۔"

"ہاں...... اور وہاں کے بسنے والوں سے بھی۔ مجھے کوئی جھوٹی کہانی مت سناؤ۔ یہ بتاؤ تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟"

"وہ شخص جس کا میں قیدی ہوں، پلاٹوس کے بت کی تلاش میں آیا ہے۔" ایڈمرل نے جواب دیا اور پادری خوفزدہ ہوکر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کک...... کیا...... کیا مطلب؟"

"سونے کا ایک بت...... جو ایلڈوس نامی جہاز میں......"

"نحوست کا دیوتا...... کیا تمہیں اس بات پر یقین ہے؟"

"میں نہیں مانتا لیکن درحقیقت اس کا کیا کوئی وجود ہے؟" ایڈمرل نے کہا۔

"ہاں...... وہ سمندر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سمندر سے باہر آکر وہ تباہی کا دیوتا تو بن سکتا ہے، کسی کے لئے شفقت بخش نہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"ہاں...... ہم نے اسے سمندر کے مخصوص مقام پر پوشیدہ کر دیا ہے۔ لیکن اسے نکالنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن وہ شخص اسی لئے یہاں آیا ہے۔"

"ناکام رہے گا...... موت اپنائے گا۔ اور موت ہی اس کا مقدر ہے۔ ابھی نہ سہی کچھ وقت گزارنے کے بعد تم سن لو گے کہ وہ مارا گیا۔ لیکن تم خود کو اس کا قیدی کیوں کہتے ہو؟"

"میں جو کچھ تم سے کہوں گا تم اسے جھوٹی کہانی سمجھو گے۔"

''اس کے باوجود میں سننا چاہتا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا اور ایڈمرل نے اسے پوری تفصیل بتا دی۔ اس نے مارتھر کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر نفرت کے آثار پھیل گئے۔

''گویا دنیا ابھی تک جوں کی توں ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی اس میں۔ مجھے اسی لئے تمہاری دنیا سے نفرت ہے۔''

''تمہارا کیا نام ہے معزز پادری؟''

''صرف پادری...... میں نے یہاں ناموں کی تخصیص ختم کر دی ہے۔ جن کے نام تھے وہ انہیں بھول گئے ہیں۔ نئے پیدا ہونے والوں کے نام نہیں رکھے جاتے۔ ہم نے مہذب دنیا کی ہر چیز سے اختلاف کیا ہے۔''

''میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''کچھ نہیں...... ہماری کوئی کہانی نہیں ہے۔ بس یہ جزیرہ ہمارا مقدر ہے۔ ہم چند یہاں پہنچ گئے۔ سمندر میں غرق جہاز سے ہم نے سب کچھ نکال لیا۔ اس جزیرے کو باہر کے گندے لوگوں سے پاک رکھنے کے لئے جہاز کے لوہے سے ہتھیار بنائے گئے۔ زرعی آلات بنائے گئے۔ ضرورت کی دوسری چیزیں بنائیں۔ ایک نئی دنیا آباد کر لی ہے ہم نے۔ اور ہماری نسل بڑھ رہی ہے اور ہم مطمئن اور مسرور ہیں۔ ہم جدید دنیا کی غلاظت سے پاک ہیں۔ اول تو یہ جزیرہ مہذب لوگوں کی پہنچ سے دور ہے اور اگر کوئی بھٹکا ہوا یہاں آ بھی جاتا ہے تو ہم اس کے لئے معقول بندوبست رکھتے ہیں۔''

''لیکن آپ لوگ انگریزی بولتے ہیں۔''

''ہاں۔ تو اس میں کیا حرج ہے۔ خیالات کے اظہار کے لئے یہ زبان ہماری معاون ہے۔''

''آپ لوگوں کا طرزِ زندگی کیا ہے؟'' ایڈمرل اپنی مصیبت کو بھول کر اس دلچسپ ماحول کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ اسے یہ لوگ عجیب محسوس ہو رہے تھے۔

''کچھ نہیں۔ ہم نے انسان کو تہذیب اور اخلاق کی بندشوں سے آزاد کر دیا ہے۔ کیا فائدہ اس کمزور ہستی پر وزنی بوجھ لادنے کا۔ جب یہ بوجھ اٹھایا نہیں جا سکتا تو اسے قائم

رکھنے سے کیا فائدہ۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ سب لباس کی قید سے آزاد ہیں۔ یہاں رشتے نہیں ہوتے۔ زندگی گزارنے کے لئے ہر طرح کی آزادی ہے۔ ہر عورت، عورت ہے اور مرد، مرد۔ سب سال کے چار ماہ اجناس اور گوشت کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ آٹھ ماہ تک پہاڑوں اور غاروں میں پوشیدہ رہ کر آرام سے بسر کرتے ہیں۔ سبزی ترکاری اُگائی جاتی ہے۔ چار ماہ ہمارے لئے بڑی مصروفیت کے ہوتے ہیں اور آٹھ ماہ آرام کے۔ کیونکہ برف باری اور کہر کی وجہ سے ہم ان دنوں میں کچھ نہیں کر سکتے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''یہ کون سا موسم ہے؟''

''جدوجہد کا آخری مہینہ۔ ہماری ذخیرہ گاہ بھر چکی ہے۔ بس آخری کام ہو رہا ہے۔ کھلیاں خشک کی جا چکی ہیں اور انہیں سمیٹا جا رہا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، آسمان سے کہر اتر رہی ہے۔ ابھی یہ ہلکی ہے لیکن ایک یا ڈیڑھ ماہ کے اندر یہ اتنی گہری ہو جائے گی کہ پھر برف باری شروع ہو جائے گی اور ہم غاروں میں چلے جائیں گے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

ایڈمرل اس عجیب وغریب زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

''تمہاری نسل بڑھ رہی ہے؟''

''ہاں...... مناسب رفتار سے۔''

''کیا ایک دن یہ نسل اتنی زیادہ نہیں ہو جائے گی کہ یہ جزیرہ تمہارے لئے تنگ ہو جائے گا؟'' ایڈمرل نے پوچھا۔

''سارے انتظامات مکمل ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آبادی کے لحاظ سے عمر کا تناسب مقرر ہے۔ ایک خاص عمر میں آنے کے بعد موت اپنانی پڑتی ہے۔ لیکن ابھی تو طویل عرصہ اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔''

''کیا اس زمین سے تم اتنا غلہ حاصل کر لیتے ہو کہ......''

''غلہ ہمارے ہاں تیسرے درجے کی ایک چیز ہے۔ نمبر ایک مچھلیاں جو ہماری عام خوراک ہیں اور وسیع سمندر۔ دوسرے نمبر پر گوشت جس میں کیڑے مکوڑے، سانپ بچھو

سے لے کر شیر اور ہاتھی تک ہر جانور ہماری گوشت کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ تیسرے نمبر پر پھل وغیرہ آتے ہیں۔ سبزیاں، گھاس پھونس جو چیزیں انسانی معدے میں سما سکتی ہیں سب ہمارے لئے غذا کا کام دیتی ہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"آخری سوال اور ہے۔ پلاٹوس کے بت کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟"

"عقیدہ ہی نہیں، تجربہ بھی ہے۔ وہ تباہی کا دیوتا ہے اور جب تک وہ سمندر میں رہے گا حالات ٹھیک رہیں گے۔ دوسری صورت میں تباہی یقینی ہے۔"

ایڈمرل خاموش ہو گیا۔ اسی وقت چند برہنہ نوجوان اندر داخل ہوئے اور انہوں نے کہا۔

"باہر سے آنے والے دشمن کو پہاڑیوں میں گھیر لیا گیا ہے۔ لیکن اس بار وہ سخت حملہ کر رہا ہے۔ ہمارے بیس جوان مارے گئے ہیں۔"

"اوہ...... آؤ...... میں صورتحال کا جائزہ لوں گا۔" بوڑھے نے دانت پیس کر کہا اور پھر وہ دو آدمیوں سے بولا۔ "اسے بند کر دو اور سخت نگرانی کرو۔"

ان دونوں آدمیوں نے ایڈمرل کو دوبارہ اسی جگہ پہنچا دیا اور دونوں لڑکیاں اس کی نگرانی پر مامور ہو گئیں۔

✡......✡

مارتھر کی وحشت عروج پر تھی۔ اس کے آٹھ ساتھی مارے جا چکے تھے اور اب ان کی تعداد صرف اٹھارہ رہ گئی تھی۔ دو لڑکیاں اور ایک پرتھوی سنگھ اس طرح کل اکیس آدمی تھے۔

سب کے سب جدید اسلحے سے لیس تھے اور اس وحشت ناک جزیرے پر خرگوشوں کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ پرتھوی نے تسلیم کیا تھا کہ مارتھر بے جگر آدمی ہے۔ خوف کا اس کے قریب سے گزر نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بھی اس کی مانند تھے۔ وہ اب جزیرے کے ہر حصے کو دیکھ رہے تھے۔ مارتھر ہر جگہ بے دھڑک چلا جاتا تھا۔ قدم قدم پر مقامی باشندوں سے جھڑپیں ہوتی تھیں جن میں لڑکیاں، عورتیں، بوڑھے سبھی ہوتے تھے۔ یہ مقابل بھی بے حد خطرناک تھے۔ انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک مارتھر ان میں سے کسی کو زندہ نہیں پکڑ سکا تھا۔ لیکن وہ ان کو ہلاک ضرور کر دیتا تھا۔ اور اب تک اس کی ذہانت

نے اس کے لوگوں کو محفوظ رکھا تھا۔

پرتھوی سنگھ کو حیرت تھی کہ ان دس دنوں کے اندر اس نے مارتھر کو کبھی آرام کرتے نہیں دیکھا۔ نہ ہی اس کے انداز میں کوئی اضمحلال نظر آ رہا تھا۔ وہ بھرپور طور سے سرگرمِ عمل تھا۔ دورانِ جنگ بھی اس نے اپنے لوگوں کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ زیادہ تر بوڑھے انسانوں کو شکار کریں۔ اسے جوانوں کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہ انوکھی بات تھی۔

پورے بیس دن گزر گئے۔ ابھی تک نہ ان لوگوں نے ہار مانی تھی اور نہ ہی مارتھر کے ارادوں میں کوئی زوال محسوس ہوا تھا۔ البتہ اب موسم بدلتا جا رہا تھا۔ جزیرے پر سورج ...نا بند ہو گیا تھا اور کہر گاڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ مارتھر اپنے مضبوط ٹھکانے پر رہتا تھا اور اس کے آدمی مقامی باشندوں کا شکار کرتے رہتے تھے۔

پھر پرتھوی سنگھ کو یوں محسوس ہوا کہ مارتھر راتوں کو کسی خاص چیز کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اور پھر ایک رات وہ اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر کہر میں چل پڑا۔ اس رات اس نے ایک وسیع غار پر حملہ کیا تھا۔ یہ مقابلہ اب تک ہونے والے تمام مقابلوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ لاتعداد وحشی مارے گئے اور پہلی بار دو وحشی مارتھر کے ہاتھ آئے تھے۔ مارتھر نے نہایت پھرتی سے اس غار کے اوپری حصوں پر مشین گنیں نصب کر دیں اور اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی کہ وہ وحشیوں پر نگاہ رکھیں۔ پھر وہ پرتھوی سنگھ کو لے کر ان غاروں میں داخل ہو گیا اور پرتھوی سنگھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ غار خشک پھلیوں، سبزی ترکاریوں، پھلوں اور دوسری غذائی اجناس سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ وحشیوں کی ذخیرہ گاہ تھی جو نہایت محفوظ تھی۔

اور شاید وحشی آبادی کے لئے یہ سب سے خوفناک امتحان تھا۔ جن دو وحشیوں کو زندہ پکڑا تھا وہ خوفزدہ نظر آ رہے تھے لیکن مارتھر نے ان کے ساتھ بہت محبت کا سلوک کیا اور

"میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم جاؤ اور اپنے سربراہ کو میرا پیغام دے دو۔ اسے کہو کہ میں ان کے جزیرے کو تسخیر کرنے اور یہاں قیام کرنے نہیں آیا۔ میں صرف ان کی امداد چاہتا ہوں۔ وہ لوگ اگر میرے ساتھ تعاون کریں تو میں کہر گاڑھی ہونے

سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اور اگر انہوں نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو میں صرف ایک دن انتظار کرنے کے بعد یہ غار بارود سے اُڑا دوں گا اور تمہاری خوراک کا ذخیرہ تباہ ہو جائے گا۔ جاؤ...... یہ پیغام اپنے لوگوں کو دے دو۔"

اور پھر ان دونوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ اب ان کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ اور یہ انتظار زیادہ طویل نہ ہوا۔ دوسرے دن اجناس گاہ کے سامنے کے وسیع میدان میں وحشیوں کے جتھے گروہ جمع ہونے لگے۔ اور جب ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہو گئی تو بوڑھا پادری آگے بڑھا۔ ایڈمرل احمد ان کے ساتھ تھا۔ بوڑھے کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔ اس نے تھکے لہجے میں مارتھر سے پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"پلاٹوس کا سنہری مجسمہ جو سمندر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ تمہارے لوگ اسے نکال کر ہمارے حوالے کرنے میں مدد کریں گے اور اس کے بعد ہم خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"وہ نحوست کا مجسمہ ہے۔ اگر اسے سمندر سے نکالا گیا تو کوئی محفوظ نہیں رہے گا۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"سمندر کی اس نحوست کو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ تمہیں اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ دوسری صورت میں تم موسم کی نحوست کا شکار ہو جاؤ گے۔ ہم نے تمہارے غذائی ذخیرے کے چاروں طرف بارود جمع کر دیا ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے اس وقت تک کوئی حرکت کی جب تک ہم اپنی آبدوز کی مرمت کر کے یہاں سے نکل نہ جائیں تو تمہیں اس ذخیرے سے محروم کر دیں گے اور تم اس میں سے کچھ نہ پا سکو گے۔" مارتھر نے کہا۔

بوڑھا پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کے چہرے پر بے بسی کے آثار تھے۔ مارتھر نے اس کی خاص رگ دبائی تھی۔ اگر ذخیرہ تباہ ہو جاتا تو وہ آنے والے خوفناک موسم میں بھوک کا شکار ہو جاتے۔ دوسری کوئی صورت زندگی کی نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔

ایڈمرل احمد پھر ان لوگوں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان وحشیوں کو قبضے میں رکھنے

اس ذخیرے کی حفاظت سب سے ضروری تھی۔ چنانچہ مارتھر نے اپنے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد پرتھوی سنگھ کی نگرانی میں ذخیرہ گاہ پر چھوڑ دی اور خود بوڑھے کے ساتھ کام میں مصروف ہو گیا۔

ناکارہ آبدوز سے وہ کرین نکال لی گئی جس میں لوہے کے مضبوط تاروں کے اسپول لگے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے کئی ایکسٹرا اسپول بھی غوطہ خوروں نے سخت محنت کے بعد نکال لئے اور پھر ایک پورا گروہ سمندر کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس موقع پر ایڈمرل احمد بھی خود کو باز نہیں رکھ سکا تھا۔ سمندر کی پراسرار گہرائیوں میں غوطہ خوروں کے رہنما بڑے اطمینان سے اتر رہے تھے۔ ان لوگوں کو پانی میں رہنے کی خاص مہارت تھی اور انہوں نے کوئی لباس استعمال نہیں کیا تھا۔ ننگ دھڑنگ لوگ کسی دوسرے احساس سے بے نیاز غوطہ خوروں کی رہنمائی کرتے ہوئے بالآخر سمندر کی گہرائی میں ایک پہاڑی کٹاؤ کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں سمندری گھاس کے ڈھیر کا ذخیرہ تھا اور جب وحشی سفید فاموں نے گھاس کے یہ مصنوعی ڈھیر ہٹائے تو قدیم یونان کی ایک پراسرار داستان کی مانند سونے کا پلاٹوس مجسمہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک ہیبت ناک شکل کا بت جس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ یہ انوکھے ہیرے زندہ معلوم ہوتے تھے اور دیکھنے والوں پر سحر طاری ہو گیا تھا۔

ایڈمرل کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی منع کر رہا ہے کہ یہ مجسمہ سمندر سے نہ نکالا جائے لیکن اس نے یہ احساس ذہن سے جھٹک دیا کہ اول تو یہ وہم ہے۔ صرف ان داستانوں کا نتیجہ جو اس نے اب تک اس مجسمے کے بارے میں سنی ہیں۔ دوئم وہ یہ قدرت نہیں رکھتا کہ مارتھر کو اس کوشش سے باز رکھ سکے۔ چنانچہ وہ خاموش تماشائی بنا رہا۔ لوہے کے ہک مجسمے کے چاروں طرف ایک دوسرے سے منسلک کر دیئے گئے اور پھر اوپر اشارہ دے دیا گیا۔ ہزاروں لوگوں کی قوت اس مجسمے کو اس کی جگہ سے جنبش دینے لگی اور مجسمہ چند ساعت کے بعد اپنی جگہ سے ہل کر پانی کی تہہ سے اوپر اٹھنے لگا۔ مارتھر بہت خوش تھا اور مجسمے کے ساتھ ساتھ تیرتا ہوا اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت چمک رہی تھی۔ اس کا عظیم الشان مشن پورا ہو گیا تھا۔ وہ کامیابی سے اس مجسمے کو اوپر لے جا رہا تھا۔

دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ ایڈمرل بھی پانی کی سطح پر جا رہا تھا۔ اوپر ساری مشینری

تیار تھی۔ چنانچہ مجسمے کو خشکی کی سمت گھسیٹا جانے لگا۔ تقریباً تین سو افراد سخت جدوجہد کر رہے تھے۔ مارتھر کے ساتھی صرف اس کارروائی کی نگرانی کر رہے تھے۔ غوطہ خور بھی خشکی پر پہنچ گئے اور مجسمہ کشاں کشاں خشکی پر آنے لگا۔ آسمان پر ایک عجیب سی سرخی ابھر رہی تھی اور گہری کہریوں لگ رہی تھی جیسے فضا میں آگ لگ گئی ہو۔ تب بوڑھے پادری نے آسمان کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

"یہ قہر کی علامت ہے۔ جزیرے کے آسمانوں پر ایسی سرخی کبھی نہیں دوڑی۔ آہ..... دیکھو، موت کی سرخ آنکھیں زمین والوں کو گھور رہی ہیں...... آہ...... آہ......"

لیکن مارتھر کا قہقہہ اس کی آواز پر بھاری ہو گیا۔

"وحشت کے اس ماحول نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔ خاموش ہو جاؤ اور دوسروں کو خوفزدہ نہ کرو۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھی لرز رہے تھے۔ سونے کے عظیم الشان مجسمے کو خشکی پر لے آیا گیا اور پھر اسے کھڑا کر دیا گیا۔ قہر و جبروت کا دیوتا اپنی شعلہ بار آنکھوں سے کائنات کو گھور رہا تھا اور جزیرے کے باشندوں کے حلق سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ سب کانپ رہے تھے۔ خوف سے ان کی بری حالت تھی اور آسمان کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"اپنے ٹھکانوں میں چلے جاؤ۔ تمہاری خوراک کا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ہم ایک بار اور تمہیں تکلیف دیں گے، اس وقت جب مجسمے کو آبدوز میں پہنچایا جائے گا۔ اگر تم ہم سے تعاون کرو گے تو ہم تمہارے دوست ثابت ہوں گے۔ لیکن خبردار، اس دوران کوئی سازش نہ ہو۔ ورنہ تم اور تمہارا یہ ذخیرہ محفوظ نہ رہے گا۔"

بوڑھے نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ننگ دھڑنگ وحشیوں کا گروہ پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔

آسمان کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہ لوگ حیران تھے۔

"یہ سرخی حیران کن ہے مسٹر احمد! پورا ماحول سرخ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم اسے کیا کہہ سکتے ہیں؟"

لیکن کوئی جواب نہیں تھا۔ پراسرار سرخی اب اتنی گہری ہو گئی تھی کہ سرخ رنگ کے علاوہ اور کوئی چیز نمایاں نہیں تھی۔

مارتھر نے شانے ہلائے۔ پھر اس نے اپنے چند ساتھیوں کو جمع کیا اور بولا۔

"آخری مرحلہ رہ گیا ہے دوستو! آبدوز کی مرمت۔ اور مجھے اپنے ساتھیوں کی مہارت پر مکمل اعتماد ہے۔ اس کے علاوہ ایڈمرل! مجھے اس سلسلہ میں تمہاری مدد بھی درکار ہو گی۔ کیا تم اس آخری مرحلے میں میرا ساتھ دو گے؟"

"میں نے کبھی تم سے انحراف نہیں کیا مارتھر! میں تیار ہوں۔" ایڈمرل نے جواب دیا۔ اور مارتھر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سرخ سمندر میں غوطہ خوروں کی ایک ٹیم غرق شدہ آبدوز کی طرف چل دی۔ ایڈمرل احمد بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ آبدوز کی مرمت کے بارے میں اس کے ذہن میں تشویش تھی۔ ہرچند کہ آبدوز کے انجن وغیرہ زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے تاہم ایڈمرل سوچ رہا تھا کہ مارتھر کے انجینئر ممکن ہے انہیں درست نہ کر پائیں۔

مخصوص راستے سے وہ آبدوز کے اندر داخل ہو گئے۔ آکسیجن پلانٹ اچھی طرح کام کر رہا تھا اور آبدوز کو ابھی دس پندرہ گھنٹے تک سمندر کی تہہ میں رکھا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے مزید احتیاط کرتے ہوئے آکسیجن سلنڈر کا استعمال جاری رکھا اور آکسیجن پلانٹ بند رکھا۔ اس کے بعد وہ انجنوں کا جائزہ لینے لگے اور اپنی رپورٹ ایڈمرل کو پیش کر رہے تھے۔ اور یہ رپورٹ امید افزا تھی۔ اندرونی نظام متاثر ضرور ہوا تھا لیکن اس قدر بھی نہیں تھا کہ اس کی درستگی ناممکن ہو۔ چنانچہ ابتدائی کام کا آغاز کر دیا گیا۔

✡......✡

جزیرے کی خونی فضا بڑی گھٹن آلود ہو گئی تھی۔ ماحول وحشت ناک ہوتا جا رہا تھا۔ اور ان سرخ فضاؤں میں بجلیوں کی کڑک نے اور دہشت انگیزی پیدا کر دی۔ شام ہوئی تو ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ بہت دور بینائی کی آخری حدود پر سمندر میں اُونچے اُونچے ... اٹھ رہے تھے۔

بلندی پر کھڑے لوگوں نے سمندر کا یہ رنگ دیکھا اور ان کے دل خوف سے دھڑکنے ... " پرتھوی سنگھ نے متاثر لہجے میں کہا۔

''مسٹر مارتھر! کیا ان لوگوں کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی؟''

''کیا مطلب؟''

''یہ سرخ ماحول اور یہ طوفانی جھکڑ...... سمندر کی لہریں بلند ہو رہی ہیں۔''

''تم بھی ان طلسمی باتوں سے متاثر ہو گئے پرتھوی سنگھ؟''

''نہیں ...... لیکن اس کی سرخی کا کیا جواز ہے؟''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔'' آہنی شخص نے کہا اور پرتھوی سنگھ خاموش ہو گیا۔

لیکن سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ سرد ہواؤں کے جھکڑ اب قیامت خیز ہو گئے تھے۔ سونے کا بت پلاٹوس تباہی کا مجسمہ بلاؤں کو پکار رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں سمندر کو گھور رہی تھیں اور اس کا تابع سمندر اُبل رہا تھا۔ دیو قامت لہریں جزیرے کی طرف دوڑ رہی تھیں اور ساحل کی چٹانوں میں گڑگڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

لہریں جب پہاڑی کے سرے کو چھونے لگیں تو پرتھوی سنگھ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم کوئی پناہ گاہ تلاش کر لیں۔''

''ہوں ...... تم ان غاروں کی طرف جاؤ جو ذخیرہ گاہ ہیں۔ میں سمندر کا رنگ دیکھ رہا ہوں۔ ضرورت ہوگی تو میں بھی وہاں آ جاؤں گا۔''

اسی وقت ایک ہیبت ناک دھماکا ہوا اور پانی کی ایک پُرشور لہر نے بے شمار چٹانیں اٹھا کر ایک دوسرے پر دے ماریں۔ کان سن ہو گئے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی بپھرا ہوا سمندر جزیرے پر چڑھ دوڑا...... ساتھ ہی بھیانک انسانی شور نے ماحول کو وحشت ناک بنا دیا۔ چیختے چلاتے وحشی سفید فام غاروں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ان کے دانت نمایاں تھے۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ خوف نے انہیں دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔

''تم ظالم ہو...... تم نے سکون کی آبادی خفا کر دی...... تم نے ہمیں پلاٹوس کے قہر کا شکار بنا دیا۔ ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ مار ڈالو...... چیر پھاڑ کر رکھ دو۔''

اور غار والے یہ یلغار نہ روک سکے۔ وحشیوں نے انہیں جکڑ لیا۔ ان کے نرخرے دانتوں سے ادھیڑ ڈالے اور ان کا سرخ خون چاٹنے لگے۔ اور پھر پانی کا ایک خوفناک

ریلا غار میں گھس آیا۔ آن کی آن میں غار میں پانی ہی پانی تھا۔ لوگ اس پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ زندگی بچانے میں کوشاں تھے لیکن بے رحم موجیں انہیں غاروں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر مار رہی تھیں۔ چاروں طرف سرخی تھی اور اب یہ سرخی سمندر کے پانی میں گھل گئی تھی۔ پانی درختوں کی چوٹیوں سے اوپر آ رہا تھا۔ درخت جڑیں چھوڑ رہے تھے اور بے رحم موجوں نے چٹانوں کے نقشے ہی بدل دیئے تھے۔ پانی کی خوفناک قوت سونے کے ستون سے ٹکرائی اور موجوں نے اسے سر پر اٹھا لیا۔ فوراً ہی بڑی بڑی لہریں دوسری طرف سے کھسک کر پہنچ گئیں۔ انہوں نے چٹانوں کو صاف کر کے راستہ بنا لیا تھا اور سونے کا بت موجوں کے جلوس کے ساتھ سمندر کی طرف بہہ رہا تھا۔ کئی بار وہ سطح سمندر پر ابھرا اور پھر پانی میں بیٹھ گیا۔ سمندر نے اپنی امانت واپس لے لی تھی۔''

نظمہ خاموش ہوئی تو جیسے یہ طلسم ٹوٹ گیا...... سب چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگے۔

رازل جریری نے کہا۔ ''آہ...... کیا انوکھی داستان تھی۔''

''واقعی...... شہباز نے کہا۔ پھر اچانک رازل جریری نے چونک کر نظمہ کو دیکھا تو نظمہ بے اختیار مسکرا کر بولی۔

''میں انہی لمحات کا انتظار کر رہی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''جب رازل جریری چونک کر مجھے دیکھیں اور ان کی آنکھوں میں سوال ہو۔''

''کیسا سوال......؟'' رازل جریری نے بزرگانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

''یہی کہ یہ انوکھی داستان مجھے کہاں سے معلوم ہوئی۔'' نظمہ نے اعتماد سے کہا۔

''سوال تو ہے۔'' رازل جریری نے کہا۔

''ہاں...... سوال ہے۔ خاصے دن پہلے کی بات ہے، ایک ردی فروش کے ٹھڑے سے مجھے ایک خوبصورت جلد والی ڈائری ملی۔ میں نے اسے صرف اس کی خوبصورت جلد کی وجہ سے اٹھا لیا۔ لیکن اس میں مجھے یہ کہانی ملی۔ ڈائری کا مالک پرتھوی سنگھ نامی شخص تھا۔

''آہ...... اس داستان کا اہم کردار......؟''

''ہاں۔ اُس نے اس داستان کے بعد کے واقعات بھی لکھے تھے۔ ایڈمرل احمد آبدوز کو صحیح سالم واپس لے آیا تھا اور اس کے ساتھی بچ گئے تھے۔ پرتھوی سنگھ کے دل میں شاید

سونے کے اس بت کے حصول کی خواہش اب بھی باقی تھی۔''

''مطلب......؟'' شہباز کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''اسی ڈائری میں ایک بوسیدہ کاغذ بھی دستیاب ہوا جس میں اس علاقے کا نقشہ تھا جہاں وہ بت غرق ہوا تھا۔'' نظمہ نے جواب دیا۔

''وہ ڈائری تمہارے پاس ہے؟'' رازل جریری نے پوچھا۔

''ہاں...... ہم نہ فقیر ہیں نہ درویش، نہ ہی ہم نے ترکِ دنیا کی ہے۔ لیکن ساری زندگی کا تجربہ ہے کہ دولت کا یہ تصور انسان سے دانش چھین لیتا ہے اور انسان اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ ہم لوگوں نے دنیا کو جس طرح دیکھا اور ہماری زندگی میں خود جو واقعات پیش آئے انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ زندگی گزارنے کے لئے دولت ایک انتہائی اہم ضرورت تو ہے لیکن یہ ضرورت زندگی کے ساتھ ساتھ ہی سفر کرتی ہے۔ قارون نے دولت کے انبار جمع کر لئے اور اس کے بعد سب کچھ یہیں چھوڑ گیا۔ ایسی چیز کے لئے اتنی تگ ودو تو کی جا سکتی ہے کہ انسان قیمتی زندگی کے کچھ لمحات اس میں خرچ کر دے۔ لیکن زندگی کی قیمت پر اس کا حصول ایک غیر دانش مندانہ عمل ہی لگتا ہے۔ یہ میرا اپنا نظریہ ہے جسے میں کسی پر لاگو نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے پاس یہ ڈائری ایک بے مقصد شے بن کر رہ گئی۔ کیونکہ اس سے وہ فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ بے شک سونے کا وہ پراسرار بت اس دور کے لئے ایک انتہائی قیمتی چیز ہوگا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جتنے لوگوں نے اس کے لئے زندگی کھو دی، کیا ان کا زندگی کھونا کافی نہیں ہے؟ ہم کیوں اس دوڑ میں شریک ہوں؟'' سعدی حشمی نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔

''لیکن محترم رازل جریری! یہ بات آپ پر لاگو نہیں ہوتی۔ کیونکہ آپ کا مقصد، آپ کا موقف بہت مختلف ہے۔ آپ جو چاہتے ہیں وہ ایک عالمی انسانی سطح کی چیز ہے۔ میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس ڈائری کو پڑھ کر ہم لوگ بڑے محظوظ ہوئے تھے۔ لیکن اس کے بعد نظمہ نے اسے ایک بے کار چیز کی طرح اپنے کباڑ خانے میں ڈال دیا اور وہ آج بھی اسی کباڑ خانے میں موجود ہے۔ ہم نے اسے باہر کی بھی ہوا نہیں لگنے دی یہ سوچ کر کہ اگر یہ کسی سرپھرے کے ہاتھ لگ گئی تو ایک بار پھر زندگی اور موت کا کھیل کہیں نہ کہیں شروع ہو جائے گا۔ نظمہ! وہ ڈائری رازل جریری

کو پیش کرو۔'' سعدی حشمی نے کہا۔

شہباز رازل جریری کے چہرے پر پیدا ہونے والے تغیرات کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، رازل جریری نے کہا۔

''تقریر کا شوق ہر شخص کو ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی عقل کے دائرے میں کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور کہہ دیتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ صرف اور صرف اس کی کم علمی ہے۔ ورنہ بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جو اس کی ذہنی پہنچ سے دور ہیں۔ تم نے بھی ایک تقریر کی سعدی حشمی! بے شک تم نے بہت سے انسانی اصولوں کو سامنے رکھا۔ لیکن بعد میں تم یہ بھی کہہ گئے کہ میری ضرورتیں کچھ اور ہیں۔ ہاں...... میری ضرورتیں واقعی کچھ اور ہیں۔ بس اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں اور جہاں تک بات اس ڈائری کی ہے تو سونے کے اس بت کا تذکرہ ہی ہے نہ اس میں ایسے بے شمار سونے کے بت تلاش کر لینا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بہتر ہے وہ ڈائری رہنے دو۔ اصل میں میرا مسئلہ کچھ اور تھا۔ علی اصغر جراری ایک ایسا کردار ہے جس سے میں نے بہت سی توقعات پیدا کر لی تھیں۔ اس کی زندگی بچانے میں حقیقت یہ ہے کہ ایک انسانی احساس بھی تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ شاہ ایران کے اس خزانے کی تفصیل بھی تھی جس کو تم لوگوں نے مسخ کر کے نجانے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ بہرحال رب کائنات نے اس کائنات کو اتنے خزانے بخشے ہیں کہ اگر انسان انہیں حاصل کر لے تو کائنات کے رنگ ہی بدل جائیں۔ بہرحال مجھے وہ ڈائری نہیں چاہئے۔''

''شاید آپ میری بات کا برا مان گئے رازل جریری! حقیقت یہ ہے کہ سعدی حشمی نے کوئی اتنی بڑی بات نہیں کی تھی۔ لیکن انسان کا مزاج ہوتا ہے۔ پتہ نہیں رازل جریری کو اس کی بات کیوں بری لگی تھی۔ اور اس کے بعد نظمہ اور سعدی حشمی انہیں روکتے رہ گئے۔ لیکن رازل جریری نے واپسی کا سفر ہی اختیار کیا تھا۔ کچھ شہباز کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ رازل جریری اس قدر بدل کیوں گیا ہے۔ بعد میں یوکاس پہنچ کر علی اصغر جراری کے سامنے اس نے کہا۔

''سونے کا بت اور وہ بھی پراسرار روایتوں کا حامل۔ اگر میں ایک مہم جو ہوتا اور مجھے صرف اس بت کی ہی تلاش ہوتی تو شاید میں اس چیلنج کو قبول کر کے سمندر کی آغوش سے

سونے کا وہ بت چھین لیتا۔ لیکن میں صرف ایک مہم جو نہیں ہوں، میرے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہے۔ میں دنیا کو اس کے سارے رنگ واپس کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میری عمر مختصر اور کائنات کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔ لیکن بات وہی ہے کہ اپنے آپ سے اور آنے والے لمحات سے مایوس ہو کر بیٹھ جانا زندگی کی علامت تو نہیں ہے۔ ہم تو زندگی کو جدوجہد کا دوسرا نام سمجھتے ہیں۔ اور جب آسمانوں سے اس جدوجہد کے خاتمے کا اعلان ہوتا ہوگا تو ظاہر ہے آج تک کی تاریخ میں کوئی اس اعلان سے بغاوت نہیں کر سکا ہے۔ میں نہ حیاتِ ابدی چاہتا ہوں نہ مجھے آبِ حیات کی تلاش ہے۔ میں تو صرف ان بے کس اور بے بس انسانوں کی حیات میں سرگرداں ہوں جنہیں بے مقصد اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے پیسا جا رہا ہے۔ بہر حال میں نہیں جانتا کہ آنے والا وقت کیا کہے گا۔ قدرت نے مجھے ایک قوت سے نوازا ہے وہ یہ کہ میں اپنے جسم کو محفوظ کر کے اپنی روح کو سرگرداں کر سکتا ہوں۔ علی اصغر جراری! مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہاں میرے پاس آنے کے بعد تم ناخوش نہیں ہو۔"

"آپ ناخوش کی بات کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے دوسری زندگی تو آپ لوگوں نے دی ہی ہے لیکن اس زندگی گزارنے کے راستے بھی بتا دیئے ہیں۔ میں آپ کی جدوجہد میں شریک رہ کر اپنے آپ کو بے حد خوش محسوس کرتا ہوں۔ رازل جریری۔"

"شکریہ۔ شہباز! ہم اسے بھی اپنے دوستوں میں شریک کرتے ہیں۔ بہر حال اب ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے علی اصغر جرادی یہ لیبارٹری ابھی تک تو کسی کی نگاہوں میں نہیں آئی۔ اسے لوگوں کی نظروں سے محفوظ رکھنے کا جو طریقہ کار میں نے متعین کیا ہے۔ میں مکمل طور پر تمہارے علم میں بھی اسے لے آنا چاہتا ہوں۔ یہاں میری اور شہباز کی غیر موجودگی میں جب ہم اپنی مہمات پر نکلے ہوئے ہوں گے۔ تم اس لیبارٹری کے محافظ رہو گے۔ اپنی پوری ذہانت کے ساتھ جس کی تمہیں مزید تربیت دے دی جائے گی۔ تمہیں اس لیبارٹری کا تحفظ کرنا ہے۔

"آہ...... میرے لئے وہ ایک عبادت کا درجہ ہوگا۔" علی اصغر جراری نے کہا۔

"ٹھیک اور شہباز جیسا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میرے دست راست ہو اور تم نے وہ سب کچھ سنبھال رکھا ہے۔ جو میری ضرورت ہے یعنی جو میں کرنا چاہتا تھا اور کر سکتا

تھا۔ وہ تم کر سکتے ہو۔ مجھے کچھ دن کی آزادی دے دو۔ درحقیقت میں کچھ ایسے جہانوں کی تلاش میں نکلنا چاہتا ہوں جہاں میرے لئے مستقبل کے دروازے کھل سکیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میرا مطلب۔ میں خزانوں کی تلاش میں سرگرداں ہونا چاہتا ہوں تا کہ اپنے اس مشن کو با آسانی پورا کر سکوں اور تم...... تمہارے لئے میں یقینی طور پر کوئی ایسا راستہ تلاش کروں گا جو تمہاری آگے کی مہم بن جائے۔"

"مجھے آپ کے کسی عمل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اس دوران تم چاہو تو اپنے ماں باپ کے پاس رہ سکتے ہو۔ علی اصغر جراری! تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ اور شہباز! تم جب بھی یہاں واپس آنا چاہو، آ سکتے ہو۔ میں اگر قریب ہوا تو تم سے رابطہ رکھوں گا۔ لیکن ایک خاص بات کی ہدایت میں تمہیں کئے دیتا ہوں، وہ یہ کہ میرے جسم کو محفوظ رکھنا۔ جس کے لئے ایک باقاعدہ بندوبست کئے دیتا ہوں۔"

شہباز نے رازل جریری سے تعاون کرنے کے انداز میں گردن ہلا دی تھی۔

۞......۞
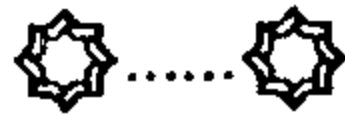
پلاسکو کے دارالحکومت میں ایک بہت ہی اہم اور پُر حفاظت علاقے میں کئی گاڑیاں سفر کر رہی تھیں۔ ان کی منزل شہری آبادی سے دور فوجی علاقے کی ایک عمارت تھی جس کی وسعت بے پناہ تھی۔ اور اس کے اردگرد اتنے زبردست حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے کہ غلط نگاہ سے دیکھنے والے کو دانتوں پسینہ آجائے۔ اس عمارت کے وسیع وعریض ہال میں اس وقت پلاسکو کی کریم موجود تھی۔ تمام بڑے بڑے عہدے دار اور اعلیٰ ترین فوجی حکام موجود تھے اور جو بقیہ رہ گئے تھے وہ ان گاڑیوں میں سفر کر کے یہاں تک پہنچ چکے تھے۔

آخر کار ہال کا دروازہ بند ہو گیا۔ پلاسکو کے سربراہِ اعلیٰ اس میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے اور کرسی صدارت پر بیٹھے کورم پورا ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخری آدمی جو اس ہال میں داخل ہوا وہ ریڈ چینل کا سربراہ گیرٹ بیراٹ تھا۔ گیرٹ بیراٹ ایسی ہی شخصیت تھا کہ اس کو دیکھ کر بہتوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ ریڈ چینل خفیہ جماعت کا ایک خاص سیکشن تھا اور اس کے فرائض میں دنیا بھر سے حاصل کئے گئے ان افراد کی موت کا کام تھا جو کسی نہ کسی طرح حکومت پلاسکو کے غدار، اس کے مفادات کے مخالف ہوا کرتے تھے۔ ریڈ چینل کا یہ سخت گیر اور بے رحم سربراہ اپنی درندگی اور سفاکی کے لئے بہت مشہور تھا۔ ایسے کسی شخص کی یہاں آمد یہاں موجود لوگوں کے لئے بڑی دہشت اور سنسنی کا باعث تھی۔ ویسے بھی اس کانفرنس کی نوعیت اسی قدر ہولناک تھی۔ صدرِ مملکت کے ساتھ ان کے تین مشیر بھی آس پاس بیٹھے تھے۔ پھر اسپیکر کی آواز ابھری۔

''تمام لوگ آچکے ہیں۔ چنانچہ کارروائی کا آغاز کیا جائے۔''

صدرِ مملکت کے اشارے پر مشیر نے اپنے سامنے رکھا ہوا مائیک آن کیا اور نرم لیکن صاف ستھرے لہجے میں بولا۔

''اس میٹنگ کی نوعیت کو دوہرانا بے مقصد اور وقت کے ضیاع کے مترادف ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع رازل جریری ہے اور اس میں تمام باتوں کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ صدرِ مملکت کے الفاظ ہیں اور انہیں اسی نوعیت سے سمجھا جائے۔ ایک نام جس کا تعلق ایران سے بتایا جاتا ہے یا اگر وہ ایران سے نہیں بھی ہے تب بھی ہمارے ہاں اسے یہی نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایران ایک ایسی جگہ ہے جو طویل عرصے تک حکومت پلاسکو کی مخالفت کرنے کے باوجود اپنے اندر مستحکم ہے۔ وجوہات کچھ بھی ہوں، اس میٹنگ میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ رازل جریری نے ایرانی مفادات کے لئے کچھ بھی نہیں کیا لیکن وہ ایسے شخص کی حیثیت سے منظر عام پر آیا جو اپنے بیان کے مطابق دنیا بھر میں تخریبی سرگرمیاں روکنا چاہتا ہے اور اس نے حکومت پلاسکو کو پوری دنیا میں سب سے بڑا تخریب کار قرار دیا۔ پلاسکو کا اس کی طرف متوجہ ہونا لازمی امر تھا اور اس کے بعد جب حالات کا تجزیہ کیا گیا تو پتہ یہ چلا کہ وہ حکومت پلاسکو کے چھوٹے چھوٹے مفادات کو بدترین ضربیں لگا چکا ہے۔ بحالت مجبوری اسے پلاننگ چینل کے سپرد کر دیا گیا اور پلاننگ چینل کے کرتا دھرتاؤں نے اس کے لئے منصوبہ بندی کی۔ وہ ہمارے ہاتھ آ گیا لیکن ان فلمی قسم کے لوگوں نے اسے فوری طور پر تیزاب میں ڈبو کر مار ڈالنے کی بجائے وان کیسرو کے غاروں میں پھنکوا دیا۔ اب اس سے ان کا مقصد کیا تھا، وہ کون سے بڑے مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے جس کی بناء پر انہوں نے اسے فوری طور پر ختم کرنے کی بجائے آرتھینو ویسکو کے اس علاقے کو منتخب کیا۔ اس کی کوئی خاص وضاحت اگر ہے تو صدرِ مملکت اس کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔

پھر اس کے بعد دوسرے عوامل سامنے آئے۔ بتایا گیا کہ رازل جریری صرف ایک سائنٹسٹ نہیں تھا بلکہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک بھی تھا اور اس نے پراسرار طریقے سے اپنی روح کو اپنے جسم سے الگ کر لیا اور پھر اس کی روح نے ہمارے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا۔ آرتھینو ویسکو میں دو لیبارٹریاں قائم کی گئی تھیں۔ ان میں دنیا کے کئی بڑے سرمایہ دار ملکوں کا سرمایہ لگا ہوا تھا اور انہوں نے ہماری ذمے داری پر یہ لیبارٹریاں قائم کی تھیں تاکہ اپنا ایک الگ چینل بنایا جا سکے اور اس کے تحت دنیا بھر پر اپنا اقتدار قائم کیا جا سکے۔ ان لیبارٹریوں میں ہونے والا کام بے مثال حیثیت کا حامل تھا۔ لیکن رازل جریری

کی روح نے وہ لیبارٹریاں تباہ کرنا شروع کر دیں اور اس طرح ہمیں کھربوں ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ہم کئی ملکوں کے مقروض ہو گئے اور اس سلسلے میں ہمیں شدید مالی خسارے برداشت کرنا پڑے۔ اس کے بعد ہمارے ذمے دار لوگوں نے کچھ اور دشمن دریافت کئے۔ اور اپنی ناقص پلاننگ سے رازل جریری کو اس کا جسم واپس کر دیا۔ جو ایک بہت بڑا کارنامہ تھا ہمارے لوگوں کا۔

رازل جریری نے بھرپور طریقے سے اپنی قوتوں کو جمع کر لیا اور اس کا دست راست وہ ایشیائی نوجوان تھا جسے آپ لوگوں نے اپنی گڈ بک میں چھلاوے کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ چھلاوا لمحوں کے اندر ہمارا نہیں، رازل جریری کا وفادار بن گیا اور اس کے بعد وہ لوگ یہاں سے چلے گئے۔ ہمارے اوپر لگنے والی آخری ضرب میلیکو میں ہمارے ایک سائنس دان کی موت اور اس کے پراجیکٹ کی تباہی ہے۔ ہمارا یہ منصوبہ اس قدر شاندار تھا اور اتنی اعلیٰ ترین توقعات کے ساتھ عمل میں لایا گیا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ہم دنیا کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول قائم کر سکتے تھے۔ نام میلیکو کا ہوتا۔ اور اگر کوئی بہت ہی بڑی طاقت ہمارے اس منصوبے کے خلاف کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو نقصان پلاسکو کا نہیں، میلیکو کا ہوتا۔ تمام تر شواہد اور معلومات سے پتہ چل گیا ہے کہ ہمارے اس پراجیکٹ کی تباہی رازل جریری کی کارروائیوں کا نتیجہ ہے اور میلیکو میں بیٹھ کر اس نے یہ سب کچھ کیا اور ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ میں ان لوگوں سے ان تمام باتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ صدر مملکت کی خواہش ہے۔ میں متعلقہ افراد سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سامنے آئیں اور اپنے بارے میں وضاحت کریں۔"

مشیر بیٹھ گیا تو ایک شخص نے جو بھاری بھرکم جسم اور اچھی شخصیت کا مالک تھا، کھڑے ہو کر کہا۔

"رازل جریری کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا تھا اس کا کچھ پس منظر تھا۔ ہم اسے بجلی کی کرسی پر ہلاک کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جس قدر باصلاحیت انسان تھا، ہماری خواہش تھی کہ ہم اسے اپنے آپ میں شامل کر لیں اور اسی لئے اس کا جسم وان کیسرو کے غاروں میں ڈلوا دیا گیا تھا۔ مگر افسوس ہم اس کی روح کو قابو میں نہ کر سکے۔"

"جو کام آپ نہیں کر سکے اس کے لئے آپ اپنے لئے کیا سزا تجویز کرتے ہیں؟" دوسرے مشیر نے کھڑے ہو کر کہا۔

"سزائیں خود نہیں تجویز کی جاتیں، دوسری طرف سے دی جاتی ہیں اور وہیں سے ان کی تکمیل کی جاتی ہے۔"

"مسٹر گیرٹ بیراٹ! آپ کا مجرم، براہِ کرم اسے اپنی تحویل میں لے لیجئے۔" اس بار صدر مملکت نے خود بگڑے ہوئے کرخت لہجے میں کہا تھا اور گیرٹ بیراٹ نے گردن ہلا دی تھی۔

"مسٹر جارج! آپ نے اطلاع دی تھی اور ایشیاء کے اس علاقے سے خاص طور سے شہباز نامی نوجوان کو یہاں تک پہنچایا تھا جس کی وجہ سے ہمیں یہ نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟"

"نہیں۔" جارج نے زیادہ بددماغی کرنا پسند نہیں کی تھی۔

"آپ کا دوسرا مجرم مسٹر گیرٹ بیراٹ!"

اور اس طرح چھ افراد گیرٹ بیراٹ کے حوالے کئے گئے۔ اور گیرٹ بیراٹ کا ریکارڈ تھا کہ جب کوئی اس کی تحویل میں پہنچ جاتا تھا تو پھر اس کا سراغ لگانا ناممکنات میں سے ہوتا تھا۔ اس کے عزیز واقارب اس کی لاش تک نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ چاہے وہ کتنے ہی بااثر ہوں۔

"مسٹر گیرٹ بیراٹ! آپ اپنے شکار لے کر یہاں سے جا سکتے ہیں۔ اب ہمارے دوسرے کام کا آغاز ہوگا۔"

ردوبدل ہوئی۔ چھ آدمی سر جھکائے موت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ ماحول میں پوری طرح سے سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے مواقع بہت کم آتے تھے جب کروڑوں ڈالر سے تیار کی ہوئی یہ کریم خود ضائع کر دی جاتی تھی۔ لیکن میلیکو میں جو سائنسی حادثہ ہوا تھا اسے برداشت کرنا حکومت پلاسکو کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ نتیجے میں یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

بہت دیر تک اس خوفناک واقعے کے اثرات یہاں موجود بقیہ افراد پر موجود رہے اور اس کے بعد فضا آہستہ آہستہ نارمل ہوتی چلی گئی کیونکہ اس کا نارمل ہونا بہت ضروری تھا۔

پھر ایک اور مشیر کی آواز ابھری۔

''ڈیپارٹمنٹ او، کے سپرد کچھ ذمے داریاں کی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں ڈیپارٹمنٹ او نے جو سفارشات پیش کی تھیں ان کی منظوری اسے دی جاتی ہے۔ ڈیپارٹمنٹ او، کے سربراہ مسٹر گان جیرل یہ کاغذات وصول کر لیں۔'' گان جیرل اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ دراز قد کا ایک شاطر سی شکل کا آدمی تھا۔ اس نے منظوری کے وہ کاغذات وصول کئے اور شکریہ ادا کر کے واپس پلٹا تو مشیر کی آواز ابھری۔

''مسٹر گان جیرل! صدرِ مملکت کی خواہش ہے کہ آپ اپنے منصوبے کی تفصیل اپنی زبان سے بیان کریں۔''

گان جیرل نے گردن خم کی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈائس تک پہنچ گیا۔ ڈائس پر پہنچ کر اس نے مائیک سیدھا کیا اور پُر وقار لہجے میں بولا۔

''صدرِ مملکت اور معزز ارکان!

ہم جس عظیم خسارے سے دوچار ہو چکے ہیں اس کی تفصیل ہر شخص کو معلوم ہے۔ چنانچہ میرا اس موضوع کو چھیڑنا ایک بالکل ہی بے موقع بات ہوگی۔ ہاں! یہ بات دوہرانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کی وجہ وہ خطرناک سائنس دان رازل جریری ہے۔ مجھے اس بات کا بھی انتہائی افسوس ہے کہ ہمارے اپنے آدمی ناقص اور غیر معیاری پلاننگ کر کے ایک عظیم الشان تباہی کا باعث بنے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے دنیا کے جن ممالک میں جنگ لڑی اور ایسی جنگ لڑی جو مثالی حیثیت رکھتی ہے ان میں بھی ہمیں اتنے عظیم جانی اور مالی نقصانات نہیں ہوئے جتنے رازل جریری سے محاذ آرائی میں اٹھانے پڑے ہیں۔ محترم صدر مملکت! ایسی باتیں آسانی سے نظر انداز نہیں کی جاتیں۔ جن لوگوں کو اس سلسلے میں سرزنش کی گئی وہ درحقیقت اسی قابل تھے۔ خیر حکومت کے معاملات حکومت ہی طے کرتی ہے اور یہ الفاظ میں خود ادا نہیں کر سکتا۔ میں ایک بار پھر اس بات کی نشاندہی کرتا ہوں کہ ہمیں جتنے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں ان کی تلافی خاص طور سے جانی نقصانات کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم دولت کی بارش کر دیں اور ایسے لوگوں کو اپنا ساتھی بنائیں جو

ہمارے لئے کام کر سکیں۔ جناب صدرِ مملکت! میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنی تجویز آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت پلاسکو کے تمام تر منصوبوں پر آخری ضرب میلیکو میں ہمارے مفادات کے نگراں اور ایک عظیم منصوبہ بندی کے حامل سائنسدان کی تباہی کی شکل میں پڑی اور ہمیں بد ترین نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ بہرحال اب میں بھی کوشش کر رہا ہوں۔ براہِ کرم تمام حضرات اس بات پر غور کر لیں۔ میں اپنے آپ کو عقل کی آخری منزل پر نہیں سمجھتا لیکن یہ ایک عمل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حکومت پلاسکو اس سلسلے میں کام کر رہی ہے۔ بلکہ اس کام کا آغاز ہی ہمارے کسی ایسے دشمن ملک سے ہو جو ہمیں تباہی سے دوچار کرنا چاہتا ہو۔ اور یہاں سے یہ آغاز ہو جائے تو ہمارے لئے بے حد فائدہ مند رہے گا۔ مثلاً میں نام لیتا ہوں زوگو لینڈ۔ زوگو لینڈ کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ ہمارے بدترین مخالفوں میں سے ہے۔ زوگو لینڈ میں ہمارے چھ ایسے ایجنٹ پہنچ جائیں جو ایک ایسے خاص منصوبے پر عمل کریں جو پلاسکو کا منصوبہ ہو۔ میری مراد کسی ایسے کردار سے ہے جیسے سر جن ڈی گاما۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے سر جن ڈی گاما کا نام بڑی شد و مد کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسا فارمولا تھا جو اس نے کسی بھیڑیئے میں چھپا رکھا تھا اور اپنے علاقے میں وہ بڑی خوفناک حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ دنیا کے کئی ملکوں کے ایجنٹ اس فارمولے کو حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگیاں کھو بیٹھے تھے اور اس کے بعد یہ سب کچھ بڑی خاموشی سے ختم کر دیا گیا اور یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ سر جن ڈی گاما کا کیا ہوا، یا وہ خطرناک فارمولا جو بہت سوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا کسی کو حاصل ہوا یا نہیں ہوا۔ حکومت پلاسکو چونکہ دوسرے معاملات میں الجھ گئی تھی اس لئے اس پر توجہ نہیں دی جا سکی۔ لیکن میرے ذہن میں وہ آج تک محفوظ ہے۔ کیونکہ اس سے متعلق جو شواہد ہمیں ملے تھے وہ بڑی حیثیت کے حامل تھے۔ جناب صدر! ہم اپنے چند ایجنٹوں کی قربانی دیں گے۔ یعنی زوگو لینڈ میں قتل و غارت گری ہوگی۔ اور اس کے بعد ایک بار پھر سر جن ڈی گاما کے فارمولے کی کہانی منظر عام پر آئے گی۔ ہم خفیہ ذرائع

سے کام لے کر اس کی ایسی پبلسٹی کریں گے کہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر رازل جریری اس طرف توجہ دے گا۔ ہم اپنے پانچ چھ افراد زوگولینڈ میں مروا دیں گے لیکن اس طرح ہم رازل جریری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور پھر ہمارا ایک پورا سیکشن اس کے پیچھے لگ جائے گا۔ اور اس طرح ہم اس پر قابو پا لیں گے۔ جناب والا! میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ مسٹر جارج نے جس شخص کا انتخاب کیا وہ بے شک اپنی مثال آپ تھا لیکن ایک بہت بڑی غلطی کی مسٹر جارج نے۔ انہیں اس بات کو مدنگاہ رکھنا چاہئے تھا کہ وہ شخص بھی ایشین ہے۔ اگر اس کا تعلق مغرب سے ہوتا تو لازمی بات ہے کہ وہ پلاسکو کے مفادات کا نگران ہوتا اور اس سے اتفاق کرتا۔ لیکن ایک مشرقی باشندے کو مشرق سے جو لگاؤ ہو سکتا ہے وہ مغرب سے نہیں ہو سکتا۔ یہ شخص رازل جریری کے ساتھ شامل ہوا اور آپ یہ سمجھ لیجئے کہ رازل جریری کی روح کو بدن مل گیا۔ یہ ایک سالم حقیقت بھی ہے اور ایک اشاراتی حقیقت بھی۔ کیونکہ وہ شخص رازل جریری کے لئے جس قدر کارآمد ثابت ہوا ہے وہ معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے مکمل اور ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ جناب والا! یہ میری منصوبہ بندی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اس پر ہوم ورک شروع کر دیا جائے اور اس بارے میں جان لڑا دی جائے۔"

صدر مملکت کے مشیر خاص نے کہا۔

"اس تجویز کو تحریری شکل دی جائے۔ اور اس کے بعد صدر کی منظوری کے لئے پیش کر دیا جائے۔ صدر اس پر پچاس فیصد آمادہ ہیں، باقی تفصیل کے بعد۔"

ان الفاظ کے ساتھ یہ میٹنگ ختم کر دی گئی۔

✡ ...... ✡

بعض اوقات بڑا ذہین سے ذہین آدمی جب اپنے اندر جھانکتا ہے تو بالکل بچہ لگتا ہے۔ رازل جریری جو انتہائی پراسرار قوتوں کا مالک تھا اور جس کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہی ہوتا تھا کہ اس کے اندر کون کون سی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ کبھی کبھی تو اس کے بارے میں غور کرتے ہوئے انسان یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ یقینی طور پر

کوئی درویش ہے، روحانی قوتوں کا مالک جسے سائنسی قوتیں بھی حاصل ہیں۔ اور وہ صرف انسانیت کی فلاح کے لئے کام کر رہا ہے۔ اور یہ سچ بھی تھا کہ ابھی تک اس کا کوئی ذاتی مقصد سامنے نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی تو شہباز جیسا لاابالی شخص بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ آخر رازل جریری کی زندگی کا پس منظر کیا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اس میں صرف انسانیت کی محبت ہی ہے یا پھر کچھ اور جذبے بھی۔ اس کے ماضی کے بارے میں ابھی تک کسی کو کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ حالانکہ وہ شہباز سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور شہباز کی ہر بات کو پوری اہمیت دیتا تھا۔ لیکن شہباز نے جب بھی کبھی اس کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کی، اس نے اس سے گریز کیا اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا۔

بہرحال اس وقت اس کی مجلس مشاورت میں صرف یہی دو آدمی تھے یعنی علی اصغر ہزاری اور شہباز جسے وہ اپنا جسم و جان کہا کرتا تھا اور عمل بھی اسی طرح کا کیا کرتا تھا۔ شہباز خاصے عرصے تک شبیلہ اور فیض شاہ کے پاس رہا تھا اور شبیلہ اور فیض شاہ نے اس سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔ فیض شاہ نے کہا۔

"شہباز! یہ حقیقت ہے کہ میں نے بھی اپنی زندگی سرکس میں گزاری اور سرکس کی زندگی بڑی ایڈونچرس ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس سے بھی اکتاہٹ ہو جاتی ہے۔ اور اب تو خیر یہ کھیل ہی ختم ہو گیا۔ ہم نے تو کبھی مغرب کی اس دنیا میں آنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن بیٹے! تم نے ہمارے یہ سارے خواب پورے کر دیئے۔ ہمیں وہ سب کچھ دکھا دیا جس کی آرزو کبھی کبھی خوابوں کی شکل میں ہمارے دل و دماغ میں آ جاتی تھی۔ لیکن اب باہر کی اس دنیا کو دیکھنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ ایک بار پھر اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ یہ بہت بڑا سچ ہے شہباز! کہ اپنی مٹی سے بڑا جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ مٹی آواز دیتی ہے۔ مٹی بذاتِ خود انسان کے وجود کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اور شاید فطری طور پر وہ اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ جہاں سے اس کا خمیر اٹھا وہیں اس کا اختتام ہو۔ بیٹا! اگر مناسب سمجھو تو ہمیں ہمارے وطن بھجوا دو۔ شبیلہ کی بھی یہی خواہش ہے۔ جس طرح تم یہاں عرصے عرصے کے بعد ہم سے ملتے ہو، وطن بھی واپس آ سکتے ہو۔ اپنے لوگوں کے درمیان جینے کو بڑا دل چاہتا ہے۔"

"آپ کہاں جانا چاہتے ہیں بابا فیض شاہ صاحب؟"

"کنٹری۔ تم نہیں جانتے کنٹری کیا بستی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے ماضی کے لوگ وہاں موجود ہوں گے۔ قدرت نے مجھے کچھ لمبی ہی زندگی دے دی ہے۔ لیکن پھر بھی وہاں اپنائیت ہے۔ اپنا ماحول ہے۔ اپنا دیس ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں رازل جریری سے بات کرلوں گا۔ تھوڑا سا وقت دے دیجئے مجھے۔"

رازل جریری نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

'ان کی خواہش فطری ہے۔ اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ذرا موجودہ حالات دیکھ لو، ایک عجیب وغریب منظر نامہ سامنے آیا ہے۔" رازل جریری نے وہ چند اخبار اٹھا کر سامنے رکھ دیئے جس میں قتل و غارت گری اور تباہی کی داستان تھی۔ میلیکو کے دارالحکومت یوکاس میں چھ افراد قتل ہوئے تھے اور ان سب کے پاس ایک خاص قسم کا نشان ملا تھا۔ کالا دائرہ اور اس کے گرد سرخ حاشیے۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ کالا دائرہ اور سرخ حاشیے سرجن ڈی گاما کا شناختی نشان تھے۔"

"سرجن ڈی گاما؟"

"ہاں...... اپنی نوعیت کا منفرد انسان۔ اس کا تعلق پینیسکو سے تھا اور یہ حکومت پینیسکو کا غدار تھا۔"

"غدار؟"

"ہاں...... وہ اپنے وطن پینیسکو میں آزادی کے لئے کوئی تحریک چلا رہا تھا۔ سائنٹسٹ تھا اور ایک ایسے فارمولے کا مالک تھا جس کے بارے میں دنیا کے کئی ممالک دعوے دار تھے۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ بہت ہی مضبوط اور ذہین شخصیت کا مالک تھا۔ بس میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں، یوں سمجھ لو میرے پسندیدہ افراد میں سے تھا اور اپنے مشن پر بڑی ہمت کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنا مسکن ریاست سلازیکا میں بنا رکھا تھا اور وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ سلازیکا میں ہی رہتا تھا۔"

"تھا سے آپ کی کیا مراد ہے رازل جریری؟" شہباز نے سوال کیا۔

"جو اطلاع اس کے بارے میں ہے وہ یہ ہے کہ سرجن ڈی گاما مر چکا ہے لیکن آزادی کی وہ تحریک زندہ ہے جو پینیسکو کے خلاف تھی اور جس کا بانی ڈی گاما تھا۔ بہرحال ان دنوں ڈی گاما کے اس فارمولے کے بارے میں بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ چھ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق مختلف جگہوں سے تھا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، سرجن ڈی گاما کے آدمیوں کی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں اور انہوں نے بدستور سلازیکا کو ہی اپنا مرکز بنا رکھا ہے۔ سلازیکا بہت قدیم علاقہ ہے۔ بہت ہی قدیم۔ یہاں ریت کی بہت سی داستانیں رقم ہوئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں اس کی تاریخ بتانا بے مقصد ہے۔ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"جی...... میں اس داستان سے آپ کا تعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" شہباز نے رازل جریری کی مشکل حل کر دی۔ دونوں اب ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ رازل جریری جب ایسی کوئی مقصد کی بات شہباز سے کہنا چاہتا جسے کہتے ہوئے اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ شہباز سے ضرورت سے زیادہ کام لے رہا ہے تو ان جملوں کو ادا کرتے ہوئے اس کا داہنا گال پھڑکنے لگتا تھا اور جب بھی اس کا داہنا گال پھڑکتا تھا، شہباز کو یہ احساس ہو جاتا تھا کہ رازل جریری اس سے اپنے مطلب کی کوئی بات کہنا چاہتا ہے۔ اس نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"سرجن ڈی گاما نے ایک سفید بھیڑیا پال رکھا تھا۔ وہ بھیڑیا ہر لمحے اس کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک ماہر سرجن تھا۔ اس نے اس بھیڑیئے کی گردن کا آپریشن کر کے وہاں ایک خفیہ جیب نما چیز بنا دی تھی جو بھیڑیئے کے لمبے لمبے بالوں میں چھپی ہوا کرتی تھی۔ کوئی اسے چھو کر اس لئے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ بھیڑیا بہت خوفناک تھا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، سرجن ڈی گاما اس خفیہ جیب کو اپنے خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے اس خفیہ جیب میں کوئی بہت ہی قیمتی شے محفوظ کر دی تھی۔"

"مسخرے پن کی بات نہیں ہے؟ بھیڑیا مر سکتا تھا، زخمی ہو سکتا تھا، بھاگ سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں تو مجھے صرف ایک کہانی معلوم ہوتی ہیں۔"

"دنیا کی ہر بات ایک کہانی ہی ہوتی ہے شہباز! ایک بات کو مدنظر رکھنا، جو لوگ ان

کہانیوں کو صرف کہانی سمجھتے ہیں، وہ جاہل اور دنیا سے ناواقف لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی کہانی کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ وہ اسے کہانی کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت ذہین سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ ان سے بڑا جاہل اس روئے زمین پر دوسرا کوئی نہیں ہوتا۔ ارے بابا! انسان تو انسان ہی ہے۔ جب کوئی بات ٹھوس شکل میں تمہارے سامنے آجاتی ہے، تم سر کھجا کر کہتے ہو کہ یار پتہ نہیں کیا ہوا۔ اور اگر وہی بات تم سے لفظوں میں کہہ دی جائے تو تم مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہو یا پھر بے تکلف ہوتے ہو تو مذاق اُڑا دیتے ہو۔"

"نہیں نہیں رازل جریری صاحب! میں مذاق نہیں اُڑا رہا۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن بہرحال ایسا ہے۔"

"تو پھر؟"

"اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرجن ڈی گاما مر چکا ہے۔"

"اور بھیڑیا؟"

"ہاں...... وہ بھیڑیا اس کی بیوی کے پاس ہے۔"

"اوہ...... اس کی بیوی کہاں رہتی ہے؟" شہباز نے سوال کیا۔

"وہیں سلازیکا میں۔"

"گویا یہ چھ افراد جن کی ہلاکت ہوئی ہے، ان معلومات کے حصول کے لئے سرگرداں تھے جو آپ نے مجھے فراہم کی ہیں۔"

"ہاں، بالکل۔ اور یہ بات طے ہے کہ سرجن ڈی گاما نے مرنے سے پہلے کچھ خفیہ کاغذات بھیڑیئے کی گردن میں چھپا دیئے تھے جو اب تک وہیں ہیں اور اس وقت دنیا کے زبردست ترین لوگ ان کاغذات کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"اور آپ کی یہ معلومات سرجن ڈی گاما کے بارے میں؟" شہباز نے سوال کیا۔

"ذاتی اور خفیہ ہیں۔ اتنی معلومات ابھی تک کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ خاص طور سے بھیڑیئے کے بارے میں جتنی مجھے حاصل ہے۔ چونکہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سرجن ڈی گاما سے میرا ایک تعلق رہ چکا ہے۔"

"دلچسپ بات ہے۔ اچھا ایک بات بتایئے رازل جریری! کہ کیا آپ اس سلسلے میں

کوئی قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں...... میں ان کاغذات کا حصول چاہتا ہوں۔ وہ فارمولا اس قدر خطرناک ہے کہ اس کا دوسرے لوگوں کے ہاتھ لگنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں اس سلسلے میں سارنیکا سے بات کر چکا ہوں۔"

"سارنیکا......؟" شہباز ایک بار پھر چونکا۔

"ہاں...... ڈی گاما کی بیوی۔"

"اوہو...... کیا اس سے بھی......"

"ظاہر ہے، شوہر سے میری دوستی تھی تو بیوی سے اتنے فاصلے کیسے ہو سکتے ہیں۔ میں نے اسے ایک اطلاع بھی دے دی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ تم اس کے پاس پہنچ رہے ہو۔ وہ بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"تو یہ کہئے نا کہ سارا معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔"

"نہ صرف سارنیکا کو اس بارے میں اطلاع دے دی گئی ہے بلکہ وہاں کے ایک خاص آدمی کو تمہارے بارے میں اطلاع دے دی گئی ہے۔ وہ تمہاری بھرپور مدد کرے گا۔ تمہیں اس سے رابطے کا طریقہ بتا دیا جائے گا۔ اب پہلے یہ بتاؤ کہ اس کام کا آغاز کرو گے یا پہلے اپنے والدین کو اپنے وطن پہنچاؤ گے؟"

"نہیں...... آپ آرام سے تیاریاں کر لیجئے۔ وہ لوگ اس قدر پریشان نہیں ہیں۔ پہلے میں اپنا کام مکمل کر لوں۔ گویا اب یہ طے ہوا کہ مجھے سارنیکا سے مل کر وہ کاغذات حاصل کرنے ہیں۔"

شہباز نے کہا اور رازل جریری نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

✿......✿

آخر کار جہاز کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد شہباز پینیسکو کے دارالحکومت تھاؤن کے ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ زندگی میں کبھی ان علاقوں کے بارے میں نقشے پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں آنے کا تو خیر تصور ہی مضحکہ خیز تھا۔ لیکن تقدیر کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا

سکتا۔ تقدیر نے کیا کیا فیصلے کئے ہیں، وہ بالکل ایک الگ بات ہوتی ہے۔ شہباز کو اب زندگی کے لاتعداد تجربات ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ہر طرح سے اپنے آپ کو چست و چالاک رکھے ہوئے تھا اور حقیقتوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا کر لی تھی اس نے۔ حالانکہ عمر اب بھی زیادہ نہیں تھی۔ دیکھنے والے اسے اس کے لباس اور حلیے سے کالج کا کوئی اسٹوڈنٹ ہی سمجھ سکتے تھے۔ اب یہ تو بعد ہی کی بات تھی کہ وہ اس کی شخصیت کے شناسا ہو جائیں۔

تھاؤن ایئر پورٹ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا لیکن جب وہ جدید ترین ایئر پورٹ کے لان میں پہنچا تو اسے ایک عجیب سی پراسرار کیفیت نظر آئی۔ فوجی جوان رائفلیں تانے مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ شہباز کی چھٹی حس نے اسے کچھ عجیب سا احساس دلایا اور اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ اچانک ہی بہت سی فوجی رائفلوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شہباز کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسا ہولناک استقبال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں کے اشارے پر اس نے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔ ایک فوجی نے آگے بڑھ کر اسے زور سے دھکا دیا اور دوسرے نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس چھین لیا۔

ایئر پورٹ پر موجود دوسرے مسافر سہمے ہوئے سے انداز میں ایک جگہ جمع ہو گئے۔ شہباز کو دھکے دے دے کر ایئر پورٹ سے باہر لایا گیا اور پھر وہ لوگ اسے ایک سمت لے گئے۔ ایک افسر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تلاشی لو اس کی۔'' اور وہ لوگ بڑی بے دردی سے شہباز کی تلاشی لینے لگے۔ اب یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ اس بار شہباز کو کچھ خاص ہتھیار وغیرہ بھی نہیں دیئے گئے تھے۔ البتہ یہ بتا دیا گیا تھا اسے کہ پینسکو میں اس کے تحفظ کے لئے معقول انتظامات کر دیئے گئے ہیں اور وہاں نہ صرف یہ کہ ڈی گاما کی بیوی سارینکا اس کا انتظار کر رہی ہے بلکہ رازل جریری کے متعین کردہ افراد بھی وہاں شہباز کو بھرپور تحفظ دیں گے۔

پھر یہ گڑبڑ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن لاتعداد باتیں کہاں سمجھ میں آتی ہیں۔ یہاں تک کہ تلاشی کے بعد اسے ایک جیپ میں بٹھایا گیا اور جیپ ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ شہباز پر سکتہ سا طاری تھا لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے برابر بیٹھے ہوئے فوجی افسر سے پوچھا۔

''جناب! میں ایک غیر ملکی ہوں اور سیاحت کے لئے یہاں آیا ہوں۔ کیا مجھے میری گرفتاری کی وجہ بتائی جا سکتی ہے؟''

''خاموش رہو...... بولنے کی اجازت نہیں ہے۔'' افسر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور شہباز خاموش ہو گیا۔ جیپ تقریباً دو گھنٹے تک ایک سنسان اور طویل سڑک پر دوڑتی رہی جس کے دونوں طرف تاریک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اور پھر اس کا سفر ختم ہو گیا۔ ایک بڑی سی عمارت کے صدر دروازے پر جیپ رک گئی تھی۔ یہ غالباً کوئی فوجی قید خانہ تھا۔ تجربے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اندازے کی بنیاد پر یہی کہا جا سکتا تھا۔ آخر کار وہ لوگ شہباز کو لے کر اندر عمارت میں چل پڑے اور یہاں شہباز کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ بہت سی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا گیا اور شہباز کو اندر دھکا دے دیا گیا تھا۔ بڑی عجیب صورتحال ہو گئی تھی۔ کوٹھڑی میں گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

شہباز نے بمشکل تمام اس کا اندازہ لگایا کہ دروازے کے علاوہ اس کوٹھڑی میں دو فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی ایک دیوار کھڑی تھی جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ بہرحال کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے اور یہ لوگ اس سے کیا چاہتے ہیں۔ یہ قید اسے بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس کا سامان بھی ان لوگوں کی تحویل میں تھا۔ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ سامان میں صرف اس کے کاغذات اور کپڑے وغیرہ ہیں، ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کی شخصیت کو مشکوک کر دے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایئر پورٹ پر اتنی زبردست تیاریوں سے آخر اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ کوئی دس گھنٹے اسے یہاں گزارنے پڑے اور اس کے بعد ایک میجر تین سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا اور اس نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ جس بڑے اور بیلٹ نما ہال میں اسے لایا گیا تھا اس کی صورتحال کا جائزہ شہباز نے باہر سے ہی لے لیا تھا۔ وہ بیرک گیٹ کے بالکل قریب تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اسے گیٹ نظر آ رہا تھا جہاں زبردست چوکی تھی۔ وہ ہال کافی بڑا تھا جہاں اسے لایا گیا اور جہاں چند فوجی افسران ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے شاید اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔

شہباز گہری سوچ میں تھا۔ ان لوگوں کا جو رویہ اس کے ساتھ تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی بڑی بات ہے اور یہ لوگ اسے آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔ اور پھر شہباز جیسا سیماب صفت انسان ایک بے مقصد قید میں رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب اس نے اپنے طور پر غور کرنا شروع کر دیا۔ ایک نگاہ ہال کا جائزہ لے کر اس نے اس کی پچویشن کو ذہن نشین کر لیا۔ ہال میں دیواروں پر جگہ جگہ تصویریں آویزاں تھیں اور تصویروں کے یہ فریم مضبوط کھونٹیوں سے جڑے ہوئے تھے۔ کچھ عجیب طرز کی تھیں یہ کھونٹیاں۔ دیوار سے کوئی چار چار انچ باہر نکلی ہوئی۔ اوپر روشن دان کھلے ہوئے تھے۔ شہباز کو اس گول میز کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور اسے لانے والے پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگے۔ ایک بلڈاگ قسم کے فوجی افسر نے اسے دیکھا اور کہا۔

"نام؟"

"شہباز۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"میلیکو سے۔"

فوجی افسر نے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر نگاہ ڈالی۔ یہ شہباز ہی کے کاغذات تھے۔

"پنیسکو میں آنے کا مقصد؟"

"سیاحت۔" شہباز نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی شناسا؟"

"کوئی نہیں۔"

"اب اصلیت بتا دو۔ یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

"ایک سوال میں آپ سے بھی کرنا چاہتا ہوں جناب! اگر اجازت ہو۔"

"بولو۔"

"مجھ پر کس طرح کا شک کیا جا رہا ہے؟"

"حکومت پلاسکو نے تمہارے بارے میں کچھ شواہد ہم تک پہنچائے ہیں۔ ہمیں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ تم یہاں کسی خاص مقصد سے داخل ہوئے ہو اور تم ایک خطرناک

آدمی ہو۔ جس کی تفصیل وہ لوگ ہمیں بہت جلد مہیا کر دیں گے۔ کچھ لوگ پلاسکو سے آ رہے ہیں جن کو تمہاری گرفتاری کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ وہ تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں جناب! کہ یہ سب کچھ غلط فہمی پر مبنی ہے اور میں ایک شریف آدمی ہوں، صرف ایک سیاح تو کیا میری دادرسی کی جائے گی؟"

"اس وقت تک کچھ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ پلاسکو کے نمائندے یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ ہم نے تمہیں ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہاں اگر تم یہاں مجھے اپنی آمد کی وجہ بتا دو اور اس میں کوئی ایسی بات ہو جس کا تعلق پنیسکو سے ہو تو پھر ہم تمہیں ضمانت دے سکتے ہیں اور حکومت پلاسکو کے حوالے نہیں کریں گے۔"

شہباز اب پوری طرح اپنے کام کے لئے تیار تھا۔ اس کا ورزشی اور پھرتیلا جسم اندر سے پھڑک رہا تھا۔ پچویشن کا وہ پوری طرح جائزہ لے رہا تھا۔ جس طرح سے یہ فوجی حکام یہاں اس ہال میں موجود تھے اس کے تحت دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے گارڈز کسی بھی طور گولی نہیں چلا سکتے تھے کیونکہ ان لوگوں کا نشانے پر آ جانا یقینی تھا۔ اس کے علاوہ وہ کھونٹیاں جن کا شہباز جائزہ لے چکا تھا، اس طرح تھیں کہ شہباز نے انہیں ایک، دو، تین، چار، پانچ تک نمبر دے دیئے تھے۔ یہ پانچ کھونٹیاں اسے روشندان تک پہنچانے میں معاون ہو سکتی تھیں۔ بس بھرپور جسمانی پھرتی اور مشقت کی ضرورت تھی۔

افسر اعلیٰ نے کہا۔

"ہاں...... کیا تم ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کرو گے؟"

"سو فیصدی جناب!" شہباز نے کہا اور پھر اچانک ہی وہ اس طرح اپنی جگہ سے اچھلا جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ وہ پھرتی سے اس میز پر چڑھا اور گارڈز نے رائفلیں سیدھی کر لیں۔ میز پر چڑھتے ہی اس نے چھلانگ لگائی اور ایک نمبر کی کھونٹی پر کھڑا ہو گیا۔ گارڈ نے ادھر کا نشانہ لیا تو اس نے وہ کھونٹی چھوڑ دی اور نمبر دو اور نمبر تین پر پہنچا۔ یہاں تک کہ ایک گارڈ نے فائر کر ہی دیا اور شہباز کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ خوش قسمتی سے میز پر بیٹھے ہوئے لوگ تو بچ گئے لیکن پیچھے کھڑا ہوا ایک دوسرا گارڈ اس گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اس دوران شہباز چوتھی اور پھر پانچویں کھونٹی پر پہنچا۔

لوگوں کے لئے تو یہ عمل ہی ساکت کر دینے والا تھا۔ ایک شخص دیواروں پر دوڑ رہا تھا۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں کھونٹی طے کر کے اچانک ہی اس نے روشن دان کی طرف چھلانگ لگائی اور پھر اس طرح روشن دان سے باہر نکل گیا جیسے مچھلی ہاتھوں سے پھسل جاتی ہے۔ باہر نکل کر وہ برق رفتاری سے بیرک کی چھت پر پہنچا۔ اندر موجود لوگ ابھی یہ فیصلہ کرنے بھی نہیں پائے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے کہ وہ بیرک کی چھت پر دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف چلا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر ایک ستون پر سے چھلانگ لگائی اور پھر اس کی خوش قسمتی نے اس کا ساتھ دیا۔ ایک بہت ہی قیمتی کار نیچے آ کر رکی تھی اور اس سے چند فوجی افسران نیچے اترے تھے۔ شہباز کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ کار کی ڈرائیور سیٹ پر ڈرائیور موجود تھا۔ فوجی افسر وہاں سے اتر کر ریسپشن کی جانب چلے تھے کہ شہباز نے ستون سے نیچے چھلانگ لگا دی اور اس کے بعد اس نے برق رفتاری سے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ ڈرائیور کچھ سوچ بھی نہ سکا، شہباز نے اسے اٹھا کر دور پھینک دیا اور پھر قیمتی کار ریورس میں دور تک چلی گئی۔ مداخلت کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ سب حیرت زدہ تھے اور کوئی سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ کوئی خاص قسم کی کارروائی ہو رہی ہے اور یہ موقع اس کے لئے کافی تھا۔

چنانچہ اس نے برق رفتاری سے آخری پوسٹ پر جا کر کار کا رخ تبدیل کیا۔ پوسٹ پر موجود سپاہی دیکھتے ہی رہ گئے اور انہوں نے صرف حیرت کرنے پر ہی اکتفا کی اور اس دوران شہباز کو دور نکل آنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران اسے اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ یہ فوجی چھاؤنی تھاؤن کے آخری سرے پر ہے اور یہاں سے جنگلوں کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جہاں باغیوں نے اپنے اڈے بنا رکھے تھے۔ اور یہ باغی سو فیصدی سرجن ڈی گاما کے ساتھی تھے۔ لیکن وہ کیا جانیں کہ شہباز کون ہے اور وہ یہاں پینسکو میں سارنیکا سے ملاقات کے لئے آیا ہے۔ سارنیکا بھی غالباً اس گوریلا کارروائی میں بھرپور طریقے سے حصہ لے رہی تھی اور ان جنگلوں میں سارنیکا کے گوریلے پھیلے ہوئے تھے۔

بہرحال دوسری جانب سے بھی کارروائی ہونے میں دیر نہ لگی۔ شہباز انجانے راستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا کہ اچانک ہی اسے فضا میں ایک جیٹ طیارے کی آواز سنائی دی۔ یہ

یارہ اس قدر نیچا آ رہا تھا کہ شہباز کو اندازہ ہو گیا کہ یقینی طور پر وہ اسی کے لئے آ رہا ہے۔ صورتحال اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ فوری طور پر اور تو کچھ نہیں ہو سکا لیکن فضا میں وریلوں کی نگرانی پر مامور اس لڑاکا طیارے کو شہباز کے فرار کی اطلاع دے دی گئی تھی۔

شہباز پوری طرح فارم میں تھا اور ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے کو تیار پا رہا تھا۔ جیٹ طیارہ کسی عقاب کی مانند اس کی کار پر جھپٹا۔ اس کے اطراف ٹی مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور کار سے دو فٹ آگے سڑک پر دھول نے لگی۔ کنکریٹ اور تارکول کے ننھے ننھے ذرات آ کر ونڈ شیلڈ سے ٹکرائے تھے۔ ہباز کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔ اور اچانک ہی اس نے قیمتی اور اندار کار کے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس ایک لمحے کے ٹھہراؤ نے اسے فائدہ ہنچایا تھا۔ مشین گن کی گولیاں اس کے پاس سے نکل گئی تھیں۔ اس نے جیٹ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ایکسیلیٹر پر سے پاؤں ہٹائے تھے اور اس طرح طیارے کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور اس کی جان بچ گئی تھی۔ پینسکو کے اس خطے میں گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ سڑک شکستہ اور ناقابل استعمال حد تک اُدھڑی ہوئی تھی۔ اس پر کاریں تو نہیں لتہ بیل گاڑیاں ضرور چل سکتی تھیں۔ شاید گدھوں اور گھوڑوں کو کوئی دقت پیش نہ آتی ہو۔ لیکن کار کے لئے یہ انتہائی مشکل جگہ تھی اور اس قدر قیمتی کار کو ایسی سڑک پر دوڑانا بھی کارِ دارت تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ وہ شہباز کی ملکیت نہیں تھی ورنہ شہباز کتنا ہی دل والا ہوتا، اس سڑک کے کنارے روک کر خود پیدل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ اتنی قیمتی کار کو اس طرح تباہ کرانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

دائیں جانب پہاڑی سلسلہ تھا اور بائیں جانب وہ گھنا اور دشوار گزار جنگل جس کے بارے میں شہباز کی معلومات یہ تھیں کہ یہاں حکومت کے بھیڑیئے شکاری کتوں کی طرح تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ بے شک یہ ساری کارروائی ڈی گاما کے گوریلوں کے لئے ہوئی تھی لیکن اس وقت شہباز ان کے نشانے پر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے مقامی حکومت نے اپنی پوری فوج اس جنگل میں اتار دی ہو۔ طیارے کی فائرنگ سے گھبرا کر وہ کار روکتا تو جنگل میں چھپے ہوئے گوریلوں کا نشانہ بن جاتا۔ اب وہ کیا جانے کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔

بہر حال کار آگے بڑھتی رہی اور آخر کار ایک ٹیلے کو طے کر کے دفعتہً نشیب میں پہنچ گئی۔ اونچائی سے اچانک نیچے جانے پر ایک تو ویسے ہی ایک دم وحشت ہوتی تھی، دوسرے یہ ہوا کہ کار میں سے کچھ آوازیں نکلنے لگیں۔ جس طرح اسے دوڑایا جا رہا تھا اگر وہ بالکل نئی اور خصوصی طور پر نہیں بنائی گئی ہوتی تو اس وقت اس کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے ہوتے۔ گہرائی میں اترتے ہوئے تو اس کے چند بونٹ ڈھیلے ہوئے تھے۔ یہی غنیمت تھا۔ ورنہ اصولی طور پر تو اس کے ہر حصے کو الگ الگ ہو جانا چاہئے تھا۔

جب طیارہ فضا میں ایک مختصر سا دائرہ بنا کر دوبارہ کار کی جانب بڑھ رہا تھا، اس کا پیکر یوں کہنا مناسب ہوگا کہ خونی پیکر بہت ہیبت ناک معلوم ہو رہا تھا۔ بڑی شدید جدوجہد ہو رہی تھی اور موت زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شہباز حیرت انگیز طور پر ایک انتہائی پھرتیلا اور زیرک نوجوان نہ ہوتا تو اس وقت اس کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہوتا۔ وہ اب بھی کار کو پوری رفتار سے چلا رہا تھا۔ پختہ سڑک کا تو کہیں نام و نشان نہیں تھا اور جس جگہ کار دوڑ رہی تھی وہ محض پگڈنڈی یا کچے راستے قسم کی کوئی چیز تھی۔ یہ تمیز کرنا بھی دشوار تھا کہ شہباز کا رخ کس طرف ہے۔

بہر حال زندگی بچانے کے لئے رخ کا تعین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی نقشے سے آشنا بھی ہوتا تو ان حالات میں نقشے پر سفر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ طیارے میں لگی مشین گن کی گولیاں تڑ تڑ چلنے لگیں اور ایک بار پھر صرف قدرت کی مدد سے ہی بچنا نصیب ہوا۔ لیکن کب تک۔ جیٹ طیارہ گرجتا ہوا کار کا پیچھا کر رہا تھا۔ کار بھلا جہاز کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کے بعد شہباز نے قرب و جوار کے موسم اور ماحول کا اندازہ لگایا۔ پہاڑوں سے آنے والی ہوائیں اتنی سرد تھیں کہ ان کی شدت سے دانت بجنے لگے۔ ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے جا رہے تھے۔ لیکن نگاہ رفتار بتانے والی سوئی پر تھی۔ پھر اچانک ہی کار کا اندرونی بلب شاید کسی جھٹکے سے علیحدہ ہو کر گر گیا اور کار کے اندر تاریکی پھیل گئی۔ جیٹ طیارے نے کسی عقاب کی طرح پھر غوطہ لگایا اور شہباز نے وہی پہلے والا عمل دوہرایا۔ یعنی اس نے طیارے کے غوطہ لگاتے ہی کار کے بریکوں پر دباؤ ڈال دیا۔ گاڑی کے پہیوں نے سخت آوازیں نکالیں اور اچانک ہی اس کا انجن بند ہو گیا۔ ایک بار پھر طیارے کے پروں سے آتشی لکیریں نکلیں اور کار کے اگلے حصے سے ٹکرائیں۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور دھوئیں کا

ایک کثیر مرغولہ بلند ہو گیا۔

شہباز کو ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ اس بار گولیاں ریڈی ایٹر میں پیوست ہوئی تھیں کیونکہ دوسرے لمحے اسے پانی کی سنسناہٹ بھی سنائی دی تھی۔ طیارہ ایک خوفناک گرج کے ساتھ شہباز کے سر پر سے گزرتا ہوا اب اوپر اٹھ رہا تھا۔ بے پناہ نزدیک ہونے کی وجہ سے شہباز نے اپنے چہرے پر گرم ہوا کے تھپیڑے بھی محسوس کئے تھے۔ اس کے اب تک زندہ بچ جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیرت انگیز طور پر حاضر دماغی کا ثبوت دے رہا تھا۔ لیکن کب تک۔ فضا میں اُڑتی ہوئی سیسے کی چھ انچ لمبی گولیاں کسی بھی لمحے اس کے بدن میں پیوست ہو سکتی تھیں۔ طیارے سے چلائی جانے والی گولیاں صرف انسانی جسم کا خاتمہ ہی نہیں کرتیں بلکہ اس کے چیتھڑے اُڑا دیتی ہیں۔

بہر حال آگے جا کر وہ راستہ مزید پُر پیچ اور دُشوار گزار ہو گیا تھا۔ کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا۔ ان راستوں پر گاڑی چلانا بس غیر انسانی عمل ہی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن جب بقاء کی جنگیں لڑی جاتی ہیں اور موت سے پنجہ کشی کی جاتی ہے تو پھر باقی چیزوں کا تصور ذہن سے دور ہو جاتا ہے۔ آگے جا کر بھی جنگل کے اندر ہونے کے باوجود ایک آدھ گولی آنے لگی تھی۔ اندھیرے میں مہیب درخت عجیب عجیب شکلیں بنا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی فائر ہوتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اندھیرے میں کسی جگنو نے حرکت کی ہو۔ ایک شعلہ سا کوندتا تھا اور پھر تاریکی چھا جاتی تھی۔ اب تو یہ تاریکی بھی نگاہوں کو اجنبی نہیں لگ رہی تھی۔

یہ رات کبھی نہ ختم ہونے والی پُر آشوب رات۔ اس بار جب طیارے نے غوطہ لگایا تو گولیاں ونڈ اسکرین تک آ گئیں۔ ونڈ اسکرین ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شیشے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بال پڑ گئے۔ ایک ہلکا سا جھٹکا انہیں ننھی ننھی کرچیوں میں تبدیل کر سکتا تھا۔ ایک گولی ڈیش بورڈ میں بھی پیوست ہوئی تھی اور وہاں سے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ اس دھوئیں میں تیل کی بو شامل تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ گاڑی اب آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔ اس کے دو اگلے پہیئے برسٹ ہو چکے تھے۔ گیس کی ٹینکی لیک کر رہی تھی اور سامنے والا ایکسل دائیں جانب مڑ گیا تھا۔

شہباز ابھی تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا لیکن ہلکی ہلکی خراشوں کا اسے بھی کوئی

اندازہ نہیں تھا۔ ویسے اچانک بریک لگانے سے بھی اس کا چہرہ ڈیش بورڈ سے ٹکرا جاتا اور آہنی کل پرزے اس کے رخساروں پر زخم کی لمبی اور گہری لکیریں چھوڑ جاتے۔ نجانے کتنے گھاؤ لگ چکے تھے اب تک۔ اس کا حساب لگانے کی فرصت کہاں تھی۔ جب موت تعاقب کرتی ہے تو چھوٹی موٹی چیزوں کا حساب کون رکھے۔

دفعتہً جنگل کی طرف سے کار پر پھر ایک برسٹ مارا گیا اور اس بار کوئی گولی گیس کے ٹینک پر جا لگی۔ دوسرے لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا اور شہباز اپنی سیٹ سے دو فٹ اونچا اچھل پڑا۔ گیس ٹینک میں آگ لگ گئی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس آگ نے پوری کار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک منٹ...... صرف ایک منٹ اور اگر وہ اپنی سیٹ پر موجود رہتا تو شاید روسٹ ہو جاتا۔ اس نے پھرتی سے دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سسکاری سی لے کر اسے چھوڑ دیا۔ ہینڈل انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو پیچھے کرتے ہوئے دروازے پر پوری قوت سے ایک لات رسید کی اور دروازہ اکھڑ کر دور جا گرا۔ شاید اس کے قبضے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دروازے میں لگا ہوا فریم جل گیا ہو اور دروازہ ڈھیلا ہو گیا ہو۔

بہر حال کچھ بھی تھا، شہباز نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور سیٹ سے چھلانگ لگا دی۔ خاردار جھاڑیوں نے اس کا پُرتکلف استقبال کیا اور ہاتھ پاؤں بری طرح چھل گئے تھے۔ چہرہ تو پہلے ہی زخمی ہو گیا تھا۔ بدن میں بھی آگ لگ گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے تلوار سے گھاؤ لگا دیئے ہوں۔ ان خاردار جھاڑیوں میں لڑھکتے ہوئے وہ دور تک چلا گیا۔ موت یہاں بھی آنکھ مچولی کھیلنے سے باز نہ آئی۔ اگر اس نے لڑھکتے ہوئے ان جھاڑیوں کو پکڑنے کی کوشش نہ کی ہوتی اور زمین پر جسم کو چپکا نہ لیا ہوتا تو یقینی طور پر وہ ایک گہری اور مہیب کھائی میں جا گرتا۔ گاڑی حقیقتاً اس نشیب سے اب صرف چند فٹ کے فاصلے پر رکی تھی۔

شہباز ان جھاڑیوں میں چوپاؤں کی طرح دبکا ہوا اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ ابھی اس کے سانس پوری طرح درست بھی نہیں ہو پائے تھے کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور اس بار کار کی ٹینکی کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔ ایک دھماکے سے گاڑی میں جنبش ہوئی اور وہ ایک جھٹکے سے اس مہیب نشیب میں جا پڑی۔ پے در پے دو تین دھماکے

بڑھے ہوئے اور سرخ سرخ شعلوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دیر تک اس کے چٹختے ہوئے کل پرزے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتے رہے تھے۔

شہباز نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ ماتھے سے ٹپکتا ہوا پسینہ اور گالوں سے ٹپکتا ہوا خون صاف کیا۔ مگر ابھی مکمل اطمینان کہاں سے حاصل ہو سکتا تھا۔ جیٹ طیارہ ابھی تک چکرا رہا تھا۔ وہ غالباً پوری طرح اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ جو قیدی گاڑی کو لے کر بھاگا ہے وہ زندہ تو نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کا آغاز ہوتا یعنی اس جنگل میں چھپے ہوئے خون آشام درندے جو اس ہنگامہ آرائی سے ناواقف نہیں ہوں گے اور یقیناً وہ یہ جاننا چاہیں گے کہ یہ کارروائی کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔

بہر حال شہباز اس وقت بڑی خطرناک پوزیشن میں تھا اور یہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ آگے کس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ سوچتا رہا۔ اور پھر اچانک ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ کمال کی بات تھی۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح کے حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ معلومات تو سب کچھ حاصل ہو گئی تھیں لیکن عملی طور پر وہ ابھی ایسے واقعات سے بہت دور تھا۔

ہوا کے دوش پر کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے ایک بار پھر اس کے اعصاب پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ جنگل میں چھپے ہوئے گوریلے تو ہو نہیں سکتے تھے۔ یقینی طور پر پینیسکو کے فوجی ہی ہیں۔ کاش کوئی ان کے کان میں کہہ سکتا، انہیں سمجھا سکتا کہ وہ تو پینیسکو کی بقاء کا ضامن ہے۔ وہ تو کچھ اور ہی کرنے آیا تھا۔ یہاں اسے دعوت دی گئی ہے۔ لیکن کون کسے سمجھاتا۔ البتہ ان لوگوں نے کمال کا انتظام کر رکھا تھا۔ غالباً اس وجہ سے کہ ڈی گاما کے گوریلے ان پر زندگی تنگ کئے ہوئے تھے اور وہ اپنی بقاء کے لئے ان گوریلوں کے خلاف ہر طرح کی کارروائی کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جیٹ طیارہ بھی فوراً ہی اس کے پیچھے لگ گیا۔ آہا...... یقیناً انہیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ فرار ہونے والے شخص کا تعلق ڈی گاما ہی سے ہے اور اندرونی طور پر اس کی مدد کی جا رہی ہے۔

یہ تمام خیالات اور احساسات شہباز کے ذہن سے گزرتے رہے۔ ادھر کتے بھونکتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ تعجب کی بات تھی کہ کتوں نے اس کی راہ کیسے پا لی تھی۔

بہر حال بہت سی باتیں تعجب کی ہوتی ہیں۔ لیکن فیصلہ تو وقت ہی کرتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے شہباز نے سوچا کہ ان کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگنا شروع کر دیا اور اب وہ یہ ڈھلان طے کر رہا تھا جہاں کار لڑھک کر گری تھی۔ کار کے شعلوں کی تمازت ابھی اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ لیکن وہ نظر آ رہے تھے۔ جانوروں کی طرح سے اس ڈھلان پر پھسلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ خودرو جھاڑیوں اور خاردار درختوں نے یہاں اپنے جال بُن رکھے تھے۔ مگر وہ خبیث قسم کے قد آور کتے جن کے ساتھ اب ٹارچوں کی روشنی کی گردش بھی نظر آ رہی تھی، اسی جانب بڑھ رہے تھے اور لازمی بات تھی کہ اگر ذرا بھی اپنی تحریک میں کمی پیدا کی جاتی تو وہ آن کی آن میں شہباز تک پہنچ سکتے تھے۔

ڈھلان در ڈھلان راستوں کو عبور کرتا ہوا وہ ایک جگہ رکا۔ سامنے ایک طویل چٹان حائل تھی اور راستہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اس چٹان کو عبور کرنا ہی ممکن نہیں تھا۔ اور پلٹ کر اسی راستے پر جانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کتوں سے اپنے آپ کو چندھی چندھی کرا دے۔

اس مسلسل بھاگ دوڑ سے سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور شہباز ان لمحات کو اپنی زندگی کے خطرناک ترین لمحات قرار دے چکا تھا۔ دفعتہً بادلوں سے چاند نے چہرہ اٹھایا اور پل بھر میں جنگل اور پہاڑ کا وہ حصہ منور ہو گیا۔ شہباز نے پھرتی سے اپنے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔ دور بائیں جانب قدرے نشیب میں محرابیں سی بنی ہوئی نظر آ رہی تھیں جن کا اوپری حصہ پھسلوان اور کوئی پانچ چھ انچ چوڑا تھا۔ اس کو طے کرنا تو بڑی بات تھی، اس پر قدم رکھنا بھی زندگی کی بازی لگا دینے کے مترادف تھا۔ لیکن شہباز کو بس یہی فوقیت حاصل تھی۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا بازی گر تھا اور اسی بازی گری نے اسے آزادی دلائی تھی۔ اگر اس بازی گری سے کام لیتے ہوئے اس جگہ کو عبور کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید کام بن سکتا ہے۔

لیکن سرکس میں کھیل دکھانا ایک الگ بات ہے۔ ایسی کوئی صورتحال اگر اپنے لئے پیش آ جائے تو پھر خودبخود صلاحیتیں کند ہونے لگتی ہیں۔ لیکن بہر حال پھر بھی وہ اس طرف دوڑنے لگا۔ جسم میں لگی ہوئی خراشیں ہلکی ہلکی تکلیف دے رہی تھیں مگر موت ان سب

سے زیادہ خوفناک تھی۔ اس لئے وہ بھاگتا ہی رہا۔ وہاں بھی جابجا درخت اور جھاڑیاں تھیں اور اوپر سے اچانک دیکھ لئے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ اس نے حتیٰ الامکان کوشش کی تھی کہ ان درختوں کی آڑ میں رہے۔ دفعتہً اس نے اپنے بے حد نزدیک قدموں کی چاپ سنی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شاید ان میں سے کوئی محافظ دوسرے راستے سے اتر آیا تھا۔ وہ پھرتی سے چوڑے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اس تنے سے اپنے آپ کو چپکا کر سانس روک لی تھی۔ آنے والے دو تھے اور ان کے ہاتھوں میں مشین گن دبی ہوئی تھی۔ ان کی رفتار بہت سست تھی اور وہ اس طرح اس جانب آ رہے تھے جیسے انہوں نے شہباز کو دیکھ لیا ہو۔

چاند دوبارہ بادلوں میں جا چکا تھا اور اب وہاں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسی طرف آ رہے تھے مگر اس میں کسی طے شدہ منصوبے کا دخل تلاش کرنے کی ضرورت تھی اور اندازہ یہ ہوا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ ان کی حرکت سو فیصدی لاشعوری ہے اور وہ بالکل اتفاقیہ طور پر اندھیرے میں اس طرف چلتے ہوئے آ گئے ہیں۔ مگر وہ انتہائی چالاک آدمی معلوم ہوتے تھے کیونکہ کچھ لمحوں کے بعد رکتے، ٹھٹک کر آس پاس کی سن گن لیتے۔ اب یہ اندازہ صحیح طور پر کرنا مشکل تھا کہ درخت کی طرف سیدھ باندھ کر آنے کا مقصد کیا تھا۔

لیکن بہر حال جیسے ہی آگے والا پستہ قد آدمی اس درخت کے پاس آیا، شہباز نے بجلی کی تیزی سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ پاؤں مار سکتا، شہباز نے اس کی گردن میں نرخرے کے مقام پر دونوں انگوٹھے جما دیئے۔

بہر حال وہ ایک انتہائی نوجوان اور طاقتور آدمی تھا۔ کبھی کبھی انسان کو ایسے حالات میں اپنی قوتوں کا خود اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سیکنڈوں کی بات تھی وہ شخص حلق سے عجیب غرغراہٹ کی آواز نکال کر ٹھنڈا ہو گیا لیکن اس کے ساتھی نے آواز سنتے ہی پھرتی سے اپنی مشین گن سیدھی کی۔ وہ درخت پر فائر کرنا ہی چاہتا تھا کہ شہباز کے اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے پستہ قامت کو اس پر کھینچ مارا اور وہ اڑتا ہوا اپنے ساتھی پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا مشین گن والا سنبھلتا شہباز نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت اس کے اندر شدید وحشت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اسے رگیدتے ہوئے اس کا چہرہ زمین پر دبا

دیا۔ پھر اس کے بال پکڑ کر اتنی زور زور سے زمین پر ٹکریں ماریں کہ شاید اس کے سارے نقوش ہی اس کے چہرے سے غائب ہوگئے۔ یہ ایک انتہائی وحشیانہ عمل تھا۔ سرکس پر کام کرنے والا یہ نوجوان بے شک انتہائی جیالا تھا۔ خوف اس کے قریب سے نہیں گزرتا تھا لیکن انسانی زندگیوں سے کھیلنا اس کی فطرت کا حصہ نہیں تھا۔ خطرات میں یہ تبدیلی جس طرح کے حالات پیدا کردیتے ہیں۔ اس وقت وہ انہی حالات میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے شکار کے کمر کے حصے سے ٹکرایا اور اچانک ہی اسے خنجر کا دستہ اپنے ہاتھ کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے خنجر کھینچ لیا اور پھر انتہائی وحشیانہ انداز میں اس نے اپنے شکار کے جسم کے مختلف حصوں پر شگاف ڈال دیئے۔ وہ اپنے مردہ ساتھی اور مشین گن سے اتنا الجھ گیا تھا کہ اسے کسی چیز کی خبر نہیں رہی تھی۔

بہر حال اس کا یہ دوسرا شکار ابھی چیخ مار کر زمین پر آ رہا۔ شہباز نے اس کی موت کے آخری لمحات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن پر ایک عجیب سا تاثر پیدا ہوا لیکن پھر اس نے وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ اگر وہ چاہتا تو اس وقت ایک مشین گن اس کے ہاتھ آسکتی تھی لیکن یہ اس کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس بھاری گن کو لے کر بھاگنا مذاق نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اسے اٹھانے کا ارادہ ترک کردیا۔ اب اس کے بعد ضروری تھا کہ وہ یہاں سے دور نکل جائے۔

چنانچہ ہرن کی طرح چوکیاں بھرتا ہوا وہ اس بے ہنگم دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ جس کے ایک طرف پانی اور دوسری طرف کھائی تھی۔ اس پر قدم جما کر چلنا بہت ہی مشکل کام تھا ابھی اس نے دو چار ہی قدم طے کیے ہوں گے کہ پاؤں پھسلا اور چودہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ بے اختیار قلابازی کھا کر نیچے گرا تھا لیکن ایک لمحے کے اندر اندر اس کے ذہن نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ اگر وہ گہرائی میں زیادہ دور تک چلا گیا تو اس کے بعد زندگی کا تصور بھی مشکل ہو جائے گا اور یہاں ایک مخصوص فن اس کے کام آیا۔ یہ اس کی اپنی اختراع تھی۔ فضا میں کوئی دس بارہ گز نیچے گرنے کے بعد واپس پلٹنا ایک ناممکن بات تصور کی جاتی تھی۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر لنگوروں میں ایک قوت ہوتی ہے کہ وہ چھلانگ لگاتے ہیں اور اگر ان کا ٹارگٹ بہتر نہیں ہوتا تو درمیان سے اوپر کی سمت پلٹ پڑتے ہیں لیکن کسی انسان کے لیے یہ کام ناممکن ہوتا اور پھر خاص طور سے گہرائیوں سے اوپر کی

سمت جانا لیکن اس وقت کوئی دیکھنے والا موجود نہیں تھا۔ اگر دیکھتا تو شدت حیرت سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جاتیں۔ کیونکہ اتنی گہرائی میں گرنے کے بعد وہاں سے پلٹنا آسان کام نہیں تھا لیکن شہباز نے یہ ناممکن کام کر دکھایا تھا۔

دوسرے لمحے وہ پھرتی سے اوپر پہنچا جس جگہ وہ پہنچا اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں دیوار کچھ چوڑی تھی۔ اس نے دیوار میں انگلیاں گاڑھیں اور اپنے بدن کو دیوار پر اوندھا لٹا لیا۔ بڑا سنگین عمل تھا یہ اور حقیقت ہے کہ موت کی ہوائیں اسے چھو کر گزر رہی تھی۔ پھر اچانک ہی چاند بادلوں کی اوٹ سے نمودار ہوگیا۔ جنگل اور آس پاس کی تمام چیزیں پھر سے منور ہوگئیں اور عین اسی وقت ڈھلان کے ابتدائی سرے پر فوجیوں کی ٹوپیاں دکھائی دیں۔ وہ سب مشین گنوں سے مسلح تھے اور خون آشام درندوں کی مانند اس ڈھلان میں جھانک رہے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے شہباز کو دیکھ لیا۔ دوسرے لمحے اس کی چیخ ابھری اور اس نے اپنے ساتھیوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی۔

سب کے حلق سے آوازیں نکلی تھی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مشین گنوں کے رخ شہباز کی طرف کردیئے۔ مشین گنوں سے گولیاں برسنے لگیں۔ اس کے ساتھ پے درپے کئی دستی بم بھی دیوار کے قریب آ کر پھٹے تھے۔ شہباز اس وقت اپنی زندگی کے بد ترین لمحات سے دوچار تھا۔ اگر اس نے اس وقت برق رفتاری سے دیوار کو چھوڑتے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ نہ لے لی ہوتی تو شاید اس مقام پر اس کی چندھیاں بکھر جاتیں۔ وہاں گولیاں شدت سے برس رہی تھیں اور فضا میں بارود کی بو پھیل گئی تھی۔ شاید قدرت ہی کو رحم آ گیا۔ چاند دوبارہ بادلوں کی آڑ میں ہوگیا اور وہاں تاریکی پھیل گئی جو شہباز کی زندگی کی ضامن بن سکتی تھی۔ اس نے فوری طور پر اپنے آپ کو ان پتھروں سے اٹھانے کی کوشش نہیں کی اس اندیشے کے پیش نظر کہ چاند دوبارہ بادلوں کی اوٹ سے نہ نکل آئے اور وہ ان محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جائے۔

پھر غیر متوقع طور پر ایک محافظ اس دیوار کے ابتدائی سرے تک پہنچ گیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ شہباز سانس روکے اس پتھر پر پڑا رہا۔ وہ شہباز کو دیکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسے اس طرح پتھر پر پڑا دیکھ کر اس کے ذہن میں نجانے کیا خیال آیا۔ اس نے اپنی مشین گن سیدھی کی اور دیوار پر قدم جماتا ہوا شہباز کی طرف بڑھا۔ ابتدائی حصہ بے حد
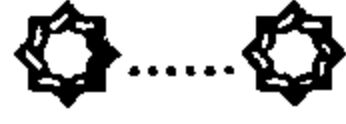
پتلا اور پھسلوان تھا۔ اس لئے فوجی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ پھر بھاری مشین گن کی وجہ سے وہ اپنا توازن بھی بمشکل سنبھال پا رہا تھا۔ لیکن بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح کھسکتا ہی رہا اور چیونٹی جیسی چال چلتا ہوا شہباز کے قریب آتا رہا۔ شہباز دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ایک خفیف سی حرکت بھی اسے ہوشیار کر سکتی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ شہباز سے دو قدم کے فاصلے پر رُکا، شہباز نے وہ خنجر لہرا کر ٹھیک اس کے دل کے مقام پر مارا جو اس نے ایک محافظ کی پیٹی سے حاصل کیا تھا۔ خنجر کا پھل پسلیوں کو کاٹتا ہوا اس کے سینے میں غائب ہو گیا۔ فوجی کے حلق سے ایک کربناک آواز نکلی اور وہ لڑکھڑا کر دیوار پر اور پھر گہری کھائی میں جا گرا۔ اس کی طویل اور کربناک چیخ اس کھائی میں دیر تک گونجتی رہی تھی۔

پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ شاید کسی چٹان سے ٹکرا کر وہ زندگی سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ شہباز نے ایک گہری سانس لی اور پھر اس پتلی سی دیوار پر قدم قدم جما کر چلنے لگا۔ اتنی دیر میں اسے تھوڑی سی مہارت ہو گئی تھی۔ اور پھر اس کا بدن اس سلسلے میں بڑا ہی کارآمد تھا۔ کسی بھی چیز پر پاؤں جما کر وہ اپنے پیروں کو اپنے بدن کے وزن سے بے نیاز کر سکتا تھا۔ اور یہ سرکس میں کام کرنے والوں کا ابتدائی عمل ہوتا ہے۔ اور سب سے پہلے انہیں اسی کی تربیت دی جاتی ہے کہ پتلے سے رسے یا باریک سے تار پر اپنے قدم جماؤ تو اپنے جسم کو اس طرح ان پیروں سے الگ کر لو کہ وہ پیر اس کے بدن سے کسی مشکل کا شکار نہ ہوں۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہوتا ہے لیکن بہرحال کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ہر وقت تقدیر ساتھ نہیں دیتی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں جا کر جہاں ان لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بن گیا تھا جو شہباز کی تاک میں تھے تو شہباز کو بھی آگے کا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت وہ جس پتھر پر چڑھا وہ شاید الگ ہی سے رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا۔ شہباز نے قوت لگا کر اپنے جسم کو اٹھانا چاہا تو اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلا۔ وہ پتھر اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور شہباز ایک پُرشور آواز کے ساتھ نیچے گرنے لگا۔ اب اس وقت اس نے اپنی اس مہارت سے کام لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور چند لمحوں کے بعد وہ چھپاک کی ایک آواز کے ساتھ پانی میں گرا۔

نیچے...... اور نیچے...... اور ہی نیچے...... وہ کافی دور تک گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ کیونکہ

بلندی سے گرا تھا۔ شاید وہ تہہ تک بیٹھتا چلا گیا تھا۔ پھر پانی نے اسے اُچھالا اور وہ تیر کی طرح اوپر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی کوشش کی لیکن نجانے اعصاب اس قدر ساتھ کیوں چھوڑ چکے تھے۔ منہ زور لہریں اسے بے بس کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور وہ ہوش و حواس سے عاری ہو کر تنکے کی طرح ان میں بہنے لگا......!

پھر نجانے کب ہوش آیا تھا۔ اور یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہا ہے۔ ہوش میں آنے پر اس نے آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں۔ جسم سرتا پا انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور پورے بدن کو ٹوٹے ٹوٹے پن کا احساس ہو رہا تھا۔

بہر حال ہوش وحواس آہستہ آہستہ واپس آتے گئے۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلائے تو اس کو اپنے آپ کو ایک لکڑی پر ہونے کا احساس ہوا۔ غالباً یہ مسہری یا تخت تھا۔ ایک لمحے تک وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ حواس تو پوری طرح جاگ چکے تھے اور سب سے پہلے ظاہر ہے یہی سوال ذہن میں پیدا ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اسے ماضی یاد آ رہا تھا۔ وہ کار، اطراف میں چلتی ہوئی گولیاں، فضا میں نظر آنے والی چمکدار لکیریں اور پھر پانی...... وہ پانی میں گرا تھا۔ لیکن اب میں کہاں ہوں؟ ......اور پھر ایک لمحے کے اندر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں۔ کوئی اس کے قریب موجود ہے۔ دو نرم و نازک ہاتھ اس کے بالوں بھرے سینے پر گدگدی کر رہے تھے۔ ان ہاتھوں کی پسینے میں ڈوبی ہوئی حدت شہباز کے جسم کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے ایک دم چونک کر اپنے جسم کو ان ہاتھوں سے دور کرنے کی کوشش کی تو دفعتہً ہی ایک نسوانی سرگوشی سنائی دی۔

"نہیں...... خاموشی سے لیٹے رہو۔ تم غلط جگہ نہیں ہو۔" نسوانی آواز میں ایک عجیب سی لرزش تھی۔ پھر تھوڑے فاصلے پر ایک بھاری آواز نے کہا۔

"کیا اسے ہوش آ گیا وینا؟"

"وہ...... وہ......" نسوانی آواز جسے وینا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، اپنی لرزشوں پر قابو پانے لگی اور شہباز کی آنکھیں کھل گئیں۔ تب اس نے اس خوبرو دلکش لڑکی کو دیکھا جو اس پر جھکی ہوئی تھی اور جس کے ہاتھوں کی نرماہٹ اس کے بدن میں گدگدیاں پیدا کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ وسفید اور آنکھیں بے حد کشادہ تھیں۔ بہت ہی خوبصورت لباس میں ملبوس

تھی۔ مرد کی آواز پر اس نے گردن گھما کر مرد کو دیکھا اور بولی۔

"ہاں...... اسے ہوش آ گیا ہے۔"

"تو پھر جاؤ۔ اس کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔"

شہباز کی نگاہیں لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ مرد کے اس حکم پر جیسے لڑکی کو ایک ناگواری کا احساس ہوا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی چل پڑی۔ شہباز کی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ چھوٹا سا قد، پتلی کمر، بھاری کولہے، چال میں بے پناہ کشش تھی۔ دو تین دفعہ اس نے مڑ مڑ کر شہباز کو دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔ اتنی دیر میں وہ مرد قریب آ گیا تھا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"کیا وہ ہوش میں آ گیا؟"

"ہاں۔" مرد نے جواب دیا۔

"کیا وقت ہو گیا؟"

"چار بج رہے ہیں۔"

شہباز کی نگاہیں قرب وجوار میں بھٹکنے لگیں۔ غالباً یہ کسی کسان کا گھر تھا۔ تخت سے کچھ فاصلے پر ایک آتش دان تھا جس کے قریب تندرست و توانا عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بھورے اور چھوٹے چھوٹے تھے جنہیں اس نے پیچھے لے جا کر سختی سے باندھ رکھا تھا۔ غالباً یہی عورت تھی جو ابھی ابھی داخل ہوئی تھی۔ مرد نے کہا۔

"آؤ...... اسے دوسرے بستر پر منتقل کر دیں۔ اچھا خاصا زخمی جسم ہے۔"

ان لوگوں نے شہباز کو ایک آرام دہ گدے پر لٹا کر اپنا کمبل لپیٹ دیا۔ شہباز کے گیلے کپڑے آتش دان کے قریب لٹک رہے تھے اور ایک لمحے میں اسے احساس ہوا کہ اس وقت وہ بے لباس ہے۔ اُسے اس خوبصورت لڑکی کے ہاتھوں کی گردش یاد آئی جو اس کے قریب بیٹھی ہوئی غالباً اس کے زخموں کا جائزہ لے رہی تھی یا پھر اپنے زخموں کا جائزہ لے رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی طاری رہی اور شہباز بوجھل پلکیں جھپکاتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا اور وینا اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے ایک اور دراز قامت آدمی تھا۔ آتش دان میں دہکنے والے شعلوں کی چمک اس کے گالوں پر منعکس ہوئی تو اس کی سرخی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں روشن اور چمکدار تھیں اور اس میں زندگی کی حرارت تھی۔

گھنی مونچھوں میں اس کا دہانہ چھپ گیا تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا شہباز کے پاس پہنچا اور اسے دیکھنے لگا۔

شہباز کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اس کے محسن ہیں اور انہوں نے ہی اس کی جان بچائی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تو مرد نے کہا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟ بہت عرصے تک تم بے ہوش رہے ہو۔''

''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو دوست؟'' دوسرے مرد نے کہا۔

''آپ ذرا پیچھے ہٹیں، میں بات کرتی ہوں۔'' وینا بولی اور شہباز کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور شہباز کو اس کی آنکھیں بہت خوبصورت لگیں۔ وہ بولا۔

''کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ میں کہاں ہوں؟''

''تم اس وقت لی آن میں ہو۔ اور یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر دریا ہے جس میں بہہ کر تم یہاں تک پہنچے ہو۔'' شہباز کو یہ اطلاع پا کر خوشی ہوئی تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ وہ اس علاقے میں موجود تھا جہاں اسے اپنا مشن سرانجام دینا تھا۔ اس نے کہا۔

''کیا لی آن چھوٹا سا گاؤں ہے؟''

''بہت چھوٹا۔'' بوڑھے کسان نے منہ بنا کر جواب دیا اور پھر عجیب سے انداز میں بولا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ کچھ دن کے بعد یہ اور چھوٹا ہو جائے گا۔''

''تھاؤن سے اس کا فاصلہ کتنا ہے؟''

''تقریباً تیس کلومیٹر۔ ہم ریجن اور ہیگ کے بیچ میں ہیں۔ اس علاقے سے سڑک مڑ کر ریجن جاتی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلازیکا یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔''

''سلازیکا......'' سب کے منہ سے بیک وقت آوازیں نکلی تھیں۔ لمبے چوڑے قد و قامت اور مونچھوں والے شخص کے چہرے پر بھی شکنیں نظر آئیں۔ اس نے نروس انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بولا۔

''کیا ہم لوگ ایک زخمی سے ضرورت سے زیادہ باتیں نہیں کر رہے؟ ہم نے بہت

زیادہ باتیں کر لی ہیں۔''

''ہاں...... اسے زیادہ پریشان نہ کرو۔ یہ لو، میں اس کے لئے یہ لے آئی ہوں۔'' اس نے ایک مگ شہباز کی جانب بڑھا دیا۔ شہباز نے کہنیوں کے بل اپنے جسم کو اٹھایا، تکیے سے ٹیک لگا لی۔ مگ میں سوپ تھا۔ عورت نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا جملہ دہرایا۔

''اور ہمیں بہت زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ سب کے لئے نقصان دہ ہوں گی۔''

''کیا تم سب سے زیادہ بک بک نہیں کر رہیں؟'' مونچھوں والا شخص جھلا کر بولا، پھر شہباز کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔

''تم یہاں صرف شام تک آرام کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہیں یہ جگہ چھوڑنا ہو گی۔ معافی چاہتا ہوں تم سے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری حالت درست نہیں ہے مگر مجبوری ہے۔ میں اس سے زیادہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔'' اس نے بے بسی سے شانے ہلائے۔ شہباز نے مگ سے ایک چھوٹا سا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں جناب!''

سوپ بہت شاندار تھا۔ اس کے پہلے ہی گھونٹ نے شہباز کی ساری پریشانی دور کر دی تھی اور اسے اپنے جسم کی توانائی بحال ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''لیکن پپا! یہ تو بہت کمزور ہے۔ آپ نے اس کے زخموں کو نہیں دیکھا۔ ابھی اس کا جانا کسی طرح مناسب نہیں ہو گا۔'' وینا کے ان الفاظ پر ایک بار پھر شہباز نے چونک کر اسے دیکھا تھا لیکن مرد کی آواز ابھری۔

''سوری...... میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ۔'' شہباز ہاتھ اٹھا کر بولا اور وہ سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ''میں جانتا ہوں کہ مجھے پناہ دے کر آپ لوگ مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔ میں یقیناً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ نے میری زندگی بچائی ہے، اس کے لئے میں آپ کا بے حد احسان مانتا ہوں۔''

''اگر کچھ وقت پہلے تم ہمارے پاس آئے ہوتے تو ہم تمہیں پناہ دے سکتے تھے۔'' بوڑھے کسان نے کہا۔ ''مگر آج کل حالات......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"ہاں...... حالات واقعی بہت خراب ہیں۔" وینا بار بار مداخلت کر رہی تھی۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنے والا کل ہمارے لئے منحوس ثابت ہو اور...... اور...... لی آن کا وجود ہی نہ رہے۔"

شہباز نے ایک بار پھر چونک کر انہیں دیکھا لیکن کچھ نہ بولا اور خاموشی سے سوپ پیتا رہا۔ پھر اس نے مگ خالی کر کے ایک طرف رکھا اور کہنے لگا۔

"ویسے مجھے حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ لیکن کیا میں تم سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ اس علاقے میں کیا ہو رہا ہے؟ آپ لوگوں کو کیا پریشانی ہے؟"

بوڑھا کسان دراصل زیادہ جذباتی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا۔ "لعنت بھیجو ان کتے کے بچوں پر جو ہماری جان کے دشمن بن گئے ہیں۔ لیکن اجنبی دوست! تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ہماری جنگ ہے۔"

"جنگ ہرگز نہیں......" عورت کرخت آواز میں بولی اور پھر کہنے لگی۔ "تم سب بیوقوف ہو...... جنگ تو ختم ہو چکی ہے۔"

"کیسی جنگ؟" شہباز نے حیرت سے کہا۔ "مجھے بھی تو اس بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"نہیں...... ہر بات کا جاننا ضروری نہیں ہوتا دوست! تم جن حالات میں ہمیں ملے ہو، ہم تمہارے لئے جو کچھ کر سکتے تھے، بس اتنا ہی کر سکے ہیں۔"

"لیکن اس کے باوجود میں آپ سے ایک سوال اور کروں گا محترم! آپ یہ بتائیے کہ لی آن پر کیا تباہی آنے والی ہے؟ اور ایک بات میں آپ کو اور بتا دوں، اگر آپ نے مجھے یہ نہ بتایا تو میں اس جگہ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو تم۔ یہ اندازہ لگانے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی ہے کہ تم...... تم ان کے دشمن ہو اور تمہیں یہاں پناہ دینے والا مصیبت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس گاؤں کے ساتھ دریا لگ کر بہتا ہے اور یہاں کی زمینیں بڑی زرخیز ہیں اور پینیسکو کی حکومت اس جگہ کو بہت عرصے سے لالچ بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ خاص طور سے فوجی حکام۔ وہ یہاں اپنا کیمپ بنانا چاہتے ہیں۔"

"مزید کچھ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں...... تمہارا دماغ خراب ہے؟ پینیسکو کے حالات تمہارے علم میں نہیں

ہیں۔ یہاں کی آبادی میں پچاس فیصد لوگ ہم تھے اور انہیں ہمارا یہ تسلط پسند نہ آیا۔ کیا سمجھے؟ وہ ہمیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ یہاں مکمل طور پر اپنا تسلط چاہتے ہیں۔ وہ اطراف میں رہنے والوں کو بھگانے کے لئے سختیاں کر رہے ہیں۔"

شہباز نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"تو تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"ارے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ پدی نہ پدی کا شوربہ۔ وہ ہمیں یہاں سے طاقت کے زور سے نکال دیں گے اور ہماری سرسبز و شاداب زمینیں ان کے قبضے میں چلی جائیں گی اور اس کے بعد...... اس کے بعد لازمی بات ہے کہ ہماری موت واقع ہو جائے گی۔"

"اوہ...... واقعی مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے یہاں پہنچانے والا کون ہے؟"

"بس لی آن کے ایک آدمی نے تمہیں دریا میں بہتا دیکھ لیا تھا۔ اس نے تمہیں بچایا اور ہم تمہیں یہاں لے آئے۔ لیکن ہمیں کچھ اور ہی خبریں ملی ہیں۔"

"خبریں......؟" شہباز چونک کر بولا۔

"ہاں۔"

"کیا خبریں؟"

"ہمیں پتہ چلا ہے کہ پینیسکو کے فوجی تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور تم جانتے ہو کہ اگر تم یہاں سے برآمد ہو گئے تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم سب موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تم لوگ میرا انتظار کرنا۔ میں تم سب لوگوں کو اس علاقے سے نکال لے جاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" شہباز اکیلا تھا اور یہاں کئی افراد موجود تھے۔ لیکن شہباز کو یوں لگا جیسے اس کے ان الفاظ پر ان کے چہرے کھل اٹھے ہوں۔

شہباز ان لوگوں کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا۔ یہ اپنے ماحول سے بیزار معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ حکومت کے موقف کے حامی تھے یا پھر ڈی گاما کے مشن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ڈی گاما جو اب اس دنیا میں نہیں تھا اور یہ تحریک شاید اس کی بیوی سارینا ہی چلا رہی تھی۔

بہر حال شہباز کو تو صرف ایک چیز سے دلچسپی تھی، وہ یہ کہ سرجن ڈی گاما کے پالے ہوئے بھیڑیئے کی گردن سے وہ دستاویز حاصل کی جائے جس کی رازل جریری کو ضرورت

ہے اور جس کے لئے رازل جریری نے یہ مشن اس کے سپرد کیا ہے۔ ویسے یہ انتہائی دلچسپ بات تھی۔ لیکن حکومت پلاسکو کی خوفناک ذہانت کی مظہر بھی۔ جو منصوبہ حکومت پلاسکو نے بنایا تھا وہ یہ تھا کہ رازل جریری اور شہباز کو بھیڑیئے کے راستے پر لگایا جائے۔ اور جب شہباز اس بھیڑیئے کے حصول کے لئے سرگرداں ہو تو وہیں کہیں راستے میں اسے ختم کر دیا جائے۔ اور ایک بہت بڑی حقیقت یہ تھی کہ جن لوگوں نے شہباز کا پیچھا گھیر رکھا تھا ان کا تعلق بے شک پینیسکو سے ہی تھا لیکن ان کے پس منظر میں حکومت پلاسکو کی کارروائی ہی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے چھ آدمیوں کی قربانی دی تھی۔ صرف ان دو افراد کو ختم کرنے کے لئے۔ رازل جریری تو انہیں نظر نہیں آیا تھا لیکن شہباز کا مسلسل تعاقب کیا جا رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص عقل کل نہیں ہوتا۔ لیکن لوگ ابھی تک حکومت پلاسکو کی چال بازی کو نہیں سمجھ سکے تھے اور شہباز بالکل صحیح راستے پر سفر کر رہا تھا۔ سرجن ڈی گاما کی وہ کارروائی اور پینیسکو کے گوریلے مسلم حقیقت تھے۔ یہ ڈبل منصوبہ اسی انداز میں کام کر رہا تھا۔ وہ سفید بھیڑیا حکومت پلاسکو کی نگاہوں میں بھی نہیں آ سکا تھا اور اسے اس کی تلاش بھی تھی۔ یہ تصور ابھی ذہن میں تھا کہ اگر شہباز بچتا بچاتا کسی طرح سفید بھیڑیئے تک پہنچ بھی جاتا ہے اور دستاویز اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کے بعد بھرپور کارروائی اس سلسلے میں کی جائے گی کہ وہ دستاویز اس سے حاصل کر لی جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت پلاسکو کے ماسٹر پلان ایسے ہی زبردست ہوا کرتے تھے۔ لیکن تقدیر اور اتفاق کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تقدیر کے فیصلے بالکل الگ اور مختلف ہو جاتے ہیں اور ان سے جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رازل جریری غیر جسمانی طور پر اس تمام کارروائی کی نگرانی پر ہو اور پلاسکو کا راز کھل جائے۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتی تھیں اور سرکس کے جھولے پر کام کرنے والے ایک معمولی سے آدمی کا بیٹا جس نے تھوڑی بہت تربیت حاصل کی تھی، ایسے مشن پر کام کر رہا تھا جس میں ساری دنیا کی بقاء کا مشن تھا اور حقیقت یہ ہے کہ لاکھوں انسانوں کی زندگی اس کی کاوشوں کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

بہر حال ان معاملات کا لب لباب یہ تھا کہ انسانی تقدیر، ہمت اور عزم ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یہاں اس چھوٹے سے گاؤں لی آن میں کسی قدر زخمی حالت میں موجود

ہباز اپنی موجودہ ہیئت پر غور کر رہا تھا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی اور شہباز نے دروازہ ول دیا۔ آنے والی وینا تھی۔ وہ دلکش وجود جس کے بدن سے اٹھنے والی بھینی بھینی قدرتی بو ذہن کو مسحور کر دیتی تھی۔ اس کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"میں سمجھی تم سو رہے ہو۔" یہ ایک بے مقصد لفظ تھا۔ شہباز ہنس پڑا تو وہ چونک کر لی۔ "کیوں...... ہنسے کیوں؟"

"تم سمجھی میں سو رہا ہوں اور تم نے دروازے پر دستک دے کر مجھے جگا دیا۔"

"ایں...... نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

ں کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ، ناک پر آ جانے والے پسینے کے قطرے اور جھکی جھکی نگاہیں ں کے اندرونی جذبوں کا پتہ دے رہی تھیں۔ شہباز نے کہا۔

"اگر میں سو رہا ہوتا تو تم کیا کرتیں؟"

"کک...... کچھ نہیں...... واپس چلی جاتی۔"

"نہیں، واپس نہیں جاؤ۔ آؤ بیٹھو۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے سلازیکا کا راستہ کون بتائے گا؟"

"سلازیکا کا راستہ مشکل تو نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ آواز بدستور لرز رہی تھی۔ ہونٹ رز رہے تھے، چہرے کی تپتی ہوئی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ جذبات میں سلگ رہی ہے۔ ہباز کو یوں لگا جیسے وہ چنگاریوں کے بستر پر لیٹا ہوا ہو۔ ایک عجیب سی حدت، ایک عجیب گرمی اس کے سارے وجود میں ابھرنے لگی تھی۔ یہ بھی زندگی کا ایک بہت ہی انوکھا بہ تھا۔ بعض حالات میں انسانی جسم دماغ کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ سوچ سمجھ کے وازے بند ہو جاتے ہیں اور جذبات متحرک۔ شاید پہلی بار شہباز کے وجود میں یہ کیفیت دار ہوئی تھی۔ ورنہ وہ کم از کم ابھی تک ان جذبوں سے دور تھا۔ کچھ دیر تک یہ جذباتی فان موجزن رہا۔ شہباز کی آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ دنیا اس کے قریب آ گئی۔ اور پھر انے کیا ہوا، شہباز کے ہاتھ اس کے شانوں پر جا ٹکے تھے اور اس کے بعد اسے یوں لگا ے طوفان کی ایک لہر نے اسے الٹ پلٹ کر دیا ہو...... وہ دنیا کے وجود میں کھو گیا اور ط کی دیوار ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پا لینے کی شوں میں مصروف ہو گئے۔ یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئیں۔ وہ لازوال گھڑیاں خوابِ ال کی مانند نجانے کب تک ان دونوں پر مسلط رہیں۔ اور اس کے بعد شہباز کو جب ہوش

آیا تو وہ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ وینا بھی مسلسل لرز رہی تھی۔ اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"مم...... میں...... تت...... تمہارے لئے...... سس...... سوپ...... سوپ......" اس سے زیادہ وہ جملے ادا نہ کر سکی اور اس کے بعد باہر نکل گئی۔ شہباز آنکھیں بند کئے اپنی زندگی کے اس انوکھے تغیر پر غور کرتا رہا۔ نجانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ایک سحر، ایک جادوگری ہوئی ہے۔ ورنہ اس کے کردار میں تو کبھی کوئی کھوٹ ہی نہیں تھی۔ بہت پریشان رہا وہ۔ وینا اس کے لئے سوپ لے آئی۔ شہباز اس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ وہ سوپ پیتا رہا اور وینا خاموش کھڑی رہی۔ پھر بولی۔

"تو شام کو تم چلے جاؤ گے؟" شہباز کو اس کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں۔"

"میں تمہیں زندگی میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔"

"اور شاید میں بھی۔" شہباز نے بدستور لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور وینا اسے دیکھنے لگی۔ شہباز کو یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ اگر اتنا کچھ ہے تو واپس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں یہاں سے جانا چاہتے ہو۔ یہیں ہمارے دُکھ درد میں شریک ہو جاؤ۔ لیکن یہ آسان تو نہیں تھا۔ وینا کی آواز ابھری۔

"تم یہاں سے سلازیکا جاؤ گے؟"

"ہاں......"

"میں تمہیں بالکل سچ بتا رہی ہوں۔ وہاں جانا بہت مشکل کام ہے۔"

"لیکن مجھے یہ مشکل کام سرانجام دینا ہے۔"

"بابا تمہیں راستہ بتا دیں گے۔ مجھ سے یہ بات کہہ رہے تھے۔ لیکن میں ایک بار پھر تم سے یہ کہتی ہوں کہ یہاں سے نہ جاؤ تو بہتر ہے۔"

"جانا ہے وینا! جانا ہے۔"

"تب پھر ایک وعدہ کرو۔"

"ہاں، بولو۔"

"واپس آؤ گے۔"

"وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"کیوں......؟"

"یہ بھی نہیں بتا سکتا۔"

وینا ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

بہر حال شہباز ان لوگوں کا شکر گزار تھا۔ انہوں نے حتیٰ الامکان اس کی مدد کی تھی۔ پھر ات کو وینا کا باپ شہباز کو صحیح راستے پر پہنچانے کے لئے تیار ہو گیا اور اسے ضرورت کی ھ چیزیں بھی دیں۔ شہباز نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور اس راہ پر چل پڑا۔ اس اریک وادی کا راستہ بے حد طویل تھا۔ اور ایک کچا راستہ سیدھا دور تک چلا گیا تھا۔ تھوڑی ر پہنچنے کے بعد خنکی بڑھ گئی۔ برف پوش پہاڑوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں ہڈیوں میں ہت ہونے لگیں۔ آگے جا کر وہ وادی سمٹ گئی تھی۔ دونوں جانب کھڑے ہوئے پہاڑ زدیک آ گئے۔ شہباز اب ایک تنگ سے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ کچھ دور جا کر اس طرح کی اڑی چٹانیں نظر آئیں جیسے کسی نے انہیں زینوں کی شکل میں تراش دیا ہو۔ وہ بھی دور یب میں چلی گئی تھیں اور ان کا اختتامی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن ان زینوں پر م رکھتے ہی نجانے کیوں اسے احساس ہونے لگا کہ کوئی اسے چاروں طرف سے دیکھ رہا ے یا اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ لیکن اندھیرے میں لاکھ آنکھیں پھاڑنے پر بھی کچھ ائی نہیں دے رہا تھا۔

شہباز کو اندازہ تھا کہ یہ اس کی چھٹی حس کا کرشمہ ہے۔ کوئی خاص واقعہ نہ بھی ہو تو شعور عجیب عجیب خوف تشکیل دینے لگتا ہے اور ذہن میں نجانے کیسے کیسے وسوسے آنے تے ہیں۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور اس کی چھٹی حس اسے بتاتی رہی کہ وہ ایک ان دیکھے جال پھنستا جا رہا ہے۔ پھر اس نے زیادہ سے زیادہ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک ے قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد دو سائے پھرتی سے اس پر جھپٹے۔ باز کسی چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ مگر اس وقت وہ جس راستے سے آ رہا تھا وہ بھی مسدود ہو تھا۔ سائے اسی طرف سے بڑھ رہے تھے۔ پھر سامنے سے ایک سائے نے بھرپور مکا باز کے پیٹ میں مارا اور شہباز ہل کر رہ گیا۔ لیکن پھر اس کے بھی ہاتھ پاؤں حرکت میں

آ گئے اور اس نے جدوجہد شروع کر دی۔ آنے والے کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس نے جھٹکا دیا اور تقریباً اسی وقت دوسرے ہاتھ سے عقب والے کی ٹھوڑی پر ہاتھ جڑ دیا۔ اتفاقیہ طور پر ہاتھ اتنا زوردار پڑا کہ وہ چاروں شانے چت گرا۔ اس کے چودہ نہیں تو تیرہ طبق ضرور روشن ہو گئے ہوں گے۔ سامنے سے آنے والے دوسرے شخص کے پیٹ پر ایک زوردار گھونسا مارا تو وہ بلبلا کر دوہرا ہو گیا اور اس اسٹائل سے پڑنے والی ضرب نے اس آدمی کی شخصیت بگاڑ کر رکھ دی۔ وہ ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھ سکا تھا۔

شہباز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لیکن پھر ایک تیسرے آدمی کا بھی احساس ہوا جس نے ایک دم چیخ کر کہا تھا۔

''اے......اے......ایک منٹ ٹھہرو۔''

مگر شہباز نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اسی وقت اس نے چھلانگ لگائی اور شہباز پر چڑھ آیا۔ یہ ایک حیران کن شخصیت تھی۔ اتنے لمبے چوڑے بدن کا مالک کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ دو آدمیوں کے برابر قد تھا اور بدن بھی اتنا ہی چوڑا لگ رہا تھا یا پھر ہو سکتا ہے تاریکی میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا ہو۔ اس کے شانے ٹھوس اور اس قدر بھاری تھے کہ لگتا تھا جیسے اس نے شانوں پر پیڈ باندھ رکھے ہوں۔ گردن کندھوں پر رکھی ہوئی تھی۔ جب اس نے شہباز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شہباز کو ایک دم شدید دہشت کا احساس ہوا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی جگہ لوہے کا ایک تین شاخہ لگا ہوا تھا اور فولاد کے تین لمبے لمبے ناخن کسی انسان کو ایک لمحے کے اندر ہلاک کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر وہ ان فولادی ناخنوں کو شہباز کے پیٹ میں مارتا تو اس کی آنتیں باہر نکل آتیں۔ لیکن اس کی کوشش یہ تھی کہ اس پر چھلانگ لگا کر اس کو قابو میں کر لے۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کوئی آدمی اگر بلندی پر سے چھلانگ لگاتا ہے تو اسے واپس زمین پر آنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر بلندی پر پہنچنے کے بعد بلندی ہی میں لڑھک کر اس سے اوپر اور اس سے اوپر بالکل اس طرح جیسے پانی کی لہرں پر کوئی بلند ہوتا چلا آتا ہے۔

شہباز نے اسی طرح چھلانگیں لگائیں اور اس کے پیچھے جا گرا۔ لیکن وہ اپنی خوفناک جسامت کے باوجود انتہائی پھرتیلا تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ مافوق الفطرت تھا۔ اس نے پھر چھلانگ لگائی اور اپنا فولادی کانٹے والا ہاتھ شہباز کی طرف

بڑھایا۔ پہنچ ضرورت سے زیادہ ہی تھی۔ شہباز نے اس کا وہ بازو پکڑ کر پھرتی سے موڑ دیا اور اپنی دونوں ٹانگیں لیٹے ہی لیٹے اس کے پیٹ پر ماریں۔ وہ دور جا کر ایک زوردار دھاکے سے گرا۔ بالکل ایسا لگا جیسے کوئی چٹان بلندی سے نیچے گری ہو۔

شہباز پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی چھلانگ لگا کر سیدھے ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ایک بار پھر شہباز کی طرف آیا اور شہباز نے پھر اس کے ہاتھ کی رینج سے ہٹ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے بازو کے جوڑ پر ضرب لگائی۔ اس انداز کی ضرب قوی تر اشخاص کو بھی چیخنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس میں یقینی طور پر بازو جوڑ سے ٹوٹ جاتا ہے یا وقتی طور پر ناکارہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس ضرب سے اس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا بلکہ شہباز کو اپنی ہتھیلی میں ہی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بازو پر فولاد کا خول چڑھا ہوا تھا۔ گویا اس کے ہاتھ میں فولادی ناخن ہی نہیں تھے بلکہ وہ مجسم فولادی ہاتھ کہا جا سکتا تھا۔ اچانک ہی اس شخص کا ایک ہولناک قہقہہ ابھرا اور اس نے کہا۔

''بس......اپنی تمام تر کوششیں کر چکا۔ اب میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں شدید نفرت اور حقارت ٹپک رہی تھی۔ اور پھر اس نے اچھل کر شہباز کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اسے پکڑ کر بے دردی سے مروڑنے لگا۔ شہباز اس وقت اپنی اچھل کود سے بھی نہیں جیت سکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شدید تکلیف تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ جیسے ہی وہ گرا وہ باقی تینوں آدمی بھی یہاں پہنچ جائیں گے جو شہباز کے ہاتھوں شکار ہوئے تھے اور بظاہر بے ہوش تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ کمزور پڑے گا وہ اس پر حملہ کر دیں گے۔ شہباز نے جب محسوس کیا کہ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ اس کا کچھ نہیں کر سکتا تو اس نے آخری حربے کے طور پر اپنی ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسائیں اور پوری قوت سے اس کو دھکا دیا۔ وہ جھٹکے سے ایک طرف ہوا تو شہباز نے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ وہ یہ کچھ تو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے شانے پر شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ کیونکہ گرتے گرتے وہ اپنے فولادی ناخن اس کے شانے میں مار چکا تھا۔

ایک لمحے کے اندر اندر یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے شانے میں انگارے بھر دیئے ہوں۔ گرم خون کی تین دھاریں پھوٹیں اور ہتھیلی تک لکیریں بنتی چلی گئیں۔ شہباز درحقیقت اپنی بہت سی صفات سے ناواقف تھا۔ رازل جریری نے اسے مختلف طریقوں سے تربیت

دلوائی تھی لیکن اس کے اندر کی جو کیفیتیں تھیں وہ شاید ابھی تک رازل جریری کے علم میں بھی نہیں تھیں۔ انہی کیفیتوں کی وجہ سے وہ ایک طرح سے غیر یقینی کارنامے سرانجام دیتا تھا۔ بدن کی پھرتی بے مثال تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ایک طرح سے کشش ثقل اس پر بے اثر ہو گئی تھی۔ وہ جب اپنی مکمل فارم میں ہوتا تو نجانے کیا سے کیا بن جاتا تھا اور اس وقت شاید اسے خود بھی اپنی کیفیتوں کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ مدمقابل ایک دیو صفت آدمی تھا اور شاید دس بیس آدمی مل کر بھی اس پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔ لیکن اب جب اس کے فولادی پنجوں نے شہباز کو زخمی کر دیا تھا تو شہباز کی اپنی فطرت ابھر آئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر ایک زوردار لات اس کی ٹھوڑی پر جڑی اور وہ اچھل کر دور جا گرا، پھر زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ ایک جگہ گرنے کے بعد اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن شہباز نے چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھوں کو اس نے اپنی رانوں میں دبا لیا تھا اور پھر اپنے ہاتھوں سے قینچی بنائی اور اس کے ہاتھوں میں پھندہ ڈال دیا اور اس وقت اس نے پوری قوت سے اس کے گلے کو گھونٹنا شروع کر دیا۔ بس یہی وہ کیفیت تھی جو نا قابل فہم تھی۔

آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں اور گلے سے خرخراہٹ بلند ہونے لگی۔ اس کے ہاتھ شہباز کی رانوں کے درمیان دبے کانپنے لگے تھے اور وہ بہت ہی بری کیفیت کا شکار تھا۔ اچانک ہی شہباز نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی۔ یقیناً وہ تینوں ہوش و حواس قائم کرکے اس کی طرف آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ مدمقابل کا شہباز کے پنجے میں دم نکل جائے، کوئی سرد سی چیز شہباز کی کھوپڑی میں آکر لگی اور کسی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ مر گیا تو میں تمہارا بھیجہ اُڑا دوں گی۔"

شہباز نے سر موڑ کر دیکھا تو ایک عورت اسے رائفل تھامے دکھائی دی۔ رائفل کی نال شہباز کے سر کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ شہباز نے اس کی دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے شکار کی گردن پر مزید دباؤ بڑھا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس عورت کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ وہ ایک جوان، دلکش اور خوبرو عورت تھی۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ نسوانی اعضاء میں دلکشی اور جاذبیت بے پناہ تھی۔ بال سیاہ اور چمکدار تھے۔ لیکن شانوں کے اوپر سے انہیں کاٹ دیا گیا تھا۔

شہباز نے اپنے شکار کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ غالباً اسے کسی بھی لمحے موت کی ہچکی آنے والی تھی۔ شہباز نے وحشیانہ انداز میں بھیڑیئے کی طرح دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"تم خوشی سے مجھے گولی مار سکتی ہو۔"

"دیکھو...... اُسے چھوڑ دو۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"اگر اسے چھوڑ دوں گا تب بھی مارا جاؤں گا۔" شہباز نے کہا۔

"بیوقوف آدمی! اگر تمہیں مارنا مقصود ہوتا تو کہیں سے بھی گولی چلا کر تمہارے دماغ میں سوراخ کیا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمہیں زندہ قابو میں کر لیں۔ مگر تم نے انہیں غصہ دلا دیا اور اب یہ حرکت تم میرے ساتھ کر رہے ہو۔ ایک لمحے کے اندر اسے چھوڑ دو۔ تم سے پھر وہی بات کہہ رہی ہوں۔ اگر یہ مر گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

شہباز نے ایک لمحے کے اندر محسوس کیا تھا کہ عورت سنجیدہ ہے۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارے کہنے سے یہ کر رہا ہوں۔ لیکن......"

"نہیں...... ایک لفظ زبان سے مت نکالو۔ اپنے ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ جاؤ۔ فوراً ایسا کرو۔ ورنہ میں صرف تین تک گنوں گی۔ ایک......" شہباز نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ وہ شخص فوراً نہیں اٹھ پا رہا تھا۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ البتہ اس کے چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ اعتدال پر آتا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ ہاتھ ٹکا کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو جھٹکنے لگا۔ وہ بقیہ افراد بھی قریب پہنچ گئے تھے اور اب شہباز کے چاروں طرف کھڑے اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ انتہائی ہیجان کے عالم میں تھے۔ کیونکہ بہرحال وہ بھی زندگی اور موت کے درمیان لٹکنے لگے تھے۔ اچانک ہی عورت نے طویل القامت شخص سے کہا۔

"ڈوگو...... ڈوگو...... تم ٹھیک تو ہو نا؟"

ڈوگو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دو چار لمبی لمبی سانسیں کھینچیں۔ سانسیں لیتے وقت اس کا سینہ کسی غبارے کی طرح پھول گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو اس نے اپنے بھیانک دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... یہ عجیب ہے۔ اس نے مجھے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن...... لیکن......''

''شکر کرو تمہاری جان اس عورت کی وجہ سے بچ گئی۔ ورنہ تمہارے پاس لیکن کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' شہباز نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''زیادہ چہکنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اچانک ہی ڈوگو نے اچھل کر اپنے فولادی ہاتھ سے شہباز کی گردن پکڑ لی۔ شہباز کو تکلیف تو ہوئی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ڈوگو کی آواز اُبھری۔

''اگر یہ اجازت دے تو میں تمہاری گردن یہیں کاٹ دوں۔''

''ہوں...... ڈوگو! اپنے حواس کو قابو میں رکھو۔ کیا تم مجھ سے آگے بڑھ کر بولنے کی کوشش نہیں کر رہے؟'' عورت کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں یہ کون ہے۔ یہ جاسوس ہے اور حکومت پینیسکو نے اسے ہمارے خلاف جاسوسی کے لئے بھیجا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسی کوئی بات بالکل نہیں ہے۔ میں تو یہاں ایک خاص کام سے آیا تھا۔''

''کیا اس خاص کام کے بارے میں تم بتانا پسند کرو گے؟''

''ہاں...... مجھے میڈم سارنیکا سے ملنا تھا۔'' شہباز نے کہا اور عورت کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

''بکواس کر رہے ہو تم...... بکواس کر رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم لوگ بیوقوف ہیں۔ تم اپنے باس سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ دودھ پیتا بچہ ہے اور جن جن لوگوں کے خلاف اس نے قدم اٹھایا ہے وہ آسانی سے اس کے قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔ ڈمباسٹر صحیح معنوں میں ڈمباسٹر ہے۔''

''مگر میں کسی ڈمباسٹر سے واقف نہیں ہوں۔ اس سے کہو اب یہ مجھ سے شکست کھانے کے بعد اپنی قوتوں کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور اگر ایسا کرنا ہی چاہتا ہے تو پھر باقاعدہ مجھ سے مقابلہ کرے۔'' شہباز کے ان الفاظ پر ڈوگو مزید چڑ گیا۔ شہباز کی گردن پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ اس کے فولادی پنجے گردن میں زخم لگانے کا باعث بن گئے تھے اور اس

سے خون بہنے لگا تھا جس کی چپچپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

''تم نے مجھ سے اسے چھوڑ دینے کے لئے کہا تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ تعاون کیا۔ لیکن یہ غالباً میرے ہی ہاتھوں موت کا شکار ہوگا۔ کیا یہ دھوکا دہی مناسب ہے؟''

''تم اپنے بارے میں بتا دو۔ یہ تمہیں چھوڑ دے گا۔''

''اپنے بارے میں، میں بتائے دیتا ہوں۔ لیکن اب ایک قرض تم پر ہو گیا ہے میرا۔''

''قرض؟''

''ہاں۔''

''وہ کیا؟''

''اس آدمی سے کہو کہ یہ میری گردن چھوڑ دے اور اس کے بعد جس وقت مناسب سمجھے مجھ سے مقابلہ کرے۔ ہم دونوں کے لئے اب یہ مشکل ہے کہ ایک ساتھ زندہ رہ سکیں۔ یا تو اسے زندہ رہنا ہوگا یا مجھے۔''

جواب میں ڈوگو کی ہنسی سنائی دی۔ پھر اس نے شہباز کی گردن چھوڑ دی اور شہباز گردن پر پڑنے والی خراشوں کو ہاتھ سے مسلنے لگا۔ عورت نے کہا۔

''تو تم سارنیکا سے ملنے آئے تھے۔''

''ہاں۔''

''فرض کرو اگر تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے تو تم اس سے کیا کہو گے؟''

''میں اسے ایک پیغام دوں گا اور یہ پیغام رازل جریری کا ہوگا۔'' شہباز کو یہی سب کچھ بتایا گیا تھا۔ عورت کے چہرے پر نمایاں تبدیلی رونما ہو گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر سرسراتی آواز میں بولی۔

''تم رازل جریری کو کیسے جانتے ہو؟''

''یہ بھی ایک احمقانہ سوال ہے۔ کیونکہ خود رازل جریری نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ وہ یہ بات جانتا ہے کہ سرجن ڈی گاما کی موت کے بعد اس کا مشن اس کی بیوی سارنیکا نے سنبھال رکھا ہے۔ وہ دستاویز جو سفید بھیڑیئے کی گردن میں خود سرجن ڈی گاما نے سرجری کر کے پوشیدہ کی تھی، اگر رازل جریری کے پاس پہنچ جاتی ہے تو اس سے سرجن ڈی گاما کے

مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ میں اسی کا نمائندہ ہوں۔ اور جیسے ہی میں پینسکو میں داخل ہوا، مقامی فوج میرے پیچھے لگ گئی اور اس کے بعد سے میں شدید مشکلات کا شکار ہوں اور مسلسل جھگڑوں میں پڑا ہوا ہوں۔"

ان سب کے چہرے عجیب سے ہو گئے تھے۔ سارنیکا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں سارنیکا ہوں...... ڈی گاما کی بیوی، سارنیکا۔"

"آپ......؟"

"ہاں...... کیوں، تمہیں اس بات پر حیرت کیوں ہوئی؟" اس نے سوال کیا اور وہ بے اختیار مسکرا پڑا۔

"بس ایک عجیب سا احساس میرے دل میں پیدا ہوا ہے۔ مجھے معاف کرنا، سرجن ڈی گاما کی عمر کے بارے میں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، وہ تو اچھے خاصے عمر رسیدہ آدمی تھے۔ جبکہ تم......"

"ہاں، میں جن حالات کے تحت اس کی بیوی بنی وہ بالکل ذاتی نوعیت کے ہیں اور افسوس، میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ البتہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تمہیں اس قدر شدید جدوجہد کرنا پڑی۔ واقعی میں اس پر افسردہ ہوں۔ آؤ...... پلیز، میرے ساتھ آؤ۔ چلو ڈوگو...... پیچھے ہٹ جاؤ۔ راستہ دو۔"

وہ لوگ شہباز کو اپنے ساتھ لے کر چل پڑے اور اس کے بعد پیچ در پیچ پہاڑی راستوں سے گزر کر ایک ایسے بڑے غار میں داخل ہو گئے جسے دنیا کی ہر چیز سے آراستہ کر دیا گیا تھا اور پینسکو کے گوریلے اس غار کو اپنا ہیڈ کوارٹر کہتے تھے۔ چونکہ سارنیکا یہاں سے انہیں کنٹرول کرتی تھی۔

وہ جب نرم ہوئی تو کچھ اس طرح نرم ہوئی کہ اس نے شہباز پر تمام آسائشوں کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ اس کے زخموں کی پٹی بھی خود کی اور اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"مجھے واقعی افسوس ہے کہ ہمارے دشمنوں کے علاوہ میرے ہاتھوں سے بھی تمہیں تکلیف اٹھانی پڑی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد وہ دستاویز میرے حوالے کر دو جو بھیڑیئے کی گردن

میں پوشیدہ ہے۔ کیا تم ایسا کرنا پسند کرو گی؟ اور کیا تمہیں واقعی مجھ پر اعتبار ہو گیا ہے؟"

سارنیکا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ یوں لگا جیسے اسے افسوس ہوا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"افسوس...... بھیڑیا اب میرے پاس نہیں ہے۔"

"کیا......؟" شہباز اچھل پڑا۔

"ہاں...... وہ ڈمباسٹر کے پاس ہے۔"

"ڈمباسٹر؟...... میں پینسکو کی حکومت کے بارے میں تو جانتا ہوں کہ وہ ڈی گاما کے خلاف تھی۔ اور ڈی گاما نے اپنی گوریلا فورس الگ بنالی تھی۔ لیکن یہ ڈمباسٹر میرے لئے نیا نام ہے۔"

"میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی ہوں۔" سارنیکا نے کہا۔ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔

"یہ بات تو تمہارے علم میں آ چکی ہے کہ ہم یہاں اس خطے کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ابھی کچھ روز پہلے ہی ہمارے درمیان ایک کالی بھیڑ پیدا ہو گئی اور اس نے فوج سے مخبری کر دی۔ میرے شوہر کو بے شمار افراد کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ آزادی کے لئے جنگ کرنا مذاق نہیں ہے۔ اس تحریک کے لئے اپنا خون دینا پڑتا ہے۔ بہرحال مجھے اس وقت تک یہ بات نہیں معلوم تھی کہ سازش اندر سے ہی ہوئی ہے اور میرا شوہر اس سازش کا شکار ہوا ہے۔ ایسا تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا۔ اور آخر کار ڈمباسٹر منظر عام پر آ گیا۔ اور اس کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ ڈی گاما کا نائب ہے اور کچھ اس طرح اس نے ڈی گاما کے آدمیوں کو اپنے قبضے میں کیا کہ وہ سب اسے ڈی گاما کا نائب ماننے لگے اور اس کے احکامات کی تعمیل کرنے لگے۔

"مگر تم ڈی گاما کی بیوی ہو۔"

"ہاں...... میں کیا بتاؤں تمہیں۔ بے شک میں اس کی بیوی ہوں لیکن ڈمباسٹر کمبخت ڈی گاما کی ناک کا بال بن چکا تھا اور وہ ڈی گاما کی گوریلا فورس کا چیف بھی تھا۔ میں کسی طرح اس کا زور نہیں توڑ سکی اس نے لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ میری حیثیت صرف ڈی گاما کی بیوہ کی ہے، باقی میں صرف ایک عورت ہوں۔"

’’تو کیا وہ بھیڑیا اپنے قبضے میں کر چکا ہے؟‘‘

’’ہاں...... اس نے بھیڑیے کو ہلاک کر دیا ہے اور اب اس نے اس میں بھس بھرا کر رکھا ہوا ہے اور ڈی گاما کی نشانی کے طور پر اسے استعمال کرتا ہے۔ لوگ اس بھیڑیے کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ڈی گاما کے عقیدت مند ہیں۔ اس بھیڑیے کے بل پر اس نے ان کی سربراہی قبول کر لی ہے۔ ان اطراف میں زندگی بہت بے رحم ہے اور اس خطے کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے ہمیں ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ اس دوران سینکڑوں افراد ہم سے بچھڑ گئے اور ایک نئی نسل مزید تیار ہو گئی ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اس نسل میں بھی وہی اُمنگ اور جذبہ اور روح پھونکی جائے جو اس سے پہلے کی نسل میں پھونکی گئی تھی ورنہ یہ نسل ہم سے بچھڑ جائے گی۔ ہم جس مشن کو لے کر چلے ہیں وہ خاک میں مل جائے گا۔‘‘

اچانک ہی ڈوگو کی غراہٹ اُبھری۔

’’ہم ڈی گاما کے خون کا بدلہ ضرور لیں گے۔‘‘

سارنیکا نے نگاہیں اٹھا کر ڈوگو کو دیکھا۔ ڈوگو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ شہباز کی طرف رخ کر کے بولی۔

’’یہ انسان نہیں، ڈی گاما کا کتا ہے۔ کتے بھی اتنے وفادار نہیں ہوتے جتنا یہ اس کا وفادار ہے۔ بہر حال وہ اس بھیڑیے سے بھرپور کام لے رہا ہے اور اس کا تحفظ بھی پوری طرح کرتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں وہ دستاویز رازل جریری کے لئے نہیں بھجوا سکی جس میں ایک عظیم الشان راز ہے۔ آہ، کاش...... یہ راز ان تخریب کاروں کے ہاتھوں میں نہ جائے جو سرجن ڈی گاما کی زندگی بھر کا نچوڑ ہے۔ اگر وہ لوگ اسے استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے تو دنیا ایک عظیم خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔‘‘

’’اور یہ بات تم جانتی ہو سارنیکا! کہ رازل جریری کا مشن صرف یہی ہے۔ وہ خود کسی کے خلاف نہیں ہے بلکہ تخریب کاری کے خلاف ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی کسی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔‘‘

شہباز خاموشی سے بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ اچانک ہی اس نے سارنیکا سے سوال کیا۔

’’مجھے ایک بات بتاؤ سارنیکا! اگر سرجن ڈی گاما نے اس راز کو اتنی حفاظت کے ساتھ

بھیڑیے کی گردن میں پوشیدہ رکھا ہے تو کیا اب یہ راز ڈمباسٹر کے علم میں ہو گا؟‘‘

’’امکان نہیں ہے۔‘‘ سارنیکا نے جواب دیا اور شہباز اچھل پڑا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’میں نے کہا نا، ڈی گاما اس قدر بیوقوف نہیں تھا کہ اتنے اہم راز کو کسی اور پر منکشف کر دے۔‘‘

’’تو پھر بھیڑیا؟‘‘

’’میں نے کہا نا کہ وہ صرف ڈی گاما کی نشانی سمجھ کر استعمال کیا جا رہا ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ بھیڑیے کی گردن کی وہ جیب اب بھی محفوظ ہو گی۔‘‘

’’امکان اسی بات کے ہیں۔‘‘

شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ’’اب اس کا ایک ہی حل باقی رہ گیا ہے۔‘‘

’’وہ کیا......؟‘‘

’’میں ڈمباسٹر کے پاس جاؤں گا۔‘‘

سارنیکا حیرت سے سانس لینا بھول گئی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے شہباز کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ’’نہیں...... یہ ناممکن ہے۔‘‘

’’لیکن مجھے اس ناممکن کو ممکن بنانا ہے۔‘‘

’’کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ تمہیں ہلاک کر دے گا۔ تمہاری کوئی بات نہیں سنے گا۔‘‘

’’ہو سکتا ہے...... لیکن میں کوشش کروں گا کہ......‘‘

’’لیکن کیا کہو گے اس سے...... کیا تم اسے بتا دو گے کہ......‘‘

’’نہیں خیر، اس کا کیا سوال ہے۔‘‘

’’تو پھر کیا کرو گے تم؟‘‘

’’یہ تو میں ابھی خود بھی نہیں جانتا۔ بس جیسی بھی صورتحال ہوئی، میں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ایک بات بتاؤ، وہ مجھے کہاں ملے گا؟‘‘

’’دیکھو...... تم نوجوان لڑکے ہو۔ مجھے تو حیرت ہے کہ رازل جریری نے اس خوفناک مُہم کے لئے تمہیں کیوں بھیجا۔ میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں۔ ابھی تم نے اس دنیا میں

دیکھا ہی کیا ہے۔ حالانکہ اس بات کا بھی مجھے اندازہ ہے کہ تم اب تک پینیسکو کی تمام کوششوں سے بچتے آ رہے ہو۔"

"میں تمہاری اس ہمدردی کا احسان مانتا ہوں۔ مگر مجھے یہ کام تو سرانجام دینا پڑے گا۔"

"آہ...... میں نے رازل جریری سے رابطہ قائم کر کے وعدہ کیا تھا کہ فارمولا ان کے حوالے کر دوں گی مگر افسوس...... مگر نہیں، ٹھیک ہے۔ تم اگر یہ کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ مگر ہم سب تمہارے ساتھ جائیں گے۔"

"بالکل نہیں...... اس طرح میرا کام مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر وہ بھیڑیا......"

"وہ بھیڑیا ہمارے لئے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا تمہارے لئے۔ کیا سمجھے۔ کیا کہتے ہو تم ڈوگو؟"

"ہم اپنے آقا کی ہر بات کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہم لوگ بہت کم ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم زندگی تو دے سکتے ہیں اپنے آقا کے نام پر۔ اور اب میں یہ کہتا ہوں کہ میری عظیم محسنہ! میرے آقا کی بیوی! ایک بات سامنے آئی ہے جو اب تک میرے علم میں نہیں تھی۔ چنانچہ میں اس سلسلے میں تمہارا حکم نہیں مان سکوں گا۔ ہمیں ڈمباسٹر پر حملہ کر کے وہ بھیڑیا اس سے حاصل کرنا ہو گا اور اسی میں ہمارے آقا کے مشن کی تکمیل ہو گی۔ ہم اس لڑکے کے ساتھ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر تیاری کرو۔ اور تم آرام کرو۔" سارنیکا نے شہباز کو سرسری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ لیکن پھر اچانک ہی نجانے اس کی آنکھوں میں کیا تبدیلی رونما ہوئی، وہ دیر تک شہباز پر نگاہیں جمائے رہی تھی۔ آخر کار ڈوگو نے تیاریاں کر لیں۔ وہ جس قدر لمبے چوڑے بدن کا مالک تھا اور جس انداز میں وہ بھیڑیا بن جاتا تھا اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ عقلی طور پر وہ صفر ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کو ساتھ لے کر اس نے جو تیاریاں کی تھیں وہ بہت شاندار تھیں۔ شہباز نے بحالت مجبوری ان تیاریوں کو قبول کر لیا تھا چونکہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ سارنیکا ہی سارے مسئلوں کا حل تلاش کرے گی اور اسے وہ دستاویز فراہم کرے گی جسے لے کر اسے رازل جریری کے پاس پہنچنا ہے۔

✿......✿

آخر کار وہ اپنے مشن کے لئے چل پڑے۔ اس علاقے سے نکل کر تھوڑی سی آبادی تھی۔ کچے پکے مکانات کا ایک سلسلہ تھا۔ ہر چند کہ یہ آبادی بہت کم تھی اور اس چیز کی عکاسی کرتی تھی کہ وہ قبیلوں اور گروہ میں بٹ کر زندگی گزارتے ہیں۔ جو ان میں سے تمدن یافتہ ہو گئے تھے وہ پکے مکانات میں رہ رہے تھے ورنہ اطراف میں خیموں کے شہر میلوں آباد تھے۔ اور پھر شہباز کو ڈمباسٹر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ زیادہ فاصلے پر نہیں رہتا۔ خیموں کے اس شہر کے اختتام پر اس کی قیام گاہ ہے۔ ویسے پہاڑوں کے اس سلسلے کو جگہ جگہ قابل استعمال بنایا گیا تھا۔ خاص طور سے ایک عظیم الشان پہاڑ جس کے بیچ میں عبادت گاہ اور چاروں طرف آبادی بکھری ہوئی تھی۔ ڈمباسٹر بھی اسی قسم کی ایک قلعہ نما عمارت میں رہتا تھا جو پہاڑیوں کو تراش کر بنائی گئی تھی۔

آخر کار یہ سفر ختم ہوا اور وہ لوگ قریب پہنچے تو سارنیکا نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

"جب تک سرجن ڈی گاما زندہ تھا ہم یہیں رہتے تھے۔ اور اب ہمارا یہ گھر ڈمباسٹر کے قبضے میں ہے۔"

جس جگہ کو اس نے گھر کہا تھا وہ قابل دید تھی۔ قدرتی پہاڑوں کو جس مشکل اور محنت کے ساتھ ایک خوبصورت قلعے کی شکل میں تراشا گیا تھا، وہ فن تعمیر کی ایک اعلیٰ مثال تھا۔ سب کچھ ہی بنایا گیا تھا وہاں لیکن سب پہاڑوں کو کھوکھلا کر کے۔ برج، منارے اور جابجا محرابیں۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ قدرتی دیواروں میں تراشی گئی ہیں۔ پھر ایک طرف سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ سیڑھیاں طے کر کے ایک ہال نما کمرے میں آئے۔ وہاں تک چونکہ سورج کی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی اس لئے مشعلیں جلا کر روشن کر لی گئی تھیں۔ فضا میں چربی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں اور فرش میں جگہ جگہ دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ یقینی طور پر یہ جگہ بہت سال پہلے تعمیر کی گئی ہو گی۔ سب کچھ ہی تو بنایا گیا تھا وہاں۔ قدرتی غاروں کو ہال کی شکل دی گئی تھی اور اس سلسلے میں پتھروں کی تراش بے مثال تھی۔ ایک سرے پر ایک اونچا سا ڈائس بنا ہوا تھا جس کو جابجا جانوروں کی کھالوں سے سجا دیا گیا تھا۔ ڈائس پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی اور ڈائس کے نیچے بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ سارا سیٹ اپ قدیم رومن درباروں جیسا تھا اور اس شاندار جگمگاتی کرسی پر اس وقت ایک تندرست و توانا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گالوں پر سرخی تھی اور آنکھیں تکبرانہ انداز میں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم

پر خاکی لباس تھا اور وہ حلیے سے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ گھنی داڑھی اور سر پر عجیب سی ٹوپی۔ اس کی گود میں ایک آٹو میٹک پستول پڑا تھا جس کو وہ اس طرح چلا رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں اس کا کوئی پسندیدہ کھلونا ہو۔ اس کے آس پاس بے شمار افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھا اور پھر گردن خم کر کے بولا۔

''آہا...... میرے آقا کی بیوہ سارنیکا! قابل احترام اور قابل عزت۔ جسے میں ہمیشہ مکمل احترام دیتا ہوں۔ آؤ...... تمہارے ساتھ موجود چہرے میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ لیکن یہ...... یہ کون ہے؟ اسے میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔''

شہباز خود آگے بڑھا اور بولا۔ ''معزز ڈمباسٹر! تمہارے بارے میں مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا ہے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ میں سرجن ڈی گاما کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ میرے ساتھ ایک اور بزرگ بھی ہیں جو سرجن ڈی گاما کے بچپن کے دوست ہیں۔ سرجن ڈی گاما ہمیشہ کے حریت پسند تھے۔ پینیسکو میں مغربی قبائلیوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک ہوتا رہا ہے سرجن ڈی گاما ہمیشہ اس کے لئے دکھی رہے۔ ایک بار انہوں نے میرے، عزیز بزرگ سے کہا کہ اب وہ وطن واپس جا کر اپنے ہم وطنوں کے لئے آزادی کی تحریک چلانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس تحریک کے لئے اپنا نشان سفید بھیڑیا منتخب کیا تھا اور ایک سفید بھیڑیا نشانی کے طور پر حاصل کیا تھا۔ آہا، شاید یہ وہی سفید بھیڑیا ہے جو تمہارے دائیں سمت رکھا ہوا ہے۔ یہ بات مجھے سارنیکا نے بتائی کہ بھیڑیا مر چکا ہے اور اب اس میں بھس بھرا کر یہاں رکھ لیا گیا ہے۔''

''مقصد کیا ہے تمہارا...... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ڈمباسٹر نے پوچھا۔

''مجھے یہ بھیڑیا چاہئے۔''

''کیا مطلب...... وہ تو بس ایک آرائشی چیز ہے۔ تم اسے کیوں لینا چاہتے ہو؟''

''یہ سوال میرے بزرگ کے لئے ہے۔ مجھے تو یہی ہدایت ملی ہے۔''

''نہیں میرے دوست! تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بھیڑیا تم سارنیکا کے حوالے کرنا چاہتے ہو تا کہ وہ اپنی برتری کا اعلان کر دے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں صحیح معنوں میں ڈی گاما کا نائب ہوں۔''

ڈوگو کے حلق سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔ لیکن شہباز نے اشارہ کیا۔

''سنو...... شاید میرا بزرگ اسے سرجن ڈی گاما کی یادگار کے طور پر محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر یہ بھیڑیا چاہتا ہے اور یہ بھیڑیا سارنیکا کو نہیں ملے گا بلکہ میرا بزرگ اس بھیڑیئے کو اپنا سہارا بنا کر پوری دنیا میں پینیسکو کے مظالم کو سامنے لانا چاہتا ہے۔ بات صرف پینیسکو کی ہی نہیں رہنی چاہئے، کم از کم دنیا کو بھی پتہ چلے کہ کس طرح پینیسکو کے مغربی قبائل کے خلاف پینیسکو کی حکومت طاقت آزمائی کر رہی ہے۔ اس طرح میرا بزرگ آدمی کے اس علم کو بلند کرنا چاہتا ہے اور ساری دنیا کو اس بھیڑیئے کے ذریعے ڈی گاما کے مشن سے روشناس کرانے کا خواہش مند ہے۔''

شہباز کو یا تو دنیا داری آ گئی تھی یا پھر یہ صرف اتفاق تھا کہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ ان الفاظ پر اس نے ڈمباسٹر کو تو بے چین دیکھا تھا لیکن باقی وہاں موجود لوگوں کو چونکتے ہوئے اور اندازہ بھی ایک منٹ کے اندر ہی اندر ہو گیا تھا۔ یہ سب کے سب سرجن ڈی گاما کے وفادار تھے اور صرف اس بنیاد پر ڈمباسٹر کے لئے کام کر رہے تھے کہ وہ سرجن ڈی گاما کا نائب کہتا تھا خود کو۔ اب شہباز کے ان الفاظ پر وہ سب شہباز سے متاثر ہونے لگے تھے۔ اور پھر ان کے درمیان چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ...... کوئی واضح بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہباز نے اس صورتحال سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ اس بھیڑیئے پر اب تمہارا، میرا یا سارنیکا کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ بھیڑیا تو پوری عالمی برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ سرجن ڈی گاما آزادی کا علمبردار تھا اور اس کی موت کے بعد اب وہ بھیڑیا آزادی اور جدوجہد کا نشان بن گیا ہے۔ ڈمباسٹر! تم اسے اپنے پاس رکھ کر ایک عظیم تحریک کا گلا گھونٹ رہے ہو۔ اتنی قربانیاں دے چکے ہیں یہ لوگ جو تمہارے اس پاس بیٹھے ہوئے ہیں کہ اب کسی ایک کا تسلط اس بھیڑیئے پر اصولی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ میں بھی اسی آزادی کا علمبردار ہوں اور میرا بزرگ یہ چاہتا ہے کہ ڈی گاما کے مشن کو پوری قوت سے آگے بڑھائے۔''

اس بار لوگ کھل کر بولنے لگے تھے اور ہال میں بے شمار آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر ایک بوڑھے نے شہباز سے سوال کیا۔

''تو کیا تم جس بزرگ کا تذکرہ کرتے ہو صرف اور صرف یہی مقصد ہے اس کا؟''

''یہ بھیڑیا بڑی شہرت کا حامل ہے۔ کیونکہ زندگی میں وہ سرجن ڈی گاما کا نشان سمجھا جاتا تھا اور اس کی اور سرجن کی موت ایسا لگتا ہے جیسے کسی سازش کے تحت کی گئی ہو۔ تاکہ وہ تحریک دم توڑ دے۔ ہوسکتا ہے آپ ہی لوگوں کے درمیان کوئی ایسی کالی بھیڑ ہو جو پینسکو کے مفادات کے لئے کام کر رہی ہو۔ اگر آپ وہ بھیڑیا میرے حوالے کر دیں گے تو فائدے میں رہیں گے۔ شاید میں عالمی برادری کو جگانے میں کامیاب ہو جاؤں اور آپ کی تحریک کو ساری دنیا سے مدد حاصل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ملک آپ کو اسلحہ سپلائی کرنے پر آمادہ ہو جائے اور کوئی اور ملک جو سرجن ڈی گاما کے مشن سے اتفاق رکھتا ہو، آپ کو مالی طور پر مدد دینے پر تیار ہو جائے۔''

ایک اور طرف سے ہاتھ لہرا کر پیشکش کی گئی۔

''یہ ٹھیک کہتا ہے...... ہمیں یہ بھیڑیا اس کے حوالے کر دینا چاہئے۔''

''بکواس مت کرو تم۔'' ڈمباسٹر دھاڑا۔ ''اس نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ کا پلندا ہے۔ جب تک......''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی خیال کے تحت اس نے خاموشی اختیار کر لی ہو۔ اس کے چہرے پر تبدیلی آ گئی اور اس نے بھیانک انداز میں دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہیں وہ بھیڑیا چاہئے۔ وہ رکھا ہوا ہے وہ بھیڑیا۔ اٹھو اور اسے حاصل کر لو۔'' اس نے بھیڑیئے کی طرف اشارہ کیا اور شہباز دو تین چھلانگوں میں فاصلہ طے کر کے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا بھیڑیا اس کی طرف سرکا دیا۔ بھیڑیئے میں نہایت مہارت سے بھس بھرا گیا تھا۔ آنکھوں کی جگہ چمکدار شیشے جڑ دیئے گئے تھے جس سے گمان ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ شہباز نے بھیڑیئے پر جذباتی انداز میں ہاتھ پھیرا اور نامحسوس طریقے سے اس کی گردن کو ٹٹولا۔ ایک بار، دو بار، تین بار۔ مگر وہ تھیلی یا خفیہ خانہ کہیں نہیں محسوس ہوا جہاں وہ کاغذات ہونے چاہئے تھے۔ ڈمباسٹر کی نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی اور وہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہی شہباز نے بھیڑیئے کو واپس سرکاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... یہ وہ بھیڑیا نہیں ہے۔''

ڈمباسٹر نے ایک پھنکار سی ماری اور اپنا ریوالور گود سے اٹھا لیا۔ پھر اس کی شعلہ بار آواز ابھری۔

''کتے کے بچے! یہ بھیڑیا ڈی گاما کے ساتھ مرا تھا اور میں نے اپنی نگرانی میں اس میں بھس بھروایا ہے۔ تو مجھے جھوٹا کیوں کہہ رہا ہے؟''

''کتے کے بچے تم ہو ڈمباسٹر! میں نہیں۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سرجن ڈی گاما کا بھیڑیا نہیں ہے۔''

ڈمباسٹر پھر پھنکارا اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سنو...... تم کتے کی موت مرنے کے لئے یہاں آئے ہو۔ مجھے میڈم سارنیکا سے اس کی توقع نہیں تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے ان مٹھی بھر لوگوں کو یہاں میرے خلاف بھڑکا کر لائی ہے۔ میں جانتا تھا ایک دن وہ ایسا ہی کریں گے۔ سنو...... یہ شخص بالکل فریبی ہے۔ اس نے بھیڑیئے کو طلب کیا اور جب میں نے اسے مطلوبہ شے پیش کی تو یہ مجھے جھوٹا قرار دینے لگا۔''

بہت سے لوگ جو اس کے خاص آدمی تھے ایک دم مشتعل ہو گئے اور ان کے ہاتھ ریوالوروں اور خنجروں پر پہنچ گئے۔ ان میں سے دو تین نے سارنیکا اور اس کے آدمی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے بھی دیکھا تھا۔ لیکن شہباز کی آواز ابھری۔

''بتا...... اصلی بھیڑیا کہاں ہے؟ کہاں چھپایا ہے تو نے اسے؟''

ڈمباسٹر نے شہباز کی بات کا جواب اسلحہ کی زبان میں دینا چاہا۔ اس کا ریوالور آہستہ آہستہ شہباز کے سینے کی جانب اٹھ گیا تھا۔

''اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور اپنے چوہوں سمیت یہاں سے باہر نکل جاؤ۔ ورنہ میں تم سب کا جو حشر کروں گا وہ دیکھنے کے قابل ہو گا۔''

ڈائس کے نیچے سے لوگوں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''بیوقوف شخص! آج تک ہم تیری عزت صرف اس لئے کرتے تھے کہ تو اپنے آپ کو ڈی گاما کا وفادار کہتا تھا۔ لیکن اب یہ ثابت ہو گیا کہ تو ایک چالاک اور کمینہ انسان ہو سکتا ہے۔ در پردہ تو پینسکو کی وفاداری کر کے ہمارے اس مشن کو نقصان پہنچا رہا ہے...... آہ...... بہت سے خیال آتے ہیں اب تو۔''

ڈوگو کے یہ جملے سن کر ڈمباسٹر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

اس کے آدمی اس کے حکم کا انتظار کر رہے تھے اور امکان اس بات کا پیدا ہو گیا تھا کہ اشارہ ملتے ہی وہاں کا فرش خون سے رنگین ہو جائے گا۔ لیکن اسی وقت شہباز نے اپنی پنڈلیوں پر دباؤ ڈال کر ایک چھلانگ لگائی اور ڈمباسٹر تک پہنچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا ایک آدمی رائفل لے کر شہباز کی طرف آیا۔ شہباز نے ڈمباسٹر پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس آدمی کی رائفل پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ہاتھ پھیلا کر ایک طرف گرا۔ اسی وقت شہباز نے گھوم کر رائفل کا بٹ پوری قوت سے اس کے منہ پر مارا اور وہ ایک کرب ناک چیخ مار کر اوندھا ہو گیا۔ اس دوران شہباز نے ایک اور چھلانگ لگائی۔ اس نے ڈمباسٹر کو میز کے عقب سے نکلنے کی کوشش کرتے دیکھا لیکن ڈمباسٹر اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کا پاؤں کرسی کے پائے میں اس طرح سے الجھا کہ وہ اپنی جگہ پر لڑھک گیا۔ شہباز اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے داہنے بازو میں لات مار کر ریوالور اس کے قبضے سے چھین لیا۔ اس کے آدمیوں نے مضطربانہ انداز میں آگے بڑھنے کی کوشش کی تو شہباز نے وہی ریوالور ڈمباسٹر کی پشت سے لگاتے ہوئے دھمکی دی۔

''خبردار...... تم لوگ اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میں تمہارے سردار کا بھیجہ اُڑا دوں گا۔''

وہ تمام آدمی اپنی جگہ یوں ٹھٹک گئے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ان میں سے کچھ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریوالور شہباز پر تان لئے۔ لیکن شہباز جانتا تھا کہ وہ انہیں استعمال نہیں کریں گے۔ تب اس نے ڈوگو کو آواز دی۔

''ڈوگو، سارنیکا اور تم سب میرے پاس آ جاؤ۔''

ڈوگو نے شہباز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم حیرت انگیز ہو۔''

''ڈمباسٹر! تم اس وقت پوری طرح سے میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہاں کوئی پچھلا دروازہ ہے؟''

''ہاں...... اُس طرف۔'' ڈمباسٹر کی بجائے ڈوگو نے دو محرابوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ وہ محرابیں کچھ اس انداز میں بنی ہوئی تھیں کہ دروازہ نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ ان محرابوں کے قریب کھڑے ہوئے مسلح افراد وہاں سے واضح دکھائی دے رہے تھے۔

''ان لوگوں کو حکم دو کہ وہ محرابوں کے پاس سے ہٹ جائیں۔'' شہباز نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ڈمباسٹر نے شہباز کی شکل دیکھی اور نجانے کیا نظر آیا اسے کہ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ شہباز اس وقت ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور آنکھوں کی پتلیاں تقریباً غائب ہو گئی تھیں۔ اس طرح کے لمحات کئی بار آئے تھے۔ اس وقت جب وہ کسی خاص مقصد پر کام کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کر لیتا تھا اور اس کے راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو جاتی تھی۔ شہباز نے ریوالور اس کی پسلیوں میں زور سے چبھایا تو اس نے سراسیمہ ہو کر انہیں آواز دی۔

''ہیلو...... دروازے پر سے ہٹ جاؤ۔ سب ہٹ جاؤ۔''

وہ سب وہاں سے ہٹ گئے تو دروازہ دکھائی دینے لگا۔ شہباز نے اپنے ریوالور سے دھکا دے کر ڈائس سے اترنے کو کہا۔ وہ نیم مردہ حالت میں ایک طرف بڑھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہے۔ شہباز نے مزید احتیاط کے پیش نظر اس کا بازو دوبارہ تھام لیا تھا۔ ڈمباسٹر جس قدر ہوشیار اور بہادر دکھائی دے رہا تھا حقیقت میں اس کا آدھا بھی نہیں تھا۔ شہباز نے ریوالور کی نال اس کی پسلیوں سے لگائی تو اس کے پورے بدن سے پسینہ پھوٹنے لگا اور اس کی لرزشیں نمایاں ہو گئیں۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

''تم...... تم مجھے مارنے کی حماقت نہیں کرو۔ مم...... مجھے مارنے سے تمہیں فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔''

''صرف اس شرط پر کہ تم چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔'' شہباز نے جواب دیا۔ تمام لوگ شہباز کے گرد جمع ہو گئے تھے اور اس طرح شہباز ڈمباسٹر کو کور کئے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچتے ہی نجانے کیوں اچانک ہی ڈوگو نے آگے جانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو دھکا لگا اور اس کا بازو شہباز کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ نہ صرف بازو بلکہ شہباز کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور بھی ایک طرف جا پڑا تھا۔ ڈمباسٹر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس نے فرش پر لوٹ لگائی۔ چیخ کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

''مار وان کو...... مارو۔ جانے نہ پائیں۔''

ملی جلی کیفیت تھی۔ کچھ لوگ بے شک شہباز کے حق میں ہوئے تھے لیکن اس بدلی ہوئی صورتحال سے وہ دم بخود رہ گئے تھے۔ اور کچھ ایسے تھے جو تھے ہی ڈمباسٹر کے آدمی۔ چنانچہ ان لوگوں نے فوراً ہی ڈمباسٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ کیونکہ ڈمباسٹر اس وقت خطرے سے نکل چکا تھا۔ اور اس کے بعد زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ گولیوں اور خنجر کو آزادانہ استعمال کیا جانے لگا۔ کون کس کو رگڑ رہا تھا اور کون کس سے اپنی جان بچا رہا تھا اس کا ہوش کسی کو نہیں تھا۔ جس کا سینگ جدھر سما رہا تھا وہ اسی طرف دوڑ پڑا تھا۔ لیکن شہباز کے لئے یہ ہنگامہ آرائی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے بھی فرش پر چھلانگ لگائی اور کسی سانپ کی طرح برق رفتاری سے دروازے کی طرف رینگنے لگا۔ جب وہ باہر پہنچا تو اس کے علاوہ نو افراد اور باہر نکل چکے تھے۔ ایک چوڑے چکلے بدن کا آدمی تلوار لے کر شہباز پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اچانک ہی وار کیا تھا۔ لیکن تقدیر نے موقع پر ساتھ دیا اور شہباز پھرتی سے اس کے وار سے بچ گیا اور اس وقت اس نے اپنی تمام تر حیثیت کو استعمال کیا تھا۔

چنانچہ اب بجلیاں کوندرہی تھیں اور شہباز پھرتی سے اِدھر سے اُدھر ہو کر ان لوگوں کو بدترین نقصانات پہنچا رہا تھا۔ تلوار کا وار کرنے والے کا وار خالی دے کر اس نے پوری قوت سے اس کی پشت پر لات جمائی اور وہ چیختا ہوا اپنی ہی تلوار پر گر پڑا اور تلوار اس کے سینے سے باہر ہو گئی۔ کمرے کے اندر اور بھی بہت سے دلچسپ مناظر تھے۔ ڈوگو واقعی اپنی جسامت اور طاقت سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ایک آدمی نے سارنیکا کی طرف خنجر اٹھانے کی کوشش کی تو ڈوگو نے ایک اور آدمی کو اٹھا کر اس پر دے مارا اور دونوں اس طرح زمین پر گرے کہ چپک کر رہ گئے۔ اس وقت شہباز کے ساتھی کوشش کر رہے تھے کہ سب باہر نکل آئیں۔ اور جیسے ہی وہ باہر نکلے، ڈوگو نے اپنی جسامت سے کام لے کر لکڑی کا بھاری دروازہ بند کر دیا۔ اندر بہت سارے لوگ پھنس گئے تھے۔ سارنیکا نے کہا۔

''ہم بھیڑیوں کے بھٹ میں ہیں اور اس وقت یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں ملی جلی صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ بہت سے اور بھی افراد اس کی مدد کو آ جائیں گے اس لئے نکل بھاگنا زیادہ مناسب ہے۔'' سب نے اس بات سے اتفاق کیا اور وہاں سے واپسی کے لئے دوڑ لگا دی۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنے مسکن پر آ کر ہی دم لیا تھا۔

جو ہنگامہ آرائی ہوئی تھی وہ بڑی زبردست تھی۔ سارنیکا بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ پتہ

ہیں کیوں اس کی نگاہیں بار بار شہباز کا جائزہ لینے لگتی تھیں۔ اس نے کہا۔

''اب اس ہنگامہ آرائی کے بعد دل چاہتا ہے کہ کچھ دیر مکمل طور پر آرام کیا جائے۔ نہاری کیا رائے ہے ڈیئر شہباز؟''

''جیسا آپ پسند کریں۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اور وہ شہباز کو اپنے ساتھ لے کر ایک غار میں داخل ہو گئی۔

اے غار کہنا بے وقوفی کی بات تھی۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔

''تم چاہو تو یہاں آرام کر سکتے ہو۔ یہ میری خواب گاہ ہے۔'' سارنیکا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''نہیں، آپ کو تکلیف ہو گی۔''

''بیکار باتیں مت کرو۔ تکلیف ہوتی تو میں تمہیں یہاں لاتی ہی کیوں۔''

اور اس کے بعد اس نے بڑی اپنائیت سے شہباز کا ہاتھ پکڑا اور اسے آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ اور آنکھوں میں ہلکے ہلکے گلابی ڈورے شہباز کو احساس دلا رہے تھے کہ اس کے اندر عورت جاگ رہی ہے۔ وہ شہباز کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ شہباز نے کہا۔

''وہ بھیڑیا نقلی تھا۔ اور میں نہیں جانتا کہ ڈمباسٹر نے اتنی عقل مندی کا ثبوت کیوں دیا ہے اور اصلی بھیڑیا اس نے کہاں چھپا رکھا ہے۔''

''پتہ نہیں، چھوڑو بھیڑیوں کی باتیں۔ انسانوں کی باتیں کرو۔''

''ہاں واقعی...... بتاؤ، کیا باتیں کی جائیں؟''

سارنیکا اپنی جگہ سے اٹھی اور مسہری پر شہباز کے پاس بیٹھ گئی، پھر بولی۔

''تم ایشیائی ہو؟''

''ہاں۔''

''انسان تو معلوم ہی نہیں ہوتے۔''

''ارے، پھر کیا لگتا ہوں؟''

''بھیڑیئے۔'' وہ دانت کچکچا کر بولی اور شہباز ہنسنے لگا۔

''نہیں، میں انسان ہی ہوں۔''

"سنو...... میں...... میں......" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ ڈوگو ایک دم نمودار ہو گیا۔ اس نے یہاں کے ماحول پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ہتھیلی پر گھونسہ مار کر بولا۔

"سب کو احمق بنا دیا ہے اُس نے۔ سب کو بیوقوف بنا دیا ہے۔ ہم بھی بیوقوف بنتے رہے۔ آخر وہ اصلی بھیڑیا کہاں گیا؟"

سارنیکا نے ایک دم اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "پتہ نہیں۔" وہ ڈوگو سے کچھ خائف سی معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگی۔ "یہ بات ڈمباسٹر ہی بتا سکے گا۔"

"لیکن آپ لوگ بے فکر رہیں۔ میں اس کا پتہ لگانے جاؤں گا۔" شہباز نے کہا اور وہ دونوں حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... کیا تم بھیڑیوں کی وادی میں واپس جاؤ گے؟" ڈوگو نے پوچھا۔

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہیں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔" سارنیکا سختی سے بولی۔

"ہمارا پہلا ہی تجربہ بھیانک ثابت ہوا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہم غیر متوقع طور پر اس کے پاس پہنچے تھے اس لئے اس کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ لیکن اب وہ پوری طرح تیار ہو چکا ہے اور ہم...... ہم بہرحال اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

شہباز نے خونخوار انداز میں ان دونوں کو دیکھا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"اور اگر ہم واپس جا کر اس پر پھر حملہ کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی اس کے لئے غیر متوقع ہوگا اور بدحواسی میں کچھ نہ کر سکے گا۔ وہ تو یہی سمجھے یا یہی سوچے بیٹھا ہوگا کہ ہم اپنی جان بچانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔"

"مگر اس کے ساتھی بہت زیادہ ہیں۔" ڈوگو ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ہم اس کے دس بیس آدمی مار دیں گے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جبکہ ہمارا ایک ایک آدمی قیمتی ہے اور ہم ان میں سے کسی کو ضائع نہیں کر سکتے۔"

"ہاں...... میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔" سارنیکا بولا۔ "اس وقت جذبات سے کام نہ لو۔"

"تعجب کی بات ہے سارنیکا! ہمیں ان سے مقابلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں تو یہ کہتا

ہوں کہ ہمیں فوراً ہی ان پر جوابی حملہ کر دینا چاہئے۔"

ڈوگو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے اچانک ہی گردن ہلا کر کہا۔ "میرے خیال میں ایک طرح سے یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمارا کیمپ محفوظ ہے۔ اگر ہم یہاں بیٹھے رہے تو ان لوگوں کے درمیان گھر کر رہ جائیں گے۔ سمجھ رہی ہو نا تم۔ اگر انہوں نے ہمیں ہم سے پہلے جوابی حملہ کر کے گھیر لیا تو پھر ہمیں یہیں مرنا پڑے گا۔"

"مگر میں یہ نہیں کرنا چاہتی۔" سارنیکا بولی۔

"تو پھر کیا کریں گے ہم؟ بولو، کیا ہار مان لیں گے اس سے؟"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ سارنیکا کے انداز سے محسوس ہوتا تھا جیسے اس وقت اسے ڈوگو کی مداخلت ناگوار گزری ہے۔ وہ اس وقت اپنے عورت پن کا شکار تھی۔ پھر ڈوگو کی آواز دوبارہ ابھری۔

"میں ان اطراف میں رہنے والے لوگوں کی طبیعت اور میلان سے واقف ہوں۔ اب جب ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ بھیڑیا نقلی ہے، اس کے آدمی اس سے ٹوٹنا شروع ہو جائیں گے۔ ڈمباسٹر، اس کے مرتبے اور جادہ کا مینار ڈھے کر رہ جائے گا۔ اس سلسلے میں دیر کرنے سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا غصہ دھیما پڑ جائے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم کوئی مناسب فیصلہ کر لیں۔ اس بار ہم ایک اور مختلف راستہ اختیار کریں گے۔ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ ہو کہ وہ اپنے کمروں اور بڑے ہالوں کو گرم رکھنے کے لئے گرم تہہ خانے بناتے ہیں۔ یہاں کی طرز تعمیر بھی اسی نمونے پر ہے۔ اس لئے تہہ خانے بھی ہیں۔ البتہ دیواروں کو گرم کرنے کے لئے اوپری حصے میں سرنگ نما نالیاں بنائی جاتی ہیں جن میں تہہ خانے سے گرم ہوا پھینکی جاتی ہے۔ ہم ان سرنگوں کے راستے اندر جائیں گے۔"

"بکواس کئے جا رہے ہو ڈوگو۔ لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"نہیں، میں پاگل نہیں ہو گیا۔ میں جانتا ہوں ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔ اب نہ سہی، کچھ وقت کے بعد۔ لیکن جتنا وقت گزر رہا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔" ڈوگو نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سارنیکا دیر تک غم و غصے میں ڈوبی رہی تھی۔ پھر اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"وہ حد سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے میں اس سے اتفاق نہیں

رکھتی۔تم بتاؤ،تم کیا کہتے ہو؟'' اس نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر میں اس سے اتفاق رکھتا ہوں۔''

''تب تم دونوں بھاڑ میں جاؤ۔ میں اب تمہارے اس مشن سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہباز حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ رازل جریری نے تو یہی بات کہی تھی کہ سارنیکا بھرپور تعاون کرے گی۔ لیکن یہاں صورتحال خاصی مختلف نظر آ رہی تھی۔

بہر حال ایسا ہوتا ہے۔ بہت سے معاملات غیر متوقع شکل اختیار کر جاتے ہیں اور انہی سے نمٹنا اصل کام ہوتا ہے۔ بہر حال سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے شہباز اور ڈوگو نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ ڈوگو کمال کی شخصیت ثابت ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان کافی مفاہمت ہو گئی تھی۔ سارنیکا نے آخری وقت پر بھی اپنی ضد برقرار رکھی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ راستے میں کہیں نہ کہیں ڈمباسٹر کے آدمیوں سے ان کا ٹکراؤ ضرور ہوگا۔

بہر حال یہ سفر خیریت سے گزرا اور کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ سورج غروب ہونے کے بعد یہ لوگ ان رومن ٹائپ کے غسل خانوں کے قریب پہنچ گئے۔ گندے پانی کی نکاسی والے راستے سے ہوتے ہوئے وہ اسی تنگ و تاریک گلی میں آئے جہاں ڈمباسٹر کے آدمیوں نے ان پر گولیاں برسائی تھیں۔

بہر حال آدھے گھنٹے تک کا یہ سفر بڑا سنسنی خیز تھا لیکن وہ اپنی کاوشوں میں کامیاب ہو گئے اور ڈمباسٹر کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اس بار انہوں نے سامنے والے راستے پر سے جانے کی بجائے عقبی راستے کا انتخاب کیا تھا اور پھر وہاں انہیں ایک مجہول سا محافظ کندھے پر بندوق رکھے ٹہلتا دکھائی دیا۔ ڈوگو نے اس کے عقب میں واقع محراب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس طرف ایک راستہ تہہ خانے کو جاتا ہے اور وہیں سے ہم ان سرنگوں میں داخل ہو سکیں گے جن سے گرم ہوا پھینکی جاتی ہے۔''

دونوں کچھ دیر وہیں کھڑے محافظ کو قابو میں کرنے کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ اس کی حرکات وسکنات کا مطالعہ گہری نگاہوں سے کیا گیا تھا۔ محافظ دروازے کی حفاظت کرنے کی بجائے بس اپنا وقت ٹال رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور کبھی

دیر تک ایک جگہ کھڑا رہتا۔ ڈوگو نے آہستہ سے کہا۔

''اس بار جیسے ہی یہ اپنی جگہ سے آگے جائے گا، ہم دروازے پر پہنچ جائیں گے۔''

شہباز نے اس سے اتفاق کر لیا۔ محافظ ٹہلتا ہوا دور نکل گیا اور پانچ منٹ تک واپس نہیں آیا۔ یہ دونوں اس موڑ سے ایک ایک کر کے اس تہہ خانے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سیڑھیاں طے کر کے یہ دونوں تہہ خانے میں اتر گئے۔ وہاں آگ دہکانے کے لئے بھی باقاعدہ بھٹی بنی ہوئی تھی اور اس کے اوپر تین چار سرنگیں بنی ہوئی تھیں جو اوپری ہال اور دوسرے کمروں کو گئی تھیں۔ ان سرنگوں کی چوڑائی ڈیڑھ فٹ کے قریب رہی ہوگی۔

''مگر ان سرنگوں میں گرد اور غلاظت بھری ہوگی۔ کیا ہم ان کے ذریعے سفر کر سکتے ہیں؟''

''یقیناً کر سکتے ہیں۔ یہ سرنگیں اوپر تمام کمروں تک جاتی ہیں اور اس بات کے مکمل امکانات ہیں کہ اس وقت ڈمباسٹر اپنی آرام گاہ میں تنہا ہوگا۔''

''اور اگر کوئی ہمارے پیچھے آ گیا تو؟''

''تو ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ سرنگیں ایسی ہیں کہ اس میں تو ہم ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے۔ مقابلہ کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کو اگر ذہن میں رکھا جائے گا تو پھر کوئی کام ہی نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے ہمیں اس سرنگ سے اپنے سفر کا آغاز کر دینا چاہئے۔''

شہباز نے گردن اٹھا کر سرنگ کا جائزہ لیا، پھر اپنے جسم کو تولا اور اچھل کر سرنگ کا نچلا حصہ تھام لیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ کسی بندر کی طرح ہلکے پھلکے طریقے سے اوپر پہنچ گیا۔ لیکن ڈوگو کے لئے یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جسمانی اعتبار سے بہت پھیلا ہوا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے یہ سفر زیادہ مشکل تھا۔ لیکن اس بات کا شہباز نے دل سے اعتراف کیا کہ ڈوگو ایک جانباز ہے اور کسی بھی طرح کے حالات سے گھبرانے والا نہیں ہے۔ وہ سرنگ اس کے لئے تنگ تھی مگر وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس میں ٹھنس گیا۔ سرنگ میں بالکل تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا ان لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ سانس پھول رہا تھا۔ بے حد گھٹن تھی۔

پھر پاؤں کے نیچے سے گزرنے والے چوہوں اور جسم پر رینگنے والے حشرات الارض نے اور قیامت مچا رکھی تھی۔ یہ لوگ بار بار اچھل پڑتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ گرمی کے باعث وہاں کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن وہاں سبھی کچھ تھا۔ ڈوگو نے ایک سوراخ میں جھانک کر کہا۔

''اس وقت ہم درمیانی ہال تک پہنچ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈمباسٹر کا کمرہ کچھ ہی فاصلے پر رہ گیا ہے۔''

شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے بھی اپنے نزدیکی سوراخ سے جھانکا تو اسے اس کمرے میں ایک درجن کے قریب آدمی بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ سب ایک میز کے گرد جمع تھے اور ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو لازماً کسی زمانے میں سرجن ڈی گاما کے ساتھی رہے ہوں گے۔ ایسے چار آدمیوں کے چہروں پر پختگی تھی۔ وہ عمر رسیدہ تھے۔ باقی تمام نوجوان اور بےفکرے سے نظر آتے تھے۔ سارنیکا نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو تنظیم کے اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ ڈمباسٹر کے گرد صرف اپنے مطلب براری کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ ایسے کچھ افراد کی نشاندہی سارنیکا کر چکی تھی۔

بہرحال سرنگ کا دہانہ کمرے کے قریب پہنچنے پر چوڑا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ آہستہ سے کھڑے ہو گئے۔ اپنی ہیئت کذائی پر اس وقت انہیں خود بھی ہنسی آ رہی تھی۔ ڈوگو اور شہباز اس سرنگ میں سفر کرنے کے بعد بھوت بن گئے تھے اور اس وقت تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے ڈمباسٹر کی آواز سنی جو اپنے آدمیوں سے کہہ رہا تھا۔

''میں کہتا ہوں کہ سارنیکا کو جہنم میں ڈالو اور مجھے اس گدھے کے بچے کی فکر بھی نہیں ہے۔ لیکن ہمیں حقائق سے منہ نہیں موڑنا چاہئے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہماری نفری مسلسل کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور پینیسکو کی مسلح افواج ہمارے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہیں۔ اس خطے کی آزادی اب محض ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ ہم حکومت پینیسکو کے نزدیک ننھے سے کانٹے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔''

''کانٹا کوئی معمولی چیز نہیں ہوتا۔ اور حکومت پینیسکو کے پہلو میں بری طرح چبھتا رہتا ہے۔'' ایک بزرگ نے کہا اور ڈمباسٹر نے طنزیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

''مگر کتنے عرصے کے لئے۔ ہمارے ہتھیار پرانے اور زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ ہمارے غیر ملکی ساتھیوں نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے اور ہمارے معاملوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی

ہے۔ ہم بالکل بے یار و مددگار ہیں۔''

''لیکن سنو...... میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ......''

''کچھ نہیں۔ سب بے کار باتیں ہیں۔ سب فضول باتیں ہیں۔ تم لوگ ہوا کا دامن پکڑ رہے ہو جو کسی بھی طرح تمہارے حق میں نہیں ہو سکتا۔ یہ سب بکواس ہے۔''

''اور وہ جو باہر سے آیا ہے؟''

''بالکل بکواس۔''

''تم اسے بکواس کہہ سکتے ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ یہاں تک آیا اور صاف بچ کر نکل گیا۔''

''میں اتنا جانتا ہوں کہ ہم اس بے سروسامانی کی حالت میں مرتے کٹتے رہے تو بہت جلد فنا ہو جائیں گے۔''

''تو پھر اور کیا، کیا جا سکتا ہے...... یہ بتاؤ؟''

''ایک اور حل بھی ہے۔'' ڈمباسٹر نے عجیب سے انداز میں لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

''ہم حکومت سے صلح کر لیں۔ پینیسکو کے اعلیٰ حکام نے مجھ تک یہ بات پہنچائی ہے کہ اگر ہم حکومت سے صلح کر لیں تو حکومت ہمیں بہت سی مراعات دے گی۔''

''بکواس کر رہا ہے یہ۔'' ڈوگو نے سرگوشی کی اور شہباز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہلکی سی سرگوشی بھی اس وقت ان کے لئے خطرے کا بم ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈمباسٹر کے یہ الفاظ بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ وہ اصل میں حکومت کا نمائندہ ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ڈمباسٹر نے شہباز کے بارے میں حکومت پینیسکو کو اطلاع دی ہو اور اسی کی مخبری پر حکومت نے اپنی فوجوں کو متحرک کر دیا ہو جنہوں نے راستے میں شہباز کی زبردست پذیرائی کی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسے جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ امکانات تھے اس بات کے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو۔ ویسے بھی یہ آدمی انتہائی چالاک اور غدار معلوم ہوتا تھا۔

بہرحال یہ اس وقت سوچنے کی بات نہیں تھی۔ ڈمباسٹر کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

''یہ بات تم لوگوں کے لئے خوشی کا باعث ہو گی کہ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھا ہے

اور حکومت کو اس بات کا اشارہ دے دیا ہے کہ ہم اس سے تعاون کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اعلیٰ حکام یہاں آئیں اور ہم سے بات کریں۔''

ڈوگو کے اندر پھر بے چینی کی ایک لہر پیدا ہوئی اور اس نے دانت پیس کر کہا۔

''یہ میرے مالک کی ساری کوششوں کو ناکام کر دینا چاہتا ہے کتا۔''

شہباز نے ایک بار پھر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت ایک بوڑھے کی آواز ابھری۔ ''اور اگر ہم حکومت سے صلح پر آمادہ نہ ہوں تو؟''

''تو پھر تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ان بیوقوفوں کے ساتھ شامل ہو جاؤ جو پہاڑوں میں اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو پینیسکو کا باغی کہتے ہیں۔''

''دیکھو، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ ہمیں سکون کا ایک موقع ملا ہے۔ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ تباہی اور بربادی کا یہ سیلاب ان کے دامن تک پہنچ جائے گا۔ کیا تم اسے روکنا نہیں چاہتے؟ میں کہتا ہوں کہ تم کب تک اپنے خون کی ہولی کھیلتے رہو گے؟ ہمارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو؟''

اب ڈوگو کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک غراہٹ نکلی اور اس نے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔ وہ سب اس کے اچانک اس طرح نمودار ہونے پر ششدر رہ گئے تھے۔ ڈوگو نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کتے کے بچو! اس آدمی کو نہیں جانتے تم۔ یہ تمہیں بیوقوف بنا رہا ہے۔ تم سب گدھے ہو گیا؟ تمہاری عظیم تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے یہ۔ تم جانتے ہو کہ کتنے افراد نے اس آزادی کے لئے جان دی ہے۔ کیا تم اسے پس پشت ڈال دو گے؟ تم...... تم تو میرے دادا کے برابر ہو۔ بتاؤ، تم اس خطے کی آزادی کے لئے سرجن ڈی گاما کے شانہ بشانہ نہیں لڑے؟ اور کیا تم اس خطے کی آزادی کا سودا کرنے پر تیار ہو؟''

''یہ کہاں سے آمرا۔ پاگل، یہ ڈوگو ہے، ڈوگو...... ڈوگو! خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ آزادی حاصل کرنے کے نام پر آخر ہم کب تک اپنا خون بہائیں گے؟''

''تو بکتا ہے کتے! تو بکتا ہے۔ تو مجھے کیا کچھ کہہ رہا ہے؟'' ڈمباسٹر کو اچانک ہی احساس ہوا کہ ڈوگو نجانے کہاں سے نمودار ہوا ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا دیکھتے ہو، گھیر لو اسے۔ یہ زندہ بچ کر نہ جانے پائے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے

کہا اور وہاں ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ وہ سب ہی ڈوگو کی بجائے ڈمباسٹر پر پل پڑے تھے۔ مجبوراً شہباز کو بھی اس سرنگ میں چھلانگ لگانی پڑی اور وہ ڈوگو کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن چاروں طرف سے اس پر بھی حملہ ہو گیا تھا اور اس میں اسے نقصان ہو گیا۔ کیونکہ وہ بغیر کسی منصوبے کے اس ہنگامہ آرائی میں شریک ہوئے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ دوست اور دشمنوں کی تمیز کر لی جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہو پایا تھا۔ بس اندھی چھلانگیں لگائی گئی تھیں اور اس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ اچانک ہی رائفل کا ایک بٹ شہباز کے سر پر پڑا اور کئی رائفلوں نے اس کا استقبال کیا۔ شہباز یہاں مار کھا گیا اور کچھ لمحوں کے بعد اس کے ہوش وحواس رخصت ہو گئے!

۞......۞

نجانے کب ہوش آیا تھا۔ اور جب شعور نے کام کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے سماعت سے یہ جملہ ٹکرایا۔

''یہ ہوش میں آ رہا ہے۔ ہوشیار!''

''ٹھیک ہے ڈانگ! تم تیار ہونا؟'' دوسری آواز نے کہا۔

''ہاں......'' مختصراً جواب ملا۔

آنکھوں پر چھائی ہوئی تاریکی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد شہباز کو واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک فولادی کرسی سے بندھا ہوا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے بے لباس کر دیا گیا تھا۔ لباس نام کی کوئی چیز اس کے بدن پر موجود نہیں تھی۔ اندازہ یہ ہوا کہ وہ اس وقت کسی تہہ خانے میں ہے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں اس فولادی کرسی کے کلپ میں پھنسے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور جسم کی کیفیت ایسی ہو رہی تھی جیسے اسے تیز بخار ہو۔ اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر ایک پستہ قد گنجا کھڑا ہوا تھا اور اس کی توند تربوز کی مانند نکلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر روایتی جلادوں جیسی کرختگی تھی۔ اس کے قریب ہی ڈمباسٹر بھی موجود تھا۔ اس نے شہباز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام شہباز ہے اور مجھے تمہارے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ غالباً تم رازل جریری کے ساتھی ہو۔ وہ احمق سائنسدان جو ساری دنیا میں ہونے والی تخریب کاری کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ بیوقوف لوگو! قدرت کا قانون بھی کوئی چیز ہے۔ اگر اس دنیا سے موت ختم ہو جائے، لوگ مرنا بند کر دیں تو جانتے ہو اس دنیا کا کیا حشر ہوگا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوگی۔ خوراک نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ مرنے سے روکنے والوں کو میں احمق قرار دیتا ہوں۔ آنے اور جانے کا یہ سلسلہ تو ازل سے جاری ہے

اور ابد تک جاری رہے گا۔ اور یہی اس کائنات کے لئے ذریعہ نجات ہے۔ موت کہیں نہ کہیں سے تو نازل ہوتی ہے۔ خوفناک ہتھیاروں سے، قحط، سیلاب اور دوسری قدرتی آفات سے۔ تم اس بات سے کیوں انکار کرنا چاہتے ہو؟ وہ احمق سائنسدان اس موت کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گدھا ہے۔ بالکل گدھا ہے۔ بہرحال تم نے اور ڈوگو نے مجھ تک پہنچنے کے لئے جو راہ اختیار کی ہے میں واقعی اس کی داد دیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں نے کچھ لمحے کے لئے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ بہرحال اب تم دوبارہ یہاں آ گئے ہو تو میں تمہیں اپنے اس ڈرائنگ روم میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

ڈرائنگ روم کے دروازے پر شہباز نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر دیکھا، قدیم رومن طرز کے تہہ خانے میں اذیت دینے والے تمام آلات بکھرے پڑے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں کسنے والے شکنجے، آنکھیں نوچنے والا چمٹا، انسانی جسم پر پھیرنے والا فولادی رولر، چھت سے لٹکتی ہوئی فولادی بیڑیاں اور گلے میں ڈالا جانے والا آہنی پتھر، زبان کھینچنے والا چمٹا۔ یہ تمام چیزیں یہاں موجود تھیں۔ سب سے بڑی بات شہباز کی برہنگی تھی جو اس کے لئے سب سے زیادہ اذیت ناک تھی۔

آہستہ آہستہ ڈمباسٹر آگے بڑھا اور اس نے شہباز کے نزدیک آ کر اس کے بال پکڑے اور اس کا سر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا دیا۔ اس نے کہا۔

''خوبصورت نوجوان! دنیا بہت بری ہے۔ لوگ اتنی اتنی سی عمروں میں ایسے ایسے کاموں پر لگا دیتے ہیں جو تم جیسی چھوٹی عمر کے لوگوں کے لئے بالکل ہی مناسب نہیں ہوتا۔ بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ، تم بہترین کارکردگی کے مالک ہو۔ اب میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم اس سوال کا تسلی بخش جواب دو گے۔ یہ بتاؤ، سرجن ڈی گاما کے بھیڑیئے کا کیا راز ہے؟ ہم نے اس کے حصول کے لئے ہی پہلی اور آخری کوشش کی ہے۔ رازل جریری کے لئے اس بھیڑیئے کی کیا اہمیت ہے؟''

''تم سر سے پاؤں تک گدھے ہو بیوقوف!'' شہباز نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن دوسرے لمحے ڈمباسٹر کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ابھی کچھ دیر کے بعد ڈوگو بھی یہاں آئے گا اور میں دیکھوں گا کہ تم میں سے کون زیادہ سخت جان ہے۔ یہ لمحات جو گزر رہے ہیں، تمہارے لئے بہت قیمتی ہیں۔ اگر تم زبان

کھول دو تو تمہارے حق میں بہت بہتر ہوگا۔ ورنہ بعد میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ تم جتنا بھی معافی مانگو گے، تمہیں معافی نہیں ملے گی۔ کیا سمجھے۔ اس آدمی کو دیکھ رہے ہو، اس کا نام ڈرنگ ہے۔ اور یہ کیا ہے، تم دیکھو گے تو ششدر رہ جاؤ گے۔ چلو ڈرنگ! اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔"

ڈرنگ نے گردن جھکائی اور پھر وہ شہباز کی کرسی کے پیچھے پہنچ گیا۔ پتہ نہیں وہ کیا کر رہا تھا۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد شہباز نے محسوس کیا کہ آگ جلائی جا رہی ہے اور اسے دہکایا جا رہا ہے۔ یہ آگ شہباز کی کرسی کے نیچے ہی جلائی گئی تھی۔ ڈمباسٹر کی آواز ابھری۔

"بس چند منٹ...... اور اس کے بعد تم کیا کیا کہو گے اس کا تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا۔"

آگ دھیرے دھیرے بڑھنا شروع ہوئی اور کرسی گرم ہونے لگی۔ شہباز کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ اس نے کرسی کے ہتھے مضبوطی سے پکڑ لئے۔ حلق سے نکلنے والی چیخوں کو روکنے کے لئے اس نے دانت پر دانت جما لئے تھے۔ ڈمباسٹر نے کہا۔

"اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہاری زبان نہیں کھلوا سکوں گا۔"

شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان شعلوں کو دھونکنی سے دہکایا جا رہا تھا۔ آگ اب پوری طرح بھڑکنے لگی تھی۔ کرسی انگارہ ہو گئی تھی اور کمرے میں جلتے ہوئے گوشت کی بو پھیلنے لگی۔ اور یہ شہباز کا ہی گوشت تھا۔

"ہاں..... کیا راز ہے اس بھیڑیئے کا؟" ڈمباسٹر نے پوچھا لیکن شہباز نے دانتوں پر دانت جما لئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"بہت زیادہ بہادر بننے کی کوشش کر رہے ہو تم۔ میں تمہارے جسم کے ایک ایک حصے کو جہنم میں جھلسا دوں گا۔ ڈرنگ! اب دوسرا کھیل شروع کر دو۔"

ڈرنگ نے پھر گردن ہلائی اور کرسی کے نیچے بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈال دیا۔ پھر اس نے شہباز کے ہاتھ پاؤں آہنی کلپ سے آزاد کئے اور اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر برف کی ایک سل پر دھکا دے دیا جو پہلے سے وہاں تیار تھی۔ چونکہ شہباز کا جسم گرم تھا اس لئے اچانک ٹھنڈک پر جانے سے اس کی جھلسی ہوئی کھال تڑخ گئی اور اپنے حسین اور بے داغ جسم پر نجانے کہاں کہاں اس نے داغ کھائی۔ اس کی حالت واقعی بری ہو رہی تھی اور وہ

ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ پھر اس وقت وہ کوئی جدوجہد نہیں کر سکا جب ڈرنگ نے دوبارہ اس کے ہاتھوں میں فولادی زنجیریں ڈال دیں۔ وہ زنجیریں چھت میں لگے ہوئے ایک کانٹے میں لگی ہوئی تھیں۔ ڈرنگ نے جب ان زنجیروں کے دوسرے سرے پکڑ کر کھینچے تو شہباز اس چبوترے سے اٹھتا چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے میں معلق تھا۔ اس کے ہاتھ چھت کی جانب کھنچے ہوئے تھے۔

بات اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ ڈرنگ نے تیل میں بھیگا ہوا چمڑے کا کوڑا اٹھایا اور فضا میں لہرا کر شہباز کی پیٹھ پر شڑاک سے مارا۔ شہباز نے انتہائی کوشش کی تھی کہ اس کے منہ سے آواز نہ نکلے لیکن بعض اوقات بہت سی چیزیں انسان کے اپنے بس میں نہیں ہوتیں۔

"واہ...... چیخے...... چیخے......" ڈمباسٹر جیسے خوشی سے اچھل پڑا۔

"ڈرنگ! تم واقعی ایک فنکار ہو۔ اور سنو لڑکے! اس کوڑے کی ہر ضرب پر تمہاری کھال اپنی جگہ چھوڑتی جائے گی۔"

ڈرنگ نے دوسری بار کوڑا گھمایا تو شہباز کے منہ سے پھر آواز نکل گئی۔

"دیکھو، ضد چھوڑ دو۔ ورنہ تھوڑی دیر کے بعد تم کچھ بتانے کے قابل نہیں رہو گے۔"

تین چار کوڑے کھانے کے بعد شہباز نے اپنی کھال کھنچتی ہوئی محسوس کی۔ آہنی زنجیروں سے لٹکتے ہوئے سارا زور کندھوں پر پڑ رہا تھا اس لئے شانوں کی ہڈیاں اپنی جگہ سے ہٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"ہاں، کیا کہتے ہو...... کیا ہے اس بھیڑیئے کی حیثیت؟" ڈمباسٹر نے پھر سوال کیا۔ شہباز خاموش رہا تو پھر زبردست کوڑا پڑا اور اس کے بدن کی کھال ایک جگہ سے اُڑ گئی۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا اس لیے شہباز نے سوچا کہ اب کچھ کرنا چاہیے۔ کوڑے کی اگلی ضرب کے ساتھ ہی اس نے چیخ مار کر گردن ایک طرف ڈال دی۔ دو چار کوڑے اور برسے مگر اس نے انہیں برداشت کیا اور اپنے آپ میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے ڈمباسٹر کی آواز سنی۔

"بے ہوش ہو گیا ہے حرامی، رک جاؤ۔"

"اس کی کھال جگہ جگہ سے اڑ گئی ہے۔"

"تم گدھے کے بچے ہو ڈرنگ! میں نے اس کے سامنے تم سے کچھ نہیں کہا۔ کیا تمہیں

اس کی اجازت دی گئی تھی کہ تم اسے مار مار کر بے ہوش کر دو۔"

"لل......لیکن۔"

"کتے کے بچے اس ہوش میں لاؤ۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کوئی انتظار نہیں کر سکتا میں۔"

"یہ تو مجبوری ہے۔"

"مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں جب یہ ہوش میں آئے تو مجھے بلا لینا۔"

یہ کہہ کر ڈمباسٹر غصیلے انداز میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ایک ایک پل صدی بن کر گزر رہا تھا۔

شہباز نے محسوس کیا کہ ڈرنگ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا ہے پھر اس نے سگریٹ سلگائی جس کی بو کمرے میں پھیل گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"جہنم میں جائے یہ سب کچھ میں پاگل نہیں ہوں۔یہ شخص بالکل پاگل ہو چکا ہے۔جس کا نام ڈمباسٹر ہے۔" ایک بار پھر قدموں کی آواز ابھری اور دروازہ کھل کر بند ہو گیا۔وہ کمرے سے چلا گیا تھا شہباز نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کی تصدیق ہو گئی۔

اب اس وقت تہہ خانے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے دروازے پر کھڑکھڑاہٹ سی سنی۔ایسا لگا جیسے کوئی خاص عمل ہوا ہو۔اچانک ایک سرگوشی سی ابھری۔

"شہباز۔" شہباز نے بدوقت سر گھمایا تو دروازے میں دو سائے کھڑے تھے۔شہباز نے ایک لمحے کے اندر انہیں پہچان لیا وہ سارنیکا کے ساتھی تھے اور پہلے مقابلے میں ان کے ساتھ آئے تھے اور شاید یہاں گرفتار ہو گئے تھے۔

"کیا تم ہماری آواز سن سکتے ہو۔" ان میں سے ایک کی آواز ابھری۔

"ہاں۔"

"کیا تم ہوش میں ہو۔"

"ہاں میں ہوش میں ہوں لیکن مجھے ڈوگو کے بارے میں بتاؤ کہ کیا ڈوگو کو قیدی بنا لیا

گیا ہے۔"

"نہیں۔کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔لگتا ہے وہ فرار ہو گیا۔"

"ہو سکتا ہے مر گیا ہو۔"

"تم دونوں قیدی ہو۔"

"ہاں۔انہوں نے ہمیں زندہ رکھا ہوا ہے اور یہ ہمارے ساتھ جو سلوک کریں گے وہ اس سے بھی بدتر ہوگا۔وہ کسی نئے کھیل کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

"کھیل۔" شہباز حیرت سے بولا۔

"موت کا کھیل۔جس کے طریقے ہم نے سن لیے ہیں۔"

"وہ کیا......؟"

"یہ سب ہمیں کسی بڑے میدان میں جمع کر کے تم پر شیروں کو چھوڑ دیں گے۔"

اوہ۔کیا ان کے پاس اس کا انتظام ہے۔"

"ان کے پاس کیا نہیں ہے۔"

"کیا تم حوصلہ ہار رہے ہو۔"

"نہیں۔لیکن ہم اسکے قیدی نہیں تھے۔ہمارے کئی ساتھی ہمارے ساتھ تھے اور اب ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ڈمباسٹر ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"وہ پاگل ہو چکا ہے۔"

"اوہو شاید ڈرنگ آ رہا ہے ہوشیار۔" آواز ابھری اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

شہباز کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔اس دوران اس نے اپنی انتہائی ول پاور سے کام لے کر اپنی انتہائی قوت ارادی سے کام لے کر اپنی قوت کو بحال کیا تھا اور یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ بس جتنا ہو چکا وہ کافی ہے اب رہائی کی جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہیے۔کسی کی آمد کا انتظار کیے بغیر۔"

چنانچہ اس نے زور لگا کر اپنے بدن کو اٹھایا اور زنجیروں کو پکڑ پکڑ کر چھت کی طرف بڑھنے لگا۔ہر چند کہ اس کوشش میں اس کے بازو اس کے بدن سے علیحدہ ہوتے محسوس ہوئے تھے مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

وہ اب اپنی ان تمام صلاحیتوں سے کام لینا چاہتا تھا جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ

تھیں۔اس وقت اسے شدید زخمی کر دیا گیا تھا ورنہ یہ کام اس کے لیے بہت آسان ہوتا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح چھت تک پہنچ کر اس نے اپنے پاؤں شہتیر میں پھنسا دیئے اور ٹھیک اسی وقت اس نے دروازے پر قدموں کی چاپ سنی۔اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے اس نے پھرتی سے آنکڑے میں پھنسی ہوئی زنجیر نکال لی۔

ڈانگ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک نگاہ میں ہی اسے دیکھ لیا پھر ڈانگ نے پھرتی سے کوڑا اٹھا کر اس کی طرف گھمایا کوڑا کافی لمبا تھا۔ایک بار پھر ایک ضرب شہباز کی پیٹھ پر پڑی لیکن کسی نہ کسی طرح وہ زنجیر کھینچ کر اس کے سر کا نشانہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈانگ کے حلق سے ایک ہولناک چیخ نکلی تھی۔زنجیر پوری قوت سے اس کے سر پر پڑی تھی۔وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر زمین پر لیٹتا چلا گیا پھر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ شہباز نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کی گردن اتفاق ہی سے شہباز کے ہاتھ میں آ گئی۔ شہباز پوری قوت سے اسے دبانے لگا ڈانگ کے حلق سے دبی دبی چند چیخیں نکلیں اور کچھ دیر کے بعد اس نے گردن ایک طرف ڈال دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر شہباز نے دروازہ کھولا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

۞......۞

شہباز پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اور اسے ڈر لگا تھا کہ اس وقت کوئی اور پیچھے نہ آ جائے وہ ایک طویل راہداری تھی جس کے دونوں طرف کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور ان کوٹھریوں میں مختلف موقع پر گرفتار ہونے والے افراد قید کر دیئے گئے تھے۔اس راہداری کے اختتام پر بھی ایک دروازہ تھا۔شہباز نے اسے کھول کر باہر چھلانگ لگائی مگر تاریکی میں اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کہاں اور کس چیز پر چھلانگ لگا رہا ہے اور مزہ ہی آ گیا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم کسی چھپاکے کے ساتھ کسی تالاب میں گرا تھا اسے اندازہ ہوا کہ یہ روشن طرز کا کوئی اکھاڑا ہے اور وہ خون کے سرخ تالاب میں گرا ہے۔

وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھا تو اسے پورے جسم میں چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان تو بہر حال انسان ہی ہوتا ہے اور خوف انسانیت کا ایک حصہ۔وہ تالاب سے باہر نکلا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔جو کچھ اس نے دیکھا اس نے اسے دیوانہ کر دیا۔

اس کے چاروں طرف دائرے میں سیڑھیاں تھیں اور ان سیڑھیوں کے اختتام پر ڈمباسٹر کی تنظیم کے افراد کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں چاروں طرف سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں اور ان سرچ لائٹوں کی روشنی میں ڈمباسٹر کے آدمیوں کے ہاتھوں میں خوفناک ہتھیار نظر آ رہے تھے۔

شہباز کے پورے بدن میں گرم گرم لہریں اترنے لگیں اس کی زبان خشک ہو گئی تھی اس نے دیکھا کہ مشرق کی جانب ایک اونچی جگہ ہے ڈمباسٹر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔سرچ لائٹوں کا رخ آخر کار شہباز کی جانب ہوا اور شہباز کو روشنی نے اپنے دائرے میں لے لیا۔شہباز ڈمباسٹر کو دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ شہباز کا جائزہ لے رہا تھا۔اس کے دانت بھیڑیئے کی مانند نکلے ہوئے تھے۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس کیفیت میں ہے۔

بہر حال یوں لگ رہا تھا جیسے موت کا دیوتا پوری طرح نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو اور اب موت کا بھیانک کھیل شروع ہونے والا ہو۔تھوڑے فاصلے پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ بھی سارنیکا کے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔اس کے علاوہ کتنے آدمی یہاں کھڑے ہوئے تھے، ان کا کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ دفعتہً ہی ڈمباسٹر کا بے ہنگم قہقہہ سنائی دیا۔اس نے کہا۔

”نوجوان لڑکے! کبھی کبھی مجھے بھی کسی کے مرنے کا افسوس ہوتا ہے۔اور وہ مرنے والا تجھ جیسا ہی کوئی ہوتا ہے۔خوبصورت، نوجوان، زندگی کی بہاریں دیکھنے سے قاصر۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں پہنچنے والا دوسرا آدمی تو ہو گا۔لیکن بہر حال جو ہے سو ہے۔“

شہباز نے اپنے حواس جمع کئے اور بولا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“

”جو چاہتا ہوں ابھی تمہارے سامنے آنے والا ہے۔“ ڈمباسٹر نے جواب دیا۔ایک لمحے کے لئے شہباز کا ذہن اپنے ماضی کی جانب لوٹ گیا۔انسان ہر چیز سے چھٹکارہ پا سکتا ہے، اپنے ماضی سے نہیں۔ ماضی کا ہر نقش ایک لمحے کے اندر ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ فیض شاہ نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔اس وقت جب وہ اسے سرکس کے لئے تیار کر رہا تھا اس نے اسے ہر طرح کے داؤ پیچ بھی سکھائے تھے۔جسمانی پھرتی خداداد تھی اور اس میں وہ

اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس نے سرکس میں کام کے دوران ایک عالم کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور پھر یہی مہارت رازل جریری کی زندگی بچانے میں کام آئی تھی۔

ایک لمحے کے لئے اسے احساس ہوا کہ عمر کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں جاتا اگر کچھ سیکھنے میں صرف کیا جائے۔ جو کچھ اس نے سیکھا تھا آج وہ اس کے لئے انتہائی کارآمد تھا اور زندگی کے بہت سے مرحلے اس کے ذریعے طے ہو رہے تھے۔ زخمی جسم پر لباس کچھ لمحوں کے لئے تکلیف دیتا رہا۔ یہ لباس ڈمباسٹر کی جانب سے ہی مہیا کیا گیا تھا۔ کمبخت نے پورا روم کا دربار بنا رکھا تھا۔

آخر کار شہباز کو اس اکھاڑے میں چھوڑ دیا گیا جہاں اسے موت کی جنگ کرنی تھی۔ اور شاید اسی اکھاڑے میں جنگ کر کے سارینکا کا ایک ساتھی موت کے گھاٹ اترا تھا۔ اس کی لاش اکھاڑے کے کنارے پر پڑی ہوئی تھی۔ پھر تاریکی سے ایک قد آور لڑکا برآمد ہوا۔ اس کے جسم پر انتہائی چست لباس تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں تین کونوں والا نیزہ جسے ترشول کہا جاتا ہے اور دائیں ہاتھ میں مضبوط ڈوریوں کا جال دبا ہوا تھا جن کے آخری حصوں پر وزنی گولے بندھے ہوئے تھے۔ غالباً وہ یہ جال ڈال کر شہباز کو پکڑنا چاہتا تھا۔

شہباز کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ اپنی اصل شخصیت میں واپس آتا جا رہا تھا۔ لڑاکا چاروں طرف گھوم کر ایک طرف رک گیا جیسے فیصلہ کرنے میں الجھن محسوس کر رہا ہو کہ شہباز پر کس طرح حملہ کرے۔ تبھی شہباز نے حقارت بھرے انداز میں اس کی طرف رخ کر کے تھوک دیا۔

''اپنے گھر میں ہو، اپنے ساتھیوں کے درمیان ہو اور اس کے بعد کھڑے سوچ رہے ہو۔ تمہیں تو عورتوں کی طرح میک اپ کر کے کمر لچکانی چاہئے تھی۔''

کچھ لوگ شہباز کے اس جملے پر ہنس پڑے۔ لیکن مدمقابل نے اسے اپنی بدترین توہین محسوس کر کے دانت پیسے اور پھر اس جال کو گھمانا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک خاص انداز تھا جو شہباز کو پسند آیا تھا۔ جال کا محیط پہلے تو محدود رہا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ لیکن شہباز جال کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی اس کی پتلیاں ساکت ہوئیں، شہباز نے اس کی مخالف سمت میں چھلانگ لگائی اور الٹتا ہوا چلا

گیا۔ نائیلون کا مضبوط جال اس سے چند گز کے فاصلے پر گرا تھا۔ یہ ایک انتہائی مہارت کی کوشش تھی۔

شہباز کو اس کے حملے کا اندازہ اس کی آنکھوں سے ہوا تھا، جال سے نہیں۔ اگر وہ جال کی طرف متوجہ ہوتا تو آسانی سے اس کا شکار ہو جاتا کیونکہ اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ جال کب اور کن لمحات میں اس پر پھینکا جانے والا ہے۔ مدمقابل اپنی ناکامی پر جھلا گیا۔ اس نے تیزی سے جال اپنی جانب کھینچا تاکہ اسے دوبارہ شہباز کی طرف اچھال سکے۔ لیکن اس سے پہلے ہی شہباز نے ایک قلابازی کھائی اور اس کے قریب پہنچ کر ایک لات اس کے ماری۔ کنگفو کا یہ خطرناک داؤ اگر صحیح پڑ جاتا تو یہ شخص زندگی بھر واقعی کمر ہی لچکاتا پھرتا۔ لیکن اندازہ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو گیا اور شہباز کی لات اس کی بائیں ران پر پڑی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس نے جال گھما کر دوبارہ شہباز کی جانب پھینکا۔

اس بار نہ صرف یہ کہ شہباز نے اسے ڈاج دیا بلکہ جیسے ہی جال گھوم کر گرا، شہباز نے اس کا ایک کنارہ پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا اور مدمقابل اس جال کے ساتھ ہی کھنچتا چلا آیا اور پھر منہ کے بل زمین پر گرا۔ شہباز نے اسے مہلت نہیں دی اور اس کے ہاتھ سے ترشول چھین کر اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ شہباز نے چند ہی لمحوں میں اس کا کام تمام کر دیا تھا اور چند ہی لمحوں کے بعد چاروں طرف سے غیض و غضب والی آوازیں آنے لگیں۔

وہ لوگ اپنے ساتھی کی موت پر انتہائی برگشتہ ہو گئے تھے۔ لیکن شاید جنگی اصولوں کے مطابق وہ شہباز پر لپکے نہیں تھے۔ ادھر شہباز پوری طرح تیار تھا اور ترشول کا دستہ پکڑے کھڑا تھا۔ پھر اچانک اس نے ترشول اس شخص کی لاش سے کھینچا اور وہ کر ڈالا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ڈمباسٹر کی طرف بڑھا اور ڈمباسٹر ایک طرح دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

''نہیں نہیں...... ایسا مت کرنا، ایسا مت کرنا۔ اگر تم نے یہ کیا تو میرے آدمی تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے۔''

شہباز بے اختیار ہنس دیا، پھر بولا۔ ''لیکن ایسا کرتے ہوئے ان میں سے کم از کم پندرہ

آدمی ہلاک ہوں گے۔ ان پندرہ آدمیوں کو منتخب کر کے میرے سامنے بھیج دو جو ہلاک ہونا چاہتے ہیں۔"

"یہ...... یہ تو کھیل تھا۔ تم اس کھیل سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے ہو کہ قتل و غارت گری پر تل گئے۔" ڈمباسٹر نے مسخرے پن سے کہا۔

"کھیل؟"

"ہاں...... موت کا کھیل۔"

"تم پاگل معلوم ہوتے ہو ڈمباسٹر! بالکل پاگل۔"

"اور تم مجھ سے بڑے پاگل ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، اتنے لوگوں کے مجمع میں تم زندہ بچ جاؤ گے؟"

"آہ...... کاش! یہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ تم اس علاقے کی آزادی کا سودا کر رہے ہو۔"

"چلو ٹھیک ہے، میں سودا کر رہا ہوں، غداری تو نہیں کر رہا۔" ڈمباسٹر نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تو پھر غداری اور کسے کہتے ہیں؟"

"میں تمہیں بتا دوں کہ پینیسکو کے اعلیٰ حکام یہاں آنے والے ہیں اور میں ان سے مذاکرات کرنے والا ہوں۔ پھر اس علاقے کا تمام انتظام میرے سپرد کر دیا جائے گا اور میں...... میں اس علاقے کو گلزار بنا دوں گا۔ پھر اس خطے کا کوئی بھی شخص بھوکا اور ننگا نہیں رہے گا۔"

"یہی بات تو غداری کہلاتی ہے۔ آزادی کی نعمت کو فروخت کر کے تم انہیں روٹی دے رہے ہو۔ کیوں دوستو! کیا آزادی کی قیمت پر روٹی لینا پسند کرو گے تم؟ تم جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں۔ کتا اور صرف کتا۔"

"آزادی کوئی حلوہ نہیں ہے جو تمہیں پلیٹ میں سجا کر پیش کر دی جائے۔ آزادی کے لئے خون بہانا پڑتا ہے۔ جانیں دینی پڑتی ہیں اور یہ لوگ بہت عرصے سے یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ سرجن ڈی گاما نے بغیر کسی صحیح پلاننگ کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اور حقیقتاً اس نے یہاں کی آبادی کو موت کا شکار کر دیا۔ ایسا کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ لوگ اب سکون سے رہنا چاہتے ہیں اور خون کی اس ہولی کو بند کرنا پسند کرتے ہیں۔ خود

اپنے ہاتھوں سے، اپنا لہو اچھالنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مگر تم جو کوشش کر رہے ہو، وہ بے مقصد ہے۔ تم انہیں بہکا کر میرے خلاف کھڑا کرنا چاہتے ہو۔ بڑی احمقانہ اور معصومانہ کوشش ہے یہ بچے! دیکھو، تمہارا قاتل اکھاڑے میں اتر چکا ہے۔"

دفعتہً ہی شہباز نے مڑ کر دیکھا، اکھاڑے میں ایک اور شخص اتر رہا تھا۔ یہ پہلے والے سے زیادہ طاقتور اور جسیم لگ رہا تھا۔ اس کے سینے پر آہنی خول اور ہاتھوں پر فولادی پتر چڑھے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی تلوار تھی جو خاص انداز میں بنائی گئی تھی۔ وہ تلوار کو اس طرح گھما رہا تھا کہ فضا میں ایک خاص قسم کی شائیں شائیں کی آواز ابھر رہی تھی۔

شہباز ایک دم سنبھل گیا۔ آنے والا لڑاکا دانت نکال کر اس کی جانب بڑھا۔ اس نے پہلے شخص کی موت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ مدمقابل بہت پھرتیلا ہے۔ چنانچہ چوہے بلی کا انداز ترک کر کے اس نے اچانک تلوار سے شہباز پر حملہ کیا۔ شہباز نے اس وقت جس فن کا مظاہرہ کیا تھا وہ عام انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ٹانگوں کو سر لچکائے بغیر سیدھا زمین پر لیٹ جانا بالکل لکڑی کے کسی کندے کی طرح۔ اس نے یہی کیا تھا۔ تلوار کا وار خالی گیا۔ شہباز زمین پر لیٹ گیا تھا البتہ لیٹ کر اس نے فوراً ہی ایک لمبی لوٹ لگائی۔ تلوار اس کے بائیں پہلو کے قریب زمین میں گڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے زمین سے نکال کر دوبارہ شہباز پر حملہ آور ہوتا، شہباز نے پلٹ کر پوری قوت سے اس کے پیٹ پر ایڑی ماری اور وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ تکلیف سے سرخ ہو گیا تھا۔ شہباز برق کی طرح اٹھا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے زخموں نے منہ کھول دیئے تھے۔ شدید ترین بھاگ دوڑ ان زخموں کو ایک بار پھر ہرا کر رہی تھی جن پر جما ہوا خون ابھی کھرنڈ کی شکل نہیں اختیار کر سکا تھا۔ تلوار والا پھر سنبھلا اور اس بار اس نے بہت زبردست حملہ کیا لیکن شہباز فضا میں کئی فٹ اونچا اچھلا اور اس کے سر پر سے گزر کر دوسری طرف زمین پر آیا اور اس کے بعد تو شہباز نے اپنا وہی مظاہرہ شروع کر دیا جو وہ سرکس میں کیا کرتا تھا۔

وہ پورے مجمع کے سر پر سے گزر رہا تھا اور لوگ طرح طرح کی آوازیں نکال کر اِدھر سے اُدھر دیکھ رہے تھے جیسے فضا میں کسی مکھی کو اُڑتے دیکھ رہے ہوں۔ پھر شہباز نے وہ کیا

جو کسی کی توقع کے مطابق نہیں تھا۔ اچانک وہ زمین پر گرا اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اکھاڑے کی مٹی اٹھالی اور پھر دونوں مٹھیوں میں ریت لڑاکے کی آنکھوں میں جا پڑی۔ لڑاکے نے یہاں بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا، اس نے پھرتی سے اپنی ڈھال سامنے کر دی۔ ریت اس کی ڈھال سے ٹکرائی اور اس کی بصارت متاثر نہیں ہونے پائی۔ شہباز کو بس اتنا ہی وقت چاہئے تھا کہ وہ چند لمحوں کے لئے اس کی طرف سے غافل ہو جائے۔ وہ ریت سے بچا تو شہباز نے اچھل کر اس کی کلائی پر لات ماری اور اس کے حلق سے ایک بدترین دھاڑ نکل گئی۔

اصولی طور پر اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ جانی چاہئے تھی۔ لیکن ہڈی بچ گئی۔ پھر تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور فضا میں دھاریں بناتی ہوئی دور جا گری۔ اس نے جھلا کر شہباز پر چھلانگ لگائی اور شہباز ایک بار پھر اسی طرح زمین پر لیٹ گیا۔ وہ پھرتی سے ایک طرف لپکا جہاں اس کی تلوار پڑی ہوئی تھی۔ شہباز جانتا تھا کہ اگر اس نے تلوار اٹھالی تو اس بار وہ زیادہ محتاط ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے حلق سے ایک ہولناک دہاڑ نکالی اور وہ شخص ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک لمحے تک اس کی آنکھوں میں حیرت کے سائے لہرائے۔ شہباز کی آواز پھر حلق سے نکلی۔ عجیب سی آواز تھی۔ وہ سب اس پریشانی کا شکار ہو گئے کہ یہ کیا چاہتا ہے اور اس کی توجہ تلوار کی جانب سے بھی ہٹ گئی۔

شہباز نے اسی لمحے سے فائدہ اٹھایا اور دوڑ کر اس پر فلائنگ کک لگائی۔ اس نے اپنی ڈھال سنبھال کر اپنا دفاع کرنا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ شہباز کے پاؤں کی دونوں ایڑیاں اس کے حلق پر پڑیں اور اس کے حلق سے بھنچی بھنچی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ یہ انوکھی آوازیں نکالتا ہوا زمین پر چت گرا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اور منہ کھل گیا تھا۔ شہباز نے جو کچھ کیا تھا، وہ انتہائی سنگین عمل تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کی گردن پیچھے کی جانب لٹک گئی۔ اس کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اسی لمحے شہباز نے لپک کر تلوار اٹھائی اور اپنے حلق سے وحشیانہ چیخیں نکالتا ہوا ڈمباسٹر کی طرف بڑھا۔ اسے اس لڑاکے کی پرواہ نہیں تھی۔ اگر وہ حوصلہ کر کے اس کی جانب بڑھتا تو اس وقت شہباز اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ وہ ڈمباسٹر کے قریب پہنچا اور کہا۔

''ہاں ڈیئر ڈمباسٹر! اب بولو، کیا کہتے ہو؟ شاید اب تم مجھ پر بھوکے شیر چھوڑو گے۔''

ڈمباسٹر ایک بار پھر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ دو بار شہباز نے اس طرح اسے اپنے داؤ پر رکھا تھا۔ اگر چاہتا تو آسانی سے ڈمباسٹر کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا مگر یہ بات بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے بعد کوئی ایسی ترکیب نہیں نکل سکے گی جس سے جان بچائی جا سکے۔ چنانچہ اس نے سنبھل کر اپنے آپ کو پیچھے کیا۔ ڈمباسٹر کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شہباز اسے قتل نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ اس نے کسی قدر پُرسکون لہجے میں کہا۔

''تم واقعی کمال کے انسان ہو۔ اگر تم شیروں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو ان کا انتظام بھی ہو جائے گا۔''

''اور میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ جو کچھ بھی تم میری طرف بھیجو گے ان کا حشر ان دونوں سے مختلف نہیں ہو گا۔''

''چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پَر نکل آتے ہیں سمجھے۔ سرجن ڈی گاما نے بھی میری راہ میں آنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کو ٹھکانے لگا دیا۔ تمہارا کام بھی پہلے تمام ہو چکا ہوتا، مگر ہمیں تم پر قابو پانے میں کچھ دیر لگی۔ تمہارا کیا خیال ہے، تم زندہ سلامت یہاں سے بچ کر جا سکو گے؟''

''سنا تم لوگوں نے...... جس شخص کو تم اپنا دیوتا مانتے ہو یا مانتے تھے اسے اس شخص نے ٹھکانے لگایا۔ یہ اس کا اعتراف کر رہا ہے۔ کیوں......''

''ہاں...... میں اعتراف کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہ بے وقوف تھا۔ اور میں بے وقوفوں کو پسند نہیں کرتا۔''

''ویری گڈ۔ ویسے پینیسکو میں جس شخص سے مجھے ملنا تھا وہ بھی تمہارا ہی آدمی تھا۔ اس لئے تمہیں میری آمد کی خبر مل گئی۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، میں بے وقوف ہوں۔ میں نے پہلے ہی مرحلے پر ایک ایسے مشکوک آدمی کے داخلے کی اطلاع مقامی فوج کو دے دی تھی۔ کیا سمجھے۔ تم بے وقوف آدمی، تم کیا جانو یہاں سب کچھ میرے اپنے بس میں ہے۔ میرے بس میں ہے وہ سب کچھ...... ہم میں سے بہت سے احمقوں کی طرح جنگ آزادی نہیں لڑ رہے بلکہ ہم ہمیشہ اپنے مفاد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ سمجھ رہے ہو؟ ٹھیک ہے تم اپنے آپ کو بہت زیادہ آگے کی چیز سمجھ رہے ہو۔ اب سنبھالو اپنے آپ کو۔ میں جس کو تمہارے مقابلے میں بھیج رہا ہوں، امید ہے

وہ تمہیں پسند آئے گا۔"

شہباز نے تلوار سے زمین پر لکیر کھینچی اور دوبارہ اس طرف مڑ گیا جہاں اس نے دو افراد سے مقابلہ کیا تھا۔ لیکن اچانک ہی اسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ان دونوں لڑاکوں کی لاشیں وہاں سے غائب تھیں۔ انہیں وہاں سے ہٹوا دیا گیا تھا۔

بہر حال شہباز انتظار میں تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے کہ اچانک اسے تیز غراہٹیں سنائی دیں۔ اکھاڑے کے مغربی سمت سے آتی ہوئی ان غراہٹوں نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے اور وہ کانپ اٹھا۔ آوازیں کسی ایک جانور کی نہیں تھیں اور چار یا پانچ جانور بدستور غرا رہے تھے اور یہ جانور بھیڑیئے تھے۔ انتہائی قد آور اور خونخوار بھیڑیئے جو اس دیوار میں بنے ہوئے سوراخ سے برآمد ہو کر اب شہباز کی جانب چل پڑے تھے۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے تماشائیوں کو انہوں نے بغور دیکھا اور یہ جان کر کہ یہ ان کی پہنچ سے کافی دور ہیں، وہ سب شہباز کی جانب بڑھے اور اسی وقت ڈمباسٹر کا بھیانک قہقہہ گونج اٹھا۔

"ہاں مائی ڈیئر! مائی ڈیئر ینگ مین! میرے پیارے دوست، فی الحال تمہاری خدمت میں یہ آدم خور بھیڑیئے موجود ہیں۔ ان کو میں نے بھیڑیوں کی وادی سے پکڑا ہے اور یہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اگر ان پر گزارہ نہ ہوا تو شیروں کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

شہباز سنبھل گیا تھا۔ وہ انسان تھا اور انسانی فطرت کا ہر عنصر اس میں موجود تھا۔ انسانوں سے بھی جنگ نہیں کی تھی اس نے کبھی باقاعدگی کے ساتھ۔ وہ تو سرکس کی زندگی کا ایک خوبصورت پہلو تھا۔ لیکن اب اسے جن حالات میں گزارہ کرنا پڑ رہا تھا وہ بالکل اس کی مجبوری تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بھلا دیا تھا۔ دو نئے کام ہوئے تھے۔ اتنے لوگوں کا قتل اور ایک عورت کی قربت۔ زندگی میں نئی تبدیلیاں آئی تھیں۔ لیکن ان بھیڑیوں کو دیکھ کر صحیح معنوں میں اس کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں اور سر میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا، کیا جائے۔

بہر حال وہ اندر سے خوفزدہ تھا لیکن اب بھی یہ خواہش تھی کہ چہرے سے خوف کا اظہار نہ ہونے پائے۔ اسی وقت ڈمباسٹر کی آواز ابھری۔

"یہ کھیل تمہارے لئے یقینی طور پر دلچسپ ہو گا۔ ان بھیڑیوں کی نمائندگی بھی وہی

بھیڑیا کر رہا ہے جس سے تمہیں ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیا سمجھے۔ اب جس طرح مناسب سمجھو اس سے مل لو۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ بھیڑیئے کافی عرصے سے بھوکے ہیں۔"

شہباز کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یہ الفاظ بھی اس کے لئے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ نقلی بھیڑیا جس میں بھس بھر کر رکھا گیا تھا اور اصل بھیڑیا ان بھیڑیوں میں سے کوئی ہے۔ شہباز کی نگاہیں ان بھیڑیوں پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے ڈمباسٹر پر سے توجہ ہٹالی تھی۔ ویسے بھی وہ پاگلوں کی طرح ہنس ہنس کر اپنی نشست پر اوندھا ہوا جا رہا تھا، شہباز اسے کیا دیکھتا۔

بہر حال یہ ایک بڑی بات تھی کہ وہ سفید بھیڑیا بھی انہی میں شامل تھا اور اس کے ختم ہونے کی اطلاع جھوٹی تھی۔ اس انکشاف نے شہباز میں ایک عجیب سی تبدیلی رونما کر دی تھی۔ اس بھیڑیئے کے زندہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ڈمباسٹر کو بھی ابھی اس راز کی ہوا نہیں لگنے پائی ہے جو اس کی گردن میں محفوظ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھیڑیا ان میں سے کون سا ہے اور یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ وہ بھیڑیئے زمین کی مٹی کریدر ہے تھے۔ ہوا میں منہ اٹھا اٹھا کر جبڑے چلا رہے تھے اور اپنی دُموں کو خوفناک انداز میں بل دے رہے تھے اور اپنے شکار کو سامنے پا کر اس کی تکہ بوٹی کرنے کے لئے بے چین تھے۔

دفعتہً ان میں سے دو اپنی جگہ سے غراتے ہوئے اچھلے اور شہباز نے ان میں سے ایک بھیڑیئے کے دانت اپنی ران کے قریب محسوس کئے۔ اس نے اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے سب سے نزدیکی بھیڑیئے پر تلوار چلائی اور کیا ہی خوبصورت وار تھا یہ۔ بھیڑیئے کی گردن ہوا میں بلند ہوئی اور خون بہاتی ہوئی ایک طرف جا گری۔ شہباز نے اپنی جگہ کھڑے ہوئے فضا میں ایک، دو اور تین چھلانگیں لگائی تھیں اور اس کے بعد وہ زمین پر آیا تو دوسرا وار ایک اور بھیڑیئے پر ہوا تھا۔ وہ اچھل کر اس کے نرخرے میں دانت گاڑھنے ہی والا تھا کہ تلوار بھیڑیئے کے پیٹ میں لگی اور وہ خوفناک آواز نکالتا ہوا دو ٹکڑے ہو گیا۔ شہباز کا وار اتنا بھرپور پڑا تھا کہ بھیڑیا پیٹ کے پاس سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ پھر شہباز بھی دیوانہ ہی ہو گیا۔ اس نے دل میں ایک تہیہ کر لیا تھا کہ اگر کسی بھیڑیئے کا ایک

ناخن بھی اس کے بدن پر لگ گیا تو اپنے آپ کو ان بھیڑیوں کے سپرد کر دے گا تا کہ وہ اس کی تکہ بوٹی کر ڈالیں۔ یہ دیوانگی اس کے اندر ہی پل گئی تھی۔ لیکن خدا نے اس کی یہاں بھی مدد کی۔ بھیڑیئے لپک کر اس پر آتے رہے اور لہولہان ہو کر پیچھے ہٹتے رہے۔ شہباز کو اس کا ہوش نہیں تھا۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد اکھاڑے کا وہ حصہ بھیڑیوں کے خون سے داغدار ہو چکا تھا۔ اور جب ان میں سے صرف دو باقی رہ گئے تو معرکہ آرائی میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ ان باقی بچنے والوں میں شاید سرجن ڈی گاما کا بھیڑیا بھی ہو گا۔ شہباز نے خاص طور سے اس بھیڑیئے کو دیکھا تھا۔ وہ قد و قامت میں دوسروں سے نکلتا ہوا تھا۔ شہباز نے اس پر کئی بار تلوار چلائی لیکن وہ جُل دے کر نکل گیا۔ پتہ نہیں اسے کس طرح اتنی اچھی تربیت دی گئی تھی۔

دفعتہً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ چونک پڑا۔ اس نے بھیڑیئے کو دیکھا، بھیڑیا ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بھیڑیا اس کی بات سمجھ رہا ہو۔ شہباز نے اس سے صاف ستھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں...... تمہیں مجھ پر حملہ نہیں کرنا...... تمہیں مجھ پر حملہ نہیں کرنا۔'' شہباز نے یہ الفاظ کہے۔ لیکن دونوں بھیڑیئے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اب شہباز نے اپنے تجربے کو ناکام قرار دے کر ان میں سے ایک پر تلوار سے وار کیا۔ آنے والا بھیڑیا زخمی ہو کر غراتا ہوا پیچھے چلا گیا۔ اس کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا اور اب تکلیف سے اس کی آواز میں تشنج پیدا ہو گیا تھا۔ شہباز بدستور اپنے الفاظ دوہرا رہا تھا۔

''نہیں...... تم مجھ پر حملہ نہیں کرو گے...... میں...... میں...... سرجن ڈی گاما کا آدمی ہوں۔ سرجن ڈی گاما...... ڈی گاما...... ڈی گاما......'' اور شہباز کے رونگٹے اس وقت کھڑے ہو گئے جب اس نے بھیڑیئے کو ٹھٹک کر رکتے ہوئے دیکھا۔ بھیڑیا اب اس کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا اور دور کھڑا ہوا اپنی دُم کو بل دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ اس کے چہرے کی خوفناک کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی اور شاید وہ لوگ شہباز کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے بھیڑیئے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ بات ان کے لئے ناقابل فہم تھی اور وہ سب سکتے کے سے عالم میں آ گئے تھے۔ ان کی سانسیں بھی رک گئی تھیں۔

شہباز اپنے اس تجربے سے بہت زیادہ خوش تھا۔ ان میں سے کوئی شخص نہیں جانتا تھا

کہ وہ سرکس میں جانوروں کے درمیان رہ چکا ہے اور جانتا ہے کہ سدھائے ہوئے جانوروں کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت بھی اسی انداز میں ان دونوں بھیڑیوں کو حکم دے رہا تھا اور سدھا ہوا بھیڑیا اب اس کی جانب متوجہ تھا اور اس کے احکامات کی پابندی کر رہا تھا۔

''اس طرف...... اس طرف...... وہاں دشمن ہیں، اس طرف...... اس طرف...... وہاں دشمن ہیں۔ ٹوٹ پڑو ان پر...... ٹوٹ پڑو......''

یہ بڑی عجیب بات تھی۔ شہباز کو خود بھی اس کا بہت زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ جانوروں کے ٹرینر جانوروں کو جس طرح ٹرینڈ کرتے تھے اس نے انہیں دیکھا تھا اور اس وقت وہی طریقہ کار استعمال کیا تھا۔ نتیجہ اس کی توقع کے مطابق نکلا۔ اچانک ہی بھیڑیوں نے چھلانگیں لگائیں اور ڈمباسٹر کے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ڈمباسٹر کے آدمی بری طرح بدحواس ہو گئے۔ بھیڑیئے واقعی بھوکے تھے۔ ان کے سامنے جو بھی آیا، انہوں نے اسے بھنبھوڑ ڈالا۔ ڈمباسٹر اور اس کے گرد کھڑے ہوئے بہت سے محافظوں کے ہاتھوں سے ان کے ہتھیار چھوٹ گئے۔ دونوں بھیڑیئے اب ڈمباسٹر پر ٹوٹ پڑے تھے۔ شہباز نے اپنی آنکھوں سے ڈمباسٹر کو دیکھا۔ بھیڑیئے اس کی چندھیاں بکھیر رہے تھے اور ڈمباسٹر کے پورے بدن سے گوشت کے ٹکڑے علیحدہ ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ہی فضا ہولناک دھماکوں سے گونج اٹھی۔ اس میں مشین گن کی رینٹ کے علاوہ دستی بموں کے دھماکے بھی شامل تھے اور اس کے ساتھ ہی شہباز کو سارنیکا کی آواز سنائی دی۔

''فکر مت کرنا...... ہم آ گئے ہیں۔''

اور اس کے بعد انتہائی خوفناک ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ لیکن شہباز اس بھیڑیئے کو نگاہوں میں رکھے ہوئے تھا جو اب بھی انسانی گوشت کے مزے اُڑا رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے سارنیکا کو دیکھا جو اس بھیڑیئے کی جانب دوڑی تھی۔ شہباز اس کے قریب پہنچ گیا۔

''اس نے ڈمباسٹر کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا ہے۔'' سارنیکا اس بھیڑیئے کے سر پر ہاتھ پھیر کر محبت آمیز لہجے میں بولی۔

''پارنس، پارنس! دیکھو میں آ گئی ہوں۔'' بھیڑیئے نے پالتو کتے کی طرح دُم ہلائی اور اس کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ سارنیکا نے کہا۔

''عقل مندی کا تقاضا ہے کہ ہم فوراً یہاں سے واپس اپنے مسکن پر پہنچ جائیں اور اپنے گوریلوں کو ہوشیار کر دیں تا کہ اگر پینیسکو کی فوج یہاں پہنچے تو ہم مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائیں۔''

ڈوگو اور باقی افراد اپنے آدمیوں کو جمع کرنے لگے۔ کچھ جگہوں سے مقابلہ ہوا تھا لیکن یہ زیادہ شدید نہیں تھا۔ شہباز وغیرہ اپنے آدمیوں کا نقصان اٹھائے بغیر آخر کار اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

٭......٭

ایک کامیاب مہم سے واپسی کس قدر فرحت بخش ہوتی ہے اس کا احساس اب شہباز کو پوری طرح ہونے لگا تھا۔ رازل جریری نے علی اصغر کے ساتھ شہباز کا پُر جوش خیر مقدم کیا تھا اور بہت دیر تک اسے گلے لگائے رہا تھا۔ دنیا کا پراسرار ترین شخص رازل جریری جس نے اپنی علیت سے کام لے کر ایک حیرت ناک تجربہ اپنی زندگی میں کیا تھا یعنی یہ کہ وہ اپنے جسم سے اپنی روح کو الگ کر لیتا تھا اور اس کے بعد دوبارہ اپنے بدن میں واپس آجاتا تھا۔ یہ قصے کہانیوں کی باتیں تو معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اگر اس پر شبہ کیا جاتا تو حقیقت کم از کم دو افراد کے سامنے ضرور تھی۔ یعنی شہباز اور علی اصغر جراری۔

ویسے تو حکومت پلاسکو کو اس روح کے بڑے بڑے تلخ تجربات ہو چکے تھے اور رازل جریری نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کافی پیتے ہوئے یہی دلچسپ انکشاف کیا تھا۔

''پلاسکو کے نمائندے جنہیں گھما پھرا کر زوگولینڈ سے لایا گیا تھا حقیقتاً اپنی زندگیاں قربان کر کے میلیکو میں ہماری رہائش گاہ کا پتہ چلانا چاہتے تھے اور تمہیں ایک ایسے راستے پر لگا کر جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا اور ان کے لئے اس لئے کہ راستے میں تمہارا خاتمہ کر دیا جائے۔

پینیسکو کے جن فوجیوں نے تمہیں گھیر کر اپنے بھرپور ذرائع سے کام لیتے ہوئے تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی، وہ درحقیقت حکومت پلاسکو کے انعام یافتہ تھے اور انہیں بھاری رقومات دے کر اور پلاسکو کو غلط راستے پر ڈال کر یعنی یہ کہ پینیسکو کے باغی ایک زبردست امداد پانے والے ہیں۔ حکومت پلاسکو نے ایک بھرپور پلان بنایا تھا لیکن اس کا پلان ناکام ہو گیا۔ مجھے اس کے بارے میں ذرا دیر سے پتہ چلا لیکن شہباز! تمہارے جانے کے بعد

میں ایک پل آرام سے نہیں بیٹھا بلکہ یہ معلوم کرتا رہا ہوں کہ سرجن ڈی گاما کے پاس جو دستاویزات تھیں ان کی حقیقی نوعیت کیا تھی۔ حکومت پلاسکو نے تو یہ صرف روایت کے طور پر عمل کیا تھا یعنی ہماری ضرورتوں کو محسوس کر کے اس نے ہمیں اس راستے پر لگایا تھا اور تمہیں شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہمارا کام بڑی آسانی سے بن گیا اور ہم اس سلسلے میں حکومت پلاسکو کے شکرگزار ہی ہو سکتے ہیں کہ اس نے مذاق ہی مذاق میں ہمیں ایک اہم راستے پر لگا دیا۔ کیونکہ اس دوران میں بھی تھوڑی سی معلومات حاصل کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری یہ معلومات اس دستاویزات سے مکمل ہو جائیں گی۔ لیکن ہمیں کچھ اور بھی انکشافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ کہ حکومت پلاسکو جانتی ہے کہ رازل جریری نے اپنے پاؤں مضبوط کر لئے ہیں اور اب اپنے مشن کی کامیابی کے لئے اسے دولت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے ہمیں اس راستے سے متوجہ کیا۔ اس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دشمن ہمارے معاملات سے ناواقف نہیں ہیں۔

فخر کی بات یہ ہے کہ ایک اتنا بڑا ملک جو پوری دنیا پر اپنا تسلط جمانے کی فکر میں سرگرداں ہے اور کافی جگہ کام کر چکا ہے، ایک معمولی سے سائنسدان یعنی رازل جریری سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ ہر قیمت پر اس کی موت چاہتا ہے۔ خیر...... یہ بہت اچھی بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دشمن ہی زندگی میں تحریک پیدا کرتے ہیں۔ دوست تو ٹھنڈی چھاؤں ہوتے ہیں جن کے ساتھ بیٹھ کر انسان سرمستیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح رگوں میں خون کی روانی انسان کو جلا دیتی ہے اسی طرح ایک خوف کی جدوجہد زندگی اور موت کی آنکھ مچولی جسم کو بھی توانا رکھتی ہے اور روح کو بھی۔ ہمارا ایک مقصد اور ایک مشن ہے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں تفصیل بتانے کے لئے تیار ہوں۔ آؤ، ایک بار پھر میری ان کاوشوں کو دیکھو جو مجھے متحرک کئے ہوئے ہیں۔''

رازل جریری نے انہیں دعوت دی اور اس کے بعد اپنے پروجیکشن روم میں لے گیا جہاں کوئی فلم دکھانے کے مکمل انتظامات تھے۔

عجیب و غریب شخصیت تھی رازل جریری کی بھی۔ اس نے خود ہی کہا۔

''زندگی کا اختتام ہر شخص کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ آنے والے ایک لمحے کے بارے میں بھی نہیں جانتا کہ موت اس سے کتنے فاصلے پر ہے۔ لیکن

یہ بھی قدرت نے اس کی فطرت کا ایک حصہ رکھا ہے کہ اپنا اختتام معلوم ہونے کے باوجود وہ جدوجہد کرتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ اور ایسا ہونا چاہئے۔ میرے ذہن میں بھی ایک طویل منصوبہ ہے۔ اصل میں بات وہی آ جاتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں بچپن ہی سے میں دُکھی انسانیت کے لئے دُکھی رہا ہوں اور آج اس عمر کو پہنچنے کے باوجود میرے دل سے یہ درد کم نہیں ہوا ہے۔ دیکھو، ذرا دیکھو......"

یہ کہہ کر رازل جریری نے ریموٹ کنٹرول سے پروجیکٹر آن کیا اور ایک بڑے اسکرین پر تصویریں نمایاں ہوگئیں۔ یہ تصویریں دنیا کے مختلف گوشوں کی تھیں۔ فلسطینی کیمپوں میں بے کسی اور بے بسی کا شکار فلسطینی باشندے، اسرائیلیوں کے ان پر تشدد و مظالم۔ زندگی اس قدر بے حقیقت، چھوٹے چھوٹے بچے افلاس کا شکار۔ پھر اس کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں تذلیل انسانیت کے خونچکاں منظر۔ کشمیر کی حسین وادیوں میں بے بسی سے روتی ہوئی مائیں اپنے بچوں، شوہروں اور باپوں کے لئے ماتم کناں۔ یہ سارے دلدوز مناظر اسکرین پر آتے رہے اور پھر رازل جریری کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"کیوں...... آخر کیوں؟ یہ سب ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ زمین تو اللہ کی ہے۔ ہر جگہ یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ ایک دوسرے کو دبانے کے لئے زندگی کتنی آسانی سے چھینی جا رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس سارے مسئلے کو درست نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی میری یہی خواہش ہے کہ جہاں اور جس جگہ دُکھی اور زخمی انسانیت کی مدد کی جا سکے، کم از کم اپنا فرض تو پورا کر کے جاؤں۔ یہی میرا مقصد ہے اور اس کے لئے مجھے دولت درکار ہے۔ دولت...... دیکھو، میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ قتل و غارت گری اور دہشت گردی کر کے میں دولت کے انبار لگا سکتا ہوں۔ لیکن فائدہ؟ پھر ان میں اور مجھ میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں اسی لئے اپنی راہ بدل کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی میرے بچو شہباز! علی اصغر! تم دونوں میرے اہم ترین ساتھیوں کی حیثیت سے ہو۔ لیکن دوسرا کام میں نے یہی کیا ہے کہ جگہ جگہ اپنے نمائندے قائم کرتا جا رہا ہوں۔

بہر حال شہباز! تمہاے بارے میں مجھے بار بار کہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا کہ اگر رازل جریری کا کوئی بیٹا ہوتا یا رازل جریری اپنی شخصیت کسی اور میں منتقل کرنا چاہتا تو وہ تم ہوتے اور تم ہو۔ میں تمہیں خوش کرنے کے لئے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا۔ بس یوں سمجھ لو کہ مجھے لگتا ہے

جیسے میرا یہ مشن تمہارے ہی ذریعے انجام پذیر ہوگا۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ ایک بار پھر تم نے ایک کامیاب مہم سرانجام دی ہے اور اب تم دونوں مجھے موقع دو کہ میں اس دستاویز کو دیکھ کر کوئی صحیح نتیجہ اخذ کر سکوں جس کی طرف حکومت پلاسکو نے اس لئے متوجہ کیا تھا کہ شہباز کو شکار کیا جا سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری ایک اہم ضرورت پوری ہونے جا رہی ہے۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے؟"

اس کے بعد رازل جریری نے پورے پانچ دن تنہائی میں گزارے۔

شہباز اس دوران فیض شاہ اور شبیلہ سے ملنے چلا گیا تھا۔ علی اصغر جراری کی ذمے داری یہ لگائی گئی تھی کہ جب رازل جریری اپنے کام سے فارغ ہو جائے تو شہباز کو اطلاع دے دے۔ اور شہباز پانچویں دن علی اصغر جراری کی اطلاع پر ہی وہاں پہنچا تھا جہاں رازل جریری اور علی اصغر ایک اہم انکشاف کرنے کے لئے تیار تھے۔

رازل جریری بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"وہ نہیں ہوا جو ہمارے ذہن میں تھا۔ سرجن ڈی گاما نے جو دستاویز اس بھیڑیئے کی گردن میں پوشیدہ کی تھی، وہ پتہ نہیں کس کے لئے تھی۔ اس نے ایک مائیکرو چپ بنائی تھی جس میں اس نے اپنے مقصد کی تفصیل اکٹھی کی تھی۔ وہ محب وطن شخص حکومت پینیسکو کے چنگل سے اپنی قوم کو، اپنے قبیلے کو نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ لیکن حقیقت بھی یہی ہے کہ خود اس کے دست راست ڈمباسٹر نے اس کے مشن کو ناکام بنا کر اسے قتل کر دیا۔ وہ خود بھی خزانوں کا متلاشی تھا اور اس نے ایک ایسی کتاب دریافت کی تھی جس کے حصول کے بعد وہ بہت سی قوتوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کتاب کے ذریعے وہ کچھ علوم سیکھنا چاہتا تھا اور یہ علوم ہی اسے ان خزانوں کا پتہ دے سکتے تھے جو صدیوں پرانی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے اور جنہیں ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا حل اس کتاب میں موجود ہے اور وہ کتاب، آہ...... وہ کتاب ایسی الجھی ہوئی اور ایسی پراسرار کہانی، شہباز! تم نے اور علی اصغر جراری نے کبھی نہ سنی ہوگی جو میرے علم میں آئی ہو۔ وہ کتاب جس میں ایک خفیہ خزانے کا نقشہ ہے اور اس کے حصول کے پراسرار طریقے ہیں، وہ میزاس کے پاس ہے۔ میزاس، یہ نیا نام میرے علم میں اس دستاویز کے ذریعے آیا ہے۔ میزاس کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ جزیرے پر حکمران

ہے اور خود ابدی زندگی کی تلاش میں ہے۔ کیا ہی الجھی ہوئی کہانی ہے۔ اگر تم اس پر غور کرو تو ششدر رہ جاؤ گے۔"

علی اصغر جراری اور شہباز، رازل جریری کا دمکتا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے اور انہیں واقعی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ درحقیقت کوئی بہت ہی پراسرار داستان جنم لینے والی ہے!

✡......✡
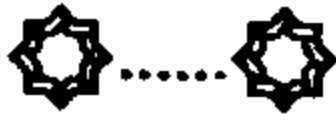
شہباز کی یہ ایڈونچرس داستان ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات کے لئے جلد سوئم کا مطالعہ کریں۔

جانباز
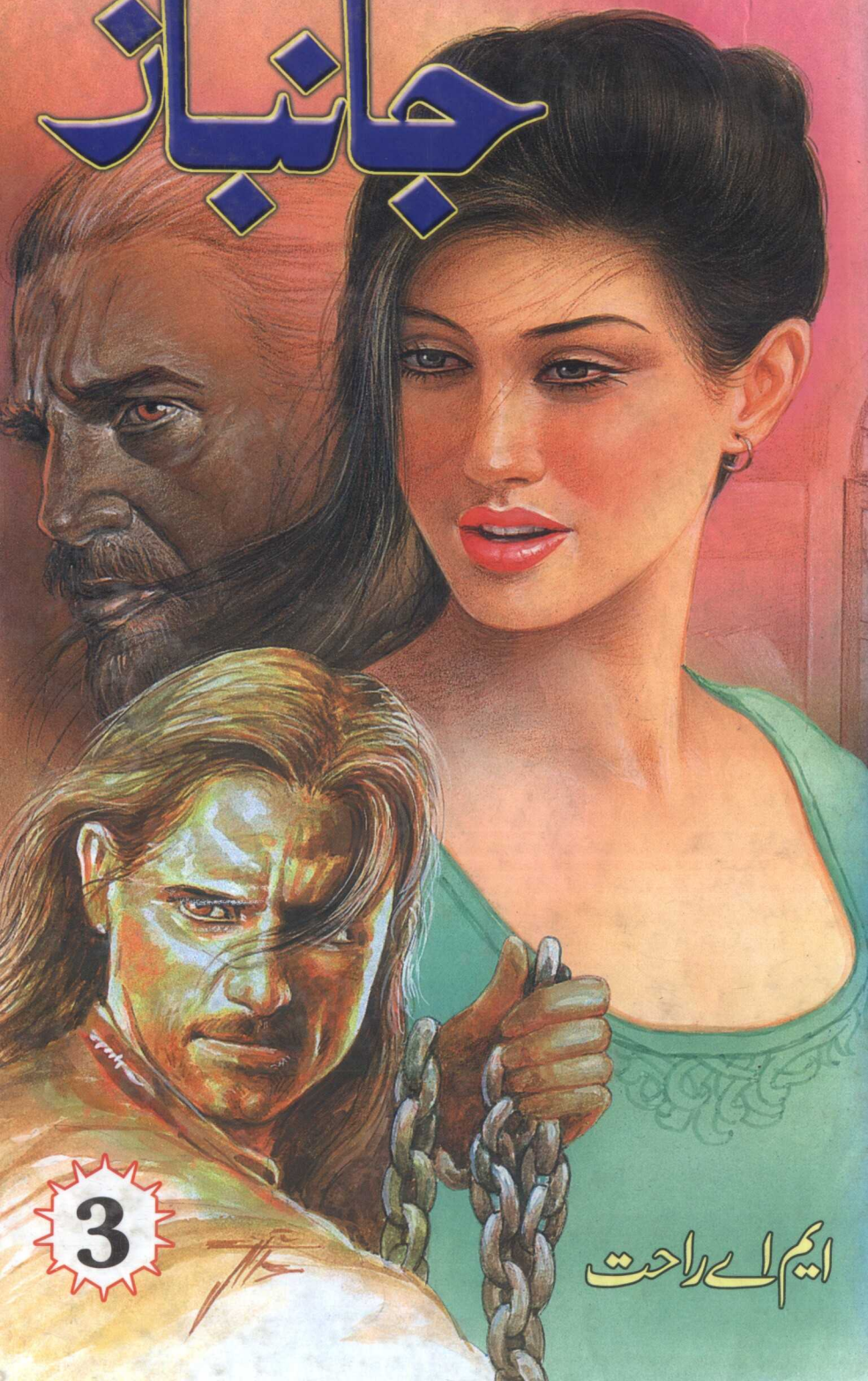
3

ایم اے راحت

پلاسکو میں الیکشن ہوئے۔اس وقت کا صدر پلاٹ ایگل الیکشن ہار گیا اور گارسس کلیٹن پلاسکو کا نیا صدر بنا۔ یہ صدر پہلے پلاسکو کی حکومت میں وزیر دفاع کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا تھا۔اور بہت پہلے سے وہ پلاٹ ایگل کی پالیسیوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ کرسی صدارت پر بیٹھ کر اس نے سب سے پہلے پلاٹ ایگل کے کچھ ایسے قوانین منسوخ کئے جو متنازعہ تھے۔ پلاٹ ایگل کی سیاسی پارٹی ان قوانین کی حمایت کرتی تھی لیکن ایک بہت بڑا طبقہ ایسا تھا جو ان کے خلاف کئی بار آواز اٹھا چکا تھا لیکن اس آواز کو طاقت کے ذریعے دبا دیا گیا تھا۔ گارسس کلیٹن نے برسر اقتدار آتے ہی سب سے پہلے ان قوانین کی منسوخی کا اعلان کیا اور اس کے بعد اس نے اپنا ذہنی بخار نکالنا شروع کر دیا۔ بہت سے معاملات میں پلاٹ ایگل کی پالیسیوں کے خلاف ایکشن لیتے ہوئے اس نے بہت سے افراد کو گرفتار کیا لیکن سب سے پہلے اس نے جو عمل کیا وہ رازل جریری کے خلاف ایکشن لینے کی پالیسی کو سامنے لا کر کیا۔ اپنی ایک خصوصی تقریر میں اس نے کہا۔

''مسٹر پلاٹ ایگل ملک کے لئے جو کچھ بھی رہے ہوں یا رہے ہیں، اعلیٰ ذہانتوں کے مالک اس بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں سب سے پہلے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ایرانی نژاد سائنسدان رازل جریری کو اس قدر اہمیت کا حامل کیوں سمجھا گیا کہ اس کے لئے پلاسکو کی ترقی کا ایک عظیم دور گنوا دیا گیا۔ اور اگر صاحب عقل میرا ساتھ دیں تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اس پالیسی نے پلاسکو کو پچاس سال پیچھے کر دیا۔ وان کیسرو میں اور آرتھینو ویسکو میں ہماری وہ زیر زمین لیبارٹریاں جو تباہی سے دوچار ہوئیں ہمارے ملک کی معیشت اور سائنسی ترقی کا سنگ میل تھیں۔ انہیں رازل جریری کے ہاتھوں تباہ و برباد کرا دیا گیا۔ کیوں؟ کیا وہ بے شمار عظیم سائنسدان کسی طور بھی رازل جریری کی اعلیٰ ذہانتوں سے پیچھے تھے؟ اور اگر ان لیبارٹریوں میں اپنا کام کرتے تو کیا دنیا کے سائنس

ملکوں کے لئے جو سائنسی کام سرانجام دیئے جارہے تھے وہ حکومت پلاسکو کی ترقی میں چار چاند نہ لگا دیتے؟ ان ملکوں نے ہم پر بھروسہ کیا اور ہمیں اپنے کام سونپے۔ یہ تو ایک شاندار پالیسی تھی اور اس سے ہمیں دو فائدے تھے۔ وہ لوگ حکومت پلاسکو کی برتری کو ہمیشہ اپنے سروں پر رکھتے اور اس کے علاوہ ان کے مالی وسائل کا چالیس فیصد حصہ ہمارے پاس آتا رہتا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ پلاسکو کی ترقی ہوتی بلکہ ہم دنیا کے اور بہت سارے ملکوں کو اپنے زیرنگیں لانے میں کامیاب ہو جاتے۔ انتہائی قیمتی زندگیوں اور عظیم سرمائے کا نقصان کیا گیا اور مکمل طور پر اس کا ذمہ دار میں مسٹر پلاٹ ایگل کو قرار دیتا ہوں۔ لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مسٹر پلاٹ ایگل کا جیسے رازل جریری سے کوئی ذاتی تصادم ہوا اور انہوں نے پلاسکو کی تقدیر کو داؤ پر لگا کر رازل جریری سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ ایسی صورت میں، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مسٹر پلاٹ ایگل کو غلط پالیسیوں کا ذمے دار قرار دیا جائے۔ انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ ایسا ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ جہاں میں نے ان کی دوسری بہت سی پالیسیوں کو مسترد کیا ہے وہیں آج سے میں یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ رازل جریری کے خلاف ہونے والی مہم منسوخ کی جائے۔ وہ جہاں بھی ہے، اسے اس کا کام کرنے دیا جائے۔ اور اگر ہم اس کی صحیح نشاندہی پائیں تو اسے اس بات سے مطلع کریں کہ پلاٹ ایگل کی غلط پالیسیوں کا موجودہ حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ پالیسیاں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ اور اگر رازل جریری موجودہ حکومت سے کسی بھی طرح کا تعاون کرنا چاہے تو ہم اسے خوش آمدید کہیں گے۔ جہاں تک اس کے اپنے مشن کا تعلق ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر سے تشدد اور تخریب کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے تو بہرحال ایسی پالیسی کا نام لے کر تو ہم ملکوں پر لشکر کشی کر رہے ہیں۔ ہم اس کی ان کاوشوں کو سراہیں گے اور جہاں ہمارے مفادات مجروح ہوئے وہاں ہم خاموشی سے اس کے کاموں کو مسترد کر دیں گے اور اسے نقصان پہنچائیں گے۔ لیکن پلاسکو بینر پر نہیں، اس پالیسی کو ذہن میں رکھا جائے اور اس کے نئے قوانین منتخب کئے جائیں۔''

گارسس کلیٹن نے اپنا حکم نافذ کر کے پلاسکو کے عہد کا ایک اہم دور ختم کر دیا۔

✡......✡

ادھر رازل جریری ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اپنے

مثلث سے کام لے رہا تھا۔ اصولی طور پر صرف تین افراد تھے۔ بلکہ اگر انہیں دو کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ رازل جریری خود، شہباز اور علی اصغر جراری جو ابھی تک ان تمام کاوشوں میں کوئی نمایاں کام سرانجام نہیں دے پایا تھا۔ البتہ رازل جریری کو ان دو آدمیوں سے بڑی مدد حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کی حفاظت کے لئے ایک ایسا شیشے کا تابوت تیار کیا تھا جس کے اندر لاکھوں خصوصیات تھیں۔ وہ اس کے جسم کی بقاء کے لئے ایٹمی توانائی کے ذریعے مصروف رہتا تھا۔ رازل جریری کے جسم کو بھرپور توانائی حاصل ہو رہی تھی۔ ایسا اس وقت ہوتا تھا جب وہ اپنے جسم کو محفوظ کر کے ہوا کی طرح باہر کی دنیا میں نکل جاتا تھا اور معلومات حاصل کر کے آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رازل جریری نے اپنے ذرائع سے کام لے کر جو دولت اکٹھی کی تھی وہ خاتمے کے قریب تھی اور دنیا بھر میں وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے اس کے پاس وسائل محدود سے محدود تر ہوتے جارہے تھے۔ ایک میٹنگ میں علی اصغر جراری نے تجویز پیش کی۔

''رازل جریری! ہم لوگ انسانیت کی بقاء کے لئے کام کر رہے ہیں۔ دولت کے حصول کے لئے ہم ملکوں کو بلیک میل کر سکتے ہیں۔ دولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط کام نہیں ہے۔''

''ہے میرے دوست! جہاں اپنا ضمیر داغدار ہو جائے وہاں ہم دوسرے کو بے ضمیر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ تمہارے خیال میں کیا یہ تخریب کاری نہیں ہوگی؟ ظاہر ہے اگر کوئی ہمیں کچھ دے گا تو خوش دلی سے تو نہیں دے گا۔ ہم اسے مجبور کر کے وہ سب حاصل کریں گے۔ تو کیا اسے مجبور کرنا غیر انسانی عمل نہیں ہوگا؟'' اس بات کا اعتراف کر لیا گیا تھا۔ رازل جریری نے کہا۔

''میں اس کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ وہ کتاب پراسرار علوم سے تعلق رکھتی ہے۔ پراسرار کالے علوم اور اس کے بارے میں نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ اس کے ذریعے ہر طرح کے خزانوں کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اگر اس زمین میں مدفون وہ خزانے مل جائیں جو اب کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ البتہ اگر ان کی تاریخ کوئی ہے تو الگ بات ہے۔ ویسے ایک دلچسپ بات میں تمہیں بتاؤں۔ ایک تجزیہ کر رہا ہوں میں بہت عرصے سے۔ اور یہ تجزیہ میری دلچسپیوں کو بڑھا رہا ہے۔ علی اصغر جراری کا

حصول اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اس وقت شاہ ایران کے خزانے کو کسی جگہ منتقل کرنے کا ایک ذریعہ بنا تھا اور اس گروپ کے ساتھ گیا تھا جس نے وہ خزانہ منتقل کیا تھا۔ لیکن علی اصغر جراری اس سے ناواقف نکلا اور وہ سب کچھ نہیں ہو سکا جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن بہرحال اس کی زندگی بچ جانا بھی ایک اچھا اور پسندیدہ عمل رہا۔ پھر اس کے بعد ہمیں سونے کے اس بت کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ بلکہ درمیان میں اس دوسرے خزانے کا علم بھی ہوا جو سعدی حشمی اور نظمہ کی زندگی سے تعلق رکھتا تھا۔ سعدی حشمی نے اس خزانے کا ایک حصہ حاصل بھی کیا تھا لیکن بعد میں وہ خزانہ بھی روپوش ہو گیا۔

پھر سونے کے بت کا معاملہ آیا۔ لیکن ہمارے خیال میں وہ اس معیار کی چیز نہیں تھی کہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہم کوئی مہم ترتیب دیتے۔ اصل میں ایک ایسی مہم جوئی چاہتا ہوں میں جس سے ہمیں اتنا کچھ حاصل ہو جائے کہ ہم اپنے طور پر کچھ کر سکیں۔ جادو کی اس کتاب کے بارے میں علم ہوا ہے کہ اس کتاب میں ایسے خزانوں کے حصول کے بہت سے طریقے ہیں۔ اگر وہ کتاب حاصل ہو جائے تو بڑا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہت ہی انوکھے انکشافات ہوئے ہیں اس کے بارے میں اور ایک عجیب الجھی ہوئی کہانی سامنے آ گئی ہے۔ میزاس 9 جزیروں کا حکمران ہے۔ اور سنا یہ گیا ہے کہ وہ اس کتاب کی مدد سے بہت سی پراسرار قوتیں حاصل کر چکا ہے۔ وہ جزیرے سحر الجزائر کہلاتے ہیں اور وہاں جا کر میزاس سے وہ کتاب حاصل کرنا جتنا مشکل کام ہے، مجھے اس کا اندازہ ہے اور میں بہت ہی خلوص اور پیار کے ساتھ تم سے یہ سوال کرتا ہوں شہباز! کہ کیا تم اس کتاب کے حصول کے لئے ان جزیروں تک جا سکتے ہو؟ وہاں ہمیں ایک طویل اور انوکھی مہم جوئی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ وہاں ایک خطرناک انسان کی حیثیت سے جا کر اس کتاب کو حاصل کرنا ممکن ہے۔ کیونکہ یہاں معاملہ ایک حکمران کا ہے۔ اس کے وسائل جو بھی ہوں گے وہ کسی عام قسم کے مجرمانہ ذہنیت کے حامل شخص کے وسائل نہیں ہوں گے۔ اصل میں طریقہ کار یہ اختیار کرنا پڑے گا کہ تم وہاں کسی ایسی حیثیت سے جاؤ جس کے لئے وہاں کوئی جگہ نکل سکے، تم وہاں کوئی مقام بنا سکو۔ اور میں دن رات اسی فکر میں سرگرداں ہوں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے شہباز! کہ کیا تم اس مہم جوئی کے لئے تیار ہو؟''

شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں رازل جریری! کہ میرا باپ گلباز ایک سرکس میں کام کرتا تھا۔ وہاں سے میں نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ وہ جھولے پر انتہائی خوفناک کرتب دکھایا کرتا تھا۔ لیکن اس کی دلی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا یہ خطرناک کرتب نہ کرے۔ اور ہوا یہی۔ میرا باپ جھولے ہی سے گر کر مرا تھا۔ میں اس وقت سرکس کی زندگی سے بہت متاثر تھا اور سوچتا تھا کہ کیا ہی دلچسپ کام ہے یہ۔ کیسی اچھی زندگی گزارتے ہیں یہ لوگ۔ اپنی مرضی سے، اپنی پسند سے ہر کام کرتے ہیں۔ میرا یہ شوق پورا ہوا لیکن اس کے بعد مجھے اپنے باپ کی خواہش کا خیال آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود شاید اس منزل تک نہ آ سکتا۔ میری خوش بختی نے مجھے آپ تک پہنچا دیا رازل جریری! اور اب میں اس پہنچ کی قدر کرتا ہوں۔ چنانچہ مجھ سے سوال کئے بغیر آپ مجھے میری منزل دکھایا کریں۔ مجھے بے انتہا خوشی ہو گی۔''

رازل جریری کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

لیکن پھر کچھ اور دلچسپ واقعات درمیان میں رونما ہوئے۔ رازل جریری چونکہ مسلسل گردش میں رہا کرتا تھا اور اپنے مقصد کے لئے بے جسمی کی شکل میں گردش کرتا رہتا تھا چنانچہ ایک دن اس نے واپس آنے کے بعد انکشاف کیا۔

''شہباز! میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے اپنے ہر مقصد میں ہمیشہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن ایک سچائی ہے جس پر میں یقین رکھتا ہوں۔ اس وقت جب مجھے ان برفانی غاروں میں پھینک دیا گیا تھا، یقین کرو اس وقت بھی مجھے اپنے مستقبل سے مایوسی نہیں تھی۔ میری روح جس قدر وسائل رکھتی تھی، میں ان وسائل سے کام لے رہا تھا اور میں نے پلاسکو کو شدید نقصانات پہنچائے تھے۔ لیکن اس بات کا مجھے یقین تھا آخر کار آسمانوں سے میری مدد ہو گی اور کوئی ایسا ذریعہ ضرور سامنے آئے گا جس سے میں ایک بار پھر اپنا جسم حاصل کر سکوں گا۔ حالانکہ جس جگہ انہوں نے مجھے پھینکا تھا وہاں سے اپنی مقدور بھر کوششوں کے باوجود وہ خود میرے جسم کو باہر لانے میں ناکام رہے تھے۔ بس مجھے ایک بات پر بھروسہ تھا اور وہ یہ تھی کہ جس مقصد کے لئے میں نے اپنے کام کا آغاز کیا ہے اس کی تکمیل ضرور ہو گی۔ پورا پورا یقین تھا مجھے اس بات کا۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کتاب کا حصول بھی ایک کوشش ہے۔ بس ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں اس سے کیا فائدے حاصل ہوں گے۔

امکانات ہیں اس بات کے کہ ان پراسرار علوم کے ذریعے ہم یقینی طور پر کوئی بہتر ذریعہ تلاش کر سکیں گے اور وہ ہمارے حق میں بہت ہی کارآمد رہے گا۔ اور اس کے لئے ہمیں میزاس تک پہنچنا ضروری تھا۔ کچھ تمہاری بھی خوش قسمتی ہے اور کچھ ہماری بھی کہ اس وقت میزاس اپنے 9 جزیروں میں سے کسی جزیرے پر نہیں ہے بلکہ وہ اس وقت لائیٹن میں ہے۔ لائیٹن ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ انتہائی خوش حال اور بہت ہی خوبصورت۔ اکثر بڑے بڑے حکمران موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے لائیٹن آتے ہیں۔ لائیٹن کے شہر ذوگانہ میں بہت ہی شاندار قسم کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں اور یہ جگہ بھی بے مثال ہے اور ان دنوں میزاس لائیٹن آیا ہوا ہے اور لائیٹن کے ہوٹل کار میں وہ مقیم ہے۔ یہ ہوٹل کار جو ہے یہ انڈونیشی ہے اور اسے انڈونیشیا کا ایک خوبصورت تصور دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں بہت پسند آئے گا۔ کار اصل میں کراکاٹو کا ایک سمبل ہے۔ کیا سمجھے؟''

''میں سمجھ رہا ہوں۔

''تو مطلب یہ ہے کہ ہمیں میزاس کے جزیروں پر جا کر میزاس سے وہ کتاب حاصل کرنا تھی۔ لیکن اب میزاس چونکہ لائیٹن میں ہے تو کیوں نہ ہم یہیں اس سے ملاقات کریں اور اسے اپنے مقصد کے لئے حاصل کر لیں۔''

''یعنی اغواء......؟'' شہباز نے پوچھا۔

''سو فیصدی۔ اور اس کے لئے ہمیں کوئی چھوٹا سا منصوبہ بنانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ہر ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' شہباز نے جواب دیا۔

نجانے اس بار علی اصغر جراری کو کیا سوجھی کہ اس نے فوراً ہی فرمائش کر ڈالی۔ ''اور میں جو ایک گھریلو زندگی بسر کر رہا ہوں اس بار یہ فرمائش کئے بغیر نہیں رہ سکوں گا رازل جریری! کہ شہباز کے ساتھ اغوا کی اس مہم میں مجھے بھی شرکت کی اجازت دی جائے۔''

''خوش دلی سے......خوش دلی سے۔ بھلا اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ ہاں اپنے دوست شہباز سے ضرور پوچھ لو۔''

''واہ......اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے علی اصغر جراری! یہ میرے لئے بہت محبت اور احترام کا باعث ہیں اور میں انہیں اپنے بہترین ساتھیوں میں تصور کرتا ہوں۔ اگر یہ اس مہم

کو سر انجام دینا چاہتے ہیں تو میں ان کے زیر ہدایت بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

''نہیں۔ یہ ایک مشترک کام ہے۔ بہرحال میری طرف سے مکمل اجازت ہے۔ تم لوگ جس طرح پسند کرو، لائیٹن روانہ ہو جاؤ۔ ہم اس منصوبے کو آخری شکل دیئے لیتے ہیں۔''

علی اصغر جراری حیرت انگیز طور پر خوش تھا۔ لائیٹن کے دارالحکومت ذوگانہ کے ایئر پورٹ پر جب وہ لوگ اترے تو ان کی روح تک خوش ہو گئی۔ مدھم مدھم کہر نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ہلکی سی سردی کی لہر گردش کر رہی تھی اور ایک عجیب سا سماں بندھا ہوا تھا۔ ایئر پورٹ پر دنیا کے بے شمار ملکوں کے افراد موجود تھے اور خوب رونق نظر آ رہی تھی۔ دن کا وقت تھا لیکن کہر کی وجہ سے مدھم مدھم روشنیاں اپنی بہار الگ دے رہی تھیں۔ جب یہ لوگ امیگریشن وغیرہ کے قوانین سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو ہوٹلوں کے نمائندوں نے انہیں گھیر لیا۔ اپنے اپنے بروشر پیش کئے جانے لگے۔ شہباز نے ہنس کر کہا۔

''علی اصغر جراری! تم آنکھیں بند کر کے ایک بروشر اپنے ہاتھ میں لے لو۔ بس ہم اسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔'' اور علی اصغر جراری نے بھی مستی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے ایک نمائندے کا بروشر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ یہ ہوٹل کالکا تھا۔ ایک ہندوستانی ہوٹل۔ اس کی نمائندہ ایک ہندوستانی لڑکی تھی جس نے ان لوگوں کے کھیل کو دلچسپی سے دیکھا تھا اور پھر وہ انہیں لے کر اس شاندار کیڈلک کی جانب بڑھ گئی جو ہوٹل کی کار تھی۔

''میرا نام سریتا ہے اور میں ہندوستانی ہوں۔''

''آپ کے چہرے سے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔''

''ویسے میرا ہوٹل آپ کو پسند آئے گا۔ ہم ایشیائی لوگ اسی قسم کی سادگی پسند کرتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر آپ کے ساتھ کھیل میں مزہ آیا۔''

سریتا کا کہنا بالکل درست تھا۔ کالکا کی آٹھویں منزل پر انہیں ایک بہت ہی خوبصورت ڈبل روم حاصل ہو گیا لیکن منصوبے کے تحت ایک اور کمرہ بھی حاصل کر لیا گیا تھا جس کے لئے شہباز نے ہوٹل کی انتظامیہ کو بتا دیا تھا کہ اس کے کچھ اور مہمان بھی آ سکتے ہیں۔ ایسا احتیاطاً کیا گیا تھا اور اس کے بعد وہ کالکا میں مقیم ہو گئے۔

یہاں قیام کرنے کے بعد سب سے پہلی منصوبہ بندی کے تحت ہوٹل کے رینٹ اے

کار سے ایک کار حاصل کی گئی اور ڈرائیور سے کہا گیا کہ شہر گردی شروع کر دی جائے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوگانہ انتہائی خوبصورت شہر تھا۔ اس کے بارے میں پتہ چلا کہ ہمیشہ ہی ہلکی کہر میں ڈھکا رہتا ہے۔ سبزہ بے پناہ تھا اور ہر طرف حسین پھول کھلے ہوئے تھے جو خوشبودار بھی تھے اور آرائشی بھی۔ شہر کی عمارتیں بے پناہ خوبصورت تھیں۔ وہ لوگ ڈرائیور سے مختلف معلومات حاصل کرتے رہے۔

دو دن تک یہ سیر و سیاحت کی گئی۔ رازل جریری کی طرف سے انہیں مکمل اجازت دی گئی تھی کہ اپنا کام خوش دلی اور پُر اطمینان انداز میں کریں اور کہیں بھی جلد بازی یا الجھن کا شکار نہ ہوں۔ کیونکہ بہرحال کام سنگین نوعیت کا ہے۔

سحر الجزائر کے پراسرار حکمران کو اغوا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ البتہ رازل جریری نے انہیں جو سہولتیں مہیا کی تھیں وہ ذرا مضبوط نوعیت کی تھیں۔ سحر الجزائر کے حکمران میزاس کے بعد کچھ اور لوگوں کا کام شروع ہو جاتا تھا جن کے بارے رازل جریری نے مکمل معلومات دی تھیں اور انہیں بتایا تھا کہ جس وقت وہ میزاس پر قابو پا لیں تو انہیں کہاں پہنچنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اور اس چیز کو ان لوگوں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔

بہرحال کار کے بارے میں ابھی تک کوئی خاص تفصیلات نہیں معلوم ہوئی تھیں۔ لیکن دو دن تک شہری سیاحت کرنے کے بعد اور اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد جہاں میزاس کو اغوا کرنے کے بعد انہیں پہنچنا تھا انہوں نے کار کی جانب رخ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انڈونیشیا کے آتش فشاں کی طرز پر تعمیر شدہ یہ ہوٹل اپنی مثال آپ تھا۔ اسے ایک آتش فشاں کی شکل دی گئی تھی اور اس میں داخلے کے لئے انوکھے سوراخ بنائے گئے تھے۔ اس کا دہانہ ایسی لائٹوں سے مزین تھا جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس دہانے کے اندر آتش فشاں دہک رہا ہے۔ اپنی نوعیت کا انتہائی منفرد اور خوبصورت ہوٹل ان لوگوں کو بے حد پسند آیا تھا اور اس کا جائزہ لینے کے بعد اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوٹل کی انتظامیہ کو اطلاع دی گئی کہ ایک مشرقی شہزادہ ہوٹل میں قیام کرنے کے لئے آ رہا ہے، اس کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح کے شہزادوں سے ہوٹل کی پوری ہی انتظامیہ خوش رہا کرتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ جو کچھ دے جاتے تھے وہ بے مثال ہوتا تھا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ سحر الجزائر کا حکمران میزاس ہی ان لوگوں کے لئے نعمت بنا ہوا تھا کہ آٹھویں منزل کے اس مسافر

نے اس علاقے کے ویٹرز کو نہال کر دیا۔ اب اتنے وسائل تو تھے ان لوگوں کے کہ وہ اپنا سکہ جمانے کے لئے کچھ بھی کر سکیں اور تدبیر علی اصغر جراری کی تھی۔ اس نے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے شہباز! مجھے معاف کرنا، انسانوں کا تجربہ مجھے شاید تم سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کائنات میں یہ کمبخت دولت جس کے لئے علی رازل جریری جیسا عظیم انسان سرگرداں ہے، بڑی اہم نوعیت کی حامل ہے۔ مقاصد بے شک الگ الگ ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی آسائشوں کے لئے، کوئی اپنے بچوں کی آسائشوں کے لئے اور کوئی کسی عظیم مشن کے لئے خواہش مند دولت کا ہی ہوتا ہے۔ اگر تم اپنا کوئی بلند مقام بنانا چاہتے ہو تو اس دولت کا سہارا لے لو۔ پھر تماشہ دیکھنا'' اور شہباز نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

وہ خود تماشہ دیکھتے رہے اور اس دوران انہوں نے خصوصی طور پر سحر الجزائر کے حکمران میزاس کا بھی جائزہ لیا۔ میزاس کی شان انوکھی تھی۔ گہرے سانولے رنگ کے خوبصورت نقوش کا مالک یہ چالیس بیالیس سالہ شخص بڑی عجیب سی کیفیت کا مالک تھا۔ اس کے اندر ایک انوکھی کشش تھی۔ ویسے تو اس کے ساتھ اور بھی چند افراد ہوتے تھے جو اس کے مختلف کام کیا کرتے تھے لیکن سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ سانولی سلونی ناقابل یقین نقوش کی مالک لڑکی زونا تھی۔ زونا اس کی خاص سیکرٹری تھی اور اس کے سارے پروگرام زونا ہی کے علم میں ہوا کرتے تھے اور علی اصغر جراری نے کہا۔

''ہمیں چونکہ قدم بہ قدم اپنے مقصد کی تکمیل کرنی ہے اور اس کے لئے زونا ایک اہم ذریعہ ہے۔ لیکن شہباز! اگر میں تم سے ایک بات کہوں تو میری بات مان لینا میرے دوست! پہلی بار تمہاری کسی مہم میں حصہ لے رہا ہوں اور اپنے آپ کو آزمانا چاہتا ہوں۔''

''تم بار بار یہ بات کہہ کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو علی اصغر جراری؟ میں تمہارا بے حد احترام کرتا ہوں اور ہر طرح تمہاری بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔''

''تم نے کبھی اپنے آپ پر غور نہیں کیا۔ تم مردانہ حسن کا شاہکار ہو۔ ایک نوعمر اور خوبصورت شہزادہ نجانے کتنی لڑکیوں کے لئے پُرکشش ہو گا۔ تم نے خود تو غور ہی نہیں کیا، جب تم ہوٹل کے ہال میں جاتے ہو تو بے شمار نگاہیں تمہارا طواف کرتی ہیں اور میں آنکھوں کو پڑھنا جانتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے خاص طور سے غیر ملکی دل پھینک لڑکیاں جن کی جانب تم نگاہ اٹھا دو تو تم پر برسنا شروع ہو جائیں۔''

شہباز کو گزرے ہوئے کچھ لمحات یاد آ گئے جس میں اسے ایک حسین جسم نے اپنے سحر میں گرفتار کیا تھا۔ اور اکثر کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں جب اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ گرم گرم سانس اسے اپنے چہرے سے ٹکراتے محسوس ہوتے جنہوں نے اسے زندگی کے ایک نئے سرور سے آشنا کیا تھا۔ لیکن پھر اس کے بعد اس نے ایسی کسی لڑکی کی جانب نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ علی اصغر جراری کی باتوں سے وہ سحر زدہ سا ہو گیا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''کیونکہ تم ایک شہزادے کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہو اور لوگوں نے تمہیں شہزادہ تسلیم کر لیا ہے۔ ایک بیالیس سالہ حکمران کے سامنے ایک بائیس سالہ حسین شہزادہ بڑی زبردست حیثیت رکھتا ہے۔ زونا اگر تمہاری طرف متوجہ ہو جائے تو اس کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ وسیع ہو جائیں گی۔

''اوہ...... لیکن......''

''اس کا ذریعہ تم ہی بنو گے۔ تمہاری دلکش مسکراہٹ اگر زونا کے دل میں اتر گئی تو سمجھ لو کہ عورت بھی بڑی عجیب چیز ہے وہ اپنی پسند کے لئے سب کچھ ٹھکرا دیتی ہے۔''

''ایک عجیب تجربہ ہوگا میرے لئے۔''

''لیکن کارآمد۔'' علی اصغر جراری نے کہا۔

حسین ترین لباس خریدے گئے اور پھر اس شام ''کار'' کے اس حسین ڈائننگ ہال کے ایک گوشے میں جہاں زونا اپنی الگ میز پر بیٹھی ہوئی تھی، اسے یقینی طور پر میزاس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ میزاس عموماً اپنی میز پر تنہا ہی ہوتا تھا یا پھر اس کی پسند کی کچھ شخصیات جو زیادہ تر خواتین پر ہی مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ یہ خواتین اس کی پہلے سے شناسا نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہیں اسی ہوٹل میں ایسی خواتین اس کی قربت حاصل کرنے کی خواہش مند رہا کرتی تھیں جنہیں یہ علم ہو جاتا تھا کہ میزاس 9 جزیروں کا حکمران ہے۔

بہرحال زونا میزاس کی میز سے زیادہ دور نہیں تھی اور اپنی میز پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ علی اصغر جراری کی ڈائریکشن میں سارا کام ہو رہا تھا اور شہباز درحقیقت اس وقت پورے ہال میں جگمگا رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے بلوری گلاس سے کسی مشروب کے ہلکے ہلکے سپ لے رہا تھا کہ زونا کی نظر اس پر پڑی۔ علی اصغر جراری اس تمام کارروائی کا نگران تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کی کاوشیں رنگ لا رہی ہیں...... زونا کی نگاہیں شہباز پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اور پھر شہباز نے نظریں اٹھا کر زونا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور زونا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ کا جواب شہباز نے اسی طرح مسکراتے ہوئے دیا تھا۔ یہ گویا پذیرائی تھی۔ زونا اُسے دیکھتی رہی اور کچھ لمحوں کے بعد میزاس نے اسے طلب کر لیا۔ زونا اٹھ کر پُر ادب انداز میں میزاس کے پاس پہنچ گئی۔ میزاس اسے کچھ سمجھاتا رہا اور زونا گردن خم کئے سنتی رہی۔ پھر وہ وہیں سے باہر نکل گئی تھی۔

میزاس اس کے جانے کے بعد کوئی بیس منٹ تک بیٹھا رہا اور اس کے بعد وہ خود بھی اٹھ گیا۔ قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے اس کے تمام ساتھی جن کی تعداد آٹھ کے قریب تھی، اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ علی اصغر جراری نے کہا۔

''کیا شان ہے اس شخص کی۔ ویسے کچھ لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔''

شہباز نے گردن ہلائی۔ پھر اسی وقت اس نے علی اصغر جراری سے کہا۔

''وہ واپس آ رہی ہے۔''

''اوہو...... لگتا ہے کام بنے گا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ مسکراہٹ جو تمہاری جانب اچھالی گئی تھی اس میں ایک پیغام تھا اور غیر ارادی طور پر تم نے اس پیغام کا جواب بھی دے دیا تھا۔''

اور دونوں نے دیکھا کہ زونا سیدھی اسی میز کی طرف آ رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ قریب پہنچ گئی اور اس نے کہا۔

''میں یہاں بیٹھنا چاہتی ہوں...... کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟''

''ہاں ہاں، بیٹھئے آپ...... براہِ کرم بیٹھئے۔ پرنس! میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' علی اصغر جراری نے فوراً ہی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ زونا کرسی لے کر بیٹھ گئی تھی۔ علی اصغر جراری سیدھا چلا گیا۔ شہباز کے انداز میں ہلکی سی بوکھلاہٹ تھی اور زونا کی تجربے کار نگاہیں اس الہڑ سے نوجوان کا گہرے انداز میں جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ کے بارے میں مجھے علم ہوا ہے کہ آپ کا تعلق ایشیاء کی کسی ریاست سے ہے؟''

''ایں...... ہاں، ہاں۔''

''کیا نام ہے آپ کی ریاست کا؟''

اس سوال کا جواب پہلے سے تیار کرلیا گیا تھا چنانچہ شہباز نے بے تکان اپنی ریاست کا نام لے دیا۔

''یہاں سیاحت کے لئے آئے ہیں؟''

''ہاں۔''

''پرنس! آپ بہت خوبصورت ہیں۔''

شہباز کے چہرے کی قدرتی گلابیاں چمک اٹھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ زونا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اوراس کی آنکھوں میں قربان ہوجانے والی کیفیت تھی۔ وہ کہنے لگی۔

''آپ کو میرا یہاں آنا برا تو نہیں لگا؟''

''نہیں۔''

''آپ مجھے جانتے ہیں؟''

''ہاں...... آپ کو یہاں دیکھا تھا۔ وہ صاحب سحرالجزائر کے حکمران ہیں۔ نام نہیں جانتا میں ان کا۔''

''میز اس۔ دنیا کا حیرت انگیز آدمی۔''

''کیا واقعی......؟''

''ہاں......''

''بہت عظیم خاندان ہوگا اس کا۔''

''خاندان......'' زونا عجیب سے زہریلے انداز میں بولی۔

''کیوں......؟''

''نہیں، اس کا خاندان عظیم نہیں ہے۔ اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے سحرالجزائر پر اپنا اقتدار قائم کیا ہے۔''

''اوہو...... کیا واقعی......؟'' شہباز نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''ہاں...... وہ جادوگر ہے اور شیطان کا پجاری۔''

''کیا مطلب؟''

''بس اتنا ہی بتا سکتی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ بتانا خود میرے لئے عذاب بن سکتا ہے۔''

''مگر تم نے میرے تجسّس کو بھڑکا دیا ہے۔ میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں؟''

''زونا۔''

''میرا نام شہباز ہے زونا! کیا واقعی وہ جادوگر ہے؟''

''ہاں...... براہِ راست اس کا شیطان سے تعلق ہے۔ اوراب وہ ایک انوکھے کھیل میں مصروف ہے۔''

''کمال کی بات ہے...... کمال کی بات ہے۔''

''بہرحال چھوڑو اس کی باتیں۔ اپنی بات کرو۔ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ کیا میں تمہارے ساتھ وقت گزار سکتی ہوں؟''

''اسے اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں...... وہ صرف اپنی ضروریات کا غلام ہے۔ اس کے علاوہ کون کیا کررہا ہے، اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اصل میں وہ بہت زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شیطانی قوتیں اس کا تحفظ کرتی ہیں اور کوئی اسے نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ وہ کسی دن بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوگا۔''

''ایک بات پوچھوں زونا؟'' شہباز نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہاں پوچھو...... تمہارا اندازِ گفتگو مجھے بہت پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دو قدیم شناسا بات کررہے ہوں۔ یہاں میرے نظریئے سے پتہ نہیں تم اتفاق کرو یا نہ کرو۔ بات قدیم شناساؤں کی نہیں ہوتی۔ بلکہ کچھ شخصیتیں اور کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو ایک لمحے کے اندر اندر زندگی کا ایک طویل سفر طے کرلیتے ہیں۔ سالوں کا سفر۔ اور زونا! تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔'' شہباز نے زونا کے چہرے پر ایک پُرمسرت کیفیت پھیلے ہوئے دیکھی تھی۔ اس نے کہا۔

''کیا واقعی تم مجھے یہ مقام دوگے؟''

''دوگے نہیں، دے چکا ہوں۔ ورنہ میں ذرا بے وقوف قسم کا آدمی ہوں۔ خواتین سے

بہت جلد بے تکلف نہیں ہو پاتا۔"

"مجھے لگ رہا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے اہمیت دی۔"

"میں وجہ بتا چکا ہوں کہ بعض اوقات سالوں کا سفر لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔"

"بڑی خوبصورت باتیں کرتے ہو تم شہباز!"

"تو میں تم سے یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پائی جاتی ہے۔"

"کیا؟"

"ایسی جیسے تم...... مجھے معاف کرنا، میزاس کو ناپسند کرتی ہو۔"

زونا نے خلا میں نگاہیں جما دیں اور بولی۔ "تمہارا روم نمبر کیا ہے؟"

"ٹرپل ایٹ۔ یعنی آٹھ سو اٹھاسی۔"

"کیا تم مجھے اپنے کمرے میں جگہ دو گے؟ میں بہت زیادہ دیر تمہارے پاس نہیں بیٹھ سکتی۔ میزاس ابھی واپس آ جائے گا۔ لیکن رات کو ایک بجے اگر تم اپنے کمرے میں میرا انتظار کرو۔"

شہباز نے بادل نخواستہ گردن ہلا دی تھی۔

"میں اٹھتی ہوں۔" زونا اچانک ہی اٹھ گئی اور اس کے بعد وہ ہال سے باہر نکل گئی تھی۔
شہباز بھونچکا سا بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ لیکن ایک بات اس نے دل سے محسوس کی تھی کہ زونا انتہائی پُرکشش لڑکی ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد علی اصغر جراری مسکراتا ہوا آیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں دوست! تم نے دیکھا میری ترکیب کس قدر کارآمد ثابت ہوئی۔"

"تم استاد ہو۔ خاص طور سے لڑکیوں کے بارے میں ماہر ہو۔"

"نہیں...... ایسا نہ کہو میرے دوست! میری زندگی کی جو عظیم ساتھی تھی اس سے تو بچھڑ گیا ہوں میں اور اس کے بغیر یقین کرو دنیا بڑی پھیکی پھیکی لگتی ہے۔"

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بوڑھے ہو گئے ہو اور تمہارے اندر نسوانیت کے لئے کوئی کشش نہیں ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے علی اصغر جراری! جب تم مجھے دوست بنا ہی چکے ہو اور بے تکلف ہو کر تم نے مجھے ایک عجیب راستے پر ڈال دیا ہے تو میں بھی تم سے یہی کہوں گا کہ

زندگی اتنی محدود نہیں ہونی چاہئے۔ وہ تو ایک مجبوری تھی۔ اور انسان مجبوریوں سے نہیں لڑ سکتا۔ لیکن اب اپنی زندگی گزارنے کے لئے کچھ نہ کچھ سوچو۔"

علی اصغر جراری نے گردن جھکائی اور غور کرنے لگا۔ پھر بولا۔

"میں ضرور سوچوں گا۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ ہم اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ اصل میں زونا کے بارے میں اگر تم مجھے تجربہ کار سمجھتے ہو تو میرا تجربہ تھا کہ وہ خود سے باغی لڑکی ہے اور ضرور تمہاری جانب متوجہ ہو جائے گی۔ میری یہ تدبیر کارگر رہی۔ ذرا یہ بتاؤ کہ باتیں کیا ہوئیں؟"

"مختصر یہ کہ وہ اپنے باس میزاس سے نفرت کرتی ہے۔ وجوہات نامعلوم ہیں اور...... اور...... اور"

"اور کے آگے کیا بات ہے...... جھجک کیوں رہے ہو؟"

"رات کو ایک بجے وہ میرے پاس میرے کمرے میں آئے گی۔"

علی اصغر جراری کے انداز سے یوں لگا جیسے وہ اچھل پڑے گا۔ بہرحال اس کا چہرہ پُرمسرت انداز میں دمکنے لگا۔ اس نے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات...... گویا تیر نشانے پر لگا ہے۔"

"ہاں علی اصغر! لیکن...... لیکن......"

"نہیں، جو تلقین مجھے تم کرتے ہو نا خود بھی اس میں آگے بڑھنا چاہئے۔ اور میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ رازل جریری کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

شہباز نے کسی انوکھے خیال کے تحت شرما کر گردن جھکا لی تھی۔

✪......✪

ساری باتیں اپنی جگہ، شہباز ابھی تک اپنی فطرت میں ایک معصوم نوجوان تھا۔ وقت اسے لاتعداد تجربات سے آشنا کر رہا تھا لیکن عمر جس قدر تھی بات کبھی کبھی وہیں آ جاتی تھی۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر رات کا ٹھیک ایک بجا تھا۔ رازل جریری کی ہدایت کے مطابق وہ اصولی طور پر اپنا کام کر رہا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں جو بھی مراحل آتے ان سے تو گزرنا ہی پڑتا۔ علی اصغر جراری چالاک آدمی تھا اس نے راستہ صاف کر دیا تھا اور اس وقت وہ خود کمرے میں موجود نہیں تھا۔

دروازہ کھلا تو خوشبو کا ایک حسین جھونکا اندر آیا اور اس جھونکے میں لپٹی ہوئی زونا بھی اندر آ گئی۔ اس قدر حسین لباس پہنے ہوئے تھی کہ انسان دیکھ کر ویسے ہی مسحور ہو جائے۔ اور جو انوکھی خوشبو اس نے لگا رکھی تھی وہ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور دل آویز انداز میں ایک جگہ رک کر شہباز کو گھورنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

کوئی کسی کی پذیرائی کرتا ہے تو شاید انسان کی زندگی بڑھ جاتی ہے۔ سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں حسین نوجوان! کہ اگر تم ایک ریاست کے شہزادے نہ بھی ہوتے اور ایک عام سے معمولی سے انسان ہوتے تب بھی میری پسندیدگی کا انداز یہی ہوتا۔ تم ایک لمحے کے اندر دل میں اتر جانے والوں میں سے ہو اور سب سے پہلی بات میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تمہاری ریاست میں جاؤں اور تم سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے یہاں سے واپس سحر الجزائر ہی جانا ہوگا اور میں یہ نوکری کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"آؤ بیٹھو...... پہلی بات تو یہ کہ میں نے خواب میں بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہارا مجھ سے لگاؤ کسی لالچ کا نتیجہ ہے۔ میں بھی ان تمام باتوں کو نہیں جانتا۔ لیکن دوسرا سوال میں تم سے ضرور کروں گا۔ یقیناً یہ نوکری تمہارے لئے اتنی ہی منافع بخش ہوگی۔ ظاہر ہے 9 جزیروں کے حکمران کا سیکرٹری ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔"

زونا نے عجیب سی نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور بولی۔

"خیر...... بات اس قدر ذاتی نوعیت کی ہے کہ اس پر کوئی خیال آرائی کی ہی نہیں جا سکتی۔ البتہ اتنا ضرور بتا دوں تمہیں کہ اگر اس کائنات میں مجھے سب سے زیادہ نفرت کسی انسانی وجود سے ہے تو وہ میزاس ہے۔ بس، پلیز ان دلکش لمحات کو مکدر نہ کرو۔" اور پھر زونا آگے بڑھ کر اس کے نزدیک آ گئی اور شہباز نے کھلے دل سے تسلیم کیا کہ اس کائنات میں عورت کا وجود بے معنی نہیں ہے۔ منوچہر کی بیٹی بھی دلکشی میں کسی سے کم نہیں تھی لیکن اس وقت شہباز کا خیال تھا کہ وہ بہت عظیم ہے اور منوچہر نے اس کی جو توہین کی تھی وہ اس کی عظمت پر داغ تھی۔ لیکن زونا نے ایک بار پھر اسے بہت سے احساسات دلا دیئے تھے۔ اور جب طوفانِ بادوباراں میں کچھ کمی ہوئی تو زونا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"جانا ہے مجھے...... ضرور جانا ہے۔ اپنی بات کا بھرم بھی رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔"

"لیکن تم نے میرے ذہن کو جس طرح الجھا دیا ہے وہ بہت عجیب ہے۔ کیا کوئی ایسا عمل ہو سکتا ہے کہ میں تمہارا یہ ذہنی تکدر دور کرنے کی کوشش کروں؟"

"مطلب......؟"

"مطلب یہ کہ میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔"

"نہیں...... ہماری یہ ملاقات پہلی اور آخری ملاقات ہے۔"

"کیوں...... کیا میزاس کل واپس جا رہا ہے؟"

"نہیں...... لیکن میں تم سے زیادہ مل کر تمہارے لئے مشکلات نہیں پیدا کرنا چاہتی۔ بس تم میرے دل کی گہرائیوں میں اترے اور پھر تمہاری قربت نے مجھے سیراب کر دیا۔ میرے لئے یہی مناسب ہے کہ تمہیں بالکل نظر انداز کر دوں۔ میزاس شیطانوں کا شیطان ہے۔ اس کی نگاہیں دیواروں کے پار جھانک لیتی ہیں۔ وہ ضرور میرے اور تمہارے درمیان قربت سے واقف ہو جائے گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ رقابت کا شکار ہوگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں چاہے گا کہ میں کسی اجنبی سے ملوں اور اس کا کوئی راز کہیں چلا جائے۔"

"آہ...... کاش تم مجھے اپنے سارے رازوں میں شریک کر لیتیں۔"

"میرے ایک راز میں تو تم شریک ہو چکے ہو۔" زونا نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر گھڑی دیکھ کر بولی۔ "میں چلتی ہوں۔"

زونا کی قربت سے کوئی خاص بات حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اگر ان لمحات کو خاص کہا جائے تو یہ تھے۔ لیکن پھر زونا ہی کے ذریعے شہباز کو میزاس کے کمرے تک جانے کا موقع مل گیا۔ اس وقت میزاس اپنے آدمیوں کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا۔ زونا ہوٹل کے کوریڈور میں کھڑی باہر برستے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہی تھی کہ شہباز نے اسے دیکھ لیا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ زونا نے اسے دیکھا اور دوسری طرف منہ کر لیا۔

"بات دوبارہ نہ ملنے کی نہیں ہے۔ لیکن ہم اس انداز کو نفرت کا انداز سمجھتے ہیں۔"

"شاید مرتے دم تک میں تم سے نفرت نہ کر سکوں۔" زونا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"پھر یہ منہ پھیر لینا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"یادوں کو تازہ نہیں کرنا چاہتی۔"

"بری بات ہے۔ ٹھیک ہے، نہ سہی۔ لیکن جب تک یہاں ہو، ہم دوستی کا انداز تو اختیار کر سکتے ہیں۔ کیا میزاس اس اپنے کمرے میں موجود ہے؟ غالباً اسی منزل پر وہ ہوتا ہے۔"

"نہیں...... وہ یہ کاغذات میرے حوالے کر کے کسی ضروری کام سے گیا ہے۔ آؤ میں تمہیں اس کے کمرے میں لے چلوں۔"

یہی تو شہباز کا مقصد تھا۔ زونا اسے ساتھ لئے ہوئے میزاس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ شہباز نے کہا۔ "واہ...... ایک بادشاہ کے شایانِ شان کمرہ ہے۔ لیکن افسوس، تم کہتی ہو وہ بادشاہ نہیں ہے۔"

"ہم اس موضوع پر بات نہ کریں تو بہتر ہوگا۔" زونا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

شہباز نے عجیب سی نگاہوں سے زونا کو دیکھا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ زونا کی ذات میں ایسی کوئی خوبی نہیں تھی جسے بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ اس سے تو ملاقات کی وجہ ہی میزاس تھا۔ اور پھر اس کے کمرے میں آ کر شہباز اس کمرے کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ یہ بات تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میزاس وہ کتاب ساتھ لئے نہیں پھرتا ہوگا۔ ایسی قیمتی چیزیں تو ستر پردوں میں رکھی جاتی ہیں۔ لیکن کمرے کو دیکھ کر کم از کم میزاس کی شخصیت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہ پتہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس اندازِ فکر کا حامل ہے۔ اور اگر اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے کیا ذرائع بہتر ہوں گے۔ چنانچہ زونا کی یہ بات اسے پسند نہیں آئی اور وہ عجیب سی نگاہوں سے زونا کو دیکھنے لگا۔ لیکن زونا اس سے بے خبر اپنی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے گردن ہلا کر کہا۔

"یقیناً تم مجھے میزاس کا غلام سمجھتے ہو گے۔ اور بھی بہت سے خیالات تمہارے ذہن میں ہوں گے۔ لیکن تم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔ کیونکہ بالکل اتفاقیہ طور پر تم میری جسم و جاں سے منسلک ہو گئے ہو۔ شاید تم میری بات پر یقین نہ کرو کہ یہ صرف میرا کچلا ہوا وجود تھا جس نے تمہیں اپنے قریب آنے کی اجازت دے دی۔ ورنہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو کسی کی امانت سمجھا ہے۔ مگر یوں سمجھ لو کہ بات پرانی ہوگئی۔ اب تو میں خود اپنی نگاہوں میں

کچھ بھی نہیں رہی۔ میزاس نے مجھے بہت پامال کیا ہے۔ اور یہ جو تمہاری قربت میں نے حاصل کی ہے یہ سمجھ لو کہ صرف اسی جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھی۔ میں نے سوچا کہ میں میزاس ہی کی ملکیت کیوں بنی رہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

شہباز اب بے شمار باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔ اپنی سادہ لوحی کے باوجود دنیا بہر حال اسے تجربات تو دے ہی رہی تھی۔ اور وہ ان تجربات سے دور نہیں تھا۔ وہ خاصی دیر تک زونا کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"زونا! مجھے تم سے بے حد ہمدردی ہے اور شاید آہستہ آہستہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا ہوں۔"

"نہیں...... براہِ کرم ایسا نہ کرنا۔ اس شخص نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ میں ایک لالچ میں اس کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں اسے مطمئن کرنے میں کامیاب ہوگئی تو وہ جس طرح بھی بن پڑے گا، جس طرح بھی ہو سکے گا وہ...... وہ......" زونا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں شروع ہو گئیں۔ وہ آنسو بہاتی رہی۔ جملے درمیان میں ہی رہ گئے تھے اور شہباز بھی سوچ رہا تھا کہ بی بی! خود ہی ذرا اوقات میں آ جاؤ تو تم سے آگے بات کی جائے۔ زونا منتظر رہی کہ شہباز وہ جذباتی اقدامات کرے جو ایسے موقعوں پر کئے جاتے ہیں۔ لیکن سامنے والا ایک ٹھوس دیوار کی مانند تھا جو خاموشی سے بیٹھا اس کی صورت دیکھتا رہا۔ تب زونا کو خود ہی اپنے ہلکے پن کا احساس ہوا۔ اس نے آنسو خشک کئے اور بولی۔

"چلو اٹھو یہاں سے۔ ہمیں بہت دیر تک اس کمرے میں نہیں رہنا چاہئے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ سحر الجزائر کا حکمران لاتعداد شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ کون جانے وہ کہاں سے بیٹھا ہوا ہمیں دیکھ لے۔ اس کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آؤ، پلیز آؤ۔"

وہ اٹھی اور دروازے کی جانب چل پڑی تو شہباز کو بھی بادل نخواستہ وہاں سے اٹھنا پڑا۔ زونا کہنے لگی۔ "تم نے میرے دل کے چھالے پھوڑ دیئے ہیں۔ میرا زخم تکلیف دینے لگا ہے۔ تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ فرازی کون ہے۔"

"فرازی......؟"

"ہاں۔"

"یہ نیا نام ہے میرے لئے۔"

"ہاں...... تم میرے وجود کو اگر پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک دیکھو تو تمہیں فرازی نظر آجائے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"اپنے کمرے میں چلو۔" زونا زبردستی شہباز کو اس کے کمرے میں لے آئی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"آج فرازی میرے ذہن میں پھر سے جاگ گیا ہے۔ آہ...... وہ میرے ذہن میں پھر سے جاگ گیا ہے۔"

"وہ ہے کون......؟"

"میرا محبوب۔ میرا بچپن کا ساتھی۔ میرا خالہ زاد بھائی۔ ہمارا پورا خاندان ایران میں ہی آباد تھا۔ ہم نسلاً ایرانی ہیں اور ہماری زندگی بیشتر وہیں گزری ہے۔ لیکن اس کے بعد تقدیر نے ہمیں نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس دنیا میں نہ میرا کوئی ہے اور نہ فرازی کا۔ اس کی منزل کچھ اور ہو گئی ہے، میری کچھ اور۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک بار بدنصیبی نے اسے اس منحوس شخص کے چکر میں لا ڈالا۔ یعنی میزاس کے سلسلے میں۔ اور میزاس نے اس سے نجانے کیا کیا کام لینا چاہے۔ فرازی اپنی سرکش فطرت کی بناء پر میزاس سے تعاون نہیں کر سکا اور میزاس نے اپنی شیطانی قوتوں سے کام لے کر فرازی کو ایک بہت گہرے جال میں پھانس دیا اور آخر کار اسے ایک بہت بڑا مجرم قرار دے کر کیراس کی جیل تک پہنچا دیا اور کیراس کی جیل کے بارے میں اگر تمہیں کچھ معلوم ہو تو بس یوں سمجھ لو، میرے خدا...... میرے خدا...... میں تمہیں سچ بتا رہی ہوں، فرازی میرے وجود کا ایک حصہ نہیں بلکہ میں ایک مختصر سا حصہ ہوں اور وہ میری ذات میں مکمل...... تمہیں تعجب ہوگا، وہ ایک ایسا انسان تھا جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

وہ شہباز کو فرازی کی کہانی سناتی رہی اور شہباز آنکھیں بند کئے اندر ہی اندر چکراتا رہا۔ اسے ایک دم یہ احساس ہوا تھا کہ اگر یہ داستان رازل جریری تک پہنچ جائے تو ہو سکتا ہے رازل جریری اپنے پروگرام میں تبدیلی پیدا کرے۔ کیونکہ اس نے ابتدا ہی شاہِ ایران کے خزانے سے کی تھی۔ اس کے ذہن میں نجانے کیوں وہ عظیم الشان خزانہ رچا ہوا تھا اور اس

نے چھوٹے چھوٹے خزانوں کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ جیسے سونے کا وہ بت جو تھوڑی سی کوشش کے بعد حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن واقعی رازل جریری کا کہنا درست ہی تھا، کام کیا جائے تو کم از کم اس پیمانے پر کیا جائے کہ اس کے نتائج سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکے۔ بات بالکل سچ تھی۔ لیکن اب فیصلہ یہ کرنا تھا کہ میزاس کی کتاب کا حصول زیادہ ضروری ہے یا پھر فرازی سے ملاقات۔

اور اب اس کے بعد ضروری تھا کہ وہ رازل جریری سے ملاقات کرے اور اپنی اس نئی معلومات سے اسے سرفراز کرے۔ رازل جریری تک پہنچنا بہرحال ایک مرحلہ تھا۔ یہ احساس بھی تھا شہباز کو کہ ہو سکتا ہے رازل جریری اس بات کو پسند نہ کرے اور یہ کہے کہ جو کچھ اسے بتایا گیا ہے وہی اس کے لئے ضروری ہے۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ لیکن رازل جریری نے اس کی پذیرائی کی۔ ویسے تو وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا لیکن جب کبھی شہباز کسی ضروری کام میں مصروف ہوتا تب بھی رازل جریری اسے نظر انداز نہ کرتا۔

"یقیناً میرے بیٹے! میزاس سے مل لئے ہو گئے تم۔ اور نہ بھی ملے ہو گے تو لائیٹن سے یہاں تک کا واپسی کا سفر کسی خاص اہمیت کا حامل ہوگا۔"

علی اصغر بھی پاس ہی موجود تھا اور اب وہ اس قدر ان لوگوں کا راز دار بن چکا تھا کہ اس کے سامنے کوئی بات کہتے ہوئے کسی بھی قسم کی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ اس مثلث کو خود رازل جریری نے ایک بہتر نام دیا تھا۔ شہباز نے کہا۔

"ہاں رازل جریری! مجھے معاف کرنا، میں نے اس بار ذرا اپنی سوچ سے کام لے لیا ہے اور میں نہیں کہتا کہ وہ تمہارے لئے کسی اہمیت کی حامل ہو گی یا نہیں۔ کیونکہ وہ ذرا ایک الگ ہی موضوع رکھتی ہے۔"

"نہیں شہباز! ایسی بات اس کے بعد نہ کرنا۔ تم جانتے ہو کہ دولت ہمیں اپنے لئے درکار نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہم کسی قسم کی مکاری سے کام لے رہے ہیں۔ تم نے مجھے دولت کے حصول کے لئے ایک تجویز پیش کی تھی اور میں نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ اس سے تم یہ اندازہ لگا لو کہ میں اپنے کام میں ایماندار اور مخلص ہوں اور وہ نہیں کرنا چاہتا جو ہماری اپنی کوششوں کو داغدار کر دے۔ کیونکہ ان میں خلوص بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ خیر بات ذرا الگ

ہوگئی۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم اگر کوئی اہم انکشاف لے کر یہاں آئے ہو تو سر آنکھوں پر۔ اور اگر تمہارے دل میں اپنے ماں باپ کی محبت جاگی ہے تو بھی سر آنکھوں پر۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

''شکریہ رازل جریری! آپ نے ہمیشہ میری اسی طرح پذیرائی کی ہے جس کے لئے میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''تم بالکل بے فکر رہو۔ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟''

اور جواب میں شہباز وہ ساری تفصیل رازل جریری کو بتانے لگا جس میں زونا کا ذکر بھی آتا ہے۔ رازل جریری نے مسکرا کر کہا۔

''وہاں میں تمہارا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ وہ لڑکی میزاس کی سیکرٹری ہے اور میزاس اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔''

''ہاں...... بظاہر وہ سیکرٹری ہے لیکن اصل میں وہ میزاس کی قیدی ہے۔''

''قیدی......؟''

''ہاں......''

''دلچسپ انکشاف ہے۔''

''اور اس کے پس منظر میں فرازی کی کہانی ہے۔ نریمان فرازی۔''

''یہ کون ہے؟''

''ایک ایرانی باشندہ جو بڑی خصوصیات کا حامل ہے اور دنیا کے خطرناک ترین مجرموں میں شمار ہوتا ہے۔''

''زونا کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ زونا کا منگیتر ہے اور اس کا محبوب۔''

''ہاں ہے اس وقت؟''

''کیراس کی خوفناک جیل میں۔''

''ہاں...... کیراس کی جیل کے بارے میں بہت سی کہانیاں منظر عام پر آئی ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔''

''میں آپ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔''

''بتاؤ......''

اور اس کے بعد شہباز رازل جریری کو وہ کہانی سنانے لگا جو لڑکی نے اسے سنائی دی۔ دونوں کہانی کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے۔ چونکہ علی اصغر، شاہ کے خزانے کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا بھی تھا چنانچہ وہ بھی اپنی معلومات سے شہباز کی باتوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''اور نریمان فرازی کا نام میں سن بھی چکا ہوں۔ کوئی غیر معروف نام نہیں ہے یہ۔ البتہ اس کے بارے میں مجھے بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔''

''یہ تو واقعی ایک دلچسپ کہانی ہے اور بڑی اہمیت کی حامل۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے...... مگر نہیں، میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ اوہو، ویری گڈ...... دیکھو یہ ایک عجیب و غریب کھیل ہے۔ علی اصغر! تم دیکھ رہے ہو نا، تقدیر ابھی ہمیں اس کتاب تک نہیں جانے دینا چاہتی۔ یعنی شہباز کے ذریعے ہم جو کام کرنا چاہتے تھے، اس نئی داستان سے اس کام میں تھوڑا سا تعطل پیدا ہوگا۔ میں جادو کی اس کتاب کو حاصل تو کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی جو صورتحال میرے سامنے آئی ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔''

''میں بھی اسی سلسلے میں معلومات چاہتا ہوں۔''

''خیر میزاس جب تک لائیٹن میں ہے یا جب وہ اپنے جزیرے پر واپس چلا جاتا ہے، ہمیں اس کا تعاقب تو کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم اس مسئلے کو دیکھیں گے۔ یہ تو بڑا ہی دلچسپ انکشاف ہے۔ میں اب اس سلسلے میں تم لوگوں سے تین دن کی مہلت چاہتا ہوں۔ یہ تین دن گزار لئے جائیں، اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ شہباز! میں ایک انوکھا تجربہ کر رہا ہوں۔ تم اگر چاہو تو اپنے والدین کے پاس جا سکتے ہو۔ یہ تین دن تم وہاں گزار لو۔ تین دن کے بعد میں تم سے ملاقات کر کے نئے منصوبے کی ترکیب کروں گا۔ ویسے میں جو تجربہ کر رہا ہوں وہ بڑی زبردست اہمیت کا حامل ہے۔''

بعد میں علی اصغر جراری کے ساتھ چائے پیتے ہوئے شہباز نے اس تجربے کے بارے میں سوال کیا تو جراری ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''جس وقت تم لوگوں نے مجھے سزائے موت کے وقت جیل سے باہر نکالا تھا تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ بعد میں جو ساری تفصیلات سامنے آئیں انہوں نے

مجھے ششدر کر دیا۔ حکومت پلاسکو بہت دن سے خاموشی کی زندگی گزار رہی ہے اور اس نے رازل جریری کی چھان بین نہیں کی اور اس کا تعاقب نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ بھی معلوم ہوئی ہے کہ پلاسکو میں نئے انتخابات کے نتیجے میں نیا حکمران آ گیا ہے۔ وہ رازل جریری کے خلاف نہیں ہے۔ خلاف تو خیر ضرور ہوگا وہ لیکن جو نقصانات رازل جریری کے ذریعے پچھلی حکومت کو پہنچے ہیں وہ ان کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ اس نے رازل جریری کے سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ بلکہ ممکن ہے کچھ عرصے کے بعد وہاں سے یہ اعلان بھی ہو کہ نئی حکومت رازل جریری کو معاوضہ ادا کرنا چاہتی ہے اور اس سے دوستی کی خواہش مند ہے۔ تم دیکھ لینا، ایسی کوئی بات ضرور ہوگی۔ اور جہاں تک رازل جریری کا تعلق ہے، خدا کی قسم وہ اس دور کا سب سے بڑا جادوگر ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے بڑا جادوگر ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن وہ سائنس کا جادوگر ہے۔ ایسی ایسی انوکھی ایجادات کر رہا ہے۔ وہ مجھ پر تجربے کرتا رہتا ہے۔"

"گڈ...... آج کل کوئی خاص تجربہ ہو رہا ہے؟"

"ہاں...... کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ میں ڈیڑھ دن تک چوہا بنا رہا ہوں۔ ایک دن تک خرگوش اور ایک دن کے لئے کتا۔"

"کیا......؟" شہباز نے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... مجھے ایک چوہے کی سوچ دے دی گئی تھی۔ رازل جریری نے ایک انجکشن کے ذریعے مجھے چوہا بنا دیا تھا۔ میں بلوں میں رہنا چاہتا تھا جبکہ میرا جسم یہی تھا۔ میں کیڑے مکوڑے شکار کر کے کھانے لگا تھا۔ ایسے ایسے گھناؤنے کام کئے میں نے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور اس کے بعد خرگوش بن کر میں نے نجانے کیا کیا سوچا۔ ایک خرگوش کی تمام سوچ میرے ذہن میں سما گئی۔ اور اس طرح میں کتا بھی بنا رہا ہوں۔ رازل جریری کہتا ہے کہ ایک انسان کے لئے جانور کا انداز اختیار کر لینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جبکہ دوسرے انسان کی سوچ کو اپنا لینا کوئی مشکل عمل نہیں ہے۔"

"عجیب و غریب بات ہے، جو یقین کرو آدھی سے زیادہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔" شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس اتنا کہنا چاہتا تھا کہ رازل جریری ایک عالمگیر محقق ہے اور سائنس کی دنیا میں اپنا

کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ اس نے جو مقصد اپنایا ہے اسے ہم دنیا کا عظیم ترین مقصد کہہ سکتے ہیں۔ ویسے اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ ان دنوں وہ خاصا مالی مشکلات کا شکار ہے اور اپنے بہت سے منصوبوں پر صرف دولت نہ ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کر پا رہا۔ اکثر میں نے اسے الجھن کے عالم میں دیکھا ہے۔ ایک دن کہہ رہا تھا کہ علی اصغر جراری! میں اس پورے گھر کے احاطے میں نوٹوں کے انبار لگا دوں اگر مجرمانہ طریقے سے کچھ وصول کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ لیکن پھر میرا پورا نظریہ حیات فیل ہو جائے گا۔ کیونکہ میں نے تو دنیا کی ہر برائی سے گریز کر نے کا سوچا ہے۔ خود ایک برائی میں ملوث ہو جاؤں گا تو ضمیر داغدار ہو جائے گا۔ ورنہ بھلا دوست! میرے لئے کون سی مشکل چیز ہے۔"

"میں اس بات سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔"

بہر حال یہ ساری باتیں شہباز کے علم میں تھیں۔ اور پھر رازل جریری کے ساتھ کچھ وقت گزرنے لگا۔ شہباز کو رہ رہ کر زونا یاد آتی تھی۔ اب اس کی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں اور وہ زندگی کی رنگینیوں کو اپنے آپ سے دور نہیں سمجھتا تھا۔ یہ تو نوجوانی کا ایک حصہ ہوتا ہے اور تجربہ زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اکثر اب اس کے دل میں خواہشیں بیدار ہونے لگتی تھیں۔

ادھر رازل جریری اپنے کام میں مصروف تھا اور یہ حقیقت تھی کہ اسے خاصی مالی پریشانیاں تھیں اور وہ ان پریشانیوں کو دور کرنا چاہتا تھا۔ نجانے کیوں اس کے ذہن پر شاہ ایران کا خزانہ مسلط تھا۔ غالباً اس کا بھی کوئی گہرا ہی پس منظر ہو سکتا تھا۔

بہر حال وہ اپنے طور پر کام کرتا رہا اور آخر کار اس نے ایک دن علی اصغر جراری سے کہا۔

"شہباز کی کیا کیفیت ہے؟"

"ٹھیک ہے...... اپنے والدین کے پاس ہے اور خوش و خرم ہے۔ وہ لوگ غالباً واپس وطن جانا چاہتے ہیں۔ شہباز ایک دن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو میں اپنے والدین کو کچھ عرصے کے لئے اپنے وطن واپس بھجوا دوں اور اگر وہ وہاں مستقل رہنا چاہیں تو انہیں وہیں منتقل کر دوں۔"

"اگر تم رازل جریری سے یہ بات کہو گے تو وہ انکار نہیں کریں گے۔"

"ہاں...... اپنا وطن دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ واقعی اگر وہ جانا چاہیں گے

تو میں بھرپور طریقے سے ان کی مدد کروں گا۔ لیکن ابھی میں کچھ وقت کے لئے ذرا جانا چاہتا ہوں۔ شاید اس میں کچھ زیادہ وقت لگ جائے۔''

''لیکن کہاں؟''

''یہ بات واپس آکر ہی بتا سکتا ہوں۔'' رازل جریری نے کہا اور علی اصغر خاموش ہو گیا۔

بہرحال رازل جریری نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ تیار کیا تھا وہ ایک انتہائی سنگین نوعیت کا حامل تھا۔ کیراس کی جیل معمولی جیل نہیں تھی اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جیلوں سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ کیراس کس قدر خوفناک جگہ ہے۔ جیل کے حکام کا دعویٰ بالکل درست تھا کہ کوئی قیدی یہاں سے فرار ہونے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور یہ اس جیل کی پوری تاریخ تھی جو اس دعویٰ کی تصدیق کرتی تھی۔

سوزانیہ کی واحد جیل وہ تھی جہاں سے قیدیوں کے فرار کی کوئی کوشش اب تک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی کہ اس فصیل کے اندر سزا کاٹنے والے قیدی بڑے شریف النفس اور سیدھے سادھے ہوتے ہیں جو فرار کا خیال دل میں نہ لاتے ہوں۔ اس دنیا کا کون شخص آزاد فضاؤں میں سانس نہیں لینا چاہتا۔ اس جیل کے قیدی بھی آزادی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ یہاں بھی آئے دن فرار کی کوششیں ہوتی رہتی تھیں لیکن ایسی کوششیں کرنے والے یا تو محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے تھے یا دوبارہ پکڑ لئے جاتے تھے اور ایسے موقع پر دوسرے قیدی ہمت ہار بیٹھتے۔

لیکن بہرحال کچھ ہی عرصے کے بعد جیل کے کسی نہ کسی گوشے میں فرار کی منصوبہ بندی ہونے لگتی۔ اصل میں اس جیل کا جائے وقوع بھی انتہائی خطرناک تھا۔ اس کے تین اطراف عمودی پہاڑیاں تھیں، ایک طرف آبادی اور اس کے بعد بلندی پر سوزانیہ کا وہ ریلوے اسٹیشن تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ٹرین یہاں کا راستہ بھول جاتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جس جگہ ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا گیا تھا وہ بڑی آڑی ترچھی تھی اور یہاں آنے والی ٹرین سیدھی پلیٹ فارم پر نہیں جاتی تھی بلکہ مین لائن پر دو تین میل آگے نکل جاتی اور وہاں سے الٹی چلتی ہوئی پلیٹ فارم پر آتی۔ کچھ ایسی صورتحال دوسری ٹرینوں کی بھی تھی۔ یہاں آنے والی ٹرین سیدھی پلیٹ فارم پر آتی اور مختصر سے قیام کے بعد آگے روانہ ہونے کے لئے وہ دو تین میل پیچھے جاتی پھر رخ بدلتے ہوئے مین لائن پر انتہائی تیز

رفتاری سے خطرناک ڈھلان پر اترنے لگتی۔

بہرحال اس صورتحال کی وجہ سے کیراس کی جیل کو ایک ناقابل تسخیر قلعے کی حیثیت حاصل تھی اور سوزانیہ کے اس شہر کو دوسرے شہر سے ملانے والی سڑک وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ سڑک تک پہنچنے کے لئے پہاڑیوں کے درمیان نشیب میں واقع ایک عظیم الشان اور چوڑے دریا سے گزرنا پڑتا تھا۔ قصبے کو ہائی وے سے ملانے والی ذیلی سڑک اس دریا میں سے ہو کر گزرتی تھی جو عام طور پر خشک رہتا تھا۔ لیکن برسات کے دنوں میں سڑک کے راستے پر قصبہ باقی شہروں سے کٹ جاتا تھا۔ کیراس جیل میں سزائے موت یا عمر قید پانے والے قیدیوں کو بھیجا جاتا تھا اور یہاں آنے والے ہر قیدی کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا جاتا تھا کہ اگر وہ اپنی سزا بھگتنے کے دوران جیل کے عملے سے تعاون کرے گا تو ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کچھ رعایت برتی جائے۔ عدم تعاون اور فرار کی منصوبہ بندی کی جسارت میں نہ صرف یہ کہ اس سے اضافی مشقت لی جائے گی بلکہ ممکن ہے کسی ایسی کوشش میں اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔

بہرحال یہ تھی اس جیل کی کہانی اور رازل جریری یہاں بے جسمی کی حالت میں پہنچا تھا۔ اپنے جسم کا تحفظ وہ علی اصغر جراری کے سپرد کر آیا تھا اور علی اصغر جراری ابھی تک ایک بہترین محافظ ثابت ہوا تھا۔

بہرحال یہاں اس کی آمد کا مقصد نریمان فرازی کی تلاش تھا۔ کیراس کی جیل میں آنے کے بعد انسان کی سب سے بڑی خواہش یہاں سے فرار ہوا کرتی تھی۔ لیکن رازل جریری بے جسمی کے عالم میں یہاں پہنچا تھا اور اس ہولناک جیل کا ایک ایک منظر دیکھ کر اس جیسے شخص کا دل وحشت سے کانپ اٹھا تھا۔ جب وہ نریمان فرازی کی تلاش میں کامیاب ہوا تو اس نے دیکھا کہ نریمان فرازی کی قمیض پر قیدی نمبر 916 کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس وقت یہ قیدی جیل کی سیلن زدہ کوٹھڑی میں کسی قدر بے چینی کا شکار نظر آتا تھا۔ وہ کبھی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور کبھی اٹھ کر دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی حالت اس شیر کی سی تھی جسے زخمی کر کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ یہی شخص نریمان فرازی تھا۔

نریمان فرازی کو جب اس جیل میں لایا گیا تھا تو اسے بھی اسی قسم کی وارننگ دی گئی

تھی۔ جس کے جواب میں نریمان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اصل میں جو لوگ اسے یہ وارننگ دے رہے تھے وہ اس کی اصل شخصیت سے واقف تھے۔ حالانکہ اگر وہ نریمان فرازی کی فائل پر نگاہ ڈال لیتے تو شاید انہیں یہ الفاظ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ فرازی پر تین آدمیوں کے قتل کے علاوہ اور بھی بہت سے سنگین الزامات تھے۔ دو قتل اس نے تین سال پہلے کئے تھے۔ اس جرم میں اسے عدالت سے عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی اور اسے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں چھ مہینے کے بعد ہی فرار کی کوشش میں اس نے ایک محافظ کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ دو روز تک وہ شہر میں چھپا رہا اور تیسرے روز رات کے وقت بھیس بدل کر ایک ٹرک کے ذریعے شہر سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ پکڑا گیا۔

اس پر ایک بار پھر مقدمہ چلا۔ مقدمے کی کارروائی ایک سال تک جاری رہی اور اسے لمبی سزا سنا کر ایک بار پھر جیل بھیج دیا گیا جہاں اس نے ایک سال بڑی شرافت سے گزارا لیکن اس طرح قید ہو کر بیٹھ رہنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ آخر کار وہ ایک بار پھر جیل سے بھاگ نکلا۔ اس مرتبہ اس نے فرار ہوتے ہوئے ایک محافظ کی ٹانگ توڑی اور کئی محافظوں کو زخمی کر دیا۔ اس کے جیل توڑنے کے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد پورے شہر کی پولیس کو الرٹ کر کے شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرا دی گئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ پولیس نریمان فرازی کا پتہ نہ پا سکی۔ وہ اس طرح غائب ہوا تھا جیسے دنیا میں اس کا وجود ہی نہ ہو۔

بہر حال تین سال تک وہ جیل سے فرار رہا لیکن پولیس اسے نہیں بھولی تھی۔ اعلیٰ ترین آفیسر اس کی تلاش میں مسلسل مصروف تھے۔ اور آخر کار وہ ایک قصبے سے پکڑا گیا۔ اس مرتبہ اسے ایک اور سنگین جرم میں پکڑا گیا تھا۔ اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ اسے جلدی فیصلہ سنا دیا گیا اور اسے ایک نہایت خطرناک قیدی قرار دیتے ہوئے آخر کار کیراس جیل بھیج دیا گیا۔ مجموعی طور پر اسے اڑسٹھ سال کی سزا بھگتنی تھی۔ اگر وہ مر کر دوسرا جنم بھی لے لیتا تو اس جنم کی زندگی کے آخری لمحوں تک بھی اسے جیل سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

بہر حال اس کوٹھڑی کی لمبائی دس فٹ اور چوڑائی آٹھ فٹ تھی۔ لیکن اس کی چھت کافی اونچی تھی۔ بلندی پر تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا روشن دان بنا ہوا تھا۔ روشندان

تک پہنچنا اگرچہ ممکن نہیں تھا لیکن سکیورٹی کے نقطہ نظر سے اس میں بھی موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگا دی گئی تھیں۔ مضبوط سلاخوں والے آہنی دروازے کے سامنے نیم تاریک سی راہداری تھی جس میں ہر وقت مدھم روشنی کا بلب جلتا رہتا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی جس کا احساس باہر سے آنے والے کو ہی ہوتا تھا۔ اور رازل جریری جب یہاں داخل ہوا تو اس نے بڑی دہشت اور وحشت کے عالم میں یہ جگہ دیکھی۔ جو منصوبہ اس کے ذہن میں تھا اس کے لئے یہ جگہ بڑی ہولناک تھی۔ خاص طور سے اس شکل میں کہ صورتحال کی سنگینی کا احساس رازل جریری کو دہشت زدہ کئے دے رہا تھا۔

بہر حال وہ کوٹھڑی سے واپس نکل آیا۔ نریمان فرازی جیسے مجرم کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا اس کے لئے ضروری تھا۔ کیونکہ اس شخص کو بڑی زبردست حیثیت حاصل تھی۔ کیراس جیل میں صرف ایک نریمان فرازی ہی ایسا قیدی نہیں تھا بلکہ یہاں تو لائے ہی اسی طرح کے قیدی جاتے تھے۔ نجانے کیوں رازل جریری کو یہاں سے کافی دلچسپی پیدا ہو گئی اور جیل کے مختلف حصوں کا جائزہ لیتا ہوا آخر کار وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو غالباً اس جیل کے دفاتر میں سے تھی۔ رازل جریری ان افسروں کا بھی جائزہ لینا چاہتا تھا جو اس جیل کو کنٹرول کئے ہوئے تھے اور اس وقت اس کی تقدیر اسے یہاں لے آئی تھی کیونکہ یہاں پہنچ کر وہ جس راز سے روشناس ہوا تھا اس سے نہ صرف یہ کہ نریمان فرازی کے بارے میں تفصیلات اسے معلوم ہوئی تھیں بلکہ کچھ اور ایسی کہانیاں بھی سامنے آئی تھی جو اس کام کے لئے بہترین ثابت ہو سکتی تھیں۔

جب وہ دفتر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک محافظ دو خوبصورت اور بارعب آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ دفتر کے اندر موجود جیل کے آفیسر نے جس کے شانے کے نشانات بتاتے تھے کہ وہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہے، اٹھ کر آنے والوں کا استقبال کیا۔ اس نے کہا۔

''میرا نام امیرس شکری ہے۔ اور میں اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ براہِ کرم تشریف رکھئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔''

دونوں آدمیوں نے سپرنٹنڈنٹ سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک دراز قامت، طویل جثہ اور تند چہرے کا مالک تھا۔ اس کی اوپر کو ابھری ہوئی مونچھیں اور

چوڑا چکلا سینہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ ایک نڈر، بے باک اور خطرات میں کود پڑنے والا انسان ہے۔ اس نے آرموسی کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا جبکہ دوسرے نے اپنا نام ایزال بتایا تھا۔

بہر حال وہ قدرے مختلف شخصیت کا مالک تھا۔ وہ زیادہ تر دفتروں میں کام کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر آرموسی کی سی تندی نہیں تھی۔ اس کی پیشانی کشادہ اور بال روئی کی طرح سفید اور مونچھیں چھوٹی تھیں۔ لیکن اپنی اس ہیئت میں وہ انتہائی پراسرار شخصیت کا مالک نظر آرہا تھا۔ تعارف ہو جانے کے بعد آرموسی نے اپنے بریف کیس میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر سپرنٹنڈنٹ کی طرف بڑھایا۔ اس کاغذ کی پیشانی پر ابھرے ہوئے حروف میں حکومت کے چیف سیکرٹری کا نام چھپا ہوا تھا اور ایک طرف حکومت کا مخصوص مونو گرام بھی موجود تھا۔ ٹائپ شدہ خط کے اختتام پر چیف سیکرٹری کی مہر اور دستخط بھی موجود تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے وہ خط پڑھنے کے بعد میز کی اس مقفل دراز میں سے نیلے رنگ کی ایک فائل نکالی۔ اس فائل میں بھی اسی طرح کا ایک ٹائپ شدہ خط موجود تھا اور اس پر بھی چیف سیکرٹری کے دستخط اور مہر ثبت تھی۔ یہ خط جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو آج دوپہر ارجنٹ ڈاک سے ملا تھا اور حکومت کے ایک پروجیکٹ کا حوالہ دیتے ہوئے اسے ہدایت دی گئی تھی کہ دو افراد جو اس کے پاس پہنچنے والے ہیں، ان سے ہر طرح کا تعاون کیا جائے۔ خط میں ان دونوں کو مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بتایا گیا تھا۔

دونوں خطوط کا موازنہ کرنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آرموسی کا دیا ہوا خط بھی اس نے فائل میں لگایا اور میز کی دراز میں مقفل کرنے کے بعد ان دونوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ہر چند کہ صورتحال میرے علم میں ہے اور میں آپ لوگوں کی آمد کا مقصد جانتا ہوں۔ لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ میں آپ سے بقیہ تفصیلات پوچھوں۔''

''خط کے مطابق ہمیں نریمان فرازی نامی ایک مجرم کی ضرورت ہے اور اس سے پہلے ہم اس کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے ہیں تاکہ اس سے ملاقات سے پہلے ہمیں اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ ویسے تو ہمیں اس کے بارے میں بریف کیا گیا ہے لیکن پھر بھی بہت ضروری ہے کہ ہم اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔''

''میں اس کا فائل نکالتا ہوں جناب!'' امیرس شکری نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک الماری کی جانب بڑھ گیا۔ غالباً خاص خاص مجرموں کا ریکارڈ وہ اپنے آپس میں ہی رکھا کرتا تھا اور اس کی فائلنگ بہترین تھی۔ کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ نریمان فرازی کا فائل لے آیا۔ اس فائل پر ایک تصویر لگی ہوئی تھی اور اس تصویر کو بھی رازل جریری نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہاں موجود تین افراد کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اس جگہ ایک چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ ایک ایسا پراسرار وجود جس کے بارے میں اگر انہیں تفصیل معلوم ہو جائے تو ان کا دم ہی نکل جائے۔

لیکن بہر حال رازل جریری اپنے ایک خصوصی مقصد سے آیا تھا۔ چنانچہ اس کی تمام توجہ ان لوگوں کی جانب تھی۔ اور پھر امیرس شکری کی آواز ابھری۔

''اس شخص کی تفصیل چند الفاظ میں نہیں بتائی جا سکتی مسٹر آرموسی! یہ ایران کا انتہائی خطرناک اور تیز طرار مجرم ہے اور نہایت ذہین بھی۔ ایران میں یہ شخص مجرموں کے ایک گروہ کا سربراہ ہے۔ کچھ عرصہ اس کے گروہ نے شاہ کے خلاف انقلاب کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی انقلابی پارٹی کے لئے بھی کام کیا ہے اور اس انقلاب کے بعد ایران کا دولت مند طبقہ برسر اقتدار آنے والے فوجی رہنماؤں سے خوفزدہ تھا۔ یہ لوگ اپنی جان کے خوف سے ملک سے فرار ہو رہے تھے اور پاسدارانِ انقلاب ایسے لوگوں کی تلاش میں تھے۔ برسر اقتدار آنے والے فوجی رہنماؤں کا خیال تھا کہ ان لوگوں نے دولت ناجائز ذرائع سے جمع کی ہے اور اس دولت پر عوام کا حق ہے جسے چند لوگوں نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ شاہ کے فرار کے بعد مذہبی رہنما اور انقلاب کے بانی امام خمینی نے ایران کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی صاف الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ انقلاب کی مخالفت کرنے والے ایسے لوگوں کو نہیں بخشا جائے گا جنہوں نے غریب عوام کا خون چوس کر اپنے گھروں میں دولت کے انبار جمع کر رکھے ہیں اور اب ایسے لوگ چوری چھپے ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر پکڑ لئے گئے تو سزا سے نہ بچ سکیں گے۔ پاسدارانِ انقلاب کو منظم کر کے ان کی تنظیم کو کمیٹی کا نام دے دیا گیا تھا اور کمیٹی کا ہر ممبر ایسے لوگوں کی تلاش میں تھا۔ وہ ہر اس شخص کو گرفتار کر لیتے جس پر دولت مند ہونے کا شبہ ہوتا۔ دولت مندوں کے دلوں میں پاسداران کا خوف طاری ہو گیا تھا۔ پاسداران کی کوئی

باقاعدہ یونیفارم نہیں تھی۔ ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ کہیں اس کا تعلق کمیٹی سے نہ ہو۔

فرازی نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس کے آدمی ایسے دولت مند کو تلاش کرنے لگے جو ایران سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ وہ ان سے بھاری معاوضے کے عوض یہ طے کر لیتے کہ اگر وہ اپنی دولت بھی ساتھ لے جانا چاہیں تو انہیں باحفاظت ایران کی سرحدوں سے نکال کر ان کے کسی بھی پسندیدہ ملک یا محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے گا۔ یہ خوفزدہ لوگ فوراً ہی آمادہ ہو جاتے اور اپنی دولت سمیٹ کر فرار کے منصوبے بنانے لگتے۔ لیکن فرازی یا اس کے ساتھی ایسے لوگوں کو سرحد پار کرانے کی بجائے ان کی دولت سمیٹ کر انہیں پاسداران کے حوالے کر دیتے تو انہیں احساس ہوتا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکے ہیں۔ اسی دوران فرازی نے ایک ایسا منصوبہ بنایا جس کو سن کر بے اختیار اس شخص کی جرأت اور ہمت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کو دل چاہتا ہے۔

اس نے تہران میں واقع پاسداران کے ایک گودام سے آدھا ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات چوری کئے اور یہ مال راتوں رات وہاں سے سینکڑوں میل دور پہنچا دیا۔ یہ ہیرے جواہرات اور آدھا ٹن سونا تین دن تک شہر سے باہر ایک کھنڈر میں پڑا رہا۔ اس دوران شہر کی پولیس اور پاسداران فرازی کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ اس طرح غائب ہو چکا تھا جیسے ایران میں کبھی اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ اور پھر ایک ہفتے کے بعد فرازی اطمینان سے رفسنجان، ہرکان اور زاہدان ہوتا ہوا میرجاوادہ سے چند میل دور پہاڑیوں سے سرحد عبور کر کے دوسرے ملک میں داخل ہو گیا۔''

''کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات اور آدھا ٹن سونا.....؟'' ایزال نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، ایسا ہی.....'' سپرنٹنڈنٹ حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''پاسدارانِ انقلاب کے بارے میں تو یہ کہا جاتا تھا کہ وہ بپھرے ہوئے شیر ہیں اور شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔''

''اتنا بڑا کام کرنے کے لئے نریمان فرازی جیسے شخص کی ہی ضرورت تھی جو شیر کا جگر رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا اور اس خزانے کو لے کر نہ صرف ایران کی

سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ جس ملک میں وہ داخل ہوا تھا وہاں کے اہل کاروں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے آخر کار یہ خزانہ ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا۔ اس نے اینٹی اسمگلنگ کے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کر دی اور اس مخبری پر ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت اس مکان پر جہاں فرازی قیام پذیر تھا چھاپہ مار کر اسے خزانے سمیت گرفتار کر لیا گیا۔''

''یہ شخص تو واقعی انتہائی بھیانک صورتحال کا مالک ہے۔''

''ہاں......ایسی ہی بات ہے۔''

''کیا وہ نسلاً ایرانی ہی تھا......میرا مطلب ہے......'' ایزال نے سخت متاثر کن لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں، نریمان فرازی کا باپ نوجوانی میں آرمینیا سے ہجرت کر کے ایران آیا تھا جہاں اس نے ایک ایرانی خاتون سے شادی کر لی۔ وہ مشہد میں تھے۔ فرازی کی پیدائش کے چند ہی سال بعد اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بڑے عجیب و غریب حالات میں پرورش پائی۔ اس کے باپ کا قالین بنانے کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ فرازی اپنے آپ کو ایران کے بہت بڑے رئیس خاندان کا فرد بتاتا تھا۔ اس کی مادری زبان اگرچہ فارسی ہی ہے لیکن آرمینیائی، اُردو، فارسی اور یورپ کی کئی زبانیں اہل زبان کی طرح بول سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایران کا سب سے ذہین اور دلیر مجرم ہے۔ کیا سمجھے آپ۔ اور ہمیں اپنے مشن کے لئے کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔''

سپرنٹنڈنٹ خاموش ہو کر ایزال کی جانب دیکھنے لگا۔ ایزال نے کہا۔ ''اگر اس کا باپ اتنی دولت چھوڑ کر مرا تھا تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ یہ جرائم کی طرف کس طرح راغب ہوا؟''

''یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ کو جیسے فرازی کے شجرۂ نسب سے پوری پوری واقفیت تھی۔ اس نے کہا۔ ''فرازی کے باپ کے انتقال کے دو سال بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ اس کا سوتیلا باپ ایک لالچی آدمی تھا اور اس نے اس کی ماں سے شادی ہی محض دولت کے لالچ میں کی تھی۔ شادی کے فوراً ہی بعد اس نے جائیداد اور دولت پر قبضہ جمانے کے منصوبے بنانا شروع کر دیئے۔ لیکن وہ کمسن فرازی کو اپنے راستے کی

سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ آخر کار اس نے فرازی کو پیرس کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ ایران کے دولت مند طبقے میں اپنے بچوں کو یورپ میں تعلیم دلانا مشن بن چکا تھا۔ فرازی کے باہر جانے کے بعد اس کے سوتیلے باپ نے اطمینان کا سانس لیا اور فرازی کی ماں کو آہستہ آہستہ اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ شروع کے چند برسوں تک تو فرازی کو چھٹیوں میں ایران بلا لیا جاتا تھا لیکن پھر اس معمول میں فرق آ گیا۔ چند مرتبہ سوتیلا باپ اپنی بیوی کے ساتھ اس سے ملنے کے لئے پیرس بھی گیا لیکن پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے باپ نے اسے باقاعدگی سے اخراجات بھیجنا ترک نہیں کیا تھا۔ فرازی جب بھی مشہد آنے کے لئے لکھتا سوتیلا باپ اسے منع کر دیتا کہ اس کی تعلیم کا حرج ہو گا۔ آخر کار کئی سال کے بعد فرازی کوئی اطلاع دیئے بغیر ایران آ گیا۔ اس وقت وہ کوئی اٹھارہ سال کا بھرپور نوجوان تھا۔ جب وہ مشہد میں پہنچا تو یہ انکشاف اس کے لئے بڑا روح فرسا ثابت ہوا کہ اس کی ماں کئی سال پہلے مر چکی ہے اور تمام جائیداد اور کاروبار اس کی زندگی میں ہی اس کے سوتیلے باپ نے اپنے نام منتقل کرا لیا ہے۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا لیکن اسے کسی نہ کسی طرح فرازی نے برداشت کیا۔ البتہ اسے اس بات کا شبہ تھا کہ اس کی ماں کو قتل کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اپنے سوتیلے باپ کے خلاف کچھ بھی ثابت نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ اس کا اپنے سوتیلے باپ سے جھگڑا ہوا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا جرم تھا جس کے لئے اسے سات سال جیل میں گزارنے پڑے۔

جب وہ جیل سے رہا ہوا تو ایک مختلف فرازی تھا۔ وہ جیل سے بہت کچھ سیکھ کر نکلا تھا۔ اس نے اپنا ایک گروہ بنا لیا اور ایک خطرناک مجرم بن گیا۔ کئی سال تک پولیس سے اس کی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ اس دوران وہ کئی مرتبہ ملک سے باہر بھی گیا۔ اس کی ماں کے کچھ رشتے دار مختلف شہروں میں تھے جن سے وقتاً فوقتاً ملتا رہتا تھا۔ اور پھر جب ایران میں شاہ کے خلاف امام خمینی کی تحریک شروع ہوئی تو ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے فرازی بھی انقلابیوں میں شامل ہو گیا۔ وہ ایک ذہین نوجوان تھا اور اس میں صورتحال کو سمجھنے کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ شاہ کے فرار کے بعد ملک میں عجیب افراتفری کی سی کیفیت تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ ذرا سے شبہ میں لوگوں کو گولیوں سے اڑا دیا جاتا تھا۔ بے شمار افراد کو روزانہ شاہ کا حامی ہونے کے شبہ میں موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ فرازی نے صورتحال

سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ پہلے وہ انقلابیوں کے لئے کام کرتا رہا اور ان میں اچھی طرح داخل ہو گیا۔ بڑے بڑے لوگوں کو اس نے ان کی دولت سمیت پاسداران کے حوالے کیا اور اس کے بعد پاسداران پر ہی وار کر دیا اور ان کے گودام سے وہ خزانہ اڑا لیا۔ جعلی کاغذات کے ذریعے اس نے کئی ملکوں کی شہریت حاصل کر لی تھی۔ ایک آدھ جگہ اس نے مقامی جرائم پیشہ افراد کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔

آخر کار ایک دوسرے ملک میں رہ کر اس نے یہاں بھی وارداتیں شروع کر دیں اور ڈکیتی کی ایک واردات کے دوران دو آدمی بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس سلسلے میں جب اس کے خلاف بھرپور طریقے سے کارروائی ہوئی تو اس نے زاہدان کی طرف فرار ہونے کی کوشش کی اور گرفتار ہو گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اس جیل سے فرار ہو گیا۔ فرار کی کوشش میں اس نے جیل کے ایک شخص کو مار بھی ڈالا تھا۔ وہ دو روز تک شہر میں چھپا رہا لیکن تیسرے روز بھیس بدل کر ایک مال بردار ٹرک کے ذریعے شہر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ ایک بار پھر اس پر مقدمہ چلا اور اس مرتبہ بھی اسے لمبی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن جیل کی چار دیواری میں محصور رہنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر جیل سے بھاگ نکلا۔ اس مرتبہ فرار ہوتے ہوئے اس نے ایک محافظ کی ٹانگ بھی توڑ دی۔ اس کے جیل سے فرار ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ لیکن پولیس اس کا کوئی سراغ نہ لگا سکی۔ وہ تین سال تک لاپتہ رہا اور آخر کار چند ہفتے قبل آدھے ٹن سونے اور کروڑوں روپے کی مالیت کے زر و جواہرات سمیت پکڑا گیا۔ اسے نہایت خطرناک قیدی قرار دیتے ہوئے آخر کار کیراس کی جیل بھیج دیا گیا۔ یہ ہے اس کی کہانی۔''

سپرنٹنڈنٹ نے ایزال کو ساری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اپنی دانست میں اس نے یہ کہانی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو سنائی تھی لیکن ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ ایک اور شخصیت اس کہانی کو پوری دلچسپی سے سن رہی ہے اور یقینی طور پر اس کے پس منظر میں کوئی بہت ہی اہم کام سر انجام پانے والا ہے اور یہی ساری تفصیل رازل جریری نے شہباز اور علی اصغر جراری کو بتائی تھی۔

''آدھا ٹن سونا اور کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات کا تو علم ہو چکا ہے اور یہ سونا

اور جواہرات کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ لیکن نجانے کیوں مجھے اس بات پر یقین ہے نریمان فرازی ہی وہ شخص ہوسکتا ہے جو اس سلسلے میں ہمارے کام آسکے۔ اور میں نے اس دوران بہت سے فیصلے کئے ہیں جن کی تفصیل میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔'' شہباز اور اصغر جراری اشتیاق بھری نگاہوں سے رازل جریری کو دیکھنے لگے جو اس وقت اپنے پورے جسم میں تھا اور درحقیقت ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے کر آیا تھا جسے بے مثال کہا جاسکتا تھا۔

کیراس جیل کی ہولناک کہانیاں بڑی مشہور تھیں لیکن ایک شخص نے اسے ایک عام گزرگاہ بنادیا تھا اور اس کا نام رازل جریری تھا۔

''بعد میں، میں نے نریمان فرازی کو دیکھا اور میرا دل و دماغ جھوم اٹھا۔ بلند و بالا قد اور بھرے بھرے جسم کا مالک یہ شخص سو فیصدی شہباز جیسی جسامت کا آدمی ہے اور شہباز! میں اس کی تصویریں بھی لے آیا ہوں۔ یہ میرا اپنا طریقہ کار تھا کہ تصویریں میں نے کس طرح حاصل کیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم میک اپ کے ماہر ہو۔ یہ الفاظ جو میں ادا کر رہا ہوں یہ میرے منصوبے کا ایک حصہ ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ تم میک اپ کے ماہر ہو اور ایک ایسے شخص کو جس نے میک اپ سرجری میں کمال حاصل کیا ہو، اس چہرے کو اپنانے میں کوئی دقت نہیں پیش آئے گی۔ جبکہ جسامت کے لحاظ سے یہ ایک بہترین تصور ہوگا۔''

شہباز نے شدید سنسنی محسوس کی تھی۔ اس نے کہا۔

''تو کیا مجھے نریمان فرازی کی جگہ لینی ہوگی؟''

''ہاں...... تم نریمان فرازی کی حیثیت اختیار کرو گے۔ اور سنو، ایک بات میں تمہیں اور بتادوں۔ میرے اپنے تجربے کے مطابق جس کا تجربہ میں تم سے پہلے بھی کر چکا ہوں، میں تمہیں مکمل طور پر نریمان فرازی کا ذہن دوں گا۔ یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا میرے لئے۔ اس کی بھی تفصیل میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ شہباز! تم اپنی بہترین جسمانی اور عملی صلاحیتوں سے کام لے کر جیل میں داخل ہو گے۔ لیکن بےفکر رہو۔ میں اس وقت تمہارے اندر موجود ہوں گا۔''

''اندر......؟''

''ہاں...... میرا جسم یہاں پر رہے گا اور میں اپنے ہوائی وجود کو لئے ہوئے ہر جگہ آجا سکتا ہوں۔ تمہارے دماغ میں محفوظ ہو جاؤں گا۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا تجربہ ہے جسے میں

پچھلے دنوں کرتا رہا ہوں اور مقدور بھر جو کچھ مجھ سے ہوسکتا ہے وہ میں کرلیا کرتا ہوں۔ یعنی کسی دوسرے انسان کے ذہن میں منتقل ہونا۔ لیکن اپنے طور پر تمہاری شخصیت کم نہیں ہو جائے گی۔ مزہ آئے گا تمہیں کہ تمہارے اندر دو وجود شامل ہوں گے۔ یعنی پہلے میں اور دوسرا نریمان فرازی۔''

''کیا......؟'' شہباز اچھل پڑا۔

''ہاں...... وہ تمہارے دماغ کے اندر رہے گا اور جو کچھ ہدایت تم اسے دو گے اسے قبول کرنا پڑے گی۔ یعنی حاوی تم ہو گے۔ کیونکہ تمہارا جسم اور تمہارا دماغ دونوں تمہارے اپنے ہیں۔ اور وہ صرف تمہارے دماغ کا قیدی۔ کیسی انوکھی بات ہے۔ مزہ آئے گا نا تمہیں۔ وہ زندہ سلامت ہوگا۔ اپنے طور پر سوچے گا۔ اپنے طور پر کام کرے گا۔ لیکن تمہارے احکامات کا پابند ہوگا۔ کیونکہ یوں سمجھ لو کہ تمہارا دماغ اس کے لئے ایک کرائے کا گھر ہوگا اور وہ اس کرائے کے گھر میں رہنے پر مجبور ہوگا۔ یہ کام میں کروں گا۔ حکومت پلاسکو بڑے بڑے تجربات کر رہی ہے۔ وہ خلا پر حکمران ہونے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ آسمان کے تمام سیاروں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ زمین پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ رازل جریری پر قابو نہیں پاسکے اور شاید ایسا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔ انہیں اپنے خوابوں کی یہ تعبیر کبھی نہیں ملے گی۔ اور رازل جریری ان کے ہر اس راستے میں رکاوٹ بنتا رہے گا جو دنیا کے لئے خطرناک ہو۔ کیونکہ میں نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کردیا ہے۔ تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تم یہاں سے جاکر اس جیل میں داخل ہو گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ پھر اس کے بعد یوں ہوگا کہ میں تمہارے ذہن سے نکل جاؤں گا اور نریمان فرازی کے دماغ کو خالی کر کے تمہارے دماغ میں منتقل کردیا جائے گا تاکہ تم اسی کے انداز میں سوچو، اسی کے انداز میں عمل کرسکو۔ بے شک جسم تمہارا ہوگا، دماغ اس کا۔ لیکن اس دماغ پر بھی تم حاوی ہو گے اور جو حکم اسے دو گے اسے وہی کرنا ہوگا۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ پھر میں اپنے آپ کو اس کے جسم میں داخل کردوں گا۔ تم اس کی جگہ اپنے چہرے پر میک اپ کئے ہوئے موجود ہو گے اور میں تمہاری کاوشوں سے دوسرا میک اپ اس کے چہرے پر کر کے وہاں سے اس کے جسم سمیت نکل آؤں گا۔ پھر ہم اس کے جسم کو اس وقت تک یہاں محفوظ کردیں گے جب تک کہ تم اپنا کام مکمل نہ کرلو۔ سمجھ رہے ہو نا تم میری

بات؟ تم مکمل طور پر نریمان فرازی ہو گے۔ اس کے ماضی، حال اور مستقبل سے واقف۔ اس کے ہر عمل کے حکمران اور یہ عمل تمہارے ذریعے ہوگا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''آہ..... کیا یہ ایک ناقابل یقین بات نہیں ہے؟''

''ہزاروں باتیں ناقابل یقین ہوتی ہیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھو۔ ہر وہ بات جس کا تصور تمہارے ذہن میں آ جائے، ناقابل یقین تو ہوتی ہے ناقابل عمل نہیں ہوتی۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟''

شہباز گردن ہلانے لگا۔ اصغر جراری حیران نگاہوں سے رازل جریری کو دیکھ رہا تھا۔ رازل جریری نے کہا۔ ''میں تمہارے لئے میک اپ کا سامان مہیا کرتا ہوں اور تم اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔''

یہ ذمے داری سونپ کر رازل جریری وہاں سے چلا گیا۔ شہباز واقعی ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سارے وجود میں ایک اینٹھن تھی۔ رازل جریری سے نریمان فرازی کے بارے میں جو کہانی سنی تھی وہ اس کے سارے وجود میں گردش کر رہی تھی۔ سنگدل، بے رحم، درندہ، وحشی، انسانوں کو با آسانی قتل کر دینے والا یہ شخص جو دھوکے بھی دے سکتا تھا اور دھوکے کھا بھی سکتا تھا۔ ہر جگہ ہر وہ کام کر سکتا تھا جو انسانیت سے بعید ہو۔ اور اب یہ کام شہباز کو اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینا پڑے گا اور رازل جریری کا یہ بھیانک تجربہ اس کے لئے بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ لیکن رازل جریری جو کچھ کہہ دیتا تھا، وہی ہوتا تھا۔

میک اپ کر لیا گیا اور رازل جریری کے علاوہ علی اصغر نے بھی حیرانی سے کہا۔

''حقیقت ہے کہ یہ فن بھی جادوگری ہے۔''

''ہاں..... شاید نریمان فرازی خود بھی شہباز کو اس وقت دیکھ لے تو یہی تصور کرے گا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔''

.....
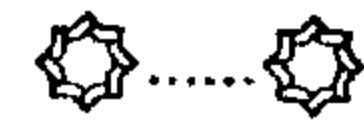
کیر اس جیل کے وہ منتظمین جنہوں نے کیر اس جیل کو ناقابل تسخیر قرار دے دیا تھا اور اس بات کا دعویٰ کر دیا تھا کہ کیر اس جیل سے کوئی قیدی کبھی فرار نہیں ہو سکتا اگر اس کارروائی کے بارے میں جان لیتے تو انہیں سر ہی پیٹ لینا پڑتا۔ یعنی دو افراد ایسے تھے جو آسانی سے اس جیل میں داخل ہو سکتے تھے اور یہاں سے نکل سکتے تھے۔ ہاں وہ دشوار گزار راستے انہیں بے شک ذرا مشکل ہی سے طے کرنا پڑے تھے جو جیل تک جانے کا راستہ تھے لیکن اس کے بعد شہباز جیسا خطرناک جمناسٹر اتنے آرام سے جیل میں داخل ہوا کہ جیل کے محافظ شبہ بھی نہ کر سکے۔ جیل کے اردگرد کی فصیلیں اس کے لئے ایک تفریح گاہ ثابت ہوئی تھیں اور وہ بڑے آرام سے ان فصیلوں کو عبور کر کے محافظوں کی سرچ لائٹوں سے محفوظ ہو کر جیل میں داخل ہو گیا تھا۔

رازل جریری کا تو خیر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ چھپتا چھپاتا انتہائی مہارت اور مشاقی کے ساتھ ایسی جگہوں پر سفر کرتا ہوا جہاں سفر کرنا انسانی قدموں کی بات نہیں تھی یعنی جیل کی چھتیں، دروازے، کھڑکیاں، ایک چھوٹی سی ابھری ہوئی ایسی جگہ جہاں ایک لمحے کے لئے پاؤں ٹکایا جا سکے۔ اور اس کے بعد جیل کی کوٹھڑیاں۔ رات کا وہ وقت تھا جب محافظ سو رہے تھے اور ہر طرف سکون ہی سکون پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوتے سوتے چونک پڑتے تھے اور اپنی ذمے داری کا مظاہرہ کر کے یہ سوچتے تھے کہ سب ان کی جانب سے مطمئن ہوں گے۔ پھر جیل کی کوٹھڑی کا دروازہ بھی نہایت مہارت سے کھول لیا گیا اور یہ کام بھی بخوبی سرانجام دیا گیا۔ دنیا کا خطرناک ترین آدمی نریمان فرازی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس بلند و بالا قد و قامت کے مالک شخص کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ واقعی ان تمام روایتوں کا امین ہے جو اس سے متعلق ہیں کچھ دیر کے بعد جب اسے اپنے دماغ میں سرسراہٹ محسوس ہوئی تو وہ کلبلا کر رہ گیا البتہ یہ ہوش اسے اس وقت آیا تھا جبکہ وہ خود

ناہوشی کی منزل میں داخل ہو گیا تھا۔ رازل جریری کا تجربہ کام کر رہا تھا اور اس کا جسم دماغ سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ خود رازل جریری اس وقت شہباز کے دماغ سے نکل گیا اور زمین پر اس کے برابر لیٹا ہوا اپنی زندگی کے اس عجیب و غریب تجربے میں مصروف تھا۔ اسے اپنے سارے وجود میں ایک عجیب اینٹھن کا احساس ہو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انوکھا عمل ہو رہا ہو۔ جس سے وہ خود بھی ناواقف ہو دنیا کا عظیم ترین سائنسدان دنیا کا عظیم ترین ہمدرد ایک ایسا شخص جس کا اپنا نقطہ نظر کچھ بھی نہیں تھا۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے مصروف عمل تھا اور یہ کام تقریباً تیس منٹ میں پورا ہو سکا۔

اب نریمان فرازی کا دماغ اس کے جسم سے جدا ہو چکا تھا اور وہ ایک بے دماغ کا شخص تھا جبکہ اس کا اپنا دماغ اب شہباز کے دماغ میں موجود تھا اور شہباز ایک اجنبی وجود کو اپنے اندر محسوس کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا بوجھ اس وقت تک محسوس ہوتا رہے گا جب تک کہ وہ اس کا عادی نہ ہو جائے۔ پھر رازل جریری نے دوسرا عمل کیا اور بڑے آرام سے اس کے جسم میں منتقل ہو گیا۔ نریمان فرازی کا جسم اب جسم تھا لیکن دماغ رازل جریری کا تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ادھر شہباز بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا رازل جریری نے اس سے سوال کیا۔

''تم کیا محسوس کر رہے ہو۔''

''اپنے اعصاب پر ہلکا سا دباؤ۔'' ''ہاں بالکل۔ لیکن اس کا دورانیہ دس سے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ہوگا اس کے بعد تم ایک اجنبی وجود کو اپنے اندر برداشت کرنا سیکھ جاؤ گے اور اس کے بعد جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا۔''

''ہاں۔ لیکن میں اس سلسلے میں تشویش کا شکار رہوں گا کہ آپ اس شخص کے جسم کے ساتھ کیسے باہر نکلیں گے۔''

''بڑی آسانی سے۔ تم اس کے لیے بالکل بے فکر رہو۔ میرے پاس ایک نوجوان اور طاقتور جسم ہے اور میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ سرکس کا جمناسٹر کس طرح اس جیل کی دیواروں کو ناکام بنا سکتا ہے اور محافظوں کو کس طرح بیوقوف بنا سکتا ہے اور ایک بات تم اور بھی ذہن میں رکھو میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بڑے آرام کے ساتھ یہاں اپنا کام جاری رکھو۔ میں اپنا کام کر لوں گا۔ میری طرف سے قطعی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور بہتر کام یہی ہوتا ہے کہ انسان یکسو ہو کر اپنا عمل کر سکے۔''

اور اس کے بعد رازل جریری جیل کی کوٹھری سے باہر نکل گیا تھا۔ اس نے کھولا ہوا تالا دوبارہ اپنی جگہ لگا دیا تھا اور یہ کام اس طرح سے ہو گیا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے۔ البتہ شہباز کے لیے یہ انوکھا تجربہ اب آہستہ آہستہ دلکشی کا حامل ہوتا جا رہا تھا۔ رازل جریری نے شہباز کو جس حد تک صورتحال سے آگاہ کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقامی حکومت نریمان فرازی سے کوئی کام لینا چاہتی ہے اور اس کے لیے منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ رازل جریری نے اسے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا تھا۔ کہ جیل میں داخل ہونے کی وجوہات کچھ اور تھیں یعنی کہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ نریمان فرازی بھی زونا کا محبوب جس کے بارے میں زونا نے انکشافات کیے تھے یقیناً شاہ کے خزانے سے متعلق بہت سی اہم باتیں جانتا ہے لیکن یہاں جو صورتحال تھی وہ کچھ اور تھی۔

بہرحال وہ انتظار کر رہا تھا اور یہ انتظار اسے مزید دو دن کرنا پڑا اور ان دو دنوں میں اسے کم از کم اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ جیل کے احکام کو اس پر کوئی شبہ نہیں ہے البتہ نریمان فرازی نے اس کے دماغ میں بڑی اچھل کود مچائی تھی۔

''کیا ہے یہ سب کچھ تم کون ہو جو مجھے اپنے ساتھ ساتھ نظر آتے ہو۔ یہ سب میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا۔ مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہارے وجود کا قیدی ہوں۔''

''ہاں۔ تم میرے وجود کے قیدی ہو۔ تمہارا دماغ میرے قبضے میں ہے اور تمہارا جسم محفوظ۔ میں تم سے جو کچھ کہوں گا تمہیں وہی کرنا ہوگا اسی میں تمہاری بقا ہے اور دوسری صورت تمہارے لیے سخت نقصان دہ ہوگی۔ میں تمہارے ذہن کو ہی ختم کر دوں گا۔'' شہباز کی خوفناک آواز نے نریمان فرازی کو متاثر ضرور کیا تھا لیکن وہ ایک بے جگر شخص تھا اس نے کہا۔

''آخر تم چاہتے کیا چاہتے ہو۔''

''بس یہی کہ تم میرے وجود میں زندہ رہو۔ میں اپنے دماغ کو تم پر مسلط نہیں ہونے دوں گا بلکہ خاموشی سے نگاہیں جھکائے تمہیں تمہارا کام کرنے دوں گا لیکن شرط یہی ہے کہ جو اچھل کود تم کر رہے ہو وہ نہ کرو اور اس کے بعد بقیہ اڑتالیس گھنٹے ان دونوں کی دوستی میں گزرے تھے نریمان فرازی نے اسے ایک اچھا انسان تسلیم کر لیا تھا وہ اپنے وجود کو اسی شکل میں دیکھتا تھا اور مضبوط آہنی سلاخوں والے دروازے کے سامنے جس پر ہر وقت ایک مدھم

روشنی کا بلب جلتا رہتا تھا۔ موجود نریمان فرازی شہباز کے جسم میں زندہ تھا۔ بڑی دلچسپ کیفیت تھی یہ دو وجود یکجا ہو گئے تھے اور ایک وجود نے دوسرے کو مکمل آزادی بخشی تھی اس وقت بھی نجانے کیوں فرازی کا ذہن منتشر تھا۔ وہ بے چین انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اب اس وقت چونکہ وہ شہباز کے جسم میں تھا اس لیے شہباز ہی کے انداز میں سوچ سکتا تھا۔

بہر حال وہ گزارہ کر رہا تھا۔ آخر کار وہ وقت آ گیا جس کی نشاندہی رازل جریری نے کی تھی اور شہباز جس کا منتظر تھا۔ اچانک راہداری میں قدموں کی گونج سنائی دی اور شہباز ٹہلتے ٹہلتے رک گیا وہ دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر متوقع نگاہوں سے آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے اندر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے ایک سے زیادہ ہیں اور اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا کچھ دیر کے بعد جیل کا سپرینٹنڈنٹ مسلح محافظوں کے ساتھ راہداری میں نمودار ہوا اور اس کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی منتخب کی اسے تالے کے سوراخ میں گھمایا اور تالہ کھول دیا۔ شہباز آنے والے کو گھورنے لگا تھا۔ تبھی سپرینٹنڈنٹ کی آواز ابھری۔

''مسٹر نریمان فرازی! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی گئی۔'' شہباز نے حیرانی سے سپرینٹنڈنٹ کو دیکھا۔ پتہ نہیں یہاں قیدیوں کے ساتھ یہی شریفانہ اندازِ گفتگو استعمال کیا جاتا ہے۔ یا پھر اس وقت اسے فوقیت دی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ سپرینٹنڈنٹ کا سوال بھی خاصا معنی خیز تھا۔ جس کے بارے میں شہباز ے کہے بغیر رہ نہ سکا۔

''آفیسر! تم نے کچھ عجیب سا سوال کیا ہے یہ تو ایسی بات ہے جسے کسی شخص کو دو چار روز بھوکا رکھ کر پوچھا جائے کہ تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی۔''

''میرا مطلب نہیں سمجھے تم۔ جہاں تک اس کوٹھری اور جیل کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پوچھنے کا مقصد تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خلاف قانون سختی تو نہیں کی گئی ہے۔''

میرے خیال میں تو میرے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ بھی خلاف قانون ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ اس تنگ اور غلیظ کوٹھری میں کوئی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ یہ الفاظ شہباز کے نہیں بلکہ نریمان فرازی کے تھے جو اس نے اپنی مرضی سے ادا کیے تھے اور اب شہباز نے اس کے ذہن کو اس کی مرضی پر آزاد چھوڑ دیا تھا اور اپنے ذہن کو ایک مخصوص نقطے پر مرکوز کر لیا

تھا یعنی اس وقت اس کا جسم صرف جسم تھا۔ دماغ کچھ بھی نہیں تھا اور اس جسم پر نریمان فرازی مکمل طور سے قابض تھا۔ سپرینٹنڈنٹ کی آواز ابھری۔

''اس معاملے میں میرے اختیارات محدود ہیں تمہارے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ تم ایک خطرناک مجرم ہو اس لیے تم پر سختیاں کی جائیں۔ تم خود سوچو تم پر کم از کم تین افراد کے قتل اور متعدد بار جیل توڑنے کا امکان ہے اور آخری مرتبہ پکڑے گئے تھے اور تمہارے حصے سے آدھا ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات برآمد ہوئے تھے۔ جیل کی تاریخ میں اتنی ساری مقدار میں سونا او ہیرے جواہرات اسمگل کرنے کا کیس بھی ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ تم نے یہ سونا اور ہیرے جواہرات کہاں سے حاصل کیے تھے۔''

''عزت افزائی کا شکریہ۔'' شہباز نے خشک لہجے میں کہا۔ لیکن اسے مکمل طور پر احساس تھا کہ اس وقت اس کی زبان نہیں بلکہ نریمان فرازی کی زبان مصروف عمل ہے اس کا تند لہجہ ابھرا۔

''میرا خیال ہے تمہیں میرے بارے میں بہت کم بتایا گیا ہے۔ میں ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔'' سپرینٹنڈنٹ کے چہرے پر کوئی تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ ممکن ہے اس انکشاف سے مرعوب ہو گیا ہو لیکن اس نے اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا اور بدستور نرم لہجے میں بولا۔

''اس فصیل کے اندر قدم رکھنے والا ہر شخص صرف قیدی رہ جاتا ہے میرے نوجوان دوست! خیر چھوڑو اس فضول باتوں کو تم محافظوں کے ساتھ جاؤ اور نہا دھو کر دوسرا لباس پہن لو کچھ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے۔''

''ہاں۔''

''کون لوگ ہیں وہ؟''

''ان سے ملاقات کر کے تم ناخوش نہیں ہو گے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا اور شہباز کی صورت دیکھنے لگا۔ نریمان فرازی کی حیثیت سے شہباز کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر اس نے گردن ہلا کر کہا۔

‘‘ٹھیک ہے۔’’

‘‘چلو۔’’ محافظوں نے کہا اور شہباز ان کے ساتھ چل پڑا۔ سپرینٹنڈنٹ کچھ دیر کھڑا شہباز کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر واپس مڑا اور اپنے دفتر پہنچ گیا۔ اسے غالباً ہدایت کی گئی تھی کہ کچھ لوگ اس کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ آنے والے نئے لوگ نہیں تھے۔ ان میں دراز قامت اور تند چہرے کا مالک آرموسی تھا اور دوسرا ریزال دونوں نے بے تکلف انداز میں ان سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد کہا۔

‘‘ہاں۔ کیا آپ نے انتظام کرلیا ہے جناب۔’’

‘‘جی۔ بس وہ کچھ دیر میں پہنچنے والا ہے۔’’ سپرینٹنڈنٹ نے جواب دیا اور وہ دونوں انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دفتر کا دروازہ کھلا اور شہباز، نریمان فرازی کی حیثیت سے اندر داخل ہوا۔ اس نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں تعریفی انداز تھے۔ کیونکہ ان کے سامنے ایک تنومند جوان کھڑا ہوا تھا۔ تازہ بنا ہوا شیو، سلیقے سے بنے ہوئے بال اور صاف ستھرے لباس میں وہ بے حد متاثر کن شخصیت کا مالک نظر آرہا تھا۔ ایس پی نے اسے ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے پوری طرح تیار کرلیا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آخر ریزال کی آواز ابھری۔

‘‘آفیسر! کیا ہم چند منٹ تنہائی میں اس نوجوان سے بات کرسکتے ہیں۔’’

‘‘کیوں نہیں جناب۔’’ سپرینٹنڈنٹ نے جواب دیا اسے چیف سیکرٹری کی طرف سے ملنے والے خط میں ان دونوں سے مکمل تعاون کی ہدایت کی گئی تھی اور ظاہر ہے وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

‘‘جب آپ فارغ ہوجائیں تو کال بیل بٹن دبا دیجئے گا۔ میں زیادہ دور نہیں رہوں گا۔’’ یہ الفاظ کہہ کر وہ دفتر سے باہر نکل گیا اور دروازہ بھی بھیڑ دیا۔ تب ریزال نے فرازی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

‘‘ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہیں آخری مرتبہ سونے اور جواہرات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ نے تمہارے قبضے سے آدھے ٹن سونا اور کروڑ روپے کی مالیت کے ہیرے جواہرات برآمد کیے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی تمہارے اوپر

کچھ سنگین الزامات ہیں اور تمہیں مجموعی طور پر اڑسٹھ سال کی سزا سنائی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ کافی طویل مدت ہے اگر تم دوسرا جنم بھی لے لو تو اس جیل سے باہر نہیں نکل سکو گے۔’’

‘‘سنا تو یہی ہے کہ آج تک کوئی قیدی اس جیل سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوسکا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جیل کی اونچی اور سنگلاخ سلاخیں کب تک میرا راستہ روک سکتی ہیں۔’’ بالکل ہی غیر فطری طور پر شہباز نے بے پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ یہ سارے ایکشن نریمان فرازی کے تھے اور شہباز اپنی زندگی کے ایک دلچسپ اور انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا جس نے اسے ایک نشے کی سی کیفیت کا شکار کردیا تھا۔ بعض انداز میں بھی نشہ ہوتا ہے۔ اسی وقت آرموسی کی آواز ابھری۔ ‘‘ہم تمہارے پاس ایک تجویز ایک پیش کش لے کر آئے ہیں۔ بشرطیکہ تم اسے غور سے سنو۔’’

‘‘لیکن آپ نے ابھی اپنا تعارف نہیں کرایا۔’’ شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

‘‘میرا نام ریزال ہے اور میں اس وقت حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔’’

‘‘کمال ہے ایک معمولی قیدی اتنا اہم کیسے ہوگیا کہ حکومت اس میں دلچسپی لینے لگے۔’’ ریزال نے اس طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

‘‘اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے کی حامی بھر لو تو نہ صرف تمہارے خلاف عائد شدہ الزامات واپس لے لیے جائیں گے بلکہ ایک بہت بڑی رقم بھی تمہیں پیش کی جائے گی۔’’

‘‘مثلاً کتنی رقم۔’’ شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

‘‘کم از کم پچاس لاکھ روپے۔’’

‘‘اور تعاون کی نوعیت کیا ہوگی۔’’

‘‘اگر تم تعاون پر آمادہ ہو تو تفصیلی بات بعد میں ہوگی۔’’ ریزال نے کہا۔

‘‘آزادی اور دولت ایسی چیز ہے جسے کوئی شخص ٹھکرانے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ سمجھ رہے ہو۔ لیکن اس کے بعد میں پوری تفصیل سننے کے بعد ہی فیصلہ کروں گا کیونکہ بعض چیزیں آزادی سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ ریزال کھڑا ہوگیا اور اس نے شہباز کے کندھے پر

ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جوان آدمی اب کل صبح تم سے ملاقات ہوگی۔ ممکن ہے یہاں۔ یا ممکن ہے کہیں اور۔ کہیں اور ملاقات کی شکل میں ایک گاڑی تمہیں لینے کے لیے پہنچ جائے گی اس نے میز پر لگا ہوا بٹن دبایا اور صرف ایک منٹ کے بعد سپریٹنڈنٹ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور ریزال اور آرموسی اسے نریمان فرازی کے بارے میں ہدایات دینے لگے۔''

وہ دونوں چلے گئے محافظ باہر موجود تھے۔ وہ شہباز کے اردگرد پھیل گئے باہر نکلتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

''اور جہاں تک میری اپنی معلومات کا تعلق ہے تمہاری خوش بختی کے دن بہت قریب آ گئے لیکن میرے دوست! خوش بختی کے حصول کے لیے نیک اور ایماندار ہونا بھی بے حد ضروری ہے میرا مطلب ہے کم از کم اس حد تک جب تک تم اس جیل کی چار دیواری میں موجود ہو۔'' شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اسے واپس اس کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ لیکن بہترین سہولتوں کے ساتھ۔ تب اس نے نریمان فرازی سے کہا۔

''کیا تم اس ملاقات سے مطمئن ہو؟''

''آہ۔ میں مطمئن ہوں یا غیر مطمئن یہ تو میں نہیں جانتا لیکن مجھے یہ بتا دو کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔''

''بہت سادہ اور سیدھی سی بات ہے۔ نریمان فرازی اس دنیا میں ہر شخص جس کے پاس کسی طرح کی طاقت ہے۔ کچھ نہ کچھ اپنے لیے کرتا ہی رہتا ہے اور جن لوگوں نے تمہارا جسم اپنے قبضے میں لے کر تمہارے دماغ کو میرے دماغ میں شامل کر دیا ہے وہ تم سے وہی چاہتے ہیں جو آنے والے وقت کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ اگر تم اپنے جسم و جان میں ہوتے تو یقینی طور پر اس بارے میں جو پیش کش تمہیں دی گئی ہے مناسب فیصلہ کرتے اور اب بھی تم وہ فیصلہ کرنے پر آزاد ہو تم نے ان لوگوں کے سامنے کہا ہے کہ جو پیش کش انہوں نے تمہیں کی ہے۔ تم اس پر راضی ہو اور آزادی اور وہ رقم چاہتے ہو۔ میں تم سے صرف اتنا وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر تم نے ان کا کام کیا جو صرف تمہاری مرضی پر منحصر ہے تو ملنے والی رقم آزادی تمہارا جسم اور تمہارا دماغ تمہیں ایک امانت کی طرح لوٹا دیا جائے گا اور تم دنیا کے جس

گوشے کو پسند کرو گے زندگی گزار سکو گے۔ وہ لوگ صرف عارضی طور پر تم سے وہ سب کچھ چاہتے ہیں جو یہ لوگ چاہتے ہیں۔''

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ جو پیش کش مجھے کی گئی ہے اس پر بھی تمہاری مرضی کے مطابق عمل کروں۔''

''ہرگز نہیں۔ اس پر تم اپنی مرضی کے مطابق عمل کرو۔ جو تمہارا دل و دماغ کہے جسم میرا ہوگا دماغ تمہارا۔ نقصان بھی مجھے پہنچے گا۔ تمہیں نہیں۔''

''ایک بات بتاؤ میرے دوست! تم میرے ہم شکل کیوں ہو۔''

''میرے چہرے پر میک اپ ہے انہوں نے مجھے تمہاری شکل دی ہے۔''

''بار بار تم ان کا تذکرہ کرتے ہو وہ کون لوگ ہیں۔''

''کچھ پراسرار لوگ۔''

''گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بھی ان کے قیدی ہو۔''

''قیدی نہیں کارکن۔ جو پیش کش تمہیں کی گئی ہے اسی طرح ایک بہترین پیش کش مجھے بھی کی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں میں ان کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔''

''تعجب کی بات ہے تعجب کی لیکن دلچسپ ہے انتہائی دلچسپ اور سنو میں سچ سچ ان لوگوں سے تعاون کروں گا فیصلہ کر چکا ہوں۔ چونکہ بہر حال جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ زندگی اور آزادی بڑی قیمتی چیز ہوتی ہیں اور میں انہیں حاصل کرنے کی تو کوشش کروں گا۔''

نریمان فرازی نے کہا اور شہباز ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

فضا شدید سردی کی لپیٹ میں تھی۔ دو دن پہلے برفباری ہوئی تھی۔ زمین پر اگرچہ برف پگھل چکی تھی لیکن بعض مکانوں کی چھتوں پر ابھی تک برف کی تہہ جمی ہوئی تھی شہر کے چاروں طرف پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ ایک آدھ روز میں مزید برفباری ہو گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا لیکن اس قیامت خیز سردی کے باوجود لوگوں کے معمولاتِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

سیاہ رنگ کی ایک قیمتی کار ایک کشادہ شاہراہ پر رینگتی ہوئی سی چل رہی تھی۔ سڑک بھیگی

ہونے کی وجہ سے تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف خیار کے
درختوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں اوپر سے درختوں کی چوٹیاں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ
دھوپ سڑک تک نہیں پہنچ سکتی تھی پھر ایک خاص سمت سے آنے والی ٹویٹا ایک وسیع و
عریض موڑ سے ایک کشادہ گلی میں جڑ گئی۔ اس گلی کے دونوں طرف وسیع و عریض بنگلے
تھے۔ سیاہ رنگ کی ٹویوٹا اس بنگلے کے سامنے آکر رک گئی۔ کار کا دروازہ کھلا اور تین افراد
نیچے اتر آئے۔ ان میں دو سیاہ پولیس والے تھے جن کے داہنے ہاتھ اپنے اپنے کوٹوں کی
جیبوں میں تھے۔ ان دونوں پولیس والوں کا تعلق سینٹرل جیل سے تھا۔ کار سے اترنے والا
تیسرا آدمی نریمان فرازی یا اس کے دماغ اور جسم سے منسلک شہباز تھا۔

شہباز نے لمبا کوٹ اور سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ دونوں پولیس والوں کے
درمیان چلتا ہوا بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گارڈ کیبن میں کھڑا ہوا تھا ایک آدمی سامنے آ
گیا۔ اس نے بھی سیاہ رنگ کا اوورکوٹ اور اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس نے پولیس والوں
سے کوئی بات کی اور پھر ان کے جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

گیٹ کے اندر پختہ راستے کے دونوں طرف وسیع لان بنا ہوا تھا۔ جس کے پودے اس
وقت پتیوں سے محروم تھے۔ گھاس پر کہیں کہیں برف جمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ عمارت کے
برآمدے میں بھی ایک آدمی موجود تھا اس نے شہباز کے ساتھ آنے والے سیاہ لباس میں
پولیس والوں سے کچھ بات کی اور پھر ان کے اندر جانے کے لیے دروازہ کھول دیا۔

دوسری منزل پر ایک کشادہ کمرے میں ریزال اور آرموسی غالباً ان کے منتظر تھے ان
کے سامنے کافی کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میز پر ایک فائل
بھی رکھی ہوئی تھی۔ آتش دان کے سامنے اینٹوں کے ایک چھوٹے سے چبوترے پر
الیکٹرک ہیٹر رکھا ہوا تھا جس سے کمرے کی فضا میں ایک خوشگوار سی حدت محسوس ہو رہی
تھی۔ شہباز کے ساتھ آنے والے سادہ لباس میں ملبوس پولیس والوں میں سے ایک نے
اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر آرموسی کی طرف بڑھا دیا۔ آرموسی نے کاغذ پڑھا یہ قیدی
کی سپرداری کی رسید تھی۔ آرموسی نے دستخط کر کے کاغذ پولیس والے کو لوٹا دیا اور وہ دونوں
واپس چلے گئے۔

''ہاں۔ بڑے آدمی۔'' آرموسی نے شہباز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک

مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

وہ پھر بولا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

''شکریہ۔'' شہباز کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''واہ۔ تم واقعی ایک شریف آدمی ہو۔ تم سے مل کر
خوشی ہوئی۔ ویسے یہاں تمہاری آمد کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ہماری پیش کش قبول کر لی
ہے۔''

''ہاں۔ اصولی طور پر۔'' شہباز نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''آخری فیصلہ پوری بات سننے کے بعد ہی کروں گا۔''

''وری گڈ۔'' اس بار ریزال کی آواز ابھری۔ ''یہ ایک اچھی بات ہے اس کا مطلب
ہے کہ ہم تم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔''

''ہاں۔ اگرچہ میری شہرت اچھی نہیں ہے لیکن یہ سب ذاتی طور پر بتا رہا ہوں کہ میں
کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا اور نہ کبھی میں نے اصولوں کے خلاف سمجھوتا کیا ہے اگر میں نے
آپ کا کام کرنے کی حامی بھر لی تو میں زندگی کے آخری سانسوں تک اسے پورا کرنے کی
کوشش کروں گا اور اگر میں نے انکار کر دیا تو دنیا کی پوری دولت اور آپ لوگوں کی کوئی
کوشش مجھے یہ ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میں تیسرے درجے کا دھوکے باز
انسان نہیں ہوں شیر کی طرح شکار کر کے کھاتا ہوں۔'' یہ الفاظ بڑے متاثر کن تھے خود شہباز
کو بھی اپنی زبان سے ادا ہونے والے نریمان فرازی کے یہ الفاظ پسند آئے تھے۔

اس دوران آرموسی نے الیکٹرک ہیٹر والے چبوترے پر رکھی ہوئی شیشے کی خوبصورت
الیکٹرک کیتلی سے ایک کپ میں کافی انڈیلی اور کپ شہباز کے سامنے رکھ کر دوبارہ اپنی جگہ
بیٹھ گیا۔ شہباز نے بڑی بے باکی سے کافی کا کپ اٹھا لیا اور اس کی چسکیاں لیتے ہوئے
بولا۔ ''عمدہ......عمدہ ہے۔''

''ہاں تو نریمان فرازی میں مختصر بات کروں گا یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ
عام انقلاب سے پہلے شاہ کے کئی ممالک سے گہرے تعلقات تھے۔ لیکن وقت گزرتے دیر
نہیں لگتی اس وقت شاہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور خود دوسروں کی مدد کا محتاج ہے۔
میں تمہیں جو اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ اسے ذرا غور سے سنو۔'' آرموسی کا لہجہ رازدانہ ہو

گیا پھر اس نے کہا۔

"ہم شاہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن نکل کر سامنے نہیں آسکتے یہاں شاہ کی حمایت میں کوئی بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن ہم اس موقع پر شاہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔" شہباز ایک لمحے کے لیے چونکا تھا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ البتہ فرازی نے بغیر کسی دقت کے کہا۔

"کیا موجودہ حکومت شاہ کی واپسی کے لیے کسی جگہ بھی انقلاب میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہوا ایسا بالکل نہیں ہے۔ آرموسی۔ نے بے چینی سے کہا۔

"تو پھر؟"

"ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ کسی ایسی کاروائی میں حصہ لے سکیں۔ ویسے بھی شاہ کی واپسی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ ایران کے مذہبی رہنما حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے ہیں۔"

"تو پھر....." شہباز نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "آپ شاہ کی مدد کس طرح کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم جانتے ہو کہ سوئٹزرلینڈ لینڈ اور امریکہ کے بینکوں میں شاہ کی بے حساب دولت جمع تھی لیکن ایران کی انقلابی حکومت نے ان اثاثوں پر حکومت ایران کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ متعلقہ ممالک کی عدالتوں نے وہ اثاثے منجمد کر دیئے ہیں اور اب ان میں سے ایک پائی بھی شاہ کو ملنے کی توقع نہیں ہے۔ لیکن ملک چھوڑنے سے پہلے شاہ نے اپنی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ چھپا دیا تھا۔ اس میں ملکہ فرح دیبا کے شاہی تاج کے علاوہ اربوں مالیت کے ہیرے جواہرات اور کم از کم کئی ٹن سونا شامل ہے۔ یہ سونا تہران میں ایک عورت کی تحویل میں ہے اور اس عورت کا نام میں تمہیں بتاؤں بڑے غور سے سننا بہت اہم انکشاف کر رہا ہوں تم پر۔ اس کا نام خانم جیانیہ ہے۔" شہباز پر ایک بار پھر سنسنی کا حملہ ہوا تھا اور اس کا دماغ دیر تک جھنجھناتا رہا تھا پھر اس نے آرموسی کی آواز سنی۔

"خانم جیانیہ کے شاہ کے خاندان سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ انقلاب کے بعد شاہ کے حواریوں کی پکڑ دھکڑ کے باوجود خانم جیانیہ نے ایران سے فرار ہونے کی کوشش نہیں

کی۔ جواب بھی تہران میں موجود ہے۔ ایک موقع پر وہ پکڑی بھی گئی تھی لیکن ایک ہفتہ جیل میں رہنے کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا کیونکہ وہ شاہی خاندان سے اپنی لاتعلقی ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ خانم جیانیہ انتہائی سادہ زندگی بسر کر رہی تھی اور یہ بھی اس کی کامیابی کی ایک دلیل تھی چونکہ پاسداران انقلاب کو اس کے قبضے سے دولت نام کی کوئی چیز نہیں ملی۔ چنانچہ اسے بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ اس پر شہباز نے نریمان کے ذہن پر حاوی ہو کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ شاہ کا خزانہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں بالکل ٹھیک ایسی ہی بات ہے شاہ کا یہ خفیہ خزانہ تہران میں موجود ہے۔" شہباز پر بدستور سنسنی طاری تھی وہ خزانہ جس کے حصول کے لیے رازل جریری بہت کچھ کر چکا تھا اور بہت کچھ کرنے پر آمادہ تھا اور جس کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ وہ کہیں دور دراز مقام پر پوشیدہ ہے۔ اس کے بارے میں شہباز کو یہ اطلاع مل رہی تھی کہ وہ عظیم الشان خزانہ جس کی تھوڑی سی تفصیل آرموسی نے بتائی تھی۔ تہران میں ایک عورت خانم جیانیہ کی تحویل میں محفوظ ہے اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ اسے چھپائے ہوئے ہے۔ یہ سوچ کر کہ کچھ نہ کچھ بولنا ضروری ہے اس نے ایک بار پھر فرازی کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا فرازی نے کہا۔

"یہ انتہائی خطرناک کام ہے۔ آپ کو اس کا اندازہ ہے مسٹر آرموسی؟"

"ہے۔ اسی لیے ہم نے اس خطرناک کام کے لیے تم جیسے خطرناک آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ تم وہ آدمی ہو جو پاسداران انقلاب کے گودام سے کروڑوں روپے کی مالیت کے ہیرے جواہرات اور آدھا ٹن سونا چوری کر سکتے ہو۔ یقیناً شاہ کا یہ خزانہ حاصل کرنا بھی تمہارا لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آرموسی کی تیز نگاہیں شہباز کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شہباز نے ایک بار پھر فرازی کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا اور فرازی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر اس نے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ تہران میں یہ خزانہ کس جگہ چھپایا گیا ہے۔"

"خزانے کا پتہ تو صرف خانم جیانیہ سے ہی معلوم ہوسکتا ہے البتہ ہم تمہیں اس کا پتہ ضرور بتا دیں گے تمہیں پہلے اس سے ملنا ہوگا۔" آرموسی نے کہا۔

"آپ نے اس کام کا کتنا معاوضہ بتایا تھا؟" فرازی اب اپنی اصلیت پر آ گیا۔ اس

نے باری باری ریزال اور آرموسی کا چہرہ دیکھا۔

"تمہاری مکمل طور پر آزادی اور پچاس لاکھ روپے ہوسکتا ہے بعد میں تمہیں اور انعام بھی دیا جائے۔ آرموسی نے کہا۔

"کیا مجھے تہران میں آپ کے آدمیوں کا تعاون حاصل ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔ تہران میں پہلے ہی ہمارے اہل کاروں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی باقاعدہ نگرانی کی جاتی ہے۔ میں یہ بات شروع میں ہی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ یہ مشن تمہیں مکمل اپنے طور پر کرنا ہوگا۔ پکڑے جانے کی صورت میں ہماری حکومت کا نام بھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گا۔ ہم تمہیں پہچاننے سے انکار کردیں گے اور ایک بات اور ذہن میں رکھنا۔ یہ راز صرف تمہارے سینے تک رہنا چاہیے۔ تمہارے اپنے آدمی تہران میں موجود ہیں۔ تم ان سے ضرور کام لے سکتے ہو۔"

"ہاں۔ ویسے تو میرے آدمی بھی ایران میں ہیں۔ لیکن وہ لوگ جب کام کریں گے تو انہیں کچھ دینا بھی پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ پچاس لاکھ روپے اس کام کے لیے بالکل غیر مناسب ہیں۔"

"تم یہ سوچو کہ تمہیں نئی زندگی اور نئی آزادی مل رہی ہے۔ ورنہ تمہاری عمر تو جیلوں ہی میں بسر ہونی تھی۔"

"یہ بات بار بار کہہ کر تم مجھ کو خود سے منحرف کررہے ہو اور......"

"نہیں نہیں...... مطلب یہ نہیں ہے خیر ہم اس میں کچھ اضافہ کیے دیتے ہیں۔ چلو تم بھی کیا یاد کرو گے رقم ڈبل کی جاتی ہے یعنی ایک کروڑ......"

"اور آدھی رقم تمہیں پیشگی دینا ہوگی۔ یہ رقم ایرانی کرنسی میں مجھے ملنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے تمہیں یہ رقم بھی مل جائے گی۔ لیکن اگر تم ناکام ہوگئے تو اس رقم کا کیا ہوگا۔"

"یہ تم بتاؤ۔"

"اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے گا۔"

"ہرگز نہیں۔ آپ اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کر بھی نہیں کرسکیں گے۔ کیونکہ ناکامی کا مطلب میری موت ہوگا۔" فرازی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تمہاری اس بات نے ہمیں اپنا اعتماد بحال کرنے میں مدد دی ہے۔ اب یہ

بتاؤ تمہارا منصوبہ کیا ہوگا۔ ریزال نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

"میں اس قسم کے سوال کا جواب کبھی دینے کا پابند نہیں ہوں۔ ویسے بھی وقت اور حالات دیکھ کر کام کرتا ہوں۔ فرازی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن ہم تمہیں اپنا منصوبہ بتادینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اس بار ریزال نے کہا تھا۔"

"ہاں بولو۔" اور اس کے بعد ریزال تقریباً ایک گھنٹے تک اسے اپنا منصوبہ بتاتا رہا تھا اور شہباز فرازی کی حیثیت سے اس منصوبے سے اتفاق کرتا جارہا تھا۔ پھر جب شہباز اس بنگلے سے باہر نکلا تو بالکل مختلف حلیے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس تھا اور وہ ایک آزاد انسان تھا یہ آزادی ایسے نہیں دے دی گئی اور شہباز کو اب مکمل طور پر اپنے طور پر نریمان فرازی کا کردار سرانجام دینا تھا اور یہ اس کے لیے ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ البتہ اس نے نریمان فرازی سے سوال کیا۔

"میرے دوست! اب تک جو کچھ ہوا ہے کیا تم اس سے اتفاق رکھتے ہو۔"

"تم نے مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ بعد میں میرا جسم مجھے دے دیا جائے گا اس وقت واقعی جو کچھ ہورہا ہے۔ وہ بہت عجیب ہے لیکن میں اس بات سے خوش نہیں ہوں۔"

"اس طرح کے کام ہمیشہ ناخوشی کے ساتھ کیے جاتے ہیں لیکن تم سوچ لو میں جب چاہوں تمہیں اپنے ذہن سے نکال کر پھینک سکتا ہوں اور بے رحمی کے عالم میں تم کیا کرسکو گے اور ویسے بھی صرف ذہن سے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو صرف ایک ناکارہ چیز ہوگی جو کچھ عرصے کے بعد مٹی کا ڈھیر ہوسکتی ہے اور جب تمہارا ذہن مرجائے گا تو تمہارا جسم بھی سوکھ کر خاک بن جائے گا ذرا اس بارے میں سوچ لو اور اس کے بعد موجود شکل کے بارے میں۔"

"مجھے دھمکی مت دو۔ بغیر دھمکی دیئے بھی تم مجھ سے وہ کام لے سکتے ہو جو لینا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب کیا کرو گے۔" شہباز نے سوال کیا۔

اس شہر میں سڑکیں اور گلیاں میری دیکھی بھالی ہیں۔ تم مجھے میرے ذہن کے ساتھ سوچنے اور کام کرنے دو۔"

"ہاں۔ تمہیں پوری آزادی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اب میں تمہارے کسی معاملے میں مداخلت نہ کروں شہباز نے کہا اور اپنے ذہن کو فرازی کے ذہن سے علیحدہ کر لیا۔ فرازی دن بھر سڑکوں اور گلیوں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ اسے کوئی بھی شخص اپنے تعاقب میں نظر نہیں آیا۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو وہ اسے آسانی سے جل دے سکتا تھا۔ پھر جب رات کی تاریکی نے درشن پھیلایا تو وہ ایک مخصوص علاقے میں گھوم رہا تھا۔ یہاں وہ پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا۔ وہ اس علاقے میں رہنے والی ایک طوائف کے مکان کی تلاش میں تھا۔ آخری مرتبہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کے ایک دوست نے اس طوائف کے حسن کی بڑی تعریف کی تھی اور اس کے مکان کا پتہ بتاتے ہوئے اسے وہاں جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ ادھر کا رخ نہیں کر سکا تھا۔ خاصے لمحات پہلے طوائفیں بازار میں بیٹھا کرتی تھیں اور ایک مخصوص علاقے کی لاتعداد تنگ سی گلیاں ان کے لیے مخصوص تھیں۔ اس علاقے میں شام کا اندھیرا پھیلنے سے رات گئے تک خوب رونق رہتی تھی لیکن بہر حال کچھ عرصے کے بعد نئی حکومت کے حکم سے یہ قہوہ خانے بند کر دیئے گئے اور طوائفوں نے شہر کے مختلف علاقوں میں اڈے قائم کر لیے۔ ان کے شناسا گاہک اب انہی اڈوں پر آتے تھے۔ پولیس تو طوائفوں کے ان ٹھکانوں سے پوری طرح واقف تھی لیکن کبھی ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس کو ان اڈوں سے باقاعدہ کمیشن ملتا تھا۔

بہر حال شہباز کے اپنے ذہن کے مطابق تو یہ تجربہ اس کے لیے بڑا انوکھا اور نیا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ نریمان فرازی اس مکان کو کیوں تلاش کرنا چاہتا ہے جو کبھی ایک مخصوص طوائف کا مکان تھا۔ بہر حال اسے یہ مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اس شناسائی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ مقصد صرف رات گزارنے کا تھا۔ حالانکہ یہاں اس کے اور بھی بہت سے شناسا تھے اور نریمان فرازی کی حیثیت سے بہت سے ایسے لوگ تھے جو اسے اپنے درمیان پناہ دیتے لیکن اس نے شروع ہی سے احتیاط سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شہباز نریمان فرازی کی حیثیت سے ہر وہ کام کرتا رہا تھا جو نریمان فرازی کرنا چاہتا تھا اور وعدے کے مطابق اب اس نے اپنے ذہن کو ایک طرح سے سلا ہی دیا تھا بس اس کی

آنکھیں جاگ رہی تھی دیکھ رہی تھیں۔ دستک کے جواب میں دروازہ اسی طوائف نے کھولا تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال رہی ہوگی کمر تک جھولتے ہوئے سیاہ بال، کالی اور بادلی آنکھیں اور چہرے کے تیکھے نقوش ایک نگاہ دیکھنے سے ہی وہ بہت حسین لگتی تھی۔

اس نے بڑے عجیب سے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ کتنا وقت یہاں گزارو گے۔"

"مجھے اندر تو آنے دو۔"

"آ جاؤ۔" لڑکی کا حسن اور اس کی آواز ہم آہنگ نہیں تھی۔ بڑا کاروباری سا انداز تھا اس کا۔ شہباز نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"صرف ایک رات۔"

"یہ میرا کمرا ہے۔" وہ بولی اور شہباز اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں صرف ایک ہی بستر تھا۔ ایک طرف باتھ روم ایک چھوٹا سا کچن جس میں پتھر کے کوئلے کا اسٹوپ جل رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی۔ فرش پر ایک پرانا قالین بچھا ہوا تھا۔ جس کا رنگ بالکل خراب ہو چکا تھا اور دھاگے کئی جگہ سے ادھڑے ہوئے تھے۔ شہباز نے فرازی کے ذہن سے پوچھا۔

"تمہارے پاس دوسرا بستر نہیں ہے۔"

"دوسرا بستر کیوں۔ میں سمجھی نہیں۔"

"تم دوسرے بستر کا مطلب نہیں سمجھتیں؟"

"سمجھتی تو ہوں لیکن یہاں کبھی کسی نے دوسرے بستر کی بات نہیں کی۔"

"تو پھر سنو۔ میں ذرا مختلف قسم کا آدمی ہوں اپنے کام میں کسی کی شرکت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہمیشہ الگ بستر پر سوتا ہوں۔ اور آج تو میں خاص طور سے الگ بستر پر سونا چاہتا ہوں کیونکہ کئی راتوں سے پکے فرش پر کروٹیں بدلنے سے ہڈیاں دکھ رہی ہیں۔"

لڑکی نے برا سا منہ بنایا کچھ لمحے ناگواری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"یہاں کوئی جگہ نہیں ہے بہتر ہے کسی ہوٹل میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں رات بھر کے لیے بستر مل جائے گا۔"

"ایک رات کا کیا نذرانہ لیتی ہو جان من!" شہباز نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس

کی طرف دیکھا اور خود اپنی آنکھوں میں شرمندہ ہو گیا کیونکہ یہ الفاظ اس کے نہیں تھے اور نہ ہی یہ انداز اس کا تھا۔ یہ صرف فرازی بول رہا تھا۔ لڑکی کہنے لگی۔

''اگر کوئی ڈھنگ کا آدمی ہو تو پانچ سو روپے بھی دے جاتا ہے اور تم جیسے کنگلوں سے میں دو تین سو روپے لیا کرتی ہوں۔''

''میرے بارے میں یہ خیال ہے تمہارا۔''

''نہیں میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ ویسے شکل سے کنگلے تو نہیں لگتے ہو۔''

شہباز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور پانچ سو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ لڑکی کا انداز ایک دم بدل گیا اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی۔ کسی گاہک سے پانچ سو روپے والی بات محض گپ تھی۔ کسی نے آج تک اسے سو روپے سے زیادہ نہیں دیئے تھے۔ لیکن شہباز نے سو روپے کا ایک اور نوٹ لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''یہ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کے لیے کھانا لذیذ اور عمدہ ہونا چاہیے۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں جناب! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔'' لڑکی پر سحر طاری ہو گیا تھا۔

''تمہیں خراٹے لینے کی عادت تو نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' لڑکی جلدی سے بولی۔

''ویری گڈ۔'' شہباز نے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''کھانے کے فوراً بعد میں سو جانا چاہتا ہوں اور تم اس قالین پر سوؤ گی ٹھیک ہے؟''

''لیکن یہ پانچ سو روپے کس بات کے ہیں؟'' لڑکی نے ایک بار پھر حیرت سے اسے دیکھا۔

''بے وقوف لڑکی! میں نے یہ پیسے اپنی نیند خراب کرنے کے لیے نہیں دیئے۔ میں سونا چاہتا ہوں سکون کی نیند سمجھیں۔''

''سمجھ گئی۔'' لڑکی نے اس بات پر سر ہلایا اور بستر ٹھیک کرنے چلی گئی۔ تبھی نریمان فرازی نے کہا۔

''اور تمہیں یقیناً مزہ آ رہا ہوگا بھلا میں اپنے پیسے خرچ کر کے تمہارے جسم کے لیے لذتیں مہیا کیوں کروں۔ میں تو صرف دماغ ہوں اس وقت بدن تو تم ہو۔''

''اور یہ بہتر ہے میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی اور آئندہ اس بات کا خیال رکھنا کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ تم اگر ذہنی طور پر بھی کچھ کرنا چاہو تو کم از کم میرے جسم کو استعمال مت کرنا۔''

''واہ۔ یہ تو بڑی دلچسپ بات تم نے خود بتا دی۔''

''کیا مطلب۔''

''اگر کبھی شرارت کرنے کو دل چاہے تو کسی حسین لڑکی کو تمہاری قربت پر مجبور کر دیا جائے۔ واہ، میں تو صرف دیکھنے والوں میں سے ہوں گا۔''

''خدا کے واسطے تم ایسا نہیں کرو گے۔ اور اگر تم نے ایسا کیا تو میں بھی پھر تمہارے ذہن کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کروں گا۔'' شہباز کو محسوس ہوا کہ نریمان فرازی نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا ہے لیکن بہرحال اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ کر آئندہ کا پروگرام طے کرنے لگا۔ واپس ایران میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کمیٹی کے ہرکارے ہر جگہ شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

بہرحال دوسرے دن صبح صبح وہ بیدار ہو گیا۔ شیو اور غسل کا انتظام بھی لڑکی نے ہی کیا تھا اور اس کے بعد اس نے وہ لباس پہن لیا جو گزشتہ روز اس نے خریدا تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے قالین پر سوئی ہوئی لڑکی کو جگایا اور ناشتہ تیار کرنے کو کہا۔ وہ رات کو دیر تک جاگنے اور صبح دیر تک سونے کی عادی تھی۔ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گھس گئی۔ ناشتے کا سامان شاید وہ رات کو ہی بیکری سے لے آئی تھی۔ انڈا فرائی کرنے کے بعد اس نے ڈبل روٹی کے پیس بھی ہلکے سے تل دیئے۔ پھر جیلی، مکھن، پنیر اور انڈا، ڈبل روٹی کے علاوہ سلائس چھوٹی میز پر رکھ دیئے۔ اس کے بعد اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سنو...... میں سو رہی ہوں۔ اب اس بستر پر تمہارا قبضہ نہیں ہے۔ چونکہ رات گزر چکی ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد یہاں سے پھوٹ لو۔ اور سنو، جانے لگو تو دروازہ بند کر جانا۔'' شہباز نے مسکراتی نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا، وہ اپنے بستر میں گھس گئی تھی۔ اس نے اطمینان سے ناشتہ کیا اور اس کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

فضا دھند آلود تھی۔ سڑکیں اور گلیاں تقریباً ویران پڑی تھیں۔ کہیں کہیں گرم کپڑوں میں

لپٹے ہوئے لوگ آ جا رہے تھے جو دھند کے باعث چلتے پھرتے بھوت معلوم ہوتے تھے۔ دن کو دس بجے تک وہ گزشتہ روز کی طرح سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا رہا لیکن اسے اپنے تعاقب میں کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ دُکانیں کھلنا شروع ہوگئی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک ایسی دکان میں گھس گیا جہاں ڈراموں میں استعمال ہونے والے ملبوسات اور دیگر اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ وہاں سے اس نے اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں خریدیں اور اگلی دکان میں داخل ہوگیا۔ اس طرح اس نے کچھ اور دکانوں سے سامان خریدا اور پھر ایک تنگ سی گلی میں واقع ایک دکان میں داخل ہوگیا۔ دکان کے باہر اسے پرانے سے بورڈ پر دکان کے مالک کا نام لکھا ہوا نظر آیا۔ وہ دکان ایک کباڑ خانہ ہی لگتی تھی کیونکہ اس میں سب پرانا سامان بھرا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات نریمان فرازی کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ دکان کا مالک کچھ اور بھی کام کرتا ہے۔ ایک کونے میں رکھے ہوئے پرانے کیسٹ پر اٹالین میوزک بج رہا تھا۔ دکان کا مالک قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا بڑی بے توجہی سے یہ سن رہا تھا۔ جیسے اس کا مقصد میوزک سننا نہ ہو بلکہ صرف کوئی کام کرنا ہو۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک مجہول سا آدمی تھا۔ اس وقت اس کا شیو کم از کم تین دن سے بڑھا ہوا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی پہنے ہوئے تھا جس سے کان بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ میلا سا اوور کوٹ اور پیروں میں براؤن جوتے جنہیں غالباً بہت عرصے سے پالش نصیب نہیں ہوئی تھی۔

''ہیلو......'' شہباز نے اس کے قریب پہنچ کر کہا اور وہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

''مجھے تمہارے ایک دوست نے بھیجا ہے۔''

''کس دوست نے......؟'' مالک نے بھنویں سکوڑ کر شہباز کو گھورا۔

''اس کا نام غالباً سہراب ہے۔'' نریمان فرازی نے جواب دیا۔ اب وہ مکمل طور پر اپنے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ ایک شناختی لفظ تھا۔ اس نے کہا۔ ''اور میرے دوست سہراب نے بتایا ہے کہ چاندنی واپس آگئی ہے۔''

''واہ...... اگر چاندنی واپس آگئی ہے تو آؤ ہم اندر بیٹھتے ہیں۔ بھلا باہر کھڑے رہنے سے کیا حاصل۔''

''جہاں مرضی چاہے لے چلو۔'' شہباز مسکرا کر بولا اور دکاندار نے دکان کا بیرونی شیشے والا حصہ لاک کر دیا۔ پھر وہ شہباز کی رہنمائی کرتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں داخل ہوگیا۔

یہ کافی کشادہ کمرہ تھا۔ ایک کونے میں میز پڑی ہوئی تھی جس پر رنگ برنگے کیمیکل سے بھری ہوئی بوتلیں نظر آ رہی تھیں۔ دوسری طرف لکڑی کے اسٹینڈ پر دو کیمرے موجود تھے۔

''ہاں......اب تم صحیح جگہ آگئے ہو۔ مجھے بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے ایرانی شناختی کاغذات کے چند سیٹ درکار ہیں۔ ان میں جو تصویریں لگائی جائیں گی ان میں، میں مختلف لباس اور ڈریس استعمال کروں گا۔ اس کے لئے میں تمام ضروری لباس وغیرہ ساتھ لایا ہوں۔ دستاویزات میں تم نام کا خانہ خالی چھوڑ دو گے جسے میں بعد میں پُر کرلوں گا۔ یہ کاغذات مجھے آج ہی چاہئیں۔''

''آج تو بہت مشکل ہے۔ مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔'' دکاندار بولا۔

''تمہارے دوسرے کام انتظار کر سکتے ہیں لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا سمجھے۔'' نریمان کا لہجہ کچھ تبدیل سا ہوگیا۔

''کیا تم یہ کام ارجنٹ کرانا چاہتے ہو؟''

''ہاں...... میں جانتا ہوں تم معاوضے کی بات کرو گے اور تم جیسے لوگوں کے لئے معاوضہ زندگی سے بھی زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ خیر ٹھیک ہے۔ معاوضہ میں تمہارے حساب سے ہی دوں گا۔''

''مثلاً پانچ ہزار روپے فی سیٹ۔'' دکاندار بولا۔

''ٹھیک ہے۔''

''تب تو سمجھ لو تمہارا کام ہوگیا۔'' دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ شہباز کو یہ سارا دن یہیں گزارنا پڑا تھا۔ چونکہ دکاندار جو کام کر رہا تھا وہ خاصا طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ اور یہ کام رات گئے تک جاری رہا تھا۔ لیکن اس سے شہباز کو یہ اندازہ ہوا تھا کہ نریمان فرازی کتنا چست و چالاک آدمی ہے اور ذہین بھی جو اپنا کام نہایت ذہانت کے ساتھ پورا کرنا جانتا ہے۔

بہرحال سب سے پہلے شہباز نے مختلف گوشوں میں تصاویر اتروائیں۔ جب یہ تصویریں تیار ہوگئیں تو اس نے ان کے نیگیٹو جلا دیئے۔ اس کے بعد جو سیٹ تیار ہو جاتا اس پر فرازی اپنے ہاتھ سے نام لکھ دیتا۔ مقصد یہ تھا کہ دکاندار وہ نام نہ دیکھ سکے۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس نے ہر سیٹ کو متعلقہ لباس کے ساتھ مختلف تھیلوں میں بند کر کے انہیں

ایک بڑے پیکٹ میں باندھ دیا۔ پیکٹ کے اندر ایک لفافہ بھی رکھ دیا جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے تیار کیا تھا۔ اور آخر میں اس نے دکاندار کو معاوضہ ادا کیا اور پیکٹ اٹھا کر دکان سے باہر نکل آیا۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔ نریمان فرازی کے طور پر جو کچھ وہ کر رہا تھا، اس سے ناواقف نہیں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ خاصا فاصلہ طے ہو گیا لیکن اس طرح وہ ایک کھلی شاہراہ پر نکل آیا۔ یہ شہر کا سب سے خوبصورت کمرشل علاقہ تھا۔ بڑی بڑی دکانیں، بہترین ریسٹورنٹ۔ شام کے وقت اس سڑک پر اچھی خاصی رونق ہوا کرتی تھی لیکن اس وقت سردی کی شدت کے باعث یہ سڑک بھی سنسان نظر آ رہی تھی۔ البتہ ہوٹلوں میں رونق تھی۔

وہ ایک خوبصورت سے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے دوسری طرف جانے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا اور آخر کار میز منتخب کر کے اس پر جا بیٹھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ویٹر اس کے پاس آ گیا تھا۔ شہباز کو بھوک لگ رہی تھی اس نے اسے کھانے کا آرڈر دے دیا اور ویٹر نے کچھ دیر کے بعد کھانا اس کے لیے سرو کر دیا۔ بہترین کھانا تھا۔ شہباز سب کچھ بھول کر کھانے میں مصروف تھا۔ کھانے کے بعد وہ اپنا پیکٹ میز پر ہی چھوڑ کر کاؤنٹر پر آ گیا اور ٹیلی فون اپنی طرف کھسکا کر ریسیور اٹھا لیا پھر وہ ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ اس کی اپنی کوششوں میں سے نہیں تھا بلکہ اس وقت سو فیصد ہی نریمان فرازی کا ذہن کام کر رہا تھا اور وہ خود پس منظر میں تھا۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔

”ہیلو مسعودی! کیا تم میری آواز کو پہچان سکتے ہو۔“

”تمہاری آواز۔ بھلا یہ آواز بھی کبھی بھلائی جا سکتی ہے سناؤ کیسے ہو۔“

”بس زندگی کا گاڑی کو دھکا لگانے کا شغل جاری ہے۔“

”مگر تم یہاں کیسے۔ میں نے تو سنا تھا کہ۔“

”ہاں۔ میں اس قوت جس ریستوران میں بیٹھا ہوا ہوں اس کا نام زیدیکا ہے زیدیکا۔“

”ہاں ہاں مجھے پتا ہے۔“

”آ جاؤ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”ملنے کا مطلب بتانا ضروری ہوتا ہے۔“

”ابھی۔“

”میں نے کہا نا سارے کام چھوڑ کر یہاں آ جاؤ۔“

”مگر کچھ تو۔“

”کچھ نہیں بتا سکتا۔ ویسے مجھ سے مل کر تمہیں خوشی ہو گی۔“ یہ کہہ کر شہباز نے فون بند کر دیا اور واپس اپنی میز پر آ بیٹھا اسی وقت فرازی نے اس کے ذہن میں کہا۔

”میرے کام کا ساتھی ہے یہ بات تمہارے علم میں لانا ضروری ہے کہ یہاں میرے بے شمار کارکن موجود ہیں۔“ شہباز نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لا سکتا تھا لیکن جس کام کی ہدایت رازل جریری کر دے وہ اس کے لیے زندگی کا سب سے بڑا کام ہوتا تھا اور اس کے بعد وہ مزید کچھ نہیں سوچتا تھا۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد ایک صحت مند آدمی اس کے میز پر آ گیا اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤں؟“

”ہاں ہاں بیٹھو۔ کیوں نہیں۔“ نریمان فرازی نے پرتپاک لہجے میں کہا اس کا دوست مسعودی ایک سینئر انجن ڈرائیور تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں ٹرین لے جایا کرتا تھا۔ وہ ٹرین جو اس کے لیے مخصوص تھی۔ ایران کے کئی شہروں میں جا سکتی تھی اور ہفتے وار تھی۔ اس پر عملی طور پر اسمگلروں کا قبضہ ہوتا تھا۔ ملکوں کی سرحدوں پر دونوں طرف سخت چیکنگ کے باوجود اسمگلر کروڑوں روپے کی مالیت کا سامان لے کر سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ریلوے کے کچھ ملازمین بھی اسمگلنگ میں ملوث ہوا کرتے تھے۔ مسعودی اگر انجن ڈرائیور تھا اس کی تنخواہ محدود تھی لیکن وہ جس عیش کی زندگی گزار رہا تھا کوئی دیکھتا تو گڑبڑا جاتا۔ فرازی جیسے لوگوں کے کام آ کر وہ لاکھوں کما لیا کرتا تھا اس نے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک کالونی میں مکان بنا رکھا تھا اور اس کی رہائش اسی مکان میں تھی۔ ریلوے کی طرف سے جو سرکاری مکان اسے ملا تھا وہ اس نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد فرازی نے آگے کی بات شروع کر دی۔

”آج کل کس روٹ پر ڈیوٹی دے رہے ہو۔“

”وہی پرانا روٹ۔“

”یہ بیگ زاہدان پہنچانا ہے اور اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ بہت ہی اہم بیگ ہے۔“

فرازی نے دوسری کرسی پر ایک بیگ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''پہنچ جائے گا۔لیکن تمہیں معلوم ہے کہ زاہدان کی ٹرین ہفتے کو صبح یہاں سے روانہ ہوتی ہے اور آج ہفتے کا دن گزر چکا ہے اور یہ تمہاری خوش قسمتی کہ شدید بارش کی وجہ سے یہ ٹرین کل صبح روانہ ہوگی۔اس ٹرین پر اگرچہ میری ڈیوٹی نہیں ہے لیکن ایک قابل اعتماد دوست کے ذریعے یہ بیگ پہنچایا جا سکتا ہے۔کیا تمہیں اس کے جلد پہنچنے کی جلدی ہے۔''

''بالکل۔لیکن میں اس بیگ کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا۔بہتر یہی ہے کہ تم خود پہنچاؤ۔میں کسی دوسرے پر اعتبار نہیں کر سکتا۔

''ایسی صورت میں......'' مسعودی سوچتے ہوئے بولا۔''مجھے ڈیوٹی تبدیل کرانی پڑے گی۔ویسے اس میں کوئی خطرناک چیز تو نہیں ہے۔'' اس نے کرسی پر رکھے ہوئے بیگ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''صرف کپڑے اور کاغذات ہیں اس میں نہ تو منشیات ہیں نہ ہی کوئی دھماکہ خیز مواد اور نہ ہی کسی قسم کی خفیہ دستاویزات۔''

''ٹھیک ہے......پھر میں آج رات ہی کنٹرولر سے مل کر یہ ڈیوٹی تبدیل کرا لوں گا۔ زاہدان میں یہ بیگ کہاں پہنچانا ہے؟'' مسعودی نے سوال کیا اور فرازی نے ایک جیب سے لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا پھر بولا۔

''اس پر نام، پتہ اور فون نمبر لکھا ہوا ہے۔وہ لفافہ اس شخص کو دے دینا اور کہنا فوراً ہی اس پر لکھی ہدایت پر عمل شروع کر دے۔اس بیگ میں پانچ پیکٹ ہیں جو ایران میں مختلف جگہوں پر پہنچانے ہیں۔ان جگہوں کے پتے اس خط میں موجود ہیں۔اسے تاکید کر دینا کہ تمام پیکٹ ایک لمحے کے اندر اندر ہی اپنی منزل پر پہنچ جانے چاہئیں۔'' اس نے جیب سے دوسرا لفافہ نکالا اور مسعودی کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا نذرانہ ہے۔''

''خاصا وزنی لفافہ ہے۔'' مسعودی نے لفافے کو ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا۔

''ہلکا کام میں نے کبھی نہیں کیا۔'' فرازی مسکراتا ہوا بولا۔مسعودی نے لفافہ جیب میں ٹھونس لیا اور مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔

''شکریہ فرازی! پیر کے روز یہ بیگ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔''

مسعودی کے جانے کے بعد فرازی کچھ لمحے دروازے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ساتھ والی میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔یہ آج ہی شام کو شائع ہونے والا اخبار تھا لیکن بری طرح مسلا ہوا تھا جیسے بہت سے ہاتھوں سے گزر چکا ہو۔فرازی نے اخبار کو ہلکا سا جھٹکا دے کر سیدھا کرتے ہوئے اپنے سامنے پھیلا لیا۔لیکن ہیڈ لائن پر نظر پڑتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''ایران سے آدھا ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات چرانے والا مجرم نریمان فرازی ڈرامائی انداز میں جیل سے فرار ہو گیا۔''

یہ اخبار کی ہیڈ لائن تھی۔اس کے ساتھ ہی فرازی کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جسے دیکھ کر فرازی کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔لیکن یہ شہباز کا ذاتی مسئلہ نہیں تھا۔البتہ فرازی کے دماغ پر جو کیفیت اثر انداز ہوئی تھی اس وقت وہی شہباز کے سسٹم پر حاوی ہو گئی تھی۔شہباز نے خود پر قابو پایا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کے ایک انتہائی انوکھے تجربے سے وہ دوچار ہو رہا تھا۔شکل کسی کی تھی اور آ اس پر پڑی تھی۔یہ تجربہ وہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔بہت ہی انوکھی کیفیت تھی۔

بہر حال اس وقت اس نے اپنے آپ کو فرازی کے حوالے کر دیا تھا۔یہ تو دیکھ چکا تھا کہ جو کچھ فرازی کر رہا ہے وہ اس نوعیت کا حامل ہے جسے شہباز کے فرشتے بھی نہیں سمجھ پا رہے۔رازل جریری کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ دیا جائے کم ہے۔پتہ نہیں کتنے انسانوں کی ذہنی قوتیں رکھتا تھا وہ۔اس کی سوچ اتنی دور تک کام کرتی تھی کہ یقین نہ آئے۔اب نریمان فرازی کا انتخاب کوئی معمولی بات تو نہیں تھی اور پھر اس کے لیے فرازی نے کتنے پاپڑ بیلے تھے یہ بات بھی وہ جانتا تھا ویسے یہ بھی ایک دلچسپ منظر تھا کہ رازل جریری کے دو ساتھی جیل ہی سے اس تک پہنچے تھے۔یہ بھی ضروری شاید ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا کام ہی ایسا تھا۔

بہر حال اس وقت نریمان فرازی جو عمل کر رہا تھا وہ بڑا دلچسپ تھا۔نریمان فرازی کی حیثیت سے شہباز نے ادھر ادھر دیکھا ریستوران میں اس وقت اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت ہلکے پھلکے میک اپ میں تھا جو اس نے احتیاطاً دوکاندار کی دکان سے باہر نکلتے ہوئے اپنے چہرے پر

چکالیا تھا یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

بہر حال وہ دھڑکتے دل سے خبر پڑھنے لگا۔

”خطرناک مجرم نریمان فرازی جسے چند ہفتے قبل گرفتار کیا گیا تھا اور گرفتاری کے وقت جس کے قبضے سے آدھا ٹن سونا اور کروڑوں روپے کی مالیت کے ہیرے جواہرات ملے تھے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے نہایت ڈرامائی انداز میں جیل سے فرار ہو گیا فرار کا یہ منصوبہ بڑی ذہانت سے تیار کیا گیا تھا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ارجنٹ میل کے ذریعے چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک خط موصول ہوا تھا۔ جس میں بتایا گیا کہ مرکزی حکومت ایک نئے مشن کے سلسلے میں مجرم نریمان فرازی سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے اس سلسلے میں مرکزی حکومت کے دو نمائندے اس سے ملاقات کے لئے جیل آرہے ہیں چیف سیکرٹری کے خط میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کے نمائندوں سے بھرپور تعاون کیا جائے۔ اور اگر وہ تحقیقات کے سلسلے میں نریمان فرازی کو جیل سے باہر لے جانا چاہیں تو انہیں اجازت دے دی جائے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کے بیان کے مطابق جمعرات ہی کی شام کو مرکزی حکومت کے وہ دونوں نمائندے جیل پہنچ گئے۔ انہوں نے چیف سیکرٹری کا ایک دستی خط بھی انہیں دیا۔ اس خط میں بھی ہدایت کی گئی تھی کہ اس کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا جائے۔ مرکزی حکومت کے دونوں نمائندے آدھے گھنٹے تک نریمان فرازی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت کی کہ نریمان فرازی کو کل صبح بھیج دیا جائے تاکہ اس سے اہم سرکاری معاملے میں تفتیش کی جائے۔ دوسرے دن جیل کے سپرنٹنڈنٹ چیف سیکرٹری کے دفتر سے اس حکم نامے کی تصدیق نہیں کر سکا لیکن دفتر سے چیف سیکرٹری کی مہر اور دستخطوں سے جاری ہونے والے ان دونوں خطوط سے وہ مطمئن تھا۔

چنانچہ نریمان فرازی کو صبح دو کانسٹیبلوں کی نگرانی میں روانہ کر دیا گیا جنہوں نے اسے ایک بنگلے میں پہنچا دیا۔ مرکزی حکومت کے ایک نمائندے نے قیدی کی سپرداری کی رسید بھی دی تھی۔ اس روز جمعہ کی چھٹی ہونے کی وجہ سے جیل سپرنٹنڈنٹ چیف سیکرٹری کے دفتر کو قیدی کی منتقلی کی اطلاع نہیں دے سکا اور آج صبح جب جیل کی طرف سے اس خطرناک قیدی کے بارے میں یہ اطلاع ملی تو چیف سیکرٹری کے دفتر میں کھلبلی سی مچ گئی۔

ہمارے نمائندے کے مطابق چیف سیکرٹری کے دفتر سے قیدی کے سلسلے میں اس طرح کا کوئی خط جاری نہیں کیا گیا ہے اور اب یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خود کو مرکزی حکومت کے نمائندے ظاہر کرنے والے نریمان فرازی کے ساتھی تھے اور انہوں نے چیف سیکرٹری کے نام سے جعلی خطوط کے ذریعے بڑی مہارت سے اس کے فرار کا یہ منصوبہ تیار کیا تھا جو کامیاب رہا۔

پولیس نے مطلوبہ بنگلے پر چھاپہ مارا تو انکشاف ہوا کہ یہ بنگلہ پندرہ دن پہلے ایک شخص نے کرائے پر لیا تھا۔ اس نے ایک مہینے کا کرایہ بھی پیشگی ادا کر دیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ وہ برف باری دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور نریمان فرازی کو لے جانے والے دونوں کانسٹیبلوں کو معطل کر کے حراست میں لے لیا گیا ہے اور پولیس بڑی سرگرمی سے نریمان فرازی اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کر رہی ہے۔ بہت سے ایسے لوگوں کو بھی حراست میں لے لیا گیا ہے جن کے بارے میں یہ شبہ ہے کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح فرازی سے ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پولیس نے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ فرازی ابھی تک یہیں روپوش ہے اور اسے بہت جلد گرفت میں لے لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مزید انکشافات کی توقع ہے۔“

شہباز نے پوری خبر پڑھنے کے بعد بے چینی سے نریمان فرازی کے ذہن کی طرف رخ کیا۔ بڑی سنگین صورتحال تھی۔ اس کے فرار کا انکشاف آج ہوا تھا اور وہ آج صبح ہی سے اپنے مطلوبہ شخص کی دکان میں بند تھا۔ اور اس کے ساتھ کام میں مصروف رہا تھا۔ تھوڑے دنوں میں اسے باہر کے حالات کی خبر تک نہیں رہی تھی۔ جبکہ پولیس پورے شہر میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آرموسی اور ایزال کون تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اسے ڈرامائی انداز میں جیل سے کیوں نکالا تھا؟ مطلب تو صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ تہران میں پوشیدہ معزول شاہ کا خزانہ حاصل کرنا چاہتے تھے جس کی مالیت اربوں ڈالر تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو حکومت کا نمائندہ ظاہر کر کے اسے جیل سے فرار کرانے کی کوشش کیوں کی تھی۔

بہر حال یہ دونوں ناقابل فہم تھے۔ اور انہوں نے محض اسے جیل سے نکالنے کے لئے

اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر ان کا راز فاش ہو جاتا تو اس وقت وہ دونوں بھی جیل کی کسی تنگ سی کوٹھڑی میں بند ہوتے۔ لیکن منصوبہ واقعی با کمال تھا اور بڑی مہارت سے تیار کیا گیا تھا۔ چیف سیکرٹری کے نام سے ارجنٹ میل سے ایک خط حاصل کرنا اور پھر جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو پہنچانا سب کچھ بڑی ذمے داری اور مہارت سے تیار کیا گیا تھا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی دھوکا کھا گیا اور پھر ان دونوں کی شخصیت بھی اس قدر شاندار تھی کہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ انہوں نے بڑے پروقار اور دبنگ لہجے میں بات کی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو نریمان کو اسی شام اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے لیکن انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ ہدایت کی تھی کہ اگلے روز دو سپاہیوں کی نگرانی میں اسے بھیج دیا جائے۔

بہر حال یہ ایک شاندار منصوبہ بندی تھی اور اس کے لئے ہر جگہ کیل کانٹے سے لیس رہا گیا تھا۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ بدستور موجود تھا کہ وہ دونوں آخر تھے کون؟ کیا واقعی ان کا تعلق ایران کے معزول شاہ سے تھا یا پھر کسی ایسی تنظیم سے وابستہ تھے جسے شاہ کے پوشیدہ خزانے کا علم ہو گیا تھا اور وہ خزانہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان دنوں ایران سے دولت باہر لے جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ خزانہ صرف اور صرف نریمان فرازی ہی حاصل کر سکتا ہے۔ جو شخص پاسدارانِ انقلاب سے اتنی قیمتی اشیاء چرا سکتا ہے اس کے لئے شاہ کا پوشیدہ خزانہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ان دونوں کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔ لیکن فرازی کو یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی موقع پر اس سے رابطہ ضرور قائم کریں گے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اسے جیل سے رہائی دلائی تھی بلکہ ایک بہت بڑی رقم بھی خرچ کر ڈالی تھی اور ظاہر ہے یہ سب کچھ تفریحاً نہیں ہوا تھا۔

بہر حال اچانک ہی نریمان فرازی شہباز کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”کیا ہی دلچسپ بات ہے کہ جو کچھ کر رہے ہو وہ تم کر رہے ہو اور میں تمہارے وجود میں قید صرف منصوبہ بندی کر رہا ہوں جو تمہارے ذریعے عمل میں آ رہی ہے۔ تم یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہو گے میرے دوست! کہ اگر تم گرفتار ہو گئے تو میرا جسم تو وہاں محفوظ رہے گا جہاں تم لوگوں نے پوشیدہ کر دیا ہے لیکن تم موت کے کھیل میں شریک ہو جاؤ گے۔

کیا تم اب بھی مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ ان تمام چیزوں کے پس پردہ کیا ہے؟“

”شاہ کا خزانہ......“ شہباز نے فوراً ہی جواب دیا۔

”وہ تو میں جانتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہارے لئے یہ سارے کام کروں۔ لیکن بس مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ یعنی ہوگا وہی جو ہونا ہے۔ لیکن اگر تم پھنس گئے۔ ویسے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم بھی انتہائی پھرتیلے اور ذہین آدمی ہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیا کریں؟“

ابھی نریمان فرازی کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ اچانک ہی اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کی نظریں سب سے پہلے اس شخص کے جوتوں پر پڑی تھیں جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ سیاہ رنگ کے بوٹ تھے جن کی ٹو چمک رہی تھی۔ جوتوں سے اوپر خاکی پتلون تھی۔ آہستہ آہستہ فرازی کی نظریں پتلون کی کریز کے ساتھ ساتھ اوپر اٹھتی چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک پولیس آفیسر تھا جو اس کی میز کے قریب کھڑا گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو کانسٹیبل بھی تھے جنہوں نے رائفلیں سنبھال لی تھیں۔

”جی سر! مجھ سے کوئی کام ہے؟“ شہباز نے انتہائی نرم اور مخلص لہجے میں کہا۔

”زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اپنا شناختی کارڈ دکھائیں گے؟“ انسپکٹر کے پھول والے ایک شخص نے کہا۔

”کیوں نہیں سر...... اگر آپ کا حکم ہے۔“ یہ کہہ کر فرازی نے اپنے کوٹ کی جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ شناختی کارڈ بھی آج ہی حاصل کیا گیا تھا اور اس وقت اس کے چہرے میں جو تبدیلی تھی وہ اسی شناختی کارڈ پر لگی تصویر کے مطابق تھی۔ شناختی کارڈ اصلی اور حکومت کا جاری کردہ تھا۔ وہ دکاندار جس سے فرازی نے اپنا کام لیا تھا اپنے فن کا انتہائی ماہر تھا اور بہت ہی پوشیدہ طور پر یہ کام کیا کرتا تھا۔ ایسے بہت سے کارڈ اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کارڈ یا تو گمشدہ تھے یا ان کے مالکان کا انتقال ہو چکا تھا۔

بہر حال اس کارڈ پر جو نام اور پتہ لکھا ہوا تھا وہ بالکل محفوظ تھا۔ انسپکٹر نے کارڈ پر لگی تصویر کو دیکھا اور پھر نریمان فرازی کی طرف دیکھ کر کارڈ اسے واپس کر دیا۔

"آپ کو یقیناً اس شخص کی تلاش ہے آفیسر!" مطمئن ہونے کے بعد کہ آفیسر کو اس پر شبہ نہیں ہو سکا ہے، نریمان فرازی نے کھلنے کی کوشش کی اور سامنے میز پر رکھے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کر دیا۔

"بالکل صحیح خیال ہے آپ کا۔"

"اخبار کی اطلاع کے مطابق یہ شخص گزشتہ روز جیل سے فرار ہوا تھا۔ کیا آپ کے خیال میں وہ ابھی تک شہر میں آزادانہ طور پر گھوم رہا ہوگا؟" نریمان فرازی نے کہا۔

"پھر بھی، اس کی تلاش کی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔" انسپکٹر یہ کہہ کر دوسری میز کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے انداز اور لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ کارروائی محض خانہ پری کے لئے کر رہا ہے اور اسے اس تمام کارروائی سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکل گیا۔

کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگ اب اس موضوع پر باتیں کرنے لگے تھے۔ نریمان فرازی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا ان لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس نے کوٹ کا کالر اوپر اٹھایا اور ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے اور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔

✡......✡

شہباز کو اس کی ساری ہنگامہ آرائی پر کوئی اعتراض نہیں تھا رازل جریری کے ساتھ اس نے خطرناک سفر کا جو آغاز کیا تھا وہ اب اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ اب تک رازل جریری نے اسے کئی ایسی مہمات میں جھونکا تھا جہاں موت کسی بھی لمحے اسے گلے لگا سکتی تھی۔ یہ بھی ایک انوکھا نشہ ہوتا ہے۔ عام لوگ اس طرح کے کام کرنے والوں کو دیوانہ سمجھتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر پیش ہونے والے ایسے انوکھے کھیل جن میں زندگی کی امید کم اور موت کا امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہوئے دلوں میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ یہ زندگی کے اتنے دشمن کیوں ہیں اور زندگی کے ساتھ یہ مذاق کیوں کرتے رہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کوئی ان کے دل سے پوچھے۔ موت کی طرف لپکنا اور موت کا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جانا ایک ایسا دلکش کھیل ہے جس کا نشہ ہی بالکل مختلف ہوتا ہے اور شہباز اب اس نشے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس وقت کام تو نریمان فرازی کر رہا تھا لیکن وجود شہباز کا تھا اور شہباز نریمان فرازی کے ذہن سے اس طرح تعاون کر رہا تھا کہ سوچ کر بھی حیرت ہو۔

نریمان فرازی مکمل طور پر اس کے جسم کو استعمال کر رہا تھا حالانکہ اس نے خود بھی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ شہباز گھن کی طرح پس رہا ہے لیکن بات یہ نہیں تھی۔

بہرحال اس کے بعد نریمان فرازی مقامی علاقے سے اپنی واقفیت کی بناء پر بیش بہا کارنامے سرانجام دیتا رہا ایک مال بردار ٹرک کے ذریعے اس نے ایک طویل فاصلہ طے کیا اور پھر جب اس نے سرحد عبور کی تو ایک دم محتاط ہو گیا۔ پھر نریمان فرازی کی باری آئی اور اس کے کاغذات بھی بڑی باریک بینی سے چیک کیے گئے۔ اس سے متعدد ایسے سوالات کیے گئے کہ اگر کوئی اور ہوتا تو گڑبڑا جاتا لیکن نریمان نے بڑے پرسکون لہجے میں ان سوالات کے جوابات دیئے تھے اور شہباز عش عش کرنے لگا تھا۔ واقعی یہ شخص با کمال شخصیت کا مالک

ہے۔ خیر اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ بڑے دل گردے کا مالک ہے۔ کیونکہ دل اور گردے تو شہباز کے استعمال ہو رہے تھے لیکن دماغ نریمان فرازی کا تھا اور دماغ ہی کے ذریعے وہ سارے جسم کو کنٹرول کر رہا تھا۔

پھر وہ مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ زاہدان میں اس نے سب سے پہلے آتری سے رابطہ قائم کیا آتری اس کے خاص لوگوں میں سے تھا اور سرحد سے تقریباً پچاسی کلومیٹر کے فاصلے پر ریگستان کے کنارے پر آباد تقریباً دو لاکھ کی آبادی پر مشتمل اس شہر میں اپنا ایک محفوظ مقام رکھتا تھا۔ اس شہر کے رہنے والے زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ قالین بنانے کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں یہاں قائم ہیں اور تھوڑے ہی فاصلے پر افغان سرحد کے قریب دریائے ہرل کے کنارے زابل کا تاریخی شہر آباد ہے۔ زابل سیستان کا مرکزی شہر ہے۔ حال ہی میں یہاں ایک قدیم شہر کے کھنڈرات بھی دریافت ہوئے ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ چار ہزار سال پہلے یہاں ایک خوبصورت شہر آباد تھا۔ یہاں سے بہت سی ایسی چیزیں دریافت ہوئیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ اب تک دریافت ہونے والے بیشتر کھنڈرات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جیسے یہ قدیم شہر آگ لگنے سے تباہ ہوا ہو۔ لیکن فی الحال کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ مقامی والے اسے شہر سوختہ کے نام سے ہی پکارتے ہیں یعنی جلا ہوا شہر۔

بہر حال یہاں کمیٹی کے اہل کار پورے زاہدان شہر میں دندناتے پھرتے ہیں اور اس وقت تو شاید ان کی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ ہر مشتبہ شخص کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔

چنانچہ شہباز کو بھی شہر میں دو مرتبہ روکا گیا اور دونوں مرتبہ بڑی باریک بینی کے ساتھ اس کے کاغذات چیک کیے گئے۔ ان کاغذات کے مطابق وہ شیڈز میں قالین تیار کرنے والی کمپنی کا مالک تھا اور کاروباری سلسلے میں یہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ ویسے شہباز جب زاہدان پہنچا تھا تو اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے وہ جانتا تھا کہ شہر میں گھومنا پھرنا زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک ریسٹوران میں بیٹھ گیا اور پھر یہیں سے اس نے اپنے دوست آتری سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت آتری اسے دستیاب نہیں ہو سکا اور اب وہ ریسٹوران میں بیٹھا وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس نے دوبارہ

ٹیلی فون سے آتری کا نمبر ڈائل کیا اور اس مرتبہ رابطہ قائم ہو گیا۔ آتری چند منٹ پہلے گھر پہنچا تھا۔

''آہ۔ کیا تم ہو؟'' آتری کی آواز ابھری۔

''ہاں۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں آرہا ہوں تم اپنے گھر پر ہی میرا انتظار کرو۔''

شہباز کے جسم میں قید نریمان فرازی نے کہا اور ریسٹوران سے نکل آیا۔ آتری کے مکان تک پہنچنے میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے تھے۔ آتری بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''ایٹم بم ہو تم پورے ایٹم بم۔ اس وقت تم سوچ نہیں سکتے کہ زاہدان میں تمہارے خلاف کیا کچھ ہو رہا ہے۔ کمیٹی کو تمہاری آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ پورے شہر میں تمہاری تلاش ہو رہی ہے ہر مشتبہ شخص کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ تمہارے اوپر ایک انتہائی قیمتی انعام مقرر ہو چکا ہے اتنا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' آتری نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''مجھے کسی حد تک اندازہ ہو چکا ہے تم نے یہاں سے میری روانگی کا کیا بندوبست کیا ہے یہ بتاؤ۔''

''دوپہر کو ایک مال بردار ٹرک کرمان کے لیے روانہ ہونے والا ہے تم ٹرک ڈرائیور کے ہیلپر کی حیثیت سے ساتھ جاؤ گے تم نے جو پیکٹ بھیجے تھے وہ متعلقہ جگہوں تک پہنچا دیے گئے ہیں۔ لباس وغیرہ تبدیل کر لو میں معلوم کر کے آتا ہوں کہ ٹرک کس وقت روانہ ہو گا۔''

''جاؤ۔''

''سب کچھ یہاں موجود ہے تم جانتے ہو یہاں رہ کر تمہیں کیا کرنا ہے۔''

''ہاں۔ میں جانتا ہوں۔'' شہباز نے جواب دیا اور پھر اس کے جاتے ہی اس نے میز پر رکھا ہوا ایک تھیلا کھول لیا جس میں بوسیدہ سے لباس کے علاوہ اس کے نئے شناختی کارڈ اور کاغذات موجود تھے۔ لباس پر جگہ جگہ گریس اور تیل کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس نے لباس تبدیل کر کے کاغذات جیب میں رکھے اور کچن میں داخل ہو گیا۔

پھر اس نے فریج کھول کر اندر کا جائزہ لیا فریج میں انڈے، مکھن، ضرورت کی کئی چیزیں موجود تھیں اس نے دو انڈوں کا آملیٹ بنایا اور ڈبل روٹی کے سلائس گرم کرنے لگا ابھی اس

نے سلائس پلیٹ میں رکھے ہی تھے کہ باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ گاڑیاں نہایت عجلت میں روکی گئی ہیں۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں اٹھائے کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی پر رنگین شیشے لگے ہوئے تھے جن سے آر پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے ایک انچ کے قریب کھڑکی کا پٹ کھول دیا اور باہر جھانکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ گئی اور تلے ہوئے سلائس فرش پر بکھر گئے۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ کمیٹی والوں کو اس کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے اور اسے شہر میں بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کمیٹی والے اتنی جلدی اس تک پہنچ جائیں گے۔ وہ ایک کار اور دو چھوٹے ٹرک تھے جو گلی میں آ کر رکے تھے اور کمیٹی کے تقریباً ڈیڑھ درجن مسلح آدمی ٹرکوں سے اتر کر آٹومیٹک ہتھیار سنبھالے پوزیشن لینے کے لیے ادھر دوڑ رہے تھے۔ کار میں سے تین آدمی اترے۔ دو تو کمیٹی کے آفیسر معلوم ہو رہے تھے اور تیسرا ایک مقامی مذہبی رہنما تھا اس نے سیاہ رنگ کا چوغہ پہن رکھا تھا اور سر پر سیاہ پگڑی تھی چہرے پر گول داڑھی جس میں سے ہلکی سی سفیدی بھی جھلک رہی تھی اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک ریوالور بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کمیٹی کے افسران کو احکامات جاری کر رہا تھا۔

شہباز کچھ لمحوں کے لیے بری طرح نروس ہو گیا۔ کمیٹی کے مسلح آدمی جس طرح گلی میں پوزیشن لے رہے تھے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس مکان کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ گویا کمیٹی کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ وہ اس مکان میں موجود ہے لیکن انہیں یہ اطلاع کیسے ملی او پھر اچانک اس کے ذہن میں آتری کا نام ابھرا۔ کمیٹی نے نریمان فرازی کی گرفتاری کے لیے بہت بڑی انعام کی رقم کا اعلان کر رکھا تھا۔ اس کے بارے میں آتری ہی نے مجھے بتایا تھا کہ اور یہ رقم اتنی بڑی تھی کہ کسی کی نیت تو کیا ایمان تک ڈگمگا سکتا تھا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آتری یہاں سے جانے کے بعد سیدھا کمیٹی کے دفتر پہنچا ہو اور انہیں فرازی کی اس مکان میں موجودگی کی اطلاع دے دی ہو۔

بہرحال انسان انسان ہی ہوتا ہے اور اس طرح کے لوگوں کا نظریہ صرف دولت اور صرف دولت ہوتی ہے۔ شہباز نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور تیزی سے کچن سے باہر نکل آیا اس کے ساتھ ہی اس نے لباس میں چھپایا ہوا پستول نکال لیا۔ سامنے والے

دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ پچھلی طرف سے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس مکان کے پیچھے بھی ایک مکان تھا جس کی پشت ملی ہوئی تھی۔ سوچنے میں صرف ایک لمحہ ضائع کیا گیا اور پھر اندرونی زینہ چڑھ کر وہ اوپر آ گیا۔ مکان کے چھت کی اطراف میں تقریباً تین فٹ اونچی منڈیر تھی۔ چھت پر ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بکھرا ہوا تھا۔ پچھلا مکان دو منزلہ تھا۔ مکان کی چھت پر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

اس کی نظر اپنے مکان کی چھت پر موجود آخری کونے میں پانی کی ٹینکی پر جم گئی۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں پناہ لی جا سکتی ہے۔ گلی میں بھاگ دوڑ کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا شہباز تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹینکی کے پاس پہنچا اس نے آہستگی سے ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا تہہ میں کوئی ڈیڑھ فٹ پانی تھا باقی ٹینکی خالی تھی۔ وہ بڑی آہستگی سے ٹینکی میں اتر گیا اور آہنی ڈھکنا اس طرح رکھ دیا کہ ہوا کی آمد ورفت کے لیے تھوڑی سی جھری باقی رہ جائے۔ ابھی اسے پانی کی ٹینکی میں پناہ لیے ہوئے ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ چھت پر شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر یوں لگا جیسے ساتھ والے مکان کی چھت سے کوئی اس چھت پر کودا ہوا۔

شہباز ٹینکی کی پچھلی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا اس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور اسے یقین تھا کہ اگر اس کا پتہ چلا بھی لیا گیا تو ہاتھ آنے سے پہلے وہ دو چار آدمیوں کو تو موت کی نیند سلا ہی دے گا۔ اچانک ہی فائر کی آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ شہباز چونک پڑا جب وہ اس مکان میں داخل ہوا تھا یہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ آتری اکیلا ہی یہاں رہتا تھا یہ بات اسے نریمان فرازی کی حیثیت سے معلوم تھی۔ لیکن چھت پر کسی نسوانی چیخ نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک چھت پر دوڑتے ہوئے لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

پانی کی ٹینکی میں شہباز کا دم گھٹ رہا تھا۔ لیکن وہ باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ اسی طرح گزر گیا پھر گاڑیوں کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی کمیٹی والے واپس جا رہے تھے لیکن شہباز نے پانی کی ٹینکی سے باہر آنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ کمیٹی کا کوئی نہ کوئی آدمی مکان میں ضرور موجود ہوگا۔ دس منٹ گزر گئے چھت پر قدموں کی آواز ایک بار پھر ابھری اور وہ چونک پڑا۔ پستول پر اس کی انگلیوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ چھت پر چلنے والے قدموں کی آواز بھاری نہیں ہے۔

کوئی بہت ہلکے قدموں سے چل رہا تھا۔

شہباز نے ٹینکی کے ڈھکنے کی جھری سے جھانک کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پھیل گئی۔ وہ آتری تھا جو چھت پر ایک جگہ کھڑا پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شہباز نے ایک لمحے کا انتظار کیا اور پھر آہستہ آہستہ ڈھکنا ایک طرف ہٹا دیا آواز سن کر آتری اس کی جانب گھوما اور پھر اسے ٹینکی میں سے سر ابھارتے دیکھ کر آتری کے منہ سے بے اختیار آواز نکل گئی۔

''اوہ تم...... تم...... خدا کا شکر ہے کہ تم محفوظ ہو میں سمجھا تھا کہ۔''

''ہاں۔ لیکن انہیں میری یہاں موجودگی کی اطلاع کیسے ملی۔'' شہباز کا لہجہ حد درجہ سرد تھا۔

''انہوں نے تمہاری تلاش میں یہاں چھاپہ نہیں مارا تھا۔'' آتری بولا۔

''تو پھر۔'' شہباز نے اسے گھورا وہ اب بھی آتری کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

''انہیں اطلاع ملی تھی کہ تہران کی ایک دولت مند عورت ساتھ والے مکان میں چھپی ہوئی ہے۔ جو اپنی دولت سمیت یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ چھاپہ اسی عورت کی پکڑنے کے لیے مارا گیا تھا۔ اس نے ہمارے مکان کی چھت کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے گولی مار کر زخمی کر دیا گیا۔ بہر حال اب وہ لوگ جا چکے ہیں اور شکر ہے کہ تم ان کی نگاہوں میں نہیں آئے۔'' آتری نے کہا۔

''اوہ۔'' شہباز نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی یہ ایک نیا انکشاف ہوا تھا اسے پھر وہ کہنے لگا۔

''جب ان کی گاڑیاں گلی میں آ کر رکیں تو میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں۔'' بہر حال پانی کا یہ ٹینک میرے لیے بڑی اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا۔

''وہ لوگ جا چکے ہیں اب کوئی خطرہ نہیں اب نیچے آ جاؤ۔'' آتری نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

شہباز کے جوتے بری طرح بھیگ گئے تھے۔ نیچے آ کر اس نے جوتے اتار کر آتش دان کے سامنے رکھ دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ جوتے اور دیگر کپڑے چند منٹ میں سوکھ جائیں گے۔ آتری نے لکڑی کے چند پھندے آتشدان میں ڈال دیئے۔

''کمیٹی والے اب تک تین آدمیوں کو تمہارے شبہ میں گرفتار کر چکے ہیں اور انہیں تشدد کا

نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ تم شہر کے شمالی اڈے پر چلے جاؤ۔ ٹرک ٹھیک دو بجے روانہ ہو گا۔ میں تمہیں اس کا پتہ بتائے دیتا ہوں۔ لیکن تمہیں تنہا ہی جانا ہو گا۔ معاف کرنا میرے دوست اس وقت میں اپنی شخصیت کو مشکوک نہیں کرنا چاہتا۔ تم اس وقت ان لوگوں کے لیے بارود کا ڈھیر بنے ہوئے ہو۔ کوئی بھی چنگاری تم تک پہنچی تو ایسا دھماکہ ہو گا کہ زاہدان ہل کر رہ جائے گا۔ میں تمہیں ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام وغیرہ بتا دیتا ہوں۔''

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد شہباز، آتری کے مکان سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد ٹرکوں کے اڈے تک پہنچنے کے لیے اسے خاصی محنت کرنا پڑی۔ جب وہ ٹرکوں کے اڈے پر پہنچا تو مذکورہ ٹرک جانے ہی والا تھا۔ اس پر سامان لوڈ کیا جا چکا تا۔ ڈرائیور کو پہچاننے میں شہباز کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ٹھیک دو بجے ٹرک اڈے سے نکل کر آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا کام مکمل تھا اور شہباز ایک بار پھر کامیابی کے ساتھ اپنا سفر کر رہا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا اور شہباز پوری نیند جاگ رہا تھا راستے میں کئی بار اس نے نریمان فرازی سے گفتگو کی تھی۔

زاہدان سے نکلنے کے بعد وہ شام کے وقت تھوڑی دیر رکے تھے اور پھر ان کا سفر دوبارہ جاری ہو گیا تھا۔ ابھی وہ مطلوبہ جگہ سے تقریباً اسی میل دور تھے کہ ٹرک خراب ہو گیا اور انہیں ایک چھوٹے سے قصبے میں رکنا پڑا۔ ڈرائیور تو رات گزارنے کے لیے قصبے کے سرائے میں چلا گیا۔ شہباز مجبوراً ٹرک کے کیبن میں لیٹ گیا۔ وہ اس وقت ٹرک کے کلینر کی حیثیت سے اپنا حلیہ بنائے ہوئے تھا۔ پھر اس کے بعد دوسرا دن ٹرک کی مرمت پر لگ گیا اور جب وہ قصبے سے روانہ ہوئے تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے کے لگ بھگ وہ کرمان پہنچ گئے۔

یہاں بھی کمیٹی کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں اور جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ ٹرک ڈرائیور سے رخصت ہونے کے بعد شہباز نے ایک بار پھر اپنا حلیہ تبدیل کیا اور پھر وہ وہاں سے چل پڑا۔ راستے میں اسے ایک ٹیوٹا کار نظر آئی جس سے اس نے لفٹ مانگی۔ کار کا ڈرائیور کسی کمپنی کے مالک کا ڈرائیور تھا۔ اس نے شہباز سے پیسے طلب کر لیے اور شہباز نے اسے فوراً ایک نوٹ نکال کر دے دیا اور اس نے بتایا کہ وہ کوہ پایا نامی قصبے کی جانب جا رہا ہے کرمان سے بتیس کلومیٹر دور دشت لود کے کنارے کوہ پایا نامی اس قصبے کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ

نہیں تھی۔ پختہ سڑک یہاں ختم ہو جاتی تھی اور اس سے آگے کچی سڑک تھی جو ریگستان کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی ور بند، عرب آباد اور فیض آباد کی طرف چلی جاتی تھی۔ شہباز قصبے سے گزرتا ہوا کچی سڑک پر کئی میل آگے نکل گیا اور آخر کار اس نے ایک جگہ کار رکوا دی۔ اس کے چاروں طرف ویرانہ تھا میلوں دور تک لق و دق صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کچی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی تھی ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس سے آگے آپ کو کہاں جانا ہے جناب!"

"ڈرائیور مجھے اس گاڑی کی ضرورت ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم میرے ساتھ رکو گے یا۔"

"مگر میں کار کیسے چھوڑ سکتا ہوں جناب!" ڈرائیور نے جواب دیا اور اسی وقت اس بے چارے کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ نریمان فرازی نے ذرا بھی تکلف سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کی پیشانی میں گولی اتار دی۔ یہ کام اتنی جلد بازی میں ہوا تھا کہ شہباز اس بے گناہ انسان کی موت سے نریمان فرازی کو روک بھی نہیں سکا اور یہاں پہلی بار اسے نریمان فرازی پر غصہ آیا جو اس کے جسم پر تسلط جمائے بیٹھا تھا اور وہ عمل کر رہا تھا جو شہباز کو نا پسند تھے۔ یعنی اس وقت ڈرائیور کی موت کے بعد اس نے نریمان فرازی سے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"کم از کم تمہیں مجھ سے اس بارے میں مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔"

برا مت مانو میرے دوست! میری تو مجبوری ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں تمہارے لیے کر رہا ہوں اپنے لیے نہیں۔ اس وقت تو تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں اپنی زندگی بھی داؤ پر لگائے ہوئے ہوں۔ اگر تمہارے جسم کو کچھ ہو گیا تو تمہارا کیا خیال ہے کوئی مجھے اس دماغ سے نکال کر لے جائے گا یا میں خود یہاں سے آزادی حاصل کر لوں گا۔ میں اگر ایسا کر سکتا تو یقین کرو میں کر لیتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور باقی جو کچھ میں کر رہا ہوں اس پر تم اس قدر بھروسہ رکھو کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

شہباز خاموش ہو گیا تھا۔ جس جگہ انہوں نے گاڑی روکی تھی اس کے چاروں طرف بھر پور ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ میلوں دور تک لق و دق صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کچی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھار کوئی اکا دکا گاڑی گزر جاتی تھی۔ پھر شام کے چھ بج

گئے۔ سورج مغرب کی سمت جا رہا تھا لیکن صحرا کی ریت ابھی تک تپ رہی تھی۔ شہباز کار سے اتر کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بائیں طرف ریت کے تپتے ہوئے ٹیلے تھے اور بائیں طرف کچھ فاصلے پر سرخ چٹانیں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ہی چٹانوں کے ایک طرف ایک گدھ فضا میں پرواز کرتا دیکھ کر وہ چونک سا گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد اسے ایک اور گدھ نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر بعد جب دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا تو گدھوں کی تعداد تین ہو چکی تھی اور یہ ایک دائرے کی صورت میں پرواز کر رہے تھے۔

شہباز کو حیرت ہونے لگی ڈرائیور کی لاش اس نے ریت میں دفن کر دی اس لیے یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک مردہ جسم کی بو پر یہ خوفناک گدھ آئے ہوں پھر ان کی یہاں آمد کا کیا مقصد ہے۔

بہر حال شہباز خاصا پریشان ہونے لگا اب وہ بہت تھک چکا تھا اور اسے اپنا لباس بھی جسم پر بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے لباس کے اندر چھپے ہوئے پستول کو چھو کر محسوس کیا۔ اسے یہ پستول بھی ایک ناگوار سا بوجھ لگ رہا تھا۔ لیکن وہ اسے بیکار سمجھ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔

بہر حال کار اس وقت ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑی ہوئی تھی اور اسے سڑک سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے فرازی سے یہ سوال کیا تو فرازی کہنے لگا۔

"میرے دوست! ہمیں آگے تو بڑھنا ہی ہے۔ تھوڑا سا اور انتظار کر لو اس کے بعد سفر شروع کریں گے۔ شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے فرازی سے سوال کیا۔

"لیکن اب اس کے بعد تمہارا منصوبہ کیا ہے میرے ذہن میں رہ کر کم از کم تم مجھے اپنے آگے کے مشغلے سے تو آگاہ کر دیا کرو۔"

"کرمان میں مجھے ایک شخص سے ملنا ہے اس کا نام ریحان ہے ریحان دروزی یہ میرا دوسرا مطلوبہ شخص ہے۔ شہباز خاموش ہو گیا۔ بہت دیر گزر گئی پھر ایک جگہ کھڑے کھڑے وقت ضائع کرنے کے مترادف سمجھ کر اس نے آگے کی جانب قدم بڑھا دیئے اور ان چٹانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جو کافی فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔ یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ چٹانوں کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ چٹانوں کی دوسری جانب ایک تنگ و تاریک راستہ بتدریج نشیب

میں اترتا چلا گیا تھا۔ نجانے کیوں وہ اس راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر اس کے پیروں سے پھسل کر نشیب میں لڑھک رہے تھے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا ہوا میں ایک ناگوار سی بو کا احساس شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہ بو کسی گٹر یا گیس کی بو سے مشابہت رکھتی تھی۔ وہ راستے کے ایک تنگ موڑ پر رک گیا۔ نشیب میں کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ کے قریب چند کچے مکانوں کے کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ ان کے قریب ایک کنواں تھا جو خشک پڑا ہوا تھا اور اس کی منڈیر سوئی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ پہلے کسی خانہ بدوشوں کی بستی ہوگی جو اب ویران ہو چکی تھی اور اب جہاں کھنڈرات کے سوا کچھ نہیں تھا۔

نجانے کیوں شہباز کے منہ سے ایک انوکھی سی آواز نکلی۔

"دروزی! کیا تم یہاں ہو۔" اس نے فرازی کے دماغ کو ٹٹولا تو فرازی نے کہا۔

"مجھے کچھ وقت ذرا سکون لینے دو میرے دوست! بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا انکشاف وقت سے پہلے ممکن نہیں ہوتا۔ شہباز کے ذہن میں غصے کی ایک لہر پھر نمودار ہوئی تو فرازی نے کہا۔

"دیکھو...... تم مجھے بہت عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں نے خود تو تمہارے اس جسم پر قبضہ جمانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ایسا تم نے کب اور کس طرح کیا۔ ایک اس قدر ناواقف آدمی جو صرف تمہارے لیے کام کر رہا ہے اگر تم جگہ جگہ اس پر جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرو تو کیا یہ زیادتی نہیں ہے۔ میں تو مجبوری کے عالم میں تمہارے ذہن میں قید ہوں۔ چلو میرا بدن واپس نہ کرو میرا ذہن ہی آزاد کر دو۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ویسے ایک بات تم سے کہوں۔ مجھے یہ لگتا ہے جیسے جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی تمہاری اپنی کاوش نہیں ہے تم خود کسی کے آلۂ کار ہو لیکن کیا تمہیں اس کا مناسب صلہ ملے گا۔"

"ان تمام باتوں کو چھوڑو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تم نے کہا تھا کہ کرمان میں تمہیں ریحان دروزی سے ملنا ہے۔ یہاں تم کہاں ریحان دروزی کو تلاش کر رہے ہو۔"

"میرے اور اس کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ اگر کبھی ایسی کوئی بات ہو تو وہ یہاں اس جگہ مل سکتا ہے اس کے لیے ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ یہ غالباً اس کا ایک خفیہ ٹھکانہ ہے۔" شہباز کو احساس ہوا کہ وہ ایک پراسرار بات سن رہا ہے اس کا تعلق گزرے ہوئے لمحات سے تو نہیں تھا تاہم اس نے خاموشی ہی اختیار کی اور دیکھنے لگا کہ اب آگے کیا ہوتا ہے۔

پراسرار شخص جو کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود تھا۔

"اگر تم یہاں ہو تو میرے سامنے آؤ۔ میں نریمان فرازی ہوں۔ ریحان...... ریحان دروزی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا لگتا تھا جیسے اس پرسکوت ویرانے میں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ رہا ہو لیکن آسمان پر منڈلاتے ہوئے وہ گدھ وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ اب ان کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ شہباز کچھ لمحے وہیں کھڑا کھنڈرات کو گھورتا رہا۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ فضا میں گیس یا گٹر جیسی ناگوار بو اب بھی موجود تھی اور یہ شمال کی طرف سے ہوا کے ساتھ آ رہی تھی۔ کچھ رُوکھے سوکھے ہوئے درختوں کے قریب والا مکان دوسرے مکانات سے نسبتاً بڑا تھا اس کی چھت اور شمال کی سمت والی دیوار گر چکی تھی بڑی بڑی کچی اینٹیں آس پاس بکھری ہوئی تھیں۔ ان اینٹوں کو دیکھ کر شہباز کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ایک چھوٹی سی بستی بہت قدیم ہے اور پھر ممکن ہے کنوئیں کا پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے خانہ بدوش ہجرت کر کے کہیں اور چلے گئے ہوں اور اس کے بعد سے یہ بستی ویران پڑی ہو۔ ایک بار پھر شہباز کے منہ سے فرازی کے زیر اثر ایک تیز چیخ نما آواز نکلی۔

"ریحان......" اس کا رخ کھنڈرات کی طرف تھا۔ لیکن اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا اس نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا نشیب میں کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگا۔

بہرحال بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے آگے کا سفر شروع کیا۔ نجانے کیوں اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ ہونا ضرور ہے۔ وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہا اور ہر طرح کی احتیاط برتنا چاہتا تھا۔

"یہاں تم کس طرح کا خطرہ محسوس کر رہے ہو۔" شہباز نے سوال کر ڈالا۔

"ہاں۔ اصل میں میرے دوست! زندگی کو اگر احتیاط سے خرچ کرو تو وہ کچھ بڑھ جاتی ہے۔ کچھ عرصے قبل جب میں پاسدارانِ انقلاب کے ایک گودام سے کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات اور سونا لے کر فرار ہو رہا تھا تو میرے ایک ساتھی نے مجھے دھوکا دیا اور میں اپنے ساتھی کی مخبری پر ہی پکڑا گیا تھا اور اب ایک بار پھر ایک ایسی ہی صورتحال درپیش ہے۔ تم نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے اس پر شک کیا تھا میرا مطلب ہے آتری پر کیونکہ

ہمارے لیے ایک بہت بڑا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ ویسے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ہم بڑے خطرات سے دوچار ہیں کمیٹی نے میرے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے اور قدم قدم پر میری تلاش ہو رہی ہے اس طرح سے یوں سمجھ لو کہ ہم شیروں کی کچھار میں ہیں۔ لیکن تمہیں بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ موت سے پنجہ آزمائی زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے کیا سمجھے۔ اور اگر تم یاوہ جس نے اس تمام تر جدوجہد کے لیے میرے جسم کو قیدی بنا رکھا اور دماغ کو آزادی دی ہے اگر شاہ کا خفیہ خزانہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہر طرح کے خطرے سے گزرے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ یعنی اب بھی میرے ایسے ساتھی موجود ہیں جو میرے لیے جان بھی دے سکتے ہیں لیکن احتیاط تو ضروری ہوتی ہے۔''

شہباز نے اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں اب خنکی بڑھ گئی تھی۔ شہباز پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا کھنڈرات کے قریب پہنچ گیا۔ پہلا جھونپڑا خالی تھا دوسرے جھونپڑے میں کسی جانور کا خستہ سا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ یہ ڈھانچہ غالباً کتے کا تھا اس کے پاس مٹی کے چند ٹوٹے ہوئے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ مکان کے صحن میں اسی طرح کی چند اور چیزیں بھی بکھری ہوئی تھیں جنہیں اب ریت کا غلاف چڑھ گیا تھا۔ شہباز مکان سے نکل کر کھلے صحن میں آ گیا یہاں ریت پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ جو درختوں کے جھنڈ کے قریب بڑی جھونپڑی کی جانب رہنمائی کر رہے تھے۔ شہباز کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یقیناً یہ ریحان کی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات ہوں گے۔ وہ اس بڑے جھونپڑے کے قریب رک گیا اور چند سیکنڈ تک آہٹیں لیتا رہا پھر محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا جھونپڑے کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف نکل گیا۔ اس طرح آتے ہی اسے کچھ نظر آیا اور ایک لمحے کے لیے اس کے بدن میں پھر لرزش پیدا ہوگئی۔

''شہباز......'' نریمان فرازی کی آواز ابھری۔ اس نے پہلی بار شہباز کو اس انداز میں مخاطب کیا تھا۔ شہباز نے اس کے ذہن سے رابطہ کیا تو نریمان فرازی کہنے لگا۔

''ہاں۔ یہ ریحان ہی ہے۔'' شہباز کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ کھجور کے گرے ہوئے دو خشک تنوں کے درمیان جو انسانی جسم پڑا ہوا تھا وہ بے لباس تھا اور اس کے آس پاس بھی لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شہباز تقریباً دس منٹ کے فاصلے پر رک کر اس جسم کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی رسی سے بندھے ہوئے

تھے۔ جس کا دوسرا سرا درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔ آس پاس ریت پر قدموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔

شہباز وہیں رک کر محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ کے دوسری طرف ایک کار نظر آ رہی تھی۔ بے اختیار نریمان فرازی نے کہا۔

''آہ...... یہ ریحان کی ہی کار ہے۔'' وہ تیز تیز قدموں سے کار کے پاس پہنچ گیا اور کھلی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ ریحان کا کوٹ ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن شہباز نے کوٹ یا کسی اور چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے گردن گھما کر ریحان کی برہنہ لاش کو دیکھا اور ایک بار پھر وہ بری طرح چونک پڑا اسے ریحان کے سینے میں ہلکا سا زیروبم محسوس ہو رہا تھا۔ تبھی نریمان فرازی کی سرسراتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔

''آہ...... شہباز! شاید یہ زندہ ہے جلدی چلو آگے چلو۔'' شہباز کے قدم تیزی سے اس کے جسم کی جانب اٹھ گئے اور پھر اسے یہ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ کوئی لاش نہیں ہے بلکہ اس میں ابھی زندگی باقی ہے۔ لیکن اس کی حالت دیکھ کر شہباز کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی کہ ریحان کو اس حالت میں پہنچانے والے ایک سے زیادہ افراد تھے اور وہ یقیناً اپنے کام میں ماہر تھے۔ اسے جس طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اسے دیکھ کر شہباز کے پورے جسم میں تھرتھری دوڑ رہی تھی۔ ریحان کی ناف کے نیچے بہت بڑا زخم تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھی کاٹ دیئے گئے تھے اور اس طرح اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں لیکن آنکھوں کے سکڑے ہوئے ڈیلوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی بینائی ختم ہو چکی ہے اس کا منہ کھلا ہوا تھا جس سے سونے کا ایک دانت جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بے اختیار شہباز، ریحان کے چہرے پر جھک گیا اور اس نے پھر ایک بار اسے آواز دی۔

''دروزی...... ریحان دروزی...... ریحان......'' ریحان کے سینے میں زیروبم پیدا ہوا جس سے یہ اندازہ لگانے میں کافی آسانی پیدا ہوگئی کہ وہ زندہ بھی ہے اور سن بھی سکتا ہے۔''

''ریحان......'' اس نے ایک بار پھر پکارا اب یہ سارا عمل فرازی کر رہا تھا۔ ریحان کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بڑی مشکل سے بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم...... تو م...... آواز ہوا کی سرسراہٹ سے بھی مدھم تھی۔

"ہاں۔ میں فرازی ہوں نریمان فرازی۔" شہباز نے کہا۔

"بہت دیر...... بہت دیر......" ریحان کے ہونٹ پھڑ پھڑائے۔

"مم...... مجھے...... مجھے قتل کر دو...... مجھے قتل کر دو پلیز...... ریحان درروزی کی آواز میں بھیک مانگنے کی سی کیفیت تھی۔ شہباز نے پتلون کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی پانی کی بوتل نکال کر اس کا ڈھکن کھولا اور بڑی تیزی سے چند قطرے اس کے زخمی اور خشک ہونٹوں پر ٹپکائے۔

"آہ...... مجھے...... مجھے قتل کر دو...... تمہاری بڑی مہربانی...... تمہاری......" درروزی کی کرب ناک آواز بمشکل تمام نکل رہی تھی۔

"درروزی ہمت رکھو۔ حوصلہ رکھو۔ یہ کہتے ہوئے شہباز کچھ اور اس پر جھک گیا۔ درروزی جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شہباز نے کہا۔

"کون لوگ تھے وہ۔ بتاؤ کون لوگ تھے وہ۔"

"تت...... تت......" درروزی کے حلق سے مدھم سی آواز نکلی۔ شہباز نے پانی کے کچھ قطرے اس کے حلق میں ٹپکائے اور ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔ درروزی کے جسم پر سے جگہ جگہ سے کھال اتار لی گئی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن بھی غائب تھے۔ انگلیوں کی پوروں پر ناخنوں کے بجائے جما ہوا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کے ناخن غالباً پلاس سے اکھاڑے گئے تھے۔ دونوں پیروں کے انگوٹھے کٹے ہوئے تھے۔ غالباً اس کی پشت پر بھی زخم تھے لیکن خون جم جانے کی وجہ سے اس کا جسم اب ریت سے چپکا ہوا تھا اور اس کو ہلائے بغیر زخم کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔

"کون لوگ تھے وہ۔ بتاؤ کون لوگ تھے وہ۔" شہباز کی آواز ایک بار پھر نکلی۔

"تلاتی......" ریحان درروزی کی مردہ سی آواز نکلی۔" وہ...... وہ...... خزانے کا پتہ پتہ...... پتہ۔" اس کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

"خزانہ۔" اچانک ہی شہباز چونک پڑا۔ تلاتی اس کا ایک ساتھی تھا۔ ایک انتہائی ذلیل قسم کا غدار جس نے اس سے غداری کی تھی اور مخبری کر کے اسے ہیرے جواہرات اور سونے سمیت پکڑوا دیا تھا۔ تلاتی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ہیرے جواہرات اور سونا سب حکومت کی تحویل میں ہے پھر وہ ریحان سے کس خزانے کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کیا تلاتی کو کسی طرح یہ راز معلوم ہو گیا ہے کہ وہ شاہ کے خفیہ خزانے کی

اصل جگہ جانتا ہے۔ لیکن اسے یہ راز کس طرح معلوم ہوا اور کیسے پتہ چلا کہ ریحان درروزی ان کھنڈرات میں موجود ہے۔ ریحان کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

"میں بڑی اذیت میں ہوں پلیز مجھے قتل کر دو۔ مجھے اس اذیت سے نجات دلا دو۔" اس کی آواز بڑی دردناک تھی۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں ابھی لے کر کرمان جا رہا ہوں تم بچ جاؤ گے۔ میں تمہارا علاج......"

"نہیں پلیز...... میری بات مانو براہ کرم میری بات مانو تو مجھے ہلانا مت مجھے گولی مار دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ لوگ......"

"نہیں میرے دوست! میں برا آدمی ضرور ہوں۔ لیکن میں تمہیں گولی نہیں مار سکتا۔" شہباز کے منہ سے آواز نکلی۔ یہ جذبہ اور یہ عمل سو فیصد فرازی کا تھا۔

"مان لو میری بات...... میری بات مان لو۔" ریحان کی آواز ڈوب گئی اور آہستہ آہستہ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ ختم ہو گیا تھا اور اسے زندگی کی اس اذیت سے نجات مل گئی تھی۔ شہباز کو زندگی کے نئے نئے تجربات ہو رہے تھے۔ آہ سرکس کی زندگی کتنی حسین تھی۔ جھولے پر کھیل دکھانا بے شک موت کی قربت کا کھیل تھا لیکن یہ سب کچھ بہت دردناک تھا۔ وہاں انسان اگر مرتا تو زیادہ سے زیادہ اپنی موت مر جاتا تھا۔ بڑا عجیب سا احساس اس وقت اس کے ذہن میں جاگزین تھا۔ لیکن اس کے ذہن کا دوسرا حصہ مختلف انداز میں سوچ رہا اور عمل کر رہا تھا۔ اس وقت نریمان فرازی کی کیفیت بڑی عجیب سی تھی۔ کچھ لمحے کے بعد وہ کار کے قریب آ گیا اس نے کار کی چابی نکالی وہ اگر چاہتا تو کار پر پٹرول چھڑک کر اس کو آگ لگا سکتا تھا۔ لیکن اندیشہ تھا کہ دھواں دیکھ کر کمیٹی والے تحقیق حال کے لیے یہاں نہ پہنچ جائیں۔ ہو سکتا ہے وہ آس پاس ہی موجود ہوں۔ شہباز کمیٹی والوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کوئی ویرانہ بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا البتہ وہ یہ کر سکتا تھا کہ کار کو ناقابل شناخت بنائے اس نے کار کی دونوں لائسنس پلیٹس اتار کر وہاں سے کافی دور ریت میں دفن کر دیں۔ انجن کے سیریل نمبر کے بارے میں ظاہر ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دو کتابیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ناول تھے جن میں سے ایک کا ایک صفحہ مڑا ہوا تھا۔ غالباً ریحان کتابیں پڑھتے پڑھتے یہاں چھوڑ چکا تھا۔ اس کی کوٹ کی جیب میں سے تمام چیزیں

اور رقم نکال کر شہباز نے اپنی جیبوں میں رکھی اور کوٹ وہیں ڈال دیا۔ ایک بار پھر اس نے تنقیدی نگاہوں سے کار کا جائزہ لیا اور وہاں سے ہٹ کر چٹان کی جانب چلنے لگا۔

سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا تنگ راستے پر چلتا ہوا وہ اوپر پہنچ گیا۔ اس نے آخری مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا اندھیرے میں اس کی لاش نظر نہیں آ رہی تھی وہ مڑ کر آگے بڑھنے لگا اور اسی وقت چاند چٹان کی چوٹی سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔

حالانکہ شہباز ریحان دروزی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن جو لمحے اس کی زندگی کے آخری وقت کے شہباز کی نگاہوں کے سامنے آتے تھے وہ بڑے دلدوز تھے۔ نریمان فرازی بھی بہت متاثر نظر آ رہا تھا لیکن ظاہر ہے اس کا ایک طویل تعلق دروزی سے رہ چکا تھا وہ جس حد تک متاثر تھا وہ ایک الگ بات تھی۔ لیکن شہباز پر بھی ایک عجیب سا سوگوار احساس طاری تھا۔

وہاں سے واپسی تو ضروری تھی۔ ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ٹیلے کی آڑ میں اسے ایک اور گاڑی کھڑی نظر آئی تھی یہ روکس ویگن تھی اور یہ گاڑی شہباز کی گاڑی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ شہباز محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ لیکن روکس ویگن کے اندر یا آس پاس اسے کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک تین انسانی سائے چٹان کی آڑ سے نکل کر اس کے سامنے آ گئے۔ وہ دو مرد تھے اور ایک عورت ایک آدمی کے ہاتھ میں ایک آٹو میٹک رائفل تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور۔ عورت خالی ہاتھ تھی۔ وہ اسے زد میں لیے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔

مدھم مدھم چاندنی میں وہ صاف نظر آ رہے تھے دونوں آدمیوں میں سے ایک بھاری بھرکم اور طویل قد و قامت کا مالک تھا اور اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ دوسرا قدرے پستہ قامت اور دبلے پتلے بدن کا مالک تھا۔ اسی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ شہباز کے اندازے کے مطابق وہ دونوں تیس اور پینتیس سال کے درمیان رہے ہوں گے اور ان کی ساتھی لڑکی بالکل نوجوان تھی اس نے پینٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ رہی ہو گی بلاشبہ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ لڑکی اپنے ساتھیوں سے چند قدم دور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

''کون ہو تم لوگ؟'' شہباز ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔

''دیکھو...... میں تمہیں ایک بات کہوں۔ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش مت کرنا میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے جو کچھ بھی ہے اگر تم چاہو تو میں اسے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔''

''ہمیں تمہاری رقم سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' لمبے قد والے نے کہا۔

''تو پھر۔''

''اپنا ریوالور نکال کر ایک طرف پھینک دو اگر کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔'' شہباز نے ایک بار پھر گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا اگر چالاکی دکھانے کی کوشش بھی کرتا تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لمبے قد و قامت والے کے آٹو میٹک رائفل کی موجودگی میں اس کے اشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ سے ہٹ کر چٹان کی طرف چلی گئی تھی۔

''میں تمہیں صرف دس سیکنڈ دے رہا ہوں ریوالور جینا کی طرف اچھال دو'' لمبے قد والے نے اپنی رائفل کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ شہباز کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ اس نے لمبے قد والے کے کرخت چہرے کی طرف دیکھا اور احتیاط سے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر پہلے ہتھیلی پر رکھا اور پھر اسے لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ لڑکی نے نہایت مہارت سے یہ ریوالور ہوا میں ہی کیچ کر لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ گئی۔

''گڈ...... اب آگے چلو اس کی طرف۔'' لمبے قد والے نے نشیب کی طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو کم از کم مجھے بتا تو دو کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو۔'' شہباز نے پوچھا۔

''یہ بات تمہارے ساتھی کے قریب پہنچ کر ہی بتائیں گے۔'' لمبے قد والے نے جواب دیا۔ اب تک ساری گفتگو وہی کرتا رہا تھا اس کا دوسرا ساتھی اور وہ لڑکی جسے جینا کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، خاموش ہی رہے تھے۔ نشیب کی طرف جانے والے تنگ راستے پر رک گیا۔ شہباز نے ایک بار پھر باری باری تینوں کو دیکھا انہوں نے صرف ریوالور لیا تھا اس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ جبکہ شہباز کے پاس ایک خنجر اب بھی موجود تھا جسے اس نے کوٹ کے نیچے بغل میں چھپایا ہوا تھا۔

''چلو نیچے اترو۔'' اس مرد اور چھوٹے آدمی نے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

شہباز نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور نیچے اتر کر ایک بار پھر تنگ راستے کی طرف دیکھا۔ اس

کے پیچھے لمبے قد والا تھا جس نے یہ رائفل سنبھال رکھی تھی اس کا پستہ قامت ساتھی دوسرے نمبر پر تھا اور لڑکی سب سے پیچھے تھی۔ اس تنگ سے راستے پر اترتے ہوئے شہباز نے بڑی احتیاط سے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بغل میں چھپایا ہوا خنجر نکال لیا۔ وہ جیسے ہی مڑا لمبے قد والے نے اپنے رائفل کی جھکی ہول اوپر اٹھا لی لیکن اسے رائفل استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ شہباز کے ہاتھ سے نکلا ہوا خنجر بڑی تیزی میں ہوا میں چلتا ہوا اس کے حلق میں ترازو ہوگیا اور وہ کھڑے کھڑے لہرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریگر دب گیا اور رائفل سے نکلنے والی گولیاں چاند کو نشانہ بنانے لگیں۔ جینا کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اس کا پستہ قامت ساتھی بدحواس سی نگاہوں سے اپنے گرتے ہوئے ساتھی کو دیکھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا شہباز نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر اپنی چھلانگ لگادی۔ وہ اس طرح کی چھلانگوں کا ماہر تھا جبکہ نشیب میں گرنے والا کوئی آدمی اس طرح بلندی کی جانب ایسی چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک انسانی جسم میں لنگوروں سے زیادہ پھرتی ہوسکتی ہے۔ شہباز کے سر کی زوردار ٹکر اس کے پیٹ پر لگی اور وہ کراہتا ہوا نیچے گرا لیکن اس نے گرتے ہوئے بھی شہباز کی گرفت سے بچنے کی کوشش کی تھی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ وہ دونوں بڑی تیزی سے نشیب میں لڑھکنے لگے۔ اس دوران لمبے قد والا آدمی جسے شہباز نے خنجر کا نشانہ بنایا تھا۔ تنگ راستے کے کنارے سے لڑھک کر بیس فٹ نیچے گہرے کھڈ میں جاگرا تھا۔

شہباز نے دوسرے آدمی کو پکڑ رکھا تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ڈھلان پر لڑھک رہے تھے اور لڑکی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے پاس اگرچہ شہباز کا ریوالور موجود تھا لیکن اس کے حواس شاید ختم ہوچکے تھے اور غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتحال میں اس کا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ وہ لڑکی شہباز کے لیے بھی خطرناک ہوسکتی تھی لیکن شہباز فی الحال اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ نیچے لڑھکتے ہوئے پتھر بری طرح چبھ رہے تھے۔ شہباز کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ وہ اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید یہ ڈھلان کبھی ختم نہیں ہو۔ پھر اچانک وہ کسی بڑے پتھر سے ٹکرا کر رک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے حواس واقعی رخصت ہونے جارہے ہوں۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاڑیاں رقصاں

تھیں۔ چند لمحات اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسے اپنے اوپر آسمان بڑی تیزی سے گھومتا ہوا لگ رہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ ہورہی تھی اور کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہیں سکا۔ تب اس نے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹنا چاہا تو اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ جس چیز سے اس کا ہاتھ ٹکرایا تھا وہ کوئی پتھر نہیں تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا وہ اس کے حریف کا ریوالور تھا۔ جسے اس نے فوراً آہنی گرفت میں لے لیا۔ ڈھلان پر اوپر سے ابھی تک چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھک رہے تھے۔

شہباز گھٹنوں پر بوجھ ڈال کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا اسے ایک بار پھر اپنے گرد کی ہر چیز گھومتی ہوئی لگی اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلتی جارہی تھی۔ سر کو وہ زور زور سے جھٹکنے لگا پھر کافی دیر تک اس کیفیت کا شکار رہا۔ آخر کار جب تھوڑی سی کیفیت بہتر ہوئی تو وہ گھسٹتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اسے داہنی ٹانگ میں خاصی تکلیف محسوس ہورہی تھی لیکن اتنی نہیں کہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کی بارے میں سوچا جاسکے۔ یہ تکلیف پتھروں سے ٹکرانے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ گھسیٹتا ہوا بڑے پتھر کے پاس پہنچ گیا اور پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا جب حواس کسی قدر بحال ہوئے تو اس نے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

”چاند گہرے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ جینا اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے جینا کسی کو پکار رہی ہو۔ یہ آواز اوپر سے آرہی تھی اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔ اس کے چاروں طرف بڑے بڑے پتھر ٹیلوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اس نے پہلی مرتبہ غور سے جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ اگر وہ اس پستہ قد آدمی کے ساتھ گتھم گتھا لڑھکتا ہوا چٹان کے دامن میں اس جگہ گرا تھا جہاں کسی زمانے میں دریا بہتا ہوگا۔ لیکن اب وہاں پتھروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شہباز کو وہ پستہ قد آدمی قرب و جوار میں کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک بار پھر چٹان کی طرف دیکھنے لگا۔ چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ بادلوں سے نکل آیا۔

تب شہباز کو وہ لڑکی نظر آئی۔ جو بہت محتاط ہوکر اس تنگ سے راستے پر نیچے آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور صاف نظر آرہا تھا۔ یہ ریوالور شہباز کا ہی تھا۔ لڑکی ایک ایک قدم

پھونک پھونک کر رکھ رہی تھی۔ آخر کار وہ چٹان کے قدموں میں آ کر رک گئی۔ ایک بار پھر چاند گھرے بادلوں میں چھپ گیا اور تاریکی چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً بیس گز آگے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز ابھری اور پھر ایک آواز سنائی دی۔

''جینا!'' وہ یقیناً اس لڑکی کے ساتھی کی آواز تھی جو سرگوشی کے انداز میں اسے پکار رہا تھا۔ شہباز اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور چیک کیا جو پوری طرح لوڈ تھا۔ لیکن اس پر سیفٹی کیچ لگا ہوا تھا۔ یہ اسی پستہ قد آدمی کا ریوالور تھا۔ سیفٹی کیچ لگا ہونے کی وجہ سے شہباز کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شخص فی الحال اس ریوالور کو استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ شہباز نے آہستگی سے سیفٹی کیچ ہٹا دیا ریوالور آٹو میٹک پر سیٹ تھا جسے اس نے سنگل فائر پر سیٹ کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور بہت محتاط ہو کر پتھر کے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ چند گز دور لمبے قد والا آدمی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ یہ وہ تھا جسے شہباز نے خنجر مارا تھا۔ خنجر کے وار اور اتنی بلندی سے پتھروں پر گرنے سے وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کا پستہ قامت ساتھی اس پر جھکا۔ وہ اسے ہلا کر دیکھ رہا تھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

اب شہباز نے یہاں بیٹھے رہنا مناسب نہیں سمجھا اور آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے سرکنے لگا اس کی ٹانگ کی تکلیف اب کافی کم ہو گئی تھی اب وہ آسانی سے چل سکتا تھا۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لے کر اس طرف بڑھتا رہا جہاں اس نے آخری مرتبہ چھوٹے قد والے آدمی کو دیکھا تھا۔ اچانک ہی ایک سرگوشی کی سی آواز ابھری۔

''سنو...... ہیلو...... سنو میری بات سنو......'' یہ سرگوشی دائیں طرف سے ابھری تھی اور آواز بلاشبہ اسی لڑکی کی تھی لیکن شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ اس کی چالاکی بھی ہو سکتی تھی۔ لڑکی پھر بولی۔

''میں تم سے مخاطب ہوں۔ ہوشیار رہنا۔ ہوشیار رہو'' جینا کی سرگوشی دوبارہ ابھری جس انداز میں وہ اسے مخاطب کر رہی تھی اور جو بات کر رہی تھی اس سے اس کے لہجے کا اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ شہباز کو حیرت ہوئی کہ اگر یہ لڑکی اسے خبردار کر رہی ہے تو آخر کیوں۔ لیکن شہباز نے اس بار بھی خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جینا اپنے ساتھی کے برخلاف اسے ہوشیار رہنے کا مشورہ کیوں دے رہی ہے لیکن پھر اسے یہ

سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس کی ہمدرد بن کر اس کے خلاف کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ محتاط انداز میں بے آواز آگے بڑھنے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے جا کر اسے بائیں طرف مڑنا پڑا۔ اس کے سامنے ایک عمودی چٹان تھی اور بائیں طرف وہ کھڈ تھا جہاں لمبے قد والے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ شہباز اب اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا اگر وہ اسے نہ مارتا تو لمبے قد والا اسے زخمی کر دیتا اور شاید ہلاک کرنے سے پہلے اسے بھی اسی طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا جس طرح ریحان دروزی کو۔ ریحان دروزی کی لاش کا تصور کر کے شہباز کے بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ اچانک چند پتھر اس کے پیروں سے پھسل کر ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔ سناٹے میں پتھروں کے لڑھکنے کی آواز دور دور تک سنی جا سکتی تھی۔ شہباز ایک دم ساکت ہو گیا۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔

شہباز نے ایک بار پھر رک کر صورتحال کا جائزہ لیا۔ جس تنگ راستے سے لڑھک کر وہ نیچے آیا تھا۔ وہاں سے واپس اوپر جانا ممکن نہیں تھا۔ چونکہ اس طرح وہ نظروں میں آ سکتا تھا۔ ایک بار پھر اسے ایک سرگوشی سنائی دی۔ جو اس پستہ قامت آدمی کی تھی۔

''جینا...... جینا......'' شہباز نے آواز کی سمت دیکھا لیکن اسے وہ شخص دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی جینا کہیں نظر آئی وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا لمبے قد والے کی لاش کے قریب آ چکا تھا اور پھر وہ جھک کر اس کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔ جیبوں سے برآمد ہونے والی رقم، کاغذات اور چابیاں اس نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس شخص کی جیب سے برآمد ہونے والی نوٹوں کی گڈی کافی موٹی تھی۔ شہباز نے ادھر ادھر دیکھا اور اسے آٹو میٹک رائفل کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ رائفل شاید اس کے دوسرے ساتھی نے اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ ابھی شہباز سوچ ہی رہا تھا کہ نشیب کی طرف سے آٹو میٹک رائفل کا سیٹ مارا گیا۔ ویرانہ گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔ یہ گولیاں شہباز کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی چٹان پر لگیں۔ شہباز نے فوراً ہی ایک پتھر کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور وہ اس سمت کا اندازہ لگانے لگا جہاں سے فائرنگ کی گئی تھی۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ فائرنگ کھنڈرات والی سائیڈ سے کی گئی تھی۔ اسی وقت پھر وہ سرگوشی سنائی دی۔

''جینا! ادھر آ جاؤ۔'' لیکن شاید لڑکی نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس نے اس آواز کا

کوئی جواب نہیں دیا۔شہباز آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک بار پھر پتھر کے پیچھے دبکنا پڑا چونکہ ایک بار پھر دوسری طرف سے برسٹ مارا گیا تھا۔شہباز زمین پر لیٹ گیا اور پتھروں پر سینے کے بل رینگتا ہوا نشیب میں خشک دریا کی سمت بڑھنے لگا۔چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رکا۔حالات کا اندازہ لگایا اور اس کے بعد پھر رینگنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ کھنڈرات کے قریب تھا۔اچانک بائیں سمت کسی کے حرکت کرنے اور ایک چھوٹا سا پتھر لڑھکنے کی آواز آئی اور وہ اس طرف دیکھنے لگا کچھ فاصلے پر گزشتہ مکانوں کے ستون نظر آرہے تھے۔یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اگر یہاں کوئی موجود ہے تو وہ کس ستون کے پیچھے ہوگا۔ریوالور کے دستے پر شہباز کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔لیکن دوسری طرف خاموشی تھی کچھ لمحے گزر گئے۔پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کررہا ہو۔شہباز بھی دبے قدموں چلتا ہوا ایک شکستہ ستون کی آڑ میں پہنچ گیا۔لیکن دوسری طرف ایک بار پھر خاموشی چھا چکی تھی۔کچھ دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر ویرانے میں ایک سرگوشی ابھری۔

''جینا! کہا مر گئی ہو۔بولتی کیوں نہیں۔'' لیکن یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ آواز کس سمت سے آئی تھی۔انداز میں احتیاط تھی جیسے دوسرے شخص کو یقین ہو کہ اس کا دشمن ہوشیار ہے۔

یہ آواز چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔دوسری اور تیسری بار پھر یہی آواز سنائی دی اس بار غصے میں زور سے پکارا گیا لیکن جینا نجانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔دفعتاً ہی شہباز چونک پڑا۔چند قدم کے فاصلے پر نشیب پر ایک سر سا ابھرتا ہوا نظر آیا۔شہباز نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔پھر کندھے دکھائی دیے اور شہباز فوراً ہی حرکت میں آگیا اس نے نشیب سے نمودار ہونے والے ہیولے پر چھلانگ لگادی۔اسی لمحے بائیں سمت سے فائرنگ کی گئی۔شہباز پرندے کی طرح اڑتا ہوا اس ہیولے پر پڑا اور اسے ساتھ لیتا ہوا نشیب میں گر گیا۔اسے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ جس پر اس نے چھلانگ لگائی تھی وہ مرد نہیں عورت تھی اور ظاہر ہے یہاں جینا کے علاوہ اور کون عورت ہوسکتی تھی۔جینا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔وہ شہباز کے نیچے دبی ہوئی تھی۔شہباز نے جلدی سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی دونوں کلائیاں پشت پر گرفت میں لے کر اس کی کمر پر دباؤ ڈالنے لگا۔

''آواز نکالی تو تمہاری گردن موڑ کر رکھ دوں گا۔'' شہباز کی غراہٹ ابھری۔جینا جو مزاحمت کرنے کی کوشش کررہی تھی۔اس خوفناک آواز کو سن کر ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔اسی وقت اس کے ساتھی کی آواز پھر ابھری۔

''جینا...... جینا...... جنیا...... میں کہتا ہوں اگر تم مر چکی ہو تو دوسری بات ہے اور زندہ ہو تو بولو۔اس کی آواز چٹانوں میں بازگشت پیدا کررہی تھی۔شہباز نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میری بات غور سے سنو۔کیا تم میری آواز سن رہی ہو۔''

''ہاں۔'' جینا کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔شہباز نے جس طرح اس پر گرفت قائم کیے ہوئے تھی۔اس سے اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔شہباز نے اس کے منہ سے ہاتھ اٹھالیا اور کمر پر گھٹنے کا زور کچھ اور بڑھا دیا۔

''تم میرے ہر سوال کا جواب دوگی لیکن آواز زیادہ بلند نہیں ہونی چاہیے۔''

''تم جانتے ہو کہ تم...... تم خطرے میں ہو؟''

''میری پرواہ چھوڑ دو۔تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔شہباز نے سوال کیا۔

''جنیدال...... تم نے جنیدال کو مار دیا۔وہ تلاتی کے لیے کام کررہا تھا۔وہ میرا دوست تھا جینا نے جواب دیا۔

''کون جنید؟''

''وہی جسے تم نے قتل کردیا۔ہمارے دوسرے ساتھی کا نام غوزل ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''مجھے کیوں گھیرا گیا تھا۔''

''میں تفصیل کچھ نہیں جانتی لیکن جنیدال کا خیال تھا کہ تم شاہ کے کسی خفیہ خزانے سے واقف ہو۔وہ تم سے اس خزانے کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا اس کے لیے تلاتی نے اسے ایک بڑی رقم دی ہے۔میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں میں محض دولت کی لالچ میں اس کے ساتھ آ گئی تھی جنیدال کا خیال تھا کہ تم سے خزانے کا پتہ معلوم کرنے کے بعد وہ تلاتی کو بھی ختم کر دے گا اور اس طرح خزانے پر اکیلا قابض ہوجائے گا۔دوسرے آدمیوں کو بھی اس نے دولت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیا تھا۔''

''ہوں۔اب ایک بات کا جواب تم مجھے بالکل سچ دوگی۔جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو جو

کچھ میں تمہارے ساتھ کروں گا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔"
"کیا؟" لڑکی نے بھی سرگوشی میں کہا۔
"ریحان درروزی کو کس نے قتل کیا تھا۔" شہباز کی آواز ابھری۔
"جنیدال نے۔" جینا نے جواب دیا۔ "ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ جنیدال کا خیال تھا کہ اگر درروزی سے خزانے کا پتہ معلوم ہو جائے تو تم سے الجھنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور تمہارے تہران پہنچنے سے پہلے ہی خزانے پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ لیکن وہ بڑا سخت جان تھا اور جنیدال وہ خاص حالات میں درندہ بن جاتا ہے۔ وہ تشدد کے ایسے ایسے طریقے جانتا تھا کہ پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر وہ تمہارے ساتھی کی زبان نہیں کھلوا سکا۔"
"کچھ دیر پہلے تم نے مجھے ہوشیار کیوں کیا تھا؟" شہباز نے سوال کیا۔
"م...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" جینا بولی۔
"میری مدد کی ضرورت۔"
"ہاں۔"
"کیا؟"
"دیکھو جنیدال ختم ہو چکا ہے اور یہ دوسرا آدمی بھی اس سے کم خطرناک نہیں ہے۔ وہ تم سے خزانے کا پتہ معلوم کر کے مجھے اور تمہیں دونوں کو قتل کر دے گا۔ شہباز چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا پھر اچانک ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے جینا کو دبوچا اور اس کے جسم کی تلاشی لینے لگا اس کا اشاریہ تین آٹھ کا ریوالور جینا کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ جسے اس نے اپنے قبضے میں لے لیا اس کے علاوہ جینا کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ شہباز نے مطمئن ہو کر اسے چھوڑ دیا۔ ایک بار پھر جنید کے ساتھی کی آواز ابھری۔ وہ جینا کو آواز دے رہا تھا اور خاصا غصے میں تھا۔ شہباز نے ایک طرف ہٹ کر ریوالور پتلون میں اڑس کر اپنا ریوالور ہاتھ میں سنبھال لیا۔ جینا کچھ لمحے اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑی رہی پھر لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھر گئے تھے۔ وہ شہباز سے تقریباً دو گز کے فاصلے پر تھی۔ تاریکی کے باعث شہباز کو اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اپنی جگہ بیٹھا رہا پھر پتھر کی آڑ سے گردن نکال کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تاریکی میں چٹانوں کے ہیولوں کے سوا

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہباز نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر جینا کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف کھینچنے لگا۔ جینا کے خیال میں یہ ایک کھنڈان کے لیے بہترین پناہ گاہ تھا۔ وہ اس سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی لیکن شہباز کے سامنے کوئی مزاحمت نہیں کر سکی۔ اس نے البتہ یہ محسوس کیا کہ جینا ہولے ہولے کپکپا رہی ہے۔ یہ کپکپاہٹ سردی کی وجہ سے تھی یا خوف کی وجہ سے وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ بائیں طرف قدرے فاصلے پر کچھ شکستہ ستون نظر آ رہے تھے۔ وہ جینا کا ہاتھ پکڑ کر دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا۔ چشم تصور سے وہ اپنے دشمن کو گھات لگائے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اگرچہ جینا کو اپنے سامنے ڈھال بنا رکھا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر اس شخص نے اسے دیکھ بھی لیا تو وہ فائر کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ جینا کی اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر جینا کو ایک ستون کے پیچھے دھکیل دیا اور خود بھی آڑ میں چلا گیا لیکن ان کا تحفظ غیر یقینی تھا۔ وہ کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ دائیں، بائیں۔ پیچھے یا تنگ درے میں۔
"وہ اس طرف۔" اچانک جینا کی سرگوشی سنائی دی اور شہباز نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا لیکن اس کچھ نظر نہیں آیا۔
"میں نے اسے اس طرف حرکت کرتے دیکھا۔" جینا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر سرگوشی کی۔ شہباز کو اس مرتبہ بھی اگرچہ کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ آس پاس ہی کہیں گھات لگائے بیٹھا ہے۔ جینا اس وقت تو واقعی شہباز کی ہمدردی کر رہی تھی۔ اس نے اسے جو کہانی سنائی تھی۔ شہباز نے اس پر یقین تو کر لیا تھا کہ وہ لوگ اس سے شاہ کے خفیہ خزانے کا پتہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس طرح اپنی جان کے خوف سے اس کے ساتھ آن ملی تھی۔ ممکن ہے یہ کوئی اور چال ہو اور موقع پا کر وہ اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرے اس مرتبہ شہباز نے خود ہی اسے سامنے لانے کی کوشش کی اور اچانک اس کی آواز ابھری۔
"سنو یہ لڑکی میرے قبضے میں ہے وہ زخمی ہے اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"
جواب میں ایک جنونی قہقہے کی آواز سنائی دی تھی۔ آواز اگرچہ گونجتی ہوئی سنی تھی لیکن شہباز کو اس کی سمت کا اندازہ لگانے میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ وہ درے کے اسی طرف موجود تھا۔
"تم یہیں رکو میں ابھی آتا ہوں۔" شہباز نے جینا کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں بھی تمہارا ساتھ چلوں گی۔" جینا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ٹھیک ہے چلو۔"

"ایک منٹ۔" جینا رک گئی۔

"کیا بات ہے؟"

"وہ اوپر ہے اور ہم اگر یہاں سے جنبش کریں گے تو آسانی سے اس کی نگاہوں میں آ جائیں گے۔"

"مجبوری ہے ہم زندگی بھر یہاں نہیں کھڑے رہ سکتے۔" شہباز نے کہا اسی لمحے درے کی طرف سے برسٹ مارا گیا۔ گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر گئیں ایک گولی ستون پر پڑی پتھر کا ایک ٹکڑا شہباز کے کان کے قریب سے گزر گیا۔ جینا کانپ کر رہ گئی۔ شہباز نے فائرنگ کی آواز کی سمت دیکھا چٹان کی طرف سے تنگ سے راستے کی طرف ایک بڑے سے پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ شہباز نے جینا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ اس موتبہ ان پر فائرنگ نہیں کی گئی تھی۔ وہ مکانوں کے کھنڈرات کے اوپر سے ہوتے ہوئے پچھلی سمت نکل گئے اور ایک جگہ رک گئے۔

شہباز نے محافظ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر جینا کا ہاتھ پکڑ کر اس تنگ سے راستے کی طرف دوڑ لگا دی۔ جس سے چٹان کے اوپر پہنچا جا سکتا تھا اسی لمحے ان پر دو فائر کیے گئے۔ لیکن گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔ وہ دوڑتے ہوئے اس تنگ سے راستے پر پہنچے اور پتھروں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگے۔ اچانک ایک اور فائر ہوا اور اس مرتبہ گولیاں قریب سے چڑھائی گئیں تھیں۔ شہباز نے مڑ کر دیکھا ایک انسانی ہیولا ایک طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔ یہ وہی پستہ قامت تھا جو ایک بڑے پتھر کی آڑ لینے کے لی دوڑ رہا تھا۔ شہباز نے فائر کر دیا اور اس بار وہ اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ وہ دونوں اس تنگ سے راستے پر اوپر چڑھنے لگے تقریباً دو فٹ چوڑے اس راستے کے اس طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف ایک گہرے کھڈ۔

شہباز نے جینا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ راستے کے ایک موڑ پر جا کر اس ن جینا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس سے تین چار قدم آگے نکل گیا۔ اچانک جینا کا پیر پھسلا اور ایک بڑا پتھر اس کے

پیر کے نیچے سے نکل گیا جینا کی چیخ سن کر شہباز تیزی سے پیچھے بڑا۔ جینا راستے کے کنارے اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی بے شمار فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتی چلی گئی۔ اس کی آخری چیخ بے حد بھیانک تھی۔

شہباز خطرناک حد تک تیزی سے چلتا ہوا نیچے آیا۔ جینا پتھروں پر پڑی تھی اس کا جسم خون میں لت پت تھا اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ختم ہو گئی تھی۔ شہباز واپس چل پڑا اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے تھے۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر پھینک دیا اور خود اپنی ٹویوٹا میں بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے اس نے کار کا رخ سڑک کی طرف کر دیا۔

اب وہ دروزی اور تلاتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تلاتی کو کس طرح اس کا راز معلوم ہو گیا تھا اور اس راز کے لیے دروزی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ تلاتی کے دو آدمی اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ جینا کی موت کا بہر حال اسے افسوس تھا لیکن اسی وقت اسے اپنے ذہن سے نریمان فرازی کی آواز سنائی دی۔

"نہیں اس کا مر جانا بھی بہتر ہی ہوا۔ ویسے مجھ یقین ہے کہ کسی نہ کسی موقع پر تلاتی سے آمنا سامنا ضرور ہو گا۔"

کار واپس کا سفر طے کرنے لگی۔ شہباز اس انوکھی ہنگامہ آرائی سے خاصا متاثر تھا۔ بس ویسے تو جو کچھ اب تک اس نے کیا تھا وہ ان معاملات سے کہیں زیادہ خطرناک تھا لیکن ہر مرتبہ اسے یہ احساس تھا کہ اس بار مہم جوئی پہلے کی مہم کئی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

۞......۞

موسم بہت خوشگوار تھا۔ انٹیلی جنس کا سربراہ کرنل اعظم حیات اپنے دفتر میں داخل ہوا تو اسے پیغام ملا کہ چیف نے اسے فوراً اپنے دفتر میں طلب کیا ہے۔ کرنل حیات فوراً ہی واپس مڑا اور چیف کے دفتر کی جانب چل پڑا۔ چیف نے اس کے سلام کا جواب دیا اور نیلے رنگ کا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جس پر سرخ رنگ کا کراس بنا ہوا تھا۔

"یہ پیغام گزشتہ رات پڑوسی ملک سے موصول ہوا ہے۔" چیف نے کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور کرنل نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔ پھر اس پر درج شدہ پیغام پڑھنے لگا۔

> "ہمارے شہر کے ایک علاقے میں جو ایران سے منسلک ہے واقع ایک بنگلے میں چار روز پہلے خفیہ میٹنگ ہوئی تھی۔ جس میں تین افراد شامل تھے۔ دو کا تعلق ایک بین الاقوامی خفیہ تنظیم سے ہے اور تیسرا بدنام زمانہ شخص نریمان فرازی تھا جسے اس روز جیل سے نہایت ڈرامائی انداز میں رہا کرایا گیا تھا۔ خیال ہے کہ اس میٹنگ میں شاہ کے کسی خفیہ خزانے کے بارے میں میٹنگ ہوئی ہے۔ بین الاقوامی خفیہ تنظیم کے دونوں آدمی اور فرازی لاپتہ ہیں۔ پولیس بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ نریمان فرازی ایران کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ پولیس نے ان تمام راستوں کی ناقہ بندی کر رکھی ہے۔ اس بارے میں جیسے ہی کچھ معلوم ہوا مطلع کر دیا جائے گا۔"

یہ پیغام پہلے خاموشی سے اور اس کے بعد کسی قدرے بلند آواز میں کرنل حیات نے پڑھا انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل جو ایک پستہ قامت اور تند مزاج آدمی تھا کلین شیو گھٹے ہوئے جسم

کا مالک اور گنجے سر اور وہ سر کو بھی باقاعدگی سے شیو کیا کرتا تھا۔ تند نگاہوں سے کرنل اعظم حیات کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس سلسلے میں کرنل اعظم سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"کیا کہتے ہو تم اس بارے میں۔"

"سر! نریمان فرازی ایک بہت ہی زیادہ خطرناک آدمی ہے کچھ عرصہ پہلے وہ کمیٹی کے آدمیوں کو چکر دے کر......"

"معلوم ہے معلوم ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں بتا رہے تم مجھے۔" انٹیلی جنس چیف نے کرخت لہجے میں کہا۔

"اور یہ بات بھی پتا چلی تھی جناب! کہ اس کے کسی ساتھی نے غداری کر کے اسے گرفتار کرایا تھا۔"

"جانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔ میں نے تم سے اس کی سوانح عمری نہیں پوچھی بلکہ میں اس پیغام کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ معذول شاہ کا کوئی خفیہ خزانہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ خزانہ......"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ایک بار پھر چیف نے کرنل حیات کی بات کاٹ دی "اگر شاہ نے ملک چھوڑنے سے پہلے کوئی خزانہ چھپایا تھا تو وہ یہیں تہران میں ہی ہوگا۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے آخری دنوں میں شاہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں اگرچہ گلستان محل تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں۔ لیکن اس کے کچھ خاص معتمد سرگرم نظر آئے تھے۔ ان کی سرگرمیاں بہت پراسرار تھیں۔ جب شاہ ملک چھوڑ کر فرار ہوئے تھے تو وہ خاص معتمد بھی ساتھ چلے گئے تھے۔ لہٰذا یہ بات خارج از امکان نہیں ہو سکتی کہ آخری دنوں میں انہوں نے کوئی بہت بڑا خزانہ کہیں چھپا دیا ہو۔ تاکہ وہ انقلابیوں سے محفوظ رہے۔ انہیں امید نہیں ہوگی کہ انقلاب کامیاب ہو جائے گا اور یہ کہ ایک نہ ایک دن شاہ ضرور واپس آ جائے گا یا بعد میں کسی وقت وہ لوگ یہاں سے اس خزانے کو نکال لے جائیں گے۔ لیکن شاہ کی واپسی کے تمام امکانات ختم ہو گئے اور اس کے خلاف یہ انقلاب کامیاب ہو گیا۔ حکومت پر امام خمینی اور ان کے حامی مذہبی رہنماؤں کی گرفت خاصی مضبوط ہو رہی ہے۔ اگرچہ ملک میں انتشار اور

افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے شاہ کا خفیہ خزانہ یہاں سے اٹھانے کا منصوبہ بنایا ہو اور اس کے لیے نریمان فرازی جیسے شخص کی خدمات حاصل کی گئیں ہوں۔"

"نریمان فرازی کے جیل سے فرار ہونے کے بارے میں ایک طویل کہانی ہمیں پہلے بھی مل چکی ہے سر! اسے بہت ڈرامائی انداز میں رہا کرانے والے دونوں آدمیوں نے اپنے آپ کو مرکزی حکومت کا نمائندہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن بعد میں حکومت نے بڑی سختی سے اس کی تردید کر دی تھی اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں کا تعلق براہ راست شاہ سے ہو اور انہوں نے نریمان فرازی کی مدد سے شاہ کے خزانے کے حصول کا یہ منصوبہ بنایا ہو۔ ہمارے پڑوسی ملک سے حاصل ہونے والی رپوٹوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھرپور طریقے سے ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں البتہ اس بات کے امکانات ہیں کہ بعض افراد خفیہ طور پر کسی بڑے انعام کے لالچ میں اس منصوبے میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کا مشن کسی صورت میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔ سکیورٹی کو الرٹ کر دو اور ان دونوں افراد کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرانے کے لیے ہدایات جاری کر دو۔"

"یس سر۔" کرنل حیات نے جواب دیا۔

"اور جیسے ہی نریمان فرازی کے بارے میں کوئی اطلاع ملے۔ فوراً مجھ سے رابطہ قائم کرو۔" چیف نے آخری حکم دیا۔

"یس سر۔"

جا سکتے ہو۔" چیف اپنے مخصوص انداز میں بولا اور کرنل حیات کمرے سے باہر نکل گیا یہ اس ملاقات کے دوسرے روز کی بات ہے۔ سیاہ رنگ کی ایک کار تہران کے سب سے خوبصورت پارک باغ ملت کے سامنے رکی اس وقت صبح کے چھ بجے تھے اور پارک کے سامنے صرف ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ جس کا ڈرائیور نہایت انہماک سے کار کے شیشے چمکانے میں مصروف تھا۔ سیاہ رنگ کی کار کے ڈرائیور نے باہر نکل کر پہلے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور باادب کھڑا ہو گیا۔ اندر سے کرنل حیات نے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر نیچے اتر آیا۔ فضا میں ہلکی سی دھند کے جھونکے خنجر کی نوک کی طرح جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔ ہوا کا پہلا یخ بستہ جھونکا اب کرنل حیات کے جسم سے ٹکرایا۔ تو اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس

نے اُونی ٹوپی کانوں تک کھینچ لی۔ اور کوٹ میں کالر کانوں تک اٹھا لیا اور متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ چند گز دور کھڑی ہوئی کار کا ڈرائیور کار کی صفائی میں مصروف تھا۔ اس نے اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید اپنے آپ کو اس طرح مصروف رکھ کر وہ سردی کی شدت سے بچنا چاہتا تھا۔"

"خانوس!" کرنل حیات نے اپنے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں چند منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔ یہیں رک کر میرا انتظار کرو۔" پھر وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا۔ سامنے وسیع و عریض لان تھا جس کے گرد پھولوں کے پودوں کا باڑ اور بیچ میں کہیں کہیں پودوں کی مختلف شکلوں والی کیاریاں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ سبز گھاس کی پتیاں شبنم کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ کرنل حیات نے فوارے کے نزدیک رک کر چند لمحے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر پختہ فرش پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ پارک میں سناٹا تھا۔ اگر بہار کا موسم ہوتا تو اس وقت یہاں پر ہوا خوری کے لیے آنے والوں کا ہجوم ہوتا لیکن مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ٹھنڈے موسم میں لوگ گرم بستروں میں دبکے رہنا پسند کرتے ہیں۔ کرنل حیات فرش کے ایک موڑ پر بائیں طرف بڑھ گیا۔ یہاں فرش کے ساتھ ساتھ قد آور پودے لگے ہوئے تھے اور ان گنجان پودوں کی دوسری طرف کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک جگہ پودوں کے درمیاں خلاء میں سے گزر کر دوسری طرف آ گیا۔ اس طرف بھی ایک وسیع و عریض لان تھا اور گنجے سر والا ایک وسیع و عریض آدمی ننگے پیر شبنم کی بھیگی گھاس پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے جسم پر پتلون اور آدھے آستین کی ٹی شرٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ انٹیلی جنس کا مینیجنگ ڈائریکٹر تھا اس سے تقریباً بیس گز دور اس کے دو مسلح محافظ بھی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے اور کوٹ پہن رکھے تھے۔ سروں پر اونی ٹوپیاں بھی تھیں۔ جو پیشانی تک جھکی ہوئی تھیں کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں اور پیشانی تک جھکی ہوئی ٹوپیوں میں ان کے چہرے تقریباً چھپ گئے تھے ان دونوں کے ہاتھ اپنے اپنے کوٹوں کی جیبوں میں تھے۔ کرنل حیات کو یقین تھا کہ ان کے دائیں ہاتھ جیبوں میں رکھے ہوئے ریوالوروں کے دستے پر ہوں گے۔ کرنل حیات نے قریب پہنچ کر چیف کو سلام

کیا اور اس کے ساتھ ہی ٹہلنے لگا۔ چیف کی معمول کے مطابق کرخت اور ناخوشگوار آواز ابھری۔

''زاہدان سے ایک اہم پیغام ملا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پتلون کی جیب سے نیلے رنگ کا ایک کاغذ نکال کر کرنل کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ پیغام گزشتہ رات ملا ہے۔ وہ دونوں اس وقت لان کے آخری سرے پر اونچے درختوں کے نیچے پہنچ چکے تھے۔ کرنل حیات پیغام پڑھنے لگا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔

''نریمان فرازی، زاہدان کے راستے ایران میں داخل ہو چکا ہے
وہ کسی بھی لمحے تہران پہنچ سکتا ہے۔ کمیٹی کو اس کی بھنک مل گئی ہے۔
پچھلی رات کمیٹی نے زاہدان کے ایک مشتبہ مکان پر چھاپہ مارا تھا۔
اس کاروائی میں کمیٹی کا ایک آدمی اور مخالف پارٹی کے دو آدمی مارے
گئے لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ مکان میں موجود پارٹی کا نریمان
فرازی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ممکن ہے نریمان فرازی کو بھی کمیٹی کی
سرگرمیوں کی اطلاع مل گئی ہو اور اس نے کمیٹی کے آدمی کو غلط راستے
پر ڈالنے کے لیے کرائے کے آدمیوں کے ذریعے یہ ڈرامہ اسٹیج کیا ہو
اور اس طرح وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو، خیال ہے کہ کرمان
کی طرف گیا ہے ہو سکتا ہے کل رات کسی وقت تہران میں داخل
ہونے کی کوشش کرے۔''

''یعنی آج رات۔'' کرنل حیات نے نیلے کاغذ کی تحریر ختم ہونے کے بعد کہا۔

''ہاں...... آج رات۔'' چیف کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ پیغام اگرچہ واضح نہیں ہے لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ تم تہران میں اپنے آدمیوں کو ڈبل الرٹ کر دو۔ نریمان فرازی کو اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اسے کمیٹی کے آدمی کے ہاتھ لگنا چاہیے سمجھ رہے ہو نا میری بات اسے کمیٹی کے آدمیوں کے ہاتھوں نہیں لگنا چاہیے۔''

''یس سر!'' کرنل حیات نے کسی قدر الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر بولا۔

''سر! میرا خیال ہے کہ آپ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں۔ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اور اس جگہ کا انتخاب بھی میں نے اسی لیے کیا

ہے جہاں ہم پوری آزادی کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ کوئی ہماری گفتگو سن لے سمجھ رہے ہو نا۔ یہاں ہماری کوئی بات ریکارڈ نہیں کی جا سکتی۔''

چیف کی آواز مدھم ہوئی اور وہ بولا۔

''ہم کچھ عرصے سے ایک دوسرے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ تمہارا کام اس منصوبے میں رکاوٹ کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ افراد کے بارے میں ایک بار میں نے ذکر کرتے ہوئے تم سے کہا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔''

''جی سر! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کرنل حیات نے جواب دیا۔''

''اور آگے بولو۔''

''جی سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ الفاظ کہنے سے گریز نہ کروں کہ اس وقت ایران کی تقدیر انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔'' انٹیلی جنس کا چیف چلتے چلتے رک گیا اور کرنل حیات کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''اور اب یہ تقدیر دوسرے ہاتھوں میں جانے والی ہے۔ فوج اور سول سروس میں نوجوان اور ترقی پسند افسروں کا ایک گروہ ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ جن کے نظریات ہمارے نظریات سے ہم آہنگ ہیں۔ انہیں وطن سے محبت ہے اور وہ اس جنونی فضا کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ روزانہ کتنے ہی بے گناہ اس جرم کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ اس خوفناک فضا کو ختم کر کے ملک کو امن اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی خواہش میں مبتلا ہیں وہ۔''

''تم جانتے ہو کہ اس انقلاب کے بعد ملک کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ رہی سہی کسر عراق سے جنگ نے پوری کر دی ہے۔ تمام ترقیاتی کام رک گئے ہیں کاروبار تباہ ہو چکے ہیں۔ سرمایہ تیزی سے غائب ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلاب سے پہلے چند سائنسدانوں نے دولت سمیٹ رکھی تھی لیکن وہ اس دولت کو ترقیاتی کاموں پر بھی لگا رہے تھے۔ ان کا سرمایہ متحرک تھا اور بڑے بڑے پروجیکٹ تعمیر ہو رہے تھے لیکن اب یہ سب ختم ہو رہا ہے۔ جن کے پاس دولت تھی وہ موت کے خوف سے ملک چھوڑ کر فرار ہو چکے ہیں یا چھپتے پھر رہے ہیں مذہبی رہنماؤں کو دوسروں پر اعتماد نہیں ہے۔ سول سروس اور فوج کے افسران کو بھی غصے کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس صورتحال نے بعض نوجوانوں میں عدم اطمینان کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور وہ اس کا سد باب کرنے منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک

لاوا ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہے اور پھٹ پڑنے کو بے قرار ہے۔" کرنل حیات کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔ انٹیلی جنس چیف نے اس سے قبل اتنی آزادی سے ان خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آج وہ واضح الفاظ میں حکومت کا تختہ الٹنے کی بات کر رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی کرنل حیات کو دیکھا اور بولا۔

"کرنل کیا میں تمہیں اپنے دوستوں میں تمہارا شمار کر سکتا ہوں۔" کرنل نے ایک لمحے کے لیے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اسے یوں لگا جیسے انٹیلی جنس چیف کے چہرے پر ٹکے ہوئے آنکھوں کے نشانوں سے کچھ لکیریں اس کے دماغ اتر رہی ہیں اور اس کے دماغ کا بھرپور طریقے سے جائزہ لے رہی ہیں ظاہر ہے یہ شخص جتنے بڑے عہدے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مذاق ہی میں یہاں تک نہ آ گیا ہوگا۔ بہر حال کرنل حیات نے فوراً جواب دیا۔

"آپ جانتے ہیں سر! کہ ہمیشہ سے میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"ہاں۔" اسی اعتماد کے تحت میں نے تم سے اپنے دل کی بات کہی ہے وقت آنے پر میں آپ کو پوری تفصیل بتا دوں گا۔ فی الحال میں موجودہ مشن کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" انٹیلی جنس چیف چند لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو کہ ایران کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عراق نے ایران کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایران کے علاقوں پر قبضہ کر لے گا اس نے کردوں کو بھی ایران کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عراق کو اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہیں حاصل ہو سکی۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے فوج اور سول سروس میں اپنے ہم خیال گروپ کے نمائندے کی حیثیت سے چوری چھپے بغداد تک جانے کی ہمت کی تھی اور پھر میں نے عراق کے صدر صدام حسین سے بات بھی کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اگر ہم خوشی سے نجات حاصل کر لیں تو معاہدہ امن کے لیے بعد کی کیا شرائط ہوں گی۔ میری بات کا جواب ایک ہفتے کے بعد ملا تھا۔ صدام حسین نے کہا تھا کہ معاہدہ امن کے لیے ایرانی فوج کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔" انٹیلی جنس چیف کا چہرہ گہرا سرخ ہو رہا تھا وہ رکا اور چند لمحوں تک آسمان پر دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

"میرا خیال ہے مذہبی رہنماؤں کے تسلط سے ہمیں آزادی اور امن کی یہ قیمت ادا کرنی پڑے گی۔" کرنل حیات کا بدن کانپ رہا تھا اس سے سرسراتی آواز میں کہا۔

"لیکن سر......"

"میں نے ابھی پوری بات نہیں کی ہے۔" انٹیلی جنس چیف نے اسے ٹوک دیا اور پھر بولا۔

"اگر واقعی یہاں شاہ کا کوئی خزانہ پوشیدہ ہے تو وہ اس منصوبے میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

"کیا سول سروس اور فوج کے یہ افسران شاہ کو واپس لانا چاہتے ہیں۔" کرنل حیات نے پوچھا۔

"تفصیل بعد میں بتاؤں گا فی الحال تو اپنی تمام تر توجہ اس مشن پر مبذول رکھو۔ نریمان فرازی اس وقت ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔" انٹیلی جنس چیف نے کہا۔

"سر میں جانتا ہوں۔" کرنل حیات بولا۔

"بس تو پھر جاننے سے کام نہیں چلے گا۔ اس سلسلے میں یوں سمجھ لو کہ ہمارا پہلا قدم یہی ہو گا کہ ہم نریمان فرازی کو اپنے قبضے میں کر لیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد انٹیلی جنس چیف نے کرنل حیات کو جانے کی اجازت دے دی تھی اور جب وہ چیف سے رخصت ہو کر باغ ملت سے نکل رہا تھا تو اس پر عجیب سی کیفیت تھی۔ جو راز اس پر منکشف ہوا تھا وہ اسے حکومت کے کسی اعلیٰ عہدے پر بھی پہنچا سکتا تھا اور موت کے منہ میں بھی لے جا سکتا تھا۔

✡......✡

شہباز جب کرمان پہنچا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نریمان فرازی کی آواز اس کے ذہن میں گونجی۔

"اس وقت یہ کار ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ چنانچہ اس پر سے جہاں جہاں تمہیں شبہ ہے اپنے ہاتھوں کے نشانات مٹا دو اور اس کے بعد ہم کسی بھی طرح اس سے آگے روانہ ہوں گے۔ جس جگہ ہم کار چھوڑیں گے وہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے ہمیں تہران روانہ ہونے میں دقت نہیں ہوگی۔

"اگر تم یہ مناسب سمجھتے ہو تو ظاہر ہے یہی بہتر ہوگا۔"

"ہاں مناسب تو میں سمجھتا ہوں لیکن دشت لوط کے کنارے ان کھنڈرات میں جو کچھ بھی ہوا۔ وہ بڑا پریشان کن تھا تلاتی کے دو آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور تلاتی کو میں جانتا ہوں کہ وہ کیا شے ہے وہ انتہائی خونخوار انسان ہے اپنے آدمیوں کی موت کی خبر سنتے ہی

وہ پاگل کتے کی طرح ہماری تلاش شروع کردے گا اور عین ممکن ہے کہ وہ کمیٹی کو بھی اس کی
اطلاع دے دے۔ ویسے بھی کمیٹی والے بڑی سرگرمی سے تمہاری تلاش کر رہے ہیں۔ اس
لیے ٹرین کا راستہ تھوڑا سا مخدوش ہو گیا ہے۔''

''تو پھر کیا، کیا جائے۔'' شہباز نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایک لمبا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔''

یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔'' بہرحال شہباز وہاں سے چل پڑا اور سارے کام نریمان
فرازی کی زیر ہدایت ہو رہے تھے اور یہ ایک دلچسپ عمل تھا کہ نریمان فرازی شہباز کے بدن
کی غلامی صرف اس لیے کر رہا تھا کہ اس کا جسم رازل جریری کی قید میں تھا۔ کیا ہی انوکھی اور
کیا ہی پراسرار کہانی تھی پر یہ کردار جس کا نام رازل جریری تھا۔ اسے کائنات کا سب سے بڑا
جادوگر کہا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ سائنس کی جادوئی قوتوں سے مالا مال تھا اور اس نے اس وقت
ایک ایسے شخص کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا جس کے پیچھے پورا ایران لگا ہوا تھا۔

ذہن میں یونہی ایک دلچسپ سا خیال آیا اور شہباز کے منہ سے نکل گیا۔

''نریمان فرازی! اب تمہارے بارے میں کسی طرح کی واقفیت حاصل کرنا میرے
نزدیک ایک احمقانہ عمل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس پائے کے آدمی ہو۔ لیکن ایک سوال
میرے ذن میں بار بار آتا ہے۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں تم سے یہ سوال پوچھوں۔''

''پوچھو......'' نریمان فرازی کی آواز اس کے ذہن میں گونجی۔

''جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے یا جس طرح تم بے اختیار ہو کر وہ سب کچھ کر رہے ہو۔
جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں ہے تو تم دل سے کر رہے ہو یا حالات کا شکار ہو۔ اس
عالم میں تمہاری کیا کیفیت ہے۔ کچھ دیر نریمان فرازی کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا لیکن
پھر اس نے کہا۔

''سچ کہوں یہ سب کچھ میرے لیے ناخوشگوار نہیں ہے۔'' نریمان فرازی کی آواز سے بھی
خوشی جھلک رہی تھی۔

''کیا مطلب......'' شہباز نے سوال کیا۔

''دوست! ہر انسان کے اندر ایک بچہ چھپا ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی خونخوار اور وحشی
کیوں نہ ہو جائے اور بچے کے ذہن میں شدید تجسس ہوتا ہے۔ رازل جریری کے بارے

میں کوئی تفصیل میں نہیں جانتا لیکن جس عمل سے میں گزر رہا ہوں وہ میرے لیے انتہائی سنسنی
خیز تجربے کا حامل ہے اور اس وقت میں عجیب و غریب ذہنی کیفیتوں سے گزر رہا ہوں۔ مجھے
یوں لگتا ہے جیسے میرا کوئی داہناں بازو پیدا ہو گیا ہو۔ تھکن تو کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ زندگی میں
شدشد جدوجہد کی ہے میں نے اور بعض اوقات کسی طویل اور تھکا دینے والی مشقت سے تھکن
کے احساس کا شکار ہو کر میں یہ بھی سوچتا تھا کہ مجھے کوئی ایسا گوشہ نظر آ جائے جہاں میں سکون
کا کچھ وقت گزار سکوں۔ کوئی مجھے کہانی سنانے والا نہ ہو۔ کوئی واقعہ مجھ تک نہ پہنچے کہیں سے
کوئی اطلاع مجھے دستیاب نہ ہو۔ یہ میری جسمانی تھکن تھی جو اس طرح کے تقاضے کرتی تھی
اور تم یقین کرو طویل عرصے سے مجھے اس کا کوئی موقع نہیں ملا۔ لیکن اب مجھے یوں لگتا ہے
جیسے کوئی میرا دست راست پیدا ہو گیا ہو۔ میرے جسم کو آرام کی نیند سلا دیا گیا ہے۔ ایک
دلچسپ تجربہ ہے میری زندگی میں تم یہ نہ سمجھنا کہ میرے جسم سے میرا رابطہ بالکل ٹوٹ گیا
ہے۔ یہ بھی ایک عجیب تجربہ ہے زندگی کا۔ پتہ نہیں ہم اسے کیا نام دیں گے۔ جب میں اپنے
جسم سے رابطہ قائم کرتا ہوں تو وہ پرسکون ہوتا ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے اور میں یہ بھی سوچتا
ہوں کہ میں آرام بھی کر رہا ہوں اور مصروف بھی ہوں۔ یہ ساری کاروائی میری اپنی تھی۔ بس
اتنا سا فرق ہے کہ میرا جسم اس میں حصہ نہیں لے رہا لیکن میرا ذہن پوری طرح سرگرم عمل
ہے اور تم بھی ایک دلچسپ آدمی ہو۔ تم نے مجھ پر قادر ہونے کے باوجود مجھے مکمل آزادی دی
ہے اور ہر کام میں اپنی مرضی کے مطابق کر رہا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا وہی مشن
ہے جو میرا طریقہ کار کا فرق ہے۔ لیکن اس سے بھی مجھے اختلاف نہیں ہے کیونکہ تم میرے ہی
ہم پلہ ہو اور جسمانی طور پر میری زیر ہدایت تم جو کچھ کرتے ہو وہ اتنا ہی مکمل اور تسلی بخش ہوتا
ہے کہ مجھے تم سے کوئی شکایت ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے جو کچھ ہو رہا ہے جاری رکھو تم مجھ سے
اختلاف بھی تو نہیں کرتے اور یقین کرو میں بھی اپنی ذہانت بھر وہی عمل کرنے کی ہدایت کرتا
ہوں تمہیں جو تمہارے جسم اور میرے ذہن کے حقوق میں ہو۔ یا پھر ہمارے مشن کے حقوق
میں ہو مگر تم نے جب اتنی بات کی ہے تو مجھے ذرا سا رازل جریری کے بارے میں بتا دو۔''

نریمان فرازی کا انداز بہت ہی دوستانہ تھا۔ شہباز کے بارے میں اس نے جس طرح
اطمینان کا اظہار کیا تھا اس سے شہباز کو بھی خوشی ہوئی تھی۔ شہباز نے ایک گہری سانس لے
کر کہا۔

''رازل جریری نسلاً ایرانی ہے لیکن اصلاً اس کا تعلق ساری دنیا سے ہے۔ ایک ایسا سر پھرا سائنسدان جو ان تمام لوگوں کے خلاف ہے جو انسانی زندگی کو اذیت کا شکار کیے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کو امن کا گہوارہ دیکھنا چاہتا ہے حالانکہ یہ اس کی ایک معصوم خواہش ہے لیکن بہرحال وہ اپنے طور پر وہی سب کچھ کر رہا ہے۔ حکومت پلاسکو نے اسے اپنا ٹارگٹ بنایا ہوا ہے اور شاید اس سے خوفزدہ ہو کر اس کے ہر عمل کو ناکام بنانا چاہتی ہے لیکن اس نے حکومت پلاسکو کو بدترین نقصان پہنچائے ہیں۔ وہ صرف پلاسکو ہی کے خلاف کام نہیں کر رہا بلکہ دنیا میں ہر اس مقصد کو ناکام بنانا چاہتا ہے جو انسانیت کی تباہی کے لیے ہوں اس نے ایک لیبارٹری بنائی ہوئی ہے جہاں تک اس کی سائنسی مہارت کا تعلق ہے تو تم دیکھو کہ تمہارا جسم اس کے پاس ہے اور ذہن میرے ذہن سے ہم آہنگ۔ اسے اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دولت درکار ہے۔ پتہ نہیں کیوں شاہ کا خزانہ شروع ہی سے اس کے ذہن میں ہے۔ حالانکہ ہمیں کئی ایسے چھوٹے چھوٹے خزانوں کا پتہ ملا ہے جو ہمیں مدد دے سکتے ہیں لیکن رازل جریری نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ شروع ہی سے وہ شاہ کے عظیم خزانے کے بارے میں مصروف عمل ہے شاید اسے اس کی کچھ خصوصی تفصیل معلوم ہو۔ یہ خزانہ صرف وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے تو تم یقین کرو میرے دوست! کہ دنیا بھر کے دولت مندوں کو بلیک میل کر کے دولت کے پہاڑ بنا لینا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ وہی عمل اگر اسے خود بھی کرنا پڑا یعنی انسانیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش، تو پھر وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ تو بے مقصد ہوا نا۔ شہباز خاموش ہوا تو نریمان فرازی بھی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''عجیب منطق ہے لیکن مقصد نیک ہے برا نہیں ہے اور میں سچ بتاؤں کہ اب تک میں ایک الجھن، ایک تجسس کا شکار تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ کام بھی برا نہیں ہے۔ میں بھی جو کچھ کرتا ہوں اس کے کرنے سے بہت کچھ نہیں حاصل ہو جاتا۔ لیکن یہ ایک اچھا عمل ہے جسے میں تسلیم کرتا ہوں اور یہ تو رہی ایک دلچسپ بات ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم خود کیا ہو۔''

نریمان فرازی کی آواز سے مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔ شہباز بھی مسکرا دیا پھر بولا۔

''رازل جریری کی محبتوں کا ایک معمولی سا انسان جسے رازل جریری نے اپنا دست راست بنا کر بہت بڑی عزت دے دی ہے۔ شہباز نے مختصراً اسے اپنے بارے میں بتایا اور

فرازی کی آواز ابھری۔

''اگر تم معمولی ہوتے تو رازل جریری جیسا غیر معمولی آدمی اپنے اہم ترین مقاصد کے لیے تمہارا استعمال نہ کرتا۔ جس طرح اس نے میرا انتخاب کیا۔'' بہرحال اس لمبے راستے کو طے کرتے ہوئے شہباز کو کوئی بہت زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ نریمان فرازی جگہ جگہ اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''ظاہر ہے وہ میرا اپنا علاقہ ہے اور میں اس کے چپے چپے سے واقفیت رکھتا ہوں۔ چنانچہ اب ہمارا مختصر قیام جس جگہ ہوگا وہ ایک ٹرک اڈا ہے جو تہران سے افغانستان اور قرب و جوار کے دوسرے علاقوں میں جانے کے لیے مال برداری کا مرکز ہے۔ ٹرک اڈے کے ایک جھونپڑا ریستوران میں رات کا کھانا کھایا گیا اور پھر شہباز اڈے پر اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے اسے اپنے آگے کے مقصد کے لیے کام کرنا تھا۔ ایک بہت بڑا تجارتی ملک ہونے کی وجہ سے کرمان کے ملک کے باقی حصوں سے مواصلاتی رابطوں کی کمی نہیں تھی۔ ریل، ہوائی جہاز اور پختہ سڑکوں کے ذریعے ملک کے تمام شہروں سے اس کے رابطے قائم تھے۔ شہباز کے خیال میں اس وقت سفر کے لئے سڑک کا راستہ سب سے زیادہ محفوظ تھا اور یہی خیال نریمان فرازی کا تھا اور اسی نے یہ مشورہ دیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک مال بردار ٹرکوں کے اڈے پر گھومنے کے بعد ایک ایسے ٹرک ڈرائیور سے اس کا رابطہ قائم ہو ہی گیا جو اس کو قلی کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

''اور ظاہر سی بات ہے کہ تم خفیہ طور پر یہاں سے نکلنا چاہتے ہو۔ چنانچہ اس کے لیے تمہیں اتنی رقم خرچ کرنا ہوگی کہ میں یہ خطرہ مول لے سکوں۔'' ٹرک ڈرائیور نے صاف لہجے میں کہا۔ ظاہر ہے وہ اس طرح کے کام کرتا رہتا ہوگا۔ شہباز نے فوراً ہی کہا۔

''میں تمہیں تمہاری منہ مانگی رقم دینے کے لیے تیار ہوں لیکن باقی معاملات......''

''وہ ہماری ذمے داری۔'' مال بردار ٹرک عام طور پر رات کے وقت سفر کرتے ہیں۔ یہ ٹرک بھی رات کو دس بجے کے قریب اڈے سے روانہ ہوا تھا۔ شہر کی آخری چیک پوسٹ پر ایک بار پھر چیکنگ ہوئی اور ٹرک ڈرائیور نے اپنے وعدے کے مطابق خود ہی سارا معاملہ نمٹا دیا۔ شہباز قلی کی حیثیت سے ٹرک کے پچھلے حصے میں پڑا ہوا تھا۔ اس سے کمیٹی والوں نے ایک بھی سوال نہیں کیا تھا۔ یہ ٹرک تقریباً ساڑھے تین سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے صبح چار

بجے کے قریب یزد پہنچا۔ شہباز نے صبح روشنی پھیلنے تک کا وقت ٹرک کے کیبن میں ہی سو کر گزارا تھا۔ صبح سات بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اگرچہ ٹرک ڈرائیور نے اسے شام تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا لیکن یزد پہنچنے کے بعد اس نے کہا۔

''اور اب یہاں سے آگے جانے کے لیے کم از کم ہمیں چوبیس گھنٹے درکار ہوں گے۔ تمہیں انتظار کرنے میں کوئی قباحت تو نہیں ہوگی۔''

''لیکن کیوں...... پہلے تو تم نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔''

''جو بات تم سے تعلق نہیں رکھتی تھی وہ تمہیں بتانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کرمان سے ٹرک لادے جانے والا مال یہاں اتارا جاتا ہے اور آگے ہم اسی وقت روانہ ہوں گے جب ہمیں یہاں سے آگے لے جانے کے لیے مال نہ مل جائے۔''

''مگر دوست! مجھے تو بڑی دقت ہو جائے گی۔'' شہباز نے عاجزی سے کہا تو ٹرک ڈرائیور نے نرم لہجے میں کہا۔

''ٹھہرو میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔'' اور اس کے بعد ٹرک ڈرائیور نے یہاں بھی اس سے بھرپور تعاون کیا۔ اس نے شہباز کو ایک اور ٹرک ڈرائیور کے سپرد کر دیا۔ جسے چار بجے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے بھی تھوڑی بہت رقم لے کر اسے یہاں سے لے جانے کی حامی بھر لی۔ شہباز جانتا تھا کہ ان دنوں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ فرازی نے اسے ساری تفصیلات بتا دیں تھیں اور جگہ جگہ اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے کہا۔

''اس وقت زبردست چیکنگ ہو رہی ہے۔ میں بہت بڑا رسک لے کر تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''تمہارا شکریہ۔'' شہباز نے جواب دیا۔

بہر حال ڈرائیور نے ذمے داری قبول کر لی تھی۔ چار بجے یزد سے روانہ ہو کر رات کے تقریباً گیارہ بجے وہ کاشان پہنچ گئے اور شہباز نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور اڈے سے نکل کر ایک طرف بڑھ گیا۔

''چلتے رہو...... میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے جاؤں گا جو تمہارے لیے بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے ہمارے لیے۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ شہر سے تقریباً دو کلو میٹر دور ایک اجڑی ہوئی بستی میں پہنچ گیا۔ اس بستی تک فرازی نے ہی

رہنمائی کی تھی۔ بستی کچھ کچے پکے مکانوں پر مشتمل تھی۔ عام طور سے یہ مکان کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے یہ فاصلے طے کرنے کے بعد وہ ایک شکستہ دیوار کے پیچھے بیٹھ کر وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

''ہمیں یہاں بیٹھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔؟ شہباز نے سوال کیا۔

''نہیں۔ اب ہمیں کچھ لوگوں کا انتظار ہے۔''

''ٹھیک۔'' اس وقت رات کے بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب شہباز کو کھنڈرات میں کچھ فاصلے پر روشنی سی چمکتی نظر آئی۔ غالباً کوئی ٹارچ روشن کی گئی تھی اور اسے بجھا دیا گیا تھا۔

''تمہاری جیب میں پنسل ٹارچ موجود ہے۔ اسے نکالو اور تیار رہو۔ دوبارہ جب روشنی ہوگی تو تمہیں اس کا جواب دینا ہوگا۔'' شہباز نے فرازی کی ہدایت پر عمل کیا اور تاریکی میں اس طرح گھورنے لگا جہاں چند منٹ پہلے روشنی چمکی تھی۔ ٹھیک تیس سیکنڈ کے بعد روشنی دوبارہ چمکی اس مرتبہ ٹارچ دوبارہ جلی بجھی تھی۔ شہباز نے فرازی کی ہدایت کے مطابق ٹارچ کو دو مرتبہ جلایا بجھایا اور تاریکی میں گھورنے لگا۔ ایک منٹ کے بعد یہ تینوں آدمی تاریکی سے نکل کر اس کے سامنے آ گئے دو تو دور ہی رک گئے اور تیسرا شہباز کے قریب آ گیا۔

''رحمان ہے میرا نام۔ کیا سمجھے اور میں مگر ٹھہرو...... کیا تم میرے بارے کچھ جانتے ہو۔''

شہباز کے ذہن کی چرخی چل اٹھی اور نریمان فرازی اسے رحمان کے بارے میں بتانے لگا۔ رحمان بھی اس علاقے کا نامی گرامی مجرموں میں شمار ہوتا تھا۔ انقلاب سے پہلے اس علاقے پر اس کی حکمرانی تھی لیکن انقلاب کے بعد خود ساختہ محافظ پاسداران ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اگر رحمان بعض اہم آدمیوں کی گرفتاری میں کمیٹی سے تعاون نہ کرتا تو اب تک اس کا بھی تیا پانچا ہو جاتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ کمیٹی والوں نے اس کو بخش دیا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اب بھی ان کی نگاہوں میں تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ رحمان بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا لیکن اس کے باوجود اس کی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ بے شک وہ محتاط ہو گیا تھا لیکن اس کی غیر قانونی سرگرمیاں اب بھی جاری تھیں۔ ان دنوں اس کا اہم کاروبار مذہبی حکمرانوں کے زیر عتاب لوگوں کو قانون کی نظروں سے بچا کر ملک

سے فرار کراتا تھا اور اس کام میں سامنے آئے بغیر بہت دولت کما رہا تھا۔ اس قسم کے کام وہ اپنے گروہ کے آدمیوں سے لیا کرتا تھا۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ گزشتہ چند مہینوں میں اس کے کئی منصوبے ناکام ہو گئے تھے۔ وہ جن لوگوں سے بھاری معاوضہ لے کر انہیں ملک سے فرار کرانے کا وعدہ کرتا وہ عین وقت پر پکڑے جاتے۔ اس طرح اس کے تین آدمی بھی اب تک کمیٹی کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ پس منظر میں رہنے کی وجہ سے وہ خود ابھی تک بچا ہوا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ عرصہ بچا نہیں رہ سکے گا۔ اسے اس بات کا بھی یقین ہو چکا تھا کہ اس کے گروہ کا کوئی آدمی غداری کر رہا ہے اور کمیٹی کو اس کے منصوبے سے آگاہ کر دیتا ہے۔

دو روز پہلے زاہدان سے اسے بتایا گیا تھا اور اس عظیم دوست نے کہا تھا کہ اسے یہ کام کرنا ہے۔ ان دونوں کا بزنس اب بھی ایک ہی نوعیت کا تھا اور وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ اپنے خاص دوست کا فون ملنے کے بعد رحمان کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ نئی مذہبی حکومت کے مخالفین تو ملک چھوڑ کر فرار ہو رہے ہیں پھر یہ کون ہے جو تہران جانا چاہتا ہے۔

بہر حال اس نے اپنے دوست سے اس سلسلے میں کچھ نہیں پوچھا تھا نہ ہی اسے کوئی تجسس تھا۔ اس کے دوست نے بڑی سختی سے اسے رازداری کی ہدایت کر دی تھی۔ رحمان نے اس آدمی کی آمد پر اپنے ساتھیوں کو بھی عین وقت پر آگاہ کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی غدار موجود ہے تو اسے کمیٹی والوں کو اطلاع دینے کا موقع نہ مل سکے اور اس وقت وہ خود شہباز کے پاس پہنچا تھا اور اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو چند گز دور ہی روک دیا تھا۔ اس کے دوست نے اس سے تعاون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ ایک آدمی مقررہ وقت پر ان سے ان کھنڈرات میں ملاقات کرے گا۔ وہ اسے سادہ لباس اور ریلوے ٹکٹ دے کر تہران جانے والی ٹرین پر سوار کرا دے۔ اور اس وقت یہی مقصد رحمان کے ذہن میں تھا اس نے قریب آ کر کہا۔

"خوش آمدید۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھا دیا جسے شہباز نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رحمان کی آواز ابھری۔

"میرا نام رحمان ہے اور میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"شکریہ۔" شہباز نے جواب دیا۔ "مجھے امید ہے کہ یہ جگہ محفوظ ہوگی۔"

"بے فکر رہو۔ یہ لو۔" رحمان نے کہا اور ایک چھوٹا سا بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اس میں تمہارے کاغذات اور تہران کا ٹکٹ ہے۔ تہران جانے والی ٹرین ایک بج کر پچیس منٹ پر روانہ ہوگی اور سنو تم یہاں اپنی خالہ کی عیادت کرنے آئے تھے۔ اس بیگ میں تمہاری خالہ کا ایک خط بھی موجود ہے۔ جو اس نے دو ہفتے قبل تمہیں لکھا تھا۔ تہران میں ہمارے آدمی موجود ہیں اگر تم ان سے رابطہ قائم کرنا چاہو تو میں تمہیں ان کا پتہ دے سکتا ہوں۔ اب تم یہ کپڑے پہن لو اور پرانے کپڑے اتار کر میرے حوالے کر دو۔ انہیں صبح تک ضائع کر دیا جائے گا۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔" شہباز نے کہا۔ رحمان سے کپڑے لیے اور تھوڑا سا پرے ہو کر لباس تبدیل کرنے لگا۔

"ویسے یہاں آس پاس کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔" لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ ایران میں آجکل قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن یہاں ہمارے لیے زیادہ خطرات موجود تھے۔ کمیٹی والے خاص طور سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور میرے گروہ میں کوئی غدار موجود ہے جو ہماری سرگرمیوں کی اطلاع کمیٹی کو پہنچا دیتا ہے۔"

"اوہ پھر تو کسی بھی وقت ہمیں گھیرے میں لیا جا سکتا ہے۔" شہباز نے کہا۔

"نہیں۔" رحمان اطمینان سے بولا۔ "مجھے تمہارے بارے میں ہدایت کر دی گئی ہیں میں نے تمہاری آمد کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا بلکہ مشورے کے بہانے یہاں آنے کے بعد تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ آج رات ان آدمیوں کے ساتھ ایک مکان میں گزاروں گا۔ تاکہ ان میں اگر کوئی غدار موجود ہے تو اسے کمیٹی تک پہنچنے کا موقع نہ ملے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر اب میرے لیے کیا حکم ہے۔"

"تمہیں چلنا چاہیے۔ کیونکہ ٹرین کی روانگی میں تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔" دس منٹ کے بعد تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت کر لوں گا۔ تم بس اپنے آدمیوں کا خیال رکھو کہ کسی کو اطلاع نہ دیں۔" شہباز نے کہا اور رحمان نے سر ہلا دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نووارد خود بھی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے

پھر اس کے بعد اس نے شہباز کو اسٹیشن جانے کا راستہ سمجھایا اور الوداعی مصافحہ کر کے وہاں سے چل پڑا وہ چند ہی لمحات کے بعد وہاں سے غائب ہو گیا تھا او شہباز اپنی منزل کی جانب چل پڑا تھا۔

✿......✿

رات ختم ہوتی جارہی تھی۔ رحمان اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا رات کی مختصر سی مہم نے اسے تھکا دیا تھا اور پھر رات کو سونے سے پہلے بھی وہ اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ جسے اس کے دوست نے اس کے پاس بھیجا تھا زاہدان سے فون پر بات کرتے ہوئے اگرچہ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے لیکن شہباز کو ایک عجیب سی حیثیت سے اس نے پہچان لیا تھا۔ بس دیکھا ہے اور پھر نجانے کب تک وہ اپنے ذہن پر زور دیتا رہا تھا اور آخر کار اسے نریمان فرازی یاد آ گیا تھا۔ نریمان فرازی جو کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ چونکہ شہباز نریمان فرازی کے میک اپ میں تھا اس لیے اس کے نقوش رحمان کے ذہن میں آ گئے اور وہ اچھل پڑا پھر اس نے اپنے اس تجسس سے مجبور ہو کر رات ہی کو زاہدان فون کیا تو اس کے دوست نے رحمان کے اس شبے کی تصدیق کر دی۔

''ہاں۔ وہ نریمان فرازی ہی ہے لیکن میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ کسی مشن پر تہران جا رہا ہے مجھے بالکل نہیں معلوم۔'' رحمان حیران ہو گیا۔ شدید ہیجانی عالم میں اس نے سوچا کہ یہ تو بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے نریمان فرازی نے۔ ایران میں تو اس کے سر کی قیمت مقرر تھی اور سے چپے چپے پر تلاش کیا جارہا تھا اور اس بات کو نریمان فرازی پوری طرح جانتا تھا۔ اگر وہ کسی کی نظروں میں آ گیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے کمیٹی والوں کے عتاب سے نہیں بچا سکے گی۔

بہرحال رحمان کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا اور یہ الجھن آخر کار نیند نے اس کے ذہن سے نکال پھینکی تھی لیکن زیادہ دیر نہیں وہ رات کا آخری پہر تھا کہ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی یقیناً آنکھ بے مقصد نہیں کھلی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور رحمان کی خوبصورت بیوی مہلکہ اس کے پہلو میں گہری نیند سو رہی تھی شب خوابی کا لباس اس کے جسم پر تھا اور بالوں کی کئی لٹیں اس کے چہرے اور سینے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نیلی روشنی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی

تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے رحمان یہ بھول گیا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی ہے۔ وہ مہلکہ کے اس حسن خوابیدہ میں کھو گیا تھا۔ کچھ لمحے وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اچانک چونک گیا۔

مکان کے باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ اس کے ذہن پر طاری نیند کا خمار دور ہو گیا۔ وہ اچھل کر پلنگ سے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جیسے ہی باہر جھانکا اسے اپنے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کمیٹی والوں کی گاڑیاں تھیں اور کمیٹی کے مسلح آدمی گاڑیوں سے اتر کر اس کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رحمان تیزی سے پیچھے مڑا اس کی خوبصورت بیوی بھی بیدار ہو گئی تھی۔ گلی میں بھاری بوٹوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مہلکہ دہشت بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

''کک...... کمیٹی...... کمیٹی......'' رحمان کے منہ سے اتنی ہی آواز نکلی مکان کا بیرونی دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جارہا تھا۔

''جلدی چلو......'' رحمان نے کہا اچانک ہی یوں لگا جیسے دروازے کو توڑنے کے لیے اس پر کسی چیز سے ضربیں لگائی جارہی ہیں۔ وہ دونوں خود حفاظتی کے لاشعوری جذبے کے تحت خوابگاہ سے نکل کر عقبی دروازے کی طرف بھاگے لیکن خوش بختی ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی کہ دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ تیز روشنی میں نہا گئے۔ چاروں طرف آٹومیٹک رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں نے خاموشی سے ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور پھر انہیں رائفلوں کی زد میں لے کر باہر لایا گیا اور گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔ سب مشین گنوں سے لیس کمیٹی کے چار آدمی بھی ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ رحمان ایک سیٹ پر تھا اس کے دائیں بائیں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے والی سیٹ پر اس کی بیوی دو آدمیوں کے درمیان سینڈوچ بنی بیٹھی تھی۔ اس کے بعد گاڑی آگے بڑھ گئی۔ رحمان کے ذہن میں سناٹے دوڑ رہے تھے۔ اس وقت سوچنے سمجھنے کی قوتیں بالکل ختم ہو گئیں تھیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد انہیں کمیٹی کے مقامی ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا اور وہاں ایک آدمی کو دیکھتے ہی رحمان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جس آدمی کو دیکھ کر وہ اس قدر بدحواس ہوا تھا وہ سہراب تھا اس کا اپنا داہنا بازو، اس کا نائب۔ رات بارہ بجے جب رحمان شہر کے نواح میں واقع کھنڈرات میں شہباز سے ملنے گیا تھا تو سہراب بھی

اس کے ساتھ تھا اور اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ سہراب ہی وہ غدار تھا جو اس کی مخبری کرتا رہا ہے۔ دوسری بات جو خوفناک خطرے کی شکل میں رحمان کے ذہن میں پیدا ہوئی اس نے اس پر لرزا طاری کر دیا۔

اس وقت سہراب کا نکل کر سامنے آجانا اس بات کی دلیل تھی کہ اب رحمان کی زندگی چند لمحات کی رہ گئی ہے۔ ورنہ وہ اپنے آپ کو ظاہر نہ کرتا اور اس وقت وہ جس جگہ موجود تھا یہ ایک خوفناک عقوبت خانہ تھا۔ کمیٹی کے جلادوں کے بارے میں رحمان بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ درندگی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے تشدد سے شیطان بھی پناہ مانگتا تھا۔ یہ ان کا ظلم و تشدد ہی تھا کہ لوگ ان کا نام سن کر ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ کمیٹی کے دو آدمی مہلکہ کو بانہوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور اس کی دلدوز چیخیں رحمان کے ذہن پر لرزہ طاری کر رہی تھیں۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد رحمان کو بھی دو آدمی دھکیلتے ہوئے تہہ خانے میں لے گئے۔

یہ تہہ خانے اذیت پہنچانے کی جگہ تھے اور یہاں مختلف قسم کے آلات نظر آ رہے تھے۔ ایسے خوفناک آلات جسے دیکھ کر رحمان کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ چند منٹ کے بعد سہراب ایک اور آدمی کے ساتھ تہہ خانے میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور آدمی بھی تھا۔ جو انتہائی لمبے قد اور تناور جسم کا مالک تھا۔ اس کا سر گنجا تھا چہرے پر بے پناہ سفاکی اور آنکھوں میں ہولناک درندگی کی جھلک نمایاں تھی۔

''اور اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تمہارے بہت سے منصوبے کامیاب کیوں نہیں ہو سکے۔'' سہراب نے شیطانی آواز میں کہا۔ اس کی بے غیرت نگاہیں رحمان کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ بولا۔

''آخر کار تمہاری زندگی میں یہ دن آنا ہی تھا۔ لیکن اب بھی ایک موقع ہے اگر تم ہم سے تعاون کرو تو تم پر سے یہ برا وقت ٹل بھی سکتا ہے۔ ہمیں صرف چند سوالات کے جواب درکار ہیں۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک بتا دو تم تمہاری جان بچ جائے گی۔''

''کتے کے بچے! میرے جوتے چاٹ چاٹ کر تو نے زندگی گزاری ہے اور اب میرے سامنے اس انداز میں آیا ہے۔'' رحمان کا پارہ عروج پر پہنچ گیا اور اس نے سہراب کے منہ پر تھوک دیا۔

''میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا کتے......'' وہ چیخ کر بولا۔ لیکن سہراب واقعی بے غیرت تھا۔

اس نے اطمینان سے اپنے ہاتھ کی آستین سے رحمان کا تھوک صاف کیا اور بولا۔

''زاہدان سے آنے والا کون تھا اور اس وقت کہاں ہے۔'' سہراب کا لہجہ پرسکون تھا۔

''تو سمجھتا ہے کہ میری زبان کھلوا لے گا۔ ہاں تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہ کام کر سکتا تھا لیکن تو ذلیل کتے......'' جواب میں سہراب نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''وہی سب کچھ کہہ رہے ہو جو میں نے بہت پہلے سوچا تھا۔ یعنی یہ کہ جب تمہیں میرے بارے میں معلوم ہوگا تو تم زیادہ سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہو۔ مگر تمہارا یہ کہنا بھی بالکل ٹھیک ہے۔ انا کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ چلو خیر...... اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو میرے ساتھ ہے۔ چلو...... مجھے نہیں اسے بتا دو...... چلو چلو......'' اس نے گنجے کو اشارہ کیا اور گنجا نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا رحمان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں رحمان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ رحمان کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ لمبے قد والا گنجا بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کے چہرے کی سفاکی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ رحمان پیچھے ہٹ گیا پھر دیوار سے جا لگا۔ گنجا اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ چند لمحے رحمان کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ رحمان اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے جھک گیا۔ گنجے کا گھونسہ دیوار پر لگا اس کے منہ سے کراہ نکل گئی لیکن وہ ایک دم سنبھل گیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا داہنا ہاتھ سہلاتے ہوئے رحمان کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرنے لگی تھی۔

''یہاں آنے والے خاموشی سے مار کھا لیتے ہیں اور مجھے اس میں بالکل مزہ نہیں آتا۔'' دفعتاً ہی گنجے کے منہ سے آواز نکلی اور وہ پھر بولا۔

''تم پہلے شخص ہو جو مزاحمت کر رہے ہو۔ تمہاری پٹائی کرتے ہوئے واقعی لطف آئے گا۔''

گنجے نے یہ جملے ادا کرتے ہوئے اچانک ہی رحمان پر پھر جھپٹا مارا لیکن رحمان اس مرتبہ بھی اچھل کر اپنے آپ کو بچا گیا اور پھر اس کمرے میں دونوں کی اچھل کود شروع ہو گئی۔ تین منٹ میں گنجے کا ہاتھ ایک مرتبہ بھی رحمان کے بدن کو نہیں چھو سکا تھا۔ سہراب ایک طرف کھڑا

دلچسپ نگاہوں سے یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس نے مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ گنجا ایک بار پھر رحمان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک طرف جھکائی دے کر اچانک ہی دوسری طرف حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ رحمان مار کھا گیا گنجے نے اس پر مکوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ رحمان اب بھی بچنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا۔ جہاں شدید ضربیں نہ لگ رہی ہوں۔ جبکہ سہراب بڑے اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ منٹ کے بعد رحمان ریت کے ڈھیر کی مانند فرش پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چہرہ لہولہان تھا اور آنکھیں بری طرح سوجھ گئی تھیں۔

''میں انقلابی حکومت کا وفادار ہوں رحمان!'' سہراب نے کہا۔

''بات صرف اصولوں کی ہے۔''

''کتے کے...... کتے کے بچے۔ تم مجھ سے کچھ نہیں اگلوا سکتے۔'' رحمان نے اٹک اٹک کر کہا۔

''نہیں دوست! یہ نہ کہو ہم زبان کھلوانے کے طریقے جانتے ہیں اور پھر میں، میں تمہاری مکمل شخصیت سے واقف ہوں کیونکہ میں نے ایک طویل عرصہ تمہاری غلامی میں گزارہ ہے۔ ہاں چلو......'' سہراب نے کہا اور دروازے پر کھڑا ہوا محافظ اس کے اشارہ سمجھتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور دو آدمی مہلکہ کو گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

مہلکہ کے ساتھ غالباً ابھی تک کوئی زیادتی نہیں کی گئی تھی لیکن خوف و دہشت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے خون اس کے جسم سے نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس نے اپنے شوہر کا جب یہ حشر دیکھا تو دہشت سے بری طرح کانپنے لگی۔ دونوں آدمی مہلکہ کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ سہراب نے گنجے کو اشارہ کیا اور گنجا اس بار مہلکہ کے پاس پہنچ گیا۔ مہلکہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بڑی بری طرح مچل رہی تھی۔ دونوں محافظوں نے مہلکہ کی ٹانگیں پکڑ کر ٹخنوں پر ہتھکڑیوں کی طرح آہنی کلپ پہنا دیئے۔ ان آہنی کلپوں سے منسلک موٹی زنجیر چھت تک چلی گئی تھی۔ یہ زنجیر چھت پر لگی ہوئی ایک ریل پر سے گزر کر دوسری طرف لٹکی ہوئی تھی۔

سہراب کا اشارہ پا کر دو آدمی زنجیر کا دوسرا سرا کھینچنے لگے۔ مہلکہ کا جسم فرش سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ چند سکنڈ کے بعد وہ الٹی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی شدید دہشت تھی اور وہ بری

طرح چیخ رہی تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہوئے گنجے نے خنجر نکالا اور اس کی دھار چیک کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بکری ذبح کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔

''ہاں۔ اب کیا خیال ہے رحمان تمہاری بیوی پر اب کام شروع کیا جائے۔'' سہراب نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر ہنس کر بولا۔

''اس وحشی کو آج تک صرف مردوں سے واسطہ پڑا ہے۔ تمہاری بیوی کے خوبصورت بدن پر خنجر چلاتے ہوئے یقینی طور پر اسے ایک نیا لطف آئے گا۔'' رحمان نے آنکھیں بند کر لیں اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔

''نہیں...... نہیں خدا کے لیے اسے کچھ مت کہو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے یہ کچھ نہیں جانتی۔'' اچانک تہہ خانے میں مہلکہ کی خوفناک چیخیں گونجنے لگیں۔ رحمان نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا کہ گنجے نے مہلکہ ک دونوں بازو پکڑ رکھے تھے اور محافظ اس کی دونوں ٹانگوں کو مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔

''چھوڑ دو اسے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔'' رحمان نے وحشیانہ انداز میں مچلتے ہوئے کہا۔ میں بتاتا ہوں۔ تم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو میں بتاؤں گا۔'' سہراب نے محافظوں کو اشارہ کیا انہوں نے مہلکہ کو چھوڑ دیا اور وہ دھپ کی آواز سے سر کے بل فرش پر گری اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ محافظوں نے اس کے پیروں پر لگے ہوئے آہنی کلپ بھی کھول دیئے۔

''ہاں اب بتاؤ وہ کون تھا۔'' سہراب نے رحمان کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ ''لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں جھوٹ برداشت نہیں کروں گا اور غلط بیانی تم دونوں کے لیے کس قدر خطرناک ہو گی یہ تم خود بھی جانتے ہو۔''

''وہ نریمان فرازی تھا۔'' رحمان نے جواب دیا۔ ''نریمان فرازی۔ وہ رات ایک بج کر پچیس منٹ والی ٹرین سے تہران گیا ہے۔'' سہراب کے چہرے پر خون کی سرخی نظر آنے لگی اور پھر وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

......

تہران میں کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر کو یہ اطلاع ملی کہ نریمان فرازی صبح کی ٹرین سے تہران پہنچ رہا ہے تو ہیڈ کوارٹر میں کھلبلی مچ گئی۔ نریمان فرازی اس وقت کمیٹی کو سب سے زیادہ مطلوب آدمی تھا۔ اطلاع ملتے ہی ہیڈ کوارٹر میں بھگدڑ مچ گئی اور پھر صبح ہونے سے پہلے ہی تہران کے ریلوے اسٹیشن کو کمیٹی کے آدمیوں نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا اور یہ اطلاع انٹیلی جنس تک بھی پہنچا دی گئی تھی۔ چنانچہ کرنل حیات اور اس کے آدمی بھی حرکت میں آ گئے تھے۔ صبح ساڑھے نو بجے جب ٹرین تہران اسٹیشن پر پہنچی تو ایک ایک آدمی کو چیک کیا جانے لگا۔ کمیٹی کے آدمی اس چیکنگ میں بھی انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ عورتوں کے بال کھینچ کر ان کے جسموں کو ٹٹول کر دیکھا گیا۔ لیکن انہیں نریمان فرازی کا پتہ نہیں ملا تھا۔

ادھر بے چارے رحمان کو کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا تھا اور وہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے تہہ خانے میں فرش پر گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ سہراب اور ایک ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں اس کی سلامتی سے کوئی دلچسپی تھی۔ بلکہ کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس ٹرین سے نریمان فرازی تہران کیوں نہیں پہنچا۔

ڈاکٹروں کی مسلسل کوششیں جاری تھیں۔ تھوڑی دیر میں رحمان نے آنکھیں کھول دیں اور گہری گہری سانس لیتا ہوا ویران نگاہوں سے سہراب کو گھورنے لگا۔

”تم نے ہمیں دھوکہ دیا ہے رحمان!“ سہراب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ نریمان فرازی تہران پہنچنے والی ٹرین میں موجود نہیں تھا۔ ٹرین سے اترنے والے مسافروں کو چیک کر لیا گیا۔

”نہیں۔ میں نے سچ کہا تھا۔ وہ اسی ٹرین سے روانہ ہوا تھا۔“ رحمان نے رک رک کر کہا۔

”بکواس کرتے ہو حرام زادے!“ سہراب بری طرح غرایا۔ ”ہم سے ہی غلطی ہوئی ہم

نے تمہاری بیوی کے ساتھ بڑا نرمی کا سلوک کیا ہے۔ پھر وہ قریب کھڑے ہوئے محافظوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

”ذرا اس کی چہیتی کو اندر لاؤ۔ دیکھیں اس کی قوت برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ہے۔“

”دیکھو...... براہ کرم مت کرو۔ رک جاؤ...... میری بیوی کو اب یہاں مت لانا وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی اور میں اسے نہیں دیکھ سکوں گا۔“

”تو پھر وہ بات بتاؤ جو ہم سننا چاہتے ہیں۔“ سہراب بولا۔

”ہاں۔ بتاؤ کیا؟“

”نریمان فرازی تہران میں کب اور کہاں مل سکتا ہے۔“

”میں سچ کہتا ہوں میری بات کا یقین کر لو۔ مجھے اس کے پروگرام کا کوئی علم نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے وہ بازار ولی عصر کے علاقے میں واقع کیفے دشت میں زندال سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ زندال اس کا گہرا دوست ہے اور جب وہ تہران میں تھا تو اکثر اس سے ملا کرتا تھا۔

”گڈ...... سہراب کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔ وعدہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے پستول نکالا اور رحمان کے سر پر فائر کر دیا۔ رحمان کے منہ سے ایک بھیانک سی چیخ نکلی اور وہ ایک طرف لڑھک گیا اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ سہراب ایک محافظ کی طرف مڑ گیا اس نے کہا۔

”اس کی بیوی کو بھی لے آؤ۔ اب وہ حسینہ اس دنیا میں اکیلی رہ کر کیا کرے گی۔ ویسے بھی ایران کی سرزمین پر اس جیسی بدکردار عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“ کچھ ہی دیر کے بعد دو آدمی مہلکہ کو گھسیٹتے ہوئے لے آئے اس نے اپنے شوہر کو دیکھا اور چیختی ہوئی اس کی جانب دوڑی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے اس پر جھکی ہی تھی کہ تہہ خانہ ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ دو گولیاں مہلکہ کے پہلو کو چیرتی ہوئی دل میں پیوست ہو گئیں اور وہ آخری بھیانک چیخ مار کر اپنے شوہر کی لاش پر ڈھیر ہو گئی۔

✿......✿

یہ بات بھی شہباز کے ذہن میں نریمان فرازی نے ہی ڈالی تھی۔ نریمان فرازی کہنے

لگا۔

''میرے دوست شہباز! اب میرے اور تمہارے درمیان مکمل طور پر مفاہمت ہے تمہارے جسم کی حفاظت یہ سمجھ لو اس طرح ہے جیسے میں اپنے جسم کی حفاظت کر رہا ہوں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم جس قدر اعلیٰ کارکردگی کے مالک ہو اسے دیکھ کر میں بالکل یہی محسوس کرتا ہوں جیسے میرا ہی جسم مصروف عمل ہے۔ یہاں ایران میں اب تم یہ سمجھ لو کہ چپے چپے پر نریمان فرازی کو تلاش کیا جا رہا ہے اور جو لوگ اسے تلاش کر رہے ہیں اور اس قدر ہولناک لوگ ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں اپنے اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں۔''

''کیا......؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''ہمیں اس ٹرین سے تہران نہیں جانا چاہیے۔''

''کیوں......؟'' شہباز حیرت سے بولا۔

''میں نے کہا نا اس طرح براہ راست ہماری روانگی، میرا مطلب ہے تہران میں ہمارا پہنچنا موت کے مترادف ہے اس وقت کسی پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ رحمان نے بے شک ہماری مدد کی ہے اور یہ سلسلے بیچ در بیچ چلے آ رہے ہیں۔ جو لوگ اس وقت میرے معاون ہیں انہیں تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں اور میں نے زندگی میں ایک ہی کام کیا ہے۔ وہ یہ کہ اپنے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا۔ تمہاری یا رازل جزیری کی بات کچھ اور ہے۔ خیر چھوڑو اس طوالت سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ایسا کرنا ہے کہ ہمیں تہران سے پہلے اتر جانا چاہیے۔''

''اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو یقیناً میں نے اب تک تمہارے کسی کام میں مداخلت نہیں کی۔''

''ہاں یہ تمہاری ذہانت کی دلیل ہے کہ تم صرف جسم کا کردار ادا کر رہے ہو۔ پھر صبح سات بجے کے قریب شہباز تہران سے تقریباً پینتالیس کلومیٹر دور رباط کریم نامی ایک اسٹیشن پر اتر گیا۔ پچھلے تمام اسٹیشنوں کی طرح اس اسٹیشن پر بھی ضرورت سے زیادہ تعداد میں پولیس اور کمیٹی والے نظر آ رہے تھے۔ کچھ مسافر ٹرین سے یہاں اترے تھے ان مسافروں میں ایک ادھیڑ عمر عورت بھی شامل تھی۔ جس کے ساتھ دس گیارہ سال کی ایک لڑکی اور تقریباً ڈھائی سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ عورت بچوں کے ساتھ شہباز والے ڈبے سے ہی اتری تھی۔ ڈبے میں ان کی سیٹس کے قریب قریب ہی تھیں اور شہباز راستے میں اس ڈھائی سالہ بچے

سے باتیں کرتا ہوا آیا تھا۔ جو اسے بہت پیارا لگا تھا۔ کم سن لڑکی نے حجاب پہن رکھا تھا۔ جس میں نہ صرف اس کے کندھے اور سر پوری طرح ڈھک گیا تھا بلکہ چہرے کا کچھ حصہ بھی چھپ گیا تھا جبکہ ادھیڑ عمر کی عورت نے سیاہ رنگ کی چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ ہاتھوں کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے ہی شہباز نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ انقلاب سے پہلے ایران میں خواتین کو مکمل آزادی تھی۔ لباس کے معاملے میں بھی ایرانی خواتین پوری طرح آزاد تھیں۔ زیادہ تر تو یورپین لباس ہی پہنا جاتا تھا۔ بعض خواتین تو اس طرح کا لباس استعمال کرتی تھیں کہ یورپین خواتین بھی شرما جائیں۔ درمیانے اور نچلے طبقے کی خواتین میں بھی شرم و حیا کا مادہ کسی قدر موجود تھا۔ لیکن اونچے طبقے کی خواتین نے تو بے حیائی میں یورپ کی خواتین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں رونق انہیں کے دم سے تھی۔

انقلاب کے ساتھ ہی صورتحال تبدیل ہوئی۔ رنگین تتلیوں کی طرح ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں نظر آنے والی خواتین غائب ہو گئیں۔ بڑے بڑے شاپنگ سنٹر اور مارکیٹیں ان کی رونق سے محروم ہو گئیں۔ جب بے پردہ خواتین کو سزا دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو سڑکیں بھی ویران نظر آنے لگیں۔ آزادی پسند خواتین نے پکڑے جانے اور سزا کے خوف سے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ چادر اور حجاب کو خواتین کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ اب جن خواتین کو کسی مجبوری کے تحت گھر سے نکلنا ہوتا تو وہ چادریں اس طرح لپیٹے ہوتیں کہ جسم مکمل طور پر چھپ جائے۔ دس سال سے اوپر کی بچیوں کے لیے بھی حجاب لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔

وہ عورت اپنے بچوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ وہ بچہ اور بچی اگرچہ راستے میں شہباز سے باتیں کرتے رہے تھے لیکن عورت سے بات کرنے کا ایک مرتبہ بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی شہباز نے اندازہ لگا لیا کہ پچھلے اسٹیشنوں کی طرح یہاں بھی چیکنگ ہو رہی ہے۔ ٹرین سے اترنے والے دو مسافروں کو کمیٹی کے تین آدمیوں نے روک لیا اور ان کے کاغذات چیک کیے جا رہے تھے۔ شہباز کے پاس تہران کا ٹکٹ تھا۔ گیٹ پر ٹکٹ چیک کرنے کی صورت میں اسے بھی روک کر پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پلیٹ فارم کے خارجی گیٹ پر ٹکٹ کلیکٹر کے قریب کھڑا ہوا ایک آدمی آنے جانے والوں کو مشتبہ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ شہباز اس چادر پوش خاتون سے چند گز کے فاصلے پر

تھا۔ ڈھائی سالہ بچہ غالباً ضد کر رہا تھا کہ اسے گود میں اٹھالیا جائے اور وہ عورت اسے ڈانٹ رہی تھی اس کے پاس دو بیگ بھی تھے ایک بیگ بچی نے اٹھا رکھا تھا دوسرا چادر پوش عورت خود سنبھالے ہوئے تھی۔

شہباز نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھالیا اور گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ چادر پوش عورت نے اس کی اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے جیسے گیٹ کے قریب پہنچ رہی تھی شہباز کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ایک مسافر ان سے پہلے گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں شہباز کے برابر ہی تھا۔ وہ ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دے کر جیسے ہی آگے بڑھنے لگا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے دوسرے آدمی نے اسے روک لیا۔ اسی دوران شہباز اس چادر پوش خاتون اور بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے پہنچنے والا مسافر جیب سے کاغذات نکال رہا تھا۔ شہباز نے اپنی گود میں اٹھائے ہوئے بچے کو زور سے چٹکی کاٹ لی بچہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔

"کیا ہوا بچہ کیوں رو رہا ہے؟" یہ سوال اس آدمی نے کیا تھا جو پہلے مسافر کے کاغذات چیک کر رہا تھا۔

"اس کے پیٹ میں تکلیف ہے بہت دیر سے پریشان کر رہا ہے۔" شہباز جلدی سے بولا۔

"سامنے والی سڑک پر تقریباً ایک فرلانگ آگے بیمارستان ہے اسے وہاں لے جاؤ۔" اس شخص نے اشارہ کیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے بھی ان پر توجہ نہیں دی۔ شہباز ان لوگوں کو لے کر اسٹیشن کی عمارت سے نکل آیا۔ کچھ ہی فاصلے پر دو کھٹارہ سی ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ چادر پوش عورت ایک ٹیکسی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ شہباز نے بچے کو گود سے اتار دیا اور اس کے رخسار کو چوم کر خدا حافظ کہہ کر ایک طرف چل پڑا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پلیٹ فارم کا گیٹ یہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا دھوپ نکل آئی تھی۔ بازار میں بعض دوکانیں کھل چکی تھیں لیکن سڑکوں پر ابھی تک زیادہ لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ شہباز تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تقریباً دس منٹ کے بعد ہی اسٹیشن پر پہنچ گیا۔

گرج جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ شہباز ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہو گیا۔ گرج یہاں سے تقریباً چالیس کلومیٹر فاصلے پر اس لائن پر واقع ہے جو تہران سے قزوین، زنجان اور طبرز

وغیرہ کی طرف چلی جاتی ہے۔ یہ چھوٹا سا ایرانی طرز کا شہر تہران سے اڑتالیس میل کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بس نے تقریباً دو گھنٹے میں شہباز کو گرج پہنچا دیا۔ بس اسٹیشن سے نکل کر شہباز نے ایک ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا اور بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ اب تک کی جدوجہد انتہائی شدید تھی اور اس کے ذہن میں اس وقت پھر خیالات کی چرخی چل پڑی تھی۔

سرکس سے لے کر یہاں تک کی زندگی میں جن حالات میں گزرا تھا ان کا وقفہ سینکڑوں سال معلوم ہوتا تھا۔ یہ سینکڑوں سال کا سفر شہباز نے کتنے عرصے میں طے کیا تھا۔ اسے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔ نریمان فرازی اکثر اس سے مخاطب ہو جاتا تھا۔ خاص طور سے ایسے وقت جب کسی اہم مسئلہ میں اسے اطلاع دینی ہوتی چنانچہ اس نے کہا۔

"اب تک ہم لوگ کامیابی سے یہاں تک کا سفر کر چکے ہیں۔ اب یہ بتاؤ میرے دوست آگے تمہارا کیا منصوبہ ہے۔" شہباز ہنس پڑا پھر بولا۔

"میرا تو کوئی منصوبہ نہیں ہے۔" "میں تو صرف تمہارے منصوبوں پر عمل کر رہا ہوں۔"

"ہنسو نہیں...... ہنسو نہیں...... اکیلے بیٹھے ہوئے کسی آدمی کو ہنستے ہوئے دیکھ کر کوئی بھی تمہاری طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور اس وقت تمہاری سب سے بڑی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ ہونے دیں۔" شہباز ایک دم سنبھل گیا۔ نریمان فرازی نے کہا۔

"یہاں گرج میں میرا ایک شناسا ہے جو تمہیں سونحان اسٹریٹ پر ملے گا۔ اس وقت تمہارے لیے وہ سب سے بہتر جگہ ہوگی۔"

"مجھے پتہ بتاؤ۔"

"ریستوران سے اٹھو تو میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔" اور ایسا ہی ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد نریمان فرازی کی رہنمائی نے شہباز کو ایک گھر کے دروازے پر پہنچا دیا شہباز نے دروازے پر دستک دی اور شہباز انتظار کرنے لگا۔ دو منٹ کے بعد ایک فربہ اندام عورت نے دروازہ کھولا اور شہباز پر نظر پڑتے ہی بری طرح چونک پڑی۔

"ارے تم...... نریمان فرازی!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

"آؤ...... آؤ...... اندر آجاؤ۔" شہباز اندر داخل ہو گیا۔ عورت نے جلدی سے دروازہ بند

کر دیا تھا۔ شہباز نے کہا۔

''ہاں۔ محترم خاتون! اب یہ بتائیے رامش کہاں ہے۔''

''میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔ البتہ اگر آپ تکلیف کرنا چاہتی ہیں تو ایک پیالی کافی پلا دیجئے گا۔'' شہباز نے کہا اور عورت گردن ہلا کر باہر نکل گئی۔

''یہ رامش کی بیوی ہے۔''

''کام پر گیا ہے۔ کل تمہارا پیکٹ مل گیا تھا۔ لیکن پیکٹ میں بعد میں لاؤں گی۔ پہلے تمہارے لئے ناشتہ تیار کر دوں۔'' عورت نے پُر محبت لہجے میں کہا۔

''مگر پیکٹ والی بات۔''

''ہاں۔ وہ پیکٹ میں نے اسی کو بھیجا تھا۔'' نریمان فرازی کی آواز ابھری۔ وہ عورت بظاہر ایک سیدھی سادھی خاتون خانہ نظر آتی تھی لیکن یہ بات نریمان فرازی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ انتہائی مضبوط دل گردے کی مالک ہے اور رامش اس پر مکمل بھروسہ کرتا ہے۔ اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی اور کچھ ہی دیر کے بعد کافی کی ٹرے اور ایک پیکٹ لے کر وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔

''یہ رہا تمہارا پیکٹ......'' اس نے پیکٹ شہباز کے قریب ہی ایک کرسی پر رکھ دیا اور شہباز مسکرا دیا۔ نریمان فرازی نے اس کے ذہن میں سرگوشی کی۔

''دنیا کا کوئی بھی کام بغیر خرچ کیے ہوئے نہیں ہوتا۔ دوستی چاہے کتنی ہی گہری ہو لیکن اپنی ضروریات سے دوستی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے ایک معقول رقم دو۔'' شہباز نے فوراً ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور خاصی رقم نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور یہ تمہارا نذرانہ۔'' عورت نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر نوٹ ہاتھ میں پکڑ لیے اور پھر انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔

''آہ...... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔''

''نریمان فرازی اپنے دوستوں کو خوش دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ویسے کافی بہت عمدہ ہے۔'' شہباز کے منہ سے نریمان فرازی کی آواز ابھری اور اس کے بعد وہ کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ عورت پھر باہر نکل گئی تھی۔ نریمان فرازی نے کہا۔

''میری اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا۔ یہ کم بخت کاغذ کے ٹکڑے انسان کی شخصیت پر

اس قدر حاوی ہیں کہ اس وقت ان سے زیادہ طاقتور کوئی چیز روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔

کچھ لمحوں کے بعد عورت واپس آئی اور بولی۔

''تمہیں جو سامان درکار ہے اس کی ہدایت رامش مجھے کر کے گیا ہے اسی کمرے میں تمہارا سامان اٹھا لاؤں یا دوسرے کمرے میں آنا پسند کرو گے۔''

''یہاں اٹیچ باتھ ہے۔''

''ہاں۔'' یہ بات شاید نریمان فرازی بھی نہیں جانتا تھا کہ شہباز اس قدر زبردست میک اپ کا ماہر ہے یقینی طور پر وہ جس عالم میں تھا اسے شہباز کی کارکردگی کا پورا پورا علم تھا۔ شہباز نے اپنے چہرے پر میک اپ کیا اور یہ میک اپ اس قدر شاندار تھا کہ دیکھنے والے یقین نہ کر پائیں۔ میک اپ کے اوپر میک اپ کرنے کا تجربہ شہباز جیسا ماہر ہی کر سکتا تھا اور ایک گھنٹے کے بعد جب وہ رامش کے گھر سے باہر نکلا تو بالکل ہی بدلا ہوا انسان تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی اور گھنی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ جسم پر کسانوں والا لباس تھا۔ شناختی کاغذات کی رو سے وہ آزر بائیجان کا ایک کاشتکار تھا اور اس کے پاس حکام کا جاری کردہ ایک خصوصی اجازت نامہ بھی تھا۔ جس کی رو سے وہ مویشیوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔

بہر حال اس کے ذہن پر شدید تجسس سوار تھا۔ دوپہر چار بجے کے قریب وہ ٹرین سے تہران اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر حسب معمول چیکنگ ہو رہی تھی لیکن اس کی جانب کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ پُر ہجوم گیٹ سے گزرتے ہوئے اس نے اس شخص کو دیکھا وہ لمبے قد و قامت کا مالک تھا۔ اس کا رخ باہر کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی کار کی طرف تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں نریمان فرازی کی آواز ابھری۔

''یہ انٹیلی جنس کا کرنل حیات ہے۔ ایک انتہائی مشہور آدمی۔'' بہر حال اس کے بعد کوئی ایسی خاص بات پیش نہ آئی جو قابل ذکر ہوتی۔ پھر خاصا وقت گزر گیا اور شہباز نے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ولی عصر کے چوراہے پر واقع کیفے دشت کمیٹی کے سادہ لباس آدمیوں کے نرغے میں تھا۔ دو آدمی داخلی دروازے کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان میں ایک قدرے بھاری بھرکم بدن کا مالک تھا اور دوسرا دبلا پتلا سا نوجوان جس کی عمر بمشکل تمام بیس سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی بے ترتیب داڑھی تھی اور یہ داڑھی اس کے چہرے پر خاصی بھلی

لگ رہی تھی۔ دو آدمی کیفے کے عقبی دروازے پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے کوٹ پہنے ہوئے تھے جن کی دائیں جیبیں بوجھ سے کسی قدر لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ بوجھ ریوالور یا پستول کے سوا کسی چیز کا نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک آدمی کیفے کے اندر بیٹھا گاہکوں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہا تھا۔ کیفے میں گاہکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن جو لوگ موجود تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بات چیت میں بہت محتاط نظر آ رہے تھے۔ پبلک مقامات پر یوں بھی لوگ سیاست یا ملک کے موجودہ حالات پر گفتگو کرتے گھبراتے تھے اور کبھی باتوں کے دوران سیاسی موضوع نکل بھی جاتا تو انقلاب کے حق میں بات کی جاتی۔ یہ سب ہی جانتے تھے کہ کسی پبلک مقام پر انقلاب یا کسی مذہبی رہنما کے خلاف کوئی بات کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اسی لیے لوگ آپس کی بات چیت سے بھی خاصے محتاط تھے اور کسی اجنبی کی موجودگی میں تو کوئی ایسی بات منہ سے نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیفے دشت سے کچھ دور حسن اسٹریٹ پر سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ جس میں کمیٹی کا مقامی سربراہ بیٹھا ہوا تھا قریبی گلیوں میں اور کچھ کاریں بھی موجود تھیں ان سب کا آپس میں ریڈیو کنٹرول کے ذریعے رابطہ تھا۔

کمیٹی کا مقامی سربراہ جس کا نام عادل سرائی تھا چوڑے شانوں والا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ دو روز پہلے اسے کاشان سے اطلاع ملی کہ نریمان فرازی تہران کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ عادل سرائی اپنے آدمیوں کو لے کر صبح سویرے ہی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا۔ جب ٹرین ریلوے اسٹیشن پر آکر رکی تو اسے پوری طرح گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ ایک مسافر کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اسی روز عادل سرائی اسٹیشن پر انٹیلی جنس کرنل حیات کو بھی اپنے چند آدمیوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ کرنل حیات کو وہاں دیکھ کر عادل سرائی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کیا انٹیلی جنس کو بھی نریمان فرازی کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔

بہر حال اس بات کا عادل سرائی کے پاس ابھی کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس نے کرنل حیات سے محتاط رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تہران ریلوے اسٹیشن پر مایوسی کے بعد عادل سرائی نے کمیٹی کے کاشان آفس کو بھی صورتحال سے مطلع کر دیا تھا اور کاشان سے تہران تک تمام ریلوے اسٹیشنوں کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس ٹرین سے کسی مشتبہ آدمی کو اترتے ہوئے دیکھا گیا ہو تو اسے اس کے بارے میں اطلاع دے دی جائے۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب

رباط سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ایک آدمی کو ایک عورت اور دو بچوں کے ساتھ مشتبہ انداز میں اسٹیشن سے باہر آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

یہ اطلاع سنتے ہی عادل سرائی رباط روانہ ہوگیا۔ اس کی اطلاع کے مطابق اس ٹرین سے چھ سات آدمی رباط اسٹیشن پر اترے تھے۔ تمام مسافروں کے کاغذات چیک کیے گئے تھے وہ اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ البتہ ایک آدمی کو چیک نہیں کیا گیا تھا جو ایک عورت اور دو بچوں کے ساتھ تھا اس آدمی نے ڈھائی سالہ بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچہ مسلسل روئے جا رہا تھا پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بچے کے پیٹ میں تکلیف ہے پلیٹ فارم پر موجود کمیٹی کے ایک آدمی نے اسے بیمارستان لے جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن تقریباً ایک گھنٹے بعد کمیٹی کے اس آدمی کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ بیمارستان جا کر اس بچے کے بارے میں معلوم کرے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ کسی بچے کو علاج کے لیے یہاں نہیں لایا گیا۔ اس شخص کے بارے میں نجانے کیوں عادل سرائی کے ذہن میں شبہ جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ اس نے تحقیقات کا فیصلہ کر لیا۔ تحقیقات کا آغاز اس نے ریلوے اسٹیشن کے سامنے ٹیکسی اسٹینڈ سے کیا۔

ٹرین کی آمد پر یہاں عام طور سے تین چار ٹیکسیاں کھڑی رہتی تھیں۔ لیکن اس وقت صرف دو ٹیکسیاں تھیں۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی جو صبح چادر پوش عورت او بچوں کو لے کر گیا تھا۔

''صبح کاشان سے آنے والی ٹرین کے مسافروں کو تم کہاں لے گئے تھے۔'' عادل سرائی نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ وہ اس وقت کمیٹی کے مقامی دفتر میں موجود تھے یہ دفتر ایک رہائشی مکان کے دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے کو حوالات ک طور پر استعمال کیا جا رہا تھا جبکہ دوسرے کمرے میں دفتر قائم تھا۔ اس میں چند ٹوٹی ہوئی میز اور چند جھولتی ہوئی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''خانم اور اس کے دونوں بچوں کو میں نے خیابانِ سعد پر واقع ان کے مکان کے سامنے اتار دیا تھا۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

''اور وہ آدمی، اسے کہاں اتارا تھا۔'' عادل سرائی نے اسے گھورا۔

''ان کے ساتھ کوئی آدمی نہیں تھا۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ عادل سرائی اسے گھورتا رہا پھر اس کا ایک بھرپور تھپڑ ٹیکسی ڈرائیور کے منہ پر پڑا۔ یہ صورتحال ٹیکسی ڈرائیور کے لیے غیر

متوقع تھی۔ وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا عادل سرائی نے اٹھ اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ڈرائیور بلبلاتا ہوا فراش پر لوٹتا رہا۔"

"میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ اس آدمی کو تم نے کہاں اتارا تھا۔" عادل سرائی نے اس کی کھوپڑی پر ایک اور ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔" ڈرائیور کراہتے ہوئے بولا۔

"لیکن میری اطلاع کے مطابق جب وہ عورت ٹرین سے اتری تھی تو اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ جس نے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور تم کہتے ہو کہ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔" عادل غرایا۔

"وہ...... آدمی، وہ آدمی۔" ڈرائیور اپنے آپ کو اس کی ایک اور ٹھوکر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔

"وہ...... وہ ان کے ساتھ نہیں تھا۔ خانم اور بچوں کو چھوڑ کر وہ بازار کی سمت چلا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ بعد میں گھر پہنچا ہو۔ لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" عادل سرائی تھوڑی دیر تک ٹیکسی ڈرائیور کو گھورتا رہا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

بہر حال عادل سرائی نے عورت کے گھر کا پتہ معلوم کرنے کے بعد ڈرائیور کو چھوڑ دیا اور اس کے بعد وہ وہاں سے چل پڑا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ خیابانِ سعد پر اس مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں دروازہ ایک عورت نے کھولا تھا لیکن وہ اس طرح دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کس سے ملنا ہے۔" عورت نے پوچھا۔

"آج صبح کاشان والی ٹرین سے یہاں کون آیا تھا۔" عادل سرائی نے پوچھا تھا۔

"میں آئی تھی اپنے بچوں کے ساتھ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"میں کمیٹی کے تہران آفس کا سربراہ ہوں۔ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے اندر آنے کی اجازت دو۔" عادل سرائی نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ عورت نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ کمیٹی والوں کے

سامنے مزاحمت کرنے کا مطلب اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا اور عادل سرائی کو سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ اس وقت گھریلو لباس میں تھی۔ عادل سرائی نے اس سے سوال کیا۔

"کیا تم ایسا ہی لباس پہنتی ہو۔"

"نن...... نہیں یہ تو گھر میں پہننے کا لباس ہے عورت ہکلائی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔

"تمہارا شوہر کہاں ہے۔" عادل سرائی نے سوال کیا۔

"وہ کام کے سلسلے میں قم میں رک گیا ہے میں بھی قم گئی ہوئی تھی۔ اپنی ماں کے پاس بچوں کو لے کر وہاں سے میں واپس آ گئی ہوں اور میرا شوہر ایک دو دن کے بعد آئے گا۔ لیکن کمیٹی کو ہم سے کیا دلچسپی ہے۔ ہم نے تو پوری زندگی میں کوئی جرم نہیں کیا۔ میرے شوہر نے ہمیشہ انقلاب کی حمایت کی ہے۔"

"ہوں۔" عادل سرائی نے پر غرور انداز میں اپنے حلق سے ایک آواز نکالی جیسے وہ اس دنیا پر بادشاہت کے لیے پیدا ہوا ہو اور باقی سب اس کے سامنے ہیچ ہوں۔ اس نے اس جگہ جہاں وہ موجود تھا کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ یہ وسیع سیٹنگ روم تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور قیمتی صوفے قرینے سے آراستہ تھے۔ درمیان میں شیشے کی ٹاپ والی میز پڑی ہوئی تھی۔ قالین پر تین چار قیمتی کھلونے بھی پڑے ہوئے تھے۔ مینٹل پیس پر چند اور چیزوں کے علاوہ تصویر کا ایک فریم بھی رکھا ہوا تھا اس تصویر میں ایک عورت اور ایک مرد نظر آ رہے تھے۔ مرد نے عمدہ قسم کا سوٹ پہن رکھا تھا عورت کے جسم پر بھی یورپی لباس تھا۔ تصویر دیکھ کر عادل سرائی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کئی سال پہلے کی اسی عورت کی تصویر ہے جو سامنے کھڑی تھی وہ گھوم کر عورت کو دیکھنے لگا۔ عورت کی عمر تیس یا چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کے چہرے کے نقوش بے حد جاذب نگاہ تھے۔

"صبح تمہارے ساتھ آنے والا مرد کون تھا۔ اس نے عورت کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"م...... میرے ساتھ...... کک...... کوئی...... کک...... کوئی مرد نہیں تھا۔" عورت اس کا سوال سن کر ہی کانپ اٹھی تھی۔ اس نے صوفے پر پڑی ہوئی سیاہ چادر اٹھا کر جسم پر اوڑھ لی۔

’’میں اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو کاشان سے تمہارے ساتھ آیا تھا۔‘‘ عادل سرائی غرایا۔

’’کک..... کاشان.....‘‘ عورت کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ’’میں قم سے آئی ہوں میں کاشان سے آنے والے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔‘‘

’’میں تمہارے دوست کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو ٹرین سے اترتے وقت تمہارے ساتھ تھا اور جس نے تمہارے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔‘‘ عادل سرائی نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ عورت ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی پھر اس کے منہ سے نکلا۔

’’اوہ..... وہ..... لیکن میں اسے نہیں جانتی۔‘‘ وہ ٹرین میں میرے بچوں سے مانوس ہو گیا تھا اور جب ہم ٹرین سے اترے تو میرا بچہ ضد کر رہا تھا کہ میں اسے گود میں پکڑوں مگر میرے پاس بیگ بھی تھا۔ میں اسے گود میں نہیں اٹھا سکتی تھی۔ بچے کو ضد کرتے اور روتے دیکھ کر اجنبی نے اسے گود میں اٹھا لیا تھا اور پھر وہ ہمیں ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب چھوڑ کر چلا گیا تھا۔‘‘

’’میں اس اجنبی سے تمہارا تعلق جاننا چاہتا ہوں۔‘‘ عادل سرائی بولا۔

’’میرا اس سے کون سا تعلق ہے۔‘‘ عورت رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

’’میں ایک شریف عورت ہوں۔ کسی غیر مرد کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔‘‘

’’لیکن وہ تمہارا ہمسفر تھا اور اس نے تمہارے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔‘‘ عادل سرائی عورت کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

’’ہمسفر ہونا محض اتفاق ہے اور میرے بچے کو اس نے محض انسانی ہمدردی کے تحت گود میں اٹھایا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔‘‘

’’دیکھو.....‘‘ عادل سرائی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ’’اگر تم بتا دو گی کہ وہ کہاں ہے تو تمہارے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔ لیکن دوسری صورت میں.....‘‘

’’مم..... میں سچ کہتی ہوں اس اجنبی کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی۔‘‘ عورت بے اختیار رو پڑی۔ عادل سرائی چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تمام کمروں میں گھومتا رہا اور عورت کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ پورا گھر قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ جس سے اہل خانہ کی مالی حیثیت کا

اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

’’تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔‘‘ عادل سرائی نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

’’وہ پھولوں کا بیوپاری ہے۔ باغات کے ٹھیکے لیتا ہے۔‘‘ عورت نے جواب دیا۔

’’کیا تم جیسی کوئی جوان اور حسین عورت شوہر کے بغیر رہ سکتی ہے۔‘‘ عادل سرائی نے سوال کیا۔ عورت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہونٹ کپکپا رہے تھے اور منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ عادل سرائی کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا۔

’’تمہارے بچے کہاں ہیں؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’کچھ دیر پہلے باہر نکلے تھے پڑوس کے کسی مکان میں ہوں گے۔‘‘ عورت نے جواب دیا۔

’’تمہارا دوست ٹیکسی میں بٹھانے کے بعد کہاں گیا تھا۔‘‘ عادل سرائی نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

’’خدا کے واسطے..... خدا کے واسطے مجھ پر الزام نہ لگائیے۔ وہ میرا دوست نہیں تھا اور میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔‘‘ عورت نے جواب دیا اور اب خوف کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں غصہ بھی نمودار ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نوکیلے ناخنوں سے عادل سرائی کا منہ نوچ لے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی اس نے اگرچہ کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کمیٹی کے کسی آدمی کے ساتھ کوئی بھی بدسلوکی کس حیثیت کی حامل ہو سکتی ہے۔‘‘

’’اس کا حلیہ بتا سکتی ہو۔‘‘ عادل سرائی نے سوال کیا۔

’’’میں نے اسے توجہ سے نہیں دیکھا۔ لیکن جو کچھ سمجھ میں آیا، بتا دیتی ہوں۔‘‘ عورت نے کہا اور اس اجنبی کا حلیہ بتانے لگی۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ عادل سرائی بولا۔ ’’میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ لیکن اگر اس آدمی سے تمہارا تعلق ثابت ہو گیا تو میں تمہیں کمیٹی کے حوالے کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔‘‘

عادل سرائی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔ اپنے عقب میں اس نے دھڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ رباط کریم میں مزید تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس حلیے کا ایک آدمی صبح ساڑھے دس والی بس میں سوار ہوا تھا اور اس نے گرج کا ٹکٹ خریدا تھا۔ عادل سرائی کمیٹی کے مقامی آدمیوں کو اس عورت کے بارے میں ہدایت دیتا ہوا گرج کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا یہ شبہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ رباط کریم اسٹیشن پر اترنے والا وہ اجنبی نریمان

فرازی ہی تھا۔

"وہ لوگ جانتے تھے کہ نریمان فرازی بہت چالاک انسان ہے۔ اسے بھی یقیناً شبہ ہوگیا ہوگا کہ اگر کاشان میں رحمان پکڑا گیا تو وہ کمیٹی کو اس کے بارے میں بتا دے گا کہ وہ ٹرین سے تہران کے لیے روانہ ہوا ہے۔ نریمان فرازی کے ذہن میں یقیناً یہ خیال ہوگا کہ تہران میں اس ٹرین سے آنے والے مسافروں کو چیک کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ رباط کریم اسٹیشن پر اتر گیا اور اس عورت اور بچوں کی آڑ میں اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ رباط کریم سے گرج اور پھر وہاں سے تہران پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہ راستہ بے شک طویل تھا لیکن زیادہ محفوظ تھا۔ اس عورت کے بارے میں بھی وہ سوچ رہا تھا کہ شاید وہ سچ ہی بول رہی ہو لیکن وہ اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے کمیٹی کے مقامی آدمیوں کو اس عورت کی نگرانی کی ہدایت کردی تھی۔

عادل سرائی گرج کے بس ٹرمینل اور اس کے قرب و جوار میں نریمان فرازی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے اس کے حلیے سے یہ کوششیں کی تھیں۔ لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی اور آخر کار وہ جب تہران پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ یہاں ایک اور اطلاع اس کی منتظر تھی۔ کاشان سے سہراب نے یہ اطلاع دی تھی کہ رحمان سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق نریمان فرازی بازار ولی عصر کے علاقے میں واقع کیفے دشت میں زندال سے ملنے کی کوشش کرے گا کیونکہ وہ اس کا گہرا دوست ہے اور جب وہ تہران میں تھے تو اکٹھے ہی کام کیا کرتے تھے۔ ایک بار پھر عادل سرائی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ یہ اطلاع کافی امید افزا تھی لیکن سب سے بڑا مسئلہ فرازی کی شناخت کا تھا۔ وہ اب تک بڑی خوبصورتی سے پولیس اور کمیٹی کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا تھا۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بلا روک ٹوک زاہدان سے تہران پہنچ چکا تھا اور ظاہر ہے وہ اپنی اصل شکل میں نہیں گھوم رہا ہوگا۔ بدلے ہوئے بھیس میں کسی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ سہراب کی اطلاع کے مطابق وہ زندال سے ملنے کی کوشش کرے گا اور نریمان فرازی تک پہنچنے کے لیے زندال کو تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ زندال کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اسے خیال آیا کہ کچھ دن پہلے جرائم پیشہ لوگوں کا ریکارڈ بنایا گیا تھا۔ یقیناً اس میں زندال کا ریکارڈ بھی ضرور موجود ہوگا اور اسے

مایوسی نہیں ہوئی۔ اس نے فوراً ہی ریکارڈ روم کا رخ کیا اور اس کے بعد کافی دیر کی تلاش کے بعد اسے زندال کا فائل مل گیا جسے لے کر وہ اپنے کمرے میں آگیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ زندال کی فائل پر جھکا رہا۔ فائل میں زندال کی کوئی تفصیل نہیں تھی لیکن اس کا حلیہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ متعدد سنگین جرائم کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا اس پر ایک عورت کے قتل کا الزام بھی تھا لیکن وہ کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک شاہ پرست دولت مند خاندان کے افراد بھاری معاوضہ لے کر ترکی کے راستے فرار کرانے کی کوشش کرتے ہوئے طبریز سے بیس کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی میں وہ پاسداران کے گھیرے میں آگیا تھا لیکن اس کے بعد وہ بڑی دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف فرار ہوگیا بلکہ لاکھوں ڈالر مالیت کے ہیرے جواہرات پر مشتمل ان لوگوں کی ساری پونجی بھی ساتھ لے گیا۔ جنہیں وہ سرحد پار کرانے کے لیے لے جا رہا تھا۔

پاسداران صرف انہی لوگوں کو گرفتار کر سکتے تھے، جو ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ زندال کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ جھیل ارمیت کے اوپر سے گھومتا ہوا پہاڑوں میں آباد خانہ بدوش کردوں سے جا ملا تھا۔ اس کے بعد زندال کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا گیا۔ ممکن ہے وہ پہاڑی سلسلہ عبور کر کے ترکی کی طرف نکل گیا ہو۔ یا پہاڑی میں ہی کردوں کے ساتھ ہی رہ گیا ہو۔

بہرحال یہ اس کے ماضی کی داستان تھی۔ عادل سرائی نے فائل بند کر دیا وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے زندال واپس آگیا ہو اور تہران کی سرزمین پر روپوشی کی زندگی گزار رہا ہو۔ چنانچہ عادل سرائی تیاریوں میں مصروف ہوگیا اور تھوڑے ہی وقت کے بعد کیفے دشت کی نگرانی شروع کر دی گئی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اگر زندال کے حلیے کا کوئی آدمی انہیں نظر آئے تو وہ اسے اطلاع دیں۔ اس نے اپنے آدمیوں کو نریمان فرازی کے حلیے سے بھی واقف کر دیا تھا۔ یہ حلیہ وہ تھا جو رباط کریم میں اسے عورت سے معلوم ہوا تھا۔

بہرحال اپنے جیسی ہر ممکن کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن اس بات کا اعتراف بھی کرنا پڑ رہا تھا کہ نریمان فرازی اس قدر ذہین انسان ہے کہ اس کی ذہانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ وہ بے مثال صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس تک پہنچنے کی ہر کوشش بڑی آسانی سے ناکام ہو رہی ہے۔ یہ

بات شدید جھلاہٹ کا باعث تھی مگر جھلانے سے مسئلے حل نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ کیفے دشت کی نگرانی بھرپور طریقے سے جاری تھی اور دو دن کی نگرانی کے بعد اسے امید افزا اطلاع ملی تو وہ خود بھی اس علاقے میں پہنچ گیا۔ اسے نریمان فرازی کی گرفتاری کی پوری پوری امید تھی۔ اسے یقین تھا کہ انٹیلی جنس کا کرنل حیات بھی نریمان فرازی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو کرنل حیات کے ساتھ مل کر کوئی مناسب منصوبہ بندی کر سکتا تھا۔ لیکن بات وہی اپنے پن کی آجاتی ہے۔ نریمان فرازی کی گرفتاری کا سہرا وہ اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ شبہ بھی تھا کہ کرنل حیات انقلابی حکومت کے ساتھ پوری طرح مخلص نہیں ہے۔

کیفے دشت ایک بدنام ہوٹل تھا۔ انقلاب سے پہلے یہ کیفے جرائم پیشہ افراد اور طوائفوں کا بہت بڑا مرکز تھا لیکن انقلاب کے بعد طوائفیں یہاں سے اس طرح غائب ہو گئیں تھیں جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ ویسے اس وقت گاہکوں کی ایک معقول تعداد کیفے میں موجود تھی چار بج کر پندرہ منٹ پر ایک خوش پوش شخص ہوٹل میں داخل ہوا۔ کیفے میں موجود عادل سرائی کا آدمی اس پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ اس نے اٹھ کر بل ادا کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اطمینان سے کار کے اندر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے عادل سرائی سے رابطہ قائم کیا تھا۔

''ابھی ابھی ایک مشتبہ قسم کا آدمی ہوٹل میں داخل ہوا ہے اس نے گرے رنگ کا کوٹ پہن رکھا ہے اور چہرے پر گھنی مونچھیں ہیں۔ یا تو وہ نریمان فرازی ہے یا اس کا بھیجا ہوا کوئی آدمی۔'' عادل سرائی نے کلائی پر بندھی گھڑی میں نظر ڈالی اور پھر اپنے آدمی کو ہدایت کی۔

''اب تم اندر جا کر بیٹھ جاؤ اور نو وارد پر نگاہ رکھو۔ یہ ہدایت لے کر وہ شخص خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کیفے میں موجود گرے سوٹ والا کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا وہ کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کھول کر دیکھنے لگتا اور کبھی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اس کے چہرے پر بتدریج مایوسی پھیلتی جا رہی تھی۔ پانچ بجے کے قریب اس نے میز پر دس طعمان کا نوٹ رکھا اور اپنا اخبار لپیٹتا ہوا اٹھ گیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گرے سوٹ والا تیزی سے گھوما اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کے سامنے کیپٹی کا ایک آدمی کھڑا تھا۔

''خود کو زیر حراست سمجھو۔'' اس شخص نے گرے سوٹ والے کے چہرے پر نگاہیں

جماتے ہوئے کہا۔

''اور بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔''

لیکن اس شخص نے بھاگنے میں قطعاً دیر نہیں لگائی۔ وہ کسی جنگلی بھینسے کی طرح شیشے کی پارٹیشن سے ٹکرایا اور زبردست چھناکے سے فٹ پاتھ پر جا گرا۔ شیشے کے ٹکڑے اس کے چاروں طرف بکھر گئے۔ کیفے کے اندر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دو تین آدمیوں کی چیخیں بھی گونجی تھیں۔ باہر گرے سوٹ والا گرتے ہی اٹھا اور بھاگنا چاہ رہا تھا کہ اسی لمحے کسی طرف سے تین فائر ہوئے اور وہ سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کیپٹی کی دو تین گاڑیاں پہنچ گئیں۔ ایک گاڑی سے سب سے پہلے عادل سرائی باہر نکلا اور دوڑتا ہوا زخمی شخص کے پاس پہنچ گیا۔

''ابھی زندہ ہے۔'' وہ چلایا۔ ''فوراً ایمبولینس منگاؤ۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔'' اسی لمحے کیفے دشت کے سامنے والی عمارت کے پورچ سے ایک آدمی باہر نکلا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر بے پرواہی کے انداز میں چلتا ہوا قریبی گلی میں داخل ہوا۔ دس منٹ کے بعد اس کے سامنے والی عمارت کے نیم تاریک برآمدے سے ایک عورت نکلی اور پہلی عمارت کے پورچ سے نکلنے والے شخص کے تعاقب میں چل پڑی۔ وہ عورت ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ رات کے وقت کسی عورت کا اکیلے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس وقت چادر پوش عورت کو شاید خطرات کی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن آگے چلنے والا شخص اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا خیابان باہر کی طرف نکل آیا اور آخر کار ایک طویل چکر کاٹتا ہوا بازار بزرگ کے علاقے میں واقع ابرز ریستوران میں داخل ہو گیا۔

تعاقب کرنے والی عورت شیشے کے دروازے کے پاس ذرا سا رکی اور پھر آگے بڑھ گئی اس کی چال میں ایک دم تیزی آ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ مصطفیٰ اسٹریٹ پر واقع ایک پرانی عمارت میں داخل ہوئی اور لکڑی سے بنے زینے چڑھنے لگی۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اس نے ایک دروازہ پر تین مرتبہ مخصوص دستک دی۔

''اندر آ جاؤ۔ مہلکہ!'' اندر سے شہباز کی آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھلا ہے۔''

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ارمزی ریسٹورنٹ میں گاہکوں کا ہجوم تھا اور ریسٹورنٹ کا مالک کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایک ویٹر اس کے قریب پہنچا اور اس نے اسے بتایا۔

"عقبی فون بوتھ میں ایک آدمی اس سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کیا......؟" ریسٹورنٹ کے مالک نے نگاہیں اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں......اس نے مجھ سے یہی کہا ہے ارمزی کو اس کا یہ پیغام دے دو۔"

"مگر وہ مجھ سے ملنے یہاں کیوں نہیں آ رہا۔ اچھا میں دیکھتا ہوں۔" ریسٹورنٹ کے مالک ارمزی نے اسے گھورا اور ایپرن سے ہاتھ پونچھتا ہوا پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔ جہاں فون بوتھ میں ایک آدمی ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔ ارمزی نے بوتھ کا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔" ارمزی تیز لہجے میں بولا۔ "اور سنو جلدی بات کرو اس وقت گاہکوں کا بہت رش ہے۔ میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں دولت کی فراوانی انسانی قدروں کو پامال کر دیتی ہے۔" بوتھ میں کھڑے ہوئے شخص نے کہا اور اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ دفعتاً ہی ارمزی اچھل پڑا۔

"اوہ میرے خدا۔ تم نریمان فرازی۔"

"ہاں۔ تمہارا پرانا خادم۔" شہباز کی آواز ابھری۔ نریمان فرازی کی بے مثال ذہانت کا شہباز دل سے قائل ہوتا جا رہا تھا۔ درحقیقت وہ ماحول پر حکمرانی کرنا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے اندر فیصلہ کرنا اور اس پر عمل کر ڈالنا اس کی خوبیوں میں شامل تھا۔ بے شک وہ جسم شہباز کا استعمال کر رہا تھا۔ لیکن اس نے بھی شہباز پر مکمل بھروسہ کیا ہوا تھا۔

"میرے دوست! میں تمہیں کسی خاص وجہ سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا بلکہ واقعی مجھے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کوئی عار نہیں ہے۔ اگر مجھے کوئی ڈھیلا ڈھالا اور بے تکا انسان

اس حیثیت سے ملتا تو شاید میں اس معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔ لیکن تم بہت اعلیٰ شخصیت کے مالک ہو بلکہ صحیح معنوں میں مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ تم واقعی میرے وجود کا دوسرا حصہ ہو اور اگر کبھی مجھے جسمانی حیثیت میں تمہارے ساتھ کسی مشن کو سرانجام دینے کا موقع ملا تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔"

بہرحال فرازی کی آواز ابھری۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو کیا زندگی سے بے زار ہو چکے ہو۔"

"زندگی سے پیار کرنے والے ہمیشہ پہلے مرتے ہیں۔" شہباز نے کہا۔ "میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ کیا تم چند منٹ نکال سکتے ہو۔"

"میرے ساتھ آؤ۔ میر خدایا تم نے مجھے لرزا دیا ہے۔ آہ......تم نہیں جانتے اچھا ذرا آؤ......اندر آؤ......میں نے تمہیں صرف تمہاری آواز سے پہچانا ہے اور یہ آواز میں جانکنی کے عالم میں بھی نہیں بھول سکتا۔ تم نے اپنے چہرے کو تبدیل کر رکھا ہے نا۔ شکل سے تو میرے فرشتے بھی تمہیں نہیں پہچان سکتے تھے۔ لیکن جیسے ہی تم بولے، میں نے تمہیں پہچان لیا۔"

"اب ان باتوں کو چھوڑو۔ میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ذرا تھوڑی سی خاموشی اختیار کرو۔" ارمزی نے دبی آواز میں کہا اور پھر وہ اسے ایک ایسی جگہ لے گیا جو ریستوران کے عقبی حصے میں تھی اور ارمزی کے خیال کے مطابق بالکل محفوظ تھی۔

"یہاں آرام سے بات کی جا سکتی ہے۔ میں اب بھی تمہارے اس بھیس بدلنے کے کمال کی داد دیتا ہوں۔"

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔" شہباز نے کہا۔ "میں البرز کے ریستوران کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"اس ریستوران کے مالک کا نام فخری ہے جو شہر کا رہنے والا ہے اور کچھ۔" ارمزی نے کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا اس کا تعلق کمیٹی یا انٹیلی جنس سے ہو سکتا ہے۔"

"اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔"

"مگر میں اس بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

''اس سلسلے میں بہتر آدمی ملا سعد ہے۔ جو تمہیں اس کی تفصیل بتا سکتا ہے۔ کیا میں ملا سعد کو فون کروں۔''

''نہیں۔فون پر ایسی بات کرنا درست نہیں ہے۔ میں خود اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔''

''تم بڑا خطرہ مول لیے پھر رہے ہو۔ شکر ہے کہ تم نے اپنا چہرہ تبدیل کیا ہوا ہے لیکن کمیٹی کے لوگوں کو جانتے ہو، وہ بہت تیز اور چالاک ہیں اور ان کی نگاہیں بہت دور تک دیکھ لیتی ہیں۔''

''تم فکر مت کرو۔'' تھوڑی سی خاطر مدارت کے بعد فرازی نے اسے رخصت کر دیا اور تقریباً ایک گھنٹے کے بعد شہباز، نریمان فرازی کے زیر ہدایت تہران کے زیریں علاقے میں ریلوے لائن کے قریب ایک پسماندہ بستی میں واقع ایک مکان میں موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شہباز کو اس کی اپنی حیثیت سے یہ کام سونپا جاتا تو وہ ایک فیصد بھی کامیابی نہیں حاصل کر سکتا تھا کیونکہ حالات انتہائی سنگین اور دہشت ناک نوعیت کے حامل تھے۔ واسطہ کسی ایک شخص سے نہیں تھا بلکہ کمیٹی کے نام سے ایک پوری فوج سے تھا اور فوج بھی ایسی کہ بس قدم قدم پر دہشت ناکی میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ لیکن رازل جریری کے کام ایسے ویسے نہیں ہوا کرتے وہ جب بھی سوچتا بہت گہرائی میں سوچتا اور بڑی کاوشوں کے بعد اس نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا اور نریمان فرازی واقعی ایک زبردست شخصیت تھی۔ خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی لائن کے سینکڑوں افراد سے واقف تھا اور چونکہ خود اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا، اس لیے شہباز نے محسوس کیا تھا کہ جرائم پیشہ لوگ اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔ ویسے شہباز جب یہاں آیا تھا تو ملا سعد موجود نہیں تھا۔ دروازے کے باہر تالا لگا ہوا تھا اور یہ تالا شہباز نے اپنے ہاتھ سے کھولا تھا اور اب اندر بیٹھا ملا سعد کا انتظار کر رہا تھا اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ملا سعد آ گیا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور سامنے کرسی پر ایک آدمی کو بیٹھے دیکھ کر اس نے پستول تان لیا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے ملا سعد پستول جیب میں رکھ لو۔ یہاں بھی نریمان فرازی کی آواز کام آئی تھی اور ملا سعد نے فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا۔ چند لمحات وہ حیرت سے فرازی کو دیکھتا رہا پھر پستول جیب میں رکھ کر بولا۔

''اور اگر یہ آواز فرازی کی ہے تو میں اپنے دوست کو خوش آمدید کہہ سکتا ہوں۔ میں سمجھا

شاید کوئی چور وغیرہ گھس آیا ہے۔ بیرونی تالا کھلا دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔''

''پولیس یا کمیٹی والوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' شہباز نے اسے گھورا۔

''تم جانتے ہو انہیں پہلے بھی کبھی مجھ پر شبہ نہیں ہوا۔ پولیس یا کمیٹی کے پاس میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے ویسے بھی میں آج کل شرافت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن پر کام کرنے والے کسی شخص پر پولیس یا کمیٹی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ملا سعد نے کہا۔

''بہر حال تم یہ بتاؤ البرز ریستوران کے مالک کے بارے میں کیا جانتے ہو۔''

''وہ...... منوچہر ہے اس کا نام وہ تلاتی کا آدمی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ پولیس کے لیے بھی مخبری کرتا ہے لیکن کبھی اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ بہر حال ان دنوں چونکہ تم پورے ایران کا موضوع بنے ہوئے ہو۔ اس لیے مجھے بھی تمہاری تازہ سرگرمیوں کی معلومات حاصل ہیں اور یہ بھی پتہ ہے کہ ملک کے چپے چپے میں تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے لیکن بہر حال وہ تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

''کون؟''

''میرا مقصد منوچہر سے ہے۔''

''مجھے بھی یہی شبہ ہے۔ اب یہ بتاؤ تمہاری کیا سرگرمیاں چل رہی ہیں۔''

''میں نے کہا نا بالکل ٹھنڈا بیٹھا ہوا ہوں۔ زندگی سے پیار ہے مجھے، کمیٹی والوں کے ہاتھوں زندگی کھونا نہیں چاہتا۔''

''تب تو مجھے بھی تمہارا خیال رکھنا چاہیے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

''نہیں، اب ایسا بزدل بھی نہیں ہوں میں۔''

''پھر آؤں گا۔'' یہ کہہ کر شہباز ملا سعد کے مکان سے باہر نکل آیا۔ لیکن بارش شروع ہو گئی تھی۔ بادل تو آج صبح ہی سے چھائے ہوئے تھے۔ دن میں ایک آدھ بار ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی تھی لیکن اس وقت جس طرح بارش شروع ہوئی تھی اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ موسلا دھار برسے گی۔ شہباز کا یہ اندازہ بھی درست نکلا وہ بستی سے نکل کر ریلوے لائن کو عبور کر کے بس ٹرمینل کی طرف آیا تو بارش کافی تیز ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں اور بازار سنسان ہو گئے۔ لوگ باش سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ شہباز کو ایک ٹیکسی مل گئی۔ جس نے چند ہی منٹ میں اسے البرز ریستوران کے سامنے اتار دیا۔ جب وہ

ریستوران میں داخل ہوا تو اس نے کاؤنٹر پر ایک گنجے سر والے دبلے پتلے آدمی کو دیکھا۔ ریستوران میں بہت گاہک موجود تھے جن میں دو عورتیں بھی تھیں۔ بعض عورتیں سر تا پا چادریں اوڑھے تھیں اور بعض نے حجاب پہن رکھے تھے۔ ان دنوں ہوٹلوں میں بہت کم عورتیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ یہ عورتیں غالباً بارش سے بچنے کے لیے یہاں آ گئی تھیں۔

شہباز ایک کونے کی میز پر جا بیٹھا اس نے اپنے لیے کافی منگوالی اور جب کافی اسکے سامنے سرو ہوگئی تو وہ ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ایک آدمی ریستوران میں داخل ہوا۔ گویا غالباً ٹیکسی یا کار سے اتر کر آیا تھا کیونکہ اس کے لباس پر بارش کے چند ہی چھینٹے پڑے تھے۔ لیکن اس شخص کو دیکھ کر شہباز چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ خود تو اسے نہیں جانتا تھا لیکن چونکنے کی وجہ نریمان فرازی کے منہ سے نکلنے والی آواز تھی۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''اسے دیکھ رہے ہو جو ابھی اندر آیا ہے۔''

''ہاں۔''

''تہران سے فرار ہونے سے پہلے جب تلاتی اس کے ساتھ کام کرتا تھا تو یہ شخص بھی تلاتی سے ملا کرتا تھا۔ بہر حال اب اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ البرز ہوٹل کا مالک منوچہر تلاتی ہی کا آدمی ہے۔ شہباز کی نگاہیں اس شخص پر جم گئیں۔ وہ شخص ادھر ادھر دیکھے بغیر اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا تو شہباز نے بھی کرسی چھوڑ دی اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا زینے پر پہنچ گیا۔ البتہ اس نے قرب و جوار کا جائزہ لیا تھا ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ پہلی منزل پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ نووارد راہداری میں دائیں طرف والے تیسرے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔

''شہباز نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر زور دار دھکے سے دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا بلکہ دروازے ہی میں رک گیا۔ پستول اس کی جیب سے نکل کر ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ کمرے میں پانچ افراد بیٹھے ہوئے تھے جن میں وہ شخص بھی شامل تھا جو چند سیکنڈ پہلے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے والی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نریمان فرازی اسے بھی اچھی طرح

جانتا تھا۔ وہ طوائف تھی اور آج کل شاید روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک آدمی پھرتی سے کرسی سے اٹھ گیا اور اس کی آواز ابھری۔

''کون ہو تم؟'' اس کے بعد اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اسی لمحے شہباز کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی کوئی حرکت نہیں کرو گے تم اپنی جگہ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اس نے پستول کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''تم میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ورنہ اپنی موت کا ذمے دار خود ہوگا۔''

''تم ہو کون۔'' اس مرتبہ اس شخص نے پوچھا تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا شہباز یہاں تک آیا تھا۔

''میں......نریمان فرازی ہوں۔'' شہباز نے پرسکون لہجے میں جواب دیا اور کچھ لمحات کے لیے وہاں سکتہ طاری ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی وہ شخص بولا۔

''بکواس کرتے ہو تم۔ تم نریمان فرازی نہیں ہو سکتے میں تو اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''تو میں وہی نریمان فرازی دکھا دیتا ہوں تمہیں۔ جسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' یہ کہہ کر شہباز نے اپنا میک اپ اتار دیا اور یہ سارا عمل نریمان فرازی کے زیر ہدایت ہو رہا تھا اور رازل جریری کی طرف سے اسے ہدایت تھی کہ نریمان فرازی جو کچھ بھی کرتا ہے اس پر مکمل طور پر خاموشی اختیار کی جائے۔ ہاں، اگر اپنی جان پر بنے تو اپنا بچاؤ کرنا بہت ضروری ہے۔ چند لمحوں کے بعد شہباز کی داڑھی، مونچھیں اور نقلی بال فرش پر پڑے تھے۔ شہباز نے کہا۔

''میں صرف تلاتی کی تلاش میں آیا تھا۔ لیکن وہ یہاں نظر نہیں آیا۔ کیا کہتے ہو تم لوگ۔'' مگر وہ لوگ کیا کہتے ان پر تو سکتہ طاری تھا۔ پتہ نہیں نریمان فرازی نے یہ ڈرامہ بازی کیوں کی تھی۔ جبکہ شہباز کے خیال کے مطابق یہ ڈرامہ بازی بے حد خطرناک تھی او پھر نریمان فرازی نے پھرتی سے اسے باہر نکلنے کے لیے کہا اور باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور پھر زینے کی طرف دوڑا لیکن ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ نیچے دھماکے سے دروازہ کھلنے اور بھاری قدموں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اسی لمحے پہلی منزل کے تیسرے کمرے کا دروازہ اندر سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ شہباز نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ جوتے اتار کر پھینک دیئے اور اوپر کی طرف بھاگا۔ اوپر فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا نیچے

آوازوں کے شور کے درمیان مشین گن کی آواز گونجی۔ حملہ آوروں کا کمانڈر زور زور سے فارسی زبان میں ہدایت دے رہا تھا۔ شہباز کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کمیٹی والے تھے۔ جنہوں نے ہوٹل پر چھاپہ مارا تھا۔ شہباز تیسری منزل کی بالکونی پر لٹک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کمیٹی کے آدمی تلاشی کے آدمیوں کو گرفتار کرنے کے بعد چلے جائیں گے تو وہ اوپر آ جائے گا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی بادلوں کی وجہ سے فضا میں تاریکی سی تھی۔ شہباز نے بالکونی کے جس کونے پر ہاتھ ڈال رکھے تھے۔ وہ خاصا چکنا تھا اچانک بائیں ہاتھ والی ٹائل اکھڑ گئی۔ لیکن وہ شہباز تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اس نے ایک ابھری ہوئی کگر پر پاؤں جمائے اور پھر فوراً ہی سینٹری پائپ پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ بھی پائپ پر ڈال دیا اور آہستہ آہستہ نیچے سرکنے لگا۔ لیکن یہ اس کا اپنا فن تھا جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

چنانچہ وہ اچھی خاصی بلندی سے جس طرح نیچے تک پہنچا۔ اس پر نریمان فرازی بھی ششدر رہ گیا۔

"کمال کا سدھا ہوا جسم رکھتے ہو دوست! مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے تمہارے بدن کا کوئی وزن ہی نہیں ہے۔" یعنی کشش ثقل سے آزاد یہ فن تم نے کہاں سے سیکھا۔" لیکن اس وقت اپنے فن کے بارے میں نریمان فرازی کو کچھ بتانے کی مہلت کہاں تھی۔ وہ پھرتی سے بلندی عبور کر کے گلی میں آ گیا۔ خوش قسمتی سے عقبی گلی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ پائپ سے گلی میں اتر کر تیزی سے ایک طرف دوڑا تھا۔ گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ دوسری طرف سے دوڑتا ہوا ایک آدمی سامنے آ گیا۔ اسے دیکھ کر شہباز ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ کمیٹی کا آدمی تھا اور اس کا تعلق یقیناً کسی مسجد یا مدرسے سے ہو گا۔ لمبی داڑھی اور سیاہ ٹوپی، اس کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفل بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔ چھاپہ مار ٹیم کو شاید یہ پتہ چل گیا تھا کہ کوئی شخص ہوٹل کی عقبی سمت سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ غالباً اسے روکنے کے لیے اس طرف آیا ہے۔ داڑھی والے نے شہباز کو دیکھا اور اس پر رائفل تان لی لیکن شہباز اس وقت چھلاوا بنا ہوا تھا۔ بہت عرصے کے بعد اسے اپنی جسمانی مشقت کا موقع ملا تھا۔ اس نے دیوار پر ایک پیر ٹکایا اور اس طرح ہوا میں اڑا جیسے فضا میں کوئی پرندہ اڑتا ہے اور اس کے بعد اس کی پرواز داڑھی والے پر جا کر ختم ہوئی تھی۔ داڑھی والے کو فائر کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ دھکا لگنے سے رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ خود بھی لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل فرش

پر گر پڑا تھا۔ شہباز اس کے اوپر گرا تھا جس جگہ یہ گرے تھے وہاں بارش سے کیچڑ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں کیچڑ پر پڑے ایک دوسرے کو رگید رہے تھے۔ داڑھی والے کی عمر پنتالیس سے اوپر ہی اوپر رہی ہوگی۔ لیکن شہباز کو اعتراف تھا کہ وہ بے حد پتھریلا اور طاقتور ہے۔ ایک موقع پر شہباز اس کے شکنجے میں بھی آ گیا داڑھی والا شہباز کے سینے پر سوار تھا اور اس کے دونوں ہاتھ شہباز کے گلے پر تھے اور انگلیوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ شہباز کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گردن کسی آہنی شکنجے کی گرفت میں آ گئی ہو۔ اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ داڑھی والے کے منہ سے خرخراہٹ سی نکل رہی تھی۔ اس نے شور مچا کر اپنے آدمیوں کو بلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ شاید اسے اپنے آپ پر ہی اعتماد تھا اور وہ جانتا تھا کہ ایک آدمی کو بے بس کر دینا اس کے لیے مشکل نہیں ہو گا۔ شہباز نے دونوں پیر سمیٹ کر اس کے پیٹ پر جمائے اور جسم کی پوری قوت جمع کر کے اسے اوپر اٹھانے لگا۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی تھی داڑھی والا اس کے اوپر سے قلابازی کھانے کے بعد چپ کی آواز کے ساتھ پشت کے بل کیچڑ میں گرا شہباز نے فوراً ہی سنبھل کر اسے چھاپ لیا اب شہباز داڑھی والے کے سینے پر سوار تھا اور اس کا نرخرہ شہباز کی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ شہباز کو یہ اندیشہ تھا کہ داڑھی والے کا کوئی دوسرا ساتھی اس طرف نہ آ نکلے۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا جلد از جلد کرنا تھا۔ داڑھی والے کے نرخرے پر شہباز کی فولادی انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ مزاحمت کر رہا تھا لیکن بتدریج اس کی مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

آخر کار وہ بے حس و حرکت ہو گیا شہباز اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ واقعی یہ شخص اس کے لیے ایک دلچسپ تجربہ تھا، کیونکہ اس نے ابتدائی کچھ لمحات میں شہباز پر قابو پا لیا تھا اور بہت عرصے کے بعد شہباز کو کوئی ایسی شخصیت ملی تھی جس نے اسے کچھ لمحات کے لیے معطل کر دیا ہو۔

دفعتاً ہی اسے گلی کے دوسری طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ شہباز نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تاریکی میں ایک چھلانگ لگا دی۔ ابھی وہ ایک عمارت کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی اسے دیکھ لیا گیا تھا اور اس پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ شہباز نے عمارت کی ڈیوڑھی میں چھلانگ لگا دی۔ اس عمارت کا ایک گیٹ دوسری طرف تھا۔ وہ اندھا دھند دوڑتا ہوا اس طرف دوسری گلی میں نکلا اور کچھ دور تک دوڑنے کے بعد ایک اور عمارت

میں داخل ہوگیا۔ گلیوں میں دوڑتے ہوئے لاتعداد قدموں کی آواز ابھر رہی تھی۔ کمیٹی والے اس کا اڈا تلاش کررہے تھے لیکن اب شہباز ان کی پہنچ سے بہت دور نکل آیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب وہ مصطفیٰ اسٹریٹ پر مہلکہ کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس کا حلیہ اچھا خاصا بگڑا ہوا تھا۔

✡......✡

انٹیلی جنس کے سربراہ کے چہرے پر سخت برہمی پائی جاتی تھی۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا نجانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک کمیٹی کا مقامی سربراہ عادل سرائی کمرے میں داخل ہوا اس نے انٹیلی جنس کے سربراہ کو سلوٹ کیا لیکن سربراہ کچھ ایسے موڈ میں تھا کہ اسے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کرخت لہجے میں بولا۔

''عادل سرائی! کیا تم اپنی نامعقول سرگرمیوں کی وضاحت کرو گے۔'' عادل سرائی بری طرح نروس ہوگیا۔ بمشکل تمام اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا۔

''میں سمجھا نہیں سر۔''

''حالانکہ تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھتے ہو۔ انٹیلی جنس کا سربراہ غرایا۔''

''میں وضاحت کردیتا ہوں۔'' اچانک ہی ایک آواز سنائی دی۔ یہ کرنل حیات کی آواز تھی وہ کمرے میں بائیں طرف بیٹھا تھا اور اس نے ابھی تک اس سارے معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ اس آواز پر چونک کر عادل سرائی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو کرنل حیات نے کہا۔

''چیف کا اشارہ تمہاری ان حرکتوں کی طرف ہے، جو آج تم سہ پہر سے لے کر تھوڑی دیر تک کرتے رہے ہو اور میں تمہاری حرکتوں کو انتہائی نامعقول، احمقانہ اور مجرمانہ سمجھتا ہوں۔''

''مجرمانہ؟ کیا مجرموں کی سرکوبی مجرمانہ عمل ہے۔'' عادل سرائی نے کہا اور پھر کسی قدر خشک لہجہ اختیار کرکے بولا۔

''کرنل حیات! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کمیٹی کے ایک اعلیٰ افسر سے مخاطب ہو۔''

''اعلیٰ افسر! ہونہہ..... تم میرے مشن میں رکاوٹ کا باعث بن رہے ہو عادل سرائی!''

کرنل حیات نے کہا۔ ''ایک انتہائی خطرناک اور خوفناک مجرم اس وقت تہران میں موجود ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو تمہاری کمیٹی کے گودام سے آدھا ٹن سونا اور لاکھوں روپے

مالیت کے ہیرے جواہرات لے کر اڑا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق اب بھی وہ ایک خاص مشن کے تحت یہاں آیا ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو انقلابی حکومت کو پہلے سے کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تم میرے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے بے گناہ عوام کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارتے پھر رہے ہو۔ جانتے ہو آج البرز ریستوران میں کتنے بے گناہ لوگ تمہاری گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ چھ آدمی اور دو عورتیں ہلاک ہوئی ہیں اور تقریباً ایک درجن افراد زخمی ہیں۔ یہ ایک سنگین جرم ہے ایک کمیٹی کا اعلیٰ افسر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس طرح اپنی من مانی کرکے نہ صرف عوام کی جان و مال کو نقصان پہنچاؤ بلکہ انقلابی حکومت کو بدنام کرتے پھرو۔ انقلابی حکومت ظالم نہیں ہے۔ بلکہ عوام کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے آئی ہے لیکن تم نے آج بہت بری مثال قائم کی ہے اور میں اپنی رپورٹ میں اس کا تذکرہ کرچکا ہوں۔''

عادل سرائی کے چہرے پر اب گھبراہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ انٹیلی جنس کے سربراہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کس رپوٹ کا ذکر کیا جارہا ہے سر!''

''یہاں کی صورتحال کے بارے میں ہر ہفتے ایک تفصیلی رپوٹ قم روانہ کی جاتی ہے اور اس مرتبہ بھی یہ رپوٹ حسب معمول کرنل حیات نے تیار کی ہے اور اس کی کاپیاں تہران میں موجود متعلقہ افراد کو پہنچا دی گئی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ان ذمے دار افراد کے امام خمینی سے قریبی رابطے ہیں۔ وہ کسی قسم کی بے ضابطگی یا ایسی بات برداشت نہیں کریں گے، جس سے انقلابی حکومت کی نیک نامی پر حرف آئے یہ رپوٹ میرے تصدیقی دستخطوں کے ساتھ روانہ کی گئی ہے۔'' چیف کی آواز ابھری۔

''ایک منٹ سر۔'' عادل سرائی نے کہا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر بدستور موجود تھا۔

''میں اپنے کاموں میں بااختیار ہوں۔ آپ کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔''

''تمہیں نریمان فرازی کی گرفتاری میں تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔'' کرنل حیات نے تلخ لہجے میں کہا۔

''لیکن تم نے نریمان فرازی کے بارے میں ملنے والی اطلاعات کو اپنے تک محدود رکھا اور ہمیں بتائے بغیر کارروائی کرڈالی جس سے نہ صرف متعدد بے گناہ افراد اپنی جان سے ہاتھ

دھو بیٹھے بلکہ نریمان فرازی کو بھی فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ جب تم نے البرز ریستوران پر چھاپہ مارا تھا تو نریمان فرازی وہاں موجود تھا اگر تم اندھا دھند فائرنگ کے بجائے حکمت عملی سے کام لیتے تو شاید وہ گرفتار ہو جاتا۔''

''مجھے افسوس ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے آدمیوں نے واقعی کچھ عجلت سے کام لیا۔ آپ فی الحال یہ رپوٹ روک دیں باہمی مشورے سے مفاہمت کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔ کیونکہ ہمارا مقصد ایک ہی ہے۔'' ابھی عادل سرائی نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور چیف نے کال ریسیو کی پھر ریسیور عادل سرائی کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''تمہاری کال ہے۔'' عادل سرائی نے ریسیور کان سے لگایا اور چند لمحوں تک دوسری طرف بات سنتا رہا پھر اس نے ریسیور رکھ کر چیف کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا۔ میرا خیال ہے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' چیف نے کہا۔

''نریمان فرازی کے ہاتھوں ہمارا ایک آدمی زخمی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے ہسپتال میں دم توڑ دیا ہے۔'' عادل سرائی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ہمیں زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ ہمارا شکار انتہائی خطرناک آدمی ہے اور ہم اسے شکار کرنے کے بجائے خود اس کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔'' چیف نے کہا اور پھر کرنل حیات کی طرف رخ کر کے بولا۔

''حیات! فی الحال اپنی رپوٹ روک لو، نریمان فرازی انتہائی ہوشیار اور شاطر آدمی ہے اس کے لیے ہمیں از سر نو پلاننگ کرنا ہوگی۔''

''مجھے اجازت دیجئے سر۔'' عادل سرائی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور پھر اجازت کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

''ہوں۔ کیا خیال ہے کرنل حیات۔'' عادل سرائی کے جانے کے بعد چیف نے سوالیہ نگاہوں سے کرنل حیات کو دیکھا۔

''ہم عادل سرائی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس سے پہلے نریمان فرازی تک پہنچنا ہوگا۔'' کرنل حیات نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

✡......✡

نریمان فرازی نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر تبدیلیاں پیدا کر لیں تھیں۔ اصل میں شہباز اس کام کا اس قدر ماہر ہوگا۔ خود نریمان فرازی کو بھی اس بارے میں اندازہ نہیں تھا۔ وہ شہباز کے اس فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شہباز نے اس بار جو میک اپ کیا تھا اس میں وہ بہت پر اعتماد تھا اور اس وقت بھی وہ پر وقار انداز میں تہران کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جس کی تلاش میں کمیٹی والے پاسداران پولیس اور انٹیلی جنس والے تہران کے ہر کونے میں جھانک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا پھر ایک انتہائی شاندار ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ ہال میں مہمانوں کی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ کچھ ایسے بھی نظر آ رہے تھے جن کا تعلق موجودہ حکومت سے تھا۔ انقلاب سے پہلے اس ہوٹل کو شہر کا سب سے بڑا نائٹ کلب سمجھا جاتا تھا۔ جہاں مقامی رقاصاؤں کے علاوہ غیر ملکی رقاصائیں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد وصول کیا کرتی تھیں۔ لیکن اب سٹیج سنسان پڑا تھا۔ شہباز بے نیازی سے چلتا ہوا کاؤنٹر کے اس حصے پر پہنچا، جہاں ہوٹل کا مالک کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے ایک ملازم کو کچھ ہدایت دے رہا تھا۔ شہباز اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس نے جیب سے انتہائی حسین سونے کا لائٹر نکالا، سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور پھر لائٹر سے اسے سلگا لیا۔ ایک کش لیا اور بے نیازی سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ تب مالک نے ملازم کو رخصت کر دیا تو شہباز اس کی طرف مڑا۔

''میرے دوست! رامش اگر تم میری آواز پہچان کر مجھے پہچان لو تو چونکنا نہیں۔''

''اوہ۔ میرے خدا...... میرے خدا...... میرے خدا......'' رامش کے منہ سے ایک بار پھر حیرت بھری آواز نکلی۔

''اوہ...... بیوقوف آدمی میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں پر سکون رہنا ہے۔ خبردار احتیاط رکھو۔''

''ہاں...... میں، میں تھوڑی دیر کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مجھے یہ بتاؤ کہ صمدی کہاں ہے؟''

''صمدی اوپر ہے میرے دفتر میں۔'' ہوٹل کے مالک رامش نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام جاری رکھو میں خود ہی اس سے مل لیتا ہوں اور دیکھو ذرا دھیان رہے مجھے ہال میں کچھ آفیسر قسم کے لوگ بھی نظر آ رہے ہیں۔''

"ہاں۔ مجھے پتہ ہے لیکن تم...... اوہ میرے خدا میں جس قدر حیران ہوؤں کم ہے۔تم اس طرح کھلے عام پھر رہے ہو جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ایٹم بم چوری ہو جائے اور وہ کہیں محفوظ کر دیا جائے تو اس کی تلاش میں بھی اتنی زیادہ سرگرمی کا اظہار نہیں کیا جائے گا۔ جتنا مظاہرہ تمہاری تلاش کے لیے کیا جا رہا ہے۔ میرے دوست! کیا تمہارا اس طرح کھلے بندوں پھرنا مناسب ہے۔"

"ہاں۔میرے نظریے کے مطابق۔" شہباز نے جواب دیا۔

"تمہارا نظریہ۔"

"بالکل۔ میں ہمیشہ دشمن کی ناک کے نیچے چل پھر کر کام کرتا ہوں۔ وہ جگہ سب سے زیادہ محفوظ رہتی ہے، جہاں دشمن سامنے موجود ہو۔ اچھا رامش میں صدی سے ملنے جا رہا ہوں۔ واپسی میں شاید تم سے ملاقات نہ ہو سکے اس لیے خدا حافظ۔ یہ کہہ کر شہباز مڑا اور پھر پروقار انداز میں چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"اصل میں صدی بھی میرا ایک پرانا اور قابل اعتماد دوست ہے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز ایک باکسر کی حیثیت سے کیا تھا۔لیکن رفتہ رفتہ وہ جرم اور سزا کی دنیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے تہران میں جو گروہ بنایا تھا، اس میں صدی میرا دستِ راست تھا۔ پاسداران کے گودام سے سونے او جواہرات کی چوری میں بھی صدی نے میرا ساتھ دیا تھا وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے دنیا میں صرف دو چیزیوں سے محبت ہے۔ پہلے نمبر پر دولت اور دوسرے نمبر پر زیمان فرزی اور ان دونوں چیزوں کی خاطر میں ہزار جانیں بھی قربان کر سکتا ہوں اور واقعی وہ اپنے اس دعوے میں بالکل سچا آدمی ہے۔

نریمان فرازی نے شہباز کے ذہن میں کہا۔

"پہلی منزل پر پہنچ کر شہباز نے دفتر کے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ جب وہ مڑا تو صدی اس کے سامنے پستول تانے کھڑا تھا۔اس کے چہرے پر سخت کرختگی طاری تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"کون ہو تم؟ اور اس طرح اندر کیوں آئے ہو؟"

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس طرح گھبراہٹ کا مظاہرہ کبھی نہ کرتا۔" شہباز نے پُر

سکون لہجے میں کہا اور وہی ہوا۔ صدی نے ایک لمحے کے اندر اس کی آواز پہچان لی۔ یہ بات شہباز نے اچھی طرح محسوس کی تھی کہ نریمان فرازی کے جتنے بھی شناسا تھے وہ اس سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اس طرح اپنے ذہن میں اتارا ہوا تھا کہ وہ کتنے ہی عرصے میں ان سے ملاقات کرے اس کے منہ سے نکلی ہوئی آواز ان لوگوں کے لیے مکمل طور پر شناسا ہوتی تھی۔ صدی کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے پستول جیب میں رکھا اور بے اختیار آگے بڑھ کر شہباز سے لپٹ گیا۔

"میرے خدا...... میرے خدا......" تمہیں زندہ دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے، میں تو سمجھا تھا کہ تم سے اب کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ویسے تمہارا میک اپ شاندار ہے۔ اتنا اعلیٰ درجے کا میک اپ کرنا تم نے کہاں سے سیکھا۔ بخدا اگر تم خاموش رہتے تو میں تمہیں کبھی نہیں پہچان سکتا تھا۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو صدی کہ مجھے سکون کی زندگی پسند نہیں ہے۔ ہنگاموں کے بغیر کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔"

"آؤ...... آؤ بیٹھو...... میں تمہاری اس ہنگامہ خیز زندگی کے بارے میں جانتا ہوں۔ حالانکہ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہے کہ جب تک اس روئے زمین پر تمہارے قدم موجود ہیں۔ ہنگامے تمہارے قدموں سے لپٹے رہیں گے۔ شہباز اس کے اشارے پر بیٹھ گیا۔ پھر نریمان فرازی کی مرضی کے مطابق اس نے اپنی زبان سے گزرے ہوئے واقعات صدی کو بتا دیئے اور کہنے لگا۔

"اب اس نئے منصوبے میں تمہاری شرکت بڑی ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو کسی ایسے ٹھکانے کا انتظام کرنا، جہاں چند روز سکون سے گزارے جا سکیں۔"

"تم بالکل بے فکر رہو، انتظام ہو جائے گا۔" صدی نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ تم جانتے ہو کہ پاسداران میری تلاش میں ہیں۔ کمیٹی کے آدمیوں سے میری جھڑپ بھی ہو چکی ہے۔ پاسداران کے علاوہ تلاقی اور انٹیلی جنس والوں کو بھی تہران میں میری آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ تلاقی کو تو میں زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں حالانکہ وہ ہمارے لیے پریشانی پیدا کر سکتا ہے لیکن اس کا بندوبست کر لیا جائے گا۔ میں انٹیلی جنس کے کرنل حیات کی طرف سے زیادہ فکر مند ہوں اسے بھی غالباً میرے مشن کی بھنک مل

چکی ہے۔ میں اس کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہوں۔ کرنل حیات کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ شخص ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ غیر شادی شدہ ہے اور خوبصورت لڑکیوں کا رسیا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کا بندوبست کرنا ہے اور میرا خیال ہے ہمیں اس کے لیے ایک حسین اور نازک اندام لڑکی کی ضرورت ہوگی۔ ایسی لڑکی جو ہمارے اشاروں پر کام کر سکے۔"

صمدی کچھ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس کے لیے ہمیں ایک خاص آدمی سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا اور تم اس خاص آدمی کو اچھی طرح جانتے ہو۔"

"کون؟" زریمان فرازی کی حیثیت سے شہباز نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام دارا ہے۔ دارا، یاد ہے نا یہ نام۔"

"اوہ مائی گاڈ...... وہ ابھی تک تہران میں موجود ہے۔"

"ہاں۔ نہ صرف موجود ہے بلکہ خوب دولت کما رہا ہے صمدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے لوگوں نے کس کس طرح اپنے لیے بندوبست کر رکھے ہیں۔"

"یار...... زندگی گزارنے کے لیے نجانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ خیر ٹھیک ہے، میں بتا رہا تھا کہ دارا کا بزنس خوب زیادہ چمک رہا ہے۔"

"تب تم اس سے ضرور بات کرو۔"

"اچھا اب تم ایسا کرو کہ ہوٹل کی عقبی گلی میں پہنچ جاؤ۔ وہاں میری سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہوئی ہے۔ یہ چابی لو اور کار میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر صمدی نے کار کی چابیوں والا گچھا اس کی طرف بڑھا دیا اور شہباز نے ہاتھ بڑھا کر چابیاں جیب میں ڈال لیں پھر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری میں رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر عقبی زینے کی سمت چل پڑا۔ عقبی گلی میں اکا دکا لوگوں کی آمد ورفت تھی۔ ہوٹل کی عمارت کے دروازے سے نکلنے کے بعد شہباز نے محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ گلی میں تین چار کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر اسے سیاہ رنگ کی ایک پرانی سیٹرون نظر آ گئی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھا کر کار کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا

اور ایک چابی لگا کر لاک کھولا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ابھی تک یہ کارروائیاں بڑی مناسب رہی تھیں حالانکہ انتہائی ہنگامہ خیز زندگی گزری تھی اور بارہا شہباز نے یہ بات سوچی تھی کہ آخر وہ کر کیا رہا ہے؟

اس وقت بھی اسے تنہائی کے کچھ لمحات ملے تو اس نے اپنے ذہن کا استعمال شروع کر دیا۔

"کیا...... مجھے واقعی یہی سب کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ میری اپنی زندگی کا محور کیا ہوگا؟"

"تم کیا پسند کرو گے۔ ایک اور آواز اس کے کانوں میں ابھری تو وہ اچھل پڑا۔ بھلا رازل جریری کی آواز کو وہ نہیں پہچان سکتا تھا۔ ایک لمحے کے اندر تو اسے یہ احساس ہوا کہ یہ آواز تو بالکل وہم ہے۔ ظاہر ہے رازل جریری کا اس سے اتنا گہرا تعلق ہے لیکن یہ آواز اس کے ذہن میں نہیں گونجی تھی۔ آواز نے پھر کہا۔

"بولو شہباز! تمہارا اپنا نظریہ حیات کیا ہے۔"

"کیا آپ واقعی یہاں آس پاس کہیں سے بول رہے ہیں؟"

"یہ مت سمجھو کہ میں تمہارے گرد ہی منڈلاتا رہا ہوں۔ میں تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں بلکہ یوں سمجھ لو یہاں میں نے تمہاری تمام تر کارروائیوں کا جائزہ لیا ہے اور میں یہ بتانے تمہارے پاس پہنچا ہوں کہ جس قدر توقع میں تم سے رکھتا ہوں تم اس سے بھی زیادہ شاندار طریقے سے اپنا یہ مشن سرانجام دے رہے ہو۔ لیکن میرے بچے اس سے بددل نہیں ہونا۔ میری زندگی کا ایک مقصد ہے۔ اگر اس چھوٹے سے مقصد کی تکمیل کے لیے تم مجھ سے تعاون کرو اور بعد میں یہ چاہو کہ مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو اور اپنے لیے کوئی زندگی اپنالو تو بخدا میں تمہیں خوشی سے اجازت دوں گا اور بہت ہی اچھے اور مہمان دوست کی طرح تمہیں رخصت کروں گا۔ ان تمام مراعات کے ساتھ جو تمہارے تصور میں بھی نہیں ہوں گی۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کو یکسانیت سے اکتاہٹ ہو جاتی ہے اور واقعی تم بہت عرصے سے صرف میرا جسم بنے ہوئے ہو تمہیں کوفت تو ہوتی ہی ہوگی۔"

"شاید میرے انداز فکر نے آپ کو کچھ بددل کر دیا ہے رازل جریری!"

"بددل...... یہ بہت برا لفظ استعمال کر رہے ہو تم۔ میں اس لفظ پر احتجاج کرتا ہوں تم سے بھلا کون بددل ہو سکتا ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میرے دوست...... میرے بچے حقیقت یہ ہے کہ رازل جریری نے جن راستوں کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ وہ راستے تو بارود

سے اڑا دیئے گئے تھے۔ میری روح صرف انتقامی کاروائیاں کرسکتی تھی اور کاروائیاں میں کرتا
رہتا لیکن ان انتقامی کارروائیوں سے بھلا دنیا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ یہ تم ہو جس نے میرے
ارادوں کو روشن کر دیا۔ میں تمہارے بھی تمام راستے روشن ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''میں معافی چاہتا ہوں رازل جریری، ایک لمحے کے لیے یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔''
''نہیں۔ یہ ایک فطری خیال ہے اور اس کے لیے تم مجھ سے معافی مانگ کر بھی مجھے
شرمندہ مت کرو۔ صرف اتنا بتا دو کہ کیا چاہو گے۔''
''رازل جریری! میری زندگی میں ابھی کوئی ایسا موڑ نہیں آیا جس سے میری چاہتیں
اجاگر ہو جائیں میرے تمام راستے میرے ماں باپ کی جانب جاتے ہیں اور میں ان کے
علاوہ اور کچھ سوچتا ہی نہیں ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بس خیال یونہی آ گیا ذہن میں آپ
بد دل نہ ہوں اچھا یہ بتایئے تہران کب پہنچے میرا مطلب ہے ایران۔''
''میں نے کہا نا بس تمہاری خبر لینے کو جی چاہا اور بڑی دقتیں ہوئیں تمہیں تلاش کرنے
میں یہاں تو یوں سمجھ لو کہ چپے چپے پر نریمان فرازی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ویسے نریمان
فرازی تمہارا اس تعاون کا بھی میں شکر گزار ہوں۔ میرے دوست یہ تعاون بڑا ضروری تھا اور
میں جانتا ہوں کہ تمہارے علاوہ یہ کام اور کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ تم جن راستوں سے گزر سکتے
ہو، ان راستوں کی تلاش بھی ایک مشکل کام ہے۔ جو نہ میں کرسکتا تھا اور نہ شہباز۔''
''اور اگر میں خود نہ چاہتا تو یقین کرو رازل جریری، یہ کام اس قدر آسان نہ ہوتے کسی بھی جگہ
میں شہباز کو پھنسا کر خود اس کے ذہن سے نکل جاتا اور پھر اپنے جسم کے حصول کی کوشش کرتا۔''
''میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں، کہ تم بھی میری مہم کے شریک کار بن گئے ہو۔ دوست
زندگی میں دولت اکٹھا کرنے کا تصور کس دل میں نہیں ہوتا، لیکن اس دولت کے خرچ کا ایک
مصرف اگر انسانیت کی بھلائی کے لیے ہو تو بات ثواب کی حد میں آ جاتی ہے۔''
''اور میں زندگی میں پہلی بار ثواب کمانے کی کوشش میں مصروف ہوں۔'' نریمان فرازی
نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔
''تم میرے بدن کی بات کرو اگر اسے نقصان پہنچ گیا رازل جریری، تو تم ایک بدترین
دشمن کی تخلیق کرو گے۔''
''مجھے دھمکی نہ دو۔ تم میرے جسم کا ایک حصہ ہو۔ تمہارے جسم کی حفاظت بھی اس طرح

میرے لیے فرض ہے جس طرح میرا اپنا بدن بلکہ یوں سمجھو کہ وہ دونوں جسم ساتھ ساتھ موجود
ہیں اور ان کے تحفظ کا اس قدر معقول بندوبست ہے کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔''
''میرا بس اتنا ہی مسئلہ ہے۔''
''ہاں تو شہباز! بولو بتایا نہیں تم نے۔''
''بتاؤں گا کبھی ابھی نہیں۔'' شہباز نے جواب دیا اور اس کے بعد زیادہ دیر تک رازل
جریری سے یہ رابطہ قائم نہیں کرسکا کیونکہ دور سے صمدی آتا ہوا نظر آ گیا تھا۔ کار کے قریب پہنچ
کر اس نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے شہباز کے
وجود میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رازل جریری کار سے اتر گیا یا نہیں۔
لیکن بہرحال یہ بات کسی اور سے تو نہیں کہی جاسکتی تھی۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔
''میرا خیال ہے تمہارے مالی حالات کچھ زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ راستے میں شہباز نے
نریمان فرازی کی حیثیت سے کہا اور صمدی مسکرا دیا اور اس نے کہا۔
''یہ بات شاید تم پرانی کار کو دیکھ کر کہہ رہے ہو۔''
''ہاں۔''
''لیکن شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ اس وقت دولت کی نمائش ایران میں سب سے بڑا جرم
ہے نئی کار رکھنا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ شہر میں گھومتے ہوئے پاسداران ہر
اس شخص کو پکڑ لیتے ہیں، جن کے پاس قیمتی کار ہے یا جس نے قیمتی کپڑے پہن رکھے ہوں۔
میں نے اپنی پہلی کار بیچ دی تھی اور کام چلانے کے لیے یہ پرانی کار خرید لی۔ اس طرح میں
ان لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچتا رہا ہوں۔ جو خود تو دولت سے محروم رہے اور اب
دوسروں کے پاس بھی یہ چیز نہیں دیکھ سکتے۔'' شہباز ایک گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
کار شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتی ہوئی عباس آباد کی کشادہ سڑکوں پر نکل آئی۔ البرس
کے دامن میں یہ علاقہ انقلاب سے پہلے صاحب ثروت لوگوں کی جنت سمجھا جاتا تھا لیکن اب
وہاں ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ عظیم الشان وسیع و عریض بنگلے سنسان
پڑے ہوئے تھے۔ کچھ عمارتوں کو انتقاماً منہدم کیا جا چکا تھا اور جو باقی بچیں تھی ان میں بھی
بیشتر ویران پڑیں تھیں۔ ان پُرشکوہ عمارتوں کے مقیم یا تو ملک چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے یا شاہ
پرستی کے الزام میں جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ صمدی کی کار ایک ویران سے بنگلے میں

داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہوئے۔ راہداری کے
آخری سرے پر گھوم کر وہ ایک تنگ و تاریک کمرے میں داخل ہو گئے۔

یہ ایک اسٹور روم تھا جہاں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، کاٹھ کباڑ اور ردی اخبار بکھرے ہوئے تھے۔
صمدی نے اوندھی پڑی ہوئی دو تین کرسیاں اور ایک میز اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ نیچے
سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ صمدی نے پہلے شہباز کو اشارہ کیا پھر اس کے پیچھے خود بھی تہہ خانے
کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ چند سیڑھیاں اترنے کے بعد اس نے میز کھینچ کر اس طرح رکھ دی
کہ سیڑھیوں والا راستہ تقریباً چھپ گیا۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر ایک کشادہ اور نیم تاریک تہہ
خانے میں اتر گئے۔ ایک کونے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ وہیں دیوار کے قریب
ایک میز بھی پڑی ہوئی تھی لیکن کسی انسان کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میز کے قریب
رک گئے پھر چند سیکنڈ کے بعد نجانے کس طرح سے ایک مجہول سا آدمی اتر کر سامنے آ گیا۔
یہی دارا تھا۔

دارا ہر قسم کے جعلی دستاویزات اور شناختی کارڈ تیار کرنے کا ماہر تھا۔ شاہ پرست اور
انقلاب کے مخالفین سے جان بچانے کے لیے ملک سے فرار ہو رہے تھے، اصل کاغذات پر
سفر کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایسے لوگ جعلی کاغذات کے لیے دارا کی خدمات حاصل کر
رہے تھے۔ وہ جعلی دستاویزات اور شناختی کارڈ اس خوبصورتی سے تیار کرتا کہ ان پر جعلی
ہونے کا شبہ تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ خوشی کا اظہار کرتا رہا کچھ دیر تک وہ
رسمی باتیں کرتے رہے پھر صمدی اصل موضوع پر آ گیا۔

''ہمیں ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو بے حد حسین ہو اور بنا چون و چرا ہمارا کام کر
سکے۔''

''ہاں...... کیوں نہیں ایسی لڑکی میری نگاہوں میں ہے۔ وہ چند مہینے پہلے میرے پاس
جعلی کاغذات تیار کرانے آئی تھی۔ بے حد حسین ہے اور ذہین بھی ہے۔''

''ہمیں اس کی ضرورت ہے اور ہم آج شام اس لڑکی سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم براہ کرم
ہمیں اس کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرو۔ صمدی نے کہا اور دارا انہیں لڑکی کے
بارے میں بتانے لگا۔

آسمان پر ستاروں کا راج تھا لیکن ان کی روشنی زمین پر پہنچنے سے قاصر تھی۔ اس لیے
رات کو تاریک ہی کہا جا سکتا تھا۔ فضا اداس تھی ایک خوبصورت فلیٹ کی بالکونی میں ایک
انتہائی حسین لڑکی آرام دہ کرسی پر بیٹھی آسمان کو گھور رہی تھی۔ اس کا نام نتاشیہ تھا۔ نتاشیہ کا
ذہن اس وقت ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ اصل نام تو شاید کچھ اور ہی تھا لیکن کاغذات میں
اسے نتاشیہ لکھا گیا تھا۔ اس کا باپ یہودی اور ماں ایرانی تھی، جس کا تعلق بہائی فرقے سے
تھا۔ باپ بزنس مین تھا اس طرح اور بھی بہت سے یہودی ایران میں آباد تھے۔ یہ تمام
یہودی کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایران کی معیشت انہی یہودیوں کی قید
میں تھی۔ شاہ کی طرف سے انہیں بے شمار مراعات حاصل تھیں اور یہ دونوں ہاتھوں سے
دولت سمیٹ رہے تھے لیکن انقلاب کی آمد کے ساتھ ہی یہودیوں نے سب کچھ سمیٹ کر
ملک سے بھاگنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو راہ فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ
انقلاب پسند عوام اور پاسداران کے ہاتھوں مارے گئے۔ نتاشیہ کا باپ بھی انہی لوگوں میں
شامل تھا جو اپنا کاروبار اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگنے کی فکر میں تھا۔ لیکن انقلاب پسندوں
کے ہاتھوں مارا گیا۔

نتاشیہ ان دنوں اپنی ایک دوست کے پاس ہمدان گئی ہوئی تھی۔ اپنے باپ کی ہلاکت کی
خبر اسے ہمدان ہی میں ملی تھی۔ وہ اس روز واپس آنا چاہتی تھی لیکن اس کی دوست کے
والدین نے اسے روک لیا۔ ہمدان میں کچھ دن گزارنے کے بعد جب نتاشیہ تہران واپس
پہنچی تو اسے پتہ چلا کہ پاسداران اس کی ماں اور بھائی کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ اس کی
ماں کا تعلق چونکہ بہائی فرقے سے تھا اور یہ فرقہ بھی خاص طور سے انقلاب کے بعد زیر عتاب
آیا تھا۔ ان کی مذہبی روایات اسلام سے الگ ہٹ کر تھیں۔ انہیں صاف الفاظ میں کہہ دیا گیا
تھا کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس فرقے کی مذہبی
سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

بہائی فرقے سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ ملک سے فرار ہو چکے تھے۔ جو ملک
میں موجود تھے وہ پکڑے جانے اور جان کے خوف سے چھپتے پھر رہے تھے۔ نتاشیہ کی ماں
اور بھائی بھی گھر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے لیکن آخر کار انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اطلاع
نتاشیہ کے حواس پر بجلی بن کر گری قریب تھا کہ وہ شدت غم سے پاگل ہو جاتی لیکن جان

بچانے کے لیے لاشعوری جذبے کے تحت اس کے حواس بحال رہے۔ اس نے بھاگ کر ایک ایسی خاتون کے ہاں پناہ لے لی جو اس کالج میں پروفیسر تھی جہاں نتاشیہ زیر تعلیم تھی۔ اس نازک اور ہنگامی صورتحال میں نتاشیہ کو صرف اسی کا چہرہ نظر آیا تھا جو اسے پناہ دے سکتا تھا۔

خانم دونیہ نے پڑوسیوں کے سامنے اسے بھانجی ظاہر کیا اور اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس نے اس کا نام بھی بدل دیا تھا اور کسی اور نام سے اسے پکارا جاتا تھا تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔

بہرحال خانم دونیہ کے پاس پناہ لینے کے بعد نتاشیہ نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ وہ کسی انتہائی ہنگامی ضرورت کے تحت گھر سے نکلتی تھی لیکن دروازے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے چادر اس طرح اوڑھ لیتی تھی کہ آنکھوں کے سوا اس کا پورا بدن چھپ کر رہ جائے۔ یہ تھا نتاشیہ کا ماضی۔

اس وقت وہ بالکونی میں کرسی پر بیٹھی تاریک خلا کو گھورتے ہوئے، گزرے ہوئے انہی واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پہلے اس نے کبھی کسی مذہب کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی اسے مذہب سے کوئی دلچسپی تھی لیکن انقلاب کے بعد جو کچھ ہوا یا جو ہو رہا تھا اس دیکھ کر نتاشیہ کو مذہب سے نفرت ہوگئی تھی۔

بعض لوگ مذہب کے نام پر جس طرح بے گناہ لوگوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں وہ قابل نفرت ہے وہ سر سے پاؤں تک انسان تھی اور انسان ہی انسان کے دشمن ہوگئے تھے اور وہ بھی صرف مذہب کے نام پر جو صرف انسانیت کے راستے سکھاتا ہے۔ انسانیت سے ہٹنے کا درس کبھی نہیں دیتا۔ نتاشیہ یہی سب کچھ سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک اگرچہ ہلکی تھی لیکن یہ آواز نتاشیہ کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ بدحواس سی ہوگئی اور اٹھ کر بھاگتی ہوئی خانم دونیہ کے پاس پہنچ گئی۔

تہران میں خانم کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور کبھی کوئی ان کے گھر نہیں آیا تھا وہ جب سے یہاں آئی تھی دروازے پر یہ دستک پہلی بار ہوئی تھی۔

"گھبراؤ نہیں میں دیکھتی ہوں کون ہے۔" خانم دونیہ نے اسے تسلی دی اور دروازہ کھولنے کے لیے چلی گئیں۔ نتاشیہ وہیں کھڑی ہوئی اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جی فرمائیے۔" خانم دونیہ نے دروازے پر کھڑے ہوئے دو اجنبیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خانم دونیہ۔ ہم تمہاری بھانجی نتاشیہ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"میری بھانجی گھر پر نہیں ہے۔" خانم دونیہ نے کہا اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنے لگی۔

"سنیے..... میری بات تو سنیے۔ اگر وہ گھر پر نہیں ہے تو ہمیں آپ سے بات چیت کرنا ہو گی اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک پیالی کافی آپ کے لیے ایسی کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ویسے مجھے صمدی کہتے ہیں اور یہ میرے دوست...... مگر چھوڑیے ان کا نام پہلے سے بتانا مناسب نہیں ہے، البتہ میں یقین رکھتا ہوں اس بات پر کہ خانم دونیہ اپنے مہمانوں کو کبھی گھر کے دروازے سے واپس نہیں کریں گی۔"

خانم بدحواس سی ہوگئی تھی۔ صمدی نے اسے تھوڑا سا اندر دھکیلا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا اور اس کے پیچھے شہباز بھی تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"کک کیا..... کیا کر رہے ہو تم لوگ، کیا تم کمیٹی سے تعلق رکھتے ہو۔" خانم دوینہ ہکلائی، اس کا چہرہ اب خوف سے زرد پڑ چکا تھا۔ وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شہباز یا صمدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا تھا اور شہباز آگے بڑھ کر دوسرے کمرے میں جھانکنے لگا۔ خانم دونیہ کا چہرہ دودھ کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون غائب ہو گیا ہو۔ شہباز نے دوسرے کمرے کے دروازے ہی میں رک کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور ایک لمحے تک اس کی نگاہیں اس حسین لڑکی پر جمی رہ گئیں۔ جس کا نام اس کے علم کے مطابق نتاشیہ ہو سکتا تھا۔

پھر اس نے صمدی کی طرف دیکھا۔ کمرے میں کھڑی نتاشیہ کا چہرہ دُھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اس کے پورے وجود میں شدید کپکپاہٹ تھی۔ شہباز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اتنی حسین لڑکی اس نے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ بے باکی سے نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا نتاشیہ کے قریب پہنچ گیا اور چند لمحے اسے قریب سے دیکھتا رہا پھر اس کے منہ سے آواز نکلی، یہ آواز نریمان فرازی کی نہیں بلکہ خود شہباز کی اپنی تھی۔

"عجیب سی بات ہے۔" اس کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔

"مجھے دیکھ کر تمہاری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور تمہیں دیکھ کر میرا دل کانپ رہا ہے۔"

"سنو..... تمہیں خدا کا واسطہ میری بچی کو نقصان مت پہنچانا۔" خانم

دونیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اندر آ کر زمین پر جھکی اور شہباز کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ہم تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے خانم! لیکن تمہاری بچی مجھے سراسر نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس بات کا ذمے دار کون ہے؟'' شہباز کے اندر نجانے کہاں سے یہ بے باکی پیدا ہو گئی تھی۔ نریمان فرازی یقینی طور پر اس کی یہ آواز سن کر مسکرا رہا ہو گا۔ اس نے اس وقت شہباز کو آزادی دے دی تھی۔ ادھر خانم دونیہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور حیرت سے اس نے شہباز کو دیکھا اس کے دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ان لوگوں کا تعلق پولیس یا پاسداران سے نہیں ہے۔ اس نے نتاشیہ کی طرف دیکھا۔ نتاشیہ کی ٹانگوں کی کپکپاہٹ کسی حد تک کم ہو گئی تھی اور چہرے کی رنگت بھی اب آہستہ آہستہ لوٹ رہی تھی۔

''دیکھو...... میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ ہمیں ہراساں نہ کرو صرف یہ بتا دو کہ تم کون ہو۔ تا کہ اس کے بعد ہم سکون سے تم سے گفتگو کر سکیں۔'' خانم دونیہ اس بار کچھ بہتر کیفیت میں نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا خانم، یوں سمجھ لیجیے کہ ہم آپ کا کسی بھی طرح کوئی نقصان نہیں کرنا چاہتے۔ بس آپ ہماری ضرورت ہیں۔ آپ ہمیں اپنا دوست سمجھ سکتی ہیں۔ پھر وہ نتاشیہ کی طرف گھوم کر بولا

''اور تمہارے بارے میں جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے یا مجھے جو بتایا گیا ہے۔ تم یہودی ہو اور خانم دونیہ سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' نتاشیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس کے دماغ میں ایک بار پھر سنسناہٹ ہونے لگی اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ لیکن پھر فوراً ہی نریمان فرازی کی آواز ابھری اب اس نے خود بولنا ضروری سمجھا تھا۔

''ڈرنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے ہمارا تعلق پولیس یا پاسداران سے نہیں ہے۔ بلکہ ہم تو پاسداران کے دشمنوں میں سے ہیں ہمیں ایک اہم معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''مم...... مدد'' نتاشیہ کی آواز پہلی بار نکلی۔ بڑی خوبصورت اور نغمہ بار آواز تھی۔ شہباز نے دل ہی دل میں اس آواز کی بھی تعریف کی پھر وہ بولی۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

''چہرے کی طرح تمہاری آواز بھی بہت خوبصورت ہے۔'' شہباز بولے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے جیب سے کرنل حیات کی تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''اس شخص کا نام کرنل حیات ہے اور یہ انٹیلی جنس میں کرنل کے عہدے پر فائز ہے۔ یہ خوبصورت لڑکیوں کو بہت پسند کرتا ہے۔ تمہیں چند روز تک اس کے ساتھ رہنا ہو گا اور اس سے دوستی کرنا ہو گی۔'' نتاشیہ کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا اور وہ ایک بار پھر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

''کک...... کیسی باتیں کر رہے ہو، کیا...... کہا مجھے معاف کرنا، کیا تم اپنی کسی انتہائی عزیز لڑکی سے اس طرح کی بات کہہ سکتے ہو۔ اس طرح اسے کسی فوجی آفیسر کی آغوش میں پھینک سکتے ہو۔ تم نہیں جانتے میں ایک پاکباز لڑکی ہوں۔ تم میری نسل کو کتنا ہی برا بھلا کہہ لو لیکن انفرادی طور پر میں ایک اچھے کردار کی لڑکی ہوں۔ اور...... اور میں کسی بھی مذہبی تعصب سے پاک ہوں۔ میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی، اس ذلت پر مجھے موت منظور ہے۔ سخت نفرت کرتی ہوں میں ان لوگوں سے انہوں نے میرے باپ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا، میری ماں اور بھائی کو گرفتار کر لیا۔ آہ...... نجانے ان دونوں پر کیا گزری ہو گی۔ تم کیا سمجھتے ہو کیا میں کسی ایسے شخص کی صورت بھی دیکھ سکتی ہوں۔''

''تم تعاون نہیں کرو گی تو؟'' اس بار صمد نے بولنا مناسب سمجھا جو اندازہ لگا چکا تھا کہ شہباز اس لڑکی سے کوئی سختی نہیں برت سکتا جو برتنی چاہیے، چونکہ شاید وہ اس سے متاثر ہو گیا ہے اس لیے اس نے بولنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''تو میں مجبوراً پاسداران یا انٹیلی جنس کو صرف یہ بتاؤں گا کہ تم یہودی ہو اور تمہارے کاغذات جعلی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ تمہارے ساتھ ہو گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ تم نے صرف یہ سنا ہے تمہارے باپ کو بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تمہیں کہ موت سے پہلے اسے کیسی کیسی اذیتیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ انٹیلی جنس اور پاسداران اپنے مخالفین کو اذیت پہنچانے کے لیے ایسے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ شیطان بھی کانپ اٹھے۔ وہ تمہارے اس خوبصورت جسم کا ایک ایک تار اس طرح الگ کریں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں، تم کو موت سے ہمکنار کرنے سے پہلے وہ تم پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے۔ لیکن ہمارا ساتھ دو گی تو تمہیں صرف ایک ذلت کے نتیجے میں تمہاری اس انقلابی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ تو تم اپنی ساری تکلیف بھول جاؤ گی۔ بولو کیا خیال ہے۔''

ثناشیہ پر سکتہ سا طاری تھا ادھر شہباز کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا یہ صمدی کا اپنا انداز تھا جبکہ شہباز اس بات کا دل سے قائل تھا کہ عزت و آبرو زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی چیزیں ہوتی ہیں۔ ثناشیہ کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ غالباً وہ یہ سوچ رہی تھی کہ انکار کی صورت میں یہ شخص پاسداران کو اس کے بارے میں اطلاع کر دے گا اور پھر پاسداران اس کا جو حشر کریں گے اس کے تصور ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ دوسری طرف اسے ایک رسوائی اٹھانی پڑتی تھی جس کے نتیجے میں بقول اس شخص کے اس انقلابی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا جس نے اس کا سب کچھ اس سے چھین لیا اور انقلابی حکومت کا یہ نقصان اس کے زخموں کا مرہم ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ابھی اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دفعتاً شہباز کی آواز ابھری۔

”اور اگر تم ذہانت سے کام لو تو اس آدمی کو احمق بنا سکتی ہو۔ ایک عورت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا جسم دے کر ہی اس سے کام کرا سکے۔ اس کی ادائیں اور اس کا انداز اس شخص کو اس طرح اپنی مٹھی میں جکڑ سکتا ہے کہ وہ اس کے بدن کا سفر نہ کر سکے۔“

نجانے یہ الفاظ شہباز نے کس انداز میں کہے تھے لیکن ثناشیہ کے چہرے میں تبدیلی رونما ہوئی پھر ایک لمحے کے لیے جیسے وہ کھو سی گئی اور اس کے بعد اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ ایسا ممکن ہے۔“

”گویا تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہو۔“ اچانک ہی صمدی نے کہا۔

”ہاں۔“

”مجھے بے حد افسوس ہے۔ ثناشیہ کہ تمہیں کسی ایسے مقصد کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ہمیں معاف کرنا۔“ ثناشیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے صمدی نے کہا۔

”اسے تھوڑی دیر تک رو لینے دو ہم دوبارہ آپ کے پاس آئیں گے خانم دونیہ آپ سمجھ لیجیے یہ کام ہمارے لیے ہی نہیں آپ کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دونوں اس عمارت سے باہر نکل آئے اور ادھر کمرے میں ثناشیہ کی دلدوز آہیں ابھرنے لگیں وہ خانم دونیہ سے لپٹ گئی اور خانم دونیہ اس کی سسکیوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

تہران کی گھڑیاں رات کے نو بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ کرنل حیات کھانا کھانے کے بعد اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے اردلی نے کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دی۔ کرنل حیات کی بھویں سکڑ گئیں۔ وہ آج دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد بری طرح تھک گیا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا اس وقت کسی ملاقاتی کی آمد اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دروازے میں آ گیا۔ کار کا ڈرائیور اسے دیکھ کر مستعدی سے آگے بڑھا اور سلام کے بعد جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”کرنل حیال نے لفافہ کھول کر پڑھا تو اس کی پیشانی کی شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔ کاغذ پر مختصری تحریر نظر آ رہی تھی۔

”میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

یہ پرچہ پڑھتے ہی اس شخص کے ساتھ آ جاؤ۔ حمادی۔“ حمادی کی طرف سے اس طرح اچانک طلبی کرنل حیات کے لیے حیران کن تھی اس نے اس شخص سے کچھ پوچھنا چاہا جو سامنے کھڑا تھا اور پرچہ لے کر آیا تھا، لیکن یہ اس پائے کا آدمی نہیں تھا کہ اس سے کوئی سوال کیا جائے۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کی ایک لمحے رکنے کے بعد اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم رکو میں آتا ہوں۔“ وہ اندر گیا، لباس تبدیل کیا اور واپس آ کر سیاہ رنگ کی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔

کرنل حیات کا ذہن مختلف خیالات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ راستوں پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ کار ایک شاندار ہوٹل کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

اس اٹھارہ منزلہ خوبصورت ہوٹل کی آخری منزل پر گھومنے والا ریستوان، سولہویں منزل پر کشادہ اوپن پارک، دوسری منزل پر ڈائننگ ہال تھا۔ یہ ہوٹل ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ انقلاب کے بعد جب دونوں ہاتوں سے لوٹنے والے شاہ کے پروردہ یہودیوں کے لیے یہ زمین تنگ ہوگئی تو وہ لوگ اس ملک سے فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ اس ہوٹل کا یہودی مالک بھی سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے فرار ہوگیا اور یہ ہوٹل پاسداران کے قبضے میں آ گیا۔ انٹیلی جنس کا ایک آفیسر باہر ہی منتظر کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر پرادب انداز میں دروازہ کھولا اور کرنل کے اترنے کے بعد اس کی رہنمائی کرتا ہوا ایک ہال نما کمرے کے سامنے پہنچ گیا جو بند تھا۔

کرنل حیات کو اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ انٹیلی جنس چیف نے ملاقات کے لیے اس ہوٹل کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ جبکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پاسداران اس عمارت کو اپنے ہیڈ کواٹر کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ہال نما کمرے کے دروازے پر انٹیلی جنس کے دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے کرنل حیات کو دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا اور کرنل اندر داخل ہوگیا۔

یہ ایک آراستہ کمرہ تھا۔ دائیں جانب صوفے پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک انٹیلی جنس کا چیف حمادی تھا اور دو آدمی کرنل حیات کے لیے اجنبی تھے۔ لیکن ان کے چہرے اور بالوں کی مخصوص تراش بتا رہی تھی کہ ان کا تعلق فوج سے ہے۔ کرنل حیات نے تینوں کو سلام کیا اور مؤدب کھڑے ہوکر احکامات کا انتظار کرنے لگا۔ تب حمادی کی آواز ابھری۔

''بیٹھ جاؤ۔ یہ ایک نجی ملاقات ہے اس لیے پروٹوکول کی ضرورت نہیں۔'' کرنل حیات نے گردن خم کی اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ حمادی نے ان آدمیوں کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے کرنل حیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کرنل! کہ ایران اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہم اس کی سلامتی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں امید بھی ہے اور خطرہ بھی ہے تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔''

''یس سر۔'' کرنل نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ہم نے جو منصوبہ بنایا ہے اس پر عمل کرنے کا وقت قریب آ گیا ہے لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ

یہاں کی صورتحال کیا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ حل ہوا یا نہیں۔ میرا مطلب نریمان فرازی سے ہے۔'' حمادی کی سوالیہ نگاہیں کرنل حیات کی جانب اٹھ گئیں۔

''آج دو مشتبہ آدمیوں کو عباس آباد کے ایک بنگلے میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ وہ بنگلہ ایک ایسے شخص کی ملکیت ہے جس کے شاہ کی فیملی سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ شاہ فرار ہونے کے دو دن بعد وہ شخص بھی جعلی کاغذات کے ذریعے اپنے بیوی بچوں سمیت ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسی شام کچھ لوگوں نے اس بنگلے پر ہلا بول دیا اور پولیس کے پہنچنے سے پہلے بنگلے کا ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ وہ بنگلہ کافی عرصہ سے سنسان پڑا تھا لیکن کچھ عرصہ سے وہاں کچھ پراسرار قسم کی سرگرمیاں دیکھی جا رہی ہیں۔ آج وہ مشتبہ آدمی سیاہ رنگ کی ایک کار پر وہاں آئے تھے وہ تقریباً ایک گھنٹے تک بنگلے میں رہے۔ شام کو ایک اور اطلاع ملنے پر میں نے بنگلے پر چھاپہ مارا لیکن بنگلہ خالی ملا ایک کمرے میں ٹوٹا ہوا فرنیچر اور کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں تہہ خانے کا راستہ بھی ہے لیکن تہہ خانے سے بھی کچھ نہ ملا۔ بنگلے میں آنے والی سیاہ کار کا نمبر اگرچہ نہیں دیکھا گیا لیکن میرے آدمی اس کار کو تلاش کر رہے ہیں۔

''کیا ہی بیوقوفی کی بات ہے۔'' حمادی نے گردن جھٹک کر کہا۔ ''اس شہر میں سیاہ رنگ کی درجنوں کاریں موجود ہیں۔'' وہ کچھ لمحے کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔

''بہر حال نریمان فرازی کا ہمارے ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔ اسے تلاش کرو اور اگر عادل سرائی اسے ہم سے پہلے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا تو سارا مسئلہ خراب ہو جائے گا یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں سر۔'' کرنل حیات نے جواب دیا۔

''لیکن بہت ہوشیاری سے قدم اٹھانا ہمارا دوسرا منصوبہ متاثر نہیں ہونا چاہیے۔'' حمادی نے کہا۔

''دوسرا منصوبہ۔''

''اشارہ اس گفتگو کی طرف ہے جو ہمارے درمیان باغ ملت پارک میں ہوئی۔''

''اوہو ٹھیک۔ آپ فکر نہ کریں جناب!'' کرنل حیات نے جواب دیا اس کے بعد وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک مزید گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو میں وہ دونوں آدمی بھی شریک تھے

پھر جب کرنل حیات ہوٹل سے باہر نکلا تو دس بج چکے تھے۔ اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے چیف نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ بے حد خطرناک تھا اور حیات کے خیال میں اس میں کامیابی کے امکانات کم اور خطرات کے زیادہ تھے۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ شاید ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکے ڈرائیور نے اسے دیکھ کر کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن کرنل حیات اسٹیرنگ کے سائیڈ والے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔"

"تم جاؤ۔ گاڑی میں خود ڈرائیو کروں گا۔" اس نے کہا۔ ڈرائیور پچھلی سیٹ کا دروازہ بند کر کے مودبانہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔ کرنل حیات نے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور اسے ہوٹل کی حدود سے نکال لے گیا۔ نجانے کیوں اسے ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید یہ بے چینی حمادی کا منصوبہ سن کر پیدا ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے رات بھر نیند نہیں آئے گی اور وہ اپنا دھیان ہٹانا چاہتا تھا تاکہ ذہن پرسکون ہو سکے یہی سوچ کر اس نے گاڑی ایک سینما کے سامنے روکی۔ جہاں آج کل کے انقلاب کی کہانی اسٹیج پر تمثیل کی صورت میں دکھائی جا رہی تھی۔ انقلاب کے بعد تمام سینما ہال بند ہو چکے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو یہ سینما ہال ویران ہوئے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان پر رونق لوٹنے لگی لیکن ان سینما میں چلنے والی فلمیں پہلی فلموں سے بالکل مختلف تھیں۔ اب ان میں ایسی فلمیں دکھائی جاتی تھیں جن سے دیکھنے والوں کو درس دیا جا سکے۔ بعض سینما ہاؤس تھیٹر نما بن گئے تھے جہاں تمثیل اور زندہ جاوید کرداروں کے ذریعے لوگوں کو انقلاب کی کہانی بتائی جاتی تھی۔

کرنل حیات ہال میں پہنچا تو ہال کی روشنیاں بجھ گئیں اور اسٹیج رنگ برنگی خوبصورت روشنیوں میں نہا گیا۔ پروگرام شروع ہونے سے قبل بائیں طرف والے بوتھ کا دروازہ کھلا اور کچھ نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ کرنل حیات نے بے خیالی میں سر گھما کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہاں حسن و رعنائی کا ایک مجسمہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر کرنل حیات کے سینے میں ہلچل مچ گئی۔ اتنی خوبصورت اور معصوم لڑکی کا چہرہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسٹیج پر پروگرام جاری تھا لیکن کرنل حیات اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ تو بار بار مڑ کر اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگتا تھا جس نے پہلی نظر میں اس کا سکون برباد کر دیا تھا۔ پروگرام ختم

ہو گیا ہال کی بتیاں جل گئیں، شائقین سیٹوں سے اٹھ کر تھکے تھکے انداز میں باہر نکلنے لگے۔

کرنل حیات کو سارے پروگرام کے دوران حسن و جمال کی یہ دیوی پریشان کرتی رہی تھی جو ساتھ والے بوکس میں بیٹھی ہوئی تھی اس نے اس کے سینے میں آگ سی لگا دی تھی۔ پروگرام کے بعد جب وہ بوکس سے باہر نکل رہا تھا تو لڑکی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب وہ راہداری میں پہنچا تو اس نے دیکھا باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ لڑکی بھی راہداری میں پہنچ کر رکی ہوئی تھی اس کے چہرے پر الجھن سی نظر آ رہی تھی۔ کرنل حیات کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی کہ وہ اکیلی ہے اور اس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اسے حیرت ہوئی تھی اس قدر حسن اور جوان لڑکی رات کے وقت اکیلی گھر سے کس طرح آ گئی۔ اس نے اگرچہ چادر اوڑھ رکھی تھی لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

لڑکیوں کے معاملے میں کرنل حیات دوسرے مردوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ حسین لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ اس مسئلے میں اس نے کبھی اپنے رتبے کا خیال نہیں رکھا تھا اس وقت وہ ویسے بھی سادہ لباس میں تھا۔ عام لوگ اسے نہیں پہنچانتے تھے وہ ٹہلتا ہوا لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کی خوش گوار آواز ابھری۔

"ہیلو...... شاید تمہارے پاس سواری نہیں ہے اور تم اکیلی ہو۔"

"ج...... جی۔" لڑکی نے کہتے ہوئے چادر اچھی طرح درست کر لی کہ آنکھوں کے سوا اس کا پورا چہرہ چھپ گیا۔ اوہ۔ کوئی بات نہیں میں ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی۔"

"میری گاڑی حاضر ہے آپ اسے ٹیکسی سمجھ سکتی ہیں۔"

"آپ...... آپ ٹیکسی ڈرائیور تو نہیں لگتے۔" لڑکی حیرت سے بولی۔

"کچھ لوگوں کے لیے ٹیکسی ڈرائیور بھی بننا پڑتا ہے۔ آؤ میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔" کرنل حیات نے کہا۔

"جی نہیں۔ شکریہ میں ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"دیکھو رات کا وقت ہے۔ تم جیسی حسین اور جوان لڑکی اگر بدمعاش کے ہاتھ نہ لگی تو پاسداران کی نگاہوں سے نہ بچ سکو گی تم۔ وہ تمہیں بے حیائی کے الزام میں بھی گرفتار کر سکتے ہیں اس طرح اچھی خاصی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ آؤ میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

لڑکی نے کچھ تامل کیا اور پھر اس کے ساتھ کار میں بیٹھی۔

''کہاں رہتی ہو؟'' کرنل حیات نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں ریلوے اسٹیشن کی دوسری طرف شہر کے زیریں علاقے میں رہتی ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا کرنل نے کار کو گیئر میں ڈالا اور کار ہلکی سی حرکت میں آ گئی کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے پھر کرنل نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام حیات ہے۔ مجھے کرنل حیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انٹیلی جنس میں کرنل ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے۔

''مجھے نتاشیہ کہا جاتا ہے۔'' لڑکی نے اپنا نام بتایا۔

''تم بہت حسین ہو۔'' کرنل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بے حد حسین اور بے حد معصوم تم جیسی حسین لڑکیاں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ بلکہ یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ تم پہلی لڑکی ہو جسے قدرت کا حسین شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے آؤ تھوڑی دیر کسی کیفے میں بیٹھتے ہیں نجانے کیوں تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' یہ کہہ کر کرنل نے لڑکی کی بات کا انتظار کیے بغیر گاڑی کی رفتار کم کر دی اور آخر کار کو ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دیا۔

لڑکی نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا دونوں گاڑی سے اتر کر ریستوران میں داخل ہو گئے۔ ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ کوئی عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ کرنل حیات نتاشیہ کو لے کر کونے کی ایک میز پر جا بیٹھا اور ویٹر کو کافی کے لیے کہا پھر اس کے کہنے پر نتاشیہ نے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔ کافی پیتے ہوئے کرنل اس کے حسن کی تعریفیں کرتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ریسٹورنٹ سے اٹھے تھے۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا ان کی کار ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف جیسے ہی ایک سڑک پر گھومی، تین چار آدمیوں نے انہیں روک لیا۔ کرنل کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پاسداران تھے۔ ان میں دو داڑھی والے تھے اور دونوں کی عمریں چالیس کے لگ بھگ تھیں۔ جب کہ دوسرے نوجوان تھے ان سب کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفلیں تھی۔ وہ رائفلیں سنبھالے سڑک کے عین وسط میں کھڑے تھے۔ سڑک کے کنارے سفید رنگ کی ایک نئی مرسڈیز کھڑی تھی۔

''تم کون ہو؟ اور یہ عورت کون ہے؟ اور اس وقت کہاں سے آ رہے ہو۔'' ایک داڑھی والے نے کرنل حیات کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں انٹیلی جنس کا کرنل حیات ہوں اور یہ میری عزیزہ ہیں اور اسے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔ کرنل حیات نے بارعب لہجے میں جواب دیا۔

''کاغذات دکھاؤ'' داڑھی والے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کیا.....'' کرنل حیات چیخ اٹھا۔

''کاغذات دکھاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ اس عورت سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔'' داڑھی والا بولا اس پر کرنل کے چیخنے کے کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ پاسداران نے انہیں رائفلوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ نوجوان خاموش تھے جبکہ دونوں داڑھی والے بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو کرنل حیات کو گرفتار کرنے کی دھمکی بھی دے دی تھی اور ممکن ہے وہ لوگ انہیں گرفتار کر بھی لیتے کہ کمیٹی کا مقامی سربراہ عادل سرائی جو اپنے دو تین آدمیوں کے ساتھ وہاں سے گزر رہا تھا، رک گیا اور اس طرح کرنل حیات کو ان ملاؤں سے جان بچانے کا موقع ملا۔ نتاشیہ نے اپنے گھر سے دور ہی گاڑی رکوا لی۔ وہ کرنل حیات کو اپنے گھر تک نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے کرنل حیات اس سے اگلی شام کو ملاقات کا وعدہ لے چکا تھا۔

یہ سارا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ منصوبے کے تحت نتاشیہ شہباز اور صمدی سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی تو شہباز کو اپنا منتظر پایا۔ سینما ہاؤس میں کرنل حیات سے اس کی ملاقات صرف اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی۔ صمدی شروع ہی سے کرنل کی نگرانی کر رہا تھا اور جب کرنل حیات اس ہوٹل داخل ہوا تو اس نے ٹیلی فون پر شہباز کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا پھر شہباز نتاشہ کو لے کر ہوٹل کے قریب پہنچ گیا تھا اور گاڑی میں بیٹھا کرنل حیات کے ہوٹل سے برآمد ہونے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ پھر جب کرنل ہوٹل سے باہر نکلا اور سینما ہاؤس میں داخل ہوا تو شہباز نتاشیہ کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ نتاشیہ کو وہاں چھوڑ کر وہ اس کے فلیٹ میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ نتاشیہ نے اسے کرنل حیات سے ملاقات کی ساری تفصیل بتائی اور یہ بھی بتایا کہ کرنل نے اسے کل پھر بلایا ہے۔

"ٹھیک......" شہباز نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "معاملہ میری توقع کے مطابق ہے۔" لیکن اچانک ہی نتاشیہ سسک پڑی۔

"پلیز مجھ پر رحم کرو......رحم کرو۔ میری پیشانی پر رسوائی کا یہ داغ نہ لگاؤ۔ میں نے نہایت صاف ستھری اور شریفانہ زندگی گزاری ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ کسی ایک کے اوپر ساری زندگی گزار دوں گی۔ مجھے ایسے کاموں سے سخت نفرت ہے مجھے قتل کر دو۔ میر گلہ دبا دو۔ مگر مجھے اس کام پر مجبور نہ کرو۔ آج جب وہ بدمعاش مجھے گھور رہا تھا تو مجھے وحشت ہو رہی تھی اور......اور کل جب وہ مجھے ملے گا تو......تو، میں اس کی ہر کیفیت سے واقف ہوں۔ خدا کے لیے......خدا کے لیے میری مدد کرو، مجھے اس طرح داغدار نہ کرو کہ میں زندگی بھر تڑپتی رہ جاؤں۔" شہباز کا دل بری طرح کسمسا رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ نتاشیہ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ جو کام اسے کرنا پڑ رہا تھا وہ اس کے لیے انتہائی شرمناک تھا اور وہ خود اسے کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ لیکن جس مقصد کے لیے وہ کام کر رہا تھا اس کے لیے یہ قربانی ناگزیر تھی۔ آہ، کاش اس وقت کسی طرح رازل جریری سے رابطہ قائم ہو جائے اور وہ اسے کوئی مشورہ دے سکے۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں نریمان فرازی کی آواز ابھری۔

"نہیں۔ بڑے مقصد کے لیے بہت سی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ یہ قربانی تمہیں دینا پڑے گی شہباز! جس قدر تم اس لڑکی سے متاثر ہو رہے ہو۔ تم جیسے نوجوان کو ہونا ہی چاہیے۔ میں تو بے جسم ہوں لیکن تم یقین کرو میرے دل میں بھی اس کے لیے بہت درد ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں میرے دوست! اگر تم خلوص دل سے رازل جریری کے لیے کام کرنا چاہتے ہو تو، شہباز تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا وہ تو کچھ بول نہیں پایا تھا لیکن نریمان فرازی نے کہا۔

"ہاں نتاشیہ! کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ تم اپنے باپ کے قتل اور گھر کی بربادی کا انتقام نہیں لینا چاہتیں کیا۔ اس کے لیے تمہیں ایک اچھا موقع ملا ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔"

"کیا مجبوری ہے تمہیں؟ کیا تمہیں پورے تہران میں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی۔" نتاشیہ نے ترش لہجے میں کہا۔ "اس شہر میں درجنوں طوائفیں ایسی ہیں جو چند ٹکوں کی خاطر تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گی۔ تم میری زندگی برباد کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ کیسے نوجوان ہو، کیسا دل، جگر رکھتے ہو تم؟ کیا تمہیں ایسی لڑکی پر ترس نہیں آتا جو ابھی تک اپنے

آپ کو وحشی درندوں سے بچائے ہوئے ہے۔"

"یہ کام کوئی طوائف نہیں کر سکتی۔" یہ آواز نریمان فرازی کی تھی مجھے ایک بے حد حسین سیدھی سادھی اور گھریلو لڑکی کی ضرورت تھی اور تم سے بہتر کوئی لڑکی نہیں ہے۔ طوائف تو دور سے ہی پہچان لی جاتی ہے اور سنو نتاشیہ! وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا کہیں خودکشی نہ کر بیٹھنا تم تو مر جاؤ گی لیکن تمہاری یہ موت تمہاری محسنہ خانم دوینہ کو مصیبت میں پھنسا دے گی اور تم جانتی ہو کہ خانم دوینہ اس عمر میں کوئی زیادتی یا تشدد برداشت نہیں کر سکتیں۔" یہ الفاظ نریمان فرازی ہی ادا کر سکتا تھا۔ لیکن شہباز جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے خلوص اور بے گناہی کا مظاہرہ کرے بھی تو نتاشیہ کے یقین کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ جسم اس کا تھا لیکن آواز بے شک نریمان فرازی کی تھی اور نریمان فرازی نے اس وقت یہ آواز اس لیے اختیار کی تھی کہ وہ جان چکا تھا کہ شہباز اس لڑکی سے متاثر ہو چکا ہے اور اس سے وہ سب کچھ نہیں کہہ پائے گا جو اسے کہنا چاہیے لیکن بہرحال نتاشیہ اس سے دو قدم دور ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر نفرت کے آثار تھے۔

"بہت ہی سنگدل انسان ہو تم حالانکہ چہرے سے ایسے نہیں لگتے۔"

"میری بات سنو نتاشیہ!" نریمان فرازی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"اپنا ہاتھ میرے جسم سے دور رکھو۔" شہباز خاموشی سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ لیکن تمہیں حالات کے ساتھ سفر کرنا ہی ہوگا۔"

"نہیں کروں گی لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے حالات پر۔" نتاشیہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ بھی اچھی بات ہے۔ واقعی یہ سب کچھ ایسا ہی ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے۔" یہ آواز شہباز کی تھی۔

"لیکن تمہیں حالات کے مطابق قدم ملا کر چلنا ہوگا۔" نریمان فرازی نے فوراً ہی صورتحال کو سنبھالا۔

"میں نے کہا نا کہ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے حالات پر۔"

"نہیں نتاشیہ میں چلتا ہوں۔ کل تمہیں کرنل حیات سے ضرور ملنا ہے اور ایک بات ذہن

میں رکھنا۔ میرے آدمی چوبیس گھنٹے تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔'' زریمان فرازی نے فوراً ہی شہباز کو وہاں سے واپسی کی ہدایت کی اور شہباز وہاں سے باہر نکل گیا۔ لیکن نتاشیہ اپنی سرپرست خانم دونیہ سے لپٹ کر بری طرح سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''وہ لوگ آپ کو اذیت پہنچانے کی دھمکی دے گئے ہیں۔'' رات کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزری ایک ایک لمحہ نتاشیہ کے لیے اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔ آنے والے وقت کے خیال سے وہ بار بار کانپ اٹھتی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ خودکشی کے بارے میں سوچا لیکن ہر مرتبہ خانم دونیہ کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ خانم نے اسے پناہ دے کر نئی زندگی دی تھی۔ وہ اسے دھوکہ نہیں دے سکتی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خانم کا بوڑھا جسم واقعی تشدد برداشت نہیں کر سکے گا۔

بہرحال دوسرا دن آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ نتاشیہ کو معلوم تھا کہ اگر آج وہ کرنل حیات سے نہ ملی تو وہ اسے تلاش کرے گا وہ انٹیلی جنس کا آدمی تھا اور پولیس یا پاسداروں سے زیادہ خطرناک وہ اسے تلاش کیے بغیر نہیں رہے گا اور جب اسے نتاشیہ کی اصلیت کا پتہ چلے گا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے وہی سب کچھ کرنا ہے، جس کی ہدایت کر دی گئی ہے۔ بہرحال مجبوری تھی۔

پھر اسی رات وہ کرنل حیات کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ کھانا بے حد شاندار اور لذیذ تھا لیکن نتاشیہ کو اس سے ذرا بھی رغبت نہیں تھی۔ اس کی طبیعت اندر سے بجھی ہوئی تھی اور دل زار و قطار رو رہا تھا۔ کھانے کے بعد جب کرنل حیات نے اسے اپنی رہائش گاہ پر چلنے کے لیے کہا تو وہ انکار نہیں کر سکی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ کرنل حیات کی خوابگاہ میں بے بس پڑی ہوئی تھی۔ اس کی حالت اس بکری کی سی تھی جو قصائی کی چھری تلے کھڑی ہو۔

کرنل حیات کی سوچ میں اب کسی قدر حقیقت پسندی آ گئی تھی اب وہ اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ اس کی خوابگاہ میں اس لڑکی کی موجودگی کسی سازش کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ بستر سے اٹھا۔ نشست گاہ میں جا کر اس نے نتاشیہ کا پرس اٹھا کر کھولا۔ شناختی کاغذات چیک کیے پھر فون پر اپنے ایک ماتحت کا نمبر ملانے کے بعد اسے ہدایت دینے لگا۔ ایک گھنٹے کے

بعد اس کے ماتحت نے فون کر کے اس کے سوال کا جواب دے دیا جسے سن کر اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ آخر کار اس کا تعلق انٹیلی جنس سے تھا اور انٹیلی جنس والے اس قدر گدھے بھی نہیں ہوتے۔

✡......✡

میدان فردوسی کے بارونق بازار میں واقع جنرل اسٹور کے پچھلے کمرے میں بیٹھا ہوا نوشاد اپنے سامنے کاغذات پھیلائے کسی حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اسی لمحے اسٹور میں داخل ہونے والا ایک ملازم اندر داخل ہوا اور دو ملاقاتیوں کی آمد کی اطلاع دی۔

''انہیں اندر بھیج دو۔'' نوشاد نے کہا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔

''ہیلو نوشاد۔'' یہ آواز سن کر نوشاد نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے سامنے دو آدمی نظر آئے۔ ان میں سے ایک صمدی تھا جسے اس نے فوراً ہی پہچان لیا البتہ دوسرا شخص کچھ اجنبی سا لگا لیکن جب وہ بولا تو نوشاد اچھل پڑا۔

''اوہو...... زریمان فرازی تم۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔

''بس دوست! آج کل یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔'' شہباز کی آواز ابھری۔ ''ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا بھیس بدلنا پڑتا ہے۔ تہران کی سڑکیں اور گلیاں میری دشمن ہو گئی ہیں۔''

''مگر تم تو ایران سے فرار ہو گئے تھے؟''

''ہاں...... یہ ایک طویل کہانی ہے۔ بہرحال اس وقت میں ایک خاص کام کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔'' زریمان فرازی نے کہا۔

''میں دل و جان سے حاضر ہوں۔'' نوشاد مسکرا دیا۔

''تم تلاقی کے لیے بھی کام کرتے رہے ہو۔'' شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ تمہارے گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ میں نے کچھ دن ہی اس کے ساتھ کام کیا تھا پھر بند ہو گیا اور یہ دکان کھول لی۔ اس وقت سے میں کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوا۔ تلاقی سے ملے ہوئے بھی مجھے کچھ عرصہ بیت چکا ہے۔''

''تعلقات کیسے ہیں۔'' شہباز نے سوال کیا۔

"ملاقات ہوگی تو بہت اچھے طریقے سے ملے گا۔" نوشاد نے کہا۔

"تم جانتے ہو اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔" اس بار شہباز کی آواز میں نریمان فرازی بولا تھا۔

"ہاں......اور مجھے اس کی ذہنیت پر افسوس بھی ہوا تھا۔" نوشاد نے کہا۔

"خیر......میں ایک خاص مشن پر تہران آیا ہوں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا لیکن تلاتی کو میرے اس مشن کی بھنک مل گئی ہے۔ جب میں زاہدان سے یہاں آرہا تھا تو اس نے کرمان کے قریب میرے ایک آدمی کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ اب تلاتی تہران میں موجود ہے وہ میرے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ انٹیلی جنس اور پاسداران والے بھی میری تلاش میں شہر بھر میں بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تلاتی کی وجہ سے میری پریشانیاں اور بڑھ گئیں ہیں۔ سب سے پہلے میں اس کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" نوشاد نے کہا۔ شہباز چند لمحات خاموش رہا پھر اس نے آہستہ آہستہ سے کہا۔

"میں تمہیں اپنا منصوبہ بتاتا ہوں۔" اور پھر وہ اسے اپنا منصوبہ بتانے لگا پھر اس نے کہا۔

"کیا سمجھے......لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہیں دنیا کے کسی گوشے میں مجھ سے پناہ نہیں ملے گی۔"

"تم مطمئن رہو آدمی کسی کو دھوکا اسی وقت دیتا ہے جب اسے دولت کا لالچ ہو یا جان کا خوف ہو۔ مجھے نہ تو دولت کا لالچ ہے اور نہ ہی تمہاری طرف سے جان کا خوف۔"

"ٹھیک ہے۔ تو کل رات میں تمہارے پیغام کا انتظار کروں گا۔ اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا چلتا ہوں۔"

"بیٹھنا چاہو تو بیٹھو میں تمہیں......"

"نہیں کچھ نہیں۔" نریمان فرازی یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی صمدی نے بھی کرسی چھوڑ دی تھی۔ نوشاد نے انہیں وہیں سے ہاتھ ملا کر رخصت کر دیا۔ دروازے تک ان کے ساتھ آنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ اس کے فعل سے اخلاقی قدروں کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ بس احتیاط کا دامن ان میں سے کوئی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اندرونی

کمرے سے نکل کر وہ دونوں اسٹور میں رک گئے۔ اس وقت اسٹور میں کوئی گاہک نہیں تھا لیکن اسی لمحے تین چار گاہک دکان میں داخل ہوتے نظر آئے۔ ان میں دو چار چادر پوش عورتیں تھیں ایک مرد اور ایک کم سن بچہ جسے مرد نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ شہباز ایک لمحے کو دکان میں رکا اور صمدی کو اشارہ کرتا ہوا دکان سے باہر نکل آیا۔

صمدی کی گاڑی دکان سے چند گز دور کھڑی تھی اس وقت شام کے آٹھ بجے سڑکوں پر برقی روشنیاں جگمگا اٹھیں تھیں۔ بازاروں میں اگرچہ لوگوں کی آمد ورفت کم تھی دکانیں بھی سجی ہوئی تھیں۔ لیکن ان سجی ہوئی دکانوں میں لوگوں کی آمد کا تصور نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شخص اپنی حرکات وسکنات اور گفتگو کے معاملے میں بہت محتاط ہو۔ بعض لوگ تو بار بار چونک کر اس طریقے سے پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے جیسے انہیں اپنے تعاقب کا شبہ ہو رہا ہو۔

صمدی کی سیاہ سیٹرون وسیع وعریض چوراہے میدان فردوسی سے گھوم کر دائیں طرف ایک کشادہ سڑک پر نکل آئی۔ چوراہے پر عظیم شاعر فردوسی کا مجسمہ نصب تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں شاہ نامہ تھا اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ۔ شہنشاہ کے عہد میں سارے تہران میں چوراہوں پر مختلف لوگوں کے مجسمے نصب تھے۔ ان میں زیادہ تر خود شاہ اور ان کے بچوں کے مجسمے تھے اور بہت سے مجسمے اس کے پیشواؤں بادشاہوں اور اس کے آباؤ اجداد کے بھی تھے۔

نہر آباد ایئر پورٹ سے شہر آتے ہوئے سب سے پہلے چوراہے پر معزول شاہ کے باپ کا مجسمہ نصب تھا جو بلندی، چوڑائی اور حُسن ورعنائی میں اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن انقلاب کے بعد تہران کے چوراہوں سے مجسموں کو صاف کرنے کی مہم کا آغاز اسی مجسمے کی شکست کی وجہ سے ہوا تھا اور اس وقت کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے پہلا ہتھوڑا مار کر اس کی توڑ پھوڑ کا آغاز کیا تھا اور پھر یہ سلسلہ اس طرح چل نکلا کہ شہر کے سارے مجسمے زمین بوس ہو گئے۔ صرف فردوسی کا یہ مجسمہ جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ اس واحد مجسمے کو دیکھ کر ایرانی قوم کے روایت پسند ہونے اور اپنے شاعروں فنکاروں کے قدر دان ہونے کا ثبوت ملتا تھا۔ سیاہ سیٹرون ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی اس کی دونوں طرف دو کانیں تھیں زیادہ دکانیں صرافوں کی تھی۔ صراف موجود تھے لیکن دوکان میں مال ندارد تھا۔

"کیا خیال ہے کیوں نہ کسی ریسٹورنٹ میں رک کا کافی پی جائے۔" شہباز نے اپنی طلب کا اظہار کیا تو صمدی نے کار کی رفتار کم کر دی۔ اتفاق سے تھوڑے فاصلے پر ہی میدان

فردوسی کا خوبصورت بازار تھا جس میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی گلیاں اور ان گلیوں میں دکانوں کی بہتات تھی۔ ان دکانوں میں ان لوگوں کے کہنے کے مطابق سوئی سے لے کر ہاتھی تک مل جاتا تھا۔ صدی نے اسی علاقے کے ایک خوبصورت سے ریستوران کے سامنے کار روکی اور انجن بند کر دیا۔ پھر وہ دونوں نیچے اتر آئے انہیں تقریباً پندرہ گز کا فاصلہ ٹہلتے ہوئے طے کرنا تھا۔

چنانچہ وہ ٹہلنے والے انداز میں چلتے ہوئے ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بھی گاہکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ انقلاب سے پہلے اس علاقے میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا یہاں گاہکوں کی زیادہ تعداد عورتوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ یورپی اور نیم عریاں لباس میں چلتی پھرتی کچھ عورتیں دعوت نظارہ دیتی تھیں اور مرد یہاں آنکھیں سینکنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ لیکن اب کچھ چادر پوش عورتوں کے سوا یہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں ریستوران کی رونق بھی اجڑ گئی تھی۔ ان لوگوں کے سامنے ان کی طلب پر کافی لا کر رکھ دی گئی اور وہ خاموش بیٹھے کافی کا مزہ لیتے رہے۔

پھر کافی پینے کے بعد وہ وہاں سے اٹھے شہباز نے بل ادا کیا اور دونوں ریستوران سے نکل کر کار کی طرف چل دیے۔ ابھی وہ کار سے کچھ ہی گز دور کھڑے ہوئے تھے کہ اچانک ہی صدی ٹھٹک گیا۔ اسے کار کے قریب مشتبہ آدمی کھڑا ہوا نظر آیا تھا۔ اس نے شہباز کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی لیکن وہ رکنے کے بجائے کار کی طرف بڑھتے رہے۔ قریب پہنچ کر صدی نے جیب سے چابی نکالی اور دروازے کے لاک کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کار سے دو گز فاصلے پر کھڑا ہوا شخص قریب آ کر رک گیا پھر بولا۔

''یہ کار تمہاری ہے۔'' اس نے صدی کو گھورتے ہوئے کہا وہ ایک لمبا تڑنگا قوی الجثہ آدمی تھا۔''

''ہاں کیوں خیریت'' صدی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔''

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس شخص نے کہا اور پھرتی سے ریوالور نکال لیا۔ صدی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا وہ شخص بظاہر اکیلا تھا لیکن اس کے لفظ ہمارے نے سارا مسئلہ خراب کر دیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں گے۔ اور پھر چند ہی لمحوں میں صدی کے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ایک اور آدمی

تاریک گوشے سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا اور اس نے آتے ہی شہباز کو ریوالور کی زد پر لے لیا تھا۔

''ہمارا تعلق انٹیلی جنس سے ہے ہم کل سے اس کار کی تلاش میں ہیں۔ اس لمبے تڑنگے آدمی نے کہا۔

''لیکن کیوں'' صدی نے بے چین لہجے میں سوال کیا۔

''اس کار کو عباس آباد کے ایک ایسے کمرے میں دیکھا گیا تھا جو بعض جرائم پیشہ افراد کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ صورتحال جس قدر سنگین ہو گئی تھی ایک لمحے کے اندر اندر اس کا احساس کر لیا گیا تھا۔ قرب و جوار کے مناظر بھی بدلتے جا رہے تھے۔ وہاں جو لوگ موجود تھے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دو آدمیوں کے ہاتھوں میں ریوالور ہے۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے اپنے اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے ہٹنے لگے۔ صورتحال بہت پیچیدہ تھی۔ اصل مسئلہ تو یہی تھا کہ ایک بار بھی ان لوگوں کے ہاتھوں پھنس گئے تو نکلنے کا تصور ختم ہو جاتا تھا۔ ایک آدمی نے صدی کو زد پر لے رکھا تھا اور دوسرے نے شہباز کو لیکن یہ دونوں اب بھی پرسکون تھے۔ کسی کے چہرے پر پریشانی یا بدحواسی کے آثار نظر نہیں آئے تھے البتہ ان دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہوا اور پھر صدی نے آہستہ سے کہا۔

''ہم آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں جناب! یہ ہمارا فرض ہے یہ کہہ کر انہوں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور بس یہیں کور کرنے والوں کو دھوکا ہو گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے نرم ہوئے تھے کہ اچانک ہی صدی اور شہباز نے اپنے اپنے حریفوں پر حملہ کر دیا۔ دونوں پھرکنی کی طرح گھومے اور بیک وقت ان دونوں کے پاؤں ریوالوں والے ہاتھوں پر لگے۔ یہ صورتحال ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ صدی کے حریف کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر کار کی چھت پر جا گرا۔ البتہ شاہباز کے حریف کے ہاتھ سے ریوالور نکلا نہیں بلکہ وہ ایک جھٹکے سے لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ بلند کر کے فائر کرنے کی کوشش کی لیکن شہباز کی جسمانی مشقت اس وقت اس کے کام آ گئی۔ وہ بری طرح اچھلا اور نشانہ غلط ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے حریف نے یکے بعد دیگرے کئی فائر اس پر کر ڈالے۔ شہباز کبھی بیٹھ جاتا کبھی فضا میں اچھل کر اوپر ہی اوپر قلابازی کھاتا یہ صورتحال صدی

کے لیے حیران کن تھی۔

بہرحال شہباز نے ایک لمحے کے لیے اپنا اسی طرح بچاؤ کیا اور اس کے بعد ایک بار جب وہ اوپر اچھلا تو سیدھا اس شخص پر جا گرا تھا اور اس کی گردن پر سوار ہو کر نیچے تک لے گیا تھا۔ وہ شخص بری طرح زمین سے ٹکرایا۔ ریوالور سے گولی چلی لیکن سامنے ایک دکان کے پلاسٹک سائن پر جا کر لگی۔ فائر کی آواز سے بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر بھاگے اور دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔

شہباز نے حریف کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا اور اس کے فوراً بعد اس کے اس ہاتھ کو دبا دیا جس میں ریوالور دبا ہوا تھا اس کی انگلیاں ٹریگر پر دبتی رہیں اور فائرنگ ہوتی رہی۔ لیکن شہباز نے اب اسے ہاتھ اٹھانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے بری طرح اس شخص کو رگڑ کر رکھ دیا اور وہ شخص حلق سے خوفناک آوازیں نکالنے لگا۔ دوسری طرف صمدی اپنے حریف سے گتھم گتھا نظر آ رہا تھا لیکن صمدی کا حریف اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اس نے اسے اس طرح زمین پر گرا رکھا تھا کہ صمدی کا سر کار کے اگلے ٹائر سے لگا ہوا تھا اور دشمن اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ صمدی کے گلے پر جمے ہوئے تھے اور وہ اس کا نرخرہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صمدی نے اپنے جسم کی تمام قوت استعمال کرتے ہوئے اپنے حریف کو دائیں طرف پلٹ دیا۔ اس کا گلہ حریف کی گرفت سے آزاد ہوا تو صمدی بڑی پھرتی سے اٹھ گیا اس نے حریف پر ٹھوکروں کی بارش شروع کر دی۔ ہر ٹھوکر پر اس کا حریف ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھتا لیکن آخر کار اسے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے صمدی کا پیر پکڑ کر اسے پوری قوت سے موڑ دیا اور صمدی کراہتا ہوا ایک پیر پر گھوم کر نیچے گرا۔ اب اس کے حریف کی باری تھی اس نے صمدی پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔

ادھر شہباز کا حریف ایک بار پھر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن شاید خالی ہو چکا تھا۔ البتہ اس بات کا شہباز کو کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اس کا ہاتھ ریوالور پر جا کر پڑا شہباز نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ کی کلائی پر اپنی ٹانگ کی ٹھوکر رسید کی اور کلائی درمیان سے ٹوٹ کر جھول گئی۔ اس کا ہاتھ کہنی سے آ لگا تھا اور وہ بری طرح بلبلانے لگا تھا۔ شہباز نے ایک اور ٹھوکر اپنے حریف کی کھوپڑی پر ماری اور پھر اس کی نگاہیں صمدی کی جانب اٹھیں۔ صمدی کا حریف تھا بھی بہت لمبا تڑنگا اور ضرورت سے

زیادہ طاقتور۔ یہ وہی آدمی تھا جو ضرورت سے زیادہ تنومند نظر آ رہا تھا۔ صمدی اس سے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ اس پر قابو نہیں پا رہا تھا۔

اچانک ہی شہباز اپنی جگہ سے اچھلا اور فضا میں کافی بلند ہو کر اس نے شہباز کے حریف کے سر پر دونوں ٹھوکریں ماریں۔ یہ ایک سرکس کے جمناسٹر کا ہی کمال ہو سکتا تھا۔ شہباز کا لمبا تڑنگا حریف حلق پھاڑ کر چیخا اور پھر دونوں ہاتھوں کا بیلنس کر کے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیچے گر پڑا تھا۔ اچانک ہی فضا سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ غالباً کسی نے فون پر پولیس کو اس ہنگامے کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔

چنانچہ اب یہاں رکنا حماقت کی بات تھی۔ صمدی کی آواز ابھری۔

"بھاگو" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ اس شہباز نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس بازار کی دکانیں دور دور تک بند ہو چکی تھیں۔ تاریکی ان کے لیے فائدہ مند تھی۔ اچانک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی صمدی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا گیا۔ انٹیلی جنس کے دو آدمیوں میں سے کسی نے ریوالور اٹھا کر فائر کر دیا تھا اور گولی صمدی کے بائیں بازو میں کہنی سے ذرا اوپر لگی تھی۔

شہباز نے ایک لمحے کے لیے رک کر صمدی کو سہارا دیا۔ صمدی نے دائیں ہاتھ سے اپنے زخمی بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"تم بھاگ جاؤ فرازی! پلیز میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر پولیس نے ان گلیوں کو گھیرے میں لے لیا تو فرار کا راستہ نہیں ملے گا۔"

"لیکن تم......"

"میری کوئی فکر مت کرو تم۔ گولی نے بس بازو کا گوشت چیر دیا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے تم نوشابہ کے ہاں پہنچ جاؤ۔ میں بھی وہیں آ جاؤں گا۔ ان حالات میں وہی جگہ ہمارے لیے محفوظ ثابت ہو سکتی ہے جاؤ جلدی کرو۔ پولس کی گاڑی قریب آ رہی ہے۔ مجبوری تھی فیصلہ نریمان فرازی نے کیا تھا اور شہباز ایک طرف دوڑ پڑا تھا۔ دور دور تک کی دکانیں چونکہ بند تھیں۔ لوگ یقیناً یہی سمجھے تھے پاسداران کا کسی پارٹی سے ٹکراؤ ہو گیا ہے۔ پاسداران کا خوف سب کے ذہنوں پر سوار تھا۔ اس لیے لوگ دکانیں بند کر کے بھاگ رہے تھے۔ اس صورتحال سے شہباز نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور وہ گلیوں میں دوڑنے لگا۔

ادھر تو یہ صورتحال تھی ادھر جب صمدی اور شہباز نوشاد کی دکان سے نکلے تھے تو ٹھیک دس منٹ کے بعد نوشاد نے دکان بند کردی تھی۔ دکان بند کرنے کے بعد اس نے ایک پرائیویٹ ٹیکسی روکی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو اپنی منزل کا پتہ بتا دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ٹیکسی کمیٹی کے مقامی ہیڈ کواٹر کے سامنے رکی۔ نوشاد نے کرایہ ادا کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے ایک آدمی سے عادل سرائی کے بارے میں دریافت کیا اور اس شخص نے کمرے کی جانب اشارہ کر دیا۔ نوشاد جب کمرے میں داخل ہوا تو خاصا بدحواس نظر آ رہا تھا وہ اس میز کے قریب جا کر رک گیا جہاں عادل سرائی بیٹھا تھا۔ کمرے میں دو آدمی اور بھی تھے ایک داڑھی والا تھا جس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہوگی۔ سفید داڑھی سیاہ لباس اور سر پر سیاہ پگڑی۔،

''کیا بات ہے، کون ہو تم۔'' عادل سرائی نے گھورتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''جناب نریمان فرازی کے بارے میں ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔'' نوشاد نے کہا اور عادل سرائی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ داڑھی والا اور دوسرا آدمی بھی نریمان فرازی کا نام سن کر اپنی اپنی جگہ اچھل پڑے تھے۔

''تم خوفزدہ ہو آرام سے بیٹھو۔ یہاں تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عادل سرائی نے کہا اور نوشاد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے حواس پر قابو پا چکا تو اس نے عادل سرائی کو بتایا کہ نریمان فرازی کہاں مل سکتا ہے۔

نتاشیہ کرنل حیات کی خوابگاہ میں تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے کرنل حیات کا بریف کیس جسے وہ ہمیشہ الماری میں لاک کر کے رکھا کرتا تھا، ڈریسنگ پر پڑا تھا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پھر وہ بریف کیس کی جانب بڑھ گیا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے پہلے بریف کیس کا خیال ہی نہ رہا ہو اور اب وہ اسے الماری میں رکھنا چاہتا ہو۔ اسی اثناء میں فون کی گھنٹی بج گئی اور وہ فون کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ لمحے بھر اس کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آتے رہے پھر اس نے تیز تیز لہجے میں چند ادھورے جملے کہے اور پھر فون بند کر کے لباس تبدیل کرنے لگا اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

ادھر نتاشیہ بستر پر لیٹی ہوئی یہ ساری کاروائی دیکھ رہی تھی۔ اس نے کرنل حیات سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کچھ لمحوں کے اندر کرنل نے لباس تبدیل کر لیا اور بولا۔

''میں تھوڑی دیر کے بعد واپس آ رہا ہوں۔'' وہ جوتے پہننے لگا۔ ''دفتر سے ایک ضروری پیغام ملا ہے مجھے۔ لیکن تم فکر مت کرو زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا اس کا بریف کیس بدستور ڈریسنگ پر پڑا رہ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی نتاشیہ تیزی سے بستر سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ کرنل حیات کی کار بنگلے سے نکل رہی تھی۔ نتاشیہ نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا، کھڑکیوں کے پردے کھینچے اور بریف کیس کھول کر اس میں رکھے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگی۔ ان کاغذات میں اسے ایک ایسا خط بھی مل گیا جو فارسی ٹائپ شدہ تھا۔ اس خط کو پڑھتے ہوئے نتاشیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے اپنے بیگ سے منی کیمرہ نکالا سب سے پہلے اس خط کی تصویر بنائی پھر جلدی جلدی تمام کاغذات کی تصویریں لینے لگی۔ پھر تمام کاغذات اسی ترتیب سے واپس بریف کیس میں بند کر کے اور کیمرہ اپنے بیگ میں چھپا کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا دل بڑی شدت سے

دھڑک رہا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد کرنل حیات واپس آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوشگوار مسکراہٹ تھی اس نے لباس تبدیل کیا اور بستر پر آ گیا۔ نتاشیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر بتدریج اس کی کیفیت اعتدال پر آتی چلی گئی۔ وہ لڑکی کرنل حیات کے لیے تو محض ایک کھلونا تھی اور وہ اس حسین کھلونے سے دل بہلا رہا تھا۔ صبح ساڑھے تین بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی اور کرنل حیات نے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔ اس فون کے کال کے انتظار میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔

دوسری طرف سے اسے خوشخبری سنائی گئی تھی۔ اسے سن کر وہ اچھل پڑا۔ گزشتہ رات اس کے دو آدمیوں نے میدان فردوسی کے بازار میں سیاہ رنگ کی وہ سیٹرون کار تلاش کر لی تھی جسے دو ہفتے قبل عباس آباد والے بنگلے میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے کار پر آنے والے دو افراد کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے آدمیوں کی اطلاع کے مطابق ان دونوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو فرازی کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ فرار ہوتے ہوئے انٹیلی جنس کے ایک آدمی کی فائرنگ سے فرازی یا اس کا ساتھی زخمی بھی ہوا تھا پھر رات بارہ بجے اسے فون پر اطلاع ملی کہ فرازی اور اس کا ساتھی یوسف آباد کے ایک فیشن ایبل بنگلے میں موجود ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ دفتر پہنچ گیا۔ اگر نتاشیہ اس کی خوابگاہ میں نہ ہوتی تو وہ خود اس بنگلے پر الرٹ کرتا لیکن اپنے آدمیوں کو بنگلے پر چھاپہ مارنے کی ہدایت دے کر وہ اپنی رہائش گاہ پر لوٹ آیا تھا۔ تاکہ نتاشیہ کے حُسن سے لطف اندوز ہو سکے اور اب اسے اس چھاپے کے بارے میں اطلاع دی جا رہی تھی۔ اس اطلاع کے مطابق یوسف آباد کے اس بنگلے میں بہت سے آدمی موجود تھے۔ جن سے زبردست مقابلہ ہوا تھا۔ پولیس مقابلے میں مخالفین کے تین آدمی مارے گئے تھے جبکہ باقی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انٹیلی جنس کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔

''اور نریمان فرازی۔'' کرنل حیات نے پوچھا۔ دوسری طرف سے سننے کے بعد وہ بولا۔

''ٹھیک ہے میں پہنچ رہا ہوں۔'' ریسیور رکھنے کے بعد وہ نتاشیہ کی طرف مڑا اور پر تعصب

نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''سوری لڑکی تمہارا ڈرامہ ختم ہو گیا۔'' یہ الفاظ نتاشیہ کے حواس پر بجلی بن کر گرے۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

''مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا یہ بات مجھے بہت پہلے پتہ چل گئی تھی کہ تم کون ہو اور تمہاری اصلیت کیا ہے۔

''اگر ایسی بات تھی تو تم نے مجھے پہلے ہی دن گولی کیوں نہیں ماردی۔'' نتاشیہ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''میرے جسم کو کیوں پامال کیا، کیوں روندا مجھے، وہ زاروقطار رونے لگی۔

''تم اچھی لڑکی ہو، خوبصورت ہو، بھولی بھالی ہو، تمہارے پہلو میں سکون ہے، محبت ہے اگر ملاؤں کی حکومت نہ ہوتی تو میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن......'' کرنل حیات کا جملہ پورا ہونے سے پہلے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ چند لمحے تک دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر دہاڑا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔'' اس نے ریسیور پٹخ دیا اور نتاشیہ کی طرف گھوم کر بولا۔

''کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے میں دفتر جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گی ویسے تم بھاگ کر کہیں جا بھی نہیں سکتیں۔ کرنل حیات نے ایک بار پھر عجلت میں لباس تبدیل کیا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا کرنل کے نکلنے کے بعد فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجی۔

''نتاشیہ میں صمدی بول رہا ہوں شاید تم نام سے مجھے نہ پہچان سکو پہلی مرتبہ جب نریمان فرازی تمہارے فلیٹ پر آیا تھا تو میں اس کے ساتھ تھا۔'' نتاشیہ اُبل پڑی۔

''تم لوگوں نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔ اس خبیث کرنل کو میرے بارے میں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔''

''تم ایک اچھی لڑکی ہو نتاشیہ تم جس مقصد کے لیے کام کر رہی ہو اس کے پیش نظر یہ معمولی سی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کرنل نے تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے وہ اس سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ غالباً وہ تم سے بہت زیادہ متاثر ہے۔''

"لعنت ہے تم سب پر لعنت ہے۔" نتاشیہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔

"دیکھو نتاشیہ! تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتی تو گالیاں دے دے کر میرے کان بہرے کر دیتی۔" بہر حال میں ٹھیک پانچ بجے تمہارے کمرے کے روشن دان سے ایک ڈوری کے ساتھ پستول پھینکوں گا۔ پستول کو اس ڈوری سے الگ کر لینا۔"

"خودکشی کے لیے۔"

"نہیں انتقام اور آزادی کے لیے کرنل حیات تمہیں باقاعدہ طور پر انٹیلی جنس کی تحویل میں دینے کے موڈ میں ہے۔ تم اس پستول سے کرنل کی کھوپڑی میں سوراخ کر دینا اور آرام سے نکل جانا تمہیں کوئی پریشان کرنے نہیں آئے گا۔ کرنل کے سوا تمہاری اصلیت کوئی بھی نہیں جانتا اور یہ پستول اپنے پاس رکھ لینا اور منی کیمرا اس ڈوری سے باندھ کر لٹکا دینا۔ کیمرے کا کام ختم ہو گیا ہے یا نہیں۔"

"ہاں کام ہو گیا ہے۔"

"گڈ..... تمہاری خدمات کے صلے میں نرمان فرازی نے خانم دونیہ کو پچاس ہزار تومان دیئے ہیں یہ رقم تمہارے کام آئے گی۔ اوکے نتاشیہ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد کمرے کے عقبی روشندان سے ڈوری سے بندھا ہوا پستول اندر لٹکا اور دھیرے دھیرے نیچے آنے لگا۔ جب وہ نتاشیہ کی دسترس میں آ گیا تو اس نے پستول کھول کر منی کیمرہ ڈوری میں احتیاط سے باندھ دیا اور ڈوری کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف صمدی نے ڈوری کو واپس کھینچ لیا۔ ڈوری سے بندھا ہوا کیمرہ دیوار پر کسی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا روشندان میں غائب ہو گیا۔

نتاشیہ کچھ دیر تک پستول کو ہاتھ میں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پستول پلنگ کے میز کے نیچے چھپا دیا اور بستر پر گر کر ایک بار پھر سسکیاں لینے لگی۔

نریمان فرازی یا شہباز کی اب تک کی حکمت عملی مکمل طور پر کامیاب رہی تھی اور تقدیر نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ گزشتہ رات میدان فردوسی کے ایک بازار میں وہ انٹیلی جنس کے ہتھے چڑھ گئے تھے لیکن آخر کار وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ صمدی زخمی ہو گیا تھا اور اس نے اسے ایک مخصوص جگہ پہنچنے کا مشورہ دیا تھا۔

چنانچہ شہباز گلیوں میں دوڑتا ہوا کشادہ سڑک پر نکل آیا پھر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد

وہ پرسکون ہو گیا۔ اب وہ دوڑنے کے بجائے اطمینان سے چل رہا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مطمئن ہو گیا ہے۔ اس کے خیال میں پولیس ہنگامے کے دوران ادھر پہنچ چکی ہو گی اور آس پاس ہی گلیوں، بازاروں میں ان کی تلاش ہو رہی ہو گی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ تلاش فی الحال اسی علاقے تک محدود رہے گی اور پھر تلاش کا یہ سلسلہ پورے شہر تک پھیل جائے گا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن دوڑنے کی کوشش لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے رفتار بالکل سست کر دی۔ ابھی وہ ٹیکسی وغیرہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ یہ بات جانتا تھا کہ پولیس، کمیٹی اور انٹیلی جنس والے سارے شہر کے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھ گچھ کریں گے کہ وہ اس علاقے سے کسی مشتبہ شخص کو تو نہیں لے کر گئے تھے۔ اس لیے وہ کوئی ٹیکسی روکنے کے بجائے تیز تیز چلتا رہا۔

خیابان ولی عصر سے ہوتے ہوئے وہ بازار بزرگ پہنچ گیا۔ تقریباً چھ سو کلومیٹر کا یہ فاصلہ طے کرنے میں اسے بیس منٹ لگے تھے اور ان بیس منٹوں میں اس کی تلاش کا سلسلہ کافی دور تک پھیل گیا تھا۔ بازار بزرگ شہر کا گنجان ترین علاقہ تھا۔ سب سے بڑا کاروباری مرکز ہونے کے علاوہ یہاں رہائشی فلیٹ بھی تھے۔ تنگ اور پر پیچ گلیوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ یہاں مختلف کاروبار کے لیے مختلف شعبے تھے جنہیں مارکیٹیں کہا جا سکتا ہے ایک علاقہ مرچ مصالحہ جات اور اسی قسم کی چیزوں کے لیے موجود تھا۔ دوسرے علاقے میں کراکری کی دکانیں تھیں ان دکانوں میں ایران ہی کی بنی ہوئی پلاسٹک کی کراکری بھری ہوئی تھی۔ ایک علاقہ قالینوں کے کاروبار کے لیے مخصوص تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں قالینوں کے انبار تھے۔ دکانوں کے اندر اور باہر خوبصورت قالین لٹکے ہوئے تھے۔ یہ بہت ہی تنگ گلیاں تھیں۔ یہاں لوگوں کی آمدورفت بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ عمارتوں کے نیچے دکانیں تھیں اور اوپر رہائشی فلیٹ وغیرہ تھے۔ بازار بزرگ تو تہران کا قدیم ترین علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ بعض عمارتیں اس قدر خستہ تھیں کہ کسی بھی لمحے زمین بوس ہو سکتی تھیں۔ شہباز اس وقت بازار بزرگ کے قالینوں والے سیکشن میں تھا اور اس طرح چل رہا تھا جیسے محض ٹہلنے کے لیے گھر سے نکلا ہو۔ وہ دائیں بائیں دکانوں کے اندر اور باہر لٹکے ہوئے قالینوں کو بھی دیکھتا جا رہا تھا لیکن وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ ایک جگہ وہ چلتے چلتے رک گیا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ رک کر دکان میں لٹکے ہوئے قالین کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس کی توجہ اس تنگ دروازے پر مرکوز تھی جو دو دکانوں

کے بیچ میں نظر آ رہا تھا۔ دونوں دروازوں پر ٹنگے ہوئے قالینوں کی وجہ سے یہ دروازہ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت دونوں دکانوں پر گاہک موجود تھے۔ شہباز نے کن انکھیوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دوسرے لمحے وہ تیزی سے دروازے میں گھس گیا۔ پر تنگ دروازہ اور تاریک سی ڈیوڑی تھی۔ سامنے ہی لکڑی کا زینہ تھا۔ شہباز زینے کے اوپر چلنے لگا۔

یہ وہ جگہ تھی جس کے بارے میں صمدی نے اسے بتایا تھا۔ شہباز بے چارہ تو ان تمام باتوں سے مکمل طور پر ناواقف تھا لیکن نریمان فرازی جانتا تھا کہ ایران کے کون سے حصے میں اس کے کون سے وفادار موجود ہیں۔ یہ عمارت بازار بزرگ کی غالباً سب سے قدیم عمارت تھی۔ زینہ نہایت خستہ تھا۔ تختے اس کے قدموں کے نیچے چرچرا رہے تھے وہ پہلی منزل کے دروازے پر رک گیا۔ یہاں اچھی خاصی تاریکی تھی۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک منٹ بعد اس نے دوبارہ دستک دی اس مرتبہ اسے زنجیر ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی پھر دروازہ چند منٹ کے بعد کھلا اور ایک عورت کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔

”کون ہو تم۔ کس سے ملنا چاہتے ہو۔“ عورت نے پوچھا۔

”خانم نوشابہ سے ملنا ہے۔“ شہباز نے جواب دیا۔

”یہاں کوئی نوشابہ نہیں رہتی۔“ عورت نے جواب دیا اور دروازہ بند کرنا چاہا لیکن شہباز نے جلدی سے پیر آگے پھنسا دیا۔

”پردیسیوں کے ساتھ یہ سلوک اچھا نہیں ہے اجنبی مہمان کیا سوچے گا۔ اس نے کہا۔

”کک.....کون، کون۔“ عورت چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگی پھر بولی میں تمہیں پہچان نہیں سکی تھی اندر آ جاؤ۔“ شہباز اندر داخل ہو گیا، عورت نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی تھی۔ یہ تو نوشابہ ہی تھی کمرے میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی کمرے میں پہنچنے کے بعد ہی شہباز اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکا تھا اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ خاصی حسین عورت تھی اس نے شفون کی میکسی پہن رکھی تھی۔ جس میں اس کا سنہری بدن جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نریمان فرازی نے شہباز کے کان میں کہا۔

”یہ ایک رقاصہ ہے اس کا شمار تہران کی صف اول کی رقاصاؤں میں ہوتا تھا۔ اس کے

پروگرام بڑے بڑے نائٹ کلبوں میں ہوتے تھے۔ جس رات جس کلب میں اس کا پروگرام ہوتا وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ اس کا آخری پروگرام رائل کلب میں ہوا تھا اور یہ اس دن کی بات ہے جب شاہ کے فرار ہونے میں صرف دو روز باقی تھے ایک طرف انقلابی سرگرمیاں عروج پر تھیں تو دوسری طرف ابلیس کے پجاری دولت مند لوگ عیش و عشرت میں مصروف تھے۔ بعض سنجیدہ لوگ وقت کی نبض کو دیکھتے ہوئے آنے والے دور کا اندازہ لگا چکے تھے اور اپنے بچاؤ کا بندوبست کر رہے تھے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو شہر میں ہونے والے ہنگاموں کو محض باسی کڑھی اُبال سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاہ کی طاقتور سلطنت سے ٹکرانا کوئی آسان بات نہیں ہے لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ جب سینوں میں دین کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس سیلاب کا راستہ نہیں روک سکتی۔ ٹینکوں سے مجسموں کو تو کچلا جا سکتا ہے لیکن روح کو نہیں کچلا جا سکتا۔ شہر میں ہونے والے ہنگاموں کے ساتھ دولت مند طبقے کی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اس رات رائل کلب میں ہونے والے پروگرام کی خوب مشہوری کی گئی تھی۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی خوب میزیں بھر گئیں تھیں اور اس رات دو بجے رقص ابلیس عروج پر تھا انقلاب کے حامیوں نے رائل کلب پر ہلہ بول دیا۔ وہ بے شمار افراد تھے جنہوں نے رائل کلب کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ درجنوں آدمی اندر گھس آئے تھے ایک ہنگامہ ہو گیا۔ عورتوں کی چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ اس رات صمدی بھی رائل کلب میں موجود تھا۔ نریمان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ صمدی اور نوشابہ میں تعلقات کس طرح قائم ہوئے۔ نوشابہ جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھی۔ لوگ اس کا ایک رات کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن نجانے کیوں نوشابہ نے صمدی کا انتخاب کیا تھا حالانکہ صمدی کے پاس نہ دولت تھی اور نہ ہی اسے اچھا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لوگ بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ حملہ آور اس کے اسٹیج پر چڑھ گئے۔ نوشابہ چیختی ہوئی اسٹیج کے پچھلے حصے کی طرف دوڑی صمدی اسٹیج سے کافی دور تھا وہ نوشابہ کی مدد کے لیے ڈریسنگ روم کی طرف دوڑا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر نوشابہ حملہ آوروں کے ہتے چڑھ گئی تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کلب کی دوسری رقاصائیں نیم عریاں لباسوں میں چیختی ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔

صمدی ڈریسنگ روم میں پہنچا تو نوشابہ وہاں نہیں تھی اس دوران حملہ آوروں نے کلب کو آگ لگا دی۔ شعلے بھڑکنے لگے۔ چیخوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ پھر نوشابہ کی چیخ سن کر ہی صمدی عقبی دروازے کی طرف دوڑا تھا۔ دو آدمی نوشابہ کو گھسیٹتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف لے جا رہے تھے نوشابہ چیختے چلاتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

صمدی نے اس طرف دوڑ لگائی وہ دونوں آدمی نوشابہ کو گھسیٹتے ہوئے سوئمنگ پول کے کنارے پہنچ چکے تھے اور اب اسے اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینکنا ہی چاہتے تھے کہ صمدی نے ان پر چھلانگ لگا دی یہ مزاحمت ان دونوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ نوشابہ ان کی گرفت سے نکل گئی۔ صمدی نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ان پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ صمدی نے ایک آدمی کو اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک دیا۔ دوسرے کی کھوپڑی پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ شخص کراہتا ہوا سوئمنگ پول کے کنارے پر گرا۔ چنانچہ صمدی نے اسے بھی اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک دیا اور نوشابہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ صمدی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اسے لے کر درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ صمدی نوشابہ کو لے کر سوئمنگ پول کے دوسری طرف بہت دور عقبی دیوار پھلانگ گیا۔ اس طرح وہ نوشابہ کو اس ہنگامے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس رات نوشابہ اپنے مکان پر بھی نہیں گئی اور صمدی اس بازار بزرگ کے اس مکان میں لے آیا۔ یہ مکان اس کے ایک عزیز کا تھا جس کا انتقال ہو چکا تھا اور یہ مکان عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا اس کے بعد سے نوشابہ یہیں رہ رہی تھی۔

نریمان نے بتایا کہ جب وہ تہران میں تھا تو بہت سی بار صمدی کے ساتھ نوشابہ سے مل چکا تھا۔ اس وقت چونکہ وہ میک اپ میں تھا اس لیے نوشابہ اسے نہیں پہچان سکی تھی۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ نجانے نریمان فرازی کی آواز اس کے تمام شناساؤں کے ذہنوں میں کیوں اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی آواز سے اسے پہچان لیا جاتا تھا۔ نوشابہ نے سوال کیا۔

”کیا صمدی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔“

”نہیں۔“

”کیا بات ہے تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔“

”پولیس سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ صمدی زخمی ہے اسے گولی لگی تھی میں اس کے لیے

پریشان ہوں۔“ شہباز نے جواب دیا۔

”کیا مطلب۔ وہ زخمی ہے اور تم اسے چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔ نوشابہ کافی پریشان ہو گئی۔

”نہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ گولی بازو پر لگی تھی۔ معمولی سا زخم ہے وہ ابھی پہنچنے ہی والا ہو گا۔“ نوشابہ بہت زیادہ بے چین ہو گئی۔ شہباز ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ شیفون کی میکسی میں سے جھلکتا ہوا نوشابہ کا گداز بدن دعوت گناہ دے رہا تھا لیکن نریمان فرازی اس وقت نریمان فرازی نہیں بلکہ شہباز تھا۔ شہباز کے اگر تھوڑا سا دل میں گداز پیدا ہوا تھا تو وہ ناتاشیہ کے لیے تھا باقی اور کوئی اسے متاثر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نوشابہ کی طرف صرف اسی لیے دیکھ رہا تھا کہ اسے پریشانی سے باز رکھ سکے۔ صمدی کے زخمی ہونے کی اطلاع نے نوشابہ کو پریشان کر دیا تھا۔ ویسے تو شہباز بھی نریمان فرازی کی حیثیت سے صمدی کے لیے پریشان تھا۔ اگر صمدی خود یہ ضد نہ کرتا تو وہ کبھی اسے چھوڑ کر نہ آتا۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ اگر ایک پکڑا جائے تو دوسرا تو محفوظ رہے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا اب شہباز واقعی پریشان ہونے لگا تھا پھر اچانک وہ چونک اٹھا چوبی زینے پر ہلکے ہلکے تختوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی تھی۔ جیسے کوئی بہت ہی محتاط قدموں سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر قدموں کی آواز رک گئی اور چند لمحوں کے بعد دروازے پر ہلکی ہلکی دستک سنائی دی۔ نوشابہ نے شہباز کو اشارہ کیا اور شہباز کرسی سے اٹھ کر دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ جب دروازہ کھلا تو وہ مکمل طور پر اس کے پیچھے چھپ گیا اس طرح آنے والا صمدی کے بجائے کوئی اور ہوتا تو اس پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا۔ نوشابہ نے محتاط انداز میں دروازہ کھول کر دیکھا سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ایک سایہ سامنے کھڑا تھا۔ دروازے سے آنے والی ہلکی سی روشنی میں اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن پھر اس نے چہرے سے چادر ہٹائی وہ صمدی ہی تھا۔ نوشابہ نے دروازہ کھول دیا اور صمدی کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ صمدی کو دیکھ کر شہباز کے چہرے پر ایک سکون کی کیفیت پھیل گئی۔

نوشابہ کی حالت بھی البتہ قابل دید تھی۔ صمدی کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی لیکن پھر شہباز کا خیال کر کے وہ ہٹ گی۔ اس نے کہا۔

"کہاں گولی لگی ہے زخم کہاں ہے۔" وہ وحشت زدہ نگاہوں سے صمدی کے پورے جسم کو دیکھنے لگی۔ صمدی نے جسم پر لپٹی ہوئی چادر ہٹا دی۔ اس کی بائیں آستین اوپر سے نیچے تک خون میں تر ہو رہی تھی۔ قمیض کے دوسرے حصوں پر بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر ہلکی سی نقاہت نظر آ رہی تھی۔ نوشابہ نے دوڑ کر فرسٹ ایڈ بکس اٹھایا شہباز نے صمدی کو کرسی پر بٹھا کر اس کی قمیض اتار دی اور زخم صاف کر کے ڈریسنگ کرنے لگا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

"یہاں تک آنے کے لیے کوئی دشواری تو نہیں پیش آئی۔" شہباز نے سوال کیا۔

"زیادہ نہیں میدان فردوسی کے بازاروں میں بھاگتے ہوئے میں نے ایک عورت سے یہ چادر چھین لی تھی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہماری تلاش کا سلسلہ یہاں تک پھیل چکا ہے۔ بازار بزرگ کی پارچہ جات والے سیکشن میں، میں نے پاسداران کو چیکنگ کرتے ہوئے دیکھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی سرگرمی سے ہماری تلاش میں ہیں۔ میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔" شہباز نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی۔ پھر بولا۔

"لیکن صمدی تمہاری کار ان کے قبضے میں پہنچ گئی ہے۔ وہ کار کے ذریعے تمہارے مکان تک پہنچ جائیں گے۔" صمدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

"نہیں یہ کار میں نے جس شخص سے خریدی تھی وہ اس کے اگلے روز ایران سے فرار ہو گیا تھا کاغذات اسی کے نام پر ہیں۔ مجھے ٹرانسفر کرانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ اگر پولیس یا انٹیلی جنس نے لائسنس پلیٹ کے ذریعے کار کے مالک کا پتہ چلا بھی لیا تو وہ اس کو تلاش کرتے رہیں گے۔ کوئی نہیں جان پائے گا کہ یہ کار میری ملکیت ہے۔"

"گڈ......" شہباز کی زبان سے نریمان فرازی کی آواز نکلی۔

بہر حال صورتحال پر غور کرتے ہوئے شہباز نے کہا۔

"کافی الجھے ہوئے حالات ہیں اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارا رخ کسی بھی طور کامیابی کی جانب نہیں ہے۔ کیونکہ تم اپنے اصل مشن کا آغاز ابھی تک نہیں کر سکے۔ ایران کی حدود میں داخل ہوتے ہی کمیٹی اور انٹیلی جنس والے میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ تلاتی نے

الگ جال بچھا رکھا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں سے پیچھا چھڑا کر میں اصل کام پر توجہ دوں گا لیکن معاملات کی الجھنوں نے ابھی تک مجھے اپنے اصل کام کی طرف توجہ ہی نہیں لینے دی۔

بہر حال اب زیادہ وقت نہیں صرف کرنا چاہیے۔ یہ مجبوری ہے کہ میں ان لوگوں کے خلاف کوئی ایسا ٹھوس قدم اٹھاؤں جس سے اپنا کام شروع کیا جائے اگر ایسا نہ ہوا تو شاید مرتے دم تک ایران سے باہر نکلنا نصیب نہ ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے اگر تم یہ سمجھتے ہو تو پھر ہمیں دوسرا قدم اٹھانا ہو گا۔"

"دوسرا قدم کیا ہو گا۔" نریمان فرازی نے اپنے قابل اعتماد دوست صمدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کل ہی کرنل حیات اور عادل سرائی کو گولی سے اڑا دوں گا۔" صمدی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"لیکن ان دونوں کو قتل کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ بلکہ صورتحال کچھ اور الجھ جائے گی۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔"

وہ کیا؟" صمدی نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"نوشابہ کچھ کھلاؤ گی نہیں۔ معدہ خالی ہو تو دماغ بھی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"اگر مجھے تم لوگوں کے آنے کی اطلاع ہوتی تو میں بہت کچھ بندوبست کرتی لیکن بہر حال اب جو کچھ بھی ہے پیش کر دیتی ہوں۔" نوشابہ اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ تینوں کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد خاموشی رہی البتہ کھانے کے بعد نوشابہ نے بہترین کافی انہیں پیش کی اور کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے نریمان فرازی شہباز کے ذریعے اپنا منصوبہ بتانے لگا۔

"میرا منصوبہ یہ ہے کہ عادل سرائی اور کرنل حیات کو تلاتی کے پیچھے لگا دیا جائے۔ یہ تینوں آپس میں لڑتے رہیں اور ہم آرام سے اپنا کام کر لیں۔"

"کیا یہ اتنا ہی آسان ہو گا۔" صمدی نے سوالیہ نگاہوں سے شہباز کو دیکھا اور نریمان فرازی جلدی سے بولا اٹھا۔

"اصل میں ان تینوں کو آپس میں الجھانے کے لیے ایک منصوبہ میرے ذہن میں ہے

میں مختصراً تمہیں اس کی تفصیل بتا رہا ہوں۔ نریمان فرازی صمدی کو سمجھانے لگا پھر بولا۔
"میں نے نتاشیہ کو اس لیے کرنل حیات کے پیچھے لگایا تھا کہ ہم اپنے بارے میں اس کے پروگرام سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔ لیکن نتاشیہ نے ابھی تک ہمیں کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔ میرا خیال تھا کہ کرنل حیات نے میرے بارے میں باقاعدہ پلاننگ کی ہوگی۔ اس لیے میں نے نتاشیہ کو ایک منی کیمرہ بھی دے دیا تھا کہ وہ موقع پا کر اس کے بریف کیس میں رکھے ہوئے کاغذات کی تصویریں کھینچ لے لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ کرنل حیات بہت محتاط آدمی ہے۔ بہر حال کل رات تم نتاشیہ سے رابطہ قائم کرو گے۔"
شہباز ایک بار پر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں کے بعد اس نے صمدی کو سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہو گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نریمان فرازی نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ واقعی بہت شاندار تھا وہ یقینی طور پر ایک کامیاب منصوبہ ہوتا۔

دوسرا دن انہوں نے نوشابہ کے فلیٹ میں ہی گزارہ اور پھر شام کا اندھیرا پھیلتے ہی حرکت میں آ گئے۔ رات کے بارہ بجے سے کچھ پہلے اس نے انٹیلی جنس کے دفتر فون کر کے بتایا کہ نریمان فرازی اور اس کے گروہ کے چند آدمی یوسف آباد کے ایک فیشن ایبل بنگلے میں موجود تھے۔ ان کا پروگرام رات بنگلے میں گزارنے کا ہے۔ اگر انٹیلی جنس کو نریمان فرازی سے دلچسپی ہے تو اس کے ساتھیوں سمیت اس بنگلے سے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کرنل حیات دفتر میں موجود نہیں تھا۔ لیکن نریمان فرازی کو معلوم تھا کہ اس تک اطلاع پہنچتے ہی چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ انٹیلی جنس کو فون کرنے سے پہلے نریمان فرازی ایک اور حرکت کر چکا تھا جس پر شہباز خود حیران رہ گیا تھا۔

شہباز تو در حقیقت اس وقت نریمان فرازی ہی بنا ہوا تھا کبھی کبھی تو اسے شبہ ہوتا تھا کہ اصل میں نریمان فرازی کا بدن نہیں غائب کیا گیا ہے بلکہ شہباز کا ذہن غائب ہو چکا ہے اور نریمان فرازی اس کے جسم پر قابض ہے۔ رات کے دس بجے کے قریب اس نے کمیٹی کے مقامی دفتر کو فون کر کے عادل سرائی کو فون کیا اور اپنے آپ کو نریمان فرازی کا ایک پرانا ساتھی ظاہر کر کے یہ اطلاع دی کہ نریمان فرازی اور اس کے ساتھی آج رات بارہ بجے کے قریب آباد کے بنگلے میں آنے والے ہیں اگر وہ چاہے تو اپنے آدمیوں کے ساتھ پہلے بنگلے میں چھپ جائے اور جب نریمان فرازی اور اس کے ساتھی وہاں پہنچیں تو انہیں گرفتار کر لیا

جائے اس نے یوسف آباد والے بنگلے کا نمبر بتا دیا تھا۔ عادل سرائی اس کا نام پوچھتا رہ گیا تھا لیکن شہباز نے فون بند کر دیا تھا۔ عادل سرائی شہباز کی توقع سے کچھ زیادہ ہی بیوقوف ثابت ہوا تھا۔ اس نے صرف یہ معلوم کر لیا تھا کہ جس بنگلے کا نمبر بتایا گیا ہے وہ ملکہ فرح کے ایک دُور کے عزیز کی ملکیت تھا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ نریمان فرازی کے بارے میں دی جانے والی اطلاع میں صداقت کتنے فیصد تھی۔ اس کے لیے یہی اطلاع تھی کہ یہ بنگلہ ملکہ فرح کے کسی رشتے دار کا تھا اور یقینی طور پر اسے کسی مقصد کے لیے یا ایک ایسے جرائم پیشہ شخص کے لیے ملکہ فرح کا بنگلہ سب سے بہتر ہو سکتا تھا۔

وہ اپنے چھ آدمیوں کو لے کر رات گیارہ بجے اس بنگلے پر پہنچ گیا۔ وسیع و عریض بنگلہ خالی پڑا ہوا تھا۔ تھوڑا بہت فرنیچر وہاں موجود تھا جو پہلے سے توڑ پھوڑ دیا گیا تھا۔ عادل سرائی اور اس کے آدمیوں کے پاس سب مشین گنیں تھیں اور اس نے اپنے آدمیوں کو بنگلے میں اس طرح مختلف جگہوں پر چھپا دیا تھا کہ وہ کسی کو نظر نہ آ سکے اور اگر نریمان فرازی اور اس کے ساتھی وہاں پہنچیں تو بچ کر نہ جا سکیں۔ یہ تمام انتظامات کرنے کے بعد وہ وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ سوا بارہ بجے کے قریب چند آدمی بہت محتاط انداز میں بنگلے میں داخل ہوئے اور جیسے ہی آگے بڑھے، عادل سرائی کے ایک ماتحت نے وارننگ دیئے بغیر آنے والوں پر فائر کھول دیا۔ آنے والوں میں سے ایک چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اس کے دوسرے ساتھیوں نے پوزیشن سنبھال کر فائرنگ شروع کر دی۔

دونوں طرف سے زبردست فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔ آدھے گھنٹے تک یوسف آباد کا علاقہ گولیوں کی آواز میں گونجتا رہا آنے والوں کی تعداد زیادہ تھی ان کا ایک آدمی مارا جا چکا تھا جبکہ عادل سرائی کے تین آدمی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اب عادل سرائی کے پاس صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ چوتھا وہ خود تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ان لوگوں کی آمد سے پہلے بنگلے میں پوزیشن لے کر حماقت کی تھی۔ اسے باہر چھپ کر بنگلے کو گھیرے میں لے لینا چاہیے تھا۔ جب نریمان فرازی اور اس کے ساتھی بنگلے میں گھستے تو انہیں گھیرے میں لے لیتا لیکن اب وہ خود گھیرے میں تھے اور تین آدمیوں کی جانیں ضائع ہونے کے بعد سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور گھیرے میں رہے تو حملہ آور انہیں بھی ختم کر دیں گے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو پسپائی کا حکم دے دیا اور وہ لوگ بڑی مشکل سے بنگلے سے نکل کر فرار ہونے میں

کامیاب ہو سکے۔ بھاگتے ہوئے اچانک عادل سرائی کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نریمان فرازی اوراس کے ساتھی بعد میں آئے تھے بنگلے سے فائرنگ ہونے کے بعد تو انہیں بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہ صرف مقابلے پر ڈٹے رہے بلکہ خود انہیں میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ عادل سرائی کی گاڑی وہاں سے تقریباً دو فرلانگ دور کھڑی تھی۔ اس نے کار کے ریڈیو پر اپنے دفتر سے رابطہ قائم کر کے مزید فورس طلب کی اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک درجن آدمی وہاں پہنچ گئے اور جب وہ اس بنگلے میں پہنچے تو صورتحال جان کر عادل سرائی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

وہ جن حملہ آوروں کو نریمان فرازی اوراس کے ساتھی سمجھا وہ انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔ جنہوں نے اس اطلاع پر بنگلے پر چھاپہ مارا تھا کہ نریمان فرازی اوراس کے ساتھی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نریمان فرازی نے انہیں اتنی خوبصورتی سے بے وقوف بنا دیا اور آپس کے تصادم میں ان دونوں پارٹیوں کے چار آدمی مارے گئے ہیں اسی دوران صمدی نتاشیہ سے رابطہ قائم کر کے اسے پستول پہنچا کر اس سے منی کیمرہ لے آیا تھا اور رات کے آخری پہر تین بجے کے قریب جب کرنل حیات کو یہ اطلاع ملی کہ نریمان فرازی نے انہیں اور کمیٹی والوں کو بیوقوف بنایا تھا تو ٹھیک اسی وقت نریمان فرازی منی کیمرے سے نکالی گئی فلم ڈویلپ کر رہا تھا اور چند منٹ کے بعد تیار شدہ پرنٹس کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک پرنٹ پر نظر آنے والی تحریر پڑھتے ہی وہ اس طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔ وہ ایک بار پھر اس تحریر کو پڑھنے لگا اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

✡......✡

شہر بھر میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دو سکیورٹی کمپنیوں کا آپس میں متصادم ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک ایسے شخص نے ان لوگوں کو پاگل بنایا تھا جو حکومت ایران کو سب سے زیادہ مطلوب تھا اور جس کے سر کی بھاری قیمت مقرر تھی۔ انقلابی حکومت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کھل کر ان سکیورٹی ایجنسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا، جن کا کام صرف یہ تھا کہ وہ ایسے لوگوں پر نگاہ رکھیں جنہیں سرزمین ایران پر انقلابی تبدیلی پسند نہیں آئی تھی۔ مذہبی روایات سے بے گانہ، بے حیائی اور بے غیرتی کے یہ علمبردار آزاد رہنا

چاہتے تھے۔ ایک مرد قلندر نے یہ طاغوتی حصار توڑ دیا تھا۔ تاریکی اور بدلی کا دیوتا اس ملک سے فرار ہو چکا تھا۔ ایک نیا سویرا طلوع ہو چکا تھا۔ اجالے پھیل رہے تھے لیکن کچھ ایسے لوگ اب بھی موجود تھے جو اندر ہی اندر اس اسلامی انقلاب کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ یہ لوگ جان کے خوف سے البتہ کھل کر بھی سامنے نہیں آئے تھے لیکن کسی موقع پر انقلابی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنا کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ الزام بھی لگایا جا رہا تھا کہ چونکہ نریمان فرازی کی گرفتاری پر بھاری انعام مقرر ہے اس لیے ان دونوں سکیورٹی کمپنیوں کے نااہل افسران نے انعام کے لالچ میں سوچے سمجھے بغیر یہ کاروائی کر ڈالی تھی۔ جس میں ان کے اپنے ہی چار آدمی مارے گئے تھے۔ اگر یہ دونوں مل کر پلاننگ کرتے اور اس اطلاع کی تصدیق کرتے تو یہ افسوس ناک حادثہ پیش نہ آتا لیکن لالچ انہیں لے ڈوبا۔ یہ الزام لگانے والے حلقوں کی طرف سے مطالبہ بھی کیا جا رہا تھا کہ ان نا اہل افسروں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں بدترین سزا دی جائے۔ اس طرح صورتحال کافی سنگین ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ کرنل حیات کی بری حالت تھی۔ وہ شدید جھنجلایا ہوا تھا۔ کرنل حیات نے اپنے چیف حمادی کو اس واقع کی اطلاع دینی چاہی تھی لیکن وہ تہران میں موجود نہیں تھا۔ وہ دو دن پہلے قم گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کرنل حیات نے قم کے فون نمبر پر بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کرنل حیات گزشتہ رات سے دفتر میں تھا۔ پورا دن گزر گیا تھا اور اب شام ہو چکی تھی۔ اس کا لباس مسلا ہوا اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا سارا دن چائے اور کافی پیتے ہوئے گزر گیا تھا۔ جس سے اس کی طبعیت اور زیادہ خراب ہو گئی تھی اور اب تو چائے یا کافی کے تصور ہی سے اس کی حالت خراب ہونے لگی تھی سگریٹ پی پی کر حلق خشک ہونے لگا تھا اور کانٹے سے پڑنے لگے تھے اس وقت بھی اس کے منہ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ اس نے کش لگایا تو یوں لگا جیسے پیٹ میں آنتیں الٹ گئیں ہوں۔ اسے تے سی محسوس ہونے لگی اس نے سگریٹ میز کے کونے پر رکھی ہوئی ایش ٹرے سے مسل ڈی۔ ٹھیک اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی اس نے لپک کر رسیور اٹھا لیا۔

''ہاں کون...... میں کرنل حیات بول رہا ہوں۔'' وہ ماؤتھ پیس میں دھاڑا۔

''بہت غصے میں ہو اس ناگہانی نے شاید تمہارا دماغ کافی خراب کر دیا ہے۔''

"کون ہو تم؟" کرنل حیات کے لہجے میں بدستور تندی تھی۔

"جس کی تمہیں تلاش ہے نریمان فرازی۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور کرنل حیات کو یوں لگا جیسے چھٹانک بھر پسا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کے ماتحت اس کی یہ حالت دیکھ کر بری طرح چونک گئے۔ کرنل حیات نے بمشکل ریسیور اٹھایا۔

"تت......تم۔" وہ ہکلا کر بولا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سمجھے میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کتے کے بچے۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور کن اکھیوں سے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ان کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ نریمان فرازی سے بات کر رہا ہے۔

"زندہ چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میں تمہاری گرفت میں آؤں لیکن تم۔"

"تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے اور نہ ہی تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ میری پیشانی پر رسوائی کا جو دھبہ لگا ہے وہ صرف تمہارے خون سے دُھل سکتا ہے میں دنیا کے آخری سرے تک تمہارا تعاقب کروں گا۔" کرنل حیات نے یہ کہتے ہوئے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے اپنے ایک ماتحت کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ماتحت کی تحریر کے ذریعے ہدایت کی تھی کہ دوسرے فون ایکسچینج سے یہ معلوم کرے کہ اس نمبر پر کال کہاں سے آرہی ہے۔ ماتحت فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

"تم تہران میں تو مجھے ابھی تک تلاش نہیں کر سکے دنیا کے آخری سرے تک میرا تعاقب کیا کرو گے۔ نریمان فرازی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔"

"لیکن میں تمہیں روکوں گا تمہیں ایسی خوفناک سزا دوں گا کہ ایران میں پھر کسی مجرم کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی۔" کرنل حیات نے کہا وہ نریمان فرازی کو باتوں میں لگا کر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس دوران میں معلوم کیا جا سکے کہ وہ کس نمبر سے بات کر رہا ہے۔"

"جو شخص خود مجرم ہو وہ دوسروں کو کیا سزا دے سکتا ہے۔" نریمان فرازی نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا بکتے ہو۔" کرنل حیات غرایا۔

"میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے سمجھے۔" نریمان فرازی نے کہا۔

"کیا بکتے ہو؟ کرنل حیات دہاڑا۔

"سزا مجھے نہیں تمہیں ملے گی کرنل حیات۔ یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ تم کل کا سورج طلوع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکو گے۔" نریمان فرازی نے کہا اور اچانک لائن بے جان ہو گئی۔ اسی لمحے کرنل حیات کا ماتحت کمرے میں داخل ہوا اس نے کاغذ کی سلپ کرنل حیات کی طرف بڑھا دی۔ کرنل حیات نے ریسیور پٹخ دیا اور وہ سلپ اٹھالی۔

"پبلک بوتھ نمبر تیس بازار بزرگ۔" چلو جلدی کرو ایک درجن آدمی تیار کرو۔ وہ ابھی اس علاقے میں ہوگا۔ کرنل نے اپنے ماتحت سے کہا اور پھر مختلف احکامات جاری کرنے لگا۔ دو منٹ کے اندر اندر دو گاڑیاں طوفانی رفتار سے بازار بزرگ کی جانب جا رہی تھیں۔ ان میں کرنل حیات کے علاوہ چودہ افراد تھے جو سب مشین گنوں سے مسلح تھے۔ انہیں بازار بزرگ میں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ پبلک ٹیلی فون نمبر تیس بازار کے اس سیکشن میں تھا جہاں کراکری وغیرہ کی دکانیں تھیں یہ بوتھ ایک گلی کے موڑ پر تھا لیکن اس وقت خالی تھا۔ کرنل حیات کے حکم پر اس کے آدمیوں نے اردگرد کے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ اسے یقین تھا کہ نریمان فرازی ابھی اسی علاقے میں ہوگا بازار کو اس طرح گھیرے میں لیے جانے پر خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔

کرنل حیات کے آدمی ہر مشتبہ شخص کو روک کر پوچھ گچھ کرنے لگے۔ کرنل حیات خود لوگوں کے شناختی کارڈ چیک کر رہا تھا۔ وہ اس وقت ٹیلی فون بوتھ سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر کھڑا ایک آدمی کے کاغذات چیک کر رہا تھا کہ دائیں طرف سے ایک بوڑھا اور ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ بوڑھا کلین شیو تھا چہرے پر باریک سی جھریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے کمر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ پچھتر سال کے قریب لگایا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ عورت سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ چادر پر سفید چھوٹے چھوٹے پولکا ڈاٹس بنے ہوئے تھے۔ اس کا جسم پوری طرح چادر میں لپٹا ہوا تھا

صرف آنکھیں اور ہاتھ برہنہ تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے چادر کا کونا تھام رکھا تھا اور دوسرے میں کوئی بنڈل تھا۔ اس عورت کی عمر کوئی بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کرنل حیات کے ایک ماتحت نے انہیں روک لیا۔ بوڑھے نے اپنے کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس وقت کرنل حیات دوسرے آدمی کے کاغذات واپس کرتے ہوئے اس چادر پوش عورت کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ نرم و نازک انگلیاں دیکھ کر کرنل حیات کی رال ٹپکنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت عورت کے کان میں اڑسا ہوا چادر کا ایک کونا باہر نکل گیا۔ چادر کا نقاب نما حصہ لڑھک گیا اور عوت کا چہرہ نمایاں ہوگیا۔ عورت نے بڑی عجلت سے بنڈل نیچے رکھا اور پھر چادر کا کونا درست کرنے لگی لیکن کرنل حیات اس کا چہرہ دیکھ چکا تھا حسین وجمیل چہرہ دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ نجانے اسے یہ احساس کیوں ہوا تھا کہ یہ چہرہ پہلے بھی اس نے کہیں دیکھا ہے اس نے ایک بار پھر اس عورت کی طرف دیکھا اب صرف عورت کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اور کرنل حیات کو یہ آنکھیں بھی جانی پہچانی لگ رہی تھیں لیکن اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے یہ حسین چہرہ اور نشیلی آنکھیں کب اور کہاں دیکھی تھیں۔

کرنل حیات کے ماتحت نے بوڑھے کے کاغذات واپس دے کر کہا۔

”اس عورت سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔“ اس نے بوڑھے سے سوال کیا۔

”میری بہو ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میرا بیٹا ایرانی فوج میں سارجنٹ ہے اور اس وقت محاذ پر عراق کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ کرنل حیات کے ماتحت نے اسے اشارہ کیا۔ بوڑھے نے عورت کو اشارہ کیا اور اس نے زمین پر پڑا ہوا بنڈل اٹھایا اور بوڑھے کے ساتھ چل پڑی۔ کرنل حیات کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ اس حسینہ کو اس نے کب اور کہاں دیکھا تھا کرنل حیات ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ایک ماتحت نے کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔

”نوشابہ سر۔“ ایران میں کولڈ ڈرنک کو نوشابہ کہا جاتا ہے۔ کرنل حیات نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا اور وہ بری طرح اچھل پڑا۔ اسے یاد آگیا کہ وہ حسینہ نوشابہ تھی۔ مشہور اور معروف رقاصہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ

نوشابہ صمدی کی داشتہ تھی اور صمدی نریمان فرازی کا دوست تھا۔ نریمان فرازی کے ایران سے فرار ہونے کے بعد صمدی بھی غائب ہوگیا تھا کرنل حیات کو یقین تھا کہ نریمان فرازی اب بھی صمدی کے آس پاس ہی ہوگا۔ وہ نوشابہ کے ذریعے صمدی اور نریمان فرازی تک پہنچ سکتا ہے۔

”بھاگو......“ وہ اپنے ماتحتوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”اس بوڑھے اور اس کے ساتھ چادر پوش عورت کو تلاش کرو۔ جلدی کرو چاروں طرف پھیل جاؤ۔ کرنل حیات خود بھی اسی طرف بھاگا، جس طرف بوڑھا اور چادر پوش عورت گئے تھے۔ ایک بار پھر بھاگ دوڑ شروع ہوئی بوڑھے اور عورت کو گئے ہوئے صرف دو منٹ ہوئے تھے لیکن وہ اس طرح غائب ہو چکے تھے جیسے اس دنیا میں ان کا وجود ہی نہ ہو۔

کرنل حیات انہیں تلاش کرتا ہوا بازار بزرگ کے قالینوں والے سیکشن میں پہنچ گیا اور اچانک وہ ٹھٹھک گیا اسے یوں لگا جیسے دو سائے قالینوں کے درمیان کہیں غائب ہو گئے ہوں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا۔ قالینوں کے درمیان ایک تنگ سا دروازہ تھا اندر تاریک ڈیوڑھی تھی اس نے جھانک کر دیکھا، لکڑی کے زینے پر کوئی نہیں تھا اس نے اندر داخل ہو کر ڈیوڑھی کے زینے کے پیچھے دیکھا۔ مگر وہاں کسی کا وجود نہیں تھا وہ باہر آگیا اور متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

کرنل حیات کی تلاش ناکام ہو چکی تھی وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ پبلک ٹیلی فون بوتھ کیس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ماتحت اب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ لیکن اچانک کرنل حیات کے ذہن میں ایک اور خیال گزرا۔

”ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ میں دفتر تھوڑی دیر بعد پہنچوں گا اور تم سب لوگ میرے آنے تک دفتر موجود رہو گے۔ کوئی آدمی ادھر ادھر نہیں ہوگا۔“ کرنل حیات یہ کہتے ہوئے بازار کے قالینوں والے سیکشن کی طرف چل پڑا۔ وہ چادر پوش عورت نوشابہ ہی تھی اور اس کے ساتھ وہ بوڑھا نریمان فرازی تھا اس کا میک اپ اس قدر مکمل اور شاندار تھا کہ کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فریدوں نے شہباز کو ایسا اعلیٰ تحفہ دیا تھا کہ جس کی کوئی مثال ممکن نہیں تھی۔ شہباز جسمانی طور پر تو قیامت تھا ہی لیکن فریدوں نے اس قیامت کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

بہر حال شہباز دل ہی دل میں کرنل حیات کی پھرتی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا وہ فون کال کے بعد چند منٹ کے اندر اندر اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے فون کیا گیا تھا۔لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی وہ نریمان فرازی کو نہیں پہچان سکا۔ البتہ جب نوشابہ کے چہرے سے چادر ہٹ گئی تھی اور کرنل نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو شہباز کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا کہ نوشابہ کو پہچان لیا گیا ہے لیکن اس وقت تو نہیں البتہ کچھ دیر کے بعد کرنل حیات نے اسے پہچانا تھا اور اب بڑی شدومد سے ان دونوں کی تلاش شروع ہوئی تھی۔ جبکہ نریمان فرازی یا شہباز نوشابہ کو لے کر بڑی تیزی سے مختلف گلیوں میں گھومتا ہوا بحفاظت نوشابہ کے فلیٹ میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں صمدی ان کا منتظر بیٹھا ہوا تھا اس نے قمیض اتار رکھی تھی اور بائیں بازو پر پٹی باندھی ہوئی تھی وہ لوگ بہت دیر تک تازہ ترین حالات پر گفتگو کرتے رہے۔اس دوران شہباز نے اپنے چہرے سے بوڑھے والا میک اپ صاف کر دیا تھا۔

ہر طرف مکمل سناٹا طاری تھا کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ان گلیوں میں دن کے وقت لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی لیکن جونہی رات ہوتی یہ جگہ قبرستان بن جاتی۔ وہ تینوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ہی صمدی چونک پڑا۔اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔شہباز اور نوشابہ بھی گوش برآواز ہو گئے۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد انہوں نے یہ بھی آواز سن لی۔وہ ایک سے زیادہ لوگوں کی آواز تھی۔ جیسے کچھ لوگ بہت زیادہ محتاط انداز میں سڑک پر چل رہے ہوں۔صمدی نے جلدی سے قمیض پہن لی اور اٹھ کر دبے قدموں کھڑکی کی طرف چلا گیا کھڑکی کے سامنے دبیز پردہ پڑا ہوا تھا اس نے بڑے محتاط انداز میں پردے کا ایک کونا سرکایا۔ وہ بازار میں جھانکنے لگا اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اسے دو انسانی سائے نظر آئے۔ جو دکانوں کی آڑ لیتے ہوئے بہت محتاط انداز میں ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ان کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں صاف نظر آ رہی تھیں صمدی کو یقین تھا کہ وہ صرف دو آدمی نہیں ہوں گے بلکہ ان کے اور ساتھی ہوں گے۔اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی دیر نہیں لگی کہ انہیں گھیرے میں لیے جانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر تیزی سے شہباز اور نوشابہ کے قریب آ گیا۔

''ہمیں گھیرا جا رہا ہے۔'' اس نے شہباز کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔'' ان کی صحیح تعداد کا

اندازہ نہیں صرف دو آدمی نظر آئے ہیں۔ شہباز ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔نوشابہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔صمدی اندر کمرے کی طرف دوڑ گیا اور اندر سے دو سب مشین گنیں نکال لایا۔اس نے ایک مشین گن نریمان فرازی کی جانب اچھال دی اور اس نے اسے ہوا میں ہی دبوچ لیا۔اسی لمحے لکڑی کے زینے پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔قدموں کے بوجھ سے زینے کے تختے چرچرا رہے تھے۔قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جو دروازے کے سامنے رک گئے تھے پھر یوں لگا جیسے دروازے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

''اس طرف۔'' نوشابہ نے اشارہ کیا۔''ہم دوسرے کمرے کی کھڑکی سے ساتھ والے مکان کی چھت پر کود سکتے ہیں۔'' اسی لمحے دروازے پر دستک دی گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''دروازے کو کھولو نریمان فرازی! تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں ہو کسی طرف سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔ بہتر ہوگا کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔'' یہ کرنل حیات کی آواز تھی۔

ان کے چہرے آگ کی طرح سرخ ہو رہے تھے جس قدر سنگین صورتحال اس وقت درپیش تھی ایسی سنگین صورتحال اس پوری مہم کے دوران شہباز کو پیش نہیں آئی تھی۔ بدن تو اس کا تھا اور اس بدن کا تحفظ اب اس کی ذمے داری تھی۔ نریمان فرازی تو صرف اس کے ذہن میں قید تھا۔ اگر شہباز کا بدن ختم ہو جاتا تو نریمان فرازی کو بھی اسی وجود میں ہلاک ہونا پڑتا۔ ادھر صمدی اور نوشابہ بھی مصیبت کے جال میں پھنسے ہوئے تھے آخر کار صمدی نے خود ہی فیصلہ کیا اور برق رفتاری سے سب مشین گن کا رخ دروازے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ لاتعداد گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی ہولناک چیخیں سنائی دیں۔ پھر فوراً ہی دوسری طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس دوران شہباز صمدی اور نوشابہ دوسرے کمرے میں طرف دوڑ پڑے تھے۔ پہلی کوشش کر کے انہوں نے ان کا فوری راستہ روکا تھا اور اب دوسری کوشش اپنی جان بچانے کی تھی۔

چنانچہ صمدی نے پچھلی طرف کی کھڑکی کھول دی ساتھ والے مکان کی چھت تقریباً کھڑکی سے تقریباً چار فٹ اونچی تھی اور اس سے آگے والے مکان کی چھت کوئی بارہ فٹ بلند۔

''نوشابہ!'' صمدی نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا اور وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ سانس پھول رہا تھا۔ صمدی نے فوراً ہی کہا۔

''ساتھ والی چھت پر چھلانگ لگا دو۔'' نوشابہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور کھڑکی پر چڑھ گئی لیکن ابھی وہ چھلانگ لگانے کے لیے پر تول ہی رہی تھی کہ اس کے آگے والے مکان کی چھت پر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور نوشابہ کا جسم گولیوں سے اس طرح چھلنی ہو گیا کہ گردن سے لے کر سینے پیٹ اور پیٹ کے نچلے حصے میں سوراخ ہی سوراخ ہو گئے۔ نوشابہ کی بھیانک چیخ بڑی دلدوز تھی۔ وہ پیچھے الٹ گئی، شہباز اور صمدی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئے۔ صمدی نے جھک کر نوشابہ کو دیکھا۔ اس کا جسم چھلنی تھا اور خون کے فوارے

ابل رہے تھے ایک لمحے کے اندر اندر اس نے دم توڑ دیا۔ شہباز نے چوکھٹ کی آڑ لیتے ہوئے باہر جھانکا۔ سامنے اونچے مکان کی چھت پر اسے ایک ہیولا نظر آیا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا اور دوسرے لمحے چیخوں کی آواز کے ساتھ مکان کی چھت پر آ گرا۔ ادھر زینے والے دروازے پر زور زور سے ضربیں لگا کر توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ شہباز نے فوراً ہی کہا۔

''صمدی کھڑکی سے کود جاؤ۔'' زیادہ وقت نہیں ہے لیکن صمدی بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا اس کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔

''نوشابہ......نوشابہ۔''

''کچھ نہیں کر سکتے اس کے لیے ہم جلدی کرو وہ لوگ دروازہ توڑ رہے ہیں۔'' شہباز نے کہا اور صمدی کو بازو سے پکڑ کر زبردستی کھینچنے لگا۔ صمدی نے کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی اور اسی وقت زینے کے دروازے کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت نریمان فرازی کھڑکی کے فریم پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کرنل حیات کو دیکھا جو دو آدمیوں کے ساتھ فائرنگ کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ بس ایک نگاہ کرنل حیات پر ڈالی اس کے بعد شہباز نے چھلانگ لگا دی۔ بڑا بروقت عمل تھا اس کا۔ کیونکہ اسی وقت بہت سی گولیاں کھڑکی کے آس پاس دیوار پر لگیں اور کچھ کھلی ہوئی کھڑکی سے دم دار ستارے کی طرح روشنی کی لکیریں چھوڑتی ہوئی تاریک خلا میں گم ہو گئیں۔

دائیں بائیں سمت والے مکانوں سے بھی زبردست فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ صمدی اور شہباز دونوں طرف فائرنگ کرتے ہوئے تیسرے مکان کی چھت پر کود گئے اور پھر چھتوں ہی چھتوں پر کودتے ہوئے وہ بہت آگے نکل آئے۔ یہاں بھی وہ کرنل حیات کے ہاتھ نہیں لگے تھے اور کرنل حیات اپنی زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس نے نریمان فرازی کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے نوشابہ کی لاش دیکھی۔ پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس محاذ آرائی میں اس کے بھی چن افراد مارے گئے تھے۔ جن کے لیے وہ متردد تھا۔ کیونکہ وہ اس کے خاص جنگجو ساتھیوں میں سے تھے جو ہر طرح کے ایکشن لینے میں کمال رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ کمال ان کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ مدمقابل اتنا ہی خوفناک انسان تھا اور صحیح معنوں میں اب نریمان

فرازی چند افراد کے لیے ایک اعصابی جنگ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

بہر حال اس وقت وہ ہاتھ دکھا کر نکل گیا تھا۔ کرنل حیات بے شک اس کا پیچھا کرتا رہا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اتنا قریب کبھی نہیں پہنچا تھا اس وقت تو بقول کسی کے نریمان فرازی اس کی مٹھی سے نکل گیا تھا۔ جبکہ یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کتنے افراد ہیں اور کرنل حیات اپنے ساتھ اچھی خاصی فورس لایا تھا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں لاش کو اٹھانے کے لیے کہا اور پھر مکان کی تلاشی میں مصروف ہو گیا لیکن اس مکان سے اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اسے فرازی کے کسی اور ٹھکانے کا علم ہوتا۔ اس کی یہ مہم بھی بھرپور ناکامیوں کا شکار ہو گئی تھی۔

بہر حال اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس مکان پر چند آدمیوں کو چھوڑا اور ساری رات کی مصیبت اٹھانے کے بعد صبح چار بجے کے قریب وہ اپنے دفتر پہنچ گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور اس وقت درحقیقت وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا کیونکہ اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر شہباز نے اسے پے در پے چرکے لگائے تھے اور اس بدترین شکست سے دوچار کیا تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے اسے بیوقوف بنا کر عادل سرائی کے آدمیوں سے لڑا دیا اور اب دوسری مرتبہ وہ حصار توڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان پے در پے شکستوں نے کرنل حیات کر بری طرح جھنجھلا دیا تھا۔ وہ دو راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اس وقت اسے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت تھی۔ وہ سکون چاہتا تھا۔ ایسا سکون جو اسے ان ہنگاموں سے دور کر دے اور اسے ایک دم نتاشیہ کی یاد آئی۔

نتاشیہ ہی واحد ایسی تھی جو ان حالات میں اس سکون پہنچا سکتی تھی۔ ایک نرم و نازک وجود جس کی آغوش بڑے سکون کا باعث ہوتی تھی۔ حالانکہ کرنل حیات نتاشیہ کے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا۔ اسے پتہ چل چکا تھا کہ نتاشیہ یہودی ہے اور اس نے جعلی شناختی کارڈ بنوا رکھے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا باپ پاسداران کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ماں اور بھائی کو بھی پاسداران نے گرفتار کر لیا تھا جن کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ دونوں زندہ ہیں یا نہیں۔ بلکہ اس بات کے امکانات زیادہ تھے کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو۔

بہر حال اسے اتنا ضرور علم تھا کہ ان تمام باتوں کے باوجود نتاشیہ ایک معصوم اور سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ اس کے حسن و جمال اور سادگی نے کرنل حیات جیسے بھیڑیئے کو سحر میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے نتاشیہ کے بارے میں انکشاف کے باوجود یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے حکومت کے حوالے نہیں کرے گا اور اس وقت نتاشیہ اسے شدت سے یاد آئی تھی۔ نتاشیہ کی قربت ہی اس وقت اس کے لیے باعث سکون تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر اسے کچھ ہدایات کر دیں اور پھر اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ نتاشیہ کے آنے کے دوسرے ہی دن اس نے اپنے اردلی کو چھٹی دے دی تھی۔ اس کے خیال میں نتاشیہ کی نگرانی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ نتاشیہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ کار سے اتر کر نتاشیہ کے تصور سے دل ہی دل میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

پھر اس نے دیکھا نتاشیہ ایک صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے وہ رک کر اسے دیکھنے لگا اور نتاشیہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”تم جاگ رہی ہو۔“ نتاشیہ نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔

”اصل میں ہمارا کام ہی ایسا ہے کہ کئی کئی روز تک گھر آنا نہیں ہوتا اور آج کل تو ویسے بھی کم بخت نریمان فرازی نے ہم پر زندگی تنگ کر رکھی ہے۔ کیا تم نے نریمان فرازی کا نام سنا ہے۔“ نتاشیہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے خود ہی کہا۔

”بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ آہ آج تو وہ گھیرے میں آ گیا تھا لیکن بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن بچ کر کہاں جائے گا آخر کار میرا نام بھی کرنل اعظم حیات ہے۔ بڑے بڑے خطرناک مجرموں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ بچ کر جائے گا کہاں میں اسے بھی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا۔“ نتاشیہ نے کتاب بند کر کے رکھ دی تھی لیکن نجانے کیوں کرنل حیات پر نریمان فرازی کا دورہ پڑا ہوا تھا اس نے کہا۔

”ویسے میں تم سے ایک بات کہوں نتاشیہ! بڑے بڑے خطرناک لوگوں کو دیکھا ہے میں نے لیکن نریمان فرازی کی بہادری کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہو گی۔ اس قدر دلیر اور چالاک انسان ہے۔ اس نے پورے شہر کی پولس، کمیٹی اور انٹیلی جنس کو انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔ کیا سمجھی تم بالکل خاموش ہو میری جان! تمہارے بارے میں، میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے کیونکہ

میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' وہ مسکراتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور نتاشیہ نے پہلی بار اپنے ہونٹ کھولے۔

''لیکن میں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا کرنل حیات! اس نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھائی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ صوفے کے پیچھے پہنچ گئی تھی۔

''کون سا فیصلہ۔'' کرنل حیات مسکرا کر بولا۔

''میرا فیصلہ تمہاری موت...... کیونکہ میں تم سے بے پناہ نفرت کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کتاب صوفے پر پھینک دی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول سامنے کر دیا۔ کرنل حیات کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ بمشکل تمام اس کے منہ سے نکلا۔

''نتا......نتاشیہ...... یہ یہ...... یہ پستول کہاں سے آیا تمہارے پاس۔''

''یہ پستول مجھے اس شخص نے دیا تھا جس کی تلاش میں تم پاگل کتوں کی طرح تہران کی گلیوں اور سڑکوں پر پھر رہے ہو۔ نتاشیہ کی آواز میں شدید نفرت تھی۔ کرنل حیات نے اپنی زندگی میں اس قدر سخت الفاظ نہیں سنے تھے۔ لیکن اس وقت وہ شدتِ حیرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''کک......کون، نریمان فرازی؟''

''ہاں نریمان فرازی! لیکن وہ بھی تمہاری طرح بہت گھٹیا انسان ہے۔ بہت ہی گھٹیا انسان۔ تم مرد ہوتے ہی ایسے ہو۔ اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ میں یہودی ہوں اور میں نے جعلی کاغذات بنا رکھے ہیں۔ اس نے مجھے تمہاری نگرانی کی ہدایت کی اور انکار کی صورت میں اس نے مجھے کمیٹی کے حوالے کر دینے کی دھمکی دی۔ اگر بات صرف میری ہوتی تو میں مر جانے کو ترجیح دیتی لیکن میں خانم دوینہ کو کسی مصیبت میں گرفتار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خانم دوینہ نے مجھے اپنی بھانجی ظاہر کیا تھا اور میرے جعلی کاغذات بنوائے تھے۔ تم کیا سمجھتے ہو کرنل حیات تم بہت زیادہ چالاک آدمی ہو۔ بیوقوف آدمی! سینما ہاؤس میں میری تم سے ملاقات صرف اتفاقیہ نہیں تھی۔ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا۔ نریمان فرازی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس کے بارے میں تمہارے منصوبوں سے اسے آگاہ کرتی رہوں۔ لیکن نریمان کے سلسلے میں تم سے کچھ معلومات نہ کر سکی۔ البتہ اور بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ تمہارے بریف کیس میں رکھے ہوئے تمام کاغذات کی تصویریں میں نریمان فرازی کو پہنچا چکی ہوں۔

کیا سمجھے؟'' کرنل حیات کے پورے وجود میں تھرتھری دوڑ رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر آگے بڑھا۔ خبر نتاشیہ کی آواز ابھری۔

''خبردار! کتے کے بچے آگے قدم مت بڑھانا۔ آگے قدم مت بڑھانا۔

''تو نے......تو نے کیا واقعی تو نے......'' کرنل حیات کے منہ سے پورا جملہ تک نہیں نکل سکا۔''

''ہاں تمہارا منصوبہ نریمان فرازی تک پہنچ چکا ہے۔'' نتاشیہ نے کہا۔ کرنل حیات آہستہ آہستہ اپنے اعصاب پر قابو پاتا جا رہا تھا۔ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا تھا اور جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا وہ اس کے لیے اس قدر بھیانک تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پر بیٹھ جائے۔ پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت تک ختم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اب اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور مدھم لہجے میں بولا۔

''کیا واقعی تم نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا واقعی...... لیکن تم یہ جانتی ہو نتاشیہ! ابھی تم کہہ چکی ہو کہ نریمان فرازی گھٹیا انسان ہے ہاں واقعی وہ گھٹیا انسان ہے۔ جس نے تم جیسی حسین لڑکی کو اس طرح اپنا آلہ کار بنایا زندگی کی دھمکی دے کر اس نے تم سے وہ سب کچھ کرایا لیکن میری جان، میں لاکھ برا سہی لیکن میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں تم سے واقعی محبت کرنے لگا ہوں اور تمہیں اپنے گھر کی رونق بنانا چاہتا ہوں۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں......

''بکواس مت کر ذلیل سؤر'' نتاشیہ نے شدت جذبات سے دانت بھینچ کر دونوں ہاتھوں میں پستول بھینچ لیا اور بولی۔

''تو کہتا ہے کہ تو نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میری عزت اور عصمت کس نے لوٹی مجھے پامال کس نے کیا۔ کیا یہ زیادتی نہیں تھی۔

''میری جان! میں اس زیادتی کا ازالہ کر دوں گا تمہیں اپنی بیوی بنا کر۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کیا ہوں اور کیا بننے والا ہوں۔ بس چند روز کی بات ہے یہاں جو کچھ ہونے والا ہے تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتی نتاشیہ! لاؤ...... بچپنا نہ کرو یہ پستول مجھے دے دو۔ میں نے ابھی تک کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا کیونکہ میں تو تمہیں اپنے گھر کی رانی بنانا چاہتا ہوں۔ نتاشیہ یہ پستول مجھے دے دو۔ بعض اوقات انسان اپنی رو میں بھٹک کر غلط فیصلے کر لیتا ہے۔ مجھے نقصان پہنچا کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ تم اس طرح سے اپنی سرپرستی کھو دو

گی۔ میں تمہارا سرپرست ہوں۔ میں تمہیں زندگی بھر ظلم کے پنجوں سے بچائے رکھوں گا لاؤ پستول مجھے دے دو۔ کرنل حیات ایک ایک قدم آگے بڑھا تو نتاشیہ چیخ کر بولی۔

''اپنی جگہ کھڑے رہو۔ اب تمہارے ناپاک ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تم جس بھیانک جرم کے تانے بانے بن رہے ہو۔ اس کی سزا بہت خوفناک ہے لیکن میں تمہیں بہت ہلکی سزا دے رہی ہوں۔'' نتاشیہ نے کہا۔

''دیکھو میری بات سنو، میری بات سنو'' لیکن نتاشیہ اب زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کرنل حیات کے دل کا نشانہ لے کر دو فائر کیے اور کرنل کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی اور پھر وہ آہستہ آہستہ قالین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کا خون قالین کو سرخ کرنے لگا تھا۔ نتاشیہ نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا پھر پستول اپنے پرس میں رکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ نجانے کیوں وہ اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ابھی اس نے سڑک پر تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار اس کے قریب آ کر رکی۔ دروازہ کھلا ایک آدمی باہر نکلا اور اس نے پھرتی سے نتاشیہ کو پکڑ کر گاڑی میں ٹھونس دیا۔

اس کے ساتھ ہی کار ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اس شخص کا ایک ہاتھ نتاشیہ کے منہ پر تھا۔ نتاشیہ سیٹ پر پشت کے بل پڑی انتہائی خوفزدہ نگاہوں سے اپنے اوپر جھکے ہوئے شخص کو دیکھنے لگی اور پہلی بار اس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ مسکراتا ہوا چہرہ ایک دلکش چہرہ تھا اور یہ چہرہ نریمان فرازی کے علاوہ اور کسی کا نہیں تھا۔ ہاں شہباز جو اس وقت نجانے کون کون سی صورتیں اختیار کیے ہوئے تھا۔

❀......❀

عادل سرائی اس وقت گہری نیند سو رہا تھا جب ٹیلی فون کی مسلسل گھنٹی نے اس کی نیند میں خلل اندازی کی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں نیم روشنی کا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ خالی انداز میں رہا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور اس نے اپنی گردن کو جھٹک کر ہاتھ آگے بڑھا دیا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹائم پیس پر اٹھ گئیں جس کی سوئیاں نجانے کیا بجا رہی تھیں صحیح وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال اس نے بمشکل تمام کہا۔

''ہاں عادل سرائی۔'' اس کی آواز میں اب بھی نیند تھی۔

''سر! آپ کا خادم شاہ بول رہا ہے۔ شاہ پاشا۔''

'ہاں ہاں بولو۔'' عادل سرائی نے اپنے ماتحت کی آواز پہچان کر کہا۔

''سر! کرنل حیات نے رات ایک بجے اپنے آدمیوں کے ساتھ بازار بزرگ کے ایک مکان پر چھاپہ مارا تھا اسے اطلاع ملی تھی کہ اس مکان میں نریمان فرازی اور اس کے ساتھی چھپے ہوئے ہیں۔ نریمان فرازی تو اس کے ہاتھ نہیں لگا البتہ اس کے کچھ آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک سابق رقاصہ نوشابہ برآمد ہوئی جو اس کاروائی میں ماری گئی۔

''نوشابہ!'' عادل سرائی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی سر!'' ماتحت نے جواب دیا۔

''مگر نوشابہ......''

''جی سر! نوشابہ اسی مکان میں موجود تھی۔ جو کرنل حیات کی گولیوں کا نشانہ بن گئی۔ نریمان فرازی اور اس کا ایک ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔''

''یہ کب کی بات ہے۔'' عادل سرائی نے اب پوری طرح ہوش سنبھال کر پوچھا۔

''ایک بجے کے لگ بھگ یہ کاروائی کی گئی تھی۔'' ماتحت نے جواب دیا۔

''اور تم مجھے اب اطلاع دے رہے ہو۔'' عادل سرائی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس اطلاع سے اس کے ذہن سے نیند کا سارا خمار غائب ہو چکا تھا۔''

مجھے دو بجے کے قریب اطلاع ملی تھی سر! پہلے میں تصدیق کے لیے خود وہاں گیا تھا اس وقت کرنل حیات خود وہاں موجود تھا۔ پولیس کی بھاری نفری بھی تھی آس پاس چاروں طرف پولیس لگی ہوئی تھی۔ لیکن کرنل حیات کے آدمیوں نے کسی کو بھی آگے نہیں جانے دیا۔ انہوں نے مجھے بھی اس مکان کے قریب جانے سے روک دیا تھا۔

''ہوں۔ تم کہاں ہو۔'' جواب میں ماتحت نے اسے جگہ کے بارے میں بتایا تو عادل سرائی بولا

''ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔'' اس کے بعد عادل سرائی نے فوان کا ریسیور رکھا اور بستر سے اتر گیا اس کے بعد بڑی برق رفتاری سے اس نے اپنا لباس تبدیل کیا تھا۔ ویسے وہ بار باردانت پیس رہا تھا اسے اندازہ تھا کہ کرنل حیات اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہا ہے۔ اس

کے محکمے کا کام لوگوں کے بارے میں خفیہ طریقے سے معلومات حاصل کرنا تھا۔ صرف وہ لوگ جن کا سیاست سے کوئی تعلق ہو یا انقلابی حکومت کے خلاف وہ کسی قسم کی سازش میں مصروف ہوں۔ نریمان فرازی جیسے جرائم پیشہ افراد کے خلاف کوئی بھی کاروائی کرنا پولیس کا کام تھا لیکن سب کچھ سوچتے ہوئے عادل سرائی یہ بھول گیا تھا کہ وہ بھی اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہا ہے۔ جرائم پیشہ افراد کے خلاف کسی قسم کی کاروائی پولیس کا کام تھی کمیٹی پاسداران کا کام ان پر نگاہ رکھنا تھا۔ لیکن پاسداران اور کمیٹی نے پولیس سے تمام اختیارات چھین لیے تھے اور پولیس عملاً مفلوج ہو کر رہ گئی۔ پولیس کا کام اب صرف اور صرف چوکیداری رہ گیا تھا۔

بہرحال جب عادل سرائی اپنے دفتر پہنچا تو اس کا ماتحت منتظر بیٹھا تھا۔ وہ دونوں چند آدمیوں کو لے کر بازار بزرگ کی طرف چل پڑے۔ جائے وقوع پر پہنچنے میں انہیں بہت مختصر وقت لگا تھا اس وقت مکان پر کرنل حیات کے دو آدمی موجود تھے۔ انہوں نے پہلے تو کسی کو مکان میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن پھر جب اس نے عادل سرائی کو پہچانا تو بھیگی بلی بن گئے۔ عادل سرائی اپنے مخصوص آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اگرچہ لاشیں ہٹائی جا چکی تھیں لیکن داخلی دروازے کے سامنے زینے کی بینڈ نگ پر اور دوسرے کمرے میں کھڑکی کے قریب خون کے دھبے موجود تھے جو آہستہ آہستہ سوکھتے جا رہے تھے۔ عادل سرائی کمروں کا معائنہ کرنے لگا لیکن اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ مکان کی تلاشی پہلے ہی اچھی طرح لی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کرنل حیات نے کوئی چیز نہیں چھوڑی ہو گی کرنل حیات کا خیال آتے ہی عادل سرائی کا ذہن کھول اٹھا۔ وہ خون کے گھونٹ لے کر رہ گیا اس نے بہرحال فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کرنل حیات کو زیادہ پھیلنے کا موقع نہیں دے گا۔ اس نے انٹیلی جنس کے دونوں آدمیوں کو وہاں سے ہٹا کر اپنے آدمی تعینات کر دیے اور اپنے دفتر آ گیا۔

جب وہ دفتر پہنچا تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر کرنل حیات کے دفتر کا نمبر ملایا لیکن وہاں سے اسے پتہ چلا کہ وہ گھر جا چکا ہے اس نے کریڈل ٹیک کیا اور کرنل حیات کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی اس نے جھلا کر ریسیور پٹخ دیا۔

"یہ کہاں مر گیا ہے۔" آدھے گھنٹے تک اس نے انتظار کیا اور اس کے بعد دوبارہ نمبر ملایا اس مرتبہ بھی کال ریسیو نہیں کی گئی تو اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔

"اس حرام زادے کو اس کے گھر پر ہی پکڑنا پڑے گا۔ چلو......" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور کرنل حیات کے گھر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ کرنل گھر جاتے ہی سو گیا ہو گا اور گہری نیند کی وجہ سے اس کی آنکھ فون کی گھنٹی سے نہیں کھل سکی ہو گی۔ بہرحال اس نے اپنے ماتحتوں کو چند ہدایات دیں اس کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا۔ جب وہ کرنل حیات کے مکان والی سڑک پر مڑا تو مکان سے کچھ فاصلے پر اسے سیاہ رنگ کی ایک گاڑی نظر آئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی آدمی نے ایک عورت کو زبردستی اٹھا کر گاڑی میں ڈالا ہو۔ اس کے فوراً ہی بعد گاڑی حرکت میں آ گئی تھی نیم تاریکی اور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے نہ دیکھ سکا۔ اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا کہ ممکن ہے یہ اس کا وہم رہا ہو۔ ویسے اسے اس گاڑی کو چیک کرنے سے زیادہ ضروری کام تھا۔ اس لیے اس نے اس مسئلے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا کچھ دیر کے بعد اس کی گاڑی کرنل حیات کے گھر کے سامنے جا کر رکی باہر گیٹ کھلا ہوا تھا وہ گاڑی کو ڈرائیو وے میں لے گیا اور آخر کار اسے برآمدے کے سامنے روک دیا پھر وہ گاڑی سے اتر کر برآمدے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا اندر کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا دوسری اور تیسری گھنٹی بجانے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اچانک ہی عادل سرائی کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ اس نے غیر ارادی طور پر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہینڈل گھماتے ہی دروازہ کھل گیا۔

عادل سرائی کے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا تھا اب اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو بنیادی طور پر کوئی خوفناک حیثیت رکھتی ہے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور اس نے زور سے آواز دی۔

"کرنل اعظم حیات! کرنل اعظم حیات!" لیکن جواب میں خاموشی رہی تھی۔ راہداری تاریک تھی البتہ سامنے والے دروازے کی نچلی جھری سے روشنی جھلک رہی تھی۔ عادل سرائی دروازے پر رک گیا۔ اس نے ایک بار پھر کرنل حیات کو پکارا اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر دستک بھی دی۔ مگر یہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا

سا دباؤ ڈالا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ عادل سرائی اندر داخل ہو گیا لیکن پہلا قدم اندر رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ بائیں طرف پلنگ کے قریب کرنل حیات قالین پر آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا اس کے سینے سے بہنے والا خون اس کے لباس اور قالین کو تر کرتا ہوا جم چکا تھا ایک لمحے تک عادل سرائی سکتے کے سے عالم میں کھڑا رہا پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کرنل حیات پر جھک گیا۔ اس نے نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ نبض ساکت تھی اور بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ کرنل حیات ختم ہو چکا تھا۔

✿......✿

اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے صمدی نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں ایک گاڑی کو گلی کے پچھلے موڑ پر اس کی طرف گھومتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اس دوران شہباز نتاشیہ کو سیٹ پر ڈھیر کر چکا تھا۔ چنانچہ صمدی نے سیدھے ہوتے ہوئے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور ایکسلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ یہ سڑک کافی دور تک سیدھی چلی گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سڑک پر گھومنے والی دوسری گاڑی بھی ان کے پیچھے آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اس گاڑی نے ان کا پیچھا نہیں کیا تھا اور صمدی نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ گاڑی کرنل حیات کے بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ تب اس نے سکون کا سانس لیا اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ اس نے ایکسلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ہلکا کر دیا اور گاڑی اگلے موڑ سے دائیں طرف گھما دی۔ ایک بار پھر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔

نوشابہ کے مکان سے فرار ہونے کے بعد وہ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ دور تک وہ مکانوں کی چھتوں پر دوڑتے چلے گئے تھے اور آخر کار ایک مکان سے گلی میں کود گئے۔ یہ ایک تنگ و تاریک سی گلی تھی وہ جیسے ہی گلی کے اگلے موڑ پر پہنچے دو کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا۔ صمدی آگے تھا ایک کتے نے اس پر چھلانگ لگا دی تو صمدی نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر اسے لٹھ کی طرح گھما دیا۔ رائفل کا بٹ کتے کے منہ پر لگا اور وہ چیختا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ دوسرے کتے نے اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر فرار ہونے ہی میں عافیت سمجھی تھی اور بھونکے بغیر خاموشی سے تاریکی میں دبک گیا تھا۔ ان دونوں کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کس جگہ پر ہیں۔ تنگ و تاریک گلیوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔

کسی کشادہ گلی میں بجلی کا ایک آدھ بلب روشن نظر آ جاتا۔ بعض گلیاں تو اس قدر تنگ تھیں کہ سبزی فروش کا ٹھیلہ بھی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ ان گلیوں میں روشنی کا انتظام نہیں تھا تاریکی اس قدر تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ تقریباً چالیس منٹ تک ان بھول بھلیوں میں گھومتے پھرے اور آخر کار ایک کشادہ گلی نظر آئی اور وہ اس سے ہوتے ہوئے سڑک پر نکل آئے۔ وہ بازار بزرگ کے قالینوں والے سیکشن سے تقریباً ڈیڑھ میل دور تھے۔

شہباز کو یقین تھا کہ کرنل حیات کے آدمی انہیں کچھ دیر تک یہیں تلاش کرتے رہیں گے اور پھر ان کی تلاش کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ نوشابہ کے مرنے کا افسوس شہباز کو بھی تھا لیکن صمدی کی حالت تو بہت خراب تھی۔ اس نے جوش کے عالم میں قسم کھائی تھی کہ اگر کرنل حیات اس کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے تڑپا تڑپا کر مارے گا۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ کر ایک بار پھر کشادہ گلیوں میں گھس گئے اور آخر کار خیابان ولی عصر پر نکل آئے۔

شہباز کے خیال میں اس طرح سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہنا مناسب نہیں تھا۔ اگر کمیٹی یا پولیس کی نگاہ ان پر پڑ گئی تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اب وہ ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں رہائشی بنگلے تھے۔ وہ ایک گلی میں گھومے ہی تھے کہ سامنے والے موڑ سے ایک گاڑی گھومتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دونوں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ گاڑی سے شاید انہیں دیکھا نہیں گیا تھا لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد گاڑی ایک بنگلے میں جا کر رک گئی اور ایک آدمی اتر کر برآمدے کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ شہباز اور صمدی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس بنگلے کی دیوار پر چڑھ کر اندر کود گئے۔ جب وہ کار کے قریب پہنچے تو وہ شخص جیب سے چابی نکال کر مکان کا دروازہ کھول رہا تھا۔ صمدی نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر رائفل کی نال اس کی پشت سے لگا دی۔

''منہ سے آواز مت نکالنا ورنہ چھلنی کر دوں گا۔'' وہ غرایا۔ دوسرے شخص کے حلق سے ڈری ڈری سی آواز نکل کر رہ گئی پھر بمشکل تمام اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''کک...... کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔ اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔''

''یہاں تمہارے علاوہ اور کون ہے۔'' صمدی نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں...... خدا کی قسم کوئی نہیں میں اکیلا رہتا ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے دروازہ کھولو اور کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔" صمدی کی آواز بے حد خوفناک تھی۔ اتنے میں شہباز دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس شخص نے صمدی کے کہنے پر دروازہ کھولا اور صمدی اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا شہباز بھی اس کے پیچھے ہی تھا اس نے اندر داخلے کا دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ تینوں سیٹنگ روم میں آ گئے۔ بتی جلاتے ہی شہباز نے کھڑکیوں کے سامنے پردے کھینچ دیئے۔ اس نے اور صمدی نے سامنے والے شخص کو دیکھا اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک تھی۔ خوف کے مارے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور بدن میں سخت تھرتھری پھیلی ہوئی تھی۔

"نہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر تم نے ہماری ہدایت پر عمل کیا تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" شہباز نے اس کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے کہا۔

"تت...... تم دونوں شاید وہی مفرور ہو جنہیں پاسداران تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے بھی راستے میں دو جگہ روکا گیا تھا۔" اس شخص نے کہا۔

"ہاں ہر خفیہ ایجنسی ہماری تلاش میں ہے۔ مگر تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے اچھا یہ بتاؤ کیا تم اس وقت ہمارے لیے چائے بنا سکتے ہو۔" اس غیر متوقع سوال پر اجنبی چونک پڑا۔ شہباز کو دیکھتا رہا صمدی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس وقت واقعی شہباز نے ایک ایسی فرمائش کی تھی جس سے اچھی فرمائش اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چچ...... چائے۔"

"کوئی انتظام نہیں ہے؟"

"ہے مگر باورچی...... باورچی خانہ۔"

"چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" صمدی نے اسے رائفل سے دھکا دیا اور وہ آگے بڑھ گیا اور صمدی اس کو ساتھ لیے ہوئے کچن میں پہنچ گیا۔ تھوڑے سے انتظامات کیے اور چائے بنانے لگا۔ صمدی کچن کے دروازے پر رائفل تھامے کھڑا رہا پھر اس نے اس شخص سے کہا۔

"تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا میرے دوست! حالانکہ تم ایک اچھے اور مہمان نواز آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"میں ایک پبلک ٹرانسپورٹ کمپنی میں مینیجر کے طور پر کام کرتا ہوں اور یہی وقت میری واپسی کا وقت ہوتا ہے۔"

"بہر حال اس کے بعد ان دونوں نے اس شخص کے ساتھ بڑے مزے سے چائے پی خاصا وقت وہاں گزارا تقریباً چار بجے صمدی نے اسٹینڈ پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور پھر کرنل حیات کے دفتر کا نمبر ملایا پوچھنے پر اسے پتہ چلا کہ کرنل حیات ابھی ابھی دفتر سے گھر کے لیے نکلا ہے اس نے فون بند کر دیا اور شہباز سے بولا۔

"چلو فرازی! میں اس خبیث کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" صمدی نوشابہ کے قتل سے بہت دلبرداشتہ تھا۔

"یہاں آنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ ہم یہاں زیادہ وقت گزار لیں گے اس شخص کو یرغمال بنا کر ہمیں عارضی طور پر ایک ٹھکانہ مل جائے گا اور بہت سی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس وقت باہر نکلنا خطرناک نہیں ہوگا۔ شہباز نے کہا۔

"میں خطرات سے نہیں ڈرتا۔ تم تصور نہیں کر سکتے فرازی میرے دوست! میں نوشابہ سے کتنی محبت کرنے لگا تھا۔ میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے جب تک میں نوشابہ کے قتل کا بدلہ نہیں لے لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"اس شخص کا کیا کیا جائے؟"

"نہیں ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن اس کے ہاتھوں نقصان اٹھانا بھی پسند نہیں کریں گے۔" صمدی نے کہا اور پھر اس شخص کو باندھنے لگا۔ اس شخص نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ان کی باتیں بھی سن رہا تھا بعد میں صمدی نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا اور پھر بولا۔

"صبح کو کوئی نہ کوئی تمہیں آ کر کھول دے گا۔ کیا سمجھے؟ معاف کرنا ہم تمہاری کار لے جا رہے ہیں۔ تمہیں اور کوئی نقصان ہم نے نہیں پہنچایا لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو ہمارے بارے میں تفصیلی رپورٹ کسی کو نہیں دینا ورنہ ہم نے یہ گھر بھی دیکھ لیا ہے اور تمہارے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا بھی ہمارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر صمدی نے میز پر

سے گاڑی کی چابی اٹھالی اور دونوں باہر آ گئے۔ صمدی نے اسٹیرنگ خود سنبھالا تھا۔ شہباز جان بوجھ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ صمدی ایسے راستوں سے گاڑی لے جا رہا تھا جہاں پولیس یا کمیٹی کے آدمیوں سے سامنا نہ ہو۔ وہ ابھی کرنل حیات کے مکان سے چند گز دور ہی تھے کہ فضا میں ایک کے بعد دیگرے دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنی صمدی نے فوراً ہی دائیں جانب درختوں کی آڑ میں گاڑی روک لی۔

"یہ آواز کیسی ہے۔"

"پتہ نہیں۔" صمدی نے پرخیال انداز میں کہا اور نگاہیں کرنل حیات کے بنگلے پر جما دیں کچھ ہی لمحوں کے بعد انہوں نے نتاشیہ کو گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ایک دم سنبھل گئے نتاشیہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مخالف سمت میں چل پڑی۔ صمدی نے مڑ کر شہباز کو دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ نتاشیہ کے قریب پہنچ کر اس نے گاڑی روکی اور شہباز نے بڑی پھرتی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نتاشیہ کو اندر گھسیٹ لیا۔ صمدی نے بڑی پھرتی سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ اسی وقت صمدی نے ایک اور گاڑی کرنل حیات کے بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھی۔ وہ بری طرح چونک پڑا تھا۔

بہر حال گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ صمدی نے نتاشیہ کی طرف رخ کر کے اس سے کرنل حیات کے بارے میں پوچھا۔ نتاشیہ نے چونکہ شہباز کو پہچان لیا تھا چنانچہ وہ گہری گہری سانسیں لے کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"کیا تم نے کرنل حیات کو قتل کر دیا۔"

"ہاں۔" وہ پتھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں اب کسی سے نہیں ڈرتی تم چاہو تو مجھے پاسداران کے حوالے کر سکتے ہو۔" کسی نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن یہ بات صمدی اور شہباز کو معلوم ہو گئی کہ کرنل حیات کے قتل کا مسئلہ اب کوئی راز نہیں رہا۔

گاڑی شہر کے زیریں علاقے میں داخل ہو چکی تھی ویسے اندازہ یہ ہوا تھا کہ اس طرف آتے ہوئے انہیں کسی بھی صورت میں مشکوک نہیں سمجھا گیا تھا۔ ایک جگہ صمدی نے گاڑی روک لی اور وہ تینوں نیچے اتر آئے۔ گاڑی کی چابی اسی طرح لگی رہنے دی گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلیوں میں چلنے لگے۔ یہ شہر کا پسماندہ علاقہ تھا۔ وہ گلیوں ہی گلیوں میں

چلتے ہوئے تقریباً ایک میل دور نکل آئے۔ اس وقت دن کا ہلکا سا اُجالا پھیلنے لگا تھا لیکن گلیاں سنسان تھیں۔ ایک تنگ سی گلی کے اختتام پر پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں پر چڑھنے لگے سیڑھیوں کے اختتام پر ایک کشادہ سی گلی تھی۔ اس گلی میں تقریباً پچاس میل چلنے کے بعد بائیں طرف مڑ کر ایک تنگ سی گلی میں تیسرے مکان کا دروازہ ان کی نئی منزل تھا۔ غالباً اس سلسلے میں دونوں نے ذہنی طور پر یہ فیصلے کیے تھے اور اس فیصلے سے خود ہی متفق ہو گئے تھے۔

چنانچہ صمدی نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ ایک بوڑھی عوت تھی جس نے صمدی کو دیکھا اور ایک طرف ہٹ گئی۔ صمدی نے بڑھیا کے چہرے پر کچھ خوف اور گھبراہٹ کے آثار دیکھے تھے لیکن توجہ نہیں دی تھی وہ تینوں اندر داخل ہو گئے لیکن ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک ہی ان کی پشت سے کوئی ٹھوس چیز آ لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک غراہٹ سنائی دی تھی۔

"رائفلیں پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" حکم کی تعمیل کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔"

"آگے بڑھو۔" دوسرا حکم ملا اور جب وہ مختصر سا آنگن عبور کر کے کمرے میں داخل ہوئے تو شہباز کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ نریمان فرازی نے اس کے کان میں کہا۔

"یہ جو شخص سامنے بیٹھا ہوا ہے اس کا نام تلاتی ہے۔ تلاتی! یعنی ہمارا دشمن نمبر ایک۔" یہ مسکراہٹ بھی نریمان فرازی کی زیر ہدایت تھی۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ تھا۔ تلاتی گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر نریمان فرازی نے کہا۔

"اور یقیناً تم مجھے پہچان گئے ہو گے۔"

۞......۞

یہ بات شہباز نے ہمیشہ محسوس کی تھی کہ چاہے چہرہ کوئی بھی ہو۔ نریمان فرازی کی آواز اس کے شناساؤں کے سینوں میں اتری ہوئی تھی اور وہ اسے کبھی نہیں بھولتے۔ تلاتی نے بھی چونک کر آنکھیں پھاڑ دی تھی اور پھر اس کے ہونٹوں پر بھی ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے یقین تھا کہ بہت جلد تم میرے پاس آؤ گے۔ خوشی ہوئی تم سے مل کر"

"سناؤ اب کیسے ہو؟ بیٹھنے کو نہیں کہو گے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اس وقت تو تم پوری ایرانی حکومت کے مہمان ہو۔"

"اس خیال کو دل سے نکال دینا کہ حکومت کے حوالے سے تم مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے پہلے بھی بہت نقصان اٹھا چکا ہوں میں۔"

"مثلاً......"

"تم جانتے ہو کہ میں نے وہ سونا اور جواہرات اس کمیٹی کے گودام سے بڑی مشکل سے حاصل کیے تھے۔ لیکن تمہاری غداری سے نہ صرف وہ ساری دولت میرے ہاتھ سے نکل گئی بلکہ مجھے اور بھی بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد سے تم جو کچھ کرتے رہے ہو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تو تم سے بڑا احمق میرے سامنے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نے کرمان کے قریب میرے ایک بہترین آدمی کو مروا دیا۔ اس کی موت کا منظر میں زندگی کے آخری لمحوں تک نہیں بھول سکتا۔ تم نے اسے جس طرح اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا تھا وہ ناقابل معافی ہے۔ تمہارے آدمیوں نے اس سے خزانے کا پتہ پوچھنے کے لیے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ جب مجھے گرفتار کیا گیا تھا تو وہ خزانہ بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ میں اگر چاہتا تو تہران آنے کے بعد تمہیں کسی بھی وقت موت کی نیند سلا سکتا تھا لیکن تمہارے سلسلے میں مجھے مناسب وقت درکار تھا۔ اس کے لیے انٹیلی جنس اور کمیٹی کی طرف سے بھی میرے لیے کچھ

پریشانیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ پہلے میں ان لوگوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"او ڈفر! مجھے اس خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا میں تو اس خزانے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جسے حاصل کرنے کے لیے تم یہاں آئے ہو۔"

نریمان فرازی نے شہباز کے روپ میں نگاہیں اٹھا کر تلاتی کو دیکھا تو تلاتی بولا۔

"انجان بننے کی کوشش مت کرو فرازی! تمہیں مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا یہ بات میرے علم میں ہے کہ دولت کے لیے تم جہنم میں بھی جانے کے لیے تیار ہو سکتے ہو۔ اگر معاملہ شاہ کے پوشیدہ خزانے کا نہ ہوتا تو کبھی تہران کا رخ نہ کرتے جہاں تمہارے سر کی بھاری قیمت مقرر ہے۔"

"نجانے تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ شاہ کا خزانہ میرے لیے حیرت کی بات ہے۔"

"نہیں تمہارے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ تم اگر ایکٹنگ کرنے کی کوشش کرو تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تمہارے سامنے میں ہوں سمجھے اور تم مجھے اس کا پتہ ضرور بتاؤ گے۔"

یہ کہہ کر تلاتی اپنی جگہ سے اٹھا اور نریمان فرازی کے قریب پہنچ گیا۔

نتاشیہ خاموش کھڑی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ تو ان لوگوں کو معمولی سا اور عام سا مجرم سمجھتی رہی تھی۔ لیکن اب ان کے بڑے انوکھے انکشافات ہو رہے تھے۔ یہ بات اسے بھی معلم تھی کہ نریمان فرازی چند ماہ پہلے پاسداران کے گودام سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں ڈالر کی مالیت کے جواہرات لے اڑا تھا اور اب یہ انکشاف اس کے لیے حیرت انگیز تھا کہ وہ یہاں شاہ کے کسی خفیہ خزانے کی تلاش میں آیا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہم یہاں آزادی سے بات نہیں کر سکیں گے اس قسم کی بستیوں میں گھروں میں ہونے والی کوئی بات بھی راز نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ کیوں نہ ہم لوگ ایک محفوظ جگہ پر چلیں جہاں اطمینان سے بات ہو گی اور میرے دوست! کیا ہی خوش نصیب انسان ہوں میں کہ تم بڑے اطمینان سے یہاں تک پہنچ گئے۔ جبکہ میں خود تمہاری تلاش میں نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ تم خزانے کا پتہ مجھے ضرور بتاؤ گے مجھے یقین ہے۔" تلاتی نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ فوراً باہر نکل گیا اس کا دوسرا ساتھی انہیں سب مشین گن کی زد پر لیے کھڑا رہا۔ ایک بڑھیا بھی اسی کمرے میں موجود تھی اور خوف کے مارے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ شہباز جب تہران میں تھا تو اکثر یہاں آیا کرتا تھا یعنی نریمان فرازی ایک

دومرتبہ تلاتی کے ساتھ بھی وہ یہاں آ چکا تھا لیکن اب شہباز کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مسئلہ بہت زیادہ گھمبیر ہے تلاتی بھی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ نریمان فرازی نوشابہ کے گھر میں چھپا ہوا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ نوشابہ کے مکان پر چھاپہ پڑا تھا اور وہ وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ انٹیلی جنس یا کمیٹی میں تلاتی کا کوئی نہ کوئی ایجنٹ موجود تھا جو اسے صورتحال سے باخبر رکھے ہوئے تھا اور بہرحال اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ نوشابہ کے مکان سے فرار ہونے کے بعد نریمان فرازی اب اسی بڑھیا کے مکان کا رخ کرے گا۔ وہ پہلے ہی سے یہاں پہنچ گیا تھا تا کہ ان پر قابو پایا جا سکے اور اس وقت وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا جبکہ نریمان فرازی کو یہاں پہلی بار زبردست چوٹ ہوئی تھی اور اس وقت تک شہباز کو ان کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں تھیں کیونکہ نریمان فرازی نے اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔

بہرحال کچھ ہی لمحوں کے بعد باہر کہیں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد تلاتی کا وہی آدمی اندر داخل ہوا۔

''چلو...... لیکن خبردار کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تم لوگوں کے جسم چھلنی ہو جائیں گے سمجھے۔ میں تم تینوں ہی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔'' تلاتی نے کہا اور اس کے بعد انہیں باہر نکلنے کا اشارہ کیا وہ چاروں طرف سے رائفلوں کی زد میں تھے اس لیے اس وقت کچھ نہیں کر سکتے تھے ویسے نریمان فرازی اس بات پر افسردہ تھا کہ یہاں آنے سے پہلے شہباز کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا تھا اور اس وقت نقصان اٹھا گیا تھا۔

بہرحال وہ رائفلوں کے زور پر مکان سے باہر آ گئے۔ چند قدم دور کشادہ گلی کے اس موڑ پر ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ اس وقت گلی میں صرف ایک آدمی نظر آیا تھا جو مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اس نے بھی مڑ کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ان تینوں کو ایمبولینس کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا اور دونوں آدمی رائفلیں سنبھالے ان کے ساتھ جا بیٹھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی معمولی سی حرکت پر واقعی انہیں ہلاک کر دیں گے۔ تلاتی ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر پہنچ گیا۔ ایمبولینس کی کھڑکیوں کے سامنے دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے۔ اس طرح سے باہر سے یہ دیکھنا ممکن نہیں تھا کہ اندر کون ہے ایمبولینس حرکت میں آ گئی۔ گلیوں میں لوگوں کی

آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ وہ مڑ مڑ کر ایمبولینس کو دیکھ رہے تھے جس کی چھت پر فلشر روشن تھا ایمبولینس کشادہ گلی سے ہوتی ہوئی ریلوے لائن کا پھاٹک عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گئی۔ اس طرف مختصر سی پسماندہ آبادی تھی اور اس سے آگے بہشت زہرہ کا قبرستان تھا۔ ایمبولینس قبرستان کے ساتھ ساتھ کشادہ سڑک پر چلتی ہوئی پچھلی طرف نکل گئی۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر کے ایمبولینس ایک حویلی نما مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ قدیم طرز کا یہ مکان کافی خستہ حالت میں تھا۔ اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ مکان کے وسیع و عریض احاطے میں درختوں کی بہتات تھی اور چاروں طرف خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شاید کسی زمانے میں یہاں خوبصورت لان ہوگا۔ لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ عرصے سے لان پر توجہ نہیں دی گئی۔ جس سے خودرو جھاڑیوں کو پھیلنے کا موقع مل گیا۔

ایمبولینس رکی اور اس کے بعد انہیں نیچے اتارا گیا۔ ایک گن مین نے شہباز کے کولہوں پر زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ باہر سے خستہ اور بے حال نظر آنے والی حویلی اندر سے بہت شاندار تھی۔ تمام کمرے قیمتی ساز و سامان سے آراستہ اونچی چھتوں سے بہت شاندار فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ کمروں اور راہداریوں کے فرش پر بہت دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ یہ شاہ کے ایک فرد کی ملکیت تھی جو امام خمینی کی آمد کے وقت کیمپس کے ساحل پر اپنی داشتاؤں کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ انقلابی، شاہ کے خاندان کے افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھکانے لگا رہے ہیں تو وہ تہران واپس آنے کے بجائے ترکی بھاگ گیا۔ اس حویلی پر پاسداران نے قبضہ کر لیا لیکن بعد میں میرے ایک دوست نے اسے حکومت سے اونے پونے میں خرید لیا اور پھر ایک روز میرا دوست بھی لاپتہ ہو گیا اور یہ حویلی میرے استعمال میں آ گئی۔ سرکاری کاغذات میں یہ حویلی میرے دوست کی جائز ملکیت ہے۔ لیکن اب وہ کبھی دعویٰ کرنے نہیں آئے گا کیونکہ وہ اسی حویلی میں ایک جگہ زمین کی گہرائیوں میں روپوش ہے۔'' کیا سمجھے۔

تلاتی نے تفصیلی طور پر اس حویلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا پھر بولا۔

''اور تم لوگوں کو بھی اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ کسی کو تمہارا سراغ تک نہ ملے گا۔''

وہ خاموش ہو کر ان لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ نریمان فرازی اور صمدی کے چہرے تو پرسکون تھے لیکن نتاشیہ کا چہرہ

خوف کی شدت سے بالکل سفید ہو رہا تھا اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔
"یہ لڑکی کون ہے۔" تلاتی نے پہلی بار نتاشیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے پہلے تو کبھی تمہارے ساتھ نہیں دیکھا گیا۔"
"یہ تمہاری خوش بختی ہے کہ تم نے پہلے کبھی اسے ہمارے ساتھ نہیں دیکھا اور اب بھی اگر تم اس کی طرف دیکھو گے تو......"
"واہ......مگر یہ ہے کون؟"
"یہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی جسے ہم نے کرنل حیات کے شکنجے سے چھڑایا ہے۔ ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ہم اسے اس کے گھر پہنچا دیتے لیکن غلطی ہو گئی۔"
"اوہو......کوئی بات نہیں اب یہ میری ذمے داری ہے۔" تلاتی اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا اور پھر بولا
"یقین کرو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور باحفاظت اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا لیکن تم سے معاملہ طے ہونے کے بعد۔"
"تم کتے ہو تلاتی! اور اطمینان رکھو تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔" تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو نریمان فرازی نے شہباز کی آواز میں کہا۔
"اور تم بھی جانتے ہو۔" تلاتی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں جو چاہتا ہوں اسے حاصل کر لیتا ہوں اور اگر حاصل نہ کر سکوں تو برباد کر دیتا ہوں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس بربادی سے بچنے کے لیے تم مجھے شاہ کے خفیہ خزانے کا پتہ بتا دو۔"
"میں کسی خزانے کے بارے میں نہیں جانتا۔" نریمان فرازی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
"ضد نہ کرو میری جان! اگر تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے تو تم مجھ سے تعاون کرو۔ میں اس خزانے کا پچیس فیصد تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔"
"اگر مجھے زندگی سے پیار ہوتا تو کبھی ایران کا رخ نہ کرتا۔ جہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی ہے اور تمہاری حیثیت میرے لیے ایک مسخرے سے زیادہ نہیں ہے سمجھے......" ان الفاظ نے تلاتی کو برگشتہ کر دیا وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اچانک ہی اس نے شہباز کے جبڑے پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ شہباز لڑکھڑا گیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی تلاتی نے ایک اور گھونسہ جما دیا۔ یہ گھونسہ شہباز کی کھوپڑی پر لگا اور شہباز کو اپنی آنکھوں کے آگے نیلی

پیلی روشنیاں رقص کرتی محسوس ہونے لگیں اور اس کے بعد وہ سنبھل نہیں سکا تھا۔ اگر چاروں طرف رائفلیں نہ تنی ہوتیں تو وہ اس طرح مار نہیں کھا سکتا تھا لیکن اس وقت نجانے کیوں پہلی بار اس نے فوراً ہی تلاتی پر حملہ نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے نریمان فرازی یہ نہ چاہتا ہو مگر تلاتی نے اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی تھی۔ پھر اس کا ایک ساتھی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جبکہ دوسرے آدمی نے صمدی کی گردن سے سب مشین گن کی نال لگا دی تھی۔ اس طرح شہباز اپنی زندگی میں پہلی بار اس طرح مار کھانے کا مزہ چکھ رہا تھا اور اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔ نتاشیہ ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی سہمی ہوئی نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خود صمدی بھی حیران کھڑا ہوا تھا کہ نجانے اس طرح مار کھانے میں اس کے نزدیک نریمان فرازی کی کیا مصلحت تھی۔ نریمان فرازی جیسے آتش مزاج کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ تلاتی بے شک ایک انتہائی خطرناک اور جنگجو شخص تھا لیکن اب تک جو کارروائی ہوتی رہی تھی اس کے تحت شہباز کی بھی حیثیت سے یہ مار نہیں کھا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے ذہن پر نریمان فرازی کا پوری طرح قبضہ ہو اور نریمان فرازی اس وقت یہی چاہتا ہو تبھی تلاتی کی آواز ابھری۔
"اب بھی وقت ہے شاہ کے خزانے کا پتہ بتا دو ورنہ تمہارے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ کر دیا جائے گا۔"
"تم مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکتے۔" نریمان فرازی نے کراہتے ہوئے کہا۔ تلاتی نے ایک بار پھر اسے گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ صمدی اس وقت بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا لیکن اس نے ایک بار آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن گن مین نے اس کی پسلیوں پر رائفل کی نال سے اس طرح ضرب لگائی کہ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔
بہرحال نریمان فرازی یا شہباز پٹتا ہوا نتاشیہ کے قریب آ گیا اور اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا نتاشیہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔
"موت تمہارے سر پر کھیل رہی ہے نریمان فرازی! اٹھو۔" تلاتی نے اس کا گریبان پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا کمرے کے درمیان میں لے گیا۔ لیکن اسے نے نتاشیہ پر توجہ نہیں دی تھی۔ جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے اس اپنا ہاتھ زمین پر ٹکانا

چاہا مگر ہاتھ پرس پر پڑا پرس کا اسٹریپ گلے میں لٹکا ہوا تھا اور پرس زمین پر تھا۔ ہاتھ کے دباؤ سے نتاشیہ کو اپنے پرس میں کسی سخت چیز کا احساس ہوا اور اس کے دماغ میں ایک چھناکہ سا ہوا اسے یاد آ گیا کہ اس کے پرس میں پستول موجود ہے۔ حالانکہ ابھی تک نریمان فرازی سے وہ نفرت کرتی رہی تھی کیونکہ اس کے ساتھ نریمان فرازی نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس کی وجہ سے وہ نریمان فرازی کے ہاتھوں اپنی عزت و ناموس سے محروم ہوئی تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس نے اس وقت نریمان فرازی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور نہایت خاموشی سے پرس میں سے پستول نکال لیا پھر وہ اٹھ کر دیوار کے ساتھ سرکتی ہوئی اس آدمی کی طرف بڑھنے لگی جس نے صدی کو سب مشین گن کی زد میں لے رکھا تھا صدی نے اسے پستول نکالتے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے پر کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

نتاشیہ نے انتہائی ذہانت کے ساتھ پستول پشت پر چھپا رکھا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اپنی جگہ سے سرک رہی تھی اور پھر وہ گن بردار کے پیچھے پہنچ گئی اور اس کے بعد اس نے بڑی ہمت اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پستول اس شخص کی گردن پر لگا دیا۔

”رائفل پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ گولی چلا دوں گی۔“ وہ شخص بدحواس سا ہو گیا اپنی طرف سے توجہ ہٹتے ہی صدی نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مڑ کر اس کے ہاتھ سے گن چھین لی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا جھٹکا لگنے سے نتاشیہ کی انگلی سے ٹریگر دب گیا اور گولی اس شخص کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی۔ اس کی چیخ بڑی بھیانک تھی۔ فائر کی آواز سے تلاتی اور اس کا دوسرا ساتھی چونک گیا۔ وہ اس وقت شہباز پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ اس کے ساتھی نے اچانک رائفل سیدھی کرنا چاہی لیکن صدی نے اسے دوسرے آدمی سے چھینی ہوئی سب مشین گن کی زد پر لے لیا۔

”تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے رائفل پھینک دو۔“ صدی غرایا اور تلاتی کے آدمی نے رائفل پھینک دی ادھر شہباز ناک اور ہونٹوں سے خون پونچھتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے نتاشیہ کو دیکھا جو پستول ہاتھ میں لیے بدحواس کھڑی تھی۔ شہباز کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نتاشیہ کا شکریہ ادا کیا تھا اور اس کے فوراً بعد وہ اپنی اصل حیثیت میں آ گیا۔ نجانے اس وقت وہ کیوں اس قدر نڈھال ہو گیا تھا لیکن اصل حیثیت میں آتے ہی وہ تلاتی اور اس کے آدمی پر ٹوٹ پڑا اور اس کے بعد اس نے جوان

لوگوں کی مرمت شروع کی تو ان کے حلیے بگاڑ دیے۔

شہباز پورا پورا انتقام لے رہا تھا اس کے بعد جب وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تو شہباز نے اس کے اور اس کے ساتھی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قالین پر ڈال دیا صدی تلاتی کے اس آدمی کو بھی پکڑ لایا جو ایمبولینس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوار تھا۔ گہری نیند کی وجہ سے اس نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی اسے بھی کمرے میں باندھ دیا گیا۔ شہباز پر اس وقت جنون سا سوار تھا اسے گیراج سے پٹرول کا ٹین مل گیا۔ اس نے تلاتی اور اس کے ساتھیوں پر پٹرول چھڑکا اور پھر فرنیچر وغیرہ پر پٹرول چھڑکنے لگا۔

تلاتی اور اس کے ساتھی اب بری طرح بدحواس ہو گئے اور گڑگڑا رہے تھے لیکن شہباز پر ان کی گڑگڑاہٹ کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ نتاشیہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ شہباز کے اشارے پر صدی نتاشیہ کو لے کر کمرے سے نکل گیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد شہباز نے دروازے کے قریب قالین پر شعلہ دکھا دیا۔ پٹرول میں تر ہونے کی وجہ سے قالین نے فوراً ہی آگ پکڑ لی اور شہباز باہر کی طرف بھاگ نکلا۔ تلاتی اور اس کے آدمیوں کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کی ہر چیز نے آگ پکڑ لی۔

ایمبولینس تیزی سے حویلی سے نکل گئی۔ تلاتی اور اس کے ساتھیوں کی چیخیں کچھ اور بلند ہو گئی تھیں کچھ دور جانے کے بعد انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ قدیم حویلی پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ شہباز کے ذہن میں نریمان فرازی نے کہا۔

”میں تو حیران ہوں اس بات پر کہ تم نے اتنی مار کیسے کھا لی۔“ شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

”کبھی کبھی انسان کو مار بھی کھانی چاہیے۔“ صدی نے بھی یہ الفاظ سنے۔ یہ تو نہیں سمجھ پایا تھا وہ کہ شہباز یہ الفاظ کس سے کہہ رہا ہے لیکن وہ بھی مسکرا دیا تھا اور عجیب سی نگاہوں سے شہباز کو دیکھنے لگا تھا۔

✿......✿

دو کانٹے نکل چکے تھے اب صرف عادل سرائی رہ گیا تھا اور یہ بات نریمان فرازی کو معلوم تھی کہ عادل سرائی کرنل حیات کے قاتل کو تلاش کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے

گا۔بہرحال اس نے اس سے نمٹنے کا منصوبہ بنالیا تھا لیکن اس کے لیے مناسب وقت درکار تھا۔عادل سرائی کو یقیناً اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ کرنل حیات چونکہ اسی کیس پر کام کر رہا ہے اس لیے نریمان فرازی نے ہی اس کا کام تمام کیا ہوگا۔نتاشیہ کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کیونکہ کرنل حیات نے کسی سے نتاشیہ کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔یہ جاننے کے باوجود کہ نتاشیہ یہودی ہے اور اس نے جعلی شناختی کارڈ بنوا رکھا ہے۔کرنل حیات نے اسے متعلقہ حکام کے حوالے نہیں کیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ نتاشیہ کو اپنی داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا تھا اور اس کی یہی ہوس اور حسن پرستی نتاشیہ کے تحفظ کا باعث بن گئی تھی۔ویسے نریمان فرازی تو اپنے طور پر نتاشیہ کے دل میں جو بھی جذبات رکھتا ہو لیکن یہ پہلی لڑکی تھی جس سے شہباز بذات خود متاثر ہوا تھا۔بے حد حسین، معصوم اور بھولی بھالی۔یہ منصوبہ نریمان فرازی کا تھا کہ اسے کرنل حیات کے پھانسنے کے لیے استعمال کیا جائے۔خود اگر موت کی قیمت پر بھی ہوتا تو شہباز اسے کسی بھی طور پر کرنل حیات جیسے وحشی کے حوالے کرنے کو تیار نہ ہوتا اور یہ بات شہباز اچھی طرح جانتا تھا کہ نتاشیہ کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔خود شہباز نے اپنی زندگی میں اتنی حسن اور بھولی بھالی لڑکیاں کم ہی دیکھیں تھیں نریمان فرازی نے اس معصوم حسینہ کو کرنل حیات جیسے شخص کی بھینٹ چڑھا دیا تھا جس کا اسے بہت غم تھا لیکن اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔نتاشیہ کو کرنل حیات کے پیچھے لگانے کا یہ مقصد تھا کہ نریمان فرازی کے بارے میں اس کی طرف سے پلاننگ کی آگاہی ہوتی رہے۔ان کئی دنوں کے درمیان تو نتاشیہ نہیں معلوم کر سکی تھی کہ کرنل حیات نریمان فرازی کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کر رہا ہے۔لیکن آخری رات نتاشیہ نے کرنل حیات کے بریف کیس میں رکھی جن کاغذات کی تصویریں اتاری تھیں وہ اس کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔کرنل حیات کے ایک بہت بڑے اور خوفناک منصوبے کا راز نریمان فرازی کے ہاتھوں پہنچا تھا اور اس منصوبے میں عادل سرائی کا نام بھی شامل تھا۔کرنل حیات تو نتاشیہ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن عادل سرائی ابھی زندہ تھا اور اب نریمان فرازی کو اپنے مشن میں کامیابی کے علاوہ اس منصوبے کو بھی ناکام بنانا تھا۔

بہرحال وہ صمدی کے ساتھ اس وقت خانم دوینہ کے فلیٹ میں تھا۔حویلی کو آگ لگانے کے بعد وہ سیدھے اس طرف آئے تھے۔ایمبولینس انہوں نے خانم کی عمارت سے بہت دور

چھوڑ دی تھی۔خانم دوینہ نتاشیہ کے ساتھ ان دونوں کو دیکھ کر زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی لیکن بہرحال اسے ان دونوں کو اس وقت تک برداشت کرنا تھا جب تک وہ یہاں رہنا چاہے اور انہیں یہاں رہتے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔اس دوران ان دونوں نے اس دروازے سے باہر جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔یہاں آنے کے تھوڑی دیر کے بعد ہی شہباز نے خانم دوینہ کو نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی دے کر کہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ اس کے مہمان رہیں گے اور یہ رقم اخراجات کے سلسلے میں تھی۔

”تم لوگ مجھے کیا باور کرانا چاہتے ہو۔کیا میں مہمانوں کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔لیکن معاف کرنا تمہیں مہمان رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔جتنا وقت گزر چکا ہے اسی پر اکتفا کرو اور خدا کے واسطے کہیں اور اپنے لیے جگہ منتخب کرو۔“

”سنو۔خانم دوینہ! جب انسان زندگی کی بازی لگا دیتا ہے اور زندگی اس سے مذاق کرتی ہوئی اس کے قریب سے گزرتی رہتی ہے اور موت چھوتی رہتی ہے تو پھر اس نے نزدیک زندگی اور موت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی وہ خود مرنے والا ہوتا ہے تو اپنی زندگی بچانے کے لیے سامنے والے کو قتل کرنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتا۔کیا سمجھیں میرا خیال ہے بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہوگی۔“ خانم دوینہ شہباز کے لہجے پر لرز گئی۔وہ سمجھ گئی تھی کہ چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا اور واقعی یہ سخت لوگ اسے ہلاک کر دیں گے۔چنانچہ وہ خاموش ہو گئی۔ان دونوں نے فلیٹ کے کمرے پر قبضہ کر لیا جبکہ دوسرا کمرا دونیہ اور نتاشیہ کے استعمال میں تھا۔نتاشیہ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی۔وہ لوگ جب سے یہاں آئے تھے اس نے ایک مرتبہ بھی شہباز یا صمدی سے بات نہیں کی تھی جبکہ دوسری طرف شہباز اپنے دل میں اس کے لیے لطیف جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ نتاشیہ پہلی لڑکی تھی جس کے متعلق شہباز ذرا مختلف انداز میں سوچ رہا تھا چونکہ انہوں نے خود اسے کرنل حیات کی ہوس کی بھینٹ چڑھایا تھا۔چنانچہ وہ اسے قصوروار نہیں سمجھتے تھے۔بلکہ نتاشیہ اس کے بعد جس طرح نڈھال ہوگئی تھی وہ چیز ان لوگوں کے لیے دکھ کا باعث تھی۔

بہرحال پھر تین دن اسی طرح گزر گئے تیسرے دن رات کے وقت آخر کار نریمان فرازی نے شہباز سے کہا کہ اب کچھ کرنا چاہیے۔اس دوران خانم دونیہ کے لائے ہوئے اخبارات کے ذریعے صورتحال کا پتہ چلتا رہا تھا لیکن اندر کی باتیں تو اخبارات میں نہیں چھپتی

تھیں۔ پچھلے دن کے اخبار میں قدیم حویلی میں آتش زدگی اور وہاں سے برآمد ہونے والی تین جلی ہوئی لاشوں کی تفصیل بھی چھپی تھی۔ وہ جلی ہوئی لاشوں کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں لکھ سکے تھے بس قیاس آرائیاں کی گئیں تھیں۔ یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ لاشیں کس کی تھیں البتہ پولیس کے حوالے سے یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ آتشزدگی اتفاقیہ نہیں ہے ان تین آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس قتل کو چھپانے کے لیے حویلی کو جان بوجھ کر آگ لگا دی گئی تھی چونکہ تینوں جلی ہوئی لاشوں پر رسی لپٹی ہوئی تھی۔ رسی بھی اگرچہ جل چکی تھی لیکن یہ انداز لگانا مشکل نہیں تھا کہ ان تینوں کو باندھ کر مار ڈالا گیا تھا۔

بہر حال پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ شام کا اندھیر پھیل گیا تو شہباز فلیٹ سے باہر نکل آیا صمدی نے اسے پستول ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا لیکن شہباز نے پستول ساتھ لے جانا ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ ایک خنجر اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا۔ یہ خنجر بڑے اہتمام کے ساتھ ایک چرمی فیتے کی مدد سے بازہ میں اس طرح باندھا گیا تھا کہ بازو کی مخصوص حرکت سے خنجر نکل کر ہاتھ میں آجائے۔ شہباز اپنے میک اپ کے فن سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ نریمان فرازی بھی اس کے اس فن سے بہت متاثر تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"میرے دوست! یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ میں نے زندگی میں بہت بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ لیکن تم جس طرح اپنے چہرے کو بدل لیتے ہو۔ یہ ایک واقع عظیم بات ہے جو میں نہیں کرسکتا اور تم اس میں جتنی مہارت رکھتے ہو۔ مجھے اس کا پورا پورا اندازہ ہے۔" بہر حال اس وقت شہباز کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی اور گھنی مونچھیں تھیں۔ وہ گلیوں میں گھومتا ہوا مین روڈ پر آگیا۔ ابھی تو شام کی ابتداء ہوئی تھی سڑکوں پر چہل پہل تھی شہباز ایک جگہ رک گیا اور ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے ایک ٹیکسی آتی ہوئی نظر آئی اور شہباز نے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کردیا۔ ٹیکسی اس کے قریب آکر رک گئی شہباز پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا لیکن پھر اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ پرائیویٹ ٹیکسی نہیں تھی بلکہ پچھلی سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا اور جو بیٹھا ہوا تھا اسے ایک نگاہ دیکھ کر بدن میں جھرجھری سی آجاتی تھی۔ وہ ایک نوجوان عورت تھی اس نے اگرچہ حجاب پہن رکھا تھا لیکن چہرہ عریاں تھا وہ بے حد حسین تھی۔ شہباز نے اس کے چہرے سے ہی اندازہ لگالیا کہ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ شہباز کی طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ

گئی تھی۔

"کہاں جانا ہے۔" ڈرائیور نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ولی عصر کیفے البرس۔" شہباز نے جواب دیا اور پھر بولا۔

"لیکن پہلے خانم کو ان کی منزل پر پہنچادو۔"

"خانم کو بھی خیابان ولی عصر ہی جانا ہے۔" ڈرائیور نے گردن ہلا کر کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ شہباز نے محسوس کیا تھا کہ وہ عورت آہستہ آہستہ اس کی جانب سرک رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ لگ گئی۔ شہباز کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ کس قماش کی عورت تھی لیکن وہ اطمینان سے بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ البتہ جب وہ عوت اس سے بالکل چپک گئی تو شہباز سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔

"شاید تم کسی بیماری کا شکار ہو۔ پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔

"ہاں میں بیمار ہوں اور یہ بیماری جس طرح کی ہے تمہیں اس کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"جو کچھ تمہاری جیب میں ہے وہ نکال کر میرے حوالے کردو ورنہ میں شور مچادوں گی۔"

عورت نے کہا او شہباز ایک لمحے کے لیے لرز کر رہ گیا۔ ان الفاظ میں جو خوفناک پہلو پوشیدہ تھا اسے یہ عورت بھی نہیں جانتی تھی ویسے قصور اس کا نہیں تھا کیونکہ طوائفیں کھلے عام اب اپنا کاروبار نہیں چلاسکتی تھیں۔ ان بدقماش عورتوں نے اب یہ دھندہ شروع کردیا تھا اور شہباز کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ڈرائیور بھی اس کا ساتھی ہی ہے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شہباز ان دونوں کو اس حرکت کا مزہ چکھادیتا لیکن خود اس کی اپنی پوزیشن ہر حالت میں نازک تھی اگر عورت واقعی شور مچادیتی اور ڈرائیور کسی پرہجوم جگہ پر گاڑی روک دیتا تو لوگ مار مار کر نہ صرف اس کا حلیہ بگاڑ دیتے بلکہ اس کا میک اپ بگڑ جانے سے اس کی اصلیت بھی کھل جاتی۔

"آگے چوراہا ہے۔ اگر تم نے خانم کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو میں گاڑی وہاں روک دوں گا اور خانم شور مچادے گی کہ تم اسے چھیڑ رہے تھے۔ پہلے تو لوگ تمہاری مرمت کریں گے اور پھر تمہیں کمیٹی کے حوالے کردیا جائے گا اور تم جانتے ہو کمیٹی والے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا

سلوک کرتے ہیں۔'' شہباز کے منہ سے بے اختیار گہری سانس نکل گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت اس کی جیب میں ہزار بارہ سو سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ اس نے خاموشی سے یہ رقم نکال کر عورت کے حوالے کر دی۔

''بس مجھے یہیں اتار دو۔''

''اب ہم اتنے بد اخلاق بھی نہیں ہیں کہ جیب خالی کرانے کے بعد تمہیں راستے میں ہی اتار دیں اطمینان رکھو اب تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور تمہیں خیابان ولی عصر پر کیفے کے سامنے اتار دیا جائے گا۔'' ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا شہباز خاموش ہو گیا۔ عورت اب سمٹ کر دوسرے دروازے کی جانب جا لگی تھی پھر ٹیکسی خیابان ولی عصر کے سامنے رک گئی اور شہباز اتر کر کیفے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک اور آدمی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ شہباز بے اختیار مسکرا پڑا وہ اس ٹیکسی کے نئے مسافر کے انجام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرنے کا خیال بھی آیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے ارادہ ترک کر دیا کہ اس قسم کا کام کرنے والے محتاط رہتے ہیں۔ شکار پر نکلنے سے پہلے اس نے یقیناً ٹیکسی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دی ہوگی۔ جعلی نمبروں سے کسی گاڑی کا سراغ لگانا آسان کام نہیں ہوتا۔

کیفے البرس کا مالک سلجوتی، تلاتی کا آدمی تھا اور یہ بات نریمان فرازی اچھی طرح جانتا تھا یہ ریسٹورنٹ تلاتی کے ہیڈ کوارٹر کا کام دیتا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کے تھوڑی دیر کے بعد پاسداران نے چھاپہ مار لیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے تھے وہ لوگ۔ اس ہنگامے میں آٹھ افراد مارے گئے تھے۔ جن میں چھ آدمی اور دو عورتیں شامل تھیں کچھ مشتبہ لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ گرفتار ہونے والے دیگر آدمیوں کا تو کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ البتہ سلجوتی دوسرے دن ریسٹورنٹ میں موجود تھا جس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تلاتی کے علاوہ پولیس یا کمیٹی کے لیے بھی مخبری کرتا ہے اس کا سب سے بڑا فائدہ تلاتی کو پہنچا ہوگا کیونکہ وہ سلجوتی کے ذریعے پولیس کی سرگرمیوں سے باخبر رہتا ہوگا۔

اس وقت کیفے میں البرس میں شہباز کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ وہ تلاتی کی موت کے بارے میں سلجوتی اور دیگر ساتھیوں کا رد عمل بھی معلوم کر سکے یقیناً انہیں پتہ چل چکا تھا کہ تلاتی

بھی اسی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا ہے۔ شہباز کاؤنٹر کے قریب ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ نا صرف کاؤنٹر بلکہ ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے اور اوپر جانے والے زینے پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ ہال میں گاہکوں کی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ سلجوتی اس وقت کاؤنٹر پر موجود تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ سیڑھیوں سے اترتا ہوا نظر آ گیا اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جسے دیکھ کر شہباز چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ نریمان نے اس کے کان میں کہا۔

''ہاں اب تم تیز نگاہ بھی رکھنے لگے ہو۔ یہ عادل سرائی کا آدمی ہے بظاہر وہ دونوں لاتعلق نظر آ رہے تھے لیکن شہباز کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پہلے یقینی طور پر ساتھ ہی بیٹھے ہوئے ہوں گے اور آپس میں کوئی نہ کوئی منصوبہ گھڑ رہے ہوں گے۔''

بہر حال سلجوتی بھی کاؤنٹر کی طرف آ گیا اور دوسرا آدمی ادھر ادھر دیکھے بغیر باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے کافی منگوائی اور جب اس کی کافی سرد ہو گئی تو وہ ہلکی ہلکی چسکیاں لیتا ہوا کاؤنٹر کی طرف دیکھتا رہا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ایک اور آدمی کو ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر نریمان فرازی نے شہباز کے کانوں میں کہا۔

''اسے دیکھو..... پہچانتے ہو۔''

''ہاں یہ تلاتی ہی کا آدمی ہے۔''

''بالکل ٹھیک ...... اب تو یوں لگ رہا ہے جیسے تمہارے ذہن میں خود میری ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ تم اس مسئلے پر شناسا ہو گئے ہو۔ یہ تلاتی ہی کا آدمی ہے۔ اوہو...... ادھر دیکھو، ادھر دیکھو، نریمان فرازی نے شہباز کو اس طرف متوجہ کیا اور شہباز ادھر دیکھنے لگا اس شخص نے کاؤنٹر کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ سے مخصوص اشارہ کیا تھا اور پھر زینے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شہباز سمجھ گیا سلجوتی کو اوپر بلایا گیا ہے۔ وہ آدمی آخری سیڑھی پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اس کے چند ہی سیکنڈ کے بعد سلجوتی بھی کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اب شہباز کا یہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے پھرتی سے سامنے رکھی ہوئی کافی کی پیالی اٹھا کر حلق میں انڈیل لی۔ کافی کڑوی تھی اور گرم بھی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ صرف ایک منٹ کے بعد شہباز بھی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ پہلی منزل کی راہداری پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ سلجوتی کا دفتر دائیں طرف تھا۔ شہباز دبے

قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دفتر کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اندر سے باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شہباز نے دروازے سے کان لگا دیئے لیکن آوازیں صاف نہیں تھیں۔ وہ صرف ایک نام سن سکا تھا اور وہ نام تھا عادل سرائی۔

دفعتاً ہی اوپر والے زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور شہباز جلدی سے دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ اس انداز میں نیچے جانے کے لیے زینے کی طرف چل پڑا جیسے پہلے سے ایسا کر رہا ہو۔ اوپر سے ایک عورت اور ایک آدمی اتر رہے تھے۔ وہاں رکنا شہباز کے لیے اب کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ چونکہ کوئی بھی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ چھپ کر ان دونوں کے چلے جانے کا انتظار کر سکے۔ چنانچہ ہال میں آنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ البتہ جس جگہ وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا وہاں کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ مجبوراً شہباز کو ایک دوسری میز سنبھالنا پڑی اور میز پر بیٹھنے کے بعد اس نے ویٹر کو دوبارہ کافی لانے کے لیے کہہ دیا وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ وہاں سے چوتھی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے شہباز کو اوپر جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ شخص کچھ دیر تک شہباز کو دیکھتا رہا پھر باہر نکل گیا شہباز البتہ اس آدمی سے واقف نہیں ہو سکا تھا۔ وہ بار بار زینے کی طرف دیکھ رہا تھا تقریباً تین منٹ کے بعد کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی اور کاؤنٹر پر موجود شخص نے ریسیور اٹھایا اور پھر فون پر بات کرتے ہوئے وہ متجسس نگاہوں سے اس میز کی طرف دیکھنے لگا جہاں شہباز بیٹھا ہوا تھا پھر اس نے فون بند کر دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زینے کی جانب چل پڑا۔ چند سیڑھیاں طے کر کے اس نے رک کر شہباز کی میز کی طرف دیکھا اور پھر اوپر چلا گیا۔

اس کے تقریباً پانچ منٹ کے بعد دو آدمی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازے پر رک کر چند سیکنڈ تک متجسس نگاہوں سے ہال میں دیکھا۔ جیسے کسی خالی میز کی تلاش میں ہوں۔ ٹھیک اسی وقت شہباز کے ساتھ والی میز پر سے دو آدمی اٹھ گئے۔ میز خالی ہوگئی۔ دروازے سے آنے والے دونوں آدمی میز پر آ کر بیٹھ گئے اور ویٹر کو بلا کر کافی کا آڈر دے دیا کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ شہباز اگرچہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ مگر ان سے غلطی ہوگئی ان میں سے ایک نے کسی مسئلے پر تلاتی کا نام لیا اور یہ آواز شہباز کے کانوں میں پہنچ گئی۔ اس نے اپنی تمام تر ساعتیں قوتیں اس طرف منتقل

کر دیں وہ سرشیانہ لہجے میں اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

"تلاتی کی موت پر اس کے آدمی خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح نریمان فرازی کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تلاتی کے نائب نے بھی آج ہمارے باس سے رابطہ قائم کیا تھا اور ایک بھاری معاوضے کی پیش کش کی درخواست کی تھی۔"

"کس قسم کا تعاون۔" دوسرے نے پوچھا۔

"نریمان فرازی کو تلاش کرنے کا۔" پہلے آدمی نے جواب دیا۔

"نریمان فرازی کا تلاش کرنے کا۔" پہلے آدمی نے جواب دیا۔

"تلاتی کے معاون نے سختی سے یہ ہدایت بھی کر رکھی ہے کہ اگر نریمان فرازی کہیں مل جائے تو اسے نقصان پہنچانے کے بجائے زندہ سلامت اسکے حوالے کیا جائے۔ وہ نریمان فرازی سے تلاتی کا انتقام لے گا۔"

"مگر آخر وہ ہمیں ملے گا کہاں۔ کیا اس طرح ہوٹلوں میں مارے مارے پھرنے سے ہمیں نریمان فرازی مل جائے گا۔"

"ظاہر ہے کوشش تو کرنا ہی ہوگی۔" پہلے نے جواب دیا۔ اگر وہ ہمیں مل جائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ باس نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ جو شخص نریمان فرازی کو تلاش کرے گا اسے ایک لاکھ ریال انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔"

"آہ...... خدا کرے یہ لاٹری ہمارے نام نکل آئے۔ دوسرے شخص نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کاش...... ایسا ہی ہو۔" پھر انہوں نے موضوع بدل دیا۔ شہباز نے بہت ہی خفیف سے انداز میں گردن گھما کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں صورتوں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ یقیناً ان کا تعلق جرائم پیشہ گروہ سے تھا۔ ان میں سے ایک درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کا سر گنجا اور باریک مونچھیں تھیں جو چوہے کی دم کی طرح ہونٹوں کے دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں۔ دوسرا دبلا پتلا اور نکلتے ہوئے قد کا مالک تھا۔ اس کی مونچھیں بھاری تھیں اور چہرہ کافی سخت معلوم ہوتا تھا۔

"چلو اب اٹھو۔ یہاں سے چلنا چاہیے۔" پستہ قامت گنجے نے کہا۔

"تم باہر انتظار کرو میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔" دوسرے نے مخصوص انداز میں چھوٹی انگلی

اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ انہوں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کر دیا۔ پستہ قامت شخص باہر نکل گیا جبکہ دراز قامت اپنے زینے کے ایک طرف بنی ہوئی راہداری کی طرف جہاں ٹوئلٹ کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد شہباز بھی اس تنگ سی راہداری میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ راہداری آگے جا کر دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ اس طرف والی راہداری کشادہ تھی۔ فرش اور دیواروں پر سفید ٹائلیں لگی ہوئی تھیں اور دونوں طرف ٹوائلٹ بنے ہوئے تھے۔

شہباز دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ وہ تیسرے دروازے کے سامنے سے ایک قدم آگے بڑھا تھا کہ دروازہ کھلا اور اس ٹوائلٹ سے وہی دراز قد آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی آہٹ سن کر شہباز تیزی سے پیچھے مڑا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ لمبے قد والے آدمی کے ہاتھ میں وہ چیز شہباز کی کھوپڑی پر لگی اور شہباز کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پیلی پیلی چنگاریاں ناچنے لگیں اور پھر تاریکی کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ وہ کھڑے کھڑے لہرا گیا لیکن اس شخص نے گرنے سے پہلے ہی اسے سنبھال لیا اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹتا ہوا راہداری کے اگلے سرے کی جانب بڑھ گیا۔

اس طرف بھی ایک دروازہ تھا۔ اس شخص نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور شہباز کو گھسیٹتا ہوا دروازے میں غائب ہو گیا۔ شہباز کو اندازہ نہیں تھا کہ اسے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا ہے لیکن جب آنکھ کھلی تو سر بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار سر پر پہنچ گیا۔ ہاتھ پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ ضرب لگنے سے کھوپڑی کی کھال پھٹ گئی تھی اور خون جم گیا تھا۔ اس کا ہاتھ چہرے پر پہنچ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے پورے بدن میں جیسے کرنٹ سا لگا اس کی داڑھی اور مونچھیں غائب تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ تہہ خانے میں ہے۔ ایک طرف اوپر جانے کے لیے پتلی سیڑھی نظر آ رہی تھی۔ یہ تہہ خانہ غالباً ریسٹورنٹ کے گودام کا کام دیتا تھا۔ کیونکہ ایک طرف آٹے وغیرہ کی بوریاں اور لکڑی کی پیٹیاں رکھی ہوئی تھی اور بھی بہت سی چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ شہباز اٹھ کر پیٹیوں کے قریب پہنچ گیا اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ پیٹیوں میں شراب کی بوتلیں تھیں جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں چوری چھپے شراب بھی فروخت ہوتی ہے اور ظاہر ہے اس قسم کے کاروبار کے لیے سلجوقی کو کسی نہ کسی سرکاری آفیسر کی سرپرستی بھی حاصل ہو گی۔ اس ملک میں اب بھی ایسے لوگوں کی

کمی نہیں تھی جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی نہ کسی طرح انقلابی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔

اسی لمحے سیڑھیوں کا اوپر والا دروازہ کھلا اور دو آدمی سیڑھیاں اتر کر اندر آ گئے۔ ان میں ایک سلجوقی تھا اور دوسرا وہی لمبے قد و قامت والا دبلا پتلا آدمی جس نے ٹوائلٹ میں سے اس پر حملہ کیا تھا اب شہباز کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان لوگوں کو اس پر پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا اور ساتھ والی میز پر دو آدمیوں کی وہ گفتگو اسے پھنسانے کے لیے چال تھی اور وہ بڑی آسانی سے اس چال میں آ گیا تھا۔ شہباز نے پھرتی سے شراب کی بوتل اٹھا لی لیکن لمبے قد والے آدمی کے ہاتھ میں اس نے ریوالور دیکھ کر بوتل چھوڑ دی۔

''ہم خوش قسمت ہیں۔'' سلجوقی اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''تہران کی تمام سیکورٹی ایجنسیاں تمہاری تلاش میں ہیں کرنل حیات اور تلاتی تمہارے ہاتھوں مارے گئے۔ انٹیلی جنس اور کمیٹی کے آدمی تمہاری جستجو میں اپنی جان سے ہاتھ دھوتے رہے لیکن تم ہر مرتبہ چھلاوے کی طرح ان کے جال سے نکل گئے۔ بتاؤ کیا یہ ہماری خوش قسمتی نہیں ہے کہ تم خود چل کر ہمارے پاس آ گئے ہو اور اب اس تہہ خانے سے تم اس وقت تک نہیں نکل سکو گے جب تک شاہ کے خفیہ خزانے کا پتہ نہ بتا دو۔''

''واہ......'' شہباز نے خود کو سنبھال لیا پھر بولا۔

''بیوقوف ہو تم سلجوقی نہ تو تم مجھ سے خزانے کا پتہ معلوم کر سکتے ہو اور نہ ہی تم مجھے یہاں روک سکتے ہو۔''

''یہ شخص البتہ دبلا پتلا سا آدمی ہے لیکن اسے زبان کھلوانے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔''

سلجوقی نے کہتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور دراز قد آدمی نے اپنا ریوالور سلجوقی کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا شہباز کی جانب بڑھنے لگا۔ شہباز نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر ایک پیٹی میں سے شراب کی بوتل اٹھا لی لیکن وہ دراز قد واقعی چھلاوا تھا اس نے اس طرح پلٹ کر شراب کی دوسری بوتل اٹھائی کہ شہباز بھی اس کی پھرتی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب وہ آگے بڑھ رہا تھا اور شہباز الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ آخر کار وہ آٹے کی بوری کے ساتھ جا لگا۔ دراز قامت آدمی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شہباز

اس وقت بڑی برق رفتاری سے اپنا کام کرنا چاہتا تھا چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ باقاعدہ
دشمنوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔

دفعتاً دراز قامت شخص نے ایک پینترا بدلا اور شہباز نے فوراً ہی اس کی کاٹ کی اس کے
ساتھ ہی اس نے بوتل سے دراز قد آدمی پر حملہ کر دیا۔ دراز قد آدمی نے فوراً ہی اپنے آپ کو
سنبھالا بوتل آٹے کی بوری پر لگی اور چند سیکنڈ بعد دراز قد آدمی نے دوسرا حملہ کر دیا اس مرتبہ
اس حملے کو روکنے کے لیے شہباز نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سامنے کر دی ایک زور
دار آواز کے ساتھ دونوں بوتلیں پھٹ گئیں اور شراب کی چھینٹوں نے دونوں کے لباس اور
چہروں کو تر کر دیا۔ شراب کی بو سے شہباز کو ابکائی سی آنے لگی لیکن اس نے فوراً ہی اپنی اس
کیفیت پر قابو پا لیا۔ دونوں کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی بوتلیں اب خوفناک ہتھیار کی صورت
اختیار کر چکی تھیں اور دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ شہباز نے
ایک بار پھر وار کیا اور اس کا حملہ خالی گیا۔ دراز قد آدمی نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے
ہوئے حملہ کر دیا۔ شہباز بڑی تیزی سے نیچے جھک گیا۔ دراز قد آدمی کی بوتل آٹے کی بوری
پر لگی اور بوری میں کافی حد تک اندر دھنس گئی۔ شہباز نے اس صورتحال سے پورا پورا فائدہ
اٹھاتے ہوئے بوتل پوری قوت سے اس کے سینے پر ماری اور بوتل کے ٹوٹے ہوئے نوکیلے
کونے اس کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ دراز قد آدمی کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ وہ
لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر سلجوتی بدحواس سا ہو گیا
اس کا خیال تھا کہ نریمان فرازی دباؤ میں رہے گا اور زیادہ دلیری نہیں دکھا سکے گا لیکن یہاں
صورتحال اس کے برعکس ثابت ہوئی تھی۔ سلجوتی نے ریوالور والا ہاتھ سیدھا کیا لیکن اسی لمحے
شہباز کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل ہوا میں اُڑی اور سلجوتی کے ریوالور والے ہاتھ پر لگی۔
بوتل کا ٹوٹا ہوا ایک کونا خنجر کی طرح اس کی کلائی کے قریب گوشت میں پیوست ہو گیا۔ اس
کے منہ سے چیخ نکلی اور ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شہباز ایک ہی چھلانگ میں سلجوتی کے
نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اس نے داہنے بازو کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ آستین میں چھپا ہوا خنجر
پھسل کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے لپک کر سلجوتی کو اس طرح جکڑ لیا کہ اس کا سر
شہباز کے گھٹنوں پر تھا۔ شہباز نے اس کے بال پکڑ کر سر کو ایک طرف جھکایا اور دائیں ہاتھ
میں پکڑا ہوا خنجر اس کی شہ رگ پر پھیر دیا۔

اب اس وقت وہ غیر انسانی کیفیت اختیار کر گیا تھا خود نریمان فرازی اسے احکامات
دے رہا تھا۔ چنانچہ شہباز کے چہرے پر بے پناہ درندگی پھیل گئی تھی۔ اس نے قصائی کی طرح
سلجوتی کی شہ رگ پر خنجر چلایا تھا اور سلجوتی کی شہ رگ سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ شہباز
نے اسے چھوڑ دیا سلجوتی اب بری طرح فرش پر تڑپنے لگا تھا۔ ایک لمحے تک شہباز اس کے
تڑپنے کا منظر دیکھتا رہا لیکن پھر وہ اس وقت چونکا جب اوپر سے آوازیں سنائی دیں۔ اس
کے ساتھ ہی پھرتی سے اس نے سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ آخری سیڑھی پر تھا
کہ تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ شہباز دروازے کی آڑ میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو
گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا لیکن اسے دیکھ کر شہباز دنگ رہ
گیا۔ یہ عادل سرائی تھا جو اس بات سے بے خبر تھا کہ دروازے کی آڑ مین کوئی ہے۔ جیسے ہی
وہ آگے بڑھا شہباز نے اپنی ٹانگ اس کے سامنے کر دی۔ عادل سرائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ
نکلی اور وہ سیڑھیوں پر قلابازیاں کھانے لگا۔ شہباز نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور نیم
تاریک راہداری میں ایک طرف دوڑ لگا دی۔

✡......✡

تہران میں پے درپے ان وارداتوں سے خوف وہراس تو پھیلا ہی تھا کمیٹی اور انٹیلی جنس میں بھی ٹھن گئی تھی۔ جبکہ پولیس خاموش تماشائی بنی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ عادل سرائی بڑی سرگرمی سے نریمان فرازی کی تلاش میں تھا۔ اس سے ان واقعات کے بارے میں تین دن میں رپوٹ پیش کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے فرازی کے بارے میں کوئی ایسا ٹھوس مواد مل جائے جسے وہ رپوٹ کی بنیاد بنا سکے۔ اس شام وہ آٹھ بجے اپنے دفتر میں تھا کہ اسے کیفے البرس کے مالک سلجوقی کی فون کال ملی۔ سلجوقی بہت عرصے سے اس کے لیے کام کررہا تھا۔ اس کی مخبری پر بہت سے مجرم پکڑے بھی گئے تھے۔ جو اس وقت آہنی سلاخوں کے پیچھے بند تھے۔ سلجوقی نے اسے بتایا کہ اسے اپنے آدمی سے ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے کہ ایک مشتبہ آدمی اس کے ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ نریمان فرازی ہوسکتا ہے لیکن وہ خود کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا اس لیے عادل سرائی آجائے۔ اس کے آنے تک اس مشتبہ شخص کو روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ اطلاع ملتے ہی عادل سرائی کیفے البرس کی طرف روانہ ہوگیا تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ کاؤنٹر پر موجود سلجوقی کے آدمی نے بتایا کہ وہ مشتبہ شخص نریمان فرازی ہی تھا اور اس وقت وہ تہہ خانے میں ہے اور سلجوقی اور ایک اور آدمی بھی وہیں موجود ہیں۔ اچانک ہی عادل سرائی کو احساس ہوا کہ اس نے حماقت کی ہے معمولی شخصیت نہیں تھی اس کی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے ساتھ ذمے داروں کی ایک فوج لاسکتا تھا۔ لیکن بس دوہری کیفیت کا شکار تھا۔ اس نے اکیلے یہاں آنا مناسب سمجھا تھا کیونکہ پچھلے چند تجربات سے وہ خاصا محتاط ہوگیا تھا۔ اس لیے کوئی کاروائی کرنے سے پہلے ہر طرح کا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ اس اطلاع کو پا کر اسے امید بندھی تھی کہ شاید اس بار نریمان فرازی ہاتھ آجائے اور وہ اسے بے بس کر کے قید خانے میں ڈال دے۔ وہ ریسٹورنٹ کی عقبی راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ رپورٹ

کے بجائے کل صبح نریمان فرازی کو اعلیٰ حکام کے سامنے پیش کر دے گا اور اس وقت اس کی حیثیت جس قدر مستحکم ہوجائے گی اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

بہر حال تہہ خانے والا دروازہ لاک نہیں تھا بلکہ ایسے ہی بھڑا ہوا تھا دروازہ کھول کر اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے کسی شخص نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑائی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بری طرح سیڑھیوں پر قلابازیاں کھاتا ہوا تقریباً بارہ فٹ نیچے جاگرا۔ اس طرح سیڑھیوں پر لڑھکنے سے اس کے جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں لگی تھیں۔ اس نے پیشانی کو چھو کر دیکھا، چوٹ اگرچہ زیادہ نہیں لگی تھی لیکن خون بہہ نکلا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھاتی جارہی تھی۔ اس نے دو تین بار سر جھٹکا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ چند سیکنڈ کے بعد جب حواس بحال ہوئے تو اس نے سیڑھیوں کی طف دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے سیڑھیوں سے گرانے والا جو کوئی بھی تھا جا چکا تھا اس نے گھوم کر تہہ خانے میں دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

دو لاشیں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی تھی ان میں سے ایک سلجوقی کی تھی اور دوسری اس دراز قامت آدمی کی جس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر ٹوٹی ہوئی بوتل پیوست تھی۔ سلجوقی کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی دونوں لاشیں دیکھ کر عادل سرائی کو اپنے دماغ پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ اس نے انقلاب کے دوران بہت خون بہتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جس سفاکی سے یہ قتل کیے گئے تھے اسے دیکھ کر یہ اپنی طبیعت پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ البتہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات پوری طرح آچکی تھی کہ اسے سیڑھیوں سے گرانے والا نریمان فرازی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ اب وہ اپنی اس حماقت پر بھی پچھتا رہا تھا کہ اکیلا یہاں کیوں آیا تھا اگر اپنے کچھ ماتحتوں کو ساتھ لے آتا تو فرازی کو فرار ہونے کا موقع نہ ملتا۔ وہ تہہ خانے سے باہر آگیا۔ فرازی کی تلاش میں اس کے پیچھے بھاگنا بے کار تھا وہ تیز تیز قدموں سے راہداری طے کرتا ہوا ہال میں آیا۔ ہال کی تمام میزیں گاہکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ عادل سرائی نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا ٹیلی فون اپنی طرف سرکایا اور ریسیور اٹھا کر اپنے دفتر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

وہ چیخ چیخ کر فون پر بات کر رہا تھا۔ اصل میں اسے اپنے ذہنی ہیجان پر قابو پانا سخت مشکل لگ رہا تھا اس وقت ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ یہاں دو آدمی

قتل کر دیئے گئے ہیں تو وہ سیٹوں سے اٹھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہال خالی ہو گیا۔ عادل سرائی کے آدمیوں نے کیفے البرس پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ عادل نے اپنے چند آدمیوں کو یہاں پہنچنے کے علاوہ یہ ہدایت بھی کی تھی کہ شہر کی تمام سڑکوں کی ناکا بندی کر دی جائے اور نریمان فرازی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ سلجوقی کے ایک آدمی کے بیان کے مطابق نریمان فرازی کے چہرے کا میک اپ صاف کر دیا گیا تھا اور اس وقت وہ اپنی اصل شکل میں تھا جسے شناخت کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس نے حکم دیا تھا کہ ہر مشتبہ شخص کو گرفتار کر لیا جائے۔

عادل سرائی رات دس بجے تک کیفے البرس میں مصروف رہا پھر شہر کے گشت پر نکل کھڑا ہوا۔ اس کے احکامات پر بڑی سختی سے عمل کیا جا رہا تھا سڑکوں پر کمیٹی کی گاڑیاں دندناتی پھر رہی تھیں۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی تھی اسے بھی کئی جگہ روکا گیا لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہی اس کے ماتحت مؤدب ہو جاتے اور اب تک کی کاروائی کی رپوٹ پیش کر دیتے۔ ایک گھنٹے میں بائیس مشتبہ شخص کو گرفتار کر کے کمیٹی کے دفتر پہنچا دیا گیا تھا۔ عادل سرائی شہر کی مختلف سڑکوں پر گشت کرتا ہوا جب دفتر پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔ گرفتار کیے جانیوالے مشتبہ آدمیوں کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ان میں سے تین آدمی ایسے تھے جن کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا۔ ان تینوں کو حوالات میں بند کر کے باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ عادل سرائی کرسی سے اٹھ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے رسیور اٹھا لیا۔ کچھ منٹوں تک کسی سے باتیں کرتا رہا پھر فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ لمحے کے بعد اس کی گاڑی کرنل حیات کے بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔ کرنل حیات کا بنگلہ انٹیلی جنس کے چیف کے حکم پر مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا اور اسے مقفل کر دیا گیا تھا۔ بنگلہ مقفل کیا جانے سے پہلے تقریباً دو گھنٹے تک چیف اکیلا ہی بنگلے میں بند رہا تھا۔ اس وقت اپنے ماتحت سے بات کرتے ہوئے کرنل حیات کا ذکر بھی آیا تھا اور عادل سرائی کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کرنل حیات کے قاتل کا اگرچہ سراغ نہیں مل سکا۔ لیکن اس واردات میں بھی نریمان فرازی کے ملوث ہونے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ عادل سرائی یہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے کرنل حیات کو نریمان فرازی کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہو گئی ہو اور نریمان نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہو۔ اب وہ یہ سوچ کر کرنل حیات کے بنگلے کی جانب جا رہا تھا کہ ممکن ہے

وہاں سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جس سے نریمان فرازی کے بارے میں کوئی سراغ مل سکے۔ کرنل حیات کا بنگلہ اگرچہ مقفل کر دیا گیا تھا مگر اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔

چنانچہ عادل سرائی کو عقبی دروازے سے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کرنل حیات کی خواب گاہ میں پہنچ کر روشنی جلانے سے پہلے اس نے تمام کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیئے۔ اسے یقین تھا کہ اس مکان کو مقفل کرنے سے پہلے اس کی مکمل تلاشی لے لی گئی ہو گی۔ لیکن نجانے کیوں اسے امید تھی کہ اسے یہاں کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور مل جائے گیا جو اس کی رہنمائی کر سکے۔

بیڈ روم کے علاوہ اس نے دوسرے کمروں کی بھی تلاشی لے لی لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ملی جسے مفید اور کار آمد کہا جا سکتا۔ آخر کار ایک بار پھر وہ بیڈ روم میں آ گیا اور چند لمحے متجسس نگاہوں سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر غیر ارادی طور پر اس نے کمرے کا میٹرس الٹ دیا۔ میٹرس کے نیچے براؤن رنگ کا لفافہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھر آئی۔ اس نے لفافہ اٹھا لیا جو کافی ہلکا تھا۔ عادل سرائی نے لفافہ کھولا تو اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اس میں پولورائیٹ کیمرے سے کھینچی ہوئی صرف ایک تصویر تھی۔ وہ خوبصورت لڑکی پلنگ پر سو رہی تھی۔ بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ تصویر دیکھتے ہی عادل سرائی کو اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تصویر اس لڑکی کے سوتے میں بے خبری میں کھینچی گئی تھی عادل سرائی نے کرنل حیات کے بارے میں عورت کے سلسلے میں کئی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس معاملے میں وہ کافی بدنام تھا۔ عام طور پر طوائفیں اور بدکردار عورتیں ہی کرنل حیات جیسے لوگوں کے ساتھ شب بسر کرتی تھیں۔ جبکہ یہ لڑکی ایسی نہیں لگ رہی تھی اس کے چہرے پر تو بے پناہ معصومیت تھی اگر وہ بھی اس قماش کی لڑکی تھی اور اس نے رات کرنل حیات کے ساتھ گزاری تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کرنل حیات نے سوتے میں اس کی ایسی تصویر کیوں کھینچی تھی۔ اس نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا اس کے پیچھے دو نام لکھے ہوئے تھے اور شہر کے زیریں علاقے میں واقع ایک فلیٹ کا پتہ بھی لکھا تھا اس کے ساتھ ہی پانچ دن پہلے کی تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تصویر پانچ دن پہلے کھینچی گئی تھی۔

عادل سرائی نے گھڑی کی طرف دیکھا گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے

تصویر والا لفافہ جیب میں رکھ لیا اور جس راستے سے گھر میں داخل ہوا تھا اسی سے واپس نکل آیا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی کار شہر کے زیریں علاقے کی طرف جا رہی تھی۔ عادل سرائی کو وہ اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کار اس نے سڑک پر روک دی اور بلڈنگ کے مین گیٹ میں داخل ہو گیا یہ اس نے باہر ہی دیکھ لیا تھا کہ بیشتر فلیٹوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اس عمارت کے رہنے والے اکثر لوگ جاگ رہے تھے۔ تیسری منزل تک چڑھتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا۔ وہ راہداری میں کھڑا ہو کر کچھ دیر اپنا سانس درست کرتا رہا پھر دروازے پر لگے نمبر کو دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔

اس منزل پر چار فلیٹ تھے دو ایک طرف اور دو دوسری طرف۔ مطلوبہ فلیٹ دائیں طرف تھا اس کا دروازہ ذرا آگے تھا اس نے دروازے کے سامنے رک کر ایک لمحے توقف کیا پھر ہلکی سی دستک دے ڈالی صرف ایک منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کے چہرے پر سر درد اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے عادل سرائی کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو تم، اور کس سے ملنا ہے۔'' عورت نے پوچھا اس کے لہجے میں خاصی کرختگی تھی۔

''خانم دونیہ۔'' عادل سرائی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ میرا ہی نام ہے لیکن میں تمہیں نہیں جانتی۔'' عورت نے جواب دیا۔

''یقیناً آپ مجھے نہیں پہچانتی ہوں گی۔'' عادل سرائی نے کہا اس نے تصویر سے پہلا نام لے کر یہ سوال کیا تھا اور تصویر یقیناً اس عورت کی نہیں تھی۔

''میں کمیٹی کا مقامی سربراہ ہوں۔ عادل سرائی۔''

''کک...... کمیٹی......'' خانم دونیہ ہکلا کر رہ گئی اس کا چہرہ ایک دم سے سفید پڑ گیا تھا پھر اس نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھ سے کیا کام ہے؟ میں نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔''

''یقیناً نہیں کیا ہوگا۔'' عادل سرائی نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا پھر تصویر جیب سے نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

''اس لڑکی کو پہچانتی ہو اس کا نام نتاشیہ ہے۔ اس سے تمہارا کیا تعلق ہے۔''

''نتاشیہ میری بھانجی ہے وہ بڑی معصوم لڑکی ہے اور......'' خانم دونیہ نے تصویر دیکھے بغیر کہا تصویر پر نظر پڑتے ہی ایسے خاموش ہو گئی جیسے زبان بند ہو گئی ہو۔ اسے اپنے سینے میں سانس رکتا محسوس ہونے لگا تھا۔

''تمہاری بھانجی کی معصومیت تو اس تصویر میں نظر آ رہی ہے۔'' عادل سرائی نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ تو سو رہی ہے یہ اس کی تصویر نہیں ہو سکتی یہ جھوٹ ہے۔'' خانم دونیہ نے ہکلا کر کہا۔

''کیا تم اس تصویر کو جھٹلا سکتی ہو۔'' عادل سرائی نے اسے گھورا اور اسے ہٹا کر دروازے میں داخل ہو گیا۔

''تم جانتی ہو کہ بے حیائی کتنا بڑا جرم ہے۔ یہ تصویر تمہاری بھانجی کو اور تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی ہے لیکن میں ایک اور معاملے میں نتاشیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے مجھ سے تعاون کیا تو کچھ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن دوسری صورت میں......'' عادل سرائی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ خانم دونیہ کا چہرہ بدستور زرد پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ جبکہ اندر دائیں طرف والے کمرے میں صمدی آوازیں سن کر کمرے کے دروازے پر آ گیا تھا۔ اس نے جھری میں سے جھانک کر دیکھا عادل سرائی کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے اپنی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تیسری منزل سے چھلانگ لگانے کی ہمت کسی بھی طور نہیں کی جا سکتی تھی اچانک اس کی نگاہ کھڑکی کے دو فٹ کے فاصلے پر ڈرینل پائپ پر جم گئی۔ کھڑکی چوکھٹ پر چڑھ کر اس نے پائپ پر گرفت جمائی اور ایک پیر چوکھٹ سے ہٹا کر پائپ کی اسی بریکٹ پر جما دیا جو اسے سہارا دینے کے لیے دیوار میں لگی ہوئی تھی اس نے دوسرا پیر بھی چوکھٹ پر جمایا اور جلدی سے دوسرے ہاتھ کی گرفت بھی پائپ پر جما دی۔ نیچے دیکھتے ہوئے اسے چکر سا آ گیا تھا اگر پائپ اکھڑ جاتا یا اس کا ہاتھ چھوٹ جاتا تو تین منزل نیچے سڑک پر گر کر اس کی ہڈیوں کا سرمہ بن جاتا۔ پہلے اس نے سوچا کہ پائپ کے سہارے نیچے چلا جائے۔ لیکن اسی لمحے کمرے میں عادل سرائی کی آواز سنائی دی وہ خانم دونیہ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

صمدی نے سوچا کہ پائپ کے سہارے نیچے جانے کی صورت میں اگر عادل سرائی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیا تو اسے دیکھ لیا جائے گا اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر بندر کی سی پھرتی سے پائپ پر اوپر کی طرف سرکنے لگا۔ کھڑکی کے اوپر تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی کارنس بنی ہوئی تھی۔ صمدی اس کارنس پر کھڑا ہو گیا ٹھیک اس لمحے عادل سرائی نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اس نے اوپر کی طرف دیکھا بھی تھا لیکن کارنس کی وجہ سے صمدی اس کی نظروں میں آنے سے محفوظ ہی رہا۔

ادھر خانم دونیہ عادل سرائی کے ساتھ ساتھ اس طرح چل رہی تھی جیسے اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہو۔ عادل سرائی جب کمرے کی طرف بڑھا تو اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کپکپا رہی تھیں وہ جانتی تھی کہ اندر صمدی موجود ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صمدی تو پکڑا ہی جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی شامت آجائے گی۔ عادل سرائی نے دروازہ کھول دیا جب وہ اندر داخل ہوا تو خانم کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے کمرا خالی دیکھا تھا چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے تو حیران رہ گئی تھی کہ آخر صمدی کہاں غائب ہو گیا۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں صمدی نے کھڑکی سے چھلانگ نہ لگا دی ہو وہ بے اختیار کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ عادل سرائی نے اچٹتی ہوئی نگاہوں سے کمرے میں دیکھا پھر کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکنے لگا اس نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف بھی دیکھا تھا۔ خانم دونیہ نے بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا اس کا خیال تھا کہ سڑک پر صمدی کی لاش پڑی ہو گی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ عادل سرائی اس کمرے سے نکل آیا۔ خانم دونیہ بھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں پیچھے پیچھے آرہی تھی۔

''تمہاری بھانجی کہاں ہے؟'' عادل سرائی نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''وہ...... وہ اس کمرے میں ہے سو رہی ہے۔'' خانم دونیہ نے جواب دیا اور عادل سرائی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ نتاشیہ سامنے پلنگ پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی خوف کے مارے اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ عادل سرائی نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا کہ کرنل حیات کے کمرے سے ملنے والی برہنہ تصویر اسی کی ہے۔ وہ اسے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہا تھا وہ واقعی بے حد حسین تھی۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر بھولپن نمایاں تھا۔ عادل سرائی کے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔

''مم...... میں...... بے گناہ ہوں میں نے کوئی جرم نہیں کیا؟'' نتاشیہ ایک دم سسک پڑی۔

''اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو تمہارا یہ جرم نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ عادل سرائی نے اسے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ اپنی برہنہ تصویر دیکھ کر نتاشیہ اچھل پڑی اور پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ تصویری سوتے میں کھینچی گئی تھی اور نتاشیہ کو اس کا علم نہیں تھا۔

''مم...... مجھے نہیں معلوم یہ تصویر اس شیطان نے کب کھینچی تھی۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''اس پر لکھی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تصویر کرنل حیات کے قتل کیے جانے سے دو دن پہلے کھینچی گئی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کتنے عرصے سے اس سے مل رہی تھیں اور آخری ملاقات کب ہوئی تھی۔ عادل سرائی نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''اس سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب اسے قتل کیا گیا تھا لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا میں تو جب آدھی رات کو اس کے پاس سے آئی تھی تو وہ زندہ تھا۔'' نتاشیہ نے جواب دیا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر جھوٹ کے اثرات نمایاں تھے لیکن عادل سرائی نے شاید اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

''کرنل حیات ان دنوں نریمان فرازی کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ کیا تمہارے سامنے اس نے کبھی نریمان فرازی کا تذکرہ کیا تھا۔''

''نریمان فرازی......'' نتاشیہ دانت کچکچا کر بولی۔ ''میری بربادی کا اصل ذمے دار وہی ہے۔ میں کوئی آوارہ اور بدچلن لڑکی نہیں جناب! نریمان نے ہی مجھے اس خبیث کے پاس بھیجا تھا۔ وہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔'' عادل سرائی اچھل پڑا یہ انکشاف اس کے لیے خاصا سنسنی خیز تھا۔ اتفاق سے اس کی قسمت اسے ایک ایسی جگہ لے آئی تھی جہاں سے نریمان فرزی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

''لڑکی مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔ میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ نریمان فرازی سے تمہارا کیا تعلق ہے اور وہ تمہیں بلیک میل کیوں کر رہا تھا اور یہ بات ذہن میں رکھو صرف سچ بولنے سے ہی تم بچ سکتی ہو۔'' عادل سرائی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''میں دس بارہ دن پہلے نریمان فرازی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی صرف اخبارات میں اس کا نام پڑھا تھا۔ پھر ایک روز اچانک ہی وہ یہاں آگیا وہ کرنل حیات کی نگرانی کرانا چاہتا تھا تاکہ اپنے بارے میں اس کے منصوبوں سے آگاہ ہوتا رہے۔ اس کے لیے اسے

ایک ایسی لڑکی ضرورت تھی جس پر شبہ نہ کیا جا سکے۔ بد قسمتی سے میں اس کی نظروں میں آ گئی۔

''وہ تمہیں کس بات پر بلیک میل کر رہا تھا۔'' عادل سرائی نے پوچھا۔

''اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ شاہ کی بھانجی میری دوست ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو وہ شاہ کے خاندان سے میرے تعلقات سے کمیٹی کو آگاہ کر دے گا حالانکہ میرا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بھانجی میری کلاس فیلو تھی لیکن نریمان فرازی نے کہیں سے کوئی پرانی تصویر بھی حاصل کر لی تھی۔ میری یہ تصویر شاہ کے گھر میں تمام افراد خانہ کے ساتھ تھی۔ یہ تصویر تقریباً دو سال پہلے اس وقت کھینچی گئی تھی جب میں ایک تقریب میں ان کے گھر گئی تھی۔ فرازی مجھے اس تصویر کے بل بوتے پر بلیک میل کر رہا تھا۔ اگر میں انکار کر دیتی تو وہ یہ تصویر کمیٹی کو دے دیتا اور میں بلا وجہ ہی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی مجھے مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی اور اپنی عزت و ناموس سے ہاتھ دھو بیٹھی۔''

نتاشیہ کی ہچکیاں بندھ گئیں خوفزدہ ہونے کے باوجود اس نے ایک ایسی کہانی گھڑ لی تھی جس پر یقین کیا جا سکتا تھا۔

''نریمان کے بارے میں کرنل حیات سے کچھ معلوم ہوا۔'' عادل سرائی نے سوال کیا۔

''نہیں...... اس نے میرے سامنے نریمان فرازی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ نتاشیہ نے بتایا۔

''کیا اس کے قتل میں نریمان فرازی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس رات جب کرنل حیات کے گھر سے آئی تھی تو وہ زندہ تھا۔'' نتاشیہ نے جواب دیا۔

''کیا اس کے بعد فرازی سے تمہاری ملاقات ہوئی۔'' عادل سرائی یہ کہتے ہوئے اس مرتبہ اس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔''

''ہاں۔'' نتاشیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ دو دن پہلے یہاں آیا تھا۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ کسی مجرم کو پناہ دینا جرم ہے اور مجرم بھی ایسا جو انقلابی حکومت کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ عادل سرائی نے کہا۔

''اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے کسی کو بتایا تو ہمیں قتل کر دیا جائے گا۔'' نتاشیہ نے

جواب دیا۔

''اب وہ تم سے کب ملے گا۔''

''مجھے نہیں معلوم اسے جب ملنا ہوتا ہے تو بغیر اطلاع کے آ جاتا ہے۔'' نتاشیہ نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ ایران میں کس مشن پر آیا ہے۔'' عادل سرائی نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ اس نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔'' نتاشیہ نے جواب دیا۔

عادل سرائی خاموش کبھی نتاشیہ اور کبھی خانم دونیہ کو دیکھتا رہا۔ خانم دونیہ نظریں جھکائے کھڑی تھی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے تصویر نتاشیہ کے سامنے پھینک دی پھر کہا۔ ''تمہاری باتوں سے لگتا ہے تم واقعی شریف لڑکی ہو اور حالات کا شکار ہوئی ہو۔ میں اتنا سنگدل نہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کروں۔ میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں لیکن تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ نریمان فرازی نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے وہ یہاں کا خوفناک مجرم ہے آج رات اس نے کیفے البرس میں دو آدمیوں کو انتہائی بے دردی سے ذبح کر دیا ہے تمام سکیورٹی ایجنسیاں اسے پورے شہر میں تلاش کرتی پھر رہی ہیں۔ اسے گرفتار کرنا بے حد ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ یہ جلد یا بدیر تم سے ضرور رابطہ کرے گا۔ وہ جیسے ہی تم سے ملنے آئے مجھے اطلاع کر دینا ویسے ایک بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھی بہت برا ہوگا ویسے یہ میں تمہیں بتا دوں کہ میرے آدمی چوبیس گھنٹے تمہاری نگرانی کریں گے یہاں سے فرار ہونے کی کوئی کوشش تم دونوں کے لیے بے حد خطرناک ہوگی ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

خانم دونیہ بھی اس کے پیچھے کمرے سے نکلی اور جب بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تو اس نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی نتاشیہ والے کمرے میں آ گئی۔ نتاشیہ اس وقت اپنی تصویر دیکھ رہی تھی خانم کو اندر آتے دیکھ کر اس نے تصویر کے پرزے پرزے کر دیئے اور اٹھ کر خانم سے لپٹ گئی۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئی تھیں۔

ادھر عادل سرائی فلیٹ سے نکل کر راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت کی طرف سے نکل کر وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا کہ دائیں طرف سے آنے والا ایک آدمی اسے دیکھ کر تیزی سے سڑک پر کھڑی ایک کار کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ نریمان فرازی تھا۔ عادل سرائی کو اس بلڈنگ سے برآمد ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ اگر وہ ایک دم کار کے پیچھے نہ چھپ جاتا تو یقیناً اس کی نگاہوں میں آ جاتا۔ وہ کار کے پیچھے چھپا ہوا عادل سرائی کو دیکھتا رہا اور جب عادل سرائی کی کار اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔

۞......۞

صمدی ایک ایک لمحے سے آگاہ تھا جب اس نے عادل سرائی کی کار کو واپس جاتے دیکھا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی کے پیچھے سے اتر کر پائپ کے ذریعے اترتا ہوا چند فٹ نیچے آ گیا۔ پھر کھڑکی میں داخل ہونے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر لانج میں آ گیا اور جب وہ نتاشیہ والے کمرے میں داخل ہوا تو نتاشیہ خانم دونیہ سے لپٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔ خانم دونیہ اسے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔

"تت...... تم کہاں تھے۔" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"میں کھڑکی سے نکل کر پائپ کے ذریعے اوپر چلا گیا تھا۔" صمدی نے اسے بتایا پھر بولا۔ "لیکن وہ کیا کہہ رہا تھا۔ تعجب ہے وہ کہ وہ یہاں تک آخر کیسے پہنچ گیا۔"

"تم لوگوں نے بیٹھے بٹھائے ہمیں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ خانم دونیہ نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر نتاشیہ ذہانت سے کام نہ لیتی تو ہم بے موت مارے جاتے ہم بہت ذلیل و رسوا ہو چکے ہیں تم لوگوں کی وجہ سے۔ خدا کے واسطے اب ہماری جان چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم کمیٹی کی نظروں میں آ چکے ہیں وہ بار بار یہاں آتے رہیں گے اور اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو تو ہماری لاشیں بھی سڑکوں پر گھسیٹی جائیں گی۔ وہ ہماری نگرانی شروع کرنے والا ہے۔ شاید کچھ دیر بعد ہی اس کے آدمی یہاں پہنچ جائیں۔ بہتر ہوگا کہ تم لوگ جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جاؤ۔"

"یہ فیصلہ تو نریمان فرازی کے آنے کے بعد ہی کیا جائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے لیکن یقین کرو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔"

"کیا کسی عورت کی عزت لٹنے سے بڑھ کر کوئی نقصان ہو سکتا ہے؟" خانم دونیہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ اس معصوم بچی کو برباد کر دیا تم لوگوں نے اب ہم دونوں کی جان ہی باقی ہے دیکھو...... کب تک ہم زندہ رہتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ تم لوگ ہمیں نہیں رہنے دو گے۔" خانم دونیہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔

"میں ایک استاد ہوں میں نے ہمیشہ سچائی اور دیانت کا درس دیا ہے۔ لیکن آج میں خطرناک مجرموں کی صف میں کھڑی ہوں۔ جب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ پروفیسر دونیہ نے خطرناک مجرموں کو پناہ دے رکھی تھی تو ہر استاد پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ استاد کا تقدس پامال ہو جائے گا۔ خدا کے لیے اس نام کو رسوا نہ کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

صمدی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر تین مرتبہ دستک ہوئی اس مخصوص انداز میں دستک دیئے جانے پر صمدی سمجھ گیا کہ نریمان فرازی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس نے خانم دونیہ کو اشارہ کیا اور خود دروازے کی آڑ میں ہو گیا۔ خانم نے خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ آنے والا نریمان فرازی تھا وہ شام کو جب یہاں سے نکلا تھا تو اس کے چہرے پر داڑھی مونچھیں تھیں لیکن اب داڑھی مونچھیں غائب تھیں۔

"تم لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرتے پھر رہے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے میں اب تم لوگوں کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ کمیٹی کا مقامی سربراہ بھی ایک منٹ پہلے یہاں آیا تھا۔ اسے تمہاری تلاش ہے میں نہیں چاہتی کہ تمہیں میرے فلیٹ سے گرفتار کیا جائے۔ سمجھ رہے ہو نا تم میری بات۔" خانم دونیہ اسے دیکھتے ہوئے چیخنے لگی۔

"یہ گھر عادل سرائی کی نگاہوں میں آ گیا ہے اس لیے یہاں ہمارا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ سنو...... میں تم لوگوں کو صرف پانچ منٹ دے رہا ہوں اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لو اور چلنے کی تیاری کرو۔" شہباز نے نریمان فرازی کی آواز میں خانم دونیہ کو حکم دیا۔

"ہم لوگ......"

"ہم کیوں؟"

"میں تم لوگوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑ سکتا۔" شہباز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ممکن ہے اس وقت عادل سرائی نے تم سے بڑی نرمی سے بات کی ہو۔ کوئی لالچ یا ترغیب بھی

دی ہو لیکن تم ان کمیٹی والوں کو نہیں جانتیں اس نے یہاں کا راستہ دیکھ لیا ہے وہ یہ بھی معلوم کر لے گا کہ نتاشیہ کا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ نتاشیہ ایک یہودی لڑکی ہے تم نے اسے اپنی بھانجی ظاہر کر کے جعلی شناختی کارڈ بنا کر رکھا ہے۔ یہ راز کھلے گا تو سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ تمہارا کیا حشر کرے گا۔

''لل...... لیکن میں نے تو نتاشیہ کے لیے یہ سب کچھ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کیا ہے۔'' خانم دونیہ نے کہا۔

''اور تم شاید نہیں جانتیں کہ وہ لوگ تمہارے اس جذبے کو نہیں سمجھیں گے بلکہ وہی کریں گے جو ان کے خیال میں درست ہوگا اور ان کے خیال میں کیا درست ہے یہ تم بھی خوب جانتی ہو۔ انہوں نے ایران میں دولت مندوں کی دولت چھین کر ان کی لاشوں کو سڑکوں پر پھینک دیا ہے تمام انسانی آزادیاں سلب کر لی ہیں۔''

''لیکن اس بات کا اعتراف تو تم بھی کرو گے کہ شاہ کے دور میں بے حیائی اور بے غیرتی حد سے بڑھ چکی تھی۔ ظلم اور نا انصافی کی انتہا ہو چکی تھی یہاں حق بات کہنے والوں کا گلہ گھونٹ دیا جاتا تھا۔ ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لی جاتی تھیں انہیں گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا جاتا تھا۔ انہیں ٹینکوں سے کچل دیا جاتا تھا اور جب ایک حق پرست نے شہنشاہ کا تختہ الٹ دیا تو اس کے حواریوں کو بھی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ انہیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ ان کا احتساب ہوگا۔ ان سے یہ حساب کیا جائے گا کہ انہوں نے دولت کس ذرائع سے حاصل کی تھی۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو سکے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب شہنشاہ کا چار میں اپنی تاج پوشی کا جشن منا رہا تھا تو ریلوے لائن کے قریب کچی بستی کے ایک مکان میں ایک شیر خوار بچہ بھوک سے بلک رہا تھا اس کی ماں کی چھاتی سوکھ چکی تھی۔ کئی دن سے ان کے گھر میں چولہا نہیں جلا تھا ماں تین دن کے فاقے سے تھی وہ اپنے لختِ جگر کے لیے اپنی سوکھی چھاتی سے دودھ کا ایک قطرہ نہ نچوڑ سکی تھی۔ وہ معصوم بچہ بھوک سے بلک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ بجانے کتنے معصوم بچوں نے بھوک سے تڑپ تڑپ کر دم توڑا ہوگا لیکن اس ملک کا حکمران شہنشاہ اپنی تاج پوشی کا جشن منا رہا تھا کیا یہ ظلم نہیں تھا؟ اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانا غلط تھا؟''

''تم جذباتی ہو گئی ہو خانم۔'' شہباز نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ بھی انصاف تھا کہ تمہیں محض اس لیے کالج کی ملازمت سے نکال دیا گیا کہ تم آزادی پسند تھیں اور تم نے چادر لپیٹ کر کالج جانے سے انکار کر دیا تھا۔ نتاشیہ کے باپ کو محض اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ وہ یہودی تھا۔ اگر تمہیں کوئی خوف نہیں تھا تو نتاشیہ کو اپنی بھانجی ظاہر کر کے اس کے جعلی کاغذات کیوں بنوائے اور اب تم کیوں خوفزدہ ہو۔ اس لیے کہ تم جانتی ہو کہ اگر نتاشیہ کا راز نکل گیا تو تم دونوں سے جینے کا حق چھین لیا جائے گا۔ میں برا آدمی ضرور ہوں خانم! لیکن احسان فراموش نہیں ہوں میں تم دونوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ عادل سرائی یہ معلوم کر لے گا کہ نتاشیہ کا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور اس کے کاغذات جعلی ہیں اسے یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ تم نے ہمیں پناہ دی ہے۔ ایسی صورت میں وہ تم لوگوں کے ساتھ جو سلوک کرے گا۔ اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ میں تمہیں تیاری کے لیے صرف چند منٹ دے سکتا ہوں۔ اپنی ضروری چیزیں، نقدی اور زیور وغیرہ سمیٹ لو مجھ پر یقین کرو میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا اور اگر پسند کرو گی تو بحفاظت تم دونوں کو ایران کی سرحد پار کرا دوں گا۔ اس کے بعد تم دونوں کہیں بھی جا سکتی ہو۔'' خانم دونیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن نتاشیہ اس سے پہلے ہی بول پڑی۔

''ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔'' خانم دونیہ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور سر ہلا کر رہ گئی۔

''بس اب تم لوگ تیاری شروع کرو ہم زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں یہاں سے نکل چلیں گے۔'' شہباز نے صمدی کو اشارہ کیا اور دوسرے کمرے میں آ گیا پھر ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ فلیٹ سے نکل رہے تھے۔ نتاشیہ نے ایک گٹھری اٹھا رکھی تھی جس میں ان دونوں کے کپڑے اور ضروری چیزیں تھیں۔ زیورات اور نقدی وغیرہ تو ایک بیگ میں تھیں۔ یہ بیگ خانم دونیہ نے اپنے کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ شہباز اپنی کار کے قریب پہنچ گیا جس کے پیچھے اس نے عادل سرائی کی نظروں سے بچنے کے لیے پناہ لی تھی کار کا دروازہ لاک تھا لیکن ایک تار کی مدد سے اسے لاک کھولنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے اسٹرنگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے پچھلا دروازہ کھول کر نتاشیہ اور خانم دونیہ کو بٹھایا۔ ان دونوں کے چہرے بری طرح زرد ہو رہے تھے۔ صمدی الگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ شہباز نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک زوردار جھٹکے سے دو تاریں کھینچ لیں اور ان کے سرے ملا کر انجن اسٹارٹ

کر دیا۔ اس کے چند سیکنڈ کے بعد کار حرکت میں آ گئی۔ کار شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی تخت جمشید کی طرف جا رہی تھی۔ شہباز اس وقت نریمان فرازی کی حیثیت سے ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جہاں پولیس یا کمیٹی کے آدمیوں سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو لیکن تخت جمشید کے راستے میں پہنچتے ہی ایک موڑ پر کمیٹی کے دو آدمیوں نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ شہباز اس وقت نریمان فرازی کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کے ان کے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے کار کے دائیں جانب رخ کیا اور دوسرا بائیں سمت پہنچ گیا پھر ان میں سے ایک نے کار میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔

''کون ہو تم لوگ اور اس وقت کہاں سے آ رہے ہو۔'' یہ سوال اس شخص نے کیا تھا جو شہباز کی طرف کھڑا ہوا تھا۔

''ہم لوگ دعوت میں گئے ہوئے تھے گھر واپس جا رہے ہیں۔'' شہباز نے جواب دیا۔

''دعوت۔'' وہ شخص بولا۔ ''عیاشی اور بے حیائی کا ایک ذریعہ۔ یہ عورتیں کون ہیں اور تم دونوں کا ان سے کیا رشتہ ہے۔''

''یہ میری بیوی اور میری ساس۔'' شہباز نے ثناشیہ اور خانم دونیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''کاغذات دکھاؤ'' اس شخص نے غراتے ہوئے کہا۔ شہباز نے معنی خیز نگاہوں سے صمدی کو دیکھا اور ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال دیا جیسے واقعی کاغذات نکالنا چاہتا ہو۔ اس کا دوسرا ہاتھ دروازے کے لیور پر تھا۔ صمدی کا ایک ہاتھ اپنی طرف والے دروازے کے لیور پر پہنچ چکا تھا اور پھر انہوں نے بیک وقت ذور دار جھٹکوں سے اپنی اپنی طرف والے دروازے کھول دیئے۔ دروازوں کو جھٹکے لگنے سے دونوں آدمی پشت کے بل نیچے گرے۔ چنانچہ صمدی اور شہباز نے کار سے اترنے میں دیر نہیں لگائی۔ انہوں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے رائفلیں چھین لیں۔ یہ صورتحال ان دونوں کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ زمین پر پڑے خوفزدہ نگاہوں سے شہباز اور صمدی کو دیکھ رہے تھے۔

''اٹھو.....'' شہباز نے رائفل سے اشارہ کر کے حکم دیا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب اس طرف دوڑ لگا دو اگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو ساری گولیاں تمہارے بدن میں اتر جائیں گی۔ انہوں نے بھاگنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں کی تھی اور اتنی تیزی سے بھاگے تھے جیسے جہنم کی

بلائیں ان کا پیچھا کر رہی ہوں۔ ان کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر صمدی اور شہباز کے منہ سے قہقہہ نکل گیا پھر انہوں نے رائفلیں سڑک پر پھینکیں اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود ثناشیہ اور خانم دونیہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ ہی گئی تھی۔ ساری سچویشن انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ شہباز نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

''تخت جمشید کے علاقے سے نکل کر وہ کوہ البرس کے دامن میں پہنچ گئے۔ شاہ کے زمانے میں اس علاقے میں بڑے ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ سڑکیں زیر تعمیر تھیں۔ وسیع و عریض بنگلے بن رہے تھے لاتعداد بنگلے تیار ہو گئے تھے اور لاتعداد زیر تعمیر تھے۔ اکثر لوگ ان بنگلوں میں رہائش اختیار کر چکے تھے بعض لوگوں کو ان بنگلوں میں رہنا نصیب نہیں ہوا تھا اور وہ ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ انقلاب کے بعد اس علاقے کے تمام ترقیاتی کام رک گئے تھے زیر تعمیر سڑکوں اور بنگلوں کا کام ادھورا رہ گیا تھا۔

نریمان فرازی کی ہدایت پر شہباز اس طرف کار لایا تھا کیونکہ نریمان فرازی ہی جانتا تھا کہ اس کا کون سا قدم انہیں تحفظ دے سکتا ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ رازل جریری نے ایک ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس نے شاہ کے خزانے کے حصول کے لیے نریمان فرازی جیسے شخص کا انتخاب کر کے بلاشبہ انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا تھا کیونکہ نریمان فرازی ہی جانتا تھا کہ ایک اور کونسی جگہ محفوظ ہو سکتی ہے۔ شہباز کو بے شک جسمانی طور پر اس نے داؤ پر لگا دیا تھا لیکن نریمان فرازی اسے ہر مشکل سے نکال کر لے جاتا تھا اور اب تک انتہائی انوکھے طریقے سے نریمان فرازی شہباز کا تحفظ کر رہا تھا۔

بہر حال شہباز مختلف ویران سڑکوں پر کار کو دوڑاتا ہوا اس بنگلے میں پچھلی طرف گیراج کے سامنے رک گیا گیراج کا گیٹ مقفل نہیں تھا شہباز کے اشارے پر صمدی نے اتر کر دروازہ کھول دیا اور شہباز کار کو اندر لیتا چلا گیا۔ انداز ایسا تھا جیسے یہ بنگلہ ان کے باپ دادا کی ملکیت ہو۔ جب وہ کار کو گیراج میں بند کر کے بنگلے میں پہنچا تو ایک ادھیڑ عمر آدمی دروازے سے باہر نکل آیا۔

''کون ہے۔'' اس نے قدموں کی آواز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور شہباز کو پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ نریمان فرازی یہاں بے مقصد نہیں آیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی معلومات بے پناہ تھیں نریمان فرازی فوراً ہی شہباز کے اندر سے بولا۔

"میں ہوں فرازی! تم کیسے ہو آقائے مالک علی اور تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"وہ سو رہی ہے اندر آ جاؤ تم لوگ۔" ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا جسے مالک علی کے نام سے پکارا گیا تھا۔ وہ چاروں اندر آ گئے اور مالک علی نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ یہ بنگلہ کئی کمروں پر مشتمل تھا اور کافی وسعتوں میں پھیلا ہوا تھا بعض کمروں میں سامان بھی موجود تھا۔ اصل میں یہ بنگلہ ایک ایسے شخص کی ملکیت تھا جسے اس کی تکمیل کے بعد صرف تین دن یہاں رہنے کا موقع ملا تھا اور چوتھے دن وہ اپنے اہل خانہ سمیت ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ اس قسم کے بہت سے بنگلے اب انقلابی حکومت کے قبضے میں تھے۔ مالک علی اس بنگلے کا چوکیدار تھا اور گزشتہ طویل عرصے سے اپنی بیوی کے ساتھ یہاں رہ رہا تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں قاصد کی حیثیت سے ملازمت کرتا تھا۔ اصل میں جب نریمان فرازی پہلے ایران میں موجود تھا تو وہ اس سے چھوٹے موٹے کام لے لیا کرتا تھا اور اس وقت مالک علی نے فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا۔ "کہو یہاں کی صورتحال کیسی ہے۔" شہباز نے پوچھا۔

"کل دو آدمی آئے تھے اس بنگلے کے بارے میں تفصیلات لکھ کر گئے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص بتا رہا تھا کہ شاید چند روز کے بعد یہ بنگلہ نیلام کر دیا جائے گا۔" مالک علی نے بتایا اس دوران نتاشیہ اور خانم دونوں کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ بیڈ کا میٹرس ٹوٹا پھوٹا سا تھا اور اس پر ایک میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔

"تم لوگوں کو دو تین دن یہاں رہنا پڑے گا کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مالک علی ضرورت کی ہر چیز تمہیں فراہم کرے گا لیکن کسی بھی وقت کمروں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ میری ہدایت ہے تمہیں۔" آخر میں شہباز نے لہجہ سخت کیا اور اس کے بعد کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ صمدی فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ شہباز بھی اس کے قریب ہی فرش پر لیٹ گیا۔ مالک علی ابھی تک یہاں موجود تھا۔ چنانچہ شہباز نے جیب سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے اور بولا۔

"صبح ناشتے اور دوپہر کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کر لینا اور بہتر ہے کہ اب تم جا کر سو جاؤ۔" مالک علی نوٹ جیب میں ڈالتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شہباز اور صمدی سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے۔

دوسرے دن شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد شہباز بنگلے سے نکلا۔ بنگلے سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے چہرے پر ایک بوڑھے آدمی کا میک اپ کر لیا تھا۔ لباس بھی اسے بنگلے ہی سے ملا تھا۔ بنگلے سے نکل کر اسے تقریباً آدھے میل تک پیدل چلنا پڑا۔ تب وہ مین روڈ پر پہنچ کر ایک درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ یہاں بس اسٹاپ کا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس بورڈ پر ان بسوں کے روٹ نمبر لکھے ہوئے تھے جو یہاں سے گزرتی تھیں۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد شہباز کو اپنے روٹ کی بس مل گئی اور وہ بس میں جا بیٹھا۔

بھانت بھانت کے لوگ بھانت بھانت کی باتیں لیکن سب کے سب اس طرح جیسے ہر شخص ان سے خوفزدہ ہو شہباز کا ذہن نجانے کس طرح ماضی کی طرف لوٹ گیا اس نے اپنے چہرے پر میک اپ کیا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا قدرت نے اسے ایسے ہی کاموں کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور یہ جو تربیت اسے ملی تھی وہ اسی وقت کے لیے تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اگر اسے اتنا شاندار میک اپ کرنا نہ آتا تو ابھی تک وہ اتنی آسانی سے محفوظ نہ رہتا۔

بہر حال وہ شہر کے مرکزی بس ٹرمینل پر اترا اور کافی دور تک پیدل چلتا رہا پھر ایک اور بس پر سوار ہو گیا جس نے اسے شہر کے زیریں علاقے میں پہنچا دیا۔ اسٹاپ پر بس سے اتر کر شہباز ادھر ادھر دیکھے بغیر ایک طرف چل پڑا۔ جس جگہ وہ آیا تھا ایک متوسط طبقے کی آبادی تھی۔ کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد وہ ایک ایسی گلی میں داخل ہو گیا جس کے کنارے پر دونوں طرف دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ویسی ہی دکانیں تھیں جیسی عام طور پر محلوں میں ہوتی ہیں۔ دکانوں کے سامنے سامان بھی رکھا ہوا تھا اور دکانوں پر گاہک بھی موجود تھے کچھ بچے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ شہباز نے نریمان فرازی سے سوال کیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی قدم تم مجھے اعتماد میں لیے بغیر اٹھا لیتے ہو اور میں سمجھ بھی نہیں پاتا کہ تم کیا چاہتے ہو اور کہاں جا رہے ہو۔" شہباز کو محسوس ہوا جیسے نریمان فرازی مسکرایا

ہو۔اس نے کہا۔

”میرے دوست! حقیقت یہ ہے کہ تمہارے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے زندگی کا لطف آ رہا ہے۔ میں تمہیں سچ بتاؤں میں نے دل میں سوچا تھا کہ جس طرح میرے بدن پر قبضہ کر کے میری ذہن کو تمہارے ذہن کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے اگر کوئی ایسا موقع ملا کہ میرا بدن مجھے واپس مل جائے تو میں تمہارا وفادار نہ رہتا اور ہو سکتا ہے تمہیں دھوکے سے بدترین نقصان پہنچا دیتا۔ لیکن شہباز میری جان! تم جس قدر اعلیٰ کارکردگی کے مالک ہو اور جسمانی طور پر تم جس قدر برق رفتاری کا مظاہرہ کر سکتے ہو میں دنگ رہ جاتا ہوں اور بعض اوقات تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ اگر رازل جریری نے میرا بدن مجھے واپس کر دیا اور میں اس کی فرمائش پوری کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہو سکتا ہے تم سے علیحدگی میرے لیے ممکن نہ ہو میں تم سے یہی کہوں گا کہ شہباز آؤ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔“

شہباز مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔

بہرحال گلی میں دائیں بائیں مکانوں کو دیکھتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی مکان تلاش کر رہا ہو اور آخر کار ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ یہ دو منزلہ مکان تھا مکان کے دروازے کے دونوں طرف پلرز پر جہاں عام طور سے روشنی کے بلب لگے ہوتے ہیں عقاب بنے ہوئے تھے یہ دونوں عقاب سنگ مرمر سے تراشے گئے تھے اور اس پوزیشن میں تھے جیسے اڑنے کے لیے پر تول رہے ہوں لیکن دائیں طرف والے عقاب کا ایک پر ٹوٹا ہوا تھا۔ شہباز نے چمکتی نگاہوں سے ان عقابوں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کئی روز کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد آخر کار اس نے اپنے مشن پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو چکی تھیں۔ کرنل حیات کو اس نے نتاشیہ کے ذریعے راستے سے ہٹا دیا تھا اور اپنے سب سے بڑے حریف تلاتی کو اس نے حویلی میں زندہ جلا دیا تھا۔ کل رات اس کے نائب کو بھی ذبح کر ڈالا تھا اب صرف عادل سرائی رہ گیا تھا جس کے ساتھ کمیٹی کی پوری فورس تھی۔ کمیٹی کو اگرچہ اس وقت سب سے زیادہ طاقتور اور بااختیار سمجھا جاتا تھا اس کے پیچھے بڑے بڑے انقلابی رہنماؤں کی قوت موجود تھی اور عادل سرائی، نریمان فرازی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن نریمان فرزی اب زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر مزید تاخیر ہوئی تو الجھنیں

بڑھتی چلی جائیں گی اور عین ممکن ہے حالات ایسا رخ اختیار کر لیں کہ اسے اپنے اصل مشن پر کام کا موقع نہ مل سکے یا وہ خود پکڑا یا مارا جائے۔ نتاشیہ اور خانم دونیہ افشائے راز سے بھی اس کو کچھ مشکلیں پیش ہو گئی تھیں۔ نتاشیہ نے اس کے لیے بڑی قربانی دی تھی اور اپنی عزت تک مٹا دی تھی۔ جس مقصد کے لیے اس نے نتاشیہ کو کرنل حیات کے پیچھے لگایا تھا وہ اگرچہ پورا نہیں ہوا تھا لیکن نتاشیہ کے ذریعہ وہ کرنل حیات کے اہم راز سے واقف ہو گیا تھا۔ یہ اہم راز ایک ایسا خوفناک منصوبہ تھا جس سے ایران کی سرزمین پر ایک بار پھر خون کی ندیاں بہہ سکتی تھیں۔

کرنل حیات اگرچہ ختم ہو چکا تھا لیکن اس منصوبے پر عمل کرنے والے دوسرے لوگ موجود تھے کرنل حیات کی حیثیت ایک معمولی مہرے کی سی تھی اصل لوگ پس پردہ تھے۔ نریمان فراری کی حیثیت سے شہباز نے اسی روز طے کر لیا تھا کہ وہ کرنل حیات اور اس کے ساتھیوں کے اس منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دے گا لیکن اس کے لیے بہرحال ایک مناسب وقت ضروری تھا۔ البتہ اس منصوبے کو ناکام بنانے سے پہلے وہ اپنا مشن مکمل کر لینا چاہتا تھا جس کے لیے رازل جریری نے اسے مخصوص کیا تھا۔ حالانکہ رازل جریری کا انداز ایک طرح سے نریمان فرازی جیسے شخص کے لیے تکلیف دہ اور یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ناقابل عمل تھا لیکن جس طرح شہباز نے اس کے دماغ سے اس کا کردار ادا کیا تھا اور رازل جریری نے جس طرح اپنے منصوبے کے بارے میں اسے تفصیل بتائی تھی اس نے نریمان فرازی جیسے شخص کو رازل جریری کے منصوبے سے متفق کر دیا تھا کیونکہ رازل جریری کے ارادے بھی انتہائی نیک تھے اور ان میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو قابل اعتراض ہو۔

بہرحال نریمان فرازی نے اب تک جو کارروائی کی تھی اس میں صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ عادل سرائی اور کرنل حیات سے اس کی ٹسل چلی تھی۔ تلاتی بھی درمیان میں تھا۔ اپنے زیادہ تر دشمنوں کو وہ ختم کر چکا تھا۔ چنانچہ اب اس نے فیصلہ کیا کہ اصل کام میں جتنی تاخیر ہوگی وہ مناسب نہیں ہوگی۔ شہباز اس وقت تک یہ نہیں جانتا تھا کہ نریمان فرازی اب جس طرف جا رہا ہے وہ کون سا راستہ ہے۔

بہرحال جس جگہ وہ پہنچا تھا وہاں پہنچنے کے بعد اس نے اس عورت سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا دروازہ کھلا اور ایک عورت کا آدھا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی تھی

اور دروازہ صرف چند انچ کھلا تھا۔

''کون ہے اور کس سے ملنا ہے۔'' عورت نے سوال کیا۔

''خانم جہانیہ...... میں خانم جہانیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' شہباز کے منہ سے نریمان فرازی کی آواز نکلی لیکن شہباز خود چونک پڑا تھا۔ خانم جہانیہ اس عورت کا نام تھا جس کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ شاہ کے خزانے کی اصل جگہ سے صرف اور صرف وہ عورت واقف ہے بلکہ اس کی تحویل میں ہے۔ دروازہ کھولنے والی عورت نے کہا۔

''کون خانم جہانیہ...... یہاں کوئی خانم جہانیہ نہیں رہتی۔'' یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹی اور دروازہ بند کرنے لگی تو شہباز نے جلدی سے کہا۔

''ایک منٹ خانم...... میں بہت دور سے آیا ہوں اور اس عقاب کو قوت پرواز دینا چاہتا ہوں جس کے پر کاٹ دیئے گئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے شہباز نے دروازے کے اوپر زخمی عقاب کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی اور اس نے سوال کیا۔

''کک...... کون ہو تم۔''

''جانثار......'' شہباز کے منہ سے آواز نکلی اور عورت نے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ پھر خود گردن نکال کر گلی میں جھانک کر اِدھر اُدھر دیکھا تقریباً بیس گز دور بجلی کے پول کے قریب چند بچے کھیل رہے تھے اور اپنے کھیل میں مگن تھے۔ ان بچوں کے علاوہ اس وقت گلی میں اور کوئی موجود نہیں تھا اور غالباً اس بات نے عورت کو تقویت دی تھی چنانچہ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''اندر آ جاؤ۔'' شہباز اندر داخل ہوگیا۔ عورت نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا دروازے کے دوسری طرف ایک مختصر سا آنگن تھا۔ دائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرا جس کے دروازے پر بلب جل رہا تھا۔

''آؤ......'' عورت نے کہا اور سامنے والے دروازے میں داخل ہوگئی۔ شہباز بھی اندر داخل ہوگیا جب دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو اس کے ہونٹوں پر بے اختیار خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ عورت اس کے سامنے پستول تانے کھڑی ہوئی تھی۔

''کون ہو تم۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ گولی مار دوں گی۔'' وہ غرائی۔

''نریمان فرازی۔'' یہ کہہ کر شہباز نے سر سے پکڑ کر چہرے سے ایک جھلی اتار دی اب نریمان فرازی کا چہرہ سامنے آ گیا تھا عورت کے منہ بے اختیار آواز نکل گئی پھر اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

''مجھے معاف کرنا نریمان فرازی! میں تمہارے بارے میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔''

''میں نے برا نہیں مانا۔ احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے لیکن میرے لیے چہرہ بدلنا ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر شہباز نے دوبارہ جھلی اور وگ چڑھا لی پھر بولا۔

''کیا میں خانم جہانیہ سے مخاطب ہوں۔''

''ٹھیک سمجھے۔'' عورت کی آواز ابھری اور شہباز نے غور سے اس عورت کو دیکھا اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ بال سنہرے اور کمر سے نیچے تک دراز تھے۔ آنکھیں انتہائی حسین گلاب کی پتیوں سے نازک ہونٹ۔ پتلی تیکھی ناک اس نے میکسی نما لباس پہن رکھا تھا جس سے اس کا جسم پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ جب اس نے دستک کے جواب میں دروازہ کھولا تو سر پر حجاب بھی تھا جس سے چہرے کا بھی کچھ حصہ چھپا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے حجاب اتار دیا تھا۔

''کیا آپ خانم جہانیہ ہیں۔'' ایک بار پھر شہباز نے سوال کیا۔

''نہیں خانم جہانیہ یہاں نہیں ہے۔ میرے ماں باپ نے میرا نام صندل رکھا ہے تم مجھے صندل کے نام سے مخاطب کر سکتے ہو۔''

صندل انوکھا اور خوبصورت نام ہے۔ بہت خوبصورت نام ہے خیر اب یہ بتاؤ کہ خانم جہانیہ کہاں ہیں اور ان سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''خانم جہانیہ بیمار ہیں اور ان دنوں ایک دوسری رہائش گاہ میں رہائش پذیر ہیں۔ تقریباً پندرہ دن پہلے انہیں اطلاع ملی تھی کہ تم تہران آ رہے ہو۔ بہت زیادہ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ چل پھر نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا تا کہ تم یہاں آؤ تو کسی نہ کسی کو یہاں موجود پاؤ اور کہیں واپس نہ پلٹ جاؤ۔'' صندل نے جواب دیا۔

''ایک سوال کروں صندل۔''

''ہاں۔''

''تمہارا خانم جہانیہ سے کیا رشتہ ہے۔''

"بس یوں سمجھ لو میں ان کی شاگرد ہوں۔"

"شاگرد؟" شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے صندل کو دیکھا۔

"ہاں۔ وہ کسی زمانے میں سکول ٹیچر تھیں۔ تقریباً پانچ سال پہلے وہ ریٹائرڈ ہو گئیں تھیں۔ میں نے زندگی کے ابتدائی برسوں میں انہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ان کی گرویدہ رہی۔ وہ بہت شفیق اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ شاہ کی بہن نے بھی ابتدائی تعلیم خانم جہانیہ سے ہی حاصل کی تھی۔ شاہی خاندان ان کا بہت احترام کرتا تھا۔"

"ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں خانم جہانیہ سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟" شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے صندل کو دیکھا۔

"نہیں میں نہیں جانتی مجھے انہوں نے اس ملاقات کا مقصد نہیں بتایا تھا البتہ یہ کہا تھا کہ نریمان فرازی یہاں آئے گا۔ انہوں نے مجھے پاس ورڈ بھی بتا دیئے تھے اور کہا تھا کہ تمہیں ان کے پاس پہنچا دوں میں تقریباً دس دن سے تمہارے بارے میں اخبارات میں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم یہاں آتے ہی دشمنوں میں گھر گئے ہو۔"

"ہاں۔ دشمن اب بھی میرے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ خیر یہ تو ہوتا ہے ہم جیسے لوگوں کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اچھا یہ تو بتاؤ خانم سے ملاقات کب ہو گی؟"

"جب تم چاہو جس وقت مجھے اشارہ کرو۔ چاہو تو ابھی۔" صندل نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تیار ہوں اصل میں، میں اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا خانم سے جتنی جلدی ملاقات ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے کیا تم مجھے تیار ہونے کا موقع دو گے۔"

"ضرور۔" شہباز نے جواب دیا اور صندل تیاریاں کرنے لگی۔ اس نے حجاب پہن لیا الماری میں رکھا ہوا چھوٹا سا سوٹ کیس نکالا اپنی بکھری ہوئی چیزیں سوٹ کیس میں ڈالیں اور بالکل تیار ہو گئی۔ شہباز نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی تھی کہ صندل نے پستول سوٹ کیس میں رکھنے کے بجائے لباس میں چھپا لیا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ مکان سے باہر نکل آئے صندل نے تالا لگا کر چابی بھی لباس کے اندر رکھی اور گلی میں چلنے لگی۔ شہباز بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ یہاں آتے ہوئے گلی میں جس طرف سے داخل ہوا تھا اب وہ دونوں اس کے مخالف سمت جا رہے تھے۔ گلی کے آخری سرے پر صندل ایک دکان کے

سامنے رک گئی۔ دکان بند تھی اس کے سامنے فولڈنگ گرل لگی ہوئی تھی۔ صندل نے تالا کھول کر گرل ہٹا دی اور جب لکڑی والا دروازہ کھلا تو اندر ایک کار کھڑی دیکھ کر شہباز سمجھ گیا کہ اس دکان کو گیراج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ باہر ہی کھڑا رہا صندل نے کار میں بیٹھ کر اس کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے ریورس گیئر میں گیراج سے باہر نکال لائی۔ کار باہر روک کر وہ نیچے اتری۔ دروازہ اور گرل بند کر کے تالہ لگایا اور شہباز کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔

"تقریباً چالیس منٹ تک تہران کی سڑکوں پر ان کا سفر جاری رہا۔ پھر کار اس سڑک پر نکل آئی اور ایک مخصوص علاقے کی جانب چل پڑی۔ شہر کی بیرونی چوکی پر انہیں روکا گیا۔ یہاں چیکنگ ہو رہی تھی صندل نے اپنے کاغذات دکھائے۔ ان کاغذات کے مطابق وہ تدریش کے ایک گرلز ہائی سکول کی پرنسپل تھی اور اس کی رہائش تہران میں تھی اس کے پاس تہران اور تدریش کے درمیان کسی بھی وقت سفر کرنے کا اجازت نامہ موجود تھا۔

"یہ کون ہے۔" چیکنگ آفیسر نے کاغذات اسے لوٹاتے ہوئے شہباز کی طرف اشارہ کیا جو پینجر سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

"میرا باپ ہے بیمار ہونے کی وجہ سے میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔" صندل نے فوراً جواب دیا۔ شہباز کے چہرے کی جھلی اور اس کا میک اپ اس وقت اس کے لیے بڑا معاون ثابت ہوا تھا۔ چیکنگ آفیسر نے فوراً ہی جانے کا اشارہ کر دیا۔ تدریش تہران سے تقریباً بیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کی حیثیت تہران کے ایک نواحی علاقے کی ہے اور اسے تہران ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے کار کی رفتار تیز نہیں تھی۔ یہ فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ علاقے میں داخل ہونے سے پہلے یہاں بھی چیکنگ ہوئی لیکن انہیں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کار تدریش کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی شمال کی جانب نکل گئی۔ آبادی اب بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

شہباز پینجر سیٹ پر بیٹھا تاریکی میں گھور رہا تھا اس نے ایک بار بھی صندل سے یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ اب انہیں کہاں جانا ہے۔ یہ علاقے شہباز کے لیے تو بے شک اجنبی تھے نریمان فرازی کے لیے نہیں اور جب نریمان فرازی مطمئن ہوتا تو شہباز کے ذہن میں خاموش ہی رہتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے تھے۔ تدریش

سے تقریباً تین میل آگے ایک اور چھوٹی سی بستی تھی اور چند میل آگے پہاڑوں میں یہ پختہ سڑک ختم ہو جاتی تھی۔ شہباز سوچ رہا تھا کہ شاید یہ چھوٹی سی بستی ہی ان کی منزل ہو لیکن ان کا خیال غلط نکلا۔ تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد صندل نے کار ایک کچی سڑک پر موڑ دی۔ یہ پتھریلا راستہ تھا جس پر کاریں اور ٹرک وغیرہ چل سکتے تھے۔ اس طرف ایک وسیع چراگاہ تھی جو میلوں دور دامن کوہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ چراگاہ میں پہاڑی ٹیلوں کے گرد بل کھاتی ہوئی سڑک سے بتدریج بلند ایک بلندی نظر آ رہی تھی اور سڑک اوپر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ آخر کار سڑک نشیب میں اتر کر ایک وادی میں پہنچ گئی۔ نشیب میں بہت دور ٹمٹماتی ہوئی اسے روشنی نظر آ رہی تھی اور پھر ایک عمارت کا ہیولا بھی نظر آیا۔ جو بتدریج واضح ہوتا چلا گیا۔

وہ عمارت ابھی تقریباً دو سو گز دور تھی کہ صندل نے دو مرتبہ کار کا ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز وادی میں بازگشت پیدا کرنے لگی۔ جب وہ عمارت کے سامنے پہنچے تو انہیں گیٹ کھلا ہوا ملا لیکن کار کے داخل ہوتے ہی گیٹ بند ہو گیا۔ کار آخر کار عمارت کے وسیع برآمدے میں پہنچ کر رک گئی۔ صندل نے انجن بند کیا اور نیچے اتر آئی۔ شہباز بھی نیچے اتر کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اس قلعہ کا تصور بھی ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس بات کے امکانات تھے کہ اس عمارت کا مالک بھی انقلابیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہو یا جان بچا کر ملک سے فرار ہو گیا ہو۔ کار رکنے کے صرف ایک منٹ کے بعد ایک لمبے قد کا آدمی برآمدے میں نمودار ہوا تھا۔ وہ انتہائی لمبا تھا اور اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اس کے سر گنجا تھا عمر کا اندازہ پینتالیس کے لگ بھگ لگایا جا سکتا تھا۔ یقیناً وہ کسی زمانے میں انتہائی طاقت ور اور پہلوان ٹائپ کا آدمی رہا ہو گا۔

''خانم کیسی ہیں۔ سو رہی ہیں یا بیدار ہیں۔'' صندل نے گنجے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے سے بہتر ہیں۔'' گنجے نے جواب دیا۔

''ہوں۔''

''جو روگ انہوں نے اپنے دل میں پال رکھا ہے اس نے ان کی راتوں کی نیندیں اڑا دی ہیں۔''

''ان سے ملو یہ نریمان فرازی ہے۔ خانم جہانیہ کا وہ مہمان جس کا انہیں کئی روز سے

انتظار تھا۔'' صندل نے تعارف کرایا۔ دراز قامت نے سر ہلاتے ہوئے شہباز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ لوگ مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی پلنگ پر ایک بوڑھی عورت لیٹی ہوئی تھی جس کی رنگت بستر پر بچھی ہوئی چادر کی طرح بالکل سفید ہو رہی تھی۔ شہباز کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینسٹھ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے اس نے صندل کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہیں شہباز کے چہرے کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ کچھ لمحے کے لیے خاموش رہی اور پھر کمزور سی آواز میں بولی۔

''جو کچھ بھی تم سے کیا جا سکتا ہے کر لو تم میری زبان نہیں کھلوا سکتے۔ وہ خزانہ میرے پاس امانت ہے اور میں تم لوگوں کو اس کا پتہ بتا کر امانت میں خیانت نہیں کر سکتی۔ چاہے اس کے لیے تم میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کیوں نہ کر دو۔'' نریمان فرازی کی حیثیت سے شہباز سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ خانم جہانیہ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اس کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھے۔ لیکن اس وقت وہ ان الفاظ کو سن کر ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور اسے جال میں پھنسایا گیا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا گنجا کسی دیو کی طرح دروازے میں کھڑا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور چہرے پر کرختگی تھی۔ وہ صندل کی طرف دیکھنے لگا۔ صندل بھی اس سے چند قدم دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پھر صندل کی آواز ابھری۔

''نریمان فرازی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے لباس میں سے پستول نکال لیا۔ ''اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے تم سو فیصدی ہمارے اشاروں پر کام کر رہے ہو۔ سو فیصدی، سو فیصدی، سو فیصدی۔ کیا تم ان الفاظ پر حیران ہو جاؤ گے۔ نریمان فرازی تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو حیران رہ جاتا تم جس پائے کے مجرم ہو اس سے پورا ایران لرز رہا ہے لیکن تم نے دیکھا کہ کس طرح تم ہمارے اشاروں پر چلتے ہوئے آخر کار یہاں تک پہنچ گئے ہو۔ ہم روز اول سے یہ بات جانتے تھے کہ تم یہاں کس مشن پر آ رہے ہو۔ جس بنگلے میں تمہیں بریفنگ دی جا رہی تھی وہاں ہمارا ایک آدمی موجود تھا اس نے اسی روز ہمیں تمہارے بارے میں آگاہ کر دیا اور خانم جہانیہ کا پتہ اور شناختی الفاظ بھی بتا دیئے۔ اس سے اگلے ہی روز ہم نے خانم کو تلاش کر کے اپنے قبضے میں کر لیا اس وقت سے اب تک خانم یہاں ہے ہم

نے اس سے خزانے کا پتہ پوچھنے کے سارے حربے آزما ڈالے لیکن یہ کم بخت بڑھیا اس قدر سخت جان ہے کہ آج تک زبان نہیں کھولی اس نے ویسے ہم اس پر زیادہ تشدد بھی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ اگر یہ مرگئی تو ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ بہر حال اس کی طرف سے ہمیں مکمل مایوسی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ہمیں صرف تمہارا انتظار تھا کیا سمجھے صرف تمہارے انتظار اور اب تمہیں یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ تم اس بڑھیا سے خزانے کا پتہ معلوم کرو۔ نریمان فرازی صرف آج رات اور کل دن بھر کی مہلت دی جاتی ہے اگر تم اس خزانے کا پتہ معلوم کر لو گے تو بھی اس خزانے میں ہمارے حصے دار بن سکتے ہو۔ دوسری صورت میں کل رات تم دونوں کو اسی کمرے میں دفن کر دیا جائے گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔''

شہباز کے ذہن میں نریمان فرازی گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بولنا اسے ہی تھا یہ شعبہ اسی کا تھا۔ رازل جریری نہایت ذہین اور بہت دور تک دیکھنے والا انسان تھا اس نے شہباز کا جسم اور نریمان فرازی کا ذہن استعمال کیا تھا کیونکہ اس خزانے کے حصول کے سلسلے میں نریمان فرازی وہ پہلا اور آخری انسان ہوسکتا تھا۔ شہباز کی کارکردگی پر اسے پورا پورا بھروسہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک شہباز نے اصل شہباز کی حیثیت سے کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ وہ تو صرف رازل جریری کی ہدایت کے مطابق نریمان فرازی کا کردار سرانجام دے رہا تھا اور نریمان فرازی ہی اس کے ذہن میں متحرک ہوا۔ اس کی آواز ابھری۔

''میرا حصہ کتنا ہوگا۔''

''پانچواں حصہ۔ چار تو ہم......'' وہ کہتے کہتے اچانک خاموش ہوگئی۔ لیکن نریمان فرازی کا مقصد پورا ہو چکا تھا وہ صندل کے ادھورے جملے سے یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ ان لوگوں کی تعداد چار ہے ایک تو صندل، دوسرا دراز قامت جس کا نام بعد میں شہکان دریافت ہوا تھا اور باقی دو یا تو اس وقت یہاں موجود نہیں تھے یا انہوں نے سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کیا میں تمہاری اس پیش کش کو قبول کر لوں گا۔'' شہباز نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے نریمان فرازی کی آواز میں کہا اور صندل مسکرانے لگی شہباز بولا۔

''میں ایک جرائم پیشہ آدمی ضرور ہوں۔ لیکن میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ میں موت قبول

کر سکتا ہوں لیکن کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔

''ٹھیک ہے یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تمہیں صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت دی جارہی ہے اس وقت گیارہ بجے ہیں۔ اگر کل گیارہ بجے تک تم نے اس بڑھیا سے خزانے کا پتہ پوچھ کر ہمیں نہ بتایا تو تمہاری موت کی خواہش پوری کر دی جائے گی اور ایک بات میں تمہیں یہ بھی بتادوں کہ ہم تلاتی، کرنل حیات اور عادل سرائی سے بہت مختلف لوگ ہیں او کے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکی پھر پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کے فوراً بعد شہکان بھی باہر نکل گیا۔ بھاری دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوگیا تھا اور شہباز کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

وہ چند لمحے دروازے کو دیکھتا رہا خاصا بھاری تھا۔ اگر اس پر ٹکریں ماری جاتیں تو شاید اس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ پھر وہ دروازے سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ کمرہ تقریباً بیس فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا تھا۔ چھت ضرورت سے کہیں زیادہ اونچی تھی اور اس پر بہت لمبی راڈ سے پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں میں الماریاں بنی ہوئی تھیں جو اندر کی طرف تھیں۔ تیسری دیوار میں فرش سے تقریباً پانچ فٹ اونچی بہت بڑی محرابی کھڑکی تھی۔ جس میں موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے کافی اوپر چھت پر ایک روشن دان بھی تھا۔ کسی سیڑھی کے بغیر اگرچہ روشن دان تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں بھی موٹی موٹی سلاخیں لگائی گئی تھیں۔ دائیں طرف والی دیوار میں ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ یہ محراب بارہ فٹ اونچی اور چار فٹ چوڑی اور چار فٹ ہی گہری تھی۔ اس محراب کا مقصد کچھ سمجھ میں نہیں آسکا تھا ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں اس محراب کے سامنے پردہ لٹکا کر اس سے ڈریسنگ روم کا کام لیا جاتا رہا ہو لیکن اب تو یہاں ایک الماری کھڑی کی جاسکتی تھی۔ شہباز کھڑکی کے پاس پہنچ گیا یہ کھڑکی کی عمارت کے عقبی سمت میں تھی۔ اس طرف درختوں کی بہتات تھی اور درختوں سے آگے اونچی فصیل تھی۔ اس نے دو سلاخوں کو ہلا کر دیکھا وہ کافی مضبوط تھیں انہیں اکھاڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دیوار میں بنی ہوئی اس محراب میں داخل ہوگیا۔ اس کا خیال درست نکلا محراب یقیناً ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھی۔ کیونکہ دیواروں پر کپڑے ٹانگنے کے لیے چار پانچ کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں اور دائیں طرف کی دیوار میں نیچے اوپر تین شیلف بنے ہوئے تھے جہاں یقیناً

کپڑے رکھے جاتے ہوں گے۔ تینوں شیلفوں اور محراب کے فرش پر گرد جمی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ عرصے سے کسی نے اس محراب پر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ محراب سے نکل کر پلنگ کے قریب آ گیا۔ پلنگ کے فرش پر آٹھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف سیدھی پشت والی پرانی کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ شہباز ایک کرسی گھسیٹ کر پلنگ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس دوران خانم جہانیہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے سوال کیا۔

''تم آخر ہو کون۔ بتاؤ گے نہیں اپنے بارے میں خانم جہانیہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔''

''نریمان فرازی۔'' یہ کہہ کر شہباز نے بالوں کی وگ اور چہرے پر سے جھلی اتار کر دوسری طرف ایک کرسی پر ڈال دی۔

''اوہ میرے خدا...... میرے خدا...... میرے خدا......'' خانم نے تین بار یہ الفاظ کہے پھر بولی۔

''تو تم بھی ان کے قابو میں آ گئے۔''

''مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے خانم! میں خطرات میں کھیلنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے موت سے پنجے لڑانے میں بہت مزہ آتا ہے ویسے یہ لوگ کون ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟ اور آپ ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں۔''

''آہ...... میرا نیٹ ورک کام کر رہا تھا مجھے تمہارے بارے میں خفیہ پیغام مل گیا تھا لیکن اس کے دوسرے ہی دن یہ لوگ مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ یہ لوگ مجھ سے شاہ کے خزانے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ پہلے تو انہوں نے میرے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا پھر تشدد پر اتر آئے۔ یہ دیکھو...... خانم نے یہ کہہ کر لباس کا اوپر والا حصہ اٹھا دیا۔ اس کے پیٹ اور سینے پر داغے جانے کے نشانات تھے۔ زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ وہ بولی۔

''یہ لوگ میرے جسم کو تپتی سلاخوں سے داغتے رہے لیکن میں نے زبان نہیں کھولی اب بھی میں مرنا پسند کروں گی لیکن شاہ کا راز نہیں کھولوں گی۔''

''میرے سامنے بھی نہیں۔'' شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ تم واقعی نریمان فرازی ہو، اس وقت تک میری

زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ یہ میری زبان کھلوانے کے لیے ان لوگوں کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ خانم جہانیہ نے کہا۔

''آپ کس طرح تصدیق چاہتی ہیں۔'' شہباز مسکرا دیا وہ دل ہی دل میں بڑھیا کے حوصلے کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جس نے اتنے تشدد کے باوجود زبان نہیں کھولی تھی۔

''میری معلومات کے مطابق نریمان فرازی جب تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے پیرس سے مشہد آیا تھا تو اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا اسے سزا بھگتنے کے لیے مشہد کی جس جیل میں بھیجا گیا تھا، وہاں قتل کی سزا روکنے والے قیدیوں کو کچھ خاص نام بتائے جاتے تھے ان ناموں کی تعداد سات تھی اور یہ کوئی سرکاری کارروائی نہیں تھی بلکہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اپنے طور پر ایک طریقہ کار اختیار کیا تھا۔

بہر حال جب نریمان فرازی کو اس جیل میں لایا گیا تو جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے بھی اپنا وہ کام دکھایا اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تم نریمان فرازی ہو تو وہ سات نام کیا تھے۔ یہ لمحہ ایسا تھا کہ شہباز کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اگر نریمان فرازی اس کے ذہن میں نہ ہوتا اور یہ صرف اس کی ذمے داری ہوتی کہ وہ اپنا نام بتائے تو اس کے فرشتے بھی یہ نام نہیں جانتے تھے لیکن نریمان فرازی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی اور پھر وہ عجیب وغریب نام دوہرانے لگا جن کی کیفیت کچھ یوں سی تھی۔

''سوالہ۔ پنکان۔ غیرو۔ حاتم۔ سبال۔ شنیال۔ کھیڑہ۔'' شہباز کو یہ نام دوبارہ یاد نہیں آئے تھے لیکن خانم جہانیہ کے چہرے میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگی تھیں اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آہ...... واقعی، واقعی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ کیا عجیب وغریب طریقہ کار تھا۔ کیا عجیب وغریب طریقہ کار مجھے تم پر اعتماد ہے نریمان فرازی۔ تم واقعی فرازی ہو۔''

''اور میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں خانم جہانیہ! یقین کریں میں بھی کمزور آدمی نہیں ہوں۔ یہ لوگ قیامت تک میری زبان نہیں کھلوا سکیں گے۔ کیا اب آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ شاہ کا خزانہ کہاں ہے۔''

''اس کے لیے ہمیں زنجان جانا پڑے گا۔'' خانم جہانیہ نے کہا۔

"کیا مطلب کیا خزانہ تہران میں نہیں ہے۔" شہباز نے سوال کیا۔

"نہیں...... آخری دونوں میں جب شاہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کی سلطنت نہیں بچے گی تو اس نے خزانہ کے ایس پی این کے ساحلی شہر رامسر منتقل کر دیا تھا۔ شاہ عام طور سے گرمیوں کا موسم اسی شہر میں گزارتا تھا۔ اسے امید یہ بھی تھی کہ طاقت کے ذریعے ہنگاموں پر قابو پالے گا لیکن جب یہ امید ختم ہو گئی او انقلابی قوتوں میں اضافہ ہوتا گیا تو شاہ نے ملک سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے چند روز پہلے اس نے خفیہ طور پر مجھے ایک مکان میں بلوایا اور یہ عجیب وغریب درخواست کی کہ میں اس کا خزانہ اپنے پاس رکھ لوں کبھی حالات ٹھیک ہوں گے تو وہ اپنی امانت واپس لے لے گا۔ میں اسکول کی پرنسپل تھی شاہ کی چھوٹی بہن میری شاگرد رہ چکی ہے پھر اس نے پرنس رضا کی اتالیقی بھی کی ہے شاہ کو مجھ پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں اس خزانے کی حفاظت کر سکوں گی کیونکہ کسی کو مجھ پر شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بہر حال شاہ کی روانگی سے صرف دو دن پہلے وہ خزنہ نہایت خفیہ طور پر رامسر سے زنجان پہنچا دیا گیا۔ میں زنجان میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ وہاں میرا آبائی مکان اب بھی موجود ہے"

"شاہ کے تین نہایت معتمد آدمی خزانہ لے کر گئے تھے وہ تینوں شاہ کے ساتھ ہی ملک سے فرار ہو گئے تھے ان میں سے دو تو بعد میں بڑے پراسرار حالات میں موت کا شکار ہو گئے تھے اور تیسرا لاپتہ ہو گیا تھا۔ مجھے تھوڑے دن پہلے جو پیغام ملا تھا اس میں خفیہ الفاظ بھی تھے جو میرے اور شاہ کے درمیان طے ہوئے تھے۔ کسی تیسرے کو اس کا علم نہیں تھا چنانچہ میں سمجھ گئی کہ یہ پیغام شاہ کے کہنے پر ہی بھیجا گیا ہے۔"

"اطمینان رکھو یہ لوگ کبھی خزانے کا راز نہیں پا سکیں گے۔" شہباز نے نریمان فرازی کی حیثیت سے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"ویسے یہ خزانہ ہے کتنا۔"

"کتنا......" خانم نے آنکھیں بند کر لیں "تقریباً پانچ ٹن خالص سونا، ملکہ فرح شاہ بانو کا تاج، اربوں ڈالر مالیت کے ہیرے اور جواہرات یہ شاہ کا خزانہ ہے۔ شہباز کی آنکھیں بند ہو گئیں رازل جریری کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ رازل جریری ایک مخلص انسان جسے خزانہ صرف اس لیے درکار تھا کہ دنیا بھر میں دکھی انسانیت کی خدمت کرے۔ وہ اگر چاہتا

تو اس سے کہیں زیادہ بڑا خزانہ، بڑے بڑے ملکوں کو بلیک میل کر کے حاصل کر سکتا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ برائی سے برائی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ برائی کا خاتمہ صرف اچھائی سے ہوتا ہے۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد نریمان فرازی کی آواز شہباز کے ذہن میں ابھری۔

"کچھ سنا تم نے۔"

"ہاں۔"

"تمہارا مقصد پورا ہوتا ہے۔"

"میرا نہیں، رازل جریری کا۔"

"وہی ٹھیک ہے اور اس کے بعد تم میرا بدن مجھے واپس کر دو گے۔"

"میں نہیں رازل جریری۔" شہباز نے جواب دیا۔ نریمان فرازی اس کے ذہن میں چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"تم بہت اچھے انسان ہو شہباز...... بہت اچھے انسان۔" پھر وہ بوڑھی عورت کو دیکھنے لگا تو بوڑھی عورت نے کہا۔

"تو نریمان فرازی اب میں تمہیں اپنے آبائی مکان کا پتہ سمجھا دیتی ہوں تاکہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم شاہ کی امانت مجھ تک پہنچا سکو۔" وفادار عورت کی آواز ابھری اور ایک لمحے کے لیے شہباز ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تاہم اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اطمینان رکھو خانم! تم میرے ساتھ ہی جاؤ گی۔" خانم جہانیہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

✿......✿

آخر کار چوبیس گھنٹے گزر گئے۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے شہباز کے خیال میں وہ لوگ آنے ہی والے تھے۔ دن میں وہ ان کی آوازیں سنتا رہا تھا لیکن کسی نے اس کمرے میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا نہ ہی انہیں کچھ کھانے پینے کو دیا گیا تھا۔ شہباز کو اپنے آپ سے زیادہ خانم جہانیہ کی فکر تھی وہ زخمی بھی تھی اور بھوکی پیاسی بھی۔ چوبیس گھنٹے تو شہباز کو یہاں بیت چکے تھے۔ اس سے پہلے نجانے کب سے خانم جہانیہ کو بھوکا پیاسا رکھا ہوگا۔ گیارہ بجے کے بعد باہر قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں دروازے کے سامنے رک گئیں پھر دروازہ کھلا اور تین افراد اندر داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک صندل تھی، دوسرا طویل القامت گنجا

اور تیسرے کو شہباز نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بھی انتہائی طاقتور اور طویل القامت آدمی تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا سر جسم کی نسبت چھوٹا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی لمبے تڑنگے آدمی کے جسم پر گیارہ سالہ بچے کا سر فٹ کر دیا گیا ہو۔ تنگ پیشانی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کی مکاری کی نمائندگی کرتی تھیں اس کا نام صالم تھا۔ دوسری چیز جو شہباز نے دیکھی وہ گنجے کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ صندل کے ہاتھ میں ریوالور جبکہ صالم خالی ہاتھ تھا۔ وہ تینوں دروازے سے دو قدم آگے آ کر رک گئے۔ صندل کچھ دیر تک خانم جہانیہ کو دیکھتی رہی پھر اس نے شہباز کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

”غالباً تم نے اپنی شناخت کرانے کے لیے چہرے کا میک اپ اتارا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بڑھیا نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہو۔“

”ہاں اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ شاہ کا خزانہ کہاں پوشیدہ ہے۔ لیکن تم لوگوں کا کیا خیال ہے کیا تم میری زبان کھول سکو گے۔ تم تو اس بے چاری بوڑھی اور کمزور عورت کی زبان نہیں کھلوا سکے تو نریمان فرازی کی زبان کھلوانے میں کیسے کامیاب ہو سکو گے۔“ ان تینوں کے چہرے بگڑ گئے۔ صندل نے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو ہم بے وقوف ہیں۔ بڑھیا پر ہم نے زیادہ سختی اس لیے نہیں کی کہ اگر یہ ختم ہو گئی تو خزانے کا راز بھی اس کے سینے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے اگر تم ہمارے ہاتھوں مر بھی گئے تو ہمیں پرواہ نہ ہوگی۔ اس طرح ہمارے پاس ایک چانس بھی ہے۔ تمہیں تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھ کر شاید بڑھیا بولنے پر مجبور ہو جائے۔“ صندل بے رحمی سے بولی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ کوشش کر لو۔“ شہباز نے کہا۔ اس وقت وہ ایک شریر بچہ معلوم ہو رہا تھا جو کچھ لوگوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا ہو۔ لیکن صندل نے چھوٹے سر والے کو مخاطب کر کے کہا۔

”صالم۔“

”تم نے ایک مرتبہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تم ایک رات مجھے اپنے بستر پر سلانا چاہتے ہو۔“ صندل بے حیائی سے بولی اور صالم کا چہرہ عجیب سا ہو گیا۔ صندل نے کہا۔

”آج میں تمہیں ایک موقع فراہم کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم اس شخص کی زبان کھلوا دو تو باقی رات میں تمہارے بستر پر رہوں گی۔ تم جتنی جلدی اس کی بان کھلوا لو گے اتنا ہی زیادہ وقت

تمہارے ساتھ رہوں گی۔“ یہ کہہ کر صندل نے ایک عجیب حرکت کی اس نے جو میکسی قسم کی چیز پہنی ہوئی تھی اسے اتار کر اپنے جسم سے ایک طرف فرش پر پھینک دیا۔ میکسی کے نیچے اس نے انتہائی مختصر سے لباس پہنے ہوئے تھے اور تقریباً برہنہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا یہ عمل وہاں موجود تمام مردوں پر برا ہی ہوا۔ شہبا کا ذہن بھی ایک لمحے کے لیے جھنجھنا گیا تھا۔ اس نے صالم کی طرف دیکھا۔ صالم کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور اس کی بھوکی نظریں صندل کے بدن کو ٹٹول رہی تھیں۔ صندل اپنے جسم کو بڑی ہیجان خیز جنبش دے کر بولی۔

”میں تمہیں زیادہ سے زیادہ دس منٹ دے سکتی ہوں چلو آگے بڑھو۔“ صندل نے صالم کو اکسایا شہباز کو اندازہ ہو گیا کہ صالم کوئی خاص ہی چیز ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی ہوشیار ہو گیا۔ صالم حرکت میں آ گیا اس کے دونوں بازو پہلو میں لٹکے ہوئے تھے اور ہتھیلیاں بھنچی ہوئی تھیں وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا شہباز کی طرف بڑھنے لگا۔ شہباز بھی سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو بالکل تیار کر چکا تھا۔ صالم اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا اور پھر اس نے اچانک ہی وار کر دیا۔ لیکن شہباز رانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اچھلا اور صالم کے کندھوں پر چڑھ کر کود گیا صالم نے اس پر گھونسا چلایا تھا۔ وار خالی جانے کی وجہ سے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پھر شہباز نے ایک لمحے تک اس کے کندھوں پر پیر ٹکائے تھے۔ یہ انوکھا مسئلہ صالم کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی جھونک میں لڑکھڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ شہباز نے چار پانچ الٹی قلابازیاں کھائیں جس برق رفتاری سے وہ قلابازیاں کھا رہا تھا وہ یہاں پر موجود ہر شخص کے لیے بہت انوکھی بات تھی پھر اس نے اچانک ہی زمین پر ہاتھ ٹکا کر گدھے کی طرح صالم کی کمر پر دولتی رسید کر دی۔ صالم اچھل کر اس بری طرح دیوار سے ٹکرایا تھا کہ اس کا سر نیچے اور پاؤں اوپر تھے۔ لیکن پھر وہ فوراً سنبھل گیا اس بار جب وہ شہباز کی جانب بڑھا تو اس کے چہرے پر درندگی کے آثار نظر آ رہے تھے وہ بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا شہباز کی طرف لپکا اور شہباز نے زمین پر لیٹ کر اپنے دونوں پاؤں اس کے پیٹ پر ٹکائے اور اوپر اچھال دیا لیکن ذرا سی غلطی ہو گئی تھی۔ جیسے ہی وہ اچھلا خانم نے اس کے دونوں پاؤں پیچھے سے پکڑ لیے اور پھر اس طرح گھمائے کہ شہباز کو الٹی قلابازی کھانا پڑی۔ صالم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی پسلی پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی اور شہباز زمین پر لوٹ لگا کر ذرا سا دور نکل گیا لیکن اسے اس بات کی امید نہیں تھی کہ گنجا بھی بالکل غیر متوقع طور پر اس جنگ

میں شریک ہو جائے گا۔

گنجے نے بالکل ہی غیر متوقع طور پر شہباز پر حملہ کیا تھا اور پوری قوت سے اس کے جسم پر ٹھوکریں لگائی تھیں۔ یہاں شہباز مار کھا گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گنجا اس کے سینے پر سوار ہو گیا اس کے دونوں ہاتھ شہباز کے گلے پر تھے اور شہباز کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گردن لوہے کے شکنجے میں کسی جا رہی ہو۔ پھر گنجے کی آواز ابھری۔

"خانم کے سوالات کے جواب دینے کو تیار ہو یا نہیں۔" صالم نے غراتے ہوئے کہا اس کے ساتھ ہی اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو گئی تھی۔

"نن..... نہیں۔" شہباز بمشکل بول سکا اس کو سینے میں سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ گنجے نے پھر گردن دبوچ لی۔ دو تین مرتبہ اس نے یہ عمل دوہرایا لیکن ہر مرتبہ شہباز نے نفی میں سر ہلایا اور آخر کار گنجا اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس نے شہباز کو تین چار ٹھوکریں رسید کیں پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہباز فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا اس کے جسم کے ہر حصے میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"اب بھی وقت ہے خزانے کا پتہ بتا دو۔ جب وہ لوٹ کر آئے گا تو پہلے سے زیادہ خوفناک ہو گا؟" صندل نے اس کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ شہباز نے نفرت بھری نگاہوں سے صندل کو دیکھا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ صندل ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی اور پھر اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل پڑا ان دونوں کا کہنا درست تھا۔ صالم ایک منٹ کے بعد واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو انچ چوڑی آہنی پٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس کے دونوں سروں پر کلپ سے بنے ہوئے تھے اور سوراخوں میں تقریباً آٹھ انچ لمبی آہنی سلاخ پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے سلاخ نکال لی آہنی پٹی شہباز کے سینے پر لپیٹ دی اور پشت پر کلپ میں آہنی سلاخ پھنسا کر اسے گھمانے لگا۔ کلپ میں چوڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سلاخ گھمانے سے شہباز کے سینے پر بندھے ہوئے آہنی شکنجے کی پٹی کستی چلی گئی شہباز زمین پر بیٹھا ہوا تھا اسے اپنی پسلیاں دبتی محسوس ہونے لگیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ صالم سے اچھی طرح نمٹ لیتا لیکن شہکان نے اس پر جو طبع آزمائی کی تھی اس نے شہباز کو بری طرح نڈھال کر دیا تھا شکنجہ کستا چلا گیا۔ شہباز کو سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔

"ہاں بولو کیا کہتے ہو۔ خزانے کا پتہ بتاؤ گے یا نہیں۔" صالم کے حلق سے بھیڑیوں جیسی

آواز نکلی۔

"نہیں۔" شہباز بولا اور صالم بھی شکنجہ کسنے لگا۔ شہباز کی پسلیاں دب رہی تھیں سانس رک رہا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابلتی پڑ رہی تھیں وہ زمین پر بیٹھے بیٹھے بری طرح مچلنے لگا لیکن گنجا شہکان مسلسل صالم کا ساتھ دے رہا تھا۔ صالم نے شکنجے کو ایسے پکڑ رکھا تھا کہ شہباز کے جسم کا بالائی حصہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا وہ زمین پر ایڑیاں رگڑتا رہا سینے میں جیسے سانس رکنے لگا۔ پسلیاں جیسے دل اور پھیپھڑوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ریڑھ کی ہڈی اپنی جگہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔

ٹھیک اسی لمحے ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر صندل نے جلدی سے زمین پر پڑا ہوا لبادہ اوڑھ لیا۔ نیا آنے والا درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ سیاہ داڑھی میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ اس کے سر پر انقلابی رہنماؤں جیسا امامہ اور جسم پر گہرے براؤن رنگ کا لبادہ تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے یہاں کے ماحول کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ابھی تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"بہت سخت جان ہے یہ۔ اور لگ رہا ہے آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔"

"دنیا میں کوئی بھی کام آسان نہیں ہوتا اسے چھوڑ دو میں بات کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔ صالم نے شکنجہ ڈھیلا کر دیا اس کے چہرے پر بے پناہ مایوسی ابھر آئی تھی۔ وہ شکنجہ ڈھیلا کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید اس کی یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ شکنجہ ڈھیلا کرتے ہی شہباز کو ابکائی آئی اور اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ وہ دیر تک ہانپتا رہا اور خون تھوکتا رہا۔ اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی بہہ رہا تھا پھر کسی کو اپنے قریب پا کر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اس شخص کا چہرہ دیکھ کر انتہائی تکلیف کے باوجود شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "مجھے یقین تھا کہ اس منصوبے کے پیچھے تم جیسا ہی کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔" شہباز نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو مجھے۔"

"ہاں تم جیسے شیطان کو کون نہیں جانتا۔ تم سراوان ہو۔ ہونا۔" سراوان ایک بہت بڑا انقلابی لیڈر تھا۔ انقلابی حکومت اگرچہ اس کا کوئی قاعدہ نہیں تھا لیکن اسے بے انتہا اختیارات

حاصل تھے۔ وہ ہر محکمے میں مداخلت کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔
”دولت کی چاہت کسے نہیں ہوتی۔“ سراوان نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”مجھ جیسے لوگوں نے کمیٹی کا ساتھ اس لیے نہیں دیا تھا کہ ہم لوگ بھی دنیا کی نعمتوں کو ٹھکرا کر ایک حجرے میں بند ہو جائیں۔ دولت پر صرف امیروں کا نہیں ہمارا بھی حق ہے اور اب موقع ملا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آئی ہوئی دولت کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔“
”لیکن سراوان! ایسی دولت تمہارے کس کام کی جس کو تم آزادی سے خرچ بھی نہ کر سکو۔“ شہباز نے کہا۔
”دولت مل جانے کے بعد ایران میں کون رکنا پسند کرے گا۔“ سراوان نے جواب دیا۔
”میں نے گزشتہ چند مہینوں میں اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر خفیہ ذرائع سے مجھے اطلاع ملی کہ شاہ نے فرار ہونے سے پہلے یہاں کوئی خزانہ چھپا دیا تھا اور تم وہ خزانہ لے جانے کے چکر میں ہو۔ ہم نے خانم جہانیہ کو پکڑ لیا لیکن وہ بڑی سخت جان ثابت ہوئی اب تک اس نے زبان نہیں کھولی پھر تم تہران پہنچ گئے اور یہاں ایک ہنگامہ مچ گیا کوئی بھی تمہاری گرد کو نہیں پہنچ سکا۔ مجھے یقین تھا کہ تم اپنے ان حریفوں سے نمٹ کر ہی خانم جہانیہ کا رخ کرو گے اس لیے میں نے اپنی بیٹی صندل کو تمہارا انتظار کرنے کے لیے جہانیہ کے مکان پر پہنچا دیا اور آخر کار وہ تمہیں اپنے جال میں پھانسنے کو تیار ہو گئی۔
”صندل تمہاری بیٹی ہے۔“ شہباز نے حیرت سے پوچھا۔
”ہاں اور مجھے اس پر فخر ہے۔“
”واقعی ایک بے غیرت باپ کو اس جیسی بے غیرت بیٹی پر فخر ہونا ہی چاہیے۔ واقعی...... واقعی...... بہت بے غیرت انسان ہو تم جو دولت کے لیے اپنی بیٹی کی عزت نیلام کرتے پھر رہے ہو۔“
”بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ صندل میری بیٹی ہے۔ اسے آٹھ سال کی عمر میں تعلیم کے لیے یورپ بھیج دیا گیا تھا۔ یہ وہیں پروان چڑھی ہے میں نے بھی یورپ میں تعلیم حاصل کی ہے اور تم جانتے ہو یورپ میں ایسی باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی وہ لوگ ہر معاملے میں آزاد ہیں اور اگر ہمیں وہاں رہنا ہے یہ باتیں تو اپنانی ہی پڑیں گی۔ اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو بہر حال ایک ایک لفظ کا حساب لیا جائے گا تم سے اور زبان کھولو تاکہ جو کچھ میں تمہارے

ساتھ کروں اس پر مجھے بعد میں افسوس نہ ہو۔“
”تم جیسے لوگ ہی مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی اس انقلاب کا مخالف ہوں۔ میرے بارے میں سب جانتے ہیں کہ میں کیا ہوں لیکن تم...... تم جیسے لوگ مجھ سے بھی کہیں زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔ میں اگر یہاں سے زندہ بچ نکلا تو وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اس بے حیائی اور بے غیرتی کی سزا تمہیں ایسی دوں گا جس طرح انقلابی فاحشاؤں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔“
”پاگل ہو...... پاگل ہو...... پاگل ہو تم، کیا تم اب بھی اس بات کے تصور میں ہو کہ یہاں سے زندہ بچ جاؤ گے۔“ سراوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”تم کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہو لیکن میرے پاس ایک اور تجویز بھی ہے۔ تم جانتے ہو کہ کمیٹی کو تمہاری تلاش ہے میں تمہیں کمیٹی کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ وہ لوگ زبان کھلوانے کے اور بھی بہت سے طریقے جانتے ہیں ان کے سامنے تو پتھر بھی بول اٹھتے ہیں۔ تم سے سب کچھ اگلوانے کے بعد رپورٹ میرے پاس ہی آئے گی اور اس طرح وہ خزانہ میرے قبضے میں آ جائے گا۔ تمہیں کچھ نہیں ملے گا، خزانہ ملتے ہی میں اس ملک سے نکل جاؤں گا۔ میں نے روانگی کے تمام انتظامات مکمل کر رکھے ہیں۔ لیکن تمہیں میری پیشکش ہے کہ اگر تم خزانے کا پتہ بتا دو تو میں اس میں تمہارا بھی حصہ لگا لوں گا۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ شاہ کے خزانے میں حصہ چاہتے ہو یا کمیٹی کے قبضے میں جانے کے خواہش مند ہو۔“
”کتے! جس قدر بے غیرت تو ہے میرے دل میں انتہائی نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ میں تیری کوئی بات نہیں مانتا۔“ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر صاحب اختیار ہونے کے باوجود سراوان ایک دم غصے میں نہیں آتا تھا ورنہ باقی طور پر شہباز کے یہ الفاظ اس کے غصے کو بھڑکا دینے کے لیے کافی تھے اور وہ ایک لمحے کے لیے اس کی زندگی کے درپے ہو جاتا لیکن اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔
”جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمہیں مزید چوبیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ کل اسی وقت مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ انکار میں صورت میں تمہیں کمیٹی کے حوالے کرنے سے پہلے تمہارے سامنے اس بڑھیا کا کام تمام کیا جائے گا۔“ اس نے خانم جہانیہ کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند

کیے پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی اس کے صرف ہونٹ متحرک تھے شاید وہ کوئی دعا مانگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں۔ میرا خیال ہے آئندہ چوبیس گھنٹے تمہارے سوچنے سمجھنے میں بڑے معاون ہوں گے۔ یہ کہہ کر وہ دوسروں کو اشارہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھاری دروازہ پھر سے بند ہو گیا تھا۔ شہباز نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سینے میں بے پناہ درد اٹھ رہا تھا۔ کچھ لمحے وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر بڑی مشکل سے اٹھ کر پلنگ کے قریب آ گیا۔ خانم جہانیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ چند ثانیے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر آنکھیں بند کر لیں۔

شہباز پلنگ کے قریب چھوٹے سے قالین کے ٹکڑے پر لیٹ گیا کمرے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ شہباز چھت کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس ملک میں اس جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر دھوکا دے رہے ہیں۔ امام خمینی کا انقلاب اگرچہ کامیاب ہو چکا تھا لیکن اگر انقلاب کو کوئی خطرہ تھا تو وہ شاہ پسندوں سے نہیں ان جیسے منافقوں کی طرف سے تھا وہ دیر تک لیٹا یہی سب کچھ سوچتا رہا پھر جب تکلیف کچھ کم ہوئی تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے خانم جہانیہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں اب ہونٹ تک متحرک نہیں تھے وہ شاید سو چکی تھی۔

شہباز ٹہلتا ہوا محراب کی طرف چل پڑا۔ محراب والے حصے میں بھی ایک بلب لگا ہوا تھا لیکن وہ بلب یا تو فیوز تھا یا پھر اس کا سوئچ آن نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے والے بلب کی مدھم سی روشنی یہاں پہنچ رہی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دیوار کی شیلفوں میں جھانکنے لگا سب سے اوپر والے شیلف میں پچھلی دیوار کے قریب کپڑے کا ایک ٹکڑا دیکھ کر اس نے غیر ارادی طور پر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے کپڑے کے اس ٹکڑے کو چٹکی میں پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن کپڑا وہیں رہ گیا۔ شاید شیلف میں کسی جگہ پھنسا ہوا تھا اس نے دوبارہ کپڑے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا لیکن کپڑا اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر گہری نگاہوں سے شیلف کو دیکھنے لگا اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ کپڑے کا باقی حصہ شیلف کی پچھلی دیوار میں غائب تھا۔ اس احساس نے اچانک ہی شہباز کے ذہن میں ایک دھماکہ سا پیدا کیا۔

یہ کسی جاگیردار کی محل نما حویلی تھی۔ جاگیردار امراء اپنے مکانات تعمیر کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کرتے تھے کہ کسی ہنگامی صورتحال میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر مکان سے باہر نکلا جا سکے۔ یہ خیال آتے ہی شہباز پچھلی دیوار ٹٹولنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کوئی خفیہ راستہ ہے اور دروازے کا میکیزم بھی یہیں کہیں موجود ہونا چاہیے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ درمیان والے شیلف کا تختہ ایک انچ موٹا تھا۔ دائیں بائیں دیواروں میں بھی ایک انچ چوڑا اور لمبا کھانچہ بنا ہوا تھا۔ جس میں یہ تختہ فٹ ہو جاتا تھا۔ شہباز باری باری ان کھانچوں میں انگلیاں ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ دائیں طرف کے کھانچے میں پچھلی دیوار کے قریب لٹو کی طرح ایک چھوٹی سی ناب محسوس ہوئی جسے چٹکی میں آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا اس نے ناب کو پہلے باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا پھر اس نے اسے چٹکی میں پکڑا اور پیچ کی طرح گھمانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی پوری الماری کسی دروازے کی طرح باہر کی طرف کھل رہی تھی۔ پچھلی دیوار میں پھنسا ہوا کپڑا بھی نکل آیا وہ ایک ریشمی کپڑا تھا نجانے کس طرح یہاں پھنس گیا تھا لیکن بہرحال اس نے اسے ایک نیا راستہ دکھا دیا تھا۔ شہباز راستہ کھلا چھوڑ کر کمرے میں آ گیا اور دروازے کے پاس جا کر باہر سے کسی کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر مکمل سناٹا تھا اگر کوئی چوکیداری کر بھی رہا تھا تو وہ بھی سو رہا ہو گا۔ شہباز دبے قدموں چلتا ہوا دوبارہ محراب میں داخل ہو گیا الماری والے راستے میں داخل ہو کر اس نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا وہاں دو سوئچ لگے ہوئے تھے۔ پہلا سوئچ آن کیا تو اندر ایک بلب روشن ہو گیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دوسرا سوئچ آن کیا الماری والا دروازہ بند ہونے لگا۔ اس نے سوئچ آف کیا تو دروازہ اپنی جگہ رک گیا یہ ایک تنگ سی سرنگ تھی اس میں دو آدمی برابر چل سکتے تھے۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ یہ سرنگ کھوکھلی دیوار کے درمیان بنائی گئی تھی۔ تقریباً بیس قدم کے بعد وہ رک گیا یہاں بھی دیوار میں دو سوئچ لگے ہوئے تھے جبکہ سرنگ مزید آگے چلی گئی تھی۔ شہباز سمجھ گیا کہ یہاں کسی دوسرے کمرے کا خفیہ راستہ ہو گا۔ اس نے ایک سوئچ آن کر دیا اس کا اندازہ درست نکلا۔ دیوار کا ایک حصہ الماری کی طرح پچھلی طرف کھلتا چلا گیا۔ یہ شہباز کی خوش قسمتی تھی کہ اس مکان میں آنے کے بعد اس سے صرف ریوالور گیا تھا اور تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ خنجر اس کی آستین میں موجود تھا۔ اس نے بازو کو مخصوص

انداز میں جنبش دی اور خنجر آستین میں پھسلتا ہوا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ خنجر سنبھالے نہایت احتیاط سے کام لیتا ہوا اس راستے میں داخل ہو گیا اس کے دوسری طرف بھی ویسی ہی محراب تھی اس نے محراب سے نکلنے سے پہلے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا ار ایک آدمی پلنگ پر سو رہا تھا۔ شہباز دبے قدموں آگے بڑھا لیکن اچانک اس کا پاؤں فرش پر پڑی ایک خالی بوتل سے ٹکرایا۔ یہ بوتل فرش پر لڑھکتی چلی گئی۔ آواز سن کر وہ شخص ایک جھٹکے سے اٹھ گیا یہ صالم ہی تھا۔ صالم نے فوراً ہی شہباز کو دیکھ لیا اور بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ شہباز سنبھل گیا صالم جیسے ہی اس کے قریب پہنچا شہباز کا خنجر اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ صالم کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی وہ پیٹ پکڑ کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ شہباز نے اس کے دل میں مقام پر دو تین وار کیے اور پھر اچھل کر دروازے کے پیچھے دیوار سے چپک گیا کیونکہ باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور گنجا شہکان اندر داخل ہوا لیکن دوسرے قدم پر ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔
اس کی نگاہیں صالم کی خون میں لت پت لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کچھ سمجھ سکتا شہباز نے لپک کر اسے پیچھے سے دبوچ لیا اور اسے زمین پر ڈھا کر تیز دھار دار خنجر اس کی شہ رگ میں پھیر دیا اس وقت شہباز کے اندر بے پناہ درندگی تھی یہ سب کچھ وہ نریمان فرازی کے کہنے پر نہیں کر رہا تھا بلکہ اس وقت اس کی اپنی شخصیت سامنے تھی۔

اپنے شکار کو چھوڑ کر وہ ایک بار پھر دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ کئی منٹ گزر گئے مگر مزید کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تو شہباز کمرے سے نکل آیا اور محتاط انداز میں چلتا ہوا مختلف کمروں میں جھانکتا رہا۔ تمام کمرے خالی تھے اس کا مطلب تھا کہ یہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لڑکی بھی غالباً یہاں سے جا چکی تھی۔ جس کا نام صندل تھا اور وہ شیطان صفت سراوان کی بیٹی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تدریش سے تہران واپس جا چکے ہوں۔

بہرحال شہباز عمارت سے باہر آ گیا۔ برآمدے کے سامنے ایک کار موجود تھی وہ دوڑتا ہوا اس کمرے کے سامنے آ گیا جہاں اسے بند رکھا گیا تھا۔ دروازے پر تالہ نہیں تھا البتہ موٹی آہنی سلاخ والا کنڈا لگا ہوا تھا اس نے کنڈا کھینچ کر دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔
خانم جہانیہ اس طرح نیم غشی کی سی کیفیت میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ خانم جہانیہ کے پاس پہنچا اور اس نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''اٹھو خانم جہانیہ اٹھو۔ ہم آزاد ہو گئے ہیں ہمیں جلدی یہاں سے نکل جانا چاہیے اٹھو خانم!''
خانم جہانیہ کے وجود میں جیسے نئی زندگی دوڑ گئی بے شک بھوک پیاس نے اس پر شدید نقاہت پیدا کر دی تھی لیکن ان الفاظ نے جیسے اس کی کیفیت بالکل درست کر دی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے شہباز کو دیکھا۔

''ختم کر دیا میں نے انہیں آؤ...... جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے ہمیں۔''
خانم جہانیہ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ اس سے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ شہباز نے اسے کندھے پر لادا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔
شہباز جیسے طاقتور انسان کے لیے خانم جہانیہ جیسی کمزور عوت کو لے کر دوڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ باہر آ کر اس نے اسے سیٹ پر بٹھا دیا اور پھر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس وقت تہران کا رخ کرنا خطرناک ہو گا۔ اسے کہیں اور پناہ لینی پڑے گی۔ خانم جہانیہ ہوش میں تھی۔ اس نے کہا۔

''اگر تم تدریش تک پہنچ سکو تو وہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔''

''تدریش میں کون ہے۔''

''میری ایک شاگرد زبیدہ طرزی۔ میں تمہیں اس کا پتہ بتائے دیتی ہوں۔ اس کا شوہر فوج میں ہے اور اس وقت عراق کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ اس لیے ہمیں وہاں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔''

''ٹھیک ہے'' شہباز نے گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور کچھ دیر کے بعد کار بیرونی گیٹ سے نکل کر تیز رفتاری سے پہاڑی میں بل کھاتی سڑک پر دوڑنے لگی۔

✿......✿

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے جب شہباز نے زبیدہ طرزی کے گھر کے دروازے کی بیل بجائی تھی۔ زبیدہ طرزی کو صورتحال بتائی گئی تو اس نے خانم جہانیہ کو دیکھا اور فوراً مستعد ہوگئی۔ وہ ان دونوں کو اندر لے گئی۔ کار گیراج میں بند کر دی گئی تھی۔ زبیدہ کو جب خانم کی آمد کا پتہ چلا تو وہ پریشان ہوگئی۔ خانم کو فوراً ہی آرام دہ بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کی عمر بتیس کے قریب ہوگی بعد میں پتہ چلا کہ اس کا شوہر فوج میں میجر ہے اور ان دنوں محاذ جنگ پر ہے۔ زبیدہ طرزی کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ گھر میں اکیلی ہی رہتی تھی۔

بہرحال خانم جہانیہ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو زبیدہ طرزی اس سے باتیں کرنے لگی۔ خانم جہانیہ نے اسے بتایا کہ کچھ لوگ کچھ عرصہ پہلے اسے اغوا کر کے لے گئے تھے اور ایک نامعلوم مقام پر رکھا گیا تھا اور اس دوران اس پر تشدد بھی کیا جاتا رہا تھا خانم جہانیہ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا تھا اور اغوا کرنے والے اس سے کیا چاہتے ہیں۔ البتہ اس نے بتایا کہ اس کا بھتیجا اس کی تلاش میں ہے جس نے بالآخر ان لوگوں کے ٹھکانے کا پتہ لگا لیا اور ایک زبردست معرکے کے بعد اسے چھڑانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے شہباز کو اپنا بھتیجا ظاہر کیا تھا اس نے زبیدہ سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ یہاں ان کی آمد کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے۔ خانم جہانیہ نے ایک اچھا جھوٹ بولا تھا جو شہباز اور اس کے ساتھ ہی نریمان فرازی کو پسند آیا تھا۔

بہرحال شہباز کے خیال کے مطابق یہ محفوظ جگہ تھی۔ نریمان فرازی نے بھی اس کی تصدیق کی تھی اور کہا تھا کہ اس عورت کی بات پر اعتبار رکھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں کوئی آ نہیں سکے گا اور اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل پائے گا۔

بہرحال ابھی کوئی عمل کرنے سے پہلے کچھ آرام کر لینا زیادہ مناسب تھا چنانچہ جو کمرہ زبیدہ نے اسے دیا اس میں پہنچنے کے بعد شہباز بستر پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند

کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ اب یہ بات تو وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ نریمان فرازی اس کے ذہن میں جاگ رہا ہے یا سو گیا ہے۔ رازل جریری نے جو عمل کیا تھا وہ بلاشبہ سائنس کی دنیا کا ایک انوکھا انقلاب اور ایک حیران کن تجربہ تھا لیکن بہت سے معاملات میں شہباز کو اس قدر واقفیت حاصل نہیں تھی اور نہ ہی نریمان فرازی جانتا تھا کہ موجود صورتحال کی کیا کیفیت ہے۔

بہرحال یہ سب کچھ اس کے لیے بھی بڑا دلچسپ اور دلکش تھا اور کتنی ہی بار نریمان فرازی اس بات سے دلچسپی کا اظہار کر چکا تھا کہ جن لمحات سے وہ گزر رہا ہے وہ اس کی زندگی کے انوکھے لمحات ہیں اور اگر کبھی اسے اس کا بدن واپس مل سکا تو ہو سکتا ہے کہ وہ رازل جریری کے بہترین عقیدت مندوں میں سے ہو۔

بہرحال اس کے بعد شہباز پورا دن سوتا رہا تھا۔ چار بجے کے قریب جب وہ بیدار ہوا تو اپنے آپ کو ہلا کا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے زبیدہ سے کچھ چیزیں منگوا کر چہرے کا حلیہ بدلا اور اس کے بعد وہاں سے جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

”میں آپ کو کچھ ہدایت دینا چاہتا ہوں۔ خانم زبیدہ طرزی۔“

”ہاں کہو۔“

”بس خانم جہانیہ کے سلسلے میں آپ تھوڑی احتیاط رکھیے گا۔ جیسا کہ انہوں نے آپ کو بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے انہیں اغوا کر لیا تھا اور انہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔“

اس نے اپنے چہرے میں تبدیلیاں کر لی تھیں نریمان فرازی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے اندر سب سے بڑی خوبی یہ ہے دوست! کہ تم جسمانی طور پر اور ذہنی طور پر بڑے فٹ انسان ہو۔ میں سمجھتا ہوں رازل جریری نے اپنی آرمی ایک شخص کو بنا کو بڑی عقل کا ثبوت دیا ہے۔ میں تمہیں ون مین آرمی کہہ سکتا ہوں۔ چہرہ تبدیل کرنے میں تمہاری کوئی مثال نہیں، دی جا سکتی اس طرح اپنے آپ کو بدلتے ہو کہ انسان حیران رہ جائے۔“

”ہاں۔ میرا ایک ہمدرد میرا ایک محب، بس یوں سمجھ لو میرے دوست نریمان فرازی کہ زندگی میں مجھے ایسے انسان ملتے رہے ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں میری زندگی کی تعمیر کی ہے۔ میں کس کس کا نام لوں اس کائنات میں میری ماں ہے۔ باپ بے شک اس دنیا میں نہیں ہے لیکن باپ سے زیادہ محبت کرنے والا ایک شخص جس کا نام فیض شاہ ہے میری زندگی

کے راستے تو ہمیشہ دوسرے ہی منتخب کرتے رہے ہیں۔''

''ہاں مجھے اندازہ ہے لیکن تم خود جسمانی طور پر کس قدر بہترین ہو وہ کارنامے سرانجام دے دیتے ہو جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں واقعی یہ سوچتا ہوں کہ اگر تم سچ مچ نریمان فرازی ہوتے تو میرا خیال ہے مجھ سے کہیں زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہوتے۔ میں تو پھر بھی بہت سے معاملات میں پیچھے رہ جاتا ہوں اور تم انہیں انجام دے دیتے ہو۔ اب تو کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ مل کر کام کروں لیکن اپنے وطن سے سب کو محبت ہوتی ہے۔'' شہباز ہنسنے لگا تھا نریمان فرازی نے کہا۔

''البتہ ایک سلسلے میں مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور تعجب بھی۔''

''کیا......'' شہباز نے سوال کیا۔

''تم ابھی تک کسی جگہ اس قدر متاثر نظر نہیں آئے جتنا تمہیں ہونا چاہیے تھا میرا مطلب ہے صنف نازک کا تمہاری زندگی میں کوئی گہرا دخل نہیں رہا۔

شہباز گہری سوچ میں ڈوب گیا اس سوال نے اس کے ذہن کے پردوں پر بہت سے نقوش بیدار کر دیئے۔ وہ پہلی لڑکی جس نے اسے اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا اور اس کے باپ نے یہ الزام لگایا تھا کہ شہباز اس کی دولت کے ذریعے اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہے اگر اس کا باپ شہباز پر یہ حملہ نہ کرتا تو اس بات کے امکانات تھے کہ شہباز اپنی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سے متاثر ہو جاتا اور شاید اس کے بعد زندگی کا رخ ہی بدل جاتا۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے۔'' نریمان فرازی نے کہا۔

''اپنے اندر جھانک رہا ہوں کیا واقعی تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن ایک لڑکی مجھے متاثر کرتی ہے اور وہ نتاشیہ ہے جس نے ہمارے لیے ہر چیز داؤ پر لگا دی۔''

نریمان فرازی نجانے کس تاثر کے تحت خاموش ہو گیا تھا۔ بہر حال شہباز بس اسٹاپ پر پہنچا اسے تہران کے لیے بس مل گئی اور تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ تہران کے مرکزی بس ٹرمینل پر جا پہنچا یہاں سے اسے سیدھا تخت جمشید پہنچنا تھا اور جب وہ وہاں پہنچا تو صمدی اس کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ شہباز نے اسے تمام تر صورتحال سے آگاہ کیا تو صمدی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اوہو......اس کا مطلب ہے کہ اگر ملا سعد بچ کر نکل گیا ہے تو بہت برا ہو جائے گا۔''

''وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ میں بہت جلد اس کا بندوبست کر رہا ہوں۔'' نریمان فرازی نے کہا پھر بولا۔

''اب تم یوں کرو کہ خانم اور نتاشیہ کو لے کر صبح زنجان روانہ ہو جاؤ۔ وہاں تم میرے دوست کے ہاں ٹھہرو گے۔ میں تمہیں پتہ سمجھا دوں گا۔ کل شام تک میں بھی پہنچ جاؤں گا اور پھر میرے مشن کا آخری مرحلہ شروع ہو جائے گا۔''

''مجھے وہ پتہ بتا دو۔'' صمدی نے کہا اور شہباز اسے پوری تفصیل سمجھانے لگا۔

یہ نریمان فرازی کا معاملہ تھا صمدی کو اچھی طرح تفصیل سمجھانے کے بعد وہ بنگلے سے باہر نکل آیا اس کے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ خیابان ڈاکٹر علی کے قریب اس کثیر المنزلہ عمارت میں داخل ہو رہا تھا جس میں بہت سے سرکاری دفاتر بھی تھے۔ چوتھی منزل پر وہ ایک ایسے دفتر کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا جس کا تعلق حکومت کے انتہائی حساس ادارے سے تھا۔ یہ پورا فلور اسی حکومت کے تصرف میں تھا۔ یہ ادارہ یہاں بظاہر ایک تجارتی کمپنی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ لیکن نریمان فرازی جانتا تھا کہ وہ درحقیقت کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں نریمان فرازی نے جان ہتھیلی پر رکھ دی تھی اور شہباز کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''دوست! میں تمہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں رکھنا چاہتا۔ جہاں اس وقت ہم آئے ہیں وہ جگہ بارود کا ڈھیر ہے خیال رکھنا۔''

''مجھے بارود کے ڈھیر میں اپنے لیے جگہ تلاش کرنا آتا ہے۔'' شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا بہر حال اس کے بعد اس نے ادارے کے ڈائریکٹر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جس میں اسے خاصی دشواری پیش آئی تھی لیکن آخر کار ڈائریکٹر تک پہنچنا نصیب ہو گیا۔ وہ جب اس وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ڈائریکٹر کے علاوہ دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہاں تم کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔'' ڈائریکٹر نے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں قومی سلامتی کے ایک اہم مسئلے کے لیے حاضر ہوا ہوں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کسی اور کی موجودگی میں بات کرنا ممکن نہیں ہوگا۔''

''ہوں۔'' ڈائریکٹر نے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا دونوں اٹھ کر

کے راستے

گئے۔

"ہاں اب کہو کیا بات ہے۔" ڈائریکٹر کے چہرے پر اشتیاق نظر آ رہا تھا۔

"محترم! میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ انقلاب سے پہلے میں اپنے والدین کے ساتھ باختران میں تھا پھر میں تہران میں آ گیا میرا خیال تھا کہ مجھے تہران میں ایک اچھی ملازمت مل جائے گی لیکن انقلاب کے ہنگاموں کی وجہ سے مجھے کوئی کام نہیں مل سکا۔ مجبوراً میں نے چوریاں شروع کر دیں۔" یہ کہہ کر شہباز رکا اور اس نے ڈائریکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈائریکٹر کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ تب شہباز نے سلسلہ گفتگو دوبارہ جاری کیا۔

"کچھ روز قبل میں چوری کی نیت سے ایک بنگلے میں داخل ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ بنگلہ کس کا تھا۔ وہاں ایک بریف کیس میں رقم کے ساتھ مجھے کچھ کاغذات بھی ملے اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے ان کاغذات کا مطالعہ کیا۔ کاروباری نوعیت کے کاغذات تھے البتہ ایک لفافے میں سے مجھے ایک دستاویز کی فوٹو کاپی ملی اس نے جیب سے دستاویز کی تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی یہ وہی تصویر تھی جو نتاشیہ نے کرنل حیات کے بریف کیس سے برآمد ہونے والے کاغذات کی کھینچی تھی شہباز نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! میں ایک چور ضرور ہوں لیکن مجھے اپنے وطن سے محبت ہے ہزاروں زندگیوں کی قربانی دے کر ہمارے رہبر نے اس سرزمین کو ظلمت سے نجات دلائی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایک بار پھر یہاں ظلمت کے اندھیرے پھیلانا چاہتے ہیں۔ میں دستاویز کی یہ تصویر کسی ذمے دار شخص تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں ایک ایسے شخص سے رابطہ قائم کروں جو بڑی اہمیت کا حامل ہے یعنی عادل سرائی لیکن اس کے بارے میں بھی کچھ ایسے انکشافات ہوئے ہیں کہ میں نے اس کے پاس جانا مناسب نہیں سمجھا اور بڑی مشکل سے میں نے آپ تک رسائی حاصل کی ہے۔ ایک ایماندار اور وطن پرست شخص تصور کر کے۔"

ایک بار پھر شہباز نے ڈائریکٹر کے چہرے کا بغور جائزہ لیا لیکن کم بخت لگا تھا پتھر کا بنا ہوا انسان ہے۔ چہرے کے تاثرات سے وہ کوئی تاثر نہیں دے رہا تھا۔ وہ دستاویز کی تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں تحریر بہت باریک تھی اس نے میز کی دراز سے محدب عدسہ نکالا اور تحریر پڑھنے لگا البتہ اب وہ اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ وہ جیسے جیسے یہ تحریر پڑھ رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ ایران کی اسلامی حکومت کے خلاف جوابی انقلاب کا منصوبہ تھا۔ جس میں چند بڑی سیاسی شخصیات کے علاوہ چند فوج کے کرنل بھی شامل تھے۔ اس منصوبے میں کرنل حیات اور انٹیلی جنس کے سربراہ کا نام بھی شامل تھا۔ اس منصوبے کے مطابق اسلامی انقلاب کے سربراہ اور دیگر مذہبی شخصیات کو قتل کر کے فوری فوج پر قبضہ کرنا تھا البتہ ان دستاویزات میں ان خطرناک فوجی انقلاب کی کوئی تاریخ مقرر نہیں تھی لیکن اس پر کسی وقت بھی عمل ہو سکتا تھا۔

"اور تم عادل سرائی کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو۔" ڈائریکٹر نے بمشکل تمام شہباز کے چہرے کی طرف دیکھا۔

کل رات تدریش میں چوری کی ایک واردات کرنے کے بعد میں وہاں سے تین میل دور پہاڑی میں واقع ایک عمارت میں چھپا ہوا تھا کہ میں نے عادل سرائی کو اپنی بیٹی اور چند دیگر افراد کے ساتھ وہاں آتے ہوئے دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت ان کی قیدی تھی کچھ دیر بعد ایک اور قیدی کو وہاں لے آیا گیا۔ عادل سرائی کے آدمی اس قیدی اور بوڑھی عورت سے شاہ کے کسی خفیہ خزانے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان پر بے پناہ تشدد کیا جا رہا تھا۔ بعد میں عادل سرائی اور اس کی بیٹی کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ عادل سرائی ایک منافق آدمی ہے۔ وہ اسلام کی محبت میں انقلابی تحریک میں شامل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ حریص انسان ہے اس نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بے پناہ دولت اکٹھی کر لی ہے۔ اس کا پروگرام یہی ہے کہ شاہ کا خفیہ خزانہ حاصل کر کے یہاں سے فرار ہو جائے گا۔ اگر آپ میرے بیان کی تصدیق کرنا چاہیں تو آج شام سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

"نریمان فرازی۔" شہباز کے منہ سے نریمان فرازی کی آواز نکلی اور خود شہباز کا پورا بدن ایک لمحے کے لیے شل ہو گیا۔ ڈائریکٹر پر اس کے اثرات نمایاں ہوئے تھے۔ وہ اپنی جگہ اچھل پڑا اور پھر اس کی آواز ابھری۔

"یہاں آنے کا مطلب سمجھتے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔ تمام سکیورٹی ایجنسیاں میری تلاش میں ہیں۔ بس میرے یہاں آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ یا میں نے اپنے آپ کو سرینڈر کر دیا ہے۔ میں جرائم پیشہ ضرور ہوں لیکن بے ضمیر نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایران کے چالیس کروڑ عوام کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔ اتفاق سے ایک سازش میری

نظروں میں آ گئی تھی جس کی اطلاع میں آپ تک پہنچانا ضروری سمجھتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جو اس سیلاب کے سامنے قبل از وقت بند باندھ سکتے ہیں اس کے لیے آپ کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں، کن لوگوں سے رابطے قائم کرتے ہیں یہ سوچنا آپ کا کام ہے جہاں تک میرا تعلق ہے پورے ایران کی سکیورٹی ایجنسیاں اب تک مجھے تلاش نہیں کر سکیں۔ اور یہاں سے بھی اس طرح میں اپنے پیروں پر چل کر جاؤں گا جس طرح آیا تھا۔ اگر آپ مجھے جانتے ہیں تو میرے ان الفاظ کا وزن بھی آپ کو تلاش کرنا ہو گا۔"

"ہوں اور شاہ کے خفیہ خزانے کا کیا قصہ ہے۔" ڈائریکٹر نے نریمان فرازی کی تمام باتوں کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ اس کی نظریں نریمان فرازی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب اس کا چہرہ بہت سے تاثرات کا آئینہ دار نظر آ رہا تھا اور لگتا تھا کہ وہ نریمان فرازی اور اس کے کردار سے بے حد متاثر ہوا ہے۔

بہر حال وہ نریمان فرازی کی صورت سوالیہ انداز میں دیکھتا رہا تھا۔ نریمان فرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ محض ایک قصہ ہے ایک فرضی کہانی اور اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ اچھا محترم اب میں جا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ مجھے روکنے یا میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ دروازے کے قریب جا کر شہباز رکا اور بولا۔

"جاتے جاتے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ جس طرح بھی بن پڑے آپ عادل سرائی کے سلسلے میں کوئی مناسب کام کریں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اسے راتوں رات حراست میں لے لیا جائے۔ اس جیسے شخص کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" یہ کہہ کر شہباز دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈائریکٹر کچھ دیر تک خالی خالی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دستاویز کی فوٹو اسٹیٹ کی طرف دیکھا اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ کوئی خاص نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ شہباز جب اس عمارت سے باہر نکلا تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ بہت دور تک پیدل چلتا رہا یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا پھر اس نے ایک ٹیکسی، دوسری ٹیکسی اور پھر تیسری

ٹیکسی بدلی اور آخر کار بس ٹرمینل پر پہنچ گیا۔ جب وہ تدریش جانے والی بس میں پر بیٹھ رہا تھا تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کا تعاقب یا نگرانی نہیں کی جا رہی گویا ڈائریکٹر نے اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا تھا۔

آخر کار شہباز تدریش پہنچ گیا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ خانم جہانیہ کی حالت کافی خراب تھی۔ اسے تیز بخار تھا اور اس پر نیم مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ شہباز کے لیے یہ صورتحال کافی تشویش ناک تھی۔ خانم جہانیہ کو کم از کم اس وقت تک زندہ رہنا تھا جب تک وہ شاہ کے پوشیدہ خزانے کی نشاندہی نہ کر دے زبیدہ طرزی بھی بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ شہباز نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی ایسا ڈاکٹر تمہارا واقف نہیں ہے جو رازداری سے خانم جہانیہ کا علاج کر سکے۔" زبیدہ نے کچھ لمحے سوچا پھر بولی۔

"کچی آبادی میں ایک ڈاکٹر ہے۔ اصل میں اس کے پاس ڈاکٹری کی کوئی سند نہیں ہے لیکن وہ پندرہ سال تک ایک ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر رہا ہے اور اب اس نے کچی آبادی میں اپنا کلینک کھول رکھا ہے۔ کافی تجربے کار ہے اور بہترین علاج کرتا ہے۔"

"تو پھر اب تک تمہیں اسے یہاں لے آنا چاہیے تھا مگر میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم خانم جہانیہ سے کہاں تک دلچسپی رکھتی ہو مجھے معاف کرنا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مروت میں کچھ کام کرنے پڑ جاتے ہیں۔ یا پھر انسان ان سے بچنا چاہتا ہے۔" زبیدہ طرزی نے ایک نگاہ شہباز کو دیکھا اور پھر بولی۔

"میں اسے لینے کے لیے جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سیاہ چادر اوڑھی اور باہر نکل گئی شہباز البتہ کرسی پر بیٹھا بار بار خانم کی پیشانی کو چھو کر دیکھتا رہا اس کا جسم انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ نریمان فرازی نے کسی قدر پریشان لہجے میں کہا۔

"اس کا بخار ہر قیمت پر اترنا چاہیے ورنہ سارا کھیل ادھورا رہ جائے گا۔"

"میں خود بھی اس کے لیے پریشان ہوں۔ شہباز نے اپنے ذہن میں چھپے ہوئے اس شخص سے کہا جواب اسے اپنا بہترین دوست معلوم ہوتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے اس کا یہ دوست اس کے دماغ میں رہ کر پر سکون ہو اور خود وہ بھی سکون ہی محسوس کر رہا ہو۔

بہرحال دونوں خاموشی سے بیٹھے خانم جہانیہ کی صورت دیکھتے رہے۔ اچانک ہی زریان فرازی نے کہا۔

''اور اگر اس کے باوجود اس کا بخار نہ اترا تو ہم صبح سویرے اسے لے کر زنجان کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔'' شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا زبیدہ کی واپسی آدھے گھنٹے کے بعد ہوئی اس کے ساتھ آنے والے شخص کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ ایک بھاری بھر کم آدمی تھا اس کا سر درمیان میں سے صاف اور چاروں طرف سفید بالوں کی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ ڈاکٹر کے تمام آلات لے کر آیا تھا اور اس نے بڑی توجہ سے خانم جہانیہ کا معائنہ کیا تھا۔ پھر اس نے اسے دو انجکشن لگائے اور چند دوائیں لکھ کر دیتے ہوئے بولا۔

''یہ کیپسول ہر گھنٹے کے بعد دیتے رہیں اور یہ مرہم زخم پر لگانے کے لیے پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے رہیں۔ صبح تک بخار نہ ٹوٹے تو اسے بیمارستان لے جائیں۔ یہ کہہ کر اس نے پرچی شہباز کی طرف بڑھا دی اسی وقت زبیدہ طرزی نے کہا۔

''اور باہر نکلتے ہی تم یہ بھول جاؤ گے کہ کسی مریضہ کو دیکھنے اس مکان میں آئے تھے۔ یہ اپنا معاوضہ رکھو یہ کہہ کر زبیدہ طرزی نے جیب سے دو سوریال نکال کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیئے اس کے لہجے میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔ ڈاکٹر نے فوراً نوٹ ہاتھ میں پکڑے اور مسکرا کر بولا۔

''کون سی مریضہ۔''

''عقل مند آدمی ہو۔'' زبیدہ طرزی بھی مسکرا کر بولی۔ شہباز خاموشی سے اس شخص کا چہرہ دیکھ رہا تھا زبیدہ طرزی نے کہا۔

''میں چلتی ہوں میڈیکل اسٹور یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے میں دوائیاں لے کر آتی ہوں۔''

''یہ رقم رکھ لو۔'' شہباز نے کچھ نوٹ نکال کر زبیدہ طرزی سے کہا اور پھر وہ مسکرا دی پھر بولی۔

''میرے حالات اس قدر خراب نہیں ہیں اور خانم جہانیہ میری استاد رہ چکی ہیں کیا سمجھے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد میڈیکل اسٹور سے دوائیں لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے خانم جہانیہ کے زخموں پر مرہم لگایا اور دوا کی پہلی خوراک دی پھر دونوں باری باری اس کے سر پر برف کی پٹیاں رکھتے رہے۔ شہباز کو رات بھر جاگنا پڑا تھا۔ خانم جہانیہ کی زندگی اس کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر خانم جہانیہ مر گئی تو ساری محنت پر پانی پھر جائے گا اس کے بعد کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔ صبح

چار بجے کے لگ بھگ بخار اتر گیا اور سات بجے جب شہباز روانگی کی تیاریاں کر رہا تھا تو زبیدہ طرزی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں خانم کو یہاں سے لے جا رہا ہوں ان کی تمام دوائیں ایک تھیلی میں ڈال دو۔'' شہباز نے جواب دیا۔

''مم...... مگر یہاں؟ اور اس حالت میں یہ تو بالکل مناسب نہیں ہو گا۔''

''میں تہران میں ایک ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو بہتر طور پر اس کا علاج کر سکتا ہے۔'' شہباز نے جواب دیا۔

''لیکن میری بات تو سنو۔''

''نہیں تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے جو ابتدائی سہارا دیا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔'' پھر آدھے گھنٹے کے بعد کار مکان کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ یہ وہی کار تھی جس پر شہباز پہاڑی میں واقع مکان نما قلعے سے فرار ہوا تھا۔ اس کار پر سفر کرنا اگرچہ خطرناک تھا لیکن خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے خانم کو پچھلی سیٹ پر لٹا کر اس پر کمبل ڈال دیا۔ اس کے علاوہ اس نے زبیدہ کو بھی یہی بتایا تھا کہ وہ خانم کو تہران لے جا رہا ہے اگر وہ بتا دیتا کہ خانم کو لے کر وہ زنجان جانے والا ہے تو شاید زبیدہ اس سلسلے میں کافی رکاوٹ بن سکتی تھی۔ تہران سے قزویل اور تاکستان سے زنجان کا راستہ تقریباً تین سو کلومیٹر ہے۔ عام طور پر یہ راستہ ساڑھے تین چار گھنٹوں میں طے کیا جا سکتا ہے لیکن خانم جہانیہ کی وجہ سے شہباز کو کار کی رفتار ہلکی رکھنی پڑ رہی تھی۔ اس طرح جب وہ زنجان پہنچا تو شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ راستے میں کئی مرتبہ چیکنگ ہوئی اور شہباز کے پاس طبریس تک کا جاری سفر اجازت نامہ موجود تھا لیکن خانم کی وجہ سے اسے کہیں بھی باز پرس کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہر جگہ چیکنگ کے دوران وہ یہی بتاتا کہ وہ اپنی بیمار ماں کو لے کر طبریس جا رہا ہے اور اسے فوراً ہی آگے جانے کی اجازت مل جاتی۔ دن کے گیارہ بجے کے لگ بھگ خانم کا بخار تیز ہونا شروع ہوا تو شہباز نے گاڑی روک کر اسے ایک خوراک دے دی تھی۔ شام کو جب وہ زنجان پہنچا تو خانم بخار میں تپ رہی تھی۔

شہباز کی کار شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی شمالی علاقے میں واقع ایک بنگلے کے گیٹ

میں داخل ہو کر رک گئی۔ یہ اس کے شناسا کا بنگلہ تھا جس کے بارے میں نریمان فرازی نے اس کے ذہن میں تفصیلات بتا دی تھیں اور اس کا سارا پتہ صمدی کو بھی بتا دیا گیا تھا اسے یقین تھا کہ اس پتے پر جو اس نے صمدی کو بتایا تھا، صمدی وغیرہ بھی پہنچ چکے ہوں گے اور اس کا یہ اندازہ درست نکلا صمدی، خانم اور نتاشیہ کو لے کر دوپہر ہی کو یہاں پہنچ گیا تھا۔ خانم جہانیہ کی کافی دلداری کی گئی اور اسے بستر پر لٹا دیا گیا۔ کم از کم آج کی رات خانم جہانیہ کی زندگی شہباز کے لیے بہت ضروری تھی ادھر صمدی نے سارے انتظامات کر لیے تھے۔ اس کے دوست نے فوراً ڈاکٹر کا بندوبست کیا خانم جہانیہ کو ایک بار پھر انجکشن دیئے گئے اور دوائیں بھی تبدیل کر دی گئیں انجکشن اور دواؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو گھنٹے میں بخار ٹوٹ گیا۔ تقریباً نو بجے ایک بار پھر شہباز نے خانم کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا صمدی ساتھ بیٹھ گیا اور نتاشیہ کو بھی خانم کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا البتہ دونیہ کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

شہر سے نکلنے کے بعد شہباز نے گاڑی کا رخ مغرب کی سمت جانے والی سڑک کی سمت موڑ دیا تاریک اور سنسان ہائی وے پر تقریباً چھتیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے وہ زرین آباد نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچ گئے۔ نتاشیہ نے خانم جہانیہ کو اٹھا کر بٹھایا سفر اور بے آرامی کی وجہ سے اس کا بخار ایک بار پھر تیز ہونے لگا۔ خانم جہانیہ نے اپنے ہوش و حواس سنبھالے اور کمزور لہجے میں پوچھا۔

''ہم لوگ کہاں ہیں۔''

''زرین آباد۔''

''چلو...... چلو آگے چلتے رہو۔ قصبے سے تقریباً ایک میل آگے نکلنے کے بعد شہباز نے خانم کی ہدایت پر گاڑی کچی سڑک پر موڑی۔ خانم جہانیہ اس وقت کافی ہوش و حواس کا ثبوت دے رہی تھیں حالانکہ اس پر بار بار غشی سی طاری ہونے لگتی تھی کیونکہ بخار کی شدت تھی لیکن شہباز کے کہنے پر نتاشیہ بار بار خانم کے بازو دبا کر اسے ہوش میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شہباز نے کار روک دی۔ یہاں چار پانچ مکان تھے ایک مکان نسبتاً بڑا تھا جو دوسرے مکان سے ہٹ کر تھا دائیں طرف ایک وادی سی نظر آ رہی تھی جو دور تک نشیب میں چلی گئی تھی اس وادی میں سیب کے باغات تھے۔ یہ اراضی خانم جہانیہ کے باپ کی ملکیت تھی لیکن اب اس کے علاوہ خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں رہا تھا۔

باغات اجڑ چکے تھے اور چار چار اپنچ گھروں پر مشتمل یہ چھوٹی سی بستی طویل عرصے سے ویران پڑی تھی۔ یہاں پہنچ کر خانم نے جیسے ایک نئی انگڑائی لی۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک تھلگ مکان کی طرف اشارہ کر دیا اور عجیب سے لہجے میں بولی۔

''آخر کار میں اپنے گھر پہنچ گئی۔'' اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں سے اس کا گہرا ذہنی رابطہ ہو۔ مکان کے گرد اونچی چار دیواری تھی۔ خانم کے اشارے پر شہباز کار کو اس چار دیواری کے اندر لیتا چلا گیا یہاں کسی زمانے میں گیٹ رہا ہو گا لیکن اب نہیں تھا۔ چار دیواری بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ شہباز نے سہارا دے کر خانم جہانیہ کو کار سے اتار لیا۔ مکان کے دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا لیکن اس تالے کی چابی خانم کے پاس نہیں تھی۔

''ہمیں یہ تالا توڑنا پڑے گا۔'' خانم کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ شہباز کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تالا توڑ دیا گیا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ شہباز نے جیب سے ٹارچ نکالی، فرش پر کئی انچ گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

''ادھر اس طرف۔'' خانم جہانیہ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری اور وہ اندرونی دروازے میں داخل ہو گئے۔ شہباز ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ جس پہلے کمرے میں داخل ہوئے یہاں کچھ ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا ہوا تھا جس پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ فرش پر بھی گرد کی دبیز تہہ تھی۔

''ادھر اس کونے میں......'' خانم نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور شہباز ادھر دیکھنے لگا ٹارچ کی روشنی میں اس جگہ کا پورا جائزہ لیا پھر ہاتھ سے گرد ہٹانے لگا۔ کمرے کا سارا فرش اینٹوں کا بنا ہوا تھا لیکن اس کونے میں سیمنٹ کی ایک صلیب تھی۔ جو چاروں طرف سے تین تین فٹ اونچی تھی یہ صلیب سیمنٹ سے لگائی گئی تھی اور اسے محض خالی ہاتھ سے نہیں اکھاڑا جا سکتا تھا۔

''صمدی......'' شہباز نے صمدی کو دیکھتے ہوئے اسے پکارا اور صمدی مستعد ہو گیا۔

''خانم جہانیہ کو کرسی پر بٹھا دو اور گاڑی میں سے کوئی ایسی چیز نکال کر لاؤ جس سے یہ صلیب اکھاڑی جا سکے۔'' صمدی فوراً متحرک ہو گیا۔ اس نے خانم جہانیہ کو ایک ٹوٹی کرسی پر بٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کی واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کے

ہاتھ میں ڈیڑھ انچ چوڑی لوہے کی پٹی تھی جو ایک طرف سے جڑی ہوئی تھی شہباز کے اشارے پر وہ ایک طرف سے صلیب کھودنے لگا۔لیکن یہ کام آسان نہیں تھا اس میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔

آخر کار صمدی نے آہنی پٹی صلیب کے اوپر درز میں پھنسا کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی اور صلیب ذرا سی اوپر اٹھ گئی شہباز نے اس میں ہاتھ پھنسایا اور پھر دونوں نے مل کر صلیب اکھاڑ دی۔صلیب کے نیچے تنگ سی سیڑھیاں تھیں جو تہہ خانے میں چلی جاتی تھیں۔

شہباز نے خانم جہانیہ کی طرف دیکھا وہ اس وقت پوری طرح مستعد اور ہوش میں نظر آ رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی ہو۔

بہرحال شہباز پہلے سیڑھیوں سے اترا اس کے پیچھے صمدی اور آخر میں نتاشیہ دس سیڑھیاں اتر کر وہ تہہ خانے میں پہنچ گئے۔شہباز نے ٹارچ روشن کر کے تہہ خانے کا جائزہ لیا ایک طرف لکڑی کی کئی پیٹیاں اور صندوق رکھے ہوئے تھے جن پر آہنی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ شہباز نے ٹائرنگ سے ایک پیٹی کی پٹیاں توڑیں او جب پیٹی کھولی گئی تو کمرہ جگمگا اٹھا شہباز تمام پیٹیاں کھولتا چلا گیا۔ان پیٹیوں میں سونا اور ہیرے جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ نجانے کتنے ٹن سونا اور کروڑوں روپے کی مالیت کے ہیرے جواہرات،شہباز سکتے کے سے عالم میں رہ گیا صمدی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عظیم الشان روایتی خزانے کو دیکھ رہا تھا۔ نتاشیہ کی حالت بھی بہتر نہیں تھی وہ ایک طرف کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور پھر اچانک ہی شہباز بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے نتاشیہ کا بازو پکڑ لیا وہ اپنی اس کامیابی پر بے پناہ خوش تھا۔

پتہ نہیں رازل جریری اس وقت کہاں ہے۔کتنے فاصلے پر ہے اور کیا سوچ رہا ہے؟ ہو سکتا ہے اس کی روح آس پاس ہی موجود ہو۔اچانک ہی اوپر سے ایک آواز سن کر وہ بے حس و حرکت ہوگئے۔آواز ایسی تھی جیسے کوئی بھاری چیز گری ہو۔شہباز نے فوراً ٹارچ بجھادی اور جیب سے پستول نکالی تہہ خانے میں قبر کی سی خاموشی اور سناٹا تھا ان کے دل بڑی تیزی سے دھڑک رہے تھے شہباز کی ہتھیلیاں پسینے میں تر ہونے لگیں۔وہ خزانے تک پہنچ گئے تھے اور عین آخری لمحوں میں کوئی گڑبڑ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔کئی لمحات گزر گئے لیکن کوئی آہٹ سنائی نہیں دی شہباز ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے ہاتھ میں

پستول سنبھالے اندازے کی بنا پر دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچ گیا اس نے خلاء میں سے جھانک کر دیکھا کمرے میں گہری تاریکی اور سناٹا تھا اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ٹارچ روشن کر لی۔اس کے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا لیکن ٹارچ کی روشنی کمرے میں گردش کرتی ہوئی ایک جگہ رک گئی اور شہباز کے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔

صمدی نے خانم جہانیہ کو ایک ٹوٹی کرسی پر بٹھایا تھا لیکن اب وہ فرش پر پڑی تھی اور آواز غالباً اسی کے گرنے کی تھی۔شہباز نے نیچے منہ کر کے صمدی اور نتاشیہ کو صورتحال سے آگاہ کیا۔تو وہ بھی تہہ خانے سے باہر آ گئے قریب پہنچ کر صمدی نے خانم جہانیہ کو اٹھانا چاہا تو بری طرح چونک پڑا۔اس نے خانم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور چند لمحوں کے بعد اٹھ کھڑا ہوا پھر اس کی مدھم سی آواز ابھری۔

''یہ مر چکی ہے۔''

بڑا سا ٹرک تھا جس پر کھانے پینے کی اشیاء لدی ہوئی تھیں۔ یہ ٹرک زنجان کی شہری حدود سے نکلنے کے بعد تیز رفتاری سے زرین آباد والی شاہراہ پر دوڑنے لگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شہباز تھا اور دوسری سیٹ پر صمدی بیٹھا ہوا تھا۔ نتاشیہ کو شہباز نے اپنے ایک دوست کے پاس پہنچنے کی تاکید کرتے ہوئے روانہ کر دیا تھا۔ جہاں وہ دونیہ کو چھوڑ کر آئے تھے۔ خانم دونیہ وہیں پر موجود تھیں۔ شہباز کے پاس پہاڑوں میں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں اشیائے خوردنوش کی سپلائی کا اجازت نامہ موجود تھا اور یہ عظیم کاروائی بھی نریمان فرازی ہی کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کردار مل کر ایک ایسے ذہین انسان کا فرض ادا کر رہے تھے۔ جو منزل بہ منزل اپنے راستے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ رازل جریری نے آج تک شہباز پر جس سلسلے میں اعتماد کیا تھا شہباز اس پر پورا اترا تھا اور آج تک کبھی رازل جریری کو اس سے کسی قسم کی مایوسی کا سامنا نہں کرنا پڑا تھا۔ اس وقت نریمان فرازی ہی کی ہدایت کے مطابق یہ عمل بھی کیا گیا تھا۔ اشیائے خوردنوش کے اس قسم کے ٹرک پہاڑی بستیوں میں اکثر گھومتے رہتے تھے اور پہاڑوں میں موجود ان چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگ اپنی ضروریات کا سامان انہی ٹرکوں سے خریدا کرتے تھے۔ ان ٹرکوں کو گشتی دکانیں بھی کہا جاتا تھا اور مقامی لوگ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔

نریمان فرازی نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی اور سب ہی کو یہ تجویز بے حد پسند آئی تھی۔ چنانچہ ٹرک کی فراہمی اور پھر اس طریقہ کار کے مطابق اس پر عمل درآمد میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی گئی تھی اور یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ راستے میں کسی جگہ انہیں خاص طور سے چیک بھی نہیں کیا گیا تھا۔ زرین آباد سے ایک ڈیڑھ میل دور نکلنے کے بعد ٹرک دائیں طرف کچی سڑک پر مڑ گیا۔ البتہ اس سڑک پر مڑتے ہی شہباز نے نریمان فرازی کی ہدایت کے مطابق ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور اس کی رفتار بھی کم کر دی کیونکہ تاریکی میں پہاڑی راستے سے تیز

رفتاری میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ گزشتہ رات کی کاروائی بھی اہم رہی تھی۔ انہوں نے بڑی خاموشی سے خانم جہانیہ کی تدفین کر دی تھی۔ تہہ خانے کے راستے پر سیمنٹ کی صلیب فٹ کر کے اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔

بہر حال ٹرک کو مکان کی چار دیواری کے اندر روک کر وہ بڑی پھرتی سے ٹرک پر لدا ہوا سامان اتارنے لگے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے پورا ٹرک خالی کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ اس کے بعد وہ تہہ خانے میں گھس گئے۔ شہباز پیٹیوں کو پیک کرنے کا سامان اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایک گھنٹہ پیٹیوں کی پیکنگ میں لگ گیا۔ پھر وہ پیٹیاں تہہ خانے سے نکال کر ٹرک پر لادنے لگے۔ ٹرک کا آدھے سے زیادہ حصہ ان پیٹیوں نے گھیر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ اشیائے خوردنوش کا اتارا ہوا سامان ٹرک پر لادنے لگے۔ اس سامان میں گھی، تیل کے ڈبے، آٹے، میدے کی بوریاں، تھیلوں اور ڈبوں کی صورت میں لاتعداد چیزیں تھیں۔ پہلے آٹے اور میدے کی بوریاں خزانے کی پیٹیوں پر رکھی گئیں پھر دوسرا سامان اس طرح رکھا جانے لگا کہ خزانے کی پیٹیاں اس کے نیچے دب گئیں۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ رات بھر کی مشقت سے بری طرح تھک چکے تھے وہ دونوں لیکن اس کے باوجود ان کے عمل میں کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ صمدی نے ٹرک میں سے ایک تھرمس نکال لیا جس میں کافی بھری ہوئی تھی۔ اس نے دو برتنوں میں کافی انڈیلی۔ ایک شہباز کی طرف بڑھا دیا اور ایک خود لے لیا۔ چھ بجے دن کی روشنی پھیل گئی وہ دونوں ٹرک میں بیٹھ گئے۔ اس مرتبہ بھی شہباز ہی اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ قصبے کی گلیوں اور بازاروں میں ابھی تک سناٹا تھا۔ ٹرک قصبے کی سڑک سے نکل کر تیز زفتاری سے زنجان کی طرف دوڑنے لگا۔

زنجان سے کوئی دو میل پہلے سامنے سے آنے والی کار نے ان کا راستہ روکا اس کار میں چار آدمی سب مشین گنیں سنبھالے موجود تھے جو لمحوں کے اندر کار سے اتر آئے ان میں دو پاسداران تھے۔ شہباز نے سنجیدہ نگاہوں سے صمدی کو دیکھا اور صمدی نے اسے...... دونوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں۔

"نیچے آ جاؤ کاغذات دکھاؤ۔" پارٹی کے انچارج نے تحکمانہ انداز میں کہا اور وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ شہباز نے کاغذات نکال کر انچارج کی طرف بڑھا دیئے۔ یہ کاغذات بالکل

اصلی تھے۔ نریمان فرازی نے ان کاغذات کے مالک کو یہ لالچ دیا تھا کہ وہ اس اجازت نامے پر اپنا مال لے جا کر پہاڑی بستیوں میں فروخت کرے گا اور منافع میں اس کا پچاس فیصد حصہ اسے دیا جائے گا۔ پاسداران کی پیٹرولیم پارٹی کے آدمی ٹرک کے پیچھے چڑھ گئے اور سامان الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ اناج کے کچھ تھیلے انہوں نے نیچے بھی پھینک دیئے۔ شہباز اور صمدی کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک آدمی ٹرک کے آگے والے حصے میں میدے کی بوریوں پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک بوری کھینچ کا ایک طرف اچھال دی اور شہباز کا دل حلق میں آ گیا اس نے کن انکھیوں سے صمدی کی طرف دیکھا اس کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ٹرک میں لدے ہوئے خزانے کا راز فاش ہو گیا تو ان دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ وہ آدمی اب نیچے والی میدے کی بوری کھینچ کر ہٹا رہا تھا۔ شہباز کا جسم پسینہ چھوڑنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دل کی حرکت رک جائے گی اس شخص نے میدے کی دوسری بوری ہٹانے کے بعد درمیانے سائز کی اٹیچی کیس کے برابر لکڑی کی ایک پیٹی کھینچ کر نکال لی جس پر چھ آہنی پٹیاں لپیٹی ہوئی تھیں چار تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوڑائی کے رخ اور دو لمبائی کے رخ پر شہباز جانتا تھا کہ اس پیٹی میں دس دس تولے کی سونے کی ٹکیاں بھری ہوئی تھیں اور ہر ٹکی پر بنک ملی ایران کی مہر ثبت تھی۔

''اس میں کیا ہے؟'' اس شخص نے پیٹی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''باورچی خانے کے استعمال کے سامان، چمچے، چھریاں، کانٹے اور اسی قسم کی چیزیں۔ شہباز نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ اس شخص نے پیٹی نیچے پھینک دی۔ جو دھماکے کی آواز کے ساتھ سڑک کے کنارے کچی جگہ پر گری اس کے ساتھ ہی شہباز کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اسے یقین تھا کہ گرنے کے بعد پیٹی ٹوٹ گئی ہو گی اور سونے کی ٹکیاں بکھر گئیں ہوں گی۔ لیکن جب اس نے آنکھیں کھولی تو اطمینان کا سانس لیا کہ پیٹی ٹوٹی نہیں تھی۔ شاید زیادہ تعداد میں لپٹی آہنی پٹی نے ٹوٹنے سے بچا لیا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے زنجان کی طرف سے ایک تیز رفتار کار آتی نظر آئی۔ پارٹی کے انچارج نے کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کار کی رفتار کم ہونے لگی لیکن قریب پہنچ کر اچانک ہی کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ پارٹی کا انچارج اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر اسے

ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو کار کے نیچے کچلا جاتا۔

''جلدی کرو اس کار کا پیچھا کرو'' انچارج چیختا ہوا کار کی طرف دوڑ پڑا۔ ٹرک پر چڑھے ہوئے دونوں آدمی چھلانگ لگا کر نیچے آ گئے اور برق رفتاری سے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کا چوتھا ساتھی انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔ انچارج نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شہباز کے کاغذات پھینک دیئے۔ جنہیں شہباز نے دوڑ کر اٹھایا اور جیب میں ٹھونسنے لگا۔ پھر وہ سونے کی پیٹی کی جانب لپکے اور بمشکل تمام اسے ٹرک کے پچھلے حصے تک پہنچایا۔ صمدی اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ وہ سڑک پر پڑے تھیلے اٹھا اٹھا کر ٹرک پر پھینکنے لگا۔ شہباز نے اوپر چڑھ کر سونے کی پیٹی اس کی جگہ رکھی اور میدے کی بوری اس پر ڈال دی پھر وہ چھلانگ لگا کر ٹرک سے نیچے اتر آیا اور اس کے بعد قرب وجوار کا آخری جائزہ لے کر وہ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا پھر اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا اور ٹرک خوفناک حد تک تیز رفتاری سے زنجان کی طرف دوڑنے لگا۔ انہوں نے اس واقع پر کوئی تبصرہ تک نہیں کیا تھا کیونکہ ان کی حالت ابھی تک بہتر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ یہ طے تھی کہ اس کار میں جو کوئی بھی تھا ان کے لیے فرشتہ رحمت ہی ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے موت کو اپنے تعاقب میں لگا لیا اور شہباز اور صمدی کی جان بچ گئی۔

آخر کار شہر کے آثار نظر آئے اور ٹرک مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا متوسط طبقے کے کاروباری علاقے میں آ گیا۔ بہت بڑا تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ زنجان ایک صنعتی شہر بھی ہے یہاں صبح بھی جلد ہو جاتی ہے۔ اس وقت شہر کی بہت سی دکانیں کھل چکی تھیں سڑکوں پر خوب آمد و رفت تھی۔ شہباز نے ٹرک کو ایک کشادہ گلی میں لے جا کر بہت بڑے آہنی گیٹ پر روک دیا۔ گیٹ کے اوپر ایک ورکشاپ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ شہباز نے نیچے اتر کر گیٹ کا تالا کھولا اور دوبارہ اسٹرنگ کے سامنے آ بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد ٹرک ورکشاپ میں کھڑا ہوا تھا۔ ورکشاپ کی دیواریں کافی اونچی تھیں اور باہر سے ٹرک کو دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔ باہر آ کر شہباز نے دوبارہ گیٹ بند کر کے تالا لگایا اور صمدی کے ساتھ بازار کی طرف چلنے لگا۔ جب وہ بنگلے پر پہنچے تو اس وقت ریڈیو پر خبریں شروع ہو چکی تھیں۔ سب سے پہلی خبر انقلابی حکومت کے خلاف فوجی سازش کی تھی جسے ناکام بنا دیا گیا تھا اور کئی اعلیٰ افسروں کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ سازش کی ناکامی کی تفصیلات کے بعد عادل سرائی کی خبر نشر کی گئی تھی اسے بھی

سنگین الزامات کے تحت اسلامی انقلابی حکومت کا غدار قرار دے کر گولی سے اڑا دیا گیا تھا جبکہ اس کی بیٹی کو زندان میں ڈال دیا گیا تھا۔ شہباز نے مسکرات نگاہوں کے ساتھ نتاشیہ کی طرف دیکھا اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

فوجی سازش کے اس منصوبے سے صرف نتاشیہ ہی واقف تھی کرنل حیات کے بنگلے میں دستاویزات کی تصویریں اسی نے بنائی تھیں۔ انقلابی اسلامی حکومت کے خلاف سازش کی ناکامی کی خبریں سن کر شہباز نے نریمان فرازی کی ذہنی کیفیت کا جائزہ لیا۔ نریمان فرازی بڑی آسودگی محسوس کرنے لگا تھا۔

بہر حال وہ اور بھی بہت سے احساسات کا حامل تھا اور یہ بات کبھی کبھی شہباز نے محسوس کی تھی کہ نریمان فرازی ایران کے معاملات سے بالکل لاتعلق نہیں رہنا چاہتا بلکہ کہیں کہیں اس کی اپنی ذاتی دلچسپیاں بھی جھلک اٹھتی ہیں۔ بات رازل جریری تک آ جاتی تھی۔ رازل جریری صرف ایک سائنسدان ہی نہیں تھا جو دنیا کی بہتری کا خواہش مند تھا بلکہ کبھی کبھی وہ ایک ذہین سیاستدان بھی نظر آتا تھا جس کی منصوبہ بندیاں بے مثال ہوتی تھیں اور وہ بڑی طمانیت محسوس کرتا تھا۔ یہ انتخاب بھی اس کا بے مثال انتخاب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ کے عظیم الشان خزانے کو ایک اہم مقصد کے لیے حاصل کر کے رازل جریری بہت بڑا کام سر انجام دے رہا تھا۔ نریمان فرازی جو یہ بات جانتا تھا کہ شاہ کا خزانہ اب کس طرح در بدر ہوتا رہے گا نجانے کیوں رازل جریری کے لیے خلوص دل کے ساتھ یہ کام کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا حالانکہ اگر صرف یہ بات کہی جائے کہ رازل جریری ن اس کے جسم کو یرغمال بنا کر اسے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا تو یہ ممکن نہیں ہوتی کیونکہ نریمان فرازی اپنے تمام تر تعلقات اور شناسائیوں سے کام لے رہا تھا۔ ایران کے مختلف شہروں میں اس کے وفادار بھرپور ساتھ دے رہے تھے جبکہ ابھی تک ان کے لیے لالچ کا کوئی ایسا سامان نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ سوچا جا سکے کہ وہ لوگ اس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔

بہر حال یہ بہت بڑی بات تھی اور یہی بڑی بات تھی جس کے نتیجے میں شاہ کا عظیم الشان خزانہ اس وقت ان لوگوں کی تحویل میں تھا۔ پھر تقریباً ایک ہفتے کے بعد صبح چار بجے وہی ٹرک ورکشاپ سے باہر نکلا تو اس کی ہیئت بدلی ہوئی تھی۔ اسٹرنگ کے سامنے شہباز اور ساتھ والی سیٹ پر صمدی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک باہر نکالنے کے بعد صمدی نے ورکشاپ کا گیٹ بند کر کے تالا

لگا دیا۔ ٹرک مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا شہر کے پسماندہ علاقے میں ایک جگہ رک گیا اور شہباز ٹرک سے اتر کر ایک گلی میں گھس گیا پھر وہ دو تین تنگ گلیوں میں مڑنے کے بعد ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ دروازہ دو مرتبہ دستک دینے کے بعد کھلا۔ ایک بھاری بھرکم اور کسی قدر پستہ قامت آدمی تھا۔ اس نے صرف پاجامہ اور سینڈو کٹ دھاری دار شرٹ پہنی ہوئی تھی لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند سے اٹھ کر آیا ہے کیونکہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن شہباز کا چہرہ دیکھ کر وہ ایک دم سے اچھل پڑا۔

''او ہو تم آ گئے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں...... یہ لو ورکشاپ کی چابی اور اپنا معاوضہ۔'' شہباز نے چابیوں کا گچھا اور نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی اس کی طرف بڑھا دی۔

''کام ہو گیا۔'' اس شخص نے دونوں چیزیں لیتے ہوئے کہا وہ اس ورکشاپ کا مالک تھا اور شہباز نے ورکشاپ ایک ہفتے کے لیے اس سے کرائے پر لیا تھا۔ اس دوران ورکشاپ کے ملازمین کو بھی چھٹی دے دی گئی تھی

''ہاں کام ہو گیا بہت بہت شکریہ۔'' شہباز نے اس سے ہاتھ ملایا اور واپس مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ٹرک پر پہنچ گیا تھا۔

ٹرک ایک مرتبہ پھر حرکت میں آ گیا اس مرتبہ ٹرک کا رخ شہر کے شمالی علاقے کی طرف تھا اور تقریباً بیس منٹ کے بعد ٹرک شہباز کے دوست کے بنگلے میں اندر جا کر رک گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں خانم دونیہ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے آنے سے شہباز کے دوست، خانم دونیہ اور نتاشیہ ایک دم چونک کر سنبھل گئیں۔ شہباز نے نریمان فرازی کے ذہن کے مطابق کہا۔

''اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ ہم لوگ ٹھیک سات بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے ناشتے کے بعد یہاں سے روانگی کی تیاری کر لو اور وہ سب لوگ اس طرح مصروف ہو گئے جیسے کسی مشین کا سوئچ دبانے سے مشین کے تمام کل پرزے حرکت میں آ سکتے ہیں۔ ناشتہ بڑی برق رفتاری سے تیار کیا گیا تھا اور اس کے بعد ناشتے سے فراغت حاصل کرنے لگے۔ اس کے بعد شہباز کے اس دوست نے براؤن رنگ کا ایک لفافہ شہباز کی طرف بڑھا دیا۔

''اس میں وہ تمام کاغذات موجود ہیں جن کے لیے تم نے کہا تھا۔ ان کاغذات کے

مطابق تم لوگ یہاں سے شفٹ ہو کر ترکی کی سرحد کے قریب ایران کے آخری حصے قطور جا رہے ہو جہاں تمہارے والد کی زمینیں ہیں اور ان زمینوں پر انگور کی کاشت ہوتی ہے کچھ روز پہلے تمہارے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور اب تم اس کا تمام کاروبار سنبھالنے کے لیے مستقل طور پر قطور منتقل ہو رہے ہو۔ ان کاغذات کے مطابق خانم تمہاری والدہ اور نتاشیہ تمہاری بیوی ہے۔ صمدی تمہارا بھائی ہے ان کے نئے نام کاغذات میں لکھے ہوئے ہیں۔ سب لوگوں کو چاہیے کو اپنے اپنے نام یاد کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ راستے میں کسی جگہ چیکنگ کے دوران گڑبڑ ہو جائے۔''

''بہت بہت شکریہ۔ واقعی تم نے ایک بہترین کام کیا ہے۔'' نریمان فرازی نے شہباز کی آواز میں کہا اور وہ کاغذات لے کر ایک لفافہ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا جو کافی وزنی تھا اس نے کہا۔

''اسے میں تمہاری محنت کا صلہ نہیں کہوں گا۔ بس یوں سمجھ لو بھاگ دوڑ کے سلسلے میں یہ معمولی سی رقم حاضر ہے۔''

''میرے لائق آئندہ جب بھی کوئی خدمت ہو تو مجھ سے گریز مت کرنا۔'' اس کے دوست نے جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر ٹھیک سات بجے وہ رخصت ہو گئے۔ اسٹرنگ پر معمول کے مطابق شہباز ہی تھا اور ساتھ والی سیٹ پر صمدی ان سیٹوں کے پیچھے کیبن میں خانم دونیہ اور نتاشہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ کیبن اتنا کشادہ تھا کہ لمبی سیٹ پر دو آدمی آسانی سے سو سکتے تھے۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں گھریلو استعمال کا سامان لدا ہوا تھا۔ جس میں تین پلنگ، میز، کرسیاں اور بستر وغیرہ شامل تھے۔ یہ سارا سامان استعمال شدہ تھا۔ اپنی ذہانت سے ان لوگوں نے یہاں سے نکلنے کے لیے انتہائی مناسب اور بھرپور تیاریاں کر لی تھیں۔

شہری حدود سے باہر نکلنے کے بعد شہباز نے رفتار بڑھا دی زنجان سے طبریز تک کا تقریباً تین سو کلومیٹر کا فاصلہ تیسرے پہر تک طے کر لیا گیا۔ راستے میں جگہ جگہ انہیں پاسداران کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس طرف چیکنگ کچھ زیادہ ہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ انقلاب کے دوران اور اس کے فوراً ہی بعد بڑی تعداد میں لوگوں نے غیر قانونی طور پر فرار ہونے کا یہی راستہ منتخب کیا تھا اور اب بھی فرار ہونے والے اسی راستے کا انتخاب کرتے تھے۔ شہباز اچھی

طرح جانتا تھا کہ یہ راستہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ دشوار گزار بھی ہے۔ بلند پہاڑوں میں کرد خانہ بدوش آباد تھے۔ فرار کے بعد اگر پاسداران سے بچ جاتے تو ان کردوں کے ہتھے چڑھ جاتے۔ کرد انہیں لوٹ کر یا تو قتل کر دیتے یا انہیں پہاڑوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو کردوں اور پاسداران سے بچ بھی گئے تھے لیکن وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہ یا تو سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے تھے یا بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو گئے تھے۔ طبریز میں وہ تھوڑی دیر کے لیے رک کے چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہو گئے۔ اس طویل اور بے آرام سفر نے نتاشیہ اور خانم کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ خانم دونیہ کا اصرار تھا کہ رات طبریز میں گزاری جائے لیکن شہباز نے اس کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔

طبریز سے چالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد صوفیہ نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ یہاں شہباز نے ٹرک کو ایک سرائے کے احاطے میں لا کر روک دیا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا۔ شہباز نے رات یہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد شام ہو جاتی اور رات کے وقت ان خطرناک پہاڑوں پر سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ صوفیہ نامی اس بستی کی تعداد سولہ سترہ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ شاہراہوں کے سنگم پر ہونے کے علاوہ یہاں ریلوے جنکشن بھی ہے۔ لائن مارند سے گزرتی ہوئی روس کی سرحد کی طرف چلی جاتی ہے اور دوسری ترکی کی سرحد کی طرف۔ کچھ یہی صورتحال ٹرکوں کی بھی ہے ایک ہائی روسی سرحد پر مشرق آزر بائیجان کی طرف اور دوسری شبستر سے ہوتی ہوئی اور دوسری ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جھیل اور مید کے ساتھ چکر کاٹتی ہوئی ترکی کی سرحد کی قریب ایران کے آخری قصبے قطور کی طرف چلی جاتی ہے۔

بہر حال شہباز کو قطور تک پہنچنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا تھا۔

انہوں نے رات گزارنے کے لئے سرائے میں ہی ایک بڑا کمرہ حاصل کیا تھا اس کمرے میں پلنگ وغیرہ کے بجائے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ قالین پر ڈھیر ہو گئے۔ خانم دونیہ اور نتاشیہ تو لیٹتے ہی سو گئیں البتہ شہباز اور صمدی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دونوں چونک پڑے الجھی ہوئی نگاہوں سے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شہباز نے

صدی کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ دو آدمی تھے ان کا تعلق پاسداران سے تھا۔ ایک کسی قدر طویل قامت تھا جس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی زبردستی اندر گھس آیا۔ شہباز نے بھی کسی مزاحمت کی کوشش نہیں کی تھی۔

''کون ہو تم لوگ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس شخص نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ شہباز نے پہلے سے طے شدہ کہانی سنا دی اور وہ شخص اسی لہجے میں بولا۔

''اپنے کاغذات دکھاؤ۔''

شہباز نے جیب سے کاغذات نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ شخص شاید زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا دیر تک کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر کاغذات لوٹاتے ہوئے بولا۔

''کمپاؤنڈ میں وہ ٹرک تمہارا ہے۔''

''ہاں۔'' شہباز نے گردن ہلائی۔

''ٹرک کا سامان چیک کیا جائے گا۔ تم دونوں ہمارے ساتھ آجاؤ۔'' اس نے کہا۔ شہباز اور صدی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ان دونوں کے ساتھ چل پڑے۔ ٹرک پر ترپال پڑی ہوئی تھی جسے اتار دیا گیا۔ دونوں پاسداران پہلے ٹارچوں کی روشنی میں ٹرک پر لدے سامان کا جائزہ لیتے رہے پھر لمبے قد والے نے اتارنے کا حکم دے دیا۔ ظاہر ہے شہباز یا صدی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں ٹرک سے سامان اتارنے لگے پاسدارن ٹارچوں کی روشنی میں گہری نگاہوں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے وہ تینوں ٹرنک بھی کھلوا لیے جو ٹرک سے اتارے گئے تھے۔ ان ٹرنکوں میں استعمال شدہ کپڑوں اور ایسی چند چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ پاسداران نے ٹرک کے کیبن کی بھی تلاشی لی لیکن انہیں کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکتی۔

''ٹھیک ہے سامان لوڈ کر لو۔'' لمبے قد والے نے کہا اور وہ دونوں دوسری طرف چلے گئے۔ صدی نے زیرلب انہیں ایک غلیظ گالی دی اور شہباز کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ سامان دوبارہ ٹرک پر لاد دیا گیا۔ صبح سات بجے وہ روانہ ہو گئے۔ قصبے سے نکلنے کے بعد شہباز نے ٹرک کا رخ شبستر کی طرف کر دیا۔ یہ ایک عظیم الشان شاہراہ تھی۔ اس وقت سورج

طلوع ہو چکا تھا لیکن فضا میں خنکی باقی تھی۔ بائیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے وہ آخر کار شبستر پہنچ گئے۔ اب سڑک پر ایک چائے خانہ کھلا دیکھ کر شہباز نے ٹرک روک لیا۔ نتاشیہ اور خانم دونیہ کے لئے ان کے کیبن میں چائے پہنچا دی گئی اور شہباز اور صدی ٹرک سے اتر کر لکڑی کی بینچ پر بیٹھ کر چائے پینے لگے وہ بھی چائے پی رہے تھے کہ صوفیہ کی طرف سے آنے والی ایک کار تیز رفتاری سے سڑک سے گزر کر ان کے قریب پہنچی۔ اس کے تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس سے تقریباً اکتیس کلومیٹر کے فاصلے پر جھیل کے کنارے شرف خانہ نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا سڑک اور ریلوے لائن یہاں سے جھیل کے کنارے کنارے تک چلی گئی تھی وہ لوگ یہاں رکے بغیر آگے نکل گئے۔ یہ سڑک مسلسل بلندی کی طرف جاتی تھی۔ یہاں کئی خطرناک موڑ بھی تھے کوئی معمولی سی غفلت انہیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

تقریباً تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک موڑ گھومتے ہوئے شہباز کو ٹرک روک لینا پڑا چند گز آگے سیاہ رنگ کی کار سڑک پر اس طرح آڑی کھڑی ہوئی تھی کہ ٹرک کے گزرنے کا راستہ نہیں رہا تھا یہ وہی کار تھی جس کو انہوں نے شبستر کے مقام پر تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ صدی نے جیب سے ریوالور نکال لیا اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اگر پاسداران ہوتے تو کار اس طرح آڑی ترچھی کھڑی کر کے راستہ روکنے کے بجائے سڑک پر کھڑے ہو کر واضح طور پر انہیں رکنے کا اشارہ کرتے کار کے آس پاس کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔ شہباز نے ٹرک کی رفتار کم کر دی اور آخر کار ٹرک روک لیا۔ ٹھیک اسی لمحے دائیں بائیں مورچوں کی آڑ سے دو آدمی نمودار ہوئے ان دونوں کے ہاتھ میں آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر شہباز بری طرح اچھل پڑا۔

نجانے کیوں یہ دونوں شکلیں شناسا محسوس ہوئی تھیں۔ لیکن یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ کون ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی کی آواز ابھری۔

''نیچے آجاؤ اور کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔'' شہباز نے صدی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر نیچے اتر آئے۔ صدی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور سڑک پر پھینک دیا تھا۔ تب ان میں سے ایک نے کہا۔

''اور یقیناً تم ہمیں پہچاننے میں دقت محسوس نہیں کر رہے ہو گے۔ پھر بھی تعارف بہت ضروری ہے۔ میں سلجوقی ہوں اور یہ دارا کیا تم ہمارے چہروں سے ناواقفیت کا اظہار کرو گے۔ ہمارا خیال تھا کہ سرحد پار کرنے کے بعد تم لوگوں سے ضرور بات ہو جائے گی۔ لیکن تم لوگ کچھ جلدی نہیں آگئے۔'' شہباز نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن میری ایک بات غور سے سن لو۔ خزانہ تم لوگوں کو ترکی کی سرحد میں پہنچنے کے بعد ہی ملے گا۔ یہاں ہم بالکل خالی ہاتھ ہیں۔''

''کیا مطلب۔'' سلجوقی اسے گھورتا ہوا بولا۔

''تم جانتے ہو۔ ایران کی تمام سکیورٹی ایجنسیاں میری تلاش میں ہیں۔ میں خزانہ ساتھ لے کر چلنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا اس لیے شاہ کا وہ خزانہ میں نے دو دن پہلے ہی سرحد پار بھجوا دیا تھا۔ شہباز مسکراتا ہوا بولا۔

''بکواس کرتے ہو تم۔'' دارا غرایا۔

''تم تلاشی لے سکتے ہو۔'' شہباز پرسکون لہجے میں بولا۔ دارا نے آگے بڑھ کر ان دونوں کی تلاشی لی۔ صمدی پہلے ہی اپنا ریوالور پھینک چکا تھا۔ شہباز کے لباس میں چھپا ہوا پستول بھی نکال کر دور چٹانوں میں اچھال دیا گیا اور پھر سلجوقی نے خانم دونیہ اور نتاشیہ کو بھی ٹرک سے اتار لیا ان کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی۔ سلجوقی نے چاروں کو رائفل کی زد پر لے لیا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا وہ ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف بڑھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ٹرک سے اتر کر نیچے آگیا تھا۔

''خزانہ واقعی ٹرک میں نہیں ہے بلکہ کاٹھ کباڑ لدا ہوا ہے۔'' اس نے سلجوقی کو بتایا۔

''میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ خزانہ سرحد پار پہنچ چکا ہے۔'' شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

''ویسے تم لوگوں نے خوب منصوبہ بنایا۔'' شہباز نے باری باری ان دونوں کو دیکھنے کے بعد کہا۔

''جب تم مجھے رہا کرانے کے لیے آئے تھے اور اپنے آپ کو حکومت کا نمائندہ ظاہر کیا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے اور دوسری طرف اخبارات کی خبروں سے مجھے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ تم دونوں بڑے جعل ساز ہو تم لوگوں کو کسی طرح شاہ کے خزانے کا راز

معلوم ہو گیا تھا لیکن تم کسی وجہ سے خود ایران میں داخل ہو کر یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ تم لوگوں نے اربوں ڈالر کی مالیت کا منصوبہ بنایا اور مجھے جیل سے رہا کرایا اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کون کیا کرنا چاہتا ہے۔''

''لیکن تم یہ بتاؤ کہ خزانہ کیا واقعی۔''

''ہاں۔ بہر حال تم جو کچھ بھی سمجھ لو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ہمیں اس خزانے کے بارے میں خاصی تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں اور خانم جہانیہ کے بارے میں بھی تم واحد وہ شخص کو جو یہ خزانہ حاصل کر سکتے تھے۔ تمہارے آنے کے دو تین دن بعد ہم بھی تہران آگئے اور ہم نے ایک ایک لمحہ تم پر نگاہ رکھی۔ جب تم لوگ خزانہ لے کر زنجان کی طرف جا رہے تھے تو پاسداران نے تمہیں روکا۔ پہلے ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ صورتحال کیا ہو گی ہم تو محض یہی دیکھنے کے لیے جا رہے تھے کہ تم لوگ خزانہ نکال چکے ہو یا نہیں۔ ہم نے دور ہی سے ٹرک کو پاسداران کے گھیرے میں دیکھ لیا اور تم لوگوں کو بچانے کے لیے ہم نے یہ چال چلی کہ پاسداران تمہیں چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگ گئے اس طرح تم لوگوں کو نکلنے کا موقع مل گیا لیکن پھر تم لوگ اچانک ہی غائب ہو گئے۔ کل صبح پھر ہماری نگاہوں میں آئے تو ہم نے دوبارہ تمہارا تعاقب شروع کر دیا۔''

''لیکن بدقسمتی سے تمہیں ابھی خزانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہم ترکی کی سرحد پر نہیں پہنچ جاتے۔ شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جہاں کئی مہینوں سے انتظار ہو رہا ہے وہاں چند گھنٹے اور سہی۔ چلو ٹرک میں بیٹھو اور کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش مت کرنا۔'' پہلے دونوں عورتوں کو اور اس کے بعد ان دونوں کو ٹرک میں بٹھایا گیا۔ سلجوقی اور دارا مستعد نظر آرہے تھے۔

بہرحال ٹرک چل پڑا سڑک جھیل کے کنارے بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ایک طرف بلند چٹانیں تھیں اور دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرائی میں جھیل کا نیلگوں پانی لہریں دے رہا تھا۔ جھیل کے کنارے ڈیڑھ منٹ اونچی حفاظتی منڈیر بنی ہوئی تھی لیکن اگر کوئی گاڑی بے قابو ہو جاتی تو منڈیر کو توڑتی ہوئی جھیل میں گر سکتی تھی اور ٹرک اس وقت ایسی ہی جگہ سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف سینکڑوں میل کی گہرائی میں جھیل تھی۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی تھی اس کے بعد سلجوقی نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ۔ خزانہ تم نے سرحد پار کہاں چھپا رکھا ہے اور ہم اس تک پہنچنے کے لیے کتنا راستہ طے کریں گے۔"

"تم اس وقت خزانے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہو میرے دوست!" نریمان فرازی نے شہباز کی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب۔" سلجوقی بولا۔

"کچھ دیر پہلے تم نے کہا تھا نا کہ میں زنجان میں اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔" شہباز پر سکون لہجے میں بولا۔

"ہاں پھر۔"

"یہ ایک ہفتہ ہم نے ورکشاپ میں گزارہ تھا۔ جہاں میں نے ٹرک کا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا اور ٹرک کی باڈی کھول کر میں نے نئے چیسز تیار کیے سونے کے چیسز جن کے اندر صرف اتنا لوہا استعمال کیا گیا تھا کہ وہ ٹرک کا بوجھ برداشت کر سکے۔ لوہے کی اس راڈ کے علاوہ ٹرک کا پورا چیسز سونے کا ہے۔ اس ٹرک کی باڈی کی دیواریں بھی دوہری ہیں جن میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ شہنشاہ ایران کا اربوں مالیت ڈالر کا خزانہ اس کھٹارہ سے ٹرک میں پوشیدہ ہوگا۔" یہ کہہ کر شہباز نے قہقہہ لگایا اور وہ دوں بری طرح بدحواس ہو گئے۔

"رکو...... ٹرک روکو۔" کیبن میں بیٹھے ہوئے سلجوقی نے کہا اور اس نے رائفل کی نال شہباز کی گردن سے لگا دی تھی لیکن اسی لمحے نتاشیہ کی رائفل جنبش میں آئی اور اس نے سلجوقی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ان دونوں میں رائفل کی کھینچا تانی ہونے لگی اور اس دوران ٹریگر دب گیا گولی رائفل سے نکل کر ونڈ سکرین توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ دوسری طرف دارا صمدی سے لپٹ گیا تھا وہ اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹرک اس وقت ایک خطرناک موڑ سے مڑ رہا تھا جس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف تقریباً پانچ سو فٹ کی گہرائی میں جھیل کا نیلگوں پانی لہریں لے رہا تھا۔ شہباز نے بڑی مشکل سے ٹرک کو سنبھالا ذرا سی غفلت انہیں جھیل کی گہرائیوں میں اتار سکتی تھی۔ کیبن کی سیٹ پر دارا اور نتاشیہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے جبکہ خانم دونیہ ایک کونے میں سمٹی چیخ رہی تھی اچانک دارا نے نتاشیہ کو اٹھا کر پیچھے دھکیل دیا اور نتاشیہ سر کے بل شہباز کی پشت والی سیٹ پر الٹ گئی وہ اپنے

آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہی تھی لیکن دارا نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر پوری قوت سے دھکیل دیا۔ نتاشیہ سیٹ کی پشت پر سے ہوتی ہوئی سر کے بل صمدی کی سمت اس طرح گری کہ اس کا سر صمدی کی گود میں تھا اور اس کا جسم شہباز کے اوپر۔ شہباز کے ہاتھ سے اسٹرنگ چھوٹ گیا اس کے دونوں ہاتھ نتاشیہ کے جسم میں پھنس گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی پیر بھی اپنی جگہ سے ہٹ گئے تھے۔ وہ دروازے کے ساتھ ٹکرایا اور اسی وقت ٹرک بے قابو ہو کر سڑک کی جھیل والی سمت حفاظتی منڈیر کی طرف بڑھا۔ ڈھلان ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار کافی تیز تھی اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسرے لمحے ٹرک ڈیڑھ فٹ اونچی حفاظتی منڈیر سے ٹکرایا منڈیر کی طرف ٹرک قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے جانے لگا۔ پانچ سو فٹ کی نیچے گہرائی اور جھیل کے پرسکون نیلگوں پانی تک کا سفر اور اس کے بعد خاموشی۔ ماضی کے شہنشاہ ایران کا یہ خزانہ اس وقت پتہ نہیں کس حال میں تھا اور ٹرک جس تیز رفتاری سے نیچے جا رہا تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بس چند لمحوں کے بعد کوئی ایسا عمل ہونے والا ہے جو اس پوری کہانی کو ختم کر دے گا۔

آخر کار کہانی ختم ہو گئی۔ لیکن جنہیں باقی بچنا تھا وہ باقی بچ گئے اور جنہیں دنیا سے رخصت ہونا تھا انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ البتہ جب شہباز نے آنکھ کھولی تو بدن کے نیچے نرم بستر پایا۔ کچھ ایسی مانوس آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں جنہیں سننے کے باوجود یقین نہ کرنے کو جی چاہے اور ان آوازوں میں شبیلا کی آواز نمایاں تھی۔ دونوں غالباً اس کمرے کے باہر تھے جس کے اندر شہباز موجود تھا پھر اس نے اپنی آنکھوں سے فیض شاہ اور شبیلا کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور فیض شاہ خوشی سے بولا۔

"لو وہ جاگ گیا ہے۔" شبیلا بیٹے کی جانب بڑھی اور اس کے بعد اس نے شہباز کا سر اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ بہت دیر تک وہ ماں کی محبت کا اظہار کرتی رہی لیکن شہباز کا ذہن نجانے کہاں کہاں کی سیر کر رہا تھا۔ کیا واقعی یہ زندگی ہے۔ یہ زندگی تو خواب ہے یا موت کے بعد کی کوئی حقیقت فیصلہ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ آخر کار ماں سے یہ پوچھا۔

"کیا میں بے ہوش تھا؟"

"بے ہوش تو نہیں تھے لیکن جو لوگ تمہیں یہاں پہنچا کر گئے انہوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ تم کچھ دیر سے ہوش میں آؤ گے۔ یعنی نیند سے جاگو گے اور ہم نے تمہیں یہاں لٹا دیا۔ شہباز

نے اپنے جسم کا معائنہ کیا سب ٹھیک ہی تھا۔ ناقابل یقین، ناقابل فہم، ٹرک پانچ سو فٹ کی بلندی سے نیچے گرا تھا اور ان میں سے کسی کا بچ جانا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن بہرحال ان دونوں سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ صبر و سکون کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کر اسے یہ پتہ چل گیا کہ اس کی یہ مہم ختم ہو گئی ہے اور وہ وہاں موجود ہے جہاں انہوں نے اپنا مسکن بنایا تھا یعنی یوکاس اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ میکسیکو میں ہیں اور پھر شہباز نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ یہ وقت گزارا۔ اپنی جسمانی تندرستی پر اسے بے پناہ حیرت تھی۔ رازل جریری کی پراسرار قوتوں کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سائنس کی آڑ میں طاقت و جادوگری کے بہت سے سنگ میل نصب کرنے والا رازل جریری ناقابل فہم قوتوں کا مالک ہے۔ لاتعداد بار وہ پراسرار حیثیتوں سے سامنے آیا تھا اور لاتعداد بار ایک ایسے سائنسدان کے طور پر جو اپنی مثال آپ ہو اور جس نے پلاسکو جیسی حکومت کے بخیے اکھیڑ دیئے ہوں۔

بہرحال وہ رازل جریری کے پاس پہنچ گیا اور وہاں جیسے اس کی آمد کا انتظار ہی کیا جا رہا تھا۔ مسکراتی بہت سی نگاہوں نے اس کا استقبال کیا اور یہ دیکھ کر شہباز مزید حیران رہ گیا کہ ان مسکرا کر استقبال کرنے والوں میں نریمان فرازی بھی موجود ہے۔ علی اصغر جراری بھی اور رازل جریری بھی۔

''یہ چار کرسیاں ان میں سے ایک تمہارے لیے تھی۔ لیکن طے یہ کر لیا گیا تھا کہ جب تک تم خود ذہنی فراغت حاصل کر کے یہاں پہنچو گے تبھی تم سے رجوع کیا جائے گا۔ باقی تمہیں اسی طور چھوڑ دیا جائے گا۔''

''تاکہ میں اپنی ذہنی قوتوں سے محروم ہو جاؤں۔'' شہباز نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ذہنی قوتوں سے محروم نہیں ہو جاؤ۔ بلکہ ذہنی قوتوں کو ایک بار پھر سے جمع کر لو تاکہ تمہارے آگے کے سفر کا آغاز ہو سکے۔'' رازل جریری نے کہا پھر بولا۔

''میرے عظیم بیٹے! تم نے درحقیقت میری ان تمام آرزوؤں کو پورا کر دیا ہے۔ جو میرے سینے میں پل رہی تھیں۔ یقینی طور پر تمہاری رگِ تجسس پھڑک گئی ہو گی اور تم یہی جاننا چاہتے ہو گے کہ اس عظیم الشان خزانے کا کیا ہوا جس کے لیے تمہیں اور نریمان فرازی نے اپنی زندگی کی زبردست جدوجہد کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے مرحلے کو سر کیا ہے جو

آسان عمل نہیں تھا۔ میں تمہیں افسوس کے ساتھ پہلی اطلاع دیتا ہوں کہ جب تمہارا ٹرک بلندی سے نیچے گر رہا تھا اور صورتحال بالکل اتفاقیہ طور پر توقع کے برعکس ہو گئی تھی تو میں وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور میں صرف اتنا ہی کر سکتا تھا کہ تم چند افراد میں کسی ایک کو اپنے بازوؤں کی زینت بنا لوں اور ظاہر ہے میرے لیے وہ تم ہی ہو سکتے تھے جو نجانے میرے لیے کیا ہو۔ مجھے افسوس ہے میرے بچے کہ وہ لڑکی جس نے تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا اور جس کا نام نتاشیہ تھا نہ بچ سکی۔ اس کے ساتھ ہی صمدی بھی موت کا شکار ہو گیا او باقی وہ تمام لوگ بھی جو تمہاری دشمنی پر آمادہ تھے۔ میں صرف تمہارے جسم کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے سکا اور میں نے تمہیں زندہ بچا لیا۔ تمہارے دماغ میں نریمان فرازی بھی موجود تھا جس نے درحقیقت اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لے کر ہمیں شاہ ایران کے خزانے کا مالک بنایا۔ بہرحال اس کے بعد تم نے وہ خزانہ جس محنت کے ساتھ محفوظ کیا تھا میں نے اسے اپنی محنت اور صلاحیتوں سے حاصل کر کے یہاں منتقل کر دیا۔ کیونکہ اصل کام اس کا حصول ہی تھا جو تم جیسے آدمی کے لیے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ خزانہ ہماری تحویل میں ہے اور ہم اس سے وہ خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے کی پلاننگ کر رہے ہیں جس کے لیے اس قدر جدوجہد کی لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ نریمان فرازی جیسا زیرک اور ذہین انسان اپنا کام حاصل کرنے کے بعد ہم سے جدا ہونے کو تیار نہیں ہے اور میں اس پر مکمل بھروسہ کر چکا ہوں کیونکہ نریمان فرازی میری بات کا برا نہ مانے میں نے اس کے ذہن کا تجزیہ کیا ہے جو مجھ سے کبھی منحرف نہیں ہو سکتا۔''

''اور آپ کو یہ بات بالکل سچ بتا رہا ہوں میں محترم رازل جریری! کہ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ نوجوان اور خوبصورت لڑکا ہے جس کا نام شہباز ہے۔ میں نے دنیا میں اپنے ساتھ ایسے انسان بہت کم دیکھے ہیں۔ میرے لاتعداد دوست تھے جنہیں میں صرف ایک کاروباری حیثیت دے سکتا ہوں انہوں نے میرے ساتھ لاتعداد معاملات میں بھرپور تعاون کیا اور میرا ساتھ دیا لیکن میں اس شخص کے جسم میں رہ چکا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کے جسم پر میرا بھی ایک حق ہے۔ شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

''اور میں نے ایک استاد کی حیثیت سے تمہیں ہمیشہ تعلیم کیا ہے نریمان فرازی اور اس بات کو پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم جیسے ذہین اور زیرک لوگ دنیا میں بہت کم پیدا

ہوتے ہیں۔''

''میں نے نریمان فرازی کو اس خزانے کی پیش کش بھی کی اور علی اصغر جراری کو میں نے ان سے ہر طرح کے تعاون کا فیصلہ کا کیا اور پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو اس خزانے میں سے اپنا حصہ وصول کر کے دنیا کے کسی بھی خطے میں گم ہو سکتے ہیں اور اپنے لیے ایک عیش کی زندگی تلاش کر سکتے ہیں لیکن دونوں میرے مشن سے متفق ہیں اور میرے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں اور میں نے انہیں اپنے درمیان قبول کر لیا ہے۔'' نتاشیہ کی موت بہر حال شہباز کے لیے افسوس ناک تھی ایک بار پھر اس نے اپنی زندگی میں تنہائی محسوس کی تھی اور بعد میں نریمان فرازی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں۔ تم نے مجھے اپنے بارے میں بتایا لیکن میرے دوست زندگی اسی کا نام ہے۔ وقت اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کون خوش نصیب ہو گی جو تمہاری آمد کا انتظار کر رہی ہو گی۔'' بعد میں نریمان فرازی کی بات پر شہباز مسکرا دیا تھا۔ پھر رازل جریری نے کہا۔

''البتہ اب میں تم سے جو کہنا چاہتا ہوں اسے غور سے سنو...... میں بہت کچھ کرتا رہا ہوں وہ لوگ جنہیں تم اپنے ماں باپ کہتے ہو۔ جن میں ماں تمہاری ہے مگر باپ اپنا نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے تمہاری ماں کے باپ کی حیثیت یعنی تمہارے نانا کی حیثیت رکھتا ہے وہ میری مراد فیض شاہ سے ہے یہ لوگ ایک طویل عرصے سے زندگی گزار رہے ہیں لیکن اس میں ان کی پسند کی زندگی شامل نہیں ہے۔ وہ جگہ جس کا نام کنٹری ہے یہ لوگ وہی نام لیتے ہیں۔ یہ وہاں جا کر اپنی دنیا میں گم ہونا چاہتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تمہیں اپنے ان معاملات سے الگ رکھ کر اس دنیا میں جانے کا موقع دوں۔''

''یہ ایک اچھی بات ہے اگر آپ اجازت دیں محترم رازل جریری! تو میں اپنے والدین سے یہ سوال کر لوں۔''

''میری طرف سے تمہیں مکمل اجازت ہے۔'' رازل جریری نے جواب دیا۔

فیض شاہ کو تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ شہباز کے سوال پر اس نے حسرت بھری آواز میں کہا تھا۔

''مٹی انسان کو ضرور پکارتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری مٹی کی پکار کس طرح پوری ہوتی ہے لیکن بیٹے! یہ میری نہیں شیلا کی بھی زندگی کا خواب ہے۔''

''تو ٹھیک ہے ہم لوگ چل رہے ہیں۔''

نجانے کتنے عرصے کے بعد یہ لوگ بستی کنٹری میں داخل ہوئے تھے۔ جن تیاریوں کے ساتھ وہ آئے تھے وہ ناقابل یقین تھیں کنٹری میں کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئی تھیں مثلاً بستی کنٹری سے کوئی دو میل پرے ایک بہت شاندار حویلی بنوائی گئی تھی اور یہ حویلی طارق شاہ کی تھی جس نے اپنا سرکس ختم کر دیا تھا اور اب یہاں ایک زمیندار کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔ کنٹری والوں کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ رحیم شاہ کا بیٹا ہے لیکن یہ بات بھی انہیں معلوم تھی کہ رحیم شاہ کے جگری دوست فیض شاہ کو طارق شاہ نے ذلیل کر کے نکال دیا تھا اور فیض شاہ نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

چنانچہ بستی کنٹری کے لوگ جو روایتی قسم کے تھے ان باتوں کو نہیں مانتے تھے البتہ جب خود فیض شاہ وہاں پہنچا اور لوگوں کو گلباز کے بیٹے کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئیں تو لوگوں نے آنکھیں جھکا دیں اور کنٹری کی تقدیر میں ایک اور نئے باب کا اضافہ ہوا۔ فیض شاہ تو اپنے نام کے مطابق تھا ہی دوسروں کو فیض پہنچانے والا بستی کنٹری کے ایک ایک بے روزگار نوجوان کے لیے روزگار کا بندوبست کیا گیا اور ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈال دی گئی اور جب اس کام سے نمایاں طریقے سے فراغت حاصل ہوئی تو رازل جریری کا دعوت نامہ پہنچ گیا اور شہباز کو اپنے مرکز کی جانب آنا پڑا۔ لیکن رازل جریری نے جو کچھ حاصل کیا تھا۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیا تھا۔ حکومت پلاسکو کی لاتعداد سازشیں ناکام ہو چکی تھیں اور رازل جریری اب صرف شہباز پر ہی انحصار نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے اپنی مجلس میں نریمان فرازی جیسے ذہین انسان اور علی اصغر جراری جیسے انسان کو شامل کر لیا تھا جو اس دوران بہت سے کارنامے سرانجام دے چکے تھے لیکن رازل جریری نے شہباز کو جب اپنی حکومت میں طلب کیا تو ایک بہت ہی دلچسپ انکشاف اس پر کیا۔

''اور تم یقینی طور پر ان ہنگامہ آرائیوں کے درمیان سحر الجزائر کے اس پراسرار کردار کو بھول گئے ہو گے جس کا نام میزاس، میزاس کے حلقۂ احباب میں ہیکلے اور رازطمورا جیسے لوگ موجود تھے جو نسلاً یہودی تھے اور یہودیوں کے بارے میں یہ بات آنکھیں بند کر کے کہی جا سکتی ہے کہ ان سے کسی بہتری کی توقع رکھنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ میزاس آج بھی ہمارے نشانے پر ہے اور ہم اس سے اس کتاب کی تفصیل پوچھ سکتے ہیں، جو اس

کائنات کی پراسرار بن کتاب ہے اور جس کے حصول کے لیے نجانے کب سے کوششیں ہو رہی ہیں بات تمہیں خوش کرنے کی نہیں ہے شہباز! حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے اپنے وجود کا عکس محسوس ہوتے ہو۔ تم نے میرے دل میں اتنا بڑا مقام پیدا کرلیا ہے کہ اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر رازل جریری اس کائنات میں نہ رہا تو اس کی جگہ صرف اور صرف تم سنبھالو گے۔ مجھے ابھی تک تمہارے جیسا کوئی کردار نہیں ملا جسے میں اس مقام کے لئے منتخب کرسکتا۔ خیر میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ویسے تو میں اپنے مقصد کے لیے ہر اس ملک اور اس شخص کے خلاف کارروائی کرنے کا خواہش مند ہوں جو دنیا کی تباہی اور دنیا کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے لیکن کچھ ایسے پراسرار عمل ہوتے ہیں جن پر نگاہ ڈالنے کے بعد باقی دوسرے کام ہیچ ہو جاتے ہیں میرا مطلب سمجھ رہے ہونا۔ سحرالجزائر کے بارے میں، میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ ایک پراسرار اور انوکھا سلسلہ ہے جس کے بارے میں نجانے کون کون، کب کب اور کہاں کہاں مصروف رہا ہے میں خود بھی اس میں بہت دلچسپی لیتا رہا ہوں اور درجنوں بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میں سحرالجزائر کی تفصیلات معلوم کرسکوں۔ میزاس ایک پراسرار اور انوکھا کردار ہے میں تمہارا تعارف ان تمام لوگوں سے کرانا چاہتا ہوں۔ بولو کیا تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گے اور یہ تو ایک خوبصورت سی بات ہے کہ تمہارے والدین اپنی منزل پر چلے گئے ہیں اور وہاں خوش ہیں اس سے مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ جو کچھ بھی تم کرو گے وہ پوری دلجمعی کے ساتھ کرو گے اور یہی میں چاہتا بھی ہوں۔"

"محترم رازل جریری آپ کی ان محبت بھری باتوں کے لئے میرے پاس کہنے کے لیے وہ مناسب الفاظ نہیں ہیں بہرحال میں دل سے آپ کے ساتھ حاضر ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو آؤ میں تمہیں ایک اور انوکھے تجربے سے دوچار کروں جو میں نے کیا ہے جو یقیناً تمہارے لیے حیران کن اور باعث دلچسپی ہوگا۔ اب تک تم بہت کچھ کر رہے ہو لیکن اب صورتحال ذرا بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ میں تمہیں ایک ایسا مقام دینا چاہتا ہوں جو کسی اور کو حاصل نہیں ہوگا۔ سنو...... میزاس کی کہانی بے حد پراسرار ہے اور اس میں بڑے نئے نئے کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں روح میں منتقل کردوں گا اور جب بھی تمہیں کردار کی ضرورت پیش آئے گی میں تمہیں کردار بنا کر پیش کردوں گا۔ میری الجھی ہوئی بات تمہاری سمجھ میں بے شک نہیں آئی ہوگی لیکن تم یہ سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا سب سے انوکھا تجربہ ہو

گا۔ تم کو اس بات کا تو اندازہ ہے کہ رازل جریری اپنے جسم کو روح سے علیحدہ کرلیتا ہے اور روح میں بھی کچھ قوتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن میں تمہارے جسم کو کسی بھی جگہ میلا نہیں کروں گا بلکہ اسے جگہ جگہ محفوظ کردیا جائے گا اور جب بھی کوئی لمحہ ہوگا وہ تمہیں حاصل ہو کر ایک کردار کی حیثیت سے کسی بھی جگہ پیش کردے گا کیا سمجھے۔ میزاس کے بارے میں ہمیں تفصیلات درکار ہیں اور یہ تفصیل ہم بہت جلد معلوم کرلیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت میزاس ہمیں کہاں ملے گا بولو کیا تم اس کے حصول کے لیے تیار ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں...... ظاہر ہے یہ تو پہلے بھی ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم میزاس تک پہنچیں گے اور سحرالجزائر کا راز معلوم کریں گے۔"

"تو پھر آؤ...... میزاس کا حصول ہماری زندگی کا ایک گہرا مقصد ہے۔" رازل جریری نے کہا اور واقعی اس کے بعد کا تجربہ شہباز کی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ سرکس کی زندگی میں وہ ایسے ایسے ناقابل یقین کارنامے سرانجام دیتا تھا کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھیں۔ اس کے لیے دیوانے ہو جائیں لیکن جب اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم اس کی روح سے علیحدہ ہو چکا ہے اور ایک پراسرار غلاف میں لپٹا ہوا ایک ایسی جگہ موجود ہے جہاں اس کے حصول کے لیے ایسی کوئی دقت نہیں پیش آئے گی تو وہ حیران رہ گیا۔

فریدون نے اسے چہرے بدلنا سکھایا تھا لیکن رازل جریری کی پراسرار شخصیت نے اسے ایسے ایسے تجربوں سے دوچار کیا تھا کہ وہ ششدر رہ گیا تھا وہ شخص جس کا نام میزاس تھا انسان سے زیادہ شیطان معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا البتہ بدن کا پھیلاؤ باقی کسر پوری کردیتا تھا۔ رازل جریری نے اسے اغوا کیا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ راز جریری کی تجربہ گاہ میں تھا۔ اس عجیب و غریب مخلوق کے بارے میں کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا تعلق زمین سے نہیں ہے بلکہ کسی اور ہی پراسرار دنیا سے اس کا تعلق رہا ہے۔ البتہ جب اس نے ہوش میں آنے کے بعد ان دونوں کو دیکھا تو بڑے صاف اور شگفتہ لہجے میں بولا۔

"اور میں جانتا ہوں کہ تم نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے۔ تمہیں وہ کتاب مطلوب ہے نا جس میں کائنات کے بہت سے راز سربستہ موجود ہیں اور تم سحرالجزائر کی سیر کرنا چاہتے ہو جو ایک ایسی پراسرار وادی ہے جس کا روئے زمین پر تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن تم کیا سمجھتے ہو اس

کتاب کا بھی اس کائنات میں کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ کتاب میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر کے فنا کر دی ہے اور اب صرف میرے ذہن میں وہ کتاب موجود ہے اور کہیں نہیں بتاؤ کیا تم اسے میرے ذہن سے حاصل کر سکتے ہو۔'' رازل جریری نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں۔''

''تو پھر ضرور اسے حاصل کرو دیکھو میں آنکھیں بند کر رہا ہوں اور اب اگر تم میرے جسم کو ہزار ٹکڑوں میں بھی تقسیم کر دو تو تمہیں وہ کتاب نہیں حاصل ہو گی۔''

''شاید میں تم سے صحیح طور پر تعارف نہیں کرا سکا۔ میزاس تم بہت عجیب وغریب ہو لیکن تمہارا واسطہ رازل جریری سے پڑا ہے۔ میں تمہارے دماغ کے بیس ہزار خلیوں میں سے ایک ایک خلیے کا آپریشن کر کے اس سے تمہاری کتاب کا راز نکال لوں گا۔''

''کوشش کرو۔ دیکھو میں آنکھیں بند کر رہا ہوں۔'' اور میزاس بے جان ہو گیا۔ شہباز نے پریشانی سے رازل جریری کو دیکھا لیکن رازل جریری نے کہا۔

''نہیں۔ یہ بڑا دلچسپ اور انوکھا شخص ہے میں اس کا دماغ کھول کر کتاب کا راز نکال لوں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص جسمانی طور پر یہاں سوتا رہے گا لیکن کہیں اور کسی بھی جگہ ان راستوں کا راہی بن کر نمودار ہو سکتا ہے۔ ابھی تم سائنس کی اس تھیوری کو نہیں سمجھ سکو گے یہ بہت آگے کی چیز ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس سن میں یہ عمل شکل میں وجود میں آئے گا لیکن بہت سے سیاروں پر یہ وجود میں آ چکی ہے اور اس کا کچھ حصہ میرے پاس ہے۔ آؤ ہم اس کے دماغ کی کائنات کا سفر کرتے ہیں۔ آؤ......''

یہ کہہ کر رازل جریری نے شہباز کا ہاتھ پکڑا اور اس کے بعد شہباز کو نجانے کیسے کیسے جہانوں کی سیر کرنا پڑی وہ واقعی ان جہانوں کا سفر کر کے حیران رہ گیا تھا۔

٭......٭

اویس کی عمر تقریباً تیرہ سال ہو چکی تھی لیکن اس کا وزن صرف پینتیس کے جی تھا۔ حالانکہ جسمانی طور پر وہ بالکل فٹ تھا۔ سان گیرٹ اپنے بچوں کو بہت احتیاط سے کھلاتا پلاتا تھا گو انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی وہ سیر و سیاحت بھی کرتے تھے اپنی پسند کی چیزیں بھی کھاتے تھے لیکن سان گیرٹ ان سے اس قدر مشقت لیتا تھا اور اتنی ورزش کراتا تھا کہ ان میں سے کسی کا وزن بھی نہیں بڑھتا تھا بلکہ سان گیرٹ نے اس سلسلے میں اپنا ایک جم بنایا ہوا تھا جہاں وہ بچوں کو ہر طرح کی ورزشیں کراتا تھا اور اس کے ساتھ ہی انہیں وہ تربیتیں بھی دیتا جو اس کے کام میں معاون ہوتی تھیں۔ چوروں کی دنیا میں اس نے اپنی سائنس سے کام لیتے ہوئے چوری کے سلسلے میں بھی مختلف مشقیں کی تھیں۔ مثلاً اس کے لیے چوریاں کرنے والے بچے اٹھائی گیرے نہیں تھے نہ ہی وہ ایسے کام ان سے کراتا تھا وہ تو ایسے ضرورت مندوں کے لیے مناسب معاوضہ لے کر چوریاں کراتا تھا جنہیں کسی جگہ سے کوئی دستاویز کوئی ایسی قیمتی چیز جو ان کی خواہش اور ضرورت کے مطابق ہو درکار ہوتی تھی تو وہ اس سلسلے میں اچھے معاوضے لے کر اپنے ان تربیت یافتہ بچوں سے ان کی مشکلیں حل کراتا تھا اور اپنے آپ کو ایک نیک نام انسان قرار دیا کرتا تھا۔ سان گیرٹ سے کام لینے والے اس سے کبھی ناخوش نہیں ہوتے تھے۔ سان گیرٹ یہ بچے مختلف شہروں سے اغوا کراتا، انہیں خریدتا اگر کچھ بچے ایسے ہوتے جو اس کے لئے کارگر نہ ہوتے تو وہ انہیں ایسے لوگوں کے حوالے کر دیا کرتا تھا جو ان بچوں کو مشرق وسطیٰ اسمگل کر دیا کرتے تھے اور اس طرح سان گیرٹ کا کاروبار بخوبی ل رہا تھا۔ اویس جس کی عمر تیرہ سال کے قریب تھی بہت ہی مشاق بچہ تھا۔ دبلے پتلے پھرتیلے بدن کا مالک سان گیرٹ ہی نے ایک مرتبہ تھپڑ مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دی تھی کیونکہ سان گیرٹ کی انگلی میں پہنی ہوئی مخصوص طرز کی انگوٹھی تھپڑ کے ساتھ اس کی آنکھ میں گھس گئی تھی پھر سان گیرٹ نے بہترین ہسپتالوں میں اس کا علاج کرایا۔ آنکھ کی واپسی تو ممکن نہیں

ہوئی تھی زخم ٹھیک ہو گیا اور اویس ایک چشم رہ گیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے ایک آنکھ موجود تھی۔

بہرحال اس وقت اویس کو اس چمنی کے ذریعے اس گھر کی گہرائیوں میں اترنا تھا۔ پورا نقشہ اس کے ذہن میں بٹھا دیا گیا تھا۔ یہ گھر اویس کو بہت پراسرار لگا تھا۔ دن کی روشنی میں چار بار اسے اس گھر کا طواف کرایا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ کہاں وہ آسانی سے اندر داخل ہو سکتا ہے بات صرف اس گھر کی چھت پر بنی ہوئی اس چمنی تک پہنچنے کی تھی۔ جس کے ذریعے اویس کو اندر اترنا تھا۔ یہ بھی بڑی ٹیکنیکل باتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ موسم آتشدان روشن رکھنے کا نہیں تھا۔ اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ کون سا موسم کون سی مہم کے لیے زیادہ مناسب ہوتا ہے۔

چنانچہ ان دنوں بھی آتشدان کا موسم نہیں تھا اور پھر یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مکان خالی پڑا ہوا ہے اور اس کا مکیں ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ مکان کے بیرونی حصے میں البتہ ایک چوکیدار رہتا ہے جو عمر کی اس منزل میں ہے جس میں مستعدی نام کو نہیں ہوتی۔ بس گزارے والی بات ہوتی ہے۔ اویس جیسی عمر کے لڑکے کو اتنی ٹیکنیکل باتیں بتانا ضروری نہیں تھا لیکن سان گرٹ اپنے ہر بچے کی بہترین تربیت کیا کرتا تھا۔ ان بچوں کا حصول اس کے لیے آسان نہیں ہوتا تھا اور پھر ان کی تربیت کا معاملہ ہر طرح کیل کانٹے سے لیس ہوتے تھے یہ اویس اس نے اس دیوار کو ٹٹول کر دیکھا جس کے ذریعے اسے سب سے چھوٹی چھت پھر وہاں سے پائپ کے ذریعے اوپر والی چھت تک پہنچنا تھا۔ اوپر والی چھت تک پہنچنے کے بعد بھی اسے کھپڑیلوں کا ایک اونچا مینار طے کرنا تھا۔ تب کہیں جا کر وہ چمنی کے اوپری حصے تک پہنچ سکتا تھا۔ بند گھروں میں ویسے بھی خطرات نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔ جس چوکیدار کی بات اسے بتائی گئی تھی وہ بھی کہیں آس پاس موجود نہیں تھا۔ بلکہ بیرونی حصے میں غالباً اس گھنے درخت کے نیچے چارپائی ڈالے آرام کی نیند سو رہا تھا جس کے بارے میں یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ وہ کس چیز کا درخت ہے۔ اویس نے پہلی دیوار عبور کی اور چھوٹی سی چھت پر پہنچ گیا۔ جو سات یا آٹھ فٹ کے قطر میں تھی یہاں سے اسے اس پائپ کو پکڑ کر اوپر چڑھنا تھا جو زیادہ مضبوط نہیں تھا اور زیادہ سے زیادہ اویس ہی جیسی کسی وزن دار چیز کو اٹھا سکتا تھا۔

چنانچہ اویس اس پائپ کو ٹٹولنے لگا اور پھر اس کی بہترین مہارت اسے اوپر تک لے گئی

کھپڑیلوں کا معاملہ سب سے ٹیڑھا تھا کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کھپڑیلوں کو دور سے دیکھا بھی جا سکتا تھا اور کوئی بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتا تھا کہ بھلا ان کھپڑیلوں پر کسی چھوٹی سی عمر کے لڑکے کو چڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ نہ تو یہ پتنگ بازی کا موسم تھا کہ وہ پتنگ لوٹنے کے لیے اوپر جا رہا ہے نہ ہی کوئی اور ایسا کھیل ہو سکتا ہے جو اتنی بلندی تک کسی کو لے جائے لیکن اس قسم کے خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔

چنانچہ وہ کھپڑیلوں والے مینار پر پہنچ گیا اور پھر یہ اہرام نما مینارا اسے اوپر لے جانے لگا اس کا اختتام اس چمنی پر ہی ہوتا ایسی محفوظ چمنیاں کم ہی بنائی جاتی ہیں لیکن عبور کرنے والے اگر ماہر ہوں تو زیادہ مشکل نہیں ہوتی۔

چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ چمنی پر پہنچ گیا اب وہ چمنی سے لپٹا ہوا تھا اندر ہاتھ ڈال کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ چمنی میں گرمی کا تو کوئی نام ونشان نہیں ہے بعض سرپھرے مشغلے کے طور پر ہی ایسا کوئی عمل کر ڈالتے ہیں لیکن کسی سرپھرے کی موجودگی کا خدشہ یوں نہیں تھا کہ مالک مکان ملک سے باہر تھا اور پھر لوکا لگی چمنی میں اترنا بھی ایک خوفناک مرحلہ ہوتا ہے کہیں کہیں یہ لوکے راستے بند کر دیتے ہیں۔ اگر چمنی کی صفائی نہ کی جائے تو لیکن ایسا ہوتا بہت کم ہے کیونکہ لوگ بہرحال یہ چاہتے ہیں کہ آتشدان میں سلگنے والی لکڑیوں کا دھواں آسانی سے باہر جاتا رہے۔

بہرحال اویس چمنی میں پہنچنے کے بعد اپنے دبلے پتلے جسم کو سکوڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پاؤں لوکا لگی چمنی میں جمائے نیچے اترنے لگا۔ وہ جانتا تھا جب وہ نیچے پہنچے گا تو کوئی بھی اسے دیکھے تو دہشت سے کانپ اٹھے گا کیونکہ اس کی ہر چیز کالی ہو گی۔ آخر کار اس نے نیچے زمیں پر قدم رکھ دیئے اور اپنی اکلوتی آنکھ سے قرب وجوار کا جائزہ لینے لگا۔ یہ جگہ اس کے لیے بڑی دہشت ناک تھی وہ دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے زور زور سے پاؤں زمین پر مارے اگر قرب وجوار میں اس کے نشان بن بھی جاتے ہیں یا اس کے بدن سے لپٹے ہوئے لوکے سے قالین خراب ہو بھی جاتا ہے تو بھلا اس کے باپ کا کیا جاتا ہے اسے تو کچھ لمحوں کے بعد یہاں سے نکل جانا ہو گا۔ کالی گرد اس کے بدن سے اُڑی اور خوشنما قالین پر جمنے لگی لیکن ایسی چیزوں کی پرواہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اپنے جسم سے کالی گرد جھاڑنے کے بعد اس نے اپنے ذہن میں استاد کے بتائے ہوئے فارمولے کو دہرایا۔ کمرے سے باہر

سامنے والے کوریڈور میں بیس قدم چلنے کے بعد تیسرے نمبر پر داہنے ہاتھ کا کمرا دروازہ بند ہو تو کھول لیا جائے اور پھر تیسرے ہاتھ کے اس کمرے سے اندر داخل ہو کر ایک دروازہ نظر آئے گا۔ جس میں پہنچنے کے بعد وہ جگہ سامنے آجائے گی جو مطلوب ہے۔

بہرحال یہ ساری کاروائی اسے کرنی تھی وہ پوری ہوشیاری کے ساتھ اپنی ذمے داری پوری کرنے لگا۔ یہ کام مشکل نہیں تھا کہ اسے کوئی دقت ہوتی۔ کوریڈور میں نکلنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور پھر نپے تلے قدموں کے ساتھ اس طرف چل پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

تیسرا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا نہ ہی باہر سے۔ اس نے اسے دھکیلا تو اندر سے ایک عجیب سی خوشبو کا جھونکا آیا۔ اس کی ناک ٹکرایا وہ اس خوشبو کو محسوس کرنے لگا۔ بڑی بہترین خوشبو تھی۔ عمدہ قسم کے کھانوں کی خوشبو۔ اصل میں اس کا استاد سان گیرٹ جب اپنے کسی شاگرد سے کوئی کام لینے لگتا تھا تو اسے کم از کم چھ گھنٹے بھوکا رکھتا تھا تاکہ اس کے بدن میں چستی اور مستعدی رہے اور وہ اپنا کام بخیر و خوبی سرانجام دے سکے۔ یہ کیفیت اس وقت اویس پر بھی قائم تھی اور وہ سخت بھوک محسوس کر رہا تھا بھوک کے عالم میں اگر کھانوں کی خوشبو اس طرح نتھنوں سے ٹکرائے تو انسان خود بخود دوسرے سارے معاملات بھول کر اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت اویس کی تھی ایک لمحے کے لیے اس کا دل ڈول گیا تھا اور وہ اس خوشبو پر غور کرنے لگا تھا۔ یہ خوشبو اسے تیز تیز قدموں چلاتی ہوئی اس پردے کی جانب لے گئی جس کی دوسری طرف یہ آرہی تھی اور اسی سمت اویس کو جانا بھی تھا۔ اس نے تیزی سے پردہ سرکایا اور دسری طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کافی بڑا کمرہ تھا۔ اس کے درمیان میں ایک میز لگی ہوئی تھی اور میز پر عمدہ قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ پلیٹیں بھی اس طرح لگی ہوئی تھیں جیسے کوئی کسی مہمان کی آمد کا انتظار کر رہا ہو اور چند ہی لمحوں کے بعد دوسرے دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اویس کے اوسان خطا ہو گئے۔ لمبے قد و قامت کا مالک ایک عجیب الخلقت آدمی تھا اس کی مڑی ہوئی طوطے کی چونچ جیسی ناک باریک باریک بھنچے ہوئے ہونٹ اسے شیطان ظاہر کر رہے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور لکیروں کی شکل میں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے اس اویس کی طرف دیکھا، دیکھتا رہا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی

آنکھوں کی چمک اویس کے پورے وجود میں اتر رہی ہو۔ صرف ایک لمحہ اور دوسرے لمحے اس نے آگے بڑھ کر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی دونوں پلیٹیں میز پر رکھ دیں اور اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اور معزز مہمان! نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ کھانا میں تنہا نہیں کھاؤں گا بلکہ کوئی اور بھی میرے ساتھ شریک ہوگا۔ اوہو...... تمہارے ہاتھوں پر کالک لگی ہوئی ہے۔ دیکھو وہ سامنے ٹوائلٹ لگا ہوا ہے۔ جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ اور ہو سکے تو منہ پر بھی تھوڑا سا پانی ڈال لو وہ تولیہ جو وہاں لٹکا ہوا ہے شاید تمہارے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ گندا تو بے شک ہو جائے گا لیکن کوئی بات نہیں چلو جاؤ...... دیر مت کرو میں بھوکا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ کھانا جلد از جلد کھا لیا جائے۔''

اس کے لہجے میں ایک عجیب سا حکم تھا اور اویس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں خود بخود ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گئے ہوں پھر ہاتھ اور منہ ہی دھویا جا سکا تھا وجود تو سارا ہی کالا ہو چکا تھا لیکن بہرحال اتنا صاف ضرور ہو گیا تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ میز پر آبیٹھے۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں ایک طرح سے سلب ہو گئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ صرف اس شخص کے احکامات کی پابندی کرنے کے لے پیدا ہوا ہو۔ حالانکہ سان گیرٹ ایک بہت سخت گیر آدمی تھا اور کسی بھی قیمت پر اپنے احکامات سے انحراف پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ بات اس کے سارے شاگرد جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ سان گیرٹ جب سزا دینے پر آتا ہے تو اس کی دی ہوئی سزائیں جان لیوا ہوتی ہیں اور برسوں انہیں نہیں بھولا جا سکتا۔ لیکن بس اس وقت جو کیفیت اویس پر طاری تھی وہ اس سے بہتر نہیں بتا سکتا تھا۔

''کھاؤ پیارے بچے کھاؤ۔ مجھے حیرت ہوئی ہے کہ ایسے مہمان میرے لیے بڑے حیران کن ہوتے ہیں۔ تم غالباً چمنی کے راستے نیچے اتر کر آئے ہو۔'' اویس نے جلدی سے اپنی پسندیدہ ڈش اپنی پلیٹ میں ڈالی اور اس کے بڑے بڑے نوالے حلق میں ٹھونستا ہوا بولا۔

''ہاں معزز میزبان! میں چمنی کے راستے ہی اندر آیا ہوں۔''

''غالباً چوری کی نیت سے۔''

سو فیصدی ایسی ہی بات ہے۔ یہ جو کمرا ہے اس میں جو الماری نظر آرہی ہے یعنی اس میز سے گیارہ قدم آگے چل کر میں اس الماری تک پہنچوں گا۔ اس کو کھولوں گا تو اس کی نچلی تہہ

میں مجھے ایک چیز نظر آئے گی۔ یہ چاندی کا بنا ہوا ایک کچھوا ہے جو بہت خوبصورت ہے اور یہی میرے استاد کی طلب ہے۔ میرا استاد یعنی سان گیرٹ چاندی کا یہ کچھوا غالباً کسی شخص کی فرمائش پر چوری کر رہا ہے۔ اصل میں ہم چودہ لڑکے ہیں جو سان گیرٹ کے شاگرد ہیں سان گیرٹ ہماری ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہم اس کے لیے سارے کام کیا کرتے ہیں وہ ایک اچھا استاد ہے ہمیں ہر طرح کے فنوں میں طاق کرتا ہے۔ ہماری خبر گیری کرتا ہے بیماری سے لے کر کھانے پینے اور لباس تک اور ہم اس کے لئے ایسی ہی چوریاں کرتے ہیں۔''

اچانک ہی سامنے بیٹھے ہوئے اس شخص کی آنکھوں میں شیطانی چمک لہرائی اس نے کہا۔

''واہ...... یہ سان گرٹ تو بڑے کام کا آدمی ہے کیا ایک سوال میں تم سے کر سکتا ہوں میرے پیارے بچے تمہارا نام کیا ہے۔''

''اویس......'' اویس نے جلدی جلدی کھاتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا نام اوسیانوس ہے۔ لاک اوسیانوس۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مہربان دوست اوسیانوس۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں اور ویسے بھی میں بھوکا تھا اس وقت آپ نے مجھے خوراک دے کر میری مدد کی ہے۔''

''کھاؤ کھاؤ...... عیش و آرام کے ساتھ کھاؤ...... یہاں تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ کچھ عرصے پہلے اس عمارت سے ایک کتاب حاصل کی گئی تھی اور اس کتاب کے اوپری سرے پر لکھا تھا۔ ''بنگال سمورس'' تم مجھے بتاؤ میرے بچے کیا تمہیں اس کتاب کے بارے میں کچھ علم ہے۔''

''واہ...... ایک بہت ہی دلچسپ اور بڑا ہی عجیب سوال پوچھا آپ نے میرے معزز بزرگ بنگال سمورس نامی کتاب اسی چمنی کے راستے نیچے اتر کر میں نے ہی اس عمارت سے حاصل کی تھی۔'' یوں لگا جیسے سامنے بیٹھے ہوئے اوسیانوس کے پورے جسم کو بجلی کے کئی جھٹکے لگے ہوں کچھ لمحوں کے لیے اس کا رنگ متغیر ہوا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

''اور وہ کتاب سان گیرٹ کے پاس موجود ہو گی۔''

''ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں۔ البتہ کتاب تین چار دن تک اس کے پاس رہی تھی اور وہ اس کا مطالعہ کرتا رہا تھا لیکن اس لیے کہ جس شخص نے اسے یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے کہا تھا

وہ شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔''

''کون تھا وہ کیا نام تھا اس کا؟''

''غالباً میزاس۔ اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں اور کوئی تفصیل نہیں جانتا۔'' اویس نے اپنی پلیٹ تقریباً پوری انڈیلتے ہوئے کہا۔

''کھاؤ خوب کھاؤ...... اتنی کھاؤ کہ اس کے بعد تمہیں بھوک نہ رہے تم بہت ہی پیارے بچے ہو لیکن ایک بات بتاؤ۔ اس وقت کیا تم صرف یہ کچھوا حاصل کرنے آئے تھے۔ یہ کہہ کر اوسیانوس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں سے چاندی کا ایک چھوٹا کچھوا نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آہ...... یہ...... یہ ہی تو ہے جس کی تصویر مجھے دکھائی گئی تھی۔ لیکن یہ تمہارے پاس...... کیا تم ہی اس گھر کے مالک ہو؟''

''یہی سمجھ لو۔ لیکن تم بالکل بے فکر رہو جس کام کے لیے تم آئے ہو وہ کر کے جاؤ گے۔ دوستی تو دوستی ہی ہوتی ہے جب میں نے تمہیں اپنے دوستوں میں تصور کر لیا ہے تو سمجھ لو سب کچھ تمہارے ہی لیے ہے کیا سمجھے۔ شیطان صورت اوسیانوس عجیب سی ہنسی ہنسنے لگا اور اویس سوچنے لگا کہ ایسے بھی لوگ اس دنیا میں ہو سکتے ہیں جو کسی چور کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں۔

بہر حال اوسیانوس اس سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا اور اویس اپنا پیٹ بھرتا رہا اوسیانوس نے اس سے پوچھا۔

''کیا تمہارا استاد سان گیرٹ باہر تمہارا منتظر ہے۔''

''ہاں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ جب تک میں اس کے پاس نہیں پہنچ جاؤں گا وہ میرا انتظار کرتا رہے گا۔''

''دوستی کے تقاضے ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے۔''

''ضرور۔''

''سان گیرٹ کو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا یہ کچھوا تم اسے لے جا کر دے سکتے ہو لیکن بس بعد کی باتیں تمہیں صیغہ راز میں رکھنا ہوں گی۔''

''میرے لیے ضروری بھی ہے کیونکہ جب سان گیرٹ کو یہ بات پتہ چلے گی کہ میں کھانا

کھا کر یہاں سے نکلا ہوں تو وہ اسے بالکل پسند نہیں کرے گا بلکہ اس پر سخت ناراضگی کا اظہار بھی کرے گا۔ خیر اس کے بارے میں تو تم غور بھی مت کرو۔ کیا یہ کچھوا میں اپنے لباس میں رکھ لوں۔"

"ہاں۔" اوسیانوس نے پرمحبت مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پھر برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"اگر تم کھانا کھا چکے ہو تو واپس اس چمنی کے راستے جاؤ کیونکہ اس گھر کا محافظ جاگ رہا ہے تم دروازے سے نہیں جا سکو گے۔" اویس کے لیے بھلا چمنی کے راستے اوپر جانا کون سا مشکل کام تھا لیکن جب وہ اپنے استاد سان گیرٹ کے پاس پہنچا تو سان گیرٹ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ زیادہ دیر ہوگئی تمہیں۔" اویس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کی تلاش میں وقت لگا اور پھر ویسے بھی یہ ایک مشکل کام تھا۔"

"آؤ......" سان گیرٹ نے کچھوا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ مڑی ہوئی طوطے کی ناک والا اوسیانوس ان دونوں کا بڑی احتیاط کے ساتھ تعاقب کر رہا ہے۔

۞......۞

شہباز کے لیے یہ کائنات کا سب سے انوکھا طلسم تھا۔ اس کی اپنی زندگی ہمیشہ ہی پرپیچ معاملات سے دوچار رہی تھی۔ باپ نہیں چاہتا تھا کہ وہ سرکس کے جھولے پر کام کرے اپنی اولاد کو وہ کسی مشکل کا شکار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس میں صرف اس کی محبت ہی شامل تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان دنیا کا خطرناک سے خطرناک کام کرے لیکن اپنی اولاد کو وہ ایک چار فٹ اونچی دیوار سے بھی کودتے نہیں دیکھ سکتا کہ کہیں اس کے پاؤں میں موچ نہ آ جائے۔ کہیں وہ زخمی نہ ہو جائے۔ یہ احساسات اس کے دل میں رہتے ہیں یہی وجہ تھی کہ گلباز نے کبھی اپنے بیٹے کو سرکس میں کام نہ کرنے دیا اور اسے شہری آبادی میں بھیج دیا۔ اب یہ شہباز کی صلاحیتیں تھیں کہ اس نے وہاں سے بھی کچھ حاصل کر ہی لیا۔ تعلیم نے اسے یہ مقام دے دیا تھا کہ وہ ہر طرح کے ماحول میں اپنے آپ کو ضم کر سکے۔ فریدوں نے اسے میک اپ کا فن دیا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر اور بھی بہت کچھ سیکھ لیا تھا

اور اب وہ جس مقام پر تھا وہ بہت ہی بے مثال تھا رازل جریری کے ساتھ نے اسے نجانے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ رازل جریری کے لیے جو کارنامے اس نے اب تک سرانجام دیئے تھے وہ ناقابل تصور تھے اور وہ ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا تھا اور اب تو رازل جریری نے اسے اپنے عکس کا ایک حصہ بنا لیا تھا۔ جو تجربہ اس نے شہباز پر کیا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ شہباز بھی اس وقت ایک نامعلوم اور نظر نہ آنے والی شخصیت اختیار کر چکا تھا۔ دونوں ہواؤں کے ساتھ تحلیل ہونے کی قوتیں رکھتے تھے۔ رازل جریری کو خزانہ حاصل ہو گیا تھا۔ علی اصغر جراری اور سب سے بڑی شخصیت نریمان فرازی کی تھی جس نے اسے بڑی قوتیں بخشی تھیں۔ نریمان فرازی بہت ہی کارآمد انسان نکلا تھا۔

رازل جریری کے مشن کو سمجھنے کے بعد اس نے جس کام کا آغاز کیا تھا اس نے رازل جریری کو بہت سے مرحلوں سے آزاد کر دیا تھا اور اب میزاس تھا جو رازل جریری کا شکار تھا اور رازل جریری اس کے ذریعے کائنات کے ایک ایسے پراسرار طلسم کی کھوج میں تھا جو رازل جریری کے اپنے منصوبے کے مطابق پریشان حال انسانیت کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ وہ دونوں اس نظر نہ آنیوالی حیثیت کے تحت مصروف عمل تھے اور اس سلسلے میں ان کی پہلی کوشش یہ گھر تھا جس میں کتاب نیگال سمورس کے بارے میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ دونوں اس وقت یہاں موجود تھے جب اویس جو سان گیرٹ کا شاگرد تھا اور جس کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے رازل جریری نے اس سے کہا تھا۔

"یہ شخص سان گیرٹ کمال کی شخصیت ہے تم اسے ضرور دیکھو گے میں تمہیں ذرا سی تفصیل بتاؤں۔ سان گیرٹ آوارہ اور بے گھر بچوں کے گروہ کا سردار ہے۔ اس شخص نے مختلف طریقوں سے یہ بچے حاصل کیے ہیں کہیں اس نے انہیں خریدا ہے کہیں اغوا کیا ہے شدید تشدد کر کے اس شخص نے انہیں بلا کا تیز اور ماہر چور بنا دیا ہے۔ اس کا ایک مخصوص انداز ہے وہ ان بچوں کو تنگ و تاریک چمنیوں کے ذریعے مکانوں میں اتار دیا کرتا ہے اور بچے اس کی ہدایت کے مطابق اشیاء چوری کرتے ہیں۔ اس کی داہنی ٹانگ لکڑی کی ہے اور یہ بہت ہی پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اوسیانوس نے نیگال سمورس نامی کتاب کے بارے میں اسے جو تفصیل بتائی، اس کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ ہم اس کہانی کا تعاقب کریں گے اور جہاں بھی ہمیں نیگال سمورس کے حصول کے لیے انسانی شکل اختیار کرنی

پڑے گی وہاں ہم اپنی اصل حیثیت سے سامنے آجائیں گے۔ یہ ایک بہت ہی پراسرار اور ایک انوکھا طلسم ہے جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں وہ شخص جس کا نام اوسیانوس ہے اور تم دونوں ہاتھوں کو دیکھو اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ یہ شخص بہت ہی سنگین مزاج کا مالک ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ابلیس کا پجاری ہے لیکن ابلیس اس سے اور یہ ابلیس سے بے پناہ نفرت کرتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو ابلیس کا خادم کہتا ہے لیکن نیگال سمورس کے حصول کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے کیونکہ اگر نیگال سمورس اس کے ہاتھ میں آجائے تو پھر اسے ابلیس کی غلامی کی ضرورت نہیں رہے گی اور ابلیس اس کے قبضے میں آجائے گا۔ شیطان کو قبضے میں کرنے کا تصور تم یہ سمجھ لو ان جیسے کالے جادو کے ماہروں کے لیے بڑا انوکھا ہوتا ہے۔ بقول اس کے اگر شیطان اس کے قبضے میں آجائے تو تمام جنات، بھوت، پریت اور روحیں اس کی غلام ہوں گی۔ وہ شیطان جسے یہ ابلیس کا نام دیتا ہے اس کے سامنے ہر وہ خوشی پیش کر دے گا جو یہ چاہے گا۔ اصل میں یہ بھی ایک لمبا تصور ہے جو میرے یا تمہارے مقصد کے لیے غیر ضروری ہے لیکن پھر بھی میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ابلیس کے مختلف مدارج ہیں۔ خناس، اس کی ضروریات میں تصور کیا جاتا ہے اور یوں سمجھ لو کہ اسی کی ایجادات میں سے ہے۔ یہ خناس مختلف شکلوں میں سامنے رہتا ہے اور انسان کو انسانیت سے دور لے جاتا ہے لمبی کہانی ہے۔ ابلیس پر ہاتھ ڈالنا تو ممکن نہیں ہوتا لیکن اگر خناس قابو میں آجائے تو تم یہ سمجھ لو کہ ابلیس کی خاص توجہ اس عامل کو حاصل ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں کہ یہ شخص جو نیگال سمورس کے حصول کے سلسلے میں سرگرداں ہے ایک ایسے ہی خناس کا پیچھا کرتا رہتا ہے جسے اسرائیل کے بادشاہ نے یروشلم کا مندر تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا اور اسی کو قابو میں کرنے کے لیے اوسیانوس دو بار عمل کر چکا ہے لیکن اس کا عمل ناکام رہا ہے اور اب وہ خناس مسلسل اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ وہ اسے اپنا غلام بنانے کے لیے مسلسل اوسیانوس پر حملے کر رہا ہے اور اوسیانوس سمورس کے حصول کے لیے سرگرداں ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خناس اسے بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ نیگال سمورس اس کی نجات کا واحد ذریعہ ہے ایک مرتبہ اگر اس نے نیگال سمورس حاصل کر لیا تو پھر تمام شیطان تمام بھوت پریت اس کے غلام ہو جائیں گے۔ یہ شخص اوسیانوس سفلی عمل کا ماہر بھی ہے ہپناٹس بھی ہے کالا علم بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ شیطان سے اس کی اتنی قربت

رہی ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ ایک انتہائی سفاک قاتل بھی ہے اور ایک بار بھٹک کر شیطان کے مدمقابل بھی آچکا ہے۔ بس اسی وقت سے شیطان نے خناس اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس کی تمام تر قوتیں اس خنانس کے مقابلے میں ہیچ ہیں اور اسے زیر کرنے کے لیے نیگال سمورس کا حصول ضروری ہے لیکن نیگال سمورس بھی حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے وہ کتابیں ضروری ہیں جس کا تذکرہ میزاس سے ہوا اور اس وقت یہی کتابیں دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہیں اور انہی کے ذریعے یہ سارا کام ہوگا۔ یہ سفید کچھوا جو چاندی کا بنا ہوا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ نیگال سمورس ہی کے حصول کی ایک کوشش ہے۔ بس عجیب و غریب چیزیں ہیں اور تمہیں بلاشبہ لطف آئے گا کیونکہ اس سلسلے میں بے شمار کردار ہمارے سامنے آئیں گے۔ وہ شیطانی کتابیں جو نیگال سمورس سے متعلق ہیں اور جن کے ذریعے جناتوں اور روحوں کو بلایا جا سکتا ہے اور اپنا تابع کیا جا سکتا ہے اس وقت ان تمام لوگوں کے لیے بہت قیمتی ہیں ان کی تعداد تین ہے میں تمہیں ان کی تفصیل بتائے دے رہا ہوں کہ مزید کچھ اور بتا دوں تو تمہارے آگے کا سارا سلسلہ ختم ہو جائے۔ ہو وہ دیکھو...... وہ یقینی طور پر اس بچے اویس کا تعاقب کر رہا ہے جس کو اس نے چاندی کا یہ کچھوا دیا ہے حالانکہ چاندی کا یہ کچھوا خود اوسیانوس کی ضرورت بھی ہے لیکن اس نے بڑی فراخ دلی سے اسے بچے کو حوالے کر دیا ہے اصل میں یہ مچھلی کو پھانسنے کے کانٹے کا کام دے رہا ہے۔ آؤ اس کا تعاقب کرتے ہیں۔"

رازل جریری نے شہباز سے کہا اور دونوں نادیدہ حالت میں اس کے پیچھے چل پڑے۔

سب سے آگے سان گیرٹ جس کی ٹانگ لکڑی کی تھی اور جو لنگڑا کر چل رہا تھا اور جسے اس کا مطلوبہ چاندی کا کچھوا مل چکا تھا اور جس کی اسے بھاری قیمت ملنے والی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا شاگرد خاص اویس جو درحقیقت اوسینوس جیسے شیطان کی گرفت سے بچ کر آیا تھا اور اگر اوسیانوس کو سان گیرٹ کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور اس لڑکے کو چارہ بنانے کی تو لازمی امر تھا کہ اس پرانے اور خالی مکان میں اویس کی لاش ہی دستیاب ہوتی اور بس۔ اویس کے پیچھے اوسیانوس جا رہا ہے۔ آؤ ہمارے لئے اس سے عمدہ مقام اور کون سا ہو سکتا ہے۔" شہباز نے دلچسپی سے گردن ہلا دی تھی۔

۞......۞

اوسیانوس کو واقعی بالکل اتفاقیہ طور پر اس گھر سے بقول کسی کے ایک خزانہ ملا تھا۔ وہ

نجانے کب سے ان کتابوں کی تلاش میں تھا اور نجانے کیسے کیسے مراحل سے گزر کر یہاں تک آیا تھا اس سلسلے میں اس نے دنیا کے خطرناک ترین آدمی یعنی ڈولمین سے دشمنی لے لی تھی۔ ڈولمین کی بیوی کا قتل بالکل اتفاقیہ کوشش تھی۔ اسے پتہ چلا کہ وہ عورت ان کتابوں کے بارے میں کچھ جانتی ہے اور وہ اس تک پہنچا تھا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس پراسرار مکان تک اس کی آمد اس عورت کی نشاندہی کا نتیجہ تھی لیکن بعد میں اس نے جس طرح کی مزاحمت کی اس سے اوسیانوس کو اپنی زندگی بچانے کی فکر لاحق ہوگئی اور نتیجے میں وہ عورت جو ڈولمین کی بیوی تھی اس کے ہاتھوں قتل ہوگئی اور فوراً ہی ڈولمین وہاں پہنچ گیا۔ دنیا کا خطرناک ترین باکسر اور انتہائی خوفناک شخصیت جو اپنی بیوی کو بے پناہ چاہتا تھا اور جس نے اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایک دم اپنی بیوی کے قاتل کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا اور اس کے بعد اس نے کسی سائے کی طرح اوسیانوس کا پیچھا شروع کر دیا۔ یہ شیطان کے ساتھ ساتھ ایک نیا عذاب تھا جو اوسیانوس کی زندگی کا دشمن بن گیا تھا۔ لیکن بات وہیں آجاتی ہے کہ اگر وہ چیز اسے مل جائے یعنی نیگال سمورس تو اس کے بعد ایک ایک کو دیکھ لیا جائے گا۔

ڈولمین جیسا آدمی تو خیر چیز ہی کیا تھا البتہ وہ اس سے خوفزدہ ضرور تھا بلاوجہ کی مصیبتیں کبھی کبھی انسان کو غیر متوقع طور پر مشکل میں ڈال دیتی ہیں اب یہ دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال اس نے کامیابی سے وہاں تک کا تعاقب کیا جہاں سان گیرٹ نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ سان گیرٹ بہرحال اس قدر ہوشیار اور طاقتور آدمی نہیں تھا کہ اوسیانوس جیسے کالے جادو کے ماہر کا صحیح انداز میں مقابلہ کرسکتا۔ آخرکار اوسیانوس نے موقع پاتے ہی اس پر قبضہ حاصل کرلیا۔ اس وقت سان گیرٹ اپنی لکڑی کی ٹانگ اپنے پاؤں سے اتار کر ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ اوسیانوس اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے سان گیرٹ کو چند لمحوں میں انتہائی خوفزدہ کر دیا اور آخرکار اسے اپنے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کرلیا۔ اس کی چمکدار آنکھیں چوکنے انداز میں سان گیرٹ کو دیکھ رہی تھیں جو میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ سان گیرٹ کو اوسیانوس نے ہپناٹائز کرلیا تھا اور یہ طے کر چکا تھا کہ اس شخص کی زندگی ہر لحاظ سے خطرناک ہے اور اسے کچھ دیر کے اندر مر جانا چاہیے وہ اسے مکمل طور پر قتل کرنے کا منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔ آخرکار اس کی سرد اور پتھریلی آواز ابھری۔

"مجھے نیگال سمورس کے بارے میں بتاؤ۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا سر!" سان گیرٹ نے تنویم کے عالم میں جواب دیا۔ اس شخص نے مجھ سے نیگال سمورس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ میزاس نے تمہاری خدمات کس لیے حاصل کی تھیں۔"

"کیا غلط نام لے رہے ہیں۔ میزاس نے مجھ سے ان کتابوں کے حصول کے لیے بات ضرور کی تھی لیکن میں صرف وہ کام کرتا ہوں جس کی مکمل نشاندہی مجھے کر دی جائے جبکہ وہ ان کی صحیح نشاندہی نہیں کرسکا تھا۔

"تو پھر......" اوسیانوس نے چونک کر پوچھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ کتابیں چرانے کے لیے مجھے مسٹر نیکسن لیور نے منتخب کیا تھا اور صحیح معنوں میں میں نے مسٹر نیکسن کیوز کے لیے ہی کام کیا۔"

"آہ...... یہ تو نیا نام تم نے مجھے بتایا۔ بالکل نیا نام لیکن ذرا مجھے ان کتابوں کے بارے میں تو بتاؤ۔" سان گیرٹ کے بدن میں تھرتھری پیدا ہوئی اور پھر اس نے اوسیانوس کو بتایا۔

"وہ کتابیں کالے جادو سے متعلق تھیں بھوتوں اور شیطانوں کے بارے میں ایسی کتابیں جنہیں ابلیس کے پرستار حاصل کرنے کے لیے نجانے کتنی تعداد میں زندگی دے چکے ہیں۔" اوسیانوس نے حقارت سے اس دو ٹکے کے شخص کو دیکھا جو ابلیس کا نام اتنی نفرت سے لے رہا تھا ابھی تو اوسیانوس اسی کا پجاری اور خادم تھا لیکن وہ ابلیس کے جال سے نکلنا چاہتا تھا ایک مرتبہ نیگال سمورس اس کے ہاتھ لگ جائے تو پھر اسے ابلیس کی غلامی کی ضرورت نہیں رہے گی اور وہ بہت بڑی شخصیت کا مالک بن جائے گا۔

بہرحال اس شخص کو غور سے دیکھنے لگا جو آوارہ اور بے در بچوں کا سردار تھا۔ یہ بہت ہی کریہہ صورت تھا۔ چیچک کے داغوں نے اس کے چہرے کو گلہری کی طرح بنا دیا تھا۔ وہ بوسیدہ اور میلے کپڑوں میں اس وقت اوسیانوس کے سامنے بے بس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی لکڑی کی ٹانگ اس کے قریب رکھی ہوئی تھی لیکن اس سے زیادہ وہ اس وقت اوسیانوس کے قبضے میں تھی اور اوسیانوس ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے اسے اٹھا سکتا تھا۔ سان گیرٹ کی عمر کوئی تیس پینتیس سال کی ہوگی لیکن شکل اور حلیے سے وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ کا لگتا تھا۔ اس کے گروہ کے چور بچوں میں چند ایسے تھے جن کو اس نے غریب والدین سے معمولی قیمت

خرید لیا تھا اور بقیہ وہ یتیم اور بے سہارا تھے جن کی گزر اوقات سڑکوں پر بھیک مانگنے اور چوریاں کرنے پر تھی۔ اس وقت یہاں اس کے گندے کمرے میں دو لڑکے موجود تھے ننگے پیر اور بوسیدہ کپڑوں میں لپٹے ہوئے۔ وہ دونوں فرش پر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ قریبی آتش دان میں جلتی ہوئی آگ ان کو گرمی پہنچا رہی تھی۔ حالانکہ یہ موسم آتش دان کا نہیں تھا۔ لیکن یہ جگہ کچھ ضرورت سے زیادہ سرد تھی اس لیے آتش دان روشن کر لیا گیا تھا۔ لڑکوں کو معمول کے مطابق سان گیرٹ نے افیون کا ست پلا کر بے خبر سلا دیا تھا یہ کمرا ایک پرانی اور بوسیدہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ یہ اس شہر کے پسماندہ اور گندے ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا تھا اور اس علاقے میں رہنے والے زیادہ تر جرائم پیشہ افراد تھے۔ جو منشیات کی تجارت کرتے تھے یہاں کی تنگ و تاریک گندی گلیاں اور قدیم اور بوسیدہ کئی منزلہ عمارتیں جرائم پیشہ افراد، چوروں، ڈاکوؤں، اور عورتوں کا مسکن تھیں۔

آخر کار سان گیرٹ کی آواز ابھری۔

''وہ کتابیں اصل میں مسٹر ایکوناس کی تھیں۔ اصل میں یہ اطلاع مجھے نیکسن لیور نے پہنچائی تھی۔ ایکوناس نے وہ کتابیں کہاں سے حاصل کیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم لیکن نیکسن ان کے گھر گیا تھا اور ان کتابوں کو دیکھنے کے بعد اس نے مجھے اس جگہ کی تفصیل بتائی اور کہا کہ اگر میں ان کتابوں کو چوری کر لوں تو وہ مجھے اس کا بہترین معاوضہ ادا کرے گا اور یہ معاوضہ اس نے ایک طرح سے مجھے ایڈوانس دے دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ کتابوں کا مالک کب گھر سے باہر ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے سب سے ہونہار لڑکے اولیس کو چمنی کے ذریعے مکان کے اندر اتارا۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ وہ کتابیں چوری کر لی تھیں۔

''اوہ...... یہ کمبخت نیا نام میرے سامنے آیا ہے۔ ویسے تم ایک بات بتاؤ۔ تمہاری اس سے مزید گفتگو تو ہوئی ہوگی۔ وہ ان کتابوں کو کیوں حاصل کرنا چاہتا تھا؟''

''جناب عالی! اصل میں وہ ان کتابوں کے ذریعے نیگال سیمورس کا راستہ اور اس کے حصول کا ذریعہ جاننا چاہتا تھا۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ وہ نیگال سیمورس کو حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ لٹانے پر تیار تھا اور اس کے پس منظر میں اس کی بھی اپنی ایک کہانی تھی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ ایک امیر ترین انسان ہے اور اس کی عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ لیکن بدنصیبی نے اسے

موت کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ اسے بھی روحانیات اور سحر میں مہارت حاصل ہے اور اسے یقین ہے کہ اگر نیگال سیمورس اسے مل جائے تو اس کا مہلک مرض کینسر ٹھیک ہو سکتا ہے بہر حال یہ ایک سنگین کہانی ہے۔''

''اور اس نے اس کا معقول معاوضہ دیا ہوگا تمہیں۔''

''انتہائی معقول۔''

''اب تم مجھے ایک بالکل آخری اور راز کی بات بتاؤ۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے کیونکہ جھوٹ تمہاری موت بن سکتا ہے۔ تم نے ان کتابوں پر نگاہ تو ضرور ڈالی ہوگی۔ کیا لکھا تھا ان میں؟''

''ہاں...... میں خود بھی چونکہ روحانیات سے دلچسپی رکھتا رہا ہوں اس لئے میں نے ان کتابوں پر نگاہ ڈالی ہے۔ وہ شیطانی کتابیں تھیں جن کے ذریعے جنات اور روحوں کو بلایا جا سکتا ہے اور ان پر قبضہ جمایا جا سکتا ہے۔''

''کتابوں کے نام کیا تھے؟'' اوسیانوس نے سوال کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا معمول ذرا سی تفصیلات بھی یاد کر سکتا ہے۔ ایسی تفصیلات جو بیداری کے عالم میں ممکن نہیں۔''

''وہ تین کتابیں تھیں۔ بہت قیمتی۔ اور ان پر جو نام چھپے ہوئے تھے میں یاد کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔''

اوسیانوس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے ایک تیز دھار والا خنجر نکال لیا۔ اس کے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ ایک تو شیطان کا خوف لاحق تھا جو ہر لمحہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا کیونکہ اس وقت وہ اس کا بدترین دشمن تھا۔ دوسرا خوف اسے ڈولمین کا تھا۔ ڈولمین جو اپنے وقت کا چیمپئن تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ڈولمین کی آنکھوں میں اترے ہوئے خون نے اسے بدحواس کر رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈولمین اپنی بیوی کے قتل کا انتقام لئے بغیر نہیں رہے گا۔

بہر حال سان گیرٹ نے اسے کتابوں کا نام بتایا اور اوسیانوس نے ایک گہری سانس لی۔ انہی کتابوں کے لئے اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا تھا۔ لیکن اب یہ کتابیں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ ان میں پہلی کتاب جادو کی سات سو سال پرانی کتاب تھی۔ نایاب کتاب جو کالے جادو کی کنجی تھی اور چودھویں صدی کی ایک ایسی کتاب تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں ساحرانہ عملیات تھے اور دوسری کتابیں بھی ایسی ہی تحریر کی

مالک تھیں جن میں روحوں کو قابو کرنے کے بہت سے عملیات تھے۔ آہ...... واقعی، میں نے اپنی آدھی زندگی ان کتابوں کے حصول میں سرگرداں کی ہے۔ میں اب یہ بات بھی جانتا ہوں کہ نیکسن لیور اس کی تلاش میں ہے۔ آہا...... نیکسن لیور یہی شخص ہوسکتا ہے۔ اُفوہ...... میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ اس نے تو میرا زبردست تعاقب کیا ہے۔ بڑی خطرناک شخصیت کا مالک ہے وہ بھی۔ وہ سائے کی طرح اس کے تعاقب میں لگا رہا ہے لیکن اس سے پہلے اوسیانوس نے اس پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ صدیوں سے لوگ جن کے پاس ایک یا دو حصے موجود تھے۔ جادوئی عمل کر رہے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ نیگال سیمورس چیز ہی دوسری ہے۔ اس کے حصول کے لئے صدیوں سے انسان ناکام ہو رہے ہیں۔ سفلی عمل اور کالے جادو میں اوسیانوس کو جو مہارت حاصل تھی کسی اور کو نہیں ملی۔ اور صرف وہی اس عمل میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ لیکن اس کے لئے اسے وہ کتابیں ملنا ضروری تھیں جو اب بقول اس شخص کے نیکسن لیور کے قبضے میں پہنچ چکی ہیں۔ آہ...... کیا نیکسن لیور اس سے پہلے ان کتابوں کے عملیات کے ذریعے وہ قوتیں حاصل کرے گا جن کی اسے ضرورت تھی؟ لیکن کچھ بھی ہے، اب اس شخص کو تلاش کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کتابوں کے ذریعے عمل کر کے نیگال سیمورس حاصل کرے، کتابیں اس سے چھین لی جائیں۔ وہ ساحر تھا، سفلی عمل کا ماہر۔ اور صرف موت سے بچنے کے لئے ان کتابوں کے حصول کے لئے سرگرداں رہا تھا تاکہ نیگال سیمورس حاصل کر کے اپنے مرض کا علاج دریافت کر سکے۔ اور آخر کار وہ ان نایاب کتابوں کا مالک بن گیا تھا۔

اچانک ہی اوسیانوس چونک پڑا۔ اسے نیچے سڑک پر شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پتہ نہیں کون تھا۔ لوگ بھی چیخ رہے تھے۔ اور پھر کسی شخص کے بھاگتے ہوئے آنے کی آواز زینے کی طرف سنائی دی اور نجانے کیوں اوسیانوس چونک پڑا۔ وہ ساحر تھا اور اسے کم از کم اپنے لئے پیش آنے والے کسی خطرے کا بروقت احساس ہو جاتا تھا۔ اس نے سحر کی آنکھوں سے دیکھا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ڈولمین ہے۔ وہی ڈولمین جس سے وہ خوفزدہ ہے۔ نجانے کس طرح وہ اس کا پتہ پا گیا تھا غالباً اس نے اسے سان گیرٹ کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یہاں تک آتے ہوئے بھی۔

بھاری قدموں کی چاپ قریب سے قریب تر آتی سنائی دے رہی تھی اور اچانک ہی اسے

خطرے کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کمرے میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ اگر وہ اس راستے سے باہر نکلا تو سیدھا ڈولمین کے سامنے پہنچ جائے گا۔ فرش پر سوتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں ملنے لگا اچانک ہی اوسیانوس نے پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور جھک کر پھرتی سے سان گیرٹ کی لکڑی والی ٹانگ اٹھالی۔ اسی وقت دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور کوئی غضب ناک لہجے میں دہاڑا۔

"کتے کے بچے! ذلیل جادوگر، کہاں تک بھاگ سکتا ہے تو مجھ سے آخر کار تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی تھی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اوسیانوس دیوار سے لگ کر دروازے کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا اس نے لکڑی کی مصنوعی ٹانگ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی۔

"کہاں مر گیا ہے تو جادوگر! تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے۔ سمجھا تیری موت۔" اور اس کے بعد اچانک ہی اس نے پوری قوت سے لکڑی کی بھاری اور مصنوعی ٹانگ گھما دی اور فضا میں ایک کرب ناک چیخ گونج کر رہ گئی۔

اس کے بعد ایک دم سے بھگدڑ سی مچ گئی اور رازل جریری نے شہباز سے کہا۔

"آؤ...... کہانی تو ابھی بہت لمبی ہے۔ ہمیں بہت دور تک اس کہانی کے ساتھ سفر کرنا ہے۔

یہ ایک نئی دنیا تھی۔ شہباز کے لئے انوکھی اور اجنبی، رازل جریری اسے وہاں لے آیا تھا اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرا خیال ہے تم ذہنی طور پر بہت تھک گئے ہو۔ کیا چاہتے ہو مجھے جواب دو۔''

''جو واقعات اس وقت پیش آ رہے ہیں اور جس انداز میں آپ مجھے ان کا تجزیہ کرا رہے ہیں۔ وہ تو بہت ہی دلچسپ اور میرا خیال ہے انتہائی پراسرار ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا آخر یہ قصے کیا ہیں۔''

''یہی تو خوبی ہے اس تمام واقعہ کی کہ انتہائی دلچسپ ہونے کے باوجود بھی اس طرح الجھا ہوا ہے جیسے پتنگ کی ڈور اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ اصل میں یہ اونٹ ہی سب سے مشکل چیز ہوتی ہے۔ یہ بیٹھ جائے تو صورتحال کا صحیح معنوں میں پتہ چلتا ہے۔ ورنہ انسان ڈانواں ڈول ہی رہتا ہے۔ آؤ میرا خیال ہے تھوڑا سا وقت خاموشی سے گزارو اور دنیا کی دلچسپیوں میں حصہ لو۔ ورنہ یہ واقعات تمہارے ذہن کی چولیں ہلا دیں گے۔ ہم ذرا ماحول کو تبدیل کرتے ہیں۔ رازل جریری ایک فراخدل انسان تھا اپنے مقصد کے حصول کے بعد وہ کافی خوش مزاج بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''اگر ہم اپنے اپنے جسم حاصل کر لیں تو ہمیں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ لیکن بس کچھ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ویسے شہباز میں تم سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس کا صحیح انداز میں جواب دو گے۔''

''بھلا اس کا کیا امکان ہے کہ میں آپ کی کسی بات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کروں۔''

''دنیا کی دلچسپیوں میں کیا تم صنف مخالف کی قربت کے لیے خواہش مند ہو۔ میرا مطلب ہے ایسے دلکش اور کومل بدن جنہیں تم اپنی قربت میں لانا چاہتے ہو۔ شہباز نے ایک لمحے کے لیے گردن جھکائی پھر کسی قدر سرد لہجے میں بولا۔

''عجیب سا سوال ہے مجھے واقعی آپ کے سامنے اس کا جواب دیتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی تک اس طرف راغب نہیں ہوا ہوں۔ میری زندگی میں کئی ایسے کردار آئے جنہوں نے میرے دل کے تاروں کو چھونے کی کوشش کی لیکن نجانے کیوں میں ان کے قریب سے ہو کر گزر گیا یا پھر کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ وہ میرے قریب سے ہو کر گزر گئے اور میں انہیں چھو بھی نہ سکا۔''

''زندگی کو ایک مرکز پر قائم رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔ جسمانی ضرورتیں بے شک ہوتی ہیں لیکن کسی بھی چیز کو حاصل کر لو گے تو اس کے بعد اس کی دلکشی ختم ہو جائے گی۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔''

''نہیں۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق یہ عمل کروں گا۔''

''تو پھر بہتر ہے کہ جسموں سے دور رہ کر روحوں کی آزادی سے فائدہ اٹھاؤ اور تھوڑا سا وقت اپنی خوشگوار کیفیت کے مطابق گزارنے کے بعد دوبارہ آگے بڑھیں گے۔''

''لیکن بات تو نیگال سمورس کی ہے۔ کیا بات ہم یہاں پر چھوڑ دیں گے۔''

''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، بالکل نہیں بھلا اس کا کیا سوال ہے۔ یہ نیگال سمورس تو ہماری اولین کوشش ہے اور ہم خود بھی اس کے حصول کے لیے اسی طرح سرگرداں ہیں جس طرح بے وقوف شخص جو یہ سمجھ رہا ہے کہ اس نے اپنے بدترین دشمن ڈولمین کو ہلاک کر دیا ہے۔ کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہے وہ اصل میں اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہر شخص ذہانت میں مکمل نہیں ہوتا چاہے وہ کالا علم حاصل کر لے یا کچھ بھی۔''

''تو کیا...... تو کیا...... ڈول مین جو تاریکی میں......''

''ہاں اس نے نشانہ ڈولمین کو ہی بنایا تھا لیکن...... لیکن اس کا نشانہ ڈولمین نہیں بن سکا بلکہ وہ شخص یعنی سان گیرٹ......'' رازل جریری نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شہباز نے چکراتے ہوئے دماغ کے ساتھ سوچا کہ دیکھو زندگی کیسے کیسے انوکھے کھیل کھیلتی ہے لیکن بہرحال حصول کے لیے جو ہنگامہ آرائی ہوئی تھی یا اس سے پہلے جو سارے کام ہوئے تھے یعنی ملکوں سے باقاعدہ محاذ آرائی اور اس میں کامیابی وہ اپنی جگہ بہترین نوعیت کی مالک تھی لیکن نیگال سمورس کے لیے جو کھیل شروع ہوا تھا وہ ان تمام داستانوں میں سب سے زیادہ پراسرار کھیل تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت خود رازل جریری اپنے دوسرے

معاملات سے نمٹنے کے بعد شہباز کے ساتھ تھا اور وہ لوگ صرف ایک تماشائی بنے ہوئے تھے لیکن کسی بھی وقت اس کھیل میں داخل ہونے کے لیے تیار۔ رازل جریری نے شہباز کو بتایا تھا۔

''ہاں...... سان گیرٹ کی رہائش گاہ پر پہنچنے والا شخص ڈولمین ہی تھا لیکن تاریکی کی وجہ سے اور پھر تقدیر کی خوبی سے ڈولمین اوسیانوس کے وار سے بچ گیا۔ لکڑی کی اس ٹانگ نے درحقیقت سان گیرٹ کو ختم کر دیا یہ ایک دلچسپ المیہ ہے تمہیں یہ لفظ بہت عجیب محسوس ہوگا کہ کسی المیے کو دلچسپ کہا جا رہا ہے لیکن جس کہانی کا آغاز ہوا ہے وہ ایک انتہائی دلچسپ کہانی ہے۔ نیگال سمورس اچانک ہی ایک عجیب سی حیثیت اختیار کر گیا ہے اس سے پہلے بھی اس کے لیے کوششیں ہوتی رہیں ہیں لیکن اچانک ہی جو طوفان برپا ہوا ہے وہ دلچسپی کا حامل ہے ویسے دیدور ہونے کا مزہ ہی الگ ہے۔ البتہ میں اب ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔''

''کیا......'' شہباز نے اپنے استاد محترم سے پوچھا۔ فیاض شاہ اور شبیلا کو کنٹری پہنچانے کے بعد شہباز کے اندر ایک انوکھا اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے اس کائنات میں اس نے اپنا مقام حاصل کر لیا ہو۔ حالانکہ کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی رازل جریری نے اسے ہر جگہ باقاعدہ مقام دیا تھا اور صرف اپنے معاملات پر توجہ رکھنے کے علاوہ اس پر کوئی پابندی بھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ لمحے کبھی نہ بھلانے والے تھے جب اس نے فیاض شاہ اور شبیلا کو کنٹری میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز دیکھا تھا۔ لوگ ان کے سامنے اس طرح آ کر جھکتے تھے جیسے وہ اس آبادی کے مالک ہوں۔ فیاض شاہ وہاں لوگوں کو اپنے بارے میں بتاتا تھا بہت سے ایسے تھے جو بے شک بوڑھے ہو گئے تھے لیکن انہیں رحیم شاہ اور فیاض شاہ کا دور یاد تھا اور وہ اس کے بارے میں تذکرہ کرتے تھے۔ رازل جریری نے کہا۔

''اور بات اس جگہ آ کر رکی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اوسیانوس جو انتہائی چالاک شخص ہے اور جو نیگال سمورس کی تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے اور وہ درحقیقت ایک بہت ہی خطرناک شخصیت کا مالک ہے۔ تمہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اب وہ ان کتابوں کے حصول کے لیے کیا کرتا ہے اور اپنے خطرناک دشمن جس سے وہ خوفزدہ ہے یعنی ڈولمین اس کے لیے کیا کرتا ہے۔ چنانچہ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنا جسم حاصل کر لو میں تمہیں تمہارا جسم فراہم کیے دیتا ہوں۔ تم زندگی کو

اپنے طور پر دیکھو۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ نیگال سمورس کے حصول کے لیے اوسیانوس کیا کر رہا ہے۔ ویسے ایک دلچسپ بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ نیگال سمورس کا خواہش مند کورنیلیس بھی ہے اور کورنیلیس اپنی زندگی کی بقا کے لئے نیگال سمورس کا حصول چاہتا ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ کون کہاں تک جا سکتا ہے۔ ہم تو صرف یہ دیکھیں گے کہ نیگال سمورس تک پہنچنے والے کون ہوتے ہیں اور جہاں بھی ہم اپنی مداخلت کی ضرورت محسوس کریں گے وہاں اپنے قدم آگے بڑھا دیں گے۔''

شہباز نے اس پر بھی آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ رازل جریری نے اس سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اور میرے بچے میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ زندگی کو اپنی پسند سے دیکھو کسی ایسی بات کو نظر انداز نہ کرو تو تمہیں لطف دے سکے۔ میرا خیال ہے ایک بزرگ کے لیے اپنے بچوں سے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے شہباز نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔

✪......✪
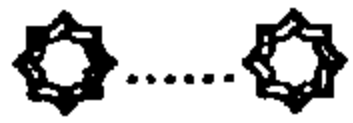
پینتیس سالہ راب جرکن بہت زیادہ افسردہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخص تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے شہرت کے حصول کے لئے زندگی میں کوئی ایک کام نہیں کیا تھا زمانہ طالب علمی میں وہ شطرنج کا ایک ایسا ماہر تھا جس کے بارے میں دنیا حیران تھی یعنی اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے شطرنج کے کئی عالمی مقابلے جیتے تھے اس کے بعد تھوڑا سا بڑا ہوا تو ربی کی جانب مائل ہو گیا اور ربی کے کھیل میں ایک انتہائی شہرت یافتہ کھلاڑی کے طور پر دنیا اسے جاننے لگی۔ اس نے عدل کا پیشہ اپنایا اور ایک جسٹس کی حیثیت سے اتنا مشہور ہوا کہ اسے سر کا خطاب ملا اور اب حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ ضرورت سے زیادہ معزز شخصیات میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اس وقت وہ بہت افسردہ تھا۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ سر میں شدید درد تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بستر پر آرام سے لیٹ کر سو جائے لیکن یہ آرام کا وقت نہیں تھا۔ اس کی افسردگی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے صبح برستے ہوئے پانی میں تقریباً بیس ہزار کے مجمع کے درمیان کھڑے ہو کر جیل کے سامنے ایک چودہ سالہ لڑکے کی پھانسی کا المناک منظر دیکھا تھا اور بہت ہی غمزدہ تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب اس لڑکے کا غمزدہ باپ اس کے مطالعہ کے کمرے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ راب مرکن کی افسردگی کی وجہ باپ

کے چہرے پر بیٹے کی موت کا غم تھا اور وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک مخصوص مشروب تیار کر کے اس کا ایک گلاس سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو پیش کیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں ڈولمین میرے دوست! آہ کاش میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا۔ ویسے مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں مجھے تمہیں نہیں بلانا چاہیے تھا کیونکہ تم تو خود غمزدہ ہو لیکن میرا تجسس۔''

''آپ کی یاد آوری کا شکریہ سر! میں دوسرے کاموں میں اتنا مصروف تھا کہ آپ کا پیغام مجھے دیر سے ملا۔ مجھے اندازہ ہے کہ میری آمد سے آپ کو اور مسز کو تکلیف ہوئی ہوگی کیونکہ میں خاصا لیٹ آیا ہوں۔ ڈولمین نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ابھی تو صرف آٹھ بجے ہیں اور تمہاری آمد سے کسی زحمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میں تو خود بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''آپ کی بہت مہربانی۔ لڑکے کی تحسین و تدفین میں تو وقت لگنا ہی تھا۔ یہ ایک اس قدر مشکل اور افسردہ کر دینے والا کام تھا۔ آپ کو اس کا اندازہ ہے۔'' راب جرکن نے نگاہیں اٹھا کر ڈولمین کو دیکھا دیو قامت شخص جو جسمانی طور پر اب بھی ایک پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ اس کی عمر اڑتالیس برس کے قریب ہوگی لیکن اس کا دیو قامت جسم فولاد کی طرح گٹھا ہوا تھا۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی اس نے اپنے بھرے ہوئے آہنی بازوؤں کو سمیٹ کر رکھا تھا وہ ننگے مکوں سے مقابلہ کرنے والا اس دور کا سب سے نامی گرامی باکسر تھا اور اب لاتعداد نوجوان باکسروں کو تربیت دیا کرتا تھا۔ راب جرکن ڈولمین کی حیثیت سے اس کی بڑی عزت کرتا تھا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ راب جرکن اس وقت مقامی لوگوں میں امیر ترین شخص تصور کیا جاتا تھا لیکن ایک ہمدرد اور دل سوز انسان ہونے کی حیثیت سے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ واقعی دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ جس شخص نے ڈولمین کی بیوی کو قتل کیا تھا اسی نے ڈولمین کے بے گناہ لڑکے کو اپنے دوسرے قتل کے الزام میں پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ ایک بدترین المیہ تھا۔ واقعی ڈولمین کے خلاف اس سے زیادہ گھناؤنی سازش اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اوسیانوس درحقیقت شیطان کا دوسرا نام تھا۔ اگر وہ شیطان سے مقابلہ کر رہا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ شخص بے

پناہ قوت کا مالک ہے قسمت کی ستم ظریفیوں پر کس طرح سر جھکائے بیٹھا ہے۔ ڈولمین کا چہرہ بھی بل ڈاگ کی طرح خطرناک تھا۔ اس کا سر جو ہمیشہ بالوں سے صاف رہتا تھا تاکہ مخالف اس کے بال نہ پکڑ سکے اس وقت یہ سر چمک رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے لے کر چہرے تک زخموں کے لاتعداد نشانات تھے۔ ناک مسلسل چوٹیں کھا کھا کر چپٹی ہو چکی تھی۔ گردن تو جیسے نظر ہی نہیں آتی تھی بس شانوں پر رکھی ہوئی تھی۔ داہنے پیر میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی اور جسم کسی گینڈے کی طرح چست اور سخت تھا۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت میں بڑا وقار اور جاذبیت تھی اور اس حیرت انگیز شخص کی آواز گردن پر مسلسل چوٹوں کی وجہ سے بے حد نرم اور دھیمی ہو گئی تھی۔ اس وقت اس نے سیاہ رنگ کا لانگ کوٹ پہن رکھا تھا جو اپنے بے گناہ بیٹے کی موت پر سوگ کی علامت تھا۔ اس غمزدہ اور نرم دل آدمی کو دھوکا دینا یا دشمن بنانا موت کے مترادف تھا۔ ویسے بھی ان دنوں وہ مکے بازی، شمشیر زنی اور خنجر کے استعمال کی تربیت دینا چاہتا تھا اور یہ بات صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں تھی۔ یہ فن اس نے وراثت میں پایا تھا اور اس کا تعلق باکسروں کے ایک مشہور خاندان سے تھا وہ بے حد ذہین اور صاف گو تھا۔ حالانکہ اس نے کسی مدرسے سے تعلیم نہیں حاصل کی تھی پھر بھی وہ علم سے بے بہرہ نہیں تھا اور پھر اس کو باکسنگ کے رنگ نے زندہ رہنے کا فن بھی سکھا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس پیشے نے اسے مجرموں کی زیر زمین دنیا کے متعلق جو معلومات دی تھیں وہ ایک بیش قیمت خزانہ تھیں اور یہ بات راب جرکن اچھی طرح جانتا تھا کہ ان تمام تر خوبیوں کے باوجود ڈولمین بے حد ایماندار اور دیانت دار شخص ہے۔''

''میں نے اپنے بچے سے وعدہ کیا تھا مسٹر راب جرکن! اس نے پھانسی سے پہلے کہا تھا کہ وعدہ کرو ڈیڈ! کہ تم مردہ چوروں کو میری لاش چرانے کا موقع نہیں دو گے میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد وہ میری لاش قبر سے چوری کر کے ان بے رحم ڈاکٹروں کو فروخت کر دیں جو اسے چیر پھاڑ کر اپنے تجربات کرتے ہیں۔ مجھے مرنے کے بعد کی اس چیر پھاڑ سے بڑا خوف محسوس ہوتا ہے۔ ایک انوکھی فرمائش تھی ایک عجیب و غریب بات تھی جو دل دکھانے والی بھی تھی اور حیران کن بھی راب جرکن نے سوچا کہ دیکھو کیسے کیسے عجیب و غریب مناظر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ ڈولمین نے ایک سفید رومال نکال کر آنسو پونچھے اور بولا۔

''اور میں نے اپنے بچے کے تابوت میں چونا بھر دیا تھا اور اب اگر وہ اس کا تابوت کھود

کر نکال بھی لیں گے تو انہیں کچھ نہیں ملے گا۔'' ڈولمین کے ان انوکھے الفاظ پر راب جرکن کے پورے بدن میں شدید سنسنی دوڑ گئی۔ اس کی نگاہوں میں پھانسی کا وہ منظر پھر گیا، جسے دیکھنے کے لیے ہزاروں تماشائی جمع ہو گئے تھے اور ان میں وہ مردہ چور بھی ہوں گے جن کا ذریعہ معاش تازہ لاشوں کو قبر سے نکال کر تجربہ کرنے والے ڈاکٹروں کے ہاتھوں فروخت کرنا تھا۔ اچانک ہی راب جرکن کو کچھ خیال آیا اور اس نے کہا۔

''وہ جو قتل ہوا یعنی جس کے قتل کا الزام تمہارے بیٹے پر لگایا گیا۔ میری مراد سان گیرٹ سے ہے۔ اس کے ساتھ لڑکے بھی تو ہوا کرتے تھے کیا تم نے ان لڑکوں سے دوبارہ بات کی تھی۔''

''ہاں۔ لیکن وہ کوئی روشنی نہ ڈال سکے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ میرے بچے نے سان گیرٹ کا سر اس کی مصنوعی ٹانگ سے پاش پاش کر دیا اور پھر دوسرے لڑکے کے سر میں بھی گولی ماردی تاکہ وہ گولی نہ مار سکے یہ خوفناک گواہی میرے بچے کی موت کا سبب بن گئی۔''

''اور وہ کمرے میں بیٹھا اونگھتا رہا تاکہ پولیس آ کر اسے گرفتار کرے۔'' راب جرکن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔

''بعض اوقات پولیس کتنے غلط فیصلے کرتی ہے۔ حالانکہ یہ یقین کر لینا چاہیے تھا کہ تمہارا بیٹا کسی بھی طور قاتل نہیں ہو سکتا۔ ویسے تو ہمیں اس بات کا علم ہے ہمیں سے مراد تم اور تمہارے ذریعے یہ ساری حرکت اس شیطان کی ہے جس کا نام اوسیانوس ہے۔ اوسیانوس انتہائی شیطانی قوتوں کا مالک ہے اس نے پہلے سان گیرٹ کو قتل کیا اور پھر تمہارے بیٹے کے پستول سے اس کے ساتھ لڑکے کو بھی ہلاک کر دیا اور یقینی طور پر تمہارے لڑکے کو ہپناٹائز کر کے چھوڑ دیا۔ سو فیصدی ایسی ہی بات ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تمہارے بیٹے کا اصل قاتل اوسیانوس ہی ہے۔ اپنے تمام تر تجربے کی بنیاد پر میں اوسیانوس کو اس کا قاتل قرار دیتا ہوں۔''

''میں اس کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دوں گا۔ میں اسے بالکل نہیں چھوڑوں گا۔ میری زندگی کا اصل مقصد اسے قتل کر دینا ہے اور اب میں اس کی تلاش میں ایک ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں مجھے اس کے مل جانے کی امید ہے۔''

''کام بے حد خطرناک ہے ڈولمین! اصل میں اوسیانوس جسمانی طور پر تمہارا بالکل

مدمقابل نہیں ہے لیکن اس کم بخت کے پاس شیطانی قوتیں ہیں۔ وہ بہت خطرناک دشمن ہے کیونکہ اس کے پاس بدی کی قوتیں بھی ہیں۔ وہ ساحر ہے حالانکہ عمل تقویم اور روحانیات کا تھوڑا بہت علم مجھے بھی ہے لیکن توبہ توبہ اوسیانوس وہ تو شیطان کا دست راست ہے کیا سمجھے۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو نجانے کیسی کیسی شکلوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ آہ...... میرے خدا دنیا کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے وہ۔''

''وہ جو کچھ بھی ہے سر! لیکن میں اسے قتل کر کے چھوڑوں گا۔''

''بے شک اسے قتل کرنا تم پر فرض ہو چکا ہے۔ انصاف نے تمہارا ساتھ نہیں دیا یہ بات میں جانتا ہوں۔ قانون نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے لیکن قانون تو ہمیشہ ہی مفلوج ہوتا ہے وہ صرف ثبوتوں کی روشنی میں کام کرتا ہے۔ بہرحال میری تمام تر ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں اور میں تمہیں اسی لیے زحمت دے رہا ہوں کہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں سر! آپ ہمیشہ میرے محسن رہے ہیں۔ آپ نے پہلے بھی میری بہت مدد کی ہے میرے پاس تو اپنے بیٹے کے لیے وکیل کرنے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے تمام اخراجات خود اٹھائے ہیں اور بیماری کے عالم میں آپ اس سے ملنے جیل بھی گئے تھے۔ میں آپ کا بہت احسان مند ہوں اور مزید زحمت دینے کی ہمت نہیں کرتا۔''

''میرے پیارے دوست ڈولمین! میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیا ہے۔ بہت کچھ کیا ہے میں نے۔ کسی نے گوئٹے سے کہا تھا کہ وہ حد سے زیادہ محنت کیوں کرتا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ آرام کرنے کے لیے دوسری حیات اب بھی پڑی ہے پھر حیات فانی کو کیوں ضائع کیا جائے۔ گوئٹے کی اس بات سے میں بھی مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ کیا سمجھے نجانے راب جرکن پر کیا کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کسی قدرے بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا پھر اس کی آواز ابھری۔

''تم جانتے ہو۔ میں تمہاری مدد کیوں کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس لیے کہ آپ ایک اچھے محسن ہیں۔''

''نہیں۔ میں اس لیے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے احسان کا کچھ تو بدلہ چکا سکوں۔''

"میرا احسان۔ میں نے تو کبھی آپ پر احسان نہیں کیا ہے مسٹر راب جرکن۔" ڈولمین نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔

"نہیں۔تم چونکہ ایک اچھے اور محبت کرنے والے انسان ہو۔ بے شک تمہارا پیشہ کچھ بھی ہے جبکہ وہ برا نہیں ہے لیکن تمہارے اندر انسانیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔تم نے یقیناً یہ بات یاد نہیں رکھی ہوگی کہ چار سال پہلے کی بات ہے دسمبر کی ایک سرد ترین رات جب میرے دونوں بچے سکول سے واپس آ رہے تھے وہ راستے پر پڑی برف سے ہنستے کھیلتے چلے آ رہے تھے کہ اچانک جرائم پیشہ لڑکوں کے گروہ نے ان پر حملہ کر دیا۔ اگر تم بروقت نہ پہنچ جاتے تو نجانے میرے بچوں کا کیا حشر ہوتا۔ ڈولمین گردن جھٹکنے لگا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"نہیں سر نہیں۔ اسی وقت میری ملاقات اپنے بچے سے بھی ہوئی تھی۔ وہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ میں تھا۔ میرا بیٹا جو بہت چھوٹی عمر کا تھا جسے اپنے والدین کا پتہ نہیں تھا بہت چھوٹی عمر میں گم ہو گیا تھا اور اگر آپ اس بات کو ایک بنیادی حیثیت دیتے ہیں تو میں تو کہوں گا کہ آپ کے احسانات کا سلسلہ وہیں سے جاری ہو گیا تھا وہ بچپن میں گم ہو گیا تھا اور اس روز محض اتفاقاً مل گیا تھا۔ کیا یہ کم بات ہے آہ...... لیکن وہ ملا تو بہت ہی مختصر عرصے کے لیے۔ کاش! میری اور اس کی ملاقات کا یہ وقت طویل ہوتا۔" ڈولمین کے لہجے میں بھراہٹ پیدا ہو گئی۔

"کچھ بھی ہے میں تمہارا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کروں گا۔"

"آپ کی محبت ہے سر! لیکن آپ نے اس کے صلے کے لیے بھی تو بہت کچھ کیا ہے اب کہاں یہ وقت ہے کہ ان باتوں کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔ بھلا یہ کوئی بھولنے کی بات ہے کہ آپ نے میری اکیڈمی میں ایسے معزز اور مشہور لوگوں کو تربیت کے لیے بھیجا جن کے شہرت سے میری عزت افزائی ہوئی اور انہوں نے مجھے فراخدلی سے معاوضہ ادا کیا اس لیے میرا آپ پر کوئی احسان نہیں ہے۔" راب جرکن نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ معزز لوگوں کی بات بھی خوب رہی مسٹر ڈولمین معزز اور مشہور لوگوں سے جتنے تعلقات تمہارے ہیں میرے نہیں ہیں۔تم کسر نفسی سے کام لے رہے ہو۔ تمہارے ذاتی تعلقات اتنے مشہور مشہور لوگوں سے ہیں کہ میں ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" بہرحال مجھے بے پناہ افسوس ہے اور کچھ بھی ہو جائے میں تمہارے احسانات کو نظرانداز نہیں

کر سکتا۔

"اس وقت ان احسانات کا کیا تذکرہ ہے جناب! میں تو بس۔"

"نہیں تذکرہ ہے۔" نجانے کیوں مسٹر راب جرکن اس طرح کی باتیں کر رہے تھے اس سے وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتے تھے یا پھر بس یونہی انہوں نے کہا۔

"اور اس کے علاوہ تم نے میرے بیٹے کو بھی بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ وہ اپنے ہم عمروں میں بہترین باکسر شمار ہوتا ہے اس کے لیے میں تمہارا ممنون ہوں۔"

"آہ...... میں نے اپنے بیٹے کو بھی بہت کچھ سکھایا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو باکسنگ میں میرا نام روشن کرتا لیکن وہ شیطان کا بچہ خدا اسے غارت کرے اس نے اسے نوجوانی میں ہی پھانسی کے پھندے پر لٹکوا دیا۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے ڈولمین! ویسے مجھے اوسیانوس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیلات بتاؤ تاکہ میں بھی اس شیطان صفت آدمی سے واقف ہو سکوں۔"

"میں اس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر رہا ہوں جناب! اور جہاں تک میری تازہ ترین معلومات کا تعلق ہے وہ اس وقت ملک سے باہر نکل چکا ہے۔ شاید وہ اس وقت اوکلو کے لیے چل پڑا ہے۔ اوکلو میں تھیٹر کے ان اداکاروں کے ساتھ جواب اوکلو میں روانہ ہو چکے ہیں۔ ویسے جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اوکلو میں وہ نیو تھیٹر میں کام کرتے ہیں پتہ نہیں اس شخص کے کیا تعلقات ہیں۔ یہ ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے جبکہ میرا جہاں تک خیال ہے میں اس کے بارے میں اوکلو میں زیادہ معلومات حاصل کر سکتا ہوں کیونکہ آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں ہو گا جناب! کہ میری بیوی بھی اداکاراؤں کے اسی گروپ کے ساتھ کام کرتی تھی جس میں وہ شامل ہوا ہے۔

"آہ...... یہ بات مجھے کبھی تم نے کسی وقت بتائی تھی۔ مجھے یاد ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤ کہ کیا اس بات کے امکانات نہیں ہیں کہ اس نے تمہیں دھوکہ دیا ہو۔ یعنی تم پر یہ کاری ضربیں لگانے کے بعد وہ غائب ہو گیا ہو۔"

"نہیں سر! میرا خیال ہے کہ وہ جا چکا ہے۔ اصل میں سان گیرٹ کے ساتھ جو لڑکے کام کرتے ہیں وہ اس قدر تیز اور چالاک ہو چکے ہیں کہ اب معمولی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ بات بھی طے ہے کہ وہ سان گیرٹ سے محبت بھی کرتے تھے اور ان میں سے بے شمار کو یہ

بات معلوم ہے کہ اوسیانوس ان کے استاد کا قاتل ہے وہ خود بھی اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ سان گیرٹ بھی بہت چالاک تھا اس نے ایک لڑکے کو باقاعدہ اس شخص کے تعاقب پر لگا دیا تھا اس لڑکے نے اوسیانوس کو ہارلے اسٹریٹ کے اس سرجن کے ہاں دیکھا تھا جو بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس سلسلے کا ایک اہم ترین کردار ہے۔ یعنی سرجن کورلینیس ہم اسے سرجن کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ سرجن نہیں ہے۔ بہر حال میں خود اس ڈاکٹر سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اوکلو کا باشندہ ہے اور کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ چند دنوں کا مہمان ہے اور اپنے کسی خاص مقصد کے لئے وہ بھی اوکلو جا رہا ہے۔

''اور میں جانتا ہوں یہ بھی جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ کورلینیس کو بھی نیگال سمورس کی تلاش ہے کیا ہی الجھی ہوئی بات ہے کیا حیران کن۔''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جناب! لیکن ایک بات......'' اچانک ہی ڈولمین خاموش ہو کر جرکن کی صورت دیکھنے لگا۔ راب جرکن کو یوں محسوس ہوا جیسے ڈولمین کی خاموشی میں کوئی خاص بات چھپی ہوئی ہو۔ ڈولمین کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''لیکن سر! آپ اس کے بارے میں اتنا زیادہ کیسے جانتے ہیں۔'' جواب میں راب جرکن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''بہت سے راز، راز ہی رہ جانا بہتر ہوتے ہیں تم یہ سمجھ لو کہ میری معلومات بھی اس سلسلے میں خاصی ہیں۔ میں یہ بات جانتا ہوں کہ اوسیانوس کسی نہ کسی طرح اسے بھی نقصان پہنچائے گا۔ کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ کورلینیس کو وہ کتابیں مل چکی ہیں، جن کی تلاش میں اوسیانوس ہے۔''

''ہوں۔ اوسیانوس کبھی نیگال سمورس کے چکر کو نہیں چھوڑے گا اس جیسے شیطان کے لیے نیگال سمورس بھی زندگی کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح کورلینیس کے لیے۔''

''میری بیوی بھی یہی کہتی تھی سر!'' ڈولمین نے کہا اور اس کے حلق سے سسکیاں سی نکل گئیں۔ ڈولمین کی بائیس سالہ بیوی ریٹا درحقیقت بہت حسین تھی اور اس کے سنہری بال کمر سے نیچے تک لمبے تھے وہ خود بھی تھیٹر کی اداکارہ تھی اور اسی طرح اس کی ملاقات تھیٹر ہی کے حوالے سے اوسیانوس سے ہوئی تھی جس نے بھیانک طریقے سے اسے قتل کر دیا کیونکہ اس نے اوسیانوس کا راز معلوم کر لیا تھا۔ درحقیقت راب جرکن ڈولمین کے اس غم سے بہت زیادہ

متاثر تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا میز کی دراز سے کھول کر اس نے دو زرد رنگ کے لفافے اور سیاہ رنگ کی چمڑے کی ایک پیٹی نکالی اور ڈولمین کے قریب پہنچ گیا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا ڈیئر ڈولمین کہ میں تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے تمہارے غم کا بھرپور احساس ہے۔ یہ صرف تمہارا ہی حوصلہ ہے جو اتنے صدمے کے باوجود حواس میں ہو۔ میں تمہارا شریک غم ہوں اور اسے اپنے پاس رکھو۔ اس نے لفافے اور پیٹی اس کی سمت بڑھا دی۔ ڈولمین نے پیٹی کا وزن محسوس کیا وہ کافی بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ پیٹی دوہری ہے اور اس کے اندر کی سمت پاکٹ بنے ہوئے ہیں انہیں کھول کر دیکھو۔'' ڈولمین نے اندرونی پاکٹ کھولے تو اس نے دیکھا کہ یہ سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے ہیں اور سونے کے بسکٹ انتہائی قیمتی تھے ڈولمین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! میں اتنی بڑی رقم نہیں لے سکتا میں تو ساری زندگی ان کی ادائیگی نہیں کر سکوں گا۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں سر! لیکن......''

''نہیں ڈولمین! یہ رقم تمہیں قبول کرنا ہوگی۔ اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں اسے تم میرے بچوں کی جان بچانے کے سلسلے میں ایک حقیر سا تحفہ تصور کر سکتے ہو۔''

''آہ......سر! میں ایک لالچی آدمی نہیں ہوں اور میں......''

''مائی ڈیئر! ڈولمین خوش قسمتی سے میں اس قابل ہوں کہ تمہارے کام آسکوں اس لیے اب اس مسئلے پر بحث بے کار ہے اب غور سے میری بات سنو۔ میں اوکلو میں رہ چکا ہوں لیکن تم کبھی نہیں گئے۔ یہ وحشی اور پسماندہ جاہلوں کی سرزمین ہے جہاں نہ کوئی تہذیب ہے اور نہ کوئی سکہ۔ مجھے اچھی طرح اس کے بارے میں علم ہے سمجھے۔ وہاں کرنسی نہیں ہے وہاں لوگ سونے کے عوض خرید و فروخت کرتے ہیں۔ کاغذ کے کچھ نوٹ رائج ہیں وہاں لیکن لوگ اسے لینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ قومی حکومت، شہری حکومت، بینک، ریلوے لائن یہاں تک کہ دولت مند لوگ اپنی الگ الگ کرنسی رائج کیے ہوئے ہیں اور اس میں اس کرنسی کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن اس نئی دنیا میں سونے کی بہت قدر ہے اور پیارے دوست اب تمہارے پاس سونے کے معقول ذخیرہ ہے اور تم میری دولت میں حصہ بنانے کے جائز حق دار ہو کیونکہ میرے پاس بے انتہا دولت ہے لوگ کہتے ہیں کہ میں آج تک دنیا کے دولت مند لوگوں میں شمار ہوتا ہوں۔ بہر حال میرے دوست تم اب انکار نہیں کرو گے۔ یہ رقم اب تمہاری ہے تم

اسے واپس کرنے کا خیال بھی مت کرنا۔'' ڈولمین کی آنکھیں احساس تشکر سے بھر آئیں اس نے آہستہ سے لہجے میں کہا۔

''میں نے سوچا تھا کہ اپنی اکیڈمی فروخت کردوں گا۔''

''تم نے قرض حاصل کرنے کا فیصلہ بھی تھا کسی یہودی سے میں ٹھیک کہتا ہوں نا۔''

ڈولمین کو واقعی حیرت ہوئی اور اب راب جرکن جیسا معروف آدمی اس کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات کیسے رکھتا ہے اور کیوں رکھتا ہے کیا صرف کسی احسان مندی کے جذبے کے تحت پر، ذرا تعجب خیز بات تھی۔ اسی وقت راب جرکن نے کہا۔

''لیکن اب تمہیں کسی قرضے کی ضرورت نہیں ہے میرا خیال ہے تمہاری وہاں کی ضروریات کے لیے یہ رقم کافی ہوگی۔ تمہیں بحری جہاز سے سفر کرنا ہوگا یہ مشہور جہاز اسی ہفتے روانہ ہونے والا ہے اوکلو جانے کے لیے اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوگا۔ میں بھی اسی جہاز سے جس کا نام بینڈوس ہے اوکلو گیا تھا۔''

''سر! آپ مجھ پر اتنے احسانات کر رہے ہیں کہ میں ان کا صلہ نہیں ادا کر سکتا۔'' سادہ دل ڈولمین نے کہا۔ درحقیقت وہ سادہ دل آدمی تھا ایک انتہائی طاقتور اور پیشہ ور باکسر ہونیکے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے ایک نرم دل کا مالک اور طبعیت کا سادہ لوح بنایا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خود راب جرکن کے دل میں کوئی ایسی بات ہو۔ مثلاً جب ساری دنیا نیگال سمورس کے لیے سرگرم عمل تھی اور یہ جانتے تھے وہ لوگ یعنی جو نیگال سمورس کے لیے سرگرداں تھے کہ نیگال سمورس کو حاصل کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان پر فتح حاصل کر لی جائے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کوئی انسان اس کے ذریعے اور اس سے ملاقات کر کے بہت کچھ کر سکتا تھا۔

بہر حال اس نے اس انداز میں نہیں سوچا اور وہ پیٹی اور وہ چیزیں قبول کرتا ہوا بولا۔

''سر! میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں ادا کر سکتا۔''

''ٹھیک۔ سفر میں دو ہفتے لگیں گے۔ اگر سمندر پرسکون رہا تو اور بھی کم وقت لگ سکتا ہے اب ان لفافوں کو دیکھو ان میں سے ایک لفافہ ایک تعارفی خط ایک شخص گورتھم کے نام ہے ایک چھوٹے سے اخبار کا پرنٹر اور ایڈیٹر ہے یہ اخبار اوکلو کے غیر ملکی باشندوں کے لیے شائع ہوتا ہے یہ شخص تمہیں ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے گا اور اس سے میرے نام پر تم ہر قسم کا

تعاون طلب کر سکتے ہو اور یہ دوسرا خط ایک اور شخص کے نام ہے جس سے تم ملو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ میں ابھی تمہیں اس کا نام نہیں بتانا چاہتا لیکن اس کے بارے میں ساری تفصیلات بتائے دیتا ہوں جب تم اس سے ملو گے تو تم ایک زندگی کے نئے تجربے سے دوچار ہو گے۔ وہ بہت ہی منفرد قسم کا انسان ہے۔ اوکلو میں وہ تمہارے اس قدر کام آ سکتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سمجھ رہے ہو نا۔''

''جی سر۔''

''وہ اوکلو کی پسماندہ بستیوں میں بسنے والے جرائم پیشہ افراد کی رگ رگ سے واقف ہے وہاں کے تھیٹر کی دنیا ہو یا روحانیات یا جادوگروں کا حلقہ۔ وہ ہر ایک کے بارے میں باخبر رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بھی تاریکیوں کا مکین ہے لیکن اوسیانوس کی طرح نہیں یوں سمجھو اس نے تمام تاریکیوں کو اپنے ذہن میں سمیٹ لیا ہے۔ اپنی روح میں بسا لیا ہے اور وہ اس تاریک دنیا کے بہت بھیانک پہلو سے اچھی طرح واقف ہے لیکن وہ بہت ہی عجیب وغریب قسم کا انسان ہے۔''

بہر حال میرا خیال ہے وہ ان خفیہ ٹھکانوں سے ضرور واقف ہوگا جہاں تمہیں اوسیانوس مل سکتا ہے سمجھ رہے ہو نا تم۔ بہر حال میرا تعارفی خط پڑھ کر وہ تم سے ہر ممکن کوشش کرے گا میں تمہیں بہت اچھے لوگوں کے راستے بتا رہا ہوں جو اوکلو میں تمہارے کام آئیں گے۔''

''شکریہ سر۔'' ڈولمین نے آہستہ سے کہا۔

''ایک بات اور مائی ڈیئر ڈولمین! اس پیٹی کو ذرا اپنی کمر سے باندھو۔'' راب جرکن نے ایک عجیب سی فرمائش کی اور ڈولمین اسے مطمئن کرنے لگا۔ پیٹی اس کی کمر سے بالکل فٹ تھی تو راب جرکن نے کہا۔

''تم اس بکل کو دیکھ رہے ہو یہ عام پیٹیوں کی طرح نہیں لگتا۔ بلکہ اندر لگے ہوئے اس ہک میں لگتا ہے۔ اب ذرا اس بکل کو پکڑ کر زور سے کھینچو، ہاں اسی طرح۔'' جب ڈولمین نے یہ بکل کھینچا تو ایک چھوٹا سا تیز دھار خنجر باہر نکل آیا اور ڈولمین چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ راب جرکن۔ بے اختیار مسکرا دیا پھر بولا۔

''قتل وغارت گری اوکلو کے باشندوں کا پرانا مشغلہ ہے۔ میں نے یہ بیلٹ اٹلی میں خریدی تھی یہ تو تم جانتے ہو کہ اٹلی کے لوگ خنجر اور چاقو کے استعمال میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ ہتھیار تمہارے کام آئے گا۔''

"ایک بار میں پھر شکریہ ادا کرتا ہوں سر۔" ڈولمین نے کہا اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور ایک خوبصورت سی عورت اندر داخل ہوگئی۔ وہ بھاری بھر کم جسم کی صحت مند عورت تھی اور گود میں ایک بڑے بڑے بالوں والے سفید کتے کو لیے ہوئے تھی۔

"اوہ۔ ڈیئر ڈولمین تم۔" اس نے کہا۔ ڈولمین نے جلدی سے خنجر کو چھپالیا یہ راب جرکن کی بیوی تھی۔ میاں بیوی سرگوشی میں باتیں کرنے لگے پھر راب جرکن نے فکر مند نظروں سے ڈولمین کو دیکھا۔

"میری بیوی کہتی ہے کہ کتا بار بار بھونک رہا تھا انہوں نے تین آدمیوں کو کئی بار مکان کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے اور اب وہ تینوں سڑک پار پارک میں چلے گئے ہیں۔"

"اوسیانوس کے آدمی۔" ڈولمین نے چونک کر کہا۔

"کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ اوسیانوس ہی کے آدمی ہو سکتے ہیں۔" راب جرکن اس کے قریب آکر بولا۔

"مسز جرکن آپ نے ان تینوں کو غور سے دیکھا ہے کیا ان میں اسے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی سی لائٹین تھی اور وہ دسرا جو بڑا ہیٹ پہنے ہوئے ہے۔ ایک بہت لمبی موٹی لاٹھی لیے ہوئے تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ اوہ میرے خدا تم نے تو ان کا صحیح نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ مسز جرکن حیران ہوکر بولیں۔

"تب وہ یقیناً اوسیانوس کے آدمی ہیں۔ پھانسی کے بعد سے وہ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں مجھے افسوس ہے کہ وہ میری وجہ سے یہاں تک پہنچ گئے۔"

"لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ۔" نجانے کیوں راب جرکن کے لہجے میں ایک خوف سا ابھر آیا۔

"ہاں۔ جو حلیہ میں نے بتایا اور جس کی تصدیق کی گئی اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ او یانوس کے آدمی ہی ہیں۔"

"تب پھر تم یہاں رکو میں پولیس کو مطلع کرتا ہوں۔"

"نہیں سر۔" ڈولمین نے اپنی سیاہ فلیٹ ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ صرف میری تلاش میں ہیں اور میں اس سے خود نمٹ لوں گا۔"

"لیکن وہ تین ہیں ڈیئر ڈولمین۔"

"بدمعاشوں کو ٹھیک کرنا میرا پیشہ ہے سر!" ڈولمین نے کہا۔ "اور پھر ممکن ہے ان میں سے کوئی مجھے اوسیانوس کا پتہ بھی بتا دے۔"

"میرے دوست! میرا خیال ہے مجھے پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔"

"نہیں سر! آپ ایسی کوئی کوشش نہ کریں گے اور ویسے بھی آپ پولیس سے آخر اس بارے میں کہیں گے کیا۔ میرا خیال ہے آپ انہیں مجھ پر چھوڑ دیں انہیں آپ کے گھر تک نہیں آنا چاہیے تھا اور اب میرے لئے ضروری ہے کہ آپ کی سلامتی کے لیے میں انہیں ٹھکانے لگا دوں۔"

"خدا تمہیں کامیاب کرے ڈولمین۔" راب جرکن نے فکر مند لہجے میں کہا اور ڈولمین نے گردن خم کی اور اس کے بعد مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

✿......✿

اب تک جس طرح بھی زندگی گزاری تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاید کبھی کسی وقت شہباز کے اندر وہ کیفیت نہ پیدا ہو سکے۔ اپنے جسم کے ساتھ وہ ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں مقیم تھا اور وہاں اسے ہر طرح کی آسائش اور آسانیاں حاصل تھیں۔ رازل جریری معمول کے مطابق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے نادیدہ شکل میں غائب ہو چکا تھا شہباز جب بھی اس پراسرار وجود کے بارے میں سوچتا تو ہزاروں خیالات اس کے دل میں گردش کرنے لگتے آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ رازل جریری دنیا بھر کی پراسرار قوتیں اپنے پاس جمع کر لینا چاہتا تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا مقصد برا نہیں تھا۔ اب تک وہ ایک محب انسانیت شخص کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا تھا اور اس کے اس کردار پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن بہرحال ہر چیز کا کہیں نہ کہیں اختتام تو ضرور ہوتا ہے۔ یہ شخص اپنی منزل پر کب اور کہاں پہنچے ا اس کے علاوہ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی عمر کی انتہا کیا ہے وہ جس پراسرار علوم کے حصول کے لیے مستقل طور پر سرگرداں تھا اس سے تو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ خود بھی ایک لمبے عرصے کی زندگی جینا چاہتا ہے۔ کیا وہ ایک طویل زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ امکانات تھے اس بات کے لیکن کیا ایک طویل زندگی بہتر ہوتی ہے۔ خیال تو یہ ہے کہ وہ زندگی بے مقصد اور بے کار ہو جاتی ہے۔

بہرحال ابھی تو میری زندگی کا آغاز ہوا ہے آگے چل کر دیکھتا ہوں کہ صورتحال کیا رہتی ہے اور میں کتنے عرصے رازل جریری کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شیطان کو یاد کرو تو شیطان فوراً موجود ہو جاتا ہے۔ رازل جریری شیطان تو نہیں تھا لیکن اس وقت اس کی آمد کچھ ایسی ہی تھی۔ نادیدہ شکل میں ہی تھا۔ اچانک ہی شہباز کو اس کی آمد کا احساس ہوا تھا۔

''ہیلو۔'' رازل جریری کی آواز ابھری اور شہباز ایک دم سے چونک پڑا۔

''میں جانتا ہوں تمہیں میری آمد کا علم ہو چکا ہے حالانکہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تم کو ایک طویل عرصہ یہاں پر گزارنے کا موقع دوں گا لیکن صورتحال بعض اوقات ایسی اچانک ہو جاتی ہیں جس کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ اس دوران کی مختصر کہانی یہ ہے کہ اس رات جب ہم نے دیکھا کہ اوسیانوس نے سان گیرٹ کو پکڑ لیا اور اس سے ان کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا اور یہ بھی پتہ چلا ہمیں کہ وہ کتابیں ایک ایسے شخص کورلینیس کے پاس پہنچ گئی ہیں جو کینسر کا مریض ہے اور کتابوں کے جادو سے وہ اپنی زندگی بچانا چاہتا ہے گویا ایک ایسا شخص جو جادوگری کر کے یا یہ سمجھ لو کہ نیگال سمورس حاصل کر کے جینے کا خواہش مند ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ قابل رحم بھی ہے اور خطرناک بھی۔ خطرناک اس لیے کہ جب زندگی، موت سے ہمکنار ہونے لگتی ہے تو انسان یہ سوچتا ہے کہ جب موت ہی گلے لگانی ہے تو زندگی کی کوششیں کیوں نہ کی جاتی رہیں اسی صورت میں وہ اوسیانوس کے لیے بہت زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے یعنی اگر کبھی ان دونوں کا سامنا ہو جائے تو اوسیانوس کو دانتوں پسینے آ جائیں گے یہ الگ بات ہے کہ وہ انتہائی خطرناک آدمی ہے خیر تو اب جو صورتحال ہے اس کی تفصیل اتنی سی ہے کہ اوسیانوس نے سان گیرٹ کو اس کی مصنوعی ٹانگ سے قتل کر دیا اور پھر ڈولمین جو اپنی بیوی کے قتل کے بعد وحشی درندے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہاں پہنچا تو اس نے ایک اور لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور اس کا الزام ڈولمین کے بیٹے پر لگا دیا۔ کم سن نوجوان کو دو افراد کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا اور جج نے مختصر سماعتوں کے بعد اسے موت کی سزا سنا دی۔ ڈولمین کو تو ایک طرح سے یوں سمجھ لو کہ تباہ کر دیا گیا۔ اوسیانوس کی دشمنی اسے اس قدر مہنگی پڑی کہ ڈولمین نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور ویسے بھی وہ ایک سیدھا سچا اور شریف آدمی ہے اب اس کے دل میں صرف انتقام پل رہا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اوسیانوس کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے اور اوسیانوس اپنی تگ و دو میں مصروف ہے وہ جانتا ہے ڈولمین ایک انتہائی خطرناک آدمی ہے اب میں یہ نہیں جانتا کہ ان تمام تر قوتوں کے باوجود اوسیانوس ڈولمین سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہے۔ حالانکہ وہ ڈولمین پر حاوی ہو سکتا ہے۔ بہرحال ڈولمین اس کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ اوسیانوس اس دوران ایک ایسے تھیٹر گروپ کے دوران اوکلو

نامی ملک نکل گیا تھا۔ اوکلو جسے دنیا کے نقشے پر مجرموں کا ملک کہا جاتا ہے۔ اوسیانوس اس تھیٹر گروپ کے ساتھ وہاں پہنچ چکا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈولمین بھی برابر اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ ڈولمین کی مدد ایک شخص نے کی ہے جس کے اور ڈولمین کے درمیان بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ خیر باقی ساری باتیں تو اپنی جگہ ہمارے علم میں ایک شخص آیا جس کا نام ڈیگال گوریل ہے۔ یہ ڈیگال کوریل انتہائی پراسرار کردار ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ یہ بہت سے کام کرتا ہے۔ اخباروں کی رپوٹنگ بھی کرتا ہے لیکن بذات خود ایک بوسیدہ علاقے میں رہتا ہے اور کوئی نہیں جانتا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے۔ میں بھی نہیں جانتا اور اس وقت میری توجہ کا مرکز یہی شخص ہے۔ تو بات تم نے سن لی ہمارا ٹارگٹ اوسیانوس ہے جو نیگال سمورس کے حصول کے لیے ایسی بھرپور کوششیں کر رہا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آخر کار وہ نیگال سمورس تک پہنچ ہی جائے گا اور شہباز! کیا کہتے ہو تم بجائے اس کے کہ ہم خود بذات خود نیگال سمورس کے لیے دیوانہ جدوجہد کریں کیوں نہ اس بار کسی دوسرے کی کوششوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور دوسرا بھی وہ خود ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور مجرمانہ طریقے سے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

''میں نے تو پہلے بھی کبھی آپ کے کسی عمل سے انحراف نہیں کیا سر! اور اب بھی نہیں کرنا چاہتا۔''

''تمہیں اپنا جسم چھوڑنا پڑے گا کیونکہ ہمیں نادیدہ انداز میں سفر کرنا ہے۔''

''بھلا مجھے کیا اعتراض ہے لیکن اس کے لیے تمارتر۔''

''ہاں ہاں اس کی تو تم فکر ہی مت کرو میں تمہارے جسم کے تحفظ کی مکمل ذمے داری لیتا ہوں۔'' رازل جریری نے کہا۔

☆......☆

اور یہاں ایک نئی کہانی اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ چوڑے چکلے بدن والا مکروہ صورت آدمی جس نے وہ لاش دو دن قبل قبر سے چوری کی تھی۔ اس لاش کو بھاری معاوضے کے لیے چھپائے ہوئے تھا اور اس وقت وہ ڈیگال کوریل کے سامنے موجود تھا۔ ڈیگال کوریل نے سرد لہجے میں کہا۔

''مجھے اس بات کا ثبوت چاہیے کہ لاش واقعی تمہارے پاس موجود ہے۔ میں تمہاری

بات پر بھروسہ کر کے اس کی بیوہ کو رقم ادا کر دینے کی ہدایت نہیں کر سکتا۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ میرا اپنا ایک باعزت مقام ہے۔''

مسٹر ڈیگال کوریل ہم عزت دار لوگوں کے ہی زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔ ہم تمہیں بھی قتل کر کے اس کی لاش کے ساتھ دفن کر سکتے ہیں اس طرح تم اطمینان سے یہ تصدیق کر لو گے کہ لاش ہمارے قبضے میں ہے یا نہیں اور ایک بات اور ذہن میں رکھنا اگر تم نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو میں تمہیں اتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتاروں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' یوں لگا جیسے ڈیگال کوریل کو اس کے یہ الفاظ انتہائی مضحکہ خیز محسوس ہوئے ہوں اس نے مسکرانا چاہا لیکن نجانے کیوں اپنی مسکراہٹ دبا گیا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔

''میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' اس کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہونے تھے کہ سامنے کھڑے ہوئے شخص نے اپنے پستول کی نال ڈیگال کوریل کی کنپٹی سے لگا دی اور بولا۔

''اب یہ اندازہ ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے پستول کا ٹریگر دبایا کلک کی آواز آئی لیکن گولی نہیں چلی۔

''ایک لاکھ ڈالی مائی ڈیئر ڈیگال کوریل اور نقد سونے کے سکے میں سامنے والے شخص کے زرد دانتوں میں سرخ داڑھی کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ ڈیگال کوریل کے چہرے سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس خوفناک آدمی سے یہ خوفزدہ ہے یا ڈر نہیں رہا۔ اس نے اپنی بیک کی چھڑی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا پھر اس نے کہا۔

''تم ایک لاش کی بہت بڑی قیمت طلب کر رہے ہو۔'' وہ شخص جو اس کے سامنے موجود تھا اور جس کا نام شاید ہیگ تھا یا پھر کچھ اور اس کی زبان شراب کے نشے سے لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے شراب بھری آواز میں کہا۔

''اور ڈیئر ڈیگال کوریل! تمہیں عورتوں کے دل کا بہتر طور پر اندازہ ہونا چاہیے۔ اس عورت کو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی۔ بلکہ سچ پوچھو تو تم دونوں کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے اس زمین پر ہی اس کی لاش تمہارے حوالے کرنے پر رضامند ہوں ورنہ اس سے دوسری دنیا میں ہی ملاقات ممکن تھی۔ یہ کہہ کر اس شخص نے ایک ہذیانی سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

''لاش چور کے ساتھ...... مگر نہیں چھوڑو۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا

نجانے کیوں وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا ڈیگال کوریل کی آنکھوں میں ایک لمحے
کے لیے نفرت کے نقوش ابھرے۔ لیکن وہ ان خوف ناک لوگوں کی موجودگی کو برداشت کر
رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ان تینوں پر نگاہ ڈالی۔ ہیگ کی زبان شراب کے نشے سے
لڑکھڑا رہی تھی۔ یہی شخص ان کا سرغنہ تھا۔ پستہ قد اور صرف داڑھی کے ساتھ اس کی آنکھوں
میں شیطان جیسی چمک تھی۔ اس کا ہرے رنگ کا میلا اوور کوٹ کسی فرش کی جھاڑن کی طرح
گندا تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے پستول کے علاوہ اس نے ایک تیز دھار کا بڑا سا خنجر
بھی سنبھالا ہوا تھا۔ ڈیگال کوریل جانتا تھا کہ وہ ایک پیشہ ور قاتل ہے اور جب وہ نشے میں
ہو پھر تو بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کوریل نے اسے چوتھی بوتل پیتے ہوئے دیکھا تھا۔
رم، بیئر اور شکر ملی شراب انتہائی بدمزہ ہوتی تھی لیکن ہیگ جیسے شخص کی کیفیت اس کے علاوہ
اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں گہرے نشے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ کوریل اس شدید
ٹھٹھرا دینے والی سردی کے موسم میں ایک گھٹیا سی شراب کی دکان میں بیٹھا ہوا تھا جو فائیو
پوائنٹ کے گندے علاقے میں تھی یہ تنگ و تاریک اور غلیظ بستی بدترین جرائم پیشہ افراد کا
مسکن تھی اور یہ تنگ و تاریک جگہ جہاں ڈیگال کوریل اس وقت بیٹھا ہوا تھا تہہ خانے کی
طرح سرد اور بدبودار تھی اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لاش چور بھی اتنے ہی غلیظ تھے۔
انہوں نے جس عورت کے شوہر کی لاش قبر سے چوری کر لی تھی اس کو واپس حاصل کرنے
کے لیے معاوضے کی رقم یہاں طے کرنے آیا تھا اور نجانے اس عورت سے ڈیگال کوریل کا
کیا رشتہ تھا۔ یقیناً کوئی ایسی ہی جذباتی کیفیت ہو گی جس کی وجہ سے وہ ان خطرناک لوگوں
کے درمیان اس گھٹیا سے شراب خانے میں آ گیا تھا حالانکہ اس کے بارے میں رازل
جریری کا علم بھی کچھ نہیں تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں رازل جریری اس قدر
اہمیت دے کر ان کی اصلیت تک نہ سمجھ پائے۔

بہرحال اس عورت کا ڈیگال کوریل سے کیا رابطہ تھا۔ یہ بھی ایک پراسرار کہانی تھی لیکن
ہیگ نے اندر آنے والی دس سالہ کم سن اور پیشہ ور لڑکی کو مسکرا کر دیکھا اور پھر اس کو مخاطب
کر کے بولا۔

"کیا کہتے ہو ڈیگال کوریل! یہ بات ہم جانتے ہیں کہ وہ عورت اپنے شوہر کی لاش
غائب ہو جانے پر بہت رنجیدہ ہے۔"

"غائب نہیں۔ چوری ہو جانے پر۔" ڈیگال کوریل نے فوراً ہی کہا اور ہیگ اسے خونی
نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر شیطانی انداز میں مسکرا دیا اور بولا۔

"ہاں سنا ہے کہ تم بہت زہریلی زبان رکھتے ہو لیکن میرے پاس زبانوں کا ایک ذخیرہ
ہے۔ صرف لفظوں کے طور پر نہیں حقیقت کے طور پر میں نے انہیں ایک ایسے سیال میں ڈبو
رکھا ہے جس میں وہ گلتی سڑتی ہیں۔ یہ زبانیں انہی لوگوں کی ہیں جو بہت زیادہ زہریلی
زبانیں رکھتے تھے اور میں نے انہیں کاٹ دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن بہرحال لاش بھی چوری ہی کی گئی ہے۔ کیا سمجھے اور اگر تم اس بات
سے مجھے خوفزدہ کرنا چاہو کہ میں صحیح لفظ بھی استعمال نہ کروں تو یہ تمہاری حماقت ہے میری
نہیں ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے قتل کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرو گے۔ سمجھے۔"
جواب میں ہیگ ہنس پڑا پھر بولا۔

"ہاں۔ ہیگ، ٹام لوڑی اور سل ویسٹر ہم تینوں آئرلینڈ کے بدترین مجرم اور قاتل تھے
اور ہم اپنا سفر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ان دنوں اوکلو میں ہمارا قیام ہے اور ہم نے یہ کام
بڑی محنت کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ لاش کی چوری سے وہ عورت بے حد خوفزدہ ہے۔"

"خیر اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے غیر مشروط مطالبے تسلیم کرنے یہاں
نہیں آیا ہوں کسی شرط کو تسلیم کرنے سے پہلے تمہیں یہ اطمینان دلانا لازمی ہے کہ لاش واقعی
تمہارے پاس ہے یا نہیں۔"

"اوہ ہیگ! تم اس کی باتیں اتنے سکون کے ساتھ سن رہے ہو میں اس بات سے سخت
بے چین ہوں۔ کیا یہ شخص ہمیں نہیں جانتا۔" ہیگ کے ایک بدکار ساتھی نے کہا جس کے
بارے میں مشہور تھا کہ وہ خطرناک زانی ہے اور اس کا شکار ہمیشہ کم عمر لڑکیاں ہوتی ہیں۔
لیکن ہیگ نے اس موقع پر نجانے کیوں مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... تم ڈیگال کوریل کو نہیں جانتے؟ ایک پراسرار شخصیت انتہائی پراسرار جس کے
بارے میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی اصلیت کیا ہے لیکن دیکھو کس طرح اتنے بڑے
بڑے لوگ کسی نہ کسی جال میں پھنس جاتے ہیں میرا خیال ہے یہ اس عورت سے محبت کرتا
ہے۔ جس کے شوہر کی لاش ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نام ہو بھی نہیں
سکتا۔ چلو خیر ٹھیک ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ ڈیگال کوریل کون ہے مسٹر

ڈیگال کوریل یہ تو آپ کا مسئلہ ہے کہ آپ کس طرح اس عورت سے رابطہ قائم کرتے ہیں لیکن اس بات کی آپ کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی کہ ہم نے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب کیا یعنی آپ کا۔ آپ اس سلسلے میں ہمارے اور اس کے درمیان رابطہ بن سکتے ہیں۔''

ڈیگال کوریل جو کچھ بھی تھا اس کی شخصیت کو اگر پراسرار کہا جاتا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا وہ جو کچھ بھی تھا بہرحال وہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن اس وقت کی صورتحال خاصی مختلف تھی۔ ڈیگال کوریل کی شخصیت کے بارے میں نجانے کیسے کیسے اوہام تھے جو اس بارے میں عجیب وغریب انداز میں سوچتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھی ڈیگال کوریل اپنی تحریروں کے ذریعے ہنگامہ آرائی کر دیتا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اوکلو کی حکومت کئی بار ڈیگال کوریل کے آرٹیکل کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔ ایک دو بار ڈیگال کوریل پر قاتلانہ حملے بھی ہو چکے تھے لیکن وہ دوہری شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی تحریری شخصیت اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتی تھی اور جب وہ بالکل خاموش بیٹھا ہوتا تھا تو لوگ اسے بھول جاتے تھے۔ پتہ نہیں اس کی شخصیت کا یہ دوسرا روپ کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بظاہر تنگ دست بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ مالی طور پر بالکل کھوکھلا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ برے لوگوں سے تعاون نہیں کرتا۔ ڈیگال کوریل کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ ذہنی پریشانی کہیں اسے بھی اس کی بہن روزائی کی طرح پاگل نہ کر دیں۔ اس کو اس بات کا شدید دکھ تھا کہ اسے اس کی اصل جگہ نہیں دی گئی۔ جب اس کی چہیتی بیوی بہت کم عمری میں اچانک مر گئی اور اس کے بعد ماں اور سوتیلی ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو ڈیگال کوریل حد سے زیادہ شراب پینے لگا۔ لیکن بہرحال نجانے کس طرح سیرین نے اسے سہارا دیا۔ سیرین وہ عورت تھی جس کے مرحوم شوہر کی لاش واپس حاصل کرنے کی غرض سے وہ یہاں آیا تھا اور ان بدترین مجرموں سے معاملہ طے کرنا تھا۔ یہ بھی خیال دوستوں کے حلقوں میں موجود تھا کہ وہ سیرین سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔

دفعتاً سامنے بیٹھے ہوئے شخص جسے دیکھ کر ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ یعنی ہیگ نے غراتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے۔'' اس نے جیب سے ایک مڑا ہوا پن نکال کر

اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ سونے کا بنا ہوا یہ خوشنما پن بہت قیمتی تھا۔ اس پر مڑا ہوا ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔

''یہ لاش کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ ڈیگال کوریل نے بے اختیار اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہیگ نے اس کے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے لیکن یہ تمہاری چہیتی میڈم کا ہے میں تمہیں دکھاتا ہوں۔'' پھر اس نے پن کے اوپر بنا ہوا لاکٹ کھولا اندر سیرین اور اس کے شوہر کی ننھی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔

''اور اگر تم مزید ثبوت چاہتے ہو تو یہ دیکھو۔'' اس نے میز کے نیچے رکھے ہوئے ایک گندے سے تھیلے کو ٹھوکر لگائی پھر اپنے ساتھی کی طرف رخ کر کے بولا۔

''ذرا اس شخص کو نیچے دکھاؤ۔ دیکھو تم بھی اس منحوس شکل کو دیکھ لو کیا اب بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے۔ ڈیگال کوریل نے نیچے جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ لاش کی کٹی ہوئی گردن تھیلے میں رکھی ہوئی تھی اور سو فیصدی سیرین کے شوہر کا سر تھا جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ڈیگال کوریل کے چہرے پر کئی رنگ آئے سفیدی، پیلاہٹ، نیلاہٹ یہ منظر بڑا بھیانک تھا۔ لاش چرانے والوں نے سر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

ہاں اب کیا کہتے ہو مائی ڈیئر ڈیگال کوریل! کیا اس کے بعد بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔ کوریل سکتے میں تھا اور پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے اس بھیانک منظر کو دیکھے جا رہا تھا۔ ہیگ کے ایک ساتھی نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''میرے دوست! ڈیگال کو اب یقین آ جانا چاہیے۔''

✡......✡

ڈولمین نے نفرت سے فرش پر پڑے ہوئے ڈیگال کوریل کو دیکھا تو دل چاہا کہ کوریل کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کرے۔ پتہ نہیں کوریل اس وقت شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا یا پھر اس کے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے اس نے اس کے ہوش وحواس چھین لیے تھے۔ وہ بے ہوشی جیسے عالم میں فرش پر پڑے ہوئے اخبارات میں لیٹا ہوا تھا۔ تنگ وتاریک اور سرد کمرے میں اس کا سکڑا ہوا جسم عجیب وغریب منظر پیش کر رہا تھا۔ اس جسم پر میلے کچیلے

کپڑے غلاف کی طرح چڑھے ہوئے معلوم ہوئے تھے۔ ڈولمین نے پہلی بار اس کو دیکھا تھا اور اسے سخت مایوسی ہوئی تھی ایک گندے اور شرابی شخص کے لیے جو ایک زندہ لاش کی طرح فرش پر بے حس وحرکت پڑا ہے اس نے اتنا لمبا سفر طے کیا ہے۔

وہ نیڈوسا سے اترتے ہی گھوڑا گاڑی کر کے اوکلو کے اس علاقے میں پہنچا تھا جہاں ڈیگال کوریل کے مل جانے کے امکانات تھے۔ اس نے اوکلو شہر کی حالت زار دیکھی تھی۔ صبح کے دھندلکے میں سڑک کے کنارے گیس لیمپ جل رہے تھے۔ برف باری ہو رہی تھی اور سڑک کی جمی برف گیس کی روشنی میں خوبصورت لگ رہی تھی لیکن دونوں طرف بنے ہوئے لکڑی کے مکانات کے سامنے پڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھنے والا تعفن نا قابل برداشت تھا ہر سمت غلاظت کے ڈھیر اور کیچڑ تھی۔ اتنی دیر میں ڈولمین کو اس بدبودار شہر سے نفرت ہو گئی تھی۔

بہر حال اس کا کام تھا کہ اوسیانوس کو تلاش کرے اور اسے قتل کر کے یہاں سے فوراً روانہ ہو جائے۔

”یہ سوتے میں کیا بڑبڑا رہا تھا۔“ نجانے کس طرح ڈولمین کے منہ سے یہ الفاظ نکلے لیکن اسی وقت عقب سے آواز آئی۔

”مسٹر ڈیگال کوریل اسی طرح سوتے میں بڑبڑانے کے عادی ہیں۔“ یہ آواز اس چودہ پندرہ سالہ لڑکے کی تھی جو اچانک ہی اندر داخل ہوا تھا۔ ڈولمین نے چونک کر اس لڑکے کو دیکھا اور ایک لمحے میں سنبھل کر خاموش ہو گیا۔

”میں سامنے والے ہوٹل میں کام کرتا ہوں جناب! اور اکثر ان کے لیے کھانے پینے کی اشیاء لاتا ہوں۔ دیکھیے اس وقت بھی میرے پاس چائے کے برتن ہیں لیکن مسٹر ڈیگال کوریل......“ وہ لڑکا خاموش ہو گیا۔

”بکواس مت کرو یہ بتاؤ کہ اسے ہوش کب آئے گا۔“

”بس...... سر زیادہ دیر نہیں گزری مسٹر کوریل کو ایک گھوڑا گاڑی والا یہاں چھوڑ گیا ہے۔ وہ اکثر کبھی کبھی اسی طرح آجاتے ہیں لیکن اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ نشے کے عالم میں ہیں یا بے ہوشی کے عالم میں۔ ویسے جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ سو رہے ہیں۔“

”یہ ہلکی ہلکی بدبو کہاں سے اٹھ رہی ہے۔“

”یہیں سے سر! یہ شہر کا گندہ ترین علاقہ ہے بڑی بھیانک اور غلیظ آبادی ہے اس علاقے میں زیادہ تر آئیرش جرائم پیشہ رہتے ہیں۔“

”ہوں...... گویا اوکلو پر بھی آئیرش باشندوں کا قبضہ ہے۔“

”جی سر! اٹھارہ سو اڑتالیس کے قحط میں لاکھوں تو مر گئے اور لاکھوں دوسرے ممالک کی طرح یہاں آکر پناہ گزیں ہو گئے۔“

”مگر تم مسٹر ڈیگال کوریل سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہو۔ کچھ بتا سکتے ہو یہ کتنی دیر میں ہوش میں آجائیں گے۔“

”آپ آرام کریں سر! میرا تو خیال ہے اب یہ دیر میں ہوش میں آئیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے لیے گرم گرم کافی لے آؤں۔“

”نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔“ ویسے آپ اطمینان رکھیں میں یہاں آپ کے تمام کام کروں گا میری تو ذمے داری بھی یہ ہے۔

”ٹھیک ہے میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کروں گا۔ میں اس کا مہمان ہوں اور بہت دور سے آیا ہوں۔“

”مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔“ لڑکے نے کہا اور ڈولمین اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جو خوابگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا نجانے کیوں اسے اس وقت ڈیگال کوریل کو دیکھ کر ایک ایسا شخص یاد آ گیا جب ایک رات وہ اس کے قدموں میں اس طرح بے بس پڑا ہوا تھا چونکہ ڈولمین نے اس کا گلہ کاٹ دیا تھا۔ کمرے میں جا کر ڈولمین بستر پر لیٹ گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک خواب جیسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور ذہن کسی انوکھے منظر میں کھو گیا تھا۔ وہ نرم نرم گیلی گھاس پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ برستے ہوئے پانی میں اس کی آنکھیں تاریک رات میں گھور رہی تھیں جہاں کہیں وہ تینوں آدمی اس کا تعاقب کرتے ہوئے پارک میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے اپنے لمبے چوڑے کوٹ میں چہرے اور جسم کو چھپا رکھا تھا اور وہ تاریکی کا ایک حصہ بن گیا ہے اور کچھ ہی قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا شخص بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا کچھ دیر کے بعد اس نے تینوں قاتلوں کو مختلف سمتوں میں خود کو تلاش کرتے دیکھ لیا تب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑبڑاتی آواز میں کہا۔

"مجھے قتل کرنے آئے ہو میری جان! آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔"

"ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد اسے تلاش کرو۔" اور ڈولمین نے اس کی آواز پہچان لی جس کا نام ہارٹی تھا اور جوان تینوں افراد میں سرغنہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لالٹین پکڑ لی تھی۔ یہ لالٹین درحقیقت اس کا ایک خطرناک ہتھیار تھی۔ وہ اچانک اپنے شکار کی آنکھوں پر اس کی روشنی ڈال کر اسے چکا چوند کر دیتا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکے ہارٹی کا خنجر اس کا حلقوم چاک کر دیتا تھا۔ مقتول کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب ایک خوفناک ہتھیار اس کی گردن کو چھو کر گزر گیا۔

"نجانے کمبخت اس چڑیا گھر میں کیوں آیا ہے ہوسکتا ہے وہ کسی جانور کے کمرے میں چھپ گیا ہو۔ یہ آواز ٹینکر کی تھی جس کی ایک آنکھ نجانے کب غائب ہو چکی تھی۔ اس شخص نے اپنا ٹوپی والا پستول لانگ کوٹ کے اندر چھپا رکھا تھا تاکہ بھیگ نہ سکے۔

"وہ کہیں بھی ہو تلاش کر کے جلد از جلد ٹھکانے لگا دو۔ ہمیں اس بارش میں ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے اتنا بھاری معاوضہ نہیں دیا گیا ہے۔ ہارٹی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے تیسرے ساتھی کو آواز دی۔

"بگ! تم کہاں مر گئے۔" ڈولمین اس دراز قد قاتل کو بخوبی جانتا تھا۔ البانیہ کا رہنے والا بدمعاش بڑا ظالم تھا۔ اس کے سارے بال سفید تھے اور وہ ہر وقت ایک لمبی سی بھاری لاٹھی کندھے پر اس طرح لیے رہتا جیسے وہ بندوق ہو۔ وہ تاریکی میں گاہکوں کی تلاش میں بھٹکنے والی پیشہ ور عورتوں کو لوٹنے کا عادی تھا اور اسے عورتوں پر تشدد کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

"میں یہاں ہوں ماسٹر!" تاریکی میں آواز ابھری۔ ڈولمین کو یوں لگا جیسے سفید بالوں والا یہ قاتل اسے گھور رہا ہو اور جیسے اس نے اسے دیکھ لیا ہو۔ ہارٹی نے ڈولمین کے برابر والے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"تم ادھر تلاش کرو۔ ہم نے اسے اسی سمت آتے ہوئے دیکھا ہے۔ کم بخت نجانے کہاں مر گیا۔ ڈولمین اپنی جگہ لیٹا ہوا ان تینوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اس خنجر پر پہنچ گیا تھا جو اس کے پاس موجود تھا۔

"بلا کی سردی ہے" اکلوتی آنکھ والے نے اپنی آنکھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"سردی۔" ہارٹی غرایا۔

"اگر اس کا کام نہ کر سکے تو تمہیں ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا جائے گا۔ ہارٹی کے لمبے لمبے بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ڈولمین کو جانتا تھا حالانکہ کبھی دونوں میں لڑائی نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے اور ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ڈولمین جانتا تھا کہ ہارٹی کرائے کا قاتل ہے اور ایک کرائے کا قاتل جس قدر کمینہ فطرت کا مالک ہوسکتا ہے۔ ہارٹی اس سے بھی کہیں زیادہ کمینہ تھا۔

"اگر وہ اس تاریکی میں نہ مل سکا تو ہم کیا کریں گے۔" آواز ابھری۔

"تو اس کے بعد ہمیں اس کا نیا ٹھکانہ معلوم کرنا پڑے گا۔ ویسے اس سلسلے میں ہماری مدد مسٹر...... چھوڑو...... ہمیں نام نہیں لینا چاہیے۔ میں راب جرکن کی بات کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال راب جرکن ہمارا مددگار ہوسکتا ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اس کے ایک آدھ بچے کو ختم کرنا ضروری ہو جائے گا۔ ڈولمین کا خون غصے سے کھول اٹھا۔ اس کا بہترین دوست، اس کا محسن، اس کا عظیم ساتھی جو ہمیشہ ہی اس کے کام آ سکتا تھا اور آتا رہا تھا اچانک اس کے پورے جسم میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا سیاہ اوورکوٹ بائیں ہاتھ میں لے لیا تھا دوسرے لمحے اس نے دوڑ لگا کر اپنا یہ اوورکوٹ چشم کے چہرے پر ڈال دیا۔

دوسری طرف سفید بالوں والا بگ بھی موجود تھا جو لبانیہ کا باشندہ تھا۔ اس اچانک حملے سے دہشت زدہ ہو کر بگ پیچھے ہٹا کہ پھسل کر گر پڑا اور اس کے حلق سے گھگھیائی ہوئی آوازیں نکلنے لگیں۔

"بچاؤ...... بچاؤ......" اتنی دیر میں ڈولمین اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا اس نے پھرتی کے ساتھ اوورکوٹ کو بگ کے چہرے سے ہٹایا اور داہنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا خنجر اس کے حلق میں پیوست کر دیا ایک ہلکے سے جھٹکے سے بگ نے اپنے جسم کو جنبش دی اور اسی وقت ڈولمین نے بڑی پھرتی کے ساتھ ہاتھ بڑھایا کہ بگ کے ہاتھوں میں دبا ہوا پستول چھین لیا۔ اس نے کن انکھیوں سے باقی دونوں افراد کو اپنی سمت بھاگتے ہوئے دیکھا وہ دونوں سر پر آ پہنچے اسی لمحے دوسرے آدمی نے اپنی ساٹھ فٹ لمبی لاٹھی ہوا میں بلند کی۔ ڈولمین جانتا تھا کہ اگر یہ لاٹھی کا وار پڑ گیا تو یہ کھوپڑی اتنے حصوں میں تقسیم ہو جائے گی کہ

دنیا کا کوئی ڈاکٹر ان ہڈیوں کو جوڑ نہیں سکتا۔ اس نے انتظار کیے بغیر فائر کر دیا اور گولی دراز قامت کی پنڈلی میں جا لگی۔ اس نے ایک دردناک چیخ ماری لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گری ڈولمین ہر قیمت پر اس لاٹھی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ ہارٹی کے حملے کو ناکام بنانے کے لیے یہ بہترین ہتھیار تھے اس کے بعد وہ جانتا تھا کہ ہارٹی ہی اس پر حملہ آور ہو گا۔

''اب تم دوسری گولی نہیں چلا سکتے۔'' دراز قامت درد سے تلملاتا ہوا چلایا پھر بولا۔

''اسے ختم کر دو ہارٹی۔'' ادھر ہارٹی مقابلے کے لیے تیار تھا اسے اطمینان تھا کہ اب مقابلہ صرف ایک ہی دشمن سے ہے۔ ڈولمین بھی مسکراتی نگاہوں سے ہارٹی کو دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں اسے اندازہ تھا کہ وہ اسکے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن اس وقت ہارٹی کسی خونی سانڈ کی طرح ہانپتا ہوا اس پر حملہ آور ہوا ڈولمین نے پستول کھینچ کر ہارٹی کو مارا اور لاٹھی اٹھانے کے لیے جھک گیا۔ ہارٹی الو کی نسل سے معلوم ہوتا تھا یعنی اندھیرے میں دیکھ لینے کا عادی ورنہ تاریکی میں پستول کے حملے سے خود کو بچانا ذرا مشکل ہی کام تھا لیکن اس نے جھکائی دے کر خود کو پستول کی زد سے بچایا اور برق رفتاری سے ڈولمین پر چھلانگ لگا دی لیکن ڈولمین نے اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ وہ پھرتی سے بیٹھ گیا اور اس کی ٹھوکر ہارٹی کے جبڑے پر پڑی۔ ہارٹی درد سے چیخ کر الٹ گیا۔ ڈولمین نے پلٹ کر دیکھا۔ لاٹھی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے لاٹھی اٹھائی اور دانستہ اس طرح جھکا رہا اس کی پشت ہارٹی کی سمت تھی اور ہارٹی سمجھ رہا تھا کہ ڈولمین اٹھنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے خنجر نکال لیا اسی وقت ڈولمین بجلی کی سرعت کے ساتھ گھوما اور اس نے لاٹھی پوری قوت سے ہارٹی کے پیٹ میں ماری ہارٹی کی سانس حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ درد کے باوجود وہ بھی چیخ نہ سکا اور دوہرا ہو کر جھک گیا۔ دوسرے لمحے ڈولمین نے اس کے لالٹین والے ہاتھ پر لاٹھی کا بھرپور وار کیا اور ہارٹی کی کلائی ٹوٹ گئی۔ لالٹین اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اگلے وار سے ڈولمین نے اس کا گھٹنہ بھی توڑ دیا۔

ہارٹی کی دردناک چیخ فضا میں گونجی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ ڈولمین نے ایک اور بھرپور ضرب اس پر لگائی جو کاری ثابت ہوئی۔ غالباً لاٹھی اس کی کنپٹی پر پڑی تھی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ٹھنڈا ہو گیا۔ تیسرا آدمی جو حیرت اور پھٹی ہوئی نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہا

تھا غصے اور بے بسی سے چلایا۔

''مجھے بھی قتل کر دے حرامی! انتظار کیا کر رہا ہے۔'' ڈولمین ہانپتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور بولا۔

''موت تو تیری بھی یقینی ہے کتے! لیکن میں تجھے سسکا سسکا کر ماروں گا۔''

''میں تو صرف کرائے کا آدمی ہوں اگر تو میرے بیوی بچوں کا خیال کرے تو تیری مہربانی ہو گی۔''

''مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے تھے۔''

''آہ...... تم نہیں جانتے...... تم کیوں نہیں جانتے کہ تمہارا دشمن کون ہو سکتا ہے۔''

''کیا تو اس کا نام نہیں لے گا۔''

''اوسیانوس...... اوسیانوس۔''

''مگر وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے۔''

''اس لیے کہ وہ تم سے خوفزدہ ہے۔ کہتا کہ ہے کہ تم ساحرانہ قوتوں کے مالک ہو۔''

ڈولمین حیران رہ گیا۔ جناتھن کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے وہ اس لیے حیران تھا کہ اوسیانوس جیسا آدمی اس سے خوفزدہ ہے۔

''کیا کہتے ہو؟ کیا تم میری جاں بخشی کرو گے۔''

''مجھے اوسیانوس کے بارے میں اور بھی کچھ بتاؤ۔''

''ہم لوگ کرائے کے قاتل ہیں اس نے ہمیں معاوضہ دیا تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں وہ انتہائی خطرناک آدمی ہے۔ ایک خوفناک جادوگر۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' ڈولمین نے کہا لیکن وہ مدمقابل کی حرکتوں سے واقف تھا اچانک ہی اس پر حملہ ہوا لیکن ڈولمین تیار تھا۔ اس کا خنجر آخری آدمی کے دل میں پیوست ہو گیا اور یہاں سے اسے اوسیانوس کی اس دشمنی کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئیں۔

بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں اور وہ اپنی زندگی کے انوکھے مشن پر نکلا ہوا تھا۔

⊛......⊛
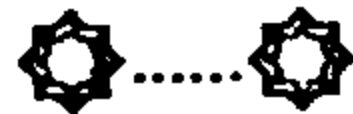
لڑکے نے اپنا نام سیلر بتایا تھا اور وہ خاصا مہمان نواز ثابت ہوا تھا۔ اس نے کافی کی تیسری پیالی ڈولمین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ شخص جس کا نام ڈیگال کوریل ہے ایسی عجیب وغریب صفات کا نمونہ ہے کہ کسی کو بتایا بھی نہیں جا سکتا۔ دنیا کی کئی زبانیں جاننے والا یہ شخص میرے لیے بڑی عظیم حیثیت رکھتا ہے۔"

"لیکن لگتا یوں ہے جیسے یہ بہت ہی معمولی اور گھٹیا سی زندگی گزار رہا ہے۔"

"آپ چاہیں تو یہ الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل ہر بڑا آدمی میری مراد اس سے ہے جو اندر سے بڑا ہے۔ پریشان حال تو ہوتا ہے لیکن مسٹر ڈیگال کوریل اپنی پریشانیوں کو فروخت نہیں کرتے۔"

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ برفباری بدستور جاری تھی اور ماحول بڑا عجیب وغریب تھا۔ جس کمرے میں ڈولمین نے اپنے لیے جگہ بنائی تھی وہ الگ تھلگ تھا۔ لڑکے کے آنے جانے کا راستہ بالکل مختلف تھا لیکن اچانک ہی کچھ دیر کے بعد سیلر ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

"اوہو...... بڑی عجیب بات ہوگئی ہے مسٹر ڈیگال کوریل جا چکے ہیں۔"

"کیا......" ڈولمین اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"ہاں وہ جا چکے ہیں وہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ کب ہوش میں آئے اور کب یہاں سے باہر چلے گئے۔ کیا ہی عجیب بات ہے انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ذرا اندر کا جائزہ لے لیں۔"

"تم گدھے ہو۔" ڈولمین نے کہا اور برق رفتاری سے باہر نکل گیا۔

✿......✿

بات کسی قدر حیرانی کی بھی تھی۔ پتہ نہیں ڈیگال کوریل ایک شادی شدہ عورت سے اس قدر متاثر کیوں تھا۔ اس وقت بھی وہ سیرین کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

"مگر ایک لاکھ ڈالر کی رقم تو بہت زیادہ ہے۔"

"نہیں کوریل! اپنے شوہر کی لاش واپس حاصل کرنے کے لیے میں منہ مانگی رقم ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم جانتے ہو میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے اور یہ دولت......" اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ دولت اس کے شوہر ہی نے اسے فراہم کی ہے۔ ڈیگال کوریل نے محبت بھری نگاہوں سے سیرین

کو دیکھا۔ وہ اس عورت کی پرستش کرتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ یشرین اپنے مرحوم شوہر کے متعلق کوئی اہم بات چھپا رہی ہے۔

"ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔" ڈیگال کوریل نے آہستہ سے کہا۔

"کوریل پلیز! ان سے کہہ دو کہ میں شرط ماننے کے لیے تیار ہوں لیکن لاش مجھے فوراً واپس مل جانی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ان سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"لیکن تم کب تک......" سیرین نے کسی قدر بے تابی سے کہا۔

"ان سے ملاقات کرنے کے لیے تھوڑے سے وقت کا انتظار تو ضروری ہے نا۔ وہ خود ہی ملاقات کی جگہ اور وقت کا تعین کریں گے اور میرا خیال ہے مزید تاخیر کا بھی امکان ہو سکتا ہے کیونکہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کا انتظام اور لاش کی واپسی کوئی آسان کام نہیں ہے پھر وہ بھی جب تک پوری طرح مطمئن نہیں ہو جائیں گے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم سے رابطہ نہیں کریں گے۔ ڈیگال کوریل نے کہا وہ نجانے کیوں کسی قدر افسردگی کا شکار ہوگیا تھا۔ یہ افسردگی غالباً کسی احساس نے طاری کر دی تھی۔ اسے اپنی بیوی یاد آ رہی تھی جس نے اس کے ساتھ فاقے کیے تھے۔ وہ بیمار ہوگئی تھی تو صحیح طور سے اس کا علاج نہیں کرا سکا تھا ڈیگال کوریل اور اسے موت کے منہ سے نہیں بچا سکا تھا۔ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کی موت نے اس کے زندہ رہنے کی آرزو بھی چھین لی تھی۔

بہرحال بڑی تنگ دستی کی زندگی گزاری تھی اس نے افلاس، ناقدری اور مسلسل ناکامی پھر ہمیشہ اپنی انا کو قائم رکھنے کا مسئلہ جسے وہ کسی قیمت پر قربان کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسکے جاننے والے اسے انتہائی خود پرست اور مغرور شخص کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور کسی کو خود سے برتر تصور نہیں کرتا تھا۔ اوکلو اس زمانے میں جہالت اور پستی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ تہذیب نام کی کسی چیز کا یہاں وجود نہیں تھا۔ جرائم، بربریت، نسل پرستی اور عیاشی معاشرے میں عام تھی اور اپنے معاشرے کی ان برائیوں کو ڈیگال کوریل کبھی کبھی بے نقاب کر دیا کرتا تھا۔

بہرحال وہ اس وقت اپنی مطلوب نظر پتہ نہیں کیوں کے سامنے عجیب وغریب انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد سیرین کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنی سفید شال شانوں کے

گرد مضبوطی سے لپٹی ہوئی تھی وہ بے حد حسین اور دراز قامت تھی اس کے سر کے بال سنہری اور کافی لمبے تھے۔ اصل میں اس کی ملاقات ڈیگال کوریل سے کوئی ایک یا ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی اور ڈیگال کوریل اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد یہی عورت تھی جس نے اس کے دل میں ایک بار پھر زندہ رہنے کی لگن جگا دی تھی۔ وہ اس عورت کی پرستش کرنے لگا تھا۔ نجانے کیوں یہ بات خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سیرین کے بارے میں البتہ یہ نہیں اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ڈیگال کوریل کے لیے اس کے دل میں کیا گنجائش ہے۔ اس کے شوہر کو قتل کر دیا گیا تھا اور چوروں نے اس کی لاش قبر سے چوری کر لی تھی۔ سیرین اس غم سے نڈھال تھی اس نے اپنے دوست ڈیگال کوریل کو اس معاملے کی ذمے داری سونپی تھی کیونکہ وہ اس پر مکمل اعتماد کرتی تھی لیکن ڈیگال کوریل کو نجانے کیوں یہ یقین تھا کہ اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے وہ چھپاتی رہی ہے۔ اچانک اس نے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔

"کوریل! کیا تمہارے دل میں اپنی مرحوم بیوی کو دیکھنے کی خواہش کبھی پیدا ہوئی۔ چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔" ڈیگال کوریل نے حیرت سے اس سوال کو سنا اور اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

"آہ...... میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ میں اس کے لیے آنسوؤں سے نہیں خون جگر سے روتا ہوں۔ میرا خیال ہے اگر وہ زندہ ہوتی تو میری زندگی میں کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ میں اس کے بغیر اس قدر ادھورا ہو گیا ہوں کہ شاید کوئی میری اس ادھوری کیفیت کو سمجھ بھی نہ سکے۔" ڈیگال کوریل کی آواز میں ایک بھراہٹ پیدا ہوگئی۔ سیرین پر اس وقت نجانے کیا کیفیت طاری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈیگال کے بالکل قریب آ کر رک گئی اور اس نے ڈیگال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہارے دل میں یہ آرزو نہیں پیدا ہوتی کہ تم دوبارہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے ہونٹوں کو چومو۔"

ڈیگال نے انتہائی کرب کے عالم میں اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسے وہ لمحے یاد آ گئے جب چند سال قبل اسٹیج پر گاتے ہوئے اس کے خون کی ایک شریان پھٹ گئی تھی اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں بچ پائے گی لیکن وہ زندہ بچ گئی اور ایک بار پھر جب

اس میں زندگی کی آس پیدا ہوگئی تو ایک سال بعد دوبارہ اس کی شریان پھٹ گئی۔ وہ دوبارہ بھی ٹھیک ہوگئی تھی اور پھر بار بار موت اور زیست کی مسلسل جنگ شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ یہ جنگ ہار گئی۔ ڈیگال کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی ایک آنسو اس کی پلکوں سے لٹک کر رخسار پر آ گیا اور وہ بے جان سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"بس میں نہیں جانتا کہ مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوگئی۔ تم یقین کرو سیرین انسان بڑی عجیب و غریب چیز ہوتا ہے کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو بہلانے کے لیے نجانے کیسے کیسے راستے اختیار کر لیتا ہے لیکن میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ مجھے اپنی مرحوم بیوی سے بے پناہ محبت ہے اور اس کے بغیر میں ایک زندہ لاش کی مانند ہوں۔" سیرین نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا اور پھر اس کی سرگوشی جیسی آواز ابھری۔

"تم اس سے مل سکتے ہو کوریل! سمجھے تم اس سے مل سکتے ہو۔" ڈیگال کو اس کے یہ الفاظ مذاق محسوس ہوئے تھے وہ اسے دیکھنے لگا تو سیرین آہستہ سے بولی۔

"ہاں۔ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو سکتے ہیں سمجھے۔ یہ الفاظ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" اچانک ہی ڈیگال کوریل کے دماغ پر ایک ضرب سی پڑی۔ وہ ایک دم جھرجھری لے کر کھڑا ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندیشہ درست ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ سیرین جیسے نیم غشی کی کیفیت میں تھی۔ ڈیگال کو یقین آ گیا کہ اس سے زیادہ حساس شخص کسی بھی منتشر لمحے کا شکار ہو سکتا ہے۔ آواگون، روحوں اور بھوتوں کے ماورائی افسانے حقیقتوں پر مبنی ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے اس کا بھرپور ثبوت تو اس کے پاس نہیں تھا لیکن اب ایک بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ سیرین اپنے شوہر کی لاش کے حصول کے لیے کیوں بے چین تھی۔ اس کی کرخت آواز ابھری۔

"سیرین! میں جانتا ہوں کہ کسی نے تمہیں یقین دلایا ہے کہ تمہارے شوہر کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ سیرین گھبرا گئی اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ ڈیگال نے کہا۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس طرح کے لوگ بے شمار مل جاتے ہیں یقیناً تمہیں کوئی ایسی ہی شخصیت ملی ہے جس نے تم جیسی سمجھ دار عورت کو اپنے فریب میں پھانس لیا ہے۔

میں تمہیں بتاؤں سیرین دنیا کا بہت مطالعہ کیا ہے میں نے یہ سب فراڈ ہوتے ہیں۔ بیوقوف بنانے والے جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ کر نہیں سکتے سمجھیں۔''

''میں اپنے ذاتی معاملات میں تمہیں اتنی مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کوریل! تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ غلط ہے۔ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کروں گا بھی نہیں۔ لیکن میں تمہیں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ نام نہاد ماہر روحانیات اور ساحر مکمل طور پر فراڈ ہوتے ہیں یہ لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں فریب دے کر لوٹتے ہیں اور طرح طرح کے دعوے کرتے ہیں جیسے کہ یہ دعوا کہ روح کو بلایا جا سکتا ہے۔ مرنے والوں سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ یہ ناممکن ہے سیرین۔ ایک سمجھدار عورت کو ایسی کسی حماقت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ کاش! ایسا ہو سکتا اور اگر ایسا ہو سکتا تو ہمیں بہت سی ایسی کہانیاں سننے کو ملتیں۔ میری بات مانو۔'' اس نے یہ جملے کہے تھے کہ سیرین آہستہ سے آگے بڑھی اور اس نے اپنا سر کوریل کے شانوں سے ٹکا دیا۔ وہ جذباتی ہوگئی تھی کوریل کی آواز ابھری۔

''ایسے لاتعداد لوگ بڑی دولت کما رہے ہیں۔ تاریک کمروں میں نرم موسیقی کے ساز پر وہ لوگوں کی ملاقات روحوں سے کراتے ہیں۔ یہ روحیں متحرک ہوتی ہیں اور وہ نجانے کیا کیا کچھ کرتے ہیں روحوں کے ان دیکھے ہاتھ ساز بجانے لگتے ہیں۔ تاریکی میں مرنے والوں کے ہیولے نظر آنے لگتے ہیں اور یہ جعل سازی اب پوری دنیا میں پھیلتی جا رہی ہے۔ یہاں خود اوکلو میں ایسے بے شمار افراد موجود ہیں اور خاص طور پر بھولی بھالی لڑکیاں با آسانی ان کے فریب کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

''میرا شوہر...... میرا شوہر...... میں اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں کوریل! جس طرح آج بھی تم اپنی بیوی کو یاد کر کے آنکھوں کو آنسوؤں میں ڈبو لیتے ہو اسی طرح میں بھی اپنے شوہر کو بے پناہ چاہتی ہوں۔ میں اسے اس دنیا میں واپس لانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن کیا ایسا ممکن ہے سیرین! تم خود سوچو مرنے والے کبھی زندہ نہیں ہو سکتے۔''

''کوریل خدا کے لیے یہ نہ کہو۔ اسے زندہ ہونے دو اسے مجھ سے ملا دو۔'' پلیز کوریل سیرین میں ایک عجیب سا جوش پیدا ہو گیا۔ اس نے کوریل کے بازوؤں میں انگلیاں گاڑھ

دیں وہ جنون کے عالم میں تھی۔ ڈیگال کوریل نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''سیرین میری بات تو سنو۔'' لیکن سیرین نے اس کے الفاظ نہ سنے اور وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''وہ میرا انتظار کر رہا ہے......'' ڈیگال نے غصے میں اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے

''وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ سمجھیں وہ اس دنیا میں نہیں ہے سمجھنے کی کوشش کرو۔ مرنے کے بعد کوئی اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔ تم دھوکے میں مت آؤ خدا کے لیے سیرین ان لوگوں کے فریب میں نہ آؤ۔''

''آہ...... وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔''

''کون۔''

''وہ...... وہ...... وہ...... وہ اس کا نام ہاں اس کا نام ڈینس ہے ڈینس پارک۔'' سیرین نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا۔ اس سے پہلے یہ نام ڈیگال کوریل نے نہیں سنا تھا۔ ڈینس پارک اوکلو کا مشہور وکیل تھا اور سیرین اور اس کا شوہر اس کا دوست وہ ان کا قانونی مشیر بھی تھا۔ ڈیگال کوریل کو یہ بات معلوم تھی کہ ڈینس پارک کو روحانیت سے بڑی دلچسپی ہے اس کو مردوں کی چیر پھاڑ دیکھنے سے بھی دلچسپی تھی اور وہ گھنٹوں یہ دیکھتا رہتا تھا وہ دولت مند اور تعلیم یافتہ شخص تھا اور اسے سیرین کے شوہر کی لاش چوری کرنے والوں کے لئے رقم کی ادائیگی کا انتظام بھی کرنا تھا۔ یہ بات ڈیگال کوریل ڈینس پارک کے بارے میں جانتا تھا لیکن اس سے پہلے کبھی اس نے ڈینس پارک کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ حالانکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ ڈینس پارک جب بھی اسے اور سیرین کو ساتھ دیکھتا ہے ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس کے شوہر کی موت کے بعد ڈینس پارک سیرین کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ کتنی ہی بار اس نے سیرین اور ڈیگال کوریل کی قربت کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ دفعتاً ہی ڈیگال کوریل کی آواز ابھری۔

''سیرین اس کا مطلب ہے کہ ڈینس پارک تمہیں دوسرے راستوں پر لگا رہا ہے وہ تمہیں روحانیات کے چکر میں ڈال کر۔''

''سنو ڈیگال کوریل میری بات سنو۔'' سیرین کی آواز میں غصہ تھا۔

''ڈینس صرف میری خوشی کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔'' ڈیگال آگے بڑھا اور اس نے سیرین کے شانے پکڑ لیے۔

''سیرین......'' سیرین نے پلٹ کر اسے دیکھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں اس کے بغیر مر جاؤں گی کوریل! خدا کے لیے مجھے اس سے ملا دو۔''

''مگر تم میری بات تو سنو۔'' ڈیگال کوریل نے کہا۔

''تم میرے درد کو جانتے ہو تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ اس لیے کہ تم خود بھی اس درد کا شکار ہو۔ میری بات مانو، پلیز میری بات مانو تمہیں اندازہ ہے کہ جدائی کا غم کیا ہوتا ہے۔'' ڈیگال کوریل کا سر جھک گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔''

''مجھے تمہارے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں ہے میں چاہتی ہوں کہ تم ڈینس پارک سے ملو۔ اس سے کہو کہ لاش حاصل کرنے کے لیے رقم کا فوری انتظام کر دے میرے اکاؤنٹ سے رقم نکال کر تیار رکھے تا کہ تا کہ......''

''ٹھیک ہے تمہارے لیے میں سب کچھ کروں گا میں مل لوں گا اس سے۔''

''شکریہ۔ کوریل مجھے تمہارے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ ان لوگوں سے بات کرنے کے بعد مجھ سے ملے اس کام میں ذرا بھی تاخیر نہ ہو۔''

''ایک سوال اور کر سکتا ہوں سیرین۔''

''ہاں بولو۔''

''یہ ماہر روحانیات کون ہے۔ جس کے لیے ڈینس پارک تمہیں مجبور کر رہا ہے۔ اس سوال پر سیرین سوچ میں ڈوب گئی پھر بولی۔

''میں تم پر اندھا اعتماد کر رہی ہوں سمجھے۔ میں تم پر اعتماد کر رہی ہوں۔''

''بتاؤ مجھے وہ کون ہے۔''

''اس کا نام شاید پیراسس ہے۔ پیراسس۔'' دفعتاً ہی ڈیگال کوریل کی ہنسی نکل گئی۔''

''پیراسس۔ اس سے زیادہ دلچسپ مذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا ڈیئر سیرین! پیراسس

نے یہ وعدہ تم سے کیا ہے۔''

''دیکھو...... میں نے تمہیں اس لیے یہ سب کچھ بتایا۔''

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں اس نام کو سن کر میں ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اصل میں اصلی پیراسس اپنے دور کا ایک زبردست ساحر تھا سولہویں صدی میں وہ سوئٹزرلینڈ کی یونیورسٹی کا قابل ترین پروفیسر تھا وہ بہترین فزیشن، ماہر کیمیا، فلاسفر اور جادوگر تھا۔ کہتے ہیں اس نے معجزاتی طور پر ناقابل علاج مریضوں کو صحت یاب کر دیا تھا۔''

''اور تم اس کا مذاق اڑا رہے ہو۔''

''نہیں نہیں۔ میں مذاق نہیں اڑا رہا میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس دور میں وہ کہاں سے آ گیا۔''

''دیکھو...... میں یہ سب کچھ نہیں جانتی جو کچھ میں تم سے کہہ رہی ہوں وہ سب کچھ تم کرو۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' ڈیگال کوریل سوچ رہا تھا کہ اسے ہر قیمت پر سیرین کو یہ بتانا ہے کہ مرنے والے زندہ نہیں ہو سکتے۔

بہرحال اس کے بعد وہ سیرین سے رخصت ہو کر باہر نکل آیا اور نجانے کیا سوچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جب بھٹکنے والے بھٹکتے ہیں تو نجانے کس کس طرح بھٹک جاتے ہیں کون انہیں روکے۔ کون انہیں سمجھائے۔

✡......✡

اور اس کے بعد ڈیگال کوریل کا برا وقت شروع ہو گیا۔ وہ اپنے کالج کی بیٹھک میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ کمرے میں شدید سردی تھی۔ اس نے آتشدان روشن رکھنے کے لیے لکڑی کے کندے جلائے ہوئے تھے کہ دفعتاً اسے ایک آواز سنائی دی۔

''کوریل...... کوریل...... ڈیئر!'' یہ آواز کسی عورت کی تھی جو باغ سے پکار رہی تھی۔ ڈیگال کوریل کے ذہن میں ایک جھناکا سا ہوا یہ آواز...... یہ آواز...... وہ حیران سا ہو کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔ آواز پھر سنائی دی۔

''کوریل، کوریل...... میرے پاس آؤ، میرے پاس آؤ کوریل۔ میں تمہاری ایڈنا ہوں، کوریل میں تمہاری......'' کوریل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینہ

توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس کی سانس ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو پیار سے ایڈنا ہی کہا کرتا تھا جبکہ اس کا نام کچھ اور تھا اور یہ آواز اس کی بیوی ہی کی تھی۔ اس کی مرحوم بیوی کی آواز۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور بے تاب ہو کر باہر بھاگا۔ سڑک کے پار برف پوش پہاڑوں کے قریب اس کی بیوی ایڈنا کھڑی ہوئی تھی۔ ڈیگال کوریل کے پورے وجود میں شدید سنسنی دوڑ گئی۔ اسے سانس لینا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کرب ناقابل برداشت تھا آواز پھر سنائی دی۔

''کوریل! میں ہی ہوں تمہاری ایڈنا! میرے محبوب میرے پاس آؤ'' چاندنی رات میں وہ سفید لبادہ پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بے شک نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ڈیگال کوریل کا اذیت زدہ ذہن حقیقت و سراب کے فرق پہچاننے سے عاری ہو چکا تھا۔ بیماری، جدائی، غم اور مسلسل محرومیوں نے اس کی ذہنی حالت خراب کر دی تھی۔ اس کے کانوں میں مسلسل ایڈنا کی آواز ابھر رہی تھی غم سے نڈھال ڈیگال کوریل بے خودی کے عالم میں آگے بڑھا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔ برف پر اس کے پاؤں پھسل رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑنے لگا پھر اچانک ہی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے گر گیا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر وہ پھر کھڑا ہوا تو اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔

''ایڈنا......'' لیکن ایڈنا غائب ہو چکی تھی۔

''ایڈنا......'' وہ کرب ناک لہجے میں چیخا۔ اس نے جھک کر قدموں کے نشانات دیکھے اس پر تازہ تازہ سرخ سرخ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ آہ...... ایڈنا کی شریان پھٹ گئی تھی وہ خون تھوکتی مر گئی تھی۔ اس نے ڈیگال کوریل کے بازو میں ہی دم توڑا تھا۔ ڈیگال کوریل نے کرب کے عالم میں ایڈنا کے پیروں کے نشانات کو چھوا۔ گاڑھا گاڑھا تازہ خون اس کے ہاتھوں سے لگ گیا اس نے دیوانہ وار اس خون کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ اس کی ایڈنا کا خون تھا اور سیرین کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

مرنے والے پھر واپس آ سکتے ہیں وہ دوبارہ زندہ ہو سکتے ہیں۔

......

ہیگ کی انگلیاں گلے میں پڑے ہوئے اس پھندے کو کھولنے کی ناکام کوشش کرتی رہیں جو لمحہ بہ لمحہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ہیگ چھت سے لٹک رہا تھا۔ اس کے پیر زمین سے

بلند تھے اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ اسی کا دوسرا سرا چھت پر لگے کنڈے کے دوسری جانب سے نکل کر دور کھڑے ہوئے اوسیانوس کے ہاتھ میں تھا۔ جو شیطانی انداز میں اسے آہستہ آہستہ کھینچ رہا تھا۔ ہیگ ہوا میں لٹکتا رہا اوسیانوس سے اس کی نفرت کی وجہ وہ دھوکہ تھا جو ہیگ نے اسے دیا تھا اور اوسیانوس کی لغت میں غداری کی سزا موت تھی۔ ہیگ وہ شخص تھا جس نے سیرین کے شوہر کی لاش چرائی تھی۔ اور اس وقت وہ شدید اذیت کے عالم میں تھا اس کا دم گھٹ رہا تھا سر میں شدید دھماکے ہو رہے تھے۔ منہ خوف و دہشت سے کھلا ہوا تھا اور وہ سانس لینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اوسیانوس اس کی اذیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دونوں اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلے تھے۔ فرش پر پیاز کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ ایک بوسیدہ سے کنستر میں کوئلے جل رہے تھے۔

ہیگ بڑی شدت کے ساتھ ہاتھ پیر مار رہا تھا اس کی آنکھوں میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور وہ شدید تکلیف کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تم اپنی موت کا سبب سن لو'' اوسیانوس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''تم ان تینوں کے غدار ہو میرا مطلب ہے ان غداروں کے ساتھی جنہیں میں نے اپنے کام کے لیے مخصوص کیا تھا یعنی بورتھم اور دوسرے سمجھے شیطان کے بچے! میں نے تمہیں ایک اہم کام سپرد کیا تھا لیکن تم نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تم سب کی سزا صرف موت ہے۔ صرف موت۔'' اس نے اسی کو جھٹکا دیا اور ہیگ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا۔

ہیگ اس عمارت میں اس پیغام کو پڑھ کر آیا تھا۔ جو بظاہر ڈیگال کوریل کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ پیغام میں موجود تھا کہ آج رات دس بجے وارتھا اسٹریٹ کے پہلے مکان کی تیسری منزل پر واقع آخری کمرے میں مجھ سے ملو۔ میں تمہارے مقاصد کے لیے کام کرنے کو تیار ہوں۔ یہ پیغام ہیگ کو ایک بچے نے لا کر دیا تھا اور ہیگ اس کام کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ وہ کوئی شبہ کیے بغیر اس تاریک کمرے میں داخل ہو گیا تھا جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھندہ اس کی گردن میں اتنا اچانک پڑا تھا کہ وہ حیران رہ گیا تھا اور پھر نجانے کتنی دیر گزر گئی۔ اوسیانوس نے اسے لٹکائے رکھا یہاں تک کہ شاید اس کی روح پرواز

کر گئی۔ اوسیانوس نے اس کی لاش کو فرش پر لٹایا ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا اسے شیطان کو خوش کرنے کے لیے قربانی دینے کا کام مکمل کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے سیاہ لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک تیز دھار چمکتا ہوا خنجر نکالا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہیگ کی لاش پر بیٹھ گیا، پھر اس کے حلق سے آوازیں نکلیں۔

''سنا تو نے...... سنا تو نے...... میں تجھ سے ہی مخاطب ہوں بول میں تجھے کس نام سے مخاطب کروں میں استاد محترم، میرے جد امجد...... یہ قربانی میں صرف تیرے لیے دے رہا ہوں۔ صرف تیرے لیے۔ میری اس قربانی کو قبول...... قبول کر میری اس قربانی کو۔ قبول کر...... قبول کر...... اس نے تین بار کہا اور کسی ماہر سرجن کی طرح لاش کے سینے کو چاک کرنے لگا......

✿......✿
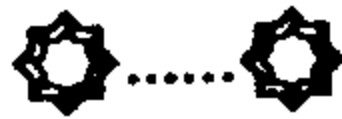
شہباز کی یہ ایڈونچرس داستان ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات کے لئے جلد چہارم کا مطالعہ کریں۔

جانباز

4

ایم اے راحت

''یہ عشق کی کرشمہ سازیاں ہیں جان عزیز! میرا خیال ہے زندگی میں ایک آدھ عشق ضرور کرنا چاہئے۔ اور یوں بھی عمر تو ہے ہی تجربات کا نام۔ انسانی زندگی کی اہم ضرورتیں تو چند ہی ہیں۔ ان سے واقفیت ہونی چاہئے۔''

''ایک سوال پوچھوں محترم رازل جریری! گستاخی تو تصور نہیں کریں گے؟''

''جانتا ہوں کیا پوچھو گے۔ ہاں...... میں نے بھی عشق کیا ہے۔ لیکن ذرا مختلف۔ بتاؤں گا کبھی تمہیں اس بارے میں۔''

''مجھے یہ سب کچھ عجیب لگتا ہے۔ سیرین اپنے مُردہ شوہر کی واپسی چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کا سارا اعتماد ڈیگال کوریل پر ہے۔ اور ڈیگال کوریل جو ہر وقت اپنی بیوی کے لئے آنسو بہاتا رہتا ہے، سیرین کے لئے کچھ کرنے کو تیار ہے۔''

''ہاں...... اس بار ایک دلچسپ سچویشن سامنے آئی ہے۔ تھوڑی سی ریسرچ کرنی پڑے گی۔ ویسے تو جو بھی نتیجہ ہوگا، سامنے آجائے گا۔ آؤ، ہم اس کا پیچھا کریں۔ وہ شاید وکیل ڈینس پارک سے ملنے جا رہا ہے......'' رازل جریری نے کہا اور وہ دونوں نادیدہ شکل میں ڈیگال کوریل کے پیچھے چل پڑے۔

وکیل ڈینس پارک ایک ترش رو اور کسی قدر بدمزاج آدمی تھا۔ یا پھر اس نے ڈیگال کوریل کے بارے میں ضرورت سے کچھ زیادہ نہیں دیکھا تھا۔ کوریل کی پوری بات سن کر وہ ایک طنزیہ ہنسی ہنسا اور پھر اس نے کہا۔

''بہت خوب...... آپ کی بدقسمتی ہے مسٹر کوریل! کہ میں اتفاق سے آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل آپ ایک کتاب کا مسودہ لئے کچھ پبلشروں کے ہاں چکر لگا رہے تھے لیکن شاید کوئی آپ کی کتاب چھاپنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔''

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ ڈیگال کا لہجہ کھردرا ہوگیا۔

”بات اصل میں یہ ہے مسٹر ڈیگال کوریل! کہ میں ایک وکیل ہوں۔ اور ایک وکیل کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں صاف گوئی سے کام لوں۔“

”بہت سے وکیلوں کو جانتا ہوں میں مسٹر ڈینس پارک! بہت سے وکیلوں کو میں جانتا ہوں۔ تم لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے ہو۔ میں یہ الفاظ تمہارے بارے میں نہیں کہہ رہا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم وہ کیس لڑتے ہو جن کے بارے میں تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ یعنی ایک قاتل جو قتل کر چکا ہوتا ہے اور تمہارے ذریعے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتا ہے، مسٹر ڈینس پارک! کیا تم یہ جانے بغیر کہ اس نے قتل کیا ہے یا نہیں، اس کی پیروی پر آمادہ ہو جاتے ہو صرف اپنی فیس لے کر۔ دوسروں کو اگر تم ڈاکو کہنا چاہتے ہو تو سب سے بڑے ڈاکو تو تم خود ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

ڈیگال کوریل کے ان الفاظ پر ڈینس پارک کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔ پھر اس نے کہا۔

”اور میں بھی کسی اور کے بارے میں نہیں، تمہارے بارے میں کہنا چاہتا ہوں مائی ڈیئر ڈیگال کوریل! تم اپنے آپ کو ایک بہت بڑا نقاد، بہت بڑا ادیب اور صحافی سمجھتے ہو۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ تم ایک قلاش آدمی ہو اور اس قسم کے مفلسوں میں جو راتوں رات اپنی تقدیر بدل لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ایک ناکام ترین انسان ہو اور اپنی حیثیت بڑھانا چاہتے ہو۔ تم سو فیصدی، سو فیصدی سیرین کی دولت پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہو۔“

”تم جیسے پاگل وکیلوں کا علاج میں اچھی طرح کر لیا کرتا ہوں، سمجھے۔ تم حد سے گزر رہے ہو۔ تم مجھ پر سیرین کی دوستی سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کا الزام لگا رہے ہو۔ نتیجہ جانتے ہو اس بات کا......؟“

”جانتا ہوں...... جانتا ہوں...... اچھی طرح جانتا ہوں کہ سیرین ایک دولت مند عورت ہے۔ شوہر کی موت اور پھر اس کی لاش کی چوری نے اسے غم سے نڈھال کر دیا ہے۔ اور تم...... تم ان لاش چوروں کے بہانے سے اس سے ایک بھاری رقم ہتھیانا چاہتے ہو۔ کیا سمجھے؟......“

”سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اشتعال میں آ کر میں تمہاری گردن نہیں دباؤں گا۔ تم......“

”خاموش...... خاموش...... میں جانتا ہوں، مفلسی اور ضرورت انسان کو ہر کام پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن میرے دوست! تم وکیلوں کو جو کچھ بھی کہہ لو، تمہاری مرضی ہے۔ لیکن ہم اپنے پیشے سے انصاف کرنا جانتے ہیں، سمجھے...... ہم اپنے پیشے سے انصاف کرنا جانتے ہیں۔“

ڈیگال کوریل غصے سے بے چین ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ واقعی اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بوسیدہ لباس اور پھٹے ہوئے جوتوں میں ملبوس یہاں تک آیا تھا۔ اس کے برعکس ڈینس پارک کا یہ خوبصورت کمرہ تھا جو شاندار فرنیچر، قیمتی قالین اور مصوری کے نادر نمونوں سے سجا ہوا تھا۔ یہ مغرور شخص اس کی مفلسی کا مذاق اُڑا کر اس کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک سچ تھا کہ ڈیگال کوریل کا پراسرار ماضی ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ بہرحال اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر کسی قدر پُرسکون لہجے میں بولا۔

”کیا تم این آئس کے بارے میں جانتے ہو مائی ڈیئر ڈینس پارک؟ اگر نہیں جانتے تو میں تمہاری معلومات کی وضاحت کر دوں کہ این۔ آئی۔ ایس اس شخص کو کہتے ہیں جو احمقوں کی اس جمہوری پارٹی کا رکن ہوتا ہے جو غلاموں کے کاروبار کے شدید مخالف ہے۔ این آئس کے سیاہ فام کے غلاموں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ چاہنے والے کے بارے میں ذرا غور کرو۔ تم رُوئی کے کاشتکاروں کی جس انجمن کی نمائندگی کرتے ہو انہیں یہ بات اگر معلوم ہو جائے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کا قانونی مشیر ان کے مفادات کی نگرانی کی بجائے ان کے کاروبار کا بیڑا غرق کرنے کی سازش کر رہا ہے تو تم کو کتنا نقصان ہوگا۔ کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ایک ادیب، ایک محقق یا پھر دوسرے الفاظ میں اگر تم صحیح الفاظ بھی میرے منہ سے ادا کرانا چاہتے ہو تو میری بات غور سے سنو۔ میں وکیل ڈینس پارک کی بات کر رہا ہوں۔ ڈینس پارک کے بارے میں اگر تمہیں، میرا مطلب ہے ان لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ مسٹر ڈینس پارک کیا کر رہے ہیں تو ان کا رویہ اور ان کا سلوک تمہارے ساتھ کیا ہوگا، یہ بات عام لوگوں کو نہیں معلوم۔ لیکن اس سے تمہیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ایک محقق کی معلومات کیا ہوتی ہیں۔ ڈیگال کوریل کیا چیز ہے۔“

ان الفاظ پر ڈینس پارک کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ اسے واقعی اس بات کی امید نہیں ہوگی

کہ اس کا ایک خفیہ پہلو کتنی وضاحت کے ساتھ کسی کے علم میں ہوگا۔ اسے ڈیگال کوریل کے الفاظ ایک جادوگر کے الفاظ ہی محسوس ہو رہے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈیگال کوریل کو دیکھ رہا تھا۔ ڈیگال کوریل کے چہرے پر ایک باریک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں طنز کا پہلو نمایاں تھا۔ لیکن ڈینس پارک بھی وکیل تھا۔ عدالتوں میں ججوں کے سامنے بڑے بڑے پراسرار کھیل کھیلنے کا عادی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک پہلو سے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم ملک میں غلاموں کے کاروبار کو جاری رکھنے کے حامی ہو۔ حالانکہ یہ ایک ظالمانہ عمل ہے۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں؟" اس بار ڈیگال کوریل کی مسکراہٹ کا انداز بدل گیا تھا۔ اس مسکراہٹ میں زہر کی آمیزش تھی۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... میں اس تجارت کا حامی ہوں۔"

"اور تم سیاہ فاموں سے میری ہمدردی کو بے نقاب کرنا چاہتے ہو۔ کیوں؟"

"اس کے پس منظر میں کچھ ہے۔ جسے میں منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔"

"سوچ لو! اگر تم میرے خلاف کھڑے ہوئے ہو تو تمہاری اس بات کو میں بھی بے نقاب کرسکتا ہوں۔ اور اس کے بعد کتنے دشمن تمہارے سامنے ہوں گے۔ میرا خیال ہے تم ان کا حساب تو لگا سکتے ہو۔" برابر کی چوٹیں ہو رہی تھیں۔ ڈیگال کوریل نے کہا۔

"اگر تم ایسا کرو گے ڈینس پارک! تو میرے پاس اور بھی اس کے ذرائع ہیں۔ ہمارے درمیان اگر سیاست کی جنگ کا آغاز ہوا تو تم ڈیگال کوریل سے جیت نہیں سکو گے۔ کیونکہ تم ایک محدود انسان ہو۔ جبکہ ڈیگال کوریل کی وسعتیں بے پناہ۔"

اس بات کو ڈینس پارک نے دل سے تسلیم کیا۔ وہ آتش دان کے پاس خاموش کھڑا ہاتھ سینکتا رہا۔ واقعی یہ حیرت ناک خبر تھی جو ڈیگال کی زبانی اس نے سنی۔ جبکہ اس کا یہ کام انتہائی خفیہ تھا اور اس کا خفیہ رہنا بھی بہت ضروری تھا۔ کیونکہ جن لوگوں سے اس کا رابطہ تھا وہ غیر انسانی صفات کے حامی تھے اور ان کے لئے کسی کو نقصان پہنچا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بہر حال اس نے کہا۔

"سیرین کا کہنا ہے کہ تمہیں ڈاکٹر پیراسس سے اس کے روابط پر اعتراض نہیں ہے۔"

"روحانیات کا یہ دھندا سو فیصدی فراڈ ہے۔ قطعی اور مکمل فراڈ، سمجھے۔ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے اب تک ڈاکٹر پیراسس سے ملاقات نہیں کی ہے۔"

"شکر ہے، اس کی نوبت نہیں آئی۔" ڈیگال کوریل نے نفرت زدہ لہجے میں جواب دیا، پھر بولا۔ "کیا تم اب بھی ان سڑی ہوئی لاشوں کی چیر پھاڑ کا تماشہ دیکھنے جاتے ہو ڈیئر ڈینس پارک؟" نجانے ان الفاظ نے کیا اثر کیا تھا کہ ڈینس پارک اپنے ضبط کو کھو بیٹھا۔ اس کا چہرہ غضبناک ہو کر بڑا مکروہ ہو گیا اور اس نے غصے میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے ڈیگال کوریل کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"تم...... تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کتے کی اولاد! یہ الفاظ کیسے کہے تم نے؟"

اس بات پر ڈیگال کوریل برگشتہ ہونے کی بجائے بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، سیرین تم سے محبت کرے گی؟ سنو، اس خیال کو دل سے نکال دو۔ چاہے تم اس کی کتنی ہی خوشامد کیوں نہ کرو، وہ تمہاری طرف کبھی مائل نہیں ہوگی۔"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تم جیسے حقیر نالی کے کیڑے سے محبت کرتی ہے؟ تم، جسے پیٹ بھرنے کے لئے روٹی بھی نصیب نہیں۔ تمہاری شخصیت انتہائی واہیات ہے۔ اور اگر مجھ سے معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرے پاس بھی تمہارے بارے میں بڑی شاندار معلومات ہیں جو دنیا کو نہیں۔ دنیا یہ نہیں جانتی کہ تم نے اپنی بارہ سالہ کزن کو بالغ ظاہر کر کے اس سے شادی کر لی تھی جبکہ تم چھبیس سال کے تھے۔ اور تم دونوں شوہر بیوی کے تعلقات کبھی قائم نہ کر سکے، سمجھے۔ وجہ تم جانتے ہو۔ تم مرد ہو ہی نہیں۔" یہ وار بھی شاید کاری ہی تھا۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر نظر نہ آنے والے موٹے موٹے ڈنڈے برسا رہے تھے۔ ڈیگال کوریل نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آج سے تم نے مجھے اپنا بدترین دشمن بنا لیا ہے ڈینس پارک! کیا سمجھے؟ اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ میری معلومات تم سے کہیں زیادہ ہیں، سمجھے۔ تم نے جو الفاظ میرے لئے استعمال کئے ہیں، کاش تم کوئی عورت ہوتے تو میں تمہیں اس کا مناسب جواب دیتا۔"

ڈینس پارک کو ایک دم اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے ایک ایسا کاری وار کیا ہے کہ ڈیگال

کوریل تڑپ کر رہ گیا ہے۔ ڈیگال کوریل جس کا ماضی تاریکیوں کی آغوش میں چھپا ہوا تھا، یہ محسوس کر کے ڈینس پارک کو بڑی خوشی ہوئی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں، بہت خوش ہو رہے تھے میرے بارے میں ایک انکشاف کر کے۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ تمہاری دشمنی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اور کوئی انکشاف کرو میرے بارے میں۔''

''ہاں...... ہمارے درمیان جب انکشافات کی جنگ شروع ہو چکی ہے تو میرا خیال ہے مجھے عصمت فروشی کے کاروبار میں تمہاری شمولیت کے ثبوت بھی فراہم کرنے پڑیں گے۔ اور یہ میرے لئے مشکل کام نہیں ہے۔''

یہ بھی غالباً ایک کاری ہی وار تھا۔ اور کمال کی بات تھی کہ کبھی کبھی ملنے والے اور بالکل اتفاقیہ طور پر ملاقات کرنے والے دونوں افراد جن کا ایک دوسرے سے کبھی تعلق نہیں رہا تھا، ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے تھے۔ ڈیگال کوریل کے ان الفاظ پر بھی ڈینس پارک کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ غصے میں مٹھیاں بھینچ کر آگے بڑھا لیکن پھر رک گیا اور اس کے بعد اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''تم نے میری مرحوم بیوی کی توہین کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''گرجا گھروں کے نام سے سستے داموں پر جائیدادیں خرید کر بعد میں اپنے نام پر منتقل کرا لینے والا ڈینس پارک۔ دنیا کو دکھانے کے لئے ان کاغذات پر تمہارے کسی زر خرید پادری کا نام درج ہوتا ہے۔ تم وکیل ہو کر قانون کا مذاق اڑاتے ہو اور پھر ان عمارتوں میں جسم فروشی کا گندا کاروبار کراتے ہو اور عصمت فروشی سے کمائی ہوئی دولت سے خود کو معزز آدمی کہلواتے ہو۔ بولو، اس کے لئے کیا میں ان عمارتوں کی نشاندہی کروں؟ ان کی گہرائیوں میں جاؤں اور ذمہ دار لوگوں کو ان کی تفصیلات بتاؤں؟ بولو، کیا یہ غلط ہے؟''

''نکل جاؤ...... فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

ڈینس پارک کے پاس اس سے بڑا الزام اور کوئی نہیں تھا ڈیگال کوریل کے لئے۔

''اور سیرین سے جا کر کیا کہوں؟ کیا یہ کہ مسٹر ڈینس پارک نے اپنی اوقات سے بے نقاب ہوتے ہی مجھے باہر نکال دیا؟'' ڈیگال کوریل بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ڈینس

پارک کوشش کے باوجود اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو نہ روک سکا۔ زندگی میں کبھی اسے اتنی بے عزتی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ شدید بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر رکھے میز کی دراز سے برانڈی کی بوتل نکال کر منہ سے لگائی۔ اس کا پورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ڈیگال کوریل خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ تب ڈینس پارک کی آواز اُبھری۔

''وہ چاہتی ہے کہ لاش چوروں کو معاوضہ ادا کر دیا جائے اور اسے یقین ہے کہ ڈاکٹر پیراسس اس کی مدد کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ ہر قیمت پر اپنے شوہر کی لاش کی واپسی چاہتی ہے۔ کیوں، یہی بات ہے نا؟ اور اس کے لئے...... اس کے لئے......'' ڈینس پارک نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''سیرین کہتی ہے کہ مرنے والے اس دنیا میں دوبارہ واپس آ سکتے ہیں۔ حالانکہ میں اس خیال سے بالکل اتفاق نہیں کرتا۔ اور تم ڈاکٹر پیراسس کو اس بات سے مطلع کر سکتے ہو۔ کیا سمجھے؟'' پھر اچانک اسے رات کے حیرت انگیز واقعے کی یاد آئی۔ کیا واقعی وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے صرف خواب دیکھا تھا؟

ڈینس پارک خاموش کھڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈیگال کوریل کو گالیاں دے رہا تھا۔ اسے صحیح معنوں میں آج اپنی شخصیت بہت ہلکی نظر آ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کیا یہ شخص اس حد تک معلومات رکھتا ہے۔ اور اب تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ خود بھی کسی روحانی قوت کا حامل ہے یا پھر کسی خاص جذبے کے تحت وہ ڈینس پارک کی جاسوسی کرتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے سیرین کے شوہر کی لاش کے معاملے میں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ درمیان میں کیوں آ گیا ہے اور سیرین اس پر اس قدر اعتماد کیوں کرنے لگی ہے۔ کیا دوسری بہت سی عورتوں کی طرح وہ بھی اس منحوس کی گرویدہ ہے؟ اچانک اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''میں تمہیں یقین کرنے پر مجبور کر دوں گا، سمجھے۔ میں تمہیں......'' اس کی بڑبڑاہٹ واضح نہیں تھی۔ اسی وقت ڈیگال کوریل کی آواز اُبھری۔

''کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟''

ڈینس پارک چونک پڑا۔ اس نے گھبرا کر ڈیگال کوریل کی طرف دیکھا اور بولا۔

"نہیں...... میں نے تم سے کچھ نہیں کہا۔ میں ذرا اجازت چاہتا ہوں۔" اس نے کھوئے ہوئے پریشان لہجے میں کہا اور برانڈی کی بوتل ہاتھ میں لئے ہوئے وہاں سے باہر نکل گیا۔ کسی اور کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اس نے زور سے بند کیا۔

ڈیگال کوریل حیران ہو کر دروازے کی سمت دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی نگاہ سامنے والی دیوار پر پڑی جس پر سرخ رنگ کا کاغذ چڑھا ہوا تھا اور تین بڑی بڑی نایاب تصویریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پہلی تصویر میں ایک چرواہا اپنی جھونپڑی کے سامنے بھیڑوں کے ریوڑ کو ہانک رہا تھا۔ دوسری میں تین آدمی جن کے ہاتھ اور پاؤں پشت سے بندھے ہوئے تھے، پھانسی پر لٹک رہے تھے۔ ان کی گردنیں ڈھلک چکی تھیں۔ تیسری کسی حسن تماشے کا نمونہ تھی۔ عجیب بھیانک منظر تھا۔ بہت سے بونے سانپ اور مردوں کی کھوپڑیاں لئے کھڑے ہوئے تھے اور عورتیں اپنے عریاں جسموں سے گاہکوں کو دعوتِ گناہ دے رہی تھیں۔ کہیں جادوگری کا تماشہ ہو رہا تھا اور کہیں شمشیر زنی کا مقابلہ اور کہیں جادوگر تلوار سے اپنی گردن کاٹ رہا تھا۔ ایک سمت بھیانک اور ہیبت ناک اژدھے تماش بینوں کو نگلنے کے لئے منہ پھاڑے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ وسیع و عریض تصویر کسی دنیا کا بھیانک خواب نظر آ رہی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا اس کے تمام کردار زندہ ہوں اور سامنے کی سمت دیکھ رہے ہوں۔ بلاشبہ یہ کوئی طلسمی تصویر تھی۔ کیونکہ ڈیگال کوریل کی کیفیت اسے دیکھ کر عجیب سی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور تمام جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ وہ سانس لینے میں بھی دشواری محسوس کر رہا تھا اور کمرے میں شدید حبس اور گرمی ہونے لگی تھی۔ پھر اچانک اسے قہقہوں اور شور وغل کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن کمرے میں وہ بالکل تنہا ہی تھا۔ ایک عجیب سا خوف اس کے سارے وجود پر مسلط ہونے لگا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا اور شور بڑھتا جا رہا تھا۔ شور اچانک اتنا زیادہ ہوا کہ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک اسے کھانسی اٹھی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ کمرے میں لوبان کی تیز خوشبو پھیل گئی تھی۔ ڈیگال کوریل نے آنکھیں بند کیں اور حلق پکڑ کر کھانسنے لگا۔ پھر اچانک اس کے کانوں میں موسیقی کی آواز ابھرنے لگی۔

"یا خدا! یہ سب کیا ہو رہا ہے...... میرا ذہنی توازن خراب تو نہیں ہو گیا؟"

اس نے زور سے آنکھیں بھینچ کر کھولیں اور دیکھا کہ تصویر والے دونوں بونے اس کے سامنے بالکل قریب کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا، جاگتی آنکھیں خواب نہیں دیکھتیں۔ بونے واقعی اس کے قریب تھے۔ جیتے جاگتے زندہ بونے۔ دونوں کے جسموں پر بالکل ایسے ہی لباس تھے جیسے تصویر میں نظر آ رہے تھے۔ ان کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں بھی بھیانک کھوپڑیاں تھیں۔ اچانک ایک بونے کی فلک شگاف چیخ فضا میں گونجی اور اس نے پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھوپڑی ڈیگال کوریل پر دے ماری۔ ڈیگال کوریل گھبرا کر پیچھے ہٹا اور کھوپڑی اس کے گھٹنے سے ٹکرا کر دور جا گری۔ دونوں بونے پھر آگے بڑھنے لگے۔ کسی پراسرار ساز کی آواز تیز ہونے لگی۔ ڈیگال کوریل مسلسل پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ داہنی سمت مڑا تو تصویر والی بے لباس طوائف مسکراتی ہوئی اس کی سمت بڑھنے لگی۔ اس کی گردن میں لپٹے ہوئے زہریلے سانپ اپنی زبانیں نکال کر حملے کے لئے سر اٹھا رہے تھے۔ تصویر کے سارے کردار زندہ ہو گئے تھے۔ مدہوش ڈیگال کوریل خوفزدہ انداز میں تیزی سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ کسی چیز سے اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ وہ یقیناً پاگل ہو گیا تھا۔ پھر وہ کچھ اس طرح بدحواس ہوا کہ بے اختیار چیخنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اٹھنے کی کوشش کی تو اچانک عقب سے کسی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھا تو خنجر باز سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے تیز دھار کے خنجر سے ڈیگال کوریل کے چہرے پر وار کیا تو ڈیگال کوریل نے بے اختیار بائیں ہاتھ سے وار روکا۔ لیکن خنجر سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا اور کلائی سے خون بہنے لگا۔ دفعتہً اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ دہشت و جنون کے عالم میں اس نے اس چیز کو اٹھایا تو یہ ایک ڈنڈا تھا۔ یہ ڈنڈا اٹھا کر اس نے پوری قوت سے خنجر باز کے چہرے پر مارا۔ ڈنڈا درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ چھوٹی سی داڑھی اور چپٹی ناک والا خنجر باز لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ ڈیگال کوریل نے ہاتھ کی سمت دیکھا۔ اس کی کلائی کے زخم سے خون بہہ رہا تھا اور یہ خون یقینی طور پر اصلی تھا۔ اسے نجانے کیوں احساس ہونے لگا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔ غصے اور جنون کے عالم اس نے ٹوٹے ہوئے ڈنڈوں کے ٹکڑے اٹھائے اور قریب موجود دونوں بونوں پر پل پڑا۔ وہ ان پر بے پناہ وار کر رہا تھا۔ ڈنڈے، ٹھوکریں وہ ان بونوں کو بری طرح مار رہا تھا۔ ایک بونے کی باریک سی چیخ فضا میں گونجی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں

سے چہرہ چھپالیا۔ ڈنڈے کی نوک نے چہرے سے لے کر گردن تک ایک گہرا شگاف ڈال دیا تھا۔ جس سے بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔ لیکن ڈیگال کوریل پر اب دیوانگی سوار ہوگئی تھی۔ وہ ایک بھیانک خواب کے زیر اثر تھا۔ دوسرا بونا غصے میں اس کی سمت جھپٹا تو موسیقی کی آواز اور تیز ہوگئی۔ اچانک اس عریاں طوائف نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ڈیگال کوریل جیسے ہی ادھر پلٹا، عورت نے کئی سانپ اس پر اچھال دیئے اور قہقہے لگانے لگی۔ سانپوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے جسم ڈیگال کوریل کے چہرے اور گردن سے ٹکرائے اور اس کے حلق سے بلند ہونے والی دہشت زدہ چیخیں کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں۔ وہ لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کی چیخوں سے کمرہ گونج رہا تھا اور وہ بے تحاشا اپنی گردن پر رینگتے ہوئے سانپوں کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کھینچ کر ہٹا رہا تھا۔ لیکن اس کی گردن گھٹتی جا رہی تھی۔ پھر اس کے ذہن پر تاریکیوں کا راج ہوتا چلا گیا۔ وہ شدید دہشت کے عالم میں بے ہوش ہوگیا تھا۔

......

بے ہوشی کا یہ وقفہ نجانے کتنا طویل تھا۔ آخر کار اسے ہوش آ گیا اور اس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ فرش پر چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ سامنے ایک دراز قامت اور چھریرے بدن کی عورت سیاہ لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی انجیل مقدس کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ یہ عورت ڈینس پارک کی بیوی لوئیسا تھی۔ اس نے کہا۔

''میں خدا کا کلام پڑھتی ہوں مسٹر کوریل! آپ آرام سے لیٹے رہیے۔ خدا کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔''

ڈیگال کوریل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ تصویر زندہ ہوگئی تھی۔'' وہ تصویر کی سمت اشارہ کر کے بولا۔

''میں تمہیں خدا کا کلام سناتی ہوں۔'' عورت نے بائبل کھولتے ہوئے کہا۔

''رہنے دو لوئیسا! اس دیوانے پر وقت ضائع نہ کرو۔'' ڈینس پارک کی آواز آئی۔ ''یہ تو ہر وقت نشے میں ڈوبا رہتا ہے۔ اور شراب نے اس کا ذہنی توازن خراب کر دیا ہے۔''

لوئیسا شوہر کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور بائبل پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ ڈیگال

کوریل کی وحشت زدہ نگاہیں اب بھی تصویر پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''خدا کی قسم، یہ تصویر زندہ ہوگئی تھی۔''

''چپ رہو نشے باز! اگر خود پر قابو نہیں پا سکتے تو اتنی زیادہ پیتے کیوں ہو؟ تمہارا سارا وجود شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔'' ڈینس پارک کی نفرت بھری آواز ابھری اور پہلی بار ڈیگال کوریل نے اپنے آپ پر توجہ دی۔ اس نے خود بھی یہ بُو محسوس کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا لباس شراب سے تر ہے۔ تھوڑے فاصلے پر شراب کی خالی بوتل اور گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک بار پھر وہ ذہنی بحران کا شکار ہوگیا۔ کیا واقعی میں ذہنی توازن کھو رہا ہوں؟ اسی وقت ایک سیاہ فام غلام اندر داخل ہوا جو ڈینس پارک کا ملازم تھا۔ اس نے سہارا دے کر ڈیگال کو اٹھایا اور اسی وقت ڈینس پارک کی آواز ابھری۔

''میرا خیال ہے ڈیگال کوریل! تم کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا علاج کراؤ۔ بلکہ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ڈاکٹر پیراسس کو دکھا دو۔ وہ ایسی بیماریوں کا ماہر ہے۔''

اچانک ڈیگال کوریل نے اپنا خون آلود زخمی ہاتھ اتنی تیزی سے آگے بڑھایا کہ قریب کھڑی ہوئی لوئیسا گرتے گرتے بچی۔

''میں پاگل نہیں ہوا ہوں ڈینس پارک! ان دونوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ دیکھو...... یہ دیکھو۔ یہ زخم فرضی نہیں ہے۔ یہ اصلی خون ہے۔''

''ہاں...... اور تم نے یہاں جو توڑ پھوڑ مچائی ہے اس کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ تم نے جنون کے عالم میں اپنا ہاتھ خود زخمی کر لیا ہے۔ اور اس ڈنڈے کو دیکھو......'' ڈیگال کوریل نے زمین کی سمت دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی لکڑی کی خون آلود نوک اس کے سامنے تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے قدم دروازے کی جانب اٹھنے لگے۔ لوئیسا بدستور زور زور سے انجیل پڑھ رہی تھی۔ تب اس کے کانوں میں ڈینس پارک کی آواز ابھری۔

''لاش حاصل کرنے کے لئے رقم کا انتظام کر لیا جائے گا۔''

لیکن نجانے کیوں ڈیگال کوریل وہاں نہ رکا۔ اس کا ذہن صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی میں دیوانگی کی حد میں داخل ہو رہا ہوں......؟

......

شہباز نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور سامنے بیٹھے ہوئے رازل جریری کو دیکھا۔
رازل جریری اپنے سامنے رکھی شطرنج کی بساط پر مہروں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ دونوں کے جسم بھرپور طریقے سے ان کے ساتھ شامل تھے۔ برابر ہی کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے اس شاندار کمرے میں جو کھانا انہوں نے کھایا تھا وہ واقعی بے مثال تھا۔
شہباز، رازل جریری کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔
"مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ شطرنج نہیں کھیل رہے۔ اور پھر شطرنج تنہا نہیں کھیلی جاتی۔ اس کے علاوہ آپ جو مہرے اِدھر اُدھر اُلٹ پلٹ کر رہے ہیں ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں ہے۔"
رازل جریری نے گردن اٹھا کر شہباز کو دیکھا اور پھر شطرنج کی بساط پر سجے ہوئے سارے مہرے پورے ہاتھ سے گرا دیئے۔ وہ اس کہانی کے نادیدہ تماشائی بنے ہوئے تھے۔ اور یہ واقعی ایک بالکل ہی انوکھا انداز تھا۔ دو پراسرار وجود جو کرداروں کا تعاقب کر رہے تھے اور ہر اہم کردار کے ساتھ اس کی شخصیت کا بھرپور تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ اور یہ کام شاید دنیا کا سب سے دلچسپ اور دلکش ترین کام تھا، کسی کے خفیہ رازوں سے واقف ہوا جائے اور ان میں اپنا کردار تلاش کیا جائے۔ لیکن یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہو رہا تھا۔ اور یہی سوال اس وقت پھر شہباز کے ہونٹوں پر آ گیا تھا۔ اس دلچسپ تماشے کا آخری سین ڈیگال کوریل کی ڈیفنس پارک کے گھر سے واپسی تھی۔ اور اس کے بعد یہ تجویز خود رازل جریری نے پیش کی تھی۔
"کیا خیال ہے شہباز! اب اس داستان کے نئے کرداروں کا تجزیہ کرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک دن اور ایک رات اپنے جسموں کے ساتھ گزاریں تاکہ ہمیں یہ احساس رہے کہ ہم زندہ وجود ہیں، اپنے جسم سے علیحدہ ہو جانے والی روحیں نہیں ہیں۔ کھائیں پئیں، عیش کریں، سیر و سیاحت کریں۔ کھیل بے پناہ دلچسپ ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ سفر میگال سیمورس کی طرف ہے۔"
شہباز نے خود بھی اس خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔
"ہاں، بے شک جسموں کو چھوڑنے کے بعد ہمیں اشیاء کی طلب نہیں رہتی۔ لیکن زندہ اجسام اس کی ضرورت ضرور محسوس کرتے ہیں۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ عمدہ کھانا، عمدہ بستر اور پھر شہری رونقیں۔ انسان ان کا طلب گار تو ہوتا ہی ہے۔"
بہر طور ان تمام باتوں کے بعد انہوں نے اپنے جسم حاصل کئے تھے۔ ایک بہت ہی عالیشان ہوٹل میں ایک کمرہ لیا گیا تھا۔ کیونکہ دونوں کے پاس اس کے سوا کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نہ ہی شہباز کے کردار میں کوئی کھوٹ تھی اور رازل جریری تو بہر حال ایک الگ ہی قسم انسان تھا۔ چنانچہ خوب کھایا پیا گیا۔ سیر و سیاحت کی گئی اور اس کے بعد رات کے وقت ان دونوں نے اپنے ہوٹل کا کمرہ اپنا لیا۔ رازل جریری نے کہا۔
"شہباز! کوئی کوفت تو نہیں ہو رہی تمہیں؟"
"بالکل نہیں۔ اس کی وجہ خاص طور سے یہ ہے کہ تنہا یا دوسرے عام کرداروں کے ساتھ تو میں نے آپ کے احکامات کی تعمیل تو کی ہی ہے۔ لیکن اس بار آپ کے ساتھ بے جسمی کی حالت میں جو دلکش تجربات ہو رہے ہیں وہ الگ نوعیت کے حامل ہیں۔"
"میگال سیمورس ایک بڑی طلب ہے۔ ویسے تم یہ تو ضرور سوچتے ہو گے شہباز! کہ یہ رازل جریری کس قسم کا انسان ہے۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری کے لئے سرگرداں ہو جاتا ہے۔ اس میں تم یہ بتاؤ کہ میری اس طلب کی روح کیا ہے......"
"زندگی کو رواں دواں رکھنا، انسانیت کی بھلائی کے لئے مصروف عمل رہنا، نت نئے تجربات کرنا۔ اور سچ کہوں، ان لوگوں پر فوقیت لے جانا جو اپنے آپ کو آسمانی مخلوق سمجھتے ہیں۔"
رازل جریری کے منہ پر حیرت کے نقوش نمایاں ہو گئے۔ اس نے تعجب سے کہا۔
"اتنا سمجھنے لگے ہو تم مجھے۔ خیر، میں نے یہ غلط تو نہیں کہا کہ تمہارے وجود میں مجھے رازل جریری ملتا ہے۔ اور سنو، کبھی یہ بات مت سوچنا کہ یہ الفاظ تمہاری خوشامد ہیں یا تمہیں اپنے ساتھ شامل رکھنے کے لئے ایک عمل۔ کبھی میری اس نیت پر شک مت کرنا۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہی کہا ہے۔ دیکھو، ہم دنیا کی ہر چیز کے لئے جدوجہد بھی کر سکتے ہیں، لڑ بھی سکتے ہیں اور کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں اپنے اعتماد اور یقین کے ساتھ۔ صرف ایک چیز ایسی رہ جاتی ہے جس کے خلاف عمل کرنے کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور وہ ہے موت۔ ہر شخص کو اپنی میعاد پوری کر کے چلے جانا ہوتا ہے۔ عمروں

کے حساب سے اگر طبعی موت انسان کو ملے تو بوڑھے پہلے جاتے ہیں اور نوجوان بعد میں، جب بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ہمارا یہ مشن میرے بعد تم پورا کرو۔ اور ظاہر ہے جب تمہارا تجربہ بہت آگے بڑھ جائے گا تو تم بھی کسی ایسے شخص کا انتخاب ضرور کر لو گے جو تمہارے بعد اس مشن کو لے کر آگے بڑھے۔ ہم یہاں سے جاتے ہوئے اپنے اس مشن کے پورا کرنے والوں کو اتنا موقع دے جائیں گے کہ انہیں ہماری طرح مشکلات درپیش نہ ہوں۔''

شہباز غور سے رازل جریری کی بات سن رہا تھا۔ رازل جریری خود ہی خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کافی خشک باتیں کر لیں ہم نے۔ ارے ہاں، یہ نیا تجربہ کیسا ہے؟''

''بہت ہی دلچسپ۔''

''اصل میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس ماحول میں ایک کردار بن کر شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں وہ جدوجہد کرنا پڑے گی جو ہمارے لئے خاصی تکلیف دہ ہو گی۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ میگال سیمورس کے حصول کے لئے اوسیانوس سرگرداں ہے۔ اس کے ساتھ ہی تمہارے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ اب بہت سے کردار اس کا حصول چاہتے ہیں۔ کیسے کورنیلیں جو اپنی زندگی کی بقاء کے لئے اس کا خواہش مند ہے۔ ہم اگر چاہیں تو اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن ہماری نگاہ ان سب پر ہے۔ جب ان کی جدوجہد سمٹ کر کم افراد پر رہ جائے گی تو ہم کوئی کردار اختیار کر کے ان کے درمیان اپنا پاؤں پھنسا لیں گے۔ کیسا رہے گا یہ؟''

''بہت عمدہ۔ میں تو پہلے ہی اس سے متفق ہوں۔''

''آؤ تو پھر اس ہوٹل کے کمرے میں آرام کرنے کی بجائے کیوں نہ ہم اپنا دوسرا ہی کام کریں۔ یعنی ان لوگوں کی نگرانی۔ تم نے دیکھا کہ ڈیگال کوریل اور ڈینس پارک کے درمیان کیا عمدہ گفتگو ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کا کچا چھٹا کھولنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ وہ اسی وقت مصروفِ عمل ہوتا ہے جب بات اس تک پہنچ جاتی ہے۔ ورنہ بعض اوقات وہ خاموشی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس وقت ایسی ہی کیفیت ہے۔ لیکن ہمارے لئے کافی دلچسپ۔ ارے ہاں، ہم اپنے دوست اوسیانوس کو بہت وقت سے بھولے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ بھولنے والی چیز نہیں ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی وہ کیا کر رہا ہے۔''

✿......✿
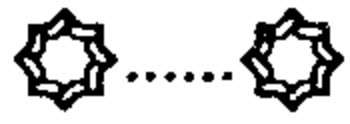
اوسیانوس نے خنجر کے ایک ہی وار سے ایلس کارپ کا نرخرہ کاٹ دیا۔ اور جب دوسرے لاش چور نے چیخنے کے لئے منہ کھولا تو اس کی آواز نہیں نکل سکی۔ یہ لاشوں کے چور ہیک کا ساتھی تھا۔ نشہ آور شراب کی نیند سے اس کی آنکھیں اب بھی نہیں کھل رہی تھیں۔ لیکن اپنی تمام تر قوتِ ارادی سے کام لے کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ اٹھ کر اپنے اس درندہ صفت دشمن کا گلا دبا دے۔ لیکن اس کے جسم میں کھڑے ہونے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں اور اس کے کٹے ہوئے نرخرے سے ابلنے والا خون اس کے لباس کو سرخ کئے دے رہا تھا۔ یہ خون ایک فوارے کی شکل میں اچھل رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے اوسیانوس کو گھور رہا تھا جس کے ہاتھوں میں خون آلود خنجر سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ چند ہی لمحے کے بعد کٹی ہوئی گردن والے کا جسم بے جان ہو کر ایک سمت لڑھک گیا۔ اوسیانوس نے اس سے بھی غداری کا انتقام لے لیا تھا اور اب وہ شیطان کو دوسری قربانی پیش کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

✿......✿
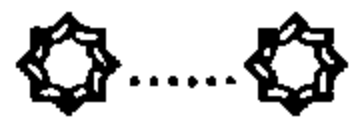
وہ ایک تنگ گلی تھی جس کے دونوں طرف لکڑی کے مکانوں کے درمیان بہت سے بچے کیچڑ میں کھیل رہے تھے۔ ان کے جسم گھٹنے گھٹنے تک کیچڑ میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ باقاعدہ اس کیچڑ میں لیٹ بھی جاتے تھے۔ عجیب کھیل تھا کہ وہ سب خاموش تھے۔ حیرت کی بات تھی۔ ڈولمین نے برابر کھڑے ہوئے نیلس سے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں...... یہ عجیب و غریب کھیل نہیں ہے؟''

''یہ کھیل نہیں ہے۔'' نیلس نے بتایا۔

''تو پھر؟''

''یہ غلاظت میں بھرے ہوئے چوہے اور جانور تلاش کر کے بیچتے ہیں اور سور کو یہ غذا بہت پسند ہوتی ہے۔''

''بیچتے ہیں؟''

''ہاں!''

''خریدتا کون ہے؟''

"جانوروں کے مالک۔ یہ بچے اس طرح پیٹ بھرنے کے لئے چند سکے کما لیتے ہیں۔"

"آہ...... کمال کی بات ہے۔ واقعی کمال کی بات ہے۔" ڈولمین نے حیرانی سے کہا۔

وہ برنم کے میوزیم جا رہے تھے۔ یہ خوبصورت پتھر سے بنی ہوئی ایک پانچ منزلہ عمارت تھی۔ اوکلو کے باشندوں کو تھیٹر ناپسند تھا اس لئے یہاں کے سمجھداروں نے اپنے تھیٹر اور تماش گاہ کو میوزیم کا نام دے رکھا تھا۔ یہ شاندار عمارت براڈوے اور این اسٹریٹ کے کونے پر واقع تھی۔ گیارہ بجے صبح کو یہاں گھوڑا گاڑیوں اور عوام کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ شاید ہی کبھی کسی نے اتنا ہجوم دیکھا ہو۔ خود ڈولمین نے بھی نہیں۔ اس نے کبھی اتنا ٹریفک نہیں دیکھا تھا۔ شاندار فٹنگ اور زرق برق وردیوں والے گاڑی بان، خوبصورت اور قیمتی لباس والے الگ سوسائٹی کے افراد۔ ڈولمین نے تھوڑی دیر پہلے مفلسی اور گندگی کا جو منظر دیکھا، یہ منظر اس کے بالکل متضاد تھا۔ واقعی اوکلو وحشیوں کا دیس ہے۔ عجیب و غریب۔ اس کا پچپن سالہ نیلس ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے سیاہ ریچھ کی کھال کا ایک بہت ہی پرانا کوٹ پہن رکھا تھا اور یہ شخص خاموشی سے اپنی گھوڑا گاڑی چلا رہا تھا۔ ڈولمین اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈولمین کی دیو قامت جسامت اور فولادی اعضاء نے نیلس کو بہت مرعوب کیا تھا۔ خاصے عرصہ پہلے اس نے ڈولمین کا باکسنگ کا ایک مقابلہ دیکھا تھا اور ڈولمین سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔ ڈولمین نے اس سے ایک سوال کیا۔

"یہ میوزیم آخر ہے کیا چیز؟"

"چھ ہزار مختلف تفریحات کا مجموعہ۔" نیلس نے بتایا۔ "جس میں رقص و موسیقی، سرکس اور مختلف قسم کے کھیلوں کے شو ہوتے ہیں۔ ویسے مسٹر ڈولمین! ایک بات بتائیے، آپ کا تعلق جیمس ڈولمین کے خاندان سے تو نہیں ہے؟"

"ہاں، میں اسی خاندان کا فرد ہوں۔ مسٹر جیمس ڈولمین میرے دادا تھے۔"

"آہ، واقعی؟" نیلس کی آنکھوں میں بہت ہی پرستش پوجا کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر اس نے کہا۔ "جیمس ڈولمین سترہ سو انیس میں ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن تھے۔ ان کو باکسنگ کے فن کا بانی تصور کیا جاتا تھا۔ شمشیر زنی اور آلاتِ حرب کے استعمال میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ویسے آپ جب اپنے گھر واپس جائیں تو براہِ کرم انہیں میری عقیدت

کے پھول ضرور پہنچا دیں۔ اور جیمس ڈولمین کے خاندان کے ایک منفرد وارث کی خدمت میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔"

"شکریہ مسٹر نیلس! میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

"اوہو...... وہ کیسے؟ کیا آپ مشہور زمانہ ڈیگال کوریل سے واقف ہیں؟ بہت ہی بڑے دانشور ہیں یہ۔ لیکن افسوس اوکلو نے اتنے بڑے شخص کی کوئی قدر نہیں کی۔"

"آہ...... کیا یہ واقعی ڈیگال کوریل ہے؟ یہ تو بڑا مشہور تحقیق کرنے والا ہے۔ ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کا کالم نویس۔ جس کے کالم کبھی کبھی بڑی ہلچل مچا دیتے ہیں۔"

"ہاں وہی۔" نیلس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا، پھر ہنس کر بولا۔ "بڑے لوگوں سے بڑے لوگ ہی ٹکراتے ہیں۔ کیا آپ اس سے ملنا پسند کریں گے؟"

"اس وقت نہیں۔" ڈولمین نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی میوزیم کی شاندار عمارت بھی نہیں دیکھی ہے۔"

کچھ دیر کے بعد وہ عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ بیرونی حصہ میں مختلف ممالک کے درجنوں رنگین جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ہر منزل پر بڑے بڑے بورڈ اور پوسٹر آویزاں تھے۔ عمارت دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ لیکن ڈولمین یہاں تفریح کرنے نہیں آیا تھا۔ اسے یہاں ان اداکاروں کی تلاش تھی جو اوسیانوس کے شریک کار بن کر یہاں آئے تھے۔ یہاں سے اسے اپنی بیوی اور لڑکے کے قاتلوں سے انتقام لینے کی ابتداء کرنا تھی اور یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اس وقت اس کی زندگی میں اس کے علاوہ اور کوئی تصور تھا ہی نہیں۔ بہر حال وہ اس میوزیم کا نظارہ کرتا رہا۔ اس کا ساتھی اس کی ہر طرح سے رہنمائی کر رہا تھا۔ آخر کار اس نے سوال کیا۔

"یقیناً آپ کو یہ میوزیم پسند آیا ہو گا مسٹر ڈولمین!"

"ہاں...... بہت شاندار ہے۔" اور اچانک ڈولمین خاموش ہو گیا اور حیرت زدہ نگاہوں سے ایک طرف گھورنے لگا جس کا احساس فوراً اس کے ساتھی کو ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے مسٹر ڈولمین؟"

"ان دونوں آدمیوں کو دیکھ رہے ہو؟" اچانک ڈولمین کا لہجہ موت کی طرح سرد ہو گیا۔ اس نے میوزیم کے سامنے کھڑی خوبصورت بگھی کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہ دونوں جو سیاہ بگھی سے اترنے والی خاتون سے باتیں کر رہے ہیں۔" ڈولمین نے سرسراتی آواز میں کہا اور اس کا ساتھی ادھر دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں۔"

"آیا وہ...... وہ لوگ مسز کورنیلس سے باتیں کر رہے ہیں۔ جسٹس کورنیلس بے چارے کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ بہت دولت مند آدمی تھا۔ لیکن اس کی دولت اسے کینسر کے مرض سے نہ بچا سکی۔ وہ اپنے مرض سے چھٹکارا پانے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کالا جادو سیکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔ صرف اپنی بقاء کے لئے۔"

اچانک ہی ڈولمین نے اپنی بگھی میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"جلدی...... براہِ کرم جلدی کرو۔ ہمیں اس بگھی کا پیچھا کرنا ہے جو واپسی کی تیاریاں کر رہی ہے۔"

"لیکن سر! آپ تو......"

"اوہو، دیکھو دیر نہ کرو۔ ہمیں اس بگھی کا تعاقب کرنا ہے۔ جلدی۔" ڈولمین نے بگھی پر سوار ہو کر لگام اپنے ہاتھ میں لے لی اور گھوڑے کو چابک مارتے ہوئے کہا۔ کچھ فاصلے پر دوسری بگھی حرکت میں آ چکی تھی۔

اچانک ہی یہ سب کچھ ہوا تھا۔ ڈولمین کو اس بات کی امید نہیں تھی کہ مسز کورنیلس اس طرح نظر آ جائے گی۔ کورنیلس کے نام کے ساتھ ہی اسے اوسیانوس کا خیال آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اوسیانوس اسے وہیں مل جائے گا جہاں لیڈی کورنیلس جائے گی۔ اس دوران اس کا ساتھی بھی بگھی میں سوار ہو چکا تھا اور کافی حیران نظر آ رہا تھا۔ بگھی میں سوار ہونے کے بعد اس نے کہا۔

"لیکن آپ کے انداز میں تو بڑی بدحواسی ہے۔ معافی چاہتا ہوں جناب! یہ بڑا ہی سنگین عمل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو......"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو۔ ویسے تمہارے خیال میں وہ کہاں جا رہی ہے؟"

"خیر، کسی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی حماقت ہی ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ گھر ہی جا رہی ہے۔" حیرت زدہ نیلس نے کہا۔ ڈولمین پوری توجہ کے ساتھ

بگھی آگے ہانک رہا تھا۔ وہ کسی حالت میں کورنیلس کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اور اس کی تمام تر توجہ اس کی جانب تھی۔

✡......✡
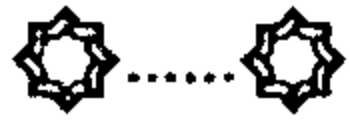
کمرہ بالکل تاریک تھا۔ میز کے ایک سرے پر پیراسس اپنی سفید قبا اور سفید دستانے پہنے بیٹھا تھا۔ لباس کی وجہ سے وہ تاریکی میں بھی نظر آ رہا تھا۔ دوسرے سرے پر بھاری بھر کم جسم والا ادھیڑ عمر میک برگن بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایک بھاری جسم کا آدمی تھا۔ اس کی اُنیس سالہ بیوی ایک حادثے میں گھوڑے سے گر کر مر گئی تھی۔

"ڈاکٹر پیراسس! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ دو مرتبہ تم مجھے میری پیاری مارتھا سے ملوا چکے ہو۔ بس ایک مرتبہ اور اس سے ملاقات کرا دو۔"

پیراسس جانتا تھا کہ میک برگن ایک مالدار پراپرٹی ڈیلر ہے اور اس سے منہ مانگی قیمت حاصل کرنا آسان ہے اور ایسی مالدار آسامیوں کو وہ کسی طور چھوڑنا پسند نہیں کرتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک جادوگر ہی تھا اور اپنی شکل وصورت سے بھی مکمل طور پر جادوگر ہی لگتا تھا۔ اس کا قد دراز اور جسم مضبوط تھا۔ شانے خوب چوڑے اور سر کے بال سفید چاندی کی تاروں کی طرح جو تاریکی میں بھی خوب چمک رہے تھے۔ اس کی لمبی سفید داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے کلائنٹ کے ساتھ تاریک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کمرے کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے کالی روشنی دینے والی پانچ موم بتیاں روشن کی گئی تھیں۔ یہ موم بتیاں بھی غالباً خاص ہی انداز میں بنائی جاتی ہوں گی۔ ان کا جسم بھی کالا تھا۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ان سے جو شعلہ اٹھ رہا تھا، اس کا رنگ بھی گہرا سیاہ تھا۔ بس اس سیاہی کے درمیان ایک تاریک چمک تھی جو کمرے کے ماحول کی تاریکی دور کرنے میں ناکام تھی۔ لیکن یہ پانچ دھبے بڑی پراسرار اہمیت کے حامل تھے۔ پھر پیراسس کی آواز ابھری۔

"اپنے ہاتھ پھیلا لو مسٹر میک برگن! دونوں ہاتھ۔ ہاں، ان کو اس طرح میز پر برابر رکھو اور پانچوں انگلیاں اس طرح پھیلی رہیں کہ میری انگلیوں سے مس ہوتی رہیں۔"

میک برگن نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس کی آنکھیں ڈاکٹر پیراسس کی چمکتی ہوئی نگاہوں پر جمی ہوئی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ڈاکٹر پیراسس کی آنکھوں سے نیلے شعلے نکل رہے ہوں۔ یہ نیلے شعلے اس کے دماغ میں داخل ہو کر اس کے پورے

جسم میں اترتے جارہے تھے اور وہ ان میں ڈوب رہا تھا۔ اس پر خمار کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس کی مارتھا آنے والی تھی۔ وہ اسے دیکھ سکے گا۔ اس سے بول سکے گا۔ دفعتہً کوئی نرم سی چیز اس کے رخساروں سے ٹکراتی ہوئی نیچے گری۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ گلاب کے پھولوں کی پتیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس کا پسندیدہ پھول گلاب کمرہ مہکانے لگا تھا۔ پیراسس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میک برگن کے ہاتھوں پر رکھ کر انہیں دبا لیا تھا۔

''تم ذرا بھی حرکت نہیں کرو گے برگن! اگر تم نے اٹھنے یا بولنے کی کوشش کی تو روح واپس چلی جائے گی۔''

''ہاں..... میں وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن خدا کے لئے اسے واپس نہ جانے دینا۔ میں.....''

ابھی اس کا جملہ یہاں تک پہنچا تھا کہ اچانک کمرہ موسیقی سے گونج اٹھا۔ وہی مخصوص نغمہ جو مارتھا گایا کرتی تھی۔ فضا میں اچانک ایک ساز اُڑتا ہوا نظر آیا۔ یہ مارتھا کا پسندیدہ ساز تھا۔ ساز کے گرد ایک نیلی روشنی کا دائرہ رقص کر رہا تھا۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ لیکن برگن اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے حلق سے تھرتھراتی آواز نکلی۔

''مارتھا..... مارتھا..... میری زندگی.....'' برگن دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پیراسس نے اس کے ہاتھوں کو دبا کر اٹھنے سے روک دیا۔ البتہ میک برگن کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے ڈاکٹر کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور میز پر پڑا ہوا نیکلس اٹھا لیا۔ لیکن اچانک ہی اس کے سارے وجود میں ایک حیرت ناک سنسنی پھیل گئی اور اس کے منہ سے نکلا۔

''مارتھا کہ یہ ہار..... یہ ہار تو تجوری میں بند ہے گھر پر۔''

دفعتہً ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔

''برگن..... برگن.....''

یہ آواز مارتھا ہی کی تھی۔ میک برگن نے بے تاب ہو کر آواز کی سمت دیکھا اور اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اس کی پیاری مارتھا اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ خوشی اور محبت کے آنسو بے ساختہ اس کی آنکھوں سے نکلنے لگے۔

''آہ، مارتھا..... میری مارتھا..... میری زندگی۔'' وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ مارتھا

کا چہرہ ایک نقاب میں پوشیدہ تھا جو اس کے جسم پر پہنے ہوئے نیلے عبا سے جڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر چہرے کو ایک سمت موڑے کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''میں صرف چند لمحوں کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں ڈیئر! صرف چند لمحوں کے لئے۔'' مارتھا کی آواز میں غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میک بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

''مارتھا.....''

''اگر تم ایک انچ بھی آگے بڑھے تو مارتھا واپس چلی جائے گی۔'' پیراسس کی بھیانک آواز ابھری اور میک بے بس ہو گیا۔ اس کے قدم بے جان ہونے لگے اور وہ اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

''مارتھا..... مارتھا.....'' اس نے آنسوؤں اور سسکیوں میں کراہ کر کہا۔

''برگن ڈیئر! تم نے زیکرے اور بیو کو بلاوجہ مار ڈالا۔ تم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

میک برگن کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یہ دونوں نام اس کے لئے بڑی سنسنی خیز کیفیت کے حامل تھے۔ زیکرے اس نئے گھوڑے کا نام تھا جو مارتھا کے لئے خریدا گیا تھا۔ اسی گھوڑے سے گر کر وہ مر گئی تھی۔ اور بیو اس گھوڑے کے نیگرو سائیس کا نام تھا۔ مارتھا کی موت کے بعد دونوں کو اس نے غصے کے عالم میں ہلاک کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ راز کسی کو نہیں معلوم۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔

''مارتھا! میں.....'' لیکن مارتھا نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا اور بولی۔

''وہ دونوں بے قصور تھے برگن! لیکن میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اسی لئے میں آئی ہوں۔''

برگن کو پسینہ آ رہا تھا۔ ایک خوف اس کے دل پر چھاتا جا رہا تھا۔ اب یہ راز پیراسس بھی جان گیا تھا۔ اس کے منہ سے آواز ابھری۔

''مارتھا! کیا تم خوش ہو؟''

''ہاں برگن! میں بہت خوش ہوں۔ لیکن ہر لمحہ تمہیں یاد کرتی رہتی ہوں۔''

''اوہ، میری زندگی..... میری روح.....'' برگن ہچکیاں لینے لگا۔

''میں پھر تم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن اس کا انحصار ڈاکٹر پیراسس کی مہربانی پر

ہوگا۔ اگر وہ چاہیں گے تو ملاقات ہوگی۔'' فضا سے پھولوں کی پنکھڑیاں پھر برسنے لگیں۔ مارتھا کی آواز نغمے میں تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ اچانک کوئی چیز میز پر گری تو میک برگن نے چونک کر دیکھا، یہ وہ کنگھا تھا جو مارتھا بالوں میں لگائے رہتی تھی۔ پھر جب اس نے نگاہیں اٹھائیں تو مارتھا غائب ہوچکی تھی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔

''مارتھا......'' اور وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔

''واپس بلا دو ڈاکٹر...... اسے واپس بلا دو...... اسے واپس بلا دو'' وہ کربناک آواز میں چیخا۔

''روحیں میرے اختیار میں نہیں ہیں۔'' پیراسس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر! پلیز......''

''بے کار باتیں نہ کرو۔ مجھے ابھی ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔''

''جانا ہے...... میں سمجھا نہیں؟''

''مسٹر میک برگن! مجھے اور لوگوں کی خدمت بھی کرنا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے معاوضہ دیا ہے۔''

''خدا کے لئے نہ جاؤ...... خدا کے لئے میری مارتھا کو بلا دو۔ ابھی تو میرا دل بھی نہیں بھرا۔'' میک گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جھک گیا۔ پھر بولا۔ ''میں التجا کرتا ہوں۔ میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔ مارتھا کو ایک بار پھر مجھ سے ملا دو۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ براہِ کرم اب تم مجھے تنہا رہنے کا موقع دو۔ تم جا سکتے ہو۔'' میک برگن روتا ہوا چلا گیا۔ لیکن جب وہ چلا گیا تو ڈاکٹر پیراسس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر گر گیا۔ آج اس نے اس دولت مند احمق سے خاصی موٹی رقم اینٹھی تھی۔

بہرحال کچھ دیر کے بعد وہ بالائی منزل پر واقع اپنے خفیہ کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں گیس کی بتیاں روشن کر دی گئی تھیں اور ایک بہت ہی حسین عورت ماربل کی میز پر اپنے پیر اٹھائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ عورت اس قدر حسین تھی کہ اس کا حسن کسی کو بھی اپنا دیوانہ بنا سکتا تھا۔ شفق جیسے گلنار رخسار پر ایک سیاہ رنگ کے تل نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا سیاہ ریشمی لباس تھا اور وہ بلور کے ایک خوبصورت جام سے

غالباً شراب پی رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک پتلا سا سگار سلگ رہا تھا۔ اس عورت کا نام سارا ڈینس تھا۔ سارا ڈینس کون تھا، یہ بات ابھی صیغۂ راز میں تھی۔ پیراسس سیدھا قد آدم آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد کہ اس کا حلیہ خاطر خواہ ہے، اس نے اپنی مصنوعی بال اتار کر زمین پر پھینک دیئے اور پھر اپنی سفید عبا اتار دی۔ اس کے بعد شانوں اور پیٹ پر مڑی ہوئی گدیاں بھی اتار کر نیچے ڈال دیں۔ پھر اس نے اپنے چہرے سے مصنوعی ناک اور داڑھی بھی علیحدہ کر دی اور عبا اٹھا کر اس سے چہرے کا میک اپ صاف کیا۔ اب وہ ایک تیس برس کا خوبرو اور وجیہہ نوجوان تھا جس کا جسم اور چہرہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوکر اپنے برہنہ خوبصورت جسم اور چمکتی ہوئی نیلی آنکھوں کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ساحرانہ مقناطیسی چمک تھی۔ اس کے ہونٹوں پر اچانک ہی ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھرنے لگی۔ سارا دیوانہ وار نگاہوں سے اس کے سڈول اور چمکتے ہوئے جسم کو دیکھ رہی تھی۔ ایک طرف سارا ڈینس کے بارے میں اگر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ حسن و جمال کی دیوی ہے تو دوسری طرف پیراسس ایک ایسا حسین نوجوان تھا جسے یونانی سنگتراشی کا شاہکار کہا جا سکتا تھا۔ سارا حریص نگاہوں سے اس کے پورے بدن کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''کتنا وصول کیا؟''

''بہت۔ یوں سمجھ لو کہ پندرہ ہزار سونے کے سکے۔ اور ابھی مزید ملنے کی توقع ہے۔''

''ویری گڈ...... ویری گڈ......'' سارا کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ مسکرانے سے اس کا حسن اور بھی نکھر گیا۔

''کسی سے کہو کہ اس خفیہ دروازے میں تیل لگا دے۔ آج تو وہ تقریباً اٹک کر ہی رہ گیا تھا۔ اگر وہ نہ کھلتا تو سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ ملازم سے کہو کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے...... کہہ دیا جائے گا۔''

وہ سارا کی سمت مڑا۔ وہ اسے پرستش کے انداز میں گھور رہی تھی۔ اسے شاید خود بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ اس مرد پر دل و جان سے کیوں فدا ہے۔

''بیویاں مرنے کے بعد بھی شوہروں کے اعصاب پر کس طرح سوار رہتی ہیں۔ حد یہ

ہے کہ راٹ کو ایک بہت ہی ذہین آدمی یعنی ڈیگال کوریل بھی اپنے اعصاب کھو بیٹھا ہے۔"

"آہ...... کیا بتاؤں، کس بلا کی سردی تھی۔ اور برف میں میرے پاؤں جلے جا رہے تھے۔" سارا نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔ "میں تو ڈر رہی تھی کہ وہ چیخ چیخ کر مر نہ جائے۔"

"اور اس بیوقوف کو دیکھو، میری مراد میک برگن سے ہے۔ مارتھا کے غم میں مرا جا رہا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ مارتھا کس قدر آوارہ تھی اور اپنے محبوب سے خفیہ ملاقات کے لئے جاتے ہوئے حادثے میں مر گئی تھی تو جانے اس بد بخت کا کیا حال ہو۔" پیراسس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر بولا۔

"ویسے تم نے گریڈی کو بھیج دیا تھا؟"

"ہاں...... سب سے تیز رفتار گھوڑے پر۔" سارا نے جواب دیا۔ "وہ میک برگن سے پہلے اس کے مکان پر پہنچ کر مارتھا کی نیکلس اور کنگھا تجوری میں واپس رکھ دے گا۔ ظاہر ہے کہانی کو مکمل تو کرنا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتو ہمارا کاروبار کیسے چلے۔"

"تم بہت ہوشیار ہو سارا!"

"سب کچھ تم سے ہی تو دیکھا ہے ڈارلنگ! تم نے اوروں کی طرح مجھے بھی دیوانہ بنا رکھا ہے۔"

"تم اس محبت میں میک برگن کے نوکروں کو انعام دینا نہ بھول جانا اور اس کے وکیل کو بھی۔ اگر وہ تمام ضروری معلومات فراہم نہ کرتے تو برگن پر خاطر خواہ اثر ڈالنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔"

"سب کو کل ہی رقم ادا کر دی گئی تھی۔" سارا نے بتایا۔

"آؤ...... اب غسل کریں۔" پیراسس نے سارا کو پیشکش کی اور شاید یہ اس کا پسندیدہ شغل تھا۔ اس طرح اسے پیراسس کے سڈول، چکنے اور چمکدار جسم کو چھونے کا موقع ملتا۔ پیراسس شب میں جا کر بیٹھ گیا اور سارا اسے خوشبودار پانی سے نہلانے لگی۔ پھر بولی۔

"ویسے ڈیگال کوریل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"آہ...... میرا پیارا کوریل۔" پیراسس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "دو مرتبہ ہم نے اسے وہم کا شکار بنا دیا ہے اور دونوں مرتبہ اسے اپنی ذہنی کیفیت پر شبہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ پچھلی کوشش کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔"

"اور اگر ہم اسے اپنے مقصد پر چلنے کے لئے تیار نہ کر سکے تو؟"

"میں اسے تباہ و برباد کر دوں گا۔" پیراسس نے جواب دیا اور سارا اس کے بدن کو چھونے لگی۔ اس نے پیراسس کا ایک ہاتھ پکڑ کر محبت سے چوم لیا۔ اس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی غائب تھی۔

☼......☼

ہیگ نے ڈیگال کوریل کی کمر پر اتنی زور سے لات رسید کی کہ وہ لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے دوسرے آدمی نے کلہاڑی گھمائی۔ ڈیگال کوریل اس کے وار سے بچنے کے لئے گھوما تو توازن قائم نہ رکھ سکا اور منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ راٹ کو ایڈن کی روح اور صبح تصویر کے کرداروں کا زندہ ہو کر حملہ کرنا اور اب یہ اچانک تشدد۔ ڈیگال کوریل کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ ہیگ اور بیگ اسے گھسیٹتے ہوئے سڑک پر سے اس اصطبل میں لے کر آئے تھے جو علاقے کے ایک سنسان علاقے میں واقع تھا اور انہوں نے یہاں ڈیگال کوریل کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ کوریل نے ان کی دانست میں دغا بازی کی تھی۔ ہیگ نے اپنے اوورکوٹ کا بٹن کھولا اور شرٹ کے اندر پوشیدہ تیز دھار والا خنجر نکال لیا۔ وہ کوریل کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کوریل جس کا ماضی تاریکی میں تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ پانچ جزائر پر مشتمل ایک ریاست کا جلا وطن شہزادہ ہے جو بڑی بے بسی اور بے کسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ غالباً کسی خاص سیاست کے تحت یہ شہزادہ جو افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا، ان وحشی مجرموں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنے والا تھا۔ وہ اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑوں، گاڑی کے شکستہ پہیوں اور گھاس کے گٹھوں کے درمیان گندی زمین پر بے بسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا اور اس کے دشمن اس کے لئے موت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ڈیگال کوریل نے گھٹنوں کے بل اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر سہلائی اور کراہتے ہوئے کہا۔

"میں اس سلوک کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔"

خوفناک شکل والا ہیگ آگے بڑھا اور اس نے کوریل کے بالوں کو پکڑ کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ کوریل کو اپنی گردن اُکھڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہیگ اس کے منہ سے منہ ملا کر سانپ کی طرح پھنکارا۔

"سبب...... سبب تم کو ضرور بتایا جائے گا۔ کیونکہ مرنے سے پہلے ہر مجرم کو اس کا جرم بتا دیا جاتا ہے۔"

ڈیگال کوریل کو یقین آ گیا تھا کہ آخری وقت آ پہنچا ہے۔ یہ کوئی خواب کی کہانی کا پلاٹ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ وہ سیرین کے مکان کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا کہ اچانک ان شیطانوں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک بار پھر اس کی آواز ابھری۔

"لیکن میں نے جرم کیا، کیا ہے؟ مجھے یہ تو بتا دو۔" ڈیگال کوریل نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

"جرم...... میں نے تم سے کہا تھا مائی ڈیئر ڈیگال کوریل! کہ اگر تم نے ہمیں دھوکا دیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس وقت دو افراد مر چکے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم کورنیلس کی لاش کو واپس حاصل کرنے کے لئے معاوضہ طے کرنے ہمارے پاس آئے ہو۔ لیکن تم ہمیں دھوکا دے رہے تھے، ہم سے دغا بازی کر رہے تھے اور اس کے آلہ کار بن کر کام کر رہے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس نے تمہیں ہمارا سراغ لگانے کے لئے متعین کیا تھا اور آخر کار اس نے میرے دو عزیز ترین ساتھیوں کو قتل کر دیا۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم سے تلخ بیانی کروں۔ لیکن افسوس اس وقت صورتحال میرے بس میں نہیں ہے۔"

"تلخ بیانی...... میں تمہاری یہ زبان گدی سے نکال کر کھا جاؤں گا۔ کیا تم اوسیانوس کے لئے کام نہیں کر رہے تھے؟" ہیگ نے انتہائی خوفناک غراہٹ کے ساتھ کہا۔

"سنو...... میں کسی اوسیانوس کو نہیں جانتا۔" ڈیگال کوریل نے بیزار لہجے میں کہا۔

"جھوٹے...... کتے! اسی طرح پڑے رہو...... اٹھنے کی کوشش کی تو ہیگ کی کلہاڑی تمہاری گردن ایک لمحے میں شانوں سے الگ کر دے گی۔ وہ سب سے زیادہ غصے کا شکار ہے۔ کیونکہ جسے تمہاری وجہ سے قتل ہونا پڑا وہ اس کا بھائی تھا۔"

"تم مجھ پر کتنے ہی الزام لگا لو۔ لیکن تحقیقات کرو گے تو یہ بات ضرور واضح ہو جائے گی کہ میں کسی اوسیانوس کو نہیں جانتا۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ میں یقین کر لوں گا؟" ہیگ کی آواز سانپ کی پھنکار کی طرح تھی۔

اس کی آنکھوں میں شدید وحشت نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"اوسیانوس نے میرے دونوں ساتھیوں کو قتل کرنے کے بعد بڑی بے دردی سے ان کا سینہ چاک کیا اور ان کا دل اور جگر نکال کر آگ میں جلا دیا۔ ان دونوں کی لاشوں کے پاس جو پرچہ پڑا ہوا ملا تھا وہ تمہارا پرچہ تھا۔ سمجھے ڈیگال کوریل! وہ تمہارا پرچہ تھا۔ اور میں...... میں ان لاشوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ وہ پرچہ تھا جس کے ذریعے تم نے دھوکہ دے کر انہیں وہاں بلایا تھا۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم نے اوسیانوس کے ساتھ مل کر یہ جال بچھایا تھا اور اوسیانوس تمہارے ذریعے ہمارے خفیہ ٹھکانوں تک پہنچا۔ اور اس کے بعد تم ہم سے فریب کی باتیں کر رہے ہو۔ نہیں ڈیگال کوریل! نہیں۔ ہم اتنے بیوقوف نہیں ہیں۔ تمہارے جیسے غدار کی سزا صرف ایک ہے۔ موت اور صرف موت۔ سمجھے، موت۔"

ہیگ پر جنون طاری تھا۔ وہ کسی خونخوار درندے کی طرح اپنا تیز دھار خنجر لے کر آگے بڑھا اور ڈیگال کوریل کی آنکھوں میں موت کا خوف جھلکنے لگا۔ وہ موت سے ڈر رہا تھا لیکن بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ تب ہیگ نے وار کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کیا کہ اچانک ہی ایک گرجدار آواز ابھری۔

"خبردار! جو کسی نے ذرا بھی حرکت کی۔ ایک انچ بھی ہلا تو اپنی موت کا ذمے دار خود ہو گا۔" یہ آواز کچھ اس طرح کی تھی کہ ہیگ کے قدم رک گئے۔ اس نے سامنے دیکھا، ڈولمین اصطبل میں آنے والی لکڑی کی سیڑھی پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور چمک رہے تھے اور ان ریوالوروں کا رخ ہیگ اور اس کے ساتھیوں کی طرف تھا۔ ڈیگال کوریل نے حیرت سے نگاہیں اٹھا کر اس رحمت کے فرشتے کو دیکھا۔ ایسا دیو قامت اور خوفناک فرشتہ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ شخص اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈولمین آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ ہیگ اور اس کے ساتھی دم بخود ہو گئے تھے۔ وہ لوگ ڈولمین کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"تم اصطبل کے سائیس تو معلوم نہیں ہوتے۔ صورت شکل سے تم قصائیوں کی اولاد نظر آتے ہو۔ لیکن تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ فوراً اپنے ہتھیار پھینک دو، سمجھے۔ ایک لمحے کے اندر اندر۔"

ہیگ پر کچھ ایسا اثر طاری ہوا کہ اس نے اپنا خنجر فوراً ہی پھینک دیا، جیسے وہ اس کے ہاتھوں میں چبھ رہا ہو۔ اس وقت کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ تب ڈولمین کی آواز اُبھری۔

''مسٹر ڈیگال کوریل! آپ اصطبل کا دروازہ کھول کر باہر نکل جائیے۔ باہر سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ اس پر ایک آدمی آپ کو ملے گا۔ اپنا تعارف کرا کے وہیں انتظار کیجئے۔''

ڈیگال کوریل نے جیسے ہی اٹھنا چاہا، ہیگ نے اپنی کلہاڑی گھمائی۔ اس کے لئے مزید برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ لیکن ڈولمین غافل نہیں تھا۔ اس کی پستول سے فائر ہوا اور ہیگ کی پیشانی میں سوراخ ہوگیا۔ وہ زمین پر گرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ لیکن اس فائر نے ڈولمین کو بھی تقریباً موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ دھماکا ہوتے ہی گھوڑے خوفزدہ ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ ایک گھوڑا رسّی تڑوا کر اتنی زور سے دوڑا کہ اپنے ساتھ لکڑی کی وہ سیڑھی بھی لے گیا جس پر ڈولمین کھڑا ہوا تھا۔ ڈولمین نے ہوا میں قلابازی کھائی اور دونوں پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرے۔ لیکن ڈولمین نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ پھرتی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن پستول اب اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ ادھر ڈیگال کوریل خوفزدہ ہو کر ایک کونے میں دبک گیا۔ باہر نکلنے کا راستہ ایک دم بند ہو چکا تھا۔ ایک طرف خوفزدہ گھوڑے تھے اور دروازے کے سامنے دو خطرناک اور مسلح دشمن راستہ روکے موجود تھے۔ ابھی ڈیگال کو صحیح طریقے سے اٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ ہیگ نے اپنا خنجر اٹھا لیا اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر گھوڑوں سے دور کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی سرعت کے ساتھ عمل کیا تھا اور ان میں سے ایک نے ہیگ کی کلہاڑی اٹھا لی تھی اور اب وہ دونوں خونخوار نگاہوں سے ڈولمین کو گھور رہے تھے۔ ڈیگال کوریل کا حلق خوف سے خشک ہو گیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں اپنے نجات دہندہ کو دیکھ رہا تھا جو اب خود بھی موت کے منہ میں پھنس گیا تھا۔ لیکن دیو قامت شخص اطمینان سے پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا ہوا تھا۔

ہیگ اور اس کے ساتھیوں کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس پر حملہ کریں۔ سامنے والے شخص کی شکل ہی خونخوار نہیں تھی بلکہ وہ ایک بپھرا ہوا انسان تھا جسے قدرت نے جسامت بھی شاندار دی تھی اور وہ غم و غصے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے پھرتی کے ساتھ جھک کر لکڑی کی وہ بھاری سیڑھی اٹھا لی جس پر سے وہ گر پڑا تھا اور دوسرے لمحے اس نے سیڑھی

اپنے دونوں حریفوں پر دے ماری۔ اس کا یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ ہیگ اور اس کے ساتھی دونوں کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ وہ سیڑھی کی زد میں آ کر ایک ساتھ نیچے گرے۔ اس سے پہلے کہ وہ وزنی سیڑھی سے بچ نکلنے کی کوشش کریں، ڈولمین نے ان پر چھلانگ لگائی اور اس کے بعد ڈیگال کوریل نے سحر زدہ نگاہوں سے ہیگ کے ساتھ جو موت کا منظر دیکھا، گرنے کے باوجود ہیگ کے ساتھی نے کلہاڑی پر اپنی گرفت نہیں چھوڑی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ ڈولمین اس قسم کے خطرناک مقابلوں کا ماہر ہے۔ کلہاڑی والے نے پھرتی کے ساتھ کروٹ بدلی اور سیڑھی کے نیچے سے نکل گیا۔ کلہاڑی تھامے ہوئے اس نے پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ابھی اس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ سامنے کھڑے ہوئے ڈولمین نے اپنے فولادی ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور اپنے گھٹنے کی بھرپور ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ کلہاڑی والے کا چہرہ سامنے سے چپٹا ہو گیا۔ ناک منہ پر بالکل غائب ہو گئی۔ دانت اکھڑ کر حلق میں چلے گئے۔ خون کا فوارہ اس کے لئے اتنا خوفناک ثابت ہوا کہ وہ سانس تک نہ لے سکے۔ اذیت اور بے بسی کے سبب اس کی کلہاڑی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ ڈولمین نے بائیں ہاتھ سے اس کی کھوپڑی دبائی اور دائیں سے اس کی ٹھوڑی دبا کر اچانک اس کی گردن کو جھٹکے سے اس طرح گھمایا جیسے کوئی پہیہ ہو۔ کلہاڑی والے کی گردن مُڑ کر ایک سمت جھول گئی۔ اس کا بے جان جسم زمین پر لڑھک گیا۔ طاقت کا اتنا خوفناک مظاہرہ کسی انسانی آنکھ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ وہاں جتنے افراد موجود تھے ان کے جسم خوف سے سرد پڑ گئے۔ ہیگ جو اب تک صرف خوفزدہ نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا، اچانک آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر چمک رہا تھا جسے اس نے حملے کے لئے بلند کیا۔ یہ اس کی دیوانگی ہی تھی۔ اسی لمحے اصطبل کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ روشنی میں ڈولمین کا چہرہ چمکتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہیگ کے مقابلے کے لئے جھک کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن دروازہ کھلتے ہی خوفزدہ گھوڑے بری طرح ہنہناتے ہوئے اس طرح دروازے سے بھاگے کہ اگر ہیگ اچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتا تو کچلا جاتا۔ اسی لمحے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے اس شخص نے کہا۔

''ڈولمین! تم خیریت سے تو ہو؟ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔'' یہ ڈولمین کا ساتھی تھا۔ خوفزدہ ہیگ غصے میں چلایا۔

“اس کا مطلب ہے تمہیں...... کیوں مسٹر! تم مجھے بتاؤ۔ کیا تمہیں اوسیانوس نے یہاں بھیجا ہے؟”

“اوسیانوس؟” ڈولمین نے حیرانی سے دوہرایا۔

“ایکٹنگ کر رہے ہو جھوٹے آدمی! تم مجھے بھی قتل کرنے آئے ہو۔ لیکن میں تمہیں دعوے سے کہتا ہوں کہ تم میرا دل نہیں نکال سکو گے۔ تم...... تم......” اچانک ہیگ اس طرح بڑھا اور دروازے سے چھلانگ لگا کر اس طرح بھاگا جیسے شیطان پیچھا کر رہا ہو۔ ڈیگال کوریل اپنی جگہ دم بخود کھڑا ہیگ جیسے درندہ صفت قاتل کو بھاگتا دیکھتا رہا۔ یہ اوسیانوس کون ہے جس کے نام سے خوفزدہ ہو کر ہیگ جیسا ظالم شخص فرار ہو گیا۔ جس نے ہیگ کے ساتھیوں کو بے دردی سے قتل کر کے ان کے دل سینے سے نکال کر جلا ڈیئے تھے۔ ڈیگال کوریل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اور یہ بلڈاگ جیسا خوفناک اور دیو قامت شخص کون ہے جو اب جھک کر اپنی پستول اور جیکٹ کو اٹھا رہا تھا۔ اوسیانوس جو بھی ہو، بے حد خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور جب تک یہ خطرہ راستے سے دور نہیں ہو جاتا، زندگی عذاب رہے گی۔ ڈیگال کوریل نے آنکھیں کھولیں تو دیو قامت اور اس کا ساتھی سامنے کھڑے تھے۔

“کیا تم اوسیانوس کے آدمی ہو؟” اس نے پوچھا

“میں اسے قتل کرنے آیا ہوں۔” ڈولمین نے جواب دیا۔

“آہ...... میں تمہارا شکرگزار ہوں۔” نجانے اس شخص کی موجودگی میں اسے احساسِ تحفظ کیوں ہو رہا تھا۔ ڈولمین اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا تو ڈیگال کوریل نے کہا۔

“تم نے میری جان بچائی ہے۔ کاش...... میں بھی تمہارے کام آ سکتا۔”

“تم میرے بہت کام آ سکتے ہو۔

“کیسے...... میں ہر مشکل اٹھا کر تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔”

“میرا نام ڈولمین ہے۔ اور میں اوسیانوس کو تلاش کرنے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ اگر تم ڈیگال کوریل ہی ہو تو میرے پاس تمہارا ایک تعارفی خط بھی ہے۔”

“میرا خیال ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔” کوریل نے کہا۔

“کیا تم مسٹر ڈیگال کوریل نہیں ہو؟ تعارفی خط میں تو یہی لکھا ہے۔”

“لیکن تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ جبکہ میں نے آج تک تمہاری شکل بھی نہیں دیکھی۔”

“میرا خیال ہے یہ گفتگو باہر چل کر بھی ہو سکتی ہے۔ آؤ...... باہر آ جاؤ۔” ڈولمین کے ساتھی نے کہا اور ڈولمین اس کی بات مان کر باہر کی طرف چل پڑا۔ وہ آگے بڑھا تھا کہ ڈیگال کوریل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

“میں اس معاملے میں مزید نہیں پڑنا چاہتا۔ ان لوگوں سے میری دشمنی خاصی مشکل ہو گی میرے لئے۔ اور مجھے پتہ ہے کہ ایک خطرناک قاتل زندہ ہے۔ یعنی ہیگ۔”

“نہیں میرے دوست! اب یہ ممکن نہیں رہا ہے۔ تمہیں میری مدد کرنا ہی پڑے گی۔ بجائے اس کے کہ میں تمہارے ساتھ کوئی سخت رویہ اختیار کروں پہلے تم یہ تعارفی خط پڑھ لو۔ آؤ...... باہر آ جاؤ۔”

یہ کہہ کر ڈولمین، ڈیگال کوریل کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ وہ غالباً کچھ اور انکشافات کرنا چاہتا تھا۔

✡......✡

وہ سب ایک جگہ جمع تھے۔ڈولمین اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا۔
''ہم میوزیم سے آپ کا تعارف کرتے ہوئے آ رہے تھے مسز کورنیلس! آپ کے مکان سے ذرا پہلے ہم نے مسٹر ڈیگال کوریل کو سڑک کے کنارے کنارے پیدل آتے ہوئے دیکھا۔ پھر ایک گھوڑا گاڑی سے وہ تینوں بدمعاش ان پر جھپٹے اور مسٹر کوریل کو قربانی کے بکرے کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔تب ہم نے اصطبل تک ان کا پیچھا کیا اور......''
وہ جملہ مکمل کئے بغیر پستول صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔اس وقت وہ لوگ مسز کورنیلس کے مطالعہ کے کمرے میں آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔آتش دان میں جلتی ہوئی گرمی ماحول کو ایک لطیف کیفیت دے رہی تھی۔ ڈیگال کوریل کسی حد تک برگشتہ نظر آ رہا تھا۔ایک مشکل سے نکل کر دوسری مشکل میں پڑتے ہوئے وہ شدید ذہنی کوفت محسوس کر رہا تھا۔ڈولمین نے اس سے ذرا سخت لہجے میں کہا تھا کہ وہ اس کا کام کرنے کے لئے مجبور ہے۔ڈول مین اپنے کام میں مصروف رہا۔ڈیگال کوریل کہنے لگا۔
''اور یہ حقیقت ہے کہ تم اپنی صباحت کی بنیاد پر دوسروں سے کام لینے کے عادی ہو۔''
''خیر، میں آپ پر کوئی احسان نہیں جتاؤں گا۔احسان تو صرف ماننے والی چیز ہوتی ہے بشرطیکہ کوئی مانے۔اگر میں آپ کا تعاقب کر کے وہاں تک نہ پہنچتا تو اصطبل میں آپ کی لاش ہوتی۔''
''میرا خیال ہے جارحانہ انداز میں گفتگو کرنا تمہاری فطرت بن چکی ہے۔بے شک تم نے یہ احسان مجھ پر کیا ہے۔لیکن اپنے پستولوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''
''اچھا سوال کیا تم نے۔دوسری بہت سی باتیں چھوڑ کر صرف پستول کے بارے میں بات کرنا ایک دلچسپ بات ہے۔اور مجھے دلچسپ باتوں کا بڑا شوق ہے۔کم از کم ان میں نیا پن تو ہوتا ہے۔ویسے ان پستولوں کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ یہ مشہور ترین اسلحہ ساز

کمپنی نے میرے لئے تیار کئے تھے۔''
''واہ......واہ۔کون سی اسلحہ ساز کمپنی تھی؟'' ڈیگال کوریل کو شاید اس بارے میں خود بھی کچھ معلومات حاصل تھیں۔
''جان فارتھ۔اس کا آتشیں اسلحہ اتنا مشہور ہے کہ نپولین بونا پارٹ نے انہیں بیس ہزار پونڈ کی پیشکش صرف اس لئے کی تھی کہ وہ اپنے اسلحہ سازی کے فن سے اس کے آدمیوں کو آگاہ کر دیں۔لیکن مسٹر جان فارتھ بھی ایک قوم پرست انسان تھے۔انہوں نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور نپولین نے اسے اپنی توہین تصور کیا اور انہیں ہلاک کر دینے کی دھمکی دی۔ڈیوگاس ویلنٹائن میرے دادا مرحوم کے پاس آئے اور انہیں درخواست کی کہ مسٹر فورتھ اسمتھ کو تحفظ فراہم کریں۔میرے دادا جان نے یہ ذمے داری قبول کر لی اور مسٹر فارتھ کے ساتھ باڈی گارڈ کی طرح ہر وقت رہنے لگے۔''
ڈولمین نے سانپ کے اس نشان کو سہلایا جس نے اس کی بائیں ابرو بیچ سے کاٹ دی تھی۔پھر کہا۔''ایک رات چند حملہ آور قتل کے ارادے سے مکان میں داخل ہوئے۔لیکن میرے دادا نے ان کا حملہ ناکام بنا دیا۔تین حملہ آور ختم ہو گئے۔بقیہ زخمی ہو کر بھاگ گئے۔''
ڈیگال کوریل بے اختیار ہنس پڑا۔پھر بولا۔''انہوں نے گلاب کے پودے تو نہیں روند ڈالے تھے؟''
''نہیں مائی ڈیئر کوریل! لیکن فرار ہوتے ہوئے ان کی ایک گولی میرے دادا جان کی ران میں لگ گئی تھی اور اس میں زہر پھیل جانے سے وہ ہلاک ہو گئے تھے۔ان کے بعد مسٹر فورتھ نے خود یہ پستول بنا کر مجھے تحفے کے طور پر دیئے تھے اور نشانہ بازی مجھے ایک بہت ہی ذہین آدمی نے سکھائی تھی۔
''آہ......اس کہانی سے تو میں بھی واقف ہوں۔'' بارکن نے کہا۔بارکن نیلس اس وقت بھی وہیں موجود تھا۔اب وہ احترام اور پرستش کے انداز میں ڈولمین کو گھور رہا تھا۔خود ڈیگال کوریل بھی نجانے کیوں ڈولمین سے متاثر نظر آ رہا تھا۔اس نے کہا۔
''لیکن سوال یہ ہے کہ تم سیرین کا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟''
''ہاں، یہ سوال تو واقعی میں بھی پوچھنا چاہتی ہوں۔'' سیرین نے کہا۔
''میڈم! تقریباً ایک مہینہ قبل اوسیانوس نے میری بیوی کو قتل کر دیا اور اس کے قتل کا

الزام میرے بچے پر لگا کر اسے بھی موت کی سزا دلوا دی۔ میری بیوی بالکل نوجوان تھی اور اسے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ایک مشہور فادر کی بیٹی تھی لیکن اسے اداکاری کا اتنا شوق تھا کہ اس نے تھیٹر میں ملازمت کر لی۔ اس کے باپ نے خفا ہو کر اسے گھر سے نکال دیا تو میں نے اسے پناہ دی اور گرجا میں باقاعدہ اس سے شادی کر لی۔ اسٹیج کی اداکاری کے دوران اس کی ملاقات اداکاروں کے ایک گروہ سے ہوئی جو دراصل اوسیانوس کے آدمی تھے۔ ان کے ذریعے اس کی دوستی اوسیانوس سے ہوئی اور ان دونوں کے درمیان......"

ایک لمحے کے لئے ڈولمین کی آواز بند ہوئی تو سیرین نے کہا۔

"میں سمجھ گئی مسٹر ڈولمین!" سیرین کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"شکریہ میڈم! اس ذکر سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ اوسیانوس بہت ناپاک اور کمینہ آدمی ہے۔ شیطان کا پجاری۔ اسے بہت سے پراسرار علوم آتے ہیں۔ وہ کالے جادو کا ماہر ہے۔ یہ جنوں اور روحوں کو بلانے کا ماہر بھی ہے اور بے حد چالاک ہے۔ جادوئی قوتوں کے مالک اس شخص نے کافی عرصے سے ایک مشن پر کام شروع کیا ہوا ہے نیگال سمورس۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو جادوگروں کی دنیا میں بہت مقدس اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ نیگال سمورس کے حصول کے لئے اوسیانوس اپنی ساحرانہ قوتوں سے کام لے کر کوششوں میں مصروف ہے۔ یہ ایک بہت لمبا چکر ہے۔"

ڈولمین کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہوا۔ اس کی نگاہیں سیرین کی جانب اٹھیں۔ سیرین کی نگاہیں حیرت انگیز انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔ ڈولمین نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میری بیوی نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد سے ہی وہ اوسیانوس سے خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ اس نے اوسیانوس کے بارے میں جو کچھ معلوم کیا تھا وہ مجھے بتا دیا۔ اوسیانوس نیگال سیمورس حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ نیگال سیمورس کوئی ایسی چیز ہے جو ساحرانہ قوتوں کو مکمل کرتی ہے اور اس کے حصول کے بعد ایک طرح سے یوں سمجھ لیجئے کہ شیطان پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ اوسیانوس جو شیطان کا پجاری ہے اور اس کے احکامات پر عمل کرتا ہے، شیطان کو خود اپنے قبضے میں کرنے کی فکر میں ہے۔ اور نیگال سیمورس اس کا ذریعہ۔ اور آپ یہ بات جانتی ہیں مسز کورنیلس! کہ آپ کے شوہر بھی نیگال سیمورس کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"ہاں...... مجھے اس بات کا علم ہے۔ وہ اس کے ذریعے اپنا مرض دور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں اس بات سے بالکل ناواقف تھی کہ نیگال سیمورس کیا چیز ہے۔" سیرین کی آواز بھرا گئی۔

"میڈم! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اگر اوسیانوس سے ذرا بھی آپ کا تعلق ہے تو خدارا اس سے اپنا یہ تعلق منقطع کر لیجئے۔ وہ آپ کو تباہ کر دے گا۔ نیگال سیمورس کو حاصل کرنے کا اسے جنون ہے اور اس کے راستے میں جو بھی حائل ہو گا وہ اسے تباہ کر دے گا۔ اس کے لئے یہ بھی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور وہ اپنی زندگی بچانے کے لئے اور اپنے جادو کو مکمل کرنے کے لئے راستے میں آنے والے ہر شخص کو ہلاک کر سکتا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے ڈولمین! کیا یہ ساری باتیں جو تمہیں تمہاری بیوی نے بتائیں، کیا یہ سچ ہیں؟" ڈیگال کوریل نے سوال کیا۔

"ہاں مسٹر کوریل! یہ تمام باتیں بالکل سچ ہیں۔ میں تمہیں اپنی بیوی کے بارے میں بتاؤں۔ اصل میں اس کا باپ یعنی میرا سسر ایک خدا رسیدہ بزرگ اور پادری تھا۔ لیکن اوسیانوس نے اس پر بھی وار کیا تھا اور انہیں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اوسیانوس کے پاس چند لاطینی اور یونانی کتابوں کے نسخے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں عمل کا طریقہ کار درج ہے۔ اس عمل کا جس کے ذریعے نیگال سیمورس کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے سسر ان کتابوں کا ترجمہ کریں۔ اس نے میری بیوی سے تعلقات اس لئے پیدا کئے تھے کہ وہ میرے سسر تک رسائی حاصل کر سکے۔ وہ قدیم زبانوں کے ماہر تھے۔ لیکن میرے سسر نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا، یہ جادو کی کتابیں ہیں اور ایسے شیطانی علوم کا ترجمہ کرنا گناہ تصور کرتے ہیں۔ اس لئے اوسیانوس نے ان کو بھی انتقام کا نشانہ بنایا۔"

ڈولمین ماضی کے گزرے ہوئے واقعات سے متاثر ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے کوریل کی سمت دیکھا اور کہا۔

"مسٹر کوریل! آپ بھی یونانی علوم جانتے ہیں۔ اوسیانوس نے میرے سسر اور بیوی کو ایک عجیب عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کیا تھا۔ کیا آپ ایسی سائیکلس کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"ایسی سائیکلس؟" ڈیگال کوریل بری طرح اچھل پڑا۔

"ہاں......آپ کا انداز بتاتا ہے کہ آپ ایسی سائیکلس سے واقف ہیں۔ مجھے بتایئے، کیا یہ سچ ہے؟"

"آہ......یہ بڑی بھیانک موت ہوتی ہے۔ یونانی دیومالا کے مطابق ایسی سائیکلس کو دیوتا زیوس کا بیٹا کہتے ہیں۔ ایسی سائیکلس بڑی خبیث فطرت کا مالک تھا۔ زیوس کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اسے کوہ اولمپس پر دیوتاؤں کے حلقے میں شامل کرلیا گیا تھا۔ لیکن وہاں اس نے ایسی گھناؤنی حرکتیں کیں کہ اسے سزا کے طور پر ایک چشمے کے کنارے پیڑ سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ جب پیاس سے بے تاب ہوکر وہ پانی پینے کے لئے زبان نکالتا تو پانی کی سطح نیچے ہوجاتی۔ جب بھوک سے بے حال ہوکر وہ درخت کے پھل توڑنا چاہتا تو شاخیں بلند ہوجاتیں۔ اس سے لفظ ایسی سائیکلس بنا ہے جس کے معنی ہیں ترساتا۔"

"مگر میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کررہا مسٹر ڈیگال کوریل!"

"کیا مطلب؟" کوریل نے پوچھا۔ اور پھر اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

"خدایا......کیا تم......تم......تم......"

"ہاں، میں اس واقعہ کا حوالہ دے رہا ہوں۔ مسٹر کوریل جن کے مطابق ایسی سائیکلس نے خود اپنے بیٹے کو قتل کرکے اس کا گوشت دیوتاؤں کو کھلا دیا تھا اور اس بھیانک اور ڈراؤنے فعل کی بنا پر دیوتاؤں نے اسے یہ سزا دی تھی۔ اوسیانوس نے میری بیوی کو قتل کرنے کے بعد میرے سسر کی اور میری دعوت کی اور ہم دونوں کو اس کا گوشت کھلایا۔ اور ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہوسکا۔"

"آہ......میرے خدایا۔ کیسی بھیانک باتیں ہیں۔ نیلس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ سیرین کی آنکھیں بھی دہشت سے پھیل گئیں۔ ڈیگال کوریل اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ اس ہولناک حرکت کا تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ڈولمین اور اس کے سسر کو اس کی بیوی کا گوشت کھلایا گیا تھا۔ دفعتہً ہی سیرین کا دل اس دیوقامت شخص کے لئے بھر آیا۔ اس کے خیال میں یہ شخص بے حد مظلوم تھا۔ روتے ہوئے بولی۔

"یہ سچ ہے، میرے شوہر بھی نیگال سیمورس کو حاصل کرنے کی تگ ودو میں تھے۔ لیکن وہ صرف اپنے موذی مرض کے علاج کے لئے یہ کوششیں کررہے تھے۔ افسوس کہ موت نے انہیں یہ موقع نہیں دیا۔" سیرین نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں، پھر بولی۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ اور سچ پوچھو تو مجھے ان باتوں پر اعتماد بھی نہیں ہے۔ لیکن میرے شوہر کا یقین تھا کہ یہ ممکن ہے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے جادو اور جنوں کو قابو کرنے کے متعلق سحر کے موضوع پر بہت سی قدیم کتابیں بھی جمع کی تھیں۔"

ڈیگال کوریل اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے وکیل ڈینس پارک کے گھر پر جس کیفیت کا سامنا کیا تھا اور جس طرح اپنی مرحوم بیوی کی روح دیکھی تھی، اب وہ سب اس کے ذہن میں تازہ ہوگیا تھا۔

"سیرین!" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے تاریکی میں رکھا۔ اور مجھے استعمال کیا۔ مجھے اس بات سے بڑا دکھ پہنچا ہے۔"

سیرین نے سر جھکا لیا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے اور اس کی مدھم سی آواز ابھری۔ "مجھے معاف کردو مائی ڈیئر! مجھے معاف کردو۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے تمہیں معاف کردیا۔ لیکن اب تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھ سے مزید کچھ نہ چھپاؤ۔ ابھی مسٹر ڈولمین نے بتایا تھا کہ انہوں نے میوزیم کے سامنے تمہیں جن دو آدمیوں کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا تھا وہ اوسیانوس کے آدمی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے سیرین؟"

سیرین نے بے بسی سے نظریں جھکا لیں۔ وہ بے حد شرمندہ نظر آرہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں تم سے سخت شرمندہ ہوں کوریل!"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ دوبارہ بولی۔ "میرے شوہر کی لاش قبر سے میری مرضی اور اجازت کے بغیر نکال لی گئی تھی۔"

"تمہاری مرضی کے بغیر؟"

"ہاں......"

"لیکن سیرین......"

"میں سخت شرمندہ ہوں۔"

"سیرین......کیا واقعی......؟"

"مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"

''اوہ......میرے خدا......!''

ڈیگال کوریل سخت ہیجان کا شکار ہوگیا تھا۔بمشکل تمام اس نے کہا۔

''تو کیا تم نے ان لاش چوروں کو خود......'' سیرین نے افسردگی سے گردن ہلائی اور شرمندہ لہجے میں بولی۔

''ہاں......میں نے یہ سب کچھ اس کے حکم پر کیا تھا۔''

''کس کے حکم پر......؟'' کوریل نے سوال کیا۔

''ڈاکٹر پیراسس......انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرے شوہر کی لاش ان کو مل جائے تو وہ اسے زندہ کر سکتے ہیں۔آہ، تم نہیں جانتے مجھے کورنیلس سے کتنی محبت تھی۔ اس لئے میں نے اس کے مقبرے سے محافظ ہٹا لئے اور تالا کھول دیا تا کہ ڈاکٹر پیراسس لاش نکال لیں۔''

ڈیگال کوریل کے چہرے پر غصے اور نفرت کے آثار نظر آنے لگے۔اسے شدید افسوس تھا کہ اس نے جس عورت کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی، درحقیقت وہ ایک چالاک اور بدکار عورت ہے۔وہ بولا۔

''تم نے اسے بھاری رقم بھی ادا کی ہوگی۔''

''ہاں......کیونکہ میں ہر قیمت پر اپنے شوہر کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔اور میں اس معاملے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی۔میں نے اسے بھاری رقم ادا کی ہے۔اور یہ میرا بالکل ذاتی معاملہ ہے۔''

ڈیگال کوریل نے شدید غصے کے عالم میں سیرین کا بازو اتنی زور سے دبایا کہ وہ بلبلا اٹھی۔پھر وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سیرین!مُردے کبھی زندہ نہیں ہوتے۔یہ شخص جو خود کو ڈاکٹر پیراسس کہتا ہے، فراڈ ہے۔بے وقوف بنا رہا ہے وہ تمہیں۔''

سیرین نے ایک جھٹکے سے اس سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔اس کے انداز میں بھی سختی پیدا ہوگئی تھی لیکن کوریل نے اس کی پرواہ نہیں کی۔وہ بولا۔

''کیا تم سن سکو گی کہ وہ تمہارے شوہر کی لاش کا کیا کرے گا؟ سن سکو گی تم؟ وہ اس پر ایسی سائیکلس کا عمل کرے گا۔یہ بدترین کالا جادو ہے جس کے ذریعے مرنے والے کی

روح کو بلا کر اس سے بات کرتے ہیں۔یونانیوں کے دورِ حکومت میں یہ عام تھا جو اس بات پر اعتقاد رکھتے تھے کہ روحیں مستقبل کا حال بتا سکتی ہیں۔اور چونکہ وہ فضائے بسیط سمیت پوری کائنات میں جا سکتی ہیں اور ہر چیز کو دیکھ سکتی ہیں اس لئے وہ ان سے خفیہ خزانوں کا حال پوچھتے تھے۔اسی عمل کے ذریعہ جادوگر ابلیس اور جنات کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔سمجھ رہی ہو نا تم۔میں تم سے التجا کرتا ہوں سیرین! کہ ایسی حماقت میں مت پڑو۔نجانے کیوں میرے دل میں تمہارے لئے اس قدر پیار پیدا ہو گیا ہے۔حالانکہ میں......میں بھی تمہاری ہی طرح اپنی بیوی کا فدائی تھا۔''

ڈولمین اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔خود اسے بھی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص سیرین سے دیوانہ وار محبت کرتا ہے۔کوریل کہہ رہا تھا۔

''سیرین......سیرین! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس منحوس اور ناپاک چکر میں نہ پڑو۔وہ تمہارے شوہر کی لاش پر کالا عمل کر کے بدروحوں اور شیطانی قوتوں کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرے گا۔ممکن ہے وہ آوارہ روحوں کے غیبت گروہ کے سردار کو اپنا تابع کرنے کا عمل بھی کرے۔لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ اگر یہ عمل ناکام رہا تو اس کی جگہ جو بھی مرد ہوگا وہ بدی کی ان قوتوں کا نشانۂ انتقام بن جائے گا۔میری بات سمجھنے کی کوشش کرو سیرین! میں جو کہہ رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔''

سیرین نے اسے ناگواری سے دیکھا اور غصے میں اس کی سمت پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔ڈیگال کوریل اسی طرح بیٹھا رہا۔اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار تھے اور آنکھوں سے ایک عجیب سی بے بسی جھلک رہی تھی۔

''یہ نو دن اور نو راتوں کا عمل ہوتا ہے۔اس دوران عمل کرنے والا جادوگر مسلسل تیاریاں کرتا ہے۔وہ انتہائی گھناؤنی اور ناپاک حرکتیں کرتا ہے۔لاشوں سے اتارے ہوئے متعفن کپڑے پہنتا ہے۔اور جب تک عمل پورا نہ ہو جائے وہ یہی لباس پہنے رہتا ہے۔وہ ایسی روٹی کھاتا ہے جو بے خمیر کی ہو اور جس میں نمک بالکل نہ ہو۔اور وہ زیادہ سے زیادہ گندی ہو۔سنا تم نے۔وہ کتے کا سڑا ہوا گوشت کھاتا ہے۔کیونکہ غلاظت اور تعفن جتنا زیادہ ہوگا، بدروحیں اتنی ہی زیادہ جلدی آئیں گی۔وہ ایک حصار کے اندر بیٹھ کر جادو کے منتر پڑھتا رہتا ہے۔'' ڈیگال کوریل اپنی معلومات کے متعلق سیرین کو بتا رہا تھا۔کیونکہ وہ

خود بھی جادو منتر کے بارے میں اچھا علم رکھتا تھا۔

سیرین شدید غصے کے عالم میں اس کی سمت مڑی اور بولی۔

''تم کچھ بھی بکواس کرتے رہو، مجھے بالکل پرواہ نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر پیراسس مجھے میرا کورنیلس واپس دلا دے گا۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔''

پھر ڈولمین نے ان معاملات میں مداخلت کی اور بولا۔

''آخر یہ ڈاکٹر پیراسس ہے کون؟ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی مسز کورنیلس؟''

سیرین کی بجائے ڈیگال کوریل چیخ کر بولا۔

''یہ منحوس وہی ہے جس کی تمہیں تلاش ہے، سمجھے۔ وہ اوسیانوس ہے۔ جس نے تمہاری بیوی کو قتل کیا تھا، سمجھے۔ یہ وہی ہے جس کا نام اوسیانوس ہے۔''

ڈولمین نے آگے بڑھ کر ڈیگال کوریل کو شانوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور بری طرح جھنجھوڑتا ہوا بولا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ پیراسس درحقیقت اوسیانوس ہے؟''

''آہ...... میں نے تو کتنی ہی بار اس کے بارے میں لکھا ہے۔ تم نہیں جانتے، دنیا مجھے ایک معمولی شخصیت سمجھتی ہے۔ لیکن میرا ماضی اگر دنیا کے سامنے آ جائے تو لوگ مجھے اتنا معمولی نہیں سمجھیں گے۔ میں جو کچھ بھی کہتا ہوں، بڑی ٹھوس بنیادوں پر کہتا ہوں۔ ڈاکٹر پیراسس ہر قیمت پر سیرین کے مرحوم شوہر کی لاش حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے چند افراد کو جو جرائم پیشہ تھے، لاش نکالنے کا کام سپرد کیا تھا۔ لیکن انہوں نے دھوکا دیا اور لاش لے کر فرار ہو گئے تاکہ اس کی واپسی کے لئے سیرین سے بھاری رقم وصول کریں۔ لاش چوروں کے گروہ کے دو آدمیوں کو اوسیانوس نے اس بدعہدی کے جرم میں قتل کر دیا۔ تم خود بھی گواہ ہو کہ ہیگ نے تمہارے سامنے یہ کہا تھا کہ اوسیانوس نے اس کے ساتھیوں کو قتل کیا ہے، سمجھے۔ پیراسس اور اوسیانوس درحقیقت ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔''

''میں نہیں مان سکتی...... میں نہیں مان سکتی۔'' سیرین نے اس گفتگو میں مداخلت کی۔ ''پیراسس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں کورنیلس کی جدائی کے غم میں خودکشی کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے باز رکھا۔ وہ ہرگز......'' ڈیگال کوریل نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔

''سیرین! تم نے مجھے تاریکی میں رکھ کر اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور میں نے

معاف کر دیا۔ لیکن میں یہ حقیقت معلوم کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم سے بھی حقیقت معلوم کر کے رہوں گا۔ تم خود حقائق کا تجزیہ کرو۔ ہیگ نے خود اعتراف کیا ہے کہ کورنیلس کی لاش قبر سے نکالنے کا کام اسے اوسیانوس نے سونپا تھا اور مسٹر ڈولمین نے خود تم کو اوسیانوس کے دو آدمیوں سے بات کرتے ہوئے دیکھا۔

''وہ دونوں اسٹیج کے اداکار ہیں۔ ان کا تعلق ڈاکٹر پیراسس سے ہے۔ مجھے جب ڈاکٹر سے ملنا ہوتا ہے تو ان کے ذریعے اسے پیغام دیتی ہوں۔''

''تھوڑی سی عقل سے کام لے لو سیرین! تھوڑی سی عقل سے کام لے لو۔ یہ دونوں اداکار جو پیراسس کے پیامبر ہیں، درحقیقت اوسیانوس کے آدمی ہیں۔ پیراسس اور اوسیانوس ایک ہی شخص کا نام ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، تمہاری ملاقات اس سے کتنے عرصے قبل ہوئی تھی؟''

''کورنیلس کی موت کے فوراً بعد۔ اس سے پہلے میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔''

''گویا تین ہفتے قبل۔ مسٹر ڈولمین! اولیانوس نے وہ جگہ کب چھوڑی تھی، آپ مجھے یہ بتائیے۔''

''تقریباً اتنے ہی دن پہلے۔'' ڈولمین نے جواب دیا۔

''سنو سیرین! مجھے کورنیلس کی موت کا بہت دکھ ہے۔ اوسیانوس نے فرار اس لئے حاصل نہیں کیا کہ اسے مسٹر ڈولمین سے خطرہ تھا۔ اصل میں وہ کورنیلس کے تعاقب میں یہاں آیا تھا تاکہ اس سے میگال سیمورس کو حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کر سکے۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ مر چکے ہیں تو اس نے لاش پر قبضہ کرنے کی سازش کی۔ اس کے لئے تمہیں اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ اس نے تمہارے نوکروں اور دوستوں کے ذریعے تمہاری زندگی کے ذاتی پہلوؤں کے متعلق معلومات حاصل کی تاکہ ایک ایسا ذریعہ دریافت کر سکے جس سے تم کو متاثر کیا جا سکے۔ تم بتاؤ کیا اس نے تمہاری ازدواجی زندگی کے متعلق ایسی باتیں نہیں بتلائیں؟ تمہاری دانست میں وہ باتیں جو کورنیلس کے اور تمہارے علاوہ اور کسی کے علم میں نہیں تھیں۔''

سیرین نے چند لمحات سوچا، پھر بولی۔ ''ہاں...... یہ تو سچ ہے۔ اور اس کے علم سے متاثر ہو کر میں نے اپنی کئی سہیلیوں اور دوستوں کو بھی اس سے متعارف کرایا ہے۔ ایسی سہیلیاں

اور دوست جو میری ہی طرح غمزدہ ہیں۔"

"یقیناً یہ دوست مالدار بھی ہوں گی۔" ڈیگال کوریل نے کہا۔

سیرین ایک لمحے تک سوچتی رہی، پھر ہیجانی لہجے میں بولی۔ "تمہیں خدا کا واسطہ کوریل! تم میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دو۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے سیرین! لیکن تم اور میں دونوں تقدیر کے ہاتھوں گروی ہو چکے ہیں۔ میری وجہ سے دو آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ کیا پیراسس نے تمہیں میری خدمات حاصل کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا؟"

"نہیں۔ اس سلسلے میں تمہارا انتخاب میں نے کیا تھا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم میرے ہمدرد ہو، میرا خیال رکھتے ہو۔ پیراسس کو یہ انتخاب بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تم میں برداشت کی قوت نہیں ہے اور تمہیں سچ بولنے کا مرض ہے۔ اس لئے کام خراب کر دو گے۔"

"ہیگ نے کہا تھا کہ میں اوسیانوس کا آلہ کار ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ میں غیر دانستہ طور پر واقعی اس کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ ہیگ نے بتایا تھا کہ قتل کے بعد اس کے دونوں ساتھیوں کے دل اور جگر سینے سے نکال کر جلا دیئے گئے تھے۔ سیرین! یہ سب شیطان کی پوجا کی علامات ہیں۔ یہ جنات کے خبیث بادشاہوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسم ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں کبھی پیراسس سے غداری نہیں کروں گی، سمجھے۔ کبھی نہیں۔" سیرین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"وہ قاتل ہے۔ اور تمہیں بھی قتل کر سکتا ہے۔"

"میں ہرگز اس بات پر یقین نہیں رکھ سکتی۔ تم اس بات کو کتنی ہی بھیانک اور دہشت ناک کہانی بنا کر کیوں نہ پیش کرو۔ میں کبھی یقین نہیں کروں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم پیراسس سے جلتے ہو۔"

"تم مجھے اذیت پہنچا رہی ہو سیرین!"

"اور سنو مائی ڈیئر مسٹر ڈولمین! تم بھی اپنی بیوی کا گوشت کھانے کی کہانی سنا کر مجھے نہیں ڈرا سکتے۔ تم دونوں ملے ہوئے ہو۔"

"میڈم! میرے سسر پر اس حادثے کا اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ دیوانہ ہو گیا اور اس نے

خودکشی کر کے جان دے دی۔ تم اسے افسانہ کہہ رہی ہو۔" ڈولمین کی آواز میں کسی قدر غصہ تھا۔ اچانک ہی سیرین نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ ڈیگال کوریل آگے بڑھا اور اس نے سیرین کو بازوؤں میں لے لیا۔ ڈولمین کہنے لگا۔

"معافی چاہتا ہوں میڈم! لیکن کیا آپ مجھے اس شخص کا حلیہ بتا سکتی ہیں؟ میرا مطلب ہے پیراسس کا۔" ڈولمین بولا۔

"وہ عمر رسیدہ آدمی ہے۔ سفید چاندی جیسے لمبے لمبے بال اور داڑھی۔ چوڑا سینہ۔ وہ بہت خوبصورت انسان ہے۔ وہ اوسیانوس ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

ڈولمین نے اپنی آنکھوں میں اوسیانوس کا چہرہ لانے کی کوشش کی۔ اسے یہ اندازہ تھا کہ اوسیانوس ایک جوان، خوبصورت اور بلا کا تیز طرار آدمی ہے۔ پیراسس تو اس سے بالکل مختلف تھا جس کا حلقہ وہ بتا رہی تھی۔ اس نے ڈیگال کوریل سے کہا۔

"ڈیگال! یہ حلقہ تو بالکل ذرا الگ سا ہے۔"

"میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں مائی ڈیئر مسٹر ڈولمین! کہ اوسیانوس کا تعلق اداکاروں کے گروپ سے ہے۔ کیا وہ حلیہ تبدیل کرنے کے فن میں ماہر نہیں ہو سکتا؟" ڈیگال کوریل نے کہا۔

"تم کچھ بھی کہو، میں تم دونوں کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔" سیرین نے غصے سے کہا۔

"سیرین! اس پیراسس یا اوسیانوس نے دو مرتبہ مجھے اس وہم میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرا دماغی توازن خراب ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ ڈینس پارک کے مکان پر اور دوبارہ میرے گھر پر۔ اور یہ وہم اتنا شدید تھا کہ میں اپنی بیوی کا نام لے کر چلاتا ہوا اس سائے کی سمت بھاگ نکلا تھا۔ اصل میں وہ مجھے ذہنی طور پر ناکارہ بنانا چاہتا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ بات سوچی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟"

"سنو میرے عزیز دوست! تمہاری ہمدردی اور محبت سے میں ہمیشہ سے متاثر ہوں۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ لیکن خدارا مجھ سے یہ سوال نہ کرو۔"

"اب آپ اتنا تو کر سکتی ہیں میڈم! کہ جب دوبارہ پیراسس آپ سے یا آپ کے کسی دوست سے ملاقات کا پیغام بھیجے تو ہمیں بتا دیجئے۔" ڈولمین بولا۔

"نہیں، میں یہ ہرگز نہیں کر سکتی۔"

"خدا کے لئے سیرین! ضد نہ کرو۔ تم خطرے میں ہو۔"

"اچھا، اب میں اجازت چاہتی ہوں۔ میرے وکیل نے مجھے لاش کے معاوضے کے سلسلے میں بلایا ہے۔ مجھے رقم نکالنے کے لئے چیک پر دستخط بھی کرنے ہیں۔ فی الحال مجھے اپنے شوہر کی لاش حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی فکر نہیں ہے۔ خدا حافظ۔" اس نے مزید کوئی بات سننا پسند نہ کی اور وہاں سے چلی گئی۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ نیلس نے اب تک خاموشی اختیار کی تھی۔ اور ویسے بھی وہ ان بڑے لوگوں کی باتوں میں دخل دینے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اب اس نے کھانس کر کہا۔

"مسٹر ڈولمین! اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"سنو، جو کچھ کمرے میں سنا گیا ہے اسے بھول جانا نیلس۔ اگر اوسیانوس کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ تم ان باتوں سے واقف ہو تو تمہاری زندگی کی خیر نہیں ہے۔ یہ میں تمہاری بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

"مجھ پر اعتماد کیجئے مسٹر ڈولمین! میں تقریباً تیس برس سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ اوکلو کے بارے میں، میں یہ بات پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وحشیوں کا شہر ہمیشہ جرائم اور تشدد کا مرکز رہا ہے۔ بدترین افلاس اور غیر مہذب جنگلی معاشرہ یہاں کی اصل بیماری ہے۔ یہاں کالرا، چیچک اور پلیگ کی بیماری موجود ہے۔ لیکن یہ بات میں خود بھی دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ اوسیانوس جو ہے یہ ان تمام بیماریوں سے زیادہ خطرناک بیماری ہے۔ یہ میرا مختصر سا تجزیہ ہے۔"

"اوسیانوس......" ڈیگال کوریل نے زیرلب کہا۔

"ہاں، اوسیانوس۔ کیا سمجھے؟"

"آیئے مسٹر کوریل! یہاں سے چلتے ہیں۔ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں چل کر قیام کریں گے اور پھر کھانا کھا کر اوسیانوس کے بارے میں سوچیں گے۔ میرا خیال ہے اس نے آپ کی تلاش ابھی سے شروع کردی ہوگی۔ اس لئے احتیاط لازم ہے۔" وہ جیسے ہی باہر نکلے ایک سیاہ فام نیگرو ملازم جو ان کی تمام باتیں سن رہا تھا، چپکے سے عقبی دروازے سے باہر نکلا اور اوسیانوس کو اطلاع دینے کے لئے روانہ ہوگیا۔

✿......✿

اوسیانوس اپنے کام میں مصروف تھا۔ نیگال سیمورس اس کے لئے زندگی موت کا مسئلہ تھا اور وہ اس کے حصول کے لئے ہر وہ کام کررہا تھا جس کا انسانیت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ درحقیقت کالے جادو کے حصول کے خواہش مند، انسان رہتے بھی نہیں ہیں۔ ان کا شیطان سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے اور وہ شیطان زادے ہوتے ہیں۔

اور اس وقت شیطان زادہ اوسیانوس اپنے شیطانی عمل میں مصروف تھا۔ وہ سامنے کھڑے ہوئے شخص سے کہہ رہا تھا۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو۔"

"کیوں نہیں مسٹر اوسیانوس......"

"ڈیگال کوریل بے حد خطرناک ہے۔"

"تو پھر؟"

"تم اسے اچھی طرح نہیں جانتے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"تم اسے قتل کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔"

"کیا آپ کی باتوں میں تضاد نہیں ہے مسٹر اوسیانوس؟"

"تضاد......؟"

"ہاں......"

"اوہ......تم نہیں سمجھ سکتے۔ میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔"

"حقیقت تو یہ ہے کہ جو باتیں آپ کررہے ہیں وہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" ایڈمین نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں صرف تمہارے لئے، میرا مطلب صرف اس لئے اپنا منصوبہ تبدیل نہیں کرسکتا کہ ڈیگال کوریل نے تمہاری انا کو ٹھیس پہنچائی ہے ریڈ مین!"

"پھر آپ اس کو ٹھکانے لگانے سے منع کیوں کررہے ہیں؟"

"یہی تو ایک اہم بات ہے۔"

"لیکن مسٹر اوسیانوس! وہ......"

"نہیں......نہیں......میں تفصیلات نہیں سنوں گا۔ میں کسی عدالت کا جج نہیں ہوں کہ

تمہارے دلائل سنوں۔ بلاشبہ اس نے اپنے کالم کے ذریعے تمہاری زندگی کے بہت سے پہلو بے نقاب کئے ہیں۔ اس نے تم پر بہت سے الزام بھی عائد کئے ہیں اس لئے میں نے اسے معمولی سی سزا بھی دی۔ سمجھ رہے ہونا تم۔ اس کا ذہن اب تک اس تصویر کے بھیانک کرداروں کے زندہ ہونے کے وہم سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ کافی ہے۔ تم نہیں سمجھتے۔ اس طرح کی خوراکیں بہت عرصے تک منہ کڑوا رکھتی ہیں۔''

''لیکن وہ انتہائی کمینہ، جاہل اور بدزبان ہے۔'' ریڈ مین نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ وہ بے حد ذہین، صاحب علم اور بلند پایہ ذہنیت کا مالک ہے۔ بے شک وہ غریب ہے اور اس کا سب کچھ اوکلو کے بدذوق عوام ہیں۔ سچ پوچھو تو وہ ایک صدی قبل پیدا ہو گیا ہے اسی لئے ناقدری کا شکار ہے۔''

''ٹھیک ہے...... میرے ذہن میں جو کچھ ہے وہ ایک الگ جگہ ہے۔ لیکن میں تم سے یہ سوال کر رہا ہوں ڈیئر اوسیانوس! کہ میں اسے قتل کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میرے بارے میں تم نے اس قدر معلومات کہاں سے حاصل کر لیں؟ یہ بھی ایک سوال ہے اور بڑی اہمیت کا حامل۔''

''ڈیگال کوریل کی مجھے ابھی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ جو کچھ تم نے سوچا ہے اسے اپنے ذہن سے نکال پھینکو۔ اس کے ذریعے مجھے کورنیلس کی لاش کا بھی پتہ چلانا ہے۔ ابھی زندہ رہنا ہے۔ سمجھ رہے ہونا۔ اسے ابھی زندہ رہنا ہے۔ سیرین کو بھی اس پر کافی اعتماد ہے اور یہ بات تم بھول گئے ہو کہ ہیگ ابھی زندہ ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر لاش کا پتہ لگانا مشکل ہو جائے گا۔ اور میرے دوست میری جان! تم کیا سمجھتے ہو کہ میرا ہر عمل مصلحت سے خالی ہوتا ہے۔ تم پسند کرو یا نہ کرو، سیرین تم سے زیادہ ڈیگال کوریل پر اعتماد کرتی ہے اور ہم ڈیگال کوریل کو رُوحوں پر یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس طرح وہ ہم پر اعتماد کرنے لگے۔ اور سیرین کو لاش کی بازیابی کے لئے رقم ادا کرنے سے نہ روکے۔''

''تم کچھ بھی کہو اوسیانوس! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے ایسی عبرتناک موت دوں گا کہ وہ بھی یاد رکھے گا۔''

''نہیں...... اس نے جو کچھ بھی تمہارے بارے میں اپنے کالم میں لکھا تھا وہ ٹھیک تو تھا۔ حقیقت کو قبول کرنے کی عادت ڈالو۔''

''مجھے ایک سوال کا جواب دو اوسیانوس! تمہاری مشکل کو میں جانتا ہوں۔ کیا تم کورنیلس کی لاش حاصل کئے بغیر نیگال سیمورس کو حاصل نہیں کر سکتے؟''

''نہیں...... کیونکہ کورنیلس کے پاس وہ اہم کتابیں ہیں جن کے ذریعے نیگال سیمورس حاصل کرنے کے عمل کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس کی موت کے بعد سے یہ کتابیں غائب ہیں۔ مجھے ان کتابوں کو حاصل کرنے کے لئے اور نیگال سیمورس حاصل کرنے کے لئے اب کورنیلس کی روح سے رابطہ کرنا ہوگا اور اس کے لئے اس کی لاش کا حصول ضروری ہے۔''

''ڈیگال کوریل ہم سب کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ دماغی طور پر کتنا طاقتور ہے۔''

''یہ مسئلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''اگر ایک مرتبہ اس نے تمہیں بے نقاب کر دیا تو سارا گورکھ دھندا ختم ہو جائے گا اور احمقوں کی جیبوں سے دولت آنے کا سلسلہ بھی۔ سمجھ رہے ہونا۔''

اب اوسیانوس کی پیشانی پر غصے کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ اس نے کہا۔

''یہ میرا فیصلہ ہے ریڈ مین! کہ ڈیگال کوریل زندہ رہے گا۔ جب تک مجھے ضرورت ہے، جہاں تک دولت کی آمد کا مسئلہ ہے، یہ مفت نہیں آتی۔ میں اس کے عوض بہت سے اہم کام سرانجام دیتا ہوں۔ لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔''

اور حقیقت یہ تھی کہ اوسیانوس واقعی اپنے عقیدت مندوں کی خدمت کرتا تھا۔ وہ ان کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا۔ بے شمار دولت مند لوگ اس کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے اور وہ خود ان کو مطمئن رکھنے کے لئے نجانے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ اس نے اپنا ایک چینل بنا رکھا تھا۔ بے شمار لوگوں کی ایک فوج پال رکھی تھی جن میں نوکر، خادمائیں، دوست، نقب زن جو ذاتی کاغذات اور دوسری چیزیں اس طرح چوری کر سکتے تھے کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو سکے۔ وکیل، پولیس والے، جج، رشتے دار، ڈاکٹر اور ایسے تمام لوگوں کو وہ رشوتیں دیتا تھا جن سے وہ اپنے عقیدت مندوں کے بارے میں ذاتی معلومات حاصل کر سکتا تھا اور انہی معلومات کی بنا پر وہ ان پر مافوق الفطرت اثرات پیدا کرتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ واقعی روحوں سے ملاقات کر رہے ہیں۔ یہ تمام باتیں ریڈ مین اچھی طرح

جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اوسیانوس روحوں کے کھیل کے علاوہ اپنے عقیدت مندوں کی ذاتی کمزوریوں کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہے مثلاً کنگ لوئی۔ اور گب لارنی کو لڑکیوں سے دلچسپی تھی اور اوسیانوس ان کی تسکین کے انتظامات کرتا تھا۔ خود ریڈ مین کی بھی یہ کمزوری تھی۔ اور یہ کمزوری اوسیانوس کی داشتہ سارا تھی جس کا وہ دیوانہ تھا۔ لیکن اوسیانوس اب اسے بھی بلیک میل کر سکتا تھا۔ ڈگر ڈیگال کوریل نے اس کا راز فاش کر دیا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس کا موقف بالکل مختلف تھا۔ اور اس کے لئے ڈیگال کوریل کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔

''ڈیگال کوریل کو زندہ رہنا ہے ریڈ مین! سمجھ رہے ہو نا۔ تم جو کچھ سوچ رہے ہو وہ غلط ہے۔''

اوسیاس نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا ہو۔ پھر وہ بولا۔ ''اور اب یہ میرا حکم ہے۔ جو تمہیں ماننا ہوگا۔''

''ہاں، ٹھیک ہے اوسیانوس! جیسے تمہاری مرضی۔'' نجانے کس طرح ریڈ مین کے منہ سے الفاظ نکلے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اوسیانوس اور اس کی داشتہ سارا تیسری منزل کے کمرے میں کھڑے ہوئے باہر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دریچے سے جھانک کر ریڈ مین کی بگھی روانہ ہوتے ہوئے دیکھی تھی۔ سارا نے اوسیانوس سے کہا۔

''میرے لئے کیا کہتے ہو۔ کیا اب مجھے ریڈ مین کے ساتھ رات بسر کرنا ہوگی؟''

''نہیں۔'' اوسیانوس نے جواب دیا۔ لیکن ریڈ مین بہت مغرور ہو گیا ہے اور یہ اس کے زوال کی علامت ہے۔''

''تو کیا تم اسے ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''نہیں۔ وہ اپنے غرور کے زعم میں خود ختم ہو جائے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھے دھوکا دے سکے گا۔ میں لہجے اور چہرے کے عضلات سے انسان کے دل کی کیفیت کا پتہ لگا سکتا ہوں۔ اس نے بظاہر مجھ سے کہا ہے کہ ہاں اوسیانوس جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن اس کے اندر جو منصوبے جنم لے رہے تھے وہ لفظوں تک کی شکل میں میرے سامنے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھے دھوکا دے سکے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ڈیگال کوریل کو ختم کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اور اسے یہ نہیں معلوم کہ ڈیگال کوریل اب ڈولمین جیسے خطرناک شخص کے

سائے میں ہے۔ اور ڈولمین اور ڈیگال کوریل دو ایسے کردار ہیں جنہیں زوال نہیں۔ ریڈ مین ڈولمین کی صلاحیتوں سے واقف نہیں، سمجھے۔ وہ ڈولمین کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہے۔''

❁......❁
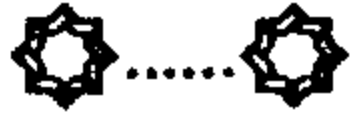
''میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔ میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں۔'' ڈیگال کوریل نے شدید غصے کے عالم میں کہا لیکن ڈولمین شیشے کے سامنے کھڑا شیو کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنے چہرے سے ریزر علیحدہ کرتے ہوئے کہا کہ کہیں نشان نہ لگ جائے۔ اس میں اسے ہنسی آئی تھی۔ اس نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''واقعی، تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا ہے۔ باپ رے باپ۔''

''تم نے جس طرح میری تذلیل کی ہے، اس کے بعد تمہاری شکل دیکھنا بھی مجھے گوارا نہیں ہے۔'' ڈیگال کوریل نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''میں نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا کمتر محسوس نہیں کیا ہے۔''

''اوہو، اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس طرح آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر آپ کو بستر پر ڈال دیا تھا، وہ ذلت آمیز بات تھی۔'' ڈولمین نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے جانوروں کی طرح باندھ کر یہاں قید کر رکھا تھا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور تمہیں گرفتار کراؤں گا۔''

''نہیں میری جان! یہ آسان نہیں ہوگا۔'' ڈولمین نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''نیلس مجھے پولیس کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ بدمعاشوں نے انہیں مار مار کر ان کا برا حال کر دیا ہے کہ تمہارے پولیس والے اب وردیاں بھی نہیں پہنتے اس ڈر سے کہ کہیں اوپلو کے بدمعاش ان کی پٹائی نہ کر دیں۔ اور پھر وہ یہی سمجھیں گے کہ تم نے شراب کے نشے میں کوئی خواب دیکھا ہوگا۔'' ڈولمین نے شیو مکمل کر کے تولیے سے منہ صاف کیا اور پھر ڈیگال کوریل کی سمت مڑ کر بولا۔

''مائی ڈیئر مسٹر کوریل! آپ اس کمرے سے قدم باہر نہیں نکال سکتے۔ نہیں، پہلے میری بات سن لیں۔ آپ کو یہ اندازہ ہو جانا چاہئے کہ اب تک اوسیانوس کو ہماری ساری باتوں کا علم ہو گیا ہوگا۔ ان کے جاسوس ہر جگہ موجود ہیں۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ دو

راتوں سے زیادہ کہیں قیام نہیں کروں گا۔ اور اوسیانوس کے علاوہ ہیگ اور اس کے ساتھی بھی آپ کو قتل کرنے کے لئے آپ کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ آپ یہ نہ بھولیے کہ ان کے دو ساتھیوں کی لاشیں اب بھی شاید اصطبل میں پڑی ہوں گی اور اس لئے اب تک میں نے جو بھی کیا وہ آپ کی حفاظت کے خیال سے کیا ہے، ذلیل کرنے کے لئے نہیں۔ اس کے علاوہ سیرین کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ آپ دونوں کی حفاظت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں میں۔ اور ان خطرناک مجرموں کے مقابلے میں آپ تنہا کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ سمجھ رہے ہیں آپ۔ کیا اب بھی آپ مجھ سے تعاون نہیں کریں گے؟'' ڈولمین کے لہجے میں اب سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی اور ڈیگال کوریل کو اس کے لہجے کا خیال کرتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ پھر وہ تھکے تھکے انداز میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ ڈولمین واقعی سچ کہہ رہا ہے۔

''اور کیا تم سیرین کی حفاظت کا بھی وعدہ کرتے ہو؟'' ڈیگال کوریل کا لہجہ کچھ نرم ہوا۔

''ہاں......اور آپ کی بھی۔'' ڈولمین نے جواب دیا۔ اور ڈیگال کوریل سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈیگال کوریل، ڈولمین کے ساتھ تھا۔ ڈولمین نے اچانک ہی کہا۔

''اور آپ یہ جانتے ہیں مائی ڈیئر مسٹر ڈیگال کوریل! کہ ہوٹل کے کمروں میں یہ گول گول سوراخ کیوں بنے ہوئے ہیں۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ گیس کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ گیس بند کئے بغیر پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا جاتا ہے۔ اور بند کمرے میں بنی ہوئی گیس انہیں موت کی نیند سلا دیتی ہے۔ اس لئے ہوٹل کی انتظامیہ نے احتیاطی طور پر یہ سوراخ بنا دیئے ہیں۔''

''آہ......مجھے بھی اس کا علم نہیں تھا......اب میں یاد رکھوں گا۔ ویسے فی الحال اس ہوٹل میں قیام مناسب رہے گا۔ کیونکہ یہاں سے میں میوزیم پر با آسانی نظر رکھ سکتا ہوں۔''

ڈولمین نے خاموشی سے بیٹھے ہوئے ڈیگال کوریل کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ''آپ اگر چاہیں تو نیچے جا کر ناشتے کا آرڈر کیجئے۔ میں ابھی غسل کر کے آتا ہوں۔ پھر ساتھ گھومنے چلیں گے۔''

''نہ جانے کیوں تم غلط فہمی کا شکار ہو مسٹر ڈولمین! تم کیوں سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ

رہنا پسند کرتا ہوں؟''

''مجھے سو فیصد یقین ہے مسٹر ڈیگال کوریل! کیونکہ اس شہر میں آپ کا واحد دوست ہوں۔'' ڈولمین نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ریڈ مین عام طور سے کوشش کرتا تھا کہ بورتھم سے جلد از جلد جان چھڑائی جائے۔ لیکن اس دن وہ اس سے بہت گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ بورتھم جس کو نئی نئی دولت ہاتھ لگی تھی اوپلو کے معزز رؤسا سے تعلقات بڑھانے کے لئے بے تحاشا خرچ کرتا تھا تاکہ اس کا شمار بھی طبقہ امراء میں ہونے لگے۔ وہ عادی جواری، بلا کا شرابی اور کم سن پیشہ ور لڑکیوں کا دلدادہ تھا۔ ایک اندھا دلال۔ اس کو نوخیز حسین لڑکیاں بھاری قیمت پر فراہم کیا کرتا تھا۔ اس دوپہر ریڈ مین اتنی توجہ سے بورتھم کی بکواس سن رہا تھا جیسے اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ وہ دونوں ایک درخت کے نیچے ٹخنوں تک برف میں کھڑے ہوئے تھے اور شیمپین پی رہے تھے۔

''بڑا دلچسپ مقابلہ ہو گا مائی ڈیئر ریڈ مین! وہ جو سامنے زرد رنگ کی بگھی کھڑی ہے، اس میں دونوں لڑنے والے فریقوں کو آمنے سامنے بٹھا دیا جائے گا۔ دونوں کے دائیں ہاتھ بگھی سے باندھ دیئے جائیں گے اور بائیں ہاتھوں میں تیز دھار خنجر دے دیئے جائیں گے۔ دونوں کمر سے اوپر تک ننگے رہیں گے اور پھر جیسے ہی میں اشارہ کروں گا، بگھی روانہ ہو جائے گی۔ یہ تم برف پر صاف راستے دیکھ رہے ہو، اس میں وہ دو چکر لگائے گی۔ اس دوران وہ دونوں ایک ہاتھ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو بچ جائے گا وہ فاتح کہلائے گا۔ واہ کتنا لطف آئے گا؟''

''واقعی، بڑا دلچسپ مقابلہ ہے۔ میں تمہارے ذہن کی داد دیتا ہوں۔'' ریڈ مین نے مکھن لگایا۔

''اب تم سے کیا چھپانا۔'' بورتھم نے خوش ہو کر کہا۔ ''آج سے بارہ تیرہ سال پہلے میں نے پیرس میں ڈوئل کا ایسا مقابلہ دیکھا تھا اور مجھے بڑا لطف آیا تھا۔ اور اب میرے پاس اس طرح کے ذرائع موجود ہیں کہ میں خود ایک ایسا مقابلہ منعقد کرا سکوں۔ میں نے یہاں بھی دوستوں کی تفریح کے لئے اس کا انتظام کر لیا۔''

"بہت خوب......لیکن یہ ڈوئل لڑنے والے تمہیں کہاں سے مل گئے؟"

بورتھم نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میں لوئر ڈانس ہال میں تفریحاً گیا ہوا تھا۔ تم جانتے ہو وہاں ہر وقت چوروں، بدمعاشوں، قاتلوں اور پیشہ ور عورتوں کا مجمع رہتا ہے۔ یہ دونوں بدقسمت چوری کی رقم کی تقسیم کے معاملے میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ جھگڑا صرف اٹھارہ سینٹ کے لئے تھا لیکن اس معمولی رقم کے لئے وہ قتل پر آمادہ تھے۔ میں نے دونوں کو پانچ پانچ ڈالر دے کر جھگڑا ختم کرا دیا اور ان کو ڈوئل لڑنے پر بھی آمادہ کر لیا۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ ڈوئل جیتنے والے کو اتنی رقم انعام میں دوں گا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔"

"واہ......واہ......واقعی تم نے کمال کر دیا۔" ریڈ مین نے تعریف کی۔ ریڈ مین کی مسلسل تعریف سے بورتھم خوشی کے مارے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ ریڈ مین کو اعلیٰ سوسائٹی میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ کچھ فاصلے پر بورتھم کی خوبصورت بگھی کھڑی ہوئی تھی جس کے گرد دس بارہ تماش بین کھڑے مفت کی شراب پی رہے تھے اور لذیذ کھانوں کی ڈش اُڑا رہے تھے۔ بورتھم نے ڈوئل کے مقابلے کا انتظام اپنے فارم پر کیا تھا جو اوپلو کی حدود سے باہر ایک کھلی جگہ پر واقع تھا۔ کچھ فاصلے پر لکڑی کی بنی ہوئی عمارت نظر آ رہی تھی۔ بورتھم کی بگھی کا دروازہ کھلا اور ریڈ مین کو ڈیئر بارن کی حسین شکل نظر آئی۔ گیارہ بارہ سال کی اس نازک عمر لڑکی کو بورتھم نے اپنی داشتہ بنا رکھا تھا۔ وہ اسے بھی مقابلہ دکھانے اپنے فارم پر لایا تھا۔ بورتھم نے آگے بڑھ کر ڈیئر بارن کو اتارا۔ وہ خوبصورت اور قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی اور بورتھم اپنے مہمانوں کو بڑے فخر کے ساتھ ڈیئر بارن کے حسن کا دیدار کروانا چاہتا تھا۔ بگھی کے سہارے ایک دیو قامت اور فولادی جسم کا سیاہ فام نیگرو کھڑا تھا۔ بورتھم کا پچیس سالہ ملازم یہ نیگرو بہت ہی طاقتور آدمی تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ باکسنگ کے مقابلے میں اب تک اسے کسی نے شکست نہیں دی تھی۔ وہ صرف باکسر اور بورتھم کا باڈی گارڈ ہی نہیں تھا بلکہ خطرناک قاتل بھی تھا اور بہت سے قتل کر چکا تھا۔ یہ بات عام تھی کہ جس نے بھی بورتھم کو خفا کیا وہ اس کے ہاتھوں موت کا نشانہ بن گیا۔ اور یہ بات تھی کہ اس کا پراسرار قاتل بھی پکڑا نہ جاتا۔ اور اگر کسی نے واردات ہوتے دیکھ بھی لی تو جان کے خوف سے زبان بند رکھتا تھا۔ اس لئے بورتھم کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی تھی اور

اس کی مخالفت کسی سے بھی نہیں ہوئی۔ اسی لمحے ایک اور خوبصورت بگھی آ کر رکی تو بورتھم کی آواز ابھری۔

"یہ لوگ بھی آ گئے۔ اب مقابلہ شروع ہو جانا چاہئے۔"

ریڈ مین نے اس بگھی سے اترتے ہوئے اس طویل قامت آدمی کو دیکھا۔ یہ پرلے درجے کا بے ایمان اور ظالم شخص ایریس تھا۔ بارک ایریس اور لارک ایریس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ اول درجے کا بے ایمان اور ظالم آدمی ہے جس نے اپنے بوسیدہ جہازوں سے بڑی دولت کمائی تھی۔ یہی حال اس کے ساتھ اترنے والے اس کے دوسرے ساتھی کا بھی تھا۔ یہ بے ایمان کے علاوہ بدکردار اور عیاش بھی تھا۔ لیکن آج ریڈ مین ان سب کو استعمال کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے باتوں باتوں میں کہا۔

"تم سب تماشہ دیکھنے میں اتنے مصروف ہو جاؤ گے کہ میں مجبوراً تمہیں ایک اہم بات کی طرف متوجہ کروں گا۔ شاید تمہیں یہ خبر نہیں کہ ڈیگال کوریل نے ہمیں تباہ کرنے کا مکمل منصوبہ بنا لیا ہے۔"

اچانک ہی ریڈ مین نے یہ گفتگو شروع کی تھی۔ آنے والے سب اسے چونک کر دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں کے رنگ بگڑ گئے تھے۔ ریڈ مین نے ایک لمحے میں محسوس کیا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا ہے۔ اس نے ڈیگال کوریل کے بارے میں بڑھا چڑھا کر باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس نے کہا۔

"وہ کہہ رہا تھا، بورتھم چور ہے اور وہ شہر میں روشنی کے لئے استعمال ہونے والا تیل چوری کر کے دولت جمع کر رہا ہے۔"

"اوہ...... کیا واقعی...... اس کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔ میں دیکھوں گا اسے۔" بورتھم نے غضبناک ہو کر کہا۔ ریڈ مین جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ تھا۔ اس لئے بورتھم کا غصہ ہونا یقینی بات تھی۔ ریڈ مین نے مزید لقمہ دیا۔

"اس نے دھمکی دی ہے کہ سب کو بے نقاب کر دے گا۔ اگر اس نے اوسیانوس سے ہمارے تعلقات کو بے نقاب کر دیا تو ہم واقعی تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بات بھی بالکل ٹھیک ہے۔ ایسے ہو سکتا تھا۔"

"ایسی صورت میں سب سے پہلے کہ وہ زبان کھولے، اسے ٹھکانے لگا دینا چاہئے۔"

بورتھم نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے سیاہ فام حبشی ساتھی کو دیکھا اور سب نے اس کی تائید کر دی۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ اوسیانوس کتنا محتاط شخص ہے۔ وہ جس اہم کام میں مصروف ہے اگر وہ پورا ہوگیا تو ہم سب کی قسمت کھل جائے گی۔"

"بے شک......" بورتھم کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"اور اوسیانوس کو اس کام کے لئے بھاری رقم درکار ہے۔ اور مسز کورنیلس نے اسے یہ رقم فراہم کرنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ لیکن ڈیگال کوریل نے اسے ورغلایا ہے۔ اور اگر اس نے ہمیں بے نقاب کردیا تو......؟"

"بس تم فکر مت کرو۔ اب ڈیگال کوریل کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔" بورتھم نے کہا اور اس انداز سے پتہ چل گیا کہ اب جو کچھ ہوگا وہ بالکل ہی مختلف ہوگا۔ گویا ریڈ مین اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مقابلہ شروع ہوگیا۔ لوگ چیخ چیخ کر تالیاں بجانے لگے۔ لیکن ریڈ مین اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ چشم تصور سے ڈیگال کوریل کی لاش دیکھ رہا تھا اور اس کے راستے سے ہٹنے کے بعد حسین سیرین کو اپنی آغوش میں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے تصور میں اتنا محو تھا کہ جب مقابلے میں ہلاک ہونے والے حریف کی فلک شگاف چیخ فضا میں گونجی تو اسے محسوس ہوا جیسے یہ ڈیگال کوریل کی آخری چیخ رہی ہو۔

۞......۞

ڈیگال کوریل کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے وہ کسی تابوت میں بند ہے اور یہ تابوت نرم نرم مٹی میں قبر کے اندر بند ہے۔ اسے زندہ دفن کردیا گیا تھا۔ اس کا سینہ گھٹن سے پھٹا جا رہا تھا اور وہ تابوت کا ڈھکن کھولنے کے لئے اس پر مسلسل گھونسے برسا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں لہولہان ہو چکی تھیں اور اس کی چیخیں قبر میں گھٹ کر دم توڑ رہی تھیں۔

اسے زندہ دفن کردیا گیا تھا......خوف سے اس نے ایک بھیانک چیخ ماری۔

"کوئی بات نہیں، مسٹر کوریل! تم خیریت سے ہو۔ آنکھیں کھو[illegible] میں ڈولمین ہوں۔"

کسی نے کوریل کے شانے رگڑتے ہوئے کہا اور کوریل نے [illegible] الھوں سے ڈولمین کو دیکھا۔ کوریل کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ "تم شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے مائی ڈیئر کوریل!" ڈولمین نے کہا۔

"ڈراؤنا خواب......؟"

"ہاں......تم اس طرح چیخ رہے تھے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔"

"پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ خواب میں نہ سہی، جاگتے میں، میں بھوت ہی کو دیکھ رہا ہوں۔"

نجانے کیوں اپنی زندگی کے احساس نے کوریل کے مزاج میں شگفتگی پیدا کردی تھی اور وہ ہنس پڑا تھا۔ ڈولمین نے وہ تولیہ جس سے وہ اپنا جسم صاف کر رہا تھا، ڈیگال کوریل کی طرف پھینکا۔

"لو، اس سے پسینہ صاف کرلو اور اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو۔ ہمیں اٹھ کر ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

اس رات ہوٹل واپس آنے سے پہلے کوریل اور ڈولمین ٹیلر بر سے ملنے اس کے میوزیم گئے۔ ریگال کوریل نے بر سے ڈولمین کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ مسٹر اوپ جرکن کے دوست ہیں۔ اوپ جرکن کو تو تم جانتے ہی ہو گے۔"

"آہا......کیوں نہیں......مگر میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔" ڈولمین نے کہا اور پھر وہ اسے ملاقات کا مقصد بتانے لگا۔ برنم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے کہا۔

"مجھے آپ کی بیوی کی المناک موت پر بڑا دکھ ہے۔ آپ میری تعزیت قبول کریں مسٹر ڈولمین! جہاں تک ان دونوں اداکاروں کا معاملہ ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تو بے شک وہ میرے میوزیم میں کام کرتے ہیں۔ میں نے خود انہیں ملازم رکھا ہے۔ چار سال قبل جب میں اوپلو سے باہر گیا تھا تو مجھے ان کی اداکاری بہت پسند آئی تھی۔"

"ہاں...... مجھے یاد ہے۔ میں نے آپ کا وہ شاندار کھیل دیکھا تھا جو ملکہ عالیہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ میں اس میں مدعو تھا۔"

یہ سن کر ڈیگال کوریل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"آیا تو آپ شاہی مہمانوں میں شامل تھے۔" برنم نے مرعوب لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔

"اور سچ پوچھئے تو اس شو سے ہمارے گروپ کو شہرت حاصل ہوئی تھی۔"

"ویسے کیا یہ حقیقت ہے مسٹر ڈولمین! کہ تم شاہی مہمانوں میں شامل تھے؟" ڈیگال کوریل اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا۔

"ہاں...... میں ڈیوایلبرٹ کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ میں نے ڈیوایلبرٹ کو باکسنگ کی تربیت دی تھی۔"

"مسٹر ڈولین! میرے لئے روپ جرکن جیسے مشہور دوست سے یہ بے تکلفانہ ملاقات باعث اعزاز ہے۔" برنم نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔"

اس رات ڈولین نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے شریر بونے تھم نے اپنی مزاحیہ اداکاری سے سب کو بہت ہنسایا تھا۔"

"آہ...... ٹام تھم" برنم نے خوش ہو کر کہا۔ "میں اسے چارلی کہتا ہوں۔ جب میں نے اسے ملازم رکھا تھا تو وہ صرف پانچ سال کا تھا۔ مسٹر ڈولین! آپ میرے ان دونوں اداکاروں کو اپنی بیوی کے قتل کے سلسلے میں تلاش کر رہے ہیں۔ آپ پولیس سے مدد کیوں حاصل نہیں کرتے؟"

"نہیں، پولیس بھلا میری پیاری بیوی اور بیٹے کے سلسلے میں اتنی جذباتی کہاں سے ہو سکتی ہے؟ وہ قانونی چکروں میں پڑ جائے گی۔ اور اوسیانوس محفوظ رہ جائے گا۔ مجھے کسی کی مدد نہیں چاہئے مسٹر برنم! میں ان سے خود انتقام لوں گا۔"

برنم نے اپنا سر کھجایا۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے اسے ڈولین کی بات پسند نہ آئی ہو۔ بہر حال وہ بولا۔ "میں اس معاملے میں خود نہیں الجھنا چاہتا۔ آپ چونکہ روپ جرکن کے دوست ہیں اور مسٹر بورتھم نے آپ سے میرا تعارف کرایا ہے اس لئے میں صرف یہ گزارش کروں گا کہ آپ میرے میوزیم میں ان سے انتقام نہ لیں۔ خون خرابہ میری بدنامی کا باعث ہوگا۔"

"اس کا میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے مسٹر برنم!"

"شکریہ مسٹر ڈولین! تب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ وہ دونوں ایسٹر ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر ایک ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ آج رات وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ بروکلین میں ایک شخص کی بیوی سخت بیمار ہے اور اس نے بیوی کی تفریح کے لئے ایک شو کا انتظام کیا ہے۔ وہ دونوں اس سلسلے میں اس کے پاس فارم ہاؤس گئے ہوئے ہیں۔"

"آہ...... میں آپ کا واقعی شکر گزار ہوں مسٹر برنم!" یہ کہہ کر ڈولین نے ڈیگال کوریل کا

شانہ ہلایا جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"کیا تم سو رہے ہو مائی ڈیئر کوریل؟"

ڈیگال کوریل اپنے خیالات سے چونک اٹھا۔ اس نے کہا۔

"کیا پھر میری آنکھیں کھلی ہوئی نہیں ہیں؟"

"ہاں، آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں لیکن کچھ لوگ جاگتے میں بھی خواب دیکھتے ہیں۔" ڈولین نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں جاگ رہا تھا۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"بس، مجھے تھوڑا سا کام ہے۔ ممکن ہے سیرین نے کوئی پیغام بھیجا ہو۔ کیونکہ اسے نہیں معلوم میں اس وقت کہاں ہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی مائی ڈیئر ڈیگال کوریل! ویسے کیا خیال ہے، تم ان دونوں اداکاروں کی تلاش میں میرا ساتھ دو گے......؟ مجھے یقین ہے کہ مرنے سے پہلے وہ مجھے اوسیانوس کا پتہ ضرور بتا دیں گے۔"

"مجھے ذرا سا غور کرنا پڑے گا۔" ڈیگال کوریل نے پُر خیال انداز میں کہا۔

"ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"ہاں......" کوریل بولا۔

"کیا تم اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم اس عورت سے زیادہ محبت کرتے ہو یا اپنی مرحوم بیوی سے؟"

"تمہیں میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"بتا دو...... بتا دو مائی ڈیئر! تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں آئندہ ان تمام باتوں کا خیال رکھوں گا۔"

"میں نہیں جانتا...... میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے مجھے قتل کر دیا جائے۔ ہم لوگوں نے جس خطرناک آدمی سے جھگڑا مول لیا ہے اس کا نام اوسیانوس ہے۔ میں واقعی سیرین سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔"

''اور وہ......؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''اور میں جانتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے پتہ ہے دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔'' ڈولین نے کہا اور ڈیگال کوریل عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

✪......✪

اوسیانوس واقعی ایک شیطان صفت جادوگر تھا۔ پتہ نہیں یہ جادوئی عمل وہ کس مقصد کے تحت کرتا تھا، کیا بننا چاہتا تھا۔ آج تک شاید کسی بھی شخص نے کسی جادوگر سے کوئی انٹرویو نہیں کیا تھا لیکن یہاں تک بات سننے میں آتی تھی، یہی ہوتی تھی کہ کوئی حیاتِ ابدی حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ کوئی کائنات کی تمام دولت اپنے قبضے میں کر لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ کوئی دنیا کی حسین ترین لڑکیوں کو اپنے قدموں میں جھکانے کا خواہش مند ہے۔ ہر ایک کا نقطہ نظر الگ الگ ہے اور وہ اس کے لئے جادوئی قوتوں کا حصول چاہتا ہے اور اپنا ایمان، دھرم سب کچھ فراموش کر بیٹھتا ہے۔

اوسیانوس بھی اس وقت ایک منتر پڑھ رہا تھا۔ جس کیفیت میں وہ نظر آ رہا تھا وہ بڑی عجیب وغریب تھی۔ وہ مادرزاد برہنہ تھا اور پیٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی چاروں سمت طلسمی حصار کھنچا ہوا تھا۔ اس کا چھریرا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دونوں پیر پھیلے ہوئے تھے۔ ہاتھ آگے دراز تھے اور اس طرح اس کے جسم سے سحر کے پانچوں کونے بنے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ ائرٹائٹ تھا۔ اتنا بند کہ باہر چاندنی کی جھلک بھی اندر نہیں آ رہی تھی اور کمرے کی روشنی کا ذریعہ وہ چاروں سیاہ موم بتیاں تھیں جو طلسمی حصار کے گرد جل رہی تھیں۔ اور یہ حصار انسانی ڈھانچے کی جلی ہوئی راکھ چھڑک کر کھینچا گیا تھا۔ اوسیانوس کی بھیانک آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ زبان نامعلوم تھی اور اس زبان سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے ان کا مقصد تھا جاننا، ہمت کرنا، ارادہ کرنا اور خاموش رہنا۔ منتر کے بولوں کا یہی مفہوم تھا۔ یعنی ساحروں کی قوتوں کو جمع کرنا۔ ان کی صفات کو پیدا کرنا جو جادوگری کے لئے ضروری ہیں۔ علم بغیر ہمت کے بیکار ہے۔ اتنا ہی بے کار جتنا ہمت بغیر علم کے۔ اور جس طرح ارادہ

ثابت قدمی پیدا کرتا ہے اسی طرح ثابت قدمی اس وقت تک بیکار ہے جب تک ساحر میں عمل کی ہمت نہ ہو۔ چوتھی قوت خاموشی ہے۔ خاموشی اور مکمل خاموشی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اپنے خیالات اور منصوبے سے دوسرے کو آگاہ کر دینا مقصد کے حصول کی قوت کو کمزور بنا دیتا ہے۔ خاموشی کی قوت کو توڑنا یکسوئی کو ختم کر دیتا ہے اور احتیاط کا دامن چھوڑنا دشمن کو خبردار کر دیتا ہے۔ اس لئے اوسیانوس مکمل آزادی اور خاموشی کے ساتھ اور پوری توجہ سے منتر کا ورد کر رہا تھا اور یہ عمل جنات کے سردار کو اپنا تابع کرنے کے لئے کر رہا تھا اور جنات کے سردار کو یہ خوشخبری دینا چاہتا تھا کہ آج رات تین اور انسانی جانیں اس کی بھینٹ چڑھائی جائیں گی جس کے عوض اوسیانوس اس سے نیگال سیمورس حاصل کرنے کے لئے مزید مہلت کا خواہش مند تھا۔ آج رات اوسیانوس نے ہیگ کی بیوی اور اس کے دونوں بچوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شیطان کی طرح جنات میں بھی ہمت، مکاری، دانشمندی اور بصیرت کی بھرپور قوتیں موجود تھیں اور اسے بھی نسل انسانی سے شدید نفرت تھی جس طرح شیطان۔ اور پھر ہیگ کو بھی غداری کی سزا ملنا ضروری تھی۔ بیوی اور بچوں کی موت سے ہیگ کو جو اذیت پہنچے گی اس سے جنات کے سردار کو خوشی حاصل ہوگی۔ کیونکہ اذیت پسندی اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

کمرے میں لوبان کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کالے رنگ کی موم بتیاں چاروں سمت کی نگرانی کر رہی تھیں۔ ان چاروں کے گرد کتے کے خون سے چار طاقتور جنوں کے نام تحریر کر دیئے گئے تھے۔ زمر جو جنوب کا حکمران تھا۔ گورین جو شمال کا حکمران تھا۔ ارائین جو مغرب پر حکمرانی کرتا تھا اور گواب جو مشرق پر حکمران تھا۔ کتے کا خون ساری دنیا کی دیوی ہیکائی کے لئے نذرانہ عقیدت تھا جو تمام جادوگروں، چڑیلوں اور خبیث روحوں کی حکمران تھی اور جس کے ہمراہ ہمیشہ بھونکتے ہوئے کتے چلتے تھے۔ اوسیانوس نے اپنے آپ کو طلسمی حصار میں محفوظ کر لیا تھا تاکہ اس کے عمل سے آنے والی بدروحیں اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ وہ مسلسل منتر پڑھتا جا رہا تھا۔ یہ منتر جو قدیم مصر، یونان، ایران کے زرتشت کے پجاری ماگی کے دور کے جادوگر پڑھا کرتے تھے، بے حد موثر اور بڑے خطرناک تھے۔ اوسیانوس کا جسم مسلسل مشقت سے اکڑ گیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ وہ طلسم کی تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے یونانی اور عبرانی زبان کے طلسمی منتروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔''

رازل جریری نے یہ ساری تفصیل شہباز کو بتائی تھی اور شہباز نے نادیدہ ہاتھوں سے نادیدہ سر پکڑ لیا تھا۔

''میرے خدا...... میرے خدا......'' اس کے منہ سے نکلا اور رازل جریری مسکرا کر اس سے بولا۔

''کیا ہوا؟''

''یہ سب جو آپ نے بتایا ہے، ایک بات میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں محترم رازل جریری!''

''ہاں، پوچھو۔''

''آپ ان تمام باتوں سے کس حد تک واقف ہیں؟''

''کن باتوں سے؟''

''یہی سیاہ موم بتیاں، کتے کا خون، جنوں کے نام، دیوی ہیکائی کے لئے نذرانہ عقیدت وغیرہ وغیرہ۔ جو کچھ یہ کر رہا ہے آپ اس کے عمل سے پوری طرح واقف ہیں؟''

''ہاں، ہوں۔''

''یہ معلومات آپ کو کہاں سے حاصل ہوئیں؟'' شہباز نے سوال کیا۔ رازل جریری سوچ میں ڈوب گیا۔ بہت دیر تک وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''دنیا کے نوسوستاسی علوم...... کتنے؟''

''نوسوستاسی۔'' شہباز نے کہا۔

''ہاں، نوسوستاسی علوم سے واقفیت ہے مجھے قدیم تحریروں اور زبانوں کے سلسلے میں۔ آج تمہارے سوال پر میں تم سے یہ بات کہتا ہوں کہ مجھ سے بڑا ماہر اس وقت کائنات میں موجود نہیں ہوگا۔ میں نے بہت سے عقائد اور بہت سی روایتوں کے بارے میں بھی اتنی معلومات حاصل کی ہیں۔ مثلاً جو لوگ سانپوں کو اپنے قبضے میں کرتے ہیں اور انہیں اپنا مطیع کر لیتے ہیں وہ خزانوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ کیونکہ سانپ زیر زمین سفر کرتا ہے بلکہ جب وہ سانپوں کے بادشاہ بن جاتے ہیں تو اپنے عمل کردہ سانپوں کو وہ زمین کی گہرائیوں میں چھوڑ دیتے ہیں اور انہیں حکم دیتے ہیں کہ ان پوشیدہ ذخیروں کا پتہ لگائیں جو صدیوں سے زمین کی گہرائیوں میں روپوش ہیں۔ اور یقین کرو، وہ کامیابی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

ناگوری کو اپنے قبضے میں کرنے کا علم بھی میں جانتا ہوں۔''

''میں یہی سوال آپ سے کر رہا تھا محترم رازل جریری! کہ آپ جب ان تمام چیزوں سے واقف ہیں تو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے خزانوں کے حصول کے لئے آپ نے یہ راستے کیوں نہیں اپنائے۔''

رازل جریری تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں پراسرار قوتوں کا سہارا لے کر دنیا میں رہنے والے ان بے شمار افراد کو دولت کے حصول کے لئے مجبور کر سکتا ہوں جنہیں میری ضرورت پوری کرنے میں کوئی دشواری نہ آئے۔ لیکن وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی کہ اس طرح دولت کا حصول وہی کچھ بن جاتا ہے جس کے لئے اس وقت کائنات میں ہر کوئی سرگرداں ہیں۔ یعنی ڈاکہ زنی، لوٹ مار، چوری، اسمگلنگ اور اسی قسم کے گھناؤنے جرائم۔ ایسا کوئی عمل اس لئے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں غلاظتوں کا لحاف اوڑھنا پڑتا ہے۔ کیا تم میری فطرت سے اس بات کی توقع رکھتے ہو کہ میں اپنے کسی ناپاک مقصد کی تکمیل کے لئے کسی کتے کو ذبح کر کے اس کا خون اپنے جسم پر ملوں، مُردہ انسانوں کا گوشت کھاؤں؟ یہ تصور کر سکتے ہو تم میری ذات سے؟''

''معافی چاہتا ہوں۔ یہ سب ایک سوال تھا۔''

''نہیں شہباز! دیکھو، دنیا کا ہر ذی روح، دنیا میں پیدا ہونے والی ہر شے فانی ہے۔ ہر چیز کو تم اپنے قبضے میں کر سکتے ہو اپنی قوتوں سے کام لے کر۔ لیکن وہ قوتیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں وہ نہیں جن کا تعلق شر سے ہے۔ شیطانی قوتیں بہرحال فنا ہو جاتی ہیں۔ وہ اس قدر پائیدار نہیں ہوتیں۔ اللہ کی عطا کی ہوئی ایک قوت پہلی سے لے کر آخری سانس تک تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ پھر ان باطل قوتوں کا سہارا لینے کا عقل سے کیا تعلق ہے میرے دوست شہباز! گناہ کے راستے بڑے دلکش ہوتے ہیں۔ بڑے آسان ہوتے ہیں۔ ان پر دوڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن ان کا اختتام تباہی کے بھیانک غاروں پر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نیکیوں کی چڑھائی بڑی کٹھن ہوتی ہے انسان ایک ایک قدم پر ہانپ جاتا ہے۔ زبان تک باہر آ جاتی ہے لیکن جب وہ اپنی منزلیں طے کرتا ہے تو اس کے اردگرد مسرتیں ہی مسرتیں ہوتی ہیں۔ خوشبودار پھولوں کے باغ اور حسین ترین ماحول۔ میں یہ

جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس میں میرے دل میں صرف ایک مقصد ہے، دکھی انسانیت کی خدمت کرنا۔ جس طرح بھی بن پڑے ان لوگوں کی تباہی جو اپنے آپ کو موت کا فرشتہ سمجھتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے اگر میں بھی انہی کا انداز اختیار کرلوں تو پھر کیا فائدہ ان نیکیوں کا۔ اس لئے شہباز! میرے بچے! میں ایسے کسی عمل سے گریز کرتا ہوں۔ ہاں، نیکیوں کے راستے صاف کرنے کے لئے اگر برائیوں کو ختم کرنا پڑے تو میں اس سے گریز نہیں کرتا۔ سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں......آپ کی بات کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔'' شہباز نے متاثر لہجے میں کہا۔

''اب دیکھو، یہ شخص جو منتر پڑھ رہا ہے، یہ کہاں تک اس میں کامیاب ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ ہمیں آنے والے وقت کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ لیکن شہباز! ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ سارے کے سارے مل کر کس طرح جدوجہد کر رہے ہیں۔ اب تو ہمارے سامنے بہت سے کردار بکھر چکے ہیں۔ ڈینس پارک، ڈولمین، روپ جرکن، بورتھم، پیراسس، سیرین، ڈیگال کوریل، ریڈ مین۔ تم دیکھو کیسے مزے کی بات ہے کہ یہ سارے شدید جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے دشمنی، ایک دوسرے کے خلاف عمل۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ سب اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ وہ باقی سب پر فوقیت لے جائے۔ ہم اس وقت ان کے درمیان داخل ہوں گے جب یہ نیگال سیمورس تک پہنچ چکے ہوں گے۔ ہمارا یہ سفر نیگال سیمورس کی طرف ہی ہے۔ لیکن ان کے شانوں پر بیٹھ کر۔ اور اگر اس وقت میں تم سے یہ کہوں شہباز! کہ اس طرح میں ان سب سے زیادہ طاقتور ہوں کیونکہ ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ ہم ان کے سر پر مسلط ہیں اور ان کی کوششوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کے سارے مسائل سے آگاہ۔ جتنا کردار اس سلسلے میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم جب بھی ان تک پہنچتے ہیں ہمیں ان کی اوقات معلوم ہو جاتی ہے۔''

''یہ شخص کیا کر رہا ہے......کیا اس کا انداز بہت عجیب و غریب نہیں ہے؟''

''ممکن ہے تھوڑی دیر کے بعد اس پراسرار وجود کو یہاں پر دیکھو جسے شیطان کہا جاتا ہے۔ یعنی خوفناک قوتوں کا سربراہ، ان کا مالک۔''

شہباز ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں اوسیانوس کو دیکھ رہی تھیں جس نے اپنے آپ کو طلسمی حصار میں محفوظ کیا تھا تاکہ اس کے عمل سے آنے والی

بدروحیں اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ وہ مسلسل منتر پڑھتا جا رہا تھا۔ وہی منتر جو قدیم مصر، یونان، ایران کے زرتشت کے پجاری ماضی کے جادوگر پڑھا کرتے تھے۔ بے حد موثر اور بڑے خطرناک منتر۔ اور اس خطرناک مشقت سے اوسیانوس کا جسم اکڑ گیا تھا اور لحہ بہ لحہ وہ طلسم کی تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے یونانی اور ایرانی زبانوں کے منتروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔

''شیوائی، لوہم، زبا، رتہ العلونائی، ہمولہ، لارڈ، میچ ٹیڑا گوامٹین، الوہمیگر۔''

اور اچانک کمرے میں ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ جھکڑ اتنے سرد تھے کہ اوسیانوس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے خون اس کی رگوں میں جمنے لگا ہو۔ لیکن وہ اسی طرح منتر پڑھتا رہا۔ اور پھر کمرہ خوفناک اور بھیانک چیخوں سے گونجنے لگا۔ ان گنت خبیث روحیں کمرے میں داخل ہو گئیں اور پورا کمرہ ان سے بھر گیا۔ ان کی آوازیں اتنی ہولناک تھیں کہ رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ خود اوسیانوس اگر طلسمی حصار میں نہ ہوتا تو اس کا دل پھٹ جاتا اور اس کے جسم پر بدروحیں قبضہ کر لیتیں۔ لیکن اوسیانوس منتر پڑھتا رہا۔ اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر منتر پڑھ رہا تھا۔ آخر کار بھیانک چیخیں سنائی دینا بند ہو گئیں۔ اوسیانوس نے اپنی قوتِ ارادی سے خبیث روحوں کو شکست دے دی تھی۔ پھر ایک بھیانک گونج کمرے میں سنائی دی اور کچھ لمحے بعد موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ شیطانی قوتوں کا بادشاہ کمرے میں آ چکا تھا۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی کمرے میں اتنا شدید تعفن پھیل گیا کہ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ شہباز اور رازل جریری اگر انسانی جسم میں ہوتے تو ایک لمحے یہاں نہیں رک سکتے تھے۔ ان کے دماغ پھٹ جاتے۔ لیکن اس وقت وہ صرف ہوا کے جھونکے تھے۔ کمرے کے در و دیوار کسی دہشت ناک درندے کی گونج سے لرزنے لگے۔ خوف سے ہانپتے ہوئے اوسیانوس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ہیولا تشکیل پا رہا تھا۔ اور جب وہ اپنی اصل شکل میں سامنے آیا تو اوسیانوس لرز کر رہ گیا۔ خوفناک قوتوں کا بادشاہ شیطان اس قدر بھیانک تھا کہ انسانی آنکھ اسے دیکھے اور دل برداشت کر جائے، یہ ناممکن تھا۔ لیکن اوسیانوس نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ جانتا تھا کہ حصار سے نکلنا موت ہے۔ شیطان بار بار بھیانک روپ بدل کر اسے ڈراتا رہا تاکہ وہ خوفزدہ ہو کر حصار سے باہر بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔ کبھی وہ تین

سروں والا اژدھا بن کر اس پر حملہ کرتا جس کے منہ سے شعلے نکل رہے ہوتے۔ کبھی کسی خوفناک درندے کی شکل میں حملہ آور ہوتا۔ لیکن اس کی ان تمام کوششوں سے اوسیانوس کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ وہ حصار میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اور پھر جلد اس نے ایک لفظ زبان سے نکالتے ہوئے شیطان سے ذہنی رابطہ کر کے اسے بتایا کہ وہ آج تین انسانی جانوں کا خون اس کی بھینٹ چڑھائے گا جس کے عوض وہ نیگال سیمورس حاصل کرنے کے لئے مزید مہلت دیدے گا۔ اس کے ان الفاظ پر شیطان اتنی زور سے چنگھاڑا کہ دیواریں ہل گئیں اور زمین کے ہلنے سے اوسیانوس بھی کافی اونچا ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ کمرے میں سناٹا طاری ہونے لگا اور لوبان کی خوشبو پھر سے محسوس ہونے لگی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ شیطان جا چکا ہے اور اوسیانوس کی التجا قبول کر لی گئی ہے۔

۞......۞

اس چھوٹی سی عمر کی ایک لڑکی کو دیکھ کر ڈیگال کوریل ساکت رہ گیا تھا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ اس پر سے نگاہ تک نہ گرنے پائے۔ یہ لڑکی جس وقت سیرین کے کمرے میں داخل ہوئی تو ریڈ مین، لارک ایرس کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ لارک ایرس نے ڈیگال کوریل سے ڈیئربارن کا تعارف کروایا۔

''اوہو ڈیگال کوریل! تو تمہیں میرا پیغام مل گیا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تم سے کل کے رویے پر تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔'' سیرین نے فوراً ہی کہا۔

''نہیں سیرین! پلیز، مجھ سے اس طرح کے الفاظ مت کہو۔'' ڈیگال کوریل نے جلدی سے کہا۔

''نہیں، میں اتنی شرمندہ ہوں کہ ان مہمانوں کے سامنے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ تم میرے اتنے عزیز دوست ہو کہ شاید اس کائنات میں تم سے زیادہ اعتماد اور اعتبار میں کسی پر نہ کر سکوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی تمہارا دل نہیں دکھاؤں گی اور تمام ذاتی فیصلے تمہاری مرضی اور مشورے سے کروں گی۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''میرا خیال ہے تم نے ہیگ سے رابطہ کر لیا ہوگا ڈیگال کوریل!'' ریڈ مین نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

''ہم اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔''

''نہیں۔'' کوریل نے ڈیئربان کو دیکھ کر مختصر سا جواب دیا۔ ڈولمین دریچے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں نیچے کھڑی ہوئی لارک ایرس کی بگھی پر بیٹھے ہوئے سیاہ فام پر مرکوز تھیں جو ایک سفید فام شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈولمین نے مڑ کر ریڈ مین اور لارک ایرس کی طرف دیکھا۔ چھوٹے سے دہانے کا لارک ایرس اسے پہلی ہی نظر میں مکار اور خطرناک نظر آ رہا تھا۔

"مسٹر ڈیگال کوریل! کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ ہیگ سے آپ کی ملاقات کب تک ہو جائے گی؟"

"نہیں...... میں نہیں جانتا۔ لیکن جیسے ہی وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے گا، میں سیرین کو اور تمہیں مطلع کر دوں گا۔" ڈیگال کوریل نے ایک بار پھر ڈیئر بارن کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مسٹر کوریل!" لاک ایرس نے اچانک کہا۔ اسے کوریل کا بار بار ڈیئر بارن کو دیکھنا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بولا۔ "میری بھانجی آپ کو بہت زیادہ پسند آئی ہے؟"

ڈیگال کوریل نے اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا، پھر بولا۔

"بے شک...... ننھی سی ڈیئر بارن بے حد معصوم اور حسین ہے۔ تمہارا اپنی داشتہ کو بھانجی کہنا بالکل پسند نہیں آیا ہے۔"

سیرین نے گھبرا کر کوریل کی طرف دیکھا۔ لارک کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن ریڈ مین مسکرا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب لارک ایرس کسی بھی طرح ڈیگال کوریل کو معاف نہیں کرے گا۔

"مجھے بھی تم جیسے دو ٹکے کے آدمی کی بدزبانی بالکل پسند نہیں آئی ہے۔" لارک نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"کم سے کم میں دو ٹکے کے لئے چور بازاری اور ملاوٹ نہیں کرتا مائی ڈیئر لارک ایرس!" ڈیگال کوریل نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "اور نہ معصوم اور کم سن لڑکیوں سے عیاشی کرتا ہوں۔"

"اس کے بعد اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں اپنے ملازم کو بلا کر تمہاری ہڈیاں تڑوا دوں گا۔ سمجھ رہے ہو میری بات؟" لارک ایرس نے غضبناک پھنکار کے ساتھ کہا۔

"اوہو، شاید تم اس منحوس شکل سیاہ فام کی بات کر رہے ہو۔" اس بار ڈیگال کوریل کے بولنے سے پہلے ڈولمین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ "لیکن اس کی آمد سے پہلے میں تمہارا دماغ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔"

لارک ایرس غصے سے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ لیکن ریڈ مین نے درمیان میں آ کر فوراً معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ اور پھر فضا اس حد تک ناخوشگوار ہو گئی کہ انہیں وہاں سے جانا

پڑا۔ سیرین ہکا بکا تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے ڈیگال کوریل سے کہا۔

"کوریل! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم خوامخواہ سب سے دشمنی مول کیوں لے لیتے ہو؟"

"ایسے گھٹیا اور کمینے آدمیوں سے صرف دشمنی ہی کی جا سکتی ہے۔ دوستی تو نہیں۔"

"آہ...... تم...... بہت خوددار انسان ہو...... بہت ہی خوددار انسان۔ اور شاید تمہارے پسماندہ رہ جانے کی یہی وجہ ہے۔ اس دور میں لوگ حقیقتوں کو کہاں پسند کرتے ہیں۔ وہی لوگ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں جو کسی برائی پر نقطہ چینی کرنے کی بجائے اس سراہتے ہوں۔ ویسے میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بچی اس کی داشتہ ہو گی۔"

"پیراسس، ریڈ مین اور پھر یہ کمینہ انسان لارک ایرس۔ تم نے بھی خوب دوست پال رکھے ہیں۔ مجھے ان کے وجود سے گھن آتی ہے۔ ایسے ایسے لوگ سامنے آ رہے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ قتل عام کرتے جاؤ۔" ڈولمین نے کہا۔ ڈیگال کوریل کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے۔ غصے سے اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ پھر وہ بولا۔

"حقیقتیں تو برداشت کرنی ہی پڑتی ہیں مسٹر ڈولمین!"

"بہرحال، ٹھیک ہے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ اپنی جگہ۔ ویسے ایک بات میں تم سے کہوں ڈیئر ڈیگال کوریل! میں سیرین کے الفاظ سے کافی حد تک اتفاق کرتا ہوں۔ تم دوستی سے زیادہ دشمنیاں پالنے کے عادی ہو اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تم شدید احساسِ برتری میں مبتلا ہو۔"

"احساسِ برتری ٹھیک ہے۔ تم اسے احساسِ برتری کہہ سکتے ہو۔ لیکن یہ احساس غلط نہیں ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں، دنیا میں شاید چند ہی افراد جانتے ہوں گے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوں، پاگل نہیں ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تمہیں اوسیانوس اور پیراسس کے بارے میں حقیقت بتا دوں۔ یہ میرا استدلال تجزیہ ہے اور اس سے تمہیں میری ذہانت کا اندازہ خود بخود ہو جائے گا۔ بے شک میں مفلس ہوں اور میرا ماضی تاریکی میں ہے موجودہ حالات میں۔ ورنہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا، اس بات کو جانے دو۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میری پوری زندگی افلاس، محرومی اور ناکامی کا مجموعہ ہے۔ ٹھیک ہے، جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہی کہو گے۔ میں اسے تسلیم بھی کر لیتا ہوں۔ لیکن ذہنی اعتبار سے تو مفلس نہیں ہوں۔

چھوڑو ان باتوں کو۔اب میں تم پر بڑے انوکھے انکشافات کرتا ہوں۔سنو!''

ڈیگال کوریل کے چہرے پر ماضی کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''اصلی پیراسس پندرھویں صدی میں سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔وہ یونیورسٹی آف میلوس میں پروفیسر آف میڈیسن تھا اور یہ بات وقت اور تاریخ اور حالات ثابت کرتے ہیں کہ وہ جادوگر بھی تھا۔نظر بندی کے فن کا ماہر بھی۔وہ لوگوں کے ذہن پڑھ لیتا تھا۔مستقبل کا حال بتا دیتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اتنے شدید احساسِ برتری میں مبتلا ہو گیا کہ ہر ایک سے اس کی دشمنی ہو گئی۔یہاں تک کہ اسے یونیورسٹی سے فرار ہونا پڑا۔پھر وہ یورپ میں دربدر مارا مارا پھرتا رہا اور آخر کار انتہائی پراسرار حالات میں مر گیا۔'' ڈیگال کوریل نے خاموش ہو کر سیرین کی طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ تھا اصل پیراسس۔لیکن اب جو شخص پیراسس بن کر ہمارے سامنے آیا ہے وہ بلاشبہ پیراسس سے بھی زیادہ خطرناک بدکار آدمی ہے۔اس کا اندازہ لاش چوروں کے قتل سے ہو جاتا ہے۔اس نے ان کو قتل کرنے کے بعد ان کے دل اور جگر جلا دیئے۔عبرانی عقیدے کے مطابق جلتے ہوئے جگر اور دل کی بُو سے شیطان کو شدید اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یعنی بدروحوں کے بادشاہ کو جو اس کائنات میں ہر برائی کا ذمہ دار ہے۔''

''دیکھو، یہاں میرے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ڈاکٹر پیراسس ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔'' سیرین نے بے چینی سے کہا۔

''تمہارے مرحوم شوہر کو دوبارہ زندہ کر کے۔'' ڈیگال کوریل نے غصے سے کہا۔اور اپنی زخمی ہتھیلی سامنے کر دی۔''یہ دیکھو......یہ کل ریڈمین سے ملاقات کا تحفہ ہے۔''

''خدایا......کیا ایسا ریڈمین نے کیا ہے؟'' سیرین حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

''ہاں......اس کے کمرے میں لگی ہوئی تصویر زندہ ہو گئی تھی۔اس کے اندر نظر آنے والے بونوں اور درندوں نے بظاہر مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔''

''تصویر زندہ ہو گئی تھی؟'' ڈولمین نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں......میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس بات پر یقین کر لیتا۔لیکن میں مسٹر ڈولمین! میں صرف حقیقت پر یقین رکھتا ہوں اور میری نگاہیں ایسے فریب سے دھوکا نہیں کھا سکتی ہیں۔

یہ میرا علم اور ذہانت تھی جس نے مجھے تصویر کے زندہ ہونے والے واقعے پر یقین نہیں کرنے دیا۔مجھے یقین ہے کہ پہلے مجھے کسی نشہ آور گیس کے ذریعے مدہوش کیا گیا، پھر میرے سامنے تصویر کا تماشہ پیش کیا گیا۔گیس کے زیر اثر وہ سب کچھ مجھے حقیقت محسوس ہوئی۔لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھ پر حملہ کرنے والے بونے مافوق الفطرت نہیں تھے بلکہ وہ زندہ اور جیتے جاگتے تھے۔'' کوریل نے سیرین کی سمت دیکھا اور بولا۔

''اور میں تم پر یہ انکشاف کرتا ہوں سیرین! کہ درحقیقت یہ ریڈمین ہی تمہارے شوہر کی لاش کی چوری میں ملوث ہے۔اور وہ اوسیانوس یا تمہارے پیراسس سے ملا ہوا ہے۔

سیرین نے چکراتے ہوئے سر کو سنبھالنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ان انکشافات نے غالباً اسے ذہنی طور پر دیوالیہ کر دیا تھا۔کچھ دیر تک وہ چکراتی رہی، پھر اس کے بعد اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''تم ریڈمین پر اتنا سنگین الزام کس طرح لگا سکتے ہو ڈیگال کوریل؟''

''اس لئے سیرین! کہ ریڈمین مجھے تم سے اتنا قریب نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''کیا مطلب......؟'' سیرین حیرانی سے بولی۔

''وہ تمہیں خود اپنانا چاہتا ہے۔تم اس کے اور اوسیانوس کے لئے بہت قیمتی ہو۔''

''میرے خدا......'' سیرین اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لئے سہارا لیتی ہوئی بولی۔

''اور وہ مجھے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتا ہے۔کیونکہ اسے معلوم ہے کہ تم میرے مشوروں پر عمل کرتی ہو اور مجھے اپنا سمجھتی ہو۔''

سیرین کی آنکھیں برسنے لگیں۔عورت ویسے بھی جذباتی ہوتی ہے اور اس طرح کے جذباتی جملے سن کر سیرین کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی۔وہ تھوڑی دیر تک غم کی سی کیفیت کا شکار رہی اور اس کے بعد اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''یہ سچ ہے ایڈی......یہ سچ ہے......تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔میں یہ بات برسرِ عام کہہ سکتی ہوں کہ تم واقعی مجھے بے حد عزیز ہو۔ان سب سے زیادہ جو میرے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ہاں ڈیگال کوریل! میں تمہیں سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں سمجھے۔میں تمہیں سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔'' چند لمحے وہ اسی کیفیت کا شکار رہی۔اور اس کے بعد اس

نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بولی۔

''لیکن تعجب کی بات ہے کہ ریڈ مین بھی غدار ہے۔ دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔ آخر انسان دنیا میں کس پر اعتبار کرے؟ یقین کرو، شدید مشکل کے عالم میں بھی یہ بات نہیں سوچ سکتی تھی کہ ریڈ مین کسی طرح مجھ سے منحرف ہو سکتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا...... اس نے مجھ سے دغابازی کیوں کی...... اس کی وجہ کیا تھی؟''

''برائی کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ سمجھ رہی ہو نا تم؟ برا آدمی برائی تو کرتا ہے۔ اگر وہ برائی نہ کرے تو اس کو برا کیوں کہا جائے؟ ایک بہت سیدھی سی بات ہے۔''

''ریڈ مین برا آدمی۔ بہت ہی دکھ ہو رہا ہے مجھے یہ بات سوچتے ہوئے۔''

''پیراسس کو اس طرح کے کاموں کے لئے اس طرح کے مکار لوگ درکار ہوتے ہیں جو اس کے مریدوں کے گھریلو اور ذاتی معاملات سے اسے آگاہ کرتے رہیں۔ ریڈ مین نے ہی اسے بتایا ہوگا کہ تم لاش کے لئے کتنا معاوضہ ادا کر سکتی ہو۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے نوکروں میں اوسیانوس یا پیراسس کے جاسوس ضرور موجود ہیں جو یہاں کی ہر بات سے اسے آگاہ رکھتے ہیں۔''

اچانک ہی ڈولمین نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ ڈیگال کوریل! ایک منٹ۔ تم چونکہ حقیقت جاننے کا دعویٰ کرتے ہو اس لئے یہ بھی بتاؤ کہ نیگال سیمورس نامی کسی چیز کا کوئی وجود ہے؟''

''یہودیوں اور عربوں کا عقیدہ ہے کہ نیگال سیمورس جسے زمانہ قدیم میں نیگال سنگیاس بھی کہا جاتا تھا ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق غیر معمولی قوتوں کے مالک ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کا سنگھاسن ہے۔ وہ بزرگ اس کے ذریعے دنیا بھر کی خبر رکھتے ہیں۔ اور وہ سنگھاسن یوں سمجھ لو کہ کائنات کی چابی تھا جس کی ہر ذی روح عزت کرتا تھا اور اس کے سامنے سر جھکاتا تھا۔ عیسائی اور یہودی بھی اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق تمام بھوت، پریت، جنات اور بدروحیں اور پریاں جادوگر نیگال سنگیاس کے تابع ہیں اور اس میں سحر کی تمام کتابیں پوشیدہ ہیں۔ اس کا مالک روحوں اور جنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟'' ڈیگال کوریل اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''نیگال سنگیاس یا نیگال سیمورس انسانی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ لیکن افسوس میں ان

تمام باتوں کی تصدیق نہیں کر سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے اس کا وجود ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی۔'' ڈولمین نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''ویسے ایک بات میں بھی کہتا ہوں کہ اگر اوسیانوس نے اسے حاصل کر لیا تو وہ ناقابل شکست بن جائے گا۔''

''ہاں، بشرطیکہ واقعی یہ ممکن ہو سکے۔'' ڈیگال کوریل نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے نہیں دیکھا ہے لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی بدروح...... وہ کوئی بدروح......'' بولتے بولتے اچانک ہی ڈیگال کوریل کو خاموش ہونا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ سیرین دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے سسکیاں لیتی دوسرے کمرے کی طرف دوڑ پڑی ہے۔ اور پھر دروازہ زور سے بند ہو گیا ہے۔ ڈیگال کوریل نے بہت دکھ بھری اور بے بسی کی نگاہوں سے ڈولمین کو دیکھا اور بولا۔

''مسٹر ڈولمین! تم اوسیانوس کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہو نا؟''

''یہ تم جانتے ہو کہ میری آمد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

''تو پھر اسے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ختم کر دو۔ ورنہ وہ سیرین کو ضرور تباہ کر دے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جسمانی طور پر تمہارے زیادہ کام نہیں آ سکتا لیکن اپنے تمام علوم کے ذریعے میں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔''

اچانک ہی ڈولمین نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر دبے پاؤں جا کر ہال میں کھلنے والا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھول دیا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا، ہال خالی پڑا تھا۔

''ممکن ہے سیرین آ رہی ہو...... کیا تمہیں آہٹیں محسوس ہوئی تھیں؟''

''ہاں...... لیکن مجھے معلوم ہے کہ سیرین دوسرے کمرے میں ہیں۔ ان کی سہیلیوں کی آوازیں میں سن رہا ہوں۔''

''اس دروازے کے پیچھے کوئی تھا، یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ ویسے میں اس بات کی نشاندہی بھی کر چکا ہوں کہ اوسیانوس کے جاسوس یقیناً اس گھر میں موجود ہیں۔''

''ظاہر ہے۔ ہم بغیر کسی شبے کے کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ویسے بہتر یہ ہے کہ ہم

دونوں یہاں سے روانہ ہو جائیں اور اس بورڈنگ ہاؤس میں چلیں جہاں وہ اداکار مقیم ہیں۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے، میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"کیا؟"

"ہمیں ہیگ تک پہنچنا ہے۔"

"ہیگ تک؟"

"ہاں۔"

"وہ کیوں؟"

"کورنیلس کی لاش اس کے قبضے سے حاصل کرنے کے لئے۔"

"لیکن ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہمیں ضرورت ہے۔ کیونکہ اوسیانوس اس کو حاصل کرنے کے لئے آئے گا اور اس طرح مائی ڈیئر! تم اسے ہلاک کر سکو گے۔ ویسے مجھے سیرین کی سلامتی درکار ہے۔ وہ مجھے بے حد عزیز ہے اور میں جانتا ہوں کہ جب تک اوسیانوس زندہ ہے، اس کی زندگی کو خطرہ لاحق رہے گا۔"

"تم بھی بہت چالاک آدمی ہو۔ اب تک میں یہ سمجھتا رہا کہ میں تمہیں اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہوں لیکن اب اندازہ ہوا کہ درحقیقت تم مجھے ہنکاتے رہے ہو۔ ویسے کیا خیال ہے کہ اگر ہم دونوں ریڈ مین کے پیچھے لگ جائیں تو وہ ہمیں یقیناً اوسیانوس تک پہنچا دے گا؟"

"میری بھی عقل یہی کہتی ہے کہ لارک ایرس اور دوسرے تمام لوگ بھی اس گھناؤنے کھیل میں شریک ہیں۔ اس لئے یہ مناسب نہیں ہوگا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ریڈ مین کب اوسیانوس یا پیراسس سے رابطہ کرے گا۔ اگر ہم صرف اس کے پیچھے لگ گئے تو ہمیں بڑے طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس لئے ہماری توجہ ہیگ پر ہونی چاہئے۔"

"واقعی، تمہیں قدرت نے بڑا ذہین دماغ عطا کیا ہے۔"

"ہمیں بہت خطرناک کام کرنا ہے مسٹر ڈولمین! کیونکہ ہمیں اس معاملے کے ایک ایک لمحے پر نگاہ رکھنی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہی ہے۔ ہماری ذہانت اور چالاکی ہی ہمیں

اس شخص کے مقابلے میں کامیابی دلا دے گی۔"

"مجھے اس بات کا اعتراف ہے۔" ڈولمین نے کہا۔

۞......۞

جزیرہ اسکائن ایک تیرہ میل لمبا اور تقریباً ڈھائی میل چوڑا جزیرہ تھا۔ اٹھارہ سو چالیس میں اس جگہ فائیو پوائنٹ کے علاقے میں دنیا کے بدترین جرائم پیشہ افراد آباد تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فائیو پوائنٹ کا کوئی وجود باقی نہ رہا۔ فائیو پوائنٹ درحقیقت پانچ سڑکوں پر پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کئی منزلہ لکڑی کے بنے ہوئے مکانات تھے۔ مکانات کی حالت اتنی خستہ ہو چکی تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گر پڑیں گے۔ ان بوسیدہ عمارتوں میں افلاس زدہ لوگ انتہائی گندگی اور کسمپرسی کی حالت میں رہتے تھے۔ سڑکوں پر اتنا کیچڑ ہوتا تھا کہ چلنے والوں کے پاؤں دھنس جائیں۔ اس لئے لوگوں نے ان پر کوڑا کرکٹ اور لکڑی کے پرانے تختے ڈال دیئے تھے۔ یہاں پر بسنے والوں کی اکثریت ان باشندوں کی تھی جو ہجرت کر کے اوپلو آئے تھے۔ یہ سب جرائم پیشہ چور اور قاتل تھے۔ یہ بوسیدہ مکانات تاریک سرنگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ زمین دوز راستوں کو فرار کے علاوہ جرائم پیشہ لوگ انہیں اپنی کمین گاہ کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ یہاں کی عمارتوں کے نام بھی یہاں پر رہنے والوں کے سے تھے۔ مثلاً دوزخ کا دروازہ، خون کا پیالہ اور بھوتوں کی نگری وغیرہ۔ فائیو پوائنٹ کے چوک پر علاقے کا مشہور شراب خانہ واقع تھا۔ یہ ایک پانچ منزلہ عمارت تھی جس میں ایک ہزار سے زائد جرائم پیشہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ ان میں بیشتر لوگ مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے یہاں زیادہ تر تعداد سیاہ فاموں کی تھی۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ یہاں کسی ایک عمارت میں قتل نہ ہو جائے۔ لیکن پولیس کبھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی۔

اوسیانوس اس عمارت میں ہیگ کی بیوی اور بچے کو قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ ہیگ کی بیوی ایلزا اور اس کے دونوں بچے سر پر منڈلاتی ہوئی موت سے بے خبر تھے۔ اوسیانوس رات کی تاریکی میں سائے کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ ایلزا اس وقت چولہے کے پاس بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اس کا تین سالہ اور دو سالہ بچہ قریب ہی بیٹھے کھیل رہے تھے۔ ان لوگوں کی مالی حالت زیادہ اچھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ہیگ نے کہا تھا کہ اب اس نے

جس کام کا آغاز کیا ہے جلدی ہی ان کے تمام دکھ دور کردے گا۔ ایلزا نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا جو بھوک کی وجہ سے منتظر نگاہوں سے چولہے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ وہ پانی لانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی سمت مڑتے ہی سیاہ لبادے میں چھپے شخص کو دیکھ کر وہ خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اوسیانوس نے چھلانگ لگائی۔ ایلزا کو چیخنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے چیخنے سے پہلے ہی اوسیانوس اس کی شہ رگ کاٹ چکا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر گر پڑی۔ کرب اور اذیت کے عالم میں اس نے اپنا گلا پکڑ لیا جس سے نکلنے والے خون کے فوارے سے اس کے کپڑے تر ہوتے جا رہے تھے۔ ایلزا نے بے بسی کے عالم میں اپنے بچوں کی سمت دیکھا تو اوسیانوس کی سفاک آواز ابھری۔

”یہ دونوں بھی بہت جلد تم سے آملیں گے۔ میں تمہارا خون اپنے جد امجد شیطان کو نذرانے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔“

ایلزا کچھ کہنے سے پہلے ہی بے جان ہو کر گر پڑی۔ تب اوسیانوس دونوں بچوں کی سمت بڑھا جو دہشت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

☆......☆

سیرین اس وقت ڈاکٹر پیراسس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور وہ عجیب بے کسی کے سے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

”خدا کے واسطے ڈاکٹر پیراسس! میں التجا کرتی ہوں، مجھے سچ سچ بتا دیجئے۔ کیا واقعی میرا شوہر زندہ ہو جائے گا؟“

پیراسس اپنی آنکھیں بند کر کے سفید دستانے میں پوشیدہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔

”تم نے کبھی میرے وعدے پر شبہ نہیں کیا ہے مسز کورنیلس! آج تمہیں شک کیوں ہو رہا ہے؟“

”آہ...... میں ابھی آپ کو اپنے دوست ڈیگال کوریل کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ وہ ...... نجانے کیوں وہ آپ کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ......“ سیرین نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہوں...... میں جانتا ہوں۔ ڈیگال کوریل انتہائی ذہین اور علم کا بادشاہ ہے۔ لیکن مفلسی نے اس کے ذہن کو خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تمہیں میرے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے۔ کیا وہ یہ الفاظ نہیں کہتا کہ پیراسس فراڈ ہے۔ وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ کیا اس نے یہ الفاظ بھی نہیں کہے کہ مرنے والے کبھی زندہ نہیں ہوتے، مُردے کو زندہ کرنے کا دعویٰ دھوکا ہے۔“

”ہاں...... لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ سیرین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”مجھ سے یہ سوال کر رہی ہو...... مجھ سے...... مجھے اس کائنات کی ہر چیز کا علم رہتا ہے مسز کورنیلس...... مجھے ہر بات کا علم رہتا ہے۔ افسوس، تم لوگوں نے مجھے میرا مقام نہیں دیا۔ تم لوگ مجھے پہچان نہیں سکے۔ اور مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔“

سیرین حیرت اور احترام سے پیراسس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شخص بلاشبہ عظیم تر روحانی قوتوں کا مالک ہے۔ ادھر پیراسس سوچ رہا تھا کہ ڈیگال کوریل اب واقعی خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سیرین اس سے محبت کرتی ہے۔ ایک دن وہ اس کی باتوں سے متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن ابھی ڈیگال کوریل کو زندہ رکھنا اس کے لئے ضروری تھا۔ بہت ہی ضروری۔

”لوگ ان حقائق کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ان کا نہیں، ان کی کم علمی کا قصور ہوتا ہے۔ اور پھر بہت دنوں سے ڈیگال کوریل کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ بیوی کی موت نے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچایا ہے۔“

”ہاں...... وہ بے چارہ بہت دکھی انسان ہے۔“ سیرین نے تسلیم کیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ ”ڈاکٹر پیراسس! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرنے والے کی روح زندہ ہو اور وہ ہمیں نظر نہ آئے۔“

”مسز کورنیلس! رات کو تارے چمکتے ہیں لیکن سورج نکلتے ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں...... لیکن کیا ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے؟ ہرگز نہیں، وہ موجود رہتے ہیں۔ اور جس طرح روشنی چاند تاروں کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے اسی طرح موت کی تاریکی مرنے والوں کو چھپا دیتی ہے۔ لیکن وہ موجود ہیں۔ لیکن ہمیں نظر نہیں آتے۔“

”میں...... میں...... میں آپ پر یقین کرتی ہوں۔ لیکن ڈیگال کوریل بہت ذہین ہے۔

آخر اس کے انکار کی کوئی دلیل ہوگی۔"

اچانک ہی کمرے میں ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز شروع ہوگئی۔

"اور دلیل یہ ہے...... دلیل یہ ہے سیرین! کہ حیات بعد الموت ایک حقیقت ہے۔ تمہارا شوہر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں شامل ہو گیا ہے...... میں اسے دنیا میں واپس بلاسکتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے اس کی لاش کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ تم لاش کے حصول کے لئے معاوضہ دینے کے لئے تیار ہونا؟"

"ہاں...... میں منہ مانگا معاوضہ ادا کروں گی۔ ڈاکٹر پیراسس! ڈیگال کوریل کہتا ہے کہ تم کوئی اور ہو...... وہ کہتا ہے کہ میں......"

"کہ میں...... اوسیانوس...... ایک فراڈ، خطرناک قاتل۔ یہی کہتا ہے نا وہ؟"

سیرین ایک بار پھر دم بخود رہ گئی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ یہ سب کچھ پیراسس کو کیسے معلوم ہوگیا۔ پیراسس مسکرا رہا تھا۔

"میں سب جانتا ہوں مسز کورنیلس!"

اچانک موسیقی کی آواز تیز ہوگئی۔ کچھ عجیب سی موسیقی تھی یہ۔ سیرین پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور پھر اس کے سر پر کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ سیرین نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ہوا میں معلق ایک بانسری نظر آئی جس سے موسیقی پھوٹ رہی تھی۔ اور جب اس نے میز کی سمت دیکھا تو اس کے سامنے اس کے مرحوم شوہر کی خاص طلائی ڈبیہ رکھی ہوئی نظر آئی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ تو...... یہ تو...... کورنیلس کی ڈبیہ ہے۔"

"اسے کھول کر دیکھو۔" تاریکی میں پیراسس کی آواز سنائی دی اور سیرین نے ڈبیہ کھول کر دیکھی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اندر کورنیلس کی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔

"لیکن یہ یہاں......"

"بڑی خوبصورت انگوٹھی ہے۔ یہ تمہارے شوہر نے اس وقت تیار کروائی تھی جب تم پہلی بار اس کے ساتھ غیر ملکی دورے پر گئی تھیں۔ یہ انگوٹھی ایک بہت بڑی شخصیت کی انگوٹھی کی نقل تھی۔ ہے نا یہی بات؟"

سیرین کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ یہ کھوگئی ہے۔ کورنیلس کی موت کے بعد سے لاپتہ ہوگئی تھی۔

پیراسس مسکرا رہا تھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کسی ایسے ہی مناسب موقع کے لئے چوری کرائی گئی تھی۔

"ڈاکٹر! یہ...... یہ تو بہت بڑی بات ہے ڈاکٹر! یہ بہت بڑی بات ہے۔"

"کیا اب بھی تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتی ہو؟"

"نہیں ڈاکٹر! نہیں۔ مجھے مکمل اعتماد ہے...... مکمل اعتماد۔" اس نے انگوٹھی کو چھوتے ہوئے کہا۔ آنسوؤں سے اس کے رخسار تر ہوگئے تھے۔

"اب مجھے اوسیانوس کے بارے میں بتاؤ۔"

"ڈیگال کوریل اور اس کا دوست ڈولمین، اوسیانوس کی تلاش میں ہیں۔ ڈولمین نے اسے قتل کرنے کا عہد کرلیا ہے لیکن وہ این اسٹرین میں واقع بورڈنگ ہاؤس میں دو اداکاروں کو تلاش کرنے گئے ہیں۔"

پیراسس کی مٹھیاں غصے میں بھنچ گئیں۔ 'ڈولمین اب واقعی ایک بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ اگر اس نے ان اداکاروں کا پتہ لگالیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اب ضرورت پیش آ گئی ہے کہ ڈولمین کو بلا تاخیر راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ بہت ضروری ہے...... انتہائی ضروری۔' اس نے سوچا۔

"تم شاید جوزف اور برناٹ کا ذکر کررہی ہو جو ہمارے درمیان رابطے کا کام دیتے تھے۔ لیکن سیرین! اب ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس دن برنم میوزیم کے سامنے تم نے جوزف اور برناٹ سے بات کی تھی، اسی دن میں نے ان کو اپنی ملازمت سے برطرف کردیا تھا۔ ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم یہ ڈیگال اور ڈولمین کو بتا دینا۔ ان دونوں نے مجھ سے اپنے ماضی کو چھپایا ہوا تھا اور مجھے جیسے ہی اس حقیقت کا علم ہوا، میں نے انہیں برطرف کردیا۔ میں مجرموں اور دغابازوں سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ ویسے مجھے ایک بات بتاؤ مسز کورنیلس! یہ لوگ بورڈنگ ہاؤس کب جائیں گے؟"

"آج ہی......" سیرین نے جواب دیا۔ اور اوسیانوس کے چہرے پر کسی قدر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ وہ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں چلتا ہوں۔ تم میری مدد کرو گی۔ اور میں تمہاری۔ یہی ہم دونوں کا کام ہے۔"

پھر سیرین کو رخصت کرنے کے بعد اوسیانوس یا پیراسس سیدھا سارا کے پاس پہنچا۔ اس نے کہا۔

"یہ کام فوری طور پر ہونا ہے۔ لاریس اور چارلی کو فوراً میرے پاس بھیجو۔ وہی یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"یعنی جوزف اور برنات کو قتل کر دینا ہے؟" سارا نے پوچھا۔

"ظاہر ہے...... اس کے علاوہ اور کیا، کیا جا سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے...... میرا خیال ہے یہ کام ہو جائے گا۔"

"ان کو فوری طور پر راستے سے ہٹا کر بورڈنگ ہاؤس کو آگ لگا دینی ہے۔ لیکن اس طرح کہ یہ حادثہ معلوم ہو۔ اور اس سے پہلے کہ ڈولمین اور ڈیگال کوریل وہاں پہنچ سکیں، یہ کام ہو جانا چاہئے۔ بولو، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"آپ کہیں مسٹر اوسیانوس! اور یہ کام نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" سارا نے مسکرا کر کہا۔

✪......✪

ٹن اسٹریٹ کے بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر ڈولمین اور ڈیگال کوریل کو معلوم ہوا کہ دونوں اداکار اب تک واپس نہیں آئے۔ انہوں نے اپنی گھوڑا گاڑی کا رخ فائیو پوائنٹ کی طرف موڑ دیا جہاں جونی بیکر ہوا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں ڈیگال کوریل نے بتایا کہ وہ چوروں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ ہے۔

"مگر وہ چوری کا مال جمع کرنے کے علاوہ کبھی کبھی کسی مالدار آدمی کو اغوا کروا دیتا ہے اور پھر بھاری تاوان حاصل کر کے رہا کر دیتا ہے۔" ڈیگال کوریل نے بتایا۔ ڈولمین گھوڑا گاڑی پر آرام سے دراز تھا۔ یہ گھوڑا گاڑی اس نے کرائے پر حاصل کی تھی۔ کیونکہ گاؤں کا کرایہ اسے ادا نہیں کرنا تھا۔ لیکن دنیا کی نظروں میں اس نے یہ دولت ڈانسنگ ہال سے کمائی تھی۔ بہر حال اتفاق سے بیکر بھی اسی فیلڈ کا آدمی تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ تمام چور اچکے اوپلو کے اسی علاقے میں جمع ہو گئے ہیں۔" ڈولمین نے کہا۔

"اس آدمی سے محتاط ہو کر بات کرنا۔ یہ جنگل کا جانور ہے۔ وحشی اور درندہ صفت۔"

"مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ کیسا ہے۔ بس ہمارا کام کر دے۔ یعنی ہمیں ہیگ سے ملوا دے۔" ڈولمین نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ وہ غلیظ اور تنگ راستوں سے گزرتے رہے۔ کبھی کبھی تو اتنا تعفن ملتا کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ ڈولمین اونگھنے لگا تھا لیکن بہر حال وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ڈولمین نے کہا۔

"کبھی کبھی انسان کتنا احمق ہو جاتا ہے۔ اب اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں سکون کی گہری نیند سو جاؤں۔ جب کہ یہ کسی بھی طور ممکن نہیں ہے۔" وہ خود ہی اپنی بات پر ہنس پڑا۔

✪......✪

ہیگ، ایلزا کے ٹھنڈے بے جان ہاتھ کو پاگلوں کی طرح چوم رہا تھا۔ اسے زندگی میں اتنا گہرا صدمہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کے حلق سے کرب و اذیت سے بھری ہوئی کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس کا دل انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

"اوسیانوس، ڈیگال کوریل اور اس کا دوست جس نے میرے دو ساتھیوں کو ہلاک کر دیا تھا، ان کو بے دردی اور عبرت انگیزی کے ساتھ ہلاک کر کے رہوں گا میں...... یہ میرا عہد ہے۔ اپنے بیوی اور بچوں کا اس طرح انتقام لوں گا میں کہ دنیا کانپ اٹھے گی۔ انہوں نے میری ایلزا کو ہلاک کیا ہے۔ میرے ننھے بچوں کا گلا گھونٹا ہے۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کے ذہن میں شعلے اٹھ رہے تھے۔ غصے اور بے بسی کے عالم میں وہ پاگلوں کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اور پھر وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ بڑا خوفناک منظر تھا۔ ایسا خوفناک کہ انسان دیکھے تو دماغی توازن کھو بیٹھے۔ ان ننھے ننھے بچوں کو ہلاک کر کے ان کے دل سینے سے نکال دیئے گئے تھے۔ اور پھر ظالم قاتل نے یہ ننھے دل جلا کر خاک کر دیئے تھے اور ایسا ظالم دیوانہ اس جادوگر کے علاوہ کون ہو سکتا ہے جس کا نام اوسیانوس تھا۔

"اوسیانوس! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیرے مددگار ڈیگال کوریل اور اس کے ساتھیوں کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلاؤں گا۔ ان کتوں کو ان کمزور اور معصوم بچوں سے انتقام لیتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ عورت اور یہ ڈیگال کورل بھی تو عورت پر فریفتہ

ہے۔ ہاں، اسے بھی اسی طرح اذیت ملنی چاہئے۔ میں اس کی محبوبہ سے انتقام لوں گا تاکہ موت سے پہلے ڈیگال کوریل بھی اسی طرح اس کے غم میں تڑپے۔ میں...... میری محبت کرنے والی بیوی ایلزا، میں تیری لاش کی قسم کھاتا ہوں کہ ان سب سے میں بھیانک انتقام لوں گا۔''

ہچکیوں سے روتے ہوئے اس نے عہد کیا اور آخری بار سوچا کہ سیرین کورنیلس کون سے علاقے میں رہتی ہے۔

''سیرین! تیرا قتل ڈیگال کوریل کے لئے بہت دردناک ہوگا۔ میں تجھے قتل کر کے ہی چین سے بیٹھوں گا۔''

✡......✡

ڈولمین نے اس علاقے کو دیکھا اور گردن ہلانے لگا۔

''مجھے یقین ہے کہ شیطان بھی اس غلیظ اور متعفن علاقے میں آنے پر راضی نہ ہوگا۔ بہرحال گاڑی والے کو انتظار کا حکم دے کر وہ دونوں لوئر سے ڈانسنگ ہال میں داخل ہو گئے۔ اندر تیل سے جلنے والے بہت سے لیمپ دیواروں پر لگے ہوئے تھے جن کی روشنی میں ان لوگوں کا ایک ہجوم نظر آ رہا تھا۔ شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دیواروں کے کنارے بچھی ہوئی بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور درمیان میں مستی اور جنون کے عالم میں ہیجانی رقص کرنے والے جوڑوں کا سمندر موجزن تھا۔ تیز موسیقی سے کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ مجمع میں شامل لوگوں کے لباس عموماً گندے اور بوسیدہ تھے۔ چودہ پندرہ برس کی لڑکیاں نیم عریاں لباس میں ویٹرز کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ یہ سب پیشہ ور تھیں۔ ڈیگال کوریل نے ایک لڑکی کو روک کر اس کے کان میں کچھ کہا، وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی تو ڈولمین نے اس سے کہا۔

''تم نے اس سے معاملہ طے کیا ہے؟''

''ہاں......''

''دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔''

''کیوں؟''

''کیا تم اس سلسلے میں یہاں آئے ہو؟''

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''کوئی بات بعید نہیں ہے۔ لوگوں کے مزاج سمجھنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔''

''میں نے اس سے کہا ہے کہ یہ لائیڈ جونی کو بلا کر لے آئے۔''

''تم اسے اچھی طرح جانتے ہو مائی ڈیئر کوریل؟''

''ہاں...... کئی بار اس سے ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ بے حد چالاک اور سفاک قاتل اور جرائم پیشہ لوگوں میں باعزت شخص ہے۔ لیکن اجنبیوں کی آمد پسند نہیں کرتا۔''

اس لمحے وہ دبلی پتلی لڑکی واپس آ گئی۔

''مسٹر لائیڈ نے کہا ہے کہ ان کے پاس دو ٹکے کے شرابیوں سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔'' ڈولمین نے ڈیگال کوریل کی طرف دیکھا لیکن ڈیگال کوریل نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر خوشامدانہ انداز میں لڑکی سے کہا۔

''ان سے کہہ دو کہ ملنا بہت ضروری ہے۔ اور......''

''سنو لڑکی!'' ڈولمین نے ڈیگال کوریل کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے حال کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تو یہاں آ کر بات کرلے۔ ورنہ میں اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ لاؤں گا۔ جاؤ۔'' ڈولمین غرایا۔ لڑکی سہم کر چلی گئی۔

''ارے...... باپ رے...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا ڈولمین! وہ یہاں تنہا تو نہیں ہوتا۔''

''اس کی فکر مت کرو دوست! تم بھی تنہا نہیں ہو۔'' ڈولمین نے اپنا پیڈ درست کرتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بیکر جونی لائیڈ ان کے سامنے تنا ہوا کھڑا تھا۔ واقعی وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر مجمع گائے کی طرح کٹ گیا تھا اور دو خونخوار شکلوں والے مرد اور ایک عورت اس کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈولمین نے ایسی عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کسی طلسمی دنیا کی بھوتنی معلوم ہو رہی تھی۔ سیاہ فام جسم ہتھنی کی طرح بھاری بھرکم اور بازو کسی طرح ڈولمین سے کم نہیں تھے۔ اس نے ایک بھڑکیلا ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور اس کی پنڈلی سے ایک لمبا خنجر بندھا ہوا تھا۔ یہ عورت اتنی خوفناک تھی کہ دیکھ کر ہی ڈر لگتا تھا۔ ڈولمین کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ نیگرو عورت ایک خوفناک قاتل ہے۔ اس کے چہرے پر قتل کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ جونی بیکر لائیڈ نے دونوں ٹانگیں پھیلائیں اور کسی مجسمے کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر پہنچ گئے تھے۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"شاید تم ہی وہ بدقسمت ہو جس نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔" اس کی نگاہیں ڈولمین پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈولمین خاموشی سے دراز قد قاتل کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ کافی دلکش چہرے کا مالک تھا۔ اس نے اس کی پشت پر کھڑے ہوئے بقیہ افراد کا بھی جائزہ لیا۔

"تمہارا بھی کوئی نام ہوگا...... کیا نام ہے تمہارا؟" لائیڈ نے پھر کہا۔

"ڈولمین......" ڈولمین نے اطمینان کے ساتھ بتایا۔

"ڈولمین بہت لذیذ پھل کا نام ہے۔" پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

"کھڑے ہو جاؤ کتے! تمہیں ہم بڑے لوگوں کے سامنے بیٹھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" اس نے ٹھوکر مارنے کے لئے پوری قوت سے اپنی لات بلند کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کی لات نیچے آتی، ڈولمین بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اٹھا۔ اس کا پیر اتنی قوت سے حملہ آور کے پیٹ میں لگا کہ وہ پیٹ پکڑ کر درد سے دہرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ڈولمین کا مُکا فضا میں بلند ہوا۔ بظاہر وہ ہلکا سا وار تھا لیکن حملہ آور فضا میں اچھل کر دور جا گرا۔ رقص رک گیا۔ لوگ خوفزدہ ہو کر دور ہٹ گئے۔ ڈولمین اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ پھر وہ پھرتی سے اٹھا اور لائیڈ کے پیٹ سے پیٹ ملا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیبوں میں تھے اور ان میں رکھے ہوئے پستولوں کی نالیں لائیڈ کے پیٹ میں چبھ رہی تھیں۔

"مسٹر بیکر لائیڈ! ہمیں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ براہ کرم اس کا انتظام کرو۔"

لائیڈ بے وقوف آدمی نہیں تھا۔ اسے ایک دم اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔ پیچھے کھڑی ہوئی دیو قامت عورت کا ہاتھ خنجر کی طرف بڑھا لیکن لائیڈ نے فوراً ہی اشارے سے اسے روک دیا۔

"ٹھہرو...... میرا خیال ہے کہ ہمیں مسٹر ڈولمین اور ڈیگال کوریل سے بات کر لینی چاہئے۔" پھر وہ ڈولمین، ڈولمین کی گردان کرنے لگا اور پھر ایک دم اچھل کر بولا۔

"اوہو...... کہیں تم باکسر جیمس ڈولمین تو نہیں ہو......؟" لائیڈ کا رویہ اچانک تبدیل ہو چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے واقعی ڈولمین سے مل کر خوشی ہوئی ہو۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے ڈولمین کے شانے پکڑ کر دبائے اور بولا۔

"خاصی پرانی بات ہے۔ اس وقت میں نوخیزیت کی منزل میں تھا۔ میں نے تمہاری

باکسنگ کا شاندار مظاہرہ دیکھا تھا۔ خدایا، تم واقعی باکسنگ کے شہنشاہ ہو۔" اس نے مڑ کر حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھا اور بولا۔

"رقص جاری رکھو دوستو! یہ میرے پرانے اور قابل اعتماد دوست ڈولمین ہیں۔ باکسنگ کی دنیا سے واقف کوئی بھی شخص ڈول مین کا نام سن کر اجنبیت کا اظہار نہیں کرے گا۔"

"ڈولمین...... ڈولمین...... ڈولمین......" بہت سی آوازیں ابھریں۔ لائیڈ کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔

"یہ باکسر ڈولمین ہیں؟"

"ہاں...... خدا کا شکر ہے کہ تم نے ان کو چھیڑ کر اپنی موت کو دعوت نہیں دی۔" لائیڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ڈولمین! یہ بلیک ٹرٹل ہے۔ اس کا نام میں نے رنگت اور جسامت کی مناسبت سے رکھا ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور یہ میری بہترین لیفٹیننٹ ہے۔" لائیڈ نے عورت کی طرف رخ کر کے کہا اور پھر بولا۔ اس کی وجہ سے یہاں امن و امان سے رہتا ہوں اور کسی کو ہنگامہ آرائی کی جسارت نہیں ہوتی۔ یہ زخمی شیرنی کی طرح لڑتی ہے۔ فائیو پوائنٹ کے کسی بھی شخص کو اس سے مقابلے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی ایسی جرأت کر بھی بیٹھتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی بیوہ کی گزر اوقات کا بندوبست کر لیتا ہے۔" اس نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ ڈولمین کے شانے پر رکھا اور کہا۔

"اور یہ نام بھی اجنبی نہیں ہے۔ یعنی ڈیگال کوریل۔ اصل میں میرے ذہن میں نہیں تھا کہ دو اتنے بڑے آدمی اچانک اس طرح یہاں آ جائیں گے۔ اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے تو صرف ناواقفیت کی بنیاد پر۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ غلط فہمی میں کی جانے والی کوئی بھی بات زیادہ قابل غور نہیں ہوتی۔ میں تم دونوں کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، میرے لائق کیا خدمت ہے؟" ڈولمین نے دیکھا کہ بلیک ٹرٹل اسے خونخوار نگاہوں سے گھور رہی ہے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں قتل کر دے گی۔ لائیڈ کا زخمی ساتھی بھی زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا بدمعاش بھی ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ڈولمین کے ہاتھ اب تک جیب میں تھے۔

"ہمیں ہیگ سے ملنا ہے...... تم ہماری اس سے ملاقات کرا دو۔"

"ہیگ ......" وہ سوچنے لگا، پھر چونک کر بولا۔ "آہا، وہ...... جو لاشوں کی چوری کرتا ہے۔ لیکن تم دونوں اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"یہ ہم صرف اسے بتا سکتے ہیں۔ اسے خبر کر دو کہ مسٹر ڈولمین اور مسٹر ڈیگال کوریل اس سے ملنا چاہتے ہیں اور اس ملاقات سے اسے فائدہ پہنچے گا۔ ممکن ہے اس طرح اس کی جان بچ جائے۔" ڈولمین نے کہا۔

"جان بچ جائے......؟" لائیڈ حیران ہو کر بولا، پھر مسکرا کر بلیک ٹرٹل کی طرف مڑا اور بولا۔ "تم نے سنا ڈارلنگ! میرا خیال ہے اب ہیگ تم دونوں سے ضرور ملے گا۔ آیئے میری طرف سے بہترین شراب کی دعوت قبول کیجئے۔ آپ دونوں میرے معزز مہمان ہیں۔"

"شکریہ بیکر لائیڈ! میں شراب نہیں پیتا۔ اور مسٹر ڈیگال کوریل نے آج کل شراب کا روزہ رکھا ہوا ہے۔"

"اوہ ڈیئر...... اوہ ڈیئر...... اب ہر غلط فہمی کو دل سے نکال دو۔ اسکائین کی شراب بنانے والے اب بے کار ہو جائیں گے۔ کیوں مسٹر ڈیگال کوریل!" بیکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے مسٹر ڈولمین! آپ دونوں یہاں آرام کیجئے، میں ہیگ کو اطلاع بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔" اس نے بلیک ٹرٹل کی کمر میں بانہیں ڈالیں اور اپنے دونوں بدمعاشوں کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ ڈولمین بڑا عجیب وغریب آدمی تھا۔ شیر کی دھاڑ میں بھی وہ ہر کام لاپرواہی سے کرنے کا عادی تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا اور ہال کا جائزہ لینے لگا۔ البتہ اس کے ہاتھ ابھی تک اپنی جیب میں پستولوں پر تھے۔ پتہ نہیں ڈیگال کوریل نے کچھ اندازہ لگایا تھا یا نہیں لیکن اسے جونی لائیڈ بیکر کی باتوں سے مکاری کی بو آ رہی تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھے تھے، وہاں ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ لائیڈ کے جانے کے بعد پردہ ہلا اور ایک کریہہ صورت عورت نے سر نکال کر ڈیگال کوریل کے کان میں سرگوشی کی۔ اتفاق سے ڈولمین کی نگاہ اس طرف اٹھ گئی تھی۔ ڈولمین نے کہا۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ اگر اس کی جان کے تحفظ کا وعدہ کیا جائے تو یہ ایک اہم بات بتانا چاہتی ہے۔"

ڈولمین نے سر ہلا کر ہامی بھر لی۔ بڑھیا نے تیز روانی کے ساتھ ڈیگال کوریل کے کان

میں کچھ کہنا شروع کیا، پھر سیدھی ہوئی تو ڈیگال کوریل نے سنجیدگی سے ڈولمین سے کہا۔

"کچھ ریز گاری ہو گی؟"

"اس منحوس بڑھیا کے لئے؟"

"ہاں...... لیکن ادھر مت دیکھو، ایسے ہی بیٹھے رہو۔ تاکہ لوگ متوجہ نہ ہوں۔ یہ واقعی انعام کی مستحق ہے۔ یہ بتا رہی ہے کہ لائیڈ ہمیں دھوکا دے کر پھانسنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔"

ڈولمین نے جیب سے سونے کا ایک سکہ نکالا تو ڈیگال کوریل نے اسے روک دیا، پھر بولا۔ "اگر تم نے سونے کا یہ سکہ اسے دیا تو یہاں سے اس کی لاش ہی واپس جائے گی۔"

ڈولمین نے ایک گہری سانس لی اور چاندی کا ایک سکہ کوریل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے وہ سکہ بڑھیا کو دیا اور بڑھیا شکریہ ادا کر کے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل چلیں۔" ڈیگال کوریل نے کہا۔

"اگر ہم ہیگ سے نہ مل سکے تو سیرین کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔" ڈولمین نے یاد دلایا۔

"لیکن اگر ہم یہاں ٹھہرے تو یہ ہمیں ہلاک کر دیں گے۔" ڈیگال کوریل بولا۔

"مسٹر کوریل! موت کے بارے میں میرا نظریہ بالکل مختلف ہے۔ میں آج تک موت سے ڈر کر نہیں بھاگا۔"

ان لوگوں کو یہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ اور پھر اچانک ہی انہیں احساس ہوا کہ کوئی ایسی گڑبڑ ہو رہی ہے جو ناقابل فہم ہے۔ ڈول مین اس کا تذکرہ ڈیگال کوریل سے کرنا ہی چاہتا تھا کہ ڈیگال کوریل نے کہا۔

"ہمیں اٹھنا چاہئے...... مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔"

ڈولمین مسکرا دیا اور اس نے کہا۔ "ہم دونوں کی ناک بیک وقت مصروف عمل ہوتی ہے۔ چلو اٹھو...... دیکھتے ہیں۔" اور اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

عمارت کا اندرونی حصہ سنسان تھا۔ وہ ایک کوریڈور سے گزر رہے تھے کہ کوریڈور کے اختتام پر انہیں ایک سایہ سا نظر آیا جو ان کو دیکھتے ہی برق رفتاری سے آگے بڑھ کر روپوش

ہو گیا تھا۔ ڈولمین نے بے اختیار اس طرف چھلانگ لگا دی۔ ڈیگال کوریل بھی اس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ کوریڈور کے اختتام پر بائیں سمت ایک کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ جو کوئی بھی تھا، اسی دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ڈولمین اس طرح جذباتی ہو رہا تھا کہ اس نے کسی صورتحال کا جائزہ بھی نہ لیا اور تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر سامنے اس نے ایک روشن خلا دیکھا۔ یقیناً کسی تہہ خانے کا دروازہ تھا اور جو کوئی بھی تھا، وہ اس تہہ خانے میں اندر داخل ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈیگال کوریل ڈولمین کو ہوشیار کرنے کی بات کرے، ڈولمین اس تہہ خانے کی سیڑھیوں پر اتر گیا تھا۔ بحالت مجبوری ڈیگال کوریل نے بھی اسی بات پر عمل کیا اور وہ نیچے اترتا چلا گیا۔ جہاں ان سیڑھیوں کا اختتام ہوا، وہاں ایک سیلن زدہ زمین دوز کمرہ تھا جس میں ہر طرف وہسکی کے بڑے بڑے ڈرم اور بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں شدید گھٹن تھی اور شراب کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ایک سرنگ نما راستہ تھا جس میں اسے لائیڈ بیکر اور کالی عورت کھڑے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ انہیں گھیر کر یہاں تک لائے تھے۔ کمرے میں مٹی کے تیل کی لالٹین جل رہی تھی اور اس کی مدھم روشنی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ روشنی کمرے کی تاریک فضا کو دور کرنے کے لئے ناکافی تھی۔ لیکن بہرحال اتنا ضرور تھا کہ قرب و جوار کی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔

وہ دونوں رک گئے تو لائیڈ بیکر نے کہا۔

”بعض اوقات قصے کہانیوں کی باتیں حقیقت کا روپ دھار جاتی ہیں۔ جیسے اس وقت شکار خود شکاری کے قبضے میں آ گیا ہے۔ لیکن لائیڈ بیکر، ڈولمین جیسے خطرناک آدمی سے واقف نہیں تھا۔ جو کام ڈولمین نے کیا وہ انتہائی خطرناک تھا۔ اس نے اچانک ہی لائیڈ پر حملہ کیا اور اس کا گریبان پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے کے وسط میں لے آیا۔ پھر اس نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ نیچے آ گرا۔ ڈولمین نے اسی پر بس نہ کیا، اس نے برابر رکھا ہوا وہسکی کا ایک ڈرم اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور ساری وہسکی لائیڈ بیکر پر بہا دی۔ یہ کام چار آدمیوں کے بس کا بھی نہیں تھا۔ لیکن بات وہی تھی، وہ لوگ ڈولمین سے واقف نہیں تھے۔ اور پھر ایک بپھرا ہوا شخص۔ لائیڈ کے حلق سے دہشت بھری آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ تب ڈولمین نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ لائیڈ کے

پورے بدن سے شراب بہہ رہی تھی اور فضا میں ایک انتہائی ناگوار بو پھیل گئی تھی۔ وہ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنا ریوالور نکال کر کھڑا ہو گیا اور پستول کی نال لائیڈ کے کان میں ٹھونس دی۔ بلیک ٹرٹل اس کے برابر کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک لمحے میں اپنے ہاتھ بلند کر لئے۔

”ہاں...... اب ذرا مجھے یہ بتا دو کہ مجھے یہاں تک لانے کا پس منظر کیا تھا؟“

”آہ...... مائی ڈیئر مسٹر ڈولمین! تم نے مجھے وہسکی میں اس طرح نہلا دیا ہے کہ اس کی بو سے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہے۔“

”اوپر کتنے آدمی ہمارے منتظر ہیں؟“

”تین۔ وہ سرنگ کے اختتام والے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”کیا منصوبہ تھا تمہارا...... لازمی بات ہے کہ تم ہمیں ختم کرنا چاہتے تھے۔“

”میں نہیں، آپ لوگوں کو قتل کرنے کا منصوبہ ہیگ نے بنایا تھا اور اس نے ہمیں اس کام کے لئے معقول رقم دی تھی۔“

”کیا مطلب...... ہیگ نے ہمیں قتل کرنے کے لئے تمہاری خدمات کیوں حاصل کی تھیں؟“ اس بار ڈیگال نے سوال کیا۔

”اس کا خیال ہے کہ اس کی بیوی اور دونوں ننھے بچوں کو قتل کرنے میں آپ دونوں کا ہاتھ ہے۔“ لائیڈ نے بتایا۔ ”اس نے آپ دونوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے ہماری خدمات حاصل کی تھیں۔ ہم تو آپ کو تلاش کر کے قتل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بالکل اتفاق ہے کہ آپ لوگ خود ہی یہاں آ گئے۔“

”تم جیسے مکار انسان روئے زمین پر کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پنجے اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ لائیڈ کچھ تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ اور اب وہ کچھ خوف بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے مسٹر ڈیگال کوریل! مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں اس کی تلاشی کرنے کو تیار ہوں۔“

”بکواس کرتا ہے کتے! ہم سمجھتے ہیں تو کیا چیز ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ ہم یہاں تیرے رحم و کرم پر ہیں؟“

"مگر تم میری بات سن لو۔ اگر تم نے گولی چلائی تو اس کی آواز سن کر اوپر بیٹھے ہوئے میرے آدمی چشم زدن میں یہاں پہنچ جائیں گے اور تم واپس بھی گئے تو میرے آدمی بار میں تمہارے منتظر ہوں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ریوالور میرے حوالے کر دو۔"

جواب میں ڈولمین نے ایک پستول اپنی بغل میں دبایا اور ایک زوردار مُکا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ لائیڈ، ڈولمین کے مکے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ اپنی سیاہ فام محبوبہ کو لئے ایک دھماکے کے ساتھ فرش پر جا گرا۔ بلک ٹرٹل اپنی بھاری جسامت کے باوجود شیرنی کی سی پھرتی کے ساتھ اچھل کر اٹھی۔ لائیڈ کراہتا ہوا تڑپنے لگا۔ بلیک ٹرٹل حملے کے لئے تیار تھی لیکن فوراً ہی ڈولمین نے کہا۔

"مائی ڈیئر مسٹر لائیڈ! ویسے تو میں اس عورت کو باآسانی جہنم رسید کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا ابھی نہیں کرنا چاہتا۔ تم نے شاید یہ نہیں سوچا کہ میں نے تمہارے کپڑے شراب میں کیوں تر کئے تھے۔ اگر تم نے ذرا بھی گڑبڑ کی اور میں نے یہ جلتی ہوئی لالٹین تمہارے اوپر پھینکی۔ اس لئے اپنی سیاہ بھتنی سے کہہ دو کہ حرکت نہ کرے۔ اور تم خود میرے ساتھ اس کمرے کی طرف چلو جس میں تمہارے وہ قاتل دوست بیٹھے ہوئے ہیں جو ہمیں قتل کرنے کے لئے بلائے گئے تھے۔"

ڈولمین نے یہ کہہ کر لائیڈ کا گریبان پکڑا اور ایک بار پھر اسے کھڑا کر دیا۔ بات ان لوگوں کی سمجھ میں آ گئی تھی اس لئے بلیک ٹرٹل بھی رک گئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے خون رس رہا تھا۔ لائیڈ کراہتا ہوا فرش سے اٹھا اور خاموشی سے چلتے ہوئے چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جو سرنگ کے اختتام پر واقع تھا۔

ڈیگال کوریل البتہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازے کے اندر موت پوشیدہ ہے۔ اگر اندر بیٹھے ہوئے قاتلوں کو ذرا بھی شبہ ہو گیا تو وہ انہیں بھون ڈالیں گے۔ دروازے کے سامنے وہ رک گئے۔ لائیڈ نے گھوم کر ڈولمین کو دیکھا جس نے پستول کمر کی پیٹی سے لگا کر لالٹین ڈیگال کوریل سے لے لی تھی۔ پھر اس نے لائیڈ کو اشارہ کیا۔ لائیڈ نے دروازے پر دستک دی۔

"دروازہ کھولو...... میں لائیڈ ہوں۔" اس نے کہا۔ دروازہ کھلا۔ اندر صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ ایک شخص لالٹین لئے دروازے کے پاس آیا اور انہیں اندر آنے کا اشارہ

کیا۔ ڈیگال کوریل پوری طرح ہوش میں تھا اور چاروں طرف کے ماحول سے باخبر بھی تھا۔ ڈولمین نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"پیچھے رہو...... درمیان میں مت آنا۔"

لائیڈ اور بلیک ٹرٹل دروازے میں داخل ہوئے۔ اچانک ہی ڈولمین کا ہاتھ جنبش میں آیا۔ اس نے زور سے لائیڈ کو دھکا دیا اور لالٹین والے شخص پر فائر کر دیا۔ اسی وقت لائیڈ چیخا۔ "قتل کر دو اسے...... قتل کر دو۔ یہ بچ کر نہ جانے پائے۔"

ڈیگال کوریل سکتے کے سے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ ڈولمین نے دوبارہ فائر کیا اور تاریکی میں آگے بڑھنے والا شخص حلق پھاڑ کر چیخا۔ تبھی لائیڈ نے کہا۔

"کتے کے بچو! کیا کر رہے ہو؟ مارو اسے۔ مارو......" اسی وقت ڈیگال کوریل نے بلیک ٹرٹل اور ایک اور شخص کو ڈولمین پر جھپٹتے ہوئے دیکھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب ڈولمین نے جلتی ہوئی لالٹین لائیڈ پر کھینچ ماری۔ شیشہ ٹوٹنے کے چھناکے کے ساتھ ہی لائیڈ کا پورا جسم بھڑک اٹھا۔ اس نے ایک خوفناک چیخ ماری۔ لیکن وہسکی نے پٹرول کی طرح چشم زدن میں آگ کے شعلے بھڑکا دیئے اور لائیڈ کا جسم خشک لکڑی کی طرح جلنے لگا۔ جلتے ہوئے گوشت کی تیز بو کمرے میں پھیل گئی۔ لائیڈ اذیت کے عالم میں دردناک چیخیں مارتا ہوا کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ وہ اپنے جسم سے جلتے ہوئے کپڑے نوچ پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کپڑے جسم سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ادھر بلیک ٹرٹل اور دوسرے شخص نے کسی طرح ڈولمین کو زمین پر گرا لیا تھا اور وہ اس پر حملے کر رہے تھے۔ لیکن ڈیگال کوریل کی نگاہیں جلتے ہوئے لائیڈ پر مرکوز تھیں۔ وہ دہشت اور خوف کے عالم میں ایک زندہ انسان کو جلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر دم توڑتے ہوئے لائیڈ کے حلق سے کربناک چیخیں نکلنے لگیں۔ زمین پر پڑا ہوا ڈولمین بپھرے ہوئے شیر کی طرح لڑ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے ایک زوردار ٹھوکر سامنے والے حملہ آور پر رسید کی جو الٹ کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اپنی آنکھ میں آگ سی دہکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بلیک ٹرٹل نے اپنی انگلی اس کی آنکھ میں گھسیڑ دی تھی۔ ڈول مین نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے پیچھے کیا اور بلیک ٹرٹل کی کلائی پر اپنے دانت گاڑھ دیئے۔ اس نے چیخ کر اپنا ہاتھ اٹھایا اور ڈولمین کی گردن پکڑنے کی کوشش کی لیکن ڈولمین نے اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ اور اس کے بعد وہ پھرتی سے اٹھ کر سیاہ

فام عورت پر حملہ آور ہوا۔ اس نے عورت کے منہ پر اپنے گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ الٹ کر فرش پر گری۔ لیکن بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ گئی۔ ڈولمین نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ لڑنے کے فن سے پوری طرح واقف ہے۔ بلیک ٹرٹل نے سر جھکایا اور ڈولمین کو ٹکر مارنے کے لئے جھپٹی۔ ڈولمین پھرتی سے ایک سمت ہٹ گیا۔ وہ میز سے ٹکرا کر نیچے گری۔ اس نے ایک بار پھر سر کو جھٹکا اور پھر میز کا ایک پایہ پکڑ کر اسے جھٹکے سے توڑ کر ہاتھ میں بلند کیا۔

فرش پر پڑے ہوئے لائیڈ کی چیخیں اب سرد پڑ چکی تھیں۔ اس میں ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی تھی۔ بلیک ٹرٹل نے میز کا چھوٹا سا ڈنڈا فضا میں بلند کیا اور ڈولمین پر جھپٹی۔ تجربہ کار ڈولمین اس کا منتظر تھا۔ جب بلیک ٹرٹل بالکل اس کے سر پر پہنچ گئی تو اچانک وہ اپنے داہنے گھٹنے کے بل بیٹھ گیا اور پھرتی کے ساتھ اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا اور اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا خنجر آ چکا تھا اور یہ خنجر بلیک ٹرٹل کے پیٹ میں دھنسا چلا گیا...... وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ حیرت زدہ نگاہوں سے اس نے اپنے پیٹ کو دیکھا، لڑکھڑائی۔ میز کا پایہ چھوٹ کر اس کے پیروں میں گر پڑا۔ خون سے اس کا لباس تر ہو چکا تھا۔ اس کے حلق سے ایک آواز ابھری۔

''لائیڈ......''

ڈولمین اپنی جگہ سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گیا اور اسی لمحے دیو قامت بلیک ٹرٹل لڑکھڑا کر لائیڈ کی سلگتی ہوئی لاش پر گری۔ اس نے لائیڈ کے بدن کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ اس وقت ڈولمین نے آگے بڑھ کر ڈیگال کوریل کی کلائی پکڑ لی۔ ڈیگال کوریل اس وقت ذرا ضرورت سے زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ ڈولمین اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا لیکن خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اچانک ہی یہاں آگ کیسے بھڑک اٹھی جہاں برنم کا بورڈنگ ہاؤس تھا اور اس کے اداکار یہاں رہتے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ وہسکی کے ڈرم اور بوتلوں کی وجہ سے پوری عمارت بارود کا ڈھیر بن گئی تھی۔ لائیڈ کو آگ سے جل کر مرتے ہوئے دیکھ کر جس بھیانک انداز میں ڈیگال کوریل نے دیکھا تھا، وہ بھولے سے نہ بھولا جا رہا تھا۔ اور اب وہ ڈولمین کے ساتھ تماش بینوں کے ہجوم میں کھڑا این اسٹریٹ کے اس بورڈنگ ہاؤس کو جلتے ہوئے دیکھ رہا تھا جس میں برنم میوزیم کے اداکار رہتے تھے۔ آگ بالکل اچانک لگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کی پوری عمارت اس کا دہکتا ہوا جہنم بن گئی تھی۔ بچنے والوں میں چند ہی

تھے۔ اور وہ نہیں تھے جن کی تلاش میں ڈول مین یہاں آیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''بات معمولی نہیں ہے۔ نہ یہ کیس ہیگ کا ہے نہ لائیڈ بیکر کا۔ کوئی ہمارے راستے بند کرنے میں بڑا سرگرم عمل ہے۔ افسوس، وہ دونوں اداکار بھی گئے۔ اب ہم ان سے بات نہیں کر سکیں گے۔''

''لیکن تم تو انہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔''

''آہ...... تم نہیں سمجھ رہے ڈیگال کوریل! اگر وہ مجھے زندہ مل جاتے تو میں انہیں ہلاک کرنے سے قبل ان سے اوسیانوس کا پتہ معلوم کر لیتا۔ اب یہ ممکن نہیں رہا۔ بہر حال تمہارا چہرہ ضرورت سے زیادہ اترا ہوا نہیں ہے۔''

''میں نے موت کے بھیانک مناظر دیکھے ہیں مسٹر ڈولمین! آپ یقین کریں میں اس کا عادی نہیں ہوں۔''

اسی وقت جلتی ہوئی عمارت ایک دھماکے کے ساتھ گری اور لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ ڈولمین اور ڈیگال کوریل بھی پیچھے ہٹے تھے۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد ڈولمین کو احساس ہوا کہ ڈیگال کوریل اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس نے دیوانہ وار اس کو تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ ڈولمین کو شدید غصہ آیا کیونکہ وہ اس کے لئے بہت پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ ممکن ہے وہ ہوٹل واپس چلا گیا ہو۔ موت کے ہولناک مناظر نے اسے بہت زیادہ افسردہ کر دیا تھا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خود بھی واپس پلٹ جائے۔ اس کا رخ ہوٹل کی جانب تھا۔

☼......☼

ڈیگال کوریل واقعی بڑی شدید ذہنی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ وہاں سے واپس پلٹا۔ ڈولمین کے ساتھ کا مقصد یہ تھا کہ وہ بھیانک لمحات سے دوچار رہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے ذہن میں یہ تصور آیا تھا کہ ذرا سا وقت ڈولمین سے دور رہ کر آزادی کے ساتھ گزارے۔ موت کے ان بھیانک مناظر نے واقعی انہیں بہت پریشان کر دیا تھا۔ وہ ایک بار میں داخل ہوا اور اس نے دو پیگ سستی شراب کے لئے۔ وہ اس ہولناک منظر کے دہشت ناک نقوش مٹا دینا چاہتا تھا جو چند ہی گھنٹوں میں اس نے دیکھے تھے۔ اس لئے

اس نے ڈولمین کو وہاں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ڈولمین کا ساتھ اب مناسب نہیں ہے۔

بہر حال اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں جا کر سونے کا خواہش مند ہو گیا۔ جہنم میں جائے یہ ڈولمین۔ یہ انسان نہیں، وحشی درندہ ہے۔ میں اس درندے کا کس وقت تک ساتھ دے سکتا ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے لڑکھڑاتا ہوا ہوٹل کے کمرے تک پہنچا اور کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ اب واقعی کانپ رہے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس دوران ڈولمین بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اچانک اسے گیس کی تیز بو محسوس ہوئی۔ کمرا گیس سے بھرا ہوا تھا۔ نشے کے باوجود ڈیگال کوریل نے حقیقت محسوس کر لی۔ ڈولمین کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس نے سوچا اور بڑی مشکل سے جیب میں ہاتھ ڈال کر دروازے کی کنجی تلاش کی۔ دروازہ کھولنے میں اسے خاصا وقت لگ گیا۔ اس کا ذہن اسے بار بار خبردار کر رہا تھا کہ ڈولمین خطرے میں ہے......ڈولمین خطرے میں ہے۔

دروازہ کھولتے ہی گیس کا تیز بھبکا باہر نکلا لیکن ڈیگال کوریل لڑکھڑاتا ہوا گیس کی بدبو کی پرواہ کئے بغیر اندر گھس گیا۔ اس نے پوری قوت سے واش بیسن کو قبضے سے اکھاڑا اور دریچے پر کھینچ مارا۔ دوسرے لمحے تازہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ ڈیگال کوریل بری طرح کھانس رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑے دکھن سے پھٹے جا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ واقعی ڈولمین اندر موجود ہے۔ شراب خانے میں اس نے خاصا وقت لگا دیا تھا اور ڈولمین واپس ہوٹل آ چکا تھا۔ اپنے بستر پر تھکے تھکے انداز میں لیٹا ہی تھا کہ اچانک ہی گیس کی بو نے اسے جکڑ لیا۔ اب اس وقت پتہ نہیں اس پر کیا گزری تھی لیکن گیس نے اسے بری طرح بے ہوش کر دیا تھا۔ ڈیگال کوریل پہلی بات تو یہ کہ نشے میں تھا۔ دوسری بات یہ کہ گیس اس پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ ڈولمین کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ لیکن ڈولمین نہیں اٹھ رہا تھا۔

''اٹھو ہاتھی کے بچے......ورنہ یہیں مر جاؤ گے۔'' اس نے پوری قوت سے ڈولمین کو بستر سے گھسیٹنے کی کوشش کی اور دوسرے لمحے دونوں فرش پر آ گرے۔ بہر حال ڈیگال کوریل کوشش کرتا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرح ڈولمین کے پہاڑ جیسے جسم کو گھسیٹ کر باہر لایا۔ لیکن اب اس کی قوت بھی جواب دے گئی تھی۔ باہر نکلتے ہی وہ خود بھی بے دم ہو کر گر

پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ڈولمین کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر منہ سے آواز نہیں نکل رہی ہے۔

......

''مائی ڈیئر سارا، آج تم اپنے دوست کو خواب میں نظر نہیں آؤ گی؟'' اوسیانوس نے سارا کے حسین اور ہیجان خیز جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج وہ تمہارے دلفریب جسم سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گی جسے اب تک وہ اپنی مرحوم آوارہ بیوی کا جسم سمجھ کر استعمال کرتا رہا ہے۔ آج تم کو ایک بار پھر ڈیگال کوریل کی بیوی بن کر اس کے پراگندہ ذہن پر تازہ ضرب لگانی ہے۔ سارا کی پرستش بھری نگاہیں اوسیانوس کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور بولی۔

''سیرین دن بدن ڈیگال کوریل کے اعصاب پر چھاتی جا رہی ہے اور خود ڈیگال کوریل بھی اس کے لئے ایک پسندیدہ مرد ہے حالانکہ وہ اس کا اعتراف نہیں کرتی۔''

''وہ اس سے محبت کرتی ہے؟'' سارا نے پوچھا۔

''ہاں......'' اوسیانوس بولا۔ ''شوہر کی موت کے بعد اسے ایک ہمدرد کی ضرورت تھی۔ اور ڈیگال کوریل نے اس خلا کو پُر کر دیا ہے۔ بے چارہ کوریل ہمیشہ محرومیوں اور مایوسیوں کا شکار رہا ہے اور بیوی کی موت کے بعد تو اس کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے۔ سیرین اب اس کی واحد غمگسار ہے۔ کیا سمجھیں۔''

سارا سوچنے کی کوشش کرتی رہی۔ ادھر اوسیانوس سوچ رہا تھا کہ اس کی اپنی ماضی کی زندگی بھی ڈیگال کوریل سے زیادہ مختلف تو نہیں ہے۔ سارا نے اوسیانوس کا چہرہ دیکھا اور پھر کہنے لگی۔

''میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گی اوسیانوس! آج ڈیگال کوریل کی بیوی پھر زندہ ہو کر اس کے سامنے آئے گی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اسے دیوانہ بنا دوں گی۔''

''ہاں......لیکن تاریکی میں رہ کر۔'' اوسیانوس نے کہا۔

''تاریکی میں کیوں؟''

''اس لئے بیوقوف عورت! کہ تاریکی ہر چیز کو پراسرار بنا دیتی ہے اور شناخت کے امکانات ختم کر دیتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں نے بھی اپنے باپ کو تاریکی میں ہی قتل کیا تھا۔''

یہ بات سارا جانتی تھی۔ وہ متعدد بار اس کہانی کو سن چکی تھی۔ اوسیانوس نے اسے اپنی

روح بنا رکھا تھا اور روح کا کردار ہمیشہ کسی بیوقوف شخص کے سامنے وہی کیا کرتی تھی۔

اوسیانوس نے اپنی اس کہانی کو سناتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

''میرا باپ بھی ایک اداکار تھا۔ وہ اپنے تھیٹر کے ساتھ سفر کرتا ہوا ایک بار **نیو لینڈ** پہنچا۔ وہ جنونی تھا۔ جادوگر تھا۔ شعبدہ باز تھا۔ نیو لینڈ میں اس نے میری ماں کی **عصمت** زبردستی لوٹ لی اور اسے چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ میری ماں اس وقت صرف پندرہ سال کی تھی۔ میری ماں نے یہ بات مجھے اس وقت بتائی جب میں دس سال کا تھا۔ اور یہ بات میرے ذہن پر بری طرح جم گئی۔ میں جانتا تھا کہ میری ماں کے ساتھ شدید ظلم ہوا ہے۔ میرے دل میں اس ظلم کا بدلہ لینے کا خیال اس طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا دل کسی اور کام میں لگتا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے باپ کی تلاش شروع کر دی اور آخر کار میں نے اسے تلاش کر لیا۔ لیکن اسے آخری وقت تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں اس کا اپنا بیٹا تھا۔ تین سال تک میں اس کے ساتھ مختلف ممالک کا سفر کرتا رہا اور اس سے ساحری کے رموز سیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں جادوگری اور شعبدے بازی میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ اور جب وہ اس حقیقت کو محسوس کر کے مشتعل ہوا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اب اس پر ایک دیوانگی سی سوار ہوتی تھی۔ میں اس سے کہیں آگے پہنچ چکا تھا۔ میری ماں...... میری ماں ...... جب وہ......'' اوسیانوس کی آواز بھرا گئی۔ سارا نے محبت کے ساتھ اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

''صدمے سے میری ماں کا ذہنی توازن خراب ہو گیا......'' اوسیانوس نے کہا۔ ''اور اس ظالم نے میری ماں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود کبھی بھول کر بھی اس کی خبر نہ لی۔ یہاں تک کہ میری پاگل ماں ایک دن خود کو آگ لگا کر جل مری۔ دیوانگی کے عالم میں بھی وہ مجھے پہچانتی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس سے بے پناہ محبت کی۔ اس کے علاوہ دنیا میں میرا تھا بھی کون۔ ماں کی موت کا انتقام میں نے لے لیا اور ایک دن تاریکی میں، میں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ اس دن کے بعد سے میری آنکھ خشک ہو گئی۔ اور آج تک آنسو کا ایک قطرہ بھی میری آنکھ سے نہیں نکلا۔''

اوسیانوس کے حلق سے ایک عجیب طرح کی آواز نکلی اور سارا نے اپنے ہونٹ اس کے رخسار پر رکھ دیئے۔

۞......۞
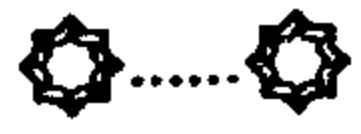
''میرا ارادہ تھا کہ پولیس کو تمہاری آمد کے مقصد سے آگاہ کر دوں مسٹر ڈولمین! لیکن پھر خیال آیا کہ پہلے تم سے بات کر لی جائے۔ بورڈنگ ہاؤس کی آتش زدگی سے مجھے جو نقصان پہنچا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ تمہاری حرکت ہے۔ لیکن جو کچھ تم نے بتایا اس کے بعد میں معذرت چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم میری اس حماقت کا خیال نہ کرو گے۔'' برنم نے کہا۔

''مسٹر برنم! میں تمہیں پھر یقین دلاتا ہوں کہ اس واردات میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔'' ڈولمین نے برنم کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے اطمینان ہے...... ویسے بھی لوگوں نے آتش زدگی سے ذرا دیر قبل دو اجنبی افراد کو عمارت سے نکل کر بھاگتے دیکھا تھا۔ ویسے مسٹر ڈیگال کوریل کہاں ہیں؟''

''وہ نیچے بگھی میں موجود ہیں۔ رات کی تین وارداتوں نے ان کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ اب میں انہیں لے کر جا رہا ہوں تاکہ وہ آرام کریں۔''

واپس ہوتے ہوئے ڈولمین سوچ رہا تھا کہ گیس کے ذریعے اسے ہلاک کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی، کم از کم وہ اوسیانوس کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اوسیانوس لوگوں کو قتل کر کے ان کا خون شیطان کی بھینٹ چڑھانے کا عادی ہے اور یہ دونوں بہرحال زندہ سلامت بچ گئے تھے۔

۞......۞
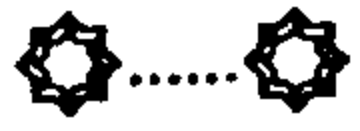
دولت مند لارک ایرس جو مختلف ناموں سے جانا جاتا تھا، اس وقت بھی اپنے آرام دہ تابوت میں چھوٹی سی عمر کی لڑکی ڈیئر بارن کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ ڈیئر بارن کو اپنے بازو میں اٹھا کر عمارت کے اس کمرے میں لے جاتا جہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ملازمین کو بھی نہیں۔ تابوت میں لیٹنا اس کے خیال میں زندگی کو بڑھانا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی ڈیئر بارن تابوت میں لیٹی ہوئی تھی کہ باہر سے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ دستک اتنی زوردار تھی کہ ایرس کو باہر آنا پڑا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے ریڈ مین کو دیکھا جو ملازموں کو دھکے دیتا ہوا شدید ہیجانی کیفیت کے عالم میں وہاں چلا آیا تھا۔ یہاں کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ ڈیئر بارن اس کی آواز سن

کر چونک پڑی۔ اسی وقت ریڈ مین کی آواز ابھری۔

"اوہ مائی ڈیئر مسٹر اریس! وہ کمبخت پھر بچ گئے...... بچ گئے وہ دونوں۔ وہ منحوس ڈیگال کوریل ابھی تک زندہ ہے۔" ریڈ مین نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"آہستہ بولو..... آہستہ بولو۔ کتنی بار تم سے کہا ہے کہ دیوانگی کے شکار مت ہو جایا کرو۔"

"خاک آہستہ بولوں۔ وہ منحوس گیس سے بھی نہیں مر سکے۔ اب بولو، کیا کریں؟"

لارک اریس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن ڈیئر بارن کے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔ وہ حیرانی سے ان کی بات سن رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ریڈ مین ڈیگال کوریل کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو انتہائی نیک، نرم دل اور مہربان فطرت کا آدمی تھا۔ اور ڈیئر بارن اسے پسند کرنے لگی تھی۔ لارک اریس، ریڈ مین کو لے کر دروازے کے باہر پہنچ گیا تو ڈیئر بارن کو تجسس پیدا ہوا۔ وہ تابوت سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک پہنچی اور سننے لگی۔ ریڈ مین آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز سنی جا سکتی تھی۔

"وہ کمبخت گیس سے بھی نہیں مر سکا...... مجھے تمہارا مشورہ نہیں ماننا چاہئے تھا۔"

"تو اس میں اس طرح پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

"اوہ..... تم سمجھتے نہیں ہو میرے دوست! ڈیگال کوریل کو ہر قیمت پر مر جانا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں گے۔ تم بالکل اطمینان رکھو۔"

ڈیئر بارن کے بدن پر تھرتھری طاری ہو گئی۔ وہ تو زندگی کی رسیا تھی۔ بہت ننھی سی عمر میں اسے بہت سی جسمانی حقیقتوں سے روشناس کرا دیا گیا تھا اور اس کا ایک باقاعدہ پس منظر تھا۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں۔ بہر حال اس میں اس کی اپنی پسند اور مرضی بھی شامل تھی۔ سردی سے کانپتی ہوئی وہ اپنے بستر میں جا کر لیٹ گئی۔ اسے طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے اور اس کا ننھا سا کومل وجود تھرتھراہٹ کا شکار تھا۔ پھر نجانے کب تک وہ جاگتی رہی۔ لارک اریس واپس نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اس کی پلکیں جڑ گئیں اور وہ گہری نیند سو گئی۔

☆......☆

شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ فضا میں ابھری۔ سیرین نے جلدی سے وہ کتاب رکھ دی جو اس کے ہاتھ میں تھی اور باہر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہال میں کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر کسی نے غصے سے کہا۔

"یہاں بھی نہیں ہے کمبخت۔"

"اس چڑیل کو تلاش کرو..... کسی اور کمرے میں ہو گی۔" کسی نے غراتے ہوئے کہا۔

سیرین نے حیرت زدہ ہو کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہیگ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہیگ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس نے اپنا تیز دھار خنجر نکال لیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ سیرین دروازہ بند کرتی، ہیگ نے اسے جھپٹ کر پکڑ لیا اور اپنا بازو اس کی گردن میں حمائل کر کے خنجر حلق پر رکھ دیا۔ سیرین خوف سے دم بخود رہ گئی تھی۔ بمشکل تمام اس کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔

"کیا کر رہے ہو ہیگ! تم..... تم..... تم کیا کر رہے ہو؟"

"قتل کر رہا ہوں تمہیں..... سمجھیں..... قتل کر رہا ہوں۔" ہیگ نے وحشیانہ انداز میں کہا۔ اس کے جسم کی بدبو سے سیرین کو متلی سی ہونے لگی تھی۔ ہیگ پھر بولا۔

"تم مجھے میری ایلز تو واپس نہیں دے سکتی ہو ناں..... اسی لئے میں تمہیں بھی اس کے پاس ہی پہنچا رہا ہوں۔"

سیرین نے ہیگ کے ساتھیوں کو گھر میں آزادانہ لوٹ مار کرتے ہوئے دیکھا۔ خوفناک شکل والے وہ بدمعاش ہر قیمتی چیز سمیٹ رہے تھے۔ ہیگ بولا۔

"میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔ اب وہ میرے قبضے میں ہے۔ چنانچہ اب یہاں مزید ٹھہرنا خطرناک ہو گا۔"

اور پھر وہ سیرین کی طرف مڑا اور پھر بولا۔ "تم نے ذرا بھی مزاحمت کی تو میں تمہاری

گردن کاٹ کر شانوں سے دور پھینک دوں گا۔ اس لئے بہتر ہے خاموش رہنا۔"

سیرین نے اس کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ہیگ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا کہ وہ چکرا کر رہ گئی۔ ہیگ نے سیرین کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ دروازے سے باہر پڑی ہوئی لاش دیکھ کر سیرین کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ لیکن ہیگ اس وقت دیوانہ ہو رہا تھا اس لئے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور لاش کو ٹھوکر مارتا ہوا آگے نکل گیا۔

"تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گی جان من! میں جو کچھ تمہارے ساتھ کرنے والا ہوں اس کے دوران تم بار بار موت کی دعا مانگو گی لیکن موت بھی تمہیں اتنی آسانی سے نہیں آئے گی۔ سمجھے۔" وہ سیرین کو لے کر باہر نکل آیا۔ باہر گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے اسے لے جا کر گھوڑا گاڑی میں ڈالا۔ اس کے ساتھی بھی لوٹ کا مال لئے ہوئے آ گئے اور گاڑی فائیو پوائنٹ کی سمت روانہ ہو گئی۔

✿......✿

ڈیگال کوریل نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

"جادو کا وجود انسانی تہذیب کے پتھر کے دور سے چلا آ رہا ہے مسٹر ڈولمین! ساحری، شعبدے بازی، شیطان کی پوجا سب سحر پرستی کے مختلف شعبے ہیں۔ ان خفیہ علوم کا وجود ہزاروں برس پرانے دور میں بھی تھا۔ تم کہتے ہو کہ اوسیانوس کی دونوں چھوٹی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ یہ بھی جادوگروں کی ایک رسم ہے۔ وہ ان انگلیوں کو شیطان کی نذر کر دیتے ہیں۔ جنات اور خبیث روحوں کو تسخیر کرنے والے عامل یہ طریقہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اوسیانوس بھی شیطان کا پجاری جادوگر ہے۔" ڈولمین نے ڈیگال کوریل کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے۔ کوریل نے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ یہ عورت اس کی بیوی کی ماں تھی اور وہ اس ضعیف عورت کے سامنے یہ ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کاٹیج کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں ایک کونے میں کھانے کی میز بھی لگی ہوئی تھی۔ ڈولمین اس وقت اس کا مہمان تھا۔

"مجھے معاف کرنا مائی ڈیئر ڈولمین! مفلسی میں ہم تمہاری کوئی خاطر مدارت نہیں کر سکے۔"

"تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو مائی ڈیئر ڈیگال کوریل! میرا تعلق بھی غریب گھرانے سے ہے۔ اور میں یہی غذا کھانے کا عادی ہوں۔ اور پھر تم میرے محسن ہو۔ بلاشبہ تم نے میری جان بچائی ہے۔"

"یہ کام تو تم نے بھی کیا ہے مسٹر ڈولمین! اس لئے یہ کوئی احسان نہیں ہے۔"

"تو تم مجھے اوسیانوس کی جادوگری کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"ہاں...... اوسیانوس ہی کی نہیں، تم جانتے ہو میں ایک محقق ہوں اور میں مختلف موضوعات پر تحقیقات کرتا رہا ہوں۔ ساحری کی قدیم تاریخ کو سمجھنے کے لئے اس موضوع پر مکمل معلومات ضروری ہیں۔ اور میں جس قدر جانتا ہوں وہ تمہیں ضرور بتاؤں گا تاکہ ہم دونوں کو اوسیانوس کو بھی سمجھنے کا صحیح موقع مل سکے۔ قدیم مصر، بابل اور یونان میں جادو دراصل اس دور کے مذہب کا ایک حصہ تھا۔ اسی طرح رومن اور یورپ کی قدیم تہذیب میں بھی ساحری ایک عام بات تھی۔ سب سے پہلے اسلام نے جادو کو حرام قرار دیا۔ اسلام کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ آخرکار سولہویں یا سترھویں صدی میں یورپ میں جادو کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن چرچ کی مخالفت کے باوجود جادو ٹونے کا استعمال جاری رہا۔ ہندوستان میں جادو ٹونا عام تھا اور ہے۔ روحوں، چڑیلوں اور جنات کے عامل وہاں بھی موجود تھے اور ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب باتیں محض وہم سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن افریقہ کے وچ ڈاکٹر اور حیات بعد الممات کا فلسفہ ذہن کو اس بارے میں شبہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ سب کچھ ایک ناقابل فہم اسرار ہے۔ میں نے اس موضوع پر اتنا پڑھا ہے اور اتنا لکھا ہے کہ ڈرتا ہوں کہ کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔"

"اوہ...... نہیں میرے بچے......" ڈیگال کوریل کی ساس نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا اور ڈیگال کوریل خلا میں گھورنے لگا۔

بہرحال ڈولمین کو یہاں ٹھہرنا تھا۔ وہ اس لئے اس رات یہاں ٹھہر گیا تھا کہ وہ ڈیگال کوریل جیسے بہترین دوست کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ ڈیگال کی حفاظت اس کا فرض بن چکی ہے۔ وہ ڈیگال کو بات کرنے سے نہیں روک سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی باتیں بڑی عالمانہ ہوتی تھیں اور وہ بلاشبہ ایک انتہائی قابل نوجوان تھا۔ اس کا احساس خود ڈیگال کوریل کو بھی تھا اور دوسرے پر برتری جتانے پر وہ بھی

نہیں چوکتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی غرور بھری نگاہیں ڈولمین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"یہ کوئی آٹھ برس پہلے کی بات ہے جب میں سیمون میں تھا۔ ان دنوں ایک شخص ولیم برٹن ایک رسالے کی ادارت کیا کرتا تھا لیکن مجھ سے مشورہ کئے بغیر وہ کبھی کوئی کام نہ کرتا تھا۔ میرا نام بڑی حیثیت کا حامل تھا۔ یہیں میں نے اپنے قارئین کو چیلنج کیا کہ وہ فرنچ، اٹالین، اسپینش، جرمن، لٹن، گریک سے مجھے معمے حل کرنے کے لئے بھیجیں۔ میں حل کر دوں گا۔ اس چیلنج کے جواب میں مجھے سو خطوط مختلف زبانوں میں آئے اور میں نے ننانوے کے صحیح حل بتائے۔ ننانوے مسٹر ڈولمین! اور سو نمبر کا سوال ہی غلط تھا اس لئے میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اب اس سے زیادہ مشکل چیلنج کی بات سنو جسے میں نے قبول کیا اور کامیاب ہوا۔ تقریباً چھ مہینے قبل اس شہر میں قتل کی ایک دلچسپ واردات ہوئی۔ ہوٹل ایسٹ میں کام کرنے والی ایک تمباکو فروش لڑکی قتل کر دی گئی اور اخبارات نے اس واردات کو خوب اچھالا۔ اس بھیانک قتل میں عوام نے بھی بڑی دلچسپی کا اظہار کیا کیونکہ لڑکی انتہائی حسین تھی اور بہت سے لوگ اسے اپنے دام میں لانے کی فکر میں پڑے رہتے تھے۔ میں نے صرف اخبارات میں شائع ہونے والے اطلاعات کی بنیاد پر صرف اور صرف ان کے سامنے رکھ کر ایک کہانی لکھی جس میں کرداروں کے نام بدل دیئے اور میں نے اپنی کہانی میں اس قتل کا معمہ حل کر دیا۔ سمجھے مسٹر ڈولمین! میں نے قتل کا معمہ حل کر دیا اور اس کے بعد اس قتل کا سراغ لگا لیا گیا۔ اور جن لوگوں نے قتل کا اعتراف کیا یہ سب وہی لوگ تھے جن کے نام تبدیل کر کے میں نے اپنی اس کہانی میں پیش کئے تھے اور انہوں نے یہ واردات بالکل میرے تحریر کردہ انداز میں کی تھی۔ میں نے اور بھی اسی طرح کے مضامین اور واقعات لکھے ہیں اور ایسے سراغ رسانوں کی تخلیق کے صلے میں جو مشاہدے کے فن میں اتنے ماہر تھے، مجھے اب تک کوئی صلہ نہیں ملا۔ میں جو اپنی تخلیقات کے عوض معقول صلے سے ہمیشہ محروم رہا ہوں۔ ہاں مسٹر ڈولمین! میں اس ناقدری کے دور سے پوری طرح آشنا ہوں۔ لیکن جب میں کہتا ہوں تو ہمیشہ استقلال کی بنیاد پر کہتا ہوں۔ میرا ذہن مفروضات پر بھی کام نہیں کرتا۔ ہمیشہ استقلال کو بنیاد بناتا ہے۔ میں منطق سے کام لیتا ہوں، صرف تصورات سے نہیں۔ میں پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ حقیقت کی خدمت کرتا ہوں جس کے لئے مجھے قدر ناشناسی اور خوشحالی اور ایک حد تک اپنی ذہنی توانائی کی قیمت بھی ادا

کرنا پڑتی ہے۔"

ڈولمین بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس شخص کی بات سن رہا تھا۔ اس میں شک کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی کہ ڈیگال کوریل اتنا ہی ذہین آدمی تھا۔ ڈولمین بہت چوکنا تھا اور گہری نگاہوں سے ڈیگال کوریل کو دیکھ رہا تھا جو اپنی کرسی پر بیٹھا انگلیوں میں پکڑے ہوئے چمچے کو گھما رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

"کبھی تم نے یہ سوچا ہے مسٹر ڈولمین! کہ اوسیانوس کو تم میں قدیم روحانی روحیں نظر آتی ہیں جو شاید اس کی ساحرانہ قوتوں سے بھی زیادہ طاقتور ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے ڈیئر کوریل! میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ مجھ میں کوئی خاص بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں اوسیانوس کو ہلاک کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔"

"مسٹر ڈولمین! تم جادو کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"جان بھی کیسے سکتا ہوں کوریل! میں جادوگر تو نہیں ہوں؟"

"پھر بھی میں نے تمہیں روح کی بات کرتے ہوئے سنا ہے۔"

"میری بیوی نے بتایا تھا کہ اس نے یہ باتیں اوسیانوس سے سنی تھیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ چڑیل کی پیشانی پر صلیب کا نشان بنا دو یا ناک کے اوپر سے اس کا خون بہا دو تو وہ ہلاک ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی ساری قوت اسی خون میں ہوتی ہے۔"

"نہیں...... تم اور دوسرے لوگ اپنے انداز سے زیادہ جادو ٹونے اور کالے علم کے بارے میں جانتے ہو۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے اندر بھی طاقت اور روحانی قوت ہو سکتی ہے جس کا تمہیں خود احساس کبھی نہیں ہو گا۔ لیکن اوسیانوس اس علم میں مہارت رکھتا ہے اور ایسی قوتوں کو پہچان لیتا ہے۔ وہ یقیناً اس بات کو بھی پہچان جائے گا۔ اور سچ پوچھو مسٹر ڈولمین! تمہارے پراسرار دیوتاؤں کی پرستش، میرا مطلب ہے کہ تم جیسے بے شمار افراد ان دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اور ایسے عجیب و غریب عملیات کرتے تھے جن کا وجود آج بھی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انہی میں سے کوئی انجانی قوت تمہارے اندر بھی آ گئی ہو؟"

"ارے کیوں مذاق کرتے ہو یار!" ڈولمین نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ڈیگال کوریل نے کہا۔

''مسٹر ڈولمین! اچھا ایک بات کا جواب دو۔ کیا تمہارے یہاں بلیوں کے قریب بات کرنا اب بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا؟ کیونکہ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ بلیوں کی شکل میں آوارہ روحیں موجود ہوتی ہیں اور یہ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ چڑیلیں بلیوں کے روپ میں آ کر تمہارا راز بھی معلوم کر سکتی ہیں۔ کیا تم اس بات پر یقین کرتے ہو؟''

ڈولمین نے خاموشی سے گردن ہلائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔''

''یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ خرگوش بھی جن بھوتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کتے بدروحوں کو پہچان لیتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں پر سنجیدگی سے کوئی یقین نہیں کرتا۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ویسے تم نے بتایا تھا مائی ڈیئر ڈولمین! کہ اوسیانوس تم سے ڈرتا ہے۔''

''ہاں...... اس کے ایک آلہ کار نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔''

''تمہیں کبھی یہ خیال آیا کہ اس خوف کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں کہ تمہارے اپنے اندر ایک ایسی روحانی طاقت ہے جو اس کی ساحرانہ قوتوں سے زیادہ ہے۔''

''مگر میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بالکل نہیں جانتا۔''

''بے شک، میں یہ بات جانتا ہوں۔ یہی تو قدرت کا اسرار ہے۔ بعض لوگوں کو قدرت نے ایسی طاقتور روحانی قوتیں فراہم کر دی ہیں جن کے سامنے کالا جادو اور ہر طرح کی ساحری بے کار ہو جاتی ہے۔ تم نے کبھی یہ سوچا کہ اُبلے ہوئے انڈے کا آدھا چھلکا الٹا رکھ دینے کی روایت کیوں پڑی ہے؟ کیا تم اس روایت کے بارے میں جانتے ہو؟''

''ہاں......''

''تو اس کے پس منظر میں کیا ہے؟''

''کہتے ہیں کہ اس سے بدروحیں بھاگ جاتی ہیں۔''

''بالکل...... بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ کیا یہ جادو نہیں ہوا؟ اسی طرح بہت سی روایتی رسمیں ایسی ہیں جن کا تعلق ہماری تہذیب سے ہے۔ مختلف ٹونکے دنیا میں آج بھی رائج ہیں جن سے ماوق الفطرت موجدات کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ہم انہیں محسوس بھی نہیں کرتے۔ اسی طرح جنوں بھوتوں اور چڑیلوں کے لئے بھی ان کے بارے میں ہماری عقل پُراسرار

مشاہدات کی کوئی تشریح نہیں کر پاتی۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں میرے دوست ڈولمین! میں ہر چیز کی تشریح اپنی قوت استقلال سے کر رہا ہوں اور ہمیشہ تجزیے کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ تم روحانی قوت کے مالک ہو۔''

''وہ سچ کہتا ہے...... وہ واقعی سچ کہتا ہے۔''

اچانک ہی رازل جریری کی آواز شہباز کے کانوں میں گونجی اور شہباز جو خود اپنے آپ کو ان طلسمات میں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا، چونک پڑا۔

''کیا مطلب......؟''

''نیگال سیمورس...... نیگال سیمورس ایک ایسا راز ہے جو ابھی تک مکمل طور پر دنیا کے سامنے نہیں آیا۔ جادوگری کا مسکن، بلکہ یوں کہو کہ جادوگری کی زنبیل۔ نیگال سیمورس اگر کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو وہ سب سے بڑا جادوگر بن سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے حصول کے لئے نجانے کب سے کوششیں جاری ہیں اور کب تک جاری رہیں گی۔ میں اپنے آپ کو بھی اس کا مریض پاتا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا شہباز میرے دوست! نیگال سیمورس کے حصول کے بعد میں یہ نہیں کروں گا کہ لوگوں کو اپنے سحر کا شکار بناتا رہوں بلکہ میں ان سائنسی ساحروں کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو دنیا کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور دنیا کو شدید نقصانات میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں مسٹر رازل جریری! میں جانتا ہوں۔'' شہباز نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''سنو، سنو...... ان کی سنو۔ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔''

ڈولمین کہہ رہا تھا۔

''کچھ پتہ نہیں مسٹر ڈیگال کوریل! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر قیمت پر اوسیانوس کو قتل کرنا ہے اور میں اس کے کالے جادو سے بالکل نہیں ڈرتا۔''

''مسٹر ڈولمین! ہم یقین کریں یا نہ کریں لیکن بہرحال اوسیانوس کو کچھ مافوق الفطرت قوت ضرور حاصل ہے۔ چاہے وہ کالا جادو ہو یا کچھ اور۔ وہ کورنیلس کی لاش اس لئے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اپنے عمل کے ذریعے اس کی روح کو بلا سکے۔ اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ ایک باقاعدہ عمل ہے۔ یعنی مُردوں کی روح کو بلانے کا عمل اور کسی کی روح کو

بلانے اور اپنے تابع بنانے کا عامل سامری کی کتابوں کے مطابق صرف نو دن کا ہوتا ہے۔
اوسیانوس نے جنوں کے خبیث گروہ کے بادشاہ کو ناراض کر دیا ہے۔ اسے خوش کرنے کے
لئے وہ مسلسل انسانی زندگیوں کو اس کی بھینٹ چڑھا رہا ہے تاکہ وہ خود اس کے قہر کا شکار نہ
بن جائے اور اگر اس عمل کے دوران جبکہ شیطان اور دوسری بدروحیں اس کے گرد منڈلا
رہی ہوں گی، کوئی اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہو جائے گا۔ اس عمل کی ابتداء
جس منتر سے ہوتی ہے اس کے ترجمہ کے الفاظ میں تمہیں سناتا ہوں۔ 'مردے زندہ ہو کر
میرے پاس آجا' یہ عمل مسلسل نو دن تک کسی قبرستان یا ویرانے میں کیا جا سکتا ہے جہاں
کسی مداخلت کا امکان نہ ہو۔ عامل ایک حصار کے اندر بیٹھ کر منتر پڑھتا ہے اور نو دن تک
حصار میں رہتا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک عمل ہوتا ہے۔ ذرا سی غلطی ہلاکت کا باعث ہو
جاتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے اوسیانوس کسی ویرانے کو منتخب کرے گا۔ وہ کسی مردے کا
بدبودار لباس پہنے گا۔ دن کو سوئے گا لیکن تمام رات جاگے گا۔ آدھی رات کو کھانا کھائے گا
اور یہ کھانا مرے ہوئے کتے کا گوشت اور بغیر خمیر کی سڑی ہوئی روٹی پر مشتمل ہوگا۔ اس
لئے مجھے اوسیانوس کو یہ عمل کرنے سے پہلے تلاش کرنا ہوگا۔ اگر اس کا یہ عمل کامیاب ہو گیا
تو پھر اسے کوئی ایسی مافوق الفطرت قوت حاصل ہو جائے گی کہ اسے کوئی ہلاک نہیں کر سکے
گا۔''

''اوہ......اوہ......تم مجھے خوفزدہ کر رہے ہو۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں، اس
زندگی میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں ہے۔ جن لوگوں سے میری زندگی کا وجود تھا وہ اس
دنیا میں نہیں ہیں۔ میں تمہیں اوسیانوس کے بارے میں بتا دوں کہ وہ صرف ایک صورت
میں زندہ رہ سکتا ہے۔''

''وہ کون سی؟'' ڈیگال کوریل نے پوچھا۔

''وہ صورت یہ ہے کہ وہ پہلے مجھے ہلاک کر دے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن دلائل کی روشنی میں ہم اسے تلاش کر سکتے ہیں۔ وہ بہت
چالاک ہے۔ اس کا قریبی تعلق اداکاروں سے ہے۔ لہٰذا حلیے بدلنے کا بھی ماہر ہے۔ اس
نے مختلف ممالک کا مختلف ناموں سے سفر کیا ہے جس کے لئے پاسپورٹ درکار ہوتا ہے۔
اس لئے وہ اس فن کا ماہر ہے۔ وہ نوجوان ہے لیکن پیراسس کے روپ میں اس طرح

ضعیف بن کر آتا ہے کہ شناخت ممکن نہیں ہوتی۔ اسے دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے
ہپناٹزم اور شعبدے بازی کا فن حاصل ہے۔ وہ منصوبہ بندی میں ماہر ہے اور اس کے بہت
سے خطرناک ساتھی ہیں۔ لیکن وہ تمہیں اپنا بدترین دشمن تصور کرتا ہے مسٹر ڈولین! کل رات
اس نے تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

''میں خود اس الجھن میں مبتلا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ حرکت کون کر سکتا تھا؟''

''اوسیانوس تاریک دنیا کا باسی ہے مسٹر ڈولین! نیگال سیمورس کے وجود کے متعلق اس
کی معلومات، اسے حاصل کرنے کی مسلسل تگ و دو اور ساحری میں اس کی دلچسپی، تمہاری
بیوی، بیٹیوں اور سسر کا قتل، ہیگ کے بیوی بچوں اور ساتھیوں کی ہلاکت، مجھے شعبدہ بازی
سے دیوانہ بنا دینے کی سازش اور ریڈ مین کے گھر پر کی جانے والی شعبدہ بازی۔'' وہ
اچانک رک کر سوچنے لگا، پھر بولا۔

''ریڈ مین! ڈولین میرا خیال ہے میری ساس کے سامنے ہم اچھے موضوعات پر گفتگو
کریں۔''

''اب تم جو گفتگو کرنا چاہتے تھے وہ تو کر ہی چکے ہو۔ تم میرا خیال نہ کرو، اطمینان سے
باتیں کرو۔'' ڈیگال کوریل کی ساس نے کہا۔

''نہیں، ہمیں جو گفتگو کرنا تھی وہ میں کر چکا ہوں۔ مجھے کچھ اور بھی کرنا ہے۔ کیا تم مجھے
اس کا موقع دو گے مائی ڈیئر مسٹر ڈولین! آرام کی نیند سو جاؤ۔ اور بڑی بی تم بھی۔ مجھے
یقین ہے کہ تم لوگ برا مانے بغیر مجھے تنہا چھوڑ دو گے۔''

''ٹھیک ہے......میں مسٹر ڈولین کو ساتھ لئے جا رہی ہوں۔''

''اوکے......شب بخیر۔'' ڈیگال کوریل نے کہا اور بوڑھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔
بحالت مجبوری ڈولین کو بھی کھڑا ہونا پڑا تھا۔ بوڑھی کی رہنمائی میں وہ اوپر کی منزل پر پہنچ گیا
اور بوڑھی عورت اسے کمرے کے دروازے سے اندر لے گئی۔ اس نے کہا۔

''میں معذرت چاہتی ہوں، یہاں روشنی کا انتظام نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو یہاں
تکلیف ہوگی مسٹر ڈولین!''

''نہیں میڈم! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں تو ہمیشہ اندھیرے میں سونے کا عادی
ہوں۔''

"آہ...... یہ تو اچھی بات ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" بوڑھی عورت نے اسے شب بخیر کہا اور جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ فضا میں ایک تیز چیخ ابھری۔

"نہیں......نہیں......سنو...... میری بات سنو...... رک جاؤ...... رک جاؤ...... رک جاؤ...... براہِ کرم رک جاؤ۔" اور یہ آواز فوراً پہچان لی گئی تھی۔ ڈیگال کوریل کے علاوہ یہ کسی اور کی آواز نہیں تھی۔ ڈولمین نے جلدی سے اپنے دونوں پستول سنبھالے اور بوڑھی عورت کو پھلانگتا ہوا نیچے کی سمت بھاگا۔ اوپر سے بوڑھی عورت کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کیا ہوا......ڈیگال کوریل! میرے بچے، کیا ہوا؟"

ڈولمین جتنی برق رفتاری سے ڈیگال کوریل تک جا سکتا تھا وہ اس نے استعمال کی اور پھر اس نے ڈیگال کوریل کو کاٹیج سے باہر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ڈولمین لمحوں کے اندر اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ باہر رات کی تاریکی بکھری ہوئی تھی۔ لیکن اس تاریکی میں اسے ڈیگال کوریل کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ ڈیگال کوریل رات کی تاریکی میں گھور رہا تھا۔ اچانک اس کے حلق سے آواز نکلی۔

"ادھر......ادھر دیکھو درختوں کے قریب...... آہ...... اس نے مجھے آواز دی ہے۔ وہ میری بیوی ہے......میری مرحوم بیوی۔ ہائے، یقیناً یہ فریب ہے لیکن......لیکن میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" اور اس وقت ڈولمین نے سفید لبادے میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو درختوں کی آڑ سے نکل کر برف پوش زمین پر تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ سڑک کی سمت بھاگ رہی تھی اور اس عورت کو اور کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو لیکن اوسیانوس نے سارا کو اس کام کے لئے تیار کیا تھا اور سو فیصدی وہ سارا ہی تھی۔ اچانک ہی ڈولمین نے اس کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اسے یقین تھا کہ سارا جلد ہی درختوں کی آڑ میں پہنچ جائے گی۔ وہ پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔ عورت درختوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ڈولمین جانتا تھا کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکے گا۔ اچانک وہ رکا اور اس نے اپنا پستول سیدھا کر لیا، پھر نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ عورت درختوں کی آڑ میں غائب ہو چکی تھی لیکن ڈیگال کوریل اور ڈولمین دونوں اس کے تعاقب میں بھاگنے لگے۔ درختوں کے پاس پہنچ کر اچانک ڈیگال کوریل زمین پر جھک گیا۔

"اوہ، مسٹر ڈولمین! ذرا یہ دیکھو، برف پر خون کے دھبے۔ یہ مصنوعی خون ہے۔ اس

سے پہلے بھی مجھے اسی طرح دھوکا دیا گیا تھا۔"

"ذرا ادھر آؤ مسٹر کوریل!" ڈولمین نے کہا تو کوریل دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ درختوں کے پاس ہی ایک سفید لبادہ پڑا ہوا تھا جو شاید جھاڑیوں میں اٹک کر اتر گیا تھا۔ اس کی پشت پر ایک خون آلود سوراخ تھا۔ ڈولمین کی گولی نشانے پر لگی تھی۔ اس نے کہا۔

"اس مرتبہ یہ خون مصنوعی نہیں ہے۔ میں نے اس عورت کو زخمی کر دیا ہے۔ آؤ......ہم اسے تلاش کریں۔"

چاندنی رات میں زمین پر جمے ہوئے خون کے دھبوں کو دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگے۔

✿......✿

لارک ایرس اچانک ہی خوفزدہ ہو گیا۔ جو آواز اس نے سنی تھی وہ اوسیانوس کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ غرائی ہوئی آواز میں کہا گیا تھا۔

"خبردار ایرس! گھوم کر مت دیکھنا۔ اسی طرح کھڑے رہو۔"

ایرس کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ اوسیانوس کی آواز پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی اور اس آواز کو سن کر وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ اپنے گھر کی اوپری منزل پر اپنے مخصوص کمرے میں تھا۔ بے شک دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن نہ تو قدموں کی چاپ نہ سانسوں کی آواز۔ اسے خود پتہ نہیں چلا تھا۔ اوسیانوس کی آواز پھر ابھری۔

"غور سے سنو...... سب سے پہلا کام تمہیں یہ کرنا ہے کہ مڑنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ممکن ہے تمہارے منحوس چہرے کو دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکوں اور میں تمہیں یہیں قتل کر دوں۔ سمجھے تم۔" ایرس ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ اوسیانوس کی آواز پھر ابھری۔

"گزری رات تم نے اور ریڈ مین نے میرے حکم کے خلاف ڈیگال کوریل کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی...... جواب دو۔"

"لل......لیکن مسٹر اوسیانوس! ریڈ مین نے تو یہی کہا تھا کہ یہ آپ کے حکم پر کیا جا رہا ہے۔"

"ریڈ مین......اس کتے کی یہ مجال کہ اس نے مجھ سے دغا بازی کی کوشش کی۔ سنو......

میں تمہیں بتاؤں، اب ریڈ مین کو قتل کر دینا ضروری ہے...... بہت ضروری۔"

لارک ایرس کو یوں لگا جیسے کسی بلی نے میاؤں کی ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید یہ اس کا وہم ہے۔ اس کی آواز اُبھری۔

"یہ مسٹر اوسیانوس...... تم...... میں......"

"اور تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی ہے کہ تم بھی ریڈ مین کے شریک کار رہے ہو...... اور وہ کتنا جوگن بھی۔ بولو، کیوں نہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں۔ کیا تم مرنا چاہتے ہو؟"

بلی کی میاؤں کی آواز پھر سنائی دی۔ اور لارک ایرس کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے مڑ کر دیکھنا چاہیئے لیکن اوسیانوس نے مڑنے کے لئے منع کر دیا تھا چنانچہ اس کے خوف سے اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ تب اس نے کہا۔

"اوسیانوس! میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"جانتا ہوں...... جانتا ہوں۔ یہی نا کہ تم نے ریڈ مین اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈیگال کوریل کو ہلاک کرنے کا ایک اور منصوبہ بنایا ہے۔"

"ہاں...... ایسی ہی بات ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن کیا تم مرنے کے لئے تیار ہو؟"

"نہیں...... پلیز...... مم...... میں......"

"تو پھر تم اپنی زندگی کا سودا کرو۔ سمجھے...... بولو، کیا کہتے ہو؟"

"میں تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔ تم جیسا بھی چاہو میں تمہیں منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"تم دولت سے اپنی زندگی کو نہیں خرید سکتے۔ اپنی زندگی کے لئے تمہیں دو زندگیوں کی بھینٹ لانی ہوگی۔ دو افراد کی بطور تاوان قربانی دینا ہوگی۔"

"میں ہر شرط کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔" ایرس کی آواز لرز رہی تھی۔

"تو پھر تم پر لازم ہے کہ ریڈ مین کو قتل کر دو۔ سمجھے۔ اور تم اس کے لئے ریڈ مین کے دوسرے ساتھی کی مدد لے سکتے ہو۔ لیکن میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اگر ڈیگال کوریل کو ذرہ برابر کوئی نقصان پہنچا تو تم تینوں کی موت عبرت ناک ہوگی۔ اسے چھونے کی کوشش بھی

مت کرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں مسٹر اوسیانوس!"

"اور اب ریڈ مین کو ٹھکانے لگانا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"یہ کام مجھے کب کرنا ہوگا؟"

"جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ لیکن اگر تم ناکام رہے تو......"

"اطمینان رکھو...... ہم ناکام نہیں ہوں گے۔"

اچانک ہی بلی کی میاؤں پھر سنائی دی اور پھر دوسرے لمحے ایرس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ لارک ایرس کے سر پر پڑنے والی ضرب زیادہ سخت نہیں تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ وہ ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔ پھر اس کی آنکھ بلیوں کی خوفناک چیخوں سے کھلی تھی۔ کمرے میں اتنی شدید بدبو پھیلی ہوئی تھی کہ برداشت کرنا دشوار ہو جائے۔ اوسیانوس جاتے ہوئے ایک تھیلا آتش دان میں ڈال گیا تھا جس میں بلیاں بند تھیں اور جلتی ہوئی زندہ بلیوں کی چیخ و پکار اتنی ہولناک تھی کہ لارک ایرس کی آنکھ کھل گئی۔ خوف سے اس کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکلنے لگیں۔ اور جب گھبرائے ہوئے نوکروں نے دروازہ کھولا تو وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے نوکروں سے پوچھا کہ کیا انہوں نے کسی اجنبی کو دیکھا ہے؟ لیکن ان سب کا جواب نفی میں تھا۔ آتش دان میں زندہ جلتی ہوئی بلیاں آخری چیخیں مار رہی تھیں اور ان کے گوشت کے جلنے کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

✡......✡

ڈولمین نے آخری اُبلا ہوا انڈا منہ میں ڈالتے ہوئے چھلکا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ تیز رفتار ٹرین کے ڈبے میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر ڈیگال کوریل ہاتھ میں اب تک وہ لبادہ لئے ہوئے تھا جو زخمی عورت گرا گئی تھی۔ وہ اس میں ڈولمین کی گولی سے ہونے والے سوراخ میں بار بار انگلی ڈال رہا تھا۔ ڈولمین نے کسی قدر پُر مزاح لہجے میں کہا۔

"اگر یہ کھانے کا [illegible] ہیں ہے تو مجھے دے دو۔" اور پھر وہ بولا۔ "ناشتہ نہیں کرو گے؟ یہ سب ایسے ہی [illegible] دا ہے۔"

"نہیں پلیز...... میرے حصے کا ناشتہ بھی تم ہی کر لو۔" ڈیگال کوریل نے کسی قدر مضمحل لہجے میں کہا اور پلیٹ اس کی جانب سرکا دی۔

"تم نے کوئی خاص بات محسوس کی مسٹر ڈولمین؟" ڈیگال کوریل نے پوچھا۔

"خاص بات...... ہاں، یہ ناشتہ بہت لذیذ ہے۔"

"میں ناشتے کی بات نہیں کر رہا۔"

"تو پھر......؟"

"تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اتنے بڑے ڈبے میں ہم دونوں تنہا ہیں۔ جبکہ تینوں اسٹیشنوں میں ٹرین رک چکی ہے۔ لیکن جب بھی کوئی مسافر ہمارے ڈبے کا رخ کرتا ہے۔ کنڈیکٹرا سے بھگا دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ڈبہ رزرو نہیں ہے اور پھر اس کا پچھلا دروازہ بھی مقفل ہے۔ کیا کہتے ہو تم...... یہ اہتمام ہمارے اعزاز میں تو نہیں ہو سکتا۔"

پہلی بار ڈولمین کو احساس ہوا کہ ڈیگال کوریل واقعی جو کچھ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے۔" وہ ایک دم چوکنا ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ خطرہ......"

"سو فیصدی...... ایسی ہی بات ہے۔" ڈیگال کوریل نے یہ الفاظ ادا کئے تھے اور ڈولمین نے فوراً اپنے پستول سنبھال لئے تھے۔ اچانک پچھلا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا اور ڈولمین اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن انہیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

"عجیب بات ہے، یہ دروازہ جو مقفل تھا اتنی زور سے کھل کر بند ہوا لیکن نہ کوئی اندر آیا نہ باہر گیا۔" ڈیگال کوریل بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ڈولمین نے اس بارے میں کچھ کہنا چاہا لیکن کوریل نے اسے روک دیا۔

"پلیز خاموش رہو......" کوریل بولا تو ڈولمین کے چہرے پر حیرانی کے نقوش پھیل گئے۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا اور اس کے بعد سرسراتی ہوئی آواز بولا۔

"لیکن یہاں ہم دونوں کے علاوہ کون ہے؟"

"ہشت......" ڈیگال کوریل نے سرگوشی میں کہا۔

"دیکھنا تو یہی ہے کہ کیا ہم واقعی اکیلے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ......" ابھی انہوں نے اتنے ہی جملے ادا کئے تھے کہ اچانک ہی دو افراد کہیں سے نمودار ہوئے اور ان پر جھپٹ

پڑے۔ یہ اندازہ ناممکن ہو گیا کہ وہ کہاں سے برآمد ہوئے ہیں۔ بس یہی لگا تھا جیسے دونوں فضا سے نمودار ہوئے ہوں۔ انہوں نے بالکل اچانک ہی ان پر چھلانگ لگائی تھی۔ ان کے جسم پر مضحکہ خیز لباس تھے اور سروں پر مصنوعی بالوں کی وِگ۔ انہوں نے میک اپ کیا ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے دو دھاری خنجر تھے۔

دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ پھر کھلا اور ایک اور حملہ آور نمودار ہوا۔ جس نے پھرتی سے ان پر چھلانگ لگا دی تھی۔ ڈولمین بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہوا اور اس نے جھپٹ کر سامنے والے حملہ آور کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سر سے ایک زوردار ٹکر ماری۔ ڈولمین کے گھٹے ہوئے سر کی اس فولادی ٹکر سے حملہ آور کا چہرہ بھرتا ہو کر لہولہان ہو گیا۔ یہ لیور پولکس نامی مشہور داؤ تھا جس کی ٹکر برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈولمین نے فوراً ہی پیچھے ہٹ کر ڈیگال کوریل کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے حملہ آور کے سامنے رات والی عورت کا لبادہ اس طرح تانے کھڑا تھا جیسے کسی سانڈ سے لڑ رہا ہو۔ حملہ آور نے کئی بار اپنے خنجر سے وار کیا لیکن ہر بار اس کا خنجر لبادے میں خراش لگا کر رہ گیا۔ ڈولمین نے اندازہ کر لیا کہ ڈیگال کوریل کی جان خطرے میں ہے۔ اس نے پھرتی کے ساتھ پستول رکھنے والا لکڑی کا بکس سیٹ سے اٹھا کر ڈیگال کوریل کے حملہ آور پر کھینچ مارا۔ بکس حملہ آور کے سر سے ٹکرایا اور وہ گھبرا کر اتنی زور سے پیچھے اچھلا کہ ادھر سے آتے ہوئے تیسرے حملہ آور سے ٹکرا گیا اور فرش پر گر پڑا۔ لیکن تیسرا حملہ آور فرش پر پڑے ہوئے اپنے ساتھی کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ڈولمین پر جھپٹا۔ ڈولمین پیچھے ہٹتا چلا گیا اور داہنے ہاتھ سے پیٹی سے لگا ہوا اپنا چھوٹا سا خنجر نکال لیا۔ تیسرے حملہ آور نے اپنا تیز دھار خنجر گھمایا، ڈولمین اور پیچھے ہٹ گیا۔

اسی وقت ٹرین کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور ڈولمین اور حملہ آور ایک ساتھ فرش پر گر پڑے۔ ڈولمین نے جیسے ہی سر اٹھایا اسے تیسرے حملہ آور کا خنجر اپنی سمت بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس نے پوری قوت سے حملہ آور کے پیٹ پر لات ماری اور حملہ آور درد سے چیخ کر الٹ کر گرا۔ اس کے سر پر چڑھی ہوئی مصنوعی وِگ فرش پر گری اور حملہ آور کا ننگا سر دھوپ میں چمکنے لگا۔ ایک دلچسپ صورتحال سامنے آ گئی تھی۔ اس کا سر انڈے کی طرح سفید تھا اور چہرہ کالا۔ وہ سفید فام تھا اور اس نے اپنے چہرے پر کالا روغن لگا رکھا تھا۔ حملہ آور اور ڈولمین تقریباً ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ حملہ آور غصے میں ڈولمین کی سمت تیزی سے جھپٹا۔ ڈولمین منتظر تھا۔

جیسے ہی اس نے ڈولمین کے قریب پہنچ کر اپنا خنجر بلند کیا، ڈولمین بیٹھ گیا۔ حملہ آور جھونک میں آگے بڑھا تو ڈولمین نے اپنا خنجر اس کے سینے میں اتار دیا اور ساتھ ہی اس کے پیٹ پر زوردار لات رسید کر دی۔ حملہ آور کئی قدم دور جا کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ اسی وقت ڈیگال کوریل کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی تھی جسے سن کر ڈولمین پھرتی سے پلٹا۔ دوسرا حملہ آور ڈیگال کوریل پر وار کرنے کے لئے اپنا خنجر نکال چکا تھا۔ ڈولمین کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے چھلانگ لگا کر حملہ آور کو کمر سے پکڑ لیا اور کسی بورے کی طرح اٹھا کر دور پھینکا۔ حملہ آور ڈبے کی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا لیکن دوسرے لمحے وہ ایک غضبناک دھاڑ مار کر اٹھا اور ڈولمین سے لپٹ پڑا۔ ڈولمین نے اپنا فولادی مُکا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ حملہ آور چکرا گیا اور اسی وقت ڈولمین نے اس طرح اسے فرش سے اٹھا لیا جیسے وہ کوئی اناج کا بورا ہو۔ خوفزدہ ڈیگال کوریل نے حملہ آور کی دردناک چیخ فضا میں سنی اور حملہ آور کی ٹانگیں کھڑکی سے جاتی ہوئی نظر آئیں۔ ڈولمین نے اسے چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیا تھا۔ ڈیگال کوریل نے دہشت سے آنکھیں بند کر لیں۔ تب ڈولمین بولا۔

”الو کے پٹھے...... صرف تین تھے اور ہمیں ختم کرنا چاہتے تھے۔“

ڈیگال کوریل سیٹ پر گر پڑا۔ اس کی نگاہیں ایک طرف اٹھیں تو وہ بولا۔

”یہ ابھی زندہ ہے۔“ زمین پر پڑے ہوئے زخمی حملہ آور کے بدن میں جنبشیں ہو رہی تھیں۔ ڈولمین نے دیکھا حملہ آور کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈولمین نے لپک کر اپنا خنجر اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس کے چہرے پر خوف کے بادل چھا گئے۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے ڈولمین کو دیکھنے لگا۔

”اگر تم نے ہمیں یہ نہ بتایا کہ تمہیں کس نے ہم پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا تو یہ خنجر تمہارے دل میں اتر جائے گا۔“ ڈولمین نے خنجر کی نوک ذرا سی چھوئی تو اچانک اس کی آواز ابھری۔

”ریڈ مین...... ریڈ مین...... ریڈ مین......“ اور اس کے بعد اس کی گردن ڈھلک گئی۔ ڈولمین نے اس کی نبضیں دیکھیں، وہ ختم ہو چکا تھا۔

❁......❁

اوسیانوس کی نگاہیں اس ننھی سی قامت کے بونے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کی کلائی پر

بندھے ہوئے چرمی تسمے سے ایک تیز دھار جراحی کا نشتر باندھ رہا تھا۔ اوسیانوس کے ہاتھ خوشی سے لرز رہے تھے۔ نیگال سیموس اب اس کی دسترس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بونے نے اس کے دوسرے ہاتھ کی کلائی پر بھی ایک نشتر باندھ دیا تھا۔ اوسیانوس کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ہیگ نے سیرین کو اغواء کر لیا ہے اور اولڈ بریوری کی عمارت میں قید کر رکھا ہے۔ چنانچہ اب وہ ہیگ کو قتل کرنے جا رہا تھا۔

”آپ کو یقین ہے کہ مسز کورنیلس کی لاش بھی اولڈ بریوری کی عمارت میں موجود ہے؟“ بونے نے پوچھا۔

”ہاں...... ہیگ کے خیال کے مطابق وہ محفوظ ترین جگہ ہے۔ ورنہ وہ مسز کورنیلس کو وہاں قید نہ کرتا۔ اوسیانوس نے کہا، پھر بولا۔ ”بیوی بچوں کی موت نے اسے دیوانہ کر دیا ہے ورنہ وہ مسز کورنیلس کو وہاں نہ لے جاتا۔ ایک مرتبہ...... صرف ایک مرتبہ ہیگ میرے ہاتھ لگ جائے تو پھر اس سے لاش کا پتہ پوچھنا مشکل نہیں ہوگا۔“

”بے چاری مسز کورنیلس......“ بونے نے کہا۔ ”پولیس اسے بھی برآمد کرنے میں ناکام ہو گئی۔“

اوسیانوس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بونا اسے جوتے پہنانے لگا۔

”پولیس کو معلوم ہے کہ سیرین کہاں ہے اسی لئے وہ اسے برآمد کرنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی۔ فائیو پوائنٹ کے علاقے میں جانے کے تصور سے ہی پولیس والے کانپتے ہیں۔“

جوتے پہننے کے بعد اوسیانوس اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر کھڑا ہو کر اپنا لبادہ پہننے لگا۔ ساتھ ہی وہ باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”مسز کورنیلس کا سامان لوٹنے والے کوڑیوں کے دام اسے بیچ رہے ہیں۔ اور پھر شراب کے نشے میں ہیگ اور سیرین کا ذکر بڑے گندے انداز میں کر رہے ہیں۔ اس طرح میرے خنجروں کو ہیگ کی پناہ گاہ کا پتہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی اور اسی طرح میرا کام بھی بنا ہے۔“ اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر پوچھا۔

”سارہ اب تک نہیں آئی۔ اسے اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا۔ سنو، میں اس کے لئے فکر مند ہوں...... وہ آ جائے تو کہہ دینا کہ یہیں میرا انتظار کرے۔ ایرس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ بونے نے سر ہلا دیا تو اوسیانوس بولا۔

"ٹھیک ہے......اب میں چلتا ہوں۔" یہ الفاظ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

✿......✿

ڈیگال کوریل اور ڈولمین دونوں غصے میں تھے۔ ڈیگال کوریل کا جسم غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ وہ براڈوے کے پُرہجوم علاقے میں ایک کونے میں کھڑے ہوئے تھے اور غصے کے باوجود دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔

"بے وقوف آدمی! مجھے معلوم ہے کہ سیرین کتنے خطرے میں ہے۔ میں اسی کے گھر سے آ رہا ہوں اور تم سے مطالبہ کرتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔"

"مطالبہ......؟" ڈولمین غرایا۔

"ہاں مطالبہ۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟"

"اوہ......دماغ تو خراب ہونا ہی ہے۔ ہیگ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کے آدمیوں نے گھر کا سارا سامان لوٹ لیا ہے۔ اور اب سیرین اس درندے کے پاس فائیو پوائنٹ میں قید ہے۔"

"ڈیگال کوریل۔" ڈولمین نے اپنی موٹی انگلی سے کوریل کے سینے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں اتنی دیر سے سردی میں یہاں کھڑا کانپ رہا ہوں۔ یہ سب بلاوجہ نہیں ہے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلوں گا جب تک ریڈمین یہاں واپس نہیں آ جاتا۔"

ڈولمین نے سامنے عمارت کے زینے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا جہاں ریڈمین کا دفتر تھا۔ وہ بہت دیر سے سامنے کھڑا ریڈمین کا انتظار کر رہا تھا لیکن ڈیگال کوریل کی ذہنی حالت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ سیرین کے اغواء کی خبر نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ ڈولمین کو احساس تھا کہ ڈیگال کوریل کی پریشانی بجا ہے لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ریڈمین کو ٹھکانے لگا کر ہی یہاں سے ہلے گا۔ اس شخص نے دو مرتبہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی اور اب وہ اس خطرے کو ہمیشہ کے لئے دور کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن خوش نصیب ریڈمین اس وقت اپنے دفتر میں موجود نہیں تھا۔ وہاں موجود اس کے دونوں کلرکوں نے بتایا تھا کہ وہ کام سے باہر گیا ہوا ہے اور کچھ دیر میں واپس آئے گا۔ اس کے علاوہ اب یہ بات بھی ظاہر ہو چکی تھی کہ ریڈمین کا تعلق اوسیانوس سے ہے اور ڈولمین اس سے اوسیانوس کا پتہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

خاص طور سے ڈولمین کے لئے یہ بات سیرین کے اغواء سے زیادہ اہم تھی۔ اپنے اپنے معاملات ہوتے ہیں۔ ڈیگال کوریل نے بے تابی کے ساتھ ڈولمین کی آستین پکڑ کر کھینچی۔

"میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔ ابھی فوراً۔" ڈولمین نے ایک جھٹکے کے ساتھ آستین چھڑا لی۔

"تم اس عورت کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو۔ جب میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کی مدد کو ساتھ چلوں گا تو پھر یہ بدحواسی کیوں ہے؟"

ڈیگال کوریل کی آنکھوں سے شعلے ابلنے لگے۔ اس نے کہا۔ "میں نے تمہاری جان بچائی تھی اور تم اس کا یہ صلہ دے رہے ہو مجھے؟"

ڈولمین اس وقت سامنے کی سمت دیکھ رہا تھا کیونکہ ایک بگھی آ کر رکی تھی جس میں سے تین عورتیں اتر کر ریڈمین کے دفتر کی طرف چل پڑی تھیں۔ لیکن ڈیگال کوریل کے الفاظ سے ڈولمین کو بھی طیش آ گیا اور وہ بولا۔

"اور میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے احسان فراموش ہو۔" ڈیگال کوریل نے ایک گہری سانس بھری تو ڈولمین کو پھر اس پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا۔

"بس تھوڑا سا انتظار کر لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ......"

"سوچ لو ڈولمین! اگر......اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

ڈیگال کوریل دانت بھینچ کر غرایا اور اچانک ہی ڈولمین کی ہنسی نکل گئی۔

"تم......تم مجھے قتل کر دو گے؟" وہ ہنستا ہوا بولا اور ڈیگال کوریل ان الفاظ پر بغلیں جھانکنے لگا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ڈولمین اس سے پچاس گنا زیادہ طاقتور تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ اس کا دوست تھا اور اب دونوں کے درمیان دوستی کے گہرے رشتے قائم تھے۔ ڈولمین نے پھر نرم لہجے میں کہا۔

"تھوڑی دیر انتظار کر لو......بس تھوڑی دیر۔"

"میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں۔" ڈیگال کوریل کے الفاظ ابھرے لیکن ڈولمین کی نگاہیں اب اس گھوڑا گاڑی کا بھرپور جائزہ لے رہی تھیں جو ابھی سڑک کے پار آ کر رکی تھی۔ یہ دوسری گھوڑا گاڑی تھی اور ڈولمین نے اس میں سے ریڈمین کو اتر کر اپنے دفتر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ڈولمین سنبھل کر آگے بڑھا لیکن ڈیگال کوریل درمیان میں آ

گیا۔

''کہاں جا رہے ہو...... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' ڈیگال کوریل کی غصے میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری تو ڈولمین نے اسے دھکا دے دیا۔

''تم اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ ریڈ مین آ گیا ہے۔ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈولمین سڑک پار کر کے تیزی کے ساتھ اس زینے کی طرف بڑھا جو ریڈ مین کے دفتر کی طرف جاتا تھا لیکن ابھی اس نے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ تین نوجوان تقریباً بھاگتے ہوئے زینے سے نیچے اترے اور ڈولمین کو حیران چھوڑ کر ہجوم میں غائب ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ ڈولمین ایک لمحہ ان کو دیکھتا رہا، پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لیکن ریڈ مین کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ڈولمین کے قدم رک گئے۔ سامنے میز الٹی پڑی ہوئی تھی۔ دونوں کلرکوں کی خون آلود لاشیں دروازے کے اندر پڑی ہوئی تھیں اور ان کے قریب ہی ریڈ مین بھی اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر تیز سلگتے ہوئے آتش دان میں تھا اور کمرے میں بال جلنے کی تیز بو پھیلتی جا رہی تھی۔ ریڈ مین کی لاش پر ایک عورت کا اسکرٹ پڑا ہوا تھا۔ ریڈ مین کے دونوں ہاتھوں کی چھوٹی انگلیاں کٹی پڑی تھیں اور فرش پر ہر سمت خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ڈولمین کے چہرے پر عجیب سے آثار نظر آئے اور اس کے بعد وہ پھرتی سے واپس مڑا اور زینہ اتر کر سڑک پر پہنچ گیا۔ شدید بدبو سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ یہ بدبو جلتے ہوئے بالوں کی تھی۔

سڑک پر آ کر اس نے تازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لیں اور پھر ڈیگال کوریل کی طرف دیکھا لیکن ڈیگال کوریل کا وہاں پتہ نہیں تھا۔

✡......✡

سیرین ہوش و حواس کے عالم میں ہی تھی لیکن اس کا ذہن خوف سے مفلوج ہو رہا تھا۔ دہشت سے اس کے بدن میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن جسم ایک کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ اولڈ بریوری میں ایک گندے اور تاریک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس قدر دہشت زدہ تھی وہ کہ ڈر کے مارے اس نے آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں۔ اچانک اس کے کانوں میں ایک آواز ابھری۔

''نہیں، نہ وہ بے ہوش ہے، نہ وہ سو رہی ہے۔'' یہ آواز ایک غلیظ سے نوجوان کی تھی جس نے یہ الفاظ اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

''تو پھر......؟''

''وہ شرم کے مارے منہ چھپائے پڑی ہے۔'' دوسرے ساتھی نے کہا۔

''کیا واقعی......؟'' یہ تیسری آواز تھی۔ اور اس کے بعد تینوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر انہی میں سے کسی نے کہا۔

''ہیگ شراب سے اپنا غم غلط کر کے ہال میں مدہوش پڑا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس عورت کو ہاتھ نہیں لگا سکتے یار! یہ تو ظلم ہے۔ کیا کہتے ہو؟''

''ہاں...... اور اس غم کو غلط کرنے کے لئے ہمیں بھی شراب ہی کا سہارا چاہئے۔'' دوسرا بولا۔ اور اس کے بعد پیمانوں کی کھنکھناہٹ ابھرنے لگی۔ وہ شراب پی رہے تھے۔

سیرین کوشش کے باوجود اپنے جسم کی کپکپاہٹوں پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ اسے سب کچھ پتہ تھا۔ انہوں نے اس کے جسم سے سارے زیورات اور کپڑے اتار لئے تھے۔ ویسے بھی سیرین نے اپنے گھر کو لٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے ان تمام چیزوں کی پرواہ نہیں تھی۔ بس شرم سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ مر جائے۔ وہ اس گفتگو کو بھی سن رہی تھی جو وہ اس کے بارے میں کر رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب اس کی عزت بھی لوٹ سکتے تھے۔ خدایا، اس سے تو بہتر یہ تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔'' سیرین سوچ رہی تھی۔ وہ فرش پر بغیر کسی بستر کے پڑی ہوئی تھی۔ اس بھیانک صورت شخص ہیگ نے کہا تھا کہ اوسیانوس اور ڈیگال کوریل نے اس کی بیوی کو قتل کر دیا ہے اس لئے وہ سیرین کو ہلاک کر کے انتقام لے گا۔ ایک بار پھر ان کے کان ان تینوں کی آوازوں کی جانب اٹھ گئے۔ اسے پتہ چل گیا کہ وہ تینوں اس کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن اب شراب ان پر اثر کرتی جا رہی ہے اور ان کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ اور خیالات میں خرابی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بار بار اس کے جسم کا تذکرہ کر رہے تھے۔ سیرین کو پوری طرح اندازہ تھا کہ شراب ان سے ان کی عقل چھینتی جا رہی ہے اور ہو سکتا ہے کچھ دیر کے بعد وہ بالکل ہی آؤٹ ہو جائیں۔

اچانک ان میں سے ایک اٹھ کر آگے بڑھا لیکن فوراً ہی دوسرے کی آواز سنائی دی۔

''اے...... اے، ہوش میں آؤ۔ اسے چھونے کی کوشش مت کرنا۔ سنو، میں تمہیں

خبردار کر رہا ہوں۔ اسے ہاتھ لگانے کا انجام برا ہوگا۔'' لیکن دوسرے شخص نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ سیرین کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا اور پھر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسی وقت اس شخص کی کڑک دار آواز دوبارہ سنائی دی جو اسے سیرین کے پاس آنے سے روک رہا تھا۔

''سنو گے نہیں تم......اسے تنہا چھوڑ دو۔''

سیرین کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

''کمال ہے یار! اتنی حسین عورت کو وہ قتل کر دے گا۔ میرا تو خیال ہے اس سے بڑی جنونی حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ہیگ یقیناً پاگل ہو گیا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی، شعلہ لگتی ہے۔''

''وہ اس سے اپنی بیوی اور بچوں کا انتقام لے گا۔ بات بالکل ٹھیک بھی ہے۔ کسی کی پوری دنیا لٹ جائے تو وہ دیوانہ نہ ہو جائے تو کیا کرے؟ وہ صدمے سے بالکل پاگل ہو رہا ہے۔''

جو شخص اٹھ کر سیرین کے پاس آیا تھا وہ واپس دوسرے لوگوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''ایک بات بتاؤ۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں بولو۔''

''ہال میں ہیگ نے بورے کے اندر کیا دفن کیا ہے؟ وہ اسی پر سو رہا ہے۔''

''تم نہیں جانتے۔'' دوسرے نے سرگوشی کی۔ یہ سرگوشی سیرین کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ان کی باقی باتیں تو وہ بغور سن رہی تھی لیکن بہت زیادہ دبی ہوئی آواز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جو سرگوشی کی گئی تھی وہ اسے بالکل نہیں سمجھ پائی اور کوشش یہ کرتی رہی کہ ان کی آگے کی ہونے والی گفتگو اس کی سمجھ میں آئے۔ پھر اس کے کانوں میں جو الفاظ پڑے وہ کچھ یوں تھے۔

''اوہو......تو یہ بات ہے۔ لیکن اگر ہیگ نے اسے قتل کر دیا تو پھر اس کے شوہر کی لاش کا تاوان کس سے وصول کرے گا؟'' دوسرے نے آہستہ سے کوئی جواب دیا اور تینوں زوردار قہقہے لگانے لگے۔

سیرین کے حلق سے سسکیاں سی نکلنے لگی تھیں۔ شراب آہستہ آہستہ ان پر اثر انداز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ شخص خاص طرح سے متاثر تھا جو ابھی چند لمحے قبل سیرین کے بالوں سے کھیلنے کی کوشش کر چکا تھا۔ ایک بار پھر وہ اٹھا اور سیرین کی جانب بڑھنے لگا تو دوسرے نے کہا۔

''اے الّو کے پٹھے......تم باز نہیں آؤ گے؟''

''اوہو، ایک نظر دیکھ لینے سے وہ مر تو نہیں جائے گی۔ میں اس کے بے لباس جسم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اچانک ہی سیرین پر حملہ آور ہو گیا۔ اس نے سیرین کے برہنہ جسم پر پڑے ہوئے کمبل کو اس کے بدن سے گھسیٹ لیا۔ سیرین کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی تھی۔ بقیہ دونوں افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیرین کے بے لباس جسم نے ان کے نشے کو دو آتشہ کر دیا اور تینوں شیطان صورت لئے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

۞......۞

''تم مجھے گریٹ کہہ کر پکار سکتے ہو مسٹر ڈیگال کوریل! اور میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو، کیا سمجھے۔'' ڈیگال کوریل نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر آگے بڑھنا چاہا لیکن پھر وہ جلدی سے درمیان میں آ گیا۔

''اگر تم نے میری بات نہیں سنی مسٹر کوریل! تو میں ابھی سب کو بتا دوں گا کہ تم پولیس کے مخبر ہو اور تم جانتے ہو یہ کون سی جگہ ہے۔ اسے فائیو پوائنٹ کہتے ہیں۔ فائیو پوائنٹ پر تمہارا کیا حشر ہوگا، تمہاری لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔''

ڈیگال کوریل سہم گیا۔ اس نے سامنے کھڑے ہوئے اس شخص کو دیکھا جو انتہائی بدشکل تھا۔ اس کے چہرے پر جو داڑھی نظر آ رہی تھی وہ جھاڑ جھنکاڑ کی شکل میں تھی۔ لیکن ڈیگال کوریل اس وقت کسی دوسرے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے جلد از جلد ہیگ کو تلاش کرنا تھا تاکہ سیرین کی زندگی بچائی جا سکے۔

''مجھے بتاؤ میرے دوست! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' ڈیگال کوریل نے لہجہ نرم کر کے کہا تو وہ بھیانک انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''تم سیرین کو رنیکس کو تلاش کرنے کے لئے آئے ہو ناں؟''

''ہاں، ایسی ہی بات ہے۔''

"میں تمہاری مدد کروں گا۔" ڈیگال کوریل نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اس وقت اولڈ بریوری کے ایک بڑے کمرے میں تھا جسے چوروں کا اڈہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی رہنمائی کی گئی تھی اور وہی بوڑھی عورت جسے انہوں نے کچھ رقم دی تھی، اس کی رہنمائی کرتی ہوئی طویل زمین دوز راستے سے اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سو کے قریب افراد نظر آ رہے تھے اور یہ سو کے سو افراد وہ جرائم پیشہ لوگ تھے جو ہر قسم کے جرائم کرلیا کرتے تھے۔ ان میں بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے سب شامل تھے۔ ان کے گندے وجود سے ایسی بو پھیلی ہوئی تھی کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔ اِکا دُکا موم بتیوں کی مدھم روشنی میں ان کے وجود اور بھی زیادہ بھیانک لگ رہے تھے۔ ویسے یہ صاف اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ انتہائی غربت کا شکار ہیں اور اسی غربت نے انہیں فائیو پوائنٹ میں جگہ لینے پر مجبور کیا ہے جہاں ہر قسم کے جرائم پیشہ لوگوں کی کھپت ہو جاتی ہے۔ لیکن بس اتنی کہ کسی کو دو وقت کی روٹی مل جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ مفلسی اور کسمپرسی کا ایسا منظر ڈیگال کوریل نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہر حال بدہیئت بوڑھے نے نگاہیں اٹھا کر ڈیگال کوریل کو دیکھا، پھر بولا۔

"شاید تم اس بات پر یقین نہیں کر رہے ہو کہ میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔ گریٹ کہتے ہیں مجھے۔ گریٹ۔ اور میں واقعی گریٹ ہوں۔ میری ظاہری حالت پر مت جاؤ۔ میں تمہیں ہیگ کے پاس پہنچا سکتا ہوں مسٹر کوریل! اور تم تسلیم کرو گے کہ یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہے۔"

"اچھا، ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں پوچھو؟"

"کیا تم جانتے ہو کہ سیرین کہاں ہے؟"

"ہاں...... میرے ساتھ آؤ۔ ہیگ کے تین ساتھی اس کی نگرانی کر رہے ہیں اور ہیگ کسی دوسرے کمرے میں ہے۔" بدنما شخص نے کہا۔

"کیا تم یقین کرو گے کہ میں مسز کورنیلس کو جانتا ہوں۔ شاید تمہیں میرے ان الفاظ پر تعجب ہو۔ لیکن کسی زمانے میں، میں ان کے ہاں ملازم تھا۔ پھر میں معذور ہو گیا۔ اور لوگ یہ نہیں سوچتے کہ برائی کس طرح فروغ پاتی ہے۔ ہمیں ہر حالت میں ایک دوسرے کی مدد

کرنی چاہئے۔"

"آہ، کیا تم ایک مرتبہ پھر مسز کورنیلس سے میری سفارش کرا سکتے ہو؟ میں تمہیں اتنا انعام دلواؤں گا کہ باقی تمام زندگی عیش سے بسر کرو گے۔" ڈیگال کوریل نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"تو پھر آ جاؤ میرے ساتھ۔"

"لیکن ذرا تیز رفتاری سے۔" کوریل بولا اور اس کے بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔

ڈیگال کوریل کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے۔ لیکن راستے میں وہ گندے مندے لوگ حائل تھے جن کی وجہ سے اتنی زیادہ برق رفتاری ممکن نہیں تھی۔ بوڑھی عورت ان کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور اب وہ ایک سرنگ نما تاریک راستے سے گزر رہے تھے۔ یہاں آنے کے بعد بدنما شخص نے اپنی جیب سے ایک موم بتی نکال کر جلائی اور انہیں ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے ہیگ کے خفیہ ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔ آخر کار بدہیئت شخص ان کو تاریکی میں چھوڑ کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

منصوبہ یہ تھا کہ وہ سیرین کے تینوں محافظوں کو باتوں میں لگائے رکھے لیکن جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اچانک ایک خوفناک شخص کے آدمی نے جس کی داڑھی غیر معمولی طور پر لمبی تھی اپنے پستول کی نال اس کی گردن پر رکھ دی اور بوڑھے نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

"ارے ارے...... سنو سنو...... سنو تو سہی۔ سمجھو تو سہی میں کون ہوں۔ میں خوشخبری ہوں، خوشخبری۔" بوڑھے نے اس کے کان میں کچھ دیر تک سرگوشی کی۔ کوریل تاریکی میں کھڑا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور بوڑھے نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کوریل لپک کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ تاریکی میں اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"مسز کورنیلس سامنے ہیں۔ مسٹر کوریل ادھر کونے میں آرام کر رہی ہیں۔"

ڈیگال کوریل نے جیسے ہی گھوم کر دیکھا، ایک زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ دونوں آدمیوں نے پھرتی کے ساتھ اس پر قابو پا لیا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ پیر رسیوں سے باندھ دیئے گئے۔ یہ سب کچھ اتنی برق رفتاری سے ہوا تھا کہ کوریل ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلا سکا۔ اس نے ایک نگاہ بوڑھے پر ڈالی۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں مسٹر ڈیگال کوریل! اس علاقے میں پولیس کے مخبر کے ساتھ بڑا دردناک سلوک ہوتا ہے۔ میں نے ان دوستوں کو بتایا کہ تم مسز کورنیلس کو رہا کرانے آئے ہو۔ بس یہ آپے سے باہر ہوگئے۔ کیا سمجھے؟"

"لیکن میں...... میں تم سے...... میں نے تمہیں......" ڈیگال کوریل نے غصے میں اٹھنے کی کوشش کی لیکن پسلیوں پر اتنی زور سے ٹھوکر پڑی کہ وہ کراہ کر گر پڑا۔ پھر اسے ایک آواز سنائی دی۔

"تم نے جس بے دردی سے میرے کزن کو ہلاک کیا، میری مراد لائیڈ سے ہے، کیا تمہیں وہ منظر یاد ہے مسٹر کوریل؟" اس وقت اس بدصورت شخص کی نفرت آمیز آواز ابھری اور کوریل حیران رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بوڑھے نے اس کے ساتھ غداری کی ہے اور چالاکی سے اسے یہاں تک لے آیا ہے۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ بوڑھا پھر بولا۔

"میں نے جس بے دردی کے ساتھ، جس اذیت اور بے بسی کے عالم میں لائیڈ کو جل کے راکھ ہوتے دیکھا ہے وہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ آہ، افسوس میں اس کو بچانے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن ہیگ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لائیڈ کا انتقام لے گا اور خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔ سمجھے۔ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنے گندے دستانے اتارے۔ ڈیگال کوریل نے دیکھا کہ اس کی چھوٹی انگلی کٹی ہوئی ہے۔ ایک لمحے کے اندر اندر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اسی وقت عقب سے کسی نے اس کے منہ میں ایک رومال ٹھونس دیا۔ ڈیگال کوریل جو کچھ بولنا چاہتا تھا، بول نہ پایا لیکن اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اب جان بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ بوڑھے شخص نے اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھا اور پھر ہیگ کے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

"آخاہ...... میں بالکل ہی بھول گیا۔ تم میں سے کسی ایک کو ہیگ نے طلب کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں، مسٹر ہیگ کا منصوبہ بدل گیا ہے۔"

"میں پھر وہی سوال کروں گا کہ کیا مطلب؟"

"مسٹر ہیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس عورت کو قتل کرنے کی بجائے بردہ فروشوں کے

ہاتھ بیچ دیا جائے۔"

"ارے واہ...... واہ...... ارے تمہاری تو لاٹری نکل آئی۔"

ایک بار پھر وہ لوگ قہقہے لگانے لگے۔

"کیا مطلب؟"

"میرا ساتھی اس عورت سے لطف اندوز ہونے جارہا تھا۔ لو، یہ شراب پیو۔" اس نے شراب کی بوتل بوڑھے کی طرف بڑھادی۔ اس نے ایک گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے ڈیگال کوریل کی سمت دیکھا اور بولا۔

"کیا تم کو بھی شراب کی طلب ہورہی ہے مسٹر کوریل؟" اس نے بوتل آگے بڑھائی لیکن ڈیگال کوریل نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

"ٹھیک...... بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تم نے۔ واقعی، بالکل ٹھیک۔ اب جہنم میں جاکر اطمینان سے رہنا۔" بوڑھا بولا اور قہقہے لگانے لگا۔ تینوں بدمعاش بھی اس کے ساتھ ہی ہنس رہے تھے۔ لیکن ڈیگال کوریل نے اب اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ وہ بھیانک صورت والا شخص مشہور زمانہ اوسیانوس تھا اور وہ ان تینوں بدمعاشوں کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔ سو فیصدی دھوکا دے رہا تھا۔ لیکن اس وقت ڈیگال کوریل کوئی ایسا فیصلہ نہ کرسکا جو اوسیانوس کے خلاف ہوتا۔ اچانک ہی اوسیانوس نے کہا۔

"ہم ذرا ہیگ سے مل کر آتے ہیں۔ دیکھیں وہ کیا چاہتا ہے۔ آؤ تم میرے ساتھ۔" یہ وہ شخص تھا جو بوڑھے کے ساتھ گیا جس نے سیرین سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی تھی۔ باقی دونوں افراد اندر رہ گئے تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"اور یہ عورت، یہ بڑھیا جو اسے یہاں تک لائی ہے۔" ان میں سے ایک نے بوڑھی کی طرف اشارہ کیا جو سیرین کے پاس بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھی۔

"اسے یہیں دفن کئے دیتے ہیں۔" دوسرے نے جواب دیا اور شراب کی خالی بوتل اٹھا کر آگے بڑھا۔ عمر رسیدہ بوڑھی کی کھوپڑی بوتل کی ضرب سے پاش پاش ہوگئی۔ اس کے حلق سے چیخ نہیں نکل پائی تھی۔ ڈیگال کوریل بے بسی کے عالم میں پڑا اسے دم توڑتے دیکھتا رہا۔

☆......☆

کرب اور اذیت کی ایک شدید لہر ہیگ کی گردن میں دوڑ گئی۔ اس نے آہستہ سے
تڑپ کر اٹھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے گلے پر گیا جس سے
خون کا فوارہ بہہ رہا تھا۔ کسی نے اس کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ غصے اور خوف کے عالم میں
اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا تاکہ خنجر نکال کر اپنے قاتل پر وار کر لے۔ لیکن خنجر وہاں
نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے خون میں ڈوب گیا۔ تبھی اسے ایک سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔

''مائی ڈیئر ہیگ!'' یہ آواز ایک تاریک گوشے سے ابھری تھی۔ ہیگ بدستور اپنا خنجر
تلاش کر رہا تھا۔ نجانے کس طرح اس کے حلق سے یہ آواز نکل سکی۔

''کک......کون......کون......کون ہے......؟''

''تمہارا دوست۔''

''کون میرا دوست؟''

''اوسیانوس۔'' اوسیانوس کی آواز سنائی دی اور ہیگ کا خون جیسے اس کی رگوں میں منجمد
ہوگیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ تب اسے اچانک احساس ہوا کہ
اس کے جسم پر ایک وزن پڑا ہوا ہے۔ اس نے برق رفتاری سے اس شخص کو دیکھا لیکن یہ
شخص بھی شاید زندہ نہیں تھا۔ ایک مُردہ جسم اس کے اوپر پڑا ہوا تھا اور سو فیصدی یہ تینوں
بدمعاشوں میں سے ایک تھا جنہیں اوسیانوس اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر
ہیگ کو اندازہ ہوگیا کہ وہ اس کا ساتھی ہے اور مر چکا ہے اور اس کی لاش ہیگ کے اوپر پڑی
ہوئی تھی۔ لیکن اور بھی بہت کچھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ جلتی ہوئی آدھی موم بتی اس کے منہ
میں ٹھونسی ہوئی ہے۔ خوف سے ہیگ نے چیخ مارنا چاہی لیکن آواز اس کے کٹے ہوئے گلے
میں خرخراہٹ پیدا کر کے رہ گئی۔ اس نے زور لگا کر اپنے ساتھی کی لاش کو ایک سمت دھکیل
دیا اور موم بتی بھی بجھ گئی۔ یہ آخری روشنی تھی جو اس کمرے میں ہو رہی تھی اور اب کمرہ بالکل
تاریک تھا۔

''ہاں میری جان......مسٹر ہیگ! یہ بتاؤ کہ کورنیلس کی لاش کہاں ہے؟'' اوسیانوس کا
سفاک لہجہ ابھرا اور پھر خود اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ اسی کمرے میں ہے لیکن
کہاں ہے؟ یہ تم مجھے بتاؤ گے۔''

ہیگ خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مر رہا ہے لیکن اس نے ایک لمحے کے اندر فیصلہ

کیا کہ وہ اس شیطان کو بھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ اچانک اس کے سینے پر ٹھوکر لگی
اور وہ گر پڑا۔ دوسرے لمحے اوسیانوس کا تیز دھار نشتر ہیگ کے سینے میں اتر گیا۔ وہ ہیگ کا
دل نکال رہا تھا۔ یہ اس کی ضرورت تھی۔

✿......✿
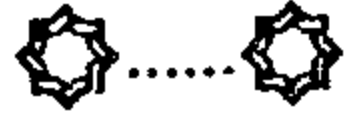
ڈولمین نے دروازے سے کان لگا کر آہٹ لی اور پھر برابر میں کھڑے بونے کو اشارہ
کیا جس نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ بونے کا سر غیر معمولی طور پر بڑا اور آنکھیں
جذبات سے عاری تھیں۔ اس نے لالٹین کا تیل الٹ دیا اور اس میں آگ لگا کر تیزی سے
پیچھے ہٹ گیا۔ ڈولمین دونوں ہاتھوں میں پستول لئے منتظر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ غلط
نہیں نکلا۔ شعلے بھڑکتے ہی ہر سمت دھواں پھیل گیا۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد کمرے کا
دروازہ کھلا۔ ڈولمین نے فوراً ہی اچھل کر دروازے پر اتنی زور سے لات ماری کہ دروازہ
کھولنے والا الٹ کر اندر جا گرا۔ ڈولمین چھلانگ لگا کر اندر داخل ہوگیا لیکن اسے یہ دیکھ کر
حیرت ہوئی کہ اندر صرف دو ہی آدمی تھے۔ ان میں سے ایک فرش پر پڑا کراہ رہا تھا اور
دوسرا ایک کونے میں دبکی ہوئی سیرین پر دست درازی کر رہا تھا۔

ڈولمین اندر داخل ہوا تو اس شخص نے تیزی کے ساتھ کمر سے لگے ہوئے پستول کی
سمت ہاتھ بڑھایا لیکن ڈولمین نے فائر کر دیا اور گولی اس شخص کے جبڑے توڑتی ہوئی باہر
نکل گئی۔ وہ کربناک آواز میں چیخا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پکڑ کر کراہنے لگا۔ اس
کی زبان بیکار ہوچکی تھی۔ البتہ جس شخص کو ڈولمین نے ٹھوکر ماری تھی وہ گھٹنوں کے بل اٹھنے
کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن اس نے ایک ہاتھ اسی طرح اوپر اٹھا رکھا تھا جیسے پناہ مانگ رہا
ہو۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور وحشت جھلک رہی تھی۔ ڈولمین نے اسے گریبان سے پکڑ
کر اٹھایا۔ وہ تھرتھر کانپ رہا تھا۔

''چلو آگے بڑھو......'' ڈولمین نے اشارہ کیا۔ اور پھر اس نے ڈیگال کوریل کو دیکھا جو
ایک گوشے میں بندھا ہوا پڑا تھا۔

''آ......آ......اس کا مطلب ہے سب کچھ ٹھیک ہے۔ چلو کتے! اسے فوراً آزاد کر دو۔
چلو۔'' ڈولمین نے ایک ٹھوکر اس شخص کی پنڈلی پر ماری۔ وہ زور سے کراہا اور تیزی سے
آگے بڑھا۔ ڈولمین نے پستول کی نال بلند کی تو اس نے کہا۔

"کھولتا ہوں...... کھولتا ہوں......" اور پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈیگال کوریل کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ ہاتھ کھلتے ہی کوریل نے سب سے پہلے منہ میں ٹھونسا ہوا رومال نکالا اور پھر جلدی سے بولا۔

"ان لوگوں نے بوڑھی عورت کو قتل کر دیا۔"

"ہوں...... اس کمرے میں تو خاصی تبدیلیاں ہیں۔ واہ، اوہو...... واقعی یہ بیچاری بڑھیا تو ہماری وجہ سے ہلاک ہوگئی۔"

یہ وہی بڑھیا تھی جس نے انہیں لائیڈ کے ارادے سے خبردار کیا تھا۔ ڈیگال کوریل کے دل میں نجانے کیا کیا خیال تھے۔ وہ بے تابی کے ساتھ آگے بڑھا اور پھر اس کی آواز ابھری۔

"سیرین...... سیرین......"

سیرین کونے میں دبکی ہوئی خوف سے کانپ رہی تھی۔ ڈولمین نے جلدی سے اپنا کوٹ اتار کر ڈیگال کوریل کو دیا اور بولا۔

"اس کا بدن ڈھک دو۔"

ڈیگال کوریل نے فوراً ہی سیرین کے بدن کو اس لمبے کوٹ سے ڈھک دیا تھا۔

"ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔" ڈیگال کوریل نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہاں رکنا خطرناک ہے۔ وہ کسی بھی لمحے آسکتے ہیں۔ سیرین! تم اس کوٹ سے اپنے آپ کو پوری طرح ڈھک لو۔ بٹن لگا لو اس کے۔ ہرچند کہ یہ بے تکا ہے لیکن پھر بھی اس وقت تمہاری جسم پوشی کے کام آسکتا ہے۔ آؤ میرا سہارا لو۔"

سیرین نے یہ سہارا لینے سے انکار نہیں کیا تھا چنانچہ ڈیگال کوریل اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھا اور پھر اس نے ڈولمین سے کہا۔

"ڈولمین! اوسیانوس یہاں موجود ہے۔"

"کیا؟"

"ہاں۔"

"کہاں ہے وہ؟" ڈولمین نے بے تابی سے پوچھا۔

"یہ بتائے گا۔" ڈیگال کوریل نے خونخوار انداز میں اس بدمعاش کو دیکھا جس کی

حالت خوف سے تباہ ہو رہی تھی۔ یہ الفاظ سن کر اس کا خوف اور زیادہ بڑھ گیا اور اس نے کہا۔

"مم...... مم...... میں کسی اوسیانوس کو نہیں جانتا۔"

"سور کے بچے! تو یہ تو جانتا ہے کہ ہیگ کہاں ہے؟" ڈیگال کوریل دھاڑا۔

"ہاں...... وہ...... ہاں...... وہ......"

"اوسیانوس بھی اس کے پاس ہوگا۔"

"مم...... مم...... میں......"

ڈولمین غصے میں آگے بڑھا اور اس نے اس شخص کی گردن پکڑ لی۔

"بتاؤ ہیگ کہاں ہے؟ ورنہ تمہاری زبان باہر نکل آئے گی۔" اس نے اپنے شکار کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

......

ہیگ کا دل آتش دان کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کی بدبو اور دھوئیں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ تو نظر آ رہا تھا۔ لیکن اوسیانوس وہاں موجود نہیں تھا۔ ڈولمین مایوسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ اسے اب اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ کچھ ہی لمحے پہلے اوسیانوس یہیں موجود تھا۔ لیکن اب وہ وہاں سے نکل چکا تھا۔

"کمبخت وہ چھلاوہ ہے، چھلاوہ۔ واقعی وہ ایک بدترین لیکن کامیاب جادوگر ہے۔ ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی وہ اپنا کام کر کے باہر نکل گیا۔" ڈولمین کی افسردہ آواز ابھری جس میں غصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"اور لازمی بات یہ ہے کہ وہ کورنیلس کی لاش بھی نکال کر لے گیا۔ آہ، یہ گڑھا اسی کا معلوم ہوتا ہے۔" ڈولمین نے فرش پر کھدے ہوئے گڑھے کی نرم اور تازہ مٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سیرین جو ابھی تک ڈیگال کوریل کے سہارے کھڑی ہوئی تھی چونک پڑی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی تھی۔

"خدا غارت کرے اس شیطان کو۔" ڈولمین نے مٹی میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"اب وہ لاش کو لے کر کسی قبرستان اور ویرانے میں چھپ جائے گا۔ میں اسی بات سے ڈر رہا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ اب اسے تلاش کرنا بہت دشوار ہوگا۔ بہت ہی دشوار۔" ڈیگال کوریل نے کہا۔ ڈولمین نے پستہ قد بونے کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

"یہ سونک لیک ہے۔سونک۔اس کے پستہ قد پر نہ جانا۔یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ مسٹر بر نے مہربانی کرتے ہوئے اسے ہمارے ساتھ کیا ہے تاکہ یہ ہماری مدد کرے۔یہ ہمیں خفیہ زمین دوز راستے سے یہاں لے کر آیا ہے۔لیکن افسوس کہ اوسیانوس کی تقدیر بھی بڑی زوردار ہے۔ایک بار پھر وہ شیطان کا بچہ بچ کر نکل گیا۔لیکن اب ہمیں اسے نو دن مکمل ہونے سے پہلے تلاش کرنا ہے۔"

"نو دن؟"

"ہاں۔اگر ہم نے اسے اس دوران تلاش نہ کرلیا تو پھر وہ بہت خطرناک ہو جائے گا۔" ڈیگال کوریل نے کہا۔ان کے چہروں پر مایوسی کی زردی پھیل گئی تھی۔وہ کچھ لمحے وہاں کھڑے ہوئے ہیگ کے جلتے ہوئے دل کو دیکھتے رہے جو چرمرا رہا تھا۔سکڑ رہا تھا۔ اس میں موجود خون اب کوئلے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔پھر وہ تاریک زمین دوز راستے سے واپسی کے لئے تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔اس منحوس جگہ سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔

......

اوسیانوس کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔اس دیوانگی کے عالم میں اس نے کہا۔

"نیگال سیمورس...... نیگال سیمورس اب میری ملکیت ہوگا۔اور اس کے بعد جانتے ہو مائی ڈیئر مسٹر ایرس! کیا ہوگا؟ ہم ہواؤں پر حکمران ہوں گے۔تمام بری روحیں میرے قبضے میں ہوں گی۔سب کچھ میرے قبضے میں ہوگا۔میں شہروں کو الٹ سکتا ہوں۔سب کچھ کر سکتا ہوں۔بس اب میرے ہاتھ نیگال سیمورس تک پہنچنا ہی چاہتے ہیں۔" اوسیانوس یہ جملے ادا کر کے خاموش ہوگیا۔

لارک ایرس کانپ رہا تھا۔اس وقت وہ ایک تاریک اصطبل میں کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے ایک کونے میں پیال پر سارہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔اس کے سینے میں داہنی جانب زخم تھا جس سے خون رس رہا تھا۔بمشکل تمام ایرس کے منہ سے نکلا۔

"اور سارا کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے مسٹر اوسیانوس؟"

"وہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتی، یہیں رہے گی۔اور تم اس کی دیکھ بھال کرو گے، سمجھے۔" اوسیانوس نے کہا۔

"جی۔"

"میں نے کورنیلس کی لاش حاصل کرلی ہے۔اب میں اس کی روح کو طلب کر کے نیگال سیمورس حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کرلوں گا اور اس کے بعد مجھے بالکل فرصت نہیں ہوگی۔لیکن ایک بات میں تمہیں یاد دلوانا چاہتا ہوں۔"

"جی......" لارک ایرس نے کہا۔

"دو بد روحیں زندہ ہیں۔وہ نیگال سیمورس کے تابع نہیں ہوں گی۔"

"بد روحیں؟"

"ہاں......"

"لیکن وہ......"

"میں بتاتا ہوں۔ ان میں سے ایک کا نام ڈیگال کوریل اور ایک کا ڈولمین ہے، کیا سمجھے۔ تم شاید جانتے ہو کہ ٹرین کے حملے سے بچنے کے بعد وہ ریڈ مین کے دفتر پہنچ گئے تھے اور ریڈ مین کی تلاش میں اس کے دفتر میں تمہارے آدمیوں نے ریڈ مین کا کام تمام کر دیا۔ اس لئے اب وہ تمہاری تلاش میں ہوں گے۔"

"میری تلاش میں؟" ایرس خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور کسے تلاش کریں گے؟"

"تت......تو پھر......مم......میں کیا کروں؟"

"زندہ رہنے کے لئے اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ ڈیگال کوریل تو بے ضرر ہے لیکن اس وقت ڈولمین بہت خطرناک ہے۔ اس میں انجانی روحانی قوتیں موجود ہیں اور جسمانی طور پر بھی وہ کسی دیو سے زیادہ طاقتور ہے اور لڑنے کے فن میں تو وہ ماہر ہے۔ اس لئے میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ ڈولمین سے ہوشیار رہنا۔"

"آہ......اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، ہم کیوں نہ اسے ہلاک کر دیں۔" لارک ایرس نے خوفناک لہجے میں کہا اور جواب میں اوسیانوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کسی قدر طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو کر لو۔ اب مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو، تمہارے فارم کے قریب کوئی نہ آنے پائے۔ یہ میں تمہیں ایک دوستانہ رائے پیش کر رہا ہوں۔"

"میں نے اپنے ملازموں کو سختی سے ہدایت کر دی ہے۔ آپ اطمینان رکھئے مسٹر اوسیانوس! وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"اور اب میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ بہت خطرناک ہوگا۔ نو دن تک کوئی اس باڑے کے قریب بھی نہ آئے۔ میرے عمل کے دوران وہاں ایسی خبیث اور خوفناک روحیں منڈلا رہی ہوں گی کہ قریب آنے والا ہولناک موت کا شکار ہو جائے گا۔ اور میں بھی اسے ان بدروحوں سے نہیں بچا سکوں گا۔" اوسیانوس کا لہجہ موت کی طرح سرد تھا اور اس کے اثرات

لارک ایرس کے چہرے پر صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، تم اطمینان رکھو۔" لیکن ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال ابھرا تھا۔ ایسا عجیب خیال جو اس سے پہلے کبھی اس کے دماغ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ چپکے سے جا کر نیگال سیمورس کی ایک جھلک دیکھے گا۔ حالانکہ اوسیانوس نے جو الفاظ کہے تھے وہ دہشت زدہ کر دینے والے تھے اور ان الفاظ کے سننے کے بعد بھلا کس کی مجال ہو سکتی تھی کہ ایسی کوئی جرأت کر لیتا۔ بہرحال اوسیانوس یہ ہدایت دینے کے بعد اچانک ہی چھلاوے کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دیر کے بعد لارک ایرس نے اس کی گھوڑا گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنی تھی۔

۞......۞

وہ لوگ خاصے پریشان تھے۔ ڈیگال کوریل تو شدتِ حیرت سے کچھ لمحوں کے لئے گنگ رہ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے اوسیانوس کو معلوم ہو گیا ہو کہ تم وہاں پہنچنے والے ہو اور وہ ہم سے پہلے ہی ایک بوڑھے آدمی کا بھیس بدل کر وہاں پہنچ گیا۔ حیرت کی بات یہ دیکھو کہ بیچاری بوڑھی عورت جس نے بلاشبہ ہماری بہترین مدد کی، اپنے منصوبے میں بری طرح ناکام ہو گئی اور اپنی جان دے بیٹھی۔ مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے۔ بعض لوگ بالکل ہی بے مقصد مر جاتے ہیں۔ لیکن اوسیانوس کی چالاکی کی داد ضرور دینی پڑے گی کہ اس نے کس چالاکی سے ہیگ کو قتل کر کے کورنیلس کی لاش حاصل کر لی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔"

سیرین کے حلق سے ایک سسکی سی نکل گئی۔ شوہر کا نام سن کر وہ ایک لمحے کے لئے افسردہ ہوئی تھی۔ سسکی کی اس آواز پر ڈیگال کوریل نے گردن گھما کر سیرین کو دیکھا جو بستر پر دراز ہاتھ میں گرم گرم سوپ کا پیالہ لئے ہوئے تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ وہ بھیس بدلنے کا ماہر ہے۔ کیونکہ اداکاروں کے درمیان رہا ہے۔ اور اب یہ بات ثابت بھی ہو گئی ہے۔ اب تو ہمارے پاس اسے تلاش کرنے کے لئے نو سے بھی کم دن رہ گئے ہیں۔"

"مسٹر ڈولمین! اب تک جن لوگوں نے بھی اس مسئلے میں رخنہ اندازی کرنے کی کوشش

کی ہے انہیں ہلاک کر دیا گیا اور ان سب کا قاتل اوسیانوس ہے۔ اور وہ اس وقت اس قدر شاطر اور حالات پر قادر ہے تو پھر سوچو کہ نو دن کے بعد اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ ذرا غور تو کرو۔ تینوں لاش چرانے والے لائیڈ، ریڈ مین سب کے سب اس کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ صرف ہم لوگ خوش قسمتی سے بچ گئے ہیں۔ لیکن اگر اس نے اپنے ان نو دنوں کا عمل پورا کر لیا تو پھر ہماری بھی خیر نہیں ہوگی۔ کیونکہ پھر وہ نا قابل شکست ہو جائے گا۔''

''کیا تم اوسیانوس سے ڈرتے ہو مسٹر ڈولمین؟''

''بے وقوفی کی بات کر رہے ہو ڈیگال کوریل! وہ جن پراسرار قوتوں کا مالک ہے کیا ان سے تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟''

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس سے خوفزدہ ہو۔''

''ہاں...... مجھے اس کا اعتراف ہے۔'' ڈولمین نے کہا۔

''تم واقعی حقیقت پسند اور کھرے آدمی ہو۔ مجھے خود اس سے ڈر لگتا ہے۔ مگر پھر بھی میں اسے ختم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔ کیونکہ رات کو اس نے مجھ سے زندگی کا واحد سہارا چھین لینے کی کوشش کی تھی۔ سیرین اگر دنیا سے چلی گئی تو یہ سمجھ لو کہ میرے لئے زندگی بالکل بے مقصد ہو جائے گی۔''

ڈیگال کوریل نے محبت بھری نگاہوں سے سیرین کی طرف دیکھا۔ سیرین کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔

''میں تمہاری اور مسٹر ڈولمین کی بے حد شکر گزار ہوں۔''

''ایک بات پر مجھے یقین ہے مسٹر ڈیگال کوریل! ریڈ مین کو اوسیانوس نے قتل نہیں کیا۔ ممکن ہے اس میں اوسیانوس کی مرضی شامل رہی ہو۔ لیکن قاتل وہ خود نہیں تھا۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' ڈیگال کوریل نے کہا۔ ''تم نے ان تین عورتوں کو دیکھا تھا جو ریڈ مین کی آمد سے ذرا دیر قبل اس کے دفتر میں گئی تھیں۔''

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' ڈولمین نے جواب دیا۔ ''لیکن جب میں اس کے دفتر گیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھیں۔''

''لیکن تمہیں اس کی لاش کے قریب کسی عورت کا اسکرٹ پڑا ہوا ملا تھا۔ اور جب تم زینہ چڑھ رہے تھے تو تین نوجوان بھاگتے ہوئے نیچے اترے تھے۔''

''ارے ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی...... واقعی، اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔''

ڈیگال کوریل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''مسئلہ بالکل صاف ہے مائی ڈیئر ڈولمین! وہی عورتیں ریڈ مین کی قاتل تھیں لیکن بہت چالاک۔ قاتل درحقیقت وہ عورتیں تھیں ہی نہیں بلکہ عورتوں کا بھیس بدل کر وہ تین افراد اندر گئے اور پھر قتل کرنے کے بعد زنانہ لباس سوٹ کیس میں بند کر کے واپس چلے گئے۔ البتہ جلدی میں ایک اسکرٹ وہاں چھوٹ گیا۔''

''اوہ مائی گاڈ...... مائی گاڈ...... تم واقعی ٹھیک کہتے ہو ڈیگال کوریل! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہاری ذہنی پہنچ کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک خطرناک قوت بن جاتے ہیں۔ تم عقل اور میں بدن۔''

''بات صرف اتنی سی ہے کہ میں حقائق کا تجزیہ استدلال سے کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جس طرح ہمیں ٹرین میں قتل کرنے کے لئے آنے والے حملہ آور میک اپ میں تھے اسی طرح ریڈ مین کے قاتل بھی بھیس بدل کر آئے تھے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کنگ اور ایرس اس میں شریک تھے۔''

''ہاں۔ ایرس، کنگ کا دوست ہے۔'' ڈولمین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ تینوں ہم پر قاتلانہ حملے کے ذمہ دار ہیں مسٹر ڈیگال کوریل! چلو ٹھیک ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہو۔ لیکن وقت نے میرا اگلا قدم اٹھا دیا ہے۔''

''مطلب......؟''

''آج رات ہم کنگ کی تلاش میں آؤس آف وینس چل رہے ہیں۔'' ڈولمین نے کہا اور ڈیگال کوریل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بہرحال، بعض معاملات میں تم بھی بے مثال حیثیت رکھتے ہو اور خاص طور سے مشغلے تلاش کرنے میں تو کمال ہے۔'' ڈیگال کوریل بولا اور ڈولمین مسکرانے لگا۔ سیرین نے سُوپ کا پیالہ ختم کر لیا تھا۔

☆......☆
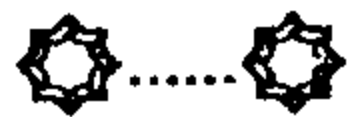
اوسیانوس کو رات بھر عمل کرنا تھا۔ اس لئے اس کے لئے دن میں سونا ضروری تھا۔ وہ

شہر سے دور ایک سنسان باڑے کی عمارت میں کچی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواریں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں جن کی درزوں سے دھوپ چھن چھن کر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایرس سویا ہوا تھا جسے اس طلسمی عمل میں اوسیانوس کی مدد کرنا تھی۔ سونے کے لئے انہوں نے کچی شراب میں نیند کی دوا ملا کر پی رکھی تھی۔ ان کے جسموں پر بوسیدہ اور بدبودار کپڑے تھے جو انہوں نے ایک قبرستان سے مُردوں کے جسم سے اتارے تھے اور یہ بھی بڑا سنسنی خیز منظر تھا۔ ایرس کا تو دل کانپ کانپ گیا تھا لیکن اوسیانوس ایسے کاموں کا ماہر تھا۔ جب اس نے پہلی قبر کھودی اور اس کے تابوت کا ڈھکن اٹھایا تو ایرس کو یوں لگا جیسے سینکڑوں روحیں تابوت سے نکل کر پرواز کرنے لگی ہوں۔ ایک مدھم سی بھنبھناہٹ، ایک عجیب سا شور فضا میں ابھرا تھا۔ قبر کے اندر جو مُردہ تابوت میں لیٹا ہوا تھا اس کا جسم گل سڑ چکا تھا اور گلے ہوئے جسم کی غلاظت لباس سے لتھڑ گئی تھی۔ لیکن اوسیانوس نے ان تمام چیزوں کی پرواہ کئے بغیر اس کے جسم کا لباس اتارا اور خوشی کے عالم میں بولا۔

”یہ مت سمجھنا کہ اس قبر کا انتخاب میں نے بے مقصد کیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس قبر کے تابوت میں جو کوئی موجود ہے، اس کی جسامت مجھ جیسی ہے۔ اور کیا ہی عمدہ لباس پہن کر مرحوم نے انتقال کیا تھا۔ دیکھو تو، یہ میرے جسم پر بالکل فٹ ہے۔“

ایرس کا دل چاہا کہ کچھ بولے لیکن آواز اس کے منہ سے نہیں نکل سکی تھی۔ اوسیانوس نے بڑے اطمینان سے اپنا لباس اتار کر ایک طرف پھینکا اور یہ غلیظ اور گلے ہوئے جسم کی غلاظتوں میں لتھڑا ہوا لباس اپنے جسم پر پہن لیا اور اس طرح خوش اور مطمئن نظر آنے لگا جیسے اسے دنیا کا بہترین سکون حاصل ہوا ہو۔ اور پھر اس نے اپنے لباس کا بنڈل بنا کر اسی تابوت میں پھینکا اور بولا۔

”معاف کرنا دوست! میرے اور تمہارے درمیان ایک رشتہ قائم ہو چکا ہے۔“

اس نے تابوت کا ڈھکن بند کیا اور اس کے بعد مٹی برابر کرنے لگا۔ پھر ایرس کو دوسری قبر کھودنے میں اس کی مدد کرنا پڑی تھی۔ لیکن بہرحال وہ بھی اوسیانوس کا ساتھی ہی تھا۔ ایک اور ویسا ہی لباس، ایک اور ویسا ہی مُردہ، ایک ایسا جسم جسے مرنے کے نجانے کتنے عرصے بعد دیکھا جا رہا تھا۔ یہ لباس ایرس کے جسم پر فٹ آ گیا اور اس کے بعد وہ دونوں طلسمی حصار کے اندر پہنچ گئے جس کا قطر نو فٹ کا تھا۔ یہ حصار اوسیانوس نے ایک مخصوص

طلسمی چاقو سے کھینچا تھا۔ تین فٹ کے فاصلے پر ایک اور حصار میں رکھے ہوئے لکڑی کے تابوت میں کورنیلس کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس کا کٹا ہوا سر تابوت میں رکھا ہوا تھا۔ دونوں حصاروں کو بدروحوں کے داخلے سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اس طلسمی عمل کے تین درجے تھے۔ اول تیاری جس کے لئے حصار کے باہر آگ جلانے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک پیالے میں افیون کا عرق رکھا ہوا تھا۔ کچھ لکڑیاں اور چھ موم بتیاں، نمک، پانی اور ایک تیز دھار لکڑی کی کھونٹی بھی اس میں شامل تھی۔

کھانے کے لئے کتے کا گوشت اور سڑی ہوئی بدبودار روٹی رکھی ہوئی تھی۔ اوسیانوس اور ایرس کو ٹھیک آدھی رات کو کھانا کھانا تھا۔ بہرحال وقت گزرنے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے آدھی رات ہوتے ہی کورنیلس کی روح کو لانے کے عمل کا آغاز ہو گیا۔ اوسیانوس اور ایرس دونوں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے حصار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے مُردے کی ہڈیوں کی راکھ اپنے سروں پر چھڑک رکھی تھی۔ ایرس نے دونوں ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں اٹھا رکھی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ذہن اوسیانوس کی طرف تھا جو منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ ایرس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی جسے سنتے سنتے اسے نیند آنے لگی تھی۔ وہ نیند پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے رکھی ہوئی نوک دار کھونٹی پر نظر پڑی جو اس کے بائیں جانب رکھی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں اسے خوف سے پھریری آ گئی۔

اوسیانوس نے بتایا تھا کہ جب کورنیلس کی روح سے تمام باتیں دریافت کر لی جائیں گی تو یہ کھونٹی اس کی لاش کے مُردہ دل میں گاڑھ دی جائے گی تاکہ کوئی بھی اس کی روح کو تنگ نہ کر سکے۔ کافی دیر تک اوسیانوس کے منتر پڑھنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ اور پھر اچانک اس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

”تاجو، تھا، ککنش، چینو، چلاؤ، دھاڑو، بولو، ہمارا نام ہمیشہ سے زندہ ہے۔ کیونکہ ہمارے، بہت سے وجود ہیں۔ نیکم، سیدہ، اودونی، بنی، لوہم، ذابک، الوہ، جیست، الوہ، جیست، الوہ، جیست......“

اچانک ہوا کے تیز جھونکے چلنا شروع ہو گئے۔ موم بتیاں اور مشعلیں بھڑکنے لگیں۔ ایرس کے ہاتھ خوف سے کانپنے لگے تھے۔ لیکن وہ بالکل ساکت بیٹھا اوسیانوس کو گھور رہا تھا

جو کورنیلس کی روح کو طلب کر رہا تھا۔

✡......✡

لارڈ کے قہوہ خانے کی تیسری منزل پر ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈیگال کوریل اندر داخل ہو گیا۔ ڈولمین اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لیکن اندر کا شرم ناک منظر دیکھ کر ان کے قدم رک گئے اور اسی وقت اندر موجود کنگ کی آواز سنائی دی۔

"بے غیرتو! بے وقوفو! کسی کی خلوت گاہ میں داخل ہونے کے آداب آتے ہیں تمہیں۔ اوہ مسٹر کوریل! تم تو ایک مشہور اور مہذب آدمی سمجھے اور کہلائے جاتے ہو۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں یہ میرا مسئلہ ہے۔ یہاں تمہاری ماں ار بہنیں تو نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم اس طرح گدھے کی طرح منہ اٹھا کر اندر کیسے آ گئے؟ میں تمہیں اٹھوا کر باہر پھینکوا دوں گا۔"

اس وقت کلک کی آواز ہوئی اور ڈیگال کوریل سمجھ گیا کہ ڈولمین نے جو کمرے کے باہر دروازے کو بند کر کے سامنے کھڑا ہوا ہے اپنے پستول کا گھوڑا چڑھا لیا ہے۔ وہ کنگ سے صرف اوسیانوس کا پتہ دریافت کرنے آئے تھے۔

"مسٹر کنگ! اوسیانوس کہاں ہے؟ مجھے فوراً اس کا پتہ بتاؤ ورنہ تمہاری زندگی کے یہ دلکش لمحات اس قدر مختصر ہو جائیں گے کہ تم نے خواب میں بھی ایسی موت کے بارے میں نہ سوچا ہوگا۔"

ڈولمین کی خوفناک آواز اور چہرے کے تاثرات نے کنگ کو خوفزدہ کر دیا۔ اس کی ہکلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اوسیانوس...... مم...... مم...... میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔ اور تم...... تم مجھ سے اس طرح کے سوال کرنے والے کون ہو؟"

"بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔" ڈولمین نے خوفناک آواز میں کہا اور آگے بڑھ کر پستول کی نال بلند کر دی۔

"تعارف زبان سے کراؤں یا پستول کی گولی سے؟"

ڈیگال کوریل نے کنگ کو سہم کر پیچھے ہٹتے دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور گھسٹ گھسٹ کر اپنے بے لباس بدن کو پیچھے کرنے لگا، پھر بولا۔

"مم...... مم...... میں...... دیکھو......" اس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ تب ڈیگال کوریل

نے اس کی مدد کی۔

"نہیں مسٹر ڈولمین! یہ آدمی تو بہت اچھا ہے۔ بتا دے گا۔ سب کچھ بتا دے گا۔ کیوں، کیا میں نے تمہاری سفارش کر کے غلطی کی ہے؟" ڈیگال کوریل نے بھی مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"لیکن...... مم...... مم...... میں کسی...... او...... اوسیانوس کو نہیں جانتا۔" اس نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔

"تم مت بولو ڈیگال کوریل! یہ شخص موت چاہتا ہے۔ صرف موت۔" ڈولمین نے غصے میں غرا کر کہا اور آگے بڑھ کر پستول کی نال کنگ کی کنپٹی پر رکھ دی اور کنگ پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"ایک منٹ...... ایک منٹ مسٹر ڈولمین! ایک منٹ۔ کسی شخص کی زندگی چھین لینے سے کام نہیں بن جاتا۔ تھوڑی سی کوشش اور کئے لیتے ہیں۔ اچھا ہے، بے چارے کو چند سانسیں اور مل جائیں۔ وہ حیران ہے، کنگ حیران ہے۔ کیونکہ وہ تمہاری موت کے لئے بہت سی کوششیں کر چکا ہے۔ کیوں کنگ! کتنا سخت جان ہے یہ شخص جس کا نام ڈولمین ہے۔ یہ نہ گیس سے مرا اور نہ ٹرین میں تمہارے آدمیوں کے قاتلانہ حملے سے۔ اور پھر تم یہ خیال کرو، یہاں شہر کے اور بھی معزز حضرت موجود ہیں۔ وہ دیکھو، کونے میں شہر کے مالدار رئیس اور بہت بڑی جہاز ران کمپنی کے مالک مسٹر ڈربن کس طرح بازوؤں میں اپنی عزت سمیٹے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور کیا یہ مسٹر اوکلو ہیں۔ پتہ تو ہوگا تمہیں کہ شہر میں ان کے کتنے پلازے ہیں اور سوسائٹی میں یہ کتنے بڑے شہری تصور کئے جاتے ہیں۔"

"لعنت ہے ان سب پر...... یہ کتے ہیں جو اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لئے کتیوں کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ میں تھوکتا ہوں ان پر۔ مجھے ان کی شکلوں سے گھن آتی ہے۔"

"ایسا نہ کہو مسٹر ڈولمین! ذرا دیکھو تو سہی، کیسی کیسی حسین لڑکیاں ہیں۔ کیا تمہیں ان کا دل توڑنے میں مزہ آ رہا ہے؟" ڈیگال کوریل نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ اور ان خاتون کو دیکھو جو کنگ کی آغوش میں تھیں۔ یہ، اوہو...... اوہو...... یہ دیکھو...... ارے واہ، یہاں تو ہمارے شناسا چہرے بھی موجود ہیں۔ ذرا پہچانو مسٹر ڈولمین! کیا یہ تینوں وہی نہیں ہیں جنہوں نے ریڈمین کو قتل کیا تھا؟"

کنگ کے تھوڑے فاصلے پر گدے پر بیٹھا ہوا زنانہ شکل کا نوجوان پھرتی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے برق رفتاری کے ساتھ اپنا ہاتھ بلند کیا جس میں تیز دھار چاقو چمک رہا تھا۔ لیکن ڈولمین غافل نہیں تھا۔ وہ اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھر انتہائی خوفناک انداز میں اس نے اپنا پستول جیب میں رکھ لیا۔ اس دوران حملہ آور اس پر حملہ کر چکا تھا۔ اس نے حملہ آور کا بازو وار کرنے سے پہلے پکڑ لیا اور دوسرے لمحے اس نے پوری قوت سے وہ بازو پیچھے گھمایا۔ نوجوان درد سے کراہتے ہوئے گھوما اور ڈولمین نے زور سے جھٹکا دیا۔ تڑاخ کی آواز ہوئی اور بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ نوجوان کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی تھی۔ وہ قالین پر گر کر تڑپنے لگا۔ بقیہ دونوں خوبرو نوجوان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی ہمت نہ پڑی کہ آگے بڑھیں۔ ڈولمین نے بڑے اطمینان سے پستول دوبارہ نکال لیا اور ان کو زد میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... تم سب میرے شکار ہو۔ لیکن میں تمہیں اس وقت شکار کروں گا جب ضرورت سمجھوں گا۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو بتا دو کہ اوسیانوس کہاں ہیں۔ میں تین تک گنتی گنتا ہوں کنگ! اور اس کے بعد بحالت مجبوری میں تمہارا بھیجہ اُڑا دوں گا۔"

"نہیں...... نہیں...... نہیں......" کنگ کی ہمت پست ہو گئی۔ وہ خوف سے رونے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میں قسم کھاتا ہوں مجھے نہیں معلوم۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ضرور بتا دیتا۔ میں...... میں......"

"تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ایسے لوگ میرے لئے بے مقصد ہوتے ہیں جو میرے خلاف کام تو کر لیں لیکن جب ان کی باری آئے تو وہ رونے پیٹنے لگیں۔"

اچانک ہی کنگ نے پھرتی کے ساتھ چھلانگ لگائی اور اس ریشمی پردے کے پیچھے بھاگا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ ڈولمین اور ڈیگال کوریل بھی تیزی سے آگے بڑھے لیکن اسی لمحے شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا اور کنگ کی خوفناک چیخ فضا میں ابھری اور پھر دور ہوتی چلی گئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے دم بخود رہ گئے تھے۔ پھر ڈولمین آگے بڑھا اور پردہ ہٹا کر اس نے دوسری طرف دیکھا۔ پردے کے عقب میں موجود کھڑکی کا شیشہ چور چور ہو گیا تھا اور کھڑکی سے باہر برف آلود سڑک پر پڑی ہوئی کنگ کی لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ ڈیگال کوریل نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں بند کر لیں اور سرد لہجے میں بولا۔

"یہ سب اوسیانوس سے کتنے خوفزدہ ہیں۔ واقعی، وہ شیطان کا دوسرا روپ ہے۔" وہاں موجود بہت سے لوگ خوف سے کانپ رہے تھے۔ ڈولمین نے کانپتے ہوئے رئیس زادے کو دیکھا۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔

"تم...... تم دونوں نے اسے ختم کر دیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"اگر تم میں سے کسی نے ہم پر اس کی موت کا الزام لگایا تو اپنی موت کا الزام کس پر لگاؤ گے؟ میں جہنم میں بھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔" ڈولمین کا لہجہ اتنا خونخوار تھا کہ وہ لرز گئے۔ "میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟" ڈولمین نے کہا۔

"ہاں...... ہاں...... ہاں......" بہت سی آوازیں سنائی دیں اور اس کے بعد ڈولمین نے ڈیگال کوریل سے کہا۔

"آؤ، ہمیں ان کتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم انہیں یہیں، اسی جگہ ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا فائدہ اتنے سارے خون کرنے سے۔ البتہ ایک بات پھر تم لوگوں کو بتائی جاتی ہے، یہاں جو کچھ ہوا تم بھول جاؤ گے۔ اور ویسے بھی اس قہوہ خانے میں تم اپنی موجودگی کا اظہار نہیں کرو گے۔ ورنہ تمہاری پوزیشن کیا رہے گی۔ اور رہی بات ان کتیوں کی تو یہ بھلا ایسی باتوں کو کیوں یاد رکھیں گی۔ آؤ ڈیگال کوریل!" ڈولمین نے کہا اور وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئے۔

⊛......⊛

نگاہوں کی حد تک پھیلی ہوئی برف سورج کی تیز روشنی میں آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ لارک ایریں کے ویران فارم پر موت کا سا سکوت طاری تھا جو کبھی کبھی ان گھوڑوں کے ہنہنانے سے ٹوٹ جاتا جنہیں ایریں اور اوسیانوس نے اپنے استعمال کے لئے اصطبل میں باندھ رکھا تھا۔ لیکن یہ آوازیں ان بھیڑیوں نے بھی سن لی تھیں جو برف باری کی وجہ سے کئی دن سے بھوکے تھے اور اس وقت وہ برفیلی زمین پر چلتے ہوئے اصطبل کی سمت بڑھ رہے تھے۔

گھوڑوں کی خوشبو انہیں صاف محسوس ہو گئی تھی اور وہ انہیں شکار کرنے کے لئے بے تاب تھے۔ ان کی تعداد کافی تھی اور وہ بڑے چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے کان کھڑے ہوئے، سینے جھکے ہوئے اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان کے دہانے وار

کرنے کے لئے کھلے ہوئے تھے جن سے ان کے سفید نوکیلے دانت نظر آرہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ اصطبل کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ بھوک سے بے تاب ہونے کی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے شکار پر حملہ آور ہو جائیں۔ لیکن اچانک ہی ان کے قدم رک گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے جسم منجمد ہو گئے ہوں۔ ان کے کان کھڑے ہو کر سر سے چپک گئے تھے اور اس طرح چند لمحوں تک وہ ساکت و جامد کھڑے رہے اور اس کے بعد وہ الٹے قدموں پیچھے کی طرف چل پڑے۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ان کے دہانے بند ہو گئے تھے۔ گردنیں دائیں بائیں اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے کسی خوفناک حملے کا خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی انجان خطرے کی بو پا چکے ہیں لیکن وہ اس خطرے کو پہچاننے سے قاصر تھے۔

ہوا کے تیز جھکڑوں کی شائیں شائیں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ پھر بھیڑیوں کے غول کے سرغنہ نے منہ اٹھا کر اچانک بھیانک آواز نکالی۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ بقیہ تمام بھیڑیے بھی اپنی مخصوص آواز کے ساتھ بھونکتے ہوئے پلٹے اور اس طرح بھاگے جیسے موت تعاقب کر رہی ہو۔ ان کی رفتار اتنی تیز تھی کہ آن کی آن میں وہ یہاں سے بہت دُور نکل گئے۔ ہر سمت مکمل سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ دور دور تک کسی متنفس کا نام ونشان نہیں تھا لیکن بھیڑیوں نے اس شیطانی قوت کو محسوس کر لیا تھا جو ان کے آس پاس موجود تھی اور وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔

اوسیانوس اس وقت سو رہا تھا۔

⁂......⁂

ڈیگال کوریل، سیرین کے پاس پہنچ گیا۔ سیرین اس وقت بستر پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر شدید کشمکش کے آثار تھے۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی اظہار کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خواب کے عالم میں وہ کسی خوفناک شے سے جنگ کر رہی ہو۔ یہ کیفیت کافی دیر سے قائم تھی اور اس وقت ڈاکٹر اندر داخل ہوا تو ڈیگال کوریل نے اسے سیرین کی جانب متوجہ کیا اور اس کی کیفیت کے بارے میں بتانے لگا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ سو رہی تھیں اور پھر خواب کے عالم میں انہوں نے چیخیں مارنا

شروع کر دیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خواب کے عالم میں کسی سے خوفناک جنگ کر رہی ہو۔"

"ہوں......" ڈاکٹر نے کہا اور آلے سے سیرین کا معائنہ کرنے لگا۔

"یوں لگتا ہے جیسے کسی بھیانک خواب نے انہیں شدید خوفزدہ کر دیا ہو۔ یہ کیفیت کبھی کبھی بہت زیادہ خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ میں انہیں کچھ انجکشن دیتا ہوں اور دوائیں دیتا ہوں جو آپ انہیں احتیاط کے ساتھ استعمال کروائیں۔"

ڈاکٹر اپنا فرض ضورا کرنے لگا۔ سیرین پر مسلسل اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ ڈیگال کوریل نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے پیار سے دبانے لگا۔ ڈاکٹر نے اس کے یکے بعد دیگرے دو انجکشن لگائے اور اس کے بعد ایک پرچے پر کچھ دوائیں لکھ کر ڈیگال کوریل کو دے دیں، پھر بولا۔

"فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ایمرجنسی پیش آئے تو براہِ کرم مجھے دوبارہ اطلاع دیجئے گا۔"

"شکریہ ڈاکٹر!" ڈیگال کوریل نے کہا۔

انجکشنوں میں خواب آور دوا ڈالی تھی لیکن خاصی دیر تک سیرین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ مسلسل اضطرابی کیفیت کا شکار رہی۔ آخر کچھ دیر کے بعد اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ ڈیگال کوریل اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی اس کیفیت پر پریشان تھا۔

⁂......⁂

اندھا ایمرے اپنی روکنگ چیئر پر ہل رہا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں ان کے چہرے پر اس طرح مرکوز تھیں جیسے وہ دیکھ رہا ہو۔ چند لمحے تک انہیں دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"ہوں......تو اب تمہیں ڈیئر بارن کی ضرورت پیش آ گئی اور تم اسے لینے آئے ہو۔" اندھے کے چہرے پر ایک طنز تھا۔

"اس کے علاوہ ہم تمہارے اس قہوہ خانے میں کیا لینے آ سکتے ہیں؟" ڈولمین نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"گڈ......ویری گڈ......کیا معاوضہ دے سکو گے اس کا؟"

"جو تم چاہو ڈیئر بارن! تمہاری بیٹی تو نہیں ہے۔ ایک پیشہ ور لڑکی ہے۔ پھر تم کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

یہ منصوبہ بھی ڈیگال کوریل کے ہی ذہن کی پیداوار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جب لارک ایریس کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کی چہیتی داشتہ دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی ہے تو وہ غصے سے پاگل ہو جائے گا اور یہ توہین برداشت نہیں کر سکے گا اور اس کی تلاش میں بھاگتا ہوا اس کے پاس آئے گا۔ اس طرح ڈیگال کوریل اور ڈولمین اس کی تلاش کی زحمت سے بچ جائیں گے۔

"تعجب ہے...... تعجب ہے۔ میں تو جو کچھ سوچ رہا ہوں، وہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن آپ یہ بتائیے مسٹر ڈیگال کوریل! آپ تو کہتے تھے کہ کم عمر لڑکیوں سے پیشہ کروانے والوں کو برسرِ عام پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے۔" ایمرے نے کہا۔

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔ لیکن ہمیں ڈیئر بارن کی ضرورت عیاشی کے لئے نہیں ہے۔" ڈیگال کوریل نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہو...... کسی خاص ضرورت کے لئے آئے ہیں آپ۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ڈیئر بارن آپ کو نہیں مل سکتی۔ کسی اور نے اسے اپنے لئے مخصوص کرا لیا ہے۔"

"تم اس سودے کو کینسل کر دو۔ کیونکہ ہم تمہیں تمہاری منہ مانگی قیمت ادا کریں گے۔" ڈولمین نے کہا۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔" ایمرے خشک لہجے میں بولا۔ ڈولمین نے برابر والے طویل کمرے میں دیکھا جہاں فرش پر بچھے ہوئے پیال پر گندے اور پھٹے ہوئے گدے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن کمرہ خالی تھا۔ باہر والے دروازے پر تین بچے کھڑے تھے۔ ان کے جسم کے چیتھڑوں اور بڑھے ہوئے خشک بالوں سے یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ وہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ لیکن ڈیئر بارن وہاں موجود نہیں تھی۔

"سنو...... اگر تم اس طرح شرافت سے نہیں مانتے تو ہم اسے زبردستی اٹھا لے جائیں گے اور تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے ہمارا۔" ڈیگال کوریل نے ان الفاظ کے تاثرات بوڑھے کے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھے پر کوئی خاص اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی بے نور آنکھوں سے ان کو دیکھا پھر منہ میں انگلی ڈال کر تین بار سیٹی بجائی۔ خدا نے جن لوگوں سے بینائی کا نور واپس لے لیا ہے ان سے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ خود ان کا تحفظ کرے گا۔" ایمرے نے کہا۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں اور پھر گھوم کر دیکھا تو پندرہ نوعمر لڑکے اور لڑکیاں ان کے گرد آ کر کھڑے ہو

گئے۔ ان سب کے جسموں پر پھٹے پرانے کپڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے، چھری، چاقو اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں تھیں جنہیں انہوں نے حملے کے لئے بلند کر رکھا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ڈیئر بارن ان سب سے آگے تھی۔

"یہ میری آنکھیں اور میرے محافظ ہیں۔" اندھے ایمرے نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "انہیں غور سے دیکھو۔ ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے سوائے میرے۔ اس لئے یہ میرے لئے جان بھی قربان کر دیں گے اور ان کی موجودگی میں کسی کی مجال نہیں جو مجھے دھمکی دے سکے۔ ان کے جسم، دل و دماغ سب پر میرا حکم چلتا ہے۔ بظاہر یہ بچے ہیں لیکن چاقو زنی میں ماہر ہیں۔ تم چاہو تو آزما کر دیکھو۔ اس نے پھنکارتے ہوئے کہا اور پھر آواز دی۔

"ڈیئر بارن!"

"جی مسٹر ایمرے؟"

"کیا تم ان دونوں مہمانوں کو سبق دینے کے لئے تیار ہو؟"

"آپ کے حکم کی دیر ہے مسٹر ایمرے!" ڈیئر بارن نے انہیں غضبناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"جیسے ہی میں تالی بجاؤں گا یہ بچے تمہاری بوٹیاں نوچ کر پھینک دیں گے۔" ایمرے کی نفرت زدہ آواز ابھری اور اس نے ایک ہاتھ بلند کر لیا۔ "مجھے دھمکی دینے کی سزا اب تمہارا مقدر بن چکی ہے۔" ایمرے نے جیسے ہی اپنے ہاتھ بلند کئے، ڈولمین نے کوٹ کی جیب سے دو فائر کئے اور ایمرے ایک دلخراش چیخ کے ساتھ کرسی سمیت الٹ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔ وہ اذیت اور غصے میں چیخ چیخ کر مغلظات بک رہا تھا۔ ڈولمین پھرتی سے بچوں کی طرف مڑا اور بولا۔

"حرامزادو! اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ٹانگیں چیر کر باہر پھینک دوں گا۔" اس نے دھاڑتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور قدم آگے بڑھائے تو بچے سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے اتنا خوفناک اور دیوقامت آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"اور تم آگے بڑھ کر ڈیگال کوریل کے پاس آ جاؤ ڈیئر بارن!"

ڈولمین نے ایک لمحے میں محسوس کر لیا تھا کہ اس نے ماحول پر اپنا اثر قائم کر لیا ہے۔ چنانچہ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد ڈیئر بارن، ڈیگال کوریل کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔

کوریل نے محبت سے اس کی گردن میں اپنے بازو ڈال دیئے۔ بچے جو اس صورت حال سے سہم گئے تھے ایک مرتبہ پھر ہمت کر کے آگے بڑھے تو ڈولمین نے اداکاری کر کے منہ سے ایک بھیانک آواز نکالی اور بولا۔

''بھاگ جاؤ...... ورنہ سب کو مار ڈالوں گا'' وہ آگے بڑھا۔ اس کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ بچے دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور پھر بے تحاشہ بار بھاگ نکلے۔ ڈولمین نے مڑ کر اندھے ایبرے کی طرف دیکھا جو اذیت سے تڑپ رہا تھا۔

''بوڑھے دلال! زندگی عزیز ہے تو ڈیئر بارن کی تلاش میں مت آنا۔ سمجھے۔ بہت بڑا معاوضہ تم خود کھو چکے ہو اپنے آپ کو بہت بڑی شے سمجھ کر۔ چلو'' ڈولمین نے کہا۔ اور ڈیگال کوریل ڈیئر بارن کو لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

✿......✿

لارک ایرس نے اپنے اس خوفناک سیاہ فام ملازم کی سمت دیکھا اور بولا۔

''ڈاکٹر کے تعاقب میں جاؤ اور موقع ملتے ہی اسے قتل کر دو۔ اس کی زندگی مناسب نہیں ہے۔'' یہ ڈاکٹر چند لمحے کے بعد باہر نکلا تھا۔ اس نے سارا کے زخم کی مرہم پٹی کر کے دوا دی تھی۔

''لیکن کیوں نہ اسے یہاں ٹھکانے لگا دو'' کالے ملازم نے پوچھا۔

''تم نے سنا نہیں کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟'' لارک غصے سے دھاڑتا ہوا بولا۔

''سس...... سس...... سر میں بھول گیا'' کالے ملازم نے کہا۔

''اس نے کہا تھا کہ سیرین کورنیلس بھی اس کے زیر علاج ہے۔ ہیگ نے اسے اغواء کر لیا تھا اور اس کے بعد خوف اور صدمے سے سیرین کی حالت خراب ہے۔ اور ڈیگال کوریل ہر لمحہ اس کی تیمارداری کر رہا ہے۔ یہ ڈاکٹر واپسی میں سیدھا سیرین کو دیکھنے جائے گا اور اگر وہاں اس نے باتوں باتوں میں ذکر کر دیا کہ سارا زخمی ہے اور مر رہی ہے تو یہ بھی بتا دے گا کہ میں اس وقت اپنے مضافاتی فارم والے گھر پر مقیم ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ فی الحال ان کو میرا پتہ معلوم ہو سکے۔ وہ میری تلاش میں ضرور گئے ہوں گے۔ کیا سمجھے۔ اس لئے ڈاکٹر کا قتل ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے سر! آپ اطمینان رکھئے۔ ڈاکٹر ان کے پاس نہیں پہنچ سکے گا'' کالے

ملازم نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر بولا۔

''تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ ڈاکٹر کافی دور نکل گیا ہو گا''

''سنو......'' لارک ایرس نے اسے روکا۔

''یس سر!''

''واپسی میں ڈیئر بارن کو ساتھ لیتے آنا۔ اور یہ رقم اس اندھے کو دے دینا'' اس نے کچھ رقم نکال کر ملازم کے حوالے کر دی۔ ملازم نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ رقم جیب میں رکھ لی۔ یہ اندازہ تو اسے بخوبی ہو گیا تھا کہ لارک ایرس بہت خوفزدہ ہے۔ اوسیانوس کی داشتہ مر رہی ہے اور ایرس جانتا ہے کہ یہ الزام اسی کے سر آئے گا۔

✿......✿

سیرین پر نجانے کیا کیا کیفیتیں طاری تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ تاریکی سے بہت خطرناک شکلیں بھیانک روپ دھار کر اس کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ سیرین ان سے جان بچا کر بھاگنا چاہتی تھی لیکن اس کے پیر بے جان ہو کر جیسے زمین سے چپک گئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا شوہر کورنیلس سامنے کھڑا ہوا بے بسی کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کورنیلس کے منہ کے دونوں حصوں سے سرخ لہو بہہ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھتے اور وہ سیرین کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کے قدم آگے نہیں بڑھ پا رہے تھے۔ دفعتہً اس کے حلق سے آواز نکلی۔

''سیرین......''

یہ انتہائی بھیانک آواز تھی۔ سیرین خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ چیخ رہی تھی کہ اچانک تاریکی میں ایک پراسرار ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمک دار خنجر نظر آ رہا تھا۔ وہ ہاتھ اس کی سمت بڑھا۔ سیرین نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اچانک ہی اس کے پیروں میں موٹی موٹی زنجیریں آ پڑیں۔ خنجر والا ہاتھ اس کے چہرے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سیرین نے بچنے کے لئے ایک آخری چیخ ماری اور اچانک اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے بازو پکڑ لئے ہوں۔

''سیرین! میری زندگی...... میری روح...... روؤ نہیں۔ میں ہوں تمہارے پاس۔ ڈیگال کوریل۔ ڈرو نہیں میری زندگی۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا''

سیرین نے اپنی دہشت زدہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اس کے سینے سے لپٹ گئی۔

''اوہ......کوریل! مجھے چھوڑ کر نہیں جانا۔ کوریل! میں مر جاؤں گی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا سیرین! میری زندگی، میری روح! میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' ڈیگال کوریل نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔

✿......✿

اوسیانوس اپنے طلسمی حصار میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کتے کے بدبودار گوشت میں لتھڑے ہوئے تھے اور وہ یہ گوشت کھا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک تصور تھا، ڈیگال سیمورس۔ اب اس کے حصول میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس کے برابر والے حصار میں بیٹھا ایرس بھی یہ غلیظ گوشت کھا رہا تھا اور اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔

اچانک ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ باڑے کی دیواریں ہلنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے خوفناک طوفان آ گیا ہو۔ جلتی مشعلیں زمین پر گر گئیں۔ اوسیانوس نے دیکھا کہ ایرس خوفزدہ ہو گیا ہے۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''سنو......غور سے سنو۔'' وہ اوسیانوس کی طرف دیکھ کر بولا اور اوسیانوس سننے لگا۔ ہوا میں دُور سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔

''اوسیا......اوسیا......نوس......نوس......'' دہشت زدہ ایرس اٹھنے لگا تو اوسیانوس غرا کر بولا۔

''کتے! خبردار، خاموش بیٹھا رہ......خاموش۔''

اسی وقت اوسیانوس کے چہرے پر بھی خوف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ بڑا ہی بھیانک منظر تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے قبضے میں آ جانے والا شیطان اسے خوفزدہ کرنے کی آخری کوششیں کر رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اوسیانوس کے قبضے میں جائے۔ اب وہ اسے خوفزدہ کرنے کی آخری کوشش کرے گا اور اس کے بعد وہ اسے خوفزدہ نہیں کر سکے گا۔ اوسیانوس نے گوشت ایک طرف پھینک دیا اور طلسمی منتروں کی جاپ شروع کر دی۔

''لافیل، میرائن، تارمائیل، لائل، ریکس۔''

ہوا چنگھاڑ رہی تھیں۔ لکڑی کے بنے ہوئے باڑے کی دیواریں ہل رہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی اکھڑ کر گر پڑیں گی۔ اوسیانوس نے اور زور زور سے منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔ اور پھر اچانک ہوا برف کی طرح سرد ہو گئی۔ جھکڑوں کی چنگھاڑ سے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اور پھر اچانک موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ ہوائیں ایک دم رک گئیں۔ ایرس پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور شہباز کو اپنے بدن میں بھی کپکپاہٹوں کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں رازل جریری سے سرگوشی کی۔

''آہ......کیا بھیانک منظر ہے۔ آپ کو کوئی احساس نہیں ہو رہا رازل جریری؟''

''خاموش شہباز! یہ وقت بولنے کا نہیں ہے۔ اگر تم یہاں بے حد خوف محسوس کر رہے ہو تو آؤ ذرا منظر تبدیل کرتے ہیں۔ ابھی آٹھ دن باقی ہیں۔ ہمارا کام آٹھ دن کے بعد شروع ہوگا۔''

شہباز ایک لمحے کے لئے سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رازل جریری کا منصوبہ کیا ہے۔ لیکن اتنا اندازہ اسے ضرور ہو گیا تھا کہ رازل جریری شاید اب اس جدوجہد کی آخری منزل میں داخل ہو چکا ہے جو اصل میں یہ لوگ کر رہے تھے۔ اور رازل جریری صرف ان کی کامیابی سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھا۔

✿......✿
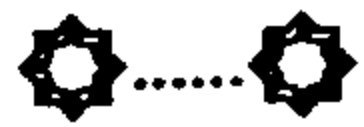
ڈیگال کوریل نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ ڈولمین بہت آہستہ سے متعلقہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ڈیگال کوریل مسکراتی نگاہوں سے ڈولمین کو دیکھنے لگا۔ وہ آج بے حد خوش تھا کیونکہ سیرین نے اس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس نے اقرار کیا تھا کہ وہ تمام زندگی اس کے ساتھ بسر کرے گی۔ اب وہ صرف اس کی تھی۔ صرف اس کی۔

''ہیلو مسٹر ڈولمین! اندر آ جاؤ۔ غالباً تم سیرین کورنیلس سے احتیاط برت رہے تھے۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''میں تم سے اجازت لینے آیا تھا ڈیئر ڈیگال کوریل!''

''اجازت؟''

''ہاں......''

"میں سمجھا نہیں...... کیسی اجازت؟"

"ایک انتہائی اہم شخصیت نے میری دعوت کی ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"بورتھم۔" ڈولمین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مسٹر بورتھم نے میری دعوت کی ہے اور میرا خیال ہے کہ فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں صبح تک واپس آجاؤں گا۔"

"تو پھر تم ضرور جاؤ۔ بورتھم کی دعوت سے انکار کرنا زیادتی ہوگی۔ اور ہاں، ڈیئر بارن ملازمہ کے کمرے میں سو رہی ہے۔"

"میں رات وہیں گزاروں گا۔ لیکن صبح سویرے ہی واپس آجاؤں گا۔" ڈولمین نے کہا، پھر بولا۔ "تم فکر نہ کرو مسٹر ڈیگال کوریل! ایک مرتبہ وہ بدمعاش لارک ایرس میرے ہاتھ آجائے، پھر میں اس سے سب کچھ اگلوالوں گا۔"

"اوکے...... اوکے......" "تم جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" ڈیگال کوریل نے مسرور لہجے میں کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ اس کی محبت اسے مل گئی تھی۔

٭......٭

ایرس کے کپکپاتے جسم سے سردی کا احساس ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اوسیانوس اسے ہپناٹائز کر رہا تھا اور اس کی ہدایت کے مطابق ایرس مسلسل اوسیانوس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اوسیانوس کی آنکھوں میں آگ لگی ہوئی ہو۔ وہ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ ایرس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ ایرس کے جسم کی حرارت واپس آتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا اور ایک عجیب فرحت انگیز سکون اس کے دل و دماغ پر طاری ہوتا جا رہا تھا جیسے وہ بالکل ہلکا ہو گیا ہو۔ ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو کر ہواؤں میں پرواز کر رہا ہو۔ اوسیانوس نے اسے ہپناٹائز کر کے سلا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک ایرس طلسمی حصار کے اندر ہے، محفوظ رہے گا۔ اور آج اوسیانوس اور شیطانوں کے بادشاہ کے درمیان خوفناک معرکہ تھا۔ اتنا خوفناک معرکہ جو اوسیانوس کی زندگی کا سب سے اہم مقصد ہو سکتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ ایرس خوفزدہ ہو کر کہیں حصار سے باہر نہ نکل بھاگے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر اوسیانوس کو بھی مشکل پیش آسکتی ہے۔ ایرس تو ہلاک ہو ہی جائے گا لیکن اوسیانوس کا عمل بھی خراب ہو جائے گا۔ اس لئے

اوسیانوس نے اسے سلا دیا تھا۔ جب ایرس سو گیا تو اوسیانوس کے حلق سے آواز نکلی۔

"شیطانوں کے بادشاہ! آج میں تجھے شکست دے کر رہوں گا۔ آج تیری شکست کا دن ہے۔ اس کے بعد تیری جگہ اوسیانوس ہوگا جو اس کائنات پر شیطانی حکمرانی کرے گا۔"

٭......٭

ڈولمین اس وقت موجود نہیں تھا اور ایک طرح سے یہ کہا جائے تو یہ غلط نہیں ہوگا کہ ڈیگال کوریل تقریباً بے سہارا تھا اور اسے وہ مضبوط قوت حاصل نہیں تھی جس کے ذریعے وہ اب تک ہر چیز پر فتح پاتا چلا آیا تھا یعنی ڈولمین۔ اس وقت وہ ایک لمحے کے لئے پریشان ہو گیا۔ جب ملازم نے آکر اسے اطلاع دی کہ لارک ایرس آیا ہے اور اندر آنا چاہتا ہے تو ڈیگال کوریل بری طرح اچھل پڑا۔ اس نے سیرین کی طرف دیکھا جو ابھی سوئی تھی۔ وہ اسے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پھرتی سے باہر بھاگا تا کہ راستے ہی میں ایرس کو روک لے۔ ایرس سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ ڈیگال کوریل کو دیکھ کر بولا۔

"میں ڈیئر بارن کو لینے آیا ہوں اور اسے ہر قیمت پر لے کر جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ سیرین کے گھر میں ہے۔ اور تم لوگوں نے اسے بوڑھے سے زبردستی حاصل کیا ہے۔" ڈیگال کوریل نے دیکھا، کالا سیاہ فام دیو ایک اور بدمعاش کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

"چلو ہٹو، راستہ دو۔"

"نہیں مسٹر لارک ایرس! شریف آدمی بننے کی کوشش کریں۔ آپ اس مکان میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

"مجھے اس مکان میں داخل ہونا ہے۔"

ڈیگال کوریل نے حسرت بھری نگاہوں سے ان دونوں بدمعاشوں کے عقب میں دیکھا۔ اصولی طور پر ڈولمین کو اب تک آجانا چاہئے تھا۔ وہ صبح آنے کے لئے کہہ گیا تھا اور اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں ڈولمین کہاں غائب ہو گیا ہے۔

"تو تم راستہ نہیں دو گے؟"

"ہرگز نہیں۔" ڈیگال کوریل کمزور لہجے میں بولا اور لارک ایرس نے پیچھے پلٹ کر دونوں بدمعاشوں کو دیکھا۔ اسی وقت ڈیگال کوریل نے کہا۔

"تم مجھے اس طرح نقصان نہیں پہنچا سکو گے جس طرح تم نے [illegible] مین کو پہنچایا۔"

"یہ بکواس بھی کر سکتے ہو۔ کرتے رہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری یہ بک بک تمہاری زندگی کی آخری بکواس ہو۔ میں ڈیئر بارن کو لے کر جاؤں گا۔ وہ میری ہے اور تم اسے نہیں روک سکتے۔

"اور تم مجھے اوسیانوس کے بارے میں بتاؤ گے کہ وہ کہاں ہے اور اس نے کورنیلس کی لاش کو کہاں چھپایا ہوا ہے، سمجھے۔ تم یہ بتائے بغیر ڈیئر بارن کو حاصل نہیں کر سکتے۔"

لارک ایرس کے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے بغور ڈیگال کوریل کو دیکھا اور پھر بولا۔

"واہ...... تو اصل مسئلہ یہ تھا۔ تم اس لئے ڈیئر بارن کو اغوا کر کے لائے تھے۔ اب سمجھ میں آیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز کچھ اس طرح چڑانے والا تھا کہ ڈیگال کوریل کے بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر لارک ایرس کے بالکل پاس پہنچ گیا۔

"میں نے جو تم سے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"تمہارے سوال کا جواب اب یہ کالا دیو دے گا۔" اس نے اپنے سیاہ فام باڈی گارڈ کو اشارہ کیا۔ ڈیگال کوریل اب لارک ایرس کے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اچانک آگے بڑھا اور پھر دوسرے لمحے اس کا بھرپور تھپڑ لارک ایرس کے گال پر پڑا۔ یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ سب حیران رہ گئے اور اس حیرانی میں خود ڈیگال کوریل بھی شریک تھا۔ غصے نے اس کے اندر یہ جرأت پیدا کر دی تھی اور وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ لارک ایرس کا گال اس کے زوردار تھپڑ سے سرخ ہو گیا تھا۔ غضبناک لہجے میں غرایا۔

"تجھے کچھ اندازہ ہے کہ تیری اس حرکت کا انجام کیا ہوگا۔"

"ہاں۔ میں نے تمہیں ڈوئل کو چیلنج کیا ہے۔" ڈیگال کوریل نے ایک مرتبہ پھر سب کو حیرت زدہ کر دیا۔

"ویری گڈ...... بڑی بات ہے۔ بڑی بات ہے۔ مجھے تمہارا یہ چیلنج منظور ہے۔ نہیں، کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔" اس نے اپنے دونوں باڈی گارڈز کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پھر بولا۔

"مجھے تمہارا چیلنج منظور ہے۔ لیکن ہتھیاروں کا انتخاب میری پسند کا ہوگا اور جگہ اور وقت

کا تعین بھی میں ہی کروں گا۔" اس نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں اعلان کرتا ہوں کہ مقابلہ ابھی ہوگا اور میرا ہتھیار......" وہ مسکرایا اور پھر اس کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ "یہ میرا ہتھیار ہے۔" اس نے کالے ملازم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ڈیگال کوریل حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ...... یہ...... یہ ہتھیار ہے؟"

"ہاں...... تم نے بالکل صحیح سنا ہے مسٹر ڈیگال کوریل!" لارک ایرس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ڈیگال کوریل کی نگاہ برابر کھڑے ہوئے دیو قامت سیاہ فام پر پڑی جو اسے کسی خونی درندے کی طرح گھور رہا تھا۔

"ہاں...... میں مسٹر لارک ایرس کا ہتھیار ہوں۔ اب تم یہ بتاؤ کہ جنت میں جانا پسند کرو گے یا جہنم میں؟ میرے خیال میں تمہارے لئے مناسب جگہ جہنم ہے۔" دیو قامت ایک قدم آگے بڑھا تو ایک اور آواز عقب سے سنائی دی۔

"ٹھہرو...... تم نے داروغہ جہنم سے تو اجازت ہی نہیں لی۔ مجھ سے ملو۔ میری اجازت کے بغیر کیا تم کسی کو اپنی مرضی سے جہنم میں داخل کر سکتے ہو؟"

ڈیگال کوریل اچھل پڑا۔ یہ آواز ڈولمین کی تھی۔ اور ڈولمین کے ساتھ گھوڑا گاڑی والا بگ بھی موجود تھا جو ڈولمین کا بہترین ساتھی بن چکا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک اور دراز قد شخص بھی تھا۔ غالباً ڈولمین نے ساری باتیں سن لی تھیں چنانچہ وہ بولا۔

"یہاں کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں پستول نکال لئے۔ لارک ایرس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ پھر وہ بمشکل تمام بولا۔

"مسٹر ڈیگال کوریل اگر اتنے ہی بے شرم اور بزدل ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن شرفاء ڈوئل کے چیلنج سے نہیں بھاگتے۔"

"بات شرفاء کی کر رہے ہو تم لارک ایرس! شرفاء کم عمر معصوم لڑکیوں کو داشتہ بھی تو نہیں بناتے۔" ڈولمین کی نگاہ سیاہ فام غلام کی جانب اٹھ گئی جو الہ دین کے جن کی طرح اسے گھور رہا تھا۔

"مسٹر ڈولمین! میں نے ڈوئل چیلنج کی ہے۔ اور میں اپنی عزت کی خاطر اپنی جان بھی

دے سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے مسٹر ڈیگال کوریل! تم نے لارک ایرس کو چیلنج کیا تھا لیکن اس بزدل نے اپنے پالتو درندے کو آگے بڑھا دیا۔" ڈولمین نے کالے غلام کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ "لیکن یہاں ڈوئل کا مقابلہ نہیں لڑا جا سکتا ورنہ قانون کی خلاف ورزی پر پولیس سارک ایرس کو بھی حراست میں لے لے گی۔ کیوں سارجنٹ!" اس نے مڑ کر دراز قد آدمی کی طرف دیکھا تھا۔ "سارجنٹ ڈیمل یہاں سیرین کے ڈاکٹر کی تفتیش کے سلسلے میں یہاں آیا ہے جسے رات کو کسی درندے نے قتل کر دیا۔" اس نے کالے غلام کی طرف دیکھا اور لارک ایرس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"یہ بالکل درست ہے۔ میں پولیس کا سارجنٹ ہوں اور ڈاکٹر کے قتل کے سلسلے میں سیرین کا بیان لینے آیا ہوں، سمجھے۔ میری واپسی تک خاموش رہو۔ میں چلتا ہوں۔" وہ انہیں چھوڑ کر اوپر چل پڑا۔

"اور جہاں تک مقابلے کا تعلق ہے مسٹر لارک ایرس! وہ ضرور ہوگا۔ لیکن یہاں نہیں۔ تم کسی اور دن ایسی جگہ کا تعین کر لو جو پولیس کی حدود سے دور ہو۔"

لارک ایرس نے حیرت زدہ ہو کر ڈولمین کو دیکھا۔ اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ کیا یہ شخص ڈیگال کوریل کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے؟" ڈیگال کوریل بھی حیران رہ گیا۔

"ٹھیک ہے...... میں اب سے چھ دن کے بعد جگہ کا تعین کر کے مطلع کر دوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی مسٹر لارک ایرس!" ڈولمین نے کہا۔ "اور چونکہ تم نے اپنے لئے ہتھیار کے بجائے ایک کالے غلام کو منتخب کیا ہے اس لئے مسٹر ڈیگال کوریل اپنی بجائے مجھے مقابلے کے لئے منتخب کرتے ہیں۔"

"کیا......؟" لارک ایرس اچھل پڑا۔ ڈیگال کوریل نے کچھ کہنا چاہا لیکن ڈولمین نے اسے روک دیا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" لارک ایرس بولا۔

"بالکل ایسے ہی جس طرح تم نے مسٹر ڈیگال کوریل جیسے نفاست پسند آدمی کے مقابلے پر اس کالے نیوس کو منتخب کیا ہے۔ بالکل اسی طرح مسٹر ڈیگال کوریل کو حق حاصل ہے کہ وہ میرا انتخاب کریں۔" ڈولمین نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اور تم میرے ساتھ ہو گے...... مقابلے اور جگہ کے سلسلے میں بقیہ تفصیلات لارک ایرس سے آپ کو طے کرنا ہیں۔"

ڈولمین کے ساتھی نے گردن ہلائی اور ڈولمین نے لارک ایرس کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

"اور اگر مقابلے سے پہلے کسی نے ڈیئر بارن کو لے جانے کی کوشش کی تو وہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔ یہ یاد رکھنا۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ مقابلے کے بعد میں تم سے اوسیانوس کے خفیہ ٹھکانے کا پتہ اس طرح دریافت نہیں کروں گا بلکہ کسی اور طرح سے۔ اور یہ بات میں تمہیں پہلے سے بتانا پسند نہیں کرتا۔"

لارک ایرس جن حالات میں یہاں سے واپس گیا تھا وہ انتہائی شرمناک تھے۔ لیکن ظرف والے کسی کی کمزوری پر ہنستے نہیں ہیں اس لئے ان لوگوں نے بھی جانے والے کا مذاق نہیں اڑایا۔ البتہ اندر آنے کے بعد ڈیگال کوریل نے کہا۔

"میں تمہارے احسانوں کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں مسٹر ڈولمین!"

"یہ احسان نہیں ہے۔ میں اس منحوس کے بوجھ سے زمین کو پاک کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکا تھا۔" ڈولمین نے جواب دیا۔

✪......✪

طلسمی حصار کے باہر قیامت صغریٰ بپا تھی۔ شیطان اپنی پوری طاقت سے چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی بھیانک آواز سے فضا لرز رہی تھی۔ باڑے میں اتنا شدید تعفن پھیلا ہوا تھا کہ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن اوسیانوس اب اپنے ساحرانہ عمل سے اتنا طاقتور ہو چکا تھا کہ بھیانک صورت کے سو انسانوں کے برابر چوڑے چکلے شیطان سے بالکل خائف نہیں تھا۔ البتہ وہ ایرس کو دو مرتبہ روک چکا تھا ورنہ ایرس دہشت کے مارے حصار سے باہر بھاگ نکلتا۔ شیطان نے اب ایک اور انسانی قربانی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"تجھے ایک اور انسانی قربانی دینا پڑے گی۔ سمجھا۔ اور اس بار قربانی کا انتخاب میں خود کروں گا۔ میں اس وقت جا رہا ہوں۔ تو قربانی کی تیاریاں کر لینا۔" یہ کہہ کر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا لیکن اوسیانوس کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ پھر آئے گا۔ ابھی ان کے درمیان قوت کا امتحان ہونا باقی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ آخری مقابلہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مقابلے سے انکار کیا یا قربانی نہیں دی تو شیطان اسے اسی دائرے میں ختم کر دے گا۔

وہ بار بار آئے گا اور اسے اتنا پریشان کرے گا کہ وہ اپنا مکمل عمل کر بھی نہ پائے۔ اور اگر اس عمل کے دوران اوسیانوس کی توجہ اور قوتِ ارادی برقرار نہ رہی اور عمل بگڑ گیا تو ہولناک موت اس کا مقدر ہوگی۔ اس نے ایک بار پھر ایک عمل پڑھا اور بھیانک وجود دوبارہ نمودار ہو گیا۔

"مجھے تیری یہ شرط منظور ہے۔ میں تجھے قربانی دوں گا۔ اور وہ بھی تیری پسند کے مطابق۔ لیکن اب تو مجھے یہ بتائے گا کہ قربانی کے لئے تو نے کسے پسند کیا ہے تا کہ میں اسے یہاں بلانے کا انتظام کرلوں؟"

شیطان کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے بھیانک انداز سے اوسیانوس کو دیکھا اور کہا۔

"تو نے وعدہ کر لیا ہے......خیال کرنا اس بات کا۔"

"ہاں، میں نے وعدہ بھی کر لیا ہے اور خیال بھی رکھوں گا۔ تو یہ بتا، تو کس کی قربانی چاہتا ہے؟"

"اس عورت کی جو کورنیلس کی بیوی ہے اور جس کا نام سیرین ہے۔" شیطان نے جواب دیا اور غائب ہو گیا۔

✲......✲

ڈوئل کے مقابلے میں صرف چار دن باقی تھے۔ ڈیگال کوریل، ڈولمین اور اس کا ساتھی اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈیگال کوریل نے کہا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے اور میری دانش میرا ساتھ دیتی ہے، حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے صرف ایک ہی نام سامنے آتا ہے۔ یعنی سیرین کے ڈاکٹر کی موت میں لارک ایرس کا ہاتھ ہے۔ لارک ایرس ہی اس کے قاتلوں سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ ڈاکٹر کو ایرس نے کسی عورت کے علاج کے لئے بلایا تھا۔ گھوڑا گاڑی لے کر جو کوچوان آیا تھا اس کا نام قم ہے۔ اور یہ شخص لارک ایرس کا ملازم ہے۔ علاقے کے لوگوں نے اسے کہتے سنا کہ کوئی عورت گولی لگنے سے زخمی ہے اور اس کی حالت خراب ہے جس کے سلسلے میں لارک ایرس نے ڈاکٹر کو فوراً طلب کیا تھا اور وہ عورت...... کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے؟" ڈیگال کوریل نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے ڈولمین کی طرف دیکھا تو ڈولمین

مسکرا کر بولا۔

"میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں جسم ہوں اور تم عقل۔ کیا کہتی ہے تمہاری عقل؟"

"وہی عورت ہے جو اس رات تمہاری گولی سے زخمی ہوئی تھی اور جو تمہاری بیوی کی روح بن کر تمہارے سامنے آئی تھی۔ کیا سمجھے؟"

"وہ کوچوان کہاں ہے؟"

"لاپتہ ہو گیا۔" ڈولمین کے ساتھی نے بتایا۔ پھر بولا۔ "اور ڈوئل کے انتظامات کے سلسلے میں لارک ایرس کی نمائندگی وہ دوسرا آدمی کر رہا ہے جس کا نام قم ہے۔ وہ تم دونوں سے سخت ناراض ہے۔"

"اسے ہونا بھی چاہئے۔" ڈولمین نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "کیونکہ ہم نے اسے خوبرو لڑکیوں کے ساتھ قہوہ خانے میں جس شرمناک حالت میں دیکھا ہے، اس کے بعد اس کا غصہ جائز ہے۔"

"ہم نے تمہارے حامیوں میں رومال بانٹنے شروع کر دیئے ہیں مسٹر ڈولمین!" ڈولمین کے ساتھی نے بتایا اور ڈولمین مسکرا دیا۔ اس دور کے رواج کے مطابق دونوں باکسروں کے حامیوں میں رومال بانٹے جاتے تھے۔ اور جس شخص کو رومال ملتا تھا وہ باکسر کو پانچ پونڈ ادا کرتا تھا۔ ڈوئل کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ اس مقابلے کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ ڈولمین کا نام باکسنگ کی دنیا میں اتنا مشہور تھا کہ دھڑا دھڑ شرطیں لگ رہی تھیں۔ لارک ایرس نے اپنے سیاہ فام غلام کو بہترین تربیت کرنے والے مہیا کر دیئے تھے اور وہ اسے مشق کرا رہے تھے۔ وہ بیشتر وقت تیاری ہی میں گزار رہا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ بیشتر مقابلہ کرنے والے رنگ سے زندہ واپس نہیں گئے تھے۔

ادھر ڈولمین بھی مکمل تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے باکسنگ چھوڑ چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کے ذریعے ان باکسروں کو بلوایا تھا جو کالے غلام سے مقابلے میں معذور ہو کر زندہ بچ گئے تھے۔

"وہ ہیمر گلوز استعمال کرتا ہے مسٹر ڈولمین!" مارکر نے بتایا۔ "اپنا مکا فضا میں بلند کر کے براہِ راست سر پر ہتھوڑے کی طرح مارتا ہے اور تابڑ توڑ حملے کرتا ہے۔ موقع ملے تو گتھم

گھٹا بھی کر لیتا ہے اور اپنے مقابل کو آہنی گرفت میں لے کر اتنی زور سے دباتا ہے کہ پسلیاں ٹوٹ جائیں۔"

"آنکھوں کی حفاظت خاص طور پر کرنا ہوگی۔" ٹوبی نے بتایا جو ایک آنکھ سے اندھا ہو چکا تھا۔ "وہ درندہ ہے مسٹر ڈولمین! سیدھی انگلیاں آنکھوں میں گھسیڑ دیتا ہے۔ اور اس طرح کہ دیدے باہر نکل آئیں۔

"وہ دائیں بائیں سے حملہ نہیں کرتا۔ عموماً سامنے سے آتا ہے اور سر کی ٹکر اتنی زور سے مارتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی ٹکرا گیا ہے۔"

ان تفصیلات کو جاننے کے بعد ڈولمین کو تیاریاں کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی تھی۔

☆......☆

اور دوسری طرف اوسیانوس کسی قدر پریشانی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ شیطانوں کا شہنشاہ، بادشاہِ جنات قربانی کے لئے جو نام لے گیا تھا وہ بہت مشکل نام تھا۔ یعنی سیرین کورنیلس۔ اوسیانوس کو سیرین کا خون شیطانوں کے بادشاہ کی بھینٹ چڑھانا تھا لیکن وہ اپنے طلسمی حصار کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے یہیں بیٹھ کر سیرین کو اس جگہ بلانا تھا اور اس کے لئے اسے اپنی تمام تر ساحرانہ قوتوں کا استعمال کرنا تھا۔

اپنے عمل کے آخری دن نویں شب کو اسے سیرین کا خون شیطان کی بھینٹ چڑھانا تھا اور یہ تصور اس کے لئے بڑا ہی پریشان کن تھا۔ اس نے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں بند کر لیں۔

بہر حال یہ ساری تفصیلات اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتی تھیں۔

دوسری جانب ڈیگال کوریل اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ اس وقت بھی کئی گھنٹے سے ان کاغذوں کو پڑھ رہا تھا جن میں لارک ایریس کی جائیداد کی تفصیل درج تھی اور ان کاغذات کو پڑھ پڑھ کر وہ تھک چکا تھا لیکن اب تک اسے کوئی ایسی جگہ نہیں مل سکی تھی جہاں اوسیانوس کے ہونے کا امکان ہوتا۔ اس نے لیمپ قریب کیا اور ایک بار پھر کاغذات پر جھک گیا۔ وہ پراپرٹی ریکارڈ کے آفس کے ایک ایسے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں اور بھی دم گھٹ رہا تھا۔

لیکن وہ مقابلے سے پہلے اوسیانوس کی خفیہ پناہ گاہ کا پتہ معلوم کر لینا چاہتا تھا۔ نجانے کب اس کی آنکھوں میں نیند داخل ہوگئی۔ اور جب ریکارڈ آفس کا کلرک کمرے میں آیا تو

ڈیگال کوریل رجسٹر پر سر رکھ کر بے خبر سو رہا تھا۔

☆......☆

اوسیانوس نے اپنے ساحرانہ عمل سے اب اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کورنیلس کی قربت کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نویں شب کو وہ کورنیلس کی روح سے نیگال سیمورس حاصل کرنے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لے گا۔

منتروں کی جانب سے وہ اپنے آپ کو اب بہت طاقتور محسوس کرنے لگا تھا۔ جاپ کی جگہ آنے والی بدروحوں اور شیطان سے اب وہ بالکل خوفزدہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس سے کچھ فاصلے پر بے چارہ ایریس اس کا ساتھ دے رہا تھا جبکہ اس کا حلیہ بھیانک ہوگیا تھا۔ اس کا سر مردے کی راکھ سے بھرا ہوا تھا۔ داڑھی بڑھ گئی تھی اور آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہشت زدہ نظر آتی تھیں۔ وہ درندوں کی طرح کتے کے سڑے ہوئے گوشت کو بھنبھوڑ رہا تھا اور اس کا ذہن قطعی مفلوج ہو چکا تھا۔

وہ اب کتوں کی طرح اوسیانوس کے حکم پر دُم ہلانے لگا تھا۔ اوسیانوس نے ضرورت کے مطابق منتروں کا جاپ پھر شروع کر دیا تھا۔

دوسری طرف ڈولمین نے اپنی تیاریوں کے لئے خود کو مکان کے تہہ خانے والے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ اس نے ہر ایک شخص کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اسے ہرگز نہ چھیڑا جائے اور نہ کوئی اس سے ملنے کی کوشش کرے۔ لیکن ڈیگال کوریل کے لئے یہ دوری مشکل تھی۔ آخر کار وہ برداشت نہ کر سکا اور ڈولمین کی سخت ہدایت کے باوجود زینہ طے کر کے تہہ خانے میں پہنچ گیا اور پھر اس نے آواز لگائی۔

"مسٹر ڈولمین...... مسٹر ڈولمین!"

"میں نے منع کر دیا تھا کہ میرے پاس کوئی نہ آئے۔" تاریکی میں ڈولمین کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

"ہم آپ کے لئے پریشان ہیں۔ آپ نے خود کو بالکل تنہائی میں قید کر لیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں آخر تم اس تاریک اور بدبودار تہہ خانے میں قید ہو کر کیا کر رہے ہو؟ کم از کم ایک اور موم بتی جلا لو۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔" ڈیگال کوریل نے کسی ایسے ہمدرد انسان کی حیثیت سے کہا جیسے اس کی ذات سے بے پناہ دلچسپی رکھتا ہو۔

"نہیں......" ڈولمین نے ترش لہجے میں کہا۔ "مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ تم واپس جاؤ مسٹر ڈیگال کوریل! اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا خیال رکھو اور آئندہ یہاں کسی کو نہ آنے دینا۔"

"لیکن مسٹر ڈولمین! خیریت تو ہے؟" ڈیگال کوریل کو نجانے کیوں ضد سی چڑھ گئی تھی۔ اسے پریشانی یہ تھی کہ ڈولمین نے خود کو یہاں کیوں بند کر رکھا ہے۔ کمرے میں صرف دو موم بتیاں جل رہی تھیں جو اسے روشن رکھنے کے لئے ناکافی تھیں۔ ڈولمین چند مخصوص سبزیاں اور پانی استعمال کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے مقابلے کے لئے بہترین غذاؤں کی ضرورت تھی۔ ڈیگال کوریل کے ذہن میں ایک شبہ جنم لے رہا تھا لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں مسٹر ڈولمین! کہ مسٹر برنم نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کی کامیابی کے لئے دعا کر رہے ہیں۔" وہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے سیڑھیاں اترتے ہوئے تہہ خانے میں آ گیا۔

"میں جانتا ہوں مسٹر ڈولمین! میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اوسیانوس تم سے بلا سبب خوفزدہ نہیں ہے۔ تم نے بلیک فاسٹ رکھ چھوڑا ہے۔ تم کو قدرت نے خاص طور سے روحانی قوتوں سے نوازا ہے جس کے سامنے بدی کی ساری قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور تم یہ روزہ ان قوتوں کو مزید بحال کرنے کے لئے رکھ رہے ہو۔"

ڈولمین نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تو ڈیگال کوریل نے پھر کہا۔

"یہ روزہ جسم اور ذہن کو پراسرار اور غیر مافوقی قوتیں عطا کر دیتا ہے جس کے سامنے انسان پر جادو کی کوئی قوت کارگر نہیں ہوتی۔ مجھے خوشی ہے میرے دوست! بے حد خوشی ہے کہ تم ان قوتوں کے مالک ہو۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے سب سے زیادہ آرزومند ہوں۔ لیکن میں یہاں تم سے کوئی اور باتیں کرنے آیا ہوں۔"

ڈولمین نے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈیگال کوریل مجنونانہ انداز میں بولا۔

"میں نے لارک ایرس کی جائیداد کے بارے میں چھان بین کی تفصیلات تمہیں بتائی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مقابلے سے پہلے لارک ایرس کے ٹھکانے کا پتہ لگا لیا جائے تاکہ ہمیں اس کے ذریعے اوسیانوس کا پتہ معلوم ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا عمل مکمل نہ کر سکے، تم اسے ہلاک کر دو۔"

ڈیگال کوریل نے اپنے الفاظ کا اثر دیکھنا چاہا۔ آنکھیں تاریکی کی عادی ہو گئی تھیں اور اب اسے ڈولمین کا دھندلا سا جسم نظر آ رہا تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور کمرے میں نظر آنے والی موم بتیوں کا رنگ بالکل سرخ تھا۔ ڈیگال کوریل سمجھ گیا کہ وہ نیکی کی ناقابل شکست قوتوں کی تسخیر کا عمل کر رہا ہے۔ وہ تاریکی کی بدقوتوں کے مقابلے کے لئے نیکی کے دیوتاؤں سے روحانی قوت حاصل کرنے میں مصروف ہے۔

"وقت بہت کم ہے مسٹر کوریل!" آخرکار ڈولمین نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "اور اس کا امکان بھی ہے کہ اوسیانوس کا پتہ آسانی سے لگ جائے۔ پھر بھی بہت بہت شکریہ۔ جاؤ، مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"میں تمہارے لئے دعا گو ہوں مسٹر ڈولمین! اور سیرین اور وہ مظلوم بچی ڈیئر بارن بھی۔" ڈیگال کوریل نے کہا۔

جو پریشانی اسے لاحق تھی وہ شاید اب دور ہو گئی تھی۔ ڈولمین نے اس سلسلے میں اور کوئی جواب نہیں دیا تو ڈیگال کوریل آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

۞......۞
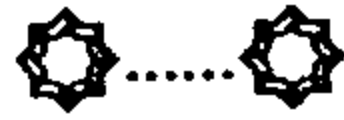
بے پناہ تھکن سے ایرس تقریباً نیم مُردہ ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حصار کے اندر بے خبر سویا ہوا تھا اور اوسیانوس اپنے حصار میں بیٹھا منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔ کتے کے سڑے ہوئے گوشت اور کورنیلس کی لاش کا تعفن پھیلا ہوا تھا لیکن اسے کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ خود کو اتنا توانا اور طاقتور محسوس کر رہا تھا کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ نیگال سیمورس اب اسی کا ہے۔ اب روئے زمین پر اس سے طاقتور شخص کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنی طاقتور ساحرانہ قوتوں کے ذریعے اس قابل ہو گیا ہے کہ اتنے فاصلے کے باوجود سیرین کے ذہن کو اپنے قابو میں کرنے اور اسے اپنا حکم ماننے پر مجبور کر دے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سیرین اس کے سامنے تھی۔ وہ منتروں کا جاپ کر کے اسے حکم دے رہا تھا کہ میرے پاس آؤ...... میرے پاس آؤ......

اس کے کچھ ہی دیر کے بعد ڈیئر بارن نے اپنے کمرے کے دریچے سے باہر جھانکا تو سیرین کو ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا جسے ایک ملازم دروازے تک لایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت سیرین کی طبیعت خراب ہے۔ اور پھر شدید سردی میں اسے

ڈیگال کوریل کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مسز کورنیلس نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ صرف ملازم کو بگھی لانے کا حکم دیا تھا۔ کسی سے بات کئے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ پھر اس نے حیرت سے ڈیگال کوریل کو بگھی سے باہر نکل کر سیرین کو سہارا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ڈیگال کوریل ہی ہے۔ دوسرے لمحے بگھی ان دونوں کو لے کر روانہ ہوگئی۔ ڈیئر بارن کھڑکی سے ہٹ کر جیسے ہی مڑی، اسے سامنے لارک ایریں نظر آیا۔ اس کے پیچھے دو آدمی اور کھڑے تھے۔ ڈیئر بارن سکتے اور خوف کے عالم میں اسے گھورتی رہی۔

''آخر کار میں نے تمہیں تلاش کر ہی لیا جان من!'' لارک ایریں مسکراتا ہوا آگے بڑھا، پھر بولا۔ ''ہم نے سیرین کو جاتے دیکھ لیا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم عقبی دروازے سے آئے ہیں۔''

خوف کے مارے ڈیئر بارن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ لارک ایریں کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے آگے جھک کر لارک ایریں کے کان میں کچھ کہا تو لارک ایریں نے کہا۔

''ہاں...... اسے لے چلو۔''

اور اس کے بعد بھلا بے چاری وہ نرم نازک سی لڑکی کیا مداخلت کرسکتی تھی؟ اسے باہر لا کر گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ لارک ایریں اس کے ایک طرف، اس کا دوسرا ساتھی دوسری طرف۔ اس طرح یہ لوگ اسے لے کر چل پڑے۔ ان کے درمیان ایک شخص بھی بے ہوش پڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ ڈیئر بارن نے اسے غور سے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کیونکہ یہ ڈیگال کوریل تھا۔ ڈیئر بارن بہت حیران تھی۔ کیونکہ ذرا سی دیر پہلے اس نے ڈیگال کوریل کو سیرین کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں جاتے دیکھا تھا۔ پھر ڈیگال کوریل یہاں کیسے آگیا؟ یہ ٹیڑھا سوال اس کا ذہن حل نہیں کرسکا تھا۔

⚙......⚙

سیاہ فام دیو نے تین مکے ڈولمین کو رسید کئے۔ مکے کیا تھے، ہتھوڑے تھے۔ ڈولمین چکرا کر رہ گیا۔ لیکن وہ پھرتی کے ساتھ مدمقابل کی پہنچ سے باہر نکل گیا۔ جبڑوں پر پڑنے والی چوٹ درد کر رہی تھی۔ ڈولمین نے اندازہ لگا لیا کہ سیاہ فام واقعی اتنا ہی طاقتور ہے جتنی

داستانیں اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بات تھی۔ وہ یہ کہ کالے باکسر کی ڈولمین سے تقریباً آدھی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ سات انچ اور وزن ڈولمین سے ساٹھ پونڈ زیادہ تھا۔ اور پھر اس کے جسم میں انتہائی پھرتی تھی۔ اسے اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ جیتنے کے بعد اس سے ایک بڑا انعام سونے کے سکوں کی شکل میں ملنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے بائیں مکے سے ایک اور بھرپور حملہ کیا۔ ڈولمین پھرتی سے جھک کر یہ وار بھی خالی دے گیا۔ حملہ آور جھونک میں آ کر آگے جھکا اور ڈولمین نے پہلا بھرپور وار اس کے سینے پر کیا اور تابڑ توڑ دو مکے اس کے جبڑے پر رسید کئے۔ بہرحال ڈولمین کا اپنا ایک تجربہ تھا۔ ایک طاقت تھی۔ ایک جوش تھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو ایک لمحے میں ناک آؤٹ ہو جاتا لیکن کالا غلام تکلیف کے عالم میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ بے شک چکرا گیا تھا لیکن ابھی اتنا نہیں کہ شکست مان لے۔

تماش بینوں کے ہجوم نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ کالا حبشی اٹھا لیکن لڑکھڑا کر رنگ کی رسیوں پر گرا۔ شور اور بھی بڑھ گیا تھا۔ برنم جو رنگ کے بالکل برابر میں بیٹھا تھا، بے اختیار ہوگیا۔ وہ گلا پھاڑ کر ڈولمین کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔

''ناک آؤٹ...... ناک آؤٹ......'' اس کا ساتھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ لیکن ڈولمین جانتا تھا کہ مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اس لئے موقع سے فائدہ اٹھا کر آرام کر لیا جائے۔ اسے مجمع کے جوش و خروش کا احساس تھا۔ باکسنگ کی دنیا میں ایسا مقابلہ کسی نے کب دیکھا ہے۔ البتہ اس کی نگاہیں تماشائیوں میں بہت سی بار ڈیگال کوریل کو تلاش کر چکی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ کوریل کہاں ہے۔ صرف ایک ہی بات سوچی جاسکتی تھی کہ کوریل کسی مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ ورنہ وہ اس مقابلہ سے غیر حاضر نہیں ہوتا۔

ریفری نے لارک ایریں کے اصرار پر ٹائم دیا ہوا تھا۔ اس نے اچانک ہی اعلان کیا۔

''ٹائم اسٹارٹ۔''

ڈولمین تیار ہو کر مقابلے کے لئے آگے بڑھا۔ کالے حبشی نے اچانک ڈولمین کے بائیں جبڑے پر وار کیا۔ ڈولمین بچنے کے لئے جیسے ہی جھکا، سیاہ فام نے اس کے پیٹ پر ایسی زبردست ٹکر ماری کہ وہ الٹ کر گر پڑا۔ اس کی سانس اکھڑ کر رہ گئی اور اتنا شدید درد ہوا جیسے کسی نے آگ بھر دی ہو۔ سیاہ فام نے پھرتی کے ساتھ پشت سے اسے بازوؤں میں

جکڑ لیا اور اپنی آہنی گرفت میں دبانا شروع کیا۔ اور پھر اچانک ڈولمین کو سر پر اٹھا کر رنگ میں اتنی زور سے پٹخا کہ لوگ چیخ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی کالا غلام بھی جست لگا کر پوری قوت کے ساتھ خود بھی ڈولمین پر گرا تھا جیسے اسے کچل دینا چاہتا ہو۔ لیکن ڈولمین نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کروٹ لے لی لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ لیکن وہ شدید اذیت کے عالم میں تھا۔ اس کا پیٹ، سینہ اور بازو دُکھ رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ اب کبھی نہ اٹھ سکا تھا۔ مجمع بری طرح چیخ رہا تھا اس میں برنم کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ چلا رہے تھے۔

”اٹھو ڈولمین...... جلدی اٹھو...... خدا کے لئے اٹھ جاؤ۔“

ڈولمین نے بے حد کوشش کی لیکن اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

۞......۞

آدھی رات ہونے میں صرف چار گھنٹے باقی تھے۔ اوسیانوس اب کورنیلس کی روح کو طلب کرنے کا منتر پڑھ رہا تھا۔ زندگی کی علامت نمک اور پانی اس نے کورنیلس کے تابوت کے گرد چھڑکا کر لیرس نے تابوت کے آگے اور پیچھے دو موم بتیاں جلائیں۔ یہ بھی زندگی کی علامت تھیں۔ اس کے بعد لوبان اور دوسرے خوشبودار سفوف سلگا دیئے گئے۔ ماحول کا تعفن دب گیا۔ خوشبو کے دھوئیں میں تیز خوشبو ہر سمت پھیل گئی۔ اوسیانوس کو گیارہ مرتبہ اس خوشبو کا دھواں اس تابوت پر دینا تھا۔ اس کے بعد وہ کورنیلس کی لاش کو زندہ کرنے کا آخری منتر پڑھنا شروع کرے گا اور اس کی روح جسم میں واپس آ جائے گی۔ پھر وہ کورنیلس کی روح سے وہ تمام راز معلوم کر لے گا جن کے ذریعے نیگال سیمورس حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اسے شیطان سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق بھینٹ چڑھانا تھی۔ اوسیانوس اس بارے میں مطمئن تھا۔ اس کو یقین تھا کہ آدھی رات سے پہلے سیرین یہاں پہنچ جائے گی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ سیرین کو ڈیگال کوریل سے گہری محبت ہو چکی ہے اور اس لئے اوسیانوس نے ڈیگال کوریل کی شکل کو استعمال کیا تھا۔ سیرین نے کوریل کے کمرے میں دیکھا۔ اسی لئے سیرین کو گاڑی طلب کرنے اور پھر اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہی اس نقلی کوریل کے ساتھ بگھی میں موجود تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ کورنیلس زندہ ہو گیا ہے اور وہ سیرین کو اس کے پاس لے چلے گا۔ لیکن سیرین کے سحر زدہ ذہن کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ سب محض اس کا وہم ہے۔ وہ ڈیگال کوریل نہیں ہے جو اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے اور جس نے اسے بتایا ہے کہ کورنیلس کی روح اس کے جسم میں واپس آ چکی ہے۔

۞......۞
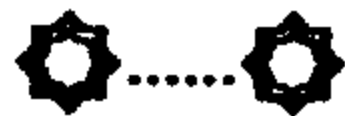
ڈیگال کوریل کو یقین تھا کہ اسے جو شراب پلائی گئی تھی اس میں خواب آور دوا شامل تھی

لیکن اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے موت کی نیند سلایا جا چکا تھا۔ ایک تابوت میں بند کر کے اسے زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ ہر سمت تاریکی تھی اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ بڑی کوشش کر رہا تھا کہ حواس پر قابو رکھے۔ اسے جو پرچہ ملا تھا اس میں لکھا تھا کہ وہ فوراً اس سے ملاقات کرے اور جس شخص نے یہ پرچہ لکھا تھا اس کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اوسیانوس کو تلاش کرے۔ اور اس نے پرچے میں یہی لکھا تھا کہ اسے اوسیانوس کے بارے میں ایک اہم اطلاع ملی ہے۔ حالانکہ ڈیگال کوریل کو ڈولمین کے مقابلے میں شرکت کرنا تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ڈولمین اس کے لئے پریشان ہوگا۔ لیکن لارک ایریس کے آدمیوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اور اس سلوک نے اسے دنیا سے بے خبر کر دیا تھا۔

✡......✡

برنم نے پانی کی بوتل ڈولمین کے گلے سے لگا دی اور ڈولمین جو برنم کے گھٹنے پر بیٹھا ہوا تھا بمشکل پانی پی سکا۔ اس کے زخمی ہونٹ سوج گئے تھے۔ برنم کی غمزدہ آنکھیں آبدیدہ تھیں۔ ڈولمین کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی بائیں آنکھ بے کار ہوگئی ہو۔ اس پر اتنا ورم آ گیا تھا کہ اس سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ برنم کا ساتھی اسپنج سے اسے صاف کر رہا تھا۔

”تیئس راؤنڈ...... یہ صرف معجزہ ہے کہ تم اب بھی زندہ ہو ڈولمین! اس شیطان نے تو تم کو قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”ابھی میں زندہ ہوں دوستو!“ ڈولمین نے تسلی آمیز آواز میں کہا۔ ”اور ڈولمین جب تک زندہ ہے، شکست تسلیم نہیں کرے گا۔“

”لیکن مسٹر ڈولمین! تم اب لڑنے کے قابل نہیں ہو۔“ برنم نے زور دے کر کہا۔

”ٹائم......“ ریفری کی آواز گونجی۔ برنم کے منع کرنے کے باوجود ڈولمین اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بند تھی۔ لیکن اسے یقین تھا، اعتماد تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ اور اب بھی میں شکست نہیں کھاؤں گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈولمین نے کالے غلام کو بھی بری طرح مارا تھا۔ اس کی حالت بھی خراب تھی لیکن آخر میں وہ ڈولمین پر حاوی ہوتا چلا گیا تھا۔ بہرحال ایک بار پھر دونوں مدمقابل ہو آ گئے۔ اس بار کالے غلام نے آگے بڑھ کر ڈولمین پر ایک بھرپور وار کیا۔

ڈولمین نے پھرتی سے ہٹ کر وار خالی کر دیا۔ سیاہ فام نے دوبارہ اپنا گھونسہ ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر مارا۔ یہ اس کا مخصوص داؤ تھا۔ لیکن گھونسہ سر کی بجائے ڈولمین کے شانے پر لگا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کا شانہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ہاتھ بے جان سا ہو کر لٹک گیا۔ ڈولمین واقعی بدحواس ہو گیا تھا۔ کالے نے ایک اور وار کیا لیکن ڈولمین نے یہ وار خالی کر دیا۔ پھر اچانک اس نے برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ کر کالے غلام کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ اسے بار بار اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ کالے غلام کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اچانک اس نے ڈولمین کے پیٹ پر گھٹنا مارا اور اس کی آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے۔ وہ لڑکھڑایا اور گر گیا۔ اسے برنم کی آواز بہت دور سے آتی لگ رہی تھی۔ برنم چیخ رہا تھا۔

”فاؤل...... فاؤل...... یہ فاؤل ہے۔“

اچانک اسے ایک اور زوردار آواز سنائی دی۔ ایک آواز نہیں، یہ تو بہت سی آوازیں تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”تم نے ہمیں یاد کیا تھا...... ہم آ گئے ہیں...... ہم آ گئے ہیں...... ہم آ گئے ہیں۔“

ڈولمین نے سر اٹھایا۔ سامنے چمکتا ہوا پورا چاند تھا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ آوازیں چاند سے آ رہی ہوں۔ یہ آوازیں ڈولمین کے بزرگوں کی تھیں۔ انہی سے اس نے اپنی کامیابی کی دعائیں مانگی تھیں جن کی مدد کے لئے اس نے روزہ رکھ کر عمل کیا تھا۔ یہ ان بزرگوں کی غیبی آوازیں تھیں اور ڈولمین کو ان آوازوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی دماغی قوتیں سو گئی ہوں اور پھر وہ گہری نیند سو گیا۔ اور پھر جب وہ اٹھا تو بونا اسے پانی پلا رہا تھا۔ برنم اور اس کا ساتھی اور ہزاروں کا مجمع خوشی سے چیخ رہا تھا۔ ان کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ لوگ اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ اس کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ برنم کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کالے غلام کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ وہ زخمی پڑا ہوا تھا اور اب اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ دوسروں سے زیادہ وہ خود حیران تھا کہ چند لمحے پہلے نیم مُردہ ہو جانے والے ڈولمین میں نہ جانے کہاں سے جان آ گئی۔ اس نے پے در پے ایسے زوردار وار کئے تھے کہ کالے غلام کے آہنی جسم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے دانت اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ لارک ایریس اور

دوسروں کی تمام کوششیں اسے ہوش میں لانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں اور اسے ناک آؤٹ قرار دے دیا گیا تھا۔

✿......✿

سیرین کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات کی سچی خوشی اسے حاصل ہو گئی ہو۔ وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا کورنیلس زندہ ہو گیا تھا اور ڈیگال کوریل اسے اس کے پیارے شوہر کے پاس لے کر جا رہا تھا۔ ڈیگال کوریل...... آہ، وہ اسے کتنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے کتنی مصیبتیں اٹھا رہا ہے۔ کاش میں اسے زندگی کی تمام خوشیاں دے سکوں۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ گھوڑا گاڑی بڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا کے دوش پر اڑ رہی ہو۔ وہ منتظر تھی کہ جلد ہی کورنیلس کو دیکھ سکے گی۔ چھو سکے گی۔ اس سے بات کر سکے گی۔ لیکن اصلیت کو وہ نہیں جانتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ گاڑی ہر لمحہ اسے اوسیانوس کے قریب لے جا رہی ہے جو اس کے خون کا منتظر ہے۔ بے چاری سحر زدہ سیرین کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کوریل کو زندہ قبر میں دفن کر دیا گیا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ڈیگال کوریل پر کیا گزر رہی ہے۔

قبر میں اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ تابوت کے ڈھکن پر زور زور سے مکے مار رہا تھا اور اس کے ہاتھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس کی بھیانک چیخیں تابوت سے باہر نہیں جا پا رہی تھیں۔ سیرین یہ تمام باتیں نہیں جانتی تھی۔ اسے ڈیگال کوریل کی چیخیں بھلا کہاں سنائی دے سکتی تھیں۔ یہ عجیب و غریب داستان اسی انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔

دوسری طرف ڈولمین اپنی زندگی کے سب سے خطرناک مرحلے سے نجات پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ مجمع اب خوشی سے بے تاب ہو کر رنگ میں گھس آیا تھا۔ لوگ ڈولمین کی شاندار فتح پر دیوانے سے ہو گئے تھے۔ لیکن ڈولمین کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس نے لارک ایرس اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ لیا تھا جو بے ہوش غلام کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اس نے برنم کے کانوں میں کچھ سرگوشی کی اور برنم بولا۔

"آپ فکر نہ کریں مسٹر ڈولمین! ابھی انتظام ہو جاتا ہے۔" برنم کے انداز میں بڑی عقیدت تھی۔ پھر اس نے مڑ کر بونے ساتھی کو کچھ ہدایات دیں اور بونے ساتھی نے گردن

ہلا دی۔

ادھر لارک ایرس انتہائی پریشانی کے عالم میں تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے مخصوص ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا اور ڈاکٹر اس کے لئے بھرپور کوششیں کرنے لگا۔ لیکن ڈاکٹر کی بھرپور کوششوں کے باوجود غلام کے منہ سے بہنے والا خون بند نہیں ہو سکا تھا۔

"یوں لگتا ہے جناب! کہ حلق پر لگنے والے مکے سے کوئی اندرونی رگ پھٹ گئی ہے۔"

"میں اس کتیا زادے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس اسے ختم کرنا ہے مجھے۔ اور باقی جہاں تک رہی اس کالے غلام کی بات تو مرتا ہے حرامزادہ تو مر جائے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ چونکہ اب یہ اس شکست کے بعد میرے لئے بیکار ہو گیا ہے۔ بالکل بیکار ہو گیا ہے۔"

"واقعی...... آپ کا غصہ بجا ہے۔ غالباً آپ کو ایک ڈالر کا نقصان بھی ہو گا۔"

"اوہ...... مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں پریشان اس لئے ہوں کہ ڈولمین زندہ ہے۔" لارک ایرس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا لیکن پھر فوراً اس نے اپنی زبان بند کر لی اور ڈاکٹر کے پاس سے ہٹ کر اپنی بگھی کی جانب چل پڑا۔ واقعی اس کی پریشانی صرف یہی تھی کہ ڈولمین زندہ تھا۔ لارک ایرس اب اس دیوزاد شخص سے اتنا خوفزدہ تھا کہ پناہ کے لئے کوئی جگہ تلاش کر لینا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس کا وہی فارم سب سے مناسب جگہ تھی کیونکہ ڈولمین وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بہر حال وہ اپنی بگھی کے قریب پہنچا۔ اس نے جلدی جلدی ڈیئر بارن کو سوار کرایا اور پھر خود بھی اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا لیکن نگاہ اٹھاتے ہی اس کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کیونکہ سامنے والی سیٹ پر ڈولمین بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ لارک ایرس کے پورے بدن پر تھرتھری طاری ہو گئی۔

"کیا تم مجھے کامیابی کی مبارکباد بھی نہیں دو گے مسٹر لارک ایرس؟" ڈولمین نے کہا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔ برابر وہی بونا بیٹھا ہوا تھا۔

"تم...... تم...... تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم دم دبا کر بھاگ رہے ہو اور وعدے کے مطابق مجھے تم سے اوسیانوس کا پتہ معلوم کرنا تھا۔"

"نن...... نن...... نہیں...... نن...... نہیں......" لارک ایرس کے منہ سے خوفزدہ انداز

میں نکلا۔ لیکن اسی وقت ڈولمین کا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور لارک ایرس سیٹ سے نیچے گر پڑا۔ ڈولمین نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''اسی جگہ اگر تمہارا مدفن بن جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ورنہ مجھے فوراً بتاؤ کہ اوسیانوس کہاں ہے؟''

''مسٹر ڈولمین! انہوں نے ڈیگال کوریل کو لے جا کر قبرستان میں دفن کر دیا ہے۔ زندہ دفن کر دیا ہے۔'' ڈیئر بارن نے سرگوشی کی اور ڈولمین کے پورے بدن کے بال کھڑے ہو گئے۔

''کیا......؟''

''ہاں...... یہ اسی بدبخت سے پوچھیں۔'' ڈیئر بارن نے کہا اور ڈولمین نے غصے کی زیادتی کے زیر اثر لارک ایرس کو بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''سنو! اگر ڈیگال کوریل کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں اس کے برابر میں دفن کر دوں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔ اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی ایک سچائی ہے۔'' ڈولمین نے غضبناک لہجے میں کہا۔

✿......✿

پھر لارک ایرس کی زبان کھل گئی اور ڈولمین اس کی رہنمائی میں اس جگہ تک پہنچا جہاں ڈیگال کوریل تابوت کے اندر ساکت پڑا ہوا تھا۔

''چلو، اسے جلدی نکالو ورنہ......'' وہ گرجا۔

لارک ایرس اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ تابوت کھولنے میں زخمی ہو چکے تھے لیکن موت سر پر کھڑی تھی۔ انہوں نے مرتے گرتے جس طرح بھی ممکن ہو سکا، ڈولمین کے حکم کی تعمیل کی۔ ڈیگال کوریل زندہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت زدہ نگاہوں سے سب کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نگاہ ڈولمین پر پڑی اور وہ پریشانی سے بولا۔

''اوہ مسٹر ڈولمین! یہ آپ کے چہرے کو کیا ہو گیا؟ آپ تو بہت زیادہ زخمی ہو گئے۔''

''اس کالے بھیسے کو شکست دینا اتنا آسان نہیں تھا۔'' ڈولمین نے جواب دیا۔ لیکن باتیں پھر ہوں گی۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ آؤ۔'' ڈولمین نے کہا۔ پھر بولا۔ ''ڈیئر بارن کہہ رہی تھی کہ اس نے پہلے تمہیں سیرین کے ساتھ بگھی میں جاتے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ

لارک ایرس کی قید میں دیکھا۔

''سیرین کے ساتھ جاتے ہوئے نہیں۔ میں نے تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''

''وقت صرف دو گھنٹے کا ہے۔ ہمیں بارہ بجے سے پہلے اوسیانوس کے پاس پہنچنا چاہئے۔''

''بے شک...... اور مجھے یقین ہے کہ سیرین کو اپنے جادو کے ذریعے اوسیانوس نے بلایا ہو گا۔ وہ خطرے میں ہے مسٹر ڈولمین! اور ایک بات آپ کو بتاؤں۔ میں نے اوسیانوس کا پتہ لگا لیا ہے۔ وہ لارک ایرس کے اس فارم پر ہے جہاں یہ گھوڑے رکھتا ہے۔''

لارک ایرس بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ڈولمین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تب یہی کتا ہمیں اوسیانوس کے پاس لے چلے گا۔''

یہ کہہ کر ڈولمین نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور بگھی میں اچھال دیا۔

✿......✿

آخر کار وہ لارک ایرس کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ ڈیگال کوریل نے جلدی سے گھوڑوں کو پیڑوں سے باندھا اور ڈولمین نے لارک ایرس کو گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔

''چلو...... اور یاد رکھو، میرے پستول کی نال تمہاری پشت پر ہو گی۔ بھاگنے کی کوشش کی تو موت یقینی ہے۔''

لارک ایرس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ہر سمت موت کا سناٹا تھا۔ کچھ فاصلے پر انہیں وہ باڑہ نظر آ رہا تھا جس میں اوسیانوس اپنا جاپ مکمل کر رہا تھا۔ ڈولمین نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ وہ بروقت پہنچ گئے تھے۔

''وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ جلدی کرو......'' اچانک ایک دردناک چیخ فضا میں ابھری اور ڈولمین کا جملہ نامکمل رہ گیا۔ چیخ سیرین کی تھی۔ ڈیگال کوریل کے حلق سے ایک زوردار آواز نکلی اور پھر وہ بے تحاشہ باڑے کی طرف بھاگا۔ وہ سیرین، سیرین چیخ رہا تھا۔ اچانک ہوا کے تیز برفیلے جھکڑ اتنی زور سے چلنا شروع ہو گئے کہ ڈیگال کوریل گر گیا۔ لیکن وہ پھر بھاگا۔ ادھر ڈولمین نے پستول کی نال لارک ایرس سے لگا دی۔

''تم بھی تیز چلو۔ ورنہ میں یہیں ختم کر دوں گا۔'' کانپتا ہوا لارک ایرس آگے بڑھا۔ ڈولمین نے چاند کی طرف دیکھا اور اس کا سانس رکنے لگا۔ اندر حصار میں لیٹی ہوئی سیرین

پوری قوت کے ساتھ لیرس کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیرس اسے بار بار زمین پر لٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اوسیانوس کے ہاتھ میں تیز دھار والا خنجر تھا جسے اس نے سیرین کا گلا کاٹنے کے لئے بلند کر رکھا تھا۔ ان کے چہرے انتہائی بھیانک ہو رہے تھے۔ ہر سمت تعفن پھیلا ہوا تھا۔ اچانک ہوا کے چنگھاڑتے ہوئے جھونکے شروع ہو گئے۔ شیطان اپنی بھینٹ لینے آ گیا تھا۔ اوسیانوس نے خنجر بلند کیا۔ وہ شیطان کو بھینٹ دینے کے لئے تیار تھا۔ تبھی انہوں نے ایک عجیب وغریب چیز دیکھی جو رفتہ رفتہ زمین سے ابھر رہی تھی۔ اس کی روشنیاں اتنی تیز تھیں کہ آنکھوں کی بینائی چلی جائے۔ سنگ مرمر جیسی ایک سفید میز پر جس کی لمبائی چوڑائی دو فٹ ہو گی، ایک سنہرے رنگ کا تاج رکھا ہوا تھا۔ اس پر روشن لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے بجلی کے بلب جلتے بجھتے ہیں۔

شہباز سحر زدہ سا رہ گیا تھا۔ رازل جریری نے اس کے کان میں سرگوشی کی کہ یہی نیگال سیمورس ہے۔ ایک ایسا تاج جو سر پر رکھ لیا جائے تو انسان، شیطان کا ہم اثر بن جائے۔ یعنی وہ اس طرح کی خوفناک قوتوں کا مالک بن جائے کہ پھر اسے شکست دینا ممکن نہ ہو سکے۔"

شہباز ساکت کھڑا ہوا تھا۔ رازل جریری نے کہا۔

"ہوشیار ہو جاؤ اور حصار کے بالکل قریب پہنچ جاؤ۔ جیسے ہی ان لوگوں کا کام ختم ہو گا، ہم یہ تاج اپنے قبضے میں کر لیں گے۔"

ہوا کے خوفناک جھکڑ شدت اختیار کرتے جا رہے تھے کہ ڈیگال کوریل کی آواز ابھری۔

"ٹھہر جاؤ......"

ہوا کے جھکڑ اور بھی تیز ہو گئے۔ موم بتیاں گر پڑیں۔ کوریل نے کہا۔

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں ٹھہر جاؤ۔"

اوسیانوس نے غضب ناک نگاہوں سے کوریل کو گھورا اور بولا۔ "گدھے کے بچے! تو اسے نہیں بچا سکتا۔ تو اسے کسی قیمت پر نہیں بچا سکتا۔" وہ چیخا لیکن اسے اسی وقت اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ڈولمین سامنے نظر آیا۔ اوسیانوس پر ایک دم خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹا اور بولا۔

"نہیں......نہیں......تم اس حصار میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

"تم بدی کی قوتوں پر نازاں تھے ناں اوسیانوس! لیکن تم بھول گئے کہ خدا کی قوت سب پر برتر ہے۔ تم نے بہت خون بہا لیا۔ اب تمہاری باری ہے۔"

"نہیں......" اوسیانوس دہشت زدہ ہو کر چیخا۔ اور اسی وقت فضا میں ایک ہیبت ناک قہقہہ بلند ہو گیا۔ یہ شیطان کا قہقہہ تھا جو اپنی تمام تر ہیبت ناکیوں کے ساتھ سامنے موجود تھا۔ اوسیانوس کانپنے لگا۔ اچانک لیرس نے سیرین کو زمین پر گرا کر بے بس کر دیا۔ اسی وقت اوسیانوس کی دھاڑ سنائی دی۔

"اسے قتل کر دو لیرس! دیر نہ کرو۔ اسے قتل کر دو۔"

لیرس نے ایک دم اپنا خنجر بلند کیا تو ڈولمین کی پستول سے شعلہ نکلا اور لیرس کی کنپٹی میں سوراخ ہو گیا۔ وہ بے جان ہو کر سیرین پر گر پڑا اور اسی وقت ڈولمین نے لپک کر لیرس کی لاش کو حصار سے باہر پھینک دیا۔ ساتھ ہی اس نے ڈیگال کوریل کو حصار کے اندر گھسیٹ لیا۔

"اس شخص نے یہ حصار اپنی بچت کے لئے بنایا تھا لیکن اس وقت یہ ہمارے کام آ رہا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ باہر سے لارک ایرس کی چیخ سنائی دی۔

"مجھے بچاؤ......اوسیانوس! مجھے بچاؤ......بچا لو مجھے۔"

"اوسیانوس! آج نیکی اور بدی کی قوتوں کا مقابلہ ہے۔ تم نے جو شیطانی قوتیں طلب کی تھیں وہ سب یہاں ہیں۔ لیکن اب وہ تمہارے قابو سے باہر ہیں۔"

اوسیانوس کی قہر آلود نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ جلدی جلدی منتر پڑھ رہا تھا۔ باہر سے لارک ایرس کی دردناک چیخ پھر سنائی دی۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔

"بچا لو مجھے اوسیانوس! بچا لو مجھے......خدا کے لئے۔"

اچانک ایک دلخراش چیخ سنائی دی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

اسی لمحے ڈولمین نے اوسیانوس کے حصار میں چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ اوسیانوس اس پر اپنے خنجر سے وار کر سکتا، ڈولمین کا زوردار گھونسہ اوسیانوس کے جبڑے پر پڑا اور پھر ڈولمین نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نے اپنے آہنی پنجے سے اوسیانوس کا بازو گھمایا۔ خنجر اوسیانوس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ ڈولمین نے اپنا خنجر بلند کیا۔ اس میں اتنی غیبی قوت آ گئی تھی کہ اوسیانوس اس کی گرفت میں کمزور پڑ گیا تھا۔ اس نے ڈولمین کی آنکھوں میں دیکھا اور دہشت زدہ ہو کر چیخا۔

"نہیں......آہ نہیں......"

لیکن ڈولمین نے خنجر اس کے سینے میں اس طرح پیوست کیا کہ اس کا دستہ بھی سینے کے سوراخ میں غائب ہوگیا اور اوسیانوس کے حلق سے کالا کالا خون اُبل پڑا۔ شیطان نے ایک خوفناک گرج کے ساتھ پیچھے ہٹ کر نیگال سیمورس کی طرف دیکھا جو آہستہ آہستہ زمین کی طرف جا رہا تھا۔ شہباز نے چیخ کر کچھ کہا لیکن رازل جریری کی نگاہیں اوسیانوس پر تھیں جس کا جسم اب سکڑتا جا رہا تھا۔ ڈیگال کوریل اور ڈولمین اس سکڑتے ہوئے جسم کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ جھڑ رہا تھا۔ جیسے بدن پر گوشت نہ ہو بلکہ وہ کوئی مٹی کی تخلیق ہو۔ شہباز نے پھر کہا۔

"نیگال سیمورس...... نیگال سیمورس۔"

رازل جریری اب بھی اس طرف متوجہ نہ ہوا۔ وہ ان لوگوں کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ سیرین کو ڈیگال کوریل نے سنبھال لیا جو بے ہوش ہو چکی تھی۔ اور پھر جب شیطان غائب ہوگیا تو ڈولمین نے کہا۔

"آؤ......اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

حصار کے باہر لارک ایرس اور اس کے ساتھی کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں توڑ مروڑ کر ختم کر دیا گیا ہو۔ شہباز نے پھر کہا۔

"نیگال!"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ فضا میں ایک عجیب و غریب آواز ابھری۔ ایک ایسی گرجدار آواز جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ آواز صاف اور واضح تھی۔

"خدا نے تمہیں جتنی قوتیں دے کر اس کائنات میں بھیجا ہے، انہی پر انحصار کرو۔ تمہارے وسیع و عریض دماغ میں اتنی قوتیں پوشیدہ ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مانگنے کا عمل تمہیں دیا گیا ہے۔ اور اللہ سے وہ مانگو جو اللہ تمہیں دینا پسند کرے۔ اس کی ناپسندی کے خلاف کوئی ایسی چیز طلب نہ کرو جسے وہ نہ دینا چاہے۔ جو مانگو، اس رب ایزدی سے مانگو اور خود ان طاقتوں کے حصول کے لئے سرگرداں نہ ہو۔ جو پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ملیں گی ہی نہیں اور اگر تم یہ سوچو کہ تمہیں مل جائیں گی تو تم اپنے جیسے انسانوں پر کبھی قابو نہ پا سکو گے۔ کیونکہ محافظ ذات تمہیں صرف اتنی قوت دیتی ہے کہ تم

نیکیوں کے راستے پر چل سکو۔"

"آؤ" رازل جریری نے شہباز سے کہا اور شہباز ہواؤں میں پرواز کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ان کے جسم محفوظ تھے۔ رازل جریری نے شہباز سے کہا۔

"جس آواز نے ہماری رہنمائی کی کیا اس کے کسی لفظ کو تم غلط کہہ سکتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"نیگال سیمورس کا حصول کسی کے لئے بھی مناسب نہیں تھا کیونکہ اس کے مطابق جو قوتیں حاصل ہو جاتیں اس سے انسانیت کی بھلائی قائم نہ رہتی۔ اور میں تو خوشی سے اپنی اس جدوجہد کی ناکامی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ یہی اللہ کی مرضی تھی۔ اور اب تم آرام کرو۔ بے شک ہمیں اپنی کاوشوں میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی لیکن ہماری ناکامیوں میں ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہمارا مقصد انسانیت کی بھلائی بے شک ہے لیکن ایسا نہیں کہ ہمیں اپنے تخلیق کنندہ کی ناراضگی مول لینی پڑے۔ جو کچھ کیا، اس پر اللہ سے توبہ کرتے ہیں۔ البتہ وہ جدوجہد اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو ہماری رہنمائی ہو جائے گی۔ ہمیں اس بات کا پورا پورا یقین ہے۔"

شہباز نے گردن جھکا لی تھی۔

......

میلیکو کی اس خوبصورت آبادی میں رازل جریری کی یہ تجربہ گاہ خوبصورت سے خوبصورت ترین ہو چکی تھی۔ علی اصغر جراری اور نریمان فرازی کو فری ہینڈ دے دیا گیا تھا اور تعجب ہی تھا کہ دونوں اس طرح یہاں مصروف ہو گئے تھے جیسے ان کا اس لیبارٹری سے عقیدت کا کوئی گہرا رشتہ ہو۔ شہباز نے خصوصاً نریمان فرازی سے کہا تھا۔

"علی اصغر جراری تو موت کی سزا پا چکا تھا اور وہ جب پھانسی کے پھندے سے لٹک رہا تھا تو رازل جریری نے اسے زندگی کی جانب کھینچ لیا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے یہ موقف اپنا لیا کہ اب یہ زندگی رازل جریری کی امانت ہے جس کی وہ حفاظت کر رہا ہے۔ لیکن میرے دوست نریمان فرازی! تم تو آزاد دنیا کے ایک آزاد پنچھی ہو۔ آخر تمہیں اس طرح کی دلچسپی کیسے پیدا ہوگئی؟ تم تو بذاتِ خود بھی بڑی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہو۔"

نریمان فرازی ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"انسانی دماغ عجیب وغریب چیز ہے۔ کبھی کبھی اس طرح متاثر ہو جاتا ہے کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے۔ بہرحال میں اب یہیں کا ہو گیا ہوں۔ زندگی کی وہ جدوجہد ترک کر دی نے میں نے۔ اور رازل جریری کے موقف کا قائل ہو گیا ہوں۔ گویا تم یہ کہہ سکتا ہو کہ میں نے رازل جریری کی برتری قبول کر لی ہے اور ان کے موقف سے متفق ہو گیا ہوں۔ ایک طرح سے ان کا درجہ میرے لئے ایک پیر جیسا ہے۔"

علی اصغر جراری کا موقف بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ بہرحال یہ سارے سلسلے جاری رہتے ہیں۔

شہباز نے رازل جریری سے اجازت لی اور فیاض شاہ اور شبیلہ سے ملنے اپنے وطن چلا گیا۔ کنٹری بستی کا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ فیاض شاہ اور شبیلہ کو شہباز کے ذریعے بڑی دولت حاصل ہو گئی تھی اور وہ اپنی قدیم اور آبائی بستی کو جنت نظیر بنا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ فیاض شاہ اکثر مسرت بھرے انداز میں کہتا تھا۔

"لوگ کس طرح ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ ہم ہر چند ہر چیز پر قدرت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمارے لئے مقرر کر دیا ہے اس پر قدرت حاصل کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ کاش جانے والوں کو روکا جا سکتا یا واپس لایا جا سکتا۔ کبھی کبھی مجھے گلباز اور میرا دوست رحیم شاہ بہت یاد آتے ہیں۔ کاش کنٹری کی یہ شکل وہ بھی دیکھتے۔ انہیں علم ہوتا کہ کنٹری کتنی خوبصورت ہو چکی ہے۔ اور اس کا روح رواں ان کا بیٹا ہے تو دونوں فخر سے پھولے نہ سماتے اور دونوں ناز کرتے۔ لیکن وقت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ خیر، کیا کہا جا سکتا ہے۔"

شہباز ان تک پہنچا تو وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ رازل جریری نے شہباز کو بہت بڑی رقم دی تھی اور کہا تھا کہ یہ ماں باپ کو دے دی جائے۔

ادھر دوسرے معاملات کا آغاز ہو گیا تھا۔ حیات کی کہانی کو بہرطور آگے تو بڑھنا ہی تھا۔ حکومت پلاسکو کو بہت سے معاملات میں شدید ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ ان ناکامیوں کی وجوہ کی تلاش میں لگ گئے۔ حالانکہ اس کا تعلق رازل جریری سے نہیں تھا لیکن ان کے ذہن میں یہی آیا کہ ان ناکامیوں کا سب سے بڑا ذمہ دار رازل جریری ہی ہے۔ رازل جریری کے سلسلے میں نئی منصوبہ بندیاں ہونے لگیں۔ پے درپے شکستوں نے منصوبہ

سازوں کو زیادہ آگے بڑھ بڑھ کر بولنے سے تو روک رکھا تھا کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں کر پاتے تھے اور ان کی ہر کوشش ان کے لئے شکست ہوتی تھی۔ لیکن دل سے سب یہی چاہتے تھے کہ جس طرح بھی بن پڑے رازل جریری کا کھیل ختم کر دیا جائے تاکہ دنیا ان کے زیر نگیں ہو۔ اس خواہش اور اس آرزو کا سب سے بڑا رکاوٹی پتھر رازل جریری ہی تھا۔ منصوبہ ساز ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

پچھلے کئی مشاہدات سے یہ تو پتہ چل ہی چکا تھا کہ رازل جریری نے میلیکو میں مستقل سکونت اختیار کر رکھی ہے۔ تھوڑی بہت نشاندہی اس علاقے کی بھی ہو گئی تھی جہاں رازل جریری کی تجربہ گاہ تھی۔ لیکن ایک دوسرے ملک میں بھرپور پیمانے پر کوئی موثر کارروائی ممکن نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ایک مکمل دستاویزات تیار کی گئی تھی جس میں میلیکو کے نواحی علاقے میں ایک خوفناک سازش کی مکمل تفصیل بھی تھی اور اس تفصیل میں رازل جریری کا کردار بھی شامل تھا۔ حکومت میلیکو کو بھی اپنے ملک میں ایک ایسے بھیانک حادثے پر تشویش تھی اور اس کے بارے میں تحقیقات ہو رہی تھیں۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں میلیکو کے جاسوس پلاسکو تک پہنچ گئے تھے اور بھرپور کارروائیاں کر رہے تھے۔ یہ ایسے ملکی معاملات تھے جو اعلیٰ سطح پر زیر عمل ہوتے ہیں۔

حکومت پلاسکو نے جو منصوبہ تیار کیا تھا اس میں اپنے دو زبردست دماغوں کو استعمال کیا تھا۔ اور منصوبہ سازوں نے جو عمل طے کیا تھا وہ یہ تھا کہ یہ دونوں بہترین دماغ میلیکو میں داخل ہو کر کوئی جرم کریں اور اس کے بعد اس طرح پولیس یا فوج کو اپنی جانب متوجہ کر لیں کہ وہ ان کا تعاقب کرے اور یہ اس عمارت میں داخل ہو جائیں جو رازل جریری کی عمارت ہے۔ اور پھر وہاں سے مقامی پولیس کے دس پندرہ افراد کو قتل کر دی۔ یوں حکومت میلیکو رازل جریری کی لیبارٹری کی طرف متوجہ ہو جائے گی اور رازل جریری منظر عام پر آ جائے گا۔ چنانچہ اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ڈیمل اور ہیکسن نامی ایسے دو ایجنٹ میلیکو تک پہنچا دیئے گئے تھے جنہیں حکومت پلاسکو کے ناک کا بال سمجھا جاتا تھا۔ اور اب انہوں نے بیش بہا کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ خاص طور سے ہیکسن تو ایک بالکل ہی نئے منصوبے پر کام کر کے لوٹا تھا اور آرام بھی نہ کرنے پایا تھا کہ یہ نئی ذمہ داری اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ آخرکار مطلوبہ آپریشن شروع ہو گیا۔ لوگوں نے میلیکو کے ایک بھرے

پرے بازار میں اندھا دھند فائرنگ کر کے نو افراد ہلاک کر دیئے تو پولیس کی گاڑیاں ان کے پیچھے لگ گئیں۔ یہ لوگ ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے اور آخر کار منصوبے کے مطابق کار رازل جریری کی رہائش گاہ میں داخل ہو گئی۔

یہ لوگ جو مشین گنوں سے مسلح تھے، فوراً ہی ایسی جگہوں پر منتقل ہو گئے جہاں سے وہ باہر سے مقابلہ کر سکیں۔ شہباز تو موجود نہیں تھا، رازل جریری، علی اصغر جراری اور نریمان فرازی حیران رہ گئے۔ علی اصغر جراری اور نریمان فرازی تو صورتحال کو سمجھ نہ پائے تھے لیکن رازل جریری نے موقع کی نزاکت کا احساس کر لیا تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی عمل کیا تھا۔ شہباز کو اس لیبارٹری کی بہت سی تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ رازل جریری نے اسے واقعی دنیا کا آٹھواں عجوبہ بنا دیا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی کیفیت دوہری ہو گی۔ چنانچہ سب سے پہلے تو رازل جریری نے اپنی لیبارٹری کے نچلے حصے میں جا کر کارروائی شروع کی اور لیبارٹری گہرائیوں میں چلی گئی۔ اوپری حصہ نیچے چلا گیا اور نیچے کے سادہ سادہ حصے اوپر آ گئے۔ گویا اس دوہرے مکان کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ پولیس پر گولیاں چلانے والے دونوں افراد یعنی ڈیمل اور ہیکسن جب اپنے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی دیکھنے پر مجبور ہوئے تو مشین گنیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوششوں پر مجبور ہو گئے۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں گہرائیوں میں چلے جا رہے ہیں۔ سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ اور جب زمین رکی تو دو افراد ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں بری طرح رسیوں میں جکڑ لیا گیا۔ ادھر رازل جریری آنے والے وقت کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ جب پولیس اس عمارت میں داخل ہوئی تو اس کی ملاقات ایک بزرگ اور محترم شخصیت سے ہوئی۔

”میرا نام باطش عامری ہے اور میں ایک شریف شہری ہوں۔ وہ لوگ جو بھاگ کر یہاں داخل ہوئے تھے وہ پچھلے راستے سے فرار ہو گئے۔ آپ معائنہ کر لیجئے۔“ لیبارٹری منظر عام پر نہیں آ سکی تھی کیونکہ وہ ایک زبردست میکانزم کے ذریعے زمین کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی اور اوپر کا گھر ایک شریف شہری کا گھر تھا۔ وہ دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے وہ دونوں نکل کر باہر گئے تھے جن کی نشاندہی رازل جریری نے کی تھی۔ پولیس کا ایک گروپ ان کی تلاش میں دوڑ گیا اور دوسرے گروپ نے اس گھر کی پوری پوری تلاشی لے ڈالی۔ علی

اصغر جراری اور نریمان فرازی بھی دونوں اپنے کام سے فارغ ہو کر اوپر آ گئے تھے اور ایک کمرے میں کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ پولیس نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ان دونوں کے بارے میں رازل جریری سے سوالات کئے اور اس کے بعد وہ معذرت کر کے نکل گئے۔

اور یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ دونوں قاتل اور جرائم پیشہ افراد دہشت گردی کرنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ازل جریری سے معذرت کر کے پولیس واپس چلی گئی۔ رازل جریری کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

”یہ صرف ایک سرسری کارروائی نہیں تھی بلکہ مجھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ بہت بہتر بتا سکیں گے۔“

”ہم ان کے جبڑے توڑ دیں گے۔ دیکھیں گے کہ وہ کون تھے اور کیا چاہتے تھے۔“

”ہاں ضرور۔“

”ان پر تشدد کرنا پڑے گا۔“ نریمان فرازی بولا اور رازل جریری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

”نہیں، یہ سب کچھ میں کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اور اس کے لئے شدید محنت کرتا رہا ہوں۔“ رازل جریری کی بات اس وقت تک تو سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ لیکن بعد میں یہ سب کچھ سمجھ میں آیا۔

ڈیمل نامی شخص کو ایک میز پر لٹا کر اس کے ہاتھوں پیروں پر کلیم چڑھا دیئے گئے اور پھر اسے ایک ایسی مشین میں داخل کر دیا گیا جو سٹی اسکین جیسی مشین تھی۔ سامنے ایک بہت بڑا سا اسکین لگا ہوا تھا۔ علی اصغر جراری اور نریمان فرازی اس اسکرین کے سامنے بیٹھ گئے۔ رازل جریری نے انہیں کچھ ہدایات دی تھیں۔ چنانچہ وہ ان ہدایات پر عمل کرنے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد اسکرین پر مناظر ابھرنے لگے۔ ڈیمل آرمی انٹیلی جنس کی وردی میں نظر آیا۔ اس کے ذہن کے جو اُڑے اُڑے نقوش تھے وہ سامنے آتے رہے اور پھر اس کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہو گیا۔ اسکرین پر جو تفصیلات نمایاں ہوتی جا رہی تھیں، اصغر جراری اور نریمان اس کے اہم پوائنٹ نوٹ کرتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مناظر آ گئے جب حکومت پلاسکو کے سرکردہ افراد ان دونوں کو رازل جریری کے خلاف ہونے والے آپریشن کے بارے میں ہدایات دے رہے تھے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ عمل تھا۔ کسی

بھی قسم کے تشدد سے گریز کر کے دماغ کے پرزے کھول لئے گئے تھے اور ان سے ساری حقیقتیں اخذ کر لی گئی تھیں۔ پہلے ہی مرحلے پر یہ شاندار کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور حکومت پلاسکو کا سارا منصوبہ علم میں آ چکا تھا۔ تاہم ابھی دوسرا آدمی ہیکسن باقی تھے۔ ہیکسن کو میز پر لٹا کر دماغ کھولنے والی مشین میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن یہاں ایک اور پراسرار داستان منظر عام پر آئی۔ ایک عجیب سا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ نجانے یہ کون سا ملک تھا، کون سا شہر تھا۔ اس وقت دو گارڈ چہل قدمی کر رہے تھے۔ یہ ایک عمارت تھی جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کون سی عمارت ہے۔ ان میں سے ایک گارڈ جیسے ہی برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر مڑا، اسے ایک تیز چیخ کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گارڈ شدید خوفزدہ نظر آنے لگا اور اپنی رائفل کاندھے سے اتار کر اس سمت دوڑا جدھر سے آواز آئی تھی۔ دوسرا گارڈ بھی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر ایک بنڈل سا بنا ہوا رکھا تھا۔ نیچے خون کے دھبے نظر آئے۔ اور وہ اس بنڈل نما ڈھیر کی جانب آگے بڑھا تو اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ اس بنڈل میں سے ایک کراہ نکلی اور وہ اپنی جگہ جنبش کرنے لگا۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔

"خدا کی پناہ! یہ تو انسان معلوم ہوتا ہے۔"

جب وہ اس ڈھیر کے قریب پہنچا تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ آدمی جو ڈھیر کی شکل میں مڑا تڑا گیٹ کے قریب پڑا تھا، اس کے بال جھلسے ہوئے تھے، آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل آئی تھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی گردن اور ہاتھ انتہائی شکستہ حالت میں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے چبا لیا ہو۔ وہ شخص آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ دونوں گارڈ پہلے تو خوفزدہ ہو گئے اور اس کے بعد وہ اس کی تحقیقات کرنے لگے۔ ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ خون کی ایک چھوٹی دھار اس کے منہ سے نکل کر قرب و جوار کو سرخ کر گئی اور دونوں گارڈ اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ یہ منظر کچھ ہی لمحوں میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ لیکن رازل جریری، اصغر جراری اور نریمان فرازی اس بھیانک منظر سے سخت متاثر ہوئے تھے اور خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔

"اوہ میرے خدا...... میرے خدا...... یہ تو کوئی اور ہی کہانی معلوم ہوتی ہے۔" اصغر جراری کے منہ سے نکلا لیکن رازل جریری نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کیا اور

اسکرین پر نگاہیں جما دیں۔ وہ مختلف مناظر دیکھتا رہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر اسکرین کے عقبی حصے میں جا کر اس نے کچھ کارروائیاں کیں اور کسی مشین کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے ایک بار پھر میز پر پڑے ہوئے نوجوان سے کہا۔

"ہاں...... جو تم نے دیکھا، تفصیل سے بیان کرو۔"

اس کے بعد بہت دیر تک وہ اسکرین کے ان مناظر کو ریکارڈ کرنے لگا جو اس شخص کے ذہن سے نکل کر اسکرین پر آ رہے تھے۔ یہ واقعی ایک بہت ہی عجیب و غریب انکشاف تھا جو ہیکسن کے ذریعے ہوا تھا۔

☼......☼

میلیکو حکومت کے شاندار ایجنٹ اپنی کارروائیاں کر رہے تھے۔ رازل جریری کے بارے میں انہیں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں اور اس کے بعد یہ بھی پتہ چلا تھا کہ حکومت پلاسکو رازل جریری کے سلسلے میں بڑی عظیم الشان کارروائیاں کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی پچھلے کچھ عرصے قبل میلیکو کے نواحی علاقے میں جو ایک عمارت حادثے کا شکار ہوئی تھی اس کے بارے میں بھی ان ایجنٹوں کو کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اور آخر میں انہیں رازل جریری کے بارے میں یہ مکمل تفصیلات حاصل ہوئی تھیں اور وہ اس سے آگے برداشت نہیں کر پائے تھے اور میلیکو پہنچ گئے تھے جہاں انہوں نے یہ تفصیلی رپورٹیں دیں اور میلیکو میں تہلکہ مچ گیا۔ رازل جریری کو اس علاقے کے بارے میں تفصیلات کا پتہ چلا اور باقی تفصیل بھی پتہ چل گئی جس کے تحت باطش عامری نامی ایک بزرگ ہستی اس گھر میں رہتی تھی لیکن گھر بالکل عام سا تھا۔ باقی ساری تفصیل بھی مقامی حکومت کو پتہ چل گئی تھی۔ اور ایک ہنگامی اجلاس ہوا تھا جو انتہائی خفیہ تھا اور جس میں صرف میلیکن کریم شامل تھی۔ اس میں یہ بات حتمی طور پر طے کی گئی کہ رازل جریری کی خدمات میلیکو کے لئے بہت عظیم ہیں۔ ورنہ لاکھوں افراد کی زندگی ختم ہو جاتی۔ پلاسکو مسلسل میلیکو کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ مزید کچھ تفصیلات ان ایجنٹوں کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں اور اس سلسلے میں بھی سنسنی پھیل گئی تھی۔ تب مشترکہ طور پر طے کیا گیا کہ رازل جریری سے ملاقات کر کے اسے اعتماد میں لیا جائے اور اس سے کہا جائے کو جو نیا مرحلہ سامنے آیا ہے اس کے سلسلے میں میلیکو کی مدد کی جائے تا کہ خوفناک صورتحال سے بچا جا سکے اور اس سلسلے

میں بہت سی دستاویزات میلیکن ایجنٹ پلاسکو کے اداروں سے حاصل کر کے لائے تھے جس کی تفصیل کی ایک باقاعدہ رپورٹ تیار کی گئی اور پھر حکومت کے اعلیٰ ترین عہدیدار رازل جریری کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ رازل جریری ان سے بڑے مشفق انداز میں ملا تھا۔

"میرا نام باطش عامری ہے...... اور میں ایک امن پسند شخص اور میلیکو کا محب وطن ہوں۔"

"یقیناً ایسی ہی بات ہے۔ ہم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ ہم اپنا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔ اور جب ان لوگوں نے اپنا تعارف کرایا تو رازل جریری دنگ رہ گیا۔ وہ لوگ کسی پروٹوکول کے بغیر آئے تھے اور اہم ترین سرکاری لوگ تھے۔ مثلاً وزیر داخلہ، وزیر خارجہ، وزیر دفاع اور خود صدر مملکت۔ رازل جریری ششدر رہ گیا تھا۔

"آپ کی بہت ہی محبت ہے مسٹر رازل جریری! کہ آپ نے ہمارے ملک کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ آپ اپنے آپ کو باطش عامری کے نام سے متعارف کراتے ہیں لیکن ہمیں آپ کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اور اس کا ذریعہ ہمارے وہ ایجنٹ ہیں جو پلاسکو میں کام کرتے رہے ہیں۔ ویسے تو آپ نے ہمارے ملک کے لاکھوں انسانوں کی زندگی بچائی ہے جس کی تفصیل بھی ہمارے ایجنٹوں کے ذریعے معلوم ہو چکی ہے لیکن اس وقت ہم اپنے ایک خاص مقصد کے تحت آپ کے پاس آئے ہیں اور آپ کو ایک اہم صورتحال سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ہماری ضرورت پر فوراً مستعد ہو جائیں۔ آپ جیسی عظیم شخصیت سے صرف درخواست کی جا سکتی ہے اور اس بات پر خوشی کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں آپ کی قربت حاصل ہے۔ براہِ کرم اپنے آپ کو باطش عامری نہ کہیں۔ ہمیں رازل جریری سے ملنے دیں۔ آپ یہ دیکھئے اس کے بعد آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر وزیر دفاع نے اپنے سامنے رکھے ہوئے فائل سے چند بڑے سائز کے فوٹو نکالے اور رازل جریری کی طرف سرکا دیئے۔

فوٹو میں جو آدمی تھا اسے دیکھ کر رازل جریری کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ شخص بالکل جھلسا ہوا تھا۔ آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور جسم مڑا تڑا سا تھا۔ یہی تصویر رازل جریری اپنی اسکرین پر دیکھ چکا تھا۔ لیکن یہ اس قدر واضح نہیں تھی۔ کیونکہ یہ صرف ایک دماغ کے اندر

محفوظ تھی۔ جبکہ یہ دوسری تصویریں باقاعدہ کیمرے سے بنائی گئی تھیں۔

فرازی نے کہا۔ "یہ تابکاری کا شکار ہوا ہے۔ ایک دوست ملک مدر لینڈ کے مقامی سفارت خانے یعنی میلیکن سفارت خانے کے سامنے یہ شخص نیم مردہ حالت میں پایا گیا جس کی تصویر آپ نے دیکھی ہے۔ اس نے چند بے ربط الفاظ ادا کئے اور پھر اسی پراسرار حالت میں مر گیا۔"

رازل جریری نے دلچسپ نگاہوں سے فرازی کو دیکھا اور بولا۔ "وہ الفاظ کیا تھے؟"

"ٹرانس لیور...... ایل سی ایم...... ٹرانس لیور ایل سی ایم...... یہ الفاظ اس نے دو دفعہ ادا کئے تھے اور اس کے بعد مر گیا تھا۔

"الفاظ کچھ سمجھ نہیں آئے۔"

"ہاں...... ٹرانس لیور ایک بحری جہاز کا نام ہے۔ آپ اسے تیل بردار جہاز کہہ سکتے ہیں۔ یہ جہاز کچھ عرصہ پہلے ایمونا کی بندرگاہ سے پچاس لاکھ گیلن تیل لے کر نکلا ہے اور اس کی منزل میلیکو کا ایک شہر ڈوینہ ہے۔"

"اور ایل سی ایم کیا چیز ہے؟"

"ایک خوفناک مادہ جو تابکاری تجربوں میں استعمال ہوتا ہے اور بہت طاقتور ہے۔"

"آپ کا کہنا ہے کہ یہ شخص جس کی یہ تصویر ہے ایل سی ایم کا شکار ہوا ہے؟"

"ہاں...... یہی اندازہ ہے ہمارے سائنسدانوں کا۔

"لیکن یہ آدمی کون ہے؟" رازل جریری نے سوال کیا۔

"ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ ہمارے ماہرین ریکارڈ چیک کر رہے ہیں۔ ویسے خیال ہے یہ کوئی عرب ہے۔"

"لیکن یہ ایل سی ایم تک کیسے پہنچ گیا؟"

"مسٹر رازل جریری! ابھی یہ نہیں بتایا جا سکتا۔ ہم اس کے بارے میں بالکل تفصیل نہیں جانتے۔"

دفعتہً رازل جریری نے کسی خیال سے چونک کر کہا۔ "آپ ایک بات بتایئے۔ کیا ایل سی ایم نامی مادہ کسی نہ کسی شکل میں ٹرانس لیور پر موجود ہے؟ اوہو...... کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹرانس لیور جو آپ کے ایک شہر ایمونا آ رہا ہے، ایل سی ایم نامی مادہ آپ کے شہر میں لا

رہا ہے؟"

"آپ سے زیادہ یہ بات اور کوئی نہیں جانتا مسٹر رازل جریری! کہ حکومت پلاسکو ایک انتہائی بھیانک قدم اٹھا چکی ہے اس سائنسدان کی شکل میں جس نے ہمارے ہی ملک کے ایک گوشے میں اپنی مملکت قائم کر رکھی تھی۔ ہم اسے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرتے تھے۔ اس کی عزت، اس کا احترام کرتے تھے اور وہ ہمارے خلاف کام کر رہا تھا۔ اور اس نے ہمارے ملک کے ایک بڑے حصے کو تباہی سے دوچار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مسٹر رازل جریری! آپ کو یہ بات معلوم ہونے کے بعد آپ نے ہمارے وطن کے لاکھوں انسانوں کو نئی زندگی بخشی۔ ہم آپ سے جس قدر محبت کریں کم ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں ہوتی کہ اتنا بڑا احسان کرنے کے باوجود آپ نے ہم پر یہ احسان جتانے کی کوشش نہیں کی اور ہمیں حکومت پلاسکو سے یہ تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ہم بھی ناسپاس نہیں ہیں کہ آپ کی اس محبت کی قدر نہ کریں۔ میں صدر مملکت میلیکو کی حیثیت سے آپ کو پیشکش کرتا ہوں کہ میلیکو میں آپ جس طرح چاہیں قیام کریں اور ضرورت پڑنے پر ہم سے ہر طرح کی فرمائش کر سکیں۔"

رازل جریری نے پُر خیال انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔

"ٹھیک ہے...... میں آپ کی یہ پیشکش قبول کرتا ہوں۔ لیکن میری ایک خواہش ہے۔ کہ میرا اصل نام اور میری کاوشیں صرف چار افراد تک محدود رکھی جائیں اور انہیں کہیں ریکارڈ میں بھی درج نہ کیا جائے۔"

"ہم آپ کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں۔"

"ٹھیک...... اب آپ یہ بتائیے کہ اس سلسلے میں فوری عمل کیا ہو سکتا ہے؟"

"میرا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اس جہاز کو ڈومینہ تک پہنچنے سے روکنا ہوگا۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ جہاز کب یہاں پہنچے گا۔ اس کی ملکیت جہاں کی ہے وہاں سے ہمارے بہترین تعلقات ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا دوست ملک کسی بھی قیمت پر یہ کارروائی نہیں کرے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے عرصے پلاسکو نے کیا حرکت کی تھی۔ وہ مدرلینڈ اور ڈیولینڈ کے خلاف مصروف عمل تھا۔ ڈیولینڈ سے اس نے ایک بدترین جنگ کی تھی اور ہمیں ڈیولینڈ کی مدد کرنا پڑی تھی۔ لیکن درپردہ اب حکومت پلاسکو اس بات کی خواہش مند ہے کہ ڈیولینڈ اور میلیکو میں اختلافات ہو جائیں اور حکومت پلاسکو اس سے

بھرپور فائدہ اٹھائے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک خوفناک مادہ یعنی ایل سی ایم جو انتہائی قیمتی ہے حکومت پلاسکو میں ہی تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم سمندر میں جہاز روک کر یہ مطالبہ بھی کریں کہ یہ مادہ ہمارے حوالے کر دیا جائے تو ظاہر ہے یہ ممکن نہیں ہوگا۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ اسے سمندر میں پھینک دیا جائے تو مسٹر رازل جریری! اس کے بھی خوفناک نتائج نکلیں گے۔ اس مادے سے پورا سمندر تابکاری اثرات سے دوچار ہو جائے گا۔ ہم اس سلسلے میں بے انتہا پریشانیوں کا شکار ہیں۔ اگر ہماری بحریہ نے اس پر قابو پا لیا تب بھی ہم یہ جاننے سے قاصر رہیں گے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا اور اسے میلیکو کس لئے لایا گیا تھا۔ ڈومینہ میں اسے کیوں پہنچایا جا رہا تھا۔ کیا وہاں کسی قسم کے عناصر موجود ہیں جو اسے وہاں استعمال کرنا چاہتے ہیں کسی شکل میں؟"

"بہرحال ہم زبردست پریشان ہیں۔ آپ ضرور سوچیں گے۔ کیا آپ سے تعارف ہوتے ہی ہم لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن مسٹر رازل جریری! ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ ہماری معلومات کے مطابق یہ معلومات ہمیں حکومت پلاسکو سے حاصل ہوئیں۔ وہ یہ کہ آپ کے اور پلاسکو کے درمیان تصادم کی وجہ یہ ہے کہ آپ دنیا بھر میں امن و امان کا دور دورہ چاہتے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ جو تخریبی کارروائیاں ہو رہی ہیں ان کا خاتمہ ہو جائے۔"

کچھ لمحے کے لئے رازل جریری خاموش ہو گیا۔ لیکن بہرحال اس کے جذبات یہی کچھ تھے۔ اس نے کہا۔

"واقعی، یہ ایک سنسنی خیز بات ہے۔ یہ تو ضرور سوچا جائے گا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا۔ ایل سی ایم کا موجب کون ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسے جہاز پر کس نے لادا ہے۔ ٹرانس لیور کے عملے کو اس کے بارے میں تفصیلات معلوم ہیں کہ نہیں۔ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ یہ مادہ سمندر میں نہیں پھینکا جانا چاہئے بلکہ اسے حاصل کرنا ہوگا۔ ایک سوال اور۔ اگر آپ کے خیال میں حکومت پلاسکو اس کی ذمے دار ہے تو کیا آپ یہ چاہیں گے کہ وہاں اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوں؟"

"بالکل نہیں...... ہم پلاسکو کو میلیکو پر حملہ کرنے کا کوئی چانس نہیں دے سکتے۔"

"ٹھیک ہے...... یہ کام ہو جائے گا۔ اب یہ بتایئے کہ اس جہاز کو ڈومینہ کے ساحل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟"

"تقریباً اٹھارہ دن۔"

"جہاز کا روٹ کیا ہے؟"

"بس یہ بحر سرخ سے گزر رہا ہے۔ پھر یہ وسیع سمندر میں اور پھر پلاننگ اور پانامہ چینل سے ہوتا ہوا میلیکو کے سمندر میں داخل ہو جائے گا۔ مگر جناب عالی! ہم نے بہت غور وخوض کیا ہے اور ہمیں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"بتایئے کیا؟" رازل جریری نے کہا۔

"ہمیں خوف ہے کہ اس دوران ایل سی ایم کو کہیں اور منتقل نہ کر دیا جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"جس شخص نے اس مادے کو جہاز پر لادا تھا اور وہ سفارت خانے کے سامنے مردہ پایا گیا تھا اس کے بارے میں ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تو؟"

"دوسری بات؟" رازل جریری نے سوال کیا۔

"دوسری بات یہ کہ ایل سی ایم جس پیکنگ میں رکھا جاتا ہے وہ اس میں سے لیک نہیں کرتا۔"

"اوہو...... اوہو......" رازل جریری ایک دم چونک پڑا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ......"

"ہاں۔ ایمونا میں، میرا مطلب ہے مدر لینڈ میں سفارت خانے کے سامنے آدمی کے مردہ پائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیکنگ کھول کر اس میں سے ایل سی ایم نکال لایا ہے۔"

"آپ پورے دعوے سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ بحری جہاز ٹرانس لیور پر ایل سی ایم ہی لادا گیا تھا؟"

"یہ صرف ہمارا قیاس ہے۔ ویسے اگر آپ اس سلسلے میں رازل جریری صاحب! ہماری مدد کریں تو ہمارے ہرڈیپارٹمنٹ کا ایک ایک شخص آپ کو مکمل تعاون دے گا۔ ہماری بحریہ جہاں آپ جانا چاہیں گے، آپ کو وہاں پہنچائے گی۔ اس کے علاوہ ہم دوسرے شعبوں میں بھی آپ کی خواہش کے مطابق آپ سے تعاون کریں گے۔"

"ٹھیک...... بہت بہتر۔ ہم آپ کا یہ کیس اپنے ذمے لیتے ہیں اور آج سے ٹھیک تین دن کے بعد آپ کو اس بارے میں مکمل اطلاع دے دی جائے گی۔ گویا اٹھارہ میں سے پندرہ دن آپ کو کم کرنا ہوں گے اور کام کا آغاز ہو جائے گا۔"

یہ بات علی اصغر جراری بھی جانتا تھا اور نریمان فرازی بھی کہ اس کام کے لئے شہباز کو فوری طور پر طلب کر لیا جائے گا۔ دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ شہباز واقعی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ نریمان فرازی نے خاص طور سے علی اصغر جراری کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔

"وہ شخص کبھی کبھی مجھے غیر انسانی وجود معلوم ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ انسان نہ ہو بلکہ چھلاوا ہو اور ہر وہ کام کر لیتا ہو جو انسانوں کے لئے ممکن نہ ہو۔ میں دماغ کے طور پر اس کے جسم میں تھا اور جو جو وہ کرتا تھا اسے دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی محبت ہی نے مجھے رازل جریری کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا ہے۔ رازل جریری بذاتِ خود بہت اعلیٰ شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن یہ بھی یک حقیقت ہے کہ پتہ نہیں کس کی خوش قسمتی ہے کہ یہ دونوں یکجا ہو گئے ہیں۔"

"اور میں تمہیں بتاؤں میرے دوست! کہ رازل جریری نے بے شک میری زندگی بچائی ہے۔ لیکن یہ شخص میری زندگی بچانے میں جسم کی حیثیت سے رہا ہے۔"

"وہ ہے ہی جسم۔"

وہ دونوں شہباز کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور رازل جریری نے شہباز کو طلب کر لیا۔ شہباز بادل نخواستہ ہی پہنچا تھا اور رازل جریری نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نہیں کہہ سکتا شہباز! کہ تم کس کیفیت میں یہاں آئے ہو۔ آنا بھی چاہتے تھے ابھی یا نہیں۔ لیکن میرے بچے! صورتحال ایسی ہی تھی کہ تمہیں آنا ہی تھا۔"

پھر رازل جریری نے ساری تفصیل شہباز کو بتائی اور کہا۔ "تمہیں ضرورت کی ایسی چیزیں مہیا کی جائیں گی جو اس مشن میں تمہاری مددگار رہوں۔ میلیکن نیوی تم کو مکمل تعاون دے گی۔ تم جہاں جانا چاہو، جب جانا چاہو، جیسے جانا چاہو تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ تمہارے لئے خاص لباس موجود ہے تاکہ تم ان جگہوں پر بلاخوف وجھجک آجا سکو

جہاں تابکاری کے اثرات کا اندیشہ ہو۔ اور تمہارے پاس ایسے آلات ہوں گے جو تمہیں تابکاری سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے تمہیں ایسی تمام چیزیں مل جائیں گی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اپنا سفر کہاں سے شروع کروں گا؟"

"اب یوں ہوگا کہ میں تمہاری تیاری کے بارے میں ان لوگوں کو اطلاع دے دوں گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے تمہیں مدر لینڈ جانا ہوگا۔" رازل جریری نے کہا اور شہباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

شہباز کی اس مسکراہٹ کو رازل جریری نے کسی قدر حیران نگاہوں سے دیکھا تو شہباز بولا۔ "نہیں...... کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس اس بار جب میں ان لوگوں کے پاس گیا تو انہوں نے کچھ دلچسپ باتیں کیں۔ ایسی دلچسپ باتیں جنہوں نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ مثلاً وہ لوگ میری شادی کرنا چاہتے ہیں اور کنٹری کی کسی ایک ایسی معصوم اور الہڑ لڑکی سے جس نے باہر کی دنیا دیکھی تک نہ ہو۔"

"یہ تو بہت ہی دلچسپ اور حیران کن بات ہے۔ واقعی۔ مگر مجھے ایک بات بتاؤ۔ خود تمہارے اپنے ذہن میں ابھی تک کوئی لڑکی داخل ہوئی یا نہیں؟"

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"خیر، تم اس مشن کی تیاریاں کرو۔ باقی باتیں ہم بعد میں سوچیں گے۔ ہاں، ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ یہ مشن بہت خوفناک ہوگا اور تمہیں اپنی زندگی کی حفاظت کرنی ہوگی۔ ویسے میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی تربیت بھی دوں گا اور یہ تربیت اس طرح کی ہوگی کہ تم کسی آبدوز سے سفر کرتے ہوئے سمندر میں رواں دواں بحری جہاز پر کیسے چڑھو گے۔ یہ تربیت بہت دشوار ہوگی۔ کیا سمجھے؟"

"میں جانتا ہوں۔"

اور اس کے بعد شہباز کی تربیت کا آغاز ہوگیا۔ اس کے لئے خاص طور سے لکڑی کا ایک چھوٹا بحری جہاز منگوایا گیا تھا اور اسے فولادی زنجیر کے ذریعے اوپر چڑھنے کی تربیت دی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جارہا تھا کہ بحری جہاز میں تیل کا ٹینک کہاں ہوتا ہے اور وہاں تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ تمام کارروائیاں میلیکو کی بحریہ کر رہی تھی اور علی

اصغر جراری اور نریمان فرازی وہاں موجود تھے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہوسکتا ہے رازل جریری خود بھی بے جسمی کی کیفیت میں ان لوگوں کے پاس ہی ہو۔

بہرحال تیاریاں مکمل ہوئیں اور آخر کار شہباز اپنے مشن پر روانہ ہوگیا اور ایک طیارہ اسے لے کر مدر لینڈ چل پڑا تھا۔

☆......☆

شہر ایمرسن، مدر لینڈ کا دارالحکومت تھا اور مدر لینڈ کے اسی شہر میں وہ واقعہ پیش آیا تھا جس کی تفصیل پیچھے درج ہے۔ ایمرسن رقبے میں چھوٹا تھا اور اس کی آبادی بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ مگر اس کی اہمیت بے پناہ تھی کیونکہ اس کی معدنیات دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی کل معدنیات سے بھی زیادہ تھیں۔ اس کی زمینوں کے نیچے سیال سونا تھا اور اعداد وشمار کے مطابق دنیا بھر کے سونے کے ذخائر سے کہیں زیادہ ذخائر یہاں موجود تھے۔

بہرحال طیارہ ایمرسن ایئرپورٹ پر اتر گیا اور شہباز کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہاں کوئی باقاعدہ اس کا استقبال کرے گا۔ غالباً اس کا انتظام حکومت میلیکو نے کیا تھا کیونکہ اس وقت حکومت میلیکو، رازل جریری کی زبردست دوست بن چکی تھی۔ جو شخص آگے بڑھ کر شہباز کے سامنے آیا اس نے پُرادب انداز میں جھکتے ہوئے کہا۔

"میرا نام لیو ایلفر ہے۔ اور جناب عالی! آپ کے بارے میں مجھے بتا دیا گیا ہے کہ آپ کا نام شہباز ہے اور آپ ایک خاص مشن پر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بہرحال میں آپ کو ایمرسن میں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

اس شخص کے بارے میں شہباز کو بتایا نہیں گیا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنے بارے میں جس طرح سے اطمینان دلایا اس سے شہباز مطمئن ہوگیا۔ اس نے پُراخلاق انداز میں لیو ایلفر سے مصافحہ کیا۔ لیو ایلفر بہرحال اس کا بہترین معاون ثابت ہوا۔ کسٹم وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شہباز اس شخص کے ساتھ باہر نکل آیا اور اس نے کہا۔

"میں اس قدر اہمیت کا حامل نہیں ہوں کہ آپ کے مشن کے بارے میں مکمل تفصیلات مجھے بتائی جائیں۔ البتہ حکومت میلیکو نے مجھے یہاں اپنا نمائندہ مقرر کرکے مجھے ہدایات دی ہیں کہ آپ کے مشن میں آنکھیں بند کرکے آپ کا ساتھ دوں۔ میرا مطلب ہے کہ جو کچھ بھی آپ کی ضرورت ہو میں اس سے گریز نہ کروں۔ تاہم میری خواہش ہے کہ آپ ایسا

کوئی عمل نہ کریں جس سے ہمارے راستوں میں مشکلات پیش آئیں۔"

شہباز نے ان الفاظ پر اسے دیکھا اور بولا۔"آپ کے الفاظ بے شک ضرورت سے زیادہ ہیں۔لیکن بعض لوگوں کو ضرورت سے زیادہ بولنے کی علادت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں آپ کے ان الفاظ کو نظر انداز کرتا ہوں۔آپ کو اس بات کا بالکل علم نہیں ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

"مکمل طور پر نہیں۔البتہ یہ اندازہ ہے کہ جو شخص ہمارے سفارت خانے کے سامنے موت کا شکار ہوا ہے،آپ اس کے بارے میں تحقیق کرنے آئے ہیں۔"

"اور کچھ؟" شہباز نے سوال کیا اور وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔

"میں نے عرض کیا نا جناب! کہ نہ تو مجھے بہت زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہیں، نہ ہی میری کوئی ذاتی تحقیق ہے۔"

شہباز نے پُر خیال انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔"بہر حال، یہ بات کان کھول کر سن لو مسٹر لیو ایلمر! کہ میرے بارے میں یہاں کسی کو کسی طرح کی معلومات فراہم نہ کی جائیں۔یہ میری ہدایت ہے۔"

"ہاں......آپ اس بارے میں اطمینان رکھئے گا۔" اس نے کہا اور ایک شاندار اور قیمتی کار میں بیٹھتا ہوا بولا۔

"یہ کار آپ کے لئے ہے۔ظاہر ہے جب تک آپ کا قیام یہاں ہے، آپ کو کار کی ضرورت ہوگی۔"

"نہ صرف کار بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک قابل اعتماد ڈرائیور بھی۔ کیونکہ میں شہر کی گلی کوچوں سے واقف نہیں ہوں۔"

"وہ ڈرائیور میں ہوں مسٹر شہباز! اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ مجھ پر جتنا چاہیں اعتبار کریں۔"

شہباز نے ایک گہری نگاہ اس شخص پر ڈالی تھی لیکن ابھی کوئی خاص فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ البتہ اس نے اس سے پوچھا۔"جو شخص سفارت خانے کے سامنے مرا تھا یقیناً اس کے بارے میں معلومات تو حاصل ہو گئی ہوں گی۔"

"بہت زیادہ نہیں۔ کیونکہ اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا اور اس کے بارے میں جس قدر

اندازے قائم کئے جا سکے ہیں اور جو بھی تفصیلات جمع ہوئی ہیں وہ آپ کو مسٹر ہاورڈ سے حاصل ہو جائیں گی۔مسٹر ہاورڈ اسسٹنٹ ڈپٹی چیف ہیں۔"

"ہم اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"سفارت خانے۔وہیں سب سے ملاقات ہو جائے گی۔" ایلمر نے جواب دیا۔

بہر حال یہ سفات خانہ تین منزلہ عمارت پر واقع تھا۔عمارت کی طرزِ تعمیر جدید انداز کی تھی۔سامنے کی سمت مکمل طور پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ایلمر نے اس کی پارکنگ لاٹ میں کار روکی تو چار محافظ دوڑ کر قریب آ گئے۔انہوں نے ان دونوں کے اترتے ہی اچھی طرح سے تلاشی لی۔شناختی کاغذات بھی چیک کئے اس کے بعد شہباز، ایلمر کے ساتھ اندر چل پڑا۔

"میرا آفس بھی یہیں اسی عمارت میں ہے۔یہ سب کچھ ظاہر ہے بہت ضروری تھا۔ ویسے ہاورڈ بھی بہت بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ایک ملک کے صدر کا رشتے دار ہر موقع پر اپنے نمبر بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے۔اپنی معلومات کبھی کسی کو فراہم نہیں کرتا۔اور اس سلسلے میں بھی میں آپ کو بتا دوں مسٹر شہباز! آپ کو بے شک حکومت میلیکو نے اپنے معاملات کے سلسلے میں یہاں بھیجا ہے لیکن ہاورڈ آپ کو اپنے آپ سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔اصل میں وہ اس فکر میں ہے کہ اسے یہاں میلیکو کا سفر بنا دیا جائے گا۔"

شہباز نے اس شخص کی باتوں سے لطف لیتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ بے فکر رہے۔ایسے لوگوں سے نمٹنا اسے بخوبی آتا ہے۔

"وہ سامنے ہاورڈ کا کمرہ ہے۔آپ کو میں اس کی سیکرٹری سے ملائے دیتا ہوں۔وہ سامنے اس کی سیکرٹری ہے۔"

ایلمر نے خوبصورت لڑکی کے پاس جا کر کچھ کہنا چاہا تو وہ مسکرا کر انگلی اٹھا کر بولی۔

"مسٹر شہباز فرام میلیکو؟"

"ہاں، ظاہر ہے تمہیں اس بارے میں معلومات ہونی چاہئے تھی۔ بہر حال اب میں چلتا ہوں۔اب یہ تمہارے حوالے۔"

"میرے حوالے؟" سیکرٹری نے بے باکی سے شہباز کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا پھر بولی۔"مسٹر ایلمر! میں آپ کو ان کی کیا قیمت ادا کروں؟"

"صرف اتنی کہ ہوش و حواس قابو میں رکھنا اور اپنے لالچی باپ سے انہیں بچانے کی

کوشش کرنا۔"

"جو چیز میری ملکیت بن جاتی ہے ناں میں اس کی ہر طرح حفاظت کرتی ہوں۔ سوری مسٹر شہباز! لیو ایلمر بہت ہی پُر مذاق آدمی ہیں اور ان کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے بڑا لطف آتا ہے۔"

"تم نے ایک لمحے میں انہیں اپنی ملکیت بنا لیا۔ اصل میں خواتین کو یہ بڑی غلط فہمی ہوتی ہے کہ اگر ان کا چہرہ چکنا اور رنگ صاف ہے تو دوسرا انہیں دیکھتے ہی اس پر آمادہ ہو جائے گا کہ اپنے آپ کو ان کی ملکیت قرار دے دے۔"

سیکرٹری ہنسنے لگی تو ہیلمر واپس چلا گیا۔ وہ بولی۔ "ایک منٹ مسٹر شہباز! میں ذرا باس سے بات کرلوں۔"

سیکرٹری نے فون پر بات کی اور ہاورڈ کے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

ہاورڈ کا کمرہ جدید فرنیچر سے مزین تھا۔ فرش کا قالین اتنا دبیز تھا کہ اس میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور وہاں کا ماحول بہت پراسرار تھا۔ ہاورڈ پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوا کہ وہ دراز قد اور توانا آدمی ہے۔ اس کے کندھے چوڑے اور بال سیاہ، چہرے کے نقوش بڑی حد تک ایک اداکار سے مماثلت رکھتے تھے جسے خوبصورت اداکار کہا جاتا تھا۔ بہرحال اس نے اپنے چہرے پر ایک خوبصورت سفارتی مسکراہٹ سجائی اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"خوش آمدید مسٹر شہباز!"

شہباز نے ایک لمحے میں اس کے ہاتھ کی سختی کو محسوس کرلیا۔ اس کی گرفت فولادی تھی۔

"کہئے، میلیکو کا موسم آج کل کیسا جا رہا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"معتدل۔"

"آپ براہِ کرم تشریف رکھئے۔" اس نے سامنے کرسی پر اشارہ کیا اور شہباز کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیو ہیلمر نے اس شخص کے بارے میں ذہن میں بلاوجہ ایک دھبہ ڈال دیا تھا۔ اور یہ دھبہ شہباز کو روک رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ بے تکلف ہو۔ اس نے کہا۔

"مسٹر لیو ہیلمر نے مجھے اطلاع دی ہے کہ سفارتخانے کے سامنے مرنے والے کی اچھی طرح شناخت نہیں ہوئی۔ بلکہ سرسری انداز میں یہ شناخت ہوئی اور آپ کو اس بارے میں

کچھ معلومات بھی حاصل ہیں۔"

شہباز کا لہجہ بالکل کھردرا اور کسی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ لیکن ہاورڈ نے کرسی پر جھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اور میں انہی معلومات کی روشنی میں آپ کو بتاؤں مسٹر شہباز! کہ آپ کا یہ تحقیقاتی مشن کامیاب نہیں ہوگا۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمہاری تمام تر جدوجہد صرف وقت گزاری ہوگی۔ اور تم کچھ کر نہیں پاؤ گے۔"

"کیوں......؟" شہباز نے لہجہ مزید کرخت بناتے ہوئے کہا۔ اس شخص کے بارے میں لیو ہیلمر نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ یہ ضرورت سے زیادہ مغرور اور اپنے آپ میں گم معلوم ہوتا تھا۔

"اس لئے کہ میں نے اس واقعے کے بارے میں رپورٹ تیار کر لی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکیں گے۔"

شہباز کہنے لگا۔ "نتیجہ برآمد کرنا میرا کام ہے مسٹر ہاورڈ! آپ وہ رپورٹ مجھے پیش کیجئے۔" شہباز کا لہجہ حد درجہ سرد تھا۔ ہاورڈ کی نظروں میں ایک لمحہ کے لئے حیرت کے آثار نظر آئے پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور کہا۔

"تھوڑی دیر کے بعد ہمیں ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"کس کے بارے میں اور کیا؟" شہباز نے ترکی بہ ترکی سوال کیا۔

"میرا مطلب ہے وہ لوگ فرار نہیں ہو سکتے۔ ہمارے آدمیوں نے وہ جگہ مکمل گھیرے میں لے رکھی ہے۔"

"اور تم اب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہو۔" شہباز انتہائی سخت ہو گیا اور کرسی پیچھے سرکا کے کھڑا ہو گیا۔

"یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں؟" مسٹر ہاورڈ نے احتجاج کر ڈالا۔

"سنو...... میں براہِ راست میلیکو کے سربراہ کو جوابدہ ہوں۔ تم چاہو تو انہیں فون کر کے تسلی کر سکتے ہو۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کرلو، میں صاف یہ بات کہہ دوں گا کہ تم مجھ سے تعاون نہیں کرنا چاہتے۔"

"نہیں سر! مم.... مم.... میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" ہاورڈ کے حوصلے پست ہونے لگے۔

''اس سے پہلے کہ معلومات کوئی غلط رخ اختیار کریں، تم مجھے وہ تمام واقعات بتا دو۔ لیکن سنو، کسی بھی ردّ و بدل کے بغیر۔''

''جی سر...... جی...... مرنے والے کا نام احمد علی ہے۔ اور وہ یہاں کی ایک دہشت پسند تنظیم سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمیں اس کی ایک دوست لڑکی کا سراغ حاصل ہو گیا ہے۔ لڑکی یہاں کے ایک پوش علاقے میں رہتی ہے۔''

''تمہارے آدمی اس کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کر رہے ہیں؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''ہاں......''

''اس علاقے کا پتہ بتاؤ۔''

''نیوالی سٹریٹ۔ مشہور جگہ ہے۔ اور اس اسٹریٹ میں اپارٹمنٹ نمبر تیرہ۔''

''ٹھیک ہے۔ بس اتنا کافی ہے۔''

پھر شہباز نے اس کا منہ کھلا چھوڑا اور اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ ہاورڈ کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ شہباز اس کے ساتھ ایسا کوئی سلوک کرے گا۔ لیکن بہرحال شہباز کا بھی اپنا ایک مزاج تھا۔ ہاورڈ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ راہداری میں جو محافظ ٹہل رہا تھا، شہباز نے اسے روک کر پوچھا۔

''لیو ایلمر کا آفس کون سا ہے؟''

''وہ سر...... وہ...... اس طرف۔'' محافظ نے کہا اور کچھ اس طرح بدحواس ہوا کہ شہباز کے ساتھ ہی دوڑتا چلا آیا۔ پھر لیو ایلمر کے دروازے پر رک کر اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے۔''

لیکن شہباز نے اس کی بات نہیں سنی تھی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اور پھر اس نے کہا۔ ''اٹھو لیو ایلمر!''

لیو ایلمر جو ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا، ایک دم چونک پڑا۔ پھر وہ بھی بدحواسی سے کھڑا ہو گیا۔

''خیریت جناب؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' شہباز نے کہا۔

''کک...... کہاں؟''

''دیکھو......'' شہباز انگلی اٹھا کر بولا۔ ''میں سب سے پہلی رپورٹ حکومت میلیکو کو یہ پیش کروں گا کہ اس کے سفارتخانے کے افراد نے یہاں میرے ساتھ سب سے پہلی بداخلاقی کی اور عدم تعاون کیا۔''

''نہیں جناب! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے معاف کیجئے گا۔ کچھ ابتدا ہی غلط ہو گئی۔ ایسی بات نہیں۔ براہِ کرم آئیے۔ لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

شہباز برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''نیوالی سٹریٹ، اپارٹمنٹ نمبر تیرہ۔''

''اوہو...... سر! وہ تو زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمیں......''

''چلو جلدی کرو۔ اتنی دیر تم نے اس قسم کی باتوں ہی میں کر دی۔'' لیو ایلمر کو شاید شہباز کے مزاج کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ویسے مزاج شہباز کا بھی ایسا نہیں تھا۔ لیکن جس طرح ان لوگوں نے جن کے بارے میں اسے بتایا تھا کہ وہ ہر طرح کے تعاون کے ذمے دار ہیں، طریقے کار اختیار کیا تھا اس نے شہباز کو بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اور پھر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تھا جس نے اسے اس قدر برق رفتاری پر مجبور کر دیا تھا۔

بہرحال لیو کار کے پلاٹ پر آیا اور پھر اسی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا۔ سفارتخانے کے کچھ افراد حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ بہرحال لیو ایلمر تیز رفتاری سے کار چلا رہا تھا اور شہباز نے اپنا ریوالور سنبھال لیا تھا۔ یہ ریوالور اس نے بغلی ہولسٹر میں رکھا تھا اور اس کے بعد گائی کر کاؤنٹر نکال لیا تھا۔ لیو ایلمر کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے۔ شہباز جو کچھ کر رہا تھا وہ اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پھر دور سے نیوالی سٹریٹ کا علاقہ نظر آنے لگا۔ یہاں بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بہت سے ملٹری کے سپاہی موجود تھے۔ شہباز کو اپنے اس خیال کی تصدیق ہونے لگی جس کے تحت وہ ہاورڈ کے پاس سے اٹھ کر بھاگا تھا۔ لیو ایلمر بھی کچھ بڑبڑایا تھا۔ شہباز کے اشارے پر اس نے کار ایک طرف روکی تو شہباز نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اور بے تحاشہ اس طرف بھاگنے لگا۔

ایک ملٹری آفیسر نے چیخ کر کچھ کہا اور پھر تین چار افراد آگے بڑھے اور انہوں نے شہباز کا راستہ روک دیا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ اس وقت لیو ایلمر دوڑ کر قریب پہنچ گیا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" شہباز غرایا اور آفیسر کا چہرہ بھی بگڑنے لگا۔ لیکن لیو ہیلمر نے صورتحال سنبھالی۔

"نہیں آفیسر! نہیں۔ یہ بہت بڑی شخصیت ہیں۔ آپ انہیں اندر جانے کی اجازت ضرور دے دیں گے۔"

آفیسر پر اس کا اثر ہوا تھا۔ اس نے فوراً راستہ چھوڑ دیا اور شہباز فوراً عمارت کے دروازے کی جانب دوڑ پڑا۔ اچانک عمارت کا دروازہ کھلا اور دو بحری آفیسر دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ انہوں نے تابکاری کے اثرات کے بارے میں کچھ کہا اور انہیں بہت سے ملٹری کے نوجوانوں نے اپنے نرغے میں لے لیا۔

"کیا ہوا...... کیا بات ہے؟" لیو ہیلمر نے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ جس شخص نے اس سے یہ سوال کیا تھا اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور وہ آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ اس نے لیو ہیلمر پر ایک نگاہ ڈالی اور ہکلا کر رہ گیا۔

"اور یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے؟" لیو ہیلمر نے گھبرا کر کہا۔

"وہ...... وہ مر چکے ہیں...... دوسری منزل......" جیک نے بمشکل کہا۔ "پہلے والے کی طرح وہ ابھی گگ...... گگ...... گرم ہیں......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ لیکن شہباز سمجھ گیا گرم سے مراد ان کے جسم تابکاری اثرات کی لپیٹ میں ہیں۔ دفعتہً ہی شہباز کے حلق سے آواز نکلی۔

"ہیلمر! تمام افراد کو اس عمارت سے دور کر دو ورنہ قیامت آجائے گی۔" اور اس کے بعد شہباز برق رفتاری سے واپس پلٹ پڑا۔ اتنے سارے معاملات میں حصہ لینے کے بعد وہ اس قدر ذہین ہوگیا تھا کہ لمحوں کے اندر صورتحال کی نزاکتوں کو سمجھ لے۔ چنانچہ وہ بھاگ کر کار کی طرف دوڑا اور اس نے اپنے بیگ سے تابکاری سے محفوظ رکھنے والا لباس نکالا جو خصوصی طور پر اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے اس لباس کو پہن لیا۔ اور ایک بار پھر اس عمارت کی طرف آگیا۔ اس نے اپنا ماسک اپنے چہرے پر لگا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شہباز نے ہاتھ میں گائیگر کاؤنٹر سنبھالا اور اس عمارت میں داخل ہوگیا۔ گائیگر کاؤنٹر کی سوئی تابکاری اثرات کو فوراً ظاہر کر دیتی ہے اور اس کی شدت بھی فوراً ظاہر کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب شہباز دوسری منزل پر پہنچا تو کاؤنٹر پر لگی ہوئی سوئی سرخ

نشان تک جانے لگی اور گائیگر سے مدھم مدھم آوازیں نکلنے لگیں۔ شہباز جیسے جیسے ایک خاص سمت بڑھا، گائیگر کی سوئی خطرے کے نشان کی طرف بڑھتی ہی چلی گئی۔ تیرہ نمبر کے کمرے میں تین آدمی دکھائی دیئے۔ وہ مردہ حالت میں تھے۔ مگر سب کی حالت اس شخص سے بھی ابتر تھی جس کی تصویریں میلیکو میں دکھائی گئی تھیں۔ یعنی وہی شخص جو میلیکن سفارت خانے کے سامنے پراسرار انداز میں مرا تھا۔ شہباز کا دل سینے میں اس طرح پھڑ پھڑانے لگا جس طرح تڑپ کر باہر آجائے گا۔

ان کی کھوپڑیوں کے بال جھلس گئے تھے۔ آنکھیں اُبل گئی تھیں اور زبانیں باہر آگئی تھیں۔ جسم یوں مڑے تڑے پڑے تھے جیسے وہ گوشت پوست کی بجائے موم کے بنے ہوئے ہوں۔ شہباز انہیں سکتے کے سے عالم میں دیکھ رہ گیا تھا۔ لیکن پھر وہ ایک دم سنبھل گیا۔ اسے ہر قیمت پر اپنا کام کرنا تھا۔ وہ کام جس کے لئے اس پر بھروسہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ بیٹھ گیا اور ان کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ ان جیبوں میں سے چند سکے، رومال اور کنگھے برآمد ہوئے۔ ان تینوں میں سے ایک عورت بھی تھی جس کا پرس دائیں جانب پڑا ہوا تھا۔ شہباز نے گائیگر کو حفاظتی سوٹ میں ڈالا اور اس پرس کو کھول کر دیکھا۔ پرس میں سے میک اپ کی چند اشیاء برآمد ہوئیں۔ اس کے علاوہ ایک خط جو انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

شہباز نے یہ خط اپنی جیب میں رکھا اور ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس خط پر بھی تابکاری کے اثرات ضرور ہوں گے اور جو چھوئے گا اس کی حالت کم و بیش انہی لوگوں جیسی ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اس خط پر لکھے ہوئے پتے کو ذہن نشین کیا۔ پورا خط پڑھنے کی گنجائش کسی صورت میں نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ خط واپس اس کے پرس میں رکھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھا جب وہ اس طرف بڑھا تو گائیگر کاؤنٹر کی سوئی اپنی آخری حدوں کو چھونے لگی اور ڈائل پر لگا بلب جلنے اور بجھنے لگا۔ دروازہ بند تھا۔ شہباز نے اس کے قریب پہنچ کر ٹھوکر ماری تو بولٹ ٹوٹ کر ایک طرف جا پڑا اور دروازہ کھل گیا۔ اس نے دیکھا کہ اندر ایک ڈرم رکھا ہوا ہے اور ڈرم پر ایک عبارت لکھی ہوئی ہے۔ یہ عبارت ایک انتہائی سنسنی خیز عبارت تھی جو ایک خاص ملک کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ ایک تخریب کار ملک کی طرف......!

لیو ہیلمر خود تو اندر نہیں آیا تھا لیکن اس کے بعد مقامی حکومت کے ٹیکنیشن یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس عمارت کے قرب و جوار سے لوگوں کو ہٹانے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ اور اس کے بعد شہباز کے سوٹ کی صفائی کی گئی تا کہ جب وہ باہر آئے تو اس پر تابکاری کا اثر نہ ہو۔ البتہ عمارت میں مقیم افراد کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ مدر لینڈ کا مقامی سفیر جو میلیکو میں تھا، اسے ایمرجنسی کال پر ساری تفصیلات سے آگاہ کیا گیا اور فوراً اس نے دوسرے ممالک سے رابطہ قائم کیا اور تابکاری سے محفوظ رکھنے والے اداروں سے مدد مانگی کہ وہ جس قدر جلدی ہو سکے، مدر لینڈ پہنچ جائیں۔ اور اس عمارت میں رکھے ہوئے تابکاری مادے کو اپنے قبضے میں لے لیں تا کہ خوفناک حادثوں سے بچا جا سکے۔ اس دوران جو حادثے ہو چکے تھے، وہ انتہائی دہشت ناک اور سنسنی خیز تھے۔ بہرحال یہاں تک کی ساری کارروائی میں شہباز ایک چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے بعد کی صورتحال بالکل مختلف تھی اور اب یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی ضرورت۔ چنانچہ وہ لیو ہیلمر کے ساتھ وہاں سے واپس چل پڑا۔

لیو ہیلمر کے چہرے پر ایک عجیب سی دُکھ بھری کیفیت طاری تھی اور وہ بھی تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔ کچھ شہباز کا اپنا بدن چور چور ہو رہا تھا۔ بہت زیادہ بھاگ دوڑ تو نہیں کی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ محنت مشقت وہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن شاید یہ تابکاری کے ہی اثرات تھے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو بڑا تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔

آخر کار لیو ہیلمر نے کار سفارتخانے کے پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر روکی اور اس کا انجن بند کر دیا۔ شہباز کا اندازہ تھا کہ لیو ہیلمر پر بھی ویسی ہی تابکاری کی تھکن سوار ہے۔ وہ کار ہی میں بیٹھا رہا تو شہباز نے اس سے پوچھا۔

"کیا خیال ہے...... کیوں نہ ہم دونوں کار ہی میں سو جائیں؟ اس وقت تو بدن ہلانے کو

بھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"آہ...... واقعی، تابکاری کے اثرات کتنے خطرناک ہوتے ہیں اس کا اندازہ زندگی میں پہلی بار ہوا ہے۔" لیو ہیلمر کے لہجے میں ایک عجیب سی افسردگی جھلک رہی تھی۔

"ایسے افراد جو تابکاری کی زد میں آ جائیں، مشکل ہی سے زندہ بچتے ہیں۔"

"ہاں، وہ دونوں بحری افواج کے سپاہی جو اس اپارٹمنٹ میں گئے تھے، یقینی طور پر ان پر بھی ایسا ہی شدید اثر ہوگا۔" لیو ہیلمر کے لہجے میں ایک ایسی بے کسی اور عبرت تھی کہ شہباز چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"واقعی، وہ تمہارے ہم وطن ہیں۔ تمہیں یقیناً ان کے بارے میں تشویش ہوگی۔"

لیو ہیلمر کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بدستور افسردہ لہجے میں کہا۔ "صرف ہم وطن ہی نہیں، اور بھی کچھ ہیں۔" لہجہ ایسا تھا کہ شہباز چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے لیو ہیلمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور بھی کچھ سے تمہاری کیا مراد ہے...... کیا تمہارے کوئی عزیز، رشتے دار؟"

"ہاں...... رشتے دار بھی اور اس سے زیادہ کہیں۔ تم نے دوسرا لفظ ٹھیک کہا یعنی عزیز، دل جان سے عزیز ہے مجھے ان میں سے ایک شخص...... صرف ایک۔"

"کون ہے وہ تمہارا؟"

"بیٹا......"

اس نے سسکاری سی لے کر کہا اور شہباز کو یوں لگا جیسے اس کے سر پر کوئی پہاڑ سا ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ سکتے کی سی حالت میں لیو ہیلمر کو دیکھتا رہ گیا جو اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے آنسو بہا رہا تھا۔ لیکن لرزہ خیز بات تھی کہ اس کا بیٹا تابکاری اثرات کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیو ہیلمر نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"صرف اکیس سال کا تھا وہ۔ آہ...... میں کتنا بدنصیب ہوں۔ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا اور میں فقط خاموش تماشائی رہا۔ اس کے سوا اور کوئی......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا تھا؟"

اپنی آرام گاہ میں شہباز نیم دراز ہوگیا۔ واقعی ویسے تو جو ہولناک تباہی اس نے دیکھی تھی وہ بڑی دردناک تھی۔ لیکن ایک باپ اپنے بیٹے کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھتا رہ گیا اور کچھ نہ کر سکا۔ یہ بڑی دردناک صورتحال تھی۔ شدید دکھ کا باعث۔ نجانے وہ کس سوچ میں ڈوبا رہا۔ تبھی اسے رازل جریری کی آواز سنائی دی۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں کہ تم کس کیفیت کا شکار ہو۔ واقعی بہت دکھ بھرے مناظر تھے۔ میں خود بھی ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔''

شہباز چونک کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

''نہیں نہیں...... لیٹے رہو۔ اگر تم حیران ہو تو حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہارا باپ نہیں ہوں شہباز! لیکن یہ کہتے میں شرم بھی محسوس نہیں کرتا کہ تمہارے لئے اتنا ہی مضطرب رہتا ہوں جتنا کہ ایک باپ اپنی اولاد کے لئے۔ اور بعض اوقات جھنجھلا جاتا ہوں کہ آخر میں تم سے اتنا متاثر کیوں ہوگیا؟ یہ دنیا تو صرف لو اور دو کے حساب پر چلتی ہے۔ ویسے میرے اور تمہارے درمیان یہ حساب بھی اتنا ہی اسٹرونگ ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ مجھے لیو ایلر کے دُکھ کا بھی احساس ہے۔ بڑی مشکل بات ہے کہ میں نے کبھی ایک باپ کے دل کی گہرائیوں کو نہیں ٹٹولا۔ کیونکہ ان مرحلوں سے ہی نہیں گزرا۔ لیکن محسوس تو کر سکتا ہوں کہ انسان رشتوں کے بندھن میں کس طرح بندھا ہوتا ہے اور کیسے کیسے اسے مرنا ہوتا ہے۔ خیر تمہاری اب تک کی تمام کارروائیوں کو میں پوری طرح مانیٹر کرتا رہا ہوں۔ اپنے طور پر تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔ کچھ اور چیزوں کا بندوبست بھی کرنا ہے مجھے۔ لیکن یہاں نہیں، بلکہ ایمونہ جانے کے بعد۔''

''ایمونہ؟'' شہباز نے کسی قدر متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... یہاں تمہاری موجودگی بے مقصد ہوگئی ہے۔ تمہیں ایمونہ جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے...... وہاں جا کر مجھے کیا کرنا ہے؟''

''میں تمہیں بتاؤں کہ ایل سی ایم کو ایک خطرناک ملک کے نیوکلیئر انرجی ڈویژن سے اڑا دیا گیا ہے اور بہرحال تمہیں میلیکو کے لئے اس کا سراغ لگانا ہے۔ کیونکہ حکومت میلیکو ہم سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں شہباز! اگر صورتحال دبی نہ ہوتی یعنی اگر یہ سب کچھ ہمارے مقصد کے مطابق نہ ہوتا تو ہم اس قدر

دلچسپی نہ لے سکتے۔ لیکن انسانی زندگیوں کو لاحق خطرہ کہیں بھی اور کسی بھی طرف سے ہو، ہماری زندگی کا مقصد ہی یہی ہے۔ ایمونہ میں بھی لیو ایلر تمہاری مدد کرے گا۔ ویسے میں چاہتا ہوں کہ کسی کو تمہارے بارے میں علم نہ ہو سکے۔ خاص طور سے راسکو نظر نہ آنے والی آنکھوں سے ہماری بھرپور نگرانی کر رہا ہے۔ ہمیں خاص طور سے اس کی نگاہوں سے بچنا ہے۔''

غرض یہ کہ ایمونہ جانے کی تیاری ہوگئی لیکن اس کے لئے لیو ایلر کے ذریعے ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اور پہلے شہباز ایک طیارے کے ذریعے ایک اور ملک پہنچا۔ یہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسے ایمونہ پہنچنا تھا لیکن زیلیکون پہنچنے کے بعد نئے سرے سے کچھ تیاریاں کرنی پڑیں۔ زیلیکون وہ ملک تھا جہاں ایمونہ سے پہلے پہنچنا تھا۔ چنانچہ مدر لینڈ سے زیلیکون کا سفر تقریباً چھ گھنٹے کرنا پڑا اور آخر کار جب شہباز زیلیکون ایئرپورٹ پر اترا تو نیوی کے کمانڈر لائٹ بونڈ نے اس کا استقبال کیا۔ کچھ دیر کسٹم سے فراغت میں لگی اور اس کے بعد لائٹ بونڈ اسے لئے ہوئے وی آئی پی لاؤنج کی طرف چل پڑا۔ اس نے کہا۔

''مسٹر شہباز! آپ کے بارے میں مجھے بڑی تفصیلی اطلاعات دی گئی ہیں۔ میں خود ایک ایڈونچر پسند آدمی ہوں اور ایڈونچرز کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ آئیے ایک کپ کافی ہوجائے۔ وہیں میں آپ کو آگے کے منصوبوں سے آگاہ کردوں گا۔''

وی آئی پی لاؤنج میں کافی پی گئی اور لائٹ بونڈ اسے زیلیکون کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا۔ آخر کار تازہ دم ہونے کے بعد دونوں باہر نکل آئے۔ پارکنگ لاٹ میں ایک شاندار کار کھڑی ہوئی تھی۔ یہ نیوی کی اسٹاف کار تھی۔ شہباز کا سامان پچھلی سیٹ پر رکھ دیا گیا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''ایمونہ تک کے سفر کے بارے میں کیا انتظام کیا گیا ہے؟''

یہ بات تو آپ جانتے ہیں مسٹر لائٹ بونڈ! کہ میں مدر لینڈ سے ایمونہ تک براہِ راست پہنچ سکتا تھا لیکن یہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔ مجھے علم ہوا ہے کہ میرے لئے ایک ہیلی کاپٹر کا انتظام کیا گیا ہے۔''

''بالکل ٹھیک علم ہوا ہے آپ کو مسٹر شہباز! یہاں سے ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر آپ کو سمندر کی طرف لے جائے گا اور وہاں سے ایک آبدوز آپ کو ایمونہ کے ساحل پر چھوڑ

دے گی۔ ہمارے خیال میں یہ ایک انتہائی اطمینان بخش سفر ہوگا۔ کیونکہ اس طرح دشمن کو یا ان تخریب کاروں کو جو انسانی زندگیوں کے گاہک بنے ہوئے ہیں، آپ کی آمد کا پتہ نہیں چل سکے گا۔ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں۔''

''کیا آپ اس سفر کو اطمینان بخش سمجھتے ہیں؟''

''یقیناً......حکومت میلیکو نے جن جن لوگوں پر انحصار کیا ہے وہ غلط تو نہیں ہوں گے۔''

''خاص طور سے زیلیکون کی بات کریں آپ۔ زیلیکون ہمیشہ سے میلیکو کا دوست رہا ہے۔ ہمارے درمیان ہر طرح کے تعاون ہیں۔ دفاعی، تجارتی، ہر طرح کے تعاون۔ بہر حال جس آبدوز سے آپ کو لے جایا جائے گا وہ انتہائی شاندار ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہماری جدید ترین آبدوزوں میں سے ایک جس پر ہم اپنی سمندری حدود کے تحفظ کا انحصار کرتے ہیں اور بہت مطمئن ہیں۔''

''اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے مجھ آبدوز تک پہنچایا جائے گا؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''ہاں......آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''نہیں......اعتراض بالکل نہیں ہے۔''

''تو پھر......میرا مطلب ہے کہ آپ کے انداز میں ایک سوال تھا۔ میں یہ سوال ذرا تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔''

''آبدوز اس وقت کہاں ہے؟''

''سمندر میں تقریباً دو سو میل آگے۔''

''کوئی غیر ملکی جہاز تو اس طرف نہیں ہیں؟''

''بالکل نہیں۔ ویسے کھلے سمندر میں اگر کوئی جہاز آ بھی گیا تو ہمارے ہیلی کاپٹر کو پرواز کے دوران نہیں دیکھ سکے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے ریڈار وغیرہ......''

''وہ کیوں......؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''کیونکہ ہیلی کاپٹر نیچے پرواز کر جائے گا۔ اس کے علاوہ ہیلی کاپٹر سے آپ آبدوز میں رات کے وقت منتقل کئے جائیں گے۔ اس لئے دیکھ لئے جانے کا احتمال نہیں ہے۔''

''اور اس وقت ہم کہاں چل رہے ہیں؟'' شہباز نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تو لائٹ بونڈ بھی مسکرا دیا اور دلچسپی سے بولا۔

''ہوٹل میں آپ کے لئے انتظام کر دیا گیا ہے۔''

شہباز مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔

فائیو سٹار ہوٹل میں اس کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ حالانکہ قیام بہت مختصر تھا لیکن اسے ہوٹل میں ہر طرح کی آسائشیں دی گئیں اور اس کے بعد لائٹ بونڈ چلا گیا۔ پورا وقت شہباز کو آرام کے لئے دیا گیا تھا۔ ہر طرح کے آرام کا خیال رکھا گیا تھا جس کی ہدایت شاید لائٹ بونڈ نے خاص طور سے کر دی تھی بہر حال پھر بھی دن بڑا تھکا تھکا سا گزرا تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد ملٹری ایئر پورٹ جانا پڑا اور اس کا ذریعہ لائٹ بونڈ ہی تھا۔ ملٹری ایئر پورٹ سے ایک ہیلی کاپٹر ایک آبدوز تک لے گیا جہاں آبدوز کے کمانڈر نے اس کا استقبال کیا تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ کمانڈر نے اس وقت شہباز سے کوئی خاص سوال نہیں کیا بلکہ کہنے لگا۔

''میں چاہتا ہوں جناب! آپ آرام کریں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان بات ہو جائے گی۔ آیئے میں آپ کو کیبن تک پہنچا دوں جہاں آپ آرام کر سکتے ہیں۔''

کھانے کا بندوبست آبدوز پر ہی کیا گیا تھا لیکن اب یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کھانے میں کوئی نشہ آور چیز دے دی گئی تھی اسے یا پھر یہ صرف ایک اتفاق تھا۔ آبدوز کے مختصر سے کیبن میں کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ لیٹا تو پھر اسے دنیا کا ہوش نہیں رہا۔ آبدوز نے کتنی دیر تک سفر کیا اور اس دوران کیا کیا کچھ ہوا، اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب آبدوز کے کمانڈر نے اسے جگایا۔

''اٹھ جایئے جناب! ہم منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اس پُرسکون نیند سے جگایا لیکن ہمیں آگے بھی کام کرنا ہے۔ آیئے ذرا میں آپ کو دکھاؤں۔'' اور اس کے بعد وہ شہباز کو لے کر چپلی اسکوپ پر پہنچ گیا۔

''دیکھئے ذرا......اس سے دیکھئے۔'' اور شہباز نے ایمونہ کو دیکھا۔ ایمونہ گھن گرج اور کثیر دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ دو قوموں کی چپقلش کا شکار، کھنڈر میں تبدیل ہوتا ہوا۔ حالانکہ دنیا کے نقشے پر تھوڑے ہی عرصے قبل ایمونہ کو دنیا کی جنت کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ دنیا کی جنت عام طور پر کالے دھوئیں میں لپٹی رہا کرتی تھی۔ کمانڈر کی آواز سنائی دی۔

''ساحل پر پہنچ کر آپ کو جن چیزوں کی ضرورت پڑے گی مسٹر شہباز! براہ کرم اس کی

تفصیل بتادیجئے۔ کیونکہ ہمیں آپ کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"سب سے پہلی بات تو اس ساحل تک پہنچنے کی ہے۔ یہ آبدوز ساحل تک تو جانہیں سکتی۔ چنانچہ مجھے ایک ربڑ کی کشتی، سیاہ لباس اور اوزاروں کے تھیلے کی ضرورت پڑے گی۔ سیاہ لباس اس لئے ضروری ہے کہ مجھے دیکھا نہ جاسکے۔"

"آپ کی واپسی کب تک ہوگی؟"

"بس یوں سمجھ لیجئے کہ ساحل تک پہنچنے میں جتنا وقت لگے گا، واپسی پر بھی اتنا ہی وقت لگے گا۔"

"ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ہمیں آپ کا انتظار کرنا ہے۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ آپ کو سورج نکلنے سے پہلے واپس آنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے...... میں کوشش کروں گا۔"

"مگر ایک بات یاد رکھئے مسٹر شہباز! یہ بڑی صاف ستھری سی بات ہے کہ اگر ساحل پر کوئی خطرہ ہوا تو ہم لوگ آپ کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ کیونکہ ہمیں یہی ہدایت ہے۔ ہم اپنی قیمتی آبدوز کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔ ایسی صورت میں آپ کو خود وہاں سے نکلنا ہوگا۔"

شہباز نے کمانڈر کو گہری نگاہ سے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

"ان الفاظ کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔"

"نہیں، ٹھیک ہے۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ تمہیں اس بات کی اجازت ہے کہ اگر کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو یا مجھے بہت زیادہ دیر ہو جائے تو واپس جاسکتے ہو۔"

کمانڈر نے ٹوپی اتار کر گردن خم کر دی تھی۔

✿......✿

ربڑ کی کشتی چپوؤں کے ذریعے آگے بڑھنے لگی۔ ایمونہ کی سرد و گرم ہواؤں نے شہباز کا استقبال کیا۔ موسم سرد تھا اور کسی قدر خوشگوار لیکن اس میں بارود کی مہک تھی۔ شہر میں مشین گنوں کا شور جاری تھا اور لوگوں کی چیخ پکار سمندر تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن یہ لڑائی شہباز کے لئے آسانیاں بھی فراہم کر رہی تھی۔ البتہ ایمونہ کی اس کیفیت سے شہباز کو دلی دکھ ہوا تھا۔ انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے۔ انسان، انسان کا خون بہا رہا تھا۔

یہی تو اختلاف تھا اسلحہ اور تباہ کن ہتھیار بنانے والے ملکوں سے رازل جریری کا۔ اسے یہ بہتا ہوا خون دلی دکھ دیتا تھا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہی اس نے اپنی زندگی وقف کی تھی اور ساری دنیا سے جھگڑا مول لے لیا تھا۔ جو حادثہ پیش آیا تھا، وہی کم نہیں تھا۔ اور اسی کے اثرات کیا کم تھے کہ اس وقت یہ ہنگامہ آرائی اس کے لئے دُکھ کا باعث بن گئی تھی۔ بہرحال کشتی کا سفر جاری رہا۔ کوسٹ گارڈ اس لڑائی کی طرف متوجہ تھے اس لئے شہباز کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ شہر جو کسی زمانے میں دن اور رات جاگتا رہتا تھا اور جس کی راتیں جوان رہتی تھیں اس وقت سکوت اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ تمام رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ موت کا بازار گرم تھا۔ ہر طرف انسانی لاشیں اور ٹوٹی ہوئی عمارتوں کے کھنڈرات تھے۔ انسان خون پی رہا تھا۔ خون اور موت قہقہے لگا رہی تھی۔

ربڑ کی کشتی میں بیٹھنے سے پہلے آبدوز میں ہی ایمونہ کا نقشہ دیکھا جاچکا تھا چنانچہ وہاں کی تفصیل شہباز کے ذہن میں محفوظ تھی۔ اور جس پتے پر شہباز کو پہنچنا تھا وہ اس کے گلی اور کوچوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر چکا تھا۔ آخر کار وہ ساحلی علاقے پر پہنچ گیا اور پھر وہ اپنے ذہن میں ترتیب دیئے ہوئے نقشے کے مطابق آگے بڑھنے لگا۔ جس علاقے کی جانب اسے جانا تھا وہاں اس وقت لڑائی ہو رہی تھی۔ بہرحال اس نے خود بھی ریوالور ہاتھ میں سنبھالا اور ساحل کے علاقے سے آگے بڑھ آیا۔ تھوڑے فاصلے پر گوداموں کے احاطے بنے ہوئے تھے۔ وہ ان کی آڑ لیتا ہوا اس علاقے کی طرف چل پڑا۔ "سی گونا" نامی علاقہ مشرقی سمت کی طرف تھا اور یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے ۔ب۔ بہرحال جس شخص سے اسے ملنا تھا اس کا نام شارمن تھا۔ شارمن اور وہ روشیل اسٹریٹ پر رہتا تھا۔ روشیل اسٹریٹ اس وقت آگ اور دھوئیں کا ڈھیر بنی ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے تقریباً تمام عمارتوں سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھا۔ عمارتیں شکستہ ہو چکی تھیں اور ان میں سے کراہیں اور چیخیں برآمد ہو رہی تھیں۔ ہر عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے بس یہی احساس ہوتا تھا کہ بس اب گری پڑی اور تب گری۔

شہباز اس عمارت کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا رہا جہاں شارمن رہتا تھا۔ یہ شارمن وہی شخص تھا جس نے مدر لینڈ میں موجود لڑکی کو خط لکھا تھا۔ اس لڑکی کو جو تابکاری کے اثرات کا شکار ہو کر مر چکی تھی۔ بہرحال وہ عمارت کے سامنے پہنچ گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس

عمارت میں سامنے والے دروازے سے داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ کوئی بھی سپاہی اسے دیکھتے ہی گولی مار سکتا تھا۔ اس لئے اس نے ہنگامی سیڑھیوں کا استعمال کیا اور آخر کار ان سیڑھیوں کو عبور کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ چھت پر تھا۔ چھت پر پہنچنے کے بعد اسے زینے سے تیسری منزل پر پہنچنا تھا۔ چھت پر پہنچ کر اسے ایک کونے میں دبکنا پڑا۔ بہرحال تھوڑا سا ماحول کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا اور اپنا سانس بھی درست کرنا تھا۔ ابھی وہ نیچے جانے کے لئے زینے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اس نے چھت کے دوسرے سرے پر روشنی کا ایک نقطہ دیکھا۔ یہ نقطہ حرکت کر رہا تھا۔ شہباز ٹھٹک کر رک گیا۔ دوسری بار نقطے نے پھر حرکت کی جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ چھت پر کوئی شخص موجود ہے اور سگریٹ پی رہا ہے۔ شہباز تاریکی میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔ پھر اسے عمارت کی چمنی دکھائی دی۔ سپاہی اس کے قریب کھڑا تھا۔ شہباز کے پورے جسم نے پسینہ چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی سانس روکی اور اندازہ لگانے لگا کہ سپاہی تک پہنچنے میں کیسی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ اسے اپنے راستے سے ہٹائے بغیر وہ نیچے جانے اور پھر واپس آنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سانس روکا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے انتہائی احتیاط برتی اور اس کی پشت پر پہنچ گیا۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے چھت پر سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر چھت کے درمیان پھینک دیا۔

سپاہی چونک پڑا۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے سگریٹ نکال کر چھت پر پھینکی اور اسے بوٹ سے مسلنے کے بعد آواز کی سمت بڑھا۔ اسی وقت شہباز نے پھر ایک آہٹ پیدا کی اور سپاہی ایک دم مڑ گیا۔ شہباز پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی اسٹین گن سیدھی کی لیکن شہباز اسے کوئی مہلت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنا لمبا چاقو لباس سے نکال کر مٹھی میں دبایا اور اس کے بعد بجلی کی سی تیزی سے اس پر پل پڑا۔ وہ اپنی اسٹین گن کے ٹرائیگر کو نہیں دبا سکا تھا کہ شہباز کا تیز دھار چاقو اس کے نرخرے میں اتر گیا۔ اس کے حلق سے ایک خرخراتی سی آواز نکلی اور وہ لہرا کر چھت پر گرنے لگا۔ لیکن شہباز نے پھرتی سے اسے سنبھال لیا اور احتیاط سے چمنی کے پیچھے ڈال دیا۔ شہباز نے اس کی دونوں ٹانگوں پر اپنے پاؤں رکھ دیئے تھے تاکہ اس کے تڑپنے سے آواز نہ پیدا ہو۔ اس کے بعد اس کا بدن

ساکت ہو گیا اور شہباز کو محسوس ہوا کہ وہ زندگی سے دور ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ جھکا اور اس نے اس کے لباس کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ مگر کوئی قابل ذکر چیز ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ شہباز نے چاقو کا پھل اس کے کپڑوں سے صاف کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ یہ پہلا اور آخری خطرہ تھا جو نیچے جانے میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ زینے کی جانب بڑھ گیا۔ زینے طے کر کے جب وہ تیسری منزل پر پہنچا تو منزل سنسان پڑی ہوئی تھی۔ راہ داری میں ایک ملگجا سا بلب لگا ہوا تھا۔ شہباز نے گائیگر کاؤنٹر نکال کر پہلے ہی اطمینان کر لیا کہ یہاں تابکاری کے اثرات تو نہیں ہیں؟ کائیگر کی سوئی نے بتایا کہ یہ علاقہ کلیئر ہے۔ چنانچہ شہباز نے ریوالور نکال کر دائیں ہاتھ میں لیا اور آخر کار وہ شارمن کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے شارمن کے اپارٹمنٹ کا دروازہ دبانے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت اس کے برابر والے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک شخص باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور دبا ہوا تھا۔ اور اس نے ریوالور کی نال سیدھی کر کے ٹریگر پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ شہباز کے ریوالور نے پے در پے دو شعلے اگلے اور وہ کرب ناک حالت میں بل کھاتا ہوا راہداری میں گر پڑا۔ چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔ شہباز کی چلائی جانے والی گولیوں میں سے ایک اس کے سینے اور دوسری اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ ماتھے سے بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو نہایت ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ اچانک ایک آواز سنائی دی۔

''سیڈ مین...... سیڈ مین...... کہاں ہو تم؟''

یہ آواز راہداری کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ پھر کسی کے اندھا دھند دوڑنے کی آواز سنائی دی اور وہ اس طرف دوڑ پڑا تھا۔ بہرحال اب شہباز کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان وحشی درندوں کو جو موت کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں، بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دے۔ چنانچہ ایک بار پھر اس کے ریوالور نے شعلہ اگلا اور ایک اور زندگی کو چاٹ لیا۔ البتہ اب صورتحال ذرا سنگین ہو گئی تھی۔ شہباز کو پتہ تھا کہ فائرنگ کی آواز باہر تک گئی ہوگی اور بس چند ہی منٹوں بعد اپارٹمنٹ میں فوجی بوٹوں کی دھمک گونج رہی ہوں گی۔ اس کے لئے اس کے پاس صرف چند لمحے تھے۔ اور ان چند لمحوں میں اسے اپنا کام نمٹا لینا تھا۔

چنانچہ اس نے جھک کر مرنے والے آدمی کی جیب کی تلاشی لی۔ اس کی اندرونی جیب سے سیکرٹ سروس کا شناختی کارڈ ملا۔ بہر حال اس مشن میں اس شخص کا کیا کردار تھا، یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شہباز نے اس کا شناختی کارڈ اپنی جیب میں رکھا اور پھرتی سے شارمن کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ اپارٹمنٹ کی حالت بے حد ابتر تھی۔ صوفے الٹے پڑے تھے۔ میز کی درازیں اوندھی پڑی تھیں۔ وال پیپر دیواروں سے نوچ لیا گیا تھا۔ ایک نگاہ دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کی اچھی طرح تلاشی لی گئی ہے۔ وہاں دو لاشیں بھی نظر آئیں جو ایک مرد اور ایک عورت کی تھیں۔ ان کی جسمانی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان پر تشدد کیا گیا ہو۔ ظاہر ہے یہ کام انہی ایجنٹوں نے کیا ہوگا۔ شہباز اس پے در پے ہنگامی کیفیت سے خاصا جذباتی ہو گیا تھا لیکن بہر حال جو ذہنی ہیجان اس پر طاری تھا اس کے تحت صرف ایک ہی ترکیب تھی۔ کام کرے اور برق رفتاری سے کام کرے۔ آبدوز اس کی منتظر تھی۔ ورنہ اس کے بعد اسے جن حالات کا سامنا کرنا پڑتا شاید خود بھی وہ اس کے ذہن میں واضح نہیں تھے۔

بہر حال ان دونوں کی تلاشی سے کوئی قابل ذکر چیز ہاتھ نہیں لگی تھی۔ وہ واپس آیا اور راہداری کے دوسری طرف پڑے ہوئے ایجنٹوں کی تلاشی لینے لگے۔ ایک ایجنٹ کی جیبیں تو اس نے دیکھی تھیں۔ جن سے اسے ایک شناختی کارڈ ملا تھا۔ لیکن دوسرے ایجنٹ کی جیب سے ایک لمبا سا لفافہ برآمد ہوا۔ اس لفافے میں کچھ دستاویزات رکھی ہوئی تھیں۔ بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ آبزویٹری کے پاس تھے۔ ایسے پاس جن کے ذریعے نیوکلیئر ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ یہ پاس انتہائی خوفناک اہمیت کے حامل تھے کیونکہ ان سے ایک ملک کی ایٹمی طاقت کا پتہ چلتا تھا۔ یہ بات بھی ظاہر ہو گئی تھی کہ ایل سی ایم کی پیکنگ نیوکلیئر ڈیپارٹمنٹ سے باہر کیسے لائی گئی۔ تعجب کی بات تھی، پتہ نہیں ان ایجنٹوں کا تعلق کون سے ملک سے تھا۔ اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت نہیں ہو پا رہا تھا۔ لیکن یہ سوچا جا سکتا تھا کہ یہ ایجنٹ اس وقت ان پاسوں میں دلچسپی لے سکتے تھے جبکہ یہ پاس انہی لوگوں نے مہیا کئے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ انہیں حاصل کر کے ضائع کرنا چاہتے ہوں گے تا کہ اس معاملے میں ان کی موجودگی کا سراغ نہ لگ سکے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ ایل سی ایم کو نیوکلیئر ڈیپارٹمنٹ سے نکلوا کر اس کی پیکنگ توڑنا، پھر

اسے جہاز پر لادنا ان کے حق میں کیونکر سود مند ہو سکتا تھا۔

جہاز پر تابکاری کے اثرات پھیلانے سے انہیں کیا مل جاتا۔ کیا فائدہ ہو سکتا تھا تیل کے اس جہاز کو تباہ کرنے سے۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ گلی میں کسی ٹرک کے رکنے کی آواز آئی اور پھر چند آدمی چیخ چیخ کر کچھ کہتے سنائی دیئے۔ شہباز نے ان پاسوں کو لفافے میں رکھا اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں اڑستا ہوا زینے کی طرف بھاگا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ چھت پر تھا۔ اسے صاف محسوس ہو گیا کہ بہت سے افراد عمارت میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اس عمارت کی چھت دوسری عمارتوں سے ملی ہوئی تھی۔ شہباز برابر والی عمارت کی چھت پر پہنچا پھر وہاں سے تیسری چھت پر اور اس کے بعد یہاں سے وہ نیچے اترنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ نیچے پہنچا تھا۔ عمارت میں اس سے زیادہ ایک لمحے کے لئے بھی رکنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ بہر طور کسی نہ کسی طور نیچے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی وہی جمناسٹک کام آئی تھی۔

عمارت سے نیچے اترنے کا براہِ راست کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کی تیز نگاہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر اس بلند چھت سے جو تیسری منزل کی چھت تھی اس کھڑکی کے سامنے نکلے ہوئے چھجے پر قدم جمائے جائیں اور اس چھجے سے اس روشن دان کے شیشے کے فریم کو جو کھلا ہوا تھا اور جس کے بارے میں نہیں معلوم تھا کہ اس کے دوسری طرف کیا ہے۔ پھر اس فریم سے نچلی منزل کی گیلری میں اور پھر اس گیلری سے بالکل اسی طرح کھڑکی کے چھجے اور روشن دان کو اپنے لئے کارآمد بنایا جائے۔ دیکھنے والے اگر اسے دیکھتے تو کسی فلم کا منظر سمجھتے جیسے اسپائیڈر مین یا سپر مین خلاء میں چھلانگیں لگاتے نظر آتے ہیں، ایک انسان کو حقیقی طور پر ایسا دیکھنے کا یہی لمحہ تھا۔ حالانکہ اس جمناسٹک کو استعمال کئے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا اور شہباز کو اس کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن اس وقت اس نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ عمل دوہرایا تھا۔ وہ اپنے وزن کو بالکل بے وزن کرنا جانتا تھا۔ یہ ایک تکنیک تھی۔ جھولوں پر کام کرنے کی۔ گلباز نے اپنے بیٹے کو جھولوں پر کام کرنے سے روکا تھا۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو واقعی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لختِ جگر کو موت سے کھیلتے نہیں دیکھ سکتا۔ بے چارے ایلمر نے جس طرح اپنے بیٹے کو تابکاری کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا تھا، یہ اس کا دل گردہ تھا۔ ایک باپ نہ ہونے کے باوجود شہباز اس کی کیفیت

کو سمجھ سکتا تھا۔ بڑی ہمت اور بڑے دل والے لوگ ہوا کرتے ہیں اور سب کچھ کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ شہباز کو اس کے دل کا حال معلوم تھا۔ بہر حال یہ اندازہ اسے پہلی بار ہوا کہ انسان اگر اپنے آپ کو باعمل رکھے تو کوئی بھی ایسا کام جو اس کے لئے اتنا فائدہ مند ہوتا ہو، بھولنے والا کام نہیں ہوتا اور وہ زندگی کے کسی دور میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح نیچے اترا اور اس کے بعد جیٹی کی طرف چل پڑا۔ اس کے ذہن میں لاتعداد خیالات تھے۔ جیٹی پر اسے چند سپاہی مصروف دکھائی دیئے۔ شہباز نے ایک بڑے کریٹ کی آڑ میں ہو کر ان کا جائزہ لیا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ شہباز کی ربڑ کی کشتی پانی سے نکال رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں اس کی موجودگی کا پتہ چل گیا ہے۔ اور اس کے بعد شہباز کے لئے نکل جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ اگر شہباز ریوالور نکال کر فائرنگ کرتا تب بھی ناممکن تھا کہ ان سب کو ایک ہی وقت میں ہلاک کر دیتا۔ ایسی کوشش پر وہ اپنے ساتھیوں کے مرنے کے بعد مزید کمک منگوا لیتے اور شہباز کے لئے وہاں سے نکل جانا ممکن نہیں ہوتا۔ واقعی اس وقت اسے ایک چوہے کی موت مرنا پڑتا۔

اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اس بات کا اعتراف نریمان فرازی نے بھی کیا تھا کہ شہباز جب دماغ کا استعمال کرتا ہے تو وہ اس کے جسم کے استعمال سے کسی قدر کم نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں اور پھر اس نے فرار کا ایک راستہ دریافت کر ہی لیا۔ راستہ یہ تھا کہ وہ کسی اور موٹر بوٹ پر قبضہ کرتا اور بے تحاشا سمندر کی طرف بھاگ نکلا۔ اس بات کے سو فیصدی امکانات تھے کہ وہ یقیناً شہباز کا تعاقب کرتے۔ لیکن اس دوران وہ آبدوز والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو جاتا اور پھر اس میں بیٹھ کر فرار ہو جاتا۔ ایئر پورٹ یہاں سے کافی دور تھا اور پھر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہاں اسے کوئی ہوائی جہاز مل جاتا۔ اور ویسے بھی یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ بہر حال وہ یہاں سے پیچھے کھسک گیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر جیٹی کی طرف چل پڑا۔ اس نے ایک سنسان ساحل کا انتخاب کیا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی جہاں روشنی بھی کم تھی اور وہاں کسی پہریدار کی نگاہ میں آنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے ایس ٹائپ کی ایک اسپیڈ بوٹ مل گئی۔ بوٹ کے اگنیشن

میں چابی لگی ہوئی تھی اور اس پر سوٹ کیس لدے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہاں سے کوئی رات کی تاریکی کا سہارا لیتے ہوئے فرار ہونا چاہتا ہو۔

شہباز نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور اس کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے سمندر کی طرف موڑ دیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد پتہ چلا کہ بوٹ کے پیندے میں سوراخ ہے اور اس میں سے آہستہ آہستہ پانی اندر آ رہا ہے۔ یہ نئی افتاد تھی۔ لیکن اسے ہی ایڈونچر کہتے ہیں۔ شدید ترین مشکلات میں بھی ہوش و حواس پر قابو رکھنا اور اس کے بعد اپنے لئے مناسب راستے تلاش کرنا یہی ایک ایڈونچرس کام ہوتا ہے اور مہم جوئی اسی کا نام ہے۔ چنانچہ شہباز نے فوراً ہی لائیو جیکٹ پہنی اور بوٹ کی رفتار بے پناہ تیز کر دی۔ بوٹ کا گلا حصہ اوپر اٹھ گیا اور وہ اچھلتی ہوئی سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن پانی تیزی سے اندر آ رہا تھا اور بوٹ پانی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ شہباز نے بوٹ کا اسٹیئرنگ چھوڑ دیا اور یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ اب بوٹ ڈوبنے ہی والی ہے، پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس نے چند لمحوں کے بعد پانی کی سطح پر تیز روشنی پڑتی دیکھی۔ دو گن بوٹس سرچ لائٹ روشن کئے تیزی سے اس طرف آ رہی تھیں اور ان کے ڈیک پر مشین گن بردار مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ ایک خوفناک لمحہ قریب تر آ گیا تھا اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اگلا منظر کیا ہو۔ شہباز کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ اس کی جیب میں نیوکلیئر ڈیپارٹمنٹ کے پاس رکھے ہوئے تھے جن سے یہ بھی ثابت ہو سکتا تھا کہ اس نے وہاں سے ایل سی ایم چرایا ہے۔ بہر حال یہ سب کچھ اب فیس کرنا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دونوں کشتیاں شہباز کے اطراف میں پہنچ گئیں اور اسے روشنی کی زد میں لے لیا گیا۔ اور اس کے بعد اسپیکر پر ایک آواز ابھری۔

”خبردار......زندگی چاہتے ہو تو خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“

اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ شہباز ان کی ہدایت پر عمل کرے۔

✿......✿

شہباز گرفتار ہو گیا۔ بوٹ کا کمانڈر اس کے حق میں پتہ نہیں کیوں بہتر ثابت ہوا۔ اس نے شہباز کو خشک لباس دیا اور غیر ضروری سوالات نہیں کئے۔ سوال و جواب کے لئے اس نے شاید اپنے افسروں کی ذمہ داری سمجھ لی تھی۔ جب بوٹ ساحل پر رکی تو اسے ایک کار کی

طرف لے جایا گیا۔ کار سے دو آدمی سادہ لباس میں اترے تھے جنہیں بوٹ کمانڈر نے سلیوٹ کیا اور پھر اس نے شہباز کے لباس سے برآمد ہونے والے پاس اس کے حوالے کئے اور بولا۔

"ہم نے اسے پانی سے اٹھایا ہے اس لئے یہ دستاویزات اور پاس گیلے ہو گئے ہیں۔ تاہم ابھی یہ قابل مطالعہ ہیں۔ انہیں دیکھ کر آپ کو صورتحال کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"اوکے......" آفیسر نے کہا اور شہباز کو کار کی طرف دھکیلنے لگا۔

"اس کے علاوہ اس کے قبضے سے ایک بغیر نمبر کا ریوالور اور ایک تیز دھار چاقو برآمد ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... ہم اسے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ بولا۔ شہباز اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا اور دوسرے آدمی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جب کار وہاں سے آگے نکلی تو شہباز کے برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شہباز۔"

"کس کے لئے کام کرتے ہو؟"

"میلیکو اٹامک انرجی کمیشن کے لئے۔ ویسے دوست! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مجھے میرے سفارتخانے کی طرف لے چلو۔ ہم لوگوں کے درمیان بہت اچھی گفتگو ہو سکتی ہے۔"

"پہلے ہم تمہارے ساتھ کچھ محبت بھری باتیں کریں گے اور اس کے بعد......" اس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا اور پھر بولا۔ "ویسے تم نے سب سے پہلے یہ بتانا ہے کہ تم ایمونہ میں کیا کر رہے تھے؟ اور یہ دستاویزات تم تک کیسے پہنچیں؟"

"یہ تم نہیں پوچھ سکتے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم نے مجھے اپنے ملک کی سرحد سے گرفتار نہیں کیا ہے۔"

"تمہارے پاس سے ہمارے ملک کی ملٹری کے کاغذات دستیاب ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں حق ہے کہ تمہارا منہ کھلوائیں۔"

"ٹھیک ہے...... تم مجھے نیوسٹربٹ لئے جا رہے ہو۔ اور وہاں تمہاری انٹیلی جنس کا ہیڈ

کوارٹر ہے۔"

"ایں......؟" برابر بیٹھے ہوئے شخص نے شدید حیرت کا اظہار کیا اور پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر شدید حیرت کا حملہ ہوا ہو۔ شہباز نے کہا۔

"میں انٹیلی جنس چیف مسٹر ڈاٹ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

شہباز کو یہ تفصیلات رازل جریری کی طرف سے ہی معلوم ہوئی تھیں۔ انٹیلی جنس کے چیف ڈاٹ کے بارے میں گنے چنے چند افراد کو معلوم تھا کیونکہ ایسے افراد کے نام صیغۂ راز میں رہتے تھے لیکن شہباز کے ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر نکلا۔ برابر بیٹھا ہوا شخص ایک دم ہکا بکا ہو گیا تھا۔ کم از کم اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کا سابقہ کسی غیر اہم شخصیت سے نہیں پڑا ہے اور وہ شہباز کے ساتھ عام مجرموں جیسا برتاؤ نہیں کر سکتا۔ بہر حال وہ شہباز کو انٹیلی جنس کے عقبی دروازے سے اندر لے گئے اور وہاں اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑیاں نکال دی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شہباز جانتا تھا کہ وہ اعلیٰ افسران سے رابطہ قائم کر رہے ہوں گے اور یہ سوال کر رہے ہوں گے کہ یہ شخص ایمونہ کے ساحل پر کیا کر رہا ہے۔ اس وقت ہنگامہ ہونے کی زیادہ توقع تھی جب انہیں پتہ چلتا کہ ملٹری کے پاس جعلی ہیں اور صرف نیوکلیئر اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

بہر حال ڈاٹ کو غالباً اطلاع ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ ایک چالاک اور چاک و چوبند آدمی تھا۔ مگر اس وقت اس کے چہرے کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ ٹائی گلے میں ڈھیلی ہو کر جھول رہی تھی۔ بال منتشر تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی میز پر ایک سفری بیگ اچھال دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صبح بخیر!"

شہباز اب بالکل پُرسکون تھا۔ نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ رازل جریری کا پراسرار وجود اس کے آس پاس ہی موجود ہے۔ بہر حال ڈاٹ نے اپنے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور بولا۔

"اس بیگ میں تمہارے ناپ کے کپڑے ہیں۔ ایک نیا پاسپورٹ ہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک فلائٹ جائے گی۔ تمہیں اس سے جانا ہے۔"

"اور ملٹری پاس؟"

"ان کا مطالبہ مت کرو۔ اور ایک بات اور سن لو۔ آئندہ اس ملک کا رخ نہ کرنا اور ہمارے کسی آدمی کے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔ سمجھ گئے ناں بات؟"

شہباز کی آنکھیں شدتِ حیرت سے چڑھ گئی تھیں لیکن اچانک ہی اس کے کان میں کسی مچھر کی سی بھنبھناہٹ سنائی دی۔

"موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرو۔" آواز رازل جریری کے علاوہ کسی اور کی نہیں تھی۔ بہرحال بات ابھی تک واقعی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر شہباز کے ساتھ بہتر سلوک کیا گیا اور اسے زیلیکون پہنچا دیا گیا۔ زیلیکون میں اس کی آمد کی اطلاع وہاں کے اعلیٰ حکام کو بھی دے دی گئی۔ لیکن جب شہباز نے طیارے سے باہر قدم نکالا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ لائٹ بونڈ پر پڑی تھی۔ لائٹ بونڈ اس وقت پہلے سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور اس نے شہباز سے اس یگانگت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا جس یگانگت سے وہ پہلے اس کے ساتھ پیش آتا رہا تھا۔ عمارت سے باہر نکل کر شہباز نے لائٹ بونڈ سے کہا۔

"اگر ممکن ہو سکے تو تم مجھے میلیکن سفارتخانے پہنچا دو۔"

"سوری، یہاں سے میں آپ کو ایئر ہینگر تک لے جاؤں گا۔ مجھے آپ کے بارے میں یہی حکم ملا ہے۔" لائٹ بونڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مگر یہ حکم کس نے دیا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب صرف اتنا سا ہے جتنا میں نے آپ سے کہا مسٹر شہباز!" وہ بولا اور شہباز نے خاموشی اختیار کر لی۔ رازل جریری نے اس سے یہی کہا تھا کہ حالات سے سمجھوتہ کر لے۔ بعد میں صورتحال اپنے قابو میں لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ لائٹ بونڈ نے شہباز کو ہینگر کے نزدیک اتارا جہاں ایک ہیلی کاپٹر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"شکریہ مسٹر لائٹ بونڈ! واقعی آپ بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔"

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اس کے بعد شہباز ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا۔

ہیلی کاپٹر میں اس نے پائلٹ کی سیٹ پر جس شخص کو دیکھا، حیران رہ گیا۔ یہ نریمان فرازی تھا۔ مکمل طور پر نریمان فرازی جس نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"میں بخوبی ہیلی کاپٹر اڑا سکتا ہوں۔"

شہباز کے منہ سے دیر تک آواز نہیں نکل سکی تھی۔

"آؤ...... جلدی اندر آ جاؤ۔" وہ محبت بھرے انداز میں بولا۔

شہباز نے ایک گہری سانس لے کر ہیلی کاپٹر میں قدم رکھ دیا۔ واقعی نریمان فرازی ایک بہترین پائلٹ تھا۔ وہ بولا۔

"رازل جریری کو اس وقت کسی مقامی آدمی پر بھروسہ نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے یہاں پر بلا لیا۔"

"کیا تم پہلے سے یہاں کچھ کام کر رہے تھے؟"

"ہرگز نہیں۔ ایمرجنسی میں یہاں آیا ہوں۔ اور میرا خیال ہے مجھے فوراً یہاں سے چلے جانا پڑے گا۔ اس کی اجازت مجھے مل چکی ہے۔"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"اس آبدوز تک جس میں تم سفر کر چکے ہو۔"

"اوہ میرے خدا......" شہباز نے کہا۔ ہیلی کاپٹر نے زمین چھوڑ دی تھی۔ چند لمحات وہ خاموش رہا۔ پھر وہ بولا۔ "آبدوز اس وقت کہاں ہے؟"

"لائیوونگ کے ساحل پر۔ ویسے تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے ہو۔"

"ہاں یار! بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ آبدوز میں تمہیں کافی آرام کرنے کا موقع ملے گا۔" نریمان فرازی نے کہا۔ درحقیقت شہباز، نریمان فرازی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ زیادہ تر رازل جریری ان مہمات میں شہباز کو ہی استعمال کر رہا تھا، کسی اور شخص کو جو اس کے اپنے آدمیوں میں سے کوئی ہو، وہ پہلی بار لایا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ ہیلی کاپٹر کا سفر ہو۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی گڑگڑاہٹ کی وجہ سے حلق پھاڑ کر بات چیت کرنا پڑ رہی تھی اس لئے شہباز نے خاموشی اختیار کر لی۔ کھلے سمندر تک خاموشی رہی اور اس کے بعد آبدوز نظر آنے لگی۔ آبدوز کے اوپر پہنچ کر پہلے اس کی سیڑھی سے شہباز کو نیچے اتارا گیا اور اس کے بعد ہیلی کاپٹر واپسی

کے لئے مڑ گیا۔

شدید حیرت سے شہباز کا دماغ اب تک چکرا رہا تھا۔ چنانچہ آبدوز میں کمانڈر نے اس کا استقبال کیا اور معذرت کی کہ وہ ایمونہ کے ساحل سے اسے نہیں اٹھا سکا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایمونین گن بوٹوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا۔ بہرحال کمانڈر نے اس کے لئے چائے وغیرہ کا بندوبست کیا اور پھر بولا۔

”میرا خیال ہے اب تم آرام کرلو۔ باقی سب کچھ بعد میں۔“

”ہاں...... میں اس کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“ شہباز نے جواب دیا۔

✿......✿

شہباز کو دنیا و مافیا کی کوئی خبر نہیں رہی تھی۔ لیکن بہرحال آدھی رات کے قریب آبدوز سطح سمندر پر ابھر آئی۔ وہ اس وقت بحری جہاز ٹرانسلیور کے متوازی چل رہی تھی۔ اس وقت شہباز کو جگایا گیا اور جب وہ پوری طرح ہوش وحواس قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو اسے رازل جریری کا پیغام دیا گیا جو اس وقت درحقیقت میلیکو کے لئے ایک اہم شخصیت بنا ہوا تھا۔ چنانچہ رازل جریری کی ہدایت کے مطابق شہباز کو تیاریاں کرنا پڑیں اور اس کے بعد اس کے جسم پر ربڑ کا لباس اور تمام ضروری چیزیں آویزاں ہو گئیں۔ ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر اسے دیا گیا تاکہ وہ آبدوز سے رابطہ رکھ سکے۔ تابکاری اثرات معلوم کرنے کا آلہ اور تھوڑا سا اسلحہ جو ایک ہلکی اسٹین گن اور چند دوسری چیزوں پر مشتمل تھا اس کو دی گئیں۔ اس کے سپرد جو ذمہ داری کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اسے ٹرانسلیور کے عملے پر قابو پانا ہے۔ بہرحال جہاز کی طرف ایک لمبا سا رسہ پھینک دیا گیا۔ اس کے اگلے سرے پر ایک فولادی کانٹا بنا ہوا تھا جو پہلی ہی کوشش میں کہیں جا کر پھنس گیا۔ اس کے بعد کمانڈر نے کہا

”میرے علم میں یہ بات آئی ہے مسٹر شہباز! کہ آپ ایک بہترین جمناسٹر ہیں اور آبدوز سے بحری جہاز کے ہنگامی سفر کا یہ تجربہ میں نہیں جانتا کہ آپ نے کبھی زندگی میں کیا ہے یا نہیں۔ لیکن آج یہ تجربہ آپ کو کرنا پڑ رہا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ جہاز کے عملے کو آپ کی موجودگی کا پتہ نہ چلے۔ ہم آبدوز کو زیادہ گہرائی میں نہیں رکھ رہے تاکہ کسی بھی مشکل حالت میں آپ کے ساتھ تعاون کر سکیں۔ اب آپ اپنے سفر کا آغاز کیجئے۔“

شہباز تیار ہو گیا اور ایک لمحے کے اندر اس نے سمندر کا جائزہ لیا۔ پانی اور تاریکی تیز

اٹھتی لہروں کو نمایاں کر رہی تھی اور لہریں جیسے اسے ہڑپ کرنے کے لئے بے تاب ہوں۔

بہرحال ایک بار پھر اسے جسمانی مشقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اگر ذرا سی چوک ہو جاتی تو پانی کی گہرائیاں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمندر کی آغوش میں گم کر دیتیں۔ اس نے رسہ پکڑ کے ہلکی سی جست لگائی تو جا کر جہاز کے پیندے سے ٹکرائی اور اس کے بعد اس نے فوراً ہی اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔ اوپر چڑھنا اتنا ثابت نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ طوفانی ہواؤں کے جکڑ اسے تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر پٹخ رہے تھے۔ اور جیسے جیسے وہ اوپر چلتا جا رہا تھا، ہوا کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کئی بار تو اسے یوں لگا جیسے اس کے بازو اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے۔ جہاز کی بلندیاں جیسے آسمان سے جا ملی تھیں۔ جب بھی اوپر نگاہ اٹھاتا جیسے ابھی اسے میلوں اوپر چڑھنا ہے۔ بہرحال جسمانی مشقت میں وہ بے مثال تھا اور ایسے ایسے کارنامے دکھا چکا تھا کہ لوگ سینے پر ہاتھ رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن اس وقت کی صورتحال بہت مشکل تھی۔ کھلے سمندر میں چلنے والی ہواؤں کا اندازہ کسی ایسے شخص کو ہی ہو سکتا ہے جس نے ان ہواؤں سے مقابلہ کیا ہو۔ بہرحال وہ اپنی پوری جسمانی قوت صرف کر کے اوپری ڈیک تک پہنچ ہی گیا اور ڈیک تک پہنچ کر اس نے فولادی کانٹا ریلنگ سے نکال کر وہیں سمندر میں پھینک دیا اور خود ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گیا۔ اسے اپنے حواس بحال کرنے کے لئے کچھ لمحے درکار تھے۔

بہرحال ٹرانسلیور کا نقشہ اس کے ذہن میں تھا اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا ہے اور یہاں سے ساٹھ فٹ نیچے تک سیڑھیاں چلی گئی ہیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک راہداری تھی جو ایل ڈیک تک پہنچا دینے میں معاون ثابت ہوتی۔ بہرحال شہباز نے وقت ضائع نہیں کیا اور سیڑھیوں کے اختتام تک پہنچ کر ایل ڈیک پر آ گیا۔ سیڑھیاں بھی پھسلوان اور تاریک تھیں۔ ایل ڈیک سے تھوڑی دور آگے جانے کے بعد اسے بہت سے پائپ ملے۔ شاید وہ ٹینک سے نکل کر پیچھے کی طرف کو گئے تھے۔ اس جگہ کو عبور کرنے کے بعد وہ ہاچورے کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جگہ بہت بڑی تھی اور وہاں چاروں طرف تیل پھیلا ہوا تھا جس کی بدبو پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے آگے لکڑی کی کچھ پیٹیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن ان پیٹیوں کے قریب اسے ایک بستر نظر آیا جو لپٹا ہوا تھا اور ایک کریٹ کے آڑ میں چھپا دیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر شہباز کو اندازہ

ہو گیا کہ یہاں کوئی اور بھی چھپا ہوا ہے۔ لیکن کون؟ بستر کو ٹٹولا پر کوئی نشان نہیں ملا۔ بہر حال شہباز نے بھی اسی جگہ کو اپنا مسکن بنایا تھا کیونکہ یہ سب سے محفوظ جگہ تھی۔ پھر ایک کریٹ کی آڑ میں لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت نجانے کتنا وقت ہوا تھا کہ اچانک ہی اسے ایک شخص نظر آیا جو سیاہ لباس میں وہاں موجود تھا۔ اس نے ٹارچ روشن کر کے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر شہباز کو دیکھ بھی لیا۔ دوسرے لمحے اس نے شہباز پر چھلانگ لگا دی تھی۔ لیکن ایک ہی لمحے کے اندر شہباز نے اسے اپنے قابو میں کر لیا اور اس کا چہرہ فرش سے رگڑتے ہوئے بولا۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی جگہ میں تمہاری گردن توڑ دوں۔ لیکن تم حماقت کر رہے ہو اور میں حماقت نہیں دوہرانا چاہتا۔ چنانچہ میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی اسی جہاز میں پوشیدہ ہو اور میں بھی۔“

”مگر تم کون ہو؟“

”بس اس کے بارے میں کیا تفصیل بتائی جائے۔ لیکن تم اپنے بارے میں ضرور بتاؤ۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”میرا تعلق امریکہ سے ہے اور میں یہاں ایک خاص مقصد کے تحت آیا ہوں۔“

”امریکن؟“

”نہیں.....نسلاً فرانسیسی ہوں لیکن امریکہ کے لئے کام کرتا ہوں۔“

”گڈ.....اب یہ بھی بتا دو کہ کام کیا کر رہے ہو؟“

”مجھے ایک تخریبی مادے کی تلاش ہے جو ایل سی ایم کہلاتا ہے اور ایل سی ایم کے ذریعے پچھلے دنوں جو تباہی پھیلی ہے وہ نہ صرف امریکہ بلکہ پیرس اور لندن کے لئے بھی اتنی ہی خوفناک ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے کیا نقصانات ہو سکتے ہیں۔“

”تم تو بہت بڑی شخصیت کے مالک ہو دوست! اب اپنا نام نہیں بتاؤ گے مجھے؟“ شہباز نے کہا اور وہ شخص کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔

”اصل میں تمہاری شخصیت میں مجھے کچھ عجیب سے نقوش نظر آئے ہیں۔ خیر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تمہارا دل چاہے تو مجھے ڈبو دو یا پھر ایک اچھے دوست ہونے کا ثبوت دو۔ میرا نام گیراڈ ہے اور میری

پوری زندگی سائنسی امور میں گزری ہے۔ اس وقت بھی ایک مشن پر کام کر رہا ہوں۔ یہ تفصیل نہیں بتاؤں گا کہ یہ مشن کون سے ملک کے لئے ہے۔ لیکن تھوڑے سے الفاظ ضرور کہوں گا تم سے۔ یوں سمجھ لو یہ مشن دنیا کی تباہی کے خلاف ہے۔ ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ معمول کے مطابق دنیا کے وہ جنگجو ملک جو اپنی برتری کے لئے انسانیت کی حدود پار کر چکے ہیں اور اب ان کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جاتا، یہ لوگ بدترین ہیں اور ان کے خلاف کام کرنا ہر شخص کا فرض ہے۔“

”یقیناً تم ایل سی ایم کی تابکاری کے بارے میں بات کر رہے ہو۔“ شہباز نے کہا اور گیراڈ ششدر رہ گیا۔ دیر تک وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہباز کو دیکھتا رہا، پھر اس نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ گیا......بس میں سمجھ گیا۔ تم بھی یقیناً اسی مشن پر کام کر رہے ہو۔ ٹرانسلیور پر ممکن ہے اور بھی چند افراد یہی سب کچھ کر رہے ہوں۔“ شہباز مسکرا کر خاموش ہو گیا تو گیراڈ کہنے لگا۔

”خیر میں تمہیں بتاؤں کہ میری زندگی تو مسلسل اسی طرح کی مہم جوئی میں صرف ہوئی ہے۔ میں ایک ایسے عجیب و غریب مسئلے سے دوچار ہو چکا ہوں جس کے بارے میں تم سنو گے تو ششدر رہ جاؤ گے۔ بالکل ایسی ہی ایک مہم تھی۔ لیکن مہم نے مجھے ایک ایسا نایاب تحفہ دیا ہے جو میری زندگی کے لئے انتہائی اہم حیثیت کا حامل ہے۔“

”تحفہ......؟“

”ہاں......حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا تحفہ جو......“ گیراڈ ایک لمحے تک سوچتا رہا اور پھر مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”تم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”نہیں، میں تمہیں بتاؤں گا اس بارے میں بھی۔ بتاؤں گا۔“ گیراڈ نے کہا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”اس تحفے کا نام عینی ہے۔“

”عینی......یعنی کوئی لڑکی؟ کوئی عورت؟“

”نہیں، میری زندگی......“ گیراڈ نے مسکراتی نگاہوں سے کہا اور پھر اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''آلات بالکل صحیح کام کر رہے تھے......خلائی مرکز میں سائنسدان اس خلائی جہاز کی کارکردگی سے مطمئن تھے لیکن اس کی واپسی کا آخری لمحہ ختم نہیں ہوا تھا کیونکہ جب مدار تبدیل کر کے انہوں نے بلندی سے زمین کی طرف لانے والے انجن کو چلانا چاہا تو سوئچ نے کام نہیں کیا۔ بٹن دباتے ہی ایک شعلہ سا لپکا اور ان کے کیبن میں دھواں پھیل گیا۔''
گیراڈ کی آواز جیسے خوابوں کی سرزمین سے آرہی تھی۔ وہ کسی پراسرار خیال میں کھو گیا تھا۔

✿......✿

میلسی بحریہ پر ایک مسافر بردار جہاز محو پرواز تھا۔ نیوگنی جانے والے مسافر سوئے پڑے تھے اور جہاز میں ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف ایک بچہ کھڑکی سے ناک لگائے تاریک آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے اُفق پر نارنجی روشنی کی ایک لکیر سی دیکھی۔ اس نے اپنی ماں کو ہلایا جو ساتھ والی سیٹ پر آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔

''مم......ممی......وہ کیا ہے......؟'' اس نے بے قراری سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لکیر لمبی ہوتی جارہی تھی۔ ماں نے آنکھ کھول کر کاہلی سے روشن لکیر کو دیکھا۔ اسی لمحے لکیر کے آخری سرے پر تین شعلے چمکے، پھر سب کچھ غائب ہو گیا۔

''سو جاؤ بیٹے!'' ماں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ستارے ٹوٹتے ہیں تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔''

''ممی......ستارے کون توڑتا ہے؟'' اس نے چند سیکنڈ جواب کا انتظار کیا اور پھر باہر جھانکنے لگا۔ شاید وہ پھلجھڑی سی پھر چھوٹے۔ آخر ستاروں کو ٹوٹنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یوں تو سارا آسمان خالی ہو جائے گا......خیر......خدا اور بنا لے گا......وہ سو گیا۔

نیوزی لینڈ سے وان کیسرو تک کی پرواز ختم ہونے کو تھی۔ دونوں پائلٹ بالکل مطمئن بیٹھے تھے۔ اگرچہ کنٹرول نے دھند کی اطلاع دی تھی اور ونڈ اسکرین پر بہتے ہوئے بارش کے قطروں نے ان کے لئے باہر کے منظر کو اور بھی دھندلا کر دیا تھا۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ وان کیسرو اور نیوزی لینڈ کے درمیان وہ ان گنت بار پرواز کر چکے تھے اور ان اڈوں پر کنٹرول کی مدد سے ہر قسم کے موسم میں اتر سکتے تھے۔ شام کے پانچ بج کر دس منٹ پر جبوتی ایئرپورٹ نے انہیں کلیرنس دی۔ ہیلو......فلائٹ فائیو ون زیرو......ٹرن رائٹ......

بلاک ایٹ رن وے نمبر فور الفا چارلی۔''

جہاز کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔ کنٹرول انہیں مسلسل پکارتا رہا۔ فلائٹ فائیو ون زیرو......ہیلو......ہیلو......کم آن......فلائٹ فائیو ون زیرو......''

مسز ہیرس وان کیسرو کے جبوتی ایئرپورٹ سے چند میل دور رہتی تھیں اور گزشتہ بیس سال جہازوں کے اترنے اور پرواز کرنے کے شور کی عادی ہو چکی تھیں۔ چائے کا ایک کپ ختم کر کے وہ دھلے ہوئے کپڑے پھیلانے مکان کے پچھلے حصے کے باغ میں چلی گئیں۔ گیلے کپڑے وہ عموماً چھت پر پھیلاتی تھیں لیکن دشواری یہ تھی کہ ڈاکٹر نے اسے دو ماہ تک سیڑھیاں چڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ اور ابھی صرف تین ہفتے ہوئے تھے۔ اگر وہ ڈاکٹر کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی جیسا کہ عموماً خواتین کرتی ہیں تو وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوتا۔ کپڑے پھیلاتے پھیلاتے اس نے جہاز کے انجنوں کی آواز سنی مگر نظر اٹھائے بغیر اپنے کام میں مصروف رہی۔ جب شور حد سے بڑھ گیا تو اس نے اوپر دیکھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ دیوہیکل جہاز تیزی سے اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا......بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے اس نے جہاز کے پہیوں کو کسی باز کے پنجوں کی طرح شکار پر جھپٹنے کے انداز میں اپنی طرف لپکتے دیکھا، پھر جہاز کے آہنی پر زن سے گزر گئے۔ گرج کے ساتھ تیز گرم ہوا کا جھونکا آیا اور بس......وہ لان پر گر گئی۔

جہاز کے تیز پروں نے مکان اس طرح کاٹ دیئے جیسے چھری ڈبل روٹی کاٹ دیتی ہے۔ لکڑی کے شہتیر ماچس کی تیلیوں کی طرح بکھر گئے۔ جہاز کے پہیوں نے تارکول کی سڑک کو ادھیڑ دیا اور اس پر چلنے والی کاروں کو اس کی گہرائی میں دفن کر دیا۔ جہاز کے ایک انجن کے گھومتے ہوئے پنکھوں نے گاڑیوں کو کھلونوں کی طرح اچھال دیا اور ایک فیکٹری کی فولادی چھت کو کاغذ کے پرزوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ دوسرا انجن الگ ہو کر ایک سپر مارکیٹ پر بم کی طرح گرا اور پھٹ گیا۔ خریدار اور دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے ٹن اور شوکیس پل بھر میں ملبے کے نیچے چھپ گئے۔ جہاز کا پچھلا حصہ ایک ہوٹل کے ڈانس فلور سے گزرا اور رقص کرتے ہوئے جوڑے ایک دوسرے کی آغوش میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جہاز کا اگلا حصہ گھوم کر گنجان آباد مکانوں میں جا گھسا......گرد وغبار اور چیخ وپکار کا

طوفان تھا تو جہاز کے اڑتالیس مسافروں کے علاوہ زمین پر بسنے والے سینکڑوں انسان جنہیں ایک لمحہ پہلے اپنے زندہ رہنے کا اتنا ہی یقین تھا جتنا اپنے وجود کا، شکستہ اعضاء اور خون آلود گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ جب ان کو اکٹھا کیا گیا تو عجیب مضحکہ خیز اعداد و شمار حاصل ہوئے۔ سات سو بارہ سالم سر اور اکیس سو چوبیس بازو اور ٹانگیں۔ حالانکہ دو ہاتھ اور دو پیر۔ خیر کبھی کبھی حساب غلط بھی ہو جاتا ہے۔ اگر تعداد پوری بھی ہوتی تب بھی انسانی مشین کے ان پرزوں کو دوبارہ جوڑنا ناممکن تھا۔ اتنا ہی جتنا جہاز کے میلوں تک پھیلے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر جہاز کو دوبارہ اڑانا۔

شدید بارش میں ایمی کرائم رپورٹ بحریہ کے ایک چھوٹے سے جہاز پر کھڑی ایٹمی قوت سے چلنے والی آبدوز پر سوار ایٹمی میزائل اتارنے کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ بحریہ کے مستعد انجینئر سمندر کی گہرائی سے مار کرنے والے ان میزائلوں کو بڑی مہارت اور احتیاط سے اتروا رہے تھے۔ اس کے اردگرد اور بھی اخباری نمائندے تھے۔ میزائلوں کے گرد پلاسٹک کی جھلی لپٹی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ سب آبدوز میں ان توپ نما دہانوں میں اتار دی گئیں جہاں سے وہ پانی کی سطح کو چیر کر گولی کی طرح نکلتی تھیں اور آبدوز کے اندر بیٹھے ہوئے انجینئرز کے فیصلوں کے مطابق نظر نہ آنے والی ریڈیائی لہروں کے اشاروں پر عمل کرتی اپنے نشانے پر جا لگتی تھیں۔ خواہ انہیں سات سمندر پار کسی پہاڑ کے دامن میں پوشیدہ کسی عبادت گاہ کو یا بچوں کے سکول کو پیوند خاک کرنا پڑے۔ آنکھ، کان، ناک نہ ہونے کے باوجود وہ دیکھ سکتی تھیں اور سن سکتی تھیں۔ بادلوں سے گزرتی، برف پوش چوٹیوں سے بچتی، سمندروں کو عبور کرتی وہ ہر لحظہ اپنے شکار کی طرف بڑھتی جاتی تھیں اور ان کا شکار ان سے بھاگ کر کہیں چھپ نہیں سکتا تھا۔ انہیں دھوکا دینا ناممکن تھا۔

آفیسرز میس میں بحریہ کے افسران پریس کے نمائندوں کو بڑی خوش اخلاقی سے ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے لیکن ان کے لہجے میں اعتماد اور ہلکا سا تفاخر شامل تھا۔ اچانک کیبن کے اسپیکر پر ایک آواز گونجی۔

''معزز مہمان توجہ فرمائیں۔ پروگرام کے مطابق میلسی بحریہ انہیں کل صبح تربیتی مرکز میں خوش آمدید کہے گی۔ لیکن ہم بے حد معذرت خواہ ہیں کہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ میزائل بردار آبدوز ''ٹائی ٹون'' کو نہیں دیکھ سکیں گے جس کا ہم نے وعدہ کیا تھا۔ ناگزیر وجوہ

کی بناء پر اس کی آمد میں تاخیر کے امکان ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے مہمانوں کو ایک دوسرے جہاز پر لے چلیں گے۔ امید ہے کہ آپ نے آج جو کچھ دیکھ لیا ہے وہ کل میلسی کے شہریوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس سلسلے میں فوجی رازداری کے قواعد و ضوابط کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ شکریہ...... بس یہ نہ بھولئے کہ ڈنر کا وقت ساڑھے سات بجے ہے۔ گو یہ بحریہ کا ڈنر ہے لیکن ہم سمندر سے کوئی چیز پکڑ کر آپ کو نہیں کھلائیں گے۔''

بیشتر صحافی مسکرائے۔ لیکن کریمر کا ذہن ایک الجھن میں گرفتار تھا۔ تاخیر کس لئے......؟ وہ ناگزیر وجوہ کیا ہیں؟ سیاسی یا فنی؟ صحافت میں تجسس کا جذبہ ہی بڑی بڑی سرخیوں کو جنم دیتا ہے۔

ڈاکٹر لائیل سلیٹر مواصلاتی نظام کا ماہر تھا۔ الیکٹرونکس شروع سے اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس کے اساتذہ نے یہ خدیہ ظاہر کیا تھا کہ وہ اعداد و شمار سے حاصل ہونے والے نتائج سے زیادہ اپنے تخیل کی پرواز پر بھروسہ کرنے لگتا ہے اور ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہے۔ جو کبھی تو حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی محض خواب بن کر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک اخبار میں سائنس کے مستقبل کے بارے میں کالم بھی لکھتا تھا اور حال ہی میں پلاسکو کے دورے سے لوٹا تھا۔ اس دورے میں بھی وہ مشاہدہ کرتے کرتے خواب دیکھنے لگتا تھا۔ اگر یوں ہو جائے تو؟ محض اس سوال پر وہ ایک ایسے منصوبے کے قابل عمل ہونے کے امکانات کا جائزہ لینے لگتا تھا جس پر وقت اور قومی سرمائے کا مصرف ایک جواء نظر آتا تھا۔ نیوگنی میں ایک معمولی بات نے اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ ریگون ایئر پورٹ سے شہر کے وسط تک مین فورٹ کے علاقے میں پہنچنے کے لئے اس نے ہیلی کاپٹر کی ایئر ٹیکسی میں سفر کیا۔ مقصد صرف شہر کا ایک فضائی منظر دیکھنا تھا۔ جب اس نے نیچے نگاہ ڈالی تو سر بلند عمارتوں سے بھی نیچے اسے سڑکوں اور شاہراہوں کا ایک جال سا بچھا ہوا نظر آیا۔ یوں جیسے انسانی جسم میں شریانیں اور وریدیں، خون کے آنے اور جانے کے راستے۔ ان پر حرکت کرتی ہوئی کاریں ننھے ننھے نقطے نظر آ رہی تھیں۔ ایک ہی تسلسل کے ساتھ ایک ہی سمت میں رواں...... جیسے خون کے سرخ اور سفید ذرات۔ اس وقت اسے پورا نیوگنی ایک زندہ جسم کی طرح نظر آیا۔ پل بھر میں اس کا ذہن مشاہدات سے بھٹک کر امکانات کی وادیوں میں گم ہو گیا۔ اگر ایک دل سارے جسم میں پھیلی ہوئی رگوں میں

دوڑتے ہوئے خون کی گردش کو آتے جاتے کنٹرول کرسکتا ہے تو کیا اس شہر کا کوئی دل نہیں ہوسکتا جو اسی طرح ٹریفک کے نظام کو تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ کنٹرول کرے۔ اس طرح کہ کہیں رفتار زیادہ نہ ہو۔ کہیں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ مقصد تو منزل تک پہنچنا ہے۔ اگر تھوڑا طویل راستہ اختیار کرنا پڑے تو ٹریفک جام نہ ہو تو کتنی آسانی ہو جائے گی۔ مگر کیسے؟ کس طرح شہر کے مرکز میں ایک کمپیوٹر تمام سڑکوں پر ٹریفک کے بوجھ کو یکساں اور مساوی طور پر تقسیم کرسکتا ہے؟ اس طرح کہ جیسے ہی ایک سڑک پر ٹریفک بڑھے اور کاروں کی رفتار میں فرق پڑے، وہ فوراً بوجھ ان راستوں پر منتقل کردے جو خالی ہوں۔ اس طرح حادثات کے امکانات بھی کم کئے جاسکتے ہیں۔

شب و روز انہی خیالات میں غرق رہنے کے بعد اس نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دی اور اسے شہر کے ایک حصے میں آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اسے ٹریفک پولیس کے حکام سے لے کر عوام کے نمائندوں تک ہر شخص کو مطمئن کرنا پڑا۔ انتظامیہ نے فوراً اس منصوبے کی افادیت کو تسلیم کرلیا۔ مگر شہری حقوق تنظیم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مشینی نظام انسان کی قوتِ فیصلہ اور آزادی کو مفلوج کررہا ہے۔ آدمی اپنی مرضی سے کار نہیں چلاسکتا۔ اپنی پسند کی سڑک پر نہیں جاسکتا۔ کیونکہ کمپیوٹر چاہتا ہے کہ وہ اس کے احکامات کی پابندی کرے۔ کل کو کمپیوٹر یہ بھی فیصلہ کرے گا کہ وہ کیا کھائے۔ کون سے رنگ کی ٹائی باندھے......''

لیکن بالآخر اسکیم کے تجرباتی مراحل کے اخراجات کی منظوری مل گئی۔ سڑکوں کے نیچے مقناطیسی فیتے، حساس مائیکروفون، ٹی وی کیمرے اس پیچیدہ نظام کا ایک حصہ تھے جس کا تعلق میلوں لمبے تاروں کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے تھا۔ کمپیوٹر کے ''برقی دماغ'' میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ ہر سڑک پر کتنی ٹریفک ہونی چاہئے۔ گاڑیوں کی رفتار کس سڑک پر کتنی ہونی چاہئے اور اگر اس میں کمی بیشی ہو تو اسے ڈرائیور کو کیا ہدایات دینی چاہئیں۔ حیرت انگیز طور پر کمپیوٹر نے ٹریفک پولیس کو مات دے دی۔ سارے علاقے میں ایک بھی ٹریفک جام یا حادثہ نہیں ہوا۔ رگوں میں دوڑنے والے خون کی طرح ٹریفک سڑکوں پر چلتی رہی۔ ڈاکٹر سلیٹر مطمئن تھا۔ اور لوگ مطمئن تھے۔ تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اور اب اسے پورے شہر تک پھیلانے سے پہلے متعلقہ وزیر اس کی کارکردگی کا بنفس نفیس جائزہ لینے، فنی پہلو کو سمجھنے اور اس کے اخراجات کا اندازہ کرنے آرہے تھے تاکہ وہ اگلے دن ایک بل کی صورت میں

پارلیمنٹ سے اس کی منظوری حاصل کرسکیں اور حزب اختلاف کے سوالات کے جوابات دے سکیں...... سلیٹر کے سامنے اڑتالیس ٹی وی اسکرین روشن تھے جو شہر کے اس حصے کی پوری ٹریفک کا نقشہ پیش کررہے تھے۔ کمپیوٹر کا برقی نظام ہدایات دے رہا تھا۔ کاروں کے ریسیور انہیں ڈرائیوروں تک پہنچا رہے تھے۔ سب کچھ اس طرح ہو رہا تھا جس طرح سلیٹر نے سوچا تھا اور ہوتا رہا۔

لیکن عین اس وقت جب وزیر موصوف بڑے انہماک اور توجہ سے ٹریفک کنٹرول ہوتے دیکھ رہے تھے، اس عظیم نظام میں کہیں کوئی نقص پیدا ہوگیا۔ میڈونا میوزیم کے چوراہے پر سگنل سبز ہوا، پھر سرخ اور سیکنڈ میں پھر سبز...... چوراہے کے وسط میں ایک ٹیکسی نے گزرنے کی کوشش کی...... رُکی...... پھر چلی...... مگر اتنی دیر میں دوسری سمت سے آنے والی بس نے اسے الٹ دیا۔ سلیٹر نے پریشانی سے دیکھا۔ وزیر کی نگاہ بھی جیسے ٹی وی پر جم کر رہ گئی تھی۔ اتنی دیر میں دوسری اسکرین پر معمولی سی خرابی نے سگنل بند کردیئے۔ ٹریفک ہر طرف سے چل پڑی اور پھر جام ہوگئی۔

''خرابی کہاں ہے سلیٹر؟'' وزیر نے تشویش سے پوچھا مگر سلیٹر اس کا کیا جواب دیتا۔ یہ کہ میلوں تک پھیلے ہوئے برقی نظام میں کہیں۔ مگر وزیر نے پوچھا تھا کہاں؟ اس کا جواب کہیں نہیں تھا۔ اس دوران تیسرے سکرین پر نظر آنے والا سگنل چار منٹ سے سبز تھا اور دوسری طرف ٹریفک کی لائن دو میل سے بھی لمبی ہوگئی تھی۔ انہی چار منٹوں کے دوران دوسری سڑکوں پر سولہ حادثات ہو چکے تھے اور ایمبولینس گاڑیاں جلتی بجھتی روشنیوں کے ساتھ سائرن بجاتی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔

''بند کرو یہ قتل عام......'' وزیر مواصلات نے جلا کر کہا۔ ''پولیس کو بلاؤ۔ دس منٹ کے اندر اندر انہیں ڈیوٹی پر ہونا چاہئے۔''

سلیٹر کا ہوائی قلعہ منہدم ہو چکا تھا۔ ڈائریکٹر پروجیکٹ سرنگوں کھڑا تھا۔ چیف کانسٹیبل نے فون پر وزیر کے احکامات سنے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کیا یہ واقعی وزیر کی آواز ہے؟ اتنی اونچی؟ خیر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر کمزور اعصاب کے لوگ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر کریمر نے اپنی تجربہ گاہ وان کیسرو میں قائم کی تھی اور گیراڈ کے علاوہ تین سائنسدان اس کے ماتحت تھے اس لئے کہ ان سب کو یکجا کرنے اور ان کی تخلیقی صلاحیت کو

ایک وقت میں کسی ایک مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کا خیال سب سے پہلے
اسی کو آیا تھا۔ وہ عمارت جس میں وہ تجربات کرتے تھے کریمر کی ملکیت تھی۔ اور اس میں
تمام سائنسی آلات اور ساز و سامان اس نے فراہم کیا تھا۔ گیراڈ اور کریمر نے ہالی یونیورسٹی
میں اکٹھے تعلیم حاصل کی تھی اور کریمر کے میلسی چلے آنے کے بعد گیراڈ نے ہالی یونیورسٹی
میں ایک سال بڑی مشکل سے پورا کیا۔ اساتذہ میں وہ سب سے جونیئر تھا عمر اور تجربے
کے اعتبار سے۔ لیکن ذہانت کے معیار پر وہ سال خوردہ پرانے پروفیسر سے بہتر تھا جو
پڑھے ہوئے نصاب کو سالہا سال سے پڑھاتے پڑھاتے ٹیپ ریکارڈ بن گئے تھے۔ مگر
ایک خود ساختہ احساسِ برتری میں مبتلا ہونے کے باعث نوجوان ذہنوں کی اسپیچ کو کم عقلی
سے تعبیر کرتے تھے۔ گیراڈ جیسے شخص کے لئے اس صورت حال کو قبول کرنا مشکل تھا۔ وہ
ریگون سٹی چلا آیا جو اس کا وطن تھا۔ دو سال پہلے وہ ایک چھوٹے سے کالج کو بھی خیر باد کہنے
کے خیال پر غور کر رہا تھا۔ جب کریمر ریگن سٹی آیا، اس کے گھر ٹھہرا اور اس کے ساتھ وہ
وان کیسرو چلا آیا۔ بہت جلد اسے احساس ہوا کہ یہاں کریمر اس کا وہ دوست نہیں رہا جو
ہالی میں تھا۔ جوشیلا اور فلسفیانہ ذہن رکھنے والا۔ اس کی شخصیت بہت دلکش تھی۔ وہ دوسروں
کو متاثر کرنا اور انہیں اعتماد میں لینا جانتا تھا۔ اس کا دماغ ایک موجد کا دماغ تھا۔ نئے نئے
خیالات چاہے وہ قابل عمل ہوں یا مضحکہ خیز، اسے چوبیس گھنٹے کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور
کرتے تھے۔ اس کی نیلی آنکھیں گفتگو کے دوران بھی سوچ میں گم نظر آتی تھیں جن میں
ایک مقناطیسی سحر تھا جو غیر مرئی لہروں کی طرح اثر کرتا تھا۔ الفاظ اس کی زبان سے یوں
نکلتے تھے جیسے ٹیکسال سے سکے بن کر نکلتے ہیں۔ نپے تلے ایک ہی سانچے میں ڈھلے
ہوئے۔ دوسروں پر چھا جانے اور ان پر غالب آ جانے کی خواہش رکھنے والا اور شہرت اور
ناموری کے جذبے کا اسیر کریمر اب دولت کو اپنا اولین اور آخری مقصد بنا چکا تھا۔ گیراڈ کو
اس کی شخصیت اس کے بدلے ہوئے روپ نے بہت مایوس کیا۔ رفاقت کا وہ احساس جو
ہالی میں تھا، اب مفقود ہو چکا تھا۔

اور کریمر نے کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کی بجائے اپنے علم اور اپنی صلاحیت کو پہیہ گھمانے پر
لگا دیا تھا۔ وہ ہر تجربے کی افادیت کو نفع و نقصان کے پیمانے سے تولنے لگا تھا۔ گیراڈ کو زندگی
نے ہر قدم پر دھوکا دیا تھا۔ پہلے وہ ہالی یونیورسٹی کے آمرانہ نظام کو قبول نہ کر سکا اور درس و

تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ تصورات باطل ہو گئے۔ پھر اس نے جس لڑکی سے
شادی کی وہ گیراڈ کی جھیل کی طرح پُرسکون طبیعت کے مقابلے میں پہاڑوں کے پتھروں
سے ٹکراتی شوریدہ سر ندی ثابت ہوئی۔ اس تضاد نے ابتداء میں گیراڈ کو اس طرف متوجہ کیا
تھا اور شاید یہی تضاد پہلے ان کے درمیان کشیدگی اور بالآخر طلاق کا سبب بنا۔

پھر کریمر کے نئے روپ نے اچانک اس سے اس کے دوست کو چھین لیا جس کے
ساتھ محض ذہنی ہم آہنگی کی کشش اسے اپنے وطن ریگون سٹی سے کھینچ لائی تھی۔ اب وہ اس نیم
تاریک سرد عمارت میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ ریگون سٹی میں وہ اتنا تنہا نہیں تھا۔

کریمر نے جو لوگ اپنے گرد جمع کئے تھے وہ الگ الگ خصوصیات کے مالک تھے۔
لیکن کریمر نے انہیں بٹالین کمانڈر کی طرح قدم ملا کر ایک ہی سمت میں چلنے پر مجبور کر دیا
تھا۔ بزلین کا ''بیوشان'' انگریز نژاد رائٹ کے سامنے جس صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے
اپنے نظریات پیش کرتا تھا اس سے زیادہ تنگ نظری اور حسد کے ساتھ رائٹ ان کی
صداقت کو آزمائے بغیر بیک جنبش لب مسترد کر دیتا۔ دونوں مستقل مزاج تھے۔ نہ وہ اپنی خو
بدلتا تھا اور نہ وہ اپنی وضع۔

تیسرا سکیلن تھا جو سائنسدان سے زیادہ انجینئر اور انجینئر سے زیادہ سیلز مین تھا۔ محض
چرب زبان جو ''بیوشان'' اور رائٹ کی نظریاتی جنگ کے اسباب کو ہوا دے کر اپنا کام چلاتا
تھا۔ وہ سیاستدان بھی بن سکتا تھا مگر کریمر کے یہودی ذہن کو دیکھتے ہوئے وہ سیلز مین بن
گیا۔ سائنس دان ہونے کے باوجود اس کے خیالات اور نظریات حالات کے مطابق بدل
جاتے تھے۔

گیراڈ نے ایک نظر بلیک بورڈ کی طرف دیکھا جس پر سائنسی اصطلاحات اور ریاضی
کے اعداد و شمار غلط ملط پڑے ہوئے تھے۔ اس کے تینوں ساتھی اپنے اپنے ڈیسک پر
پورے انہماک کے ساتھ سائنس کو تجارت بنانے میں مصروف تھے۔ اگر اس ٹیم کو بلیک بورڈ
پر لکھا جاتا تو یوں ہوتا۔

بیوشان + رائٹ = صفر
بیوشان x رائٹ = سکیلن
ان سب کا مجموعہ = کریمر

وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ کریمر نے گیراڈ کو ہنستے دیکھا۔ ہال میں قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ الگ کھڑے ہوئے گیراڈ پر پڑی۔

"میرا خیال ہے تم کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہو۔"

اس کے نزدیک ہنسی کا کوئی اور سبب نہیں ہوسکتا تھا۔

گیراڈ مسکرایا۔ "ہاں...... اس نتیجے پر کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے۔" کریمر نے گیراڈ کی بات کو ناگواری سے برداشت کیا۔

"حضرات، میرے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے۔ ایک مسئلہ ہماری فوری توجہ کا محتاج ہے۔" وہ سب تھکے ہوئے تھے مگر کریمر کے نزدیک تھکن عمر کے اس دور کی کیفیت کا نام تھا جب عناصر میں اعتدال نہ رہے اور قویٰ مضمحل ہو جائیں۔ چنانچہ کریمر نے اپنی بات جاری رکھی۔

"بیرٹ اسٹور تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ کھلونوں کی دکان ہے۔ وہاں پلاسٹک کے چند کھلونے خراب ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے حرارت سے پگھل گئے ہوں یا کسی نے ایسی ٹون ڈال دیا ہو۔ گیراڈ! اگر تم خراب شدہ پلاسٹک کا کوئی ٹکڑا لے آؤ تو ہم تجزیہ کر کے اصل سبب معلوم کریں گے۔ اسٹور کا مالک پریشان ہے۔ کیونکہ کرسمس نزدیک ہے اور اگر اس کے کھلونے اسی طرح خراب ہونے لگے تو......"

بات ختم ہونے سے پہلے گیراڈ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ویسے بھی سخت بیزار تھا اور باہر نکلنا چاہتا تھا۔ کریمر مسکرا دیا۔

"اگر تم گھر جاتے ہوئے میری بیوی کو ساتھ لے جاؤ تو میرا وقت بچ جائے گا۔" اس نے گیراڈ سے کہا۔ "وہ تمہیں وہی اسٹور میں ملے گی۔"

گیراڈ نے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

اینی کریمر سے گیراڈ کی ملاقات دو بار ہوئی تھی۔ پہلی بار وان کیسرو پہنچتے ہی کریمر کے گھر پر اور دوسری بار تجربہ گاہ میں جب وہ اپنے شوہر سے کچھ کہنے آئی تھی۔ سرسری سی ملاقات۔ لیکن گیراڈ کے لئے اس کی ایک ہی نگاہ کافی ثابت ہوئی تھی۔ وہ اک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم تھی، ایک عورت کی نگاہ...... حسین عورت کی نگاہ...... حسین عورت جو اپنی قوت تسخیر کے احساس سے سرشار ہوتی ہے اور تسخیر کر لیتی ہے۔ خواہ وہ پتھر کا مجسمہ ہو، اس کے

سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا۔ گیراڈ تو پھر زندہ گوشت پوست کا انسان تھا۔ ناآسودہ اور پیاسا...... تپتے ہوئے صحرا کی طرح بارش کے ایک ٹھنڈے قطرے کے انتظار میں۔

کرسمس ابھی دور تھا مگر اسٹور میں خریداروں کا ہجوم تھا اور یہ خریدار خریدے جانے والے کھلونوں سے زیادہ شور مچا رہے تھے۔ تجربہ گاہ کے سکوت کے بعد گیراڈ کو یہ آوازیں بڑی بھلی لگیں۔ ننھے منے بچے...... روتے...... ضد کرتے...... مچلتے...... انہیں سمجھاتی، مناتی، گھسیٹتی مائیں...... بچے اور کھلونے دونوں ڈھول اور بگل بجاتے عجیب وغریب آوازیں نکالتے...... دوڑتے بھاگتے...... خریداری سے مطمئن اور غیر مطمئن مسکراتے ہوئے فخر سے رنگین ڈبے اٹھائے باہر نکلنے والے۔ ایک دوسرے کو رشک اور حسد سے دیکھتے۔ گیراڈ بڑی دلچسپی اور محویت سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ اس میں اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"کیا دیکھ رہے ہو...... کھلونے یا بچے؟" اس نے اینی کی آواز سنی...... جلترنگ...... گھنٹیاں اور گھنگھرو...... گیراڈ پلٹ کر مسکرایا۔

"دونوں۔ مجھے تو دونوں ایک جیسے لگتے ہیں۔" پھر اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جس کا شگفتہ چہرہ، بے قرار آنکھیں اور شوخ لباس نمایاں تھے۔

"یہ مسٹر ایپسی نال ہیں۔ فلپ ایپسی نال...... اور یہ مسٹر گیراڈ......"

دونوں نے ہاتھ ملائے۔ چار مہینے پہلے جب اسٹور والوں نے کھلونوں کی سالانہ نمائش میں مشینی خلانورد رکھے تھے جو ایک پیچیدہ نظام کے ذریعے مصنوعی خلائی جہاز سے اترتے تھے اور خلانوردوں کی طرح آہستہ آہستہ چلتے چھ گز دور سے چاندی کے رنگ کی سفید مٹی اٹھاتے تھے اور واپس جہاز میں لوٹ جاتے تھے۔ شاید اس پبلٹی پر ان کے ہزاروں ڈالر صرف ہوئے ہوں گے۔ مگر سٹور کے اس عجوبے نے لاکھوں تماشائیوں کو متوجہ کیا اور ان کے اسٹور میں یہ ہجوم اسی شہرت کا نتیجہ تھا۔ مشینی خلانورد میں اس نمائش کے بعد کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ فلپ کی کمپنی نے اسے خرید کر مرمت کیا۔ کچھ پرزے بدلے اور اس میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اینی کریمر نے اخبار کے ایک کالم میں اس پر تبصرہ بھی کیا۔ مگر کرسمس کے موقع پر جب اسے دوبارہ دکان میں رکھا گیا تو پھر کچھ گڑبڑ ہوگئی۔

اس کے پلاسٹک کے کچھ حصے ناکارہ ہو گئے۔ یوں جیسے وہ گل سڑ گئے ہوں۔ اگر ان کی

جگہ اسٹیل کے پرزے لگائے جاتے تو نہ صرف یہ کہ ان کا وزن بڑھ جاتا بلکہ خصوصی آرڈر پر بنوائے جانے والے پرزے لگا کر لاگت بھی بے تحاشہ بڑھ جاتی۔ مشینی خلانورد کا برقی دماغ خراب ہو گیا تھا مگر اسے پاگل خانے نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ خصوصی پلاسٹک، کریمر کی تجربہ گاہ میں بنا تھا اور فلپ کے پاس فاضل پُرزوں کا صرف ایک سیٹ رہ گیا تھا۔

گیراڈ کے سامنے فلپ نے یہ آخری سیٹ جوڑا اور خلانورد کی بیٹری کے کنکشن ملا کر اس کے سوئچ آن کر دیئے۔ وہ دو مرتبہ بڑی مہارت سے عین خلانوردوں کے انداز میں اترا اور چڑھا۔ گیراڈ نے اس کی صناعی کو سراہا۔ انسانی جسامت کا یہ فولادی انسان واقعی دلچسپ تخلیق تھا۔ مگر تیسری بار جب گیراڈ نے اسے چلانا چاہا تو وہ اتر کر سفید مٹی اٹھانے کی بجائے اینی کریمر کی جانب بڑھا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کا ایک فولادی ہاتھ اینی کے شانے پر پڑا اور وہ چیخ مار کر ایک طرف ہو گئی۔ خلانورد کا دماغ پھر خراب ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا چلتا گیا مگر اس کے راستے میں اٹھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ شوکیس کے شیشوں کو توڑ کر خریداروں کے ہجوم میں جا گھسا۔ فلپ اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر اتنی دیر میں خریداروں کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ مائیں اپنے اپنے بچوں کو سنبھالتی بھاگ رہی تھیں۔ انہیں چلا چلا کر پکار رہی تھیں۔ جب فلپ نے اس کے سوئچ آف کیئے تو اسٹور خالی ہو چکا تھا۔ بھاگنے والوں کے جوتے اور ہیٹ بکھرے پڑے تھے۔ خلانورد لڑکھڑایا اور اس کا فولادی ڈھانچہ ایک دھماکے سے فرش پر گر گیا۔ ایک منٹ تیس سیکنڈ میں سب کچھ ہو گیا۔ گیراڈ نے خوفزدہ اینی کریمر کو ایک کونے میں دیکھا۔ وہ اپنا شانہ دبائے کھڑی تھی۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' اس نے اینی سے پوچھا۔ ''چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔''

''میں ٹھیک ہوں......'' اس نے بازو کو اوپر نیچے کرتے ہوئے کہا۔ مگر تکلیف کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

''کام......؟''

''کام ہو جائے گا۔'' اس نے اینی کا بازو تھاما۔ ''چلو۔''

اینی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر چل پڑی۔ ''میں کچھ تھکی ہوئی ہوں...... کچھ پینا چاہتی ہوں......''

گیراڈ نے گاڑی ایک بار کے سامنے روک دی۔ وہ آمنے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئے۔

''وہ خلانورد حسن پرست تھا۔ مگر تم ابھی تک بدحواس ہو۔ ایک سائنسدان کی بیوی کو ایک کھلونے سے اتنا نہیں ڈرنا چاہیئے۔'' گیراڈ نے کہا۔

''کیوں......؟ سائنسدان کی بیوی انسان نہیں ہوتی؟'' اس نے گیراڈ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں......'' گیراڈ نے کہا۔ ''میں تو ڈاکٹر ہوں۔'' اس سوال نے اسے بوکھلا دیا۔

''ڈاکٹر صاحب......'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''سائنسدان کی بیوی مشین نہیں ہوتی۔''

''تمہارا فلیٹ کہاں ہے؟'' اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جہاں میں رہتی ہوں...... جہاں تم ایک بار آ بھی چکے ہو۔'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں...... میں غالباً بھول گیا تھا۔'' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مسکرائی، معنی خیز انداز میں یوں جیسے وہ اس جھوٹ سے خوش ہوئی ہے۔ یوں جیسے وہ کہنا چاہتی ہو۔ مجھے معلوم ہے تم بھولے نہیں ہو۔ بس تمہاری آنکھیں جھوٹ بول رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی بات کیئے بغیر مختلف پُر پیچ راستوں سے گزرتے وہ کریمر کے فلیٹ پر پہنچے۔ گیراڈ نے جب اینی کریمر کے شانے پر ایک سرخ رنگ کی گہری خراش دیکھی تو یوں محسوس ہوا جیسے سنگ مرمر میں بال پڑ گیا ہو۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ مگر جب اینی نے محسوس کیا کہ وہ زخم کو نہیں دیکھ رہا ہے تو اس نے جھینپ کر کوٹ اپنے شانے پر ڈال لیا۔

''کچھ پیو گے؟''

''میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیئے...... اسٹور میں لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' گیراڈ نے خفت سے دیکھا۔

''لاحول ولا قوۃ۔'' اس نے راستے میں سوچا۔ ''یہ عورت ہے کہ ایکسرے مشین۔ اندر تک دیکھ لیتی ہے۔''

جب وہ واپس اسٹور پہنچا تو دکان بند ہو رہی تھی۔ مگر فلپ، خلانوردوں کے پرزوں کو الگ کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے پلاسٹک کے پرزے کام نہیں کریں گے۔ ان کی جگہ **اسٹیل** استعمال کرنا پڑے گا۔'' فلپ نے کہا۔ پلاسٹک کے کنارے نرم پڑ گئے تھے اور جگہ جگہ سے کٹے

پھٹے نظر آ رہے تھے۔ یہ کوئی عام پلاسٹک نہیں تھا۔ اس کا کیمیائی نام ایمنیو اسٹرین تھا اور اسے کریمر کی ٹیم نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سخت ہونے کے باوجود ترخ کر خراب نہیں ہوتا تھا۔ ٹوٹتا نہیں تھا اور آگ نہیں پکڑتا تھا۔ اس قسم کے پلاسٹک کو استعمال کر کے انہوں نے ایک نیا کیمیائی مرکب بھی تیار کیا تھا جس کا ایک مکعب فٹ کا ٹکڑا روشنی اور آکسیجن میں کیمیائی تبدیلی کے عمل سے چٹکی بھر راکھ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس کا استعمال تجارتی پیمانے پر ڈیگرون کے نام سے شروع ہو چکا تھا۔ ایمنیو اسٹرین رائٹ کی ایجاد تھی اور اسے اس پر فخر تھا۔ کھلونوں سے لے کر برتنوں اور بہت سی مشینوں میں ایمنیو اسٹرین پلاسٹک کا استعمال ہو رہا تھا۔ بجلی کے تاروں پر اس پلاسٹک کی سخت تہہ عام پلاسٹک سے زیادہ پائیدار اور سستی ثابت ہوئی تھی اور بجلی کی صنعت میں اس کی کارکردگی دوسری قسم کے پلاسٹک سے بہتر تھی۔ چنانچہ مواصلاتی نظام میں ریڈیو، ٹرانسمیٹر اور ایسے ہی بہت سے آلات کے تاروں پر یہی پلاسٹک مقبول ہو رہا تھا۔

گیراڈ نے خراب شدہ پلاسٹک کے حصوں کو بڑی احتیاط سے سمیٹ کر پولی تھین کے بیگ میں بند کیا اور بریف کیس میں ڈال لیا۔

”شاید تجربہ گاہ میں ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔“ اس نے فلپ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”اینی......میرا مطلب ہے مسز کریمر سے معذرت کر لیجئے گا میری طرف سے۔“ فلپ نے کہا۔

”آپ......آپ انہیں جانتے ہیں؟“ گیراڈ نے کہا۔ وہ اس کے ”اینی“ کہنے سے چونکا تھا۔

”نہیں......بس وہ اچھا لکھتی ہے۔“ فلپ نے کہا۔ مگر گیراڈ کا شک دور نہ ہوا۔

ناوک نے تیر صید نہ چھوڑا زمانے میں
یہ بھی ان میں ہو تو کیا تعجب

✿......✿

سلیٹر نے یوں بھی رات بڑے کرب میں گزاری تھی اور صبح اس کی طبیعت مضمحل تھی۔ اس کی خواب دیکھنے کی عادت نے بالآخر اس کی زندگی تباہ کر دی اور اسے مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ ایک ایسے جنونی کی طرح جس نے محض اپنی خوشی کے لئے لاکھوں پونڈ کے قومی سرمائے سے ایک کھلونا بنایا اور اس کھلونے سے بیس آدمیوں کی جان لے لی۔ تحقیقات کے لئے اعلیٰ سرکاری حکام اور ممتاز سائنسدانوں پر مشتمل جیوری کا اجلاس دو گھنٹے کے بعد شروع ہونے والا تھا۔ اس نے اب تک اس حادثے پر ہر پہلو سے غور کیا تھا مگر فنی اعتبار سے یہ نظام مکمل تھا۔ اس میں خرابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے اور اس کے ذہن نے ابھی تک اس حقیقت کو قبول نہ کیا تھا کہ اس کا منصوبہ ناقابل عمل تھا۔

بات محض ایک نقص کی تھی مگر سمجھنے والوں سے زیادہ سمجھانے والوں کے لئے دشواری تھی کہ نقص کے اسباب کے بارے میں نشاندہی کر سکیں اور اس بات کی ضمانت دے سکیں کہ پھر ایسا نہ ہوگا۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ لوگ یہ تو دیکھتے تھے کہ چلتا پھرتا صحت مند انسان حرکت قلب بند ہونے سے مر جاتا ہے مگر کسی نظام کی خرابی کو قبول نہیں کرتے تھے۔

کمیٹی میں ایک تو ایتھرٹن تھا۔ سائنسدان اور وزارت دفاع کا سائنسی مشیر۔ مگر سلیٹر کے مخالفین میں سے۔ ایک دوسرا پروفیسر اسٹر تھا جس سے وہ صرف ایک بار ملا تھا۔ اس واحد ملاقات کا تاثر یہ تھا کہ وہ ذہین اور خوش اخلاق مگر ٹھنڈے دماغ کا غیر جذباتی انسان ہے۔ شاید وہ ایتھرٹن کے مقابلے میں اس کی بات زیادہ توجہ سے سنے۔ تیسرا ہالینڈ تھا۔ پروجیکٹ ڈائریکٹر۔ سلیٹر کو اگر امید کی کرن نظر آتی تھی تو محض اس لئے کہ ہالینڈ نے اس سارے منصوبے میں شروع سے آخر تک دلچسپی لی تھی اور اسے سمجھا تھا۔ چوتھا منٹن تھا جو کمپیوٹروں کی نمائندگی کر رہا تھا اور قدرتی طور پر اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ کمپیوٹر میں کوئی خرابی پیدا نہیں

ہوئی۔

دوخواب آور گولیوں نے رات کو اسے نیم غنودگی کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا اور اب اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر باہر کی طرف شبنم کے قطرے جم گئے تھے اور دسمبر کی صبح کی سردی عروج پر تھی۔ اس نے خود کو تنہا اور بے سہارا محسوس کیا۔ تحقیقات کرنے والوں کو کیا پڑی ہے کہ اس کی سنیں۔ وہ سب اپنی اپنی پوزیشن کا دفاع کریں گے۔ سلیٹر، ٹھیک ہے تم ملک کے نامور سائنسدان ہو۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ یہ غلطی ہمیں کتنی مہنگی پڑی۔ تمہاری نہ سہی، نظام کی سہی۔ مگر نظام کا موجد کون تھا۔ معاف کرنا۔ ذمہ دار صرف تم ہو۔

سلیٹر کو معلوم تھا کہ نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اسے اگر جیل نہ بھیجا گیا تب بھی سائنسی تحقیق کی سہولتوں اور تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ فراموش کر دیا جائے گا۔ بے عزتی، گمنامی اور اس کا عذاب جھیلنے کے لئے۔

ناشتے میں اس نے سیاہ کافی کے دو مگ چڑھائے۔ اس سے غنودگی کی کیفیت ختم ہوگئی اور وہ نئے اعتماد کے ساتھ اپنا دفاع کرنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ وائٹ ہال کے اندر پہنچ کر اس نے اپنے ہیٹ اور کوٹ سے برف جھاڑی۔ اندر کی فضا نسبتاً گرم تھی۔ سلیٹر نے ہالنیڈ کی آواز سنی۔

"کیا بات ہے...... تم بیمار نظر آتے ہو۔ کمال ہے، ابھی سے تم اتنے خوفزدہ ہو۔ میرے خیال میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

سلیٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے معلوم ہے، میری تقدیر کے فیصلے پر تصدیق کی مہر لگ چکی ہے۔

"سلیٹر! میں کسی کی ذاتی رائے سے نہیں، حقائق اور اعداد و شمار سے متاثر ہوتا ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بھی میرے خلاف ہوں گے۔"

تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟ تمہارے خیال میں، میں جذبات کی رو میں بہنے والا شخص ہوں جسے رائے عامہ کی یا اپنی ذات کے لئے شہرت کی زیادہ پرواہ ہے۔" ہالنیڈ نے کہا......

سلیٹر خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ "ایتھرٹن مجھے تباہ کرنے کے لئے اسی موقع کا منتظر ہوگا۔" سلیٹر نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔ مجھے تم سے اس کی مخاصمت کا علم ہے۔ چیئر

مین کی حیثیت سے نہیں، مگر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ احمق ہے۔" ہالنیڈ نے کہا۔

کارروائی مقررہ وقت پر شروع ہوئی۔ اس سے قبل وہ اپنی اپنی رائے تحریری طور پر مرتب کر کے کمیٹی کے چیئرمین کو ارسال کر چکے تھے اور ایک دوسرے کی رائے کا مطالعہ کر چکا تھا۔

"خلاصہ آپ سب کی رائے کا یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیٹر خرابی کا ذمہ دار کمپیوٹر کو سمجھتے ہیں۔" ہالنیڈ نے کہا۔ "مسٹر ہنٹن کا نظریہ یہ ہے کہ اس پورے نظام میں خرابی یا ناکامی کے لئے حفاظتی انتظامات ناکافی تھے۔ مسٹر ایتھرٹن! غالباً آپ بھی اس نظریئے کے حامی ہیں۔"

"ناکافی......؟ یہ منصوبہ ابتداء ہی سے ناقابل عمل تھا۔ اور اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ ڈیزائن کی خامیوں کے نمودار ہونے کی صورت میں متبادل صورت کیا ہوگی۔" ایتھرٹن نے کہا۔

"میں یہی عرض کر رہا ہوں...... ڈاکٹر اسٹار کی رائے بین بین ہے۔ یعنی ان کے نزدیک ڈیزائن کے چند نقائص کو کمپیوٹر کا خودکار نظام دور کرنے میں ناکام رہا۔" ہالنیڈ نے کہا۔

"میں نے ڈاکٹر سلیٹر کے ڈیزائن کو بھی دیکھا ہے، کنٹرول سسٹم کو بھی اور خودکار کمپیوٹر کو بھی جو اس سارے نظام میں ہر خرابی دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کی یہ صلاحیت ضرورت کے وقت کام نہ آئی۔ اور بیس افراد مارے گئے۔ لاکھوں روپے مالیت کی گاڑیاں تباہ ہوئیں اور خوف و ہراس پھیلا۔" ایتھرٹن نے کہا۔ "کسی نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ کنٹرول کے کسی نقص کو اگر کمپیوٹر دور نہ کر سکا تو کیا ہوگا؟"

"یہ ٹھیک ہے...... اول تو ہمیں یقین تھا کہ خرابی نہیں ہوگی۔ اگر ہوئی تو پہلے کمپیوٹر کا خودکار نظام درست کرے گا۔ یہ ہم نے نہیں سوچا تھا کہ کمپیوٹر کا خودکار نظام بھی اس خرابی کو دور کر سکتا ہے۔ اگر وہ بھی خراب ہوگیا تو کیا ہوگا۔ ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ کمپیوٹر آزمائش کے ہزاروں مرحلوں سے گزر چکا ہے اور اس کا خراب ہونا ناممکن ہے۔ اور ہم نے یقین کر لیا۔" سلیٹر نے کہا۔

"مسٹر ہنٹن!" ہالنیڈ نے سوالیہ نگاہوں سے کمپیوٹر انجینئر کو دیکھا۔

"مسٹر سلیٹر نے صحیح کہا...... ہم نے یہ یقین دہانی کرائی تھی۔ لیکن اب ہماری ورکشاپ

میں انجینئرز نے ایک چھوٹے سے نقص کا پتہ چلایا جس کے بارے میں سلیٹر نے کہا تھا کہ اس قسم کی خرابی سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔"

"ہاں......" سلیٹر نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم نے کہا تھا کہ ہمارے انجینئر چند سیکنڈ میں کمپیوٹر کے ہر نقص کو دور کر سکتے ہیں۔ کہا تھا یا نہیں؟ مگر وزیر کے سامنے تم احمقوں کی طرح کھڑے رہے۔"

ہنٹن خاموش رہا۔

"بات یہ ہے مسٹر ہنٹن! ہر مشین میں چند خرابیاں متوقع ہوتی ہیں اور چند بعید از قیاس۔ اسی طرح جیسے اس کمرے کا دروازہ، اس کے قبضے خراب ہو سکتے ہیں، تالا خراب ہو سکتا ہے یا پالش خراب ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ یہ توقع کبھی نہیں رکھتے کہ آپ دروازہ کھولیں تو دروازہ درمیان سے بسکٹ کی طرح دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ یہ ناممکن ہے۔ کمپیوٹر میں لاکھوں نقص ہیں۔ اور ہم اپنے تجربہ سے جان لیتے ہیں کہ کس سیکشن میں گڑبڑ ہے۔ لیکن جس خرابی کا ہمیں پتہ چلا ہے وہ ایک معمہ ہے۔ اس کے اندر چند تاروں پر سے پلاسٹک کی تہہ غائب ہو گئی ہے اور دو تار آپس میں مل گئے ہیں۔ اور یہ تہہ اتارے بغیر نہیں اتر سکتی۔"

شام کو ہلنیڈ تھکا ہارا بار میں بیٹھا تھا۔ دن بھر کی بحث کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تھی۔ کمیٹی کے تمام ارکان اپنے اپنے شعبے میں اپنی بات کو حرف آخر تسلیم کرانا چاہتے تھے مگر نتیجہ صفر تھا۔ وہ اسٹول پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ مائر آ بیٹھا جو ہوائی حادثے کے اسباب کی تحقیقات پر مامور تھا۔

"ہیلو مسٹر ہلنیڈ...... آپ پریشان ہیں...... کیا ہوا تحقیق کا؟"

"کیا ہونا تھا...... ماہرین نے میرا دماغ خراب کر دیا۔ مجھے تو کمپیوٹر کی خرابی نظر آتی ہے...... اس میں چند تاروں پر سے ایمنیو اسٹرین پلاسٹک کی تہہ اتر گئی ہے۔ کمپیوٹر والے اسے تخریبی کارروائی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تار کا کنکشن اتر سکتا ہے لیکن جب تک چھیل کر نہ اتاریں، اس کا پلاسٹک نہیں اتر سکتا۔ وہ کہتے ہیں کسی نے کمپنی کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔" ہلنیڈ نے کہا۔

مائر نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا۔ "ہلنیڈ! کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں جس فضائی حادثے کی تفتیش کر رہا ہوں اس میں بھی حادثے کا سبب کچھ اسی قسم کا ہے۔ یعنی تاروں

سے پلاسٹک اتر گیا۔ تار شاٹ ہو گئے۔"

"اچھا؟......" ہلنیڈ نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ پلاسٹک حرارت سے پگھل کر اتر گیا ہو؟"

"اوہوں......" مائر نے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "ایمنیو اسٹرین پلاسٹک تین سو پچاس ڈگری سینٹی گریڈ تک نہیں پگھلتا۔"

✡......✡

رائٹ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"گیراڈ! اگر پلاسٹک حرارت سے پگھلتا تو اس کی صورت یہ نہ ہوتی۔ پھر یہ کہ ساڑھے تین سو ڈگری سینٹی گریڈ...... تم خود ہی سوچو، اتنی زیادہ حرارت کہاں سے آئے گی؟ ضرور کسی نے اس پر ایسی ٹون وغیرہ ڈال دیا ہے۔"

"کھلونوں کی دکان پر بھلا کون ایسی ٹون لے کر جائے گا۔ اور یہ مشینی خلانورد تو شوکیس میں تھا۔ سڑک پر سے اور دکان کے اندر سے لوگ ہر وقت اسے دیکھتے رہتے تھے۔ ان سب کی نظروں کے سامنے کوئی یہ حرکت کیسے کر سکتا ہے؟" گیراڈ نے کہا۔

"پھر...... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں کہہ سکتا ہوں، میں کیمسٹ نہیں ہوں۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ پلاسٹک کسی وجہ سے خراب ہو گئی ہو۔" گیراڈ نے کہا۔

"کیسی خرابی؟"

"کوئی بھی...... مثلاً حرارت یا روشنی اس پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتی ہوں۔ ایمنیو اسٹرین کو ہم نے لیبارٹری میں آزمایا ہے۔ استعمال کے بعد طویل مدت میں پیدا ہونے والی خرابیاں وقت کے ساتھ ہی معلوم ہوں گی۔ فضا کی نائٹروجن یا آکسیجن مونو آکسائیڈ وغیرہ...... پانی کے بخارات...... یہ سب دیکھنا پڑے گا کہ اسے کس نے گلا دیا ہے۔"

"مجھے زیادہ امکان اس بات کا نظر آتا ہے۔ فیولا کمپنی جس نے ایمنیو اسٹرین پلاسٹک کو تجارتی پیمانے پر تیار کر کے حقوق حاصل کئے ہیں، کہیں تیاری کے مراحل میں ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ کیمیائی اجزاء کا تناسب یا ان کا معیار درست نہ رہا ہو۔" رائٹ نے کہا۔ وہ اپنی ایجاد کی خامی کو قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔

"مشکل ہے...... ایک تو ان کا تجربہ اور جدید ترین پلانٹ ہے۔ دوسرے ایک نئی پیشکش کو متعارف کرانے سے پہلے خرابی کی صورت میں کاروباری ساکھ بگڑنے کا ڈر...... دونوں باتیں ایسی ہیں کہ وہ حد سے زیادہ محتاط ہوں گے۔" گیراڈ نے جواب دیا۔

"ہم اس کا لیبارٹری ٹیسٹ بھی کر چکے ہیں۔" رائٹ نے خراب پلاسٹک کے ٹکڑوں کو ریفریجریٹر میں رکھ دیا۔ "ابھی اس میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں؟" گیراڈ نے تعجب سے کہا۔

"اس لئے کہ اس سے زیادہ اہم کام ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔" رائٹ نے اپنے ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ گیراڈ کا ذہن بدستور اس مسئلے میں الجھا رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ایک خبر...... اس نے اپنے دماغ پر زور دیا...... کسی اخبار میں......؟ اس نے کریمر لیبارٹری کی سیکرٹری کو طلب کیا۔

"مس ڈیوس! گزشتہ دس دن کے سارے اخبار آپ کے کمرے میں ہیں؟"

آہستہ آہستہ اس نے ایمنیو اسٹرین کی تیاری میں کسی خامی کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دیوار پر اس پلاسٹک سے بنی ہوئی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ ٹیوب اور تار جو ٹیلی فون اور بجلی کے آلات میں استعمال ہوتی ہیں اگر ان کا پلاسٹک اتر جائے، گل سڑ جائے تو کیا ہوگا؟ اسے کریمر کے ساتھ کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ رائٹ اس سے پہلے سے یہاں موجود تھا اور اس ایجاد ایمنیو اسٹرین کی مقبولیت نے کریمر لیبارٹری کو معاشی طور پر مستحکم کر دیا تھا۔ اگر یہ ایجاد ناقص ثابت ہوگئی تو یہ استحکام باقی نہ رہے گا! اور کریمر اسے کس چیز سے تعبیر کرے گا۔ رائٹ کے ساتھ جذبہ رقابت سے؟ لیکن دوسری طرف یہ اٹل حقیقت تھی کہ ایمنیو اسٹرین کی خامی ان گنت خرابیوں کی ذمہ دار ہوسکتی تھی۔ پھر وہ کیا کرے؟ اپنی تحقیق کا رُخ موڑ دے؟ کریمر کے نقطہ نظر سے یہ تخریبی عمل ہوگا۔ لیکن سائنسدان کا نقطہ نظر کسی فرد کی ذاتی منفعت تک محدود نہیں رہنا چاہئے۔ جو کچھ کرتا ہے، ساری دنیا کے لئے کرتا ہے۔

لیکن ایمنیو اسٹرین ہی کریمر کے لئے سب کچھ نہیں تھی۔ بے شک اس کی دولت میں بے پناہ اضافہ اس کیمیائی مرکب سے ہوا تھا جس کا بنیادی جزو ایمنیو اسٹرین تھی لیکن وہ مرکب اس سے مختلف تھا۔ اس کی ایجاد محض اتفاق تھی۔ ایمنیو اسٹرین پر کیمیائی تجربات کے

دوران ایک ایسی چیز بن گئی تھی جو پلاسٹک کی طرح نظر آتی تھی۔ لیکن روشنی اور آکسیجن اسے ذرا سی دیر میں خاک کر دیتے تھے۔ بھورے رنگ کا ایک سفوف جسے پھونک مار کر اُڑایا جاسکتا تھا۔ بظاہر اس کا کوئی مصرف نہ تھا لیکن اس نے راتوں رات کریمر کو دولت مند بنا دیا تھا۔ بیوشاں کو ایک رات سوتے سوتے یہ خیال آیا۔ وہ کمبل پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا اور آدھی رات کو اس نے کریمر کو اور کریمر نے باقی سب کو تجربہ گاہ میں یہ اطلاع دی کہ اس نئے مرکب سے ایسی بوتلیں اور ڈبے بنائے جائیں گے جو کھانے پینے کی چیزوں، دواؤں، سامانِ آرائش اور دیگر ہزاروں روز مرہ کے استعمال کی اشیاء کو بند کرنے میں استعمال ہو سکیں گے اور خالی ہونے کے بعد راکھ بن کر اُڑ جائیں گے۔

کروڑوں، اربوں بوتلیں جو ہر گھر کے ڈسٹ بن سے نکل کر کوڑے کچرے کے ڈھیروں کی صورت میں جمع کر کے جلائی جاتی ہیں، پھینکی جاتی ہیں، استعمال کرنے والوں سے لے کر صفائی کرنے والوں تک کے لئے مسئلہ بن جاتی ہیں۔ ٹن کے ڈبے جو نہ جانے کہاں کہاں سے اکٹھے ہو کر اتنا بڑا ڈھیر بن جاتے ہیں کہ ان کو شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے ہٹانے میں کارپوریشن کا حملہ سڑکوں اور لاریوں کی مدد سے بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوتا۔ ایک ایسی ایجاد جو پیکنگ کے لئے استعمال ہوگی اور اس کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گی۔

خیال بہت انوکھا تھا۔ ایجاد رائٹ کی تھی اور استعمال بیوشان کا۔ کریمر نے فوری طور پر اندازہ کر لیا تھا کہ یہ استعمال کتنا مفید اور منافع بخش ہوگا۔ اس کو عام کرنے سے پہلے اس کی تیاری کے مختلف تجربات اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ان سب کی مشترکہ ذہنی جدوجہد نے بالآخر جس چیز کو جنم دیا اس کا نام انہوں نے متفقہ طور پر ڈیگرون رکھا۔

ڈیگرون کی بوتل کے گرد سیاہ پلاسٹک کی ایک پتلی سی تہہ رکھی گئی جو روشنی اور ہوا سے بوتل یا ڈبے کو محفوظ کر دیتی تھی۔ سیل بند بوتل کو کھولنے ک لئے سیاہ پلاسٹک کی بیرونی تہہ کو پھاڑنا ضروری تھا چنانچہ ڈھکن کے گرد اسی سیاہ پلاسٹک کا ایک حلقہ سا تھا جسے آسانی سے کھینچ کر توڑا جاسکتا تھا پھر ڈھکن کھل جاتا تھا اور دو گھنٹے کے اندر اندر نہ ڈھکن رہتا تھا اور نہ بوتل۔ جو راکھ بنتی، وہ سیاہ پلاسٹک کو گلا کر پانی کی طرح بے رنگ محلول بنا دیتی تھی اور یہ محلول پٹرول کی طرح بخارات بن کر اُڑ جاتا تھا۔ بوتل کے سیاہ بیرونی پلاسٹک پر واضح طور

پر سفید حروف میں چھپا ہوا تھا۔
''سیل توڑنے کے بعد دو گھنٹے کے اندر اندر بوتل غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ اسے کھولتے ہی خالی کر لیا جائے اور اس کے اندر کی چیز استعمال کر لی جائے یا کسی اور برتن میں انڈیل لی جائے۔ سیل توڑنے کے عمل کو دلچسپ اور آسان بنانے کے لئے ڈھکن کے حلقے میں سیاہ پلاسٹک کا ایک ہک سا تھا جسے کھینچنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے زپ کھولنے سے۔ اور ماہرینِ نفسیات کا خیال تھا کہ یہ آواز زِپ کی طرح سیکس اپیل رکھتی ہے۔

پہلی بوتل کی تیاری کے مختلف مرحلوں میں کریمر کی ٹیم ایک نئے ولولے کے ساتھ کام کرتی رہی۔ دن رات ایک ہو گئے۔ اس انقلاب انگیز ایجاد کی کامیابی نے ان کی بھوک پیاس اُڑا دی۔ کئی دن کی مسلسل محنت کے بعد جب وہ تھکن سے چور تھے، ایک بھدی، بدوضع بوتل بن کر تیار ہوئی جسے کریمر نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے روشنی میں لا کر کھولا۔ دو گھنٹے تک وہ سب سانس روکے خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ بوتل بالکل غیر محسوس طریقے پر غائب ہو گئی۔ خوشی کے مارے وہ پاگلوں کی طرح ناچنے اور چلانے لگے۔

کریمر نے اس ایجاد کو ٹیسٹ کرنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں سینکڑوں اخباری رپورٹرز، ریڈیو کے نمائندوں اور ٹی وی کیمروں کے سامنے اپنی بوتل کو پیش کیا اور ٹی وی پر کروڑوں اربوں گھروں میں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس جادوئی بوتل کو غائب ہوتے دیکھا۔ دو گھنٹے کے دوران بوتل میز پر بخارات بن کر اڑتی رہی۔ کریمر سوالات کے جواب دیتا رہا۔ پھر جیسے ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ بیک وقت ساری دنیا میں پیکنگ کے لئے بوتلیں اور ڈبے بنانے والی سینکڑوں فرموں کے درمیان اس ایجاد سے فائدہ اٹھانے کی جدوجہد شروع ہو گئی اور کریمر نے مکمل کاروباری ذہنیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رائلٹی پر اس کی تیاری کی اجازت دینی شروع کر دی۔ پیسہ برسنے لگا۔ اشتہار دینے والی فرموں نے الگ کمایا۔ بوتل بنانے والوں نے الگ۔ اور ان میں اپنی مصنوعات بھر کر بیچنے والوں نے الگ۔ استعمال کی چیزیں بنانے والی کمپنی نے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر نت نئے ناموں سے پرانی مصنوعات کو فروخت کرنے کی مہم شروع کر دی۔

''کوکا کولا پیجئے۔ بوتل کی فکر مت کیجئے۔''

''دودھ کا دودھ، پانی کا پانی۔ دودھ آپ لے لیجئے، بوتل پانی بن کر اڑ جائے گی۔''

''کوڑا کرکٹ سورج صاف کرے گا۔ آپ ایک شیمپو سے سر صاف کیجئے۔''

''فارغ البال ہیئر ٹانک۔ طلسماتی بوتل میں طلسماتی ٹانک۔ بوتل غائب، بال حاضر۔''

ساری دنیا میں اربوں ہاتھ زپ کی طرح بوتلیں اور ڈبے کھولنے لگے۔ دنیا میں ہر چیز ڈیگرون سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی شیشیوں میں، بوتلوں، ڈبیوں اور ڈبوں میں فروخت ہونے لگی۔ صنعتی پیمانے پر ان کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کے لئے ڈیزائنرز اور مشینیں بنانے والے نئے نئے تجربات کرنے لگے۔ ڈیگرون روزمرہ زندگی کا ایک جزو بن گیا جس کے نام سے بچہ بچہ واقف تھا۔ شیشے اور پلاسٹک اور ربڑ کی طرح کریمر نے سینتالیس فرموں سے معاہدے کئے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر دن بدن صفائی کا مسئلہ بنتے جا رہے تھے، دھوئیں کے ساتھ غلاظت میں اضافہ کر رہے تھے، یہ ایجاد سب کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ مگر کریمر کو اس نے سب کچھ دے دیا۔ دولت، عزت، شہرت۔ اس کے سارے خواب سچ کر دیئے۔

'اور اب......؟' گیراڈ نے سوچا۔ اگر وہ یا کوئی اور یہ ثابت کر دے کہ ڈیگرون یا ایمیو اسٹرین ایک ناقص مرکب ہے تو کریمر کی دولت اور شہرت کے محل مسمار ہو جائیں گے جو اس ایک ستون پر قائم ہیں۔ کیا یہ کام اسے کرنا ہوگا؟ کیا اس کے بعد کریمر کی سائنسی جدوجہد جاری رہے گی؟ خواہ اس کا مقصد دولت کا حصول ہو یا کچھ اور...... کیا وہ اس کا دوست رہے گا یا اس پر بھروسہ کرے گا؟

مس ڈیوس نے اخبارات کا پلندہ اس کے سامنے رکھا تو اس کے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔

''آپ کافی تو نہیں پئیں گے؟'' اس نے بے رخی سے پوچھا۔ گیراڈ نے بلا ارادہ نفی میں سر ہلا دیا۔

اخبارات کے صفحے پلٹتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کافی کی تو اسے اشد ضرورت ہے۔ ہوائی حادثے کی خبر ایک ہفتہ پرانی تھی۔ اس بارے میں تحقیقات جاری تھیں۔ لیکن اس شبہ کا اظہار ضرور کیا گیا تھا کہ بجلی کے تاروں کے جال میں کہیں کوئی تار شاٹ ہو گیا تھا ایمیو اسٹرین کی تہہ اتر جانے سے۔ تاروں پر تو اب ہر جگہ ایمیو اسٹرین ہی استعمال ہو رہی تھی۔

اس نے بے دلی سے اخبار ایک طرف رکھ دیئے۔ اچانک اس کی نظر وان کیسرو میں ٹریفک جام اور حادثات سے متعلق ایک خبر پر پڑی۔

"سلیٹر...... یہ کون ہے؟" اس نے سوچا۔ "خیر، ہوگا کوئی......"

اس نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ٹریفک کے نظام کو کنٹرول کرنے والے خود کار نظام کے کمپیوٹر میں ایک تار شارٹ ہوگیا تھا۔ پلاسٹک کی تہہ اتر گئی تھی۔ کمپیوٹر بنانے والوں کی طرف سے اس کو تخریبی کارروائی بتایا گیا تھا اور انہوں نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا تھا کہ کمپیوٹر میں اس مخصوص تار کو جوڑتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ گیراڈ کو ہوائی حادثہ اور کمپیوٹر کی خرابی کے درمیان کوئی رشتہ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر یہ ممکن تھا۔ اس نے کافی طلب کی۔ آہستہ آہستہ گیراڈ کے ذہن میں یہ شبہ تقویت پکڑتا گیا۔ مگر ابھی وہ قطعی طور پر پورے وثوق سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ تصدیق ضروری تھی۔ کریمر سے کوئی بات کرنے سے پہلے اس کے پاس ناقابل تردید شہادت ہونی چاہئے تھی۔ اس نے ٹریفک کے جام والی خبر کو غور سے پڑھا۔ وہیں ایک چھوٹی سی سرخی یہ تھی کہ سلیٹر کو تحقیقات مکمل ہونے تک معطل کردیا گیا ہے۔ لیکن وہ بدستور وزارتِ مواصلات کا مشیر ہے۔ اس نے فون اٹھایا۔ وزارتِ مواصلات میں آپریٹر نے جواب دیا۔

"لیس سر......؟"

"میں مسٹر سلیٹر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ گیراڈ...... لیوک گیراڈ......"

سلیٹر تھوڑی سی تاخیر سے پہنچا۔ لیکن سینٹ بار میں گیراڈ اسے منتظر ملا۔ سلیٹر پہلے اسے پیشہ ور صحافی سمجھا تھا جو کسی نہ کسی بہانے سنسنی خیز سرخی جمانے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کیونکہ گیراڈ نے اپنا تعارف ضرور کرایا تھا لیکن کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی۔ گیراڈ نے ٹیلی فون پر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بات محض شبہ کی تھی اور کسی بھی طرح کریمر تک پہنچ جاتی تو ردعمل نجانے کیا ہوتا۔ وہ چاہتا تھا سلیٹر خود ہی سب کچھ بتا دے۔ سلیٹر کا چہرہ ایک متفکر انسان کا چہرہ تھا۔ وسکی کے دو جام پی کر وہ ذرا سا کھلا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ تم کون ہو...... اور کیا چاہتے ہو...... مگر اب میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ اگر تم صحافی ہو تو جو تمہارا جی چاہے چھاپ دو...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا......" اس کی گفتگو اس کے ذہنی کرب کی غماز تھی۔ سرکاری تحقیقات کے طویل بیزار کن سرخ فیتے میں

بندھے ہوئے شخص کی کیفیت کی عکاس۔

"میں صحافی نہیں ہوں۔" گیراڈ نے مسکرا کر کہا۔

"پھر کون ہو؟"

"ڈاکٹر ہوں...... کریمر گروپ کا۔" سلیٹر نے جواب دیا۔

"میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گا۔ کبھی کسی ایسے ادارے میں کام نہ کرنا ڈاکٹر! جہاں تمہارا ذہن غلام ہو جائے۔ جہاں تمہارے گرد بزدل لوگ جمع ہوں۔ بزدل اور احمق۔ جن کے دماغ میں بھوسا بھرا ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کرنے دیں گے اور کوشش کریں گے کہ تمہارا دماغ نکال کر اس میں بھی بھوسا بھر دیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا ڈاکٹر؟ یا تمہاری کھوپڑی میں پہلے ہی بھوسا بھرا جا چکا ہے......؟" اس نے گلاس کو زور سے میز پر رکھا۔

"مسٹر سلیٹر! آپ مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوں۔" گیراڈ نے کہا۔

چند لمحے سلیٹر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا رہا۔ گومگو کی کیفیت میں۔ پھر بولا۔ "بات یہ ہے ڈاکٹر گیراڈ! مجھے کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ میری حالت اس خرگوش کی طرح ہے جس کے تعاقب میں شکاری کتے ہیں۔ بھوکے...... پتہ بھی کھڑکتا ہے تو میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ہر طرف خطرہ نظر آتا ہے۔"

گیراڈ کو اس کی صاف گوئی نے متاثر کیا اور اسے سلیٹر پر افسوس بھی ہوا کہ اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر گیراڈ نے اپنے خدشات کا اظہار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ اس نے ہیرٹ اسٹور میں کھلونے والے واقعے کو ہوائی حادثہ اور سلیٹر کے منصوبے کی غیر متوقع ناکامی سے جوڑنے کی کوشش کی اور بولا۔

"مجھے اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ ایمینو اسٹرین طویل مدت میں فضائی اثرات کے تحت خراب ہونے لگتی ہے...... اس میں کوئی کیمیائی تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ مگر میں ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ کیوں، کون سی چیز اسے نقصان پہنچاتی ہے۔ دیکھو نا...... اس سے ڈیگرون بنا ہے اور وہ روشنی اور ہوا کے لگتے ہی ختم ہونے لگتا ہے۔ شاید ایمینو اسٹرین میں بھی مخصوص حالت میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

سلیٹر تعجب اور غور سے سنتا رہا، پھر بولا۔

''ہاں...... یہ ممکن ہے...... ورنہ کسی وجہ کے بغیر اچانک تاروں پر سے ایمنیو اسٹرین کی تہہ کا غائب ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ الو کے پٹھے کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ کسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیسے کیا تو سب چپ ہو جاتے ہیں۔ کمپیوٹر پر چوبیس گھنٹے آپریٹر اور انجینئر موجود رہے۔ سوائے ان کے کون سمجھتا ہے کہ کمپیوٹر کیا ہے۔ اور انہیں کیا فائدہ۔ خیر میں ہالنیڈ سے کہوں گا کہ وہ اس امکان کو بھی ذہن میں رکھے۔

وہ اٹھا مگر آدھے راستے سے لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر امید کی نئی روشنی تھی۔ اس نے کہا۔

''ڈاکٹر! تم اگر انتظار کرو تو میں اس سے بات کر کے پھر تم سے یہیں ملوں...... لنچ کا وقت ہے۔ وہ کھانا کھا رہا ہوگا۔ پھر ہم یہیں لنچ کریں گے۔''

''او کے...... میں انتظار کروں گا۔''

گیراڈ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے تالاب کے ساکت پانی میں ایک کنکری پھینک دی تھی۔ مگر اس نے سلیٹر کی مدد کرنے کی خواہش نے مجبور کر دیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لوٹا تو اس کا مسکراتا ہوا چہرہ سلیٹر کے مایوس چہرے سے قطعی مختلف تھا جسے گیراڈ نے تھوڑی دیر قبل پہلی بار دیکھا تھا۔ کھانے کے دوران انہوں نے بہت کم بات کی لیکن سلیٹر کو گیراڈ نے خاصا متاثر کیا۔

''گیراڈ! تم نے مجھے نیا حوصلہ عطا کیا ہے...... ہالنیڈ نے مائر سے مل کر اس امکان کا جائزہ لینے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔''

''مسٹر سلیٹر! مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوئی۔'' اس نے سلیٹر کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''اور آپ سے مل کر بھی۔''

کھانے کے بعد وہ دوستوں کی طرح رخصت ہوئے۔ گیراڈ نے محسوس کیا کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کوئی ایسا بیان نہیں دیا جس سے کریمر کو نقصان ہو۔ صرف تحقیقات کرنے والوں تک ایسی بات پہنچا دی ہے جو شاید ان کے ذہن میں نہ ہو۔ ابھی تو اس نے صرف ایک شخص کی مدد کی ہے۔ لیکن اس کے خدشات درست ثابت ہوئے تو نجانے کتنے ہوائی حادثات ہوں گے۔ وان کیسرو کی سڑکوں پر سلیٹر ٹریفک کنٹرول کر سکے گا۔ ایک عظیم

ذہن کا عظیم خواب ادھورا نہیں رہے گا۔ نجانے کتنے سلیٹر معطل نہیں ہوں گے اور خوف ان کے ذہنوں کی پرواز کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ سلیٹر کا پریشان، خوفزدہ چہرہ اس کے سامنے تھا۔

''میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں...... بھوکے کتے میرے تعاقب میں ہیں۔'' پھر اس نے سلیٹر کی آواز سنی۔

'تم نے مجھے نیا حوصلہ دیا ہے۔' وہ مسکرایا۔ 'کریمر سے میرا کیا رشتہ ہے اور کریمر کا نفع نقصان کیا چیز ہے۔' اس نے اطمینان سے سوچا۔ 'اس سے کہیں عظیم تو انسان کا وہ دماغ ہے جو ہمیشہ عظیم تر مستقبل کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اس میں کوئی بھوسہ نہیں بھر سکتا۔ کوئی نہیں۔ نہ کریمر اور نہ ایتھرٹن اور نہ کوئی اور......!!'

۞......۞

مائر کے کمرے میں ایک لمبی سی ڈیسک پر ماڈل ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی اور دیوار پر سکائی لینڈ کے رنگین نقشے پر ہوائی جہاز کے راستوں کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ پنسل اور کوئلے سے بنی ہوئی ایک تصویر میں پہلی زیر زمین گاڑی کو سرنگ نما راستے کے اندر دکھایا گیا تھا۔ انجن کا دھواں سرنگ کی چھت تک پہنچ رہا تھا۔

الماری میں جو کتابیں بھری پڑی تھیں وہ بھی اوٹ پٹانگ موضوعات پر تھیں۔ ہالنیڈ کسی کو فون کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔

'ہنٹن...... نہیں بھائی، ہنٹن...... نہیں، بیل سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں ہاں میں ہولڈ کئے ہوئے ہوں۔'' فون پر ہاتھ رکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''مصیبت ہے ان بڑے بڑے کاروباری اداروں میں کسی سے رابطہ قائم کرنا۔ اس نے مائر سے کہا۔

''ہیلو ہنٹن...... میں ہالنیڈ...... ہاں تمہیں کچھ پتہ چلا...... گڈ...... ہاں ہے تو حیرت کی بات...... خیر...... یہ بتاؤ کس نے سپلائی کئے ہیں؟''

ہالنیڈ نے پھر فون پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''دیکھ رہا ہے......'' اس نے سرگوشی میں مائر سے کہا۔

''ہاں...... نئے تار تھے۔ ایمنیو اسٹرین کے کور والے...... شکریہ بھائی...... ہاں بس منگل کو...... خدا حافظ......'' اس نے فون رکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

''ٹھیک ہے...... خرابی اسی تار میں تھی جس پر ایمنیو اسٹرین چڑھی ہوئی تھی۔''

"فائن......" مائر نے ماڈل ریلوے کو زور سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ سیدھی دیوار کے بفر سے جا ٹکرائی۔ "اب کچھ ایسا لگتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہو جائیں گے۔"

"تار نیو پلاس والوں نے فراہم کیا تھا۔" ہالینڈ نے کہا۔ "نیو پلاس لمیٹڈ......اسکیس۔"

"مجھے معلوم ہے، یہ ایمیو اسٹرین کیا بلا ہوتی ہے۔" مائر نے کہا۔

"زیادہ تو نہیں معلوم مگر پلاسٹک سے زیادہ مضبوط اور سستی چیز ہے۔ کریمر لیبارٹری میں ایک نوجوان ہیرالڈ لائٹ کی ایجاد ہے۔ انہی نے بعد میں ڈیگرون ایجاد کیا۔ ہالینڈ نے کہا۔ اسی میں ان کے وارے نیارے ہو گئے۔"

مائر نے سر ہلایا۔

"یہ سب کریمر کے ذہن کا کرشمہ ہے۔ اس نے لوگوں کو اِدھر اُدھر سے جمع کر کے سب کو ایک کام پر لگا دیا۔

لیکن کریمر عین اسی وقت بڑا متفکر اور پریشان بیٹھا تھا۔ رائٹ دوسری کرسی پر نیم بیزاری کے عالم میں دراز تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔" رائٹ نے چڑ کر کہا۔

"قصور ہے یا نہیں، صورتحال یہ ہے کہ نیو پلاس والے ہمیں ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ ہوائی جہاز کے حادثے......ٹریفک جام......اور وہ کھلونوں والی دُکان کے واقعے میں ایمیو اسٹرین کی خرابی ہی سامنے آتی ہے......" کریمر نے کہا۔

"کریمر! دو یا تین حادثات میں جو الگ الگ وقتوں میں پیش آئے، کوئی ایسی بات تلاش کر لینا جو مشترک ہو، کیا مشکل ہے......آخر تحقیقات کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ تو ثابت کرنا ہی تھا اور انہوں نے اپنی آسانی کے لئے یا کسی اور وجہ سے......مثلاً یہ کہ ہمارے کسی بدخواہ نے انہیں معقول معاوضہ ادا کر دیا ہو۔ باہمی رضامندی سے ایک بیان دے دیا ہو۔" رائٹ نے جواب دیا۔

"رائٹ! ایسے کام نہیں چلے گا۔ تم نیو پلاس لمیٹڈ سے آئے تھے۔ میں تمہیں لایا تھا۔ تم نے یہیں رہ کر نام پیدا کیا اور دولت کمائی۔"

"صرف میں نے......؟" رائٹ نے طنز سے کہا۔

"اچھا اچھا......ہم دونوں نے۔ مگر اب ہم دونوں خطرے میں ہیں۔ نیو پلاس والے

کہتے ہیں کہ ہم نے غلط بیانی کی۔ ایمیو اسٹرین کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ خامیوں کا ذکر گول کر گئے۔ مثلاً وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کیا خرابیاں رونما ہو سکتی ہیں۔" کریمر نے کہا۔

"اس کا تم نے موقع ہی کب دیا؟" رائٹ نے کہا۔

"میں نے......؟" کریمر نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے کیسے؟"

"ہاں تم نے......اس لئے کہ تم تاخیر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تم پیسہ کمانا چاہتے تھے۔ جلد از جلد۔ تم نے میں اتنی مہلت نہیں دی کہ ہم وقت گزرنے کے ساتھ پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کر سکتے۔ تم نے ہمیں مجبور کیا۔ یہ بھی چھوڑو۔ اسے بھی جانے دو۔ بس اتنا کافی ہے۔" رائٹ کی آواز بلند ہوتی گئی۔ "اب تم ہی اسے بھگتو......نام تم نے کمایا......بدنامی بھی سمیٹو۔"

کریمر کا چہرہ فق ہو گیا۔ بیوشان اس دوران خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کریمر......" بیوشان نے کہا۔ "آپس میں لڑنا بیکار ہے۔ کیا قانونی طور پر ہم محفوظ ہیں؟"

کریمر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "کیا مطلب؟"

"ہم نے تین سو سے زائد معاہدے کئے ہیں اور نجانے کہاں کہاں ایمیو اسٹرین کا استعمال ہو رہا ہے۔" بیوشان نے کہا۔ "اگر اس کی خرابی ثابت ہو گئی تو جتنے حادثے، جتنی اموات اور جتنا نقصان ہو گا اس کے ذمے دار ہم سمجھے جائیں گے۔"

"کیوں......؟" رائٹ نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم نے ایک چیز بنائی ہے۔ اس کا طریقہ بتا دیا اور اس کا فارمولا فروخت کر دیا۔ کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ کسی خامی کو نہیں چھپایا۔ جو چیز تھی، جیسی تھی سامنے رکھ دی۔ خریدنے والوں نے اپنا اطمینان کر کے خریدی۔ بعد کے ذمے دار ہم نہیں......ایک تجربہ ہم نے کیا تھا جو کامیاب ہوا۔ ہم نے کہیں یہ ضمانت نہیں دی تھی کہ بعد میں جو خرابیاں سامنے آئیں گی ہم ان کا خمیازہ بھی بھگتیں گے۔"

"پھر بھی......یہ ہمارا فرض ہے۔" بیوشان نے کہا۔

"ہمارا فرض کیوں ہے۔ خریدنے والے بھی وہ لوگ تھے جن کو ہم جیسے سینکڑوں سائنسدانوں کی خدمات حاصل تھیں۔ کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ خریدنے سے پہلے آزما

لیتے۔ اگر کوئی شبہ تھا تو دور کر لیتے۔'' رائٹ نے غصے کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''ان کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی کہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔''

کسی نے رائٹ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ پھر کریمر نے فون اٹھا کر گیراڈ کے گھر کا نمبر ملا دیا۔ وہ اکیلا رہتا تھا اور اس نے اپنے چھوٹے سے فلیٹ کی آرائش تجریدی انداز میں اپنے ذوق کے مطابق کی تھی۔ بہت کم لوگوں کو اس کباڑ خانے میں حسن آرائش کا احساس ہوتا تھا۔ دیواروں پر روشنی آڑھے ترچھے زاویوں سے منعکس ہوتی تھی۔ چھت میں اور فرش پر کہیں اسپیکر پوشیدہ تھے جو اسٹریو ریکارڈوں کے نغموں کو اس طرح سناتے تھے کہ کمرہ موسیقی سے بھر جاتا تھا۔ چھت میں شیشے کے گولے لٹک رہے تھے۔ رنگین پلاسٹک کے مکعب زینے کی طرح رکھے تھے۔ ان پر کتابیں کھڑی تھیں۔

''ہیلو......'' اس نے فون کو کندھے اور کان کے درمیان دبا کر انڈے پھینٹتے ہوئے کہا۔

''گیراڈ...... شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ بات ایمیو اسٹرین پر آ رہی ہے...... ہاں...... ایک تو برنارڈ ہالنیڈ ہے...... وزارت مواصلات کا سائنسدان۔ دوسرا ایئر کرافٹ انسپکٹر مائر ہے۔ سارا معاملہ ان کے ہاتھ میں ہے...... ذرا ان سے بات کرو...... اس طرح کہ الزام ہم پر نہ آئے...... ہاں، محتاط ہو کر بات کرنا...... ذرا ہوشیاری سے...... ہاں...... بالکل...... قصور انہی کا ہے۔ انہیں اطمینان کر لینا چاہئے تھا۔ میرا مطلب ہے بنانے والوں کو...... ہاں...... ہم نے کوئی ضمانت نہیں دی تھی۔ سال، دو سال یا پچاس سال کی۔ قطعی نہیں......''

مائر...... اس کا پتہ ہے......؟''

''ہاں...... کمرہ نمبر دو سو چوبیس، وزارت صنعت۔''

گیراڈ نے فون رکھ دیا اور مسکرایا۔

'اگر انڈا خراب نکل آئے تو کیا مرغی ذمے دار ہو سکتی ہے؟ نہیں......' اس نے آملیٹ بناتے ہوئے سوچا۔ مارا گیا تو بے چارہ دکاندار یا کھانے والا۔

وان کیسرو کی زیر زمین ریل اچانک رک گئی۔ ڈبے میں ان لوگوں کے پسینے اور جسموں کی ملی جلی بو تھی جو سب کے سب کام سے لوٹ رہے تھے۔ تیل اور پسینے سے گندے ہاتھوں اور کام کے میلے لباس کے علاوہ بڑھی ہوئی شیو نے ان کے چہروں پر تھکن اور

پژمردگی کے احساس کو شدید کر دیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملے کھڑے تھے۔ ایک طویل قامت شخص اپنے سامنے کھڑے ہوئے پستہ قد مرد کے کندھوں کے اوپر سے اس کے سامنے پھیلا ہوا اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ ایک موٹی عورت ایک داڑھی والے شخص کی بداخلاقی سے نالاں تھی جو مسلسل باہر دیکھ رہا تھا تاکہ اسے اپنی جگہ معزز خاتون کو نہ پیش کرنی پڑے۔ اچانک گاڑی ایک جھٹکے سے چلی اور پھر رک گئی نوجوان نے سیٹی کی تال پر جوتا بجانا شروع کیا اور ایک سیاہ فام لڑکی کو آنکھ ماری۔ موٹی عورت کو مزید صدمہ ہوا۔ نوجوان نے سگریٹ سلگائی تو اس کے لئے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔

''سگریٹ پینا منع ہے مسٹر......'' اس نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا......؟'' اس نے بے حد تعجب سے کہا اور سگریٹ کو دو انگلیوں سے مسل دیا۔ اس کی راکھ موٹی عورت کے جوتے پر گری۔

پندرہ منٹ گزر گئے تھے، لوگ گھڑی دیکھتے دیکھتے بھی بیزار ہونے لگے۔ بھوک کے علاوہ بھی بہت سے مسائل انہیں پریشان کر رہے تھے۔ فرسٹ شو جس کا وہ ٹکٹ خرید چکے تھے۔ وعدہ جو وہ کسی سے کر چکے تھے۔ بچے جو ان کے انتظار میں تھے۔ بیویاں جو پریشان ہوں گی۔

ڈبوں کو ملانے والے شیشے کا دروازہ کھول کر ریلوے کی نیلی وردی میں کنڈکٹر گارڈ نے ان کے ڈبے میں قدم رکھا تو وہ سب پھٹ پڑے۔

''گھنٹہ بھر ہو گیا ہے یہیں پر۔''

''یہ کیا گڑبڑ ہے...... کیا ہم رات یہیں پر بسر کریں گے؟''

''کتنی دیر اور لگے گی؟''

''دھکا لگانا پڑے گا کیا؟''

''پلیز پلیز......'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''سگنل خراب ہو گیا ہے۔'' آپ لوگ چند قدم پیدل چلنے کی زحمت کریں۔ سگنل کے ادھر دوسری گاڑی تیار ہے۔''

''اور ریلوے لائن پر جو کرنٹ ہے؟''

''دو فرلانگ میں چند قدم ہوتے ہیں۔''

''ہم نے اسے بند کر دیا ہے۔ ہم زحمت کے لئے معذرت خواہ ہیں۔''

بکتے جھکتے، غصے سے بڑبڑاتے، چیئر مین سے گفتگو کا تہیہ کرتے، وزیر کو خط لکھنے تک کے منصوبے بناتے لوگ ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ ان کے آگے لوگوں کی ایک طویل قطار سلیپرز پر قدم رکھتی جا رہی تھی۔

''سگنل خراب کیسے ہو سکتا ہے؟'' موٹی عورت نے سیٹی بجانے والے نوجوان سے کہا۔

''یہ سب ڈھونگ ہے......'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے خاتون کہ......'' اس نے سگریٹ کو کان سے ہٹا کر دوبارہ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ساٹھ سال قبل ٹھیک اسی وقت ڈرائیور پیدا ہوا تھا جب گاڑی رکی۔ اسے یاد تھا۔ چنانچہ ساٹھ سال پورے ہوتے ہی وہ ریٹائرڈ ہو گیا۔ اس نے گاڑی چلانے سے انکار کر دیا۔ قانوناً اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔''

کچھ لوگ مسکرائے۔ خاتون نے برا سا منہ بنایا لیکن سیاہ فام لڑکی بے ساختہ ہنس پڑی۔

نوجوان اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ سرنگ کے اندر کی ہوا گرم تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گول دیواروں میں بلب روشن تھے۔ پیچھے نیم تاریک راستے پر وہ خالی کھڑی ہوئی گاڑی ایک روشن لکیر کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اسٹیشن کی روشنی سامنے ایک فرلانگ دور جگمگا رہی تھی۔

نوجوان نے زور سے سیٹی بجائی اور اس کی بازگشت کو سنا۔ لوگ ایک قافلے کی صورت میں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ سگنل کیبن کے اندر نیلی وردی میں ملبوس کنڈیکٹر گارڈ نے ٹیلی فون سنبھال رکھا تھا۔

''میں نے کہا نا کہ لائٹ سرخ ہے۔ پندرہ منٹ تک تو میں انتظار کرتا رہا۔ نہیں مجھے معلوم ہے کہ سگنل خود کار ہے۔ ہاں میں نے سوئچ سے بھی کوشش کر لی۔ اسٹیشن ماسٹر کو معلوم ہے۔ دوسری گاڑی کا بندوبست اسی نے کیا ہے۔'' وہ کچھ دیر سنتا رہا، پھر بولا۔

''یہ میرا کام نہیں ہے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ نیچے اتر کر وہ مسافروں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بلا ارادہ وہ سرنگ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے والے بجلی کے تاروں کو دیکھتا گیا جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چینی کے گول پیالہ نما انولیٹرز کے سوراخوں سے گزر رہے تھے۔ اچانک اس کے قدم رک گئے۔ سرنگ کی دیوار میں ایک بلب کے قریب موٹے تار کا تانبہ چمک رہا تھا۔ ایمنیو اسٹرین کی موٹی تہہ جگہ جگہ سے کٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ کئی جگہ سے

یہ رنگین تہہ پگھل کر قطرہ قطرہ نیچے ٹپک رہی تھی۔ جھاگ کی طرح بلبلے بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟

کنڈکٹر گارڈ دس سال سے انہی راستوں پر سفر کر رہا تھا۔ اس کے سامنے پرانی گاڑیوں کی جگہ الیکٹرک ٹرین نے لے لی تھی اور سگنل کا خود کار نظام نصب کیا گیا تھا جو خطرے کی صورت میں ریلوے لائن کو لاک کر دیتا تھا۔ پچیس سال پرانے تاروں کی جگہ نئے تار لگائے گئے تھے۔ بالکل نئے تار...... وہ واپس ریلوے سگنل کی طرف بھاگا اور فون اٹھا لیا۔

''ہیلو...... ہیلو...... سگنل آپریشن چیف...... میں ڈک ہوں۔''

✡......✡

ہلنیڈ اپنے آفس میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا ہاضمہ پھر خراب تھا۔ اس نے ہاضمے کی دوا پی کر ایک ڈکار لی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو...... سلیٹر...... ہاں...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ ٹیوب میں ایک سگنل فیل ہو گیا تھا۔ ہاں...... کنڈکٹر گارڈ کی رپورٹ مجھے مل چکی ہے۔ کون...... نہیں...... میں جانتا تو نہیں مگر خیر...... اپنے ساتھ لے آؤ۔''

چند منٹ بعد اس کے کمرے میں مائر اور سلیٹر کے علاوہ ایک اور شخص بیٹھا تھا جس کا تعارف سلیٹر نے گیراڈ کے نام سے کرایا تھا۔ وہ میز کے کونے پر ٹکا ہوا گفتگو کر رہا تھا۔

''مسٹر ہلنیڈ! اگر واقعات کو ترتیب وار سامنے رکھا جائے تو ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ حادثات کا سبب تاروں کا شارٹ ہونا تھا۔ ان سب پر سے ایمنیو اسٹرین غائب ہو گئی تھی حالانکہ کہیں بھی...... سوائے جہاز کے...... درجہ حرارت کے ساڑھے تین سوسینٹی گریڈ تک پہنچنے کا سوال ہی نہ تھا۔ بے شک تاروں کا پلاسٹک کٹ جاتا ہے، چٹخ جاتا ہے مگر یوں غائب نہیں ہوتا۔ بغیر حرارت کے پگھل کر نہیں گرتا۔'' گیراڈ نے کہا۔

''مسٹر گیراڈ...... واقعات، مقامات اور وقت کے اعتبار سے الگ ہیں۔ غالباً تار بھی الگ الگ کمپنیوں نے بنائے ہیں۔'' ہلنیڈ نے کہا۔ ''کوئی نتیجہ اخذ کرنا قبل از وقت ہے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی فیصلہ کر رہا ہوں۔ میں امکانات پیش کر رہا ہوں۔ فرض کیجئے، ایمنیو اسٹرین میں کہیں کسی خاص وجہ سے کوئی ایسا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔''

''آپ اپنی لیبارٹری میں خلانورد کے اس کھلونے کے پارٹس کی خرابی کا تجزیہ کر رہے

ہیں۔'' ہالنیڈ نے کہا۔ ''بہتر ہوگا پہلے آپ رپورٹ مرتب کرلیں۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ہالنیڈ نے ریسیور اٹھالیا۔

''ہالنیڈ......'' اس نے کہا۔ ''نہیں...... میں اکیلا ہوں مسٹر مائر...... بورڈ اور ٹرین کے...... سیلٹر...... وزارت مواصلات کے اور ڈاکٹر گیراڈ...... جی...... کریمر گروپ کے......'' وہ کچھ دیر خاموشی سے سنتا رہا۔ باقی لوگ اس کے ماتھے کی شکنوں کو گہرا ہوتے دیکھتے رہے۔ ''اوکے......'' اس نے فون رکھ دیا۔

''تھینک یو مسٹر گیراڈ! آپ نے زحمت کی۔'' اس نے اخلاقاً اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ گیراڈ نے اس اچانک تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ''میں بہت جلد رپورٹ آپ کو ارسال کروں گا۔'' اس نے باقی دونوں سے ہاتھ ملایا جو گیراڈ کے اس طرح رخصت کئے جانے پر کسی قدر شرمندہ تھے۔ لیکن گیراڈ نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ فون خاصا اہم تھا جس کے پیغام کو وہ اس کے سامنے بحث کا موضوع بنانا نہیں چاہتے تھے۔

''حضرات! وہ دونوں تحقیقاتی کمیٹی کے رکن ہیں۔ دفاعی امور سے متعلق رازداری کے قانون کی ہر شق سے واقف ہیں۔ وزارتِ دفاع نے اطلاع دی کہ ایک آبدوز ٹرائی ٹون اپنے عملے سمیت غائب ہے۔ ہمیں فوری طور پر وہاں پہنچنا ہے۔''

اینی کریمر نے ایک طوفانی رات میں ایٹمی میزائلوں کے اترنے کا تماشہ دیکھتے ہوئے جو کچھ سوچا تھا وہ درست تھا مگر اخبار کی شہ سرخی نہیں بن سکتا تھا۔ سرکاری معاملات کی رازداری کے قانون کے مطابق وہ تینوں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ آدھے گھنٹے بعد ان کا رخ بحریہ کے ہیڈ کوارٹر کی جانب تھا۔ مال روڈ پر بحریہ کے صدر دفتر کو آنے والی سڑک پر اسّی گز چلنے کے بعد اگر کوئی سڑک کے وسط میں رک جائے تو اسے قطعی احساس نہ ہوگا کہ اس کے قدموں کے نیچے پچاس فٹ کی گہرائی میں ایک کمرہ ہے جہاں قومی سلامتی کے اہم راز دفن ہیں اور بحریہ کے اعلیٰ حکام جو فیصلے اس کمرے میں بیٹھ کر کرتے ہیں وہ ساری دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کمرے تک رسائی کی نسبت بحرالکاہل کی انتہائی گہرائی کو چھونا یا کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنا زیادہ آسان ہے تو قطعی مبالغہ نہیں ہوگا۔ یہاں گنے چنے چند لوگ آتے ہیں۔ ان کے پاس مخصوص شناختی کارڈ ہوتے ہیں جنہیں ایک کمپیوٹر چیک کرتا ہے اور جواب ہاں یا نہیں میں دیتا ہے۔ اگر اندر قدم رکھتے ہی

بحریہ کے دفتر کا یہ محلہ طے ہوجائے تو ایک دیوار شق ہوجاتی ہے اور دو مسلح افراد نظر آتے ہیں جو کنکریٹ کی راہداری میں آگے پیچھے چلتے ہیں اور لفٹ تک پہنچا کے لوٹ جاتے ہیں۔ پوشیدہ کیمرے اس سارے منظر کو دیکھتے ہیں اور لفٹ زمین کی گہرائی میں اترنے لگتی ہے۔ اس کا دروازہ براہِ راست آپریشن روم میں کھلتا ہے۔ سیلٹر، مائر اور ہالنیڈ نے آخری بار اپنے خصوصی شناختی کارڈ دکھائے اور چھوٹے سے کمرے سے گزر کر وسیع وعریض ہال میں پہنچے جو انتہائی نفاست سے آراستہ اور روشن تھا۔

''بات یہ ہے کہ آبدوز ٹرائی ٹون سے ہمارا رابطہ منقطع ہوچکا ہے۔'' ایڈمرل وائٹ نے کہا۔ ''اب دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ غرق ہوگئی ہے یا...... ہدایات کے مطابق اس نے عمداً رابطہ منقطع کرلیا ہے جیسا کہ انتہائی سنگین خطرات میں کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''کیسے خطرات......؟'' مائر نے پوچھا۔ ''فنی یا سیاسی؟''

''یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ نظام ایسا ہے کہ ہر شخص اپنے شعبے سے متعلق معلومات رکھتا ہے۔ پوری بات کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ مقصد غالباً یہ ہے کہ دشمن کسی ایک شخص سے صرف جزوی معلومات حاصل کرسکے۔ آبدوز پچاس دن کے مشن کے بعد لوٹ رہی تھی جو انہوں نے مواصلاتی اور مشینی نظام میں غیر متوقع خرابیوں کی اطلاع دی۔''

''غیر متوقع خرابیوں کی اطلاع ہوجائے تو بہتر ہے۔'' ہالنیڈ نے کہا۔

''پہلی خرابی تو کنٹرول میں ہوئی۔ وہاں شارٹ سرکٹ ہوجانے سے آگ لگ گئی۔ خیر اس پر قابو پالیا گیا۔ پھر میزائل کنٹرول کمپیوٹر میں گڑبڑ ہوئی...... آخری پیغام سوائے چیخ و پکار کے کچھ نہ تھا۔ ہنگامہ اور افراتفری۔ ٹوٹ پھوٹ اور دوڑ بھاگ...... جیسے لوگ مدد کے لئے پکار رہے ہوں۔ اور رفتہ رفتہ یہ آوازیں بند ہوگئیں اور اس کے بعد سے اب تک خاموشی ہے۔''

ہالنیڈ، سیلٹر اور مائر نے جیسے عملے کے ایک سو تراسی افراد کے ڈوب کر مرنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سمندر کی گہرائی میں کہیں وہ دیو پیکر آبدوز کسی وہیل کی لاش کی طرح پڑی ہوگی جو برسوں کے تجربات اور فنی مہارت کا مکمل ترین شاہکار تھی اور اس کے پیٹ میں ایک سو تراسی افراد بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، دیواروں کے ساتھ لٹکے ہوئے، آلات

پر جھکے ہوئے، کھلی آنکھوں میں جانکنی کا سارا کرب سمیٹے بند ہو گئے۔ ایک آہنی قبر میں اکڑے پڑے ہوں گے اور آہستہ آہستہ ان کے جسم تحلیل ہو رہے ہوں گے۔ وردیاں پہنے، نشان اور تمغے سجائے ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے تا قیامت یونہی پڑے رہیں گے۔ یا سال دو سال بعد اگر زمین کو لوٹے بھی تو اس لئے کہ الگ الگ مٹی کے خانوں میں بند کر دیئے جائیں۔

''مسٹر ہلڈیڈ! آپ وان کیسر وٹریفک حادثات، جبوتی ایئر پورٹ اور ٹیوب میں سگنل فیل ہو جانے کے حادثات سے باخبر ہیں۔'' ایڈمرل نے کہا۔ ''اسے بھی اپنی تفتیش کے دائرے میں شامل کر لیجئے۔''

''کسی سرکاری حکم کے بغیر؟'' ہلڈیڈ نے کہا۔ ''اور تفتیش کی شہادت......''

''اس وقت کابینہ کا ہنگامی اجلاس جاری ہے۔ آپ اسے وزیراعظم کا حکم سمجھ لیجئے۔ تفتیش کے دوران آپ کو ہر قسم کی شہادت فراہم کی جائے گی۔'' ایڈمرل نے کہا۔

✡......✡

پانچ سال گزر جانے کے بعد اپی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کریمر سے شادی کر کے اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے۔ یہ جوا زندگی ایک بار ہی کھیلتی ہے۔ ہارنے والوں کی طرح اپی نے پہلے سال کے اختتام پر جذبات کے تند نشے کا خمار اُترتے محسوس کیا۔

شادی سے پہلے کریمر کی ذہانت اور زبردست شخصیت نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس کے باپ کی طرح پُرعزم، جسمانی طور پر مضبوط اور ناقابل شکست قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ ایک سال تک اپی اس کی محبت سے سرشار اور فخر و انبساط کے جذبے سے معمور رہی۔ پھر حالات بدلنے لگے۔ آہستہ آہستہ جب کریمر ایگون سٹی سے لوٹا تو اس کے رویے میں نمایاں فرق آچکا تھا جسے اپی نہ سمجھ سکی۔ کریمر نے اپنی تجربہ گاہ کی بنیاد رکھی تو اپی نے پورے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا۔ وہ کاغذات ٹائپ کرتی رہی۔ کافی بناتی رہی۔ ٹیلی فون ریسیو کرتی رہی۔ اس وقت اس کا مطمع نظر سائنس کو انسانی فلاح کے عظیم تر مقصد کے لئے استعمال کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر کریمر کو دولت کی ہوس نے مغلوب کر لیا۔ ایمنیو اسٹرین کے بعد ڈیگرون کی ایجاد ہونے تک وہ دولت کے سوا سب کچھ بھول گیا اور

اس کی ساری توجہ اس ایجاد سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے پر مرکوز ہو گئی۔ اپی تنہا رہ گئی۔ وہ رات گئے تک کام میں مگن رہتا۔ بھول جاتا کہ اس نے شام کو تھیٹر لے جانا ہے۔ اپی کی سالگرہ میں شرکت کرنی ہے یا اسے کوئی تحفہ دینا ہے۔ واپسی پر وہ معذرت نہ کرتا اور بستر پر پڑ کر خراٹے لینے لگتا۔ وہ بستر پر پڑی کروٹیں بدلتے رات گزار دیتی مگر کریمر سے شکوہ نہ کرتی۔ کیونکہ اس کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا۔

''ڈارلنگ! میرا کام میرے لئے سب سے زیادہ اہم ہے...... تقریبات میں تو تم بھی میری نمائندگی کر سکتی ہو......''

جس رات اسٹور میں اس کا شانہ زخمی ہو گیا تھا وہ رات ایک بجے تک منتظر رہی۔ کریمر خود نہ آئے، فون پر اس کی خیریت ہی پوچھ لے۔ گیراڈ نے اسے ضرور بتا دیا ہوگا۔ یوں بھی اس نے شام کو جلدی آنے اور تفریح کے لئے باہر جانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر دو بج گئے اور رات کا سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ شادی کی سالگرہ کی رات گزرتی گئی۔ سوگئی راستہ تک تک کر اک راہگزر کا۔ وہ معطر شام کے لباس میں کرسی پر نیم دراز لیٹی رہی۔ پھر ایک پرانے خیال نے سر اٹھایا۔ کریمر پہلے تو ایسا نہ تھا۔ ریگون سٹی سے واپس آنے کے بعد ہی اچانک اس میں تبدیلی آئی تھی۔ یہ خیال اسے اکثر آتا تھا کہ اس کے مداحوں کے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مگر گزشتہ دو سال میں رفتہ رفتہ خطوط کی تعداد کم ہوتے ہوتے صرف ایک رہ گئی تھی۔ اور یہ ایک خط بڑی باقاعدگی سے آتا رہا۔ ایک عورت کا خط۔ وہ ایک دوسرے کا خط نہیں کھولتے تھے۔ اس خط کے بارے میں اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے کریمر سے پوچھ لیا۔ وہ دیر تک ہنستا رہا۔

''حسد کی کوئی بات نہیں۔ کیمسٹری کی ایک پروفیسر ہے۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھی۔''

مگر اپی کی تشفی نہ ہوئی۔ سرکاری، کاروباری نوعیت کے خطوط دفتر میں آتے تھے اور کریمر گروپ کی سیکرٹری مس ڈیوس کھولتی تھی۔ گھر پر ان کے ذاتی خطوط آتے تھے۔ پھر کریمر کے پاس ریگون سٹی سے آنے والے خطوط یورپ کے مختلف شہروں سے آنے لگے۔ اپی اس مخصوص ہینڈ رائٹنگ کے علاوہ مہر اور تاریخ کو بڑے غور سے دیکھتی تھی اور اس دن جب کریمر شادی کے پانچ سال پورے کرنے کی خوشی میں شام کو ایک ہوٹل میں کھانے اور

جیوا ہاؤس لے جانے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا تو اینی کو وہ خط ملا جس پر کیمبرج کی مہر تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے وقتی طور پر خط کھول کر پڑھنے کی خواہش کو دبا دیا۔ ایک خوبصورت شام کو برباد کرنے سے کیا حاصل؟ اور خط کو اسٹڈی روم میں کریمر کی میز پر رکھ دیا۔

شام کو جب وہ اسٹور میں کریمر کی منتظر تھی، اسے گیراڈ ملا۔ مگر اس نے کریمر کا کوئی پیغام نہیں دیا۔ جب وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تب بھی وہ اسی لباس میں بیٹھی رہی۔ بلا ارادہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے پھر وہ خط یاد آیا۔ اگر وہ بارہ بجے تک نہ آیا تو میں اسے کھول لوں گی...... اس نے فیصلہ کیا...... مگر بارہ کی بجائے دو بج گئے۔ بڑی ہمت کر کے وہ خط اٹھا لائی اور دیر تک اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی اور تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ وہ اسے کھلتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کہیں امید کی آخری کرن بھی گم نہ ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ اس کے خدشات تحریر بن کر اس کے سامنے آ جائیں جنہیں وہ جھٹلا بھی نہ سکے۔ خود کو دھوکا دینے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔

بے بسی اور تنہائی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد مایوسی کی جگہ انتقامی جذبے نے لے لی۔ بالآخر اس نے خط کھول لیا۔ ایک طویل عشقیہ خط گزشتہ دو سالوں کی یادوں اور واقعات کے ذکر سے پُر بے تکلفی کا وہ رنگ جو پانچ سال کی طویل رفاقت کے باوجود ان کے تعلقات میں مفقود تھا۔ اپنائیت کا وہ انداز جو شادی کے صرف پہلے سال میں محسوس ہوا تھا۔ لکھنے والی کا نام ''شیرون'' تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ وہ چونک پڑی جیسے کسی نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو اور غیر ارادی طور پر خط کو بلاؤز میں چھپا لیا۔ صبح کے تین بجے تھے۔

''اینی......'' اس نے کریمر کی آواز سنی۔ ''میں شام کو گھر نہ پہنچ سکا۔ کام ذرا زیادہ تھا۔ گیراڈ نے تمہیں گھر پہنچا دیا تھا نا؟''

''ہاں......'' وہ بڑی مشکل سے بولی۔ اس نے کوشش کی کہ کریمر کو اس کی آواز سے اس کے جذبات کا اندازہ نہ ہو۔ ''سوری ڈیئر! تم سو رہی تھیں۔ میں اس کانفرنس میں بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔''

''کہاں......؟ کس کانفرنس میں......؟''

''یونیورسٹی میں...... تمہیں بتایا نہیں تھا میں نے؟'' اس کا لہجہ صاف اس کے جھوٹ کی گواہی دیتا تھا۔

''نہیں...... مجھے تم نے کچھ نہیں بتایا۔'' کریمر کے شب بخیر کہنے سے پہلے اس نے فون بند کر دیا اور خط اٹھا لیا۔

''کل تمہیں دفتر میں فون کروں گی۔ مجھے ابھی معلوم نہیں کس ہوٹل میں جگہ ملے۔ خط تو میں ایک کیفے میں لکھ رہی ہوں۔ ابھی یہاں پہنچے دس منٹ بھی نہیں ہوئے۔''

بات واضح ہو چکی تھی۔ اینی نے بڑا سکون محسوس کیا۔ یوں جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا۔ لفافے کے پیچھے اس نے پتہ دیکھا۔ ڈاکٹر شیرون گیراڈ۔

''گیراڈ......؟'' اس نے دماغ پر زور دیا۔ پھر جیسے دھند چھٹنے لگی...... ہاں...... دو سال قبل کریمر ریگون سٹی گیا تھا اور اس نے گیراڈ کے گھر قیام کیا تھا۔ گیراڈ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ بعد میں وہ کریمر کے ساتھ مل کر کام کرنے آ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے ابھی نہیں معلوم۔ خط کو لفافے میں بند کرنے سے پہلے وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ دو خواب آور گولیاں کھا کر وہ بے ہوشی کی نیند میں کھو گئی۔ صبح نو بجے اس کی آنکھ کھلی تو رات کا واقعہ ایک بھیانک خواب بن کر پھر اس کے سامنے آ گیا مگر وہ خوفزدہ تھی اور نہ نروس۔ ناشتے کے بعد وہ بالکل تازہ دم ہو گئی۔

ہم دونوں وہی فریب خوردہ ہیں...... اس نے سوچا۔ ہم نے اس عشق میں کیا کھویا، کیا پایا ہے، گیراڈ کے سوا کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے۔

اس نے فون اٹھایا اور مس ڈیوس سے کہا کہ وہ گیراڈ سے بات کرے گی۔

''مسٹر گیراڈ...... ہیلو...... میں اینی ہوں...... یس، کل میں آپ کا صحیح طور پر شکریہ ادا نہ کر سکی۔ شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں تو عنایت ہو...... نہیں...... مسٹر کریمر یونیورسٹی میں ہیں...... آپ کو نہیں معلوم...... خیر......''

مس ڈیوس سنتی ہے تو سنا کرے۔ اس نے فون بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

رات کو جب گیراڈ نے اسے دروازے پر چھوڑا تو ایک پُر کیف شام کا خمار آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ کٹھن مرحلہ ابھی باقی تھا مگر گھر اسی طرح ویران پڑا تھا۔ کریمر نہیں آیا تھا۔ اسے کیا ضرورت ہے آنے کی۔ کسی نے سرگوشی میں کہا۔ کیا یہ خط پڑھ کر بھی تم خود فریبی میں مبتلا

ہو؟

نہیں ...... خود فریبی نہیں ...... امید ...... کہ شاید یہ بہت آخری ہو جو اس قید خانے میں گزارنی پڑے۔ وہ بے دلی سے کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اگر وہ آ جاتا تو فیصلہ ہو جاتا۔

ساڑھے گیارہ بجے رات کو کریمر کا فون آیا۔ وہ پوری طرح بیدار تھی۔

''معاف کرنا اینی! میں ایسا الجھ گیا ہوں کہ شاید آج بھی نہ آ سکوں۔'' اس نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔'' تصور میں اس نے دیکھا کہ شیرون اس کے ساتھ کھڑی ہے اور کریمر مسکرا رہا ہے۔

''میں جانتی ہوں ......'' اس نے شب بخیر کے آخری الفاظ سنے مگر جواب دیئے بغیر فون رکھ دیا اور آرام سے سو گئی۔ صبح پھر اس کی آنکھ کھلی تو نئے دن کے ساتھ نیا حوصلہ عود کر آیا تھا۔ اس کا دماغ پوری طرح صورتحال سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ناشتے سے فارغ ہو کر ایک مختصر سا خط لکھا۔

''کریمر ......

میرا خیال ہے اب ہم میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ تمہیں ایک بہتر بیوی کی تلاش ہے اور مجھے ایک بہتر شوہر کی۔ تم نے شاید دو سال قبل شیرون گیراڈ کا انتخاب کر لیا تھا مگر مجھے اور گیراڈ کو اب اپنی تلاش کا آغاز کرنا ہے۔ ایک اعتبار سے وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اسے تم پر ابھی تک اعتماد ہے۔ مگر میں دو سال پہلے ہی حالات سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اور اب تک محض نباہ رہی تھی۔ علیحدگی ہم دونوں کے مسائل حل کر دے گی۔

اینی۔''

خط کو لفافے میں بند کر کے اس نے نمایاں جگہ پر رکھ دیا شیرون کے کھلے خط کے ساتھ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گیراڈ سے ملنے روانہ ہو گئی۔

❁......❁

ہولڈن ...... وان کیسرو کی زمین دوز ریلوے کا جنرل منیجر سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے سیلسٹر، آخر میں اینی اور گیراڈ۔ پلیٹ فارم سے اتر کر وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ

چلنے لگے۔ ایک فرلانگ آگے تک سرنگ تاریک تھی مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے روشنیاں جل اٹھیں۔

''آپ لوگ ذرا محتاط رہیں ...... لائنوں میں کرنٹ ہے۔'' ہولڈن نے پلٹ کر کہا۔

اینی نے سہم کر گیراڈ کا بازو تھام لیا۔

''ڈرنے کی بات نہیں۔ درمیان میں ارتھ کی لائن ہے۔ جب تک تم ان دونوں کو بیک وقت نہیں چھو لو گی، کرنٹ لگنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ بس گرنا نہیں ان کے اوپر۔''

وہ سرنگ کے اندر سو گز تک گئے ہوں گے کہ سرنگ کے اندر ایک چوراہا سا آیا۔ دائیں جانب بھی ایسی ہی سرنگ رہی ہو گی۔ مگر اس کو اینٹوں سے اوپر تک بند کر دیا گیا تھا۔ مقابل کی دیوار میں جو سوراخ تھا وہ لوہے کے گیٹ سے بند تھا۔ اینٹوں کے بند سرنگ سے پرانی زنگ خوردہ لائن نئی لائن کو کاٹتی ہوئی سامنے والے دروازے کے نیچے سے اندر چلی گئی تھی۔ دھکیلنے سے دروازہ سرنگ کی دیواروں میں گھس گیا تھا۔ اس کے اندر لکڑی کے تختے اور دوسرا بہت سا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔

''یہ سرنگ پہلے استعمال ہوتی تھی۔'' ہولڈن نے کہا۔ اس کے دروازے میں کھڑے ہو کر وہ نئی سرنگ کو دائیں بائیں دور تک روشن دیکھ سکتے تھے۔ ہولڈن نے ٹارچ کی روشنی پرانی سرنگ کے اندر گھمائی۔ پھر اوپر دیوار پر مرکوز کر دی۔ اس وقت ریلوے لائن میں سنسناہٹ سی پیدا ہوئی۔ اینی کا رنگ اڑ گیا۔ ہولڈن مسکرایا۔

''ڈرنے کی بات نہیں۔ گاڑی نئی سرنگ میں ہے۔ ابھی آپ کے سامنے سے گزرے گی۔''

تین سیکنڈ بعد وہ پرانی سرنگ کے دروازے میں کھڑے گڑگڑاہٹ کے ساتھ روشنیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دوڑتے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی کے گزرتے ہی شور کم ہو گیا اور پھر پہلے جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ مگر دہشت زدہ اینی ابھی تک گیراڈ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے اینی کے شانے پر تھپکی دی۔ اینی الگ ہو گئی۔ گیراڈ نے ٹارچ کی روشنی میں تانبے کی سرخ تار کو چمکتے دیکھا۔ اردگرد پلاسٹک کی تہہ پر بدستور بلبلے بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ اس نے دستانے پہن کر ایک چمٹی سے تار کو اردگرد سے دبا کر دیکھا۔ اس کا پلاسٹک بھی نرم پڑ گیا تھا اس میں سے سڑے ہوئے گوشت کی سی بو آ رہی تھی۔ گیراڈ نے

چمٹی سے کھینچ کر آسانی سے نرم پلاسٹک کے چند ٹکڑے توڑے اور ایک بوتل میں ڈال دیئے۔ دوسری بوتل میں اس نے حصے کے نمونے حاصل کئے جس میں بلبلے سے اٹھ رہے تھے۔ تیسری میں اس نے فرش سے وہ پلاسٹک اٹھایا جو پگھل کر قطرہ قطرہ ٹپک چکا تھا۔ لائن مین آگے تک چیک کر رہے تھے۔ ہولڈن نے کہا۔

''پتہ نہیں نقصان کہاں کہاں ہوا ہے۔''

''اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو تار شارٹ ہوتے رہیں گے؟'' سلیٹر نے پوچھا۔

''اس کا جواب تو آپ کو دینا ہے۔'' ہولڈن نے کہا۔ سلیٹر نے گیراڈ کی طرف دیکھا۔

گیراڈ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ کاش وہ رائٹ کی ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ لیبارٹری ٹیسٹ کے بغیر کوئی جواب دینا ذرا مشکل ہے۔ اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''فوری طور پر کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔''

اینی نے اسی اثناء میں کیمرے سے بہت سے رنگین فوٹو اتار لئے تھے۔ وہ ایک قطار میں واپس چل پڑے۔ ان کے پیچھے ایک چھوٹا سا دھماکہ ہوا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ نہیں تھا۔ مگر ان کے پلٹنے سے پہلے اچانک سرنگ کی دیواریں لرزنے لگیں۔

ایک اور زوردار دھماکہ ہوا۔ اوپر سے سرنگ کا کنکریٹ ان پر گرا اور وہ ریلوے لائن پر جا پڑے۔ ریلوے لائن کی سنسناہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے پیروں پر کھڑے ہونے سے پہلے سرنگ میں دور تک دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرنگ کے اندر پسلیوں کی طرح پھیلی ہوئی آہنی سلاخیں ٹیڑھی ہو گئیں۔ گرد میں انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ مگر زمین کانپنے لگی تھی۔

''کیا ہوا گیراڈ......؟'' اینی نے لرزتے ہوئے پوچھا...... اسی وقت دور ایک اور دھماکہ ہوا۔ کوئی جواب دیئے بغیر اس نے اینی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور باہر کی طرف دوڑا۔ ہولڈن اور سلیٹر ان سے چند قدم آگے تھے۔ سرنگ کی روشنیاں اچانک بجھ گئیں۔

اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی ابھی ابھی آ کر رکی تھی اور اس کی روشنی سیدھی ریلوے لائن پر پڑ رہی تھی۔ انجن کی ایک آنکھ نے روشنی کی ایک لکیر سی بنا دی تھی۔ خطرے کی روشنی ہر لائن پر نظر آ رہی تھی۔ اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ مگر گیراڈ کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت اسے مسلسل کھینچ رہی تھی۔ ایک دھماکہ اور ہوا...... کسی عورت نے چیخ ماری۔

دھماکے سے اسٹیشن کی عمارت بھی لرز اٹھی تھی۔ لوگ جلدی جلدی باہر نکلنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ وہ ان دھماکوں سے دہشت زدہ ہو گئے تھے اور ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔ لیکن ان کو جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

''ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ گاڑی کے بیچ میں سے گزر جائیں۔'' ہولڈن نے کہا اور انجن کا دروازہ کھول کر اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اینی کو کھینچ لیا۔

ایک اور دھماکہ ہوا جس نے پوری گاڑی کو ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ ہولڈن نے انجن اور دوسرے ڈبے کا درمیانی دروازہ کھولا ہی تھا کہ جیسے دن نکل آیا۔ ہر چیز روشن ہو گئی۔ اندھیرے کا وجود نہ رہا۔ ان کے سامنے اسٹیشن کی عمارت اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی میں آگ لگ گئی۔ ہولڈن نے دوسرے ڈبے کے دروازے سے چھلانگ لگائی۔ اس کے پیچھے گیراڈ اور اینی ایک دوسرے پر گرے۔ انہوں نے آگ میں جلتے ہوئے بے بس مسافروں کی چیخ و پکار سنی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھاگنے والوں کے قدموں کے نیچے گر کر کچلتے اور پھر اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ لوگ شیشے توڑ رہے تھے۔ کھڑکیوں سے کود رہے تھے اور شعلے ان کے جسموں کو چاٹ رہے تھے۔ عورتیں بے ہوش پڑی تھیں۔ ٹرین کی لکڑی شعلوں میں چیخ رہی تھی اور شیشہ پگھل گیا تھا۔ جو جل گئے تھے ان کے جسم کوئلہ بن کر کھڑکیوں اور دروازوں سے لٹک رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ جو جل رہے تھے وہ دیوانہ وار بھاگ رہے تھے...... لوٹ رہے تھے...... چلا رہے تھے۔ تڑپنے والے جسم ساکت ہوتے جا رہے تھے۔ گوشت جلنے کی بو ہوا کے ساتھ دور دور تک پھیل رہی تھی۔ گیراڈ نے اس سے زیادہ دہشت انگیز منظر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اینی کو گیراڈ نے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

''ہوش میں رہنا...... سنا......؟'' اس نے اینی کے گال تھپکتے ہوئے کہا۔ اینی نے سر ہلایا۔ تپش سے اس کے جسم میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ گیراڈ نے ایک شخص کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی جو دیوانہ وار بھاگ رہا تھا مگر گیراڈ کے ہاتھوں میں اس کا جلا ہوا گوشت رہ گیا۔ وہ اوندھے منہ گرا...... دوسرا شخص موت سے بچنے کے لئے ایک دائرے میں دوڑ رہا تھا اور اس کے کپڑے دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے وہ الاؤ کی طرح بھڑکتے ڈبے میں گھس گیا۔ ایک معمر شخص کے ہاتھ میں پیرافین کا بیگ تھا۔ وہ اچانک

پھٹ گیا اور اس نے بوڑھے کے جسم کو خاکستر کر دیا۔ ایک عورت جان بچانے کے لئے بھاگی اور ریلوے لائن پر جا گری۔ ایک شعلہ سا لپکا اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اینی کے ساتھ ایک اور لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیوار کا سہارا لیا، پھر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اینی نے بھی بیٹھ جانا مناسب سمجھا اور اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ اسٹیشن ماسٹر بے بسی سے انجن کے دروازے میں کھڑا تھا۔

''باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں؟'' ہولڈن نے چیخ کر کہا۔ اس کے عتاب کا نشانہ اسٹیشن ماسٹر تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے لکڑی کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کے نیچے سر!'' اس نے پھولی ہوئی سانس میں کہا۔

''یہاں سے گزرنا ناممکن ہے۔'' ہولڈن نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''سیڑھیاں جل اٹھیں تو ہم وہیں کوئلہ بن جائیں گے۔''

''محفوظ ترین راستہ وہی ہے جس پر ہم چل کر آئے ہیں۔'' سلیٹر نے کہا۔ گیراڈ نے اتفاق کیا۔ اسٹیشن ماسٹر ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔

''اگلا اسٹیشن آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔'' اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ مگر انہوں نے اینی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکی اسی طرح بیٹھی رہی۔ ایک طویل قامت شخص اس کے پاس گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

''وینڈی...... کم آن گرل......''

سلیٹر نے اس کی مدد کی اور لڑکی کو اٹھا لیا۔ ان کا مختصر سا قافلہ سرنگ کی طرف چلنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ آگ کی تپش سے دور ہوتے گئے۔ بالآخر وہ پرانی سی سرنگ میں جا پہنچے۔

''ادھر ڈھلان ہے۔ گاڑی تو نہیں چل پڑے گی؟'' ہولڈن نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ ''بریک اسے روکے رہیں گے۔'' اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''پچھلے اسٹیشن سے کوئی اور گاڑی؟'' گیراڈ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ہولڈن نے جواب دیا۔ ''لائن میں کرنٹ نہیں ہے۔''

طویل قامت شخص انداز و اطوار سے معزز اور باوقار نظر آتا تھا۔ اس نے سلیٹر اور گارڈ سے ہاتھ ملایا۔

''میرا نام پرائس ہے......'' اس طرح جیسے وہ کہہ رہا ہو میرا نام چرچل ہے۔ مگر وہ صحیح پرائس کو نہیں جانتے تھے اور یہ تعارف کا موقع بھی نہ تھا۔ اس نے پھر کہا۔

''تمہیں معلوم ہے یہ ہنگامہ کیسے شروع ہوا؟''

''نہیں...... اگر آپ کو معلوم ہے تو ہمیں بتا دیجئے۔'' سلیٹر نے چڑ کر کہا۔

''آپ لوگ یہاں ٹھہریں، ہم آگے جا کر دیکھتے ہیں۔'' ہولڈن نے کہا۔ سلیٹر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

وان کیسرو کا پرانا شہر زمین کے اوپر اور نیچے اس طرح پھیل گیا ہے کہ اس کے پرانے باسی بھی نہیں جانتے کہ کون سا راستہ کہاں جاتا ہے۔ وہ انہی راستوں کے بارے میں جانتے ہیں جو ان کی روزمرہ زندگی میں کوئی دخل رکھتے ہیں۔ دفتر، اسکول اور بازار کا راستہ۔ کلب، ریستوران اور تھیٹر کے راستے، پیلس اور نمبر دس ڈاؤننگ اسٹریٹ کے راستے۔ نیو لائن کا کراس لائن ریلوے اسٹیشن ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں چھ اہم سڑکیں ملتی ہیں اور ان پر چوبیس گھنٹے ٹریفک چلتی ہے۔ اسٹیشن پر آنے جانے والی گاڑیوں سے جو مسافر اترتے ہیں وہ ہر وقت فٹ پاتھ پر چلتے سڑک پار کرتے نظر آتے ہیں۔ نیچے زمین دوز ریلوے کی سرنگوں کا ایسا پیچیدہ نظام ہے جس میں پانچ مختلف راستوں پر چلنے والی گاڑیاں ہر وقت دوڑتی رہتی ہیں۔ ان کے راستے کہیں ایک دوسرے کے متوازی ہو جاتے ہیں اور درمیان میں چند فٹ دیوار حائل رہ جاتی ہے، کہیں ایک دوسرے کے اوپر یا نیچے سے گزر جاتے ہیں اور کہیں مل جاتے ہیں۔ کسی ایک گاڑی میں سفر کرنے والے نہیں جانتے کہ چند فٹ اوپر یا نیچے یا ان کے دائیں بائیں کون شخص کس سمت میں سفر کر رہا ہے۔ دن اور رات میں شاید دو گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جب ٹریفک میں تھوڑی سی کمی ہو جاتی ہے، رات کے ڈیڑھ بجے سے صبح کے ساڑھے تین بجے کے درمیان جب گاڑیوں کی دیکھ بھال کرنے والا اور صفائی کرنے والا عملہ مصروف کار رہتا ہے۔

زیر زمین ریلوے کے پانچ مختلف راستے الگ الگ کمپنیوں کی ملکیت ہیں اور ہر ایک مختلف انداز میں بنایا گیا ہے۔ انہی سرنگوں کے ساتھ زمین کی سطح کے نیچے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ گیس اور پانی کی لائنیں، گندے پانی کی نکاسی کے راستے، ٹیلی فون اور بجلی کی تاروں کے پائپ مختلف قطر کے جن کا سلسلہ پورے وان کیسرو کی آبادی کے نیچے جال کی

طرح بچھا ہوا ہے۔ یہ نظام جس شہر کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، وہ کئی گنا پھیل چکا ہے مگر زمین کے نیچے گھر گھر گیس اور پانی پہنچانے والی اور گندے پانی کو شہر سے باہر لے جانے والی سرنگ نما پائپ لائنیں وہی ہیں۔ زمین پر سیمنٹ، کنکریٹ اور اینٹوں سے بنی ہوئی عمارتوں کے وجود میں آنے سے پہلے شمالی پہاڑوں سے آنے والی چھوٹی چھوٹی ندیاں کسی رکاوٹ کے بغیر دریا میں مل جاتی ہیں۔ انسان نے ان کے راستے روک دیئے اور ان کا رخ بدل کر سرنگوں میں قید کر دیا۔ ایسی ہی ایک بارہ فٹ قطر کی سرنگ اسٹیشن کے قریب سے گزرتی تھی۔ اس کے متوازی دو فٹ قطر کی دو الگ الگ گیس پائپ لائنز ہیں جو سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں۔ 1842ء میں تعمیر ہونے والے گندے پانی کی نکاسی کے راستے کو چھوتی کاٹتی آگے بڑھتی ہیں اور یہ سب نالیاں، سرنگیں اور پائپ لائنیں گھومتیں، چکر کاٹتی شہر کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہیں۔ اوپر چلنے والے نہیں جانتے کہ ان کے قدموں کے نیچے کیا ہے۔ ان کی ذرا سی خرابی کیا کیا تباہی لا سکتی ہے۔

چند ہفتے قبل پانی کا ایک قطرہ گندے پانی کی نکاسی کے راستے میں کسی درز سے گزر کر ایک زیر زمین ریلوے کی سرنگ میں داخل ہوا۔ سرنگ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پلاسٹک کی موٹی تہہ والا بجلی کا تار تھا۔ اس پلاسٹک کے اندر ربڑ چڑھے ہوئے بہت سے پتلے پتلے تار تھے۔ گندے پانی میں ایک ایسا کیمیائی عنصر شامل تھا جس نے پلاسٹک کو گلانا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود اندر کے ربڑ چڑھے ہوئے تار آپس میں نہیں ملے اور ریلوے کے سگنل کا مواصلاتی نظام کام کرتا رہا۔ پلاسٹک کے گلنے سڑنے سے ایک گیس پیدا ہوئی جو آہستہ آہستہ سرنگ کے اندر جمع ہوتی گئی۔ دو تار ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ پلاسٹک کی تہہ اتر جانے کے بعد کسی فوری خطرے کا سبب نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن جب پانی رس کر ان دونوں کے درمیان حائل سرنگ کی سطح کو گیلا کرنے لگا تو نمی نے وہی کام کیا جو ان دونوں کو ملانے والا کوئی تار کر سکتا تھا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور سرنگ کی سطح کے ساتھ جلنے لگا۔ گیس پہلے سے موجود تھی۔ ایک چھوٹا سا دھماکہ ہوا مگر آگ سے زیادہ یہ دھماکہ تباہ کن ثابت ہوا۔

اس نے گیس پائپ لائن اور سرنگ کے درمیان تیس انچ کی دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ گیس جو بڑے دباؤ کے ساتھ لائن سے گزر رہی تھی، آہستہ آہستہ سرنگ میں داخل ہونے

لگی۔ اس سے مزید دھماکے ہوئے۔ سرنگ کے اوپر دوسری سرنگ تھی جس میں سے ایک مختلف راستے پر چلنے والی گاڑی گزرتی تھی۔ گیس کی چوبیس انچ قطر والی لائن ان دونوں سرنگوں کے درمیان میں تھی۔ آگ گیس لائن کے اندر پہنچی تو لائن زبردست دھماکے سے پھٹ گئی اور اوپر کی سرنگ کا ملبہ نیچے آ گرا۔ آگ گیس لائن میں آگے پھیلتی گئی۔ ریلوے اسٹیشن کے نیچے پلیٹ فارم اور کھڑی ہوئی گاڑی کے درمیان ایک اور جگہ سے لائن پھٹی تو ٹرین اور اسٹیشن کی عمارت میں شعلے بھڑک اٹھے۔ پہلے دھماکے نے گیراڈ اور اس کے ساتھیوں کے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔ دوسرے دھماکے کی تباہ کاری کا نظارہ انہوں نے چند منٹ میں کیا۔ گیس لائن کی آگ نے اسٹیشن کے باہر ایک فٹ پاتھ کے نیچے سیفٹی والوں کے جام ہو جانے سے زمین کو پھاڑ دیا اور آگ کے شعلے پانی کی طرح ابلنے لگے۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے بہت سے راہگیر جھلس گئے یا جل کر خاک ہو گئے۔ دور کھڑے ہوئے لوگ آگ کے اس فوارے کو دیکھتے رہے۔ پھر ایمبولینس کاروں کے سائرن گونجنے لگے۔ فائر مین راستوں کو بند کرنے لگے۔ پولیس مین ہجوم کو منتشر کرنے لگے اور پریس کے نمائندے کیمرے آنکھوں سے لگائے پیچھے ہٹنے لگے۔

دھواں آہستہ آہستہ سرنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر اور وینڈی دونوں کا حال زیادہ خراب تھا۔ ہولڈن اور سلیٹر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ انہیں گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں آگے چلنا چاہئے۔ اگر ہم اس سرنگ میں رکے رہے تو دم گھٹ کر مر جائیں گے۔“ گیراڈ نے کہا۔ پرائس نے سر کی جنبش سے رضامندی کا اظہار کیا۔ اینی نے وینڈی کو تھام لیا اور پرائس نے اسٹیشن ماسٹر کو۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ٹارچ گیراڈ کے ہاتھ میں تھی۔

”گیراڈ! اگر گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تو اسے کون روکے گا؟“ اینی نے کہا۔

”اس سرنگ میں دو جگہ دیوار میں گہرے شگاف ہیں۔ کیبن نما۔“ گیراڈ نے جواب دیا۔ وہیں، پناہ لینی پڑے گی۔“

”تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہیں؟“ اینی نے پوچھا۔ گیراڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تین سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہولڈن اور سلیٹر کا کہیں سراغ نہ تھا۔ شاید وہ اگلے اسٹیشن تک جا پہنچے۔ گیراڈ نے سوچا۔ روشنی کا دائرہ محدود سی جگہ پر پڑ رہا تھا۔ اچانک اس دائرے

میں انہوں نے سلیٹر کو پڑا دیکھا۔ گیراڈ فوراً بیٹھ گیا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ مر چکا ہے مگر گیراڈ نے جھک کر اس کے سینے پر سر رکھا، نبض کو دیکھا اور تیزی سے مصنوعی تنفس کا طریقہ آزمانے لگا۔ چند منٹ بعد اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس کا سانس معمول پر آ گیا۔ راست...... آگے سے...... بند ہے......'' اس نے کہا۔

''ہولڈن کہاں ہے؟'' گیراڈ نے پوچھا۔

''اس نے گزرنے کی کوشش کی تھی...... مجھے نہیں معلوم......'' سلیٹر نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ گیراڈ اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' پرائس اس کے ساتھ ہولیا۔

ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے ذرا آگے ملبے کا ڈھیر دیکھا جس نے راستے کو تقریباً بند کر دیا تھا۔

''ہم کتنی گہرائی میں ہیں؟'' پرائس نے پوچھا۔

''ساٹھ فٹ کی۔'' گیراڈ نے جواب دیا۔

''ہولڈن نے بتایا تھا کہ اس کے اوپر ایک اور ریلوے لائن ہے۔ دھماکہ اسی میں ہوا ہو گا......'' پرائس نے کہا۔ مگر رفتہ رفتہ انہیں سانس لینے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اوپر سے پانی بھی ٹپک رہا تھا۔ پرائس نے جیب سے ماچس نکال کر جلائی۔ ''اسے یہیں ہونا چاہئے تھا۔''

''یوفول......'' گیراڈ اس پر جھپٹا۔ ''یہاں گیس ہے......'' مگر تیلی اس سے پہلے ہی بجھ چکی تھی...... ''ہاں......'' پرائس نے سر ہلایا۔

''کاربن ڈائی آکسائیڈ۔''

ملبے کے ڈھیر کے اوپر چھت میں شگاف تھا اور اس شگاف سے ہولڈن کا آدھا دھڑ لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں۔

''میں اسے لے کر آتا ہوں۔'' گیراڈ نے کہا مگر اچانک اسے چکر آ گیا۔ اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور ملبے کے ڈھیر پر چڑھ کر ہولڈن کو کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے جسم کی طاقت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گر پڑا۔ پرائس نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

''واپس چلو......'' گیراڈ نے جھولتے ہوئے کہا۔ ''چلو...... نہیں تو ہم بھی مارے جائیں

گے۔'' وہ لڑکھڑاتے، گرتے واپس ہوئے۔ پچاس گز دور آ کر تازہ ہوا کے جھونکے نے انہیں سنبھال لیا۔ وہ واپس پہنچے تو باقی لوگ اسی طرح سرنگ میں بیٹھے تھے۔ دھواں اندر داخل ہو رہا تھا اور ہوا گرم ہوتی جا رہی تھی۔ انہوں نے دروازے کو گھسیٹ کر بند کر دیا اور ہانپنے لگے۔ ان کی نگاہ ایک اجنبی صورت پر پڑی۔ ایک نوجوان جو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔

''یہ میرا اسیکرٹری ہے...... ہارڈی۔'' پرائس نے کہا۔

''جہنم میں جائے یہ بھی اور تم بھی۔'' سلیٹر نے دل ہی دل میں کہا۔ ''یہ کون سا موقع ہے تعارف کا؟''

مگر وہ سر ہلا کر چپ ہو گیا۔

''یہ سرنگ آگے کہاں تک جاتی ہے؟'' پرائس کے اس سوال کا جواب تو ہولڈن دے سکتا تھا جو مر چکا تھا یا اسٹیشن ماسٹر جو بے ہوش تھا۔ سرنگ آگے تک اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ہا......'' گیراڈ نے چلا کر کہا اور غور سے اپنی آواز کی بازگشت سنی۔ پھر سلیٹر نے دونوں انگلیاں منہ میں ڈال کر زور سے سیٹی بجائی اور وہ دونوں غور سے سننے لگے۔ پرائس اور ہارڈی انہیں یوں دیکھتے رہے جیسے وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ سلیٹر نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ہم خود آگے جا کر دیکھیں۔'' گیراڈ نے کہا۔

وہ زنگ آلود ریلوے لائن پر ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھتے آگے بڑھتے گئے۔ سرنگ میں وہ سامان بھرا پڑا تھا جو نئی ریلوے لائن کی دیکھ بھال اور مرمت میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر سرنگ کے دو حصے ہو گئے۔ ایک راستہ بائیں جانب تھا جو نئی ریلوے لائن کے متوازی تھا۔ اس میں ریلوے لائن نہیں تھی اور یہ پرانی لائن کا اسٹور رہا ہو گا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے، حرارت میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر ایک دیوار آ گئی۔ وہ واپس ہوئے تو ان کے کپڑے ان کے جسم سے چپک گئے تھے۔ اب وہ سرنگ کے دوسرے راستے پر چل پڑے جو تھوڑا سا گھوم کر دائیں جانب جاتا تھا۔ جہاں یہ راستہ ختم ہوا وہاں ایک سوراخ تھا کنوئیں کی طرح اور لوہے کی ایک سیڑھی نیچے جا رہی تھی۔ وہ دونوں نیچے اتر گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے ایک وسیع ہال دیکھا جہاں لکڑی کے سلیپر اور دوسرا بہت سا سامان پڑا

ہوا تھا۔اوزار پڑے تھے۔یہاں کی ہوا نسبتاً زیادہ تھی۔

"ہم سب کو یہاں لے آئے ہیں۔وہاں دھوئیں کے علاوہ گرمی بڑھتی جا رہی ہے اور آکسیجن کم ہے۔" گیراڈ نے کہا۔سلیٹر نے سر ہلایا۔وہ اسی راستے سے واپس لوٹے جس پر چل کر آئے تھے۔سلیٹر نے بے ہوش اسٹیشن ماسٹر کو کندھے پر ڈالا۔پرائس اور ہارڈی نے مل کر وینڈی کو اٹھایا۔گیراڈ اور ایبی ان کے آگے آگے ٹارچ کی روشنی میں راستہ دکھاتے چلنے لگے۔

ریلوے لائن سیدھی چلی گئی تھی وہ دائیں طرف مڑ گئے۔گول سوراخ پر پہنچ کر گیراڈ نے سیڑھی کے سامنے جگہ سنبھال لی۔

"تم دونوں پہلے چلو۔" گیراڈ نے ہارڈی اور پرائس سے کہا۔

"ٹارچ مجھے دو۔" پرائس نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"میں روشنی ڈال رہا ہوں۔" گیراڈ نے کہا۔

پرائس نے طیش میں اس پر ایک نگاہ ڈالی۔مگر سلیٹر بھی اسٹیشن ماسٹر کو نیچے ڈال کر اسے گھور رہا تھا۔وہ نیچے اترنے لگا۔اس کے بعد سلیٹر نے ماسٹر کو گھسیٹا اور کندھے پر ڈال کر نیچے اتر گیا۔اس کے بعد ہارڈی اور ایبی اترے۔آخر میں گیراڈ بھی نیچے پہنچ گیا۔وینڈی اور اسٹیشن ماسٹر کو انہوں نے بنچ پر لٹا دیا۔

اب انہوں نے اس ہال کا جائزہ لیا۔روشنی کا دائرہ گھومتا گیا۔لکڑی کے تختے،لوہے کی سلاخیں،بیلچہ،دو ڈرم،ربڑ کے لمبے پائپ۔گیراڈ نے روشنی میں غور سے دیکھا۔

"ویلڈنگ سیٹ۔" سلیٹر نے کہا۔ایک چائے دانی،دو مگ،چائے کا پیکٹ۔

ایبی نے اسے چھو کر دیکھا،وہ گرم تھی۔

"ابھی ابھی کوئی یہاں سے گیا ہے۔" اس نے گیراڈ سے کہا۔"کوئی راستہ ضرور ہوگا۔"

روشنی اور آگے بڑھی۔ایک فولادی دروازہ نظر آیا۔سلیٹر نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ مضبوطی سے بند تھا۔تالا لگا ہوا تھا۔گیراڈ نے ٹارچ کو گھمایا۔روشنی پانی کے ایک تالاب پر پڑی۔پانی کی سطح سے ذرا اوپر پرانے تار لٹک رہے تھے اور ان کے پیچھے لوہے کا ایک اور بند دروازہ تھا۔تار جگہ جگہ سے کٹے ہوئے تھے اور چند ایک پانی کی سطح کو تقریباً چھو رہے تھے۔

"ہم ادھر سے بھی جا سکتے ہیں۔" ہارڈی نے کہا۔

"تاروں کے اس جال سے گزر کر......؟ ناممکن......" سلیٹر نے کہا۔"اور وہ دروازہ بھی اسی طرح بند ہے۔"

"روشنیاں تو ساری بند ہیں۔" پرائس نے کہا۔"کرنٹ کہاں سے آیا؟"

"ممکن ہے بند کی گئی ہوں۔اور یہ ضروری نہیں کہ لائٹوں کا کنکشن ان تاروں سے ہو۔" گیراڈ نے کہا۔کونے میں روشنی کا دائرہ ایک سوئچ گیر بکس پر پڑا۔

"میں اسے کھول کر دیکھتا ہوں۔" سلیٹر نے کہا۔

بکس کے اندر ایک پلاسٹک کے گول دستے والا ہینڈل تھا۔سلیٹر نے اسے کھینچا۔کمرہ روشنی سے جگمگانے لگا۔انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔سلیٹر کی نگاہ ویلڈنگ سیٹ پر تھی۔گیراڈ دروازے کو دیکھ رہا تھا مگر دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔

"دروازہ کاٹا جا سکتا ہے۔" گیراڈ نے کہا۔

"یہی ایک صورت ہے۔" سلیٹر نے کہا۔"تار کو کاٹ دیا جائے۔"

گیراڈ نے تائید میں سر ہلایا۔

"دروازہ چھ انچ موٹا ہوگا۔تم اسے کبھی نہیں کاٹ سکتے۔" پرائس نے کہا۔

"تم سے کسی نے پوچھا؟" سلیٹر نے اسے اچانک دھکیل کر دیوار سے لگا دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔"اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو دوسروں کو کرنے دو۔بھونکنے کی ضرورت نہیں۔"

پرائس نے اس پر وار کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ گیراڈ ان کے درمیان میں حائل ہو گیا۔پھر وہ بنچ پر آ بیٹھے۔پرائس نے جیب سے برانڈی کی ایک بوتل نکالی اور ایک گھونٹ لے کر آگے بڑھا دی۔سلیٹر،گیراڈ اور ہارڈی نے بھی ایک ایک گھونٹ لیا۔چند منٹ میں ان کا جسم گرم ہو گیا۔ان کے تھکے ہوئے اعصاب معمول پر آ گئے اور وہ بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگے۔پرائس بلڈوز بنانے والی ایک فیکٹری کا مالک تھا۔اس کا سیکرٹری اور مارکیٹ ریسرچ آفیسر ہارڈی ایگون سٹی کا رہنے والا اور غالباً پرائس کی بیٹی وینڈی کا چاہنے والا تھا۔سلیٹر نے سگریٹ نکال کر سب کو دی۔

سب سے پہلے سلیٹر اٹھا اور اس نے ویلڈنگ ٹارچ اٹھا لی جس میں ربڑ کی دو نلکیاں آ

کرل گئی تھیں۔

''پتہ نہیں گیس کا دباؤ کتنا ہے؟'' گیراڈ نے کہا۔''سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔'' ان دونوں کے علاوہ وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔

''ابھی کافی ہے۔'' سلیٹر نے کمپریس ڈائل کو دیکھا۔''لیکن کام لمبا ہے۔ خیر دیکھی جائے گی۔'' اور پیتل کی نلکی پر نوک سے ذرا نیچے والو کو کھول دیا۔ سگریٹ کے ساتھ چھوتے ہی پٹاخے کی آواز کے ساتھ نیلا شعلہ پیدا ہوا۔ سلیٹر کو دروازے کے قریب چھوڑ کر گیراڈ واپس آیا تو اسٹیشن ماسٹر بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ایک اخبار تھا اور وہ معمہ بھر رہا تھا۔ گیراڈ نے سیڑھیاں چڑھ کر پرانی سرنگ کے دروازے تک جانے کی کوشش کی مگر حرارت زیادہ ہو چکی تھی اور باہر سے لکڑیوں کے جلنے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوہے کا دروازہ تپ رہا تھا۔ ادھر سے باہر نکلنا اب ناممکن تھا۔ غالباً جلتی ہوئی گاڑی سرنگ میں داخل ہو گئی تھی۔

جب وہ واپس آیا تو پسینے میں شرابور سلیٹر نے دروازے میں صرف ایک انچ چوڑا سوراخ کیا تھا اور اسے تالے کے گرد کم سے کم نو انچ چادر کو کاٹنا تھا۔

''بڑا مشکل کام ہے۔'' اس نے آستین سے آنکھوں میں آنے والے پسینے کے قطرات کو صاف کیا اور پھر چشمہ چڑھا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

''اب ہم واپس بھی نہیں جا سکتے۔'' گیراڈ نے کہا۔''شاید آگ اس لوہے کے دروازے کو بھی پگھلا دے۔

اینی کو بڑی تلاش کے بعد ایک ڈبے سے بسکٹ کے چند پیکٹ ملے جنہیں وہ سب کے لئے برابر تقسیم کر رہی تھیں۔ پرائس قمیض اتارے بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔

''شیر لوہے کے جال میں ہے۔'' اینی نے کہا اور بینچ پر آ بیٹھی۔

''یہ الّو کا پٹھا اپنی زبان بند رکھے اور آرام سے بیٹھ جائے تو بہتر ہے۔ اس طرح آکسیجن زیادہ خرچ ہوتی ہے۔'' گیراڈ نے کہا۔

''تم تھک گئے ہو تو لیٹ جاؤ۔'' وہ اینی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ان نامساعد حالات میں بھی اس کی گود کی نرم اور راحت بخش حرارت، اس کے جسم کی مہک اور گھنے بالوں کا سایہ اسے سپنوں کی دنیا میں لے گیا۔ اس نے اینی کے سرخ لبوں اور سیاہ آنکھوں

کو اپنے اوپر جھکتے دیکھا اور اینی کی انگلیوں کو اپنے بالوں میں کنگھی کی طرح چلتے محسوس کیا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر سوتا رہا۔ پھر ایک چیخ نے اسے بیدار کر دیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا اور اینی کے زرد چہرے کو دیکھا۔

''نہیں...... یہ آواز وینڈی کی تھی۔'' اینی نے ہاتھ سے تالاب کی طرف اشارہ کیا۔ ذرا دور سلیٹر ویلڈنگ کی تیز روشنی میں دروازے پر جھکا ہوا تھا مگر پرائس، ہارڈی اور وینڈی غائب تھے۔ اس نے پانی کے تالاب کا رخ کیا۔ وہ ایک کونے میں ہونے کی وجہ سے تاریکی میں تھا۔ وینڈی کی ایک اور طویل چیخ سن کر وہ بے تحاشہ بھاگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ تالاب کے وسط میں ہارڈی کی لاش تیر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر مڑ گئے تھے اور کرب کے عالم میں زبان دانتوں میں دبی ہوئی باہر لٹک رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی وینڈی کھڑی لرز رہی تھی۔ اینی نے سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا مگر گیراڈ نے اس کی قمیض کا کالر پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ قمیض پیچھے سے پھٹ گئی اور اینی دو گز پیچھے جا گری۔ اس ک ساتھ ہی گیراڈ نے وینڈی کو بھی گرتے دیکھا۔

''قریب مت جانا...... پانی میں کرنٹ ہے۔'' گیراڈ نے چیخ کر کہا۔ پھر اسے لکڑی کے تختوں پر ربڑ کا پائپ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے دوڑ کر پائپ اٹھایا اور اس کے دونوں سروں کو تھام کر جھولے کی طرح وینڈی کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ ایک جھٹکے میں وہ پانی سے باہر آ گری۔ گیراڈ اسے گھسیٹ کر دور لے گیا اور اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اینی دوزانو ہو کر اس پر جھک گئی۔ وینڈی کا سانس رک گیا تھا۔ گیراڈ نے پیشہ ورانہ انداز میں اسے فرش پر چت لٹا کر پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور وینڈی کے منہ سے منہ ملا کر پھونکنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں نے مصنوعی تنفس جاری کرنے کی جدوجہد کی۔ اینی اسے دہشت زدہ سی دیکھتی رہی۔ تین منٹ گزر گئے۔ وینڈی کے دل نے ابھی تک دھڑکنا شروع نہیں کیا تھا۔ مگر گیراڈ نے اپنی کوشش جاری رکھی...... جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ پسینے میں شرابور اٹھ کھڑا ہوا۔ وینڈی کا جسم ساکت اسی طرح پڑا رہا۔ اینی نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ گیراڈ نے جھک کر وینڈی کے مردہ جسم کو اٹھایا اور بینچ پر سیدھا لٹا دیا۔ اینی کے لرزتے جسم کو اس نے ایک ہاتھ سے سمیٹ لیا۔

"رونے سے کیا ہوتا ہے اینی! آکسیجن ہی بہت کم تھی۔ ورنہ وہ نہ مرتی۔" اس نے کہا۔
پھر اس کی نگاہ پانی کی سطح پر مضحکہ خیز انداز میں پڑی ہوئی ہارڈی کی لاش کے آگے گئی جہاں ایک تار پانی کی سطح کو چھو رہی تھی۔ اکثر تاروں سے پلاسٹک کی تہہ اتری ہوئی تھی۔ رائٹ لائٹ! یہ تم نے کیا ایجاد کر دیا......!!

پر اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اور سلیٹر ساری باتوں سے بے خبر اپنے کام میں مگن تھا۔

"ان میں سے ایک، دوسرے کی جان بچانے کی کوشش میں مارا گیا۔" گیراڈ نے کہا۔

"شاید اسی کا نام محبت ہے۔" اینی نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا۔

گیراڈ نے اینی کو دوسری بینچ پر لٹا دیا اور گیس کے ڈرم کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ سلیٹر کے پاس گیا۔ اس نے تالے کے چاروں طرف چادر میں لمبی لمبی درزیں بنا دی تھیں مگر کونے باقی تھے۔ گیراڈ نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی۔ "پریشر کم ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

سلیٹر وہیں فرش پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ گیراڈ کو ایک خیال آیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "اس پانی سے منہ دھونے مت چل پڑنا۔ اس میں کرنٹ ہے۔ وینڈی اور ہارڈی مر چکے ہیں۔"

سلیٹر رک گیا۔ وہ اسی ارادے سے اٹھا تھا۔ گیراڈ کو آدھے گھنٹے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ کام کتنا سخت ہے۔ اسے تعجب ہوا کہ سلیٹر اکیلا ہی دو گھنٹے سے مصروف تھا جبکہ وہ خود سو کے تازہ دم ہو چکا تھا۔ بالآخر تالے کے تین طرف کی چادر صاف کٹ گئی۔

"بس کرو۔" سلیٹر نے کہا۔ "اسے ہم توڑیں گے۔" ویسے بھی شعلے کی لو مدھم پڑ گئی تھی۔ گیراڈ نے ایک سریا اٹھایا اور کٹے ہوئے حصے میں پھنسا کر دبایا۔ سریا ٹیڑھا ہو گیا۔

گیراڈ نے سریا نکال کر پھینکا اور ایک ہتھوڑا تلاش کر کے لایا۔ پوری قوت سے ضرب لگانے کے باوجود تالے کا کچھ نہ بگڑا۔ وہ سلیٹر کے پاس بینچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اینی ان دونوں کے پیچھے مایوس کھڑی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا۔

"گیراڈ......" اس نے جھینپ کر کہا۔ "بینچ۔"

"بینچ......؟" سلیٹر نے دیکھا۔

"ہاں۔"

وہ دونوں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بینچ کافی بھاری تھی اور اس کے بازو لوہے

کے تھے۔ وہ بینچ کو اٹھا کر پیچھے لے گئے۔ اینی اور گیراڈ نے ایک طرف سے اسے تھام لیا۔ دوسری طرف سے سلیٹر اکیلا تھا۔

"او کے......" اس نے ماتھے سے پسینے کو صرف کرتے ہوئے کہا۔ "ون......ٹو...... تھری......" وہ تینوں بینچ اٹھا کر دوڑے اور اس کے آہنی بازو کو تالے سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ نشانہ ذرا سا خطا ہو گیا۔

"دوبارہ۔" گیراڈ نے کہا۔

اس بار وہ صرف تین گز پیچھے گئے۔

"بس......" وہ دوبارہ دوڑے۔ ایک دھماکے کے ساتھ بینچ کا آہنی بازو تالے کے درمیان میں ٹکرایا اور اسے باہر نکال دیا۔

وہ بینچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ اینی نے دروازہ کھولا تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا۔ ان کے سامنے ایک چھوٹی سی تاریک سرنگ تھی جس کے آخر میں سیڑھیاں تھیں۔ وہ تینوں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

اوپر جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں، ایک اور آہنی دروازہ تھا۔ اتنا ہی مضبوط اور مقفل۔

"اوہ گاڈ......" سلیٹر نے مایوسی سے کہا۔ "اب تو گیس بھی نہیں ہے۔"

وہ تینوں سیڑھیوں پر دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ مضبوط تالے میں چابی کے سوراخ سے سورج کی ایک کرن اندر آ رہی تھی اور فرش پر ننھا سا سفید دھبہ بن گیا تھا۔ وہ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر نیند نے مایوسی کی جگہ لے لی۔

گیراڈ نے دیکھا کہ وان کیسرو کی سڑکوں پر بارش ہو رہی ہے۔ آنکھ کھلی تو اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا ایک قطرہ گرا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ایک قطرہ اسی وقت اس کے حیرت سے کھلے منہ میں گرا جب وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ بدذائقہ اور پرانی اینٹیں تھیں جن کے درمیان سے چاک کے رنگ کا سفید مصالحہ جھڑ رہا تھا۔ اس کی دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے آتی ایک اینٹ نکلی ہوئی تھی اور خالی جگہ میں مکڑی کے جالے لٹکے ہوئے تھے۔

گیراڈ نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ اینٹوں کی ترتیب کسی بند دروازے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس نے چند لمحے اس نئی صورت حال پر غور کیا۔ دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ وان کیسرو کی کھلی فضا یا کوئی اور سرنگ؟ گندے پانی کی یا گیس لائن...... مگر اس نے کوشش

کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دروازہ کاٹنے کی نسبت یہ کام زیادہ آسان تھا۔ اینٹوں کی قدامت، دیوار کی خستہ حالت اور سال خوردہ پلاسٹر کو دیکھتے ہوئے اس نے ایبی سے کہا کہ وہ ایک سریا اور بیلچہ اٹھا لائے۔ سریے کی پہلی ضرب سے پانچ اینٹیں نکل گئیں اور گرد وغبار گیراڈ کی آنکھوں میں پڑا۔ دوسری دفعہ میں بارہ اینٹیں الگ ہو گئیں۔

کام آسان دیکھتے ہوئے ایبی نے بھی اپنی طاقت آزمانے کی کوشش کی اور دوسرا سریا اٹھالائی۔ مگر گیراڈ نے اسے منع کر دیا۔ ڈیلائلہ ڈیئر! تم دیکھو، سیمسن کیا کرتا ہے۔" اس نے سریے کو نیزے کی طرح تولتے ہوئے کہا۔ ایبی ہنس پڑی۔

"تم دونوں نے کیا شور مچا رکھا ہے...... سونا حرام کر دیا۔" سلیٹر اٹھ بیٹھا۔ مگر اتنی دیر میں گیراڈ نے دیوار میں اتنا بڑا سوراخ کر دیا تھا جس سے گزرا جا سکتا تھا۔ اور ملبے پر پاؤں رکھے یوں کھڑا تھا جیسے شکاری مردہ شیر پر بندوق رکھ کر کھڑے ہوتے ہیں فوٹو کھنچوانے کے لئے۔ دیوار کے ادھر ان کے لئے مزید حیرت کا سامان تھا۔ وہ سوراخ سے نکل کر سیدھے کھڑے ہوئے تو تاریکی میں انہوں نے ایک پرانے زمین دوز ریلوے اسٹیشن کی عمارت دیکھی۔

"یہ آثارِ قدیمہ دریافت کرنے میں ہمارا ذکر تاریخ کی کتابوں میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔" گیراڈ نے کہا۔

"ہاں...... ہمارے آثارِ قدیمہ دریافت ہونے کے بعد۔" ایبی نے کہا۔

"یہ کون سا اسٹیشن نکل آیا...... ہیں تو ہم وان کیسرو ہی میں نا؟" سلیٹر نے کہا۔ "یا سرنگوں میں چلتے چلتے کسی اور براعظم میں آ گئے ہیں۔"

بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح یہ تینوں خالی پلیٹ فارم پر چلنے لگے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے پڑے تھے اور دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ پرانے پوسٹر گرد میں چھپے ہوئے تھے۔ ریلوے لائن غائب تھی اور پوری عمارت آسیب زدہ لگتی تھی۔

"گرے اِن" سلیٹر نے محراب نما دروازے پر ٹارچ کی روشنی کی مدد سے حروف کو پڑھتے ہوئے کہا۔ دو آدمی گفتگو کر رہے تھے اور تیسرا کان لگائے کھڑا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ "سوچ سمجھ کر بات کیجئے۔"

"جب میں چھوٹا تھا تو اس قسم کا ایک اشتہار میں نے کھڑکی کے شیشوں پر چپکا پایا تھا۔"

سلیٹر نے وزارتِ دفاع کے اس اشتہار کی عبارت پڑھتے ہوئے کہا۔ "تا کہ بم کے دھماکے سے شیشے ٹوٹیں تو اندر نہ آئیں۔ تین سال پہلے کی بات ہے۔"

تصویر میں گفتگو کرنے والے کی شکل ہٹلر سے ملتی تھی اور اس کے سینے پر سواسکا کا نشان تھا۔

گیراڈ بے ساختہ ہنس پڑا۔ "میں نے کہیں پڑھا ہے کہ زیر زمین اسٹیشن ہوائی حملے سے بچاؤ کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ایک بم ان میں سے کسی اسٹیشن پر آ گرا تھا۔ اس نے چھت میں شگاف کر دیا اور نجانے کتنے لوگ مارے گئے۔"

کچھ آگے چل کر تیر کے نشان پر لکھا تھا۔

"باہر جانے کا راستہ۔"

مگر اس کے سامنے ملبے کا ایک ڈھیر تھا۔ اوپر تک۔ جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا تھا وہاں ریت کی بوریوں سے راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ یہ کبھی کسی ریل گاڑی کا پہلا اسٹیشن رہا ہو گا...... یا آخری......!

✿......✿

گرین اسٹریٹ جو ''ایم آر'' روڈ کے مشرق میں ہے، خاصی بارونق سڑک تھی۔ سڑک کے درمیان میں تین فٹ چوڑی سبز گھاس کی پٹی تھی اور دونوں کناروں پر گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ سڑک کے نیچے ریلوے کی سرنگ تھی جس کے روشن دان کہیں کہیں اس سڑک کے درمیان کھلتے تھے۔ ان پر سیاہ جالی لگی ہوئی ہے۔ جس وقت کنگ اسٹیشن میں دھماکے ہوئے اور آگ لگی تقریباً اسی وقت ان جالیوں کے نیچے لاوے کی شکل کا پگھلا ہوا مادہ جمع ہو رہا تھا اور اس کی سطح آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ سارے علاقے میں سڑے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ کسی کا کتا یا بلی گٹر لائن میں گر کر مر گئی ہے۔ وہ زمین دوز ریلوے کی سرنگ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے بند تھی اور اسے سیلاب یا بارش کے فاضل پانی کے نکاس کے متبادل نظام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ گٹر لائن کا پانی ابل کر اکثر اس میں آجاتا تھا اور لائن صاف ہونے کے بعد واپس اتر جاتا تھا۔ اس کی جالیوں سے بارش کا پانی سڑک سے بہہ کر سرنگ میں داخل ہو جاتا تھا؟ سرنگ آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ پگھلا ہوا مادہ آہستہ آہستہ اوپر آتا گیا۔ کسی راہ گیر نے رک کر پل بھر کے لئے سگریٹ جلائی اور جلتی ہوئی تیلی جالی پر پھینک دی۔ ایک شعلہ سا لپکا اور کنکریٹ کی فٹ پاتھ ایک دھماکہ سے اُڑ گئی۔ تیلی پھینکنے والے کا نام ونشان تک نہ رہا۔ لوہے کی جالی کے چوکھٹے ہوا میں اُڑتے ہوئے کاروں اور فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی دکانوں کے شیشوں سے ٹکرائے اور انہیں ریزہ ریزہ کر دیا۔ نیچے ستر مربع میل میں پھیلی ہوئی زیر زمین سرنگوں میں بارہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جیسے جیسے پلاسٹک کے گلنے سے سگنل بند ہوئے، روشنیاں بجھ جانے اور الیکٹرک انجنوں کے رک جانے کے واقعات میں اضافہ ہوتا گیا۔ آگ اور دھماکوں کی خبریں زیادہ آنے لگیں۔ وان کیسرو کے چیف ٹرانسپورٹ انجینئر کے لئے زمین دوز ریلوے کے نظام کو بند کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔

زمین کے اوپر ٹریفک سگنل کی جگہ پولیس مین پوسٹ کر دیئے گئے۔ ریڈیو کی نشریات وقفے وقفے سے بند ہونے لگیں اور اناؤنسر بار بار معذرت کرتے رہے۔ انجینئر ابھی کسی خراب تار کی جگہ نیا تار لگا کر فارغ بھی نہیں ہوتے تھے کہ کسی دوسرے ٹرانسمیٹر کے بند ہونے کی اطلاع ملتی۔ بالآخر چینل نمبر ایک اور چار مستقل طور پر بند کر دیئے گئے۔ ٹی وی کی نشریات کی کبھی تصویر اور کبھی آواز بگڑنے لگی۔ سارے شہر میں باسی گوشت کی بو پھیل گئی۔ پلاسٹک کے ڈبے اور بوتلیں گلنے لگیں۔ دوائیں خراب ہو گئیں اور تیزاب کے مرتبان جیسے گل گئے۔ ایک دفتر میں تاروں کے مل جانے سے آگ لگ گئی جسے ایک نوجوان نے دیوار پر لگے آگ بجھانے والے آلے سے فرو کر دیا مگر اتنی دیر میں حرارت سے پلاسٹک کا جار پھٹ گیا اور تیزاب کے گرم قطرے عملے کے لباس اور چہروں پر پڑے۔ جھلسے ہوئے چہرے لے کر بھاگنے والی لڑکیاں سیڑھیوں پر سے پھسل گئیں۔

کریمر لیبارٹری میں رائٹ، بیوشان اور سکیلین کو اپنی اور گیراڈ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جائے حادثہ یعنی ریلوے اسٹیشن کے قریب گلے ہوئے تار کے نمونے اور فوٹوگراف لینے گئے تھے۔ کریمر بھی ابھی اسٹور سے نہیں لوٹا تھا۔ دوپہر کے بعد بی بی سی اور ٹی وی نشریات وزارتِ داخلہ کے ایک اہم اعلان کے لئے روک دی گئیں۔ وزیر اعظم کا سنجیدہ چہرہ لاکھوں گھروں کے ٹی وی اسکرینوں پر نظر آیا مگر لاکھوں لوگ خالی اسکرین کو بھی گھورتے رہے۔ ان کے سیٹ خراب پڑے تھے۔

''حالیہ واقعات کی وجہ سے مجھے ملکہ میلسی نے ہنگامی حالات کے نفاذ کی اجازت دے دی۔ جو حادثات اب تک پیش آچکے ہیں ان سے ہونے والے جانی اور مالی نقصان کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ لیکن پلاسٹک کی خرابی نے وقتی طور پر ریڈیو، ٹیلی فون، آمدورفت اور بجلی کی فراہمی کو مشکل بنا دیا ہے۔ میں وان کیسرو کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہراساں نہ ہوں اور جہاں بھی پلاسٹک کی خرابی سے کسی نقصان کا اندیشہ محسوس کریں، ہنگامی مراکز کو مطلع کریں۔ شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اردگرد کے علاقوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔''

رائٹ نے جھلا کر ٹی وی بند کر دیا۔

''کیا اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟'' بیوشان نے طنز سے پوچھا۔

"بیوشان! دشمنی میں یہ مت بھولو کہ اب معاملہ صرف ایمبو اسٹرین کا نہیں ہے۔ ہر قسم کا پلاسٹک خراب ہو رہا ہے۔ پلاسٹک کی درجنوں اقسام ہیں مگر سب یکساں طور پر متاثر ہو رہی ہیں۔" رائٹ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو اپنی کریمر کی فکر ہے۔" سکیلن نے کہا۔

"میاں اسٹونو میں ہے اور بیوی ایک اجنبی کے ساتھ۔ اگر میری بیوی ہوتی ہے......"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے گلے پر چھری چلائی۔

"سکیلن! میں نے تم جیسا احمق نہیں دیکھا۔ ارے بابا! سارا وان کیسرو تباہ ہو رہا ہے اور تمہیں ایک عورت کی فکر ہے۔" رائٹ نے کہا۔

"مسئلہ پلاسٹک کا ہے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں یہ کبھی دیکھا نہ سنا۔"

"رائٹ! میں نے ہی نہیں، دنیا کے کسی شخص نے بھی کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ پلاسٹک جو ان کی زندگی میں صبح سے شام تک ان گنت چیزوں میں استعمال ہوتا ہے، کنگھے سے لے کر ٹی وی تک، گل سڑ بھی سکتا ہے۔ اس کا اصل سبب صرف ایک آدمی کو معلوم تھا اور وہ مر چکا ہے۔ ڈاکٹر سائمن۔ جس کا انتقال دس سال پہلے جولائی کی 20 تاریخ کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوا تھا۔

یہ تقریباً پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ ایک دن صبح کے وقت ان کے باتھ روم کی فلش لائن بند ہو گئی۔ انہوں نے دیکھا تو پلاسٹک کی ایک تھیلی جالی کے منہ پر چپک گئی تھی۔ اسے ہٹاتے ہی سارا پانی نکل گیا۔ 'لاحول ولا قوۃ۔' انہوں نے کہا۔ "بچے آلو کے چپس کھائیں یا پاپ کارن۔ لفافے نالی میں ضرور ڈالیں گے۔ نجانے ساری دنیا میں ہر روز کتنی لائنیں اسی طرح بند ہوتی ہوں گی اور لوگ پلمبرز کو بلاتے ہوں گے اور ان سے لڑتے ہوں گے۔"

ان کی زندگی بیکٹیریا کی نشوونما پر ریسرچ کرتے گزری تھی۔ رات کو کھانا کھاتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ وہ بیکٹیریا کی کوئی ایسی نسل یا قسم دریافت کریں اور تجربہ گاہ میں بنا لیں جو پلاسٹک کھا لیا کرتے ہیں تو گٹر لائن میں ان کی موجودگی بہت سی غلاظت کو ختم کر دے گی۔ یہیں سے ساری تباہی شروع ہوئی۔ کیونکہ ڈاکٹر سائمن کے لئے سوچنا اور کرنا برابر تھا۔ انہوں نے اس بیکٹیریا کو ایجاد کر لیا جو پلاسٹک کو کھا جائے۔

ایجاد یوں کہ اس بیکٹیریا کا اس سے پہلے وجود نہ تھا۔ اس کام میں ان کا بہت وقت

صرف ہوا مگر وہ ہمت ہارنے والے انسان نہیں تھے۔ انہوں نے عام قسم کے بیکٹیریا سے تجربات کا آغاز کیا۔ نظریاتی طور پر یہ بات ممکن تھی۔ ہر جاندار جس ماحول میں رہتا ہے اس کی جسمانی ساخت اور ضروریات اس ماحول کے مطابق ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ برفانی ریچھ سفید ہوتا ہے اور میدانی ریچھ سیاہ۔ اسی طرح تمام جاندار اپنی غذائی ضروریات کے معاملے میں خود کفیل ہو جاتے ہیں اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ درخت اپنی کھڑے فضا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور جڑیں گہرائی سے پانی کھینچ لاتی ہیں۔ بیکٹیریا نظر نہ آنے والے جاندار ہیں جو صرف ایک خلیے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جراثیم کی طرح یہ جانداروں کی خوراک بھی بنتے ہیں اور انہیں اپنی خوراک بھی بناتے ہیں، ان حشرات الارض کو جو مر جاتے ہیں اور ان انسانوں کو بھی جو زمین کے اندر ان کا رزق بننے کے لئے دفن کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سائمن کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا۔ کسی طرح سے انہیں پلاسٹک کھانے کی عادت ڈالی جائے۔ انہوں نے لوگوں کو سنکھیا کھانے کی عادت ڈالتے دیکھا تھا جو ایک ذرے سے شروع کرتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی تھی کہ تولہ بھر سنکھیا بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑتا تھا۔ خواب آور ادویات اور نشے کے عادی بھی رفتہ رفتہ ایک ایسی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کا جسم معمولی مقدار سے متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے۔ چڑیا گھر کے شیر کو اگر گوشت نہ دیا جائے تو وہ گھاس کھانے پر مجبور ہو جائے گا اور پنجرے میں پیدا ہونے والا بچہ خرگوش کے بچے کی طرح صرف گھاس ہی کھائے گا اور اتنا ہی بے ضرر ہو گا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ پروٹین جو بیکٹیریا کی سب سے اہم غذا ہے، کیمیائی اعتبار سے پلاسٹک کے اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ لکڑی سے کرسی بھی بنتی ہے اور میز بھی۔ دونوں کی شکل الگ ہے مگر اصل ایک ہے۔ گنے کا رس، گڑ اور چینی کی اصل ایک ہے یعنی ان کے اجزاء ایک ہیں۔

چینی میں کاربن کے بارہ اور ہائیڈروجن کے بائیس اور آکسیجن کے گیارہ حصے ہوتے ہیں۔ پلاسٹک میں بھی یہی تین جزو ہوتے ہیں مگر ان کا باہمی تناسب مختلف ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی چائے میں پلاسٹک گھول کر پی سکتا ہے اسی طرح جیسے میز پر بیٹھ کر کرسی پر نہیں لکھ سکتے۔ لیکن چینی نہ ملے تو گڑ کا عادی بن سکتا ہے۔

ڈاکٹر سائمن نے بیکٹیریا کو پروٹین سے ہٹا کر پلاسٹک تک لانے میں کئی برس صرف کئے۔ وہ ان کی غذا میں تبدیل کرتے گئے۔ پروٹین سے دور اور پلاسٹک کے قریب لائے گئے۔ ایسے کیمیائی مرکبات کھلا کر جو وہ اپنی تجربہ گاہ میں آسانی سے تیار کر سکتے تھے۔ بیکٹیریا کے لئے یہ غذا ہضم کرنا مشکل ہوتا تھا مگر وہ انہیں زندہ رکھتے تھے۔ تابکاری اثرات سے مزاحمت پیدا کر کے بیکٹیریا کی دوسری نسل کے لئے وہی غذا قبول کرنا آسان ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ نوبل پرائز کے حصول کا۔ بیکٹیریا کو یہ پتہ نہ تھا۔ دوسری نسل کی غذا میں ملاوٹ بڑھ گئی۔ یکے بعد دیگرے ان کی ہر نئی نسل کو جو خوراک ملی اور جس پر انہیں ڈاکٹر نے زندہ رکھا، زیادہ سے زیادہ پلاسٹک کے اجزاء پر مشتمل تھی۔ اٹھاون نسلیں گزر جانے کے بعد جو نسل وجود میں آئی وہ صرف پلاسٹک کھاتی تھی۔ خاص پلاسٹک۔ اور کوئی چیز نہیں۔ ڈاکٹر سائمن نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا تھا مگر ان کا اپنا وقت پورا ہو گیا تھا۔ تحقیق و تفتیش اور تجربات کے کٹھن اور صبر آزما مرحلوں میں ڈاکٹر نے اپنے سونے اور کھانے پینے کی فکر چھوڑ دی تھی اور ہمیشہ ایک ہی فکر میں غلطاں رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا بلڈ پریشر بڑھتا گیا۔ اس کے خون میں کولیسٹرول کی مقدار بڑھ گئی اور اسے پتہ نہ چلا۔ ایک دن وہ پلاسٹک کھانے والے اربوں کھربوں بیکٹیریا کو شیشی میں بند کئے فخر و انبساط کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ کولیسٹرول کی زیادتی نے اس کے خون میں ایک ننھا سا لوتھڑا پیدا کر دیا۔ ایک جمے ہوئے خون کا قتلہ جو اس کے دماغ کی ایک رگ میں پھنس گیا۔ دل نے خون کو گردش میں رکھنے کے لئے دباؤ ڈالا مگر ایک جگہ سے راستہ بند تھا۔ دماغ کی وہ رگ پھٹ گئی۔ ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ زمین اور آسمان گھومنے لگے اور اس کے لئے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ اس نے موت کے فرشتے کو سامنے کھڑا دیکھ لیا...... منتظر...... ''اوہ...... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' اس نے سوچا مگر مہلت کی گنجائش نہ تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ شیشی اس کے ہاتھ سے گر کر واش بیسن میں ٹوٹ گئی۔ زرد رنگ کا مائع نالی کے راستے بہہ کر نیچے چلا گیا اور ڈرین پائپ سے ہوتا ہوا گلی کی گٹر لائن میں شامل ہو گئے۔ کھلے نل سے پانی کی دھار بہتی رہی۔

اس سال نوبل پرائز سائنس میں ایک ایسی ایجاد پر پلاسکو، ریگون سٹی کے دو سائنسدانوں کو دیا گیا جنہوں نے تجربہ گاہ میں زیادہ پیداوار دینے والے گندم کا بیج پیدا کیا تھا۔

......
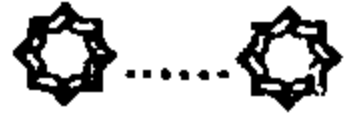
گرین لائن کے ویران ریلوے اسٹیشن پر کسی گاڑی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ 14 جنوری 1944ء کا ایک زرد، خستہ اور داغدار اخبار پلیٹ فارم کی گرد کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سلیٹر نے پیر سے گرد صاف کی اور شہ سرخی کے الفاظ ٹارچ کی روشنی میں نظر آنے لگے۔

''میلسن میں فیراڈی افواج کی زبردست کامیابی۔''

''مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔'' اینی نے کہا۔ ''میرے سارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔''

گیراڈ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ملبے میں خشک لکڑی کے بہت سے ٹکڑے تھے مگر آگ جلانے میں خطرہ تھا۔

''اس قسم کے مقامات پر جو برسوں بند پڑیں رہیں، زہریلی گیسیں جمع ہو جاتی ہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جیب سے لائٹر نکال کر روشن کیا۔ اس کا شعلہ خاموشی سے سیدھا جلتا رہا۔

''گیس نہیں ہے۔'' گیراڈ نے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے۔ تم نے جرأت کا نہیں، حماقت کا ثبوت دیا ہے۔'' سلیٹر نے کہا۔ ''گیس ہوتی تو دھماکے سے پورا اسٹیشن اُڑ جاتا۔ اگر جل کر ہی مرنا تھا تو جدوجہد کا کیا مقصد تھا۔'' گیراڈ نے کوئی جواب نہیں دیا...... وہ خاموشی سے لکڑیوں کا ڈھیر اکٹھا کرتا رہا۔ پرانے اخبار اور پوسٹر اکٹھے کر کے اس نے کاغذ کو آگ دکھا دی۔ پرانی لکڑیوں نے تیزی سے آگ پکڑ لی۔ شعلے بلند ہو گئے۔ ان کے سائے اندھیرے اسٹیشن کے کھنڈر میں بھوتوں کی طرح رقص کرنے لگے۔ حرارت نے ان کے جسموں میں توانائی کو بحال کر دیا۔ سلیٹر جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا، غنودگی کے عالم میں ایک طرف جھکنے لگا اور بالآخر فرش پر لڑھک گیا۔ برسوں کی گرد میں پیر پھیلا کر خراٹے لینے لگا۔ اینی نے اپنے کپڑے ایک ایک کر کے اتارے اور کھلی کھڑکی کے پٹوں پر پھیلائے۔ گیراڈ نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا۔ اب اینی چپکے سے آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

گیراڈ نے ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر اپنے قریب کر لیا۔ وہ مسکرائی۔ دو گھنٹوں میں کپڑوں کا سارا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ سلیٹر کی آنکھ کھلی تو وہ دونوں بے خبر سوئے پڑے

تھے۔اس نے انہیں جگانے کے لئے ان کے بالوں کو کھینچا۔ایپی کی آنکھ پہلے کھلی، پھر گیراڈ بھی اٹھ بیٹھا۔

"سونے کے لئے عمر پڑی ہے۔" سلیٹر نے کہا۔

ایپی نے خشک کپڑوں کو جھاڑ کر پہن لیا۔

"یہ آواز کیسی ہے؟" گیراڈ نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔سلیٹر نے غور سے سننے کی کوشش کی۔

"آواز تو نہیں، مگر بدبو ہے۔"

"نہیں......آواز بھی ہے۔ بہتے پانی کی آواز...... پلیٹ فارم کے نیچے۔" گیراڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ آواز کی سمت میں چل پڑا۔رفتہ رفتہ سلیٹر کے کانوں میں بھی یہ آواز آنے لگی۔

"گٹر لائن......" اس نے کہا۔مگر پلیٹ فارم پر سوائے گرد کے کچھ نہیں تھا۔گیراڈ نے اپنے جوتے اتار دیئے۔

"جھاڑو تو ہم دے نہیں سکتے۔ ننگے پیروں کے نیچے اگر کسی گٹر کے مین ہول کا ڈھکن آیا تو پتہ چل جائے گا۔عموماً لوہے کے یہ ڈھکن اوپر سے ہموار نہیں ہوتے۔ان پر ابھرے ہوئے خانے یا حروف ہوتے ہیں۔"

"لائن اگر ہوگی تو دیوار کے ساتھ ہوگی۔" سلیٹر نے کہا۔

گیراڈ نے ایک کنارے سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلنا شروع کیا۔تقریباً پچاس قدم چل کر وہ رک گیا اور بیٹھ کر ہاتھ سے گرد ہٹائی۔ مین ہول کا گول ڈھکن نمودار ہوا۔سلیٹر نے اس پر ابھرے ہوئے حروف کو پڑھا جو غالباً ڈھکن بنانے والی کمپنی کے نام کے ابتدائی حروف تھے۔دونوں کناروں پر گڑھے سے بنے ہوئے تھے۔ جیسے کسی گیند کو درمیان سے کاٹ دیا جائے۔اس میں بھی مٹی بھر گئی تھی۔گیراڈ نے انگلیوں سے مٹی کو نکالا۔ ڈھکن کی سطح کے برابر دونوں گڑھوں میں چھوٹی چھوٹی سلاخیں سی تھیں۔گیراڈ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے انہیں پکڑا اور ڈھکن اوپر کھینچ لیا۔شدید بدبو کا ایک بھبکا آیا۔گیراڈ نے روشنی اندر ڈالی۔گہرے بھورے رنگ کا ایک سیال سا ایک سمت میں بہتا جا رہا تھا۔

گیراڈ نے اس بو کو پہچان لیا تھا۔سیال میں جو گٹر کے پانی کی طرح تھا، بلبلے اور جھاگ بھی

پیدا کر رہا تھا۔

"پلاسٹک......" گیراڈ نے کہا۔"نہ جانے کہاں کہاں سے پگھل کر آنے والا لاکھوں بوتلوں، کھلونوں، گھریلو استعمال کی چیزوں اور تاروں پر سے اُترا ہوا۔

گٹر کی تہہ میں بہتا اُبلتا سیال مادہ سڑے ہوئے گوشت کی بو پھیلاتا بہہ رہا تھا۔اندر اترنے کے لئے لوہے کے زنگ خوردہ ہک سے بنے ہوئے تھے۔ایپی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ٹین کا ایک گول ڈبہ الٹا پڑا تھا۔اس نے سیدھا کر کے دیکھا، وہ اندر سے بالکل صاف تھا۔گیراڈ احتیاط سے نیچے اترا اور رقیق مادے سے ڈبے کو آدھا بھر لیا۔باہر نکل کر اس نے تھوڑا سا مادہ ایک انگلی کے کنارے پر لگا کر دیکھا۔کوئی جلن محسوس نہیں ہوئی۔اور اس طرح آگ کے پاس آ بیٹھے۔مگر ڈبے کو دور رکھا۔

"سلیٹر! مجھے ذرا اپنا پین دو۔" گیراڈ نے کہا۔

پین کو اس نے اس ڈبے میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ کیپ تک وہ محلول میں ڈوبا رہا۔دس منٹ میں اس نے پین کو نکالا اور دوسرے ہاتھ سے دبا کر دیکھا۔وہ نرم پڑ چکا تھا اور نیچے کا حصہ تقریباً پگھل گیا تھا۔

"سلیٹر......بہتر ہے تم دوسرا پین خرید لو...... یہ مل جائے گا کسی ریلوے اسٹال سے۔" گیراڈ نے کہا۔سلیٹر نے اسے گالی دی۔

"میرا شیفر......"

"یہ دیکھو، اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو پلاسٹک کو دیمک کی طرح کھا رہی ہے۔" گیراڈ نے قلم کا نچلا حصہ اس کی طرف کیا۔سلیٹر نے دیکھا کہ وہ ربڑ کی طرح ہو گیا ہے۔

"اس کو واپس ڈبے میں ڈال دو۔" گیراڈ ابھی تک انگلی پر اس بدبودار سیال کو لگائے بیٹھا تھا۔"جسم کو اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا امکان نہیں۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" ایپی نے کہا۔گو وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔وہ اپنے کپڑے اتار رہا تھا۔

"میں اندر اتر رہا ہوں۔" گیراڈ کھڑا ہو گیا۔"میں دیکھتا ہوں یہ گٹر لائن کہاں جاتی ہے۔"

وہ ہک تھامے نیچے اترنے لگا۔آہستہ آہستہ اس نے اپنا ایک پیر اس غلیظ سیال میں

ڈالا، پھر دوسرا۔" گٹر کے اوپر سے سلیٹر نے اسے ٹارچ پکڑا دی۔

"دیر مت کرنا......" اینی نے تشویش سے کہا۔

سیال گیراڈ کی کمر تک آ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ بدبو سے اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ کئی بار اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر متلی کو روکا۔ جھاگ اور بلبلوں کے علاوہ اس سیال کی رفتار خاصی تیز تھی۔ گیراڈ نے تہہ میں بہت سی چیزوں کو پیروں کے نیچے آتے محسوس کیا۔ پتھر، ڈبے اور شیشے کی بوتلیں۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو سو گز کے بعد اس کے سامنے لوہے کی جالی آ گئی۔ سیال اس جالی سے گزرتا جا رہا تھا اور باقی چیزیں جالی میں اٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے غور سے ان چیزوں کو دیکھا۔ اس کوڑے میں وہ چیز نہیں تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ پھر اس نے کندھوں تک ہاتھ ڈبویا اور تہہ میں سے چیزیں نکال نکال کر روشنی میں دیکھنے لگا۔ دس منٹ جو اسے دس گھنٹوں کی طرح لگے بالآخر کارآمد ثابت ہوئے۔ اس کے ہاتھ میں مطلوبہ چیز آ گئی اور وہ اسے ہاتھ میں دبا کر چل پڑا۔ مین ہول کے قریب پہنچ کر اس نے اینی کی آواز سنی۔ ہسٹریائی...... پکارتی ہوئی...... وہ غلیظ جسم کے ساتھ باہر نکلا تو وہ اس سے چمٹ گئی۔

"گیراڈ! تم ٹھیک ہو نا؟" وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھی تم ڈوب گئے۔"

"میں پلاسٹک کا گڈا نہیں ہوں۔" اس نے اینی کو تھپکتے ہوئے کہا۔ کاغذ کے ٹکڑوں سے اپنا جسم صاف کیا۔ کپڑوں کو اینی نے جھاڑ کر آگ سے دور پھیلا دیا۔

سلیٹر بھی محض انڈرویئر پہنے بیٹھا تھا۔ قمیض اور پتلون بالکل خشک ہو چکے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور وہ چیز نکالی جسے وہ تلاش کر کے لایا تھا۔ پھر اسے پین کا خیال آیا۔ اس نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"میں پین واپس کرنا بھول ہی گیا۔ دراصل میں چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جانے کا عادی ہوں۔" اس نے ڈبے میں انگلی ڈال کر ایک کلپ نکالا۔ "یہ لو۔ باقی چیزیں پوری کر لینا۔" لیکن پین کا اس محلول میں کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔

"سلیٹر! یہ بوتل کے ڈھکن ہیں۔ اسی بوتل کے جو غائب ہو جاتی ہے۔ ڈیگرون کی بنی ہوئی۔ ابتدا میں چند کمپنیوں نے ڈھکن کے اندر ایلومینیم کے گول پترے لگائے تھے جن پر کمپنی کا مونوگرام ہوتا تھا۔ بچے انہیں شوق سے جمع کرتے تھے۔ پانچ دس گول ایلومینیم کی

ٹکیوں کے بدلے انہیں کمپنی کی طرف سے کوئی چیز مفت مل جاتی تھی۔ لکی کوپن کی طرح ان پر نمبر بھی ہوتے تھے۔ کسی خاص نمبر پر کوئی بڑا انعام مل سکتا تھا۔ چنانچہ بوتل غائب ہو جاتی تھی اور صرف ایلومینیم کا ہلکا سا گول ٹکڑا رہ جاتا تھا جس پر مونوگرام یا سیریل نمبر ہوتا تھا۔"

"میں سمجھا نہیں......" سلیٹر نے کہا اور غور سے ایلومینیم کے اس ٹکڑے کو دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے...... محض خیال...... کہ یہ سارا فساد اس بوتل کا ہے۔ اس کے غائب ہونے کے بعد کوئی ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو نظر نہیں آتا مگر پلاسٹک کو نقصان پہنچاتا ہے" گیراڈ نے کہا۔ "مثلاً کوئی بیکٹیریا، پلاسٹک اور پروٹین کے اجزاء مشترک ہیں۔ چنانچہ بیکٹیریا جو پروٹین پر نشوونما پاتے ہیں اور پھیلتے ہیں۔"

"بیکٹیریا کے پھیلنے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔" اینی نے کہا۔ "ایک سے دو...... دو سے چار...... چار سے آٹھ۔"

"ہاں...... مگر یہ محض میرے تخیل کی پرواز ہے...... گٹر لائنوں میں یہ بیکٹیریا پیدا ہوئے اور بڑھے۔ پھر جہاں جہاں گٹر کا پانی یا اس کی نمی پہنچی، بیکٹیریا بھی پہنچ گئے۔ دیوار کے ساتھ پھیلتے گئے اور پلاسٹک کو گلاتے گئے۔ تم نے اپنے قلم کا حشر دیکھا۔ اس سے میرے نظریئے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ کوئی کیمیائی مادہ ہے یا بیکٹیریا...... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن دونوں میں سے ایک چیز ضرور ہے۔"

سلیٹر نے سر ہلایا۔ "تمہاری بات قابل تردید ہے مگر اس نظریہ پر تحقیق کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمارا باہر نکلنا ضروری ہے۔"

وہ تم ہم نکل جائیں گے...... اگر نو بھی پرائز ہے تو مجھے دے دو۔" گیراڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او کے...... یہ لو......" اس نے ایلومینیم کا ٹکڑا اس کی قمیص پر چپکا دیا۔ "اور اب میرا خیال ہے ہمیں وہیں قسمت آزمانی چاہیے جہاں سے پانی کا قطرہ ٹپکا تھا۔

ڈکٹ سائمن کے پرورش کیے ہوئے بیکٹیریا گٹر لائن میں زندہ نہ رہ سکے اس انہیں وہ خوراک یعنی پلاسٹک نہ ملی جس پر ان کی زندگی کا انحصار تھا کچھ بیکٹیریا بہتے ہوئے پولی تین اور سلوفین کے لفافے پر چپک گئے اور باقی گٹر کی دیواروں پر ہی خشک ہو گئے ان کی تخلیق کا عمل رک گیا۔ ایک سے دو اور دو سے چار ہونے کا...... مگر یہ صلاحیت باقی رہی جیس ننھے

سے بیج کے اندر ایک تناور درخت پڑا سوتا رہتا ہے لیکن جیسے ہی اسے زمین کی محبت بھری آغوش میں نمی اور سورج کی روشنی ملتی ہے وہ پھوٹ نکلتا ہے۔ سال دو سال سو سال یا ہزار سال بعد جب بھی اسے نشونما کے لیے موافق حالات میسر آجائیں۔ یہ خشک بیکٹیریا بھی اس وقت کے منتظر رہے۔ جب قدرت انہیں دوسرے جنم کے لیے ان کی غذا یعنی پلاسٹک فراہم کرے۔ یہ غذا گریمر کے گروپ کے سائنسدان رائٹ کے وسیلے سے انہیں دس سال بعد فراہم ہوئی جب لاکھوں افراد نے ڈیگرون کی بنی ہوئی بوتل اور ڈبوں کو گٹر لائن میں ڈالنا شروع کیا اواس کے اجزاء پانی میں تحلیل ہو کر خشک بیکٹیریا تک پہنچنے لگے۔

انہیں اپنی غذا وافر مقدار میں باقاعدگی سے ملنے لگی اور ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوگیا۔ وہ ایک سے دو......دو سے چار......اور چار سے آٹھ ہونے لگے۔ اتنی تیزی سے کہ یہ اتنی تیزی سے کہ ہر سیکنڈ میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچنے لگی اور بڑھتی گئی۔

گٹر لائن کے پانی کے ساتھ سارے شہر میں نیچے ہی نیچے پھیلتی گئی۔ زمین دوز ریلوے کی دیواروں میں پانی کے ساتھ جذب ہوگئی۔ شہر کی نالیوں میں گھروں میں ان کی نشونما کے لیے حالات پوری طرح سازگار تھے۔ وہ پیٹ بھر کر پلاسٹک کھا سکتے تھے وہی نہیں ان کی سینکڑوں نسلوں کے لئے دنیا میں خوراک کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ جوڑے میں لگے ہوئے پھول سے لے کر میزائل تک ہر چیز میں پلاسٹک موجود تھی۔ وہ ڈاکٹر سائمن کی تصویر کا پلاسٹک کا فریم تک کھا گئے۔

بیوشان نے اندھیرے میں اندازے سے سوئچ تلاش کیا کمرہ روشن ہوگیا۔ وہ اور سکبلن ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں داخل ہوئے جہاں شیشوں اور بوتلوں کی قطاریں رکھی تھیں۔ ”میں نے تمہیں آدھی رات کو اس لیے پریشان کیا ہے کہ تمہیں ایک ایسے راز میں شریک کروں جو ناقابل یقین ہے مگر ناقابل تردید بھی۔“ بیوشان نے کہا۔

”میں نے اس فلانواد کھلونے کے پلاسٹک کے اجزاء پر تحقیق کی اور مجھے عجیب و غریب کامیابی حاصل ہوئی۔“ اس نے سکبلن کے سامنے چار شیشیاں رکھ دیں۔

ان میں سے دو خراب پلاسٹک کے ٹکڑے ڈالنے کے بعد میں نے ڈیگرون کے ٹکڑے شامل کیے اور شیشی کو بند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پلاسٹک تیزی سے حل ہونا شروع ہوا اور جھاگ بن کر بالآخر ایک محلول میں تبدیل ہوگیا۔ میں نے اس کا ایک قطرہ شیشے پر ڈال کر

مائکروسکوپ سے دیکھا۔ اس سے عجیب و غریب بیکٹیریا پیدا ہو گئے تھے انہوں نے ڈیگرون کو کھا لیا تھا۔ سوال صرف یہ ہے کہ کھلونے کے پلاسٹک پر وہ بیکٹیریا کہاں سے آئے جس نے ڈیگرون کے ٹکڑوں کو کھا لیا۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے لیکن میں نے وہ بیکٹیریا دریافت کر لیا ہے جس نے ایمنیو اسٹرین اور ڈیگرون کو کھانا شروع کر دیا تھا۔

کھلونے میں بیکٹیریا پیدا ہونے کے اسباب جانے بغیر اس نتیجے پر پہنچنا بے کار ہے لیکٹیریا کو پھیلنے سے روکنے کا سدباب کیے بغیر ناممکن ہے۔“ سکیلن نے کہا۔

”درست میں نے اس بیکٹیریا کو ڈیگرون ک بعد پلاسٹک کے مختلف اقسام پر آزمایا اور نتیجہ ہمیشہ ایک ہی دیا بیکٹیریا نے ہر قسم کے پلاسٹک کو کھا لیا۔“ بیوشان نے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے بیکٹیریا کی کتنی اقسام ہیں اور وہ پروٹین پر مشتمل ہوتے ہیں اور اسی پر ان کی نشونما ہوتی ہے۔ پروٹین اور پلاسٹک کی کیمیائی ترکیب میں صرف عناصر کے تناسب کا فرق ہے۔ چنانچہ بیکٹیریا پلاسٹک کھانے والے ہیں۔ جس نے کسی ثبوت کے بغیر ایک نظریہ قائم کیا تھا اور اس پر تجربات کیے نظریہ درست ثابت ہوا اور بیکٹیریا کی یہ قسم دریافت ہوگئی۔ کسی ایک بیکٹیریا کو دوسرے سے الگ کرنا اور ان کی مصنوعات معلوم کرنا کسی نظریہ پر کام کیے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔“

”تم نے انہیں دیکھا؟“ سلیکن نے پوچھا۔

”وہاں۔“ وہ اٹھا اور الیکٹرونک مائکروسکوپ والے کمرے کی طرف بڑھا انہوں نے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ بیوشان نے شیشے کا چھوٹا سا ٹکڑا اسپرٹ لیمپ پر گرم کیا پھر ایک پلاٹینم کا تار کو چند سیکنڈ تک شعلے میں رکھ کر اس سے ڈسٹلڈ واٹر کا ایک قطرہ شیشے پر ٹپکایا ایسی تار کو اس نے پلاسٹک کھانے والے بیکٹیریا کی شیشی میں ڈالا اور محلول کا ایک قطرہ شیشے کے ٹکڑے پر ڈال دیا۔ اس کا رنگ دھندلا پڑ گیا۔ اس چوکور شیشے کو اس نے الیکٹرونک مائیکروسکوپ کے ایک خانے میں ڈال دیا۔ پھر اس نے مختلف سوئچ دبائے اور دیوار پر ایک ٹی وی اسکرین روشن ہوگیا۔ بیوشان نے مختلف بٹن گھما کر اسکرین کی روشنی کو کنٹرول کیا۔ یہاں تک کہ ساری لہریں غائب ہوگئیں۔ پھر ایک بٹن دباتے ہی اس پر نقطے سے نظر آنے لگے۔ سیاہ حرکت کرتے ہوئے۔ بیوشان نے بٹن گھما کر انہیں فوکس کیا۔ نقطے آگے آگے لگے اور بڑے ہوتے گئے یہاں تک کہ اسکرین پر چند کیل کی طرح کے چھوٹے چھوٹے

متحرک اجسام رہ گئے۔ بیکٹیریا۔ جنہیں الیکٹرونک مائیکروسکوپ دس لاکھ گنا بڑا کر کے اسکرین پر دکھا رہا تھا۔ بیوشان نے بٹن دبایا اور اسکرین تاریک ہو گیا۔

"اب میں انہیں کچھ کھانے کو دوں گا...... یہ مائع پلاسٹک ہے۔" بیوشان نے ایک شیشی میں بھورے زرد مائع کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "خاص پلاسٹک۔" شیشے کے ٹکڑے کو اس نے مائیکروسکوپ سے باہر نکالا۔ پلاٹینم کے تار کو گرم کر کے ٹھنڈا کیا اور مائع پلاسٹک میں ڈبو کر ایک قطرہ شیشے کے درمیان میں ٹپکا دیا۔ اسے فوکس کیے ہوئے مائیکروسکوپ میں ڈال کر جیسے ہی اس نے سوئچ آن کیا، روشن اسکرین پر بیکٹیریا میں تیزی سے تبدیلی آنے لگی۔ وہ مائع پلاسٹک کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر بیکٹیریا کے دوسرے کنارے پر بھی کیل کی طرح سر پیدا ہو گیا۔ پھر وہ درمیان سے ٹوٹ گیا۔ ایک سیکنڈ میں صرف ایک بیکٹیریا کے چار بن گئے تھے اور یہی عمل تیزی سے جاری رہا تھا۔ اسکرین پر ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ پورا اسکرین سیاہ ہو گیا تھا۔ پلاسٹک ملتے ہی بیکٹیریا میں افزائش کا عمل شروع ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے لائٹ کو بھی بلالیں۔" سکیلن نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

✡......✡

ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد فوج کے ایک بریگیڈ نے وان کیسرو کے اس حصے کا انتظام سنبھال لیا جہاں دھماکوں اور آگ لگنے کی وارداتیں زیادہ ہوئی تھیں۔ اگرچہ شہر کے باقی حصے میں بھی پلاسٹک کی خرابی بہت سے حادثات کا سبب بنی تھی لیکن وہ علاقے زیادہ تر مضافات میں تھے۔ بریگیڈیئر نے فوری طور پر ایک کانفرنس طلب کی اور انتظامی امور سے متعلق فیصلے کیے۔ اس نے اس مسئلے کے طبی پہلوؤں کی نگرانی ڈاکٹر فریک ڈیل کے سپرد کی۔ پولیس اور ٹریفک کے معاملات ہلنیڈ کے حوالے کر دیئے اور متاثرہ علاقے میں امدادی کام کا نگران ڈاکٹر مائی لینڈ کو بنا دیا۔

فوجی دستوں کی نقل و حرکت اور احکامات جاری کرنے کی ذمہ داری اپنے پاس رکھی۔ یہ سب لوگ سنجیدہ مزاج، اپنے اپنے کام کے ماہر اور پچاس سال سے زائد عمر کے تھے۔ اس نے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات! یہ بیماری یا وبا...... ایک میل قطر میں زیادہ شدت اختیار کر چکی ہے اور شہر

کے باقی علاقوں کا تحفظ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ متاثرہ علاقے کو شہر سے کاٹ دیا جائے۔ آج دوپہر سے فوجی دستے ناکہ بندی شروع کریں گے اور رات گیارہ بجے تک یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ بیماری یا وبا...... یا مصیبت اگر سارے وان کیسرو میں پھیل گئی تو ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔ چنانچہ متاثرہ علاقے سے باہر یا اس کے اندر آنے جانے پر مکمل پابندی ہوگی اور نقل و حرکت محدود کر دی جائے گی۔ بجلی کے نظام کی خرابی فوری طور پر دور نہیں ہو سکتی چنانچہ ملٹری کے جنریٹر تھوڑی بہت بجلی فراہم کریں گے تاکہ گھروں میں بیمار اور بوڑھے سردی سے مر نہ جائیں۔ یہ وبا کیا ہے؟ اس پر ڈاکٹر فرینک ڈیل روشنی ڈالیں گے۔"

ڈاکٹر فرینک ڈیل تک ابھی پلاسٹک کھانے والے بیکٹیریا یا بریگیڈیئر کی دریافت یا بیوشان کی تحقیق کے نتائج نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ وہ بھی کسی ثبوت کے بغیر یہ کہنے پر مجبور تھے کہ یہ بیکٹیریا کی کوئی نئی قسم ہے جو پلاسٹک کھاتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو فاضل مادے کے طور پر خارج کرتی ہے وہ میتھین اور اسی قسم کے ہائیڈروکاربن پر مشتمل ہونے کی وجہ سے آگ پکڑ لینے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔ اور جہاں یہ گیس جمع ہو وہاں ایک چنگاری خواہ وہ پلاسٹک اترے ہوئے تاروں کے آپس میں ملنے سے پیدا ہو یا ماچس کی تیلی سے، دھماکہ کا سبب بن جاتی ہے۔ چونکہ اس نے ابھی تک انسانوں کو نقصان نہیں پہنچایا ہے اس لئے حفاظتی ٹیکے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بیکٹیریا کو تباہ کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر اینٹی بایوٹک اور جراثیم کش ادویات کا استعمال کیا جائے گا۔ کہیں بھی بیکٹیریا نقصان پہنچاتے نظر آئیں تو اس کی اطلاع ہنگامی مراکز کو دی جائے گی۔

"دوسرا مسئلہ اس علاقے سے لوگوں کا انخلاء ہے۔" ہلنیڈ نے کہا۔

"یہ کام اسی طرح ہو گا جیسے جنگ یا وبائی امراض پھوٹ پڑنے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ پہلے ان لوگوں کو نکالا جائے گا جو یہاں نہیں رہتے یا نوکری وغیرہ کے لئے باہر جانے پر مجبور ہیں۔ پھر بیماروں کو۔ ہنگامی قوانین کے تحت ہم نے مضافات کے تمام خالی مکان اور ہوٹل حاصل کر لئے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ ایک بار متاثرہ علاقے سے نکل جائیں وہ ہنگامی حالات ختم ہونے تک واپس نہیں جائیں گے۔ مضافات کے سکولوں کو ہسپتال بنا لیا جائے گا اور تمام پرائیویٹ ڈاکٹر ہماری تحویل میں ہوں گے۔ یہ مرحلہ آج نصف شب تک مکمل ہو

جائے گا۔ بقیہ لوگ آئندہ دو دن تک منتقل کر دیئے جائیں گے۔ لیکن باہر جانے سے پہلے ہر شخص کا طبی معائنہ ہوگا جس کی تفصیلات ڈاکٹر مائی لینڈ بتائیں گے۔ لوگ گھروں میں رہیں گے۔ گلیاں اور سڑکیں صرف ہمارے استعمال میں رہیں گی۔ یعنی فوجی دستے اور امدادی کام کرنے والوں کے لئے۔ ان حالات میں جرائم زیادہ ہونے کا بھی امکان ہے۔ ممکن ہے لوگ احتجاج یا مظاہرہ کریں۔ ان سے ہنگامی قوانین کے تحت نمٹا جائے گا۔ کسی خالی مکان یا دکان میں چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے والے کو وہیں گولی مار دی جائے گی۔'' ہلنیڈ بیٹھ گیا اور ڈاکٹر مائی لینڈ نے اس کی جگہ لے لی۔

''متاثرہ علاقے سے باہر جانے والے ہنگامی مراکز میں رپورٹ کریں گے جو اس نقشے میں دکھائے گئے ہیں۔'' اس نے دیوار پر پھیلے ہوئے ایک ایسے نقشے کو لکڑی کی چھڑی سے چھوا جس پر سرخ نشانات لگے ہوئے تھے۔

''وہ پرانے کپڑے اتار دیں گے...... نہ اپنے ساتھ کوئی چیز لائیں گے اور نہ لے جائیں گے۔ خصوصاً پلاسٹک کی۔ انہیں دوسرے کپڑے دیئے جائیں گے جو مضافات میں رہنے والے دھو کر ابال کر فراہم کریں گے...... ہر گھر سے ایک جوڑا...... یہ کپڑے پہننے سے پہلے وہ جراثیم کش ادویات ملے پانی سے غسل کریں گے۔ ایکسرے مشین کے سامنے سے گزریں گے۔ اس علاقے میں رہنے والے اگر کہیں پلاسٹک کو گلتا پگھلتا دیکھیں گے تو خود کچھ نہیں کریں گے، ہنگامی مراکز پر اطلاع دیں گے۔ گندا اور استعمال شدہ پانی گھر سے باہر نہیں پھینکیں گے...... پانی صرف کھانے پکانے اور پینے میں استعمال ہوگا۔ جسم کی صفائی گیلے تولیے سے کی جائے گی اور فضلے کو پولی تھین کے بیگ میں جمع کیا جائے گا اور صفائی کرنے والے دستے اسے شہر سے باہر لے جا کر جلا دیں گے۔''

ایک گھنٹے بعد یہ اعلانات ریڈیو، ٹی وی اور پولیس گاڑیوں پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر سے نشر کئے جا رہے تھے اور شہریوں کو مکمل ہدایات چھپی ہوئی صورت میں فراہم کی جا رہی تھیں جن میں نقشے بھی شامل تھے۔ سرخ ٹوپیاں پہنے فوجی دستے قطار اندر قطار گاڑیوں سے اتر کر ہدایات کے مطابق پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے آنے جانے والی ٹریفک روک کر گلیوں، سڑکوں کے سروں پر لوہے کے کھمبے گاڑ دیئے تھے جن سے صرف پیدل جانے والے گزر سکتے تھے اور ان کے سامنے سفید بورڈ لگا دیئے گئے تھے جن پر سرخ

حروف میں ''داخلہ ممنوع ہے'' لکھا تھا۔ آہستہ آہستہ گاڑیوں کی نقل و حرکت متاثرہ علاقے میں مکمل طور پر رک گئی۔ صرف پیدل چلنے والے رہ گئے جو تیز تیز قدموں سے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ اعلانات کی وجہ سے کہ کھانے پینے کی اشیاء فوج فراہم کرے گی، دکانیں خالی ہو گئیں۔

لیکن ان سب انتظامات سے بے نیاز بیکٹیریا پلاسٹک کی تھیلیوں میں پلاسٹک کے لیڈرز، ہینڈ بیگ اور مردوں کے کنگھوں، بچوں کے کپڑوں، پانی، گیس اور سیوریج کی لائنوں میں ہوا کے ساتھ ہر جگہ پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وان کیسرو کی انڈر گراؤنڈ ریلوے بند پڑی تھی۔ ٹیلی فون بیکار ہو چکے تھے اور بجلی کے ساتھ گیس اور پانی کی فراہمی بھی متاثرہ علاقوں میں رک گئی تھی۔ سڑک پر ایک بوڑھے آدمی کے چشمے کا فریم پگھل گیا اور عینک گرتے ہی شیشے چور چور ہو گئے۔ ہسپتال میں ایک نرس اور ڈاکٹر بے بس سے پلاسٹک کی اس ٹیوب کو گلتا ہوا دیکھ رہے تھے جس سے قطرہ قطرہ خون ایک مریض کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔

وان کیسرو کے جنوبی ایئر پورٹ پر ریڈیو کنٹرول روم آپریٹر اپنے ہاتھ سے ایک انچ قطر کا گول بٹن اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اس سے وہ کچھ دیر پہلے جہازوں کے لئے سگنل کی فریکوئنسی کنٹرول کر رہا تھا لیکن اب وہ اس کے ہاتھوں میں چپک کر کنٹرول پینل سے الگ ہو گیا تھا۔

صنعتی ضروریات کے لئے استعمال ہونے والا ایک زہریلا مادہ پلاسٹک کے بڑے بڑے ڈرموں میں بھر کر ایک ٹرک کے ذریعے دوسرے شہر لے جایا جا رہا تھا۔ ڈرائیور سیٹی بجا رہا تھا اور ڈرم کے سوراخ سے اس زہریلے مادے کی ایک لکیر پیچھے سڑک پر بہتی جا رہی تھی۔

شہر کی تمام دیواروں پر ہنگامی کانفرنس کے فیصلے، احکامات اور عدم تعمیل کی سزا کے پوسٹر چسپاں تھے۔

متاثرہ علاقے کے ایک شہری جیک بیلی کے گھر میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں اور وہ کمبل اوڑھے کرسی پر نیم دراز تھا۔ سرد ہوا کے ایک جھونکے سے دروازہ کھل گیا۔ اس نے اٹھے بغیر لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔

''ابھی تو گیس آ رہی ہے۔'' اس کی بیوی میری نے کافی کے دو کپ میز پر رکھتے ہوئے

کہا۔

"جب تک جلتی ہے، جلنے دو۔ کچھ تو گرم ہوگا کمرہ۔" جیک نے کہا۔ ریڈیو اور ٹی وی بند پڑے تھے اور باہر نکلنے پر پابندی تھی۔

"یہ لو......" اس نے جیب سے بہت سے سکے نکالتے ہوئے کہا۔ "ایک ایک شلنگ ڈالتی جاؤ۔" ایک شلنگ میٹرلیس ڈالنے سے گیس بارہ گھنٹے اور بجلی چھ گھنٹے جل سکتی تھی۔

میری نے سلائیاں اور جیک نے ایک کتاب اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ انہیں اس بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ باورچی خانے میں گندے پانی کی نکاسی کے پائپ میں گلی کی گٹر لائن سے جھاگ دیتے اُبلتے، پگھلتے ہوئے پلاسٹک کے ساتھ بیکٹیریا اوپر چڑھ رہے ہیں۔ یہ رقیق مادہ واش بیسن میں بھر گیا اور چھلک کر فرش پر گرا۔ چند قطرے پلاسٹک کی شیلف پر پڑے جس میں فوراً بلبلے نمودار ہو گئے۔ جو بلبلا پھٹتا تھا، ننھے منے قطرے ارد گرد دوسری چیزوں پر پڑتے تھے۔ وینائل وال پیپر گل گیا۔ پلاسٹک کی بنی ہوئی بوتلیں بکھرنے لگیں۔ ان پر بکھرے ہوئے کافی، چائے، چینی، نمک وغیرہ کے حروف غائب ہو گئے۔ پولی تھین کے جگ میں رکھا ہوا کسٹرڈ پگھلے ہوئے پلاسٹک کے ساتھ بہنے لگا۔ کھانے کی میز پر پھیلا ہوا پھولدار پلاسٹک داغدار ہو گیا اور جگہ جگہ سے کٹنے لگا۔ سوراخ بڑے ہوتے گئے۔ بجلی کا سوئچ پگھل گیا۔ جیک کی ناک میں اس کی بو پہلے پہنچی۔ اس نے کتاب رکھی اور موم بتی اٹھا کر وہ باورچی خانے کی طرف چلا۔ میری اس کے پیچھے تھی۔

"گیس بند کر دو......" جیک نے کہا۔ میری نے کانپتے ہاتھوں سے تعمیل کی۔ جیک نے دروازہ لاک کر دیا۔

"اسے کھولنا نہیں ہے۔ میں رپورٹ کرنے جا رہا ہوں ہنگامی مرکز میں۔" اس نے واپس کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر؟ میں بھی ساتھ چلوں گی۔" میری نے اس کا بازو تھام کر کہا۔

"دماغ خراب ہے...... باہر سخت سردی ہے۔" جیک نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"ہونے دو...... میں تنہا اس اندھیرے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ وہ مجھے بھی کھا جائیں گے۔" میری نے کہا۔

"ابھی تک انہوں نے وان کیسرو میں کسی کو کھایا ہے؟" جیک نے اسے پیچھے دھکیل کر

دروازہ بند کر دیا۔ بیس منٹ بعد وہ لوٹا تو میری اکیلی کھلی کھڑکی سے آنے والی سرد ہوا میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کے پیچھے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ مکمل طور پر ابر کا لباس پہنے جو سر سے پیر تک سیاہ تھا مگر جس میں دیکھنے کے لئے شفاف شیشے کی آنکھیں سی بنی ہوئی تھیں، تین آدمی اندر آ گئے۔ ان کے خود پر لکھا تھا۔

"کنٹرول یونٹ۔"

ایک کے ہاتھ میں اوزاروں کا تھیلا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ابر کی نلکی اور کمر پر آہنی سلنڈر۔ تیسرے کے پاس بیٹری تار اور چھوٹا سا ویلڈنگ سیٹ تھا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر ایک نے لوہے کے پائپ کو کاٹا اور لوہے کی کیپ چڑھا کر ویلڈ کر دیا۔ دوسرے نے باورچی خانے سے پلاسٹک کی ہر چیز بیچ میں ڈھیر کر دی کراکری اور کٹلری سمیت...... دیواروں اور الماریوں پر پڑتے ہی وال پیپر پانی بن گیا۔ پلاسٹک کے تمام برتن غائب ہو گئے۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں گئے۔ اور ہر چیز تباہ کر دی۔ پلاسٹک کے پھول، وال لائٹس، آرائشی گلدان، مجسمے۔ جیک اور میری کو باہر نکال کر انہوں نے تمام دروازوں کی دہلیز کے ساتھ ساتھ کوئی کیمیائی مادہ چھڑک کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔ چابی انہوں نے جیب میں ڈال لی۔ جیک خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا لیکن میری کو انہیں گھسیٹنا پڑا۔ اس کی لاتیں، مکے اور گالیاں کھانی پڑیں۔ انہیں ایک چھوٹی سی وین میں بند کر دیا گیا اور وین چل پڑی۔

"میرا گھر...... مجھے میرے گھر جانے دو۔" وہ فرش پر پڑی سسکیاں لیتی رہی۔ جیک نے اسے نرمی سے اٹھایا۔

"میری! ہم اپنے گھر جائیں گے۔ ضرور جائیں گے۔ ہم اسے پھر بنا لیں گے۔ پہلے سے بھی اچھا سجا لیں گے۔ کم آن۔"

متاثرہ علاقے کا ایک اور شہری ہیری منزول تھا۔ اس نے بھی سارے اعلانات سنے تھے اور سارے اشتہارات پڑھے تھے اور صورتحال سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود کامل اطمینان اور سکون سے اپنے فلیٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کمرے میں وہ تنہا تھا۔ لباس اور انداز و اطوار سے وہ بے حد معزز اور معتبر نظر آتا تھا۔ وان کیسرو میں اس کے دو کلب تھے اور جوتوں کی چھ دکانیں مختلف مقامات پر۔ وہ

باقاعدگی سے انکم ٹیکس ادا کرتا تھا اور وان کیسرو پولیس کے ریکارڈ میں اس کا نام دس سال پہلے ایک چھوٹی سی چوری کے سلسلے میں ضرور آیا تھا مگر اس کے بعد وہ ایک عام شہری کی طرح رہا یہاں تک کہ وہ ریکارڈ بھی تلف کر دیا گیا۔

دس سال قبل وہ فوج میں تھا۔ اس کا شمار نڈر اور خطرات سے کھیلنے والے سپاہیوں میں ہوتا تھا اور وہ موت سے اتنا بھی نہیں ڈرتا تھا جتنا چوہے سے۔ سڈنی کی جنگ میں اس نے اپنی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کو گولی ماردی جس نے سڈنی کی باشندہ ایک لڑکی کو اس لئے گولی ماردی تھی کہ وہ ممنوعہ علاقے میں کافی رات کو مشتبہ طور پر گھومتی ہوئی پائی گئی۔ اور سنتری کے روکنے پر بھاگ اٹھی...... ریکارڈ میں یہی تھا۔ لیکن اس لڑکی کا اصل جرم یہ تھا کہ وہ ہیری سے شادی کرنا چاہتی تھی اور کرنل کے لئے ہیری کو منع کرنا زیادہ مشکل تھا۔ فرار ہو کر وہ وطن واپس پہنچا اور ایک رات پستول لے کر کرنل کے گھر میں کود گیا...... دو گھنٹے پہلے اس نے ایک پٹرول پمپ سے دس ہزار ڈالر لوٹے تھے۔

''میں نے تمہارے شوہر کو قتل کیا تھا۔'' اس نے خوف سے لرزتی ہوئی عورت کو جگا کر کہا۔ ''کیونکہ اس نے میری بیوی کو ماردیا تھا۔''

وہ وحشت زدہ عورت اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

''پھر......؟ کیا یہ کافی نہیں......؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... اصولاً مجھے بھی اس کی بیوی کو ماردینا چاہئے تھا۔ اس کو نہیں۔ تاکہ وہ زندگی بھر اسی عذاب کو جھیلتا جو میں جھیل رہا ہوں۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''ممی......'' دوسرے کمرے سے ایک بچے کی آواز سنائی دی۔ ''کیا ڈیڈی واپس آ گئے ہیں؟''

''نو...... نو...... لیس...... لیس ڈیئر......'' اس کی ماں نے مشکل سے کہا۔

''ہیلو ڈیڈ......'' دروازے میں ساڑھے تین سال کا صحت مند بچہ خواب آلود نیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جب اس کا باپ گیا تو یہ چھ ماہ کا تھا...... میں نے کہا...... کہیں یہ شور نہ مچائے۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''یہ پستول آپ میرے لئے لائے ہیں؟'' بچے نے پُر اشتیاق نظروں سے آگے

بڑھتے ہوئے کہا۔

اس کے ہاتھوں میں پستول کانپنے لگا۔ ''معاف کرنا بیٹا...... میں بھول گیا......'' اس کا ہیرے سے سخت دل پھول کی اس پتی سے کٹ گیا تھا۔ وہ پستول جیب میں ڈال کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے بچے کے چھوٹے سے معصوم چہرے کو اپنے کھردرے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

''مجھے معاف کرنا بیٹے! صبح تم اپنی ممی کے ساتھ جا کر بہت سے کھلونے لے آنا مگر پستول نہیں...... یہ لو۔'' اس نے دس ہزار ڈالر کے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ''مجھے واپس جانا ہے۔'' اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا...... پھر دروازے کی طرف بڑھا عورت پتھر کے بت کی طرح کھڑی رہی۔ پھر اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اور اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

''ڈیڈی کو خدا حافظ کہو بیٹے!'' عورت نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

''بائی بائی ڈیڈ!'' اس نے اپنا منا سا ہاتھ ہلایا۔ مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ چوری کے جرم میں اسے ایک سال کی سزا ہوئی...... اب وہ ایک پیشہ ور مجرم تھا۔ ذہین اور ٹھنڈے دماغ والا۔ مگر وہ چھوٹا سا ہاتھ کبھی کبھی اس کے دل کو جکڑ لیتا تھا۔ ''بائی بائی ڈیڈ!''

اس نے فون اٹھایا۔ خلاف توقع لائن مل گئی۔ ''سولی ہو...... میں ہیری بول رہا ہوں۔ ریڈیو سن رہے ہو نا؟'' وہ ہنسا۔ ''ہاں...... حالات تو خراب ہیں مگر میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے...... ہاں...... ایک خیال آیا ہے مجھے۔ الفورڈ کہاں ہے...... گڈ...... تم دونوں آ جاؤ...... ہاں ابھی......'' فون بند کر کے وہ اپنے کمرے میں آیا۔ ڈبل بیڈ کو گھسیٹا، قالین ہٹایا۔ اس کے نیچے فرش کا ایک ٹائل ہٹا کر کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک بنڈل نکالا۔ ایک اسٹین گن اور دو ریوالور۔ بالکل صاف۔ ایک ایک پرزے میں تیل دیا ہوا تھا۔ دونوں ریوالور بھر کر اس نے مشین گن کا پورا راؤنڈ قمیض کے نیچے بیلٹ کی طرح باندھ لیا۔ کمرے کی ہر چیز کو اس نے پھر پہلے کی طرح کر دیا۔ دروازے پر دستک ہوتے ہی وہ باہر نکل آیا۔

''ساری چیزیں لائے ہو ناں؟'' اس نے کہا۔

''ہاں...... جانا کہاں ہے......؟'' ایک نے پوچھا۔

''گولڈن اسٹریٹ...... برائٹ جیولر......'' گلی میں ابھی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی

مگر دکانیں بند پڑی تھیں۔ ہیری نے فٹ پاتھ کی برف پر بنتے ہوئے قدموں کے نشانوں کو تھوڑی سی تشویش سے دیکھا۔

برائٹ جیولرز کی دکان کا فولادی دروازہ بند تھا اور اِدھر اُدھر فلیٹوں میں بھی روشنی نہیں تھی۔ سولی نے اپنا کام شروع کیا۔ وہ بیس گز دور ایک کون میں مشین گن تھامے کھڑا رہا۔ اب تک کبھی اس کو چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن مقابلہ اب اس جیسے فوجیوں سے تھا۔

الفورڈ دوسرے کنارے پر بظاہر بے نیازی سے ایک دروازے میں کھڑا سیٹی بجا رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں سولی کی ڈرل مشین کی آواز کچھ زیادہ ہی آ رہی تھی۔ تین منٹ کے طویل وقفے میں ہیری جیسے شخص کو پسینہ آ۔ پھر سولی کی سیٹی سنائی دی۔ اس نے مشین گن کو اوور کوٹ کے اندر چھپایا۔ ہیٹ آنکھوں سے ذرا اوپر تک جھکایا۔ کوٹ کے کالر کھڑے کئے اور الفورڈ کے ساتھ دکان میں داخل ہو گیا۔ دروازے کو انہوں نے پھر بند کر دیا۔

''کوئی ہے......؟'' الفورڈ نے اونچی آواز میں کہا۔

ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے ہر کونے کو دیکھ لیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ اب الفورڈ کا کام شروع ہوا۔ اس نے جیب سے بجلی کا تار کاٹنے والی پلائرس، پیچ کش، وولٹ میٹر اور ٹیسٹر نکالے۔ ''تاروں میں بجلی نہیں ہے۔'' اس نے پہلی اطلاع دی۔ پھر وہ سیڑھیوں سے نیچے تہہ خانے میں اتر گئے۔ ''سیف میں کرنٹ نہیں ہے۔'' یہ دوسری اطلاع تھی۔ ہیری نے سر ہلایا۔ ''کوئی بیٹری الارم بھی نہیں ہے۔'' اس نے احتیاطاً سارے کنکشن کاٹتے ہوئے کہا۔

اس تصدیق کے بعد سولی نے پھر اپنا کام شروع کیا۔ دو گھنٹے بعد تجوری کھل گئی۔ اس کے اندر ایک فولادی تہہ خانہ تھا جو کنکریٹ کی دیوار میں نصب تھا۔ سولی نے اس میں چھ چھ انچ کے گہرے چار سوراخ کئے۔ ان میں الفورڈ نے چار ڈائنا مائیٹ اسٹک لگا کر تاروں سے ان کے کنکشن جوڑ دیئے۔ دو تاروں کو فرش پر پھیلاتا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی لوہے کی جالی کے پاس تھی جو روشندان میں لگا ہوا تھا۔ دونوں تاروں کو اس نے بیٹری کے پول سے جوڑ دیا۔

''تم دونوں سیڑھی کے نیچے جاؤ۔'' ہیری اور سولی کنکریٹ کے زینے کے نیچے ہو گئے۔

''اوکے بوائے...... ریڈی......؟'' الفورڈ نے کہا اور دونوں تاروں کو آپس میں ملا

دیا...... ایک دھماکہ ہوا۔

''جلدی کرو...... وہ آنے والے ہوں گے۔'' الفورڈ نے خانے میں ہاتھ ڈال کر دو تھیلیاں ہیری کی طرف اچھال دیں۔ ابھی وہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے ہی تھے کہ پوری عمارت ایک دھماکے سے اُڑ گئی۔ گرد اور ملبے میں الفورڈ کی آخری چیخ دب گئی۔ ہیری کو جیسے کسی نے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اندھیرے مکانوں کی کھڑکیوں میں سے کوئی سر نہ نکلا۔ ہیری کپڑے جھاڑ کر اٹھا۔ اسٹین گن اس کے قریب ہی پڑی تھی اور اس کے جسم پر معمولی چوٹوں اور خراشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

''سولی......'' اس کی آواز سناٹے میں گونجی۔ ''ہیری......'' پچاس گز دور اس نے سولی کو لڑکھڑاتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ ایک تاریک زینے میں چھپ گیا۔

اسی وقت گلی کے دونوں کناروں سے فوجی ٹرک نمودار ہوئے۔ سپاہی کود کر اترے اور انہوں نے تباہ شدہ عمارت کے گرد مشین گن سنبھال کر پوزیشن لے لی۔ وہ چھ آدمی تھے۔ ساتواں ایک نوجوان کیپٹن تھا۔ وہ ملبے کے اوپر چڑھا اور اندر اتر گیا۔ اس کے پیچھے تین سپاہی چلے گئے۔ ہیری چھپا ہوا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ سولی اس سے تقریباً پچیس گز دور دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

''احمقوں کی طرح مت کھڑے رہو...... اوپر کے فلیٹ دیکھو......'' نوجوان کیپٹن نے واپس آ کر کہا۔ سپاہی سیڑھیاں چڑھ کر غائب ہو گئے۔ ہیری نے جیب سے دستی بم نکالا اور دانتوں سے اس کی پن نکال کر پوری قوت سے مخالف سمت میں پھینک دیا۔ پچیس گز دور سولی کھڑا تھا۔ ملبے کے پیچھے اس کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔ وہ پوری عمارت باقی عمارتوں سے کٹ گئی تھی۔ دو منزلہ عمارت جس کی اوپری منزل میں بھی ایک فرم کا دفتر تھا۔ نوجوان کیپٹن دوڑتا ہوا ادھر آ گیا جہاں دستی بم پڑا تھا مگر وہاں بھی صرف ملبہ تھا۔

''باہر آ جاؤ...... کون ہے؟'' اس نے چلا کر کہا۔

''گیس کیپٹن......'' ایک سارجنٹ نے کہا۔ ''اگر کوئی ہو گا تو ملبے کے نیچے۔''

''بس...... پوری گٹر لائن اُڑ گئی۔'' کیپٹن نے کہا۔

''تہہ خانے میں تجوری کے پیچھے سے۔''

''ملبے نے آگ بجھا دی ہے ورنہ سب لپیٹ میں آ جاتے۔'' سارجنٹ نے کہا۔

"آگ جلائی کس نے؟ علاقہ تو خالی کرایا جا چکا ہے۔" کیپٹن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مالک، چوکیدار یا چور......" سارجنٹ نے کہا۔ "ملبہ ہٹے گا تو پتہ چلے گا۔"

"یہ دوسرا دھماکہ......؟" اس نے کہا۔ "اس کی آواز پر تم نے غور کیا؟"

"یس سر...... آواز دستی بم کی تھی۔ مگر جہاں ایک بار دھماکہ ہو، وہاں کبھی کبھی بہت سے دھماکے ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک۔" سارجنٹ نے کہا۔ سپاہی آس پاس کے فلیٹوں میں جھانک کر اتر آئے تھے۔

"یو آر رائٹ...... اسٹیشن کی سرنگ میں بھی یہی ہوا تھا۔" اس نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

مگر اس کے ذہن میں ایک اور چیز تھی۔ فولادی دروازہ جو ملبے پر پڑا تھا۔

"تم ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے کر آ جانا۔" اس نے سارجنٹ سے کہا جو دوسری جیپ میں بیٹھ رہا تھا۔ "آل از او کے۔" ابھی اس کی زندگی کے دن باقی تھے۔ ورنہ ہیری کی مشین گن ان سب کے لئے کافی تھی۔

"یس سر......" سارجنٹ نے کہا۔ کیپٹن کو اس چور کے مرنے کا ذرا بھی ملال نہ تھا جس نے فولادی دروازے کے تالے کو کاٹ کر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی...... باسٹرڈ......

✿......✿

پلیٹ فارم کے آخری کنارے پر سگنل کیبن میں گیراڈ کو ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا لیکن شعلوں کی روشنی میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس نے سلیٹر کے ہاتھ سے ٹارچ لی۔

"کیبن میں کوئی ہے۔" اس نے کیبن کی سمت میں نظریں جمائے رکھیں۔ "میں دیکھتا ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ کیبن کی طرف چل پڑا۔ وہ لوہے کی زنگ خوردہ سیڑھی پر چڑھ کر چوکور ڈبے جیسے کیبن میں پہنچا۔ شیشے اب ٹوٹے پڑے تھے اور لیور جام ہو گئے تھے۔ ایک دیوار پر ریلوے لائن کا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ پچھلی دیوار میں لکڑی کا ایک دروازہ تھا جس پر آڑے ترچھے تختے لگا کر کیلیں ٹھونک دی گئی تھیں۔ ایک امید پھر پیدا ہوئی۔ شاید دروازہ کہیں لے جائے۔ اس نے درزوں سے منہ لگا کر دیکھا۔ دوسری طرف بھی اندھیرا تھا۔ مگر ٹھنڈی ہوا تیزی سے اندر آ رہی تھی۔ تختوں کا توڑنا کیا مشکل ہے۔ اس نے سوچا۔ پیچھے سے کسی کے تیز تیز سانس لینے کی آواز سن کر وہ اچانک پلٹا۔ مگر اس کے سر پر کوئی چیز پڑی۔ وہ کچھ نہ دیکھ سکا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہ آگ کے قریب پلیٹ فارم پر لیٹا تھا۔ سر میں شدید درد تھا اور منہ میں خون کا ذائقہ۔ اس کے بالوں میں بھی خون چپکا ہوا تھا۔

"مجھے کیا ہوا تھا......؟" گیراڈ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں...... شاید گر پڑے تھے۔" اینی نے کہا۔ "کوئی لیور وغیرہ لگ گیا تمہارے سر میں۔"

"نہیں......" اسے یاد آ گیا۔ "کسی نے میرے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔"

"ہمارے سوا یہاں کون ہے؟" سلیٹر نے کہا۔ "جو تمہیں ڈنڈے مارے؟"

"اگر تم دونوں نے نہیں مارا تو کوئی ضرور ہے۔" گیراڈ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دو گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ "کیبن کے اندر پچھلی دیوار میں لکڑی کا بند دروازہ ہے۔" گیراڈ

نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔''

''توڑ نہیں سکتے ہیں۔'' اینی نے کہا۔ ''توڑنے کے لئے ہمارے پاس کیا ہے؟''

سلیٹر کھڑا ہوا۔ ''کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

انہوں نے دروازے کے سامنے لکڑی کا ڈھیر لگا دیا۔ پینٹ کے دو پرانے کنستر کھول کر انہوں نے ایک کنستر خشک لکڑیوں پر انڈیل دیا۔ پھر سلیٹر نے لائیٹر سے ایک کاغذ جلایا اور اس ڈھیر پر رکھ دیا اور وہ تینوں دوڑ کر باہر نکل آئے۔ شعلے ایک دم بھڑک اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی اور شعلوں میں سے ایک شخص کا ہیولا نمودار ہوا۔

''پرائس......'' اینی نے چلا کر کہا۔ ''وہاں کیا کر رہے ہو؟ جل جاؤ گے۔''

جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا اور الف ننگا کھڑا تھا۔ اس نے گیراڈ پر ٹارچ پھینک کر ماری اور ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی قمیض تار تار تھی اور پتلون کے اس نے درمیان سے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ انہیں وہ دوسرے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

''پیچھے ہو جاؤ...... گاڑی آ رہی ہے۔'' اس نے منہ سے انجن کی آواز نکالی اور پلیٹ فارم کے نیچے ریل کی پٹڑی کے پرانے راستے پر دوڑتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ وہ تینوں افسوس اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے رہ گئے۔ سلیٹر نے آگے بڑھ کر ٹارچ اٹھا لی۔ اس میں سے سیل غائب تھے۔ ذرا سی دیر میں کیبن جل کر خاک ہو گیا۔ انگارے رہ گئے۔ انہوں نے اس پر ریت ڈالنی شروع کر دی۔ دروازے کے تختے ضرورت سے زیادہ جل گئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد سلیٹر اور گیراڈ نے کندھے ملا کر دھکا لگایا اور دروازے کے ساتھ دوسری طرف جا پڑے۔ اینی نے پرانی ترپال کو پھاڑ کر پینٹ میں ڈبو دیا اور لکڑی پر لپیٹ لیا۔

''یہ ہماری ٹارچ ہے۔'' گیراڈ نے کہا

آدھے گھنٹے میں اینی اور سلیٹر نے ایسی ہی چھ مشعلیں تیار کر لیں۔ ایک کو انہوں نے روشن کر لیا اور دروازے سے گزر کر اینٹوں کے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئے جو گول سلنڈر کی طرح بلند تھا۔ عمودی سرنگ کی طرح۔ بالکل اوپر روشنی کا دائرہ تھا جس سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ مگر یہ سوراخ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ نیچے سے اوپر تک دیوار میں چھ چھ انچ کی زنگ خوردہ کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ دیوار میں نمی سے کائی پیدا ہو گئی تھی اور اینٹوں کا

رنگ سیاہی مائل سبز تھا۔

''خدا کا شکر ہے آسمان تو نظر آیا۔'' سلیٹر نے کہا۔

''مگر سوال اس آسمان کو چھونے کا ہے۔'' گیراڈ نے کہا۔ ''ان کیلوں کے سوا اس کنوئیں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

''میرے لئے تو یہ ناممکن ہے۔'' اینی نے کہا۔ ''میں آدھے راستے میں گر جاؤں گی۔''

سلیٹر خاموش کھڑا تھا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے بچپن ہی سے ایک بیماری ہے۔ بلندی پر مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔ میرے لئے بھی یہ ناممکن ہے۔ میں چوتھائی راستے سے گرنے کی کوشش کروں گا۔''

''رہا میں...... تو میں زخمی ہوں۔ مگر خیر...... خدا حافظ۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پہلی کیل پر قدم رکھا اور اس کی مضبوطی کو آزمایا۔ اس کی لمبائی صرف اتنی تھی کہ وہ اس پر ایک وقت میں صرف ایک پیر رکھ سکتا تھا۔ دوسری کیل بھی خاصی مضبوطی سے گڑی ہوئی تھی۔ ایک کیل سے دوسری کیل کا فاصلہ تقریباً چار فٹ تھا۔ وہ اپنا ہاتھ بلند کر کے آٹھ فٹ اوپر دوسری کیل کو پکڑ سکتا تھا اور اس کے سہارے اپنے بوجھ کو کھینچ کر درمیانی کیل پر پیر جما سکتا تھا۔ اس نے پہلی کیل پر قدم رکھا تو اسے تیسری کیل کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس کے پاؤں دوسری کیل پر لگے تو وہ تقریباً دوہرا ہو گیا۔ پھر اس نے چوتھی کیل کو پکڑا اور لٹک کر دوسری کیل پر ٹک گیا۔ زمین سے آٹھ فٹ اوپر اسے کل پچیس یا تیس کیلوں کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس کا سر ویسے ہی درد سے پھٹ رہا تھا اور جسم کا بند بند تکان سے ٹوٹ رہا تھا مگر زندہ رہنے کی خواہش اور جدوجہد کا عزم باقی تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بلند ہو گیا۔ چوتھائی راستہ طے کر کے اس نے نیچے دیکھا۔ سلیٹر مشعل اٹھائے کھڑا تھا۔ روشنی کے مختصر سے دائرے میں وہ دونوں اسے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں نے ہاتھ ہلایا اور اس نے طے کیا کہ اب وہ نیچے نہیں دیکھے گا۔ نیچے جہاں اینی کا دل پل بھر کے لئے دھڑکنا بھول جاتا تھا۔ جب وہ ایک ایک کیل پر اپنا بوجھ ٹکا کر دوسری کیل پر جماتا تھا اور سلیٹر، اینی کا زرد چہرہ دیکھتا تھا اور گیراڈ کو قدم بہ قدم اس سے دور ہوتے دیکھتا تھا تو اس کے دل میں ایک کانٹا سا چبھنے لگتا تھا۔

''کاش! میں اتنا بزدل نہ ہوتا۔ اس کے لئے کچھ کر سکتا۔''

وہ اپنی عمر گزار چکا تھا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ نہ بیوی تھی نہ بچے۔ لیکن وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کے لمحات کی قربانی بھی نہ دے سکا۔ اپنی خود غرضی پر اسے اپنی بزدلی سے زیادہ شرم آئی۔ اس نے مشعل اینی کو پکڑا دی اور مستعد ہو کر اوپر دیکھنے لگا کہ خدانخواستہ اس کا پیر پھسلے تو وہ اسے اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے کی کوشش کرے۔ اینی کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی نظروں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ کیا وہ اوپر تک پہنچ جائے گا؟ کیا ساری کیلیں ایک جیسی مضبوط ہیں؟ پرانی اینٹوں میں لگی ہوئی اور نجانے دیوار میں کتنی گہری گڑھی ہوئی ہیں۔ اگر ایک اینٹ نکل گئی تو کیل رہے گی یا وہ بھی ساتھ ہی نکل جائے گی۔ اس خیال سے ہی اسے چکر سا آیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اپنے سینے پر صلیب بنائی۔

"خداوند! مجھے صرف اتنا بتا دے کہ اس کا ہر قدم زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے یا موت کی طرف۔"

آدھا راستہ طے کر کے گیراڈ نے پھولے ہوئے سانس کو قابو میں کرنے کے لئے دم لیا۔ دو منٹ بعد اس نے اگلی کیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نم آلود مٹی کے ساتھ ایک کیل باہر آ گئی اس کا سانس رک گیا۔ اینٹ گولی کی طرح نیچے گئی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ نیچے دیکھے۔ پھر اینی کی ایک طویل چیخ سنائی دی۔ شاید وہ مر گئی۔ شاید اینٹ اس کے سر پر پڑی اور اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ اب وہ نیچے لیٹی ہو گی۔ خون کے ساتھ اس کا بھیجہ بکھرا ہوا ہو گا۔ ایک منٹ گزر گیا...... مجھے دیکھ لینا چاہئے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے نگاہ ڈالی۔ اینی مشعل اٹھائے اوپر دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس سیلسٹر کھڑا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو گئی۔ وہ اوپر چڑھنے لگا۔ اب اس کے ہاتھ میں زنگ خوردہ کیلوں سے چھالے پڑنے لگے تھے۔ آٹھ دس کیلیں باقی تھیں۔ آسمان زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اگلی کیل کو پکڑنے سے پہلے اس نے کھینچ کر اس کی مضبوطی آزمانی چاہی۔ کیل اس کے ہاتھوں میں آ گئی اور پل بھر میں نیچے چلی گئی۔ اینی کی ایک اور چیخ کی بازگشت اس کے کانوں میں پہنچی۔

اس نے نیچے دیکھا۔ مشعل بدستور روشن تھی اور وہ دونوں نقطوں کی طرح مشعل کے روشن دائرے میں نظر آ رہے تھے۔ اب اگلی کیل چار فٹ اوپر اور اس سے اگلی بارہ فٹ اوپر تھی جسے وہ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لیا اور چھپکلی کی

طرح اس کی سطح سے چمٹ گیا۔ یونہی ہاتھ پھیلائے اس نے ایک پیر اوپر اٹھایا اور کیل پر جما لیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے درمیانی کیل کو تھام لیا۔ مگر اس طرح اس کا سر نیچے ہو گیا اور کنواں اس کے سامنے گھومنے لگا۔ اور پھر سیدھا ہو گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے ایک پیر پر سارا زور ڈالا اور پوری قوت سے اچھل کر اوپر والی کیل کو تھام لیا۔ اگر یہ کیل اس کے ہاتھ میں نہ آتی تو وہ ساٹھ ستر فٹ کی بلندی سے نیچے جاتا۔ شاید تھکن کے باعث ہر کیل ایک مرحلہ بن گئی۔ رفتہ رفتہ جسم کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ آخری تین کیلوں پر چڑھتے ہوئے آزادی کو اتنے قریب دیکھ کر اس کی ہمت عود کر آئی۔ اس نے آخری کیل پر قدم رکھا تو اسے کھلی زمین پر پھیلا ہوا آسمان نظر آیا۔ وہ ایک جست میں باہر نکل گیا اور زمین پر بے سدھ لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

یہ ایک احاطہ تھا جس میں بہت سے بلڈوزر کھڑے تھے۔ چاروں طرف آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ لوہے کا بڑا دروازہ مقفل تھا لیکن لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ اندر سے کھولا جا سکتا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے دروازہ کھولا اور اس نے وان کیسرو کی سڑک پر قدم رکھا۔

جگہ اس کی جانی پہچانی تھی۔ اس نے اپنے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آ گیا۔ مگر اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجے تھے۔ تھوڑا سا اجالا باقی تھا۔ نہیں...... صبح نہیں ہو سکتی۔ شام کے پانچ بجے ہیں۔ صبح کے پانچ بجے تو بہت اندھیرا ہوتا ہے۔ مگر یہ ویرانی کیسی؟ سڑکوں پر ٹریفک کیوں نہیں ہے؟ پارکنگ میٹر خالی کھڑے تھے۔ کہیں ایک کار بھی نہیں تھی۔ اور لوگ؟ یہ تو خاصی بارونق جگہ تھی۔ دکانیں کیوں بند ہیں۔ شاید میرے حواس جواب دے گئے ہیں۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ نہیں...... یہ مارٹ بیکر کا علاقہ ہے۔ اس سے ذرا آگے بی بی سی کی عمارت ہے۔ مکانوں میں رہنے والے کدھر گئے؟ کہیں سے روشنی کی ایک کرن نظر نہیں آتی۔ وہ چلتا گیا، آسیب زدہ شہر میں جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ویران اور سنسان...... قبرستان کی طرح خاموش۔ اس کی زندگی یہاں نہیں گزری تھی مگر وہ سیلانی طبیعت کا آدمی تھا۔ شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ یہ سڑکیں اس نے ہمیشہ آباد دیکھی تھیں۔ پُر ہجوم۔ آوازوں سے پُر۔ اب سوائے اس کے قدموں کی چاپ کے کوئی آواز نہ تھی۔

"ہیلو......" وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔ "کوئی ہے......؟"

سرکس سے گزرتا ہوا وہ پال اسٹریٹ میں آ گیا۔ ہر جگہ وہی سناٹا محیط تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ کس سے پوچھے۔ اس شہر کے کوچے اور بازار میں سناٹا کیوں ہے؟ کیا حادثہ ہو گیا ہے آج؟ میں پاگل ہو گیا ہوں...... اس نے اپنے آپ سے کہا۔ بائیں جانب جیولرز کی عمارت منہدم پڑی تھی۔ پھر اس کی نگاہ دائیں جانب گئی۔ تاریک زینے میں ایک شخص مشین گن لئے کھڑا تھا۔ پہلا آدمی اور مشین گن۔

"ہیلو......" وہ بے تحاشا دوڑا۔ "میں ڈاکٹر گیراڈ ہوں۔" مگر وہ شخص بت کی طرح کھڑا رہا۔ گیراڈ اس کے قریب پہنچ کر گر پڑا۔ وہ اب ایک قدم نہیں چل سکتا تھا۔

اس کی آنکھ ہیری کے فلیٹ میں کھلی۔ وہ کمبل اوڑھے بستر پر لیٹا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں اس اجنبی جگہ اپنی موجودگی کو محسوس کیا اور اٹھ بیٹھا۔ وہی آدمی اسٹین گن کی بجائے شراب کا جام لئے کھڑا تھا۔

"تمہیں برانڈی کی ضرورت ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گیراڈ نے ایک گھونٹ میں جام خالی کر دیا۔

"میں کتنی دیر سوتا رہا؟" اس نے اجنبی سے پوچھا۔

"آدھے گھنٹے۔" اس نے گیراڈ کے جام کو پھر بھر دیا۔ "میں تمہیں اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں۔ میرا نام ہیری ہے۔"

"میں ڈاکٹر لیوک گیراڈ ہوں۔" اس نے دوسرا جام خالی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے...... میں نے تمہاری جیبوں کی تلاشی لی تھی۔" ہیری نے کہا۔

"مسٹر ہیری! میں تمہاری مدد کا بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے اب جانا ہے۔ میرے ساتھی ابھی تک زیر زمین قید میں ہیں۔" اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ہیری اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ دروازہ مقفل تھا۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" گیراڈ نے ہیری کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر گیراڈ! محض شکر گزاری سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو احسان کا بدلہ احسان سے چکانا چاہئے۔" ہیری نے اطمینان سے کہا۔

"کس قسم کا احسان؟"

"ڈاکٹر گیراڈ! آپ اپنے دوستوں کو باہر نکالنا چاہتے ہیں اور......" اس نے جیب سے چند شیشیاں نکالیں۔ "غالباً آپ کو کیمیائی تجزیے کے لئے کریمر لیبارٹری بھی لے جانا چاہتے ہیں۔"

گیراڈ کا ہاتھ بے ساختہ اپنی جیب پر گیا۔ "یہ تم نے کیوں نکالیں؟ تمہیں معلوم نہیں ان میں کیا ہے۔"

ہیری ہنسا۔ "مجھے خوب معلوم ہے ڈاکٹر! کیا تمہیں یہ شہر خالی نظر نہیں آتا؟"

یہ خوفناک حقیقت اچانک گیراڈ پر واضح ہوئی کہ جتنی دیر وہ زمین کے نیچے رہے، زمین کے اوپر اتنی دیر میں کیا قیامت گزر گئی۔ وہ دروازے کا ہینڈل تھامے کھڑا رہا۔

"کیا سارا وان کیسر واس کی لپیٹ میں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"سارا تو نہیں...... مگر یہ علاقہ ضرور ہے۔ فوج نے اردگرد کی ناکہ بندی کر دی ہے اور مکان خالی کرا لئے ہیں۔" ہیری نے کہا۔ "اب ہم دونوں کو اس علاقے سے نکلنا ہے۔ تمہیں اپنی ضرورت کے تحت اور مجھے اپنی ضرورت کے تحت۔"

"صاف صاف بات کرو...... میرے پاس بہت کم وقت ہے۔" گیراڈ نے کہا۔

"اچھا تو سنو۔ ہمیں اس علاقے سے ایک چیز باہر لے جانی ہے۔ لیکن جہاں سے اس متاثرہ علاقے کی ناکہ بندی کی گئی ہے وہاں ملٹری ہر شخص کے کپڑے اتروا لیتی ہے اور نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنا کر واپس کرتی ہے۔ نہانے دھونے میں تو کوئی حرج نہیں ہے مگر وہ لوگ کوئی چیز باہر نہیں لے جانے دیتے۔ ایک تنکا بھی نہیں۔ سمجھ رہے ہو نا۔ چنانچہ ہم تمہاری اس کیمیائی مادوں کی شیشیوں کے نیچے ایک چیز چھپائیں گے۔ وہ تمہاری بات سن کر تمہیں ان چیزوں کو لے جانے دیں گے۔"

"یہ کیا چیز ہے...... ہیروئن وغیرہ؟" گیراڈ نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ عام شہریوں پر، جو خالی ہاتھ جائیں، ملٹری معترض نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم نہا دھو کر تمہیں باہر ملیں گے اور دوستوں کی طرح اپنے اپنے راستوں پر چل پڑیں گے۔"

"دوستوں کی طرح...... اور میں ادھر جا کر تمہاری چیز دینے سے انکار کر دوں تو؟" گیراڈ نے کہا۔ "کیا ہماری دوستی برقرار رہے گی؟"

"ابھی تو تم بچ جاؤ گے۔ مگر تم ایک مشہور آدمی ہو۔ تمہیں قتل کرنے کے لئے کسی پولیس مین سے پتہ پوچھ لینا کافی ہوگا۔ لیکن تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ پولیس کے پاس میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور میں نے تمہیں اپنا نام بھی درست نہیں بتایا۔" ہیری نے کہا۔

"اگر میں نہانے دھونے کے دوران پولیس کو بتادوں پھر......؟"

"میں تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔ تمہیں ان کیمیائی مادوں کے بہانے ہیروئن اور ایل ایس ڈی نکالنے کی کوشش میں دھرلیا جائے گا اور ان کی موجودگی کا جواز پیش کرنا پڑے گا جو تمہارے لئے کافی ذلت اور رسوائی کا باعث ہوگا۔ اور مارے تو تم پھر بھی جاؤ گے۔" وہ ہنسا۔ ایک لمحے کے لئے گیراڈ نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے اور ہیری کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا جو اسے چیک کرے۔ مگر انکار کی صورت میں رسوائی لازمی تھی۔

"تم نے میری تھوڑی سی مدد کی ہے۔" گیراڈ نے کہا۔ "چنانچہ میں احسان کا بدلہ اتارنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے دو ساتھیوں کی زندگی بھی بچانی ہے۔ اس لئے میں پولیس کی پوچھ گچھ میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے منظور ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر! تم خاصے سمجھدار ہو۔" ہیری نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ میں زیادہ بزدل ہوں مسٹر ٹام ڈک یا ہیری! میں ابھی آدھے گھنٹے پہلے موت کے منہ سے نکل کر آیا ہوں۔ محض دھمکی میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ چلو۔"

وہ دونوں بالکل خاموشی سے ویران فٹ پاتھ پر چلتے رہے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک ٹین کا ڈبہ تھا۔ اس میں اوپر چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔ ان کے اردگرد اور نیچے روئی کی تہہ تھی شیشوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے بہرحال وہ ایک چیک پوسٹ پر پہنچے جہاں سڑک لوہے کے کھمبوں سے بند کردی گئی تھی اور دو مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ اسی سڑک پر ایک فرلانگ آگے پھر اسی قسم کے کھمبے تھے جن کے پار وان کیسرو کا شہر اپنی ساری رونقوں کے ساتھ آباد نظر آرہا تھا۔ کھمبوں کے درمیان سڑک کے ٹکڑے پر بھی مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے اور باہر جانے والے لوگوں کی قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ دونوں قطار میں شامل ہوگئے۔ ہیری کو اس سے پہلے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ پھر گیراڈ کی

باری آئی۔

"مجھے یہ ڈبہ ساتھ لے جانا ہے۔" اس نے ڈیوٹی آفیسر سے کہا۔ "میں ڈاکٹر گیراڈ ہوں۔"

"سوری ڈاکٹر! اس کی اجازت نہیں ہے۔" نوجوان میجر نے بے نیازی سے کہا۔

"اجازت کون دے گا؟" اس نے میز پر جھک کر ہاتھ مارا۔ "جنرل فین وک یا ہائیڈ؟"

میجر نے تعجب سے کہا۔ "چلانے کی ضرورت نہیں۔"

"میں ان سے بات کروں گا۔ ابھی۔ اسی وقت۔"

"ہمارے پاس فون نہیں ہے۔ لائن ڈیڈ ہے۔ سارجنٹ! انہیں لے جاؤ۔" میجر نے حکم جاری کرتے ہوئے کہا۔

"میجر! تمہارے پاس وائرلیس ہے جیپ میں۔ اگر تم نے فوراً ایک منٹ کی تاخیر کئے بغیر ایڈمرل وائٹنگ فین وک یا ہالینڈ سے رابطہ قائم نہ کیا اور اس ڈبے کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔ لیکن میں سیدھا ہوم سیکرٹری یا وزیراعظم کے پاس جاؤں گا اور صرف آدھے گھنٹے بعد تم میجر کی حیثیت سے نہیں، مجرم کی طرح کورٹ مارشل کے سامنے کھڑے ہوگے۔ میں ڈاکٹر گیراڈ ہوں۔ کریر گروپ کا۔ یوفول۔"

اس کی آواز بلند ہوتی گئی اور چہرہ سرخ ہوگیا اس نے اپنے کاغذات اس کے سامنے پھینک دیئے۔

"دیکھو میرا اسپیشل شناختی کارڈ۔ تمہارے پاس ہے یہ؟"

میجر کا رنگ اُڑ گیا۔ نیلے رنگ کا پلاسٹک کارڈ۔

"مائی گاڈ" کانپتے ہاتھوں سے اس نے سارے کاغذات سمیٹے۔ "آئی ایم سوری ڈاکٹر گیراڈ! ویری سوری۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ باکس میرے سارجنٹ کو دے دیں۔ نہانے دھونے کے بعد آپ کو مل جائے گا۔"

"نو...... باکس میرے ساتھ رہے گا۔ اس میں جو بیکٹیریا ہیں، انہیں مارنا نہیں ہے۔" اس نے کاغذات سمیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

"آل رائٹ...... آل رائٹ۔ جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ "ڈونٹ مائنڈ...... غلطی میری تھی۔" اس نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو جانتا نہیں تھا۔"

"نہانے دھونے کے بعد جو کپڑے اسے پہننے کے لئے دیئے گئے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل فٹ تھے بلکہ کسی حد تک قیمتی بھی۔ جوتے سے لے کر سوٹ اور ٹائی تک اس نے کوئی سوال کئے بغیر پہن لئے۔ آخری حد کے باہر ہیری بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"تھینک یو ڈاکٹر!" ہیری نے کہا۔

"ہیری! مجھے معلوم نہیں کہ تم نے یہ ہیرے کہاں سے حاصل کئے ہیں۔" گیراڈ نے کہا۔ "لیکن تم نے مجھے ایک چھوٹے سے احسان کے بدلے اسمگلر بنا دیا۔ اپنے ہیرے گن لو اور یہ سمجھ لو کہ میں تمہیں اسی وقت گرفتار کرواسکتا ہوں۔"

ہیری اسے تیز قدموں سے جاتے اور ٹیکسی روک کر بیٹھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کیسے عجیب لوگ ہوتے ہیں جو بیکٹیریا کو ہیروں سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔ کیا انہیں پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی؟"

"اور یہ تو اس نے ٹھیک کہا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ اسٹین گن کے پورے راؤنڈ سے زیادہ خطرناک ہوسکتا تھا۔" اس نے دوسری ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوچا۔

اگلے بہتر گھنٹے گیراڈ کے لئے ایک خوفناک خواب کی طرح تھے۔ وقفے وقفے سے اسے بہت سی باتیں یاد آتی رہیں۔ کریمر اور ہالینڈ کے متفکر چہرے۔ شاید پولیس کے لوگ تھے جن سے ہالینڈ نے کچھ کہا تھا۔ ایک بار اس نے دائیں اور بائیں بستر پر لائٹ اور بیوشان کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ خود بار بار بے ہوش ہوجاتا تھا۔ شاید ڈاکٹروں کی کوشش سے خواب میں اسے یوں لگتا تھا جیسے پرائس ننگا اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس پر وار کررہا ہے۔ وہ چیخ مار کر بھاگنے کی کوشش کرتا مگر ہسپتال کا عملہ پکڑ کر اسے لٹا لیتا۔ اسے ہارڈی کے دانتوں میں دبی ہوئی زبان اور اکڑے ہوئے ہاتھ پیر نظر آتے۔ آسیب زدہ اسٹیشن اور دھڑ ادھڑ جلتا ہوا کیبن۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ بلندی سے نیچے گر رہا ہو۔ جلتی ہوئی مشعلوں کے الاؤ میں۔

✡......✡

"سینٹ تھامس کی تجربہ گاہ نے بھی میرے اس نظریے کی توثیق کردی ہے۔" بیوشان نے فون رکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کریمر!" مس ڈیوس نے دروازے سے سر نکال کر کہا۔ "ان کا کچھ پتہ نہیں

چلتا۔ میں نے پولیس اور ملٹری کو بھی مطلع کردیا ہے۔ سارے ہسپتالوں میں کسی کے ریکارڈ میں ان کا نام تک نہیں۔ میری سمجھ میں......"

"میں نے سن لیا...... گیٹ آؤٹ۔" کریمر نے دھاڑ کر کہا۔ فون کی گھنٹی پھر بجی۔

"مسٹر کریمر! نیوگنی سے مسٹر...... مسٹر مارکر......" انٹرکام پر ڈیوس کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ کریمر نے فون اٹھالیا۔

"ہیلو مارکر...... ہاں...... ایمیو اسٹرین کا کوئی قصور نہیں۔ بالکل...... ہم نے تصدیق کرلی ہے۔ یہ ایک بیکٹیریا ہے۔ میں تمہاری رائے نہیں سننا چاہتا۔ اس لئے کہ میرے پاس شہادت ہے۔ سینٹ تھامس لیبارٹری والوں کی بھی کل میٹنگ ہے۔ ٹھیک ہے، یوں ہی سہی۔ میں پہنچ جاؤں گا۔" اس نے فون رکھ دیا۔

"مس ڈیوس! کل صبح ساڑھے دس بجے نیوگنی پہنچنے والی پرواز سے میرے لئے کسی بھی جہاز کی سیٹ بک کرادو۔ جہنم میں گئے وہ دونوں۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

ایئی...... ایئی...... اس کے ذہن میں کسی نے آہستہ سے کہا۔

"بین الاقوامی ادارۂ صحت کے سائنسدان اور مشیر، ایمیو اسٹرین کے بارے میں فیصلہ کرنے جمع ہورہے ہیں کہ اس کے استعمال پر پابندی لگائی جائے یا نہیں۔ کل صبح ساڑھے گیارہ بجے مجھے اپنی اور سینٹ تھامس والوں کی رپورٹ اور بیکٹیریا کے نمونے سیل کرکے دے دو۔" اس نے بیوشان سے کہا۔ "ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

وان کیسرو کا ہوائی اڈہ بین الاقوامی آمدورفت کے لئے بند کردیا گیا تھا۔ جہاز قطار اندر قطار ہینگرز میں کھڑے تھے۔ نیوگنی جانے والی خصوصی سفارتی پرواز کے لئے صرف ایک بوئنگ 747 رن وے پر موجود تھا۔ ربڑ کا لباس پہنے، کمر پر سلنڈر اٹھائے خلانورد نظر آنے والے انسان جہاز کے اندر اور باہر خصوصی حفاظتی انتظامات کے تحت دوائیں چھڑک رہے تھے۔

کسی مسافر کو اپنے ہمراہ پلاسٹک کی کوئی چیز ان ادویات میں دھوئے بغیر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چشمے، سوٹ کیس کھول کر لائن میں رکھ دیئے گئے تھے اور باری باری اس میں دھوئیں کی پھوار کی طرح ادویات کی پھوار پڑ رہی تھی۔ کریمر نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح تعمیل کی۔ فلائٹ نمبر 1244 روانہ ہوئی تو کریمر نے جیب سے قلم نکالا

اور لکھنا شروع کیا۔ صفحے پر صفحے بھرتے گئے۔ اس کے ہاتھوں میں پسینے کی نمی تھی۔

ایئر ہوسٹس نے پلاسٹک کی ٹرے اس کے سامنے کی اور اس نے دیکھے بغیر پلاسٹک کا کپ اٹھالیا۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کا پین کوٹ کی جیب میں تھا اور ادویات کی پھوار صرف اس کے کلپ پر پڑی تھی۔ نچلے حصے میں پلاسٹک کھانے والے بیکٹیریا اس کے ساتھ نیوگنی جارہے تھے۔

پسینے سے تر ہاتھ سے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے تھوڑی سی نمی ٹرے میں لگ گئی۔ بیکٹیریا ٹرے میں منتقل ہوگئے۔ وہ لکھنے میں مصروف تھا کہ ایک خاتون کا اسکرٹ چھو جانے سے کافی کا وہ کپ گر گیا جس میں کافی مقدار میں بیکٹیریا پہنچ چکے تھے۔

''سوری......'' خاتون نے کہا۔

اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ لکھنے میں مصروف تھا جب ایئر ہوسٹس نے نیچے گرا کپ اٹھایا اور کافی کا دوسرا کپ رکھ گئی۔ پہلے کپ سے کریمر نے کافی نہیں پی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے ذراسی لاپرواہی کرتے ہوئے اسی کپ میں مزید کافی بھری۔ کریو کیبن کا دروازہ کھولا اور پائلٹ کیپٹن ہاورڈ کو دے دی۔

''تھینکس جولی۔ اس میں تم نے اپنی مسکراہٹ ملائی ہے؟''

وہ ہنسی۔

''میں حسد سے مرا جارہا ہوں۔'' کو پائلٹ نے کہا۔ ''ایک کپ میرے لئے بھی۔ ورنہ......''

''اوکے......اوکے......'' وہ ہنسی ڈبل مسکراہٹ کے ساتھ۔ اس نے دروازہ بند کرنے سے پہلے سنا......''اگلے ہفتے بینسی سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔''

جولی نے دیکھا، کریمر کا کپ خالی ہو چکا تھا۔ اس نے کپ اٹھایا، دھویا اور کافی سے بھر کر ٹرے میں رکھ دیا۔ مگر جب اس نے کو پائلٹ کو دینے کے لئے اٹھانا چاہا تو اس نے محسوس کیا کہ کپ ٹرے سے چپک گیا ہے۔ اس نے احتیاط سے الگ کیا مگر ٹرے سے مکڑی کے جالے کی طرح لیس بھی ساتھ ہی آگئی۔

''اتنا ناقص پلاسٹک سپلائی ہوا ہے۔ ذراسی حرارت سے پگھل گیا۔'' اس نے کہا۔

''ڈبل مسکراہٹ میں خاصی حرارت ہوتی ہے۔'' کیپٹن ہاورڈ نے کہا۔ ''پلاسٹک کیا

کرے۔''

کو پائلٹ نے کنٹرول کو آٹو پائلٹ پر سیٹ کر کے کپ لینا چاہا تو اس کا ہاتھ پلاسٹک کے بٹن پر یوں چپک گیا جیسے اس پر گوند لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو سونگھا۔

''کنجوسی تو میں کرتا ہوں۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ گندے انڈے کھاؤں۔ پھر یہ بدبو کہاں سے آگئی میرے ہاتھوں میں؟''

جب وقت ایئر ہوسٹس کریو کیبن سے دونوں کپ لے کر آئی تو اس کی دونوں آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ کپ پگھل رہا تھا۔ اس کے ایک کنارے سے پلاسٹک کا قطرہ فرش پر ٹپکا۔ دوسرا ربڑ کی طرح نرم ہوگیا تھا۔ چیف اسٹیورڈ کو یہ بات سمجھانا اس کے لئے خاصا مشکل ثابت ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد جس خاتون نے کریمر کا کپ گرایا تھا، ٹائلٹ روم سے واپس آکر اپنی سیٹ کے نیچے سے جہاز کے فرش پر رکھا ہوا بیگ اٹھانے کی کوشش کی۔ پلاسٹک کا ہینڈل کھینچ کر یوں ہاتھ میں آگیا جیسے وہ کپڑے کا بنا ہوا ہے۔

''یہ کیا بکواس ہے......؟'' اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''ہیٹر کس نے آن کیا ہے؟''

''ہیٹر تو کوئی نہیں خاتون!'' ایئر ہوسٹس نے شائستگی سے کہا۔ ''غالباً بیگ پرانا ہے۔''

''اوہ......'' خاتون نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''کس نے تمہیں ایئر ہوسٹس بنا دیا...... یہ پرانا بیگ ہے؟ ابھی میں نے ایئرپورٹ سے خریدا ہے اور جہاز میں آبیٹھی ہوں۔'' عقل نہیں تو آنکھیں تو ہیں۔''

کریمر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اچانک جہاز آگے کی طرف جھکا۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ بھی آگے جھک گیا۔ کیپٹن ہاورڈ نے نگاہیں ڈائل پر رکھتے ہوئے اسے سنبھالنے کی کوشش کی......

''کیا گڑبڑ ہے......؟'' اس نے انجن کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ ایک چھوٹا سا دھماکہ ہوا اور کیبن میں دھواں بھر گیا۔ کو پائلٹ نے ہاتھوں سے دھواں ہٹاتے ہوئے مائیکروفون اٹھا لیا۔

''حضرات اور خواتین! معاف کیجئے گا۔ زحمت نہ ہو تو سیفٹی بیلٹ باندھ لیجئے۔ جہاز تھوڑا سا نشے میں ہے۔ شکریہ۔''

مسافر مسکرائے اور بیلٹ باندھ لی۔ کریمر نے اپنے سامنے پھیلی ہوئی میز پر قلم رکھا تو

اس کے دونوں حصے الگ ہو گئے۔ پیتل کی کیپ سے ڈھکن والا حصہ اور اس سے اوپر نب تک کا حصہ۔ اس نے کیپ کو اٹھا کر دیکھا، اس میں سے پگھلے ہوئے پلاسٹک کا قطرہ باہر گرا۔ دوسرا حصہ ربڑ کی ٹیوب اور آدھی باڈی کے ساتھ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ میز کے کونے پر گئی۔ پلاسٹک کے کنارے پر بلبلے بن رہے تھے۔ اس کا رنگ اُڑ گیا......

کیپ کو اس نے فوراً جیب میں ڈال لیا اور بٹن دبایا۔ کسی نے نہیں دیکھا۔

''میں کیپٹن سے بات کرنا چاہتا ہوں...... اسی وقت۔'' اس نے ایئر ہوسٹس کے کانوں میں آہستہ سے کہا۔ ''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ ذرا دور سے بات کرو۔''

''آپ مجھے نہیں بتا سکتے سر!'' وہ خوش اخلاقی سے مسکرائی۔

''نو...... پلیز...... جہاز خطرے میں ہے۔ تم نہیں سمجھو گی۔ مگر میں یہاں سے اٹھ کر نہیں جاؤں گا۔''

کیپٹن ہاورڈ نے یہ درخواست حیرت سے سنی۔ ''پاگل تو نہیں ہے؟''

''مگر خبطی ضرور ہے۔ ایسے بیٹھا ہے جیسے کسی متعدی مرض میں مبتلا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔''

''گڈ مارننگ سر!'' کیپٹن ہاورڈ نے اس کے پاس آکر کہا۔

''کیپٹن دیکھو! نہ میں پاگل ہوں، نہ جہاز کو اغوا کرنے والا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔'' اس نے اپنے کاغذات سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میری بات غور سے سنو۔ ہم سب کی جان خطرے میں ہے۔''

کیپٹن ہاورڈ مسکرایا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں۔ جہاز تین انجنوں سے ساری دنیا کا چکر لگا سکتا ہے۔''

''انجن کی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ جہاز ایک انجن سے بھی اتر سکتا ہے۔ میں سائنسدان ہوں، سکول کا بچہ نہیں۔''

کے۔ ایل۔ ایم کی یہ سفارتی پرواز برازیل سے آئی تھی۔ کیپٹن ہاورڈ پلاسٹک کھانے والے بیکٹیریا کے نظریہ سے قطعی ناواقف تھا۔ کریمر نے مختلف الفاظ میں اسے ساری بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن ایئر ہوسٹس نے اسی وقت جبکہ وہ اس نظریہ پر مزید سر کھپانے کو تضیع اوقات سمجھ کر جانے والا تھا، اس کے کان میں ایک بات کہی۔ وہ رک گیا۔

''پہلے کپ اور پھر بیگ کا ہینڈل؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ پھر اسے وہ کپ یاد آیا جو ڈبل مسکراہٹ کی حرارت سے پگھل کر ٹرے سے چپک گیا تھا۔ پھر کاک پٹ کی خرابیاں۔ اس نے کچن میں جا کر کپ کو دیکھا جواب جھاگ بن چکا تھا۔ بظاہر سکون کے ساتھ وہ مسافروں کے درمیان سے گزر کر کاک پٹ میں پہنچا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس نے کو پائلٹ سے پوچھا۔

''بنی...... وولٹیج کی خرابی ٹھیک ہوئی؟'' وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا۔

''نہیں...... نیوگنی میں اسے بدلنا پڑے گا۔''

''نہیں...... انجینئر کو بلاؤ۔ اس سے کہو کہ ریگولیٹر کو ابھی نکال کر دیکھے۔ اسی وقت۔''

آدھے گھنٹے بعد انجینئر نے ریگولیٹر پینل کھولا اور اندر سے رنگین تاروں کی بجائے رنگین بلبلوں کا ایک ڈھیر باہر نکالا۔ سڑے گوشت جیسی بدبو کیبن میں پھیل گئی۔ ہاورڈ نے مائیکروفون پر آواز میں انتہائی ملائمت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم کریمر کے ممنون ہوں گے اگر وہ چند منٹ کے لئے زحمت فرما کر آگے آ جائیں۔''

لیکن اتنی دیر میں ریگولیٹر سے ٹپکا ہوا قطرہ فرش کے وینائل کو گلانے لگا تھا۔ سمندر کی لہروں کی طرح جھاگ آگے پھیلتی جا رہی تھی اور کریو کیبن کے دروازے سے گزر کر اب مسافروں والے حصے میں داخل ہونے والی تھی۔ غسل خانے میں پائپ، کچن میں برتن، مسافروں کے سروں کے اوپر لائٹس کے شیڈ، ''سگریٹ پینا منع ہے'' اور ''سیٹ بیلٹ باندھ لیجئے'' کے نوٹس سب نرم پڑتے جا رہے تھے اور سوئے ہوئے مسافران سب سے بے خبر تھے۔

''ڈاکٹر کریمر! میرا خیال ہے تمام خرابیوں کے باوجود ہم ریگونی ایئر پورٹ پر حفاظت سے اتر سکتے ہیں۔'' ہاورڈ نے کہا۔

''نہیں...... ہم نیوگنی نہیں جا سکتے۔ یہ وبا لے کر کسی الگ تھلگ مقام پر، کسی ویران ہوائی اڈے پر لے چلو۔ ورنہ پلاسکو اس کی لپیٹ میں آ جائے گا۔''

''میں آپ کی بات ماننے پر مجبور ہوں۔ حالانکہ مجھے یقین نہیں آتا۔'' ہاورڈ نے کہا۔

مسافروں کے ایک حصے میں ایک عورت نے چیخ ماری۔ اس کا پلاسٹک فوم، ربڑ کا کوٹ گھلتا جا رہا تھا۔

’’خواتین وحضرات! کیپٹن ہاورڈ آپ سے مخاطب ہے۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر ہم نیوگنی ریگونی ایئر پورٹ کی بجائے عارضی طور پر راستے میں قیام کریں گے۔ آپ لوگ بیلٹ باندھے رہیے۔ شکریہ۔‘‘

فرسٹ کلاس میں ایک بوڑھا مسافر تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ’’میں تم سب کو تباہ کر دوں گا۔ ایک منٹ کی تاخیر سے مجھے ایک ملین ڈالر کا نقصان ہوگا یو باسٹرڈز!‘‘

’’پاگل کے بچے!‘‘ کریمر نے اسے کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔ ’’اگر تمہارے حلق سے ایک لفظ اور نکلا تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ جہاز خطرے میں ہے۔ خاموشی سے جا کر سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔‘‘

وہ سہم گیا۔ کریمر کے درشت رویے کے بعد بوڑھا پُرسکون ہو گیا اور چپ چاپ اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا اپنی عینک کے اچانک پگھل جانے کا شکوہ کر رہا تھا۔ ان دونوں کا بلڈ پریشر ہائی تھا۔

’’اگر ہم جہاز کو چالیس میل دور جنوب میں ٹاور کے اڈے پر اتار لیں تو کیا حرج ہے۔ ایک ہی رن وے ہے وہاں جنگ عظیم دوم کے زمانے کا۔‘‘ ہارڈ نے کہا۔ بنی نے سر ہلایا اور بٹن دبا کر جہاز کا رخ موڑا۔ اس وقت بیکٹیریا جہاز کے اندر خاصی گیس خارج کر چکے تھے۔ بٹن دبانے سے ایک ننھا سا شعلہ پیدا ہوا کیونکہ اندر دو تار آپس میں مل گئے تھے۔

شمالی فرنٹ کے ساحل پر ایک ماہی گیر نے زبردست دھماکہ سنا مگر اس نے اوپر دیکھا تو سینکڑوں شعلے الگ الگ نظر آئے۔ پل بھر میں وہ سمندر کے ساحل پر پھیل کر غائب ہو گئے۔

اینی کریمر کی آنکھ ہسپتال میں کھلی تو بیوشان اس کے پاس تھا۔ اسے یاد آیا کہ گیراڈ کے جانے کے بعد وہ دو گھنٹے تک اس کا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر وہیں بیٹھ کر سو گئے تھے۔ انہیں آرمی کے دو جوانوں نے جگایا تھا اور لکڑی کے بکس میں بٹھا دیا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ایک موٹا رسا لٹکا ہوا تھا جس نے آہستہ آہستہ انہیں اوپر کھینچ لیا تھا۔ انہیں الگ الگ ایمبولینس میں روانہ کر دیا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر کو بھی ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا اور اس کی لاش بعد میں ملی تھی۔ یہ اطلاع بیوشان نے دی تھی۔

بیوشان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کریمر کی اطلاع اینی کو دے یا نہ دے۔ اور اگر

دے تو کس طرح۔ خود اینی کی زبان پر یہ سوال کئی بار آ کے رک گیا کہ کریمر اسے دیکھنے اب تک کیوں نہیں آیا۔ کیا وہ ابھی تک اسٹونو میں ہے؟ اگر کریمر نے وہ خط پڑھ لیا ہے تو یہ توقع رکھنا بھی حماقت تھی۔ بالآخر اس نے اس سوال کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خواہ جواب کچھ بھی ہو۔

جیمس نے کریمر کو نہیں دیکھا وہ کہاں ہے۔

بیوشان خاموش بیٹھا انگلیاں چٹخاتا رہا۔ اینی کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس نے طلاق کی درخواست دے دی ہوگی اور سارے زمانے کو بتا دیا ہوگا کہ وہ گیراڈ کے ساتھ بھاگ گئی۔

’’جیمس! کوئی بات نہیں۔‘‘ اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ ’’ہمارا نباہ مشکل تھا۔‘‘

’’کیا؟‘‘ بیوشان نے تعجب سے کہا۔ ’’تمہیں افسوس نہیں ہے، تمہیں معلوم ہے۔‘‘

’’ہاں مجھے معلوم ہے اور مجھے قطعی افسوس نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مجھ پر بے وفائی کا الزام لگانے کی کوشش کی ہوگی مگر بے وفائی میں نے نہیں، بے وفائی اس نے کی۔ اس نے گیراڈ کا گھر تباہ کیا۔ اس کی بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کیے۔ گیراڈ غریب کو معلوم بھی نہیں مگر مجھے سب معلوم ہے۔ تین سال سے وہ برابر مل رہے ہیں۔ ان کی خط و کتابت جاری ہے۔ گیراڈ اسے طلاق دے چکا ہے اور اب کریمر مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ میرے پاس ثبوت ہے۔‘‘ شدتِ جذبات سے اس کی آواز رک گئی۔

بیوشان حیرت سے منہ کھولے سنتا گیا۔ وہ اس انکشاف کے لئے تیار نہ تھا۔

’’اینی! وہ مر چکا ہے۔‘‘ اب جبکہ اینی نے خود ہی بیوشان کی مشکل آسان کر دی تھی، یہ کہنا مشکل نہ تھا۔ مگر یہ الفاظ بم کی طرح اینی پر گرے۔

’’کیا......؟‘‘ اس نے چیخ کر کہا۔ ’’کیسے......؟ کیا اس نے خودکشی کی ہے جیمس! کیا اس نے......‘‘ اس نے بیوشان کے کوٹ کا کالر تھام کر کہا۔

’’وہ ہوائی حادثے میں مارا گیا...... اینی...... ہوش میں آؤ۔‘‘ بیوشان نے اپنے کوٹ کا کالر چھڑاتے ہوئے کہا۔

’’ہوائی حادثے میں؟‘‘ اینی نے بے جان ہو کر بستر پر گرتے ہوئے کہا۔ ’’کہاں...... وہ کہاں جا رہا تھا؟‘‘

"نیوگنی...... عالمی ادارۂ صحت کی کانفرنس میں۔ جہاں یہ ثابت کرنا تھا کہ ایمنیو اسٹرین کا اس بحران سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا استعمال بے ضرر ہے۔" بیوشان نے کہا۔

"ایمنیو اسٹرین؟" وہ تلخی سے ہنسی۔ "اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی لاپتہ ہے، ایمنیو اسٹرین سے محبت کرتا تھا۔ پیسے سے محبت کرتا تھا اور...... اور شیرون گیراڈ سے محبت کرتا تھا۔" وہ تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے افسوس ہے اینی! کاش یہ اطلاع دینے میں نہ آتا۔"

"جیمس! میں احمق ہوں نا...... میں سمجھی تھی اس نے خودکشی کر لی۔ اسے کیا ضرورت تھی خودکشی کرنے کی۔ وہ اسٹونو میں شیرون کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا اور مجھے فون پر بتا رہا تھا کہ وہ کانفرنس میں پھنسا ہوا ہے۔ تم نے دیکھ لیا نا، بیوی کی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ اس نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی...... کبھی نہیں...... کبھی نہیں۔" وہ تکیے پر مکے مار کر بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ "میں سمجھی تھی اس نے خط دیکھ لیا ہے۔"

پھر اچانک وہ اٹھ بیٹھی۔ "جیمس! میں گھر جاؤں؟" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ابھی تم ٹھیک نہیں ہو۔ تمہارا گھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔" بیوشان نے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں...... اگر تم نہیں لے جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ اٹھتے ہی بولی۔

"او کے...... ڈاکٹر سے تو پوچھ لو۔" بیوشان نے بے بسی سے کہا۔ "اگر یہ محسوس کرتی ہو کہ ٹھیک ہیں تو کوئی حرج نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ گھر پہنچ گئی۔ اس کا خیال درست تھا۔ خط اسی طرح رکھا تھا۔ کریمر نے اسے کھولا بھی نہیں تھا۔ اس نے خط کو پرزے پرزے کر دیا اور کریمر کی تصویر کو اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ تم نے مجھے مرتے مرتے بھی دھوکا دیا......!

✿......✿

عالمی ادارۂ صحت کے ماہرین کی کانفرنس جو کریمر کی موت کے بعد ملتوی کر دی گئی تھی پلاسٹک کھانے والے بیکٹیریا کو دنیا میں پھیلنے سے روکنے کے لئے وان کیسرو میں شروع ہوئی تو ڈاکٹر کنیڈل اس کی صدارت کر رہے تھے۔ کریمر گروپ کی نمائندگی اب گیراڈ اور

رائٹ کر رہے تھے۔ کانفرنس ہال کے اردگرد ایک میل کے علاقے میں کسی شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اخباری نمائندے، پریس اور ٹی وی کے فوٹوگرافر فوجی پہرے سے گزر کر مندوب سے کوئی بات معلوم کرنے یا کانفرنس کی کارروائی سے متعلق کوئی اطلاع حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔

"تجربات اور تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ڈیگرون کا اس تباہی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک بیکٹیریا ہے جو ہر قسم کے پلاسٹک کو کھا رہا ہے۔" رائٹ نے جوشیلے انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اپنے طور پر اور دوسری تجربہ گاہوں میں دوسرے سائنسدانوں نے اس بیکٹیریا کے متعلق حقائق دریافت کئے ہیں۔ اس کے الیکٹرانک مائیکرواسکوپ سے لیٹے ہوئے فوٹو لائف سائیکل سے متعلق اعداد و شمار آپ لوگ دیکھ چکے ہیں۔"

"مسٹر رائٹ! پلاسٹک مختلف صورتوں میں بہت عرصے سے استعمال ہو رہا ہے لیکن اس بیکٹیریا کی تباہ کاری ڈیگرون کی ایجاد کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ ڈیگرون نے اس بیکٹیریا کو جنم دیا؟" ڈاکٹر کنیڈل نے سوال کیا۔

"آپ اسے اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ ہر ایجاد کو بعد میں پیش آنے والے کسی حادثے سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے قیاس کی نہیں، ثبوت کی ضرورت ہے۔"

"مسٹر رائٹ!" گیراڈ نے کہا۔ "یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ڈیگرون کی موجودگی میں ان بیکٹیریا کی افزائش کی رفتار عام پلاسٹک کے مقابلے میں دُگنی ہوتی ہے۔"

"اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" رائٹ نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہوتا ہے مسٹر رائٹ...... ڈیگرون کی پیداوار بند کر دینے سے بیکٹیریا کی افزائش کی رفتار آدھی رہ جائے گی۔" ڈاکٹر ہیروٹ نے کہا۔

"اس سے آدھا مسئلہ حل ہوتا ہے۔" ایک مندوب نے کہا۔

"باقی آدھا مسئلہ رہتا ہے۔" رائٹ نے تائید کی۔ "بیکٹیریا ختم نہیں ہوتے۔"

"اس کے لئے دنیا میں جو دوائیں ہیں وہ سب ان بیکٹیریا کو تباہ کرنے میں غیر موثر ثابت ہوئی ہیں۔ سوائے نیو مائی سین ڈی کے۔" وان کیسرو کے سائنسدان البرٹ وکٹر نے کہا۔

"یہ الگ بات ہے کہ نیو مائی سین ڈی کا موجودہ ذخیرہ وان کیسرو کے لئے بھی کافی نہیں۔" ڈاکٹر فیراڈی نے کہا۔ اس پر ہلکا سا قہقہہ پڑا۔

"جو دوائیں موثر ثابت ہو سکتی ہیں، انہیں وسیع پیمانے پر استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان سے انسانی زندگی، نباتات اور حیوانات کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔" سائنسدان فسیکونی نے کہا۔

"چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیکٹیریا کو پھیلنے سے روکنے کی طرف پہلا قدم ڈیگرون بوتل پر پابندی عائد کرنا ہوگی۔" ڈاکٹر کنیڈل نے کہا۔

"یہ بے فائدہ ہے...... بالکل بے مقصد۔" رائٹ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"بیکٹیریا دوسرے پلاسٹک کو کھاتے رہیں گے۔"

"مسئلے کے دو پہلو ہیں مسٹر رائٹ! بیکٹیریا کو پھیلنے سے روکنا اور ان کو تباہ کرنا۔" ڈاکٹر کنیڈل نے کہا۔ ڈیگرون ٹانک کی فراہمی روک کر ہم ایک مسئلے پر اس کے ایک پہلو پر......"

"تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... بالکل کچھ نہیں۔" رائٹ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تم سب لوگ تنگ نظر، متعصب اور حاسد ہو۔ میں نوبل پرائز پر بھی لعنت بھیجتا ہوں اور تم پر بھی۔" وہ پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ ایک منٹ کے لئے اجلاس پر مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ ایک میل دور ٹیلی اسکوپ لینس کی مدد سے کیمروں نے اس کے باہر نکلنے کی فوٹو اتار لی۔

ڈارک روم میں فوٹوگرافرز نے اس کے چہرے کو انلارج کیا اور اس کے ماتھے کی لکیروں سے ایک سرخی بنالی۔

"ڈیگرون کے موجد کا واک آؤٹ۔ ڈیگرون کی تیاری پر پابندی کے خلاف احتجاج۔ عالمی ادارۂ صحت نے ڈیگرون کو انسانی استعمال کے ناقابل قرار دے دیا۔"

لائٹ کے جانے کے بعد کانفرنس ہال میں گیراڈ نے مائیکروفون سنبھالا۔

"جیسا کہ میں نے عرض کیا، ڈیگرون کی موجودگی میں بیکٹیریا کی افزائش دوگنی ہو جاتی ہے لیکن اسی چیز کو ہم بیکٹیریا کے خاتمے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

سارے سر اس کی طرف گھوم گئے۔ گیراڈ ایک لمحے کے لئے رکا، پھر بولا۔

"یہ بیکٹیریا ڈیگرون کو زیادہ شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔ ہم انہیں اس خوراک میں زہر بھی دے سکتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ ہلاک ہو جائیں یا ان میں مزید افزائش کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ ڈیگرون کی بوتل میں کوئی ایسا کیمیائی مادہ شامل کیا جا سکتا ہے جو انہیں تو نقصان پہنچائے لیکن انسانی استعمال کی اشیاء میں شامل نہ ہو۔ یہ زہر بیکٹیریا کو دگنی رفتار سے تباہ کرے گا۔ یعنی کسی اور پلاسٹک سے ایک بیکٹیریا پیدا ہوگا تو اتنی ہی دیر میں دو ختم ہو جائیں گے۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کانفرنس کے مندوبین کے آپس میں اظہارِ خیال کا ملا جلا شور بلند ہوا۔ ڈاکٹر کنیڈل نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر گیراڈ! آپ کی تجویز ناقابل عمل ہے۔ بشرطیکہ......" ڈاکٹر کنیڈل نے کہا۔

"بشرطیکہ ڈیگرون میں کوئی ایسا کیمیائی عنصر شامل کیا جا سکے۔ اس کے فارمولے میں کیا یہ ممکن ہے؟"

"میرا خیال ہے رائٹ اس کا جواب دے سکتا ہے۔" گیراڈ نے کہا۔

"میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

کانفرنس آدھے گھنٹے کے لئے ملتوی ہوگئی۔ مندوبین کے لئے کافی اور چائے لائی گئی۔ گیراڈ نے رائٹ کو پچھلی طرف گھاس کے تختوں پر طیش کے عالم میں ٹہلتے دیکھا۔ اس نے گیراڈ کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"رائٹ......" اس نے آواز دی۔

"دفع ہو جاؤ...... اس سے پہلے کہ میں تمہیں قتل کر دوں۔ میں سمجھتا تھا تم دوست ہو۔" اس کا چہرہ سرخ تھا۔

"میں تمہارا دوست ہوں اب بھی۔" گیراڈ نے کہا۔ "میں تمہیں ایک چیلنج دینے آیا ہوں۔ کانفرنس کی طرف سے میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ تم اسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔"

آدھے گھنٹے بعد کارروائی شروع ہوئی تو رائٹ نے کہا۔ "حضرات! جو میں نے پہلے کیا تھا، اب بھی کر سکتا ہوں۔ میں اور گیراڈ ہم خیال ہیں۔"

"کتنی دیر میں...... کتنے دن میں؟" بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

"ایک دن۔ چوبیس گھنٹے۔ صرف ایک دن۔" رائٹ نے کہا۔

گیراڈ نے اپنا سر تھام لیا۔ "ایک دن......؟"

۞......۞

رات کے تین بجے تھے۔ گیراڈ اور بیوشان، سکیلن اور رائٹ سب کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کئی سیاہ بورڈ چاک سے لکھی ہوئی کیمسٹری کی علامات سے بھرے پڑے تھے۔ انہیں بالکل احساس نہیں تھا کہ انہوں نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہے اور صرف اس کافی کے سہارے کھڑے ہیں جو مس ڈیوس انہیں لا کر دیتی رہی تھی۔ سولہ گھنٹے بیت چکے تھے۔ آہستہ آہستہ کامیابی کی منزل کے قریب تھے۔ ان سب کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ سب کے ماتھے پر ایک جیسی لکیریں تھیں۔ کسی کو نوبل پرائز کا خیال نہیں تھا۔ کسی کے ذہن میں نفع نقصان نہیں تھا۔ سب کے سامنے ایک چیلنج تھا اور اس چیلنج کے سامنے وہ سب ایک تھے۔ کوئی یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ چوبیس گھنٹے کا وقت مانگ کر رائٹ نے حماقت کی تھی۔

تین بج کر دس منٹ پر رائٹ نے نئی بوتل کو بیکٹیریا کے سامنے رکھا۔ بلبلے پیدا ہوئے اور بڑھنے لگے۔ وہ سانس روکے دیکھتے رہے۔ مگر بلبلے پھیلتے گئے۔ آہستہ آہستہ ان کے چہروں پر مایوسی کے سائے پھیلنے لگے۔ گیراڈ نے بلبلوں کو ایک فلٹر پیپر میں جذب کیا اور شیشے کی سلائیڈ پر چپکا دیا۔ الیکٹرانک مائیکرواسکوپ نے دیوار پر لگے ہوئے اسکرین پر بیکٹیریا اور زہر آلود ڈیگرون کی جنگ کو پیش کیا تھا۔ بیکٹیریا تیزی سے پھیل رہے تھے۔ ڈیگرون میں شامل زہر کو شکست ہو رہی تھی۔

پھر عین اسی وقت جب وہ ناکامی کو قبول کرنے پر تیار ہو چکے تھے، بیکٹیریا پسپا ہونے لگے۔ زہر کی فتح شروع ہوئی۔ ذرا سی دیر میں بیکٹیریا فنا ہونے لگے۔ ان سب کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے۔ بیوشان نے رائٹ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور ناچنے لگا۔ سکیلن اور گیراڈ کے قہقہوں کے شور نے مس ڈیوس کی غنودگی دور کر دی۔ اس نے اندر آ کر دیکھا۔

"اوہ مائی گاڈ......اس نئی ایجاد نے تو بیکٹیریا کا کچھ نہیں بگاڑا۔ کریمر گروپ کو پاگل کر دیا۔ کریمر گروپ؟ کیسا کریمر گروپ؟ وہ پیسہ بنانے والا ادارہ......؟ نہیں وہ تو کریمر کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ یہ تو کوئی اور لوگ ہیں جنہیں اگر بیکٹیریا اور ہیروں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو وہ ہیروں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ دیوانے لوگ۔

صبح تین بج کر چالیس منٹ پر کینولاس لمیٹڈ میں ٹیلی فون کی گھنٹی پر کان لگائے بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طویل میز کے گرد بورڈ آف ڈائریکٹر کے رکن، چیئرمین، پروڈکشن اور سیلز کے چیف، شفٹ انجینئر بیٹھے تھے۔

گھنٹی بجتے ہی چیئرمین نے فون اٹھایا۔

"لیس ایڈورڈ نیولاس......"

باقی لوگوں نے اس کے منہ سے کچھ اور نہیں سنا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ نے سب کو بتا دیا۔ تین منٹ بعد وہ کھڑا ہوا۔

"وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے ہیں اور پاگل بھی۔ وہ نئی بوتل کے لئے نیا معاہدہ نہیں کر رہے ہیں اور یہ فارمولا ہمیں بلا معاوضہ دے رہے ہیں۔"

۞......۞

ساڑھے چار بجے اس کا جہاز وان کیسرو کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ ایڈورڈ نیولاس نے دوربین سے دیکھا، صبح کے اجالے میں دریائے جیم کے دہانے پر ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ کھڑی تھی۔ ہیری نے آخری بار فیول پمپ کو دیکھا، وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا ارادہ رات کی تاریکی میں نکل جانے کا تھا۔ لیکن عین وقت پر فیول ٹینک سے پمپ تک آنے والی پلاسٹک کی نلکی خراب ہو گئی۔ اس نے اسے نکال پھینکا اور اس کی جگہ دوسری نلکی لگا دی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے دیکھا کہ پرانی نلکی نے موٹر بوٹ کے سامنے والے پلاسٹک کو داغدار کر دیا ہے۔

پگھلا ہوا پلاسٹک قطرہ قطرہ بہہ کر ڈائل پر آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور سپارک پلگ میں لگا دی۔ تمام ہیرے پلاسٹک کی تھرماس میں فلاسک میں بھری ہوئی کافی کی تہہ میں پڑے تھے اور تھرماس فلاسک کے نیچے کیبن میں رکھی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بیکٹیریا اسے بھی چاٹ چکے ہیں۔ انجن کے تاروں کو کھا چکے ہیں۔ فرش کے وینائل کو ختم کر چکے ہیں اور اتنی گیس خارج کر چکے ہیں کہ وہ بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہے۔ انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے سگریٹ منہ میں لگائی اور ایک ہاتھ سے لائیٹر جلاتے ہوئے دوسرے سے انجن کی چابی گھما دی۔

اوپر سے ایڈورڈ نیولاس نے یوں دیکھا جیسے کسی نے پھلجھڑی سی چھوڑی ہے۔ چنگاریاں سی بلند ہوئیں اور غائب ہو گئیں۔ تیس لاکھ پونڈ کے ہیرے دریائے جیم میں مل گئے۔ اس کی تہہ میں جا بیٹھے۔ موٹر بوٹ اور ہیری کی ہڈیوں کے ٹکڑوں کے ساتھ۔

۞......۞

نیولاس نے ڈیگرون کے زہر کے ہزاروں ٹن پاؤڈر کو پھیلا کر تین دن میں بیکٹیریا کا خاتمہ کر دیا۔ نئی بوتل بازار میں آ گئی۔ لیکن اس نئی بوتل نے کروڑوں پرانی بوتلوں اور ڈبوں کو بیکار کر دیا۔ ایک ہنگامی قانون کے تحت ان کا استعمال، خرید وفروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔ کریمر نے تین سو معاہدے کئے تھے اور ان سب پر پانی پھر گیا۔ اب معاہدے کرنے والے مقدمات دائر کر رہے تھے۔ کریمر لیبارٹری دیوالیہ ہونے والی تھی اور اس کی نئی چیئر مین مسز اینی کریمر نے ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا، قانونی وارث کی حیثیت سے۔

رات کے دو بجے تھے۔ گیراڈ بہت دیر سے یہ سوچ رہا تھا کہ اسے اس اجلاس میں جانا چاہئے یا نہیں۔ یہ بات کہ ڈیگرون سے بیکٹیریا کی نشوونما کی رفتار دوگنی ہو جاتی ہے، اس نے کہی تھی اور اس طرح اس سارے نقصان کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے نیا فارمولا کسی رائلٹی کے بغیر دے دیا تھا۔ منافع کمانے اور دیوالیہ ہونے سے بچنے کا آخری موقع بھی گنوا دیا تھا۔ اینی اس سے ناراض تھی۔ 'ہوا کرے۔' اس نے سوچا۔ 'میں اب ریگون سٹی لوٹ جاؤں گا۔' ایک ہفتے میں وہ ایک بار بھی گیراڈ سے نہیں ملی تھی۔

چوبیس گھنٹے بعد ہونے والے اجلاس میں چیئر مین کے انتخاب کا مسئلہ بھی ہر شخص کے لئے بے چینی کا سبب تھا لیکن جب اجلاس شروع ہوا تو چند منٹ کے اندر ختم ہو گیا۔ اینی کریمر نے ایک مختصر سا اعلان کیا۔

''حضرات! ابھی اسی لمحے سے کریمر لیبارٹری ختم کی جاتی ہے۔ آپ لوگ آزاد ہیں۔ جہاں چاہیں جائیں۔ کریمر لیبارٹری جس نے قائم کی تھی وہ مر چکا۔ قانونی معاہدوں کا نقصان میں پورا کروں گی۔''

ایک منٹ تک وہ خاموش رہے۔ یوں جیسے وہ کسی صحرا میں تنہا رہ گئے ہوں۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے۔ ہم تو خیر کہیں چلے ہی جائیں گے۔'' سکیلن نے کہا۔ سیاستدان سکیلن نے۔

''میں...... ریگون سٹی جا رہی ہوں۔ کیوں گیراڈ؟'' اس نے مسکرا کر گیراڈ کی طرف دیکھا۔ گیراڈ نے آہستہ سے سر ہلا دیا اور باہر دیکھنے لگا، برف باری کو جو ریگون سٹی میں بھی ہو رہی ہو گی۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اینی کو اس کے لئے سکاٹ لینڈ چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ وہ کینڈا کو چھوڑ دے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ مگر یہاں تین دوست بھی ہیں۔ رائٹ، بیوشان اور سکیلن! اس کے پرانے رفیق۔

اس نے ایک نظر ان سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ مایوس، دل گرفتہ۔ ایک لمحہ پہلے وہ جس جذبے سے سرشار تھے وہ اچانک مر گیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اب چاندی کی وہ دیوار گر چکی ہے جو کریمر نے ان کے گرد حصار کی طرح کھینچ دی تھی اور اس کے تخیل کی پرواز کے لئے سائنس کا افق دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیت کریمر کے لئے صرف سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کی ایجاد تک محدود نہیں رہی تھی۔ دنیا کے چار ارب انسانوں کی فلاح کے لئے وقف ہو گئی ہے۔ انہوں نے متعلقہ فیصلہ سے ڈیگرون کے نئے فارمولے کو بنی نوع انسان کی نذر کیا تھا۔ وہ قدم ملائے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ان عظیم انسانوں کے قافلے میں شامل ہونا چاہتے تھے جو ان سے آگے کامیابی کے علم اٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک زیادہ پُرمسرت دنیا کی تشکیل کے لئے۔ مگر اب وہ تنہائی کے صحرا میں کھڑے تھے اور انہیں اپنی سمت کا پتہ نہ تھا۔

۞......۞
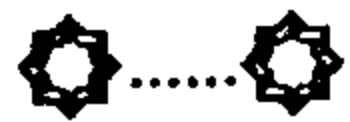
''شہباز......!'' رازل جریری کی آواز ابھری اور شہباز چونک پڑا۔ جو واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے تھے، اس قدر دل ہلا دینے والے تھے کہ بیان سے باہر۔ شہباز کے اپنے احساسات میں شدید لرزشیں تھیں اور یہی لرزشیں اس نے رازل جریری کی آواز میں محسوس کی تھیں۔ دونوں نادیدہ شکل میں ان واقعات میں الجھے ہوئے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو بھول گئے تھے جیسے وجود ہی نہ ہو۔

''شہباز......'' رازل جریری کی آواز پھر سنائی دی۔

''ہاں محترم رازل جریری؟''

''واپس چلنا ہے۔''

''آیئے۔''

وہ دونوں وہاں پہنچے جہاں ان کے جسم پوشیدہ تھے۔ دونوں نے اپنے جسموں کو فعال بنایا۔ رازل جریری نے کہا۔

''میں میلیکو جانا چاہتا ہوں...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''اعتراض کا کیا تصور کر سکتا ہوں میں؟''

میلیکو کی مخصوص لیبارٹری میں نریمان فرازی اور علی اصغر جراری اپنے فرائض بخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ یہ دونوں بھی یہاں سے خوب منسلک ہوئے تھے۔ رازل جریری جب اپنی رہائش گاہ میں داخل ہوا تو اس کے وجود میں شدید نقاہت پائی جاتی تھی۔ فوراً ہی اسے آسائشیں فراہم کی گئیں۔ اس کی خواہش پر اسے کچھ مخصوص انجکشن لگائے گئے اور ان انجکشنوں کے زیر اثر وہ تین دن سویا رہا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ اس کی یہ نیند انتہائی طویل ہو گی اور ان لوگوں کو تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ نریمان فرازی بہت گہری نگاہیں رکھتا تھا۔ اس نے کہا۔

''جن واقعات میں تم لوگ ملوث تھے اور جن کا تجزیہ کر رہے تھے، ان کی تھوڑی بہت تفصیل مجھے بھی معلوم ہے شہباز! لیکن بزرگ رازل جریری کی یہ کیفیت ذرا تعجب خیز ہے۔''

''ہاں...... مجھے یوں لگا ہے جیسے ان پر اچانک کسی احساس کا حملہ ہوا ہے۔ ویسے جو واقعات ہم پر بیتے یا جن کا ہم پر اعتراف ہوا، وہ واقعی اس قدر ہولناک تھے کہ بات سمجھ میں نہ آئے۔''

رازل جریری تیسرے روز جاگا۔ لیکن تین دن کی نیند نے شاید اسے اور زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ اسے کچھ عرقیات دیئے گئے تاکہ اس کی کیفیت بحال ہو۔ پھر ایک مخصوص کمرے میں اس نے ان تینوں کے ساتھ نشست کی۔ وہ ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا اور اس کے چہرے پر مردنی نظر آ رہی تھی۔ ماحول پر ایک پُرسکوت کیفیت طاری تھی۔ فضا میں ایک پُراسرار سا غبار پھیلا ہوا تھا۔ دیر تک کی خاموشی کے بعد رازل جریری کی آواز ابھری۔ اس نے شہباز کو مخاطب کر کے کہا۔

''تمہاری زندگی کا آغاز سرکس کی اس دنیا سے ہوا تھا جہاں تمہارا باپ گلباز لوگوں کی خوشی کے لئے زندگی کی بازی لگا دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بلندیوں پر جھولتے ہوئے ایک ذرا سی لغزش موت کا نام اختیار کر سکتی ہے۔ میں باپ نہیں ہوں، لیکن باپ کے جذبوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ یہ وجود خود دنیا کی ہر صعوبت جھیل سکتا ہے لیکن اپنی اولاد کو ایک ٹھوکر کھاتے نہیں دیکھ سکتا کہ کہیں اس کے جسم کے کسی حصے کو کوئی خراش نہ لگ جائے۔ یہ کون سا جذبہ ہے...... یہ جذبہ آسمانوں سے اتارا گیا ہے...... اس کے بعد شہباز! تم دوسری زندگی میں آئے۔ پلاسٹک سرجری شروع کی تم نے۔ لیکن اسے تم اپنا کوئی محور نہیں بنا سکے اور ایک بار پھر سرکس میں آ گئے۔ پلاسکو کے کچھ افراد نے تمہاری جسمانی پھرتی دیکھی اور وہ جو ایک مشکل میں گرفتار ہو چکے تھے میری وجہ سے، اس مشکل سے نکلنے کی کوششیں کرنے لگے۔ تم آرتھنیو ویسکو کے غاروں میں مجھ تک پہنچے۔ لیکن تم پلاسکو کے غلام نہیں تھے چنانچہ تم نے وہ فیصلہ کیا جو تمہارے دل نے کہا۔ مجھے میرا بدن واپس دیا اور ایک بار پھر مجھے میرے مقاصد کے لئے تروتازہ کر دیا۔ اپنے مقاصد کی تفصیل تک میں بعد میں آؤں گا۔ یہ بتاؤ، میرے انداز سے، میرے بولنے سے تم لوگوں کو اختلاف تو نہیں ہے؟''

''نہیں محترم بزرگ! اعتراض کا تصور تک نہیں ہے۔'' تینوں نے بیک وقت کہا۔

''شکریہ علی اصغر جراری! محبت میں ناکام ہونے کے بعد تم انسانوں سے برگشتہ ہو گئے۔ اپنی محبوبہ کا انتقام لیا تم نے اور تختہ دار تک پہنچ گئے۔ لیکن ہمیں تمہاری ضرورت تھی۔ بلاتکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاہ ایران کے خزانے کی منتقلی میں تمہارا اپنا ایک کردار تھا اور ہم تمہارے ذریعے اس خزانے کا راز پانا چاہتے تھے۔ اس لئے ہم نے تمہاری زندگی بچائی۔ بعد میں کچھ حالات منکشف ہوئے لیکن تمہاری زندگی اس خزانے سے زیادہ قیمتی ہو گئی ہمارے لئے۔

نریمان فرازی! تم ایک مجرمانہ زندگی گزارنے کے بعد جب ایک خاص طریقے سے اسی خزانے کے حصول کے لئے ہم نے تمہیں استعمال کرنا چاہا تو تم جن حالات میں بھی ہمارے ساتھ شامل ہوئے وہ الگ نوعیت کے حامل ہیں۔ لیکن بعد میں تم نے خلوصِ دل کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا اور ہماری زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ میرے دوستو! ابھی میں جن حالات سے گزرا ہوں، انہوں نے میرے سارے وجود میں ایک انوکھی تبدیلی رونما کر دی

ہے۔ بڑا الجھ گیا ہوں میں اپنی ذات میں۔ سچ کہہ رہا ہوں تم سے...... بالکل سچ۔ اور یقین رکھنا کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف سچ کا رشتہ ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اپنی زندگی کے لئے، اپنی ذات کے لئے میں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ بس تم سمجھ لو، ایک بے اگام زندگی گزارتا رہا ہوں۔ بات بہت دور سے شروع ہوتی ہے۔ دنیا میں ہلاکتوں کے بہت سے دور آئے۔ چنگیز خان، ہلاکو خان، اس کے بعد ہٹلر اور وہ بے چارہ کیا اس جیسے بہت سے ہٹلر اس کائنات میں جی رہے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ کچھ کے نام منظر عام پر آ گئے اور کچھ پردۂ راز میں ہیں۔ تم آخر سوچو، وہ سائنسدان جو زہریلی گیسیں، ہولناک بم تیار کرتے ہیں کیا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ یہ بم اور یہ زہریلی گیسیں جیتے جاگتے انسانوں کو جن کی زندگی کا آغاز ان کی نمود کے پہلے دن سے ہوتا ہے اور سینکڑوں کہانیوں کے ساتھ وہ عمر کی اس منزل تک پہنچتے ہیں جہاں اپنے آپ تباہ کن ہتھیاروں سے ان سے زندگی چھین لیتے ہیں۔ گویا آپ وہ ہنستی بستی کہانیاں لمحوں میں ختم کر دیتے ہیں جن میں نجانے کتنے کرداروں کا تعلق ہوتا ہے۔ بے شمار افراد ان کہانیوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ میرے دل میں ان کے خلاف نفرت کا غبار اٹھا اور میں نے اپنی ایجادات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دنیا کو موت کی مٹھی میں جکڑ لینے والا پلاسکو اپنی طاقت کے بل پر دنیا کو اپنا ہم آواز بناتا جا رہا ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ دنیا کا خدا بننے کی فکر میں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ صرف اس کا نام لیا جائے۔ صرف اسے بڑا سمجھا جائے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ کوشش ہی مذموم ہے۔

بہر حال میں نے جگہ جگہ اس کے خلاف کام کیا۔ بہت سی جگہوں پر مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ بلکہ جو کچھ میں نے کرنا چاہا اس میں کامیابی ہی حاصل ہوئی اور اب میں جس سلسلے میں کام کرنا چاہتا تھا اور جس طرح کے کردار میرے اردگرد پھیلے ہوئے تھے...... آہ...... انہوں نے میرا دل ہلا کر رکھ دیا اور یہاں سے میرے اندر ایک نیا احساس ابھرا اور اس احساس نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میرے دوستو! تم لوگ یقین کرو یا نہ کرو، اس احساس نے میرے اندر کی جسمانی قوتوں کو، میرے بہت سے جذبوں کو خاک کر دیا۔ ایک شعلہ سا میرے سارے وجود کو جلا کر خاکستر کر گیا۔ دوستو! تمہارا بھی مشورہ چاہتا ہوں میں۔ حالانکہ میں اس احساس کی ساری وسعتوں کا سفر کرتا رہا ہوں۔ یہ تین دن میں نے نیند میں نہیں گزارے، تجزیئے میں گزارے ہیں۔ تجزیہ کرتا رہا ہوں میں کہ جو احساس میرے سینے

میں اٹھ رہا ہے وہی سچ ہے یا پھر میں صحیح کام کرتا رہا ہوں؟ میرے بچو! ذرا غور سے سننا میری بات کو۔ دنیا موت کی مٹھی میں ہے۔ ہتھیاروں کی ایجاد ہو رہی ہے۔ سیاروں کو تسخیر کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ سیاروں کو ریڈ کر اس ننھے سے کرے کو تباہ و برباد کر دیں جہاں سرسبز میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں زندگی مسکراتی ہے۔ معصوم بچے فرشتوں جیسے، زندگی کو ایک دوسرے کی محبت میں گزارنے والے خوبصورت جوڑے، کائنات کی ہر چیز، ہنستی مسکراتی اس کائنات کے باسی اس چھوٹے سے کرے کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ وہ اسے آگ کا گولا بنا دینا چاہتے ہیں۔ میں سوال کرتا ہوں کہ اس ننھی سی زمین سے ان کی نفرت کیا معنی رکھتی ہے؟ میرے بچو! وہ سب یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور میں اس احساس سے تڑپ رہا ہوں کہ ہر اس شخص کو راستے سے ہٹاؤں جو میری اس دنیا کے خاتمے کی فکر میں ہیں۔ ہر تخریب کار کی تخریبی قوتوں کو فنا کر دوں۔ اور میں نے ایسا بہت کچھ کیا بھی ہے۔ لیکن پچھلے دنوں جو مجھ پر گزری ہے اس نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ میں بلاوجہ اپنی کاوشیں کر رہا ہوں۔ دنیا کی عمر تو کھربوں سال ہے۔ میں تو آج کی پیداوار ہوں۔ چند روز کے لئے اس دنیا میں آیا ہوں اور چند روز کے بعد میری واپسی ہو جائے گی۔ محافظ کائنات تو وہ ہے جس نے یہ کائنات بنائی ہے۔ بابائے تخلیق کنندہ اپنی تخلیق سے کتنی محبت کرتا ہے یہ تو ہر صاحب تخلیق جانتا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں، کس کس نے کیا کیا نہ کیا۔ فرعون آیا، شداد آیا، نمرود آیا۔ دنیا کو برباد کرنے کے لئے سینکڑوں منصوبے آئے۔ خود دنیا کے محافظ نے اپنے نافرمانوں کو سزا دی۔ دنیا ختم کر دی۔ برائیوں کے نتیجے میں سیلاب نازل کئے اس نے اور ایک ایک فرد ختم ہو گیا۔ اس نے جب بھی کسی کو سزا دینی چاہی، دے دی۔ دنیا کتنی ہی بار فنا ہوئی ہے۔ مجھے احساس ہوا ایک دم کہ میں غلطی پر ہوں۔ میں اس کے کام میں مداخلت کر رہا ہوں۔ لیکن میرے جذبے بڑے نیک ہیں۔ نیک جذبوں کا ایک مقام ہوتا ہے۔ لیکن اب ایسا تو میں نہیں کہ تم اپنی حد سے آگے بڑھ جاؤ۔ ایک دم مجھے یہی لگا جیسے میں حد سے آگے بڑھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، یہ بے شمار نام جو تاریخ کے سیاہ اوراق میں درج ہیں، انہوں نے کیا کیا نہ کر لیا دنیا کے خاتمے کے لئے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکے۔ ہم نے بلاوجہ اتنی کاوشیں کی ہیں۔ بے مقصد کاوشیں ہیں یہ۔ مجھے لگ رہا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ دوستو! یہی وہ احساسِ شدید ہے جس نے مجھے

نڈھال کر دیا ہے۔ فوراً ہی فیصلہ مت کر لینا۔ تم بھی غور کرو۔ مجھے بتاؤ، میں کہاں ٹھیک ہوں اور کہاں غلط۔ رہنمائی چاہتا ہوں میں تم سے۔ بری طرح الجھ گیا ہوں۔ ایک ایسے انسان کا تصور کرو جس نے ساری زندگی ایک نقطے کے لئے جدوجہد کی ہو اور بعد میں اسے پتہ چلے کہ وہ نقطہ تو سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہ صرف ایک مغموم خیال تھا جو اس کے ذہن کے علاوہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں...... مجھے سوچ سمجھ کر جواب دینا، سمجھے۔ میں انتظار کروں گا۔“

شہباز، نریمان فرازی، علی اصغر جراری سکتے کے عالم میں رازل جریری کو دیکھ رہے تھے۔

✡......✡

میلیکن وزیر خارجہ اپنے تین رکنی وفد کے ساتھ ایک اور ملک، ایک خاص مسئلے میں میٹنگ میں شرکت کے لئے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کا طیارہ ہائی جیک ہو گیا۔ یہ جہاز ایک پہاڑی علاقے میں ایک ایسی قدرتی پٹی پر اتارا گیا جسے رن وے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بے شک یہ ایک خطرناک کوشش تھی۔ لیکن تجربہ کار پائلٹ نے ہائی جیکروں کے اشاروں پر مسافروں کی زندگی بچانے کے لئے طیارے کو بہر طور بحفاظت اتار لیا۔ ہائی جیکروں نے مسافروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا بلکہ ان سے معذرت کی تھی اور صرف میلیکن وزیر خارجہ اور ان کے ساتھیوں کو طیارے سے اتار لیا گیا تھا۔ پھر ایک فوجی ٹرک جو وہاں موجود تھا، انہیں لے کر چل پڑا تھا۔ میلیکن وزیر خارجہ دم بخود تھا۔ کوئی ساڑھے پانچ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد ٹرک حکومت پلاسکو کی ایک چھاؤنی میں داخل ہوا اور اس کے بعد ایک ہیلی کاپٹر انہیں لے کر چل پڑا۔ آخر کار وہ ایک ایسی فوجی عمارت میں پہنچا دیئے گئے جہاں زبردست پہرہ لگا ہوا تھا۔ انہیں آرام کی مہلت نہیں دی گئی۔ وفد کے تینوں ارکان کو ایک تحقیقی ہال میں پہنچا دیا گیا۔ میلیکن وزیر خارجہ کو اب یہ احساس ہو چکا تھا کہ انہیں اغوا کرنے والوں میں حکومت پلاسکو کے آدمی شامل ہیں اور اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی جب ایک پلاسکن جنرل نے وزیر خارجہ سے نرم لہجے میں کہا۔

”ملکی پالیسیاں جو بھی ہوں، انسانیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ میلیکو کے وزیر خارجہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں آپ سے کچھ معلومات درکار ہیں۔ ہمارے اپنے مشن کی تکمیل ہوتے ہی آپ کو باعزت طریقے سے آپ کے وطن پہنچا دیا جائے گا اور جب تک آپ کا قیام یہاں رہے گا، آپ کو ایک معزز مہمان کی حیثیت دی جائے گی۔“

”نہیں...... کچھ کہنے کی کوشش نہ کیجئے۔ یہ نہ کہئے کہ آپ جس مشن کے لئے جا رہے تھے وہ ادھورا رہ جائے گا یا آپ کی حکومت کو آپ کے بارے میں بہت زیادہ تشویش ہو

گی۔ ہم جانتے ہیں ایسا ہوگا۔ لیکن ہمارا بھی ایک مسئلہ ہے جو آپ کے ذریعے حل ہونا ہے۔ کیا آپ ہمارے ساتھ دوستانہ تعاون کریں گے یا پھر ہمیں تشدد کا راستہ اختیار کرنا ہوگا؟ آپ اپنے اطراف کے مناظر دیکھ رہے ہیں۔ یہاں آپ کو اعلیٰ درجے کی کافی بھی پیش کی جائے گی اور غلاظت بھرا گندا پانی بھی جو کسی انتہائی قدیم گٹر سے نکالا جائے گا۔ بتایئے، دونوں میں سے کون سی چیز پینا پسند کریں گے؟ معافی چاہتے ہیں ان بدنما الفاظ پر۔ لیکن ہمارے لئے ضروری ہے۔"

میلیکن وزیر خارجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جنرل! آپ خود جو کچھ پیتے ہوں، وہیں ہمیں بھی پلا دیں۔ ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔"

جنرل کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سرخ ہو گیا۔ لیکن بات بہت دلچسپ تھی اور دلچسپ پیرائے میں کی گئی تھی۔ اس لئے اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کہا۔

"عمدہ قسم کی کافی۔" یہ الفاظ وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہے گئے تھے۔

میلیکن وزیر خارجہ نے بڑے خوشگوار ماحول میں یہ کافی پی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"جی...... میں اور میرے ساتھی کسی بھی قسم کا تشدد برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہماری مناسب حفاظت نہیں کی گئی اور ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اپنی حفاظت کریں۔"

"اچھا خیال ہے آپ کا۔ حکومت پلاسکو کے سینے پر جو شدید گھاؤ لگے ہیں وہ ناسور کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ہمارے سینے کا گھاؤ رازل جریری ہے۔ وہ سائنسدان جو آپ کے ملک میں مقیم ہے اور وہاں بیٹھ کر ہمارے خلاف کارروائیاں کر رہا ہے۔ یہ نہ کہئے پلیز کہ آپ کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔ حکومت پلاسکو بے شک رازل جریری کو بھرپور طریقے سے اپنے قبضے میں نہیں لا سکی لیکن اس کی معلومات اتنی ناقص بھی نہیں ہیں کہ اسے یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ آپ کے پاس ہے اور وہیں سے کارروائی کر رہا ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ اس سلسلے میں؟"

میلیکن وزیر خارجہ نے اپنے سامنے رکھی ہوئی پیالی سے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں...... ظاہر ہے۔ جب اس بات کا اقرار کر لیا گیا ہے کہ ہم وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں جو آپ ہم سے کہیں تو پھر باقی باتیں بیکار ہیں۔ ہمیں بھرپور طریقے سے اعتراف کر لینا چاہئے۔ وہ میلیکن دارالحکومت میں ہی ہے۔"

جنرل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر اس نے کہا۔ "آپ ہمیں اس کی رہائش گاہ کا نقشہ بتائیں گے؟"

"ہاں...... میں تیار ہوں۔" وزیر خارجہ نے جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ظاہر ہے اس کے لئے یہ خوشگوار فعل نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی اسی طرح بچا سکتا تھا۔

✡......✡

نریمان فرازی اور علی اصغر جراری نے اپنا فیصلہ بڑی خوش اسلوبی سے سنا دیا۔ ایک ہی پرچے میں دونوں نے اپنے مقصد کا اظہار کر دیا تھا۔ مختصر تحریر تھی۔ لکھا تھا۔

"ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کے یہ دن بے مقصد کھوئے ہیں۔ اصولی طور پر ہمیں اس بات پر غصہ آنا چاہئے لیکن بہرحال آپ ایک محترم شخصیت ہیں چنانچہ ہم آپ کو معاف کرتے ہیں۔ یہاں سے جا رہے ہیں۔ جو خزانہ آپ کی تحویل میں ہے، اس میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ لیکن ہم دنیا کی وسعتوں کو اپنے سامنے کھلا ہوا پاتے ہیں۔ اپنی اچھی زندگی ہم خود تلاش کر لیں گے۔"

نریمان فرازی، علی اصغر جراری

رازل جریری کا چہرہ ایک دم سُت گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ اس نے شہباز کو دیکھا اور بولا۔

"اور تم......؟"

"میں واپس اپنے گھر جاؤں گا۔ کنٹری بستی بہت خوبصورت جگہ ہے۔ میں اس کے اطراف کو آباد کروں گا۔ اور اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار کہلاؤں گا۔"

"خوبصورت فیصلہ ہے...... مجھے بے حد پسند آیا۔ میرے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اصغر جراری اور نریمان فرازی نے فیصلے میں ذرا جلد بازی کر لی۔ یہ سب کچھ ان کے کام آتا۔ لیکن خیر...... انتظامات میں کر لوں گا۔" رازل جریری نے کہا اور وہ نہ جانے کیا کرتا رہا۔ شہباز کو اس کا علم نہیں تھا۔

لیکن ایک ہولناک رات جب بڑے بڑے ٹینکوں نے اس عمارت کو گھیر لیا جس میں

رازل جریری کی رہائش گاہ تھی اور فون پر اس سے کہا گیا۔

"تمہاری کہانی ختم ہوگئی ہے رازل جریری! ہوش مند رہنے کی کوشش کرنا۔ اپنی سائنسی ایجادات سے اس جگہ کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم انسانیت کی بھلائی کے دعویدار ہو۔ تم جانتے ہو کہ اس عمارت کو تباہ کرنے سے کتنی جانیں ضائع ہوں گی۔"

شہباز نے رازل جریری سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہمارے خلاف یہ کارروائی حکومت پلاسکو نے کی ہے۔"

"ہاں...... وہی ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں نادیدہ اجسام میں آجانا چاہئے۔"

"اور وہ ہمارے جسموں پر قبضہ کرلیں گے اور اس کے بعد ہماری روحیں بھٹکتی رہیں گی۔ نہیں شہباز! تم بھی ایسا نہ کرو۔ تقدیر کے فیصلوں سے تعاون کرو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنے مقصد کے ساتھ فوت ہو چکا ہوں۔ اب میرے سامنے زندگی کا کوئی محور نہیں ہے۔ مجھے ہار مان لینی چاہئے۔"

اور یہ بار رازل جریری نے اس طرح مانی کہ اس نے ایک انتہائی قاتل زہر پی لیا۔ آخری جملے اس نے شہباز سے یہی کہے تھے۔

"تقدیر کے فیصلوں سے بغاوت مت کرو...... تقدیر تم سے زیادہ طاقت ور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مرگیا۔ شہباز نے خود کو پلاسکن حکومت کے حوالے کر دیا۔

✿......✿

اصل مسئلہ رازل جریری کا ہی تھا۔ رازل جریری کی لاش ان لوگوں کو دستیاب ہوگئی تھی۔ چنانچہ جنون کی آندھی نہیں چل سکی تھی۔ البتہ شہباز کو ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا گیا تھا۔ ان کا رویہ اس کے ساتھ بہت شدید تھا۔ پلاسکو کی ایک مخصوص عمارت میں اس سے معلومات حاصل کی گئیں اور اس نے صاف صاف بتا دیا۔

"جس وقت آپ لوگوں نے مجھے غار میں اتارا، وہاں میں بے بس ہوگیا تھا۔ رازل جریری کا جسم بہترین حالت میں موجود تھا۔ اس نے مجھے اپنا موقف بتایا اور میں اس موقف سے متاثر ہوگیا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق عمل کیا۔" اور اس کے بعد شہباز نے رازل جریری کے ساتھ گزارے ہوئے ہر لمحے کی تفصیل انہیں بتا دی جس کے نتیجے میں وہ تشدد سے بچ گیا۔ البتہ اس کی بقیہ زندگی ایک قید خانے کے سپرد کر دی گئی جہاں اس نے

تقریباً سوا سال گزارا۔ یہ سوا سال اس کی زندگی میں بے شمار تجربات کا حامل تھا۔ رازل جریری کے لئے اس نے بہت سے کارنامے سرانجام دیئے تھے لیکن ان کارناموں میں یہ تجربہ شامل نہیں تھا جو اب اسے ہو رہا تھا۔ کئی لوگوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ ان میں لارک تھا، ایڈورڈ تھا اور ہری سنگھ تھا۔ ہری سنگھ کیونکہ اس کا ہم زبان تھا اس لئے ہری سنگھ سے اس کی دوستی گہری ہو چکی تھی۔ سردار جی ہمیشہ کہتے تھے۔

"اوہ یار! ساری زندگی کیا یہیں گزارنی ہے۔ اٹھو، کوئی بھاگ دوڑ کا منصوبہ بتاؤ۔ نکلیں ادھر سے۔ کیا مشکل ہے۔"

اس دوران کئی بار انہیں مختلف قید خانوں میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس بار انہیں کسی اور قید خانے میں منتقل کیا جا رہا تھا اور اس کے لئے ان سے مسلسل مارچ کرایا جا رہا تھا۔ شہباز اپنی زندگی کے سب سے انوکھے دور سے دوچار تھا۔ حکومت پلاسکو کے قیدی کی حیثیت سے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک سچائی تھی کہ اس وقت اس کی تمام تر قوتیں مفلوج ہوگئی تھیں۔ ویسے بھی وہ لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک سرکس کا آدمی ہے اور کسی بھی لمحے کوئی کمال دکھا سکتا ہے اس لئے اس پر خاص طور سے نگاہ رکھی جاتی تھی۔ یہ مارچ ایک درمیانی ریلوے جنکشن کی طرف تھا۔ وہ انہیں پلاسکو کے ذیلی ملک لے جا رہے تھے۔ مارچ کو تین دن مسلسل ہو چکے تھے اور اس دوران نہ تو پلاسیکل محافظوں نے خود آرام کیا تھا اور نہ انہیں آرام کا کوئی موقع دیا تھا۔

ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود بھی انتہائی پُرمشقت لوگ تھے اور نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ دن رات چلنے کی وجہ سے قیدیوں کے جسم تھک کر اکٹھے ہوگئے تھے۔ چہرے تھکن سے نڈھال اور گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی اور لباس میلے کچیلے۔ اس روز انہوں نے صبح چار بجے سے جو چلنا شروع کیا تو شام پانچ بجے تک ایک لمحے کے لئے بھی نہ رکے۔ دوران سفر ہی کھانے پینے کی چیزیں فراہم کر دی گئیں۔ تیرہ گھنٹے میں ان لوگوں نے پچیس میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ ادھر گرمی بھی قیامت کی پڑ رہی تھی۔ پیاس کے مارے زبانیں سوکھی جا رہی تھیں۔ پلاسیکل فوجی دیوانگی کا شکار تھے۔ انہوں نے اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ ایک مرتبہ رک کر کسی نالے یا چشمے پر پیاس بجھا لیتے۔ اصل میں وہ بھی اس سفر سے اکتائے ہوئے تھے اور قیدیوں کو جلد از جلد ان کے کیمپ تک پہنچا

کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ان قیدیوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی اور ان کی قطار بہت طویل تھی۔ پندرہ پندرہ اور بیس بیس فٹ کے فاصلے پر مسلح پلاسیکل محافظ قیدیوں کی نگرانی کے لئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کئی قیدی چپکے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شہباز نے خود دیکھا کہ ایک چھوٹا پل عبور کرتے ہوئے شارمن نامی ایک شخص کمال ہوشیاری سے نیچے کود کر لمبی لمبی گھاس میں غائب ہو گیا۔ اگر محافظ اسے دیکھ لیتے تو نجانے کتنی گولیاں اس کے جسم کے پار ہو جاتیں۔ البتہ اس واقعہ کے بعد کچھ دیر ہی گزری تھی کہ شہباز کے بائیں سمت چلنے والے اس کے ایک ساتھی ایلگر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”دوستو! ایک مثال ہے انگریزی زبان کی جو مجھے نہیں آتی۔ لیکن مثال کا مفہوم یہ ہے کہ ”اگر کوئی زندگی میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور جو لوگ جدوجہد نہیں کر پاتے وہ صرف کامیابی کے نام سے آشنا ہو سکتے ہیں، اس کے حصول سے نہیں۔“

”مطلب......؟“ ایک اور شخص جس کا نام لارک تھا، بولا۔

”او پاجی! مطلب تو ٹھیک سمجھ میں آتا ہے۔“ تیسرے قیدی ہری سنگھ نے کہا۔ ”مگر تھوڑی سی وضاحت تو کی جائے۔“

”وضاحت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ جو حالت ہماری ہو رہی ہے وہی ان محافظوں کی بھی ہے۔ وہ بری طرح تھک گئے ہیں اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے کبھی تم نے نہیں دیکھا کہ وہ اونگھنے لگتے ہیں۔ اور یہ موقع بڑا ہی کارآمد ہے۔“

شہباز انہیں دیکھتا رہا۔ ہری سنگھ نے کہا۔

”تو پھر آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ میں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ آگے محافظوں کی تعداد کم ہے۔ ہم آسانی سے ان کی نگاہوں سے غائب ہونے لگتے ہیں۔ ہری سنگھ کے الفاظ نے شہباز کے اندر بھی ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ اصل میں رازل جریری سے اسے اس قدر عقیدت اور محبت ہو گئی تھی کہ اس کی موت نے اسے نڈھال کر دیا تھا ورنہ شاید پلاسکن فوجیوں کے لئے وہ اتنا نرم چارہ نہ ثابت ہوتا۔ بہرحال ان لوگوں نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ شہباز ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ قطار میں اگلے

قیدیوں کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے تھے۔ فاصلے طے ہوتے جا رہے تھے۔ تھوڑے سے فاصلے طے کرنے کے بعد انہیں ایک کھلا میدان نظر آیا۔ اس کھلے میدان میں چند گاڑیاں اور فوجی ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ان میں سے پلاسکن محافظ نکل کر ان کی جانب آئے اور صفوں میں داخل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی ایک تماشہ نظر آیا تھا۔ یہ لوگ قیدیوں سے ان کا سامان چھین رہے تھے۔ کچھ قیدیوں کے پاس گھڑیاں، نقد رقم اور اسی طرح کی چیزیں تھیں جو انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیں۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور جو کچھ وہ لے سکتے تھے، خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا۔ غالباً قیدیوں کو یہ بھی شبہ تھا کہ اگر انہوں نے ان کی تلاشیاں لیں تو نہ جانے کتنی ایسی چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا جو بھاگنے کے بعد ان کے کام آ سکتی تھیں۔ یہ الفاظ لارک نے کہے تھے۔ بہرحال اس کے بعد انہیں شیرون تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ لیکن یہاں تک آتے آتے فرار کا کوئی موقع نہیں ملا تھا کیونکہ تقدیر سے اس وقت صرف کھلے میدان سامنے آ رہے تھے اور ان کھلے میدانوں میں کسی بھی طرف سے محافظوں کی نگاہوں سے بچ کر نہیں جایا جا سکتا تھا۔

اس کے بعد ایک اور بھی بدنصیبی ہوئی۔ وہ یہ کہ شیرون سے نئے اور تازہ دم محافظ آ گئے جو ساری رات ان کے سروں پر رائفلیں اور سنگینیں تان کر کھڑے رہے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ابھی ایک دن کا سفر اور باقی ہے۔ چنانچہ اسی روز ساڑھے پانچ بجے انہیں پھر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جانے لگا۔

”او یار! ساری باتیں تقدیر کی ہوتی ہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہم میں سے کئی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور ابھی تک ان لوگوں کو ان کے بارے میں پتہ نہیں چلا ہے۔ اور جیسے ہی ہم نے فیصلہ کیا یہ سب کچھ ہونے لگا۔“

”اس کے باوجود ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔“ ایڈورڈ نے بے خوفی سے کہا۔

اب انہیں جس راستے پر لے جایا جا رہا تھا وہ بہت تنگ اور دشوار گزار تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ قیدیوں کے قدموں کی آواز سن کر گھروں سے بچے اور بوڑھے باہر نکل آئے اور حیرت اور افسوس سے انہیں دیکھتے۔ دوپہر تک یہ سفر مسلسل جاری رہا اور اس کے بعد انہیں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔ محافظوں کے افسروں نے قیدیوں کی گنتی کی اور اپنی فہرست کو چیک کیا تو انہیں فوراً ہی احساس ہو گیا کہ ان میں سے چند

افراد کم ہیں۔ ہنگامہ ہو گیا۔ بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ پلاسکن افسر نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم لوگوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے کہ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ جو لوگ فرار ہو چکے ہیں انہوں نے اپنی موت کو وقت سے پہلے آواز دے لی ہے۔ تم لوگ کیا سمجھتے ہو۔ یہ پلاسکو کا علاقہ ہے اور ہم پلاسکو کے مالک۔ زمین کا ہر گوشہ انہیں قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ ہم انہیں جہنم سے بھی کھینچ لائیں گے۔ اور اس کے بعد تمہارے سامنے انہیں گولی مار دی جائے گی۔ چنانچہ انتظار کرنا اس وقت کا جب انہیں تمہارے سامنے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس سے تمہیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے قبضے سے فرار ہونے کی کوشش حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

خود لارک، ایڈورڈ اور ہری سنگھ ان الفاظ کا مذاق اُڑاتے رہے تھے۔ لیکن اس وقت سب کے چہرے اتر گئے جب ایک جیپ میں وہ لوگ بٹھا کر لائے گئے جو راستے سے فرار ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے جسم سے جگہ جگہ خون بہہ رہا تھا۔ کہا تو یہ گیا تھا کہ انہیں سامنے لا کر گولی مار دی جائے گی لیکن شاید اس کے اختیارات انہیں نہیں تھے۔ چنانچہ انہیں قطار میں واپس کر دیا گیا۔ اب پہلی بار ان لوگوں کو احساس ہوا کہ پلاسکن محافظ کس قدر ہوشیار اور چوکنے ہیں اور انہیں فریب دینا آسان کام نہیں۔ جو کچھ کرنا ہو گا، سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا۔ ہری سنگھ نے فوراً ہی شہباز کے کان میں سرگوشیاں کیں۔

"او بھائی جی! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ان کی ایسی تیسی۔ اب ان سے جسمانی ہی نہیں، دماغی مقابلہ بھی ہو گا۔"

ہری سنگھ کے بارے میں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی ضدی اور طاقتور سردار ہے۔ وہ بار بار نفرت سے اپنی مٹھیاں بھینچتا اور کہتا۔

"اس کے بعد تو انہوں نے ہماری غیرت جگا دی ہے بھائی جی! اوئے سردار ہری سنگھ اتنی آسانی سے ان سے ہار نہیں مانے گا۔ کیا جانوروں کی طرح ہمیں چلا رہے ہیں۔"

ایڈورڈ نے کہا۔ "اتنی جلد بازی سے کام مت لینا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم دوستوں میں سے کوئی ایک کم ہو۔ کوئی تدبیر سوچنا پڑے گی۔ ان راستوں کو ذرا غور سے دیکھتے رہو۔

اچھا ایک بات بتاؤ، میرے پاس کچھ چیزیں موجود ہیں۔ تمہارے پاس بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟"

"او جی سوکھے ہوئے گوشت کے دو چھوٹے ڈبے، بسکٹوں کے تین پیکٹ، پنیر کے تھوڑے سے ٹکڑے اور تھوڑی سی رقم جو میں نے ایک پلاسکن سپاہی کی جیب سے نکالی تھی۔"

"واہ بھئی...... اور لارک! تمہارے پاس؟" ایڈورڈ نے پوچھا تو لارک مسکرا کر بولا۔

"برانڈی کی بوتل اور ایک کمبل۔"

اور اس کے بعد یہ لوگ خاموش ہو گئے۔ فی الحال بات انہی چار افراد میں چل رہی تھی۔ شیرون سے کوئی دو میل دور سڑک یکایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئی۔ سڑک کو جنگل میں داخل ہوتے دیکھ کر ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ایلگر نے شہباز کے کان میں کہا۔

"خدا کی قسم، اگر اب بھی ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ساری زندگی پچھتانا پڑے گا۔"

سب کی نگاہیں، ادھر اُدھر گردش کرنے لگیں۔ قیدی لڑکھڑاتے قدموں سے چلے جا رہے تھے۔ کوئی کسی سے بات تک نہ کرتا۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم تھے۔ لارک نے کہا۔

"واقعی سوچنے کی بات ہے۔ یہ سنہری موقع دوبارہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح ان کے نرغے سے نکلنا ہے۔"

دفعتہً ہی شہباز نے مڑ کر ہری سنگھ کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ پھر وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"یہ شخص ہمارے بالکل قریب ہے جو فرار ہونے کے بعد گرفتار ہو گیا تھا۔ ذرا اس کو قریب بلاؤ۔"

جس شخص کو قریب بلایا گیا اس کا نام ہیرس تھا اور یہ شخص زخمی تھا۔"

"ڈیئر ہیرس! تم فرار کی کوشش کر چکے ہو۔ ہمیں افسوس ہے کہ تم دوبارہ گرفتار ہو گئے۔ ہم بھی یہ کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہماری کچھ مدد کر سکو گے؟"

ہیرس نے حیران نگاہوں سے انہیں دیکھا اور بولا۔ "میں اور مدد...... میری حالت کا جائزہ نہیں لے رہے تم؟"

"افسوس، ہم خود غرضی سے کام لیتے ہوئے تمہاری اس حالت سے فائدہ اٹھانا چاہتے

ہیں۔ بشرطیکہ تم ہماری مدد کرنے کا فیصلہ کرلو۔''

''بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''دیکھو...... تم زخمی ہو۔ جونہی تم محسوس کرو کہ اگلے قیدیوں کا گروپ جنگل میں داخل ہو رہا ہے، چیخ مار کر زمین پر گر جانا۔ محافظ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے اور ہم اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ بس اتنا کام ہے۔ بولو، کیا تم یہ کرو گے؟ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے......''

ہیرس نے ہاتھ اٹھا کر ایڈورڈ کا جملہ پورا ہونے سے پہلے روک دیا۔

''نہیں...... ہم سب جن حالات کا شکار ہیں ان میں اپنی ذات کے مفاد کے بارے میں نہیں سوچا جا سکتا۔ تم جیسا کہہ رہے ہو، میں ویسا کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' ہیرس کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اس کے بعد یہ لوگ آہستہ آہستہ قطار کے اگلے حصے میں پہنچ گئے۔ آنے والے وقت کا تصور کر کے شہباز کی کنپٹیاں چیخ رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ لارک، ایڈورڈ اور ہری سنگھ بھی شدتِ جذبات کا شکار ہیں۔ وقت آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔ لمحے سکڑ رہے تھے۔ جونہی قیدی جنگل میں داخل ہوئے، شہباز نے مڑ کر ہیرس کی طرف دیکھا اور ہیرس نے اسی وقت اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس کے بعد وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے گرتے ہی قریب سے گزرتے ہوئے پلاسکن سپاہی رک گئے۔ قیدیوں کی گردنیں بھی اسی طرف مڑ گئیں۔ تھوڑی سی ہلچل مچی۔ ابتری سی پھیلی اور دوسرے لمحے جو لوگ پروگرام بنائے ہوئے تھے، تیر کی طرح قطار سے نکل کر اندھا دھند دوڑنے لگے۔ کوئی چالیس فٹ کے فاصلے پر ایک گڑھا نظر آیا تو وہ اس میں کود گئے۔ لیکن فوراً ہی لارک نے کہا۔

''یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ جنگل کے گھنے حصے کی طرف نکل چلو۔ وہ ہماری تلاش میں ادھر ہی آئیں گے۔''

''ابھی تک ہمیں دیکھا نہیں گیا۔ لیکن احتیاط کے ساتھ۔'' ییلگر بولا۔

وہ بندروں کی طرح ہاتھ پاؤں کے بل چلتے ہوئے خندق سے نکلے اور اب سڑک ان سے اندازاً تین سو گز دور تھی۔ ادھر پلاسکن محافظوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ لمحوں تک وہ دھڑکتے دلوں سے یہ آوازیں سنتے رہے۔ سپاہی

قیدیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہے تھے۔ بے چارے ہیرس کو پتہ نہیں کس کیفیت میں رکھا گیا تھا۔ بہرحال قیدیوں کی لمبی قطار آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی اور کچھ لمحوں کے بعد وہ غائب ہو گئی۔ ان لوگوں کو تھوڑا سا سکون ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے سامان کی جانچ پڑتال کی اور اس کے بعد گھنے جنگل میں رفتار تیز کر دی۔

اس پہلی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ اور ایک دم انہیں اپنے جسموں میں تازگی محسوس ہوئی تھی۔ شہبلور کے درختوں کے گھنے جھنڈ میں کافی دور پہنچ کر وہ رکے اور خرگوشوں کی طرح دبک گئے۔ ابھی دن کا بڑا حصہ باقی تھا۔ تھکن نے پورے وجود کو گویا ختم کر دیا۔ طے یہ پایا کہ رات کو سفر کیا جائے اور دن کو چھپنے کی کوئی بہترین جگہ تلاش کر لی جائے۔ اس طرح سے آگے کا سفر طے کیا جائے گا۔ لیکن دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد ان لوگوں نے سب سے پہلے اپنا حلیہ درست کرنے کی تدبیر کی۔ لارک کے پاس اُسترا نکل آیا۔ اس نے کئی روز کی بڑھی ہوئی داڑھی صاف کی۔ اس کے بعد استرا باقی لوگوں کے حوالے کر دیا۔ پانی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائی گئیں تو قدرت نے یہاں بھی مدد کی اور ایک چھوٹا سا برساتی نالہ دکھائی دیا جس کی آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ نالے کی تہہ میں شفاف پانی نظر آ رہا تھا۔ یہاں پیاس بجھائی۔ ہاتھ پاؤں دھوئے اور قدرت کی اس دین سے ایسی عجیب سی تازگی کا احساس ہوا کہ روح تک سرشار ہو گئی۔

اب ان لوگوں نے اپنے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ ٹین کے ان ڈبوں سے چیزیں نکال کر جیبوں میں بھریں اور ڈبے زمین کھود کر دبا دیئے۔ ان کی چمک اپنی جانب متوجہ کر سکتی تھی۔ کپڑے کا ایک فالتو تھیلا بھی ضائع کرنا پڑا۔ خوراک اتنی تھی کہ احتیاط سے استعمال کرتے تو کئی دن کے لئے سہارا ہو جاتا۔ تاہم اس بات کی امید بھی تھی کہ راہ میں چھوٹی چھوٹی بستیاں پڑتی ہیں۔ ان سے کھانے پینے کا کچھ سامان حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چاہے اس سامان کو چوری ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ سارا پروگرام سرگوشیوں میں طے ہوتا جا رہا تھا اور شہباز کو کچھ اور سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

رازل جریری کی موت، نریمان فرازی اور اصغر جراری کا پراسرار فیصلہ اور اس کے بعد یہ ساری ہنگامہ آرائی۔ وہ منتظر تھا کہ اس کا اختتام بھی سامنے آئے۔

وہ پانچ گھنٹے تک گہری نیند سوئے اور اس کے بعد جب وہ بیدار ہوئے تو شام کا اندھیرا

تیزی سے پھیل رہا تھا اور درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے واپس آ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ کسی ایک جگہ دیر تک قیام ٹھیک نہیں تھا۔ ویسے تو ان کو مختلف مقامات پر فوجی گاڑیوں کے پہیے بھی نظر آئے تھے۔ اس کا مقصد ہے کہ یہ عام گزرگاہ ہے اور انہیں دوبارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ آخر کار سورج چھپ گیا اور ان لوگوں نے پھر سفر کا آغاز کر دیا۔ عجیب وغریب احساسات دل میں جاگزیں تھے۔ چلتے چلتے دائیں بائیں چند پراسراری آوازیں سنائی دیتیں۔ جیسے کوئی دبے پاؤں تعاقب کر رہا ہو۔ اس کے بعد یہ لوگ ساکت ہو جاتے اور کسی جھاڑی میں دبک کر بیٹھ جاتے۔

یہ بات بھی طے تھی کہ انہی کی طرح اور بھی قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ بھی جنگل ہی میں چھپے ہوئے تھے۔ اس بات کے مکمل امکانات تھے کہ یہ آہٹیں ان کی ہوتیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ پلاسکن سپاہی ہیں اور یہی خیال ان کے ذہنوں میں جاگزین ہوتا۔ خاص طور سے اس آفیسر کا جملہ بہت خوفناک تھا اور ان لوگوں کو دہشت زدہ کئے ہوئے تھا جس نے کہا تھا کہ فرار ہونے والوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم انہیں جہنم سے بھی کھینچ لائیں گے۔ اس جملے نے ان پر خوف طاری کر رکھا تھا۔ پتا بھی کھڑکتا تو دل دہل جاتے۔ بہرحال ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا اور رات کی تاریکی ان کی معاونت کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور جنوب کی طرف ایک بلند پہاڑی ٹیلے تک کسی بڑی مصیبت کا سامنا کئے بغیر پہنچ گئے۔

یہاں کچھ ایسے آثار نظر آ رہے تھے جن سے شبہ ہوتا کہ یہاں ممکن ہے کوئی فوجی ٹھکانہ ہو۔ اُدھر جانا خطرناک تھا۔ جنگل میں پناہ تو لی جا سکتی تھی۔ چنانچہ انتہائی احتیاط سے انہوں نے مغرب کی جانب جانے کا فیصلہ کیا اور نجانے کتنی گھاٹیوں، خندقوں اور جھاڑ جھنکاڑ کو عبور کرتے ایک ایسے مقام پر جا نکلے جہاں یقیناً برسوں سے کسی انسان نے قدم نہ رکھا ہو گا۔ رات کا بقیہ حصہ ایک کھائی کے اندر گزرا۔ یہاں سانپوں اور زہریلے کیڑوں کا خطرہ تھا۔ لیکن پلاسکن محافظوں کے ہاتھوں عذاب سہنے کی بجائے یہ خطرہ مول لینا مناسب سمجھا گیا۔ ویسے خدا کا شکر تھا کہ کسی سانپ یا بچھو نے ڈسنے کی کوشش نہیں کی اور یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہو کر گہری نیند سو گئے۔

آنکھ کھلی تو بھوک کا احساس ہوا۔ بسکٹ موجود تھے۔ ابھی منہ چلا ہی رہے تھے کہ بالکل

قریب آہٹ ہوئی جیسے کوئی خشک پتوں پر چل رہا ہو۔ یہ آواز سن کر دہشت کے مارے سب سُن رہ گئے۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یہی خیال دل میں گزرا تھا کہ پلاسکن محافظ آ گئے۔ بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ دم سادھے پڑے رہے۔ چند لمحے بعد آواز اور قریب سے آئی اور یوں لگا جیسے کوئی کھائی کے اندر کودا ہو۔ روح کھنچ کر حلق میں آ گئی تھی اور کسی خوفناک حملے کا انتظار تھا کہ اچانک کسی نے انگریزی میں کہا۔

''اوہ تھینکس گاڈ! میں خود بھی ایک قیدی ہوں سر! اور بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ویسے مجھے آپ لوگوں کے بارے میں اندازہ تھا کہ آپ لوگ یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔''

یہ شخص ان کا چوتھا ساتھی بن گیا۔ اس کا نام فورک تھا۔ فورک ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی وردی پھٹی ہوئی، چہرہ خاک اور خون میں اٹا ہوا تھا لیکن آزاد ہو جانے کا تصور اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ لوگوں کو فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال میں اپنے ساتھ کچھ اشیاء بھی لایا ہوں۔ آپ کی خوراک میں حصہ نہیں لگاؤں گا۔ ویسے آپ لوگوں کا آئندہ پروگرام کیا ہے؟'' فورک خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا اور ڈیل ڈول سے انتہائی طاقتور۔ اس کی شرکت سبھی لوگوں نے پسند کی تھی۔ اس نے بے تکلفی سے اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھولا اور کچھ بسکٹ نکال کر منہ میں ڈال لئے۔ پھر وہ ایک طرف پلٹ گیا اور بولا۔

''میں رات بھر کا تھکا ہوا ہوں...... کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔ کیا آپ لوگ مجھے اس کا موقع دیں گے؟'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر کے بعد خراٹے لینے لگا۔

''عجیب آدمی ہے۔ جان ہی نکل گئی تھی۔'' ایڈورڈ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

سورج بلندیاں طے کر کے واپسی کے لئے جھکا تو وہ اٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیبوں سے نجانے کیا کیا چیزیں نکالیں۔ گھڑی، پنسل، ڈائری، کچھ سکے، کچھ نوٹ، ماچس کی ایک ڈبیہ اور تار کاٹنے کا ایک چھوٹا سا پلاس۔ نجانے پلاس جیسی خطرناک چیز اس نے پلاسکن محافظوں کی عقابی نظروں سے کیسے چھپائی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس نے بقیہ لوگوں کے سامنے رکھ دیں اور کہنے لگا۔

"دیکھو، غم مت کھاؤ۔ اب جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس میں واپسی کا تو کوئی تصور نہیں ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک کاغذ کا پُرزہ نکالا، اس پر پنسل سے نقشہ بنا ہوا تھا۔

"یہ نقشہ اس علاقے کا ہے اور میں نے اپنے حافظے کی مدد سے بنایا ہے۔" وہ یہاں موجود شہروں کے بارے میں تفصیل بتانے لگا، پھر بولا۔

"یہاں پلاسکن فوجیوں کے اڈے ہیں۔ صرف جنوب کا علاقہ ہے جو ہمیں پناہ دے سکتا ہے بشرطیکہ ہم احتیاط سے کام لیں اور سوچ سمجھ کر نقل و حرکت کریں۔ اب کیا کہتے ہیں، آپ اگر مجھے اجازت دیں تو میں ذرا قرب و جوار کی جاسوسی کرلوں تاکہ کوئی مناسب راستہ اختیار کیا جائے۔ آپ میری واپسی تک یہیں رہیں تو مناسب ہوگا۔" اور پھر وہ کسی گانے کی دھن سیٹی پر بجاتا ہوا چلا گیا۔

"کیا یہ آدمی پاگل نہیں ہے؟ وہ ہمیں کسی آفت میں نہ پھنسوا دے۔" لارک نے کہا۔

"ہاں...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان جنگلوں میں پکنک منانے آیا ہو۔ اگر ہم دوبارہ پلاسکن فوجیوں کے ہاتھ لگ گئے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو۔ اسے دیکھو، کیسے سیٹی بجاتا ہوا جا رہا ہے۔"

"ویسے حقیقت یہ ہے کہ اب پلاسکن فوجیوں کا ڈر نہیں رہا ہے۔" شہباز نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن...... اور جہاں تک فورک کا تعلق ہے وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ وہ ضرور کام آئے گا۔"

بہت دیر تک وہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد فورک دفعتہً ان کی پشت پر کسی چالاک درندے کی طرح نمودار ہوا۔ اس نے اپنے بھاری جوتے ایک ڈوری سے باندھ کر اپنے کندھے سے لٹکا رکھے تھے اور ان کی جگہ ربڑ کے بالکل نئے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی آہٹ نہیں سنی جا سکی تھی۔

"کیا خبر لائے؟" ایڈورڈ نے بے چینی سے پوچھا۔

"خبر یہ ہے کہ پلاسکن فوجی ہماری تلاش میں آنے والے ہیں اور ہمیں اس سے پہلے رفوچکر ہو جانا چاہیے۔"

"کک...... کیا مطلب؟" ایڈورڈ اور ہری سنگھ کی بدحواس آواز سنائی دی۔

"جب میں یہاں سے گیا تو ایک میل دور شمال کی طرف میں نے دو پلاسکن سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ تیزی سے اس طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ دراصل انہوں نے درمیانی پہاڑی پر طیارہ شکن توپیں نصب کر رکھی ہیں اور وہاں سپاہیوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ غالباً یہ دونوں سپاہی قیدیوں کے نکل بھاگنے کی خبر لے کر جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک چشمے پر پانی پینے اور ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ کمبختوں نے رائفلیں اپنے کندھوں سے نہیں اتاریں ورنہ بڑی آسانی سے دو رائفلیں ہمارے قبضے میں آ جاتیں۔ اور یہ ربڑ کے جوتے میرے ہاتھ لگ گئے اور میں ادھر بھاگ آیا۔ چلو اب یہاں سے چلنے کی فکر کرو۔"

وہ سب تیار ہو گئے۔ رات بہت تاریک تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ لوگ فورک کی رہنمائی میں اندھوں کی طرح جنوب کی طرف چلنے لگے۔ اس پُرہول سناٹے میں ان کے حواس بہت تیز تھے۔ بار بار ایسی آوازیں آتیں جن سے شبہ ہوتا کہ پلاسکن ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں اور یہ ٹھوکریں کھانے کی بجائے دیکھ بھال کر آگے چلنے کے قابل ہو گئے۔ کبھی کبھی جنگلی گیدڑ اور جنگلی خرگوش ان کے دائیں بائیں بھاگتے ہوئے غائب ہو جاتے۔ ان جانوروں نے انہیں بہت خوفزدہ کیا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر وہ جھاڑیوں کی طرف لپکتے اور پھر اپنی بدحواسی پر نادم ہو کر ہنسنے لگتے۔ فورک بندر کی طرح اچھلتا کودتا آگے بڑھ رہا تھا اور باقی افراد اس کے پیچھے پیچھے ہانپتے کانپتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتہً اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"لیٹو لیٹو...... جلدی سے زمین پر لیٹ جاؤ۔ وہ سامنے کھڑے ہیں۔" سب نے نظریں اٹھا کر دیکھا، کچھ فاصلے پر واقعی دھندلے دھندلے نقوش ابھر رہے تھے۔ فورک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ وہ اسے آواز دے کر خبردار کر سکتے۔ لیکن جب انہوں نے غور کیا تو دیکھا کہ یہ پلاسکن سپاہی نہیں بلکہ انسانی قد و قامت کے برابر جنگلی پودے تھے جنہیں ان کے خوف نے پلاسکن سپاہی بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔

اپنی اس حماقت پر انہیں بڑی شرم آئی۔ آگے فورک ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی بولا۔

"تم لوگ اگر اسی طرح خوف کھاتے رہے تو مجھے کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دو گے۔ بس تھوڑا سا سفر اور ہے۔ پھر کہیں آرام کریں گے۔ ویسے ان لوگوں نے یہاں جو مورچے بنائے ہیں ان مورچوں میں صبح دس بجے سے لے کر رات نو بجے تک کرفیو لگایا جاتا ہے۔ اور خلاف ورزی کرنے والوں کو گولی سے اُڑا دیا جاتا ہے۔ پلاسکن گاڑیاں قصبوں اور دیہاتوں میں مسلسل گشت کرتی رہتی ہیں۔ باغوں اور پارکوں کے گرد خاردار تاروں کی اونچی اونچی باڑیں لگا دی گئی ہیں اور ان کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے۔ البتہ یہ علاقہ کیونکہ دشوار گزار جنگل ہے اس لئے یہاں خاصی بہتر کیفیت ہے۔"

وہ لوگ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے معلوم ہوا کہ شیرون زیادہ دور نہیں ہے۔ کیونکہ پلاسکن فوجیوں کے ٹرکوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور انجنوں کی آوازیں سناٹے کو چیرتی ہوئی کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے اور تھکن کے باعث بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سب لوگ رک گئے۔

"بھئی اب نہیں چلا جاتا۔ تھکن اور نیند کے مارے برا حال ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں، پھر چلیں گے۔" لارک نے کہا۔

"آرام ہی کرنا تھا تو بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔" فورک نے کہا۔ "یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو پانچ منٹ کی مہلت لی جاسکتی ہے۔" اس شخص کے اندر حکمرانی کی فطرت تھی حالانکہ پلاسکن محافظوں نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ لیکن اب جب اسے آزادی ملی تو انہی لوگوں پر حکم چلانے لگا تھا۔ لیکن مخلص آدمی تھا اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ کارآمد بھی ہے۔ چنانچہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کر رہے تھے۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد اس نے چلنے کا حکم دیا لیکن ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی تھیں۔ پاؤں بے حد وزنی ہو گئے تھے۔ قدم رکھتے کہیں تھے اور جاتے کہیں اور تھے۔ اس وقت شہباز کو پتہ چلا کہ رکے بغیر مسلسل چلنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ عذاب حقیقتاً ناقابل برداشت تھا۔ ذہن ماؤف ہوئے جا رہے تھے۔ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کون سی جگہ ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ دوسروں کی

حالت کے بارے میں شہباز نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ لوگ فورک کی اس کیفیت کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ لیکن فورک تھا جو بار بار ان لوگوں کو سنبھالتا، برا بھلا کہتا، دھکے دیتا اور مسلسل آگے بڑھا رہا تھا۔

کبھی وہ کمپاس سے راستے کا اندازہ کرتا۔ چند لمحے سوچتا اور پھر نئے رخ سے چلنے لگتا۔ اس وقت نجانے کیا بجا تھا کہ وہ ایک بستی کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہ بستی پہاڑی کے دامن میں آباد تھی۔ مشرق کی طرف سے پو پھٹنے کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور جنگلی پرندوں کی آوازیں سر پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پناہ کہاں لیں۔ جس جگہ یہ لوگ کھڑے تھے اس جگہ سے سڑک سو گز دور تھی۔ اور قریب ترین مکان کا فاصلہ بھی پچاس ساٹھ گز ضرور ہوگا۔ گاؤں کے مشرقی حصے میں ایک نشیبی میدان تھا جہاں خشک گھاس کے اونچے اور بڑے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سب کی نگاہیں اس گھاس کی طرف اٹھ گئیں۔ اسی وقت فورک کی آواز سنائی دی۔

"چھپنے کے لئے بہترین جگہ۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں پانی نہیں ملے گا اور دن کے وقت نکل بھی نہیں سکیں گے۔ لیکن بہرحال دن نکلنے سے پہلے ہمیں اس میں چھپ جانا چاہئے۔"

سب لوگ گھاس کے قریب پہنچ گئے اور جلدی جلدی گھاس کے ڈھیر کو کھود کر ایک جگہ بنائی اور پھر اس کے اندر بسیرا کیا گیا۔

رات بھر جنگل میں بھٹکنے اور پھرنے سے جو سردی ان کے اندر سرایت کر گئی تھی، وہ گھاس کی گرمی نے زائل کر دی اور چند لمحوں کے بعد وہ بے خبر سو رہے تھے۔ لیکن ابھی بمشکل دو گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک عجیب سی زناٹے دار آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ یہ آواز کبھی مدھم ہو جاتی، کبھی بہت تیز، کبھی دور سے آتی کبھی قریب سے اور کبھی گھاس کے عین اوپر سے۔ ان کے دل خوف سے دھڑکنے لگے۔ فورک نے گھاس کے ڈھیر سے سر نکال کر دیکھا اور بولا۔

"ایک چھوٹا سا پلاسکن جہاز ہے۔ جو یقیناً ہماری تلاش میں اُڑ رہا ہے۔"

ابھی اس نے یہ جملہ ادا ہی کیا تھا کہ جہاز نے ایک غوطہ لگایا اور گرجتا ہوا ان کے اوپر سے گزر گیا۔

"خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو۔ انہیں شبہ ہوگیا ہے کہ یہاں کوئی چھپا ہوا ہے۔" لارک نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ڈرومت......" فورک پُراطمینان لہجے میں بولا اور اس نے وہ سوراخ بند کردیا جو اس نے طیارہ دیکھنے کے لئے بنایا تھا۔

"فرض کرو اگر انہیں پتہ چل بھی گیا تب بھی انہیں یہاں تک آنے میں وقت لگے گا۔ اتنے میں ہم کہیں کے کہیں جاچکے ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ طیارے کی یہ پرواز معمول کے مطابق ہوگی۔ اس لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اچھا بےفکر ہوکر سو جاؤ۔ میں ذرا باہر نکل کر تازہ آکسیجن سے اپنا پیٹ بھرلوں۔ اور خبردار، میری واپسی تک یہاں سے نکلنے کا تصور تک نہ کرنا۔"

عجیب آدمی تھا۔ شہباز کو اس کی دلیری پر ہنسی آرہی تھی۔ لیکن بہرحال اب اس کی فطرت بھی تبدیل ہوچکی تھی۔ اس طرح کے لوگ اسے پسند تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جہاز کی آواز بند ہوگئی تو فورک نے گھاس سے سر باہر نکالا اور اطمینان سے باہر نکل گیا۔

"عجیب مسخرہ آدمی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت ہوشیار ہے۔"

"بہتر ہے کہ سونے کی کوشش کرلی جائے۔"

لیکن بیس منٹ کے بعد ہی فورک واپس آگیا اور بولا۔ "یارو! قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ میں یہاں سے نکلا تو ایک پُرفضا باغ نظر آیا۔ اس باغ کے قریب ایک بڈھے کسان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ کمہار بھی ہے اور چاک پر برتن بنا رہا تھا۔ بڈھے نے جو تفصیل بتائی وہ یہ ہے کہ اس گاؤں کا نام اولک ہے اور شیرون یہاں سے چند منٹ دور ہے۔ پورے گاؤں میں 90 گھر ہیں اور آبادی چار سو افراد پر مشتمل ہے۔ پلاسکن سپاہی گاؤں کے اندر آج تک نہیں آئے۔ البتہ ہر روز ایک پلاسکن سپاہی موٹر سائیکل پر کھانے پینے کی چیزیں لے جاتا ہے۔ یہ سپاہی گاؤں میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ گھاس کے ڈھیر جن میں ہم چھپے ہوئے ہیں، محفوظ نہیں۔ میں نے بوڑھے کسان کو چھپنے کے لئے ایک کھتا دینے پر تیار کرلیا ہے۔ چنانچہ اب روانگی کے لئے تیار ہوجاؤ اور اپنی چیزیں سمیٹ لو۔"

سب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور چند منٹ بعد وہ اس کھتے میں کھڑے تھے۔ اس

میں شک نہیں کہ یہ بہت محفوظ اور آرام دہ جگہ تھی۔ اس کے مختلف حصے تھے۔ کہیں اناج بھرا ہوا تھا، کہیں مویشیوں کے لئے چارہ۔ انہوں نے گھاس کو اس ترتیب سے رکھا کہ خطرے کے وقت چند سیکنڈ اس میں چھپ سکیں۔

اس کے علاوہ کھتے کی دیواروں میں سوراخ بنالئے جہاں سے بڑی سڑک اور وہ راستہ دیکھا جاسکتا تھا جو کھتے کی طرف آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسان آگیا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے تقریر بھرے انداز میں جلدی جلدی کچھ کہا۔ جس کا مفہوم یہ بنتا تھا کہ اس سے زیادہ وہ ہماری مدد نہیں کرسکتا کیونکہ وہ خود پناہ گزین ہے اور کہیں اور سے یہاں آکر آباد ہوا ہے۔ خوراک کے علاوہ جو چیزیں اسے مل سکیں، مہیا کردے گا۔ بہرحال غنیمت بات تھی۔ چنانچہ دوپہر سے پہلے پہلے اس نے ان کے لئے تازہ روٹی، پنیر، انڈے، چاکلیٹ، چند برتن، ریزر، صابن اور تولیے مہیا کردیئے اور دودھ کے علاوہ اس علاقے کا ایک نقشہ بھی فراہم کردیا جس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔ یہ نقشہ ریلوے اور بس ٹائم ٹیبل کی پشت پر چھپا ہوا تھا اور اس میں بڑی بڑی سڑکوں کی نشاندہی کردی گئی تھی۔ البتہ جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ ان لوگوں کے لئے انتہائی مفید چیز تھی۔ اُس روز کئی دن بعد انہیں گرم پانی سے نہانے کا موقع ملا۔ پیٹ بھر کر لذیذ اور تازہ غذا کھانے کو ملی۔ رفتہ رفتہ ان کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ اس کے بعد آگے کی صورتحال پر غور کیا جانے لگا اور نقشے سے مدد لی گئی۔ وہ اپنی مطلوبہ جگہ یعنی ساحل سمندر پر جانے کے لئے راستوں کی ترتیب دینے لگے۔ جن جگہوں سے انہیں گزرنا تھا وہاں پلاسکو کے سپاہی تعینات تھے۔ نقشے کے مطابق اگر یہ لوگ ایک دریا کو عبور کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو بیڑا پار ہوسکتا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ یہ دریا ان کے لئے بہتر رہے گا۔ اگر وہ اس دریا کے ذریعے قریبی بستیوں اور آبادیوں تک پہنچ سکیں تو وہاں سے کشتی حاصل کی جاسکتی ہے اور کشتی مل جائے تو کمپاس سے سمت کا تعین کرکے سمندر تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ ایک مرتبہ کھلے سمندر میں پہنچ جانے کے بعد کوئی بھی جہاز انہیں پناہ دے سکتا ہے۔

کافی غوروخوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ تیسرا راستہ مناسب رہے گا۔ رات کو ساڑھے دس بجے یہ وہاں سے رخصت ہوئے۔ ان کا ارادہ دریا کو عبور کرنے کا تھا اور یہ اس مہم کی کڑی

منزل تھی۔ اس دوران انہوں نے اپنے بوڑھے میزبان سے معلوم کر لیا تھا کہ وہاں پُل پر کوئی حفاظتی دستہ موجود نہیں ہے۔ البتہ ایک پلاسکن سپاہی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر رات کو کئی مرتبہ اس پُل سے ایک اور پُل تک جو کئی فرلانگ دور ہے، چکر لگاتا رہتا ہے۔

آخر کار سفر کا آغاز کر دیا گیا۔ گاؤں سے قدم باہر نکالا تو ایک کتے نے بھونک کر انہیں رخصت کیا۔ رات کے پُر ہول سناٹے میں کتے کی آواز بڑی دہشت ناک تھی۔ ایڈورڈ نے کہا۔

"اس کتے کے بھونکنے کا شگون کچھ اچھا نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آئے گا۔"

لیکن اس بات پر فورک بری طرح بگڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "تو یوں کرو تم پیارے بھائی! کہ وہیں کھیتے میں آرام کرو۔ ہم لوگ چلتے ہیں۔"

"چھوڑو چھوڑو فورک! برا مت مانو۔ چلو آگے۔"

سڑک بالکل سنسان پڑی تھی لیکن انہوں نے اس پر چلنا مناسب نہ سمجھا اور سڑک پر اُگی ہوئی لمبی لمبی گھاس میں سے گزرنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ دوسرے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ تنگ گلیاں اور بازار دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دریا کی طرف سے سرد ہوا کے جھونکے بار بار چل رہے تھے۔ پُل ان کی نگاہوں کے سامنے تھا لیکن اس کے قریب ہی ایک پلاسکن ٹرک بھی کھڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر دہشت سے ان کا سانس رک گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں تو کافی سپاہی موجود ہوں گے۔" فورک نے کہا۔ اور پھر خود ہی بولا۔ "مگر سردی ہماری مدد کرے گی۔ تم دیکھتے ہو انہوں نے ٹرک کے چاروں طرف کینوس تارپولنگ ڈال رکھی ہے۔ خدا کرے وہ سو رہے ہوں۔ ہم آسانی سے پُل پار کر لیں گے۔ حالانکہ ہمیں اس منحوس موٹر سائیکل والے کا بھی خطرہ ہے۔ چلو آؤ......" دفعتہً ہی فورک رکا اور اس نے ان لوگوں کے پیروں پر نگاہ ڈالی۔ پھر سرد لہجے میں بولا۔

"کمال ہے یار! کمال ہے۔ تم لوگ تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اپنے گھر کے پارک میں سیر کرنے کے لئے نکلے ہو۔ ان جوتوں کی آوازیں سن رہے ہو تم؟"

سب کو ایک دم احساس ہوا کہ واقعی پختہ سڑک پر جوتے پہن کر چلنا بڑا خطرناک ہے۔

چنانچہ سب نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے اور دبے پاؤں آگے بڑھ گئے۔ جب وہ ٹرک کے قریب پہنچے تو فورک کے اشارے پر انہیں زمین پر لیٹنا پڑا اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ٹرک کے اندر سے خراٹوں کی بھیانک آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بے خبر سو رہے ہیں۔ پُل کی طرف اشارہ کر کے فورک تیزی سے انہیں دوڑانے لگا۔ پُل کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا اور پانی بہنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ہی ایک کرخت آواز اندھیرے میں گونجی۔

"ٹھہرو......کون ہو تم...... ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" یہ آواز نہ تھی جیسے پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ان کے کانوں میں اتر گیا۔ خون خشک ہو گیا۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ لہجہ زیادہ سخت تھا۔

"کون ہو تم......کوڈ ورڈ بتاؤ۔ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔" اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس کا اور ان کا درمیانی فاصلہ دس پندرہ گز سے زیادہ نہیں ہے۔ بھاگنے کی کوشش بے مقصد تھی۔ ان کے ہاتھ خود بخود اوپر اٹھ گئے۔ سامنے سے برقی ٹارچ روشن ہوئی اور انہوں نے لمبے تڑنگے پلاسکن سپاہی کو دیکھا جو اپنی رائفل سے نشانہ لئے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹارچ رائفل کی نال پر فٹ کر رکھی تھی۔ وہ ان سے پانچ گز کے فاصلے پر رک گیا اور روشنی ان کے چہروں اور جسموں پر پھینک کر ان کا اچھی طرح جائزہ لینے لگا۔ پھر کرخت لہجے میں بولا۔

"گاؤں سے آئے ہو کیا؟ تمہیں معلوم نہیں کہ اس وقت کرفیو لگا ہوا ہے۔"

"وہ سر جی...... ہم سر جی ہم...... مچھلیاں پکڑنے والے ہیں۔" ایڈورڈ نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا اور وہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان کے بالکل قریب آ گیا۔ اس نے جوتے کی دو تین ٹھوکریں ایڈورڈ کے ٹخنے پر ماریں۔ وہ بلبلا اٹھا۔

"اپنا منہ دوسری طرف کرو اور ہاتھ اوپر اٹھا لو اور سیدھے آگے چلو۔ ورنہ کھوپڑی اُڑا دوں گا۔" اس نے ٹارچ بجھا دی اور رائفل کی سنگین ان کے سینے کی طرف بڑھا کر چلنے کا اشارہ کیا۔ عین اسی وقت پیچھے کوئی تحریک ہوئی اور شہباز نے فورک کو دیکھا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر گھاس میں دبکا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور وہ اب گھاس میں سے اچانک نکلا تھا۔ پھر اس نے چیتے جیسی پھرتی سے پلاسکن سپاہی پر چھلانگ لگائی اور اپنی دونوں لاتیں اس زور

سے اس کی پشت پر ماریں کہ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا کئی فٹ دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس سے پیشتر کہ وہ اٹھے، شہباز بھوکے درندے کی طرح اس سے لپٹ گیا اور دوسروں نے بھی اس کی مدد کی۔ اس کی گردن اور منہ دبا دیا گیا۔ پھر تھپڑ، لات، گھونسے...... وہ چند ہی لمحوں میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

''جلدی کرو...... اسے اٹھا کر گھاس میں لے جاؤ۔ موٹر سائیکل کی آواز آ رہی ہے۔ ٹرک میں سونے والے سپاہی اٹھ جائیں گے۔ رائفل مجھے دے دو۔ جلدی کرو۔'' فورک نے رائفل سنبھالی اور کارتوسوں کی پیٹی اتار کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ موٹر سائیکل کی پُرشور آواز اندھیرے اور سناٹے کو چیرتی ہوئی قریب آ رہی تھی۔ پھر انہوں نے اس کی اگلی بتی بھی دیکھ لی۔ وہ بے ہوش سپاہی کو اٹھا کر ہانپتے کانپتے گھاس کے اندر لے گئے تھے۔ ایڈورڈ نے اس کا منہ سختی سے دبا رکھا تھا۔ کیونکہ خدشہ تھا کہ وہ کہیں ہوش میں آ کر شور نہ مچا دے۔ اچانک ہی شہباز نے اپنے دائیں شانے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ یہ فورک تھا۔ اس نے انگلی لبوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور رائفل سے موٹر سائیکل پر آنے والے سپاہی کا نشانہ لینے لگا۔ موٹر سائیکل ٹرک سے گزر کر پُل کی طرف آ رہی تھی۔ انہوں نے اس کی ہیڈ لائٹ میں دیکھا کہ ٹرک میں سے کوئی محافظ باہر نہیں نکلا۔ شاید وہ موٹر سائیکل والے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور یہ تو انہیں معلوم ہی تھا کہ پُل پر ان کا ایک ساتھی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ اس لئے وہ اٹھنے کی زحمت کیوں برداشت کرتے۔ موٹر سائیکل ان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر رک گئی۔ آنے والے نے اس کی لائٹ بجھائی اور اتر کر پُل کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے اپنے خاص انداز میں آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ تین مرتبہ پکارنے کے بعد اسے کچھ شک گزرا تو وہ جلدی سے موٹر سائیکل کی طرف لپکا لیکن فورک اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ رائفل دیکھتے ہی پلاسکن سپاہی نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ چند لمحے کا وہ وقفہ جس میں دو دشمن ایک دوسرے کو گھور رہے تھے، یادگار وقفہ تھا۔ سب کی توجہ اس کی طرف تھی۔ اچانک بے ہوش پڑے ہوئے سپاہی نے لارک کے منہ پر لات جمائی اور لارک الٹ کر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ ایڈورڈ اسے پکڑے، وہ چیختا ہوا ٹرک کی طرف دوڑا۔

''اسے جانے دو...... تم ادھر آؤ۔'' فورک حلق پھاڑ کر چلایا اور یہ لوگ بدحواسی میں

فورک کی طرف بھاگے۔ فورک نے رائفل کا کندھا زور سے اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکلی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

''دوڑو...... تم دونوں پُل کے پار میرا انتظار کرو۔ یہ لو رائفل۔'' اس نے رائفل شہباز کی جانب اچھال دی اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر دیا۔ اتنی دیر میں یہ لوگ پُل پار کر چکے تھے۔ فورک نے پُل کے اس طرف آ کر موٹر سائیکل کی ٹینکی کھولی اور اسے نیچے گرا دیا۔ لکڑی کے پُل پر پٹرول بہنے لگا۔ پھر اس نے ماچس کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور رگڑ کر پٹرول پر پھینک دی۔ پُل دھڑ ادھڑ جلنے لگا۔

شہباز کو نریمان فرازی یاد آ گیا۔ وہ بھی اسی قدر ذہین اور باعمل آدمی تھا۔ فورک ان پر مسلط ہونے کی کوشش ضرور کر رہا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کام بھی اتنے ہی زبردست دکھا رہا تھا۔ سب ہی اس وقت اس کی پھرتی اور دور اندیشی پر عش عش کر رہے تھے کہ ٹرک والے سپاہیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ وہ دوڑتے ہوئے پُل کی طرف آ رہے تھے لیکن اس دوران پُل پوری طرح آگ پکڑ چکا تھا اور آگ کے اونچے اونچے شعلوں نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔

''ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام تک پہنچنا ہو گا۔'' فورک نے اطمینان سے کہا۔ اب سڑک پر جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔ وہ وائرلیس کے ذریعے اگلی چوکی کو ہمارے بارے میں اطلاع دے چکے ہوں گے۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا۔

''آؤ دریا کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔ ادھر دلدلی میدان معلوم ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنی جیپ، گاڑیاں اور ٹرک لانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور اِکا دُکا سپاہیوں سے یہ رائفل نمٹ لے گی۔ اس وقت سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں تھا چنانچہ سب دریا کے ساتھ ساتھ دلدلی زمین پر دوڑنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد جلتا ہوا پُل ان کی نگاہوں سے دور ہو چکا تھا لیکن فائرنگ کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ وہ دریا کے بائیں کنارے پر تقریباً ڈیڑھ میل تک بھاگتے چلے گئے۔ رات کے تین بج رہے تھے اور حال یہ تھا کہ سانس سینے میں نہیں سماتا تھا۔ بدن کیچڑ سے لت پت تھے۔ گھنی جھاڑیوں کو پھلانگتے اور ان میں سے گزرتے ہوئے کانٹوں نے جس طرح انہیں چھیلا وہ الگ لیکن رکنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ دشمن ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ اور وہ انہیں جہنم سے بھی کھینچ لانے کا

دعویٰ کرتے ہیں۔سورج نکلنے سے پہلے پہلے انہیں لازمی طور پر کسی اچھی پناہ گاہ میں چھپ جانا چاہئے تھا ورنہ وہ انہیں گھیر کر آوارہ کتوں کی طرح مار ڈالتے۔آخر کار وہ کسی ایسے مقام پر جا نکلے جہاں ایک گہری کھائی تھی۔خیر گزری کہ پچھلے پہر کا چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں یہ کھائی نظر آ گئی تھی ورنہ ان کی ہڈیوں کا سراغ بھی نہ ملتا۔سامنے کھائی تھی اور دائیں بائیں گہری دلدلیں۔فورک کی طرف نگاہیں اٹھ گئیں۔وہ اس کی حاضر دماغی سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ایک لمحے کے لئے فیصلہ کیا کہ واپس چلا جائے۔سورج نکلنے میں ابھی دو گھنٹے اور باقی ہیں۔اس دوران ممکن ہے کوئی اور راستہ مل جائے۔شہباز کی تجویز یہ تھی کہ تیر کر دریا عبور کیا جائے اور گاؤں میں پہنچ کر کسی کے گھر میں پناہ لی جائے اور پھر نئی مہم کا آغاز کر دیا جائے۔اس دوران سپاہی ان کی تلاش میں ناکام ہو جائیں گے۔

بہرحال فورک کو ان تجویزوں سے اختلاف تھا۔اس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنی تجویز پیش کی۔

"ہم واپس جا سکتے ہیں نہ تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچنا مفید ہو گا۔البتہ تیسرا راستہ کھلا ہے۔اور ہمارے لئے یہی بہترین پناہ گاہ ہے۔"

"کیا یہ کھائی؟" ایڈورڈ نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں"

"پاگل ہو...... کھائی میں اترنا آسان ہے۔لیکن یہ بھی تو سوچو ہم اس میں سے نکلیں گے کس طرح؟"

"اگر تم لوگوں نے یہ نقشہ غور سے دیکھا ہوتا تو سب کچھ تمہاری کھوپڑی میں آ جاتا۔" فورک نے نقشہ پھیلایا اور اسے جھک کر دیکھا جانے لگا۔

"یہ دیکھو، یہی ہے وہ سڑک جس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن گزرتی ہے۔اس لائن تک پہنچنا ہے۔خواہ راستے میں کھائی ہو یا سمندر یا ریگستان۔اور یہ ہے وہ مقام جہاں اس وقت ہم موجود ہیں۔افسوس ہے کہ نقشہ بنانے والے نے یہاں کھائی واضح نہیں کی۔بہرحال یہ کم از کم چار پانچ میل لمبی دو سو فٹ گہری اور آدھے فرلانگ چوڑی ہے۔اگر ہم ہمت سے کام لیں تو اس میں اترنے اور چڑھنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔سپاہی ہمارے تعاقب میں آ رہے ہوں گے اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بہت جلد یہاں تک پہنچ

جائیں۔"

کھائی میں اترنا واقعی جان جوکھوں کا کام تھا۔شہباز گہری نگاہوں سے وہاں کا جائزہ لے رہا تھا۔یہ کام واقعی اس کے لئے مشکل نہیں تھا لیکن بہرحال باقی لوگوں کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ابھی بقیہ افراد اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ آسمان پر بادل گرجنے لگے اور بارش کے ساتھ موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔بادل نخواستہ انہوں نے ایک مٹی کے ٹیلے کے نیچے پناہ لی۔لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایسا احساس ہوا کہ ٹیلا آہستہ آہستہ کھسک رہا ہے۔بروقت وہاں سے نکل پڑے تھے ورنہ کیا ہوتا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

ان کے ٹیلے سے باہر نکلتے ہی ٹیلا ایک ہولناک آواز کے ساتھ کھائی کے اندر جا گرا۔بڑے خوفناک دھماکے ہوئے تھے۔سب کے دل لرز کر رہ گئے۔کچھ لمحوں کی تاخیر ہو جاتی تو جو کچھ ہونا تھا وہ نگاہوں کے سامنے تھا۔بہرحال بمشکل تمام ایک نشیب میں پناہ لی گئی۔لیکن بارش کا پانی بڑی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔پانی اس زوردار آواز کے ساتھ اوپر سے گر رہا تھا کہ اردگرد کی تمام نرم زمین پھٹتی جا رہی تھی۔فوراً ہی وہ جگہ بھی چھوڑ دی گئی۔اور اب بارش سے بچنے کے لئے اندھی کھائی کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔

دفعتہً ہی ایک ہلکی سی آواز فضا میں ابھری اور ان کے چہرے خوف کی تصویر بن گئے۔فورک نے سب کو خاموش کیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔پھر اس کی سرگوشی ابھری۔

"اوہو...... یہ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔" بارش کے طوفان کی وجہ سے ٹینکوں کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔لیکن اب آہستہ آہستہ ان کی آواز واضح ہوتی جا رہی تھی۔

فورک بولا۔"کھائی میں اترنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔وہ تینوں طرف سے ہمیں گھیرے میں لے چکے ہیں۔یقیناً ان کا خیال ہو گا کہ ہم کھائی کو عبور نہیں کر سکیں گے۔لیکن یہ بارش ہماری دوست ثابت ہوئی ہے۔میری انگلی سنبھالو۔میں نے ایک جگہ دیکھ لی ہے۔بادل چھٹتے ہی ہم اس میں اتریں گے۔ان لوگوں کو یہاں تک آنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگے گا کیونکہ ٹینکوں کے لئے راستہ ہموار نہیں ہے۔پانی بھی ان کا راستہ روکے گا۔آؤ میں تمہیں وہ جگہ دکھاؤں۔کھائی کا یہ حصہ زیادہ گہرا ہے لیکن اس میں اترنے کے لئے جگہ موجود ہے۔ذرا اس ابھرے ہوئے وسیع ٹیلے کو دیکھو۔اگر ہم یہاں سے اس پر کود جائیں تو کھائی کا بقیہ حصہ آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔"

فورک نے جس ٹیلے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ پچیس فٹ نیچے کھائی کی عمودی دیوار میں سے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پچیس فٹ لمبی چھلانگ لگائی جائے۔ پچیس فٹ نیچے کودنا شہباز کے لئے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کھائی میں نیچے اترنے کے لئے اس کی نگاہوں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بہت اچھا تھا۔ وہ اپنے لچکیلے، پھرتیلے بدن کو با آسانی نیچے گہرائیوں تک لے جا سکتا تھا لیکن بات اس وقت صرف اس کی اپنی ذات کی نہیں تھی، دوسرے لوگ پریشان تھے۔ لارک نے کہا۔

''فرض کرو، ہم اس ٹیلے پر کود بھی گئے تب بھی ہڈیاں وغیرہ تو چٹخیں گی۔''

''ہاں...... ایسا ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ایک اور تدبیر آئی ہے۔ تم لوگ ذرا اپنے اپنے کپڑے اتارو اور وہ کمبل بھی مجھے دے دو۔''

سب نے فورک کی ہدایت پر عمل کیا اور یہ تمام چیزیں ایک ایک کر کے اس ٹیلے پر پھینک دی گئیں۔

''اب چوٹ زیادہ نہیں لگے گی۔'' فورک بولا۔

ٹینکوں کی آواز واضح تھی اور آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ بادل چھٹ رہے تھے اور بارش ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مشرقی اُفق پر روشنی کا ایک ہالہ سا بن رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی کئی ٹینک مدھم سایوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ بہرحال فورک کے اشارے پر سب نے آنکھیں بند کیں اور ایک ایک کر کے ٹیلے پر کود گئے۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ ٹیلے پر گرنے کے بعد ان کے ہوش وحواس برقرار رہے۔ زناٹے دار ہوا چل رہی تھی اور خطرہ تھا کہ اگر نیچے کودنے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو کھائی کی گہرائیوں میں ہی ٹھکانہ بنے گا۔ لیکن بہرحال کامیابی یہاں سے ہو گئی تھی اور چند لمحوں کے بعد نئی اور انتہائی نازک صورتحال سامنے آ گئی۔ پلاسکن فوجی ان کے سر پر پہنچنے والے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ رسوں کے ذریعے کھائی میں اترنے کی کوشش کریں۔

ادھر جب یہ لوگ نیچے جھانکتے تو ان کی روح لرز کر رہ جاتی۔ کھائی کئی سو فٹ گہری تھی اور اگر ذرا سی لغزش ہوتی تو با آسانی نیچے جا سکتے تھے۔ اوپر جانے کا تو اب خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ نہ ان کے پاس رسے تھے اور نہ کھائی پر پیر جمانے کی جگہ بنانے کے لئے کیلیں اور ہتھوڑے وغیرہ۔ کھائی کی تہہ میں بارش کا پانی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ گویا نیچے

اترنے کی ہر کوشش ناکام ہو سکتی تھی۔ فورک نہایت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ شہباز نے پہلی بار اس کے چہرے پر خوف کے آثار پائے۔ مٹی کا وہ ٹیلہ جس پر یہ لوگ کودے تھے، دو فٹ چوڑا اور پانچ فٹ لمبا تھا۔ جس مقام سے یہ ٹیلا کھائی کی دیوار میں ابھرا تھا، وہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ صرف ایک آدمی چھپ کر بیٹھ سکے اور اوپر سے دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ اوپر سے با آسانی ان سب کو دیکھا جا سکتا تھا اور وہ لوگ انہیں تیزی سے گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ آخر کار فورک نے ٹیلے کے ہر حصے کا بغور جائزہ لیا۔ اس نے رائفل پر چڑھی ہوئی سنگین اتاری اور ایڈورڈ کی طرف بڑھا دی۔

''تم ٹیلے کے اس حصے کو کھود کر بڑا کرنے کی کوشش کرو جہاں ایک آدمی کے چھپنے کی گنجائش ہے۔ میرا خیال ہے مٹی نرم ہے۔ ذرا احتیاط سے کھودو گے تو ذرا سی دیر میں کشادہ جگہ بن جائے گی۔ جلدی کرو...... وہ لوگ بس پہنچنے والے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے رائفل سنبھالی اور ٹیلے کے بائیں جانب دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''تم ایڈورڈ کی مدد کرو ہری سنگھ! اور مٹی آہستہ آہستہ کھائی میں پھینکتے جاؤ۔ لیکن ایسے نہیں کہ انہیں اوپر ہی سے پتہ چل جائے۔''

ایڈورڈ انتہائی مشقت کے ساتھ مٹی کھود رہا تھا۔ اس کے طاقتور بازو مشین کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ تین منٹ کے اندر اندر اس نے مزید تین فٹ کی جگہ نکال لی۔ اب اس میں دو آدمی سما سکتے تھے۔ اچانک ہی کھائی کے اوپر پلاسکن سپاہیوں کے بولنے کی آواز سنائی دی اور پاؤں کے جوتوں کی آواز ابھری۔ وہ انہیں تلاش کر رہے تھے۔ ایک افسر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''میں دعوے سے کہتا ہوں وہ یہیں ہیں۔ دیکھو، یہ ان کے جوتوں کے نشانات۔ وہ ضرور کھائی میں اترے ہیں۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔ چلو آگے بڑھو۔''

ان کے وجود پتھرا گئے تھے۔ فورک نے دو آدمیوں کو سوراخ کے اندر گھس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خود دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا تھا۔ یہ لوگ تین فٹ لمبے اور چار چار فٹ چوڑے سوراخ کے اندر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ ان کی نگاہیں کھائی کے کناروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک پلاسکن سپاہی نے نیچے جھانکا۔ اس کی نگاہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھائی کا جائزہ لینے کے بعد اچانک اس ٹیلے پر جم گئی۔ اس نے فورک کو

دیکھ لیا تھا۔ ابھی وہ چیخنے کے لئے منہ کھول ہی رہا تھا کہ فورک کی رائفل نے شعلہ اگلا اور دوسرے ہی لمحے وہ قلابازیاں کھاتا ہوا اندرونی وسعتوں میں غائب ہو گیا۔ ایڈورڈ بدستور مٹی کھود رہا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"فورک! اندر آ جاؤ...... اب تمہارے لئے بھی جگہ نکل آئی ہے۔" فورک نے یہ الفاظ سنے تو تیزی سے کھسکتا ہوا ان لوگوں کے نزدیک آ گیا۔ اسی لمحے اوپر سے پلاسکن سپاہیوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور گولیاں ٹیلے کو ادھیڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور پلاسکن سپاہی نے جھانک کر ٹیلے کی طرف دیکھا، اپنے افسر سے کچھ کہنے کے لئے گردن گھمائی ہی تھی کہ فورک کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر گئی۔ ایک لرزہ خیز چیخ کے ساتھ وہ بھی کھائی کی سیر کرتا ہوا نظر آیا۔ پھر چند ہی لمحات کے بعد انہوں نے ٹینکوں کے واپس جانے کی آواز سنی۔

ٹینکوں کے جانے کے بعد ان کی جان میں جان آئی۔ فورک کے چہرے پر البتہ بدستور تشویش کے آثار تھے۔ اس نے باہر سرک کر دو تین مرتبہ اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی پلاسکن سپاہی کھائی کے اوپر چھپا ہوا نہیں ہے تو اس نے ان لوگوں کو بھی باہر آنے کا اشارہ کر دیا۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کھائی میں اترا کیسے جائے۔ کیونکہ پلاسکن سپاہی کسی بھی وقت دوبارہ نمودار ہو سکتے تھے۔ جس ٹیلے پر ان لوگوں نے پناہ لی تھی اس سے بارہ فٹ نیچے ایک اور ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں ایسی جگہ نظر آ رہی تھی جن پر پاؤں رکھ کر وہ احتیاط سے نیچے اتر سکتے تھے۔ بارش کی وجہ سے کھائی کی دیواریں گیلی اور چکنی ہو چکی تھیں اور ویسے بھی تہہ کے اندر پانی بڑی مقدار میں جمع ہو چکا تھا۔ ان حالات میں اس انداز میں نیچے اترنا حماقت تھی۔

"یہ بہت برا ہو گیا ہے۔" فورک نے کہا۔ "اگر وہ دوبارہ آ گئے تو ہم کتے کی موت مارے جائیں گے۔"

"خیر، مرنا تو ہر صورت میں ہے۔" ایڈورڈ نے کہا۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چند لمحات کے لئے مکمل خاموشی رہی، پھر فورک ہی بولا۔ "بہر حال، موت کو تو ایک بار آنا ہے۔ جہاں کہیں بھی آ جائے۔ لیکن زندگی تلاش کرتے رہنا چاہئے۔ ذرا یہ کمبل اور وہ کپڑے تو مجھے دو۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر ٹیلے کا

جائزہ لیا اور پھر رائفل سے سنگین اتار کر کمبل کی لمبی لمبی پٹیاں کاٹنے لگا۔ سب لوگ خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان پٹیوں کے سروں میں اس نے گانٹھیں باندھ کر خود ساختہ رسہ نیچے لٹکایا اور سنگین کے ایک سرے میں پرو کر آدھے سے زیادہ حصہ ٹیلے کے اندر گھونپ دیا جس کے اوپر یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر ہم ذرا سی ہمت کریں تو اس کھائی کے اندر اتر سکتے ہیں۔ پانی ایک گھنٹے کے اندر اندر جذب ہو جائے گا۔ آؤ اب دوسرے ٹیلے پر پہنچیں۔"

فورک کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ کھائی کا پانی ایک گھنٹے سے بھی پہلے خشک ہو گیا۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ کمبل کے بنائے گئے رسے پر پھسلتے ہوئے دوسرے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہاں سے مزید نیچے اترنے کے لئے انہیں دوپہر کا انتظار کرنا تھا۔ اس دوران ایک چھوٹا ہوائی جہاز کئی بار کھائی کے اوپر سے گزرا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس قدر نیچے اُڑا کہ انہیں یوں لگا کہ جیسے پائلٹ ان پر گولیاں برسانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ فورک نے کہا۔

"نہیں...... وہ صرف ہماری نگرانی کر رہا ہے۔ اور ان سے بچنے کے لئے ہمیں آج سورج غروب ہونے سے پہلے اس کھائی کو عبور کرنا ہو گا۔"

دو سو فٹ گہری کھائی میں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ لوگ نیچے اترے وہ ایسا بھیانک تجربہ تھا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کا ایک ساتھی آسانی سے نیچے اتر سکتا ہے اور اس کے لئے یہ تجربہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جس انداز میں اس نے رازل جریری کو تلاش کرنے کے لئے برف کی گہرائیوں کا سفر کیا تھا وہ ناقابل تصور تھا۔ بہر حال ان کے جسموں پر جابجا خراشیں آ گئی تھیں اور ہاتھ سوج گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کیچڑ میں لت پت بھوت بنے ہوئے تھے۔ کھائی کے اندر ہی اندر کئی فرلانگ سفر طے کیا گیا۔ ایک جگہ یہ کھائی کئی شاخوں میں بٹ گئی تھی لیکن وہ دم لئے بغیر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک مقام پر دلدل میں دفن ہوتے ہوتے بچے، سانپوں کے نرغے میں پھنسے۔ لیکن زندگی ابھی باقی تھی۔ ان تمام آفتوں اور سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر کار انہیں ایک سطح ایسی نظر آ گئی جہاں سے سطح آہستہ آہستہ اونچی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض

میدان میں پایا۔ جہاں کہیں کہیں بارش کا پانی جوہڑوں کا چھوٹے تالابوں کی شکل میں جمع ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں گہری دلدل تھی اور کہیں خشک اور خاردار جھاڑیاں۔ فوجی ٹرکوں اور گاڑیوں کے نشان جابجا پھیلے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ادھر گاڑیوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ سورج چھپنے کے بعد بھی انہوں نے سفر ترک نہ کیا۔ فورک کھائی میں اترتے وقت دو مرتبہ گرا تھا اور اس کی حالت ان سے کہیں بدتر تھی۔ لیکن وہ واقعی ایک باہمت انسان تھا۔ ایڈورڈ بار بار کمپاس سے راستے کی نشاندہی کرتا اور باقی افراد بھی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کتنا فاصلہ طے کیا اور اس کے بعد ایک بلند پہاڑی کے آثار دکھائی دیئے جس کے چاروں طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی سٹی گم ہوگئی کہ پہاڑی کے اردگرد پلاسکن گاڑیاں حرکت کر رہی تھیں۔

اندھیرے میں وہ لوگ ٹھوکریں کھاتے گرتے پڑتے پھر واپس ہوئے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر ایسی جگہ آ نکلے جہاں کچھ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ لیکن ان جھونپڑیوں میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ایک خالی جھونپڑی میں گھس کر وہ فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ بدن تھے کہ پھوڑے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ زمین پر لیٹنے کے بعد ایک لمحے کے اندر اندر انہیں نیند آ گئی۔ پھر باقی وقت کیسے گزرا یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ البتہ جب ان کی آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ اردگرد کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ جس پہاڑی سے یہ لوگ دور بھاگے تھے وہ تین سوگز کے فاصلے پر ان کے سامنے موجود تھی۔ سپاہیوں کی آوازیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ فورک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''خدا انہیں جہنم رسید کرے۔ کم بختوں نے پہاڑیوں پر ہی مورچے بنا رکھے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے اپنی دوربین آنکھوں سے لگا لی تو ہم دیکھ لئے جائیں گے۔ دیکھو انہوں نے اینٹی ایئر کرافٹ گنیں بھی نصب کر رکھی ہیں۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزیں قریبی کسی گاؤں سے لاتے ہوں گے اور دن بھر ان جھونپڑیوں کے آگے سے نجانے کتنی مرتبہ گزرتے ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے فوراً ہٹ جانا چاہئے۔

پہاڑی پر چہل پہل ہو چکی تھی اس لئے بہت زیادہ احتیاط برتنا تھی۔ وہ لوگ چلنے کی بجائے رینگتے ہوئے جھونپڑی سے نکلے اور ایک گھنٹے کی فنا کر دینے والی جدوجہد کے بعد تقریباً دو سوگز ہٹ کر ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

یہاں دلدلی زمین پر قدآدم گھاس اُگی ہوئی تھی۔ زمین اس قدر نرم نہیں تھی کہ اس میں بدن دھنس جائیں۔ یہاں رُکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جھاڑیوں کے اندر اپنے ٹھکانے بنا لئے۔ بھوک اور تھکن سے وہ نڈھال ہو رہے تھے۔ کھانے کے لئے بسکٹ اور پنیر کے چند ٹکڑے باقی تھے اور ان سے کچھ نہیں بن سکتا تھا۔ چنانچہ ان ٹکڑوں کے کھانے سے بھوک اور تیز ہو گئی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ آس پاس کوئی جوہڑ بھی نہیں تھا۔ اس ڈھلوان علاقے میں پانی بھلا کہاں رکتا۔ ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد انہوں نے نقشہ سامنے پھیلایا اور ''بچاؤ'' کی تدبیر پر از سرِنو غور کرنے لگے۔

شہباز اپنی زندگی کے اس انوکھے موڑ پر ہنس رہا تھا۔ بہرحال فورک اس وقت ایک بہت اچھا رہنما ثابت ہو رہا تھا۔ شہباز کا تو مسئلہ ہی بالکل مختلف تھا۔ بہرحال یہ اندازہ ہو گیا کہ تمام علاقے پر پلاسکن فوجی پھیلے ہوئے ہیں۔ کھائی سے لے کر اس پہاڑی کا درمیانی فاصلہ تقریباً آٹھ میل تھا اور اب یہ لوگ کھائی کے دوسرے کنارے پر سفر کر رہے تھے۔

ایڈورڈ کا خیال تھا کہ اگر کوئی گاؤں نزدیک ہو گا تو مقامی باشندوں سے مدد حاصل ہو جائے گی۔ کھانے پینے کا سامان لے کر ہی آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ دن کا وقت انتہائی خطرناک تھا اس لئے رات کے ایک بجے کے لگ بھگ جب جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، وہ لوگ اپنی کمین گاہوں سے باہر نکلے اور سایوں کی طرح اس پگڈنڈی پر چلنے لگے جو چکر کھا کر پہاڑ کے عقب میں گم ہو جاتی تھی۔ گاؤں تک پہنچنے کے لئے انہیں بہرحال اس مورچے کے قریب سے گزرنا پڑتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ دل کڑا کر کے نہایت حوصلے اور استقلال کے ساتھ یہ لوگ آگے بڑھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ پلاسکن فوجیوں کے مورچے اس قدر قریب تھے کہ پہاڑی کے چاروں طرف لگے ہوئے لکڑی کے کھمبے اور خاردار تار صاف نظر آ رہے تھے۔

پلاسکن سپاہی بیس بیس گز کے فاصلے سے پہاڑی کے اردگرد پہرہ دے رہے تھے۔ وہ اپنی حد میں ٹہلتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ لوگ کچھوے کی طرح زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ان کی آنکھیں انہی پہریداروں پر لگی ہوئی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ ذرا سی آہٹ پاتے ہی بے شمار گولیاں ان کے جسموں میں پیوست ہو جائیں گی۔ بہرحال سورج کی پہلی کرن سے کچھ دیر پہلے یہ بل کھاتی ہوئی

کچی سڑک پر جا نکلے۔ اب ان کی ہمتیں بالکل ٹوٹ چکی تھیں چنانچہ وہ وہیں گھاس کے اندر لیٹ کر ہانپنے لگے۔ اچانک ہی ان کے کانوں میں موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ ایڈورڈ نے سر اٹھا کر دیکھا، دور پہاڑی کی جانب سے روشنی کا ایک ننھا سا دھبہ ان کی طرف آ رہا تھا۔

"یہ یقیناً کوئی پیغام رساں ہے۔" فورک نے کہا۔

"ممکن ہے اس کے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہوں۔" شہباز نے کہا اور پھر بولا۔ "جلدی کرو...... پگڈنڈی کے عین درمیان بے ہوش بن کر لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یہاں سے گزرے گا۔ باقی کام میں سنبھال لوں گا۔"

"اگر وہ مجھ پر توجہ دیئے بغیر نکل گیا تو؟" ایڈورڈ نے پوچھا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ دیکھا جائے گا۔"

ایڈورڈ نے خوفزدہ نگاہوں سے شہباز کو دیکھا۔ شہباز نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لئے کہا اور خود سڑک کے عین درمیان لاش کی طرح لیٹ گیا۔ موٹر سائیکل کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اور پھر وہ شہباز کے بالکل سر پر آ گئی۔ شہباز نے کن انکھیوں سے دیکھا، فوجی اسے وہاں پڑے دیکھ کر بڑبڑایا۔ شاید گالی دے رہا ہوگا۔ انجن بند کئے بغیر وہ موٹر سائیکل سے اترا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا شہباز کے پاس پہنچا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ شہباز زندہ ہے یا مُردہ، اس کے دل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شہباز کا دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ الٹ گیا۔ اتنے میں ایڈورڈ اور فورک بھوکے چیتوں کی مانند اس پر جھپٹے اور ایڈورڈ کے چند ہی گھونسوں نے اسے بے جان کر دیا۔ اس کی تلاشی لی گئی۔ فورک نے فوراً ہی اس کا پستول اپنے قبضے میں لے لیا اور کارتوسوں کی پیٹی بھی نکال لی۔ اس کے بعد اس کے مشورے پر وردی بھی اتار لی گئی۔

یہ لوگ اسے گھسیٹ کر گھاس مین لے گئے۔ ایڈورڈ نے موٹر سائیکل کا انجن بند کیا اور اسے ایک گہرے کھڈ میں پھینک دیا۔ بدنصیب سپاہی کی وردی اتار کر انہوں نے اسے بالکل برہنہ کر دیا۔ اس کے پاس کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ بس شراب کی ایک بوتل لفافے میں رکھی ہوئی اور چند سینڈوچز، ایک کنگھا، آئینہ اور شیو کا سامان، ٹارچ اور کچھ کاغذات جن پر پلاسکن زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی پیٹی سے اس کے ہاتھ

پاؤں باندھ کر اسے سڑک کے کنارے لٹا دیا۔ پھر جلدی جلدی بوتل کھولی اور ایڈورڈ وغیرہ ایک ایک گھونٹ شراب پینے لگے۔ البتہ سینڈوچز میں اس نے اپنا حصہ وصول کر لیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شخص قریبی گاؤں سے انڈے اور سینڈوچز لینے جا رہا ہوگا۔ اگر ہم اس پگڈنڈی پر چلتے رہیں تو کسی نہ کسی گاؤں میں جا نکلیں گے۔" ایڈورڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... لیکن سورج نکلنے والا ہے۔ ہمیں اس سے پہلے کہیں پناہ لینا ہوگی۔ یہ علاقہ پلاسکن فوجیوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ بہت جلد اپنے ساتھی کو وہاں پڑا دیکھیں گے اور پھر خونخوار کتوں کی طرح ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔"

تھوڑا بہت کھانے پینے سے ان کے اندر نئی قوت پیدا ہو گئی تھی اور آخر کار جب سورج کی سحر انگیز کرنیں نمودار ہوئیں تو وہ ایک ویران گاؤں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ باغ اور کھیت اجڑے ہوئے تھے اور کوئی کسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فورک نے پلاسکن سپاہی کی وردی پہنی اور رائفل سنبھالتا ہوا بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

بقیہ لوگ اس کے صحیح سلامت آنے کی دعائیں مانگتے رہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ واپس آ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گاؤں بھر میں ایک بڈھے کسان اور اس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس گاؤں کے تمام افراد کو ختم کر دیا گیا ہے۔ وہاں ایک بوڑھا کسان ہے جو بیمار ہے اور اس کی بیوی کو تیمارداری کے علاوہ سپاہیوں کے لئے انڈے اور دودھ اور بعض اوقات کھانا بھی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو وہ لوگ مجھے وردی میں دیکھ کر ڈرے، پھر میں نے اپنی مصیبت کی داستان سنائی تو مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔

اس کی بیوی نے بتایا ہے کہ ایک پلاسکن سپاہی روزانہ صبح شام گاؤں میں آتا ہے اور کھانے پینے کی چیزیں لے جاتا ہے۔ کسان نے کہا کہ میں کہیں چھپ جاؤں۔ سپاہی آنے والا ہے۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ اب کم از کم وہ سپاہی یہاں نہیں آئے گا تو دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے۔ وہ لوگ پلاسکن سپاہیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ان کے مکان میں ایک تہہ خانہ ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ہم جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں۔"

"واہ...... ایک اچھا ٹھکانہ دستیاب ہوا۔"

جب یہ لوگ گاؤں میں داخل ہوئے تو دو تین کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا۔

گاؤں کی حالت دیکھ کر رونا آتا تھا۔ کوئی مکان، کوئی جھونپڑی سلامت نہیں تھی۔ ٹینکوں نے کھیتوں کو روند ڈالا تھا اور جہازوں نے خوب بمباری کی تھی۔ آوارہ مویشی اور بھیڑ بکریاں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بوڑھا کسان اور اس کی بیوی انہیں دیکھ کر رونے لگے اور انہوں نے ان سے التجا کی کہ اگر وہ یہاں سے جائیں تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں۔ کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ کسی دن ممکن ہے کہ ان کا بھی آخری دن ہو جائے گا۔

بہر حال انہیں تسلی دی گئی اور اس کے بعد انہوں نے انہیں تہہ خانے کا راستہ دکھایا۔ یہ تہہ خانہ اس علاقے کی اہم ضرورت تھی جہاں برف باری کے دنوں میں بہت آرام رہتا تھا۔ وہ کوئی بارہ فٹ لمبا، اسی قدر چوڑا تہہ خانہ تھا۔ اس کی بلندی کوئی چھ فٹ کے قریب تھی اور اس کے فرش پر نرم نرم گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کسان کی بیوی ان کی آمد سے بہت خوش تھی۔ اس نے ان کی خوب خاطر تواضع کی، گرم پانی سے اچھی طرح نہانے کا موقع ملا، پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اس کے بعد ایسے بے خبر سوئے کہ دوسرے دن صبح سویرے آنکھ کھلی۔ اس دوران بوڑھا کسان علاقے کا ایک نقشہ لے آیا تھا۔ اس نقشے سے انہیں گاؤں کے جائے وقوع کا پتہ لگا۔ بوڑھے سے بات چیت ہوئی تو اس نے بتایا۔

''اگر ہمت کی جائے تو کوئی نہ کوئی کشتی ساحل پر ضرور مل جائے گی۔ لیکن اس کے لئے دریا عبور کرنا ضروری ہے۔''

بہر حال تیاریاں کی گئیں۔ دریا یہاں سے دس میل دور تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ دیر ٹھہرنا نہ صرف ان کے لئے بلکہ اس بوڑھے جوڑے کے لئے بھی مہلک تھا۔ دوپہر میں بھنے ہوئے گوشت اور تلے ہوئے آلوؤں سے پیٹ بھرنے کے بعد ایک بار پھر نیند بھری گئی ابھی بمشکل آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا کہ بوڑھے کسان نے انہیں جگا دیا۔ ان کے چہرے خوف سے زرد ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک فوجی گاڑی ابھی ابھی گاؤں میں آئی ہے۔ اور مسلح سپاہی ایک ایک مکان اور جھونپڑی کی تلاشی لے رہے ہیں۔ آپ لوگ فوراً اوپر چلے جائیں ہم اپنی حفاظت خود کریں گے۔

''وہ تعداد میں کتنے ہیں؟''

''سات آٹھ ہیں۔'' عورت نے کہا اور اپنے شوہر کا بازو پکڑ کر اوپر چلی گئی اور تختہ بند

کر دیا۔

''اگر انہوں نے تشدد سے گھبرا کر ہمارا پتہ بتا دیا تو خاتمہ یقینی ہو جائے گا۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' فورک نے جواب دیا اور سوراخ کے قریب جا کر جھانکنے لگا، پھر بولا۔ ''مجھے ان کا ٹرک نظر آ رہا ہے۔ دو افسر اس کے پاس کھڑے ہیں اور باقی اِدھر اُدھر ہماری تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنگل میں کہیں نکل گئے ہوں۔''

ایک لمحے کے لئے فورک کی آنکھوں میں شہباز نے وہی چمک دیکھی جو کسی خطرناک فیصلے کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ اسے ایک بار پھر نریمان فرازی یاد آ گیا۔ بہر حال فورک کی آواز ابھری۔

''دوستو! میرے ذہن میں اس مصیبت سے بچنے کے لئے ایک تدبیر آئی ہے۔ تم لوگ میرے بدن پر موجود وردی دیکھ رہے ہو۔ میرے پاس رائفل بھی ہے۔ میں تم لوگوں کے ہاتھ اوپر اٹھوا کر باہر لے چلتا ہوں۔ وہ احمق سمجھیں گے کہ مفرور قیدیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ ان کے پاس لے جاؤں گا۔ اور جونہی ان کی آواز سے کھنکاروں، تم زمین پر لیٹ جانا۔ باقی کارروائی میرے ذمے۔''

سب نے فورک کے اس ڈرامے سے اتفاق کیا تھا اور اس خوفناک عمل کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ چہرے پر خوف کے آثار پیدا کئے اور ہاتھ اوپر اٹھا کر باہر نکلے تو کسان اور اس کی بیوی شدتِ حیرت سے گم رہ گئے اور جب ان کی نگاہیں فورک پر پڑیں جو رائفل تانے خونی نظروں سے انہیں گھور رہا تھا تو بے چاروں کی چیخیں نکل گئیں۔ فورک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور باقی لوگوں کو دھکیلتا ہوا میدان میں لے آیا۔

دونوں افسر اسی مکان کی طرف آ رہے تھے۔ ایکا ایکی ان کی نگاہیں ان پر پڑیں اور وہ رک گئے۔ فورک اب سچ مچ انہیں ٹھوکریں مار مار کر ان کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ لوگ ہاتھ اٹھائے بڑی بے بسی سے چل رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ افسروں نے قہقہے لگائے، ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ وہ نازک لمحہ

قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ اور پھر جب ان کا اور سپاہیوں کا فاصلہ کوئی بارہ فٹ رہ گیا تو فورک یکلخت ہنسا اور یہ آواز سنتے ہی وہ اوندھے منہ نیچے گر پڑے۔ فورک کی رائفل شعلے اگلنے لگی اور پلک جھپکتے دونوں افسر دوسری دنیا کی سیر کرنے لگے۔

”اٹھاؤ ان کم بختوں کو۔ لے چلو مکان میں۔ فائر کی آواز سنتے ہی دوسرے بدمعاش بھی آتے ہی ہوں گے۔“ فورک چلایا۔

”ان کے ریوالور بھی قبضے میں کرلو۔“ ہری سنگھ بولا۔ ایک منٹ کے اندر اندر افسروں کی لاشیں تہہ خانے میں پھینک دی گئیں جہاں تھوڑی دیر پہلے یہ لوگ خود چھپے ہوئے تھے۔

فورک ٹرک اسٹارٹ کر کے مکان کے قریب لے آیا اور کسان سے کہا۔

”جتنا سامان رکھ سکتے ہو، ٹرک میں رکھ لو۔ ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔“ پھر وہ دوسری طرف منہ کر کے بولا۔ ”ارے تم لوگ انتظار کیوں کر رہے ہو؟ ان افسروں کی وردیاں اتار لو۔ ہمارے کام آئیں گی۔“

وردیاں اتاری جا رہی تھیں۔ فورک تہہ خانے میں آیا اور بولا۔

”سپاہی اس طرف آ رہے ہیں۔ شاید انہوں نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔ وہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ تم اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لو اور اِدھر اُدھر چھپ جاؤ۔ میں ان سے ہتھیار رکھوانے کی کوشش کروں گا۔“

کسان اور اس کی بیوی گھاس میں چھپ گئے۔ انہوں نے ریوالور سنبھالے اور کواڑوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ فورک دوسری جانب دیوار سے چپک گیا تھا۔ کچھ لمحے بعد سپاہیوں کے بولنے کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ اور پھر وہ بھاری جوتوں سے لکڑی کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر چلے آئے۔ اب وہ نشانے پر تھے۔

”اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھا لو۔“ فورک نے کہا۔

انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو وردی پہنے اپنے ہی ایک ساتھی کو رائفل اٹھاتے دیکھ کر سٹپٹائے۔ بعض لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ رائفل سے گولی نکلی اور سامنے کھڑے ہوئے پہلے سپاہی کے بازو میں لگی۔

ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ وہیں گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں بقیہ لوگ سامنے آ گئے۔ چشم زدن میں سپاہی اپنی اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔

”پشت ہماری طرف کرلو...... اور اس دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ فورک نے کہا۔ ”اور سنو، اگر کسی نے شرارت کی تو بھیجہ نکال دوں گا۔“

انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ فورک نے بوڑھے کسان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھاگ کر اندر گیا اور موٹی موٹی رسیاں اٹھا لایا۔

دس منٹ کے اندر اندر ان آٹھوں کو اس طرح باندھ دیا گیا کہ وہ کوشش کے باوجود حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے حلق میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تھا۔

”ویری گڈ...... اب تم لوگ بھی اپنی اپنی وردیاں پہن لو۔“ فورک نے بقیہ افراد سے کہا۔ ”کھانے پینے اور ضرورت کی جتنی چیزیں لے سکتے ہو، لے لو۔ دریا تک ہم اس ٹرک میں آسانی سے سفر کریں گے۔ بلکہ اگر ممکن ہوا تو اپنے اس ہمدرد جوڑے کو بھی کہیں اتار دیں گے۔“

تھوڑی دیر کے بعد ٹرک بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اس سڑک پر دوڑ رہا تھا جو دریا کے کنارے پر نکلتی تھی۔ تین میل تک تو کسی کا نام و نشان نہیں ملا۔ چوتھا میل شروع ہوتے ہی سڑک کے عین درمیان ایک چوکی نظر آئی جہاں دو مسلح پہریدار ڈیوٹی دے رہے تھے۔ لکڑی کا ایک کھمبا سڑک بند کئے ہوئے تھا۔ ٹرک کو دیکھتے ہی کھمبا اٹھا لیا گیا۔ پہریداروں نے سیلوٹ کیا اور جواب میں یہ لوگ بھی سیلوٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

”خدا کا شکر ہے۔ اب آپ ہمیں کسی درمیانی گاؤں میں چھوڑ سکتے ہیں۔“ بوڑھے کسان نے کہا۔

اس وقت جس سڑک پر سفر کیا جا رہا تھا اس سڑک پر فوجی گاڑیوں کی آمد و رفت کثرت سے تھی لیکن کسی نے انہیں روکنے یا پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مخالف سمت سے آنے والے ٹرک پر موجود سپاہی ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بہرحال ایک ریلوے پل کے قریب ایک دوسری چوکی پر اسے روکا گیا۔ کیونکہ ٹریفک ایک طرف سے جا رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں وہ اس سے کسی پاس وغیرہ کا مطالبہ نہ کریں۔ فورک واقعی انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس نے ایڈورڈ کو اپنی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور شہباز کو بھی آنکھ کے اشارے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی۔

ٹرک کے تینوں طرف کینوس پڑا ہوا تھا جس کی رسیاں انہوں نے پہلے ہی کس لی تھیں تاکہ

فورک نے جس ٹیلے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ پچیس فٹ نیچے کھائی کی عمودی دیوار میں سے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پچیس فٹ لمبی چھلانگ لگائی جائے۔ پچیس فٹ نیچے کودنا شہباز کے لئے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کھائی میں نیچے اترنے کے لئے اس کی نگاہوں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بہت اچھا تھا۔ وہ اپنے لچکیلے، پھرتیلے بدن کو باآسانی نیچے گہرائیوں تک لے جا سکتا تھا لیکن بات اس وقت صرف اس کی اپنی ذات کی نہیں تھی، دوسرے لوگ پریشان تھے۔ لارک نے کہا۔

''فرض کرو، ہم اس ٹیلے پر کود بھی گئے تب بھی ہڈیاں وغیرہ تو چٹخیں گی۔''

''ہاں...... ایسا ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ایک اور تدبیر آئی ہے۔ تم لوگ ذرا اپنے اپنے کپڑے اتارو اور وہ کمبل بھی مجھے دے دو۔''

سب نے فورک کی ہدایت پر عمل کیا اور یہ تمام چیزیں ایک ایک کر کے اس ٹیلے پر پھینک دی گئیں۔

''اب چوٹ زیادہ نہیں لگے گی۔'' فورک بولا۔

ٹینکوں کی آواز واضح تھی اور آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ بادل چھٹ رہے تھے اور بارش ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مشرقی اُفق پر روشنی کا ایک ہالہ سا بن رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی کئی ٹینک مدھم سایوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ بہرحال فورک کے اشارے پر سب نے آنکھیں بند کیں اور ایک ایک کر کے ٹیلے پر کود گئے۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ ٹیلے پر گرنے کے بعد ان کے ہوش و حواس برقرار رہے۔ زناٹے دار ہوا چل رہی تھی اور خطرہ تھا کہ اگر نیچے کودنے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو کھائی کی گہرائیوں میں ہی ٹھکانہ بنے گا۔ لیکن بہرحال کامیابی یہاں سے ہو گئی تھی اور چند لمحوں کے بعد نئی اور انتہائی نازک صورتحال سامنے آ گئی۔ پلاسکن فوجی ان کے سر پر پہنچنے والے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ رسوں کے ذریعے کھائی میں اترنے کی کوشش کریں۔

ادھر جب یہ لوگ نیچے جھانکتے تو ان کی روح لرز کر رہ جاتی۔ کھائی کئی سو فٹ گہری تھی اور اگر ذرا سی لغزش ہوتی تو باآسانی نیچے جا سکتے تھے۔ اوپر جانے کا تو اب خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ نہ ان کے پاس رسے تھے اور نہ کھائی پر پیر جمانے کی جگہ بنانے کے لئے کیلیں اور ہتھوڑے وغیرہ۔ کھائی کی تہہ میں بارش کا پانی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ گویا نیچے

اترنے کی ہر کوشش ناکام ہو سکتی تھی۔ فورک نہایت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ شہباز نے پہلی بار اس کے چہرے پر خوف کے آثار پائے۔ مٹی کا وہ ٹیلہ جس پر یہ لوگ کودے تھے، دو فٹ چوڑا اور پانچ فٹ لمبا تھا۔ جس مقام سے یہ ٹیلا کھائی کی دیوار میں ابھرا تھا، وہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ صرف ایک آدمی چھپ کر بیٹھ سکے اور اوپر سے دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ اوپر سے باآسانی ان سب کو دیکھا جا سکتا تھا اور وہ لوگ انہیں تیزی سے گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ آخر کار فورک نے ٹیلے کے ہر حصے کا بغور جائزہ لیا۔ اس نے رائفل پر چڑھی ہوئی سنگین اتاری اور ایڈورڈ کی طرف بڑھا دی۔

''تم ٹیلے کے اس حصے کو کھود کر بڑا کرنے کی کوشش کرو جہاں ایک آدمی کے چھپنے کی گنجائش ہے۔ میرا خیال ہے مٹی نرم ہے۔ ذرا احتیاط سے کھودو گے تو ذرا سی دیر میں کشادہ جگہ بن جائے گی۔ جلدی کرو...... وہ لوگ بس پہنچنے والے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے رائفل سنبھالی اور ٹیلے کے بائیں جانب دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''تم ایڈورڈ کی مدد کرو ہری سنگھ! اور مٹی آہستہ آہستہ کھائی میں پھینکتے جاؤ۔ لیکن ایسے نہیں کہ انہیں اوپر ہی سے پتہ چل جائے۔''

ایڈورڈ انتہائی مشقت کے ساتھ مٹی کھود رہا تھا۔ اس کے طاقتور بازو مشین کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ تین منٹ کے اندر اندر اس نے مزید تین فٹ کی جگہ نکال لی۔ اب اس میں دو آدمی سما سکتے تھے۔ اچانک ہی کھائی کے اوپر پلاسکن سپاہیوں کے بولنے کی آواز سنائی دی اور پاؤں کے جوتوں کی آواز ابھری۔ وہ انہیں تلاش کر رہے تھے۔ ایک افسر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''میں دعوے سے کہتا ہوں وہ یہیں ہیں۔ دیکھو، یہ ان کے جوتوں کے نشانات۔ وہ ضرور کھائی میں اترے ہیں۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔ چلو آگے بڑھو۔''

ان کے وجود پتھرا گئے تھے۔ فورک نے دو آدمیوں کو سوراخ کے اندر گھس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خود دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا تھا۔ یہ لوگ تین فٹ لمبے اور چار چار فٹ چوڑے سوراخ کے اندر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ ان کی نگاہیں کھائی کے کناروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک پلاسکن سپاہی نے نیچے جھانکا۔ اس کی نگاہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھائی کا جائزہ لینے کے بعد اچانک اس ٹیلے پر جم گئی۔ اس نے فورک کو

دیکھ لیا تھا۔ ابھی وہ چیخنے کے لئے منہ کھول ہی رہا تھا کہ فورک کی رائفل نے شعلہ اگلا اور دوسرے ہی لمحے وہ قلابازیاں کھاتا ہوا اندرونی وسعتوں میں غائب ہو گیا۔ ایڈورڈ بدستور مٹی کھود رہا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"فورک! اندر آ جاؤ...... اب تمہارے لئے بھی جگہ نکل آئی ہے۔" فورک نے یہ الفاظ سنے تو تیزی سے کھسکتا ہوا ان لوگوں کے نزدیک آ گیا۔ اسی لمحے اوپر سے پلاسکن سپاہیوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور گولیاں ٹیلے کو ادھیڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور پلاسکن سپاہی نے جھانک کر ٹیلے کی طرف دیکھا، اپنے افسر سے کچھ کہنے کے لئے گردن گھمائی ہی تھی کہ فورک کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر گئی۔ ایک لرزہ خیز چیخ کے ساتھ وہ بھی کھائی کی سیر کرتا ہوا نظر آیا۔ پھر چند ہی لمحات کے بعد انہوں نے ٹینکوں کے واپس جانے کی آواز سنی۔

ٹینکوں کے جانے کے بعد ان کی جان میں جان آئی۔ فورک کے چہرے پر البتہ بدستور تشویش کے آثار تھے۔ اس نے باہر سرک کر دو تین مرتبہ اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی پلاسکن سپاہی کھائی کے اوپر چھپا ہوا نہیں ہے تو اس نے ان لوگوں کو بھی باہر آنے کا اشارہ کر دیا۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کھائی میں اترا کیسے جائے۔ کیونکہ پلاسکن سپاہی کسی بھی وقت دوبارہ نمودار ہو سکتے تھے۔ جس ٹیلے پر ان لوگوں نے پناہ لی تھی اس سے بارہ فٹ نیچے ایک اور ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں ایسی جگہ نظر آ رہی تھی جن پر پاؤں رکھ کر وہ احتیاط سے نیچے اتر سکتے تھے۔ بارش کی وجہ سے کھائی کی دیواریں گیلی اور چکنی ہو چکی تھیں اور ویسے بھی تہہ کے اندر پانی بڑی مقدار میں جمع ہو چکا تھا۔ ان حالات میں اس انداز میں نیچے اترنا حماقت تھی۔

"یہ بہت برا ہو گیا ہے۔" فورک نے کہا۔ "اگر وہ دوبارہ آ گئے تو ہم کتے کی موت مارے جائیں گے۔"

"خیر، مرنا تو ہر صورت میں ہے۔" ایڈورڈ نے کہا۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چند لمحات کے لئے مکمل خاموشی رہی، پھر فورک ہی بولا۔ "بہرحال، موت کو تو ایک بار آنا ہے۔ جہاں کہیں بھی آ جائے۔ لیکن زندگی کی تلاش کرتے رہنا چاہئے۔ ذرا یہ کمبل اور وہ کپڑے تو مجھے دو۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر ٹیلے کا

جائزہ لیا اور پھر رائفل سے سنگین اتار کر کمبل کی لمبی لمبی پٹیاں کاٹنے لگا۔ سب لوگ خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان پٹیوں کے سروں میں اس نے گانٹھیں باندھ کر خود ساختہ رسہ نیچے لٹکایا اور سنگین کے ایک سرے میں پرو کر آدھے سے زیادہ حصہ ٹیلے کے اندر گھونپ دیا جس کے اوپر یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر ہم ذرا سی ہمت کریں تو اس کھائی کے اندر اتر سکتے ہیں۔ پانی ایک گھنٹے کے اندر اندر جذب ہو جائے گا۔ آؤ اب دوسرے ٹیلے پر پہنچیں۔"

فورک کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ کھائی کا پانی ایک گھنٹے سے بھی پہلے خشک ہو گیا۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ کمبل کے بنائے گئے رسے پر پھسلتے ہوئے دوسرے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہاں سے مزید نیچے اترنے کے لئے انہیں دوپہر کا انتظار کرنا تھا۔ اس دوران ایک چھوٹا ہوائی جہاز کئی بار کھائی کے اوپر سے گزرا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس قدر نیچے اُڑا کہ انہیں یوں لگا کہ جیسے پائلٹ ان پر گولیاں برسانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ فورک نے کہا۔

"نہیں...... وہ صرف ہماری نگرانی کر رہا ہے۔ اور ان سے بچنے کے لئے ہمیں آج سورج غروب ہونے سے پہلے اس کھائی کو عبور کرنا ہوگا۔"

دو سو فٹ گہری کھائی میں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ لوگ نیچے اترے وہ ایسا بھیانک تجربہ تھا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کا ایک ساتھی آسانی سے نیچے اتر سکتا ہے اور اس کے لئے یہ تجربہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جس انداز میں اس نے رازل جریری کو تلاش کرنے کے لئے برف کی گہرائیوں کا سفر کیا تھا وہ ناقابل تصور تھا۔ بہرحال ان کے جسموں پر جابجا خراشیں آ گئی تھیں اور ہاتھ سوج گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کیچڑ میں لت پت بھوت بنے ہوئے تھے۔ کھائی کے اندر ہی اندر کئی فرلانگ سفر طے کیا گیا۔ ایک جگہ یہ کھائی کئی شاخوں میں بٹ گئی تھی لیکن وہ دم لئے بغیر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک مقام پر دلدل میں دفن ہوتے ہوتے بچے، سانپوں کے نرغے میں پھنسے۔ لیکن زندگی ابھی باقی تھی۔ ان تمام آفتوں اور سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخرکار انہیں ایک سطح ایسی نظر آ گئی جہاں سے سطح آہستہ آہستہ اونچی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض

کر گئی۔ اوسیانوس نے اس کی لاش کو فرش پر لٹایا ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا اسے شیطان کو خوش کرنے کے لیے قربانی دینے کا کام مکمل کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے سیاہ لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک تیز دھار چمکتا ہوا خنجر نکالا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہیگ کی لاش پر بیٹھ گیا، پھر اس کے حلق سے آوازیں نکلیں۔

"سنا تو نے...... سنا تو نے...... میں تجھ سے ہی مخاطب ہوں بول میں تجھے کس نام سے مخاطب کروں میں استاد محترم، میرے جد امجد...... یہ قربانی میں صرف تیرے لیے دے رہا ہوں۔ صرف تیرے لیے۔ میری اس قربانی کو قبول...... قبول کر میری اس قربانی کو۔ قبول کر...... قبول کر...... اس نے تین بار کہا اور کسی ماہر سرجن کی طرح لاش کے سینے کو چاک کرنے لگا......

✿......✿

شہباز کی یہ ایڈونچرس داستان ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات کے لئے جلد چہارم کا مطالعہ کریں۔

کچی سڑک پر جا نکلے۔ اب ان کی ہمتیں بالکل ٹوٹ چکی تھیں چنانچہ وہ وہیں گھاس کے اندر لیٹ کر ہانپنے لگے۔ اچانک ہی ان کے کانوں میں موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ ایڈورڈ نے سر اٹھا کر دیکھا، دور پہاڑی کی جانب سے روشنی کا ایک ننھا سا دھبہ ان کی طرف آ رہا تھا۔

''یہ یقیناً کوئی پیغام رساں ہے۔'' فورک نے کہا۔

''ممکن ہے اس کے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہوں۔'' شہباز نے کہا اور پھر بولا۔ ''جلدی کرو...... پگڈنڈی کے عین درمیان بے ہوش بن کر لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یہاں سے گزرے گا۔ باقی کام میں سنبھال لوں گا۔''

''اگر وہ مجھ پر توجہ دیئے بغیر نکل گیا تو؟'' ایڈورڈ نے پوچھا۔

''یہ بعد کی بات ہے۔ دیکھا جائے گا۔''

ایڈورڈ نے خوفزدہ نگاہوں سے شہباز کو دیکھا۔ شہباز نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لئے کہا اور خود سڑک کے عین درمیان لاش کی طرح لیٹ گیا۔ موٹر سائیکل کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اور پھر وہ شہباز کے بالکل سر پر آ گئی۔ شہباز نے کن انکھیوں سے دیکھا، فوجی اسے وہاں پڑے دیکھ کر بڑبڑایا۔ شاید گالی دے رہا ہو گا۔ انجن بند کئے بغیر وہ موٹر سائیکل سے اترا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا شہباز کے پاس پہنچا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ شہباز زندہ ہے یا مُردہ، اس کے دل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شہباز کا دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ الٹ گیا۔ اتنے میں ایڈورڈ اور فورک بھوکے چیتوں کی مانند اس پر جھپٹے اور ایڈورڈ کے چند ہی گھونسوں نے اسے بے جان کر دیا۔ اس کی تلاشی لی گئی۔ فورک نے فوراً ہی اس کا پستول اپنے قبضے میں لے لیا اور کارتوسوں کی پیٹی بھی نکال لی۔ اس کے بعد اس کے مشورے پر وردی بھی اتار لی گئی۔

یہ لوگ اسے گھسیٹ کر گھاس میں لے گئے۔ ایڈورڈ نے موٹر سائیکل کا انجن بند کیا اور اسے ایک گہرے کھڈ میں پھینک دیا۔ بدنصیب سپاہی کی وردی اتار کر انہوں نے اسے بالکل برہنہ کر دیا۔ اس کے پاس کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ بس شراب کی ایک بوتل لفافے میں رکھی ہوئی اور چند سینڈوچز، ایک کنگھا، آئینہ اور شیو کا سامان، ٹارچ اور کچھ کاغذات جن پر پلاسکن زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی پیٹی سے اس کے ہاتھ

پاؤں باندھ کر اسے سڑک کے کنارے لٹا دیا۔ پھر جلدی جلدی بوتل کھولی اور ایڈورڈ وغیرہ ایک ایک گھونٹ شراب پینے لگے۔ البتہ سینڈوچز میں اس نے اپنا حصہ وصول کر لیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ شخص قریبی گاؤں سے انڈے اور سینڈوچز لینے جا رہا ہو گا۔ اگر ہم اس پگڈنڈی پر چلتے رہیں تو کسی نہ کسی گاؤں میں جا نکلیں گے۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن سورج نکلنے والا ہے۔ ہمیں اس سے پہلے کہیں پناہ لینا ہو گی۔ یہ علاقہ پلاسکن فوجیوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ بہت جلد اپنے ساتھی کو وہاں پڑا دیکھیں گے اور پھر خونخوار کتوں کی طرح ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔''

تھوڑا بہت کھانے پینے سے ان کے اندر نئی قوت پیدا ہو گئی تھی اور آخر کار جب سورج کی سحر انگیز کرنیں نمودار ہوئیں تو وہ ایک ویران گاؤں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ باغ اور کھیت اجڑے ہوئے تھے اور کوئی کسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فورک نے پلاسکن سپاہی کی وردی پہنی اور رائفل سنبھالتا ہوا بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

بقیہ لوگ اس کے صحیح سلامت آنے کی دعائیں مانگتے رہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ واپس آ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گاؤں بھر میں ایک بڈھے کسان اور اس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس گاؤں کے تمام افراد کو ختم کر دیا گیا ہے۔ وہاں ایک بوڑھا کسان ہے جو بیمار ہے اور اس کی بیوی کو تیمارداری کے علاوہ سپاہیوں کے لئے انڈے اور دودھ اور بعض اوقات کھانا بھی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو وہ لوگ مجھے وردی میں دیکھ کر ڈرے، پھر میں نے اپنی مصیبت کی داستان سنائی تو مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔

اس کی بیوی نے بتایا ہے کہ ایک پلاسکن سپاہی روزانہ صبح شام گاؤں میں آتا ہے اور کھانے پینے کی چیزیں لے جاتا ہے۔ کسان نے کہا کہ میں کہیں چھپ جاؤں۔ سپاہی آنے والا ہے۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ اب کم از کم وہ سپاہی یہاں نہیں آئے گا تو دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے۔ وہ لوگ پلاسکن سپاہیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ان کے مکان میں ایک تہہ خانہ ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ہم جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں۔''

''واہ...... ایک اچھا ٹھکانہ دستیاب ہوا۔''

جب یہ لوگ گاؤں میں داخل ہوئے تو دو تین کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا۔
گاؤں کی حالت دیکھ کر رونا آتا تھا۔ کوئی مکان، کوئی جھونپڑی سلامت نہیں تھی۔ ٹینکوں نے کھیتوں کو روند ڈالا تھا اور جہازوں نے خوب بمباری کی تھی۔ آوارہ مویشی اور بھیڑ بکریاں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بوڑھا کسان اور اس کی بیوی انہیں دیکھ کر رونے لگے اور انہوں نے ان سے التجا کی کہ اگر وہ یہاں سے جائیں تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں۔ کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ کسی دن ممکن ہے کہ ان کا بھی آخری دن ہو جائے گا۔

بہر حال انہیں تسلی دی گئی اور اس کے بعد انہوں نے انہیں تہہ خانے کا راستہ دکھایا۔ یہ تہہ خانہ اس علاقے کی اہم ضرورت تھی جہاں برف باری کے دنوں میں بہت آرام رہتا تھا۔ وہ کوئی بارہ فٹ لمبا، اسی قدر چوڑا تہہ خانہ تھا۔ اس کی بلندی کوئی چھ فٹ کے قریب تھی اور اس کے فرش پر نرم نرم گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کسان کی بیوی ان کی آمد سے بہت خوش تھی۔ اس نے ان کی خوب خاطر تواضع کی، گرم پانی سے اچھی طرح نہانے کا موقع ملا، پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اس کے بعد ایسے بے خبر سوئے کہ دوسرے دن صبح سویرے آنکھ کھلی۔ اس دوران بوڑھا کسان علاقے کا ایک نقشہ لے آیا تھا۔ اس نقشے سے انہیں گاؤں کے جائے وقوع کا پتہ لگا۔ بوڑھے سے بات چیت ہوئی تو اس نے بتایا۔

"اگر ہمت کی جائے تو کوئی نہ کوئی کشتی ساحل پر ضرور مل جائے گی۔ لیکن اس کے لئے دریا عبور کرنا ضروری ہے۔"

بہر حال تیاریاں کی گئیں۔ دریا یہاں سے دس میل دور تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ دیر ٹھہرنا نہ صرف ان کے لئے بلکہ اس بوڑھے جوڑے کے لئے بھی مہلک تھا۔ دوپہر میں بھنے ہوئے گوشت اور تلے ہوئے آلوؤں سے پیٹ بھرنے کے بعد ایک بار پھر نیند بھری گئی ابھی بمشکل آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا کہ بوڑھے کسان نے انہیں جگا دیا۔ ان کے چہرے خوف سے زرد ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک فوجی گاڑی ابھی ابھی گاؤں میں آئی ہے۔ اور مسلح سپاہی ایک ایک مکان اور جھونپڑی کی تلاشی لے رہے ہیں۔ آپ لوگ فوراً اوپر چلے جائیں ہم اپنی حفاظت خود کریں گے۔

"وہ تعداد میں کتنے ہیں؟"

"سات آٹھ ہیں۔" عورت نے کہا اور اپنے شوہر کا بازو پکڑ کر اوپر چلی گئی اور تختہ بند

کر دیا۔

"اگر انہوں نے تشدد سے گھبرا کر ہمارا پتہ بتا دیا تو خاتمہ یقینی ہو جائے گا۔" ایڈورڈ نے کہا۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" فورک نے جواب دیا اور سوراخ کے قریب جا کر جھانکنے لگا، پھر بولا۔ "مجھے ان کا ٹرک نظر آ رہا ہے۔ دو افسر اس کے پاس کھڑے ہیں اور باقی اِدھر اُدھر ہماری تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنگل میں کہیں نکل گئے ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے فورک کی آنکھوں میں شہباز نے وہی چمک دیکھی جو کسی خطرناک فیصلے کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ اسے ایک بار پھر نریمان فرازی یاد آ گیا۔ بہر حال فورک کی آواز ابھری۔

"دوستو! میرے ذہن میں اس مصیبت سے بچنے کے لئے ایک تدبیر آئی ہے۔ تم لوگ میرے بدن پر موجود وردی دیکھ رہے ہو۔ میرے پاس رائفل بھی ہے۔ میں تم لوگوں کے ہاتھ اوپر اٹھوا کر باہر لے چلتا ہوں۔ وہ احمق سمجھیں گے کہ مفرور قیدیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ ان کے پاس لے جاؤں گا۔ اور جونہی ان کی آواز سے کھنکاروں، تم زمین پر لیٹ جانا۔ باقی کارروائی میرے ذمے۔"

سب نے فورک کے اس ڈرامے سے اتفاق کیا تھا اور اس خوفناک عمل کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ چہرے پر خوف کے آثار پیدا کئے اور ہاتھ اوپر اٹھا کر باہر نکلے تو کسان اور اس کی بیوی شدت حیرت سے گم رہ گئے اور جب ان کی نگاہیں فورک پر پڑیں جو رائفل تانے خونی نظروں سے انہیں گھور رہا تھا تو بے چاروں کی چیخیں نکل گئیں۔ فورک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور باقی لوگوں کو دھکیلتا ہوا میدان میں لے آیا۔

دونوں افسر اسی مکان کی طرف آ رہے تھے۔ ایکا ایکی ان کی نگاہیں ان پر پڑیں اور وہ رک گئے۔ فورک اب سچ مچ انہیں ٹھوکریں مار مار کر ان کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ لوگ ہاتھ اٹھائے بڑی بے بسی سے چل رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ افسروں نے قہقہے لگائے، ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ وہ نازک لمحہ

قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ اور پھر جب ان کا اور سپاہیوں کا فاصلہ کوئی بارہ فٹ رہ گیا تو فورک یکلخت ہنسا اور یہ آواز سنتے ہی وہ اوندھے منہ نیچے گر پڑے۔ فورک کی رائفل شعلے اگلنے لگی اور پلک جھپکتے دونوں افسر دوسری دنیا کی سیر کرنے لگے۔

"اٹھاؤ ان کم بختوں کو۔ لے چلو مکان میں۔ فائر کی آواز سنتے ہی دوسرے بدمعاش بھی آتے ہی ہوں گے۔" فورک چلایا۔

"ان کے ریوالور بھی قبضے میں کر لو۔" ہری سنگھ بولا۔ ایک منٹ کے اندر اندر افسروں کی لاشیں تہہ خانے میں پھینک دی گئیں جہاں تھوڑی دیر پہلے یہ لوگ خود چھپے ہوئے تھے۔ فورک ٹرک اسٹارٹ کر کے مکان کے قریب لے آیا اور کسان سے کہا۔

"جتنا سامان رکھ سکتے ہو، ٹرک میں رکھ لو۔ ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔" پھر وہ دوسری طرف منہ کر کے بولا۔ "ارے تم لوگ انتظار کیوں کر رہے ہو؟ ان افسروں کی وردیاں اتار لو۔ ہمارے کام آئیں گی۔"

وردیاں اتاری جا رہی تھیں۔ فورک تہہ خانے میں آیا اور بولا۔

"سپاہی اس طرف آ رہے ہیں۔ شاید انہوں نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔ وہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ تم اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لو اور اِدھر اُدھر چھپ جاؤ۔ میں ان سے ہتھیار رکھوانے کی کوشش کروں گا۔"

کسان اور اس کی بیوی گھاس میں چھپ گئے۔ انہوں نے ریوالور سنبھالے اور کواڑوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ فورک دوسری جانب دیوار سے چپک گیا تھا۔ کچھ لمحے بعد سپاہیوں کے بولنے کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ اور پھر وہ بھاری جوتوں سے لکڑی کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر چلے آئے۔ اب وہ نشانے پر تھے۔

"اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھا لو۔" فورک نے کہا۔

انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو وردی پہنے اپنے ہی ایک ساتھی کو رائفل اٹھاتے دیکھ کر سٹپٹائے۔ بعض لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ رائفل سے گولی نکلی اور سامنے کھڑے ہوئے پہلے سپاہی کے بازو میں لگی۔

ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ وہیں گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں بقیہ لوگ سامنے آ گئے۔ چشم زدن میں سپاہی اپنی اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔

"پشت ہماری طرف کر لو...... اور اس دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" فورک نے کہا۔ "اور سنو، اگر کسی نے شرارت کی تو بھیجہ نکال دوں گا۔"

انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ فورک نے بوڑھے کسان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھاگ کر اندر گیا اور موٹی موٹی رسیاں اٹھا لایا۔

دس منٹ کے اندر اندر ان آٹھوں کو اس طرح باندھ دیا گیا کہ وہ کوشش کے باوجود حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے حلق میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تھا۔

"ویری گڈ...... اب تم لوگ بھی اپنی اپنی وردیاں پہن لو۔" فورک نے بقیہ افراد سے کہا۔ "کھانے پینے اور ضرورت کی جتنی چیزیں لے سکتے ہو، لے لو۔ دریا تک ہم اس ٹرک میں آسانی سے سفر کریں گے۔ بلکہ اگر ممکن ہوا تو اپنے اس ہمدرد جوڑے کو بھی کہیں اتار دیں گے۔"

تھوڑی دیر کے بعد ٹرک بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اس سڑک پر دوڑ رہا تھا جو دریا کے کنارے پر نکلتی تھی۔ تین میل تک تو کسی کا نام ونشان نہیں ملا۔ چوتھا میل شروع ہوتے ہی سڑک کے عین درمیان ایک چوکی نظر آئی جہاں دو مسلح پہریدار ڈیوٹی دے رہے تھے۔ لکڑی کا ایک کھمبا سڑک بند کئے ہوئے تھا۔ ٹرک کو دیکھتے ہی کھمبا اٹھا لیا گیا۔ پہریداروں نے سیلوٹ کیا اور جواب میں یہ لوگ بھی سیلوٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"خدا کا شکر ہے۔ اب آپ ہمیں کسی درمیانی گاؤں میں چھوڑ سکتے ہیں۔" بوڑھے کسان نے کہا۔

اس وقت جس سڑک پر سفر کیا جا رہا تھا اس سڑک پر فوجی گاڑیوں کی آمد ورفت کثرت سے تھی لیکن کسی نے انہیں روکنے یا پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مخالف سمت سے آنے والے ٹرک پر موجود سپاہی ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بہرحال ایک ریلوے پُل کے قریب ایک دوسری چوکی پر اسے روکا گیا۔ کیونکہ ٹریفک ایک طرف سے جا رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں وہ اس سے کسی پاس وغیرہ کا مطالبہ نہ کریں۔ فورک واقعی انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس نے ایڈورڈ کو اپنی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور شہباز کو بھی آنکھ کے اشارے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی۔ ٹرک کے تینوں طرف کینوس پڑا ہوا تھا جس کی رسیاں انہوں نے پہلے ہی کس لی تھیں تاکہ

اندر موجود کسان میاں بیوی نظر نہ آئیں۔

ان کے ٹرک کے آگے تین ٹرک اور رکے ہوئے تھے اور تھوڑے فاصلے پر پلاسکن سپاہی کچھ باتیں کر رہے تھے۔ فورک نے پہلو بدلا اور شہباز کے کان میں کہا۔

"کچھ گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ وہ ان سے فارغ ہو کر ہمارے پاس بھی آئیں گے۔"

"ان کی تعداد صرف تین ہے۔ ان سے نمٹ لینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔" ہری سنگھ نے زبان کھولی۔

"دیکھتے ہیں......" ایڈورڈ نے جواب دیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بڑی بے تکلفی سے ہاتھ ہلا کر سنتریوں کو اس قسم کا اشارہ کیا جس سے وہ یہ سمجھیں کہ یہ لوگ جلدی جانا چاہتے ہیں۔ سپاہیوں نے جواباً ہاتھ ہلایا اور ان سے اونچی آواز میں کچھ کہا۔ فورک بولا۔

"تیار ہو جاؤ......ٹرک کے پچھلے حصے سے کینوس کھول کر وہیں جا بیٹھو اور اپنے ہتھیار بھی سنبھال لو۔ ایڈورڈ! تم اس تیسرے سپاہی کا خیال رکھنا اور اشارہ ملتے ہی اسے گولی سے اڑا دینا۔ بقیہ دونوں ہم میں سے پوچھ گچھ کرنے آئیں گے۔" سب نے حکم کی تعمیل کی۔ فورک اس وقت واقعی لیڈر بنا ہوا تھا اور شہباز کو اس کی لیڈری پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ وہ سب لوگ ٹرک کے پچھلے حصے میں جا بیٹھے اور کینوس اتنا کھول دیا کہ ضرورت کے وقت با آسانی باہر کودا جا سکتا۔ دو منٹ کے بعد ان کے آگے کھڑے ہوئے دونوں ٹرک اسٹارٹ ہوئے اور پل پار کرنے لگے۔ اب سنتریوں نے ان کی جانب قدم بڑھائے۔ فورک نے گھڑی باہر نکالی اور بار بار دیکھنے لگا جو اس نے پلاسکن افسر کو مار کر حاصل کی تھی۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ انہیں دیر ہو رہی ہے۔ دونوں سنتری کھڑکیوں کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہوئے۔ تیسرا پل کے دروازے پر ہی پہرہ دے رہا تھا۔ شہباز ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ بائیں طرف کھڑا ہوا آدمی ایڈورڈ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کچھ کہے بغیر اس کی طرف ہاتھ اس انداز میں بڑھایا جیسے کاغذات طلب کر رہا ہو۔ ایڈورڈ نے گردن ہلائی اور فورک کی جانب اشارہ کر دیا۔ پہلا سپاہی دوسری طرف جانے لگا تو اچانک ہی فورک کے کھنکارنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحے فورک نیچے اتر آیا اور پریشانی کے عالم میں جیبیں ٹٹولنے لگا۔ دونوں سپاہی حیرت سے فورک کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک فورک نے گردن جھکائی اور آگے سے سنتری کی ناک پر ٹکر ماری۔ یہ ضرب اتنی شدید اور غیر متوقع تھی کہ وہ

لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ فورک چیتے کی مانند اس پر جھپٹا اور اب شہباز کا راستہ صاف تھا۔ اس کے ریوالور کی گولی دوسرے سنتری کے بھیجے سے پار ہو گئی۔ پل پر کھڑے تیسرے سپاہی نے یہ تماشا دیکھا تو اس نے بدحواس ہو کر پل کے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ایڈورڈ ٹرک سے اتر کر پل کی طرف دوڑا۔ فورک گھونسوں سے سنتری کی تواضع کر رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس کے کپڑے خون سے تر ہو گئے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ان لوگوں نے اسے اٹھا کر کھائی میں پھینک دیا۔ ایڈورڈ پل پر کھڑا فائرنگ کر رہا تھا۔ فورک نے اسے آواز دی۔

"بیکار ہے ایڈورڈ! آؤ، راستہ صاف ہے۔"

کسان اور اس کی بیوی خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ سنتریوں کا خاتمہ ہوا تو جان میں جان آئی۔ فورک نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور پوری رفتار سے آگے بڑھا لیا۔ تقریباً دو میل کا سفر طے کیا گیا تھا کہ آبادی کے آثار نظر آئے۔ کسان نے بتایا کہ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہاں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ اگر وہ پسند کریں تو وہ پناہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ فورک کا بھی یہی خیال تھا کہ کیونکہ اب شام ہو گئی ہے اور پل پر ہونے والے واقعے کی خبر بالآخر پلاسکن فوجیوں تک پہنچ جائے گی اس لئے کہیں پناہ لینا ضروری ہے۔ اس ٹرک سے بھی پیچھا چھڑانا تھا۔ بہرحال گاؤں میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ممکن ہے سورج غروب ہونے کے بعد لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہو۔

کسان اور اس کی بیوی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ باقی لوگوں نے ٹرک میں سے وہ سامان نکالا جس کی انہیں ضرورت پڑ سکتی تھی اور ٹرک کو ایک کھڈ میں دھکیل دیا۔ ہر طرف ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ یہ لوگ سڑک سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں چلے گئے۔ پل کے حادثے کے بعد مشتبہ حالت میں پھرنا خطرے کا باعث تھا۔ آدھے گھنٹے بعد کسان دور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان اور بھی تھے۔ وہ سڑک پر کسی ٹرک کی ہیڈ لائٹ دیکھتے تو دبک جاتے اور ٹرک گزرنے کے بعد آگے بڑھتے۔ جب وہ قریب آ گئے تو انہیں آواز دی گئی۔ یہ نوجوان اس بوڑھے کسان کے ساتھی تھے اور ان کے استقبال کے لئے اپنی جان پر کھیل کر گاؤں سے باہر آ گئے تھے۔ بہرحال وہ سب گاؤں کی جانب چل پڑے۔ گاؤں میں داخل ہوئے تو کتوں نے حشر برپا کر دیا۔

مکانات تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ سن کر کچھ لوگوں نے کھڑکیوں میں سے جھانکا اور جلدی سے کھڑکیاں بند کر دیں۔ بہر حال اپنے ساتھیوں کی رہنمائی میں یہ لوگ شمال کی طرف بڑھے۔ راستے میں بوڑھا کسان اور اس کی بیوی ان سے جدا ہو گئے۔ بوڑھے کسان نے کہا کہ وہ صبح کسی وقت ان سے آ کر ملے گا۔ سامنے ہی ایک وسیع اور دلدلی میدان نظر آ رہا تھا اور یہاں اس لئے حفاظت کی جگہ تھی کہ ٹرک وغیرہ نہیں آ سکتے تھے۔ مغرب کی طرف ایک فرلانگ گھٹنوں گھٹنوں تک گہری دلدل میں چلنے کے بعد ایک پرانی اور بوسیدہ عمارت کے آثار نظر آئے۔ یہاں کھانے پینے کی بے شمار چیزیں چھپائی گئی تھیں۔ ان لوگوں نے بتایا کہ پلاسکن سپاہی یہاں اکثر مظالم توڑتے رہتے ہیں۔

بہر حال یہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے پینے کا جو سامان ساتھ لائے تھے اس میں نئے دوستوں کو بھی شریک کر لیا۔ دریا کی زبردست نگرانی ہو رہی تھی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ پلاسکن فوجیوں نے مقامی ملاحوں اور مچھیروں کی تمام کشتیاں اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی شخص دریا کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ وہاں نہ صرف طیارہ شکن توپیں نصب ہیں بلکہ اسلحے اور ایندھن کے ذخائر بھی ہیں۔ پلاسکن سپاہیوں کو خدشہ تھا کہ اس طرف سے ان کے دشمن ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نوجوان کہنے لگے۔

''ہم لوگ یہاں بس یوں سمجھ لیجئے کہ موت کے منتظر ہیں۔ کیونکہ ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیا آپ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟''

''ہر ممکن خدمت کے لئے حاضر ہیں۔'' فورک نے کہا۔

''دریا یہاں سے نزدیک ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپ میں سے کسی کو دریا تک لے جاؤں اور دیکھوں کہ پلاسکن فوجیوں نے وہاں کیا انتظام کر رکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ہم تو عرصہ سے دریا کے کنارے پر نہیں گئے۔ لیکن یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ ان کی طیارہ شکن توپیں نصب ہیں اور جابجا زمین دوز مورچوں میں ٹینک بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ دریا کی نگرانی دن رات ہوتی ہے اور آمد و رفت پل پر سے ہوتی ہے

جس کے اوپر سڑک ہے اور نیچے ریلوے لائن۔ ہمارے لئے اس پل کے ذریعے دریا پار کرنا ناممکن ہے۔ البتہ اگر کشتی کا انتظام ہو جائے تو بہت آگے جا کر رات کے اندھیرے میں دریا عبور کر سکتے ہیں۔''

بہر حال اس طرح کی باتیں کرتے اور مختلف تجاویز پر بحث کرتے ہوئے یہ لوگ اونگھتے رہے۔ رات کے تین بجے تھے کہ مسلسل فائرنگ کی آواز سے یہ لوگ ہوشیار ہو گئے۔ یہ آوازیں گاؤں کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پھر دستی بم پھٹنے کے دھماکے بھی سنائی دیئے۔ ان دھماکوں میں مردوں اور عورتوں کے چیخنے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

''گاؤں والوں پر آفت آ گئی۔ پلاسکن آپ لوگوں کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ صرف جنگل ہی میں کام نہیں کریں گے بلکہ وہاں آگ بھی لگائیں گے اور گاؤں کو تباہ کر دیں گے۔ انہوں نے پہلے بھی دھمکی دی تھی کہ اگر یہاں کوئی خفیہ کارروائی ہوئی تو گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

یہ لوگ اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آئے۔ پورا گاؤں شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ فائرنگ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

''کہیں وہ ادھر نہ نکل آئیں۔'' ہری سنگھ نے کہا۔

''نہیں...... اس بات کے امکانات نہیں ہیں۔'' مقامی نوجوان بولا۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ وہ آج تک کبھی دلدل میں داخل نہیں ہوئے۔''

''ٹھیک ہے...... بہر حال ہمیں روانہ ہونا ہے۔''

''آپ اپنے سفر کا آغاز کیجئے۔ ہم آپ کا تعاقب کریں گے۔'' مقامی نوجوان نے کہا۔ ''آپ کو صرف راستہ صاف کرنا ہو گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ جیٹی پر ایک بار پہنچ جانے کے بعد آپ کوئی نہ کوئی کشتی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔''

''کیا جیٹی کی نگرانی نہیں کی جاتی؟''

''نگرانی تو کی جاتی ہے لیکن صبح چار بجے سنتریوں کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں۔ رات کے جاگے ہوئے سنتری ویسے بھی غنودگی کی حالت میں ہوتے ہیں اور ان کی جگہ آنے والے ہمیشہ دیر سے پہنچتے ہیں۔ بس یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب جیٹی خالی ملتی ہے۔''

اچانک ہی فورک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اپنی رائفل اٹھا کر تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔ سب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ مقامی نوجوانوں نے جلدی جلدی ضروری چیزیں گھسیٹنا شروع کر دیں۔

''وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ کتے بھی ہیں۔ جلدی کرو، یہاں سے نکل چلو۔''

پلک جھپکتے ہوئے سب تہہ خانے سے باہر تھے۔ ہدایت کے مطابق یہ لوگ مشرق کی طرف بھاگنے لگے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دور مغربی اُفق پر بجلی چمک رہی تھی۔ وہ سفر کرتے رہے۔

''میرا خیال ہے جیٹی پر قسمت آزمائی کی جائے۔ چار بجنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ اگر بارش شروع ہوگئی تو ہمیں جیٹی تک پہنچنے میں بڑی مدد مل جائے گی۔'' فورک ہوشیار انداز میں بولا۔

یہ لوگ اب صنوبر کے درختوں میں ایک گنجان جھنڈ میں سے گزر رہے تھے۔ بجلی چمکتی تو راستہ ایک لمحے کے لئے نظر آتا اور پھر وہی گھپ اندھیرا۔ یہ لوگ ٹھوکریں کھاتے، گرتے پڑتے آگے بڑھتے رہے۔ پیچھے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو انہیں اور مستعد کر دیتیں۔ فورک کی ہدایت پر وہ لوگ ایک لمحے کے لئے رکے، اپنے پیروں سے جوتے کھولے اور ان کے تسموں کو گرہ دے کر گردنوں میں ڈال لیا۔ ان جوتوں کی وجہ سے اصل میں پاؤں پھسل رہے تھے اور چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے مسلسل جھونکے آنے لگے۔ ابھی انہوں نے ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ بارش شروع ہوگئی اور اس برق رفتاری سے ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ بارش کے تھپیڑے برچھیوں کی طرح ان کے چہروں پر پڑنے لگے۔ لیکن اب رکنے کا موقع نہیں تھا۔

دریا قریب آ گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر دومنزلہ عمارت کی سب سے اونچی کھڑکی سے فلش لائٹ چاروں طرف پھینکی جا رہی تھی۔ دریا کی طرف سے بھی اس کے جواب میں اسی قسم کی روشنی نمودار ہوتی تھی۔ اچانک ہی فورک نے کہا۔

''آپ لوگ یہیں رکیں، ہم کشتی کی تلاش میں جاتے ہیں۔ کشتی مل گئی تو ہم میں سے ایک آدمی آپ کو بلانے آجائے گا۔ شاید ڈیوٹیاں بدلنے والی ہیں۔''

یہ الفاظ اس نے مقامی لوگوں سے کہے تھے۔ موسلادھار بارش میں سب لوگ آگے بڑھنے لگے۔ چند لمحات کے بعد وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس دومنزلہ عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''احتیاط...... احتیاط......'' فورک دبی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے کوئی سنتری نظر نہیں آیا۔ شاید وہ بارش سے بچنے کے لئے عمارت کے اندر چلے گئے ہیں۔ دیکھو، وہ جیٹی نظر آ رہی ہے۔ وہاں کچھ سپاہی موجود ہیں۔''

جیٹی کے نزدیک کچھ لانچیں اور چھوٹی کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ دریا پوری طرح چڑھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ عمارت سے تقریباً تیس فٹ کے فاصلے پر رک گئے۔ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ ان کا اگلا قدم کیا ہو کہ عمارت کے صدر دروازے سے ایک سپاہی نکلا اور جیٹی کی طرف چل پڑا۔ پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا سپاہی باہر آ گیا۔ انہوں نے برساتیاں پہن رکھی تھیں۔ جیٹی اور عمارت کا فاصلہ ڈیڑھ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔

''ڈیوٹی بدل گئی۔'' فورک نے مسرت سے کہا۔ ''یہ سپاہی جیٹی پر جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت وہاں بھی چار ہی سنتری ہوں گے۔ اگر ہم انہیں راستے ہی میں جا لیں اور کچھ دیر تک قابو پا لیں تو پہرے دار سپاہی ٹھیک وقت جیٹی چھوڑ کر عمارت کی طرف آ جائیں گے اور ہمیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا اور سورج نکلنے سے پہلے ہم ان کی قید سے آزاد ہوں گے۔ ایڈورڈ! تم ان بے چارے دیہاتیوں کو بھی لے آؤ۔ میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ ان چاروں کو روکنے کے لئے میں اور شہباز کافی ہیں۔ میں جیٹی پر پہنچ کر تمہیں ٹارچ کے ذریعے سگنل دوں گا اور کسی تاخیر کے بغیر تمہیں وہاں پہنچنا ہوگا۔ ورنہ تم ہمارے ساتھ نہ جا سکو گے۔ سگنل دینے کے لئے میں صرف دو منٹ تک انتظار کروں گا۔ یہ ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تمہیں صرف دو منٹ تک طے کرنا ہے۔ سمجھ گئے ناں؟''

پلاسکن سپاہی ابھی تیس گز دور ہی گئے تھے کہ فورک نے ایک چکر کاٹا۔ شہباز بھی اس کے ساتھ تھا۔ دو سپاہی آگے تھے اور دو ان کے پیچھے۔ یہ اس مہم کا سب سے نازک اور خطرناک مرحلہ تھا اور اس کی کامیابی پر ان کی جانوں کی سلامتی کا دارومدار تھا۔ سپاہی آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ہی انہوں نے پیچھے سے رائفلوں کے کندھے پوری قوت سے دونوں سپاہیوں کے سروں پر دے مارے...... وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر

ہو گئے۔ دونوں طرف سے گھومتی فلش لائٹ، بجلی کی چمک اور موسلا دھار بارش میں آگے جانے والے سپاہیوں کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ دو سپاہیوں پر کیا گزر گئی ہے۔ فورک وغیرہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ آسانی سے یہ مہم سر ہو جائے گی۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ جیٹی اب سو گز دور تھی۔

اور اب یہ لوگ اگلے دونوں سپاہیوں پر وہی حربہ آزمانے کے لئے تیار تھے کہ اچانک ہی فورک کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی دونوں سپاہی پیچھے مڑے اور اب شہباز کے لئے اس کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کو بھون ڈالے۔ دوسرے لمحے اس نے ان پر فائر کھول دیا اور آن کی آن میں وہ دونوں بھی ڈھیر ہو گئے۔

''اوہو......'' فورک لرز گیا تھا۔ ''مائی گاڈ...... شہباز! تم نے جلدی کر دی۔ جلدی کر گئے تم...... تمہیں یہ یاد نہیں رہا کہ تم پلاسکن فوجیوں کی وردی میں ہو۔ وہ بلا تحقیق تم پر فائر نہ کرتے۔''

شہباز نے جیٹی کی طرف دیکھا، فائر کی آوازیں جیٹی پر موجود سپاہیوں نے پتہ نہیں سنی تھیں یا نہیں۔ دفعتہ ہی وہ بولا۔

''اوہو...... وہ دیکھو، وہ آرہے ہیں۔'' شاید انہوں نے سوچا ہو کہ دوسرے پہریدار راستے میں مل جائیں گے۔ تم دائیں جانب چکر کاٹ کر جیٹی کی طرف پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں بھی تمہارے پیچھے آرہا ہوں۔ ٹارچ کا خیال رکھنا۔ سگنل کے لئے اس کی ضرورت پڑے گی۔''

جیٹی والے سپاہی آہستہ آہستہ عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ بالکل صاف تھا۔ یہ دونوں کچھوؤں کی طرح رینگتے ہوئے جیٹی کی طرف بڑھنے لگے اور پانچ منٹ کے بعد نیچے کھڑی ہوئی ایک شاندار لانچ میں کود گئے۔ یہ زبردست لانچ تھی جس میں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ فورک نے ٹارچ سے بار بار اپنے ساتھیوں کو سگنل دیا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی مانند گزر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد عمارت کی اوٹ سے جواب میں ٹارچ روشن ہوئی اور بجھ گئی۔

''یہ کام خراب نہ کر دیں۔ بڑے سست جا رہے ہیں۔ میں واقعی دو منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گا۔ لانچ کا انجن اسٹارٹ کر دو۔ وہ آرہے ہیں۔'' کچھ فاصلے پر انہوں نے سایوں کو

دوڑتے دیکھا۔ ایک دو مرتبہ وہ فلش لائٹ کی زد میں بھی آئے۔ ابھی وہ جیٹی سے پچاس گز دور تھے کہ عمارت میں لگے سائرن چلا اٹھے اور اتنی سرچ لائٹیں روشن ہو گئیں کہ دور دور تک کا سارا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔

عمارت کے سائرن بجتے ہی دریا کے سائرن بھی بجنے لگے۔ اور پھر جیسے سینکڑوں مشین گنوں کے منہ کھل گئے۔ گولیاں سنسناتی ہوئیں ان کے سروں سے دائیں بائیں گزر رہی تھیں۔ اور یہ لانچ کے اندر لیٹے ہوئے عجیب وغریب احساس کا شکار تھے۔ تھوڑی دیر میں ان کے ساتھی بھی پہنچ گئے اور لانچ میں کود گئے۔

''ایڈورڈ کہاں ہے......؟'' فورک نے غضبناک ہو کر کہا۔

''وہ پیچھے رہ گیا ہے...... اسے گولی لگی ہے اور راستے میں پڑا ہوا ہے۔''

''کتنی دور ہے؟''

''قریب ہی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ہم اس کو ساتھ لے آتے مگر اس نے رائفل تان لی اور کہا بھاگ جاؤ۔ ورنہ فائر کر دوں گا۔''

''کیا کہتے ہو شہباز؟''

''نہیں...... ہم تو موت کے کھلاڑی ہیں۔ زندگی یا موت کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہمارے لئے۔ میں اسے لاتا ہوں۔''

اور اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شہباز اس طرح اچھل کر جیٹی پر پہنچا جیسے کمان، تیر سے نکلتا ہے اور پھر انہوں نے اس عجیب وغریب نوجوان کو فضا میں چھلانگیں لگاتے ہوئے دیکھا۔ وہ برق رفتاری سے ایڈورڈ کی تلاش میں جا رہا تھا حالانکہ اس کا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن انسانیت کے رشتے سب سے بڑے ہوتے ہیں۔ آخر کار اس نے ایڈورڈ کو جا لیا۔ سرچ لائٹیں گردش کر رہی تھیں۔ گولیاں برس رہی تھیں۔ اس نے ایڈورڈ کو اٹھا کر کندھے پر لادا۔

''کتے! چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو مجھے......'' ایڈورڈ چلا رہا تھا۔ لیکن شہباز نے اسے نہ چھوڑا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اسے لے کر لانچ میں کود گیا اور لانچ اسٹارٹ ہو کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ زندگی کے متلاشی، زندگی کی تلاش میں کامیاب ہو گئے تھے......!

✿......✿

کسی زمانے میں کنٹری ایک چھوٹی سی پسماندہ بستی تھی۔ اس میں رہنے والے افلاس زدہ زندگی گزارتے تھے۔ یہ بستی اب بھی پرانے رنگ میں ہے لیکن اس کے اطراف کھیتوں اور باغات سے سجے ہوئے ہیں۔ اس بستی کے کچے گھروں میں دنیا کی ہر آسائش موجود ہے۔ دور دور تک کی زمینیں شہباز کی ملکیت ہیں۔ بستی کے جوان ان زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ مقامی لوگوں کی ضرورت کے بعد باہر کی منڈیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ کاروبارِ زندگی اتنا پُرسکون چل رہا ہے کہ بزرگ ہر لمحہ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اس جنت کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

شہباز دو بچوں کا باپ ہے۔ اس کی شریک حیات جمیلہ، کنٹری کے ایک معصوم سے گھرانے کی لڑکی ہے جس نے اپنی زندگی میں کنٹری بستی کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا۔ آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل لگائے اور ہونٹوں کو دنداسے سے رنگے جب وہ شرما کر ہنستی ہے تو کائنات ہنس پڑتی ہے۔ فیض شاہ اور شبیلہ زندہ ہیں۔ خوش ہیں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے آبِ حیات پی لیا ہو۔

(ختم شد)